اس دربدر نوجوان کی سرگزشت جس کی دشمن زمین بھی تھی اور آسمان بھی
آگ بگولا
KitabPK.Com
2
محمد عباس ثاقب

KitabPK.Com

پیش لفظ

''آگ بگولا'' کی پہلی قسط کا مسودہ پڑھنے کے بعد جمال احسانی مرحوم نے کہا تھا ''دیکھو بیٹا ثاقب، میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا، تمہاری تحریر اتنی جان دار ہے کہ سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ جیسے کثیرالاشاعت جریدوں میں بھی شائع ہوسکتی ہے لیکن وہاں تمہیں اپنی تحریری صلاحیتوں کو بہتر بنانے کا موقع نہیں ملے گا، جب کہ راز دار میں تمہیں بہت کچھ سیکھنے اور اپنی خامیوں پر قابو پانے کا موقع ملے گا اور تمہاری صلاحیتیں نکھرتی چلی جائیں گی۔''

جنت مکانی جمال بھائی کے یہ الفاظ ہمیشہ میری زندگی کا ان مول اثاثہ رہیں گے۔ انہوں نے مجھے وہ اعتماد دیا جس کی مجھے اشد ضرورت تھی۔ جمال بھائی کا خیال غلط نہیں تھا۔ قارئین راز دار نے ''آگ بگولا'' کی تمام اقساط کو پزیرائی سے نوازا اور مجھے امید ہے کہ مکمل ناول کی شکل میں بھی آپ اسے اپنے ذوق مطالعہ سے کم تر نہیں پائیں گے۔

''آگ بگولا'' کے بارے میں مزید کچھ کہنے سے پہلے میں اپنے بارے میں بتانا چاہوں گا کیوں کہ اس کے بغیر ''آگ بگولا'' کا پس منظر واضح نہیں ہوگا۔ سیف داد خان عرف سیفل کے مانند میری جائے پیدائش بھی ڈیرہ غازی خان ہے، کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق، سات بھائیوں میں پانچواں نمبر سب سے بڑے بھائی جناب تاج محمد کی دیکھا دیکھی ہم سب بھائیوں کو مطالعے کی چاٹ لگ گئی۔ بہت سے الفاظ سر پر سے گزر جاتے لیکن مطالعے کا سلسلہ پورے انہماک سے جاری رہتا۔ خاصی کم عمری میں بہت کچھ پڑھ ڈالا، غیاث اقبال، مقبول جہانگیر، اشتیاق احمد، محمود خاور، اثر نعمانی، ابن صفی مرحوم، اظہر کلیم مرحوم، مظہر کلیم، محمود احمد مودودی...... بے تحاشا مطالعے نے غیر محسوس انداز میں لکھنے اور لکھانے کی طرف بھی مائل کر دیا۔ اردو کے مضمون سے ابتدا ہی سے گہرا شغف تھا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول نمبر 1، میں حصول تعلیم کے دوران جناب فخر الدین، غلام رسول سی ٹی اور غلام اکبر جیسے ادب نواز اساتذہ کی حوصلہ افزائی کے باعث ادبی ذوق کو جلا ملی اور شعر و شاعری کی طرف بھی رجحان ہوا۔ اردو کے امتحانی پرچوں میں اکثر مضامین اور ان میں شامل اشعار طبع زاد اور فی البدیہ ہوا کرتے تھے۔

میٹرک کے بعد بہتر مواقع کی امید کراچی لے آئی۔ یہ بدنصیب شہر تب تک قتل گاہ نہیں بنا تھا۔ پر غم روزگار نے رفتہ رفتہ اس شعبے میں دھکیل دیا جسے اپنانے کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ مسٹری میگزین کے پبلشر جناب غلام محمد غوری سے پہلی ملاقات مجھے اچھی طرح یاد ہے، انہوں نے پوچھا تھا ''کوئی تجربہ؟'' میں نے نفی میں جواب دیا لیکن مجھے بے نیلِ مرام لوٹانے کے بجائے انہوں نے ایک کتابت شدہ کہانی پروف ریڈنگ کے لیے مجھے تھما دی۔ اگلی ملاقات میں انہوں نے ملازمت کی پیش کش کر دی۔ بہت جلد مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ کام دلچسپ ہے اور میرے مزاج سے ہم آہنگ بھی۔ جب پہلی ہی تنخواہ طے شدہ بارہ سو کے بجائے پندرہ سو ملی تو خوش فہمیوں میں مزید اضافہ ہوا اور مابدولت نے ''اپنا گراں ہووے'' کے عنوان سے ایک عدد مختصر رومانوی افسانہ تحریر کر ڈالا جسے غلام محمد غوری صاحب نے شاید محسن میری حوصلہ افزائی کے لیے مسٹری میگزین میں شائع کر دیا۔ حیرت انگیز طور پر قارئین نے اس تحریر کی خاطر خواہ پذیرائی بخشی جس سے میرے نوزائیدہ شوق کو مہمیز ملی اور ترجمہ نگاری کے شعبے میں جوہر دکھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اچونک سے ترجمہ شدہ ''محصور'' کو اتنی پزیرائی ملی کہ میں نے یہ شغل بلا توقف جاری رکھنے کا عزم کر لیا۔ اس کے بعد ہر ماہ باقاعدگی سے میری ایک دو کہانیاں مسٹری میگزین اور ایڈونچر

KitabPK.Com

میں شائع ہونے لگیں لیکن مجھے ان کا معاوضہ نہیں ملتا تھا جب کہ مجھے پیسوں کی شدید ضرورت تھی۔ بالآخر مجھے مطالبہ کرنا پڑا، خدا خدا کر کے ادائی شروع ہوئی البتہ اس کی شرح دیگر مصنفین کے مقابلے میں نصف تھی لیکن پھر یہ ہونے لگا کہ ہر ماہ بہ مشکل ایک آدھ کہانی ہی اشاعت کا مرحلہ طے کر پاتی تھی۔

ان ہی دنوں میرے ذہن میں ایک قسط وار ناول لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ دراصل ان دنوں مسٹری میگزین اور ایڈونچر پر ایک سینیئر مصنف کا بلا شرکتِ غیر قبضہ تھا۔ یوں سمجھیں کہ وہ دونوں جریدوں میں دو دو قسط وار ناول اور متعدد متفرق کہانیاں تحریر کیا کرتے تھے۔ غوری صاحب نے شاید ان سے ہر ماہ مخصوص تعداد میں صفحات لکھوانے کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ وہ بلاشبہ اچھے مصنف تھے لیکن اس قدر بے تحاشا لکھنے کے باعث ان کی تحریر کبھی کبھی بالکل بے تاثیر ہو جاتی تھی، اس پر طرہ یہ کہ وہ قسط وار ناولوں میں مختصر سے واقعے کو بھی اتنا کھینچتے تھے کہ پروف پڑھتے ہوئے مجھ پر شدید جھنجلاہٹ طاری ہونے لگتی تھی۔ ''آگ بگولا'' کو ایک طرح سے ان صاحب کی تحریروں کا رد عمل قرار دیا جا سکتا ہے۔ خیر، تو میں قسط وار ناول لکھنا چاہتا تھا لیکن اندیشہ تھا کہ غوری صاحب ان صاحب کی اجارہ داری کے ہوتے ہوئے مجھے موقع نہیں دیں گے اور ہوا بھی یہی۔ انہوں نے کہا کہ فی الحال ترجمہ نگاری پر ہی اکتفا کرو۔ ادھر میری معاشی پریشانیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ بالآخر میں نے دیگر جرائد میں بھی قسمت آزمائی کی فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلے ڈائجسٹ انڈسٹری کے سب سے کثیر الاشاعت جرائد میں کوشش کی۔ مدیر محترم نے زبانی کلامی تو میری حوصلہ افزائی کی لیکن یکے بعد دیگرے دس کہانیاں جمع ہو جانے کے باوجود انہیں پڑھنے کا وقت نہ نکال سکے۔ دسمبر 1992ء سے جولائی 1993ء تک میں ان کی نظر کرم کا منتظر رہا بالآخر میں نے ان سے اپنی تمام کہانیاں واپس مانگ لیں جن میں سے سات مجھے مل سکیں باقی تین گم ہو گئی تھیں۔ خیر وہ ساتوں کہانیاں لے کر راز دار کے دفتر جا پہنچا۔ جمال بھائی نے حیرت انگیز طور پر پہلی ہی ملاقات میں نہایت گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ اگلی ملاقات میں انہوں نے بتایا کہ سات میں سے پانچ کہانیاں انہیں پسند آئی ہیں۔ راز دار کے معاون مدیر معروف مفتی بھی اس موقع پر موجود تھے۔ جمال بھائی نے دوران گفتگو پوچھا۔ ''کیا تم قسط وار ناول لکھنے میں بھی دلچسپی رکھتے ہو؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے ناول کا پلاٹ سنانے کی ہدایت کی۔ میں نے ''آگ بگولا'' کا مختصر خاکہ انہیں سنایا۔ جمال بھائی کو پلاٹ دلچسپ تو لگا لیکن ان کی رائے کے مطابق اس پر ایک طویل کہانی تو تحریر کی جا سکتی تھی، البتہ قسط وار ناول کے لیے وہ زیادہ موزوں نہیں تھا۔ میں نے جمال بھائی کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ میں اس پلاٹ پر کم از کم دس اقساط پر مشتمل ناول تحریر کر سکتا ہوں۔ تب جمال بھائی نے مجھے ناول کی پہلی قسط لکھنے کی اجازت دے دی۔ میں نے حسب عادت دن رات کر کے صرف ایک ہفتے میں پہلی قسط مکمل کر کے جمال بھائی کے حوالے کر دی جسے پڑھ کر جمال بھائی نے ان خیالات کا اظہار کیا جو میں اس عرض داشت میں تحریر کر چکا ہوں۔

میں اپنے آپ کو بے حد خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ نو آموزی کے باوجود اب میری بے حد حوصلہ افزائی ہوئی۔ بہت سے اچھے لوگوں کی صحبت میسر آئی۔ ''آگ بگولا'' کے ذریعے پہلا بریک دینے کے علاوہ جمال بھائی کا یہ احسان بھی میں کبھی نہیں بھلا پاؤں گا کہ انہوں نے مجھے جناب شکیل عادل زادہ صاحب سے متعارف کروایا تھا۔ شکیل عادل زادہ کی ''امربیل'' اور ''بازی گر'' وہ تخلیقی شاہکار ہیں جنہیں میں جانے کتنی بار پڑھ چکا ہوں اور مجھے ہر بار ایک نیا لطف ملا ہے۔ شکیل عادل زادہ ایسا انداز بیان اختیار کرنا تو خیر میرے بس کی بات نہیں البتہ میں نے ان کی تحریروں سے کردار سازی کی کچھ سوجھ بوجھ ضرور حاصل کی ہے جس سے ''آگ بگولا'' کے کردار تخلیق کرنے میں مجھے بے حد مدد ملی۔ میں جبار توقیر مرحوم کے انداز نگارش کا بھی مداح رہا ہوں اور میرے بھائیوں کے مطابق میری تحریر میں ان کی جھلک نمایاں ہے۔ میں ذاتی طور اسے کوئی عیب تصور نہیں کرتا کیوں کہ جبار توقیر مرحوم بلاشبہ ایک عظیم مصنف تھے۔ مجھے ہمیشہ حسرت رہے گی کہ میں ان سے ملاقات نہیں کر سکا۔

گزشتہ چھ برسوں کے دوران شکیل عادل زادہ میرے بڑے بھائی اور سرپرست کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ان کا حلقۂ احباب بے حد وسیع ہے لیکن مجھے فخر ہے کہ شکیل بھائی سے میری وابستگی رسمی سطح سے بلند ہے۔ میں نے فن تحریر سے ہٹ کر عملی زندگی میں بھی ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ ان معدودے چند ہستیوں میں سے ہیں جن کے حسن اخلاق، وسیع ظرف اور وسعت قلبی کی گواہی ان کے دشمن بھی دینے پر مجبور ہیں۔ خود غرضی اور خود پرستی کے اس دور میں ان کی شخصیت نادر و نایاب اور عجوبہ روزگار محسوس ہوتی ہے۔

شکیل عادل زادہ کے علاوہ جناب سلیم انور کو بھی میری زندگی میں اہم مقام حاصل ہے۔ میں سلیم بھائی کو ترجمہ نگاری کے شعبے میں اپنا استاد تسلیم کرتا ہوں۔ انہوں نے ہر قدم اور ہر مرحلے پر مجھے حوصلہ دیا، میری رہنمائی کی، میں جانتا ہوں کہ اگر میں انہیں اپنا محسن کہوں تو وہ ناراض ہو جائیں گے کیونکہ بڑا بھائی چھوٹے بھائی پر شفقت کرتا ہے احسان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ان کی کرم نوازیوں کے جواب میں کبھی ان کا شکریہ ادا نہیں کیا۔

ان دو عظیم شخصیات کے علاوہ بھی بہت سے مہربانوں نے مجھے اخلاقی اور عملی تعاون سے سرفراز کیا جن میں جناب انور شعور، حسن ہاشمی، امیر مینا، محمود احمد مودی، معروف مفتی، محمد اختر ابن آس، غلام محمد غوری، سید انور فراز اور ابراہیم جمالی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یہاں میں ڈیرہ غازی خان میں مقیم اپنے پیارے دوستوں سلیم احمد خان، سید فواد حسین اور سید نوشاد حسین وغیرہ کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے وقت نکال نکال کر نہ صرف ''آگ بگولا'' کی تمام اقساط کا مطالعہ کیا بلکہ اپنی پرخلوص تنقید، تبصروں اور مشوروں کے ذریعے ''آگ بگولا'' کو بہتر بنانے میں بھی میری مسلسل رہنمائی کرتے رہے۔

میں گل قریشی پبلی کیشنز لاہور کے روح رواں اور ''آگ بگولا'' کے پبلشر جناب مبین خٹک کا خصوصاً شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے ''آگ بگولا'' کو مکمل کروانے میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور پھر نہایت محبت اور نفاست کے ساتھ اسے کتابی شکل دے کر زیور اشاعت سے مزین کیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ اگر ان کا بھرپور تعاون کارفرما نہ ہوتا تو شاید ''آگ بگولا'' کبھی مکمل ناول کی صورت اختیار نہ کر پاتا۔ ادب کی ترویج اور ترقی کے لیے جناب مبین خٹک کی کاوشیں قابل تحسین۔

آخر میں قارئین سے عاجزانہ التماس، اگر یہ حقیر قلمی کاوش آپ کو پسند آئے تو میرے لیے دعا کیجیے گا، ورنہ ایک نو آموز اور ناپختہ قلم کار کی آشفتہ خیالی و خام کاری سمجھ کر معاف کر دیجیے گا۔ البتہ آپ کی آراء اور تبصروں کا معرفت پبلشرز مجھے شدت سے انتظار رہے گا اور جہاں تک بن پڑا میں آپ کے عنایت ناموں کا جواب بھی دینے کی کوشش کروں گا۔

آپ کا اپنا

محمد عباس ثاقب

KitabPK.Com

اظہاریہ

برادرم عباس ثاقب کی خواہش ہے کہ میں ان کی پہلی کتاب پر کچھ عرض کروں' میرا لکھا اور میرا کہا ہوا کوئی سند نہیں رکھتا' جو خود مبتدی ہو' اسے یہ جسارت زیب بھی نہیں دیتی' اور کوئی کسی کو کیا سند دے سکتا ہے؟ سند تو اصل میں پڑھنے والوں کی ہوتی ہے' ان صاحبان کی جن کے لیے کتاب لکھی گئی ہے' سب سے بڑے ناقد وہی ہیں۔ میں عباس ثاقب سے اپنے تعلق خاطر کی سرشاری میں اس کتاب کی مقبولیت کی آرزو ہی کرسکتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے' اس نے ابھی ابتدا کی ہے مگر ابتدا سے پہلے انتہا ممکن نہیں ہے' اور مجھے معلوم ہے' اس کے خانوادے میں حرف و خیال سے کوئی اور ذرا سا بھی علاقہ نہیں رکھتا۔ وہ ایک نہایت غیر تخلیقی ماحول میں تخلیق کی قلندری جاری رکھے ہوئے ہے۔ کہتے ہیں' تخلیق تو ایک خودرو پودے کی مانند ہے جو کنکروں کے درمیاں نمو پا جائے اور ریت میں کھل اٹھے' پھوٹ پڑے۔

عباس ثاقب ایک نوجوان آدمی ہے اور بدقسمتی سے شادی شدہ! یہ ازدواجی بکھیڑے تخلیق کار کو راس نہیں آتے' پھر اسے کچھ قرار سا آجاتا ہے' اور وہ کچھ ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھتا ہے' شادی شدہ خوابوں کی حریف ہے' کیا یہ واقعہ نہیں' اور بے شک اس کلیے سے اختلاف کا حق محفوظ ہے کہ شادی سے پہلے آدمی خواب بہت دیکھتا ہے اور شادی کے بعد خواب بچھڑ جانے کا ملال ہی کرتا رہتا ہے۔

کچھ صاحبان کمال کا فرمودہ ہے' اچھا ہے آدمی اس منزل' اس مرحلے سے ابتدا ہی میں گزر جائے' پھر اس کے قدم زمین پر زیادہ یقین اور مضبوطی سے جمتے ہیں' اور خواب زندگی کے ساتھ متحرک رہتے ہیں۔ آدمی بستر مرگ پر بھی خواب دیکھتا ہے۔ معلوم نہیں کیا سچ ہے۔ رئیس امروہوی کے ایک مصرع کے مطابق شاید کچھ یوں ہے۔

ہر شخص کا تجربہ نیا ہے.......... نیا ہے یا مختلف' زندگی ہر ایک سے مختلف شعبدے ضرور کرتی ہے۔ زندگی ایک بازی گر ہے یا شطرنج کی بساط' وہی مہرے' وہی شاطر لیکن بازی ہر بار بدل جاتی ہے' بدلتی رہتی ہے۔

عباس ثاقب کا یہ ناول پہلے اپنے دوست جمال احسانی مرحوم کے پرچے' ماہنامہ راز دار ڈائجسٹ کراچی' میں قسط وار شائع ہوتا رہا ہے' جمال شاعر زیادہ تھے' صحافی کم اور کاروباری تو صفر۔ رسالہ کاری ۷۵ فی صد کاروباری مشغلہ ہے' یہ شاعری نہیں ہے۔ لاکھوں کا نقصان اٹھا کے جمال نے رسالہ بند کر دیا' عباس ثاقب کا ناول بھی ادھورا رہ گیا۔ بہر حال' لاہور کے ایک مہم جو پبلشر کی نظر اس پر پڑ گئی' انھیں کی ایما اور تحریک پر عباس ثاقب نے دوبارہ آخری حصے پر شب و روز کھپانے شروع کیے اور اب کتاب کی صورت میں یہ تحریری کام مجسم ہو گیا' یقیناً اس کا کریڈٹ ناشر ہی کو جانا چاہیے۔

عباس ثاقب ایک پیدائشی ادیب ہے لیکن اتنا بہت نہیں ہے' مطالعہ' مشاہدہ' جستجو اور قلم کا احترام بھی لازم ہے' اور یہ سارا بھی خام اور نا تمام ہے اگر آنکھ خوبی سوزش سے عاری ہو اور دل شورش و تلاطم کے گداز سے۔ عباس ثاقب نے بہت کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور سینے پر بار کیا ہے' وہ بہ ظاہر ایک بے نیاز سا شخص معلوم ہوتا ہے مگر اس کی تحریریں حالات و واقعات میں اس کی بے پناہ شمولیت شدت سے ظاہر کرتی ہیں' وہ ایک کہانی کار' ایک قلم کار کے تمام اوصاف سے مرصع ہے۔ مجھے امید ہے' اس کا یہ پہلا ناول جو ایک ڈائجسٹ کے ''خاص مطالبے'' پر لکھا گیا تھا' قبولِ خاطر ہو گا۔

شکیل عادل زادہ
مدیر ماہنامہ سب رنگ ڈائجسٹ کراچی

خوف کے مارے میرا رواں رواں کانپنے لگا۔ دل کا یہ عالم تھا گویا پسلیاں توڑ کر' ابھی باہر آجائے گا۔ میرے حلق میں ایک پتھر سا آن پھنسا تھا جس نے میرے سانسوں کو سینے میں مقید کر کے رکھ دیا۔ میرا دل مجھے پوری قوت سے اکسا رہا تھا کہ میں فوراً اُٹھ کر کسی بھی سمت اندھا دھند دوڑتا چلا جاؤں لیکن میرا جسم میرے دل و دماغ کا حکم ماننے سے انکاری تھا۔ مجھ میں تو اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ کروٹ بدل کر اس بھیانک منظر سے آنکھیں چرا لیتا۔ میں تو بس سنگی مجسمے کی مانند آنکھیں پھاڑے بے حس و حرکت اس آئینے کو اور اس میں ابھرنے والے بھیانک منظر کو گھورے جا رہا تھا۔

وہ قدیم طرز کا ایک قدِ آدم آئینہ تھا جس کے گرد مہاگنی کا نقشین چوکھٹا تھا۔ تیز روشنی میں آئینہ خوب چمک رہا تھا لیکن اس میں ابھرنے والی شبیہہ پوری طرح واضح نہیں تھی۔ اس مبہم سی انسانی شبیہہ کے ہاتھ میں چم چم کرتا ہوا خونی خنجر ضرور میری آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ وہ مہیب ہیولا لحہ بہ لحہ میری طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ وہ شخص ہر قدم پر خنجر کو یوں جنبش دیتا تھا کہ گویا ابھی اسے میرے سینے میں ترازو کر دے گا اس کے ہاتھ کی ہر جنبش کے ساتھ میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکتا اور میری ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سرد لہر دوڑ جاتی۔

ہزار کوشش کے باوجود میرے حلق سے کوئی آواز نہیں نکل پا رہی تھی لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ جونہی وہ شخص اپنا خنجر ہوا میں تولتا' ایک دہشت بھری نسوانی چیخ ابھرتی۔ اس چیخ کے ساتھ ہی اس ہیولے کے حلق سے ایک مکروہ غیر انسانی قہقہہ اُبل پڑتا۔ اس کے بھیڑیے جیسے لمبے لمبے نکیلے دانت دیکھ کر مجھے تھرتھری چھوٹنے لگتی۔

اچانک فضا میں ایک طویل دردناک نسوانی چیخ ابھری اور اس کے ساتھ ہی وہ قدِ آدم آئینہ سرخ سرخ انسانی لہو میں نہا گیا۔ گاڑھے گاڑھے گرم خون کے قطرے بہہ بہہ کر فرش پر ٹپکنے لگے۔

اچانک میری سانس بند ہونے لگی۔ آکسیجن کی کمی کی وجہ سے میرے پھیپھڑے پھٹنے لگے۔ میں نے منہ پھاڑ کر گہرے گہرے سانس لینے کی کوشش کی لیکن میرے لئے یہ ممکن نہ تھا۔ رفتہ رفتہ میری

KitabPK.Com

آنکھوں کے سامنے گھور اندھیرا چھاتا چلا گیا۔

☆O☆

میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور جسم پر لرزہ طاری تھا۔ میرے جسم سے بہہ نکلنے والی پسینے کی دھاروں نے کھری چارپائی کا بان تک گیلا کر دیا تھا۔ میں نے کئی بار سر جھٹک کر اس دہشت ناک خواب کو بھلانے کی کوشش کی لیکن میری آنکھوں میں بار بار سرخ گاڑھے خون کا منظر گھومنے لگتا۔ دوبارہ سونے کی کوشش بے سود تھی کیونکہ اس بھیانک خواب کے بعد میں آج تک کبھی دوبارہ نہیں سو پایا۔

یہ ڈراؤنا خواب تو اب میری زندگی کا معمول بن چکا تھا۔ ہفتے میں نہیں تو مہینے میں ایک بار ضرور یہ خواب میری نیند اُڑا دیتا تھا۔ یہ خواب اس وقت سے میری زندگی کا روگ بنا جب سے میں نے نوجوانی کی راہ گزر پر قدم رکھا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس خواب کی آمد سے پہلے میں ڈر' خوف اور دہشت کے جذبے سے عملاً نا آشنا تھا۔

آسمان کی پھیکی پڑتی رنگت بتا رہی تھی کہ رات کا تیسرا پہر گزر رہا ہے۔ صحن میں بچھی ہوئی دوسری چارپائی پر چچا مہرداد ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا۔ گھر کے برآمدے میں میری چچازاد بہن' مہراں محوِ خواب تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس وقت وہ سو رہی ہے ورنہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر اس پر خفقان کے دورے پڑنے لگتے اور میرے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ نہ جانے کیا کیا پڑھ کر مجھ پر پھونکنے لگتی بالآخر تنگ آ کر مجھے سخت رویہ اپنانا پڑتا اور پھر حسبِ معمول وہ مجھ سے روٹھ جاتی لیکن اس بے چاری کی مجبوری یہ تھی کہ وہ کوشش کے باوجود مجھ سے زیادہ دیر روٹھی نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ پگلی تو مجھے دیکھ کر جیتی تھی۔ میری پیشانی کی ایک شکن اس کے دل کی نازک سی دنیا کو متزلزل کر ڈالتی۔ میری خوشنودی کی خاطر وہ ساری دنیا سے ٹکرا سکتی تھی۔ وہ سراپا خلوص' سراپا محبت تھی' اس کی ذات زندگی کے تپتے صحرا میں میرے لئے برستی بدلی کی مانند تھی۔ وہ اپنے خلوص' اپنی چاہت کے مرہم سے میری روح کے زخموں کو مندمل کرنے کی کوشش کرتی رہتی۔ وہ عارضی طور پر میرے درد کو کم کرنے میں تو کامیاب ہو جاتی لیکن میرے زخم تو ناسور تھے جن کا اندمال کسی بھی مسیحا کے بس میں نہیں تھا۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا کہ میں اس ننھی سی پری کو اپنے دل میں چھپا لوں' اپنی آنکھوں میں اسیر کر لوں لیکن پھر جب مجھے اپنے دل میں دہکتے ہوئے نفرت کے تنور کا خیال آتا اور اپنی آنکھوں سے برستی انتقام کی آگ کا خیال آتا تو میرا دل چاہتا کہ یہ گلاب چہرہ لڑکی مجھ سے دور ہی رہے تو اچھا ہے۔ مجھے خوف آتا کہ میری رگوں میں دوڑتا تیزاب اس کے نرم و نازک سندر سپنوں کو جلا کر راکھ نہ کر دے۔ کبھی کبھی میرا دل کرتا کہ اپنے سارے عذابوں کو سارے زہرابوں کو کسی اندھے کنویں میں پھینک آؤں اور خود ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس نخلستان جیسی مہکتی زلفوں کی چھاؤں میں بسیرا کر لوں لیکن کاش......... کاش کہ ایسا ممکن ہوتا۔ کاش کہ میں مہراں کے الوہی جذبۂ محبت کی پذیرائی کر سکتا۔ میرے وجود میں تو نفرت کے ہول اُگ رہے تھے اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ ان ببولوں کے کانٹوں میں اُلجھ کر اس معصوم لڑکی کے نوخیز ارمانوں کا دامن تار تار ہو۔

مہراں کو پختہ یقین تھا اور وہ اس امر کو وقتاً فوقتاً دہراتی بھی رہتی تھی کہ لوہے کے ساتھ کھیلتے کھیلتے میرے جسم کی طرح میرا دل بھی سرد بے جان لوہے کے ٹکڑے میں تبدیل ہو چکا ہے' جس میں کومل کومل نرم و نازک جذبات و احساسات کا کوئی گزر نہیں ہے۔

کاش میرے اندر اتنا حوصلہ' اتنی جرات ہوتی کہ میں اسے بتا پاتا "نہیں اے احمق لڑکی......... میرا دل لوہے کا نہیں ہے' کاش یہ لوہے کا ہوتا' تا کہ میں واقعی ہر قسم کے جذبات و احساسات کے آزار سے محفوظ ہو جاتا۔ میں جانتا ہوں کہ میرا دل تو چچا مہرداد کی لوہا پگھلانے والی بھٹی کی مانند ہے جس میں ہر وقت نفرت اور انتقام کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ اس میں میرے تمام جذبات جل کر فنا ہو چکے ہیں۔ میں خود کو انسان کیسے کہوں؟ انسانوں کی رگوں میں تو گرم گرم جلتا جاگتا خون دوڑ رہا ہے لیکن میری رگوں میں تو زہر ہے' شیش ناگ کے زہر سے بھی زیادہ زود اثر زہر۔ ایک ایسا زہر جس کا تریاق دنیا میں کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ یہ زہر ہر لحہ مجھ سے میرے انتقام کی تکمیل چاہتا ہے۔ اگر میں نے جلد ہی اس کے مطالبے کو پورا نہ کیا تو یہ مجھے موت کی نیند سلا دے گا لیکن یہ موت ایسی ہو گی کہ مجھے قبر میں بھی چین نہیں ملے گا۔ یہی تو وہ زہر ہے جو کبھی کبھی میری زبان پر نمودار ہو جاتا ہے اور تم حیرت اور خوف کے عالم میں میرا منہ تکنے لگتی ہو۔ اری پگلی تم کیا جانو نفرت کیا ہوتی ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ اس انسان کی کیا حالت ہوتی ہے جس کا سینہ رستا ہوا ناسور بن گیا ہو۔ تم بہت خوش قسمت ہو کہ تم نے میری طرح اپنا بچپن نہیں گزارا اگر تم بھی میری طرح لوگوں کے زہریلے طعنے اور طنز بھرے جملے سنتے ہوئے بچپن سے نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھتیں تو تمہیں اندازہ ہوتا کہ زندگی کتنا بڑا آزار ہے۔ ایک ایسا آزار جسے نہ چاہتے ہوئے بھی شانوں پر لادنا پڑتا ہے' بھگتنا پڑتا ہے۔

تم مجھ سے پوچھتی ہو کہ میں دوسرے لوگوں کی مانند ہنستا مسکراتا کیوں نہیں ہوں۔ میں تمہیں کس طرح بتاؤں کہ میری ہنسی تو اس وقت چھن گئی تھی جب مجھے ہنسنے کا شعور بھی نہیں تھا لیکن میری بدقسمتی یہ ہے کہ میں ہنسنے کے ساتھ ساتھ رونے کی صلاحیت سے بھی محروم ہوں۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو کہ رو دھو کر اپنا غم ہلکا کر لیتے ہیں' میں تو ایک ایسے غم کا ڈسا ہوا ہوں جس کا کرب ہر گزرتے پل کے ساتھ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

مجھ سے بڑھ کر بھی بھلا دنیا میں کوئی الم نصیب ہو گا۔ میں تو وہ حرماں نصیب ہوں کہ جسے جنت کے ٹھنڈے میٹھے چشمے نے زہر پلا کر سسک سسک کر' تڑپ تڑپ کر مرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت جب میں کسی پودے کی مانند زمین کے سینے سے سر اٹھانے ہی والا تھا' مجھے بڑی بے دردی سے نوچ کر پھینک دیا گیا لیکن ستم تو یہ ہے کہ میں کسی کے روبرو فریاد بھی نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے جڑوں سے محروم کرنے والا کوئی اور نہیں خود میرا نگہبان تھا۔

جی ہاں مجھے اپنی ماں سے شدید ترین نفرت تھی۔ یہ نفرت یک لخت میرے دل میں پیدا نہیں ہو گئی۔ یہ نفرت تو سالہا سال سے قطرہ قطرہ کر کے تیزاب کی مانند میرے دل پر ٹپک رہی تھی۔ میں اس نفرت کی کسی قیمتی خزانے کی طرح حفاظت کرتا چلا آ رہا تھا۔

KitabPK.Com

لوگ کہتے ہیں کہ محبت کر کے نبھانا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ نفرت کی پرورش کرنا اس سے بھی مشکل کام ہے۔ نفرت کا عفریت پالنا ایک عذاب ہے' یہ عذاب ذرا سا بھی بدکے تو اپنے نگہبان کو چاٹ جاتا ہے۔ خاص طور پر ایک ایسی ہستی سے نفرت کرنا جس کے نام سے تمام تر مقدس روایات اور حکایات وابستہ ہوں۔ دنیا کا کون سا مذہب اور زبان ایسی ہے جس میں اس رشتے کی عظمت کے گن نہ گائے گئے ہوں۔ کہیں تو اسے خدا کی عطا کردہ عظیم ترین نعمت کہا گیا تو کہیں اسے جنت کا سایہ قرار دیا گیا۔ ماں کے لفظ کو دنیا کے خوبصورت ترین لفظ کا نام دیا گیا۔ اسے ایثار' محبت اور قربانی کی علامت کہا گیا۔ صد افسوس کہ میری زندگی میں ان خوبصورت مقولوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ ساری باتیں میرے لئے بے معنی ہیں۔ میں نے زندگی بھر اسی لفظ سے نفرت کی ہے اور یہ نفرت آئندہ بھی جاری رہے گی۔

مجھے معلوم ہے کہ آپ میں سے زیادہ تر لوگ مجھے برا بھلا کہہ رہے ہوں گے۔ مجھے لعنت ملامت کریں گے کہ میں کیا کیا خرافات بکتا چلا جا رہا ہوں لیکن مجھے کسی کے کہنے سننے کی پروا نہیں ہے۔ میں اپنے جذبات و احساسات کے سلسلے قطعاً بے بس ہوں۔ البتہ مجھے اتنا یقین ضرور ہے کہ آپ اگر میری جگہ ہوتے اور میری طرح اتنے طویل برسوں سے روزانہ آپ کے کانوں میں زہریلے طعنوں کا زہر انڈیلا جاتا رہا ہوتا اور آپ کی روح کو زبان کے زہریلے تیروں سے چھلنی کیا جاتا تو شاید آپ کی رگوں میں بھی یہ سم موجیں مارنے لگتا۔

میں بے حد اذیت کے ساتھ اس عورت کے بارے میں سوچتا ہوں' جو اپنے ڈیڑھ دو سال کے پیارے بچے کو خاردار جھاڑیوں تلے چھوڑ کر اپنے چاہنے والے کے ساتھ فرار ہوگئی۔ کیا اسے ذرا بھی خیال نہ آیا کہ یہ معصوم جان آگ برساتی دھوپ میں بلک بلک کر موت کے منہ میں بھی جا سکتی ہے۔ اولاد تو ماں کے جگر کا ٹکڑا ہوتی ہے تو پھر یہ کیسی ماں تھی جس نے اپنے جگر گوشے پر غیر مرد کو ترجیح دی۔ اس نے تو اتنا سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی کہ اس مرگ آفریں موسم میں قدم قدم پر زہریلے سانپ اور کیڑے مکوڑے کلبلاتے پھرتے ہیں اور پھر آوارہ پھرتے ہوئے خارش زدہ کتے اس معصوم بچے کی کس کس طرح ضیافت نہیں اُڑائیں گے۔

اس بدبخت ڈاچی سوار خانہ بدوش میں اسے ایسی کیا خاص بات نظر آئی کہ اس نے اپنی گھر کو' معصوم لختِ جگر کو اور پیار کرنے والے محنت کش شوہر کو چھوڑ دیا اور جب وہ بدقسمت غیرت مند انسان اپنی عزت کو واپس لانے کے لئے نکلا تو اس ناگن جیسی عورت نے اس سیدھے سادے معصوم شخص کو اپنے چاہنے والے کے ہاتھوں گولی کا نشانہ بنوا دیا۔ وہ کیسی ماں تھی جس نے اپنے ننھے بچے کو ہمیشہ کے لئے یتیمی کے اندھیرے کا شکار بنا دیا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں میرا گلا گھونٹ جاتی تا کہ مجھے قدم قدم پر لوگوں کی ٹھوکریں تو نہ کھانی پڑتی۔ بچے بچے کی زبان پر موجود اس شرمناک داستان کے چرچے میرا کلیجہ تو چھلنی نہ کرتے۔

میں یہ ارادہ کر چکا تھا کہ اس عورت کو کسی صورت معاف نہیں کروں گا۔ آج سے کئی سال پہلے اس عمر میں جبکہ بچے انتقام کے نام سے بھی آشنا نہیں ہوتے' میں نے قسم کھائی تھی کہ میں...... عورت سے اور

اس کے چاہنے والے ڈاچی سوار سے' اپنے باپ کی موت کا ایسا بھیانک انتقام لوں گا کہ اس کی داستانیں صدیوں تک دہرائی جاتی رہیں گی۔ میری زندگی کے ہر گزرتے دن کے ساتھ میرے اس عہد کی پختگی میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

انسان کے زخموں پر نمک چھڑکنا شاید ازل سے دنیا والوں کا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے۔ میرا یہ رستا ہوا ناسور بھی ہمیشہ گاؤں والوں کا تختہ مشق بنا رہا۔ جب میں کم سن تھا تو تب بھی لوگ مجھے میری ماں کے حوالے سے تضحیک کا نشانہ بناتے۔ میں اس بات کی پوری گہرائی سے ناواقف ہونے کے باوجود اذیت سے تڑپ اُٹھتا۔ میں روتا بلبلاتا اور ہر اس شخص کو کاٹنے کو دوڑتا جس نے میری ماں کو میرے سامنے موضوعِ گفتگو بنایا ہوتا۔ لوگ میری وحشیانہ حرکتوں سے لطف اندوز ہوتے اور میرے زیادہ غل مچانے پر مجھے دو چار ہاتھ مار کر بھگا دیتے۔

اسکول میں لڑکوں کے لئے میری ذات ایک دلچسپ تماشہ تھی۔ وہ اجتماعی طور پر میری ماں کا نام لے کر مجھے چھیڑتے' میرا مذاق اڑاتے اور میرے تڑپنے پھڑکنے پر خوش ہو کر تالیاں بجاتے۔ میں نے کتنی ہی بار اپنے سے عمر میں بڑے لڑکوں سے جھگڑا مول لیا۔ بے شمار بار پٹا اور کتنی ہی بار انہیں بری طرح مارا بھی۔ تقریباً روزانہ ہی مجھے اپنے اساتذہ سے زبردست مار پڑتی۔ ہر جھگڑے کے بعد مجھے ہی قصوروار ٹھہرایا جاتا۔ ستم تو یہ تھا کہ اسکول کے زیادہ تر اساتذہ بھی ان لڑکوں کے ساتھ میری تضحیک میں برابر کے شریک ہوتے۔ جماعت کے لڑکے ان کے سامنے میری ماں کے بارے میں غلیظ تبصرے کرتے اور وہ چپ چاپ مسکراتے رہتے۔ البتہ جب میں آنکھیں بند کر کے اُن لڑکوں پر جھپٹ پڑتا تو مجھے شرپسندی اور فتنہ فساد پھیلانے کے جرم میں بری طرح دھنک دیا جاتا۔ اگر ہمارے مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر جناب خان حفیظ اللہ خان ایک خدا ترس انسان نہ ہوتے تو مجھے جانے کب کا اسکول سے خارج کر دیا گیا ہوتا۔

مجھے خود بھی پڑھنے لکھنے سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی اور میں ہر ممکن طریقے سے اسکول جانے سے بچنے کی کوشش کرتا لیکن میرے چچا مہر داد خان اس معاملے میں بہت سخت تھے۔ ''دیکھو بیٹا سیفل' تم ایک بات کان کھول کر سن لو۔ کم از کم میری زندگی میں تم اسکول نہیں چھوڑ سکتے۔'' ان کے لہجے میں فولاد کی سی سختی ہوتی ''میرے مرحوم بھائی گوہر داد خان کی دلی خواہش تھی کہ وہ تجھے خوب پڑھائے لکھائے۔ اگر وہ مر گیا تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اس کی خواہش بھی مر جائے...... نہیں بیٹا تجھے پڑھنا ہے۔ ہر قیمت پر پڑھنا ہے اگر میں نے تجھے نہیں پڑھایا تو اپنے بھائی کے پاس کیا منہ لے کر جاؤں گا۔''

''لیکن چاچا سائیں' میں پڑھ لکھ کر کروں گا کیا؟ ہمارے نصیب میں تو لوہا ہی کوٹنا لکھا ہے۔ میں کتنا ہی لکھ پڑھ جاؤں' مجھے بالآخر بھٹی کے سامنے ہی بیٹھنا ہے۔''

''قسمت کے لکھے کو تو اوپر والا ہی جانتا ہے۔ سیفل بیٹا لیکن تجھے کسی حالت میں بھی پڑھائی نہیں چھوڑنی ہے۔''

اس بھری دنیا میں چچا مہر داد اور اس کی بیٹی مہر بی بی کے علاوہ میرا کوئی بھی اپنا نہیں تھا۔ گاؤں کے ایک سرے پر جوہڑ کے کنارے ہمارا ٹوٹا پھوٹا سا مکان تھا جس کے احاطے میں چچا مہر داد نے بھٹی لگا

KitabPK.Com

رکھی تھی۔ وہ تمام دن لوہا گرم کر کے اس پر بھاری بھرکم ہتھوڑے کی ضربیں لگاتے رہتے۔ اسکول سے واپس آنے کے بعد میں بھی ان کے ساتھ کام میں شریک ہو جاتا۔ جب میں چھوٹا سا تھا تو تب ہی سے میں ان کی مدد کیا کرتا تھا۔ بھاری بھرکم ہتھوڑا اٹھانا تو خیر میرے بس میں نہیں تھا تاہم مجھے دھونکنی چلانے میں کافی مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ بھٹی میں کوئلے جھونکنا اور چچا کو مختلف اوزار پکڑانا بھی میری ذمہ داری تھی۔ چچا تمام دن ہلوں کے پھل، کلہاڑیاں، درانتیاں، گھوڑوں کی نعلیں اور دیگر سامان بناتے رہتے۔ جلتے بھنتے سورج کے نیچے دہکتی بھٹی کے سامنے بیٹھنا ایک بے حد صبر آزما کام ہوتا ہے۔ آگ کی حدت اور موسم کی گرمی کے باوجود میں کبھی اس کام سے نہیں گھبرایا۔ یہ کام شاید میرے مزاج سے ہم آہنگ تھا۔ ہم دونوں پسینے میں شرابور رہتے تھے لیکن مجھے وہ پسینہ کبھی برا نہیں لگا۔

چچا مہرداد کی بائیں ٹانگ بیکار تھی جس کی وجہ سے ان کے لئے چلنا پھرنا بے حد دشوار تھا۔ ''تمہاری وجہ سے میرا آدھا کام ہو جاتا ہے بیٹے'' وہ اکثر گلوگیر لہجے میں کہتے ''میرا بس چلے تو میں تجھے کام کو ہاتھ بھی نہ لگانے دوں لیکن......لیکن تیرا معذور چچا بہت مجبور ہے بیٹا۔''

میں جب پانچویں جماعت میں پہنچا تو چچا مہرداد بہت سخت بیمار پڑ گئے۔ جب وہ بیماری سے اُٹھے تو ان کے اندر اتنی ہمت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ اس بھاری بھرکم ہتھوڑے کو اٹھا کر طاقت ور ضربیں لگاتے۔ کئی دنوں سے ہماری بھٹی ٹھنڈی پڑی تھی۔ ہماری آمدنی کا کوئی متبادل ذریعہ تو تھا نہیں لہٰذا چند ہی دنوں میں نوبت فاقوں تک پہنچ گئی۔

''اب ہتھوڑا میں چلاؤں گا چاچا سائیں۔'' اس دن میں نے چچا سے کہا۔

''لیکن تم ابھی بہت چھوٹے ہو بیٹا اور ہتھوڑا بہت بھاری ہے۔''

''اس کے سوا کوئی چارا نہیں ہے چاچا سائیں۔ ہتھوڑا کتنا ہی بھاری کیوں نہ ہو میں اسے اٹھا کر دم لوں گا۔''

شروع کا کچھ عرصہ میرے لئے زندگی اور موت کی کشمکش کا عرصہ تھا۔ ہتھوڑے کو اپنے سر سے بلند کرتے وقت مجھے دانتوں پسینہ آ جاتا، کتنی ہی بار چکر آئے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا۔ ہر لحہ یوں محسوس ہوتا جیسے میرے کپکپاتے ہاتھوں سے ہتھوڑا چھوٹ کر گرے گا اور میرا بھیجا پکی زمین پر بکھر جائے گا لیکن بالآخر میرے عزم اور ارادے کے فولاد نے لوہے کے ہتھوڑے کو شکست دے دی اور اسے اپنا غلام بنا کر چھوڑا۔ یہ کامیابی حاصل کرنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ کاش میرے دشمنوں کے سر میرے سامنے ہوتے اور میں اسی ہتھوڑے سے انہیں کچل کر رکھ دیتا ہے۔ میرا ہتھوڑا اس قدر قوت کے ساتھ سرخ لوہے پر پڑتا کہ پس کر رہ جاتا۔ چچا جو کہ سنسنی کے ساتھ اس لوہے کے ٹکڑے کو پکڑے ہوئے ہوتے، اچانک چونک کر مجھے دیکھنے لگتے پھر گویا وہ میری آنکھوں میں چھلکتے خون کو دیکھ لیتے۔

''آرام سے سیفل بیٹا آرام سے۔ طاقت اس طرح فضول ضائع کرنے کی چیز نہیں ہوتی۔''

آٹھویں جماعت تک پہنچتے تک میرا جسم فولاد بن چکا تھا۔ میری چھاتی اور میرے شانے روز بروز چوڑے ہوتے جا رہے تھے۔ میرا قدم پونے چھ فٹ ہو کر بھی ابھی رکا نہیں تھا۔ اسکول میں میرے استاد

مجھ سے بلند آواز میں بات کرتے ہوئے جھجکنے لگے۔ پورے اسکول کے لڑکے اب مجھ سے دبنے لگے تھے اور کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ میرے سامنے اُلٹی سیدھی بات کرتا۔ میرا ایک ہاتھ بڑے سے بڑے پھنے خان کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیتا۔

خود میرے مزاج میں بھی ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ میرے سینے میں دہکنے والے جوالامکھی کی شدت میں تو خیر روز بہ روز اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا لیکن اب میں بہت کم آتش فشاں کی طرح پھٹتا تھا۔ اب مجھ پر ایک ہی دُھن سوار تھی کہ میں کس طرح اپنی جان چھڑاؤں اور اپنے دشمنوں کی تلاش میں نکل جاؤں اور ان کے مکروہ جسموں کو ان کی غلیظ روحوں سے نجات دلا دوں۔ اس مقصد کے لئے میں نے اپنے ہاتھ سے ایک بے حد خطرناک تیز دھار خنجر تیار کیا تھا۔ میں وقتاً فوقتاً اس خنجر کی دھار کو آب لگاتا رہتا۔

میرے ساتھ ساتھ مہراں بھی بھرپور جوان ہو گئی تھی۔ اس کے حسن میں ایسی معصومیت اور نکھار تھا کہ میرا دل اسے دیکھ کر انگڑائی لینے لگتا۔ مہراں کا مجھ سے بچپن کا لگاؤ نوجوانی کے والہانہ پیار میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرے تمام تر ذہنی تحفظات اور مزاحمت کے باوجود وہ مجھے اپنے دل کے بہت قریب محسوس ہوتی تھی۔ وہ شاید دنیا کی واحد ہستی تھی جس کی قربت میرے دل کی آگ کو قدرے دھیما کر دیتی۔ میں مہراں کے دلی جذبات سے بخوبی واقف تھا۔ اس کی چاہت وقتاً فوقتاً میرے دل کے تار جھنجوڑتی رہتی تھی لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں اس کی چاہت کا جواب چاہت سے نہیں دے سکتا تھا۔ میرے دل میں اتنی نفرت جمع ہو چکی تھی کہ اب اس میں محبت جیسے پاکیزہ جذبے کے سمانے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

مڈل کے امتحان کے بعد میرے واحد دوست سرور علی نے علاقے کے جاگیردار سردار شاہ مراد خان کی ہاں ملازمت اختیار کر لی۔ ''مجھے خود بھی سردار کی ملازمت پسند نہیں ہے سیفل۔'' سرور علی نے مجھے ملازمت کی اطلاع دینے کے بعد کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ یہ ملازمت کر کے میں نے گویا غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیا ہے لیکن سیفل غلامی کا یہ طوق تو علاقے کے تمام باشندوں کے گلے میں پڑا ہوا ہے، چاہے وہ سردار کے تنخواہ دار ملازم ہوں یا نہ ہوں۔ ہمارے گاؤں کے حد درجہ جاہل اور پسماندہ لوگ تو سردار کو خدا کا زمینی روپ سمجھتے ہیں' اس کی مرضی کے خلاف قدم اٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ ہر سال فصلوں کی کٹائی بوائی اور چنائی کے موقع پر گاؤں کے کتنے غریب باشندوں کو سردار کی زمینوں پر بیگار کرنی پڑتی ہے۔ آج تک کسی نے اس ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔ خود میں پچھلے تین برسوں سے لگاتار یہ جبری بیگار کرتا آ رہا ہوں۔ بالآخر مجبور ہو کر میں نے باقاعدہ ملازمت اختیار کر لی۔ اس طرح کم از کم کچھ نہ کچھ تنخواہ تو ملے گی۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ ہمارے علاقے میں روزگار کا کوئی موقع نہیں ہے میں تین تین جوان بہنوں کو چھوڑ کر کسی اور علاقے میں ملازمت کرنے جا بھی نہیں سکتا۔''

''لیکن سردار کس قدر عیاش اور بے غیرت شخص ہے اس کا تو تمہیں بخوبی علم ہے۔ اس کی ملازمت میں جا کر تمہیں بھی اس کے کارندوں کی طرح ہر جائز اور ناجائز کام کرنا پڑے گا۔''

میں نے اپنے جگری دوست کو تمام صورت حال سمجھانے کی کوشش کی۔

”اب کیا ہوسکتا ہے بھائی۔ اب تو اپنے گھر والوں کی خاطر سب کچھ بھگتنا ہی پڑے گا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے یار۔“ سرور نے نیم مردہ لہجے میں کہا۔

☆O☆

سردار شاہ مراد خان ڈیرہ غازی خان کے علاقے کے علاوہ آس پاس کے ضلعوں کے بھی چند بڑے زمینداروں میں سے ایک تھا۔ اس کی زرعی اراضی میلوں کے حساب سے پھیلی ہوئی تھی۔ ڈیرہ غازی خان صوبہ پنجاب کا پسماندہ ترین اور توجہ سے محروم علاقہ ہے۔ یہاں کے باشندوں میں تقریباً چالیس فیصد قبائلی بلوچ ہیں۔ اندازاً پچاس فیصد سرائیکی بولنے والے ہیں۔ صرف دس فیصد مہاجر اور مرکزی پنجاب کے باشندے ہیں۔ جغرافیائی لحاظ سے علاقہ بے حد اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس کی سرحدیں پاکستان کے چاروں صوبوں سے ملتی ہیں اور ویسے بھی یہ پاکستان کے بالکل مرکز میں واقع ہے۔ انگریز سرکار نے برصغیر پر حکومت کے دوران اپنا سامراجی تسلط قائم رکھنے کے لئے اس علاقے میں اپنے نمک خوار پیدا کئے۔

انگریزوں نے ”مال مفت دلِ بے رحم“ کے مصداق ان تمن داروں کو بے حد و حساب جاگیریں بخش کر نہ صرف دولت کا مالک بنا دیا بلکہ انہیں نیم سیاسی اختیارات بھی عطا کر دیے۔ اس طرح انگریز کے یہ وفادار مکمل طور پر عوام کی قسمت کے مالک بن گئے۔ انگریز نے ان سرداروں کو افسر مال کے اختیارات اور محدود فوج بھی رکھنے کی اجازت دے دی۔ ڈیرہ غازی خان کی سیاست اور قیادت انہیں نو بڑے خاندانوں کے گرد گھومتی رہتی ہے اور اس ضلع میں زمین بھی تقریباً انہی نو خاندانوں میں تقسیم رہی ہے۔

سردار شاہ مراد بھی انگریزوں کی وفادار نسل سے تعلق رکھتا تھا۔

”یہ سردار آج بھی اسی دور میں جی رہے ہیں بیٹا سیفل جس میں انسان ایک بے حیثیت غلام ہے۔ ان کی حکومت کو للکارنے والا آج بھی کوئی...... نہیں ہے۔“ چچا مہرداد نے بڑے دلگیر لہجے میں کہا۔

”لیکن چاچا سائیں سب لوگ مل کر ان کے خلاف آواز کیوں نہیں بلند کرتے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”لیکن سب سے پہلی آواز کون اُٹھائے گا بیٹا سیفل؟“ چچا مہرداد نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”یہاں کے غریب عوام صدیوں سے ظلم و جبر کی چکی میں پستے چلے آرہے ہیں۔ ان بچارے مفلوک الحال لوگوں کو زندگی کے کسی اور رُخ کا علم ہی نہیں ہے۔ یہ سردار اپنے علاقے سے جہالت کے اندھیرے دور ہی نہیں ہونے دیتے کہ لوگوں کو کچھ دکھائی دے سکے۔ مفلسی کا یہ عالم ہے کہ جسے سوکھی روٹی کے ساتھ پیاز مل جاتی ہے وہ ایسے خوش ہوتا ہے کہ گویا اسے دنیا بھر کی دولت مل گئی جس شخص کے پاس دو کے بعد تیسرا جوڑا ہو وہ اپنے آپ کو خوش حال سمجھنے لگتا ہے۔“

”اور سردار کے پاس کئی کئی لاکھ کی کئی کئی گاڑیاں ہیں!“

”یہ تو اس علاقے کے ہر سردار کا حال ہے۔ ایک کوٹھی گاؤں میں ہے تو ایک ایک دو دو کوٹھیاں ڈیرہ غازی خان‘ لاہور اور اسلام آباد میں درجنوں کے حساب سے بیش قیمت گاڑیاں ہیں۔ سینکڑوں

محافظین پر مشتمل ذاتی فوجیں۔ ہر سردار کی اپنی ذاتی جیل تک ہے۔ عوام کی حیثیت ان کے لئے کھلونوں سے بڑھ کر کچھ نہیں لہٰذا انتخابات کے موقع پر یہ عوام کو ووٹ ڈالنے کی زحمت دیے بغیر اسمبلیوں کی نشستیں آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ علاقے کی انتظامیہ تو پہلے ہی ان کی مرضی کے افراد پر مشتمل ہوتی ہے پھر بھلا ان کی حکومت کو کوئی کیسے چیلنج کرسکتا ہے۔“ چچا مہرداد نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

”یہ رات کب ختم ہوگی چاچا سائیں۔“

”آ..... ہاہاہاہا“ چچا نے ایک طویل زہریلا قہقہہ لگایا۔ ”یہ بے حد گھسا پٹا اور بے معنی سوال ہے بیٹا جی۔ بہتر یہ ہے کہ تم کوئی دوسرا سوال کرو مثلاً یہ کہ سردار شاہ مراد اپنی آٹھویں شادی کب کر رہا ہے یا پھر یہ کہ چھوٹا سردار جاہ مراد کب اسمبلی کے لئے انتخاب لڑے گا؟ یا یہ کہ سارے گاؤں میں اندھیرا ہے تو سرداروں کی حویلی کیوں روشنی سے جگمگا رہی ہے۔“

میری زندگی کے اگلے دو سال بے حد تیزی سے گزرے۔ چچا کے بے حد اصرار پر میں نے شہر ڈیرہ غازی خان کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ یہ میرے لئے ایک بالکل ہی نئی دنیا تھی۔ گاؤں سے شہر کا فاصلہ اچھا خاصا تھا۔ چنانچہ چچا مہرداد نے میرے لئے پرانی سائیکل خرید دی۔

گاؤں کے ٹوٹے پھوٹے مڈل اسکول کے مقابلے میں یہ اسکول کسی وسیع و عریض شاہی محل کے مانند محسوس ہوا۔ وسیع و عریض کمرے‘ طویل طویل راہداریاں‘ عمدہ فرنیچر‘ کھیلوں کے بڑے سرسبز میدان‘ بے شمار اساتذہ اور ہزاروں طالبان علم۔ اس اسکول میں میرے جاننے والے بہت کم تھے۔

شہر میں روزانہ آمد و رفت کے ساتھ ہی میرے سینے میں قدرے دھیما پڑ جانے والا نفرت اور انتقام کا الاؤ‘ ایک بار پھر دہک اُٹھا۔ میرے آس پاس ہر طرف اجنبی چہرے تھے۔ میری بے چین نظریں ان چہروں کا طواف کرتی رہتیں۔ میری پنڈلی پر بندھا ہوا خنجر بار بار مجھ سے خراج طلب کرتا رہتا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کرتا کہ کاش وہ دو چہرے مجھے کہیں نظر آجائیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ میں اپنے مرحوم باپ کی شکل سے بھی ناواقف تھا البتہ جب کبھی بھی مہراں کے اصرار پر صاف ستھرے کپڑے پہنتا تو چچا مہرداد جذباتی سا ہو کر کہتا۔ ”بیٹا سیف داد خان تو بالکل میرے مرحوم بھائی گوہر داد خان کی تصویر ہے۔ بالکل اسی طرح لمبا تڑنگا‘ گورا چٹا اور سجیلا۔“

چچا کی یہ بات سن کر میں بے حد تلخی سے سوچنے لگتا کہ اپنے چچا سے پوچھوں کہ اگر تمہارا بھائی اتنا ہی وجیہہ و شکیل تھا تو پھر اس کی بدبخت بیوی کو کیا آفت پڑی تھی کہ وہ اسے چھوڑ کر کسی اجنبی کے ساتھ کیوں فرار ہوگئی پھر مجھے خیال آتا کہ شاید ان دونوں میں کوئی پرانا رابطہ ہوگا اور وہ ایک دوسرے کو چاہتے ہوں گے۔

فوراً ہی مجھے خیال آتا کہ چاہت تو ایک بے حد مقدس اور اعلیٰ و ارفع جذبے کا نام ہے۔ محبت کرنے والے تو خدا کی ہر نعمت سے محبت کرتے ہیں۔ کسی محبت بھرے دل میں خود غرضی اور کمینے پن کی گنجائش کہاں ہوتی ہے۔ ان کے درمیان یقیناً شیطانی رشتہ ہوگا۔ ایسے رشتے کو محبت کا نام دینا محبت کے پاکیزہ جذبے کی شدید ترین توہین ہے۔ محبت اتنی اُتھلی اور اوچھی ہرگز نہیں ہوتی۔ محبت تو سر بہ سر ایثار اور قربانی کا دوسرا نام ہے۔

شہر کے اسکول میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ دیہات سے آنے والے لڑکوں میں واضح طور پر ایک احساس کمتری ہے۔ وہ اکثر دبے دبے اور سہمے سہمے سے نظر آتے ہیں۔ اسی ردعمل کے طور پر شہری لڑکوں میں ایک عجیب سا احساسِ تفاخر دکھائی دیتا تھا لیکن مجھے اپنے اندر اس طرح کی کوئی تبدیلی محسوس نہ ہوئی۔ میرا تعلق بھی دیہات سے تھا لیکن میں کسی سے مرعوب نہیں تھا۔ مجھے بھی دیگر دیہاتی لڑکوں کی مانند مکمل طور پر اردو میں بات کرتے ہوئے دقت پیش آتی تھی لیکن میں نے اسے نفسیاتی مسئلہ نہیں بنایا۔ جہاں میری زبان اٹکتی' میں اپنی مادری زبان سرائیکی کا سہارا لے لیا کرتا اور کسی کو یہ بات محسوس بھی نہیں ہوتی مگر میں اردو اور انگریزی سیکھنے کی تگ و دو میں بھی لگا رہتا۔

ایک دن اسکول کی چھٹی ہوئی تو میں نے سائیکل اسٹینڈ سے اپنی سائیکل نکالی اور اسے چلاتا ہوا اسکول کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ اسکول کے اندر داخل ہونے اور باہر نکلنے کے دو الگ الگ دروازے تھے۔ میں تیز تیز سائیکل چلاتا ہوا بیرونی دروازے سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سامنے سے بھی ایک تیز رفتار سائیکل سوار لڑکا آیا۔ میں نے بچانے کی بہت کوشش کی لیکن ہمارا ٹکراؤ ہو ہی گیا۔ اس لڑکے کی سائیکل بالکل نئی تھی اور اس پر رنگ برنگی بتیاں لگی ہوئی تھیں۔ ٹکر لگنے کی وجہ سے سائیکل کی ایک دو بتیاں ٹوٹ کر گر گئیں اور ہم دونوں زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اٹھ کر اس سے معذرت کروں لیکن اس خدا کے بندے نے مجھے مہلت ہی نہ دی اور کھڑے ہو کر مجھے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اس کے منہ سے مغلظات کا سیلاب ابل پڑا تھا ''سور کے بچے' ڈھگے کی نسل' تیری ماں کی.....''

یک دم میرے آنکھوں کے سامنے سرخ سرخ لہو رنگ دھند سی چھا گئی۔ مجھے ہر شے خون میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ شاید میرے تمام جسم کا خون میرے دماغ میں جمع ہو چکا تھا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں عارضی طور پر میرا ساتھ چھوڑ گئی تھیں' مجھے یاد نہیں کہ میں کب اٹھ کر اس لڑکے کے پاس پہنچا۔ مجھے بس اتنا پتا چلا کہ میرا ہاتھ اٹھ کر اس لڑکے کے منہ سے ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی اس لڑکے کے منہ سے ایک بھیانک چیخ برآمد ہوئی۔ اس چیخ کو سنتے ہی جیسے مجھے پھر سے ہوش آ گیا۔ مجھے اپنے گھونسے کی قوت کا اندازہ تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید اس لڑکے کا جبڑہ ٹوٹ چکا ہے اور پھر لڑکے کے منہ سے بہنے والے خون نے میرے اندیشوں پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

اس لڑکے کی چیخ کی آواز اس قدر زوردار تھی کہ پورا اسکول چونک پڑا تھا اور پھر چاروں طرف سے لڑکے میرے گرد جمع ہونے لگے' میں مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا اور وہ لڑکا مسلسل دردناک آواز میں چیخے جا رہا تھا۔

میں نے ہیڈ ماسٹر کے سامنے پیشی کے دوران میں' اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن میرا جرم اتنا سنگین اور ناقابلِ معافی تھا کہ مجھے فوری طور پر اسکول سے خارج کر دیا گیا۔

مجھے تو خیر اسکول سے خارج ہونے کا زیادہ افسوس نہیں تھا تاہم اس خبر نے چچا مہر داد کو کافی رنجیدہ کر دیا۔ انہوں نے سرور علی سے بات کی۔ سرور علی نے سردار شاہ مراد کے منیجر سے ہیڈ ماسٹر کو فون کرایا' جس کے نتیجے میں مجھے دوبارہ اسکول میں داخل کر لیا گیا۔ خلاف توقع میں نے میٹرک کا امتحان اچھے

نمبروں سے پاس کر لیا اور پھر کالج میں داخلے کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

☆O☆

اس دن صبح میں بہت گہری نیند سویا ہوا تھا۔ مہراں نے کئی بار مجھے جگانے کی کوشش کی مگر میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کے بعد مہراں نے مجھے بری طرح جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی اور اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے ''سیفل' تمہیں جیون بلانے آیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تجھے رتا سائیں نے بلایا ہے۔''

''اری جھلی تو اس میں اتنا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ چھوٹے سردار کو مجھ سے کوئی کام بھی تو پڑ سکتا ہے۔''

''لیکن سیفل اس کے ہاتھ میں بندوق ہے۔''

''ارے بابا' بندوق تو سرداروں کے ہر کارندے کے پاس ہوتی ہے اور پھر جیون تو سردار جاہ مراد کا خاص آدمی ہے۔ تو میرے لیے ٹکر پانی کا بندوبست کر' میں ابھی تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔''

''جانے کیوں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ خدا کرے سب خیریت ہو۔''

میں گھر سے نکلا تو جیون میرا منتظر تھا۔ خلافِ معمول اس کے تیور بگڑے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ''سیفل' تجھے رتا سائیں نے بلایا ہے' بس فوراً چل۔'' اس کے شانے پر سیون ایم ایم کی رائفل لٹک رہی تھی اور کمر میں بندھی ہوئی بیلٹ چمک دار گولیوں سے بھری ہوئی تھی۔

''خیر تو ہے جیون خان' بہت جلدی میں دکھائی دیتے ہو اور یہ چھوٹا سردار شہر سے کب واپس آیا؟''

''ان سوالوں کا جواب تجھے سائیں کے ڈیرے پر چل کر مل جائے گا۔'' اس نے سرد مہری سے کہا ''تو جلدی کر ورنہ سائیں ناراض ہو جائے گا۔''

''اچھا بابا اچھا' چلو ابھی چلتے ہیں۔''

سردار شاہ مراد کی پرشکوہ حویلی کو دیکھ کر کسی شہنشاہ کے محل کا گمان گزرتا تھا۔ دیو قامت چوبی پھاٹک جس پر ہر وقت مسلح محافظ آتشیں ہتھیار سونتے ایک لمحے کے نوٹس پر مرنے جینے کا کھیل کھیلنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ پھاٹک کے دونوں جانب کنکریٹ کے بنے ہوئے دو ستون تھے۔ جن پر رات کے وقت ہزاروں واٹ کی لائٹیں روشن ہو جاتی تھیں۔ حویلی کے گرد سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی دو فٹ موٹی دیوار تھی جس کی بلندی پندرہ سے بیس فٹ کے درمیان تھی۔ دیوار کے اوپر خاردار تاروں کی باڑھ تھی۔ رات ہوتے ہی حویلی کے احاطے میں خونخوار کتے چھوڑ دیے جاتے تھے۔

کئی ایکڑ پر محیط احاطے کے عین وسط میں حویلی کی فلک بوس عمارت سر اٹھائے کھڑی تھی۔ حویلی کے اگلے حصے میں ملاقات کا بڑا سا کمرا تھا' جہاں سردار کا دربار سجا کرتا۔ اسی کمرے کے پہلو میں مہمان خانہ تھا۔ حویلی کے پچھلے حصے میں زنان خانہ تھا جس کا حویلی کے مردان خانے سے ایک دروازے کے ذریعے رابطہ تھا۔ اس دروازے پر سردار کا سب سے قابلِ اعتماد ملازم ہمہ وقت مسلح چاق و چوبند موجود رہتا۔

اسی دروازے کے دوسری طرف ایک عجیب ہی دنیا آباد تھی۔ اس دنیا میں صرف اور صرف عورتوں

کا راج تھا۔ وہاں دن رات عورتیں آپس میں جوتم پیزار رہتی تھیں۔ وہاں کالی، گوری، موٹی، پتلی، جوان، ادھیڑ عمر، نوعمر ہر طرح کی لڑکیاں اور عورتیں موجود تھیں۔ یہ سردار شاہ مراد کا حرم تھا۔ اسے عیاشی اور زناکاری اپنے باپ سے وراثت میں ملی تھی۔ حسن پرستی اور تماش بینی اس کی لڑکپن سے کمزوری رہی۔ اس نے ایک دو نہیں بلکہ سات شادیاں کر رکھی تھیں اور یہ ساتوں کی ساتوں عورتیں اپنی بے شمار لڑکیوں کے ساتھ اس بیش قیمت قید خانے میں اسیر تھیں۔

جی ہاں آپ نے صحیح اندازہ لگایا۔ جاہ مراد عرف رتا سائیں اپنے باپ سردار شاہ مراد کا اکلوتا بیٹا تھا۔ سردار شاہ مراد نے کچھ تو اپنی حسن پرستی اور عیاش فطرت کے باعث اور کچھ مزید بیٹوں کی آس میں یکے بعد دیگرے بیویوں کی لائن لگا دی تھی۔ اگرچہ اس طرح کے جاگیردار گھرانوں میں یہ کوئی اجنبی بات نہیں تھی بلکہ اسے جاہ وحشمت اور عالی رتبے کی نشانی سمجھا جاتا تھا لیکن اس کثیر الازدواجی کے نتیجے کے طور پر حویلی کا زنان خانہ ایک زنانہ پناہ گزین کیمپ میں بدل گیا اور سردار شاہ مراد کی اونچی حویلی میں بیٹیوں کا ریوڑ کا ریوڑ جمع ہوتا چلا گیا۔ اس نے اپنی ساتویں شادی میں اعلان کیا تھا کہ یہ اس کی آخری شادی ہوگی لیکن کوئی بھی اس کی بات کا یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ سردار جاہ مراد بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا اور اس نے بھی تین سال کے عرصے میں اوپر تلے دو شادیاں کر ڈالیں لیکن ابھی تک ان دونوں میں سے کوئی بھی ماں نہیں بنی تھی۔

حویلی میں داخل ہوتے ہی مجھے حالات کی سنگینی کا احساس ہونے لگا۔ حویلی کے تمام کارندوں کے منہ بنے ہوئے تھے اور وہ چابک دستی سے کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر غیر شعوری طور پر ان کے ہتھیاروں کا رخ میری طرف ہو گیا۔ میں صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اچانک حویلی کے اندرونی حصے سے سردار جاہ مراد برآمد ہوا۔ جونہی اس کی نظر مجھ پر پڑی اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ ''پکڑ لو اس کتے کو اور اس کی مشکیں کس دو.....'' کف در ہان ہوتے ہوئے اس نے اپنے چار کارندوں کو حکم دیا اس کے ساتھ ہی تقریباً تمام رائفلوں نے مجھے اپنی زد میں لے لیا' ''جیون تم اندر سے میرا ہنٹر لاؤ۔ بہت دن ہو گئے ہیں اس نے خون کا ذائقہ نہیں چکھا۔''

مجھ پر اگر کسی جذبے کا اثر تھا تو وہ جذبہ صرف اور صرف حیرت کا جذبہ تھا۔ میں بھونچکا سا کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں ابھی تک مزاحمت کا خیال تک پیدا نہیں ہوا۔ میرا ذہن تو ابھی تک صورت حال کا تجزیہ تک نہیں کر پایا تھا۔ میں حیران تھا کہ آخر یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جو رتا سائیں کے غضب کو دعوت دے۔

اس سے پہلے کہ میں سنبھل پاتا مجھے آٹھ ہاتھوں کی زنجیر نے جکڑ لیا اور آناً فاناً میرے ہاتھ پاؤں رسی کے ساتھ سختی سے جکڑ دیے گئے۔ رتا سائیں کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے اور میں بے بسی کے عالم میں اپنے انجام کا منتظر تھا۔ چند ہی لمحوں بعد جیون واپس لوٹ آیا۔ اس کے ہاتھ میں گہرے سیاہ رنگ کا چمک دار ہنٹر' کسی چوٹ کھائے سانپ کے مانند بل کھا رہا تھا۔

''سائیں حکم ہو تو میں اس کی کھال ادھیڑ دوں؟'' جیون نے ایک مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنے

آقا سے دریافت کیا۔

''نہیں بھئی جیون' مجھ سے میرا شکار تو نہ چھینو۔ یہ تو میرا شکار ہے۔ بہت دنوں کے بعد ایسا پلا پلایا سور شکار کے لئے ہاتھ آیا ہے۔''

''لیکن سردار میرا جرم کیا ہے؟'' میں نے سرد لہجے میں دریافت کیا۔ مجھے خود پر حیرانی ہو رہی تھی۔ اس قدر خوفناک صورتِ حال کا شکار ہونے کے باوجود میرے دل میں کسی قسم کی دہشت کسی قسم کا خوف پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ شاید مجھ پر ابھی تک غیر یقینی کی سی کیفیت طاری تھی۔

''تمہارا جرم......آ ہاہاہا'' سردار نے ایک طویل قہقہے کے بعد کہا'' تو فکر کیوں کرتا ہے بچے۔ تجھے تیرا جرم بھی بتا دیں گے' پہلے ذرا میرے ہنٹر کا مزہ تو چکھ لے۔''

سردار نے اپنا ہنٹر فضا میں لہرایا ایک تیز شڑاپ کی آواز فضا میں گونجی اور وہ ہنٹر کسی زہریلے ناگ کی مانند برق رفتاری سے میرے کی طرف لپکا۔ میرے شانے سے لے کر کمر تک دہکتے ہوئے انگاروں کی لکیر کھنچتی چلی گئی۔ کرب واذیت کی لہر نے ایک ہچکی کی سی شکل میں میرے حلق کا رخ کیا لیکن میں نے اسے سختی سے ہونٹوں میں ہی دبا لیا۔

سردار کچھ دیر میری طرف سے کسی ردعمل کا منتظر رہا لیکن مجھے پتھر کی مانند بے حس دیکھ کر شاید اسے کچھ مایوسی ہوئی لیکن اس نے اس مسکراہٹ کو بدستور اپنے لبوں پر سجا رکھا۔ ''بہت خوب'' اس نے زیر لب کہا اور میر طرف پیٹھ کر کے چند قدم بڑھا لیکن وہ اچانک بجلی کی سی تیزی سے پلٹا اور اپنا ہنٹر پوری قوت سے میرے جسم پر دے مارا۔ شڑاپ کی آواز کے ساتھ ہی میرے جسم پر آگ کی ایک اور لکیر کھنچ گئی۔ میں نے اپنے جسم میں اٹھنے والے درد کے طوفان کو ایک بار پھر ہونٹوں کی دیوار کے پیچھے سے ہی واپس لوٹا دیا۔ اس بار سردار کے ہونٹوں سے ابھرنے والا قہقہہ بے حد طویل تھا لیکن مجھے اس کی ہنسی میں خفت کی جھلک صاف محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی مملکت کا ایک بے حد حقیر کیڑا اسے اس کے چمچوں کے سامنے شرمندہ کر رہا تھا۔ اس کو احساس ہو رہا تھا کہ اس کے کارندے یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ اس کے ہاتھوں میں جان نہیں ہے ورنہ اس ہنٹر کی ایک بھرپور ضرب تو پتھر کو بھی رونے پر مجبور کر سکتی تھی۔

اچانک اس پر جنون سا طاری ہو گیا اور وہ وحشیوں کی طرح مجھ پر پل پڑا۔ ایک' دو' تین' چار........

میرا دل مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں مر جاؤں مگر میری زبان سے آہ تک نہ نکلے' میرا جسم میرے دل کے حکم پر پوری طرح عمل کر رہا تھا۔ میرا پورا جسم دہکتی ہوئی بھٹی بن چکا تھا لیکن میرے ہونٹ بدستور منجمد تھے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ باؤلے کتے کی طرح ہانپنے لگا' اس کا دو گھوڑا بوسکی جسم کا کرتا پسینے میں شرابور ہو چکا تھا اور اس کی آنکھوں میں غصے کی چمک کی جگہ سخت ترین خفت کی دھند اترنے لگی تھی۔ جیون نے شاید اپنے مالک کی حالت کو محسوس کر لیا تھا' چنانچہ اس نے نمک خوار کتے کا حق ادا کرتے ہوئے' اپنے مالک کی شرمندگی دور کرنے کی کوشش کی۔

''بس کریں سائیں' نہیں تو یہ مر جائے گا۔''

''میرا خیال ہے یہی بہتر ہے اگر یہ مر گیا تو..... سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔''

اس نے ہانپتے ہوئے کہا ''جیون' تم اسے پانی وانی پلاؤ اور بے والی کوٹھری میں ڈال دو' میں اس سے مزید کل بات کروں گا۔''

میں اپنے زخموں سے رستے ہوئے خون کے قطروں کو رینگتے ہوئے کینچوؤں کی مانند اپنے پورے جسم پر پھیلتے ہوئے محسوس کر رہا تھا لیکن میرے جسم میں اٹھنے والا درد و کرب کا سیلاب ایک دوسرے زیادہ طاقتور طوفان کے سامنے ہتھیار ڈال چکا تھا۔ یہ خوفناک طوفان تھا شدید ترین نفرت کا طوفان جو کہ میری رگ رگ میں پھنکاریں مارتا ہوا میرے دماغ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''اب تو میرا قصور بتا دو رتا سائیں جی'' میرے لہجے میں طنز کا زہر تھا۔ وہ یک لخت چونک پڑا۔

اس کے لبوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ نمودار ہوئی ''تمہارا قصور؟..... ہاں ہاں ضرور بتاؤں گا تمہارا قصور' پہلے ذرا یہ گلاس ختم کرلوں۔'' اس نے اسکاچ وہسکی کا ایک لمبا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا اور پھر دو ہی گھونٹ میں اس کا گلاس خالی ہو گیا۔ ''تمہیں وہ گھوڑی یاد ہے جس کے پیروں میں تم نے پچھلے ہفتے نعلیں ٹھونکی تھیں؟ ہاں وہی جس کا رنگ چمک دار سیاہ تھا۔ وہ گھوڑی کل مر گئی۔''

''لیکن وہ مر کیسے گئی رتا سائیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ کیسے مر گئی؟........ آہاہاہاہا..... ایسے مر گئی کہ میں نے اپنے قیمتی کولٹ پستول کی گولی اس کے سر میں اتار دی لیکن نہیں اسے میں نے نہیں تم نے مارا ہے' تم قاتل ہو اس کے۔''

''لیکن میں نے اسے کیسے مار دیا سردار؟''

''ابھی بتاتا ہوں' سب کچھ بتاتا ہوں ذرا چھری کے نیچے دم تو لو'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک اور زوردار قہقہہ لگایا۔ وہ لگاتار تیسرا گلاس چڑھا چکا تھا اور شاید اُم الخبائث اس کے دماغ پر قابو پانے لگی تھی۔ ''میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ عربی نسل کی یہ نجیب الطرفین گھوڑی بے حد قیمتی ہے۔ جانتے ہو میں نے وہ کتنے میں خریدی تھی؟ پورے دو لاکھ امریکی ڈالر نقد دیے تھے میں نے اس کے ..... پورا لاہور ریس کورس دیوانہ ہو گیا تھا اس کا۔ لوگ اس کی جیت پر آنکھیں بند کر کے رقم لگانے کو تیار تھے۔ پہلی ہی ریس میں اس کا بھاؤ سب سے آگے تھا اور اس شیر کی بچی نے ثابت بھی کیا کہ وہ ایک انمول ہیرا ہے۔ ریس کے پہلے چھ چکروں میں وہ اپنے ساتھ والے گھوڑوں سے تیسیوں گز آگے تھی۔ کوئی گھوڑا اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ پا رہا تھا لیکن جانتے ہو آخری چکر میں کیا ہوا؟ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کیا ہوا۔ آدھے چکر تک وہ بدستور سب سے آگے تھی' ہمیں اس کی کامیابی کا پختہ یقین ہو چلا تھا۔ ہم چیخ رہے تھے' سیٹیاں بجا رہے تھے' نعرے مار رہے تھے کہ اچانک اس کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔ وہ پہلے سے دوسرے نمبر پر آئی اور پھر دوسرے سے تیسرے نمبر اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تمام گھوڑے اس سے آگے نکل گئے۔ اس کے جوکی نے پوری کوشش کی لیکن گھوڑی کی رفتار نہ بڑھ سکی۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ تیز دوڑنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ نہیں وہ اپنا پورا زور لگا رہی تھی لیکن اس کی رفتار بڑھ ہی نہ سکی۔ شاید وہ اپنے پیروں میں کسی قسم کی تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ اسی کشمکش کے دوران میں اسے ایک زوردار ٹھوکر لگی اور وہ گھٹنوں

کے بل گر پڑی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ نہیں کھڑی ہو سکی اس کی دونوں اگلی ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں اور پھر ..... پھر میں نے اپنا پستول نکالا اور ڈھائی روپے کی ایک گولی اس کی کھوپڑی میں اُتار دی۔'' رتا سائیں اپنی داستان کے درمیان سانس لینے کے لئے رکا۔

''لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے۔ رتا سائیں؟'' میں نے اپنے سینے میں اٹھنے والے زہریلے طوفان کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''تیرا قصور کیا ہے؟ نہیں تیرا کوئی قصور نہیں ہے۔ قصور تو میرا ہے' جس نے تجھے اس کے پیروں میں نعلیں ٹھونکنے کا حکم دیا۔ اس کے اگلے دونوں پیروں میں میخیں ٹیڑھی گڑی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے اس کی دونوں ٹاپیں زخم زخم ہو گئی تھیں۔ کاش کاش تیری وہ کتیا ماں اپنے یار کے ساتھ بھاگنے سے پہلے تجھے زمین میں گاڑ.....!''

اچانک میرے دماغ میں بھیانک سناٹا اتر آیا' میرے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی اور میری آنکھون کے آگے گہری سرخ دھند چھا گئی۔ میں کوڑیالے سانپ کی طرح رینگتا ہوا صوفے پر بیٹھے ہوئے رتا سائیں کی طرف بڑھا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کے اوپر جا پڑا۔ میرے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے لیکن مجھے اپنے ہاتھ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے منہ پورا کھولا اور اپنے دانتوں سے رتا سائیں کا نرخرہ جکڑ لیا۔ اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ برآمد ہوئی۔ اس کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر فرش پر چور چور ہو گیا۔ رتا سائیں کی چیخ سنتے ہی اس کے کارندے گویا کسی بھیانک خواب سے چونک پڑے۔ میں اپنے جسم کی پوری قوت مجتمع کر کے اس کا نرخرہ چبانے ہی والا تھا کہ اچانک کسی نے میرے سر پر پوری قوت سے رائفل کا بٹ مارا اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں میں اندھیرے اترتے چلے گئے۔

مجھے شاید دو دن کے بعد ہوش آیا تھا۔ میں اس وقت سردار شاہ مراد کے بے والے ذاتی قید خانے میں قید تھا۔ میں ناقابلِ شکست آہنی سلاخوں کے پیچھے تھا' اس کے باوجود میری نگرانی کے لئے دو مسلح چوکیدار موجود تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس تھری ناٹ تھری کی پکی رائفل تھی جبکہ دوسرے کے پاس بارہ بور کی ڈبل بیرل شاٹ گن۔ وہ دونوں سردار کے پالتو کتے تھے لہٰذا ان کے ناتجربہ کار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ مجھ سے کچھ خوف زدہ معلوم ہوتے تھے۔ چند دن پہلے ہونے والے ڈرامے کی کہانی شاید تمام کارندوں تک پہنچ چکی تھی' اسی لیے وہ بے حد محتاط تھے۔

''او جوان ادھر تو آ'' میں نے سلاخ دار دروازے کے پاس کھڑے ہو کر شاٹ گن والے نوجوان کو بلایا۔ وہ دونوں ایک ساتھ اچھل پڑے۔ ان کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت تھی۔ انہیں شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنا شدید گھائل اور تین دن کا بھوکا پیاسا شخص اس طرح یکدم اپنے پیروں پر بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔ ان دونوں کی انگلیاں اپنی گنوں کی لبلبیوں پر تھی۔ مجھے ان کی حالت پر ہنسی آنے لگی مگر یہ خوف بھی تھا کہ کہیں وہ دونوں بوکھلا کر مجھ پر گولی نہ چلا دیں۔

مجھے ایک عجیب سی روحانی مسرت کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے سردار جاہ مراد کو بدترین نفسیاتی

شکست سے دوچار کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اسے اس صدمے سے سنبھلنے میں کئی دن لگیں گے۔ اتنا تو خیر مجھے یقین تھا کہ اب بدترین موت میرا مقدر بن چکی ہے لیکن مجھے تو اپنی زندگی کی پروا کبھی بھی نہیں رہی۔ موت آتی ہے تو جم جم آئے' میرا سر مرتے دم تک بھی جھکنے والا نہیں تھا۔

''کیا چاہتا ہے تو؟'' شاٹ گن والے نے پوچھا۔

''ایک گلاس پانی مل سکے گا؟''

''رتا سائیں نے تمہیں کھانے پینے کو دینے سے منع کیا ہے۔''

''واہ بھئی واہ تمہارا یہ رتا سائیں تو کسی یزید کی نسل سے لگتا ہے لیکن میرے خیال میں تو اس کے باپ کا نام سردار شاہ مراد ترم باز خان ہے۔''

''زیادہ بک بک کی تو گولی مار دیں گے۔''

''یہی تو چاہتا ہوں سجنو' بھوکا پیاسا مرنے سے تو چنگا ہے کہ انسان ایک پکی گولی کھا کر مردوں کی طرح موت کو سینے سے لگا لے۔''

میری شگفتہ بیانی نے ان دونوں کی حالت غیر کر دی تھی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر دور کونے میں سکڑ کر جا بیٹھے تھے۔

''اور کچھ نہیں تو لمبی مونچھوں والے سنگیو' ایک چٹکی نسوار ہی عنایت کر دو۔'' میں نے ان کی کئی بار چٹکیاں لیں لیکن وہ منہ کو تالا لگائے بیٹھے رہے۔

ایک دن مزید گزر گیا۔ میرے حلق میں ایک کھیل تک اڑ کر نہیں گئی تھی۔ پانی کی کمی کی وجہ سے زبان سوکھ کر چمڑے کی مانند ہو گئی۔ حلق میں کانٹوں کی فصل اُگ آئی تھی۔ میرے زخموں سے نکلنے والا خون پپڑیوں کی شکل میں جم گیا تھا' جس کے باعث خود بخود اِندمال کا عمل شروع ہو گیا۔ میں ابھی تک اپنی قوت برداشت کے بل بوتے پر قائم و دائم تھا۔ میں نے ابھی تک ان سے روٹی پانی کے لئے التجا نہیں کی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ رتا سائیں اس وقت کا منتظر ہے جب میں گڑگڑا کر اس سے پانی کے ایک گھونٹ اور کھانے کے ایک لقمے کے لئے التجا کروں لیکن شاید وہ ابھی تک مجھے پوری طرح سمجھ نہیں سکا تھا کہ اس نے کس کے ساتھ سینگ پھنسایا ہے۔ اسے اس محاذ پر بھی شکست ہونے والی تھی۔

اگلے دن شام کو رتا سائیں اپنے تین چمچوں کے ساتھ آیا۔ میری حالت دیکھ کر اس کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''ارے بھئی اس فقیر کو کس نے یہاں بند کر دیا؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''یہ فقیر بے چارہ کسی کا مہمان بن کر آیا تھا۔ اس بے چارے کو کیا خبر تھی کہ اس کے میزبان اس سے بھی زیادہ بھوکے ننگے ہوں گے۔''

میری چوٹ نشانے پر لگی اور رتا سائیں کھسیانا سا ہو گیا۔ ''فقیر سائیں فکر نہ کرو' آج سے تمہیں کھانے کو بھی ملے گا اور پینے کو بھی' خوب کھاؤ پیو اور قربانی کے جانور کی طرح جان بناؤ تا کہ تمہاری قربانی کرنے میں بھی مزہ آئے۔''

''ہم تو آپ کی ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں سائیں' ویسے آپ کے حلق کی بانسری کا کیا حال

ہے'' میرا یہ وار بھی کارگر ثابت ہوا۔ رتا سائیں کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور اس کے ہاتھ غیر شعوری طور پر اپنے نرخرے پر جا پہنچا۔

''چہک لو خوب چہک لو تمہارے پاس چند دنوں کی مہلت ہے پھر میرے چند جگری یار آئیں گے اور شکروں کی طرح' تمہارا شکار کریں گے۔

''مجھے تمہارا شکار بننے کا خوف نہیں ہے رتا سائیں مگر تمہارا عورتوں کی طرح نرم جسم کہیں مجھے سزا دینے میں لچک نہ جائے۔'' جونہی میرا فقرہ ختم ہوا میں نے رتا سائیں کے چہرے کو ایک بار پھر رتا ہوتے دیکھا۔

میں نے اس کی دُکھتی رگ کو چھیڑ دیا تھا۔ سردار جاہ مراد کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ بچپن میں بہت خوبصورت تھا' اس کا رنگ گلابی اور گال سرخ تھے اس کے گالوں کی اسی سرخی کی بنا پر اسے رفتہ رفتہ رتا سائیں کہا جانے لگا اور پھر لوگ اس کے اصل نام کو تقریباً بھول ہی گئے رتا سائیں چونکہ کئی بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا لہٰذا وہ سب بہنوں کا لاڈلا تھا اور پھر وہ زیادہ عرصہ زنان خانہ میں رہا تھا جس کے باعث اس کی عادات واطوار میں نسوانی جھلک آ گئی تھی۔ بڑا ہونے پر اگرچہ یہ کمزوری کافی حد تک چھپ گئی تھی مگر رتا سائیں کو اپنی اس کمزوری کا احساس تھا اور اسی احساس کے ردِعمل کے طور پر وہ خود کو ایک سخت گیر اور جابر مرد ثابت کرنے کے لئے غریبوں پر ظلم وستم کرتا رہتا تھا۔

اس نے شاید اپنے کارندوں کو کوئی اشارہ کیا' جس کی وجہ سے وہ قدرے دور جا کھڑے ہوئے تھے۔ اب وہ ہماری گفتگو نہیں سن پا رہے تھے۔

رتا سائیں زیادہ دیر تک میرے زبانی حملوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور جلد ہی ڈینگیں مارتا ہوا رخصت ہو گیا۔ رتا سائیں کے جانے کے بعد واقعی مجھے کھانا اور پانی مہیا کیا گیا۔ کھانا اگرچہ معمولی قسم کا تھا تاہم اس وقت مجھے وہ بھی کسی نعمت بے بہا کے مانند محسوس ہوا۔ میں نے بہت ٹھہر ٹھہر کر صبر سے کھانا کھایا۔ اس طویل فاقہ کشی کے بعد۔ ذرا سی جلد بازی بھی سخت نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔

کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد میں موجودہ صورتِ حال پر غور وخوض کرنے لگا۔ پہلے مجھے چچا مہرداد اور ان کی بیٹی مہراں کا خیال آیا۔ مجھ پر گزرنے والے اس حادثے نے ان پر قیامت ڈھا دی ہو گی۔ خاص طور پر مہراں کا تو برا حال ہو گا پھر میں نے ان کے خیال کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔ بھلا کون تمام عمر کسی کا ساتھ دے سکتا ہے اگر ہم لوگوں کا ساتھ یہیں تک تھا تو بھلا اس سلسلے میں کوئی کیا کر سکتا ہے۔ آج نہیں تو کل مجھے انہیں چھوڑ کر جانا ہی تھا۔ میری تو منزل کوئی اور ہی تھی' مجھے تو انتقام کے ایک طویل سفر پر روانہ ہونا تھا۔ یہ درست ہے کہ مہراں کے لئے میرے دل میں ایک نازک گوشہ موجود تھا لیکن میں نے اس موہوم جذبے کو اپنی کمزوری کبھی نہیں بنایا۔ زندگی بھر میں نے خود کو ایک مسافر کی طرح سمجھا اگر اس بے سروسامان مسافر کا سفر یہیں ختم ہو رہا ہے تو یونہی سہی۔ ہر مسافر کو اس کی منزل تو نہیں ملتی۔

اس کے بعد میں سردار شاہ مراد خان کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ اپنے بیٹے جاہ مراد کی طرح پھڑ باز اور غبی نہیں تھا۔ وہ تو ایک بے حد شاطر اور سرد وگرم چشیدہ شخص تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ انتہا درجے کا

عیاش آدمی تھا لیکن وہ کام بہت سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر کرنے کا عادی تھا۔ سردار ہونے کے باوجود وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ نازک سے سنہری چشمے اور کلین شیو چہرے کے ساتھ یقین کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ وہ ایک بہت بڑا جاگیردار ہے۔ اس نے باپ دادا کی جائیداد پر عیش کرنے کے بجائے اسے مزید بڑھانے کی جدوجہد کی تھی۔ زرعی جائیداد کے علاوہ اس نے بہت سے کارخانوں' کمپنیوں اور مالیاتی اداروں میں پیسہ لگا رکھا تھا۔ اس کے دیگر جائز و ناجائز دھندوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا۔ اپنی بے پناہ زرعی جائیداد کو وہ طاقت اور سیاسی اثر و رسوخ اور بنیاد کے لئے استعمال کرتا تھا۔ علاقے کے لوگوں کی قسمت مکمل طور پر اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ ان کے ووٹوں سے اسمبلی میں پہنچتا اور پھر کسی ماہر جواری کی طرح اپنے مفادات کے پتے سیٹ کر کے حکومت میں اپنا حصہ بٹاتا۔ سیاسی وفاداریاں تبدیل کرنا اس طرح کے تمام جاگیرداروں کا معمول ہوتا ہے۔ اپنے مفادات کے حصول اور حفاظت کی خاطر یہ وڈیرے باہمی دشمنی پس پشت ڈال کر گٹھ جوڑ بھی کر لیتے تھے۔

سردار شاہ مراد خان ان دنوں ملک سے باہر تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اگر وہ اس موقع پر ہوتا تو اس کا کیا ردِعمل ہوتا۔

پیٹ بھر کے اور جی بھر کے کھانا ملنے کے بعد مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی۔ میں وہیں لمبی تان کر سو گیا۔ ایسی شاندار نیند میں شاید ہی کبھی سویا ہوں۔

تین دن تک باقاعدہ راشن پانی ملنے کے بعد میں بالکل تندرست و توانا ہو گیا۔ اس دوران میں رتا سائیں میرے پاس نہیں آیا' چوتھے دن میرے لئے کھانا لے کر آنے والا شخص' سرور علی تھا۔ ''یہ تو نے کیا کر ڈالا اسیفل؟'' اس نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

''تو اس بات کو چھوڑ یار' یہ بتا کہ چاچا اور مہراں کا کیا حال ہے؟''

''بہت بری حالت ہے سیفل ان کی' تیری زندگی سے مایوس ہو گئے ہیں سب لوگ.....''

''ارے اس زندگی میں ہے کیا' جس کے جانے کا غم کروں۔ تو دیکھ رہا ہے کہ میں کتنا خوش ہوں' بس تو بھی میری طرح خوش ہو جا۔''

''نہیں یار سیفل تو میرا ایک ہی یار ہے۔ میں تجھے اس طرح بے بسی کی موت مرنے نہیں دوں گا'' اس کا لہجہ بے حد مضبوط تھا۔

''پر تو کر بھی کیا سکتا ہے؟ کوئی احمقانہ حرکت کرنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ میرے ساتھ ساتھ تو بھی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔''

''کچھ بھی ہو سیفل' میں تجھے بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔''

اگلی صبح بھی میرے لئے کھانا سرور علی ہی لایا۔

''میں نے رات کو رتا سائیں اور وڈے سائیں کی فون پر گفتگو سنی ہے سیفل'' سرور علی نے دہشت سے بھرپور لہجے میں کہا ''رتا سائیں کے زمیندار دوست کل آ جائیں گے' اس کے بعد وہ تمہارے ساتھ بلی اور چوہے کا کھیل کھیلیں گے۔''

''کس قسم کا کھیل سرور؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''رتا سائیں' وڈے سائیں کو فون پر تمہارے متعلق بتا رہا تھا۔ وہ ہنس ہنس کر گیم' شکار وغیرہ کا ذکر کر رہا تھا۔ ان کا ارادہ ہے کہ اپنے معزز مہمانوں کے یہاں آنے کے بعد وہ تیرے ہاتھ پاؤں باندھ کر کسی ویران پہاڑی علاقے میں لے جائیں گے۔ رتا سائیں اپنے ہم شغل دوستوں کے ساتھ تیرے پیچھے پیچھے ہوں گے۔ ان کے پاس دوربینیں اور شکاری بندوقیں ہوں گی۔ اس علاقے میں پہنچ کر یہ لوگ تیرے ہاتھ پاؤں کھول کر تجھے آزاد کر دیں گے اور پھر خود جیپیں لے کر تیرے تعاقب میں نکل کھڑے ہوں گے۔ یہ لوگ تجھے پہاڑی لومڑی کی طرح شکار کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ تجھے فوراً نہیں مار دیں گے۔ یہ تجھے دوڑا دوڑا کر سسکا سسکا کر مارنا چاہتے ہیں۔ ان کی بات چیت سے پتا چلا ہے کہ یہ لوگ یہ کھیل پہلی بار نہیں کھیل رہے ہیں۔ یہ لوگ پہلے بھی بارہا یہ شیطانی وحشیانہ کھیل کھیل چکے ہیں۔

سرور علی اپنی بات ختم کر چکا تھا لیکن میں کسی پتھر کے مانند ساکت و صامت بیٹھا تھا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اور رگوں میں لہو ابل رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر پچھتاوا آ رہا تھا کہ جب اس کتے رتا سائیں کا نرخرہ میرے دانتوں کے بیچ میں تھا تو میں نے دیر کیوں کر دی' اسی لمحے اس کی سانس کی نالی کو چور چور کیوں نہیں کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ دونوں باپ بیٹے بدترین خبیث ہیں لیکن میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ شیطانی کارناموں کی دنیا میں اتنا آگے نکل چکے ہیں۔ انہوں نے تو انسانی زندگی کو معمولی کھلونوں سے کم قیمت سمجھ رکھا ہے۔ وہ دونوں باپ بیٹے نجانے کتنے معصوم انسانوں کو تڑپا تڑپا کر سسکا سسکا کر ختم کر چکے ہیں۔

''میں اگر کسی طرح بچ نکلا تو اس رزق کی قسم کھا کر کہتا ہوں سرور' میں ان باپ بیٹوں کو ایسی بھیانک سزا دوں گا کہ ان کی نسلیں تک کانپ اٹھیں گی۔''

''انشاء اللہ تو زندہ رہے گا سیفل اور میری اپنے رب سے دعا ہے کہ وہ تجھے اتنی ہمت دے کہ تو اپنی قسم پوری کرے۔''

شام کے وقت دونوں پہرے داروں کا کھانا بھی سرور علی خود ہی لے کر آیا ''لو بھئی سجنو' آج تو تمہاری موجیں ہو گئی ہیں' آج تو حویلی والوں نے تمہارے لئے شاید سالم گڑ ہی بھیج دیا ہے'' اتنی وافر مقدار میں کھانا دیکھ کر' ان دونوں کی باچھیں کھل گئیں اور وہ آستین چڑھا کر کھانے پر پل پڑے۔ انہوں نے پھوٹے منہ سے بھی سرور کو نہیں پوچھا۔ جو کہ دانت نکالے ان کی حالت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد انہوں نے اپنے برتن صاف کر دیے۔ سرور میرے لئے بھی ان کے ساتھ ہی کھانا لایا تھا جو کہ ساگ روٹی پر مشتمل تھا۔ اس وقت تک چاروں طرف رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ جیل خانے میں گیس کا ایک لیمپ روشن تھا جس کی روشنی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ کھانا ختم کرنے کے بعد میں نے سرور کو سلاخوں کے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ سرور نے گردن کے ہلکے سے اشارے سے مجھے ذرا توقف کرنے کو کہا۔ وہ بغور دونوں پہرے داروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اتنا مرغن کھانا حلق تک ٹھونسنے کے بعد ان دونوں پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور وہ دونوں اونگھنا شروع ہو گئے۔

ان میں سے ایک کو اچانک شاید اپنے فرائض کی ادائیگی کا خیال آ گیا اور اس نے ایک جھٹکے سے کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن وہ نشے میں مست کسی مے کش کی مانند جھومتا ہوا' قریب پڑی ہوئی چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔ اسی اثناء میں دوسرا پہرے دار بھی زمین پر لڑھک چکا تھا' اس کا ایک پاؤں اس کی گن کے اوپر ہوا میں بڑے بے ڈھنگے پن سے معلق تھا جبکہ دوسرا پیر اس کی گن کے نیچے دبا ہوا تھا۔

دوسرے لمحے میری حیران نظروں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ سرور علی نے زمین پر پڑے ہوئے پہریدار کو کسی مردہ گدھے کی طرح گھسیٹ کر دوسرے پہرے دار کے برابر میں ڈھیر کر دیا لیکن ان دونوں کے میں ہلکی سی جنبش بھی نہ ہوئی پھر سرور علی نے جلدی سے جیل خانے کا دروازہ بند کر دیا اور تیزی سے میری طرف بڑھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے سرور کچھ مجھے بھی تو بتاؤ؟''

''بس تم چپ چاپ دیکھتے جاؤ'' اس نے اپنی جیب ٹٹولتے ہوئے کہا' 'ان حرامزادوں کا انتظام کرنے میں میرے پورے دو سو روپے خرچ ہو گئے ہیں۔''

''لیکن انہیں ہوا کیا ہے؟''

''ارے بھئی اگر کسی شخص کے پیٹ میں مٹھی بھر ویلیم کی گولیاں اتر جائیں تو اس کا یہی حال ہوتا ہے۔'' اور پھر سرور کے ہاتھ میں موجود شے کو دیکھ کر حیرت کے مارے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''یہ کیا ہے سرور؟ اور تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''تم بھی یار ڈھگے کے ڈھگے ہی رہے۔ دیکھ نہیں رہے کہ میرے ہاتھ میں کنجی ہے اور میں قفل کھول کر تمہیں آزاد کر رہا ہوں۔''

''لیکن یہ تمہارے پاس کیسے پہنچی؟''

''پہنچی کیسے؟ بس مٹھی بھر نیند کی گولیاں جیون خان کی نذر کرنا پڑیں اور اس نے خوشی خوشی مجھ سے پوچھا کہ مانگ کیا مانگتا ہے بچہ...... میں نے تیری آزادی طلب کر لی۔''

''تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا سرور۔ وہ لوگ تیرے خون کے پیاسے ہو جائیں گے۔''

''تو مجھے چھوڑ اور اپنی فکر کر' میں تو اپنا کوئی نہ کوئی انتظام کر ہی لوں گا۔ تو فٹافٹ یہاں سے نکلنے کی کوشش کر۔ یہ دو سو روپے پکڑ اور بڑی سڑک پر چڑھ جا۔ امید ہے کہ تجھے فوراً ہی ملتان جانے والی کوئی نہ کوئی گاڑی مل جائے گی۔ ملتان اسٹیشن پر پہنچ کر کراچی کی طرف جانے والی کسی بھی ٹرین پر سوار ہو جانا خدا نے چاہا تو صبح ہونے تک ان خونی بھیڑیوں کی پہنچ سے بہت آگے نکل جائے گا۔''

''لیکن اس وقت رنا سائیں کہاں ہے؟''

''رنا سائیں کل کے ''شکار'' کا بندوبست کرنے اور اپنے دوستوں کے استقبال کی تیاریاں کرنے کے لئے ڈیرہ غازی خان والی کوٹھی پر گیا ہوا ہے۔ اس کی واپسی کل صبح تک ہو گی یا پھر ہو سکتا ہے کہ وہ حکم دے کر تمہیں وہیں لے آیا جائے۔'' اتنا کہہ کر وہ جھکا اور اپنی شلوار کا پائنچہ چڑھا کر اپنی پنڈلی پر سے کوئی

چیز کھولنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ میرا خنجر تھا جو چمڑے کی میان میں اڑسا ہوا تھا۔

''یہ...... یہ تجھے کہاں سے ملا؟''

''یہ بھی اپنے جیون سائیں کا عطیہ ہے۔ مجھے علم تھا کہ تجھے اس کی یاد ستا رہی ہو گی لہٰذا میں لگے ہاتھوں اسے بھی اُڑا لایا لیکن تجھے سختی سے سمجھاتا ہوں کہ فی الحال سرداروں سے الجھنے کی کوشش نہ کرنا' زندگی رہی تو انہیں مزہ چکھانے کے اور بھی بے شمار مواقع ملیں گے۔ فی الحال یہاں سے جان بچا کر نکلنے کی کوشش کر۔''

''ٹھیک ہے میں تیرے کہنے پر عمل کروں گا۔''

میں جب جیل خانے سے نکل کر چلنے کے لئے تیار ہوا تو سرور نے اپنے بھاری کھسے اتار کر میرے پیروں میں پہنا دیے۔ اس کے اور میرے پیر کی جسامت ایک تھی۔ اس کے بعد اس نے کپڑے کی ایک چھوٹی سی پوٹلی مجھے تھما دی۔ اس میں باجرے کی میٹھی ٹکیاں تھیں۔

''خدا حافظ میرے یار' زندگی رہی تو پھر ملیں گے'' سرور علی کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

''خدا حافظ میرے دوست۔ جب تک میری زندگی رہی میں تیری مہربانیوں کو یاد رکھوں گا۔''

''ارے پگلے کہیں دوست بھی دوست پر مہربانی کرتا ہے؟ یہ تو پیار کا خراج ہوتا ہے۔ جو ہر پیار کرنے والا ادا کرتا ہے۔ اچھا اب مزید دیر نہ کر اور یہاں سے بھاگ لے۔''

آدھے گھنٹے بعد میں بڑی سڑک پر ایک طرف چلا جا رہا تھا۔ میرے پاس سے ملتان اور لاہور جانے والی کئی لاریاں اور ویگنیں گزریں لیکن میں نے کسی کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں تیزی سے ڈیرہ غازی خان کی طرف رواں دواں تھا۔ میرا سرور کی ہدایت پر عمل کرنے کا پورا ارادہ تھا لیکن بڑی سڑک پر پہنچنے سے پہلے میں نے بے خیالی میں اپنا خنجر نکال لیا اور اس کی ساتھ ہی میری ذہنی رو پلٹ پڑی۔ مجھے اپنے خنجر کی چمک دار دھار کوئی تقاضا کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے کانوں میں قسم کے الفاظ گونج رہے تھے۔ اس قسم کے الفاظ جو میں نے رزق کو سامنے رکھ کر کھائی تھی۔

میرے بدترین دشمن اور میرے درمیان صرف چند میل کا فاصلہ حائل تھا اور میں اس کو پیٹھ دکھا کر بھاگ رہا تھا۔ آج کی سیاہ رات اس کی زندگی کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے بہت موزوں تھی۔ میں نہایت سکون سے بے خبری کے عالم میں اس کی گردن مار سکتا تھا اور اس کے بعد خاموشی سے فرار میرے لئے آسان تھا۔ چند گھنٹوں کے وقفے سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑنے والا تھا۔ یہ سوچتے ہی میرے قدم بے ساختہ شہر کی طرف اٹھ گئے تھے۔

میں اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا کہ اچانک میری پشت پر کسی گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس پڑیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا وہ جھنگ سے آنے والی ایک بس تھی۔ اس کی منزل کوٹ مٹھن براستہ ڈیرہ غازی خان تھی۔ میں نے بس کو ہاتھ کے اشارے سے رکنے کا اشارہ کیا۔ بس رکی اور میں اس میں سوار ہو گیا۔ بس پوری طرح بھری ہوئی تھی۔ اونگھتی عورتوں اور جمائیاں لیتے ہوئے مردوں نے تمام سیٹیں گھیر رکھی تھیں۔ کچھ مسافروں نے مجھ پر نظر ڈالی اور اس کے ساتھ ہی حقارت سے بھنویں تن گئیں۔ میرے جسم پر

موٹے کھدر کا ملیشیا رنگ کا جوڑا تھا اور میرے الجھے ہوئے گھنگھریالے بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر آٹھ دن کی بڑھی ہوئی داڑھی تھی۔ بس کے کنڈیکٹر نے بھی خاصی بدتمیزی سے مجھ سے کرایہ طلب کیا۔ اسے شاید امید نہیں تھی کہ وہ میری جیب سے پورا کرایہ نکلوا سکے گا۔ تاہم جب میں نے اس کے ہاتھ پر دس روپے کا نوٹ رکھا تو اس کا چہرہ پرسکون ہوگیا۔

پچیس تیس منٹ کے بعد بس شہر پہنچ گئی۔ میں شہر سے تقریباً ایک میل پہلے ہی ایک پیٹرول پمپ کے پاس بس سے اتر گیا۔ سڑک کے ساتھ ساتھ نہر بہہ رہی تھی۔ میں نے کھجور کے تنے کے پل کے ذریعے نہر پار کی اور چپ چاپ ایک طرف روانہ ہوگیا۔ رات بڑی حبس زدہ اور تاریک تھی۔ تیز تیز چلنے کی وجہ سے میرا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ میرے دائیں ہاتھ پر نہر تھی اور بائیں ہاتھ پر تاریکی میں ڈوبے ہوئے کچے پکے مکانات کی قطار۔ ان مکانات کے سامنے چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں جن پر مکانوں کے باسی لیٹے ہوئے پنکھے جھل رہے تھے۔ ابھی رات کا پہلا پہر ہی ختم ہوا تھا لہٰذا زیادہ تر لوگ ابھی جاگ رہے تھے۔ رات کے گہرے سناٹے میں کافی فاصلے پر واقع ناز اور شہزاد سینما میں چلنے والی پنجابی فلموں کی بلند آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ شہر کے چار میں سے تین سینما کھلی چھت کے تھے جس کی وجہ سے آدھا شہر بغیر ٹکٹ کے فلموں کے ڈائیلاگز اور بڑھکوں سے لطف اندواز ہوتا تھا۔

کافی دیر چلنے کے بعد مجھے وہ دو منزلہ عمارت نظر آئی جو تقریباً دو کنال کے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے احاطے میں ایک سرسبز لان تھا جس پر ایک بیڈمنٹن کورٹ بنا ہوا تھا اور مین گیٹ کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس میں ہر وقت مسلح چوکیدار موجود رہتے تھے۔

اس وقت اس کی کوٹھی کا زیادہ تر حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا' البتہ گیٹ پر لگے ہوئے پانچ سو واٹ کے دونوں بلب پوری طرح روشن تھے۔

میں کوٹھی کے عقب میں پہنچا اور پھرتی سے ایک گھنے درخت پر چڑھتا چلا گیا۔ وہ کوٹھی ایک قدرے الگ تھلگ مقام پر واقع تھی لہٰذا مجھے بیرونی مداخلت کا اندیشہ نہیں تھا۔ مجھے کوٹھی کے دو کمروں میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں بڑے صبر سے ان روشنیوں کے گل ہونے کا منتظر تھا۔ میرا یہ انتظار بہت طویل ثابت ہوا۔ رات کے تقریباً ڈیڑھ بجے تیز روشنیاں گل ہوئیں اور کمروں میں نائٹ بلبوں کی دھیمی روشنی پھیل گئی۔ میں تیزی سے درخت سے اترا اور کوٹھی کی طرف بڑھا۔

''تیری موت تیری طرف بڑھ رہی ہے رتا سائیں اب مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ'' میں نے نیفے میں اڑسے ہوئے خنجر کے دستے پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے خود کلامی کی ''بہت عیش کر لئے' بہت ظلم ڈھا لیے غریبوں پر۔ اب تیرے ظلم کی رسی کھینچنے والی ہے۔''

کوٹھی میں داخل ہونا میرے لئے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ کوٹھی کے احاطے کی دیوار میرے سینے تک بلند تھی۔ دیوار پر چڑھنے کے بعد میں بلی کی طرح چاروں ہاتھ پیروں میں چلتا ہوا' ایک طرف بڑھا۔ سامنے ہی کوٹھی کے پورچ کی چھت تھی۔ میں دیوار پر کھڑا ہوا اور ایک جست لگا کر ڈیڑھ گز کا درمیانی فاصلہ طے کر کے پورچ کی چھت پر پہنچ گیا۔ کوٹھی کی دوسری منزل کی ایک کھڑکی پورچ کی چھت

پر کھلتی تھی۔ اس وقت یہ کھڑکی بند تھی لیکن میرا خیال تھا کہ میں ذرا سی کوشش کر کے اسے کھول سکتا ہوں۔ اس کھڑکی میں سلائیڈنگ پینل لگے ہوئے تھے۔ اس طرز کی کھڑکی میں عام طور پر اندر کی جانب چٹخنیاں لگی ہوتی ہیں یہ چٹخنیاں کھڑکی کے فریم کے نچلے حصے میں چھوٹے سے گڑھے میں فٹ ہوتی ہیں اور کثرت استعمال کی وجہ سے کھڑکی کے پٹ بھی ڈھیلے ہو کر اوپر نیچے ہلنے لگتے ہیں۔

میں نے اپنے خنجر کی نوک کھڑکی کے ایک پٹ کی نچلی سمت میں موجود درز میں پھنسائی اور زور لگا کر کھڑکی کے پٹ کو اوپر کی طرف اٹھانے کی کوشش کی۔ کھڑکی کے پٹ کا ایک حصہ تھوڑا سا اوپر اٹھ گیا اور اس کے ساتھ ہی اندر کی طرف لگی ہوئی چٹخنی بھی اپنے گڑھے سے نکل کر اوپر اٹھ گئی۔ میں نے بہت آہستہ سے کھڑکی کے اس پٹ کو ایک طرف سرکایا۔ ہلکی سی آواز پیدا ہوئی اور کھڑکی کا پٹ ایک طرف سرکتا چلا گیا۔ میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ ''ایسی کی تیسی تیرے بندوق بردار چوکیدار کی'' میں نے دل ہی دل میں رتا سائیں کو گالی دی ''آج تیرے ہی خون سے تیرے بستر کو رنگا نہیں تو میرا نام بھی سیف داد خان نہیں۔''

میں نے یہ وسیع و عریض کوٹھی پچھلے انتخابات کے دوران میں اندر اور باہر سے دیکھ رکھی تھی۔ میرے خیال میں وڈیروں اور جاگیرداروں کی زندگی میں انتخابات ہی وہ واحد موقع ہوتے ہیں جب وہ عوام کے بھوکے ننگے افراد کو کسی حد تک اپنے قریب آنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس شاندار کوٹھی کی خوب سیر کی تھی اور مجھے اس کے نقشے کا بخوبی علم تھا' یہی وجہ تھی کہ میں اچھی خاصی تاریکی میں قدرے آسانی سے اپنے مطلوبہ کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اس کمرے کے دروازے کی نچلی درز سے ہلکی نیلی روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی' اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ کمرے کا مکین محو خواب ہے۔ میں نے اپنا خنجر اپنے دائیں ہاتھ مین پکڑا اور بڑی آہستگی سے دروازے پر دستک دی۔ کمرے کے اندر سے موسیقی کی بے حد مدہم آواز ابھر رہی تھی۔ دستک کی آواز سنتے ہی کسی نے موسیقی کا گلا گھونٹ دیا اور ایک مترنم سی نسوانی آواز نے پوچھا۔ ''کون ہے؟'' آواز میں پریشانی کی واضح جھلک تھی۔

''میں ہوں بی بی رتا سائیں کا خادم جیون خان۔''

''آپ کو کس سے کام ہے؟'' نسوانی آواز نے سرائیکی زبان میں پوچھا۔

''آپ دروازہ کھولیں گی تو میں آپ کو بتاؤں گا۔'' میں نے قدرے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ رتا سائیں کی دونوں بیویاں گاؤں کی حویلی سے باہر نہیں نکل سکتیں' لہٰذا یہ بات یقینی تھی کہ یہ عورت بکاؤ مال تھی' جس کی خدمت آج رتا سائیں کا پہلو گرم کرنے کے لئے حاصل کی گئی تھی۔ چنانچہ کسی دو ٹکے کی جسم فروش عورت کو اتنی جرات نہیں ہونی چاہیئے تھی کہ وہ ایک جانثار غلام اور اس کے آقا کے درمیان زیادہ دیر دیوار بنے۔ میرے لہجے کے تحکم نے کام دکھایا اور اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ میں نے اپنے خنجر کو اپنی کلائی کے ساتھ چپکاتے ہوئے اس عورت کے جسم کا جائزہ لیا۔ اس کی عمر تقریباً تیس سال ہوگی۔ جسم گداز اور نقوش قابلِ قبول تھے لیکن اس کے چہرے پر مخصوص قسم کا اجاڑ پن'

بے حسی اور پھٹکار موجود تھی جس سے ثابت ہوتا تھا کہ اس کا تعلق رات کی تجارت کرنے والوں سے ہے۔ اس کے جسم پر اس وقت ناکافی لباس تھا لیکن اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میں نے ایک نظر ڈال کر گویا اسے مسترد کرتے ہوئے کمرے میں نظر دوڑائی۔ کنگ سائز بیڈ پر ایک صحت مند مرد اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر صرف ایک معمولی سی دھوتی تھی۔ بیڈ سے متصل تپائی پر وہسکی سوڈا اور دو گلاس رکھے ہوئے تھے اور وہ شخص شاید نشے میں دھت پڑا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کمرے کی لائٹ جلا دی۔ روشنی ہوتے ہی اس عروس یک شب کی حشر سامانیاں پوری طرح واضح ہو گئیں۔ اب وہ اچھی خاصی خوب صورت لگ رہی تھی اس کی آنکھوں میں ایک بے حجاب دعوت تھی۔ میں نے اسے نظر انداز کر کے بیڈ کی طرف بڑھا اور اس کے ساتھ ہی میرا خنجر کلائی سے جدا ہو کر ہاتھ میں سیدھا ہو گیا۔ خنجر کو دیکھتے ہی اس عورت کے حلق سے بے اختیار ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں آگے بڑھ کر ایک جھٹکے سے بیڈ پر دراز شخص کو سیدھا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں مایوسی کی ایک طویل آہ بھر کر رہ گیا۔ میرے خنجر کی نوک کی سیدھ میں رتا سائیں نہیں بلکہ اس کا منہ چڑھا کارندہ غلام اکبر لیٹا ہوا تھا۔ نشے نے اسے بری طرح الٹا رکھا تھا۔

''اپنی اور اس سور کی زندگی چاہتی ہو تو اپنی زبان کو بند رکھو۔'' اس عورت کے منہ سے ایک بار پھر ہلکی سی چیخ نکل گئی جسے اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر روک لیا۔

''تم... تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟'' اس نے دھیمی اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''تم فکر نہ کرو مجھے کم از کم تم سے کچھ نہیں چاہیے۔'' میں نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''اور نہ ہی مجھے تم سے کوئی مطلب ہے۔ تم اپنے منہ کو بند کر کے سارا تماشا دیکھتی جاؤ۔''

وہ عورت شاید بحث کے موڈ میں تھی چناں چہ میں نے اسے کمرے سے منسلک باتھ روم میں بند کر کے باہر سے چٹخنی لگا دی۔ اس نے شدید احتجاج کی کوشش کی لیکن میری ایک ہی گھرکی میں وہ سیدھی ہو گئی۔

اس کے بعد میں غلام اکبر کی طرف پلٹا۔ میرے پاس وقت کم تھا اور کام بہت۔ کمرے میں ایئر کنڈیشنز چلنے کے باعث پورا ماحول یخ تھا۔ تپائی پر رکھی ہوئی پلیٹ میں پڑی ہوئی ہڈیوں کا ڈھیر ظاہر کر رہا تھا کہ یہ کمینہ شخص اپنے مالک کی غیر موجودگی سے پورا پورا فائدہ اٹھانے پر تلا ہوا تھا

شراب، شباب اور کباب۔ بہت خوب۔ اپنے غلیظ آقاؤں کے یہ غلیظ غلام بھی اپنے آقاؤں کی طرح عیاشی کے تینوں لوازم پورے رکھنے کے شوقین ہیں۔ میں زیر لب بڑبڑایا۔

دیو قامت مسہری کے سرہانے ایک میز پر پانی سے لبالب بھرا ہوا اک جگ رکھا تھا۔ کمرے کی سرد فضا کی وجہ سے وہ پانی بھی اچھا خاصا ٹھنڈا تھا۔ میں نے اس جگ کو اٹھایا اور پورے کے پورے کو غلام اکبر پر الٹا دیا۔ اس نے ایک تیز جھرجھری لی اور ایک دم آنکھیں کھول دیں اور تیزی سے اٹھنے کی کوشش کی۔

اپنی زندگی چاہتے ہو تو چپ چاپ لیٹے رہو میرے خنجر کی نوک غلام اکبر کی گردن سے صرف دو انچ

کے فاصلے پر تھی۔ ذرا سی بھی حرکت کی کوشش کی تو حلق کی بانسری بنا دوں گا۔

میرے لہجے میں پنہاں بھیانک دھمکی نے اسے منجمد کر کے رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں دہشت کے شدید تاثرات پیدا ہو گئے وہ احمقوں کی طرح منہ پھاڑے میری شکل تکے جا رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد اس کے دماغ پر سے نشے کی دھند کچھ چھٹ گئی اور اس نے مجھے پہچان لیا۔ ''سیفل یہ تم۔ یہ تم ہو؟'' اس نے شدید حیرانگی کے عالم میں پوچھا۔ ''تم یہاں کیسے؟ تم۔ تم تو تھانے والی حوالات میں بند تھے پھر تم کیسے چھوٹ گئے۔''

''ارے یہ کون سا مشکل کام تھا۔ میں نے سلاخوں کو پکڑ کر ذرا سا بھینچا اور وہ آپس میں بغل گیر ہو گئیں۔ تم تو جانتے ہو کہ لوہے سے اپنی پرانی یاری ہے۔ اچھا اب تم اپنی بک بک بند کرو اور مجھے سیدھی طرح سے بتا دو کہ تمہارا وہ بزدل سائیں کہاں گیا ہے؟'' فقرے کے اختتامی حصے میں میرا لہجہ درندوں جیسا ہو گیا تھا۔

''تم۔ تم کیا چاہتے ہو؟'' اس نے لرز کر کہا۔

''میں خون پینا چاہتا ہوں اس پلے ہوئے سرکاری سانڈ کا مجھے ایک فقیر نے نسخہ دیا تھا کہ طویل عمر حاصل کرنے کے لیے ایسے جانوروں کا خون بہت مفید ہے اور اگر تم نے ایک منٹ کے اندر اندر مجھے اس کا پتا نہیں بتایا تو میں تمہیں ذبح کر کے تمہارا خون بھی پی جاؤں گا۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے میں کبھی کبھی بد پرہیزی بھی کر گزرتا ہوں۔''

''وہ۔ تمہیں جان سے مار دیں گے۔''

''تم میری فکر مت کرو چچے۔ میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں وہ بتاؤ۔''

''رتا سائیں اپنے مہمانوں کو لینے کیلئے ملتان گئے ہوئے ہیں۔ وہ صبح تین چار بجے گاؤں پہنچیں گے اور پھر۔''

''اور پھر مجھے ساتھ لے کر شکار کھیلنے کے لیے مغربی پہاڑیوں میں نکل جائیں گے۔''

''تم۔ تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتا چلا؟'' اسے میری معلومات پر حیرت ہو رہی تھی۔

''یہ بھی اسی فقیر کی کرامات ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی میرا ہاتھ پوری قوت سے حرکت میں آیا اور میری مٹھی میں دبا ہوا خنجر کا دستہ اس کی کھوپڑی پر بج اٹھا۔ غلام اکبر کے حلق سے ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی اور وہ بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ باتھ روم میں بند حرافہ شاید دروازے سے ہی کان لگائے کھڑی تھی اس نے جونہی اپنے خریدار کی چیخ کی آواز سنی وہ خود بھی حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگی۔ میرے پاس اسے خاموش کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا اور پھر کھڑکی کے راستے پورچ کی چھت پر پہنچ گیا۔ میں نے کھڑکی کے پٹ کو دوبارہ بند کر دیا۔ اب یہ پتا چلنا مشکل تھا کہ میں کوٹھی میں کیسے داخل ہوا تھا۔

کوٹھی سے نکلنے کے بعد میں تیز تیز قدموں سے ایک طرف چلنے لگا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں بے حد بھیانک اور خطرناک حالات میں گھر چکا تھا۔ میں نے اپنا بے حد قیمتی

وقت اسی درخت پر ٹنگے رہ کر گزار دیا تھا۔ میں نے اپنے طور پر فرض کر لیا تھا کہ رتا سائیں اس کوٹھی کے علاوہ کہیں اور ہو ہی نہیں سکتا اگر میں دماغ کو تھوڑا سا حاضر رکھ کر حالات کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا تو مجھے یقیناً رتا سائیں کی غیر موجودگی کا علم ہو جاتا۔ رتا سائیں کی موجودگی میں کوٹھی میں اتنا سناٹا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ دو باڈی گارڈ تو ہر وقت موجود رہا کرتے تھے۔ میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میرا دل چاہا کہ میں اپنا سر پیٹ لوں۔ کتنے سامنے کی بات تھی جس پر میرا دھیان ہی نہیں گیا۔ جب میں پورچ کی چھت پر چڑھا اس وقت پورچ خالی تھا اگر رتا سائیں یہاں موجود ہوتا تو اس کی لینڈ کروزر جیپ ہر صورت میں یہاں موجود ہوتی۔ میں نے انتقام کے جوش میں اپنی عقل کو زحمت دینے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

صورت حال میرے لیے بے حد حوصلہ شکن ہو گئی تھی۔ رات کے اس حصے میں ملتان یا پنجاب کے کسی دوسرے حصے کے لئے گاڑی ملنا مشکل تھی۔ عین ممکن تھا کہ رتا سائیں ابھی تک گاؤں پہنچ بھی چکا ہو۔ میرے فرار سے واقف ہوتے ہی وہ ایک قیامت برپا کر دیتا۔ ملتان جانے والی سڑک تو خیر منٹوں میں اس کے قبضے میں آ جاتی لیکن ضلع سے نکاسی کے باقی راستوں کی ناکہ بندی کرنے میں بھی اسے زیادہ دیر نہ لگتی۔ اس کے ایک فون کرتے ہی پورے علاقے کے پولیس والے بھوکے کتوں کی طرح میری تلاش میں نکل پڑتے۔ مجھے یقین تھا کہ رتا سائیں اس طرف سے کوئی کسر نہ چھوڑے گا۔ میرا فرار اس کی انا کا مسئلہ تھا اور وہ کسی قیمت پر میری تلاش سے دست بردار نہیں ہوگا۔ میرا بچ نکلنا اب تقریباً ناممکن ہو چکا تھا۔

مجھ پر اُداسی اور مایوسی کی دھند سی چھانے لگی۔ میں اپنی زندگی سے ناامید ہو چکا تھا پھر اچانک میرے اندر سویا ہوا وحشی سیف داد خان ایک جھرجھری لے کر بیدار ہو گیا۔

''ایسی کی تیسی اس کمینے کے بچے رتا سائیں کی اور اس کے نمک خوار کتوں کی'' میرے ذہن میں نفرت کا طوفان امنڈ آیا۔ ''موت آتی ہے تو آ جائے لیکن میں مرنے سے پہلے اس غلیظ شخص اور اس کے ذلیل ساتھیوں کو ایک ایسا سبق سکھا جاؤں گا کہ ان کی نسلیں تک نہیں بھولیں گی۔ میرا ہاتھ ایک بار پھر اپنے خنجر کے دستے پر مچلنے لگا۔

رات کے اس آخری پہر میں تمام شہر خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ رات بھر کے حبس کے بعد ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلنے لگے تھے۔ میرا رُخ شہر کی مغرب کی طرف تھا۔ موجودہ صورت حال میں میرے پاس یہی راہِ فرار بچی تھی۔ شہر کی مغربی سمت کچھ فاصلے پر ویران بیابان علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ جہاں دور دور تک کوئی باقاعدہ انسانی آبادی نہیں تھی۔ شہر سے تقریباً بیس بائیس میل کے فاصلے پر کوہ سلیمان کی ابتداء ہو جاتی تھی اور تقریباً چالیس میل مزید فاصلہ طے کرنے کے بعد صوبہ بلوچستان کی سرحد شروع ہو جاتی۔

اس وقت انسانی آبادی میرے لئے موت کے پھندے کے مانند تھی۔ مجھے ہر صورت میں اس سے بچ کر گزرنا تھا۔ اگرچہ ڈیرہ غازی خان سے ایک پختہ سڑک سیدھی بلوچستان سے جا ملتی تھی لیکن میں

بھول کر اس سڑک کا رُخ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو سیدھا سیدھا بھیڑیوں کے منہ میں جانے والی بات تھی اگر میں شہر سے بیس تیس میل نکل کر لورالائی روڈ پر نکلوں تو شاید ان درندوں کے پنجے سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاؤں۔'' دل ہی دل میں بولا۔ میرا خیال تھا کہ ''اگر میں کسی طرح بلوچستان میں داخل ہو جاؤں تو پھر شاید رتا سائیں کے لمبے ہاتھ بھی میرا کچھ نہ بگاڑ پائیں۔

میرے قدم برق رفتاری سے اٹھ رہے تھے۔ میں شہر کے انتہائی شمالی حصے میں سے گزر رہا تھا۔ زمین تیزی سے میری قدموں کے نیچے سے پیچھے کی سمت سرکتی جا رہی تھی۔ میرے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ میں دوڑ نہیں سکتا تھا۔ میرے دوڑنے کی صورت میں بے خوابی کا شکار کوئی بھی بوڑھا چور چور کا نعرہ لگا سکتا تھا۔ ایک بار یہ لفظ لوگوں کے کان میں پڑ جاتا تو پھر لوگ کسی کی صفائی سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور میری ٹھیک ٹھاک پٹائی ہوتی اور پھر تھانے کا مہمان الگ بننا پڑتا۔ اس وقت تھانے جانے کا مطلب خودکشی کے مترادف تھا۔

ایک کے بعد شہری آبادی کا دوسرا بلاک گزرتا گیا۔ راستے میں ایک آدھ جگہ گلی کے آوارہ کتوں نے میری بے جا مداخلت پر ناگواری کا اظہار کیا لیکن میری عاجزی نے انہیں رام کر لیا۔ بالآخر شہری حدود ختم ہونے لگیں۔ میں سٹی تھانے سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے سے گزرا۔ تھانے کے بڑے سے چوبی پھاٹک پر زرد رنگ کا بلب مدھم مدھم روشنی بکھیر رہا تھا۔ یقیناً اس عقوبت گھر میں بھی ہر قیمت پر میری گرفتاری کے امکانات پہنچ چکے ہوں گے۔ عین ممکن تھا کہ اس مہیب پھاٹک کے پیچھے مجھے زیر دام لانے کے منصوبے بن رہے ہوں گے۔

تھانے سے کچھ فاصلے پر شہر کا مشہور قحبہ خانہ واقع تھا۔ اس وقت شاید ہوس کے تمام پجاری اپنی ہی غلاظت میں غوطے لگا کر بھرے پیٹ کتوں کے مانند ٹانگیں پھیلائے سو رہے ہوں گے۔

چھتیس نمبر بلاک ختم ہوا تو سامنے ایک وسیع میدان موجود تھا اس میدان کے شمال میں بھنگیوں کے ٹوٹے پھوٹے مکانات کے سیاہ دھندلے ہیولے نظر آ رہے تھے۔ میدان پار کرنے کے بعد ایک نہر میرے راستے میں حائل ہو گئی۔ شہری لوگ اسے ریتی رانی نہر کے نام سے پکارتے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق اس میں میری کمر تک پانی ہوگا لیکن میں اس وقت اس نہر میں اترنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اگر میں اپنے کپڑے بھگو لیتا تو میرے لیے تیز تیز چلنا مشکل ہو جاتا۔ ایک بار تو میرے دل ہی میں آئی کہ میں شلوار اور کھسے اتار کر گھس جاؤں پانی میں لیکن پھر میں نے اپنا یہ ارادہ مسترد کر دیا۔ نہر کا پل وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا لہٰذا میں تیزی سے بائیں طرف چل پڑا۔ نہر کے پشتے کی زمین کافی سخت اور ناہموار تھی اور میں اس وقت تقریباً دوڑ رہا تھا۔ پل عبور کرنے کے بعد کچھ فاصلے پر ریلوے لائن آ گئی۔ بائیں طرف ڈیڑھ دو کلومیٹر کے فاصلے پر شہر کے خوبصورت ریلوے سٹیشن کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ اگرچہ اس وقت کسی ٹرین کا وقت نہیں تھا لیکن مجھے تو اپنے پیچھے لہراتے ہوئے شکاری کتوں سے بچنا تھا جو کہیں بھی مل سکتے تھے۔ سامنے ہی ریلوے ورکشاپ تھی جس میں اس وقت بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بائیں ہاتھ پر مچھلی فارم تھا جس کے گرد اونچی آہنی باڑ لگی ہوئی تھی۔

تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے شہر کا بڑا قبرستان نظر آیا۔ رات کے اس پہر میں وہاں سے گزرتے ہوئے مجھے زندگی میں پہلی قبرستان میں خاموشی کا مطلب سمجھ میں آیا۔ میں اس وقت ایک نیم پختہ سڑک پر چل رہا تھا۔ میرے بائیں ہاتھ پر قبرستان اور دائیں ہاتھ پر کھیت تھے پھر میں بڑی نہر کے پل سے گزرا۔ دائیں ہاتھ کافی فاصلے پر وڈور بستی کے دھندلے آثار نظر آرہے تھے۔ صبح کے ٹھنڈے موسم میں شاید اس بستی کے کتے بھی اپنے فرض سے غافل نیند میں مست تھے۔ اگر مجھے لورالائی روڈ جانے کی ضرورت ہوتی تو بڑی نہر کے پشتے پر بنی ہوئی نیم پختہ سڑک سیدھی وہاں پہنچا دیتی۔

''خدا حافظ اے انسانوں کی پرسکون بستی'' میں نے وڈور بستی کو پیچھے چھوڑنے کے بعد زیر لب کہا۔

اب بالکل غیر آباد علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ یہاں اکا دکا کھیت تھے لیکن رہائشی مکان نہیں تھے۔ یہ کھیت بھی شاید وڈور کے باسیوں کی ملکیت تھے۔

غیر آباد علاقے میں پہنچتے ہی میں نے تیز رفتاری سے بھاگنا شروع کر دیا۔ نصف چاند کی دھندلی روشنی کسی نہ کسی حد تک راستے کے نقوش واضح کر رہی تھی۔ پیروں میں لپٹے ہوئے بھاری بھرکم کھسے مجھے راستوں کی چوٹوں سے بچا رہے تھے۔ میں ایک گھنٹے تک مسلسل بھاگتا رہا۔ اس کے بعد میری سانس اکھڑنے لگی اس کے ساتھ ہی مجھے ایک اور سنگین غلطی کا احساس ہوا۔ میں ایک بنجر اور بے آب و گیاہ علاقے کی جانب بھاگ رہا تھا لیکن میرے پاس پانی کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ حالانکہ میں نے دو نہریں بھی پار کیں لیکن میرے ذہن میں اتنا خیال بھی نہ آیا کہ میں جی بھر کے پانی ہی پی لوں۔ میرے پاس خشک خوراک کا چھوٹا سا ذخیرہ تھا لیکن باجرے کی میٹھی ٹکیاں کھانے کے بعد میری پیاس مزید بھڑک اٹھتی۔ میں تقریباً ایک گھنٹے تک تیز تیز قدموں سے چلتا رہا۔ اس دوران میں صبح کا اجالا پوری طرح پھیل چکا تھا اور ہلکی ہلکی دھوپ بھی نکل آئی تھی۔

میری پیاس' شدت اختیار کر گئی تھی لیکن وہاں آس پاس پانی کے کوئی آثار نہیں نظر آرہے تھے۔ زمین پر کانٹے دار جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں یا پھر کہیں کہیں ناگ پھنی کے پودے نظر آرہے تھے۔ سامنے ہی وہ کوہ سلیمان کا ہلکا سرمئی اور بھورا پہاڑی سلسلہ نظر آرہا تھا۔ بظاہر وہ پہاڑ بالکل قریب نظر آرہے تھے لیکن مجھے علم تھا کہ یہ محض فریب نظر ہے۔

''لو سائیں سیفل داد خان'' میں نے اپنے آپ سے کہا ''تمہارے تو دانے ابھی سے مکتے جا رہے ہیں۔ اگر مزید دو تین گھنٹے پانی نہیں ملا تو تم اسی ریگزار کا رزق بن جاؤ گے۔ رتا سائیں کو تو انگلی ہلانے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

میں چلتا گیا' چلتا گیا۔ سورج کی تپش میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا اور میرا لباس پسینے میں بھیگ کر میرے جسم سے چپکنے لگا۔ پسینے کے اخراج سے میرے جسم کا رہا سہا پانی بھی ختم ہو گیا۔ مزید ایک گھنٹا چلنے کے بعد' میرے حلق میں کانٹوں کا جال اس طرح پھیل گیا کہ میری سانس رکنے لگی۔ شاید میری برداشت کی آخری حد آن پہنچی تھی۔ میں نے ارادہ کیا کہ میں بائیں طرف چلتا ہوا لورالائی روڈ پر جا چڑھوں گا لیکن وہاں سے لورالائی روڈ کا فاصلہ بھی کئی کلومیٹر تھا اور مجھے یقین نہ تھا کہ میں وہاں تک پہنچ

پاؤں گا اور پھر رتا سائیں کے گرگوں کا خوف بھی بدستور سر پر منڈلا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ پیاس کے مارے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے سے بہتر تھا کہ رتا سائیں کی رائفل کی گولی کھا کر مر جاؤں۔ یہ خیال آیا اور میں نے اپنا منہ بائیں طرف کر کے چلنا شروع کر دیا۔ تقریباً پون گھنٹے تک لڑکھڑاتے قدموں سے سفر کرنے کے بعد مجھے لورالائی روڈ کی سیاہ لکیر نظر آئی۔ تیز دھوپ میں وہ چمکارے مار رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس پر کوئی نہ کوئی ٹرک یا لاری بھی گزرتے ہوئے دکھائی دے جاتی تھی۔

سڑک پر نظر پڑتے ہی نجانے کیوں میرے قدم دھیمے پڑنے لگے۔ اس لمحے میری نظر' اپنے دائیں ہاتھ پر واقع ایک جھونپڑے پر پڑنے لگی۔ اس ویرانے میں وہ جھونپڑا مجھے زندگی کی نوید سناتا ہوا محسوس ہوا۔ میرے قدموں کا رخ بے اختیار اس جھونپڑے کی طرف ہو گیا اور میں تیزی سے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے خدا سے دعا مانگی کہ کاش مجھے یہاں حلق تر کرنے کو پانی مل جائے۔

میری دعا شاید سیدھی عرش سے جا کر ٹکرائی تھی۔ چونکہ مجھے اس جھونپڑے میں کچھ فاصلے سے ہی انسانی زندگی کی موجودگی کا ثبوت نظر آنے لگا۔ اس جھونپڑے کا دروازہ بند تھا لیکن یہ دروازہ باہر سے نہیں اندر سے بند تھا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ جھونپڑے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دوسری بار دستک دینے سے جھونپڑے کے اندر سے ایک کرخت سی نسوانی آواز ابھری ''کون ہے؟''

''میں ایک پیاسا مسافر ہوں بی بی۔ تھوڑے سے پانی سے میری پیاس بجھ جائے گی۔''

''میرا مرد گھر پر نہیں ہے بھائی' اس لیے میں دروازہ نہیں کھول سکتی۔'' اس کی آواز میں ہلکا سا خوف جھلک رہا تھا ''بہتر یہی ہے کہ تم کسی اور کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔'' یہ مشورہ دینے سے پہلے اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ آس پاس دور دور تک کوئی گھر نہیں تھا۔

''پیاس کی شدت سے میری زبان چمڑا بن گئی ہے بہن اگر مجھے فوراً پانی نہیں ملا تو میں مر جاؤں گا۔ میری حالت غیر ہو رہی ہے۔ میری زبان اٹک رہی تھی۔

''اچھا ذرا ٹھہرو'' میرے لہجے کی لجاجت نے اس پر کافی اثر کیا تھا۔ کچھ دیر بعد جھونپڑے کا دروازہ کھل گیا۔ وہ پختہ عمر اور مضبوط کاٹھی کی قبول صورت عورت تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک کلہاڑی چمک رہی تھی اور آنکھوں میں ایسا عزم تھا کہ بدخصلت انسان کے بھی حوصلے پست ہو جائیں۔ اس نے بغور میرے چہرے کا جائزہ لیا۔ میرے چہرے پر جمی دھول اور ہونٹوں پر خشک پپڑیوں نے شاید اسے مطمئن کر دیا اور اس کے چہرے کے عضلات ڈھیلے پڑتے چلے گئے۔ ''آجاؤ بھائی' اندر آجاؤ'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تم ادھر چارپائی پر بیٹھو۔ میں تمہارے لیے پانی لاتی ہوں''

مجھے ایک جھلنگا سی چارپائی پر بٹھا کر وہ خود جھونپڑی کے ایک کونے کی طرف بڑھ گئی جہاں پانی کے دو بڑے بڑے ماٹ کچی زمین پر آدھے دبے ہوئے تھے۔ میں نے جھونپڑی کے مجموعی ماحول سے جائزہ لیا۔ پہلی ہی نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس جھونپڑے کے مکین غربت اور کسمپرسی کی زندگی

گزارنے کے عادی ہیں۔ جھونپڑے کا ساز و سامان اگرچہ بہت معمولی قسم کا تھا تاہم اسے بڑے سلیقے سے رکھا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ عورت کافی سلیقہ شعار اور سگھڑ تھی۔ ''لو پانی پی لو بھائی'' اس عورت کی مہربان آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اس کے ہاتھ میں جست کا بڑا سا کٹورا تھا۔ ٹھنڈا اور میٹھا پانی مجھے شدید تشنہ لبی کے عالم میں، آب حیات کی مانند لگا۔ میں نے دو گھونٹ میں کٹورا خالی کر دیا۔ اس دوران میں وہ بے حد مہربان اور شفقت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔ اسے شاید میری درماندہ حالت پر ترس آ رہا تھا یا پھر شاید اسے میرا بہن کہنا اچھا لگا ہوگا۔ کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ فطرتاً ہی مہربان اور نرم دل ہے۔ اس کی مسکراہٹ بہت معصوم تھی لیکن اس مسکراہٹ میں حزن و ملال و یاس کی ہلکی سی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ ''ٹھہرو بھائی، میں تمہارے لیے اور پانی لاتی ہوں۔'' اس نے کہا اور دوبارہ کٹورا بھر لائی ''یوں لگتا ہے، بہت دور سے پیدل آ رہے ہو۔''

''ہاں دراصل میں ایک حکیم کے ہاں کام کرتا ہوں اور اس کے لیے چند جڑی بوٹیاں جمع کرنے کے لیے اس طرف آ نکلا ہوں۔ تمہارا شوہر کیا کام کرتا ہے، بہن؟''

''وہ......وہ بکریاں چراتا ہے'' اس نے قدرے افسردہ لہجے میں کہا۔

''اس وقت وہ کہاں ہے اور تمہارے بچے....'' میں نے جھجکتے جھجکتے پوچھا۔ میری بات سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ''میرا ایک ہی بیٹا ہے اور میرا شوہر اسی سے ملنے گیا ہوا ہے''

''تمہارا بیٹا کہاں رہتا ہے اور وہ خود تم لوگوں سے ملنے کیوں نہیں آیا؟'' میری آواز میں حیرت تھی۔ میری بات سن کر اس عورت کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ اس کے رخسار سے آنسو ڈھلک پڑے۔ میں نے شاید اس کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا تھا۔

''میرا بیٹا......میرا بیٹا زمیندار برکت اللہ خان نے اپنی حویلی میں رکھ لیا ہے۔ اسے حویلی سے باہر نکلنے اور مجھ سے ملنے اپنے گھر آنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''کیا عمر ہے تمہارے بیٹے کی اور زمیندار نے اسے کیوں روک رکھا ہے؟''

''میرے شوہر نے اس سے دس ہزار روپے قرض لیے تھے۔ ہم لوگ یہ رقم واپس کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ اس لیے زمیندار نے میرے نو سال کے بیٹے کو اپنی حویلی میں جبری طور پر رکھ لیا ہے۔ اب وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے سارا دن حویلی کا کام کرتا ہے پھر بھی وہ اسے مارتے پیٹتے رہتے ہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ مجبور عورت، ایک بے بس ماں، زار و قطار رونے لگی۔ ''زمیندا کہتا ہے کہ جب تک ہم لوگ اس کی تمام رقم سود کے ساتھ ادا نہیں کر دیتے، وہ ہمارے بیٹے کو نہیں چھوڑے گا چاہے ساری عمر گزر جائے اور......اور ہمارے پاس تو پھوٹی کوڑی تک نہیں ہے۔ میرا شوہر صبح سے شام تک پتھر توڑتا ہے۔ تب تو ہمیں دو وقت کی روٹی مل پاتی ہے۔''

''لیکن تم لوگوں کی بکریاں کہاں گئیں؟'' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''یہ سب نصیب کی بات ہے بھائی'' اس عورت نے ایک دردناک آہ بھرتے ہوئے کہا ''میرے

شوہر نے زمیندار سے دس ہزار روپے لے کر بیس بکریاں خریدی تھیں۔ پانچ ہمارے پاس پہلے سے تھیں۔ ایک سال بعد ہماری بکریاں بڑھ کر تیس ہو گئیں۔ ہماری مالی حالت سدھرنے لگی۔ میرے شوہر نے دو بکریاں بیچ کر زمیندار کو دو ہزار روپے ادا کر دیے۔ ہم سب بہ خوش تھے کہ اچانک ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی'' اتنا کہہ کر وہ عورت ایک بار پھر رونے لگی۔

''کچھ بتاؤ تو سہی بہن کہ آخر ہوا کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔ اس دیوار پر بکریوں کی زنجیریں، بکری کے چمڑے کی بنی ہوئی دو مشکیں اور بکریوں کے لئے درختوں کی سرسبز شاخیں اور پتے اتارنے والا چرواہوں کا مخصوص آنکڑا ٹنگا ہوا تھا۔ ''ایک دن میرا شوہر بکریاں چراتا ہوا، انہیں نزدیکی پہاڑیوں کی طرف لے گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ بکریاں خشک برساتی نالے میں اگی ہوئی جھاڑیاں اور جڑی بوٹیاں چر رہی تھیں۔ میرا شوہر پہاڑی پر چڑھ کر ایک چٹان کے سائے میں لیٹ گیا اور اس کی آنکھ لگ گئی۔ ایک دن پہلے شاید پہاڑوں پر شدید بارش ہوئی تھی چنانچہ اس پہاڑی برساتی نالے میں اچانک برساتی پانی کا زبردست ریلا آ گیا۔ یہ ''نے'' اتنی طوفانی قوت سے آئی تھی کہ اس کی راہ میں آنے والی والی ہر چیز اس کے ساتھ ہی بہہ گئی'' اس عورت نے غم ناک لہجے میں اپنی بات جاری رکھی ''برساتی پانی کے ریلے کی آواز اتنی گرجدار تھی کہ میرا شوہر ایک دم گھبرا کر اٹھ بیٹھا لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکا اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے پانی کا تند و تیز ریلا ہماری ساری بکریوں کو بہا لے گیا اور میرا شوہر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنا کل اثاثہ لٹتا دیکھتا رہ گیا۔ زمیندار کو جب پتا چلا کہ ہماری مالی حالت تباہ ہو گئی ہے اور ہم کوڑی کوڑی کے محتاج ہو گئے ہیں تو وہ اپنے کارندوں کے ساتھ ہمارے جھونپڑے میں آیا اور ہمارے اکلوتے بیٹے کو زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔ اب وہ گیارہ مہینے سے حویلی میں ہے۔ مجھے اس سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔ صرف میرا شوہر اس سے مہینے میں ایک بار مل سکتا ہے۔''

''اف میرے خدا......! یہ تیری دنیا میں کیا ہو رہا ہے''

میرے دل میں درد کی ایک لہر دوڑ گئی ''تو سب کچھ دیکھ رہا ہے پروردگار اور پھر بھی تو نے آسمان کا یہ سائبان بدستور تان رکھا ہے۔ شیطان کے یہ پجاری فرعون اور شداد اور نمرود کے ہم خصلت یہ درندے تیری مخلوق کا خون، چوس چوس کر پل رہے ہیں۔ تو ان کی رسی کب کھینچے گا اے میرے معبود؟''

یک لخت میرے دل سے غم اور افسوس کی دھند چھٹنے لگی اور اس کی جگہ غصے، نفرت اور انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ نے لے لی۔ سردار شاہ مراد، سردار جاہ مراد......اور سردار برکت علی......کیا فرق تھا ان میں؟ شاید نام کا؟ یا پھر شاید شکل کا؟...... یا پھر شاید......؟ نہیں ان میں اور کوئی فرق نہیں تھا۔ ان کے دانت ایک سے نکیلے، ان کے پنجوں کے ناخن یکساں خونریز، ان کی آنکھوں میں ایک ہی قسم کی گرسنہ چمک اور ان کے جسموں میں ایک ہی طرح کی قابل نفرت شیطانی روح تھی لہٰذا......ان کا انجام بھی ایک ہی جیسا ہونا چاہئے تھا۔ انہیں کتے کی موت مار کر ایک ساتھ جہنم ایک ہی طبقے میں پہنچا دینا چاہئے تھا۔

''مجھے یہ سب کچھ سن کر بے حد افسوس ہوا بہن'' میں نے بے حد کوشش کر کے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''کاش میرے بس میں ہوتا کہ میں تمہارے بیٹے کو تم سے ملا سکتا لیکن میں تو خود بھی ایک مفلس انسان ہوں، البتہ میں خدا سے یہ دعا ضرور کروں گا کہ اللہ تعالی جلد از جلد تمہارے بیٹے کو تم سے ملائے اور.....اس بدبخت زمیندار کو ایسی سزا دے کہ اسے قبر میں بھی چین نہ آئے۔''

میری بات سن کر اس بدنصیب عورت نے جس ممنونیت بھری نگاہ سے دیکھا، میں اسے اپنی آخری سانس تک نہیں بھلا سکوں گا۔''

کچھ دیر بعد میں نے اس نیک دل خاتون سے رخصت مانگی تو اس نے مجھے پر خلوص دعاؤں میں رخصت کیا۔ گھر کے دروازے سے نکلتے وقت میرے ذہن میں ایک خیال آیا ''تمہارے بیٹے اور تمہارے شوہر کا کیا نام ہے، بہن؟'' میں نے ٹھہر کر اس عورت سے پوچھا۔

''میرے شوہر کا نام شیر عالم خان اور بیٹے کا نام نور عالم خان ہے بھائی اور تمہاری اس بہن کا نام شادو ہے۔'' اپنا نام اس نے خود ہی بتا دیا۔ اس کی بات سن کر میں نے استفہامیہ انداز میں سر ہلایا اور اپنی منزل کی طرف چلا پڑا۔ شادو کی دردناک کہانی سن کر افسردہ ہو گیا تھا۔

ابھی میں دس پندرہ قدم ہی چلا ہوں گا کہ اچانک مجھے رک جانا پڑا۔

''ذرا رکنا بھائی'' شادو نے مجھے پیچھے سے آواز دی۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اسے مخاطب کیا۔ ''کیا بات ہے بہن، تم نے مجھے کیوں روکا ہے؟''

''تم نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں بھائی''

''میرا نام......میرا نام ذوالفقار خان ہے۔'' میں نے اسے اپنے نام کا ہم معنی بتایا اور چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

''ذوالفقار بھائی تم نے بتایا ہے کہ تمہیں کافی دور تک پھرنا پڑے گا لیکن مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاس پانی کا کوئی انتظام نہیں، جب کہ اس علاقے میں پانی بہت کمیاب ہے''

''تم صحیح کہہ رہی ہو بہن'' یہ سوچ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ میں ایک بار وہی بھیانک غلطی کرنے جا رہا تھا جس کے نتیجے میں مجھے پیاس سے ایڑیاں رگڑنی پڑی تھیں۔

''تم ذرا ٹھہرو بھائی۔ میرے پاس ایک فالتو چھاگل پڑی ہے وہ میں تمہیں لا کر دیتی ہوں۔ اس طرح تمہیں پانی کے لیے بھٹکنا نہیں پڑے گا۔''

اس فرشتہ سیرت عورت نے مجھ پر ایک اور احسان کا بوجھ لاد دیا تھا۔ اس نے مجھے چند منٹوں کے دوران دو مرتبہ اذیت ناک موت سے بچایا تھا۔ میں خود کو اس کی عنایتوں کا مقروض محسوس کرنے لگا۔ میں نے اپنے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ مجھ سے جب بھی جس حد تک ہو سکا، میں اس کے بے پایاں خلوص کا بدلہ چکانے کی کوشش کروں گا۔

میرے خنجر کی دھار کے مقروض افراد کی فہرست میں ایک اور نام کا اضافہ ہو چکا تھا۔ سردار برکت علی جس کے نام سے میں قطعی ناواقف تھا، آج میرے ذاتی دشمنوں کی فہرست میں شامل ہو چکا تھا۔

اس نے خود کو اس امر کا حق دار ثابت کر دیا تھا کہ اس سے سردار شاہ مراد اور سردار جاہ مراد کے مساوی سلوک کیا جائے اور میں اس سے بھرپور انصاف کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

مجھے اس جھونپڑے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا تاہم اب میں خود کو کافی تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ میرا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ میں ممکنہ حد تک تیز رفتاری سے چل رہا تھا۔ میں اس دوران میں لحہ بہ لحہ چمکتی ہوئی سڑک سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ سورج اب میرے سر پر آ گیا تھا اور جسم میں گرم گرم سوئیاں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ راہ میں چلتے چلتے میں نے باجرے کی چار میٹھی ٹکیاں کھائیں اور اس طرح ناشتہ اور دوپہر کا کھانا اکٹھے کھا لیا۔

پانی کی چھاگل ملنے سے میرے حوصلے آسمان کو چھونے لگے تھے اور میرے پیروں میں ایک نئی جان پڑ گئی تھی۔ شام کا وقت ہونے سے پہلے پہلے میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں کے سلسلے میں پہنچ چکا تھا۔ یہاں سے رفتہ رفتہ یہ پہاڑیاں بلند ہوتی چلی گئیں۔ شام ڈھل گئی اور رات سر پر آ گئی۔ اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی میں نے اپنے لیے خواب گاہ تلاش کر لی۔ یہ ایک پہاڑی کی چوٹی کے قریب واقع ایک کھوہ تھی جسے میں نے صاف کر کے لیٹنے کے قابل بنا لیا۔

میں اپنے تھیلے کو تکیہ بنا کر زمین پر لیٹا تو مجھے جسم کی حالت کا صحیح اندازہ ہوا۔ میرا جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا تھا۔ خاص طور پر ٹانگوں کی تو یہ حالت تھی کہ جیسے ان میں جان ہی نہ ہو۔ جسم کا صرف ایک حصہ ایسا تھا جسے بے پناہ سکون کا احساس ہو رہا تھا اور وہ تھے میرے پیروں کے تلوے۔ جو کہ دن بھر کی کڑی مشقت کے بعد پھول کی طرح ہلکے اور سرد محسوس ہو رہے تھے۔ خود مجھے بھی اس وقت کافی تحفظ کا احساس ہو رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر میں کل کا سارا دن بھی مسلسل چلتا رہوں تو کسی حد تک ان لوگوں کی پہنچ سے باہر ہو جاؤں گا۔ پھر سوچتے سوچتے جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

رات کو نہ جانے کون سے پہر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے پھر وہی بھیانک خواب دیکھا تھا۔ وہی خون میں بھیگا ہوا آئینہ، چمکتا ہوا خنجر اور کسی عورت کی بھیانک چیخیں۔ میں ابھی دہشت کی کیفیت سے نکل بھی نہیں پایا تھا کہ چند آوازوں نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے۔

وہ کئی کتوں کی حلق پھاڑ کر بھونکنے کی آوازیں تھیں۔ ''ان بنجر پہاڑیوں میں کتوں کا کیا کام؟'' میں نے پریشانی کے عالم میں سوچا ''ہو سکتا ہے کہ جنگلی کتے ہوں لیکن کبھی سنا تو نہیں کہ اس علاقے میں جنگلی کتے پائے جاتے ہیں'' میں ابھی خوف اور دہشت کے قبضے سے نکل بھی نہیں پایا تھا کہ ایک مہیب آواز نے میرے اعصاب پر بجلی سی گرا دی۔ وہ مکروہ نامانوس آواز بجلی کی گرج کے مانند ان پہاڑیوں کے درمیان گونج رہی تھی، پلٹ رہی تھی۔ پتھروں میں جھنجھناہٹ سی پیدا ہونے لگی۔ کافی دیر بعد میری سمجھ میں آیا کہ وہ فلک شگاف آواز کیسی تھی۔ یہ انسانی قہقہے کی آواز تھی۔ کوئی شخص میگا فون کا والیوم آخری حد تک کھول کر حلق پھاڑ کر قہقہے لگا رہا تھا۔ ہر قہقہے کے ساتھ میرے جسم میں جھرجھری سی دوڑ جاتی۔ اس اچانک افتاد سے مجھے شدید اعصابی جھٹکا لگا۔

''مجھے ایک لوہار کی نسل سے اتنی ہمت کی امید نہیں تھی۔ سیفل داد خان'' رتا سائیں اپنی منحوس آواز

میں میگافون پر چیخا ''تو میری توقع سے زیادہ سرکش کتا نکلا۔ خیر یہ تو ہمارے لیے اور بھی خوشی کی بات ہے کہ ہمیں اتنا جان دار جانور شکار کرنے کا موقع ملے گا'' میں اپنے کشیدہ اعصاب کو مرمت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی کھوہ میں دبکا ہوا اس غلیظ کتے کی کن ترانیاں سن رہا تھا۔

''تیرا بہت بہت شکریہ سیفل کہ تو نے ہمیں بہت بڑی زحمت سے بچالیا۔ ورنہ تیرے جیسے پلے پلائے سور کو ہانک کر شکار گاہ تک لانے میں ہمیں کافی مشکل پیش آتی۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ تو نے اپنے لیے قربان گاہ کا انتخاب خود کیا ہے۔ اچھا ہے تیرے دل میں کوئی حسرت نہیں رہے گی۔

میرا دماغ تیزی سے حالات کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھا۔ جہاں تک مجھے تلاش کرنے کا سوال تھا یہ تو بالکل سامنے کی بات تھی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ بات میری سمجھ میں اب آئی تھی۔ رتا سائیں کے پاس بہترین نسل کے بو سونگھنے والے شکاری کتے تھے، جنہوں نے چند گھنٹوں میں اسے مجھ تک پہنچا دیا تھا۔ اگر مجھے اس امر کا خیال آ بھی جاتا تو میرے پاس اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا۔ میں اپنی بو کو بھلا کیسے چھپا سکتا تھا؟

''اس کا مطلب یہ تھا کہ موت میرے سر پر آ پہنچی تھی۔ میں نے مایوسی کے عالم میں سوچا۔ اب تو بچاؤ کا کوئی بھی راستہ نہیں ہے۔''

''مجھے یہ جان کر بھی بے حد خوشی ہوئی ہے کہ تیرے پاس تیرا خنجر بھی موجود ہے۔ اس طرح تو شکار کھیلنے کا اور بھی مزہ آئے گا'' رتا سائیں بدستور میگافون میں بھونک رہا تھا ''بھلا بغیر دانت کے پنجوں کے شکار کو ہلاک کرنا بھی بہادری کی بات ہے''

میرے پورے جسم میں شدید ترین نفرت کی لہریں دوڑنے لگیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں فرار ہونے کے راستے پر بھی غور کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ کر پچھلی طرف اتر جاؤں جب تک اس شیطان کو صورت کا علم ہو سکے یہاں سے دور نکل جاؤں لیکن نہیں...... اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں اگر پاتال میں بھی جا چھپتا تو یہ خونخوار شکاری کتے مجھے ڈھونڈ نکالتے۔

میں ابھی گومگو کی کیفیت میں ہی تھا کہ اچانک دو طاقتور سرچ لائٹیں روشن ہوئیں اور پوری پہاڑی روشنی میں نہا گئی۔ میرے تمام ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ اس خبیث کو میری حالت کا بخوبی اندازہ تھا۔ اس نے ایک اور زور دار قہقہہ لگایا اور پہاڑیاں ایک بار پھر لرز اٹھیں۔ ''ہم تمہاری کمین گاہ سے اچھی طرح واقف ہیں کتے لیکن تو فکر نہ کر، ہم تجھے ابھی شکار نہیں کریں گے۔ اس طرح تو ذرا بھی مزہ نہیں آئے گا۔ تیرے پاس آج کی بقیہ رات اور کل کا آدھا دن ہے۔ تو جتنا دور بھاگ سکتا ہے بھاگ لے۔ کل شام تیری زندگی کی آخری شام ہو گی لیکن خدا کے واسطے آسانی سے نہ مر جانا ورنہ میرے جگری دوستوں کو سخت مایوسی ہو گی۔ میں نے ان سے تیری بہت تعریفیں کی ہیں۔''

رتا سائیں کے منہ سے نکلنے والا ہر لفظ میرے خون میں آگ لگاتا جا رہا تھا۔ میں بری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ میری بے بسی کی انتہا یہ تھی کہ میں اس کی بکواس کا جواب بھی نہیں دے سکتا تھا۔ وہ مجھ سے کافی فاصلے پر نیچے ہموار جگہ پر موجود تھے اور میری آواز ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ''بھاگ لے حرام

کی اولاد جتنا بھاگ سکتا ہے۔ کل پوری پانچ گولیاں تیرے سینے میں اتاروں گا'' یہ رتا سائیں کے دوستوں میں سے کسی کی آواز تھی ''تیری وجہ سے میرا پورا پانچ لاکھ کا نقصان ہوا تھا کیونکہ میں رتا سائیں کی گھوڑی بلیک بیوٹی پر پانچ لاکھ لگا رکھے تھے۔ کل میں تجھ سے یہ رقم وصول کروں گا۔''

''سن لیا تو نے سیفل کہ میرا یار شوکت علی کیا کہہ رہا ہے؟ میرے دوسرے دونوں یار بھی دو دو لاکھ روپے تیری حرامزدگی کی نذر کر چکے ہیں لیکن فکر نہ کر، ہم خوش ذوق لوگ ہیں اور نہایت سلیقے سے تیرا شکار کرنا چاہتے ہیں۔''

میں اپنی اس وقت کی کیفیت کا پوری طرح اظہار نہیں کر سکتا۔ شدید نفرت، طیش اور حقارت کے ملے جلے جذبات نے میرے جسم کو بھٹی بنا کر رکھ دیا تھا۔ کاش یہ چرب زبان کتے اپنے آتشین ہتھیار الگ رکھ کر میرے سامنے آتے تو میں انہیں بتاتا کہ شکار کسے کہتے ہیں۔

''ہم اب واپس جا رہے ہیں میرے پیارے سور'' رتا سائیں نے کہا اس کے ساتھ ہی سرچ لائٹیں بجھ گئیں اور دو لینڈ کروزر جیپوں کے طاقتور انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی ''لیکن جانے سے پہلے تجھے ایک خوشخبری ضرور سنانا چاہوں گا'' اس خبیث کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا ''اور وہ خوش خبری یہ ہے کہ تیرا جگری دوست سرور...... آہاہاہا...... نہیں نہیں ڈرو نہیں...... میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ اب میں اتنا ظالم بھی نہیں ہوں کہ اپنے وفادار کارندے کو بلاوجہ ہلاک کر دوں۔ بس ہوا یہ کہ میرے ڈبو کو اس کی آنکھیں پسند آ گئی تھیں۔ چنانچہ میں نے اس کی فرمائش پر سرور کی آنکھیں اسے کھلا دیں...... آہاہاہاہا''

''نہیں یں یں یں'' میرے حلق سے بے اختیار ایک طویل چیخ نکلی اور ویرانے میں پھیل گئی۔

''میں تجھے ختم کر دوں گا کتے...... میں نسل مٹا دوں گا تیری۔ میں تیری ہڈیاں چبا جاؤں گا شیطان'' میں حلق پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا۔ میرے دل کے ٹکڑے ہوئے جا رہے تھے۔ آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں نے میرا چہرہ بھگو دیا۔ میرے جسم پر رعشہ سا طاری تھا اور میں نہ جانے کیا کیا بکے جا رہا تھا لیکن وہ شیطانوں کا ٹولا تو کبھی کا جا چکا تھا البتہ ان سنگلاخ پہاڑیوں میں ایک کریہہ قہقہے کی آواز ابھی تک گونج رہی تھی۔

چمکتا ہوا سورج میرے وجود کو بھون رہا تھا لیکن میرے قدم تیزی سے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ میرے دونوں اطراف، بلند و بالا سنگلاخ پہاڑ تھے، ان کی آخری چوٹی دیکھنے کے لیے سر کو پوری طرح اوپر اٹھانا پڑتا تھا۔ میں تقریباً تین گھنٹے سے ایک خشک پہاڑی نالے میں چلتا رہا تھا۔ میں نے کافی کوشش کی لیکن بہت زیادہ فاصلہ طے نہیں کر سکا۔ بلند و بالا پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوتے ہی راستے بے حد دشوار گزار ہو گئے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میرے راستے میں ناقابل عبور پہاڑ حائل ہو گیا اور مجھے لمبا چکر کاٹ کر آگے بڑھنا پڑا۔

رات کو میں شدید ترین جذباتی کشمکش سے دوچار رہا تھا۔ کبھی دل چاہتا کہ ابھی ان مردار خور کتوں کے پیچھے جاؤں اور ان کے گلے چبا ڈالوں لیکن پھر عملی طور یہ امر ناممکن دکھائی دیتا تو دل پر مایوسی کا غلبہ

ہونے لگتا۔ جی چاہتا کہ یہیں بیٹھ کران کا انتظار کروں۔ آخر کار حسب معمول میرے لہو میں دوڑتی ہوئی انتقام کی آگ نے میرا فیصلہ آسان کر دیا تھا۔

مجھے ہر صورت میں، ہر قیمت پر زندہ رہ کران خون آشام درندوں سے انتقام لینا تھا۔ اپنے دوست کی آنکھوں کا، اپنی توہین کا اور بے شمار مظلوم انسانوں کے خون کا۔

اگر چہ مجھے زیادہ امید نہیں تھی، تاہم میں نے بھر پور کوشش کی تھی کہ زیادہ سے زیادہ پیچیدہ اور دشوار گزار راستے اختیار کروں تا کہ انہیں میرا تلاش میں زیادہ سے زیادہ دیر لگے اس دوران میں میرا پانی بھی ختم ہو گیا اور میں کئی گھنٹوں سے پیاسا تھا۔ اس دن ضرورت سے زیادہ ہی گرمی تھی۔ سنگلاخ پہاڑ چولہے پر چڑھے تانبے کے توے کے مانند تپ رہے تھے۔ ہوا کافی تیز چل رہی تھی۔ لیکن اسے ہوا کہنا غلط ہو گا۔ یہ لو تھی۔ زہریلی تیز دھار ہلاکت خیز لو۔ دن بھر چلنے والی لو کے تھپیڑوں نے مجھے نڈھال کر دیا۔ سہ پہر تک میری یہ حالت ہو گئی کہ مجھ سے قدم نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔ بالآخر میں بے دم سا ہو کر ایک چٹان کے سائے میں ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ زندگی رہے یا نہ رہے مجھ میں مزید آگے بڑھنے کی ہمت نہیں تھی۔

میں کسی آواز کو سننے کے لیے کان لگائے بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ جلد ہی مجھ تک پہنچنے والے ہیں اور پھر میں نے وہ آوازیں سن لیں۔ وہ دونوں جیپیں تھیں جو اونچے نیچے راستے پر ہچکولے کھاتی بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اب ان کے ساتھ کتے نہیں چل رہے تھے لیکن نہیں کتے موجود تو تھے لیکن وہ بھی جیپوں میں سوار تھے۔

ان لوگوں نے آخر اتنی جلدی مجھے تلاش کیسے کر لیا؟ میرے ذہن میں کئی سوالات چکرا رہے تھے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ یہ کتوں کے پیچھے پیچھے جیپیں دوڑاتے ہوئے مجھ تک پہنچ گئے ہوں۔ جن جن راستوں سے گزر کر آیا ہوں وہاں سے کتے تو گزر کر آ سکتے ہیں لیکن جیپیں......نہیں...... قطعی نا ممکن۔

اچانک میری آنکھوں پر کسی شیشے کی چمک پڑی۔ میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر ایک لمحے میں، میرے دماغ نے سارا معما حل کر لیا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک اونچی سی پہاڑی پر ایک شخص موجود تھا۔ میں نے اسے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ رتا سائیں کا ہی گرگا تھا۔ اس کے گلے میں طاقتور دوربین لٹک رہی تھی۔ کہانی کچھ اس طرح بنی تھی کہ کل رات کو رتا سائیں بظاہر تو مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا لیکن دراصل اس نے اپنا ایک کارندہ میرے پیچھے لگا دیا تھا۔ یہ کارندہ کافی فاصلے سے میرا پیچھا کرتا رہا اور دوربین سے میری نقل و حرکت کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کا کام نسبتاً آسان تھا۔ اسے میری طرح راستہ تلاش نہیں کرنا تھا بلکہ صرف دور دور سے مجھے اپنی نظروں میں رکھنا تھا۔ اس کے پاس ٹرانسمٹر یا اسی طرح کی کوئی دوسری چیز موجود ہو گی جس کی مدد سے وہ میری تازہ ترین پوزیشن سے رتا سائیں کو آگاہ کرتا رہا ہو گا۔ رتا سائیں کا ڈرائیور اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا لہٰذا وہ بڑی آسانی سے اپنے مالک کو میرے پاس لے آیا۔ انہیں کتوں کو زحمت دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرا آخری وقت آن پہنچا تھا......

''نہیں....'' میرے ذہن میں ایک شعلہ سا لپکا ''نہیں میں اتنی آسانی سے نہیں مروں گا۔ نہیں ہر گز نہیں'' میں نے گردن کو اٹھایا اور اپنے شکاریوں کو دیکھا، دونوں جیپیں مجھ سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر رک گئی تھیں۔ میرے اور جیپوں کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں تھی اگر وہ چاہتے تو براہ راست مجھ تک آ سکتے تھے۔ لیکن ان کا منشا کچھ اور تھا۔ وہ تمام لوگ جیپوں سے اتر آئے تھے اور بڑی دلچسپی سے میرا جائزہ لے رہے تھے۔

رتا سائیں کے چہرے پر وحشیانہ مسکراہٹ تھی۔ اس کے قریب کھڑے ہوئے اس کے تینوں دوست کھیل شروع ہونے کے منتظر تھے۔ ان میں سے ایک نے جو کہ بھاری بھرکم اور دراز قد تھا، اپنا پاؤں جیپ کے فٹ بورڈ پر ٹکا رکھا تھا اور اس پاؤں کے گھٹنے پر بڑی ادا سے اپنی رائفل رکھی تھی۔ اس وقت وہ پنجابی فلم کا خبیث صورت ولن نظر آ رہا تھا باقی دونوں میں سے ایک موٹا اور پستہ قد تھا اور دوسرا دبلا پتلا اور میانہ قامت۔ ان تینوں کے ہی چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ رتا سائیں کے ہاتھ میں ایک میگا فون تھا۔

''اب اٹھ بھی جاؤ یار کیوں کمزور اور ناتواں عورتوں کی طرح پڑے ہوئے ہو۔ تم تو مہمانوں کے سامنے شرمندہ کروانے پر تلے ہو۔''

''بھاگ کتے کے پلے بھاگ'' دراز قامت اور بھاری بھرکم سور نے کہا ''اگر تم میرے پانچ تک گننے پر کھڑے نہ ہوئے تو تمہیں یہیں گولی مار دیں گے۔ مجھے مردار شکار کھانے کا شوق تو نہیں مجبوری ہو تو سب کچھ جائز ہے.....او کے تو میں گنتی گنتا ہوں....ایک....''

میرا دماغ تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ میں ان کے ہاتھوں میں کھلونا نہیں بننا چاہتا تھا لیکن اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ ''کیا کروں؟ کیا کروں؟'' میرے ذہن میں سوالات گونج رہے تھے ''دو.....تین'' رتا سائیں مسلسل بھونک رہا تھا، وقت تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا لیکن میرا ذہن کوئی فیصلہ نہیں کر رہا تھا۔

''بھاگو کتے کے بچے'' رتا سائیں نے مشتعل ہو کر کہا ''میں صرف پانچ تک گنوں گا اور پھر گولی چلا دوں گا.....چار..... پانچ'' اس نے پانچ گنتے ہی گولی چلا دی۔ ڈز کی آواز ابھری اور گولی میرے قریب زمین میں دھنس گئی۔ گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی میرے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی لیکن میرا جسم ٹس سے مس نہیں ہوا۔ دوسری گولی لمبے دراز قد والے سانڈ نے چلائی تھی اور وہ بھی میرے پاس ہی زمین میں دھنس گئی تھی۔ وہ لوگ جان بوجھ کر مجھ سے ہٹ کر نشانے لے رہے تھے۔ ان کی بس یہ خواہش تھی کہ میں اٹھ کر بھاگوں اور وہ اپنی نشانہ بازی کی حسرت پوری کر سکیں۔ اپنا یہ حربہ بھی ناکام ہوتا دیکھ کر رتا سائیں بری طرح مشتعل ہو گیا۔

''تو ایسے نہیں مانے گا حرامی..... جانو تو تینوں کتوں کو کھول دے'' جیپ کے ڈرائیوروں میں سے ایک نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور کتوں والی جیپ کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ تینوں خونخوار شکاری کتے جست لگا کر جیپ سے اترے اور بری طرح غراتے ہوئے میری طرف دوڑ پڑے۔ اب بھاگنے کے

کوئی چارہ نہیں تھا۔ مجھے بھاگتا دیکھ کر وہ لوگ زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے پھر ڈز کی سی آوازیں آنے لگیں لیکن کوئی بھی گولی میرے جسم میں پیوست نہیں ہو رہی تھی۔

شاید وہ اتنی جلدی مجھے ختم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ تو اس شکار کے ایڈونچر سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔ اس فلم کو دیکھنے کا کیا فائدہ جو ٹکٹ کے پیسے پورے کیے بغیر ختم ہو جائے۔ ان کی رائفلوں کا رخ تو بے شک میری طرف ہی تھا لیکن وہ میرے سر سے ذرا اوپر نشانہ لے کر فائر کر رہے تھے۔ ان کے فلک شگاف قہقہے مسلسل میرا پیچھا کر رہے تھے میں بے حد تیز رفتاری سے دوڑ رہا تھا لیکن ظاہر ہے کہ میں شکاری کتوں سے زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی وہ ابھی تک مجھے پکڑ نہیں پائے تھے تب مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ وہ کتے تو مجھ پر حملہ کرنا ہی نہیں چاہتے! وہ میرے ساتھ دوڑ رہے تھے کئی بار میں ان کی زد میں آیا لیکن لیکن انہوں نے مجھ پر اپنے دانت آزمانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ یہ بے زبان جانور بھی اپنے مالک کی وفاداری کی دھن میں چوہے بلی کے اس خوفناک کھیل میں برابر کے شریک تھے۔ وہ اپنے مالک کی ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کر رہے تھے۔

ہم دوڑتے دوڑتے کافی دور نکل آئے، اچانک میں ایک پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ اس وقت رتا سائیں اور اس کے حواری مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ ہمارے درمیان ایک چھوٹی سی پہاڑی حائل ہوگئی تھی البتہ پہاڑ کی چوٹی پر موجود نگران کارندہ اپنی دوربین آنکھوں سے لگائے بدستور میری نقل و حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے پہاڑ کے اوپر چڑھتا دیکھ کر اس نے اپنے آقا کو ہاتھ کے اشارے سے کچھ بتایا اور پھر دوبارہ دوربین آنکھوں سے لگائے مجھے دیکھنے لگا۔

تینوں کتے میرے پیچھے پہاڑ کی ڈھلوان پر چڑھ رہے تھے لیکن انہیں کافی مشکل پیش آ رہی تھی تقریباً پچاس گز کی بلندی تک چڑھنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اب براہ راست عمل کا وقت آن پہنچا ہے۔ میرا وفادار خنجر بجلی کی سی تیزی سے اپنی میان میں سے نکلا اور ایک کتے کی گردن میں اترتا چلا گیا۔ کتے کے حلق سے ایک دردناک چیخ نکلی اور وہ ڈھلوان پر سے لڑھکتا ہوا نیچے جانے لگا۔ اپنے ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر باقی دونوں کتوں پر وحشت سوار ہوگئی اور وہ غراتے ہوئے مجھ پر جھپٹ پڑے لیکن ان بے چاروں کی مجبوری یہ تھی کہ وہ بے حد نامناسب جگہ مجھ سے نبرد آزما تھے۔ یہ کوئی ہموار میدان نہیں تھا جہاں وہ اکٹھے مجھ پر حملہ آور ہو کر میرا خرخرہ چبا ڈالتے۔ اسی فرق کی وجہ سے ان کا پہلے والا ساتھی اپنی جان گنوا بیٹھا تھا اور یہ دونوں پھر وہی غلطی دہرا رہے تھے۔ میں نے اپنے پیر سے ان میں سے ایک کے منہ پر ضرب لگائی اور لڑھکتا ہوا کئی فٹ نیچے جا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر واپس آتا میں نے دوسرے کتے پر حملہ کر دیا۔ میں نے اپنے خنجر کو دائرے کی شکل میں حرکت دی اور خنجر کے تیز دھار پھل نے بڑی صفائی سے کتے کے حلق کی نالی کاٹ دی۔ اسی اثناء میں تیسرا کتا مجھ تک پہنچنے کی تگ و دو میں مصروف تھا۔ میں نے بڑے اطمینان سے دو تین بڑے بڑے پتھر اس کی طرف لڑھکا دیے۔ وہ بے چارہ وفادار جانور ان پتھروں کی زد میں آگیا اور ان کے ساتھ ہی لڑھکتا ہوا نیچے جا گرا۔ اب تینوں کتے موت

کی نیند سو چکے تھے۔

مجھے علم تھا کہ میرا نگران اس تمام کارروائی کی رننگ کمنٹری اپنے آقا کو سنا رہا ہوگا اور وہ یہ سب کچھ سن کر رتا سائیں کے ہوش اڑ گئے ہوں گے اور وہ کف اڑاتا گالیاں بکتا میری طرف دوڑا چلا آ رہا ہوگا۔

میرا اندازہ صحیح نکلا چند ہی منٹ بعد دونوں لینڈ کروزر اس پہاڑ کے نیچے آن رکیں۔ میں اس دوران پہاڑ پر کافی اوپر چڑھ چکا تھا اور ابھی میری جدوجہد جاری تھی۔ مجھے رتا سائیں کی حالت کے متعلق سوچ کر لطف آ رہا تھا۔ اسے یہ کتے شاید اپنی ساتوں ماؤں اور دونوں بیویوں سے بھی بڑھ کر پیارے تھے، ان کی موت کا صدمہ اس کی جان بھی لے سکتا تھا۔

''میں تیرا خون پی جاؤں گا کتے کے بچے.... میں...... میں تیری بوٹیاں نوچ لوں گا...... تیری کھال کھینچ لوں گا۔ تو نے...... تو نے...... تو نے میرے ڈبو کو مار دیا، میرے جیری اور ٹونی کو مار دیا'' وہ اس طرح ماتم کر رہا تھا کہ جیسے اس کے سگے بیٹوں کی لاشیں اس کے سامنے پڑی ہوں۔ میں نے زندگی میں پہلی بار ہی کسی کو میگا فون پر بین کرتے ہوئے سنا تھا۔ اچانک اس نے مجھ پر گولیوں کی بارش کر دی۔

گولیاں تڑاتڑ میرے آس پاس برسنے لگیں۔ میں فوراً ایک بڑے سے پتھر کے پیچھے دبک گیا۔ اس کا تفریحی مزاج یک لخت غارت ہو گیا تھا اور اس پر مجھے فوری طور پر قتل کرنے کی دھن سوار ہو گئی تھی۔ وہ بڑے اہتمام سے میرے شکار کو نکلے تھے، شکار سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے انہوں نے بہت چھوٹے بور کی رائفل کا انتخاب کیا تھا۔ وہ چاروں ہی اعشاریہ دو دو کی ہلکی رائفلیں لیے ہوئے تھے۔ یہ رائفلیں نشانہ بازی کے لیے بہت عمدہ تھیں لیکن ان کی گولی کی تباہ کن قوت کم تھی۔ اس رائفل کی ایک آدھ گولی شاذ و نادر ہی فوری موت کا باعث بن سکتی تھی۔ رتا سائیں کا مزاج دیکھ کر اس کے تینوں ساتھی بھی مجھ پر ''طبع آزمائی'' کرنے لگے لیکن وہ زیادہ سے زیادہ اس پتھر کو ہی نشانہ بنا سکتے تھے، جس کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا۔

اچانک فضا میں ایک اور فائر کی آواز گونجی۔ اس فائر کا دھماکہ پہلے والے فائروں سے زیادہ بلند تھا۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی میرے قریب موجود ایک پتھر سے چنگاریاں اڑیں۔ میں نے چونک کر فائر کرنے والے کو ڈھونڈا۔ وہ نشانہ باز میرا محترم نگران تھا جو کہ اس وقت اپنے آقا کے پہلو میں پہنچ چکا تھا۔ اس کم بخت کے پاس سیون ایم ایم رائفل تھی۔ سیون ایم ایم جیسا کہ آپ کو علم ہوگا کہ سب زیادہ طاقتور اور لانگ رینج والی رائفل سمجھی جاتی ہے اور دنیا بھر کے پیشہ ور قاتل ہمیشہ اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔

رتا سائیں کا یہ سیون ایم ایم رائفل بردار غلام اس کے دیگر بہت سے گرگوں کے مانند ایک پیشہ ور قاتل تھا۔ وہ یقیناً اپنے آقا سے بہتر طریقے سے ہتھیار برتنے کا سلیقہ رکھتا تھا اور اس کے پہلے ہی فائر نے اس کے نشانے بازی کی مہارت کا ثبوت دے دیا تھا۔ رتا سائیں اور اس کے تینوں ساتھیوں میں سے کوئی بھی مجھ سے اتنے قریب سے نشانہ نہیں لگا سکا تھا۔ اب مجھے محتاط رہنے کی ضرورت تھی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اگر میرے جسم کا کوئی معمولی سا حصہ بھی اسے نظر آ گیا تو وہ اسے فوراً نشانہ بنا دے گا۔

اچانک رتا سائیں نے میری مشکل آسان کر دی۔ اس نے اپنی ہلکی پھلکی ۲۲۔۰ رائفل جیپ کے

ساتھ کھڑی کر دی اور اپنے کارندے کی طاقتور رائفل لے لی۔ اس نے سیون ایم ایم رائفل سے جو پہلا فائر کیا وہ مجھ سے تقریباً دو گز دور ایک بڑے پتھر سے ٹکرایا۔ سیون ایم ایم کی لمبی مار کی وجہ سے اس کا فائر کے وقت لگنے والا جھٹکا بھی زبردست قسم کا ہوتا ہے لہٰذا اس کی شست پر کنٹرول بھی اچھا خاصا مشکل ہوتا ہے۔

رتا سائیں نے فوراً ہی گولی کا خالی کھوکھا باہر پھینکا اور دوسرا فائر کر دیا اور پھر تیسرا، چوتھا، پانچواں...... اس کی رائفل پر گرفت اور ٹرائیگر پر قابو پانے کی صلاحیت پہلے سے بہتر ہو گئی تھی اور اب اس کے نشانے بھی زیادہ بہتر ہو گئے تھے، اسی اثناء میں اس کے تینوں دوستوں نے بھی اپنی رائفلیں جیپ کے سہارے کھڑی کر دیں۔ شاید وہ بھی اس خوبصورت اور بارعب ہتھیار کے لمس سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔ اسی اثناء میں سیون ایم ایم کے میگزین میں گولیاں ختم ہو گئیں۔ رتا سائیں کے اس کارندے نے اپنی بیلٹ سے مٹھی بھر گولیاں نکالیں اور رائفل کا میگزین کھول کر اس میں گولیاں بھرنے لگا۔

اب صورت حال میری برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ اب کے بعد گزرنے والا ہر لمحہ میری مشکلات میں اضافہ کرنے والا تھا۔ تھکن اور پیاس کی شدت سے میری جان لبوں پر آ رہی تھی۔ میں غیر معینہ مدت تک اس پتھر کے پیچھے دبک کر نہیں بیٹھا رہ سکتا تھا۔ جبکہ میرے شکاری بڑے اطمینان سے گھات لگائے بیٹھے تھے۔ انہیں کسی قسم کی جلدی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ مکمل طور پر ضروری سازوسامان سے لیس تھے اور ہفتوں میری گھات میں بیٹھے رہ سکتے تھے لیکن میرے پاس زیادہ سے زیادہ چند گھنٹے تھے اور مجھے اسی کے دوران میں اپنی جان بچانے کی بھی کوشش کرنی تھی۔ مجھے جلد از جلد کوئی عملی قدم اٹھانا چاہیے تھا ورنہ شاید پھر بہت دیر ہو جاتی۔

”تو ہی میری رہنمائی کر یا پروردگار!“ میں نے آسمان کی طرف نظریں اٹھاتے ہوئے التجا کی۔

اچانک میری نظر اپنے قریب موجود پتھروں کے ایک ڈھیر پر پڑی۔ اس ڈھیر میں موجود چھوٹے بڑے پتھر بے ترتیب سے ایک دوسرے کے اوپر ٹکے ہوئے تھے۔ میں ایک فوری فیصلے کے تحت بڑی تیزی سے کھسکا اور میں نے اپنا دایاں پیر پتھروں کے اس ڈھیر پر ٹکا دیا اور اسے پوری قوت سے ڈھلان میں دھکیل دیا۔

پھر تو گویا قیامت سی آ گئی۔ میرے دھکیلے ہوئے پتھر بڑی تیز رفتاری سے پہاڑی کے دامن کی طرف لڑھکنے لگے۔ راستے میں یہ پتھر دوسرے پتھروں سے ٹکرائے اور پھر وہ بھی ان کے ساتھ لڑھکنے لگے۔ پتھروں کی رفتار بے حد تیز تھی اور ان کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا اور ان کے لڑھکنے سے ایک مہیب آواز پیدا ہو رہی تھی جس سے پورا علاقہ گونج رہا تھا۔

اس ہولناک شور کی آواز سن کر پہاڑی کے دامن میں کھڑے ہوئے افراد بری طرح چونک پڑے۔ انہوں نے گردن اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا تو خوف و دہشت سے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس ناگہانی افتاد نے ان کے ہوش اڑا دیے تھے اور وہ اپنی جگہوں پر منجمد ہو کر رہ گئے۔ اچانک انہیں

ہوش آ گیا اور وہ سب بگٹٹ دوڑتے ہوئے پہاڑی کے دامن سے دور ہوتے چلے گئے۔ وہ اتنی بدحواسی اور عجلت میں بھاگے تھے کہ رتا سائیں کی بیش قیمت لینڈ کروزر جیپ وہیں کھڑی رہ گئی۔ ان چاروں کی رائفلیں بھی جیپ کے سہارے کھڑی تھیں۔ پتھروں کا بپھرا ہوا تباہ کن ریلا تباہ کن قوت سے لینڈ کروزر جیپ پر برس پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے رتا سائیں کی پندرہ لاکھ روپے کی مالیت کی گاڑی کباڑے کا بے ہنگم ڈھیر بن گئی۔ منوں وزنی بھاری بھرکم پتھر اتنی قوت سے اور اتنی بڑی تعداد میں اس پر گرے تھے کہ وہ چکنا چور ہو کر پتھروں کے بہت سے ڈھیر کے نیچے دب گئی۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں چاروں رائفلیں بھی تنکوں کے مانند ٹکڑے ہو گئی ہوں گی۔

اتفاق سے ان لوگوں کی دوسری جیپ قدرے فاصلے پر کھڑی تھی اور اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ رتا سائیں بدحواسی کے عالم بھاگتا ہوا، اسی کے عقب میں جا چھپا اور اب پھٹی پھٹی نظروں سے یہ تمام منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کا خطرناک حد تک خوف سے سفید چہرہ دور سے دیکھا جا سکتا تھا، وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ اپنے اعصاب پر ابھی تک قابو نہیں پا سکتا تھا۔

مجھے اپنی اس کامیابی پر کافی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے رتا سائیں کو اچھا خاصا نقصان پہنچانے کے ساتھ ساتھ زبردست اعصابی جھٹکا بھی پہنچایا تھا۔ میں اس کی نفسیاتی کیفیت کو کافی حد تک سمجھ سکتا تھا۔ اس کی ساری شیخی کرکری ہو گئی تھی۔ وہ تو بڑے اعتماد اور انتظام کے ساتھ شکار پر نکلا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں کے سامنے بڑے بڑے دعوے کر رکھے ہوں گے لیکن اس کے شکار نے خلاف توقع زبردست مزاحمت کا مظاہرہ کر کے کم از کم عارضی طور پر ان کے ارادے خاک میں ملا دیے تھے۔ میں کم از کم فوری طور پر ان کی پہنچ سے باہر تھا۔ یہی وجہ نہیں بلکہ میں ان پہاڑی کے قریب آنے کی صورت میں مزید پتھر گرا کر انہیں نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔ میں نے رتا سائیں کے بے حد نادر اور بیش قیمت کتے خاک و خون میں لوٹا دیے تھے اور پھر اس کی قیمتی جیپ کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ شدید بے بسی اور مایوسی کے عالم میں مجھے دیکھتے رہنے کے علاوہ کچھ کر نہیں پا رہا تھا۔ میں نے اسی اثناء میں قریب ہی واقع ایک چھوٹی سی کھوہ دیکھ لی اور بجلی کی سی تیزی سے اس میں جا گھسا۔ کتنی عجیب بات تھی۔ پہلے میری خواہش تھی کہ وہ مجھے سیدھی طرح گولی کا نشانہ بنا کر زندگی کے آزار سے چھٹکارا دلا دیں لیکن وہ مجھ پر احسان کے لیے تیار نہیں تھے اور اب وہ مجھے گولیوں سے چھلنی کر دینا چاہتے تھے لیکن اب میں ان کے لیے ٹارگٹ بننے کا فریضہ انجام دینے پر آمادہ نہیں تھا۔

کچھ وقت اسی طرح گزر گیا اور پھر میری توقع کے عین مطابق رتا سائیں پر اچانک جلالی کیفیت طاری ہو گئی اور اس نے میگا فون سنبھال کر مجھے بے تحاشہ مغلظات سے نوازنا شروع کر دیا۔ میں چونکہ اس کی درماندہ ذہنی حالت سے بخوبی واقف تھا لہٰذا مجھے اس کی دریدہ ذہنی پر غصہ نہیں آ رہا تھا۔ اس طرح سے اپنے دل کا غبار نکال کر وہ گویا اپنی شکست خوردگی کا اظہار کر رہا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری پیاس شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ میرا حلق بری طرح سوکھ چکا تھا اور مجھے اپنی طبیعت بے حد گری گری سی بوجھل بوجھل سی محسوس ہونے لگی۔ مجھے اپنے سر میں

ہلکا ہلکا درد محسوس ہو رہا تھا اور مجھے چکر آ رہے تھے۔

رتا سائیں بک جھک کر خاموش ہو گیا۔ رات کا پہلا پہر شروع ہوا تو ان لوگوں نے اسی جگہ ایک بڑا سا خیمہ نصب کر کے، ایک کیمپ قائم کر لیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان کا مستقل یہیں قیام کرنے کا ارادہ ہو۔ یہ صورت حال دیکھ کر مجھے پہلی بار نازک پوزیشن کا احساس ہوا۔

میں جس پہاڑ کی کھوہ میں دبکا ہوا تھا، وہ کافی بلندی پر جا کر کسی سپاٹ دیوار کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ لہٰذا اب یہ میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ میں رات کی تاریکی میں پہاڑ کی دوسری طرف اتر کر فرار ہو جاؤں۔ میرے وہاں سے نکلنے کا بس ایک ہی راستہ تھا اور اس راستے پر شیطانوں کی وہ ٹولی ڈیرہ جمائے ہوئے میرے نیچے اترنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ لوگ تمام ساز و سامان سے پوری طرح لیس تھے اور انہیں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ کھانے پینے کی چیزوں کا وسیع ذخیرہ ان کے ساتھ ساتھ تھا اور وہ ایک طویل عرصے تک میرا انتظار کر سکتے تھے جبکہ میں...... میری حالت تو ابھی سے تباہ ہو رہی تھی اگر مزید ایک آدھ دن مجھے یہاں محصور رہنا پڑ جاتا تو میں بھوک پیاس کے ہاتھوں خود ہی موت کے منہ میں پہنچ جاتا۔

وہ پوری رات اسی طرح گزر گئی۔ رتا سائیں کے خیمے کے پاس ایک چاق و چوبند پہرے دار تعینات رہا جو دراصل میری نگرانی کر رہا تھا۔ میں ان کی نگرانی کر رہا تھا کہ کہیں میری نیند کا فائدہ اٹھا کر وہ اوپر نہ چڑھ آئیں اور مجھے گولی کا نشانہ بنا دیں۔ وہ تمام رات میں نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ صبح ہونے تک میری حالت خراب ہو گئی تھی۔ مجھے تیز بخار چڑھ گیا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے میرے جسم کی تمام طاقت نچڑ کر رہ گئی ہو۔ یہ بات تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ ان لوگوں کی پوزیشن میری نسبت بہت مستحکم تھی۔ میں ایک تھا اور وہ سات۔ ان کے پاس غیر معینہ مدت کے لیے تک قیام کے اسباب تھے جبکہ میرا وقت تیزی سے ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا تھا۔ وہ دن بھی پچھلے دن کی طرح بے حد گرم رہا۔ فضا میں لو کے زہریلے جھکڑ چلتے رہے۔ میں نے دن بھر میں کتنے ہی بگولوں کو محو رقص دیکھا۔ سہ پہر کو مجھ پر غنودگی کے دورے پڑنے لگے۔ یہ نیند اور غشی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ شام ڈھلے رتا سائیں کا صبر و تحمل جواب دے گیا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو سیفل کتے کہ ہم تجھے اس کھوہ میں چھپا ہوا چھوڑ کر چلے جائیں گے؟ اس احمقانہ خیال کو اپنے دل سے نکال دے۔ میں قیامت تک تیرے نیچے اترنے کا انتظار کر سکتا ہوں لیکن تیرے لیے بہتر یہی ہے کہ تو چپ چاپ نیچے اتر آ۔ میرا وعدہ ہے کہ میں تجھے جان بچانے کا پورا موقع دوں گا“ اس نے میگافون پر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

وہ کچھ دیر تک میری طرف سے کسی ردعمل کا انتظار کرتا رہا۔ اسے بھلا کیا معلوم کہ میری تو یہ حالت ہو رہی تھی کہ میں چاہتا بھی تو اٹھ کر کھڑے ہو کر اسے اپنے تعاون کی یقین دہانی نہیں کرا سکتا تھا۔

میری طرف سے مستقل خاموشی پا کر وہ بری طرح مشتعل ہو گیا ”کتے کی نسل تو ایسے نہیں مانے گا۔ تیرے کس بند ڈھیلے کرنے کے لیے مجھے بتانا ہی پڑے گا کہ میرا آئندہ کیا پروگرام ہے“ اس نے قدرے توقف کے بعد اپنی بات جاری رکھی ”اس غدار کتے کے بچے سرور کی آنکھیں نکالنے کے بعد میں اپنے ان جگری یاروں کے ساتھ تیرے چچا کے گھر گیا تھا۔ میرے دوستوں کو تمہارے چچا کا لوہار

خانہ بہت پسند آیا اور وہ الہڑ کبوتری مہراں بھی...... اگر تم کل صبح تک بھی اپنی کمین گاہ سے نہیں نکلے تو میں اپنے دو آدمیوں کو یہاں چھوڑ کر اپنے دوستوں کے ہمراہ گاؤں پلٹ جاؤں گا۔ اگرچہ میرے ان دوستوں کو مہنگے سے مہنگا تر مال کھانے کی عادت ہے تاہم مجھے یقین ہے کہ انہیں ایک لوہار کے گھر کا نمک بھی بہت لذیذ محسوس ہو گا۔“

میرے ذہن میں ایک زوردار دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ہی میرے تمام جسم کا خون میرے سر میں جمع ہونے لگا۔ آگ میں جلتے ہوئے جسم پر ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے اور ہاتھ پیروں میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ غصے، نفرت اور انتقام کی جلتی ہوئی آگ نے میرے جسم کے بخار کو بھی بھاپ میں اڑا دیا۔ میرے دل کے کسی دور دراز خفیہ گوشے میں نہ جانے کب سے یہ اندیشہ کسی زہریلے سنپولیے کی طرح پنپ رہا تھا لیکن میں اسے مسلسل نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اب وہ سنپولیا ایک زہریلے ناگ کا روپ اختیار کر کے میری پیشانی پر آن بیٹھا تھا۔

”مجھے تیری بات کا یقین ہے رتا سائیں“ میں نے دل ہی دل میں کہا ”مجھے یقین ہے کہ تو ایسا ہی کرے گا۔ میں تیرے ہاتھوں موت قبول بھی کر لوں تو بھی تو ایسا ہی کرے گا لیکن میں تجھے ایسا کرنے نہیں دوں گا۔ میں مرتے مرتے بھی دکھا دوں گا کہ اگر تو کالا ناگ ہے تو سیفل بھی شیش ناگ ہے۔ مجھے تو چور چور ہو کر بکھرنا ہی ہے لیکن میں تیرے جسم کی چادر کو بھی چھید چھید کر مروں گا۔“

وہ رات ہی میری زندگی طویل اور بھیانک ترین راتوں میں سے ایک تھی۔ اس تمام رات میرا خنجر میرے ہاتھ میں بے چینی سے بل کھاتا رہا۔ اسے خون کی پیاس ستا رہی تھی۔ تازہ تازہ گرم خون کی پیاس۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ آج ہی اس کی یہ ازلی پیاس بجھا کر چھوڑ دوں گا، چاہے اسے اپنے ہی خون سے غسل دینا پڑے۔

رات کے دوسرے پہر میں رینگتا ہوا اپنی پناہ گاہ سے باہر آ گیا۔ میری روٹھی ہوئی توانائی جانے کس بہلاوے میں آ کر عارضی طور پر میرے پاس پلٹ آئی تھی۔ میری وہ جان لیوا پیاس بھی گھبرا کر میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ میں اب پیاسا تو تھا لیکن پانی کا نہیں اپنے دشمنوں کے خون کا پیاسا تھا۔ دراصل میری پیاس کا رخ بدل گیا تھا۔

رتا سائیں کے خیمے کے سامنے الاؤ کی لو اب دھیمی پڑ رہی تھی اور اس کے قریب موجود رتا سائیں کا زرخرید کتا حسین خوابوں کی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ میں کسی کوڑیالے سانپ کی طرح رینگتا ہوا پہاڑی ڈھلان سے نیچے اترنے لگا۔ میں بے حد احتیاط سے قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے پوری طرح نیچے اترنے میں تقریباً دو گھنٹے لگے ہوں گے۔ نیچے اترنے کے بعد میں بلی کے سے قدموں سے چلتا ہوا پہرے دار کے پاس پہنچا۔ وہ میرا سابق نگران اعلیٰ ثابت ہوا جو کہ اس وقت بلند آواز سے خراٹے لے رہا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی جیپ کے دروازے کھولے اس کے اندر سو رہے تھے۔ میں نے قریب پڑے ہوئی سیون رائفل کے بھاری دستے سے نگران کے سر پر ضرب لگائی لیکن اس سے پہلے میں نے اس کا منہ اپنی ہتھیلی سے دبا دیا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کے خراٹے بند ہو گئے۔ اس کے بعد میں نے اپنے

اگلے شکار کا تعین کیا اور جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ دونوں ڈرائیور جیپ کی سیٹیں لمبی کیے دراز تھے۔ میں نے پہلے ایک کے سر پر رائفل کا دستہ آزمایا، اتفاق سے وار ذرا ادچھا پڑا اور اس شخص نے چیخ مار کر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز اس کے حلق میں ہی گھٹ گئی اور میری رائفل کا دستہ دوسری بار اس کے سر پر بج اٹھا۔ یہ ضرب کڑی تھی۔ وہ اسے جھیل نہ سکا۔ دوسرا ڈرائیور زیادہ شریف ثابت ہوا اور اس نے مجھے قطعاً پریشان نہیں کیا پھر میں اپنے اصل شکاروں کے خیمے کی طرف بڑھا۔ سب سے مشکل مرحلہ تو اب شروع ہوا تھا۔ خیمے کے اندر چھوٹا سا گیس کا لیمپ ہلکی لو میں جل رہا تھا۔ خیمے میں وہسکی کی بدبو پھیلی ہوئی تھی اور ایک بوتل اور چار گلاس ایک جانب لڑھکے پڑے تھے۔ وہ چاروں کئی کئی پیک چڑھا کر پڑے تھے۔ رتا سائیں کے دائیں طرف موٹا شوکت علی دراز تھا جبکہ بائیں طرف تیس بور کا کولٹس پستول چمک رہا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اس خوبصورت ہتھیار پر قبضہ کیا۔ پہلے شکار کا انتخاب زیادہ مشکل نہیں تھا۔ ان میں سے سب سے زیادہ طاقتور اور بھاری بھرکم شوکت علی تھا۔ میرا ہاتھ گھوما اور کولٹس پستول کا دستہ پوری قوت سے شوکت علی کی کنپٹی سے ٹکرایا۔ کھٹ کی آواز پیدا ہوئی اور اس نے ہاتھ پیر پھیلا دیے۔ اس کے بعد میں نے دوسرے دونوں سواروں کو لمبا لٹا دیا اور پھر میں اپنے اصل شکار کی طرف متوجہ ہوا۔

میں رتا سائیں کے ساتھ ذرا امتیازی سلوک کرنا چاہتا تھا لہٰذا میں نے خیمے کے ایک کونے میں پڑی ہوئی نائلون کی رسی اٹھالی۔ رتا سائیں نے شاید کچھ زیادہ ہی چڑھالی تھی۔ جب میں نے اس کے دونوں پاؤں جکڑ لیے تو اس نے چوں تک نہ کی۔ البتہ جب میں نے اس کے ہاتھ پشت پر کر کے باندھنا شروع کیے تو اس نے چند ناراض ریمارکس دیے، جب تک وہ پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں آتا، میں برق رفتاری سے اس کے ہاتھ پشت پر کر کے جکڑ چکا تھا۔ یہ پوزیشن کافی تکلیف دہ تھی لہٰذا اس کو ہوش و حواس کی طرف لوٹنا پڑا۔

"اٹھو میری رتی سرکار، سویرا ہو چکا ہے۔"

"کیا ہے بے..... کون ہے؟" رتا سائیں نے سر جھٹک کر نشے کے جھونکوں کو بھگانا چاہا پھر اس نے ایک جھٹکے سے اٹھنا چاہا لیکن ایک پہلو پر لڑھک گیا۔

"صبر..... صبر..... میرے چاند میں تجھے اٹھاتا ہوں۔" میں نے اسے سہارا دے کر بٹھا دیا اور پھر یکدم اس کے دماغ کی بیٹریاں چارج ہو گئیں اور خوف اور حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"ت..... ت..... تم..... سیفل یہ تم ہو؟" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"آپ کا خادم رتا سائیں" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا "آپ نے یاد کیا اور خادم حاضر ہو گیا۔"

"تم..... تم یہاں کیسے پہنچے؟"

"تعمیل حکم ضروری تھا سائیں۔ آپ نے صبح تک کی مہلت دی تھی، میں نے سوچا کہ کیوں نہ آپ کو

انتظار کی زحمت سے بچا لیا جائے"

"یہ تم نے مجھے باندھ کیوں رکھا ہے سیفل..... مجھے کھول دو اور میرا پستول مجھے واپس کر دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا"

"مجھے تمہارے وعدے پر اعتبار ہے سائیں لیکن آپ اس پوزیشن میں زیادہ خوب صورت لگ رہے ہیں اور جہاں تک اس پستول کا تعلق ہے تو یہ مجھے پسند آ گیا ہے۔ ویسے بھی میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ ہتھیار مردوں کے ہاتھوں میں ہی سجتے ہیں اور میری نظر میں تمہاری مردانگی ذرا قابل غور قسم کی چیز ہے"

"دیکھو سیفل، ان فضول باتوں سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ میں اپنے اور تمہارے درمیان موجود تمام جھگڑے ختم کر کے تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔"

"ہمارے درمیان جھگڑا تھا ہی کیا رتا سائیں؟ اس رات اگر تم مجھ پر سینکڑوں ہنٹر برسانے کے بجائے صرف چند ہنٹر اپنے جوگی پر بھی آزما لیتے تو وہ تمہیں مکمل سازش سے آگاہ کر دیتا لیکن تمہیں تو میری گردن پتلی نظر آئی تھی اور پھر تمہیں شکار کا شوق چڑھ گیا۔"

"ان باتوں کو چھوڑو سیفل۔ اب ہمیں جھگڑا ختم کرنے کی باتیں کرنا چاہئیں۔"

"ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہے سائیں مجھے تو بس سرور علی کی لہو اگلتی ہوئی آنکھیں یاد آ رہی ہیں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"مجھے اس حادثے کا بے حد افسوس ہے سیفل۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس سے معافی مانگ لوں گا اور اسے پچاس ہزار کی رقم بھی دوں گا۔"

"میں تمہیں ایک لاکھ کی پیش کش کرتا ہوں رتا سائیں۔ تم اپنی دونوں آنکھیں مجھے بیچ دو" نفرت کی شدت سے میری آواز لرز رہی تھی۔

"یہ کیسے..... یہ کیسے ممکن ہے سیفل؟" اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم صحیح کہہ رہے ہو یہ ناممکن ہے۔ بھلا آنکھوں کی بھی کوئی قیمت ہو سکتی ہے، یہ تو ایسی نعمت ہے جسے مفت میں چھین لینا چاہئے۔" میرے لہجے میں یقیناً کوئی ایسی بات تھی جسے محسوس کر کے وہ سر سے پیر تک کانپ گیا۔

"مجھے معاف کر دو سیفل۔ مجھے مت مارو" اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"ارے تم سے کس نے کہا کہ میں تمہیں مارنے والا ہوں۔ نہیں بھئی میں ایسا ظلم نہیں کر سکتا۔"

"پھر تم کیا چاہتے ہو..... دیکھو میں تمہیں دس لاکھ روپے دوں گا۔ تم مجھے چھوڑ دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ....."

"رتا سائیں، تم نے کبھی شیخ سعدی کا نام سنا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ تم کبھی نہیں سنا ہو گا بھلا تم جیسے بادشاہوں کو ان فقیر لوگوں سے کیا واسطہ ہے تو اس فقیر نے اسی موجودہ صورت حال کے مطابق مجھے ایک نصیحت کی تھی"

''ک.....کیسی نصیحت؟'' اس نے بدستور لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔
''اس نے مجھے نصیحت کی تھی کہ بدشرستوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا ایسا ہے جیسے نیکوں کے ساتھ بدی کرنا۔''
''میں.....میں وعدہ کرتا ہوں کہ.....'' اس کے لہجے کی لرزش مزید بڑھ گئی۔ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا ''اور ہاں اس نے ایک اور نصحیت بھی کی تھی۔ وہ نصیحت یہ تھی کہ کمزوروں پر رحم نہ کرنے والا طاقتوروں سے مار کھاتا ہے۔''
''مجھے معاف کر دو سیفل'' اچانک رتا سائیں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ ''تم میری ساری دولت لے لو سیفل لیکن مجھے صرف ایک بار معاف کر دو۔''
''ٹھیک ہے میں تمہیں جان سے نہیں مارتا لیکن تمہیں تھوڑی بہت سزا تو ملنا ہی چاہیے، یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے غلیظ منہ کی کمین غلیظ زبان سے میری چچا زاد بہن کے بارے میں جو کچھ بکواس کی، اس کی کیا سزا ہونی چاہیے؟''
''تم جو سزا دینا چاہو گے میں بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔''
''اچھا تو اپنا منہ کھول کر اپنی زبان باہر نکالو''
''تم.....تم کیا کرنا چاہتے ہو؟'' اس نے دہشت سے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔
''میں تمہاری دراز زبان کو تھوڑا سا کترنا چاہتا ہوں۔''
''نہیں نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ تم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے'' اس نے کانپتے ہوئے کہا۔
''دوسری صورت یہ ہے کہ میں یہ خنجر تمہارے سینے میں اتار دوں۔''
''نہیں نہیں یہ ظلم ہے..... بچاؤ۔ بچاؤ'' وہ یک لخت حلق پھاڑ کر چیخنے لگا۔
میرا بایاں ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور اس کی گردن جکڑ لی۔ جونہی میں نے گردن پر دباؤ بڑھایا اس کی آنکھیں باہر آنے لگیں اور پھر اس کی زبان بھی حلق سے باہر آ گئی۔ میرا خنجر سانپ کی سی تیزی سے حرکت میں آیا اور کی غلیظ زبان کا اگلا حصہ کٹ کر شوکت کے پاس جا گرا اور وہ بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ رتا سائیں کے حلق سے غرغر کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے اس کا گلا دبائے ہوئے ایک بار پھر اپنے خنجر کو حرکت دی۔ اس بار نشانے کی زد میں آنے والی چیز رتا سائیں کی ناک تھی۔ میں اگلے چند لمحوں میں اپنے یار سرور علی آنکھوں کا قرض بھی چکا تھا۔ رتا سائیں چیخنے کی کوشش کرتے کرتے بے ہوش ہو گیا۔ اس کے چہرے سے بہنے والا خون اب بستر کو بھگو رہا تھا لیکن میرا جنون ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ اس کے بعد میرے خنجر نے وہ ہنر دکھایا کہ خود میں حیران رہ گیا۔ میرے خنجر نے رتا سائیں کو اس قابل نہ چھوڑا کہ وہ مہراں جیسی کسی لڑکی کی بے حرمتی کا خیال بھی دل میں لائے۔ وہ اب کسی قابل نہ رہا تھا۔ اس امر پر اس کی ایک دل دوز چیخ نے آسمان سر پر اٹھا لیا اور پھر وہ گہری خاموشی کے دریا میں ڈوب گیا۔
اس کے بعد میں بقیہ تینوں شیطانوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ویسے تو وہ کسی طرح بھی رتا سائیں سے

کم درجے کے شیطان نہیں تھے لیکن میری نظر میں ان کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ انہوں نے ایک شرم وحیا کی پتلی کو، فرشتوں جیسی پاکیزہ اور معصوم و شریف زادی کو اپنی غلیظ آنکھوں سے میلا کرنے کی کوشش کی۔ نہیں یہ لوگ بھی میرے انصاف کے پوری طرح مستحق تھے۔ میرے خنجر نے چند بار مزید حرکت کی۔ چند لمحوں بعد یہ تینوں افراد اپنی ناک اور ایک ایک آنکھ سے محروم ہو چکے تھے۔
میں نے رتا سائیں کے تینوں کارندوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا البتہ میرے خنجر نے لینڈ کروزر کی وائرنگ کے پرخچے اڑا دیے۔ اب وہ لوگ زندہ رہیں یا مر جائیں، مجھے اس سے کوئی خوف نہیں تھا۔
میں نے اپنے نگران کی پانی کی چھاگل اٹھائی اور تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گیا۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ صبح ہوتے ہی اتنا زبردست دھماکہ ہونے والا تھا کہ جو سارے ملک کی سرکاری مشینری کو ہلا کر رکھ دیتا۔ ملک کے سب سے بڑے صوبے کے ایک ''معزز'' رکن اسمبلی کے بیٹے اور ''سیاحت'' کے لیے آنے والے مہمانوں کے ساتھ ہونے والا یہ بھیانک ظلم یقیناً پورے ملک کے اخبارات کی شہ سرخی بننے والا تھا اور اس جنونی مجرم کے لیے پورے ملک کی پولیس کی شامت آنے والی تھی۔
میں نے جو کچھ کیا ہے اس پر مجھے کوئی شرمندگی نہیں تھی۔ میرے دل و دماغ نے میرے اس خیال کی تائید کی۔ مجھے اپنے کیے پر کوئی ندامت نہ تھی۔
میں فاصلوں اور سمتوں کی پہچان کھو بیٹھا تھا۔ کتنے گھنٹوں تک چلنے کے باوجود مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں وہیں کھڑا ہوں جہاں سے چلا تھا۔ وہی فلک شگاف بنجر سیاہ پہاڑ، وہی تپتی زمین اور بدن میں چھید کر دینے والی لو کے جھونکے۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد میرا حلق سوکھ جاتا اور میں چھاگل سے منہ لگا لیتا۔ میرا دماغ سن ہو چکا تھا، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج ہو چکی تھی۔ رات کو جدا ہونے والا بخار ایک بار پھر جسم میں آن بسا۔ ہر قدم پر گمان ہوتا کہ جیسے میں ابھی زمین بوس ہو جاؤں گا لیکن کوئی نامعلوم قوت مجھے کشاں کشاں کسی طرف لیے جا رہی تھی۔ یہ زمین کا نہ جانے کون سا کونا تھا جہاں کسی انسان کا نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ سہ پہر کے قریب میرا توانائی کا آخری قطرہ بھی بھاپ بن کر اڑ گیا اور میں منہ کے بل ریتلی زمین پر گر پڑا۔ میری چھاگل سے بہنے والا پانی میرا منہ دھو رہا تھا لیکن مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اپنے ہونٹ کھول کر ایک آدھ گھونٹ اپنے حلق میں اتار لیتا۔

☆ .... O .... ☆

جانے کتنے عرصے بعد میرے دماغ نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا، میں آدھ کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ میں جست کے ایک کٹورے میں سے کوئی سیال چیز غٹا غٹ پی رہا ہوں پھر میرے دماغ پر تھکن سی طاری ہو گئی اور میں پھر ہوش کھو بیٹھا۔ جب دوبارہ آنکھ کھولی تو مجھے اپنے چہرے پر نمی کا احساس ہوا جیسے کوئی جانور میرا منہ چاٹ رہا ہو۔ میں نے گردن ہلا کر اس جانور کو ہٹانا چاہا لیکن وہ بدستور اپنے شغل میں مصروف رہا پھر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میری نظر ایک بوڑھے شخص پر پڑی۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی تھی اور سر پر سفید پٹے جن میں کہیں کہیں سیاہ بال بھی تھے۔ اس کا لباس بہت

میلا اور پھٹا پرانا تھا۔ وہ اپنے حلیے سے کوئی فقیر لگ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک گیلے کپڑے سے میرا منہ پونچھ رہا ہے۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اس نے فارسی میں کچھ کہا لیکن میرے دماغ پر ایک بار پھر تھکن طاری ہوگئی، میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

جب مجھے پوری طرح ہوش آیا، میں ایک پہاڑی غار کے ہموار فرش پر ایک رلی پر لیٹا ہوا تھا۔ سامنے کونے میں ایک میلا کچیلا تھیلا اور کچھ جست کے برتن رکھے تھے۔ اس وقت میں وہاں بالکل تنہا تھا۔ مجھے اس بوڑھے کا چہرہ یاد تھا۔ میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ مجھے بے حد کمزوری کا احساس ہو رہا تھا۔ اسی وقت وہ بوڑھا غار میں داخل ہوا، اس کے ہاتھ میں ایک ڈول تھا۔ اس نے اس ڈول سے بکری کا دودھ نکال کر ایک کٹورے میں ڈالا اور مجھے سہارا دے کر بٹھانے کے بعد وہ دودھ میرے منہ سے لگا دیا۔ جب میں نے دودھ ختم کرلیا تو اس نے فارسی میں میرا حال پوچھا۔

''مجھے فارسی نہیں آتی'' میں نے سرائیکی میں جواب دیا۔

''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تمہیں ہوش آگیا'' اب کی بار وہ بھی سرائیکی زبان میں بات کر رہا تھا۔ ''تم پورے آٹھ دن سے بے ہوش پڑے تھے''

''مجھے کیا ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہیں شدید ترین لو لگ گئی تھی۔ جن دنوں لو چل رہی ہو، سفر پر نکلنے سے پہلے مسافر کو پیاز کی ایک گنٹھی ضرور ساتھ رکھنی چاہئے تاکہ وہ لو سے محفوظ رہ سکے۔''

''مجھے معلوم ہے بابا۔ تم مجھے یہاں تک کیسے لائے؟''

''یہ تو بس تم پوچھو مت..... اب تک میری بوڑھی ہڈیاں درد کر رہی ہیں۔''

''میرے پاس میرا خنجر اور.....''

''سب محفوظ ہے بچہ..... خنجر، پستول اور دیگر سامان، تمہاری پستول بہت خوب صورت ہے اور یقیناً قیمتی بھی ہوگا۔''

''ہاں وہ ولایت کا بنا ہوا ہے۔''

''اور خنجر..... وہ بھی بہت خوب صورت ہے۔''

''خنجر میں نے خود بنایا ہے۔''

''اوہ تو تم لوہار ہو تب ہی تمہارا جسم اس قدر مضبوط ہے لیکن لوہار تو زیادہ تر سانولے اور کالے ہوتے ہیں، تمہارا رنگ تو گورا ہے۔ کیا تم خاندانی لوہار ہو؟''

''ہاں'' میں نے مختصر سا جواب دے کر اسے ٹالنا چاہا لیکن بوڑھا بڑا کائیاں تھا۔

''حیرت کی بات ہے، لگتا تو نہیں۔''

''اچھا بابا چھوڑو اس قصے کو۔ یہ بتاؤ کوئی پوچھتا ہوا تو نہیں آیا مجھے؟''

''کوئی پوچھنے آتا تو تم یہاں کیوں پڑے ہوتے؟'' بوڑھے نے جواب دیا۔

''تم کیا کام کرتے ہو؟ کیا تم اسی غار میں رہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''سخی داتا کا فقیر ہوں بیٹا، ان کے ہی سائے میں رہتا ہوں۔''

''حضرت سخی سرور سلطانؒ کا؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''ہاں بیٹا، اسی لکھ داتا کا غلام ہوں۔''

''یہاں سے کتنا فاصلہ ہے دربار کا؟'' میں نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

''ہوگا یہی کوئی دو تین کلومیٹر!''

فقیر بابا کا جواب سن کر میرا سر بری طرح چکرا گیا۔ میں کتنی بھیانک غلط فہمی کا شکار تھا۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ میں بلوچستان کے آزاد علاقے کے آس پاس پہنچ چکا ہوں لیکن میں تو ابھی ڈیرہ غازی خان کے مضافات میں ہی گھوم رہا تھا۔ شاید دوران سفر کسی مرحلے پر میں غلط راستے پر چلتا ہوا واپسی کے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ جس کا مجھے علم نہیں ہو سکا۔ اس کا صاف صاف مطلب یہ تھا کہ میں شدید ترین خطرے میں ہوں۔ یہ علاقہ تو تقریباً شہر ہی کا حصہ تھا، جہاں سردار کے کارندوں کا کثرت سے آنا جانا لگا رہتا ہوگا۔ اس دن کے بعد کیا واقعات رونما ہوئے، اس کا مجھے قطعی کوئی علم نہیں تھا پورے دس دن سے میں پوری دنیا سے کٹا ہوا تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ سردار شاہ مراد کے کارندے ابھی تک مجھے ڈھونڈ نہیں پائے تھے۔ حالانکہ بو سونگھنے والے کتوں کی مدد سے مجھے تلاش کرنا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

اس کے بعد فقیر بابا نے مجھے جست کے بڑے کٹورے میں وہ بدرنگ سیال پیش کیا۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہاری خوراک اور دوا'' بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ ہے کیا؟'' میں نے بدستور حیرت سے پوچھا۔

''یہ جو کا ستو ہے''

''لیکن اس کی رنگت اور بو....'' میں نے شدید حیرت کے عالم میں پوچھا۔

''اس میں فلک سیر بوٹی اور کچری بھی ملی ہوئی ہے۔''

''یہ فلک سیر کیا چیز ہے؟''

''وہی ملنگوں کی جان..... ساوی بوٹی'' فقیر بابا نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''اسی لیے اس میں سے بو آرہی ہے۔' میں نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔

''توبہ توبہ اب تم اسے برا کہہ رہے ہو، پچھلے آٹھ دن سے غٹا غٹ چڑھا رہے تھے جب کچھ نہیں'' فقیر بابا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تو تم مجھے آٹھ دن تک بھنگ پلاتے رہے ہو؟'' میں نے قدرے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔

''ہاں میرے پاس یہی کچھ تھا۔ جو کا ستو، گرمی کا دشمن ہے۔ فلک کی تاثیر بھی بے حد سرد ہے، دونوں کے ملنے سے اثر دوگنا ہو جاتا ہے اور کچری تو ہے ہی جادو اثر پھل۔ ان تینوں نے مل کر تمہارے جسم کی گرمی خارج کر دی اور اب تم تقریباً ٹھیک ٹھاک ہو۔''

"وہ ٹھیک ہے لیکن اب میں یہ نہیں پی سکتا۔ تم مجھے سادہ ستو دے دو۔"

"اچھا جیسے تمہاری مرضی" فقیر بابا نے بھنگ جیسی نعمت عظیم کی ناقدری سے آزردہ ہو کر کہا اور ایک ہی سانس میں پورا کٹورا چڑھا گیا۔

"ارے بابا، اس کی بو تو اتنی ناگوار ہے کہ اس کو پینے والے کے کتا بھی نہیں کاٹتا" میں نے روانی میں کہا اور پھر میرے ذہن ایک جھماکا سا ہوا۔ شاید کتوں کی سونگھنے کی قوت بھنگ کو برداشت نہیں کر پاتی ہوگی۔ فقیر بابا نے مجھے مسلسل آٹھ روز سے بھنگ پر لگا رکھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ بو........ سونگھنے والے کتے میری بو سونگھتے ہوئے آس پاس سے گزرے بھی ہوں لیکن بھنگ کی بو کی وجہ سے انہوں نے میری طرف پھٹکنا بھی گوارہ نہیں کیا ہوگا۔ نتیجتاً سردار کے کارندے مجھے تلاش کرنے میں ناکام رہے۔

میں نے اپنے اندازے کی تصدیق کے لئے فقیر بابا سے پوچھا۔

"مجھے یوں لگتا ہے بابا، جیسے میں نے اپنی طویل بیماری کے دوران کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آوازیں سنی تھیں۔"

"کتوں کی ٹولیاں تو پچھلے دنوں یہاں سے کئی بار گزری ہیں۔ وہ لوگ شاید پہاڑی لومڑی کا شکار کرنے آئے ہوں گے۔ تم نے انہی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنی ہوں گی۔"

"تم دربار پر کب جاتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تو مجھے دربار گئے ہوئے پورے آٹھ دن ہو گئے تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر میں کہیں نہیں جانا چاہتا تھا۔"

"پھر تو تمہارا کافی نقصان ہو گیا ہوگا بابا" میں نے تھوڑا سا شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں بیٹا، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے تمہیں پہلے بتایا کہ سخی داتا کا فقیر ہوں۔ یہ بات میں محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً کہہ رہا ہوں۔ میں سخی بابا کے دربار میں ہی چین پاتا ہوں۔ مجھے پیسے کی کوئی حرص نہیں ہے۔ میں تمام زندگی سکون کی تلاش میں در در بھٹکتا پھرا ہوں، بالآخر مجھے اس در پر دل کا سکون میسر آ گیا اور میں یہیں پڑ رہا۔ ارے..... میں بھی کتنا فضول گو ہوں، تم سے اتنی ڈھیر ساری باتیں کر لیں لیکن تم سے تمہارا نام نہیں پوچھا..... اگر مناسب سمجھو تو...... مجھے اپنا نام بتا دو اور...... یہ بھی کہ تم کہاں سے آئے ہو؟"

"میرا نام س..... سعید احمد ہے بابا..... سعید احمد خان اور میں روجہان سے تعلق رکھتا ہوں۔" فقیر بابا واقعی جہاں دیدہ اور سرد گرم چشیدہ شخص تھا۔ اس نے میری جسمانی حالت دیکھ کر خود بھی کچھ اندازے لگائے ہوں گے۔ خاص طور پر میرے جسم پر ہنٹر کے مندمل زخم تو صاف بتاتے ہوں گے کہ میں غیر معمولی حالات کا شکار رہا ہوں اور پھر میرے پاس موجود خنجر اور بدیسی پستول۔ یہ سب چیزیں مل کر میرے متعلق ایک نامعلوم کہانی کا پتا دے رہی ہوں گی۔ اسے شاید پہلے ہی اندازہ تھا کہ میں شاید اسے اپنا اصل نام اور جائے مقام نہیں بتاؤں گا۔ چنانچہ اس نے مصلحتاً اس معاملے پر زیادہ زور نہیں دیا۔

میں اپنے جھوٹ پر قدرے شرمندہ تھا۔ لہٰذا میں نے جھینپ مٹانے کی خاطر جوابی سوال کیا۔

"آپ کا کیا نام ہے بابا اور آپ کب سے یہاں رہ رہے ہیں؟"

"میرا نام سعدی خان ہے بیٹا اور....."

"کیا کیا سعدی خان......" اتنا کہہ کر میں بے اختیار ہنس پڑا۔ میرے ہنسنے پر وہ خلاف توقع برافروختہ نہیں ہوا بلکہ خود بھی زیر لب مسکرانے لگا۔ "تمہارا ہنسنا بجا ہے بیٹا۔ واقعی میرے نام کے ساتھ ہی داستان امیر حمزہ کے مشہور و معروف فیل تن و شہہ زور پہلوان سعدی کرب غازی کا تصور ذہن میں آتا ہے اور میرے سوکھے سڑے جسم کے ساتھ یہ نام واقعی مضحکہ خیز لگتا ہے۔"

میں ایک بار پھر فقیر بابا کی ذہانت اور زندہ دلی اور وسیع القلبی سے متاثر ہو گیا۔ یہ شخص اپنے مد مقابل کے خیالات پڑھنے کی صلاحیت رکھتا تھا لیکن یہ اس بات کو ظاہر نہیں کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ مد مقابل خود اپنے متعلق زیادہ سے زیادہ بتائے۔ اس کا یہ دعویٰ بھی صحیح ہی معلوم ہوتا تھا کہ اسے دولت کی ہوس نہیں ہے کیونکہ اس طرح کا ذہین شخص اگر محنت کرتا تو بہت سی دولت اکٹھی کر سکتا تھا۔ تاہم ہر انسان کی شخصیت کے بے شمار خفیہ پہلو ہوتے ہیں جن سے خود اس کے علاوہ کوئی اور واقف نہیں ہوتا۔ جانے اسے کس بات نے فقیری اپنانے پر مجبور کیا تھا کیونکہ اگر یہ چاہتا تو دنیاداری اس کے لئے زیادہ دشوار ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔

اب میں موجودہ صورت حال پر غور کر رہا تھا۔ اتنے دن کی کڑی جدوجہد کے باوجود میں ابھی تک وہیں موجود تھا جہاں پہلے دن تھا۔ جو کچھ میں کر گزرا تھا وہ اتنا تباہ کن اور ناقابل تلافی تھا کہ میرے دشمن ساری زندگی چین سے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ وہ مسلسل بھوکے کتے کی طرح میرے وجود کو پھاڑ کھانے کی دھن میں پھر رہے ہوں گے۔ قسمت کی ستم ظریفی یہ تھی کہ میں ابھی تک جائے واردات کے آس پاس ہی موجود تھا اور بو سونگھنے والے کتوں کی ٹولیاں بار بار اصرار کرتی ہوں گی کہ میں یہیں کہیں موجود ہوں لیکن وہ مجھے ڈھونڈنے سے قاصر تھے۔ میں ایک ایسے شکنجے میں آن پھنسا تھا جہاں سے بچ نکلنا مشکل نظر آتا تھا۔ بظاہر تو مجھے فوری طور پر یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی لیکن میں ان حالات میں کیسے فرار ہو سکتا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ میں کب تک اس غار میں چھپا رہ سکتا تھا۔ جو انسانی راہ گزر کے آس پاس واقع تھا۔

میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا جس نے مجھے بری طرح چونکا کر رکھ دیا۔ "یہ شخص سعدی خان میری اصلیت سے بخوبی واقف ہو چکا ہے لیکن یہ مجھ پر اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا۔ اس خیال کے آتے ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس نے کتوں کے ہمراہ گھومنے والی کئی انسانی ٹولیوں کا ذکر کیا ہے۔ اس جیسے پختہ کار شخص سے یہ امر بعید تھا کہ اس نے صورت حال دریافت کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ یہ صرف اندازوں پر تکیہ کر کے بیٹھ رہنے والا شخص نہیں ہے، چنانچہ اسے یقیناً پورے حالات کا علم ہو چکا ہے اور یہ دو جمع دو چار کے اصول کی طرح تمام نتائج اخذ کر چکا ہے۔ اب میری شخصیت اس کے نزدیک ایک کھلی کتاب کی طرح تھی۔ یہ سب کچھ سوچ کر خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو

گئے لیکن پچھلے آٹھ دنوں تک میں مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر رہا ہوں اس نے میری اصلیت سے وقف ہونے کے باوجود مجھے میرے دشمنوں کے حوالے نہیں کیا۔ اس کے بجائے اس نے میری حفاظت کی، میری مدد کی۔" یہ سوچ کر میرے اعصاب قدرے پرسکون ہو گئے۔

یہ شخص پہلے ہی خود کو میرا خیر خواہ ثابت کر چکا تھا۔ اب اس کی نیت پر شک کرنا کم عقلی اور کم ظرفی کے مترادف تھا۔ اگر مجھے یہاں سے فرار ہونا تھا تو اسے اعتماد میں لینا ناگزیر تھا۔ اس کی مدد کے بغیر میں ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ جانے کیوں مجھے پختہ یقین ہو چلا تھا کہ یہ شخص میری بھرپور مدد کرے گا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا میں اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دوں گا۔

"مجھے یہ بتاتے ہوئے شرم آ رہی ہے بابا کہ میں نے ابھی ابھی اپنے متعلق جو کچھ بھی بتایا وہ سراسر جھوٹ ہے۔" میری بات سن کر فقیر بابا کے چہرے پر ایک نرم اور مشفقانہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

اس نے بڑی وسعت قلبی سے میری معذرت قبول کر لی۔ میں نے اسے پوری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ میرے اندازوں کے عین مطابق وہ واقعی میرے متعلق بہت کچھ بلکہ تقریباً سب کچھ جانتا تھا۔ اسے دوسرے دن ہی پوری واردات کا علم ہو چکا تھا۔

"میرے ذاتی خیال میں تم نے جو کچھ کیا بالکل صحیح کیا۔ گندم از گندم بروید جواز جو، رتا سائیں نے جیسا کیا ویسا اسے بھرنا پڑا۔ مجھے ویسے بھی شیطانوں سے کوئی ہمدردی نہیں، میں تمہیں ان شیطانوں کے حوالے کیوں کرتا؟"

تم بہت عظیم آدمی ہو بابا۔ تم نے جو احسان مجھ پر کیا وہ میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا" میں نے گہری ممنونیت کے احساس کے ساتھ کہا۔

"ان فضول باتوں کے بجائے بہتر ہوگا کہ تم اپنا مستقبل کا لائحہ عمل طے کر لو۔ اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔ ابھی تک یہ معاملہ ٹھنڈا نہیں پڑا ہے ان لوگوں کو ابھی تک شک ہے کہ تم یہیں کہیں چھپے ہوئے ہو اگرچہ ان کی توجہ اب اس علاقے پر سے قدرے کم ہو چکی ہے تاہم تمہاری فی الحال ظاہر ہونا تمہاری یقینی موت بن سکتا ہے۔ میں نے ان لوگوں کو جو تمہیں تلاش کرنے آئے تھے، ایک غلط راستے کی جانب گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی اور میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ انہیں یقین سا ہو چلا ہے کہ تم اسی سمت میں فرار ہوئے ہو۔ جہاں تم اتنے دن یہاں رکے رہے ہو وہاں کچھ دن اور رک جاؤ۔ میرا یہ وعدہ ہے کہ جونہی حالات بہتر ہوئے میں فوری طور پر تمہیں یہاں سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔ آج میں سخی سائیں کے دربار، جا رہا ہوں۔ وہاں جا کر قصبے سے تازہ ترین حالات معلوم کر کے آؤں گا۔ تم یہیں رکنا اور بلاضرورت باہر نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔ میری ساوی بھی ختم ہونے والی ہے میں قصبے سے ساوی اور ستو بھی لے آؤں گا۔"

"آپ ایسا کریں بابا، کہ بس میں بیٹھ کر شہر چلے جائیں اور ضرورت کے سامان کے علاوہ پچھلے آٹھ نو دنوں کے اخبارات بھی لے آئیں۔ میں حالات کا صحیح اندازہ لگانا چاہتا ہوں۔ آپ شہر میں جا کر

اس واقعے کے متعلق سن گن لینے کی کوشش کریں۔"

"تمہاری یہی خواہش ہے تو میں سخی سائیں کے دربار پر حاضری دینے کے بعد شہر چلا جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے مجھے واپسی میں دیر ہو جائے تم پریشان نہ ہونا۔"

فقیر بابا چلا گیا اور کئی دنوں کے بعد میں ایک بار پھر تنہا رہ گیا۔ اب میں خود کو کافی چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ فقیر بابا کی فقیری نسخے نے واقعی جادو سا کر دکھایا تھا۔

اس دن خلاف معمول موسم قدرے بہتر تھا اور ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا بھی چل رہی تھی۔ مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور میں لیٹ کر سو گیا۔ میری آنکھ کھلی تو غار میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور فقیر بابا ساز و سامان سے لدا ہوا میرے سرہانے کھڑا تھا۔ وہ شہر سے ابھی ابھی آیا تھا "آج تو یوں لگتا ہے کہ جیسے سارا دن تم سوتے ہی رہے ہو؟"

"ہاں بابا۔ اب تم یہ بتاؤ کہ تم اخبار لے آئے؟"

"ہاں ہاں بھئی لایا ہوں لیکن آؤ پہلے کھانا کھا لیں۔ میں شہر سے پلاؤ چھولے لایا ہوں۔"

فقیر بابا نے لالٹین روشن کر دی اور ہم دونوں بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ مجھے کئی دنوں کے بعد صحیح معنوں میں کھانا نصیب ہوا۔ اس سے پہلے میں نے رتا سائیں کی نجی والی جیل میں باقاعدہ کھانا کھایا تھا۔ پلاؤ چھولے بے حد لذیذ پکے ہوئے تھے یا پھر یہ میری بھوک کا ردعمل تھا۔ کھانے کے دوران فقیر بابا مجھے شہر کے حالات کے بارے میں بتانے لگے۔

"اس واقعے نے پورے شہر کو لرزا کر رکھ دیا ہے۔ تمام شہری اس واقعے کے بارے میں اپنی اپنی رائے قائم کر رہے ہیں۔ رتا سائیں کو جب شہر کے ہسپتال میں لے جایا گیا تو پورے علاقے میں کہرام مچ گیا۔ کافی زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کی حالت بہت تشویش ناک تھی۔ اس واقعے کی اطلاع ملتے ہی شہر کے چوٹی کے حکام اسپتال پہنچ گئے۔ رتا سائیں کے تینوں ساتھیوں کے گھروں کو بھی اطلاع بھجوا دی گئی اور شام ڈھلے تک شہر کا اسپتال اونچے اونچے طرے والے جاگیرداروں اور ان کے خودکار اسلحہ سے لیس محافظوں سے بھر گیا۔ وہ تینوں بھی رتا سائیں کے مانند بااثر اور طاقتور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لہٰذا اب کم از کم چار خطرناک حد تک طاقتور گروہ تمہاری تلاش میں ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ متحرک شاہ مراد گروپ ہے، پولیس کی ریاستی قوت اپنی جگہ پر تمہاری تگ و دو میں لگی ہوئی ہے، تم نے جو دھماکہ کیا ہے، اس کے تباہ کن اثرات دور دور تک محسوس کیے گئے ہیں۔ وڈیروں اور جاگیرداروں کی فرعون صفت قوم نے تمہاری اس جرأت کو اپنی مطلق العنان حکومت کے خلاف چیلنج تصور کیا ہے اور وہ تمہاری گرفتاری اور پھر تمہیں عبرت کا نشان بنانے کے موضوع پر متفق ہو چکے ہیں۔"

"تم یہ بتاؤ کہ سردار شاہ مراد کو اطلاع بھجوائی گئی یا نہیں؟" میرے لہجے میں اضطراب کی لہر محسوس کر کے بابا کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"سردار شاہ مراد خان کو فون کے ذریعے اس حادثے کی اطلاع اسی دن بھجوا دی گئی تھی اور تین دن بعد وہ پاکستان پہنچ گیا۔ اس وقت تک دونوں ڈرائیور اور کارندوں نے پولیس کے سامنے کوئی باقاعدہ

بیان نہیں دیا تھا۔ انہوں نے شاہ مراد کے روبرو پیش ہو کر اسے تمام صورت حال سے آگاہ کیا اور اس کے بعد اس کی ہدایت کے مطابق پولیس کو اپنا بیان دیا۔ سردار نے ایف آئی آر میں، اپنے بیٹے پر قاتلانہ حملے کی ذمے داری اپنے ''سیاسی دشمنوں'' پر ڈالی ہے۔''

''وہ تو شدید غیض وغضب کا شکار ہوا ہوگا؟''

''اس بارے میں نہ ہی پوچھو تو بہتر ہے۔ اپنے بیٹے کی حالت دیکھ کر وہ شدید صدمے، خوف اور غصے کے طوفانی جذبات کا شکار ہو گیا۔ اس نے لاہور جا کر وزیر اعلیٰ سے ملاقات کی اور وزیر اعلیٰ نے علاقے کے ڈی آئی جی سے سختی سے باز پرس کی۔ اخبارات میں بڑی بڑی خبریں شائع کیں بلکہ چاروں جاگیرداروں نے مل کر حکومت پر زور دیا کہ وہ مجرموں کو جلد از جلد کیفر کردار تک پہنچائے۔ سردار نے اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر تمہارا نام اخباروں میں نہیں آنے دیا۔ اس نے پورے واقعے کو سیاسی رقابت کا نام دیا ہے۔ دراصل وہ بذات خود تمہیں مزہ چکھانا چاہتا ہے۔''

''یہ تو وہ باتیں ہیں جو کہ وہ دنیا کو دکھانے کے لیے کر رہا ہے آپ یہ بتائیں کہ اس نے میرے سلسلے میں کیا حکمت عملی ترتیب دی ہے۔''

''تم خود سمجھ دار ہو سمجھ سکتے ہو کہ اس نے کیا کچھ نہیں کیا ہوگا۔ بس یوں سمجھ لو کہ پورے علاقے کا چپا چپا چھان مارا گیا ہے۔ تمام چیک پوسٹوں پر پولیس کے ہمراہ سردار کے کارندے تعینات ہیں اور ان کی نظر سے کوئی چڑیا کا بچہ بھی بچ کر نہیں نکل سکتا۔ خاص طور پر اس علاقے کو تو انہوں نے پوری طرح گھیرے میں لے رکھا ہے۔ قصبے میں آنے اور جانے والے ہر شخص کو نگاہ میں رکھا جاتا ہے۔ بار بار تلاشی میں ناکامی کے باوجود انہیں ابھی تک شک ہے کہ تم اسی علاقے میں کہیں چھپے ہوئے ہو۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی میرا باہر نکلنا خطرے سے باہر نہیں ہے۔''

''اس وقت تمہارا باہر نکلنا سیدھے موت کے منہ میں اتر جانے کے مترادف ہے اور ہاں مجھے معلوم ہے کہ شاہ مراد نے اپنے کارندوں کو تمہیں زندہ گرفتار کرنے کا حکم دیا ہے۔''

کھانا کھانے کے بعد میں نے اخبارات کا مطالعہ شروع کیا۔ فقیر بابا اخباروں کا اچھا بھلا ڈھیر لے آیا تھا۔ اخبارات میں زیادہ تر وہی باتیں درج تھیں جو فقیر بابا مجھے زبانی بتا چکا تھا۔ اخبارات نے اس واردات کو کافی اہمیت دی تھی۔ زیادہ تر اخبارات نے اسے سیاسی رقابت کا شاخسانہ قرار دیا تھا تاہم کچھ اخبارات نے امکان ظاہر کیا تھا کہ یہ قبائلی دشمنی کا ذاتی انتقام کا بھی معاملہ ہو سکتا ہے۔ اخبارات کے مطابق رنا سائیں کی حالت ابھی تک تشویش ناک تھی اور اسے نشتر ہسپتال کے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں رکھا گیا تھا۔

مجھے حیرت اس بات پر ہوئی کہ اخبارات نے اس کے زخموں کی تفصیل میں سے ''اہم'' زخم کا ذکر ہی نہیں کیا تھا۔ شاید اس بات کو جان بوجھ کر اخبارات میں آنے سے روکا گیا تھا۔ ''بابا ان اخبارات نے میرے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے۔ انہوں نے میرے اصل کارنامے کو تو شائع ہی نہیں کیا۔''

''کیا مطلب بیٹا؟''

''مطلب یہ ہے بابا کہ میں نے سردار خاندان کی جڑوں کو کاٹ ڈالا ہے لیکن اس کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے۔''

''یہ سردار کے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوتا ہے کہ اخبارات اس کی نسل کے خاتمے کے متعلق سُرخیاں لگاتے لہٰذا اس نے واردات کے اس پہلو کو سختی سے پوشیدہ رکھا ہے۔ تم اس اخبار کے اس فیچر کو پڑھو اس میں کچھ قابل توجہ مواد موجود ہے۔''

اس اخبار کی اشاعت کا مقام لاہور تھا اور یہ فیچر کسی صحافی نے اسی واردات کے حوالے سے تحریر کیا تھا جس میں اس واردات کے دیگر پہلو زیر غور لانے کے بعد دبے لفظوں میں سردار شاہ مراد اور اس کے بیٹے رنا سائیں کی ذاتی زندگی کی بے راہ روی اور عیاشی کا ذکر کیا گیا تھا اور اس علاقے کی پسماندہ اور مظلوم عوام پر ہونے والے جور وستم پر بھی تفصیل سے اظہار خیال کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس سانحے کے بعد اس علاقے کی سیاسی زندگی سے شاید شاہ مراد خان کی وراثتی سیاست کا تسلسل ختم ہو جائے کیونکہ رنا سائیں کی جو حالت تھی اس میں اسے تمام زندگی دوسروں کے رحم وکرم پر گزارنی تھی چہ جائیکہ سیاسی قیادت۔

''کوئی بہت ہی واقف احوال اور جرأت مند قسم کا صحافی معلوم ہوتا ہے۔'' میں نے اس فیچر پر تبصرہ کیا۔

''تم نے شاید غور نہیں کیا کہ فیچر لکھنے والے کا نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرضی نام ہے۔''

دوسرے دن فقیر بابا صبح سویرے حضرت سخی سرور کے دربار کی طرف چلا گیا۔ اسے اب شام تک واپس پلٹنا تھا۔ میں کافی دیر تک اخبارات کو کھنگالتا رہا۔ دوپہر کے وقت مجھے شدید پیاس محسوس ہوئی۔ میں نے دیکھا تو غار کے مٹکے میں پانی ختم ہو چکا تھا۔ مجھے پانی کے حصول کا مقام معلوم تھا اور میں با آسانی پانی لا سکتا تھا لیکن مجھے اس کے لیے پہاڑی کے دامن میں واقع خشک برساتی نالے تک جانا پڑتا۔ یہ خشک برساتی نالا سخی داتا کی ایک جیتی جاگتی کرامت کا نمونہ تھا۔ آس پاس کا تمام علاقہ بے آب وگیاہ خشک، بنجر اور سنگلاخ پہاڑوں پر مشتمل تھا جہاں دور دور تک پانی نہیں ملتا تھا لیکن یہ پہاڑی نالہ چونکہ سخی سائیں کے دربار کے قدموں کو چومتا ہوا نکلتا تھا لہٰذا یہ ٹھنڈے میٹھے پانی کے خزانوں سے مالا مال تھا۔ اس خشک نالے کی ریتلی زمین کو جہاں سے بھی کچھ گہرائی تک کھودا جاتا ہے وہاں سے حیات افزا میٹھے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑتا تھا۔

میں نے کافی دیر تک پیاس کو برداشت کیا لیکن آخر میں نے فیصلہ کیا کہ میں نیچے اتر کر پانی بھر لاؤں۔ میں نے پانی کا مٹکا اٹھایا اور نزدیکی چشمے کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے جی بھر کے پانی پیا اور اس کے بعد پانی کا مٹکا بھرنے لگا۔ اچانک بہت دور سے آنے والی آواز سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں مٹکے کو وہیں چھوڑ کر اپنی پناہ گاہ کی طرف بھاگا۔

یہ کتوں کے بھونکنے کی آواز تھی جو تیزی سے قریب آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ یقینی طور پر بو سونگھنے والے کتے تھے۔ انہوں نے میری بو محسوس کر لی اور اب وہ مجھے دبوچنے کے لیے بڑھے چلے

آرہے تھے۔

فقیر بابا کا غار کافی اونچائی پر تھا اور تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ میں پوری قوت سے بھاگتا ہوا پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز کافی تیزی سے آگے بڑھتی چلی آرہی تھی۔ جب میں غار میں پہنچا تو کتے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر رہ گئے تھے۔

''بال بال بچے میاں سیفل'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے آپ سے کہا ''ورنہ آج تو تیرا کریا کرم ہو ہی گیا تھا۔ اور دعا دو فقیر بابا کی سادی بوٹی کو ورنہ تم اس غار میں رہ کر بھی اپنی جان نہ بچا پاتے۔''

میں نے محسوس کیا کہ کتے پہاڑ ہی کے دامن میں پہنچ چکے تھے۔ وہ کچھ دیر وہیں بھونکتے رہے اور پھر آگے بڑھتے چلے گئے۔ انہیں میری بو ملنا بند ہوگئی تھی اور اب وہ بے چینی کے عالم میں آگے بڑھ گئے۔

''فقیر بابا دن ڈھلے واپس آیا تو میں نے اسے پورا واقعہ سنایا۔ اس نے بھی خدا کا شکر ادا کیا اور مجھے حکم دیا کہ میں اب کسی حالت میں باہر نہ نکلوں کیونکہ سردار کے کارندے بے حد متحرک اور چوکس ہیں۔ فقیر بابا اپنے ساتھ کھانا بھی لایا تھا جو کہ ہم دونوں نے مل کر کھالیا۔

اگلے دن فقیر بابا پھر سخی سائیںؒ کے دربار پر گیا لیکن تقریباً دو گھنٹے کے بعد واپس لوٹ آیا۔ ''کیا ہوا بابا؟ آپ واپس کیوں لوٹ آئے؟''

''سخی سائیں کے دربار کے احاطے میں پہنچا'' فقیر بابا اپنے سانس درست کرتے ہوئے کہا ''تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہاں ایک کونے میں ایک مجذوب بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی جیسے ہی مجھ پر نظر پڑی اس نے آواز دے کر مجھے بلایا۔ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔''

''جی قلندر بابا؟'' میں نے کہا

''کب تک چھپائے رکھے گا بچہ اس لاڈلے کو؟'' قلندر نے کہا۔

یہ سن کر میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔

میں نے اس سے پوچھا ''تم کون سے لاڈلے کی بات کر رہے ہو قلندر بابا؟''

''اب انجان بنتا ہے۔ دس دن سے اسے چھپائے ہوئے ہے۔''

فقیر بابا وہ حیرت انگیز قصہ سنا رہا تھا اور میں دہشت زدہ سا بیٹھا، اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔ مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔

''پھر اس نے ایسی بات کی کہ میں خوف سے کانپ اٹھا'' فقیر سائیں نے کہا ''قلندر بابا نے میرے کان میں کہا ''سیفل داد خان سے کہنا کہ قلندر سائیں اس کا انتظار کر رہا ہے.....!!!!''

☆O☆

میری رگوں میں سنسنی کی سرد لہر دوڑ گئی۔ فقیر بابا کے لبوں سے نکلنے والے ان الفاظ نے مجھے سرتاپا ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میرے دماغ میں دھماکوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔

''وہ۔۔۔وہ کون ہے بابا؟'' میں نے بمشکل خود کو اس ہیجانی کیفیت سے آزاد کرانے کی کوشش کی لیکن شاید میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو پایا۔

''مم۔۔۔میرا مطلب ہے وہ قلندر بابا میرے نام سے کیسے واقف ہے؟ اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں آپ کی پناہ میں ہوں'' میں نے اپنے ذہن میں منڈلانے والے اندیشوں کے ہجوم کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کی۔

''میں خود بھی صدہا اندیشوں اور بے پایاں حیرت کی گرفت میں ہوں بیٹا'' فقیر بابا نے گھمبیر اور الجھے ہوئے لہجے میں کہا ''جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا'' میں نے آج سے پہلے اس مرد قلندر کو کبھی نہیں دیکھا لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ پہلے سے میرا منتظر تھا۔ اس کے لہجے سے یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ مجھے سالہا سال سے جانتا ہو لیکن اسے مجھ سے نہیں بلکہ تم سے دلچسپی ہے۔''

''لیکن اسے مجھ سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے فقیر بابا؟'' میری حیرت میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس نئی صورت حال نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ سوالات کا ایک ہجوم تھا جس نے میرے دماغ کی چار دیواری میں ڈیرہ جما رکھا تھا۔ میں ایک سوال کا جواب سمجھنے کی کوشش کرتا تو دوسرا چیخ چیخ کر میری توجہ کا طالب ہوتا۔ میرا بس چلتا تو میں فقیر بابا کے ذہن میں جھانک کر ان ہوش ربا سوالات کے جواب تلاش کر لیتا۔

''میں خود بھی اس وقت بے حد مضطرب ہوں سیفل بیٹے۔ اندیشوں کے جو زہریلے ناگ تمہارے دماغ کے در و دیوار پر کلبلا رہے ہیں' انہوں نے میرے دل و دماغ پر بھی حملہ کیا تھا۔ جو سوالات تم مجھ سے دریافت کر رہے ہو' وہی سوالات میں نے بھی قلندر سائیں سے دریافت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے مجھے بری طرح ڈانٹ دیا اور مجھے حکم دیا کہ میں فضول بکواس کرنے کے بجائے تم تک اس کا پیغام پہنچا دوں۔'' فقیر بابا نے تھوڑا سا دم لے کر اپنی بات جاری رکھی ''اس کی آواز میں کچھ ایسا رعب و دبدبہ اور کچھ ایسی سحر انگیزی تھی کہ میں کوشش کے باوجود اس کی بات جھٹلانے اور اس سے بحث کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ وہ منہ ہی منہ میں جانے کیا کیا بڑبڑا رہا تھا۔ میں نے بغور سننے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھے ٹھہرنے ہی نہیں دیا۔''

فقیر بابا کے طویل جواب نے میرے دماغ میں پھیلتے ہوئے وسوسوں کے جال کو مزید الجھا دیا اگر فقیر بابا جیسا جہاندیدہ شخص اس مجذوب سے متاثر ہوگیا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ صورت حال اس سے زیادہ گھمبیر تھی جتنی کہ بظاہر نظر آرہی تھی۔ میرے دماغ میں ایک مبہم سا خیال آیا اور میں نے اسے سوال کی شکل دے دی۔

''اس قلندر سائیں کا حلیہ کیسا تھا فقیر بابا؟''

''بہت ہی عجیب و غریب حلیہ تھا بیٹا'' فقیر بابا نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا ''وہ خود کو قلندر کہتا ہے لیکن اس کا حلیہ عام مجذوبوں سے مختلف ہے۔ اس کی عمر میرے اندازے کے مطابق کم از کم سو سال ہوگی۔ سفید روئی کے گالوں جیسے بال۔ چہرے پر اگرچہ جھریاں نمایاں تھیں لیکن گالوں پر

سرخی عیاں۔ سفید بھنویں' سفید پلکیں اور اس کی وہ آنکھیں۔۔۔ اف میرے خدا! گویا دماغ میں چھید کر ڈالیں گی۔"

"اور لباس۔۔۔ لباس کیسا تھا اس کا؟" میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں دریافت کیا۔ فقیر بابا کا بیان مجھے کسی الف لیلوی داستان کا سنسنی خیز حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں ان باتوں پر کس حد تک اعتبار کروں۔

"اس کا لباس بے حد سادہ تھا۔ اگرچہ وہ میلا کچیلا نہیں تھا تاہم اس کی بناوٹ قدیم بلوچی لباس جیسی تھی۔ اس قسم کا لباس آج کل شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے۔"

"پھر اب۔۔۔ اب کیا کریں بابا؟" میں نے اپنے ذہن میں دیر سے سنسناتے ہوئے سوال کو زبان دے دی۔

"میں اس سلسلے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر پا رہا ہوں بیٹا" فقیر بابا الجھے ہوئے لہجے میں بولا" میں نے ایک دنیا دیکھی ہے لیکن مجھے کبھی ایسی صورت حال پیش نہیں آئی۔ میں نے پوری کوشش کی کہ اس قلندر بابا کے انداز میں کوئی دکھاوا' کوئی بناوٹ' کوئی مکاری تلاش کر سکوں لیکن میں اپنی کوشش میں مکمل طور پر ناکام رہا۔ اس کی شخصیت میں دنیاداری کی کوئی جھلک موجود نہیں ہے' البتہ اس کے سراپے میں کوئی ایسی پراسرار قوت موجود ہے جسے نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔ وہ اگر یہ کہتا ہے کہ وہ ہمارے متعلق سب کچھ جانتا ہے تو پھر مجھے یقین ہے کہ وہ سچ ہی کہہ رہا ہے۔ یہ بات اگرچہ عقل و فہم سے ماورا ہے تاہم اسے تسلیم کیے بنا چارہ بھی نہیں ہے۔"

"تمہارا...... تمہارا مطلب ہے کہ مجھے اس کے پاس جانا ہی ہوگا؟" میں نے قدرے بوکھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ اس عجیب و غریب صورت حال نے میری عقل ماؤف کر دی تھی۔ میں گومگو کی کیفیت کا شکار تھا۔

"بظاہر تو یہ امر ناگزیر دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے دماغ میں چکراتے ہوئے تمام سوالات کا بوجھ وہی ہلکا کر سکتا ہے۔ اگر وہ ہمارے متعلق اتنا کچھ جانتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم یہاں بھی اس کی دسترس سے باہر نہیں ہیں۔ ویسے بھی اس کے رویے سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ ہمارا بدخواہ یا دشمن ہے۔ اگر وہ ہمیں کوئی نقصان پہنچانا چاہتا تو اسے زیادہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس ایک ہلکا سا اشارہ' تمہارے دشمنوں کو سیدھا ہماری کمین گاہ تک پہنچا سکتا تھا۔"

"لیکن کیا موجودہ صورت حال میں ہم دربار تک جانے کا خطرہ مول لے سکتے ہیں جبکہ بقول تمہارے' سردار شاہ مراد کے پروردہ مسلح کتے میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔"

"یہ خطرہ تو اپنی جگہ بہرحال موجود ہے بیٹا" فقیر بابا نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا" اس حقیقت سے تو فرار ناممکن ہے کہ موجودہ حالات میں قصبے کا رخ کرنا سیدھا موت کے منہ میں جانے کے برابر ہے لیکن اگر تم واقعی سنجیدگی سے قلندر بابا سے ملنا چاہتے ہو تو پھر کم از کم عارضی طور پر سردار شاہ مراد کے کارندوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا بندوبست ہو سکتا ہے۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکا بابا؟" میں نے الجھے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"دیکھو بیٹا ان لوگوں کا تمہاری تلاش کے سلسلے میں زیادہ تر انحصار بو سونگھنے والے کتوں پر ہے اور جیسا کہ ہمارے تجربے میں یہ بات آچکی ہے کہ بھنگ کی بو کی موجودگی میں کتے کی بو سونگھنے کی صلاحشت کم از کم وقتی طور پر متاثر ہو جاتی ہے۔ اب یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ یہ تاثیر اس علاقے کی مقامی بوٹی کی وجہ سے ہے یا ہر علاقے کی سادی بوٹی یہی اثر رکھتی ہے۔ بہرحال اگر تمہارے ساتھ کچھ مقدار سادی بوٹی کی ہو تو تم ان کتوں سے محفوظ رہو گے۔ رہی بات مسلح کارندوں کی تو اس سلسلے میں بھی کچھ نہ کچھ کیا جا سکتا ہے۔"

"وہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ میں ان کی نظروں سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہوں؟" میں نے اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھو بات یہ ہے سیفل بیٹا کہ ان لوگوں کو یہ شک تو ہے کہ تم اسی علاقے میں کہیں چھپے ہوئے ہو لیکن اتنے دن گزرنے کے باوجود تمہیں تلاش نہیں کر سکے' لہٰذا انہیں یہ احساس ہونے لگا ہوگا کہ شاید وہ غلطی پر ہیں اور تم اس علاقے سے فرار ہو چکے ہو۔ اس کے علاوہ ان کا یہ خیال بھی ہوگا کہ تم شاید اس سنگلاخ پہاڑی علاقے میں راستہ بھٹک کر جانے کہاں جا نکلے ہو گے اور اسی کسمپرسی کے عالم میں شاید تم بھوکے پیاسے کبھی کے موت کا شکار ہو چکے ہو" وہ سانس لینے کے لیے رکا۔ اسے شاید امید تھی کہ میں اس سے کوئی سوال کرنا چاہوں گا لیکن میں چپ چاپ اس کا منہ دیکھتا رہا۔ اس نے اب تک جو باتیں کی تھیں ان میں وزن تھا اور میں چاہتا تھا کہ وہ مزید وضاحت کرے" اس کے علاوہ ان کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ تم اس طرح کھلے عام قصبے کی طرف آسکتے ہو۔ یہ تو براہ راست شیر کے منہ میں سر دینے والی بات ہوگی پھر انہیں ایک مخصوص حلیے کے تنہا نوجوان کی تلاش ہوگی لیکن تم جب سخی سائیں کے دربار پر پہنچو گے تو تم تنہا نہیں ہو گے بلکہ میں تمہارے ساتھ ہوں گا اور میں تمہیں ایسے حلیے میں وہاں لے جاؤں گا کہ ان کا باپ بھی تمہیں پہچان نہیں سکے گا" فقیر بابا نے اپنی طول طویل بات ختم کر لی اور متوقع نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"تم نے جو کچھ کہا مجھے اس سے مکمل اتفاق ہے بابا" میں نے تفکر آمیز لہجے میں کہا" لیکن اس کے باوجود یہ ایک بے حد خطرناک کام ہے۔"

"میں نے تو صرف اپنی رائے کا اظہار کیا ہے بیٹا" فقیر بابا نے کہا" اصل فیصلہ تو تمہیں ہی کرنا ہے۔ تمہاری جو بھی مرضی ہو' میں تمہارے ساتھ ساتھ ہوں۔"

"ٹھیک ہے بابا" میں نے پرعزم اور فیصلہ کن لہجے میں کہا" ہم دونوں آج شام کو سخی سرور سائیں کے دربار پر چل رہے ہیں۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا اگر کسی بدبخت نے ہمیں روکنے ٹوکنے کی کوشش کی تو میں اپنے خنجر سے اس کی گردن اتار لوں گا۔"

"یہ ہوئی نا نوجوان مردوں والی بات" فقیر بابا نے خوش ہوتے ہوئے کہا" مجھے تمہاری یہی بے جگری تو پسند ہے۔ مرد کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ زندگی تو کبھی نہ کبھی ختم ہونی ہی ہے۔ تو یہ بہتر ہے کہ موت

کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جیا جائے۔"

شام ڈھلے میں اور فقیر بابا سخی سرور سائیں کے دربار کی طرف رواں دواں تھے۔ ہمارے پیروں کے تلے خشک برساتی نالے کا ریتلا فرش تھا۔ جواب سرد پڑنے لگا تھا۔ برساتی نالے کے دونوں طرف بلند و بالا پہاڑوں کی دیواریں تھیں۔ جن کی چوٹیوں پر ڈوبتے سورج کا سونا پگھل رہا تھا۔ ہر اٹھتے ہوئے قدم کے ساتھ میرے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھے سردار شاہ کے کارندوں کے خوف سے بھی زیادہ قلندر بابا سائیں کے متعلق تجسس تھا۔ فقیر بابا نے اس کے متعلق جو کچھ بتایا تھا وہ ایسا نہیں تھا جسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا۔ میرے دل میں تجسس کا دریا موجیں مارنے لگا۔

فقیر بابا نے واقعی میرا حلیہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت میرے جسم پر فقیروں والا مخصوص رنگ برنگے پیوند لگا چغہ تھا۔ یہ چغہ میرے جسم پر ڈھیلا ڈھالا تھا' چنانچہ فقیر بابا نے میرے جسم کے گرد ایک موٹی سی چادر لپیٹ دی تھی جس کی وجہ سے میرا جسم بھاری بھرکم نظر آتا تھا۔ میرے چہرے پر کسی نامعلوم ملغوبے کی بے حد باریک سی تہہ چڑھا دی گئی تھی۔ جس کے باعث میری گوری رنگت سیاہی مائل ہو گئی تھی۔ یہی عمل میرے ہاتھوں اور پیروں کے کھلے حصوں کے ساتھ دہرایا گیا تھا۔ میرے چہرے پر اگ آنے والی بے ترتیب داڑھی کو گرد آلود اور مزید بے ترتیب کر دیا گیا تھا۔ سر پر رنگ برنگے چیتھڑوں سے بنی ہوئی ٹوپی پہن کر میں صحیح معنوں میں ایک پیشہ ور بھکاری نظر آ رہا تھا۔ ایک ایسا بھکاری جسے بھیک کم اور ڈانٹ پھٹکار زیادہ ملتی ہے کہ وہ اتنا ہٹا کٹا ہو کر بھیک کیوں مانگتا ہے اور محنت مزدوری کر کے حلال کی روزی کیوں نہیں کماتا۔ فقیر بابا واقعی کاریگر قسم کی شخصیت تھا۔ اس کی شخصیت کے مختلف پہلو رفتہ رفتہ مجھ پر عیاں ہو رہے تھے۔

میرے چغے کی ایک جیب میں بھنگ کی ایک چھوٹی سی پوٹلی تھی جبکہ دوسری جیب میں رتا سائیں کی یادگار کولٹس پستول۔ میں نے اسے اچھی طرح چیک کر کے دیکھ لیا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک حالت میں تھا۔ اس کے میگزین میں موجود نو کی نو گولیاں خون برسانے کے لیے تیار تھیں۔ میں ایک لمحے کے عرصے میں آتش و آہن کی بارش کرنے کے لیے تیار تھا۔ میرا وفادار خنجر حسب معمول میری پنڈلی پر بندھی ہوئی چرمی میان میں پوشیدہ تھا اور میں کسی بھی لمحے اسے استعمال کر سکتا تھا۔ میرے جان نثار دوست سرور علی کی نشانی کھسے نسبتاً نئے نظر آ رہے تھے لہٰذا فقیر بابا نے ان پر بھی مٹی مل دی تھی۔

کافی دیر چلنے کے بعد ایک موڑ مڑ کر ہمیں سخی سرور سائیں کے عظیم الشان مزار کی عمارت نظر آنے لگی۔ خشک برساتی نالا عین مزار کے قدموں کو چھو کر گزرتا تھا۔ مزار کے نالے کی سمت والی دیوار تقریباً سو فٹ بلند تھی۔ اس دیوار کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ سپاٹ نہیں تھی بلکہ ایک اچھے خاصے بلند پندرہ بیس چھوٹے بڑے زینوں پر مشتمل تھی۔ نالے کی سطح سے بہت اوپر مزار کی اصل عمارت تھی جہاں موجود کنگروں والی دیوار سے برساتی نالے پر چلنے والا آدمی کھلونے جتنا دکھائی دیتا تھا۔

جوں جوں مزار قریب آتا جا رہا تھا' میرے اعصاب کھنچ رہے تھے۔ میری آنکھیں دور دور تک اپنے دشمنوں کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ فقیر بابا خود بھی اعصابی تناؤ کا شکار نظر آ رہا تھا شاید میری

طرح وہ بھی خود کو ہر طرح کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں مزار کی عمارت کے عین نیچے پہنچ گئے۔ نالے سے مزار تک پہنچنے کے دو راستے تھے۔ ایک راستہ پختہ تھا جو کہ مزار کے دائیں پہلو سے گزر کر سامنے والے دروازے سے ہوتا ہوا مزار میں پہنچتا تھا جبکہ دوسرا راستہ نیم پختہ تھا اور زیادہ عمودی بھی۔ یہ راستہ براہ راست مزار کے احاطے میں پہنچتا تھا۔ ہم دونوں نے اسی نیم پختہ راستے کا انتخاب کیا۔ سورج ڈوب چکا تھا اور مزار روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ مزار کے احاطے میں موجود مسجد سے شاید آخری نمازی بھی رخصت ہو چکا ہوگا۔ فقیر بابا مزار کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھے مجھے پرسکون رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔ ہم بغلی دروازے سے مزار میں داخل ہوئے۔ فقیر بابا نے اپنی اور میری جوتیاں اتار کر بغل میں دبا لیں۔

مزار کے احاطے میں داخل ہو کر میں نے بڑی احتیاط سے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیا۔ پورے ماحول پر سکوت سا طاری تھا۔ سخی سائیں کے دربار پر رات کے وقت ٹھہرنے والے زائرین' اپنے اپنے بستر جما کر دراز ہو چکے تھے۔ دو چار فقیر بھی ادھر ادھر دیوار سے ٹیک لگائے اونگھ رہے تھے۔ سامنے سیدھے ہاتھ پر حضرت سخی سرور سلطان کے مرقد کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اچانک فقیر بابا نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ ہمارے دائیں ہاتھ پر دو تین پختہ کمرے تھے جبکہ بائیں طرف ذرا سا ہٹ کر احاطے کا کچھ حصہ تھا۔ اس حصے میں مزار کے لنگر خانے کی دو عدد دیو قامت دیگیں تھیں۔ اس کے علاوہ دو تین متروک قسم کے ٹوٹے پھوٹے کمرے تھے۔ اس حصے میں تقریباً نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی' البتہ ایک کونے میں ایک چراغ روشن تھا۔ فقیر بابا مجھے اسی طرف لیے جا رہا تھا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو میں نے دیکھا کہ چراغ کے قریب دیوار کے سہارے ایک بے حد ضعیف العمر باریش شخص آنکھیں بند کیے بیٹھا ہے۔ اس کے سر پر سفید رنگ کا صافہ تھا اور جسم پر بلوچوں والی روائتی بغیر دامن کی گول گھیرے دار قمیص تھی۔ وہ ایک ٹاٹ نما چٹائی پر بیٹھا تھا۔ ہماری آمد کو محسوس کرتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں۔ چراغ کی روشنی میں اس کی بڑی بڑی آنکھیں چمک اٹھیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

"آ گئے ہو تم لوگ" اس نے کہا اور پھر فوراً ہی اس کے لبوں کی مسکراہٹ غائب ہو گئی "شرم نہیں آتی سخی سائیں' کے دربار میں یہ غلیظ شے لاتے ہوئے" اس نے ہمیں گھورا "ارے ڈرتے ہو۔ سخی سائیں کے دربار میں آ کر بھی ڈرتے ہو۔ پھینک کر آؤ اس بدبودار شے کو" اس کے لہجے میں حکم تھا۔

میں نے استفہامیہ انداز میں فقیر بابا سے نظریں دو چار کر لیں۔ یہ بے حد نازک مرحلہ تھا۔ قلندر سائیں کا حکم ماننے کا سیدھا سیدھا مطلب سردار شاہ مراد کے کارندوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا تھا۔ لیکن قلندر بابا کا حکم ٹالنا بھی تقریباً ناممکن ہی دکھائی دیتا تھا۔ فقیر بابا نے بے بسی کے عالم میں اپنے کاندھے اچکائے۔ میں نے اپنے چغے کی جیب سے بھنگ کی پوٹلی نکال کر اس کے حوالے کر دی۔

اپنا پستول میں نے چلانے کے لیے تیار کر کے اپنے دائیں ہاتھ والی جیب میں ڈال رکھا تھا۔ شکر

ہے کہ قلندر سائیں نے اسے باہر پھنکوانے کا حکم نہیں دیا۔

"میں باہر دروازے کے پاس کھڑا حالات کا جائزہ لے رہا ہوں" فقیر بابا نے میرے کان میں کہا "جونہی مجھے کوئی خطرہ محسوس ہوا میں تمہیں اطلاع کر دوں گا اور ہم دونوں یہاں سے نکل چلیں گے۔ یہ پوٹلی میں فی الحال اپنے پاس ہی رکھ رہا ہوں۔ تم جلد از جلد قلندر سائیں سے بات کرو" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور فقیر بابا جلدی سے مزار کے احاطے کے بڑے دروازے سے باہر نکل گیا۔

قلندر بابا نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے سامنے چٹائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ لوٹ آئی تھی۔ میں چپ چاپ اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کا منہ تکنے لگا۔ وہ کچھ دیر تک بغور میرے چہرے کا جائزہ لیتا رہا اور پھر اس کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی "واہ خوب رنگا ہے اس فقیر نے تجھے اپنے رنگ میں۔ میرا یار تمہیں اس حلیے میں دیکھتا تو مزا آتا" وہ اپنی دھن میں جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا۔ میں کچھ تو سمجھ رہا تھا اور کچھ میرے سر پر سے گزر رہی تھی۔

"آپ۔۔۔آپ کون ہیں بابا؟" میں نے بمشکل زبان کھولی "اور آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟"

میری بات سن کر قلندر بابا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "ہم کون ہیں؟ کیا کرے گا یہ جان کر بچہ؟۔۔۔ بس یہ جان لے کہ تیری وجہ سے ہمیں اپنا بسیرا چھوڑ کر آنا پڑا۔"

"میری وجہ سے! لیکن کیوں قلندر بابا؟ آپ نے میری وجہ سے اتنی تکلیف کیوں اٹھائی؟"

"مجبوری تھی بچہ۔ یاری بھی تو نبھانی تھی۔ امانت ہے ایک جو تجھ تک پہنچانی تھی۔"

"کیسی امانت قلندر سائیں؟" میں نے شدید حیرت کے عالم میں پوچھا "اور یہ امانت کس نے آپ کے سپرد کی تھی؟"

"جان جائے گا بچہ، بہت جلد جان جائے گا" قلندر بابا نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا "لے پہلے تو اپنی امانت سنبھال۔" قلندر بابا نے اپنی قمیص کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر واپس نکالا اور کوئی چیز میری طرف بڑھا دی۔ میں نے وہ چیز ہاتھ میں لے کر اس کا بغور جائزہ لیا۔ وہ سفید رنگ کا ایک معمولی سا سوتی رومال تھا' البتہ اس میں سے ایک ہلکی سی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔

میں قلندر سائیں سے مزید سوال پوچھنے ہی والا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں بہت سے کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں مزار کے بڑے دروازے کے باہر سے آ رہی تھیں۔ یہ کتے تعداد میں کئی تھے اور بری طرح بے چین ہو کر بھونک رہے تھے۔ خوف کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں اٹھ کر بھاگنے ہی والا تھا کہ اچانک فقیر بابا مزار کے احاطے میں داخل ہوا اور سیدھا ہمارے پاس آ گیا "چلو سیفل فوراً یہاں سے بھاگ چلو وہ لوگ تمہارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ وہ دربار میں پہنچنے ہی والے ہیں۔ قبل اس کے کہ وہ تم تک پہنچ جائیں تم فوراً یہاں سے فرار ہو جاؤ" وہ بے حد مضطرب لگ رہا تھا "ان لوگوں کے ساتھ وہ خونخوار شکاری کتے ہیں اور وہ خود تعداد میں چار ہیں اور پوری طرح مسلح ہیں۔"

فقیر بابا کی بات سنتے ہی میرے جسم میں خوف و دہشت کی سرد لہر دوڑ گئی۔ میں نے قلندر سائیں کا

دیا ہوا رومال مٹھی میں دبایا اور تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھا رہ سیف داد خان" قلندر سائیں نے بڑی گھن گرج سے کہا "تو بھی ڈرتا ہے؟ میرا یار تو کہتا تھا تو کسی سے نہیں ڈرتا۔ میرے یار کا لاڈلا ہو کر بھی اتنا ڈرتا ہے۔ بیٹھ جا ادھر' بیٹھ جا۔ میں دیکھتا ہوں کون تیرا کیا بگاڑتا ہے۔"

اس وقت مجھے اس کی الٹی سیدھی باتیں زہر لگ رہی تھیں۔ وہ جانے کہاں کہاں کی ہانکے جا رہا تھا اور ادھر موت میرے سر پر آن پہنچی تھی اگر میں مزید لمحوں کی دیر کر دیتا تو جانے میرا کیا حشر ہوتا۔ "چلو سیفل چلو" فقیر بابا نے بے حد اضطراب کے عالم میں کہا "وہ لوگ اندر داخل ہونے ہی والے ہونگے پھر تمہارے پاس کوئی راہ فرار باقی نہیں بچے گی۔"

"میں کہتا ہوں بیٹھ ادھر" قلندر سائیں نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک جھٹکا دے کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور پھر وہ فقیر بابا سے مخاطب ہوا "تو جا یہاں سے' یہ آ جائے گا تیرے پاس۔"

میں نے ایک جھٹکے سے کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن اپنی اس کوشش میں ناکام رہا۔ میری ٹانگوں کا تو جیسے ست ہی نکل گیا تھا۔ ایسی ناتوانی کا مجھے آج تک تجربہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے بے بسی کے عالم میں فقیر بابا کی طرف دیکھا۔ وہ شاید کچھ کچھ صورت حال کو سمجھ چکا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا "میں نیچے نالے میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تم قلندر سائیں سے اجازت لے کر فوراً نیچے پہنچو۔"

"ہاں ہاں تو جا' یہ آ جائے گا خود ہی" قلندر سائیں نے کہا۔

فقیر بابا تیز قدموں سے چلتا ہوا بغلی دروازے سے مزار کے باہر نکل گیا۔ اس نے باہر نکلتے ہوئے ایک بار پھر جھانک کر میری طرف دیکھا۔ فقیر بابا کے باہر نکلتے ہی مزار کے پرسکون ماحول میں ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ یہ دو مسلح افراد تھے۔ ان کے ہاتھوں میں طاقتور ٹارچیں تھیں اور شانوں پر رائفلیں۔ ان کی ٹارچیں روشن تھیں اور وہ ان کی روشنی باری باری تمام لوگوں کے چہرے پر ڈال رہے تھے۔ اس دوران مزار کے بڑے دروازے کے سامنے کتے مسلسل بھونک رہے تھے۔ میں نے اجازت طلب نظروں سے قلندر سائیں کو دیکھا لیکن وہ بڑی دلچسپی سے نو واردان کی حرکتوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بول بھی رہا تھا۔

اچانک ان میں سے ایک نے ہماری طرف ٹارچ کی روشنی ڈالی "ادھر سلطان خان۔ ادھر دیکھ یہ کونے میں کون لوگ بیٹھے ہیں" اس نے اپنے ساتھی سے کہا اور اپنے شانے سے سیون ایم ایم رائفل اتار کر ہماری طرف بڑھنے لگا۔ اس کے دوسرے ساتھی نے بھی اپنی رائفل چھتیالی تھی اور ہم دونوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اب میرے لیے کوئی راہ فرار نہیں بچی تھی۔ میں نے بے بسی کے عالم میں ایک نگاہ قلندر بابا کے مسکراتے ہوئے چہرے پر ڈالی اور مایوسی کے بوجھ سے میری گردن جھکتی چلی گئی اور میں نے اپنے گھٹنوں پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ قلندر بابا نے میرے ہاتھ میں سے سفید رومال نکالا اور اسے میرے سر پر ڈال دیا۔

میرے کانوں میں دونوں مسلح قاتلوں کے قدموں کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ میری طرف سے

پوری طرح مشکوک ہو چکے تھے اور اب وہ بڑے محتاط انداز میں اپنی رائفلیں تانے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ میری جیب میں بھرا ہوا پستول تھا لیکن اس کے استعمال کا وقت گزر چکا تھا۔ اب میں مکمل طور پر ان کے رحم و کرم پر تھا۔ میری اتنی طویل جدوجہد ایک بار پھر رائیگاں ہو گئی تھی۔ جانے اب میرے ساتھ کیا کچھ ہونے والا تھا۔

''ارے بدبختو' تمہیں ذرا بھی خیال نہیں کہ تم سخی سرور سائیں کے دربار میں اس طرح ہتھیار اٹھائے دندناتے پھر رہے ہو۔''

''ہم ابھی واپس چلے جائیں گے قلندر بابا'' سلطان خان نامی اس شخص نے تمسخرانہ لہجے میں کہا'' پہلے ہم ذرا اس شرمیلے خان کا چہرہ تو دیکھ لیں۔ کون ہے یہ؟''

''آنکھیں نہیں ہیں تم دونوں کی؟ دیکھتے نہیں ہو کہ سخی سرور سائیں کا فقیر ہے۔''

''آنکھیں تو ہیں بابا جی لیکن اس فقیر سے کہو کہ ذرا اپنا گھونگٹ اٹھائے تاکہ ہم بھی اپنی آنکھیں روشن کریں'' اس نے بدستور تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔

''تم لوگوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ تم چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ'' قلندر بابا نے کہا۔

''چلے جائیں گے' چلے جائیں گے۔ پہلے ذرا اس پردے دار کا دیدار تو کر لیں۔''

''اچھا تو تم یوں نہیں مانو گے'' قلندر بابا نے پرسکون لہجے میں کہا۔

''ہاں ہم نہیں مانیں گے'' سلطان خان نے خودسری کے لہجے میں کہا اور اس نے اپنی رائفل کی نال سے میرے سر پر سے رومال ہٹا دیا۔

اچانک میرے کانوں میں ان دونوں کی زوردار چیخیں گونجیں۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا تو دیکھا کہ وہ دونوں زمین پر پڑے ہوئے تڑپ تڑپ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں دبا رکھی تھیں۔ ان کی رائفلیں ان کے قریب ہی پڑی تھیں لیکن انہیں ان کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ چند ہی لمحے بعد وہ دونوں بے ہوش ہو گئے۔ ان دونوں کے ہاتھ بدستور ان کی آنکھوں پر جمے ہوئے تھے۔ اس دوران میں حیرت انگیز طور پر کوئی بھی ہماری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ میں سخت حیرانی کے عالم میں منہ پھاڑے' یہ سب تماشہ دیکھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہو گیا تھا۔ البتہ قلندر بابا بدستور مسکرا رہے تھے۔ میں نے سخت تعجب آمیز لہجے میں پوچھا ''یہ --- یہ کیا --- کیا ہوا بابا --- انہیں کیا ہو گیا ہے؟''

''انہیں کچھ نہیں ہوا۔ یہ آنکھیں روشن کرنا چاہتے تھے۔ ان کی آنکھیں روشن ہو گئیں اور وہ ہمیشہ کے لیے۔''

''لیکن کیسے...... لیکن کیسے قلندر بابا؟''

''تجھے اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس تیرے لیے کسی کا پیغام ہے' اسے غور سے سن اور اس پر عمل کرنا کہ میرا فرض پورا ہو جائے۔''

''میرے لیے پیغام ہے؟ لیکن کس کا پیغام قلندر بابا؟'' میں نے شدید حیرت کے عالم میں پوچھا۔

میری سمجھ میں قطعاً کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیا کچھ ہو چکا ہے' میں تو بس ایک تماشائی کی طرح سب کچھ دیکھے جا رہا تھا۔

''تجھے جلد ہی پتہ چل جائے گا کہ وہ کون ہے۔ ابھی تو صرف اسی کا پیغام سن۔ وہ کہتا ہے کہ تو ان سے نفرت کر جن سے نفرت کرنے کا حق ہے۔ اپنے وجود سے نفرت کرے گا تو جہنم میں جلے گا اور دوسری بات یہ کہ سخی سائیں کے میلے میں شریک ہونا نہ بھولنا چاہے جس طرح بھی ہو یہاں پہنچنے کی کوشش کرنا ورنہ ساری زندگی پچھتاتا رہے گا' جلتا رہے گا اور ہاں اس رومال کی حفاظت کرنا یہ کسی کا تحفہ ہے۔'' قلندر بابا نے مجھے کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔ مجھے یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ میں اب با آسانی کھڑا ہو سکتا ہوں'' جا اب تو جا۔'' مزار کے دروازے کے باہر کتے بدستور شور مچا رہے تھے لیکن مزار کے احاطے میں سوئے ہوئے تمام لوگ بڑی بے فکری کی نیند سو رہے تھے۔ میں تیز رفتاری سے چلتا ہوا مزار کے بغلی دروازے سے نکلا اور ڈھلوان راستے سے نیچے اترتا چلا گیا۔

فقیر بابا ایک چٹان کے پیچھے بڑی بے چینی سے میرا منتظر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بڑی تیزی سے میری طرف بڑھا ''خیریت تو ہے سیفل۔ کیا ہوا؟ اوپر کیا ہوا تھا؟''

''سب خیریت ہے فقیر بابا۔ فی الحال تو جلدی سے یہاں سے نکل چلو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ ہمارے پیچھے یہاں بھی پہنچ جائیں۔''

میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ کچھ فاصلے سے کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ فقیر بابا نے میرا ہاتھ پکڑ کر اور تیزی سے ایک طرف دوڑ پڑا۔ میں نے بھاگتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں کتے اور ان کے نگران مزار کے دوسرے پہلو کے پختہ راستے سے نالے میں اتر رہے تھے۔ ان دونوں افراد کے ایک ہاتھ میں کتوں کی زنجیریں تھیں۔ جبکہ دوسرے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔

ہم دونوں کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ جبکہ وہ دونوں ٹارچ کے محتاج تھے لہٰذا فوری طور پر ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ البتہ کتوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور وہ زنجیریں چھڑوانے کے لیے زور لگا رہے تھے۔ فقیر بابا میرا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے دوڑتا چلا گیا۔ ہمارا ان لوگوں سے اچھا خاصا فاصلہ تھا اور اس فاصلے میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ لوگ مسلسل ہمارے تعاقب میں آ رہے تھے۔

کافی دور بھاگنے کے بعد اچانک فقیر بابا ایک جگہ رک گیا اور اس نے اپنی جیب سے ایک پوٹلی نکال کر میرے حوالے کر دی۔ جونہی بھنگ کی پوٹلی میرے پاس پہنچی' دونوں کتے ہچکچا کر رک گئے اور ادھر ادھر منہ اٹھا کر بھونکنے لگے۔ وہ میری بو کی سمت کھو بیٹھے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اب فقیر بابا مجھے ساتھ لے کر جلد از جلد یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

وہ میری توقع کے خلاف قریب میں واقع ایک چھوٹی سی پہاڑی پر چڑھتا چلا گیا۔ میں بدستور اس کے ساتھ تھا۔ اس اثنا میں کتے مسلسل بری طرح بھونک رہے تھے اور ان کے ساتھی ٹارچ جلائے پریشانی کے عالم میں ان کے ساتھ تھے پھر وہ لوگ آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھنے لگے۔ وہ دراصل کسی خاص سمت میں آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ فقیر بابا کیا چاہتا ہے۔ میں بس

خاموشی سے اس کی ہدایت پر عمل کر رہا تھا۔

"اپنا پستول مجھے دے دو" فقیر بابا نے کہا اور میں نے چپ چاپ اپنا پستول نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ اس دوران میں دونوں مسلح افراد معہ کتوں کے، ہمارے کافی قریب آ چکے تھے۔ فقیر بابا نے پستول کا رخ ان دونوں کی سمت کر دیا۔ میرا خیال تھا فقیر بابا دونوں کتوں کو نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ میں اسے اس حماقت سے روکنے ہی والا تھا کہ اس نے فائر کر دیا۔ خاموش فضا میں ایک زوردار دھماکے کی آواز گونجی، اس کے ساتھ ہی ہمیں ایک فلک شگاف انسانی چیخ سنائی دی اور دونوں مسلح افراد میں سے ایک زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس کے قریب ہی اس کی ٹارچ پڑی ہوئی تھی جس کی روشنی میں اس کے سینے سے ابلتا ہوا خون کا فوارہ صاف نظر آ رہا تھا۔ میں بھونچکا سا ہو کر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

اس اچانک افتاد نے دوسرے رائفل بردار کو بھی بری طرح حواس باختہ کر دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے دم توڑتے ہوئے ساتھی کو گھورنے لگا پھر اچانک اسے ہوش آ گیا اور اس نے کتے کی زنجیر چھوڑ کر اپنی رائفل سیدھی کرنی چاہی لیکن اس اثنا میں فقیر بابا کے پستول نے ایک اور شعلہ اگل دیا۔ یہ گولی سیدھی اس کے حلق میں جا کر لگی اور وہ ایک جھٹکے سے زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ دونوں کتے اپنے نگہبانوں کے پاس کھڑے ہو کر بین کر رہے تھے۔ فقیر بابا نے تاک تاک کر دو گولیاں مزید چلائیں اور دونوں کتے بھی خاک و خون میں لوٹنے لگے۔

میں فرط حیرت سے مجسمہ بنا یہ خونریز ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے رونما ہوا کہ مجھے کسی قسم کی مداخلت کا موقع ہی نہیں مل پایا۔ فقیر بابا کا نشانہ حیرت انگیز طور پر بالکل درست تھا۔ اس نے ایک بھی گولی ضائع نہیں کی اور چار گولیوں سے چار جانوں کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے اس عمل میں مہارت کے ساتھ ساتھ سفاکی نمایاں تھی۔ اس نے نہایت سرد مہری سے دو انسانی زندگیوں کا خون کر دیا تھا۔ مجھے اتنی بے دردی سے قتل عام پر دلی افسوس ہو رہا تھا اور فقیر بابا پر غصہ بھی آ رہا تھا۔

"یہ تم نے کیا کر دیا بابا؟" میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا "ان دونوں کو ختم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

فقیر بابا حیرت سے میرا منہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے قدرے توقف کے بعد کہا "یہ بے حد ضروری تھا سیفل اگر میں انہیں نہیں مارتا تو یہ ہمیں موت کے گھاٹ اتار دیتے۔"

"لیکن بابا ہم انہیں ختم کیے بغیر بھی تو اپنی جان بچا سکتے تھے۔"

"ہاں بچا تو سکتے تھے لیکن کب تک؟ یہ زندگی اور موت کی جنگ ہے اور جنگ کا پہلا اصول یہ ہے کہ اپنے دشمن پر وار کر دو۔ قبل اس کے کہ وہ تم پر وار کر کے تمہیں نیست و نابود کر دے۔"

"لیکن یہ تو معمولی کارندے تھے بابا" میں نے بدستور دکھی لہجے میں کہا۔

"یہ معمولی کارندے نہیں بلکہ مہلک درندے تھے جو موقع ملتے ہی تمہیں چیر پھاڑ کر برابر کر دیتے۔ اچھا اب اس بحث کو چھوڑو اور میرے ساتھ چل کر ان دونوں کا جائزہ لو۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور پہاڑی سے اتر آیا۔ جب تک ہم ان کے پاس پہنچتے وہ مکمل طور پر

ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ ان کی ٹارچیں ان کے پاس ہی پڑی ہوئی تھیں جن کی روشنی بڑا عبرتناک منظر پیش کر رہی تھی۔ میں اگر کوشش بھی کرتا تو شاید یہ کچھ نہ کر پاتا جو فقیر بابا نے کر ڈالا تھا۔ اس کے باوجود وہ بالکل پرسکون اور مطمئن تھا۔ اس کے زندگی کے متعلق کچھ مخصوص نظریات تھے اور وہ ان پر سختی سے کاربند تھا۔ مجھے شک ہونے لگا کہ ماضی میں یہ شخص شاید پیشہ ور قاتل رہ چکا ہے۔ آتشیں ہتھیار کے سلسلے میں اس کی مہارت ناقابل یقین تھی۔ مجھے اس کا یہ کارنامہ پسند نہیں آیا۔ تاہم میں فی الحال اس سے بحث و تمحیص کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

ان دونوں میں سے کوئی بھی میرا آشنا نہیں تھا۔ ان کا تعلق شاید سردار شاہ مراد کی اس فوج سے تھا جو گاؤں کے علاوہ دوسری جگہوں پر تعینات ہوتی تھی۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر کا موٹا تازہ الجھی ہوئی داڑھی مونچھ والا شخص تھا جبکہ دوسرا کم عمر۔ وہ تقریباً میرا ہی ہم عمر تھا۔ ہلکی ہلکی مونچھیں، لمبے پٹے جن میں وہ تیل چپڑے ہوئے تھا۔ سردار شاہ مراد نے شاید حال ہی میں اسے اپنی ذاتی فوج میں شامل کیا ہوگا۔ اس کے ہاتھ سیون ایم ایم جیسے مہلک ہتھیار کے لیے قطعاً اجنبی دکھائی دے رہے تھے۔ جانے اس کی کونسی مجبوری اسے کھینچ کر قاتلوں کے گروہ میں لے آئی تھی اور فقیر بابا کی انگلی کی معمولی سی جنبش نے اس بدنصیب کی جوانی کا گلشن اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے بے اختیار اپنا جاں نثار دوست سرور علی یاد آیا جو میری خاطر اپنی آنکھوں کے گوہر نایاب گنوا بیٹھا تھا۔ میرا دل درد سے بھر گیا۔ کیا صلہ دے سکتا تھا میں اس کی بے لوث قربانی کا؟ کچھ بھی تو نہیں!

میں اپنی سوچوں میں گم تھا۔ اس دوران میں فقیر بابا بڑی مہارت اور پھرتی سے ان کی لاشوں کی تلاشی لے رہا تھا اور جو کچھ برآمد ہو رہا تھا اسے ایک پوٹلی کی شکل میں باندھتا جا رہا تھا۔ چھ ہی منٹوں میں اس نے اپنا کام مکمل کر لیا۔

"چلو جلدی سے یہاں سے نکل چلو" اس نے ان دونوں میں سے ایک کی ٹارچ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ دوسری ٹارچ اس نے خود لے لی تھی۔ "ان کی رائفلیں ہمارے کسی کام کی نہیں ہیں۔ دیگر سامان کے علاوہ ان کے پاس سے ایک تیس بور کا دیسی پستول اور بتیس بور کا دیسی ریوالور ملا جو کہ میں نے قابو کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ ریوالور اور پستول کی کچھ گولیاں بھی ہیں" میں نے محض گردن ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔ میں نے ایک نظر اس نوجوان کی لاش پر ڈالی اور ہم دونوں اپنی کمین گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

میں اپنے دل کو بوجھل بوجھل محسوس کر رہا تھا۔ شام ڈھلے سے لے کر اب تک مختصر سے عرصے میں جو کچھ گزر چکا تھا، اس نے میرے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ قلندر سائیں کی پراسرار شخصیت کا نقش میری روح تک پر ثبت ہو چکا تھا۔ جانے وہ کون تھا اور مجھ سے کیسے واقف تھا۔ وہ کسی اور نامعلوم شخصیت کا حوالہ بھی تو دے رہا تھا جو کہ اس کی دوست تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں اس نامعلوم شخص کا لاڈلا ہوں لیکن ایسا کون شخص ہو سکتا ہے؟ کم از کم میرے ذہن میں تو کوئی ایسا نام نہیں تھا کچھ اور باتیں بھی تو کہیں تھیں اس نے۔ نفرت اور محبت کے متعلق اور سخی سائیں کے عرس کے میلے کے متعلق اور

وہ سفید رومال۔ جو کہ بقول قلندر سائیں کے اس نامعلوم شخصیت نے میرے لیے بطور تحفہ بھیجا تھا۔

میں نے اپنے چغے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس رومال کو ٹٹولا۔ وہ موجود تھا۔ جونہی میں نے اسے چھوا مجھے ایک عجیب سی تقویت کا احساس ہوا۔ میں نے اسے باہر نکالا اور اپنے دائیں ہاتھ کی کلائی پر باندھ لیا۔ جانے اس رومال میں کیا خاص بات تھی۔

مزار کے احاطے میں ان دو مسلح کارندوں کے ساتھ جو کچھ ہو چکا تھا وہ ایسا نہیں تھا جسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا' وہ دونوں شاید اپنی آنکھوں کی روشنیاں گنوا بیٹھے تھے لیکن یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ مزار کے احاطے میں جو کچھ رونما ہوا اور قلندر سائیں سے میری جو بات چیت ہوئی' فقیر بابا اس سے قطعاً لاعلم تھا۔ وہ اس رومال کے متعلق بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔ جانے کیوں میرے دل میں خیال آیا کہ میں اسے باقی تو ساری باتیں بتا دوں لیکن رومال کا ذکر گول کر دوں۔

اپنے غار والی مخصوص پہاڑی کے پاس پہنچ کر ہم نے اپنی ٹارچیں بجھا دیں اور آدھے چاند کی دھندلی روشنی میں اوپر چڑھنے لگے۔ تمام راستہ جانا پہچانا تھا' اس لیے ہمیں غار تک پہنچنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ غار میں پہنچتے ہی فقیر بابا نے لالٹین روشن کر دی اور میں نے فوراً ہی فقیروں والا چغہ اور ٹوپی اتار پھینکی۔ فقیر بابا مال غنیمت کی پوٹلی کھول رہا تھا۔ پوٹلی کھلتے ہی غار میں ایک چمک سی لہرائی۔ یہ ایک طلائی پالش والی بیش قیمت راڈو گھڑی تھی' اس کے علاوہ تین طلائی انگوٹھیاں تھیں اور چھوٹے بڑے نوٹوں کی ایک بڑی سی گڈی۔ یہ سامان اس موٹے والے رائفل بردار شخص کی ملکیت تھا۔ اس نوجوان کے پاس سے بہت معمولی سا سامان برآمد ہوا۔ میرے پستول کے میگزین میں اب صرف پانچ گولیاں باقی رہ گئی تھیں۔ فقیر بابا نے ان کے پاس سے برآمد ہونے والی تیس بور کے پستول کی گولیاں میرے حوالے کر دیں۔ وہ پستول درے کا بنا ہوا تھا اور میرے لیے بے کار تھا' لہٰذا میں نے اسے ایک طرف ڈال دیا۔ گولیاں تعداد میں اچھی خاصی تھیں۔ میرے کولٹس پستول کے لیئے کافی عرصے تک خوراک کا بندوبست ہو گیا تھا۔ بتیس بور کے ریوالور کو فقیر بابا نے اپنے قبضے میں کر لیا۔

''کل گیارہ ہزار تین سو بیس روپے کی رقم ہے'' فقیر بابا نے رقم گننے کے بعد کہا ''یہ گھڑی اور انگوٹھیاں بھی کئی ہزار کی ہوں گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ موٹا سور ٹھیک ٹھاک اسامی تھا۔ لو یہ رقم تم رکھ لو۔ تمہارے کام آئے گی'' فقیر بابا نے رقم کی گڈی میری طرف بڑھا دی جو میں نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ لے لی۔

پانی وغیرہ پینے کے بعد میں نے فقیر بابا کو مزار کے احاطے میں رونما ہونے والے واقعات اور قلندر بابا سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا اور حسب توقع وہ فرط حیرت سے انگشت بدنداں رہ گیا۔ ''میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ قلندر سائیں کوئی معمولی شخصیت نہیں ہے'' اس نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا ''میں نے اپنی زندگی میں کبھی خود کو کسی کے سامنے اتنا حقیر اور بے بس محسوس نہیں کیا۔ کاش کہ وہ ہمیں دوبارہ مل جائیں۔''

''بہت مشکل ہے فقیر بابا'' میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا ''قلندر بابا کا کہنا تھا کہ وہ اپنا

فرض پورا کر چکا ہے' لہٰذا اب تک تو شاید وہ جا بھی چکا ہو'' میں نے قدرے توقف کے بعد سوال کیا۔ ''ویسے ایک بات ہے بابا' آج رات ہونے والے دو افراد کے قتل اور دو افراد کے اندھے ہونے کے بعد میرے دشمنوں کی صفوں میں تو زبردست کھلبلی مچ گئی ہوگی۔''

میری باتیں سن کر فقیر بابا کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی ''یہی تو میں چاہتا ہوں کہ سردار شاہ مراد اپنی ہی بوٹیاں نوچنے پر مجبور ہو جائے۔ اس کی بے بسی اس قدر بڑھے کہ وہ کتے کی طرح اپنے ساتھیوں کو کاٹتا پھرے۔ اس واقعے کے رونما ہونے کے بعد وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اس علاقے پر چڑھ دوڑے گا۔ ایک بار پھر اس علاقے کے چپے چپے کو کھنگالا جائے گا اور جب انہیں تمہاری تلاش میں ناکامی ہوگی تو سردار شاہ مراد یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ شاید تم اس علاقے سے نکل چکے ہو۔ ویسے یہ بات ہے بھی صحیح آج رات ہم نے اس علاقے میں تعینات سردار شاہ مراد کی تقریباً پوری تفری کو ناکارہ یا ختم کر دیا ہے اور اس مہلت کا فائدہ اٹھا کر تم اس علاقے سے نکل سکتے ہو لیکن اس کا کوئی دورس فائدہ نہیں ہے کیونکہ اگلے علاقوں میں تمہاری گھات میں بیٹھے شکاری یقیناً تمہیں نشانہ بنا لیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ تم یہیں چھپ کر سردار شاہ مراد کے ردعمل کا انتظار کرو۔ جب وہ تمہاری تلاش سے مایوس ہو جائے تو تم چپکے سے اس علاقے سے نکل جاؤ۔ ویسے آج میں نے جو کارروائی کی ہے۔ اس کا ایک آدھ پہلو ایسا بھی ہے جس کی طرف تمہاری توجہ نہیں گئی ہے مثلاً اگر وہ دونوں افراد ہم دونوں کو دیکھ لینے میں کامیاب ہو جاتے تو تمہاری تلاش کی مہم ایک نیا رخ اختیار کر لیتی۔ انہیں علم ہو جاتا کہ تمہارے ساتھ ایک اور شخص بھی ہے جو تمہاری مدد کر رہا ہے اور تم یقیناً اسی کی پناہ میں ہو۔ اس صورت میں تمہارے ساتھ ساتھ میرے لیے بھی گھات لگائی جاتی اور اس طرح میرے لیے بھی تمہاری مدد کرنا دشوار ہو جاتا۔''

''تم واقعی بہت دور اندیش ہو فقیر بابا'' میں نے اس کی ذہانت کا قائل ہوتے ہوئے کہا ''حقیقتاً اگر وہ لوگ تمہاری موجودگی سے واقف ہو جاتے تو شاید میرا بچ نکلنا' بہت مشکل ہو جاتا۔''

''یہی بات میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں سیفل بیٹے۔ تم بہت بہادر ہو۔ پرجوش ہو' ذہین ہو لیکن تمہارے اندر ایک خامی ہے کہ تم صرف سامنے کے پہلو کو نظر میں رکھتے ہو۔ انسان کو دور تک دیکھنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ جن لوگوں سے تم نے دشمنی کا رشتہ جوڑا ہے وہ تمہاری توقع سے زیادہ مکار' عیار اور چال باز ہیں۔ اگر تمہیں ان سے جان بچانی ہے تو ان سے ایک قدم آگے بڑھ کر سوچنا پڑے گا ورنہ تم کسی بھی مرحلے پر ان کے کسی پھندے میں پھنس کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔''

''میں کوشش کروں گا بابا کہ ہر ممکن طریقے سے آپ کی ہدایات پر عمل کروں اور اپنی غلطیوں کو دہرانے سے گریز کروں۔'' میں نے دل ہی دل میں فقیر بابا کی ذہانت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا۔

''شاباش! مجھے تم سے یہی امید تھی بیٹا۔ انسان خطا کا پتلا ہے اور وہ اپنی غلطیوں سے ہی سبق سیکھتا ہے۔ اب تم سو جاؤ' رات بہت ہو چکی ہے۔ کل صبح سے شاید یہ تمام علاقہ تمہارے دشمنوں سے بھر جائے

اور ہمیں ایک طویل اور صبر آزما انتظار سے گزرنا پڑے۔“

اگلے دن سے حسب توقع پورے علاقے پر سردار شاہ ادکی ذاتی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ ان کے ساتھ بہت سے خون خوار کتے تھے اور وہ سخت طیش کے شکار تھے۔ کے طرز عمل سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ وہ لوگ بلا تکلف ہر راہ گیر پر رائفلیں تان کر اس کی تلاشی لیتے اور سبب زدوکوب کرتے۔ قصبے سے کوئی بھی کھانے پینے کی چیز باہر لے جانے پر سختی سے پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ رات ہوئی تو ان لوگوں نے جگہ جگہ خیمے لگا لیے‘ جہاں وہ ساری رات پہرہ دیتے تھے۔ وہ بے حد چوکنا بلکہ خوف زدہ تھے اور انہیں جو بھی متحرک شے نظر آتی وہ اس پر بلا تردد فائر کھول دیتے۔ ان لوگوں کا ایک خیمہ ہماری غار والی پہاڑی سے تقریباً ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر قائم تھا۔ اگلے دن ہم نے سردار شاہ مراد کو اس خیمے کا دورہ کرتے دیکھا۔ وہ لینڈ کروزر جیپ میں سوار تھا اور اس کے ہمراہ چھے باڈی گاڈ تھے جو سرروسی ساخت کی کلاشنکوف رائفلوں سے مسلح تھے۔ یہ خودکار رائفلیں ابھی پوری طرح عام نہیں ہوئی تھیں اور چند بے حد خاص لوگوں کی پہنچ میں ہی تھیں۔ سردار شاہ مراد عام طور پر انگریزی لباس پہنا کرتا تھا لیکن اس روز وہ مخصوص قبائلی لباس میں تھا۔ اس وقت شاید وہ علاقے میں کیے گئے انتظامات کا جائزہ لینے نکلا تھا۔

فقیر بابا اس کی شکل سے واقف نہیں تھا۔ میں نے اسے سردار شاہ مراد کا چہرہ کرایا ”شکل سے تو یہ کوئی بڑا افسر یا پروفیسر قسم کا معزز شخص دکھائی دیتا ہے لیکن میں اس کے ظاہری حلیے سے دھوکا کھانے والا نہیں ہوں“ فقیر بابا نے تبصرہ کیا ”مجھے معلوم ہے کہ سانپ جتنا زیادہ خوب صورت ہوا اتنا ہی زہریلا ہوتا ہے۔ ویسے یہ خود بھی تم سے خوف زدہ دکھائی دیتا ہے۔“

میں نے ایک بار پھر بہ غور شاہ مراد کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی کسی قدر مضطرب اور خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ اپنے کارندوں سے بات کرتے ہوئے وہ بار بار چونک اٹھتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک دوربین تھی جسے وہ بار بار آنکھوں سے لگا لیتا تھا۔

”یہ دراصل تم سے نہیں تمہاری بے جگری سے خوف زدہ ہے“ فقیر بابا نے مجھے بتایا ”اسے علم ہے کہ تم اس سے اتنی شدید نفرت کرتے ہو کہ تم اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بھی اسے ختم کرنے کی کوشش کر سکتے ہو۔ جو شخص موت کی بھی پروا نہ کرے اس سے بڑے بڑے تیس مار خان تھر تھر کانپتے ہیں۔ یہ تمہیں شکار تو کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے اندر اتنی ہمت نہیں ہے کہ تمہیں دوبدو للکار سکے۔“

فقیر بابا کا تجزیہ بے حد درست تھا۔ واقعی مجھے اپنی زندگی اور موت کی پرواہ نہیں تھی۔ اگر فقیر بابا پہلے ہی سمجھا بجھا کر مجھے اندھا دھند جذباتی قدم اٹھانے سے منع نہ کر چکے ہوتے تو شاید میں اسی وقت اس کا پتا صاف کرنے کی کوشش کرتا‘ چاہے اس کے نتیجے میں مجھے زندگی سے کیوں نہ ہاتھ دھونا پڑتے۔ میں نے غیر رسمی طور پر فقیر بابا کی شاگردگی اختیار کر لی تھی اور میری کوشش تھی کہ اس کے مشوروں کے مطابق ہی عمل کروں۔

”صرف چند دن کی بات ہے بیٹا“ فقیر بابا نے مجھے تسلی دی ”اس کے بعد ان سب کو جوش و خروش

جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا۔ ان کے اعصاب کا تناؤ کم ہو گا تو یہ اس بات پر غور کریں گے کہ تم شاید اس علاقے سے نکل چکے ہو اور یہ خواہ مخواہ یہاں جھک مار رہے ہیں۔ اس دوران میں چونکہ تمام کتے بھی پر سکون رہیں گے لہٰذا انہیں پختہ یقین ہو جائے گا کہ تم آس پاس کہیں موجود نہیں ہو۔ اس کے بعد سردار شاہ مراد اپنی فوج کو یہاں سے کوچ کا حکم دے گا۔ اس کے بعد اس علاقے کی نگرانی کے لیے کسی کو چھوڑا بھی گیا تو وہ رسمی کارروائی ہو گی اور وہی تمہارے یہاں سے نکلنے کا صحیح وقت ہو گا۔“

اگلے تین دن بڑی سست رفتاری سے گزرے۔ ہم دونوں بدستور اپنے غار میں محصور رہے۔ سردار شاہ مراد کے کارندے پاگل کتوں کے مانند ادھر سے ادھر سرگرداں رہے پھر حسب توقع ان کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا اور انہوں نے اپنی سرگرمیاں محدود کر دیں۔ ہم لوگوں کو بظاہر کوئی تکلیف نہیں تھی۔ غار میں پینے کے لیے پانی اور خشک خوراک کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا اور ہمیں اس طرف سے کوئی تردد نہیں تھا‘ البتہ میں یکسانی اور بے زاری محسوس کرنے لگا اور میرا مزاج چڑچڑا ہو گیا تھا۔ میں نے اسی عالم میں ایک دو بار فقیر بابا سے تلخ کلامی کی اگرچہ میں نے بعد میں معذرت کر لی لیکن اس نے مجھ سے گفتگو کم کر دی تھی۔ وہ شاید ایک عرصے سے اس قسم کی زندگی کا عادی تھا لیکن میرے لیے یہ زندگی موت سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔

اس روز میں سارا دن سوتا رہا۔ نتیجتاً رات کے وقت نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ رات بڑی ہی تاریک تھی۔ پچھلے چار دنوں سے ہم نے احتیاطاً لالٹین بھی نہیں جلائی تھی۔ غار میں گھپ اندھیرا تھا اور میں بے چینی سے اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ رات تھی کہ گزرنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ تنگ آ کر میں اٹھ بیٹھا۔ فقیر بابا اپنے بستر پر دراز تھا لیکن شاید اسے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔

”بابا۔۔۔سو گیا کیا؟“ میں نے دھیرے سے پوچھا۔

”نہیں تو‘ جاگ رہا ہوں“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”کوئی بات کرو نا بابا!“ میں نے ملتجی لہجے میں کہا ”کوئی بات کرو تا کہ یہ سیاہ رات کٹے۔“

”کیا بات کروں بیٹا‘ سبھی کچھ تو کہہ سن چکے ہیں ہم لوگ۔“

”نہیں بابا‘ ہم نے ابھی تک بہت کچھ اپنے سینوں میں چھپایا ہوا ہے‘ تم نے آج تک اپنے متعلق ایک لفظ بھی نہیں بتایا۔“

”کیا بتاؤں اپنے متعلق؟ بس ایک فقیر ہوں اور ایک فقیر جس طرح زندگی گزارتا ہے‘ ویسی ہی زندگی میں نے گزاری ہے۔“

”نہیں بابا‘ ایسے کام نہیں چلے گا۔ تم مجھے اپنا بیٹا کہتے ہو تو اس رشتے کا بھرم رکھو۔ میں گستاخ اور نالائق ہی سہی لیکن پھر بھی تمہیں میری بات ماننی ہی پڑے گی۔ مجھے سنا دو بابا جو بھی کچھ تمہارے سینے میں محفوظ ہے‘ سب کچھ مجھے بتا دو۔ اگر تم نے آج میری بات نہ مانی تو میں صبح ہوتے ہی یہاں سے چلا جاؤں گا“ میرا اوارکاری ثابت ہوا۔ میں نے اندھیرے میں فقیر بابا کی لمبی لمبی سانسوں کی آواز سنی۔

”اچھا بابا اچھا سناتا ہوں سب کچھ سناتا ہوں۔ وہ سب کچھ سناتا ہوں جو سالہا سال سے اس

بوڑھے کے سینے میں دفن ہے۔ وہ جو میں نے آج تک کسی کو نہیں سنایا۔ تجھ سے کیا پردہ؟ تو خود زخم خوردہ ہے۔ تجھ سے یہ سب کچھ چھپا کر مجھے کیا ملے گا۔ اچھا تو سن یہ آج سے بہت برسوں پہلے کا قصہ ہے۔"

☆O☆

وہ افغانستان اور پاکستان کے سنگم میں واقع ایک آزاد قبائلی گاؤں تھا۔ جس کی آبادی چند سو افراد پر مشتمل تھی۔ اس علاقے میں کسی قسم کا کوئی قانون رائج نہیں تھا' صرف چند قدیم روایات تھیں جن پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ انصاف کے اصول بے حد سادہ تھے' ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور سر کے بدلے سر۔ ان لوگوں نے انصاف کی فراہمی کے لیے گاؤں کے چند معززین پر مبنی ایک جرگا ترتیب دے رکھا تھا جس کا سربراہ قبیلے کا سردار تھا۔ سردار عمر دراز خان اس علاقے کا سب سے دولت مند اور با اثر شخص تھا۔ گاؤں کے لوگوں میں سب سے بڑے پھلوں کے باغ اسی کے تھے اور وہی گاؤں کے لوگوں کی پھلوں کی فصلیں خریدا کرتا تھا۔ نزدیکی قصبے میں اس کی پھلوں کی اور خشک میوے کی بڑی بڑی دکانیں تھیں جہاں سے یہ نعمتیں ملک کے بڑے بڑے شہروں کو بھیجی جاتی تھیں۔ غرض یہ کہ خان عمر دراز خان کی دولت کا کوئی ٹھکانہیں تھا۔ گاؤں میں اس کی قلعہ نما حویلی سب سے نمایاں تھی۔

نوجوان معدی خان' اس دنیا میں بالکل اکیلا تھا۔ اس نے بچپن سے اپنے آپ کو اپنے دور پرے کے رشتے دار کریم الدین کے رحم و کرم پر پایا تھا۔ کریم الدین کوئی امیر شخص نہیں تھا لیکن اس نے جیسے تیسے معدی خان کا بوجھ برداشت کرلیا۔ کریم الدین کی بیوی بہت عرصہ پہلے فوت ہو چکی تھی۔ اس کی ایک ہی بیٹی تھی جس کا نام گل زریں تھا۔ گل زریں واقعی اسم بامسمی تھی۔ سنہری بال' گہری سبز آنکھیں اور گلاب چہرہ۔

نوجوان معدی خان کے لیے گل زریں سے بڑھ کر دنیا میں کچھ نہیں تھا۔ گل زریں نے بھی ہمیشہ معدی خان کو اپنے خوابوں کے شہزادے کے روپ میں دیکھا تھا۔ معدی خان اپنے ساتھ کے نوجوانوں میں سے کسی سے کم نہیں تھا۔ تلوار بازی اور بندوق اور تیر کمان کے ذریعے نشانہ بازی میں وہ سب سے آگے رہتا تھا۔ خٹک ناچ میں بھی اس کی پھرتی اور مہارت کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس کے اندر ایک ہی خرابی تھی کہ وہ بہت مفلس تھا۔ اس کا ذریعہ معاش معمولی درجے کی مزدوری پر منحصر تھا۔

گل زریں جب جوان ہوئی تو اس کے لیے رشتوں کا تانتا بندھ گیا۔ ایک سے بڑھ کر ایک امیر رشتہ ایک سے بڑھ کر ایک رقم کی پیش کش لیکن کریم الدین کسی بے حد موٹی اسامی کے رشتے کا منتظر تھا۔ ایسے میں مفلوک الحال معدی خان نے گل زریں کا رشتہ مانگا تو اس نے معدی خان کا خوب مذاق اڑایا۔

"تیری یہ اوقات کہاں معدی خان کہ تو میری بیٹی کا رشتہ طلب کرے۔ جانتا ہے اس کے لیے مجھے چار ہزار تک کی پیش کش ہو چکی ہے۔"

"تم بس ایک بار ہاں کہہ دو چاچا کریم الدین خان۔ میں تمہیں چار کی جگہ پانچ ہزار دوں گا لیکن اس کے لیے مجھے کچھ مہلت چاہیے۔"

"کتنی مہلت؟" حریص کریم الدین نے پوچھا۔

"یہی کوئی تین سال۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تین سال کے اندر تمہیں یہ رقم ادا کر دوں گا۔"

"اگر تم تین سال کے عرصے میں یہ رقم ادا نہ کر سکے تو؟"

"تو پھر اس عرصے کے دوران میں جو رقم میں تمہارے پاس جمع کراؤں گا وہ تمہاری ملکیت بن جائے گی اور میں گل زریں کے دعوے سے دست بردار ہو جاؤں گا پھر تم جہاں چاہو اس کی شادی کر دینا۔"

"سوچ لو معدی خان۔ یہ بہت بڑی رقم ہے۔"

"جہاں معاملہ زندگی اور موت کا ہو وہاں سوچا اور سمجھا نہیں جاتا چاچا کریم الدین۔ وہاں تو بس آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگانی پڑتی ہے۔"

کریم الدین نے معدی خان سے وعدہ کرلیا کہ وہ گل زریں کی شادی اسی سے کرے گا۔ گاؤں میں رہ کر اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا ناممکن تھا' چنانچہ معدی خان افغانستان کے شہر جلال آباد چلا گیا۔ گل زریں نے معدی خان کی جدائی کا مرحلہ بہت مشکل سے برداشت کیا۔ مستقل وصال کے لیے عارضی ہجر کا یہ صدمہ برداشت کرنا ضروری تھا۔

جلال آباد کا شمار افغانستان کے خوشحال ترین اور خوب صورت ترین شہروں میں ہوتا تھا۔ جلال آباد آ کر معدی خان پھلوں کی منڈی میں کام کرنے لگا۔ وہ دن کے وقت پھلوں کی پیٹیاں اٹھاتا تھا اور رات کے وقت پھلوں کے گودام کی چوکیداری کرتا تھا۔ اس قدر کڑی مشقت کے باوجود وہ پہلے سال کے اختتام تک چاچا کریم الدین کے پاس صرف پانچ سو کی رقم بھجوا سکا۔ اگلے سال اس نے پہلے سے بھی زیادہ کڑی مشقت برداشت کی اور سال کے آخر تک سات سو کی رقم چاچا کریم الدین کو بھجوا دی۔ اب اس کے پاس صرف ایک سال کی مدت باقی بچی تھی اور اسے اڑتیس سو کی خطیر رقم جمع کرنی تھی جو کہ موجودہ حالات میں بظاہر ناممکن بات تھی لیکن جواں ہمت معدی خان ہمت ہارنے پر تیار نہیں تھا۔ نئے سال کے شروع میں اس نے ایک اور قدم بڑھایا اور پھلوں کی تھوڑی بہت آڑھت شروع کر دی۔ کچھ ہی دنوں میں اس نے اپنے قدم جما لیے اور اسے اچھا خاصا منافع ہونے لگا۔ وہ یہ تمام رقم برابر چاچا کریم الدین کے پاس بھجواتا رہا۔ تیسرے سال کے اختتام تک وہ پورے پانچ ہزار کی رقم چاچا کریم الدین کے پاس بھجوانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ بے حد خوش تھا' اس نے چاچا کریم الدین کو پیغام بھجوایا کہ وہ شادی کی تیاریاں کرے کیونکہ وہ دو مہینوں کے بعد گاؤں پہنچ رہا ہے۔ وہ گل زریں کو اپنی دلہن بنا کر جلال آباد لے آئے گا' جہاں اس کا کاروبار نہایت کامیابی سے چل رہا تھا۔

دو مہینے بعد معدی خان خوش خوش اپنے گاؤں پہنچا تو ایک بھیانک خبر اس کی منتظر تھی۔ اس کو بتایا گیا کہ تقریباً دو مہینے پہلے کریم الدین خان کا اچانک انتقال ہو گیا تھا۔ جس کے تقریباً ایک ہفتے بعد گل زریں نے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔

یہ روح فرسا خبر سن کر معدی خان کے ہوش و حواس معطل ہو گئے۔ کئی دن بعد جب اسے ہوش آیا تو اس کے ایک بے حد قریبی دوست نے اسے اس سانحے کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔

بدقسمت معدی خان جن دنوں جلال آباد میں دن رات کڑی مشقت کر کے رقم جمع کر رہا تھا' انہی دنوں کریم الدین کے قبیلے کے سردار عمر دراز خان سے گاڑھی چھننے لگی۔ بدطینت عمر دراز خان کریم الدین کی خوب صورت بیٹی کو حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی راہ میں معدی خان کا معائدہ رکاوٹ بنا ہوا تھا لیکن خان عمر دراز خان نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے دوستی کا جال بچھایا اور کریم الدین اس میں پھنس گیا۔ سردار عمر دراز خان ہر جمعے کو افغانستان میں واقع ایک قریبی قصبے میں جاتا تھا۔ وہ کریم الدین کو بھی اپنے ساتھ وہاں لے جانے لگا۔ وہ دونوں خان عمر دراز خان کی جیپ میں وہاں جایا کرتے تھے۔ اس قصبے میں جمعے کے روز بزکشی کے روایتی کھیل کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ خان عمر دراز خان اس کھیل کا رسیا تھا۔ اس نے کریم الدین کو بھی اپنی لائن پر لگا لیا۔ اس قصبے میں بزکشی کے مقابلوں پر لاکھوں روپے کی شرطیں لگائی جاتی تھیں۔ خان عمر دراز خان خود بھی باقاعدگی سے شرطیں لگاتا تھا۔ اس نے رفتہ رفتہ کریم الدین کو بھی اس لت کا رسیا بنا دیا۔ کریم الدین کے پاس بہت کم رقم ہوتی تھی لیکن جونہی اس کی جیب خالی ہوتی عمر دراز خان اس کی جیب بھر دیتا۔ رفتہ رفتہ کریم الدین خان عمر دراز خان کا مقروض ہوتا چلا گیا لیکن عمر دراز خان نے کبھی بھی کریم الدین سے یہ رقم طلب نہیں کی تھی لہٰذا کریم الدین کو اس کا زیادہ احساس نہیں تھا۔ پہلے سال کے اختتام پر معدی خان نے پانچ سو روپے بھیجے لیکن کریم الدین دو ہی ہفتوں میں تمام رقم ہار گیا اور اس کے بعد دوبارہ قرض کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ادھر کریم الدین نے شرمندگی کے باعث اپنی بیٹی کو بتایا ہی نہیں کہ معدی خان نے کچھ رقم بھیجی تھی۔ اس کے بجائے وہ اسے مسلسل یہی بتاتا رہا کہ معدی خان کی طرف سے کوئی خیر خبر نہیں ملی ہے۔ دوسرے سال کے اختتام تک کریم الدین عمر دراز کا پانچ ہزار کا مقروض ہو گیا تھا۔ جب معدی خان نے صرف سات سو کی رقم بھیجی تو اسے یقین ہو گیا کہ معدی خان کبھی اتنی بڑی رقم کا بندربست نہیں کر سکتا لہٰذا اس نے بڑی بے فکری سے سات سو کی رقم بھی جوئے کی نذر کر دی۔ تیسرے سال کے درمیان تک معدی خان تین ہزار کی رقم بھجوا چکا تھا لیکن اس دوران میں عمر دراز خان سے قرض کی رقم آٹھ ہزار تک جا پہنچی تھی۔

غریب گل زریں ان تمام حالات سے قطعاً ناواقف تھی۔ اسے تو بس معدی خان کا انتظار تھا جو جلد ہی آنے والا تھا۔ تیسرے سال کے آخر تک معدی خان تقریباً پانچ ہزار کی رقم بھجوا چکا تھا لیکن یہ تمام رقم کریم الدین نے جوئے کی نذر کر دی تھی۔

خان عمر دراز خان نے صحیح موقع دیکھ کر کریم الدین خان سے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا تو کریم الدین کے ہوش اڑ گئے۔ عمر دراز خان نے اتنی جلدی آنکھیں پھیر لی تھیں کہ وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ عمر دراز خان نے شدید دباؤ ڈالا لیکن کریم الدین کے پاس کچھ ہوتا تو دیتا۔ بالآخر عمر دراز خان نے تجویز پیش کی کہ اگر کریم الدین اپنی بیٹی کی شادی اس سے کر دے تو وہ یہ تمام رقم معاف کر سکتا ہے۔ کریم الدین لاکھ برا آدمی سہی لیکن وہ اپنی بیٹی سے بے حد پیار کرتا تھا۔ وہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی پھول جیسی بیٹی ایک بڈھے کھوسٹ سے بیاہ دی جائے۔ دوسری طرف اسے معدی خان سے اپنے وعدے کا بھی

خیال تھا۔ وہ سخت ذہنی کشمکش کا شکار ہو گیا۔ بالآخر اس نے عمر دراز خان سے کہا کہ وہ اس کی رقم ادا کر دے گا لیکن اس کے لیے وہ کچھ مہلت چاہتا ہے۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ معدی خان سے اپنی بیٹی کی شادی کرنے کے بعد اپنا مکان فروخت کر کے عمر دراز خان کو ادائیگی کر دے گا۔ عمر دراز خان کو اس صورت حال کا علم ہوا تو وہ سخت تلملایا۔ اس کے سارے کیے کرائے پر پانی پھر رہا تھا۔ چند ہی دنوں بعد کریم الدین کا انتقال ہو گیا وہ ''حادثاتی'' طور پر ایک پہاڑی سے گر کر ہلاک ہو گیا تھا۔

کریم الدین کی وفات کے بعد عمر دراز خان نے دعویٰ کیا کہ کریم الدین مرنے سے چند دن پہلے اپنی بیٹی کا رشتہ اس کے ساتھ طے کر چکا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے ایک دستاویز بھی دکھائی۔ گاؤں کے جرگے نے بلا جھجک یہ دستاویز صحیح تسلیم کر لی۔ اس امر سے تو گاؤں پہلے ہی واقف تھا کہ کریم الدین عمر دراز خان کا بھاری رقم کا مقروض تھا لہٰذا کسی نے بھی اعتراض نہ کیا۔

گل زریں بے چاری ابھی اپنے باپ کی ناگہانی موت کے صدمے سے سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ اچانک یہ خبر اس پر بجلی بن کر گری کہ جرگے نے اس کے باپ کی عمر کے سردار عمر دراز خان سے اس کی شادی طے کر دی تھی۔ وہ معدی خان کی عدم الخبری سے، پہلے ہی دید دل برداشتہ تھی' اس نئی افتاد نے اس کے رہے سہے حوصلے بھی ختم کر دیے۔ ایک رات اس نے سیبوں کے پیڑوں پر چھڑکی جانے والی زہریلی کیڑے مار دوا پی لی اور چپ چاپ اس دنیا سے کوچ کر گئی۔

اس المناک داستان نے معدی خان کے سینے میں بہنے والے غم کے آنسوؤں کو نفرت اور انتقام کی آگ میں بدل دیا۔ وہ اسی روز چپ چاپ جلال آباد چلا گیا۔ اس جمعے کو جب عمر دراز خان بزکشی کا مقابلہ دیکھ کر واپس آ رہا تھا تو معدی خان راستے میں اس کا منتظر تھا۔ اس وقت عمر دراز خان کے ساتھ اس کا نوجوان بیٹا اور محافظ بھی تھا۔ معدی خان نے عمر دراز خان کے سامنے اس کے بیٹے اور محافظ کو گولی ماردی۔ اس کے بعد اس نے عمر دراز خان کی دونوں رانوں پر گولی ماردی اور پھر جیپ پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ عمر دراز خان زندہ جل گیا لیکن اس کے ساتھ ہی معدی خان کی زندگی کا رخ بھی تبدیل ہو گیا۔ اسے اب زندگی سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ وہ پہلے پشاور پہنچا۔ وہ کتنے ہی دنوں تک پشاور کی گلیوں اور سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ اس کے کپڑے چھیتڑے بن گئے۔ لوگ اسے بھکاری سمجھ کر بھیک اور خیرات دینے لگے۔ وہ صرف تھوڑی بہت کھانے پینے کی چیزیں لے لیتا تھا۔ پیسوں سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پشاور سے وہ جانے کس طرح دھکے کھاتا ہوا راولپنڈی پہنچ گیا۔ ان دنوں اسلام آباد کی تعمیر شروع نہیں ہوئی تھی۔ وہاں وہ کئی سال تک بری امام کی درگاہ پر پڑا رہا۔ یہاں اس کے دل کو کچھ سکون ہوا تو اس نے اولیا اور پیروں کے آستانوں اور مرقدوں کو اپنی منزل مان لیا۔ اس نے پاکستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تقریباً ہر مشہور مزار پر حاضری دی۔ ہزاروں لوگوں سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ کئی طرح کی زبانیں اور بولیاں اس کے لیے آسان ہو گئیں۔ پچھلے کافی عرصے سے وہ سخی سرور سلطان کے دربار پر حاضری دے رہا تھا۔ اور فی الحال اس نے اپنی اگلی منزل کا تعین نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

بابا معدی کی دل خراش روئیداد واقعی لہو رلا دینے والی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ میری اپنی ہی کہانی ہو۔ میں تو اپنے ہی زخموں کا رونا روتا رہتا تھا لیکن فقیر بابا کا سینہ بھی فگار تھا۔ میری اور فقیر بابا کی کہانی میں اچھی خاصی مماثلت تھی اور شاید اسی وجہ سے فقیر بابا مجھ پر مہربان بھی تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میرے اس اندازے کی بھی تصدیق ہوگئی کہ وہ پیشہ ور اور خاندانی فقیر نہیں تھا بلکہ بے مہر وقت کی ستم ظریفیوں نے اسے اس راہ پر ڈال دیا تھا۔

میں نے فقیر بابا کی اس داستان الم پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بھلا میں اس بارے میں کیا تبصرہ کر سکتا تھا۔ اس نے وہی کچھ کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو شاید میں بھی وہی سب کچھ کرتا۔ ہر انسان خود اپنے ضمیر کو جواب دہ ہوتا ہے اگر کسی کام سے اس کا ضمیر مطمئن ہو تو اسے دنیا کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔

اس رات میں جانے کیا کیا سوچتا رہا اور پھر بالآخر نیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس رات پھر مجھے خواب میں وہی بھیانک منظر نظر آیا۔ اس بار خنجر کی دھار پہلے سے زیادہ چمک دار تھی۔ گاڑھا سرخ لہو پہلے سے زیادہ مقدار میں آئینے کو غسل دے رہا تھا اور نسوانی چیخوں کی آواز بھی پہلے سے زیادہ دردناک تھی۔ میری آنکھ کھلی تو صبح صادق کا دھندلا دھندلا اجالا پھیل رہا تھا۔ مجھے تھوڑی سی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں نے غار سے ذرا سا باہر جھانک کر دیکھا۔ سردار شاہ مراد کے کارندوں کے خیمے کے سامنے روشن آگ مدھم پڑ چکی تھی۔ باد سحر کے خواب آور جھونکوں نے پہرے پر مامور شخص کو بھی نیند کی آغوش میں پہنچا دیا تھا میں اگر چاہتا تو اسی وقت جا کر ان سب کے سروں کو ان کی گردنوں پر سے اتار سکتا تھا لیکن میرا ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ فقیر بابا کا اس سلسلے میں کیسا بھی نظریہ ہو لیکن میں اس قسم کی حرکت نہیں کر سکتا تھا اور خاص طور پر ان معمولی کارندوں کو موت کے گھاٹ اتار کر مجھے کوئی خوشی نہ ہوتی۔

کچھ دیر کے بعد فقیر بابا بیدار ہو گیا اور پھر وہی دن بھر کا بیزار کن معمول شروع ہو گیا۔ فقیر بابا کی پیش گوئی کے عین مطابق اب وہ لوگ بیزاری کا شکار ہو چکے تھے۔ شام ڈھلے ان لوگوں نے اپنا خیمہ اکھاڑ لیا اور اسے ایک جیپ میں رکھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ یہ صورت حال دیکھ کر میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ میری محصوری کے دن ختم ہو رہے تھے۔ اس صورت حال سے فقیر بابا بھی بہت خوش تھا۔ اس رات ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔

صبح سویرے فقیر بابا قصبے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ تازہ ترین صورت حال کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ شام ہونے سے پہلے پہلے واپس لوٹ آئے گا اور میں بلاضرورت اپنی کمین گاہ سے نکلنے سے گریز کروں۔

سورج ڈھلنے سے ذرا پہلے وہ واپس لوٹ آیا۔ وہ کھانے پینے کا کافی سامان لایا تھا۔ اس کے چہرے سے خوشی عیاں تھی۔ اس نے بتایا کہ اس نے قصبے کے اندر بہ غور جائزہ لیا ہے اور بظاہر وہاں کوئی مشکوک شخص موجود نہیں ہے' خاص طور پر وہاں بو سونگھنے والے شکاری کتوں کا تو نام ونشان تک موجود

نہیں ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سردار شاہ مراد واقعی اس علاقے میں ہماری موجودگی سے مایوس ہو گیا ہے۔

اس اطلاع سے مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میں اپنی اس قید سے بری طرح تنگ آ گیا تھا اور اب یہاں سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم دونوں سونے کے لیے لیٹ گئے۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد فقیر بابا نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اپنی نیند پر پوری طرح قادر تھا اور جب چاہے جس حالت میں چاہے سو سکتا تھا لیکن میں اس صلاحیت سے محروم تھا' چنانچہ میں دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ اس رات بہت دنوں کے بعد مجھے اپنی ماں یاد آئی اور میرے سینے کی بھٹی میں خفیہ چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔ مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی زندگی کے اہم ترین مقصد سے دور ہوتا جا رہا ہوں لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں اپنے انتقام کی قسم کو بھولا نہیں تھا لیکن حالات نے مجھے کچھ اس طرح سے کھلونا بنا لیا تھا کہ میرے بس میں کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ میں تو اس سیاہ بخت عورت اور اس کے ساتھی کو خاک و خون میں لوٹانا چاہتا تھا لیکن میرے پیروں میں زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ مجھے بہرحال امید تھی کہ جلد ہی یہ زنجیریں بھی ٹوٹنے والی تھیں۔

''فکر نہ کر اے بدبخت عورت!'' میں نے اپنے دل میں سوچا ''تیری زندگی کے دن اب بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔ وہ وقت اب زیادہ دور نہیں ہے جب میں اپنے خنجر کی پیاس تم دونوں کے لہو سے بجھاؤں گا۔ وہ دن میری زندگی کا یادگار دن ہوگا' جب تم دونوں کی لاشوں کو چیل کوے اور گدھ نوچیں گے۔۔۔''

میرا خون بری طرح کھول رہا تھا۔ مجھے خود پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ صبر و ضبط کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹتا جا رہا تھا۔ مجھے اس غار سے شدید وحشت ہو رہی تھی اور جی چاہتا تھا کہ ابھی یہاں سے بھاگ نکلوں۔ میں نے بمشکل اپنے آپ پر قابو پایا اور ذہن کو ادھر ادھر دوڑانے کی کوشش کی پھر میرا ذہن مہراں کی طرف منتقل ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ ٹھنڈی پڑتی چلی گئی۔

فقیر بابا جب مجھے اپنی داستان میں گل زریں کے متعلق بتا رہا تھا تو اس وقت مجھے بار بار مہراں یاد آئی تھی اور اس وقت ایک بار پھر میرے دل و دماغ پر مہراں کی یاد نے قبضہ جما لیا۔ مجھے پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ وہ معصوم سی لڑکی میرے دل کے کتنے قریب تھی۔ میں نے تو اسے کبھی غور سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس کی من موہنی صورت میرے دل و دماغ پر نقش تھی۔ ہم نے کبھی بھی آپس میں کھل کر بات نہیں کی تھی' اس کے باوجود مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس کے دل میں موجود نازک جذبات سے پوری طرح واقف ہوں۔ میں اس کی قربت سے حتی الامکان گریز کرتا تھا لیکن اب جبکہ ہمارے درمیان اتنا طویل فاصلہ حائل تھا تو میرا دل خواہش کر رہا تھا کہ کاش وہ اس وقت میرے قریب ہوتی۔ اپنی پتلی پتلی انگلیاں میرے سر کے بالوں میں پھیر کر مجھے سلاتی۔ میری بگڑی ہوئی صورت کو دیکھ کر خفگی کا اظہار کرتی۔ اسے تو میری بڑھی ہوئی داڑھی سے سخت چڑ تھی۔ اگر وہ اتنے دن کی

بڑھی ہوئی داڑھی کو دیکھتی تو وہ کتنا ناراض ہوتی۔ جانے اب وہ کس حال میں ہوگی؟

وہ شاید رات کا دوسرا پہر تھا' جب میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ فقیر بابا نے تاکید کی تھی کہ میں سونے سے پہلے لالٹین کو بجھا دوں لیکن میرا اس وقت ہاتھ اٹھانے کو بھی دل نہیں چاہا۔ آخری بار آنکھیں بند کرنے سے پہلے میری نظر اپنی کلائی پر پڑی۔ میرے دائیں ہاتھ کی کلائی پر اب بھی قلندر سائیں کا عطا کردہ رومال بندھا ہوا تھا۔ میں نے قلندر سائیں کے متعلق سوچنے کی کوشش کی لیکن میرے دماغ نے مزید مشقت سے انکار کر دیا اور میں نیند کی وادیوں میں کھوتا چلا گیا۔

میں شاید اس وقت کوئی خواب دیکھ رہا تھا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میری پسلیوں میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ جب میرے ہوش و حواس پوری طرح بجا ہوئے تو میری سمجھ میں تمام صورت حال آ گئی۔

وہ لوگ تعداد میں تین تھے اور پوری طرح مسلح۔ ان میں سے ایک فقیر بابا پر پستول تانے ہوئے تھا جبکہ باقی دو نے مجھے زد میں لے رکھا تھا۔ ان میں سے ایک نے اپنے پستول کی نال میری کھوپڑی پر لگا رکھی تھی۔ میری پسلیوں پر ٹھوکر مارنے والا شاید دوسرا شخص تھا۔ ''اٹھو میری جان اٹھو' بہت آرام فرما لیا۔ اب حساب کا وقت آن پہنچا ہے'' اتنا کہہ کر مجھے ٹھوکر مارنے والے نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا۔ میں بڑی تیزی سے صورت حال کا تجزیہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم دونوں بری طرح پھنس چکے تھے۔ یہ یقیناً سردار شاہ مراد کے کارندے تھے جو کسی نہ کسی طرح ہم تک آن پہنچے تھے۔

''کون ہو تم لوگ؟'' اور تم نے ہمیں کیوں نشانے پر لے رکھا ہے؟'' میں نے اپنے لہجے کو مضبوط بناتے ہوئے کہا۔ اس پر اس شخص نے زوردار قہقہہ لگایا' جس نے میری کھوپڑی پر پستول رکھا ہوا تھا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ جیون خان تھا رتا سائیں کا خاص کارندہ۔ یہ دیکھ کر میرے دل میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی کہ اس کے ہاتھ میں میرا کولٹس پستول تھا۔ ان بدبختوں نے پہلے ہمیں نہتا کیا' اس کے بعد ہمیں بیدار کیا تھا۔

''خوب بہت خوب'' جیون خان نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا ''تو اب ہمیں پہچاننے سے بھی انکار کرو گے۔ ہماری تمہاری تو پرانی جان پہچان ہے۔''

''میں تمہیں پہچان گیا ہوں تم جیون خان ہو نا؟'' میں نے کن انکھیوں سے فقیر بابا کو دیکھا۔ وہ بھی اٹھ بیٹھا تھا اور اب بے بسی کے عالم میں' اس دیوہیکل شخص کو دیکھ رہا تھا جو اس پر پستول تانے ہوئے تھا۔ اس وقت اس کے دبلے پتلے بوڑھے جسم پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔

''بہت بہت شکریہ پہچاننے کا سیفل سائیں'' جیون خان نے طنزیہ لہجے میں کہا ''اگر تم ہمیں سرے سے پہچاننے سے ہی انکار کر دیتے تو ہم بھلا تمہارا کیا بگاڑ لیتے؟''

''میری تم سے تو کوئی دشمنی نہیں ہے جیون خان'' میں نے اس صورت حال سے چھٹکارا پانے کی ترکیب سوچتے ہوئے کہا۔ وہ سب تربیت یافتہ افراد تھے اور انہیں دھوکا دینا بہت مشکل تھا' وہ آسانی سے قابو میں آنے والے نہیں تھے۔ ہتھیاروں کے استعمال پر انہیں پوری طرح عبور حاصل تھا۔ وہ اپنی انگلی

کی محض ایک جنبش سے ہمیں زندگی سے محروم کر سکتے تھے۔ وہ لوگ میری کارگزاریوں سے پوری طرح آگاہ تھے لہٰذا پوری طرح چوکنا تھے۔

''دشمنی! دشمنی کیا چیز ہوتی ہے سیفل؟ میرے جیسے وفادار کارندے کی دوستی اور دشمنی اپنے مالک کے ایماء پر ہوتی ہے' میں نے اپنے مالکوں کا نمک کھایا ہے۔ تم نے رتا سائیں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے' اسے دیکھ کر میں نے قسم کھائی تھی کہ تجھے مردہ کتے کی طرح گھسیٹتا ہوا' اپنے مالکوں کے قدموں میں لا کر ڈالوں گا۔ لہٰذا اب میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

جیون خان کی آنکھوں میں خون ابل رہا تھا۔ وہ وفادار کتے کے مانند حق وفاداری نبھانے کے لیے بے تاب تھا۔ اسے اپنی نمک خواری ثابت کرنے کی بہت فکر تھی۔ وہ کسی قیمت پر مجھے بخشنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اگر میں ذرا سی بھی الٹی سیدھی حرکت کرتا تو وہ بلا دریغ مجھے گولی مار دیتا۔ اتنے قریب سے نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ لوگ پوری تیاری سے آئے تھے۔ ان کے پاس رسیاں بھی موجود تھیں جن سے وہ ہمیں باندھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

''میں نے رتا سائیں کے ساتھ جو کچھ کیا وہ۔۔۔'' میں کن انکھیوں سے فقیر بابا کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ اچانک میری آنکھوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا کہ میرا جملہ میرے حلق میں اٹک گیا۔ میں نے دیکھا کہ اچانک فقیر بابا کا استخوانی ہاتھ کالے ناگ کے پھن کے مانند تیزی سے حرکت میں آیا اور اس شخص کے گھٹنے کے جوڑ کے قریب ٹکرایا۔ اس کے سوکھے سڑے ہاتھ کے اس ستون جیسے پاؤں کے ساتھ ٹکراتے ہی وہ دیوہیکل شخص ایک دم لڑکھڑایا اور ایک زوردار دھماکے کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ بالکل ساکت و صامت پڑا تھا۔

اس شخص کے زمین پر ٹکرانے کے دھماکے نے دونوں پستول برداروں کو بری طرح چونکا دیا اور وہ اس طرف متوجہ ہو گئے۔ میرے لیے اتنا موقع بہت تھا۔ میں نے اپنے کولہوں کے بل گھوم کر اپنی ٹانگوں کو لکڑی کے شہتیروں کے مانند ان دونوں کی ٹانگوں پر مارا۔ میرے حملے میں اس قدر وحشیانہ شدت تھی کہ وہ ایک جھٹکے سے اچھلے اور بری طرح زمین پر گر پڑے۔ وہ اس بری طرح پتھریلی زمین سے ٹکرائے تھے کہ ان کے پستول ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر اٹھتے' میں نے کھڑے ہو کر ایک زوردار لات جیون خان کے سینے پر ماری۔ اس اثنا میں دوسرا شخص بھی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میری ایک لات نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد میں نے انہیں سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مردہ کتوں کے مانند زمین پر ڈھیر تھے۔ ان کے اندر ہاتھ اٹھانے کی بھی سکت نہ تھی۔ ان کا تیسرا ساتھی پہلے ہی کسی پراسرار طریقے سے فقیر بابا کے ہاتھوں انٹا غفیل ہو چکا تھا۔

میں جس دوران میں' ان دونوں سے نبرد آزما تھا فقیر بابا بڑی دلچسپی سے یہ تمام تماشا دیکھ رہا تھا۔

جب میں نے انہیں زیر کر لیا تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی' ''بہت خوب۔ اچھا مزہ چکھایا ہے تم نے ان پالتو کتوں کو۔''

''لیکن۔۔۔ لیکن بابا تم نے اس موٹے سور کے ساتھ کیا کیا ہے؟'' میں نے حیرت سے اس

ساڑھے چھ فٹ لمبے اور تین من وزنی شخص پر نظر ڈالی جو لاش کے مانند زمین پر ڈھیر تھا۔ اس کا پستول والا ہاتھ بڑے بے تکے انداز میں اس کے بھاری بھرکم جسم کے نیچے دبا ہوا تھا۔

''بتا دوں گا سب کچھ بتا دوں گا' پہلے ان تینوں کو ذرا اچھی طرح سے قابو کر لو'' فقیر بابا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ان تینوں میں سے ایک کے پاس نائلون کی رسی کا لچھا موجود تھا۔ میں نے ان تینوں کے ہاتھ پاؤں اچھی طرح جکڑ کر انہیں غار کی دیوار کے ساتھ بٹھا دیا۔ فقیر بابا اپنے شکار کی طرف متوجہ ہوا اور اس کی پنڈلی کو انگلیوں سے دبانے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ شخص قدرے ہوش میں آ گیا۔ جیون خان اور اس کا ساتھی بھی اب قدرے بہتر حالت میں تھے اور بڑی حیرت سے فقیر بابا کی حرکتوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان تینوں کو پانی پلایا تو وہ تھوڑا بہت بولنے کے قابل ہو گئے' البتہ فقیر بابا کے ہاتھوں ضرب کھانے والا بری طرح کراہ رہا تھا۔ حالت تو ان دونوں کی بھی تباہ تھی لیکن وہ اپنی کراہوں کو ضبط کر رہے تھے۔

''ہاں تو جیون خان اب تو بتاؤ کہ کیا حال چال ہیں؟'' میں نے اپنی پنڈلی کی میان میں سے اپنا خنجر نکالتے ہوئے پوچھا۔ خنجر کو دیکھتے ہی ان تینوں کی آنکھوں میں خوف کی چمک لہرائی ''سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم لوگ اس غار تک پہنچے کیسے؟''

میں نے بغور ان کے چہروں پر نظریں جماتے ہوئے اپنے خنجر کی دھار پر انگلی پھیری۔ میری اس حرکت نے ان کی آنکھوں میں پوشیدہ خوف کو مزید نمایاں کر دیا تاہم وہ بالکل خاموش رہے۔ البتہ وہ موٹا شخص بدستور ہولے ہولے کراہتا رہا۔ ان کی خاموشی نے مجھے تھوڑا سا طیش دلا دیا۔ میں نے اپنا خنجر بے حد تیزی سے ان کی آنکھوں کے سامنے لہرایا ''کیا تم لوگوں کو رتا سائیں کا حشر یاد نہیں ہے؟'' میرے لہجے کی گرج نے انہیں لرزا کر رکھ دیا لیکن انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے حوصلے کو برقرار رکھا۔ ''اچھا تم یہ بتاؤ پہلے کس سے ابتدا کی جائے؟'' میں نے بدستور خوفناک لہجے میں کہا پھر موٹے کی آنکھوں کی طرف خنجر کی نوک بڑھائی۔

اچانک اس شخص کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ بری طرح واویلا کرنے لگا ''سمجھایا تھا بہت سمجھایا تھا۔ اس کتے کے بچے جیون خان کو کہ سردار سائیں کے حکم کے مطابق عمل کرے لیکن اس حرامی پر تو بہادری کا بھوت سوار تھا۔ یہ تو تجھے اپنے ہاتھ سے گرفتار کرنا چاہتا تھا۔''

''اپنی زبان بند رکھ حرام کی اولاد'' جیون خان نے خونی نظروں سے موٹے کو گھورا اور وہ جھجک کر خاموش ہو گیا۔

''یہ حرام کی اولاد تو اپنی زبان بند کر لے گا لیکن اب تجھے اپنی زبان کھولنا پڑے گی'' میں نے درندگی سے بھرپور لہجے میں جیون خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں تیار ہوں سیفل۔ تم میری آنکھیں نکال لو اور میری زبان بھی کاٹ دو لیکن میں اپنے مالک سے نمک حرامی نہیں کروں گا'' جیون خان کی زبان سے نکلنے والے ان الفاظ نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔ میرا خنجر حرکت میں آیا اور جیون خان کے دائیں گال پر ایک گہری لکیر کھینچ گئی جس سے فوراً

ہی خون بہنے لگا۔ ''چلاؤ اور خنجر چلاؤ لیکن تم میری زبان سے ایک لفظ بھی نہیں اگلوا سکتے'' جیون خان نے خودسر لہجے میں کہا۔

''اپنے خنجر کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں سیفل بیٹا'' فقیر بابا نے پہلی بار مداخلت کی ''تم دیکھتے جاؤ کہ یہ کیسے اپنی زبان سے سب کچھ بتاتا ہے۔''

فقیر بابا کی بات سن کر میں قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ تینوں رسن بستگان کے پاس سے ہٹ گیا اور ان کا چارج فقیر بابا نے سنبھال لیا۔ فقیر بابا نے اپنے منحنی سے جسم کے ذریعے جس قدر آسانی اور مہارت سے اس فیل تن شخص کو گرایا تھا اس کے بعد اس کی شخصیت ان تینوں کے لیے پراسرار معما بن کر رہ گئی تھی۔ وہ نفسیاتی خوف بن کر ان کے اعصاب پر سوار ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا' ہو سکتا ہے' جو کام میں اپنے خنجر کے ذریعے کرنا چاہتا ہوں' وہی کام فقیر بابا اپنے کسی شعبدے کی مدد سے کر لے۔ خود میں بھی فقیر بابا کے متعلق زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا البتہ جاننا ضرور چاہتا تھا۔ اب فقیر بابا اپنی شخصیت کی ایک اور پرت کھولنا چاہتا تھا تو میں بھلا کیوں نہ اسے موقع دیتا۔

فقیر بابا ان تینوں کے سامنے پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ان دو افراد کے ساتھ ساتھ جیون خان کے چہرے سے بھی پریشانی کے آثار ہویدا ہونا شروع ہو گئے۔ ''ہوں! تو تم نہیں بتاؤ گے کہ تم اس غار تک کیسے پہنچے اور شاہ مراد نے تمہیں کون سی ہدایت کی تھی جس پر تم نے عمل نہیں کیا؟'' فقیر بابا نے گھمبیر آواز میں پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک پراسرار چمک تھی جس نے ان تینوں کو لرزہ براندام کر رکھا تھا۔

''نن ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ میں ہرگز نہیں بتاؤں گا'' جیون خان نے اپنی ہمت مجتمع کرتے ہوئے جواب دیا۔

اسی وقت موٹا چلا اٹھا ''بتا دو اسے سب کچھ بتا دو ورنہ شیطان بوڑھا میری طرح تمہاری بھی ٹانگ توڑ دے گا۔''

فقیر بابا نے موٹے کے منہ پر بائیں ہاتھ کا جھانپڑ مارا اور وہ بلبلاتا ہوا ایک طرف لڑھک گیا۔

''سیفل تم ان دونوں کتوں کو جیون خان سے ذرا دور دور کر دو تاکہ اسے تڑپنے کے لیے زیادہ جگہ مل سکے۔'' میں اگرچہ پوری بات کو سمجھ نہیں پا رہا تھا تاہم میں نے ان دونوں کو گھسیٹ کر جیون خان سے کافی دور کر دیا۔ جیون خان خوف کے عالم میں آنکھیں پھاڑے فقیر بابا کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے خود کو پرعزم ظاہر کرنے کے لیے اپنے جبڑے سختی سے بھینچ رکھے تھے۔

فقیر بابا نے بڑے ڈرامائی انداز میں اپنی جیب سے ایک لمبا سا میلا کچیلا رومال نکالا۔ ہم سب بڑی حیرت سے اس کی حرکتوں کو دیکھ رہے تھے۔ فقیر بابا نے اس رومال کو ایک بار جھٹکا اور پھر اس کے درمیان میں ایک کنکر رکھ کر لمبائی کے رخ میں گرہ لگا دی۔ اس کے بعد اس نے اس گرہ کو جیون خان کی پنڈلی کے اندر کے رخ پر رکھ کر' اس رومال کو سختی سے اس کی پنڈلی پر باندھ دیا اور پھر بڑے اطمینان سے جیون خان کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔ پوری غار پر ایک مہیب خاموشی طاری تھی۔ ہم سب حیرت اور تجسس کے عالم میں آنکھیں پھاڑے' یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ہماری آنکھیں جیون خان کے چہرے

پر جمی ہوئی تھیں۔

چند لمحے بعد جیون خان کے چہرے پر بے چینی کے آثار نمایاں ہونے لگے پھر یہ آثار تکلیف کے تاثرات میں بدلنے لگے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ شدید تکلیف میں مبتلا ہے اور اس کی تکلیف میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے کے مسام پسینہ اگل رہے تھے اور چہرہ رفتہ رفتہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے دانتوں پر دانت جما رکھے تھے ''میں کچھ نہیں بتاؤں گا'' جیون خان کے منہ سے بمشکل نکلا۔

اچانک فقیر بابا نے بالکل اسی انداز میں جیسے سگریٹ کا گل جھاڑا جاتا ہے' اپنی درمیانی انگلی کا ناخن انگوٹھے کے پہلے پورے پر رکھا اور ہلکی سی ضرب رومال پر لگائی۔ یک لخت جیون خان کے حلق سے ایک کرب ناک چیخ بلند ہوئی اور وہ بری طرح تڑپنے لگا۔ وہ بری طرح چلا رہا تھا اور تڑپ رہا تھا۔ جیون خان کے دونوں ساتھیوں کے چہرے خوف سے پیلے پڑ گئے۔ خود میں بھی بڑی حیرت کے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد شاید جیون خان کی اذیت میں کچھ کمی ہو گئی تھی اور وہ پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔

اچانک فقیر بابا نے ایک بار پھر رومال کو ''کھٹکھٹایا'' اس بار اس نے ذرا زور سے اپنی انگلی ماری تھی۔ جیون خان کسی نیم بسمل بکرے کی طرح ڈکرایا اور بری طرح تڑپنے لگا۔ اس کا جسم یوں بل کھا رہا تھا جیسے ابھی اس کی جان نکل جائے گی۔

اپنے ساتھی کی یہ ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر میرے دائیں ہاتھ پر موجود اسیر پر جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے ہذیانی کیفیت میں مجھے کہا ''اسے روک کتیا کی اولاد ورنہ جیون خان مر جائے گا۔''

شدید طیش کے عالم میں میرا ہاتھ گھوما اور میرے سیدھے ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس نے میرے اوسان خطا کر دیے۔ میرے ہاتھ کی ضرب کھا کر اس کا منہ ایک جھٹکے سے گھوما اور پھر وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے جسم پر ہلکا سا لرزہ طاری ہوا اور پھر وہ ساکت ہو گیا۔ تھپڑ کی زوردار آواز سن کر فقیر بابا اس طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ وہ فوراً ہماری طرف لپکا اس وقت تک وہ شخص ساکت ہو چکا تھا۔ فقیر بابا نے اس کی نبض دیکھا اور پھر اس کی گردن کا جائزہ لیا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد غار کی خاموش فضا میں اس کی پرسکون آواز گونجی۔

''اس کی گردن ٹوٹ چکی ہے اور۔۔۔ یہ مر چکا ہے۔''

اچانک جیون خان اور اس کا ساتھی بری طرح چیخنے چلانے لگے۔ جیون خان ہمیں گندی گندی گالیاں دے رہا تھا جبکہ اس کا ساتھی حلق پھاڑ کر مدد۔۔۔ مدد چلا رہا تھا۔ ان دونوں کی ہی کوشش رائیگاں گئیں کیونکہ نہ تو ہم پر گالیوں کا کوئی اثر ہوا اور نہ ہی کوئی اس ویرانے میں ان کی مدد کے لیے آیا۔

فقیر بابا تو نہایت پرسکون انداز میں دوبارہ جیون خان کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن میرے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ مجھ پر ہلکی سی کپکپی طاری ہو گئی تھی۔ میں نے ایک انسان کو قتل کر دیا تھا۔ غیر ارادی طور پر ہی سہی لیکن میں نے ایک انسان کو زندگی سے محروم کر دیا تھا۔ اب میں ایک قاتل تھا۔ مجھ

میں اور سردار شاہ مراد اور اس کے بیٹے جاہ مراد میں کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ ہم سب قاتل تھے' اسی زمرے میں فقیر بابا بھی شامل تھا۔ وجوہات کچھ بھی رہی ہوں لیکن ہم سب قاتل تھے اور کسی کو زندگی سے محروم کر دینا بہر حال ایک قبیح فعل تھا اور کسی کو اس امر کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی کہ انسانی زندگی سے کھیلے۔

اس اثنا میں فقیر بابا نے جیون خان کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے جو کچھ بتایا اس نے میری ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سرد لہر دوڑا دی۔

سردار شاہ مراد ہماری توقع سے زیادہ مکار شکاری ثابت ہوا۔ اس نے جب دیکھ لیا کہ ہانکا کرنے کا کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا ہے تو اس نے ہمارے لیے جال پھیلا دیے۔ اس کے ذہن میں یہ خیال اچھی طرح جم چکا تھا کہ میں اسی علاقے میں کسی جگہ کسی خفیہ پناہ گاہ میں چھپا ہوا ہوں۔ اسے پورا یقین تھا کہ مجھے کوئی مددگار مل گیا ہے جس کی وجہ سے مجھے اپنی کمین گاہ سے نکلنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ اس صورت حال میں' اس نے ہمارے ذہنوں سے سوچنے کی کوشش کی اور اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب رہا۔ اس نے نہایت کامیابی سے ہمیں یہ تاثر دیا کہ وہ اس علاقے کی طرف سے مایوس ہو چکا ہے اور اب اپنے تمام کارندے یہاں سے ہٹا رہا ہے۔ دوسری طرف اس کے کارندوں کی فوج اس چھوٹے سے قصبے کے ایک ایک باشندے کی چھان بین کر چکی تھی۔ سردار یاہ مراد کو یقین ہو چلا تھا کہ میرا مددگار اس قصبے سے تعلق نہیں رکھتا۔ البتہ یہ بات یقینی تھی کہ اسے راشن وغیرہ کی فراہمی کے لیے جلد یا بدیر اسی قصبے میں آنا تھا' چنانچہ اس نے اپنے تین کارندوں کو کسی مشکوک چہرے کی گھات میں بٹھا دیا اور اپنے باقی کارندوں کو قصبے سے ہٹا لیا۔ اس کے یہ تینوں کارندے ایسی پوشیدہ جگہوں پر چھپے ہوئے تھے کہ انہیں آسانی سے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ ان تینوں کارندوں کو سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ کسی مشکوک شخص کو تلاش کرنے کے بعد' نہایت خاموشی سے اس کی نگرانی کریں۔ انہیں ہرگز ہرگز اس سے باز پرس نہیں کرنی تھی اور اگر وہ شخص کسی طرف روانہ ہوتا تو انہیں نہایت ہوشیاری سے اس کا تعاقب کرنا تھا اور اس کی پناہ گاہ سے واقف ہونے کے بعد چپ چاپ واپس لوٹ آنا تھا اور فوراً سردار شاہ مراد کو اطلاع پہنچانی تھی۔

سردار شاہ مراد کی شاطرانہ منصوبہ بندی پوری طرح کامیاب رہی۔ فقیر بابا قصبے میں پہنچا اور فوراً ہی اس کے کارندوں کی نظر میں آ گیا۔ وہ نہایت ہوشیاری سے اس کی نگرانی کرنے لگے۔ جب فقیر بابا نے کھانے پینے کی چیزوں کی اچھی خاصی مقدار خریدی تو ان کا شک یقین میں بدلنے لگا۔ انہوں نے نہایت ہوشیاری سے فقیر بابا کی پناہ گاہ تک اس کا تعاقب کیا۔ جیون خان ایک طرح سے ان تینوں میں معتبر حیثیت کا حامل تھا' وہی ان دونوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ جیون خان فقیر بابا کے ساتھ ساتھ غار کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے ہماری گفتگو سنی اور پھر میری ایک جھلک دیکھ کر اس نے مجھے اچھی طرح پہچان لیا۔

اس مرحلے پر اس سے وہ سنگین غلطی سرزد ہوئی جس کی وجہ سے اسے موجودہ ہزیمت کا شکار ہونا پڑا۔ اس نے سردار شاہ مراد کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ہماری کمین گاہ سے واقفیت حاصل کر لی لیکن

سردار شاہ مراد کو اطلاع دینے کے بجائے اس نے براہ راست ہمیں گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھیوں نے دبے لفظوں میں مخالفت کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں اس کی بات ماننی پڑی۔ اس نے انہیں یہ کہہ کر قائل کر لیا کہ ان کا حریف ایک کمزور سا بوڑھا تھا' جس کی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس طرح انہیں درحقیقت صرف مجھ سے نمٹنا ہے اور اگر مجھے بے خبری کے عالم میں دبوچ لیا جائے تو میں کچھ بھی نہیں کر پاؤں گا۔ انہوں نے بڑی چابک دستی سے اپنے منصوبے پر عمل کیا اور ہم لوگوں کو حسب توقع ''زیر'' کر لیا لیکن انہیں فقیر بابا کے متعلق جو غلط فہمی تھی وہی ان کو لے ڈوبی۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اس مسکین سے بوڑھے کے پٹارے میں ایسے ایسے شعبدے پوشیدہ ہیں۔ اسی بے خبری نے انہیں خاک چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انہیں ہی کیا خود مجھے بھی فقیر بابا کے متعلق صحیح اندازہ نہیں تھا۔ اتنا تو خیر میں سمجھ چکا تھا کہ وہ ایک بہت گہرا شخص ہے اور اپنے متعلق بہت مشکل سے کچھ بتاتا ہے لیکن مجھے علم نہیں تھا کہ وہ اتنے خطرناک داؤ پیچ جانتا ہے۔ اس کی اسی فنکاری کے نتیجے کے طور پر جیون خان کیسی رٹے ہوئے طوطے کے مانند سب کچھ فر فر دہرا رہا تھا۔ جبکہ اس سے پہلے اس نے میرے خنجر کی تیز دھار کے سامنے ہار ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

''اب ان کا کیا کریں بابا؟'' میں نے فقیر بابا سے پوچھا۔

''تمہیں نہیں معلوم کہ ان کا کیا کرنا ہے؟'' فقیر بابا کی آنکھوں میں خوف ناک چمک تھی۔ جیون خان نے شاید اس کے لہجے میں پوشیدہ موت کی بو محسوس کر لیا تھا لہٰذا اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔

''ہمیں مت مارو...... خدا کے واسطے ہمیں معاف کر دو۔ ہمیں مت مارو۔'' جیون خان بری طرح سے واویلا کر رہا تھا فریاد کر رہا تھا لیکن فقیر بابا ٹس سے مس نہ ہوا۔

''عورتوں کی طرح بین مت کرو جیون خان۔ مردوں کی طرح کھلے ہاتھوں سے موت کا استقبال کرو۔ تم تو شاہ مراد کے بہت بہادر کارندے ہو' تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے؟''

''نہیں نہیں' میں توبہ کرتا ہوں۔ میں سردار پر لعنت بھیجتا ہوں' بس تم ایک بار مجھے بخش دو'' جیون خان نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''بس اتنی ہی وفاداری اور نمک خواری تھی تمہاری۔ نہیں جیون خان تمہیں مرنا ہی پڑے گا۔ البتہ تمہارے ساتھ اتنی رعایت ہو سکتی ہے کہ تمہیں نہایت پرسکون نیند کے انداز میں موت کے منہ میں پہنچا دیا جائے'' فقیر بابا کی آواز میں پھنکار تھی۔

''نہیں نہیں' ایسا مت کرو۔ مجھ پر رحم کرو۔''

''کیا تم نے کبھی کسی مظلوم پر رحم کیا تھا جیون خان؟'' میں نے پہلی بار ان کے درمیان مداخلت کی ''ذرا یاد کرو کہ تم نے رتا سائیں کے ایماء پر کتنے مظلوم افراد کو کوڑے مار مار کر ان کی کھال کھینچی۔ تم تو میری بھی کھال کھینچنا چاہتے تھے۔ نہیں جیون خان تم رحم کے قابل نہیں ہو۔ تم خوش قسمت ہو کہ بابا تمہیں اتنی آسان موت سے نواز رہے ہیں' ورنہ تم تو اس قابل ہو کہ۔۔۔''

اچانک جیون خان کے منہ سے مغلظات کا طوفان ابل پڑا۔ فقیر بابا کے ہاتھ میں موجود رومال

حرکت میں آیا اور اس کی گرہ جیون خان کی کنپٹی سے ٹکرائی۔ وہ یک دم اس طرح خاموش ہو گیا جیسے ٹیپ ریکارڈ کا بٹن آف ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھیں بے نور سی ہو گئیں تھیں۔ دوسرے شخص پر شاید یہ سب کچھ دیکھ کر سکتہ طاری ہو گیا۔ فقیر بابا کا رومال ایک بار پھر حرکت میں آیا اور وہ شخص بھی ایک جھٹکے سے بے حس و حرکت ہو گیا۔

''کیا یہ دونوں مر گئے ہیں بابا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں یہ صرف بے ہوش ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے ان کا کام کر دیا جائے۔'' میں نے فقیر بابا کے سوال کا جواب صرف گردن ہلا کر دیا تھا۔ میں اس فیصلے سے زیادہ خوش نہیں تھا لیکن ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ فقیر بابا نے مجھے زحمت نہیں کرنے دی۔ وہ سیدھا جیون خان کی طرف بڑھا۔ اپنا ہاتھ اس کی گردن کے گرد لپیٹا اور اس کی گردن کو ایک خاص زاویے پر جھٹکا دیا۔ ہلکی سی کڑک کی آواز ابھری اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ فقیر بابا نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا تھا۔ جیون خان ایک پرسکون موت سے ہم کنار ہو چکا تھا۔ فیقر بابا نے یہی سلوک جیون خان کے دوسرے ساتھی کے ساتھ کیا۔ اس کے بعد ان کی لاشوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ڈال دیا۔

''اب ان تینوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانا پڑے گا؟'' میں نے فقیر بابا سے پوچھا۔

''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے'' فقیر بابا نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا ''اب یہی غار ان تینوں کی قبر بنے گی۔ اب ہمارا اس علاقے میں مزید ٹھہرنا' موت کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ ہم اپنی خوش قسمتی کی وجہ سے سردار شاہ مراد کے ایک داؤ سے تو بچ گئے لیکن شاید اس کا دوسرا داؤ' ہمیں سیدھا موت کے منہ میں پہنچا دیے۔

''لیکن ہم کہاں جائیں گے بابا؟'' میں نے دل ہی دل میں فقیر بابا کی بات کی معقولیت تسلیم کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ اب قسمت پر منحصر ہے بیٹا کہ اب وہ ہمیں کہاں لے کر جاتی ہے لیکن اب ہمیں فوری طور پر یہاں سے کوچ کرنا پڑے گا۔ اگر ہم صبح ہونے سے پہلے پہلے اس علاقے سے نہ نکلے تو شاید کبھی بھی یہاں سے نہ نکل پائیں۔''

ہم لوگوں نے فوراً ہی اپنا سامان اکھٹا کیا ہمارے پاس جو کچھ بھی تھا وہ فقیر بابا کے گداگری کے جھولے اور میرے تھیلے میں سما گیا۔ ہم نے بہ غور جائزہ لے کر غار سے اپنی موجودگی کے ایک ایک ثبوت کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد ہم غار سے باہر نکل آئے۔

''ہمیں غار کے منہ کو اس طرح سے بند کرنا ہے کہ باہر سے اس کی موجودگی کا پتا نہ چل سکے'' فقیر بابا نے کہا اور میں نے سر ہلا کر اس کی تائید کی۔

یہ ایک بے حد کٹھن مرحلہ تھا۔ ہمیں غارز کا منہ پتھروں سے بند کرنے میں کافی وقت لگ گیا۔ بالآخر ہم اس کام سے بھی فارغ ہو گئے۔ اس کے بعد ہم پہاڑی سے نیچے اتر آئے اور خشک برساتی نالے میں ایک طرف چلنے لگے۔ ہم نے غار سے نکلنے سے پہلے خشک خوراک کا اچھا خاصا ذخیرہ اپنے

ساتھ لے لیا تھا اور اپنی چھاگلیں بھی پانی سے لبالب بھر لی تھیں۔ اسلحے میں سے میں نے اپنے کولٹس پستول پر اکتفا کیا۔ جبکہ فقیر بابا نے ایک ریوالور اور ایک پستول اپنے جھولے میں ڈال لیا تھا۔ اس کے علاوہ ہم نے گولیوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ بھی ساتھ لے لیا۔ میرا ساتھی خنجر تو ہمیشہ کی طرح میرے ساتھ تھا ہی۔

کچھ ہی دور چلنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم لوگوں کا رخ سیدھا سخی سائیں کے دربار کی سمت ہے۔

"یہ ہم کہاں جا رہے ہیں بابا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"سردار شاہ مراد نے ہماری سوچ کو پہلے سے سمجھ کر ایک چال چلی تھی بیٹا' اب ہم اس کی توقع سے بالکل الٹ عمل کریں گے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا بابا؟" میں نے بدستور حیرانی کے عالم میں پوچھا۔

"مطلب یہ کہ سردار شاہ مراد کو پختہ یقین ہو گا کہ اگر ہم یہاں سے فرار ہوں گے تو ہمارا رخ سیدھا بلوچستان کی طرف ہو گا کیونکہ شہر ہمارے لیے موت کے پھندے کی طرح ہے۔ ہم اس کے اسی یقین سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اس وقت ہم شہر کی طرف چل رہے ہیں۔ اس وقت تم جس فقیرانہ حلیے میں ہو' اس میں کسی کا باپ بھی تمہیں نہیں پہچان سکتا۔ کتوں سے محفوظ رہنے کے لیے تمہاری جیب میں کراماتی بوٹی کی پوٹلی موجود ہے۔ یہ نالا سخی داتا کے دربار کے پاس مڑ کر سیدھا شہر کی طرف چلا جاتا ہے۔ چند کلومیٹر چل کر یہ لورالائی روڈ کراس کرے گا۔ یہاں سے پہاڑیوں کا سلسلہ تقریباً ختم ہو جاتا ہے۔ سڑک سے کافی فاصلہ رکھ کر شہر کی سمت سفر کریں گے۔ فی الحال ہم کسی گاڑی میں سفر کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ ویسے بھی سواری میں ایک فقیر فوراً تمام لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے اور تمام لوگ ایک دوسرے سے بڑھ کر اس سے حقارت کا اظہار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم لوگ مسلسل سفر کرتے رہیں تو کل دوپہر نہیں تو کل شام تک شہر کے قریب پہنچ جائیں گے۔"

"لیکن شہر میں پہنچ کر ہم ٹھہریں گے کہاں؟"

میری بات سن کر فقیر بابا نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا "تم بھول رہے ہو کہ اب تم ایک فقیر ہو اور تمام دنیا فقیر کا ٹھکانا ہوتی ہے' جہاں رات پڑ جائے وہی اس کی منزل ہوتی ہے اور جو کچھ پہننے کو مل جائے وہی اس کا لباس ہوتا ہے۔ ویسے تم فکر نہ کرو میں کئی ایسے ٹھکانے جانتا ہوں جہاں ہماری موجودگی پر کوئی معترض نہیں ہو گا۔ وہیں سے ہمیں کچھ نہ کچھ کھانے کو بھی مل جائے گا۔ ویسے ڈیرہ غازیخان غریب شہر ضرور ہے لیکن وہاں دل والوں کی سخیوں کی کمی نہیں ہے۔"

اس اثنا میں ہم دونوں سخی سرور داتا کے دربار کے عین نیچے پہنچ چکے تھے۔ بہت بلندی پر سخی سائیں کے دربار میں روشنی ہو رہی تھی۔ ہم نے دل ہی دل میں سخی سائیں کے حضور سلام پیش کیے۔

یہ جگہ ہمارے لیے خطرناک ہے لہٰذا تیزی سے یہاں سے نکل چلو' فقیر بابا نے جلدی جلدی ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور اپنی رفتار بڑھا دی۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

ہم بہت تیزی سے چلے جا رہے تھے۔ سخی سرور سلطان کا مزار بہت پیچھے رہ گیا۔ مہینے کی آخری راتیں تھیں لیکن اس کے باوجود رات بالکل تاریک نہیں تھی اور ہمیں نالے کی ریت پر چلنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

اچانک مجھے ایک عجیب سا خیال آیا۔ اس پہلو پر تو میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ جوں جوں میں اس بارے میں سوچ رہا تھا میری حیرانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر میں نے اپنے خیالات کو زبان دے دی۔

"ایک بہت ہی عجیب بات پر آپ نے دھیان نہیں دیا بابا؟"

"کون سی بات بیٹا!" فقیر بابا نے استفسار کیا۔

"جس وقت غار میں تم جیون خان سے پوچھ گچھ کر رہے تھے تو اس کے ساتھی نے مجھے گالی دی تھی اور میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا' کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ میرے صرف ایک تھپڑ سے اس کی گردن ٹوٹ گئی اور وہ مر گیا۔"

"واقعی یہ ہے تو بے حد حیرت کی بات لیکن ہو سکتا ہے کہ تمہارا ہاتھ اس کے چہرے پر ایسے زاویے سے پڑا ہو کہ اس کی گردن ٹوٹ گئی ہو" فقیر بابا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"لیکن بابا اس کی گردن کوئی نرم و نازک گڑیا کی گردن تو نہیں تھی کہ ذرا سی ٹھیس لگے اور ٹوٹ جائے۔ وہ ایک اچھا خاصا تندرست و توانا جوان تھا۔ اگر میں اس کے کوئی زوردار قسم کا گھونسا مارتا تو پھر ایک الگ بات تھی لیکن صرف ایک تھپڑ سے...... کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"دنیا میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بہت دیر سے سمجھ میں آتی ہیں۔ اسے بھی ایک ایسی ہی بات سمجھ کر بھول جاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بھی بعد میں خود بہ خود سمجھ میں آ جائے۔"

سورج کی پہلی کرن زمین پر اتری تو ہم اس جگہ سے کافی دور نکل آئے تھے۔ پہاڑی علاقہ کافی پیچھے رہ گیا تھا اور اب ہم بنجر میدانی علاقے میں سفر کر رہے تھے۔ فقیر بابا اچھی خاصی بڑی عمر کا ہونے کے باوجود مجھ سے بڑھ کر پھرتی اور تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ہمارے آس پاس جا بجا خاردار اور خود رو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں سڑک کے متوازی سفر کر رہے تھے لیکن ہمارا سڑک سے فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ ہمیں سڑک سے دیکھا جانا ممکن نہیں تھا۔

کافی دیر تک مسلسل چلنے کے بعد بالآخر فقیر بابا ایک اونچی سی جھاڑی کے سائے میں بیٹھ گیا۔ وہاں بیٹھ کر ہم نے پانی پیا اور مٹھی بھر چنے اور گڑ کھایا' اس طرح سے گویا ہمارا صبح کا ناشتا ہو گیا۔ پانی پینے کے بعد فقیر بابا نے ایک نظر اپنے سامنے دور تک پھیلے بنجر میدان پر ڈالی اور مجھ سے پوچھا "فرض کرو اس قسم کے علاقے میں سفر کرتے ہوئے تمہارا پانی کا ذخیرہ ختم ہو جائے تو تم کیا کرو گے؟"

میں تو اس بھیانک تجربے سے گزر چکا تھا لہٰذا میں نے خوف کی ہلکی سی لہر محسوس کرتے ہوئے کہا" کروں گا کیا؟ بس پیاس سے ایڑیاں رگڑ کر جان دے دوں گا۔"

"ہوں۔۔ ایسا کرو کہ اپنا خنجر مجھے دو" فقیر بابا نے حکم دیا۔ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے قدرے

ہچکچاہٹ کے ساتھ اپنی پنڈلی کی نیام سے نکال کر اپنا خنجر اس کے حوالے کر دیا۔

فقیر بابا میرے خنجر کو لے کر قریب اگے ہو گئے ایک ناگ پھنی کے پودے کی طرف بڑھا۔ پودے کے پاس بیٹھ کر اس نے پودے کی جڑوں کے آس پاس کی زمین کھودنا شروع کر دی۔ کافی گہرائی تک کھودنے کے بعد جب پودے کی جڑیں نظر آنے لگیں تو اس نے بڑی احتیاط سے پودے کی جڑوں کو اکھاڑ کر پورا پودا زمین سے نکال لیا۔ میں بڑی حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کرنا کیا چاہتا ہے۔ جب پودا زمین سے باہر آ گیا تو اس نے بڑی مہارت سے پودے کی جڑوں کے نچلے حصے کو خنجر کی مدد سے تراش دیا۔ میں نے دیکھا کہ جونہی فقیر بابا نے جڑوں کو تراشا جڑوں کے کٹے ہوئے حصے سے شفاف سیال مادے کے قطرے ٹپک پڑے۔

''اسے چوسو'' فقیر بابا نے پودے کی جڑ والے حصے کو میری طرف بڑھایا۔ میں نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد جڑوں سے رسنے والے مائع کو چوسنا شروع کر دیا۔ اس مائع کا ذائقہ اگرچہ قدرے کسیلا تھا تاہم وہ بلاشبہ پانی تھا۔ ''اس طرح ہر پودا اپنی جگہ پر پانی کے ایک چھوٹے سے چشمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو کم از کم وقتی طور پر پیاس سے نجات دلا سکتا ہے۔'' فقیر بابا نے مجھے سمجھایا ''اس کے علاوہ اور بھی کئی ایسے پودے ہیں جو اپنے تنوں اور جڑوں میں پانی ذخیرہ کر کے رکھتے ہیں۔ ضرورت صرف انہیں پہچاننے کی ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں ایک بار پھر تسلیم کیا کہ میری حیثیت فقیر بابا کے مقابلے میں طفل مکتب سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر وہ زندگی لینا جانتا ہے تو زندگی دینا بھی جانتا تھا۔ میں نے موقع مناسب جان کر فقیر بابا سے پوچھا ''بابا اب تو مجھے بتا دیں کہ آپ نے اس وقت کس طرح اس موٹے کو بے ہوش کیا تھا اور بعد میں جیون خان کا منہ کھلوایا تھا؟''

''یہ ایک بے حد قدیم فن ہے بیٹا'' فقیر بابا نے اٹھ کر دوبارہ چلتے ہوئے کہنا شروع کیا ''پرانے زمانے میں اس فن کے ماہر اکثر ٹھگ اور چور ہوا کرتے تھے جو چٹکیوں میں اپنے شکار کو بے بس کر کے اس کا مال اسباب لوٹ لیا کرتے۔ یہ دراصل رگوں اور اعصاب کا کھیل ہے۔ اس فن کا ماہر انسانی جسم کے تمام نازک مقامات سے واقفیت رکھتا ہے۔ اسے علم ہوتا کہ کس مقام پر کس طرح کی ضرب لگا کر مد مقابل کو بے بس کیا جا سکتا ہے۔ ان دنوں میں پاک پتن میں بابا فرید گنج شکر کے مزار پر حاضر تھا کہ میں نے ایک آوارہ گرد فقیر کی مدد کی۔ وہ شدید گرمی کا شکار تھا' جس وجہ سے اس کے ہاتھ پیروں کے ناخن بری طرح پک گئے تھے۔ وہ بری طرح سے تڑپ رہا تھا۔ اتفاق سے میں اس مرض کے دیسی علاج سے واقف تھا۔ میں نے نیم کے پیڑ کے پھولوں اور پتوں کا عرق نکال کر پانی میں ملایا اور مسلسل پندرہ دن تک اسے پلایا۔ خدا نے اپنا فضل کیا اور وہ شفایاب ہو گیا۔ وہ میرا بے حد احسان مند تھا۔ چنانچہ اس نے مجھ سے رخصت ہونے سے پہلے مجھے اس فن کے چند رموز سے آگاہ کیا اور مجھے چند داؤ سکھائے' میں نے رات کو جو کچھ کیا' وہ اسی فن کا ایک نمونہ تھا۔''

''یہ تو بڑا زبردست فن ہے بابا۔ کیا تم مجھے یہ فن نہیں سکھاؤ گے؟''

''سکھاؤں گا بیٹا' ضرور سکھاؤں گا۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے اب وہ تمہارا ہی ہے۔ اس فن کی بنیاد دراصل مہارت اور چابک دستی پر ہے۔ ہمیں جونہی ذرا سکون سے سانس لینے کا موقع ملا' میں تمہیں کم از کم اتنا ضرور سکھا دوں گا جتنا کہ میں خود جانتا ہوں۔''

دوپہر کے وقت ہم ایک بار پھر ایک جھاڑی کے سائے میں ٹھہرے اور ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا جو باجرے کی میٹھی ٹکیوں پر مشتمل تھا۔ کھانا کھانے اور پانی پینے کے بعد فقیر بابا نے ہمارے پاس موجود رقم کا جائزہ لیا۔ میرے پاس تقریباً گیارہ ساڑھے گیارہ ہزار روپے کی رقم تھی جبکہ فقیر بابا کے پاس تقریباً ساڑھے سترہ ہزار روپے تھے جو اس کی سالہا سال کی کمائی تھی۔ ہم دونوں کے پاس اچھی خاصی رقم تھی۔

چھوٹے بڑے نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر مجھے اچانک اس مہربان خاتون آیا جس نے شدید ترین پیاس کے عالم میں مجھے ٹھنڈے میٹھے پانی سے سیراب کیا تھا اور مجھے زبردستی پانی کی بھری ہوئی چھاگل دی تھی تاکہ میں راستے میں پیاس کی وجہ سے پریشان نہ ہوں۔ اس حرماں نصیب غریب عورت کا اکلوتا بیٹا صرف دس ہزار روپے کی رقم کی وجہ سے اس بدخصلت وڈیرے کی حویلی میں یرغمال بنا ہوا تھا اور شدید مشقتیں برداشت کر رہا تھا۔ اس وقت میرے پاس اتنی رقم موجود تھی کہ میں بآسانی اس کے بیٹے کو چھڑا سکتا تھا۔

''بابا تم کو یاد ہے نا کہ میں نے تمہیں ایک مہربان عورت کے بارے میں بتایا تھا جس نے مجھے شدید پیاس کے عالم میں پانی پلایا تھا۔''

''ہاں بیٹا مجھے اچھی طرح یاد ہے' اس کا نام شادو تھا نا؟''

''میرا اندازہ ہے کہ ہم شادو کے گھر کے آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے پاس موجود رقم میں سے دس ہزار روپے لے جا کر اس نیک دل عورت کو دے دوں تاکہ وہ اپنے بیٹے کو اس شیطان صفت زمیں دار کے چنگل سے چھڑا لے۔''

''تمہارا ارادہ تو بہت نیک ہے بیٹا اور رقم کا اس سے بہتر مصرف اور کوئی ہو بھی نہیں سکتا لیکن تمہارے بیان کی روشنی میں اس عورت کا جھونپڑا سڑک کے پار کسی جگہ ہو گا۔ ہم دن کی روشنی میں سڑک کے قریب جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ ایسا کرتے ہیں کہ شام تک یہیں قیام کرتے ہیں۔ شام ہوتے ہی ہم اس کے گھر کو ڈھونڈنے نکلیں گے اور پھر چپ چاپ یہ رقم اس کے حوالے کر کے واپس آ جائیں گے اور رات کو پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ امید ہے کہ شام کے بعد اس عورت کا شوہر بھی گھر پر موجود ہو گا۔''

فقیر بابا کی تجویز حسب معمول بے حد معقول تھی' لہٰذا ہم اسی جگہ ٹھہر گئے۔ جب سورج ڈھلنے لگا تو ہم دونوں سڑک کی طرف روانہ ہو گئے۔ شام ہوتے ہی لورالائی روڈ پر چلنے والا ٹریفک کافی کم ہو گیا تھا۔ اب اکا دکا ٹرک ہی اس پر سے گزر رہے تھے۔ سڑک تک پہنچتے پہنچتے رات کا اندھیرا پوری طرح پھیل گیا۔ مناسب موقع دیکھ کر ہم نے سڑک پار کر لی۔ میں نے فقیر بابا کو اندازاً بتایا کہ اس کا گھر سڑک سے

کتنا فاصلہ پر ہوگا۔ ہم اتنا ہی فاصلہ رکھ کر اس مکان کو تلاش کرنے لگے۔ اس مکان کی سب سے خاص نشانی تو یہ تھی کہ وہ اس علاقے میں تنہا مکان تھا اور اس کے آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ اگر وہ آس پاس ہی کہیں موجود تھا تو پھر اس میں موجود روشنی ہمیں دور سے نظر آ جانی چاہیے تھی۔

ہم دونوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر ہمیں دور دور تک کہیں روشنی کی جھلک نظر نہیں آئی۔ ہم نے اندازہ لگا کر ایک طرف چلنا شروع کیا لیکن ہمیں اس مکان کا یا جھونپڑے کا کوئی سراغ نہ ملا۔ ہمیں شک ہونے لگا کہ کہیں ہم غلط جگہ تو اس جھونپڑے کو تلاش نہیں کر رہے لیکن میرے دماغ میں جو نشانات ثبت تھے' ان کے مطابق وہ جھونپڑا یہیں کہیں واقع تھا۔ ہم دونوں مایوس ہو کر پلٹنے ہی والے تھے کہ اچانک وہ جھونپڑا ہمارے سامنے آ گیا۔ اس اچانک کامیابی سے میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ جب میں دس ہزار روپے کی خطیر رقم اس نیک دل عورت کے ہاتھ پر رکھوں گا تو وہ کس قدر خوش ہوگی۔ یہ غیر متوقع غیبی امداد پا کر اس کے شوہر کا کیا حال ہوگا۔

جب ہم دونوں اس جھونپڑے کے دروازے کے سامنے پہنچے تو ہمیں ایک پر اسرار سے سکوت کا احساس ہوا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس گھر میں کوئی ذی روح موجود نہیں ہے۔ گھر کے اندر سے روشنی کی ہلکی سی رمق بھی باہر نہیں جھلک رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے برسوں سے یہ جھونپڑا غیر آباد اور اجاڑ ہو۔

میرے دل میں طرح طرح کے خدشات سر اٹھانے لگے۔ فقیر بابا بھی بہ غور حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے پر دستک دی۔ پہلی دستک کا کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ میں نے دوسری بار ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا' پورا ویرانہ دستک کی آواز سے مضطرب ہوا۔ اس بار جھونپڑے کے اندر ذرا سی کھٹ پٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ کوئی دروازے کے قریب آیا اور میں نے ایک پژمردہ سی مردانہ آواز سنی۔ “کون ہو بھائی۔۔۔؟”

“ہم۔۔۔ ہم مسافر ہیں بھائی۔۔۔ اور ہمیں تمہاری مدد درکار ہے۔”

“میں تمہاری کیا مدد کروں گا بھائی' اندر سے وہی شکستہ سی آواز آئی “خیر اب تم لوگ آ ہی گئے ہو تو......” اس شخص نے دروازہ کھول دیا۔ اندھیرے کی وجہ سے اس شخص کے چہرے کے نقوش تو نظر نہیں آ رہے تھے تاہم اتنا اندازہ ضرور ہو رہا تھا کہ وہ ایک دراز قامت شخص ہے۔ “آؤ بھائیو۔۔۔ بیٹھو۔ بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں' اس شخص نے ہم دونوں کو اسی چھوٹی سی چارپائی پر بٹھا دیا جس پر میں پہلے بیٹھا تھا۔ قریب ہی لوہے کے چھوٹے سے صندوق پر ایک لالٹین روشن تھی۔ جس کی لو شاید ابھی اونچی کی گئی تھی۔ میں نے چارپائی پر بیٹھ کر آس پاس کا جائزہ لیا لیکن مجھے اس شخص کی بیوی کہیں نظر نہ آئی۔ اب میں نے اس شخص کے چہرے پر نظر ڈالی۔

اس کی عمر کوئی چالیس برس کے قریب ہوگی لیکن غم دوراں نے اسے ایک بوڑھے کی سی شکل دے دی تھی۔ اس کی داڑھی کے آدھے بال سفید ہو رہے تھے۔ گال اندر کو دھنسے ہوئے تھے' نتیجتاً اس کے رخساروں کی ہڈیاں باہر کو نکل آئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ویرانیوں کا ڈیرہ تھا جبکہ اس کا خستہ لباس اس

کی مالی حالت کا نوحہ سنا رہا تھا۔

“تم۔۔۔ تمہاری بیوی کہاں ہے؟” میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

“کیوں؟ میری بیوی کو تم کیسے جانتے ہو اور تمہیں اس سے کیا کام ہے؟”

اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔ اس کے اس انداز سے میں گڑبڑا سا ہو گیا۔

“میں۔۔۔ میں۔۔۔ وہ کچھ دن پہلے میں یہاں سے گزرا تھا تو اس نے مجھے پانی پلایا تھا۔ میں نے اسے بہن بنا لیا تھا۔”

“اوہ۔۔۔ اچھا تو وہ تم تھے۔ مجھے افسوس ہے بھائی کہ تمہاری بہن پاگل ہو گئی ہے' اتنا کہتے کہتے اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

“لیکن۔۔۔ لیکن وہ کیسے پاگل ہو گئی بھائی؟” جب میں یہاں سے گزرا تھا تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی” میں نے شدید حیرانی کے عالم میں استفسار کیا۔ میں واقعی بے حد حیران و پریشان تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک کیا ہو گیا تھا۔

“اس بدنصیب کا ایک ہی بچہ تھا بھائی” اس شخص نے رندھے ہوئے لہجے میں جواب دیا “پچھلے ہفتے اس کا بچہ فوت ہو گیا' اس نے اپنے بچے کی لاش دیکھی تو اس کا دماغ چل گیا۔”

اس کی بات سن کر میرے ذہن میں ایک زوردار دھماکہ ہوا۔

وہ یہ کیا کہانی سنا رہا تھا۔ اس کا بچہ تو۔۔۔

“لیکن تمہارا بچہ اچانک کیسے مر گیا بھائی؟۔۔۔ وہ تو۔۔۔ وہ تو اس وڈیرے کے پاس۔۔۔” میں نے سخت پریشانی اور دکھ کے ساتھ پوچھا۔

“تو تمہیں یہ بھی معلوم ہے۔۔۔” اس نے آنسوؤں میں بھیگے ہوئے لہجے میں کہا “ہاں وہ ڈیرے کی حویلی میں ہی تھا اور وہیں اس کی طبیعت خراب ہوئی اور وہ اسپتال جا کر مر گیا۔”

“لیکن اسے کیا ہوا تھا بھائی؟ خدا کے واسطے مجھے بتاؤ کہ تمہارے ننھے سے بیٹے نور عالم کو کیا ہوا تھا؟ وہ اس طرح اچانک کیسے مر گیا؟” میں نے گلوگیر لہجے میں دریافت کیا۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا اپنا کوئی بہت قریبی عزیز فوت ہو گیا ہو۔

“کیا کرو گے یہ سب کچھ پوچھ کر بھائی؟۔۔۔ بس اس کی موت آئی تھی' وہ مر گیا” اب اس شخص کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو بہنے لگے۔ فقیر بابا رحم طلب نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

“نہیں نہیں تمہیں بتانا پڑے گا بھائی” میں نے سخت اضطراب کے عالم میں کہا “تمہیں اپنے مرے ہوئے بیٹے کا واسطہ مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو” میری بات سن کر وہ شخص تڑپ اٹھا۔

“بتاتا ہوں بھائی بتاتا ہوں لیکن تم میرے مظلوم بچے کا واسطہ نہ دو۔ اسپتال کے ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ میرے بیٹے کا گردہ پھٹ گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کا آپریشن کرتے' وہ فوت ہو گیا” وہ شخص اب باقاعدہ آنسوؤں سے رونے لگا۔ اس کے جفاکش چہرے پر آنسوؤں کے قطرے عجیب سے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی کھچڑی داڑھی کے بال آنسوؤں سے بھیگ گئے تھے۔

میرے سینے میں حزن و ملال کا طوفان برپا تھا۔ چند ہی دنوں میں اس مختصر سے گھرانے پر کتنی بڑی قیامت بیت گئی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس گھر کے لہلہاتے گلشن پر خزاں کے منحوس سائے قابض ہو گئے تھے۔ یہ شخص شیر عالم جو کچھ بتا رہا تھا' اس پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے اس کے جوابات سے تسلی نہیں ہوئی' لہٰذا میں نے اس سے ایک بار پھر پوچھا ''مجھے کھل کر اور صاف صاف بتاؤ بھائی شیر عالم۔ مجھے بتاؤ کہ ننھے نور عالم کا گردہ کیسے پھٹا؟''

''اسے۔۔۔اسے زمیں دار برکت علی نے قتل کیا ہے بھائی۔ اسی ظالم درندے نے میرے گھر کا چراغ گل کیا۔ خدا کرے۔ خدا کرے کہ وہ تڑپ تڑپ کر' سسک سسک کر مرے۔''

''یہ۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو بھائی؟'' مجھ پر تو گویا دکھوں اور استعجاب کا سیلاب حملہ آور ہو گیا'' اس۔۔۔اس ننھے سے بچے نے' اس بد بخت کا کیا بگاڑا تھا؟ اس کی اس سے کیا دشمنی تھی؟''

''کوئی دشمنی نہیں تھی بھائی۔ بھلا ایک گندی نالی کا کیڑا اس قابل کہاں ہوتا ہے کہ اس سے وڈیرا برکت علی جیسے عالی مرتبہ لوگ بات بھی کریں۔''

''لیکن اس ننھے سے بچے کا قصور کیا تھا؟''

''اس کا قصور بہت بڑا تھا بھائی۔ اس نے سردار برکت علی کی اتنی شاندار پارٹی کا بیڑا غرق کر دیا۔ اسے کم از کم موت کی سزا تو ملنی ہی چاہیے تھی۔''

''مجھے بتاؤ تو سہی آخر ہوا کیا تھا؟''

''بتاتا ہوں بھائی بتاتا ہوں۔ اس روز برکت علی یورپ کے طویل دورے سے لوٹا تھا۔ سردار برکت علی کو اعلیٰ ترین قسم کی شرابیں پینے اور پلانے کا بے حد شوق ہے۔ اس روز رات کو سردار برکت علی کی حویلی پر ایک بے حد زبردست محفل کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اپنے انگلینڈ کے دورے کے دوران میں سردار برکت علی کو ستر سال قدیم بے حد نایاب قسم کی اسکاچ وھسکی کی بوتل ملی تھی۔ اس کے یاروں دوستوں میں اس کی اس زبردست دریافت کا بے حد شہرہ تھا۔ سب لوگ اس کے اعلیٰ ذوق کا اعتراف کرتے نہیں تھکتے تھے۔'' اتنا کہہ کر شیر عالم کے ضبط کے بندھن ایک بار پھر ٹوٹ پڑے اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ میں نے اور فقیر بابا نے مل کر بمشکل اسے خاموش کرایا اور آگے داستان سنانے پر آمادہ کیا۔

''اس روز رات کو سردار برکت علی کے تمام دوست احباب پارٹی میں مدعو تھے۔ وہ تمام لوگ بے حد پر جوش تھے کیونکہ سردار برکت علی اس رات اپنی اس نایاب شراب کے ذائقے سے انہیں محفوظ کرنے والا تھا۔'' شیر عالم کی ایک بار پھر ہچکیاں بندھ گئیں۔ ''اس روز شر شام سے ہی سردار برکت علی کے باغ میں انگیٹھیاں دہک رہی تھیں۔ قسم قسم کے کباب تکے اور روسٹ بھوننے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ننھا نور عالم سارا دن کام کر کے تھکن سے بے حال ہو رہا تھا لیکن کام تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا لیکن اس کی اصل مصروفیات تو رات گئے شروع ہوئیں۔ وہ مہمانوں کی فرمائشیں پوری کرنے کے لیے لٹو کی طرح گھوم رہا تھا۔ نیند اور تھکن کی وجہ سے اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ شب کے آخری پہر

سردار برکت علی نے اسے حکم دیا کہ وہ حویلی کے باورچی خانے میں جا کر باورچی خانے کے منتظم سے کہے کہ وہ اس قدیم و نایاب شراب کو مہمانوں کے لیے پیش کرے۔'' شیر عالم نے رک کر اپنے آپ پر قابو پایا اور پھر دوبارہ کہنا شروع کیا ''مفت کی شراب اور وافر مقدار میں کباب کھا کھا کر باورچی خانے کا منتظم خود بھی نڈھال ہو رہا تھا اور اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اس نے فریج سے نایاب شراب کی بوتل نکالی اور برف کی بھری ہوئی بالٹی میں ڈال کر ننھے نور عالم کے حوالے کر دی۔ اتنے چھوٹے بچے کے لیے یہ بالٹی بہت بھاری تھی لیکن وہ باورچی خانے کے ظالم منتظم سے بہت ڈرتا تھا' لہٰذا اسے انکار کی یا حجت کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ جیسے تیسے شراب والی بالٹی اٹھا کر باغ کی طرف لے چلا۔ حویلی کی عمارت سے باغ کی طرف جانے کے لیے اسے کئی سیڑھیاں اترنی تھیں۔ اس وقت ان سیڑھیوں پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ خدا جانے ننھے نور عالم کا پاؤں قالین کی سلوٹ میں اٹکا تھا یا وہ ویسے ہی لڑکھڑا گیا تھا' بہر حال ہوا یوں کہ اسے بالٹی میں شراب کی بوتل لاتا دیکھ کر تمام مہمانوں نے خوشی سے نعرے لگائے۔ ان مہمانوں میں پولیس کے اعلیٰ افسران بھی تھے اور ضلع کے دیگر معزز حکام بھی لیکن اس وقت ان سب پر مفت کی شراب اور کباب کا غلبہ تھا۔ ان میں سے کسی کو احساس نہیں تھا کہ ان کے لیے شراب لانے والا نو دس سال کا کم عمر بچہ ہے۔

نور عالم شاید اس اچانک شور شرابے سے بوکھلا گیا چنانچہ سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن بھاری بالٹی نے اسے سنبھلنے نہیں دیا اور وہ لڑھکتا ہوا سامنے پختہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اسے گرتا دیکھ کر تمام مہمانوں کے حلق سے چیخیں نکل گئیں' شیر عالم سانس لینے کے لیے رکا اور پھر اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ میں اور فقیر بابا سانس روکے یہ سب کچھ سن رہے تھے ''لیکن وہ لوگ اس ننھے بچے کے لیے پریشان ہو کر نہیں چیخے تھے۔ وہ تو اس ناقابل تلافی نقصان پر تڑپ اٹھے تھے جس کی وجہ سے اتنی شاندار تقریب کا مزہ غارت ہو گیا تھا۔ اس بد بخت بچے کے گرتے ہی اس کے ہاتھوں سے بالٹی چھوٹ گئی۔ اس بالٹی میں رکھی ہوئی انمول اسکاچ وھسکی کی بوتل ایک جھٹکے سے اچھلی اور پختہ فرش پر گر کر چکنا چور ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی تمام مہمان غم اور غصے کے عالم میں بری طرح چیخنے لگے۔ وہ سب اس کم نصیب خادم پر برس رہے تھے جس کی وجہ سے اتنا نقصان ہوا تھا۔'' شیر عالم ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ہم دونوں نے اس کے خاموش ہونے کا انتظار کیا لیکن اسے خود پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

''پھر۔۔۔ پھر کیا ہوا بھائی؟'' میں نے بے حد اضطراب کے عالم میں دریافت کیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت جو کیفیت میری تھی وہی کم و بیش فقیر بابا کی بھی ہو گی۔

''پھر کیا ہونا تھا بھائی'' شیر عالم نے ٹھنڈی آہ بھر کر خود پر قابو پاتے ہوئے کہا ''سردار برکت علی اس نقصان عظیم پر سخت مشتعل تھا۔ اس نے اندھا دھند نور عالم پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ اس کے پیروں میں بھاری بھرکم کوہاٹی چپل تھے۔ اس کی نہ جانے کونسی ٹھوکر کارگر ثابت ہوئی اور نور عالم ایک بھیانک چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔''

جوں جوں شیر عالم یہ دردناک قصہ آگے بڑھا رہا تھا میری حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ میرے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔

یہ تو مجھے کیا کیا کچھ دکھا رہا ہے۔ میرے رب العالمین؟

کیا یہ واقعی انسانوں کی دنیا ہے؟ نہیں انسان ایسے تو نہیں ہوتے۔ ان کی تو کچھ اور ہی شناخت بتائی گئی ہے تو پھر یہ نامانوس مخلوق کون ہے؟ شاید خونخوار درندے۔۔۔! لیکن درندے تو جنگلوں میں ہوتے ہیں پھر یہ یہاں کیوں دندناتے پھر رہے ہیں؟ شاید یہ درندے اپنی طاقت کے بل پر انسانوں پر حاوی ہو چکے ہیں اور اب انہیں کا حکم چلتا ہے' واقعی جب انسانیت کمزور و ضعیف ہو جائے تو بربریت ہی کا دور دورہ شروع ہوتا ہے اور یہ دور اپنے عروج پر ہے۔

میری رگوں میں خون ابل رہا تھا۔ جسم کی رگیں کھینچی جا رہی تھیں۔ شیر عالم جو کچھ سنا چکا تھا۔ وہ بہت کافی تھا۔ مزید سننے کی مجھ میں ہمت نہ تھی نہ طاقت۔ نفرت اور انتقام کی آگ نے میرے روئیں روئیں کو دہکا کر رکھ دیا تھا۔ اب مجھ سے وہاں بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ میرا ہاتھ بار بار میرے خنجر کی طرف بڑھتا اور پھر رک جاتا۔

فقیر بابا میری کیفیت سے پوری طرح واقف تھا اور وہ میری پیٹھ تھپک کر مجھے پرسکون کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے اس کی یہ حرکت ایک آنکھ نہ بھائی۔ میرے صبر و ضبط کی حدود ختم ہو چکی تھیں۔ اب شاید اس کے پند و نصائح کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہونے والا تھا۔ اس درندہ صفت انسان کی موت میرے ہاتھوں مقدر ہو چکی تھی۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ فقیر بابا کے لیے شاید یہ غیر متعلق معاملہ ہو لیکن میرے لیے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ میری آنکھوں میں اس بدنصیب عورت کی صورت نقش تھی جو اپنے ننھے سے بچے کی واپسی کی بے چینی سے منتظر تھی۔ اس کے اور اس کے بچے کے درمیان دس ہزار کی رقم حائل تھی اور میں یہ رقم لے آیا تھا لیکن میں نے بہت دیر کر دی تھی۔ اس کا لاڈلا بیٹا اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روٹھ کر چلا گیا تھا۔ وہ بدنصیب پاگل نہ ہوتی تو کیا ہوتی؟ اس کا تو زندہ رہنا بھی ایک معجزہ تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ یہ خبر سن کر اس کا کلیجہ کیوں نہ پھٹ گیا۔

عین ممکن تھا کہ میں اسی وقت وہاں سے اٹھ کر بھاگ نکلتا لیکن فقیر بابا نے میری باگیں مضبوطی سے قابو میں کیے رکھیں۔ وہ میری رگ رگ سے واقف ہو چکا تھا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ یہ پُر وحشت داستان سن کر میرا ردعمل کیا ہوگا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ مجھے کس طرح قابو میں رکھنا ہے۔ اس نے مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا لیکن مجھے رسیاں تڑا کر بھاگ نکلنے سے بھی باز رکھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ شیر عالم نامی وہ شخص کس حد تک میرے جذبات و احساسات سے واقف ہو چکا ہے۔ لیکن شاید اس بے چارے کو اپنے دل کے زخموں کا کرب برداشت کرنے سے فرصت نہ تھی پھر بھلا وہ مجھ پر کیا توجہ دیتا۔ فقیر بابا نے شیر عالم سے برکت علی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کیں اور شیر عالم کی پاگل بیوی کے متعلق پوچھا۔ معلوم ہوا کہ اس حرماں نصیب عورت کو تونسہ شریف کی درگاہ پر پہنچا دیا گیا تھا۔ اب یہ اس کی

قسمت تھی کہ اس کا ذہنی توازن درست ہو جاتا ہے یا وہ وہیں سسک سسک کر موت کے منہ میں چلی جاتی۔ شیر عالم جیسا تہی دست اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

فقیر بابا نے شیر عالم کو بے حد تسلی اور دلاسہ دیا۔ حالانکہ اس بے چارے کے دل کے زخموں کا بے معنی لفظوں سے کیسے درماں ہو سکتا تھا لیکن ایک مجبور انسان دوسرے انسان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کر بھی کیا سکتا تھا لیکن میں وہ کچھ کرنا چاہتا تھا جو میرے دل کی طاقتور ترین خواہش بن چکی تھی اور میں اس خواہش کی راہ میں فقیر بابا کے فہم و تدبر کب بھی رکاوٹ بننے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

جب ہم شیر عالم کے پاس سے رخصت ہو رہے تھے سو میں نے اپنے دل میں پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ میں فقیر بابا سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ اس کا جہاں جی چاہے وہ چلا جائے کیونکہ اب میں سردار برکت علی کو جہنم رسید کیے بغیر ایک پل چین نہیں پا سکوں گا شاید فیقر بابا پہلے سے ہی میرے ہر احساس اور ارادے سے واقف تھا چنانچہ جونہی ہم شیر عالم کے جھونپڑے سے کچھ آگے نکلے اس نے میرا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا "فکر نہ کر۔ سردار برکت علی تیرے ہی ہاتھوں جہنم رسید ہوگا۔ ہم اسے ایسی دردناک موت دیں گے کہ وہ عبرت کا نشان بن کر رہ جائے گا" میرے پاس اس سے بحث کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا چنانچہ مجھے اس کی تائید کرنا پڑی۔ "لیکن ہمیں تھوڑا سا صبر کرنا پڑے گا" فقیر بابا نے مجھے قدرے پرسکون کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "شیر عالم کے بیان کی روشنی میں صاف ظاہر ہے کہ برکت علی کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اس پر اندھا دھند حملہ کر کے شاید ہم اپنی جانیں تو گنوانے میں کامیاب ہو جائیں لیکن اسے جہنم رسید کرنا بہت مشکل ہے۔ اسے اس کے کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے ہمیں بہت سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کرنے کی ضرورت ہے۔"

مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی تجویز سے متفق ہونا پڑا۔

"تو اب ہم سیدھا شہر کی طرف چل رہے ہیں۔ پہلے ہم کوئی اچھا اور محفوظ ٹھکانا ڈھونڈیں گے۔ اس کے بعد برکت علی کی گردن اتارنے کے بارے میں ٹھوس منصوبہ بندی کریں گے۔"

تقریباً ڈھائی تین گھنٹے تک تیز تیز چلنے کے بعد ہم شہر کے قریب پہنچ گئے۔

اب ہمیں شہر میں کسی ٹھکانے کی تلاش تھی اور فقیر بابا کا دعوی تھا کہ وہ ایسے چند ٹھکانوں سے واقف ہے۔ ہم ایسے ہی کسی ٹھکانے کی طرف برق رفتاری سے رواں دواں تھے۔ شہر میں زندگی کی چہل پہل پوری طرح شروع ہو چکی تھی۔ یہ چھوٹا سا سادا شہر انگڑائی لے کر پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ فقیر بابا حتی الامکان کوشش کر رہا تھا کہ مصروف سڑکوں اور بازاروں سے بچ کر چلا جائے۔ ہمارا رخ شہر کے شمال کی جانب تھا پھر ہم لوگ مشرق کی طرف مڑ گئے۔ کچھ دیر چلنے کے بعد ہم شہر کے مشہور پاکستانی چوک پر پہنچ گئے۔ ہماری بائیں طرف پتھر بازار تھا جبکہ دائیں ہاتھ پر دور کمیٹی کی گول مارکیٹ نظر آ رہی تھی۔ ہم لوگ سیدھا آگے کی جانب بڑھتے چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ہم ایک سڑک پر پہنچے' یہ سڑک دائیں طرف شہر کے لاری اڈے کی طرف جا رہی تھی لیکن ہمارا رخ بائیں طرف تھا پھر ہم جامعہ اسکول کے احاطے کے پاس سے گزرے۔

"یہ کی نا تم نے سمجھ داری کی بات ۔۔۔ جو کچھ گزر چکا ہے۔ اس پر افسوس کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ عقل مند انسان وہ ہوتا ہے جو حقیقت پسندی سے کام لے کر ماضی کے بجائے مستقبل کی فکر کرے۔ تم بھی گل ناز اور اس سے ساتھ وابستہ دردناک داستان کو بھول جاؤ۔"

میں نے فقیر بابا کے ہدایت کے عین مطابق' اس تمام قصے کو بھولنے کی کوشش کی اور کچھ دیر کی کوشش کے بعد میرا ذہن اس طرف سے ہٹ گیا۔ میں رفتہ رفتہ فقیر بابا کے رنگ میں رنگتا جا رہا تھا۔ وہ مجھے بڑے خلوص سے اپنے زندگی بھر کے تجربات کے نچوڑ سے نواز رہا تھا اور میں پورے انہماک سے سب کچھ جذب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جب ہم قبرستان میں داخل ہوئے تب مجھے اپنی منزل کا اندازہ ہوا۔ قبروں کے درمیان بنی ہوئی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر سے گزرتے ہوئے' ہم مولوی مکلیت شاہ کے چھوٹے سے لیکن پر وقار مقبرے کے پاس پہنچ گئے۔ حسب معمول وہاں لوگوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ کچھ لوگ فاتحہ قرءھ رہے تھے اور کچھ کنویں سے نکالے جانے والے پانی سے نہا رہے تھے۔ لوگوں کا پختہ عقیدہ تھا اور ہے کہ اس کنویں کے پانی سے نہانے پر ہر قسم کے جلدی امراض سے نجات مل جاتی ہے۔ میں خود بھی بچپن میں ایک دو بار یہاں نہا چکا تھا۔

میں نے اور فقیر بابا نے مزار کے احاطے کے باہر ہی سے فاتحہ پڑھ لی اور پھر فقیر بابا مجھے ساتھ لے کر مزار کے پہلو میں بنی ہوئی چند کچی پکی کوٹھریوں کی طرف بڑھ گیا۔ ہم نے ایک کوٹھری کے دالان میں ڈیرہ جما لیا۔ ہمارے سامنے دور دور تک قبرستان پھیلا ہوا تھا۔ بائیں ہاتھ پر مولوی مکلیت شاہ کے مزار کے عقب میں غازی خان کا مقبرہ تھا۔ اس مقبرے کی خوبصورتی اور بناوٹ اپنی مثال آپ تھی لیکن اس مقبرے سے محکمہ آثار قدیمہ کو تو دلچسپی ہو سکتی تھی لیکن عوام اس مقبرے پر فاتحہ پڑھنے کی بھی روادار نہ تھی۔ عوام میں روایت مشہور ہے کہ مولوی مکلیت شاہ نے اپنی وفات سے پہلے غازی خان سے ناراض ہو کر بددعا دی تھی کہ اس کی قبر پر ہمیشہ ویرانی کا ڈیرہ رہے گا۔ یہ بددعا حرف بہ حرف پوری ہوئی تھی۔ اب اس عالی شان مقبرے پر چمگادڑوں اور الوؤں کا قبضہ تھا۔

ہم دونوں نے جس جگہ ڈیرہ جمایا' وہاں ہم تنہا نہیں تھے بلکہ اور بھی کئی فقیر وہاں براجمان تھے۔ ان میں سے زیادہ تر سورج چڑھنے کے باوجود ابھی تک چرس اور افیون کے نشے میں مست پڑے تھے۔ ہماری اور ان کی ظاہری حالت میں کوئی فرق نہیں تھا۔

جب ہم ذرا سکون سے بیٹھ گئے تو میں نے فقیر بابا سے کہا کہ میں اس جلد از جلد زمیندار برکت علی کو ڈھونڈ کر اس کا خاتمہ کرنا چاہتا ہوں۔

"ذرا صبر کرو بیٹا سیفل" فقیر بابا نے دھیمی آواز میں کہا "میں اسی مقصد کے لیے تمہیں یہاں لایا ہوں۔ کچھ دیر بعد میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ میرے جانے کے بعد تم چپ چاپ یہاں پڑے رہنا۔ تم ایسے ظاہر کرنا جیسے تم خود بھی چرس کا دم لگائے ہوئے ہو۔ کسی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہاں سے سیدھا برکت علی کے گاؤں کی طرف جا کر حالات کا جائزہ لوں گا۔ اس کے بعد ہم

مل جل کر کوئی معقول منصوبہ بنائیں گے اور برکت علی کو کیفر کردار تک پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ مجھے واپس آنے میں دیر ہو جائے تو پریشان مت ہونا۔ میں کوشش کروں گا کہ پورا کام کر کے ہی لوٹوں لہٰذا مجھے دیر ہو سکتی ہے۔"

وہ پورا دن میرے لیے بے حد بیزار کن تھا۔ میرے چاروں طرف چرس کی غلیظ' لحافوں اور بستروں کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک ایک کر کے تمام فقیر' اپنے ٹھکانوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک صرف میں ہی تھا جو ابھی تک اپنی دھن میں مگن وہاں موجود تھا۔ دوپہر کے وقت میں نے کوشش کر کے نیند کو اپنے اوپر مسلط کر لیا اور سونے میں کامیاب ہو گیا۔ میری آنکھ اس وقت کھلی جب مغرب کی طرف جھکتے ہوئے سورج کی کرنیں مجھ پر پڑنے لگیں۔ دو ایک فقیر واپس آ چکے تھے اور باقی آ رہے تھے۔ وہ لوگ اپنے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں لائے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن میں نیم غنودہ سی حالت میں پڑا رہا۔ بالآخر انہوں نے مجھ پر سے اپنی توجہ ہٹا لی۔

سورج ڈھلنے کے کافی دیر بعد فقیر بابا واپس آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ کھانے پینے کا کچھ سامان لایا تھا۔ اس نے جھنجھوڑ کر بمشکل مجھے جگایا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے مجھے اپنی آج کی کاروائی سے آگاہ کیا۔

"برکت علی میری توقع سے زیادہ امیر اور طاقتور زمیندار ہے۔ اس کے پاس سردار شاہ بہادر کے برابر تو زمین نہیں تاہم وہ اچھا خاصا بارسوخ آدمی ہے۔ کوٹ مقبول میں اس کی بہت بڑی حویلی ہے۔"

"اس کی حویلی میں داخل ہونے کی کیا پوزیشن ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہی تو سب سے دشوار مرحلہ ہے۔ اس بدبخت شخص برکت علی کی بے شمار لوگوں سے خاندانی دشمنیاں ہیں جس کی وجہ سے اسے ہر وقت اپنی زندگی کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی حویلی کی حفاظت کا بہت مضبوط انتظام کر رکھا ہے۔ اس کی حویلی کے گرد قلعے کی فصیل کے مانند اونچی اونچی دیواریں ہیں جن پر خاردار تار لگے ہوئے ہیں۔ ان دیواروں کو پھلانگنا تقریباً ناممکن ہے۔ حویلی کی پھاٹک بہت مضبوط لکڑی کا بنا ہوا اور بھاری بھرکم ہے۔ اس پر ہر وقت دو مسلح افراد پہرہ دیتے رہتے ہیں۔

"پھر تو واقعی اس میں گھسنا بہت مشکل ہے" میں نے اعتراف کیا۔

"مشکل تو ہے لیکن اگر ہم لوگ اپنی پوری ذہانت استعمال کر کے کوئی مربوط منصوبہ بندی کر لیں تو یہ مشکل قابو میں بھی آ سکتی ہے۔"

ہم دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور حویلی میں داخل ہونے کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔ فقیر بابا نے بہت تفصیل سے حویلی کا جائزہ لیا تھا اور زیادہ تر کام وہی کر رہا تھا۔ البتہ وقتاً فوقتاً اسے مشورے دیتا جا رہا تھا۔ کافی دیر کی مغز ماری کے بعد ہم ایک ایسا منصوبہ ترتیب دینے میں کامیاب ہو گئے جو ممکنہ حد تک سیدھا سادھا تھا اور اس کی کامیابی کے امکانات بھی روشن تھے۔ جہاں تک خطرات کا تعلق تھا تو خطرات سے بالکل کنارہ تو بالکل ممکن ہی نہیں تھا۔ تاہم کوشش کی گئی تھی کہ کم سے کم خطرہ مول لیا جائے۔

دوسرے دن صبح سویرے فقیر بابا شہر کے بازار کی طرف روانہ ہو گیا اس وقت وہ فقیرانہ لباس میں

نہیں تھا بلکہ اس صاف ستھرے لباس میں وہ ایک معزز و معمر شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس نے سر پر سفید لٹھے کی دو پلی ٹوپی اوڑھ لی تھی۔ اسے بازار سے کچھ چیزوں کی خریداری کرنی تھی اور لباس دریوزہ گری میں یہ خریداری اسے بجا طور پر مشکوک بنا سکتی تھی۔

دوپہر کے ذرا دیر بعد' وہ واپس لوٹ آیا۔ وہ مطلوبہ سامان لے کر آیا تھا۔ اس وقت اس ٹھکانے پر کوئی گداگر موجود نہیں تھا لہٰذا ہم نے اطمینان سے ان چیزوں کا جائزہ لیا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہم آج ہی اپنے منصوبے پر عمل کریں لہٰذا فقیر بابا اپنا فقیرانہ لباس دوبارہ زیب تن کر کے' ایک اہم کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ دیگر فقیروں کے واپس آنے سے پہلے پہلے یہ کام ختم کر لینا چاہتا تھا لہٰذا اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ میں بھی اس کی ہدایت کے مطابق اس کی مدد کرتا جا رہا تھا۔ فقیر بابا مجھے اس کام کے متعلق ساتھ ساتھ سمجھاتا بھی جا رہا تھا اور میں بہ غور اس کی باتیں سن رہا تھا اور ذہن میں بٹھا رہا تھا۔

شام ہونے سے پہلے پہلے ہم دونوں اپنی مہم کے لیے تیار ہو گئے۔ فقیر بابا نے اپنے ساتھ لایا ہوا ایک سیاہ کھدر کا جوڑا مجھے دیا جو میں نے پہن لیا۔ اس بدبودار چغے اور ٹوپی سے نجات حاصل کر کے مجھے بڑی فرحت کا احساس ہوا تا ہم میرے منہ میں لتھڑی ہوئی سیاہی ابھی بدستور موجود تھی اور ابھی اسے نہ جانے کب تک میرے چہرے کی زینت بنے رہنا تھا۔ میری جیب میں بھنگ کی پوٹلی بھی موجود تھی۔ فقیر بابا اپنے مخصوص فقیرانہ لباس میں ملبوس تھا۔ اس کے شانے پر اس کا مخصوص جھولا لٹکا ہوا تھا جس میں اس کا تمام سامان موجود تھا۔ میرا تھیلا بھی میرے پاس موجود تھا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد ہم واپس یہاں نہیں آئیں گے بلکہ کسی اور ٹھکانے کی طرف چل دیں گے۔

ہم دونوں فوری طور پر یہاں سے روانہ ہو گئے۔ ابھی تک کوئی فقیر اپنے کام سے واپس نہیں پلٹا تھا۔ ہم دونوں آپس میں قدرے فاصلہ رکھ کر چل رہے تھے۔ البتہ ہم دونوں کا رخ مغرب کی سمت تھا۔ تیز تیز چلتے ہوئے ہم نے رات کا اندھیرا پھیلنے تک پورے شہر کو عبور کر لیا۔ یہ تقریباً وہی راستہ تھا جس پر چلتے ہوئے' میں اس شہر سے فرار ہوا تھا۔ چھوٹی نہر پر سے گزرنے کے بعد ہم ریل کی پٹریاں عبور کر کے قبرستان کے پاس سے گزرے۔ سامنے ہی بڑی نہر تھی۔ نہر کا پل عبور کرنے کے بعد ہمارا رخ بائیں طرف ہو گیا چونکہ اب رات کا اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا لہٰذا اب ہمیں علیحدہ علیحدہ چلنے کی ضرورت نہیں تھی۔

ہم دونوں تقریباً دو ڈھائی گھنٹے تک مسلسل چلتے رہے پھر ہمیں دور سے ایک بستی کے آثار نظر آئے۔ کچے اور نیم پختہ مکانوں پر مشتمل اس بستی کے آس پاس ہرے بھرے کھیت تھے۔ فقیر بابا نے بتایا کہ اس علاقے کی زیادہ تر زرعی اراضی کا مالک برکت علی ہے۔ ہم بستی کے دائیں جانب سے گزرے۔ تقریباً دو فرلانگ آگے چلنے کے بعد' اچانک ہمارے سامنے ایک چمکتی دمکتی محل نما حویلی آ گئی۔ اس حویلی کے تین اطراف میں کینو اور آم کے درخت تھے۔ سامنے ایک نیم پختہ سڑک تھی جو صرف اور صرف اسی حویلی تک آتی تھی۔ یہ حویلی بڑی پر فضا جگہ واقع تھی۔ حویلی کو ایک ڈیزل جنریٹر کے ذریعے بجلی مہیا کی گئی تھی جو اس وقت بھی چل رہا تھا اور حویلی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔

پھاٹک کے دونوں ستونوں پر تیز روشنی والے قمقمے روشن تھے۔ ابھی رات زیادہ نہیں گزری تھی چنانچہ گیٹ کی چھوٹی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اکا دکا ملازمین کی آمدورفت جاری تھی۔ میں اور فقیر بابا گیٹ سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر اگے ہوئے نیم کے ایک گھنے درخت پر چڑھ گئے۔ یہاں سے ہم حویلی کی دونوں منزلوں کو بالکل صاف دیکھ سکتے تھے۔ ہم بڑے سکون سے درخت پر بیٹھے مزید رات گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔

اتفاق سے ہمیں اسی درخت پر بیٹھے بیٹھے سردار برکت علی کو دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ اس وقت اپنی جیپ میں شاید شہر سے واپس لوٹا تھا۔ وہ بھاری بدن اور درمیانے قد کا ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ اس کی مونچھیں پتلی اور نکیلی تھیں اور سر پر شیشوں والی ٹوپی تھی۔ نچلی منزل پر کچھ وقت گزار کر وہ سیدھا اوپر والی منزل کے ایک کمرے میں جا گھسا۔ اس کے ذاتی محافظ نچلی منزل پر ہی رہ گئے تھے۔ اوپر والی منزل کے چاروں کمرے ایک کھلے صحن میں کھلتے تھے اور اس کھلے صحن کے چوتھی سمت ایک ریلنگ لگی ہوئی تھی۔ جس کے ساتھ پھولوں کے بہت سے گملے رکھے ہوئے تھے۔ یہ شام کو نشست جمانے کی بہت عمدہ جگہ تھی۔ حویلی کی نچلی منزل پر کوئی صحن نہیں تھا۔ بس کمرے ہی کمرے بنے ہوئے تھے۔ البتہ حویلی کی اصل عمارت کے سامنے اور آس پاس اونچی اونچی دیواروں کا وسیع احاطہ تھا۔ ان دیواروں پر خاردار تاریں لگی ہوئی تھیں۔ حویلی کے بائیں پہلو پر ایک وسیع سبزہ زار تھا۔ جس کے وسط میں ایک چھوٹا سا تالاب بنا ہوا تھا۔

کمرے میں کچھ وقت گزارنے کے بعد سردار برکت علی' کھلے صحن میں ریلنگ کے پاس آن کھڑا ہوا۔ اب اس کا رخ سیدھا ہماری طرف تھا۔ چند ہی لمحوں کے بعد ایک ملازم نے بید کی کرسی لا کر اس کے پاس رکھ دی۔ برکت علی کرسی پر بیٹھ گیا اور ملازم نے اس کے پاس حقہ لا کر رکھ دیا اور وہ بڑے اطمینان سے حقے کے کش لگانے لگا۔ اس نے ریلنگ کے ساتھ جھک کر گیٹ پر متعین چوکیداروں سے کچھ کہا اور اس کے ساتھ ہی گیٹ کی کھڑکی بند ہو گئی۔ دونوں چوکیدار گیٹ کے اندر تھے۔ حویلی کا زنان خانہ شاید پچھلی سمت تھا کیونکہ مجھے وہاں کوئی بھی عورت نظر نہیں آئی تھی۔

کچھ دیر وہیں براجمان رہنے کے بعد وہ اسی کمرے میں چلا گیا۔ اس دوران میں پوری حویلی کی روشنیاں گل ہو گئیں اور صرف گیٹ کی اور چار دیواری کی لائٹیں جل رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد برکت علی کے کمرے کی بتی بھی گل ہو گئی۔

میں نے سردار برکت علی کے مکروہ چہرے کو اچھی طرح اپنے ذہن میں نقش کر لیا۔ اس کے پر رعونت چہرے کا ایک ایک نقش مجھے ازبر ہو چکا تھا۔ مجھے کافی دیر تک اس کا جائزہ لینے کا موقع ملا تھا اور یہ تمام وقت مجھ پر بہت کڑا گزرا۔ نفرت کی چنگاریاں میرے سینے میں حشر برپا کیے ہوئے تھیں۔ اس کا مغرور سر مجھے اس کے شانوں پر موجود بہت گراں گزر رہا تھا...... میں جلد از جلد اسے زندگی کی قید سے آزاد کرا دینا چاہتا تھا۔ فقیر بابا' مجھ سے ذرا دور ایک اونچی سی شاخ پر بیٹھا ہوا تھا تا ہم وہ میرے دلی احساسات سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا "بس تھوڑا سا انتظار اور کر لو۔ گیٹ کے چوکیدار بھی قدرے غافل ہو جائیں گے پھر ہم حویلی کی سمت میں بڑھیں گے۔"

کافی دیر کے مزید انتظار کے بعد فقیر بابا نے مجھے پیڑ سے اترنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں بڑی پھرتی سے نیچے اتر آئے اور حویلی کی طرف بڑھنے لگے۔

تمام صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے بظاہر فقیر بابا کا منصوبہ مناسب ہی دکھائی دیتا تھا لیکن اس منصوبے کی کامیابی کا دارومدار کافی حد تک قسمت پر بھی تھا۔ بہر حال ہم اپنی سی کوشش کر کے تو دیکھ ہی سکتے تھے۔

حویلی کے قریب پہنچ کر فقیر بابا نہایت خاموشی سے بائیں طرف واقع درختوں کے ایک جھنڈ کی جانب بڑھ گیا جبکہ میں گیٹ کے قریب ہی موجود ایک بڑے سے درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ فقیر بابا درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو چکا تھا۔ قدرے توقف کے بعد گیٹ کے پاس کوئی سلگتی ہوئی چیز آ کر گری اور پھر لگا تار ہلکے ہلکے تین دھماکے ہوئے۔ یہ دھماکے زیادہ زوردار نہیں تھے تاہم ان کی آواز اتنی ضرور تھی کہ مجھے توقع تھی کہ انہوں نے گیٹ کے چوکی داروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہوگا۔ بشرطیکہ وہ جاگ رہے ہوں۔

قدرے توقف کے بعد گیٹ کی چھوٹی کھڑکی میں جنبش پیدا ہوئی اور ایک گردن باہر نکلی۔ وہ ایک چوکی دار تھا جو بڑے محتاط انداز میں باہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ دوبارہ اندر گھس کر کھڑکی بند کرنے ہی والا تھا کہ اچانک درختوں کے جھنڈ سے شرر کی تیز آواز ابھری اور پھر فضا میں خوشبو کی ایک تیز مہک پھیل گئی۔ چوکی دار کے چہرے پر حیرت اور خوف کے واضح آثار نمودار ہوئے۔ اس نے اپنی سیون ایم ایم کی رائفل کا رخ درختوں کے جھنڈ کی طرف کر رکھا تھا۔ وہ قدرے تذبذب کا شکار رہا پھر اس نے اپنے آپ کو منظم کیا اور بڑے محتاط قدموں سے درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھا۔ گیٹ پر لگے قمقموں کی اچھی خاصی روشنی وہاں تک پہنچ رہی تھی۔ درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچ کر وہ رک گیا اور بڑے محتاط انداز میں ادھر ادھر کا جائزہ لینے لگا۔

اچانک ایک درخت کے پیچھے فقیر بابا برآمد ہوا اور بلی کی سی چال کے ساتھ مسلح چوکی دار کی سمت بڑھنے لگا۔ چوکیدار کے حواس کافی تیز تھے' اس نے کسی کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا اور بڑی پھرتی سے پلٹنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ فقیر بابا اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس سے پہلے کہ چوکی دار پلٹ کر فقیر بابا کو دیکھ پاتا' فقیر بابا کے ہاتھ میں دبا ہوا رومال فضا میں لہرایا اور رومال کی گرہ چوکی دار کی کنپٹی سے ٹکرائی اور اس کے ساتھ ہی وہ چوکی دار ایک جھٹکے سے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ بالکل ساکت و صامت پڑا ہوا تھا۔ فقیر بابا نے اسے جلدی سے گھسیٹ کر درختوں کی اوٹ میں ڈال دیا۔ میں دل ہی دل میں فقیر بابا کی مہارت کی داد دے رہا تھا لیکن میری نظریں گیٹ پر بھی جمی ہوئی تھیں' کسی بھی لمحے دوسرا چوکی دار گیٹ سے باہر جھانکنے والا تھا اور اسے قابو میں کرنا میری ذمے داری تھی۔

جب کچھ دیر کے انتظار کے باوجود دوسرا چوکی دار باہر نہیں نکلا تو فقیر بابا درخت کے پیچھے سے نکل آیا اور اس نے مجھے اشارے سے گیٹ کی طرف بڑھنے کو کہا اور خود بھی تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ گیٹ کی چھوٹی کھڑکی کے پاس پہنچ کر اس نے بڑی احتیاط سے اندر کا جائزہ لیا۔ یہ بے حد خطرناک

کام تھا لیکن فی الحال اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ چند لمحے بعد فقیر بابا کھلی کھڑکی سے حویلی کے اندر داخل ہو گیا اور مجھے بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں نے اندر آنے کے بعد گیٹ کی کھڑکی کو بند کر دیا تھا۔

گیٹ کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی کوٹھری بنی ہوئی تھی۔ اس میں شاید چوکی دار رہتے ہوں گے لیکن اس وقت وہاں مکمل سناٹا طاری تھا۔ ہم دونوں نے بڑی خاموشی سے جا کر کوٹھری کے اندر جھانکا' وہاں ہلکی روشنی کا بلب جل رہا تھا اور بلب کی روشنی میں دو چارپائیاں نظر آ رہی تھیں لیکن اس وقت وہ دونوں چارپائیاں خالی تھیں۔

اس صورت حال نے ہم دونوں کو بری طرح چکرا دیا تھا۔ دوسرے چوکی دار کی غیر موجودگی ہمارے سارے منصوبے کو چوپٹ کر سکتی تھی۔ وہ بدبخت نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اگر وہ اچانک آ ٹپکتا تو ہم مصیبت میں بھی پھنس سکتے تھے۔

''اب کیا کریں فقیر بابا! یہ حرامی تو نہ جانے کہاں گم ہو گیا ہے۔''

''ہمارے پاس وقت بہت کم ہے اگر خدانخواستہ کسی کو گیٹ کے چوکی دار کی غیر موجودگی کا پتا چل گیا تو ہم بری طرح پھنس جائیں گے۔ اگر حویلی میں ایک بار جگار ہو گئی تو ہمارے پاس کوئی راہ فرار نہیں بچے گی۔ تم ایسا کرو کہ اب اکیلے ہی اپنے منصوبے پر عمل کرنے کی کوشش کرو۔ میں اس کوٹھری کی چھت پر چھپ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ اگر وہ چوکی دار اچانک نمودار ہو گیا تو میں اس سے خاموشی سے نمٹ لوں گا۔ تم اکیلے تمام صورت حال پر قابو تو پا لو گے نا؟''

''اس کی تم فکر نہ کرو' اچانک میری نظر کوٹھری کے کونے میں کھڑی ہوئی کلاشنکوف رائفل پر پڑی اور میں بری طرح چونک پڑا۔

''یہ دیکھو بابا' یہ کیا ہے' کلاشنکوف رائفل!''

''اوہ'' فقیر بابا کے منہ سے نکلا اور وہ لپک کر کونے کی طرف بڑھا اور رائفل کو ہاتھ میں لے کر بغور اس کا جائزہ لینے لگا ''درے کی بنی ہوئی ہے' اس کے باوجود بہت قیمتی اور خطرناک ہتھیار ہے۔ اس کے ساتھ ڈبل میگزین منسلک ہے۔ اس کا مطلب ہے ساٹھ گولیاں...... ساٹھ زندگیاں اگر اسے مہارت سے استعمال کیا جائے تو اکیلی رائفل سے اچھی خاصی فوج کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔''

''لیکن دوسرا چوکی دار اتنی بڑی رائفل یہاں چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ یہیں حویلی میں ہے اور جلد یا بدیر واپس آئے گا۔ تم جلدی سے اپنے مشن پر عمل کرو۔ میں اس رائفل کو اپنے ساتھ لے کر کوٹھری کی چھت پر چڑھ جاتا ہوں۔ اگر کوئی ہنگامی کیفیت پیدا ہوئی تو میں الو کی آواز نکال کر تمہیں اشارہ کر دوں گا۔''

میں تیزی سے کوٹھری سے نکلا اور ایک طرف بڑھتا چلا گیا۔ سامنے ہی حویلی کا بڑا دروازہ تھا جو اس وقت اندر سے مقفل تھا۔ کچھ فاصلے پر تین دروازے اور تھے لیکن ان پر بھی تالے پڑے ہوئے تھے۔ میں احاطے کے ایک نیم تاریک گوشے کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں بہت کم روشنی تھی۔ ایک جگہ پہنچ کر میں

رک گیا۔ میرے سر پر تقریباً پچیس فٹ کی بلندی پر' حویلی کے اوپری صحن کی ریلنگ کا آخری سرا تھا۔ میں نے اپنے کاندھے پر سے نائلون کی رسی کا گچھا اتارا اور اسے کھول لیا۔ اس رسی میں جگہ جگہ گرہ لگی ہوئی تھی۔ رسی کے سرے پر لوہے کا ایک آنکڑا بندھا تھا۔ اس آنکڑے کی مدد سے مزدور گندم وغیرہ کی بوریاں اٹھاتے ہوں گے۔ فقیر بابا نے اس آنکڑے پر اچھی طرح سے کپڑا لپیٹ دیا تھا۔ اب اگر یہ آنکڑا کسی دھات سے ٹکراتا بھی تو زیادہ آواز پیدا نہ ہوتی۔ میں نے اس آنکڑے کو ہاتھ میں تولا اور پھر چند بار ہوا میں گردش دے کر اوپر اچھالا پہلی بار مجھے ناکامی ہوئی اور آنکڑا کسی گملے سے ٹکرا کر بڑی تیزی سے واپس آیا۔ میں نے تیزی سے ہٹ کر خود کو اس کی زد سے بچایا۔

قدرے توقف کے بعد میں نے ایک بار پھر کوشش کی۔ اس بار آنکڑا ریلنگ میں پھنس گیا۔ میں نے اچھی طرح زور لگا کر آزمائش کر لی۔ وہ بہت مضبوطی سے ریلنگ میں اٹک گیا تھا پھر میں نے بڑی تیزی سے اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ نائلون کی رسی بہت پھسلوان تھی' اور اس کی گرہیں ہتھیلیوں میں چبھی جا رہی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ اس رسی پر خود کو متوازن رکھنا بھی ایک مسئلہ ہی تھا چونکہ ذرا سا غلط ہاتھ پڑتے ہی پورا جسم رسی کے ساتھ پنڈولم کی طرح جھولنے لگتا تھا۔ سب سے زیادہ مسئلہ پیروں کو رسی کی گرہوں پر جمانا تھا میرے ہاتھ تو خیر اچھے خاصے بے حس اور کھردرے تھے لیکن پیروں کی جلد تو ظاہر ہے جوتوں میں رہنے کی وجہ سے کافی حساس تھی۔ چنانچہ اب نائلون کی رسی کی گرہیں میرے پاؤں کے انگوٹھے اور اس کے ساتھ والی انگلی میں پیوست ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے اپنے جوتے اپنے نیفے میں اڑس رکھے تھے۔

ان تمام مشکلات کے باوجود میں ذرا بھی بددل نہیں تھا۔ میرے پاس میرے عزم اور حوصلے کی جو بے کراں دولت تھی وہ مجھے ہر تکلیف سے بے گانہ کیے ہوئے تھی۔ میری نظریں بڑی تیزی سے آس پاس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مجھے اس دوسرے چوکی دار کی طرف سے شدید خدشہ تھا۔ اگر وہ اچانک اس طرف آ نکلتا تو میں کسی معصوم بچے کی طرح ان کی گرفت میں آ جاتا۔

کچھ دیر کی مسلسل جدوجہد کے بعد میں ریلنگ تک آ گیا۔ میں نے ریلنگ کو پکڑا اور اوپر چڑھ گیا۔ صحن میں روشنی بہت کم تھی' چنانچہ میں یہاں خود کو قدرے محفوظ سمجھ رہا تھا۔ میں نے نائلون کی رسی اوپر کھینچ لی اور اسے گملوں کے پیچھے چھپا دیا۔ اس کے بعد میں دبے قدموں سے برکت علی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس کے کمرے کے دروازے کی نچلی درز سے دھیمی دھیمی نیلی روشنی نظر آ رہی تھی البتہ باقی تینوں کمروں میں بالکل اندھیرا تھا۔

برکت علی کے کمرے کے دروازے کے پاس پہنچ کر میں نے اپنا سانس درست کیا اور اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے نہایت آہستگی سے دروازے پر دستک دی۔ میں نے پوری کوشش کی کہ میری دستک کا انداز رازدارانہ ہو۔ پہلی دستک کا کوئی ردعمل نہ ہوا تو میں نے دوسری اور پھر تیسری دستک دی۔ تیسری بار دستک دیتے ہوئے میں نے کافی عجلت کا مظاہرہ کیا اور ساتھ ہی ایک تیز سرگوشی میں کہا ''دروازہ کھولیں سردار صاحب'' میں نے پوری کوشش کی کہ میری سرگوشی سے میری جنس کا تعین نہ

ہو سکے۔

میری توقع کے عین مطابق برکت علی نے فوراً جواب دیا۔ اس کی آواز نیند سے بوجھل تھی ''کون ہے بھئی؟''

''میں ہوں سردار صاحب آپ کی خادمہ پروین'' میں نے آواز بدل لی تھی۔

''کون پروین؟'' برکت علی نے غنودہ لہجے میں کہا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ میں نے پہلے سے ہی خود کو پوری طرح تیار کر رکھا۔ جونہی اس نے دروازہ کھولا میں نے اپنا پستول اس کے سینے پر رکھا اور ایک جھٹکے سے اسے واپس کمرے میں دھکیل دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا قالین پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ ابھی صورت حال کو پوری طرح سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ میں نے دروازے کو اندر سے بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔

''کک۔۔۔کون ہو تم؟'' برکت علی نے سخت حواس باختگی کے عالم میں پوچھا ''اور یہاں کیسے آ گئے؟''

''بتاتا ہوں' بتاتا ہوں۔ اتنی جلدی کیا ہے؟'' میں نے اس کے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ بڑی ہی شاہانہ آرائش تھی اس کمرے کی۔ دبیز قالین' جہازی سائز مسہری۔ دیواروں پر آرائشی طغرے سجے ہوئے تھے۔ نیلی روشنی نے عجیب رومانٹک فضا بنا رکھی تھی۔ برکت علی شاید سونے سے پہلے بھی ایک دو پیگ لگانے کا عادی تھا لہٰذا اس کی مسہری کے سرہانے ایک چھوٹی سی میز پر انگلش شراب کی بوتل' سوڈے کا فاؤنٹین اور جام رکھا نظر آ رہا تھا۔ شاہی اسباب عیش و طرب کے علاوہ اس نے اپنی مسہری کے ساتھ اسباب سپاہ گری بھی رکھ چھوڑا تھا۔ یہ ایک خوب صورت روسی کلاشنکوف تھی جو نیلی روشنی میں بھی چمک رہی تھی۔

میری اس طرح اچانک یلغار نے شاید برکت علی کو شدید اعصابی جھٹکا پہنچایا تھا۔ جس سے اس کو سنبھلنے میں تھوڑی سی دیر لگی۔ میں نے اس اثنا میں اس مہلک ہتھیار کو اپنے قبضے میں کر لیا۔

اپنی کلاشنکوف کو میرے قبضے میں جاتے دیکھ کر وہ پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں آ گیا ''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا ''اگر تم نقب زن ہو تو تم نے بہت غلط جگہ ہاتھ ڈال دیا ہے۔ تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے۔''

''تم میری فکر چھوڑو برکت علی اور اپنی خیر مناؤ'' میں نے سرد لہجے میں کہا ''مجھے اچھی طرح معلوم ہے تم کون ہو اور تمہاری اوقات کیا ہے؟''

''اوہ تو تم مجھے جانتے بھی ہو'' اس نے قدرے حیرت کے ساتھ کہا۔ ''اگر تمہیں میرے کسی دشمن نے بھیجا ہے تو واقعی اس کا انتخاب بہت اچھا ہے۔ تم بہت جی دار نوجوان معلوم ہوتے ہو۔ میرے محافظوں سے بچ کر مجھ تک پہنچنا آسان کام نہیں ہے اور جس طرح تم نے میرے کمرے کا دروازہ کھلوایا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم ذہین بھی ہو اگر تم اجرتی قاتل ہو تو مجھے اپنی قیمت بتاؤ نوجوان۔ تم جیسے نایاب ہیروں کی مجھے ہمیشہ تلاش رہتی ہے۔''

''میری قیمت تمہارے خواب و خیال سے بھی زیادہ ہے برکت علی۔''

"تم ایک بار مانگ کر تو دیکھو جوان۔ تمہیں اپنا ساتھی بنانے کے لیے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہا ہے۔ مجھے باتوں میں لگا کر شاید کوئی داؤ کھیلنا چاہتا ہے۔ "تو سن برکت علی!" میں نے درندگی سے بھرپور لہجے میں کہا "میری قیمت تیرا سر ہے۔ میں تیری موت ہوں۔ اگر تو خود اپنی موت کی قیمت ادا کرنا چاہتا ہے تو تجھ سے زیادہ احمق خریدار دنیا میں کوئی نہیں ہوگا۔ اب تو مرنے کے لیے تیار ہو جا۔" میں نے کلاشنکوف کی نال کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

میری بات سن کر اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ میں واقعی اس کی جان کے درپے ہوں لیکن اس نے اپنی آخری امید قائم رکھی ہوئی تھی "اگر تم نے گولی چلائی تو میرے ساتھ ساتھ تم خود بھی مارے جاؤ گے جوان۔ مجھے بتاؤ کہ تمہیں کس نے میری طرف بھیجا ہے۔ میں تمہیں مالا مال کر دوں گا" اس کے لہجے میں ہلکی سی لرزش تھی۔

"تم یہ چاہتے ہو کہ میں اس شخص کا نام بتاؤں جس نے تمہیں قتل کرنے کے لیے بھیجا ہے۔" میرے لہجے میں نفرت کا زہر بھرا ہوا تھا "تو سنو اس کا نام نور عالم ہے" میری انگلی کلاشنکوف کی لبلبی پر بے چین ہو رہی تھی۔ میں جلد از جلد اس کا جسم چھلنی کر دینا چاہتا تھا۔

"کک۔۔۔کون نور عالم؟" میں تو اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا' میری تو اس نام کے کسی شخص سے دشمنی نہیں ہے۔ کہیں تمہیں غلط فہمی تو نہیں ہوئی جوان؟" برکت علی نے بے چین لہجے میں کہا۔

"مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی برکت علی۔ مجھے نور عالم نے ہی تمہارے قتل کے لیے مقرر کیا ہے۔"

"لیکن میں نے تمہیں بتایا ہے کہ......" برکت علی نے روہانسا ہو کر کہنا چاہا۔ اس کا حوصلہ جواب دے رہا تھا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ میں اسے قتل کیے بغیر نہیں ٹلوں گا لیکن اس کو اس اجنبی نام نے شدید الجھن میں ڈال دیا تھا۔

"تم اسے بہت اچھی طرح جانتے ہو کتے کی اولاد" میں اچانک شدید مشتعل ہو گیا "وہ بدنصیب تیرے بہت قریب رہا ہے۔ اس نے تیری بہت خدمت کی ہے اور تو نے۔۔۔ تو نے" اچانک میرے پاؤں کی ٹھوکر اس کے منہ پر پڑی اور وہ الٹ کر گرا اس کے شاید ایک دو دانت بھی ٹوٹ گئے تھے اور اس کے منہ سے خون بہنے لگا تھا۔

"میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اس نام کے کسی شخص کو نہیں جانتا" اس نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔ اس کی تمام اکڑفوں رخصت ہو چکی تھی اور وہ بالکل ڈھیر ہو چکا تھا۔

"تو اسے جانے گا بھی کیسے بے غیرت انسان" میں نے نفرت سے تھوکتے ہوئے کہا" تجھے وہ کیسے یاد آئے گا۔ اس کی بھلا حیثیت ہی کیا تھی۔ میں تیری یہ آخری تمنا ضرور پوری کروں گا۔ تجھے یہ ضرور معلوم ہونا چاہیے کہ تیری موت کا ذمے دار کون ہے۔ سن میں تجھے بتاتا ہوں کہ نور عالم کون ہے۔ تجھے یاد ہے کہ آج سے دس پندرہ دن پہلے تو نے اپنے اس محل کے اندر ایک بہت بڑی دعوت دی تھی۔"

"ہاں۔۔۔ہاں مجھے یاد ہے۔" اس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اسی تقریب میں نور عالم بھی شامل تھا۔ وہ بے چارہ معصوم بچہ تیرے حرام زادے مہمانوں کی دوڑ دوڑ کر خدمت کر رہا تھا۔"

"تم۔۔۔تم نورو کی بات کر رہے ہو؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں "مگر وہ۔۔۔ وہ تو۔۔۔"

"ہاں مگر وہ تو مر چکا ہے۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا تم؟ ہاں وہ مر چکا ہے۔ بہت گستاخ تھا وہ۔ تیری چند ٹھوکریں بھی برداشت نہ کر سکا" میرے لہجے کے زہر نے اس کے رگ و پے میں خوف کی لہر دوڑا دی تھی۔ وہ بری طرح لرز رہا تھا۔

"میں۔۔۔میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا" اس نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں اپنی صفائی پیش کرنا چاہی۔

"ہاں مجھے معلوم ہے تم اسے جان سے نہیں مارنا چاہتے تھے۔ تم تو صرف اسے سزا دینا چاہتے تھے' ایک ایسی سزا جسے وہ تمام عمر یاد رکھے۔ اس کا جرم بھی تو ناقابل معافی تھا۔ اس نے تو ساری محفل کا لطف غارت کر دیا تھا۔"

"واقعی میں نے بہت زیادتی کی تھی" برکت علی نے گڑگڑاتے ہوئے کہا اور پھر اس نے میرے پیر پکڑنے کی کوشش کی "مجھے معاف کر دو۔ میں آئندہ کبھی کسی پر ظلم نہیں کروں گا۔"

"کاش کہ میرے پاس تیری معافی کا اختیار ہوتا۔ تو کتنا بدنصیب ہے کہ جو ہستی تجھے معاف کر سکتی تھی وہ خود اپنے معصوم بیٹے کے غم میں پاگل ہو چکی ہے۔ اب موت ہی تیرا علاج ہے برکت علی۔"

اچانک برکت علی نے اچھل کر مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی شاید وہ اپنی زندگی سے پوری طرح مایوس ہو چکا تھا اور اس نے آخری چارہ کار کے طور پر بالآخر مجھ پر حملہ کر دیا لیکن اس بدنصیبی یہ تھی کہ میں پوری طرح چوکنا تھا۔ وہ جونہی مجھ پر جھپٹا میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور میری رائفل کا بٹ اس کے جبڑے سے ٹکرایا۔ کڑک کی آواز کے ساتھ جبڑے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ برکت علی کے حلق سے ایک کریہہ آواز نکلی اور قالین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کے اندر ہلنے جلنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔

میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اس کی مسہری کے پائنتی بٹھا دیا اور اپنا پستول نکال کر اس کی نال اس کے منہ میں ڈال دی۔ اس کی مزاحمت کی قوت تو کبھی کی دم توڑ چکی تھی لیکن میری انگلیاں بھی بے جان سی ہو رہی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں گولی نہ چلا پاؤں گا۔ میں نے بے بسی کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک میری آنکھوں کے سامنے ایک چہرہ روشن ہو گیا۔ یہ ایک خستہ و درماندہ مرد کا چہرہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانیوں کا ڈیرہ تھا۔ اس کی آنکھیں مجھ سے اپنے اکلوتے بیٹے اور بدنصیب بیوی کا قصور پوچھ رہی تھیں۔ پھر ایک دوسرا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آیا۔ وہ ایک نسوانی چہرہ تھا۔ جس کے بال خاک دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹوں سے کف جاری تھا اور وہ

انسانوں کے جنگل میں اپنے بیٹے کا پتا پوچھتی پھر رہی تھی۔

اس کے بعد میں نے ایک اور چہرہ دیکھا۔ وہ ایک معصوم سے بچے کا چہرہ تھا۔ وہ اپنے ماں باپ سے لپٹ رہا تھا' کھیل رہا تھا۔ فضا میں اس کے قہقہے گونج رہے تھے۔ اچانک اس قہقہے کرب ناک چیخوں میں بدل گئے۔ اس کی چمکتی دمکتی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ چیختا رہا چیختا رہا پھر اس کا منہ خون سے بھر گیا اور اس کی چیخیں خون میں ڈوب گئیں۔

اچانک ایک جھٹکے سے میری شہادت کی انگلی پستول کی لبلبی پر دب گئی۔ برکت علی کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور اس کا بھیجا اڑ کر مسہری کی پائنتی سے جا چپکا۔ اس کے جسم پر تھرتھری سی طاری ہوئی اور پھر وہ بالکل ساکت ہو گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ میرے کانوں میں دھماکے کی آواز آئی تھی یا نہیں۔ میں تو بس برکت علی بے جان آنکھوں کو گھورے جا رہا تھا۔

اچانک مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے ابھی تک پستول کی نال برکت علی کے منہ میں ڈالی ہوئی تھی اور اس کا جسم میرے ہاتھ کے سہارے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے قالین پر لٹا دیا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میں شدید خطرے میں گھرا ہوا تھا اگرچہ اس کے منہ میں نال رکھ کر فائر کرنے سے فائر کی آواز کافی دب گئی تھی تاہم پھر بھی خطرہ تھا کہ یہ آواز کسی کے کانوں میں پہنچ نہ گئی ہو۔ اب میرے لیے لازمی ہو گیا تھا کہ میں جلد از جلد یہاں سے فرار ہو جاؤں۔

میں تیزی سے برکت علی کے کمرے سے نکلا اور اس طرف لپکا جدھر میں نے رسی چھپائی ہوئی تھی ابھی میں نے رسی اٹھائی ہی تھی کہ اچانک فضا میں الو کی چیخ ابھری اس کے ساتھ ہی کوئی شخص زور زور سے حویلی کی عمارت کا بڑا دروازہ زور زور سے تھپتھپانے لگا۔

''غلام رسول ۔۔۔ یاسین' اٹھو'' کوئی زور زور سے چیخ رہا تھا۔ ''فوراً اٹھو کوئی حویلی میں گھس آیا ہے۔''

میرے سارے جسم میں سنسنی کی تیز لہر دوڑ گئی۔ میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ ان لوگوں کو میرے حویلی میں گھسنے کا علم ہو چکا تھا۔ شاید وہ دوسرا چوکیدار اچانک کسی طرف سے نمودار ہو گیا تھا۔ فقیر بابا کو اتنی مہلت ہی نہیں مل سکی ہو گی کہ وہ اسے خاموش کر سکتا۔ اس سے پہلے ہی اس شخص نے تمام صورت حال کا اندازہ لگا لیا اور واویلا مچا دیا۔

اس شخص کی چیخ و پکار کرنے سے پوری حویلی میں کھلبلی مچ گئی اور بہت سے لوگ ایک ساتھ بولنے لگے۔ یکے بعد دیگرے دو تین دروازے دھڑ ادھڑ کر کے کھلے اور کئی افراد باہر نکل آئے۔

''کیا ہوا صداقت حسین کیوں شور مچا رہے ہو؟'' ایک زوردار آواز نے دریافت کیا۔ اس شخص کی آواز کے تحکم سے پتہ چلتا تھا کہ اسے حویلی میں کوئی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

صداقت حسین نے ہکلاتے ہوئے کہا ''و...... وہ...... گل شیر اپنے کیبن سے غائب ہے اور کسی نے میری کلاشنکوف بھی اٹھا لی ہے اور......''

''تو...... تو کہاں مر گیا تھا سور کے بچے؟'' اسی زور آور آواز نے دریافت کیا۔ صداقت حسین مزید

بوکھلا گیا۔

''وہ...... میں...... میں وہ ذرا ادھر......''

''کتے کے بچے تو آج پھر اس کتیا زرینہ کے ساتھ منہ کالا کرنے گیا ہو گا۔ تجھ سے تو میں بعد میں نمٹوں گا۔ اوہ...... رفیقے! اور غلام رسول۔ تم اپنی رائفلیں لے کر اس طرف جاؤ جو بھی نظر آ ئے اسے بے دریغ گولی مار دو' کوئی بچ کے نہ جانے پائے۔ اوئے یاسین تو سلیم کے ساتھ اوپر والی منزل پر چلا جا...... سردار صاحب کو بتا دینا کہ باہر خطرہ ہے ابھی باہر نہ نکلیں۔ اندر لطیف اور فضلو کو بھی رائفلیں دے دینا اور کہنا کہ باغیچے میں چلے جائیں۔ میرا خیال ہے دشمن کا کوئی ایک آدھ آدمی ہی اندر آ سکا ہے۔ جونہی وہ نظر آئے اسے بھون ڈالو۔''

صورت حال بہت خطرناک ہو چکی تھی۔ میرے ساتھ ساتھ فقیر بابا کی زندگی بھی شدید خطرے میں تھی۔ کسی بھی لمحے وہ ان لوگوں کی نظروں میں آ سکتا تھا اور میں تو گویا موت کے پنجرے میں پھنس ہی چکا تھا۔ دو شکاری سیدھا اوپر میرے پاس آ رہے تھے اور انہیں ہدایت تھی کہ وہ مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں۔

میں تیزی سے پلٹا اور سردار برکت علی کے کمرے کی طرف لپکا۔ میں نے اس کی کلاشنکوف وہیں چھوڑ دی تھی۔ میں تیزی سے کلاشنکوف کی طرف لپکا اور اسے اٹھا کر زینے کے پاس آن ٹھہرا۔ میرے ایک ہاتھ میں کلاشنکوف تھی اور دوسرے ہاتھ میں خنجر۔ زینے کے دروازے میں اوپر سے کنڈی لگی ہوئی تھی اور اسے توڑے بغیر وہ لوگ اوپر نہیں آ سکتے تھے۔

چند ہی لمحے بعد کسی نے زور زور سے زینے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ لوگ سخت ہیجان کا شکار تھے اور شاید اپنی رائفل کے دستے سے دروازہ کوٹ رہے تھے ''سردار صاحب ۔۔۔ سردار صاحب ۔۔۔ دروازہ کھولیں سردار صاحب۔'' ان کے خیال کے مطابق ان کا مالک اپنے کمرے میں نشے میں دھت پڑا تھا اور اس تک ان کی آواز پہنچنا ذرا دشوار بات تھی۔ اس لیے وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر تک یونہی شور و غل مچاتے رہے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اب دروازہ توڑ ڈالیں گے تو میں نے کہا۔

''کون ہے بھئی؟ کیوں شور مچا رکھا ہے' کیا آفت آ گئی ہے؟'' میں نے اپنی آواز بے حد جان دار بنا لی تھی اور کوشش کی تھی کہ وہ سردار برکت علی کی آواز سے مشابہ معلوم ہو۔ حسب توقع ان دونوں نے آواز کے فرق پر غور ہی نہیں کیا اور اپنی ہانکے گئے۔

''سردار صاحب حویلی پر دشمنوں نے حملہ کر دیا ہے۔ محمد حسین نے کہا ہے کہ میں اور سلیم اوپر مورچے لگا لیں۔ آپ دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں چلے جائیں۔''

میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا اور وہ دندناتے ہوئے زینے سے اوپر چڑھ آئے۔ اس سے پہلے کہ وہ نیم تاریکی میں مجھے دیکھ پاتے میرا خنجر تیزی سے حرکت میں آیا اور آگے والے کی گردن میں اتر گیا۔ اس کے پیچھے آنے والا صورت حال سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ میں نے کلاشنکوف کا دستہ پوری قوت سے اس کے سر پر دے مارا۔ وہ کٹے ہوئے درخت کے مانند چپ چاپ پختہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ساتھی کے کٹے ہوئے حلقوم سے آخری خرخراہٹیں خارج ہو رہی تھیں۔ میں نے اپنے خنجر کو اس

کے لباس سے پونچھ کر اپنے نیفے میں اڑس لیا پھر میں نے اپنے اگلے قدم کے متعلق سوچا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ میں نے برق رفتاری سے اس شخص کا لباس اتارنا شروع کر دیا جسے میں نے رائفل کا دستہ مار کر ڈھیر کر دیا تھا۔ میں نے اس شخص کے لباس کو اپنے لباس کے اوپر پہننا شروع کر دیا۔ وہ اچھا خاصا لمبا چوڑا شخص تھا اور اس کے کپڑے با آسانی میرے جسم پر پورے آ گئے۔ اس کے بعد میں تیزی سے زینے سے نیچے اترنے لگا۔ وہ زینہ مجھے سیدھا نچلی منزل پر صدر دروازے کے پاس لے گیا۔ اس وقت وہ دروازہ کھلا ہوا تھا اور محافظوں کا نگران' تنہا وہاں موجود تھا۔ اس نے اپنی رائفل بڑے گیٹ کی طرف تان رکھی تھی۔ میری آہٹ سن کر وہ پلٹا اور میری صورت پر غور کیے بغیر کہنے لگا۔ ''کیا ہوا؟ تم واپس کیوں آ گئے؟'' اس کا دھیان ابھی تک بڑے گیٹ کی طرف لگا ہوا تھا۔

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ''سردار صاحب نے آپ کو اوپر بلایا ہے'' اچانک اس شخص نے میری طرف غور سے دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار نمایاں ہوئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی ردعمل ظاہر کرتا میں نے رائفل گھمائی اور اس کا دستہ اس کی کنپٹی پر دے مارا۔ وہ شخص چکرا کر زمین پر گر پڑا۔ سامنے ہی بڑا گیٹ تھا۔ میں نے گیٹ کی چھوٹی کھڑکی کھولی اور باہر نکل گیا۔ میرا خیال تھا کہ فقیر بابا یہ تمام کاروائی دیکھ رہا ہوگا۔ تاہم میں نے گیٹ سے باہر آتے ہی حلق سے الو کی آواز نکالی۔ میں نے قریب ہی اگے ہوئے ایک درخت کے پیچھے پوزیشن سنبھال لی تھی۔ صورت حال بے حد نازک تھی۔ اگر مزید چند لمحوں تک فقیر بابا باہر نہ نکل آتا تو میرے لیے اس کا انتظار کرنا ممکن نہ رہتا لیکن مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ گیٹ کی چھوٹی کھڑکی کھلی اور اس میں سے فقیر بابا برآمد ہوا۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا البتہ چلتے ہوئے کچھ لنگڑا رہا تھا۔ میں تیزی سے درخت کے پیچھے سے نکلا اور اس کے پاس پہنچا۔

''تم ٹھیک تو ہو بابا؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس ذرا کوٹھری پر سے چھلانگ لگاتے ہوئے میرا پاؤں مڑ گیا تھا۔ تم فکر نہ کرو۔ میں چل سکتا ہوں۔''

''تو پھر یہاں سے بھگ چلو بابا۔ میں نے کئی آدمی بیکار کر دیے ہیں۔ وہ قبر تک ہمارا پیچھا کریں گے۔''

ہم حتی الامکان تیز رفتاری سے بھاگ رہے تھے لیکن فقیر بابا کا پاؤں اسے شدید تکلیف دے رہا تھا اور اس کے منہ سے برابر کراہیں نکل رہی تھیں۔ ہمارے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ ہم جس طرف فرار ہو رہے تھے ادھر کافی فاصلے تک کھلا میدان تھا اور اگر دشمن ہمارا پیچھا کرتا تو ہمیں ان کی نظروں سے چھپنا مشکل ہو جاتا۔ ہمارے بچاؤ کی یہی صورت تھی کہ ہم ان کی نظروں میں آئے بغیر زیادہ سے زیادہ دور نکل جاتے۔''

ہم حویلی سے تقریباً تین سو گز دور آ چکے تھے اور امید ہو چلی تھی کہ اب ہم اندھیرے میں چھپ کر

بچ نکلیں گے۔ اچانک حویلی کا گیٹ کھلا اور اس میں سے دو گاڑیاں باہر نکل آئیں۔ ان کی ہیڈ لائٹس دور دور تک کے علاقے کو روشن کر رہی تھیں۔ ان میں ایک شاید لینڈ کروزر جیپ تھی جبکہ دوسری گاڑی شاید پک اپ تھی۔

اس اچانک افتاد نے ہمیں بری طرح حواس باختہ کر دیا۔ ہم پوری طرح کوشش کے باوجود خطرے کی حدود سے باہر نہیں نکل سکے تھے۔ گاڑی چلانے والے اس طرح سے گاڑیوں کو گردش دے رہے تھے کہ ان کی ہیڈ لائٹس دور دور تک کا علاقہ کھنگال رہی تھیں۔ ہم کسی بھی وقت ان لائٹوں کی زد میں آ سکتے تھے اور پھر ہماری لاشوں میں موجود سوراخ بھی کوئی نہ گن پاتا۔

اچانک ایک گاڑی کی لائٹیں ہم پر پڑیں۔ ہم نے تیزی سے بیٹھ کر ان لائٹوں سے بچنا چاہا لیکن ہمیں دیکھا جا چکا تھا۔ گاڑی کا رخ ہم دونوں کی طرف ہوا اور ہم روشنی میں نہا گئے۔ ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی اور ایک گولی سنسناتی ہوئی ہمارے سر پر سے گزر گئی۔ اسی وقت دوسری گاڑی کا رخ بھی ہماری طرف ہو گیا۔ اس گاڑی سے کلاشنکوف کا برسٹ فائر کیا گیا لیکن گاڑی کے متحرک ہونے کی وجہ سے نشانہ خطا ہوا اور گولیاں ہمارے سر پر سے گزر گئیں۔ اب مقابلے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے اپنی کلاشنکوف شانے سے اتاری اور اس کے لیور کو لگاتار فائرنگ پر سیٹ کر کے ایک گاڑی پر برسٹ فائر کیا۔ میرا نشانہ کارگر رہا۔ اس گاڑی کی دونوں ہیڈ لائٹس تباہ ہو گئیں اور وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ میں دوسری گاڑی کا نشانہ لے کر فائر کرنے ہی والا تھا کہ اس گاڑی میں سے برسٹ مارا گیا۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں ایک زوردار انسانی چیخ گونجی۔ میں نے چیخ کی آواز سن کر فوراً مڑ کر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر فقیر بابا' منہ کے بل زمین پر ڈھیر تھا۔ اس کے جسم سے خون بہہ بہہ کر اس کے اردگرد جمع ہو رہا تھا۔

☆O☆

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل کو مٹھی میں دبا کر بری طرح بھینچ دیا ہے۔ مجھے اپنی دنیا اندھیر نظر آنے لگی۔ میرے ذہن میں ایک بڑا سا سوالیہ نشان بن گیا۔ فقیر بابا' جس کی گھنی چھاؤں نے میری سلگتی سسکتی روح کو قدرے سکون کا احساس دیا۔ جس کے بوڑھے جسم میں دھڑکتے جوان دل نے مجھے جینے کا حوصلہ بخشا' میری ویران' آبلہ پا' زیست کو نئی امنگ' نئے ولولے عطا کیے۔ اب وہی مسیحا صفت دل' دھڑکنا بھول چکا تھا۔ اس کی رگوں میں گردش کرنے والا حیات آفریں لہو بنجر زمین کی تشنہ لبی دور کر رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ سرخ سرخ زندگی میری اپنی رگوں سے نچڑ رہی ہے اور میں لمحہ بہ لمحہ قبر کے اندھیروں کی سمت لڑھک رہا ہوں۔ کچھ دیر کے لیے مجھے ہوش ہی نہیں رہا کہ میں کہاں ہوں' کیوں ہوں؟ میں تو بس یک ٹک فقیر بابا کو گھورے جا رہا تھا جو اوندھے منہ زمین پر ڈھیر تھا۔ یک دم میں اپنے حواس میں واپس آ گیا۔ خود فراموشی کی وہ کیفیت بمشکل چند لمحے مجھ پر حاوی رہی ہو گی لیکن مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں ایک عرصے سے کرب کی خاردار زنجیروں میں جکڑا ہوا خلا میں معلق ہوں۔ خود سے بے خبری کی یہ چادر اس وقت تار تار ہوئی جب کئی گولیاں شائیں شائیں کرتی ہوئی میرے کان کے پاس سے گزرتی چلی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نے مجھے عارضی طور پر اندھا کر کے رکھ دیا۔

صورت حال ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی۔ میں نے فقیر بابا کی حالت کو عارضی طور پر بھلانے کی کوشش کی اور اپنی رائفل کا رخ گاڑی کی سمت کر کے اندھا دھند فائر کھول دیا۔ میری وہ کلاشنکوف رائفل اب میری زندگی کا آخری داؤ بن کر رہ گئی تھی۔ اس وقت وہ آٹومیٹک فائرنگ پر سیٹ تھی لہٰذا جونہی میں نے ٹرائیگر دبایا۔ اس کے دہانے سے لگاتار گولیوں کی بوچھاڑ خارج ہوئی۔ میرے دل میں نفرت کا الاؤ دہک اٹھا تھا۔ ان لوگوں کی گولیوں سے چھلنی لاشیں خاک وخون میں تڑپتی دیکھنا ہی اس وقت میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا تھی۔

روسی ساخت کی کلاشنکوف کا لیور بے حد روانی سے آگے پیچھے حرکت کر رہا تھا اور اجل کی پیامبر گولیاں اپنے نشانے پر برس رہی تھیں۔ میری بدقسمتی یہ تھی کہ آنکھوں پر پڑنے والی تیز روشنی کی وجہ سے میں اپنے ہدف کا صحیح نشانہ نہیں لے رہا تھا۔ البتہ میری مسلسل فائرنگ کی وجہ سے گاڑی میں سوار مسلح افراد مجھ پر گولی نہیں چلا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد یک لخت فضا میں گھمبیر خاموشی نے قبضہ جما لیا۔ میری رائفل کی میگزین میں گولیاں ختم ہو گئیں اور اس کے ساتھ ہی میری زندگی کی امید بھی۔ میرے پاس بھلا فالتو میگزین کہاں تھا کہ میں اپنی رائفل کو دوبارہ لوڈ کرتا۔

میری لگاتار فائرنگ قطعاً بے سود رہی۔ میں ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ پایا۔ اب میرے دشمنوں کی باری تھی کہ وہ میرے خون سے اپنے انتقام کی آگ بجھائیں۔ میں نے ان کے مالک کی عالیشان حویلی میں گھس کر ان سب کی موجودگی میں خون کی ہولی کھیلی۔ میں نے ان کے سردار کو ہی موت کی نیند نہیں سلایا' اس کے علاوہ بھی ان کے کئی ساتھی میرے ہاتھوں زمین کا رزق بنے تھے۔ وہ میرا جو حشر کرتے وہ کم ہوتا۔ میری جیب میں میرا پستول موجود تھا لیکن ان مہلک خودکار ہتھیاروں کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے اپنی جیب سے نکالتا وہ میرا جسم چھلنی کر دیتے۔

اچانک مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ گاڑی میں سوار میری زندگی کے دشمن اب مجھ پر فائر نہیں کر رہے تھے۔ انہیں شاید احساس ہو گیا ہو گا کہ اب میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ درندہ کتنا ہی خونخوار کیوں نہ ہو اگر اس کے دانت اور پنجے چھن جائیں تو وہ کسی بے ضرر مویشی سے زیادہ کچھ نہیں رہتا۔ میں بھی اب بے ضرر جانور کے مانند مکمل طور پر ان کے رحم وکرم پر تھا۔ اب ان کی وہ ہیجانی کیفیت رفع ہو چکی ہو گی کہ وہ مجھے جلد از جلد موت کی نیند سلا دیں۔

اب وہ مجھے بے دست و پا کر کے میرے تمام بل دور کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں گے۔ میرے جسم کے ایک ایک انچ پر وہ اپنے انتقام کی بھیانک داستانیں رقم کرنا چاہتے ہوں گے۔

میرے لیے اب کوئی راہ فرار باقی نہیں بچی تھی۔ میری ایک ایک حرکت ان کی نظر میں تھی۔ وہ گاڑی برق رفتاری سے میری جانب بڑھنے لگی۔ میں بے بسی کے عالم میں اپنی طرف بڑھتی ہوئی موت کی چاپ کو سنتا رہا مجھے علم نہیں تھا کہ فقیر بابا زندہ ہے یا مر چکا۔ بظاہر تو اس کے جسم میں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اگر وہ زندہ بھی تھا تو بہت جلد موت کے جبڑے اسے اپنی بے رحم گرفت میں لینے والے تھے۔ جس مقدار میں خون اس کے جسم سے

ضائع ہو رہا تھا' اسے دیکھتے ہوئے اس کی زندگی کی امید رکھنا خود کو دھوکا دینے کے مترادف تھا۔ میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ میرا دوست' میرا مربی' میرا مشفق میرے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کے غار میں گم ہو رہا تھا اور میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ فقیر بابا کسی دست مہرباں کی طرح مجھ پر سایہ کیے ہوئے تھا۔ وہ سائبان مزاج شخص میرے لیے کڑی دھوپ میں شجر کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک ایسا شجر جس کی چھاؤں بھی تسکین دے اور جس کے پھل بھی میٹھے ہوں۔

''ریفل پھینک دے کتے کی اولاد۔'' ایک کڑک دار آواز نے میرے کانوں کے پردوں کو جھنجھا کر رکھ دیا۔ ''نہیں تو تیرے کو چھلنی کر کے رکھ دوں گا۔'' وہ گھنی داڑھی اور گنجے سر والا بھاری بھرکم شخص تھا۔ افراتفری میں بیدار ہو جانے سے وہ اپنی قمیض کے بٹن بھی بند نہیں کر پایا تھا۔ کھلے گریبان سے اس کی چوڑی چھاتی پر گردن تک پھیلے ہوئے سیاہ بالوں کے گچھے صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ شخص اس کھلی ڈاٹسن سے اترا جو ایک دھچکے سے بڑھ فاصلے پر آن رکی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس بدستور آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھیں۔ داڑھی والے شخص کے ہاتھ میں کلاشنکوف رائفل تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ دو اور ہتھیار بردار گاڑی سے کود کر اترے۔ ان میں سے ایک کے پاس سیون ایم ایم رائفل تھی جبکہ دوسرا تھری نٹ تھری سے لیس تھا۔ وہ دونوں بھی غیظ وغضب کا شکار تھے لیکن داڑھی والے کے تو طیش کی انتہا ہی نہ تھی۔ اس کے لبوں کے کناروں سے کف اڑ رہا تھا اور آنکھیں خون آلود محسوس ہو رہی تھیں۔

اب میں تین خطرناک ہتھیاروں کی زد میں تھا۔ میری ذرا سی بھی مزاحمت کے جواب میں وہ بلا تامل مجھ پر اپنی گنوں کے میگزین خالی کر دیتے۔ جونہی میں نے رائفل زمین پر پھینکی' وہ شخص ایک بار دھاڑا۔ ''اپنے ہاتھ اپنے سر پر رکھ لے اور تین قدم پیچھے کھڑا ہو جا۔ یاد رکھ تو نے ذرا سی بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو فوراً جان سے مار دوں گا۔''

میں نے چپ چاپ اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ میرا دماغ خالی خالی ہو رہا تھا۔ فقیر بابا کے بعد میرے جینے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔ اس بدنصیب نے میری محبت میں خواہ مخواہ اپنی جان گنوا دی اور میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا۔ میں تو اس کے قاتلوں سے انتقام بھی نہ لے سکا۔ وہ مجھے بار بار سمجھاتا رہا کہ مجھے جوش سے نہیں ہوش کا کام لینا چاہیے لیکن میں نے کبھی اس کی نصیحت پر عمل نہیں کیا۔ اگر اس وقت بھی میں حاضر دماغی اور تحمل سے کام لیتا تو شاید کسی نہ کسی طرح اپنے دفاع کرنے میں کامیاب ہو جاتا' میں عقل سے کام لیے بغیر ان پر گولیاں ضائع کرتا چلا گیا تھا۔ اب میں بالکل تہی دامن تھا۔ میری رائفل خالی ہو چکی تھی۔ میرے جنون اور غصے نے مجھے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ میرے مزاج کا اڑیل پن میری موت کے روپ میں میرے سامنے تھا۔

ان تینوں میں سے ایک نے میری تلاشی لینا شروع کی جبکہ باقی دونوں مجھے اپنی زد میں لیے رہے۔ میری تلاشی لینے والا زبردست ماہر فن ثابت ہوا۔ اس نے میرا پستول تو دریافت کرنا ہی تھا لیکن میرا خنجر بھی اس کی دست برد سے محفوظ نہیں رہا۔ کچھ دیر کے لیے وہ شخص میری زد میں رہا اور اگر میں چاہتا تو شاید کوئی کرتب دکھا سکتا تھا لیکن میرے تو ہاتھ پیروں سے گویا جان ہی نکل گئی۔ وہ شخص میرا پستول ہاتھ میں لے کر پیچھے ہٹ گیا۔

اسی وقت ان لوگوں کی نظر میری پھینکی ہوئی رائفل پر پڑی۔ ''اوئے امامی۔ دیکھ یہ تو سردار صاحب کی

رائفل ہے۔"

پستول والے کی بات سن کر وہ دونوں بری طرح چونک اٹھے۔" اوئے ۔ یہ تو واقعی سردار صاحب کی کلاشنکوف ہے۔"

وہ دونوں بیک وقت چلائے۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لوگ ابھی تک سردار برکت علی کی موت سے بے خبر ہیں۔ انہیں اتنی مہلت ہی نہیں ملی کہ وہ حویلی کی اوپری منزل کی خبر لیتے وہ تو بس اندھا دھند میرے تعاقب میں نکل آئے۔

"تیرے پاس یہ رائفل کہاں سے آئی کتے کے بچے؟" داڑھی والے نے غراتے ہوئے پوچھا۔ "سچ سچ بتا دے ورنہ تیرے ٹکڑے اڑا دوں گا۔" پھر اچانک اس پر صورت حال کا صحیح ادراک ہونے لگا۔ اس کا ذہن صورت حال کو کافی حد تک سمجھ چکا تھا۔ "اوئے جلدی سے حویلی واپس چلو۔ یہ سور کی نسل سردار صاحب کے پیچھے آیا ہوگا۔ شاید ...... شاید یہ ......" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی رائفل کا بٹ پوری قوت سے میرے شانوں کے درمیان مارا۔ میرے جسم میں درد کی شدید ترین لہر دوڑتی چلی گئی لیکن میں ابھی تک بے حسی کی سی کیفیت میں مبتلا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ خواب معلوم ہو رہا تھا جو کہ آنکھیں کھولتے ہی چکنا چور ہو جائے گا۔

"آگے لگ ۔ سیدھا سیدھا۔ ذرا سا بھی حرامی پن کیا تو تیرا یہ سور جیسا جثہ چھلنی کر دوں گا اگر خدانخواستہ سردار صاحب کو کچھ ہوا تو میں تیرا قیمہ کر کے کتوں کا کھلا دوں گا۔"

یک لخت میرے جسم میں نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ میں گویا دوبارہ ہوش میں آ گیا۔ برکت علی جیسے غلیظ شخص کو ختم کر کے مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ اس سے بدتر انجام کا مستحق تھا۔ وہ ان خون خوار کتوں جیسے نہ جانے کتنے خون آشام درندوں کا سرپرست و مربی رہا ہوگا۔ ان کا مشتعل ہونا اپنی جگہ درست ہی تھا۔ اگر میں نے ان کے آقا کو زندگی سے بے دخل کر دیا تھا تو اس کا سیدھا سیدھا مطلب یہ تھا کہ میں نے ان سب کو بھی گھنے سائے سے نکال کر کڑی دھوپ میں لا پھینکا تھا۔ اپنی پناہ گاہ سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ یہ لوگ حرام کے لقموں سے بھی محروم ہو گئے تھے۔

میرے لبوں پر بے اختیار ایک زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میں ان کے اضطراب سے پوری طرح لطف اندوز ہونے لگا۔ وہ مجھے گاڑی کی طرف دھکیل رہے تھے۔ جونہی میرے قدم سست پڑتے' ان میں سے کوئی نہ کوئی میری پشت میں رائفل کی نال سے کچوکا دیتا۔ وہ تینوں ہی بے حد محتاط تھے اور ذرا سا بھی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

"لیکن امامی بھائی ادھر جیپ میں غلام رسول اور لطیف شدید زخمی پڑے ہیں ان کا کیا بنے گا؟ اور اس کتے کی نسل کا ساتھی بھی وہ سامنے پڑا ہے۔ پتا نہیں زندہ ہے کہ مر گیا؟"

پستول والے کی بات سن کر وہ داڑھی والا بری طرح چونک پڑا۔ "ہاں مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔ وہ جیپ تو بیکار ہو گئی تم ایسا کرو فیکے' یہ گاڑی لے جاؤ اور ان دونوں کو گاڑی میں ڈال کر فوراً حویلی پہنچو۔ ہم دونوں اسے ہانک کر لاتے ہیں لیکن ٹھہرو پہلے تم دونوں اس کے دوسرے ساتھی کی لاش گاڑی میں ڈالو۔ اتنی دیر میں اسے اکیلا سنبھال لوں گا۔"

وہ دونوں چپ چاپ فقیر بابا کی طرف بڑھ گئے۔ داڑھی والا یہ شخص امامی' شاید کسی خاص اہمیت کا حامل تھا۔ اسی لیے وہ دونوں اس کی ہر بات خاموشی سے مان رہے تھے۔ میرے پاس بڑا اچھا موقع تھا کہ میں اس پر قابو پا کر بازی پلٹ دوں لیکن اپنے دونوں ساتھیوں کی رخصتی کے ساتھ ہی وہ' پہلے سے بھی زیادہ چوکنا ہو گیا۔ گاڑی کی روشنی میں اس کی آنکھیں بری طرح چمک رہی تھیں۔ کلاشنکوف اس کے بڑے بڑے ہاتھوں میں کسی کھلونے کی مانند تھی۔ ایک ایسے مہلک کھلونے کے مانند جو ذرا سے اشارے پر موت کا ترانہ گانے پر آمادہ تھا۔ میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ مجھے موقع ہی نہ ملا کہ میں کچھ کر سکتا۔ میرے ہاتھ میرے سر کی پشت پر تھے اور وہ مجھ سے کئی قدم دور تھا۔ میں کوشش بھی کرتا تو اسے قابو نہیں کر سکتا تھا۔

چند ہی لمحوں بعد وہ دونوں واپس لوٹ آئے ان میں سے ایک نے فقیر بابا کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے جبکہ دوسرے نے اس کی ٹانگیں۔ وہ دونوں گاڑی کی ہیڈ لائٹس سے ذرا باہر تھے لہٰذا میں فقیر بابا کی حالت نہیں دیکھ سکا۔ گاڑی کے پچھلے حصے کے پاس پہنچ کر ان دونوں نے فقیر بابا کے جسم کو چند بار جھلایا اور اسے بڑی بے دردی سے گاڑی کے پچھلے کھلے حصے میں اچھال دیا۔ فقیر بابا کا جسم ایک دھماکے سے گاڑی کے فولادی فرش پر گرا۔ میں یہ منظر کو دیکھ کر دہل گیا۔ غصے کے مارے میرے جبڑے سن ہو گئے۔ ہو سکتا ہے میں اندھا دھند ان تینوں پر ٹوٹ پڑتا لیکن اسی وقت میرے کانوں نے ایک ایسی آواز سنی کہ میرے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جونہی فقیر بابا کا جسم فولاد کے ٹھوس فرش پر گرا' اس کے حلق سے ایک دردناک کراہ نکلی۔

فقیر بابا مرا نہیں تھا۔ وہ ابھی زندہ تھا۔ اس کی سخت جانی اسے ابھی تک زندہ رکھے ہوئے تھی لیکن کب تک؟ اس کے جسم سے اتنا بہت سا خون بہہ چکا تھا کہ اس کا بچنا بہت مشکل تھا لیکن اگر اسے فوری طور پر طبی امداد مل جاتی تو شاید ...... لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا' یہ لوگ تو ہماری جان کے دشمن تھے۔ انہیں بھلا ہماری زندگی سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اگر فقیر بابا فی الحال نہ بھی مرتا تو بالآخر اسے میری طرح ان خونخوار درندوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترنا ہی تھا۔ پھر اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ وہ ابھی تک زندہ ہے۔ یہ سب بھیانک حقیقتیں اپنی جگہ لیکن فقیر بابا کی آواز سن کر میرے تن مردہ میں جان پڑ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری رگوں میں نئے سرے سے لہو گردش کرنے لگا ہے۔ جب تک فقیر بابا زندہ تھا' میرے سینے میں جینے کی امنگ تھی۔ موت کو تو آنا ہی تھا' اسے بھلا کون روک سکتا ہے۔

اچانک امامی کو کچھ خیال آیا اس نے پوری قوت سے اپنی رائفل کی نال میری پیٹھ میں گاڑ دی "سچ سچ بتا حرام کی اولاد تو نے سردار برکت کے ساتھ کیا کیا ہے؟ جلدی بول نہیں تو ابھی پورا برسٹ تیرے جسم سے گزار دوں گا۔ بول ...... بول۔"

"تمہارا خبیث فطرت آقا ...... جہنم رسید ہو چکا ہے۔ میں نے اس کی شیطانی کھوپڑی کے ٹکڑے کر دیے ہیں۔" میں نے بے حد پرسکون لہجے میں کہا۔ میرا جواب مکمل ہو چکا تھا لیکن وہ تینوں بالکل خاموش تھے۔ وہ شاید ابھی تک میرے جواب کو سمجھ ہی نہیں پائے تھے پھر یک لخت امامی کے دونوں ساتھیوں کے حلق سے ہلکی ہلکی چیخیں برآمد ہوئیں۔ جبکہ امامی کے حلق سے ابھرنے والی غضب ناک غراہٹ دل ہلا دینے والی تھی۔ ان کے رد عمل کو دیکھ کر مجھے دلی مسرت کا احساس ہوا۔ ابھی میں اس مسرت کے احساس سے پوری طرح لطف اندوز بھی

نہیں ہونے پایا تھا کہ میرے دائیں بازو پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ امامی نے اپنی رائفل پوری قوت سے گھما کر میرے بازو پر دے ماری۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے دائیں بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اس وار کہ سہہ پاتا' میری پشت پر سیون ایم ایم کا بٹ اتنی قوت سے پڑا کہ میں گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑا۔ جب تک میں سنبھل پاتا' میرے جسم پر اتنے وار ہو چکے تھے کہ مجھ میں ہلنے جلنے کی بھی سکت نہ رہ گئی۔ پھر ان میں سے کسی کی رائفل کا بٹ پوری قوت سے میرے سر سے ٹکرایا اور میری آنکھوں پر خون کی چادر پھیلتی چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں اندھیرے اترتے چلے گئے۔ بے ہوش ہونے سے پہلے میرے ذہن میں صرف فقیر بابا کا خیال تھا' پتا نہیں وہ اب تک زندہ ہے یا......

نہ جانے میریے بے ہوشی کتنی دیر پر محیط رہی۔ چند منٹ' چند گھنٹے یا چند دن لیکن جب میرے حواس نے کچھ کام کرنا شروع کیا تو مجھے پہلا احساس یہ ہوا کہ میرا سر کسی فولادی شکنجے میں جکڑا ہوا ہے اور کوئی شخص اس شکنجے کو کبھی کستا ہے تو کبھی ڈھیلا کرنے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ میں اپنے حواسوں میں واپس آتا چلا گیا سب سے پہلے میری آنکھیں جس چیز پر پڑیں وہ کنکریٹ کی پختہ چھت تھی۔ چھت سے ذرا نیچے فولادی سلاخوں والا روشن دان نظر آ رہا تھا جس سے سورج کی تیز روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں نے گردن گھما کر اپنے آس پاس کا جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن میرے حلق سے کربناک کراہ نکل گئی۔ میرا جوڑ جوڑ پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ میری جسمانی حالت بے حد ابتر ہو رہی تھی۔ ان تینوں مسٹنڈوں نے اپنی پوری قوت مجھ پر صرف کر دی تھی۔ جس وحشیانہ انداز میں انہوں نے میرے جسم پر رائفلوں کے بٹ برسائے تھے' اس کے پیش نظر تو میرا زندہ بچ رہنا ہی ایک معجزہ سمجھا جا سکتا تھا لیکن میرا سخت جان جسم سب کچھ سہہ گیا۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا سر پر پڑنے والی ضرب بہت کاری ثابت ہوئی لیکن مجھے سب سے زیادہ فکر اپنے دائیں بازو کی تھی جس پر اس سانڈ نما شخص امامی نے اپنی رائفل گھما کر ماری تھی۔ میرے جسم کی اگر باقی وڈیاں سلامت تھیں تب بھی کم از کم اس بازو کی ہڈی کے دو ٹکڑے ہونا یقینی تھا۔

میں نے نہایت آہستہ آہستہ اپنی گردن گھما کر اپنے آس پاس نظر ڈالی۔ میرے چاروں طرف کنکریٹ کی ناقابل تسخیر دیوار سر اٹھائے کھڑی تھی۔ یہ ایک اچھا خاصا ہال نما کمرا تھا جس میں کسی قسم کا سامان نہیں تھا۔ میں خود ایک خستہ چٹائی پر پڑا ہوا تھا۔ اس کمرے کے ایک کونے میں پختہ زینہ تھا۔ زینے کی سب سے اوپری سیڑھی کے سامنے ایک مضبوط آہنی دروازہ تھا۔ اس کمرے کی ساخت سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ ایک تہ خانہ ہے۔ یہ تہ خانہ برکت علی کی کوٹھی میں ہی کہیں ہو سکتا تھا۔ پھر یک لخت مجھے شدید بھوک اور پیاس نے گھیر لیا۔ نہ جانے میں کب سے بے ہوش تھا۔ میری بھوک کی شدت بتا رہی تھی کہ یہ مدت تین سے چار دن تک ہو سکتی ہے۔

مجھے فقیر بابا کا خیال آیا اور میرے رگ و پے میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ میرا دل خوف اور اندیشوں کے بوجھ سے ڈوبا جا رہا تھا۔ جانے فقیر بابا کا کیا حال ہوگا؟ اس کی حالت بے حد نازک تھی۔ اسے فوری طور پر طبی امداد درکار تھی لیکن ان درندوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کے علاج معالجے کا جھنجھٹ پالتے۔ موت تو ویسے بھی ہم دونوں کا مقدر بن چکی تھی۔ میں اگر اب تک زندہ رہا تو اس کی وجہ شاید یہی رہی ہو کہ وہ مجھے اذیت دے کر' سسکا سسکا کر ختم کرنا چاہتے ہوں گے۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھوں پر زور ڈال کر اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن میرے خستہ و شکستہ جسم نے میرے اس مطالبے پر شدید احتجاج کیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے پورے بدن کی ہڈیاں چیخنے لگی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھ پر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا۔

میرا دایاں بازو جس کی طرف سے میں سب سے زیادہ فکر مند تھا اس میں درد کی ہلکی سی لہر بھی نہیں تھی۔ اگر میرا پورا جسم درد کا سمندر بنا ہوا تھا تو میرا دایاں ہاتھ ایک عجیب سی راحت اور سکون کا جزیرہ لگ رہا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید میرا ہاتھ مفلوج ہو چکا ہے' جس کی وجہ سے اس پر بے حسی سی تاری ہے۔ میں نے جلدی جلدی اس ہاتھ کی مٹھی کھولنے اور بند کرنے کی کوشش کی لیکن یہ جان کر مجھے طمانیت ہوئی کہ میرا ہاتھ پوری طرح صحیح سلامت ہے اور میں اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو بآسانی حرکت دے سکتا ہوں۔

میں کافی دیر تک چاروں شانے چت پڑا رہا۔ میں نے اپنے دائیں ہاتھ کو سر پر پھیر کر چوٹ کی جگہ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی میرے سر پر پیشانی سے تقریباً تین انچ اوپر ایک گہرا زخم تھا۔ وہ جگہ سوجی ہوئی تھی اور وہاں سے خون بہہ کر خشک ہو گیا تھا جس وجہ سے بال سخت برش کے مانند ہو رہے تھے۔ میرے چہرے پر البتہ اب خون کی تہ نہ تھی۔ شاید کسی نے گیلے کپڑے سے میرا چہرہ صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے ایک بار پھر بیٹھنے کی کوشش کی اور بالآخر کافی جدوجہد کے بعد اپنے دائیں ہاتھ کے بھرپور تعاون سے اٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس وقت مجھے اپنے جسم پر ثبت ضربوں کی شدت کا پوری طرح احساس ہوا۔ ان بدبختوں نے حقیقتاً میری ہڈی پسلی ایک کر کے رکھ دی تھی۔ وہ شاید مجھے عمر بھر کے لیے اپاہج بنانا چاہتے تھے۔ وہ اپنے مقصد میں تقریباً کامیاب ہو ہی چکے تھے لیکن اس کا کیا کیجیئے کہ میری ڈھیٹ ہڈیاں تمام ضربات کو جذب کر گئیں۔

میں کافی دیر بیٹھا رہا۔ اس کے بعد میں ایک بار پھر چٹائی پر دراز ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد تہہ خانے کے روشن دان سے جھانکتی' سورج کی روشنی پھیکی پڑ گئی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا جس شخص کے پیٹ میں بھوک نے قیامت برپا کی ہوئی ہو اور جس کے جسم کی ہر ہڈی فریاد کناں ہو' اسے نیند آئے تو کیونکر؟ مجھے آنکھیں بند کیے کچھ ہی دیر ہوئی ہوگی کہ تہ خانے کے دروازے پر کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے اپنے دائیں ہاتھ پر زور ڈالا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ تہ خانے کا دروازہ کھلا اور دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک امامی تھا جب کہ دوسرا میرے لیے قطعاً اجنبی تھا۔ وہ دونوں بڑی بے فکری سے باتیں کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ وہ شاید میری طرف سے پوری طرح مطمئن ہوں گے کہ ہڈیاں چکنا چور ہونے کے باعث میں ہلنے جلنے سے بھی معذور ہو چکا ہوں۔ امامی کے پاس کلاشنکوف موجود تھی لیکن اس نے اسے بڑی بے پروائی سے کاندھے پر ٹانگ رکھا تھا۔ دوسرا شخص بظاہر خالی ہاتھ تھا۔

وہ دونوں آدمی سیڑھیاں ہی اترے ہوں گے کہ اچانک امامی کی نظر مجھ پر پڑی' وہ ایک جھٹکے سے رک گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے بیٹھا ہوا دیکھ کر وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ اس کی تقلید میں دوسرا شخص بھی رک گیا۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ بھی چونک سا گیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا البتہ

امامی کو خود پر قابو پانے میں چند لمحے لگے۔ مجھے امامی کی حیرانی دیکھ کر مسرت کا احساس ہوا۔ میں نے ایک بار پھر اپنے دشمنوں کے اندازوں کو بالکل باطل کر دیا۔ میری بے پناہ قوت مزاحمت ایک بار پھر ناقابل شکست ثابت ہوئی۔

اچانک امامی نے اپنے کاندھے سے رائفل اتار کر مجھ پر تان لی اس نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ رائفل کو کاک کر کے فوری طور پر گولیاں برسانے کے لیے بھی تیار ہو گیا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں حواس باختہ ہو کر وہ واقعی گولی نہ چلا بیٹھے۔

امامی کے برعکس دوسرا شخص پوری طرح پرسکون اور پر اعتماد نظر آ رہا تھا۔ وہ بڑی بے نیازی سے سیڑھیاں اتر رہا جبکہ امامی پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ قدرے خوف کی بھی کیفیت نظر آ رہی تھی۔

وہ شخص نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا میرے پاس آن کھڑا ہوا۔ وہ مجھ سے قطعاً خوف زدہ نہ تھا اور اسے ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔ وہ تو خود اس قابل تھا کہ اسے دیکھ کر اس کے دشمن خوف کھائیں۔ اس جیسے شیر جوان شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کا قد اگر مجھ سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھا۔ چوڑے شانے' ابھری ہوئی ٹھوس چھاتی اور چیتے جیسی کمر۔ اسے شاید اپنی جسمانی کسرتوں کا کچھ زیادہ ہی خیال ہوگا۔ جسم کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کو بھی دلکش کہا جا سکتا ہے۔ اس کے چہرے کی جلد سانولی مگر صاف شفاف اور چمکدار تھی۔ اس نے اپنے لبوں پر باریک مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں۔ امامی جسامت میں اس سے زیادہ بھاری بھر کم تھا لیکن اس کے سامنے حقیر سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس جوان کو اپنی شخصیت کی اثر انگیزی کا پورا احساس تھا۔ چنانچہ اس کی چمک دار آنکھوں میں ناقابل تسخیر قسم کا اعتماد پنہاں تھا۔ مجھے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ یہ جاذب نظر جوان کسی بھی محفل میں لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بن سکتا ہے لیکن دشواری یہ تھی کہ وہ میرے پاس دوست بن کر نہیں دشمن بن کر آیا تھا۔ میں اس کے حدود اربعہ سے تو واقف نہیں تھا لیکن ظاہر ہے کہ امامی کے ساتھ آنے والا شخص میرے لیے پھولوں کا گلدستہ لے کر تو نہیں آیا ہوگا۔

''اوئے امامی!۔ تو تو کہہ رہا تھا کہ تم لوگوں نے اس کے چاروں ہاتھ پاؤں توڑ دیے ہیں اور اس کا بچنا مشکل ہے لیکن یہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک' ہٹا کٹا الو کا پٹھا دکھائی دے رہا ہے۔''

''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا بھائی اکی! یہ تو مجھے کوئی ہوائی مخلوق معلوم ہوتا ہے۔'' امامی نے مجھ پر بدستور رائفل تانے ہوئے کہا۔ ''میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی یہ رائفل پوری قوت سے گھما کر اس کے سیدھے بازو پر ماری تھی۔ یقین کرو اگر وہ ضرب کسی لکڑی کے کھمبے پر پڑتی تو اس کے دو ٹوٹے کر دیتی لیکن یہ اسی ہاتھ کے سہارے بیٹھا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ہم تینوں نے رائفلوں کے بٹ مار مار کر اس کا بھرتا بنا دیا تھا۔''

''سوال یہ ہے کہ تمہاری چار چوٹ کی مار کے باوجود یہ زندہ کیسے بچ گیا اور تین دن کے بعد ہی کیسے اٹھ بیٹھا؟ اور وہ بھی بغیر دوائی دارو کے۔ نہیں امامی تم لوگوں نے اسے غلط سمجھا ہے۔ جو شخص اس قدر کڑے پہرے میں اس حویلی کے اندر بے دھڑک گھس کر سردار برکت علی کا خون کر سکتا ہے۔ وہ کوئی معمولی شخص نہیں ہو سکتا۔ جو شخص موت سے جتنا بے خوف ہوتا ہے موت اس سے اتنا ہی دور دور رہتی ہے۔ یہ اتنی آسانی سے موت کے

آگے ہتھیار ڈالنے والا آدمی نظر نہیں آتا۔''

میں نے ایک بار پھر اکی کا بغور جائزہ لیا۔ اس کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ بہادر اور نڈر ہی نہیں ذہین اور مردم شناس بھی ہے۔ ایسے لوگ بے حد خطرناک دشمن ثابت ہوتے ہیں۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا کہ وہ صاف گو بھی ہوگا چنانچہ میں نے اپنے ذہن میں بہت دیر سے مچلتے ہوئے سوال کو زبان دے دی۔

''میرا ساتھی...... کیسا ہے؟ کیا وہ......''

''وہ بڈھا بچ گیا ہے۔ اس کی دونوں رانوں میں گولیاں لگی ہوئی تھیں لیکن اس کے باوجود اسے بچا لیا گیا ہے۔''

اس انکشاف نے میرا دل مسرت سے بھر دیا۔ اس شخص نے مجھے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشخبری سنائی تھی۔ میرا ہمدم' میرا سرپرست' میرا بزرگ' میرا دوست زندہ اور صحیح سلامت تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس طرح اپنی مسرت کا اظہار کروں اگرچہ ہم دونوں کی زندگی کی اب بھی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ اس کے باوجود یہ جاں فزا خبر مجھے ایک نئی زندگی دے گئی۔

''تم لوگوں نے اسے کیوں بچایا؟ وہ بھی تو تمہارے سردار کے قتل میں برابر کا شریک تھا۔'' میں نے بے جگری سے سوال کیا۔

''ہم نے صرف حکم کی تعمیل کی ہے۔ اس حکم کی وجہ تو حکم دینے والا ہی جانتا ہے۔''

''وہ حکم دینے والا کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''صبر کرو۔ صبر کرو۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ سب کچھ پتا چل جائے گا۔''

''لیکن مجھے سخت بھوک اور پیاس لگ رہی ہے۔ میں دشمن ہی سہی لیکن جانی دشمن کو بھی بھوکا مارنا بہادروں کی شان کے خلاف ہے۔'' میں نے انہیں اکسایا۔

میری بات سن کر اکی کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا میں نے اس کی بہادری اور جواں مردی کو نشانہ بنایا تھا اور شاید یہ بات اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ ''تم بھوکے پیاسے نہیں مرو گے۔ تمہاری موت تمہارے شایان شان ہوگی۔ ہم حکم کے منتظر ہیں۔ ہمیں جونہی حکم ملا تمہیں کھانے پینے کو دے دیا جائے گا۔ فی الحال تو صبر کرو اور اپنے انجام کے متعلق فکر کرو۔''

''تم امامی کو کہہ رہے تھے کہ یہ مجھے پوری طرح سمجھ نہیں سکا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تم خود بھی کسی غلط فہمی کا شکار ہو اگر میں موت کی فکر کرتا تو یوں اندھا دھند برکت علی کا سر اتارنے کے لیے اس حویلی میں نہ گھس آتا۔ تم مجھ سے سیدھی سیدھی بات کرو تمہیں حکم دینے والا کوئی بھی ہے' اسے سمجھا دو کہ اگر اس نے مجھے مزید بھوکا پیاسا رکھنے کی کوشش کی تو میں اندھا دھند اس کے پالتو کتوں پر ٹوٹ پڑوں گا۔ چاہے اس کے نتیجے میں میرا جسم گولیوں سے چھلنی ہو جائے۔''

''زبان سنبھال کر بات کر حرام دے پتر' ورنہ تیری زبان کھینچ لوں گا۔'' امامی نے مشتعل ہوتے ہوئے کہا۔ اسے پالتو کتے کا خطاب کچھ زیادہ پسند نہیں آیا تھا لیکن اکی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے پرسکون رہنے کا اشارہ کیا۔ ''ایسی حماقت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہیں بلد از جلد کھانے پینے کی

اجازت مل جائے۔ ابھی ہمیں تمہاری زندگی کی بے حد ضرورت ہے۔ ابھی تو تم سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔"

"اور میرا ساتھی کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"اس کی فکر نہ کرو۔ وہ جہاں بھی ہے' بالکل ٹھیک ٹھاک ہے اور اس کا پورا علاج ہو رہا ہے۔"

میں نے اس سے مزید سوالات کرنا چاہے لیکن وہ تہ خانے کے زینے کی طرف بڑھ گیا۔ امامی بڑے محتاط انداز میں الٹے قدموں چلتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ تہ خانے سے باہر نکل گیا اور اس کے ساتھ ہی آہنی دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ بند ہو گیا۔

وہ ساری رات اور اگلا پورا دن مجھے بھوک اور پیاس کا عذاب سہنا پڑا۔ میری چوٹوں پر سے ورم اب کم ہونے لگا تھا لیکن ابھی میرے لیے کھڑا ہونا مشکل تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا میرے غصے اور نفرت کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا میں اس نامعلوم شخص کو دل کھول کر گالیاں بکتا رہا جس نے مجھے بھوکا پیاسا مرنے کے لیے اس منحوس زنداں کی زینت بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔ شام کے وقت تک میری برداشت کی آخری حد آن پہنچی۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اب میں مزید یہاں بند نہیں رہوں گا لیکن میں یہاں سے نکلوں گا کیسے؟ مجھے اس کی زیادہ پرواہ نہیں تھی اگر انسان کا عزم پختہ اور ارادے مضبوط ہوں تو ناممکن کو بھی ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ میں نے اکی سے غلط نہیں کہا تھا۔ مجھے بھوکا پیاسا زندہ رہنے سے جدوجہد کرتے ہوئے مر جانا زیادہ پسند تھا۔ میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اب میں ضرور کچھ نہ کچھ کر گزروں گا۔

میں نے اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے کھڑا ہونے کی کوشش کی۔ شروع میں تو مجھے یہ احساس ہوا جیسے میں ساری عمر کھڑا نہیں ہو سکوں گا۔ میری ٹانگیں میرا بوجھ نہیں سنبھال پا رہی تھیں۔ یوں محسوس ہوا جیسے میرے گھٹنوں کی ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو چکی ہیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میری رگ رگ سے لہو نچڑ گیا ہو۔ میں نے اپنے گھٹنوں پر ہاتھ جما کر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن میری کمر میں درد کی اس قدر شدید ٹیس اٹھی کہ میں کوشش کے باوجود سیدھا نہ ہو سکا۔ کچھ دیر بعد میں نے ایک بار پھر کھڑا ہونے کی کوشش کی۔ اس بار میں سیدھا کھڑا ہونے میں تو کامیاب ہو گیا لیکن میرا دل ہی جانتا ہے کہ مجھے کتنی کڑی اذیت سے گزرنا پڑا۔ میری آنکھوں کے سامنے بار بار اندھیرا چھاتا رہا لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح خود پر قابو پائے رکھا۔ آہستہ آہستہ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میری کھوئی ہوئی طاقت واپس لوٹ رہی ہے۔ اب میری آنکھوں کے سامنے زمین پہلے کی طرح گردش نہیں کر رہی تھی۔ میں نے کوشش کر کے ایک قدم اٹھایا میرا سر ایک بار پھر بری طرح چکرایا لیکن میں نے خود کو سنبھالے رکھا۔ دوسرا قدم پہلے قدم سے زیادہ صبر آزما ثابت ہوا۔ میری حالت قطعاً اس قابل نہ تھی کہ میں اس قسم کی مہم جوئی کرتا لیکن مجھ میں چھپا ہوا آہن صفت سیف داد خان مجھے اپنی آخری سانس تک ہمت نہ ہارنے پر مجبور کر رہا تھا۔ میں خود پر جبر کر کے قدم بہ قدم چلتا رہا۔

میں نے دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگنی شروع کی۔ اس خدا سے جو پتھر میں کیڑے کو رزق بہم پہنچاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے خود کو بہتر محسوس کیا۔ میرے تمام جسم میں درد تو بدستور موجود تھا لیکن کمزوری کا احساس کم ہو گیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا زینے کی طرف بڑھنے لگا۔ زینے کی سیڑھیاں چڑھنا میرے عزم و حوصلے کا کڑا امتحان ثابت ہوا۔ فولادی دروازے کے سامنے پہنچتے پہنچتے میری توانائی کی آخری رمق بھی جواب

دے گئی اور میں دروازے کے سامنے والی قدرے کھلی جگہ پر ڈھیر ہو گیا۔ میری آنکھیں خود بخود بند ہوتی چلی گئیں۔"

وہ نیند کی کیفیت تھی یا بے ہوشی کی مجھے کچھ معلوم نہیں لیکن جب ہوش آیا تو اس وقت آہنی دروازے پر کھٹ پٹ ہو رہی تھی۔ میں چند ہی لمحوں میں پوری صورت حال سمجھ گیا اور تیزی سے لڑھکتا ہوا دروازے کے سامنے سے ہٹ کر ایک طرف دیوار کے ساتھ لگ گیا اور پھر گھٹنوں پر زور ڈال کر' دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ اب اگر دروازہ کھلتا بھی تو میرا فوری طور پر نظر آنا ممکن نہ ہوتا۔ میں نے سوچ لیا کہ جونہی کوئی شخص تہ خانے میں داخل ہوا' میں اسے پیچھے سے چھاپ لوں گا۔ البتہ اگر وہ ایک سے زیادہ ہوتے تو پھر اللہ ہی کا آسرا ہو سکتا تھا۔ اگلے ہی لمحے ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ آہنی دروازہ کھل گیا۔

میری توقع کے مطابق وہ شخص تنہا ہی تھا اور مجھے فوری طور پر دیکھ بھی نہ سکا۔ اس نے حیران پریشان نظروں سے ادھر دیکھا' جدھر مجھے ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اپنے جسم کی پوری قوت کو مجتمع کر کے اسے سیڑھیوں کی طرف دھکا دے دیا۔ وہ دھکا بہت زیادہ طاقتور نہیں تھا' اس کے باوجود وہ بری طرح لڑکھڑا گیا۔ زوردار جھٹکے کی وجہ سے اس کے کاندھے پر لٹکی ہوئی سیون ایم ایم رائفل پھسلی اور زینے سے نیچے پختہ فرش پر جا گری۔ وہ شخص بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور سیڑھیوں پر لڑھکنیاں کھاتا ہوا گرنے لگا۔ اس نے چار پانچ سیڑھیاں اس طرح لڑھکتے ہوئے طے کیں لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور خود کو روک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے صورت حال پوری طرح سمجھ لی تھی اور اب اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ وہ شدید غیظ و غضب کی کیفیت کا شکار تھا۔ وہ میرے لیے قطعاً اجنبی تھا۔ اس کی عمر یہی کوئی تیس بتیس برس ہوگی۔ بھاری بھرکم جثہ' گھنے الجھے ہوئے بال' پھولی پھولی گھنی سیاہ مونچھیں' جنہوں نے اس کے آدھے اوپری لب کو ڈھانپ رکھا تھا۔ میری اس حرکت نے اسے بری طرح مشتعل کر دیا تھا۔

وہ کچھ دیر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مجھے گھورتا رہا۔ جب میں نے آنکھیں نہ چرائیں تو وہ ایک دم غصے سے بے قابو ہو گیا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا میری طرف لپکا۔ اس کی بائیں ٹانگ میں واضح طور پر لنگراہٹ تھی۔ اس کا گھٹنا شاید پختہ سیڑھی کے کنارے سے ٹکرا گیا تھا۔ اسے آپے سے باہر ہوتے دیکھ کر مجھے خوشی سی محسوس ہوئی۔ فقیر بابا کا کہنا تھا کہ شدید طیش کے عالم میں انسان کا تین چوتھائی دماغ مفلوج ہو جاتا ہے لہٰذا دو بدو مقابلے کے وقت خود کو زیادہ سے زیادہ پرسکون رکھنے کی اور مدمقابل کو زیادہ سے زیادہ مشتعل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

وہ شخص جب میرے پاس پہنچا تو میں اس کے خیر مقدم کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میرے پاس پہنچتے ہی اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پوری قوت سے میرے چہرے پر گھونسا دے مارا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹ کر' ایک طرف جھکا اور اس کا وار خالی چلا گیا۔ وہ قدرے لڑکھڑایا لیکن پھر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اپنا وار خالی جاتے دیکھ کر وہ مزید مشتعل ہو گیا۔ اس نے ایک بار پھر پوری قوت سے گھونسا مار کر میرے دانت حلق میں اتارنے کی کوشش کی' اس بار بھی میں پیچھے تو ضرور ہٹا لیکن اس بار اس کا وار خالی نہیں گیا۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر موٹی فولادی چادر والا دروازہ اس کے سامنے کر دیا۔ اس کا گھونسا پوری قوت سے دروازے سے ٹکرایا اور بھاری

بھرکم دروازہ بری طرح جھنجھنا گیا۔ اس شخص کے حلق سے ایک کربناک چیخ برآمد ہوئی اور اس نے اپنے مضروب ہاتھ کو اپنی رانوں میں دبا لیا۔ میں زیادہ طویل کشمکش کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میری جسمانی توانائی کسی وقت بھی جواب دے سکتی تھی اور پھر میں ایک بار پھر بھیگے چوہے کے مانند پکڑا جاتا۔ تہ خانے کا کھلا ہوا دروازہ مجھے اپنی زندگی کا راستہ نظر آ رہا تھا۔ میرے اور آزادی کے راستے میں صرف یہ شخص حائل تھا اور میں اس دیوار کو جلد از جلد گرا دینا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص سنبھل پاتا' میں نے اس کا سر پکڑ کر پوری قوت سے پختہ دیوار سے ٹکرا دیا۔ ایک ہلکا سا دھماکا ہوا اور وہ شخص ایک ہلکی سی ہچکی نما کراہ کے ساتھ سیڑھیوں کے کنارے ڈھیر ہوتا چلا گیا۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑا اور تیزی سے کھلے دروازے سے باہر نکل آیا۔ ایک ایک لمحہ بے حد قیمتی تھا۔ میرے پاس صرف بہت کم مہلت تھی۔ کسی وقت بھی کوئی شخص ادھر آ سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے اس شخص نے کسی کو جا کر میرے بارے میں اطلاع دینی ہو۔ دیر ہونے کی صورت میں اس کی تلاش کے لیے دوسرا شخص بھی بھیجا جا سکتا تھا۔

میں آہنی دروازے سے باہر نکلا تو میرے سامنے ایک اور زینہ موجود تھا اس زینے کے آخر میں چوکور ڈھکن نما دروازہ نظر آیا جو اس وقت کھلا ہوا تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر اس دروازے تک پہنچ گیا۔ قید سے نجات کا راستہ سامنے دیکھ کر میرے جسم میں بجلیاں سی بھر گئی تھیں۔ میں اپنے جسم کی تمام ٹوٹ پھوٹ اور درماندہ حالی کو بھول گیا۔

وہ دروازہ ایک چھوٹی سی کوٹھری کے فرش میں کھلتا تھا۔ میں نے گردن نکال کر آس پاس کا جائزہ لیا۔ اس وقت وہ کوٹھری کسی بھی انسانی وجود سے خالی نظر آ رہی تھی۔ میں اگلے ہی لمحے اوپر چڑھ آیا۔ دور کسی کونے کھدرے سے ڈیزل جنریٹر کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں بلاشبہ سردار برکت علی کی حویلی میں موجود تھا۔ چھت سے لٹکتے ہوئے زرد رو بلب کی مدہم روشنی میں یہ کوٹھری اسٹور روم قسم کی جگہ نظر آ رہی تھی۔ ہر طرف کاٹھ کباڑ جمع تھا۔ قریب ہی ایک ترپال نما بوریا پڑا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے تہ خانے کے دروازے کے دونوں کواڑ بند کر دیے۔ اب وہ دروازہ بالکل فرش کے برابر ہو گیا تھا۔ میں نے اس دروازے پر وہ ترپال ڈال دی۔ وہ شاید اسی مصرف کے لیے استعمال ہوتی ہو گی۔

ترپال ڈال کر میں جونہی سیدھا ہوا' ایک دم میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میرے قدم لڑکھڑا گئے۔ مجھ پر نقاہت کا غلبہ ہونے لگا۔ اگر مجھے جلد ہی کچھ کھانے پینے کو نہ ملتا تو میں کسی بھی وقت ڈھیر ہو جاتا اور پھر شاید روز قیامت ہی میری آنکھ کھلتی۔

اس کوٹھری کا دروازہ ایک طویل راہداری میں کھلتا تھا۔ اس راہداری میں مدھم روشنی والے دو بلب لگے ہوئے تھے جو اس وقت بھی زرد زرد روشنی بکھیر کر اندھیروں کو بھگانے کی سر توڑ جدوجہد میں مصروف تھے۔ جس کوٹھری سے میں نکلا تھا وہ راہداری کی آخری کوٹھری تھی۔ کوٹھری کے قریب ہی راہداری کا آخری سرا تھا جہاں ایک بڑا سا دروازہ تھا۔ اس دروازے میں اندر کی جانب ایک بھاری بھرکم زنجیر لگی ہوئی تھی اور اس زنجیر میں کئی سیر وزنی تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ دروازہ حویلی کے لان میں کھلتا ہو گا۔ میں نے اس تالے کو توڑنے کے متعلق سوچا تو وہ مجھے ناقابل تسخیر نظر آیا۔ اب ایک ہی صورت رہ گئی کہ میں اندر کی جانب جاؤں۔ حویلی میں

گزرنے والا ہر لمحہ میرے لیے خطرات بڑھا رہا تھا لیکن سب سے پہلے مجھے اپنے پیٹ کے جہنم کو سرد کرنا تھا۔ میں نے اپنے بائیں ہاتھ پر موجود کوٹھریوں کی قطار میں سے پہلی کوٹھری کی کنڈی کھولی۔ اس کوٹھری میں دو چار پائیوں پر بستروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اس سے اگلی کوٹھری میں آٹے' چینی اور پیاز وغیرہ کی بوریاں رکھی ہوئی تھیں۔ اگلی کوٹھری کا دروازہ کھولتے ہوئے میرے ہاتھ ہیجان کی شدت سے کپکپا رہے تھے۔ میرے توقع کے عین مطابق وہ کوٹھری باورچی خانہ تھی۔ وہ اچھی خاصی بڑی کوٹھری تھی۔ راہداری میں لگا ہوا بلب عین اس کے سامنے تھا۔ بلب کی روشنی میں سامنے ہی مٹی کے تیل کے تین بڑے بڑے چولہے نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک چولہے پر رکھی ہوئی ایک دیگچی شاید میری ہی منتظر تھی۔ میں نے بے صبری سے ڈھکن اٹھایا اور دیگچی کے اندر نظر پڑتے ہی میری روح سرشار ہو گئی۔ وہ دیگچی گاڑھے گاڑھے حیات بخش دودھ سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ میں نے انگلی مار کر دودھ پر چڑھی ملائی کی موٹی تہ کو توڑا اور پھر اسے دودھ میں ملا دیا۔ مجھ میں صبر کا یارا نہ تھا کہ شکر ڈھونڈتا تھا اور نہ ہی اس کی کوئی خاص ضرورت تھی۔ میں نے ایک ہی سانس میں دیگچی آدھی کر دی۔ گاڑھے دودھ نے میری مونچھوں کو بھگو دیا اور ان سے ٹپکنے والے قطرے میری داڑھی کو تر کرنے لگے۔ میں نے دیگچی کو دوبارہ منہ سے لگا لیا اور اسے اس وقت تک منہ سے نہیں ہٹایا جب تک کہ اس نعمت خداوندی کا آخری قطرہ بھی حلق میں نہیں انڈیل لیا۔

دودھ میرے خالی پیٹ میں گیا تو میری جان میں جان پڑ گئی جیسے میری آنکھوں کی روشنی واپس لوٹ آئی ہو۔ بھوکا انسان ایک دم نہیں مرتا۔ اس کی موت قسطوں میں واقع ہوتی ہے اور موت کا یہ انداز بہت ہی اذیت ناک ہے بھوک کا شکار انسان پل پل مرتا ہے اور پل پل جیتا ہے۔ ایک مرحلہ آتا ہے جب فاقہ زدہ انسان کا جسم گھلنا شروع ہو جاتا ہے لیکن اس کی روح پھر بھی اس کے جسم کا قبضہ چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتی۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ بھوکا انسان کسی قانون' کسی ضابطے' کسی روایت و تعزیر کا غلام نہیں بن سکتا۔ جس جگہ بھوک کا دور دورہ ہو وہاں پھر کوئی اخلاقی' سماجی اور معاشی ضابطے باقی نہیں رہتے۔ میں نے بھوک کے عفریت کو بالآخر پسپا ہونے پر مجبور کر ہی دیا۔

مجھے اپنے جسم میں بجلیاں سی دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ میرا دماغ پہلے سے زیادہ برق رفتاری سے کام کرنے لگا۔ نیم گرم دودھ نے میرے جسم پر جادو اثر دوا کا کام کیا۔ میں نے باورچی خانے میں ادھر ادھر ہاتھ مار کر دیکھا۔ قریب ہی ایک ٹوکری میں انڈے رکھے ہوئے ملے۔ میں نے ایک انڈا نکالا اور اسے توڑ کر کچا ہی اپنے حلق میں انڈیل لیا۔ مجھے اس وقت اپنی کھوئی ہوئی توانائی درکار تھی اور یہ انڈے میرے لیے فوری توانائی کا بہترین ذریعہ بن گئے۔ یکے بعد دیگرے تین انڈے میرے پیٹ میں اتر گئے۔

جب میں باورچی خانے سے باہر نکلا تو خود کو ایک نیا انسان محسوس کر رہا تھا۔ ساری کمزوری اور نقاہت ہوا ہو گئی تھی۔ میرا عزم اور میرا حوصلہ آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ اب میں اپنے ڈشمنوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے بے قرار تھا۔ اگرچہ اب بھی میرے جسم میں درد ہو رہا تھا لیکن اب مجھ میں اسے برداشت کرنے کی قوت پیدا ہو گئی تھی۔

میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا' راہداری میں آگے بڑھا' چند قدم چلنے کے بعد مجھے راہداری کے دائیں

ہاتھ والی دیوار میں ایک کھڑکی نظر آئی۔ میں نے بڑی احتیاط سے کھڑکی کی چٹخنی کھول لی۔ اس کھڑکی میں موٹی موٹی سلاخیں لگی نظر آئیں یہ حویلی کا پچھلا حصہ تھا۔ سامنے ہی حویلی کی چار دیواری کا عقبی حصہ نظر آیا۔ وہاں آس پاس کوئی بلب جل رہا ہوگا جس کی مریل روشنی باہر پھیلے ہوئے اندھیرے کو چاک کرنے میں قطعاً ناکام تھی۔ سارا منظر دھندلی چاندنی کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے کھڑکی کو بند کیا اور آگے بڑھ گیا۔ میری نگاہیں باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہی تھیں۔

وہ راہداری آگے جا کر بائیں جانب مڑ گئی۔ میرے سامنے ایک بڑا سا دالان نما ہال موجود تھا۔ وہاں اس وقت صرف ایک بلب روشن تھا اس ہال میں چار کمروں کے دروازے کھلتے تھے' پانچواں دروازہ بہت بڑا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ دروازہ صدر دروازے کی طرف کھلتا ہوگا۔ اس وقت یہ دروازہ بھی مقفل تھا۔

میں یکدم چوکنا ہو گیا اگرچہ مجھے اب تک کوئی مکین نہیں ملا تھا لیکن اگر یہ ہضمی قفل اندر سے بند کیا گیا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ان چاروں کمروں میں کسی نہ کسی میں کوئی فرد یا افراد یقیناً موجود ہوں گے۔ پھر مجھے اس بدنصیب کا خیال آیا جسے میں تہ خانے کی سیڑھیوں پر پڑا چھوڑ آیا تھا۔ وہ بھی ان میں سے کسی کمرے میں سے نکل کر میری خبر گیری کے لیے پہنچا ہوگا۔ مجھے ان میں سے ایک کمرے کے دروازے کے نیچے سے ہلکی سی روشنی جھانکتی نظر آئی۔ میں بلی کی سی چال چلتا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھا۔ میں نے بڑی آہستگی سے دروازے کا لٹو گھمایا اور دروازہ کھلتا چلا گیا۔ کمرے کے بلب کی دھیمی روشنی میں سامنے ایک شخص دیوار کی جانب منہ کیے ہوئے سویا ہوا تھا۔ کمرے میں ایک اور چارپائی بھی موجود تھی جس پر موجود بستر کی حالت سے ظاہر ہوتا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے کوئی اس پر سے اٹھ کر گیا ہے۔ اس چارپائی پر یقیناً وہی تہ خانے والا شخص موجود رہا ہوگا۔

میں دبے پاؤں اس کمرے میں داخل ہوا اور اس شخص کی جانب بڑھا اس وقت میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ مجھے اس شخص کی چارپائی کے سرہانے ایک شاٹ گن دیوار کے سہارے کھڑی نظر آئی۔ میں نے سب سے پہلے شاٹ گن کو اپنے قبضے میں کیا اور پھر ایک ہاتھ سے اس شخص کو بری طرح جھنجھوڑ دیا۔ وہ شخص یک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ چند لمحوں تک بدحواسی کے عالم میں مجھے گھورتا رہا۔ پھر اس کی آنکھیں حیرت کی شدت سے پھٹی پھٹی سی نظر آنے لگیں۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

''تت......تم......تم۔''

''خاموش۔'' میں نے زہریلے ناگ کے مانند پھنکارا۔ ''ذرا سی بھی آواز نکالنے کی کوشش کی تو بھیجا اڑا دوں گا۔''

وہ شخص سہم کر خاموش ہو گیا۔ اب اس کی آنکھوں میں حیرت سے زیادہ دہشت اور سراسیمگی کے آثار تھے۔ چند لمحے کے توقف کے بعد وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔ ''تم......تم یہاں کیسے آ گئے۔ اور......'' اسی وقت اس کی نگاہ اپنے ساتھی کی خالی چارپائی پر پڑی۔ ''اور فضلو۔ فضلو کہاں ہے؟''

''تمہارا ساتھی فضلو تہ خانے میں آرام کر رہا ہے اور اگر تم نے میرے سوالات کے صحیح صحیح جواب نہیں دیے تو میں تمہیں بھی اس کے پاس پہنچا دوں گا۔''

اس شخص کا چہرہ خوف سے پیلا پڑتا چلا گیا۔ مجھے اس کی حالت دیکھ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ جن لوگوں

کی نفری میں شامل تھا وہ کسی بزدل کو برداشت کر ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ شاید باورچی قسم کی چیز تھا۔ اسے اگلا سوال کرنے کی ہمت نہ ہو سکی۔

''سچ سچ بتاؤ چاروں کمروں میں اور کون کون موجود ہے؟''

میں نے شاٹ گن کی نال اس کے منہ کے سامنے کرتے ہوئے سوال کیا۔

''بب......بتاتا ہوں۔ یہاں اس کمرے میں میرے ساتھ فضلو تھا۔ وہی تمہیں دیکھنے تہہ خانے میں گیا ہوگا' اس کے علاوہ اس کمرے سے ایک کمرا چھوڑ کر تیسرے کمرے میں اکرام......اکی ہے۔''

اکی کا نام سن کر میں ایک دم چوکنا ہو گیا۔ اکی نام کا یہ جوان یقیناً خطرناک دشمن ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں وہ چمک دیکھی تھی جو صرف سفاک قاتلوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے اگر مجھے اپنی موجودہ جسمانی حالت میں اس سے نبرد آزما ہونا پڑتا تو اس جھڑپ کا نتیجہ میرے لیے تباہ کن ثابت ہو سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے بہتر یہی سمجھا کہ جس قدر بھی معلومات ممکن ہو سکیں اس شخص سے حاصل کر لوں اور اکی سے الجھے بغیر یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کروں۔

میں نے اگلا سوال کیا ''تم لوگ جب مجھے اٹھا کر لائے تھے تو میرے ساتھ ایک بوڑھا آدمی بھی تھا جو شدید زخمی تھا اس وقت وہ کہاں ہے؟''

''مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔'' میں نے شاٹ گن کی نال اس کے سینے میں گڑوتے ہوئے کہا۔

''تم چاہو قسم لے لو، مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم اسے امامی کسی ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا۔ غلام رسول اور لطیف بھی شدید زخمی تھے۔ وہ بھی امامی کے ساتھ ہی لے جائے گئے تھے اس کے بعد وہ تینوں زخمی واپس حویلی میں نہیں آئے۔''

مجھے یہ جان کر شدید مایوسی ہوئی کہ فقیر بابا اس حویلی میں موجود نہیں ہے۔ ویسے بھی اگر وہ یہاں ہوتا تو میں اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔ اس کی حالت بھی ایسی نہیں ہوگی کہ وہ فرار کی جاں گسل راہ پر میرا ساتھ دے سکتا مگر اس کے متعلق مکمل لاعلمی بھی میرے لیے ناقابل قبول تھی۔ اس سے جدا ہو کر تو میں آدھا رہ گیا تھا۔ وہ میری زندگی کا ایسا لازمی جزو بن چکا تھا کہ اس کے بغیر جینا محال نظر آتا تھا۔

''اچھا یہ بتاؤ باقی لوگ کہاں ہیں؟'' میں نے اس سے دریافت کیا۔ ''اور عقبی دروازے کی چابی کس کے پاس ہے؟''

''اکی صاحب کے پاس!'' اس نے مختصراً جواب دیا۔

''اس بڑے دروازے کی اور صدر دروازے کی چابی کس کے پاس ہوتی ہے؟'' میں نے اگلا سوال کیا۔

''مجھے ٹھیک سے پتا نہیں۔ شاید ان کی چابی بھی اکی صاحب کے پاس ہی ہو۔''

وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا۔ اس شخص کی مہیا کردہ معلومات سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر مجھے اس حویلی سے فرار ہونا ہے تو پھر اکی سے دو دو ہاتھ کرنا ضروری ہیں۔ اس کے قبضے سے چابی حاصل کر کے ہی میں صدر دروازے تک پہنچ سکتا تھا اگر میں صدر دروازے تک پہنچ جاتا تو پھر تو صرف مین گیٹ ہی باقی رہ جاتا اور

مجھے یقین تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح مین گیٹ سے گزر ہی جاؤں گا۔ اصل مسئلہ اس عمارت کے صدر دروازے سے باہر نکلنے کا تھا۔

میں نے شاٹ گن اپنے دائیں ہاتھ میں لے لی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس کی کنپٹی پر گھونسا مار کر اسے بے ہوش کر دوں۔ میں اپنے ارادے پر عمل بھی نہیں کر پایا تھا کہ اچانک اس شخص نے اپنے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور ایک پستول نکال لیا۔ وہ میری توقع سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں شاٹ گن کو سیدھا کر کے اسے نشانہ بناتا۔ میں خود اس کے نشانے کی زد میں آ چکا تھا۔

''شرافت سے شاٹ گن پھینک دے حرامی۔ بہت حرام زدگی کر لی۔ اب میں تیرے سے اپنے سارے ساتھیوں کا بدلہ لوں گا۔ تو کیا سمجھتا ہے کہ تیرے کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ اس کے چہرے سے بزدلی اور مسکینی کا نقاب پوری طرح اتر چکا تھا۔ اب وہ ایک سفاک اور عیار شکاری تھا جس نے اپنی مسکینی کا جال پھیلا کر مجھے پھانس لیا تھا۔ مجھے شاٹ گن پھینکنا ہی پڑی۔ اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ وہ چارپائی سے اتر کر چند قدم کے فاصلے پر جا کھڑا ہوا چنانچہ اب میرے لیے اس پر اچانک حملہ آور ہونا بھی ممکن نہیں رہا۔ کیا خوب قسمت تھی میری بھی۔ میں ابھی ایک جال سے نجات نہیں پاتا تھا کہ ایک نیا جال مجھے جکڑ لیتا۔ زندگی ایک عجب آنکھ مچولی بن کر رہ گئی تھی۔

''اب سیدھی طرح سے اپنے ہاتھ سر کے پیچھے رکھ لے۔ اب تیرے حساب کا وقت آن پہنچا ہے۔ سردار برکت علی کا خون اتنا سستا نہیں ہے کہ اس کا تجھے کوئی مول ہی نہ دینا پڑے۔ تجھے نہ جانے کیا سوچ کر ابھی تک زندہ رکھا گیا ہے۔''

مجھے اس کا ہر حکم ماننا پڑا۔ اب میں نے اسے پہچان لیا تھا اس کا نام سلیم تھا۔ سردار برکت علی کو حملے کی اطلاع دینے والے دو افراد میں سے ایک یہ تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی یاسین میرے خنجر سے اپنا گلا چھدوا بیٹھا تھا جب کہ اسے کلاشنکوف کا بٹ کھا کر بے ہوش ہونا پڑا تھا۔ شاید ضرب اس کے سر پر اوچھی پڑی ہوگی اسی لیے یہ میرے سامنے تندرست و توانا موجود تھا۔ اس کی مجھ سے نفرت بجا تھی۔ میں نے اکیلے ان کی قلعے نما حویلی کو الٹا کر رکھ دیا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس حویلی میں کم از کم دس بارہ مسلح مسٹنڈے موجود تھے۔ اس کے باوجود میں نے ان کے آقا کو جہنم رسید کر دیا۔ اس کے علاوہ کم از کم تین افراد ایسے تھے جن کے متعلق مجھے یقین تھا کہ وہ بھی اپنے آقا کے پاس پہنچ چکے ہوں گے۔ تقریباً اتنے ہی شدید زخمی تھے۔ گویا صحیح سلامت رہنے والوں کی تعداد بمشکل نصف رہی ہوگی۔

''چل آگے لگ۔ میں تجھے اکرام صاحب کے پاس لے چلتا ہوں۔ تجھے نہیں پتا اکی صاحب سردار برکت علی کا سگا پھوپھی زاد بھائی ہے۔ وہ تو تیری بوٹیاں نوچ لے گا۔''

''اچھا اب زیادہ بک بک مت کر۔ خواہ مخواہ پستول کے بل پر پھنے خان بن رہا ہے۔'' اس کی لن ترانی سے میری کھوپڑی گھومنے لگی۔ ''ابھی شاٹ گن کے سامنے تیرا پیشاب نکلا جا رہا تھا۔ بھول گیا کس طرح ایک ذرا سے ہاتھ میں تو آٹے کی بوری کی طرح ڈھیر ہو گیا تھا۔''

اس شخص کے چہرے پر خجالت کے آثار نمودار ہوئے لیکن پھر اس نے خود پر قابو پا لیا۔ پستول پر اس کی

گرفت بدستور مضبوط تھی۔

''وہ تو میں دھوکے سے مار کھا گیا تھا اب تو ذرا انگلی تو ہلا کر دیکھ۔ تیری کھوپڑی کے ٹکڑے نہ کر دیے تو میرا نام سلیم نہیں۔''

''اچھا تو یہ بات ہے تو پھر پھینک دے پستول اور آ جا میدان میں۔ میں بھی دیکھوں تیری ماں نے تجھے کتنا دودھ پلایا ہے؟'' میں نے اسے جذباتی داؤ میں پھنسا کر حماقت پر اکسانا چاہا لیکن میری یہ کوشش ناکام رہی۔ وہ شخص حقیقتاً مجھ سے خوف زدہ تھا۔ اس کی یہ ساری پھوں پھاں پستول کے بل پر تھی۔ اگر اس سے پستول چھن جاتا تو شاید وہ اگلے ہی لمحے میرے قدموں پر سر رکھ دیتا۔

''اچھا فالتو بکواس مت کر۔'' اس نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''اب تیرا فیصلہ کی صاحب ہی کرے گا۔ چل آگے لگ۔''

ہم دونوں اس ہال نما کمرے میں نکل آئے۔ وہاں چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ تیسرے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دھیرے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کمرے میں کسی قسم کی آہٹ سنائی نہیں دی۔ اس نے کمرے کا دروازہ اندر کو دھکیلا تو وہ اندر کی جانب کھلتا چلا گیا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا وہ شخص الٹے قدموں کمرے میں داخل ہوا اس کی پستول کا رخ بدستور میرے سینے کی جانب تھا۔ اس نے دروازے کی بائیں طرف والی دیوار کو ٹٹولا ہلکی سی کلک کی آواز پیدا ہوئی اور کمرے میں بلب کی زرد روشنی پھیل گئی۔ میری نظروں کے سامنے ایک بڑی سی مسہری موجود تھی لیکن اس وقت وہ مسہری بالکل خالی پڑی تھی۔ بستر کی حالت سے البتہ صاف پتا چلتا تھا کہ کوئی شخص کچھ دیر پہلے یہاں محو استراحت رہ چکا ہے۔ سلیم نے اب تک مسہری کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ میں دو قدم آگے بڑھا تب اس کی نگاہ خالی بستر پر پڑی اور اس کی آنکھوں میں تعجب کے آثار نظر آئے۔

یہی وہ موقع تھا جس کا میں بہت دیر سے منتظر تھا۔ لمحے بھر کے لیے اس کی توجہ مجھ سے ہٹ گئی۔ میں بجلی کے کوندے کی طرح چمکا اور اس پر قیامت بن کر ٹوٹ پڑا۔ اس کی کلائی پر پڑنے والی میرے بائیں ہاتھ کی ضرب اتنی شدید تھی کہ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کمرے کے ایک کونے میں جا گرا۔ اب وہ گویا مکمل طور پر میرے رحم و کرم پر تھا۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا لہٰذا میں نے اسے اپنے گھونسوں پر رکھ لیا۔ جب تک وہ سنبھلنے کی کوشش کرتا' اس کی حالت تباہ ہو چکی تھی۔ میں نے اس کی کنپٹی پر ایک گھونسا جمایا جو کہ فیصلہ کن ثابت ہوا۔ ضرب کھاتے ہی وہ تیورا کر فرش پر گرا اور ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ اچھے خاصے عرصے کے لیے خرد کے جھنجھٹ سے چھوٹ گیا ہے۔

کونے میں پڑا ہوا پستول میں نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ ویسے تو وہ دیسی تھا لیکن اس بناوٹ بہت نفیس تھی۔ بیریٹا کی سو فیصد کاپی تھا۔ اس نازک وقت میں اس کی رفاقت میرے لیے بے حد تقویت کا باعث ثابت ہوئی۔ اب میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ اس بدبخت اکی کی تلاش تھا' جانے وہ کہاں دفع ہو گیا تھا۔ سلیم نامی اس شخص نے مجھے بتایا تھا کہ صدر دروازے کی چابی اسی کے پاس ہے فی الحال تو میرے پاس یہاں سے فرار کی کوئی راہ نہیں تھی۔ اگر مجھے فرار ہونا تھا تو میرے لیے لازم تھا کہ میں اکی کو تلاش کروں اور اس سے چابی حاصل کروں۔

میں نے باری باری باقی دو کمروں کا بھی جائزہ لیا۔ وہ دونوں ہی خالی تھے۔ بڑی عجیب وغریب صورت حال تھی۔ بظاہر تو اس جگہ کے نکاسی کے تمام راستے مقفل تھے۔ اس کے باوجود اکی غائب تھا۔ اب صرف ایک ہی صورت باقی تھی کہ وہ اس بے ہوش شخص سلیم اور اس کے ساتھی فضلو سے آنکھ بچا کر ادھر ادھر ہو گیا ہو گا لیکن سوال پھر وہی تھا کہ وہ آخر گیا کہاں؟ تنگ آ کر میں نے اس بڑے دروازے سے زور آزمائی کا فیصلہ کیا جو میرے اندازے کے مطابق صدر دروازے کی جانب کھلتا۔ میں نے اس دروازے کو اندر کی جانب دھکیلا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ دروازہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ اس دروازے کے کھلتے ہی میں بے حد چوکنا ہو گیا۔ اب میں براہ راست خطرے کی زد میں تھا۔ صدر دروازے کے آس پاس کے کمروں میں مسلح افراد ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کوئی صدر دروازے کے اندر کی جانب بھی ڈیرہ جمائے ہوئے ہو۔

میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا آگے بڑھا۔ میں کسی بھی لمحے آتش و آہن کی بارش برسانے کے لیے تیار تھا۔ میں اس وقت ایک چھوٹی سی راہداری سے گزر رہا تھا۔ سامنے ہی ایک اور ہال نما دالان تھا۔ میں نے بڑی محتاط نظروں سے ہال کا جائزہ لیا۔ یہ جگہ ملاقات کے کمرے کے طور پر استعمال ہوتی ہو گی۔ اس کی آرائش و زیبائش بے حد قیمتی سامان سے کی گئی تھی۔ فرش پر بچھا ہوا قالین بے حد نفیس اور دبیز تھا۔ صوفے بھی بے حد بیش قیمت اور آرام دہ تھے۔ چھت پر ایک بڑا سا فانوس آویزاں تھا لیکن اس وقت وہ روشن نہیں تھا۔ اس وقت وہاں صرف ایک بلب روشن تھا۔ وہ ہال اس وقت کسی اجڑے دربار کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس دربار کا تاجدار سردار برکت علی میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا اس کے بعد جانے یہ وسیع سلطنت کس کے ہتھے لگی ہو گی؟ میں تو سردار برکت علی کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس شخص نے بتایا کہ اکی سردار برکت علی کا قریبی رشتے دار ہے تو پھر سردار برکت علی کے باقی عزیز رشتے دار کہاں ہیں؟ اس کے بیوی بچے بھی تو ہوں گے۔"

پھر مجھے خیال آیا کہ شاید حویلی کی دوسری منزل کے عقبی حصے میں زنان خانہ ہو گا۔ چار کمرے تو میں دیکھ چکا تھا۔ جو سامنے رخ پر تھے شاید اتنے ہی کمرے عقبی رخ پر ہوں گے۔

اس وقت اس ہال میں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ صدر دروازہ مقفل تھا اور اس میں اندر سے چٹخیاں بھی چڑھی ہوئی تھیں۔ دائیں ہاتھ پر زینہ تھا جو اوپر منزل تک جاتا تھا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں زینے کے ذریعے دوسری منزل پر پہنچنے کی کوشش کروں لیکن اگر زینے کا دروازہ اوپر سے بند ہوتا تو میری تمام کوششیں دھری کی دھری رہ جاتیں۔

زینے کی سیڑھیاں چڑھ کر میں دروازے کے پاس پہنچا میرا دل بے حد تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میری جدوجہد کا بے حد اہم مرحلہ میرے سامنے تھا۔ میں نے سانس روک کر دروازے کو دھکا دیا۔ یہ جان کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا کہ یہ دروازہ بھی کھلا ہوا ہے۔ قسمت کی دیوی مسلسل میرے ہم قدم تھی چنانچہ مجھے اپنے حوصلے دوبالا ہوتے محسوس ہوئے۔

میں بلی کی سی چال چلتا ہوا آگے بڑھا میری آنکھیں بڑی برق رفتاری سے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لے رہی تھیں۔ بڑی ہی تاریک رات تھی۔ آسمان پر اچھے خاصے بادل چھائے ہوئے تھے جن کی وجہ سے ستارے

روپوش ہو گئے تھے۔ رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا کچھ ہی دیر میں صبح ہونے والی تھی۔ میں پچھلی بار یہاں آیا تھا تو میری تمام تر توجہ برکت علی کے کمرے پر مبذول تھی لہٰذا میں نے کسی اور طرف زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اب میں نے دیکھا کہ زینے کے دروازے کے بائیں ہاتھ کو ایک راہداری جا رہی ہے۔ اندھیرے کی وجہ سے اس راہداری کا جائزہ لینا مشکل تھا۔ اسی راہداری کے دوسرے سرے پر زنان خانہ ہو گا۔

اچانک میری نگاہ برکت علی کے کمرے پر پڑی اور میں بری طرح چونک پڑا۔ کمرے کا دروازہ تو حسب توقع بند ہی تھا لیکن وہ باہر سے نہیں اندر سے بند تھا۔ دروازے کی نچلی درز سے جھانکتی ہلکی نیلی روشنی ظاہر کرتی تھی کہ اندر کوئی موجود ہے۔

مجھے شدید حیرت ہو رہی تھی۔ برکت علی کا قصہ پار ہوئے اتنے زیادہ دن تو نہیں گزرے کہ کوئی اور اس کے کمرے پر قبضہ کر لے۔ ابھی تو اسے پولیس کی تفتیش کی وجہ سے سربمہر ہونا چاہئے تھا۔ بالغرض اگر اسے سربمہر نہیں بھی کیا گیا تو کون ایسا شخص ہے جس نے اس حقیقت کے باوجود اس کمرے کو بطور خواب گاہ منتخب کیا کہ چند ہی دن پہلے اس کمرے میں موت کا بھیانک رقص ہوا تھا۔

میرے دل میں شدید تجسس پیدا ہو گیا کہ دیکھوں تو سہی اب اس کمرے کا نیا مکین کون ہے۔ چنانچہ میں تمام خطرات کو بالائے طاق رکھ کر اس کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔ میری پوری کوشش تھی کہ میرے چلنے سے کسی قسم کی آہٹ نہ ہو۔ میرا پستول تو ظاہر ہے میرے ہاتھ میں تھا ہی۔

کمرے کے دروازے پر پہنچ کر میں نے بہت آہستگی سے دروازے کے لٹو کو گھمانے کی کوشش کی۔ دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ میں نے دروازے سے کان لگا کر اندر کی سن گن لینے کی کوشش کی پہلے تو مجھے کچھ سنائی نہیں دیا لیکن بغور سننے پر مجھے بہت ہی مدھم سی کچھ آوازیں سنائی دیں۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی شخص بہت ہی دھیمی آواز میں بول رہا ہو۔ دروازے کے لاک میں کوئی سوراخ بھی نہیں تھا جس سے اندر دیکھا جا سکتا۔ نہ ہی میرے پاس کوئی ایسے آلات تھے جن کی مدد سے میں تالا کھول سکتا۔ لے دے کر یہ پستول تھا۔ میں دستک دے کر اور آواز بدل کر دروازہ کھلوانے کی کوشش نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب صورت حال بہت مختلف تھی۔ کمرے کے اندر ایک نہیں دو افراد تھے اگر انہیں شبہ ہو جاتا تو میرے لیے صورت حال تباہ کن ہو سکتی تھی۔

میں نے کمرے کے دروازے سے ذرا پیچھے ہٹ کر صورت حال کا مزید تفصیل سے جائزہ لیا۔ اسی وقت میری نظر ایک بڑے سے روشن دان پر پڑی۔ اس روشن دان کے فرش سے بلندی آٹھ دس فٹ رہی ہو گی۔ اس کا پٹ پوری طرح سے بند نہیں تھا اور اس میں سے نیلی روشنی کی لکیر جھلک رہی تھی اگر میں کسی طرح سے روشن دان تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا تو شاید کمرے کے اندر کا منظر دیکھنے کا موقع مل جاتا۔

مجھے یاد آیا کہ برکت علی کی زندگی کی آخری رات جب میں اور فقیر بابا درختوں پر چڑھے حویلی کی نگرانی کر رہے تھے تو ایک ملازم نے ایک کونے سے ایک آرام کرسی لا کر برکت علی کے لیے بچھائی تھی۔ میں اندازے سے اس کونے کی جانب بڑھ گیا۔ اس جانب کئی کرسیاں اوپر تلے رکھی ہوئی تھیں۔ دو میزیں بھی تھیں لیکن وہ کافی چھوٹی چھوٹی تھیں اور نازک بھی۔ میں نے بڑی احتیاط سے ایک مضبوط سی کرسی اٹھائی اور بغل میں دبا کر برکت علی کے کمرے کی جانب چل پڑا۔ کرسی کو روشن دان کے عین نیچے رکھ کر میں نے اس کی مضبوطی کا اندازہ لگانے کی

کوشش کی۔ کرسی مضبوط اور بھاری بھرکم تھی۔ اس کی نشست کی جگہ پر مخملیں گدی لگی ہوئی تھی۔ کرسی کے بازو چوڑے اور مضبوط تھے۔ میں نے اپنے پستول کو جیب میں ڈالا اور بڑی احتیاط سے کرسی پر چڑھ گیا۔ میری توقع کے عین مطابق روشن دان کا پٹ بند نہیں تھا۔ میں نے دھیرے دھیرے اسے اوپر کیا۔ اس روشن دان کے بیچ میں ایک سلاخ لگی ہوئی تھی۔ وہ پٹ اسی سلاخ میں لگا ہوا تھا۔

میں نے کمرے کے اندر جھانکا لیکن صحیح طور پر اسے دیکھ نہ پایا۔ میں نے اپنے ہاتھ روشن دان کی چوکھٹ پر جمائے اور کرسی کے ہتھوں پر چڑھ کر کمرے کے اندر جھانکا۔

یک دم مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے پاؤں کرسی کے ہتھوں پر لڑکھڑانے لگے ہیں۔ میں نے صرف ایک لمحے کے لیے کمرے کے اندر نظر ڈالی اور اگلے ہی لمحے میں ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔ میرے تمام جسم میں تیز سنسناہٹ پھیل رہی تھی۔ مجھے اپنے آپ پر قابو پانے میں کئی لمحے لگ گئے۔ میں کمرے کے اندر دوبارہ جھانکنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ میں نے بمشکل تمام اپنے اعصاب پر قابو پایا اور اپنے پاؤں مضبوطی سے کرسی کے ہتھوں پر جما کر ایک بار پھر روشن دان سے کمرے میں جھانکا۔

☆O☆

جو منظر میں نے دیکھا تھا۔ اس نے مجھے شدید ہیجانی کیفیت میں مبتلا کر دیا۔ میرے ہاتھ ابھی تک روشن دان کی چوکھٹ پر جمے ہوئے تھے لیکن مجھے ان میں لرزش محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے اپنی رگوں میں چنگاریاں سی دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے چند لمحوں میں جو کچھ دیکھا تھا وہ میری زندگی کا سب سے ہیجان انگیز اور سنسنی خیز تجربہ تھا۔

میں جلدی سے نیچے اتر آیا اور زمین پر کھڑا ہو کر ہانپنے لگا۔ میرا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ بار بار وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے آتا رہا اور میں ہر بار اسے جھٹکنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس ہیجان خیز ڈرامے کے ایک کردار کو میں نے پہچان لیا تھا۔ وہ اکی تھا۔ اکرام عرف اکی' سردار برکت علی کا پھوپی زاد بھائی لیکن وہ عورت کون تھی؟ میں نے آج سے پہلے اسے نہیں دیکھا تھا لیکن نیلگوں روشنی میں چمکتا اس کا دلکش چہرہ میرے دل و دماغ میں نقش ہو گیا۔ میں نے وہ کرسی اٹھائی اور اسی کونے میں لے جا کر رکھ دی۔ مجھے اپنے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں نے قریبی دیوار سے ٹیک لگا لی اور گہرے گہرے سانس لے کر اپنے دل کی دھڑکنیں اعتدال پر لانے کی کوشش کی۔ رفتہ رفتہ میرے اعصاب کا تناؤ کم ہونے لگا۔ کچھ لمحے مزید گزرے اور پھر میں پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں واپس آ گیا۔

لمحہ بہ لمحہ میرے لیے صورت حال خطرناک سے خطرناک تر ہوتی جا رہی تھی۔ یہ حویلی میرے لیے ایک پنجرہ بن گئی تھی جس کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں اکی کو قابو کر کے اس سے عقبی دروازے میں لگے ہوئے بھاری بھرکم قفل کی چابی حاصل کر لوں گا اگر میں ایک بار حویلی کی عمارت سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا تو حویلی کی چار دیواری پھلانگنے کی تو میں کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی لیتا۔ اپنے لیے فرار کا راستہ تلاش کرتے ہوئے میں نے حویلی کے اچھے خاصے حصے کو چھان مارا تھا لیکن فقیر بابا کہیں نظر نہیں آیا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ اس حویلی میں ہے بھی نہیں۔ اس کا پتا مجھے شاید اس حویلی کی کوئی سرکردہ شخصیت ہی بتا سکتی ہے' ایسا شخص کون ہو

ہے؟ لے دے کر میرے سامنے صرف اور صرف اکی کا نام تھا لیکن وہ تو اس وقت...... جانے وہ عورت کون ہے؟"

میں نے بہت سوچا لیکن اس کے سوا کوئی راستہ نظر نہ آیا کہ میں کسی نہ کسی طرح اکی کو قابو کر لوں اس کو بے بس کرنا ہرگز بچوں کا کھیل نہیں تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

بالآخر میں نے فیصلہ کر ہی لیا۔ میں نے اپنا پستول سنبھال لیا۔ برکت علی کا کمرا سامنے ہی تھا میں نے نہایت احتیاط سے اپنا کان دروازے سے لگا دیا۔ کمرے سے سرگوشیوں کی آواز ابھی تک آ رہی تھی۔ یک دم ایک کھنکھناتے قہقہے کی آواز نے کمرے میں جلترنگ سا چھیڑ دیا۔ میری سارے جسم میں ایک بار پھر سنسنی کی تیز لہر دوڑ گئی اور میں جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ میں نے خود پر قابو پا لیا اور دروازے پر دستک دینے کے لیے تیار ہو گیا۔

میں نے دروازے پر دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ فضا میں ایک فائر کا زوردار دھماکا گونجا۔ فائر کی آواز سنتے ہی میں بری طرح چونک پڑا۔ یہ سیون ایم ایم رائفل کا فائر تھا جو کہ حویلی کے گیٹ سے کیا گیا تھا۔ مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ اس فائر کا نشانہ میں نہیں کوئی اور ہے۔ اس کے باوجود میرے لیے صورت حال بہت خراب ہو گئی تھی اس فائر کے ساتھ ہی پوری حویلی میں جگار ہو گئی ہو گی۔ یہ آواز اس کمرے میں موجود اکی کے کانوں میں بھی پہنچی ہو گی جس کے نتیجے میں وہ بری طرح چونک پڑا ہو گا۔ وہ کسی بھی لمحے کمرے سے باہر آ سکتا تھا۔

میں تیزی سے چلتا ہوا اس تاریک گوشے میں جا چھپا جہاں کرسیاں اور میزیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ ایک اچھی خاصی محفوظ جگہ تھی جہاں فوری طور پر کسی کی نگاہ نہیں پڑ سکتی تھی۔ میں نے ابھی اپنے آپ کو پوری طرح چھپایا بھی نہیں تھا کہ فضا میں ایک اور فائر کی آواز گونجی۔ برکت علی کا کمرا میری نظروں میں تھا۔ دوسرے فائر کے ساتھ ہی کمرے میں تیز روشنی ہو گئی۔ عین اسی وقت فضا میں کلاشنکوف کے برسٹ کی کریہ آواز ابھری اس برسٹ نے کسی کے چراغ حیات کو چور چور کر دیا کیوں کہ تڑتڑاہٹ کی آواز کے ساتھ ہی فضا میں ایک کرب ناک انسانی چیخ بھی لہرائی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کلاشنکوف کا یہ برسٹ بھی گیٹ سے ہی فائر کیا گیا جبکہ چیخ کی آواز قدرے فاصلے سے سنائی دی۔ جانے کون بدنصیب جیون کی بازی ہار بیٹھا تھا۔

فائرنگ شروع ہونے کے کچھ ہی دیر بعد حویلی کے سامنے والے حصے میں کھلبلی مچ گئی۔ یکے بعد دیگرے فضا میں سیون ایم ایم کے مزید تین فائروں کے دھماکے گونجے۔ اسی کے ساتھ ساتھ کہیں دور سے دو کلاشنکوف رائفلیں گرج اٹھیں۔ گولیوں کی یہ دونوں بوچھاڑیں حویلی کے آہنی گیٹ پر پڑی تھیں جس کی وجہ سے فضا میں دھماکوں کے ساتھا تیز جھنجھناہٹ بھی ابھری پھر تو گویا قیامت بپا ہو گئی۔

دونوں جانب سے مسلسل فائرنگ کا تبادلہ ہونے لگا۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے دو دشمن ملکوں کی فوجیں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوں۔ حویلی کے گیٹ سے ایک اور کلاشنکوف معرکے میں شریک ہو گئی۔ جبکہ فریق مخالف کی جانب سے دو کلاشنکوف اور دو سیون ایم ایم رائفلیں آگ برسا رہی تھیں۔ کسی کسی وقت ایک شاٹ گن کا دھماکا بھی سنائی دے جاتا۔

عین اسی وقت سردار برکت علی کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس میں سے اکی باہر نکلا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک پستول پکڑا ہوا تھا۔ اسے خطرے کا پوری طرح احساس تھا۔ اس کا پستول کسی بھی وقت گولیاں اگلنے کے لیے تیار تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے وہ عورت باہر نکلی۔ اس نے اکی کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے اس کی شکل نظر نہیں آ رہی تھی البتہ اس کے شانوں پر پڑی ہوئی سفید شال سیاہ آسمان پر اجلے سے بدلی کے ٹکڑے کے مانند دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دونوں جھکے جھکے سے بڑی تیزی سے عقبی حصے کی راہداری کی جانب بڑھنے لگے۔ راہداری کے پاس پہنچ کر وہ عورت راہداری میں گھس گئی۔ اکی نے قدرے بلند آواز میں اسے کچھ کہا اور خود زینے کی جانب بڑھ گیا۔

دونوں طرف سے لڑائی میں مزید شدت آ گئی۔ میں بری طرح سے گھر چکا تھا۔ حویلی میں جگار ہونے کے بعد تو ویسے بھی میرے بچ نکلنے کے امکانات معدوم ہو چکے تھے۔ اس طرح یہ کہ اب حویلی کے مکین جلد ہی تہ خانے سے میرے فرار کے راز سے واقف ہونے والے تھے بلکہ اگر اکی سیدھا اپنے کمرے میں گیا تو اب تک یہ راز فاش بھی ہو چکا ہوگا۔

اب میرے پاس ایک ہی راستہ تھا۔ اس گھمسان کے معرکے میں فرار کی کوشش سیدھا سیدھا موت کے منہ میں جانے کے مترادف تھی۔ خودکار ہتھیاروں کے اس بے دریغ استعمال کے دوران میں کسی وقت بھی میری زندگی کی کتاب کا آخری باب رقم ہو جاتا۔ لہٰذا بہتر یہی تھا کہ میں اسی طرح کسی کونے کھدرے میں دبک کر بیٹھا رہوں۔ اگر جلد ہی لڑائی ختم ہو جاتی اور امن و امان بحال ہو جاتا تو شاید میرے بھاگ نکلنے کی صورت نکل آتی۔ ویسے بھی اب تک کی لڑائی سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس جنگ میں حویلی والوں کا پلہ بھاری ہے۔ انہیں شاید حملے کا بروقت علم ہو گیا ہوگا اور انہوں نے اپنے دفاع کو مضبوط بنا کر منہ توڑ جواب دیا۔ ویسے بھی ان کے غنیم کھلی جگہ پر تھے جبکہ یہ خود حویلی کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے مورچہ بند تھے لہٰذا ان کی پوزیشن بے حد مضبوط تھی۔ میں اگر اسی جگہ بھی دبکا رہتا تو فوری طور پر میرا کسی کی نظر میں آنا ممکن نہ تھا لیکن بات پھر وہیں آ جاتی کہ اگر حویلی والے حملہ آوروں کو پسپا کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو پھر انہیں فوری طور اگلے مرحلے میں میری تلاش ہوتی۔ اس کے بعد یقینی طور پر میں کسی بھیگے چوہے کی طرح گرفتار ہو جاتا۔

میں نے سوچا کہ مجھے اسی جنگ و جدل کے دوران میں ہی اپنے لیے کوئی فرار کا راستہ نکالنا ہوگا اگر حویلی والے عارضی طور پر میری طرف سے غافل ہو گئے ہیں تو مجھے اس غفلت سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ کسے خبر مجھے کوئی ایسا موقع مل ہی جائے جس سے فائدہ اٹھا کر میں کامیاب ہو جاؤں۔

میں نے اپنے ذہن میں ایک لائحہ عمل مرتب کیا اور تیزی سے زنان خانے والی راہداری کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اس راہداری کے دوسرے سرے پر دروازہ موجود ہوگا۔ اگر وہ دروازہ بند ملتا تو میری ساری جدوجہد رائیگاں ہو جاتی۔ یہ شاید میری خوش قسمتی ہی تھی کہ وہاں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ میرے سامنے ایک کھلا صحن تھا۔ اس صحن میں چار کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ اس وقت وہ چاروں دروازے بند تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ عورت انہیں کمروں میں سے کسی ایک میں موجود ہے۔ اکی نے اسے یہی ہدایت کی ہوگی کہ وہ کمرے میں گھس کر دروازہ بند کر لے۔

میں نے بلا سوچے سمجھے ایک کمرے کا دروازہ زور زور سے تھپتھپا دیا۔ اس کمرے میں سے تو کسی نے جواب نہیں دیا البتہ ساتھ والے کمرے میں سے دو تین مترنم و نیم مترنم چیخیں بلند ہوئیں۔ میرے خیال میں وہ تین عورتیں ہوں گی۔ اس بار میں نے اسی کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا دیا جس میں سے چیخوں کی آوازیں بلند ہوئی تھیں۔ دستک کی آواز سن کر ایک بار پھر خوف بھری چیخیں بلند ہوئیں۔ پھر ایک کپکپاتی ہوئی آواز نے پوچھا ”تم...... کک......کون......؟“

”میں اکی ہوں۔ دروازہ کھولو“ میں نے کوشش کی کہ میرا لب و لہجہ اکی سے ملتا جلتا ہو۔

میرا جواب سنتے ہی کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ پھر اسی آواز نے اپنے لہجے کو ذرا دبنگ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”بکواس مت کرو۔ تم اکی نہیں ہو۔ اکی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ کمرا خالی رہتا ہے۔“

”یقین کرو میں اکی ہی ہوں۔“

”ہمیں دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو۔ تم اکی نہیں ہو۔ اگر تم اکی ہو تو بتاؤ میں کون ہوں؟“

وہ کوئی بہت ہی ہوشیار اور چالاک قسم کی عورت تھی۔ اس کی آواز میں ایسی کھنک ایسا ترنم تھا کہ خواہ مخواہ ہی دل میں گدگدی سی ہونے لگتی۔ یہ شاید وہی عورت تھی جس کو میں نے سردار برکت علی کے کمرے...... میں دیکھا تھا۔ اس نے اپنی بے مثل عقل سے کام لیتے ہوئے سوال کر ڈالا جس کا جواب مجھ سے بن نہیں پڑا۔ میں نے خواہ مخواہ ہی اپنی عقل کو پرے رکھ کر اس در پر دستک دے ڈالی تھی۔ بلاوجہ ہی ان خواتین کو اپنی طرف سے مشکوک بنا ڈالا۔ جب کئی لمحے خاموشی سے گزر گئے تو شاید اس عورت کا شک یقین میں بدل گیا کہ میں واقعی کوئی نام نہاد اکی ہوں۔ اس بار پھر وہی عورت بولی مگر اب کے اس کے لہجے میں گھن گرج اور تحکم کا بھرپور تاثر تھا۔

”تم جو کوئی بھی ہو فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ میرے پاس بھرا ہوا پستول ہے۔ تم اگر دو منٹ کے اندر یہاں سے نہیں گئے تو میں کھڑکی میں سے گولی چلا دوں گی۔“

میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں وہاں سے دفع ہو جاؤں۔ وہ کمرے کے ناقابل تسخیر کواڑوں کے پیچھے بالکل محفوظ تھیں۔ میں کوشش کے باوجود ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ مجھے دفع ہو جانے میں کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں وہاں سے نکلوں کیسے؟ حویلی کے اگلے حصے میں آتش و آہن کی ژالہ باری ہو رہی تھی۔ اس طرف جانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ حویلی کا یہ زنان خانہ فی الوقت قدرے محفوظ جگہ تھی کیونکہ ابھی تک کسی کا اس طرف دھیان نہیں گیا تھا۔

میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر چھت کی منڈیر سے نیچے جھانکا۔ میرے سامنے حویلی کا عقبی حصہ تھا۔ سامنے ہی تقریباً آٹھ فٹ بلند وہ دیوار نظر آئی جس پر خاردار تار لگی ہوئی تھی۔ دائیں ہاتھ پر کچھ فاصلے پر حویلی کے لان کا آخری حصہ نظر آیا۔ بلب کی زرد روشنی میں تمام منظر بے حد پژمردہ اور اداس نظر آ رہا تھا۔ ویسے بھی اب صبح کی آمد آمد تھی۔ ماحول کی سیاہی کم ہو رہی تھی۔ حویلی کے سامنے والے حصے میں ہونے والی جنگ کی شدت میں اب کمی آتی جا رہی تھی اور کسی وقت بھی سیز فائر ہو سکتا تھا۔ جونہی لڑائی کا یہ دور ختم ہوتا' میرے گرد گھیرا تنگ ہونا شروع ہو جاتا۔ وقت تیزی سے پھسلتا جا رہا تھا۔ مجھے فوری طور پر کچھ نہ کچھ کرنا تھا ورنہ پھر میں کچھ بھی کرنے کے قابل نہ رہ جاتا۔

اچانک میری نگاہ الگنی کی رسی پر پڑی۔ کپڑے سکھانے والی یہ رسی صحن کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تنی ہوئی تھی۔ نائلون کی یہ رسی اگر بہت زیادہ پرانی نہیں تھی تو شاید یہ میرا بوجھ سہار لیتی۔ میں تیزی سے رسی کے ایک سرے کی طرف بڑھا۔ وہ رسی لکڑی کی ایک کھونٹی میں بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی گرہیں کھولنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ تنگ آ کر میں نے رسی کو توڑنے کے لیے ایک زوردار جھٹکا دیا۔ رسی نہ ٹوٹی البتہ کھونٹی ٹوٹ کر میرے ہاتھ میں آگئی۔ رسی کا دوسرا سرا منڈیر میں گڑی ہوئی ایک فولادی سلاخ میں بندھا ہوا تھا۔ میں نے زور لگا کر اچھی طرح آزمائش کر لی لیکن وہ سلاخ اپنی جگہ مضبوطی سے گڑی رہی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں پختہ منڈیر پر جمائے اور زور لگا کر منڈیر پر پہنچ گیا۔ نائلون کی رسی میں نے نیچے لٹکا دی۔ سرور علی کی نشانی وہ کھسے ابھی تک میرا ساتھ نبھا رہے تھے۔ میں نے انہیں اپنے نیفے میں اڑس لیا۔ نائلون کی اس پتلی سی رسی پر بھروسا کر کے زندگی کی بازی لگانا واقعی حماقت ہی کہلاتا لیکن اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔

بلندی سے پستی کی جانب وہ سفر میری زندگی کا کڑا امتحان ثابت ہوا۔ نائلون کی رسی کی رگڑ سے میرے ہاتھ اور پیروں کی جلد پھٹنے لگی۔ ہر لمحہ یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کسی بھی وقت رسی ٹوٹ جائے گی اور میں سر کے بل نیچے جا گروں گا۔ آدھا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ ایک اور بھیانک اندیشے نے میرے دماغ میں پنجے گاڑ دیے اگر وہ کمرا بند عورتیں میرے فرار سے آگاہ ہو جاتیں تو میں کہیں کا نہ رہتا۔ وہ کسی چاقو یا کسی اور چیز سے رسی کاٹ ڈالتیں تو میں کسی بھاری پتھر کے مانند زمین پر جا گرتا اور اپنی گردن تڑوا بیٹھتا۔ اس کے علاوہ اگر وہ پستول بردار عورت کمرے سے باہر نکل آتی اور منڈیر پر چڑھ کر مجھے گولی کا نشانہ بنانا چاہتی تو میں آسان ترین ٹارگٹ ثابت ہوسکتا تھا۔

میں ابھی ان اندیشوں سے ہی اپنا دامن نہیں چھڑا پایا تھا کہ ایک اور افتاد نے مجھے آن گھیرا۔ میں ابھی زمین سے بارہ چودہ فٹ اوپر ہی تھا کہ اچانک رسی ختم ہوگئی۔ یہ بلندی اگرچہ بہت زیادہ نہیں تھی تاہم اتنی ضرور تھی کہ میرے دونوں پیروں میں سے کسی ایک کا ٹخنا یا پنڈلی کی ہڈی شکست و ریخت کا شکار ہو جاتی۔ میں چند لمحے تک پنڈولم کی طرح جھولتا رہا۔ پھر میں نے اللہ کا نام لیا اور خود کو دیوار سے ذرا ہٹا کر رسی چھوڑ دی۔ میں اچھے خاصے زور سے زمین پر گرا۔ میرے دونوں پیر بری طرح جھنجھنا گئے لیکن یہ جان کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ میرے پیروں کی تمام ہڈیاں صحیح سلامت ہیں۔ میں چند لمحے زمین پر اکڑوں بیٹھا رہا۔ جب پیروں کی سنسناہٹ ذرا کم ہوئی تو میں اٹھا۔

اب اگلا مرحلہ حویلی کی چار دیواری عبور کرنا ٹھہرا۔ حویلی کے سامنے والے حصے میں ہونے والا معرکہ اب اپنے آخری مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔ اب فریقین محض اکا دکا فائر کر کے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ میری نگاہیں تیزی سے اردگرد کا جائزہ لینے لگیں۔ مجھے کسی ایسی چیز کی تلاش تھی جس کے سہارے میں چار دیواری کے اوپر تک آسانی سے پہنچ جاتا۔ اس وقت میری نگاہ ایک چھوٹی سی کوٹھری پر پڑی۔ یہ کوٹھری چار دیواری کے کونے میں بنی ہوئی تھی۔ اس کے اندر سے ڈیزل جنریٹر کے چلنے کی آواز آ رہی تھی اگر میں کسی طرح سے اس کوٹھری کی چھت پر چڑھ جاتا تو پھر صرف دو ڈھائی فٹ اونچی دیوار میرا راہ میں حائل ہوتی۔ اس دیوار پر موجود دو فٹ اونچی خاردار تاروں کی باڑ اس کے علاوہ ہوتی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اگر میں اس کوٹھری کی چھت پر پہنچ گیا تو

باڑ پھلانگنے کی بھی کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی لوں گا۔

میں برق رفتاری سے جنریٹر والی کوٹھری کی جانب لپکا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ حویلی کے تمام پہرے دار سامنے والے حصے میں مصروفِ حرب تھے ورنہ میں اتنی آسانی سے یہ سب کچھ نہ کر پاتا۔ میں نے جنریٹر والی کوٹھری کے پاس پہنچ کر کوٹھری کے اندر جھانکا۔ بہت مختصر سی جگہ تھی جہاں پر وہ بڑا سا جنریٹر گھڑ گھڑ کی آواز پیدا کر کے بجلی پیدا کر رہا تھا۔ میں اگر چاہتا تو بڑی آسانی سے اس جنریٹر کو بند کر سکتا تھا لیکن یہ عمل میرے لیے نقصان دہ ہی ثابت ہوتا۔ جنریٹر بند ہونے کی صورت میں حویلی تو اندھیرے میں ڈوب جاتی لیکن پھر تمام لوگ فوری طور پر اس کوٹھری کی جانب متوجہ ہو جاتے نتیجتاً میرا تمام منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جاتا۔ جنریٹر کی کوٹھری کا جائزہ لیتے ہوئے میری نگاہ ایک بے حد کارآمد چیز پر پڑی۔ یہ ترپال کا ایک بڑا سا ٹکڑا تھا جو کہ ڈیزل کے چند خالی ڈبوں پر تہ کیا ہوا رکھا تھا۔ میں نے فوراً اسے اٹھا لیا وہیں پر مجھے ایک بڑا سا فوجی ٹرک والا جیری کین نظر آیا۔ میں نے اس بھاری بھرکم جیری کین کو بھی اٹھا لیا۔ کوٹھری سے باہر نکل کر میں نے اس ترپال کو کوٹھری کی چھت پر چھال دیا اس کے بعد میں نے اس جیری کین کو اچھی طرح جما کر کوٹھری کی دیوار کے ساتھ رکھا۔ میں نے ایک پاؤں جیری کین پر رکھا اور اپنے ہاتھ کوٹھری کی چھت پر جما دیے۔ جیری کین نے میرا کام آسان کر دیا۔ اپنے ہاتھوں پر زور ڈال کر میں اوپر اٹھا اور اگلے ہی لمحے میں کوٹھری کی چھت پر تھا چند لمحے تک میں وہیں بیٹھا اپنے سانس درست کرتا رہا۔ میرے جسم کی دیگر چوٹیں تو تقریباً ٹھیک ہو چکی تھیں لیکن کمر والی چوٹ اپنی موجودگی کا بار بار احساس دلا رہی تھی۔

میں ابھی اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا عین اس وقت جبکہ میں کھڑا ہونے والا تھا، کسی نے حویلی کی پچھلی سمت سے بانس کی ایک سیڑھی دیوار کے ساتھ لگا دی۔ وہ سیڑھی خاردار باڑ سے بھی ایک آدھ فٹ اونچی تھی۔ اس طرح کی سیڑھی کی مدد سے کوئی بھی شخص باآسانی دیوار پھلانگ سکتا تھا۔ اس عجیب و غریب صورت حال نے مجھے بری طرح پریشان کر دیا۔ عجیب مصیبت میں جان تھی۔ بڑی مشکل سے فرار کی ایک راہ نظر آئی تھی لیکن اب وہاں بھی مداخلت کرنے والے آن موجود ہوئے۔

چند لمحے کے بعد اس سیڑھی پر ایک شخص نمودار ہوا۔ میں دیوار کی آڑ میں ممکنہ حد تک چھپ گیا تھا چنانچہ وہ شخص فوری طور پر مجھے نہ دیکھ سکا۔ وہ جونہی تھوڑا سا مزید اوپر چڑھا، میں بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بے چارہ بھونچکا سا ہو کر میرا منہ دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی ردعمل ظاہر کر سکتا، میرے پستول کا دستہ اس کی کھوپڑی پر بج اٹھا۔ اس شخص کے منہ سے ایک دردناک کراہ نکلی اور وہ کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح سیڑھی سے نیچے جا گرا۔ اس کے زمین پر گرنے کے ساتھ ہی فضا میں ایک اور ہلکی سی چیخ ابھری۔ وہ شاید اس شخص کا ساتھی ہو جو اس کا یہ حشر دیکھ کر حواس باختہ ہوگیا۔ اچانک اس شخص نے گولی چلا دی۔ ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی اور وہ گولی خاردار تاروں کے بیچ میں رگڑ کھاتی ہوئی آسمان کی وسعتوں میں گم ہوگئی۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری گولی بھی داغ دی۔

اس فائرنگ سے میرا کچھ نہیں بگڑا لیکن اس کی اس اندھا دھند فائرنگ کے نتائج میرے لیے بے حد تباہ کن ثابت ہو سکتے تھے۔ اس کی فائرنگ کی یہ آواز یقیناً حویلی کے پہرے داروں تک بھی پہنچی ہوگی۔ تب انہیں

احساس ہوا ہوگا کہ انہوں نے نہایت احمقانہ انداز میں حویلی کے عقبی حصے کو دشمن کے رحم وکرم پر چھوڑ رکھا ہے۔ اب وہ برق رفتاری سے حویلی کے عقبی حصے کی جانب بڑھ رہے ہوں گے۔ میرے لیے نہ جانے رفتن نہ پائے ماندن والی صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ دیوار کے اس طرف وہ نامعلوم شخص مجھے نشانہ بنانے کے لیے تیار تھا تو حویلی کے اندر سے پہرے داروں کی ٹولی میری طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔ میرے لیے دونوں طرف موت کا سامان تیار تھا۔

میں ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ جان پر کھیلے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میرا جسم برق رفتاری سے بلند ہوا۔ میرا پستول آگ اگلنے کے لیے بے چین تھا۔ میری نگاہوں نے ایک لمحے میں اس شخص کے ہیولے کو دیکھ لیا جو دیوار کے دوسری طرف سے فائرنگ کر رہا تھا۔ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ شخص تھوڑا سا بوکھلا گیا۔ اس نے میرا نشانہ لے کر فائر کرنے کی کوشش کی لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ میرے پستول نے یکے بعد دیگرے تین شعلے اگلے اور موت کی پیامبر تینوں گولیاں خاردار تاروں کے بیچ میں سے گزر کر اس شخص کے جسم میں اترتی چلی گئیں۔ اس شخص کی آخری چیخ بے حد دردناک تھی۔

میدان صاف دیکھتے ہی میں بجلی کی تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ میں نے وہ تہ شدہ ترپال خاردار تاروں کی باڑھ پر ڈالی اور اپنے دونوں ہاتھ تاروں پر جما کر خاردار باڑ عبور کر لی۔ بانس کی وہ سیڑھی میرے قریب ہی تھی۔ میں نے پہلے ایک پیر سیڑھی پر جمایا اور اگلے ہی لمحے دوسرا بھی۔ اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے میں پوری طرح اس سیڑھی پر منتقل ہو گیا۔ اس وقت میرا چہرہ حویلی کے اندر کی جانب تھا۔ عین اسی وقت میں نے تین مسلح افراد کو لان کی سرسبز گھاس روندتے ہوئے اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سب سے آگے گنجا اور موٹا امامی نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے رفیقے اور گل شیر تھے۔ امامی کی نظر بانس کی سیڑھی پر پڑی اور اس نے فوراً ہی میری طرف برسٹ مارا۔ اس وقت تک میں آدھی سیڑھی اتر چکا تھا۔ امامی کا نشانہ حیرت انگیز طور پر بے خطا ثابت ہوا کیونکہ سیڑھی کے دونوں ڈنڈوں پر کم از کم ایک گولی لگی اور بانس کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے اپنے ہاتھوں میں زناٹا سا محسوس کیا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں زمین پر اتر گیا اور برق رفتاری سے ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔ میں ابھی حویلی سے پچاس گز دور ہی پہنچا ہوں گا کہ حویلی کی جانب سے مجھ پر فائر ہوا۔ یہ فائر یقیناً حویلی کی چھت پر سے کیا گیا تھا۔ گولی مجھ سے چند قدم پیچھے دھنس گئی۔ اس کے ساتھ ہی میری رفتار میں مزید اضافہ ہو گیا۔ میں بے حد تیز رفتاری سے بھاگ رہا تھا لیکن جب کم بختی پیچھا کر رہی ہو تو تمام تیز رفتاری دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ بالکل یہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ میں ابھی مزید بیس پچیس گز دور ہی پہنچا ہوں گا کہ میری دائیں پنڈلی میں انگارے سے بھر گئے میں لڑکھڑا کر زمین پر گرا اور اچھی خاصی دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ میں نے حویلی کی جانب سے فاتحانہ نعرے کی آواز سنی۔ اس نعرے نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔ اگلے ہی لمحے میں نے اپنی پنڈلی کی شدید تکلیف بھلا دی اور ایک بار پھر اٹھ کر دوڑنے لگا۔ یکے بعد دیگرے کئی گولیاں میرے پاس سے گزرتی چلی گئیں لیکن شاید ان میں سے کسی پر بھی میرا نام نہیں لکھا تھا۔ ہر چند میری پنڈلی درد کا جہنم بنی ہوئی تھی لیکن یہ احساس میرے لیے تقویت کا باعث بن گیا تھا کہ اس گولی نے میری پنڈلی کی ہڈی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ کچھ ہی دیر بعد میں رائفل کی فائرنگ رینج سے باہر نکل گیا۔

میری پنڈلی سے بے تحاشا خون بہ رہا تھا لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اپنے زخم کا جائزہ لے سکتا۔ میں اپنے آپ پر جبر کر کے مسلسل دوڑتا رہا۔ میرے ذہن میں بس یہی دھن سمائی ہوئی تھی کہ مجھے جلد از جلد اس حویلی سے بہت دور نکل جانا ہے۔ اتنا دور کہ کوئی میری گرد کو بھی نہ پہنچ سکے۔

بالآخر خون کے بے تحاشا زیاں نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ میری آنکھوں کے سامنے بار بار اندھیرا چھانے لگا۔ میرے قدموں کی رفتار پہلے تو سست ہوئی اور پھر ان میں ڈگمگاہٹ پیدا ہونے لگی۔ بالآخر میں ایک جگہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میری نظروں کے سامنے جھاڑیوں کا ایک گھنا جھنڈ تھا۔ میں آہستہ آہستہ رینگتا ہوا ان جھاڑیوں میں اندر تک گھستا چلا گیا۔ مجھ پر شدید نقاہت طاری ہونے لگی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ میں کسی بھی لمحے بے ہوش ہو جاؤں گا۔ پنڈلی سے خون اب بھی بہہ رہا تھا۔ میں اگر اس حالت میں اپنے حواس کھو بیٹھتا تو شاید روز حشر ہی میری آنکھ کھلتی۔ میں نے بمشکل خود پر قابو پایا۔ میری شلوار پنڈلی پر سے خون سے لت پت ہو رہی تھی۔ میرے دائیں پیر کا کھسا تو پہلے ہی خون میں بری طرح بھر چکا تھا۔ میں نے شلوار کو پائنچے سے لے کر گھٹنے تک پھاڑ دیا۔ اب خون اگلتا زخم میری نظروں کے سامنے تھا۔ دراصل یہ ایک نہیں دو زخم تھے۔ گولی میری پنڈلی میں گھسی اور پھر گوشت چیرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ یہ بے حد خطرناک زخم تھا۔ اگر خون کو فوراً نہ روکا جاتا تو میری موت یقینی تھی۔ میرے جسم سے آہستہ آہستہ جان نکلتی جا رہی تھی۔ میں اپنے اندر ایک قدم بھی چلنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ بالفرض اگر میں کسی نہ کسی طرح کھڑا ہو کر چل بھی پڑتا تو اس جنگل بیابان میں مجھے طبی امداد کہاں سے ملتی۔

مجھ پر شدید مایوسی طاری ہو گئی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میری رگوں سے زندگی نچڑ رہی تھی۔ میں نے زمین پر سے مٹی بھر خاک اٹھائی اور اپنے ایک زخم پر ڈال لی۔ ایک اور مٹھی خاک سے میں نے اپنے دوسرے زخم کو ڈھانپ دیا۔ زخم پر باندھنے کے لیے میرے پاس کوئی کپڑا نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے دائیں کلائی پر بندھا ہوا میلا سفید رومال کھولا اور اسے کس کر زخم پر باندھ دیا۔ اس سے زیادہ میں کیا کرتا؟ مجھ پر شدید نقاہت کا غلبہ طاری ہوتا چلا گیا۔ میں نے اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ مکمل طور پر ہوش وحواس سے بیگانہ ہونے سے پہلے مجھے احساس ہوا کہ میرے چاروں طرف سحر کا اجالا پھیل رہا ہے۔ ذہن میں آخری سوچ یہ آئی کہ شاید یہ صبح میری زندگی کی آخری صبح ہے......!

☆O☆

جانے مجھے کتنی دیر بعد ہوش آیا۔ رفتہ رفتہ میری آنکھیں کھلنی شروع ہوئیں۔ میں اس وقت بھی انہیں جھاڑیوں کے درمیان چت لیٹا ہوا تھا' جہاں میں نے بے ہوش ہونے سے پہلے پناہ لی تھی۔ خاردار جھاڑیوں کی کئی شاخیں میرے لباس میں الجھی' میرے جسم میں کانٹے چبھو رہی تھیں۔ اس وقت آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور موٹی موٹی بوندیں مجھے بھگو رہی تھیں۔ میں نے بڑی بے تابی سے اپنا منہ کھول دیا اور بوندوں کو اپنے حلق میں اتارنے لگا۔ جب میرے حلق کی خشکی دور ہو گئی تو میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تب مجھے احساس ہوا کہ یہ بارش کافی دیر سے ہوتی رہی ہے۔ میں بری طرح سے کیچڑ میں لت پت ہو رہا تھا۔
میں نے اپنی ٹانگ کے زخم کا جائزہ لیا۔ میری پوری ٹانگ کیچڑ میں لتھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی ٹانگ پر

اچانک میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال آیا اور میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ مجھے حویلی سے فرار ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے ہیں۔ وہ لوگ میرے فرار کی سمت سے بھی واقف ہیں۔ انہیں یہ حقیقت بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ میں شدید زخمی ہوں' چنانچہ میں وہاں سے بہت زیادہ دور نہیں جا سکتا۔ اس کے باوجود وہ لوگ میرے تعاقب میں نہیں آئے۔ اگر وہ لوگ منظم طریقے سے مجھے تلاش کرنے کی کوشش کرتے تو میں بچ کر کہاں جا سکتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ تیز بارش نے میرے خون کے نشانات کو کافی حد تک مٹا دیا ہو۔ اس کے باوجود بھی وہ لوگ مجھے بآسانی گھیر سکتے تھے لیکن اگر وہ کسی وجہ سے ابھی تک مجھ تک نہیں پہنچ سکے تو کیا ہوا؟ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ میں اب بھی ان کی پہنچ سے باہر نہیں ہوں۔ وہ کسی وقت بھی مجھ تک پہنچ سکتے ہیں' میری گردن دبوچ سکتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی خوف سے مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ مجھے جلد از جلد یہاں سے بہت دور نکل جانا چاہیے لیکن میں واقعی یہاں .... سے نکل سکتا ہوں؟ کیا میرے درماندہ جسم میں اتنی جان ہے کہ میں یہاں سے فرار ہو سکوں؟ جبکہ میرے پاؤں کی پنڈلی میں اس قدر خطرناک زخم موجود ہے۔ بڑی مشکل سے خون رکا تھا۔ اگر ٹانگ پر ذرا سا بھی زور پڑتا تو دوبارہ خون بہنا شروع ہو جاتا۔ یہ سب درست سہی لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ یہاں اس طرح پڑے رہ کر اپنی موت کا انتظار تو نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے اپنے جسم کی حالت کو جانچنا چاہا۔ میرے جسم پر لگنے والی چند دن پہلے کی چوٹوں میں اب زیادہ درد نہیں تھا۔ صرف کمر پر لگنے والی چوٹ کبھی کبھار دکھتی تھی اور سر پر لگا ہوا زخم بھی کبھی کبھار اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔ میں اپنی جسمانی حالت قدرے بہتر محسوس کرنے لگا۔ کابلی کیکر کی میٹھی پھلیاں اس وقت میرے لیے بے پایاں نعمت ثابت ہوئی تھیں۔ پنڈلی کا زخم رومال کے نیچے تھا اور رومال پر کیچڑ لتھڑی ہوئی تھی۔ معلوم نہیں زخم کی کیا حالت ہو گی؟

میں نے اپنے ہاتھوں پر زور ڈال کر کھڑا ہونا چاہا میری کوشش تھی کہ میں اپنی ٹانگ پر زور ڈالے بغیر کھڑا ہو جاؤں۔ میں تقریباً اٹھ ہی گیا لیکن پھر میں توازن برقرار نہ رکھ سکا اور ایک بار پھر چھپ کی آواز کے ساتھ کیچڑ میں ڈھیر ہو گیا۔ مجھ پر ابھی تک نقاہت طاری تھی۔ میں ابھی شاید اس قابل نہیں تھا کہ چل پھر سکوں۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ بارش قدرے کم ہو گئی تھی۔ مجھے اپنا گیلا کیچڑ میں لتھڑا ہوا جسم بہت بھاری بھاری لگ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی سردی بھی محسوس ہو رہی تھی۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے بائیں پاؤں کی پنڈلی میں سوئی گھونپ دی ہو۔ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ جلدی سے پنڈلی پر سے شلوار ہٹائی۔ وہ سیاہ رنگ کا موٹا سا چیونٹا تھا جو بری طرح سے میری پنڈلی کے گوشت میں چمٹا ہوا تھا۔ میں نے چٹکی سے پکڑ کر اسے علیحدہ کر دیا لیکن اس کا سر وہیں چمٹا رہ گیا۔ میں نے اس سر کو نوچ کر پھینکا تو زخم سے خون چھلک آیا۔ اسی وقت ایک اور چیونٹے نے میرے کولہے میں اپنے جبڑے گاڑ دیے۔ میں تلملا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ میرے جسم پر بے شمار سیاہ چیونٹے چڑھے ہوئے ہیں۔ میں شاید سیاہ چیونٹیوں کے کسی بڑے سے مسکن کے پاس پڑا ہوا تھا۔ ان کے بل میں پانی پہنچا تو وہ گھبرا کر باہر نکل آئے' قریب ترین شکار میں ہی نظر آیا تو وہ سب مجھ پر چڑھ دوڑے۔

میں نے اپنے کپڑے جھاڑے مگر چیونٹوں سے نجات حاصل نہ کر سکا۔ اب وہ میرے پورے جسم میں

بندھے ہوئے رومال کو چھیڑنے کی کوشش نہیں کی۔ زخم سے خون کا جریان رک چکا تھا۔ اگر مجھے جلد ہی کوئی مناسب علاج اور محفوظ ٹھکانہ مل جاتا تو میری حالت مزید بہتر ہو جاتی۔ پھر مجھے شدید بھوک کا احساس ہوا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ رات کا پیا ہوا دودھ اور انڈے کبھی کے میرے جسم کا حصہ بن چکے تھے۔ میں نے اٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن لڑکھڑا کر دوبارہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ خون کی شدید کمی نے میرے ہاتھ پیروں سے جان نکال لی تھی۔ یہ کمی قوت بخش غذا اور مناسب آرام سے ہی دور ہو سکتی تھی۔ موجودہ حالات میں یہ سب باتیں ایک سہانے خواب کے مانند تھیں۔ میں ایک بار پھر کیچڑ میں لیٹ گیا۔ میرے آس پاس گھنی جھاڑیوں کا حصار قائم تھا۔ اچانک میری نگاہ قریبی جھاڑی پر اٹکی ہوئی کسی چیز پر پڑی میں نے ہاتھ بڑھا کر اس چیز کو جھاڑی پر سے اتار لیا۔ یہ کابلی کیکر کی پھلی تھی۔ بارش کے پانی میں بھیگ کر وہ نرم ہو چکی تھی اور اس کا سنہرا رنگ نکھر آیا تھا۔ میں نے اسے توڑ کر دانتوں سے چبایا۔ اس کا ذائقہ اگرچہ میٹھا تھا تاہم اس میں ہلکی سی کڑواہٹ موجود تھی۔ میں نے پھلی کے بیج نکال دیے اور اسے چبا کر کھا گیا۔ اس صورت حال میں کیکر کی وہ پھلی میرے لیے تحفہ خداوندی بن گئی۔ میں کوشش کر کے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ آس پاس کی جھاڑیوں میں بہت سی پھلیاں اٹکی ہوئی تھیں۔ میرے سر پر کابلی کیکر کے کئی درخت ساتھ ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ بارش کی وجہ سے اچھی خاصی پھلیاں ٹوٹ کر نیچے گر گئی تھیں اور اب بھی گر رہی تھیں۔ میں نے اچک اچک کر بہت سی پھلیاں جمع کر لیں۔ میں نے ان میں سے پختہ اور شیریں پھلیاں علیحدہ کیں اور انہیں چبانا شروع کر دیا۔ کچھ دیر میں بہت سی پھلیاں میرے پیٹ میں اتر چکی تھیں۔ میرا دل ان پھلیوں سے بھر گیا لیکن میں نے اپنے ہاتھ نہیں روکے۔

پیٹ کا جہنم سرد کرنے کے بعد میں دوبارہ کیچڑ بھری زمین پر دراز ہو گیا۔ بارش اگرچہ بہت زیادہ تیز نہیں تھی' تاہم اسے بوندا باندی بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں گزشتہ رات سے لے کر اب تک کے واقعات پر غور کرنے لگا۔ رات کے اس آخری پہر میں موت میرے بے حد قریب سے گزر گئی۔ حویلی کی چھت پر موجود وہ رائفل بردار بلا کا نشانہ باز نکلا۔ اس وقت اگرچہ صبح کا اجالا کسی حد تک پھیل چکا تھا' اس کے باوجود روشنی ہرگز اتنی زیادہ نہیں تھی کہ اتنی دور سے صحیح صحیح نشانہ لیا جا سکتا۔ شاید اسی لیے میں بچ نکلا۔ مجھے یہ سوچ کر ہنسی آ گئی کہ میں نے غیر ارادی طور پر ہی سہی' بہرحال اس حویلی والوں کو تباہ و برباد ہونے سے بچا لیا۔ حویلی کے عقبی حصے سے سیڑھی لگا کر دیوار پر چڑھنے والے وہ دونوں مسلح افراد اگر حویلی کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو جاتے تو کیا ہوتا؟ وہ دونوں تو مل کر پوری بساط الٹ کر رکھ دیتے۔ حویلی کے پہرے داروں کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہو گی کہ کوئی حویلی کے اندر بھی ان پر موت بن کر نازل ہو سکتا ہے۔ وہ تو باہر ہی کی طرف ٹھائیں ٹھائیں کرتے رہے۔ انہیں اس وقت صورت حال کا علم ہوتا جب یہ دونوں اچانک پیچھے سے جا کر گولیوں سے چھلنی کر دیتے اس کے بعد تو محض حویلی کا گیٹ کھولنے کی کارروائی باقی رہ جاتی۔

فقیر بابا نے مجھے بتایا تھا کہ سردار برکت علی نے بے شمار دشمنیاں پال رکھی ہیں۔ یہ حملہ آور گروہ بھی انہیں میں سے کسی دشمن کا بھیجا ہوا ہو گا۔ ویسے تو برکت علی کے مرنے کے ساتھ ہی اس کی تمام دشمنیاں بھی ختم ہو جانی چاہیے تھیں۔ جانے یہ کون دشمن تھا جو اپنے دشمن کو مرنے کے بعد بھی بخشنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

کاٹ رہے تھے۔ میں تیزی سے جھاڑیوں کے جھنڈ سے نکل آیا۔ اس ناگہانی آفت نے مجھے بری طرح حواس باختہ کر دیا۔ میں نے سوچا اگر میں نے فوراً ہی ان ہولناک بلاؤں سے نجات حاصل نہ کی تو یہ میری بوٹیاں نوچ لیں گے۔ اسی وقت مجھے وہ اونچا سا پشتہ نظر آیا۔ وہ شاید کوئی نہر تھی۔ میں تیزی سے اس طرف بڑھا۔ واقعی وہ ایک بڑی سی نہر تھی۔ میں نے آؤ دیکھا نا تاؤ سیدھے نہر میں چھلانگ لگا دی۔ چیونٹوں سے نجات کی مجھے یہی واحد ترکیب سمجھ میں آئی۔ نہر میں اچھا خاصا پانی تھا۔ میں نے پانی میں دو تین غوطے لگائے تو ان بدبخت چیونٹوں نے اپنے جبڑوں کی گرفت ڈھیلی کرنا شروع کر دی۔ کچھ ہی دیر بعد میری ان سے جان چھوٹ چکی تھی۔ میں بڑے پرسکون انداز میں پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ تیرنے لگا۔ اب میں خود کو کسی قدر پرسکون محسوس کر رہا تھا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میں اپنے دشمنوں سے دور ہوتا گیا۔ مجھے بار بار فقیر بابا کا خیال آ رہا تھا۔ میں خود تو کسی نہ کسی طرح بچ ہی نکلا لیکن فقیر بابا جانے کس حال میں ہوگا۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ وہ سردار برکت علی کی حویلی میں موجود نہیں ہے لیکن وہ جہاں کہیں بھی مقید تھا اس کا علم مجھے حویلی والوں ہی کے ذریعے ہو سکتا تھا۔ میں قدرے بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔ کوئی چیز میرے لاشعور میں بری طرح کھٹک رہی تھی۔ کوئی اہم بات ایسی ضرور تھی جسے میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ میں نے بہت سوچا لیکن وہ بات شعور کی سطح پر نہ آئی' میں بہت دیر تک تیرتا رہا۔ پانی ٹھنڈا تھا' مجھے اچھی ں خاصی سردی محسوس ہونے لگی۔ بارش بند ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی البتہ بادل ابھی تک گھٹے کھڑے تھے۔ میں نے کھسے اتار کر اپنے نیفے میں اڑس رکھے تھے۔ قمیص کی بغلی جیب میں پستول کافی وزنی محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ بھیگنے کے باعث اس کی کارکردگی پر کیا اثر پڑا ہوگا۔

اچانک مجھے یاد آ گیا کہ وہ کیا بات ہے جو میرے ذہن میں کھٹک رہی ہے۔ وہ بڑی ہی عجیب و غریب بات تھی۔ ان جھاڑیوں میں جب چیونٹوں نے مجھ پر حملہ کیا تو میں اس قدر حواس باختہ ہو گیا کہ میرے ذہن میں اس کے علاوہ کوئی خیال نہیں آیا کہ مجھے جلد از جلد اس خطرناک مخلوق سے نجات حاصل کرنی ہے۔ عین اس وقت مجھے یہ نہر نظر آئی اور میں نے اندھا دھند اس میں چھلانگ لگا دی۔ یہ سب کچھ اتنی افراتفری میں ہوا کہ مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ...... میری ٹانگ زخمی ہے۔ چلیں مان لیا کہ میں اپنی ٹانگ کے زخم کو بھول گیا لیکن کیا واقعی وہ زخم اتنا معمولی ہے کہ مجھے اس کا احساس ہی نہیں ہو سکا؟ جس شخص کی پنڈلی میں اس طرح کا زخم ہو' جس کی پنڈلی میں رائفل کی گولی نے اس طرح آر پار چھید ڈال دیا ہو' کیا اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ میری طرح بھاگ دوڑ کر سکے؟ نہیں' ہرگز نہیں' یہ تو ممکن ہی نہیں۔

لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود تھی کہ میں بھاگا تھا اور بے تحاشا بھاگا تھا۔ میری ٹانگ پر بھرپور وزن پڑا لیکن مجھے ذرا بھی احساس نہ ہوا کہ میری یہ ٹانگ زخمی ہے۔ میری ٹانگ میں تو ذرا سا بھی درد' ذرا سی بھی تکلیف نہیں ہوئی۔ جیسے میری ٹانگ پر تو کسی زخم کا وجود ہی نہیں۔

سوچتے سوچتے میرے سر میں درد ہونے لگا لیکن میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ رفتہ رفتہ مجھے بری طرح تھکن محسوس ہونے لگی۔ میرے شانے درد سے دکھ رہے تھے۔ اس کے باوجود مجھے اپنی پنڈلی میں کسی قسم کا درد محسوس نہیں ہوا۔ رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تو میں نہر سے باہر نکل آیا۔ میری اتنی دیر کی تیراکی' مجھے اس جگہ سے اچھی خاصی دور لے آئی تھی۔ اب میں کم از کم عارضی طور پر محفوظ ہی تھا۔ میرے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اس

وقت ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی۔ اپنے کھسے پیروں میں پھنسا کر میں ایک جانب چل پڑا۔

وہ اچھا خاصا گھنا جنگل تھا۔ دور دور تک کوئی آدم تھا نہ آدم زاد۔ پرندے اپنے بسیروں کو واپس لوٹ رہے تھے۔ آسمان پر چھائے گہرے بادل شام کے اندھیرے میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔

مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ اس علاقے کی تمام نہریں شمالاً جنوباً بہتی ہیں۔ اس لحاظ سے میں ڈیرہ غازیخان کے جنوب میں کسی جگہ موجود تھا۔ اس جگہ کا ڈیرہ غازیخان سے کتنا فاصلہ ہے' اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

کچھ ہی دور چلنے کے بعد میری حالت خراب ہونے لگی مجھے شدید سردی کا احساس ہوا۔ کمزوری سے میرے قدم کئی بار لڑکھڑائے لیکن میں خود پر جبر کر کے کسی نہ کسی طرح چلتا ہی رہا۔ کچھ دیر بعد میں ایک نیم پختہ ٹوٹی پھوٹی سڑک کے کنارے پہنچ گیا۔ رات کا اندھیرا پوری طرح چھا چکا تھا۔ میرے لیے اب ایک قدم اٹھانا بھی ناممکن ہو گیا تھا۔ بالآخر میں اس سڑک پر ہی بیٹھ گیا۔

فضا سے پرندوں کی چہچہاہٹوں کا شور ختم ہو چکا تھا۔ چاروں طرف جھینگروں کی سیٹیوں کے علاوہ کوئی آواز نہ تھی۔ پستول میری ران کے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں نے اسے باہر نکالا۔ بٹن دبایا تو میگزین باہر نکل آیا۔ میں نے پستول جھٹک جھٹک کر اس میں سے پانی نکالنے کی کوشش کی۔ اصل خطرہ میگزین میں گھسے ہوئے پانی سے تھا۔ اگر پانی گولیوں کے اندر پہنچ جاتا تو وہ بے کار ہو جاتیں۔ میں نے میگزین پستول میں چڑھایا اور اسے جیب میں ڈال لیا۔ اسی وقت جیب میں موجود کوئی چیز میری انگلیوں میں ٹکرائی۔ میں نے دو انگلیوں میں پکڑ کر اس چیز کو باہر نکال لیا۔ وہ کپڑے کی ایک بہت چھوٹی سی پوٹلی تھی۔ وہ پوٹلی پانی میں بری طرح بھیگی ہوئی تھی۔ اس پوٹلی سے بے حد ناگوار سی بو خارج ہو رہی تھی۔ میں نے اس بو کو فوراً پہچان لیا اس پوٹلی میں بھنگ بندھی ہوئی تھی۔ میں نے پچھلے چند دنوں میں اس قدر صعوبتیں جھیلیں لیکن چھوٹی سی پوٹلی کسی نہ کسی طرح میرے ہمراہ رہی۔ میرے ہونٹوں پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میں اس غلیظ شے سے کتنی نفرت کرتا تھا' اب صورت حال یہ ہو گئی تھی کہ یہ میری ذات کا ایک لازمی جزو بن گئی تھی۔

مجھے کیکر کی پھلیوں کا لنچ کیے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ وہ خود ساختہ طعام اچھا خاصا زود ہضم ثابت ہوا۔ چنانچہ اب مجھے شدت سے بھوک لگ رہی تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے ان پھلیوں سے اپنی جیبیں کیوں نہ بھر لیں۔ ویسے اس میں میرا قصور نہیں تھا۔ مجھے ان جھاڑیوں سے اس قدر افراتفری کے عالم میں بھاگنا پڑا کہ میں کچھ سوچ سمجھ ہی نہ سکا۔

تھکن اتنی تھی کہ میں بارش سے بھیگی سرد سڑک پر لیٹ گیا۔ سردی کے باعث مجھ پر کپکپاہٹ طاری تھی۔ اسی وقت مجھے ایک بار پھر اپنی پنڈلی کے زخم کا خیال آیا۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ شلوار کے پھٹے ہوئے پائنچے کو میں نے گرہ لگا کر باندھ دیا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ سے زخم پر بندھے ہوئے رومال کو ٹٹولا۔ عین زخم کی جگہ پر انگلیاں رکھ کر میں نے ہلکے سے دبایا۔ مجھے یہ جان کر شدید حیرت ہوئی کہ مجھے ذرا بھی درد محسوس نہیں ہوا۔ پھر میں نے پنڈلی کے دوسری جانب والے زخم کو ہلکے سے دبایا۔ وہاں بھی کسی قسم کا درد نہیں تھا۔ مجھ پر شدید ترین حیرت کا غلبہ ہو رہا تھا۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ تعجب کی بات تو یہ تھی کہ میری پنڈلی کا زخم والا حصہ

بے حس بھی نہیں تھا۔ مجھے اس جگہ واضح طور پر اپنی انگلیوں کا لمس محسوس ہوا۔ میں نے ٹٹول کر رومال کی گرہ کھولنا چاہی لیکن ناکام رہا۔ رومال کی گرہ کافی سختی سے بندھی ہوئی تھی اور اس اندھیرے میں میرے لیے اسے کھولنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے رومال کھولنے کی مزید کوشش ترک کردی اور دوبارہ سڑک پر دراز ہوگیا۔

مجھ پر شدید غنودگی طاری ہوگئی لیکن جب وہ آواز میرے کانوں میں پڑی تو میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ وہ کسی گھنٹی کی آواز تھی جو قدرے دور سے آرہی تھی۔ سناٹا بہت تھا لہٰذا آواز قطعی واضح تھی۔ میں نے آواز کی سمت آنکھیں لگادیں پھر میں نے ایک ٹمٹماتی روشنی کو دیکھا۔ اس روشنی کی زمین سے بلندی زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ فٹ ہوگی۔ وہ روشنی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ روشنی وقتاً فوقتاً فضا میں ڈولنے بھی لگتی تھی۔ جیسے انکار میں سر ہلا رہی ہو۔ گھنٹی کی آواز میں ایک تسلسل تھا اور آہستہ آہستہ وہ قریب آرہی تھی۔ گھور اندھیرے میں وہ مدھم اور فضا میں ڈولتی روشنی اور گھنٹی کی آواز کافی پراسرار لگی۔ میں بھوت پریت سے تو نہیں ڈرتا تھا البتہ مجھے تجسس ضرور تھا۔ پھر وہ روشنی اور گھنٹی کی آواز میرے کافی قریب آگئی۔ اب میں نے جان لیا کہ یہ چکر کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی مجھے ہنسی آگئی۔

وہ ایک سست رفتار سی بیل گاڑی تھی۔ گاڑی بان کو شاید کوئی جلدی نہیں تھی لہٰذا اس نے بیل کو اس کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ بیل بڑے مزے سے گردن ہلاتا چلا آرہا تھا۔ گاڑی کے ایک بمبو کے ساتھ ایک لالٹین بندھی تھی جو وقتاً فوقتاً ڈولنے لگتی۔ گاڑی کو قریب آتے دیکھ کر میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ گاڑی جب بالکل میرے قریب پہنچ گئی تو گاڑی بان نے مجھے دیکھ لیا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ بیل گاڑی ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔

''تو کون ہے بھائی؟'' گاڑی بان نے بے حد پرسکون لہجے میں دریافت کیا۔ اس کی عمر شاید پچپن ساٹھ سال رہی ہوگی۔ اس کے چہرے پر نصف سیاہ اور نصف سفید داڑھی تھی۔ وہ ایک بردبار اور نرم مزاج شخص معلوم ہوتا تھا۔ اس نے سر پر اپنے علاقے کا مخصوص سفید صافہ باندھ رکھا تھا۔

''میں ایک مسافر ہوں بابا۔ بھوکا پیاسا اور بیمار' مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' میں نے حتی الامکان عاجزانہ لہجے میں کہا۔

''اوہو۔ تم اس ویران علاقے میں کہاں سے آن پھنسے بیٹا۔ آؤ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میرا گھر یہاں سے کچھ فاصلے پر عالم والی بستی میں ہے۔ ویسے تو میں غریب آدمی ہوں لیکن مجھ سے جو بھی خدمت ہوسکی ضرور کروں گا۔''

میں جلدی سے بیل گاڑی میں سوار ہوگیا۔ گاڑی بان نے بیل کو ہلکا سا اشارہ کیا اور گاڑی چل پڑی۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں ایک بار پھر گھنٹی کی مدھر آواز بکھرنے لگی۔

''میرا الدھو آج بہت تھک گیا ہے'' اس بوڑھے شخص نے بڑے پیار بھرے انداز میں اپنے بیل کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا'' آج بہت سویرے سے یہ کام میں لگا ہوا ہے۔ آج ویسے بھی بہت دیر ہوگئی ہے۔ اسی لیے میں نے اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ جس طرح چاہے چلتا رہے۔ راستہ تو سارا اس کا دیکھا بھالا ہے ہی۔''

''تمہارا نام کیا ہے بابا؟ اور تم کیا کام کرتے ہو؟''

''نام تو میرا کریم بخش ہے۔۔۔۔۔۔ رہی کام کی بات تو بس چھوٹی موٹی مزدوری کرتا ہوں۔ یہ بیل گاڑی ہے میری۔ صبح بھٹے سے اینٹیں اٹھا کر شہر چھوڑنے جاتا ہوں۔''

''کون سے شہر بابا؟'' میں نے مضطرب لہجے میں دریافت کیا۔

''وہیں کوٹ چھٹہ اور کہاں؟ تمہارا نام کیا ہے؟ کہاں کے رہنے والے ہو اور کیا کام کرتے ہو؟''

''میرا نام ۔۔۔۔۔۔ غلام سعید ہے۔ رہنے والا میں کوٹ ادو کا ہوں اور میں بھی چھوٹی موٹی مزدوری کر کے گزارہ کرتا ہوں'' میں نے فوری طور پر ایک کہانی گڑھ لی۔

''تمہارے باقی گھر والے؟'' اس نے استفسار کیا۔

''کوئی نہیں ۔۔۔۔ میں اس دنیا میں اکیلا ہوں۔ گھر کے نام پر ایک کچا کوٹھڑا تھا۔ وہ بھی پچھلی بارشوں میں ڈھے گیا۔ اب میرا کوئی گھر بار نہیں۔''

''اس علاقے میں کیسے نکل آئے؟'' بابا کریم بخش نے پوچھا۔

''بس یونہی آوارہ گردی کرتے ہوئے۔ جیب خالی تھی لہٰذا پیدل ہی نکل کھڑا ہوا۔ چلتے چلتے راستہ بھول گیا پھر بارش شروع ہوگئی۔ مسلسل بھیگنے کی وجہ سے شاید بخار ہوگیا ہے۔''

بابا کریم بخش نے میری کلائی پکڑ کر دیکھا'' اوہو۔ تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ یقیناً سردی بھی لگ رہی ہوگی۔ لو تم میرا یہ پٹکا اوڑھ لو۔''

''نہیں نہیں بابا۔ اس کی کیا ضرورت ہے؟ میں بالکل ٹھیک ہوں'' میں نے شرمندہ ہو کر اس کا صافہ لوٹانا چاہا۔

''اوڑھ لو بیٹا۔ یہ کسی سردار کی پگ تو ہے نہیں جس کا شملہ نیچا ہونے کا ڈر ہو۔ میں بھی اپنی جوانی میں تمہارے جیسا ہوتا تھا۔ آزاد پنچھی کی طرح بے فکر اور آوارہ ہوا کے جھونکے کی طرح بے سمت۔''

باریک ململ کا صافہ بھلا مجھے کیا گرمی پہنچاتا لیکن میں نے بابا کی دلجوئی کی خاطر اسے اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ لمحہ بہ لمحہ میری حالت بگڑتی جارہی تھی۔ بخار کی شدت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ مجھ پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ میں سو جاتا اور پھر چونک کر آنکھ کھل جاتی۔ بابا کریم بخش کی باتوں کا میں جانے کیا کیا الٹے سیدھے جواب دے رہا تھا۔ پھر مجھ پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ بابا کریم بخش نے مجھے جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کی لیکن جب میں اٹھ کر نہ بیٹھا تو اس نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔

مجھے بالکل یاد نہیں کہ میں بابا کریم بخش کے گھر میں کیسے پہنچا۔ مجھے کچھ دیر کے لیے تھوڑا سا ہوش اس وقت آیا جب کسی نے نیم گرم دودھ سے بھرا ہوا کٹورا میرے منہ سے لگا دیا۔ میں نے غٹا غٹ وہ پورا کٹورا خالی کردیا۔ میرے کانوں میں باتوں کی آواز آرہی تھی لیکن میں ایک لفظ بھی نہیں سمجھ پایا۔ پھر ایک کٹورا میرے منہ سے لگا دیا گیا' میں نے کئی لمبے لمبے گھونٹ بھر لیے تب مجھے محسوس ہوا کہ اس بار دودھ کا ذائقہ کڑوا ہے۔ میں نے منہ پھیرنا چاہا اسی وقت کسی نے میرے سر کے پیچھے تھپکی دی اور مجھے کٹورا خالی کرنے کو کہا۔ میں نے آدھا کٹورا پیا اور ایک بار پھر غنودگی کی گود میں کھو گیا۔

مجھے اگلے دن دوپہر کے وقت ہوش آیا۔ میں نے اپنے اوپر پڑا ہوا موٹا لحاف ہٹایا۔ میرا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم میں جان ہی نہ ہو۔ میں کچھ دیر بستر پر لیٹا رہا۔ وہ دیہاتی طرز کا کچا کمرا تھا۔ کمرے کی چھت کافی اونچی تھی۔ چھت کے شہتیر کھجور کے درخت کے تنے کے تھے۔ کڑیوں کی جگہ درخت کی ٹیڑھی میڑھی شاخیں تھیں۔ ان کے اوپر چٹائی کی چھت ڈالی گئی تھی۔ میں ابھی چھت کا جائزہ لے رہا تھا کہ بابا کریم بخش کمرے میں داخل ہوا۔

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟'' اس نے پوچھا۔

''پہلے سے ٹھیک ہوں'' میں نے کمزور لہجے میں کہا۔

''شام تک یا کل صبح تک تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ ٹھہرو میں تمہارے لیے جوشاندہ لاتا ہوں''

بابا کریم بخش کمرے سے باہر نکل گیا۔ مجھے اس کا لہجہ کچھ بدلا بدلا سا لگا وہ اگرچہ مجھ سے نرم لہجے میں بات کر رہا تھا تاہم اس کے لہجے میں وہ پہلا سا اپنائیت کا عنصر مفقود تھا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ بادل نخواستہ مجھ سے بات کر رہا ہو۔ شاید کسی وجہ سے اس کی رائے میرے بارے میں بدل گئی تھی۔ چنانچہ اب وہ جلد از جلد مجھ سے جان چھڑا لینا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ میں جوشاندے کا بڑا سا کٹورا تھا۔ میں نے کٹورے سے منہ لگانا چاہا لیکن جوشاندے کی تیز بو نے مجھے منہ پھیرنے پر مجبور کر دیا۔

''بابا میں یہ نہیں پی سکتا۔ مجھے قے ہو جائے گی'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے' میں تمہارے لیے دودھ لاتا ہوں۔'' اس کے لہجے میں سرد مہری کا عنصر نمایاں تھا۔ میرے خلاف کوئی بات اس کے دل میں بہت گہری اتر گئی تھی۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ طوعاً و کرہاً مجھے اپنے گھر میں برداشت کر رہا ہے۔

دودھ کا کٹورا پینے کے بعد میں دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔ اس شخص کے رویے نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ رات کو تو وہ سراپا محبت' سراپا عنایت بنا ہوا تھا۔ جبکہ اب وہ مجھ سے سیدھے منہ بات کرنے کو بھی تیار نہیں تھا......شاید اس کے گھر کے دیگر افراد نے مجھے پسند نہیں کیا تھا۔ اگر یہ بات تھی تو اسے مجھے اپنے گھر لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ ہو سکتا ہے کوئی اور وجہ ہو۔ خواہ کوئی بھی وجہ رہی ہو میں نے اپنے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ میں جونہی قدرے بہتر ہوا' یہاں سے فوراً چل پڑوں گا۔ مجھے یہ سوچ کر سخت کوفت ہونے لگی کہ میں زبردستی کا مہمان بن کر اس شخص کے گھر میں پڑا ہوا ہوں۔

پورا دن میں اس کمرے میں پڑا رہا۔ دن میں ایک دو بار میں نے کسی لڑکی کی دھیمی دھیمی آوازیں سنیں لیکن کوئی اس کمرے میں نہیں آیا۔ دوپہر کے وقت کریم بخش کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں وہی جست کا کٹورا تھا۔ ''یہ ساگودانہ کھا لو۔ حکیم صاحب نے ابھی کھانا کھانے سے منع کیا ہے۔'' کریم بخش نے سرسری لہجے میں کہا۔ میں نے چپ چاپ کٹورا ہاتھ میں لے لیا ''تم آج کام پر نہیں گئے بابا؟'' میں نے پوچھا۔

''چلا جاؤں گا' چلا جاؤں گا۔ حکیم صاحب نے کہا ہے کہ تم کل پرسوں تک چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ میں تب تک گھر پر ہی رہوں گا'' اس نے بے زار سے لہجے میں کہا۔ اس نے بالواسطہ طور پر صاف صاف

کہہ دیا تھا کہ میں جونہی چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں' فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤں۔ میں خود بھی اب یہاں ایک پل ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ مجھ پر نقاہت کے دورے پڑ رہے تھے۔

کریم بخش کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر بستر پر دراز ہو گیا۔ مجھے اب بخار نہیں تھا۔ البتہ کمزوری بدستور تھی' اچانک مجھے ایک بار پھر اپنی پنڈلی کے زخم کا خیال آیا۔ میں یک دم اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں اچھی خاصی روشنی تھی۔ میں نے اپنی پنڈلی پر بندھے ہوئے رومال کو دیکھا۔ رومال پر خون کا کوئی دھبہ نہیں تھا۔ میں نے رومال کی گرہ کو ہاتھ لگایا۔ یک دم میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میرے سارے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ میں نے ناخنوں کی مدد سے رومال کی گرہ کھولی اور کپکپاتے ہاتھوں سے رومال کو پنڈلی سے الگ کر دیا۔

میں نے اپنے زخموں پر نگاہ ڈالی اور حیرت سے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی پنڈلی کو گھورنے لگا۔ جو کچھ میں دیکھ رہا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔ ایک دن پہلے تک جس جگہ گولی کا خون اگلتا زخم تھا' اب وہاں صرف ایک کھرنڈ موجود تھا۔ میں نے جلدی سے پنڈلی کے دوسری جانب والا زخم دیکھا۔ مجھے اس زخم پر بھی کھرنڈ نظر آیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کئی ہفتے پہلے ان جگہوں پر معمولی سے زخم آئے ہوں جو اب بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں۔ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ چند گھنٹوں کے اندر یہ اتنے گہرے زخم کیونکر ختم ہو گئے؟ وہ کون سی جادو اثر دوا ہے جس نے اندمال کا طویل عمل لمحوں میں مکمل کر ڈالا ہے۔ وہ کون سا مسیحا نفس ہے جس کے دست باشفا نے میرے اس روگ کو اتنی چابک دستی سے رفع کر ڈالا؟

میں نے مندمل زخم کی جگہ کو ہلکا سا دبایا۔ مجھے ذرا بھی درد محسوس نہ ہوا۔ میں نے ذرا اور زور سے انگلیوں کا دباؤ ڈالا۔ نہیں کچھ بھی نہیں۔ ہلکا درد بھی تو محسوس نہیں ہوا۔ عجیب بات یہ تھی کہ میری پنڈلی کے وہ حصے بے حس بھی نہیں تھے۔ میں نے جتنی بار بھی اپنی انگلیوں سے ان حصوں کو چھوا' مجھے پوری طرح سے اپنی انگلیوں کا لمس محسوس ہوا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ اگر یہ بات میں کسی اور کو بتاتا تو وہ یقیناً میرا مذاق اڑاتا لیکن میں اپنی آنکھوں دیکھے کو' اپنے آپ پر بیتے ہوئے واقعے کو کیسے جھٹلاتا۔ کسی واقعے کے وقوع پزیر ہونے کی وجہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے جب وہ وقوع پزیر ہو جائے تو اسے تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ کتنے ہی ایسے مظاہر ہوتے ہیں جو انسانی عقل و فہم سے ماورا ہوتے ہیں لیکن ان کے وجود سے انکار ممکن نہیں ہوتا۔ یہ بھی ایک ایسا سربستہ راز تھا جو میری محدود عقل سے بالا تھا' مجھے چار و ناچار اسے قبول کرنا ہی تھا۔

شام ڈھلے تک میری حالت خاصی بہتر ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ اب میں چل پھر سکتا ہوں۔ تاہم میں نے فی الحال اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ اپنی پنڈلی کے زخموں کی جانب سے مطمئن ہونے کے بعد میں خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اب مجھے صرف جسمانی توانائی درکار تھی۔ جونہی میرے جسم میں مزید کچھ جان آتی' میں فوراً یہاں سے اٹھ کر چل دیتا۔ لعنت ہو ایسی زبردستی کی مہمان داری پر۔ ٹھیک ہے اس شخص نے بادل ناخواستہ ہی سہی' مجھ پر احسان کیا ہے۔ زندگی رہی تو کسی نہ کسی طرح یہ احسان اتارا جا سکتا ہے۔

کچھ دیر بعد بابا کریم بخش وہی جست کا کٹورا ہاتھ میں لیے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کٹورے میں دودھ اور دلیا تھا۔ اس نے چپ چاپ وہ کٹورا میرے حوالے کر دیا۔

’’میں اب خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا ہوں‘‘ میں نے اسے تسلی دی ’’میرا خیال ہے میں اب کافی حد تک چل پھر سکتا ہوں۔ میں رات بھر یہاں ٹھہر کر صبح سویرے یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ تم نے مجھ پر جو یہ مہربانی کی ہے اس کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے‘‘ بابا کریم بخش نے روکھے لہجے میں کہا ’’میں تمہیں کل صبح اپنی بیل گاڑی میں بڑی سڑک تک چھوڑ آؤں گا۔‘‘

گویا یہ شخص اب اس گاؤں میں بھی میری موجودگی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ کوئی اس سے پوچھے کہ اللہ کے بندے میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے‘ کیوں میری صورت سے بے زار ہو رہا ہے۔ تم مجھے اپنی مرضی سے اپنے گھر لائے تھے۔ میں زبردستی تو نہیں آیا تھا۔ رات کو تو بیٹا بیٹا کہتے تمہاری زبان نہیں سوکھتی تھی‘ کہاں اب تم مجھے دھکے دے کر اپنے گھر سے نکالنے کو تیار ہو رہے ہو۔ آخر مجھے اپنا قصور تو معلوم ہو۔

کریم بخش‘ کٹورا لے کر چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گیا۔ جانے سے پہلے اس نے ایک لالٹین روشن کر دی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ واپس لوٹ آیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی چیز اٹھا رکھی تھی۔ وہ چیز اس نے چپ چاپ میرے پاس رکھ دی ’’کل رات یہ تمہاری جیب سے نکلا تھا‘‘ کریم بخش نے سرد لہجے میں کہا ’’دیکھ لو۔ ہم نے اسے بالکل نہیں چھیڑا ہے۔ یہاں سے جانے کے بعد ہم پر ایک مہربانی کرنا کہ کسی کے سامنے میرا نام نہ لینا۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ پولیس تھانے کی مصیبتیں جھیلنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ میں نے کسی کو تمہارے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ تمہیں ہماری طرف سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔‘‘

اف میرے خدا! یہ بوڑھا شخص کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ اسی لیے یہ کل رات سے اب تک مجھ سے کھنچا کھنچا سا ہے۔ کل رات جب اس نے میری بے ہوشی کے عالم میں مجھے بیل گاڑی سے اس بستر پر منتقل کیا تو میرا پستول اس کے ہاتھ لگ گیا ہوگا۔ میں نے اسے اپنے متعلق جو من گھڑت کہانی سنائی‘ اس میں یہ خطرناک ہتھیار کسی طرح بھی فٹ نہیں بیٹھتا۔ اس نے فوراً سمجھ لیا کہ میں نے اسے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا وہ سب جھوٹ ہے۔ اب یہ مجھے کوئی راہزن یا ڈکیت سمجھ رہا ہے۔ اب تک تو اس نے مجبوراً میرا ناپاک وجود اپنے گھر میں برداشت کر لیا ہے لیکن اسے اندیشہ یہ ہے کہ کہیں میں پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد اپنے مددگار کی حیثیت سے اس کا نام نہ بتا دوں۔ اس نے میرے متعلق جو رائے قائم کی وہ اتنی بے جا بھی نہیں کہی جا سکتی۔ میرا بے ڈھنگا لباس‘ الجھے ہوئے بال‘ بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی داڑھی مونچھیں‘ یہ سب چیزیں تو واقعی کسی جرائم پیشہ‘ مفرور مجرم کی نشاندھی کرتی ہیں۔

’’تم نے میرے متعلق غلط اندازہ لگایا ہے بابا‘‘ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ’’میں ایک بے گھر‘ بے در شخص تو ضرور ہوں لیکن میں کوئی چور ڈاکو نہیں ہوں۔ کاش تم نے اپنے طور پر قیاس کرنے کے بجائے مجھ سے اس پستول کے میرے قبضے میں ہونے کی وجہ تو پوچھ لی ہوتی۔‘‘

’’تو تم اب بتا دو کہ ایک معمولی مزدور کے پاس یہ ہولناک ہتھیار کیا کر رہا ہے؟‘‘ کریم بخش نے قدرے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔

’’میں نے تمہیں اپنے متعلق جو کچھ بتایا وہ سب سچ ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں نے چند باتیں دانستہ

تمہیں نہیں بتائیں۔ میرا خیال تھا کہ ان باتوں کو تمہیں بتانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔‘‘

’’مجھے بتاؤ کہ وہ کونسی باتیں ہیں‘‘ اس نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

’’تم اصرار کرتے ہو تو تمہیں سب کچھ بتانا ہی پڑے گا۔ ویسے تو میں کل صبح یہاں سے چلا ہی جاؤں گا لیکن میں یہ ہرگز نہیں چاہوں گا کہ میرے جانے کے بعد تم مجھے برے القاب سے یاد کرو۔‘‘

’’تم کہو تو سہی۔ وہ کونسی بات ہے جو تم مجھے بتانا چاہتے ہو؟‘‘ کریم بخش نے مضطرب لہجے میں کہا۔

’’میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میں کوٹ ادو کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ میرے پاس زرعی زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ اس زمین کے ٹکڑے کا رقبہ تو بہت معمولی ہے لیکن اپنے محل وقوع کی وجہ سے اس کی اہمیت کافی زیادہ ہے۔ میری یہ زمین بڑی سڑک کے بالکل ساتھ ہے۔ مجھے اس زمین سے بے حد معمولی آمدنی ہوتی ہے۔ گاؤں کے زمیندار ملک غلام سرور نے کافی دنوں سے میری زمین کے اس ٹکڑے پر آنکھ رکھی ہوئی ہے۔ وہ اس جگہ اپنا پٹرول پمپ قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھے یہ زمین فروخت کرنے کو کہا۔ مجھے وہ زمین فروخت کرنے سے کوئی انکار نہیں ہے لیکن ملک غلام سرور نے اس زمین کی جو قمت لگائی ہے وہ اصل قیمت کے بمشکل دسویں حصے کے برابر ہے۔ میں نے بڑے عاجزانہ انداز میں زمین فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر غلام سرور دھونس دھمکیوں پر اتر آیا۔ اس نے کہا کہ یہ زمین اس کے علاوہ کوئی نہیں خرید سکتا۔ اگر میں نے شرافت سے یہ زمین اس کے حوالے نہ کی تو وہ پٹواری سے مل کر مفت میں یہ زمین مجھ سے چھین لے گا۔ اس کی یہ دھمکی خالی خولی دھمکی نہیں ہے۔ وہ واقعی یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ سرکاری حکام اس کی انگلی کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ اگر وہ یہ سب کچھ کر گزرتا تو میں اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ پاتا۔ میں بے حد پریشان تھا۔ تمام لوگ میری حالت سے واقف تھے لیکن کوئی بھی میری کچھ مدد نہیں کر سکتا تھا‘‘ میں ذرا دم لینے کے لیے رکا۔ کریم بخش بڑے انہماک سے میری فرضی داستان سن رہا تھا۔ ’’تب گاؤں کے پرائمری اسکول کے نیک دل ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے ایک مخلصانہ مشورہ دیا۔ ایک دن میں صبح سویرے ملتان روانہ ہو گیا۔ میرے پاس ایک وکیل کا پتا موجود تھا۔ وہ وکیل ہیڈ ماسٹر صاحب کا دور پرے کا عزیز تھا۔ بقول ہیڈ ماسٹر صاحب‘ وہ ایک بے حد اصول پسند اور ایمان دار شخص تھا۔ امانت اللہ شیخ نامی اس وکیل کے پاس پہنچ کر میں نے تمام صورت حال اس کے گوش گزار کر دی۔ اسی روز ایک مختار نامہ تیار کیا گیا جس میں میں نے امانت اللہ شیخ کو اپنی جائداد کا مختار قرار دے دیا۔ اس مختار نامے کی عدالت سے تصدیق کرائی گئی اور اس کی ایک نقل متعلقہ پٹواری کو پہنچا دی گئی۔‘‘

میں چند لمحے خاموش رہا۔ کریم بخش نے بے چین ہو کر پوچھا ’’پھر کیا ہوا؟‘‘

’’ہونا کیا تھا۔ ملک غلام سرور کے تمام شیطانی منصوبے مٹی میں مل گئے۔ اب اس کے لیے ممکن نہیں رہا کہ سرکاری حکام کے ساتھ مل کر میری زمین ہضم کر لے۔ میری اس حرکت نے اسے سخت برافروختہ کر دیا۔ اب وہ میری جان کے درپے ہو گیا۔ اس نے ایک بار میرے گھر کو آگ لگوانے کی کوشش کی۔ اتفاق سے آگ زیادہ نہ بھڑک سکی اور میں بچ نکلا‘ پھر ایک رات مجھے راستے میں گھیر کر کلہاڑیوں سے میرا خاتمہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس رات بھی قسمت میرا ساتھ دے گئی اور میں اندھیرے کا سہارا لے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب مجھے یقین ہو چکا تھا کہ ملک غلام سرور مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ چنانچہ میں گاؤں سے فرار ہو گیا۔ یہ پستول

میرے دوست نظام الدین کا ہے جو اس نے مجھے اب وقت دیا جب مجھ پر کاہاڑیوں سے حملہ کیا گیا تھا۔ بس یہ ہے میری داستان اگر کل میں بے ہوش نہ ہو جاتا تو خود ہی تمہیں سب کچھ بتا دیتا۔"

"افوہ میں نے تمہیں کتنا غلط سمجھا بیٹے" بابا کریم بخش نے متاسف لہجے میں کہا۔ وہ ایک بار پھر مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب کر رہا تھا "میں نے تمہیں ظالم سمجھا جبکہ تم تو مظلوم ہو۔ میں تم سے معافی طلب کرتا ہوں' میں نے تم سے اچھا سلوک نہیں کیا۔"

"معافی تلافی کی کوئی ضرورت نہیں ہے بابا مجھے خوشی ہے کہ تمہاری غلط فہمی دور ہو گئی۔"

"بس اب اس گھر کو تم اپنا ہی گھر سمجھو۔ جب تک تم پوری طرح صحت یاب نہیں ہو جاتے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ جب تک میری مرضی ہو گی تمہیں میرے پاس رہنا ہو گا۔ جو روکھی سوکھی ہم کھاتے ہیں تم بھی کھا لینا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ایک بہت بڑے گناہ سے بچ گیا۔ اس بڑھاپے میں ایک مہمان کی دل آزاری کا گناہ تو مجھے قبر میں بھی چین نہیں لینے دیتا۔"

"جیسی تمہاری مرضی کریم بابا" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ وہ سادہ لوح شخص باآسانی میری باتوں میں آ گیا۔ دراصل ہر سیدھا سادھا شریف آدمی دوسرے شخص کے متعلق حسن ظن رکھتا ہے۔ وہ اسے اس وقت تک شریف سمجھتا رہتا ہے جب تک اس کی بدمعاشی پوری طرح ثابت نہیں ہو جاتی۔ اس کے بعد بھی اسے مدتوں تک قلق رہتا ہے کہ وہ شخص بدمعاش کیوں نکلا۔ اگر کوئی شخص غیر متوقع طور پر بدمعاش کے بجائے شریف نکل آئے تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ اس کی شرافت کی دریافت کو وہ ہمیشہ اپنا کارنامہ سمجھتا رہتا ہے۔ چنانچہ بابا کریم بخش یہ جان کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا کہ میں کوئی چور ڈاکو نہیں بلکہ ایک شریف آدمی ہوں۔

بابا کریم بخش کمرے سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا۔ یک لخت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ خستہ حال کمرا نور کی کرنوں سے جگمگا اٹھا ہو۔ اس کے ساتھ ایک نازک سی' کومل سی نوجوان لڑکی تھی۔ اس کی رنگت گلابی مائل سفید تھی۔ حجاب کے بوجھ سے جھکی ہوئی آنکھوں میں ستارے چمک رہے تھے۔ اس کے جسم پر سادہ سا دیہاتی لباس تھا لیکن اس کے متناسب جسم پر وہ لباس سج گیا تھا۔ گلابی ترشے ہوئے ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ میں مبہوت سا ہو کر اسے تکنے لگا۔ اس کی من موہنی صورت مجھے اپنے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ بعض لوگوں میں کچھ ایسی کشش ہوتی ہے کہ وہ جسے چاہیں اپنا اسیر بنا لیتے ہیں۔ ان کا معمول اگر چاہے بھی تو خود کو ان کے سحر سے نہیں بچا سکتا۔ وہ آیا' اس نے دیکھا' اس نے تسخیر کر لیا۔ ان کی واردات کا بس اتنا ہی فسانہ ہوا کرتا ہے۔ جس افسانے کی تکمیل کے لیے دیگر لوگ اپنے خون جگر کا آخری قطرہ' اپنی عمر رائیگاں کا آخری لمحہ تک صرف کر گزرتے ہیں لیکن پھر بھی ناکام رہتے ہیں' وہ افسانہ ان کی ترچھی نظر کے ہلکے سے اشارے سے تکمیل پا جاتا ہے۔ وہ تو ایسی تھی کہ اس کی آرزو میں تمام عمر گزاری جا سکتی تھی۔

تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے

"یہ میری بیٹی ہیر ہے۔ میں اسے ہرنی کہتا ہوں" کریم بابا نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ میں گویا کسی سہانے سپنے سے چونک پڑا۔ ہیر کیا وہ ہیرا تھی۔ مجھے رانجھا یاد آ گیا۔

میں نے چاہا کہ کچھ کہوں۔ اپنے تاثرات کا اظہار کروں لیکن میرے الفاظ مجھ سے بے وفائی کر گئے۔ کوئی

بھی تو اس وقت میرے کام نہ آیا۔ مجبوراً میں محض اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔ کریم بابا نے اپنی بات آگے بڑھائی "بہت چھوٹا سا کنبہ ہے میرا۔ میں' میری بیٹی ہرنی' میر الدھوا اور بس۔"

"میری بھورو کو کیوں بھول جاتے ہو بابا" ہیر نے شرمیلے لہجے میں کہا۔

"اوہو۔ معاف کرنا مجھے خیال نہیں رہا۔ ہاں بھئی بیٹا غلام سعید' اس کے علاوہ بھورو ہے۔ ہیر نے اسے بچپن سے پالا ہے۔ اب تو ماشاء اللہ اس کا بچھڑا بھی خاصا بڑا ہو گیا ہے۔ چند مہینے بعد وہ دوسرا بچہ دے گی۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ وہ دونوں باپ بیٹی اتنے لاڈ سے اپنے بیل اور گائے کا ذکر کر رہے تھے کہ گویا وہ کھائی نٹ کھٹ سے' چہیتے اور منہ چڑھے بچے ہوں۔ وہ دونوں ہی بہت سادہ لوح تھے۔ مجھے ہنستا دیکھ کر کریم بابا بھی بے اختیار مسکرانے لگا۔ عین اسی وقت ہیر بھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی شاہی رقاصہ کی پازیب سے ٹوٹ کر بے شمار نقرئی گھنگھرو پختہ فرش پر گر پڑے ہیں۔

فرش ے خانہ پہ جلتے چلے جاتے ہیں چراغ

میں مسحور سا ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔ بے ساختہ ہنسی کے دوران میں اس کا شہابی چہرہ گلاب گوں ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ننھے ننھے موتی چمکنے لگے۔ ہیر نے اپنے چہرے پر میری نظروں کی تپش محسوس کر لی تھی لہٰذا وہ شرما کر خاموش ہو گئی۔ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں ہمیشہ سے اسے جانتا ہوں جیسے ہم پہلے بھی کبھی ایک دوسرے کے قریب رہ چکے ہیں۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر اسی طرح کھلکھلا کر ہنسے تاکہ میرے کانوں میں ایک بار پھر شہد ٹپکنے لگے لیکن میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اس کے پاس ہنسی کا جو شیریں خزانہ موجود تھا اس کی قدر و قیمت سے وہ پوری طرح واقف تھی۔ چنانچہ وہ اسے جا و بے جا نہیں لٹاتی تھی "اچھا اب تم آرام کرو" کریم بابا نے میرے سندر سپنے کا تسلسل توڑ دیا "ابھی تم پوری طرح تندرست نہیں ہوئے ہو۔ میں کل صبح ایک بار پھر حکیم صاحب کے پاس جاؤں گا اور تمہاری تازہ کیفیت بتاؤں گا۔"

"ارے نہیں بابا اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ بس تھوڑی سی کمزوری ہے جو خود بخود دور ہو جائے گی" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا بھئی جیسی تمہاری مرضی۔ چلو بیٹی' مہمان کو آرام کرنے دو۔"

کریم بابا چلا گیا' ہیر چلی گئی۔ چند لمحوں کے لیے میرے دل کے اجڑے چمن میں آنے والی بہار چلی گئی۔ پھر وہی اندھیری نامرادرات تھی اور میں تھا۔ سوئے ہوئے زخم ایک بار پھر جاگ اٹھے۔ فقیر بابا کا خیال آیا تو دل کا اضطراب بڑھ گیا۔ اس ضعیف شخص نے میری خاطر کیا کیا صعوبتیں نہیں اٹھائیں۔ میری اک ذرا سی خواہش کی خاطر اس نے اپنی جان تک خطرے میں ڈالنے سے گریز نہیں کیا۔ میں چاہتا بھی تو اس کے احسانات نہ اتار پاتا۔ جانے وہ اس وقت کس حال میں ہو گا۔ جب کہ میں یہاں اس آرام دہ بستر پر لیٹا خاطر مدارت سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ یہ درست سہی کہ مجھے اس کا پتا نہیں معلوم لیکن اگر میں وہیں برکت علی کی حویلی کے آس پاس ہی موجود رہتا تو شاید کسی نہ کسی طرح اس کا اتا پتا مل جاتا لیکن میں وہاں سے اپنی خوشی سے تو دور نہیں ہوا۔ اگر میں دوبارہ اس حویلی میں جا پھنستا تو پھر کون سا فقیر بابا آزاد ہو جاتا۔ اگر زندگی باقی رہتی تو میں ایک بار پھر وہاں

پہنچ جاتا۔ میں نے کوئی ہمیشہ کے لیے تو فقیر بابا کو فراموش نہیں کر دیا۔ مجھے تو بس ذرا سا دم لینے کی مہلت درکار ہے نہ تو میرے حوصلے پست ہوئے ہیں اور نہ ہی میری رگوں میں خون سرد ہوا ہے۔ اگر اس حویلی کے نصیب میں میرے ہاتھوں ہی اجڑنا لکھا ہے تو میں اس نیک کام کو جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ پھر مجھے مہراں یاد آئی۔ مجھے ہلکا سا احساس جرم محسوس ہوا۔ میں نے مہراں کو اپنے دل کی دنیا کا بلا شرکت غیرے مالک بنا رکھا ہے لیکن اب وہی دل ہیر کے لیے بھی دھڑکنا شروع ہو گیا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ جب میں مہراں کے متعلق سوچ رہا تھا تو وہ مجھے ہمیشہ کی طرح اپنے دل کے بے حد قریب محسوس ہو رہی تھی۔ اب سے کچھ دیر پہلے میرے ہوش وحواس پر ہیر چھائی ہوئی تھی تو اب میرے دل ودماغ پر مکمل طور پر مہراں کی یادوں کا قبضہ تھا اگر یہ کسی قسم کا ہرجائی پن تھا میں اس کے لیے خود کو قطعاً بے قصور سمجھنے پر مجبور تھا۔ اگر تو میں نے مہراں سے شعوری طور پر محبت کی تھی تو ہیر لاشعوری طور پر میرے احساسات پر چھا گئی تھی۔ اگر میں جان بوجھ کر اس کے لیے اپنے دل کے بند دروازے کھولتا تو تب مجھے قصوروار ٹھہرایا جا سکتا لیکن اس نے تو میرے دل کے بند دروازے پر دستک دینے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔ جانے کس طرح وہ زبردستی' دروازے بند ہونے کے باوجود بن بلائی مہمان بن کر میرے دل میں گھس آئی۔

سوتے وقت مجھ پر بے حد خوب صورت' نرم ونازک احساسات کا غلبہ تھا لیکن نیند کی آغوش میں میرے لیے بے حد اذیت ناک عذاب پوشیدہ تھا۔ اس رات ایک بار پھر اسی وحشت ناک خواب نے میری نیند برباد کر کے رکھ دی۔ اس منحوس شخص کے مکروہ قہقہے میرے اعصاب پر کوڑے بن کر برس پڑے۔ اس نامعلوم عورت کی دردناک چیخوں نے میرا دل دہلا کر رکھ دیا۔ اس خون آلود آئینے اور اس چمک دار خنجر نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے۔

حسب معمول میں ایک جھٹکے سے بیدار ہو گیا۔ میرا جسم پسینے میں شرابور تھا اور میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے بعد میں ساری رات نہیں سو سکا۔ اس خنجر کو دیکھ کر مجھے اپنا وہ خنجر یاد آ گیا جو میں نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ میں نے عہد کیا تھا کہ میں اپنے اس خنجر کو اپنی بدبخت ماں اور اس کے شیطان فطرت آشنا کے خون سے سیراب کروں گا۔ لیکن میرا وہ عہد دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ حادثات کے تھپڑے مجھے ٹکنے ہی نہیں دے رہے تھے کہ میں ان دونوں کی تلاش شروع کر سکتا۔ اب تو وہ میرا محبوب خنجر بھی مجھ سے چھن گیا۔ جانے اب وہ کس سے وفاداری نبھا رہا ہوگا۔ ویسے مجھے اس خوب صورت کولٹس پستول کی بھی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ بلوچستان کا آزاد قبائلی علاقہ قریب ہونے کی وجہ سے مختلف قسم کا اسلحہ ہم لوگوں کے لیے اجنبی نہیں ہوتا چنانچہ اکثر نوجوان پستول اور رائفل وغیرہ کے استعمال سے واقف ہوتے ہیں۔ اگرچہ میرے پاس اپنا پستول نہیں تھا تاہم میں کتنی ہی بار پستول چلا چکا تھا لیکن وہ پستول اور ریوالور زیادہ تر دیسی ہوتے تھے۔ ان کے مقابلے میں کولٹس پستول ولایتی اور بے حد قیمتی تھا۔ اس میں جو نفاست اور روانی تھی وہ دیسی گنوں میں مفقود تھی۔

صبح کے وقت مجھے ناشتا دینے کے بعد کریم بابا اپنے کام پر روانہ ہو گیا۔ اس نے مجھے اپنی ایک قمیص اور ایک چادر دے دی۔ میرے کپڑے بہت میلے ہو رہے تھے۔ ہیر نے کہا کہ وہ انہیں دھو دے گی۔ دوپہر کے وقت میں صحن میں نکل آیا۔ میرا ارادہ تھا کہ تھوڑی سی چہل قدمی کر کے اپنی جسمانی حالت جانچنے کی کوشش کروں گا۔

ہیر اس وقت چولہے کے سامنے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ فوراً اٹھ کر آ گئی۔

''ارے تم کیوں اٹھ کر باہر آ گئے؟ تمہیں تو ابھی آرام کرنا چاہیے۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں ہیر۔ پتا نہیں کریم بابا نے تمہیں میرا نام بتایا یا نہیں' بہرحال میرا نام……''

''غلام سعید خان ہے۔ ہے نا؟'' ہیر نے خوشی سے کہا اور پھر وہ بے ساختہ ہنستی چلی گئی۔ میرے منتظر کانوں میں ایک بار پھر جلترنگ سی بج اٹھی۔ میں مبہوت سا ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگا۔ وہ چولہے کے سامنے سے اٹھ کر آئی تھی اس لیے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کے اوپری لبوں پر چمکتے ہوئے پسینے کے قطروں نے اس کی دلکشی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ میری وارفتگی دیکھ کر وہ شرما کر خاموش ہو گئی لیکن پھر اس کی نظر میرے جسم پر پڑی تو وہ ایک بار پھر ہنسنے لگی۔

''تم کیوں ہنس رہی ہو؟'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہارا یہ لباس۔ بابا کی یہ قمیص تمہارے جسم پر تنگ ہے اور اونچی بھی۔ دھوتی تو بالکل ہی گھٹنوں تک آ رہی ہے'' اس نے بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا ''میں نے تمہارے کپڑے دھو دیے ہیں۔ ابھی کچھ دیر میں وہ خشک ہو جائیں گے۔ میں تمہاری شلوار کے پائنچے میں ٹانکا بھر دوں گی' پھر تم انہیں پہن لینا۔''

ہیر نے اپنی لاڈلی گائے بھورو سے میرا تعارف کرایا۔ ہالینڈ کراس بریڈ کی وہ گائے اچھی خاصی دودھیل معلوم ہوتی تھی۔ ''تمہاری گائے تو ماشاءاللہ بہت اچھی ہے۔ دودھ بھی ٹھیک ٹھاک دیتی ہوگی۔''

''یہ گیابھن ہے اس لیے اب اس کا دودھ کچھ کم ہو گیا ہے۔ ورنہ پہلے تو یہ بڑا بالٹا بھر کر دیتی تھی۔ پورے گاؤں میں اس کے برابر کی کوئی گائے نہیں ہے'' اچانک ہیر کے چہرے کی چمک پھیکی پڑ گئی اور اس کا چہرہ بجھ سا گیا ''لیکن کمال الدین خان کہتا ہے کہ یہ گائے مجھے دے دو۔''

''یہ کمال الدین خان کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا بابا جس بھٹے سے اینٹیں اٹھاتا ہے' کمال الدین خان اس کا مالک ہے۔ اس کے اس بھٹے کے علاوہ تین اور بھٹے بھی ہیں۔ وہ بہت مال دار آدمی ہے۔''

''تو تم لوگ منع کر دو نا کہ تم اپنی گائے نہیں بیچنا چاہتے۔''

''یہی تو مشکل ہے'' ہیر نے اداس لہجے میں کہا ''ہم لوگ انکار نہیں کر سکتے۔ بابا کمال الدین خان سے کچھ رقم قرض لے رکھی ہے۔ اگر جلد ہی ہم نے وہ رقم نہ لوٹائی تو کمال الدین خان یہ گائے لے جائے گا۔''

''یہ تو بہت زیادتی کی بات ہے مگر کریم بابا نے یہ قرضہ لیا ہی کیوں؟''

''ایک مجبوری آن پڑی تھی۔ اچھا تم چھوڑو' ان باتوں کو اور جا کر آرام کرو۔ ابھی تمہیں کافی آرام کی ضرورت ہے۔''

''ہیر نے جس اداسی سے اپنی گائے کے متعلق بتایا' اس سے میں خود بھی اداس ہو گیا۔ مجھے کمال الدین خان پر غصہ آنے لگا جس نے ہیر کی گائے پر آنکھ رکھی ہوئی تھی۔ میرے پاس تو ایک پیسا بھی نہیں تھا۔ اگر میرے پاس رقم ہوتی تو میں اسے اس کمینے کے منہ پر دے مارتا۔

دوپہر کے کھانے میں ہیر نے توری پکائی۔ روٹیاں اس نے گھی میں تر بتر کر دیں۔ ساتھ ہی کٹورا بھر کر مکھن

اور رکھ دیا۔ میں نے جانے کتنے عرصے کے بعد گھر کی روٹی دیکھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ خدا نے میرے کسی نیک عمل سے خوش ہو کر میرے لیے آسمان سے من وسلوی نازل کیا ہے۔ میں نے صبر کرنے کی حتی الامکان کوشش کی لیکن پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا۔ پہلی دو روٹیاں تو چند ہی لقموں میں' میرے حلق سے نیچے اتر گئیں۔ میں نے ہیر کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھی تو خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ وہ بے چاری بھلا میری کیفیت کا کیا اندازہ لگا پاتی۔

شام کو کریم بابا' کام پر سے لوٹا تو بہت خوش نظر آیا۔ رات کا کھانا ہم دونوں نے اکٹھے کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ اپنا حقہ لے کر بیٹھ گیا۔ ''لو بھئی بیٹا غلام سعید ایک مسئلہ تو حل ہو گیا'' کریم بابا نے مسرور لہجے میں کہا۔

''کون سا مسئلہ بابا؟'' میں نے پوچھا۔ ''میں نے آج کمال الدین خان سے تمہاری نوکری کی بات کی ہے۔ اس نے تمہیں اپنے بھٹے پر ملازمت دے دی ہے۔''

''کیسی ملازمت بابا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''بس حساب کتاب کا کام ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ تم میرے بھانجے ہو اور تم نے دسویں پاس کر رکھی ہے۔ اس کے پاس منشی کی جگہ خالی ہے۔ اس جگہ پر اس نے تمہیں رکھنے کی حامی بھر لی ہے'' کریم بابا نے پر جوش لہجے میں کہا۔

''لیکن بابا مجھے تو ملازمت نہیں کرنی۔ مجھے تو واپس جانا ہے'' میں نے قدرے پریشانی کے عالم میں کہا۔

''کیوں کیا ہوا تمہیں؟ ملازمت نہیں کرو گے تو کیا کرو گے؟ اور ابھی سے واپس جا کر کیا کرنا ہے؟ سال چھ مہینے یہاں کام کرو اس کے بعد کہیں آنے جانے کی کوشش کرنا۔ کمال الدین خان تمہیں آٹھ سو روپے مہینا دے گا۔ کپڑا لتا الگ۔ میری مانو تو یہ ملازمت کر ہی لو۔ کم از کم معمولی محنت مزدوری سے تو بہتر ہی ہے۔''

اب میں اسے کیا سمجھاتا کہ یہ نوکری وغیرہ میرے بس کا کام نہیں ہے۔ میرے تو پاؤں میں چکر ہے جو مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ میں نے تو اپنے پیچھے ایسے دشمن لگا لیے تھے جو مجھے مرنے کے بعد قبر میں بھی چین نہ لینے دیتے' پھر مجھے کسی کو تلاش بھی تو کرنا تھا۔ ادھر وہ نصیبوں ماری مہراں اور میرا معزور چچا میرے انتظار میں ایک ایک پل کانٹوں پر گزار رہے ہوں گے۔ پھر وہ میرا بدنصیب دوست سرور علی جو دوستی کے نام پر آنکھیں گنوا کر اپنی دنیا اندھیر کر بیٹھا تھا۔ اس کی تو کئی جوان بہنیں تھیں جن کا وہ واحد کفیل تھا۔ میں نے رتا سائیں کی حالت بگاڑ کر اپنا انتقام تو پورا کر لیا لیکن ان تیرہ بخت لڑکیوں کے لیے روٹیوں کا انتظام کیسے کرتا؟ ادھر وہ بدنصیب رتا سائیں صبح شام میری جان کو روتا ہو گا۔ اسے تو میں نے کسی قابل نہیں چھوڑا۔ جانے رتا سائیں کے باپ سردار شاہ مراد کی کیا حالت ہو گی؟ میں نے اسے ایسی زک پہنچائی تھی کہ وہ کانٹوں پر لوٹ رہا ہو گا۔ اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا لیکن میری گرد کو بھی نہ پا سکا۔ رتا سائیں کا جو حشر ہوا سو ہوا۔ اس کے علاوہ بھی اس کے کتنے بہت سے کارندے میرے ہاتھوں جہنم رسید ہوئے یا بے کار ہو گئے۔ اگر میں اس کے ہاتھوں آ جاتا تو وہ تو مجھے کچا ہی چبا جاتا۔

ظاہر ہے کہ کسی بھٹے کے منشی کی ملازمت' میرے بس کی بات نہیں تھی لیکن مجھے کم از کم عارضی طور پر پناہ اور آرام کی ضرورت تھی۔ ویسے بھی میں کریم بابا کی کچھ نہ کچھ مالی مدد کرنا چاہتا تھا' چنانچہ میں نے ملازمت کی حامی

بھر لی۔

اگلے دن میں نے کام شروع کر دیا۔ اینٹوں کا بھٹا میرے لیے بالکل ہی اجنبی جگہ نہیں تھی۔ ہمارے گاؤں سے کچھ فاصلے پر ایک بڑا بھٹا موجود تھا۔ وہ بھٹا اندر باہر سے میرا اچھی طرح دیکھا بھالا تھا۔

اینٹوں کے بھٹے پر میرا کام بہت زیادہ پیچیدہ ثابت نہیں ہوا۔ صبح صبح اینٹوں سے بھری ہوئی بیل گاڑیاں یا گدھا گاڑیاں شہر کی جانب روانہ ہوتیں۔ میں ہر گاڑی والے کو اینٹوں کے بل کی پرچی دیتا۔ آرڈر دینے والے اکثر آدھی رقم ایڈوانس پہنچا دیا کرتے تھے۔ شام کو رقم کی وصولی کے بعد میں تمام حساب کرتا۔ رات کے نو دس بجے کمال الدین خان کا منشی آتا تو میں اسے حساب کتاب سمجھا کر تمام رقم اس کے حوالے کر دیتا۔

کام شروع کرنے کے تقریباً ایک ہفتے کے بعد میری کمال الدین سے ملاقات ہوئی۔ اس روز میں حساب کتاب مکمل کر کے ذرا جلدی فارغ ہو گیا۔ وہ جمعرات کا دن تھا۔ اگلے روز جمعہ کو چھٹی تھی۔ میں پچھلے ایک ہفتے کے دوران میں ایک بار بھی بابا کریم بخش کے گھر نہیں جا سکا۔ منشی کو حساب کتاب دیتے دیتے اتنی دیر ہو جاتی کہ میرے پاس گاؤں جانے کا وقت ہی نہ بچ پاتا۔ بھٹے کے اصولوں کے مطابق ضروری تھا کہ میں رات بھٹے پر ہی گزارتا۔ اس روز میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ حساب کتاب دینے کے بعد بابا کریم بخش کے گھر جاؤں گا۔ تقریباً آٹھ بجے منشی الفت خان آ گیا۔ اس روز وہ تنہا نہیں آیا بلکہ بھٹے کا مالک کمال الدین خان بھی اس کے ہمراہ تھا۔ کمال الدین خان تقریباً ساٹھ سال عمر کا موٹا تازہ مگر پلپلا سا آدمی تھا۔ اس نے بڑی بڑی مونچھیں پال رکھی تھیں جنہیں وہ ہر وقت خضاب سے رنگے رکھتا۔ جب وہ بولتا تو اس کے گلے میں بار بار بلغم اٹکتا اور وہ بار بار کھنکارتا' تھوکتا رہتا۔ اس نے اپنی سوجی سوجی آنکھوں سے مجھے گھورا۔

''ہوں۔ تو تم ہو کریم بخش کے بھانجے!''

''ہاں۔ میرا نام غلام سعید خان ہے'' میں نے جواب دیا۔

''ہاتھ پیر کے تو ٹھیک ہی ہو۔ کریم بخش نے بتایا ہے کہ تم تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا بھی جانتے ہو۔ اس کے علاوہ کچھ اور ہاتھ پیر بھی چلا لیتے ہو یا نہیں؟''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا خان صاحب'' میں نے کہا۔

''ارے بھئی نوجوان آدمی ہو' گرم خون ہے' کچھ مار کٹائی کا بھی تجربہ ہے یا نہیں؟''

''لڑائی مار کٹائی سے تو میں ذرا بچ کر ہی رہتا ہوں۔ ویسے زیادتی میں کسی کی برداشت نہیں کرتا'' میں نے کہا۔

''شاباش۔ بندے کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ شرافت اپنی جگہ' مردانگی اپنی جگہ۔ وہ مرد ہی کیا ہے جسے کوئی جو جی چاہے سنا دے اور وہ کان دبا کر سن لے۔ ویسے اگر ملازم اپنے مالک کی دو بات سن لے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ یہ تو نمک حلالی کی نشانی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں خان صاحب'' میں نے دھیرے دھیرے سے جواب دیا۔ اس کی بک بک سے مجھے بے زاری سی ہو رہی تھی۔ ''اور یہ داڑھی کیوں بڑھا رکھی ہے جوان؟ کیا کوئی عشق معشوقی کا چکر ہے؟'' اس کے چہرے پر مکروہ ہنسی تھی۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے خان صاحب'' میں نے قدرے جھینپتے ہوئے کہا ''بس ایسے ہی۔''

''جوان آدمی ہو' جوان آدمیوں کی طرح رہا کرو۔ تمہارا یہ جوڑا بھی بہت ہی خستہ ہو رہا ہے۔ گل زمان خان کل تمہیں دو جوڑے لا دے گا۔ میں اپنے کارندوں کو اچھی حالت میں دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ پرسوں شام کو اپنے حساب کتاب کے ساتھ حویلی ہی آجانا۔ میں تمہیں اپنے کچھ خاص آدمیوں سے ملواؤں گا۔''

''جیسی آپ کی مرضی خان صاحب۔''

خدا خدا کر کے وہ خبیث دفع ہوا۔ مجھے پہلی ہی نظر میں وہ بہت برا لگا۔ اس عمر میں بھی وہ جوانوں کے چال چلن چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے دو گھوڑا بوسکی کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ کلائی میں راڈو ڈایا اسٹار چمک دکھا رہی تھی۔ انگلیاں اس نے موٹے موٹے نگینوں والی طلائی انگوٹھیوں سے بھر رکھی تھیں۔ فرمائش اس کی یہ تھی کہ میں بھی جوانوں کی طرح ذرا بن سنور کر رہا کروں۔ ایک بار تو جی میں آئی' اسے کہوں کہ جب دولت کی اندھی دیوی تیری طرح مجھ پر بھی مہربان ہوگی تو شاید میری کھوپڑی بھی الٹی ہو جائے۔ فی الحال تو مجھے میری اوقات میں رہنے دو تو زیادہ بہتر ہے۔ یہ دولت بھی عظیم ستم ظریف شے ہے۔ نوجوانی کے دنوں میں جب اس کی شدید طلب محسوس ہوتی ہے تو اس کا دور دور تک نشان نہیں ملتا' اور زندگی کی شام ڈھلے جب امنگیں اور ولولے دم توڑ رہے ہوتے ہیں تو یہ قدموں میں بکھر بکھر جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جب ہم ننھے بچے ہوتے ہیں تو طرح طرح کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے جی للچاتا ہے لیکن ہماری جیب خالی ہوتی ہے اور جب ہم بڑے ہو جاتے ہیں اور ہمارے پاس اپنی کمائی ہوئی رقم ہوتی ہے تو بچپن میں بے حد پرکشش نظر آنے والی چیزیں ہماری نظر میں اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہیں۔

مجھے بابا کریم بخش کے گھر پہنچتے پہنچتے اچھی خاصی دیر ہوگئی۔ دیہاتوں میں تو ویسے بھی رات اور لڑکی پر جلد جوبن آجاتا ہے۔ چنانچہ جب میں بابا کریم بخش کے دروازے پر پہنچا تو پورا گاؤں تاریکی کے غلاف میں لپٹا نظر آیا۔ بابا کریم بخش کے گھر میں بھی روشنی کی کوئی جھلک نظر نہ آئی۔ میں نے سوچا کہ واپس لوٹ جاؤں پھر میں نے اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا۔ کریم بابا نے شام کو بے حد اصرار کیا تھا کہ میں آج ضرور گھر آؤں۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں آج رات ضرور آؤں گا۔ تمام راستے مجھے یہ خیال رہا کہ ہیر میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ اب جبکہ میں پہنچ ہی گیا تو یہاں سے واپس لوٹنا قطعاً مناسب نہیں ہے۔

میں نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ چند ہی لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ سامنے کریم بابا مسکراتا نظر آیا ''تم آ گئے بیٹا؟ بہت دیر کر دی۔''

''ہاں بابا بھٹے پر کمال الدین خان آ گیا تھا۔ اسی لیے دیر ہوگئی۔''

''اچھا وہ تمہیں مل گیا؟ کیا کہتا تھا؟'' کریم بابا نے دروازے پر سے ہٹتے ہوئے کہا۔ سامنے ہی ہیر کھڑی ہولے ہولے مسکراتی نظر آئی۔ میری آنکھوں میں روشنی سی اترنے لگی۔ مجھے یاد ہی نہ رہا کہ کریم بابا کیا ت کر رہا ہے۔

''کیا کہتا تھا کمال الدین خان؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔ بس ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں البتہ پرسوں مجھے اپنی حویلی بلوایا ہے۔''

''اچھا! چلو یہ بھی اچھا ہی ہے۔ تم اس کے دیگر کارندوں سے بھی مل لو گے۔''

''چار پانچ کارندے تو اب بھی اس کے ساتھ تھے۔ سب کے سب پوری طرح مسلح تھے'' میں نے اسے بتایا۔

''ہاں اتنے تو اس کے ساتھ رہتے ہی ہیں۔ پندرہ بیش کے قریب ہر وقت حویلی میں موجود رہتے ہیں۔''

''اتنے بہت سے لوگوں کا وہ کیا کرتا ہے؟'' میں کریم بابا سے بات کر رہا تھا لیکن میری نظر بار بار ہیر کی جانب اٹھ جاتی۔

وہ شرمائی شرمائی سی بیٹھی تھی۔ بالآخر وہ بول ہی پڑی۔ ''تم دونوں ہاتھ منہ دھو لو۔ میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔''

''ارے تم لوگوں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا؟'' میں نے پوچھا۔

''کہاں بھئی۔ ہم دونوں شام سے تمہاری راہ تک رہے ہیں۔ ہیر نے تمہارے لیے آلو قیمہ بھونا ہے۔ کھیر بھی پکائی ہے۔ کھانے کی خوشبو سونگھ کر تو میرا تو برا حال ہو گیا ہے۔''

ہیر کے ہاتھ میں واقعی بڑی لذت تھی۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ لاجواب کھانا کسی ان پڑھ دیہاتی لڑکی نے اپلوں والے مٹی کے چولہے پر پکایا ہے۔ شاید یہ لذت اس کے بے پایاں خلوص کی مرہون منت تھی۔

''کمال الدین چار بھٹوں کا مالک ہونے کے علاوہ ایک بڑا زمیں دار بھی ہے۔ مقدمے بازی کا شوق اس نے الگ پال رکھا ہے۔ اسی حساب سے دشمنیاں بھی بے حساب ہیں۔ اس قسم کا بندہ اگر درجنوں کے حساب سے کارندے نہ رکھے تو کیا کرے؟''

اس رات میں اور بابا کریم بخش دیر تک باتیں کرتے رہے۔ وہ مجھے کمال الدین خان کے متعلق مزید باتیں بتاتا رہا۔ پتا ہی نہیں چلا کہ کب ہم دونوں نیند کی آغوش میں کھو گئے۔

اگلی دن کی صبح بڑی خوب صورت تھی' یا پھر شاید مجھے ہی ایسا محسوس ہوا۔ بھلا ہیر کی قربت میں بھی کوئی چیز ناخوشگوار ہو سکتی تھی۔ صبح کا ناشتا اصلی گھی میں تر مراتے پراٹھوں اور تلے ہوئے انڈوں پر مشتمل تھا۔ ناشتے کے بعد بابا کریم بخش کسی کام سے باہر چلا گیا۔ ہیر ابھی تک چولہے کے سامنے مصروف تھی۔ میں اس کے پاس پڑی ہوئی ایک پیڑھی پر جا بیٹھا۔ وہ چکنی مٹی سے چولہا پوت رہی تھی۔ مجھے اپنے پاس بیٹھا دیکھ کر اس کے چہرے پر قوس وقزح کے رنگ بکھر گئے۔

''تمہاری بھورو کا کیا حال ہے؟'' میں نے قدرے شوخی کے ساتھ سوال کیا۔

''وہ سامنے تو کھڑی ہے۔ خود ہی پوچھ لو'' اس نے بھی شوخ لہجہ اختیار کیا۔

''مجھے اس کی زبان نہیں آتی نا۔ تم تو اس کی زبان سمجھتی ہو' تم اس سے پوچھ کر مجھے بتا دو۔''

''ہاں مجھے اس کی زبان آتی ہے۔ کہو تو بات کر کے دکھاؤں؟''

''ہاں ہاں ضرور۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''اچھا ابھی لو۔ بھورو۔ بھورو۔۔۔ تمہیں پیاس لگی ہے کیا؟''

یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس بے زبان جانور نے فوراً ہی اپنے منہ سے ''بھاں۔ ں۔ ں

۔ں۔'' کی آواز نکالی اور اپنی گردن زور سے ہلا دی۔ اس کی گردن میں پڑی ہوئی گھنٹی کی آواز کچے صحن میں بکھر گئی۔ عین اس وقت فضا میں جلترنگ سی بج اٹھی۔ میرے استعجاب کو دیکھ کر ہیر بے اختیار ہنس پڑی تھی۔

تب میری سمجھ میں ساری بات آگئی۔ ہیر نے اپنی گائے سے جس زبان میں بات کی' وہ محبت کی زبان تھی۔ یہ زبان انسان اور جانور تو کیا پودے بھی سمجھتے ہیں۔ اسی عالم گیر زبان کی وجہ سے تو تمام دنیا کا کاروبار جاری و ساری ہے۔ جس دن اس دنیا سے محبت کے پاکیزہ جذبے کا خاتمہ ہوا' اسی دن یہ دنیا نیست و نابود ہو جائے گی۔

''ارے یہ زبان تو مجھے بھی آتی ہے'' میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ ''کہو تو ابھی بول کر دکھاؤں؟''

ہیر نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''بھورو'' میں نے اپنے لہجے میں پیار کی چاشنی سموتے ہوئے کہا'' بھورو مجھے جانتی ہو نا میں کون ہوں؟''

گائے نے ایک بار پھر اپنے حلق سے ''بھاں۔ں۔ں'' کی آواز نکالی اور اپنی گردن ہلا دی۔ اس بار فضا میں بیک وقت دو گھنٹیوں کی جھنکار ابھری۔ ان میں سے ایک آواز تو فوراً ہی ختم ہو گئی لیکن دوسری' زیادہ سریلی' زیادہ رسیلی آواز دیر تک فضا میں شہد گھولتی رہی۔ میں چند لمحوں کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر خوابوں کے جزیرے میں جا پہنچا۔ جہاں ہر طرف بہاراں رقصاں تھی۔ ٹھنڈے میٹھے چشمے تھے۔ گنگناتے جھرنے تھے۔ میں تھا ہیر تھی اور............

''تمہیں آج تو بھٹے پر نہیں جانا ہو گا؟'' ہیر نے میرا سندر سپنا توڑ دیا۔

''نہیں دن میں تو نہیں جانا'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''البتہ رات کو جانا ہو گا۔ بھٹے پر بہت سویرے کام شروع ہو جاتا ہے۔ اس وقت میرا وہاں ہونا بہت ضروری ہے۔''

''بہت سی لڑکیاں بھی ہوتی ہیں بھٹے پر؟'' اس کے لہجے میں ہلکے سے حسد کا تاثر تھا۔

''انہیں لڑکیاں کہنا ذرا عجیب سا لگتا ہے'' میں نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا'' وہ تو مزدور عورتیں ہیں' بے چاری' خاک دھول اور راکھ میں اٹی ہوئی جفاکش عورتیں۔ انہیں تو شاید خود بھی یاد نہیں ہو گا کہ وہ صنف نازک سے تعلق رکھتی ہیں۔ چند روپوں کی خاطر' دھوپ میں جلتے' پسینا بہاتے' انہیں بس یہی فکر لگی رہتی ہے کہ اگر انہوں نے زیادہ سے زیادہ کام نہیں کیا تو ان کے گھر میں بھوک کا عفریت ڈیرے ڈال لے گا۔''

''ارے......تم تو خواہ مخواہ اتنے جذباتی ہو گئے۔ میں نے تو اس لیے پوچھ لیا کہ میری جاننے والی کئی لڑکیاں بھٹے پر کام کرتی ہیں۔ وہ مجھے وہاں کے قصے سنایا کرتی ہیں۔ تم سے پہلے جو منشی تھا وہ بڑی گھٹیا فطرت کا مالک تھا۔ اس نے بہت سی لڑکیوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں خراب کیا تھا۔ اس کی انہیں کمینی حرکتوں کی وجہ سے کئی لڑکیوں کو کام چھوڑنا پڑا۔''

''مجھ سے پہلے والے منشی کا کیا بنا؟''

''بننا کیا تھا۔ ایک دن اس نے کسی مزدور لڑکی کے ساتھ کوئی غلیظ مذاق کیا۔ اس لڑکی کا بھائی وہیں قریب ہی اینٹیں ڈھو رہا تھا۔ اس بدنصیب کی مفلسی کے نیچے دبی ہوئی غیرت جاگ اٹھی۔ اس نے ایک اینٹ اٹھائی اور منشی کے سر پر دے ماری' وہ منحوس دھان پان سا تو تھا ہی' فوراً ڈھیر ہو گیا۔''

''اور اس نوجوان کا کیا بنا؟'' میں نے افسوس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''وہی بنا جو اس کا نصیب ہے۔ حوالات میں بند اپنی قسمت کے فیصلے کا منتظر ہے۔ وہ منشی بچ گیا ہے لیکن ابھی اسپتال میں ہے۔ اس لڑکے کے ماں باپ دن رات کمال الدین خان کی حویلی کے چکر کاٹتے ہیں' اس کے پیر پڑتے ہیں کہ ان کے بیٹے کو چھڑوا دے۔''

''کمال الدین خان کیا کہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔ جب وہ بدنصیب بوڑھا بوڑھی آتے ہیں وہ دھتکار کر انہیں بھگا دیتا ہے۔ اس کا یہ پختہ نظریہ ہے کہ اس کے کسی کارندے پر حملہ دراصل خود اس پر حملہ ہے۔ وہ ایسے کسی بھی شخص کو معاف کرنے پر تیار نہیں ہوتا جس نے اس کے کسی بندے پر ہاتھ اٹھایا ہو۔''

''خواہ قصور خود اس کے بندے کا ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ دراصل اس کا نظریہ یہ ہے کہ اگر اس نے اپنے کارندوں سے باز پرس کی تو ان معمولی کمین لوگوں کے حوصلے بڑھ جائیں گے۔ اس کے اسی طرز عمل کی وجہ سے اس کے کارندے اس کی اندھا دھند اطاعت کرتے ہیں۔''

''پھر تو اس کے کارندوں نے اندھیر مچا رکھا ہو گا؟''

''وہ تو صاف ظاہر ہے۔'' ہیر نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''اور اب میں بھی کمال الدین خان کے کارندوں میں شامل ہوں۔ کریم بابا واپس آ جائے تو میں اس سے بات کروں گا۔ میں ایسے گھٹیا شخص کی ملازمت پر لعنت بھیجتا ہوں'' میں نے تھوڑی سی ناراضی کے ساتھ کہا۔

''لیکن تم یہ تو سوچو کہ تمہارے آنے سے ان بے چارے مزدوروں کو کتنا فائدہ پہنچا ہے۔ پہلے والا منشی بدنیت ہی نہیں بے ایمان بھی تھا۔ وہ ان مفلس محنت کشوں کی خون پسینے کی کمائی میں سے بھی کسی نہ کسی بہانے کٹوتی کرتا رہتا تھا۔ اس کے دفع ہونے پر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا ہے اگر تم نے ملازمت چھوڑ دی تو وہ لوگ ایک بار پھر مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ کون جانے نیا منشی کس قسم کی فطرت کا مالک ہو۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ کمال الدین خان کے کارندے کچھ بھی کرتے پھریں تمہیں ان سے کیا واسطہ؟''

''اچھا اچھا' میں سوچوں گا'' میں نے کہا۔ اس دور افتادہ گاؤں کی رہنے والی یہ ناخواندہ لڑکی شکل کے لحاظ سے ہی خوب صورت نہ تھی اس کا دل بھی بہت حسین و جمیل تھا۔ ویسے تو وہ سیدھی سادی اور اپنی ہی دھن میں مگن اکھڑ دوشیزہ نظر آتی تھی لیکن دراصل وہ اپنے اردگرد کی تمام تلخ اور زہریلی حقیقتوں کا بھرپور ادراک رکھتی تھی۔ اس کی ذہانت اور معاملہ فہمی نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں ذرا آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ کریم بابا ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ہیر بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میرا پستول بابا کریم بخش کے گھر میں ہی تھا۔ میں نے اٹھ کر اسے نکال لیا۔ میں نے اس کی اچھی طرح صفائی کر لی تھی۔ اس کے میگزین میں پانچ گولیاں باقی تھیں۔ پانی میں بھیگنے کے باوجود ان کا کچھ نہیں بگڑا۔ یہ پستول میرے لیے بے حد اہم تھا۔ مجھے جلد از جلد سردار برکت علی کی حویلی میں پہنچنا تھا۔ کون جانے مجھے وہاں کس طرح کے حالات سے نبرد آزما ہونا پڑتا۔ کس کس کی گردن میرے ہاتھوں زمیں بوس ہوتی۔ فقیر بابا کے لیے تو میں اس پوری حویلی کو خاک میں ملا دیتا۔ ویسے بھی میرے لیے اب فقیر بابا ہی سب کچھ

تھا۔ کھونے کے لیے تو میرے پاس تھا ہی کیا؟'' ایک زندگی تھی جو کسی بھی لمحے ریت کے لڈو کے مانند بھر جاتی۔

مجھے سوئے ہوئے ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میرے کانوں میں کسی کے زور زور سے کراہنے کی آواز آئی۔ میں اپنے بستر سے اٹھ کر ساتھ والے کمرے کی جانب دوڑا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ہیر اپنے بستر پر پڑی زور زور سے کراہ رہی ہے۔ اس کے سرہانے کریم بابا کھڑا تھا۔ ہیر نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے سر پر جما رکھے تھے۔ درد کی شدت سے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''کیا ہوا بابا؟ ہیر کو کیا ہوا؟'' میں نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔ میں ہیر کی حالت دیکھ کر شدید سراسیمگی کا شکار ہو گیا۔

''ہیر کے سر میں شدید درد ہے بیٹا۔'' کریم بابا نے بتایا۔

''تو اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلو نا۔''

''گاؤں میں تو کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔''

''تو دیر کس بات کی ہے؟ گاڑی جوڑ لو۔ ہم ابھی شہر چلتے ہیں' اس کی تو حالت تباہ ہو رہی ہے۔''

قدرے توقف کے بعد کریم بابا بیل کو گاڑی میں جوتنے کے لیے چلا گیا۔ مجھ سے ہیر کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ میں نے اس کے پاس بیٹھ کر دھیرے سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ہیر۔ ہیر دیکھو میں تمہارے پاس بیٹھا ہوں۔ مجھ سے بات کرو۔''

اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ اس کے لبوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گھنے بادلوں کے پیچھے سے چاند کی جھلک نظر آئی ہے پھر وہ چاند دوبارہ بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔

''میرے سر میں بے حد شدید درد ہے'' اس نے بھینچی بھینچی آواز میں کہا۔

''تم فکر نہ کرو ہیر۔ کریم بابا بیل گاڑی جوڑ رہا ہے۔ پھر ہم شہر چلیں گے۔ ڈاکٹر تمہیں دوائی دے گا اور تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

''کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میرا علاج کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے'' ہیر نے اتنا کہہ کر ہلکی سی چیخ ماری اور اپنے سر کو پوری قوت سے جکڑ لیا۔ میں نے اپنا دایاں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

''مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے ہیر۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ وہ ضرور تمہیں شفا دے گا۔''

یک لخت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہیر کے جسم کا تناؤ کچھ کم ہو گیا ہے۔ اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ ''تم نے۔۔۔ تم نے ابھی ابھی کیا کہا ہے؟ ایک بار پھر کہو۔'' ہیر نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ اس کے دونوں ہاتھ میرے ہاتھوں پر جم گئے۔ میں نے قدرے حیرانی کے ساتھ اپنی بات دہرائی۔

''میں نے کہا کہ اللہ بڑا کارساز ہے۔ وہ ضرور تمہیں شفا دے گا۔''

اچانک ہیر کے چہرے پر ہیجان کے تاثرات کا غلبہ ہونے لگا۔ اب اس کے چہرے پر کرب کے نہیں جوش کے آثار نظر آنے لگے'' صرف ایک بار اور کہو غلام سعید۔ تمہارے منہ سے جونہی رب ذوالجلال کے تعریفی کلمات نکلتے ہیں مجھے اپنے سر کے درد میں کمی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔''

میں نے ایک بار پھر وہ مقدس الفاظ دہرا دیے۔ مجھے واضح طور پر محسوس ہوا کہ ہیر کے چہرے کی چمک

لوٹ آئی ہے۔ اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر زندگی جھلکنے لگی۔ یوں لگا جیسے وہ کبھی بیمار ہی نہ رہی ہو۔ ''میں ۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہو گئی ہوں غلام سعید'' ہیر نے جذبات کے بوجھ سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا'' تمہاری زبان میں جادو کا اثر ہے۔ میرے سر کا درد بالکل غائب ہو گیا ہے۔''

''یہ میری زبان کا جادو نہیں ہیر۔ یہ اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام کی تاثیر ہے'' میں خود بھی شدید جذباتی ہیجان کا شکار ہو رہا تھا'' ورنہ مجھ جیسے گناہ گار شخص کی کیا اوقات کہ......''

''نہیں نہیں ایسا مت کہو'' ہیر نے جلدی سے کہا'' بے شک شفا دینے والی ذات تو خدا کی ہی ہے لیکن میرے لیے تو اس نے تمہیں ہی مسیحا بنا کر بھیجا ہے۔''

اسی وقت بابا کریم بخش کمرے میں داخل ہوا'' جلدی کرو بیٹا' غلام سعید۔ ہیر کو میرے ساتھ مل کر سہارا دو۔ میں نے بیل گاڑی تیار کر دی ہے۔''

''میں ٹھیک ہو گئی ہوں بابا'' ہیر نے خوشی سے معمور لہجے میں کہا'' بالکل ٹھیک ہو گئی ہوں۔ غلام سعید نے مجھے بالکل ٹھیک کر دیا ہے۔''

''کیا کہا؟ تم ٹھیک ہو گئی ہو'' کریم بابا نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا'' غلام سعید نے تمہیں ٹھیک کر دیا ہے۔ مگر کیسے؟''

''یہ ایسے ہی کہہ رہی ہے کریم بابا'' میں نے شرمندہ سا ہو کر کہا'' میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور یہ ٹھیک ہو گئی۔''

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ غلام سعید نے میرے لیے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ مجھے شفا دے اور مجھے شفا ہو گئی۔ یہ تو کرامت کی طرح بات ہے۔ غلام سعید ضرور اللہ کا پیارا بندہ ہے۔''

''مجھے مزید شرمندہ مت کرو ہیر۔ تم نہیں جانتیں کہ میں کتنا گناہ گار اور بدکردار شخص ہوں۔''

''بس ٹھیک ہے۔ اب مجھے نہیں جانا ڈاکٹر واکٹر کے پاس۔ اب میں ٹھیک ہو گئی ہوں'' ہیر نے چہکتے ہوئے کہا۔

''نہیں ہیر'' میں نے کہا'' ڈاکٹر کے پاس تو تمہیں جانا ہی پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ درد عارضی طور پر کم ہو گیا ہو۔ جانے کس وقت دوبارہ ہو جائے۔ تمہیں ڈاکٹر کو دکھانا بہت ضروری ہے۔''

کریم بابا اور ہیر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر کریم بابا نے کہا'' غلام سعید ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں ڈاکٹر کے پاس ضرور چلنا چاہیے۔ ویسے بھی لدھو تیار کھڑا ہے۔ رات ہونے سے پہلے واپس لوٹ آئیں گے۔''

قدرے ہچکچاہٹ کے بعد ہیر تیار ہو گئی۔ وہ اپنے قدموں پر چل کر بیل گاڑی پر بیٹھی۔ اسے دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ درد سے تڑپ رہی تھی۔

''چل بھئی لدھو اب ذرا پھرتی دکھا۔ ہمیں رات سے پہلے واپس بھی آنا ہے'' کریم بابا نے بیل کی کمر پر زوردار تھپکی دے کر کہا۔ اگلے ہی لمحے بیل گاڑی تیزی سے روانہ ہو گئی۔ لدھو کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹی زور زور سے بج رہی تھی۔ گھنٹی کی آواز سن کر مجھے کئی دن پہلے کی وہ رات یاد آ گئی جب میں رات کے اندھیرے میں' جنگل کی تنہائی میں اپنے انجام کا منتظر تھا۔ چند ہی دنوں میں ہم لوگوں کے درمیان کتنے مضبوط رشتے استوار ہو گئے۔

شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ بے غرض محبت بہت جلد استوار ہو جاتی ہے جبکہ اس کی خوشبو مرتے دم تک مشام جاں معطر رکھتی ہے۔

کوٹ چھٹہ پہنچنے کے بعد ہم سیدھے سرکاری اسپتال پہنچ گئے۔ جمعے کے دن کی وجہ سے بڑا ڈاکٹر اسپتال میں نہیں تھا۔ کریم بابا نے بتایا کہ بڑے ڈاکٹر کا بنگلہ اسپتال کے احاطے میں ہی ہے۔ میں نے ان دونوں کو وہیں بیل گاڑی میں بیٹھا رہنے دیا اور خود ڈاکٹر صاحب کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ گھنٹی کے جواب میں دروازہ ایک نوعمر لڑکے نے کھولا۔

''بیٹے ڈاکٹر صاحب گھر پر ہیں؟ میرا نام غلام سعید ہے اور میں بہت دور سے ان سے ملنے آیا ہوں۔''

''ابو گھر پر موجود تو ہیں مگر وہ گھر پر مریض نہیں دیکھتے' آپ صبح اسپتال آجائیں۔''

''بیٹے آپ اپنے ابو سے کہیں کہ ہم بہت دور گاؤں سے آئے ہیں صرف چند منٹ کے لیے مریضہ کو دیکھ لیں۔ ان کی بڑی مہربانی ہوگی۔''

''اچھا میں انہیں بتاتا ہوں۔''

کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر صاحب خود دروازے پر آگئے۔ وہ اس وقت کرتا شلوار میں ملبوس تھے۔ چہرے پر نرمی تھی۔ آنکھوں پر انہوں نے سنہری فریم کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ بڑھاپا ابھی ان سے کافی فاصلے پر تھا ''کیا ہے بھئی' ایک جمعے کا دن ہی تو ملتا ہے ذرا آرام کرنے کو۔ اس دن بھی تم لوگ چین نہیں لینے دیتے۔''

''مجھے بے حد افسوس ہے ڈاکٹر صاحب۔ ہم نے آپ کو بے وقت تکلیف دی دراصل......''

''اچھا' اچھا۔ تم یہ بتاؤ کہ مریضہ کہاں ہے؟''

''وہ یہیں ہے۔ میں ابھی اسے لے کر آتا ہوں'' میں نے جلدی سے کہا۔ وہ ڈاکٹر حقیقتاً کوئی بہت نیک دل انسان تھا۔

''اچھا تم اسے لے کر آؤ' میں اتنے میں گھر کے اندر سے اپنے آلات لے کر آتا ہوں۔''

میں نے خوشی خوشی کریم بابا اور ہیر کو بتایا کہ بڑا ڈاکٹر ہیر کو گھر پر دیکھنے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ کریم بابا اور ہیر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ہیر نے گویا بادل نخواستہ کہا ''چلو۔''

میں ان دونوں کے رویے کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں انہیں زبردستی یہاں گھسیٹ لایا ہوں۔ ورنہ ان کی تو یہاں آنے کی قطعاً مرضی نہ تھی۔

ہم ڈاکٹر صاحب کے بنگلے پر پہنچے تو بنگلے کے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایک نوکر پہلے سے ہمارا منتظر تھا۔ اس نے ہمیں اندر لے جا کر بٹھایا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب ابھی آتے ہیں۔ میں ڈرائنگ روم کی سجاوٹ دیکھتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذوق بے حد نفیس تھا۔ دیواروں پر آویزاں خوب صورت تصویروں سے واضح ہوتا تھا کہ وہ اعلیٰ قسم کی تصویروں کا بھی قدردان ہے۔ کریم بابا قدرے مضطرب تھا۔ بالآخر وہ اٹھ کھڑا ہوا ''میں ذرا ڈھور کو کھول کر ابھی واپس آتا ہوں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہیر نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ خود بھی بے حد مضطرب تھی۔

''اچھا تو تم لوگ آگئے'' ڈاکٹر صاحب نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ پھر ان کی نگاہ ہیر پر

پڑی تو ان کے چہرے پر ہیر کے لیے شناسائی کی لہر ابھری۔ ''ارے یہ تو ہیر ہے۔ وہ بابا کریم بخش کہاں ہے؟''

''ڈاکٹر صاحب آپ ہیر اور بابا کریم بخش کو جانتے ہیں؟'' میں نے شدید حیرانی کے عالم میں کہا۔ عجیب بات ہے۔ ہیر اور کریم بابا نے مجھے اشارتاً بھی نہیں بتایا کہ وہ پہلے بھی ڈاکٹر صاحب سے مل چکے ہیں۔ بھلا اس میں چھپانے کی کون سی بات تھی۔

''ہاں بھئی' میں کئی بار اس بچی کا معائنہ کر چکا ہوں۔ لیکن تم کون ہو؟ اس سے پہلے تو میں نے تمہیں نہیں دیکھا۔''

''میں۔۔۔ میں ان کا عزیز ہوں۔ کچھ دن پہلے ان کے پاس آیا ہوں۔''

''اچھا۔ اب کیسے آنا ہوا؟ تم بتاؤ ہیر۔ کیا آج پھر تم پر سر درد کا دورہ پڑا ہے؟''

''ہاں آج پھر اسے سر درد کا دورہ پڑا ہے۔ کیا پہلے بھی اس پر یہ دورہ پڑتا رہا ہے؟'' میں نے شدید حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''اچھا تمہیں نہیں پتا؟ خیر میں ذرا ہیر کا معائنہ کر لوں اس کے بعد تمہیں بتاتا ہوں۔ حیرت کی بات ہے' تم خود کو ان کا قریبی عزیز بتاتے ہو اور تمہیں اتنی بڑی بات معلوم نہیں ہے!''

ہیر چپ چاپ ڈاکٹر صاحب کا منہ تک رہی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ ڈاکٹر صاحب کو ایک لفظ نہ بولنے دیتی۔ جانے وہ مجھ سے کیا چھپانا چاہتے تھے؟

ڈاکٹر صاحب بہت دیر تک ہیر کا معائنہ کرتے رہے۔ میں اس تمام عرصے کے دوران میں شدید اضطراب کا شکار رہا۔ طرح طرح کے اندیشے مجھے گھیرے رہے۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنا معائنہ ختم کر لیا۔ پھر وہ مجھے ایک طرف لے جا کر بولے ''تم مجھے پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو جوان چنانچہ مجھے یقین ہے کہ تم میری بات زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکو گے۔ اگرچہ ابھی ہیر کی طبیعت قدرے بہتر ہے لیکن یقین کرو یہ کیفیت عارضی ہے۔ اس پر کسی وقت بھی دوبارہ دورہ پڑ سکتا ہے۔''

''لیکن ڈاکٹر صاحب اس پر یہ دورہ کیوں پڑتا ہے؟''

''میں نے اس کا کافی دنوں تک علاج کیا ہے۔ میں نے اسے بہت سی دوائیں کھلائیں۔ میری ان دواؤں سے اس کا درد عارضی طور پر ختم ہو جاتا ہے لیکن کچھ عرصے بعد یہ درد دوبارہ ہو جاتا ہے۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں اسے کوئی پیچیدہ مرض نہ ہو۔ میں نے اس کے کئی ٹیسٹ کروائے۔ آہستہ آہستہ میرا شک یقین میں بدلنے لگا۔ تاہم ابھی ایک ٹیسٹ باقی تھا جس کے بغیر میں پورے یقین سے اس کے مرض کی نوعیت کو نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میں نے کریم بخش کو کہا کہ وہ اپنی بیٹی کا یہ ٹیسٹ کروائے لیکن اس نے نہیں کروایا۔''

''لیکن ڈاکٹر صاحب اس نے یہ ٹیسٹ کیوں نہیں کروایا؟''

''ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ ٹیسٹ بہت مہنگا ہے۔ اس پر کئی ہزار روپے صرف ہوتے ہیں۔ پاکستان میں اس ٹیسٹ کی صرف ایک مشین ہے جو کراچی کے ایک بہت بڑے پرائیویٹ اسپتال میں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کریم بخش نے ایک بار باتوں ہی باتوں میں مجھے بتایا تھا کہ وہ ہیر کو کسی پیر کے پاس لے کر گیا تھا۔ اس پیر نے بتایا ہے کہ ہیر پر کوئی جن عاشق ہے۔ اسی وجہ سے اس پر سر درد کے دورے پڑتے ہیں۔ میں نے اسے سختی

سے منع کیا کہ وہ پیروں فقیروں کے چکر میں نہ پڑیں بلکہ ہیر کا مکمل علاج کروائیں۔ میرا خیال تھا کہ میری بات ان کی سمجھ میں آ جائے گی لیکن میری بات کا الٹا اثر ہوا۔ ان دونوں نے میرے پاس آنا ہی چھوڑ دیا۔ یہ شاید اس ڈبا پیر سے جن نکلوانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اب خدا جانے ان کے دل میں کیا آئی کہ یہ اس پیر کے پاس جانے کے بجائے میرے پاس آ گئے۔ ویسے ایک بات میں تمہیں صاف صاف بتا دیتا ہوں۔ اگر ہیر کا مرض جلد ہی تشخیص نہ ہوا اور اس کے بعد اس مرض کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے فوری کارروائی نہ کی گئی تو یہ کسی وقت بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو سکتی ہے۔ اگر تم انہیں سمجھا سکتے ہو تو ضرور سمجھاؤ کہ چند ہزار روپے کے لیے انسانی زندگی داؤ پر نہ لگائیں۔''

''آپ کے خیال میں ہیر کو کیا بیماری ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے سو فیصد تو نہیں البتہ نوے فیصد یقین ہے کہ ہیر کو برین ٹیومر ہے۔ سمجھتے ہو نا یہ کس بلا کا نام ہے؟''

''آپ کا مطلب ہے، ہیر کے دماغ میں پھوڑا ہے؟'' میں نے لرزتے دل کے ساتھ پوچھا۔ میرے دل و دماغ کی عجیب حالت تھی۔ رنج و غم کا ایک طوفان تھا جس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ڈاکٹر صاحب نہیں جانتے تھے کہ انہوں نے میرے کانوں میں کیسا تیزاب انڈیل دیا ہے۔

''ہاں بھئی میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ ہیر کے دماغ میں پھوڑا ہے۔ تمہیں شاید معلوم ہو کہ یہ کیسا جان لیوا مرض ہے۔ ایسا مریض ذرا مشکل سے ہی بچتا ہے لیکن اگر صحیح وقت پر مرض کی تشخیص ہو جائے تو مریض کی جان بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ کیا جا سکتا ہے۔ خدا کرے ہیر کا مرض ابھی لاعلاج نہ ہوا ہو لیکن اگر مزید غفلت برتی گئی تو اس کا بچنا ناممکن ہو جائے گا۔''

''نہیں خدا کے لیے ایسا مت کہیے۔ میں خود ہیر کا علاج کراؤں گا۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''میں چند دنوں کے بعد خود بھی کراچی جا رہا ہوں۔ اس وقت تک تم لوگ رقم وغیرہ کا انتظام کر لو۔ میں ہیر کو اپنے ساتھ ہی کراچی لے جاؤں گا۔ تم یا کریم بابا میرے ساتھ چلنا۔ میں کراچی میں اپنے سامنے ہیر کا ٹیسٹ کرا لوں گا۔ اگر میرا اندیشہ درست ثابت ہوا تو ہیر کے دماغ کا آپریشن کرانا پڑے گا۔ خیر وہ آپریشن تو نشتر میڈیکل یونیورسٹی ملتان میں بھی ہو سکتا ہے۔''

''اس آپریشن پر کتنا خرچا ہو گا ڈاکٹر صاحب؟'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ بتایا تھا اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ یہ سب کچھ میرے خواب و خیال سے بھی بڑھ کر ہولناک تھا۔ چند ہی دن کی رفاقت کے بعد میں ہیر کو اپنے دل کے اتنے قریب محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کی جدائی کے تصور سے ہی کلیجا منہ کو آتا تھا۔ اس کو کھو کر تو میرے پاس کچھ بھی نہ بچتا۔ اگر خدا نے ہیر کو مجھ سے اتنی جلدی چھیننا تھا تو اسے مجھ سے ملایا ہی کیوں تھا۔ کیا اس لیے کہ میرے دل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک سلگتا ہوا داغ باقی رہ جائے۔

کیوں چپکے سے وہی لوگ اتر جاتے ہیں دل میں
جن لوگوں سے قسمت کے ستارے نہیں ملتے

ڈاکٹر صاحب کی گفتگو جاری تھی ''دیکھو بھائی میں تمہیں کسی غلط فہمی میں نہیں رکھنا چاہتا۔ یہ بے حد نازک

بے حد اہم آپریشن ہے۔ اسی لحاظ سے یہ بے حد مہنگا بھی ہے۔ میں تمہیں قطعی رقم تو نہیں بتا سکتا۔ تاہم میرا اندازہ ہے کہ اس آپریشن پر ایک لاکھ روپے تک خرچ ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد بھی اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ مریض بچ ہی جائے گا۔ انسان کے بس میں تو یہی ہے کہ وہ کوشش کر دیکھے۔ شفا دینا تو بہرحال اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں ڈاکٹر صاحب، ہم کسی نہ کسی طرح یہ تمام انتظامات مکمل کر لیں گے۔''

''میں نے ہیر کے لیے دوائیں لکھ دی ہیں۔ یہ اسے کھلاتے رہو۔ میں تمہیں اپنا ٹیلی فون نمبر لکھ کر دیتا ہوں۔ اگر کسی وقت ہیر کی طبیعت زیادہ خراب ہو تو فوراً مجھے اطلاع دینا۔''

''بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب'' میں نے ممنونیت سے لبریز لہجے میں کہا۔

''اچھا اب تم لوگ جاؤ اور مجھے آرام کرنے دو۔ جب تم ٹیسٹ کے لیے رقم جمع کر لو تو مجھے اطلاع دینا۔''

''ڈاکٹر صاحب آپ کی فیس؟'' میں نے جھجکتے جھجکتے پوچھ ہی لیا۔ وہ کتنا ہی نیک دل شخص ہو لیکن بہرحال تھا تو ڈاکٹر ہی۔

''ارے چھوڑو فیس ویس کو۔ بس کراچی چلنے کی تیاری کرو۔ اس جاہل بڈھے کریم بخش کو سمجھا دینا کہ اس ڈبا پیر کو آگ میں جھونک دے۔ اگر ایک بار بیٹی چلی گئی تو ساری دنیا کے ڈبا پیر اسے واپس نہیں لا سکتے'' ڈاکٹر صاحب نے یہ الفاظ ہیر کے سامنے کہے، ہیر کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کے بنگلے سے باہر نکلے تو دیکھا کہ کریم بابا اپنے لدھو کے پاس بیٹھا ہے۔ ہمیں آتا دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا ''کیا بتایا ڈاکٹر صاحب نے؟'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''وہی جو تم نے مجھے نہیں بتایا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم دونوں نے ایسا کیوں کیا؟'' میں نے قدرے ناراضی کے ساتھ کہا۔ مجھے اس بات سے دکھ پہنچا تھا۔

''لیکن ہم نے کیا کیا ہے بیٹا؟'' کریم بابا نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''آخر مجھے ہیر کی بیماری کے متعلق بتانے میں کیا حرج تھا؟''

''دیکھو بیٹا اگر ہم تمہیں اس کے سر درد کے متعلق بتاتے تو پھر سنگل والے پیر اور جن کے متعلق بھی بتانا پڑتا۔ تم پڑھے لکھے آدمی ہو۔ تم یقیناً ہمارا مذاق اڑاتے۔''

''خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب تم دونوں کراچی جانے کی تیاری کرو۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ یہ ٹیسٹ کرانا بہت ضروری ہے'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''اچھا بیٹا جیسی تمہاری مرضی'' کریم بابا نے پژمردہ لہجے میں کہا۔ اسے شاید رقم کی فکر ستا رہی ہو گی۔ میں نے اس کے دماغ کا بوجھ کچھ ہلکا کرنا چاہا ''تم رقم کی فکر نہ کرنا بابا۔ جس قدر تم سے ہو سکے کر لو۔ باقی رقم کا انتظام میں کر لوں گا۔''

کریم بابا نے قدرے حیل و حجت کی کوشش کی لیکن میں نے اسے اپنی بات ماننے پر مجبور کر دیا۔ ابھی میں نے نہیں سوچا تھا کہ میں اس رقم کا انتظام کیسے کروں گا۔ ویسے اتنا مجھے یقین تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح یہ رقم ضرور حاصل کر لوں گا لیکن بات صرف اسی چند ہزار کی رقم کی تو نہ تھی۔ آخر آپریشن کے لیے بھی تو ایک لاکھ کی خطیر رقم

درکار تھی۔ اس رقم کا انتظام میں کیسے کر پاتا؟ نوٹ کوئی درختوں پر تو نہیں اگتے کہ میں جتنے چاہے توڑ لاتا۔ اس قدر کم وقت میں اتنی بڑی رقم کا حصول بھلا کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنی زبان میں کبھی بھی دولت کے حصول کو نصب العین نہیں بنایا۔ دولت تو ہاتھ کا میل ہوتی ہے۔ جس قدر بھی اس کی طلب کرو' اس کے ناز نخرے سہو' یہ ہم سے دامن بچانے کی کوشش کرتی ہے لیکن اگر اس سے بے نیازی کا رویہ اختیار کرو تو یہ ہمارے پیچھے آنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ یہ تمام اقوال زریں اپنی جگہ لیکن اس وقت مجھے اس نامراد شے کی شدید ضرورت تھی۔ میں نے اپنے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ اگر اس رقم کے حصول کے لیے مجھے اپنی جان پر بھی کھیلنا پڑا تو میں گریز نہیں کروں گا۔

ہم لوگ گاؤں پہنچے تو رات گہری ہو چکی تھی۔ میں نے بھٹے پر سے آتے ہوئے اپنے ماتحت گل زمان کو بتا دیا تھا کہ میں جمعے کی شام کو لوٹ آؤں گا۔ وہ اس وقت تک میری آمد کی طرف سے مایوس ہو چکا ہوگا۔ وہ یہی سمجھ رہا ہوگا کہ میں اب صبح ہی آؤں گا۔

بابا کریم اور ہیر نے مجھے روکنے کی بے حد کوشش کی لیکن میں اس وقت بھٹے کی جانب روانہ ہو گیا۔ میں چاہتا تھا کہ میں جب تک اس بھٹے پر کام کر رہا ہوں میری طرف سے کسی کو شکایت کا موقع نہ مل سکے۔

چاند کی دس بارہ تاریخ تھی۔ آسمان پر ایک بھی بادل موجود نہیں تھا۔ ہر چیز چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ مجھے بھٹے تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی بڑا ہی دلکش سماں تھا۔ ایسے موقع پر دل میں خواہ مخواہ ہی ترنگ اٹھنے لگتی ہے۔ لیکن میرا ذہن ہیر کی بیماری کی طرف لگا ہوا تھا۔ لہٰذا مجھے سب کچھ بے کیف لگ رہا تھا۔ کھانے کے نام پر بھی آج پھیکے چاول اور پتلی پانی جیسی دال ملی تھی۔

میں اپنی کوٹھری کے پاس پہنچا تو اس میں تالا لگا ہوا نظر آیا۔ اس کی چابی گل زمان کے ہی پاس تھی۔ جانے وہ بدبخت کدھر نکل گیا ہوگا۔ میں اسے ادھر ادھر تلاش کرنے لگا۔ میں کوٹھریوں کے عقب میں کچھ ہی دور گیا ہوں گا کہ اچانک میں چونک پڑا۔ میں نے کسی کی کھسر پھسر کی آواز سنی تھی۔ میں دبے پاؤں اس جانب بڑھا جدھر سے آواز سنائی دی تھی۔ اس طرف چکنی مٹی کی بنی ہوئی کچی اینٹوں کی دیواریں کھڑی ہوئی تھیں۔

میں نے دیوار کی اوٹ سے ذرا جھانک کر دیکھا تو میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ گل زمان تھا۔ اس کے ساتھ جو عورت تھی اس کا نام خیراں تھا۔ اس وقت خیراں کسی کھلی کتاب کے مانند نظر آ رہی تھی۔ اور وہ جاہل گل زمان اسے ورق بہ ورق پڑھ رہا تھا۔ مجھے اپنے قدم زمین میں گڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔ زمین پر بچھی ہوئی سفید چادر اس وقت گناہ کا اکھاڑا بنی ہوئی تھی۔ میں چند لمحوں سے زیادہ وہ سب کچھ نہ دیکھ سکا۔ مجھے آج تک علم نہیں ہو سکا کہ گل زمان بھی اس طرح کی مکروہ حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ پھر میں نے خیراں کی آواز سنی۔

''تم آخر کب تک مجھے اس طرح خراب کرتے رہو گے گل زمان۔ خدا کے لیے اب مجھے معاف کر دو۔''

''ابھی سے کہاں خیراں۔ ابھی تو تم صرف تین بار میرے پاس آئی ہو۔ یہ بھی تو دیکھو کہ تمہارا جرم کتنا بڑا ہے۔ اگر کمال الدین خان کو علم ہو جائے کہ تم اور تمہارا شوہر بھٹے کی خشک لکڑیاں چرا کر بیچتے رہے ہو تو ذرا سوچو کہ تم لوگوں کا کیا حشر ہوگا۔''

''ہم نے وہ لکڑیاں بیچی نہیں بلکہ چولہے میں جلائی تھیں۔ ہم صرف دو بار یہاں سے لکڑیاں لے گئے تھے اور وہ بھی بہت چھوٹی چھوٹی۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ چوری تو چوری ہوتی ہے نا؟'' گل زمان نے اپنی مکروہ آواز میں کہا۔

غصے کی شدت سے میرا خون کھول رہا تھا۔ وہ کمینہ شخص اس غریب عورت کو بلیک میل کر کے اپنے شیطانی جذبات کی تسکین کرتا رہتا تھا اور یہ سلسلہ جانے کب تک جاری رہتا۔ ایک بار تو میرے دل میں آئی کہ ابھی اور اسی وقت اس غلیظ شخص کا گلا گھونٹ دوں لیکن پھر میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ میں جس قسم کے حالات میں آن پھنسا تھا اس لحاظ سے تو یہ معمولی واقعہ تھا۔ یہاں کا تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا اگر کمال الدین خان کے کارندے بدطینت تھے تو میں ان کی فطرت کیسے بدل سکتا تھا۔

میں چپ چاپ اپنی کوٹھری کے دروازے کے پاس آن کھڑا ہوا۔ کچھ دیر بعد گل زمان خان جھومتا ڈگمگاتا آن پہنچا۔

''خیر تو ہے گل زمان آج کچھ زیادہ ہی ترنگ میں ہو'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تم آ گئے منشی صاحب۔ میں ذرا چاندنی رات کا مزہ لینے ٹیلوں کی طرف نکل گیا تھا'' اس نے جھینپتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں اب اس چاندنی رات کا پیچھا چھوڑ ہی دو تو بہتر ہے۔ تمہیں کم از کم پچھلے منشی کے انجام سے ہی سبق سیکھنا چاہیے۔''

''اچھا یہ بتاؤ منشی صاحب تمہارے لیے چائے بناؤں؟'' گل زمان نے شرمسار سا ہو کر بات بدلنے کی کوشش کی۔

''نہیں مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے میں صرف سونا چاہتا ہوں۔ تم یہ کھڑکی بند کرو۔ تمہاری چہیتی چاندنی رات میں آنکھوں میں چبھ رہی ہے۔''

اگلا دن معمول کے مطابق گزرا البتہ میں تمام دن یہی سوچ بچار کرتا رہا کہ فوری طور پر پانچ چھ ہزار کا بندوبست کیسے ہو سکتا ہے۔ پھر میں نے سوچا کہ کمال الدین خان سے مانگ کر دیکھوں۔ جانے وہ کیا جواب دیتا۔ بہرحال آج شام کو تو مجھے حویلی جانا ہی تھا۔ ایک بار کہہ کر دیکھنے میں تو کوئی حرج نہیں تھا۔ اگر انکار کر دیتا تو پھر دیکھا جاتا۔

شام کو حویلی کی طرف روانہ ہوا تو میری جیب میں پندرہ ہزار روپے موجود تھے۔ آج مجھے حویلی میں جا کر ہی حساب کتاب دینا تھا۔ بھٹے سے حویلی کا اچھا خاصا فاصلہ تھا۔ راستے میں کئی جگہ ویران علاقہ بھی آتا۔ ابھی رات کا اندھیرا پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے چلا جا رہا تھا۔

میں ابھی حویلی سے آدھے فاصلے پر پہنچا ہوں گا کہ اچانک مجھے چار نقاب پوشوں نے گھیر لیا وہ بھاری بھرکم تھے اور پستولوں سے مسلح۔

''اپنی جیب خالی کر دے جوان۔ ورنہ میرے پستول کی گولی کا نشانہ بننے کے لیے تیار ہو جا۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''تم جو کوئی بھی ہو میری بات غور سے سنو'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ''یہ رقم میرے پاس کسی کی امانت ہے' تم اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔''

''اپنی جوانی پر ترس کھا جوان۔ ایسا نہ ہو کہ تو ہمارے ہاتھوں سے خرچ ہو جائے۔''

''زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں ہے'' میں نے دبنگ لہجے میں کہا ''تمہاری طرح کے پستول کے بل پر اکڑنے والے دو ٹکے کے لفنگے میں نے بہت دیکھے ہیں اگر تم میں سے کوئی مرد ہے تو ذرا پستول ایک طرف رکھ کر سامنے آئے پھر تمہاری بہادری کا کچھ انداز ہو سکتا ہے۔''

''بکواس نہ کر اوئے مچھندر'' ان میں سے ایک نے گرجتے ہوئے کہا ''میں اکیلا ہی تیرا قیمہ کر دوں گا۔''

''تو پھر دیر کس بات کی ہے آؤ۔ تیرے باقی ساتھی کیا واقعی نامرد ہیں؟'' ان چاروں کے حلق سے غضب ناک غراہٹ خارج ہوئی اور وہ اپنے پستول اپنی بیلٹوں میں اڑس کر بیک وقت مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں اپنی حکمت عملی میں پوری طرح کامیاب ہو گیا۔ میں نے ان کے پستول ہی نہیں رکھوائے بلکہ انہیں بری طرح مشتعل بھی کر دیا۔ ان چاروں نے غلیظ گالیاں بکتے ہوئے مجھے اپنے گھونسوں پر رکھنا چاہا۔ میں چند قدم تک پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ مجھے پیچھا ہٹتے دیکھ کر وہ چاروں ایک ساتھ مجھ پر جھپٹے۔ اسی وقت میں گولی کی طرح ان کے درمیان سے گزرتا چلا گیا۔ اس دوران میں میرے دائیں ہاتھ کی کہنی ان میں سے ایک کی گدی پر اور بائیں ہاتھ کی کہنی دوسرے کی پسلیوں میں پڑی۔ میں نے پلٹ کر نتائج کا جائزہ لیا۔ جس نقاب پوش کی گردن کی مضبوطی کا میں نے امتحان لیا تھا وہ اس امتحان میں ناکام ہو کر منہ کے بل زمین پر ڈھیر ہو گیا جبکہ دوسرا مضروب اپنی پسلیاں دبائے اکڑوں بیٹھا نظر آیا۔ اپنے دو ساتھیوں کا یہ حال دیکھ کر باقی دونوں کے نتھنوں سے پھنکاریں نکلنے لگیں۔ وہ دونوں بیک وقت مجھ پر جھپٹے۔ وہ لوگ شاید پستول کے بل پر ہی رستمی دکھانے کے ماہر تھے۔ چنانچہ مجھے یقین تھا کہ میں انہیں خاک چٹا دوں گا۔ جونہی وہ دونوں میرے قریب آئے میں نے جھکائی دے کر ان کے وار خالی کر دیے۔ وہ ابھی جھونک سے سنبھلنے نہیں پائے تھے کہ میں نے ان میں سے ایک کی کمر پر لات جما دی جس کے نتیجے میں وہ زمین پر لڑھکنیاں کھاتا چلا گیا۔ دوسرے کو میں نے گھونسوں پر رکھ لیا۔ اس نے جوابی گھونسے چلانے کی کوشش کی لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ چند ہی گھونسوں میں اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑنے لگے۔ میں اس پر فیصلہ کن وار کرنے ہی والا تھا کہ اچانک فضا میں زوردار دھماکے کی آواز گونجی۔

دھماکے کی آواز کے ساتھ ہی میرے مدمقابل کے حلق سے ایک کریہہ چیخ نکلی اور وہ اپنی دائیں ران کو دبا کر جھک گیا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے اسے پکڑ کر اپنے سامنے کر لیا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے فوراً ہی اس کے بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول نکال لیا۔ پستول چلانے والا وہ نقاب پوش تھا جس کی پسلیاں میری کہنی کا نشانہ بنی تھیں۔ اس کی نااہلی کی حد یہ تھی کہ اس نے اپنے ہی ساتھی کی ران کو چھید کر رکھ دیا تھا...... اپنے ہی ہاتھوں اپنے ساتھی کو زخمی ہوتے دیکھ کر وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ جب تک وہ سنبھلتا میں نے اس کے زخمی ساتھی کو قابو کر کے اپنے سامنے کر لیا۔

''پستول پھینک دے اوئے چڑی مار کی اولاد'' میں نے گرجدار آواز میں کہا ''یہ ہتھیار چلانا تیرے جیسے بزدلوں کا کام نہیں ہے'' وہ شخص مزید غصے کا شکار تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ مجھے گولیوں سے چھلنی کر دیتا لیکن اس کے اور میرے بیچ اس کا اپنا ساتھی حائل تھا جو اس کی گولی کا نشانہ بن کر تیزی سے زندگی کی سرحدوں سے دور ہٹتا جا رہا تھا۔

''پستول پھینک دے اسی میں تیری اور تیرے ساتھیوں کی بہتری ہے۔ تیری چاند ماری تو میں دیکھ ہی چکا ہوں۔''

وہ شخص کچھ دیر کشمکش میں مبتلا رہا۔ پھر اس نے مرے مرے ہاتھوں سے اپنا پستول زمین پر پھینک دیا۔

''شاباش۔ اب ان دونوں پردہ داروں کے پستول بھی لے کر ادھر ڈال دے۔ جلدی کر بچے مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

باقی دو میں سے ایک تو پہلے ہی بے ہوش ہو چکا تھا جبکہ دوسرے کی ناک سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ میری ٹھوکر نے اسے منہ کے بل ڈھیر کر دیا تھا۔ شاید اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔

میں نے زخم خوردہ نقاب پوش کو اس کے ساتھیوں کی جانب دھکیل دیا۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی ہچکیاں نکل رہی تھیں۔ میں نے اسے دھکا دیا تو وہ بری طرح چیخ پڑا۔ اس کے بعد واحد صحیح سلامت ساتھی نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی لیکن اس نے اس کا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا۔ ''کتے کی نسل۔ موچی کی اولاد تیرے کو کس نے کہا تھا کہ تو اپنا خاندانی پیشہ چھوڑ کر تمیس مار خانی کر۔ تو نے ہم سب کو مروا دیا۔''

''مم۔۔۔ میں نے تو۔۔۔'' اس بے چارے نے ہکلا کر اپنی صفائی پیش کرنا چاہی۔

''بس اب بکواس نہ کر اور اپنے اس مامے سے نمٹ۔ بڑا شوق تھا تجھ پستول چلانے کا۔''

''مجھے تم لوگوں سے کچھ نہیں لینا دینا'' میں نے بھاری آواز میں کہا ''تم جیسے دو ٹکے کے اچکوں کا ایک نہ ایک دن یہی انجام ہوتا ہے۔ جاؤ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ مرہم پٹی تو خیر تم کا ہی لو گے لیکن آیندہ کوئی واردات کرتے ہوئے اسامی ذرا دیکھ بھال کر تاڑنا۔ بہتر یہی ہے کہ اکیلے دکیلے بچوں کا جیب خرچ چھین کر اپنا شوق پورا کر لو۔ راہزنی جیسا خطرناک کھیل تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔''

''ہمارے پستول تو ہمیں واپس کر دو بھائی'' نقاب پوش موچی نے بالآخر موچیوں والی بات کر ہی ڈالی۔

''تمہارے نازک ہاتھ ان خطرناک کھلونوں کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں بچے۔ چپ چاپ یہاں سے کھسکنے کی کرو۔ ایسا نہ ہو میں اپنا ارادہ بدل لوں۔''

''ٹھیک ہے جوان'' گولی سے زخمی شخص نے کہا'' آج کا یہ معرکہ تو جیت گیا ہے۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔''

''ضرور ملنا بھائی صاحب لیکن آیندہ اپنے ساتھ گھسیاروں اور موچیوں کو لے کر نہ آنا۔''

موچی صاحب نے مجھ سے کچھ مکالمے بازی کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے ساتھی نے اسے بری طرح ڈانٹ دی ''بس بس اب عورتوں کی طرح کوسنے دینا بند کر دے اور اپنے اس ماں کے یار کو ہوش میں لانے کی کوشش کر۔''

میں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑا اور کمال الدین خان کی حویلی کی جانب روانہ ہو گیا۔ ان چاروں کے پستول میرے پاس تھے۔ مجھے یقین تھا کہ فی الحال وہ کسی قسم کی شرارت کی کوشش نہیں کریں گے۔ بعد کی بعد میں دیکھی جاتی۔ اس تمام معرکے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ چنانچہ جب میں حویلی کے گیٹ پر پہنچا تو رات کا ابتدائی پہر شروع ہوا تھا۔ گیٹ پر کسی نے مجھ سے باز پرس نہیں کی اور میں سیدھا حویلی میں گھستا چلا گیا۔ سامنے ہی

ملاقات کا ہال تھا۔اس وقت مجھے وہاں کوئی بھی نظر نہ آیا۔میں چپ چاپ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ایک دو ملازم ادھر سے گزرے بھی لیکن کسی نے مجھ پر توجہ نہ دی۔ کچھ دیر بیٹھے رہنے کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔میرا ارادہ تھا کہ میں کسی سے کمال الدین خان کے بارے میں پوچھوں۔اچانک میں کمال الدین کی آواز سن کر چونک پڑا۔ یہ آواز کونے والے کمرے میں سے آ رہی تھی۔ میں اس کمرے میں چل پڑا۔ میں دروازے کے پاس پہنچا ہی تھا کہ میں نے اپنا نام سنا۔میرے قدم خود بخود رک گئے۔اب میں کمال الدین کی آواز صاف طور پر سن رہا تھا۔کمال الدین کہہ رہا تھا''بہت دیر ہوگئی۔اب تک تو اسے پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مجھے خطرہ ہے کہ ان چاروں نے اسے زیادہ ہی مار نہ لگا دی ہو۔''

''نہیں خان صاحب۔وہ بے چارہ روتا پیٹتا اب آتا ہی ہوگا۔ میں نے دوست محمد کو کہا تھا کہ اس کے ساتھ بس اتنی ہی زور آزمائی کریں کہ اس کے کس بل کا اندازہ ہو جائے۔ویسے خان صاحب آپ کا خیال بالکل صحیح ہے۔ یہ لڑکا غلام سعید ہے بہت اچھے ہاتھ پیر کا۔اگر یہ پوری طرح آپ کے سائے میں آ جائے تو ذرا سی تربیت کے بعد بہت اچھا لڑاکا بن سکتا ہے۔''

''ارے اسی لیے تو ان چاروں کو اس کے پیچھے بھیجا ہے اگر اس کے ہاتھ سے وہ رقم چھن گئی تو وہ پوری طرح ہمارے حکم کا غلام بن جائے گا۔میں اس سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ یا تو چپ چاپ میرے کہنے پر چلتا رہ ورنہ میں تجھے رقم کے غبن کے سلسلے میں جیل بھجوا دوں گا۔''

کمال الدین خان کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ بن کر اترتا رہا تھا۔ اس شیطان فطرت شخص نے مجھے قابو میں کرنے کی بے حد مکروہ اسکیم بنائی تھی۔اگر میں اس کے بنے ہوئے جال میں پھنس جاتا تو مجھے پھڑ پھڑانے کی بھی مہلت نہ ملتی۔اس اسکیم کی کامیابی کے بارے میں انہیں کوئی شک نہیں تھا۔چار مسلح حملہ آوروں کے مقابلے میں بھلا ایک نہتا شخص کیا کر سکتا تھا۔ان کی سوچ غلط نہیں تھی لیکن ان کی بد قسمتی یہ تھی کہ ان کا واسطہ سیف داد خان سے پڑ گیا تھا۔اس کے وہ کارندے یقیناً اس کے با اعتماد مہرے ہوں گے لیکن ان کے سینے میں وہ آگ نہیں بھڑک رہی تھی جس آگ میں میرا وجود سلگ سلگ کر فولاد بن چکا تھا۔ جب میں اپنے کسی دشمن پر وار کرتا تو میرے جسم میں سال ہا سال سے جمع شدہ نفرت اور انتقام کی چنگاریاں میرے وجود کو طوفانی قوت عطا کر دیتی تھیں۔اس طوفان کے سامنے بڑی سے بڑی چٹان ریت کی دیوار کے مانند بکھر بکھر کر ختم ہو جاتی۔

میں نے جتنا سن لیا تھا۔وہ میری آنکھیں کھول دینے کے لیے بہت کافی تھا۔میں اب اس بدطینت شخص کی ملازمت میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رہ سکتا تھا۔میں اس کی ایک سازش سے تو کسی نہ کسی طرح بچ گیا لیکن کون جانے اس کی اگلی چال مجھے کون سے اندھے کنوئیں میں دھکیل دے۔نہیں اب میں یہاں نہیں رک سکتا۔ یہی میرا آخری فیصلہ ہے۔

میں چند لمحے وہاں کھڑا ان کی باتیں سنتا رہا۔پھر میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا' بلا اجازت اس کمرے میں گھستا چلا گیا۔کمال الدین خان مجھے دیکھ کر حیرت سے بری طرح اچھل پڑا۔اس کے ساتھ اس کا منشی تھا۔اس کی حالت بھی اپنے مالک سے زیادہ مختلف نہ تھی۔وہ دونوں حیرانی سے منہ کھولے میری شکل دیکھ رہے تھے''تم

۔۔۔تم۔۔۔غلام سعید خان۔۔۔تم''منشی کے حلق سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

''ہاں یہ میں ہی ہوں۔میرا بھوت نہیں ہے۔''میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں ان دونوں کی آنکھیں نوچ لوں۔

اگلے ہی لمحے کمال الدین خان نے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا''خیریت تو ہے غلام سعید خان؟ تم نے آنے میں بہت دیر کر دی۔''

''ہاں دیر تو ہوگئی ہے خان صاحب۔آخر ان چاروں کے دل کی حسرتیں بھی تو نکالنی تھیں۔جنہیں تم نے میرے استقبال کے لیے بھیجا تھا''میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''کون چاروں؟ کیسا استقبال؟ میں سمجھ نہیں پا رہا کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ کمال الدین خان نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہیں ابھی سمجھ نہیں آئے گا کمال الدین خان۔ جب تمہارے کارندوں کی چارپائیاں تمہارے سامنے پہنچیں گی تو تم سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔''

میں نے دیکھا کہ کمال الدین کا پلپلا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا''تمہارا مطلب ہے کہ تم ان چاروں کو۔کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟''اس کے حلق سے بمشکل آواز نکل رہی تھی۔

''مجھے جھوٹ اور مکاری سے نفرت ہے۔میری سچائی کا ثبوت چاہتے ہو تو یہ لو''میں نے اپنی جیبوں میں ٹھنسے چاروں پستول اس کے سامنے موجود میز پر ڈال دیے''یہ چاروں پستول میں نے تمہارے ان چاروں سور ماؤں سے چھینے ہیں۔اپنے کارندوں کو ہتھیار دیتے وقت ذرا یہ بھی تسلی کر لیا کرو کہ وہ ان کی حفاظت بھی کر سکتے ہیں یا نہیں؟''

''تم نے ان چاروں کو مار ڈالا؟''منشی جی نے پھٹی پھٹی آواز میں پوچھا۔اس کی حالت اپنے مالک سے بھی زیادہ غیر تھی۔

''نہیں! میں خواہ مخواہ کسی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا پسند نہیں کرتا۔وہ چاروں زندہ ہیں البتہ ان کی جو بھی حالت ہے' اس کے ذمے دار وہ خود ہیں۔''

کمال الدین کی حیرت میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔جو کچھ وہ سن رہا تھا وہ ناقابل یقین تھا لیکن اس پر یقین کیے بنا چارہ بھی نہ تھا''اپنے غصے کو ذرا ٹھنڈا کرو جوان''کمال الدین بالآخر خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا''ذرا اطمینان سے ہمیں بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟''

''ہونا کیا ہے خاں صاحب''میں نے اپنی آواز کو دھیما مگر مضبوط رکھتے ہوئے کہا''تمہارے بھیجے ہوئے کارندوں نے مجھ سے زبردستی رقم چھیننے کی کوشش کی۔جب میں نے مزاحمت کی تو وہ ہاتھا پائی پر اتر آئے۔ان میں سے دو کو میں نے زمین پر لٹا دیا۔تیسرا اپنے ہی ساتھی کی گولی سے زخمی ہو گیا۔چوتھے کو ان کی دیکھ بھال کرتا چھوڑ کر آیا ہوں۔''

''اوئے منشی جی تم جلدی سے جا کر چار چھ آدمیوں کو اندھی کھوئی کی طرف بھیجو۔ایسا نہ ہو کہ ان میں سے ایک آدھ ختم ہو جائے''کمال الدین کا حکم سنتے ہی منشی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

’’تم یہاں آ کر بیٹھو غلام سعید خان۔ تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں‘‘ کمال الدین خان نے بے حد پرسکون لہجے میں کہا۔

’’لیکن مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی ہے‘ کمال الدین خاں صاحب۔ تم اپنی یہ رقم سنبھالو اور مجھے اجازت دو‘ میں اب ایک منٹ یہاں نہیں رک سکتا۔‘‘

’’جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ غلام سعید خان۔ غصہ تھوک دو۔ میں مانتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا وہ غلط تھا۔ دراصل تم مجھے پسند آ گئے تھے اور میں ہر قیمت پر تمہیں اپنے ساتھ ملانا چاہتا تھا۔‘‘

’’لیکن تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ مجھ میں ایسی کیا خاص بات ہے؟‘‘ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

’’تم ابھی اس بات کو نہیں سمجھ سکو گے جوان۔ زیادہ تو نہیں کہوں گا لیکن اتنا سمجھ لو کہ میں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ تمام عمر برباد کر کے بس یہ آنکھیں ہی تو پکی کی ہیں۔ میں نے تمہیں ایک نظر دیکھا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم دراصل ایک ناتراشیدہ ہیرا ہو۔ ابھی تم نے میرے کارندوں کا جو حشر کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ میری نظر نے دھوکا نہیں کھایا ہے۔ میں اپنے کارندوں کی طرف تیز نظر سے گھورنے والے کی آنکھیں نکال لیا کرتا ہوں۔ اگر تمہاری جگہ کوئی اور میرے کارندوں پر ہاتھ اٹھاتا تو میں اس کی بوٹیاں چیل کووں کو کھلا دیتا لیکن نہیں‘ تمہارا معاملہ دوسرا ہے۔ لاکھ سیپوں میں سے کسی ایک میں سچا موتی نکلتا ہے۔ تم بھی ایک نادر و نایاب موتی ہو۔ ایسے نایاب موتی کو اپنے ہاتھ سے جانے دینا میری فطرت کے خلاف ہے میرے کارندوں میں سے ایک بھی تمہاری طرح نڈر‘ بے باک اور ذہین نہیں ہے۔ میں تمہیں خلوص دل سے پیش کش کرتا ہوں کہ میرے محافظوں میں شامل ہو جاؤ‘‘ کمال الدین کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔

مجھے نہیں معلوم کہ تم میرے بارے میں کس حد تک درست کہہ رہے ہو۔ لیکن یہ بات صاف ہے کہ میں تمہارے پاس نوکری نہیں کر سکتا‘‘ میں نے دوٹوک جواب دیا۔

’’جذبات میں آ کر فیصلہ مت کرو جوان۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔ میرے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ میں تمہاری خاطر بڑی سے بڑی رقم خرچ کر سکتا ہوں۔ تم ایک بار اپنے منہ سے مانگ کر تو دیکھو۔‘‘

اچانک میرے دماغ میں بجلی سی کوند گئی۔ میں واقعی جذبات میں آ کر سب کچھ فراموش کر بیٹھا تھا۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ہیر کو ٹیسٹ کرانے کے لیے فوری طور پر کراچی لے جانا ضروری ہے۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد ہیر کا نشتر اسپتال میں دماغ کا آپریشن ہوگا۔ اگر جلد ہی اس کا آپریشن نہ ہوا تو وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گی اور اس آپریشن کے لیے بہت بڑی رقم درکار ہے۔ ایک لاکھ روپے۔ میں اتنی بڑی رقم کہاں سے لاؤں گا؟ لیکن نہیں۔ میں اس رقم کا با آسانی بندوبست کر سکتا ہوں۔ کمال الدین خان کہہ رہا ہے کہ وہ مجھے منہ مانگی رقم دے گا۔ ایک لاکھ روپے۔ مجھے اس کے پاس ملازمت ہی تو کرنی پڑے گی۔ کیا میں اپنی ہیر‘ اپنی زندگی کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتا؟ کیوں نہیں‘ میں اپنی ہیر کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ کمال الدین مجھے ڈاکے ڈالنے کو ہی کہے گا نا! تو کیا ہوا؟ اگر کسی کو قتل کرنے کو کہے تو؟ پھر بھی کوئی بات نہیں۔ میں اپنی ہیر کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔

’’کیا سوچ رہے ہو جوان؟‘‘ کمال الدین خان نے مجھے اپنے خیالوں سے چونکا دیا۔ ’’تم نے میرے

سوال کا جواب نہیں دیا؟‘‘

’’مجھے ایک لاکھ روپے چاہئیں خان صاحب‘‘ میں نے مضبوط لہجے میں بلا جھجک کہا ’’ابھی اور اسی وقت۔‘‘

کمال الدین خان کے چہرے پر چمک سی آ گئی ’’مجھے منظور ہے‘‘ اس نے بلا تامل جواب دیا۔

’’اور پانچ ہزار روپے مہینا تنخواہ۔‘‘

’’یہ بھی منظور ہے‘‘ کمال الدین خان نے مطمئن لہجے میں کہا ’’لیکن میری بھی چند باتیں سن لو۔ میرے بے شمار دشمن ہیں۔ مجھے اپنے کارندوں پر بھروسہ نہیں ہے لہٰذا میں عدم تحفظ کے احساس کا شکار رہتا ہوں۔ تم ہر وقت میرے ساتھ رہو گے۔ آج سے تم میری زندگی کے محافظ ہو۔ میں اپنے کارندوں کو ایک بات بار بار کہا کرتا ہوں۔ وہ بات تم بھی سن لو اور ذہن نشین کر لو۔ اگر تمہیں کبھی بھی کسی بھی وقت رقم کی ضرورت ہو تو بلا جھجک مجھ سے مانگ لو۔ یقین کرو میں تمہاری طلب سے زیادہ دوں گا لیکن صرف ایک بات کا خیال رہے۔ میں نمک حرامی اور غداری کے لفظ سے بھی نفرت کرتا ہوں۔ اگر تمہاری مجھ سے نہ نبھ سکے تو مجھے صاف صاف بتا دینا۔ تمہاری جو بھی شکایت ہوگی وہ میں دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر پھر بھی معاملہ نہ سدھرا تو میں خوشی خوشی جانے کی اجازت دے دوں گا لیکن اگر...... اگر مجھے کبھی یہ علم ہوا کہ تم نے کسی بھی طرح مجھ سے غداری کی ہے تو...... پھر تمہارا جو حشر ہوگا اسے سن سن کر لوگ کانپیں گے۔‘‘

’’تم میری طرف سے بالکل بے فکر رہو کمال الدین خان۔‘‘ میں نے گھمبیر لہجے میں کہا ’’میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ جب تک میں تم سے انکار کرتا رہا‘ کرتا رہا۔ اب جب کہ میں نے ہامی بھر لی ہے تو سمجھ لو‘ میں نے اپنے آپ کو تمہارے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ اب تم مجھے جس طرح استعمال کرنا چاہو میں حاضر ہوں۔‘‘

’’مجھے تم سے یہی امید تھی جوان۔ بس صبح سے تم یہیں میرے پاس آ جاؤ۔ تمہاری جگہ کسی اور کو بھیج دیں گے۔‘‘

اسی دوران میں منشی بھی واپس آ گیا۔ اسے دیکھ کر کمال الدین خان کی باچھیں کھل گئیں ’’مبارک ہو الفت خان۔ میں نے غلام سعید کو منا لیا ہے۔ اب یہ ہمارا ساتھی ہے۔‘‘

’’بہت بہت مبارک باد خان صاحب۔ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔‘‘ منشی الفت خان کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک مجھے اس کی آنکھوں میں‘ محض ایک لمحے کے لیے‘ شدید ترین نفرت اور مخاصمت کی چمک نظر آئی۔ اگلے ہی لمحے وہ بے حد خوش و خرم نظر آنے لگا۔ میرے ذہن میں منشی الفت خان کی وہ نظر پھانس بن کر چبھ گئی۔ جانے مجھے کیوں یہ احساس ہوا کہ جیسے میں نے کمال الدین خان کی ملازمت قبول کر کے الفت خان کو ناخوش کر دیا ہے پھر میں نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔ کسی کی خوشی‘ ناخوشی سے مجھے کیا لینا دینا تھا۔ میں نے غلامی کا طوق صرف اور صرف ہیر کی خاطر پہنا تھا۔ اگر وہ تندرست ہو جاتی تو میں سمجھتا کہ گویا میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔

’’اچھا خان صاحب۔ اب میں چلتا ہوں۔ انشاء اللہ صبح سویرے یہاں پہنچ جاؤں گا۔‘‘ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

’’ٹھیک ہے جوان۔ تمہاری امانت تمہیں کل مل جائے گی ہو سکے تو صبح کا ناشتا یہیں کرنا۔‘‘ کمال الدین

خان نے کہا۔

میں نے اقرار میں گردن ہلائی اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ میں دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اچانک ایک شخص دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اس کی نظر سیدھی میرے چہرے پر پڑی اور وہ بری طرح ٹھٹک گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا' اس نے ایک جھٹکے سے اپنے کندھے پر سے کلاشنکوف اتاری اور اسے کاک کر کے مجھ پر تان لیا "اب تم بچ کر کہاں جائے گا کتے کے بچے؟" اس نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا "میں تیری لاش کے ٹوٹے کر کے چیل کوؤں کو کھلا دوں گا۔"

"یہ کیا کر رہے ہو صادق" کمال الدین خان نے مداخلت کرنا چاہی "یہ اپنا ہی بندہ ہے۔"

"یہ اپنا بندہ نہیں ہے خان صاحب" اس نے میرے سینے کا نشانہ باندھتے ہوئے کہا۔ اس کی انگلی لبلبی پر مسلسل دباؤ بڑھا رہی تھی "یہ اپنا بندہ نہیں ہے خان صاحب۔ میں نے اسے پہچان لیا ہے یہ...... یہ سردار برکت علی کا جاسوس ہے!"

نیلگوں دھند میں وہ وسیع و عریض بسترِ سمندر کے بیچ خوبصورت جزیرہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس جزیرے پر اس وقت ایک جل پری موجود تھی۔ اس کے گھنگھور گھٹاؤں جیسے ریشمی بال اس کے طلائی بدن پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ سرتاپا سونے کا مجسمہ تھی لیکن شاید اسے اپنی قدر و قیمت کا اندازہ ہی نہیں تھا اسی لیے تو وہ بیش قیمت خزانہ اتنی بے پرواہی سے جزیرے کی سرزمین پر ڈھیر تھا وہ جانے کس کے خیالوں میں گم تھی۔ اس کے لبوں کے ادھ کھلے گلاب دھیرے دھیرے لرز رہے تھے۔ اس نے سوچا ہوگا کہ اس ویران جزیرے پر ایک چور شاید پہلے سے ہی اس کی گھات لگائے بیٹھا تھا جیسے ہی اسے احساس ہوا کہ جل پری خوابوں کی دنیا میں کھو گئی ہے۔ وہ فوراً ہی اس کے پاس آن پہنچا۔ اس نے بڑی آہستگی سے اس جل پری کی گھنیری ریشمی زلفیں سنوار دیں۔ زلفوں کی سیاہ چادر ہٹتے ہی اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اس نے بمشکل خود کو سنبھالا۔ اسے گلاب شاید کچھ زیادہ پسند تھے لہٰذا وہ گلاب کی پستوں کی طرف جھک گیا۔ گلاب کے لمس نے اسے فرحت تو بخشی ہوگی لیکن ظاہر ہے اس کے لالچ کی آگ تو سونے چاندی اور ہیرے جواہرات سے ہی بجھ سکتی تھی چنانچہ اس نے جل پری کے انمول خزانے سے جواہر کی ایک جوڑی کو چن لیا۔ اسے شاید ان جواہر کی پر بھی گلاب کی کلیوں کا گمان گزرا۔ اسی لیے اس نے اُن کو بھی اپنے ہونٹوں سے چھونے کی کوشش کی لیکن اسے یہ حرکت مہنگی پڑی کیونکہ عین اسی وقت جل پری نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے اس طرح رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر پہلے تو وہ چور ذرا ٹھٹکا لیکن پھر اس نے بڑی ڈھٹائی سے سونے کے انباروں پر ہاتھ ڈال دیا۔ جل پری نے اپنے خزانوں کو بچانے کے لیے کچھ مزاحمت کی لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ وہ چور جانے اس کے کانوں میں کیا کیا پھونکے جا رہا تھا۔ اچانک اس چور کا کوئی منتر کام کر گیا اور وہ جل پری رام ہو گئی' اس نے اپنے خزانے اس چور کو سونپ دیے اب وہ خوش و خرم تھی۔ اسے اپنے خزانوں کے جانے کا کوئی غم نہ رہا۔ اس کے لبوں سے نغمگیں پپیہے پھوٹ رہے تھے۔ وہ چور بڑی بے صبری سے جل پری کے خزانوں پر قابض ہو چکی تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ جلد از جلد انہیں سمیٹ لے۔ بالآخر اسے یقین آ ہی گیا کہ اس جل پری نے یہ خزانے مکمل طور پر اسے سونپ دیے ہیں تب اسے کچھ صبر آیا اور وہ پرسکون ہو

کر جل پری کی زلفوں کے سائے میں کھو گیا۔

☆O☆

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی تیز رفتار ہنڈولے پر سوار ہوں جو پوری رفتار سے گردش کر رہا ہے۔ میں ہکا بکا سا کھڑا' اس شخص کی شکل دیکھتا رہا۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ شخص کہنا کیا چاہتا ہے۔ سردار برکت علی کا نام سن کر مجھے شدید ذہنی جھٹکا لگا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ دھماکا خیز بات یہ تھی کہ وہ شخص مجھے سردار برکت علی کا جاسوس قرار دے رہا تھا۔ اس سردار برکت علی کا جسے میں نے اپنے ہاتھوں جہنم رسید کیا تھا۔ جانے یہ شخص سردار برکت علی سے کیسے واقف تھا لیکن اگر وہ سردار برکت علی سے واقف تھا تو اس نے مجھے اس کا جاسوس کس بنیاد پر قرار دیا؟ یہ گورکھ دھندا میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس کی آنکھوں میں اترا ہوا خون صاف بتا رہا تھا کہ اسے اپنی بات کا سو فیصد یقین ہے۔ اس کا یہ یقین بلا جواز تو نہیں ہو سکتا تھا۔ کلاشنکوف کی خوفناک نال کا رخ میرے سینے کی طرف تھا' لیکن مجھ پر خوف کے بجائے حیرت کا غلبہ تھا۔

"یہ تو کیا بکواس کر رہا ہے صادق خان؟" کمال الدین خان' اپنی کھرکھراتی آواز میں گرجا "سعید خان کا سردار برکت علی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اسے تو میں نے بڑی مشکل سے اپنے ساتھ کام کرنے پر آمادہ کیا ہے۔"

"یہ سب ایک بھیانک سازش ہے خان صاحب۔ اس ہنستی بستی حویلی کو اجاڑنے کی سازش۔ آپ اسے قابو کرنے کا حکم دیں تو پھر میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دوں گا۔"

"تیرے کو کوئی غلطی تو نہیں لگی صادق خان؟" کمال الدین خان نے دھیمے لیکن متذبذب لہجے میں پوچھا۔

"نہیں خان صاحب میری آنکھوں نے آج تک میرے کو دھوکا نہیں دیا۔ میں آپ سے پھر کہتا ہوں کہ پہلے اسے قابو کرواؤ اس کے بعد میں نے جو کچھ کہا' اس کی وضاحت بھی کر دوں گا۔ اگر میری بات غلط نکلے تو آپ جو چاہے مجھے سزا دینا۔ میں بھگتنے کو تیار ہوں۔" صادق خان نے پرعزم لہجے میں کہا۔

میں نے کمال الدین کی آنکھوں میں تفکر و تردد کے آثار نمایاں ہوتے دیکھے۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورنے لگا۔ میں نے بھی جواباً اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ وہ چند لمحوں تک میرے اندرونی احساسات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا "تو کیا کہتا ہے جوان؟ سنا تو نے یہ صادق خان کیا کہہ رہا ہے؟"

میں نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن مجھ سے پہلے صادق خان بول پڑا "آپ اس سے بعد میں سوال جواب کر لینا خاں صاحب' پہلے اس کا کوئی پکا انتظام کر دو۔ بڑا خطرناک شخص ہے یہ' اگر ذرا سا بھی موقع ملا تو یہ آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

"تو نے کیا مجھے بچہ سمجھ رکھا ہے صادق خان؟" کمال الدین نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا "تو

میری فکر نہ کر میں اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں۔ تو اپنی زبان قابو میں رکھ اور مجھے اس سے بات کرنے دے۔“

”لیکن خان صاحب صادق خان کی بات ماننے پر آخر ہرج ہی کیا ہے؟ صادق خان اتنے یقین سے بات کر رہا ہے تو اس کی کوئی وجہ تو ہوگی۔ آپ تو جانتے ہیں کہ صادق کوئی غیر ذمہ دار کارندہ نہیں ہے۔“ ایک اور کارندے نے صادق خان کی سفارش کی۔

”ٹھیک ہے۔“ کمال الدین نے گھمبیر آواز میں کہا ”تم جا کر روشن اور جمالو کو بھیج دو۔ آتے ہوئے ایک رسی بھی لیتے آنا۔“ اس کی سرخ سرخ آنکھیں بدستور مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا سنگی چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ صورت حال لمحہ بہ لمحہ سنگین سے سنگین تر ہوتی جا رہی تھی۔ کمال الدین خان اور اس کے کارندوں کی گفتگو سے اتنا تو واضح ہو چکا تھا میری گولی کا نشانہ بننے والا بدنصیب سردار برکت علی، کمال الدین کا جانی دشمن تھا لیکن مجھے کس سلسلے میں سردار برکت علی کا جاسوس قرار دیا جا رہا تھا؟ جب تک صورت حال پوری طرح واضح نہیں ہو جاتی، میرا کوئی بھی قدم اٹھانا مناسب نہ ہوتا۔ اگر اس شخص کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی تو اس کی کوئی نہ کوئی ٹھوس وجہ بھی ضرور ہوگی۔ ویسے بھی وہ اس وقت شدید غیظ و غضب میں مبتلا تھا۔ اگر اسے میرے جسم کی کسی جنبش سے یہ خطرہ محسوس ہوتا کہ میں حملہ آور ہونے والا ہوں تو وہ بلا جھجک مجھے گولیوں سے چھلنی کر دیتا لہٰذا میں بے حد محتاط ہو گیا۔ میرے دونوں ہاتھ میرے سر کے پیچھے رکھے ہوئے تھے۔ ویسے بھی صادق خان میری پہنچ سے دور اور پوری طرح چوکنا تھا۔ اس کی آنکھوں سے برسنے والی نفرت کی چنگاریاں مجھے حیران کیے دے رہی تھیں۔ میں نے ابھی تک اپنی کوئی صفائی پیش نہیں کی تھی۔ جب تک صورت حال پوری طرح واضح نہ ہو جاتی، میرے کہنے سننے کی کوئی اہمیت نہ ہوتی۔

کچھ دیر بعد منشی الفت علی، اس کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ دو مسلح کارندے بھی تھے۔ ان دونوں کو میں گیٹ کے قریب دیکھ چکا تھا۔ ان میں سے ایک دراز قد اور اکہرے جسم کا مالک پختہ عمر کا بارلیش شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں ڈبل بیرل شاٹ گن تھی جس کا رخ میری جانب تھا۔ اس نے اپنی مونچھوں کو تیل میں چپڑ کر بل دے رکھا تھا۔ اس نے بھی بڑے ڈرامائی انداز میں مجھے اپنے آزمودہ تھری ناٹ تھری رائفل کی زد میں لے لیا۔ منشی الفت علی نے جانے مجھے کس انداز میں ان دونوں کے سامنے پیش کیا ہوگا۔ ان دونوں کی صورتوں سے برسنے والی خشونت مجھے بری طرح کھل رہی تھی۔ ان دونوں کو آتے دیکھ کر صادق خان کے چہرے پر اطمینان کی لہر پیدا ہوگئی۔ ”روشن علی تو اس حرامی کی تلاشی لے لیکن بڑی احتیاط سے یہ بڑا زہریلا سانپ ہے۔“

”خان صاحب اپنے کارندے سے کہو کہ اپنی زبان پر قابو رکھے۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا ”میں اب تک یہ سب کچھ اس لیے برداشت کر رہا ہوں کہ میرے خیال میں یہ سب کچھ کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی یہ بکواس واقعی مجھے اپنے اصل روپ میں آنے پر مجبور کر دے۔“

”تم اپنی زبان بند رکھو صادق خان۔“ کمال الدین نے مضطرب لہجے میں کہا ”اور تو بھی اپنے آپ پر قابو رکھ جوان، میں تجھے صفائی پیش کرنے کا پورا پورا موقع دوں گا۔ فکر نہ کر۔ جب تک تیرے پر جرم ثابت نہ ہو جائے، تجھے کچھ نہیں کہا جائے گا۔“

اب لمبے اور دبلے پتلے شخص نے بڑی مہارت اور چابکدستی سے میری تلاشی لی۔ میرے پاس چند روپوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ کمال الدین کے بھیجے ہوئے چاروں کارندوں کو بے کار کرنے کے بعد میں نے ان چاروں کے ہتھیار کمال الدین کے حوالے کر دیے تھے، اب میں بالکل نہتا تھا۔ میرا پستول کریم بابا کے گھر پر تھا۔ چنانچہ وہ شخص میرے پاس سے کچھ بھی برآمد نہ کر پایا۔ ”اس کے کول کچھ بھی نہیں ہے گودا سائیں۔“ روشن نے کہا۔

”ٹھیک ہے اس کے دونوں ہاتھ اس کی کمر پر کر کے باندھ دو۔ صادق خان تو چنگی طرح سوچ لے کہ تیرے کو اب کیا کیا کہنا ہے۔ تو نے سعید خان پر جو الزام لگایا ہے وہ بے حد سنگین ہے اگر تو اسے ثابت نہ کر سکا تو پھر تیری خیر نہیں۔“

”میں نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر سب کچھ کہا ہے سائیں۔ اگر میری بات غلط نکلے تو میں ہر سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔“ صادق خان نے پرعزم لہجے میں کہا ”روشن خان نے نائلون کی ایک رسی سے میرے دونوں ہاتھ میری پشت پر کر کے باندھ دیے۔ میں نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی۔ ویسے بھی میں اس وقت دو خطرناک ہتھیاروں کی زد میں تھا اور میری کوئی بھی حماقت مجھے سیدھا اوپر پہنچا سکتی تھی۔

میرے رہن بستہ ہوتے ہی وہاں موجود تمام افراد کے اعصاب کا تناؤ کم ہو گیا۔ ”اب تو بتا صادق خان کہ تو کیسے کہتا ہے کہ یہ جوان مرحوم سردار برکت کا جاسوس ہے؟“

”خان صاحب آپ کو یاد ہے کہ پچھلے دنوں ہم نے سردار برکت علی کی حویلی پر حملہ کیا تھا؟“ صادق خان نے پوچھا۔

”ہاں ہاں بالکل یاد ہے صادق خان۔ کیا تو نے اس جوان کو اس وقت وہاں دیکھا تھا؟“

”آپ میری بات ذرا توجہ سے سنیں خان سائیں۔ ہم نے برکت علی کی موت کے بعد آپ کے حکم پر اس کی حویلی پر حملہ کیا تھا۔ ہم لوگوں نے آپ کی ہدایت کے مطابق حویلی کے محافظوں کو سامنے کے رخ پر الجھائے رکھا جبکہ میں اور شریف حویلی کے پچھلی طرف پہنچے۔ ہماری توقع کے عین مطابق وہاں بالکل سناٹا تھا۔ ہم نے دیوار کے ساتھ سیڑھی لگا دی اور میں سیڑھی چڑھنے لگا میں حویلی کی دیوار پر لگی کانٹے دار باڑ پھلانگنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک کسی نے حویلی کی دیوار کے اندر کی طرف سے میرے سر پر پستول کا دستہ مارا جس کی وجہ سے میں سیڑھی پر سے گر کر بے ہوش ہو گیا۔ کسی حرامی نے شریف کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ آپ جانتے ہیں خان صاحب وہ کتے کا بچہ کون تھا؟ صادق خان کا چہرہ غصے سے سرخ ہوتا چلا گیا۔

”وہ...... وہ حرامی یہی تھا۔ اسی نے میرے سر پر پستول کا دستہ مارا تھا۔ اسی نے میرے سنگی شریف کو گولی ماری۔ میں نے اس کا چہرہ چنگی طرح دیکھا تھا خان صاحب۔ اگر جندو اور سلطان میرے کو اپنی

جان پر کھیل کر اٹھا کر نہ لے جاتے تو میں بھی مارا گیا تھا۔''

کمال الدین خان حیرت سے منہ پھاڑے یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ صادق خان کے طویل بیان کے دوران میں اس نے کئی بار مداخلت کے لیے منہ کھولا لیکن پھر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ سب لوگ حیرانی کے عالم میں اس کی باتیں سن رہے تھے لیکن میرے دل و دماغ کی عجیب ہی کیفیت تھی۔ صادق خان نے جونہی برکت علی کی حویلی کے پچھلے حصے کی بات چھیڑی' میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے یاد آ گیا کہ یہ وہی شخص تھا جسے میں نے پستول کا دستہ مار کر گرایا تھا۔ میرا اس کا بس ایک لمحے کے لیے سامنا ہوا تھا لیکن اول صبح کے مدھم اجالے اور حویلی کی عمارت پر روشن بلب کی روشنی میں اس نے بہت قریب سے میرا چہرہ دیکھا اور یہ چہرہ اس کی یادداشت کی کتاب میں نقش ہو کر رہ گیا۔

میری پوزیشن بے حد پیچیدہ اور نازک ہو گئی تھی۔ اس شخص نے جو کچھ کہا تھا میں اس کی تردید کس طرح کرتا؟ میں لاکھ اپنی صفائی پیش کرتا لیکن یہ حقیقت تو اٹل تھی کہ میں نے ہی کمال الدین کے کارندے شریف کی قتل کیا' میری ہی وجہ سے ان کا سارا منصوبہ درہم برہم ہوا اور انہیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ جس انداز میں میرا اور صادق خان کا آمنا سامنا ہوا تھا اس لحاظ سے اس کا یہ سمجھنا اپنی جگہ درست ہی تھا کہ میں سردار برکت علی کا کارندہ' جاسوسی کرنے کے لیے کمال الدین خان کی حویلی میں آ گھسا تھا۔ میں نے کمال الدین خان کے پلپلے چہرے کو رنگ بدلتے دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر حیرانی نہیں غیظ وغضب کے آثار تھے۔ اس کی پھیلی پھیلی خون ریز آنکھیں' مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

اب تم بتاؤ سعید خان۔ تم صادق خان کے اس بیان کے متعلق کیا کہتے ہو؟'' کمال الدین خان نے گھمبیر لہجے میں کہا'' بولنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ مجھے بندے سے سچ اگلوانا اچھی طرح آتا ہے۔ بولو! کیا صادق خان سچ کہہ رہا ہے؟...... تم...... تم جاسوس ہو؟ تم کس نیت سے یہاں آئے تھے؟''

میں سخت کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ میرے دماغ میں چکی سی چلنے لگی۔ طرح طرح کے اندیشے اور سوالات مجھ سے جواب کے طالب ہونے لگے۔ کیا میں اقرار کر لوں کہ میں نے ہی شریف کو قتل کیا ہے؟ کیا میں مان لوں کہ میں ہی تھا جس نے صادق خان کے سر پر پستول کا دستہ بجا کر ان لوگوں کی مہم ناکام بنائی تھی لیکن اس اعتراف کا سیدھا سیدھا مطلب یہ لیا جاتا کہ میں واقعی سردار برکت علی کا نمک خوار کارندہ ہوں جبکہ اصل صورت حال اس کے برعکس تھی۔ تو پھر میں کیا کروں؟ کیا کمال الدین کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں؟ کمال الدین خان' برکت علی کا جانی دشمن ہے۔ جب اسے پتہ چلے گا کہ میں نے ہی اس کے دشمن کا قصہ پاک کیا ہے تو شاید وہ اپنے کارندے کا قتل نظر انداز کر دے لیکن کیا وہ میری بات کا یقین کر لے گا؟ ذرا مشکل ہی بات ہے میرے پاس کوئی ثبوت بھی تو نہیں ہے۔ جبکہ حالات و واقعات میرے خلاف گواہی دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

''چپ کیوں ہو خان؟ جواب دو۔'' کمال الدین خان نے پھنکارتے ہوئے کہا'' تمہاری خاموشی تمہارے جرم کی گواہی دے رہی ہے۔ جلد از جلد زبان کھولو۔ ایسا نہ ہو کہ میں تمہارے بولنے سے پہلے ہی تمہاری قسمت کا فیصلہ سنا دوں۔''

''کمال الدین خان' ابھی کچھ دیر پہلے جب میری اور تمہاری بات ہو رہی تھی تو تم نے کہا تھا کہ تمہیں بندے کو پہچاننا آتا ہے جبکہ میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں موت سے ڈرنے والا انسان نہیں ہوں۔ میں نے تم سے وفاداری کا اقرار کیا تھا اور اس اقرار پر اب تک قائم ہوں۔''

''ادھر ادھر کی بکواس مت کرو۔'' کمال الدین خان نے دھاڑتے ہوئے کہا'' صاف صاف بتاؤ کہ کیا تم نے ہی میرے کارندے شریف خان کو قتل کیا تھا؟ کیا واقعی تم سردار برکت علی کی حویلی سے بھیجے ہوئے جاسوس ہو؟''

''اگر میں اقرار کر لوں تو تم مجھے کیا سزا دو گے' کمال الدین خان؟''

''تمہاری جو سزا ہو گی وہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے' سعید خان۔'' کمال الدین نے بھاری آواز میں کہا'' لیکن مجھے ساری عمر افسوس رہے گا کہ میری نظر نے مجھے دھوکا دیا۔''

''تمہاری نظر نے تمہیں دھوکا نہیں دیا' کمال الدین خان۔ میں واقعی تمہارا دشمن نہیں ہوں۔'' میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

''تمہارا مطلب صادق خان جھوٹ بول رہا ہے؟''

''نہیں صادق خان نے جھوٹ نہیں بولا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں برکت علی کا جاسوس نہیں ہوں۔''

''مجھے پہیلیوں میں بات کرنے سے سخت نفرت ہے جوان۔ جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہہ دو۔ تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔''

''میری بات غور سے سنو کمال الدین۔ قسمت کبھی کبھی انسان کو ایسی جگہ پھنسا دیتی ہے جہاں وہ سچ بھی بولے تو اسے جھوٹا سمجھا جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی اس وقت یہی صورت حال ہے۔ میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں' وہ شاید تمہارے لیے ناقابل یقین ہو۔''

''میری برداشت کی حد ختم ہو رہی ہے' سعید خان جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہہ دو' سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کرنا مجھے آتا ہے۔'' کمال الدین خان نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔

''میں کہنا یہ چاہتا ہوں کمال الدین خان کہ واقعی میں نے تمہارے کارندے شریف خان کا خون کیا ہے لیکن......'' میری بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ کمال الدین خان کے منہ سے مغلظات کا طوفان ابل پڑا۔ وہ چیل کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑا اور میرے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ میں نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن جمالو نے میری کمر میں اپنی رائفل کی نال گاڑ کر مجھے پیچھے ہٹنے سے روک دیا۔ میرے چہرے پر آگ سی بھڑک اٹھی۔ میرے دونوں رخساروں میں انگارے دہک اٹھے۔ چند ہی لمحوں بعد میرے چہرے کی جلد سن ہو گئی۔ تب کمال الدین خان کے ہاتھ رک گئے۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

''میں نے تجھے کہا تھا سعید خان کہ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن غداری برداشت نہیں کر سکتا۔ تو نے میری آستین کا سانپ بننے کی کوشش کی اب دیکھ میں تیرا کیا حشر کرتا ہوں۔''

میرے چہرے پر پڑنے والا ہر تھپڑ میرے لہو کی گردش میں اضافہ کرتا رہا۔ میرے اندر سویا ہوا وحشی

سیف داد خان جھرجھری سی لے کر بیدار ہو رہا تھا۔ بے بسی کے احساس نے مجھے مزید آگ بگولا کر دیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس غلیظ شیطان کا خون پی جاؤں۔ وہ بد بخت میری بات سننے کا بھی روا دار نہیں تھا۔ میں نے خونی نظروں سے اسے گھورا۔ وہ خود بھی مجھے گھور رہا تھا۔ اس کا سانس ابھی تک ہموار نہیں ہو پایا تھا۔ میرے گھور کر دیکھنے سے وہ ایک بار پھر مشتعل ہو گیا اور گالیاں بکتا ہوا مجھ پر جھپٹا' اب میں مزید مار کھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ جونہی میرے قریب پہنچا میں نے اچھل کر اس کے پیٹ میں لات مار دی۔ اس کے منہ سے ہائے کی آواز نکلی اور وہ اپنا پیٹ پکڑ کر لڑکھڑاتا ہوا ایک صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ میری اس حرکت کا جو نتیجہ نکل سکتا تھا وہی نکلا۔ جونہی میں نے کمال الدین خان کے پیٹ میں لات ماری' اس کے تینوں مسلح کارندے بھوکے درندوں کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ ان کی گنوں کے بٹ میں جسم کے چپے چپے سے حساب طلب کرنے لگے۔ میں نے فرش پر کروٹیں بدل کر خود کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن بے سود پھر رفتہ رفتہ میرے ہوش و حواس میرا ساتھ چھوڑ گئے اور میں بے ہوشی کی مہربان آغوش میں پہنچ گیا۔

بے ہوشی کا وہ وقفہ شاید کئی گھنٹے طویل تھا۔ میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک چارپائی کے ساتھ جکڑے پایا۔ میرے دونوں ہاتھ چارپائی کے سرہانے کے پایوں سے منسلک کر کے رسی سے جکڑ دیئے گئے تھے۔ جبکہ دونوں پاؤں چارپائی کی پائنتی سے بندھے ہوئے تھے۔ میرے جسم کی جو حالت تھی' وہ کچھ میں ہی جانتا تھا۔

وہ ایک بڑا سا کمرا تھا جس میں فرنیچر کے نام پر ایک بڑی اور ایک چھوٹی چارپائی پڑی تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک تپائی پر ایک بڑا سا ریڈیو رکھا تھا جس پر گوٹے والا سرخ کپڑا چڑھا تھا۔ کمرے کی دیواریں اور چھت پختہ تھیں جبکہ فرش کچا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ مکان ابھی زیر تعمیر ہے۔ چھت پر بلب ہولڈر تو موجود تھا لیکن اس میں بلب نہیں تھا۔ وہ دوپہر کا وقت ہو گا لیکن بند دروازے کی وجہ سے کمرے میں پوری طرح روشنی نہیں تھی۔

میں نے رسی کے ساتھ کھینچا تانی کی کوشش کی لیکن رسی کے جکڑ بند بے حد مضبوط تھے۔ ''تیرا قصور نہیں ہے سیف داد خان۔'' میں نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا ''شاید تیری تقدیر میں در در کی ٹھوکروں کے علاوہ کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔ وہ جو فقیر بابا کہتا تھا کہ تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ وہی تیرا حساب ہے۔'' ہر گزرتے پل کے ساتھ میری مایوسی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

سہ پہر کے قریب میں نے دو اشخاص کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز سنی اور پھر کسی نے دروازہ کھول دیا۔ ان میں سے ایک کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ وہ جمالو تھا جبکہ دوسرا میرے لیے اجنبی تھا۔ اس وقت جمالو کے شانے پر تھری نٹ تھری کی جگہ کلاشنکوف تھی جبکہ اس کا ساتھی شاٹ گن اٹھائے ہوئے تھا۔

''لے بھئی جمالو' تیرے مہمان کو تو ہوش آ گیا۔'' شاٹ گن والے نے دانت نکالتے ہوئے کہا' اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں۔ اس کے دانت لمبے لمبے اور پیلے تھے۔ اس کو شاید بچپن ہی

سے نسوار کی لت لگ گئی تھی۔ اس کے لہجے میں عجیب سی لچک تھی۔ ''سنا بھئی رستم خان کیا حال ہے تیرا؟''

''ہردم تیڈا ای خیال ہے میڈے سوہنے شہزادے۔'' میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ''گھر سے نکلتے وقت ماں سے سرمے کا ٹکا لگوا لیا کر' تیرے نظر لگ گئی تو میرے جیسوں کی محفل اجڑ جائے گی۔''

''بہت بکواس کرتا ہے تو کتے کے پتر۔'' جمالو نے سخت غصے میں کہا ''فکر نہ کر جلد ہی تیری ساری مستی نکل جائے گی۔ صمدو تو اس سے منہ ماری نہ کر۔''

صمدو نامی اس شخص نے آنکھیں نکال نکال کر مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش کی لیکن میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر کھسیانا سا ہو گیا۔ ''شریف خان میرا جگری یار تھا۔ ذرا کمال الدین خان سے اجازت مل جائے پھر دیکھنا' میرے ہاتھوں تیرے کتنے ٹوٹے ہوتے ہیں۔''

جمالو نے قہر آلود لہجے میں کہا ''لیکن میرے سے پہلے تو خان صاحب خود تیری کھال اتارے گا۔ کمال الدین پر ہاتھ اٹھا کر تو نے اپنی موت کو دعوت دے دی ہے۔''

''زیادہ بڑکیں مارنے کی ضرورت نہیں ہے' خان صاحب کے ٹٹو۔ ہمت ہے تو ذرا میرے ہاتھ پیر کھول پھر میں تیرے کو بتاؤں گا کہ ٹوٹے کیسے کیے جاتے ہیں۔'' میں نے اسے اکسانے کی کوشش کی۔

''فکر نہ کر تیری ساری حسرتیں نکالوں گا۔ بس ذرا سا صبو کر لے۔''

میں نے اس کی بک بک کا مزید کوئی جواب نہ دیا۔ میں بابا کریم بخش اور ہیر کے متعلق سوچ رہا تھا۔ پتا نہیں کمال الدین نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو گا۔ بابا کریم بخش نے مجھے اپنا رشتے دار بتایا تھا۔ کمال الدین' کہیں اسے بھی سازش میں شریک قرار نہ دے دے۔ ہیر تو ویسے بھی سخت بیمار تھی وہ تو کسی بھی قسم کی بدسلوکی برداشت نہیں کر سکے گی۔ مجھے اصل فکر یہ تھی کہ کہیں کریم بابا اور ہیر بھی مجھے سردار برکت علی کا جاسوس نہ سمجھ لیں۔ اگر ایسا ہوتا تو میری دنیا اندھیر ہو جاتی۔ میں نے تو ہیر کی خاطر کمال الدین کی غلامی قبول کر لی تھی۔ بڑی مشکل سے تو ان کی ایک بدگمانی دور کی تھی۔ یہ دوسری بدگمانی تو شاید انہیں مجھ سے اتنا دور کر دیتی کہ میں اپنی جان دے کر بھی ان کا شک دور نہ کر پاتا۔

جانے کیا بات تھی کہ مجھے اپنے متعلق ذرا سی بھی فکر نہیں تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ کوئی کھیل ہو رہا ہو اور جلد ہی میں پھر سے آزاد ہوں گا۔ مجھے کمال الدین کے متعلق سوچ کر بھی غصہ نہیں آیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے متعلق وہ غلط فہمی کا شکار تھا۔ اگر اس کی غلط فہمی دور ہو جاتی تو وہ ہرگز میرے ساتھ اس قسم کا سلوک نہ کرتا۔

صمدو اور جمالو آپس میں سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ اب وہ میری طرف سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ پھر جمالو بڑی والی چارپائی پر دراز ہو گیا۔ صمدو نے اپنی شاٹ گن اپنی چارپائی کے ساتھ لگا کر کھڑی کر رکھی تھی۔ وہ کچھ دیر تک مجھے گھورتا رہا جب میں نے کوئی توجہ نہ دی تو وہ اکتا کر اٹھ کھڑا ہوا اور تپائی پر رکھا ہوا ریڈیو اٹھا لایا۔ وہ کچھ دیر ریڈیو کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا رہا پھر اس نے ریڈیو کو ملتان اسٹیشن پر سیٹ کر دیا۔ ریڈیو پر اناؤنسر نے کچھ اعلان کیا اور پھر میری توجہ سے بلند ہونے والی مردانہ آواز پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ عنایت حسین بھٹی کی پرسوز آواز نے ماحول پر جادو سا کر دیا۔

پچھ پچھ ہاریاں اکھیاں دل توں کدھن ہوسی دیدار؟
سوہنا مل سی کیہڑے وار؟ سانول ملسی کیہڑے وار؟

آنکھوں کا تو ہمیشہ دل سے یہی سوال رہا کرتا ہے کہ آخر وہ کون سا خوش نصیب دن ہوگا جب دلبر کی من موہنی صورت نظروں کے سامنے ہوگی؟ کب ان پیاسی آنکھوں کو دیدار کی ٹھنڈک نصیب ہوگی؟ کیا وہ بھی میرے لیے اتنا ہی بے قرار ہوگا جتنا میں اس کے فراق میں بے تاب ہوں؟ کون جانے یہ زندگی پھر کبھی ملنے کا موقع دے یا نہ دے۔ ایک بار تو آن ملو۔

کتنے ہی دن بعد میرے دل کے نہا خانوں میں چھپی' کسی کی دل آویز تصویر' میرے حواس پر چھانے لگی۔ مہراں کو میں اپنی دانست میں بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا لیکن وہ تو اب بھی ہر وقت ہر گھڑی میرے ساتھ تھی۔ وہ تو اتنی صابر وشاکر تھی کہ اس نے کبھی میری توجہ کا مطالبہ بھی نہیں کیا۔ کبھی نہیں کہا کہ تم مجھے کیوں نظر انداز کر رہے ہو۔ اس نے تو اس وقت بھی کوئی احتجاج نہیں کیا جب میرے دل نے بے اختیار ہیر کے لیے مچلنا شروع کر دیا۔ نہیں مہراں نے تو میرے دل کی مالک ہو کر بھی ایک نئے مکین کے لیے گنجائش پیدا کر لی تھی۔ اسے تو صرف اور صرف میری خوشنودی درکار تھی۔ میری خوشی کے لیے تو وہ اپنا سب کچھ قربان کر سکتی تھی۔ شاید اسی کا نام محبت ہے۔ محبت بھی وہ جو عبادت کے قریب ہو جائے۔

میں جانے کب تک مہراں کے خیالوں میں گم رہا حتی کہ شام ہو گئی۔ مغرب کا وقت ہوگا جب صمدو اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ جب وہ واپس لوٹا تو اس کے ہاتھ میں روٹی کی چنگیر تھی۔ اس نے وہ چنگیر جمالو کے سامنے پڑی چارپائی پر رکھ دی اور خود بھی اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ گرم گرم روٹیوں اور آلو گوشت کے سالن کی خوشبو نے مجھے یاد دلایا کہ میرا پیٹ کسی مفلس کے گھر کی طرح خالی ہے۔ میرے پیٹ میں آگ سی بھڑک اٹھی۔ جمالو مجھے خشمگیں آنکھوں سے گھورنے لگا۔ ''اپنی منحوس آنکھوں کو پرے پھیر لے خبیث انسان۔ کیوں ہمارے کھانے میں زہر ملا رہا ہے۔'' میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ جمالو نے ابھی پہلا ہی لقمہ منہ میں ڈالا تھا کہ اسے زبردست اچھو لگا اور وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ صمدو نے فوراً اسے پانی پلایا لیکن وہ بدستور کھانستا رہا۔ بڑی مشکل سے اس کی حالت سنبھلی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ بار بار گلا سہلا رہا تھا۔

''بڑی کمینی نظر ہے اس کتے کے بچے کی۔'' جمالو نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''کھانا اٹھا کر باہر لے چل ورنہ اس کی پلید آنکھیں ہمارے پیٹ میں درد کر دیں گی۔''

صمدو نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور وہ دونوں کھانا اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ کمرے میں موجود واحد لالٹین بھی ان کے ساتھ ہی باہر چلی گئی۔ ان دونوں نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی کمرے میں مکمل تاریکی چھا گئی۔ میں کافی دیر تک ان دونوں کا منتظر رہا لیکن وہ واپس نہ آئے۔ مجھے شدید بھوک اور پیاس لگ رہی تھی۔ میں ان سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے کھانا نہیں تو کم از کم پانی ہی پلا دیں۔ میں نے کافی دیر تک ان دونوں کا انتظار کیا لیکن انہیں نہ آنا تھا اور وہ نہ آئے۔ میری پیاس میری برداشت کی آخری حدوں کو چھونے لگی۔ کمرے میں پھیلی تاریکی نے مجھے

علیحدہ اندھا کر رکھا تھا۔

اور پھر وہ وقت آن پہنچا جب میری برداشت جواب دینے لگی۔ میرے پیٹ میں بھڑکتی ہوئی آگ میری رگوں میں دوڑتے خون میں شامل ہو گئی۔ میرے جسم کے پٹھے اکڑنے لگے۔ میں نے اپنے جسم کی تمام قوت اپنے بازوؤں میں مرکوز کر کے رسیاں توڑنے کے لیے زور لگانا شروع کر دیا۔ وہ رسیاں بڑی مضبوطی سے میرے ہاتھ جکڑے ہوئے تھیں۔ لیکن میں کسی بھی صورت ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے اپنا پورا زور لگا دیا لیکن ان رسیوں کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ مجھ پر مایوسی سی طاری ہونے لگی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ کل صبح سے میری جسمانی طاقت گھٹنے لگے گی۔ کل رات تک تو شاید میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ پھر تو میں کچھ بھی نہ کر پاؤں گا۔ مجھے جو کچھ کرنا ہے وہ آج ہی رات کرنا ہوگا۔

انسان کی بے شمار کمزوریوں میں سے ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ اسے ہمیشہ اس وقت خدا یاد آتا ہے جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو چکا ہو۔ ورنہ وہ ہمیشہ یہی سمجھتا رہتا ہے کہ سب کچھ اس کی دسترس میں ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے البتہ جب اس پر بے بسی طاری ہونے لگتی ہے تو اسے رب ذوالجلال کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس وقت مجھ پر مایوسی کا غلبہ ہوا تو مجھے بھی اپنے پاک پروردگار کی یاد آئی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا ''اے پروردگار تو نے مجھے مشکل سے آزمائش کے ہر مرحلے پر سرخرو کیا ہے تو جانتا ہے کہ میں کتنا بے بس ہوں۔ اب بھی میری مدد فرما میرے مالک۔''

میری آنکھوں سے جونہی آنسو ٹپکے مجھے اپنے دل میں سکون کی لہر اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اب میرا ذہن ہر قسم کی تشویش اور اندیشوں سے پاک ہو چکا تھا۔ اب مجھے اپنے انجام کی پروا نہ تھی۔ کچھ دیر کے بعد میں نے ایک بار پھر اپنے ہاتھوں سے بندھی رسیوں سے زور آزمائی شروع کر دی۔ مجھے اپنی رگوں میں ایک نئی توانائی گردش کرتی محسوس ہونے لگی۔ میں نے اپنا پورا زور لگا دیا۔ اچانک ایک ہلکی سی کھٹاک کی آواز آئی۔ اور مجھے اپنے سیدھے ہاتھ پر رسیاں ڈھیلی پڑتی محسوس ہوئیں۔ میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ میرے دائیں ہاتھ کی رسی کہیں سے ٹوٹ چکی تھی۔ خداوند کریم نے ایک بار پھر میری حالت پر رحم کیا تھا۔

میں نے چند جھٹکے دے کر اپنا دایاں ہاتھ رسیوں سے چھڑا لیا۔ بائیں ہاتھ پر بندھی ہوئی رسی کی گرہیں اس تاریکی میں کھولنا بہت مشکل تھا لیکن اس وقت میرے حوصلے آسمان کو چھو رہے تھے۔ چنانچہ مجھے کوئی مشکل' مشکل نہیں لگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کی جدوجہد کے بعد میں نے اپنا بایاں ہاتھ بھی آزاد کرا لیا۔ دونوں ہاتھ آزاد ہوتے ہی میں چارپائی پر اٹھ بیٹھا۔ پیروں کی رسیاں کھولنے میں مجھے زیادہ دیر نہ لگی۔ پوری طرح آزاد ہونے کے بعد میں نے نہایت آہستگی سے زمین پر قدم رکھا۔ مجھے اس چارپائی سے بندھے آج دو دن ہو چلے تھے لیکن ان بدبختوں نے میرے کھسے تک اتارنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ میرے جسم پر فالج کی سی کیفیت طاری تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دے کر دوران خون کو معمول پر لانا چاہا لیکن میرے حلق سے ہلکی سی کراہ خارج ہوئی۔ میں اپنے جسم پر لگی چوٹوں کو تو بھول ہی چلا تھا

لیکن وہ چوٹیں اتنی بھی معمولی نہ تھیں کہ انہیں اتنی آسانی سے فراموش کیا جا سکتا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد میں اندازے سے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ کسی چیز کا ہیولا تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ دروازہ میرے اندازے سے قدرے پہلے ہی میرے سامنے آ گیا اور میں اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ میں نے دروازے کے ساتھ کان لگا کر باہر کی سن گن لینے کی کوشش کی۔ باہر مکمل سناٹا تھا تاہم مجھے یقین تھا کہ صمد اور جمالو کہیں آس پاس ہی سو رہے ہوں گے۔ پتا نہیں انہوں نے کمرے کے دروازے پر صرف کنڈی لگا رکھی تھی یا کوئی قفل بھی لگایا ہوا تھا۔ میں نے دروازے کو ہلا نے جلانے کی کوشش کی وہ باہر سے بند تھا۔ مجھ پر ہلکی سی مایوسی طاری ہوئی لیکن میں نے سر جھٹک کر تمام مایوس کن خیالات اپنے دماغ سے نکال دیے۔

میں کوئی ایسی ترکیب سوچ رہا تھا جس کی مدد سے میں کمرے کا دروازہ کھول سکتا۔ مصیبت یہ آن پڑی تھی کہ اگر میں شور شرابا کرتا اول تو وہ دروازہ نہ کھولتے اور بالفرض وہ دروازہ کھول بھی دیتے تو کسی غیر متوقع صورت حال سے نمٹنے کے لیے وہ پوری طرح چوکنا ہوتے۔ مجھے کوئی ایسی ترکیب سوچنا تھی کہ وہ میری طرف سے کسی شبے میں مبتلا ہوئے بغیر دروازہ کھول دیتے۔

کافی دیر کی سوچ بچار کے بعد میں نے ایک مناسب ترکیب سوچ لی۔ اگرچہ اس ترکیب کی کامیابی بھی یقینی نہ تھی تاہم میں نے اسے آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس کونے کی طرف بڑھا جہاں تپائی پر ریڈیو پڑا ہوا تھا۔ گھپ اندھیرے میں وہ چند قدم کا فاصلہ عذاب بن گیا۔ میں راستے میں چھوٹی چارپائی سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ چارپائی کے سرہانے کے قریب ہی وہ تپائی رکھی ہوئی تھی جس پر ریڈیو موجود تھا۔ میں نے وہ ریڈیو اپنی بغل میں دبا لیا اور قدم بہ قدم دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ اب مجھے راستے کی رکاوٹوں کا اندازہ ہو چلا تھا۔ لہٰذا میں بغیر ٹھوکر کھائے دروازے کے پاس پہنچ گیا۔

میں نے وہ ریڈیو دروازے کے قریب، کچی زمین پر رکھ دیا۔ وہ تین بینڈ کا قدیم طرز کا ریڈیو تھا۔ میں نے ریڈیو کو ایف ایم بینڈ پر لگا دیا اور نہایت آہستہ آواز میں اسے آن کر دیا۔ ریڈیو میں سے سیٹی کی سی ہلکی ہلکی آواز خارج ہونے لگی۔ میں نے ریڈیو کی ناب کو تھوڑا سا گھمایا...... اچانک ریڈیو میں سے ایسی آوازیں خارج ہونے لگیں جیسے بہت ہی بلیاں آپس میں لڑ رہی ہوں۔ میں نے ایک دم ریڈیو کی آواز اچھی خاصی زیادہ کر دی۔ کمرے میں کریہہ آوازیں گونجنے لگیں۔ چند لمحوں تک کمرے میں بلیوں کی چیخیں گونجتی رہیں۔ میرے کان باہر کی جانب لگے ہوئے تھے۔ تب میں نے کسی کے زور سے بولنے کی آواز سنی۔ وہ صمد کی آواز تھی۔ وہ بلند آواز میں نہ معلوم کیا کیا بک رہا تھا۔ وہ دروازے کے قریب آ کر چیخا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ ریڈیو کس نے کھولا ہے؟''

''تو خود اسے کھلا چھوڑ کر گیا ہوگا۔'' میں نے دروازے سے ذرا دور ہٹ کر کہا ''خدا کے لیے اسے جلدی سے بند کر دو میرے کانوں میں درد ہونے لگا ہے۔

''تم خود بند کر دو نا اسے۔ مجھے تو یاد نہیں کہ میں نے اسے بند کیا تھا یا نہیں۔''

''اوئے پاگل دے پتر تیرے کو پتا نہیں کہ میں چارپائی سے بندھا ہوا ہوں۔ تو جلدی سے اپنے مامے کو چپ کرا۔''

''اچھا۔۔۔ زیادہ بکواس نہ کر، ابھی بند کرتا ہوں۔'' صمد نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ میں پوری طرح چوکنا ہو گیا۔ دروازے پر ہلکی سی کھٹ پٹ ہوئی اور پھر کسی نے دروازہ کھول دیا۔ سب سے پہلے لالٹین لیے ہوئے ایک ہاتھ اندر داخل ہوا۔ میں دروازے کے عقب میں چھپا ہوا تھا۔ صمد دو قدم آگے بڑھا۔ اس نے اپنی رائفل کاندھے پر لٹکا رکھی تھی۔ تب اس کی نظر اچانک چارپائی پر پڑی اور وہ بری طرح چونک پڑا۔ اس نے لالٹین زمین پر رکھی اور اپنے کاندھے سے رائفل اتارنے کی کوشش کی۔ میں بھلا اسے اتنی مہلت کہاں دیتا۔ میں بجلی کے کوندے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑا۔ میرے دائیں ہاتھ کا گھونسا اس کی گدی پر پڑا۔ ضرب کھاتے ہی وہ بری طرح لڑکھڑا گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کی مہلت نہ دی۔ میرے لگاتار گھونسے اس کی پسلیوں، منہ اور کنپٹی پر پڑے۔ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلیں۔ اس نے اپنے دفاع کے لیے ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میرا ایک زوردار گھونسا اس کی کنپٹی پر پڑا اور وہ لہراتا ہوا زمین پر پڑی لالٹین سے ٹکرا گیا۔ ایک چھناکے سے لالٹین کی چمنی چور چور ہو گئی اور لالٹین بجھ گئی۔ اس سے نکلنے والا مٹی کا تیل کچی زمین میں جذب ہونے لگا۔

میں نے پھرتی سے صمد کے جسم کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ اس کے پاس معمولی رقم کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ میں نے اسے وہیں چھوڑا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ کمرے کے دروازے کے کنڈے میں ایک تالا لٹکا ہوا تھا۔ اس کی چابی بھی اس میں لگی ہوئی تھی میں نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور تالا لگا کر چابی گھما دی۔ چابی کو دور تاریکی میں اچھال کر میں نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ کمرے کے اندر کی نسبت باہر تاریکی اتنی گاڑھی نہیں تھی۔ سامنے ہی دو چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس وقت دونوں چارپائیاں خالی تھیں۔ میں نے ان چارپائیوں پر بچھی دریوں پر پڑی ہوئی سلوٹوں سے اندازہ لگایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے ان دونوں چارپائیوں پر دو افراد محوِ خواب تھے۔ جمالو نامی وہ تندخو شخص جانے کس طرف نکل گیا۔ میں نے ایک چارپائی پر سرہانے رکھے تکیے کو اٹھایا میری نظروں کے سامنے ایک سیاہ ریوالور پڑا تھا۔ میں نے جلدی سے وہ ریوالور اپنے قبضے میں کر لیا۔ سرد فولاد کا لمس محسوس ہوتے ہی مجھے اپنی توانائی دوگنی ہوتی محسوس ہوئی۔ پچھلے کچھ عرصے سے میں جس قسم کے حالات سے گزر رہا تھا اس کے پیش نظر بغیر ہتھیار کے میں خود کو ادھورا محسوس کرتا تھا۔ بتیس بور کا وہ دیسی ریوالور اور اس وقت مجھے اپنا بچھڑا ہوا محبوب لگا۔

مکان کے دروازے میں اندر سے کنڈی نظر آئی۔ میں نے احتیاط سے کنڈی کھولی اور باہر کا جائزہ لیا۔ وہ مکان آبادی سے بالکل الگ تھلگ بنا ہوا تھا۔ میں مکان سے نکلا اور نہایت احتیاط سے قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں کس جگہ موجود ہوں۔ وہ مکان کمال الدین کے ایک بھٹے کے قریب واقع تھا۔ یہ بھٹا گاؤں سے اچھا خاصا دور تھا۔ میں تیز رفتاری سے گاؤں کی مخالف سمت میں چلنے لگا۔ فی الحال گاؤں کی جانب جانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ مجھے کوئی مناسب پناہ گاہ میسر آ جاتی تو پھر میں اپنے لیے کوئی لائحہ عمل ترتیب دیتا۔ فی الحال تو جان بچانا ہی میری

سب سے پہلی ترجیح تھی۔

میں نے تیز تیز چلتے ہوئے جلد ہی کافی فاصلہ طے کرلیا۔ اس وقت میں ایک چھدرے جنگل سے گزر رہا تھا۔ مجھے صرف اندازہ تھا کہ میں جنوب کی جانب چلا جا رہا ہوں۔ میں ذرا دم لینے کے لیے ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے شدید بھوک اور پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ جب انسان بھوک اور پیاس کی آخری حد تک پہنچ جائے تو اس کی آنکھیں اور کان' اسے دھوکا دینے لگتے ہیں۔ اس کی آنکھیں اسے ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ دکھاتی ہیں۔ اس کے کان اسے جھرنوں کی رل ترل سناتے ہیں لیکن میری ناک مجھے دھوکا دینے لگی تھی مجھے اس جنگل بیاباں میں گوشت بھنے کی خوشبو آ رہی تھی۔ مجھے اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی۔ میں نے اس وہم کو اپنے دماغ سے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میری ناک میں پہنچنے والی بھنے گوشت کی خوشبو کی لپٹیں کچھ اور بھی تیز ہو گئیں۔ پھر میرے کان بھی مجھے فریب دینے لگے۔ میں نے کسی کے قہقہے کی آواز سنی۔ مجھے اپنا خیال تبدیل کرنا پڑا۔ یہ وہم نہیں تھا۔ میں نے دوسری بار بھی قہقہے کی آواز سنی۔

میرے ذہن میں تجسس جاگ اٹھا۔ میں اندازے سے اس طرف بڑھنے لگا جدھر سے قہقہے کی آواز سنائی دی تھی۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا' میرے نتھنوں سے ٹکرانے والی گوشت کی مہک بڑھتی چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد میں ایک چھوٹے سے مکان کے پاس پہنچ گیا۔ اسے مکان سے زیادہ ایک حجرہ کہنا مناسب ہوگا۔ یہ حجرہ گھنے درختوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ اس کا دروازہ بند تھا لیکن کواڑوں میں موجود درزوں سے روشنی جھانک رہی تھی۔ حجرے کے قریب پہنچتے ہی میرے کانوں میں باتیں کرنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آنے لگیں۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور اپنے کان کوٹھری کے دروازے کے ساتھ لگا دیئے۔

''یار جیرے' اب ذرا بوتل کا بھی نظارہ کرا دے تیری قسم بڑی طلب ہو رہی ہے۔''

''ابے چھوڑ۔ تیرا کیا ہے۔ دو چار چسکی لگاتے ہی تجھے چھوکری یاد آئے گی۔ اس جنگل بیابان میں میں کہاں سے چھوکری لا کر دوں گا۔'' جونہی اس شخص نے بات ختم کی' کمرے میں ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ وہ کئی آدمی تھے جنہوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا تھا۔ ایک بار پھر وہ پہلے والا شخص بولا ''نہ تڑپا میرے یار جیرے۔ اب نکل بھی لے اس لال پری کو۔''

''میری بات غور سے سن لو تم تینوں۔'' ایک اور آواز بلند ہوئی۔

''تم لوگ پیو ضرور لیکن اتنی نہ پی جانا کہ مست ہو جاؤ۔ تمہیں بے حد اہم کام کرنا ہے۔ یوں سمجھو کہ ہم چاروں کی قسمت کا دارومدار اس کام پر ہے۔'' مجھے وہ آواز مانوس سی محسوس ہوئی۔

''میں اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے جیرے کی آواز سنی ''تم فکر نہ کرو منشی جی۔ تھوڑا بہت پینے سے ہمارا کچھ نہیں بگڑنے والا۔ ہم اس خان صاحب کی حویلی کی ایسی صفائی کریں گے کہ تمہارا جی خوش ہو جائے گا۔''

جیرے نے میری مشکل آسان کر دی۔ میں نے اس مانوس آواز کو پہچان لیا۔ وہ الفت علی خان کی

آواز تھی۔ کمال الدین خان کا منشی! لیکن وہ لوگ کون سے خان صاحب کی بات کر رہے تھے؟ کیا کمال الدین خان؟ نہیں ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟ میں سوچتا رہا کہ میں نے ایک بار پھر منشی الفت علی خان کی آواز سنی۔ ''اب تم لوگ جلدی جلدی تیار ہو جاؤ۔ میں نے حویلی کا انتظام پکا کر رکھا ہے۔ اس حویلی میں روشن اور نوازش کے علاوہ کوئی کارندہ نہیں ہے۔ ان دونوں کو اللہ ڈیوائی نے بے ہوشی ملا کر کھانا کھلا دیا ہوگا۔ تمہیں صرف کمال الدین خان سے نمٹنا پڑے گا۔ وہ شام سے ہی ڈیوائی کا ہاتھ تھام کر اپنے کمرے میں گھس گیا تھا۔ ڈیوائی سے کمرے سے نکلنے نہیں دے گی۔ میں تم سے پہلے ہی حویلی میں پہنچ جاؤں گا۔ تمہیں حویلی کا گیٹ صرف بھڑا ہوا ملے گا۔ حویلی کا اندرونی بڑا دروازہ بھی کھلا ہوگا۔ میں یہ سب باتیں اس لیے دوہرا رہا ہوں کہ تم انہیں اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ کمال الدین بڑا کایاں شخص ہے۔ تم سے ذرا بھی غلطی ہوئی تو وہ فوراً بھانپ جائے گا کہ یہ ہماری ملی بھگت ہے۔'' جوں جوں منشی الفت علی خان کی تقریر آگے بڑھ رہی تھی' میری حیرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کمال الدین کا معتمد ترین دست راست آستین کا سانپ بن کر اسے ڈسنے والا تھا۔

''تمہیں میرے کمرے کا دروازہ بھی کھلا ملے گا۔ تم مجھے اپنی رائفلوں کی زد میں لے لینا۔۔ حویلی میں کمال الدین کے علاوہ کوئی نہ ہوگا۔ لہٰذا کہیں سے کسی قسم کی مداخلت کا خطرہ نہیں ہے۔ میں کمال الدین سے کمرے کا دروازہ کھلواؤں گا۔ جونہی وہ دروازہ کھولے تم اسے بھی گھیر لینا۔ پھر تم کمال الدین کے سامنے ہی سر پر رائفل کا بٹ مارنا لیکن خدا کے لیے ہاتھ ہلکا ہی رکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ میری کھوپڑی کے ٹکڑے ہو جائیں۔ ضرب لگتے ہی میں ڈھیر ہو جاؤں گا اور جھوٹ موٹ کا بے ہوش ہو جاؤں گا۔ تم کمال الدین کو بھی بٹ مار کر بے ہوش کر دینا۔ مجھے تجوری کے نمبر معلوم ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ تجوری میں کم از کم آٹھ دس لاکھ کی رقم ہوگی۔ تم وہ رقم لے کر اس کوٹھری میں آ جانا۔ کوٹھری کے دروازے میں تالا لگا ہوگا۔ تم تینوں پچھلی کھڑکی سے اندر آنا۔ کھڑکی کھلی ہوگی۔ تم آج رات اور کل سارا دن یہاں چھپے رہنا۔ کل رات میں کسی وقت یہاں آؤں گا پھر ہم اس دولت کے حصے بخرے کر لیں گے ہر ایک کا وہی حصہ ہوگا جو پہلے طے ہو چکا ہے یعنی نصف حصہ میرا اور نصف تم دونوں کا۔

ڈیوائی کو میں اپنے پاس سے پچاس ہزار دے دوں گا۔''

''پچاس ہزار خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے منشی جی۔ ایک گولی اس کی گردن سے گزار دیں گے قصہ ہی پاک ہو جائے گا۔''

''نہیں جانو لالچ سے کام بگڑ جائے گا۔ ڈیوائی ہمارے بہت کام آئے گی۔'' منشی الفت علی نے اسے سمجھایا۔ ''حویلی سے نکلنے سے پہلے تم اسے رسیوں سے باندھ دینا۔ اس کی چشم دید گواہی اس واردات کو سو فیصد حقیقی واردات کا رنگ دے دے گی۔''

''جیسی تمہاری مرضی منشی جی۔ ویسے اگر ہمیں گھوڑے مل جاتے تو ذرا آسانی رہتی۔'' یہ جیرے کی آواز تھی۔

''نہیں جیرے گھوڑوں کی وجہ سے تم لوگوں کی توجہ کا مرکز بن سکتے ہو۔ تم اندھیرے کا سہارا لے کر

پیدل وہاں پہنچو گے اور پیدل ہی واپس آؤ گے۔ مجھے یقین ہے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی کہ حویلی میں کیا واردات ہو چکی ہے۔ میں اس وقت آنکھ کھولوں گا جب کمال الدین خود ہوش میں آکر مجھے ہوش میں لائے گا؟''

تمہارا بھی جواب نہیں منشی جی۔ کیا لاجواب منصوبہ بنایا ہے۔''

''ہاں صابر آج تک ہم کمال الدین کے لیے محنت کرتے رہے ہیں لیکن اس نے ہمیں چند ہزار سے زیادہ کچھ نہیں دیا۔ اب ہماری باری ہے کہ ہم اس سے اپنا حق چھین لیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ آدھے گھنٹے بعد تم لوگ بھی پچھلی کھڑکی سے نکل آنا۔''

میں حجرے کے دروازے کے پاس سے ہٹا اور دبے پاؤں چلتا ہوا ایک بڑے سے درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ میں نے منشی الفت علی خان کو حجرے سے نکلتے دیکھا۔ اس نے حجرے کا دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا اور چابی اپنی جیب میں ڈال لی۔ بغور اس کی نقل و حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے ایک طرف بڑھا۔ میں بڑی احتیاط سے اس کا تعاقب کرتا رہا۔ کچھ دور جا کر وہ ایک جگہ رک گیا۔ وہاں ایک درخت کی شاخ سے ایک گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ منشی الفت علی خان نے گھوڑے کی باگ کھول لی اور اسے لے کر ایک طرف چل پڑا۔ میں بدستور اس کے پیچھے تھا۔ وہ کچھ دیر تک گھوڑے کو لیے ساتھ چلتا رہا۔ کافی دور چلنے کے بعد وہ ایک بار پھر ایک جگہ رک گیا اس جگہ درختوں کا ایک جھنڈ موجود تھا۔ میں اس کی اس حرکت کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ وہ یک دم پلٹ پڑا۔ میں اس کی نظروں میں آتے آتے بچا۔ وہ ایک بار پھر حجرے کی طرف چلنے لگا۔ میں نے اس کا تعاقب جاری رکھا۔ کچھ دیر بعد ہم ایک بار پھر حجرے کے قریب پہنچ گئے۔ اس بار وہ حجرے کے قریب نہیں گیا بلکہ ایک بڑے سے درخت کے پیچھے چھپ کر حجرے کی نگرانی کرنے لگا۔

منسی الفت علی خان کی یہ حرکات مجھے بے حد پراسرار لگیں۔ میں نے سوچا کہ یہ شخص کسی سانپ کے مانند زہریلا اور لومڑی کی طرح مکار ہے۔ اس نے کمال الدین خان جیسے گھاگ شخص کو الو بنا رکھا ہے۔ اس نے جو منصوبہ بندی کی تھی اس میں کوئی جھول نہ تھا۔ جانے اب وہ کس ارادے سے اس حجرے کی نگرانی کر رہا تھا۔ میں بے حد محتاط تھا اگر وہ اچانک بھی پیچھے مڑ کر دیکھتا تو اسے میں نظر نہ آتا۔ ہمارے سامنے حجرے کا عقبی حصہ تھا۔ نیم تاریکی میں وہاں ایک چھوٹی سی کھڑکی نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ کھڑکی کھلی اور اس میں سے تین ہیولے باہر نکلے۔ ان تینوں نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر بھی انہوں نے سیاہ چادریں لپیٹ رکھی تھیں۔ انہوں نے کھڑکی کے پٹ بھیڑے اور گاؤں کی جانب چل پڑے۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے اور ان کی چال سے جلد بازی ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔

ان تینوں کے چلے جانے کے کچھ دیر بعد منشی الفت علی خان درخت کے پیچھے سے نکلا اور حجرے کی جانب بڑھا وہ حجرے کی کھڑکی کے پاس پہنچا اور اسے کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اس نے اپنے پیچھے کھڑکی کے پٹ بھیڑ دیے۔

میں درخت کے پیچھے سے نکلا اور تیزی سے کھڑکی کی جانب بڑھا۔ میرا ریوالور میرے ہاتھ میں

آچکا تھا۔ میں نے کھڑکی کے پٹوں کے درمیان درز سے حجرے کے اندر جھانکا۔ منشی الفت علی خان نے حجرے میں داخل ہو کر ایک لالٹین روشن کر لی تھی۔ میں نے بڑی احتیاط سے کھڑکی کے پٹوں کے درمیان درز کو تھوڑا اور چوڑا کر دیا۔ اب حجرے کے اندر کا تقریباً پورا منظر میری نظروں کے سامنے آ گیا۔ منشی الفت علی خان کے سامنے اس وقت شراب کی دو بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کوئی چیز نکالی۔ یہ کسی دوا کی چھوٹی سی شیشی تھی۔ اس نے اپنی واسکٹ کی دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا اس بار اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی پلاسٹک کی سرنج تھی۔ اس نے سرنج میں سوئی لگائی اور دوا کی شیشی میں سے سرنج بھر لی۔ سرنج کی سوئی شراب کی ایک بوتل کے کارک میں گھونپ کر اس نے پوری سرنج شراب میں خالی کر دی۔ دوسری سرنج کی دوا دوسری بوتل میں منتقل ہو گئی۔ سرنج اور دوا کی شیشی ایک بار پھر اس کی واسکٹ کی جیبوں میں پہنچ گئیں۔

شراب کی بوتلوں کو ایک ٹوکری میں رکھ کر منشی الفت علی اٹھ کھڑا ہوا۔ جونہی اس نے لالٹین بجھائی میں تیزی سے درخت کے پیچھے جا چھپا۔ وہ کھڑکی سے باہر نکلا اور کھڑکی کے پٹ پہلے کے مانند بھیڑ دیے۔ میں پوری طرح اسے اپنی نظروں میں رکھے ہوئے تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس طرف بڑھا جدھر اس نے اپنا گھوڑا چھپا رکھا تھا۔

میں نے منشی الفت علی خاں کا تعاقب نہیں کیا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں اس کی تمام کاروائی کا مطلب پوری طرح سمجھ چکا تھا۔ یہ شیطان صفت شخص ایک تیر سے کئی شکار کھیل رہا تھا۔ اس نے کمال الدین خان کی تجوری صاف کرانے کا پروگرام شاید کافی پہلے سے بنا رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کمال الدین خان نے اسے بتایا کہ اب میں اس کا محافظ بن کر اس کے ساتھ رہوں گا تو منشی الفت علی خان کو اپنے منصوبے میں کھنڈت پڑتی محسوس ہوئی۔ مجھے اس کی وہ نفرت بھری نگاہ اچھی طرح یاد تھی۔ اس وقت تو میں اس کی وجہ نہیں سمجھ سکا لیکن اب سب کچھ مجھ پر عیاں ہو چکا تھا۔ کمال الدین خان کی حویلی سے ملنے والی رقم بہت بھاری تھی۔ لیکن لالچی اور مکار منشی الفت علی خان اس میں کسی کو شریک کرنے پر تیار نہ تھا۔ ایک طرف اس نے اپنے حواریوں کو حویلی پر ڈاکا ڈالنے بھیجا تو دوسری طرف انکی شراب میں زہر کی آمیزش کر دی۔ وہ تینوں دولت سے لدے پھندے آتے تو پہلی فرصت میں شراب کی محفل سجاتے۔ ان کا پہلا جام ہی شاید ان کی زندگی کا آخری جام ثابت ہوتا۔ وہ تینوں اس حجرے میں مقفل ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان سے گزر جاتے لیکن کوئی ان کی موت سے واقف نہ ہوتا۔ شام کو یا رات کو منشی الفت علی خان یہاں آتا اور بڑی اطمینان سے تمام دولت سمیٹ کر چلتا بنتا۔ ان بدنصیبوں کی لاشیں بے گور و کفن پڑی رہ جاتیں۔ ان کی لاشیں دریافت ہو بھی جاتیں تو یہی کہا جاتا کہ زہریلی شراب پینے کی وجہ سے تین ڈاکو ہلاک ہو گئے۔ کسے پڑی تھی کہ گہرائی میں جاتا اور ان کی موت کے اصل محرکات تلاش کرتا۔

میں کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ کیا ان سب کو ان کے حال پر چھوڑ دوں اور اپنی راہ پر چلتا بنوں؟ یا پھر جا کر کمال الدین کو سب کچھ بتا دوں لیکن اگر اس نے میری بات پر اعتبار نہیں کیا تو پھر کیا

ہوگا ؟ منشی الفت علی خان کا جال بے حد مضبوط تھا۔ ہوسکتا ہے وہ راز فاش ہوتا دیکھ کر مجھے کسی نہ کسی بہانے گولی کا نشانہ بنا دیتا۔ کمال الدین نے میرے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہ کیا تھا لیکن میرے خیال میں اس کی وجہ غلط فہمی تھی۔ اگر میں کسی طرح سے اپنے بارے میں اس کی غلط فہمی دور کر دیتا تو وہ یقیناً میری بارے میں مختلف انداز میں سوچتا۔

بات دراصل یہ تھی کہ کمال الدین کی خوشنودی کا حصول میری مجبوری تھی۔ مجھے ایک بھاری رقم درکار تھی اور اتنی رقم اس کی مدد کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔ ہیر کا علاج میرے لیے اس وقت دنیا کا سب سے اہم کام تھا۔ اور ہیر کے علاج کے لیے مجھے ایک لاکھ سے زائد رقم درکار تھی۔ کمال الدین خان نے یہ رقم مجھے تقریباً دے ہی دی تھی کہ معاملہ خراب ہوگیا اور مجھے قید کر دیا گیا۔

عین اس لمحے شدید ترین بھوک اور پیاس نے مجھے حقیقی دنیا میں لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے تمام خدشوں اور وسوسوں کو ایک طرف جھٹکا اور حجرے کی کھڑکی کی طرف بڑھا میں نے کھڑکی کے پٹ کھولے اور حجرے کے اندر داخل ہوگیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ کچھ دیر کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نابینا ہو چکا ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ میری آنکھیں گہری تاریکی کی بھی عادی ہوگئیں۔ میں سنبھل کر چلتا ہوا وہاں پڑی ہوئی چار چارپائیوں کی جانب بڑھا۔ میں ٹٹول ٹٹول کر قدم آگے بڑھاتا رہا۔ ایک چارپائی کے پاس پہنچ کر میں نے جھک کر چارپائی کے نیچے ٹٹولا۔ میرا ہاتھ لالٹین سے ٹکرایا۔ میں چارپائی پر بیٹھا اور لالٹین سامنے رکھ لی۔ ماچس کے متعلق بھی مجھے معلوم تھا کہ وہ اسی چارپائی کے سرہانے موجود ہے۔ میں نے ٹٹول کر ماچس اٹھائی اور لالٹین روشن کر دی۔ میں حجرے کی واحد کھڑکی پہلے ہی بند کر چکا تھا۔ حجرے میں پھیلی ہوئی زرد روشنی نے سب کچھ واضح کر دیا تھا۔ یہ حجرہ جانے کس مقصد کے لیے استعمال ہوتا ہوگا۔ شاید اسی مقصد کے لیے یعنی ڈاکوؤں کی عارضی پناہ گاہ کے طور پر حجرے کے درمیان‘ بڑی سی آہنی کڑھائی رکھی ہوئی تھی جس میں کوئلے بھرے ہوئے تھے۔ یہ کوئلے ابھی تک سلگ رہے تھے۔ قریب ہی ایک کونے میں پانی کا مٹکا بھرا ہوا تھا۔ میں تیزی سے کونے کی طرف بڑھا۔ جست کا بڑا گلاس پانی سے بھر کر میں نے آہستہ آہستہ اپنے حلق میں انڈیل لیا۔ میری پورے وجود میں سرشاری اور تسکین کی لہر دوڑ گئی۔ میں دوسرا گلاس بھر کر چارپائی پر آ بیٹھا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ ان تینوں کے واپس آنے میں خاصی دیر تھی۔ ویسے بھی جب تک میں اندر سے کھڑکی نہ کھولتا وہ حجرے میں داخل نہیں ہو پاتے۔ پانی کا دوسرا گلاس پینے کے بعد میں کھانے پینے کی کسی چیز کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ حجرا بھنے ہوئے گوشت کی بو سے مہک رہا تھا۔ تب مجھے وہ قاب نظر آئی جو کپڑے سے ڈھانپ کر ایک بڑے سے صندوق پر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے بے تابی سے قاب پر سے کپڑا ہٹایا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک جان فزا منظر تھا۔ پوری قاب بکرے کے بھنے ہوئے گوشت کے بڑے بڑے پارچوں سے بھری ہوئی تھی۔ یہ ٹکڑے نوکدار سلاخوں پر پرو کر کوئلوں پر بھونے گئے تھے۔ میں نے قاب کو دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور چارپائی پر آ گیا۔ اب مجھے صبر کی تاب نہ تھی۔ میرے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ گوشت پر ملا ہوا مصالحہ بہت تیز تھا لیکن میں مرچوں کی پروا کیے بغیر منہ چلاتا رہا۔ یہ گوشت انہوں نے

شاید صبح کے ناشتے کے لیے بچا کر رکھا ہوگا جو اب میرے شکم کی آگ کا ایندھن بن رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں پوری طرح شکم سیر ہوگیا۔ مجھ پر ایک عجیب سی سرشاری طاری ہونے لگی۔ اب میں ہر طرح کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ میں ہلکی سی خنودگی محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت سونا میرے لیے تباہ کن ثابت ہوسکتا تھا۔ چنانچہ میں نے نیند کے احساس کو دور بھگانے کی کوشش کی۔ کچھ دیر بعد مجھ پر پھر نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ میں نے سر جھٹکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ حجرے کی گنجائش محدود تھی۔ میں نے حجرے کی کھڑکی کھولی۔ حجرے سے باہر تاریکی اور سناٹے کا راج تھا‘ البتہ جھینگروں کی زوں زوں پوری فضا کو مکدر کیے ہوئے تھی۔ میں نے کھڑکی بند کر دی۔ لیکن اس بار اسے اندر سے کنڈی نہیں لگائی۔ وقت کچھوے کی رفتار سے رینگ رہا تھا۔ میں ان تینوں ڈاکوؤں کا منتظر تھا۔ اس جگہ کا کمال الدین خان کی حویلی سے اچھا خاصا فاصلہ تھا۔ انہیں جانے اور آنے میں اچھا خاصا وقت لگتا اور یہی وقت مجھے بچھو کی طرح ڈنگ مار رہا تھا۔

میں نے لالٹین بجھائی اور اسے چارپائی کے نیچے رکھ دیا۔ اندھیرا ہوتے ہی نیند کی دیوی ایک بار پھر پوری قوت سے مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ میں نے سنا تھا کہ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے لیکن میری اس وقت کی نیند مجھے سولی پر چڑھانے کے لیے کافی تھی۔ میں نے اپنی قوت ارادی کو آواز دی اور نیند کے خلاف نبرد آزما ہوگیا۔ کچھ ہی دیر بعد میری یہ کوشش بار آور ثابت ہوئی۔ میں نے اپنے نیفے سے ریوالور نکالا اور اسے کھول کر اس کے چیمبر کو ٹٹولا۔ چھے کے چھے خانے گولیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان تینوں کے لیے یہ چھے گولیاں بہت تھیں۔ ویسے میں انہیں قتل کرنا نہیں چاہتا تھا۔

کسی نہ کسی طرح میں نے وہ کڑا انتظار برداشت کر ہی لیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اب آنے ہی والے تھے۔ میں پوری طرح چوکنا ہوگیا۔ میرے کان باہر سے آنے والی ہلکی سے ہلکی آواز سننے کے لیے تیار تھے۔ کچھ دیر بعد میں نے چند لوگوں کے دھیمے لہجے میں بات کرنے کی آوازیں سنیں۔ کسی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر وہ آوازیں حجرے کی عقبی کھڑکی کے پاس آ کر رک گئیں۔ میں پوری طرح چوکنا ہوگیا۔ میرے ہاتھ میں موجود ریوالور میری انگلی کے اشارے کا منتظر تھا۔ میں نے اپنی پیٹھ کچی دیوار کے ساتھ لگا لی۔ اور ان کے اندر داخل ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کھڑکی کھلی اور اس میں سے ایک سیاہ ہیولا اندر داخل ہوا۔ پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔

”لے بھرا جیرے اب اس مال کو تو سنبھال لے۔“ ان میں سے ایک نے ہنستے ہوئے کہا ”چنگا بھلا بھاری تھیلا ہے۔“

”تو بھی عجیب بندہ ہے یارا صابر۔ یعنی تجھے دولت کا وزن بھی برا لگ رہا ہے۔“ جیرے نے کہا اور پھر وہ تینوں ایک ساتھ ہنس پڑے ”تم ایسا کرنا جب تمہیں تمہارا حصہ ملے تو اس میں سے آدھا مجھے دے دینا تمہارا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا اور میرا بھلا بھی ہو جائے گا تمہیں تو پتا ہے مجھے پیسے کی کتنی ضرورت ہے۔“

”ابے ہمیں سب پتا ہے تیری ضرورتوں کا۔“ صابر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''جیرے نے ماچس جلائی اور چار پائی کے نیچے سے لالٹین نکال کر روشن کر دی۔ ان تینوں نے اپنی گنیں ایک چار پائی پر ڈال دی تھیں اب وہ وقت آ چکا تھا کہ میں منظر میں نمودار ہوتا۔

''خبردار۔۔۔اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو ذرا سا بھی حرکت کرنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔'' میری گرج دار آواز حجرے میں گونجی۔ وہ تینوں حیرت سے اچھل پڑے۔ وہ آہستہ سے مڑے۔ میں پوری طرح تیار ومحتاط تھا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں کینوس کا تھیلا تھا۔ اس نے بڑے غیر محسوس انداز میں وہ تھیلا اپنے پیچھے زمین پر ڈال دیا اور پاؤں سے ایک چار پائی کے نیچے سرکا دیا۔ میں انجان بنا سب کچھ دیکھتا رہا۔ چند لمحوں بعد انہوں نے اپنی حیرت پر قابو پالیا۔

''تو کون ہے جوان؟'' ان میں سے ایک نے رعب دار لہجے میں کہا ''اور یہاں کیا کر رہا ہے؟''

''تمہیں تمہارے سارے سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔ فی الحال تو تم تینوں گنوں سے ذرا دور ہٹنے کی کوشش کرو۔'' ان تینوں نے قدرے ہچر مچر کی کوشش کی لیکن میری آنکھوں میں سفا کی دیکھ کر' ان کے حوصلے پست ہو گئے۔

''اگر تو چور ہے تو تو نے بہت غلط جگہ ہاتھ ڈال دیا ہے جوان۔۔۔اور اگر تجھے پناہ درکار ہے تو ہتھیار جیب میں رکھ کے دوستوں کی طرح بات کر!'' میں نے اس کی آواز سے پہچان لیا' وہ جیرا تھا۔ میں نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا ''میں جو کوئی بھی ہوں اسے بھول جاؤ۔ بس اتنا یاد رکھو کہ تم میں سے کسی نے ہیرو بننے کی کوشش کی تو اس کی کھوپڑی میں روشن دان بن جائے گا۔ میرا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا' یقین نہ ہو تو آزما کے دیکھ لو۔''

اسی وقت میری نظر رسی کے ایک لچھے پر پڑی جو کہ رائفلوں کے قریب چار پائی پر پڑا ہوا تھا۔ ''اوئے کالے تو یہ رسی اٹھا۔'' میں نے ان میں سے ایک کو حکم دیا۔

''اوئے بکواس بند کر۔ تو نے کالا کس کو کہا؟'' کالے نے کالا ہونے کے باوجود سخت برا منایا۔ میں نے اس کی ناراضی دور کرنے کی کوشش کی ''اچھا۔۔۔اچھا گورے صاحب ذرا یہ رسی تو اٹھائیں۔''

''اوئے تیری تو میں۔۔۔۔'' اس نے غصے میں اندھا ہو کر مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی لیکن اس کے دونوں ساتھیوں نے جکڑ لیا۔

''آرام سے جانو۔ خود پر قابو رکھ۔ مجھے اس سے بات کر لینے دے۔ پتا تو چلے یہ آخر چاہتا کیا ہے۔''

''میں کچھ نہیں چاہتا۔ اچھا اب تو آگے بڑھ اور چار پائی پر سے رسی اٹھا لے شاباش دیر نہ کر۔ مجھے بھی تم سے دو دو باتیں کرنی ہیں۔'' جیرے نے مجھے گھور کر دیکھا لیکن اسے رسی اٹھانے کے لیے بڑھنا پڑا۔ اب میں مزید محتاط ہو گیا۔ مجھے بیک وقت دو اطراف کی نگرانی کرنا تھی۔ جیرا مرے مرے قدموں سے چار پائی کی طرف بڑھا۔ وہ چار پائی پر جھکا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے پلٹ پڑا۔ اس کے ہاتھ میں سیون ایم ایم رائفل تھی۔ اس نے اندھا دھند مجھ پر گولی چلا دی۔ حجرے میں کان پھاڑ دھما کا گونجا اور طاقتور گولی نے کچی دیوار میں کئی انچ گہرا گڑھا پیدا کر دیا' جس وقت وہ جھکا میں اسی وقت اس کے

ارادے کو سمجھ چکا تھا۔ اس نے پہلے تو رسی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر تیزی سے رائفل پر ہاتھ ڈال دیا۔ رائفل پہلے سے کاک تھی۔ اسے اپنی مہارت پر یقین تھا کہ وہ مجھے سنبھلنے سے پہلے ہی مار گرائے گا۔ اس کی بدنصیبی یہ تھی کہ میں اس کی نیت سمجھتے ہی بجلی کے کوندے کی طرح اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ اس کے پاس پہلے فائر کی ہی مہلت تھی دوسرے فائر کے لیے اسی رائفل کا بولٹ پیچھے کر کے گولی کا خالی کھوکھا باہر نکالنا تھا۔ اس کے بغیر مزید فائر ناممکن تھا۔ اس صورت حال میں ایسی کوئی حرکت موت کو دعوت دینے کے مترادف تھی لیکن جیرا نامی وہ شخص کچھ زیادہ ہی سرفروش یا دوسرے لفظوں میں سر پھرا تھا۔ اس نے تیزی سے رائفل کا بولٹ پیچھے کیا اور گولی کا کھوکھا باہر نکال لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ بولٹ کو آگے کر کے دوبارہ گولی چلاتا' میں نے ریوالور کا ٹرائیگر دبا دیا۔ حجرے میں ایک بار پھر دھما کا گونجا۔ ''ہائے مر گیا۔'' جیرے کے حلق سے نکلا۔ اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ کر گر پڑی اور اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے اپنا بائیں ہاتھ کی کلائی دبا لی۔ اس کا ہاتھ خون سے سرخ ہو گیا۔

میں نے دوسری گولی چلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اگر میں اسے مارنا چاہتا تو اسے رائفل اٹھانے کی بھی مہلت نہ دیتا۔ خیر جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا۔ اب اس کے دونوں ساتھیوں کی بھی پھونک نکل چکی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے گھورنے لگے۔ میں نے جیرے کو اپنے ساتھیوں کے پاس جانے کا حکم دیا۔ وہ کراہتا ہوا دھیرے دھیرے ان کے پاس پہنچ گیا۔

اب میں خود کو پوری طرح مطمئن محسوس کر رہا تھا۔ میں نے انہیں ذہنی طور پر تسخیر کر لیا۔ اب ان میں اتنی جرات نہ تھی کہ میرے خلاف کوئی حرکت کرنے کا سوچ بھی سکتے۔ ویسے بھی اس طرح کے لوگوں کا سارا طنطنہ اسلحے کے بل بوتے پر ہوتا ہے۔ حقیقی شجاعت ذرا کم ہی ان کا اثاثہ ہوتی ہے۔

اس بار میں خود اس چار پائی کی طرف بڑھا۔ البتہ میری نظریں بدستور انہیں پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے ٹٹول کر رسی کا لچھا اٹھا لیا۔ وہ تینوں میری حرکات کا جائزہ لے رہے تھے۔ جیرے کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ ریوالور کی گولی نے شاید اس کی ہڈی توڑ ڈالی تھی۔ میں نے رسی کالے کی طرف اچھال دی۔ ''اپنے ساتھی کے ہاتھ کمر پر کر کے اچھی طرح باندھ دے۔ خبردار! رسی ذرا سی بھی ڈھیلی ہوئی تو میں تیری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔'' کالے نے رسی کو پکڑ لیا۔ قدرے ہچکچاہٹ کے بعد وہ رسی کے بل کھولنے لگا۔ صابر نے اسے گھور کر دیکھا تو اس کے ہاتھ رک گئے۔ ''اپنی آنکھیں نیچی کر لے اور پھنے خان کی اولاد۔'' میں نے صابر کو للکارا۔ ''چپ چاپ دیوار کی طرف منہ کر کے اپنے ہاتھ پیچھے کر لے۔ ایسا نہ ہو تو خواہ مخواہ ہی میرے ہاتھوں خرچ ہو جائے۔''

صابر کی آنکھوں میں میرے لیے شدید نفرت تھی لیکن اسے میری ہدایت پر عمل کرنا ہی پڑا۔ میرے ریوالور کی سیاہ آنکھ میں پوشیدہ موت کو اس نے واضح طور پر اپنی جانب متوجہ محسوس کیا ہو گا۔ کالے نے میری دھمکی کا پورا پورا اثر لیا۔ اس نے صابر کے ہاتھ اتنی سختی سے باندھے کہ وہ کراہ اٹھا۔ صابر نے کالے کو ایک غلیظ گالی سے نوازا۔ کالے نے مظلومیت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''مار اس کے منہ پر تھپڑ۔'' میں نے کالے کو شہ دی۔ ''ایس کس کے تھپڑ مار سالے کے منہ پر کہ اسے ماں بہن کی قدر معلوم

ہو جائے۔''

وہ قدرے تذبذب کا شکار ہوا۔ پھر اس نے ایک ایسا کرارا تھپڑ صابر کے منہ پر مارا کہ اس کا منہ گھوم گیا۔

''اوئے پاگل دے پترو آپس میں کیوں لڑتے ہو۔'' زخمی جیرے نے درد سے کراہتے ہوئے ان دونوں میں بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی لیکن معاملہ قابو سے باہر ہونے لگا۔ صابر نے اچھل کر کالے کے پیٹ میں لات ماری۔ اس کے منہ سے ہائے کی آواز نکلی اور وہ پیٹ پکڑ کر جھک گیا...... صابر نے دوسری لات اس کے منہ پر ماری۔ کالے کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ منہ پکڑ کر قریبی چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اس کے شاید ایک دو دانت ٹوٹ گئے تھے۔ اس کے منہ سے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر میں نے مداخلت کی۔

''خبردار وہیں کھڑا رہ۔'' میں نے صابر کو للکارا ''ذرا بھی پیر آگ بڑھایا تو......'' میں نے ریوالور کا رخ اس کی کھوپڑی کی طرف کر دیا۔

وہ فوراً اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا البتہ اس کے منہ سے ابھی تک مغلظات کی بوچھاڑ نکل رہی تھی۔ کالا بار بار زمین پر تھوک رہا تھا۔ ایک دم اس پر جنون سا طاری ہونے لگا۔ اس نے اجازت طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ وہ بجلی کے کوندے کے مانند صابر پر ٹوٹ پڑا۔ صابر نے ایک بار پھر مزاحمت کی کوشش کی لیکن پیچھے بندھے ہاتھوں کی بنا پر کچھ بھی نہ کر سکا۔ کالا اس پر تابڑ توڑ گھونسے برسانے لگا۔ چند ہی گھنسوں نے صابر کا برا حال ہو گیا۔ ان کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ دونوں آنکھوں کے گرد نیل پڑ گئے اور وہ تیورا کر زمین پر گر گیا۔ میں نے کالے کو حکم دیا کہ وہ بس کرے۔ جیرا اپنا زخمی ہاتھ تھامے اکڑوں بیٹھا تھا۔ میں نے کالے کو ہدایت کی وہ اس کے ہاتھ پر پٹی باندھ دے۔ اس نے زمین پر پڑا ہوا سیاہ پٹکا اٹھا لیا اور اسے پھاڑ کر جیرے کے ہاتھ پر پٹی باندھ دی۔

''مجھے اپنی ماں کی قسم ہے جانو۔ میں تیرے ٹوٹے کر دوں گا۔'' صابر نے بھیانک لہجے میں کالے کو دھمکی دی۔ ''میں نے تیری نسل نہ مکا دی تو میرا نام صابر نہیں۔ تو اپنے اس باپ کے بل پر بہت اکڑ رہا ہے نا۔''

''نسل تو کمال الدین خان تم سب کی مٹا دے گا پٹھے۔ تو کیا سمجھتا ہے؟ وہ کیا تمہاری یہ حرکت معاف کر دے گا؟'' میں نے کہا۔

میرے منہ سے کمال الدین خان کا نام سن کر ان تینوں کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ دم بخود ہو کر مجھے گھورنے لگے۔ سب سے خراب حالت کالے کی تھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور اس پر کپکپی سی طاری ہونے لگی۔ وہ کمال الدین خان سے کچھ زیادہ ہی خوفزدہ تھا۔ کچھ دیر بعد ان تینوں نے اپنی حالت پر قابو پا لیا۔

''تو کمال الدین کو کیسے جانتا ہے جوان؟'' صابر نے بھاری لہجے میں کہا ''اور تو ہمیں اس کی دھمکی کیوں دے رہا ہے؟ ہم تو کمال الدین کے پاؤں پڑے ملازم ہیں تو اپنی خیر منا۔ جب اسے پتا چلے گا

''دیکھو میں تمہیں کمال الدین خان اور صابر دونوں سے بچا سکتا ہوں۔ شرط صرف یہ ہے کہ تمہیں میرے کہنے پر عمل کرنا ہوگا۔ میری ہدایت پر عمل کرو گے تو تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔''

کالا قدرے ہچکچاہٹ کا شکار رہا۔ پھر اس کے چہرے پر مصمم ارادے کی جھلک نظر آئی۔ ''مجھے منظور ہے۔ تم جو کہو میں کرنے کو تیار ہوں۔''

''تمہیں کچھ نہیں کرنا ہے۔ بس میرے ساتھ کمال الدین کی حویلی چلو۔ میں کمال الدین کو ساری بات بتا دوں گا۔ تمہیں صرف میری گواہی دینی ہے۔ میں کمال الدین سے تمہاری سفارش کر کے تمہیں معاف کرا دوں گا۔ رہی صابر کی بات تو کمال الدین اس کا قیمہ بنوا دے گا۔''

میری بات سن کر کالے کے چہرے پر چمک آ گئی۔ ''میں تیار ہوں۔ میں خان صاحب کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔''

''اوئے سور کی نسل۔'' جیرے نے اپنے درد کو دباتے ہوئے کالے کو گالی دی۔ ''مجھے پہلے ہی تیری گندی فطرت کا پتا تھا۔ تیرے گندے خون میں وفا کے جراثیم ہی نہیں ہیں۔''

''اور تمہارے اچھے خون میں تو وفا کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ کتے دے پتر کمال الدین نے تمہاری کتنی مدد کی۔ کتنی بار تمہیں پولیس سے بچایا لیکن تم نے اس حرامی منشی کے کہنے پر اپنے سائیں کے گھر ڈاکا ڈال دیا۔'' کالے خان نے چمک کر کہا۔ اس کا کھویا ہوا اعتماد لوٹ آیا تھا۔ ''تم دونوں نے مجھے بھی بہکا دیا۔ میں تو خان سائیں کے پیروں میں سر رکھ دوں گا۔''

''جانو تم باقی رسی سے جیرے کو باندھ دو۔'' میں نے کالے کو کہا۔ اس نے چپ چاپ میری ہدایت پر عمل کیا جیرا اور صابر اسے گالیاں بکتے رہے لیکن اس نے ان کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ میں نے چار پائی پر پڑی ہوئی دو رائفلوں اور ایک شاٹ گن سے گولیاں اور کارتوس نکال لیے اور انہیں اپنی جیب میں ڈال لیا۔ میں نے کالے سے کہہ کر جیری اور صابر کے پیر بھی بندھوا دیے۔ اب میں خاصی حد تک مطمئن تھا۔ میں نوٹوں سے بھرے تھیلے سمیت کھڑکی کے راستے حجرے سے باہر آ گیا۔ جانو میرے آگے آگے تھا۔

میں جانو کی طرف سے خاصی حد تک مطمئن تھا تاہم میں نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ میں تقریباً پورے راستے اس کے پیچھے چلتا رہا۔ میرا ریوالور اگرچہ میری جیب میں تھا تاہم میں محض ایک ثانیے میں فائر کر سکتا تھا۔ راستے میں جانو نے مجھ سے تعلقات مزید بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اس نے بتایا کہ وہ تینوں دوست اصل میں رسہ گیر ہیں۔ وہ تینوں دور دراز دیہاتوں سے بھینسیں اور دیگر مویشی چوری کر کے لاتے ہیں۔ کمال الدین خان یہ چوری شدہ مال خرید لیتا ہے۔ وہ انہیں پولیس سے تحفظ بھی دیتا ہے۔ البتہ یہ لوگ چوری شدہ مویشی کمال الدین کے علاوہ کسی اور کو نہیں فروخت کر سکتے۔ کمال الدین انہیں مال کی اصل قیمت کی تقریباً ایک تہائی رقم ادا کرتا ہے۔ جیرے اور صابر کے خیال میں یہ رقم بہت کم ہے اور وہ کمال الدین سے خوش نہیں ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ وہ کمال الدین کے علاوہ کسی اور سے مال کا سودا کرنے کی جرات بھی نہیں رکھتے۔ رقم کے لین دین کے سلسلے میں ان کا واسطہ منشی الفت علی

کہ تو نے اس کے نمک خواروں پر ہاتھ اٹھایا ہے تو وہ تیری کھال کھنچوا دے گا۔"

اس کی بات سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ میں نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ "بہت خوب بہت خوب ---۔ کیا بات ہے تمہاری نمک حلالی کی۔ جس تھالی میں کھاتے ہو اسی میں چھید کرتے ہو۔"

"کک کک ---۔ کیا مطلب؟" ان تینوں نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

میں آگے بڑھا اور چارپائی کے نیچے سے کینوس کا وہ تھیلا نکال لیا جو نوٹوں سے ٹھنسا ٹھس بھرا ہوا تھا۔ "مطلب کا پتا تمہیں اس وقت چلے گا جب میں تم لوگوں کو کمال الدین خان کے سامنے پیش کروں گا اور یہ نوٹ بھی اس کے حوالے کروں گا۔" جیرے اور صابر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں جبکہ کالے کا چہرہ زرد سے سفید ہو گیا۔ اب وہ واضح طور پر کانپ رہا تھا۔ صابر نے ایک بار پھر اپنی حالت پر قابو پالیا۔ "پتا نہیں تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ ہم نے تو اب سے پہلے اس تھیلے کو دیکھا بھی نہیں۔ کمال الدین خان تمہاری بکواس پر کوئی دھیان نہیں دے گا۔"

مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے استدال کا وزن تسلیم کرنا پڑا۔ میں کمال الدین خان کی نظر میں ایک سازشی، غدار، اور دشمن کا جاسوس تھا۔ اس نے پہلے بھی میری بات سننے سے انکار کر دیا تھا۔ اب اگر میں ان لوگوں کو اور اس کے مال کو اس کے حوالے کر بھی دیتا تو وہ شاید اسے بھی کوئی سازش سمجھتا۔ ادھر وہ منشی الفت علی خان میرے خلاف سازش کا جال پھیلا دے گا۔ میں کتنا بھی سچا کیوں نہ ہوں، میری شنوائی کہاں ہو پائے گی؟ اسی وقت میری نظر جانو یعنی کالے پر پڑی۔ وہ مرنے کی حد تک خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ میرے ذہن نے برق رفتاری سے ایک منصوبہ بنایا اور میں فوراً ہی اس پر عمل پیرا ہو گیا۔ "کمال الدین خان میری بکواس پر دھیان دے یا نہ دے یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ تم تو یہ سوچو کہ اگر میں نے منشی الفت علی خان اور تمہاری اس سازش کی ایک ایک تفصیل اسے بتا دی تو وہ تمہارا کیا حشر کرے گا؟ مجھے تمہارے منصوبے کی پوری تفصیل کا علم ہے۔ مجھے تو یہ بھی پتا ہے کہ اس منصوبے میں منشی کے علاوہ ڈیوائی بھی شامل ہے۔ تم لوگ ابھی سے اپنے آپ کو مردہ سمجھنا شروع کر دو۔"

میرا تیر نشانے پر بیٹھا۔ اب کالے کے ساتھ ساتھ جیرے اور صابر کی بھی ساری اکڑ فوں ہوا ہو چکی تھی۔ ان کے چہرے بھی اب کورے لٹھے کے مانند چٹے ہو رہے تھے۔ اس بار مجھ سے سوال کرنے والا کالا تھا۔ اس کی آواز میں واضح لرزش تھی۔ "تت ---۔ تم کو ---۔ تم کو ---۔ یہ سب کیسے معلوم ہے؟"

"اس بات کو چھوڑو کالے خاں اور اپنی فکر کرو۔ کمال الدین خان نے تجھے زندہ چھوڑ بھی دیا تو صابر تجھے ختم کر دے گا۔ اس نے تجھے ختم کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔"

"اس کی تو ماں کی ---۔" کالے نے مشتعل ہو کر صابر کو گالی دینا چاہی لیکن اس نے اتنی خوں ریز نظروں سے اسے گھورا کہ اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔ وہ صابر سے بے حد خوفزدہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ صابر آزاد ہوتے ہی اسے جان سے مار ڈالے گا۔ میں نے اس کی اس حالت سے فائدہ اٹھانا چاہا تھا "کالے خان تم مجھے چنگے بندے نظر آتے ہو۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں بچا سکتا ہوں۔" میری بات سنتے ہی اس کے چہرے پر قدرے بحالی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ "وہ ---۔ وہ کیسے بھائی؟"

خان سے پڑتا۔ جیرے اور صابر نے ایک دوبار دبے لفظوں میں منشی سے احتجاج کیا کہ رقم بہت کم ہے۔ منشی نے کہا کہ وہ لوگ خان صاحب سے بات کریں۔ وہ لوگ خان صاحب کی گرم مزاجی سے بہت ڈرتے تھے۔ لہٰذا ان میں اس سے بات کرنے کی ہمت پیدا نہ ہو سکی۔ ان تنوں میں سب سے زیادہ دولت کے لیے بے چین جیرا تھا۔ وہ ایک شوقین مزاج شخص تھا۔ اس کا دل کوٹ چھٹے کی ایک نوعمر طوائف پر آیا ہوا تھا۔ وہ طوائف کچھ ہی دن پہلے اس پیشے میں آئی اور آتے ہی سارے طلبگاروں کے دماغوں پر نشہ بن کر چھا گئی۔ جیرا اس پر کچھ زیادہ ہی فریفتہ ہو گیا۔ وہ اس سے شادی کر کے اس کے حسن کے خزانے کو صرف اور صرف اپنے لیے مخصوص کرنا چاہتا تھا لیکن اس خزانے کے حصول کے لیے ایک اور خزانہ درکار تھا۔ اس اڈے کے مالک نے اس طوائف 'ریشم' کی قیمت ایک لاکھ روپے رکھی تھی۔ اتنی بڑی رقم کا انتظام جیرے کا باپ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چور ضرور تھے لیکن ان کی تمام تر مہارت صرف مویشیوں کی چوری تک محدود تھی۔ جیرا بے حد مضطرب تھا۔ وہ کہیں سے بھی کسی بھی طرح اس رقم کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی اس بے چینی کا اظہار منشی الفت علی خان سے بھی کیا۔ کچھ دن بعد منشی الفت علی خان نے مناسب موقع دیکھ کر اسے لالچ دلایا کہ اگر وہ اس کے کہنے پر عمل کرے تو ایک نہیں بلکہ کئی لاکھ کا مالک بن سکتا ہے۔ جیرے نے بلا تامل ہامی بھر لی۔ منشی نے اسے تمام منصوبہ سمجھایا۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے انہیں ایک دو آدمی مزید درکار تھے' چنانچہ جیرے نے صابر اور جانو کو بھی اپنے ساتھ ملایا۔ اتنی بڑی رقم کا لالچ اچھے اچھوں کی نیت خراب کر سکتا ہے اور پھر وہ تو تھے ہی چور۔ کالے نے جو باقی باتیں بتائیں وہ مجھے پہلے ہی معلوم تھیں۔ میں نے اسے زہر آلود شراب کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ بھی اس کی ضرورت نہ تھی۔ یہ راز میں کسی مناسب وقت پر افشا کرنے والا تھا۔ ہم دونوں حتی الامکان نیز رفتاری سے چل رہے تھے۔ اس کے باوجود جب ہم حویلی پہنچے تو رات کا تیسرا پہر شروع ہو چکا تھا۔ جانو نے مجھے بتایا کہ انہوں نے کمال الدین کے سر پر بٹ مار کر اسے بے ہوش کر دیا تھا جبکہ منشی جھوٹ موٹ کا بے ہوش بنا ہوا قالین پر پڑا تھا۔ ڈیوائی کو انہوں نے رسیوں کے ذریعے ستون سے باندھ کر اس کے منہ پر کپڑا باندھ دیا تھا۔

جب ہم حویلی کے گیٹ پر پہنچے تو وہاں مکمل سناٹا تھا۔ ہم نے نہایت آہستگی سے گیٹ کو دھکا دیا تو ہ کھلتا چلا گیا۔ میرا ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ جانو نے ہاتھ سے گیٹ کے قریب بنی کوٹھری کی طرف شارہ کیا۔ میں نے کوٹھری کی کھڑکی سے اندر جھانکا۔ روشن نامی وہ داڑھی والا شخص چارپائی پر الٹا سیدھا ا تھا۔ دوسرا فرد میرے لیے اجنبی تھا۔ وہ بھی اپنی چارپائی کی پائنتی کی طرف سر کیے پڑا تھا۔ ان دونوں ں رائفل ان کی چارپائیوں کے سرہانے ٹکی کھڑی تھیں۔

ہم نے انہیں ان کے حال پر چھوڑا اور حویلی کی عمارت کی جانب بڑھے۔ ہال کمرے میں دھیمی شنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے جانو کو کونے والے کمرے کی جانب بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اب میں اس کی رف سے' مزید محتاط ہو چکا تھا۔ اس موقع پر اس کی ذرا سی غلط حرکت میرے لیے مصیبت بن جاتی۔ ال الدین کے کمرے کا دروازہ بھی صرف بھڑا ہوا تھا۔ میں نے جانو کو اشارہ کیا کہ وہ خاموشی سے

دروازہ کھول کر ایک طرف ہٹ جائے۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اس کمرے میں بھی مدھم روشنی تھی۔ سب سے پہلے میری نظر اس لومڑی صفت منشی الفت علی خان پر پڑی۔ وہ دروازے کی طرف پیٹھ کیے قالین پر بڑے آرام وہ پوزیشن میں ''بے ہوش'' پڑا تھا۔ پھر میں نے کمال الدین خان کو دیکھا۔ وہ مسہری کے قریب اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر سے خون نکل کر جم چکا تھا۔ میں دبے پاؤں منشی کش جانب بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ میری موجودگی کو محسوس کر سکتا' میں نے اس کی کھوپڑی پر ریوالور کے دستے کا جچا تلا وار کیا۔ اچانک کمرے میں ایک سریلی چیخ ابھری۔ تب میں نے اسے دیکھا۔ کہنے کو تو وہ ایک نوکرانی تھی لیکن اس کے اندر مردوں کے دلوں پر حکمرانی کرنے کے تمام لوازم موجود تھے۔ کمال الدین اگر ساٹھ سال کی عمر میں اس پر فدا ہو گیا تو کوئی حیرت ناک بات نہ تھی۔ وہ تو مردوں میں جان ڈالنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ ان تینوں نے ''ڈاکا'' ڈالتے وقت اس کمرے کے ایک گوشے میں ایک ستون سے باندھ دیا لیکن اتنی احتیاط ضرور برتی کہ اس کے مکھن جیسے گداز بدن پر رگڑ نہ لگے۔ ڈرامے کو سین کو حقیقت سے زیادہ قریب رکھنے کے لیے انہوں نے اسے اسی حالت میں ستون سے باندھ دیا تھا۔ جس حالت میں وہ انہیں کمال الدین کے پہلو سے ملی تھی۔ اس کے وجود کی شادابیاں انسانی دماغ کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت متاثر کرتی تھیں۔ اس کے پیمانے میں موجیں مارتی مئے لالہ فام نے اگر بوڑھے کمال الدین کو مدہوش کر دیا تو اس میں تعجب کیسا۔ اسے دیکھ کر تو شاید فرشتہ صفت لوگوں کے قدم بھی ڈولنے لگتے۔ اس کے سانولے چہرے پر موجود اس کی بڑی بڑی جھیل جیسی آنکھوں میں ڈوب جانے کو دل چاہا۔

ان کی آنکھوں کی مستیاں مت پوچھ
مے کدے ڈوب ڈوب جاتے ہیں

میں نے ایک جھرجھری سی لی۔ میرے اعصاب میں سنسناہٹ پیدا ہو رہی تھی۔۔ جانو نے اپنی پارسائی ظاہر کرنے کے لیے نظریں جھکا رکھی تھیں۔ میں نے اس بد بخت عورت کی صورت پرستی معصومیت کو حیرت سے دیکھا۔ اس کے باطن کی سیاہی کا اس کے چہرے پر ہلکا سا بھی عکس نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت تھی۔ ''تم کون ہو؟'' اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ میں اس کو جواب دینے کے بجائے کمال الدین کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اسے سیدھا کیا تو اس کے حلق سے ہلکی سی کراہ برآمد ہوئی۔ وہ ہوش میں آنے والا تھا۔ میں نے مسہری کے سرہانے موجود ایک میز پر رکھا ہوا پانی کا جگ اٹھایا اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ کچھ دیر بعد اس نے کراہتے ہوئے آنکھ کھول دی۔ ہوش میں آتے ہی اس کا ہاتھ اپنے سر کی طرف بڑھا۔ جونہی اس کے ہاتھ نے زخم چھوا' وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا۔

اس کی نظر میرے چہرے پر پڑی اور پھر اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیلتی چلی گئیں۔ ''تم ۔۔۔ تم سعید خان؟'' وہ واقعی مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ اس نے بہت جلد خود کو سنبھال لیا۔ ''تم ۔۔۔ تم یہاں کیسے آئے؟ اور وہ ۔۔۔ وہ ڈاکو ۔۔۔''

''وہ تمہارے سامنے ڈاکوؤں کا سردار پڑا ہے' کمال الدین خان۔'' میں نے منشی الفت علی خان کی طرف اشارہ کیا۔ میرا ریوالور اس وقت میری جیب میں تھا۔ کمال الدین نے غور سے منشی الفت علی خان کی طرف دیکھا اور پھر اس نے پہچان لیا۔ ''یہ تو منشی الفت علی ہے۔''

''منشی الفت علی خان ہی ڈاکوؤں کا سردار ہے' کمال الدین۔ اسی نے تمہاری تجوری کا صفایا کرایا ہے۔''

''کیا بکتے ہو۔ منشی الفت علی میرا پرانا ملازم ہے۔ اس کا بھلا ڈاکوؤں سے کیا تعلق؟ اور ان ڈاکوؤں نے تو میرے سامنے اسے ۔۔۔'' کمال الدین نے طیش میں آ کر کہنا شروع کیا۔ میری توقع کے عین مطابق وہ میری بات کا یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا ''وہ سب ایک ڈراما تھا' کمال الدین خان۔ تمہیں اپنی نظروں کی پرکھ پر بہت ناز ہے لیکن تم ہر وقت اپنے سامنے رہنے والے اس بد بخت شخص کو نہ پہچان سکے۔''

میرے لہجے کی مضبوطی نے کمال الدین کا اعتماد متزلزل کر دیا۔ وہ معاملے کی سنگینی کے پیش نظر میری بات پر توجہ دینے پر مجبور ہو گیا۔ ''تو کہنا کیا چاہتا ہے جوان؟''

''تم نے مجھے اپنا دشمن سمجھا تھا کمال الدین خان لیکن میں نے تمہیں اپنا دشمن نہیں سمجھا کیونکہ تمہاری نظروں پر شکوک کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ میرے پاس اپنی سچائی ثابت کرنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ تم نے میرے ساتھ برا سلوک کیا لیکن میں نے تمہیں معاف کر دیا کیونکہ تم غلط فہمی کا شکار تھے لیکن اگر تم نے اب بھی ہوش سے کام نہ لیا تو پھر تمہارا اللہ ہی حافظ ہے۔''

''صاف صاف بتاؤ سعید خان۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ تم منشی الفت علی خان کے بارے میں ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو؟'' اس وقت اس کی نظر جانو پر پڑی۔ ''تم ۔۔۔ تم جانو ہو نا؟ تم اس وقت حویلی میں کیا کر رہے ہو؟''

''تمہارے تمام سوالوں کا جواب تمہیں مل جائیں گے۔ پہلے تم اپنی امانت سنبھالو۔'' میں نے نوٹوں سے بھرا کینوس کا تھیلا اٹھایا اور کمال الدین کے سامنے الٹ دیا۔ قالین پر چھوٹے بڑے نوٹوں کی گڈیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس رنگ برنگے ڈھیر کو دیکھ رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے نے کئی رنگ بدلے۔ اس کے چہرے پر امیک ہی رنگ ٹھہر گیا۔ خوشی اور مسرت کا رنگ۔

''یہ ۔۔۔ یہ تمہیں کہاں سے ملے سعید خان؟'' اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ اسے شاید ابھی تک اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ ''انہیں اپنی تجوری میں رکھو کمال الدین خان اور پھر میری چند باتیں غور سے سنو۔''

قدرے ہچکچاہٹ کے بعد کمال الدین کمرے کی دیوار کی جانب بڑھا۔ وہاں پر ایک بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔ اس نے تصویر ہٹائی تو پیچھے سے ایک دیوار گیر تجوری ظاہر ہو گئی۔ اس تجوری میں نمبروں والا قفل لگا ہوا تھا۔ اس وقت وہ قفل کھلا ہوا تھا۔ کمال الدین جلدی جلدی دولت کا وہ ڈھیر تجوری میں

منتقل کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ زر کثیر واپس اپنی جگہ منتقل ہو گیا۔ کمال الدین نے تجوری کو مقفل کیا۔ عین اسی وقت اس کی نظر ڈیوائی پر پڑی۔ ''ارے۔۔۔ ارے جانو ڈیوائی کو کھولو۔'' پھر شاید اسے خیال آیا کہ ڈیوائی جس ''لباس'' میں ہے اس میں اسے کسی اور کے ذمے لگانا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ وہ بذات خود اسے کھولنے کے لیے بڑھا۔

''نہیں کمال الدین ابھی نہیں۔'' میں نے اسے منع کیا ''اسے ابھی مت کھولو۔ پہلے وہ سن لو جو میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں' اس کے بعد جو جی چاہے کرنا۔''

''لیکن ڈیوائی تو۔۔۔'' اس نے جانے مجھے کیا بتانا چاہا لیکن پھر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ''اچھا تم بتاؤ کیا بتانا چاہتے ہو لیکن پہلے منشی الفت علی خان کو تو ہوش میں لانے دو۔''

''اسی نے منشی کے سر میں بندوق ماری ہے خان صاحب۔'' ڈیوائی نے بیچ میں مداخلت کی۔ اس کی بات سن کر کمال الدین چونک پڑا ''تم نے منشی کو بے ہوش کیا؟ لیکن وہ تو ڈاکوؤں نے......''

''ڈاکوؤں نے اسے جھوٹ موٹ کا بے ہوش کیا تھا' ورنہ اسے زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔''

''سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔ کمال الدین منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

''اچھا یہ بتاؤ کمال الدین خان کہ ان ڈاکوؤں نے تمہاری تجوری کا تالا کیسے کھولا؟ تمہارے علاوہ تو کسی کو اس تالے کا نمبر نہیں معلوم ہوگا؟'' میں نے پوچھا ''نہیں کسی کو بھی نہیں۔''

''یہی تو تمہاری غلطی فہمی ہے۔ تمہیں علم ہی نہیں کہ تمہارے علاوہ منشی الفت علی خان کو بھی اس تجوری کا نمبر معلوم ہے۔ اس کی تمہاری دولت پر بہت عرصے سے نظر تھی۔ جونہی اسے موقع ملا اس نے تمہاری تجوری صاف کر دی۔ وہ تینوں ڈاکو اسی کے ساتھی تھے۔''

''مجھے پوری بات بتاؤ سعید خان۔ میں تفصیل سے سب کچھ جاننا چاہتا ہوں۔'' اس نے شدید اضطراب کے عالم میں کہا۔ میں نے اسے شروع سے آخر تک سب کچھ بتانا شروع کر دیا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں کیسے اس کی قید سے فرار ہوا۔ کس طرح محض اتفاق سے اس طرف جا نکلا جہاں منشی الفت علی خان اور تینوں ڈاکو اس کے خلاف مسکوٹ کر رہے تھے۔ میں نے جانو سے اپنے بیان کی تصدیق کروائی۔ کمال الدین قدرے تذبذب کا شکار تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ڈیوائی نامی یہ ملازمہ بھی اس سازش میں برابر کی شریک ہے۔ اسی نے چوکیداروں کو بے ہوشی ملا کھانا کھلایا ہے۔ ڈیوائی نے واویلا مچا کر اپنی بے گناہی کا یقین دلانا چاہا لیکن کمال الدین کو میری باتوں کا یقین ہو چلا تھا۔ اس نے الماری سے ایک پستول نکالا اور اس کی نال ڈیوائی کے حلق میں ڈال دی۔ کچھ ہی دیر میں ڈیوائی نے سب کچھ اگل دیا۔ کمال الدین فرط غضب سے کانپنے لگا۔ وہ منشی الفت علی خان اور ڈیوائی کو اسی وقت گولی مارنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے بڑی مشکل سے روکا۔ میرے کہنے پر اس نے جانو کو معاف کر دیا۔ جانو نے کمال الدین کی ہدایت کے مطابق منشی کے ہاتھ پاؤں رسی سے جکڑ دیئے۔

''اب ہمیں اس حجرے سے ان دونوں ڈاکوؤں کو لانا ہے۔'' میں نے کمال الدین سے کہا ''تم مجھے دو گھوڑے دو۔ میں انہیں لاد کر لے آؤں گا۔''

''نہیں جوان تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ جانو۔ تم حویلی کے پچھواڑے میرے ڈنگروں کے باڑے میں جاؤ۔ وہاں گلا مو اور نوری ہوں گے۔ ان سے کہنا کہ میں نے انہیں بلایا ہے اور ان سے کہنا کہ آتے ہوئے چار گھوڑے بھی تیار کر لائیں۔ تمہیں پہچانتے ہیں نا وہ دونوں؟''

''ہاں خان جی۔'' جانو نے مسرور لہجے میں کہا ''مجھے تو اچھی طرح جانتے ہیں وہ۔''

''بس تو فٹافٹ جا۔'' جانو تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ کمال الدین نے ایک نفرت بھری نگاہ ڈیوائی پر ڈالی۔ ''تجھ سے تو میں بعد میں نمٹوں گا کتیا۔'' اس کی غضب ناک نظروں نے ڈیوائی کو دہلا کر رکھ دیا۔ اس کا خوبصورت چہرہ پیلا پڑ گیا۔ کمال الدین میری طرف متوجہ ہوا۔

''میں تم سے بے حد شرمندہ ہوں سعید خان۔ میں نے تم پر بہت زیادتی کی ہے۔ میری آنکھوں پر منشی الفت علی کی مکاری نے پٹی باندھ دی تھی۔ مجھے امید ہے تم مجھے معاف کر دو گے۔ تم نے مجھے لٹنے سے بچا لیا۔ تم جانتے ہو اس تجوری میں کتنا پیسہ ہے؟۔۔۔ پورے بائیس لاکھ روپے!''

''لیکن خان صاحب تم نے اتنی بڑی رقم یہاں کیوں رکھ چھوڑی ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''دراصل میں نے ایک شخص سے اس کی زمینوں کا سودا کر رکھا ہے۔ اسے ایک دو دن میں رقم کی ادائیگی کرنی ہے۔ تم یہ بتاؤ تمہیں مجھ سے کوئی ناراضگی تو نہیں؟''

''تم اس بات کو بھول جاؤ کمال الدین خان۔ یہ بتاؤ تم نے کریم بابا کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی؟''

''میں نے اس کو بلوایا۔'' کمال الدین نے دھیمے لہجے میں کہا ''میں نے اس سے پوچھ گچھ کی۔ اس نے تمہارے متعلق بتایا کہ تم کس طرح اس کے پاس پہنچے۔ میں شاید اس کی بات کا یقین نہ کرتا لیکن اس نے اپنی بیٹی ہیر کی قسم کھا کر کہا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ہیر اس کی واحد اولاد ہے اور وہ اکثر بیمار رہتی ہے۔ کریم بخش اس کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا۔ چنانچہ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ تم سردار برکت علی کی حویلی میں کیا کر رہے تھے اور تم نے میرے کارندے کو گولی کیوں ماری۔ تم بے فکر ہو کر سچ بتاؤ۔ میں تمہارا قصور بھلا چکا ہوں۔''

''یہ سب قسمت کا کھیل ہے کمال الدین خان۔ دراصل میں خود بھی سردار برکت علی کی حویلی میں قید تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے خود کو آزاد کرایا۔ عین اسی وقت جبکہ میں اس منحوس حویلی سے نکلنے والا تھا تمہارے کارندوں نے اس حویلی پر دھاوا بول دیا۔ میں حویلی کی چار دیواری پھلانگنے ہی والا تھا کہ تمہارے کارندے نے باہر سے مجھ پر فائرنگ کر دی۔ مجبوراً مجھے بھی گولی چلانا پڑی جس کے نتیجے میں تمہارا کارندہ مارا گیا۔''

''تم سچ کہہ رہے ہو سعید خان؟ یہ تو بڑا عجیب و غریب اتفاق ہے لیکن تم اس حویلی میں کیوں مقید تھے؟ تم نے سردار برکت علی کا کیا بگاڑا تھا؟'' کمال الدین نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

''میں نے اس کا بگاڑا تو کچھ نہیں تھا البتہ بگاڑنے کی کوشش ضرور کی تھی۔ میں نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا۔ نتیجتاً سردار برکت علی نے مجھے اپنی حویلی کے تہہ خانے میں قید کر دیا۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ سردار برکت علی قتل ہو چکا ہے؟''

''کیا واقعی؟'' میں نے شدید حیرانی کا اظہار کیا۔ ''لیکن وہ کب قتل ہوا؟ اسے کس نے قتل کیا؟''

''اس کے قاتل کا تو کسی کو علم نہیں۔ اس کے بہت سے دشمن تھے۔ کسی کا داؤ چل گیا ہوگا۔''

''اگر اسے کوئی اور قتل نہ کرتا تو میں ضرور اسے قتل کر دیتا۔''

''تمہاری اس سے کیا دشمنی تھی سعید خان؟'' اس نے پوچھا۔

''اس بدبخت نے میری بہن کے اکلوتے بیٹے کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ میں اپنے بھانجے کے قتل کا بدلہ ضرور لوں گا۔ میں نے کوشش تو کی لیکن ناکام رہا۔''

''خیر جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا۔ اسے قتل کرنے کی کوشش مین اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچ جاتا تو میں ایک شیر دل ساتھی سے محروم رہ جاتا۔''

''اب میرا تمہارا ساتھ ذرا مشکل ہی کمال الدین خان۔''

''غصہ تھوک دو سعید خان۔ اب ہم دوست ہیں۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ مجھے مایوس مت کرو۔'' اس کے لہجے میں التجا کا رنگ تھا۔

میں خود بھی معاملہ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ''اچھا پہلے اس معاملے سے نمٹ لیں اس کے بعد دیکھیں گے۔'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

اسی اثناء میں جانو واپس آ گیا۔ اس کے ہمراہ دو ہٹے کٹے مسلح افراد تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا ''خیریت تو ہے خان صاحب؟ آپ کیسے زخمی ہو گئے؟'' اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ ''کوئی خطرے کی بات تو نہیں؟''

''سب خیریت ہے گلامو۔ بس یہ سمجھو کہ بال بال بچا ہوں۔ ان دونوں نمک حراموں کو دیکھ رہے ہو؟ انہوں نے مجھے تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی۔'' کمال الدین نے کہا۔

''یہ تو ڈیوائی ہے اور۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ تو منشی الفت علی خان ہے نا؟''

''ہاں ان ہی کتے کی نسلوں نے مجھے کنگال کرنے کی کوشش کی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ عین وقت پر یہ جوان میری مدد کو آ گیا۔ میں ان دونوں کو اسی کمرے میں بند کر کے ذرا ایک کام سے جا رہا ہوں۔ تم اور نوری اس کمرے کے دروازے پر پہرہ دو۔ بلکہ ایسا کرو کہ تم خود یہاں رکو اور نوری کو گیٹ پر بھیج دو۔ وہاں روشن اور نوازش بے ہوش پڑے ہیں۔ یہ انہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرے گا۔''

''لیکن آپ کہاں جا رہے ہیں خان جی؟ اگر کوئی خطرہ کی بات ہے تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔''

''کوئی خطرے کی بات نہیں ہے گلامو۔ تمہیں جو کچھ کہا گیا ہے وہ کرو۔'' کمال الدین نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر موٹا سا تالا ڈال دیا۔ ڈیوائی نے بہت آہ و زاری کی' معافی تلافی کی

کوشش کی لیکن کمال الدین نے اس کی کسی بات پر توجہ نہ دی۔ اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دو سیون ایم ایم رائفلیں تھیں۔ اس نے وہ رائفلیں مجھے اور جانو کو دیں۔ اس نے اپنے شانے سے ایک روسی کلاشنکوف لٹکا رکھی تھی۔ ہم حویلی سے باہر نکلے تو چار گھوڑے تیار تھے۔ ہم تینوں ایک ایک گھوڑے پر سوار ہو گئے' چوتھا گھوڑا میرے گھوڑے کے زین سے بندھا ہوا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم اس حجرے کی جانب اڑے چلے جا رہے تھے۔ سب سے آگے جانو کا گھوڑا تھا۔ جانو کو راستے کا سب سے بہتر علم تھا اس لیے اس نے راہنمائی کا فریضہ سنبھال لیا۔ پھر ہم نے اس حجرے سے کچھ پہلے اپنے گھوڑے روک لیے۔ گھوڑوں کو ایک درخت کی شاخوں سے باندھ کر ہم حجرے کے عقبی سمت واقع کھڑکی کی جانب بڑھے۔ کھڑکی کے پٹ بھڑے ہوئے تھے۔ جانو نے کھڑکی کے پٹ کھولے اور حجرے میں داخل ہو گیا۔ میں اس کے عقب میں اور پھر کمال الدین حجرے میں داخل ہوئے۔ میں نے اپنی جیب سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ جانو نے چارپائی کے نیچے ہاتھ ڈال کر لالٹین نکال لی۔ اس نے ماچس جلا کر لالٹین روشن کر دی۔ لالٹین کی دھیمی روشنی حجرے میں پھیلی۔ میں نے اس طرف نگاہ ڈالی جہاں میں صابر اور جیرے کو بندھا ہوا چھوڑ کر گیا تھا۔ میرے حلق سے بے اختیار سے ایک غراہٹ بلند ہوئی۔ وہ جگہ بالکل خالی تھی۔ وہ دونوں ہی وہاں سے غائب تھے۔ جانو نے لالٹین روشن کر کے خود بھی اس طرف دیکھا اور اس کے منہ سے حیرت بھری چیخ نکل گئی۔ وہ بھونچکا سا ہو کر اس جگہ کو گھورے جا رہا تھا۔ کمال الدین نے استفہامیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''وہ دونوں نکل کر بھاگ گئے ہیں خان صاحب۔'' میں نے بھاری لہجے میں کہا ''انہوں نے کسی طرح اپنی رسی کھول لی اور فرار ہو گئے۔''

''یہ۔۔۔ یہ تو اچھا نہیں ہوا سعید خان۔'' اس نے قدرے متفکر لہجے میں کہا ''خیر مجھ سے بچ کر وہ کہاں جائیں گے۔ میں تو انہیں زمین کی تہوں سے کھود نکالوں گا۔''

''مجھے ان کے سب ٹھکانوں کا پتہ ہے خان جی۔ وہ بچ کر کہیں نہیں جا سکتے۔'' جانو نے کہا۔

''بس وہ ایک بار میرے ہاتھ آ جائیں۔ میں ان کا وہ حشر کروں گا کہ پھر کوئی نمک حرامی کا سوچ بھی نہیں سکے گا۔''

میں نے حجرے کا بغور جائزہ لیا۔ وہ رسی وہیں پڑی ہوئی تھی جس سے وہ دونوں بندھے ہوئے تھے۔ ٹین کا ایک صندوق بھی کھلا پڑا تھا۔ چارپائی پر سے دونوں رائفلیں غائب تھیں۔ اچانک مجھے کچھ خیال آیا ''جانو کیا اس حجرے میں رائفلوں کی اور بھی گولیاں موجود تھیں؟''

''مجھے تو پتا نہیں سعید بھائی۔ یہ حجرہ تو اس حرامی صابر کا تھا۔ یہ سارا سامان بھی اسی کا ہے۔''

''خیر جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔ کیا خیال ہے خان صاحب واپس چلیں؟''

''ہاں چلو۔ اب تک تو وہ دونوں پتا نہیں' کہاں سے کہاں پہنچ چکے ہوں گے۔'' اس کے لہجے میں ہلکی سی مایوسی کی جھلک تھی۔

ہم تینوں حجرے سے باہر نکلے تو اچھا خاصا اجالا پھیل چکا تھا۔ جانو ہم دونوں سے آگے تھا۔ کمال الدین مجھے جیرے اور صابر کے متعلق اپنے خوفناک ارادوں سے آگاہ کر رہا تھا۔ ہم تینوں حجرے سے دس پندرہ قدم دور ہی پہنچے ہوں گے کہ اچانک فضا میں ایک زوردار دھما کا گونجا اور ایک گولی سنسناتی ہوئی ہمارے قدموں کے پاس زمین میں دھنس گئی۔ ابھی ہم سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ ایک اور گولی میرے کان کے پاس سے گزر گئی۔ میں نے کمال الدین خان کو دھکا دے کر زمین پر گرا دیا اور خود بھی زمین پر سینے کے بل لیٹ گیا۔ اگر ہمیں ایک لمحہ بھی دیر ہو گئی ہوتی تو ہم میں سے کسی ایک کا سینہ تو ضرور چر جاتا کیونکہ عین اسی وقت ایک گولی اس جگہ سے گزری جہاں ہم ایک لمحہ پہلے کھڑے تھے۔ جانو نے زمین پر لیٹنے کے بجائے اپنے کندھے سے رائفل اتاری اور اندازے سے ادھر فائر کر دیا جہاں سے ہم پر فائرنگ ہو رہی تھی۔ اس فائر کا صرف اتنا فائدہ ہوا کہ ہمیں چند لمحے کی مہلت مل گئی۔ میں نے بھی اپنے ریوالور سے اسی سمت میں دو فائر کیے۔ جواباً اس طرف سے دو مزید فائر ہوئے اور گولیاں ہمارے سروں پر سے گزرتی چلی گئیں۔"

کمال الدین خان نے اپنی کلاشنکوف سیدھی کی اور حملہ آوروں کی سمت چھوٹا سا برسٹ مارا۔ جوابی فائر قدرے توقف کے بعد آیا۔ میں نے بھی اپنی رائفل کاک کر کے ادھر فائر کیا' جدھر میرے اندازے کے مطابق دشمن چھپا ہوا تھا۔ ایک بار پھر ہم پر فائر کیا گیا۔ اچانک جانو کے حلق سے دردناک چیخ نکلی۔ اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی اور وہ اپنا پیٹ پکڑ کر بری طرح تڑپنے لگا۔ کمال الدین نے ایک بار پھر برسٹ مارا لیکن دشمن کا کچھ نہ بگڑا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ دشمن قدرے بلند جگہ گھات لگائے بیٹھا ہے۔ ہم اگر سارا دن بھی فائرنگ کرتے رہتے تو اس کا کچھ نہ بگاڑ پاتے جبکہ ہم بالکل کھلی جگہ پر تھے۔ وہ بڑی آسانی سے یکے بعد دیگرے ہمیں اپنی گولی کا نشانہ بنا لینے میں کامیاب ہو جاتا۔ صورت حال بے حد خطرناک تھی۔ اگر فوری طور پر کچھ نہ کیا جاتا تو موت یقینی تھی۔ میں نے کمال الدین کو کہا کہ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے برسٹ مارے۔ میں اس دوران میں دشمن کی طرف بڑھنے کی کوشش کروں گا۔ کمال الدین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے اسے اشارہ کیا۔ اس نے جونہی برسٹ فائر کیا میں تیزی سے کروٹیں بدلتا ہوا دائیں ہاتھ پر واقع درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھا۔ دوسرا برسٹ فائر ہوا تو میں درختوں کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ اسی وقت کمال الدین کی کلاشنکوف کا میگزین ختم ہو گیا۔ اس نے دوسرا میگزین لگایا۔ اس دوران میں اس پر دو فائر ہوئے لیکن دونوں ہی اس کے سر پر سے گزرتے چلے گئے۔ میں جھکا جھکا اس کی طرف بڑھنے لگا جدھر سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں نے کافی حد تک اس جگہ کا اندازہ لگا لیا تھا۔ کمال الدین نے ایک اور برسٹ مارا۔ اس دوران میں تقریباً آدھا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ ایک بار پھر کمال الدین پر فائر ہوا۔ اس بار میں نے رائفل کی نال بھی دیکھ لی۔ میں چکر کاٹ کر اس طرف بڑھا۔ پھر میں نے اس شخص کو دیکھ لیا۔ وہ دو تین پتھروں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا۔ میں بلی کی سی چال چلتا ہوا اس کے بے حد قریب پہنچ گیا۔ اسی وقت میں نے ان دونوں کو پہچان لیا۔ اس وقت جیرا زمین پر اکڑوں بیٹھا سیون ایم ایم رائفل کے میگزین میں گولیاں بھر رہا تھا۔ رائفل اس نے اپنے پیروں

کے درمیان دبا رکھی تھی۔ اس کا بائیاں ہاتھ بری طرح زخمی تھا اس کے باوجود وہ ہمت ہارنے پر تیار نہ تھا' اور اپنے ساتھی صابر کی حتی الوسع مدد کر رہا تھا۔ صرف ایک ہاتھ سے رائفل لوڈ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا لیکن جیرے نے اپنی بے مثل ہمت سے یہ مشکل کام آسان بنا ڈالا۔ دوسری رائفل صابر کے ہاتھ میں تھی اور وہ تاک تاک کر نشانے لگا رہا تھا۔

کمال الدین کی کلاشنکوف ایک بار پھر گرجی گولیوں کی بوچھاڑ ان پتھروں سے ٹکرائی جن کے پیچھے صابر علی چھپا ہوا تھا۔ فضا میں چنگاریاں سی چمکیں۔ صابر پہلے ہی پتھروں کے پیچھے دبک چکا تھا۔ میں نے اپنا ریوالور سیدھا کیا اور صابر کا نشانہ لیا۔ ادھر صابر نے ایک بار پھر اپنی رائفل کی نال کا رخ کمال الدین کی جانب کر دیا۔ میں اسے جان سے مارنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا میں نے نہایت احتیاط سے اس کی ٹانگ کا نشانہ لیا۔ میں فائر کرنے ہی والا تھا کہ صابر نے فائر کر دیا۔ فضا میں ایک زبردست دھما کا گونجا۔ دھماکے کی آواز کے ساتھ ہی فضا میں کرب سے بھرپور چیخ گونجی۔ میں نے اس آواز کو فوراً پہچان لیا۔ وہ کمال الدین کی چیخ تھی۔ کمال الدین کی چیخ سنتے ہی صابر نے خوشی سے بھرپور نعرہ بلند کیا "وہ مارا بڈھا۔" مجھ پر جنون سا طاری ہونے لگا۔ میں نے ایک بار پھر نشانہ باندھا اور گولی چلا دی۔ فضا میں فائر کا دھماکا گونجا۔ میں نے صابر کی ران کا نشانہ لیا تھا لیکن شاید اس کا آخری وقت آن پہنچا تھا چنانچہ عین اس وقت جب میں نے فائر کیا' اس نے خالی رائفل جیرے کی طرف بڑھا کر لوڈ رائفل لینا چاہی۔ نتیجتاً جس گولی کو اس کی بائیں ران کو نشانہ بنانا تھا' وہ اس کی گردن چیرتی ہوئی نکل گئی۔ اس کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ منہ کے بل کچی زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کی گردن سے بہنے والا خون ڈھلوان کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کے جسم نے چند جھٹکے کھائے اور پھر جھرجھری سی لے کر ساکت ہو گیا۔ اس بھیانک منظر نے جیرے کو عارضی طور پر ہوش و حواس سے بے گانہ کر دیا۔ وہ یک ٹک اپنے ساتھی' اپنے سنگی کی لاش کو گھورے جا رہا تھا۔ اس پر شاید سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور ایک جھٹکے سے جیرے کے دائیں ہاتھ سے رائفل چھین لی۔ اس نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی۔ ویسے بھی وہ ایک ہاتھ سے رائفل کا نشانہ نہیں لگا سکتا تھا لیکن میں نے کوئی بھی خطرہ مول لینا مناسب نہ سمجھا۔

مجھے کمال الدین کی فکر لاحق تھی۔ سیون ایم ایم کی تباہ کن قوت والی گولی نے جانے اس کا کیا حشر کیا ہو گا۔ میں نے جیرے کو اس کے حال پر چھوڑا اور برق رفتاری سے کمال الدین کی جانب دوڑتا چلا گیا۔ کمال الدین کی کلاشنکوف قریب ہی پڑی تھی اور وہ درد کے مارے زمین پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ میں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے بٹھانا چاہا لیکن وہ میرے ہاتھوں میں جھول گیا۔ اس کے بائیں شانے سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے کسی کپڑے کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ قریب ہی جانو کی لاش پڑی تھی۔ اس کا پٹکا اس کے گلے میں لپٹا ہوا تھا۔ میں نے اس کا پٹکا کھولا اور اسے پھاڑ کر چوڑی سی پٹی بنا لی۔ وہ پٹی میں نے کمال الدین کے زخم پر کس کر باندھ دی۔ گولی اس کے شانے کا گوشت ادھیڑتی ہوئی نکل گئی۔ اس کا خون تیزی سے ضائع ہو رہا تھا۔ اگر اسے جلد ہی طبی امداد نہ ملتی تو اس کا بچنا مشکل ہو جاتا۔ پٹی باندھنے سے خون کا جریان کم ہو گیا تھا لیکن یہ کافی نہ تھا۔ اسے فوراً اسپتال لے جانا

ضروری تھا۔

میں نے اسے کندھے پر لاد لیا۔ اچھا خاصا معمر ہونے کے باوجود وہ ہٹا کٹا اور بھاری بھر کم تھا۔ میں اسے تیزی سے اس طرف لے چلا جہاں ہم نے اپنے گھوڑے باندھے تھے۔ وہ چاروں وفادار جانور وہیں موجود تھے۔ قسمت کا یہ کھیل کیسا نرالا تھا۔ کمال الدین اپنے دو مجرموں کو ان گھوڑوں پر لاد کر لے جانے کے لیے یہاں آیا تھا لیکن اب وہ خود میرے کاندھے پر لدا ہوا تھا۔ اس بدنصیب شخص جانو نے اپنی موت کے ڈر سے اپنے دیرینہ دوستوں کا ساتھ چھوڑ دیا لیکن موت کے بے مہر پنجے نے پھر بھی اُسے نہ بخشا۔ یہ اور بات ہے کہ اس یہ موت ایک نمک حلال ملازم کی موت تھی جبکہ دوسری صورت میں وہ صرف اور صرف ایک احسان فروش ڈاکو کی موت مرتا۔ ان تینوں میں سے اب صرف جیرا باقی بچا تھا۔ جو اپنا مجروح ہاتھ لیے بڑی بے بسی سے اس خونریز ڈرامے کو دیکھ رہا تھا۔ میں اسے بھی نہ بخشتا لیکن مجھے پہلی ترجیح کمال الدین کی زندگی کو دینی تھی۔ جیرے کے پیچھے وقت برباد کرنے کا مطلب کمال الدین کی زندگی کی لو کو مزید مدھم کرنا ہوتا۔

میں نے کمال الدین کے بے ہوش وجود کو ایک گھوڑے پر لاد دیا۔ وہ وہی گھوڑا تھا جس پر بیٹھ کر میں یہاں تک پہنچا تھا۔ اس مختصر سی رفاقت نے ہی ہم دونوں کے بیچ یگانگت کا رشتہ استوار کر دیا تھا۔ کمال الدین اسے بڑے لاڈ سے سونا کہتا تھا۔ اب وہ اپنے سونے پر مٹی کے لندے کے مانند لدا ہوا تھا۔ باقی تینوں گھوڑے اپنی کنوتیاں اٹھائے اپنے لیے حکم کے منتظر تھے۔ میں نے ان تینوں کی لگامیں ان کے گلے میں لپیٹ دیں اور انہیں زوردار تھپکیوں کے ذریعے چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ نہایت اعلیٰ نسل کے 'سدھے ہوئے گھوڑے تھے اور اپنے مالک کے مزاج شناس بھی' میرا اشارہ پاتے ہی وہ تینوں ایک ساتھ چل پڑے۔ ان کی رفتار اچھی خاصی تیز تھی۔ وہ کسی بھی انسان سے زیادہ راستوں کی سمجھ رکھتے تھے مجھے معلوم تھا کہ ان کا رخ سیدھا کمال الدین کی حویلی کی جانب ہے۔

میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوا تو چند قدم پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ اس پر اچھا خاصا بوجھ پڑ گیا تھا لیکن اس باہمت جانور نے بڑی خندہ پیشانی سے یہ اضافی بوجھ برداشت کر لیا۔ میں نے ایڑ لگائی تو وہ تیز رفتاری سے دوڑنے لگا۔ کمال الدین میرے سامنے پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے الٹے ہاتھ سے سنبھالا۔ سونا واقع ہی سونا تھا۔ اسے بار بار ہدایت دینے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ میرے ہلکے سے اشارے سے وہ میری منشا سمجھ لیتا اور پھر فوری طور پر اس پر عمل کرتا تھا۔ اچھے گھوڑے اور اس کے سوار کے درمیان ایک غیر مرئی ذہنی رابطہ ہوا کرتا ہے۔ طویل رفاقت کے نتیجے میں یہ ذہنی ہم آہنگی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ گھوڑا اپنے مالک کی دلی خواہش کو بغیر حکم دیئے سمجھنے لگتا ہے۔ شاید اسی لیے دنیا کی تاریخ میں شہرت پانے والے اکثر فاتحین اپنے گھوڑوں کو اپنی فتوحات کا اہم سبب قرار دیتے تھے۔

میں جس راستے سے گزر رہا تھا وہ اچھے خاصے گھنے جنگل کے درمیان موجود تھا۔ ایک پر پیچ پگڈنڈی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق میرا رخ کوٹ چھٹے کی طرف تھا۔ میں کمال الدین کو اسپتال لے جا رہا تھا تاکہ اسے فوری طبی امداد دی جا سکے۔ کافی دیر تک سفر کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ

شاید میں راستہ بھٹک گیا ہوں۔ میرے اندازے کے مطابق مجھے کئی بستیوں کے قریب سے گزرنا تھا لیکن بجائے اس کے میرے آس پاس درختوں کی گنجانی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ صبح کا اجالا پھیلے کافی دیر ہو چکی تھی لیکن مجھے ابھی تک کسی انسان کی شکل نظر نہ آئی تھی۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ آگے بڑھتا رہوں۔ مجھے بار بار یہ احساس ہوتا کہ اب جنگل چھدرا ہونے لگا اور میں کسی انسانی آبادی میں پہنچنے والا ہوں لیکن پھر کچھ ہی دیر بعد میری یہ خوش فہمی دور ہونے لگتی۔ تنگ آ کر میں نے اپنے گھوڑے کی رفتار سست کر لی۔ اب تک کڑی مشقت نے گھوڑے کو پسینے میں شرابور کر دیا تھا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا میں خود بھی گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا تھا۔ کمال الدین کو بے ہوش ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ اس کے زخم پر بندھی پٹی خون سے سرخ تھی۔ اگر اس کو کچھ دیر کے اندر طبی امداد نہ ملتی تو اس کی موت یقینی تھی۔ ایک مناسب سی جگہ دیکھ کر میں نے گھوڑا ٹھہرا لیا۔ یہ ایک چھوٹی سی نہر تھی۔

میں نے کمال الدین کو گھوڑے سے اتار کر ایک درخت کے نیچے لٹا دیا۔ سونا بڑے صبر سے انتظار کر رہا تھا کہ میں اسے پانی کی اجازت دوں۔ میں نے اس کے منہ سے باگ نکال دی۔ وہ جھک کر پانی پینے لگا۔ اس کا پسینے سے بھیگا ہوا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ میں بھی پانی پر جھک گیا اور اوک میں پانی لے کر پینے لگا۔ میرے ہاتھوں سے چھلکنے والا پانی میری قمیض کو بھگونے لگا۔ سیر ہو کر پانی پینے کے بعد میں نے اوک میں پانی لیا اور کمال الدین کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس کے منہ میں پانی ٹپکانے کی کوشش کی لیکن اس اثنا میں پانی میری انگلیوں کے درمیان سے بہہ چکا تھا۔ کمال الدین کے جبڑے سختی سے بھنچے ہوئے تھے اور بغیر منہ کھولے اس کے حلق میں پانی ٹپکانا ناممکن تھا۔ اوک کے ذریعے تو ایک قطرہ بھی اس کے منہ میں نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے اس کی دائیں بانچھ میں اپنی شہادتی انگلی ڈال دی۔ اس کے دانت سختی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی انگلی اس کی داڑھوں کے پیچھے مسوڑھوں میں پھنسائی اور زور لگا کر اس کے دانتوں کو جدا کرنے کی کوشش کی۔ کافی جدوجہد کے بعد میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے جبڑوں کے درمیان کچھ خلا پیدا ہوا۔ میں نے اوپر اور نیچے کے دانتوں کے درمیان اس کی قمیض کے دامن کا کپڑا پھنسایا۔ اب اس کے حلق میں پانی جا سکتا تھا لیکن اوک کے ذریعے اب بھی اس تک پانی پہنچنا مشکل تھا۔

آخر میں نے ایک ترکیب سوچ ہی لی۔ میں نے اپنی جیب سے اپنا سفید سوتی رومال نکال لیا۔ نہر کے کنارے پہنچ کر میں نے وہ رومال اچھی طرح بھگو لیا۔ رومال سے نچڑنے والا پانی کمال الدین کے حلق میں اترا۔ میں نے رومال کو ایک بار پھر پانی میں بھگو لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے رومال میں سے ہلکی ہلکی بھینی بھینی خوشبو آ رہی ہو۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کچھ ہونے والا تھا۔ کوئی عجیب اور ناقابل یقین واقع رونما ہونے والا تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں میں لرزش سی پیدا ہونے لگی۔

''اس رومال کی حفاظت کرنا۔'' میرے ذہن میں قلندر سائیں کے کہے ہوئے الفاظ گرنجے۔ ''یہ میرے یار کا تحفہ ہے یہ تمہارے کام آئے گا۔''

میں نے رومال کا پانی دوسری بار بھی کمال الدین کے حلق میں نچوڑ دیا۔ جونہی پانی اس کے حلق

سے نیچے اترا اس کے نیم مردہ جسم میں جان سی پڑ گئی۔ اس کے حلق سے کراہ خارج ہوئی۔ وہ ہوش میں آ رہا تھا۔ وہ بغیر کسی دوا کے' مرہم پٹی کے ہوش میں آ رہا تھا۔ اس نے موت کو شکست دے دی۔ مگر۔۔۔ مگر کیسے......؟

کچھ دیر بعد کمال الدین نے آنکھ کھول دی۔ اس کے چہرے پر کرب اور نقاہت کے آثار تھے۔ تاہم وہ پوری طرح ہوش میں تھا۔ ''سعید خان۔۔۔ تم۔۔۔؟ ہم۔۔۔ ہم کہاں ہیں؟'' اس نے سوال کیا۔ میرے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ بچ گیا تھا۔ میں نے اس کی زندگی کے لیے کتنی دعا مانگی تھی۔ اس کا زندہ رہنا میرے لیے بے حد ضروری تھا۔ اس کے دم سے تو میری ہیر کی زندگی کی امید وابستہ تھی۔ اگر وہ مرجاتا تو اتنی اس بھاری رقم کا کیسے انتظام کرتا جو ہیر کے لیے درکار تھی۔

''تم ٹھیک تو ہو خان جی؟'' میں نے اپنا ہیجان چھپاتے ہوئے کہا۔ میں نے اپنا رومال اپنی کلائی میں باندھ لیا تھا۔ اس میں سے ابھی تک ہلکی ہلکی خوشبو کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ میں جونہی اس رومال کی طرف دیکھتا تھا میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگتی تھیں۔

''ہاں بھئی میرے خیال میں اب میری حالت قدرے بہتر ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ اس وقت ہم کہاں ہیں؟'' ''یہ تو مجھے نہیں معلوم خان جی۔ میں تو تمہیں کوٹ چھٹے لے جانے کے ارادے سے چلا تھا لیکن راستے میں اس جنگل کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔''

''یہ علاقہ مجھے کچھ اجنبی سا محسوس ہو رہا ہے۔ مجھے اپنے زخم میں اب کم درد محسوس ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ گولی رگڑ کھاتی چلی گئی۔''

میں نے اس کے خیال پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ سیون ایم ایم کی گولی نے اس کا شانہ کھود کر رکھ دیا تھا۔ اس کی تو لمبی ہی چھٹی ہو جاتی بلکہ یہ چھٹی مستقل ہی ہو جاتی۔ میں اسے اگر پوری بات بتا دیتا تو شاید وہ میرا مذاق اڑانا شروع کر دیتا۔ اس جیسا مادیت پرست شخص بھلا روحانیت کے اسرار و رموز کیا سمجھ پاتا۔ بہتر یہی ہے کہ اسے کچھ بھی نہ بتایا جائے۔

''لگتا ہے میرا اچھا خاصا خون ضائع ہو چکا ہے۔ میرے تو سارے کپڑے خون میں لت پت ہیں۔'' میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ پانی نے میری تشنگی تو دور کر دی لیکن بھوک کا میرے پاس کوئی علاج نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ ایسی ہی حالت کمال الدین کی ہوگی لیکن اس نے اظہار نہیں کیا۔ ہم لوگ بے شک بھوکے تھے لیکن سونے کی بھوک مٹانے کا وہاں بہت سامان موجود تھا۔ وہ نہر کے کنارے اگی ہری ہری گھاس چرتا رہا۔ جتنی دیر میں ہم دونوں تازہ دم ہوئے' وہ پوری طرح شکم سیر ہو گیا...... اب وہ ایک بار پھر میرا اور کمال الدین کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار تھا۔ بڑا ہی شہزور گھوڑا تھا وہ سونا۔ ہم دونوں کا مجموعی وزن ساڑھے تین سے چار من تک تھا لیکن اس کے قدموں میں ہلکی سی لرزش بھی نہ پیدا ہوئی۔

''اب کس طرف چلیں خان جی؟'' میں نے کمال الدین کی رائے دریافت کی۔ اب وہ میرے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ ''میرے خیال میں اس نہر کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ امید ہے کہ ہم جلد از جلد

کسی آبادی تک پہنچ جائیں گے۔'' میں نے چپ چاپ اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ میں تو سرے سے جانتا ہی نہ تھا کہ اس وقت میں کس جگہ ہوں۔ کمال الدین کی کلاشنکوف میرے کاندھے پر لٹکی ہوئی تھی جبکہ میرا ریوالور میری شلوار کے نیفے میں اڑسا ہوا تھا۔ نہر کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی پگڈنڈی اب چوڑی ہو چلی تھی۔ یہ راہ گزر شاید پہلے بھی وقتاً فوقتاً استعمال ہوتی رہی ہوگی۔ کمال الدین کا اندازہ صحیح تھا یہ راستہ یقیناً کسی آبادی تک پہنچتا ہوگا۔

کافی دور تک چلنے کے باوجود ہمیں کوئی آبادی نظر نہ آئی۔ ہم دونوں تقریباً مایوس ہو چلے تھے کہ اچانک ایک درخت کے پیچھے سے ایک عورت برآمد ہوئی اور پگڈنڈی کے بیچوں بیچ آن کھڑی ہوئی۔ مارے حیرت کے میں چونک پڑا وہ بھرے بھرے بدن کی جوان عورت تھی۔ اس کا لباس شوخ اور بھڑکیلے رنگوں کا تھا اور اس کے گدرائے بدن پر کھال کے مانند منڈھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش زیادہ تیکھے نہ تھے لیکن اس کے اڈتے شباب نے اسے توبہ شکن سراپے کا مالک بنا دیا تھا۔ اس ویران اور غیر آباد علاقے میں اس کا اس طرح اچانک نمودار ہو جانا میری سمجھ سے بالا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں آیا کہ شاید وہ کوئی ڈائن ہے جو ہماری گردنوں میں دانت گاڑنے کے لیے ہماری راہ میں حائل ہو گئی ہے لیکن پھر میں نے اس خیال کو فوراً ذہن سے جھٹک دیا۔ میرے جیسا شخص اگر ان خرافات میں ذہن کھپانے لگے تو پھر اس کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ میں نے سوچا کہ اپنی رائفل سیدھی کر لوں لیکن پھر اپنی اس سوچ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ وہ ایک عورت ہی تو تھی۔ تنہا اور نہتی۔ اگرچہ وہ مردوں کو گھائل کرنے والے تمام تباہ کن ہتھیاروں سے لیس تھی تاہم اس پر ہتھیار اٹھانے کے لیے جس قسم کے سنگلاخ دل کی ضرورت تھی' میں اس سے محروم تھا۔ اس قسم کے ہاتھوں مرنا تو عین سعادت کی بات تھی اس کے مقابل آ کر کون کم بخت بازی جیتنے کی سوچتا ہوگا۔ اس کے ہاتھوں شکست بھی ہزار فتوحات سے بڑھ کر ہوتی۔

کمال الدین کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی۔ وہ تھا تو معمر شخص لیکن سینے میں جوان دل رکھتا تھا۔ اس کے ایک دل پسند کھلونے کو تو میں اس کی حویلی میں دیکھ بھی چکا تھا۔ ڈیوائی نام کی وہ نوکرانی اس سے ایک تہائی عمر کی رہی ہوگی۔ اس کے باوجود کمال الدین نے اسے اپنی خواب گاہ کی مہمان بنانے میں کوئی عار محسوس نہ کی۔ میں نے کمال الدین کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ رنگین مزاج تو ضرور ہے لیکن زور زبردستی کا قائل نہیں ہے۔

''تو کون لڑکی؟'' کمال الدین نے مجھ سے پہلے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ ''اور اس جنگل میں کیا کر رہی ہو؟''

اس لڑکی یا عورت کے حلق سے کھنکھناتی ہنسی بہہ نکلی' جیسے چینی کے نازک برتن آپس میں ٹکرا رہے ہوں۔ اس نے بمشکل اپنی مترنم ہنسی پر قابو پایا۔ ''میں۔۔۔ میں ریشماں ہوں۔'' اس وقت اس کی نظر کمال الدین کے لباس پر پڑی ''ارے تمہاری قمیض میں تو خون لگا ہوا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''ہں نیں گھوڑے سے گر گیا تھا۔ کندھے میں نوکیلا پتھر گھس گیا۔'' کمال الدین نے فوراً ایک

کہانی گھڑ لی۔

''ریشماں تم اس جنگل میں اکیلی کیا کر رہی ہو؟'' میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔ میرا تجسس بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ وہ مجھے کسی الف لیلوی داستان کا کردار معلوم ہو رہی تھی۔ ایسا کردار جو حقیقت کا روپ دھار کر سامنے آ کھڑا ہوا ہو۔

''میں اکیلی تھوڑی ہوں یہاں۔ میرے بابا بھی میرے ساتھ رہتے ہیں۔''

''کیا کام کرتے ہیں تمہارے بابا؟'' کمال الدین نے کہا۔

''ویسے تو وہ فارسٹ گارڈ ہیں لیکن وہ جڑی بوٹیاں بھی اکٹھی کر کے بیچتے ہیں۔''

''اس وقت تیرا ابا کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اپنی اونٹنی پر جام پور گیا ہوا ہے۔ وہاں پر ایک حکیم ہے۔ بابا اس کے لیے جڑی بوٹیاں اکٹھی کرتا ہے۔''

''تمہیں اکیلے رہتے ڈر نہیں لگتا اتنے بڑے جنگل میں؟'' مجھے واقعی حیرت ہو رہی تھی۔ یہ عجوبۂ روزگار لڑکی ایسی نہ تھی کہ اسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا۔

''این ڈر؟ کس بات کا؟ میں اس جنگل میں پلی بڑھی ہوں یہاں ہر درخت اور ہر پتے کو جانتی ہوں۔ کس میں ہمت ہے کہ میری جانب آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ میں اس کی آنکھیں نکال لوں گی۔ پھر میں خالی ہاتھ نہیں ہوں۔'' اس نے درخت کے پیچھے ہاتھ ڈالا۔ جب اس کا ہاتھ واپس آیا تو اس میں ایک چمک دار کلہاڑی تھی۔

''لیکن اگر میں اپنی رائفل تم پر سیدھی کر لوں تو پھر تم کیا کرو گی؟'' میں نے پوچھا۔ اس کی باتوں میں ایک عجیب سی بے جگری تھی۔ جیسے اسے اپنی جان پر کھیل جانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ ہو گی۔''

''تم اپنی رائفل پر نہ اکڑنا۔ وقت پڑنے پر بڑے بڑے ہتھیار دھرے رہ جاتے ہیں۔''

''تم یہ فضول بحث چھوڑو لڑکی۔'' کمال الدین نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ بتاؤ تمہارے باپ کا نام کیا ہے اور تمہارا گھر کہاں ہے؟''

وہ لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''سارے سوال ایک ہی بار پوچھ لو گے چاچا جی۔'' کمال الدین چاچا جی کا خطاب ملنے پر تلملا کر رہ گیا۔

''تجھے فالتو بکواس کرنے کی بہت عادت ہے لڑکی۔ میں تیرے باپ کا نام پوچھ رہا ہوں اور تو ادھر ادھر کی ہانکے جا رہی ہے۔''

''اچھا اچھا بتاتی ہوں چاچا جی۔'' ریشماں نے ایک بار پھر کمال الدین کے زخموں پر نمک چھڑکا۔ ''میرے بابا کا نام فضل الدین ہے ہمارا گھر یہاں قریب ہی ہے۔''

''سنو لڑکی تمہارے ہاں کچھ کھانے پینے کو ہو گا ہمارے لیے؟'' کمال الدین نے سب ناراضی بھلا کر فوراً پیٹ پوجا کی سوچی۔

''کیا بہت بھوک لگ رہی ہے چاچا جی؟ میں نے سنا تھا کہ اس عمر میں انسان کی بھوک مر جاتی ہے

لیکن تمہارے ساتھ تو الٹ ہی معاملہ ہے۔'' اس نٹ کھٹ لڑکی نے کمال الدین کی دکھتی رگ کا پتا لگا لیا تھا اور اب وہ بار بار اسے چھیڑ رہی تھی۔ کمال الدین کی تیوری پر بل نمودار ہوئے تو ریشماں نے فوراً بات پلٹ دی۔ ''میرے گھر فوری طور پر تو صرف اچار اور گڑ مل سکے گا۔ روٹی میں فٹافٹ ڈال دوں گی۔ چلو میرے ساتھ۔ تمہارے نصیب میں شاید آج میرے ہی گھر کا دانا پانی لکھا ہے۔''

میں اس دختر دشت کی شوخیاں دیکھ رہا تھا۔ وہ بات کرتے ہوئے بار بار مجھے دیکھنے لگتی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک نمایاں تھی۔ وہ چمک میرے لیے اجنبی نہ تھی۔ وہ مجھ میں دلچسپی لے رہی تھی۔ میرے گاؤں کی کتنی ہی لڑکیاں مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کرتی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے بذات خود کبھی ان کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ میرے وجود میں سلگتے بھاڑ نے مجھے کبھی اتنی مہلت ہی نہ دی کہ میں کسی اور جانب آنکھ اٹھا کر دیکھ سکتا۔ جو بد نصیب انسان سر تا پا خار دار جھاڑیوں میں الجھا ہوا ہو اسے بھلا پھولوں کی دلکشی کیسے اپنی طرف متوجہ کر سکتی ہے۔ میں نے تو کبھی اپنی عزیز ترین ہستی مہراں کو الفت و چاہت کی نظر سے نہیں دیکھا' دیگر لڑکیوں کی تو بات ہی کیا تھی۔ میرا دل چاہا کہ اس کو سمجھاؤں کہ وہ خود کو سنبھالے۔ مجھ جیسے حرماں نصیب شخص سے امیدیں باندھ کر اسے مایوسی اور پچھتاوے کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہو گا۔

اس وقت سہ پہر شام کی سرمئی شال اوڑھنے کی تیاری کر رہی تھی۔ جب ہم ریشماں کے گھر پہنچے۔ یہ چونے اور پختہ اینٹوں کا بنا ہوا ایک بڑا سا گھر تھا۔ اس کی بناوٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ انگریزوں کے دور کا بنا ہوا ہے۔ شاید یہ کسی زمانے میں فوجی چوکی یا ریسٹ ہاؤس رہا ہو گا۔ گزرے ہوئے وقت کے آثار اگرچہ اس مکان پر نمایاں تھے۔ تاہم وہ اب بھی اپنی پوری مضبوطی سے اس جنگل میں سر اٹھائے کھڑا تھا۔ مکان کے بڑے دروازے میں ایک بھاری بھرکم تالا لگا ہوا تھا۔ ریشماں نے اپنے دوپٹے کے پلو سے چابی اور تالا کھول دیا اندر نیم تاریکی کا ڈیرہ تھا۔ ریشماں نے ایک لالٹین روشن کر دی۔ میں نے مکان کے اندرونی حصے کا جائزہ لیا۔ اس مکان میں صحن نام کی کوئی شے موجود نہ تھی۔ بھاری بھرکم دروازہ ایک بڑے سے ہال میں کھلتا تھا۔ اس ہال میں تین کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ اس وقت ان تینوں دروازوں میں بھاری تالے لگے ہوئے تھے۔ ہال کے کونے میں ایک پتلا سا بل کھاتا ہوا زینہ چھت کی طرف جا رہا تھا۔ کسی زمانے میں باورچی خانے کی کوٹھری مکان سے باہر ہو گی لیکن ریشماں نے اپنا عارضی باورچی خانہ اسی ہال کی ایک دیوار کے ساتھ قائم کر رکھا تھا۔ مٹی کے تیل کے دو چولہے' کچھ برتن اور ٹین کے چند ڈبے اور کنستر۔ بس یہ تھا اس کا باورچی خانہ۔

''تم لوگ منہ ہاتھ دھو لو۔'' ریشماں نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک بڑے سے پتیلے میں پانی رکھا ہوا تھا۔ پینے کے پانی کے مٹکے بھی وہیں موجود تھے۔ ''میں اتنی دیر میں تمہارے لیے کھانا تیار کر دیتی ہوں۔''

''ارے نہیں نہیں بس تم دو چار روٹیاں پکا کر کچھ اچار کے ساتھ دے دو۔ ہمیں بس اور کچھ نہیں چاہیے۔'' کمال الدین نے بھوک سے بے قرار لہجے میں کہا۔

ریشماں نے ایک شوخ نظر کمال الدین کے پھولے ہوئے جسم پر ڈالی اور کٹیلے لہجے میں کہا ''دو چار روٹیوں سے تمہارا گزارا ہو سکے گا چاچا جی؟''

''کمال الدین بری طرح جھینپ گیا۔ میں نے کمال الدین کے کان میں سرگوشی کی۔'' یہ تم سے کیوں خار کھائے بیٹھی ہے خان جی؟''

''کمال الدین میری بات سن کر ذرا سا کسمسایا پھر اس نے میرے کان میں کہا'' دراصل بات یہ ہے کہ جب یہ پہلی بار ہمارے سامنے آئی تو میری نظر ز اس کی قمیض کی بغل میں پڑی تھی۔ اس جگہ سے اس کی قمیض تھوڑی سی ادھڑی ہوئی تھی اور اس کا پنڈا جھانک رہا تھا۔ میں نے جب ایک دو بار ادھر نظر ڈالی تو یہ بھانپ گئی۔ بس فوراً ہی بدک گئی۔''

میرے حلق سے ایک بے ساختہ قہقہہ ابلا اور پورا گھر گونج اٹھا۔ ریشماں نے آٹا گوندھتے ہوئے یک دم پلٹ کر دیکھا۔ اس کے لبوں پر شوخ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔'' ایسا کیسا لطیفہ سنا دیا چاچا جی نے کہ تم اس طرح بے قابو ہو کر ہنس رہے ہو؟''

میرے حلق سے نکلنے والا قہقہہ پہلے سے بھی زیادہ زوردار تھا۔'' مجھے بھی سناؤ نا یہ لطیفہ۔'' ریشماں نے بھولپن سے کہا۔

''تم ابھی بچی ہو۔ یہ لطیفہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔''

''اچھا تو تم مجھے بچی سمجھتے ہو۔'' ریشماں نے مجھے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ میری آنکھیں خود بخود جھکتی چلی گئیں۔ مجھے احساس ہوا کہ میں غیر ارادی طور پر اس کی حوصلہ افزائی کر رہا ہوں۔ مجھے محتاط رہنے کی ضرورت تھی' بے حد محتاط رویے سے اگر کوئی غلط فہمی اس کے دل میں گھر کر جاتی تو اس کا نتیجہ اچھا نہ نکلتا۔ اس کا دل توڑ کر شاید میرے دل کو بھی چین نہ ملتا۔

کچھ ہی دیر میں ریشماں نے روٹیوں سے بھری ڈلیا ہمارے سامنے لا رکھی۔ ایک کٹورے میں ٹینٹ اور لیموں کا اچار اور دوسرے میں اعلیٰ قسم کی سفید گڑ کی بھیلیاں تھیں۔ روٹیاں موٹی موٹی اور نرم تھیں اور تعداد میں بہت زیادہ۔'' اتنی ساری روٹیاں پکانے کی کیا ضرورت تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ریشماں کی ہنسی نے ایک بار پھر فرش پر گھنگھرو بکھیر دیے۔'' آخر مجھے بھی تو روٹی کھانی ہے تک لوگ تو بس اپنی فکر کر رہے ہو۔'' اسی وقت باہر جنگل میں ایک الو اپنی کریہہ آواز میں چیخا۔ اس کی آواز نے ریشماں کو چونکا دیا لیکن اس نے فوراً خود پر قابو پا لیا۔

''ذرا بتاؤ تو چاچا جی یہ کیا کہہ رہا ہے؟'' ریشماں نے شریر لہجے میں کمال الدین سے پوچھا۔ کمال الدین گرم گرم روٹیوں پر لمبے لمبے ہاتھ مار رہا تھا۔ پیٹ کی آگ کم ہونے سے اس کے مزاج میں بھی شگفتگی عود کر آئی تھی۔'' یہ تو تمہارا پڑوسی ہے تمہیں اس کی بولی آنی چاہیے۔'' کمال الدین نے مسکراتے ہوگے کہا۔ اب وہ چاچا جی کے خطاب سے مانوس ہو چلا تھا۔

''ارے ارے چاچا جی یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ یہ الو ہمارا پڑوسی ہے۔ یہ تو دراصل اس علاقے میں مہمان آیا ہوا ہے۔'' ریشماں کی چوٹ بے حد لطیف تھی لیکن کمال الدین موٹی موٹی مونچھوں کے

نیچے نمودار ہونے والی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ اس چوٹ کو سمجھ ہی نہیں گیا بلکہ اس سے پوری طرح لطف اندوز بھی ہو رہا ہے۔ کمال الدین کی شخصیت کے پرت' وقت کے ساتھ ساتھ مجھ پر کھلتے جا رہے تھے۔ پہلے پہل میں اسے محض ایک عیاش اور بدکردار زمیندار سمجھا تھا لیکن اس کے ساتھ گزارے ہوئے وقت نے بتایا تھا کہ وہ بوڑھا ضرور ہے لیکن بہادر اور نڈر ہے۔ اس کا جسم اگرچہ ڈھیلا ڈھالا اور آرام کوش ہے لیکن اس میں حوصلے کی کمی نہ تھی۔ صورت حال سے جلد از جلد سمجھوتا کر لینا اس کی شخصیت کا ایک اہم پہلو تھا۔ وہ اگرچہ مجھ سے بالکل مختلف مزاج کا حامل تھا تاہم قابل برداشت تھا۔ وہ کل رات سے میرے ساتھ اس جنگل میں بھٹک رہا تھا لیکن اس کے لبوں پر حرف شکایت نہیں آیا تھا۔ موت اسے چھو کر گزر گئی لیکن اس نے اسے ذرا بھی اہمیت نہ دی۔

''پانی تو لا دو ریشماں۔'' کمال الدین نے کہا۔

''تم مجھے بیٹی کیوں نہیں کہتے چاچا جی؟'' ریشماں کے لہجے میں جانے کہاں سے بے پناہ حسرت اور اداسی سمٹ آئی۔ کمال الدین بری طرح گڑبڑا گیا لیکن جب اس نے ریشماں کے چہرے پر چھائی سنجیدگی اور یاس کی چادر دیکھی تو اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس کے چہرے پر بھی سنجیدگی طاری ہوتی چلی گئی۔

''ذرا پانی تو پلاؤ ریشماں۔۔۔ بیٹی۔''

''ابھی لائی چاچا جی۔'' ریشماں کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔ وہ ایک جگ لے کر پانی کے گھڑوں کی طرف بڑھی۔ اس کی پیٹھ ہماری طرف تھی۔ وہ پانی کا جگ بھرنے لگی۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکی اور مڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ کمال الدین خان بدستور کھانے میں مگن تھا تاہم مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے ریشماں کس کشمکش میں مبتلا ہو۔ اسی لمحے جنگل میں ایک بار پھر الو چیخا۔ ریشماں چونک سی گئی اور ایک بار پھر پانی کے گھڑوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جست کا وہ جگ ٹھنڈے پانی سے لبالب بھر کر اس نے ہمارے پاس لا رکھا۔ پیتل کا بڑا سا گلاس وہ جاتے ہوئے ہمارے پاس رکھ گئی تھی۔ کمال الدین نے گلاس بھرا اور دو گھونٹ میں حلق میں اتار لیا۔'' اس علاقے کا پانی کافی کھارا ہے۔'' کمال الدین نے پانی کا گلاس بھر کر مجھے پکڑاتے ہوئے تبصرہ کیا۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ پانی بہت کھارا بلکہ کڑوا تھا۔ پانی پینے کے بعد کمال الدین نے ایک بار پھر کھانے میں ہاتھ ڈال دیا لیکن میرا پیٹ بھر چکا تھا۔ میں نے چارپائی کے سرہانے ٹکی ہوئی کلاشنکوف اٹھائی اور اسے صاف کرنے لگا۔

اسی وقت مجھے کمال الدین کے گھوڑے سونے کا خیال آیا۔ وہ اس مکان کے دروازے کے ساتھ ہی بندھا ہوا تھا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں کوئی جنگلی جانور اسے نقصان نہ پہنچا دے۔ میں نے ریشماں کو اس کے متعلق ہدایت دینا چاہی لیکن یکدم مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری زبان بہت موٹی اور بھاری ہو گئی ہے۔ میں باوجود کوشش کے کچھ بھی نہ بول سکا۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے میرے ہاتھ میں موجود کلاشنکوف بہت وزنی ہوتی جا رہی ہے۔ میں نے اسے سنبھالنا چاہا لیکن اس کا وزن شاید کئی من ہو چکا تھا۔ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر وہ چارپائی سے نیچے گر پڑی۔ میں نے اسے اٹھانے کے لیے جھکا تو مجھے

زور کا چکر آیا۔ پھر میرے دماغ پر تاریکی کا پردہ گرتا چلا گیا۔

میں شاید رات بھر بے ہوش رہا۔ رات کے آخری حصے میں وہ بے ہوشی نیند میں بدل گئی۔ میں الٹے سیدھے خواب دیکھتا رہا۔ کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میں ایک خرگوش ہوں اور جنگلی کتوں کی ایک جماعت میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ میں کبھی اس جھاڑی میں گھس جاتا تو کبھی اس جھاڑی میں میرا سانس بری طرح پھولنے لگا۔ دل کی دھک دھک سے کان کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ میں ان کتوں کے خوں خوار جبڑوں میں لیر لیر ہونے ہی والا تھا کہ یک لخت منظر بدل گیا۔ اب میں خود ایک شکاری کتا تھا۔ اس وقت ایک بڑا سا سیاہ ریچھ میرے سامنے تھا۔ میں بار بار اچھل کر اس پر حملہ کر رہا تھا لیکن میرے دانت اس کی بالوں بھری موٹی کھال کو کاٹ نہ پاتے تھے۔ وہ بار بار مجھے تھپڑ مارنے کی کوشش کرتا لیکن میں ہر بار بچ جاتا۔ تنگ آ کر وہ ریچھ اپنے پچھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سینے پر بڑا سا سفید نشان تھا۔ میں ایک بار پھر اس پر جھپٹا اس بار میں اس کے جسم پر پنجے جماتا اس کی گردن تک پہنچ گیا۔ اس کا حلقوم میرے سامنے تھا۔ میں نے اس کے نرخرے میں دانت گاڑ دیئے۔ عین اسی وقت خواب کا یہ منظر بھی بدل گیا۔ پھر وہ آئینہ سرخ خون میں لت پت ہونے لگا۔۔۔ یہ وہی منحوس خواب تھا جس نے ایک عرصے سے میری زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک چمکدار خنجر لہرایا۔ فضا میں ایک دردناک نسوانی چیخ گونجی اور۔۔۔

میں ایک جھٹکے سے بیدار ہو گیا۔ میرے جسم پر ہلکی سی کپکی طاری تھی۔ چند لمحوں بعد میں پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں واپس آتا چلا گیا۔ میں زمین پر بچھی ایک چٹائی پر چت لیٹا ہوا تھا۔ میری نظروں کے سامنے جو چھت تھی اس کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ اسی وقت کسی نے میری ٹانگ پر اپنی ٹانگ رکھ دی۔ وہ کمال الدین تھا جو منہ ہی منہ میں جانے کیا کیا بڑبڑا رہا تھا۔ وہ ابھی تک نیند کے قبضے میں تھا۔ میں نے اٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کی۔ مجھے اپنے سر میں چبک سی محسوس ہوئی لیکن میں اٹھنے میں کامیاب ہو گیا۔

میری نظروں کے سامنے ایک بھاری بھرکم' لکڑی کا دروازہ تھا جو اس وقت باہر سے بند تھا۔ کمرے کی دیواریں پختہ اینٹوں کی تھیں۔ ان اینٹوں کو چونے کی مدد سے بڑی مضبوطی سے آپس میں جوڑا گیا تھا۔ میں نے کمال الدین پر نظر ڈالی۔ اس کا جسم آدھا چٹائی سے نیچے اترا ہوا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگ اپنی ٹانگ پر سے اتاری تو وہ ایک بار پھر بڑبڑانے لگا۔ اس کے شانے کے زخم پر نئی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

میں اٹھ کر کھڑا ہوا تو مجھے اپنا جسم ٹوٹتا ہوا لگا۔ اتنی دیر تک سپاٹ فرش پر پڑے رہنے سے میرے سارے پٹھے اکڑ گئے تھے۔ میں اس صورت حال پر غور کرنے لگا۔ شاید ہم دونوں کسی بہت غلط جگہ آن پھنسے ہیں۔ وہ بھولی بھالی لڑکی ریشماں ایک خوبصورت جال تھا۔ شکاریوں نے گھات لگائی اور ہم اس ہم رنگ زمین دام میں پھنس گئے۔ یہ سنگلاخ زنداں شاید ہم جیسے بھولے بھٹکے مسافروں کو پھانسنے کے لیے ہی استعمال ہوتا ہوگا۔ میرا اندازہ تھا کہ ہمارے شکاریوں نے ہمیں جنگل میں بھٹکتے دیکھ لیا ہوگا۔ ہمیں کلاشنکوف جیسے خطرناک ہتھیار سے لیس پا کر انہوں نے براہ راست ہم سے ٹکرانا مناسب نہ سمجھا۔

اس کے بجائے انہوں نے ریشماں کو بطور چارہ استعمال کیا اور حسب توقع بڑی آسانی سے ہمیں پھانس لیا۔ میں اس الجھن میں تھا کہ آخر یہ کون لوگ ہیں۔ کیا یہ کمال الدین کے دشمن ہیں؟ یہ میرے بھی تو دشمن ہو سکتے ہیں لیکن کون ہیں؟ کیا سردار شاہ مراد۔۔۔ لیکن وہ بھلا اس دور دراز جنگل میں مجھ تک کیسے پہنچ گئے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ میرے اور کمال الدین کے مشترکہ دشمن سردار برکت علی کے کارندے ہوں مگر یہ امکان بھی ذرا مشکل ہی دکھائی دیتا تھا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ یہ لوگ راہزن اور ڈاکو ہیں۔

پھر مجھے ریشماں کا خیال آیا۔ وہ ہم دونوں کی توقع سے زیادہ مکار ثابت ہوئی۔ کمال الدین جیسا گھاگ انسان بھی اس کی معصومیت کے جال میں پھنس گیا۔ کیسی معصومیت سے کہہ رہی تھی ''تم مجھے بیٹی کیوں نہیں کہتے چاچا جی؟'' اور چاچا جی اب اپنی پیاری بھتیجی کے ہاتھ کی محبت بھری سوغات کھانے کے بعد اوندھے منہ پڑا ہے۔ مجھے اس نے اپنی پیار بھری اداؤں سے پھانسنے کی کوشش کی تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے تریا چلتر کے سامنے بڑے بڑے عقلمندوں کی چالاکی دھری رہ جاتی ہے۔ لومڑی اگر مکاری کے سو داؤ جانتی ہے تو عورت کی گھٹری میں ایک سو دس داؤ ہوتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود وہ بیوقوف اور ناقص العقل کہلاتی ہے۔

کچھ دیر بعد کمال الدین کسمسایا اور ہوش میں آتا چلا گیا۔ اسے صورت حال سمجھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ میں نے اسے تمام حقائق سے آگاہ کیا تو اس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے لیکن یقین کیے بغیر چارہ بھی کیا تھا۔ ''جانے کتنی دیر بے ہوش رہے ہیں ہم دونوں۔'' اس نے اپنی کلائی پر نگاہ ڈالی اور بری طرح چونک پڑا۔ اس کی کلائی خالی تھی ''میری گھڑی؟'' اس نے گویا فریاد کی۔

''گھڑی کی بھول جاؤ خان جی اور اپنی خیر مناؤ معلوم نہیں ہم کن لوگوں کے چنگل میں آن پھنسے ہیں۔''

''چھ مہینے پہلے ہی تو سعودی عرب سے منگوائی تھی۔ پورے سات ہزار روپے کی تھی۔'' کمال الدین نے اداس لہجے میں کہا۔ ہم دونوں کے پاس کچھ بھی نہیں چھوڑا گیا تھا حتیٰ کہ ہمارے جوتے بھی اتار لیے گئے تھے۔ ''ذرا زور آزمائی تو کرو دروازے سے۔ پوچھو ان لوگوں سے یہ آخر چاہتے کیا ہیں۔'' کمال الدین نے کہا۔

میں نے دروازہ زور سے تھپتھپا دیا۔ باہر ہلکی سی کھٹ پٹ ہوئی۔ کوئی شخص دروازے کی جانب بڑھا۔ میں نے ایک بار پھر دروازہ تھپتھپا دیا۔ اچانک دروازے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی کھل گئی۔ تقریباً دو انچ چوڑی اور ایک فٹ لمبی یہ درز ایک تختی ہٹنے سے پیدا ہوئی تھی۔ درز سے دوسری طرف ایک ادھیڑ عمر کا کرخت چہرے والا شخص کھڑا تھا۔ اس کی گھنی مونچھیں بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے تیز نظروں سے مجھے گھورا ''کیا بات ہے؟''

''ارے بھائی کیا بات ہے؟ تم نے ہمیں یہاں کیوں بند کر رکھا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اپنی خیریت چاہتے تو آرام سے بیٹھو۔ جب وقت آئے گا تو تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔''

اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟ اور وہ ریشماں کہاں ہے؟"

"بڑی فکر ہے تجھے اس کی۔ ابھی آجائے گی واپس۔ تیرے جیسے بٹیرے پھانسنے کے لیے ہی تو ہم نے اسے پال رکھا ہے۔ وہ بدھا ہوش میں آیا کہ نہیں؟" یک لخت میرے دل میں اس شخص کے لیے شدید نفرت کا احساس پیدا ہوا' اس کا لہجہ بے حد مکروہ تھا۔ اس نے شاید زندگی میں کبھی اچھی صحبت میں وقت نہیں گزارا ہوگا۔ اس کے کندھے سے دونالی شاٹ گن لٹکی ہوئی تھی۔ وہ ایک جرائم پیشہ شخص تھا اور چاہتا تھا کہ وہ اپنے حلیے سے بھی جرائم پیشہ ہی نظر آئے۔ میں نے اس پر لعنت بھیجی اور کمال الدین کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

میں نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ قدرے پریشان ہوگیا لیکن اس نے جلد ہی اپنی اس کیفیت پر قابو پالیا۔ "لو بھئی سعید خان یوں سمجھو کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ ابھی تم نے میرے لیے کام شروع بھی نہیں کیا تھا کہ ہم دونوں کی آزمائش کا دور شروع ہوگیا۔ خیر جو بھی ہوگا دیکھا جائیگا۔ یہ بات تو صاف ہے کہ یہ ہماری جان کے دشمن نہیں ہیں۔ باقی ان کا جو بھی مقصد ہو' وہ سامنے آجائے گا۔"

کچھ دیر بعد مجھے کئی لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ ان میں ریشماں کی بھی آواز شامل تھی۔ میں اور کمال الدین دروازے کی جانب بڑھے۔ دروازے میں موجود درز ابھی تک کھلی ہوئی تھی۔ سامنے ہی ہال کا منظر نظر آرہا تھا۔ ریشماں کے پاس اس وقت تین افراد موجود تھے۔ ان تینوں کے حلیے تقریباً ایک ہی جیسے تھے۔ ریشماں ان سے ہنس ہنس کر بات کر رہی تھی۔ اس کے لہجے میں اس وقت معصومیت کے بجائے عامیانہ پن تھا۔ وہ سب آپس میں گھٹیا قسم کے مذاق کر رہے تھے اور زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ اسی وقت ان میں سے ایک کی نظر مجھ پر پڑی۔ "ریشماں دیکھ تیرا عاشق تجھے دیکھ رہا ہے۔" ریشماں نے مجھ پر ایک نظر ڈالی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ مجھ سے آنکھیں نہیں ملا رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے کیے پر نادم ہے لیکن پھر میں نے یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ میں ابھی تک اس کی معصومیت کے جال میں گرفتار تھا۔ وہ بے حد ماہر اداکارہ تھی۔ اسے مردوں کی نفسیات سے کھیلنا آتا تھا۔ اسے علم تھا کہ مردوں کو کیسے الو بنایا جاسکتا ہے۔ اس وقت بھی وہ اپنے آزمودہ حربے آزما رہی تھی لیکن میں مزید بے وقوف بننے کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔

وہ دیکھ سعید خان' میری کلاشنکوف!" کمال الدین نے میرے کان میں کہا۔ اس کی کلاشنکوف اس وقت ان تینوں میں سے ایک کے کاندھے کی زینت بنی ہوئی تھی۔

"اے لڑکی! کیا چاہتے ہو تم لوگ؟" کمال الدین نے ریشماں کو آواز دی۔

"چھوکری سے کیا بات کرتا ہے بڈھے' ہم سے بات کر۔" ان میں سے ایک نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ یہ وہی تھا جس نے کمال الدین کی کلاشنکوف قابو کر رکھی تھی۔ "اتنا بڈھا ہوکر بھی تیرے کو اتنی عقل نہیں کہ ہم نے تم لوگوں کو یہاں کیوں بند کر کھا ہے۔" وہ آہستہ سے چلتا ہوا دروازے کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ "کان کھول کر سن لے بڈھے ہمیں دولت چاہیے۔ وہ دولت جو تیری تجوری میں

پڑی سڑ رہی ہے۔"

"لیکن میرے پاس تو کوئی دولت نہیں ہے۔" کمال الدین نے اسے الو بنانے کی کوشش کی۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ تم نے ہمیں خواہ مخواہ یہاں بند کر رکھا ہے۔"

کمال الدین کی بات سن کر اس شخص نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ "اچھا تو تمہارے پاس کوئی دولت نہیں ہے۔ تمہیں ایک غریب آدمی ہو۔ ہمیں بیوقوف بنانے کی کوشش مت کر بڈھے۔ کیا غریب لوگ راڈو گھڑی باندھتے ہیں؟ کیا غریب آدمی کے پاس تیس ہزار کی روسی کلاشنکوف ہوتی ہے؟ تیرا گھوڑا بھی دس پندرہ ہزار سے کم کا نہیں ہے۔ اور سچ سچ بتا کہ یہ لمبا سور تیرا باڈی گاڈ نہیں ہے؟"

"ان فضول باتوں سے کچھ حاصل نہیں ہے جوان۔ تمہیں جو کچھ مل چکا ہے اسے غنیمت سمجھو۔ اس سے زیادہ کی امید مت رکھنا۔" کمال الدین نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو بڑے میاں۔ ہمیں اپنی آسامی سے پیسا نکلوانا آتا ہے۔ اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ تم رقم دیے بغیر جان چھڑا لوگے۔ کسی کے باپ کی بھی ہمت نہیں ہے کہ اس علاقے میں قدم رکھ سکے۔ خیریت چاہتے ہو تو ہمیں اپنے گھر کا م پتہ لکھوا دو۔ ہم سے تعاون کرو تا کہ جلد از جلد تمہاری جان چھوٹ جائے۔"

"اتنی بڑی بڑی باتیں مت کر جوان۔ تم مجھے جانتے نہیں' تیرے جیسے کتنے ہی کاریگر میری انگلیوں کے اشارے پر ناچتے ہیں۔ تم اپنا پورا زور لگا لو لیکن تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔" کمال الدین نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

"یہ تو وقت بتائے گا بڑے میاں۔" کلاشنکوف بردار شخص نے کہا' اسی اثنا میں اس کے ایک ساتھی نے اسے آواز دی۔ "اس سے منہ ماری کر کے اپنا ٹیم خراب کیوں کر رہا ہے دستگیر۔ دو چار دن اپنی قید کا مزا لینے دے اسے' خود بخود ہوش ٹھکانے آجائیں گے یار جی کے۔"

دستگیر اس کی بات مان کر واپس پلٹ پڑا۔ میری نظر ریشماں پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد کمال الدین دوبارہ چٹائیوں پر جا بیٹھا لیکن میں وہیں کھڑا دروازے کی درز سے باہر جھانکتا رہا۔ دستگیر' ریشماں سے کچھ زیادہ ہی لگاوٹ کا اظہار کر رہا تھا۔ جبکہ باقی دونوں افراد اپنی ہی باتوں میں مگن تھے۔ وہ دونوں ایک ہی سگریٹ سے باری باری کش لگا رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس سگریٹ میں چرس بھری ہوئی تھی۔ ان دونوں پر سرور سا طاری تھا۔

ریشماں نے کسمسا کر دستگیر سے کچھ کہا۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا کر ریشماں کی تائید کی۔ ریشماں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی میری نظر کے دائرے سے باہر نکل گئی۔ دستگیر کے دونوں ساتھی ایک ہی چارپائی پر ڈھیر ہوگئے لیکن وہ خود اپنی جگہ پر جما ہوا بیٹھا رہا۔ اس وقت دوپہر ہو چکی تھی۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ پیاس کا احساس بھی بڑھ رہا تھا۔ پھر میرے کانوں نے برتنوں کے کھڑکنے کی آوازیں سنیں۔ ریشماں شاید کھانے کا انتظام کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میرے نتھنوں میں روٹی کی خوشبو آئی۔ مجھے اپنی بھوک بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں کمال الدین کے پاس چٹائی پر جا

بیٹھا۔ ’’اب کیا کریں خان جی؟‘‘ میں نے اس کی رائے جاننا چاہی۔

’’کرنا کیا ہے سعید خان۔ اپنی قسمت کے لکھے کا انتظار کرو۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان لوگوں کو ان کی مطلوبہ رقم مل جائے تو بھی یہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ہم ان کے ارادے سے پوری طرح واقف ہو چکے ہیں۔ اگر ہم یہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائیں تو ذرا سی تگ و دو سے ان کے ٹھکانے کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ ہمیں زندہ چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔‘‘ کمال الدین نے صورت حال کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا۔

’’یہاں سے فرار کے متعلق کیا خیال ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

فی الحال تو ایسی کوئی راہ نہیں سوجھ رہی جس کے ذریعے ہم یہاں سے فرار ہو سکیں۔ دیکھو شاید آگے کوئی موقع مل جائے۔‘‘

ہم دونوں بہت دیر تک انتظار کرتے رہے کہ شاید ہمیں بھی کھانا دیا جائے لیکن ہمارا یہ انتظار بے سود رہا۔ انہوں نے ہمیں کچھ بھی کھانے کو نہیں دیا۔ کھانا تو الگ رہا انہوں نے تو ہمیں پانی تک نہیں دیا۔ تنگ آ کر میں ایک بار پھر دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ سامنے چارپائی پر صرف دستگیر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی شاید کمرے میں جا سوئے تھے۔ ریشماں کا بھی پتہ نہ تھا۔ دستگیر نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ پتا نہیں وہ سو رہا تھا یا بنا پڑا تھا۔ میں نے اسے پواز دی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ’’کیا ہے بے؟‘‘

’’تیرے کو نہیں پتا‘ کیا ہے؟‘‘ میں نے غضب ناک لہجے میں کہا ’’انسان کے بچے بنو۔ ہمیں کچھ کھانے کو دو۔‘‘

’’تمہارے باپ کے نوکر ہیں کیا؟ تم سسرال میں نہیں آئے بیٹھے ہو بچہ جی۔ بڈھے کو کہو کہ ذرا عقل کو ہاتھ مارے زندگی نہیں رہے گی تو کیا وہ اپنی دولت کو اپنے ساتھ قبر میں لے کر جائے گا۔ وہ نہیں بتاتا تو، تو ہی اس کے گھر کا پتا بتا دے۔ تو کیوں مفت میں اپنی جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔‘‘

’’میں اتنا کم نسل نہیں ہوں گھٹیا انسان۔ تیرے سے جو کچھ ہو سکتا ہے کر لے۔ دیکھتا ہوں تو کیسے رقم نکلواتا ہے۔‘‘ میں نے گرم ہو کر کہا۔

’’اوہو تو، تو بڑا نمک حلال ہے بھئی۔‘‘ دستگیر نے گہرے طنزیہ لہجے میں کہا ’’دو ایک دن رک جا۔ پھر تیری ساری وفاداری تیری ناک کے راستے بہہ جائے گی۔‘‘

’’کیوں اپنا دماغ کھا رہا ہے سعید خان۔‘‘ کمال الدین نے پیچھے سے مجھے آواز دی۔ ’’دفع کر اسے اور یہاں آ کر لیٹ جا۔‘‘ میں کمال الدین کے پاس آ کر چٹائی پر دراز ہو گیا تھوڑی دیر بعد کمال الدین سو گیا اور کمرے میں ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز گونجنے لگی۔ میں نے بھی سونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ مجھے طرح طرح کے خیالات ستاتے رہے۔ مجھے فقیر بابا کا خیال آیا۔ جانے وہ کس حال میں ہو گا۔ سردار برکت علی کے لواحقین نے معلوم نہیں اس کا علاج کرایا ہو گا یا نہیں۔ میں تو جلد از جلد اس کی تلاش میں نکلنا چاہتا تھا لیکن ایک کے بعد ایک مصیبت میرا گلا دبوچ لیتی تھی۔

مجھے خوف محسوس ہوا کہ اگر میں نے جلد ہی فقیر بابا کو تلاش نہ کر لیا تو شاید ہمیشہ کے لیے اسے کھو بیٹھوں گا۔ برکت علی کی حویلی والے اسے غیر معینہ مدت کے لیے تو مہمان نہیں رکھ سکتے۔ کوئی بھی دن اس کی زندگی کا آخری دن بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ لوگ تو انتقام میں آگ میں تڑپ رہے ہوں گے۔ میرے ہاتھ نہ آنے کی صورت میں وہ فقیر بابا پر اپنا غصہ اتارتے۔ وہ اس سے میرا پتا معلوم کرتے۔ فقیر بابا کو بھلا کیا معلوم کہ میں کہاں کہاں دھکے کھاتا پھر رہا ہوں۔ اگر اسے معلوم ہوتا تو بھی وہ ہرگز انہیں میرا پتا نہیں بتاتا۔ پھر مجھے ہیر یاد آئی۔ مجھے اپنے دل میں بے کلی کی لہر اٹھتی محسوس ہوئی۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ اگر اس کا فوراً علاج نہ کرایا گیا تو وہ چند مہینے کے اندر اندر مر سکتی ہے۔ اس کو تو ٹیسٹ کے لیے کراچی لے جانا تھا۔ کریم بابا کو مجھ سے امید تھی کہ میں ہیر کے علاج کے لیے رقم کا بندوبست کر لوں گا۔ میں نے تو تقریباً اس خطیر رقم کا انتظام کر ہی لیا تھا لیکن قسمت نے مجھے اس سنگلاخ زندان کا اسیر بنا ڈالا۔

میں نے کمال الدین پر نظر ڈالی۔ وہ بے خبری کی نیند سو رہا تھا۔ میں نے بھی آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی اور اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گیا۔

میری آنکھ برتنوں کے کھڑکنے کی آواز سے کھلی۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ مجھے اپنے حلق میں کانٹے سے چبھتے محسوس ہوئے۔ پیٹ میں بھڑکتی آگ فزوں تر ہو گی تھی۔ کمال الدین میرے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ مجھے تو اس قسم کے حالات کی عادت سی پڑ چکی تھی۔ جبکہ اس کا یہ شاید پہلا اتفاق تھا۔ وہ عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے کا عادی تھا۔ بھوک اور پیاس کے عذاب اس کے لیے اجنبی تھے۔ اس کے باوجود وہ بڑے عزم اور حوصلے سے حالات کا مقابلہ کر رہا تھا۔ ابھی تک ہم دونوں کے حوصلے بلند تھے۔ آگے کیا ہونے والا ہے‘ اس کی خبر کسی کو نہ تھی۔ میں نے اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھنا چاہا لیکن کمال الدین نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے روک لیا۔ ’’اس وقت انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ تمہیں دیکھتا پا کر وہ سمجھیں گے کہ شاید تم پر مایوسی طاری ہونے لگی ہے۔ یہ جسمانی نہیں اعصابی جنگ ہے سعید خان۔ اگر ہم نے ذرا سی بھی اعصابی کمزوری دکھائی تو یہ پوری طرح شیر ہو جائیں گے۔ اگر ہمیں ان سے سمجھوتا کرنا بھی پڑے تو وہ ہماری مرضی کے مطابق ہونا چاہیئے۔‘‘ میں نے سر ہلا کر اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ اس نے جو کچھ کہا وہ درست تھا لیکن مجھے تو بس ذرا سے موقع کی تلاش تھی۔ اگر وہ لوگ ذرا سی دیر کے لیے بھی میری زد میں آ جاتے تو میں جان پر کھیل جاتا۔ ایک موہوم سی امید کے سہارے موت کا انتظار میری سرشت کے خلاف تھا۔ اس سے پہلے کہ میرے پاس کچھ کرنے کا وقت بھی نہ بچے‘ میں کچھ نہ کچھ کر گزرنا چاہتا تھا تاہم میں اندھا دھند ہاتھ پاؤں چلانے کا بھی قائل نہیں تھا۔

’’میں کہہ رہی ہوں کہ آج یہ سب کچھ نہیں ہو گا۔‘‘ میں نے ریشماں کی غصے بھری آواز سنی۔ میں فوراً دروازے کے پاس جا پہنچا۔ اس وقت ہال میں گیس کے دو ہنڈے روشن تھے۔ پورا ہال روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ دستگیر اور اس کے دونوں ساتھیوں نے بوتلیں کھول رکھی تھیں۔ ان تینوں پر سرور طاری تھا۔ ریشماں سخت غصے میں تھی ’’تم لوگوں نے آخر مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ میں انسان ہوں مجھے انسان ہی

سمجھو۔"

"ارے ناراض کیوں ہوتی ہو ریشماں جان۔" دستگیر نے لہراتی آواز میں کہا "ان کی نہیں تو میری خاطر ہی سہی۔ وعدہ رہا کل تمہیں تنگ نہیں کریں گے۔"

عین اس وقت ریشماں نے میری جھلک دیکھ لی۔ وہ ایک دم مرجھا سی گئی "صرف آج کی رات مجھے معاف کر دو دستگیر۔" ریشماں نے کہا۔

"ہمارا دل نہ توڑو ریشماں۔ اس ویرانے میں تم ہی تو ہمارے دل کی روشنی ہو۔" دستگیر کے ایک ساتھی نے جھومتے ہوئے شاعری کی۔ "صرف ایک گانا' یقین کرو ہم تم سے دوسرے گانے کی فرمائش نہیں کریں گے۔" ریشماں کے چہرے پر بے کسی اور نفرت کے ملے جلے تاثرات پیدا ہوئے۔ اس نے ایک بار پھر انکار کی کوشش کی تو ان تینوں کے تیور بگڑنے لگے۔ اگر وہ مزید انکار کرتی تو شاید وہ تینوں تشدد پر اتر آتے۔ وہ مرے مرے قدموں سے اٹھ کھڑی ہوئی اس نے ایک نظر میری طرف ڈالی اور پھر فوراً ہی نظر چرا لی۔ میرا چہرہ اسے صاف نظر نہیں آ رہا ہوگا تاہم اسے معلوم تھا کہ میں باہر دیکھ رہا ہوں۔

دستگیر اور اس کے دونوں ساتھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے دونوں چارپائیوں کو دور دور کر کے بیچ میں کھلی جگہ پیدا کی۔ ان میں سے ایک کمرے کے اندر گیا۔ وہ واپس لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا ٹیپ ریکارڈر تھا۔ اب میں صورت حال کو کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔ ریشماں چارپائیوں کے بیچ میں' کھلی جگہ میں ایسی کھڑی تھی جیسے کوئی مجرم اپنے سنگ سار کیے جانے کی منتظر ہو۔ اس کی نظریں فرش پر کسی غیر مرئی شے کو تلاش کر رہی تھیں۔

"دستگیر استاد وہی والا گانا لگانا۔" ان میں سے ایک نے فرمائش کی۔

"تم فکر نہ کرو۔ وہی لگا رہا ہوں۔" دستگیر نے کہا "ریشماں نے کن انکھیوں سے میرے والے کمرے کی طرف دیکھا۔ دستگیر نے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دبا دیا۔ ہال میں ایک پنجابی فلمی گانے کی تیز آواز گونجنے لگی۔ وہ تینوں چند لمحے منتظر رہے لیکن ریشماں کے قدموں میں جنبش نہ ہوئی۔" کیا ہوا ریشماں؟" دستگیر کی تیز دھاڑ گانے کی آواز پر غالب آ گئی۔ ریشماں کے قدم پھر بھی نہ اٹھے تو وہ گالیاں بکتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ شاید اس پر ہاتھ اٹھانا چاہتا تھا۔ ریشماں کے جسم میں لرزش پیدا ہوئی اور وہ تیزی سے حرکت میں آ گئی۔ اس کے قدم بجلی کی سی تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ ان تینوں کے لبوں سے خوشی کا نعرہ بلند ہوا۔ دستگیر نے ٹیپ ریکارڈر کی آواز مزید تیز کر دی۔ پورا ہال گانے کے ہیجان خیز بولوں سے گونجنے لگا۔

موقع چنگا توں فیدہ اٹھا لے منڈیا
کڑی مر گئی تیرے تے پھسا لے منڈیا

ریشماں اس طرح فرش پر حرکت کر رہی تھی جیسے اس کے قدموں کے نیچے انگارے بچھے ہوں۔ اچانک ریشماں نے میری طرف دیکھا اور اس کے قدم ایک جھٹکے سے رک گئے۔ یوں محسوس ہوا جیسے کسی بجلی کے آنے کا فیوز اڑ گیا ہو۔ اس کی نظریں فرش پر گڑ گئی تھیں۔ اس کے قدا اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ وہ

تینوں کچھ دیر متوقع نظروں سے اسے دیکھتے رہے پھر دستگیر نے میری جھلک دیکھ لی۔ وہ صورت حال کو سمجھ کر گالیاں بکتا ہوا' میری طرف بڑھا۔ اس کے ساتھی نے ٹیپ ریکارڈ بند کر دیا۔ دستگیر نے ایک جھٹکے سے اس چھوٹی سی کھڑکی کے سامنے تختی چڑھا دی پھر میں نے چٹاخ کی آواز سنی اور ساتھ ہی ریشماں کی چیخ بھی "حرام زادی پارسائی دکھا رہی ہے اپنے یار کو۔ تیری تو۔۔۔" یہ دستگیر کی آواز تھی۔

میں نے ریشماں کی سسکیوں کی آواز سنی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمال الدین کے پاس چٹائی پر آن بیٹھا۔ بڑا خوش نصیب تھا جو اتنے عذابوں کے باوجود سکون نیند سو رہا تھا۔ جانے کیا بات تھی۔ ریشماں نے ہمارے ساتھ زبردست دھوکا کیا تھا' اس کے باوجود میرے دل کا کوئی خفیہ گوشہ ایسا تھا جو مسلسل اس کے حق میں دلائل دے رہا تھا۔ وہ بے قصور ہے' مجبور ہے۔ وہ یہ سب کچھ اپنی مرضی سے نہیں کر رہی ہے لیکن میرا دماغ کسی بھی دلیل کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا۔ کوئی بھی انسان محض مجبوری کا بہانہ کر کے اپنے گناہوں پر پردہ نہیں ڈال سکتا۔ اسے ایسی کیا مجبوری تھی کہ وہ ان شیطانوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنی ہوئی تھی؟ اگر وہ دل ہی دل میں ان سے نفرت کرتی ہوتی تو کسی نہ کسی طرح ان سے جان چھڑا کر فرار ہو سکتی تھی۔ اسے تو ہزار موقعے مل سکتے تھے۔ اگر وہ کل ہمیں ذرا سا اشارہ بھی کر دیتی تو ہم ان خبیثوں سے خود ہی نمٹ لیتے۔ نہیں یہ سب فرضی باتیں ہیں۔ وہ ان کے تمام کالے کرتوتوں میں پوری طرح شامل ہے۔ دستگیر کا کہنا صحیح ہے وہ خواہ مخواہ ہی اپنی پارسائی کا سوانگ رچا رہی تھی۔ غلیظ کیچڑ کے گھڑے میں گر کر بھی کوئی سفید دامن رہ سکتا ہے؟ نہیں قطعی ناممکن۔ میں سوچتا رہا' سوچتا رہا۔ مجھ پر غنودگی طاری ہوئی ہی تھی کہ اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے میں موجود چھوٹی سی کھڑکی کی تختی ہٹی ہوئی تھی۔ دوسری طرف مکمل اندھیرا تھا۔ میں نے ریشماں کی آواز سنی۔ وہ سرگوشی میں کہہ رہی تھی۔ "یہ روٹیاں لے لو۔" میں نے درز کے درمیان سے روٹیاں لے لیں۔ وہ پتلی پتلی تہہ شدہ روٹیاں تھیں۔ ریشماں نے تام چینی کی ایک پلیٹ بھی پکڑا دی۔ "ٹھہرو میں پانی بھی دیتی ہوں۔"

دو انچ کھلے شگاف میں سے گلاس وغیرہ اندر آنے کی گنجائش نہ تھی لہٰذا پانی بھی ایک گہری سی تھالی میں دیا گیا۔ "تم نے ایسا کیوں کیا ریشماں؟" میں نے سرگوشی میں سوال کیا۔

"میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکتی۔" ریشماں نے سرگوشی میں جواب دیا "بس کھانا کھاتے وقت یہ احتیاط کرنا کہ روٹی یا دال گرنے نہ پائے ورنہ ان حرامیوں کو پتا چل جائے گا کہ میں نے تمہیں کھانا دیا ہے اور پھر وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

میں نے مزید سوال کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے نہایت خاموشی سے کمال الدین کو جگایا اور اسے تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس کے جذبات اور احساسات بھی مجھ سے مختلف نہ تھے۔ وہ بھی ریشماں کے کردار کے متضاد پہلوؤں کے متعلق الجھن میں مبتلا تھا۔ ہم نے ریشماں کی ہدایت کے عین مطابق بے حد احتیاط سے کھانا کھایا۔ چٹائی اور اپنے کپڑوں پر روٹی یا دال نہ گرنے دی۔ پانی پینے کے بعد مجھے اپنی رگوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑتی

محسوس ہوئی۔ کمال الدین کی بھی یقیناً یہی حالت ہوگی۔ کھانے کے برتن پکڑاتے وقت، میں نے ریشماں سے کہا "کچھ بتاؤ تو سہی یہ سب کیا ہے؟"

"کل رات اسی وقت میرا انتظار کرنا اور ہاں دن میں اس طرح ظاہر کرنا جیسے تم دونوں اور بھوک پیاس سے بے تاب ہو، ورنہ انہیں شک ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے لیکن سنو تو۔۔۔" میں نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ نہ رکی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا چٹائی پر پہنچ گیا۔ میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ ریشماں کا رویہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک طرف تو اس نے ہمیں موت کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا تو دوسری طرف وہ ہمیں زندگی بھی دے رہی تھی۔ خدا جانے وہ کیا چاہتی تھی۔

"پریشان کیوں ہوتے ہو سعید خان۔ اسی کا نام زندگی ہے۔" کمال الدین نے کہا۔

میری سمجھ میں ریشماں کا رویہ نہیں آ رہا، خان جی۔ آخر وہ چاہتی کیا ہے؟ وہ ہم پر اتنی مہربانیاں کیوں کر رہی ہے؟"

"تم بھی یار بالکل اناڑی ہو سعید خان۔ ارے بھائی میرے وہ تجھے پسند کرتی ہے۔ پیار کرتی ہے تیرے سے۔" کمال الدین نے مجھے سمجھایا۔

"لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے خان جی؟"

"ہو کیوں نہیں سکتا۔ کیا کمی ہے تیرے اندر؟ اچھا، سوہنا، سجیلا جوان ہے تو۔ اس چھوکری کا دل تجھ پر آ گیا تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟"

"میرا مطلب یہ ہے خان جی کہ اگر اس کے دل میں ہماری کوئی قدر و منزلت تھی تو اس نے ہمیں بے ہوش کیوں کیا؟"

"وہ اس کی مجبوری تھی۔ اس نے اپنی مرضی سے یہ سب کچھ نہیں کیا۔ وہ ان لوگوں کے حکم کی پابند ہے۔ ایک طرف اس نے مجبوراً ہمیں بے ہوش کر کے ان تلنگوں کی قید میں پھنسوا دیا تو دوسری طرف وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہمیں کھانا بھی پہنچا گئی۔"

"عجیب سی بات ہے۔ شاید تمہارا کہنا درست ہی ہو۔" میں نے کہا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ ریشماں نے جاتے ہوئے تختی درز کے سامنے سرکا دی تھی اور اسے اندر سے نہیں کھولا جا سکتا تھا۔ میں مایوس سا ہو کر واپس چٹائی پر آ گیا۔

اگلے روز تقریباً بارہ بجے دوپہر دروازے کے شگاف پر سے تختی ہٹ گئی۔ وہ دستگیر تھا جو شاید ہماری حالت کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ ہم نے اپنے چہروں پر نقاہت طاری کر لی اور مردوں کی طرح چٹائی پر پڑے رہے۔

"اب بھی مان جا احمقوں کے سردار۔ پانچ دس لاکھ روپے ہمیں دینے سے تیرا خزانہ ختم نہیں ہو جائے گا۔"

دستگیر نے کمال الدین سے کہا "تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ شرافت سے مان جاؤ۔ جتنی

جلدی معاملہ طے ہو جائے گا، اتنی ہی جلدی تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔ یاد رکھو اگر ہم اپنی اصلیت پر اتر آئے تو تمہیں چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔"

"اوئے بک بک نہ کر بندر کی اولاد۔ جو تیرے بس میں ہو کر کے دیکھ لے۔ میں تم لوگوں کو ایک پیسہ بھی نہیں دوں گا۔" کمال الدین نے چٹائی پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے، دستگیر کو ڈانٹا۔

"اوہو تو تمہارے کس بل ابھی تک ڈھیلے نہیں ہوئے۔ لگتا ہے تم دونوں حرامیوں کی کھال کافی موٹی ہے لیکن ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں ہے اور تمہیں اس پنجرے میں بند رکھنے میں ہمارا خرچا بھی کوئی نہیں ہو رہا۔ دیکھتا ہوں کب تک تمہاری چربی نہیں پگھلتی۔"

"میں تیرے سے کہہ رہا ہوں نا کہ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" کمال الدین نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ دستگیر اسے گندی گندی گالیاں دینے لگا۔ میں چٹائی سے اٹھا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا دروازے کی سمت بڑھا۔ دستگیر مجھے دیکھ کر ٹھٹک سا گیا۔

"تم لوگ کتنی رقم چاہتے ہو؟" میں نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا دستگیر نے بغور مجھے دیکھا پھر اس نے مضبوط لہجے میں کہا "پورے دس لاکھ روپے۔"

"دیکھو میری بات غور سے سنو۔ میں تم لوگوں کو پانچ لاکھ روپے تک دلوا سکتا ہوں مگر مشکل یہ ہے کہ یہ رقم تم خود حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لیے تمہیں میری مدد درکار ہوگی۔"

"نہیں ہم دس لاکھ روپے سے ایک پیسہ کم نہیں لیں گے۔"

"سوچ لو کہیں پوری کے چکر میں آدھی بھی چلی جائے۔ میرا مالک دل کا مریض ہے۔ بھوک پیاس یا تشدد کی وجہ سے اس پر دل کا دورہ پڑ گیا تو تم لوگوں کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔"

دستگیر کی آنکھوں میں سوچ کے آثار پیدا ہوئے۔ "اچھا میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے تمہیں جواب دوں گا۔"

"ٹھیک ہے لیکن یہ خیال رہے کہ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ہم لوگ دو دن سے بھوکے ہیں اور میرا مالک ایک بوڑھا اور بیمار آدمی ہے۔"

دستگیر اثبات میں سر ہلاتا ہوا کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔ میرے سامنے ہال کا منظر تھا۔ اس وقت وہ جگہ بالکل خالی تھا۔ میں واپس کمال الدین کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ "تم اس سے کیا کہہ رہے تھے۔ سعید خان؟" کمال الدین نے بے چینی سے سوال کیا۔

"میں نے اسے کہا ہے تم پانچ لاکھ روپے تک ادا کر سکتے ہو۔"

"لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟ میں انہیں پانچ لاکھ روپے دے دوں تو بھی یہ لوگ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"مجھے معلوم ہے خان جی لیکن ہم اس پنجرے میں بند رہ کر اپنی موت کا انتظار بھی تو نہیں کر سکتے۔ کل رات ریشماں نے ہمیں روٹی پہنچا دی تھی، ہو سکتا ہے آج نہ پہنچا سکے۔ اس کی یہ حرکت انہیں معلوم ہو گئی تو وہ اس کا بہت برا حشر کریں گے۔ اس جگہ بھوکا پیاسا مرنے سے بہتر ہے کہ کچھ الٹے سیدھے ہاتھ

پیر مارنے کی کوشش کی جائے۔"

"لیکن تم کرنا کیا چاہتے ہو؟" اس نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"یہ تو ابھی میرے ذہن میں بھی واضح نہیں ہے۔ میری کوشش بس یہ ہے کہ کسی طرح مجھے یہاں سے نکلنے کا موقع مل جائے۔ اس کے بعد تو میں ان سے اچھی طرح نپٹ لوں گا۔"

"لیکن تم اکیلے ان کا کیا بگاڑ سکو گے؟"

"اپنی سی کوشش تو کروں گا۔ آگے اللہ مالک۔"

"اچھا بھئی جیسے تمہاری مرضی۔" کمال الدین نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی پریشانی اپنی جگہ پر صحیح تھی۔ تین تین مسلح افراد کے سامنے ایک نہتا شخص بھلا کیا کر سکتا ہے۔ وہ دو اور دو چار کے اصول پر سوچ رہا تھا جبکہ میرے سوچنے کا انداز مختلف تھا۔ میرا پختہ یقین ہے کہ اگر دل میں جان لڑانے کا جذبہ موجود ہو اور ارادے مضبوط ہوں تو انسان اکیلا ہونے کے باوجود پوری فوج سے ٹکرا سکتا ہے اور اگر خدا کی مدد شامل حال ہو تو کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔

کچھ دیر بعد میں نے ان لوگوں کی گفتگو کی آواز سنی۔ میں دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ وہ تینوں ایک ہی چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان بحث جاری تھی۔ دستگیر انہیں آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ پانچ لاکھ کی رقم پر اکتفا کر لیں لیکن وہ دونوں ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان میں سے ایک کی نظر مجھ پر پڑی تو ان کی آوازیں مدغم ہو گئیں۔ دستگیر انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ مسلسل انکار میں سر ہلا رہے تھے۔ اچانک ان دونوں میں سے ایک طیش میں آ گیا۔ "تو پھر ایک آدھ دن صبر کیوں نہیں کر لیتا۔ نصیر خان آئے گا تو وہ خود فیصلہ کر لے گا۔" اس کے دوسرے ساتھی نے اسے پر سکون کرنے کی کوشش کی تو وہ اور بھڑک اٹھا۔ "یار واحد تو بھی اس کے ساتھ پاگل ہو گیا ہے۔ اب جب نصیر خان کو پتا چلے گا تو وہ کتنا ناراض ہوگا۔ کہے گا کہ تمہیں اتنی جلدی پڑ گئی کہ میرا ذرا سا انتظار نہ کر سکے۔"

کیا پتا وہ کب تک واپس آئے گا۔" دستگیر نے بھی بلند آواز میں کہا "اگر اس کے آنے سے پہلے بڈھا لڑھک گیا تو کیا بنے گا؟ پھر تم نصیر خان کو کیا جواب دو گے؟ جو کچھ ہمتھے لگ رہا ہے قابو کر لو۔ ہم سب مل کر اسے سمجھائیں گے تو وہ مان جائے گا۔"

دستگیر کی یہ دلیل کام کر گئی۔ اس کے دونوں ساتھی کچھ نرم پڑ گئے۔ پھر وہ آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے۔ اسی وقت مجھے ریشماں نظر آئی۔ اس نے ان تینوں کے سامنے کھانا رکھ دیا۔ وہ پانی لانے کے لیے مڑی تو اس کی نظر مجھ پر پڑی' وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک سی گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں کو جھانکا۔ وہ زیادہ دیر مجھ سے نظر نہ ملا سکی۔ اس کے چہرے پر شرم و حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے نظریں جھکائیں اور گھڑوں کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک نازک سی' چھوئی موئی سی الھڑ مٹیار ہو۔ اس کے سیاہ اعمال کا چہرے پر شائبہ تک نہ تھا۔ کمال الدین نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ واقعی مجھے پسند کرنے لگی تھی۔ کمال الدین کے پاس آ کر میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

"یہ نصیر خان کون ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ان کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان کا سردار یا اسی قسم کی کوئی شخصیت ہے۔" میں نے اسے اپنے اندازوں سے آگاہ کیا۔

"اب تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"ابھی دیکھو کیا صورت حال سامنے آتی ہے۔ کوئی ایسا چکر ڈالنے کی کوشش کروں گا جس سے وہ مجھے اس جگہ سے باہر نکالنے پر مجبور ہو جائیں پھر کوئی مناسب موقع دیکھ کر میں انہیں مار گراؤں گا۔"

لیکن یہ بے حد خطرناک کام ہے۔ اس میں تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔"

"جو ہوگا دیکھا جائے گا خان جی۔ سب سے پہلا مسئلہ تو اس زنداں سے باہر نکلنا ہے۔"

کچھ دیر بعد دستگیر دوبارہ دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ میں بھی اٹھ کر دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ "اپنے مالک سے کہو میرے سے بات کرے۔" اس نے کہا۔

"جو بات کرنی ہے مجھ سے کرو۔ خان جی نے مجھے مکمل اختیار دے دیا ہے۔ ان کی طبیعت صحیح نہیں ہے۔ انہیں یوں ہی پڑا رہنے دو۔"

"اچھا تو تم یہ بتاؤ ہمیں پانچ لاکھ کی رقم کیسے ملے گی؟"

"اس کے لیے تمہیں مجھ پر بھروسا کرنا پڑے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ رقم تمہیں میں لا کر دوں گا۔" میں نے کہا۔

"صاف صاف بتاؤ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"دیکھو بات یہ ہے کہ میرے مالک نے اپنی زیادہ تر رقم اپنی تجوری میں بند کر کے رکھی ہوئی ہے...... اس تجوری کو ان کے علاوہ کوئی نہیں کھول سکتا۔ تم انہیں تو ہرگز نہیں لے جاؤ گے۔ میرے مالک کو تم یہیں قید رکھو۔ میں ان سے تجوری کھولنے کی ترکیب معلوم کر لوں گا۔ تم مجھے اپنے ساتھ لے جانا۔ حویلی پہنچ کر میں سیٹھ کے گھر والوں کو سمجھاؤں گا اور تجوری کھول کر پانچ لاکھ روپے کی رقم لے آؤں گا پھر تم لوگ ہم دونوں کو آزاد کر دینا۔"

میری بات سن کر وہ تذبذب کا شکار ہو گیا۔ اس کے دونوں ساتھی ابھی تک چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے ان دونوں کو بھی بلا لیا۔ ساری صورت حال جان کر وہ بھی تذبذب کا شکار ہو گئے پھر ان میں سے ایک نے کہا۔ "مگر تم پر ہم اعتبار کیسے کر سکتے ہیں؟"

"اس میں اعتبار نہ کرنے کی کیا بات ہے۔ میرا سیٹھ تو تم لوگوں کی قید میں ہے ہی پھر تم لوگ مسلسل میری نگرانی کرتے رہنا۔ میں کوئی ذرا سی بھی غلط حرکت کروں تو تم مجھے فوراً گولی مار سکتے ہو۔"

"ہم ایسا کیوں نہ کریں کہ سیٹھ کے گھر والوں سے رابطہ کر کے ان سے اپنی مرضی کی رقم حاصل کر لیں۔" واحد نے پوچھا۔

"اس میں کئی قباحتیں ہیں۔ پہلی بات تو وہی ہے کہ اس تجوری کو سیٹھ کے علاوہ کوئی نہیں کھول سکتا۔

دوسرے یہ کہ بات پولیس کے کانوں تک بھی پہنچ سکتی ہے پھر تو تمہارے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔"

"اچھا ہم تمہیں سوچ کر جواب دیں گے۔" دستگیر نے کہا۔ وہ تینوں ایک بار پھر چارپائی پر جا بیٹھے۔ میں ابھی تک دروازے کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اتنے میں واحد نے ریشماں سے پانی طلب کیا۔ وہ پانی لانے کے لیے بڑھی تو ایک بار پھر میری اور اس کی نظریں ملیں اور پھر وہ جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ اس نے واحد کو پانی پکڑایا تو دستگیر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ وہ سیدھی اس کی گود میں گرتی چلی گئی۔ وہ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی...... اس کے لبوں سے غلیظ گالیاں ابل پڑی تھیں۔ دستگیر اور اس کے دونوں ساتھی مکروہ قہقہے لگا رہے تھے۔ "شرم نہیں آتی تجھے۔" واحد نے مصنوعی غصے سے دستگیر کو ڈانٹا "شریف زادی کی عزت پر دھبا لگاتا ہے۔" اس بار قہقہوں کی آواز پہلے سے بھی زیادہ بلند تھی۔ ریشماں نے زخمی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں جھکتی چلی گئیں۔ اس کی ان نگاہوں میں شرمندگی' بے چارگی' احساس جرم اور التجا سبھی کچھ تھا۔ میں چپ چاپ کمال الدین کے پاس آبیٹھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ وہ تینوں کیوں ہنس رہے تھے۔

"دستگیر نے ریشماں کے ساتھ ایک بے ہودہ حرکت کی تھی۔ اس نے مزاحمت کی تو وہ اسے پارسائی اور پاک دامنی کا طعنہ دینے لگے۔" میں نے اسے تفصیل بتائی۔

"آہ بدنصیب لڑکی۔" اس نے کہا۔

"لیکن اسے اس طرح ظاہر کرنے کی ضرورت کیا ہے کہ اسے اس قسم کی حرکتیں پسند نہیں ہیں۔" میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ انسان کی فطرت ہے سعید خان۔ کوئی بھی شخص بالکل اندھا ہونے کے باوجود اندھا کہلانا پسند نہیں کرتا۔ طوائف کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ یہ بکاؤ مال ہے لیکن اگر اسے اس کے نام کے بجائے طوائف کہا جائے تو وہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی شخص اپنی کمزوریوں کی تشہیر پسند نہیں کرتا۔ خاص طور پر کسی ایسے شخص کے سامنے جس کی نظر میں وہ اپنے آپ کو اچھے سے اچھا بن کر پیش کرنا چاہتا ہو۔ ریشماں کے ان لوگوں کے ساتھ کیسے بھی تعلقات ہوں' وہ کم از کم تمہاری نظر کے سامنے اپنی نسوانیت کی توہین برداشت نہیں کر سکتی۔"

مجھے ریشماں کے لیے اپنے دل میں رحم کا جذبہ محسوس ہوا۔ وہ بدنصیب میری نظر میں اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے کیا کیا جدوجہد کر رہی تھی۔ حالانکہ اسے خود بھی معلوم ہوگا کہ اس کی یہ ساری کاوش رائیگاں ہی جائے گی جس دلدل میں وہ دھنس چکی تھی اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ جس مرض میں وہ مبتلا تھی اس سے وہ موت کے ہاتھوں ہی نجات حاصل کر سکتی تھی۔

شام کے وقت دستگیر نے بتایا کہ انہیں میری تجویز منظور ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے بہت سی دھمکیاں بھی دیں کہ اگر میں نے انہیں دھوکا دینے کی کوشش کی تو وہ میرے مالک کو جان سے مار دیں گے' وغیرہ وغیرہ۔ شام کو ہمیں کھانا اور پانی بھی دیا گیا۔ طے یہ پایا کہ کل صبح واحد اور دستگیر مجھے اپنے ساتھ لے کر روانہ ہوں گے جبکہ ان کا تیسرا ساتھی مولا بخش یہیں رہ کر کمال الدین خان کی نگرانی کرے گا۔

رات میں اور کمال الدین صورت حال کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ میری طرف سے بہت فکرمند تھا۔ اس نے مجھے منع کیا کہ میں اپنی جان پر نہ کھیلوں مگر میں باز نہ آیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ہماری پاس بس یہی آخری صورت باقی بچی ہے۔ بات صرف دولت کی نہ تھی اگر کمال الدین ان لوگوں کو اپنی تمام دولت بھی دے دیتا' تب بھی یہ ہم دونوں کو زندہ نہ نکلنے دیتے۔ اس رات ریشماں نہ آسکی۔ اسے موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ تینوں متوقع دولت کی خوشی میں رات گئے تک شراب کی محفل گرم کیے رہے۔ رات کے آخری پہر میں نے ریشماں کی گالیوں کی اور چیخوں کی آوازیں سنیں۔ میں نے دروازے کے شگاف سے باہر جھانکا۔ وہ دستگیر تھا۔ نشے میں دھت ہونے کے بعد وہ شیطان کا روپ دھار چکا تھا۔ اس نے ریشماں کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور اسے گھسیٹ کر کمرے سے باہر لا رہا تھا۔ ریشماں شاید سوتے سے اٹھی تھی۔ اس کی زلفیں بکھری بکھری سی تھیں۔ ہرنی جیسی بڑی بڑی آنکھیں حیران و پریشان تھیں۔ وہ بری طرح مزاحمت کر رہی تھی لیکن دستگیر کے سور جیسے جثے کے سامنے اس کی کوئی بات نہیں چل رہی تھی۔ دستگیر اسے گھسیٹ کر ہال کے بیچ میں لے آیا۔ میں پوری طرح سمجھ رہا تھا کہ ان لوگوں کا کیا ارادہ ہے۔ وہ تینوں شیطان گھٹیا قسم کی پنجابی فلموں کے رسیا رہے ہوں گے۔ وہ عملی زندگی میں ڈاکو تو تھے ہی لیکن جب تک وہ فلمی ڈاکوؤں والی ساری حرکتیں نہ کرتے ان کی تسکین نہ ہو پاتی۔ ریشماں کو ناچتے دیکھ کر ان کے غلیظ جذبات کو تسکین پہنچتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ آج پھر وہی منظر ترتیب دیا جائے جس میں تین شرابی ڈاکو بیٹھے قہقہے لگا رہے ہوں اور سامنے فلم کی ہیروئن رقص کر رہی ہو۔

ریشماں کے وہاں پہنچتے ہی واحد نے ٹیپ ریکارڈ چلا دیا "نچ نی مٹیارے" دستگیر نے گرجدار آواز میں فلمی مکالمہ بولا۔

ریشماں نے نفرت سے اس کی جانب گھورا۔ "نہیں ناچتی کر لے جو کرنا ہے۔" اس کی آواز میں فولاد کی سی مضبوطی تھی۔

ان تینوں نے ریشماں کے اس جملے کو بھی فلمی مکالمے کے طور پر لیا اور زور زور سے قہقہے لگائے' ریشماں کے چہرے پر نفرت کی چمک مزید بڑھ گئی۔ "تیرا تے باپ وی نچے گا کڑیے۔" واحد نے اپنی مکروہ آواز میں فلمی مکالمہ بولا۔ میں اپنے اندر غصے اور نفرت کا طوفان اٹھتا محسوس کر رہا تھا۔ ان شیطانوں کی غلیظ حرکتیں میرا خون کھولا رہی تھیں۔ واحد نے ٹیپ ریکارڈر کی آواز تیز کر دی۔ وہ وہی مکروہ گانا تھا جو اس سے پہلے بھی میں سن چکا تھا۔ موقع چنگا تو فیدا اٹھا لے منڈیا۔۔۔

عین اسی وقت کمال الدین نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے سعید خان؟" تب اس کی نظر ہال میں ہونے والے مکروہ کھیل پر پڑی۔ "ارے یہ تو ریشماں۔۔۔" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ شراب میں ڈوبا ہوا دستگیر ریشماں کی طرف بڑھا۔ بجلی کی طرح اس کا ہاتھ ریشماں کے گریبان پر پڑا۔ فضا میں کپڑا پھٹنے کی چرچراہٹ گونجی اور اس کی قمیص سامنے سے دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے بجلی کا کوندا سا لپکا۔ وہ نظارہ ہوش اڑا دینے والا تھا لیکن میری آنکھیں خود بخود جھکتی چلی گئیں۔ ہال میں ابھی تک ریشماں کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ "اف میرے خدا۔" میں نے کمال

الدین کی آواز سنی۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی تھی کہ اس کی نظریں بھی جھکی ہوئی تھیں۔ ’’یہ انسانیت کی توہین ہے سعید خان‘‘ مجھے حیرت سی ہوئی۔ کمال الدین جیسا عیاش شخص جس طرز عمل کا مظاہرہ کر رہا تھا وہ میرے لیے غیر متوقع تھا۔ اسی وقت میرے کانوں نے ریشماں کی ایک اور چیخ سنی۔ میری نظریں بے اختیار سامنے کی طرف اٹھ گئیں۔ ریشماں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی قمیض کے دونوں کنارے پکڑے ہوئے تھے۔ دستگیر اس کی دونوں کلائیوں کو پکڑ کر اوپر کی طرف اٹھانا چاہ رہا تھا تا کہ وہ ان لوگوں کی فرمائش کے مطابق رقص کرے۔ ریشماں زار و قطار رو رہی تھی۔ اس کے گھنیرے بال اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے مجھے یوں لگا جیسے اس کے وجود کے کسی کونے میں سوئی ہوئی عصمت مآب اور باحیا لڑکی جاگ اٹھی ہے۔ وہ لڑکی جسے اپنی عزت و آبرو اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ ریشماں کی مزاحمت دستگیر کے لیے غیر متوقع تھی‘ چنانچہ وہ مشتعل ہوگیا۔ اس کے منہ سے مغلظات نکل رہی تھیں۔ اس نے پوری قوت سے ریشماں کے منہ پر تھپڑ مارا۔ اس کے حلق سے دل خراش چیخ نکلی اور وہ چکرا کر منہ کے بل فرش پر ڈھیر ہوگی۔ واحد اور مولا بخش رنگ میں بھنگ پڑنے کی وجہ سے بے حد بے مزہ سے ہوگئے۔ ’’چھوڑ دیار‘ بس کرو۔‘‘ مولا بخش نے کہا ’’نہیں مانتی تو رہنے دو پھر کبھی سہی۔‘‘

’’میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ دو ٹکے کی گشتی‘ نخرے کرتی ہے۔‘‘ دستگیر نے غصے سے کف اڑاتے ہوئے کہا۔ وہ تیزی سے ریشماں کی طرف بڑھا۔ اس کی زور دار ٹھوکر ریشماں کی پسلیوں پر پڑی۔ وہ کرب ناک انداز میں چیخی۔

وہ دوسری ٹھوکر مارنے کے لیے پیر اٹھا رہا تھا کہ اس کے ساتھیوں نے اسے جکڑ لیا۔ ’’ہوش میں آؤ دستگیر۔ تجھے آج کچھ زیادہ چڑھ گئی ہے۔‘‘ مولا بخش نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ پھر وہ ریشماں کی جانب متوجہ ہوا ’’ریشماں تو اپنے کمرے میں جا‘ اس وقت اس کا دماغ خراب ہو رہا ہے۔‘‘ ریشماں آہستہ آہستہ اٹھی اور آنسو بہاتی اپنے کمرے میں گھس گئی۔ اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔

اس کے کمرے کا دروازہ تو بند ہو گیا لیکن میرے سینے میں دہکتے انتقام کے ایک اور جہنم کا دروازہ کھل گیا۔ میری آنکھوں میں خون کی سرخی گھل رہی تھی۔ مجھے بالکل یاد نہیں رہا کہ ریشماں بقول دستگیر ’’ایک دو ٹکے کی گشتی۔‘‘ ہے۔ میرے کانوں میں تو بس ایک بے بس عورت کی دردناک چیخیں گونج رہی تھیں۔ میرے رگ و پے میں دستگیر کے لیے نفرت کا تیزاب سنسنا رہا تھا۔ ’’میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔‘‘ میں نے جھرجھراتی آواز میں کہا۔

’’کیا کہہ رہے ہو سعید خان؟‘‘ کمال الدین نے حیرانی سے کہا۔ میں ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آگیا لیکن میرے وجود میں دہکتے تنور کی لپٹیں کم نہ ہوئیں۔

’’میں اس بدبخت شخص کو زندہ نہیں چھوڑوں گا‘ خان صاحب۔‘‘ میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ’’میں اس کا وہ ناپاک ہاتھ تراش دوں گا جو اس بدنصیب عورت پر اٹھا ہے۔ اس کی وہ غلیظ ٹانگ کاٹ دوں گا جس نے ایک بے بس عورت کو اپنا نشانہ بنایا۔‘‘

’’خود پر قابو پانے کی کوشش کرو‘ سعید خان۔ صورت حال کو سمجھو‘ اس وقت تمہاری کوئی بھی غلط حرکت ہماری اور اس کم نصیب لڑکی کی موت ثابت ہوسکتی ہے۔‘‘

’’تم فکر نہ کرو خان جی۔ میں کوئی اندھا قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ لیکن میں قسم کھاتا ہوں کہ مجھے جونہی موقع ملا‘ میں اسے جہنم رسید کر دوں گا۔‘‘ میں نے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی اور اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہوگیا۔ اسی وقت مجھے فقیر بابا یاد آیا۔ اسے ہمیشہ یہ گلہ رہتا تھا کہ میں جوش اور جذبات میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہوں۔ وہ مجھے ہمیشہ نصیحت کرتا تھا کہ مجھے دل کے نہیں دماغ کے کہنے پر عمل کرنا چاہیے۔ مجھے یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ میں آہستہ آہستہ اس کی اس نصیحت پر عمل پیرا ہوتا جا رہا ہوں۔

اگلے دن صبح سویرے مجھے روانہ ہونا تھا۔ اس سفر پر جس کی منزل کا ابھی میں نے تعین بھی نہیں کیا تھا۔ دستگیر کا کہنا تھا کہ وہ کمال الدین خان کے گاؤں یعنی عالم بستی کے آس پاس کے علاقے سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس جگہ سے یہاں کا فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا تاہم راستہ دشوار گزار ہونے کی وجہ سے ہمیں وہاں پہنچنے میں اچھی خاصی دیر لگ سکتی تھی۔ کمال الدین نے مجھ سے پوچھنے کی کوشش کی کہ میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں لیکن میں بھلا اسے کیا بتاتا۔ مجھے تو خود پتا نہیں تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ یہ سب تو صورت حال پر منحصر تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے بس یہ سوچا تھا کہ جونہی کہیں موقع ملا کوئی داؤ لگا کر بازی پلٹ دوں گا۔ کامیابی اور ناکامی تو ظاہر ہے خدا کی مرضی پر منحصر ہوتی ہے۔

صبح کے وقت ہمیں ریشماں نے ناشتا دیا۔ وہ بہت مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔ وہ شاید کچھ کہنا چاہتی تھی‘ کچھ بتانا چاہتی تھی لیکن اس کا موقع نہیں مل پا رہا تھا۔ وہ تینوں وہیں قریب ہی موجود تھے۔ ناشتے کے بعد مجھے اس زنداں سے باہر نکالا گیا۔ اس وقت وہ تینوں بے حد مستعد تھے۔ ان کی گنیں ہمیں نشانے پر لیے ہوئے تھیں۔ کمال الدین نے مجھے سینے سے لگایا اور واپس چٹائی پر جا بیٹھا۔ میں نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ وہ پہلے سے کافی کمزور نظر آ رہا تھا۔ اس کا زخم شاید ٹھیک ہو چلا تھا۔ مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے اپنے چہرے پر بشاشت لانے کی کوشش کی لیکن پوری طرح کامیاب نہ ہوسکا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری طرف سے فکرمند ہے۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں میں اسے آزاد کرانے کے چکر میں اپنی جان نہ گنوا بیٹھوں۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ میں جس لمحے اس کی ملازمت میں آیا‘ اسی لمحے میں نے اپنے دل میں عہد کر لیا تھا کہ میں اس کا محض نام کا محافظ نہیں ہوں گا بلکہ حقیقتاً اپنی جان پر کھیل کر بھی اس کی حفاظت کروں گا۔ اب اگر اس عہد کی آزمائش کی گھڑی آن پہنچی تھی تو میں اپنے فرض سے کیسے منہ موڑ سکتا تھا۔ مالک اور نوکر کے تعلق کے علاوہ بھی ہمارے درمیان یگانگت کا جو رشتہ قائم ہوگیا تھا وہ ایسا نہیں تھا جسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا۔ ویسے بھی اس معاملے میں ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ ہم دونوں کی ہی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی تھیں۔ اگر میں اپنی زندگی بچا لیتا تو پھر میرے لیے اس کی زندگی بچانا بھی دشوار نہ ہوتا۔ بصورت دیگر موت تو ہم دونوں کا مقدر تھی ہی۔

زنداں کا دروازہ ریشماں نے بند کیا۔ ایک بار پھر مجھے محسوس ہوا جیسے وہ بے حد مضطرب اور پریشان ہے۔ دروازے میں موٹا سا تالا لگاتے وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ تالا بند کر کے اس

نے چابی دستگیر کو تھما دی۔ یہ بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ دستگیر نے وہ چابی اپنی قمیص کے اندر بنڈی کی جیب ریں رکھی ہے۔ ''چل اب آگے لگ۔'' دستگیر کے لہجے میں سختی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موجود کلاشنکوف کی خوفناک نال بڑی بے رحمی سے مجھے گھور رہی تھی۔ واحد کے ہاتھ میں دونالی شاٹ گن تھی جبکہ مولا بخش نے تھری ناٹ تھری رائفل اٹھا رکھی تھی۔ میں چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔ میں قدرے جلدی قدم اٹھا رہا تھا تاکہ انہیں یہ تاثر دے سکوں کہ میں کچھ خوف زدہ ہوں۔ اس موقع پر تن پھن دکھانا مناسن نہ تھا۔ اگر ان کے ذہن میں یہ تاثر بیٹھ جاتا کہ میرا یہ ڈیل ڈول محض دکھاوے کا ہے اور درحقیقت میں ایک بزدل شخص ہوں تو یہ میرے حق میں کافی بہتر ثابت ہو سکتا تھا۔ پھن کاڑھے ہوئے کالے ناگ کی بہ نسبت جوتے میں چھپا ہوا سنپولیا زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ ناگ سے انسان کسی نہ کسی طرح بچ بھی نکلے لیکن بے خبری کے عالم مین جوتے میں پاؤں ڈال کر ڈسا جانا یقینی ہوتا ہے۔ میں بھی اپنے زہر کو ان کے سامنے ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ تینوں مجھے گھیرے ہوئے اس مکان سے باہر لے آئے۔ میں کسی معصوم بھیڑ کے مانند ان کی ہدایات پر عمل کرتا رہا۔ مکان کے عقب میں پہنچ کر مجھے ایک چھوٹا سا احاطہ نظر آیا۔ اس احاطے میں ایک طرف چھپر پڑا ہوا تھا۔ اس چھپر میں تین گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ میں نے ان میں سے اپنے گھوڑے سونے کو صاف پہچان لیا۔ مولا بخش نے ایک گاڑی پر سے ترپال ہٹائی۔ وہ ایک کھٹارا سی جیپ تھی لیکن جیپ کیسی بھی ہو بہرحال جیپ ہی ہوتی ہے۔ طاقت ور قابل اعتماد اور جفاکش۔ ایک گھوڑے اور جیپ میں بہت سی قدریں مشترک ہوتی ہیں۔ دونوں ہر طرح کے اچھے برے حالات میں اپنے مالک کا ساتھ نبھاتے ہیں۔

میں مزید ہدایت کا منتظر تھا کہ مولا بخش احاطے کے ایک کونے کی طرف بڑھا۔ جب وہ واپس لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک رسی تھی۔ وہ میری طرف بڑھا ''یہ کیا کر رہے ہو دستگیر خان؟'' میں نے دستگیر کی طرف مڑ کر کہا ''جب میں اپنی خوشی سے' اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ چل رہا ہوں تو پھر اس رسی کے استعمال کی کیا ضرورت ہے؟''

ہم تیرے پر بھروسا نہیں کر سکتے جوان۔ تو کوئی گڑبڑ بھی کر سکتا ہے۔'' ''بہت خوب! تم مجھ پر بھروسا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ میں تم لوگوں کے خلاف کوئی خطرناک کاروائی بھی کر سکتا ہوں لیکن کیا تم نے یہ سوچا ہے کہ جب میں کمال الدین سیٹھ کی حویلی میں جاؤں گا تو کیا اس وقت بھی میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہونگے؟ یہ تو سوچو بھائی کہ جب تمہارا اور سیٹھ کا معاملہ سیٹ ہو چکا ہے تو پھر میرے کیا پیٹ میں درد اٹھا ہے کہ میں خواہ مخواہ بیچ میں ٹانگ اڑاؤں گا۔ تمہیں جو رقم ملے گی وہ کیا میرے باپ کے گھر سے نکلے گی۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ خواہ مخواہ اپنی جان خطرے میں ڈالوں۔ مجھے تو بس یہ فکر ہے کہ جلد از جلد میری جان چھوٹ جائے۔''

مولا بخش نے دستگیر کی طرف دیکھا۔ میری اس طویل تقریر کا حسب توقع اثر ہوا ''اچھا مولا بخش رہنے دو۔ یہ صحیح کہہ رہا ہے۔ ویسے بھی جب سیٹھ ہمارے قبضے میں ہے تو یہ کیا تیر مار سکتا ہے'' مولا بخش

نے رسی کا گچھا اٹھا کر جیپ میں رکھ دیا۔ واحد نے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا۔ دستگیر جیپ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ کلاشنکوف اس نے اپنی گود میں اس طرح رکھی ہوئی تھی کہ آسانی سے نظر نہ آتی تھی۔ واحد کی شاٹ گن بھی دستگیر کے قدموں میں رکھی ہوئی تھی۔ ان کے پاس اور بھی ہتھیار ہوں گے لیکن انہوں نے انہیں ظاہر نہیں کیا۔

جیپ روانہ ہوئی تو مولا بخش واپس چل پڑا۔ جیپ کچھ دیر کچے راستے پر چلتی رہی پھر وہ ایک ''سڑک'' پر چڑھ گئی۔ وہ سڑک بس اس حد تک سڑک کہی جا سکتی تھی کہ اس پر درخت اور جھاڑیاں موجود نہیں تھیں۔ ورنہ اس میں اور کوئی سڑکوں والی بات نہ تھی۔ بجری اور تارکول کا تو ذکر کیا وہاں تو پتھر اور روڑے بھی باقی نہ بچے تھے۔ ان پر سے گزرتی تو ایسے محسوس ہوتا جیسے ہم جیپ میں نہیں بلکہ کسی بڑی گڑوی میں ہوں جو ہمیں جامنوں کے مانند گڑگڑا رہی ہو۔ کچھ ہی دیر بعد یوں محسوس ہونے لگا جیسے پیٹ کے اندر آنتیں آپس میں بل کھا رہی ہوں۔ مسلسل جھٹکوں کی وجہ سے میرے دانت آپس میں ٹکرا رہے تھے۔ واحد اور دستگیر شاید اس طرح کے سفر کے عادی تھے' لہٰذا وہ بڑے اطمینان سے آپس میں باتیں کرتے رہے۔ کچھ دیر میری طرف سے محتاط رہنے کے بعد وہ قدرے بے فکر ہو چکے تھے۔

ہم کوئی چار پانچ میل کا سفر طے کر چکے تھے مگر ابھی تک ہمیں کوئی بھی انسانی آبادی نظر نہ آئی تھی۔ میں اب اپنی کاروائی کے لیے کوئی مناسب موقع تلاش کر رہا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف اچھا خاصا گھنا جنگل تھا۔ اپنے مطلب کی جگہ دیکھ کر میں نے واحد کا کندھا تھپتھپایا ''استاد ذرا جیپ روکنا۔''

وہ دونوں ایک ساتھ چونک پڑے ''کک --- کیا ہے؟'' واحد نے بوکھلائے لہجے میں پوچھا۔ میں نے اپنی آواز بے حد پرسکون بناتے ہوئے کہا ''ہونا کیا ہے استاد' وہ ذرا جھاڑی میں جانا ہے۔'' میری بات دستگیر کے کان میں بھی پڑ گئی۔

''چھوٹا کام ہے یا بڑا؟'' اس نے پوچھا۔

''دونوں۔'' میں نے دانت نکالتے ہوئے کہا ''تمہیں ضرورت ہو تو تم بھی آ جاؤ۔ مگر ذرا جلدی۔'' واحد نے دستگیر کا اشارہ پا کر جلدی سے جیپ روک دی۔

''چلو یار میں بھی چلتا ہوں۔'' دستگیر نے کہا۔ میں اس کا مطلب پوری طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ مجھے اپنی نظروں سے دور نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ بھی حاجت کا بہانہ بنا کر میرے پیچھے آنا چاہتا تھا۔ جیپ رکتے ہی میں تیز تیز قدموں سے جھاڑیوں کی طرف بڑھا۔ میں یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے مجھے بہت جلدی ہو۔ میرا انداز اتنا فطری تھا کہ دستگیر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ میرا رخ جیپ سے چند گز پیچھے اگے ہوئے جھاڑیوں کے بلند سلسلے کی طرف تھا۔ یہ جھاڑیاں خاردار تو نہ تھیں لیکن گھنی کافی تھیں۔ میں سیدھا جھاڑیوں کے اندر گھستا چلا گیا۔ کافی اندر جانے کے بعد جھاڑیاں قدرے چھدری ہو گئیں۔ میں زمین پر بیٹھ گیا۔ اب میں دستگیر کر نظر نہیں آ رہا تھا۔ ویسے بھی اس نے جھاڑیوں کے اندر گھسنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی نظریں یقیناً ادھر جمی ہوں گی جہاں میں جھاڑیوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے ہانک لگائی ''سنبھل کے بیٹھنا دستگیر خان یہاں موٹے موٹے کالے چیونٹے ہیں۔ کہیں چپک گئے

تو نچا کر کے رکھ دیں گے۔"

"تم فکر نہ کرو میں ہوشیار ہوں لیکن تم ذرا جلدی نکلنے کی کوشش کرو' ہمیں بہت دور جانا ہے۔"

"ابھی لو میری سرکار مجھے دیر لگا کر کیا کرنا ہے۔" اتنا کہہ کر میں دونوں ہاتھوں اور پیروں پر تیزی سے دائیں جانب بڑھنے لگا۔ میری حرکت میں کسی قسم کی آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ نہ ہی جھاڑیاں ہل رہی تھیں۔ کچھ دور آگے جا کر میں دوبارہ سڑک کی جانب بڑھنے لگا۔ چند ہی لمحوں بعد میں جھاڑیوں کے سرے پر پہنچ گیا۔ میں نے جھاڑیوں سے باہر جھانکا۔ میں اس وقت جیپ سے تقریباً پندرہ گز آگے پہنچ چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دستگیر کی نگاہیں جھاڑیوں پر جمی ہوئی ہیں۔ واحد جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی چرس بھری سگریٹ سلگا لی تھی۔ وہ میری طرف سے بالکل بے نیاز نظر آ رہا تھا۔ ویسے چرس تو نشہ ہی ایسا ہے کہ آدمی کو دنیا سے تو کیا اپنے آپ سے بھی بے نیاز کر دیتا ہے۔

جب مجھے جھاڑی میں سے نکلنے میں زیادہ دیر ہوئی تو دستگیر نے بے زار لہجے میں آواز لگائی۔ "اب نکل بھی آ یار۔ کیا کرنے بیٹھ گیا۔" دستگیر کی آواز سن کر واحد بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔ میں اسی موقع کا منتظر تھا۔ جونہی واحد نے گردن موڑی میں برق رفتاری سے جھاڑیوں میں سے نکلا اور سڑک پار کر کے دوسری طرف پہنچ گیا۔ وہاں پر موجود ایک بڑے سے درخت نے بڑی آسانی سے مجھے چھپا لیا۔ میں نے نہایت احتیاط سے تنے کے پیچھے سے جھانکا۔ واحد ابھی تک دستگیر کی جانب مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے جھپاک سے درخت بدل لیا۔ اب میں جیپ کے کافی قریب پہنچ چکا تھا۔ اس اثنا میں دستگیر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے کلاشنکوف کا رخ جھاڑیوں کی جانب کیا اور ایک غلیظ گالی بکتے ہوئے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں فوراً جھاڑیوں میں سے نہیں نکلا تو وہ مجھے گولیوں سے چھلنی کر دے گا۔ دستگیر کی لن ترانیاں سن کر واحد بھی محتاط ہو گیا۔ وہ گھٹنوں کے بل جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر کھڑا ہو گیا اور اس طرف گھورنے لگا جدھر رخ کر کے دستگیر تقریر کر رہا تھا' بڑکیں لگا رہا تھا۔ اب شاید واحد بھی جیپ کے پچھلے حصے سے شاٹ گن اٹھا کر میری تلاش میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ میں اسے اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ میں رعد کے مانند کوندا اور واحد پر جھپٹا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کی گردن اپنے دائیں بازو میں دبوچی اور اسے جیپ سے نیچے گھسیٹ لیا۔ اب ہم دونوں جیپ کی اوٹ میں تھے۔ واحد نے خود کو سنبھالا اور مجھے دبوچ کر اپنے نیچے لانا چاہا۔ اس کی یہ کوشش کافی جاندار تھی لیکن میرے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ میں نے اسے بدستور اپنے نیچے دبائے رکھا۔ میری پوری کوشش تھی کہ اس کے حلق کی آواز نہ نکلے۔ یکلخت اس نے میرے بال اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر بری طرح کھینچنا شروع کر دیے۔ میری آنکھوں میں تکلیف سے آنسو آ گئے۔ اس کی اس حرکت سے مجھے بے حد اذیت ہو رہی تھی۔ میرے دونوں ہاتھ غیر ارادی طور پر اس کے حلق پر جم گئے۔ میں نے اس کی گردن دبانا شروع کر دی۔ جوں جوں میرا دباؤ بڑھتا گیا' میرے بالوں پر سے اس کی گرفت کمزور پڑتی گئی۔ اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے ابھرنے لگیں اور زبان حلق سے باہر لٹکنے لگی۔ پھر اس کا تن ڈھیلا پڑتا چلا گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ بے ہوش ہو گیا ہے۔ احتیاطاً میں نے اس کی گردن چھوڑنے کے بعد اس کا سر اٹھا کر زمین پر دے

مارا۔ اس کے جسم میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑا اور اٹھ کر دستگیر کی طرف دیکھا۔ اس نے جھاڑیوں کی طرف کلاشنکوف تان لی تھی اور وہ فائر کرنے ہی والا تھا۔ میں نے تیزی سے جیپ کے پچھلے حصے میں ہاتھ ڈالا اور ایک جھٹکے سے شاٹ گن اٹھانا چاہی۔ اچانک شاٹ گن کی بیلٹ سیٹ کے کسی حصے میں الجھی۔ شاٹ گن میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور پرشور آواز سے جیپ کی دھاتی فرش پر گر پڑی۔ عین اسی وقت دستگیر نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میں دوسری بار شاٹ گن کی جانب ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ دستگیر نے ایک لمحے کے لیے مجھے پہچان لیا۔ اس کی رائفل سے لگاتار تین چار گولیاں نکلیں اور جیپ کی باڈی میں گھستی چلی گئیں۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس نے یہ فائر اضطراری حالت میں کیے تھے اگر وہ میرا نشانہ لے کر فائر کرتا تو میرا جسم چھلنی ہو جاتا۔ میں تیزی سے جیپ کے پیچھے چھپ گیا۔ میں بے حد خطرناک پوزیشن میں پھنس چکا تھا۔ دستگیر کسی بھی لمحے مجھے گولی کا نشانہ بنانے والا تھا۔ میں نے تیزی سے واحد کا جسم ٹٹولا۔ اگر مجھے کوئی پستول یا ریوالور مل جاتا تو میں کسی نہ کسی حد تک اپنا دفاع کرنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ مجھے واحد کے پاس کوئی آتشیں ہتھیار نہ ملا البتہ اس کے نیفے میں ایک خنجر اڑسا ہوا تھا۔ میں نے وہ خنجر ہاتھ میں لے لیا۔ اس دوران میں دستگیر مجھے للکارتا ہوا جیپ کے دوسری جانب پہنچ گیا۔ وہ گھٹنے کے بل جھکا۔ اسے سامنے ہی ایک انسانی جسم نظر آیا۔ کلاشنکوف کی لبلبی پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ واحد کے بے ہوش جسم نے چند جھٹکے لیے اور پھر خاک و خون میں نہا گیا۔ دستگیر کو فوراً ہی اپنا تباہ کن غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فائرنگ بند کر دی۔ میں جیپ کے ٹائر کے پیچھے سے نکلا اور پلک جھپکتے میں ایک درخت کے پیچھے جا چھپا۔ دستگیر نے مجھے درخت کے پیچھے چھپتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ مغلظات بکتا زمین پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔ درخت کے پیچھے پہنچنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میرے فرار کی راہیں مسدود ہو چکی ہیں۔ اس درخت کے آس پاس کوئی چھپنے کی جگہ نہ تھی۔ میں دستگیر کی نظر سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ دستگیر جیپ کے سامنے سے گھوم کر اس درخت کے قریب پہنچ گیا جس کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا۔

"درخت کے پیچھے سے نکل آ حرام زادے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اس کی آواز میں شعلے دہکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر عمل بھی کرے گا لیکن مجھے اس کا حکم احمقانہ سا لگا۔ وہ مجھے کہہ رہا تھا کہ میں درخت کے پیچھے سے نکل آؤں تاکہ وہ مجھے آسانی سے گولی کا نشانہ بنا سکے۔ میں بھلا اتنی آسانی سے کیسے اپنی موت کو گلے لگا سکتا تھا۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا اس کا فیصلہ یہی ہوتا کہ جب تک ممکن ہو سکے اپنی زندگی بچانے کی کوشش کی جائے۔ ویسے بھی میرے حوصلے ابھی تک میرا ساتھ دے رہے تھے۔ اب میں بالکل نہتا نہیں تھا۔ کم از کم ایک خنجر تو میرے پاس تھا ہی۔ اگر مجھے ذرا سا بھی موقع مل جاتا تو میں اسے کم از کم زخمی تو کر ہی سکتا تھا۔ ایک معمولی خنجر کے ذریعے کلاشنکوف کا مقابلہ کرنا بظاہر احمقانہ سی بات ہے لیکن اگر دل میں حوصلوں اور فولادی جذبوں کا طوفان ہو تو زمانے نے دیکھا ہے کہ ممولے شہباز سے لڑ جاتے ہیں اور صرف لڑ ہی نہیں جاتے اسے

شکست دینے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔ میرے دل میں موت کا خوف تو جانے کب کا رخصت ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر اس جنگل میں ہی موت نے مجھے اپنا شکار بنانا ہے تو ایسے ہی سہی لیکن میں اتنی آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔ دستگیر کو مجھے گولی کا نشانہ بنانے کے لیے کافی محنت کرنی پڑے گی۔

مجھے بدستور درخت کے پیچھے چھپا دیکھ کر دستگیر کا پارہ مزید چڑھ گیا۔ اس کے منہ سے غلیظ گالیوں کی برسات ہو رہی تھی۔ وہ مجھے واحد کی موت کا ذمے دار ٹھہرا رہا تھا۔ اچانک وہ تیزی سے درخت کے پیچھے کی طرف لپکا۔ میں پہلے ہی تیار تھا۔ جونہی وہ اس طرف پہنچا' میں گھوم کر درخت کی دوسری طرف آ گیا۔ دستگیر نے اس شدید طیش کے عالم میں بھی ہوش کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اس نے درخت سے اپنا فاصلہ اتنا رکھا کہ میں اگر آنکھ بچا کر نکلنا چاہوں تو نہ نکل سکوں۔ وہ ایک بار پھر تیزی سے درخت کے سامنے آ گیا۔ میں اس دوران میں درخت کے دوسری جانب پہنچ چکا تھا۔ اگرچہ میں ابھی تک اس کے نشانے کی زد میں نہیں آیا تھا تاہم مجھے معلوم تھا کہ اس طریقے سے میں محض چند لمحوں کی مہلت حاصل کر سکتا ہوں۔ جلد ہی مجھے اس کی زد میں آنا تھا۔ اس کے باوجود میں ہتھیار ڈالنے پر تیار نہیں تھا۔ یہ آنکھ مچولی مزید کچھ دیر جاری رہی۔ وہ بری طرح ہانپنے لگا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ ایک بار پھر درخت کی پچھلی سمت دوڑا۔ میں تیزی سے اس کی مخالف سمت پہنچ گیا لیکن اس بار میں دھوکا کھا چکا تھا۔ اس نے جھکائی دے کر تاثر دیا تھا کہ وہ دوسری طرف جا رہا ہے لیکن درحقیقت دو قدم کے بعد واپس لوٹ آیا تھا۔ اب میں اس کے روبرو تھا۔ اس کی کلاشنکوف کی بے رحم آنکھ کے عین نشانے پر کلاشنکوف کا لیور آٹومیٹک پر سیٹ تھا۔ انگلی کی ایک ذرا سی جنبش سے میرا جسم چھید چھید ہو جاتا۔ میرے ہاتھ میں خنجر ابھی تک دبا ہوا تھا لیکن اس کی موجودگی اب بے معنی ہو چکی تھی۔ دستگیر کے لبوں کے کناروں سے کف بہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی۔ مجھے اپنا جسم سن ہوتا محسوس ہوا۔

میں موت کے استقبال کی تیاری کرنے لگا۔ دستگیر کے حلق سے ابلنے والا مغلظات کا طوفان تھم چکا تھا۔ اس نے کلاشنکوف کا آہنی دستہ اپنے شانے سے ٹکایا اور میرے سینے کا نشانہ لیا۔ اچانک فضا میں ایک زوردار دھماکا گونجا۔ میرے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا۔ شاید گولی سیدھی میرے دل میں گھس گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ مجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچی۔ میرا جسم بالکل محفوظ تھا۔ گولی شاید میرے پاس سے گزر گئی تھی۔ اسی وقت میری نظر دستگیر پر پڑی۔ اس کے چہرے پر شدید اذیت کے آثار تھے۔ اس کے دائیں شانے سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ کلاشنکوف پر سے ہٹا اور بے جان سا ہو کر جھلنے لگا۔ البتہ کلاشنکوف ابھی تک اس کے بائیں ہاتھ میں تھی۔ اس نے اسے نال سے پکڑ رکھا تھا۔ مجھے یکدم ہوش آ گیا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر نوک سے پکڑا اور پوری قوت سے دستگیر پر کھینچ مارا۔ تیز دھار خنجر ہوا میں دائرے بناتا اس کی طرف بڑھا اور سیدھا اس کے نرخرے میں ترازو ہو گیا۔ دستگیر کو زبردست جھٹکا لگا۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ پہلو کے بل زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا بایاں ہاتھ اپنی گردن کی طرف بڑھا لیکن خنجر سے ٹکرا کر رک گیا۔ موت اس پر اپنے بھیانک پنجے گاڑ رہی تھی۔ اس کے کٹے ہوئے نرخرے سے کھڑکھڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی اور وہ بری طرح تڑپ رہا تھا۔ اسی

وقت میں نے کمال الدین کو دیکھا۔ وہ دستگیر کے عقب والی جھاڑیوں سے برآمد ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیون ایم ایم رائفل تھی۔ اسے اس وقت' اس جگہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ میرے لیے زندگی کا پیامبر ثابت ہوا تھا۔ اس کی رائفل سے نکلنے والی گولی اگر ذرا سی بھی تاخیر سے چلتی یا ذرا بھی چوک جاتی تو میری موت یقینی تھی۔ ابھی میں اس سے سوال کرنا ہی چاہتا تھا کہ مجھے ایک بار پھر شدید حیرت کا شکار ہونا پڑا۔ وہ۔۔۔ ریشماں تھی۔

مجھے دیکھ کر ریشماں کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ اس وقت بے حد پاکیزہ' بے حد معصوم نظر آ رہی تھی۔ میری محویت دیکھ کر اس کے چہرے پر حیا کی سرخی ابھری۔ اسی وقت کمال الدین خان کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ''بال بال بچے ہو بچو۔ آج تو سمجھ لو کہ موت بوسہ لے کر واپس پلٹ گئی۔''

''تم صحیح کہہ رہے ہو خان جی۔ لیکن تم لوگ اس طرح اچانک۔۔۔''

''بتائیں گے سب کچھ بتائیں گے۔ تم ذرا اپنی حالت پر تو قابو پا لو۔'' کمال الدین کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ تھی۔ وہ بڑے اعتماد سے مسکرا رہا تھا۔ جیسے اس کی مصیبتوں نے اس کا ہمیشہ کے لیے پیچھا چھوڑ دیا ہے۔ ''پہلے تو ان دونوں لاشوں سے نجات حاصل کرو۔'' میں نے چونک کر دستگیر کی جانب دیکھا۔ وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس کے حلقوم میں خنجر موت کے پرچم کے مانند ایستادہ تھا۔ ان کی آنکھیں شدید حیرت اور اذیت سے پھٹی پھٹی سی نظر آ رہی تھیں۔ اسے شاید مرتے دم تک یقین نہ آیا تھا کہ جس موت کو وہ میری طرف روانہ کر رہا تھا' وہ پلٹ کر خود اس پر حملہ آور ہو چکی ہے۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کمال الدین کی طرف دیکھا۔ ''ان سے ہم کیسے نجات حاصل کر سکتے ہیں؟؟ ان کو دفن کرنا تو بہت مشکل ہو گا کیونکہ۔۔۔'' ''ارے! انہیں دفن کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ تم بس اتنا کرو کہ ان دونوں کو میرے ساتھ مل جیپ میں ڈال دو۔'' میں نے اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے بھی اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ ہم نے ان دونوں کو ڈنڈا ڈولی کر کے اوپر تلے جیپ میں ڈال دیا۔ کمال الدین جب جیپ کے عقبی حصے سے ہو کر واپس آیا تو تب مجھے اس کے ارادے کا پتا چلا۔ اس کے ہاتھ میں پیٹرول سے بھرا ہوا جیری کین تھا۔ اس نے وہ پیٹرول دونوں لاشوں' تمام سیٹوں اور جیپ کے انجن پر چھڑک دیا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ نکالا۔ یہ سنہری سگریٹ لائٹر اسے واپس مل گیا تھا۔ اس نے جیپ کے پچھلے حصے پر چھڑکے ہوئے پیٹرول میں آگ لگا دی۔ بھک کی سی آواز آئی اور پوری جیپ شعلہ بن گئی۔

کمال الدین نے میرا ہاتھ پکڑا اور دوبارہ ان ہی جھاڑیوں میں گھس گیا جہاں سے وہ برآمد ہوا تھا۔ یہ جھاڑیاں کافی چھدری تھیں۔ ہمیں ان کے درمیان چلنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

''مجھے بتاؤ تو سہی خان جی' یہ سب کیا چکر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''فی الحال تو یہاں سے بھاگنے کی فکر کر بچے۔ تو دو لاشوں کی چتا یہاں چھوڑ کر جا رہا ہے۔''

''لیکن ہم یہاں سے پیدل کیسے۔۔۔'' مجھے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑنا پڑا۔ سامنے ہی ایک درخت سے دو گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ سونے کو میں نے ایک نظر میں پہچان لیا۔ دوسرا گھوڑا بھی اچھا خاصا

تھا۔ جونہی ہم گھوڑوں کے نزدیک پہنچے فضا میں ایک زبردست دھماکے کی آواز گونجی۔ آگ اب جیپ کے پیٹرول ٹینک تک پہنچی تھی۔

کمال الدین نے سونا میرے حوالے کر دیا۔ ”ریشماں کو اپنے پیچھے بٹھا لے سعید خان اور فٹافٹ یہاں سے نکلنے کی کر۔“ میں سونا پر سوار تو ہو گیا لیکن مجھے ریشماں کو اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ ”یہ شرماشرمی چھوڑ و سعید خان‘ صورت حال کی سنگینی محسوس کر۔ ریشماں جلدی سے سعید کے پیچھے بیٹھ جا۔“

”میں نے ریشماں کو سہارا دے کر اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ مجبوری تھی۔ دو گھوڑوں پر تین سواروں کے بیٹھنے کی اس کے علاوہ صورت بھی کیا تھی۔ اگر ریشماں میرے ساتھ نہ بیٹھتی تو اسے کمال الدین کے ساتھ بیٹھنا پڑتا بات تو ایک ہی تھی۔ کمال الدین نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اسی طرف چل پڑا جدھر جیپ جا رہی تھی۔ جس راستے پر ہم جا رہے تھے وہ کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا تاہم ہمیں گھوڑوں پر سفر کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ ریشماں بالکل خاموش تھی۔ مجھے بھی بولنے کا یارا نہ تھا۔

کچھ ہی دیر بعد میرے ذہن سے اس واقعے کا تاثر کم ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میری نبض کی رفتار تیز ہونے لگی۔ ریشماں کے جوان بدن کا لمس میرے رونگٹے کھڑے کیے دے رہا تھا۔ میرے تمام جسم پر چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ میں زندگی میں کبھی بھی کسی نسوانی وجود کے اتنا قریب نہیں رہا تھا۔ اچھی خاصی رفتار سے بھاگتے ہوئے گھوڑے پر بیٹھے ہوئے دو مسافر اگر چاہیں تو بھی آپس میں فاصلہ برقرار نہیں رکھ سکتے۔ میری قمیص پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔ ریشماں کا گداز بدن مجھے اپنے جسم میں کانٹوں کی طرح چبھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں شدید اعصابی تناؤ کا شکار تھا۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ ریشماں بھی اسی ذہنی اذیت کا شکار ہے۔ وہ مجھ سے فاصلہ رکھنے کی خواہش کے باوجود ناکام ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید بات چیت کرنے سے ہماری ذہنی حالت کچھ پرسکون ہو سکے۔ میں نے اس سے سوال کیا ”ریشماں تم لوگ مجھ تک کیسے پہنچے؟ خان جی کب اور کیسے آزاد ہوئے؟“

میں نے محسوس کیا کہ میرے ان سوالات سے ریشماں کا ذہنی تناؤ کم ہوا ہے۔ البتہ اس کی آواز میں ابھی تک لرزش تھی۔ ”تم لوگ جب ان کو رقم ادا کرنے پر راضی ہو گئے تو میں تبھی سے تم لوگوں سے بات کرنے کا موقع تلاش کر رہی تھی لیکن مجھے موقع نہ مل سکا۔ ان تینوں کا شروع سے یہ ارادہ تھا کہ تم لوگوں سے رقم اینٹھنے کے بعد تمہیں ختم کر دیا جائے۔ یہ لوگ پہلے بھی ایسی وارداتیں کر چکے ہیں۔“

”لیکن تم ہمیں یہ سب کچھ کیوں بتانا چاہتی تھیں؟ تمہیں ہم سے کیا ہمدردی تھی؟“ میں نے سوال کیا۔ ایک لمحے کے لیے وہ بالکل خاموش ہو گئی۔

جب وہ دوبارہ بولی تو اس کی آواز میں واضح لرزش تھی۔ ”پتا نہیں کیوں مجھے کچھ دنوں سے یہ لوگ بہت برے لگنے لگے تھے۔ مجھے ان سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے میں ان کی ہر زیادتی ہنس کر برداشت کر لیتی تھی لیکن اب مجھ سے ان کی ذرا سی بھی بدتمیزی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ شاید میں اس ناپاک زندگی سے تنگ آ چکی تھی۔ جب تم دونوں مجھے ملے تو میں نے ان حرامیوں کی ہدایت کے مطابق

تمہیں بھی اپنے حسن و شباب کے جال میں پھانسنے کی کوشش کی۔ خان جی نے ابتدا میں مجھے جن نظروں سے گھورا‘ ان سے مجھے اندازہ ہوا کہ تم لوگ بھی دیگر لوگوں کے مانند ہوس پرست اور بدنیت ہو۔“

”بعد میں تم نے اپنا خیال کیسے بدل لیا؟“ میں نے سوال کیا۔

میں نے جس طرح کی ناپاک زندگی گزاری ہے۔ اس زندگی نے مجھے مردوں کی نظریں پہچاننا سکھا دیا ہے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم نے شاید کبھی بھی کسی عورت کو غلیظ نظروں سے نہیں گھورا۔ میں نے مذاق ہی مذاق میں خان جی سے اپنے آپ کو بیٹی کہلوایا لیکن جونہی اس نے مجھے بیٹی کہا اس کی نظروں کا انداز بدل کر رہ گیا۔ اس کے بعد اس نے کبھی مجھے آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ اس نے مجھے میری اصلیت سے واقف ہونے کے باوجود مجھ پر ترس بھری نظر ڈالنے کی کوشش نہیں کی مجھے علم ہو گیا کہ یہ بوڑھا شخص بظاہر کیسا بھی ہو دل کا برا نہیں ہے۔ وہ اب تک اپنی زبان سے نکلے ہوئے ایک لفظ کی لاج نبھا رہا ہے۔ اس نے مجھے جب بھی بیٹی کہا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ واقعی میرا باپ ہو۔“ ریشماں کے حلق میں آنسو اٹک رہے تھے۔ وہ شدید جذباتی ہو رہی تھی۔ میں نے اسے اس جذباتی کیفیت سے نکالنا چاہا۔

”لیکن تم نے اسے قید خانے سے کیسے نکالا؟“

”تم لوگ جونہی وہاں سے روانہ ہوئے۔ میں نے مولا بخش کو چائے میں بے ہوشی کی دوا ملا کر پلا دی۔ میں تمہیں آگاہ کرنا چاہتی تھی کہ تمہاری جان شدید خطرے میں ہے۔ دستگیر اور واحد کا منصوبہ یہ تھا کہ جونہی تم خان جی کی حویلی سے رقم لے کر واپس آؤ گے‘ وہ تمہیں گولی مار کر وہیں چھوڑ دیں گے پھر واپس آنے کے بعد خان جی کو ختم کر دیا جاتا۔ مولا بخش کو بے ہوش کرنے کے بعد میں نے رائفل سے گولی چلا کر کمرے کا تالا توڑ دیا۔۔۔“

”لیکن تم لوگ مجھ تک کیسے پہنچے؟“ میں نے سوال کیا۔

”یہ تو کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے اس راستے کا اچھی طرح علم ہے۔ مجھے یہ بھی پتا ہے کہ گھوڑوں کے ذریعے ہم باآسانی تم لوگوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ جب ہم اس جگہ پہنچے‘ جہاں ہم نے گھوڑے باندھے تھے تو ہم کلاشنکوف کی فائرنگ کی آواز سنی۔ ہم نے گھوڑے وہیں چھوڑے اور تیزی سے سڑک کی طرف بڑھے۔ اس اثنا میں دستگیر نے تمہیں گھیر لیا۔ اس وقت ہم ایک ایسی جگہ پر تھے جہاں سے سڑک کا تمام منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ خان جی نے رائفل سے نشانے کا کمال دیکھا اور اس کتے کا کندھا چھید دیا۔ باقی کام تم نے خود پورا کر دیا۔“

”اچھا تو یہ بات ہے!“ میں نے دھیرے سے کہا کتنی عجیب بات تھی یہ۔ وہ عورت جو ہم دونوں کو قید کروانے میں پیش پیش تھی‘ اسی کی مہربانی سے ہمیں رہائی نصیب ہوئی بلکہ میری تو زندگی بچانے میں بھی اس کا اہم کردار تھا۔ میں نے اسے دغاباز اور مکار عورت سمجھ کر اس سے نفرت کی تھی جبکہ وہ ذہین اور ہمدرد مزاج ثابت ہوئی۔

جوں جوں میں اور ریشماں ایک دوسرے سے باتیں کرتے گئے ہم دونوں کے دلوں سے یہ

احساس مٹتا چلا گیا کہ ہم دونوں مخالف جنسوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب ہم صرف دو مسافر تھے۔ دو ہم سفر قسمت نے ہمیں ایک سواری پر یکجا کر دیا تھا اور اب ہمیں مل کر یہ سفر کاٹنا تھا۔

اچانک ہمارے آگے گھوڑا دوڑاتے ہوئے کمال الدین خان نے اپنے گھوڑے کی رفتار سست کر لی۔ وہ راستے سے ہٹ کر دائیں جانب چلنے لگا۔ ہمارا گھوڑا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ کچھ دور چل کر وہ گھوڑا روک کر نیچے اتر گیا۔ سامنے ہی ایک چھوٹی سی نہر بہہ رہی تھی۔ اس نے اپنے گھوڑے کے منہ سے لگام نکال کر اسے پانی پینے کے لیے چھوڑ دیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ سونے کا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اسے یقیناً پیاس لگی ہوئی تھی۔

ہم تینوں گھاس کے ایک چھوٹے سے قطعے پر بیٹھ گئے۔ ریشماں نے ایک پوٹلی کھول کر روٹیاں نکال لیں۔ ہمیں اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ روٹیوں کے ساتھ' ریشماں نے ہمیں اچار دیا۔ ٹینٹ اور لیموں کا وہ اچار بے انتہا اشتہا انگیز تھا۔ میرے ہاتھ رکتے ہی نہیں تھے۔ میں نے ریشماں کے لبوں پر مسکراہٹ لرزتی دیکھی تو میں جھینپ سا گیا لیکن چند لمحوں بعد میرے ہاتھ پھر حرکت میں آ گئے۔ ریشماں انتظام پورا کر کے روانہ ہوئی تھی۔ اس نے پانی پینے کے لیے بھی ایک جگ ساتھ لے لیا تھا۔ نہر کا پانی دیکھنے میں تو صاف ستھرا نہ تھا لیکن اس کا ذائقہ بے حد شیریں ثابت ہوا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم دوبارہ گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ ریشماں ہم دونوں سے چھینی گئی تمام اشیاء ساتھ لے آئی تھی جو اس نے ہمارے حوالے کر دیں۔ ان ہی اشیاء میں بھنگ کی وہ چھوٹی سی پوٹلی بھی تھی۔

اس شعلہ صفت نوجوان
کی سرگزشت کے بقیہ واقعات
حصہ دوم میں پڑھیے

☆O☆

اس در بدر نوجوان کی سرگذشت جس کی دشمن زمین بھی تھی اور آسمان بھی
آگ بگولا
2
محمد عباس ثاقب

''اچھا تو تم بھنگ کا شوق بھی رکھتے ہو۔'' ریشماں نے شوخ لہجے میں پوچھا۔ زندگی پر اس کا اعتماد بحال ہو چلا تھا۔

''اب میں تمہیں اپنا کون کون سا شوق بتاؤں۔'' میں نے بھی شوخ لہجے میں کہا ''اچھ کیا تم اسے ساتھ لیتی آئیں۔ میں اس کے بغیر خود کو بے حد تنہا اور اداس محسوس کر رہا تھا۔'' ریشماں کی ہنسی نے فضا میں جلترنگ سی بجادی۔

کمال الدین ہماری نوک جھونک سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے سعید خان کہ یہ ساوی بوٹی تمہاری محبوبہ ہے۔'' کمال الدین نے جملہ کسا۔

''یہ خود تو محبوبہ نہیں ہے البتہ محبوبہ کی نشانی ضرور ہے۔''

''ہاہاہاہا۔'' کمال الدین کا قہقہہ فضا میں گونجا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری وہ محبوبہ بھنگ کی رسیا ہے۔''

''نہیں وہ خود تو بھنگ کی شوقین نہیں البتہ اس کا پیرومرشد دو جان سے ساوی بوٹی کا عاشق ہے۔ میری محبوبہ نے اپنی پیر سے میری سلامتی اور ترقی کے لیے تعویز مانگا تھا۔ اس نے بجائے تعویز کے یہ پوٹلی اسے دے دی کہ اس کی برکت سے جب ہم بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے مزے کر رہے ہیں تو یقیناً یہ پوٹلی جس کے پاس پہنچے گی وہ بھی مزے کرے گا۔ بس اس وقت سے میں اسے اپنے سینے سے لگائے پھر رہا ہوں۔'' ریشماں ہنس ہنس کر پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ کمال الدین بھی باوجود کوشش کے اپنی ہنسی نہیں دبا پا رہا تھا۔

اس نے ہانپتے ہوئے پوچھا ''تو بھئی کچھ فائدہ بھی ہوا پیر صاحب کے اس تحفے سے؟'' اس کے چہرے سے مسکراہٹ پھوٹی پڑ رہی تھی۔

''کوئی ایسا ویسا فائدہ؟ بس یہ سمجھ لو کہ جب سے یہ سوغات میرے پاس پہنچی ہے شاید ہی کوئی دن ایسا

گزرتا ہوگا جب میں اپنے بستر پر آرام کی نیند سوتا ہوں گا۔ ہر پانچ منٹ بعد کسی نہ کسی طرف سے کوئی گولی آتی ہے اور میرے کانوں میں سیٹیاں بجاتی گزر جاتی ہے۔“”لیکن یار اس میں پیر صاحب کا کیا قصور ہے؟ تم اتنی بار گولیوں کی بارش سے گزرنے کے باوجود ابھی تک محفوظ ہو۔ اس کا سیدھا سیدھا مطلب یہ ہے کہ یہ پوٹلی واقعی تمہاری سلامتی کی ضمانت بنی ہوئی ہے۔“

”تو پھر ایسا کرو خان جی کہ یہ پوٹلی تم اپنے پاس رکھ لو تاکہ یہ تمہاری بھی حفاظت کرتی رہے۔“ میں نے کمال الدین پر چوٹ کی۔ ”مجھے تو معاف ہی رکھو بھائی۔ یہ سوغات تمہاری محبوبہ نے تمہارے لیے حاصل کی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کا مجھ پر الٹا اثر ہو۔ کچھ خیال کرو بھائی۔ میں نے تمہیں اپنا محافظ بنایا ہے اپنی جان کا دشمن نہیں۔“

کچھ دیر تک ہم لوگ ہنسی مذاق کرتے رہے۔ ریشماں نے بچی ہوئی روٹیوں کی پوٹلی باندھ لی۔ اس نے مجھے ایک بھرا ہوا پستول دیا تھا۔ یہ پستول اس نے مولا بخش کو بے ہوش کر کے حاصل کیا تھا۔ کمال الدین کے پاس میرے والا ریوالور تھا۔ اس بار ہم لوگ روانہ ہوئے تو ہماری رفتار کافی تیز تھی۔ کمال الدین کے اندازے کے مطابق ہم نے ابھی بمشکل ایک تہائی راستہ طے کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم رات گہری ہونے سے پہلے ہی عالم بستی پہنچ جائیں گے۔ پانی پینے اور ہری بھری گھاس کھانے کے بعد دونوں گھوڑے پوری طرح تازہ دم ہو چکے تھے اور کافی تیز رفتاری سے دوڑ رہے تھے۔ کمال الدین کا گھوڑا آگے تھا جبکہ میرا گھوڑا اس کے پیچھے‘ ریشماں بدستور میرے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ گھوڑے کی رفتار تیز ہونے کی وجہ سے ہم آپس میں صحیح بات نہیں کر پا رہے تھے۔ میری نظریں کمال الدین پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے راستے کو پہچان لیا تھا اور اب وہ بے حد پرجوش تھا۔ اس کا گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

ہم تقریباً آدھے گھنٹے تک تیز رفتاری سے سفر کرتے رہے۔ ہم جس راستے پر سفر کر رہے تھے وہ سڑک کے متوازی تھا۔ سڑک پر چلنے والی کوئی بھی گاڑی زیادہ دیر ہم سے چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ ہم لوگ وقتاً فوقتاً سڑک پر نظر ڈالتے جا رہے تھے۔ اچانک کمال الدین کے گھوڑے کو زوردار ٹھوکر لگی۔ اس کا گھوڑا بڑی تیز رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔ ٹھوکر لگنے کے ساتھ ہی کمال الدین کا جسم ایک جھٹکے سے گھوڑے پر سے اچھلا اور ہوا میں قلابازی کھا کر ایک درخت سے جا ٹکرایا۔ ٹھوکر کھانے کے ساتھ ہی گھوڑا اپنے اگلے پیروں کے بل زمین پر گرا اور گردن کے بل پلٹ گیا۔ اس کے اگلے ایک یا دونوں پیروں کی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ زمین پر پڑا بری طرح ٹانگیں چلا رہا تھا۔ اس میں غالباً کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی۔ میرا گھوڑا سونا میرا اشارہ پاتے ہی ٹھہر چکا تھا۔ میں گھوڑے سے اتر کر تیزی سے کمال الدین کی جانب بڑھا۔ اسے شاید کوئی کاری چوٹ لگی تھی۔ وہ منہ کے بل زمین پر ساکت و صامت پڑا تھا۔ اس کے جسم میں زندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ ریشماں کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی لیکن اس نے فوراً اپنا منہ ڈھانپ لیا۔ میں نے جلدی سے کمال الدین کو سیدھا کیا اور اسے چت کر کے لٹا دیا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے بائیں شانے سے بھی خون نکل رہا تھا۔ شاید اس کے شانے پر لگا ہوا گولی کا زخم پھر سے اُدھڑ گیا تھا اس کی حالت

خاصی تشویشناک تھی۔ اس کے سر پر لگنے والی ضرب مہلک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ اس کے جسم سے بہنے والا خون لمحہ بہ لمحہ اسے زندگی کے ساحل سے دور کر رہا تھا۔ کمال الدین کی یہ حالت دیکھ کر ریشماں کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس نے کمال الدین کے سر کے زخم کا جائزہ لیا۔ اس نے ایک سوتی چادر کو جلدی جلدی پھاڑا اور اس سے کئی پٹیاں بنائیں۔ پھر اس نے سوتی کپڑے کے ایک صاف ستھرے ٹکڑے کو آگ دکھا دی۔ جب کپڑے کا وہ ٹکڑا جل کر راکھ بن گیا تو ریشماں نے وہ راکھ کمال الدین کے سر کے زخم میں بھر دی۔ ”اب زخم خراب نہیں ہوگا اور خون بھی رک جائے گا۔“

میں نے سر ہلا کر ریشماں کی بات کی تائید کی۔ دور افتادہ علاقوں میں جہاں فوری طبی امداد ذرا مشکل سے ہی ملتی ہے‘ زخموں میں راکھ بھرنے کا طریقہ علاج بہت عام ہے۔ راکھ کی جگہ سرمہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس آسان اور تیر بہ ہدف علاج سے صحت یاب ہونے والے مریضوں کو پہچاننا بہت آسان ہوتا ہے۔ کیونکہ زخم کے نشان کی سیاہی تمام عمر نہیں ختم ہوتی۔ اس طریقہ علاج کے ہاتھوں بہت سے مریضوں کی زندگی کا چراغ بجھ بھی جاتا ہے لیکن بھلا موت سے کیسے بچا جا سکتا ہے۔ اسے تو کسی نہ کسی بہانے سے آنا ہی ہوتا ہے۔

ریشماں نے کمال الدین کے سر پر پٹی باندھنے کے بعد میری مدد سے اس کے شانے کی بھی مرہم پٹی۔۔۔ یعنی صرف پٹی کر دی۔ مرہم کا اس جنگل میں کہاں سے انتظام ہوتا۔ اس مرحلے پر مجھے فقیر بابا یاد آیا۔ اس کی زنبیل میں ان گنت شعبدے موجود رہا کرتے تھے۔ جونہی کوئی فوری ضرورت پیش آتی‘ وہ اپنے جھولے میں ہاتھ ڈالتا اور کوئی نہ کوئی کام کی چیز برآمد کر لیتا۔ اس موقع پر اگر اس کے پاس مرہم موجود نہ بھی ہوتا تو اپنی بے مثال مہارت سے کام لے کر معمولی جڑی بوٹیوں کی مدد سے ایسی مرہم اور دوا بناتا کہ اس کے استعمال کے بعد مزید کسی دوا کی ضرورت نہ رہتی۔ وہ ضعیف شخص اپنے منحنی جسم میں اتنی گوناگوں صفات رکھتا تھا کہ ذہن ان کا پوری طرح احاطہ نہیں کر پاتا تھا۔ میری بدقسمتی یہ تھی کہ میں نے اپنے اس نادر روزگار استاد‘ بے حد مشفق و مربی بزرگ اور بہادر جاں نثار مجسم اور پرخلوص دوست کو کھو دیا تھا۔ اسے کھونا ہی چاہیے۔ میں اسے شدید زخمی حالت میں اپنے دشمنوں کی کچھار میں چھوڑ آیا تھا۔ انہوں نے خدا معلوم اس کا کیا حشر کیا ہوگا؟ میں خود سے بار بار عہد کرتا کہ میں پہلی فرصت میں اس کے پیچھے جاؤں گا لیکن حالات و واقعات کی چھچھوندر مجھے زمین پر پاؤں نہ رکھنے دیتی۔ مجھے اپنی زندگی کی حفاظت کے لیے ہر لمحہ ایک نئی جنگ لڑنی پڑ رہی تھی۔ اس گھمسان کی جنگ نے اب تک مجھے اتنا موقع بھی نہ دیا کہ میں ذرا ٹھہر کر اپنے سود و زیاں کا حساب کر لوں اور اب اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ مجھ پر کمال الدین کی زندگی کی حفاظت کی ذمے داری بھی آن پڑی تھی۔ ریشماں بھی میرے گلے میں بے موسمی پھولوں کے ہار کی طرح آن پڑی تھی۔ مجھے اسے بھی حالات کے تھپیڑوں سے بچانا تھا۔

کمال الدین کی حالت ایسی نہ تھی کہ فی الحال وہ مزید سفر کر پاتا۔ ہم اسے ہوش میں لانے کی جدوجہد کرتے رہے لیکن وہ ہوش میں نہ آیا۔ میں نے وہاں سے کچھ دور پانی ڈھونڈ لیا تھا۔ ہم اس کے حلق میں

تھوڑی تھوڑی دیر بعد پانی ٹپکاتے رہے۔ اس کے زخموں سے خون کا اخراج بند ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر اسے کوئی دماغی چوٹ نہ آئی ہو تو وہ جلد ہی صحت مند ہو سکتا ہے۔ میں اس کی صحت یابی کے لیے رب ذوالجلال سے دعا مانگتا رہا۔ میں نے ریشماں سے بھی کہا کہ وہ خدا سے کمال الدین کی صحت یابی کے لیے دعا کرے۔ میری بات سن کر وہ سرتاپا کانپ گئی۔ شاید وہ شدید ترین احساس گناہ کا شکار تھی۔ جس قسم کی زندگی وہ گزارتی رہی تھی' اس میں اسے کبھی خدا کو پکارنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی ہوگی۔ انسان جب اپنی زندگی کا کچھ حصہ مکمل طور پر شیطان کے اتباع میں گزار دیتا ہے تو اسے اپنا دل گناہوں کی سیاہی میں ڈوبا محسوس ہوتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ میں اب اس قابل کہاں رہا ہوں کہ اس ذات پاک کے حضور اپنے اعمال کے لیے معافی کا طلب گار ہوں۔ اس لمحے وہ یہ بھول جاتا ہے کہ خداوند کریم کی ذات کتنی رحیم و کریم اور ستار و غفار ہے...... اسے تو اپنے بندے کی آنکھ سے ٹپکے ندامت کے دو آنسو بھی خوش کر دیتے ہیں۔ وہ قہار و جبار ہے تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا بھی ہے۔ اسے تو اپنی رحمت کا خزانہ لٹانے کے لیے محض ذرا سا بہانہ چاہیے ہوتا ہے۔

میں نے ریشماں کو بڑے محتاط الفاظ میں' اس کے شیشہ صفت احساسات کو ٹھیس پہنچائے بغیر' دعوت دی کہ وہ ایک بار اس ذاتِ پاک کی رحمت تو طلب کر کے دیکھے۔ اس در رحمت کے کھلنے میں دیر نہیں لگتی۔ گناہوں کی سیاہی کتنی بھی گہری ہو اللہ کے نور کی ایک جھلک اس کا نام و نشان تک مٹا سکتی ہے۔

میری ان باتوں نے شاید ریشماں پر سوچ کے نئے دروازے کھول دیے۔ اس نے میری باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بجائے وہ اس طرف بڑھی جہاں پر پانی کی نہر بہہ رہی تھی۔ جب وہ واپس پلٹی تو وہ باوضو تھی۔ اس کے چہرے پر نور سا پھیلا ہوا تھا۔ وہ بظاہر پرسکون تھی لیکن اس کے وجود کی لرزش' اس کے جسم کے اندر سر اٹھاتے ہوئے طوفان کی خبر دے رہی تھی۔ اس نے ایک صاف چادر قبلہ رخ بچھائی۔ وہ جونہی سجدے میں گری اس کے صبر و ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اپنے گناہوں پر ندامت کا اظہار کر رہی تھی۔ اپنے پاک پروردگار سے بخشش کی طلب گار تھی۔ اس کی گریہ و زاری دیکھ کر میرا دل بھی بھر آیا۔ میں اسے خدا کے حضور سر جھکانے کی نصیحت کر رہا تھا لیکن میں نے خود کب آخری بار اپنے رب کے حضور سر جھکایا تھا؟ اس نے مجھ پر کبھی بھی رحمت میں کمی نہ کی تھی۔ ہر لمحہ اس نے میری دراز دستیوں کر در گزر کیا تھا' ہر قسم کی مشکل ترین صورت حال سے نجات دی تھی' ہر امتحان میں مجھے سرخرو کیا تھا لیکن میں نے کب اپنی بندگی کا اقرار کیا؟ میرا دل ندامت سے بوجھل ہو گیا۔ اس روز بہت عرصے کے بعد میں نے اپنے آپ کو خدا کے حضور اس کی رحمت کے لیے گڑگڑاتے پایا۔ آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہ تھے۔ جانے کتنی دیر تک سجدے میں پڑا رہا۔ پھر میرے دل کو سکون آتا چلا گیا۔ شاید میں اپنے پاک پروردگار کی رحمت سے اپنی کوتاہیوں کی معافی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ریشماں ابھی تک سجدے میں پڑی ہوئی تھی۔ شاید وہ اسی حالت میں سو چکی تھی۔ میں کمال الدین کی طرف بڑھا اور برتن میں سے پانی لے کر اس کے حلق میں ٹپکانے کی کوشش کی۔ اچانک مجھے ایک ہلکی

سی مہک محسوس ہوئی۔ یہ مہک مشک انبر سے مشابہ تھی۔ یہ مہک اب میرے لیے نامانوس نہیں رہی۔ مجھے اپنے وجود میں لرزا سا محسوس ہوا۔ میں اس مہک کا مرکز جان چکا تھا۔ میں نے کانپتے ہاتھ سے اپنی کلائی پر سے سفید رومال کھولا۔ میں نے جونہی اسے پانی میں ڈبویا مہک تیز ہو گی۔ میں نے رومال کمال الدین کے حلق میں نچوڑ دیا۔ یہ عمل میں نے ایک بار اور دہرایا۔ اب میں منتظر تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا یہ انتظار رائیگاں نہیں جائے گا۔ قلندر بابا نے کہا تھا کہ یہ رومال کسی کا تحفہ ہے۔ ایک انمول تحفہ جس کی مجھے اپنی جان سے بڑھ کر حفاظت کرنی تھی۔ اس کے الفاظ کے اسرار و رموز رفتہ رفتہ مجھ پر عیاں ہو رہے تھے۔ مجھے بہت سی ایسی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ جس پر میں نے اس سے پہلے توجہ نہ دی تھی۔

اچانک کمال الدین کے منہ سے ایک کراہ خارج ہوئی۔ میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے اس کا سر اپنے زانوں پر رکھا اور پانی کا برتن اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ کمال الدین نے چند لمبے لمبے گھونٹ لیے۔ پھر وہ پوری طرح ہوش میں آتا چلا گیا۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے اٹھنے سے منع کر دیا۔ اس کے حلق سے ایک اور کراہ نکلی اور اس نے اپنے سر کو ہاتھوں میں تھام لیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی حالت کافی بہتر ہو گئی۔ اس کے لبوں پر اس کی مخصوص مسکراہٹ نمودار ہوئی ''تو میں ایک بار پھر بچ نکلا''۔ اس کی آواز میں زندگی کی جھلک تھی۔

تم اتنی آسانی سے مرنے والی شے نہیں ہو خان جی۔'' میں نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

اسی وقت اس کی نگاہ رشیماں پر پڑی۔ ''ارے۔۔۔ یہ ریشماں۔۔۔؟''

''اسے اس کے حال پر چھوڑ دو خان جی۔ جانے کتنے عرصے کے بعد یہ اپنے مرکز کی طرف لوٹی ہے۔ جانے کتنی مدت کے بعد اس کی روح کو اطمینان و سکون کی نعمت حاصل ہوئی ہے۔''

''کیا واقعی۔۔۔؟'' کمال الدین کے چہرے پر اندرونی مسرت کے آثار تھے۔ خوشی کے مارے اس کی آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔ ''ہاں خان جی۔۔۔ ریشماں اب ایک بالکل نئی لڑکی ہے۔ ایک ایسی لڑکی جس کے دامن پر کسی کثافت کا داغ نہیں ہے۔ اس کا اب اس سیاہ بخت عورت سے کوئی تعلق نہیں ہے جسے ہم نے ڈاکوؤں کے اڈے پر انسانیت کی تذلیل کرنے والوں کے درمیان دیکھا تھا۔'' میری آواز جذبات کے بوجھ سے لرز رہی تھی

''یہ۔۔۔ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔'' کمال الدین نے کہا ''اور آج اس وقت میں تمہارے روبرو عہد کرتا ہوں کہ آج کے بعد میں بھی ایک بالکل مختلف انسان ہونگا۔'' اس کے لہجے میں فولادی عزم کی جھلک تھی۔ اچانک اس کی نظر اس گھوڑے پر پڑی جس کی اگلی دونوں ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں۔ وہ بار بار اذیت کے عالم میں ہنہنا رہا تھا۔

''اسے اس اذیت سے نجات دلا دو سعید خان'' میں اس کا مطلب بخوبی سمجھ رہا تھا لیکن میں اس تکلیف دہ عمل سے جان بچانا چاہ رہا تھا۔

''یہ میرے بس کی بات نہیں ہے خان جی''

"لیکن یہ تو ہمیں کرنا ہی پڑے گا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔"

"تو پھر تمہیں یہ کام خود ہی کرنا پڑے گا" میں نے اپنی جیب سے پستول نکال کر اسے تھما دیا۔ وہ دھیرے دھیرے گھوڑے کی جانب بڑھا۔ اس نے پستول کی نال گھوڑے کی کھوپڑی پر رکھی اور فائر کر دیا۔ میں نے پہلے ہی اس طرف سے منہ پھیر لیا تھا۔ فائر کی آواز سن کر ریشماں سوتے سے اٹھ پڑی۔ وہ ابھی تک قبلہ رخ سجدے میں پڑی تھی۔ جب اسے صورت حال کا علم ہوا تو اس نے کافی افسوس کا اظہار کیا۔ وہ اس گھوڑے سے کافی مانوس تھی۔

وہ رات ہم تینوں نے اسی جگہ گزار دی۔ میں نے آگ کا الاؤ روشن کر دیا تھا۔ ریشماں کو بہت جلد نیند آ گئی۔ انسان کا ضمیر ہلکا پھلکا ہو جائے تو پھر اس کے لیے زندگی بے حد سہل ہو جاتی ہے۔ انسان بظاہر کتنا بھی خدا سے دور ہو جائے اس کی پہنچ سے تو باہر نہیں ہو سکتا۔ ریشماں کے چہرے پر نیند کے عالم میں جو معصومیت اور پاکیزگی نظر آ رہی تھی وہ کسی نوعمر بچے سے مشابہ تھی۔ تزکیہ نفس اور تالیف قلب کے بعد اس کا ضمیر کورے لٹھے کے مانند بے داغ ہو چکا تھا۔ اس رات میں اور کمال الدین بہت دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ہماری گفتگو کا بنیادی محور ریشماں تھی۔ کمال الدین بڑے مشفقانہ انداز میں اس کا ذکر کر رہا تھا۔ ریشماں کو اس نے بیٹی کہا تھا اور وہ اس مقدس رشتے کی لاج نبھانا چاہتا تھا۔ اس نے واقعی اپنے آپ کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ رفتہ رفتہ بات عالم بستی تک آن پہنچی۔ وہ فکرمند تھا کہ اس کے وہاں سے غیر حاضر ہونے کے بعد جانے حویلی میں کیا حالات پیش آئے ہوں گے۔

ہم جب حویلی سے روانہ ہوئے تھے تو مکار و عیار منشی الفت علی خان اور وہ خوبصورت ناگن ڈیوائی کمال الدین کے کمرے میں بند تھیں۔ کمال الدین نے اپنے دو کارندوں کو اس کمرے کی چوکی داری کے لیے چھوڑا تھا۔ جب کمال الدین واپس حویلی نہیں پہنچا ہوگا تو معلوم نہیں ان دونوں اسیروں کے ساتھ کیسا سلوک کیا گیا ہوگا۔ کمال الدین کو خطرہ تھا کہ کہیں منشی الفت علی اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ان لوگوں کو دھوکا دے کر فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ بقول اس کے منشی الفت علی اونٹ کی طرح کینہ پرور اور سانپ کی طرح زہریلا تھا۔ اگر وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا تو اسے ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔ میں نے اسے اطمینان دلایا کہ اس کے کارندے اس کی اجازت کے بغیر ہرگز ان دونوں کو آزاد نہیں کریں گے "ویسے بھی صبح تک میرے باقی کارندے بھی حویلی واپس لوٹ آئیں گے۔ اگر شوکت واپس حویلی آ چکا ہو تو پھر خود ہی سارا معاملہ سنبھال لے گا"

"یہ شوکت کون ہے؟" میں نے پوچھا۔ مجھے یک لخت یوں محسوس ہوا جیسے اس کے چہرے کی چمک سیاہی میں بدل گئی ہو۔ چند لمحے پہلے وہ ہشاش بشاش تھا مگر میرا یہ سوال سنتے ہی اس کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔ شاید یہ سوال اس کے لیے کسی ذہنی اذیت کا باعث بن گیا تھا۔ "تم نے بتایا نہیں خان جی کہ شوکت کون ہے؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"شوکت ۔۔۔ میرا بیٹا ہے۔ اکلوتا بیٹا ۔۔۔" الفاظ اس کے حلق سے اٹک رہے تھے۔

"اچھا میں نے تو اسے آج تک نہیں دیکھا" میں نے حیرانی سے کہا۔ "دراصل وہ ۔۔۔ وہ آج کل بیمار ہے۔ لوگوں کے سامنے بہت کم آتا ہے۔ اس روز وہ ڈاکٹر کے پاس ڈیرہ غازی خان گیا ہوا تھا۔ میری جیپ اور دو کارندے بھی اس کے ہمراہ گئے تھے۔"

"کیا ہوا تمہارے بیٹے کو؟ میرا مطلب ہے کیا بیماری ہے اسے؟" میرے اس سوال نے واضح طور پر کمال الدین کے اضطراب میں اضافہ کر دیا۔ وہ اس تذکرے کو مزید آگے نہیں بڑھانا چاہتا تھا۔

"فی الحال تم اس قصے کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ کل صبح کا کیا پروگرام ہے؟" میں سمجھ چکا تھا کہ کسی نامعلوم وجہ سے کمال الدین اس موضوع کو آگے نہیں بڑھانا چاہتا۔ چنانچہ میں نے بھی دوبارہ اس کے بیٹے کا ذکر نہیں چھیڑا۔

اگلی صبح ہم ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ "دوپہر کے قریب ہم ایک بستی کے پاس پہنچ گئے۔ اس بستی میں ایک شخص کمال الدین کا واقف تھا۔ دوپہر کا کھانا اس کے ہاں کھایا گیا۔ اس جگہ سے ہمیں دو گھوڑے مل گئے چنانچہ رات ہونے سے پہلے پہلے ہم عالم بستی جا پہنچے۔

کمال الدین کو دیکھتے ہی پوری حویلی میں کھلبلی مچ گئی۔ گیٹ پر روشن اور صادق کی ڈیوٹی تھی۔ وہ شاید کمال الدین کی طرف سے صبر کر بیٹھے تھے چنانچہ انہوں نے اچانک اسے اپنے سامنے موجود پایا تو ان پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ دونوں خوشی کے نعرے لگا رہے تھے۔ روشن نے اپنی سیون ایم ایم کا رخ آسمان کی طرف کیا اور پورا میگزین خالی کر دیا۔ زوردار دھماکوں کی آواز نے پوری حویلی کو ہلا رکھ دیا۔ حویلی کے مختلف کونے کھدروں سے لوگ برآمد ہونے لگے۔ جلد ہی وہاں ایک اچھا خاصا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ ریشماں حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات میں گھری یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ کمال الدین نے اسے اپنے پہلو میں کھڑا کیا ہوا تھا۔ میں ان لوگوں سے ذرا الگ تھلگ کھڑا اس جشن مسرت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کمال الدین کے سارے ہی کارندے اسے زندہ سلامت اپنے سامنے دیکھ کر بے حد خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ روشن کی دیکھا دیکھی دیگر کارندوں نے بھی اپنے ہتھیاروں کا بوجھ ہلکا کرنا شروع کر دیا۔ فضا میں دھماکوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ ان سب کے ہتھیار خالی ہو گئے۔ عین اسی وقت جمالو کی آواز نے ان سب کو چونکا دیا "اوئے یہ تو وہی حرامی ہے" اس کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے اپنا پستول کا خالی میگزین الگ کیا اور ایک نیا میگزین لگا کر پستول کاک کر لیا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ مجھ پر بے دریغ فائرنگ نہ شروع کر دے۔ میں نے فوراً اپنی کلاشنکوف کا رخ اس کی جانب کر دیا۔ جمالو کی دیکھا دیکھی صمدو نے بھی اپنی تھری ناٹ تھری کا رخ میری جانب کر دیا۔ معلوم نہیں اس کی رائفل میں گولی تھی یا نہیں بہرحال وہ ظاہر یہی کر رہا تھا کہ جیسے ابھی میرا جسم چھلنی کر دے گا۔

"اپنا پستول جھکا لے جمالو" کمال الدین کی گرج دار آواز نے سب کو چونکا دیا "تو بھی اپنی بندوق نیچے کر لے صمدو۔ سعید خان اب اپنا ہی آدمی ہے۔" جمالو اور صمدو نے قدرے تذبذب کے بعد اپنے

ہتھیار پیچھے کر لیے۔ ’’لیکن خان صاحب اس نے تو۔۔۔‘‘

’’ہاں ہاں وہ سب غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ تم لوگ یہ بتاؤ کہ تم نے اس کتے دے پتر منشی الفت علی اور گشتی ڈیوائی کا کیا کیا؟

’’انہیں تو جی ہم نے بھینسوں والے ڈیرے پر بند کر رکھا ہے۔ گلامو اور نوری ان کی چوکیداری کر رہے ہیں‘‘ روشن نے کہا عین اسی وقت گلامو بھی حویلی میں داخل ہوا۔ کمال الدین کو دیکھ کر اس پر حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت طاری ہو گئی۔

’’خیریت تو ہے گلامو؟۔ اس حرامی منشی اور ڈیوائی کا کیا حال ہے؟‘‘ کمال الدین نے مسرور لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

بالکل فٹ فاٹ ہیں خان صاحب۔ پر وہ گشتی ڈیوائی بڑا غل مچاتی ہے۔ البتہ منشی کو چپ لگ گئی ہے۔‘‘

’’اب تو خیر وہ سیدھا ہو گیا ہے۔ لیکن جب آپ اسے اپنے کمرے میں بندھا چھوڑ گئے تھے تو ہوش میں آنے کے بعد اس نے بڑی ڈرامے بازی کی۔ وہ بار بار میرے کو اور نوری کو خوفناک دھمکیاں دیتا تھا کہ ابھی اس کے ساتھی آ کر ہمارے ٹکڑے اڑا دیں گے۔ پھر وہ ہمیں لالچ دینے لگا۔ پہلے کہتا تھا کہ اگر ہم اسے آزاد کر دیں تو وہ ہمیں دو دو لاکھ روپے دے گا پھر کہنے لگا کہ پانچ پانچ لاکھ روپے دے گا۔ ہم نے کہا کہ ہم تیری طرح نمک حرام نہیں ہیں‘ ہم اس دولت پر تھوکیں گے بھی نہیں۔‘‘

’’شاباش میرے شیرو اور دیکھو اب سعید خان بھی تمہارا ساتھی ہے۔ اس کے سینے میں شیر کا دل ہے۔ اپنے دلوں سے اس کے لیے کینہ نکال دو۔ پچھلے چار چھے دنوں میں اس نے کئی بار میری جان بچائی ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ شوکت خان واپس آیا یا نہیں؟‘‘ کمال الدین کا سوال سن کر وہ سب خاموش سے ہو گئے۔

روشن خان نے کہا ’’خان جی! نکے خان جی کا کوئی پتا نہیں۔ وہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔ اس کے ساتھ جو دو بندے گئے تھے۔ وہ بھی اس نے واپس کر دیے۔‘‘

اوئے اس کے پاس پیسے ویسے بھی ہیں یا نہیں؟‘‘ کمال الدین نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

روشن کا لہجہ بدستور دھیما رہا ’’وہ جی اس نے منشی سے دس ہزار روپے لیے تھے جانے سے پہلے۔‘‘

’’وہ تو اس نے کبھی کے اڑا بھی دیے ہونگے۔ ایک دو دن میں صادق اور جمالو کو ڈیرہ غازیخان بھیجو۔ کہو کہ شوکت خان کو اس کے اڈوں پر تلاش کریں وہ مل جائے تو اسے بتائیں کہ میں اسے فوراً بلا رہا ہوں۔‘‘

’’اگر وہ نہ آئے تو؟ خان جی‘ روشن نے مدھم لہجے میں پوچھا۔

’’اگر اصرار کے باوجود بھی نہ آئے تو ان سے کہنا کہ اس کے آس پاس رہیں۔ پانچ دس ہزار روپے ان کے ساتھ کر دینا ایسا نہ ہو کہ وہ پھر اپنی گھڑی وڑی بیچنے پر تل جائے۔‘‘ کمال الدین کی آواز خود بہ خود کم ہوتی چلی گئی۔

’’اچھا خیر تم لوگ ایسا کرو کہ زنان خانہ کھول دو۔ یہ بی بی میرے دوست کی لڑکی ہے۔ اب یہ یہیں رہے گی۔ بستی سے شریفاں کو بلا لو وہ اس کی خدمت کرے گی۔ اب تم اپنے ٹھکانوں پر پہنچو۔ گلامو تم نوری کے ساتھ مل کر اس حرامی منشی کی کڑی نگرانی کرو۔ اس سے میں صبح کے وقت نمٹوں گا۔ جاؤ شاباش‘ کمال الدین کسی فوجی جرنل کے مانند احکام صادر کر رہا تھا۔ اس کے کارندے فوری طور پر اس کے احکام کی تعمیل میں مصروف ہو گئے۔

کمال الدین مجھے اور ریشماں کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ حویلی میں زبردست چہل پہل شروع ہو گئی۔ کچھ ہی دیر بعد کمال الدین کا ایک کارندہ کھانا لے آیا۔ ہم تینوں نے مل کر کھانا کھایا۔ ریشماں کی حالت بے حد عجیب ہو رہی تھی۔ کمال الدین جونہی اسے بیٹی کہہ کر پکارتا‘ وہ چونک کر اس کی صورت دیکھنے لگتی۔ اسے شاید ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ کمال الدین نے واقعی اسے اپنی بیٹی بنا لیا ہے۔ کمال الدین نے واقعی اپنے اندر زبردست تبدیلی پیدا کر لی تھی۔ وہ اب ایک عیاش زمیں دار نہیں بلکہ ایک مشفق باپ دکھائی دے رہا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ریشماں کو حویلی کی دوسری منزل پر زنان خانے میں بھیج دیا گیا۔ شریفاں نامی ملازمہ آ چکی تھی اور اس نے زنان خانے کی صفائی بھی کر دی تھی۔ کمال الدین نے مجھے منشی الفت علی والے کمرے میں ٹھہرا دیا۔ اس نے مجھے ہدایت کی کہ میں تھوڑا سا آرام کر لوں۔ وہ خود حویلی کے کارندوں سے مل کر تمام صورت حال کی تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ میں کمرے کے آرام دہ بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرتا رہا لیکن نیند میرے پاس بھی نہ پھٹکی۔ طرح طرح کے خیالات اور یادوں نے مجھے اپنے گھیرے میں لیے رکھا۔ مجھے شدت سے ہیر یاد آ رہی تھی۔ میں خود کو شدید جذباتی ہیجان کا شکار پا رہا تھا۔ میرا دل بار بار مجھے اکسا رہا تھا کہ میں اٹھوں اور فوراً اپنی راحت جاں کے پاس پہنچ جاؤں۔ مجھے آس پاس کی فضا میں ہیر کے وجود کی مہک محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ جانے وہ میرے متعلق کیا سوچ رہی ہوگی۔ کمال الدین نے کریم بابا کو بتایا تھا کہ میں اس کے دیرینہ دشمن کا جاسوس ہوں جو اسے نقصان پہنچانے کے لیے اس کے گاؤں آیا ہوں۔ یہ جان کر اب دونوں پر خدا جانے کیا گزری ہوگی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ ایک بار پھر میرے متعلق بدگمانی کا شکار نہ ہو گئے ہوں۔

مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی کہ اچانک میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوگی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہ کمال الدین تھا۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلا تھا۔ ’’یہ لو سعید خان اسے اچھی طرح سنبھال لو‘‘ اس نے کہا۔ اس نے وہ تھیلا میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

’’یہ کیا ہے خان جی؟‘‘ میں نے حیرانی سے کہا۔

’’اس تھیلے میں تمہاری امانت ہے۔ اچھی طرح گن لو۔ پورے ایک لاکھ ہیں۔‘‘

’’لیکن خان جی۔۔۔‘‘ میں نے کچھ کہنا چاہا۔

’’کوئی الٹی سیدھی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تمہارا حق ہے۔ میں نے اپنی خوشی سے یہ رقم

تمہیں دی ہے۔"

میں یہ رقم ہرگز نہ لیتا لیکن میری مجبوری نے مجھے باندھ رکھا تھا۔ مجھے اس رقم کی ضرورت تھی۔ اپنے لیے نہیں، ہیر کے لیے۔ ہیر کی زندگی کے لیے، ہیر کی صحت کے لیے، میں نے مزاحمت کا ارادہ ترک کر دیا۔ تھیلے میں سے سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میں نے اپنی جیب میں رکھی اور تھیلا کمال الدین کو واپس کرتے ہوئے کہا "خان جی ابھی آپ یہ رقم اپنے پاس ہی رکھیں۔ کچھ دن بعد میں اسے آپ سے لے لوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں یہ تھیلا الگ رکھ دوں گا۔"

کمال الدین واپس چلا گیا اور میں ایک بار پھر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے نیند آ گئی۔ اس رات میں نے بے شمار رنگ برنگے سہانے سپنے دیکھے۔ میں ان سپنوں میں ہیر کے ساتھ خوبصورت مرغزاروں میں رقص کرتا رہا۔ پھر ہیر کی جگہ مہراں نے لے لی۔ وہ بہت غمزدہ نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما تو اس کے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے ان انمول موتیوں کو اپنے ہونٹوں سے چن لیا۔ چند ہی لمحوں بعد وہ خوش و خرم ہو گی۔ میں اسے اپنی بانہوں کے جھولے میں جھلاتا رہا۔ وہ مجھ پر اپنی زلفوں کی مہک سے جادو کرتی رہی۔ پھر اس نے مجھ سے جانے کی اجازت طلب کی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ میرے پاس ہی رک جائے۔ اس نے مجھے دعوت دی کہ میں بھی اس کے ساتھ ہی چلوں۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ اچانک کسی نے مجھے پکارا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ہیر تھی۔ مجھے ٹھہرتے دیکھ کر مہراں نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور خود آگے کی جانب بڑھ گئی۔ میں نے اسے روکنا چاہا لیکن میرے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ وہ چند قدم مزید آگے بڑھ گئی۔ میں نے چاہا کہ آگے بڑھ کر اسے روک لوں لیکن عین اسی وقت وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں اسے ڈھونڈتا رہا مگر وہ نظر نہ آئی پھر کسی نے نہایت نرمی سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا وہ ہیر تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں سب کچھ بھول گیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر ایک بار پھر جنت نظیر سبزہ زاروں میں لے آئی۔ مہراں کی جدائی کا غم کم از کم وقتی طور پر میرے ذہن سے محو ہو گیا۔

اگلی صبح میں دیر تک سوتا رہا۔ کسی نے اٹھایا ہی نہیں۔ ایک عرصے بعد مجھے ایسی بے فکری کی نیند نصیب ہوئی تھی۔ تقریباً نو بجے میری آنکھ کھلی۔ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ حویلی میں کاروبار زندگی پوری شدت سے رواں دواں تھا۔ گھریلو نوکر چاکر کام کاج میں مصروف تھے۔ ان کی نظر مجھ پر پڑی تو انہوں نے خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ میرا خیر مقدم کیا۔ کمال الدین خان نے ان سب کو میرے متعلق ہدایت دے دی ہو گی۔ میں ایک گوشے میں واقع غسل خانے میں گھس گیا۔ اس دور دراز گاؤں کے لحاظ سے اچھا خاصا خوبصورت اور صاف ستھرا غسل خانہ، اس کے ایک کونے میں باتھ ٹب کی طرح چھوٹی سی حوضی تھی۔ واش بیسن بھی موجود تھا۔ اس کے ساتھ بالکل نیا نکور آئینہ چمک رہا تھا۔ میں نے ایک طویل عرصے کے بعد آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ میں پہلے کی نسبت بہت بدلا نظر آ رہا تھا۔ میری کھلتی ہوئی گوری رنگت، اب

گندم گوں ہو چلی تھی۔ چہرے پر داڑھی اور مونچھیں بے ترتیبی سے، جھاڑ جھنکاڑ کی صورت اگ آئی تھیں۔ میرے گھنگھریالے بھورے بال دھول اور مٹی میں اٹ کر خاکستری ہو چلے تھے۔ ایک مدت سے وہ بیچارے تیل اور کنگھی کو ترس رہے تھے۔ مجھے بے اختیار خود پر رحم آنے لگا۔ واش بیسن پر خوشبودار صابن شاید کچھ ہی دیر پہلے رکھا گیا تھا۔ میں نے دو تین بار رگڑ رگڑ کر منہ دھویا۔ میں تولیے سے منہ پونچھ کر باہر نکلا تو سامنے ریشماں نظر آئی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "اوہو تو جناب نے منہ دھو ہی لیا۔"

"ہاں۔" میں نے مختصر ترین جواب میں اپنی عافیت جانی۔ اس کے شوخ لہجے میں اپنائیت کا رنگ جھلکتا صاف محسوس ہو رہا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ اس سے گریز پائی اختیار کی جائے۔ اس کے دل میں اگر میرے متعلق کوئی غلط فہمی تھی تو اسے ابتدائی مرحلے میں ہی ختم ہو جانا چاہیے تھا۔

"اگر جناب نے ذرا سی مزید تکلیف گوارا کر لی ہوتی اور غسل فرما لیا ہوتا تو زیادہ بہتر نہ ہوتا؟ اب ان کپڑوں پر بھی رحم کر دیا جائے تو بہتر ہے۔" ریشماں کے پر تکلف انداز گفتگو نے مجھے جھینپنے پر مجبور کر دیا۔

"وہ دراصل۔۔۔ میرے کپڑے۔۔۔" میں نے وضاحت کرنا چاہی۔

"ذرا ادھر تشریف لایئے۔" وہ میرا ہاتھ تھام کر غسل خانے کی طرف لے گئی۔ "یہ جناب کے لیے جوڑا ٹنگا ہوا ہے۔ براہ مہربانی دوبارہ غسل خانے میں جائیں اور اپنے بدن پر سے یہ میل کا لحاف اتار پھینکیں۔"

میں اپنے اندر مزید بحث کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ چنانچہ چپ چاپ اس کے کہنے پر عمل کیا۔ ریشماں کا کہنا غلط نہیں تھا۔ واقعی میرے جسم پر میل کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ میں مل مل کر نہاتا رہا۔ صابن کی ٹکیا ختم ہو گئی تو میرا یہ طویل غسل بھی اختتام پذیر ہوا۔ میں خود کو بے حد تر و تازہ اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ کمالیہ کی کھدر کا شلوار قمیض نہایت نفاست سے سلا ہوا تھا اور اس کی تراش خراش بھی تقریباً میری جسامت کے مطابق ہی تھی۔ میں غسل خانے سے نکلا تو ایک بار پھر ریشماں میرے سامنے تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو وہ دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس کی یہ حالت مجھے شرمسار کر رہی تھی۔ میں نے اس سے نظریں چرا لیں لیکن وہ مبہوت سی ہو کر بدستور مجھے دیکھتی رہی۔ آخرکار اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ "تم اپنے کمرے میں چلو میں ناشتا لے کر آتی ہوں۔" وہ تمام ادب و آداب بھول چکی تھی اسے شاید اپنی حالت پر شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

ناشتے کے نام پر اس نے جو چیز میرے سامنے لا کر رکھی، اسے ناشتا کہنا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ اس نے شاید صبح سویرے ہی مرغ ذبح کروا لیے تھے۔ انڈوں کا خاگینہ، پراٹھے، حلوہ اور چھاچھ اس کے علاوہ تھے۔ میں لمبے لمبے ہاتھ مارنے لگا۔ "خان جی کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

ریشماں کچھ دیر خاموش سی ہو گئی تھی "چاچا جی صبح سویرے ہی نکل گئے تھے۔ کہتے تھے کہ انہیں بھٹوں کا جائزہ لینا ہے۔ دوپہر تک واپس آئیں گے۔" اس کی بات سن کر میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ کھانا

کھانے کے بعد میں نے چارپائی سے پیر نیچے اتارے تو اپنے کھسے غائب پائے۔ اس دوران میں ریشماں کھانے کے برتن لے کر جا چکی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس لوٹی تو اس نے میرے کھسے پالش کر کے جگمگا دیئے تھے۔ ریشماں نے کھسے چارپائی کے پاس رکھ دیے اور میلا جوڑا میرے حوالے کر دیا۔

''اس میں سے اپنی چیزیں نکال لو۔ شریفاں اسے دھو دے گی۔'' میں نے اپنا سامان اور سو سو کے نوٹوں کی گڈی اپنی جیبوں میں منتقل کی اور اپنا رومال اپنے دائیں ہاتھ کی کلائی پر باندھ لیا۔ ''کیا یہ رومال بھی تمہاری محبوبہ کا تحفہ ہے؟'' ریشماں نے قدرے شوخی سے پوچھا۔

''یہی سمجھ لو۔'' میں نے اپنے کھسے اپنے پیروں پر چڑھاتے ہوئے کہا ''خان جی آئے تو اسے کہنا کہ میں اپنے ماموں کے گھر گیا ہوں۔ شام تک واپس آ جاؤں گا۔''

تمہارے ماموں کیا اسی گاؤں میں رہتے ہیں؟'' ریشماں نے پوچھا۔ ''ہاں۔ اچھا خدا حافظ۔'' میں فوراً کمرے سے نکل آیا۔ میں اس کے مزید سوالوں سے بچنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کا اگلا سوال میرے ماموں کے گھر والوں کے بارے میں ہوگا۔ اسے ہیر کے متعلق پتا چلتا تو جانے وہ کیا سوچتی۔ خیر پتا تو اسے چل ہی جاتا لیکن میں بذات خود یہ سب کچھ اسے بتانا نہیں چاہتا تھا۔

گیٹ پر موجود دونوں چوکیداروں کو میں پچھلی رات دیکھ چکا تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر خیر سگالی کے طور پر مسکراتے ہوئے اپنے ہاتھ ہلائے۔ گیٹ کر نکل کر میں سیدھا بابا کریم بخش کے گھر کی جانب چل پڑا۔ ہر قدم مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں تیز محسوس ہو رہی تھیں۔ ہیر سے ملاقات کا تصور میرے ہیجان میں اضافہ کر رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں۔ راستے میں ملنے والے زیادہ تر لوگ پہلے سے ہی مجھ سے واقف محسوس ہوتے تھے۔ کمال الدین کا کارندہ ہونا یقیناً فخر کا باعث سمجھا جاتا ہوگا۔ مجھے دیکھ کر لوگ احتراماً خیر سگالی کے اظہار کے طور پر ہاتھ ہلاتے رہے۔ میں جب کریم بابا کے گھر کے قریب پہنچا تو میرا یہ اندیشہ رفع ہو چکا تھا کہ کریم بابا اور ہیر میرے متعلق بدگمانی کا شکار ہوں گے۔ عام لوگوں کے ساتھ ان تک بھی یہ بات لازماً پہنچ چکی ہوگی کہ کمال الدین خان نے مجھے اپنا خاص کارندہ اور معتمد مقرر کر لیا ہے۔

کریم بابا کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دستک دی۔ کچھ ہی دیر بعد میں نے ہیر کی آواز سنی۔ ''کون ہے؟'' اس کی آواز مجھے اپنے کانوں میں شہد کے قطروں کے مانند ٹپکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں اس آواز کے سحر میں کھو سا گیا۔ ''کون ہے؟'' ہیر نے ایک بار پھر پوچھا۔

''میں ہوں۔۔۔ سعید خان۔'' میں نے لرزتی آواز میں کہا۔ میرا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ میرے سامنے ہیر کا دلکش چہرہ تھا۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس کی ہرنی جیسی بڑی بڑی آنکھیں مجھ پر جم سی گئیں۔ اس کا چہرہ فرط مسرت اور جوش کی شدت سے سرخ ہوتا چلا گیا۔ وہ کسی انجانے سحر میں گرفتار تھی۔ میں خود بھی اس کیفیت میں مبتلا تھا۔ میں اس کی آنکھوں میں جھانک کر اپنے جیون کی خوشیاں تلاش کر رہا تھا۔ ان آنکھوں میں وہ جادو تھا جو کسی کو بھی

دیوانہ بنا سکتا تھا۔ ان کھوئی کھوئی آنکھوں کی تمنا میں عمر گزاری جا سکتی تھی۔ ان کے ایک ہلکے سے اشارے پر زندگی لٹائی جا سکتی تھی۔

تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کے پیمانے حیا سے لبریز ہو کر جھکنے لگے۔ مجھے بے اختیار یوں محسوس ہوا جیسے فضا میں سورج کی ضیا گھٹنے لگی ہے۔ ہیر اپنی عادت کے مطابق دروازے سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے چھوٹے چھوٹے آئینوں سے جڑا ہوا چولا پہن رکھا تھا جو اس نے اپنے ہاتھ سے تیار کیا تھا۔ ہیر شاید ابھی ابھی گھر کے کام کاج سے فارغ ہوئی تھی۔ کچے صحن میں تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں سیدھا بڑے والے کمرے میں آ گیا۔ بابا کریم بخش شاید کام پر گیا ہوا تھا۔ اپنی مخصوص چارپائی پر بیٹھنے کے بعد میں ایک بار پھر ہیر کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں ابھی تک جھکی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔ میں منتظر تھا کہ وہ کچھ بولے لیکن وہ پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔ ''بیٹھو۔'' میں نے پہل کی وہ چپ چاپ کریم بابا کی چارپائی پر بیٹھ گئی البتہ اس کی زبان پر بدستور قفل لگا ہوا تھا۔ ''پوچھو گی نہیں کہ میں کس حال میں ہوں۔ کیا کیا گزر گئی پچھلے چند دنوں میں مجھ پر؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی سہانے سپنے سے چونکی ہے۔

''کک۔۔۔ کیسے ہو تم؟ بابا بتا رہا تھا کہ۔۔۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے اس کی الجھن جلد از جلد دور کرنا چاہی۔ ''کمال الدین خان کو میرے متعلق کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی۔ اب وہ غلط فہمی دور ہو گئی ہے۔ میں بدستور اس کے پاس کام کر رہا ہوں۔''

''بابا بہت پریشان تھا۔ جب تم اور کمال الدین واپس نہیں آئے تو لوگ کہنے لگے کہ کریم بخش کے بھانجے نے وڈے خان جی کو اغوا کر لیا ہے۔ حویلی کے کارندوں نے بابا کو کئی بار دھمکیاں دیں۔۔۔''

''چلو دفع کرو اس قصے کو۔ یہ بتاؤ تم تو ٹھیک ہو نا؟ تمہارے سر میں پھر تو درد نہیں ہوا؟'' میں نے اندیشوں سے لبریز لہجے میں پوچھا۔ میرے دل میں سویا ہوا خوف اور تشویش کا ناگ پھر سے بیدار ہو گیا۔

''ایک بار ہوا تو تھا لیکن پہلے کی طرح شدید نہیں تھا۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا ''میں نے ڈاکٹر صاحب کی دی ہوئی گولی کھائی تو ٹھیک ہو گیا۔''

''فکر نہ کرو تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ میں کل کوٹ چھٹے جا کر ڈاکٹر صاحب سے ملوں گا۔ تم تیاری کر رکھو۔ تمہیں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کراچی جانا ہے۔'' ہیر نے دھیرے سے اقرار میں گردن ہلا دی۔ وہ کچھ بجھ سی گئی تھی۔ اسے پوری طرح اپنی بیماری کا علم تو نہیں تھا تاہم اسے اتنا ضرور پتا تھا کہ اس کی بیماری کافی خطرناک ہے۔ اس کے چہرے پر چھانے والی غم کی گھٹا میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ لہٰذا میں نے فوراً بات کا رخ موڑ دیا۔ ''اچھا یہ بتاؤ تم نے میرے کھانے کو کیا پکایا ہے؟''

میرا داؤ کامیاب رہا۔ اس کا چہرہ ایک بار پھر پھول کے مانند کھل اٹھا۔ ”مجھے پتا تھا آج تم آؤ گے۔ اس لیے میں نے تمہارا پسندیدہ کھانا تیار کیا ہے۔ ذرا بتاؤ تو سہی کیا؟“

”قیمہ۔۔“ میں نے بلا تامل جواب دیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ چینی کی طشتری میں سچے موتیوں کی برسات ہونے لگی۔ مجھے اپنے رگ و پے میں کیف و سرور کی لہریں گردش کرتی محسوس ہوئیں۔ مجھے اس کی آنکھوں میں ستارے جگمگاتے نظر آئے۔

”ہاں تم نے بالکل صحیح اندازہ لگایا۔ میں نے آج مٹر قیمہ پکایا ہے۔“

”تو پھر نیک کام میں دیر کیسی۔ فوراً حاضر کرو تاکہ اس کے ساتھ انصاف کے تقاضے پورے کیے جاسکیں۔“

”ذرا سا صبر کرلو۔ بابا بس کچھ دیر تک آنے والا ہوگا۔ اکھٹے ہی انصاف کرلینا۔“ اس نے ہوش ربا انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا کریم بابا آج کام پر نہیں گیا؟“

”نہیں۔ وہ خود بھی آج تمہارا منتظر تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے کسی کام سے نکلا ہے۔“

”ٹھیک ہے تو اتنی دیر تک چلو تمہاری بھورو سے بات کرتے ہیں۔ تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے میرے پاس۔“

”وہ کیا؟ جلدی بتاؤ۔“ اس نے بے تاب ہو کر پوچھا۔ اس اثنا میں ہم بھورو گائے کے تھان کے پاس آن پہنچے تھے۔

”وہ خوشخبری یہ ہے کہ اب تمہاری بھورو کو تم سے کوئی نہیں چھین سکے گا۔ اب یہ تمہارے پاس ہی رہے گی۔“

”سچ!“ ہیر نے مسرت سے لبریز لہجے میں کہا ”لیکن وہ کمال الدین۔۔۔“

”ارے بھول جاؤ کمال الدین خان کو۔ اس کو تو میں نے ایسا مرید بنایا ہے کہ اب میری مرضی کے بغیر وہ دم بھی نہیں ہلا سکتا۔“ ہیر ایک بار پھر ہنسی اور ہنستی ہی چلی گئی۔ چاندی کے انگنت گھنگھرو سنگ مرمر کے فرش پر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتے رہے۔ میری سماعت پر ٹھنڈے میٹھے آب حیات کی پھوار پڑتی رہی۔ ہیر کے چہرے کا رنگ کشمیری سیب کے مانند سرخ ہو چلا تھا۔

یک لخت وہ سنجیدہ ہوتی چلی گئی۔ ”سنا ہے کمال الدین اپنے ساتھ کوئی لڑکی لایا ہے؟“

”ہاں وہ اس کے کسی پرانے دوست کی بیٹی ہے۔ اسے اپنی بیٹی بنایا ہے اس نے۔“

”سنا ہے وہ ڈاھڈی سوہنی ہے۔“ ہیر کے لہجے میں شک اور حسد کا ملا جلا تاثر تھا ”تم بھی تو ساتھ تھے خان جی کے تم سے تو خوب بات چیت کرتی ہوگی وہ؟“

”سوہنی تو وہ ہے لیکن۔۔۔ تیرا تو وہ پاسنگ بھی نہیں ہے تو تو ہیر ہے نا؟ اور ہیر تو ایک ہی ہوتی ہے ہر لحاظ سے۔“ وہ بری طرح شرما گئی۔ اس کا گلاب گوں چہرہ بالکل سرخ ہوگیا۔ میں نے پہلی بار اس طرح

اس کی تعریف کی تھی۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ شرما کر اپنے کمرے میں نہ جا چھپے لیکن خیریت رہی۔ اس نے بروقت تمام اپنے آپ پر قابو پایا۔

اس نے میرے چہرے پر نظر ڈالی اور دھیمے لہجے میں کہا ”ایک بات کہوں؟ مانو گے؟“

”تم ایک بار کہہ کر تو دیکھو۔“ میں نے والہانہ انداز میں کہا۔ ہیر کی نظریں ایک بار پھر جھک گئیں۔

”تم اپنی یہ جھاڑ جھنکاڑ سی داڑھی صاف کرادو۔ تمہاری مونچھیں بھی بے ترتیب ہو رہی ہیں۔“

”بس اتنی سی بات۔ تم نے پہلے کہہ دیا ہوتا۔ دراصل مجھے اتنی مہلت ہی نہ مل سکی کہ۔۔۔ اچھا خیر۔ میں ابھی نائی کے پاس جاتا ہوں۔“

”ارے اتنی جلدی بھی کیا ہے؟“ ہیر نے قدرے جھینپتے ہوئے کہا۔ ”تم نے پہلی بار تو فرمائش کی ہے۔ اسے فوراً پورا ہونا چاہیے۔ اتنی دیر میں کریم بابا بھی آجائے گا۔“ ہیر مجھے روکتی رہ گئی لیکن میں نکل گیا۔

گاؤں کا بازار اچھا خاصا پر رونق تھا۔ سال بھر پہلے ہی یہاں بجلی پہنچی تھی لیکن اس کے اثرات بے حد دور رس تھے۔ اکثر دکانوں میں پنکھے چل رہے تھے۔ دوپہر ہونے کے باوجود اکا دکا بلب بھی روشن تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شہروں اور دیہاتوں کا باہمی فاصلہ کم ہوتا جارہا تھا۔ بیرون ملک جانے والے دیہاتیوں نے اپنے گھروں میں صدیوں سے بھنگڑے ڈالتی مفلسی کو دیس نکالا دے دیا تھا۔ جہاں جہاں بجلی پہنچ رہی تھی۔ وہ برقی آلات کا عمل دخل بھی بڑھتا چلا جارہا تھا۔ میں نائی کی دوکان میں پہنچا تو سامنے ہی بڑا سا ٹیپ ریکارڈر رکھا نظر آیا۔ نائی تھا تو اچھا خاصا عمر رسیدہ لیکن اسے شاید ابھی تک اپنی گزری بہار کا احساس نہیں ہوسکا تھا۔ چہرے پر سے داڑھی مونچھیں اس نے رگڑ رگڑ کر صاف کر رکھی تھیں۔ دوکان کو بھی اس نے بڑے بڑے آئینوں سے مزین کر رکھا تھا۔ اچھا خاصا شوقین مزاج شخص معلوم ہوتا تھا۔ اس نے میری شکل اور حلیہ دیکھتے ہی مجھے پہچان لیا۔ ”آؤ سرکار آؤ۔ ادھر تشریف رکھو۔ کیا خدمت کروں سرکار کی۔ خان جی تو ٹھیک ٹھاک ہیں ناں؟“

”ہاں وہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ تم میری شیو بنادو۔“

”یہ شیو تو نہیں یہ تو داڑھی ہے۔“ اس کے بعد وہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

میں واپس پہنچا تو کریم بابا گھر آچکا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے بے حد خوشی کا اظہار کیا۔ ہیر نے مٹر قیمہ بہت لذیذ پکایا تھا۔ گرما گرم روٹیوں نے مزہ دوبالا کردیا۔ ہیر نے چھاچھ کی چاٹی بھی لبالب بھر کر ساتھ رکھ دی تھی۔ کریم بابا مجھ سے پچھلے دنوں کے واقعات کے متعلق پوچھتا رہا۔ میں نے مناسب قطع و برید کے ساتھ اسے تمام واقعات بتادیے۔ وہ میری بہادری کی دل کھول کر تعریفیں کرتا رہا۔

کھانا کھانے کے بعد میں نے اپنی جیب سے دس ہزار روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ”یہ کیا ہے بیٹے؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”اس بات کو چھوڑو بابا۔ تم لوگ تیاری کرلو تمہیں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کراچی جانا ہے۔“ میں

نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"لیکن تمہارے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آئی' سعید خان؟"

"یہ رقم مجھے خان جی نے انعام کے طور پر دی ہے۔ تم رقم کی فکر نہ کرو۔ ضرورت پڑی تو اور مل جائے گی۔ تم کل کوٹ چھٹے جاؤ تو واپسی پر ڈاکٹر صاحب سے مل لینا اور پتا کر لینا کہ ان کا کب تک کراچی جانے کا ارادہ ہے۔"

"اچھا بیٹا جیسی تمہاری مرضی۔" کریم بابا نے دھیمے لہجے میں کہا۔

اس روز شام بے حد جلدی ہوگئی یا شاید مجھے محسوس ہوا تھا۔ سورج ڈھلے میں کمال الدین کی حویلی کی جانب چل پڑا۔ میں حویلی میں پہنچا تو کمال الدین خان کو بڑے ہال میں اپنے کارندوں کے درمیان گھرے پایا۔ بڑی بے تکلفانہ فضا تھی۔ کارندے شاید اس سے کوئی فرمائش کر رہے تھے لیکن وہ انکار کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ کچھ چونکا۔ بغیر داڑھی کے مجھے پہچاننے میں اسے کچھ دشواری پیش آ رہی ہوگی۔ "ابے یہ اپنا سعید خان ہے؟" اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "ابے دیکھو کتنا چکنا ہو کر آیا ہے۔" کمال الدین کے علاوہ باقی لوگ بھی قہقہے لگانے لگے۔

قہقہے کچھ تھمے تو روشن نے کہا "سعید خان یار تم ہی خان صاحب سے کچھ سفارش کر دو۔ ہماری تو کسی کی نہیں مان رہے۔"

"کیسی سفارش روشن بھائی۔" میں نے پوچھا۔

"دیکھو بھائی ہم سب خان جی سے کہہ رہے ہیں کہ بہت دن ہوگئے ہیں حویلی میں مجرا نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا اب محفل جمنی چاہیے۔"

"کمال الدین بھی میری رائے کا منتظر تھا۔ میں نے جھجکتے ہوئے کہا "دیکھو بھائی مجھے تو ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔۔۔"

"تم اپنی دلچسپی کو چھوڑو یار' ہماری خاطر ہاں کر دو۔" جمالو نے کہا "ویسے بھی تم اس محفل میں نہ ہی آؤ تو اچھا ہے۔ سالی کنجری تیرے سامنے ہم جیسوں کو کیا گھاس ڈالے گی؟" تمام لوگوں نے مل کر زوردار قہقہہ لگایا۔ میں جھینپ سا گیا۔

"خان جی' سعید خان جیسے ہیرے کی آمد کی خوشی میں ہی ہاں کر دیں۔"

"ابے یہ تو سوچو اب حویلی میں ایک جوان بچی بھی تو موجود ہے۔" کمال الدین نے تیز لہجے میں کہا۔ سب لوگ ایک دم خاموش ہوگئے۔ وہ سب ریشماں کو تو بھول ہی گئے تھے۔ آخر کار صادق نے پژمردہ لہجے میں کہا "پھر جیسے آپ کی مرضی خان جی۔ ویسے اندھی کھوئی والے ڈیرے پر بھی محفل جمائی جا سکتی تھی۔"

"اچھا اچھا بھئی دو چار دن صبو کر لو۔ پھر سوچیں گے اس کے بارے میں۔" کمال الدین نے نرم لہجے میں کہا۔ ان سب کے چہروں پر طمانیت بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ سب کمال الدین کے مزاج آشنا

تھے۔ انہوں نے اس کے الفاظ سے اندازہ لگالیا کہ وہ اب تقریباً راضی ہی ہے۔

وہ محفل رات بارہ بجے تک جاری رہی۔ ٹھیک بارہ بجے تمام لوگ رخصت ہوگئے۔ صرف میں اور کمال الدین حویلی کے ہال میں رہ گئے۔ کمال الدین نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اپنے کمرے میں لے آیا۔ "سعید خان میں تمہیں ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس تحفے کے صحیح حقدار ہو۔ تمہیں یہ تحفہ ضرور پسند آئے گا۔" کمال الدین کے ان الفاظ نے مجھے تجسس میں مبتلا کر دیا۔ وہ اپنی الماری کی جانب بڑھا۔ وہ واپس لوٹا تو اس کے ہاتھ میں عمدہ قسم کے گتے کا ڈبہ تھا۔ اس نے وہ ڈبہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے بڑی بے تابی سے ڈبہ کھولا۔ ڈبے میں موجود تحفے کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے میں مسحور سا ہو کر رہ گیا۔ یہ چمک دار' گہرے رنگ کا بے حد خوبصورت پستول تھا۔ یہ سائز میں میرے کولٹس پستول سے قدرے چھوٹا تھا البتہ خوبصورتی اور نفاست میں اس سے بھی بڑھ کر تھا۔ میں نے نہایت اپنائیت سے اسے ہاتھ میں اٹھالیا۔ یہ وزن میں بھی کولٹس کی نسبت کافی ہلکا تھا۔ اس کی گولی کا خالی کھوکھا باہر پھینکنے کا راستہ بائیں جانب تھا۔ جبکہ کولٹس میں یہ راستہ دائیں جانب تھا۔ میں نے اس پر کندہ نام پڑا۔ یہ والتھر پی فائیو پستول تھا۔ جرمنی کا بنا ہوا۔ کمال الدین مسکراتی نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ لیکن میں بدستور پستول کے معائنے میں مصروف رہا۔ پستول کے ساتھ دو میگزین اور بہت سی گولیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے پستول کو اس کی جگہ پر واپس رکھا اور میگزین میں گولیاں بھرنے لگا۔ پوری آٹھ گولیاں ڈالنے کے بعد بھی مزید ایک گوئی کی گنجائش تھی۔ کمال الدین کا کہنا بالکل صحیح تھا۔ واقعی یہ بے حد شاندار تحفہ تھا۔ یہ تحفہ مجھے بے حد پسند آیا تھا۔ میں ڈبے کا ڈھکن دوبارہ بند کر دیا "نہیں سعید خان' ہتھیار سجا کر رکھنے کے لیے نہیں ہوتے انہیں اپنے ہاتھ کی پہنچ میں رکھنا چاہیے۔" کمال الدین نے کہا۔

میں نے پستول میں میگزین چڑھایا اور اسے نیفے میں اڑس لیا اور دوسرے میگزین میں گولیاں بھرنے لگا۔ "خوبصورت ہتھیار ہے خان جی۔"

"خوبصورت بھی اور تباہ کن بھی۔ میرے ایک دوست نے مجھے یہ تحفے کے طور پر دیا تھا تب سے یہ ایسے ہی رکھا ہے۔"

"تم اسے کیوں استعمال نہیں کرتے خان جی؟" میں نے سوال کیا۔

"میں دراصل پرانے مزاج کا بندہ ہوں۔ مجھے پستول سے زیادہ ریوالور پسند ہے۔ میرے پاس روگر کا بتیس بور کا امریکی ریوالور موجود ہے۔ بڑا شاندار ہتھیار ہے۔"

میں نے اس سے پوچھا "میں نے ایک بندے کے پاس کولٹس پستول دیکھا تھا۔ وہ بھی بہت خوبصورت ہتھیار ہے۔ والتھر پستول زیادہ مہنگا ہے یا کولٹس؟"

"یہ پستول جو میں نے تمہیں دیا ہے اس کی قیمت کولٹس سے تقریباً دگنی ہے۔"

ابھی ہم بات کر ہی رہے تھے کہ روشن کمرے میں داخل ہوا اس نے سیون ایم ایم رائفل شانے سے لٹکا رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر تناؤ کے آثار تھے۔ "چلیے خان جی" اس نے کہا۔

''چلو جوان یہ معاملہ بھی نمٹا ہی دیں۔'' کمال الدین خان نے اٹھتے ہوئے کہا۔ میں سمجھ نہیں پایا کہ وہ کون سے معاملے کی بات کر رہا ہے' تاہم میں بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

جب ہم حویلی کے صدر دروازے کی جانب بڑھے تو میں نے کہا'' خان جی میں اپنے کمرے سے رائفل لے لوں۔''

''نہیں رہنے دو اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' کمال الدین نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ حویلی کے گیٹ کے باہر تین گھوڑے تیار کھڑے تھے۔ میرے حصے میں ایک بار پھر سونا آیا۔ ہم تینوں گھوڑوں پر سوار ہو کر ایک طرف چل پڑے۔ کچھ دور چلنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ اس سمت میں کمال الدین کا سب سے بڑا بھٹا تھا۔ یہ بھٹا آبادی سے کافی دور تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں کمال الدین نے مجھے قید کروایا تھا۔ جس جگہ ہمارے گھوڑے جا کر رکے وہ مکان وہی تھا جس کے ایک کمرے میں فرار ہوا تھا۔ مکان کے سامنے صمدو شاید ہمارا منتظر تھا۔ اس نے تینوں گھوڑوں کی باگیں پکڑیں اور انہیں ایک طرف لے جانے لگا۔ میں نے کمال الدین سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ جو کچھ بھی تھا' سامنے آنے والا تھا۔ میرا پستول میری گرفت میں آنے کے لیے بالکل تیار تھا' لہٰذا مجھے کوئی فکر نہ تھی۔ ہم مکان میں داخل ہوئے' صحن میں لالٹین جل رہی تھی اور وہاں چار افراد چارپائی پر بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں پہچان لیا۔ وہ جندو' سلطان' صادق اور جمالو تھے۔ کمال الدین کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''کیوں بھئی سب کچھ تیار ہے نا؟'' کمال الدین نے بھاری لہجے میں کہا۔

''ہاں خان جی' سب کچھ تیار ہے'' جمالو نے جواب دیا۔ کمال الدین نے آگے بڑھ کر اس کمرے کی کنڈی کھول دی جس میں کچھ دن پہلے میں رہ چکا تھا۔ روشن نے اپنی رائفل سیدھی کر لی تھی۔ جمالو اور صادق کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اپنا والتھر نکال لیا۔ میں نے اسے کاک کیا تو مجھے بہت کم قوت صرف کرنی پڑی۔ لالٹین جمالو کے ہاتھ میں تھی۔ وہ محتاط قدموں سے کمرے میں داخل ہوا۔ صادق تقریباً اس کے ساتھ ساتھ تھا پھر ہم سب ہی اس کمرے میں گھس گئے۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں جو منظر میرے سامنے تھا اسے عبرت اثر بھی کہنا چاہیے۔ عین اسی چارپائی پر' جس پر چند دن پہلے میں بندھا پڑا تھا' اب منشی الفت علی خان رسن بستہ پڑا تھا۔ اس کے ساتھ والی چارپائی پر ڈیوائی رسیوں میں جکڑی ہوئی پڑی تھی۔ اسے پھٹے پرانے کپڑے مہیا کر دیئے گئے تھے۔ ان دونوں کے منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔ کمال الدین خان نے اشارہ کیا تو سلطان نے ان کے منہ سے کپڑے کھول دیے۔

''اب بتاؤ الفت علی تمہارا کیا حال ہے؟'' الفت علی نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن ہکلا کر رہ گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر کمال الدین نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اس کے کارندے بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگے۔ میں واحد شخص تھا جو خاموش تھا۔ میری نظریں ڈیوائی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا منہ زور شباب جانے کہاں جا سویا تھا۔ اس کی گندمی رنگت سرسوں کے پھول کے مانند زرد ہو رہی تھی۔ دونوں آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔ وہ مرنے کی حد تک خوف زدہ تھی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ اس کا لالچ

اسے لے ڈوبا تھا۔ وہ کم نصیب عورت منشی کے دکھائے ہوئے سبز باغوں کی خاردار باڑوں میں پھنس گئی تھی۔

کمال الدین نے ایک بار پھر الفت علی کا منہ کھلوانے کی کوشش کی۔ اس کا منہ کھل تو گیا لیکن اس سے بدبودار گالیوں کے علاوہ کچھ برآمد نہ ہوا۔ اس کی گالیوں کے جواب میں ایک بار پھر قہقہے بلند ہوئے۔ سلطان نے اس کا منہ ایک بار پھر کپڑے سے باندھ دیا۔ کمال الدین نے ڈیوائی کی جانب دیکھا ہی تھا کہ وہ زار و قطار رونے لگی۔ وہ گریہ زاری کرتے ہوئے کمال الدین سے معافی طلب کرتی رہی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ کمال الدین نے اشارہ کیا تو سلطان نے اس کے منہ پر بھی کپڑا باندھ دیا۔

کمال الدین مجھے ساتھ لے کر کمرے سے باہر نکل آیا اور ایک چارپائی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگا۔ اس کا سنہری لائٹر نیم تاریکی میں بھی چمک رہا تھا۔ اندر کمرے میں سے دونوں اسیروں کو اٹھا کر باہر لایا گیا۔ انہیں دو دو افراد اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ لوگ مکان سے باہر نکل گئے تو چند لمحے توقف کے بعد کمال الدین بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چلو سعید خان۔''

''لیکن کہاں خان جی؟''

''ابھی پتا چل جائے گا۔'' کمال الدین نے بھاری لہجے میں کہا۔ ہم دونوں کا رخ بھٹے کی طرف تھا۔ بھٹے کے قریب پہنچتے ہی مجھ پر پوری صورت حال واضح ہو گئی۔ اینٹ پکانے کی بڑی والی بھٹی میں آگ تیزی سے بھڑک رہی تھی' وہیں قریب ہی زمین پر وہ دونوں مجرم پڑے ہوئے تھے۔ آگ کی لپیٹیں دور سے ہی جھلسائے دے رہی تھیں۔ آگ کی زرد روشنی میں ان دونوں کے چہرے کورے لٹھے کے مانند سفید نظر آ رہے تھے۔ کمال الدین کے پانچوں کارندے پتھر کے بت بنے کھڑے تھے۔ کمال الدین کو آتے دیکھ کر سلطان نے مشینی انداز میں ان کے منہ سے کپڑا ہٹا دیا۔ ان کے حلق سے کرب ناک چیخیں نکل رہی تھیں۔ اذیت ناک موت کو سامنے دیکھ کر الفت علی بھی ساری اکڑفوں ہوا ہو چکی تھی۔ اب وہ بھی زخمی اونٹ کے مانند بلبلا رہا تھا۔ ڈیوائی کی حالت تو دیکھی نہیں جاتی تھی۔ موت کے خوف نے پہلے ہی اس کا آدھا خون خشک کر دیا تھا۔ ان کی رحم کی دردناک اپیلیں بھی کمال الدین پر کوئی اثر نہ کر سکیں۔

یک لخت مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں خود دہکتی ہوئی آگ پر معلق ہوں میرے جسم کی چربی پگھل رہی ہے۔ میرا گوشت آگ میں جل رہا ہے۔ رفتہ رفتہ میرا بھیجا' میری ناک کے راستے بہنے لگا ہے۔ اس بھیانک موت کے تصور نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ میری نظریں ان دونوں پر جم کر رہ گئیں۔ سلطان اور جندو آگے بڑھے اور انہوں نے ڈیوائی کو زمین سے اٹھا لیا۔ کمال الدین نے گردن سے اشارہ کیا۔ ان دونوں نے ڈیوائی کو ہوا میں جھلایا۔ ڈیوائی کے حلق سے آواز نکلنا بند ہو چکی تھی۔ وہ دونوں اسے دہکتی ہوئی بھٹی میں اچھالنا ہی چاہتے تھے کہ میرے حلق سے ایک زوردار چیخ برآمد ہوئی۔

نہیں یں یں۔۔۔'' میری چیخ کی آواز سن کر سلطان اور جندو یک دم ساکت ہو گئے۔ کمال الدین خان نے حیرت سے میری طرف دیکھا'' کیا بات ہے سعید خان؟'' اس کے پانچوں کارندے بھی میرا منہ

تک رہے تھے۔

''ایسا مت کیجیے خان جی ایسا مت کیجیے۔'' میری آواز میں لرزش تھی۔ تمہیں ان کا جرم معلوم ہے۔

سعید خان پھر بھی تم ایسا کہہ رہے ہو؟'' کمال الدین نے ہلکی سی تلخی سے کہا ''تمہارا مطلب ہے میں انہیں معاف کردوں؟''

''نہیں خان جی میں یہ نہیں کہہ رہا۔ ان کا جرم ناقابل معافی ہے۔ یہ دونوں موت کے مستحق ہیں لیکن اس قسم کی موت نہیں۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو سعید خان؟''

''میرا مطلب یہ ہے خان جی کہ تم انہیں موت کی سزا ضرور دو لیکن اس طرح زندہ جلا کر نہیں' یہ انسانیت کی توہین ہے خان جی۔ یہ انتقام نہیں بربریت ہوگی۔''

''لیکن سعید خان اگر ان کے ساتھ ایسا نہیں کیا گیا تو ان کے جیسے دوسرے حرامزادے کیسے عبرت پکڑیں گے۔'' کمال الدین کا لہجہ نرم پڑ گیا۔

''تمہارا یہ خیال غلط ہے خان جی کہ اس طرح دوسرے لوگ عبرت پکڑیں گے۔ اگر اس طرح لوگوں کی فطرت بدل سکتی تو سب سے پہلے منشی الفت علی کو عبرت ہوتی۔ یہ سب شیطان کی کارستانی ہے خان جی۔ جب شیطان انسانی ذہن پر غالب آجائے تو اسے اندھا کر دیتا ہے۔''

میری بات سن کر کمال الدین سوچ میں پڑ گیا۔ میں بڑی بے چینی سے اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر کمال الدین نے میری بات نہ مانی تو یہ میری اور اس کی رفاقت کا آخری دن ہوگا۔

''ٹھیک ہے سعید خان تمہاری یہی مرضی ہے تو یہی سہی۔ روشن تم ان دونوں کا مناسب انتظام کرو۔ آؤ سعید خان ہم چلتے ہیں۔'' وہ پانچوں کارندے حیرت سے میرا منہ تک رہے تھے۔ انہیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ کمال الدین میری بات مان لے گا۔ یہ بات البتہ میں نے واضح طور پر محسوس کی تھی کہ اب ان کے چہروں پر تناؤ کے آثار کم ہو گئے ہیں۔ میں بھی اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ ہم دونوں مکان کے قریب پہنچے تو صمد ہم دونوں کے گھوڑے لے کر کسی کونے کھدرے سے نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر بھی تناؤ کے آثار تھے۔ ہم دونوں گھوڑے پر بیٹھے۔ عین اسی وقت فضا میں دو دھماکے گونجے۔ یہ پستول کے فائر کی آوازیں تھیں۔ صمد یہ آوازیں سن کر بری طرح چونک پڑا۔ کمال الدین نے اسے دھیمے سے تسلی دی۔ ''کچھ نہیں ہوا صمد فکر کی کوئی بات نہیں۔''

واقعی کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ صرف دو انسان اپنی جان سے گزر گئے تھے۔ زندگی کے اسٹیج پر سے لاکھوں کرداروں میں سے دو کردار کم ہو گئے تھے۔ کھیل کے منظرنامے پر کچھ بھی اثر نہیں پڑا تھا۔ منشی الفت علی اور ڈیوائی کی کہانی ختم ہو گئی تھی۔ سیف داد خان اور ریشماں کے کردار اپنے حصے کے منظر ادا کرنے کے لیے سامنے آگئے تھے لیکن کیا واقعی میرا کردار صرف اتنا سا تھا؟ میری زندگی کی راہ گزر تو کوئی اور تھی' میں یہ

کہاں آ نکلا؟ میرا ذہن اپنے ہی عذابوں میں تھا۔ میں اور کمال الدین اپنے گھوڑوں پر حویلی کی سمت جا رہے تھے۔ ہمارے گھوڑوں کی رفتار بے حد سست تھی۔ ایسے جیسے اس بھیانک ڈرامے نے انہیں بھی مضمحل کر دیا ہو۔ ہم نے خود بھی ان کی رفتار تیز نہیں کی۔ ہمیں بھلا کس چیز کی جلدی تھی۔ حویلی میں میرا سجا سجایا کمرا میرا منتظر تھا۔ جس میں آرام دہ بستر بچھا ہوا تھا۔ چھت پر پنکھا گھوم رہا تھا۔ صبح سویرے نہایت اعلیٰ قسم کا ناشتا شکم پری کے لیے میرے سامنے پیش کیا جاتا تا مجھے کس چیز کی کمی تھی؟ میں اب بے گھر بے در سیف داد خان نہیں رہا تھا اب میں سعید خان تھا' کمال الدین خان جیسی امیر کبیر شخص کا منہ چڑھا ملازم' نمک خوار۔ اب میں وہ سرپھرا نوجوان نہیں تھا جو کسی کی ایک معمولی سی بات برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ اب تو کمال الدین مجھے دو چار جوتے بھی مار لیتا تو میں برداشت کر لیتا۔

میرے دل میں ایک چنگاری سی بھڑکی۔ میں یہ کہاں آن پھنسا ہوں۔ میری منزل یہ تو نہیں تھی۔ مجھے تو ابھی بہت سے پرانے قرض چکانے تھے۔ میں اپنے باپ کے قاتلوں کو تو بھول ہی چکا تھا۔ میں اس بدبخت عورت جنتے کو بھی تو بھول چکا تھا جو میری ماں کہلاتی تھی لیکن اس نے اپنا سگا بیٹا زمانے کی ٹھوکریں کھانے کے لیے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے اپنے آشنا کے ہاتھوں میرا باپ مروا دیا تھا۔ ہیر کی گھنی زلفوں کی چھاؤں نے مجھے اپنی زندگی کے سلگتے ریگزاروں کو بھول جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں تو اس مشفق ہستی' فقیر بابا کو بھی فراموش کر بیٹھا' جس نے میری خاطر اپنی زندگی کے راستوں کو بدل ڈالا تھا۔ میری ہی وجہ سے تو اس نے وہ قاتل گولیاں اپنے جسم میں برداشت کی تھیں۔ میں تو اپنی جان بچا کر ایسا بھاگا کہ اس کی خبر ہی نہیں لی۔

مجھے اپنے رگ و پے میں اضطراب کی مہیب لہر دوڑتی محسوس ہوئی' مجھے اس سنہرے پنجرے سے نکلنا ہے جلد از جلد۔ ورنہ میرے وجود میں پنہاں سیف داد خان مر جائے گا۔ ٹھیک ہے میں فوری طور پر یہاں سے نکل جاؤں گا لیکن ہیر۔۔۔؟ مجھے ایک بار پھر اپنے ارادے ڈانواڈول ہوتے محسوس ہوئے۔ میں ہیر کو اس طرح موت کے منہ میں جانے کے لیے بھی تو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

''خان جی مجھے تم سے ایک بات کہنی تھی۔'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''ہاں ہاں کہو سعید خان۔'' کمال الدین نے مستعد ہو کر کہا۔

''خان جی میری زندگی کے کچھ پہلو ایسے ہیں جن سے تم واقف نہیں ہو۔ یہ سمجھ لو کہ کچھ قرض ہیں جو مجھے چکانے ہیں۔ کچھ فرائض ہیں جنہیں ادا کیے بغیر میں چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔'' اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

''آگے کہو سعید خان۔ میں پوری توجہ سے تمہاری بات سن رہا ہوں۔''

''تم نے مجھ پر اتنی مہربانیاں کی ہیں کہ اب تم سے یہ چھپانا مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تم سے یہ ایک لاکھ رقم میں نے دراصل کریم بخش کی بیٹی ہیر کے لیے طلب کی تھی۔ وہ شدید بیمار ہے۔ اس کی بیماری کے علاج کے لیے بہت بھاری رقم درکار ہوگی۔'' میرا لہجہ بھاری ہو چلا تھا۔

''مجھے معلوم ہے کریم بخش کی بیٹی سخت بیمار ہے۔ اگر تم نے اس کی خاطر اتنا کچھ کیا تو یہ ایک قابل

توصیف بات ہے۔ جہاں تک رقم کی بات ہے وہ میرے پاس تمہاری امانت ہے۔"

"میرا کہنے کا مطلب یہ ہے خان جی کہ ممکن ہے کسی دن میں اپنی زندگی کے قرض چکانے کے لیے یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ ایسی صورت میں تم وہ رقم کریم بخش کو دے دینا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جونہی مجھے فراغت ہوئی' میں ایک بار پھر تمہاری خدمت میں لوٹ آؤں گا۔"

"تم نے مجھے زندگی کے ایک نئے رخ سے آشنا کیا ہے' سعید خان۔" کمال الدین نے سنجیدہ لہجے میں کہا" میں نے تمہاری ذات سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ جہاں تک ان ایک لاکھ روپوں کا تعلق ہے تو میں پہلے سے ہی کہہ چکا ہوں کہ وہ تمہارے ہو چکے ہیں۔ اگر یہ کوئی قرض تھا تو تم وہ قرض چکا چکے ہو۔ اگر وہ کوئی انعام تھا تو پچھلے چند دنوں میں تم خود کو اس انعام کا حق دار ثابت کر چکے ہو۔ جہاں تک بات نوکری کی ہے تو میرے پاس نوکروں کی کمی نہیں جو جاں نثار اور وفادار بھی ہیں۔ اب تمہاری حیثیت میرے لیے' ایک پرخلوص دوست کی سی ہے اور دوست کچھ عرصے کے لیے بچھڑ بھی جاتے ہیں۔ آج سے کریم بخش کی بیٹی میری بیٹی ہے۔ تم اس کی طرف سے بےفکر ہو جاؤ۔ تم جب چاہو' جہاں چاہو' جا سکتے ہو۔ میری طرف سے تم پر کوئی پابندی نہیں' البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر تمہیں کسی بھی طرح میری مدد درکار ہو تو مجھ سے تکلف نہ کرنا۔"

"تم نے میرے ذہن پر سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہے خان جی۔ اب میں زیادہ بہتر طریقے سے اپنی زندگی کی راہیں متعین کر سکوں گا۔"

حویلی میں پہنچنے کے بعد ہم دونوں اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے سونے کی کوشش کی لیکن سو نہ سکا۔ تنگ آ کر میں اٹھ بیٹھا۔ اس وقت رات کے تین اور چار کا درمیانی وقت تھا۔ میں نے کمرے سے باہر جھانک کر دیکھا تو کمال الدین کے کمرے میں بھی روشنی ہو رہی تھی۔ وہ بھی شاید سو نہیں سکا تھا۔ میں نے اس کے کمرے کے دروازے سے اندر جھانکا۔ وہ کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ مجھے اس سے پہلے معلوم نہیں تھا کہ وہ پڑھنا لکھنا بھی جانتا ہے۔ میرے کھٹکھٹانے پر اس نے دروازہ کھولا' اور میں کمرے کے اندر چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا" آؤ آؤ سعید خان۔ اچھا کیا تم آ گئے۔"

"بس نیند نہیں آ رہی تھی۔ تمہارے کمرے میں روشنی دیکھی تو ادھر چلا آیا۔"

"آؤ ادھر بیٹھو۔" میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میں نے پوچھا" خان جی تم نے بتایا نہیں کہ تمہارے کارندوں نے برکت علی کی حویلی پر حملہ کیوں کیا تھا؟"

"یہ ایک طویل داستا ہے' میں تمہیں مختصراً سناتا ہوں۔" کمال الدین نے کہا۔

میں ہمہ تن گوش ہو کر اس کی داستان سننے کے لیے تیار ہو گیا۔

"کسی دور میں سردار برکت علی اور میں بہت قریبی دوست ہوا کرتے تھے۔ ہمارا اٹھنا بیٹھنا' کھانا پینا زیادہ تر ایک ساتھ ہوا کرتا تھا۔ ہم دونوں عیاشی بھی ایک ساتھ کیا کرتے تھے۔ دونوں خودمختار تھے اور روپے پیسے کی بھی ہمارے پاس کمی نہ تھی۔ یہ آج سے چند سال پہلے کی بات ہے کہ میں اور برکت علی لیہ

گئے ہوئے تھے۔ ہمارا وہاں جانے کا اصل مقصد آوارگی ہی تھا لیکن ہم نے کام کا بہانہ بنا لیا تھا۔ اس وقت تک میں اور سردار برکت علی دونوں ہی رنڈوے ہو چکے تھے۔ لہٰذا ہم بے نتھے بیلوں کی طرح بالکل آزاد تھے۔ لیہ میں ہمیں اپنے ایک مشترکہ دوست سے ایک اڈے کا پتا چلا۔ یہ دراصل کوئی باقاعدہ اڈہ نہیں تھا بلکہ ایک شخص اپنی گھر والی کو دھندے پر چلاتا تھا۔ ہمارے دوست نے اس کی بیوی کی اتنی تعریف کی کہ ہم دونوں بےچین ہو گئے۔ شام ہوتے ہی ہم نے اپنے دوست سے اس شخص کا پتا حاصل کیا اور وہاں پہنچ گئے۔

وہ ادھیڑ عمر کا خوش شکل تھا لیکن وہ اول دجے کا بےغیرت اور حرام خور انسان۔ محنت مشقت اور کام کاج اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس نے ہم دونوں کو دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ ہم موٹی اسامی ہیں۔ وہ ہم سے موٹی رقم اینٹھنے کے چکر میں تھا۔ دولت ہمارے لیے مسئلہ نہ تھی۔ ہم نے اسے منہ مانگی رقم دی وہ ہمیں اپنی زال دکھانا چاہتا تھا لیکن ہم نے اسے منع کر دیا۔ ہم دونوں ہی تجسس برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ رقم کی ادائیگی کے بعد میں اور برکت آپس میں بحث کرنے لگے کہ پہلے اندر کون جائے گا۔ برکت علی ایک بےحد ضدی شخص تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بات منوا کر چھوڑے گا۔ چنانچہ میں نے اسے پہلے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ وہ اندر چلا گیا۔ میں اس شخص کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں اور برکت علی اعلیٰ قسم کی شراب کا اچھا خاصا ذخیرہ اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ میں نے اسکاچ وہسکی کی ایک بوتل کھول لی۔ اعلیٰ قسم کی شراب دیکھ کر وہ شخص بھی رال ٹپکانے لگا۔ میں نے اسے بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ وہ شخص خود بھی چرس وغیرہ کے نشے کا عادی تھا۔ اس نے اتنی اعلیٰ شراب کہاں چکھی ہو گی۔ وہ ندیدوں کی طرح پینے لگا۔ ایک بوتل ختم ہوئی تو میں نے دوسری کھول لی۔ وہ اب بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ اسے نشہ ہونے لگا لیکن اس کی نیت نہ بھری تھی۔ کچھ دیر بعد برکت علی واپس آ گیا۔ وہ بھی کسی انجانے نشے سے جھوم رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اس نے ایسی زبردست عورت آج تک نہیں دیکھی۔ اگر اسے میرا خیال نہ ہوتا تو وہ اپنی تمام عمر وہیں گزار دیتا۔

مجھے نشہ تو نہیں ہوا تھا' البتہ میں سرور کی کیفیت میں ضرور تھا۔ میں نے اس عورت کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ وہ خاصی کم عمر اور بےحد خوبصورت تھی۔ چند ہی لمحوں میں وہ میرے حواس پر چھا گئی۔ میں اس کا دیوانہ ہو گیا۔ وہ بھی مجھ سے بےحد اپنائیت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے کہا کہ وہ اپنے شوہر سے سخت بیزار ہو چکی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی اسے یہاں سے دور لے جائے۔ مجھ پر اس کا جادو پوری طرح چل چکا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ میرے ساتھ نکل چلے۔ اس نے کہا کہ اسے اپنے شوہر سے ڈر لگتا ہے۔ میں ترنگ میں تو تھا ہی میں نے بڑک لگائی کہ میں اس کے شوہر کو گولی مار دوں گا۔ وہ اس بات سے بہت خوش ہوئی اور کہنے لگی کہ بس پھر ابھی چلو۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل آیا۔ جب ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں اس کا شوہر اور برکت علی بیٹھے تھے تو میں نے دیکھا کہ اس کا شوہر نشے میں دھت ہے۔ برکت علی نے پوچھا کہ یہ سب کیا چکر ہے تو میں نے اسے بتایا کہ میں اس عورت کو اپنے

ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اس نے مجھے منع کیا لیکن میں نہ مانا۔ وہ عورت میرے دل و دماغ پر قابض ہو چکی تھی۔ میں نے اس عورت کا ہاتھ پکڑا اور باہر کی طرف چلا گیا۔ اسی وقت اس عورت کے شوہر کو کچھ ہوش آیا۔ اس نے اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکنے کی کوشش کی۔" کمال الدین اتنا کہہ کر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ذہنی اذیت کے سے آثار تھے۔ میں کچھ دیر منتظر رہا۔

آخر کار اس نے دوبارہ اپنی داستان شروع کی" مجھے اس وقت اس عورت کے علاوہ کسی کی پروا نہ تھی۔ میں نے ریوالور نکالا اور اس شخص کو گولی مار دی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس عورت نے اپنے شوہر کی موت پر ذرا بھی افسوس ظاہر نہ کیا۔ برکت علی نے کہا میں نے اچھا نہیں کیا۔ میں نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر کہا کہ یہاں سے نکلنے کی سوچو۔ ہم دونوں جس گاڑی میں لیے گئے تھے وہ برکت علی کی ملکیت تھی۔ ہم فوراً گاڑی میں بیٹھے اور عالم بستی میں آ گئے۔ راستے میں مجھے احساس ہوا کہ برکت علی اس عورت میں دلچسپی لے رہا ہے۔ لیکن میں نے اس بات پر توجہ نہ دی۔ میں تو مستقبل کے منصوبے بنا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں اس سے شادی کر لوں گا۔ عالم بستی پہنچنے کے بعد میں اس عورت کو اپنی حویلی میں لے آیا۔ میں نے برکت علی کو بتایا کہ میں اس عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے احساس ہوا کہ اس نے اس بات کو پسند نہیں کیا ہے۔ وہ شاید اسے کھلونے کے روپ میں دیکھنا پسند کرتا تھا۔ بہر حال مجھے اب کوئی فکر نہ تھی۔ برکت علی میرا دوست تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں نے اس عورت سے شادی کر لی تو وہ اسے بھابھی کے علاوہ کچھ نہیں سمجھے گا۔ برکت علی مجھے اور اس عورت کو میری حویلی میں چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ عورت چار دن تک میری حویلی میں رہی۔ میں نے اس دوران میں اس کے قریب آنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے اسے پوری عزت سے اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں اس سے پوری طرح معلوم کر لیا۔ اسے مجھ سے شادی کرنے میں کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ خود بھی گناہوں کی زندگی سے اکتا چکی تھی۔

چار دن بعد میں نے اسے برکت علی کی حویلی میں بھیج دیا۔ میں اسے پورے اہتمام کے ساتھ دلہن بنا کر اپنے گھر لانا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اپنی مرحوم بیوی کے تمام زیور دے دیے تھے۔ تاکہ وہ پوری طرح دلہن بن سکے۔ اگلے دن میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ برکت علی کی حویلی پہنچا تاکہ نکاح کے بعد اپنی دلہن کو باقاعدہ رخصت کرا کر اپنی حویلی میں لا سکوں۔ جب میں برکت علی کی حویلی میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہاں شادی کے انتظامات مکمل ہیں' البتہ حویلی میں مسلح کارندوں کی تعداد معمول سے زیادہ تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ برکت علی کو دشمن پالنے کا شوق ہے۔ لہٰذا اسے محتاط بھی زیادہ رہنا پڑتا تھا۔ اسی لیے میں نے اس بات پر توجہ نہ دی۔ برکت علی نے اپنی حویلی کے باغیچے میں نکاح کا انتظام کر رکھا تھا۔ سامنے ہی ایک تخت پر خوبصورت قالین بچھا ہوا تھا۔ قالین اور زری کے گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ مجھے برکت علی کے تیور بدلے بدلے سے لگے لیکن اس وقت اس کا سبب نہ جان سکا۔ کچھ دیر بعد نکاح خواں آ گیا۔ میں نکاح خوان کو دیکھ کر تخت پر جا بیٹھا تاکہ نکاح وغیرہ کی کاروائی پوری ہو سکے۔ عین اسی وقت برکت علی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا میرے پاس آیا۔

"یہ جگہ چھوڑ دے کمال الدین۔ یہ جگہ تیرے لیے نہیں ہے۔" برکت علی نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

میں حیرت سے اس کا منہ دیکھ رہا تھا" یہ تم کیا کہہ رہے ہو برکت علی؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"میں صحیح کہہ رہا ہوں کمال الدین۔ یہ جگہ میرے لیے ہے' تمہارے لیے نہیں۔"

"یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو برکت علی؟" میں نے شدید غصے کے عالم میں کہا۔

"میں صحیح کہہ رہا ہوں کمال الدین۔ اس وقت یہاں میرا نکاح ہو گا۔"

"تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ہے برکت علی۔ اسے میں لایا تھا اور وہ مجھ سے ہی شادی کرے گی۔" میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے کمال الدین وہ تیری شکل بھی دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ وہ اپنی مرضی سے مجھ سے نکاح کر رہی ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" میں نے سخت طیش کے عالم میں کہا۔

"یہ سچ ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو میرے ساتھ چلو۔ وہ تمہارے سامنے مجھ سے شادی کا اقرار کر لے گی۔" برکت علی نے کہا۔ میں شدید غصے اور اضطراب کے عالم میں اس کے ساتھ حویلی کے اندر داخل ہوا۔ حویلی کے زنان خانے کے ایک کمرے میں وہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اس نے میری مرحوم بیوی کے زیورات پہن رکھے تھے۔" کیا تم برکت علی سے نکاح کر رہی ہو؟" میں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔" لیکن تم نے تو مجھ سے نکاح کا وعدہ کیا تھا۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم میرے علاوہ کسی سے شادی نہیں کر سکتیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" میں جوش و جذبات میں بولتا چلا گیا۔ اس نے گردن اٹھائی۔

اس کی خوبصورت آنکھوں میں نفرت اور تمسخر کے ملے جلے تاثرات تھے۔" اونہہ۔۔۔ تم مجھ سے شادی کرو گے؟ شکل دیکھی ہے آئینے میں کبھی اپنی؟" اس کا لہجہ طنز کے زہر سے بھرا ہوا تھا۔ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی ذلت ہو سکتی ہے۔ وہ عورت میرے منہ پر میرا مذاق اڑا رہی تھی۔ میں نے ایک بازاری عورت سے جانے کیا کیا امیدیں باندھ لی تھیں۔ برکت علی صرف' عمر میں ہی مجھ سے کم نہیں تھا بلکہ وہ شکل و صورت میں بھی مجھ سے بہت بہتر تھا۔ مالی لحاظ سے بھی وہ مجھ سے کم نہیں تھا۔ اس حرافہ کو میری نسبت اس میں کشش نظر آئی۔ اس نے اسے اپنے جال میں پھانس لیا۔ کسی نے صحیح کہا ہے عورت چاہے تو اچھے اچھوں کی عقل پر پردہ ڈال سکتی ہے۔ برکت علی اس عورت کی خاطر اتنی پرانی دوستی فراموش کر بیٹھا۔" اتنا کہہ کر کمال الدین خاموش ہو گیا۔ اس نے جو داستان سنائی تھی وہ بہت دلچسپ تھی لیکن ابھی وہ پوری نہیں ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔" پھر کیا ہوا خان جی؟"

"پھر کیا ہونا تھا سعید خان۔ میں وہاں لڑنے جھگڑنے تو نہیں گیا تھا کہ میں اپنے ساتھ اپنے کارندے ساتھ لے جاتا جبکہ برکت علی نے اپنے کارندے تیار کر رکھے تھے۔ میں شدید غیظ و غضب کے

عالم میں اپنی حویلی واپس آ گیا۔ میرے ساتھ جانے والے لوگوں کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ وہ دل ہی دل میں میرا مذاق اڑا رہے تھے۔ بس اس دن سے میری اور برکت علی کی دشمنی کا آغاز ہو گیا۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ میں برکت علی اور اس کی بیوی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے تین بار برکت علی پر حملے کروائے لیکن وہ بدبخت بچ نکلا۔ اسی طرح کئی سال گزر گئے۔ پھر ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ برکت علی قتل ہو گیا ہے۔

برکت علی کی بیوی نے مجھ پر اس کے قتل کا شک ظاہر کیا لیکن پولیس میرے خلاف کوئی ثبوت نہ ڈھونڈ سکی۔ برکت علی تو ختم ہو گیا لیکن میری قسم ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ میں اس بازاری عورت کو معاف نہیں کر سکتا تھا چنانچہ میرے کارندوں نے ایک بار پھر برکت علی کی حویلی پر حملہ کیا تا کہ اس بدبخت عورت کو جہنم رسید کر سکیں۔'' کمال الدین پر پژمردگی سی طاری ہونے لگی۔ ''لیکن میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ اس جیسی مکار عورت کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ جب وہ میری حویلی میں تھی تو اس نے باتوں باتوں میں مجھے بتایا تھا کہ جس شخص کو قتل کر کے میں اسے بھگا کر لایا وہ............ بھی اسے کسی دیہات سے بھگا کر لایا تھا۔ وہ پہلے سے شادی شدہ تھی اور اس کا ایک بچہ بھی تھا۔''

میرے دماغ میں ایک زبردست دھماکا ہوا۔ میرے وجود میں زلزلہ سا آ رہا تھا۔ میں نے لرزتی آواز میں کمال الدین سے پوچھا ''اس............ اس بدبخت عورت کا نام کیا ہے خان جی؟''

''اس کا نام............ جنت ہے سعید خان!'' مجھے کمال الدین کی آواز گویا کسی کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھاتا چلا گیا۔ پھر اس اندھیرے میں سرخی کی آمیزش ہونے لگی۔ مجھے ہر طرف خون ہی خون پھیلا دکھائی دے رہا تھا۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆O☆

کمال الدین خان میری حالت سے بے خبر جانے کیا کیا کچھ کہے جا رہا تھا لیکن میری سمجھ میں تو خاک بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میرے دماغ میں تو اس نام نے حشر برپا کر دیا۔ جو کمال الدین کی زبان سے نکلا تھا۔ مجھے اچانک کھڑے ہوتے دیکھ کر کمال الدین کچھ حیران سا ہوا ''کیا ہوا سعید خان؟ کہاں جا رہا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔ میں نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں اپنے شکستہ وجود کے ریزوں کو سمیٹنے کی کوشش میں مصروف رہا۔ کمال الدین کے الفاظ نے پگھلے ہوئے سیسے کے مانند میرے کانوں میں اتر کر میرے وجود میں انگارے بھر دیے تھے۔ کمال الدین نے میرے چہرے کے تاثرات سے جانے کیا اندازہ لگایا۔ وہ یک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا' اس نے مجھے اپنی بانہوں میں بھر کر' اس دیوان پر بٹھا دیا' جس پر وہ خود نیم دراز رہا کرتا تھا۔ میرے ذہن میں سناٹے گونجنے لگے۔ مجھے گرد و پیش کی کوئی خبر نہ تھی۔ میں کسی معمول کے مانند دیوان پر بیٹھ گیا۔ کمال الدین نے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس بھر کر میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے خود کار انداز میں غٹاغٹ وہ گلاس خالی کر دیا۔ کمال الدین نے

گلاس تپائی پر رکھا اور میرے گال تھپتھپانے لگا ''ہوش میں آ جوان' کیا ہوا تجھے؟ ادھر میری طرف دیکھ'' مجھے اس کی آواز کسی اندھے کنویں کی اتھاہ گہرائیوں سے آتی محسوس ہوئی۔ میرے دل میں شدت سے خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں نے جو کچھ سنا ہے' وہ میرے کانوں کا دھوکا ہو' ایک بھیانک سپنا ہو جو میرے بیدار ہوتے ہی چور چور ہو جائے۔ میں خود کو کتنا بھی دھوکا دیتا حقیقت اپنی تمام تر سنگینی کے ساتھ' کسی بھاری پتھر کے مانند میرے منہ سے آن ٹکرائی تھی۔ میرے کانوں میں ایک ہی لفظ گونج رہا تھا۔ انتقام۔۔۔ انتقام۔۔۔ انتقام۔ اپنے زہر آلود بچپن کا انتقام' اپنے خاندان کی دریدہ آبرو انتقام' اپنے غیرت مند باپ کی لہولہو پگڑی کا انتقام' ماں کے مقدس رشتے کی توہین کا انتقام۔

کمال الدین میری حالت دیکھ کر کچھ زیادہ ہی بدحواس ہو گیا۔ اس نے مجھے دیوان پر لٹانے کے لیے مجھے اپنے بازوؤں میں لیا' تب مجھے اپنے گرد و پیش کا کچھ ہوش آیا۔ کمال الدین کو میرے اس رستے ہوئے ناسور کا علم نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اسے علم ہو گیا کہ وہ عورت۔۔۔ نہیں نہیں اگر ایسا ہوا تو میں تمام عمر اس کے سامنے نظر نہیں اٹھا سکوں گا۔ مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا چاہیے۔ اسے یہ شک تک نہیں ہونا چاہیے۔ کہ میری یہ حالت اس سیاہ باطن عورت کا نام سن کر ہوئی ہے۔ میں نے اپنے ریزہ ریزہ اعصاب کو مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ کمال الدین نے پانی کا ایک اور گلاس میرے لبوں پر لگا دیا۔ پانی کا آخری گھونٹ حلق سے اترنے تک میں نے کافی حد تک اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ میری آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی سرخ دھند چھٹنے لگی۔ کمال الدین کا پریشان چہرہ بالکل میرے چہرے کے سامنے تھا۔ وہ شاید میری آنکھوں میں زندگی کے آثار تلاش کر رہا تھا۔

میرے حلق سے ہلکی سی کراہ نکلی اور میں نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ کمال الدین نے ایک بار پھر مجھے دیوان پر لٹانے کی کوشش کی۔ اس بار میں نے مزاحمت نہیں کی بلکہ اپنے پاؤں سے کھسے نکال کر دیوان پر دراز ہو گیا۔ میرے دونوں ہاتھ بدستور میرے سر پر تھے' کیا ہوا تمہیں سعید خان؟'' کمال الدین کی آواز تشویش سے بوجھل تھی ''کیا تمہارے سر میں درد ہے؟''

''ہاں خان جی'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''بس ایک دم سے سر میں درد کی زبردست لہر اٹھی ہے اور دل بھی گھبرا رہا ہے'' میں نے اپنے چہرے پر کرب کے آثار پیدا کر لیے۔ میں دعا کر رہا تھا کہ کمال الدین میرے بہلاوے میں آ جائے۔

''اوہو تو یہ بات ہے۔ اللہ رحم کرے۔ تم یہیں لیٹو میں تمہیں سر درد کی گولیاں دیتا ہوں۔ لگتا ہے کافی شدید درد ہے تمہارے سر میں۔ تمہارا چہرہ بالکل زرد ہو رہا ہے'' کمال الدین نے اسپرین کی دو گولیاں پانی کی مدد سے مجھے کھلا دیں۔ ''پہلے تو کبھی نہیں ہوا یہ درد تمہارے سر میں؟'' کمال الدین نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''نہیں خان جی پہلے تو کبھی نہیں ہوا'' میں نے اپنے جواب کو حتی الامکان سادہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ میرے لہجے میں کرب کے آثار نہ پا کر کمال الدین کو کچھ اطمینان ہوا کہ معاملہ زیادہ خطرناک نہیں

ہے۔

اس نے متین لہجے میں مجھے ہدایت کی ''تم ایسا کرو کہ اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ ہوسکتا ہے رات کو دیر تک جاگنے کی وجہ سے تمہارے سر میں یہ درد ہوا ہو۔''

میں فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں جلد از جلد اس کی نظروں سے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ اس جیسے گھاگ اور گرگ باراں دیدہ قسم کے شخص سے زیادہ دیر تک اپنی اندرونی کیفیات پوشیدہ رکھنا میرے لیے آسان نہ تھا۔ ذرا سی بات نکلتی تو وہ بہت دور تک جا پہنچتی۔ وہ مجھ سے جو وضاحتیں طلب کرتا' میں ان کی جواب دہی کیسے کر پاتا؟

میں اپنے کمرے میں آ کر اپنی مسہری پر لیٹ گیا لیکن میرا وجود میرے بستر پر یوں کلبلا رہا تھا جیسے میں انگاروں کی سیج پر دراز ہوں۔

یونہی کروٹیں بدلتے بدلتے میں نے ایک گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزار دیا۔ میرا اندازہ تھا کہ کمال الدین اب تک سو چکا ہوگا۔ میں نے اپنے کمرے کے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ کمال الدین کے کمرے میں اندھیرا ہو چکا تھا۔ جبکہ حویلی سے باہر اندھیرا اپنے آخری دموں پر تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اذان سحر کے پاکیزہ الفاظ میری روح کو معطر کرنے لگے۔ موذن غفلت کی نیند سونے والوں کو خدا کی عبادت و بندگی کی دعوت دے رہا تھا' انہیں بتا رہا تھا کہ نماز نیند سے ہزار درجے بہتر۔ گاؤں کی وہ مسجد میں نے دیکھ رکھی تھی جہاں سے اذان کی یہ آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ گاؤں کے تمام لوگوں نے چندہ کر کے اس میں لاؤڈ اسپیکر نصب کروا دیا تھا' تاکہ دعوت حق زیادہ سے زیادہ فاصلے تک با آسانی پہنچ سکے۔ جس معرکے کے لیے میں تیاری کر رہا تھا اس میں میری کامیابی کا مکمل دارومدار رب ذوالجلال کی عنایتوں پر تھا۔ لہٰذا میرے لیے بہتر یہی تھا کہ میں اپنی تمام تر سیاہ کاریوں کے ہمراہ اس کے دربار میں سر جھکا دیتا اور اس کی رحمت اور اعانت کا طلب گار ہوتا۔ میں نے اپنے پیروں میں کھسے چڑھا لیے۔ میرا اوالتھر میرے تکیے کے نیچے محو خواب تھا۔ اسے میں نے اپنی قمیص کے نیچے نیفے میں اڑس لیا۔ اس کے بعد میں خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔ پوری حویلی پر سناٹا طاری تھا۔ میں حویلی کے گیٹ پر پہنچا تو ایک نگہبان جاگ رہا تھا جبکہ دوسرا شاید کسی کونے کھدرے میں سو رہا ہوگا۔ چوکی دار نے استفہامیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنے کانوں تک ہاتھ لے جا کر نماز کا اشارہ کیا۔ اس نے حیران سی نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر چپ چاپ گیٹ کی چھوٹی کھڑکی کھول دی۔

میں کچھ دیر بعد مسجد کے صحن میں داخل ہوا تھا۔ دائیں جانب ایک چبوترے پر پختہ چوکیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان چوکیوں کے سامنے ٹونٹیاں تھیں۔ ان ٹونٹیوں میں ایک بڑی سی ٹینکی سے پانی آتا تھا جو ہاتھ کے نلکے سے بھری جاتی تھی۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ میرے جسم میں طراوت کی لہر سی دوڑنے لگی۔

جب میں مسجد سے باہر نکلا تو خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔ اب میں یکسوئی سے اپنے لیے راہیں متعین کر سکتا تھا۔ ابھی صبح کا اجالا پوری طرح نہیں پھیلا تھا اگر میں پیدل

کوٹ چھٹے کی جانب روانہ ہوتا تو دوپہر سے پہلے وہاں پہنچ جا سکتا تھا۔ ویسے تو میں حویلی سے گھوڑا بھی لے سکتا تھا لیکن میں فی الحال کسی کو اپنی روانگی سے آگاہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں براہ راست برکت علی کی حویلی کی جانب پیدل روانہ ہو جاتا لیکن اس صورت میں مجھے تقریباً پورا دن اور آدھی رات سفر کرنا پڑتا۔ اس کے علاوہ راستہ بھٹکنے کے بھی کافی امکانات تھے۔ چنانچہ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ پہلے کوٹ چھٹن پہنچوں اور وہاں سے کسی بس وغیرہ میں بیٹھ کر اپنی منزل مقصود کی جانب روانہ ہو جاؤں۔

ایک بار تو میرے دل میں آئی کہ میں بابا کریم بخش کے گھر کی طرف سے ہوتا چلوں لیکن پھر میں نے اپنا یہ خیال رد کر دیا۔ اس طرح میری الجھنوں میں خواہ مخواہ اضافہ ہی ہوتا۔ ہیر کو دیکھ کر میرے ارادے کمزور پڑنے لگتے جو مجھے کسی صورت منظور نہ تھا۔ اس مرحلے پر میں کسی رکاوٹ کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

یہ محض میری خوش قسمتی ہی تھی کہ گاؤں سے نکلنے کے وقت تک میرا کسی سے سامنا نہ ہوا۔ گاؤں سے نکلنے کے بعد میں حتی الامکان تیز رفتاری سے کوٹ چھٹے کی جانب روانہ ہو گیا۔

سورج طلوع ہوا تو میں گاؤں سے خاصی دور آ چکا تھا۔ اب مجھے پیاس لگنے لگی۔ میں نے ایک راجباہ سے چلوؤں میں بھر کر پانی پیا اور دوبارہ روانہ ہو گیا۔ میرے سر پر سفید خانوں والا سرخ رومال بندھا ہوا تھا۔ میں کوٹ چھٹے کے قریب سے گزرنے والی بڑی سڑک پر جا پہنچا تو سورج تقریباً سر پر آن پہنچا تھا۔ بڑی سڑک کڑک دھوپ میں جھلس رہی تھی۔ میں پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ میں شربت اور سوڈے کی ایک چھوٹی سی دکان میں گھس گیا اور اسکنج بین کا ایک گلاس لیا۔

گلاس خالی کرنے کے بعد میں نے اپنی جیب کا جائزہ لیا۔ میرے پاس پانچ چھ سو روپے موجود تھے۔ میں نے اسے ادائیگی کی تو اس نے پوچھا ''بھرا جی کہاں جانا ہے تمہیں؟''

''مجھے ڈیرے جانا ہے'' میں نے اسے اپنی منزل سے آگاہ کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا ''ڈیرے جانے والی جی ٹی ایس کی بس تو سویرے چلی جاتی ہے۔ تساں راجن پور' جام پور سے آنے والی کسی بس میں بیٹھ جانا۔ ویسے پیٹرول پمپ کے ساتھ والے ہوٹل پر کئی ٹرک کھڑے ہوں گے۔ ان میں سے ڈیرے جانے والے کسی ٹرک والے سے کہو گے تو وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ دو تین روپے دے دینا خوش ہو جائے گا'' میں نے اثبات میں گردن ہلا دی اور دکان سے باہر آ گیا۔

چلچلاتی دھوپ بھیجے کو کھوپڑی میں پگھلائے دے رہی تھی۔ میں کچھ دیر سڑک کے کنارے کھڑا رہا۔ اس دوران میں وہاں سے کوئی بس نہ گزری۔ مجبوراً میں پیٹرول پمپ کے پہلو میں واقع جھونپڑے نما ہوٹل کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں اس وقت پانچ ٹرک کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے تین خالی تھے جبکہ دو پر پتھر لدے ہوئے تھے۔ ہوٹل کے سائبان کے نیچے بچھی ہوئی چارپائیوں پر اس وقت دس بارہ افراد بیٹھے تھے۔ ان میں سے کچھ کھانا کھا رہے تھے جبکہ باقی کھانے کے بعد چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

میں نے ان سب کو ایک ساتھ مخاطب کرتے ہوئے کہا ”تم لوگوں میں سے کوئی ڈیرے کی طرف تو نہیں جا رہا؟“ تقریباً سب لوگوں نے انکار میں گردن ہلا دی۔ البتہ ان میں سے ایک نے پرسکون آواز میں کہا ”میں جاؤں گا تو سہی ڈیرے مگر شام تک یہاں سے چلوں گا۔“

مجھے اس جواب سے مایوسی ہوئی۔ عین اسی وقت سڑک پر سے ایک بس گزری وہ اسٹاپ پر ٹھہری نہیں۔ اس بس کا رخ ڈیرہ غازیخان کی طرف تھا۔ اگرچہ چند اور مسافر بھی بس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ تاہم بس نے اس اسٹاپ پر رکنا گوارا نہیں نہیں کیا تھا۔ میں مایوس سا ہو کر ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کھانے کی خوشبو میری ناک میں پہنچی تو میری بھوک چمک اٹھی۔ میں نے اکنج بین کے علاوہ ابھی تک کچھ بھی نہیں کھایا پیا تھا۔ میں نے تمام تفکرات کا بوجھ ایک طرف جھٹکا اور اپنے لیے کھانا منگا لیا۔ میں نے کسی خاص سالن کا نام نہیں لیا تھا۔ ہوٹل کے چھوٹے نے میرے سامنے روٹی کی چھابی اور سالن کی رکابی لا کر رکھی تو مجھے جھٹکا سا لگا۔ وہ میرے لیے آلو قیمہ لے آیا تھا مجھے فوراً ہیر کی یاد آ گئی۔ وہ میرے لیے بڑے اہتمام سے قیمہ بھونتی تھی۔ میری اچانک گمشدگی سے جانے اس پر کیا بیتے گی؟

میں نے کھانا ختم کیا ہی تھا کہ ایک بس راجن پور کی جانب سے نمودار ہوئی۔ قبل اس کے کہ میں چارپائی سے اٹھتا' وہ تیزی سے بغیر رکے ڈیرہ غازیخان کی سمت نکلتی چلی گئی۔ میں مایوس ہو کر دل میں ان بے حس بس والوں کو برا بھلا کہنے لگا۔ میرے ساتھ والی چارپائی پر نیم دراز ٹرک ڈرائیور بغور میرا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا ”تھوڑی دیر صبر کر لے جوان۔ میرا کلینر اپنے گھر سے کپڑے لینے گیا ہے' ایک ڈیڑھ گھنٹے تک وہ واپس آ جائے گا۔ جیسے ہی وہ آیا ہم یہاں سے چل دیں گے۔“

میں نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ اس کی عمر پینتالیس سال کے قریب ہو گی۔ کسی زمانے میں اس کا رنگ گورا چٹا ہو گا جو بے رحم دھوپ سے جھلس کر سنولا ہو چکا تھا۔ اس کا لانبا قد اس کے دبلے پتلے جسم کی وجہ سے قدرے خمیدہ لگا۔ اگرچہ وہ سرائیکی بول رہا تھا' تاہم یہ بات صاف محسوس ہو رہی تھی کہ سرائیکی اس کی مادری زبان نہیں ہے۔ مجھ سے وہ بے حد شائستہ لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ جو اس طبقے کے افراد میں ذرا کم ہی استعمال ہوتا ہے۔ میری وضع قطع سے اس نے جانے کیا اندازہ لگایا ہو گا' بہرحال اس کا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔ اس نے جس پرخلوص انداز میں میری مدد کا عندیہ دیا' اس کے بعد میرے لیے یہ مناسب نہ رہا کہ میں اس کی پیش کش مسترد کروں۔ چنانچہ میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور اطمینان سے بیٹھ گیا۔ ہوٹل کے چھوٹے نے میرے کہے بغیر چائے کا گلاس میرے ہاتھ میں تھما دیا ”استاد کے لیے بھی چائے لا دے“ میں نے چھوٹے کو حکم دیا۔ میں اپنے اور اس ٹرک ڈرائیور کے درمیان باہمی خیرسگالی کے جذبات مزید مستحکم کرنا چاہتا تھا۔ استاد کے چہرے پر ایک نرم مسکراہٹ نمودار ہوئی تاہم اس نے مجھے چائے منگانے سے منع نہیں کیا۔ وہ ایک کم گو شخص معلوم ہوتا تھا جسے اپنے الفاظ کی قدر و قیمت کا پورا احساس ہو۔ میں خود بھی کم سے کم بات کرنا چاہتا تھا لہٰذا ہمارے درمیان خاصی دیر خاموشی حائل رہی۔

بالآخر گفتگو کو میں نے ہی دوبارہ جاری کیا۔ ”استاد جی ڈیرے سے آگے کہاں جانا ہے تم کو؟“

”کہیں نہیں' ہمارا مستقل اڈا ڈیرہ غازی خان میں ہی ہے۔ ہمیں جہاں بھی جانا ہو وہیں سے جاتے ہیں۔“

”یہ ٹرک تمہارا اپنا ہے؟“

”نہ جی۔ ہم تو نوکر ہیں۔ ٹرک تو مالکوں کا ہے۔ تیس ٹرک ہیں اس کمپنی کے۔“

”تمہارا نام کیا ہے استاد جی؟“

”میرا نام محمد امین ہے' یار دوست مجھے مینو بھی کہتے ہیں۔ شرافت ہے میرے کلینر کا نام۔ اچھا فرماں بردار لڑکا ہے۔ اب تو وہ ڈرائیوری بھی بہت اچھی کر لیتا ہے۔ وہ یہیں کوٹ چھٹے کا رہنے والا ہے۔“

”تم کہاں رہتے ہو استاد جی؟“ میں نے سوال کیا۔ میں محض وقت گزاری کے لیے بات آگے بڑھانے لگا۔

”میں ڈیرہ غازیخان میں ہی رہتا ہوں۔ ای بلاک میں گھر ہے میرا۔ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟“ اس نے سوال کیا۔

”میں یہاں پاس ہی ایک گاؤں میں رہتا ہوں۔ عالم بستی ہے میرے گاؤں کا نام۔“

”اوہ وہی کمال الدین خان والی عالم بستی؟ یہاں سے تو اچھی خاصی دور ہے وہ جگہ۔“

”تم کمال الدین خان کو جانتے ہو استاد جی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اسے عالم بستی کے متعلق کیوں بتایا۔ مجھے پہلے سے اندازہ ہوتا تو میں کوئی فرضی نام بتا دیتا۔ اگر یہ شخص کمال الدین کا واقف تھا تو پھر میرے لیے مشکل پیدا ہو سکتی تھی لیکن اس نے جو جواب دیا وہ میرے لیے اطمینان کا باعث ثابت ہوا ”نہیں ذاتی طور پر تو نہیں جانتا البتہ نام سنا ہے اس کا۔ اچھا خاصا مالدار شخص ہے۔ تم کیا کام کرتے ہو؟“

”کام کیا کرنا ہے جی بس سترہ کلے زمین ہے میری۔ اسی پر کاشت کاری کرتا ہوں' اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے۔“ میں نے قدرے محتاط ہو کر جواب دیا۔ اس نے مجھ سے میرا نام نہیں پوچھا تھا' تاہم میں نے بہتر یہی سمجھا کہ اس سے پوچھنے سے پہلے ہی اسے اپنا نام بتا دوں ”غلام سعید خان ہے جی میرا نام۔ ڈیرے کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں میرا ماما رہتا ہے۔ آج کل وہ بیمار ہے۔ بس اسی کے پاس جا رہا ہوں“ مینو استاد نے میری وضاحت پر استفہامیہ انداز میں سر ہلا دیا۔

اسی اثنا میں ایک نوجوان مینو استاد کی چارپائی کے پاس آن ٹھہرا ”اب اٹھ بھی جا استاد سویرے سے لمبا پڑا ہے۔ گاڑی کا بھی کچھ حال چال پوچھا یا نہیں؟“

”اوئے بیٹھ ادھر۔ بڑا آیا گاڑی کا ہمدرد۔ یہ میرا شاگرد شرافت ہے' غلام سعید خان“ مینو استاد نے میرا اسے سے تعارف کرایا۔ شرافت نامی وہ نوجوان میرا ہم عمر ہی ہو گا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی مگر چمک دار تھیں۔ ہاتھ پیر کا خاصا مضبوط' اس نے بغور میرا جائزہ لیا۔ میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ مینو استاد نے اسے میرے متعلق آگاہ کیا ”یہ جوان ہمارے ساتھ ڈیرے تک جائے گا

شرافت علی۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا "تو پھر دیر کس بات کی ہے استاد' چل اٹھ کھڑا ہو۔"

مینو استاد اپنی چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی اٹھا تھا۔ شرافت علی نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور ٹرک کی جانب چل پڑا۔ میں کھانے پینے کے پیسے پہلے ہی ادا کر چکا تھا۔ مینو استاد نے میرے اور شرافت علی کے درمیان موجود موہوم سی کشیدگی کو محسوس کرلیا۔ اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا "شرافت علی کے سخت لہجے کا برا مت ماننا جوان۔ یہ مزاج کا ذرا اکھڑ ہے۔ ویسے دل کا بہت اچھا ہے۔"

"مجھے اس سے کیا لینا دینا استاد جی۔ کچھ دیر کا ساتھ ہے' ہم لوگوں کا پھر تم کہاں میں کہاں۔"

"شاباش' تم مجھے سمجھدار بندے دکھائی دیتے ہو۔ انسان کے دشمنوں کی تعداد جتنی کم ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ میں شرافت علی کو بہت سمجھاتا ہوں مگر وہ مانتا ہی نہیں۔ خواہ مخواہ ادھر ادھر سینگ پھنساتا پھرتا ہے۔"

"ابھی اس نے زندگی کی ٹھوکریں نہیں کھائی ہوں گی۔ کچھ وقت کڑی دھوپ میں گزارے گا تو اسے چھاؤں کی قدر معلوم ہوجائے گی" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ہم دونوں ٹرک کے پاس پہنچے تو شرافت علی ٹرک کے ونڈ اسکرین کی صفائی کر رہا تھا۔ مینو استاد نے ٹرک کا دروازہ کھولا اور اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے ساتھ والی نشست سنبھال لی۔ ٹرک بے حد عمدہ حالت میں تھا۔ اس کی نہایت اچھے طریقے سے دیکھ بھال کی جاتی ہوگی۔ مینو استاد نے اگنیشن میں چابی گھمائی تو ہلکی سی کھرکھراہٹ کے ساتھ ٹرک اسٹارٹ ہوگیا۔ مینو استاد نے ایک سگریٹ سلگا لی۔ کیبن میں پھیلنے والی ناگوار بو نے فوراً ہی بتا دیا کہ سگریٹ میں چرس بھری ہوئی ہے۔ اسی دوران میں شرافت علی بھی ٹرک میں گھس آیا۔ اس کی تیوریوں پر بل پڑے ہوئے تھے۔ اس نے کرخت لہجے میں مجھے مخاطب کیا "یہ سیٹ میری ہے جوان یہ سیٹ چھوڑ دے۔ میں ہمیشہ استاد کے ساتھ بیٹھتا ہوں۔" میں نے مینو استاد کی طرف دیکھا۔ اس نے ٹرک کو گیر میں ڈال کر سڑک کی جانب بڑھا دیا تھا۔ شرافت علی نے ایک بار پھر بڑی بدتمیزی سے مجھے مخاطب کیا "سنا نہیں تو نے؟ شرافت سے میری جگہ چھوڑ دے ورنہ اچھا نہیں ہوگا" اس کے لہجے سے حقارت جھلک رہی تھی۔

مجھے اپنے وجود میں ہلکی سی غصے کی چبھن محسوس ہوئی لیکن میں نے اسے برداشت کرلیا۔ میں اس سر پھرے شخص کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا۔

"جہاں بیٹھا ہے وہیں بیٹھا رہ شرافت علی" مینو استاد نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا "گھنٹے بھر کی بات ہے' اس کے بعد یہ پوری گاڑی تیرے قبضے میں ہوگی۔ جہاں جی چاہے بیٹھنا" مینو استاد کی بات سن کر وہ کسمسا کر رہ گیا۔ چند لمحے بعد اس نے استاد جی سے سگریٹ طلب کی۔ مینو استاد نے اپنا دایاں ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھا اور بائیں ہاتھ سے اپنی سلگتی ہوئی سگریٹ شرافت علی کی طرف بڑھا دی۔

شرافت علی نے اس سے سگریٹ لی تو اس کی کہنی میری ٹھوڑی سے ٹکرائی۔ شرافت علی کے انداز میں بے پروائی تھی' تاہم مجھے معلوم تھا کہ اس نے یہ حرکت جان بوجھ کر کی ہے' اس کے باوجود میں نے کوئی

ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ مینو استاد کی تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر تھی۔ شرافت علی نے سگریٹ کے دو لمبے لمبے کش لگائے اور سگریٹ مینو استاد کو لوٹا دی۔ اس بار میں سیٹ سے پشت لگا کر بیٹھ گیا' چنانچہ اسے مجھ سے کہنی ٹکرانے کا موقع نہ مل سکا لیکن اس بار وہ ایک اور گھٹیا حرکت کر گزرا۔ اس نے اپنی بھاری بھرکم پشاوری چپل سے میرا بایاں پاؤں بری طرح کچل دیا۔ میں تلملا کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ مینو استاد نے ایک نظر مجھ پر ڈالی لیکن میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ شرافت علی کے ہونٹوں پر ایک مکروہ مسکراہٹ تھی۔ وہ میری حالت سے لطف اندوز ہونے لگا۔ مجھے اپنے خون کی حرارت بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی لیکن پھر بھی میں نے اسے اپنے اوپر قابو پالیا۔ اس چھچھورے سے جھگڑا مول لینا کسی طرح بھی مناسب نہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں اسے خاک چٹا دوں گا لیکن اس سے خواہ مخواہ کی الجھن کے علاوہ کچھ بھی حاصل نہ ہوتا۔ میں کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے میری راہ کھوٹی ہو۔ میرے سکون نے شاید شرافت کو مایوس کیا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اس طرح سے ہولے ہولے جھومنا شروع کردیا جیسے اسے نیند آرہی ہو۔ اسی طرح جھومتے ہوئے اس نے میری پسلی میں اپنی کہنی ماری۔ میری پسلی میں درد کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے اپنی کراہ کو روکتے ہوئے غضب ناک نظروں سے اسے گھورا۔ اس نے بے حد اشتعال انگیز انداز میں مجھے مسکرا کر دیکھا۔ مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ وہ مجھ سے الجھے بغیر نہیں مانے گا۔ میں نے سوچا کہ مینو استاد سے اس کی شکایت کروں لیکن پھر میں نے اپنا یہ خیال رد کردیا۔ اس معاملے کو بڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ میری طرف سے اپنی ان حرکتوں کا کوئی جواب نہ پا کر وہ خود ہی خاموش ہو کر بیٹھ جاتا۔ چند لمحے خاموشی میں گزرے۔ مینو استاد نے دوسرا سگریٹ سلگایا تو شرافت علی کو ایک مرتبہ پھر سگریٹ کی طلب ستانے لگی۔ اس نے مینو استاد سے سگریٹ لے کر ایک لمبا کش سلگایا۔ اس کا منہ اور سینہ چرس کے غلیظ دھوئیں سے بھر گیا اور پھر اس نے وہ تمام دھواں میرے منہ پر اگل دیا۔ مجھے اپنا سانس سینے میں اٹکتا ہوا محسوس ہوا۔

میں نے منہ پھیر کر بری طرح کھانسنا شروع کردیا۔ شرافت علی نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا۔ "استاد میں سمجھا تھا کہ تو نے آج کسی جوان کو اپنی گاڑی پر چڑھالیا ہے پر یہ تو چھوکری سے بھی بدتر نکلا۔ سالے کو ذرا سے دھوئیں کی بھی برداشت نہیں ہے۔" اس کی زہریلی ہنسی نے میرے سر سے پاؤں تک آگ لگا دی۔ میں نے غضب ناک نظروں سے اسے گھورا۔ مینو استاد اسے تنبیہہ کر رہا تھا۔ میری آنکھوں میں طیش کی چمک دیکھ کر شرافت علی اور بھی آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے سگریٹ کا گہرا کش لگایا اور تمام دھواں ایک بار پھر میرے چہرے پر اگل دیا۔ میری آنکھوں میں شدید جلن ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی میرا بایاں ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور شرافت علی کے منہ پر پڑا۔ میرا ہاتھ میری توقع سے کچھ بڑھ کر کارگر ثابت ہوا۔ شرافت علی کا منہ گھوم گیا۔ اگلے ہی لمحے مجھ پر جھپٹا اور میرا گلا جبانا چاہتا تھا لیکن میں نے اس کی دونوں کلائیاں جکڑ کر اسے ڈیش بورڈ کی جانب دھکیل دیا۔ وہ خاصا جاندار نوجوان تھا۔ اسے اپنی طاقت پر زعم' اتنا غلط نہیں تھا لیکن اس کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس کا مدمقابل سیف داد خان تھا۔

''اوئے۔۔۔اوئے یہ تم دونوں کیا کر رہے ہو؟ دماغ تو نہیں چل گیا ہے تم لوگوں کا؟'' مینو استاد نے بوکھلائے لہجے میں کہا اور ٹرک کی رفتار کم کر دی۔ شرافت علی کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اور لبوں کے کنارے سے کف بہہ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کلائیاں چھڑانے کی بھرپور کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ تب اس نے اپنی پشاوری چپل کی ٹھوکر میرے چہرے پر مارنا چاہی لیکن وہ اپنی اس کوشش میں بھی ناکام رہا۔ میں نے اپنی کہنیاں جوڑ کر اس کی ٹانگ اوپر نہ اٹھنے دی۔ ڈرائیونگ کیبن کی تنگ جگہ میں آزادانہ داؤ پیچ آزمانے کی گنجائش بھی کہاں تھی۔ شرافت علی نے ایک بار پھر اپنی کلائیاں چھڑانے کے لیے اپنا پورا زور لگا دیا۔ اس کے جسم کا تمام خون اس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ عین اسی وقت میں نے اس کی کلائیاں چھوڑ دیں۔ اس کا جسم ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف ہٹا اور زوردار آواز کے ساتھ دروازے سے جاٹکرایا۔ اسے اچھی خاصی چوٹ لگی ہوگی۔ وہ ایک لمحے کے لیے ساکت سا ہو گیا پھر اس نے اپنی ہمت کو یکجا کیا اور مغلظات کی بوچھاڑ اگلتے ہوئے ایک بار پھر مجھ پر جھپٹا۔ اس بار میں اس کے استقبال کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میری زوردار ٹھوکر اس کے سینے پر پڑی۔ وہ پیچھے کی طرف الٹ کر ایک بار پھر دروازے سے جالگا۔ اس بار اس کا سر دروازے سے ٹکرایا تھا۔ اسی اثنا میں مینو استاد نے ٹرک کو سڑک کے کنارے کر کے روک لیا۔ ابھی وہ ہم دونوں کی جانب متوجہ ہی ہوا تھا کہ شرافت علی ایک بار پھر مجھ پر جھپٹا۔ اس بار وہ میرا گریبان پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے مجھے اپنے سر کی ٹکر مارنے کی کوشش کی' اس کا نشانہ میرا چہرہ تھا لیکن میں نے ایک طرف جھک کر اپنا چہرہ بچا لیا۔ اس کی ٹکر میرے دائیں کاندھے پر پڑی۔ میں نے اس کی کلائیاں اپنی گرفت میں لے لیں اور اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کی۔ اس دوران میں مینو استاد ٹرک کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور چکر کاٹ کر دوسرے دروازے سے ٹرک میں داخل ہو گیا۔ اس نے شرافت علی کی گردن میں اپنا بازو ڈال کر اسے پیچھے کھینچ لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ میرے گریبان پر اپنی گرفت برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ چنانچہ میں نے اس کی کلائیاں چھوڑ دیں۔ مینو استاد کے لبوں سے نوع بہ نوع گالیاں ابل رہی تھیں' اس کا مخاطب صرف شرافت علی تھا۔ اس نے شرافت علی کو مزید پیچھے کھینچا تو اس نے میرا گریبان چھوڑ دیا۔ مینو استاد کی پشت دروازے سے ٹک چکی تھی۔ اب وہ مزید پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔

میں اگر چاہتا تو بآسانی شرافت علی کو کوئی بھی کاری ضرب لگا سکتا تھا لیکن میں نے ایسی کوئی حرکت نہ کی۔ البتہ میں پوری طرح محتاط تھا۔ جس پوزیشن میں شرافت علی اس وقت تھا اگر وہ کوشش کرتا تو بآسانی ایک زبردست ٹھوکر سے میرے دانت میرے حلق میں اتار سکتا تھا۔ مینو استاد کو بھی اندازہ تھا کہ وہ اس قدر محدود جگہ میں جھگڑے کو ختم نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس نے ایک ہاتھ سے دروازہ کھولا اور خود نیچے اتر گیا۔

اس نے شرافت علی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ ''اتر نیچے۔ بڑا تمیں مار خاں بنتا ہے نا تو۔ تیری تو۔۔۔'' میرا اندازہ تھا کہ اگر شرافت علی چاہتا تو ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا سکتا تھا لیکن وہ چپ چاپ نیچے اتر گیا۔ اس نے ذرا سا بھی زور لگانے کی کوشش نہیں کی۔ ''ذرا اڈے پر پہنچنے دے پھر میں تیرے خون کی

ساری گرمی نکال دوں گا۔ حرامی کا۔۔۔'' شرافت علی چپ چاپ سر جھکائے اس کی ڈانٹ پھٹکار سن رہا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا لیکن اس نے اپنے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا ''سالے کو کتنی بار سمجھایا ہے کہ اپنے آپ پر قابو رکھا کر۔ پر تیری تو کھوپڑی ہی الٹی ہے۔ آئندہ تو نے ایسی کوئی حرکت کی تو۔۔۔'' میں ابھی تک ٹرک میں ہی بیٹھا تھا۔ مینو استاد نے میری طرف دیکھا ''اسے معاف کر دے جوان۔ یہ بچپن سے ہی مرکھنا بیل ہے۔ تو اپنے دل میں اس کے لیے کدورت نہ رکھنا۔''

مجھے بھلا اس سے کدورت رکھنے کی ضرورت تھی۔ وہ کوشش کے باوجود میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ پایا تھا' الٹا خود اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ میں نے مینو استاد کی تائید میں سر ہلا دیا۔ ''مجھے اس سے کچھ نہیں لینا دینا ہے مینو استاد' لیکن اب میں تمہاری گاڑی میں نہیں بیٹھوں گا۔ تم لوگ جاؤ میں کوئی بس پکڑ لوں گا۔''

''ایسی بات نہ کرو جوان۔ لگتا ہے تم ابھی تک ناراض ہو۔ چلو اب غصہ تھوک دو اور اس سے دوستی کر لو۔ یہ بے وقوف ضرور ہے پر دل کا برا نہیں ہے۔ چلو نیچے اترو اور اس سے گلے ملو۔''

میں نے شرافت علی پر ایک گہری نظر ڈالی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ میں نے مینو استاد کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتا تھا' چنانچہ میں اچھل کر ٹرک سے نیچے اتر آیا...... اچانک میرے لباس سے کوئی چیز اچھل کر سیدھی شرافت علی کے پاؤں پر گری۔ شرافت علی کے حلق سے ایک نامانوس آواز برآمد ہوئی۔ میں نے اس چیز کو دیکھا تو میرا دل اچھل کر میرے حلق میں آن پھنسا۔ وہ میرا پستول تھا۔ میرا خوبصورت مگر ہولناک والتھر جس پر صرف ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ کتنا بیش قیمت اور نایاب ہتھیار ہے۔ وہ سیاہ فتنہ شرافت علی کے قدموں میں ڈھیر تھا۔ شرافت علی اور مینو استاد دونوں کی نظریں اس پر جم کر رہ گئی تھیں۔

شرافت علی نے تیزی سے جھک کر میرا والتھر اٹھا لیا۔ میری نظریں تیزی سے آس پاس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس جگہ دور دور تک کوئی آبادی نہ تھی۔ ہم تینوں ٹرک کی آڑ میں تھے' لہٰذا سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیوں کے مسافر بھی ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اگر شرافت علی مجھ پر گولی چلاتا تو میرے لیے اپنا بچاؤ کرنا مشکل ہو جاتا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مینو استاد کا آئندہ ردعمل کیا ہوگا لیکن میں ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ شرافت علی نے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی۔ اس نظر میں نفرت سے زیادہ حیرت کا عنصر غالب تھا۔ اسے شاید ہتھیاروں کی اچھی سوجھ بوجھ تھی۔ اس لیے' اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرے قبضے میں اتنا قیمتی ہتھیار ہو سکتا ہے۔ اس نے میرے پستول کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر اسے مینو استاد کی جانب بڑھا دیا۔

مینو استاد کی نظریں پستول پر کنداں عبارت پڑھنے میں مصروف تھیں۔ وہ انگریزی زبان سے بخوبی واقف تھا۔ ''والتھر۔۔۔ میڈ ان جرمنی!'' اس کی آواز دھیمی مگر معنی خیز تھی۔ میرا ذہن تیزی سے کوئی ایسی کہانی سوچ رہا تھا جو انہیں پوری طرح مطمئن کر سکتی۔ مینو استاد نے ایک بار پھر پستول کا جائزہ لیا اور پھر

اسے میری طرف بڑھا دیا۔ ''ایسی چیزوں کو احتیاط سے رکھا کرو جوان ورنہ کسی دن کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔'' میں نے چپ چاپ پستول اس کے ہاتھ سے لے لیا اور ایک بار پھر اسے اپنے نیفے میں اڑس لیا۔ میرے پاس اس سے محفوظ کوئی جگہ نہیں تھی۔ شرافت علی نے ہلکا سا احتجاج کرنا چاہا لیکن مینو استاد نے اسے کچھ ایسے انداز میں گھورا کہ اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ میرے دماغ پر اندیشوں اور تشویش کے گہرے بادل چھا رہے تھے۔ جو کچھ ہوا تھا وہ اس قابل ہرگز نہیں تھا کہ اسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا۔ شرافت میرے لیے اپنے دل میں شدید کینہ رکھتا تھا۔ ایسے میں یہ پستول ان کی نظروں میں آ گیا تھا۔ میری پوزیشن بے حد نازک ہو گئی تھی۔ شرافت علی کی زبان کی ذرا سی جنبش میرے لیے مصیبتوں کا پہاڑ کھڑا کر سکتی تھی۔ مینو استاد نے اگرچہ کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود یہ بات بالکل واضح تھی کہ اس کے ذہن میں میرے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہوں گے۔ میرے لیے بہتر یہی تھا کہ میں جلد از جلد ان استاد شاگرد سے پیچھا چھڑا لوں' بصورت دیگر یہ دونوں کسی بھی وقت مجھے کسی اندھے کنویں میں دھکا دے سکتے تھے۔

''مجھے تو بس اجازت دے دو مینو استاد۔ ہم لوگوں کا ساتھ بس یہیں تک کا تھا۔'' میں نے اپنے لہجے کو مضبوط بناتے ہوئے کہا۔

''میں تیری یہ بات نہیں مان سکتا غلام سعید خان۔ شرافت علی نے تیرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ میں جب تک اس زیادتی کی تلافی نہ کر لوں' میرے دل کو اطمینان نہیں ہوگا۔ میں پوری ذمے داری لیتا ہوں کہ اب یہ کوئی بدتمیزی نہیں کرے گا۔ اب اگر اس نے ذرا سی بھی گڑبڑ کی تو میں اسے گاڑی سے اتار دوں گا۔''
مینو استاد کا لہجہ دھیما مگر پراثر تھا۔ میرے سارے ارادے اس کے اصرار کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ اس کے اتنے اصرار کے بعد اپنی بات پر اڑے رہنا مجھے کم ظرفی اور احسان فراموشی محسوس ہوئی۔ میں نے تمام اندیشے پس پشت ڈال کر اس کی بات ماننے کا ارادہ کر لیا۔

مینو استاد اسٹیرنگ کے پیچھے بیٹھ گیا۔ مجھے اس نے اپنے پاس بٹھا لیا۔ شرافت علی نہایت شرافت سے کیبن کے دروازے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ وہ بڑی لاتعلقی سے پیچھے کی جانب دوڑتے مناظر کا جائزہ لے رہا تھا' ''شرافت علی کا بچپن بڑی محرومیوں کے درمیان گزرا ہے۔ اس کی جسمانی حالت بہت کمزور تھی۔ اوپر سے اس کا باپ بھی بے حد غریب تھا۔ محلے کے بچے اکثر اسے مارا پیٹا کرتے تھے لیکن یہ رونے دھونے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ شروع سے ہی احساس کمتری کا شکار رہا ہے۔'' مینو استاد سرگوشی کے سے انداز میں مجھے شرافت علی کے متعلق بتا رہا تھا۔ ''اس بات سے تو تم بھی بخوبی واقف ہو گے کہ غریبوں کے بچے فطری طور پر زیادہ سخت جان ہوا کرتے ہیں۔ لہٰذا شرافت علی بھی ہمیشہ سے اپنی ہٹ کا پکا ہے۔ جس بات پر اڑ جائے اسے اس پر سے ہٹانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جب اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اس کے جسم میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں ہوئیں۔ طاقت کا ایک طوفان اس کے رگ و پے میں موجیں مارنے لگا۔ انہی دنوں اسے ورزشوں کا شوق چڑھ گیا۔ یہ کئی کئی گھنٹے مختلف ورزشیں کرتا رہتا۔ نتیجتاً اس کا

جسم بے حد مضبوط اور طاقتور ہو گیا۔ تب اس نے باری باری ان تمام لڑکوں کی خاک چھڑانا شروع کر دیا۔ جنہوں نے اس سے بچپن میں اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنے محلے میں اپنی طاقت کا رعب جما دیا لیکن اس کے اندر یہ کمزوری جڑ پکڑ گئی ہے کہ اسے جونہی کوئی طاقت ور جوان نظر آتا ہے اسے اس کا احساس کمتری ایک بار پھر گھیرنے لگتا ہے۔ اس احساس سے جان چھڑانے کے لیے یہ کوشش کرتا ہے کہ کسی بھی طرح اپنے مدمقابل سے زور آزمائی کر کے اسے نیچا دکھا دے۔ یہ تم سے بھی اسی لیے لڑنا چاہتا تھا کہ اس نے تمہیں اپنے لیے ایک مضبوط چیلنج تسلیم کر لیا تھا۔'' میں نے مینو استاد کی اس طویل وضاحت کے جواب میں استفہامیہ انداز میں سر ہلا دیا۔ میں شرافت علی کی ذہنی حالت کو پہلے ہی کافی حد تک سمجھ چکا تھا۔ مینو استاد نے وضاحت کر کے معاملہ پوری طرح واضح کر دیا۔ مجھے شرافت علی پر غصہ تو پہلے بھی نہیں آ رہا تھا لیکن یہ سب کچھ سن کر مجھے وہ قابل رحم محسوس ہوا۔ میرا بچپن بھی تو اسی طرح زہریلے کانٹوں سے لہولہان ہوتے گزرا تھا۔ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ محرومیوں کا انگاروں بھرا راستہ کتنا اذیت انگیز ہوتا ہے۔ جس شخص نے اس دنیا میں آنکھ کھولنے کے ساتھ ہی نفرت کے زہر کے کڑوے گھونٹ نگلنا شروع کر دیئے ہوں' اس کے اندر محبت کی حلاوت بھلا کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ میں نے شرافت علی پر نگاہ ڈالی۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک نفرت کی چمک تھی۔ مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے فوراً سامنے دیکھنا شروع کر دیا۔

میں مینو استاد سے بات چیت کرتا رہا۔ اس نے مجھ سے میرے متعلق زیادہ سوالات نہیں پوچھے...... زیادہ تر اپنے متعلق بتاتا رہا۔ وہ لوگ اس وقت کراچی سے واپس آ رہے تھے۔ وہ سیبوں کی کھیپ لے کر کراچی گئے تھے۔ یہ سیب وہ بلوچستان سے لائے تھے۔ اس نے مجھے اپنی کمپنی کے دفتر اور گیراج کے متعلق بتایا۔ میں وہ جگہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس نے مجھے پیش کش کی کہ مجھے جب بھی اس کی کسی قسم کی مدد درکار ہو' میں بلاجھجک اس کے پاس پہنچ جاؤں۔ اس نے مجھے اپنے گھر کا پتا بھی سمجھا دیا۔ اس نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ وہ بہت کم گھر پر رہتا ہے۔

ہم لوگ پائیگاہ کے قریب پہنچے تو میں ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔ میری منزل قریب آ چکی تھی۔ مجھے شہر سے چند کلومیٹر پہلے ہی ٹرک سے اتر جانا تھا۔ مینو استاد نے غازی ٹیکسٹائل مل کے سامنے والے چھوٹے سے بازار کے قریب ٹرک ٹھہرا کر ہمیں شربت پلایا۔ اس وقت سورج ڈھل چکا تھا۔ مجھے خاصی بے چینی محسوس ہونے لگی۔ مجھے ایک اچھا خاصا فاصلہ پیدل بھی طے کرنا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ آج ہی رات سردار برکت علی کی حویلی تک پہنچ جاؤں لیکن مینو استاد کو کوئی جلدی نہیں تھی' وہ بڑے اطمینان سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ شرافت علی کا موڈ بدستور خراب تھا۔ میرے الٹے ہاتھ کے گھونسے سے اس کا بالائی ہونٹ سوج گیا تھا۔ جسمانی چوٹ سے زیادہ اسے روحانی اذیت تنگ کر رہی ہوگی۔ میں نے اس کا زعم خاک میں ملا کر رکھ دیا۔ مینو استاد مجھے جس انداز میں اہمیت دے رہا تھا۔ یہ بھی اسے بے حد ناگوار محسوس ہو رہا تھا لیکن وہ مجبور تھا۔ وہ مینو استاد کی طبیعت سے بخوبی واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ حلیم اور بردبار استاد مینو کس وقت بھڑکتے

شعلے کا روپ دھار سکتا ہے۔ اس کی خیریت اسی میں تھی کہ وہ چپ چاپ بیٹھا دل ہی دل میں مجھے کوستا رہے۔

چند ہی منٹ بعد ہم نہر شوریہ کے پل کے پاس پہنچ گئے۔ اس جگہ پر محصول چنگی والوں نے اپنی چوکی بنا رکھی تھی۔ مینو استاد کا ٹرک چونکہ خالی تھا لہٰذا اسے ٹھہرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تاہم اس جگہ تین چار بسیں اور ٹرک اس انداز میں کھڑے ہوئے تھے کہ راستہ تقریباً بند ہو کر رہ گیا تھا۔ مینو اسناد نے ٹرک بالکل آہستہ کر لیا۔ یک لخت میرا دل اچھل کر حلق میں آن پھنسا۔ وہ دو پولیس والے تھے جو ہاتھ ہلا کر ٹرک روکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ ان کے کاندھوں پر چائینز رائفل لٹکی ہوئی تھیں۔ مجھے اپنا انجام قریب محسوس ہونے لگا۔ صورت حال کچھ اس طرح کی تھی کہ میں فوری طور پر وہاں سے فرار بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک بار میں ان پولیس والوں کے پنجے میں پھنس جاتا تو باقی تفصیلات مجھ سے اگلوانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

میں نے گھبرائے ہوئے انداز میں مینو استاد کی جانب دیکھا۔ کیا میں اسے کہوں کہ وہ ٹرک یہاں سے بھگا لے جائے؟ لیکن یہ بھلا میری بات کیوں ماننے لگا؟ اس کی نظریں پولیس والوں پر جمی ہوئی تھیں۔ خلاف توقع اس کے لبوں پر ایک نرم مسکراہٹ تھی۔ وہ قطعاً پریشان نہیں تھا۔ اسے پریشان ہونے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ پریشان تو مجھے ہونا چاہیے تھا۔ جس کی گردن پھندے میں پھنسنے والی تھی۔

ٹرک ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ رک گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرا دل بھی ٹھہر گیا ہے۔ میری نظریں شرافت علی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بڑی آسانی سے اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کر سکتا تھا لیکن وہ بھی بالکل پرسکون نظر آ رہا تھا۔ ایک پولیس والا ٹرک کے سامنے سے گھوم کر مینو استاد کی طرف والی کھڑکی کے پاس آیا ''کیا حال ہے مینو استاد؟ کیسا رہا یہ پھیرا؟'' پولیس والے نے معنی خیز انداز میں مینو استاد کو مخاطب کیا۔ اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے مجھے تھوڑا سا چونکا دیا لیکن اس وقت مجھے صرف یہ خوشی تھی کہ وہ پولیس والے مینو استاد کے واقف ہیں۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ فی الحال میرے لیے خطرے والی کوئی بات نہیں تھی۔ مینو استاد نے اپنے کیبن کا دروازہ کھول کر پولیس والے سے ہاتھ ملایا۔ ''سب ٹھیک ٹھاک رہا تنویر خان! تم بتاؤ تمہارا کیا حال ہے؟''

''بس جی گزارہ ہو رہا ہے۔ ایک پیالی چائے نہیں پیو گے ہمارے ساتھ؟''

''نہیں تنویر خان ہمیں اڈے پر پہنچنا ہے۔ پہلے ہی رات ہو گئی ہے۔''

''دو چار منٹ کے لیے آ جاؤ تو اچھا ہے۔ اپنے شاہ جی بھی آئے ہوئے ہیں۔''

''اچھا شاہ جی تشریف فرما ہیں۔ پھر تو اترنا ہی پڑے گا۔ بہت دنوں سے انہیں سلام نہیں کیا۔ چل بھئی شرافت اتر لے۔''

مجھے اس سارے معاملے سے سخت الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ لوگ جانے کس شاہ جی کی بات کر رہے تھے جبکہ میرے لیے ایک ایک پل بھاری ہو رہا تھا۔ مجھے خود پر غصہ آنے لگا کہ میں نے مینو استاد کی پیشکش قبول کیوں کر لی۔ جلد یا بدیر مجھے کوئی نہ کوئی بس مل ہی جاتی۔ اب تک تو میں کبھی کا اپنی مطلوبہ جگہ پہنچ چکا ہوتا۔ یہ مینو استاد بھی عجیب سی شخص تھا۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ مجھے کتنی جلدی ہے۔ اب اسے اچانک یاد آیا تھا کہ شاہ جی کے نیاز حاصل کرنا بے حد ضروری ہیں۔

مینو استاد ٹرک سے اتر گیا لیکن شرافت علی ابھی تک اپنی جگہ جما بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی ناگواری کے تاثرات تھے۔ مینو استاد نے ایک بار پھر اسے اترنے کا حکم دیا ''ابے اتر بھی آ' نہیں کھاتے تجھے شاہ جی۔'' شرافت علی کے چہرے پر کشمکش کے واضح آثار تھے لیکن اسے اترنا ہی پڑا۔ میں چاہتا تھا کہ میں ٹرک میں ہی ان دونوں کی واپسی کا انتظار کروں لیکن مینو استاد نے میرے لیے بھی نادر شاہی حکم صادر کر دیا ''تو بھی اتر آ غلام سعید خان۔ چند منٹ کی بات ہے ابھی واپس آ جائیں گے۔'' مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مینو استاد کے لہجے میں ہلکا سا طنز پوشیدہ ہے۔ دونوں پولیس والے ٹرک کے پاس کھڑے ہوئے ہمارے منتظر تھے۔ میری ذرا سی ہچکچاہٹ انہیں میری طرف سے مشکوک بنا سکتی تھی۔ میں بے حد آہستگی سے ٹرک سے نیچے اتر آیا۔ اس دوران میں مینو استاد اور شرافت علی دونوں پولیس والوں کی معیت میں محصول کی چوکی کی عقبی سمت میں بڑھ رہے تھے۔

وہ ایک چھوٹا سا حجرہ تھا۔ مینو استاد اور شرافت علی اس کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ جبکہ دونوں پولیس والے واپس لوٹ گئے۔ جاتے جاتے انہوں نے ایک بھرپور نظر مجھ پر ڈالی تھی۔ نیم تاریکی میں وہ میرے تاثرات کا اندازہ نہیں لگا سکے ہوں گے تاہم میرا حلیہ مینو استاد اور شرافت علی سے اتنا مختلف تھا کہ وہ یہ سوچنے پر یقیناً مجبور ہوں گے کہ میرا ان دونوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ میں نے ایک ہلکی سی جھرجھری لی اور حجرے میں داخل ہو گیا۔

حجرے کے اندر کا ماحول دیکھ کر مجھے جھٹکا سا لگا۔ وہ حجرہ پولیس والوں کا عارضی ٹھکانا رہا ہوگا۔ چھت کے ساتھ ایک زرد رو بلب لٹکا ہوا تھا۔ کونے میں ایک میز پر پورٹیبل پنکھا گھر گھر کی آواز کے ساتھ ہوا پھینک رہا تھا۔ پنکھے کی ہوا کا رخ جس چارپائی کی طرف تھا اس پر ایک ہٹا کٹا کلین شیو شخص نیم دراز تھا۔ اس کی عمر چالیس پینتالیس کے قریب رہی ہوگی۔ اس نے اپنی شرٹ اتار کر چارپائی کے سرہانے ڈال رکھی تھی۔ میری نظر جونہی اس شرٹ پر پڑی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری پنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا ہو۔ شرٹ کے شانے پر چمکتے ہوئے تین نقرئی پھول مجھے احساس دلا رہے تھے کہ میں کس طرح آشام دلدل میں آن پھنسا ہوں۔ اسی وقت میری نظر چارپائی کے پائے میں لٹکے ہولسٹر پر پڑی۔ ہولسٹر میں منہ چھپائے سیاہ ریوالور کی جھلک میرے ہوش اڑائے دے رہی تھی۔ حجرے میں اس وقت اس شخص کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہی شخص شاہ جی ہے۔

شاہ جی نے مینو استاد کو دیکھا تو سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کے لبوں پر ہلکا سا تبسم پھیل گیا۔ بڑی بارعب شخصیت تھی اس کی' اسے تھانے دار بنانے والوں نے اس کے لیے بالکل صحیح عہدہ چنا تھا۔ اس کی

آنکھوں میں وہ چمک تھی جو بڑے سے بڑے مجرم کا پتا پانی کر سکتی تھی۔ مینو استاد نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لے بڑھایا۔ شاہ جی کے بڑے بڑے ہاتھوں میں مینو استاد کا ہاتھ بے حد نحیف دکھائی دے رہا تھا۔ "و بھئی استاد مینو کہاں ہو آج کل؟ دکھائی ہی نہیں دیتے۔"

"بس آپ کی نگری میں ہی ہیں شاہ جی۔ تقدیر نے ہمیں سدا کا مسافر بنا دیا ہے' سو در در کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔" مینو استاد نے اس سے مصافحہ کیا اور قریب ہی موجود ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ شرافت علی نے دور سے ہی شاہ جی کو سلام کیا اور مینو استاد کی بغل میں دبک کر بیٹھ گیا اب میری باری تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں ہاتھ ملاتے وقت وہ میرے ہاتھ کی لرزش کو نہ بھانپ لے۔ میری خوش قسمتی یہ تھی مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بھی وہ مینو استاد کی جانب ہی متوجہ تھا۔ البتہ اس نے میرا ہاتھ کافی زور سے دبایا تھا۔ ایسا اس نے غالباً عادت سے مجبور ہو کر کیا' میں نے اپنا ہاتھ نرم ہی رکھا۔ یہ اچھی بات تھی کہ اس نے مجھ پر محض ایک نظر ہی ڈالی تھی۔

"ہاں بھئی استاد مینو تمہارا یہ ٹرپ کیسا رہا؟"

"بس شاہ جی آپ کی دعا چاہیے سب ٹھیک ٹھاک رہا"

"ایک مہینے میں یہ تیسرا ٹرپ ہے نا" شاہ جی کا لہجہ بے حد گھمبیر تھا۔

"ہاں شاہ جی یہ تیسرا پھیرا تھا"

"کیوں بے تیرا کیا حال چال ہے؟" شاہ جی نے کرخت لہجے میں شرافت علی کو مخاطب کیا "کیوں استاد مینو کیسا جا رہا ہے یہ؟"

"بالکل فٹ فاٹ ہے شاہ جی۔ اب تو پوری ڈرائیونگ سیکھ گیا ہے" مینو استاد کے لہجے میں ہلکا سا تمسخر کا احساس تھا۔ اپنے تذکرے پر شرافت علی مزید سکڑ کر مینو استاد کے پیچھے چھپنے لگا۔ شاہ جی نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی۔ "چھپتا کیوں ہے حرام کے پلے۔ میں کیا تجھے کھا جاؤں گا؟" شاہ جی نے گرج کر کہا۔

"نہیں ماماجی ایسی تو کوئی بات نہیں۔" شرافت علی نے منمناتی آواز میں کہا۔

میرے ذہن میں ایک زوردار چھناکا ہوا۔ یہ۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ شاہ جی۔۔۔ یہ تھانے دار اس لڑکے شرافت علی کا ماموں ہے! مینو استاد تو کہہ رہا تھا کہ۔۔۔ اف میرے خدا میں کہاں آن پھنسا ہوں۔ یہ شرافت علی۔ یہ تو میرا جانی دشمن بن گیا ہے۔ یہ تو مجھے ہرگز بخشنے والا نہیں۔ میرے قبضے میں بغیر لائسنس کا پستول تھا اور شرافت علی کو یہ بات معلوم تھی۔ اسے کچھ بھی نہیں کرنا تھا' سوائے اس کے کہ اپنے ماموں کو اشارہ کرتا کہ اس شخص کو بچ کر نہ نکلنے دینا ماماجی۔ اس کے پاس ایک ہولناک ہتھیار ہے۔ یہ یقیناً کوئی پیشہ ور مجرم ہے۔ مجھے حجرے کی چھت ہلکورے لیتی ہوئی محسوس ہوئی۔

عین اسی وقت شاہ جی کی نظر شرافت علی کے سوجے ہوئے ہونٹ پر پڑی "یہ تیرے ہونٹ کو کیا ہوا ہے شرافت علی؟ کیا کسی سے لڑائی ہوئی ہے تیری؟"

میرے قدموں کے نیچے سے زمین تیزی سے سرکنے لگی۔ میری زندگی کا انحصار شرافت علی کے منہ سے نکلنے والے چند الفاظ پر تھا۔ شرافت علی کسمسایا۔ میرا ہاتھ بڑے غیر محسوس انداز میں اپنے والتھر کے دستے پر جم گیا۔ میں نے سوچ لیا کہ میں ہرگز پولیس کے پھندے میں نہیں پھنسوں گا۔ شاہ جی نے اگر مجھے گرفتار کرانے کی کوشش کی تو میں اسے بلاتوقف گولی مار دوں گا۔ اس کے بعد جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

شرافت علی نے اپنی زبان بند رکھی تو شاہ جی اور جھنجھلا گیا۔ "تیری زبان کو تالا لگ گیا ہے کیا؟ بکتا کیوں نہیں۔ کیا ہوا تیرے ساتھ؟"

"کچھ نہیں ہوا ہے شاہ جی۔" شرافت علی کے بجائے مینو استاد نے جواب دیا "بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ ایک جگہ میں نے فل بریک لگایا تو اس کالمنہ ڈیش بورڈ سے جا ٹکرایا۔ ہونٹ میں دانت لگ گیا ہے۔"

"حرامی کو بچپن ہی سے ہوش نہیں ہے۔ ماں غریب کہتے کہتے مر گئی کہ کچھ پڑھ لکھ لے مگر اس نے ایک لفظ پڑھ کر نہ دیا۔ آٹھ دس جماعت پڑھ لیتا تو اسے پولیس میں ہی بھرتی کروا لیتا پر اس بدبخت کے نصیب میں تو در در کی ٹھوکریں لکھی ہیں اوپر سے ہر ایک سے لڑائی مول لیتا پھرتا ہے۔"

مینو استاد اور شاہ جی کی گفتگو سن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مجھے خطرہ ٹلتا ہوا لگا۔ اس حجرے میں مجھے اپنی زندگی کے اعصاب شکن لمحات گزارنے پڑ رہے تھے۔ میں خدا سے دعا کر رہا تھا کہ جلد از جلد یہاں سے جان چھوٹ جائے لیکن میری یہ دعا کچھ زیادہ کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ شاہ جی اچانک میری جانب متوجہ ہوا "تیرا کیا نام ہے جوان؟" اس کی عقابی نظریں میرے چہرے پر گڑی جا رہی تھیں۔ مجھے اپنی رگوں میں لہو کی گردش تھمتی محسوس ہوئی۔ یہ خوف اور ہیجان کی ملی جلی کیفیت تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی اندھیری سرنگ میں سر کے بل لڑھکتا چلا جا رہا ہوں۔ میں کوشش کے باوجود کوئی جواب نہ دے سکا۔ "میں تجھ سے کہہ رہا ہوں۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"غلام سعید خان ہے میرا نام۔" میں نے، خود پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ مجھے اپنی آواز کے استحکام کو محسوس کر کے خوشی ہوئی۔

"ہوں۔۔۔ کہاں کے رہنے والے ہو؟" اس کی چبھتی ہوئی آنکھیں بدستور میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

میں کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ مینو استاد نے میری مشکل آسان کر دی۔ "اپنا ہی بندہ ہے شاہ جی۔ کوٹ چھٹے کے قریب عالم بستی کا زمیں دار ہے۔ اس کا مرحوم باپ میرا سنگی تھا۔ یہ میرے ساتھ ڈیرے جا رہا ہے۔" مینو استاد جانے کیا سوچ کر جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہا تھا۔ شاید وہ مجھے شاہ جی کی جرح سے بچانا چاہتا تھا۔

مینو استاد کی بات سن کر شاہ جی کی آنکھیں کچھ سکڑ سی گئیں۔ "اچھا! مجھے اس کی صورت کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ کیوں جوان تو کبھی تھانے تو نہیں آیا؟"

''کون سے تھانے جی؟'' میں نے اپنے لہجے میں سادگی اور معصومیت سموتے ہوئے پوچھا حالانکہ اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ نے مجھے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بدبخت انسان میری گردن کو جانے کس پھندے میں فٹ کرنا چاہتا تھا۔

شاہ جی کوئی اور سوال کرنے ہی والا تھا کہ تنویر خان نامی سنتری حجرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی بڑی چینک اور چار کپ تھے۔ اپنی رائفل وہ اپنے ساتھی کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ ''شرافت علی تو چائے کی چینک لے لے۔ تنویر تو واپس اپنی ڈیوٹی پر جا۔''

شرافت علی نے ہم تینوں کو چائے دی اور خود بھی ایک کپ چائے لے کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ وہ اب قدرے پرسکون نظر آ رہا تھا۔ میں نے شاہ جی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا کے اس کی جان چھڑوا دی۔ اب شاہ جی کی نگاہوں کا ہدف صرف اور صرف میں تھا۔ میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ میری طرف سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔ تاہم وہ مینو استاد کا لحاظ کر کے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ بصورت دیگر وہ میری پشتوں تک کو کھنگال ڈالتا۔

مجھے حیرت شرافت علی کے طرز عمل کو دیکھ کر ہو رہی تھی۔ اس نے میرے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا۔ یہ مینو استاد کی ہدایت کا ہی نتیجہ ہو سکتا تھا۔ شاہ جی نے کئی بار مجھے غور سے دیکھا اور ہر بار مجھے اپنا خون خشک ہوتا محسوس ہوا۔ چائے ختم ہوتے ہی مینو استاد اٹھ کھڑا ہوا ''ہمیں اب اجازت دیں شاہ جی۔ رات بہت ہو رہی ہے۔ ہمیں اڈے پر پہنچنا ہے۔''

''اچھا مینو استاد جیسی تمہاری مرضی۔ مینیجر صاحب کو میرا سلام کہنا اور ہاں۔ اس شرافت الو کے پٹھے کو اچھی طرح ڈرائیونگ سکھا دو۔ اس کا پکا لائسنس بن جائے تو میں ایک ٹرک خرید کر اس کے حوالے کر دوں گا۔''

''آپ فکر نہ کریں شاہ جی۔ میں سال بھر کے اندر اندر اسے اے ون ڈرائیور بنا دوں گا۔''

مینو استاد نے شاہ جی سے ہاتھ ملایا' شرافت علی نے دور سے سلام کر لیا۔ میں نے شاہ جی سے ہاتھ ملایا تو اس نے دھیرے سے میرا ہاتھ دبا کر کہا ''انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی جوان۔'' مجھے اس کے لہجے میں شک کے ناگ کی پھنکار واضح طور پر سنائی دی۔ اس کا لہجہ کچھ اتنا معنی خیز تھا کہ میں دل ہی دل میں لرز کر رہ گیا۔ ہم تینوں سڑک پر پہنچے تو تنویر خان اور اس کے ساتھی نے مینو استاد کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وہ تینوں بہت گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ مینو استاد سے ان کی واقفیت بہت گہری معلوم ہوتی تھی۔ میں دل ہی دل میں بری طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی بھیڑیے کی بھٹ میں سے بمشکل جان بچا کر نکلا ہوں۔ میری خیریت اسی میں تھی کہ میں جلد از جلد خطرے سے دور نکل جاتا لیکن مینو استاد مسلسل میری راہ کھوٹی کر رہا تھا۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ میں چپ چاپ یہاں سے نکل چلوں لیکن میں اپنی اس سوچ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ ان تینوں کی طولانی گفتگو سے تنگ آ کر شرافت علی ٹرک میں جا چڑھا' البتہ میں وہیں کھڑا رہا۔ وہ تینوں کسی بات پر قہقہے لگا

رہے تھے۔ پھر میں نے تنویر خان کی آواز سنی' وہ مینو استاد سے کہہ رہا تھا ''اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتا میرے بھولے بادشاہ۔ آج رات شاہ جی رت جگا منائیں گے۔ اس حجرے میں آج رات ایک چاند طلوع ہوگا۔ غلام علی' شاہ جی کے لیے بوتل اور چرغے لینے گیا ہے۔ آج رات تو بھی یہیں رک جا۔ ہم بھی جشن منائیں گے۔''

''نہیں بھئی مجھے تو جانا ہے۔ تم لوگ موجیں اڑاؤ میری خیر ہے۔''

''یار استاد مینو تو بھی بڑا ہی خشک آدمی ہے' ذرا سا بھی موج میلہ نہیں کرتا۔''

''اچھا سنگیو پھر ملاقات ہوگی۔'' مینو استاد نے بالآخر ان سے مصافحہ کیا اور ٹرک کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے دونوں پولیس والوں کو محض سر کے اشارے سے سلام کرنا کافی سمجھا۔ اس بار شرافت علی مینو استاد کے ساتھ والی سیٹ پر قبضہ جما چکا تھا تاہم میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ محض چند منٹ بعد میں ٹرک سے اترنے والا تھا۔ بھاڑ میں جائے شرافت علی اور اس کی سیٹ' مجھے اس سے کیا لینا دینا۔

ٹرک سنسان سڑک پر جھومتا چلا جا رہا تھا۔ میں باہر کے ماحول کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ ڈانٹ کی نہر کا پل نزدیک آیا تو میں نے مینو استاد سے کہا ''استاد مجھے نہر کے پل پر اتار دینا۔ وہاں سے میں پیدل اپنی منزل کی جانب چلا جاؤں گا۔''

''تو پاگل تو نہیں ہو گیا ہے سعید خان؟ اتنی رات گئے تو کیسے پیدل سفر کرے گا؟ پتا بھی ہے رات کے ساڑھے دس بج گئے ہیں۔ اس وقت تک تو سارا عالم سو چکا ہوگا۔ کچھ سوچ تو سہی اتنی رات گئے تو کسی کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا اچھا لگے گا۔''

''کچھ بھی ہو استاد۔ مجھے بہر حال جانا تو ہے ہی۔''

''تو صورت حال کو سمجھ نہیں رہا ہے غلام سعید خان۔ اتنی رات گئے سفر کر کے تو خواہ مخواہ اپنے آپ کو مشکوک بنائے گا۔ راستے میں کتے پیچھے پڑ گئے تو الگ مصیبت پیدا ہو جائے گی۔ تو میرے ساتھ چل۔ صبح سویرے تانگا کرائے پر لے کر سیدھا اپنی منزل پر پہنچ جانا۔''

''مینو استاد کے دلائل میں کافی وزن تھا۔ اس نے جو خطرات بتائے تھے ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں میں رات کے اندھیرے میں اپنا راستہ نہ کھو بیٹھوں' اتنی رات گئے میں کس سے راستہ پوچھتا۔ ویسے بھی میں جس جگہ جا رہا تھا وہاں کون سا کوئی میرے لیے چشم براہ تھا۔ برکت علی کی حویلی میں چوری چھپے داخل ہونا کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں تھا۔ مناسب موقعے کے انتظار میں مجھے خدا معلوم کتنا انتظار کرنا پڑتا۔ اگر میں دن میں وہاں پہنچتا تو زیادہ بہتر طریقے سے صورت حال کا جائزہ لے سکتا تھا۔ جہاں میں نے اپنے انتقام کے جہنم کی آگ کو اتنے برسوں تک برداشت کیا تھا' وہاں ایک رات اور سہی۔ شاید اسی میں میری بہتری ہو۔

ڈانٹ کا پل آیا اور گزر گیا۔ مینو استاد نے میری خاموشی کو میری رضامندی سمجھا۔ اب ہم کالج روڈ پر سفر کر رہے تھے۔ بائیں طرف نکلنے والی سڑک کمشنر اور ڈپٹی کمشنر ہاؤس کی طرف جاتی تھی۔ ہم لوگ سیدھا

نکلتے چلے گئے۔ شہر کی رونقیں رفتہ رفتہ ماند پڑنے لگی تھیں۔ یہ سڑک سیدھی بسوں اور ٹرکوں کے اڈے کی طرف جا رہی تھی۔ بائیں طرف ضلعی اسپتال کی خوبصورت عمارت تھی۔ اسپتال والی چورنگی پر پہنچ کر مینو استاد نے ٹرک روک دیا۔ پھر اس نے ڈرائیونگ سیٹ شرافت علی کے حوالے کر دی۔ ''گاڑی کو اڈے پر کھڑا کر کے گھر آ جا۔ آتے ہوئے راستے سے کچھ کھانے کے لیے لیتے آنا۔'' مینو استاد اور میں ٹرک سے نیچے اتر آئے اور شرافت علی ٹرک کو آگے بڑھا لے گیا۔

مینو استاد مجھے اپنے ساتھ لے کر مغرب کی سمت جانے والی اسٹیشن روڈ پر چل پڑا۔ اس وقت وہاں کسی قسم کی سواری موجود نہ تھی۔ اسپتال کی عمارت ہمارے بائیں طرف تھی۔ اس وقت تک تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ صرف دو تین میڈیکل اسٹور ابھی تک کھلے ہوئے تھے۔ یہ میڈیکل اسٹور چوبیس گھنٹے کھلے رہتے تھے۔ دائیں طرف نو بلاک تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ہم چوراہے پر پہنچ گئے۔ دائیں ہاتھ پر میونسپل کمیٹی اور گھنٹا بازار تھا۔ بائیں ہاتھ پر گورنمنٹ ہائی اسکول تھا جہاں میں نے دو سال تک تعلیم حاصل کی تھی۔ ہم دونوں آگے بڑھتے چلے گئے۔ دور سامنے بمبئے ہوٹل کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس ہوٹل کے باہر لان میں رنگین ٹی وی رکھا رہتا تھا۔ آس پاس کے لوگ رات گئے تک وہاں بیٹھے گپیں لگاتے رہتے اور ساتھ ساتھ ٹی وی پروگرامز سے بھی لطف اندوز ہوتے رہتے۔ ہوٹل کے سامنے وہ عمارت تھی جس سے میں بچ کر گزرنا چاہتا تھا۔ تھانہ صدر، بمبئے ہوٹل کے سامنے ہی واقع تھا اور اکثر پولیس کے سپاہی ہوٹل پر بیٹھے چائے وغیرہ پیتے رہتے تھے۔ ہم کچھ اور آگے بڑھے اور دائیں ہاتھ کی طرف والی سڑک پر مڑ گئے۔

یہ علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ اس محلے کو محلہ گجراں کہا جاتا ہے۔ کچھ ہی دور چلنے کے بعد ہمیں سڑک کے دونوں اطراف میں بھینسیں بندھی ہوئی نظر آئیں۔ مینو استاد مجھے ساتھ لے کر ایک گلی میں مڑ گیا۔ نیم تاریک گلی میرے لیے اجنبی تھی۔ خیریت یہ رہی کہ اس گلی میں بھینسیں نہیں بندھی تھیں ورنہ ہمارا گزرنا مشکل ہو جاتا۔ مینو استاد ایک گھر کے سامنے رک گیا۔ نیم تاریکی کے باوجود مجھے دروازے میں لگا قفل صاف نظر آ رہا تھا۔ مینو استاد نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر کنجی نکالی اور قفل کھول دیا۔ مینو استاد اندر داخل ہوا اور ٹٹول ٹٹول کر بتی جلا دی۔ وہ ایک چھوٹا سا دالان تھا۔ اس کی حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ مہینوں سے اس کی صفائی نہیں کی گئی۔ ہر طرف کاٹھ کباڑ بکھرا ہوا تھا۔ دالان کے درمیان میں تین چار چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان چارپائیوں کی پائنتی پر پڑے ہوئے بستر بھی میلے نظر آ رہے تھے۔ اس گھر نے شاید مدت سے کسی عورت کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ دالان میں دو کمروں کے دروازے کھلتے تھے لیکن اس وقت ان دونوں ہی دروازوں پر موٹے موٹے قفل پڑے ہوئے تھے۔ مینو استاد نے چھت کا پنکھا چلا دیا۔ جس کی وجہ سے گھٹن کم ہو گئی۔

مینو استاد ایک چارپائی پر دراز ہو گیا۔ میں نے بھی اس کے ساتھ والی چارپائی پر قبضہ جما لیا۔ مجھے سخت بھوک محسوس ہو رہی تھی لیکن صبر کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ مینو استاد نے کھانا لانے کی ذمے داری شرافت علی کو سونپی تھی۔ خدا جانے وہ کتنی دیر میں واپس آتا۔

چند لمحوں تک ہم دونوں خاموش رہے۔ بالآخر گفتگو کی ابتدا مینو استاد نے کی۔ ''دوست محمد شاہ سے ہوشیار رہنا سعید خان۔ وہ بے حد خطرناک شخص ہے۔ وہ تمہیں کسی بڑی مصیبت میں بھی پھنسا سکتا ہے۔''

''لیکن میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا۔''

''اس بات کو بھول جا سعید خان کہ تو نے کوئی جرم کیا ہے یا نہیں۔ ان پولیس والوں کی نہ دوستی اچھی نہ دشمنی۔ یہ اگر چاہیں تو بڑے بڑے جرم کو نظر انداز کر دیں اور اگر کسی کو زیرِ عتاب لانا چاہیں تو اپنے پاس سے نت نئے الزامات عاید کر دیں۔ ان کو پوچھنے والا کون ہے بھائی۔''

''تم صحیح کہہ رہے ہو مینو استاد، واقعی ان لوگوں کا احتساب کرنے والا کوئی نہیں ہے۔'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ ایسے سوالات نہ پوچھنا شروع کر دے جن کے جواب دینا میرے لیے دشوار ہو۔ ہم دونوں کچھ دیر خاموش اپنی سوچوں میں گم رہے۔ میرا ذہن ابھی تک شاہ جی میں اٹکا ہوا تھا۔ کیا واقعی مجھے سیف داد اخان کی حیثیت سے پہچانتا ہے؟ لیکن اس نے میری شکل پہلے کہاں دیکھی ہوگی؟ سردار جاہ مراد یعنی رتا سائیں والے واقعے کو اچھا خاصا عرصہ بیت چکا تھا۔ کیا سردار شاہ مراد نے میری کوئی تصویر پولیس والوں کو دی ہوگی؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، چچا مہر داد کے گھر میں میری کوئی تصویر نہیں تھی۔ اسکول کے ریکارڈ میں میری ایک آدھ تصویر ہوگی بھی تو وہ اتنی پرانی ہوگی کہ اس کے ذریعے میری شناخت بہت مشکل ہوتی۔ آخر شاہ جی نے یہ دعویٰ کیوں کیا کہ وہ پہلے بھی مجھے دیکھ چکا ہے۔

''کافی دیر ہو گئی شرافت علی ابھی تک واپس نہیں آیا، نہ جانے کدھر رہ گیا ہے؟'' مینو استاد نے ماحول پر چھائی سکوت کی چادر کو چاک کر دیا۔ ''عجیب الٹے دماغ کا چھوکرا ہے۔ مجھے ہر وقت یہی خوف رہتا ہے کہیں راستے میں کسی سے الجھ نہ پڑا ہو۔''

''آ جائے گا استاد۔ اڈے سے یہاں تک کا فاصلہ بھی تو اچھا خاصا ہے۔'' میں نے اپنی بات ختم کی ہی تھی کہ شرافت علی گھر میں داخل ہوا۔

''ابے کہاں رہ گیا تھا تو؟''

''ناراض نہ ہو استاد۔ اپنے سامنے کڑھائی بنوائی ہے۔ کھائے گا تو مزا آ جائے گا۔'' شرافت علی نے جلدی جلدی کہا۔ اس نے کھانے کا بڑا سا شاپنگ بیگ درمیان والی چارپائی پر رکھ دیا اور خود ایک کونے کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ واپس لوٹا تو اس کے ہاتھ میں کچھ برتن تھے۔ اس نے کڑھائی گوشت کو تین بڑی بڑی رکابیوں میں نکال لیا۔ روٹیاں بھی وہ ڈھیر ساری لے کر آیا تھا۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ کھانا ابھی تک گرم تھا۔ بھوک نے ہم تینوں پر اتنی شدت سے یلغار کر رکھی تھی کہ ہم میں سے کوئی بھی مزید توقف کے لیے تیار نہ تھا۔ ہم نے فوراً ہی کھانا شروع کر دیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر شرافت علی نے برتن اٹھا کر ایک طرف رکھے اور فوراً ہی ایک چارپائی پر دراز ہو گیا۔ مینو استاد نے سگریٹ سلگا لیا۔ چرس کے سلگنے کی ناگوار بو نے فضا کو قدرے مکدر کر دیا۔ مجھے اس بو سے الجھن ہو رہی تھی۔ تاہم میں نے اپنے تاثرات کو ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں اس کا منت احسان تھا۔

مینو استاد کی سگریٹ ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ شرافت علی کے خراٹے گونجنے لگے۔ مینو استاد کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے اس کے تخیلات میں خلل اندازی سے گریز کیا۔ سوچنے کے لیے میرے پاس کونسا عذاب تھا لیکن اس وقت میں صرف مینو استاد کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنے طرزِ عمل سے خود کو سلجھا ہوا شخص ثابت کیا تھا۔ وہ شاید کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ اس شخص کو سرد گرم چشیدہ تو ہونا ہی چاہیے تھا۔ تاہم اس نے ابھی تک اپنے متعلق مجھے بہت کم بتایا تھا۔ شاہ جی نامی اس تھانے دار کے ساتھ اس کی گفتگو خاصی معنی خیز تھی۔ جس انداز میں شاہ جی اس کے پھیروں کا ذکر کر رہا تھا۔ اس سے دل میں کچھ کالا دکھائی دیتا تھا۔ مینو استاد کسی کالے دھندے میں ملوث تھا' تاہم مجھے اس کے برے بھلے کردار سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ہر انسان میں کچھ نہ کچھ خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں۔ ہم اگر صرف خامیاں ہی اپنی نظر میں رکھیں تو اس دنیا میں تنہا رہ جائیں۔ مینو استاد ایک ہمدرد اور ملنسار شخصیت کا مالک تھا' میرے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ اس نے مجھے جس طرح شاہ جی کے پنجے سے بچایا تھا' اس کے بعد سے میں اسے قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔

میں نے شرافت علی پر نظر ڈالی۔ وہ بڑی بے فکری کی نیند سو رہا تھا۔ اس کا اوپری لب سوج کر بہت بد نما دکھائی دینے لگا۔ وہ خوش شکل نوجوان تھا۔ دراز قد اور کسرتی بدن کا مالک۔ یہ سر پھرا نوجوان میرا دشمن بن بیٹھا تھا حالانکہ میرے دل میں اس کے لیے کوئی مخاصمت نہ تھی۔ اگر وہ میری طرف سے اپنا دل صاف کر لیتا تو ہم دونوں میں اچھی نبھ سکتی تھی۔

''تم سوچ تو رہ ہو گے غلام سعید خان کہ تم سے خواہ مخواہ اتنی اپنائیت کا مظاہرہ کیوں کر رہا ہوں'' مینو استاد کی گھمبیر آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں چپ چاپ اس کی شکل دیکھتا رہا۔ قدرے توقف کے بعد مینو استاد نے اپنی بات آگے بڑھائی ''دراصل بات یہ ہے غلام سعید خاں کو تمہیں دیکھ کر مجھے اپنی نوجوانی کا دور یاد آ گیا ہے۔ اپنی نوجوانی کے دور میں میری صحت بھی تمہاری جیسی تھی۔ اپنی نوجوانی کے دور میں میری صحت بھی تمہاری جیسی تھی۔ بڑا شوق تھا مجھے کسرت کرنے کا۔''

مینو استاد ایک بار پھر یادوں کی دنیا میں گم ہو گیا۔ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے یکسر لاتعلق ہو چکا تھا۔ جب وہ کافی دیر تک کچھ نہ بولا تو میں نے اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالات کو زبان دینے کا فیصلہ کیا

''ایک بات پوچھوں استاد''

میری آواز سن کر مینو استاد چونک اٹھا ''ہاں ہاں پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

ذرا ذاتی سا سوال ہے'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''تم پوچھو تو سہی یار۔'' مینو استاد نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔

''استاد تم اس گھر میں اکیلے رہتے ہو؟ تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟ میرا مطلب ہے تمہارے بیوی بچے۔۔۔''

میری زبان سے نکلنے والے الفاظ سن کر مینو استاد کے چہرے پر راکھ سی بکھر گئی۔ وہ تھوڑا سا کسمسایا

۔''سب کچھ تھا میرے پاس میرے بھائی لیکن میں وہ بد بخت ہوں جس نے اپنے ہی ہاتھوں اپنے گلشن میں آگ لگا دی۔'' اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس کا جواب سن کر میرے دل کو دھکا سا لگا۔ میں نے لاعلمی میں جانے اس کے کون سے زخم ہرے کر دیے تھے۔ اس کی پرسکون سی کیفیت کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ شدید مضطرب نظر آ رہا تھا۔ میں نے مزید کوئی سوال نہیں کیا لیکن وہ خود ہی بات آگے بڑھا رہا تھا۔ ''لوگ کہا کرتے ہیں کہ اگر کسی کو سچی محبت مل جائے تو پھر اسے کسی شے کی ضرورت نہیں رہتی لیکن میں وہ بد قسمت ہوں جس نے اس انمول خزانے کو اپنے ہاتھوں مٹی میں ملا دیا۔'' وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ میں نے اپنی زبان بند رکھی۔ میں اس گفتگو کے تسلسل کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ''میں یہ سب کچھ تمہیں اس لیے سنا رہا ہوں کہ تم ابھی نوجوان ہو۔ تمہارے سامنے ساری زندگی پڑی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ خدانخواستہ تم بھی میری طرح پچھتاووں کی آگ میں جلتے رہو۔ جو کچھ میں تمہیں بتانے والا ہوں اسے غور سے سنو اور سبق سیکھنے کی کوشش کرو۔ تمہاری عمر کے نوجوان خوابوں کی دنیا میں گم رہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہمیشہ اسی دنیا میں کھوئے رہیں۔ انہیں ہوش اس وقت آتا ہے جب سب کچھ برباد ہو چکا ہوتا ہے۔''
مینو استاد ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ وہ شاید اپنی یادوں کو مجتمع کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک بار پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ وہ مجھے اپنے گزشتہ کل کے متعلق بتا رہا تھا۔

کروڑ پکا کا چھوٹا سا' پرسکون شہر مہم جو فطرت کے محمد امین کو قطعی پسند نہیں تھا۔ وہ کسی آزاد پنچھی کی طرح کھلی فضاؤں میں پرواز کرنا چاہتا تھا۔ نئے علاقے' نئے مقامات دیکھنا اس کا شغل تھا۔ اس نے ابھی میٹرک ہی کیا تھا کہ اسے اپنی فطرت سے ہم آہنگ ایک کام مل گیا۔ اس کے ایک رشتے دار کا ماموں ٹرک ڈرائیور تھا۔ وہ امین کی ماں سے ملنے آیا تو اس کو اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ کلینر کا کام امین کو بے حد پسند آیا۔ وہ ٹرک کے ساتھ شہر شہر گھومتا رہتا۔ اس کے ماموں فضل الرحمٰن نے اسے ڈرائیونگ بھی سکھانا شروع کر دی۔ جس ٹرک پر امین کلینر تھا' وہ ملتان کی ایک گڈز کمپنی کی ملکیت تھا۔ اب امین ملتان ہی رہا کرتا تھا۔ البتہ وہ مہینے میں ایک آدھ چکر اپنے گھر کا بھی لگا لیا کرتا۔ اس کے ماموں فضل الرحمان کا گھر اندرون بوہڑ گیٹ' ایک گنجان علاقے میں واقع تھا۔ امین اپنے ماموں کے گھر ہی رہا کرتا۔ اس کے ماموں کا ایک ہی بیٹا جو کالج کا طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ امین کا ہم عمر بھی تھا۔

انہی دنوں امین نوشابہ کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ نو عمری کی محبت سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کر لیا کرتی ہے۔ امین کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ نوشابہ کے علاوہ دنیا کی ہر شے فراموش کر بیٹھا۔ نوشابہ اگر خوبصورت اور پرکشش تھی تو امین بھی دراز قد' گھبرو جوان تھا۔ اگر نوشابہ نے امین کو دیوانہ کر دیا تھا تو وہ خود بھی اس کی اسیر ہو گئی تھی۔ امین کا دل اب کام میں نہیں لگتا تھا۔ وہ مختلف بہانے کر کے ٹرک کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتا تا کہ زیادہ سے زیادہ وقت گھر پر گزار سکے اور نوشابہ کے دیدار سے اپنا دل شاد کرے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی وارفتگی میں اضافہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ وہ وقت آن پہنچا جب امین کو اپنی زندگی نوشابہ کے بغیر بے معنی محسوس ہونے لگی۔ اس نے اپنے ماموں اور ممانی سے کہا کہ

نوشابہ کے والدین سے رشتہ طلب کریں لیکن ان دونوں نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ امین کی آنکھوں پر تو عشق کی پٹی بندھی ہوئی تھی لیکن وہ دونوں تو تمام صورت حال کو واضح طور پر دیکھ سکتے تھے۔ نوشابہ کا باپ شیخ کرم الٰہی ایک ٹھیکے دار ہونے کے باعث بے شمار دولت کا مالک تھا۔ محلے میں سب سے شاندار مکان اسی کا تھا' خاندانی طور پر بھی وہ لوگ بڑی شان و شوکت والے تھے، جبکہ امین ایک معمولی ٹرک کلینر تھا۔ یہ کمخواب میں ٹاٹ کا پیوند لگانے کے مترادف بات تھی۔ امین کا ماموں جانتا تھا کہ اگر اس نے ہمت کر کے نوشابہ کے والد سے بات کر بھی لی تو انکار کے علاوہ کوئی جواب نہیں ملے گا۔ اگر وہ لوگ اس جرات کو اپنی ناراضگی کی نظر سے دیکھتے تو معاملہ بگڑ بھی سکتا تھا۔ انہوں نے امین کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ باز نہ آیا۔ اس نے اپنے ماموں کو مجبور کیا کہ وہ ایک بار نوشابہ کے باپ سے اس کے رشتے کے متعلق بات تو کر کے دیکھے۔ مجبوراً فضل الرحمان نے نوشابہ کے باپ شیخ کرم الٰہی سے دبے لفظوں میں رشتے کی بات کی۔ شیخ کرم الٰہی نے نرم لیکن دوٹوک انداز میں اس رشتے داری سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ وہ لوگ صرف اپنی برادری میں شادی کیا کرتے ہیں۔ ویسے بھی امین ان لوگوں کے معیار سے بہت کم تر تھا۔ شیخ کرم الٰہی نے ڈھکے چھپے الفاظ میں فضل الرحمان پر واضح کر دیا کہ اس انکار کے بعد امین کی زبان پر کبھی نوشابہ کا نام نہیں آنا چاہیے۔ ورنہ اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔

فضل الرحمان نے یہ سب کچھ اپنے بھانجے امین کو بتایا تو اس پر بجلی سی گر پڑی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے خوابوں کی حسین جنت اس طرح اجڑ جائے گی۔ نوشابہ کی محبت اس کی زندگی کی واحد خوشی تھی اور اب یہ خوشی اس سے چھینی جا رہی تھی۔ طبقاتی تفاوت کی سنگلاخ دیوار ان دونوں کے پیار بھرے دلوں کے درمیان حائل ہو چکی تھی۔ وہ اس دیوار سے ٹکرا کر لہولہان تو ہو سکتا تھا لیکن اسے مسمار کرنا' اس کے بس کی بات نہ تھی۔ امین نے نوشابہ سے ملنے اور اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس دن کے بعد وہ نوشابہ کا سایہ تک نہ دیکھ سکا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید نوشابہ کو جبراً کوٹھی میں مقید کر کے رکھا گیا ہے لیکن اس کی یہ غلط فہمی بھی ایک دن رفع ہو گئی' جب نوشابہ کی ایک راز دار سہیلی نے امین کو نوشابہ کا آخری پیغام پہنچایا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ایک شریف اور عزت دار باپ کی فرماں بردار بیٹی ہے۔ اسے اپنے والدین کی خوشیاں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں۔ امین نوشابہ کو بھول جائے۔ آئندہ اس کی زبان پر کبھی نوشابہ کا نام نہیں آنا چاہیے۔

یہ پیغام پا کر امین کی بچی کھچی امیدیں بھی چکنا چور ہو گئیں۔ اس کا دل زندگی سے اچاٹ ہو گیا۔ وہ اب مکمل طور پر گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ اس نے ٹرک کے ساتھ جانا بھی چھوڑ دیا۔ ٹھیک تین مہینے بعد نوشابہ کی شادی ہو گئی اور وہ بیاہ کر اپنے پیا کے سنگ پردیس سدھار گئی۔ امین کی زندگی کی رہی سہی رمق بھی چھن گئی۔ وہ نیم پاگل سا ہو گیا۔ اس کی اس حالت سے پریشان ہو کر فضل الرحمان نے اسے اس کی ماں کے پاس کروڑ پکا پہنچا دیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اس کی بوڑھی ماں حواس باختہ ہو گئی۔ وہ سمجھی کہ اس کے اکلوتے بیٹے کو کوئی خطرناک بیماری لگ گئی ہے۔ امین ہر وقت گم صم اور اپنے آپ میں کھویا رہتا۔ اس کی ماں نے

اس کی دل جوئی کی بہتیری کوشش کی لیکن بے سود۔

امین کی یہ حالت تقریباً تین ماہ تک برقرار رہی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ کچھ حالات سدھرنے لگے مگر نوشابہ کی یاد اب بھی اس کے دل پر نشتر چلاتی تھی۔ تاہم اب اسے اس کرب کو برداشت کرنے کا سلیقہ آ گیا۔ اس کا دل اب بھی غم ہجر کی آگ سے پگھلتا تھا لیکن اب وہ آنکھوں کی راہ سے چھلکتا نہیں تھا۔ امین کے ماموں نے اس کی ماں سے نوشابہ کا ذکر نہیں کیا تھا۔ خود امین اس زخم کو اپنے نصیب کا لکھا سمجھ کر فراموش کرنے کی کوشش کر ہی رہا تھا لیکن یہ اتنا آسان کام ہوتا تو بات ہی کیا تھی۔

کچھ دن بعد جب معاشی پریشانیوں نے امین کی ماں کو بہت تنگ کرنا شروع کر دیا تو اس نے اپنے بیٹے کو کہا کہ وہ کوئی کام کاج کرے تاکہ گھر کی گاڑی کو جیسے تیسے چلایا جا سکے۔ امین خود بھی زندگی کے جمود سے بیزار تھا۔ اس نے اپنی ماں کی بات مان لی لیکن سوال یہ تھا کہ وہ کیا کام کرے۔ وہ ایک تجربہ کار ٹرک کلینر تھا اور کسی حد تک ڈرائیونگ بھی کر لیتا تھا لیکن اب وہ واپس ملتان نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کے اپنے شہر میں چند لوگوں کے پاس ٹرک تھے تو سہی لیکن امین اپنے جانے پہچانے لوگوں سے کہیں دور جانا چاہتا تھا۔ انہی دنوں اس کا ماموں فضل الرحمان اس کے گھر آیا۔ وہ امین کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن امین اسے بتایا کہ وہ ملتان نہیں جانا چاہتا فضل الرحمان اپنے بھانجے کی ذہنی حالت کو سمجھتا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اس کے لیے کوئی اور جگہ تلاش کرے گا۔

فضل الرحمان نے امین کے لیے کوشش کی اور کامیاب رہا۔ اس نے اپنے ایک واقف کار ڈرائیور کی مدد سے امین کے لیے ڈیرہ غازیخان میں نوکری کا انتظام کا دیا۔ اگرچہ یہ شہر امین کے اپنے شہر سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا تاہم امین نے وہاں کام کرنے کی ہامی بھر لی۔ وہ ایک بار پھر اپنے پسندیدہ پیشے میں آ گیا۔ شروع کے دنوں میں اس نے خود کو نئے لوگوں میں اجنبی اجنبی سا محسوس کیا لیکن پھر رفتہ رفتہ وہ ان لوگوں میں گھلتا ملتا چلا گیا۔ وہ نوشابہ کو اب بھی بھولا نہیں تھا۔ تاہم اس کی یادوں کے چمکدار عکس پر گرد کی ہلکی سی تہہ چڑھنے لگی۔

وقت تیزی سے گزرتا گیا۔ ایک دو اور پھر تین سال بیت گئے۔ امین اب ماہر ڈرائیور تھا۔ اس نے لائسنس بھی حاصل کر لیا' اس کی آمدنی بھی کافی بڑھ گئی۔ وہ اس عرصے کے دوران میں وقتاً فوقتاً کروڑ پکے کا چکر لگاتا رہا۔ جب سے کمپنی والوں نے اسے باقاعدہ ٹرک ڈرائیور بنایا تھا' اس کی ماں کا اصرار بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ وہ جلد از جلد شادی کر لے۔ اس نے اپنے بیٹے کے لیے ایک لڑکی ڈھونڈ رکھی تھی۔ بقول اس کے اس نے جو لڑکی تلاش کی تھی وہ لاکھوں میں ایک تھی' سگھڑ' نیک' سیدھی سادھی اور فرماں بردار۔ اس پر اضافی خوبی یہ کہ اس کا تعلق ایک بے حد غریب گھرانے سے تھا۔ اس کا بس چلتا تو فوراً اپنے بیٹے کے سر سہرا سجا دیتی لیکن اس کے اس ارادے کی راہ میں امین رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ وہ جب بھی اس کی شادی کا ذکر کرتی وہ کنی کترا جاتا۔ وہ ابھی اپنے آپ میں نوشابہ کے علاوہ کسی اور کو اپنی دلہن کے روپ میں دیکھنے کی ہمت نہیں پاتا تھا۔ بالآخر امین کی ماں کا اصرار اتنا بڑھ گیا کہ امین کی قوت مزاحمت دم توڑ گئی۔ وہ اپنی ماں

کی عادت اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے مزید انکار کیا تو ماں آپے سے باہر ہو جائے گی۔

امین نے جونہی شادی کے لیے رضامندی ظاہر کی اس کی ماں' رشیدن نے اپنے بیٹے کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پچھلے کچھ عرصے سے ان لوگوں کی مالی حالت کچھ سدھر گئی تھی۔ رشیدن نے امین کے سسرال والوں سے ایک ماہ بعد کی تاریخ لے لی۔ امین کو اپنی شادی سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ اس نے کسی معاملے میں بھی مداخلت نہ کی۔

ایک ماہ بعد امین اپنی دلہن نسیمہ کو بیاہ کر اپنے گھر لے آیا۔ پہلی رات کو جب امین نے نسیمہ کا گھونگھٹ اٹھایا تو اسے دھچکا سا لگا۔ وہ شاید غیر شعوری طور پر گھونگھٹ کے پیچھے سے نوشابہ کے دلربا چہرے کا منتظر تھا۔ نسیمہ کا چہرہ اسے بے حد پھیکا' بے حد اجنبی محسوس ہوا۔ نسیمہ عام سی شکل و صورت کی سیدھی سادھی لڑکی تھی۔ وہ نہایت کسمپرسی کے عالم میں جوان ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ کڑے وقت کے تھپیڑے سہ سہ کر کملا گیا تھا۔ امین کو اس کے چہرے میں نوشابہ کے ہوشربا حسن کی جھلک بھلا کیسے نظر آتی۔ اس کا رویہ نسیمہ کے لیے سرد مہری پر مبنی ہوتا چلا گیا۔ نسیمہ کی جگہ اگر کوئی تیز طرار لڑکی ہوتی تو شاید امین کے رویے سے ہی اصل بات بھانپ لیتی لیکن اس جیسی سادہ لوح لڑکی کے لیے یہ سب کچھ ناقابل فہم تھا۔ وہ اپنے شوہر کے رویے کو اس کی عادت سمجھ کر اپنے مقدر پر راضی بہ رضا ہو گئی۔

امین مہینے میں دو چار مرتبہ گھر آتا۔ وہ جب تک گھر پر رہتا' اس کا رویہ نسیمہ کے ساتھ بے حد ناروا ہوتا۔ وہ بے چاری صبر و شکر کے ساتھ اس کی ہر زیادتی برداشت کر لیتی۔ نسیمہ کی ساس رشیدن کا رویہ اس معاملے میں عجیب و غریب تھا۔ اس کا بیٹا اس کے سامنے اس کی بہو کو بدسلوکی کا نشانہ بناتا لیکن وہ اسے ہرگز نہ ٹوکتی۔ یہ سب کچھ اس کی امنگوں کے مطابق ہو رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس کے بیٹے نے اپنی بیوی کے ناز اٹھانا شروع کر دیے تو وہ سر پر چڑھ جائے گی۔ اس صورت میں گھر کی مملکت پر اس کی گرفت کمزور پڑ جاتی۔ یہ رشیدن کو ہرگز گوارا نہ تھا کہ اس کی بہو اس کے بیٹے کو وقتاً فوقتاً اپنی بہو کے خلاف بھڑکاتی رہتی۔ ''عورت پاؤں کی جوتی ہے مینو بیٹا۔ اس کی جگہ پیروں میں ہی ہے۔ اگر تم نے اسے ذرا بھی ڈھیل دی تو یہ سر پر چڑھ جائے گی۔ تو میرا بیٹا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تو زن مرید نہیں بن سکتا۔''

امین کے دل میں نسیمہ کے لیے تو ویسے بھی کوئی جگہ نہ تھی پھر وہ اپنے اوپر زن مریدی کا ٹھپا کیوں لگواتا۔ اس کا رویہ نسیمہ سے بد سے بدتر ہوتا چلا گیا۔ رشیدن خود بھی وقت بے وقت نسیمہ کو دھتکارتی رہتی۔ ''اپنی اوقات یاد رکھ بھکاری کی اولاد۔ جب سے تو اس گھر میں آئی ہے پورے گھر پر نحوست چھا گئی ہے۔ میرے چاند سے بیٹے کا چہرہ بھی روز روز کملاتا جا رہا ہے۔''

''اماں آپ مجھے جو جی چاہے کہیں لیکن خدا کے لیے میرے مرے ہوئے باپ کو کچھ نہ کہا کریں۔ ہم غریب ضرور ہیں مگر بھکاری نہیں۔'' نسیمہ دھیمی آواز میں کہتی۔

''ہاں تو تو راجا کی بیٹی ہے۔ تیری رانی ماں نے تیرے ساتھ سونے سے بھرے ہوئے صندوق بھیجے

تھے۔ ان ہی صندوقوں سے تو ہماری دال روٹی چل رہی ہے۔'' رشیدن اپنے بیٹے کے سامنے نسیمہ کو طعنے اور کوسنے دیتی رہتی اور وہ بے حس سنتا رہتا۔ وہ اپنی بیوی کے حق میں بول کر زن مرید تو نہیں بن سکتا تھا نا۔

امین کی شادی کو چھ مہینے ہی گزرے تھے کہ رشیدن کو اپنے پوتے پوتیوں کی لگن ستانے لگی جن کی آمد کے فی الحال کوئی آثار نہ تھے۔ رشیدن کو ایک نیا طعنہ مل گیا۔ ''پتا نہیں اس منحوس کے بچے ہوں گے بھی کہ نہیں۔ مجھے تو خطرہ ہے کہیں یہ بانجھ نہ ہو۔'' نسیمہ یہ سب سنتی اور کسی کونے کھدرے میں چھپ کر بلک بلک کر روتی۔ وہ اپنی غلطیوں کو تو کسی نہ کسی طرح دور کر لیتی لیکن قدرت کی مرضی میں وہ کیسے دخل دے دیتی۔ اس کی حساس طبیعت کے لیے یہ سب کچھ تیزاب کی طرح تھا۔ روز روز کی بلا جواز لعنت ملامت پر وہ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔ جب بھی ایسی کوئی ناخوشگوار صورت حال پیدا ہوتی اس کا کھانا پینا چھوٹ جاتا۔ اس کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ اس کے چہرے کی رونق اور شگفتگی رخصت ہو چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا قصور کیا ہے۔ اس نے اپنے شوہر اور اپنی ساس کا کیا بگاڑا ہے کہ وہ دونوں اس کو ایک پل کے لیے معاف کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اس کے بس میں محض آنسو بہانا تھا جو وہ دل کھول کر بہاتی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے وجود میں زندگی کی رمق کم ہوتی چلی گئی۔

شادی کے تقریباً ایک سال بعد نسیمہ کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشخبری ملی۔ رب ذوالجلال نے اس کی آنسوؤں بھری التجا کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت بخشا۔ اس کی کوکھ میں ایک معصوم وجود پرورش پا رہا تھا۔ اس خبر کو سن کر رشیدن بہت خوش ہوئی اس کا رویہ اپنی بہو کے ساتھ قدرے بہتر ہو گیا۔ نسیمہ کو امید تھی کہ اس خوش خبری کو سن کر امین کے رویے میں بھی مثبت تبدیلی آئے گی لیکن اس کا یہ خیال اس کی خوش فہمی ثابت ہوا۔ امین اپنی بیوی کے لیے بدستور بے مہری اور بے حسی کا رویہ اپنائے ہوئے تھا۔ نسیمہ نے اپنی ساس کے کسی قدر بہتر رویے کو ہی اپنے لیے غنیمت سمجھا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا نسیمہ کی جسمانی حالت میں ابتری آتی چلی گئی۔ اسے دن رات چکر آتے۔ خون کی کمی سے اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اسے آرام کی اور طاقتور غذاؤں کی شدید ضرورت تھی لیکن اسے یہ سب کچھ کون مہیا کرتا۔

اس دن امین اپنے گھر پہنچا تو اس نے اپنی بیوی کو سر پر دوپٹا باندھے جھاڑو دیتے دیکھا۔ کمزوری کی وجہ سے اس کے لیے جھک کر جھاڑو دینا ممکن نہ تھا چنانچہ وہ زمین پر بیٹھ کر جھاڑو دے رہی تھی۔ نسیمہ نے اپنے شوہر کو دیکھا تو اس نے اٹھ کر کھڑا ہونا چاہا۔ عین اس وقت اسے زور کا چکر آیا اور وہ ایک بار پھر زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کی ساس رشیدہ قریب ہی چارپائی پر بیٹھی چھالیا کتر رہی تھی۔ اس نے یہ سب کچھ دیکھا مگر اپنی بہو کو سنبھالنے کی کوشش نہ کی۔ اس کی نظر میں یہ سب معمول کی بات تھی۔

امین جانے کس ترنگ میں تھا۔ اس لمحے اسے اپنی بیوی پر بے ساختہ ترس آ گیا۔ اس نے نسیمہ کو سہارا دے کر اٹھایا اور کمرے میں لے جا کر لٹا دیا۔ رشیدن یہ سب کچھ بغور دیکھ رہی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا فرماں بردار بیٹا اس کے ہاتھوں سے پھسلنے لگا ہے۔ اس روز کافی عرصے کے بعد امین نے اپنی

بیوی سے نرم لہجے میں کچھ بات کی۔ نسیمہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل کے زخموں میں ٹھنڈک پڑ رہی ہے۔

اسی روز شام کو امین اپنے دوستوں کے ہمراہ گھومنے نکلا تو واپسی پر وہ کچھ پھل بھی خرید کر لے آیا۔ جب وہ گھر پہنچا تو اس کی ماں اور اس کی بیوی دونوں سو چکی تھیں۔ اس نے پھل اپنے کمرے کی میز پر رکھے اور خود بھی سو گیا۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو گھر میں ایک حشر برپا تھا۔ اس کی ماں نسیمہ کو بری طرح لتاڑ رہی تھی۔ وہ اسے چڑیل اور جادوگرنی کے خطابات سے نواز رہی تھی۔ اس نے امین کو دیکھا تو اس پر بھی برس پڑی۔ ''مجھے تیرے سے یہ امید نہ تھی۔ مینو۔ تو بھی جورو کا غلام بن گیا۔ تو بھی اس کے تریا چلتر سے فریب کھا گیا۔ یہ صرف تیرے سامنے بھیگی بلی بنی رہتی ہے۔ تو جونہی گھر سے جاتا ہے یہ اپنے اصل روپ میں آجاتی ہے۔ یہ مجھ سے لڑتی جھگڑتی ہے۔ یہ سب کچھ میں نے تجھے اس لیے تو نہیں بتایا کہ یہ سب کچھ جان کر تجھے غصہ نہ آجائے اور تو ایسی ویسی حرکت نہ کر گزرے۔''

''اچھا تو یہ بات ہے۔'' امین نے خونی نظروں سے نسیمہ کو گھورا۔ ''سن رہی ہے تو اماں کیا کہہ رہی ہے؟''

نسیمہ کی آنکھیں اشکوں سے دھندلا گئیں۔ اس کے حلق میں آنسوؤں کا گولا آن پھنسا۔ اس نے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی لیکن اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ ویسے بھی اس کی بات کا یقین کون کرتا۔ وہ چپ چاپ کھڑی آنسو بہاتی رہی۔ ''اری بولتی کیوں نہیں حرافہ؟ کیوں مگرمچھ کے آنسو بہا رہی ہے۔ میرا بیٹا تیرے ٹسوؤں کے فریب میں آنے والا نہیں ہے۔'' رشیدن نے زہریلے لہجے میں کہا ''کان کھول کر سن لے' میرا بیٹا تیرا غلام نہیں بنے گا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو میں اسے دودھ نہیں بخشوں گی۔''

اس روز کے بعد نسیمہ کے نصیب کی تیرگی کچھ اور بڑھ گئی۔ اس کے لیے اب چلنا پھرنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ جیسے تیسے گھر کا سارا کام کرتی۔ اس کی ساس اس کے کام میں ہاتھ بٹانے کے بجائے اس میں اور اضافہ کر دیتی۔

امین جب گھر آتا تو رشیدن بار بار نسیمہ کو طعنے دیتی ''خاوند کو دیکھتے ہی تیرے بہانے شروع ہو جاتے ہیں۔ کبھی سر میں درد' کبھی دل گھبرا رہا ہے۔ کبھی چکر آ رہے ہیں۔ تو چاہتی ہے کہ میرا بیٹا تیری پائنتی بیٹھ کر تیری تیمارداری کرے لیکن فکر نہ کر۔ تیری یہ چال ہرگز کامیاب نہ ہوگی۔ میرا بیٹا تیرے کسی چکر میں نہیں آئے گا۔'' نسیمہ اپنی ساس کی کسی بات کا جواب نہ دیتی۔ وہ صرف اس امید پر زندہ تھی کہ جب اس کے ہاں کوئی اولاد پیدا ہوگی تو اس کے شوہر کا رویہ خود بخود بہتر ہو جائے گا۔

چھٹا مہینہ شروع ہونے تک نسیمہ کی صحت حد سے زیادہ گر گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ ہلدی جیسا ہو گیا۔ کمزوری کی وجہ اس پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ وہ کئی کئی گھنٹے بے سدھ پڑی رہتی لیکن اس کی ساس کے دل میں ذرا رحم نہ آتا۔ اس دن امین کراچی کا پھیرا لگا کر اپنے گھر لوٹا تھا۔ اس کا ٹرک اس کے

ساتھ ہی تھا۔ وہ رات پھر اپنے گھر رک کر صبح سویرے کوئٹہ جانے والا تھا۔ وہ گھر میں داخل ہوا تو ایک ہنگامہ اس کا منتظر تھا۔ اس کی ماں اسے دیکھتے ہی اس پر برس پڑی۔ ''بس بس بہت ہو چکا مینو۔ اب میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ اب اس گھر میں تمہاری چہیتی بیوی رہے گی یا پھر میں۔'' رشیدن کے لبوں کے سرے سے کف بہہ رہا تھا۔

''کچھ بتاؤ تو سہی اماں کہ آخر ہوا کیا ہے؟'' امین نے بیزار سے لہجے میں کہا۔

''یہ تو اس گھنی ناگن سے پوچھو۔ صبح سے اٹوائی کھٹوائی لیے پڑی ہے۔ نہ کچھ کھایا نہ پکانا۔ کل رات سے ایک کھیل بھی اڑ کر منہ میں گئی ہو تو حرام ہے۔ میں اپنے واسطے کوئی ٹھکانا ڈھونڈ لوں گی' مینو بیٹا ورنہ تیری بیوی تو مجھے فاقوں مار دے گی۔''

''تم کیا کہہ رہی ہو اماں؟ میرے ہوتے ہوئے ایسا کیسے ممکن ہے۔ میں اسے تیر کی طرح سیدھا کر دوں گا۔'' امین غصے میں پھنکارتا ہوا نسیمہ کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ آنکھیں کھولے پڑی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک دم توڑ رہی تھی۔ امین ایک لمحے کے توقف کے بغیر اس پر برس پڑا۔ اس کے منہ میں جو آیا وہ بکتا چلا گیا۔ اس نے نسیمہ کو اور اس کے ماں باپ کو گندی گالیاں دیں۔ خوفناک دھمکیاں دی۔ اس نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ اب وہ اس کی روز روز کی ڈرامے بازی سے تنگ آ چکا ہے۔ اس کے لہجے میں وہ زہر تھا جو نوشابہ سے محروم ہونے کے بعد اس کی شخصیت میں پوری طرح رچ بس چکا تھا۔ نسیمہ نے شاید اپنی صفائی پیش کرنا چاہی لیکن کمزوری کی وجہ سے اس کے منہ سے بے معنی بڑبڑاہٹ کے علاوہ کچھ نہ نکل سکا۔ امین نے اس کی بات سننے کی زحمت ہی گوارا نہ کی۔ وہ پیر پٹختا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد وہ واپس لوٹا تو اپنی ماں کے لیے کھانا ساتھ لایا تھا۔ خود وہ باہر ہی کھانا کھا چکا تھا۔ وہ کمرے میں پہنچا تو نسیمہ کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ اسے ناراضی سے گھور ہی رہا تھا کہ اس کی ماں اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔ ''اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ کیسے پیر پھند کیے پڑی ہے۔ جیسے اس کی جان نکل گئی ہے۔ میں نے اس کے سرہانے کھانا رکھا مگر بیگم صاحبہ نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔''

''مرتی ہے تو مرنے دو۔ تم جا کر سو جاؤ۔ مجھے بھی سونے دو۔ صبح مجھے جلدی جانا ہے۔'' رشیدن دالان میں جا کر اپنے بستر پر جا لیٹی۔ امین خود بھی بری طرح تھکا ہوا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ رات کا جانے کون سا پہر تھا جب امین کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے نسیمہ کی آواز سنی۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی ''پانی۔۔۔ پپ پانی۔'' امین بہت گہری نیند سے جاگا تھا۔ اسے نسیمہ کی بے باکی پر شدید غصہ آیا۔ وہ اس کی بیوی ہو کر اس پر حکم چلا رہی تھی۔ بیوی کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کی خدمت کرے لیکن اس کی بیوی اس سے خدمت لینا چاہ رہی تھی۔ اس کی ماں صحیح کہتی تھی۔ اس کی بیوی واقعی اسے اپنے اشاروں پر نچانا چاہتی تھی۔ وہ یہ سب کچھ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ''میں تیرے باپ کا نوکر نہیں ہوں کہ تیری خدمت کرتا پھروں۔ آئندہ کوئی ایسی بات کی تو تیری زبان حلق سے کھینچ لوں گا۔''

امین نے گرج دار آواز میں کہا۔ نسیمہ نے ایک لمحے کے لیے پلکیں کھول کر اسے دیکھا اور پھر پلکیں بند کرلیں۔ اس کے بعد اس نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔ امین ایک بار پھر نیند کی میٹھی گود میں کھو گیا۔

صبح کو جب اس کی آنکھ کھلی تو سورج خاصا اوپر آگیا تھا۔ نسیمہ ابھی تک منہ لپیٹے پڑی تھی۔ اس کی ڈھٹائی دیکھ کر امین کا خون کھول اٹھا۔ وہ اسے اچھی طرح دڑبڑانا چاہتا تھا لیکن اسے پہلے ہی کافی دیر ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس نے نسیمہ کو اس کے حال پر چھوڑا اور پیچ وتاب کھاتا ہوا گھر سے باہر نکل آیا۔ اسے اپنی ماں بھی نظر نہ آئی شاید وہ کہیں ادھر ادھر گئی ہوئی تھی۔

امین اپنے ٹرک میں بیٹھا اور سیدھا بلوچستان روانہ ہوگیا۔ اسے ژوب سے سیبوں کی پیٹیاں لاد کر کراچی پہنچانی تھیں۔ پانچ دن بعد جب وہ کراچی سے ہو کر ڈیرہ غازیخان واپس آیا تو ایک وحشت خیز خبر اس کی منتظر تھی۔ پانچ دن پہلے کروڑ پکے سے تار آیا تھا کہ اس کی بیوی اچانک فوت ہوگئی ہے۔ یہ خبر سن کر امین کو زبردست دماغی جھٹکا لگا۔ وہ نسیمہ کو کتنا ہی ناپسند کرتا ہو بہرحال وہ تھی تو اس کی بیوی ہی۔ صدمے اور افسوس سے زیادہ اس پر حیرانی کا غلبہ تھا۔ تار میں کسی قسم کی تفصیل نہ تھی۔ امین فوراً کروڑ پکا روانہ ہوگیا۔ وہ تمام راستے میں اسی ادھیڑ بن میں لگا رہا کہ آخر نسیمہ کو اچانک ہوا کیا۔ وہ تو اسے بالکل "ٹھیک ٹھاک" چھوڑ کر آیا تھا۔

امین اپنے گھر میں داخل ہوا تو اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ گھر میں قدم رکھتے ہی اتنے بھیانک سناٹے نے اس کا استقبال کیا کہ اس کا دل خوف سے کانپ اٹھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ بے حس دیواریں ابھی بین کرنے لگیں گی۔ امین کا دل کسی آہنی ہاتھ کی مٹھی میں بھنچا جا رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ نسیمہ واقعی اس گھر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناراض ہو کر چلی گئی ہے۔ ایک گھمبیر احساس زیاں اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ اس کی ماں شاید اڑوس پڑوس میں کہیں گئی ہوئی تھی۔ امین اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی نظر نسیمہ کی خالی چارپائی پر پڑی۔ ایک لمحے کے لیے وہ سن سا ہو کر رہ گیا۔ وہ پژمردہ سا ہو کر اپنی چارپائی پر ڈھے گیا۔ اس کے ذہن میں ابھی تک یہی خیال چکرا رہا تھا کہ نسیمہ کی اچانک موت کی وجہ کیا ہے۔

امین کی ماں گھر واپس آئی تو امین اپنا سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اس کی ماں نے چند لمحے توقف کے بعد جھجکتے جھجکتے کہا "اوپر والے کی مرضی کے خلاف کوئی کچھ نہیں کر سکتا مینو بیٹے۔ اس کی زندگی اتنی ہی لکھی تھی۔"

"لیکن اسے ہوا کیا تھا اماں؟" امین نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

"اللہ ہی جانے بیٹا۔ اس دن تم صبح ٹرک لے کر چلے گئے تھے۔ میں نے دوپہر تک اس کے اٹھنے کا انتظار کیا۔ جب وہ نہ اٹھی تو میں نے اسے ہلانے جلانے کی کوشش کی تو۔۔۔ اس کا جسم پتھر کی طرح سخت ہو چکا تھا۔" رشیداں نے جھرجھری سی لے کر کہا۔

امین کے دماغ میں زبردست دھماکا ہوا۔ "مرتی ہے بھوکی تو مرنے دو۔" اس کے کانوں میں اس کی اپنی ہی آواز گونجی۔ نسیمہ نے اس کی بات مان لی تھی۔ وہ مر گئی لیکن نہیں وہ مری نہیں تھی اسے قتل کیا گیا تھا۔ کون تھا اس کا قاتل؟ "پانی۔۔۔ پپ پانی" اس کے کانوں میں لرزتی ہوئی ایک آواز گونجی۔ اس نے چونک کر نسیمہ کی چارپائی کی طرف دیکھا۔ یہ میں نے کیا کر ڈالا؟ شدید احساس جرم اس کے وجود کو پاتال کی گہرائیوں میں لیے جا رہا تھا۔ صرف پانی ہی تو مانگا تھا اس نے ایک گلاس پانی پلانے سے میرا کیا بگڑ جاتا؟ اس نے تو مجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگا تھا۔ پہلی بار اس نے کوئی شے طلب بھی کی تو اتنی بے قیمت۔۔۔ میں اتنا بدفطرت کیوں بن گیا تھا؟ وہ تو مجھے ایک ایسا انمول تحفہ دینے والی تھی کہ جسے پا کر ہماری زندگی میں رنگ ہی رنگ بکھر جاتے۔ میں ہی اتنا کم ظرف نکلا کہ اس تحفے کو خوش آمدید نہ کہہ سکا۔ وہ بیمار تھی، شدید بیمار۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس کے کپکپاتے ہاتھ پاؤں دیکھے۔ اس کے باوجود میری آنکھیں نہ کھلیں۔ میری ماں نے اسے بہانے باز کہا اور میں نے آنکھیں بند کر کے اس کی باتوں پر یقین کر لیا۔ وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی اور میں خواب خرگوش میں گم رہا۔ اپنے آخری وقت میں وہ کیا سوچ رہی ہوگی؟ میں قاتل ہوں۔ ہاں ہاں میں قاتل ہوں۔ ایسا قاتل جس کی بے رحمی اور سفاکی کی مثال شاید ہی کوئی پیش کر سکے۔ قاتل تو چند لمحوں میں اپنے شکار کو سانسوں کی قید سے آزاد کرا دیتا ہے لیکن میں تو اسے ایک عرصے سے کچوکے دے دے کر موت کی طرف دھکیل رہا تھا۔ ستم تو یہ کہ وہ بے چاری آہ وزاری بھی نہیں کر سکتی تھی۔

امین کو ایک لمحے کے لیے اپنی ماں سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ وہ بھی نسیمہ کے قتل میں برابر کی شریک تھی لیکن نہیں۔ اصل قصوروار امین ہی تھا۔ اگر وہ اپنے رویے کو صحیح رکھتا تو اس کی ماں کو بھی اپنی بہو سے بدسلوکی کی ہمت نہ ہوتی۔ جس عوت کو اس کا شوہر عزت نہ دیتا ہو۔ اس کے لیے بچہ بچہ دودھاری تکلوار بن جاتا ہے۔ نسیمہ خاردار جھاڑیوں میں اٹکی سسکتی رہی اور امین نوشابہ کے گم گشتہ وجود کی خوشبو کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔ امین دنیا والوں کی نظر میں اگر معصوم تھا لیکن اس کے ضمیر نے اسے مجرم ٹھہرا دیا۔ دنیا کی عدالت سے موت کی سزا پا کر تو شاید چند منٹوں میں اس کے اعمال کی سزا مل جاتی لیکن اس کے ضمیر نے اسے جو سزا سنائی وہ اسے اپنی زندگی کے آخری پل تک بھگتنی تھی۔ کسی شخص کے لیے اس سے بڑھ کر کیا سزا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے ہی وجود سے شدید نفرت کرے اور اس کے باوجود زندہ رہنے پر مجبور ہو۔

"اس کے بعد میں ایک لمحے کے لیے بھی اس گھر میں نہ ٹھہر سکا۔" مینو استاد نے کرب سے بوجھل آواز میں کہا "میں اسی وقت گھر سے نکلا اور سیدھا ڈیرہ غازیخان آگیا۔ اس دن کے بعد میں کبھی کروڑ پکا نہیں گیا۔ میں تو نسیمہ مرحومہ کی قبر پر بھی جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ کس منہ سے جاتا میں وہاں؟" اس کے لہجے میں پچھتاووں کی تڑپ تھی "میری ماں نے مجھے بے شمار خط لکھے کہ میں گھر آؤں لیکن میں کبھی واپس نہیں گیا۔ البتہ میں اس کے خرچ کے لیے پیسے بھجواتا رہا۔ پھر ایک دن میں کراچی کا پھیرا لگا کر لوٹا تو اطلاع ملی کہ میری ماں بھی فوت ہو چکی ہے۔ یہ اطلاع بھی ہفتہ بھر پرانی تھی۔ میری ماں کو محلے والوں نے

مل جل کر اس کے آخری ٹھکانے تک پہنچا دیا۔ اس طرح میرا اس شہر سے آخری تعلق بھی ختم ہو گیا۔"

مینو استاد ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ اسے توقع رہی ہو گی کہ میں کچھ کہوں گا لیکن میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ اس نے اپنی الم ناک آپ بیتی میں اپنی ماں کو کم سے کم قصوروار ٹھہرایا تھا لیکن میری نظر میں اس سانحے کی اصل ذمے دار اس کی ماں تھی۔ اس سنگ دل جاہل عورت نے اپنے بیٹے کے بسے بسائے گھر کو اجاڑ دیا تھا۔

کتنی عجیب بات تھی میری زندگی کو تباہ کرنے کی ذمے دار بھی میری ماں تھی جبکہ مینو استاد کے گھر کو بھی اس کی ماں نے تباہ و برباد کر دیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی ماں اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے پہلے خدا کے حضور پہنچ چکی تھی جبکہ مجھے اپنی ماں کو ابھی جہنم رسید کرنا تھا۔ مجھے اپنے انتقام کی تکمیل کی خاطر جلد از جلد سردار برکت علی کی حویلی پہنچنا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کمال الدین خان نے جس عورت کا ذکر کیا تھا وہی میری ماں ہے۔ کمال الدین نے اس کے جو گھناؤنے کرتوت بتائے تھے انہیں جان کر میرے جسم میں رواں انتقام کے شعلے کچھ اور فزوں تر ہو گئے۔ مجھے ہر صورت میں اس نابکار عورت کو کیفر کردار تک پہنچانا تھا' چاہے مجھے اس کے لیے اپنی جان ہی کیوں نہ گنوانا پڑتی۔ یہی تو میری زندگی کا مقصد تھا۔ یہ مقصد پورا ہو جاتا تو پھر میرے لیے اپنی زندگی کی کوئی خاص اہمیت نہ رہ جاتی۔ البتہ اس سے پہلے مجھے اپنی زندگی بچانے کی ہر ممکن جدوجہد کرنی تھی۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ میں صبح ہوتے ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔

مینو استاد کافی دیر تک مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ اس نے مجھ سے میرے بارے میں مزید کچھ نہیں پوچھا۔ رات کے تیسرے پہر ہم دونوں کی آنکھ لگ گئی۔ میں صبح کو ذرا دیر سے بیدار ہوا۔ مینو استاد پہلے ہی جاگ چکا تھا۔ شرافت علی کی چارپائی بھی خالی پڑی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی میں نے اپنے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ میرا ادالتھر وہاں رکھا ہوا تھا۔ اسے وہاں موجود پا کر میں نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ جس مہم پر میں روانہ ہونے والا تھا' اس میں میرا یہ نیا دوست یعنی والتھر پستول اہم کردار ادا کرنے والا تھا۔ اس کے بغیر میں آدھا رہ جاتا۔ میں نے اسے اپنے نیفے میں اڑسا اور تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ اب مجھے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ مجھے کھسوں میں پاؤں ڈالتے دیکھ کر مینو استاد چونک پڑا۔ "ارے ارے کہاں جا رہے ہو بھائی۔ شرافت علی ابھی ناشتہ لے کر آتا ہی ہو گا۔"

"نہیں استاد بس اب اجازت دو' مجھے بہت دور جانا ہے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم ناشتہ کیے بغیر کہیں نہیں جاؤ گے۔"

"لیکن استاد۔۔۔" میں نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن اس کے اصرار کے سامنے میری ایک نہ چلی۔

کچھ ہی دیر بعد شرافت علی گھر میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپنگ بیگ تھا۔ کھانا پیش کرنے کی ذمہ داری ایک بار پھر شرافت علی نے سنبھالی۔ وہ گرم گرم پوریوں کا ایک اچھا خاصا ڈھیر خرید لایا

تھا۔ آلو اور چنے کی ترکاری بھی اچھی خاصی تھی۔ اس کے علاوہ سوجی کا حلوہ بھی تھا۔ شرافت علی کے ہونٹوں کی سوجن قدرے کم ہو گئی تھی۔ میں ناشتے کے دوران میں سوچتا رہا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟ میں خود کو کسی نامعلوم سے خطرے میں گھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ ڈیرہ غازی خان میرے لیے بے حد خطرناک جگہ تھی۔ یہاں سردار شاہ مراد کے کارندوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ میں کسی بھی وقت ان کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ ناشتہ ختم ہونے تک نو بج چکے تھے۔ جونہی ناشتہ ختم ہوا مینو استاد نے شرافت علی کو اڈے پر بھیج دیا۔ میں نے اس سے اجازت چاہی تو اس نے کہا "کچھ دیر اور میرے پاس ٹھہرو جوان' مجھے تم سے کچھ بے حد ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"کون سی باتیں مینو استاد؟ جو بھی باتیں ہیں جلدی سے کہہ دو۔ مجھے جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچنا ہے۔"

"کچھ دیر اور صبر کر لو۔ میں ذرا ایک ضروری کام سے بازار جا رہا ہوں۔ واپس آ کر میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا لیکن یہ یاد رہے کہ اگر تم نے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا تو بری طرح پچھتاؤ گے۔"

مینو استاد کا لہجہ اس قدر مستحکم تھا کہ مجھے اس کی بات مانتے ہی بنی۔ میں ایک بار پھر چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔ مینو استاد فوراً گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ تو چلا گیا لیکن مجھے ایک عجیب سے وسوسے میں ڈال گیا۔ وہ مجھے کونسی باتیں بتانا چاہتا ہے؟ وہ اس وقت بازار کیا کرنے گیا ہے؟ یہ کسی قسم کا پھندا تو نہیں؟ اگر یہ پھندا ہے تو میں اس سے کیسے بچوں؟ کیا میں چپ چاپ یہاں سے نکل بھاگوں؟ اگر مینو استاد کی تنبیہہ درست ثابت ہوئی تو کیا ہو گا؟ نہیں مجھے یہیں رہ کر اس کا انتظار کرنا چاہیے۔ اس نے میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا ہے۔ مجھے اس کے ساتھ دغا نہیں کرنا چاہیے۔

مینو استاد کو واپسی میں توقع سے کچھ زیادہ ہی دیر لگ گئی۔ وہ تقریباً گیارہ بجے دوپہر واپس لوٹا تو پسینے میں شرابور تھا۔ اس کے ہاتھ میں کئی بڑے بڑے شاپنگ بیگ تھے۔ اس نے وہ شاپنگ بیگ میرے سامنے ڈال دیے۔ میں نے حیرت سے اس کا منہ دیکھا "یہ کیا ہے استاد؟"

"ارے تم کھول کر دیکھو۔ اس کے بعد میں تمہیں بتاؤں گا۔"

میں نے ایک شاپنگ بیگ کھول کر اس میں سے گتے کا ایک ڈبہ نکالا۔ اس میں اعلیٰ قسم کے سپورٹس شوز کی ایک جوڑی تھی۔ میں نے استفہامیہ انداز میں مینو استاد کی طرف دیکھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھے دوسرا بیگ کھلنے کا اشارہ کیا۔ اس شاپنگ بیگ میں اعلیٰ قسم کے ڈینم کی بلیو جینز تھی۔ پتلون کے ساتھ سیاہ رنگ کی ایک عمدہ قسم کی قمیص بھی تھی۔ میں یہ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے تیسرا شاپنگ بیگ کھولا۔ اس میں نائلون کے موزوں کی ایک جوڑی' چمڑے کی بیلٹ' اور شیونگ کا مکمل سامان تھا۔ "یہ سامان کیا ہے مینو استاد؟ یہ سب سامان کس کے لیے ہے؟"

"یہ سب کچھ تمہارا ہے۔ تم جلدی سے شیو بنانے کی تیاری کرو۔ باتیں تو ساتھ ہوتی ہی رہیں گی۔"

میں اس کی بات سن کر بھونچکا سا رہ گیا۔ "لیکن تم نے یہ سب کیوں کیا؟"

”تم خود ہی کہہ رہے ہو کہ تمہیں بہت جلدی ہے اور خود ہی دیر بھی کیے جا رہے ہو۔ چلو جلدی سے شیو بناؤ۔“ میں الجھے ہوئے انداز میں اٹھا اور ایک کٹورے میں پانی بھر لایا۔ شیشہ مینو استاد ساتھ ہی خرید لایا تھا۔ میں نے اپنے گالوں پر جھاگ لگایا تو مینو نے کہا ”اپنی مونچھیں بھی صاف کردو۔“

”لیکن کیوں استاد؟“ میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

”جو میں کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ میں یہ سب کچھ تمہاری بہتری کے لیے کر رہا ہوں۔“ میں نے بادل نخواستہ اپنی مونچھوں پر بھی کریم کا جھاگ لگالیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مینو استاد چاہتا کیا ہے۔ میں نے آہستہ آہستہ شیو بنانا شروع کیا۔ مینو استاد بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ جب میری مونچھیں بلیڈ کی نظر ہوئیں تو اس کے لبوں پر بے اختیار نرم مسکراہٹ دوڑ گئی۔ شیو کے بعد مجھے اپنا چہرہ بے حد نرم و ملائم اور صاف ستھرا محسوس ہوا‘ البتہ مجھے دل ہی دل میں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ مونچھوں کے بغیر میرا چہرہ ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا۔

”ہاں اب بنے ہو تم صحیح غلام سعید خان۔“ مینو استاد نے تعریفی نظروں سے میرے چہرے کو گھورتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگا۔

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا مینو استاد۔“ میں نے الجھے ہوئے لہجے میں اعتراف کیا۔

”میرا مطلب یہ ہے بھائی کہ صرف نام بدل لینے سے انسان کی شخصیت نہیں بدل جاتی۔ تم لاکھ خود کو غلام سعید خان کہتے پھرو‘ تمہارا چہرہ تو صاف بتا رہا تھا کہ تم دراصل سیف داد خان ہو۔“

اس کے منہ سے یوں اچانک اپنا اصل نام سن کر مجھے شدید اعصابی جھٹکا لگا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔ ”اتنا حیران مت ہو سیف داد خان۔ میں نے بہت پہلے تمہیں پہچان لیا تھا۔“

”لل۔۔۔لیکن کیسے؟ تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟ کیا تم۔۔۔“

”ارے بھئی پریشان مت ہو۔ میری ذات سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“ مینو استاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میرا اپنے نیفے کی جانب بڑھتا ہوا ہاتھ ایک بار پھر ساکت ہوگیا۔ مینو استاد کی مسکراہٹ میں دوستی کا رنگ جھلک رہا تھا۔ اگر وہ میرا دشمن ہوتا تو اس طرح میرے منہ پر مجھے پہچاننے کا اعتراف نہ کرتا۔

میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا ”تم مجھے کیسے پہچانتے ہو استاد؟“

”میں نے تمہیں اپنا دوست‘ اپنا عزیز سمجھا ہے۔ لہٰذا میں تمہیں تمام باتیں بتا دوں گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس گڈز فارورڈنگ کمپنی کا کیا نام ہے جس کا ٹرک میں چلاتا ہوں؟“ مینو استاد نے سوال کیا۔

”نہیں مجھے نہیں معلوم۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”اس کمپنی کا نام ہے سردار گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی۔ اس کمپنی کا مالک سردار شاہ مراد ہے۔“

مجھے ایک بار پھر شدید جھٹکا لگا۔ سردار شاہ مراد! میرا خطرناک ترین دشمن! اور میں اس کے ایک

کارندے کے گھر میں عیش کر رہا ہوں۔ مجھے یوں لگا جیسے میری گردن میں پھندا تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے چوکنا ہوکر اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ میں ایک لمحے کے نوٹس پر اپنا والتھرا اپنے ہاتھ میں لے سکتا تھا۔“ میں نے تمہیں کہا نا کہ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اگر تمہیں نقصان پہنچانا چاہتا تو میرے پاس بے شمار مواقع موجود تھے۔ مجھے اپنا دشمن نہ سمجھو۔ میں تمہارا دوست ہوں اور تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

مینو استاد کی باتیں تسلی بخش تھیں لیکن میرے اضطراب میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ جن حالات کا میں شکار تھا۔ ان میں میری معمولی سی لغزش کا مطلب‘ یقینی موت ہوتا۔ مینو استاد مجھ سے دوستی کے کتنے بھی دعوے کرتا‘ پوری طرح اطمینان کیے بغیر میں اس پر کیسے اعتماد کرتا۔ مینو استاد میری ذہنی حالت کا پوری طرح سمجھ رہا تھا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ تم طرح طرح کیا ندیشہ ہائے دور دراز میں گھرے ہوئے ہو۔ تم مجھے وضاحت کا موقع دو۔ مجھے یقین ہے کہ بات کو پوری طرح سمجھنے کے بعد تم مجھ پر اعتبار کرنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔“

”سب سے پہلے تو یہ بتاؤ مینو استاد کہ تم نے مجھے پہچانا کیسے؟“ میں نے گہری سنجیدگی کے ساتھ پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ یہاں سے جانے کے بعد تمہیں اپنے بعد رونما ہونے والے واقعات کی کوئی خبر نہیں مل سکی؟“

”ہاں۔۔۔تم صحیح کہہ رہے ہو استاد۔ واقعی مجھے اپنے بعد کے حالات کی کوئی خبر نہیں ہے۔“

”اچھا تو میں وہ سب کچھ مختصراً بتاتا ہوں جو مجھے معلوم ہے۔“ مینو استاد نے میرے چہرے پر نظر ڈالی۔ میں نے آہستہ سے گردن ہلا دی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ خدا جانے وہ مجھے کیا کچھ بتانے والا تھا۔ ”جب رتا سائیں والا واقعہ رونما ہوا تو پورے شہر میں کھلبلی مچ گئی۔ شاہ مراد کا شہر میں اچھا خاصا اثر و رسوخ ہے۔ اگرچہ اس کا حلقہ انتخاب شہر میں شامل نہیں ہے‘ اس کے باوجود شہر کی انتظامیہ اور پولیس والے اس کی حکم عدولی کی جرات نہیں کر سکتے۔ اخبارات میں تمہارے متعلق بڑی بڑی خبریں لگائی گئیں۔ تمہیں خطرناک ڈاکو اور سفاک قاتل کے روپ میں پیش کیا گیا۔“ مینو استاد نے عجیب سے نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”معلوم نہیں اس میں سچ کتنا اور جھوٹ کتنا‘ بہرحال کچھ دنوں کے بعد خبر آئی کہ تم نے دو بندوں کی آنکھیں نکال لیں‘ پھر خبر آئی کہ تم نے پہاڑوں میں یکے بعد دیگرے کئی کارندے قتل کر دیئے ہیں جبکہ تین بندوں کا تو ابھی تک پتا ہی نہیں چلا کہ ان پر کیا گزری۔ سردار شاہ مراد کے تمام کارندوں پر تمہاری دہشت طاری ہوگی۔ مجھے تمہارے متعلق جو اطلاعات ملی تھیں ان کے پیش نظر میرے ذہن میں تمہارا ایک بھیانک تصوراتی خاکہ تشکیل پانے لگا۔ شاہ مراد کے کارندے پاگل کتوں کی طرح تمہیں تلاش کرتے رہے۔ سردار شاہ مرامد نے پولیس والوں کی بھی جان اجیرن کر رکھی تھی۔ پولیس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ بہت جلد تمہیں ڈھونڈ نکالے گی لیکن اس کے یہ تمام دعوے محض بے معنی الفاظ ثابت ہوئے۔ پولیس

سے زیادہ سرگرمی سے سردار شاہ مراد کے کارندے تمہیں تلاش کر رہے تھے۔ شاہ مراد کو قوی امید تھی' اس کے کارندے جلد ہی تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ دراصل اسے اپنے پاس موجود اعلیٰ ترین نسل کے کتوں پر بے حد اعتماد تھا۔ اس نے اپنے کتوں کو ایسی تربیت دلوا رکھی تھی کہ وہ اپنے شکار کو پاتال سے بھی کھینچ نکالیں گے۔ لیکن پھر پتا چلا کہ تم نے یکے بعد دیگرے اس مخصوص نسل والے تمام کتے ختم کر دیئے ہیں۔ ان کتوں کے مرتے ہی شاہ مراد بالکل بے دست و پا سا ہو کر رہ گیا۔ فوری طور پر اس خاص نسل کے کتوں کا انتظام بے حد مشکل تھا۔ اگر بالفرض وہ چند کتے حاصل کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتا تو ان کتوں کو خصوصی تربیت دینے کے لیے خاصا لمبا عرصہ درکار تھا۔ بہر حال کافی دنوں تک تمہاری تلاش ہوتی رہی لیکن تمہارا کوئی پتا نہ لگ سکا۔''

''تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟ کیا تم نے میری کوئی تصویر دیکھی ہے؟ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

''وہی بتا رہا ہوں۔ کافی دونوں تک تمہاری تلاش کے باوجود پولیس تمہیں گرفتار نہ کر سکی۔ سردار شاہ مراد جب بھی پولیس والوں کو لعن طعن کرتا' وہ کہتے کہ صاحب ہم کیا کریں اگر ہمارے پاس مجرم کی کوئی تصویر ہوتی تو ہم اسے فوراً ڈھونڈ نکالتے۔ سردار شاہ مراد نے تمہاری تصویر حاصل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ کافی عرصے کی کوشش کے بعد وہ کہیں نہ کہیں سے تمہاری ایک تصویر ڈھونڈ ہی لایا لیکن وہ تصویر خاصی پرانی تھی۔ اس تصویر میں تم ایک نوعمر لڑکے نظر آتے تھے۔ چھریرے بدن اور دبلے پتلے چہرے پر مونچھوں کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ اس تصویر کے ذریعے تمہیں ڈھونڈنا بہت مشکل تھا۔ نتیجتاً پولیس والوں نے معزرت کر لی کہ وہ اس تصویر کی مدد سے تمہیں تلاش نہیں کر سکتے۔'' مینو استاد نے ذرا ٹھہر کر میری حالت کا اندازہ لگانا چاہا۔ میرا تجسس اپنی آخری حدوں تک پہنچا ہوا تھا۔ میرے تمام وجود پر سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ اس نے جو کچھ بتایا تھا' بے حد ہیجان انگیز تھا۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھا ''پھر کیا ہوا مینو استاد؟''

''اس صورت حال نے سردار شاہ مراد کو بے حد مایوس کر دیا۔ وہ ہر قیمت پر تمہیں موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ رتا سائیں کے چاروں دوستوں کے باپ بھی تمہارے خون کے پیاسے ہو چکے تھے۔ رتا سائیں کے علاوہ ان چاروں کی حالت بھی عبرتناک تھی۔''

''اب رتا سائیں اور اس کے ساتھیوں کا کیا حال ہے؟'' میں نے مینو استاد کی قطع کلامی کر کے پوچھا۔ یہ سوال میرے ذہن میں بہت دنوں سے کلبلا رہا تھا۔

''رتا سائیں اور اس کے ساتھیوں کو نشتر اسپتال پہنچایا گیا۔ اس کے دوست تو جلد ہی اسپتال سے رخصت ہو گئے لیکن وہ کافی عرصے تک اسپتال میں داخل رہا۔ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد سنا ہے کہ اس نے ملتان ہی میں رہائش اختیار کر لی ہے۔ ہاں وہ تصویر والی بات تو درمیان میں ہی رہ گئی۔ تو ہوا یوں کہ ہر طرف سے مایوس ہو کر سردار شاہ مراد لاہور چلا گیا۔ وہ اپنے ساتھ تمہارا فوٹو بھی لے گیا۔ لاہور

میں اس نے کئی آرٹسٹوں سے بات کی۔ وہ ان سے تمہاری تصویر بنوانا چاہتا تھا۔ بالآخر اس نے ایک بے حد ماہر آرٹسٹ کو تمہارا اسکیچ بنانے کا کام سونپ دیا۔ تمہارے گاؤں سے چار پانچ ایسے لوگ لاہور لے جائے گئے جو تمہیں بہت قریب سے جانتے تھے۔ اس آرٹسٹ نے تمہاری پرانی تصویر اور ان لوگوں کی زبانی حاصل شدہ معلومات کی مدد سے تمہاری تصویر بنا دی۔ سردار شاہ مراد نے اس تصویر کی بہت سی کاپیاں بنوا کر انہیں پولیس والوں اور اپنے کارندوں کے حوالے کر دیا۔ میں نے تمہاری تصویر دیکھی تھی۔''

''کیا وہ تصویر بالکل ایسی ہی ہے جیسا کہ میں ہوں؟''

''نہیں وہ تصویر تمہاری موجودہ تصویر سے کافی مختلف ہے۔ البتہ اگر کسی نے وہ تصویر بغور دیکھ رکھی ہو اور پھر وہ بہت قریب سے تمہیں دیکھے تو اسے تم واضح طور پر اس تصویر سے مشابہ نظر آؤ گے۔ خاص طور پر تمہاری آنکھیں تقریباً ایک ہی جیسی ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ انسان کی آنکھیں اس کی خاص پہچان ہوتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان کے چہرے کے نقوش تبدیل ہو سکتے ہیں لیکن آنکھوں کی بناوٹ ایک ہی رہتی ہے۔ تمہارے فوٹوگراف میں اور تمہارے اسکیچ میں تمہاری آنکھیں' بالکل ایک جیسی ہیں لہٰذا ان کی مدد سے تمہیں کافی حد تک پہچانا جا سکتا ہے۔ اسی لیے کل رات شاہ جی کو تمہارا چہرہ مانوس لگا۔ اس نے یقیناً تمہاری تصویر دیکھی ہوگی۔ میں نے تمہارا دفاع کیا تو اس کا اعتماد متزلزل ہو گیا۔ بصورت دیگر وہ تمہیں ہرگز اتنی آسانی سے نہ چھوڑتا۔ میرا تعلق چونکہ سردار شاہ مراد سے ہے۔ لہٰذا اسے میرا لحاظ کرنا ہی پڑتا ہے۔''

''تم نے مجھے کب پہچانا تھا؟'' میں نے مینو استاد سے پوچھا۔

''کوٹ چھٹے کے قریب اس ہوٹل پر جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تو مجھے تمہارا چہرہ کچھ مانوس سا ضرور لگا لیکن میں نے اسے اپنا وہم سمجھا۔ روزمرہ زندگی میں ہمیں بہت سے ایسے چہرے دکھائی دیتے ہیں جو بے حد جانے پہچانے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ہم نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوتا۔ میں نے تمہیں ٹرک میں اپنے ساتھ چلنے کی دعوت پورے خلوص سے دی تھی۔ عام طور پر میری یہی کوشش ہوتی ہے کہ اگر میری ذات سے کسی کو کوئی فائدہ پہنچے تو میں گریز نہ کروں۔ تمہاری شخصیت میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو کہ تمہارے مخاطب کو بھرپور طریقے سے متاثر کرتی ہے۔ شاید یہ تمہارا متین لب و لہجہ اور بردباری ہو جس کی وجہ سے خواہ مخواہ تمہارے لیے دل میں احترام کے جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ خیر تو میں بتا رہا تھا کہ مجھے تمہارا چہرہ مانوس تو ضرور محسوس ہوا لیکن میرے ذہن میں دور دور تک یہ احساس نہ تھا کہ تم سردار شاہ مراد کے مطلوبہ شخص بھی ہو سکتے ہو۔ جب ہم کوٹ چھٹے سے کچھ آگے آئے اور شرافت علی کا تم سے جھگڑا ہوا تو میں سنجیدگی سے تمہارے متعلق سوچنے پر مجبور ہوا۔ جس انداز میں تم نے شرافت علی کو بے بس کیا' اس سے مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ تم کوئی معمولی نوجوان نہیں ہو۔ میں شرافت علی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایک دو بندوں کے قابو میں آنے والی شے نہیں ہے۔ اس نے کئی بار تین تین چار چار آدمیوں کے اوسان بھلائے ہیں۔ اس میں کسی بھینسے کی سی وحشی طاقت ہے لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ

تم سے اپنی کلائیاں چھڑانے میں ناکام رہا جبکہ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ تمہارے ہاتھ پاؤں توڑ کر تمہیں اپاہج نہ کر دے۔ تمہاری لڑائی بند کرانے کے لیے میں نے ٹرک روکا۔ تم ٹرک سے اترے تو تمہارے نیفے سے قیمتی جرمن پستول زمین پر گر پڑا۔ میرے ذہن میں ایک زوردار جھماکا ہوا۔ اس ولایتی پستول کو دیکھ کر مجھے رتا سائیں کا پستول یاد آ گیا۔ شاہ مراد کے کارکنوں میں یہ بات بہت مشہور ہوئی تھی کہ تم رتا سائیں سے اس کا ولایتی پستول چھین کر لے گئے۔ تب پہلی بار میرے ذہن میں شک پیدا ہوا کہ کہیں تم وہی تو نہیں ہو جو شاہ مراد کے تمام کارندوں کے دل و دماغ پر قابض ہے۔ ہم لوگ غازی ٹیکسٹائل مل کے سامنے شربت پینے کے بعد دوبارہ ٹرک میں بیٹھے تو مجھے یقین ہو گیا کہ تم سیف داد خان ہی ہو۔ اس وقت میرے ذہن میں بس یہی خیال تھا کہ تمہیں کس طرح قابو کر کے سردار شاہ مراد کے حوالے کروں۔ تمہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ شاہ مراد نے تمہارے زندہ یا مردہ گرفتاری پر دو لاکھ روپے انعام رکھا ہوا ہے۔''

''دو لاکھ روپے!'' میں نے جھرجھری لے کر کہا ''گویا اب مجھ جیسے دو ٹکے کے آدمی کے سر کی قیمت دو لاکھ روپے تھی۔ سردار شاہ مراد ہر قیمت پر مجھے صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ تمام حربے استعمال کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے میرے سر کی اتنی بڑی قیمت رکھ دی تھی کہ ساری خلقت میری گردن اتارنے کے درپے تھی۔ سوال صرف یہ تھا کہ مینو استاد نے مجھے ابھی تک اپنے آقا کے حوالے کیوں نہیں کیا؟ اتنی خطیر رقم کے لیے تو اچھے اچھوں کی نیت خراب ہو سکتی تھی۔

''تو پھر تم نے مجھے شاہ مراد کے حوالے کیوں نہیں کیا' مینو استاد؟''

''دو لاکھ بہت بڑی رقم ہے بھائی۔ اگر مجھے دو لاکھ روپے مل جائیں تو میں اپنے ذاتی ٹرک کا مالک بن سکتا ہوں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں بھی دل ہی دل میں تم سے مرعوب تھا۔ مجھے تمہارے پستول سے خوف محسوس نہیں ہوا۔ ہتھیار میں بھی ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ میرے پاس ہر وقت گولیوں سے بھرا ہوا ریوالور رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ٹرک کے خفیہ خانے میں ہر وقت ایک جدید قسم کی اسٹین گن بھی موجود تھی۔ میں دراصل تمہاری وحشیانہ سرفروشی سے خوف زدہ تھا۔ تمہاری خاموشی مجھے طوفان سے قبل کی خاموشی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ اگر تمہیں ذرا سا بھی شک ہو گیا تو تم ہمیں روند کر نکل جاؤ گے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے اعصاب کی شکستگی بڑھتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ جب ہم چیک پوسٹ پر پہنچے تو میرے اعصاب مکمل طور پر جواب دے گئے۔ میں نے جونہی شاہ جی کا نام سنا' میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں تمہیں اس کے حوالے کر کے اپنی جان چھڑا لوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ اس صورت میں بھی میں کم از کم ایک لاکھ کا حقدار ضرور بن جاتا۔ اس مرحلے پر مجھے شدید اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں پولیس والوں کو دیکھ کر تم میرے ساتھ چلنے سے انکار نہ کر دو۔ تم نے ٹرک سے اترنے میں ہچکچاہٹ ظاہر کی تو میرا دل' حلق میں آن پھنسا۔ مجھے یقین تھا کہ تم ابھی ہم سب کو گولی مار کر رفوچکر ہو جاؤ گے لیکن میری یہ سوچ خیال خام ثابت ہوئی۔ تم میری ریاکاری پر بڑی معصومیت سے یقین کر کے میرے ساتھ چل پڑے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنے طرز عمل پر شرم سی محسوس ہوئی۔ اس لمحے مجھے تم ایک معصوم اور سادہ لوح محسوس ہوئے۔

شاہ جی کو تمہارے متعلق بتا دوں لیکن ہر بار کوئی انجانی قوت میری زبان روک دیتی۔ میں ابھی اپنی قوت گویائی کو آمادہ بھی نہیں کر پایا تھا کہ اس حرامی شاہ جی نے تمہیں پہچان لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس ایک لمحے میں میری ماہیتِ قلبی کیسے تبدیل ہوئی۔ ایک لمحے کے اندر اندر میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ میں تمہیں دوست محمد شاہ جیسے درندہ صفت انسان کے پنجے میں نہیں پھنسنے دوں گا۔ تم نے جس معصومانہ انداز میں اپنے آپ کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا شاید وہی انداز میرے دل میں کھب کر رہ گیا۔'' میں مبہوت سا ہو کر مینو استاد کی زبانی یہ داستان ہوشربا سن رہا تھا۔ مجھے اپنے گرد و پیش کا کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ شاہ جی تمہیں گرفتار کرنے کے بعد کیا کرے گا۔ وہ گرفتار کر کے عدالت میں مقدمہ پیش کرنے کے بجائے تمہیں فوری طور پر گولی کا نشانہ بنا دیتا۔ اس کے بعد تمہیں پولیس مقابلے کا شکار بنا کر شہرت اور محکماتی ایوارڈ حاصل کرتا۔ سردار شاہ مراد سے ملنے والا لاکھوں کا انعام الگ ہوتا۔ محکماتی ترقی کے لیے اخبار کی شہ سرخیوں سے بڑھ کر کارگر شارٹ کٹ اور کوئی نہیں ہوتا۔ جب تمہاری خون میں ڈوبی ہوئی تصویر کے ساتھ شاہ جی کی دلیری کا قصہ چھپتا تو اس کی ترقی کو کوئی نہ روک پاتا۔''

میرا دل مینو استاد کے لیے ممنونیت کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ اس نے مجھے یقینی موت سے بچا لیا تھا۔ اس نے ایک انجان شخص کے لیے لاکھوں کی رقم ٹھکرا دی۔ وہ خود کو کوئی پارسا نہیں کہتا تھا لیکن اس کا دل یقیناً سونے کا بنا ہوا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے اس کی معیت حاصل ہو گی۔ اگر میں اپنی دھن میں مگن سیدھا ڈیرہ غازیخان آ جاتا تو یقیناً کسی نہ کسی اندھے کنویں میں غرق ہو چکا ہوتا۔ دو لاکھ روپے کی رقم نے تو میری تصویر لوگوں کی نگاہوں میں ہمیشہ کے لیے منجمد کر دی ہو گی۔ اس کے علاوہ سردار شاہ مراد کے نمک خواروں کی فوج ہی میر بوٹیاں نوچنے کے لیے کیا کم تھی۔ اتنی ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی مجھے عقل نہیں آئی' مجھ سا احمق بھی کون ہو گا۔ مجھے احساس ہی نہ تھا کہ میری زندگی کے' میرے خون کے پیاسے بھیڑیے میرے انتظار میں منہ پھاڑے بیٹھے ہوں گے۔ میں بھول ہی گیا تھا کہ میں کچھ ہی عرصے پہلے یہاں کتنی بڑی قیامت بپا کر کے گیا تھا۔ میں شاہ مراد کو تو جیسے فراموش ہی کر چکا تھا۔ میں نے اس کے خاندان کی تاریخ کا آخری ورق رقم کر دیا تھا' اس کے باوجود مجھے توقع تھی کہ وہ مجھے بھول چکا ہو گا۔

مینو استاد نے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ میں کس کٹھن گھیری میں آن پھنسا ہوں۔ اس نائی سے اپنی داڑھی صاف کرواتے ہوئے مجھے بالکل یاد نہیں رہا تھا کہ میں ایک بار پھر اپنے اصل روپ میں آ رہا ہوں۔ میں نے سردار شاہ مراد کی چالاکی اور مکاری کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ اس نے میرے راستے میں اتنے کانٹے بکھیر دیے تھے کہ میرے پاؤں ہر قدم پر لہولہو ہو رہے تھے۔ شاہ جی کی صورت میں ایک اور مستقل خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مینو استاد نے میری مونچھیں کیوں صاف کروائی ہیں۔ غالباً وہ مجھے ایک نیا روپ دینا چاہتا تھا کہ میں اپنی تلاش میں بھٹکتی ہوئی بھوکی آنکھوں سے محفوظ رہ سکوں۔ وہ میرے لیے' لباس بھی اس لیے لایا تھا کہ میری پوری شخصیت ہی بدل جائے۔ اس کی سوچ میرے لیے مخلصانہ تھی۔ لیکن وہ میرے آئندہ کے ارادوں سے بے

خبر تھا۔ بلو جینز اور بوٹ چڑھا کر میں اس پسماندہ دیہات کی طرف جاتا تو خواہ مخواہ تماشا بن جاتا لیکن یہ سب کچھ میں مینو استاد کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے نہیں پوچھا تھا کہ اب میں کیا کرنا چاہتا ہوں اور نہ میں اسے بتانا چاہتا تھا۔

''میں تمہیں تمہارے اسی نام سے پکاروں گا سعید خان۔ تم اپنا یہ سوٹ اتار دو اور یہ پتلون اور قمیص پہن لو۔ مجھے امید ہے کہ یہ لباس تمہیں پورا آئے گا۔'' مینو استاد کے لہجے میں اپنائیت تھی۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی بات ماننے پر مجبور ہو گیا۔ وہ محض اندازے سے یہ لباس خرید کر لایا تھا لیکن اس کا اندازہ حیرت انگیز طور پر درست ثابت ہوا۔ پتلون اور شرٹ میرے جسم کے عین مطابق تھے۔ موزے چڑھانے کے بعد میں نے اسپورٹ شوز پہنے۔ ان کا سائز بھی بالکل درست ثابت ہوا۔

میں اس لباس میں اپنے آپ کو ایک بالکل ہی نئی شخصیت محسوس کر رہا تھا۔ مینو استاد مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ''اب ذرا چل پھر کر دکھاؤ۔'' اس نے مجھے حکم دیا۔ میں نے برآمدے میں دو تین چکر لگائے۔ مینو استاد کے چہرے پر تحسین آمیز مسکراہٹ ابھری۔ ''واہ! اس لباس میں تو تم کوئی فلمی ہیرو لگ رہے ہو۔'' مینو استاد کے لہجے میں تصنع کی جھلک تک نہ تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر ہیر مجھے اس حلیے میں دیکھے تو اب کا ردعمل کیا ہو۔ جب میں شیو بنوانے کے بعد اس کے پاس پہنچا تھا تو وہ مبہوت سی ہو کر رہ گئی تھی۔ کریم بابا کی موجودگی کی وجہ سے وہ کچھ کہہ نہ سکی تھی لیکن اس کے انگ انگ سے خوشی جھلک رہی تھی۔

ہیر کی یاد آتے ہی میرا دل اداس ہو گیا۔ میں اسے اتنی خطرناک بیماری سے تنہا نبرد آزما ہونے کے لیے چھوڑنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ کمال الدین نے خدا جانے انہیں کیا بتایا ہوگا۔ اتنا یقین تو مجھے بہرحال تھا ہی کہ کمال الدین' ان تک وہ ایک لاکھ کی رقم ضرور پہنچا دے گا۔

''اب تم ایک شہری بابو لگ رہے ہو۔'' مینو استاد نے خوشی سے لبریز لہجے میں کہا۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی اور اسے میری طرف بڑھا دیا۔ ''بس یہ اور پہن لو۔ اس کے بعد کسی کا باپ بھی تمہیں نہیں پہچان سکے گا۔'' اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ایک خوبصورت چشمہ تھا۔ میں نے وہ چشمہ بھی آنکھوں پر لگا لیا۔ ''بہت خوب۔ اب تمہیں آنکھوں کی مدد سے بھی کوئی نہیں پہچان سکے گا۔''

مینو استاد نے مطمئن لہجے میں کہا۔ ''مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ اب تمہارا ارادہ کیا ہے لیکن میرا مخلصانہ مشورہ ہے تم جلد از جلد اس علاقے سے بہت دور نکل جاؤ'' اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر نکالا اس کے ہاتھ میں سو سو اور پچاس پچاس کے بہت سے نوٹ دبے ہوئے تھے۔ اس نے وہ نوٹ میری جیب میں ٹھونسنا چاہے۔

''نہیں مینو استاد ان پیسوں کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''ارے بھائی پیسے کی ضرورت تو ہر وقت رہتی ہے۔ خدا جانے آئندہ تمہیں کس طرح کے حالات کا سامنا کرنا پڑ جائے۔'' اس نے زبردستی وہ رقم میری شرٹ کی جیب میں ڈال دی۔

میں اپنے پرانے لباس کی تمام اشیا بھی اپنی پتلون اور شرٹ کی جیبوں میں منتقل کر چکا تھا۔ مسئلہ صرف پستول اور اس کی گولیوں کا تھا۔ میں نے اپنی پتلون کا پائنچا اوپر کر کے موزے میں کچھ گولیاں ڈالیں اور موزے کو موڑ کر گولیوں کو اس کے بلوں میں پوشیدہ کر لیا۔ دوسرے موزے میں گولیاں پوشیدہ کرنے کے باوجود میرے پاس گولیاں بچ رہی تھیں۔ وہ گولیاں میں نے مینو استاد کے حوالے کر دیں۔ میرا پستول گولیوں سے پر تھا۔ ایک اضافی میگزین اس کے علاوہ تھا۔ اس سے زیادہ گولیوں کی مجھے ضرورت بھی نہ تھی۔ میں تیار ہو کر گھر سے باہر نکلنے لگا تو مینو استاد نے میرے شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ ''میں تمہیں زندگی پھر نہیں بھول پاؤں گا سیف داد خان۔ خدا تمہیں ہر مصیبت سے بچائے رکھے۔ میرے لیے دعا کرنا کہ خدا میرے دل کو سکون دے۔ جو کچھ میں کر چکا ہوں اس کی تلافی تو نہیں ہے لیکن میں نے سنا ہے کہ دعاؤں سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔''

مینو استاد کی آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی۔ ''تم بھی میرے لیے دعا کرنا مینو استاد کہ خدا مجھے میرے مقصد میں کامیاب کرے۔'' میری آواز بھی خود بخود جذبات سے بوجھل ہو گئی۔

''خدا جانے پھر کبھی ہماری ملاقات ہو یا نہ ہو لیکن میری یہ دلی تمنا ہے کہ تم مجھے ہمیشہ اپنا ہمدرد' اپنا دوست سمجھو۔ میں تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ جب بھی کبھی تمہیں میری ضرورت محسوس ہو' بلا جھجک میرے پاس آ جانا۔ میں سردار شاہ مراد کی کمپنی میں ملازم ضرور ہوں لیکن تمہارے لیے میں ایسی ہزار ملازمتوں کو ٹھوکر مار سکتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ سردار شاہ مراد کتنا بدفطرت اور ظالم شخص ہے۔ اس جیسے شخص کے خلاف آواز اٹھانا جہاد ہے۔ اس جہاد میں تم مجھے برابر کا شریک سمجھو۔''

اچانک میرے ذہن میں ایک سوال بجلی کی طرح کوندا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا ''ایک بات تو بتاؤ استاد مینو۔ کیا تمہیں سردار شاہ مراد کے گاؤں کے حالات کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟''

''نہیں۔۔۔ دراصل میرا واسطہ زیادہ تر کمپنی کے مینجر سے ہی پڑتا ہے۔ جن جن ٹرک ڈرائیوروں سے میری سلام دعا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی سردار شاہ مراد کے گاؤں سے تعلق نہیں رکھتا۔ لہٰذا مجھے گاؤں کے متعلق زیادہ معلومات نہیں ہیں۔'' مینو استاد کے جواب سے مجھے کافی مایوسی ہوئی۔

میں جاننا چاہتا تھا کہ میرے گاؤں سے بھاگنے کے بعد وہاں کیا واقعات پیش آئے لیکن میرے پاس یہ سب کچھ جاننے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ میرا دل چچا مہر داد اور مہراں کے خیال سے اکثر پریشان رہتا تھا۔ جونہی میں ان دونوں کے متعلق سوچتا طرح طرح کے اندیشے مجھے گھیرنے لگتے۔

مینو استاد مجھے اپنے گھر کے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ اب میں مزید دیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر مینو استاد سے مصافحہ کیا۔ ''اپنا خیال رکھنا۔'' مینو استاد نے دھیمے لہجے میں کہا' میں نے آہستہ سے سر ہلا دیا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ مینو استاد نے مجھے جو روپ دیا تھا۔ وہ میرے اصل حلیے سے اس قدر مختلف تھا کہ مجھے کافی تحفظ کا احساس ہو رہا تھا۔ اس لباس میں مجھے کالج کا بے فکرا نوجوان سمجھا جا رہا ہوگا۔ اپنی قمیص کا دامن میں نے پتلون سے باہر نکال رکھا تھا۔ اپنا پستول میں نے پتلون کی

پچھلی جانب اڑسا ہوا تھا البتہ یہ احتیاط میں نے ضرور رکھی کہ وہ حادثاتی طور پر گرنے نہ پائے۔ میں ایسی غلطی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

میں نے اسے اے بلاک پار کیا اور اس کے بعد یکے بعد دیگرے بلاک ایک' پانچ اور نو پار کر کے جام پور' راجن پور روڈ پر پہنچ گیا۔ سخت دھوپ اور گرمی کی وجہ سے یہ پر رونق شاہراہ بھی اجڑی اجڑی سی نظر آ رہی تھی۔

اس سڑک پر بسیں عموماً پٹرول پمپ کے پاس آ کر ٹھہرتی تھیں۔ جن مسافروں کو بس میں سوار ہونا ہوتا' وہ سوار ہو جاتے اور بس آگے روانہ ہو جاتی۔ یہاں سے سوار ہونے والے مسافر زیادہ تر ایسے ہوتے جن کی منزل مضافاتی گاؤں یا قصبے ہوتے۔ میں پٹرول پمپ کے قریب کھڑے ٹھنڈائی کے مشروب کے ٹھیلے کے پاس جا کر کھڑا ہوا۔ گرمی تو پڑ ہی رہی تھی۔ مجھے پیاس بھی لگنے لگی۔ میں نے ایک گلاس شربت پیا اور ٹھیلے سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھنڈائی والے نے ایک دو بار مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے ٹال دیا۔ اسی وقت جی ٹی ایس کی ایک بس وہاں آ کر رکی۔ اس کے ونڈ اسکرین کے پیچھے تخی سرور کی تختی لگی ہوئی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا بس میں سوار ہو گیا۔ بس کی حالت بہت خستہ تھی۔ نشستوں پر گدیوں کی جگہ پھٹے جڑے ہوئے تھے۔ یہ بس صبح سویرے تخی سرور قصبے کی طرف روانہ ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بس آدھی سے زیادہ خالی تھی۔ میں کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بس میں شدید گرمی تھی۔ میں چند ہی لمحوں میں پسینے سے شرابور ہو گیا۔ بس اس انداز میں وہاں کھڑی تھی جیسے اس کا اور آگے جانے کا ارادہ ہی نہ ہو۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ڈرائیور نے بس کا انجن بند کیا اور ٹھنڈائی والے ٹھیلے کے سائبان تلے جا کھڑا ہوا۔ بس کا کنڈیکٹر پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ ان دونوں نے ٹھنڈائی کا ایک ایک گلاس لیا اور خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ وہ کسی قسم کی عجلت میں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ مجھے ان پر شدید طیش آنے لگا۔

میں نے اضطراب کے عالم میں پہلو بدلا۔ میری کمر میں پستول چبھ رہا تھا۔ وہ پسینے میں بھیگ کر پسیج رہا تھا۔ اس وقت بس کے قریب ایک تانگا آ کر رکا۔ اس تانگے میں سے ایک مرد اور تین عورتیں اتریں اور تیز تیز قدموں سے بس کی جانب بڑھیں۔ عورتیں اور وہ مرد ابھی بس کے قریب بھی نہیں پہنچے تھے کہ بس کا کنڈیکٹر لپک کر آگے بڑھا۔ اس نے ان چاروں کو بس میں چڑھایا اور خود بھی سوار ہو گیا۔ ان تینوں عورتوں میں دو نوجوان اور ایک ادھیڑ عمر تھی۔ مرد کی عمر تقریباً پچاس کے لگ بھگ ہو گی۔ اس نے لون کا کرتا اور لٹھے کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ کرتے میں نگینوں والے بٹن چمک رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں پان کی ڈبیا اور منہ میں بھی پان ٹھنسا ہوا تھا۔ دونوں لڑکیاں اچھی خاصی خوش شکل تھیں۔ جبکہ ان کی ساتھی عورت بھی اپنی جوانی میں یقیناً خوبصورت رہی ہو گی۔ وہ تینوں برقعے یا چادر سے بے نیاز تھیں۔ اتنی گرمی کے باوجود انہوں نے ریشمی کپڑے پہن رکھے تھے۔ کنڈیکٹر ان لوگوں کے آگے بچھا جا رہا تھا۔ اس نے میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے تینوں دیہاتیوں کو اٹھا کر پچھلی سیٹوں پر بھیج دیا اور ان تینوں عورتوں کے

لیے جگہ بنائی۔ ان عورتوں کے ساتھ آنے والا مرد میری ساتھ والی سیٹ پر ٹک گیا۔ اس نے پان چبانے کے لیے منہ چلایا تو قوام اور زردے کی تیز بو میری ناک میں گھس گئی۔ مجھے ابکائی سی آنے لگی۔

وہ شخص بغور میرا جائزہ لے رہا تھا۔ میرے حلیے سے جانے اس نے کیا اندازہ لگایا۔ میں اس سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ خود ہی شروع ہو گیا۔ ''کہاں کے رہنے والے ہیں آپ میاں صاحب زادے؟'' ایک بار پھر قوام کا بھبکا میری ناک سے ٹکرایا۔

میں نے قدرے بیزار لہجے میں کہا ''میں ملتان کا رہنے والا ہوں جی۔''

''اوہو ہو بھئی بہت خوب۔'' اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''بھئی خوب ملے۔ ارے میاں ہم لوگ بھی تو وہیں کے رہنے والے ہیں۔ ملتان میں کہاں رہتے ہیں آپ؟'' اس کے یہ الفاظ سن کر میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں اپنے جھوٹ کے جال میں خود ہی الجھ گیا۔ اب مجھے اس سے بے حد محتاط ہو کر بات کرنے کی ضرورت تھی۔

''وہ جی دراصل بات یہ ہے کہ ہم لوگ دراصل رہنے والے تو وہاڑی کے ہیں' صرف میں ملتان میں رہتا ہوں۔ میرے والد صاحب کی زمینیں ہیں وہاڑی میں۔'' میں نے اپنے بچاؤ کی گنجائش نکالنے کی کوشش کی۔

اس دوران میں بس چل پڑی۔ میں نے اس کے سوالات سے جان چھڑانے کے لیے بس سے باہر دیکھنا شروع کر دیا لیکن وہ اتنی آسانی سے میری جان چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ اس نے ایک اور سوال داغ دیا۔ ''آپ کیا کام کرتے ہیں؟'' میں نے سنی ان سنی کر دی۔ میرے سامنے والی سیٹ پر کھڑکی کے ساتھ ادھیڑ عمر عورت براجمان تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ہم دونوں کی گفتگو میں بھرپور دلچسپی لے رہی تھی۔

''آپ نے بتایا نہیں میاں صاحب زادے کہ آپ کے مشاغل کیا ہیں؟''

''میں نے جی ایسوسی ایٹ انجینئرنگ میں ڈپلومہ کیا ہے۔''

''ماشاء اللہ۔'' ان صاحب نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اسی وقت میری نگاہ اس لڑکی پر پڑی جو ادھیڑ عمر عورت کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ وہ لڑکی بڑی گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کی نظروں میں میرے لیے ستائش کے واضح جذبات تھے۔ اس کے ساتھ والی لڑکی بھی اس سے ملتے جلتے انداز میں مجھے گھور رہی تھی۔ یہ صورت حال میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی البتہ وہ لڑکیاں جس بے باکی سے مجھے گھور رہی تھیں اس نے مجھے تھوڑا سا گڑبڑا دیا۔ میں ایک بار پھر بس سے باہر کے مناظر دیکھنے لگا۔ شہر سے باہر نکلنے کے بعد اب بس ڈانٹ کے پل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ یہاں سے اسے مغرب کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ جانا تھا۔ ڈانٹ کے پل پر پہنچ کر بس ایک بار پھر ٹھہر گئی۔ اس صورت حال کو دیکھ کر میرا خون کھول کر رہ گیا۔ اوپر سے وہ شخص مسلسل مجھے دق کیے جا رہا تھا۔ ''اب آپ کہاں جا رہے ہیں؟ کیا آپ بھی سخی سرور کے مزار پر حاضری دینے جا رہے ہیں؟''

''نہیں جی۔ یہاں سے چند کلومیٹر دور ایک ٹریکٹر فیکٹری ہے مجھے وہاں اترنا ہے۔ میں وہاں نوکری

کے لیے کوشش کر رہا ہوں۔"

"بہت خوب بہت خوب۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں گردن ہلائی۔

"نام کیا ہے میاں صاحب زادے تمہارا؟" اس نے ایک اور سوال کر ڈالا۔

"مجھے غلام سعید خان کہتے ہیں۔"

"بہت اچھا نام ہے۔ میرا نام شیخ سلامت علی ہے۔ یہ میری خالہ زاد بہن نور جہاں ہے اور یہ اس کی بیٹیاں عنبرین اور پروین ہیں۔" مجھے اس شخص کا لہجہ عجب سا لگا۔ وہ اپنی بھانجیوں کا تعارف ایسے کرا رہا تھا جیسے بکرا منڈی میں بکروں کو گاہک کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ میں نے عنبرین پر نظر ڈالی۔ وہ بڑے والہانہ انداز میں مجھے گھور رہی تھی۔ میں بری طرح جھینپ گیا۔ وہ اپنے ماموں اور اپنی ماں کا بھی خیال نہیں کر رہی تھی۔ اگر یہ اداکاری تھی تو بڑی لاجواب اور بے نقص اداکاری تھی۔ مجھے اپنا سانس الجھتا ہوا محسوس ہوا۔ میں کسی نئے چکر میں پھنسنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہی مجھے کسی خوبصورت لڑکی کی چشم عنایت درکار تھی۔

سلامت علی مسلسل مجھ سے باتیں کر رہا تھا لیکن میں نے ابھی تک ایک بار بھی اس کی شخصیت میں دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں بد اخلاقی کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ میں نے اپنے روکھے رویے کی تلافی کی خاطر محض رسماً شیخ سلامت علی سے پوچھا۔ "آپ لوگ ملتان میں کہاں رہتے ہیں؟" میں عنبرین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑے محویت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن جونہی اس نے میرا سوال سنا' فوراً مجھ سے آنکھیں چرا کر سامنے دیکھنا شروع کر دیا۔

شیخ سلامت علی نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا۔ "ہم لوگ حسین آگاہی میں رہتے ہیں۔ دراصل۔۔۔ ہم لوگ فن کار ہیں۔ مختلف فنکشنوں اور شادی بیاہ میں لوگ ہمیں مدعو کرتے ہیں اور ہم اپنا پروگرام پیش کرتے ہیں۔"

اس "شیخ" سلامت علی کی باتیں سن کر مجھے زبردست جھٹکا لگا۔ وہ شخص خوبصورت الفاظ میں حقیقت میں پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کا تعلق بازار حسن سے تھا۔ وہ دونوں لڑکیاں طوائفیں تھیں جبکہ بڑھیا ان کی نائکہ۔ "شیخ صاحب" ان دونوں لڑکیوں کی دلالی کے فرائض ادا کرتے تھے۔ اس وقت بھی وہ یہی کر رہے تھے۔ وہ مجھے کھاتا پیتا خوش حال نوجوان سمجھ کر گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اس شخص سے کراہت ہی محسوس ہوئی۔ اسی وقت میری نگاہ عنبرین پر پڑی۔ وہ ایک بار پھر کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اب مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ کیسے اتنی بے باکی سے مجھ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے شکار کرنے کا کام اس نے اپنے ذمے لے لیا۔ اگرچہ پروین بھی وقتاً فوقتاً میرے چہرے پر نظر ڈال لیتی تھی لیکن اس کے انداز میں عنبرین کی سی وارفتگی نہ تھی۔

"میں نے لکھ داتا سائیں کے دربار پر حاضری کی منت مانی تھی میاں سعید خان۔" نور جہاں نامی اس ادھیڑ عمر عورت نے بلا تکلف مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ اگرچہ وہ موٹی اور بھدی ہو چکی تھی اس

کے باوجود اس کی آواز میں لوچ تھا۔ "ہم تین دن ٹھہریں گے وہاں۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر اگر آپ بھی وہاں پہنچ جائیں تو کیا خوب ہو۔ اس دور افتادہ علاقے میں اپنے ہم شہر سے ملاقات ہم لوگوں کے لیے مسرت اور تقویت کا باعث ہے۔ آپ کی معیت میں ہمارے یہ دن بھی خوش گوار گزر جائیں گے۔"

اس عورت کی لچھے دار گفتگو سے مجھے الجھن سی ہونے لگی۔

میں نے اپنی جان چھڑانے کی خاطر کہا۔ "اچھا میں کوشش کروں گا۔" میرا لہجہ رسمی تھا کہ وہ لوگ اسے انکار ہی سمجھ سکتے تھے۔

میں نے عنبرین کے چہرے پر مایوسی کی لہر سی دوڑتی دیکھی۔ نور جہاں ابھی تک ہتھیار ڈالنے پر تیار نہ تھی۔ "سخی سائیں کے دربار کے قریب ہی شکر دین مجاور کے ڈیرے پر ہم لوگوں کا قیام ہوگا۔ ہم لوگ تمہارا انتظار کریں گے۔"

مجھے عنبرین کی آنکھیں سراپا التجا نظر آئیں۔ میں نے محض اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ میں ایک بار پھر بس کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ بس دوبارہ چل پڑی تھی لیکن اس کی رفتار بہت سست تھی۔ اس وقت ہم موضع گدائی سے گزر رہے تھے۔ میری کوشش تھی کہ اب ان لوگوں سے مزید گفتگو نہ ہو مگر میرے چاہنے کی ان لوگوں کو پروا تھوڑی تھی۔ "ہم لوگوں کو شاہ صدر دین کے زمیندار سردار نصرت خان نے ملتان سے خاص طور پر بلایا تھا۔ اس کے بڑے بیٹے کی شادی ہوئی ہے۔ پچھلے دنوں۔ مسلسل تین دن تک محفلیں جمتی رہیں۔ میری بچیاں تو تھک کر چور ہو گئیں۔ سردار نصرت خان ہمارے پرانے مہربان ہیں۔ ہم ان کا حکم ٹال نہیں سکتے تھے۔ ورنہ اتنی دور ان دیہاتوں میں ہم ہرگز نہ آتے۔" مجھے اس کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی لہٰذا محض گردن ہلا کر رہ گیا۔ بس اس وقت ریلوے کراسنگ کے پاس پہنچ کر ایک بار پھر ٹھہر گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بس والے مجھ سے کسی قسم کا بدلہ لے رہے ہوں۔ پھر میں یک دم چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس جگہ پر پولیس کی عارضی چوکی قائم تھی۔ بس کے رکتے ہی کنڈیکٹر بس کے اگلے گیٹ پر جا کھڑا ہوا۔ وہ ایک مسلح سپاہی سے بات کر رہا تھا۔

وہ سپاہی گھوم کر بس کی اس طرف آیا جدھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس خبیث کنڈیکٹر نے اسے ان عورتوں کے متعلق بتایا ہوگا۔ اس کی حریص آنکھیں اسی طرف جمی ہوئی تھیں۔ بس کے باہر سے اس کی تشفی و تسکین نہ ہوئی تو وہ بس کے اندر گھس آیا۔ اس نے بڑے غور سے عنبرین اور پروین کو دیکھا۔ اس کے لبوں پر ایک خباثت بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر اس نے ایک نظر نور جہاں' شیخ سلامت علی اور مجھ پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں حقارت اور تمسخر کی واضح جھلک تھی۔ اس بدبخت نے میرے متعلق جانے کیا اندازہ لگایا ہوگا۔ اپنے حلیے سے میں سو فی صدی اس چھوٹے سے گروہ کا رکن نظر آتا تھا۔" اس پوری بس میں صرف ہم پانچ افراد ہی شہری لباس میں ملبوس تھے...... اس نے یا تو مجھے ان لڑکیوں کا طلب گار سمجھا ہوگا یا پھر شاید ان ہی کے طبقے کا ایک فرد۔

کچھ دیر بعد وہ سپاہی بس سے اتر گیا۔ اس نے جن نگاہوں سے مجھے دیکھا تھا اس کے متعلق سوچ کر

مجھے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی لیکن کچھ ہی دیر میں شرمندگی کا یہ احساس رفع ہو گیا۔ جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا۔ ان لوگوں کے ساتھ ہونے کی وجہ سے اس پولیس والے نے مجھے خصوصی توجہ تو ضرور دی لیکن اس نے مجھے شک کی نظروں سے نہیں دیکھا۔ اپنے موجودہ حلیے کے ساتھ میں اگر تنہا بس میں سفر کر رہا ہوتا تو میری ذات دیگر مسافروں میں اس قدر نمایاں ہوتی کہ پولیس والے خواہ مخواہ مجھے اپنی توجہ کا مرکز بنا لیتے یہ بات میرے لیے تباہ کن بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ نور جہاں اور اس کے عملے کے دیگر ارکان نے پولیس والے کی نگاہوں کا قطعاً برا نہیں منایا۔ کنڈیکٹر نے ایک معنی خیز نظر ان لوگوں پر ڈالی اور گاڑی چلانے کا اشارہ کیا۔ مجھے یہ سوچ کر تھوڑا سا اطمینان ہوا کہ کم از کم کنڈیکٹر تو اس حقیقت سے واقف ہے کہ میرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں۔ ان لوگوں نے سخی سرور کے قصبے کا ٹکٹ کٹوایا تھا جبکہ میں نے ٹریکٹر فیکٹری کا ٹکٹ لیا تھا۔ بس نے پٹھانوں والی نہر کا پل پار کیا۔ اس کی رفتار بہتر ہو گئی تھی۔ عنبرین اب بھی دزدیدہ نگاہوں سے میرا جائزہ لے رہی تھی البتہ نور جہاں بس سے باہر جھانک رہی تھی۔ سلامت علی اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اونگھنا شروع کر دیا۔ فیکٹری اب زیادہ دور نہیں تھی۔ میں اپنی سیٹ پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سالمت علی نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ’’تو گویا آپ کی منزل آ گئی؟‘‘

’’جی ہاں۔ مجھے یہیں اترنا ہے۔‘‘ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ عنبرین کے چہرے پر ہلکی سی مایوسی کے آثار تھے۔ اسے توقع رہی ہو گی کہ میں اس کے حسن کے سحر میں گرفتار ہو کر ان کے ساتھ ہی چل پڑوں گا لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا۔

’’اچھا میاں خدا تمہیں خوش رکھے۔‘‘ نور جہاں نے ایک ہلکی سی آہ بھر کر کہا۔ ’’ہم سخی سرور کے قصبے میں تمہارا انتظار کریں گے۔ اگر وہاں نہ آ سکو تو ملتان میں تو کم از کم ہمارے غریب خانے کو ضرور رونق بخشنا۔ حسین آگاہی کے علاقے میں کسی بھی تانگے یا رکشے والے سے کہنا کہ تمہیں نور جہاں کے ڈیرے پر پہنچا دے۔ وہ تمہیں سیدھا میرے پاس لے آئے گا۔‘‘ نور جہاں کے الفاظ سے زیادہ پر اثر التجا عنبرین کی نگاہوں میں پوشیدہ تھی۔ میں بس کے اگلے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ٹریکٹر فیکٹری کے سامنے بس پہنچ کر رک گئی۔ میں بس سے اتر گیا۔ میرے ساتھ ایک دو مسافر اور بھی اتر گئے۔ بس فوراً ہی آگے بڑھ گئی۔ مجھے فیکٹری میں تو جانا نہیں تھا' چنانچہ میں سڑک پار کر کے سامنے موجود دکانوں کی جانب بڑھا۔ یہ دکانیں دراصل کھوکھے تھے۔ ان کھوکھوں پر مختلف اشیاء فروخت ہوتی تھیں۔ میں نے تیز تیز قدموں سے فیکٹری کی چار دیواری کے ساتھ مغرب کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد فیکٹری کی چار دیواری ختم ہو گئی لیکن میں مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ غیر ہموار بنجر علاقے میں میرے اسپورٹ شوز میری بہت مدد کر رہے تھے۔ میرے کھسوں کی بہ نسبت یہ کافی آرام دہ تھے۔ اس علاقے میں بے شمار خاردار جھاڑیوں کے چھوٹے بڑے جھنڈ تھے۔ میری جینز کی پتلون مجھے بڑے آرام سے ان جھاڑیوں کے کانٹوں سے بچاتی چلی گئی۔ ڈینم کے بھاری بھرکم کپڑے پر ان کانٹوں کی خراشیں بے اثر ہو رہی تھیں۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد میں ذرا سانس درست کرنے کے لیے رکا۔ میں نے

اپنی کمر کے پاس اڑسا ہوا پستول نکالا اور اسے رومال سے صاف کر کے اپنی پتلون کے سامنے والے حصے میں اڑس لیا۔

میں نے اپنی رفتار کافی تیز کر لی۔ میں چاہتا تھا کہ رات ہونے سے پہلے سردار برکت علی کی حویلی کا تفصیلی جائزہ لے لوں تاکہ اس کی روشنی میں اپنی حکمت عملی مرتب کر سکوں۔ میرے ذہن میں یہ بات بھی پوری طرح واضح تھی کہ پہلے کی بہ نسبت اب سردار برکت علی کی حویلی میں داخل ہونا زیادہ مشکل ہو گا۔ پچھلی بار میرے ساتھ فقیر بابا تھا۔ اس وقت تمام تر حکمت عملی اس کے ہاتھ میں تھی۔ میرا کردار محض اس کے مددگار کا تھا۔ فقیر بابا جیسے ہمہ صفت' ہر فن مولا شخص کی عقل و ہنر کے سامنے حویلی والوں کی تمام تر حفاظتی تدابیر دھری کی دھری رہ گئیں تھیں۔ مجھے یاد تھا کہ فقیر بابا نے معمولی پٹاخوں کی مدد سے حویلی کے مسلح چوکیدار کو چکرا کر رکھ دیا تھا اور ہم با آسانی حویلی میں گھسنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن میں اس پارس صفت ہستی کی معیت سے محروم ہو گیا تھا۔ میں نے اس منحوس حویلی کی تاریک قید میں تنہا چھوڑ دیا۔ خدا جانے اب اس کا کیا حال ہو گا؟ میں اس وحشت انگیز خیال کو اپنے ذہن کے کسی گوشے میں جگہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا کہ خدانخواستہ اسے کوئی ناقابل تلافی جسمانی نقصان پہنچا ہو گا۔ میری زندگی کے دو اہم ترین مقاصد اس ایک حویلی میں یکجا ہو گئے۔ ایک طرف مجھے اپنی روح کے رستے ناسوروں کا علاج کرنا تھا یعنی اس عورت کو زندگی کی قید سے رہائی دلانی تھی تو دوسری طرف اپنے محترم دوست اپنے مونس و غم خوار فقیر بابا کو تلاش کرنا تھا۔ ان دو مقاصد میں سے کوئی بھی ادھورا رہ جاتا تو میری تمام زندگی انگاروں پر لوٹتے گزرتی۔

جب میں مقبول بستی کے قریب پہنچا تو سورج ڈھلنے میں بہت کم وقت باقی تھا۔ تاہم اتنی روشنی ضرور تھی کہ میں آس پاس کے مناظر کا بخوبی جائزہ لے سکتا تھا۔ میں گاؤں سے کنی کتراتا ہوا سیدھا حویلی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ حویلی میں کچھ زیادہ چہل پہل نظر نہیں آ رہی تھی۔ حویلی کے آس پاس کچھ درخت تھے۔ اس کے بعد ایک بہت بڑا میدان تھا۔ اس میدان کے اختتام پر چند درخت تھے۔ اس کے بعد ہرے بھرے کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ میں کھیتوں کے بیچ میں سے گزرتا ہوا ان درختوں کے بیچ میں پہنچ گیا۔ یہاں سے حویلی کا فاصلہ اچھا خاصا تھا۔ تاہم یہاں سے حویلی کو صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ حویلی کے گیٹ میں موجود چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس دروازے سے اکا دکا ملازمین کی آمد و رفت جاری تھی۔ مجھے ان ملازمین کی شکلیں صاف نظر نہیں آ رہی تھیں۔

میں نے اپنے بوٹ اتارے اور جلدی سے ایک درخت پر چڑھ گیا۔ میں نے ایک مضبوط دوشاخہ دیکھ کر اس پر قبضہ جما لیا۔ میں نے ایک بار حویلی پر نظر ڈالی۔ اس لمحے مجھے اپنی غلطی کا اندازہ ہوا۔ میں نے درخت کا انتخاب کرتے ہوئے جلد بازی سے کام لیا تھا۔ اس درخت پر سے حویلی کی اوپری منزل پوری طرح نظر نہیں آ رہی تھی۔ خاص طور پر سردار برکت علی مرحوم کا کمرا تو وہاں سے بالکل ہی نظر نہیں آتا تھا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں درخت بدل لوں۔ میں نے اپنے جوتے سنبھالے اور

بڑی احتیاط سے درخت سے نیچے اتر آیا۔ میں نے اس بار جس درخت کا انتخاب کیا' وہ قدرے کم گھنا تھا لیکن اس کی بلندی کافی زیادہ تھی۔ وہاں سے پوری حویلی کا منظر میرے سامنے واضح تھا۔ حویلی کی اصل عمارت کا صدر دروازہ کھلا ہوا تھا اور حویلی کے کارندے اندر باہر آ جا رہے تھے۔ البتہ حویلی کی اوپری حصے کے سامنے والے حصے میں کوئی ذی روح نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد اوپری منزل کے زینے سے ایک عورت نکلتی نظر آئی۔ اس عورت کا رخ زنان خانے کی طرف تھا۔ میرا دل طوفانی رفتار سے دھڑکنے لگا۔ کیا یہی ہے وہ۔۔۔؟ میرے ذہن میں ایک بڑا سا سوالیہ نشان ابھر آیا۔ اتنی دور سے میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بالفرض اگر میں وہ چہرہ دیکھ بھی لیتا تو میں اسے پہچانتا کیسے؟ میں تو اس مکروہ چہرے کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ پرندے بھی کے اپنے آشیانوں کو لوٹ چکے تھے۔ حویلی میں روشنیاں جل اٹھیں۔ حویلی کے گیٹ پر نصب بڑے بڑے قمقمے اردگرد کے سارے علاقے کو روشن کر رہے تھے۔ حویلی کی اوپری منزل پر بھی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔

وقت آہستہ آہستہ رینگتا رہا۔ رات گہری ہوتے ہی حویلی کے گیٹ میں موجود چھوٹا دروازہ بھی بند ہو گیا۔ میں نے ایک مسلح چوکیدار کی جھلک دیکھی۔ لیکن کوشش کے باوجود اسے پہچان نہیں پایا۔ بیٹھے بیٹھے میرا جسم سن ہونے لگا۔ میں فی الحال صرف دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر قائم رہنا چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں فی الحال کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ یہ سب حالات پر منحصر تھا کہ میں کس انداز میں حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کرتا۔

میں درخت پر جما رہا۔ اونگھتی ہوئی حویلی مکمل طور پر خوابوں کی آغوش میں پہنچ گئی۔ اب وہاں صرف خاص خاص مقامات پر روشنی تھی۔ میرے درخت سے اترنے کا وقت آ گیا تھا۔ میں درخت سے نیچے اتر آیا۔ حویلی کے سامنے والے رخ پر اتنی روشنی تھی کہ اس طرف سے آگے بڑھنا خودکشی کے مترادف ہوتا۔ ویسے بھی میں گیٹ کے ذریعے اندر داخل ہونے کی کوشش نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں ڈیزل جنریٹر والی کوٹھری کا خیال آیا۔ اس قلعے نما حویلی میں داخلے کا شاید یہی قدرے آسان راستہ تھا۔ میں تھوڑے فاصلے سے حویلی کے پہلو میں سے گزرا اور حویلی کی پشت پر پہنچ گیا۔

سب کچھ پہلے ہی جیسا تھا۔ جنریٹر اپنی مخصوص آواز میں گھڑ گھڑ کیے جا رہا تھا۔ سامنے حویلی پر دو زرد بلب روشن تھے۔ آٹھ نو فٹ بلند چار دیواری پر دو ڈھائی فٹ بلند خاردار زتاروں کی باڑ جوں کی توں تھی۔ حویلی والوں نے شاید پچھلے واقعے سے کوئی سبق نہیں سیکھا تھا۔ وہ دیوار میرے انتقام کی راہ میں حائل پہلی رکاوٹ تھی۔ میں نے کان لگا کر حویلی کے اندر کی سن گن لینے کی کوشش کی۔ اندر دا مکمل سناٹا طاری تھا۔ قدرے توقف کے بعد میں نے اچھل کر حویلی کی چار دیواری پر ہاتھ جمانے کی کوشش کی۔ یہ بہت خطرناک کام تھا۔ میرے ہاتھ اگر ذرا سے بھی غلط پڑتے تو خاردار تاروں میں الجھ کر لہولہان ہو جاتے۔ میری انگلیاں دیوار کے سرے پر ٹھہریں لیکن میں دیوار پر گرفت نہ قائم کر سکا۔ میں نے ایک بار پھر کوشش کی۔ اس بار میرا ایک ہاتھ خاردار باڑ سے ٹکرا گیا۔ میری خوش قسمتی یہ تھی کہ میری انگلیوں پر زیادہ رگڑ نہ

لگی۔ اس بار میرے ہاتھ دیوار کے اوپر جم گئے۔ میں نے اپنی کلائیوں پر دباؤ ڈال کر اوپر اٹھنا شروع کیا۔ یہ بہت دشوار گزار کام تھا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ میرے ہاتھ کسی بھی وقت پھسل جائیں گے۔ اس صورت میں میرا جسم بری طرح دیوار سے رگڑ کھاتا اور میرا چہرہ شدید زخمی بھی ہو سکتا تھا۔

کچھ اور اوپر اٹھنے کے بعد میں نے اپنے ہاتھ باری باری دیوار کے اندرونی سرے پر جما دیے۔ اب میری گرفت بہت مضبوط تھی۔ میں نے خود کو بائیں ہاتھ کے بل متوازن کیا اور دایاں ہاتھ نہایت احتیاط سے تاروں کی آخری قطار پر جما دیا۔ تار میں لگے ہوئے کانٹے میری انگلیوں کے بیچ میں سے نکلے ہوئے تھے۔ میں نے تار پر دباؤ ڈال کر دیوار پر اپنا دایاں پاؤں جمانے کی کوشش کی۔ تار میں لچک بہت کم تھی اور وہ مضبوطی سے ایک فولادی گرڈر سے جڑا ہوا تھا۔ میرا پاؤں دیوار پر اچھی طرح جم گیا۔ میں نے اپنے دائیں پاؤں اور دائیں ہاتھ پر اپنا بوجھ ڈال کر اپنا بایاں ہاتھ دیوار پر سے ہٹایا اور اسے بڑی احتیاط سے خاردار تار پر جما دیا۔ میری گرفت تار پر قائم ہوتے ہی میرے لیے صورت حال بہتر ہو گئی۔ میں نے اپنا بایاں پاؤں بھی دیوار پر جمایا اور کھڑا ہو گیا۔ خاردار تار میرے جوتوں کو چھو رہا تھا لیکن میرے پاؤں مضبوط تھے۔ میں نے حویلی کے اندر کا بغور جائزہ لیا۔ میری توقع کے عین مطابق وہاں مکمل سناٹا تھا۔ حویلی کے لان میں بہت کم روشنی تھی۔ سامنے حویلی کی سامنے والی دیوار کے ساتھ شیڈ بنا ہوا تھا۔ اس شیڈ کے نیچے دو گاڑیوں کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔

مطلع صاف دیکھ کر میں نے اپنا بایاں پاؤں خاردار باڑ کے دوسری طرف دیوار پر ٹکا دیا۔ اس دوران میں میری نظریں لان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنا دایاں پاؤں بھی باڑ کے دوسری سرف رکھا اور نہایت آہستگی سے جنریٹر والی کوٹھی کی چھت پر اتر گیا۔ حویلی کے اگلے حصے کی طرف جانا بے حد خطرناک تھا اور پچھلی سمت سے اندر داخل ہونے کا صرف ایک ہی راستہ تھا جس دروازے پر اندر کی طرف موٹا سا تالا لگا ہوا میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔

میں بے آواز چلتا ہوا عقبی دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا۔ اس میں اندر کی طرف سے زنجیر لگی ہوئی تھی۔ مجھ پر ہلکی سی مایوسی طاری ہونے لگی۔ میں نے بڑی بے دلی سے دروازے کے پٹوں کے بیچ میں پیدا ہونے والی درز میں اپنا دایاں ہاتھ ڈال دیا۔ میری انگلیاں زنجیر سے ٹکرائیں۔ میں نے زنجیر اور دروازے کے پٹ کے درمیان انگلیاں پھنسا کر زنجیر کو کنڈے سے نکالنے کی کوشش کی۔ اچانک میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے جونہی زنجیر پر زور لگایا۔ وہ کنڈے میں سے نکلی اور چھن کی آواز کے ساتھ کھل کر جھولنے لگی۔

مجھے ایک لمحے کے لیے اپنی قسمت پر ناز ہونے لگا۔ میرے راستے کی رکاوٹیں خود بخود دور ہوتی جا رہی تھیں۔ میں دروازے سے اندر داخل ہوا اور دروازے کو دوبارہ بند کر دیا۔

میں محتاط قدموں سے راہداری میں آگے بڑھا۔ آگے جا کر راہداری میں بائیں جانب مڑ گئی۔ کچھ آگے جا کر راہداری اس چھوٹے سے ہال سے مل گئی۔ جس میں کئی کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ میں

نے سوچا کہ بہتر یہ ہوگا کہ پہلے ان کمروں میں محوخواب کارندوں کو بے بس کردوں تاکہ وہ بعد میں میرے لیے مصیبت پیدا نہ کرسکیں۔ میں نے ایک کمرے کی جانب قدم بڑھائے لیکن پھر ٹھہر گیا۔ بہتر یہی تھا کہ میں سب سے پہلے اکرام عرف اکی سے نمٹ لوں۔ وہ سب سے خطرناک شخص تھا۔ اکی کے کمرے میں مکمل تاریکی تھی۔ میں نے دیوار کی جانب اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر دیوار کو ٹٹولا۔ میں پہلے بھی اس کمرے میں آچکا تھا اور مجھے اندازہ تھا کہ بجلی کا بٹن کہاں ہے۔ میرا ہاتھ بٹن سے ٹکرایا۔ میں نے بلاتوقف بٹن دبا دیا۔ ہلکی سی کلک کی آواز ابھری اور کمرے میں بلب کی روشنی پھیل گئی۔ میرے سامنے ایک بڑی سی مسہری تھی۔ اس وقت وہ مسہری خالی تھی۔

اکی کے کمرے کی لائٹ آف کر کے میں نے اس کا دروازہ بھی پہلے کے مانند بند کردیا۔ سامنے ہی ایک اور دروازہ تھا۔ میں نے نہایت آہستگی سے دروازہ دھکیلا۔ مجھے اگلے ہی لمحے اندازہ ہوگیا کہ یہ کمرا بھی خالی ہے۔ میں نے لائٹ روشن کی تو میرے خیال کی تصدیق ہوگئی۔

میں سامنے موجود دروازے کی طرف بڑھا اور اسے آہستہ سے اپنی طرف کھینچا۔ حسب توقع وہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ سامنے ہی ایک چھوٹی سی راہداری تھی۔ اس کے بعد سامنے وسیع ہال تھا۔ اس وقت ہال میں مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میں محتاط قدموں سے آگے بڑھا۔ ہال کنارے پر پہنچ کر میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ اچانک میرے کانوں میں سرسراہٹ کی ہلکی سی آواز آئی۔ میں نے چونک کر آواز کی سمت گھورا لیکن مجھے دیر ہوچکی تھی۔ کوئی بھاری بھرکم ٹھوس چیز بڑے زور سے میرے دائیں ہاتھ کی کلائی سے ٹکرائی۔ میرے ہاتھ میں درد کی شدید لہر دوڑ گئی۔ میرا پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر جانے کس تاریک کونے میں جا گرا تھا۔

میں ابھی صورت حال کو پوری طرح سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ جانے کتنے افراد بیک وقت مجھ سے لپٹ گئے۔ مجھے مزاحمت کا موقع ہی نہ مل سکا۔ چند ہی لمحوں میں بے بس ہوچکا تھا۔ عین اسی وقت کسی نے روشنی کا بٹن دبا دیا۔ پورا ہال تیز روشنی سے جگمگا اٹھا۔ میری نظروں کے عین سامنے اکی کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں میرا اپنا کولٹس پستول تھا۔ اکی کے خوبصورت چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ اس کی باریک مونچھیں ہولے ہولے تھرک رہی تھیں۔ مجھے بیک وقت تین آدمیوں نے جکڑ رکھا تھا۔ ان میں ایک کو میں نے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ امامی تھا۔ وہی موٹا اور گنجا امامی جس نے پہلے بھی مجھے پکڑا تھا۔ اکی کے ساتھ تین اور مسلح کارندے موجود تھے۔ ان میں سے دو کے پاس کلاشنکوف تھی جبکہ تیسرا تھری ناٹ تھری کی پکی رائفل سے لیس تھا۔ ان تمام اجل آفریں ہتھیار کے بھیانک دہانے میرے طرف تھے۔

''خوش آمدید۔ خوش آمدید آج تو بڑا سوہنا مہمان آیا ہے ہمارے گھر۔ کیوں بھئی امامی؟'' اکی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''سوہنا تو ہے اکی بھائی پر جاندار بھی ہے۔ اس کا کوئی پکا انتظام کرو'' امامی نے بھنچے بھنچے لہجے میں کہا۔ میں ان کی گرفت سے چھٹنے کے لیے پوری قوت لگا رہا تھا لہٰذا وہ تینوں سخت مشکل میں تھے۔

اکی کے چہرے پر سنجیدگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے تھری ناٹ تھری والے بندے کو کوئی اشارہ کیا۔ وہ ایک صوفے کی طرف بڑھا۔ اس نے صوفے کے نیچے سے کوئی چیز نکالی۔ یہ نائلون کی رسی کا ایک لچھا تھا۔ اس نے وہ لچھا کھول لیا اور میری طرف بڑھا۔ مجھے جکڑنے والوں نے اپنی پوری قوت سے میرے ہاتھ پشت کی طرف کر کے انہیں ایک دوسرے سے ملا دیا۔ وہ تینوں پہلے کٹے تھے لیکن مجھے قابو میں رکھنے کی کوشش میں پسینہ پسینہ ہوئے جا رہے تھے۔ چوتھے شخص نے نائلون کی رسی سے میرے ہاتھوں کو آپس میں بے حد سختی سے جکڑنا شروع کر دیا۔ جب مجھے رسی سے اچھی طرح جکڑا جا چکا تھا تو وہ تینوں مجھے چھوڑ کر الگ ہٹ گئے۔ ان تینوں نے بھی اپنی جیب سے پستول اور ریوالور نکال کر مجھ پر تان لیے حالانکہ بظاہر اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ''کیوں کیسا لگا اپنا استقبال بالو جی؟'' اکی نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ وہ خالص اردو زبان میں بات کر رہا تھا۔ وہ مجھے سچ مچ کوئی شہری بابو قسم کی چیز سمجھ رہا تھا۔

یک دم میں اپنے تمام وسوسے اور پریشانیاں فراموش کر بیٹھا۔ مجھ پر کھلنڈرانہ موڈ طاری ہو گیا۔ ''تو بڑا ہی لاجواب بندہ ہے اکی خان۔ تجھے تو وزیر مہمان نوازی ہونا چاہیے۔'' میری زبان سے اپنا نام سن کر وہ بری طرح چونک اٹھا۔ میں نے ٹھیٹھ سرائیکی زبان میں جواب دیا تھا۔

''اوئے تم مجھے کیسے جانتے ہو؟ سچ سچ بتا دو ورنہ گولی مار دوں گا۔''

''پہلی بات تو یہ ہے اکی کہ تجھے چوری کے ہتھیار سے مجھے دھمکی دیتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم اپنی زبان سے میرے لیے کہہ چکے ہو کہ میرے جیسے بندے موت سے نہیں ڈرتے۔ یاد ہے کہ نہیں؟''

میری بات سن کر اکی کی چوڑی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے سکڑیں اور پھر پھیلتی چلی گئیں۔ ''تم۔۔۔ تم وہی ہو؟'' اس کے لہجے میں استعجاب کا دریا موجیں مار رہا تھا۔

''ہاں میں وہی ہوں۔ ذرا غور سے دیکھو اکی۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ اس کی حیرت کو دیکھ کر میرے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''تم۔۔۔ تم پھر آ گئے؟'' اکی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''امامی دیکھو یہ وہی ہے۔ اسی نے سردار برکت علی کا خون کیا تھا۔'' اکی کی بات سن کر امامی کے حلق سے حیرت زدہ سی چیخ نکلی پھر اس کی آنکھیں بھی میرے چہرے پر جم گئیں۔

''ہاں ہاں یہ وہی ہے۔ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ اس نے داڑھی مونچھیں کٹوا دی ہیں۔''

''ہاں۔۔۔ یہ بھیس بدل کر آیا ہے لیکن اس بار اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔ اب تو یہاں سے زندہ نہیں جا سکتا جوان۔ ہم تجھ سے سردار برکت علی کی موت کا بھرپور انتقام لیں گے۔'' اکی نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ اس کے ہاتھ میں موجود پستول کا رخ ابھی تک میرے سینے کی جانب تھا۔

''زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے اکی۔ جب تک میرا آخری وقت نہ آ جائے کوئی میرا بال بھی

بیکا نہیں کر سکتا۔ میں نے برکت علی کو قتل کیا کیونکہ وہ خبیث انسان اسی قابل تھا۔"

"بکواس بند کر کتے کی نسل۔" امامی حلق پھاڑ کر چیخا اور اس نے پوری قوت سے ایک طمانچہ میرے گال پر رسید کیا۔ میرے گال پر انگارہ سا دہک گیا۔ میں نے غضب ناک ہو کر امامی کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو ان میں سے ایک نے میرے سینے پر کلاشنکوف کا بٹ مارا۔ دوسرا بٹ میرے پیٹ پر پڑا۔ میں درد کی شدت سے بے تاب ہو کر بے اختیار جھک گیا۔

وہ شخص میرے منہ پر گھٹنا مارنا ہی چاہتا تھا کہ اکی نے اسے منع کر دیا۔ "نہیں صداقت نہیں۔ ابھی اس سے منہ ماری مت کرو۔ ابھی تو اس سے بہت کچھ اگلوانا ہے۔"

اسی وقت ان میں سے ایک نے صوفے کے نیچے سے میرا پستول اٹھایا اور اسے اکی کے حوالے کر دیا۔ اکی نے پستول پر نظر ڈالی اور اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار ابھر آئے۔ وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ "تجھے یہ ولائتی ہتھیار کہاں سے مل جاتے ہین جوان؟" اس نے سوال کیا۔ "یہ پستول جو میرے پاس ہے یہ بھی تو تیرا ہی ہے نا؟" اکی کا اشارہ کولٹس پستول کی جانب تھا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلا کر کہا۔ "میں ہمیشہ لاجواب ہتھیار کا انتخاب کرتا ہوں اکی' جس چیز پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہو' اسے قابل اعتماد ہونا چاہیے۔"

"یوں کیوں نہیں کہتے کہ کمال الدین خان کی حرام کی کمائی کے بل پر تم یہ قیمتی ہتھیار لیے پھرتے ہو۔ کیا تم کمال الدین خان کے کارندے نہیں ہو؟" اکی نے زہریلے لہجے میں کہا۔ مجھے پہلے ہی یہ اندازہ تھا کہ وہ لوگ مجھے کمال الدین سے وابستہ قرار دیں گے۔ یہ غلط بھی نہیں تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب میں پہلی بار اس حویلی میں داخل ہوا تھا تو میں کمال الدین کا نام تک نہیں جانتا تھا۔ میں نے اکی کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے میری خاموشی کو میرا اقرار سمجھا "کمال الدین حد سے بڑھتا جا رہا ہے۔ اب اس کا سر کچلنا ہی پڑے گا۔"

"اب کے مجھے کمال الدین خان نے نہیں بھیجا بلکہ میں خود آیا ہوں۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟ کیا تمہیں یاد نہیں ہے کہ پچھلی بار تم یہاں کتنا خون خرابہ کر کے گئے تھے۔ تم نے سردار برکت علی کے علاوہ اس کے تین کارندوں کا بھی خون کیا تھا۔ کیا تم نہیں جانتے تھے کہ اگر پکڑے گئے تو تمہارا کیا حشر ہوگا۔" اکی حیرانی کے عالم میں سوال پر سوال کرتا چلا گیا۔ اسے یقین نہیں رہا تھا کہ کوئی شخص اپنی زندگی سے اتنا بے زار بھی ہو سکتا ہے۔

"میں ان تمام باتوں سے پوری طرح واقف ہوں۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "میں نے جو کچھ کیا اس پر مجھے کوئی پچھتاوا یا شرمندگی نہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس حویلی کا ذرہ ذرہ میرے لہو کا پیاسا ہے لیکن یہاں آنا میری مجبوری تھی۔ مجھے یہاں آنا ہی تھا۔"

"وہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ تم نے جان بوجھ کر پھانسی کے پھندے میں گردن کیوں پھنسائی؟"

اکی کا لہجہ حیرت سے لبریز تھا۔

"میں اپنی زندگی کی سب سے قیمتی شے یہاں چھوڑ گیا تھا۔ مجھے اسے واپس لینے کے لیے ہر قیمت پر یہاں آنا ہی تھا۔"

"تم یہاں کون سی شے چھوڑ گئے تھے؟" اکی نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے پوچھا۔ پھر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "اوہ تم اس بڈھے کی بات کر رہے ہو جسے ہم نے گولی مار کر زخمی کر دیا تھا۔"

فقیر بابا کا ذکر آتے ہی میں بری طرح بے چین ہو گیا۔ "ہاں ہاں میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔ وہ ٹھیک تو ہے نا؟ اب اس کا کیا حال ہے؟"

"لگتا ہے بہت گہرا تعلق ہے تمہارا اس بڈھے سے۔" میری بے چینی اپنی آخری حدوں کو چھو رہی تھی اور وہ ادھر ادھر کی ہانکے جا رہا تھا لیکن فقیر بابا کے متعلق کچھ نہیں بتا رہا تھا۔

"ہاں ہاں بہت گہرا تعلق ہے میرا اس سے۔" میں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "میں اس کی خاطر جان بھی دے سکتا ہوں۔ وہ میرا باپ ہے' میرا بھائی ہے' وہ میرا سب کچھ ہے' یاد رکھو اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں تم لوگوں میں سے ایک کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

مجھے اپنی حالت پر تعجب ہو رہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے میں اپنے جذبات پر سے مکمل طور پر قابو کھو بیٹا۔ اکی حیرانی سے میری شکل دیکھ رہا تھا۔ "میں تو تجھے فولاد سمجھتا تھا جوان لیکن تو تو موم کا پتلا نکلا۔" اس کے لہجے میں مایوسی کی ہلکی سی جھلک نمایاں تھی۔

"بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں اکی، جن کے سلسلے میں بڑے سے بڑا فولادی ستون بھی پگھل کر موم بن جاتا ہے۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ تم مجھے میرے ساتھی کے متعلق بتاؤ۔ تم نے اس کا کیا حشر کیا ہے؟" میری آواز خود بہ خود بھاری ہو گئی۔

اکی میری اس کیفیت سے کافی متاثر ہوا۔ اس نے کہا۔ "وہ بندہ ہماری قید میں ہے اور بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔" پھر اس کی آنکھیں یکا یک چمک اٹھیں۔ "وہ بڑا حیرت انگیز بندہ ہے' اس نے تو ہماری کھوپڑی گھما کر رکھ دی۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے اس کا علاج کروایا۔ اسے بوڑھا اور ضعیف سمجھ کر ہم نے اس پر سختی نہیں کی لیکن وہ جونہی تھوڑا بہت چلنے پھرنے کے قابل ہوا' اس نے نہایت پراسرار طریقے سے ہمارے دو بندوں کو بے ہوش کر دیا اور فرار ہونے کی کوشش کی۔ اگر عین وقت پر میں اور امامی وہاں نہیں پہنچ جاتے تو وہ تقریباً نکل ہی گیا تھا۔"

اس کی زبان سے فقیر بابا کے کارنامے سن کر میرے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑنے لگی۔ "پھر تم لوگوں نے کیا کیا؟"

"کرنا کیا تھا؟ ہم نے اسے ایسی جگہ بند کیا کہ وہ کوئی داؤ پیچ نہ آزما سکے۔ یہ تو میں سمجھ ہی چکا تھا کہ وہ کوئی بہت اونچی ہستی ہے' البتہ میرے کارندے اب بھی اس کے قریب جانے سے ڈرتے ہیں۔" اکی کے لبوں پر مطمئن مسکراہٹ تھی۔

''تم لوگوں نے مجھے اتنی آسانی سے کیسے پھانس لیا؟ کیا تم لوگوں کو پتا تھا کہ میں حویلی میں گھس چکا ہوں؟'' میں نے اپنے ذہن میں کلبلاتے سوال کو زبان دے دی۔

''آہاہاہا'' اکی نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ ''یہ بہت راز کی بات ہے لیکن میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ جب تم آج شام درختوں کے پاس پہنچے تو اسی وقت ہماری نظروں میں آ گئے تھے۔ ہم اسی وقت سے تمہارے استقبال کی تیاری کر رہے تھے۔ حویلی کے پچھلے دروازے کا تالا بھی شام کو ہی کھول دیا گیا تھا بلکہ ہمیں تو یہ بھی اندازہ تھا کہ تم کس طرف سے حویلی میں داخل ہو گے۔ ویسے تم نے جس طرح سے چار دیواری عبور کی وہ بڑی ہمت کا کام ہے۔''

''لیکن تم لوگوں نے یہ سب کچھ کیا کیسے؟'' میں نے حقیقتاً حیران ہو کر پوچھا۔

''دراصل بات یہ ہے کہ جب تم یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تو ہمیں حویلی کے حفاظتی انتظامات کی کمزوریوں کا شدت سے احساس ہوا۔ ہم نے بے حد سوچ بچار کے بعد حویلی کے دفاعی نظام میں چند بے حد موثر تبدیلیاں کیں۔ انہی تبدیلیوں کی وجہ سے تم بڑی آسانی سے ہمارے پھندے میں پھنس گئے۔ جس وقت تم ان درختوں کے قریب پہنچے تو تم صداقت کی نظروں میں آ گئے۔ اس کے ذمے یہ کام لگایا گیا تھا کہ وہ حویلی کی چھت پر چھپ کر آس پاس کا جائزہ لیتا رہے۔ اس کے پاس بہت طاقتور دوربین تھی جس سے وہ آس پاس کا علاقہ چھان رہا تھا۔ اس نے جونہی تمہیں دیکھا' مجھے اطلاع دی۔ یہ اطلاع پا کر میں بھی چھت پر آ گیا اور بذات خود تمہیں دیکھا۔ اس وقت تم ایک درخت سے اتر کر دوسرے درخت پر چڑھ رہے تھے۔ ہمیں پہلے خیال آیا کہ تم کمال الدین کے جاسوس ہو۔ میں نے اندازہ لگایا کہ تم حویلی میں گھسنا چاہتے ہو۔ لہٰذا میں نے تمہارے راستے کی تمام رکاوٹیں ہٹا دیں۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ اب شام ہوتے ہی حویلی کے احاطے میں شکاری کتے کھلے چھوڑ دیے جاتے ہیں لیکن تمہیں خوش آمدید کہنے کے لیے میں نے آج کتے نہیں کھلوائے۔ اس حویلی میں گھسنے کے بعد تمہاری ہر حرکت ہماری نظروں میں رہی ہے۔''

اکی نے جو کچھ بتایا' اس نے میرے ہوش ٹھکانے لگا دیے۔ میری یہ مہم بھی حماقتوں' کوتاہ اندیشی اور خوش فہمی پر مبنی کارناموں کی نذر ہو گئی تھی۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ زعم بری طرح سے زور پکڑ گیا تھا کہ میں ہر رکاوٹ کو عبور کر سکتا ہوں۔ میری ذہانت اور حوصلے کے سامنے ہر دیوار منہدم ہو جائے گی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ اب حویلی کے مکین پہلے سے زیادہ محتاط ہوں گے۔ فقیر بابا کا کہنا ایک بار پھر درست ثابت ہوا' میری ناپختہ کاری نے مجھے جال میں پھنسا دیا تھا۔

میں جس آسانی سے اس چوہے دان میں آن پھنسا تھا اس کے متعلق سوچ سوچ کر مجھے شرم آ رہی تھی۔ ''اب میرے متعلق تم لوگوں کے کیا ارادے ہیں اکی؟'' میں نے پژمردہ لہجے میں پوچھا۔

''میں بتاتا ہوں' اب تیرا کیا ہو گا۔'' امامی نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ اکی جس شریفانہ انداز میں مجھ سے بات کر رہا تھا وہ انداز اسے پسند نہیں آیا۔ ''ہم سب تیرے سور جیسے جثے کی بوٹیاں کر کے کتوں کو

کھلائیں گے۔''

''اپنے کتے کو کچھ کھلایا پلایا کرو اکی۔ مجھے یہ بہت بھوکا نظر آ رہا ہے۔'' میں نے امامی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ امامی کے منہ سے ایک غلیظ گالی نکلی اور اس نے مجھ پر جھپٹنے کی کوشش کی۔

اکی نے اشارے سے روک دیا۔ ''بندھے ہوئے شکار پر حملہ کرنا مردانگی نہیں ہے امامی' تھوڑا سا انتظار کر لو۔ وقت آنے پر تمہیں اپنے دل کی حسرتیں نکالنے کا پورا موقع ملے گا۔'' پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ ''جو کچھ تم کر چکے ہو اس کے بعد بھی تمہارا سوال عجیب سا لگتا ہے۔ کیا تمہیں خود معلوم نہیں ہے کہ تمہارا کیا انجام ہونے والا ہے؟ بہرحال ہم لوگ وہی کریں گے جس کا ہمیں حکم دیا جائے گا۔''

''یہ حکم تمہیں کون دے گا؟'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔ مجھے اپنی رگوں میں خون کی گردش سست ہوتی محسوس ہوئی۔

''تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کس کا ذکر کر رہا ہوں۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کمال الدین نے تمہیں کیا حکم دیا ہے۔ وہ نامرد' ایک کمزور عورت کو بھی بخشنے کے لیے تیار نہیں۔''

''تم برکت علی کی بیوہ کی بات کر رہے ہو؟'' مجھے اپنے الفاظ حلق میں اٹکتے ہوئے محسوس ہوئے۔

''ہاں میں گودی سائیں کی ہی بات کر رہا ہوں۔'' اکی نے گھمبیر لہجے میں کہا ''تمہارے متعلق آخری فیصلہ وہی کرے گی۔''

اس کی زبان سے نکلنے والے ان الفاظ نے میرے دماغ میں طوفان سا برپا کر دیا۔ میری خم پارہ تقدیر مجھے کس عبرت ناک موڑ پر لے آئی تھی۔ میری زندگی اور موت کا دارومدار اس شخصیت کے فیصلے پر تھا جسے دنیا والے ماں کے نام سے پکارتے ہیں۔ کیا کوئی ماں بھی اپنے بیٹے کے لیے موت کی سزا تجویز کر سکتی ہے؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہی دیا جا سکتا تھا لیکن میرے معاملے میں صورت حال قطعی مختلف تھی۔

میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ میں اسے ہرگز نہیں بتاؤں گا کہ میرا اس سے کیا رشتہ ہے۔ یہ ایک طرح سے رحم کی بھیک مانگنے کے مترادف ہوتا۔ کھڑے کھڑے میرے پاؤں سن ہونے لگے۔ میرے دونوں ہاتھوں میں شدید درد ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا وزن ایک پاؤں سے دوسرے پاؤں پر منتقل کیا۔ جب میں نے مزید کوئی سوال نہ کیا تو اکی نے مجھے زمین پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ اور خود زینہ چڑھ کے اوپری منزل پر چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے اپنے کارندوں کو محتاط رہنے کی ہدایت کی۔ میں قدرے اضمحلال کا شکار ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری توانائیاں جواب دے رہی ہوں...... انسان جب مایوسیوں کی انتہا تک پہنچ جائے تو اس کی یہی حالت ہوا کرتی ہے۔ میں نے بے خود کو اس قدر افسردہ شاید ہی کبھی محسوس کیا ہو گا۔

رات تیزی سے گزرتی جا رہی تھی۔ امامی نے مجھ سے کوئی بات کرنا چاہی لیکن میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ میرا بات کرنے کو بالکل دل نہ چاہا۔ میں نے کچھ سوچنا چاہا لیکن میرے دماغ نے میرا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

کافی دیر بعد زینے پر آہٹ ہوئی۔ میں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ وہاں صرف اکی آتا نظر آیا۔ میرے دل میں اطمینان کی ہلکی سی لہر پیدا ہوئی۔ میں وہ چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میرے دل کی انتہائی گہرائیوں میں ایک خوف تھا' ایک اندیشہ تھا۔ میں اپنے آپ سے ڈر رہا تھا۔ میں نے اسے روبرو دیکھ لیا تو میرا ردعمل کیا ہوگا؟ میں نے سیف داد خان کو نفرت کی آگ میں پگھلا کر نا قابل تسخیر فولاد کی شکل دی ہے۔ اس عورت کی قربت سے کہیں یہ فولاد پگھل تو نہیں جائے گا؟ میری شخصیت کے کسی دور افتادہ تاریک گوشے میں نہاں' ماں کی آغوش کی گرمی کے لیے ترستا ہوا' بلبلاتا ہوا محروم بچہ کہیں میرے وجود پر غالب تو نہیں آ جائے گا؟

اکی میرے پاس ٹھہرے بغیر پچھلے ہال کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس لوٹا اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ پستول ایک بار پھر اس کے ہاتھ میں چمکنے لگا۔ میرا اولتھر اس نے کہیں سنبھال کر رکھ دیا ہوگا۔ اس کے کارندوں نے ایک بار پھر مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ میں سر جھکائے اکی کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ چھوٹے ہال سے گزر کر ہم عقبی راہداریوں میں داخل ہو گئے۔ تہ خانے والی کوٹھری کا دروازہ کھلا ہوا دیکھ کر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ لوگ مجھے فقیر بابا کے ساتھ ہی تہ خانے میں قید کرنے والے ہیں۔ ایسا ہوتا تو صورت حال شاید ایک نیا رخ اختیار کر لیتی۔ فقیر بابا اور میرے بیچ اس طرح کا تعلق تھا کہ ہم دونوں مل کر ایک تباہ کن قوت کا روپ دھار لیتے۔ وہ میرا مزاج آشنا ہی نہیں' میرا مسیحا بھی تھا۔

تہ خانے والی کوٹھری کے دروازے پر لگا ہوا موٹا سا تالا اب عقبی دروازے پر لٹک رہا تھا۔ ہم کوٹھری کے کھلے ہوئے دروازے پر پہنچے تو تہ خانے کے راستے پر نصب ڈھکن نما دروازے کے پٹ پہلے سے کھلے تھے۔ اکی نے سب سے پہلے مجھے اندر اترنے کا اشارہ کیا۔ تہ خانے کی طرف جانے والے زینے کی بھی لائٹ روشن تھی۔ اکی مجھے اچھی طرح پہچان چکا تھا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ میں ذرا سا موقع ملتے ہی کام دکھا جاؤں گا۔ اس نے پوری احتیاط رکھی کہ زینے کی تنگ جگہ پر میں کوئی کارنامہ سر انجام نہ دوں۔ میں نے زینے کی آخری سیڑھی طے کر کے فولادی دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے دروازے کو دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ اکی نے کہا۔ ''آرام سے سیڑھیاں اتر کر اپنے پرانے ٹھکانے پر پہنچ جاؤ۔ میں تم سے کوئی غلط رویہ اختیار نہیں کرنا چاہتا۔ امید ہے تم مجھے اس کا موقع نہیں دو گے۔''

میں مرے مرے قدموں سے سیڑھیاں اتر کر تہ خانے کے وسط میں جا پہنچا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہاں پر بچھے ہوئے ٹاٹ طنزیہ قہقہے لگا کر مجھے خوش آمدید کہہ رہے ہوں۔ کتنی جان توڑ اذیتیں اور مشقتیں سہہ کر میں نے یہاں سے آزادی حاصل کی۔ اس بدنصیب فضلو نے میرے فرار کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کی تو میں نے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ کیا ملا مجھے اتنا خون خرابہ کر کے؟ انسان سب سے جنگ کر لے لیکن اپنے مقدر سے تو جنگ نہیں کر سکتا۔

میں نے اپنے قفس کے در کی طرف نگاہ ڈالی۔ مجھے وہاں بھی ایک تبدیلی نظر آئی۔ ان لوگوں نے میرے اس تہ خانے کے فرار سے کافی سبق حاصل کیا تھا۔ اب مجھے وہاں فولادی دروازے کے ساتھ ساتھ تقریباً ایک ایک انچ موٹی سلاخوں والا ایک اور دروازہ نظر آیا۔ اکی نے سلاخوں والا دروازہ بند کر دیا۔ وہ چند لمحوں تک میرا جائزہ لیتا رہا پھر وہ واپس لوٹ گیا۔ مجھے سلاخوں کے درمیان امامی کا منحوس چہرہ نظر آیا۔ اس نے مجھے نفرت بھری نظروں سے دیکھا۔ میں نے اس کی طرف سے نظریں ہٹا لیں تو اس نے فولادی دروازہ بھی بند کر دیا۔ مجھے فقیر بابا کو اپنے ساتھ نہ پا کر شدید مایوسی ہوئی۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ ان لوگوں نے فقیر بابا کو کسی اور جگہ قید کر رکھا ہے۔

میں کچھ دیر ٹاٹ پر بیٹھا رہا۔ تہ خانے میں اگر کوئی بلب تھا بھی تو اس وقت وہ روشن نہیں تھا۔ میرے وجود کے اندر اور باہر مکمل تاریکی کا قبضہ تھا۔ میں نے ٹاٹ پر دراز ہونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ پیٹھ کے پیچھے بندھے ہوئے ہاتھوں پر اتنا شدید دباؤ پڑا کہ میں بے اختیار اٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر بعد میں دائیں پہلو کے بل ٹاٹ پر لیٹ گیا۔ مجھے خیال آیا کہ کم از کم اس منحوس رسی سے تو نجات پانے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ ان رسیوں کو توڑنا تو خیر ناممکن ہے لیکن اگر میں اپنے ہاتھوں کو کوشش کر کے اپنے سامنے لانے میں کامیاب ہو جاؤں تو شاید ان رسیوں کو کھولنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ میں ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ گھٹنوں کے بل اٹھ بیٹھا۔ میں نے اپنے بازوؤں کے درمیان جتنا ممکن ہو سکا فاصلہ پیدا کیا اور اپنے جسم کے نچلے حصے کو ان کے درمیان سے گزارنے کی کوشش کی۔ پہلے پہل تو یہ کوشش مجھے قطعاً احمقانہ محسوس ہوئی۔ میری دونوں کلائیاں اس قدر مضبوطی سے آپس میں جکڑی ہوئی تھیں کہ ان کے درمیان فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ میں نے زور لگایا تو نائلون کی رسی میری کلائیاں کاٹنے لگی۔ قدرے توقف کے بعد میں نے ایک بار پھر زور لگایا۔ نائلون کی رسی ایک بار پھر میری کلائیوں میں گڑنے لگی لیکن میں نے اپنی کلائیوں میں پیدا ہونے والے درد کو ذہن سے جھٹک کر اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری کلائیوں پر تیز دھار چھریاں چل رہی ہیں۔ میں نے مزید زور لگایا۔ اچانک میرے کولہے میری کلائیوں کے درمیان پھنس گئے۔ میری کلائیوں میں نائلون کی رسی گوشت بری طرح گڑ کر رہ گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری کلائیوں سے خون رس رہا ہے۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو کولہے سے نیچے لے جانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میں نے تھوڑا سا زور لگایا۔ اس کے ساتھ ہی میرے حلق سے کرب ناک کراہ خارج ہوئی۔ میں نے اپنی ہمت مجتمع کی اور سانس روک کر اپنے ہاتھوں کو اپنی پوری قوت سے جھٹکا دیا۔ میری کلائیوں پر ایک قیامت سی گزر گئی لیکن اس شدید اذیت کا نتیجہ میری مرضی کے مطابق نکلا۔ میری کلائیوں کا حلقہ کولہوں پر سے گزر کر میرے گھٹنوں کی پچھلی سمت پہنچ گیا۔ میں نے اپنے پاؤں سمیٹ کر با آسانی اپنے بازوؤں کے درمیان سے نکال لیے۔

میری کلائیوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ میں اندھیرے کے باعث ان کی صورت حال کا جائزہ نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھ چہرے کی طرف اٹھائے۔ مجھے رسی کے بندھنوں کے

ساتھ کسی قسم کی نمی محسوس نہیں ہوئی۔ میری کلائیوں میں خراشیں ضرور پڑیں لیکن ان سے خون نہیں نکلا۔ اسی وقت میرا گال میری شرٹ کی دائیں آستین سے چھو گیا۔ شرٹ کے دائیں بازو کے کف سے کچھ اوپر میرا رومال بندھا ہوا تھا۔ مجھے اس میں سے ہلکی ہلکی سی مہک خارج ہوتی محسوس ہوئی۔ رومال کا لمس محسوس کرتے ہی میرے حوصلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ میری افسردگی اور مایوسی جانے کہاں جا سوئی۔ میں تنہا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ میرا مددگار میرا ہمدم میرا دوست موجود ہے۔

میں گویا ایک بار پھر سے زندہ ہو گیا۔ میرے دماغ میں مایوس اور بیمار خیالات کی جگہ خوش امیدیوں پر مبنی خیالات پیدا ہونے لگے۔ یہ مصیبت مجھ پر پہلی بار تو نہیں پڑی ہے۔ پہلے بھی میری زندگی کئی بار داؤ پر لگی لیکن میں ہر آزمائش سے سرخ رو نکلا اس بار بھی میں اپنے دشمنوں کے دانت کھٹے کر دوں گا۔

میں نے اپنے ہونٹوں اور گالوں کے ذریعے اپنی کلائیوں پر بندھی رسی کی گرہوں کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ وہاں مجھے صرف دو موٹی موٹی گرہوں کی موجودی محسوس ہوئی۔ رسی کے جکڑ بندوں کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد مجھے اپنے دل میں خوشی کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میری کلائیوں کو رسی سے جکڑنے والا اناڑی لگتا تھا۔ اس نے میری کلائیوں پر بغیر کسی ترتیب کے اندھا دھند رسی لپیٹ دی۔ اس نے رسی میں جو گرہیں لگائیں وہ بھی مجھے بے ڈھنگی محسوس ہوئیں۔ میں نے ان میں سے ایک گرہ کو اپنے دانتوں کے ذریعے کھولنا شروع کیا۔ میری توقع کے عین مطابق اسے کھولنا زیادہ مشکل ثابت نہ ہوا۔ دوسری گرہ کھولنے میں بھی مجھے زیادہ وقت نہ لگا۔ گرہیں کھلتے ہی رسی ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے اپنے ہاتھ رسی سے آزاد کرا لیے۔

اندھیرے کے باعث میں نے آنکھوں کے بجائے اپنے دیگر حواس سے کام لیا اور دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا ہوا سیڑھی کی طرف بڑھا۔ قدم بہ قدم سیڑھیاں چڑھ کر میں دروازے کے سامنے والی قدرے کھلی جگہ پر پہنچ گیا۔ نائلون کی رسی کو لچھا بنا کر میں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ میں نے سلاخوں والے دروازے کو ہلانے جلانے کی کوشش کی۔ وہ اپنی جگہ سے ذرا سا بھی نہ ہلا جلا۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا۔ میں نے اس میں باہر کی طرف لگے ہوئے قفل کے وزن کو محسوس کر کے اندازہ لگایا کہ یہ بھی حویلی کے عقبی دروازے میں لگے ہوئے قفل کا بھائی بند ہے پھر میں نے بیرونی فولادی دروازے کو دھکیل کر کھولنے کی کوشش کی۔ اس میں ذرا سی بھی جنبش نہ پا کر مجھے کافی مایوسی ہوئی۔ اگر دروازہ کھلا ہوتا تو شاید میں کوئی نہ کوئی ترکیب لڑانے میں کامیاب ہو جاتا۔

اگلے دن صبح سویرے میری آنکھ کھل گئی۔ تہ خانے کی چھت کے قریب موجود چھوٹے سے جالی دار روشن دان سے اندر آنے والی روشنی سے تہ خانے کے اندر کا ماحول قدرے صاف نظر آنے لگا۔ میرے ذہن سے نیند کا غبار صاف ہوا تو میں ایک بار پھر تہ خانے کی قید سے جان چھڑانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ اس ترکیب میں رسی کا کردار بہت اہم ہو سکتا تھا۔

میں نے رسی کے ذریعے مختلف قسم کے پھندے بنانے اور انہیں استعمال کرنے کی مشق شروع کر

دی۔ میں اگر ایک بار اپنے مقصد میں ناکام ہو جاتا تو پھر میرے لیے دوسرے موقعے کی کوئی گنجائش نہ ہوتی۔ کافی دیر مشق کرنے کے بعد میں کافی حد تک مطمئن ہو گیا۔ اپنی طرف سے پوری تیاری کرنے کے بعد اپنے شکار کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ جلد یا بدیر کوئی نہ کوئی میری خبر لینے ضرور آئے گا۔ میرا یہ یقین درست ثابت ہوا۔ کچھ دیر بعد میں فولادی دروازے کے عقب میں زینے پر کھٹ پٹ کی آوازیں سنیں۔ کوئی شخص پرسکون انداز میں سیڑھیاں اتر کر فولادی دروازے کے پاس آن کھڑا ہوا۔ وہ فولادی دروازے میں لگا ہوا تالا کھولنے لگا۔ یہ آوازیں سنتے ہی میں پوری طرح چوکنا ہو گیا۔ اس شخص نے دروازے کے کنڈے سے تالا نکالا اور پھر کنڈے کو سرکا کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی میں نے خود کو آڑ میں کر لیا۔ وہ شخص آگے بڑھا اور اس نے سلاخوں والے دروازے کے بالکل قریب ہو کر تہ خانے کے اندر جھانکا۔ میں نے پہلی ہی نظر میں اسے پہچان لیا۔ وہ امامی تھا۔ اس کی نظریں تہ خانے کے وسط میں مجھے تلاش کر رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک پستول دبا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے سلاخوں کے بیچ میں گھسا۔ میرے ہاتھ میں نائلون کی رسی کا بڑا سا پھندا تھا۔ اسی وقت امامی کی نظر مجھ پر پڑی۔ فرط حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ صورت حال کو پوری طرح سمجھ پاتا' میں نے اپنے ہاتھ کو ایک خاص انداز میں جھٹکا دیا۔ نائلون کی مضبوط رسی کا پھندا فضا میں لہرایا اور امامی کی گردن کے گرد جا پڑا۔ پھندا کافی چوڑا تھا لہٰذا وہ کاندھوں سے پھسل کر اس کے سینے کے پاس پہنچ گیا۔ عین اسی وقت میں نے رسی کو زوردار جھٹکا دیا۔ اس جھٹکے کے ساتھ ہی نائلون کی رسی کا پھندا امامی کے سینے سے ذرا نیچے بری طرح سے کس گیا۔ میرا جھٹکا اس قدر طاقتور تھا کہ امامی کا جسم بری طرح سے فولادی سلاخوں سے ٹکرا گیا۔ اس کی کھوپڑی پر زبردست چوٹ آئی ہوگی۔

کچھ دیر کے لیے وہ ہوش وحواس سے بے گانہ ہو گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کے سینے کے قریب سے رسی میں جکڑ گئے۔ سب کچھ میری مرضی کے عین مطابق ہوا۔ امامی کی پشت سلاخوں والے دروازے کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ میں نے اپنا سیدھا ہاتھ اس کی گردن کے گرد لپیٹ کر اسے مکمل طور پر بے بس کر دیا۔ عین اسی وقت میری نگاہ امامی کے پستول پر پڑی۔ جس وقت میں نے اسے جھٹکا دیا۔ اسی وقت اس کا پستول اس کے ہاتھ سے چھٹ کر سیڑھیوں کے پاس جا پڑا تھا۔ یہ چیز میری مرضی کے خلاف تھی لیکن وقتی طور پر میں نے پستول کو نظر انداز کر دیا۔

امامی نے میرے بازو کی گرفت میں کسمسانے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی گردن کے گرد اپنے بازو کا گھیرا مزید تنگ کر دیا۔ امامی کا گلا گھٹنے لگا۔ اس نے منہ پھاڑ کر گہرے گہرے سانس لینے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے گرد لپٹی ہوئی رسی کو اپنے پیروں کے نیچے مضبوطی سے دبایا اور بایاں ہاتھ اس کی جیب میں ڈال دیا۔ میرا ہاتھ چابی کے گچھے سے ٹکرایا۔ میں نے فوراً وہ چابیاں اس کی جیب سے باہر نکال لیں۔ میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ کامیابی ایک بار پھر میرے پاؤں چوم رہی تھی۔ میں نے وہ چابیاں اپنی قمیص کی جیب میں ڈالیں اور اپنے پاؤں کے نیچے دبی ہوئی فالتو رسی کو اپنے بائیں ہاتھ میں

لے لیا۔ میں نے نائلون کی رسی کو اپنے دائیں بازو کے پاس سے گزارا اور اسے امامی کی گردن کے گرد کس دیا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے اپنی شرٹ کی جیب سے چابیاں نکال لیں۔ وہ مختلف سائز کی چار چابیاں تھیں۔ میں نے تالے میں ایک چابی لگائی' وہ چابی چھوٹی تھی۔ دوسری چابی تالے سے کافی بڑی تھی۔ وہ چابی کے سوراں میں داخل ہی نہ ہو سکی۔ میں نے مضطرب ہو کر تیسری چابی تالے میں لگانی چاہی لیکن ناکام رہا۔ یہ چابی بھی کسی بڑے تالے کی ثابت ہوئی۔ مجھ پر شدید مایوسی کا غلبہ ہونے لگا۔ میں نے مرے مرے ہاتھوں سے چوتھی چابی تالے میں لگانے کی کوشش کی حالانکہ چابی دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ اس تالے کی نسبت چھوٹی ہے۔

اپنی اتنی شدید محنت کو ضائع ہوتے دیکھ کر مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس بدبخت شخص کے پاس اس دروازے کی چابی ہی نہ تھی۔ وہ بے چارہ تو میرا حال چال پوچھنے آیا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہ مصیبت یوں اسے دبوچ لے گی۔ سلاخوں والے دروازے پر لگے ہوئے تالے کی چابی اکی کے پاس رہی ہوگی۔ امامی بے چارہ خواہ مخواہ میرے چنگل میں آن پھنسا تھا۔ اب وہ سلاخوں کے ساتھ بری طرح جکڑا ہوا کھڑا تھا۔ اس کی گردن اس بری طرح سے بھنچی ہوئی تھی۔ اس کا پستول میری دسترس سے باہر تھا۔ بالفرض میں وہ پستول حاصل بھی کر لیتا تو وہ میرے کس کام آتا؟ وہ تالا اس قدر بھاری تھا کہ پستول کی گولیاں تک اس پر بے اثر ہو جاتیں۔ امامی گھٹے گھٹے لہجے میں کوئی فریاد کر رہا تھا۔ اس کے الفاظ میری سمجھ میں نہ آئے لیکن وہ یقیناً مجھ سے التجا کر رہا ہوگا کہ میں اسے آزاد کر دوں۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں نے ایک بار پھر زینے پر کھٹ پٹ کی آوازیں سنیں پھر اکی کی حیرت سے لبریز بلند آواز زینے میں گونج اٹھی۔ "اوئے امامی یہ کیا ہوا تجھے؟ تیرے کو کس نے اس طرح باندھا ہے؟" امامی نے گھٹی ہوئی آواز میں کچھ کہنا چاہا لیکن ناکام رہا۔

یہ سب کچھ دیکھ کر اکی یقیناً محتاط ہو گیا ہوگا۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی اس کو چپ لگ گئی۔ اسی وقت اس کا پاؤں امامی کے پستول سے ٹکرایا۔ تب اسے اطمینان ہوا کہ میں غیر مسلح ہوں۔ وہ گرجدار آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اپنی خیریت چاہتا ہے تو میرے سامنے آ جا۔ مجھے امامی نہ سمجھنا۔ میں تیرے ٹوٹے کر دوں گا۔۔۔" وہ سمجھ رہا تھا کہ میں ابھی تک تہ خانے کے دروازے کے قریب ہی چھپا ہوا ہوں اور اس پر بھی اپنا داؤ آزمانا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی للکار کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ چپ چاپ اپنی جگہ پر لیٹا رہا۔ اکی نے ایک بار پھر مجھے للکارا۔ میں نے اس بار بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ محتاط انداز میں قدم اٹھاتا ہوا سلاخ دار دروازے کے قریب آیا۔ تب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ مجھے پرسکون انداز میں لیٹے دیکھ کر اس کے اعصاب کا تناؤ کم ہو گیا۔ اس نے بلند آواز میں مجھے مخاطب کیا۔ "تو اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا' تو اپنی ان حرکتوں سے مجھے سختی پر مجبور کر رہا ہے۔"

"آزادی کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا ہر انسان کا فطری حق ہوتا ہے اکی' میں اپنی آخری سانس تک جدوجہد کرتا رہوں گا۔ تمہارا جو جی چاہے مجھ سے سلوک کرو لیکن تم مجھے اپنی ان کوششوں سے باز نہیں

رکھ سکتے۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ میں اس دوران میں ٹاٹ پر ہی دراز رہا۔ "ہوں تو یہ بات ہے۔ ٹھیک ہے۔ تم اپنی سی پوری کوشش کر کے دیکھ لو۔ دیکھتا ہوں تم کیسے آزاد ہوتے ہو۔ اس دروازے کی چابی میرے پاس محفوظ ہے۔"

میں نے اکی کے دعوے کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میری طرف سے مطمئن ہو کر اکی نے اپنا یعنی میرا کولٹس پستول اپنی جیب میں ڈال لیا اور امامی کی بندشیں کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ میری لگائی ہوئی گرہیں اتنی آسانی سے بھلا کیسے کھلتیں؟ تنگ آ کر اس نے اپنا شکاری چاقو نکالا اور رسیاں کاٹنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد امامی آزاد ہو گیا۔ وہ چند لمحے تک اپنے اوسان درست کرتا رہا۔ جونہی اس کی حالت کچھ سنبھلی اس نے مجھ پر گالیوں کی بوچھار کر دی۔ وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اس نے اکی سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کا پستول واپس کر دے۔ اکی اس کی نیت کو پوری طرح سمجھ رہا تھا۔ اس نے اس کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ جب وہ مزید بپھرنے لگا تو اکی کو غصہ آ گیا۔ "بس بس زیادہ تیس مار خان بننے کی کوشش نہ کرو۔ اس نے سلاخوں کے پیچھے بند ہونے کے باوجود تمہیں کسی چوہے کی طرح باندھ لیا۔ اب تم اسے زنداں میں گولی کا نشانہ بنا کر اپنی بہادری کا سکہ جمانا چاہتے ہو؟"

اکی کے طنزیہ لہجے نے امامی کے غصے کے غبارے کی تمام پھونک نکال دی۔ وہ یک دم خاموش ہو گیا۔ اس نے نفرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔

اکی نے اسے اپنے ساتھ لیا اور واپس چلا گیا۔ اس نے فولادی دروازے کو بند کرنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔

میں شدید بھوک اور پیاس کا شکار تھا۔ کل دوپہر کا کھایا ہوا کھانا کبھی کا جزو بدن بن چکا تھا۔ بھوک سے بے تاب ہو کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سیڑھیاں چڑھ کر میں سلاخ دار دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ میں نے اپنے جسم کی تمام قوت مجتمع کی اور حلق کی پوری قوت سے اکی کو پکارا۔ پورا تہہ خانہ اور زینہ جھنجھنا اٹھا۔ میں کچھ دیر تک انتظار کرتا رہا۔ زینے کا کوٹھری میں کھلنے والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اگر راہداری میں یا باورچی خانے میں کوئی موجود ہوتا تو میری آواز یقیناً اس تک پہنچ جاتی۔ جب کوئی ردعمل سامنے نہ آیا تو میں نے ایک بار پھر زوردار ہانک لگائی۔ چند منٹ کے بعد میں نے تیسری بار اکی کو پکارا۔ اس بار میری محنت رنگ لائی۔ میں نے اکی کو زینے پر نمودار ہوتے دیکھا۔ جب وہ قریب آیا تو مجھے اس کے ہاتھوں میں کوئی چیز نظر آئی۔ دروازے کی سلاخوں کے قریب پہنچ کر اس نے وہ پوٹلی سی میری طرف بڑھا دی۔ "کیوں حلق پھاڑ رہے ہو بھائی۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں بھوک لگ رہی ہے۔ لو کھانا کھاؤ۔ اس کے بعد مجھے تم سے چند بے حد اہم باتیں کرنی ہیں۔"

وہ پوٹلی دراصل تین روٹیاں تھیں۔ ان روٹیوں پر دال رکھی تھی۔ یہ طریقہ عام طور پر فقیروں کو کھانا دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن اس وقت میرے ذہن میں اس طرح کے حوالے بھلا کہاں سے آتے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے روٹیاں لیں اور فوراً ہی انہیں حلق سے نیچے اتارنا شروع کر دیا۔ اس

دوران میں اکی سلاخوں سے ٹیک لگا کر کھڑا رہا۔ وہ اس قسم کا شخص نہیں تھا کہ مجھ سے خوف زدہ ہوتا۔ میں نے روٹیاں ختم کرلیں تو اس نے پلاسٹک کے گلاس میں مجھے پانی پلایا۔ میرے پیٹ کی آگ کے شعلے دھیمے پڑ گئے تو میں نے طمانیت آمیز لہجے میں کہا۔ "ہاں اب کہو اکی! تم مجھ سے کس سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہو؟"

"پہلے تمہیں مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا کہ یہ بات صرف اور صرف ہم دونوں کے درمیان رہے گی۔"

"کیا تم ایک بے بس اور اسیر شخص کے وعدے کا اعتبار کر سکتے ہو؟ ہو سکتا ہے تمہیں دھوکا دینے کے لیے میں جھوٹ بول دوں۔"

"نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ یہ ایک مرد سے مرد کا وعدہ ہوگا۔ ہم ایک دوسرے کے مخالف سہی لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ تم جوان مرد ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ ویسے بھی میں تم سے جو بات کرنے والا ہوں وہ ہم دونوں کے ہی مفاد میں ہے۔"

"ٹھیک ہے میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کروں گا۔" میں نے اقرار کیا۔

"یہ بات ہوئی نا! اب جو میں تمہیں بتا رہا ہوں' اسے غور سے سنو۔ جو بات سمجھ میں نہ آئے وہ مجھ سے پوچھ لینا۔" میں ہمہ تن گوش ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ سلاخوں کے پار اکی نے بھی یہی آسن اختیار کر لیا۔

"میں یہ تو جانتا ہوں کہ تم کمال الدین خان کے بندے ہو لیکن میں تمہارے نام سے ناواقف ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے اپنا نام اصلی نام بتاؤ گے بھی نہیں۔ خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔"

"میرا نام ذوالفقار علی خان ہے۔" میں نے کہا۔

"خیر یونہی سہی۔ تو بھائی ذوالفقار علی یہ بات تو تم جانتے ہی ہو کہ میں سردار برکت علی مرحوم کا پھوپی زاد بھائی ہوں۔ مرحوم ایک اچھا آدمی تھا لیکن اس میں بہت سی کمزوریاں بھی تھیں۔" اکی نے میرے چہرے کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ میں نے اپنا م چہرہ بے تاثر رکھا۔ "پیسے کی فراوانی نے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ شراب' جوا' طوائف بازی۔ وہ ہر عیب میں پورا تھا۔ انہیں چکروں میں اس کی کمال الدین خان سے دشمنی ہوئی۔"

"تمہید کو چھوڑو یار اکی اور اصل بات کرو۔ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے بے زار سا ہو کر کہا۔

"وہی بتا رہا ہوں۔ مرحوم سردار برکت علی نے محبت کی شادی کی تھی لیکن شادی کے کچھ ہی عرصے بعد وہ ایک بار پھر اپنی پرانی حرکتوں پر اتر آیا۔ وہ کئی کئی دن طوائفوں کے ڈیروں پر پڑا رہتا۔ گودی سائیں نے اس کے رویے پر احتجاج کیا تو وہ اس کے ساتھ بدسلوکی پر اتر آیا۔ گودی سائیں کسی طرح بھی اپنی حق تلفی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے مزاحمت جاری رکھی۔" اکی کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ میری سماعت پر انگارہ بن کر گر رہا تھا۔ وہ جونہی "گودی سائیں" کا ذکر کرتا' میرا لہو سلگ اٹھتا۔ میری روح میں کانٹے چبھتے رہے لیکن میں نے اسے نہیں ٹوکا۔ وہ مجھے جو کچھ بتا رہا تھا وہ ادھورا سچ تھا۔ وہ برکت علی

کے عیب تو بتا رہا تھا لیکن اس نے گودی سائیں کے کردار پر روشنی ڈالنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ عین ممکن تھا کہ اسے اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہو۔

میں نے اپنے دل میں اٹھتے ہوئے بگولوں کو نظر انداز کر دیا۔ فی الحال یہی میرے لیے بہتر تھا۔ اکی میری حالت سے بے خبر بولے جا رہا تھا۔

"گودی سائیں کسی طرح نہ مانی تو برکت علی نے اس کے ساتھ مار پیٹ شروع کر دی۔ انہیں دنوں برکت علی نے مجھے اپنے پاس بلوا لیا۔ اس کے دشمنوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ اسے ایک بار با اعتماد ساتھی کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی۔ میں نے حویلی کے اکثر بیرونی معاملات کو سنبھال لیا۔ اس دوران میں مجھے احساس ہوا کہ برکت علی واقعی گودی سائیں پر بہت زیادتی کرتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گودی سائیں کی برکت علی سے نفرت شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔ اس معاملے میں میری ہمدردی مکمل طور پر گودی سائیں کے ساتھ تھی۔ گودی سائیں کی برکت علی سے نفرت اس وقت عروج پر پہنچ گئی جب برکت علی نے نئی شادی کا ارادہ ظاہر کیا۔ گودی سائیں نے ایک اودھم برپا کر دیا لیکن برکت علی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ اپنے ارادے پر اٹل رہا۔ اس کی یہ حرکت گودی سائیں کی برداشت کے لیے آخری تنکا ثابت ہوئی۔ اس نے میرے روبرو قسم کھائی کہ وہ برکت علی کو اس کی شادی سے پہلے قتل کر دے گی۔ میں اس سلسلے میں بے حد پریشان تھا۔ گودی سائیں کی اس عادت سے میں بخوبی واقف تھا کہ وہ جو کچھ کرنے کا ارادہ کر لے' ہر صورت میں کر گزرتی ہے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اسے اس ارادے سے کیسے روکوں۔ مجھے برکت علی سے ہمدردی نہیں تھی۔ مجھے صرف فکر یہ تھی کہ برکت علی کو قتل کرنے کی صورت میں گودی سائیں کا کیا بنے گا؟ اس روز میں اپنے گھر گیا ہوا تھا۔ واپس لوٹا تو معلوم ہوا کہ تم نے برکت علی کو ہلاک کر دیا اور خود بھی پکڑے گئے۔ سچی بات یہ ہے کہ جب یہ خبر میرے علم میں آئی تو مجھے افسوس کے بجائے اندرونی خوشی محسوس ہوئی کہ گودی سائیں کے ہاتھ لہو میں نہیں ڈوبے اور اس کی مشکل بھی حل ہو گئی۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں نے تمہیں دیکھا تو میرے لیے تمہارے دل میں کوئی نفرت نہ تھی۔"

اکی نے بات ختم کرنے کے سے انداز میں میری طرف دیکھا۔

"یہ سب باتیں تو تم نے بتا دیں بھائی لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم اس مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے اپنی دلی کیفیت کو چھپاتے ہوئے کہا۔ اتنا تو میں سمجھ ہی چکا تھا کہ وہ اپنی گودی سائیں کو شرافت کی پتلی بنا کر پیش کر رہا ہے لیکن میں نے اسے ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔ پہلے وہ اپنا مدعا تو میرے گوش گزار کرتا' اس کے بعد ہی میں صورت حال کا صحیح تجزیہ کر پاتا۔ وہ معاملے کو جو رخ دے رہا تھا وہ سراسر میرے حق میں تھا۔

"گودی سائیں ابھی تک عدت میں ہے ورنہ وہ خود تم سے بات کرتی۔ پچھلی بار تم جب ہماری قید میں تھے تو میں نے اندازہ لگایا کہ اس کے دل میں تمہارے لیے نرم گوشہ موجود ہے۔ حویلی کے تمام کارندوں کا اصرار تھا کہ تمہیں اذیت ناک موت مارا جائے لیکن وہ مسلسل تمہارے متعلق فیصلے کو ٹالتی رہی۔ جب تم یہاں سے فرار ہو گئے تو اس نے ذرا بھی غم و غصے کا اظہار نہیں کیا۔ تمہارے فرار ہونے کے بعد جبکہ

برکت علی کو مرے ہوئے ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ برکت علی کا چھوٹا بیٹا رفاقت علی حویلی میں پہنچ گیا۔ وہ ملتان میں رہتا ہے۔ اس نے حویلی پر قابض ہونے کی کوشش کی۔ تب اسے معلوم ہوا کہ برکت علی نے اپنی تمام جائیداد گودی سائیں کے نام کر رکھی ہے۔ وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ مجھے اس کے ارادے خطرناک نظر آ رہے تھے۔ وہ پڑھا لکھا آدمی ہے' اسے معلوم ہے کہ اگر گودی سائیں ختم ہو جائے تو تمام جائیدادیں اس کے قبضے میں آ جائے گی۔ میں نے اپنے اس اندیشے کا گودی سائیں سے تذکرہ کیا تو وہ شدید خوف زدہ ہو گئی۔ رفاقت علی واپس ملتان چلا گیا لیکن گودی سائیں کا خوف دور نہ ہوا۔ کچھ ہی دنوں بعد گودی سائیں کا خوف درست ثابت ہوا۔ اس پر یکے بعد دیگرے دو قاتلانہ حملے کیے گئے۔ ایک بار اس کو کھانے میں زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی اور دوسری بار اس کے بستر پر سانپ چھوڑ دیا گیا۔ اس کی خوش قسمتی یہ رہی کہ دونوں ہی بار وہ بال بال بچ گئی۔ اس کے بعد اس کے دن رات خوف و ہراس میں گزرنے لگے۔ اسے یقین ہو چلا کہ رفاقت علی اسے کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

اکی کی داستان طویل تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے بیزار ہو کر کہا۔ "اس قصے کو چھوڑو بھائی۔ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ مجھ سے صاف صاف بات کرو۔"

"تم صاف صاف بات سننا چاہتے ہو تو سنو۔ ہم لوگ چاہتے ہیں کہ تم رفاقت علی کو ختم کر دو۔" اکی نے واضح الفاظ میں اپنا مدعا بیان کر دیا۔ مجھے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔

"مگر کیوں بھائی؟ میں اسے کیوں قتل کرنے لگا؟ میری اس سے کیا دشمنی ہے؟" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"بات دشمنی یا دوستی کی نہیں ہے میرے بھائی' بات صرف اتنی ہے کہ ایسا کرنا تمہاری مجبوری ہے۔" اکی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے میرے دوست کہ اگر تم اپنی اور اپنے فقیر بابا کی زندگی بچانا چاہتے ہو تو تمہیں ہماری بات ماننا ہی پڑے گی۔ اگر تم رفاقت علی کو ختم کر دو تو میرا وعدہ ہے کہ ہم فقیر بابا کو بحفاظت آزاد کر دیں گے۔ اس کے بعد تم دونوں جہاں جی چاہے چلے جانا۔ ہم تم سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔"

"نہیں میں یہ نہیں کر سکتا۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"جذباتی مت بنو جوان۔ اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کر لو۔ یہ خیال اپنے دل سے نکال دو کہ اب تم یہاں سے فرار بھی ہو سکتے ہو۔ میں آج شام کو پھر تم سے بات کروں گا۔ اس وقت تک تم کوئی فیصلہ کر لو۔" اکی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے لہجے میں سرد مہری جھلکنے لگی۔ وہ زینے کی سیڑھیاں چڑھ کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ خود تو چلا گیا لیکن میرے گرد سوالات کا ہجوم چھوڑ گیا۔ میں ایک بار پھر اپنے ٹاٹ پر جا کر لیٹ گیا۔

میں ایسا اپنے خیالات میں گم ہوا کہ مجھے اپنے آس پاس کا ہوش نہ رہا۔ اس بات میں کوئی شک نہ

تھا کہ میری اور فقیر بابا کی زندگی ان لوگوں کے رحم و کرم پر تھی۔ مجھے اپنی زندگی کی پرواہ نہ بھی ہوتی تو میں فقیر بابا کی سلامتی کو کیسے داؤ پر لگا دیتا۔ اس کی زندگی بچانے کی یہی صورت تھی کہ میں اکی کی بات مان لوں۔ پر میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر میں ایسا کر بھی گزروں تو کیا یہ لوگ واقعی فقیر بابا کو چھوڑ دیں گے؟ پھر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ایک بار مجھے اس قید سے نکلنے کا موقع مل جاتا تو میں سب کچھ صحیح کر لیتا۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یعنی "گودی سائیں" کی نابودی اس وقت ممکن ہوتی جب میں یہاں سے نکل پاتا۔ میں اتنے بہت سے لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگ چکا ہوں مجبوراً ہی سہی خون تو بہر حال خون ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی فہرست میں اگر ایک اور نام درج ہوتا تو کیا فرق پڑتا۔ فقیر بابا کی زندگی بچانے کے لیے ایک اور قتل اپنے نامہ اعمال میں درج کرانا ہی پڑے گا۔ اس کی شفقت' اس کی محبت' اس کی سرپرستی کا اتنا بوجھ مجھ پر حق بہر حال ہے ہی۔ ویسے بھی کون سا میں پارسائی کی خلعت پہنے ہوئے ہوں۔ جوں جوں میں سوچتا گیا میرا ارادہ تشکیل پاتا چلا گیا۔ میں نے سوچ لیا کہ میں ان لوگوں کی مرضی کے مطابق عمل کروں گا۔ ویسے بھی رفاقت علی کون سا معصوم فرشتہ ہے۔ اسے قتل کرنا انسانیت پر ایک احسان ہی ہو گا۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے اپنے ذہن کو اس معاملے سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میرا ضمیر مجھے بار بار کچوکے دینے لگا۔ میں تمام دن ادھیڑ بن میں لگا رہا لیکن لے دے کر بات پھر وہیں آ گئی۔ اگر میں ان لوگوں کی بات نہ مانوں تو کیا کروں؟ کیا فقیر بابا کو ان کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر جانے دوں؟

شام کو اکی میرے پاس آیا تو میں مصمم ارادہ کر چکا تھا کہ میں اس کی بات مان لوں گا۔ "میں تمہاری بات ماننے کو تیار ہوں۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے تمہیں فقیر بابا کو مجھ سے ملانا ہو گا۔"

"مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔ تمہیں جلد ہی اس سے ملا دیا جائے گا۔"

"اگر بات پکی ہو گئی ہے تو پھر مجھے اس تہ خانے سے نکالو۔ ظاہر ہے میں یہاں قید میں رہ کر تو اس بندے کو قتل نہیں کر سکتا۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"بس آج رات اور یہاں گزارہ کر لو۔ کل صبح تمہیں یہاں سے نکال لیا جائے گا۔ انشاء اللہ کل شام کو تمہیں تمہارے ساتھی سے بھی ملا دیا جائے گا۔ اس کے بعد تم اپنی مہم پر روانہ ہو جانا۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد اکی کھانا لے آیا۔ اس بار کھانے کا معیار پہلے سے کافی بہتر تھا۔ کھانا کھانے کے بعد میں ٹاٹ پر لیٹ گیا۔ رات کو ان لوگوں نے تہ خانے کی لائٹ بند نہ کی۔ وہ بلب سلاخ دار دروازے کے عین اوپر روشن تھا۔ میں نے سونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میرا ذہن ابھی تک میرے فیصلے کو قبول نہیں کر پایا تھا۔ میرا ضمیر بار بار مجھے ملامت کرنے لگتا۔ میں کروٹیں بدل بدل کر تھک گیا۔

صبح سویرے اکی ایک بار پھر میرے پاس آن دھمکا۔ ”اب تو مجھے اس پنجرے سے نکال لو بھائی۔ جب میں نے تم لوگوں کی بات مان لی ہے تو پھر اب مجھے یہاں قید رکھنے کا کیا جواز ہے؟“

”کچھ دیر صبر کر لو میری جان۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم یہاں سے نکلنے کے فوراً بعد اپنی مہم پر روانہ ہو جاؤ۔ ہم لوگ تمہاری روانگی کی تیاریاں مکمل کر رہے ہیں۔“ اکی نے خوش دلی سے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

”میری ایک بات اور غور سے سن لو بھائی اکی۔ جب تک تم لوگ مجھے فقیر بابا سے نہیں ملواؤ گے‘ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔“ میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

”ہمیں معلوم ہے بھائی۔ ہم لوگ اس کے بھی انتظامات کر رہے ہیں۔ لیکن میں ایک بار پھر تم سے درخواست کرتا ہوں کہ کوئی کارنامہ دکھانے کی کوشش مت کرنا ورنہ اس کا نتیجہ تمہارے اور تمہارے فقیر بابا دونوں کے حق میں اچھا نہیں نکلے گا۔“

”میں نے کہہ دیا نا کہ تم لوگ میری طرف سے بے فکر رہو البتہ مجھے جتنی جلدی یہاں سے نکال لو اتنا ہی اچھا ہے‘ ایسا نہ ہو کہ میری کھوپڑی گھوم جائے۔“

کچھ دیر بعد اکی میرے لیے ناشتا لے آیا۔ اس کے بعد وہ واپس گیا تو سہ پہر کے قریب واپس لوٹا۔ میں اس دوران میں سخت بور ہو گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا رویہ معذرت خواہانہ ہو گیا۔ ”ناراض نہ ہونا ذوالفقار علی‘ میں ایک ضروری کام سے شہر گیا ہوا تھا‘ بہر حال اب تم تہ خانے سے نکلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ اس نے اپنی جیب سے چابی نکال کر تالے میں گھما دی۔ اس نے دروازہ کھولا تو میں باہر نکل آیا۔ آزاد فضا میں پہلا سانس لیتے ہی میری روح تک سرشار ہو گئی۔ میری تقدیر بھی مجھ سے عجیب طرح کی آنکھ مچولی میں مشغول رہتی ہے۔ ابھی میں ایک زندان سے چھوٹ بھی نہیں پاتا کہ دوسرا قفس میرا منتظر ہوتا ہے۔ یہ اسیری اور رہائی کا کھیل میری زیست کا معمول بن گیا ہے۔

تہ خانے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں اکی کے پیچھے پیچھے رہا لیکن میں نے کوئی ”ایسی ویسی“ حرکت نہ کی۔ ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے شاکی لہجے میں کہا۔ ”یار اکی تمہارے جانے کے بعد کسی نے مجھے دوپہر کا کھانا بھی نہیں دیا۔“

”میں نے ان لوگوں کو سختی سے منع کیا ہوا ہے کہ میرے علاوہ کوئی تمہارے پاس نہ آئے۔ تم خود بھی کسی سے فالتو بات کرنے کی کوشش مت کرنا ہم نے حویلی کے کسی کارندے کو بھنک بھی نہیں پڑنے دی کہ تم حویلی سے جا رہے ہو۔ اگر انہیں یہ بات معلوم ہو جائے تو وہ خواہ مخواہ شک کریں گے کہ ہم نے سردار برکت علی کے قاتل کو کیوں رہا کر دیا ہے۔“

”ٹھیک ہے میں تمہاری مجبوری کو سمجھ رہا ہوں۔ میں تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“ میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ تہ خانے کے دروازے والی کوٹھری سے راہداری میں آ کر میں نے کنکھیوں سے عقبی دروازے کا جائزہ لیا۔ دروازے کے کنڈے میں لٹکا ہوا بھاری بھرکم قفل مجھے میری بے بسی کا مذاق

اڑاتا محسوس ہوا۔ راہداری میں نیم تاریکی کی چھدری چادر تنی ہوئی تھی۔ اکی مجھے اپنے ساتھ چھوٹے ہال میں لے آیا۔ اس جگہ دن کے وقت بھی اچھا خاصا اندھیرا رہتا ہو گا۔ اس وقت بھی وہاں ایک بلب روشن تھا۔

اکی نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ میں چپ چاپ اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ اسی کمرے میں مجھے صداقت ملا تھا۔ اس وقت مجھے یہ کمرا خالی نظر آیا۔ اکی نے مجھے ایک چارپائی پر بٹھا دیا۔ ”تم یہاں ٹھہرو اور مجھے کچھ دیر اجازت دو۔ اس کمرے کا دروازہ فی الحال کچھ دیر کے لیے بند رہے گا۔ تم اس کا برا نہ ماننا۔“ میرے پاس اس سے اتفاق کرنے کے علاوہ کوئی راستہ ہی کہاں بچا تھا۔ میں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اکی مجھے وہاں چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے تصدیق کرنے کی کوشش ہی نہ کی کہ دروازہ واقعی مقفل ہے یا نہیں۔ اس سے فرق بھی کیا پڑتا۔ جب تک میری فقیر بابا والی رگ ان کی انگلی تلے تھی‘ میں قید نہ ہوتے ہوئے بھی قید تھا۔

کمرے میں پنکھا مسلسل گھومتا رہا۔ میں چارپائی پر دراز ہو کر اپنے نصیب کے لکھے کا انتظار کرنے لگا۔ بستر کی نرمی مجھے آرام کی دعوت دیتی رہی لیکن مجھے تو اکی کا انتظار کرنا تھا۔ اکی مغرب کے وقت پہنچا۔ ”اٹھ کر کھڑا ہو جا جوان۔ چل تجھے تیرے فقیر بابا سے ملاتا ہوں۔“ اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔

ان الفاظ نے میرے وجود میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ فرط مسرت سے میرا دل رقص کرنے لگا۔ میرے چہرے پر بھی خوشی کے رنگ بکھر گئے ہوں گے۔ اکی بغور میرے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے لبوں پر بھی موہوم سا تبسم رقص کرنے لگا۔ میری اس کیفیت سے اسے مزید یقین ہو گیا ہو گا کہ واقعی میرے لیے فقیر بابا کی شخصیت بے حد اہم ہے اور اس کی خاطر میں سب کچھ کر گزروں گا۔

اکی مجھے اپنے ساتھ لے کر ایک طرف چل پڑا۔ میرے اندازے کے برعکس اس کا رخ حویلی کے عقبی دروازے کی طرف تھا۔ عقبی دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے قفل کھولنے کے بجائے تہ خانے والی کوٹھری کا دروازہ کھول دیا۔ مجھے ہلکا سا جھٹکا سا لگا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے حویلی سے باہر کسی جگہ لے جا رہا ہے لیکن وہ مجھے ساتھ لے کر تہ خانے کی طرف جانے والا زینہ اترنے لگا۔ ہر سیڑھی کے ساتھ میرے دل کی دھڑکن میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ تہ خانے کے دروازے پر پہنچنے تک میرا ہیجان اپنی آخری حدوں تک پہنچ گیا۔

فولادی دروازے کے پاس پہنچ کر اکی ٹھہر گیا۔ ”یہ دروازہ کھولنے سے پہلے میں تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں بھائی کہ سلاخوں والے دروازے کی چابی میرے پاس نہیں ہے لہٰذا براہ مہربانی مجھ پر زور آزمائی کرنے کی کوشش نہ کرنا‘ اس سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔“ میں نے جلدی جلدی گردن ہلا کر اسے دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ مجھ پر اس کا ایک ایک لفظ شاق گزر رہا تھا۔ میری بے چینی سے لطف اندوز ہوتے

ہوئے اس نے فولادی دروازے کا تالا کھولا اور کہا "میں ایک گھنٹے بعد واپس آؤں گا۔ تب تک تم دونوں جی بھر کے باتیں کرلو۔" اکی سیڑھیاں چڑھ کر کوٹھری میں پہنچ گیا۔ میں نے زینے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔

میں نے لرزتے ہاتھوں سے فولادی دروازے کا پٹ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی میری نظر تہ خانے کے وسط میں پڑی۔ میں نے ایک لمحے کے اندر اسے پہچان لیا' وہ فقیر بابا ہی تھا۔ اس کا مانوس سراپا ٹاٹ کے ٹکڑے پر مجھے اپنے خوابوں کی تصویر محسوس ہوا۔ اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سن لی ہوگی لیکن اس نے گردن گھما کر اس طرف دیکھنے کی بھی زحمت گوارہ نہ کی۔ اس کی آنکھیں تہ خانے کی چھت پر جمی رہیں۔ میں نے اپنے دل کی دھڑکنیں سنبھالتے ہوئے دھیرے سے اسے پکارا۔ وہ ناقابل یقین سرعت سے اٹھ بیٹھا۔

اس کی عقاب صفت نظریں تہ خانے کے دروازے پر جم گئیں۔ مجھے بغیر داڑھی مونچھوں کے دیکھ کر اسے پہچاننے میں کچھ دقت ہوئی ہوگی۔ "بابا!"

میں نے ایک بار پھر جذباتی لہجے میں اسے پکارا۔ اس بار اسے اپنی سماعت پر یقین آگیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور برق رفتاری سے میری طرف بڑھا۔ اس نے دو دو تین تین سیڑھیاں ایک جست میں طے کیں اور اگلے ہی لمحے میرے روبرو آن کھڑا ہوا۔ "میرے بچے میرے سونے!" اس نے جذبات سے لبریز آواز میں مجھے پکارا۔ مجھے اس کی آواز میں پدری شفقت کا نامانوس جذبہ لہریں مارتا محسوس ہوا۔ شدت جذبات سے میری آنکھیں بھر آئیں۔ فقیر بابا نے میرا چہرہ اپنی ہتھیلیوں کے کٹورے میں بھرلیا۔ "تو کیسا ہے میرے بچے۔ ان بدبختوں نے تیرے ساتھ برا سلوک تو نہیں کیا؟ میں تو تیرے متعلق سوچ سوچ کر آدھا پاگل ہوگیا ہوں۔ انہوں نے تجھے پولیس کے حوالے تو نہیں کیا؟" فقیر بابا نے بے قرار لہجے میں مجھ پر سوالات کی بارش کردی۔ اس پر بھی میر طرح شادی مرگ کی کیفیت طاری تھی۔

میں نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں بابا۔ تم میری فکر نہ کرو۔ انہوں نے مجھے پولیس کے حوالے بھی نہیں کیا۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"لیکن لیکن تمہیں ان لوگوں نے مجھ سے ملنے کی اجازت کیسے دے دی؟ کیا تم چوری چھپے مجھ سے ملنے آئے ہو؟ کیا تم ان کی قید سے بھاگ نکلے ہو؟" فقیر بابا کی آواز ہیجان سے لڑکھڑانے لگی۔

"تھوڑا صبر کرلو بابا۔ میں ابھی تمہیں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔"

فقیر بابا ہمہ تن گوش ہو کر میری باتیں سننے لگا۔ "یہ سب مقدروں کے کھیل ہیں بابا۔ میں یہاں سے فرار ہوگیا تھا لیکن مقدر کا چکر ایک بار پھر گھیر کر مجھے یہاں لے پیا۔ ویسے بھی میں تمہیں ان جلادوں کی قید میں چھوڑ کر کیسے چین سے بیٹھ سکتا تھا۔"

"گویا تم مجھے آزاد کرانے کی خاطر ایک بار پھر یہاں آن پھنسے ہو۔ یہ برکت علی کی حویلی کا تہ خانہ ہی

ہے نا؟ فقیر بابا نے پوچھا۔

"ہاں بابا یہ برکت علی کی حویلی کا تہ خانہ ہی ہے۔ جب تمہیں یہاں لایا گیا تھا کیا اس وقت تم نے یہ سب کچھ نہیں دیکھا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں بیٹا' مجھے تو یہ لوگ کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملا کر یہاں لائے ہیں۔ بہت محتاط رہتے ہیں وہ میری طرف سے۔" فقیر بابا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں بابا سنا ہے تم نے ان کے بندوں کو لمبا لٹا دیا تھا۔ وہ کیا قصہ ہوا تھا؟"

"ہاں وہ بات یوں ہوئی کہ میں شدید زخمی تھا تو ان لوگوں نے مجھے ایک دیہی مکان میں رکھا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے زخمی اور کمزور سا بوڑھا سمجھ کر مجھ پر زیادہ پہرہ نہیں لگایا۔ صرف دو آدمی میرے پاس رہتے تھے۔ میرے ہاتھ پیر آزاد تھے۔ دونوں پہرے داروں کو بھی میری فکر نہ تھی۔ ان لوگوں نے میرے زخموں کے علاج کے لیے ایک دیہاتی قسم کے جراح کا انتظام کیا۔ اس نے میرے زخموں پر ٹانکے تو صحیح لگا دیے لیکن اس کی مرہم پٹی یونہی فضول سی تھی۔ مجھے ہوش آیا تو میں نے اس جراح کو کچھ جڑی بوٹیوں کے نام لکھ کر دیے۔ جراح وہ جڑی بوٹیاں خرید لایا۔ وہ جڑی بوٹیاں میری برسوں کی آزمودہ تھیں۔ میں نے انہیں بطور دوا اور مرہم استعمال کیا۔ نتیجتاً وہ زخم جو کئی ہفتوں میں بھرنے والے تھے' چند دنوں میں بھرنے کے قریب ہوگئے۔ میں نے اس صورت حال کو اپنے نگہبانوں سے پوشیدہ رکھا۔ جب میری جسمانی حالت کچھ اور بہتر ہوئی تو میں نے ایک دن اپنے پہرے داروں پر اپنے داؤ پیچ آزمائے۔ وہ دونوں بے ہوش ہو کر پڑ گئے۔ میں اس مکان سے نکل کر ایک طرف روانہ ہوا ہی تھا کہ اچانک میرا اکی اور اس کے ایک ساتھی سے آمنا سامنا ہوگیا۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے اپنے پستول نکال لیے۔ یہ لڑکا اکی بہت ہوشیار ہے۔ اس نے مجھے اپنے داؤ آزمانے کا موقع ہی نہ دیا۔"

"آہاہاہا۔۔۔ گویا اڑنے بھی نہ پائے کہ گرفتار ہم ہوئے۔۔۔ والی صورت حال پیش آئی تمہارے ساتھ؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔ تم بتاؤ کہ تم یہاں کیسے موجود ہو؟ ان لوگوں نے تمہیں مجھ سے ملنے کی اجازت کیسے دے دی؟"

میں نے مختصراً پوری صورتحال اس کے گوش گزار کردی۔ البتہ میں نے اسے نہیں بتایا کہ سردار برکت علی کی بیوہ دراصل کون ہے۔ اس ناسور کو میں اپنے سینے تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے فقیر باباب کو وہ سب کچھ بھی بتا دیا جو مینو استاد کی زبانی مجھ تک پہنچا۔ یہ سب کچھ جان کر فقیر بابا ایک دم پریشان ہوگیا۔ "یہ تم نے کیسی مصیبت اپنے گلے ڈال لی سیف داد خان؟"

"یہاں میرا نام ذوالفقار علی ہے بابا!" میں نے دبی آواز میں بتایا۔

"اچھا اچھا۔۔۔ بہر حال صرف میری خاطر تم نے یہ کام اپنے ذمے لے کر اچھا نہیں کیا۔ اگر پولیس والوں کے پاس تمہاری تصویر پہنچ چکی ہے تو پھر تم کسی بھی وقت گھیرے میں آسکتے ہو۔ تمہارا یہ نیا بہروپ

تمہاری زیادہ دیر پر حفاظت نہیں کر سکتا۔ تم کسی بھی وقت پولیسوں کی نظر میں آسکتے ہو۔ یہاں سے ملتان جانے تک تو تم کتنی ہی باران کی تیز دھار نگاہوں کی سان پر چڑھ چکے ہو گے۔"

"اب تو یہ مجبوری ہے بابا۔ تمہیں آزاد کرانے کی میرے پاس بس یہی صورت ہے۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ میں پولیس والوں کی نظروں میں آئے بغیر کس طرح ملتان پہنچ سکتا ہوں۔"

"اس بات کی تمہارے پاس کیا ضمانت ہے کہ اگر تم نے ان لوگوں کو اس شخص سے نجات دلا دی تو یو ہاقعی مجھے آزاد کر کے تمہارے ساتھ روانہ کر دیں گے؟" فقیر بابا نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اس کی کوئی ضمانت نہیں ہے بابا لیکن مجھے اس بندے اکی کی زبان پر اعتبار ہے۔ ویسے بھی میں ایک بار اس حویلی سے نکل گیا تو میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ تم مجھے کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کہ میں پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ملتان پہنچ جاؤں۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم اتنی آسانی سے نہیں مانو گے۔ خیر تم کوئی ایسا طریقہ نکالو کہ جب تم پولیس والوں کے سامنے آؤ تو وہ بغور تمہارا جائزہ نہ لے سکیں بلکہ ان کی توجہ کسی اور طرف بٹ جائے۔ تم اس حلیے میں پہلے سے کافی مختلف نظر آتے ہو لیکن اگر کوئی تمہیں صرف پہچاننے کی نیت سے دیکھے تو اسے تم پر شک ہو سکتا ہے۔ اس لباس میں تم دیگر افراد سے بہت منفرد نظر آتے ہو۔ لوگوں کی توجہ خواہ مخواہ تم پر مبذول ہو جائے گی۔"

فقیر بابا کا تجربہ حسب معمول کافی حقیقت پسندانہ تھا۔ میں کچھ دیر تک سوچتا رہا' پھر مجھے اس "خاندان" کا خیال آیا جو مجھے بس میں ملا تھا۔ شیخ سلامت علی اور نور جہاں مع اپنی بیٹیوں کے میرے لیے اچھی آڑ ثابت ہو سکتے تھے۔ انہیں بھی تو ملتان جانا تھا۔ میں نے فقیر بابا کو ان لوگوں کے متعلق بتایا۔ "ہاں یہ لوگ تمہارے لیے کافی کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں لیکن تمہیں بے حد محتاط رہنا ہوگا۔ ان لوگوں کو اپنی اصلیت کا ہلکا سا شبہ بھی مت ہونے دینا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں میں اس طرح گھل مل جانا کہ دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہو کہ گویا تم انہیں کے خاندان کے ایک فرد ہو۔"

"لیکن ان لوگوں سے ملاقات کرنے کے لیے مجھے سخی سرور جانا ہوگا وہ لوگ ایک دو دن مزید وہیں رہیں گے۔"

"ٹھیک ہے تم وہیں چلے جاؤ۔ تمہارے لیے اب وہاں کوئی خطرہ نہیں ہوگا لیکن احتیاطاً کم سے کم لوگوں کی نظروں کے سامنے آنا۔ تمہارا کہنا ہے کہ وہ لڑکی عنبرین تم میں دلچسپی لے رہی ہے تو تم اس کی بھرپور حوصلہ افزائی کرنا۔ یہ لڑکی تمہارے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے بابا میں تمہاری ہدایت پر پورا عمل کروں گا۔"

"میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا کرتا رہوں گا بیٹا۔ سردار شاہ مراد کے کارندوں کی طرف سے بھی ہوشیار رہنا میں ایک بار پھر تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے غصے پر قابو پانا سیکھو۔ اپنے دشمن پر اندھا دھند جھپٹنے کے بجائے اس کے کمزور پہلو کو تلاش کر کے اس پر ضرب لگاؤ' بصورت دیگر تم نقصان اٹھاؤ گے۔"

زینے کے اوپری دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی' ہمیں احساس ہی نہ ہوا کہ "ملاقات کا وقت" ختم ہو گیا ہے۔ میرے ذہن میں کرب کی ہلکی نوکیلی لہر پیدا ہوئی لیکن میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ فقیر بابا سے جدائی لاکھ صبر آزما سہی لیکن اس کے سوا چارہ بھی تو نہیں ہے۔ محبتوں کے قرض چکائے بغیر بھی کہیں وصال کی نعمت حاصل ہوئی ہے۔ مجھے فقیر بابا کو اس زنداں سے آزاد کرانا ہے۔ ہر حال میں' ہر قیمت پر۔ میں نے فقیر بابا کے ہاتھ محبت سے دبائے اور پلٹ پڑا۔ میں اس کی آنکھوں میں نمودار ہوتے ہوئے آنسو نہیں دیکھنا چاہتا تھا' اس کے ساتھ ساتھ میں اپنی ڈبڈباتی آنکھوں کو بھی اس سے چھپانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے سیف داد خان کو ناقابل تسخیر دیکھنا چاہتا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ سمجھتا کہ فولادی حوصلوں والا سیف داد کمزور پڑ گیا ہے۔

مجھے سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر اکی اوپر ہی ٹھہر گیا۔ کوٹھری میں آ کر میں ایک طرف رک گیا۔ اکی نے دروازہ بند کیا تو میں خاموشی سے راہداری کی جانب بڑھ گیا۔ میری حالت اکی نے یقیناً بھانپ لی ہوگی۔ اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں چارپائی پر ایسے ڈھے گیا کہ جیسے میں سینکڑوں میل کی مسافت' پاپیادہ طے کر کے آیا ہوں۔ اکی مجھے اس کمرے میں چھوڑ کر واپس لوٹ گیا۔ اس چالاک شخص نے یقیناً کمرے کا دروازہ مقفل کر دیا ہوگا۔ میں دیر تک چارپائی پر پڑا اپنی حالت پر غور کرتا رہا۔ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔ مجھے اکی نے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ اس کے ہاتھ میں رات کا کھانا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد میں ایک بار پھر نیند کی وادیوں میں جا پہنچا۔

میری آنکھ ایک بار پھر اکی کے جھنجھوڑنے سے کھلی۔ وہ رات کا آخری پہر رہا ہوگا۔ میں غیر معمولی طور پر گہری نیند سویا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ شاید رات کے کھانے میں ان لوگوں نے کوئی خواب آور دوا ملا دی تھی تاکہ میں رات کو کوئی گڑبڑ نہ کر سکوں۔ اکی نے مجھے ایک گلاس پانی پلایا تو میری غنودگی کسی حد تک رفع ہوئی۔ اس نے میرے اسپورٹس شوز میرے حوالے کیے۔ "انہیں جلدی جلدی پہن لو اور تیار ہو جاؤ۔ ہم لوگ اسی وقت چل رہے ہیں۔"

میں نے جوتے پاؤں میں ڈال کر فیتے کس لیے۔ میرے موزے البتہ اس نے میرے حوالے نہ کیے۔ "میری ایک بات غور سے سن لو بھائی۔" اکی نے مجھے مخاطب کر کے سنجیدگی سے کہا۔ "تم کسی قسم کی چالاکی دکھانے کی کوشش کرو گے تو یہ تمہارے حق میں بہتر نہ ہوگا نہ تمہارے فقیر بابا کے۔ اسے یہاں سے کسی اور جگہ منتقل کیا جا چکا ہے۔ کس جگہ؟ اس کا علم میرے علاوہ اور کسی کو نہیں ہے۔"

میں نے اکی کی دھمکی کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس سے کسی حماقت کی توقع کرنا بذات خود حماقت ہوتی۔ وہ لومڑی کی طرح چالاک اور بھیڑیے کے مانند سفاک تھا۔ میں نے اس سے ایک بار بھی زور آزمائی نہیں کی لیکن وہ میری تباہ کاری سے پوری طرح واقف تھا۔ اس نے مجھے موقع ہی نہ دیا کہ میں اسے زیر کرنے کی کوشش کر سکوں۔

اکی مجھے ساتھ لے کر حویلی کی عقبی راہداری میں آ گیا' میں نے تہ خانے والی کوٹھری کا کنکھیوں سے

جائزہ لیا۔اس کا چوپٹ کھلا دروازہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اکی نے واقعی فقیر بابا کو ہاں سے ہٹا دیا ہے۔اکی نے عقبی دروازے میں لگا ہوا بھاری بھرکم قفل کھولا اور ہم دونوں باہر نکل آئے۔"میں نے تمام کتے بند کر دیے ہیں۔میں گاڑی کو ریورس کر کے اس کی طرف لاؤں گا' تم چپ چاپ پچھلی سیٹوں پر دبک جانا۔یہ احتیاط رکھنا کہ گیٹ کے چوکی داروں کی تم پر نظر نہ پڑے۔"میں نے محض اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

اکی لان میں سے گزرتا ہوا گاڑی پارک کرنے والے شیڈ کی طرف بڑھ گیا۔شیڈ کے پاس پہنچ کر اس نے گیٹ پر تعینات چوکی داروں سے کچھ کہا۔شیڈ میں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹ روشن ہوئی پھر اکی اس گاڑی کو ریورس کر کے لان کی گھاس روندتا ہوا کافی آگے تک آ گیا۔یہ ڈبل کیبن والی نئی نکور ٹویوٹا ہائی لکس تھی۔میں نے اس کے پچھلے دروازے کو کھولا اور اندر گھس گیا۔اکی نے کیبن کی لائٹ روشن نہیں کی۔میں خاموشی سے پچھلی سیٹ پر دراز ہو گیا۔اکی نے گاڑی کو دائیں طرف موڑا۔میں نے گیٹ پر لگے ہوئے طاقت ور قمقموں کی چکا چوند روشنی محسوس کی۔اگلے ہی لمحے گاڑی گیٹ سے گزرتی چلی گئی۔کچھ دور چلنے کے بعد اکی نے مجھے بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

ہم حویلی کی طرف آنے والی نیم پختہ سڑک پر بڑھے چلے جا رہے تھے۔سورج طلوع ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔میں نے بند شیشوں سے باہر کا جائزہ لیا۔اول صبح کے دھندلکے میں مجھے کئی لوگ نظر آئے۔یہ لوگ اپنی زمینوں کی طرف جا رہے تھے۔ان میں سے چند نے گاڑی کی طرف سلام کے انداز میں ہاتھ اٹھائے لیکن اکی گاڑی اڑائے چلا گیا۔کچھ ہی دیر بعد ہم لوگ ایک پختہ سڑک پر جا چڑھے۔یہاں پہنچ کر اکی نے گاڑی کی رفتار اور بڑھا دی۔

ہمارے کوئٹہ روڈ پر پہنچنے تک صبح کی سپیدی اچھی خاصی پھیل گئی۔اکی نے سڑک پار کر کے گاڑی روک دی پھر اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا"چند باتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لو ذوالفقار علی۔"اس کا لہجہ گھمبیر تھا۔"رفاقت علی کو قتل کرتے ہوئے یہ خیال رکھنا کہ وہ واردات ڈکیتی کی محسوس ہو۔دوسری بات یہ ہے کہ اگر بالفرض تم اسے قتل کرنے سے پہلے یا بعد میں گرفتار ہو جاؤ تو تم ہمارا حوالہ بالکل نہیں دو گے۔اگر تم نے ایسا کیا تو اپنے فقیر بابا پر فاتحہ پڑھ لینا۔"اس نے بغور میرا جائزہ لیا۔میں بت بنا اس کی باتیں سنتا رہا۔"تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو ہمیں اخبار کے ذریعے اطلاع مل جائے گی اور ہم فوراً ہی فقیر بابا کو رہا کر دیں گے۔ہماری طرف سے اپنے دل میں بدگمانی لانے کی کوشش مت کرنا۔میں پہلے ہی واضح کر چکا ہوں کہ میرے دل میں تمہارے لیے کوئی پرخاش نہیں ہے۔"

میں نے اس کی تمام باتوں کے جواب میں محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔اکی نے جیب سے میرا اوالتھر پستول نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔

"مجھے تمہارا یہ ہتھیار بھی پسند آیا ہے لیکن میرے لیے تمہارا پہلے والا تحفہ کافی ہے۔تم سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔تم اپنی اس مہم سے فارغ ہو کر کمال الدین کے پاس پہنچو تو اسے سمجھانا کہ وہ گودی سائیں کو

ایک کمزور عورت سمجھ کر اس پر حملہ کرنے کی کوشش نہ کرے۔وہ اکیلی نہیں ہے۔اس کی مدد اور حفاظت کے لیے میں موجود ہوں۔میری موجودگی میں کوئی اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔"اکی نے پرعزم لہجے میں کہا۔

گودی سائیں کا ذکر سن کر مجھے اپنے تن بدن میں آگ سی بھڑکتی ہوئی محسوس ہوئی۔اکی میری آنکھوں کی بڑھتی ہوئی تپش کر محسوس نہ کر سکا۔اس نے اپنی جیب سے سو سو کے بہت سے نوٹ نکالے اور میری جیب میں ٹھونس دیے۔میں اپنی جگہ ساکت کھڑا اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔وہ گاڑی میں بیٹھا اور ایک جھٹکے سے اسے اڑا لے گیا۔اس کی اڑائی ہوئی دھول دیر تک فضا میں بکھری رہی۔

"ہم ایک بار پھر آمنے سامنے ہوں گے۔اکرام خان۔میرا انتظار کرنا۔پھر میں دیکھوں گا کہ تم اپنی گودی سائیں کو کیسے مجھ سے بچاتے ہو۔"میں نے با آواز بلند اکی کو مخاطب کیا لیکن وہ تو کبھی کا جا چکا تھا۔

میں سڑک عبور کر کے اس طرف آن کھڑا ہوا جس طرف سے مجھے سخی سرور کے قصبے کو جانے والی بس مل سکتی۔کچھ دیر میں صبح کا اجالا پوری طرح پھیل گیا۔اس دوران میں ایک دو ٹرک میری سامنے سے گزرے لیکن میں نے انہیں روکنے کی کوشش نہ کی۔میں خواہ مخواہ کے سوالات جوابات کے بکھیڑے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔بالآخر مجھے ایک بس اپنی طرف آتی ہوئی نظر آئی۔میں نے ہاتھ دیا' وہ رک گئی۔وہ بس لورالائی جا رہی تھی۔مجھے سب سے پچھلی سیٹ پر جگہ ملی۔میرے ساتھ والی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے چاروں مسافر نوجوان تھے۔وہ چاروں ہی شہر کے رہنے والے اور شاید طالب علم تھے۔ان کے حلیے اور ساز و سامان سے میں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ ان کی منزل فورٹ منرو ہل اسٹیشن ہے۔یہ پہاڑی صحت افزا مقام ڈیرہ غازیخان سے تقریباً پچاس پچپن کلومیٹر دور مغرب میں آزاد قبائلی علاقے میں واقع ہے۔میں کچھ عرصہ پہلے ایک دو بار وہاں جا چکا تھا۔

سخی سرور سائیں کے قصبے کے قریب پہنچ کر کنڈیکٹر نے آواز لگائی تو میں چوکنا ہو بیٹھا۔بس رکی تو میں نیچے اتر آیا۔میرے حلیے نے وہاں موجود لوگوں کی توجہ میری طرف مبذول کرائی لیکن میں انہیں نظر انداز کر کے قصبے کے اندر کی طرف جانے والی چھوٹی سی سڑک پر آگے بڑھتا چلا گیا۔لکھ داتا کے در پر تو ہر علاقے' ہر حلیے کا شخص نظر آتا ہے۔لہٰذا وہاں کے لوگ اجنبی چہروں کے عادی ہیں۔مجھے یقین تھا کہ اگلے ہی لمحے وہ مجھے بھول چکے ہوں گے۔

قصبے کے تنگ بازار کے بیچ میں سے گزر کر میں آگے بڑھتا چلا گیا۔میری رفتار میں بھرپور اعتماد تھا۔میں قصبے کے تھانے کے سامنے سے بھی گزرا لیکن میں نے اپنی چال میں لرزش نہ آنے دی۔کچھ دیر بعد میں سخی سائیں کے دربار کے پاس پہنچ گیا۔مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ شیخ سلامت علی نے ایک مجاور کا نام لیا تھا کہ وہ لوگ اس کے ڈیرے پر مہمان ہوں گے۔میں نے ہار' شیرینی اور اگربتی بیچنے والے ایک دکان دار سے اس مجاور کے گھر کا پتا پوچھا۔دکان دار نے بغور میرے چہرے کا جائزہ لیا۔اس کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔میں نے بے چین ہو کر اپنے ایک پاؤں کا بوجھ دوسرے پاؤں پر منتقل کیا

''بتانا ہے تو بتا دے۔ ورنہ میں کسی اور سے پوچھ لیتا ہوں۔'' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔

''ارے اتنا بے قرار کیوں ہوتے ہو بابو۔ ابھی بتا دیتا ہوں۔'' اس نے مکروہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ میرے جی میں آئی کہ اس بدبخت کا منہ توڑ دوں۔ میں وہاں سے ہٹنے ہی والا تھا کہ اس نے جلدی جلدی مجھے اس مجاور کا پتا بتا دیا۔

''اور کوئی ہمارے لائق خدمت ہو تو بتاؤ بابو جی۔ کہو تو دو چار گجرے گہنے تیار کر دوں تازہ گلاب کے؟''

''شکریہ'' میں نے خشک لہجے میں کہا اور تیز قدموں سے اس گلی کی طرف بڑھ گیا۔ اپنے مطلوبہ مکان کے دروازے پر پہنچ کر میں نے دستک دی۔ پہلی دستک کے جواب میں کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا تو میں نے دوسری دستک دی۔

اس بار کسی نے گھر کے اندر سے سریلی نسوانی آواز میں دریافت کی ''کون ہے'' فوری طور پر میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا جواب دوں۔

مجھے کوشش کے باوجود یاد نہ آیا کہ میں نے ان لوگوں کو اپنا کیا نام بتایا ہے۔ ''میں ہوں۔'' میں نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے شیخ سلامت علی سے ملنا ہے۔'' میرا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ دروازہ دھڑ سے کھل گیا۔ میری نظروں میں عنبرین کا دلکش سراپا کھب سا گیا۔

وہ حیران سی ہو کر مجھے دیکھتی رہ گئی۔ ''آ۔۔۔ آپ۔۔۔؟'' اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے۔

''مجھے اندر آنے کو نہیں کہیں گے آپ؟'' میں نے اپنے لہجے میں حلاوت گھولتے ہوئے سوال کیا۔ اس وقت یہی طرز عمل مناسب تھا۔ عنبرین کے چہرے پر قوس و قزح کے رنگ بکھر گئے۔ اس نے دروازے سے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا ''آیئے۔۔۔ آیئے۔۔۔''

میں اس گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ کچی مٹی اور گارے کا بنا ہوا یہ گھر چھوٹا ہونے کے باوجود صاف ستھرا اور پرآسائش تھا۔ عنبرین مجھے ساتھ لے کر ایک بڑے سے کمرے میں آ گئی۔ کمرے کی کچی چھت کے شہتیر میں ایک نیا پنکھا تیزی سے گھوم رہا تھا۔ میں پرانی طرز کے بڑے سے نیواڑی پلنگ پر بیٹھ گیا ''آپ یہاں تک کیسے پہنچے؟'' اس نے حیران سے لہجے میں دریافت کیا۔

''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ میں یہاں تک کیسے پہنچا۔ اس دن بس سے اترنے کے بعد مجھے ایک لمحے کے لیے بھی چین نہیں آیا۔ بار بار میرا دل اس طرف کھنچنے لگتا۔ بالآخر میں نے اپنے دل کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور کشاں کشاں یہاں پہنچ گیا۔''

میرے رومانی لہجے کو محسوس کر کے عنبرین کے لبوں پر ایک دلکش مسکراہٹ دوڑ گئی۔ جس طبقے سے جس پیشے سے اس کا تعلق تھا' اس کے پیش نظر مرد کی نظر پہچاننا اس کا فطری وصف ہونا چاہیے تھا۔ اپنی سمجھ کے مطابق اس نے مجھے اپنی اداؤں کے جال میں پھانس لیا۔ چنانچہ اب وہ اپنے مخصوص کاروباری انداز

میں جال کی ڈوریاں کھینچنے لگی۔ ''اچھا تو یہ بات ہے۔ آپ اس خادمہ کو بتانا پسند فرمائیں گے کس خوش نصیب کی کشش آپ کو یہاں کھینچ لائی ہے۔''

''اللہ رے بے نیازی۔ یعنی ہم تو جاں سے گزر گئے اور جناب کو خبر ہی نہیں ہوئی۔'' مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ میں اپنے حصے کے مکالمے خوش اسلوبی سے ادا کر رہا ہوں لیکن میری یہ خوش فہمی اگلے ہی لمحے دور ہو گئی۔ عنبرین نے میرے لہجے میں تصنع کی جھلک محسوس کر لی ہو گی چنانچہ اس نے فوراً موضوع بدل دیا۔ ''دراصل میرے گھر والے ایک منت پوری کرنے کے لیے سخی سرور سائیں کے چلے والے غار کی زیارت کو گئے ہوئے ہیں۔ میری طبیعت ذرا خراب تھی اس لیے میں گھر میں رک گئی۔''

''چلو یہ بھی اچھا ہوا ورنہ تم لوگوں میں سے کسی کو بھی یہاں نہ پا کر میں تو خوار ہو کر رہ جاتا۔'' میں نے اپنے لہجے کو معمول پر لاتے ہوئے جواب دیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں اسے اپنی جھوٹی محبت کا فریب دے کر بیوقوف نہیں بنا سکوں گا۔ ''مجھے تھوڑا سا پانی تو پلا دو عنبرین۔''

میں نے پلنگ کے سرہانے سے ٹیک لگا کر فرمائش کی۔ ''اوہو مجھے باتوں باتوں میں خیال ہی نہیں رہا۔ تم ٹھہرو میں ابھی ٹھنڈا پانی لاتی ہوں۔''

عنبرین کمرے سے نکل کر برآمدے کے سرے کی طرف بڑھی۔ میں نے وہاں دو مٹکے اور پانی کا ایک کولر دیکھا تھا۔ چند ہی لمحوں کے بعد میں نے صحن میں دو مدھم سے دھماکوں کی آواز سنی۔ اسی وقت فضا میں عنبرین کی خوفناک چیخ گونجی چیخ کی آواز سن کر میں تیزی سے کمرے سے نکلا۔ ابھی میں صورت حال کو سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ اچانک کلاشنکوف کی خوفناک نال میرے سینے سے آن لگی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

☆O☆

اس ناگہانی افتاد نے چند ثانیوں کے لیے مجھے بالکل ہی حواس باختہ کر دیا۔ نیم تاریک کمرے سے چمک دار دھوپ میں آنے کے باعث میری آنکھیں بری طرح چندھیا گئیں۔ بینائی بحال ہونے کے بعد میں نے رائفل بردار کے چہرے کا جائزہ لینا چاہا ''پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگ جا۔'' اس نے کلاشنکوف کی نال میرے سینے میں گاڑتے ہوئے کہا۔ میں بے اختیار پیچھے ہٹ کر کچی دیوار سے جا لگا۔ اس کے لہجے میں ایسی درندگی تھی کہ مجھے اپنے رگ و پے میں ہلکی سی سنسناہٹ تیرتی محسوس ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں خوفناک چمک تھی۔ گھنی داڑھی اور مونچھوں کے درمیان اس کا دہانہ بمشکل ہی نظر آ رہا تھا۔ سفید قمیص اور چوڑے گھیر کی شلوار کے ساتھ وہ مجھے کسی بپھرے ہوئے شیر کے مانند نظر آیا۔ میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کیا کہ میں اس شخص سے الجھنے کی حماقت نہ کروں۔ اس نے مجھے کوئی دھمکی نہ دی لیکن وہ مجھے سراپا دھمکی نظر آیا۔

میری طرف سے مزاحمت نہ ہونے کے باعث اس کے تنے ہوئے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑ گئے۔ اپنی کلاشنکوف کا رخ بدستور میری جانب رکھتے ہوئے' اس نے برآمدے کے دوسرے سرے کی

جانب ایک نگاہ ڈالی۔ اس کے ساتھی کے پاس تھری ناٹ تھری رائفل تھی۔ اس نے عنبرین کو دیوار کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ اس شخص نے جب دیکھا کہ میں بے بس ہو چکا ہوں تو اس نے عنبرین کو بھی اس طرف بڑھنے کا حکم دیا جس طرف میں دیوار سے پیٹھ ٹکائے کھڑا تھا۔ عنبرین کے خوبصورت چہرے پر دہشت کی پیلاہٹ کا غلبہ دیکھ کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس وقت وہ مجھے سکڑی سہمی ایک ننھی سی بچی نظر آئی جسے خون خوار کتوں نے گھیر لیا ہو۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے میری طرف بڑھی۔ میرے پاس پہنچ کر اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

''مجھے بچالو۔ مجھے ان سے بچالو۔ یہ مجھے مار ڈالیں گے۔'' اس نے گھٹے ہوئے لہجے میں مجھ سے التجا کی۔

اس کی فریاد نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ وہ مجھے اپنا محافظ' اپنا مددگار سمجھ رہی تھی۔ اپنے گھر سے بہت دور اس سنگلاخ پہاڑی علاقے میں اسے میرا وجود اپنی آخری امید' اپنا آخری سہارا نظر آ رہا ہوگا۔ میں نے اسے اپنے قریب کرتے ہوئے کلاشنکوف بردار سے پوچھا۔ ''تم لوگ کیا چاہتے ہو؟'' میرا لہجہ پرسکون تھا۔ میں نے دانستہ طور پر سوال کرتے ہوئے اپنے لہجے میں شہری لوگوں کے لہجے کی جھلک شامل کر لی' میری کوشش کامیاب رہی۔ اس شخص نے بلاتردد مجھے ''شہری منڈا'' تسلیم کر لیا۔

''اپنی خیریت چاہتے ہو تو بیچ میں دخل دینے کی کوشش مت کرنا بابو۔ جو ہو رہا ہے' چپ چاپ دیکھتے جاؤ۔'' میں نے عنبرین پر نظر ڈالی۔

''یہ۔۔۔ مجھے۔۔۔ یہ مجھے مار ڈالیں گے۔۔۔'' اس نے گھگیاتے ہوئے فریاد کی۔

''تجھے کچھ نہیں ہوگا چھوکری۔ شور مچانے کی کوشش نہ کرنا۔''

''کچھ بتاؤ تو سہی کہ آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو؟ تم کیوں اس طرح سے گھر کی دیوار پھاند کر یہاں گھس آئے ہو؟ کیا تم لوگ چور ہو؟''

''بکواس بند کرو' ہم چور نہیں ہیں۔'' ڈاڑھی والے نے گرج کر کہا۔

''پھر تم کون ہو؟'' میں نے اپنے لہجے کو حتی الامکان مستحکم بناتے ہوئے پوچھا۔ میری قربت کی وجہ سے عنبرین کی وحشت قدرے کم ہونے لگی۔ اب وہ گھٹی گھٹی آواز میں سسکیاں بھر رہی تھی۔

''چلو تم دونوں اندر کمرے میں چلو۔'' کلاشنکوف بردار نے تحکمانہ لہجے میں ہم دونوں کو مخاطب کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی آواز سنتے ہی عنبرین کا نازک سراپا خوف سے لرز اٹھا تھا۔

ہم دونوں نے خاموشی سے کمرے کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے ایک بار پھر دریافت کیا۔ ''کچھ بتاؤ تو سہی کہ تم لوگ کون ہو' کیا چاہتے ہو؟''

''بک بک مت کرو۔ لاکھو تو ان کے ہاتھ باندھ دے۔'' کلاشنکوف بردار نے حکم صادر کیا۔

لاکھو نے پلنگ پر سے نائلون کا دوپٹا اٹھایا اور میری طرف بڑھا۔ میں نے مزاحمت کا ارادہ کیا لیکن پھر مجھے اپنا یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔ میں نے سوچا کہ میری مزاحمت کے نتیجے میں کلاشنکوف بردار شخص نے

فائرنگ شروع کر دی تو عنبرین بھی گولیوں کی زد میں آ سکتی ہے۔ لاکھو نے میرے دونوں ہاتھ پشت پر کیے اور نائلون کے دوپٹے کے ذریعے بڑے مضبوطی سے انہیں آپس میں جکڑنا شروع کر دیا۔ وہ ایک ماہر فن اور گھاگ شخص ثابت ہوا۔ اس نے اس خوبی سے میرے ہاتھ جکڑے کہ مجھے یوں محسوس ہوا گویا وہ فولادی زنجیروں میں جکڑے گئے ہوں۔

''اس چھوکری کے ہاتھ کیسے باندھوں نعمت خان؟'' باکھو نے اس سے پوچھا۔

نعمت نے ناخوشگوار نظروں سے لاکھو کو گھورا۔ ''تو بھی بالکل بدھو ہے لاکھو۔ اس کے سامنے میرا نام لینے کی کیا ضرورت تھی۔ خیر تو ایسا کر کہ اپنا پٹکا اتار اور اس کے ہاتھ باندھ دے۔''

عنبرین نے بڑے صبر تحمل سے اپنے ہاتھ بندھوا لیے۔ میں اس دوران میں مسلسل سوچتا رہا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ سب سے پہلے مجھے سردار شاہ مراد کا خیال آیا۔ اس نے میرے لیے جگہ جگہ جال بچھا رکھے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں اس کے کسی کارندے کی نظر میں آ گیا ہوں پھر میں نے اپنا یہ خیال خود ہی رد کر دیا۔ لاکھو اور نعمت خان دونوں میں سے کسی نے بھی مجھ سے شناسائی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ چوکنا تو ضرور تھے لیکن مجھ سے غیر معمولی طرز عمل کا اظہار نہیں کر رہے تھے۔ اگر وہ شاہ مراد کے کارندے ہوتے تو شاید مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیتے پھر مجھے برکت علی کے کارندوں کا خیال آیا لیکن پھر یہ خیال بھی مجھے بے تکا محسوس ہوا۔ یہ کوئی اور ہی لوگ تھے لیکن کون؟''

''ہماری تیرے سے کوئی دشمنی نہیں ہے بابو۔ ہم تیرے کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ اس چھوکری نے اور اس کے گھر والوں نے ہمارے سردار کی بے عزتی کی ہے۔ ہم اس چھوکری کو لے جا رہے ہیں۔ اس کے ماں باپ آئیں تو انہیں کہنا کہ سردار خضر خان کی حکم عدولی کر کے انہوں نے جو حماقت کی ہے' اب اس کی سزا بھگتیں۔''

''کون سردار خضر خان؟ کیسی بے عزتی؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔ تم اس لڑکی کو ایسے اغوا نہیں کر سکتے۔''

''کیوں! کون روکے گا ہمیں؟ تم اپنی خیر مناؤ کہ ہم نے تمہیں زندہ چھوڑ دیا ہے۔'' یہ سب باتیں سن کر عنبرین نے ایک بار پھر رونا شروع کر دیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں پر بندھے دوپٹے کے ساتھ زور آزمائی کی لیکن ناکام رہا۔ عنبرین کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے شدید غصہ آ گیا۔

''تم لوگ انسان بنو' ایک کمزور اور نہتی لڑکی پر اتنا ظلم کیوں کرتے ہو؟'' نعمت کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''اوہو بڑی ہمدردی ہے تجھے اس سے۔ سچا عاشق ہے تو اس شریف زادی کا۔ ہم اسے لے جا رہے ہیں۔ تجھ سے جو ہو سکتا ہے کر لے۔'' لاکھو نے عنبرین کو کمرے کے دروازے کی طرف دھکا دیا۔

عنبرین کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی۔ میں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن نعمت نے میری گردن پر کلاشنکوف کی نال جما کر مجھے پیچھے دھکیل دیا۔ میں نے ایک بار پھر عنبرین کی جانب بڑھنے کی کوشش کی...... اس بار نعمت نے پوری قوت سے اپنی رائفل کا دستہ میرے سینے پر مارا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ

میری پسلیاں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر میرے پھیپھڑوں میں گھس گئی ہوں۔ میں کھانستے ہوئے رکوع کے بل جھکتا چلا گیا۔ جب تک میں سنبھلتا' لاکھو عنبرین کی دھکیلتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔ نعمت نے تیزی سے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔ میں نے انہیں للکارتے ہوئے دروازے پر سینے سے ٹکریں ماریں لیکن بے سود۔ عنبرین حلق پھاڑ کر بچاؤ بچاؤ چلاتی رہی لیکن میں اس کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا۔

میں نے دروازے میں لگی ہوئی زنجیر کھلنے کی آواز سنی پھر عنبرین کی چیخیں لحہ بہ لحہ دور ہوتی چلی گئیں۔ حتی کہ بالکل معدوم ہو گئیں۔ بے بسی کے شدید احساس سے میری آنکھیں بھر آئیں۔ وہ بدنصیب لڑکی مجھ سے اپنی زندگی کے تحفظ کی التجا کرتی رہی لیکن میں اس کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا۔ ضمیر کی کسک سے بے قرار ہو کر میں نے اپنا سر دروازے سے ٹکرا دیا لیکن اس سے کیا فرق پڑ سکتا تھا۔ میں کسی بے جان آدمی کی طرح پلنگ پر ڈھیر ہو گیا۔ میرے کانوں میں بہت دیر تک عنبرین کی چیخیں گونجتی رہیں۔ اس نئی صورت حال نے میرے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

میں دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ یک لخت میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیا قصبے میں کسی نے بھی عنبرین کی چیخ و پکار کی آوازیں نہیں سنیں ہوں گی؟ ضرور سنی ہوں گی۔ یہ جگہ ویسے بھی دربار سے زیادہ دور نہیں ہے۔ لوگوں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سنا ہو گا لیکن شاید خطرناک اسلحے کو دیکھ کر کسی نے مداخلت کی جرأت نہ کی ہو گی۔ خدا جانے عنبرین کون سے اندھیرے غار کی اتھاہ گہرائی میں پڑی اپنے مقدر پر آنسو بہا رہی ہو گی۔

میں نے کئی بار اپنے ہاتھوں کو آزاد کرانا چاہا لیکن ناکام رہا۔ نائلون کے لچکدار دوپٹے کے بل زور لگانے سے اور کسنے لگتے۔ یہ صورت حال دیکھ کر میں نے جدوجہد ترک کر دی۔ مجھے اپنی حالت پر خود ہی ترس آنے لگا۔ میں نہتا نہیں ہوں۔ میرے قبضے میں ایک بے حد قیمتی اور تباہ کن ہتھیار ہے۔ اس کے باوجود میں ان نیم وحشی افراد کا کچھ بھی تو نہ بگاڑ سکا۔

میں پلنگ پر پہلو بدل بدل کر اپنے بدن کے مختلف حصوں کو سن ہونے سے بچاتا رہا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے اس حالت میں بندھے ہوئے صدیاں بیت گئی ہیں۔ بیزار سا ہو کے میں بیٹھ گیا۔ دوپہر گزری اور شام قریب آ گئی۔ میں نے سوچا کہ جانے عنبرین کے گھر والے کہاں مر گئے ہیں۔ انہیں معلوم ہی نہیں کہ ان کے گھرانے پر کیا قیامت بیت گئی۔ عنبرین جیسے بے بہا اثاثے سے محروم ہونے کے بعد تو اس نور جہاں بیگم اور شیخ سلامت علی کے پاس کچھ بھی نہ بچتا۔ عنبرین تو ان کے لیے ایسا سادہ چیک تھی جسے وہ حسب منشا کیش کراتے رہتے تھے۔

مغرب سے ذرا پہلے میں نے گھر کے دروازے پر کھٹ پٹ کی کچھ آوازیں سنیں۔ کسی نے دروازے کی زنجیر پکڑ کر دستک دی۔ دروازہ کھلا ہوا تو تھا ہی' ذرا سا دباؤ پڑتے ہی اس کے پٹ کھل گئے ہوں گے۔ میں نے شیخ سلامت علی کی استعجاب میں ڈوبی ہوئی آواز سنی۔ ''ارے یہ کیا؟ دروازہ تو کھلا ہوا ہے۔''

''خدا خیر کرے عنبرین تو اس طرح دروازہ کھلا نہیں چھوڑ سکتی۔ ارے وہ دیکھو عنبرین کے کمرے کے دروازے پر بھی زنجیر لگی ہوئی ہے۔''

''عنبرین۔۔۔عنبرین بیٹی۔'' میں نے شیخ سلامت علی کی آواز سنی پھر عنبرین کی چھوٹی بہن نے آواز لگائی۔ ''باجی۔۔۔عنبرین باجی کہاں ہو تم؟''

میں خاموشی سے ان کی تشویش سے بوجھل آوازیں سنتا رہا۔ کمرے کے دروازے پر کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور سلامت علی نے بے تابی کے عالم میں دروازہ کھول دیا۔ کمرے میں پھیلی ہوئی تاریکی کے باعث وہ فوری طور پر مجھے نہ دیکھ سکے۔ ان لوگوں نے بے تابی سے عنبرین کو پکارا۔ سلامت علی نے روشنی کا بٹن دبایا۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں اچھی خاصی تیز روشنی پھیل گئی۔ ان لوگوں کو مجھے پہچاننے میں چند لمحے لگ گئے۔ مجھے اس انداز میں غیر متوقع طور پر اپنے گھر رسن بستہ دیکھ کر وہ تینوں بری طرح حیران و پریشان ہو گئے۔

''ارے میاں صاحبزادے تم یہاں کیسے؟ ہماری بیٹی عنبرین کہاں ہے؟ تمہیں کس نے باندھ رکھا ہے؟''

''خدا کے لیے میرے ہاتھ تو کھولیے شیخ صاحب' میں ابھی آپ لوگوں کو سب کچھ بتا دیتا ہوں۔''

''اوہو۔۔۔اچھا اچھا۔'' سلامت علی تیزی سے میری طرف بڑھا اور دوپٹے کی گرہوں کے ساتھ زور آزمائی کرنے لگا۔ اس دوران میں نور جہاں بیگم اور پروین ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے میرا منہ دیکھتی رہیں۔ سلامت علی جیسے تیسے میرے ہاتھ کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اپنے ہاتھ جھٹکتے ہوئے انہیں سب کچھ بتانا شروع کیا۔

''سب سے پہلے تو تم لوگ مجھے یہ بتاؤ کہ یہ سردار خضر خان کون ہے اور تم لوگوں کی اس سے کیا دشمنی ہے؟''

''س۔۔۔سردار خضر خان!'' سلامت علی نے ہکلاتے ہوئے دہرایا۔

''ہاں! سردار خضر خان! عنبرین کو اسی کے بندے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ تم لوگوں نے سردار خضر خان کی حکم عدولی کی ہے' اب اس کی سزا بھگتو۔''

''تیرا بیڑا غرق ہو سردار خضر خان' تیرا ستیاناس ہو۔'' نور جہاں نے بلا توقف سردار خضر خان کو کوسنا شروع کر دیا۔

''کچھ مجھے بھی تو بتاؤ کہ آخر ہوا کیا ہے؟ کون ہے یہ خضر خان؟''

''ہم کیا جانیں کون ہے خضر خان۔'' نور جہاں بیگم نے کہا۔ ''جس روز ہم یہاں پہنچے اسی رات ایک مقامی شخص یہاں آیا۔ اس نے کہا کہ تم لوگوں کو کل رات سردار خضر خان نے اپنے مکان پر بلایا ہے۔ وہ شخص جانتا تھا کہ ہم لوگوں کا پیشہ کیا ہے۔ اس نے کہا کہ سردار خضر خان ہمیں منہ مانگا معاوضہ دے گا۔ تمہیں شاید پتا نہ ہو کہ ہمارے پیشے سے تعلق رکھنے والے بے شمار لوگ اس دربار پر حاضری دینے آتے

ہیں۔ان میں سے اکثر اس پاک جگہ بھی اپنا منہ کالا کرنے سے باز نہیں آتے۔سردار خضر خان ہمیں بھی انہیں بدبخت لوگوں مثل سے سمجھ رہا تھا۔"نور جہاں بیگم سانس لینے کے لیے رکی۔

میں نے بے تابی سے پوچھا"پھر تم لوگوں نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے اس شخص سے کہا بھائی اپنے سردار سے کہنا کہ ہم ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتے ہیں۔ہم اس کی یہ فرمائش یا حکم نہیں مان سکتے۔ہم اپنے گھر سے اتنی دوران پہاڑوں میں اپنی روح پر سے گناہوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے آئے ہیں' بڑھانے کے لیے نہیں۔اس مقدس مقام پر ہم کاروبار کا سوچ بھی نہیں سکتے۔اس شخص نے برافروختہ ہوتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ سردار خضر خان کو انکار کر کے اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہے۔ہم نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔وہ ہمیں دھمکیاں دیتا ہوا چلا گیا۔اگلے دن ایک اور بندہ یہاں پہنچ گیا۔اس نے ہمیں تنبیہہ کی کہ سردار خضر خان کی مرضی کے بغیر اس علاقے میں کوئی سانس تک نہیں لے سکتا۔لہٰذا بہتر یہی ہے کہ ہم لوگ چپ چاپ سردار خضر خان کی بات مان لیں۔میں نے اسے بھی یہی سمجھایا کہ ہم لوگ یہاں کاروبار کرنے کے لیے نہیں آئے ہیں۔ اپنے سردار سے کہنا کہ خدا کے لیے ہمیں معاف کر دے۔ہم بے حد گناہ گار لوگ ہیں لیکن سخی سائیں کے دربار کے آس پاس ہم غلاظت پھیلانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔اپنے سردار سے کہنا کہ اگر اسے ہم لوگوں کی خدمات درکار ہیں تو ہمارے ڈیرے پر آ جائے۔اس جگہ اور اس موقعے پر ہم اس کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکتے۔"

"پھر کیا ہوا؟"میں نے پوچھا۔

"اس وقت تو وہ شخص چلا گیا لیکن شام کو وہ پھر آن دھمکا۔اس نے بتایا کہ سردار خضر خان کا کہنا ہے کہ وہ ہماری معزرت قبول کر رہا ہے لیکن اس شرط پر کہ ہم لوگ اپنے عہد پر قائم رہیں گے۔ہم لوگ اگر سردار خضر کے ہاں حاضری نہیں دیتے تو نہ سہی لیکن کوئی اور شخص بھی تم لوگوں کی خدمات سے لطف اندوز نہیں ہو سکے گا۔اس نے دھمکی دی کہ اگر ہم نے کسی گاہک کی میزبانی کی یا خود کسی کے مہمان بنے تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔"

"ہوں! تو یہ بات ہے۔"میری آواز تفکرات سے بوجھل ہو گئی۔"اس بدبخت شخص نے تم لوگوں کی نگرانی پر اپنے کارندے تعینات کر رکھے ہوں گے۔انہوں نے مجھے تمہارے رہائشی مکان میں دیکھا تو وہ سمجھے کہ میں شاید کوئی گاہک ہوں۔انہوں نے فوراً اپنے آقا کو اطلاع کر دی۔"

"ہاں ہاں بالکل یہی ہوا ہوگا۔قصبے کے تمام لوگ عجیب عجیب نظروں سے ہماری طرف گھورتے رہتے ہیں۔تم کس وقت یہاں پہنچے تھے؟"نور جہاں بیگم نے مجھ سے پوچھا۔

"میں دوپہر سے کچھ پہلے یہاں پہنچا ہوں۔عنبرین نے مجھے دیکھ کر گھر بلا لیا۔ہمیں بات کرتے ہوئے گھنٹا بھر بھی نہیں ہوا ہوگا کہ دو افراد گھر کی دیوار پھلانگ کر اندر کود گئے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو تمہاری آمد کی اطلاع فوری طور پر پہنچ گئی تھی۔"سلامت علی

نے اپنا خیال ظاہر کیا۔میرے دماغ میں ایک جھما کا سا ہوا۔وہ پھول بیچنے والا۔۔۔میری یہاں آمد کا سب سے پہلے اسے علم ہوا اور اس نے فوراً ہی سردار خضر تک یہ خبر پہنچا دی۔نتیجتاً اس کے کارندے فوری طور پر روبہ عمل ہو گئے۔یہ پھول والا یقیناً سردار خضر کا نمک خوار ہوگا۔عنبرین کے دن دیہاڑے اغوا پر قصبے والوں نے جس بے نیازی کا اظہار کیا' اس سے سردار خضر کے اثر ورسوخ اور رعب ودبدبے کا بھی پتا چلتا ہے۔عنبرین کسی بہت ہی غلط جگہ جا پھنسی ہے۔

"اب کیا بنے گا بیٹا۔۔۔؟ کیا نام بتایا تھا تم نے؟"نور جہاں نے پوچھا۔

"میرا نام ذوالفقار علی ہے۔ذوالفقار علی شاہ۔"میں نے اپنے نام میں مزید ترمیم اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔"ہم سب کو مل جل کر اس مسئلے کا حل تلاش کرنا چاہیئے۔"

"سب سے پہلے تو ہمیں تھانے میں اس واردات کی اطلاح دینی چاہیے۔"نور جہاں نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"میرے خیال میں فی الحال ایسا کرنا مناسب نہ ہوگا۔جو حالات سامنے آئے ہیں ان کے پیش نظر تو شاید پولیس ہماری بات پر کان دھرنے کی زحمت ہی گوارا نہ کرے۔سردار خضر کوئی بہت ہی بڑی بلا معلوم ہوتا ہے۔اس سے پنجہ آزمائی ہم لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔"میں نے ان لوگوں کو اپنے تجزیے سے آگاہ کیا۔

"پھر ہم لوگ کیا کریں شاہ جی؟ ہم تو برباد ہو جائیں گے۔"نور جہاں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"ہم وہی کریں گے جو ہمیں ان حالات میں کرنا چاہیے۔میں نے سنجیدگی سے کہا۔"ہمیں سردار خضر کے پاس جا کر عاجزی سے سمجھانا چاہیے کہ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔میں یہاں گاہک کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مہمان کی حیثیت سے آیا ہوں۔شاید وہ ہماری بات مان جائے۔ہم اس علاقے میں' اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور پھر ہم اس سے جھوٹ بھی تو نہیں بولیں گے۔میں واقعی یہاں سودے بازی یا عیاشی کے ارادے سے نہیں آیا ہوں۔مجھے ملتان جانا تھا' میں نے سوچا کہ تم لوگوں کے ساتھ ہی کیوں نہ چلوں۔"معلوم نہیں میری تاویل پر انہیں یقین آیا یا نہیں بہرحال انہیں میری رائے سے اتفاق کرنا ہی پڑا۔

میں نے انہیں خود ہی اپنی حفاظت کے خیال سے تھانے جانے سے منع کیا کیونکہ اس صورت میں وہ اصرار کرتے کہ میں بھی ان کے ساتھ تھانے چلوں۔عنبرین میری موجودگی میں اغوا ہوئی تھی۔لہٰذا میرا نام خود بخود اس معاملے میں ملوث ہو جاتا۔خدانخواستہ پولیس والوں کو مجھ پر شبہ ہو جاتا کہ میں ان کا مطلوبہ مجرم ہوں تو مجھے اپنی جان کے لالے پڑ جاتے۔وہ لوگ تو جانے کب سے میرے انتظار میں منہ کھولے بیٹھے ہوں گے۔صرف میری کھوپڑی میں سوراخ کرنے کی دیر تھی۔اس کے بعد تو ان کے تمام دلدر دور ہو جاتے۔ویسے میں نے سلامت علی کو جو مشورہ دیا تھا وہ بھی غلط نہیں تھا۔ہم لوگ اگر اپنا پورا زور بھی لگا دیتے تو خضر خان کا کچھ نہ بگاڑ پاتے۔

پولیس سے یہ توقع کہ وہ علاقے کے وڈیرے یا سردار کے خلاف کاروائی کرے گی، نرم سے نرم الفاظ میں احمقانہ خوش فہمی ہی کہی جا سکتی ہے۔ جس انداز میں مجھے برکت علی حویلی میں پھانسا گیا تھا اس کے بعد سے مجھ پر کافی حد تک حقیقت پسندی غالب آنے لگی تھی۔ عنبرین کے اغوا کے بعد سے اب تک میرے ذہن میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہ آیا کہ میں تنہا جا کر کسی نہ کسی طرح خضر خان کی حویلی سے عنبرین کو چھڑا لاؤں۔ میں اپنی جان پر کھیل کر بھی عنبرین کو نہ چھڑا پاتا۔ میں نے سوچ لیا کہ میں اپنی زندگی کو ہرگز داؤ پر نہیں لگاؤں گا۔ اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو پھر فقیر بابا کا کیا بنتا۔ میری طرف سے کسی قسم کی اطلاع نہ پا کر جانے وہ لوگ اس کا کیا حشر کرتے۔

مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے ملتان جانے کی کوئی اور ترکیب کیوں نہ سوچی۔ چند گھنٹے کا سفر طے کر کے میں کسی نہ کسی طرح ملتان پہنچ ہی جاتا۔ خواہ مخواہ ان جھنجھٹوں میں گرفتار ہو گیا۔

''اب سردار خضر کی حویلی کا پتا کس سے معلوم کریں، شاہ جی؟'' سلامت علی نے مجھ سے کہا۔

''ابھی باہر چلتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ خضر خان کی حویلی کا پتا معلوم کرنا مشکل ثابت نہ ہوگا۔''

''مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ میں اس کے پیروں میں پڑ جاؤں گی۔ اپنی بچی کے لیے میں اپنی جان سے گزر جاؤں گی۔'' نور جہاں نے پرعزم لہجے میں کہا۔

''نہیں۔۔۔ تمہارا ہمارے ساتھ جانا مناسب نہیں ہے۔ تم یہیں پروین کے پاس ٹھہرو۔ ہم خود ہی اس سے بات کر لیں گے۔'' شیخ سلامت نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''ہاں ہاں امی میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔ میری تو ڈر کے مارے جان نکل جائے گی۔'' نور جہاں کو نہ چاہتے ہوئے بھی یہ بات ماننا پڑی۔

میں نے سلامت علی کو ساتھ لیا اور گھر سے باہر نکل آیا۔ اس وقت رات کا اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ تاریک گلیوں کے چند موڑ مڑ کر ہم سخی سائیں کے دربار کے قریب پہنچ گئے۔ اس وقت مزار پر بھیڑ کافی کم تھی۔ شہر سے آنے والے زائرین واپس لوٹ چکے تھے۔ اب صرف وہ زائرین وہاں موجود تھے جنہیں رات وہیں گزارنی تھی۔

میں نے پھول والے کی دکان پر نظر ڈالی۔ پہلی نظر میں تو اسے دیکھ ہی نہ سکا۔ ہم دونوں دکان کے قریب پہنچے تو مجھے وہ نظر آ گیا۔ وہ دکان کے پچھلے حصے میں سامان وغیرہ سمیٹ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ پھول والوں کی زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی ہیں۔ وہ بھی بس اب دکان بند کرنے ہی والا ہوگا۔ میں نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

''بھائی صاحب آپ تھوڑی سی مہربانی کریں گے ہم پر؟'' مجھے دیکھ کر وہ بری طرح چونک پڑا۔ اس نے بے حد محتاط لہجے میں پوچھا۔

''میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں بابو جی۔''

''بھائی پھول والے دراصل ہمیں یہاں کے ایک معزز شخص سردار خضر خان کا پتا درکار ہے۔''

میرے بجائے سلامت علی نے جواب دیا۔

''کیا کام ہے تم لوگوں کو اس سے؟'' پھول والے نے انجان بن کر پوچھا۔ وہ ہمارے چہرے سے ہمارے ارادوں کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اجی کام کیا بھائی پھول والے، بس ان کے نیاز حاصل کرنے ہیں۔'' خدا جانے پھول والا سلامت علی کی زبان سمجھا یا نہیں بہر حال اس نے یہ اندازہ ضرور لگا لیا کہ ہم جارحانہ عزائم کے تحت خضر خان کا پتا معلوم نہیں کر رہے ہیں۔

اس نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا ''میں اس کا پتا تو بتا دوں گا لیکن یہ خیال رکھنا کہ وہ بہت غصے والا آدمی ہے۔ ذرا سی بات پر بندے کو گولی مار دیتا ہے۔''

''ارے بھائی تم بتاؤ تو سہی، ہم کوئی اس سے لڑنے تو نہیں جا رہے ہیں۔'' سلامت علی نے جھلا کر کہا۔

پھول والے نے ہاتھ کے اشاروں اور سمتوں کے ذریعے ہمیں حتی الامکان تفصیل سے خضر خان کی حویلی تک پہنچنے کا راستہ بتا دیا۔ میں نے اس پر قطعاً ظاہر نہ ہونے دیا کہ مجھے علم ہے کہ خضر خان کو میری آمد کی خبر دینے والا وہی ہے۔

''اگر پھول والے نے ہمیں درست پتا بتایا ہے تو پھر خضر خان کی حویلی کو زیادہ دور نہیں ہونا چاہیے۔'' میں نے سلامت علی سے کہا۔

''بظاہر تو یہی لگتا ہے۔'' سلامت علی نے تیز تیز قدموں سے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ''ہم جس قدر جلد وہاں پہنچ جائیں بہتر ہے۔ ایسا نہ ہو کہ۔۔۔۔۔۔'' اتنا کہہ کر وہ جھجک کر خاموش ہو گیا۔ وہ عنبرین کا حقیقی باپ نہ سہی بہرحال کہتا تو اسے بیٹی تھا اور اس کے لیے کوئی ایسی ویسی بات کہنا خود اس کے لیے ذرا دشوار ہی ہوتا۔ میں نے جواب دینے کے بجائے اپنی رفتار تیز کر لی۔ کافی دور چلنے کے بعد ہمیں کچھ فاصلے پر ایک بڑی سی عمارت نظر آنے لگی۔ عمارت کے مزید قریب پہنچنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ یہی خضر خان کی حویلی ہے۔ یہ بلند و بالا اور وسیع و عریض عمارت خضر خان کی دولت اور طاقت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ ہم حویلی کے پاس پہنچے تو دو مسلح افراد نے ہمارا راستہ روک لیا۔

''کس سے ملنا ہے؟'' ان میں سے ایک نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ ان کے حلیے اور انداز گفتگو نے سلامت علی کو بری طرح گڑبڑا دیا۔

''وہ۔۔۔وہ ہمیں ہاں۔۔۔ ہم سردار خضر خان سے ملنے آئے ہیں۔''

''کیا کام ہے؟'' اس نے ایک بار پھر بارعب آواز میں سوال کیا۔

''کام۔۔۔؟ ہاں ہمیں سردار سے ذاتی کام ہے۔ ہم ملتان سے آئے ہیں، سردار سے کہو۔۔۔''

''اچھا اچھا۔'' اس شخص نے سلامت علی کی بات کاٹ دی۔ ''اصغر تو ان دونوں کا خیال رکھ میں سردار کو اطلاع دیتا ہوں۔'' اصغر نے نہایت مستعدی سے ہم دونوں کو اپنی سیون ایم ایم رائفل کی زد میں لے لیا۔ وہ نوجوان شخص تھا لیکن ہتھیار پر اس کی گرفت نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اصغر کو ہم دونوں کی نگرانی

میں چھوڑ کر وہ شخص حویلی میں داخل ہو گیا۔ اچھی خاصی دیر گزر گئی لیکن وہ شخص واپس نہ آیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرا اضطراب بڑھتا چلا گیا۔ سلامت علی کا بھی یقیناً یہی حال ہوگا۔ میں نے استفہامیہ انداز میں اصغر پر نگاہ ڈالی۔ وہ مجھے پوری طرح چاق و چوبند نظر آیا۔ میں نے اس سے کچھ کہنا چاہا لیکن اسی وقت حویلی کے اندر سے پہلے والا شخص لوٹ آیا۔

''چلو۔۔۔سردار نے تمہیں بلایا ہے۔'' اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ کلاشنکوف اس کے شانے سے اتر کر اس کے ہاتھوں میں آ گئی۔ سب سے پہلے میں حویلی میں داخل ہوا۔ اصغر اور اس کا ساتھی ہمیں اپنے ہتھیاروں کی زد میں لیے ہوئے ایک وسیع و عریض ہال نما کمرے میں آ گئے۔ اس ہال کی آرائش و زیبائش دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی بڑے شہر کے فیشن ایبل بنگلے میں موجود ہوں۔ بیش قیمت' دبیز قالین' نفیس صوفہ سیٹ' کونے میں رکھا ہوا چھبیس انچ کلر ٹی وی اور جدید ترین وی سی آر۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہاں ایئر کنڈیشنر بھی نصب ہوگا۔ میں نے معنی خیز نظروں سے سلامت علی کو دیکھا۔ اس کے چہرے سے بھی حیرت عیاں تھی۔ صوفوں پر بیٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی اصغر اور اس کے ساتھی نے ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ چند منٹ اسی کیفیت میں گزر گئے۔ میری نظر بار بار اس بڑے سے دروازے کی طرف اٹھ جاتی۔ اصغر اور اس کے ساتھی نے بدستور ہمیں اپنے ہتھیاروں کی زد میں لیے رکھا۔

اچانک دروازے میں جنبش ہوئی اور ایک شخص اندر داخل ہوا۔ مجھے پہلی نظر میں ہی یقین ہو گیا کہ وہ سردار خضر خان ہے۔ اس کا حلیہ کسی بھی مثالی بلوچ سردار کے حلیے کے عین مطابق تھا۔ سفید براق کھدر کا ڈھیلا ڈھالا چولا۔ گھیر دار شلوار اور بھاری بھرکم صافہ۔ اس کی آنکھیں برمے کے مانند میرے دماغ تک اترتی چلی گئیں۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ لگانا چاہا۔ بھاری بھرکم جسم' مہندی سے رنگی داڑھی اور سیدھی کمر' اسے زیادہ سے زیادہ چالیس سال کا بتا رہی تھی۔ اس کی توجہ کا مرکز میں تھا۔ وہ چند لمحوں تک بغور میرا جائزہ لیتا رہا۔

''ہوں۔۔۔! تو تم ہو وہ؟''

خلاف توقع اس کی آواز بہت نرم اور دھیمی ثابت ہوئی۔ اس نے بھی مجھے شہری چھوکرا ہی سمجھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے بہت صاف ستھری اردو زبان میں مجھے مخاطب کیا۔ ''تم لوگ کس لیے یہاں آئے ہو؟'' سردار خضر خان کی شخصیت نے سلامت کو بری طرح مرعوب کر دیا تھا۔ لہٰذا جواب دینے کی ذمے داری مجھے ہی سنبھالنا پڑی۔

''ہم لڑکی کو واپس لینے آئے ہیں۔'' میں نے اپنے لہجے کو مستحکم رکھا۔ تاہم میں نے بھی اردو میں جواب دیا۔

''کس میں ہمت ہے کہ چھوکری کو یہاں سے لے جا سکے۔'' یک لخت سردار خضر کا لہجہ گونج دار ہو گیا۔ ''وہ یہاں سے واپس جانے کے لیے نہیں آئی ہے۔'' اس کے لہجے میں جھلکتی رعونت نے ایک لمحے

کے لیے میرے لہو میں چنگاری سی بھڑکائی لیکن پھر میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔

''یہ تو انصاف نہیں ہے۔''

''تم مجھے انصاف کرنا سکھاؤ گے؟ میرے منہ مت لگو ورنہ یہ حویلی تمہارا مدفن بن سکتی ہے۔''

''میں دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں سردار خضر خان۔ میں عنبرین کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ تم بہت بڑی بڑی باتیں کرتے ہو لڑکے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم کس سے بات کر رہے ہو۔ کیا رشتہ ہے تمہارا اس لڑکی سے؟''

''میں۔۔۔میں اس سے محبت کرتا ہوں۔'' میں نے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہہ ڈالا۔ میری بات سن کر سردار خضر نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

''بہت خوب بہت خوب اچھا مکالمہ ہے۔ کون سی فلم سے رٹا تھا؟ تمہیں معلوم ہے اس لڑکی کا تعلق بازار سے ہے؟''

''ہاں میں جانتا ہوں۔'' میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔

''اس کے باوجود تم اس سے محبت کرتے ہو؟ شادی کرو گے اس سے؟''

''ہاں ہاں کروں گا۔ بہت سوال جواب ہو چکے اب عنبرین کو ہمارے ساتھ بھیج دو تو اچھا ہے۔'' میں نے قدرے جھلا کر کہا۔ سردار خضر پر میری جھلاہٹ کا بس اتنا اثر ہوا کہ وہ پوری طرح سنجیدہ ہو گیا۔

''دیکھو لڑکے تم ابھی نوجوان ہو......اس عمر میں عشق کا بھوت سر پر سوار ہو ہی جاتا ہے۔ تمہارے ماں باپ تمہیں اجازت دے دیں گے ایک بازاری عورت سے شادی کرنے کی؟''

''نہیں لیکن۔۔۔'' میں نے وضاحت کرنا چاہی مگر سردار خضر نے میری بات کاٹ دی۔ ''لیکن ویکن چھوڑو جوان۔ تمہاری ابھی ان چکروں میں پڑنے کی عمر نہیں ہے۔ اس لڑکی کو بھول جاؤ اور جا کر اپنی پڑھائی لکھائی پر توجہ دو۔''

''ایسا ظلم نہ کرو سردار۔ ہم لوگ تباہ ہو جائیں گے' بھوکے مر جائیں گے۔'' سلامت علی نے گھگیاتے ہوئے فریاد کی۔

''تم لوگوں کے خاندان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ میں تمہیں منہ مانگی رقم دوں گا۔ یہ لڑکی مجھے اتنی پسند آئی ہے کہ اب میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' سردار خضر نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ میں نے فوراً مداخلت کی۔

''تم ایسا نہیں کر سکتے سردار' عنبرین اور میں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں' وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔''

''پھر وہی جذباتی مکالمے بازی۔ ذرا سمجھ داری سے کام لو' عنبرین ایک ان مول ہیرا ہے۔ تم نہ تو اس کی قدر کر سکو گے اور نہ ہی اس کی حفاظت۔''

''تم میری فکر چھوڑو کہ میں اس کی قدر کر سکوں گا یا نہیں' تم عنبرین کو بلاؤ اور اسے ہمارے ساتھ بھیج دو۔ وہ کوئی بکاؤ جانور نہیں ہے۔ جسے اس کی مرضی کے بغیر جہاں جی چاہے بیچ دیا جائے۔'' سردار خضر

نے میری تلخ کلامی کا ذرا برا نہ منایا۔ اس نے اپنے کارندے کو حکم دیا۔

''گل شیر تو لڑکی کو ادھر لے آ۔''

''جو حکم گودا سائیں'' گل شیر نے ادب سے سر جھکایا اور حویلی کے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو عنبرین اس کے ہمراہ تھی۔ عنبرین کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سوج چکی تھیں۔ اس کی حالت دیکھ کر میرے دل پر چوٹ سی لگی۔ مجھے اور سلامت علی کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

''خدا کے لیے مجھے یہاں سے لے چلو۔'' عنبرین نے براہ راست مجھے مخاطب کیا۔ میں نے اس سے بڑھ کر پرجوش لہجے میں جواب دیا۔

''اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے میری جان۔ میں تمہیں لینے آچکا ہوں۔''

''یہ چھوکرا تمہاری حفاظت تو کر نہیں سکتا۔ یہ بھلا تمہیں کیا دے سکتا ہے۔ میرے پاس ٹھہر جاؤ میں تمہیں اس حویلی کی مالکن بنانا چاہتا ہوں۔''

''خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں ذوالفقار علی کے علاوہ کسی کو اپنی زندگی کا مالک نہیں بنا سکتی۔''

''میں تمہیں واپس بھیج بھی دوں تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ میں نہ سہی کوئی اور سردار تمہیں لے اڑے گا۔ اس چھوکری نما لڑکے کے نازک ہاتھ تمہاری رکھوالی نہیں کر سکتے لہٰذا۔۔۔''

سردار خضر خان کی بات ابھی درمیان میں ہی تھی کہ میں عقاب کی مانند اس پر جھپٹا۔ اس سے پہلے کہ اس کا کوئی کارندہ کچھ سمجھ پاتا' میں نے اپنا پستول سردار خضر کی کنپٹی پر رکھ کر اسے بے بس کر دیا۔ صورت حال کی اس اچانک تبدیلی نے وہاں پر موجود تمام افراد کو کچھ دیر کے لیے مبہوت سا کر دیا۔

''بس اب سارا کھیل ختم ہو چکا ہے سردار خضر خان۔'' میں نے گھمبیر لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ '' اپنے بندوں سے کہو کہ ہتھیار پھینک دیں ورنہ میں تمہارا بھیجا اڑا دوں گا۔''

''گل شیر' اصغر رائفل پھینک دو۔'' سردار خضر نے پرسکون لہجے میں کہا پھر وہ اپنے دیگر دو کارندوں کی جانب متوجہ ہوا۔ ''جابر' منگو تم بھی ہتھیار پھینک دو۔'' یہ دونوں مسلح کارندے عنبرین کو اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ قدرے کسمساہٹ کے بعد ان چاروں نے اپنے ہتھیار قالین پر ڈال دیے۔ میں نے سلامت علی سے کہا کہ وہ چاروں ہتھیاروں کو اکٹھا کر کے ایک طرف ڈال دے۔ اس نے یہ کام تو کر دیا لیکن اس کے پاؤں مسلسل کانپتے رہے۔

''ٹھیک ہے جوان تو جیتا اور میں ہارا۔'' سردار خضر خان نے پرسکون لہجے میں کہا ''تو نے ثابت کر دیا ہے کہ تیرے اندر ہمت اور حوصلہ بھی ہے اور ذہانت بھی۔ واقعی تو اس لڑکی کے قابل ہے۔ جا لے جا' اسے اپنے ساتھ لیکن اسے جلد از جلد اس دلدل سے نکال لے۔'' میں نے مشکوک نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر حسرت اور شکست خوردگی کے ملے جلے تاثرات تھے۔ البتہ اس کے لہجے سے سچائی جھلک رہی تھی۔ تاہم میں نے خطرہ مول لینا مناسب نہ سمجھا۔

''سلامت علی! تم عنبرین کو لے کر فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ میں ان کا کوئی پکا انتظام کر کے تمہارے پیچھے پیچھے آتا ہوں۔'' سلامت علی اور عنبرین نے اس ارادے کی مخالفت کرنا چاہی لیکن میں نے جب سخت لہجے میں اپنی بات دہرائی تو وہ دونوں چپ چاپ حویلی سے نکل گئے۔ اس دوران میں سردار خضر یا اس کے کارندوں میں سے کسی نے مزاحمت کی کوشش نہ کی۔

عنبرین اور سلامت علی کے جانے کے بعد میں شدید الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کروں۔ میرا ذرا سی غلطی میری موت ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ میری اس جرات کو کسی قیمت پر معاف نہ کرتے۔ سردار خضر کی دشمنی مول لینے کے بعد میرے لیے کوئی جائے پناہ باقی نہیں بچی تھی۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ میں ان پانچوں افراد کو گولی مار دوں لیکن پھر فوراً ہی میں نے اپنا یہ خیال مسترد کر دیا۔ اچانک میں نے سردار خضر کی پرسکون آواز سنی۔

''بس جوان اب یہ پستول نیچے کر لے۔ وہ معاملہ اب ختم ہو چکا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب تم لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو گی۔'' میں قدرے ہچکچایا پھر جانے کس طرح میرا پستول والا ہاتھ خود بخود جھکتا چلا گیا۔ سردار خضر کے لبوں پر موہوم سا پژمردہ تبسم نمودار ہوا۔ ''بیٹھو۔'' اس نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم لوگ جاؤ۔'' اس نے دھیمے لہجے میں اپنے کارندوں کو حکم دیا۔ وہ چاروں چپ چاپ وہاں سے چلے گئے۔

''ہاں اب بتاؤ جوان۔۔۔ کیا نام ہے تمہارا ذوالفقار علی شاہ تم سید گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود اس گھرانے میں کیسے پہنچے اور اس لڑکی سے تمہیں کیسے محبت ہو گئی۔''

''اس بات کو چھوڑو سردار خضر' یہ بتاؤ تمہیں اتنی اچھی اردو بولنا کیسے آ گئی؟'' میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ میری بات سن کر سردار خضر خان کے ہونٹ تبسم بار ہو گئے۔

''تمہیں یہ جان کر حیرت ہو گی کہ میں نے بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی سے انگلش میں ایم اے کر رکھا ہے۔''

''کیا۔۔۔؟'' میں یقیناً ششدر سا ہو کر رہ گیا۔ ''لیکن یہ۔۔۔ یہ۔''

''یہ سب بھی میری زندگی کا ایک حصہ ہے۔ ہم لوگ کتنا بھی پڑھ لکھ جائیں' اپنے ورثے تو نظر انداز نہیں کر سکتے۔''

''اچھا یہ بتاؤ سردار خضر' کیا تم واقعی عنبرین کو بے حد پسند کرتے ہو؟ کیا واقعی تم اس سے شادی کر لیتے؟''

''یہ سچ ہے ذوالفقار علی شاہ۔ اس لڑکی نے واقعی مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ خیر اب وہ تمہاری ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم اس قابل اور مستحق بھی ہو۔'' سردار خضر کے لہجے میں ایک بار پھر حسرت در آئی۔ مجھے اس پر بے اختیار ترس آنے لگا۔ اتنا طاقتور شخص اپنے دل کے ہاتھوں اتنا کمزور ہو گیا ہے۔

''کیا تم ابھی تک غیر شادی شدہ ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بھئی کچھ ایسی ہی بات ہے۔ ایک لڑکی پسند آئی تھی مجھے۔ وہ بھی مجھے پسند کرتی تھی لیکن قسمت نے اسے میرا نہ بننے دیا۔ بس اس کے بعد میں نے شادی کے متعلق سوچا بھی نہیں۔ سوائے آج کے دن کے۔'' سردار خضر نے پژمردہ لہجے میں کہا۔

''ہم لوگ کل صبح یہاں سے چلے جائیں گے سردار۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا ''ہوسکتا ہے کہ زندگی میں پھر کبھی ہماری ملاقات نہ ہو سکے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ میرے دل میں تمہاری اداسی اور حسرت ہمیشہ کے لیے کانٹا بن کر نہ چبھتی رہے۔ میں تمہیں مزید دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔'' میں نے سچ بولنے کا مصمم ارادہ کرکے کہنا شروع کیا۔

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا ذوالفقار علی شاہ۔'' اس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بات یہ ہے کہ مجھے یقین ہوگیا ہے کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ تم یقیناً عنبرین کے معاملے میں مخلص ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارا یہ خلوص رائیگاں نہ جائے۔''

''میں اب بھی تمہاری بات نہیں سمجھ پایا ہوں ذوالفقار علی شاہ۔''

''میں کہنا یہ چاہتا ہوں سردار کہ میں نے عنبرین کو تم سے چھڑانے کے لیے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے عنبرین سے کسی قسم کا جذباتی لگاؤ نہیں ہے۔''

''یہ۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' اب حیران ہونے کی باری سردار خضر کی تھی۔ ''کیا۔۔۔ کیا یہ سچ ہے؟''

''ہاں یہ سو فیصد سچ ہے۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ عنبرین تمہیں پسند کرے گی یا نہیں اور اس کے گھر والے اس کی تم سے شادی کرنے پر تیار ہوتے ہیں یا نہیں لیکن تم اپنی کوشش کرکے دیکھ سکتے ہو۔ اگر تمہیں اپنے من کی مراد مل جائے تو مجھے خوشی ہوگی۔''

''بہت بہت شکریہ ذوالفقار علی شاہ۔ تم نے مجھے ایک نئی زندگی دے دی ہے۔ عنبرین کو اپنا بنانے کے لیے میں سر دھڑ کی بازی لگا دوں گا۔ میں پہلی فرصت میں ملتان جاؤں گا۔ تم مجھے ان لوگوں کا پتا بتا دو۔'' سردار خضر نے بے تاب لہجے میں کہا۔

میں نے اسے نور جہاں بیگم کے ڈیرے کا پتا اچھی طرح سمجھا دیا۔

''میں تمہاری یہ مہربانی زندگی بھر نہیں بھولوں گا ذوالفقار علی شاہ! مجھ سے وعدہ کرو کہ تم آئندہ بھی مجھ سے ملنے آتے رہو گے۔ اگر تم مجھے اپنے گھر کا پتا دے دو تو میں خود تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔''

''میرا فی الحال کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہے۔ ویسے اگر زندگی نے کبھی موقع دیا تو میں ضرور تمہارے پاس آؤں گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں رات اچھی خاصی گزر چکی ہے۔ عنبرین اور اس کے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ مجھے خوشی ہے کہ ہم دشمن کی نہیں بلکہ اپنے دوست کی حیثیت سے ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں۔''

سردار خضر خان میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے حویلی کے گیٹ تک آیا۔ وہاں پر میں نے لاکھو اور نعمت کو

دیکھا۔ ہم دونوں کو اس والہانہ انداز میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دیکھ کر ان کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ میں نے ان دونوں کو مکمل طور پر نظرانداز کر دیا۔ سردار خضر خان نے نہایت گرم جوشی سے مجھے رخصت کیا۔ حویلی سے دور آکر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سردار خضر خان نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ میں نے اپنے ہاتھ کو جواباً فضا میں لہرایا اور قصبے کی تاریک گلیوں میں کھو گیا۔

مجھے گھر کا دروازہ حسب توقع بند ملا۔ میں نے دروازے کی زنجیر پکڑ کر زور سے ہلائی۔ زنجیر کی کھنکناہٹ نے سناٹے کی چادر میں شگاف ڈال دیا۔ قدرے توقف کے بعد میں نے ایک بار پھر زنجیر کو زور سے ہلا دیا۔ اس بار میں نے شیخ سلامت علی کی گھٹی گھٹی آواز سنی ''کک۔۔۔ کون؟''

''میں ہوں ذوالفقار علی شاہ۔ دروازہ کھولو۔'' میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا اور سلامت علی مجھ سے لپٹ گیا۔

''تم ٹھیک تو ہو شاہ جی؟'' سلامت علی نے مجھے سر سے پاؤں تک بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔'' میں نے بڑے کمرے کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے اسے تسلی دی۔ بڑے کمرے کا دروازہ مضبوطی سے بند تھا۔ سلامت علی نے جلدی سے دروازے پر دستک دی۔ ''عنبرین! نور جہاں بیگم! دروازہ کھولو۔ دیکھو ذوالفقار علی شاہ آیا ہے۔''

''اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ دروازہ کھول دو۔'' میں نے بلند آواز میں کہا۔ دروازہ بہت دھیرے دھیرے کھلا۔ میری شکل دیکھتے ہی تینوں عورتوں کے پژمردہ چہرے کھل اٹھے۔

''تم آگئے شاہ جی! خدا کا شکر ہے۔ ان لوگوں نے تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟'' نور جہاں بیگم نے مجھ پر سوالات کی بوچھار کر دی۔ میں نے اس کے سوالات کو محض گردن کے اشارے سے ٹال دیا۔ نور جہاں بیگم نے ایک بار پھر مجھ پر سوالات سے حملہ کر دیا۔

''تم بتاتے کیوں نہیں شاہ جی۔ ان لوگوں نے تمہیں کیسے واپس آنے دیا؟'' میں نے پلنگ پر جم کر بیٹھتے ہوئے عنبرین کے گل و گلزار چہرے پر نظر ڈالی۔

''اب تم لوگوں کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب ہمیں سردار خضر سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں نے اسے مطمئن کر دیا ہے۔''

''لیکن کیسے؟ تم نے تو اپنا پستول نکال کر۔۔۔'' عنبرین نے کہنا چاہا۔

''سردار خضر ایک معقول شخص ثابت ہوا ہے۔ میں نے پوری وضاحت سے تمام باتیں اسے سمجھائیں تو اس نے ہمارے نقطۂ نظر کو سمجھ لیا۔ اس نے میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اب ہم لوگ بے فکر ہو کر جب تک جی چاہے یہاں رہ سکتے ہیں۔''

''نہیں شاہ جی اب ہم یہاں نہیں رہ سکتے۔ ہم صبح سویرے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔۔۔ جیسی تم لوگوں کی مرضی۔ میں بھی تم لوگوں کے ساتھ ہی چلوں گا۔'' میں نے ایک بار پھر عنبرین پر نظر ڈالی۔ مجھ سے نگاہیں ملتے ہی اس کے چہرے پر قوس قزح کے رنگ بکھر گئے۔ میں

نے فوراً ہی اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹالیں۔ میں نے سردار خضر کے سامنے عنبرین سے محبت کا دعوی کیا تھا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ عنبرین نے کہیں اسے سچ نہ سمجھ لیا ہو۔

کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ان لوگوں نے مجھ سے پستول کے متعلق پوچھا تو میں نے جھوٹ بول دیا کہ میرے پاس اس کا لائسنس ہے۔ آخر کار تینوں عورتیں دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ میں نے اور سلامت علی نے وہاں پر موجود دونوں پلنگوں پر قبضہ جمالیا۔ اس گھمبیر صورت حال سے بخیرو خوبی نجات حاصل کرنے کے بعد میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

ذرا سا سکون ملتے ہی ایک بار پھر اپنے خیالوں کی دنیا میں کھو گیا۔ سردار شاہ مراد' چچا مہرداد' مہراں' فقیر بابا' ہیر۔ کتنے ہی چہرے یکے بعد دیگرے میرے ذہن کے پردے پر نمودار ہوئے اور پھر اوجھل ہو گئے پھر میرا ذہن اس شخص کی جانب مبذول ہوا۔ جسے قتل کرنے کے ارادے سے میں ملتان جا رہا تھا۔ رفاقت علی! سردار برکت علی کا سگا بھائی۔ اس کی بھابھی اس کی موت کی خواہاں تھی۔ میرا ذہن مکمل طور پر اس عورت کی ذات پر مرکوز ہو کر رہ گیا۔ اسے قتل کرنے کے لیے میں کتنے سال منتظر و متلاشی رہا۔ بالآخر مجھے اس کا سراغ ملا بھی تو میں کوشش کے باوجود اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ اس کا حفاظتی حصار میری توقع سے زیادہ مضبوط ثابت ہوا پھر فقیر بابا کی ذات میرے پیروں کی زنجیر بن گئی۔ اس کی زندگی اور آزادی کے لیے مجھے اس بدنصیب شخص رفاقت علی کے قتل کی حامی بھرنی پڑی۔ خدا جانے میرے ان قاتل ہاتھوں کو اور کس کس کے خون سے غسل کرنا تھا۔ میں مسلسل سوچتا رہا پھر رات کے کسی پہر خود بخود میری آنکھ لگ گئی۔

صبح کو سو کر اٹھا تو میں نے دیکھا کہ وہ لوگ روانگی کی تیاریاں مکمل کر چکے ہیں۔ عنبرین نے مجھے ناشتا دیا۔ ناشتا کرنے کے بعد میں بھی سفر کے لیے تیار ہو گیا۔ شیخ سلامت علی مجھے نظر نہیں آیا' اس سے پہلے کہ میں کسی سے اس کے بارے میں پوچھتا' وہ گھر میں داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر وہ سیدھا میرے پاس آ گیا۔

''بڑی عجیب و غریب بات ہے میاں ذوالفقار علی شاہ۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''کیوں کیا ہوا شیخ صاحب۔'' میں نے پوچھا۔

''میں مالک مکان کے پاس گیا تھا کرایہ دینے کے لیے لیکن اس نے ایک پیسہ بھی لینے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ پہلے تو وہ بہت لالچ کا اظہار کرتا رہا ہے۔'' شیخ صاحب نے الجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔

''کیوں اس نے ایسا کیوں کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''بڑی عجیب سی بات بتا رہا تھا کہ سردار خضر خان نے حکم دیا ہے کہ میں تم لوگوں سے کرایہ وصول نہ کروں۔ اس کرائے کی ادائیگی اس کی طرف سے ہو گی۔''

میں نے قدرے توقف کے بعد اسے تسلی دی۔ ''تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے شیخ صاحب۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ مین نے سردار خضر کی غلط فہمی دور کر دی ہے۔ اب وہ ہمارا خیر خواہ ہے۔ ان لوگوں کی روایات بس کچھ ایسی ہی ہیں۔ دشمنی کرتے ہیں تو آخری حد تک اور دوستی کرتے ہیں تو وہ بھی انتہا

درجے کی۔ تم یہ سمجھ لو کہ اب تک تم لوگ اس کے مہمان بن کر یہاں رہ رہے ہو۔'' میرے دلائل سن کر سلامت علی کافی حد تک مطمئن ہو گیا۔ اس نے تینوں عورتوں کو یہ بات بتائی تو وہ تینوں بھی خوش ہو گئیں۔

کچھ دیر بعد ہم لوگ بس اسٹینڈ کی جانب روانہ ہو گئے۔ ان لوگوں کا سامان دو چھوٹے سوٹ کیسوں اور ایک عدد بیگ پر مشتمل تھا۔ دونوں سوٹ کیس میں نے اٹھا لیے۔ قصبے کے بازار سے گزرتے وقت قصبے کے باشندے لگا تار ہم لوگوں کو گھورتے رہے۔ یہ دیکھ کر مجھے کافی اطمینان محسوس ہوا کہ زیادہ تر لوگوں کی توجہ کا مرکز صرف اور صرف عنبرین اور پروین تھیں' میری طرف بہت کم لوگوں نے توجہ دی۔ تھانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے اپنی گردن بالکل سامنے کی سمت رکھی۔ میری پوزیشن ایسی نہ تھی کہ کسی قسم کا خطرہ مول لے سکوں۔

ہم لوگوں کو فوراً ہی ایک ویگن میں جگہ مل گئی۔ میں نے جان بوجھ کر کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے سے گریز کیا۔ کچھ ہی دیر بعد ویگن ڈیرہ غازیخان کی طرف روانہ ہو گی۔ ویگن نے راستے میں کہیں اسٹاپ نہ کیا اور بہت کم وقت میں شہر پہنچ گئی۔ سفر کے دوران میں عنبرین نے کئی بار مجھ پر اپنی بدھ بھری نظریں ڈالیں لیکن میں نے براہ راست اس سے نظریں ملانے سے گریز کیا۔ ویگن نے ہمیں ڈیرہ غازیخان کے کہکشاں سینما کے قریب اتار دیا۔

''اب کیا کرنا ہے شیخ صاحب؟'' میں نے پوچھا۔

''کرنا کیا ہے' بس اب ملتان کے لیے روانہ ہونا ہے۔'' سلامت علی نے کہا۔

''کیوں؟ کیا اپنے ساز و سامان اور سازندوں کو شاہ صدرودین میں ہی چھوڑ کر جانا ہے؟'' نور جہاں نے چونک کر پوچھا۔

''اوہ ہاں بھئی' انہیں بھی ساتھ لینا ہے تو پھر چلو شاہ صدر دین چلتے ہیں۔''

''ہم تمہارے ساتھ کہاں اس دیہات میں جائیں اور پھر واپس آئیں؟ ہمارا دماغ خراب نہیں ہوا ہے۔ تم تنہا وہاں جاؤ' سب سامان اور ان لوگوں کو ساتھ لے آؤ۔ ہم اپنے میزبان سے اجازت ہی لے چکے ہیں۔''

''ہاں ہاں اماں ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ہم لوگ اب وہاں نہیں جائیں گے۔'' عنبرین نے نور جہاں بیگم کی تائید کی۔

''بھئی جیسی تم لوگوں کی مرضی لیکن تم لوگ یہاں ٹھہرو گے کہاں؟ مجھے واپسی میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔''

''تم اس کی فکر نہ کرو۔ یہاں ہوٹلوں کی کمی نہیں۔ اب ہم اکیلے تو نہیں ہیں۔ ذوالفقار میاں ہیں ہمارے ساتھ۔ ہم اطمینان سے سارے معاملات طے کر کے صبح یہاں آ جاؤ۔ ہم لوگ فوراً ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے تم لوگ کسی ہوٹل میں ٹھہر جاؤ۔ اس کے بعد میں روانہ ہو جاؤں گا۔''

ہوٹل کا انتخاب نور جہاں بیگم نے خود کیا۔ اس بے حد خوبصورت اور مہنگے ہوٹل کو میں نے باہر سے تو بے شمار مرتبہ دیکھ رکھا تھا۔ اس دن پہلی مرتبہ اندر سے بھی دیکھ لیا۔ یہ اس چھوٹے سے شہر کا سب سے مہنگا ہوٹل تھا۔ مجھے اس کے کمروں کے کرائے بہت زیادہ محسوس ہوئے لیکن نور جہاں بیگم کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ اس نے دونوں کمروں کے ایک دن کے کرائے کی پیشگی ادائیگی کی اور ہم اپنے کمروں میں آ گئے۔ یہ دونوں کمرے جڑواں تھے یعنی ان کے درمیان ایک مشترکہ دروازہ موجود تھا...... استقبالیہ کلرک نے یہ کمرے نور جہاں بیگم کی خصوصی درخواست پر ہمیں الاٹ کیے۔ دونوں کمروں کی سجاوٹ اور آرائش نے ایک لمحے کے لیے مجھے مبہوت سا کر دیا۔ پورٹر نے ہمارا سامان کمرے میں پہنچاتے ہی ائیر کنڈیشنر آن کر دیا۔ چند ہی لمحوں میں تیز دھوپ اور لو کا تمام تر عذاب کہیں دور جا چھپا۔ کچھ دیر بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

میں ابھی کمرے میں آ کر صوفے پر بیٹھا ہی تھا کہ پروین وہاں آن دھمکی۔ اس کے ہاتھوں میں شیونگ کا مکمل سامان تھا۔

''باجی نے کہا ہے کہ آپ شیو کر لیں۔'' قدرے تذبذب کے بعد میں نے وہ سامان لے لیا۔ وہ سامان شیخ سلامت علی کی ملکیت رہا ہوگا۔ میں نے چمک دار ٹائلوں والے خوبصورت غسل خانے کے بڑے سے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر شیو بنائی۔ اس کے بعد میں بڑے سے باتھ ٹب میں اتر گیا۔ میں بہت دیر تک نہاتا رہا۔ پہننے کے لیے میرے پاس فالتو کپڑے نہیں تھے۔ لہٰذا میں نے دوبارہ وہی کپڑے پہن لیے۔ بلو جینز کی پتلون پر تو بھلا کیا اثر پڑتا لیکن میرے سیاہ شرٹ قدرے میلی ہو رہی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے بعد میں دوسرے کمرے میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ تینوں بھی غسل سے فارغ ہو چکی تھیں۔ عنبرین کا چہرہ نہانے کے بعد کچھ اور نکھر آیا تھا۔ اس نے والہانہ نظروں سے مجھے دیکھا' اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ میں بھی کوئی قابل دید و قابل داد شے نظر آ رہا ہوں۔ نور جہاں بیگم اور پروین کی نظروں میں بھی مجھے اپنے لیے ستائش کی جھلک نظر آئی۔

''ارے تم تو وہی میلی شرٹ پہنے ہوئے ہو۔'' نور جہاں بیگم نے کہا۔

''تو پھر کیا کروں؟ میرے پاس تو فی الحال یہی لباس ہے۔''

سلامت علی کے کپڑے تو تمہیں آئیں گے نہیں کیونکہ تم ماشاء اللہ اس سے کم از کم ایک فٹ لمبے ہو گے لیکن تمہارے ان کپڑوں کو دھلوایا تو جا سکتا ہے۔ اس ہوٹل میں یقیناً لانڈری سروس کا انتظام ہوگا۔'' میں نے نور جہاں بیگم کے بے حد اصرار کے باوجود صرف اپنی شرٹ دھلنے کے لیے دی۔ شرٹ اتارتے ہی میں تینوں خواتین کی نگاہوں کا مرکز بن کر رہ گیا۔ ان کی آنکھوں میں میری جسمانی ساخت کو دیکھ کر واضح طور پر ستائشی جذبات ابھر آئے۔ میں زیادہ دیر ان کی نگاہوں کا مقابلہ نہ کر سکا' موقع ملتے ہی میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

ہوٹل کے قریب ہی اخبارات و رسائل کی بہت بڑی دکان تھی۔ میں نے ایک بیرے کے ذریعے

بہت سے اخبارات و رسائل منگوا لیے۔ میں تمام دن اخبارات کا مطالعہ کرتا رہا۔ بغور مطالعہ کرنے کے باوجود مجھے اپنے مطلب کی کوئی خبر نظر نہ آئی۔ رات کا کھانا ہم سب نے اکھٹے ہی کھایا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی میں دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ ان تینوں نے میرے اس طرز عمل کو شرمیلے پن پر معمول کیا۔ میں رات کو بھی دیر تک مطالعہ کرتا رہا' جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

اس رات میں نے ایک بار پھر ہیر کو اپنی خواب کی نگری کا مہمان بنایا۔ وہ مجھ سے سخت ناراض تھی' لیکن پھر میں نے کسی نہ کسی طرح اسے منا ہی لیا۔ اس نے اپنا نازک ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ ہم دونوں پھولوں سے اٹی ہوئی سرسبز وادیوں میں اٹھکلیاں کرتے رہے۔ تھک ہار کر ہم ایک ٹھنڈے میٹھے چشمے کے کنارے گھاس کے قطعے پر بیٹھ گئے۔ میں نے دیکھا کہ ہیر کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی ہے۔ اس نے کہا۔

''تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے' تمہیں اس جرم کی سزا ضرور ملے گی۔''

''سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔'' میں نے شہد بھرے لہجے میں کہا۔

''تو پھر تیار ہو جاؤ۔'' ہیر نے شرارت سے کہا۔ میں نے گھاس پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ہونٹوں کو شبنم میں بھیگے گلاب نے چھوا ہو۔ میں نے پھر بھی آنکھیں نہ کھولیں تو مجھے اس نم گلاب کا لمس اپنی آنکھوں پر محسوس ہوا۔ مجھے اپنے وجود میں لذت اور طراوٹ کا طوفان موجیں مارتا محسوس ہوا۔ میں نے پھر بھی آنکھیں نہ کھولیں تو اس دبیز گلاب کی شرارتیں باقاعدہ سرکشی میں بدل گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے وجود میں ہولناک بھونچال پرورش پا رہا ہو۔

''نہیں ایسا مت کرو ہیر۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ مجھے مت آزماؤ۔ میں بہت کمزور ہوں۔ میں ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاؤں گا۔'' میری تمام التجائیں بے سود ثابت ہوئیں۔ اس کی شرارتیں حد سے گزرنے لگیں۔ ''بس کرو۔ یہ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' میں نے دبی دبی آواز میں کہا اور ہیر کو اپنے وجود سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی۔ میرے کانوں میں چیخ کی ہلکی سی آواز گونجی۔ اس کے ساتھ ہی میں بیدار ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ میری ہیر واقعی میرے پہلو میں موجود ہے۔ اس نے اپنی بانہوں کا ہار میری گردن کے گرد حمائل کر رکھا تھا اور اس کے ہونٹ میرے بدن پر پیار کی مہریں ثبت کر رہے تھے۔

''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' میں نے اپنے وجود کو اس کے حصار سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔ وہ ہلکے سے احتجاج کے ساتھ مجھ سے دور ہٹ گیا۔

عین اسی وقت میری آنکھیں کھل گئیں۔ اسے پہنچاننے میں مجھے ایک لمحہ بھی نہ لگا' وہ عنبرین تھی۔ اس نے اس قدر باریک اور شفاف لبادہ پہن رکھا تھا کہ پہلی ہی نظر میں اس کے سرکش و پرشباب وجود کی تمام تر رعنائیاں اور رنگینیاں میری آنکھوں کے راستے میرے دماغ پر بجلی بن کر گریں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے بے حد تیز شراب کا جام ایک ہی سانس میں چڑھا لیا ہے۔ اس کے شریں لمس کی لذت ابھی تک میرے ہونٹوں پر باقی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی تو مجھے اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں

پیاس کا صحرا نظر آیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کا وجود ایک طاقت ور مقناطیس ہے اور میرا وجود لوہے کا حقیر ذرہ ہے میں نے اس کی بے پناہ کشش کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تم کیا کر رہی ہو عنبرین' تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔''

''اب شرم ورم کو بھول جاؤ جان۔ میرے پاس آؤ۔ میں کب سے تمہاری راہ تک رہی ہوں۔'' اس نے اپنی بات ختم کرتے ہی میرا بازو تھام کر میرے قریب ہونا چاہا۔

''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا' تم مجھے غلط سمجھی ہو عنبرین' میں اس نیت سے تمہاری مدد پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔ مجھے تم سے کسی قسم کے بدلے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''یہ کوئی بدلہ نہیں ہے جان۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور میری ہر سانس پر تمہارا حق ہے۔'' عنبرین نے اکھڑی اکھڑی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا۔ میں نے اپنے اور اس کے درمیان موجود فاصلہ برقرار رکھا۔

''نہیں یہ محبت نہیں ہے عنبرین' محبت میں تو ہوس کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ جو محبت جسمانی آلائشوں سے آلودہ ہو جائے وہ محبت نہیں رہتی۔ محض ایک حیوانی عمل بن کر رہ جاتی ہے۔ خدا کے لیے اپنے آپ پر قابو پاؤ۔ جو تم چاہتی ہو' وہ میرے لیے ممکن ہے۔''

میرے الفاظ عنبرین کے اعصاب پر برق بن کر گرے۔ اس کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت نمودار ہوئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ میں اس کے احساسات سے بخوبی واقف تھا۔ وہ سمجھ رہی ہوگی کہ میں نے اسے رد کر دیا ہے۔ جس قسم کے ماحول سے اس کا تعلق تھا اس کے پیش نظر میری باتیں سمجھنا اس کے لیے بے حد مشکل ہوتا۔ میں مسترد کیے جانے کی اذیت سے بخوبی واقف تھا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں اس نے میری مزاحمت کو اپنی توہین نہ سمجھ لیا ہو۔ میں نے اسے تسلی دینا چاہی۔

''میں تمہاری بہت عزت۔۔۔۔''

''تم میری کوئی عزت نہیں کرتے۔ تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔'' عنبرین بارود کے مانند پھٹ پڑی۔ ''تم مجھ سے بھلا کیونکر محبت کر سکتے ہو۔ میرا تعلق تو بازار سے ہے نا اور تم سید زادے ہو۔'' اس کے جارحانہ انداز نے مجھے دفاعی پوزیشن اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے عنبرین' خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری نظر میں تمہاری بہت عزت ہے۔ میری خواہش ہے کہ باقی لوگ بھی تمہاری عزت کریں۔ دنیا کا کوئی بھی شخص فطرتاً برا یا اچھا نہیں ہوتا۔ یہ حالات کے کرشمے ہیں جو انسان کو برے یا اچھے انسان کا رنگ دیتے ہیں۔'' میں نے جذباتی لہجے میں اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔

میں نے دیکھا کہ عنبرین پر میری باتوں کا حسب توقع بے حد اثر ہوا ہے۔ وہ مبہوت سی ہو کر میرا منہ دیکھنے لگی۔ ''ہاں عنبرین میں جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں نے جب تمہیں پہلی بار دیکھا تو میں تمہارے

حسن اور تمہاری معصومیت سے بے حد متاثر ہوا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ تمہارا تعلق اس کوچے سے ہے تو مجھے تم پر بے اختیار ترس آ گیا۔ میں نے سوچا کہ کاش تمہارا کسی شریف گھرانے سے تعلق ہوتا۔ تم بھی کسی شریف اور معزز شخص کے گھر کی ملکہ بن کر راج کرتیں۔ میں تم سے نفرت کرنے کا تو سوچ بھی نہیں سکتا۔''

میری بات سن کر عنبرین کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ ''تم کیا سمجھتے ہو؟ کیا میرا دل نہیں چاہتا کہ میرا بھی ایک چھوٹا سا گھر ہو۔ میں بھی کسی محنت کش مرد کی بیوی بن کر عزت کی زندگی گزاروں لیکن یہ سب میرے جیسی لڑکیوں کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ ہم دنیا بھر کے اوباش اور عیاش بھیڑیوں کے پہلو گرماتی رہیں' بس یہی ہماری زندگی کا مقصد ہوتا ہے۔ کون کرے گا ہم سے شادی؟ کیا تم مجھ سے شادی کر سکتے ہو؟'' عنبرین اپنے وجود کی گہرائیوں میں دفن حسرتوں کا زہر ہلاہل میرے کانوں میں انڈیلتی چلی گئی۔ میں کوشش کے باوجود اسے کوئی جواب نہ دے سکا۔

ہم دونوں کے بیچ خاموشی کی مسموم چادر حائل رہی۔ عنبرین کی آنسوؤں میں بھیگی آواز خاموش ہو گئی پھر وہ خاموشی سسکیوں سے بوجھل ہو گئی۔ میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہ کی۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے دل کا غبار آنکھوں کے راستے بہہ جائے۔ آہستہ آہستہ عنبرین پرسکون ہوتی چلی گئی۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ میں نے سوچا کہ اس سے اپنی بات منوانے کا اس سے بہتر موقع مجھے پھر نہیں مل سکے گا۔ میں نے کہا۔

''ٹھہرو عنبرین مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''کیا بات کرو گے تم مجھ سے؟'' اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''یہی نا کہ میں یہ گناہوں بھری زندگی چھوڑ دوں۔''

''ہاں عنبرین میں یہی چاہتا ہوں۔ میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ میرے علاوہ اگر کوئی اور شریف انسان تمہیں اپنی بیوی بنانا چاہے تو کیا تم اس سے شادی کر لوگی؟''

''اگر کوئی مجھے عزت کی زندگی دے تو میں اس کی نوکرانی بھی بن کر رہ سکتی ہوں لیکن کون ایسا شخص ہے جو مجھ گناہ اور بدنامی کی پوٹ کو اپنے گھر میں جگہ دے گا۔''

''ایسا ایک شخص ہے عنبرین۔ ایسا ایک شخص ہے' وہ تمہیں بھرپور عزت اور وقعت دے گا' تمہاری قدر کرے گا' تمہیں اپنے گھر کی ملکہ بنا کر رکھے گا۔'' میں خود بخود جذباتی ہوتا چلا گیا۔

''کک۔۔۔کون ہے وہ؟'' عنبرین نے ہکلاتے ہوئے پوچھا ''کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ''اس شخص کا نام سردار خضر خان ہے۔''

''سس۔۔۔سردار خضر خان۔'' عنبرین نے سرسراتی آواز میں دہرایا۔

''ہاں سردار خضر خان۔ اپنی ظاہری وضع قطع کے برعکس وہ ایک بہت اچھا انسان ہے۔ وہ تمہیں بے حد پسند کرتا ہے اور تم سے شادی کی خواہش رکھتا ہے۔''

''لیکن۔۔۔'' عنبرین نے کچھ کہنا چاہا۔

"پہلے میری بات پوری سن لو۔ وہ بہت شکستہ دل انسان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری دل و جان سے قدر کرے گا۔ میں نے اسے تم لوگوں کے گھر کا پتا بتا دیا ہے۔ وہ ملتان آ کر نور جہاں بیگم سے تمہارا رشتہ طلب کرے گا۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو نور جہاں بیگم کو اس رشتے سے انکار نہ کرنے دینا۔ اگر یہ موقع ضائع ہو گیا تو شاید تم زندگی بھر اس دلدل سے نجات نہ پا سکو۔"

"نہیں ایسا نہیں ہوگا۔" قدرے توقف کے بعد عنبرین نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔ نور جہاں بیگم اس رشتے سے انکار نہیں کر سکتی۔ میں اپنا تمام جمع جتھا اس کے حوالے کر دوں گی اگر وہ پھر بھی نہ مانی تو میں اسے جان سے مار دوں گی میں اس سنہری موقعے کو ضائع نہیں کروں گی۔"

"تمہیں ایسا کچھ کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ سردار خضر خان بے حد دولت مند شخص ہے۔ وہ تمہاری نور جہاں بیگم کا منہ دولت سے بھر دے گا۔ بس تم اپنی رضامندی ظاہر کر دینا۔"

ٹھیک ہے۔" عنبرین نے پر عزم لہجے میں کہا۔ "میں اس کا انتظار کروں گی۔"

"میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ مجھے وہاں صرف اور صرف سردار خضر خان کے جذبہ صادق کا عکس نظر آیا۔ میرے دل سے بے اختیار دعا نکلی کہ خداوند کریم ان دونوں محرومیوں کے مارے انسانوں کو ایک دوسرے سے ملا دے۔ کچھ دیر بعد عنبرین اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے اپنے پروردگار کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھے ایک بہت بڑی آزمائش سے نکال لیا ہے۔ اگر آج رات میرے قدم بہک جاتے تو شاید میں تمام عمر اپنے آپ سے نگاہیں نہ ملا پاتا۔

اگلی صبح شور شرابے سے بھرپور ثابت ہوئی۔ سلامت علی صبح ہی صبح اپنے سازندوں' طبلوں' ہارمونیم اور گھنگھروؤں کے ہمراہ میرے کمرے میں آن دھمکا۔ سازندوں نے متجسس نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر بے نیاز ہو گئے۔ میرے جیسے نوجوان تماش بینوں کی موجودگی ان کے لیے اجنبی تو نہ رہی ہوگی۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ ان چاروں نے کمرے میں بچھے قالین پر ڈیرہ جما لیا۔

کچھ دیر بعد ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں اور ہم ویگنوں کے اڈے پر پہنچ گئے۔ اگرچہ اس کی ضرورت نہ تھی تاہم میں نے جان بوجھ کر ایک بیگ اٹھا لیا۔ ویگنوں کے اسٹینڈ تک پہنچنے کے دوران میں میری کوشش یہی رہی کہ میں ان لوگوں کے درمیان گھرا رہوں۔ اتنے سارے مسافروں کو ایک ساتھ دیکھ کر ویگن والوں کی باچھیں کھل گئیں۔ سلامت علی نے ٹکٹ خریدے اور ہم سب ویگن میں سوار ہو گئے۔ اس تمام عرصے میں عنبرین اور پروین لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہیں۔ ویگن میں بھی میں نے ایسی سیٹ چنی جو کھڑکی سے ہٹ کر تھی۔ کچھ دیر بعد ویگن چل پڑی۔ ویگن کے شہر کی حدود سے نکلتے ہی میں مزید محتاط ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ہم سردار شاہ مراد کے علاقے میں داخل ہو جاتے۔ اگرچہ اس کا امکان بہت کم تھا تاہم اگر شاہ مراد کے کارندے گاؤں کے قریب بڑی سڑک پر گاڑیوں کی تلاشی لے رہے ہوتے تو میرے گلے میں یقیناً موت کا طوق پڑ جاتا۔

میرا یہ اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ ویگن شائیں سے گاؤں کے پاس سے سیدھی نکلتی چلی گئی۔ "ابھی خطرہ

پوری طرح ختم نہیں ہوا ہے۔" میں نے اپنے آپ کو خبردار کیا۔ "ابھی ویگن کو غازی گھاٹ کے پل پر جو پولیس چوکی کے سامنے ٹھہرنا ہے۔"

ویگن شفاف سڑک پر فراٹے بھرتی رہی۔ درختوں کی دو رویہ قطاریں سڑک پر سایہ کیے ہوئے تھیں۔ جونہی گاڑی کی رفتار ہموار ہوئی ڈرائیور نے گاڑی کا ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔ گاڑی کی محدود فضا میں عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی پرسوز آواز گونجنے لگی۔ تمام مسافر گیت کی دلکش دھن اور پر اثر بولوں میں گم ہو گئے۔

غازی گھاٹ کے پل پر ٹول ٹیکس ادا کرنے کے بعد ڈرائیور نے پولیس چوکی کے قریب گاڑی روک دی۔ وہاں موجود ایک کاہل سا کانسٹیبل بڑی بے زاری سے اٹھا' اس نے ایک طائرانہ نظر ویگن کے مسافروں پر ڈالی۔ مجھے اپنی رگوں میں خون خشک ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اگلے ہی لمحے کانسٹیبل نے ہاتھ اشارے سے ڈرائیور کو گاڑی چلانے کی اجازت دے دی۔ ویگن ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ ایدھی ٹرسٹ کے ہنگامی امداد کے مرکز سے آگے نکلتے ہی ڈرائیور نے ایک بار پھر ٹیپ چلا دیا۔ غازی گھاٹ کا خوبصورت' مضبوط اور طویل پل' چند ہی منٹوں میں پیچھے رہ گیا۔ دریائے سندھ کے حفاظتی پشتے کافی دور تک سڑک کے ساتھ ساتھ چلتے رہے پھر وہ بھی پیچھے رہ گئے۔

ویگن کے ضلع ڈیرہ غازیخان کی حدود سے نکلتے ہی میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب ہم ضلع مظفر گڑھ میں داخل ہو چکے تھے۔ تھانہ صدر' مظفر گڑھ کے سامنے سے گزر کر ہم شہر کی گنجان سڑکوں پر پہنچ گئے۔ ایک دو مسافروں کو یہاں اتار کر ویگن ایک بار پھر آگے بڑھ گئی۔ میری آنکھیں غنودگی کے بوجھ سے جھکنے لگی تھیں۔ میں اس وقت چونکا جب ویگن ایک جھٹکے سے رک گئی۔ میں نے ویگن سے باہر کے ماحول کا جائزہ لیا۔ مجھے سامنے ایک ریلوے کراسنگ نظر آئی۔ اس وقت ریلوے پھاٹک بند تھا۔ میں نے محض اندازوں کی مدد سے اس جگہ کو پہچان لیا۔ ہم اس وقت ملتان کے مضافاتی قصبے شجاع آباد کے قریب پہنچ چکے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہاں بہت بڑا آئل ڈپو ہے جہاں سے ملک کے بہت بڑے حصے کو پیٹرول اور ڈیزل سپلائی ہوتا ہے۔

ٹرین گزرنے کے بعد پھاٹک کھل گیا۔ ویگن ایک بار پھر ملتان کی جانب رواں دواں ہو گئی۔ کچھ دیر بعد ہم آئل ڈپو کے پاس سے گزرے۔ اس جگہ بلا مبالغہ سینکڑوں کی تعداد میں آئل ٹینکر موجود تھے۔ ٹینکروں کے ساتھ موجود ڈرائیوروں اور کلینروں کو دیکھ کر مجھے بے اختیار مینو اور اس کا خودسر شاگرد شرافت یاد آ گیا۔ استاد مینو اگر مجھے سردار شاہ مراد کے ہتھکنڈوں سے خبردار نہ کرتا تو میں کسی بھی وقت بڑی آسانی سے پولیس یا شاہ مراد کے کارندوں کے ہتھے چڑھ جاتا۔ اس نے مجھے موجودہ روپ دیا جس کی بدولت میں باآسانی ڈیرہ غازیخان کی حدود سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں نے عنبرین پر نگاہ ڈالی۔ وہ ویگن کی فرنٹ سیٹ پر پروین اور نور جہاں کے ساتھ بیٹھی اونگھ رہی تھی۔

ملتان شہر کی حدود شروع ہوتے ہی میں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے شیخ سلامت علی اور نور جہاں بیگم پر یہی ظاہر کیا تھا کہ میرا ٹھکانہ ملتان کے گنجان آباد علاقے انو کے چھجے میں ہے جبکہ درحقیقت میری ملتان شہر کے بارے میں تمام تر معلومات صرف اور صرف سنی سنائی باتوں پر مشتمل تھیں۔ مجھے زندگی نے کبھی اتنی مہلت نہ دی کہ میں کسی دوسرے شہر گھومنے پھرنے جاتا۔ اگر شیخ سلامت علی یا نور جہاں بیگم ملتان شہر کے علاقوں کے حوالے سے گفتگو شروع کر دیتے تو میں سخت الجھن میں پھنس جاتا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے۔ ان لوگوں سے علیحدہ ہو جاؤں۔ میرا اصل مقصد تو پورا ہو ہی چکا ہے۔ میں بہ حفاظت ملتان پہنچ چکا ہوں۔ تھوڑی بہت کوشش کے بعد میں اپنے مطلوبہ شخص کا پتا بھی چلا ہی لوں گا۔ اس کے بعد تو صرف اس کا خاتمہ ہی باقی رہ جاتا ہے۔ میں مناسب موقع دیکھتے ہی اپنے والتھر کا میگزین اس پر ہلکا کروں گا۔ اس کے بعد فقیر بابا آزاد ہو جائے گا اور میں اپنے وجود کی تمام تر زہرناکیوں کے ساتھ ایک بار پھر برکت علی کی حویلی پر قیامت بن کر ٹوٹوں گا۔ اس بار کوئی مجبوری‘ کوئی کمزوری میرا راستہ نہیں روک سکے گی۔ اس بار وہ بدبخت عورت میرے انتقام کے شعلوں سے نہیں بچ سکے گی۔

ویگن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے ویگن سے باہر نظر ڈالی۔ میں نے اپنے اندازے کی مدد سے وہ جگہ پہچان لی۔ وہ قاسم آباد تھا۔ اس جگہ تین چار مسافر اتر گئے۔ میرے سامنے والی سیٹ خالی ہوئی تو میں اس پر جا بیٹھا۔ اب فرنٹ سیٹ بالکل میرے سامنے تھی۔ میں نے نور جہاں بیگم کو مخاطب کیا۔ ”میں عزیز ہوٹل کے اسٹاپ پر اتر جاؤں گا۔ آپ لوگ آگے چلے جانا۔“

”نہیں نہیں۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے۔“ نور جہاں بیگم نے بلند آواز کہا۔

”میاں ہم تمہیں ایسے نہیں جانے دیں گے۔ بھئی ایسی بھی کیا بے مروتی۔“

”میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں۔۔۔“ میں نے کمزور لہجے میں وضاحت کرنا چاہی‘ عین اسی وقت دونوں لڑکیاں بیچ میں بول پڑیں۔

”ہاں نور جہاں بی بی صحیح کہہ رہی ہیں۔ آپ کو ہمارے گھر تک چلنا ہوگا۔“ میں نے مزاحمت کرنا چاہی لیکن ناکام رہا۔ مجھے ان کی بات ماننا پڑی۔

ویگن اسٹینڈ پر ہم سب لوگ ویگن سے اترے۔ اسی وقت مجھے اندازہ ہو گیا کہ نور جہاں بیگم اور اس کے ساتھی مالتان کے جانے پہچانے چہرے ہیں۔ کئی لوگوں نے نور جہاں بیگم کو سلام کیا۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے ان لوگوں میں چھپی طنزیہ مسکراہٹ بھی دیکھ لی۔ شیخ سلامت علی نے جلدی جلدی دو تانگوں کا انتظام کیا۔ اس دوران میں عنبرین اور پروین لوگوں کی چبھتی ہوئی نظروں کا مرکز بنی رہیں۔ میں نے عنبرین کے چہرے پر حقارت کے آثار دیکھے جبکہ پروین اپنی پذیرائی سے لطف اندوز ہوتی رہی۔

تانگے آتے ہی عنبرین سب سے پہلے تانگے پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ پروین بھی اس کے پاس جا بیٹھی۔ نور جہاں بیگم نے پچھلی نشست سنبھالی۔ ”آؤ میاں۔“ اس نے مجھے اپنے پاس بیٹھنے کی دعوت دی۔ میں تھوڑا سا جھجکا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہاں موجود تمام لوگوں کی نوکیلی نگاہیں میرے جسم کے آر پار

ہو رہی ہیں۔ مجھے ان نگاہوں سے بچنے کی یہی فوری ترکیب نظر آئی کہ میں نور جہاں کے پاس جا بیٹھوں۔ میرے بیٹھتے ہی نور جہاں بیگم نے تانگے کے ”ڈرائیور“ کو حکم دیا کہ وہ حسین آگاہی چلے۔ تانگے والے نے جونہی اپنی سواریوں کی خوشبو سے ان کے گلشن کا اندازہ لگایا۔ اس کی طبیعت میں ایک نئی ترنگ آ گئی۔ ”جو حکم بادشاہو۔ چل بھئی راکٹ‘ سوہنیا دے محلّے۔“ عنبرین اور پروین کی مشترکہ ہنسی نے فضا میں جلترنگ سی بکھیر دی۔ نور جہاں بیگم کے ہونٹوں پر بے ساختہ تبسم نمودار ہوا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اپنے شہر میں داخل ہوتے ہی اس کا کھویا ہوا اعتماد لوٹ آیا ہے۔ اب وہ بڑے ٹھسے سے بات کر رہی تھی۔

”ارے میاں ذوالفقار علی شاہ تم پریشانی محسوس نہیں کر رہے ہو۔ ہمارے ساتھ جانے میں؟“

”کیسی پریشانی نور جہاں بی بی؟“

”میرا مطلب ہے کہیں تمہیں اندیشہ ہو کہ ہماری صحبت میں‘ ہماری رفاقت میں رہ کر تم بدنام ہو جاؤ گے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے نور جہاں بی بی۔ میں اپنے معاملات میں خود مختار ہوں۔ مجھے کسی بدنامی وغیرہ کی پروا نہیں ہے۔“

”مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنے کا موقع نہیں ملا شاہ جی۔ تم نے اپنی جان پر کھیل کر جس طرح عنبرین کو آزاد کرایا ہے۔ اس احسان کو مرتے دم تک نہیں بھلا سکوں گی۔“ اس نے ممنونیت سے بوجھل لہجے میں کہا۔

”اس میں احسان کی کوئی بات نہیں ہے نور جہاں بی بی‘ مجھے تو یہ کرنا ہی تھا کیونکہ میری وجہ سے عنبرین پر یہ مصیبت آئی تھی۔“

”تم نے تو ہمیں بتایا ہی نہیں تھا کہ تمہارے پاس پستول بھی ہے۔“

”اس میں بتانے کی کیا بات ہے نور جہاں بی بی‘ میرے پاس اس پستول کا لائسنس ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ دراصل کچھ عرصہ پہلے میری کچھ لوگوں سے چپقلش چل پڑی تھی۔ وہ معاملہ تو رفع دفع ہو گیا لیکن مجھے اپنے ساتھ پستول رکھنے کی عادت سی ہو گی ہے۔“

”اچھی عادت ہے شاہ جی۔ آدمی کے ہزار دوست اور ہزار دشمن ہوتے ہیں لہٰذا چوکنا رہنا چاہیے۔“

”تم مجھے شاہ جی نہ کہو نور جہاں بی بی‘ یہ اچھا نہیں لگتا تم مجھے ذوالفقار کہہ دیا کرو۔“

”اے لو میاں ذوالفقار‘ باتوں باتوں میں پتا ہی نہیں چلا اور ہم اپنے گھر بھی پہنچ گئے۔“ نور جہاں نے کہا۔

میں آس پاس کے ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے دیکھا کہ ہم ایک بہت ہی پررونق بازار میں پہنچ چکے ہیں۔ بظاہر مجھے وہاں کوئی بھی رہائشی عمارت نظر نہیں آئی۔ وہاں پر مختلف قسم کی بے شمار دکانوں پر زور و شور سے خرید و فروخت جاری تھی۔ میں نے سوچا کہ خدا جانے ان لوگوں کی منزل مقصود کون سی دکان

ہے۔تانگے سے اترنے کے بعد میں نے استفہامیہ انداز میں نور جہاں بیگم کی طرف دیکھا۔میں نے سوچا کہ شاید وہ دوسرے تانگے کی آمد کا انتظار کرے گی لیکن اس نے تانگے والے کوادائیگی کرتے ہی ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔

”چلیں جناب۔“ عنبرین نے میرا بازو تھام کر میرے کان پر نغمہ بار سرگوشی کی۔ چند قدم آگے بڑھنے کے بعد نور جہاں بیگم ایک پتلی سی گلی میں گھس گئی۔ہم تینوں نے بھی اس کی تقلید کی۔کئی موڑ مڑنے کے بعد ہم ایک دومنزلہ مکان کے پچھواڑے پہنچ گئے۔نور جہاں بیگم نے مکان کے پچھلے دروازے پر دستک دی۔چند لمحے بعد دروازے کے پیچھے سے ایک کھردری نسوانی آواز نے پوچھا۔

”کون ہے؟“

”میں ہوں نور جہاں ہوں۔دروازہ کھولو چھیمو آپا‘ ہم لوگ واپس آگئے ہیں۔“

نور جہاں بیگم کی آواز کان میں پڑتے ہی اس عورت نے دروازہ کھول دیا۔میں اس عورت کی محض ایک جھلک ہی دیکھ سکا کیونکہ دروازہ کھلتے ہی عنبرین اور پروین اس عورت سے لپٹ گئیں۔

”ارے میری بچی‘ میری لاڈلی‘ میری آنکھوں کا نور۔تم آگئیں۔اتنا انتظار کرایا تم نے‘ جاؤ میں نہیں بولتی تم سے۔“

چھیمو نامی اس بڑھیا نے مصنوعی ناراضگی سے دونوں لڑکیوں کو اپنے سے الگ کرنے کی کوشش کی۔

”نہیں نہیں چھیمو جان ہم سے ناراض نہ ہونا۔کچھ پتا ہے تمہیں‘ تمہاری عنبرین کتنی مشکل سے جان بچا کر یہاں پہنچی ہے۔“

”ہائے میری بچی کیا ہوا تھا تجھے؟“ چھیمو نے عنبرین اور پروین کو اپنے سے الگ کر کے اپنا کلیجہ تھام لیا۔

”اری چھیمو آپا‘ اب ہمیں اندر آنے دو گی یا یہیں ساری بات کر لو گی۔“ نور جہاں بیگم کے طنز آمیز لہجے نے چھیمو کو بے اختیار جھینپنے پر مجبور کر دیا۔

”ارے نہیں نہیں۔۔۔آؤ تم سب اندر آجاؤ۔“ اس نے جلدی جلدی کہا۔جب میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چھوٹے سے صحن میں پہنچ گیا تو چھیمو نے پہلی بار مجھ پر توجہ دی۔

”ارے۔۔۔یہ کون بابو صاحب ہیں؟“

”پہلے تم ہمیں ٹھنڈا پانی پلاؤ چھیمو آپا۔پھر باقی باتیں پوچھنا۔ایسی قیامت کی گرمی پڑ رہی ہے کہ بھیجا کھدبد کرنے لگا ہے۔“ چھیمو آپا ہاں ہاں کرتی ہوئی گھر کے کسی کونے میں گھس گئی۔نور جہاں بیگم ہمیں ساتھ لیے ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہو گئی۔اس نے ایک بڑے سے نیواڑی پلنگ پر قبضہ جما لیا۔مجھے بھی اس نے اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔دونوں لڑکیاں ساتھ والے پلنگ پر تھکے تھکے انداز میں نیم دراز ہو گئیں۔میں نے کمرے کے ساز و سامان پر نظر ڈالی۔یہ کمرا پرانے طرز کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔چھت پر لگے ہوئے بڑے سے تیز رفتار پنکھے نے کچھ ہی دیر میں ہمارا پسینہ سکھا دیا۔

اس گھر میں پہنچنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اس جگہ کا ماحول میری توقع سے بالکل برعکس ہے۔ان لوگوں نے گھر اور کاروبار کو علیحدہ علیحدہ رکھا ہوا ہے۔کچھ دیر بعد شیخ سلامت علی بھی وہاں پہنچ گیا۔وہ اپنے ساتھ بازار سے کھانا لے کر آیا تھا۔ہم سب نے مل کر کھانا کھایا۔کھانے سے فارغ ہونے کے بعد شیخ سلامت علی اٹھ کھڑا ہوا۔اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کہ کہا۔قدرے توقف کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔سلامت علی مجھے اپنے ساتھ لیے مکان کے زینے چڑھنے لگا۔کچھ ہی دیر بعد ہم چھت پر پہنچ گئے۔تیز دھوپ کی وجہ سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔سلامت علی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مکان کی اوپری منزل کے دو کمروں میں سے ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔اس نے مجھے ایک پلنگ پر بٹھایا اور پنکھا کھول دیا۔

”جوتے اتار دو شاہ جی اور کچھ دیر آرام کر لو۔“ اس آگ برساتی دوپہر میں سلامت علی کی پیش کش سے فائدہ نہ اٹھانا کفران نعمت ہوتا۔میں نے جوتوں کے علاوہ اپنی شرٹ بھی اتار دی۔سلامت علی نے کسی کونے سے ایک سوتی لنگی بھی نکال کر مجھے دے دی۔میں نے جینز کی پتلون اتار کر لنگی باندھی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں تنگ جیل سے آزاد ہو گیا ہوں۔سلامت علی مجھے وہاں چھوڑ کر جانے کہاں گم ہو گیا۔

پرانے طرز کے نیواڑی پلنگ پر لیٹ کر میں اپنی آئندہ کی حکمت عملی پر غور کرنے لگا۔میں نے رفاقت علی کا پتا اپنے ذہن میں دہرایا۔اس پرسکون اور آرام دہ کمرے میں غور و غوض کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ یہ جگہ میرے مشن کے لیے ایک اچھا بیس کیمپ ثابت ہو سکتی ہے۔اس مہم کو انجام دیتے ہوئے مجھے کسی نہ کسی ٹھکانے کی تو ضرورت پڑتی ہی تو پھر یہ جگہ کون سی بری ہے۔ان لوگوں کا کوئی بھی پیشہ ہو مجھے اس سے کیا غرض ہے۔میں کوئی نوجوان لڑکی تو ہوں نہیں جسے یہ لوگ کسی اوباش شخص کی خواب گاہ کی زینت بنا دیں۔اگر مجھے اپنی مہم کے دوران میں کسی مرحلے پر چھپنے کی ضرورت پیش آئے تو یہ جگہ ایک محفوظ پناہ گاہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔میں ان لوگوں کو با آسانی اپنے تحفظ کے لیے استعمال کر سکتا ہوں۔میں سوچتا سوچتا جانے کس وقت نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

میں عصر کے بعد تک سوتا رہا۔میری آنکھ شدید پیاس کی وجہ سے کھلی۔مجھے یوں لگا جیسے میں صدیوں سے پیاسا ہوں۔میں نے شرٹ اور پتلون پہنی‘ اپنا پستول اپنی پتلون میں اڑسا اور جوتے پیروں میں پھنسا کر مکان کے نچلے حصے میں آگیا۔سب سے پہلے میرا چھیمو سے سامنا ہوا۔اس نے مجھے دیکھتے ہی دعائیں دینا شروع کر دیں ”اللہ تیری عمر دراز کرے بیٹا۔تو نے میری عنبرین کی جان بچائی‘ اللہ تیری ماں کی آنکھوں کی ٹھنڈک قائم رکھے۔“

چھیمو کی زبان سے اپنی ماں کا ذکر سن کر مجھے اپنا سینہ چاک ہوتا محسوس ہوا۔وہ مجھے میری ماں کی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دے رہی تھی۔میں اسے کیسے سمجھاتا کہ میری زندگی کو ببول کے کانٹوں کا جھنڈ بنانے والی کوئی اور نہیں میری اپنی سگی ماں ہے اور یہ کہ میں صرف اسی دن کا انتظار میں زندہ ہوں جب اپنے ہاتھوں سے میں اپنی نام نہاد ماں کے جیون کی کتاب آگ میں جھونکوں گا۔میں اسے کچھ بھی نہ بتا سکا۔اس نے بڑے پیار سے مجھے برآمدے میں بچھی ہوئی چارپائی پر بٹھا دیا۔

''نور جہاں بیگم اور دونوں لڑکیاں تو ابھی تک سوئی ہوئی ہیں' میں نے جان بوجھ کر انہیں نہیں اٹھایا۔ میں نے سوچا کہ اپنی نیند پوری کرلیں تو اچھا ہی ہے۔''

''تم نے اچھا کیا اماں بی۔ مجھے تو تم بس ایک گلاس پانی پلا دو۔''

''ابھی لو میرے بچے ابھی لو۔'' چھیمو جلدی سے اٹھ کر کونے میں رکھے کولر کی جانب بڑھی۔ وہ مجھے پانی پلا کر فارغ ہوئی تو کمرے کے اندر سے نور جہاں بیگم نے پکار کر چھیمو بی سے پانی مانگا۔ وہ جھٹ پٹ پانی لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا۔

''آؤ میاں آؤ بیٹھو۔ نیند تو پوری ہوگئی نا؟ میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ نور جہاں بیگم نے آوازیں دے کر عنبرین کو بھی جگا دیا۔ مجھے بیٹھا دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ نور جہاں بیگم نے ان دونوں کو مخاطب کر کے پوچھا۔'' کیوں لڑکیو' آج محفل جمانے کا پروگرام ہے یا کل پر رکھیں۔''

''جیسی تمہاری مرضی نور جہاں بیگم' پروین نے ہشاش بشاش لہجے میں کہا۔ جبکہ عنبرین خاموش رہی۔

''کیوں عنبرین تم کیا کہتی ہو؟'' نور جہاں بیگم کے سوال کو سن کر عنبرین خاموش رہی پھر اس نے مجھ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''اب میں محفل میں نہیں جاؤں گی نور جہاں بیگم۔''

''کیوں خیریت' تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ کیا ابھی تک سفر کی تکان نہیں اتری؟'' نور جہاں بیگم نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں نور جہاں بیگم اب میں کبھی بھی ناچ گانا نہیں کروں گی۔ اب میری زندگی بالکل مختلف انداز میں گزرے گی۔''

''تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا ہے لڑکی۔'' نور جہاں بیگم نے برافروختہ ہو کر کہا۔ ''دھندا نہیں کرے گی تو ہم سب کھائیں گے کیا؟ یہ اچانک تمہیں کیا ہوگیا ہے؟''

''مجھے کچھ نہیں ہوا ہے نور جہاں بیگم۔'' عنبرین نے اپنے لہجے کو حتی الامکان پرسکون رکھتے ہوئے کہا۔'' بس اب میں مزید یہ رزیل زندگی نہیں گزار سکتی۔ اب مجھے کوئی بھی ناچنے گانے اور دھندا کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔'' عنبرین کے لہجے سے سرکشی جھلکنے لگی۔

''اوہو نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔ ہزار نالیوں میں منہ مارنے کے بعد میری شریف زادی کو پاکیزگی کا دورہ پڑا ہے۔ میں نے تمہیں کتی بار سمجھایا ہے کہ جس اندھی سرنگ میں تم قدم رکھ چکی ہو اس میں واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ تم خواب دیکھنا چھوڑ دو۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ ملک فارس کا شہزادہ تمہیں بیاہنے آئے گا تو یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔''

''میں نے اپنے خوابوں کا شہزادہ ڈھونڈ لیا ہے نور جہاں بی بی' اب مجھے خود کو اس کے قابل ثابت کرنا ہے۔''

''کون ہے وہ شہزادہ؟ تمہیں کس کا انتظار ہے۔'' نور جہاں بیگم نے حیرانی سے پوچھا پھر اس کی

نگاہیں میرے چہرے پر جمتی چلی گئیں۔

''کیا تم ذوالفقار علی شاہ سے۔۔۔'' اس نے کچھ پوچھنا چاہا۔

''نہیں نور جہاں بی بی میرا عنبرین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں اس کے شبہے کی تردید کی'' لیکن عنبرین سچ کہہ رہی ہے۔ اب اسے مزید دھندا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے خوابوں کا شہزادہ واقعی اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آرہا ہے۔ وہ ملک فارس کا نہ سہی اپنی چھوٹی سی مملکت کا شہزادہ ضرور ہے۔ اس سے شادی کے بعد عنبرین ایک شریف زادی کی زندگی بسر کرے گی۔''

نور جہاں بیگم بھونچکا سی ہو کر میری گفتگو سنتی رہی۔ اسے چپ سی لگ گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے زبان کھولی تو اس کے لہجے میں طیش کے بجائے سنجیدگی کا تاثر نمایاں محسوس ہوا۔

''وہ شخص آخر ہے کون؟ کچھ مجھے بھی تو پتا چلے۔''

''میں سردار خضر کی بات کر رہا ہوں نور جہاں بی بی۔''

''کیا۔۔۔ کیا کہا؟ سردار خضر خان؟'' نور جہاں بیگم کی آواز حیرانی کی شدت سے پھٹنے لگی۔'' کک۔۔۔ کیا وہ۔۔۔''

''ہاں وہ عنبرین کو پسند کرتا ہے۔'' میں نے اپنے لہجے کو گھمبیر بناتے ہوئے کہا۔'' اور عنبرین کے متعلق سب کچھ جاننے کے باوجود اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''اوہو تو تم سردار خضر خان کے ایجنٹ بن کر یہاں آئے ہو۔'' نور جہاں بیگم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''نہیں نور جہاں بی بی میں کسی کا ایجنٹ نہیں ہوں' البتہ تم مجھے اس کا پیغامبر ضرور کہہ سکتی ہو۔ میں اس کے رشتے کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ عنبرین نے اپنی رضامندلی ظاہر کردی ہے۔ اب صرف تمہاری منظوری کی ضرورت ہے۔'' میں نے نور جہاں بیگم کے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ نور جہاں بیگم کے چہرے پر شدید اضطراب کے تاثرات ابھرے پھر اس کے چہرے پر روشنی پھیل گئی۔

''میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔'' اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''لیکن کیوں نور جہاں بی بی؟ تمہیں اس رشتے پر کیا اعتراض ہے؟'' دروازے کے پاس موجود چھیمو بی نے مضبوط لہجے کے ساتھ گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔'' عنبرین اگر اپنے گھر کی ہوجائے تو تمہیں اس سے کیا تکلیف ہوگی۔''

''تم تکلیف کی بات کرتی ہو چھیمو آپا۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہمارا سارا کاروبار صرف عنبرین کے دم سے چل رہا ہے۔ یہ چلی گئی تو ہمارا گزارہ کیسے ہوگا۔ تم تو جانتی ہو کہ پروین کو تو محفل میں بھاؤ بتانے تک کی تمیز نہیں ہے۔''

''تمہیں صرف اپنی کمائی کی فکر ہے نور جہاں بیگم۔ ذرا یہ تو سوچو کہ اگر خدانخواستہ عنبرین کو کچھ ہوجاتا تو پھر کون کمائی کر دیتا۔'' چھیمو بی نے عنبرین کی حمایت میں اپنا پورا زور لگا دیا۔ میں نے ان دونوں کی بحث ختم کرانے کی کوشش کی۔

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے نور جہاں بی بی' سردار خضر خان کوئی گرا پڑا آدمی نہیں ہے اگر اسے واقعی عنبرین کو حاصل کرنا ہے تو وہ تمہیں منہ مانگی رقم دے گا۔ وہ جلد ہی یہاں پہنچنے والا ہے۔ اس وقت تک تم عنبرین کو محفل کی زینت بننے پر مجبور نہ کرو۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ ایسے ہے تو ایسے ہی سہی۔ سردار خضر آ جائے۔ باقی باتیں اس وقت ہوں گی۔" نور جہاں بیگم نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ اپنے پلنگ پر نیم دراز ہو کر میں اپنا آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کرنے لگا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں کل صبح سویرے اپنے شکار کی ٹوہ لگانے نکل کھڑا ہوں گا۔ مجھے پوری طرح یقین تھا کہ اس علاقے میں پہنچنے کے بعد میں کسی نہ کسی طرح رفاقت علی کو ڈھونڈ ہی نکالوں گا۔ بڑے بڑے بنگلوں کی اس آبادی میں اگر میں شام کے بعد پہنچتا تو فوراً ہی مشکوک قرار دے دیا جاتا۔ میرے لیے بہتر یہی ہے کہ میں دن کی روشنی میں وہاں جاؤں۔

"آپ کو نیند آ رہی ہے؟" عنبرین نے اپنی مدھم اور شیریں آواز سے میرے کانوں میں رس گھولا۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔

"آپ۔۔۔ آیئے آیئے۔"

"کس کی یاد میں گم ہیں جناب کہ گردوپیش کا ہوش ہی نہیں ہے۔" اس نے معنی خیز نظروں سے مجھے گھورا۔ میں نے اس سے آنکھ چراتے ہوئے کہا۔

"مجھے کس کو یاد کرنا ہے بی بی آئیں' بیٹھیں۔"

"لگتا ہے آپ کو تنہا پڑے رہنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔ آیئے میں آپ کو نور جہاں بیگم کی دکان دکھاتی ہوں۔" قدرے ہچکچاہٹ کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلیے۔"

عنبرین مجھے ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں آ گئی۔ میں نے حیرانی سے اس کمرے کا جائزہ لیا۔ مجھے وہاں داخلے کے دروازے کے علاوہ کوئی دروازہ نظر نہ آیا۔ عنبرین چند لمحوں تک میری الجھن سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ پھر وہ میرا بازو تھام کر ایک آدم قد دیوار گیر الماری کی طرف بڑھی۔ اس نے الماری کا دروازہ کھولا۔ وہ الماری اندر سے بالکل خالی تھی۔ حتیٰ کہ مجھے اس میں خانے بھی نظر نہیں آئے۔ میں ابھی معاملے کو سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ عنبرین نے الماری کی پچھلی چوبی دیوار میں ایک کھانچے میں انگلیاں پھنسا کر اسے ایک طرف سرکانے کی کوشش کی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چوبی دیوار سلائیڈنگ دروازے کے مانند ایک طرف سرکتی چلی گئی۔ میری حیرانی دیکھ کر عنبرین کے لبوں پر ایک دلکش مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"آیئے۔" اس نے تاریک الماری میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک اور دروازے کو دھکا دے کر کھولا۔ میں بھی اس کے پیچھے الماری میں داخل ہوا کہ اور دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ ہم دونوں ایک اور کمرے میں آ چکے ہیں۔ عنبرین نے دروازہ بند کر دیا۔ اب میرے سامنے ایک اور آدم قد دیوار گیر الماری موجود تھی۔

میں نے اس کمرے کا جائزہ لیا۔ بڑا ہی اجڑا اجڑا' بے سروسامان سا کمرا تھا۔ مجھے وہاں کوئی بھی ایسی چیز نظر نہ آئی جس سے اس کمرے کی کوئی خصوصی اہمیت ظاہر ہوتی۔ عنبرین مجھے ساتھ لے کر کمرے کے دروازے سے باہر نکلی۔ دروازے سے باہر نکلتے ہی مجھے لگا کہ میں کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں آ گیا ہوں۔

وہ ایک راہداری تھی جس میں وال ٹو وال کارپٹ بچھا ہوا تھا' دیواروں پر آویزاں روغنی تصاویر' بے حد نفیس وال پیپر' چھت سے لٹکتے ہوئے چھوٹے بڑے فانوس' میں حیرت اور تحسین کے ملے جلے جذبات کے ساتھ راہداری کی آرائش کا جائزہ لیتا رہا۔ عنبرین نے مسکراتے ہوئے ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ مجھے اس کمرے میں بھی کسی اعلیٰ درجے کے ہوٹل کے کمرے کا منظر نظر آیا۔ عنبرین نے اس کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد ایک اور کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ کمرا بھی مجھے پہلے والے کمرے کا عکس محسوس ہوا۔ اس راہداری میں مجھے دو اور کمرے بھی نظر آئے لیکن عنبرین نے انہیں نہیں کھولا۔ اس راہداری سے گزر کر ہم ایک بڑے سے ہال میں آ گئے۔

اس ہال کا منظر مجھے بڑا مانوس سا محسوس ہوا۔ فرش پر بچھا ہوا وسیع و عریض سرخ قالین' دیواروں کے ساتھ رکھے ہوئے بھاری بھرکم گاؤ تکیے دیوار میں بنے ہوئے خوبصورت طاق اور ان میں رکھی ہوئی چھوٹی بڑی درجنوں ایش ٹریز' مجھے چھت سے ایک بہت بڑا فانوس لٹکا ہوا نظر آیا۔ جب یہ فانوس روشن ہوتا ہو گا تو کمرے میں ایک اور سورج کے طلوع ہونے کا منظر سامنے آ جاتا ہو گا۔ مجھے اس ہال کے کمرے سے ایک اور راہداری سامنے جاتی نظر آئی۔ اس راہداری میں بھی دو کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ مجھے ان کمروں میں سے کئی لوگوں کے بات کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ سازندے اور طبلہ نواز وغیرہ ہیں۔

"کیسا لگا آپ کو ہمارا انسانی پتلیوں کا شوروم؟" عنبرین نے قدرے تلخی آمیز لہجے میں سوال کیا۔ فوری طور پر میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ "کچھ دیر یہاں رکیں گے یا پھر واپس چلیں؟" عنبرین نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"میرے خیال میں واپس ہی چلیں تو زیادہ اچھا ہے۔ مجھے یہاں اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا ہے۔" میں نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"میرا بھی کبھی کبھی یہاں سے بری طرح دل گھبراتا ہے مگر میرے لیے تو کوئی راہ فرار نہیں ہے۔" عنبرین نے الماری والے اجاڑ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اداس لہجے میں بتایا۔

ایک بار پھر وہی پہلے والا عمل دہرایا گیا۔ ہم آدم قد الماری سے گزر کر مکان کے رہائشی حصے میں آ گئے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے عنبرین سے پوچھا۔ "تمہیں کہیں جانا تو نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے کیا تم کچھ دیر میرے پاس بیٹھ سکتی ہو؟"

"فی الحال میں آزاد اور اپنی مرضی کی مالک ہوں۔" عنبرین نے میرے سامنے والی چھوٹی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میرے جیسی لڑکیوں کو سب سے بڑی سہولت یہی تو ہوتی ہے کہ ہمارے سلسلے میں کوئی

بھی فکر مند نہیں ہوتا۔ سب کو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے پاس کھونے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔'' عنبرین نے پژمردہ مسکراہٹ کے ساتھ میرے چہرے پر نظر ڈالی۔

''میں تم سے کچھ پوچھوں تو تم ناراض تو نہیں ہوگی؟''

''میں آپ سے ناراض نہیں ہو سکتی۔''

''تم بھی مجھے تم کہہ کر مخاطب کرو تو زیادہ بہتر ہے۔ دراصل میں تم سے کچھ ذاتی سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

''تمہیں تمہید باندھنے کی ضرورت نہیں ہے ذوالفقار علی شاہ۔''

''تم مجھے صرف ذوالفقار کہہ سکتی ہو۔ خیر تو میں پوچھنا یہ چاہتا تھا کہ کیا تم نور جہاں بیگم کی حقیقی بیٹی ہو؟''

''نہیں۔'' عنبرین نے دھیمے لہجے میں مختصر ترین جواب دیا۔

''تو پھر تم جیسی نفیس لڑکی اس بدبودار دلدل میں کیسے آن پھنسی؟''

''میری طرح کی اس پیشے سے وابستہ زیادہ تر لڑکیاں اپنی اس بازار میں آمد کو نصیب اور ظالم سماج کا کارنامہ قرار دیتی ہیں۔'' عنبرین نے کھوئے کھوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ''لیکن مجھے کسی بہانے بازی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بلا جھجک اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے بذات خود اپنے آپ کو گناہوں کی اس منڈی میں پہنچایا ہے۔ میری اس تباہی کا ذمے دار میرا کوئی اور نہیں، میں خود ہوں۔'' مجھے عنبرین کی آواز کسی انجانے بوجھ سے لرزتی محسوس ہوئی۔

''لیکن یہ سب کچھ ہوا کیسے؟'' میں نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''میری بربادی کے افسانے کی ابتدا اس وقت ہوئی جب میری عمر چھے سال تھی۔ میرا باپ ایک غریب دھنیا تھا۔ یہ اس کا آبائی پیشہ نہیں تھا۔ بس حالات نے اس کے لیے جو راستہ نکالا وہ اس پر چل پڑا۔ وہ معمولی تعلیم یافتہ تھا جبکہ میری ماں چٹی انپڑھ تھی۔ انہوں نے مجھے پڑھایا لکھایا تو کچھ نہیں البتہ مجھے پیار جی بھر کے دیا۔ جب میری عمر چھے سال کی ہوئی تو میرا خان صاحب کے گھر آنا جانا ہوگیا۔ خان شبیر خان کی بیٹی اسماء میری ہم عمر تھی۔ اس زمانے میں میرا نام کوثر تھا۔ ہاں میں یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ ہم لوگ خانیوال میں رہتے تھے۔ تو میں بتا رہی تھی کہ اسماء میری ہم عمر تھی اور ہم دونوں میں بڑی پکی دوستی تھی۔ اسی زمانے میں اسماء نے اسکول جانا شروع کر دیا۔ میں اپنے گھر سے چھوٹا موٹا ناشتا کر کے اسماء کے گھر پہنچتی تو وہ اسکول جانے کے لیے تیار ہو رہی ہوتی۔ اس عمر میں میرے ذہن میں امیری غریبی کا فرق تو زیادہ واضح نہیں تھا تاہم جب اسماء کے صاف ستھرے کپڑوں کو دیکھ کر اپنے پھٹے پرانے بوسیدہ کپڑوں پر نگاہ ڈالتی تو مجھے محرومی کا ہلکا سا احساس ضرور ہوتا...... اسماء تو تیار ہو کر ناشتا کر کے اسکول چلی جاتی جبکہ میں اسی کے گھر میں بیٹھ کر اس کے اسکول سے واپس آنے کا انتظار کرتی رہتی۔'' عنبرین بولتے بولتے خاموش ہوگئی اس کی آنکھیں میرے عقب میں دیوار پر خدا جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے اس کے بولنے کا انتظار کرنے کے بعد کہا۔ عنبرین یک لخت چونک پڑی۔

''ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی؟''

''تم کہہ رہی تھیں کہ تم اسماء کے گھر پر بیٹھ کر اس کے اسکول سے واپسی کا انتظار کرتی رہتی تھی۔''

''ہاں تو میں دوپہر تک الوؤں کی طرح بیٹھی اسماء کا انتظار کرتی رہتی۔ اسماء کی ماں جیسے سب خانم بی بی کہتے تھے، بہت رحم دل اور خدا ترس عورت تھی۔ وہ میری اپنے گھر میں بلا وجہ موجودگی کا ذرا برا نہ مناتی۔ وہ مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آئی اور اکثر و بیشتر مجھے کچھ نہ کچھ کھانے پینے کو بھی دے دیا کرتی۔ خان صاحب تھے تو سخت مزاج لیکن وہ بھی مجھ سے کوئی تعرض نہ کرتے۔ اسماء اسکول سے آتی تو ہم دونوں ساتھ کھانا کھاتے اور پھر دیر تک کھیلتے رہتے۔

خان صاحب نے چند بار مجھے اپنی بیٹی کی اسکول روانگی کے بعد اپنے گھر میں موجود پایا تو انہوں نے خانم بی بی سے پوچھا کہ کیا میں سکول نہیں جاتی۔ خانم بی بی نے اسے بتایا کہ میرا باپ اپنی غربت کی وجہ سے مجھے اسکول میں نہیں پڑھا سکتا۔ خان صاحب کے دل میں جانے کیا آئی انہوں نے میرے باپ سے جا کر بات کی کہ وہ مجھے اپنی بیٹی کے ساتھ اسکول میں داخل کرانا چاہتا ہے۔ میرے باپ نے اپنی غریبی کا عذر کرنا چاہا تو خان صاحب نے اسے یہ کہ کر چپ کرا دیا کہ وہ میرے تمام اخراجات خود برداشت کرے گا۔ میری ماں کو جب یہ سب معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئی...... اگلے دن خان صاحب نے مجھے اسکول میں داخل کرا دیا۔ جس اسکول میں اسماء اور میں پڑھتی تھیں وہ تھا تو سرکاری ہی لیکن وہاں زیادہ تر امیر اور بارسوخ لوگوں کے بچے ہی پڑھتے تھے۔ اسماء کے صدقے میں، میں بھی اس اسکول میں داخل ہوگئی۔ اس اسکول میں داخلہ ہی دراصل میری تباہی کا پہلا قدم ثابت ہوا۔ عنبرین سانس لینے کے لیے رکی۔ میں نے بے صبری سے پوچھا۔

''وہ کیسے عنبرین؟ اسکول سے تمہیں کیا نقصان پہنچا؟''

''عام طور پر کہا جاتا ہے کہ غریبوں کے بچے بہت جلد سمجھدار ہو جاتے ہیں۔ یہ بات کافی حد تک صحیح بھی ہے۔ میں بچپن ہی سے اسماء کی بہ نسبت زیادہ سمجھدار اور حساس تھی۔ اگرچہ میں شکل و صورت کے لحاظ سے اسماء سے کمتر نہ تھی لیکن اس کے باوجود شروع سے ہی شدید قسم کے احساس کمتری نے میرے دل و دماغ پر قبضہ جمانا شروع کر دیا۔

خان صاحب اور خانم بی بی حتی الامکان ہم دونوں سے مساوی رویہ اختیار کرنے کی کوشش کرتے۔ اس کے باوجود میں ذرا ذرا سی بات پر کڑھتی رہتی۔ میں بات بات پر اسماء پر تنقید کرتی رہتی لیکن اگر وہ جواب میں مجھے معمولی سی بات بھی کہہ دیتی تو میں کئی کئی دن کے لیے اس سے روٹھ جاتی۔ غلطی کسی کی بھی ہوتی منانا بہرحال اسماء ہی کو پڑتا۔ وہ اکثر مجھ سے کہتی۔ ''مجھ سے ناراض نہ ہوا کرو کوثر میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔'' میں وقتی طور پر مان جاتی لیکن پھر کوئی معمولی بات ہوتے ہی میں ایک بار پھر روٹھ جاتی۔ اسماء شیشے کے نازک پیمانے کے مانند میری انا کا خیال رکھتی لیکن میں نے کبھی اس کے خلوص کی قدر

نہ کی۔ میں تقریباً تمام دن خان صاحب کے گھر رہتی اور اکثر رات کو بھی وہیں رک جاتی۔ اگر کبھی اپنے گھر جانا بھی ہوتا تو میں اپنے گھر کی ہر چیز میں نقص نکالتی' اپنے ماں باپ کو بولنے کے اور چلنے پھرنے کے انداز پر کڑی تنقید کرتی۔ جتنی دیر گھر میں رہتی ان کا ناک میں دم کیے رہتی۔ میں خان صاحب کے گھر واپس جاتی تو میرے گھر والے سکون کا سانس لیتے۔

وقت گزرتا گیا۔ میں اور اسماء آٹھویں جماعت میں آ گئے۔ نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے باوجود اسماء اور میری دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آج میں ان دنوں پر نظر ڈالتی ہوں تو مجھے یوں احساس ہوتا ہے کہ ہماری یہ دوستی یک طرفہ تھی۔ یعنی اسماء تو مجھے دل و جان سے عزیز رکھتی تھی جبکہ میں صرف اور صرف اپنی ذات کی پجارن تھی۔ انہی دنوں مجھے اور اسماء کو رومانی ناولوں اور رسالوں کا چسکا پڑ گیا۔ اسماء کے لیے پیسوں کی کوئی کمی نہ تھی وہ اسکول کی کتابوں کے بہانے وقتاً فوقتاً رسالے اور ناول خریدتی رہتی۔ ان رسالوں اور ناولوں سے ہم دونوں مل کر مستفید ہوتیں۔ کچھ ہی دنوں بعد ہم دونوں پر ان رومانی افسانوں کا نشہ طاری ہونے لگا۔ ہم دونوں ہی اپنے آس پاس کے گھروں اور گلی کوچوں میں اپنے سپنوں کے دیوتا تلاش کرنے لگیں۔ ہر روز اسکول آتے اور جاتے ہوئے ہم چور نگاہوں سے آس پاس سے گزرنے والے نوجوانوں کا اپنے آئیڈیل نوجوان سے تقابل کرتی رہتیں۔ اسماء کو یا مجھے جب بھی کوئی جاذب نظر نوجوان نظر آتا ہم بڑے رازدارانہ انداز میں ایک دوسرے کو بتاتے۔ اسماء نے چونکہ دولت مند گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ لہٰذا وہ نوجونوں کی صرف شکل و صورت پر توجہ دیتی جبکہ میں اپنی خاندانی غربت کے پس منظر میں ایسے نوجوان کو اپنی توجہ کا مرکز بناتی جو خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ خوش حال گھرانے سے بھی تعلق رکھتا ہو۔ دوسرے لفظوں میں میرا نکتہ نظر ہمیشہ اسماء کی نسبت زیادہ حقیقت پسندانہ ہوتا۔

کچھ عرصہ مزید گزرا۔ اسی دوران میری ایک نوجوان سے دوستی ہو گئی۔ مظہر نامی اس لڑکے کے ساتھ میری کافی عرصے تک خط و کتابت رہی۔ اسماء نے حسب معمول اس معاملے میں بھی میری رازدار کا کردار ادا کیا۔ پھر ایک دن اس لڑکے نے مجھے کسی جگہ ملاقات کی دعوت دی۔ اس مرحلے پر ہمیں پہلی مرتبہ معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ ہم اب تک اس تمام سلسلے کو محض شغل کے طور پر جاری رکھے ہوئے تھے۔ اس مرحلے پر ہمیں اندازہ ہوا کہ اس شغل کا نتیجہ خطرناک بھی نکل سکتا ہے۔ اسماء اور میں نے مل کر فیصلہ کیا کہ اس لڑکے والے معاملے کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ وہ لڑکا کافی دنوں تک خط و کتابت کا سلسلہ برقرار رکھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن ہم نے اس کی قطعاً حوصلہ افزائی نہ کی۔ مایوس ہو کر اس نے اپنی کوشش ترک کر دی۔ اس دن کے بعد اسماء اور میں زیادہ محتاط ہو گئیں۔ اب ہماری زیادہ تر کاروائی دن میں خواب دیکھنے تک محدود ہو گئی۔ اسماء کا تو پتا نہیں' البتہ میں دن رات اپنے خوابوں کے شہزادے کے تصور میں گم رہتی۔ وہ لمبا تڑنگا' پروقار اور وجیہہ ہونے کے ساتھ بے حد دولت مند بھی ہوتا۔ اس کی لمبی چوڑی کار اور وسیع و عریض بنگلہ ہوتا۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے اپنے محل نما بنگلے میں لے جاتا اور مجھے اپنی راجدھانی کی مہارانی بنا دیتا۔ میں نے یہ خواب بارہا دیکھا۔ میرا یہ خواب بنگلے اور کار کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا تھا۔ میرے خواب

کے شہزادے کے چہرے کے نقوش بدلتے رہتے لیکن بنگلے اور کار کا نقشہ مستقل میرے خواب کا حصہ ہوتا۔

میں نے اور اسماء نے جونہی میٹرک کا امتحان پاس کیا خان صاحب نے اسماء کی شادی کہیں طے کر دی۔ اسماء نے کسی قسم کا تعرض نہ کیا۔ وہ شروع سے ہی ایک حد درجہ فرمانبردار لڑکی تھی۔ میں نے اسماء کی شادی کی تیاریوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسماء کی بارات آئی اور وہ بیاہ کر اپنے سسرال چلی گئی۔ اس کی سسرال راولپنڈی میں تھی۔ شادی کے تین دن بعد جب اسماء کے گھر والے اسے لینے گئے تو میں بھی ان کے ساتھ گئی۔ اسماء کی سسرال دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ لوگ میری توقع سے بڑھ کر امیر تھے۔ ان کی وسیع و عریض کوٹھی دیکھ کر میں بُری طرح مرعوب ہو گئی۔ ان کے ہاں ایک نہیں تین تین کاریں تھیں۔ اسماء کا شوہر خوش شکل ہی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز سرکاری افسر بھی تھا۔ اسماء چونکہ اس گھرانے کی سب سے بڑی بہو بن کر آئی تھی لہٰذا اسے سر آنکھوں پر بٹھایا گیا۔ اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر میں رشک و حسد کے ملے جلے جذبات کا شکار ہو گئی۔ اسماء نے میری بے حد پذیرائی کی لیکن میں راولپنڈی کے قیام کے دوران میں تمام وقت اسی حسرت کا شکار رہی کہ کاش میرا بھی اسماء کے جیسا ہی نصیب ہو۔ میں بھی اس کی طرح کسی اونچی کوٹھی میں راج کروں۔ میں بھی اسی کے مانند خوشی اور مسرت کے پھولوں کے گہوارے میں چین کی نیند سوؤں۔

اسماء اپنے میکے آئی بھی اور پھر واپس چلی گئی لیکن میرے دل کے ارمانوں کی دنیا میں مسلسل ہلچل مچی رہی۔ انہی دنوں اسماء کے گھرانے کو ایک زبردست سانحے سے گزرنا پڑا۔ اسماء کے باپ خان شبیر خان پر ایک رات اچانک دل کا زبردست دورہ پڑا اور وہ انتقال کر گئے۔ اسماء یتیم اور اس کی ماں خانم بی بی بیوہ ہو گئیں۔ ان لوگوں کی دنیا تو اجڑی ہی' میری زندگی کو بھی ایک زبردست دھچکا لگا۔ میرے تقریباً تمام اخراجات خان صاحب ہی اٹھاتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ خانم بی بی عدت گزارنے کے بعد اپنا گھر بار بیچ کر اپنے بھائی کے پاس لاہور منتقل ہو گئیں۔ اس طرح اسماء سے ملاقات کا آخری سہارا بھی چھوٹ گیا۔

اس زمانے میں مجھے صحیح معنوں میں اپنی اوقات کا پتا چلا۔ خان صاحب کی وسیع و عریض حویلی میں اتنا عرصہ گزارنے کے بعد مجھے اپنے ماں باپ کا نیم پختہ گھر کچھ ضرورت سے زیادہ ہی حقیر لگا۔ مرتی کیا نہ کرتی۔ خوشی یا ناخوشی اس گھر میں مجھے گزارہ کرنا ہی پڑا لیکن میں اپنے خوابوں سے دستبردار ہونے کو پھر بھی تیار نہ ہوئی۔ ایک خوش شکل مرد بڑا سا بنگلہ چمچماتی کار۔ میرا ذہن مسلسل اسی تصور میں گم رہا۔ میرے بوڑھے ماں باپ میری جھڑکیاں اور ڈانٹ پھٹکار سنتے رہتے لیکن اپنی زبان سے ایک لفظ نہ نکالتے۔ میں بات بات پر انہیں جہالت اور غربت کا طعنہ دیتی اور وہ کان دبا کر سنتے رہتے۔ اپنی پڑھی لکھی بیٹی کو وہ کیسے سمجھاتے کہ زندگی کے کھیل میں یہ غیر معروف کردار انہوں نے خود نہیں چنا۔ یہ تو کاتب تقدیر کی قلم کی جنبش کا کرشمہ ہے کہ وہ کسی کو غیر معمولی طور پر طاقتور بنا دیتا ہے تو کسی کو انتہا درجے کے کمزور۔'' عنبرین چند لمحے خاموش رہی۔ میں نے اس کی گفتگو میں کوئی دخل نہ دیا۔ ''میرے باپ کی کمائی

کی روکھی سوکھی روٹی میرے حلق امیں اٹکتی مجھے خان صاحب کے گھر کا تر مال یاد آتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری طعن و تشنیع بڑھتی ہی چلی گئی۔ میرا باپ میری زبان کے تیروں کو زیادہ برداشت نہ کر سکا۔ ایک سرد ترین رات وہ ہمیں چھوڑ کر قبر کی گہرائیوں میں جا سویا۔ روئی کے ریشوں اور گرد کے ذرات نے ایک طویل عرصہ سے اس کے پھیپھڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ اس رات وہ کھوکھلی دیوار ڈھے گئی۔

باپ کے مرتے ہی مجھے احساس ہونا شروع ہو گیا کہ میرے باپ کا کمزور سہارا ہم لوگوں کے لیے کتنا غنیمت تھا۔ میرے باپ کے مرتے ہی ہر ایرے غیرے کی گندی نظریں ہمارے گھر کی طرف اٹھنے لگیں۔ محلے کے شوقین مزاج افراد نقد امداد کے بہانے بہت سستے داموں میری عزت کا سودا کرنے کی کوشش کرتے۔ ہم دونوں ماں بیٹی ان لوگوں کے ارادے کے خلاف بھرپور مزاحمت کرتے رہے پھر معاشی پریشانیوں کی شدت نے ہمارے اعصاب شکستہ کرنا شروع کر دیے۔ ایسے میں، میں نے کسی نوکری کے لیے کوشش شروع کر دی۔ اس چھوٹے سے شہر میں ایک میٹرک پاس لڑکی کو کیا نوکری ملتی؟ بہر حال کافی جدوجہد کے بعد مجھے ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر کی نوکری مل گئی۔'' اپنی داستان کے اس مرحلے پر آ کر عنبرین کے پرسکون چہرے پر حزن و ملال کے تاثرات چھانے لگے۔ ''میری تنخواہ کم ہونے کے باوجود اتنی ضرور تھی کہ ہم دونوں ماں بیٹی کا پیٹ بھرنے اور تن ڈھانپنے کا آسرا ہو جاتا۔ زندگی کے تھوڑا پرسکون ہوتے ہی میرے سوئے ہوئے ارمان، میرے روٹھے ہوئے خواب ایک بار پھر میرے دماغ پر قابض ہونے لگے۔ ایک خوش شکل مع چمچماتی کار اور بنگلہ۔ میری آنکھیں ایک بار پھر اپنے آئیڈیل کی تلاش میں بھٹکنے لگیں۔

پھر ایک دن مجھے میرا دلبر مل گیا۔ سلمان میں میرے آئیڈیل کی تمام تر خصوصیات موجود تھیں۔ وہ اچھی شکل و صورت کے ساتھ ساتھ ایک عدد کار اور محل نما کوٹھی کا بھی مالک تھا۔ مجھے مختلف ذرائع سے معلوم ہوا کہ اس کا باپ ایک بہت بڑا جاگیر دار ہے۔ وہ بذات خود محض ایک کالج اسٹوڈنٹ تھا لیکن اس کے ٹھاٹ باٹ اسے شوقین مزاج نواب ثابت کرتے۔ اس نے مجھے دیکھا اور فوراً ہی مجھ پر عاشق ہو گیا۔ وہ اپنی کار پر صبح سے دوپہر تک میرے اسکول کے چکر لگاتا۔ آندھی ہو یا طوفان اس نے کبھی اپنی ڈیوٹی سے ناغہ نہ کیا۔ اس نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ میری طرف سے حسب مرضی ردعمل ظاہر نہ ہونے کے باوجود اس کے پائے ثبات میں لرزش نہ آئی۔ میں اسکول میں صبح کے وقت سے لے کر چھٹی ہونے تک جب بھی اسکول کے باہر کا جائزہ لیتی مجھے اس کی گاڑی وہیں موجود ملتی۔

اس کی مستقل مزاجی نے بالآخر میرے دل کو پسیجنے پر مجبور کر دیا۔ میرے دل کو تو پسیجنا ہی تھا۔ یہ شخص اگر مجھ سے بددل ہو جاتا تو پھر خدا نہ جانے مجھے کوئی اور آئیڈیل ملتا بھی یا نہیں۔ بہر حال میں نے سلمان پر ظاہر یہی کیا کہ میں اس کے جذبہ صدق سے متاثر ہو گئی ہوں۔ پہلے پہل ہم دونوں کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہی پھر سلمان کی خواہش پر ہماری بالمشافہ ملاقات ہوئی۔ سلمان مجھے ساتھ لے کر شہر کے

مضافات کی طرف نکل گیا۔ تنہائی میں ایک دوسرے کو حال دل سنایا لیکن سلمان نے کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی شرافت دیکھ کر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ سلمان ہی میرے حسین خوابوں کی تعبیر ہے۔ اس دن کے بعد سلمان سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ہم دونوں نے قسمیں کھائیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہیں گے۔ سلمان نے مجھے بتایا کہ وہ بی اے کا امتحان دے رہا ہے۔ جونہی بی اے کا نتیجہ نکلا وہ مجھ سے شادی کر لے گا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ اس کے باپ کو مجھ سے اس کی شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ کیونکہ سلمان اس کی اکلوتی اولاد ہے اور اس کی خوشی اس کے باپ کو دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر عزیز ہے۔ میں نے بھی اپنے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ میں سلمان کے پیار کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کروں گی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری ساتھی استانیاں بھی میرے اور سلمان کے تعلق سے واقف ہو گئیں۔ وہ میرے سامنے ہی میری قسمت پر رشک کرتیں تو میں خوشی سے پھولے نہ سماتی۔ میری ساتھی استانیوں نے مجھے نصیحت کی کہ میں اپنی کسی حماقت سے اس انمول ہیرے کو ہرگز نہ گنواؤں میں نے ان کی نصیحت اپنے پلو سے باندھ لی۔

انہیں دنوں میرے لیے ایک رشتہ آیا۔ میری بوڑھی ماں جانے کتنے عرصے سے میرے رشتے کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اس دن جب میں اسکول سے گھر پہنچی تو میری ماں نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں مجھے بتایا کہ میرے لیے ایک رشتہ آیا ہے۔ میں نے بے دلی سے پوچھا ''کس کا رشتہ آن ٹپکا ہے یہ اچانک؟''

''اری سن تو سہی لڑکا بہت شریف ہے سرکاری دفتر میں کلرک ہے۔''

''ہنہ۔۔۔کلرک!'' میں نے حقارت سے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے شدید غصہ آ رہا تھا۔ اب میری یہی اوقات رہ گئی کہ ایک معمولی کلرک میرے لیے رشتہ بھیجے۔ کہاں سلمان جیسا رئیس ابن رئیس کہاں یہ دو ٹکے کا کلرک۔ میں نے اس ناخوشگوار اطلاع کو اپنے ذہن سے جھٹکا اور اپنے سلمان کے تصور میں گم ہو گئی۔

اگلی صبح اماں نے پھر اس رشتے کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے سخت لہجے میں کہا ''بس اماں اس ذکر کو یہیں ختم کر دو۔ اب اگر وہ لوگ آئیں تو تم صاف انکار کر دینا۔ تمہاری بیٹی اتنی گری پڑی نہیں کہ ایسے ٹٹ پونجیئے کے پلے بندھ جائے۔''

''بڑی مشکل سے تو یہ ایک رشتہ آیا ہے بیٹی۔'' میری ماں نے فکرمند لہجے میں کہا۔ ''وہ لوگ غریب ضرور ہیں لیکن شریف ہیں۔ پھر ہمارے جیسے مفلسوں کے گھر کون سا شہزادے کا رشتہ آئے گا۔''

''تم بس ان لوگوں کو انکار کر دو اماں۔ تم دیکھنا تمہاری بیٹی کے لیے شہزادے کا ہی رشتہ آئے گا۔'' میری ماں نے مجھے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن میں نے اس کی ایک نہ مانی۔ مانتی بھی کیسے۔ میرے حواس پر تو سلمان چھایا ہوا تھا۔ مجبور ہو کر میری ماں نے ان لوگوں کو انکار کر دیا۔ وہ لوگ میری ماں کی دماغی صحت پر شک کا اظہار کرتے ہوئے واپس لوٹ گئے۔ میں نے اس بات کا ذکر سلمان سے کیا تو اس نے

خوش ہو کر کہا۔ ''تم نے یہ بہت اچھا کیا۔ میرے علاوہ کوئی بھی تمہیں اپنا نہیں بنا سکتا۔ تم اگر اب بھکاری سے شادی کے لیے راضی ہو جاتیں تو میں اسے گولی مار دیتا۔'' میں سلمان کی وارفتگی دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھی۔

''اگر تم مجھے اتنا ہی چاہتے ہو تو پھر مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔''

''وہ وقت بھی دور نہیں ہے میری رانی۔ کچھ ہی دنوں کی بات ہے۔ پھر میں تمہیں سب کی نظروں سے چھپا کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

پھر ایک دن صبح میں اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلی تو میں نے سلمان کو راستے میں اپنا منتظر پایا۔ ''اب اتنی بھی بے قراری اچھی نہیں سلمان۔ کل شام کو ہی تو ہم لوگ ملے تھے۔'' میں نے شوخ لہجے میں کہا۔

''بس بس زیادہ باتیں نہ بناؤ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔''

''لیکن مجھے اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔ میری ہیڈ مسٹریس بہت سخت ہے۔ میں لیٹ پہنچی چخ چخ کرے گی۔ تم ایسا کرو چھٹی کے وقت آ جاؤ۔''

''بھاڑ میں گیا تمہارا اسکول اور تمہاری ہیڈ مسٹریس۔ آج تم اسکول نہیں جا رہی ہو۔'' سلمان نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''لیکن کیوں؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''اس لیے کہ تم ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ ملتان چل رہی ہو۔''

''لیکن وہ تو یہاں سے کافی دور ہے اور اگر کسی نے مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا تو؟''

''تم اتنا ڈرتی کیوں ہو۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ تم گاڑی میں بیٹھ کر پردے برابر کر لینا۔ اگر پھر بھی کوئی دیکھ لیتا ہے تو دیکھنے دو۔ آج نہیں تو کل ہمیں ہمیشہ کے لیے ایک ہونا ہی ہے۔'' میں نے سلمان کی زبان سے یہ سب کچھ سنا تو خوشی کے مارے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں مزید سوچ بچار کیے بغیر جھٹ سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ سلمان نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں نے نقاب والا کالا برقع پہن رکھا تھا جس کی وجہ سے میری پہچان آسان نہ تھی۔ گاڑی بڑی تیزی سے ملتان کی جانب بھاگنے لگی۔

کچھ دیر بعد میں نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا ''لیکن یہ تو بتاؤ سلمان کہ تم مجھے ملتان کیوں لے جا رہے ہو؟'' میں قدرے فکرمند ہو رہی تھی۔ مجھے سلمان پر کتنا بھی اعتماد ہوتا بہرحال وہ تھا تو ایک مرد ہی۔ میری بات سن کر وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔

''دراصل ملتان میں میرا ایک بہت ہی پیارا دوست رہتا ہے وہ شادی شدہ آدمی ہے۔ میں نے اسے اور اس کی بیوی کو تمہارے متعلق بتایا تو وہ تم سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ وہ میری ہونے والی بیوی کو دیکھنے کے لیے بے حد مشتاق ہیں۔ ان کا بے حد اصرار ہے کہ میں جلد از جلد تمہیں ان سے ملواؤں۔ تم فکر نہ کرو۔ ہم شام ہونے سے پہلے ہی لوٹ آئیں گے۔''

سلمان کے جواب نے مجھے پوری طرح مطمئن کر دیا۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی کیا بات ہوتی کہ وہ مجھے اپنے جاننے والوں کے سامنے بطور اپنی منگیتر پیش کرے۔

سلمان نے بہت تیز گاڑی چلائی۔ ہم تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ملتان پہنچ گئے۔ ملتان شہر کی حدود میں کچھ دیر سفر کرنے کے بعد سلمان نے ایک جگہ گاڑی روک دی اور مجھے گاڑی سے اترنے کو کہا۔ میں نے چہرے پر نقاب ڈالی اور گاڑی سے اتر آئی۔ مجھے فوراً محسوس ہوا کہ یہ کوئی بہت ہی پر رونق جگہ ہے۔ میں نے جونہی گاڑی سے باہر قدم رکھا سلمان نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک بڑی سی عمارت میں داخل ہو گیا۔ شیشے کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں شیش محل میں آ گئی ہوں۔ فضا میں پھیلی ہوئی مدھم، غنودہ سی روشنی نے ماحول کو خوابناک بنا رکھا تھا۔ میری نگاہ بائیں طرف بنے ہوئے بڑے سے کاؤنٹر پر پڑی۔ ان سب چیزوں نے مجھے شدید حیرت میں مبتلا کر دیا۔ سلمان ایک لمحے کے لیے بھی وہاں نہ رکا۔ وہ مجھے ساتھ لیے سیدھا آگے بڑھتا چلا گیا۔ پھر ہم سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے پاؤں دبیز قالین میں دھنسے جا رہے ہوں۔ پھر ہم دونوں ایک کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ سلمان نے اپنی جیب سے چابی نکال کر دروازے کا تالا کھول دیا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے نقاب اٹھا لیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ سلمان مجھے کہاں لے آیا ہے۔ یہ ملتان کا سب سے بڑا اور سب سے مہنگا ہوٹل تھا۔ میں نے متفکر نظروں سے سلمان کی طرف دیکھا۔

''پریشان مت ہونا ڈارلنگ۔ ہم کچھ دیر یہاں ٹھہریں گے اور کھانا وغیرہ کھا کر یہاں سے چلیں گے۔ دراصل میں نے آج صبح کا ناشتا بھی نہیں کیا ہے۔'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اثبات میں گردن ہلا دی۔ سلمان نے فون پر کھانے کا آرڈر دیا۔ کچھ دیر بعد ایک ویٹر ٹرالی بھر کر کھانا لے آیا۔ اس نے وہ کھانا میز پر سجا دیا تب میں نے اس بوتل کو دیکھا۔ مجھے اس بوتل کو پہچاننے میں زیادہ دیر نہ لگی۔

''تم۔۔تم پیتے بھی ہو؟'' میں نے بے یقینی کے انداز میں پوچھا۔

''ہاں جان! جب میں بہت اداس ہوتا ہوں تو مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح جب میں بیحد خوش ہوں تو خوشی کا مزہ دوبالا کرنے کے لیے میں تھوڑی بہت پی لیتا ہوں۔''

''لیکن یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔'' میں نے قدرے ناراضگی سے کہا۔

''اے اے جان'' سلمان نے بڑے لاڈ بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم ابھی میری باقاعدہ بیوی نہیں بنی ہو' لہٰذا مجھ پر حکم نہ چلاؤ' ہاں میری بیوی بن کر تم مجھے جو حکم دو گی میں آنکھیں بند کر کے بجا لاؤں گا۔'' سلمان کے اس جواب نے میری ساری ناراضی دور کر دی۔ میرا مزاج پھر سے خوشگوار ہو گیا۔ کھانا کھانے کے دوران میں سلمان نے یکے بعد دیگرے کئی پیک چڑھا لیے۔ میں قدرے فکرمندی کے عالم میں یہ سب کچھ دیکھتی رہی۔ مجھے اب بھی سلمان کے ارادوں کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ سلمان پر نشہ طاری ہونے لگا ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے بوتل لے کر رکھنا چاہی تو اس نے مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میں نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانا چاہا لیکن اس کی طاقت کے سامنے

میری بیش نہ چلی۔

”یہ کیا کر رہے ہو سلمان؟“ میں نے مزاحمت کرتے ہوئے پوچھا۔

”میں تمہیں پیار کر رہا ہوں ڈارلنگ۔“ سلمان نے نشے میں ڈوبے لہجے میں کہا۔

”لیکن یہ ممکن نہیں ہے سلمان۔ میں شادی سے پہلے تمہارے قریب نہیں آسکتی۔“

”کیوں نہیں آسکتی؟ تم میری امانت ہو۔ میرا جب دل چاہے تمہیں حاصل کر سکتا ہوں۔“

”لیکن یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ میں تمہیں اس کی اجارت نہیں دے سکتی۔“ میری بات سن کر سلمان کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے مجھے اپنی بانہوں سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔

”خبردار آئندہ میرے سامنے گناہ ثواب کی بات مت کرنا۔ مجھے بیوی کی ضرورت ہے کسی واعظ کی نہیں اگر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو تو تمہیں میری مرضی پر چلنا ہوگا۔ بصورت دیگر میری طرف سے تم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ دروازہ کھولو اور گھر چلی جاؤ۔“

میں حیرت اور پریشانی کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ میں سخت کشمکش میں مبتلا تھی۔ اگر میں اس کی بات مانتی تو اپنی عزت سے ہاتھ دھو بیٹھتی اور اگر اس کی بات نہ مانتی تو ایک عمر کی تلاش کے بعد ملنے والا میرے خوابوں کا شہزادہ ہاتھ سے نکل جاتا۔ خوش شکل مالدار' شاندار کار اور محل نما کوٹھی کا مالک۔ پھر بھلا مجھے اس جیسا کون ملتا۔ میرے دماغ نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اپنے گھر چلی جاؤں' جہاں میری بوڑھی ماں میری منتظر ہے۔ لیکن پھر میرے دل نے میرے دماغ کی تجویز کو سختی سے رد کر دیا۔ سلمان کوئی غیر تو نہیں ہے۔ صحیح تو کہہ رہا ہے یہ۔ میں اس کی امانت تو ہوں اگر میں اس کی بات مان لوں تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ آخر مجھے اسی کی دلہن بننا ہے۔ مجھے اپنی زندگی کے مالک کو ناراض نہیں کرنا چاہیے۔ اگر یہ ناراض ہو گیا تو۔۔۔

میں نے سلمان کی خواہش کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس نے میری عزت کا دامن تار تار کر دیا۔ اس کی ناراضگی کے خوف سے میں نے اپنا سب سے قیمتی خزانہ اس کی نذر کر دیا۔ اپنی خواہش پوری کرنے کے بعد سلمان پاؤں پھیلا کر سو گیا جبکہ میں احساس ندامت' احساس زیاں میں غرق تکیے میں منہ چھپائے سسکتی رہی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو تسلی دے کر بہلایا کہ آج کے اس واقع کے بعد میرا اور سلمان کا باہمی رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا ہے۔ میں نے اس کی آخری شرط بھی پوری کر دی ہے۔ اب میری اور اس کی شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ کچھ ہی دنوں بعد میری اور سلمان کی شادی ہو جائے گی۔ پھر میں اس کی محل نما کوٹھی میں ملکہ بن کر راج کروں گی۔

شام کے وقت میں نے بڑی مشکل سے سلمان کو جھنجوڑ کر اٹھایا۔ بیدار ہونے کے بعد اس نے مجھ سے اتنا پیار بھرا رویہ اپنایا کہ میرے دل کے خفیہ گوشوں میں پرورش پاتے ہوئے تمام اندیشے دم توڑ گئے۔ اس نے بڑے والہانہ لہجے میں بار بار کہا کو اب وہ مجھ سے زیادہ دن تک دور نہیں رہ سکتا اور وہ جلد از جلد مجھ سے شادی کر لے گا۔ اسے مسرور دیکھ کر میرا دل بھی مسرور ہو گیا۔ رات کے وقت جب میں اپنے گھر

پہنچی تو مجھے اپنی ماں بڑی پریشانی کے عالم میں اپنا انتظار کرتی ہوئی ملی۔ میں نے اسے ایک جھوٹی کہانی سنا کر مطمئن کر دیا۔

اس روز والے واقعے کے بعد سلمان کا رویہ مجھ سے حد سے زیادہ والہانہ ہو گیا۔ ہماری جب بھی ملاقات ہوتی وہ شادی کے متعلق اپنے منصوبے بتاتا۔ مجھے بتاتا کہ ہم ہنی مون منانے کے لیے کہاں کہاں جائیں گے۔ وہ ہمارا حجلۂ عروسی کس انداز میں سجوائے گا۔ اس کی باتیں سن کر میں خوشی سے باغ باغ ہو جاتی۔ ہم دونوں مل کر مستقبل کے سہانے سپنے دیکھتے رہتے۔ اس دوران میں وہ مجھے ایک بار اور ملتان کے اس ہوٹل میں لے گیا۔ ایک بار پھر وہی کہانی دہرائی گئی۔ اس دن کے بعد مجھے واضح طور پر احساس ہوا کہ سلمان مجھ سے اور زیادہ شدت سے پیار کرنے لگا ہے۔ سلمان مجھے تیسری بار ملتان لے گیا۔ ملتان سے واپس آنے کے بعد میں نے سلمان پر زور ڈالنا شروع کیا کہ وہ اب مزید دیر نہ کرے اور جلد از جلد شادی کی کوشش کرے۔ سلمان نے مجھ سے وعدہ کیا کہ اب مزید دیر نہیں ہوگی۔ اس دن کے بعد میری اس سے جب بھی ملاقات ہوتی میں اس پر شادی کے لیے زور ڈالتی۔ ہر بار وہ کہتا کہ وہ شادی کی بھرپور تیاری کر رہا ہے۔ اس نے اپنی ماں کو منا لیا ہے جلد ہی باپ کو بھی منا لے گا۔ ہمارے ملن کی گھڑیاں بہت قریب ہیں وغیرہ وغیرہ۔ سلمان نے مجھے چوتھی بار ملتان لے جانا چاہا تو میں نے کافی لیت ولعل سے کام لینے کی کوشش کی۔ اس پر سلمان سخت برافروختہ ہوا۔ اس نے دھمکی دی کہ ہم دونوں کا معاملہ یہیں ختم ہو جائے گا۔ مجبوراً مجھے اس کی ضد کے آگے سر جھکانا پڑا۔ تاہم میں نے اپنے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ بس یہ آخری چکر ہوگا۔ اس روز شام کو سلمان اپنا حساب بے باق کرنے ہوٹل کے کاؤنٹر پر گیا ہوا تھا۔ اسے واپسی میں کچھ دیر ہوئی تو میں نے اس کے پیچھے جانے کا ارادہ کیا۔ میں کمرے سے نکل کر راہداری میں پہنچی تو مجھے دو آدمیوں کے آپس میں بات کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے سلمان کا نام ان کی زبان سے سنا تو میں ٹھنک کر رک گئی۔ میں ایک ستون کی آڑ میں چھپ کر ان کی باتیں سننے لگی۔ وہ دونوں ہی ویٹر تھے۔

”اس بار تو باؤ سلمان بڑا اچھا دانا چھانٹ کر لایا ہے۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔ جواب میں دوسرے نے کہا۔

”ابے اچھا نہ ہوتا تو کیا باؤ سلمان اسے چوتھی بار یہاں لاتا۔ پچھلی چھوکری کی تو باؤ سلمان نے دو پھیروں کے بعد ہی چھٹی کر دی تھی۔“

”پر اس چھوکری کا بھی بس یہ آخری پھیرا ہے۔ اس کے بعد باؤ سلمان کوئی تازہ مال ڈھونڈے گا۔“

ان دونوں کی باتیں سن کر مجھے اپنے پیروں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ میں بڑی مشکل سے کمرے تک پہنچی۔ میرے دل نے مجھے بہت بہلانے کی کوشش کی لیکن میرا دماغ اس کی بات ماننے پر تیار نہ ہوا۔ مجھے رفتہ رفتہ یقین ہو گیا کہ میرے کانوں نے جو کچھ سنا وہ سچ ہے۔ سلمان نے بڑی خوبصورتی سے جال بچھا کر مجھے اپنے پھندے میں پھنسایا ہے۔ میں اس ہوٹل کے اس کمرے میں اپنی عزت گنوانے والی پہلی لڑکی نہیں ہوں۔ مجھ سے پہلے

بھی کتنی ہی لڑکیاں یہاں اپنا سب کچھ کھو کر جا چکی ہیں۔ سلمان نے ان کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اب یہی حشر میرا ابھی ہونے والا ہے۔

میرے وجود کی گہرائیوں سے سلمان کے شدید نفرت کا احساس ابھرا۔ میں نے اپنے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ اگر سلمان نے مجھے بھی جھوٹا برتن بنا کر ایک طرف ڈالنے کی کوشش کی تو میں بھی بھرپور مزاحمت کروں گی۔

سلمان کمرے میں واپس آیا اور ہم خانیوال کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں مجھے واضح طور پر محسوس ہوا کہ سلمان کا رویہ بالکل بدلا بدلا سا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے ویٹروں کی زبانی جو کچھ سنا وہ سو فیصد سچ ہے۔ سلمان اب اپنے نئے شکار کو پھانسنے کی تیاری کر رہا ہے۔

”سلمان ہماری شادی کی تیاریاں کہاں تک پہنچی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یار ہو جائے گی شادی بھی۔ تم پر تو ہر وقت اسی کا بھوت چڑھا رہتا ہے۔“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ اس کے جواب نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔

”ہاں ہاں مجھے فکر ہے کیونکہ میرے لیے اب اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ میں نے اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کر دیا ہے۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

”چیخنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے جو کچھ کیا ہے اپنی مرضی سے کیا ہے۔ میں نے تم پر زبردستی نہیں کی جہاں تک شادی کی بات ہے جب تک میرے حالات صحیح نہیں ہو جاتے میں شادی نہیں کر سکتا۔ تم اگر اس وقت تک انتظار کر سکتی ہو تو کرو ورنہ اپنے لیے کوئی اور شوہر ڈھونڈ لو۔“ سلمان کے لہجے کے زہر نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو سلمان؟ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔“

”مجھے اور اپنے آپ کو بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔ تمہیں میری دولت سے محبت تھی اور مجھے تمہارے حسن اور جوانی سے۔ ہم دونوں جب تک ممکن ہو سکا ساتھ رہے اب ہماری نہیں نبھ رہی تو ہمیں ایک دوسرے سے الگ ہو جانا چاہیے۔ تم اپنے لیے کوئی اور مال دار آسامی ڈھونڈو میں اپنے لیے کوئی خوبصورت ساتھی تلاش کرتا ہوں۔“ سلمان نے بے نیازانہ لہجے میں گویا بات ختم کر دی۔ میں شدید اذیت کے عالم میں چلائی۔

”نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم مجھ سے اس طرح جان نہیں چھڑا سکتے۔ میں ساری دنیا کو چیخ چیخ کر بتاؤں گی کہ تم نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا ہے۔ میں تمہارے گھر جا کر ہنگامہ برپا کر دوں گی۔ میں تھانے میں جا کر تمہارے سارے کرتوت پولیس کو بتا دوں گی۔“ فرطِ غضب سے میرے لبوں کے کناروں سے کف بہنے لگا۔

”ہوں! یہ ارادے ہیں تمہارے؟“ اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔

”ہاں ہاں میں اس سے بھی آگے جا سکتی ہوں۔ میں تمہاری زیادتی سہہ کر چپ چاپ بیٹھنے والی نہیں

ہوں۔“

”اچھا!“ سلمان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ اس کے بعد تمام راستے ہم دونوں کے درمیان میں کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ میں نے سمجھا کہ سلمان میری دھمکیوں سے پریشان ہو گیا ہے۔ شاید یہ اس پریشانی کے باعث بحالت مجبوری ہی سہی مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو جائے۔“

خانیوال پہنچنے کے بعد سلمان نے گاڑی میرے گھر کی طرف لے جانے کے بجائے دوسری طرف موڑ دی۔

”یہ تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”بس تم دیکھتی جاؤ۔“ سلمان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ کچھ ہی دیر بعد گاڑی تھانے کے پاس پہنچ گئی۔ سلمان نے گاڑی سیدھی ایس ایچ او کے کمرے کے سامنے لے جا کر روک دی۔

”یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”بڑا شوق تھا تمہیں تھانے جانے کا۔ میں تمہیں تھانے لے آیا ہوں۔“

میں نے مزاحمت کرنا چاہی لیکن اس نے ایک جھٹکے سے مجھے گاڑی سے اتارا اور میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتا ہوا ایس ایچ او کے کمرے میں گھس گیا۔ سور جیسی جسامت کریہہ شکل ایس ایچ او کی نظر سلمان کے چہرے پر پڑی تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”میاں جی آپ؟ آئیے آئیے تشریف لائیے زہے نصیب خوش آمدید۔“ ایس ایچ او کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ میری سماعت پر انگارہ بن کر گرا۔

”تشریف رکھیے میاں جی فرمایئے کیسے زحمت کی۔ خادم کے لائق کوئی خدمت تھی تو اطلاع بھجوا دی ہوتی۔ میں خود در دولت پر حاضر ہو جاتا۔“ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایس ایچ او بھی خوشامدی کتے کے مانند سلمان کے بوٹ چاٹنے لگے گا۔

”میں بیٹھنے کے لیے نہیں آیا ہوں کیانی صاحب۔ بس ایک مصیبت گلے پڑ گئی ہے۔ اس سے جان چھڑانے تمہارے پاس آیا ہوں۔“

”آپ حکم کریں میاں جی۔ آخر ہم یہاں کس لیے ہیں کونسی مصیبت آپ کے گلے پڑ گئی ہے؟“

”وہ مصیبت یہ ہے کیانی صاحب۔“ سلمان نے مجھے آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔ کیانی نے حیرت سے میرے چہرے پر نظر ڈالی۔ ”میاں جی؟“

”ہاں بھائی یہ۔ اس کی معصوم صورت پر نہ جانا۔ اس کی یہی معصوم صورت دیکھ کر میں نے اسے گاڑی میں بٹھایا تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی میرے گلے پڑ گئی کہ میں اپنے پاس موجود ساری رقم اور اپنی گھڑی اور انگوٹھی وغیرہ اتار کر اس کے حوالے کر دوں ورنہ یہ چیخ پکار کر کے لوگوں کو اکٹھا کر لے گی کہ میں اسے اغوا کر کے اس کی عزت لوٹنا چاہتا ہوں۔ اپنے خاندانی عزت و وقار پر آنچ آتے دیکھی تو مجھے تم یاد آئے بھائی کیانی اور میں اسے دھوکے سے سیدھا تمہارے پاس لے آیا۔“

’’آپ نے بہت اچھا کیا میاں جی۔‘‘ ایس ایچ او نے خوشامدی لہجے میں کہا۔
میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ’’یہ جھوٹ بک رہا ہے تھانے دار صاحب اس کی باتوں میں نہ آئیں دراصل۔۔۔‘‘

’’بکواس بند کر چھوکری۔ میاں جی کی شان میں گستاخی کرتی ہے۔ فکر نہ کر میں تیری ساری چالبازی ناک کے رستے نکال دوں گا۔‘‘ میں نے ایک بار پھر احتجاج کرنا چاہا تو تھانے دار نے میرے منہ پر ایسا زوردار تھپڑ مارا کہ میں چکرا کر زمین پر گر پڑی۔ ’’تجھے کسی نے بتایا نہیں کہ کیانی تیرے جیسی گشتیوں کی کیا درگت بناتا ہے۔‘‘ کیانی نے اپنے ماتحتوں کو بلا کر حکم دیا کہ وہ مجھے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے جائیں۔ وہ دونوں مشٹنڈے بڑی بے رحمی سے مجھے دھکیلتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے آئے اور مجھے برف جیسے ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں بٹھا دیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ سلمان تھانے دار کے پاس کتنی دیر رہا اور اس نے اسے کیا کیا بتایا۔ فرش پر بیٹھے بیٹھے میرا جسم سن ہونے لگا۔ میں نے اپنی نگرانی پر متعین ہیڈ کانسٹیبل سے التجا کی کہ وہ مجھے فرش پر لیٹنے کی اجازت دے دے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ کتنی عجیب بات ہے وہ شخص میرے جرم سے ناواقف ہونے کے باوجود میرے ساتھ ایسا برتاؤ کر رہا تھا جیسے کہ میں قاتل ہوں۔

رات کے تقریباً بارہ بجے مجھے تھانے دار نے اپنے کمرے میں طلب کیا۔ اس وقت تک وہ اپنی وردی اتار کر سادہ لباس پہن چکا تھا۔ اس نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’سنا ہے تجھے حسن کی خیرات بانٹنے کا بڑا شوق ہے کچھ ہم پر بھی نظر کرم کر دے۔‘‘ میں نے اس کے مکروہ چہرے پر نظر ڈالی اور پھر گردن جھکا لی۔ میں سمجھ گئی کہ سلمان نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے...... اہانت اور ذلت کے احساس سے میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کر رہ گیا۔ ’’تجھے معلوم ہے اگر میں نے تجھ پر بدکاری کا جرم عائد کر دیا تو تیرا کیا بنے گا؟ میں ایک منٹ میں تیرا جرم ثابت کر دوں گا۔ پھر تیری ساری عمر جیل میں چکی پیستے گزرے گی۔ اپنی جان بچانا چاہے تو جیسا میں کہوں ویسا کرتی جا۔‘‘

اپنی جان بچانے کے لیے میں نے وہی کیا جو تھانے دار نے چاہا۔ میں نے تین راتیں تھانے دار کے ساتھ گزاریں۔ دو راتیں ایس آئی کے ساتھ اس کے بعد ان لوگوں نے مجھے آزاد کر دیا۔ اس شرط کے ساتھ کہ میں ایک منٹ بھی اس شہر میں نہیں رکوں گی اور سلمان کا نام میری زبان پر نہیں آئے گا۔ میں نے ان کی ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کیا۔ میں ایک بار پھر ملتان آ گئی۔ میں دو تین دن ادھر ادھر بھٹکتی رہی۔ میرے پیچھے بھوکے بھیڑیوں کی کئی ٹولیاں لگی رہتیں۔ میں نے دو وقت کی روٹی کی خاطر اپنے آپ کو بہت سستے داموں بیچا پھر میری قسمت نے مجھے نور جہاں بیگم سے ملا دیا اور اس طرح میں طوائف بن گئی۔ مجھے یہاں آئے ہوئے چار سال گزر چکے ہیں۔ اس دوران میں‘ میں نے ناچنا گانا بھی سیکھ لیا۔ اس کے بعد میں کبھی واپس اپنے شہر نہیں گئی۔ میں نے اونچی حویلی کا خواب دیکھا تھا آج میں ایک شاندار حویلی میں موجود ہوں۔ دولت کی بھی کمی نہیں ہے لیکن میں آج تک اس زندگی سے سمجھوتا نہیں کر سکی۔ اب میں خدا

سے یہ دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے اس جہنم سے چھٹکارا پانے کی توفیق دے۔‘‘ عنبرین نے اپنی طویل داستان مکمل کرتے ہوئے کہا۔

’’خدا نے چاہا تو تمہاری یہ خواہش ضرور پوری ہوگی عنبرین۔‘‘ میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’سردار خضر خان کے روپ میں خداوند کریم نے تمہیں اپنے گناہوں کی تلافی کا ایک موقع دیا ہے۔ اس موقعے کو ضائع مت کرنا۔‘‘

میری توقع کے برعکس عنبرین نے مجھ سے میرے بارے میں زیادہ سوال جواب نہیں کیے۔ اس کے جانے کے بعد میں دیر تک اس کی داستان زندگی پر غور کرتا رہا۔ عنبرین نے اپنی تباہی کا ذمے دار اپنے آپ کو ٹھہرایا لیکن مجھے اس ذلیل انسان سلمان پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ کاش زندگی کے کسی مرحلے پر وہ میرے سامنے آئے تو میں اسے بتاؤں کہ کسی مجبور اور بے بس لڑکی کو تباہ کرنے کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔

پھر میں نے اس قصے کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور رفاقت علی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کو دیکھے بغیر اس کے طرز زندگی کو جانے اس کی ہلاکت کی منصوبہ بندی ناممکن تھی۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ کل صبح سویرے میں اس کی گھات میں نکل جاؤں گا۔

اگلے دن صبح سویرے میں بیدار ہو گیا۔ میں مکان کی نچلی منزل میں آیا تو میں نے دیکھا کہ نور جہاں اور دونوں لڑکیاں ابھی تک سوئی ہوئی ہیں۔ البتہ چھیمو بی مجھے حسب معمول چولہے کے سامنے مصروف نظر آئی۔ چھیمو بی نے مجھے ناشتہ دیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ’’چھیمو بی‘ نور جہاں بیگم اور عنبرین سے کہنا کہ میں ایک بے حد ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے میں شام کو لوٹ آؤں اور ہوسکتا ہے میں کئی دنوں تک واپس نہ آسکوں۔ اگر میں نہ آؤں تو پریشان مت ہونا۔‘‘ چھیمو بی نے مجھے روکنا چاہا لیکن میں مزید نہیں رکا اور پچھلے دروازے سے مکان سے باہر آ گیا۔ میں نے مکان کے سامنے والے حصے کی جانب جانے کی کوشش نہ کی بلکہ تنگ گلیوں سے گزرتا ہوا بازار میں آ گیا۔

کچھ دور چلنے کے بعد مجھے ایک خالی تانگا مل گیا۔

’’گلشن جمال چلو۔‘‘ میں نے تانگے میں بیٹھنے کے بعد کہا۔

’’وہ جی وہاں تانگا آبادی کے اندر لے جانے کی تو اجازت نہیں ہے۔‘‘ کوچوان نے عاجزی سے اپنی مجبوری ظاہر کی۔

’’تم چلو تو سہی۔ میں آبادی کے شروع میں ہی اتر جاؤں گا۔‘‘ میں نے کہا۔ کوچوان نے تانگا آگے بڑھا دیا۔ مجھے گلشن جمال کے متعلق کچھ بھی علم نہیں تھا لیکن تانگے والے کے جواب سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ گلشن جمال غیر معمولی طور پر امیر لوگوں کی آبادی ہے جہاں غریبوں کی سواری کو داخلے تک کی اجازت نہیں ہے۔

تانگا بہت دیر تک شہر کی سڑکوں پر چلتا رہا۔ تقریباً پورا شہر عبور کرنے کے بعد وہ مضافاتی علاقے میں

داخل ہوگیا۔ ایک چھوٹے سے بازار میں پہنچ کر تانگہ رک گیا۔

''لو جی بابو جی میری آخری حد آ گئی ہے۔ آگے صرف کاروں والے جا سکتے ہیں۔'' کوچوان نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

میں نے تانگے کے کرائے کی ادائیگی کی اور ایک طرف روانہ ہوگیا۔ کسی سے اپنے مطلوبہ پتے کے متعلق پوچھنا تو ویسے بھی میرے لیے ممکن نہ تھا۔ رفاقت علی کو موت کے حوالے سے وہ پتا منظر عام پر آتا تو مجھے پتہ بتانے والا میری موت کا پیامبر ثابت ہوتا۔ لہٰذا میں نے اپنی خیریت اسی میں سمجھی کہ میں اس علاقے میں گھوم پھر کر خود ہی وہ پتا ڈھونڈ لوں۔ کچھ ہی دیر کے بعد مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ کام میری توقع سے زیادہ دشوار ہے۔ اس علاقے میں اتنے وسیع وعریض بنگلے تھے کہ میل بھر لمبی سڑک پر چند ایک ہی بنگلے ہوتے۔ میں نے بنگلوں کی نیم پلیٹ پر درج نمبروں سے اپنے مطلوبہ پتے کا اندازہ لگانا چاہا لیکن ناکام رہا۔ کوشش کے باوجود میری سمجھ میں نہ آسکا کہ میں کس طرف جاؤں۔ مجھے بھٹکتے بھٹکتے دوپہر ہوگئی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ اس انداز میں تو میں تمام عمر اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ تنگ آ کر میں نے کسی سے راہنمائی حاصل کرنے کا ارادہ کرلیا۔ میں ایک بڑے سے بنگلے کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ مجھے اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر گیٹ کے قریب کھڑا ہوا پٹھان چوکی دار چوکنا ہوگیا۔

''خان بابا کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ یہ بنگلہ کس طرف ہے؟'' میں نے رفاقت علی کے بنگلے کے نمبر سے قدرے مختلف نمبر بتاتے ہوئے پوچھا۔ بوڑھے چوکی دار کے چہرے پر نرمی کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے اپنے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے میرا بتایا ہوا نمبر دہرایا۔

''یہ بنگلہ تو یہاں سے بہت دور کالونی کے پرلے سرے پر ہوگا بابو صیب'' اس نے ہمدردانہ لہجے میں بتایا'' میرا اندازہ ہے کہ یہ بنگلہ خان رفاقت علی کے بنگلے کے آس پاس کہیں ہوئے گا۔'' اس کے منہ سے رفاقت علی کا نام سن کر میں بری طرح چونک پڑا۔

''کون رفاقت علی؟ خان بابا؟''

''ارے تم رفاقت علی کو نہیں جانتا؟ وہ تو بہت مشہور آدمی ہے۔ تم ایسا کرو کہ اس سڑک سے سیدھا آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ آگے جا کر یہ سڑک ادھر مڑ جائے گی تم بھی مڑ جانا۔'' خان بابا نے مختلف مقامات اور سمتوں کے حوالے سے مجھے راستہ بتایا اور میں خاصی حد تک وہ راستہ سمجھ بھی گیا۔ میں نے خان بابا کی کوٹھری سے پانی پیا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔

اس بار مجھے اپنی مطلوبہ جگہ پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی سوائے اس کے کہ پیدل چلتے چلتے میرا جسم پسینے سے شرابور ہوگیا۔ میرے پاس سے بے شمار ایئر کنڈیشنڈ گاڑیاں شائیں شائیں کرتی گزریں لیکن کسی نے میرے حال پر نظر ڈالنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اس علاقے میں پہنچنے کے بعد رفاقت علی بلکہ خان رفاقت علی کے عظیم الشان بنگلے کو تلاش کرنا میرے لیے زیادہ مشکل ثابت نہ ہوا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ بنگلہ کم از کم چار کنال رقبے پر واقع ہے۔

اس بنگلے کے دو گیٹ تھے لیکن مجھے صرف ایک ہی گیٹ کے ذریعے آمد ورفت ہوتی نظر آئی۔ دوسرے گیٹ کو شاید خاص مواقع پر استعمال کیا جاتا ہوگا۔ بڑے گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں بظاہر سرسری لیکن درحقیقت بے حد گہری نظروں سے بنگلے کے احاطے کا جائزہ لیا۔ میں نے دیکھا کہ گیٹ کے ساتھ ہی چوکی دار کا کیبن ہے۔ بنگلے کی وسیع وعریض دو منزلہ عمارت کے تین اطراف میں مجھے سرسبز لان نظر آیا۔ سامنے پختہ روش کے ساتھ ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس میں فوارہ لگا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ میں نے محض چند لمحوں کے اندر دیکھا اور سیدھا آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں نے نوٹ کیا کہ بنگلے کی چار دیواری خاصی بلند ہے لیکن مجھے اس پر کسی قسم کی باڑ وغیرہ نظر نہیں آئی۔ دوسرے نسبتاً چھوٹے گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے ایک بار پھر بنگلے کے اندر نگاہ ڈالی۔ مجھے دور دور تک سرسبز لان پھیلا نظر آیا۔ بنگلے کی عمارت یہاں سے قدرے دائیں ہاتھ میں واقع تھی۔ بنگلے کے دو اطراف میں سڑک تھی۔ بنگلے کے کونے پر پہنچ کر میں دائیں ہاتھ جانے والی سڑک پر گھوم گیا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ میں بنگلے کی عمارت کی پہلو والی سمت میں ہوں۔ چار دیواری کے دوسری طرف وسیع وعریض لان تھا۔ لان کے ختم ہوتے ہی بنگلے کی عمارت آجاتی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ بنگلے کی عمارت کے عقبی سمت میں بھی دروازہ ہوگا۔ مجھے بنگلے میں اچھی خاصی چہل پہل نظر آئی لیکن میں بنگلے کے حفاظتی نظام کا پوری طرح اندازہ نہیں لگا سکا۔ میں نے بنگلے کے سامنے سے ایک اور چکر لگایا۔ اس بار میں بنگلے کے سامنے والی سڑک کے دوسری طرف سے گزرا۔ میں نے بنگلے کی عمارت کی ظاہری ساخت اور محل وقوع کو اچھی طرح اپنے ذہن میں بٹھا لیا۔ بنگلے سے خاصے فاصلے پر موجود ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر میں خاصی دیر تک رفاقت علی کے بنگلے کی نگرانی کرتا رہا۔ اس دوران میں نہ کوئی بنگلے میں داخل ہوا نہ باہر نکلا۔ میں کچھ دیر مزید وہاں کھڑا رہا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں اس جگہ بلا جواز کھڑا رہ کر آس پاس سے گزرنے والے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن رہا ہوں۔ میں اگر مزید کچھ دیر یہاں موجود رہا تو یہی لوگ باقاعدہ مشتبہ نظروں سے مجھے گھورنے لگیں گے۔ چنانچہ میں وہاں سے آگے چل پڑا۔ میں ابھی مزید اس بنگلے کی نگرانی کرنا چاہتا تھا تاکہ رفاقت علی کی صورت سے واقف ہوسکوں۔ اس کے علاوہ میرے لیے ضروری تھا کہ مجھے اچھی طرح علم ہو کہ وہ کس وقت گھر آتا ہے اور کس وقت گھر سے جاتا ہے۔ میں اگر چاہتا تو رفاقت علی کو گھر سے نکلتے وقت یا گھر میں داخل ہوتے وقت با آسانی گولی مار کر ہلاک کر دیتا لیکن اسطرح سے میرا مقصد پوری طرح سے حاصل نہ ہوتا۔ میں نے اپنے ذہن میں اکی کے کہے ہوئے الفاظ دہرائے 'دیکھو! رفاقت علی کا قتل ڈکیتی کی واردات کا نتیجہ معلوم ہو بصورت دیگر پولیس سب سے پہلے برکت علی کی بیوی پر شک کرے گی۔'' میں اگر اکی کی ہدایت پر پوری طرح عمل نہ کرتا تو اس قتل کے باوجود میں فقیر بابا کو نہ چھڑا پاتا۔

رفاقت علی کے بنگلے سے خاصی دور آنے کے بعد میں ایک جدید قسم کی سپر مارکیٹ کے قریب پہنچ گیا۔ اس جگہ کئی چھوٹی بڑی دکانیں اور سنیک بار موجود تھے۔ میں ایک چھوٹے اسنیک بار میں گھس گیا۔

میں نے سیلف سروس کاؤنٹر سے ایک چائے کا کپ اور کھانے کی چند ہلکی پھلکی چیزیں لیں اور ایک اونچی سی ٹیبل کے گرد موجود اسٹولوں میں سے ایک پر آن بیٹھا۔ میں نے تقریباً گھنٹا وہاں گزارا۔ اس کے بعد میں کتابوں کی ایک بڑی سی دکان میں گھس گیا۔ تقریباً نصف گھنٹا وہاں گزارنے کے بعد دو کتابیں خرید کر باہر نکل آیا۔ یخ بستہ ائرکنڈیشنڈ بک شاپ سے آگ برساتی دھوپ میں آنے کے بعد ایک بار وہی سوال میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ میں نے سہ پہر تک باقی وقت کیسے گزاروں؟ میرا اندازہ تھا کہ رفاقت علی اپنے دفتر یا فیکٹری وغیرہ سے سہ پہر کے وقت واپس آئے گا۔ اگر اس وقت میں اس کے بنگلے کے آس پاس ہوتا تو باآسانی اس کی شکل دیکھ لیتا۔

محض وقت گزاری کے لیے ایک سپر اسٹور میں گھس گیا۔ کافی دیر ادھر ادھر گھومنے کے بعد میں نے اپنے لیے ایک قمیص اور جینز کی پتلون کا انتخاب کیا اور ان کی ادائیگی کر کے اسٹور سے باہر نکلتے ہوئے میں نے سیاہ رنگ کا ایک چشمہ بھی خرید لیا۔ باہر نکلتے ہی ایک بار پھر ملتان کی مشہور گرمی نے میرا استقبال کیا۔ میں خراماں خراماں رفاقت علی کے بنگلے کی طرف چل دیا۔

بنگلے سے کچھ ہی دور بالآخر میں نے اپنے لیے ایک عارضی پناہ گاہ تلاش کر لی۔ یہ ایک چھوٹا سا پارک تھا جو کہ ایک پبلک اسکول سے ملحق تھا۔ اسکول کی چھٹی ہو چکی ہو گی۔ مجھے اس وقت وہاں کوئی بھی ذی روح نظر نہ آیا۔ میں پارک کے چھوٹے سے گیٹ سے اندر داخل ہوا اور سڑک کی سمت والے جنگلے کے ساتھ سرو کے ایک چھوٹے سے پودے کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ میں نے جنگلے کی سمت جھک کر رفاقت علی کے بنگلے کی طرف نظر دوڑائی' میں یہ جان کر مطمئن ہو گیا کہ یہاں سے میں بنگلے کے گیٹ کو واضح طور پر دیکھ سکتا ہوں۔ سرو کے پودے نے مجھ پر اچھا خاصا سایہ کیا ہوا تھا اس کے باوجود میں کچھ ہی دیر میں پسینے سے شرابور ہو کر رہ گیا۔

میں وہاں خاصی دیر بیٹھا رہا۔ اس دوران میں وہاں سے کئی لوگ گزرے لیکن اول تو ان کی نظر ہی مجھ پر نہ پڑی اور اگر پڑی بھی تو انہوں نے مجھ پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ ان لوگوں میں سے زیادہ تر مجھے حلیے سے گھریلو ملازمین دکھائی دیے۔ ایک مرتبہ جب میں رفاقت علی کے بنگلے کی طرف دیکھ رہا تھا تو سفید رنگ کی ایک مرسڈیز شائیں کر کے میرے پاس سے گزری۔ میں گاڑی چلانے والے شخص کی محض ایک جھلک ہی دیکھ سکا۔ میرے دماغ کے یادداشت والے خانے میں ہل چل سی پیدا ہوئی' مجھے یوں لگا جیسے اس گاڑی کو سردار برکت علی چلا رہا ہو۔ میری نظروں نے گاڑی کا تعاقب کیا۔ رفاقت علی کے بنگلے کے قریب پہنچ کر گاڑی کی رفتار بے حد دھیمی ہو گئی اس کے ساتھ ہی گاڑی نے ہارن بجایا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس گاڑی کو چلانے والا شخص سردار برکت علی مرحوم کا بھائی خان رفاقت علی ہی ہے۔ گاڑی کے ہارن بجاتے ہی بڑا سا گیٹ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔ گاڑی دھیرے دھیرے چلتے ہوئے گیٹ کے اندر داخل ہوئی تو مجھے اس شخص کا چہرہ قدرے واضح طور پر دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کے ساتھ ہی میرے یقین کی تصدیق ہو گئی کہ وہ رفاقت علی ہی ہے۔ رفاقت علی خاصی حد تک اپنے بھائی

برکت علی سے مشابہ تھا۔ بہت معمولی فرق کے ساتھ مجھے دونوں کے نقوش ایک جیسے نظر آئے۔ البتہ رفاقت علی اپنے بھائی کی نسبت کافی کم عمر تھا۔ تھری پیس سوٹ میں وہ مجھے کافی وجیہہ نظر آیا۔

رفاقت علی کو دیکھنے' اسے پہچاننے کے ساتھ ہی میری مہم کا ایک اہم مرحلہ مکمل ہو گیا۔ میں اس چھوٹے سے پارک سے نکلا اور ایک بار پھر مارکیٹ کی جانب چل پڑا۔ میں نے کسی نہ کسی طرح شام کا تمام وقت اسی مارکیٹ میں گزار دیا۔ رات کا اندھیرا گہرا ہونے کے بعد میں ایک بار پھر رفاقت علی کے بنگلے کی طرف چل پڑا۔ میں چہل قدمی کرتے ہوئے بنگلے کے سامنے سے گزرا اور چار دیواری کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دائیں طرف گھوم گیا۔ اس دوران میں' میں نے بنگلے کی چار دیواری کے اندر کا بہت اچھی طرح جائزہ لے لیا۔ دن کے مقابلے میں یہاں کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ بنگلے میں کئی مقامات پر بڑی بڑی سرچ لائٹیں اس انداز میں نصب ہیں کہ انہوں نے حویلی کو بقعہ نور بنایا ہوا ہے۔ بنگلے کے لان کا منظر بھی مجھے بے حد مختلف نظر آیا۔ اب لان ایک ٹینس کورٹ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ٹینس کورٹ کے ساتھ ہی بید کی چار کرسیاں اور شیشے کی سطح والی میز پر رکھی ہوئی ہے۔ کرسیوں میں سے تین پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے ان کی شکل تو نظر نہ آئی۔ البتہ میں نے اندازہ لگایا کہ ان میں سے دو مرد ہیں اور ایک عورت۔

میں ایک بار پھر واپس لوٹا اور بنگلے کے سامنے والی چار دیواری کے ساتھ گزرا۔ چھوٹے گیٹ کے پاس پہنچ کر میں نے اپنی رفتار بے حد سست کر لی۔ اس بار میں نے ذرا گہری نظروں سے ٹینس کورٹ کے پاس موجود افراد کا جائزہ لیا۔ اس بار میں نے رفاقت علی کو واضح طور پر پہچان لیا۔ اس نے سفید ٹی شرٹ اور سفید نیکر پہن رکھی تھی۔ اس کے ساتھ والی نشست پر ایک عورت تھی۔ جبکہ سامنے والی کرسی پر پندرہ سولہ سالہ برس کا لڑکا تھا۔ اس لڑکے میں مجھے رفاقت علی کی کافی مشابہت نظر آئی۔ وہ یقیناً اس کا بیٹا ہو گا۔ اس صورت میں وہ عورت یقیناً رفاقت علی کی بیوی ہی ہو گی۔ بڑے گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے چوکی دار والے کیبن پر بھرپور نظر ڈالی۔ مجھے وہاں ایک بھاری بھرکم باوردی چوکی دار نظر آیا۔ گیٹ کی جانب اس کی پشت تھی اور وہ لان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میں چہل قدمی کرتا ہوا سیدھا چلتا چلا گیا۔ اسکول والے چھوٹے سے پارک کے قریب پہنچ کر میں نے آس پاس کا بھرپور جائزہ لیا۔ مجھے اردگرد تک کوئی نظر نہ آیا۔ موقع مناسب دیکھ کر میں ہلکی سی جست لگا کر پارک کی گرل پار کر کے اندر گھس گیا۔ اس وقت اس جگہ مکمل تاریکی تھی۔ میں نے سرو کے دو چھوٹے چھوٹے پودوں کے درمیان جگہ بنائی اور دبک کر بیٹھ گیا۔ خود کو پوری طرح پوشیدہ کرنے کے بعد میں اپنا لائحہ عمل مرتب کرنے لگا۔

کافی سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں آج رات ہی بنگلے میں داخل ہونے کی کوشش کروں گا۔ البتہ اگر بنگلے کی چار دیواری میں کتوں کی موجودگی کا خدشہ صحیح ثابت ہوا تو پھر بنگلے میں داخل ہونے کا پروگرام کل پر ٹال دوں گا اور کل تمام تر ضروری تیاریوں کے بعد شام ڈھلے یہاں پہنچ جاؤں گا۔

میں رات کے تیسرے پہر تک اسی جگہ بیٹھا رہا۔اس دوران میں پولیس کی گشتی جیپ دو مرتبہ اس سڑک پر سے گزری۔دوسری مرتبہ تو وہ اس پارک کے پاس قدرے دھیمی بھی ہوئی لیکن پھر سیدھی نکلتی چلی گئی۔میں اس جیپ کی واپسی کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ واپس نہ پلٹی۔اپنے فرض کی ادائیگی کے بعد قوم کے خادم اپنے اپنے اڈوں پر جا سوئے ہوں گے۔اس سڑک پر سے اکا دکا گاڑیاں گزرتی ہیں۔گاڑیوں کی آمدورفت جب بالکل بند ہوگئی تو میں اپنی پناہ گاہ سے نکل آیا۔اپنا سامان میں نے وہیں چھوڑ دیا البتہ اپنا سب سے ضروری سامان یعنی اپنا والتھر پستول میں نے اچھی طرح سے چیک کرنے کے بعد تیار کر کے اپنی بیلٹ میں اڑس لیا۔

نیم تاریک سڑک پر رفاقت علی کے بنگلے تک کا فاصلہ میں نے دیوار کے ساتھ دبے پاؤں چلتے ہوئے طے کیا۔بڑے گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے غور سے بنگلے کے کا جائزہ لیا۔مجھے چوکی دار کہیں نظر نہیں آیا۔میں نے دیکھا کہ بنگلے کے احاطے کو جگمگانیوالی بڑی لائٹیں اب بجھ چکی ہیں۔البتہ چار دیواری پر لگے ہوئے قمقمے ابھی تک وسیع و عریض لان کو روشن رکھنے کی حتی الوسع کوشش کر رہے ہیں۔بڑی سرچ لائٹیں شاید ٹینس کورٹ پر رات کے وقت ٹینس کھیلنے کے لیے لگائی گئی ہوں گی۔کھیل ختم ہوتے ہی انہیں بند کر دیا جاتا ہوگا۔

چھوٹے گیٹ کے پاس رک کر میں نے تیزی سے آس پاس کا اور بنگلے کے اندر کا جائزہ لیا۔میدان صاف پا کر میں نے گیٹ کے اوپری حصے پر لگی ہوئی نوکیلی سلاخوں کو مضبوطی سے پکڑا اور اپنا بایاں پاؤں گیٹ پر اور دایاں پاؤں گیٹ کے ستون پر رکھ کر اپنے ہاتھوں کے زور پر اپنے جسم کو اوپر اٹھایا۔ جسم اوپر اٹھنے کی وجہ سے میرا سینہ سلاخوں کو چھونے لگا۔میں نے اپنا دائیں پاؤں کو پھیلا کر اوپر اٹھایا اور سلاخوں کے بیچ میں موجود خلا میں پھنسا لیا۔باقی کام زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوا۔اپنے دائیں پاؤں کو احتیاط کے ساتھ نوک دار سلاخوں کے درمیان پھنسا کر میں گیٹ پر کھڑا ہوگیا۔اور بایاں پاؤں بھی نوک دار سلاخوں پر سے گزار کر گیٹ کے اندر کی طرف ہو کر سلاخیں پکڑ کر آہستگی کے ساتھ نیچے لٹک گیا۔میرے پیر نہایت آرام سے زمین سے چھو گئے۔گیٹ کو چھوڑنے کے بعد میں نے از سر نو بنگلے کی عمارت اور اس کے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیا۔مجھے بنگلے کی عمارت کی تمام کھڑکیاں تاریک نظر آئیں۔اس کا یہی مطلب ہو سکتا تھا کہ بنگلے کے مکین سو چکے ہیں۔

میں نے فیصلہ کیا کہ بنگلے کی اصل عمارت کی طرف جانے سے پہلے چوکی دار کو ناکارہ کر دوں تا کہ اچانک مداخلت کا خطرہ نہ رہے۔میں چار دیواری سے قدرے ہٹ کر اگی ہوئی مہندی کی باڑ کے پیچھے چھپتا ہوا چوکی دار کے کیبن کی طرف بڑھا۔کیبن کی پشت میری جانب تھی۔تاہم میں نے فیصلہ کیا کہ خواہ مخواہ خطرہ مول لینے سے گریز کیا جائے۔

کیبن کے پاس پہنچ کر میں کیبن اور چار دیواری کے بیچ میں موجود خلا میں گھس گیا اور کیبن کے اندر کی سن گن لینے لگا۔میں نے کسی کے کھانسنے کی آواز سنی۔میری ناک میں چائے کی تیز خوشبو آئی۔مجھے

معلوم ہوگیا کہ چوکی دار نہ صرف جاگ رہا ہے بلکہ چائے سے لطف اندوز بھی ہو رہا ہے۔میں نے اپنا کاک شدہ پستول ہاتھ میں لیا اور بے آواز کھسکتا ہوا کیبن کے سامنے والے حصے کی طرف بڑھا۔میں نے بڑی احتیاط سے کیبن کے اندر جھانکا کہ مجھے فوراً ہی پیچھے ہٹنا پڑا۔میں نے دیکھا کہ لحیم شحیم چوکی دار اپنی بینچ پر سے اٹھ کر کھڑا ہو رہا ہے۔خیریت یہ گزری کہ اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی ورنہ معاملہ سخت گڑ بڑ ہو جاتا۔چوکی دار کیبن سے باہر آیا۔اس نے کریہہ آواز میں' منہ پھاڑ کر جمائی لی۔

میں نے اپنے پستول کو پوری طرح سے تیار کر لیا۔میں نے اندازہ لگایا کہ اس نے اپنی رائفل یا شاٹ گن کیبن میں ہی چھوڑ دی ہے۔میں چند لمحوں تک چوکی دار کے واپس کیبن میں جانے کا انتظار کرتا رہا لیکن مجھے اس کی طرف سے کوئی آواز سنائی نہ دی۔اچانک میں بری طرح چونک پڑا۔میں نے اپنے عقب میں کھڑ کھڑاہٹ کی ہلکی سی آواز سنی تھی۔میں نے چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔میں نے دیکھا کہ وہاں پر وہ قوی الجثہ پٹھان چوکی دار موجود ہے۔وہ بنگلے کی دیوار کے ساتھ سر جھکائے بیٹھا تھا۔وہ اگر بائیں طرف ذرا سی بھی گردن گھما لیتا تو اسے میں با آسانی نظر آ جاتا۔اس کی مصروفیت سے فائدہ اٹھا کر میں بلی کی چال چلتا ہوا برق رفتاری سے کیبن کے اگلے حصے میں پہنچ گیا۔اس کے علاوہ مجھے کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ میں کیبن کے اندر گھس جاؤں چنانچہ میں نے یہی کیا۔مجھے سامنے ہی اٹلی کی بنی ہوئی ریپٹر گن بنچ کے سہارے ٹکی ہوئی نظر آئی۔میں نے اسے بنچ کے نیچے ڈالا اور خاموشی سے چوکی دار کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے چوکی دار کے کھنکارنے کی آواز سنی پھر اس کا قوی ہیکل جسم کیبن کے اگلے حصے میں نمودار ہوا۔وہ اپنی دھن میں مگن بلا توقف کیبن میں گس گیا۔عین اسی وقت میں نے آگے بڑھ کر اپنا پستول اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔''اپنے ہاتھ سر سے اوپر اٹھالو'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا'' کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو بھیجا باہر نکال دوں گا۔''

میری آواز سن کر اسے زبردست اعصابی جھٹکا لگا۔اس نے اپنا بھاری بھرکم سر ہلائے بغیر کن انکھیوں سے میرے چہرے کو دیکھا اس کے ساتھ ہی اس کا چہرہ زرد پڑتا چلا گیا۔میں نے اس کے جسم میں واضح لرزش محسوس کی۔میرے پستول کے سرد لمس نے اس پر تھرتھری طاری کر دی تھی۔اپنے ہاتھی جیسے جثے کے باوجود وہ بالکل بھیڑ ثابت ہوا۔

''اپنے دونوں ہاتھ دیوار پر رکھو۔خبردار پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی تو توند میں سوراخ کر دوں گا۔''
اس کے جسم کی لرزیش میں مزید اضافہ ہوگیا۔

''مم۔۔۔میں۔۔۔''اس نے کچھ کہنا چاہا۔

''زبان بند رکھو۔کیا بکری کی طرح میں میں کر رہے ہو۔''میں نے سخت لہجے میں اسے ڈپٹ کر کہا۔
اس کے بعد اس نے منہ سے کوئی آواز نہ نکالی اور چپ چاپ کیبن کی چوبی دیوار پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوگیا۔میں نے ایک ہاتھ سے جلدی جلدی اس کا جسم ٹٹول کر دیکھا۔مجھے اس کے پاس کوئی ہتھیار نہ ملا۔''اپنے ہاتھ نیچے کر لو اور دھیرے دھیرے میری طرف مڑو۔''اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔اسی لمحے میں

نے پستول کی نال پکڑ کر اس کے دستے سے ایک زوردار ضرب اس فیل تن شخص کی دائیں کنپٹی پر لگائی۔ اس کے حلق سے ایک بے معنی سی آواز خارج ہوئی اور وہ دھم سے فرش پر گر گیا۔ گرتے وقت اس کا سر اچھے خاصے زور سے کیبن کی دیوار سے ٹکرایا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں اس کی کھوپڑی نہ چٹخ گئی ہو۔

چوکی دار کو اس کے حال پر چھوڑ کر میں دبے پاؤں بنگلے کی اصل عمارت کی طرف بڑھا۔ مجھے یقین تھا کہ بنگلے کا داخلی دروازہ بند ہوگا۔ لہٰذا میں اندر داخل ہونے کے لیے کسی اور راستے کو تلاش کرنے لگا۔ بنگلے کی عمارت کے قریب پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ اس کی نچلی منزل کی تمام تو کھڑکیوں پر گرل لگی ہوئی ہے اور ان کے ذریعے اندر داخل ہونا ممکن نہیں ہے۔ مجھ پر مایوسی طاری ہونے لگی۔ تاہم میں نے اپنے آپ پر قابو پایا اور ایک بار پھر بنگلے کے بائیں پہلو کی طرف آیا تو مجھے سامنے گیراج میں رفاقت علی کی سفید مرسڈیز کھڑی نظر آئی۔ مرسڈیز کے قریب ہی ایک بجیرو جیپ اور ایک ٹویوٹا کرولا کار بھی کھڑی ہوئی تھی۔ میں مزید آگے بڑھا تو اچانک مجھے نچلی منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی سے روشنی جھلکتی دکھائی دی۔ اس کمرے کا ایک دروازہ بیرونی سمت بھی تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ کمرا مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔

کمرے کے اندر سے انڈین گانوں کی آواز آرہی تھی۔ کھڑکی پر پڑے ہوئے پردوں کی وجہ سے میں اندر نہ دیکھ سکا۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی تو مجھے گانے کے بولوں کے درمیان دو آدمیوں کے بولنے کی آواز بھی سنائی دی۔ پھر ان دونوں اشخاص کے بولنے کے انداز میں تیزی آتی گئی۔ مجھے لگا کہ وہ دونوں آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ اسی وقت گانے کی آواز بند ہوگئی۔ میں نے کسی کے تیز لہجے میں بولنے کی آواز سنی۔

''اب میں مزید یہاں قیدی بن کر نہیں رہ سکتا۔'' وہ شخص ٹھیٹ پنجابی زبان میں بول رہا تھا۔ ''تم کل ملک صاحب کو جا کر کہہ دو کہ میری واپسی کا انتظام کردے۔ میں آخر کب تک اس کمرے میں قیدزہ کروی سی پر دیکھ دیکھ کر آنکھیں خراب کرتا رہوں۔''

''بات سمجھنے کی کوشش کرو منوج سنگھ جی۔'' وہ شخص سرائیکی لہجے میں پنجابی بول رہا تھا۔ اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ ''بھائی صاحب نے مجبوراً تمہیں خان رفاقت علی کے پاس ٹھہرایا ہے۔ تم ابھی سرحد پار واپس نہیں جاسکتے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے دیش کی پولیس اور دوسرے تحقیقاتی ادارے بھوکے کتوں کی طرح تمہیں ڈھونڈتے پر رہے ہیں۔ تم وہاں جاتے ہی دھر لیے جاؤ گے۔ وہ تمہاری زبان سے سچ اگلوانے میں کامیاب ہوگئے تو تمہارے ساتھ ہم بھی مارے جائیں گے۔''

''لیکن عبدالرحیم بھائی میں کب تک یہاں رکا رہوں گا؟'' منوج سنگھ نے شاکی لہجے میں پوچھا۔

''تمہیں اس وقت تک یہاں رہنا ہے جب تک حالات درست نہیں ہوجاتے۔ یہاں کی سی آئی اے اور ایف بی آئی بھائی صاحب پر کڑی نگاہ رکھ رہی ہے۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ آج کل یہاں بھائی

صاحب کی دشمن پارٹی حکومت ہے۔ وہ کسی بھی جھوٹے سچے مقدمے میں بھائی صاحب کو پکڑ لینا چاہتے ہیں۔ تمہاری حکومت کو شبہ ہے کہ تم بھائی صاحب کے پاس چھپے ہوئے ہو چنانچہ اس نے ہماری حکومت سے باقاعدہ درخواست کی ہے کہ وہ تمہیں گرفتار کرکے بھارت بھجوا دے بلکہ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ تمہاری حکومت نے چوری چھپے ایک اسپیشل ایجنٹ بھی پاکستان بھیجا ہے تاکہ وہ تمہارا پتا لگا کر اپنی حکومت کو اطلاع دے اور اس طرح تمہیں گرفتار کیا جاسکے۔''

''یہ ساری مصیبت اس حرامی بڈھے جیون مل کی وجہ سے آئی ہے۔'' میں نے منوج سنگھ کی آواز سنی۔ ''وہ کمینہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر کا قریبی رشتے دار ہے۔ پارٹی والوں نے بھارت میں ہنگامہ مچا دیا ہے۔ حکومت کی ناک میں دم ہوگیا ہے۔ حکومت نے تحقیقاتی اداروں کی اتنی کھنچائی کی کہ وہ میرے کھلائے ہوئے تمام پیسے کو بھول کر میری تلاش میں لگ گئے۔ یہ اطلاع بھی کسی ایسے ہی حرام خور نے حکومت کے کانوں تک پہنچائی ہے کہ میں تمام اغوا شدہ بندوں کو ساتھ لے کر سرحد پار آگیا ہوں۔''

''بہرحال تم خان رفاقت کے گھر میں بالکل محفوظ ہو۔ خان رفاقت بڑی اونچی شے ہے۔ اس کے صوبے کے تمام وزیروں سے گھریلو تعلقات ہیں۔ اس پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔'' رحیم نے پراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

''وہ تو صحیح ہے لیکن پتا نہیں اغوا شدگان کا کیا حال ہے؟''

''تم فکر نہ کرو کہ سردار جی ہمارے پنڈ میں وہ بالکل محفوظ ہیں۔ ہماری جیل تم نے دیکھی نہیں ہے۔ وہاں ہم نے سو سو آدمیوں کو کئی کئی مہینوں تک بند رکھا ہے۔''

عبدالرحیم نے فخریہ لہجے میں بتایا۔ ''وہ بڈھا جیون مل اور باقی چار بندے وہاں بالکل ٹھیک ٹھاک رہیں گے۔ ہم اپنے مہمانوں کو ٹھیک ٹھاک مال کھلاتے ہیں۔''

''وہ پانچوں کے پانچوں سونے کے انڈے دینے والی مرغیاں ہیں رحیم بھائی۔ ان میں سے کوئی بھی ایک کروڑ روپے سے کم کی آسامی نہیں ہے۔ ان پر میرا لاکھوں روپیا خرچ ہوچکا ہے۔''

''یہ معاملہ بھی تو بہت بڑا ہے سردار جی۔ اگر ہماری حکومت تمہاری گرفتاری میں مدد کرنے سے انکار کردے تو دونوں ملکوں کے تعلقات سخت کشیدہ ہو سکتے ہیں۔''

''اوئے پہلے کون سا شکرانے بٹ رہے ہیں رحیم بھائی۔ روزانہ تو کسی نہ کسی بات پر منہ ماری ہوتی رہتی ہے دونوں ملکوں میں۔ کبھی وہ اس کے چار سفارت کاروں کو اپنے ملک سے نکال دیتا ہے تو کبھی یہ اسکے چھے بندوں کو واپسی کا ٹکٹ کٹا دیتا ہے۔'' سردار جی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ تو صحیح ہے سردار جی لیکن اگر یہ معاملہ زیادہ خراب ہوا تو دونوں ملکوں میں جنگ کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ تمہارے ملک میں بی جے پی والوں کی طاقت روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ ان کے دباؤ میں آکر تمہاری گورنمنٹ کچھ بھی کرسکتی ہے۔''

''او نہیں بھائی نہیں اس بات کو بھول جاؤ۔ اب بھارت تمہارے ملک پر حملہ نہیں کرسکتا کیونکہ اگر اس

نے ایسا کیا تو خالصتان کے پجاری میرے بھائی بند بھارت کے پیٹ میں کرپان بھونک دیں گے اوپر سے کشمیر والے الگ اس کے سر پر ہتھوڑے چلا رہے ہیں۔'' منوج سنگھ نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

''وہ تو صحیح ہے سردار جی پھر بھی تمہارا کھلی فضا میں نکلنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔''

''اچھا بھائی میں نے تمہاری بات مانی لیکن یہ تو بتاؤ کہیں پاکستان کی حکومت تمہارے بھائی کو گرفتار تو نہیں کر لے گی؟'' منوج سنگھ نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ اس کی بات سن کر رحیم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''اس بات کی تم فکر نہ کرو سردار جی۔ میرا بھائی ملک عبدالکریم خان اتنی معمولی شے نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات میں خود ایک حکومت ہے۔ اس حکومت میں بھی اس کے بہت سے در پردہ ہمدرد ہیں۔ اگر کسی حکومتی ادارے نے میرے بھائی پر ہاتھ ڈالا تو پورے ملک میں واویلا مچ جائے گا۔ اتنے بڑے سیاسی لیڈر کو گرفتار کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ حکومت والے کچھ بھی کہتے رہیں۔ عوام اور اخبار والے یہی کہیں گے کہ حکومت نے اسے سیاسی مخالفت کی وجہ سے گرفتار کیا ہے۔ پوری حکومت کی مشینری اوپر سے نیچے تک ہل کر رہ جائے گی۔ ہمارے علاقے میں تو خیر کوئی پولیس والا داخل ہونے کی جرات کر ہی نہیں سکتا۔'' رحیم نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''کہہ تو تم صحیح رہے ہو بھائی رحیم۔'' منوج سنگھ نے اعتراف کیا۔

''بس تم صبر سے سارا کھیل دیکھتے جاؤ۔ میرا بھائی جو گیم کھیل رہا ہے اگر وہ کامیاب ہو گئی تو نہ صرف تم محفوظ رہو گے بلکہ ہم اغوا شدگان کے عوض بھاری تاوان بھی وصول کر لیں گے۔ تم میرے بھائی کو اپنی چالیں چلنے کا موقع تو دو۔''

''چلو ٹھیک ہے میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ جہاں اتنے دن اس بند کمرے میں گزارے وہاں کچھ دن اور سہی۔'' میں نے منوج سنگھ کی آواز میں بے چارگی کی جھلک محسوس کی۔ جوں جوں میں ان دونوں افراد کی گفتگو سنتا گیا' میرا دماغ استعجاب کی دلدل میں دھنستا چلا گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں داستان الف لیلہ کا کوئی گمشدہ باب پڑھ رہا ہوں۔ اس گفتگو کے اسرار یہاں مجھ پر عیاں ہوئے تو مجھے یوں لگا جیسے میرے قدموں تلے سے زمین کھسکی جا رہی ہو۔ رفاقت علی تو میری سوچوں سے بھی بالاتر شے ثابت ہوا۔ اس نے اپنے شاندار بنگلے میں ایک ایسے مجرم کو چھپا رکھا ہے جس کی تلاش بھارت اور پاکستان دونوں ممالک کے تحقیقاتی ادارے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ یہ شخص منوج سنگھ بھارت کے پانچ بے حد مال دار افراد کو اغوا کر چکا ہے تاکہ ان کے عوض تاوان حاصل کر سکے۔ ملک عبدالکریم نامی اس بارسوخ پاکستانی باشندے نے اس کی اس واردات میں بھرپور ساتھ دیا۔ تاوان کے لیے اغوا کیے جانے والے افراد کو چھپانے کی اس سے بہتر کیا صورت ہو سکتی ہے کہ انہیں سرحد پار کرا کے دوسرے ملک میں پہنچا دیا جائے اور پھر بڑے اطمینان سے اغوا شدگان کے لواحقین سے سودے بازی کی جائے۔ ملک عبدالکریم کوئی بے حد طاقت ور قسم کا جاگیر دار ہو گا۔ اس نے اغوا شدگان کو اپنے گاؤں کے ذاتی جیل

خانے میں بھیج کر گویا انہیں صفحۂ ہستی سے غائب کر دیا۔

فوری طور پر میری سمجھ میں نہ آیا کہ اب میں کیا کروں۔ میں تو رفاقت علی کو قتل کرنے کے لیے بنگلے میں گھسا تھا لیکن یہاں تو کہانی ہی دوسری نکل آئی۔ میں نے پردوں کے درمیان موجود معمولی سے حلا سے کمرے کے اندر جھانکنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ میں نے اپنے کھڑے ہونے کا زاویہ بدلا اور ایک بار پھر اندر جھانکا۔ اس بار میں ان دونوں میں سے ایک کو واضح طور پر دیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے سامنے ہی مسہری پر ایک ادھیڑ عمر شخص نظر آیا۔ اس کے کلین شیو چہرے پر مجھے بے زاری کے واضح آثار نظر آئے۔ جب وہ بولا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہی منوج سنگھ ہے۔ اس داڑھی مونچھ سے بے نیاز سردار کو دیکھ کر مجھے قدرے حیرانی ہوئی۔

میں کھڑکی کے قریب سے ہٹنے ہی والا تھا کہ میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ مجھے اپنے گھٹنوں کی ہڈیاں تحلیل ہوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں دھڑام سے زمین پر گرا اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں کے سامنے گھور اندھیرا چھا گیا۔ میں شاید کئی گھنٹوں تک بے ہوش رہا۔ رفتہ رفتہ میری بے ہوشی نیم بے ہوشی میں تبدیل ہوئی۔ میں نے کسی کے بات کرنے کی آواز سنی لیکن میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میں خاصی دیر تک ہوش اور بے ہوشی کی درمیانی کیفیت کا شکار رہا پھر آہستہ آہستہ میرے دماغ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں واپس لوٹ آئیں۔ آنکھیں کھولے بغیر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرا جسم رسیوں سے بری طرح جکڑا ہوا ہے۔ صورت حال کا ادراک ہوتے ہی میرے دل و دماغ پر مایوسی کا غلبہ ہونے لگا۔ ہزرار کوشش کے باوجود میں ایک بار پر دشمنوں کے شکنجے میں آن پھنسا تھا۔ میرے کانوں نے کسی دھیمی سی آواز سنی۔

''رحیم بھائی اس کی کھوپڑی تو نہیں تڑخ گئی ہے۔'' میں نے اس آواز کو فوراً پہچان لیا۔ یہ منوج سنگھ کی آواز تھی۔

''ارے نہیں سردار جی' اس کی تم فکر نہ کرو۔ یہ کسی اناڑی کا شکار نہیں ہوا ہے۔ بڑا ہی سچل ہاتھ ہے کاسو کا۔''

''لیکن تمہارے ڈرائیور نے گرا کیسے لیا؟ یہ تو بڑا پلا پلایا سانڈ ہے'' سردار جی کی بات سن کر رحیم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''ارے سردار جی' کاسو صرف ڈرائیور نہیں ہے۔ ہم لوگ اپنے معمولی سے معمولی بندے کو بھی پوری تربیت دیتے ہیں۔ اگر ہم کچے بندے اپنے ساتھ رکھنے لگیں تو ایک دن میں ہمارا تختہ ہو جائے' کاسو اگر کوئی عام سا ڈرائیور ہوتا تو اسے دیکھتے ہی شور مچا دیتا یا پھر اپنے بستر میں دبک کر سو جاتا لیکن اس نے چیتے کی گھات لگائی اور اسے بے خبری میں دبوچ کر بے کار کر دیا۔'' رحیم اور منوج سنگھ ایک ساتھ ہنس پڑے۔ میرے کانوں نے ایسی آہٹ سنی جیسے کوئی سیڑھیاں چڑھ رہا ہو پھر میرے کانوں میں ایک اجنبی آواز آئی۔

''کیوں بھائی رحیم اسے ہوش آیا یا نہیں؟''

''نہیں خان جی ابھی تک تو اسے ہوش نہیں آیا ہے۔لگتا ہے کاسو کا ہاتھ کچھ زیادہ ہی سخت پڑ گیا ہے۔'' رحیم نے جواب دیا۔

''پر یہ معاملہ بہت گڑبڑ ہو گیا ہے رحیم۔خدا جانے یہ شخص کس نیت سے بنگلے میں داخل ہوا ہے۔اگر یہ سی آئی اے وغیرہ کا بندہ ہوا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔'' میں نے اسے پہچان لیا وہ خان رفاقت علی تھا۔مجھے اس کے لہجے سے تشویش جھلکتی محسوس ہوئی۔رحیم نے بے پروائی سے کہا۔

''ارے نہیں خان جی یہ کوئی چور اچکا ہو گا واردات کی نیت سے بنگلے میں گھسا ہو گا۔''

''بے وقوفوں والی بات نہیں کرو رحیم۔معمولی چور اچکوں کے پاس جرمن پستول نہیں ہوتے۔اس کا حلیہ تو دیکھو۔مجھے تو یہ تربیت یافتہ ایجنٹ دکھائی دیتا ہے۔اگر یہ واقعی سرکاری ایجنٹ ہے تو ہم سب شدید خطرے کی زد میں ہیں۔اس کی گمشدگی سے ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو گا اور اگر رات کو اس کا کوئی ساتھی بھی اس کے ہمراہ تھا تو پھر سمجھو کہ ہم سب کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے ہوں گے۔''

''ایسی بات ہے تو خان صاحب ہم کو فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔'' سردار جی نے خوف زدہ لہجے میں کہا'' ایسا نہ ہو کہ ہم سب پھنس جائیں۔''

''نہیں جلد بازی سے معاملہ مزید بگڑ جائے گا۔میں نے کاسو کو جیپ پر ملک عبدالکریم کی طرف بھیج دیا ہے۔وہ اچھی طرح سے جائزہ لیتا ہوا گیا ہے کہ بنگلے کی نگرانی ہو رہی ہے یا نہیں۔اگر یہ شخص باقاعدہ منصوبے کے تحت بنگلے میں بھیجا گیا ہے تو وہ لوگ بنگلے سے نکلنے والی ہر گاڑی پر کڑی نگاہ رکھ رہے ہوں گے۔اس طرح ہمیں صورت حال کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔کاسو ملک عبدالکریم کی ہدایت بھی لے کر آئے گا کہ اس شخص کا اب کیا کیا جائے۔اگر میرا بنگلہ واقعی سی آئی اے اور ایف بی آئی والوں کی نظر میں آ چکا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ٹیلی فون بھی ریکارڈ ہو رہے ہوں گے۔خدا خیر کرے' معلوم نہیں اب کیا ہونے والا ہے۔'' رفاقت علی نے سخت پریشانی کے عالم میں کہا۔کچھ دیر تک وہاں گھمبیر خاموشی رہی پھر رحیم نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''وہ۔۔۔خان جی۔۔۔میں ایک بات آپ کو بتانا بھول گیا تھا۔''

''کون سی بات رحیم؟'' رفاقت علی نے سخت پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

''دراصل بات یہ ہے کہ کاسو نے جس وقت اسے گرایا تو یہ ہمارے کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا تھا۔مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس نے ہم دونوں کی باتیں نہ سن لی ہوں۔'' رحیم کے لہجے میں شرمندگی کی جھلک مجھے واضح طور پر محسوس ہوئی۔

''اف میرے خدا'' رفاقت علی نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا'' پھر تو سمجھو ہم سب کا آخری وقت پہنچا۔تم دونوں یقیناً انہیں بندوں کی باتیں کر رہے ہو گے۔اگر اس نے وہ باتیں سن لی ہیں تو سمجھو دن کے گرد پھانسی کا پھندا فٹ ہو چکا ہے۔میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ملک عبدالکریم کے چھوٹے

بھائی ہو کر بھی اتنے اناڑی پن کے کام کیوں کرتے ہو۔سردار جی تمہیں بھی احساس نہیں ہے کہ ہم لوگ کتنے بڑے خطرے سے دو چار ہیں۔یہ اتنی بڑی بڑی دو حکومتوں اور ملکوں کا معاملہ ہے اور تم لوگ اسے بچوں کا کھیل سمجھ رہے ہو۔''

''نہیں خان صاحب ایسی بات نہیں ہے'' سردار جی نے شرمندہ لہجے میں اپنی صفائی پیش کرنا چاہی'' وہ دراصل۔۔۔''

''اس بات کو چھوڑو سردار جی اور اپنی تیاری مکمل رکھو۔تم لوگوں کو کسی بھی وقت یہاں سے نکلنا ہے اور اسے بھی جلد از جلد یہاں سے ہٹانا پڑے گا۔''

''لیکن اسے ہوش میں تو لائیں خان جی' کچھ پتا تو چلے کہ یہ ہے کون؟'' رحیم نے تجویز پیش کی۔

''ہاں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرو' ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دو اس کے منہ پر خود ہی ہوش میں آ جائے گا۔'' رفاقت علی کی زبان سے نکلنے والے الفاظ سن کر میں چوکنا ہو گیا۔قدموں کی چاپ میرے قریب آ کر خاموش ہو گئی۔کسی نے میرے منہ پر ٹھنڈے پانی کا چھینٹا دیا۔میں نے ہلکی سی جھرجھری لی اور ایک بار پھر ساکت ہو گیا۔دوسری بار میرے منہ پر نسبتاً زیادہ پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا۔

میں نے اپنے سر کو دھیرے دھیرے دائیں بائیں جھٹکے دیے اور نہایت آہستگی سے آنکھیں کھول دیں۔سب سے پہلے میری نظر رفاقت علی کے چہرے پر پڑی۔وہ مجھے کافی حد تک سردار برکت علی سے مشابہ نظر آیا۔سوائے اس کے کہ سردار کے چہرے پر باریک نوک دار مونچھیں تھیں۔جبکہ رفاقت علی کلین شیو تھا۔منوج سنگھ کو میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا......البتہ رحیم کا چہرہ مجھے بے حد عجیب سا لگا۔اس کی شکل دیکھتے ہی میرے دماغ کی اسکرین پر ایک لفظ ابھرا'' بجو'' دبلا پتلا تھوتھنی نما چہرہ' چھوٹی چھوٹی چمک دار آنکھیں اور چھدری مونچھیں اس کی عمر پینتیس کے قریب رہی ہو گی۔

''کون ہو تم؟ کس نے بھیجا ہے تمہیں؟'' رفاقت علی نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''تم لوگ کون ہو اور تم نے مجھے یہاں کیوں باندھ رکھا ہے؟'' میں نے الٹا ان سے سوال کر ڈالا۔

رفاقت علی نے معنی خیز نظروں سے اپنے ساتھیوں پر نظر ڈالی۔

''ہمیں تم مسلح حالت میں بنگلے کے اندر ملے ہو۔تم نے ہمارے چوکی دار کو بھی زخمی کر دیا ہے۔اگر ہم تمہیں گولی مار دیں تو ہم سے کوئی جواب طلبی نہیں کر سکتا۔'' رفاقت علی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔میں پردیسی آدمی ہوں۔بھائی تم نے مجھے کیوں جکڑ رکھا ہے؟'' میں نے معصوم لہجے میں استفسار کیا۔میری بات سن کر رفاقت علی کے چہرے پر جھنجلاہٹ کے تاثرات ابھر آئے۔

''دیکھو بھائی اس ڈرامے بازی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ہمیں تم سے کچھ نہیں لینا دینا۔تم صرف یہ بتا دو کہ تم میرے بنگلے میں کس نیت سے گھسے تھے اس کے بعد ہم تمہیں آزاد کر دیں گے۔''

''ڈرامے بازی تم لوگ کر رہے ہو' میں تو ادھر پارک میں سو رہا تھا۔پتا نہیں تم کیوں مجھے یہاں اٹھا

لائے ہو؟'' میں نے اپنے ابتدائی بیان پر قائم رہتے ہوئے کہا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں یہی لائحہ عمل ہو گیا۔

''یہ اس طرح نہیں مانے گا خان صاحب' اس کی جی بھر کے کھنچائی کرو پھر یہ خود زبان کھول دے گا۔'' سردار جی نے مغلوب الغضب ہوتے ہوئے کہا۔

''تم خاموش رہو لطیف بھائی۔'' رفاقت علی نے منوج سنگھ کو ایک ریڈی میڈ نام سے پکارتے ہوئے کہا۔ ''میں اس سے خود بات کرلوں گا۔ اسے معلوم نہیں ہے کہ خان رفاقت علی کس بلا کا نام ہے۔ میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔ وہ لوگ خود ہی اس سے سب کچھ اگلوالیں گے۔'' رفاقت علی نے مجھے گیدڑ بھبکی دی۔ میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

''تو پھر دیر کس بات کی ہے بھائی؟ پولیس کو بلاؤ اور مجھے اس کے حوالے کردو۔ تم نے مجھے چھوڑ دیا پھر بھی مجھے تھانے تو جانا ہی ہے۔'' میری بات سن کر وہ تینوں بری طرح چونک پڑے۔

''کک۔۔۔کیا مطلب؟۔۔۔تم تھانے کیوں جاؤ گے۔''

''تم لوگوں کی رپٹ لکھوانے! تم لوگوں نے مجھے حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے۔''

''بکواس مت کرو۔'' رفاقت علی نے غصے سے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے ٹکڑے کرکے تمہیں چیل کوؤں کو کھلا دوں گا۔ تمہارے سرپرست ساری عمر بھی تمہیں ڈھوتے رہیں پھر بھی تمہارا پتا نہیں چلے گا۔''

''مجھے دھمکیاں دے کر تم اپنا وقت ضائع کررہے ہو۔ تم سے جو ہوسکتا ہے کرلو۔ میں نے جو کچھ تمہیں بتایا ہے وہی سچ ہے۔''

''یہ بہت پکا ہے خان جی یہ اس طرح نہیں مانے گا۔ اسے اڈے پر چڑھانا ہی پڑے گا۔'' رحیم نے خوفناک نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

''بجو صاحب آپ مجھے اڈے پر چڑھائیں گے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں رحیم کو مخاطب کیا۔ ''مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں بس اتنی احتیاط رکھنا کہ میرے پیر کے نیچے نہ آجانا۔ میں بڑا رحم دل آدمی ہوں۔ تمہاری موت کا مجھے بہت افسوس ہوگا۔'' میری بات سن کر رحیم کے سر سے پاؤں تک مرچیں لگ گئیں۔ وہ بھنبھنا کر آگے بڑھا اور اس نے پوری قوت سے میرے دائیں گال پر طمانچہ مارا۔ میرے گال میں انگارے بھر گئے۔ میں نے خونی نظروں سے اسے گھورا۔

''دیکھ لوں گا تجھے بھی۔'' میں نے زہریلے لہجے میں دھمکی دی۔

''اپنے آپ پر قابو رکھو رحیم' ورنہ یہاں سے چلے جاؤ۔ رفاقت علی نے سخت لہجے میں رحیم کو سرزنش کی۔ رحیم نے قہر آلود نظروں سے مجھے گھورا لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔

رفاقت علی نے ان دونوں کو ساتھ لیا اور ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ وہ تینوں کافی دیر تک آپس میں کانا پھوسی کرتے رہے۔ پھر وہ تینوں کمرے سے باہر نکل گئے۔

''ارے بھائی مجھے کچھ کھانے پینے کو تو دیتے جاؤ۔'' میں نے ہانک لگائی لیکن وہ ان سنی کرکے دروازہ بند کرکے سیڑھیاں اترتے چلے گئے۔

میں خاصی دیر تک رسیوں کے ساتھ زور آزمائی کرتا رہا لیکن ان رسیوں کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ تھک ہار کر میں تن بہ تقدیر ہو کر پڑا رہا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی۔ اس بار رفاقت علی تنہا کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے اس کے چہرے پر سنجیدگی کی گہری تہہ نظر آئی۔ میرے پاس آکر اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں میں نے بھی اس سے آنکھ چرانے کی کوشش نہ کی۔ مجھے واضح طور پر محسوس ہوا کہ وہ سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے۔

''دیکھو بھائی میں اس معاملے میں خواہ مخواہ پھنس گیا ہوں۔ حالانکہ میرا اس معاملے سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تو محض یار کی یاری میں مارا گیا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم کون ہو اور کس لیے یہاں آئے ہو لیکن اگر کسی طرح سے یہ معاملہ باہمی تعاون سے طے ہوسکتا ہے تو میں تم لوگوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بن سکتا ہوں۔''

''کیسا تعاون بھائی؟ کیسا رابطہ؟ میں تمہاری بات سمجھ نہیں پارہا ہوں۔''

''اتنے ان جان نہ بنو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم سارے معاملے کو سمجھ چکے ہو۔ میں تمہاری زبان بندی کی قیمت جاننا چاہتا ہوں۔ یقین کرو ہم تمہیں مالا مال کرسکتے ہیں۔ تم نے جو کچھ سنا جو کچھ دیکھا اسے بالکل بھول جاؤ۔ تمہارا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ البتہ تمہارا مستقبل ضرور سنور جائے گا۔ تم ابھی نوجوان ہو' محکمے کی طرف سے تمہیں کیا انعام مل سکتا ہے؟ چند ہزار روپے اور انعام اور تنخواہ میں دو چار سو روپے اضافہ۔ بس''

''اور اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو۔؟'' میں نے پوچھا۔

''تو پھر جو کچھ ہوگا وہ نہ تمہارے لیے اچھا ہوگا نہ ہمارے لیے۔ ہم تو تباہ ہوں گے ہی لیکن تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارا کس ادارے سے تعلق ہے؟ کیا سی آئی اے سے؟''

''نہیں!''

''تو پھر تمہارا یقیناً ایف بی آئی سے تعلق ہے؟''

''نہیں میرا کسی تنظیم سے تعلق نہیں ہے۔'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

''تم بکواس کررہے ہو تم اپنی قیمت بڑھوانا چاہ رہے ہو۔'' رفاقت علی نے طیش میں آتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنے لہجے کو بدستور پرسکون رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں میں سچ کہہ رہا ہوں میرا کسی ادارے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''مجھے معلوم ہے تم اس طرح نہیں مانو گے۔ مجھے اپنی انگلیاں ٹیڑھی کرنا ہی پڑیں گی۔'' یک لخت اس کا دایاں ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں ایک سرنج کی جھلک دیکھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے سرنج کی پوری سوئی میرے دائیں بازو میں جھونک دی۔ مجھے لگا کہ میرے بازو میں سیال آگ اتر رہی ہے۔ رفاقت علی نے سرنج میں بھری ہوئی تمام دوا میرے بازو میں اتار دی۔

''میں تمہیں کسی اچھی سی جگہ پہنچادوں اس کے بعد تم سے تفصیلی بات ہوگی۔''

مجھے رفاقت علی کا چہرہ دھندلاتا ہوا دکھائی دیا۔ میرے ہاتھ پاؤں سرد ہوگئے۔ میرا سر زور سے چکرایا۔اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا چلا گیا۔آخری احساس مجھے یہ ہوا کہ میرا چہرہ پسینے میں بھیگ رہا ہے۔

نہ جانے کتنی دیر بعد مجھے چند لمحوں کے لیے ہوش آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں منہ کے بل قالین پر ڈھیر ہوں اور وہ قالین دھیرے دھیرے ہچکولے کھارہا ہے۔اس کے ساتھ ہی میں ایک بار پھر بے ہوشی کی آغوش میں کھو گیا۔اس بار جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو عجیب سی کیفیت میں مبتلا پایا۔ میرا دماغ تو ہوش میں آ گیا لیکن میرا جسم بدستور بے حس رہا۔میرے کان بالکل ٹھیک کام کررہے تھے لیکن میں کوشش کے باوجود اپنی آنکھیں نہ کھول سکا۔میں نے کسی کے بات کرنے کی آواز سنی۔شروع شروع میں تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا پھر الفاظ میری سمجھ میں آنے لگے۔

'میں نے ابتدائی طور پر اسے سودے بازی پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن یہ نہیں مانا۔''میں رفاقت علی کی آواز کو ایک لمحے میں پہچان گیا۔''یہ تو ماننے کو تیار ہی نہیں ہے کہ اس کا تعلق سی آئی اے یا ایف بی آئی والوں سے ہے۔''

''یہ مانے گا بھی نہیں۔''میں نے کسی کی گونج دار آواز سنی۔''میں نے اپنے تمام ذرائع سے معلومات اکھٹی کروائی ہیں۔ مجھے ہر ممکن طریقے سے یقین دلایا گیا ہے کہ سی آئی اے یا ایف بی آئی والوں نے کوئی بندہ ملتان نہیں بھیجا ہے۔رہی پولیس کی بات تو وہ لوگ تو کوئی کاروائی کرنے سے پہلے ہی مجھے اطلاع دے دیتے ہیں۔یہ بندہ نہ تو سی آئی اے اور ایف بی آئی والا ہے اور نہ ہی پولیس سے تعلق رکھتا ہے۔''

''تو پھر کون ہے ملک کریم؟''

''یہی تو سوچنے والی بات ہے رفاقت علی۔''میں نے وہی گونج دار آواز پھر سنی۔''مجھے تو یہ کوئی بہت اونچا معاملہ لگتا ہے۔''

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا ملک کریم۔''

''میرا مطلب یہ ہے خان رفاقت علی کہ تم اس جوان کے قد بت' چہرے مہرے کا جائزہ لو۔اس کا فولادی جسم دیکھو۔کیا یہ تمہیں کوئی عام سا' معمولی سا سرکاری کارندہ لگتا ہے؟''

''میں تمہارا مطلب اب بھی نہیں سمجھا۔''خان رفاقت علی نے اعتراف کیا۔

''میں کہنا یہ چاہتا ہوں خان رفاقت علی کہ یہ کوئی عام سا کارندہ نہیں ہے بلکہ اعلی ترین تربیت یافتہ سیکرٹ ایجنٹ ہے۔''

''سیکرٹ۔۔۔ایجنٹ۔''رفاقت علی کی آواز حلق میں اٹکنے لگی۔

''ہاں سیکرٹ ایجنٹ! بھارت کے جاسوسی ادارے را کا بھیجا ہوا سیکریٹ ایجنٹ! مجھے اچٹتی سے اطلاع ملی تھی کہ بھارت اپنے شہریوں کی برآمدی کے لیے پاکستان کا اندر کوئی بڑی کاروائی کرنے والا

ہے۔اس بندے کی آمد اسی کاروائی کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ یہ تمہارے بنگلے تک پہنچا کیسے؟اس کا تو سیدھا سیدھا مطلب یہ ہے کہ اسے پہلے سے علم تھا کہ منوج سنگھ تمہارے بنگلے میں روپوش ہے۔یہ شاید اسی کی ٹوہ میں تمہارے بنگلے میں گھسا تھا۔''

'؟بظاہر تو یہی لگتا ہے لیکن اب اس کا کیا کیا جائے؟''رفاقت علی نے پوچھا۔

''میرے اندازے کے مطابق یہ تنہا ہی ہے۔یہ ایک آدھ گھنٹے تک ہوش میں آجائے گا۔ہم اس سے معلومات حاصل کریں گے کہ یہ ہمارے متعلق کیا کیا کچھ جان چکا ہے۔اس سے معلومات حاصل کرنے کے بعد ہم کسی نہ کسی طرح اس سے نجات حاصل کرلیں گے۔''

''لیکن اس طرح تو ہمیں ان لوگوں سے کھلی جنگ مول لینی پڑے گی۔را کا شمار دنیا کی خطرناک ترین ایجنسیوں میں ہوتا ہے۔وہ تو ہمارے پرخچے اڑادیں گے۔''رفاقت علی کی آواز میں خوف کی لرزش مجھے واضح طور پر محسوس ہوئی۔

''اس کے علاہ ہمارے پاس کوئی اور صورت ہے بھی نہیں۔بہرحال پہلے مرحلے پر تو ہمیں اس زبان کھلوانی ہے۔منوج سنگھ کو میں نے ایسی خفیہ جگہ منتقل کروایا ہے کہ کسی کے باپ کو بھی اس کا پتا نہیں چل سکتا۔اگر یہ مزید کچھ دیر تک ہوش میں نہ آئے تو اسے بے ہوشی دور کرنے والا انجکشن لگا دینا۔''

رفاقت علی نے مجھے جھنجوڑ کر ہوش میں لانے کی کوشش کی لیکن میرے جسم میں ذرا سی بھی جنبش نہ ہوئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا پورا جسم مفلوج ہوچکا ہے۔رفاقت علی نے ناکام ہوکر ملک کریم کو کہا۔

''یہ تو بالکل ہی ریت کی بوری ہو رہا ہے۔لگتا ہے کہ دوا کی ڈوز کچھ زیادہ ہوگئی ہے۔''

''تو مجھے مروائے گا رفاقت علی۔تیری یہ ادھوری ڈاکٹری کسی دن میرا کباڑا کردے گی۔ارے بھائی اسے ہوش میں لاؤ۔اگر یہ ہمیں سب کچھ بتائے بغیر مرگیا تو سمجھو ہماری عبرت ناک موت کا سامان بھی تیار ہوگیا۔خدا کے لیے اس کا کچھ کرو۔''

''اچھا اچھا تم ذرا ٹھہرو۔میں اپنی گاڑی میں سے میڈیکل بکس لے کر آتا ہوں۔تم فکر نہ کرو یہ ابھی ٹھیک ہوجائے گا۔'' میں نے رفاقت علی کے دور جاتے قدموں کی آواز سنی۔ملک کریم نے دھیمی آواز میں اسے ایک بے حد غلیظ گالی دی۔''بڑا ڈاکٹر بنا پھرتا ہے۔''وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔اس نے میری دائیں آنکھ کا پپوٹا ہٹا کر میری آنکھ میں غور سے دیکھا۔ مجھے اس کا بھری بھرکم چہرہ اپنے چہرے کے بہت قریب نظر آیا۔اس کی مرطوب سانس مجھے اپنی گردن پر محسوس ہوئی۔اپنے چھوٹے بھائی کے برعکس وہ کافی موٹا تازہ شخص تھا۔اسے میری آنکھوں میں جانے کیا نظر آیا۔ اس نے برا سا منہ بنا کر میری آنکھ دوبارہ بند کردی۔''پتا نہیں کم بخت کہاں سے آن مرا ہے۔''وہ ایک بار پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

چند منٹ بعد رفاقت علی لوٹ آیا۔میں نے میڈیکل بکس کھلنے کی آواز سنی۔

''اچھی طرح سوچ سمجھ کر انجکشن لگانا رفاقت علی' ایسا نہ ہو کہ یہ بندہ تمہاری ڈاکٹری کی نذر ہو جائے۔''ملک کریم نے طنزیہ لہجے میں رفاقت علی کو تنبیہہ کی۔

’اب اتنا شرمندہ نہ کرو بھائی کریم۔ پہلے کبھی ایسی ویسی کوئی بات ہوئی ہے۔ تم بھی ایک بات کو پکڑ کر بیٹھ جاتے ہو۔“

”اچھا اچھا تم اپنا کام کرو۔“ ملک کریم نے اسے ہدایت کی۔

مجھے اپنے بازو میں بہت خفیف سے چبھن کا احساس ہوا۔ رفاقت علی نے سرنج کی دوا میرے بازو میں اتار دی۔

”بس اب اسے ہوش آجائے گا۔“ اس نے مطمئن لہجے میں کہا۔ ”ویسے تمہیں یقین ہے کہ یہ جگہ بالکل محفوظ ہے؟ ایسا نہ ہو کہ اس کے ساتھی اس کے پیچھے پیچھے یہاں پہنچ جائیں۔“

”میں ایسا کچا کام نہیں کرتا رفاقت علی۔ جب اسے یہاں لایا گیا تو میرے کارندے گردوپیش کی کڑی نگرانی کر رہے تھے۔ کسی نے ہمارا پیچھا نہیں کیا۔ یہ گودام میں نے اسی طرح کے مواقع کے لیے خریدا ہے۔ میری اجازت کے بغیر یہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ اس انجکشن کا اثر کتنی دیر میں ہوگا؟“

”آدھے گھنٹے تک یہ مکمل طور پر ہوش میں آجائے گا۔“ رفاقت علی نے کہا۔

”ملک کریم تم نے میری مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ وعدہ ابھی تک وعدہ ہی ہے۔“

”کون سا وعدہ رفاقت علی؟“ ملک کریم نے پوچھا۔

”تم نے کہا تھا کہ تم میرے مرحوم بھائی برکت علی کی حویلی کا مجھے قبضہ دلوا دو گے اس بات کو اتنے دن گزر گئے لیکن تم نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا۔ وہ حرافہ میرے بھائی کی دولت اور جائیداد پر سانپ بنی بیٹھی ہے۔“

”ارے یار پہلے اس مصیبت سے تو جان چھوٹ جائے پھر تمہارے لیے بھی کچھ کریں گے لیکن یار تم ہو ایک نمبر کے بے کار آدمی۔ جعلی دوائیاں بیچ بیچ کر تم نے کروڑوں روپے کما لیے لیکن ایک معمولی سی عورت نے تمہیں تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ لاکھ دو لاکھ خرچ کرو اور اس کا پتا صاف کرا دو۔“

”وہ کوئی معمولی عورت نہیں ہے ملک کریم۔ اس نے اپنے پاس بے شمار مسلح کارندوں کی فوج جمع کر رکھی ہے۔ اس کے علاوہ ایک بے حد خطرناک بدمعاش اکی اس کا محافظ بنا ہوا ہے۔ میں نے دوبارا سے قتل کرانے کی کوشش کی لیکن دونوں بار ناکام رہا۔“

”اچھا اب اس قصے کو دفع کرو۔ میرے خیال میں اب اسے ہوش آرہا ہے۔“ ملک کریم نے صحیح کہا تھا۔ انجکشن لگنے کے کچھ ہی دیر بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم میں خون کی گردش بحال ہو رہی ہے۔ رفتہ رفتہ میرے جسم میں زندگی کی رمق لوٹنے لگی۔ میرے منہ سے کرب ناک کراہ خارج ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ ابتدائی طور پر میں نے یہی ظاہر کیا کہ مجھے سب کچھ دھندلا نظر آرہا ہے۔ رفاقت علی نے میرے گال تھپتھپائے میں نے کراہتے ہوئے کمزور لہجے میں پانی مانگا۔ رفاقت علی نے پلاسٹک کی بوتل سے مجھے پانی پلایا۔ پانی حلق سے نیچے اترتے ہی میرا جسم پوری

طرح اپنی اصل کیفیت میں واپس آگیا۔ میں نے نحیف آواز میں پوچھا۔

”مم۔۔۔ میں کہاں ہوں؟“ مجھے فوری طور پر احساس ہوا کہ میرا جسم چمڑے کی چوڑی بیلٹوں کے ذریعے ایک میز کے ساتھ جکڑا ہوا ہے۔

”تم جہاں کہیں بھی ہو بالکل محفوظ ہو۔“ ملک کریم نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”اس کے ساتھ ہی تم یہ بات اپنے ذہن میں اچھی طرح بٹھا لو کہ اب تمہیں ہمارے شکنجے سے کوئی نہیں چھڑا سکتا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تم سے جو کچھ پوچھا جائے اس کا صحیح صحیح جواب دو ورنہ ہم تمہارا وہ حشر کریں گے کہ تمہیں قبر میں بھی چین نہیں ملے گا۔“

”تم کون ہو بھائی اور مجھے کیوں دھمکا رہے ہو؟“ میں نے معصوم لہجے میں دریافت کیا۔ میری بات سن کر ملک کریم بری طرح تلملا اٹھا۔

رفاقت علی نے کہا ”یہ مجھے بھی ایسے ہی ان جان بن کر دکھا رہا تھا‘ کہتا ہے میں تو پارک میں سو رہا تھا۔ تم لوگ خواہ مخواہ مجھے یہاں پکڑ کر لے آئے ہو۔“

”میں سچ تو کہہ رہا ہوں بھائی۔ میں تو اس اسکول کے سامنے بنے ہوئے چھوٹے سے پارک میں سو رہا تھا بلکہ میرے ساتھ میرا سامان بھی تھا۔“ میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو تم پارک میں سو رہے تھے۔ تم بالکل معصوم ہو لیکن ذرا یہ تو بتاؤ کہ یہ جرمن پستول تمہارے پاس کہاں سے آیا۔“ ملک کریم نے اپنی جیب سے میرا اوالتھر نکالا اور اسے میرے چہرے کے سامنے گردش دی۔ میں نے غور سے پستول کو دیکھا۔

”میرا اس پستول سے کیا واسطہ؟ میں نے تو آج تک اسلحے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں بھوک سے مرا جا رہا ہوں۔“

”ہوں! لگتا ہے تم ایسے نہیں مانو گے۔ ہمیں تم پر اپنی مہارت آزمانا ہی پڑے گی۔“ ملک کریم نے مرتعش لہجے میں کہا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ تمہیں تھرڈ ڈگری برداشت کرنے کی خصوصی تربیت دی گئی ہوگی لیکن ہم بھی اس سلسلے میں دو چار ہاتھ جانتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم کس حد تک قوت برداشت کے مالک ہو۔“

”تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم کیوں مجھ پر تشدد کرنا چاہتے ہو؟“ میں نے بے چارگی کے عالم میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”بس اب تم اپنی ڈرامے بازی چھوڑ دو اور ہمارے ڈرامے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ ملک کریم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ میں بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ میں اس کے سوالات کا کیا جواب دیتا؟ اسے کیا بتاتا کہ میں کون ہوں اور کس نیت سے رفاقت علی کے بنگلے میں گھسنے پر مجبور ہوا۔ اگر میں یہ سب کچھ بتا بھی دیتا تو کیا فرق پڑتا۔ اول تو وہ یقین ہی نہ کرتے اور اگر یقین کر بھی لیتے تو بھی وہ کسی حالت میں مجھے زندہ نہ چھوڑتے۔ اب تو انہیں یقین ہو چکا ہے کہ میں ان کے تمام کالے کرتوتوں سے واقف ہو چکا ہوں۔ انہیں تو بس یہی فکر ہے کہ میں اور میرے فرضی سرپرست ان کے بارے میں کیا کیا جانتے ہیں تاکہ

یہ سب کچھ جان کر یہ اپنے دفاع کی تیاری کر سکیں۔ اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ میں بالکل تنہا' بے در' بے گھر شخص ہوں تو یہ ایک لمحے کے لیے بھی مجھے زندہ نہیں رکھیں گے۔ میری زندگی کے بچنے کی یہی صورت ہے کہ میں اپنی زبان بند رکھوں۔ جب تک میری زبان بند رہے گی۔ یہ مجھے زندہ رکھنے پر مجبور ہوں گے۔ ورنہ یہ تو میں اپنے کانوں سے سن ہی چکا ہوں کہ یہ میری زبان کھلوانے کے ساتھ ہی مجھے میرے عبرت ناک انجام تک پہنچا دیں گے۔ میں نے اپنی تمام تر ہمتیں اور حوصلے یکجا کیے اور ملک کریم کا مشق ستم بننے کے لیے تیار ہو گیا۔ مجھے صرف ایک موقع کی تلاش تھی اگر مجھے وہ موقع مل جاتا تو میں یہ بساط الٹ کر رکھ دیتا۔ اس موقع کی امید وانتظار میں مجھ پر جو گزری وہ میرا نصیب۔

اچانک مجھے اپنے گھٹنے کے جوڑ سے ذرا نیچے پنڈلی پر ایک مضبوط گرفت محسوس ہوئی۔ میں نے چونک کر اپنے پیروں کی طرف نظر ڈالی۔ مجھے وہاں ملک کریم کھڑا نظر آیا۔ اس نے میرے گھٹنے سے ذرا نیچے چمڑے کی تقریباً ایک انچ چوڑی بیلٹ کس کر باندھ دی۔ مجھے لگا کہ میری پنڈلی آہنی شکنجے میں پھنس گئی ہے۔ اس نے بیلٹ کو کسنے میں اپنی پوری قوت صرف کر دی تھی۔ اس نے بالکل ویسی ہی بیلٹ میری دوسری پنڈلی میں بھی باندھ دی۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ بڑے اطمینان سے رفاقت علی کے ساتھ والی کرسی پر جا بیٹھا۔

میں ابھی اس سارے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اس کی کاروائی کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے پیروں کو خون کی سپلائی بالکل رک گئی ہے۔ گھٹنوں سے نیچے نیچے میرے دونوں پاؤں سن ہوتے چلے گئے۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ میرے پیر بے جان ہو گئے ہیں۔ میں نے اپنے دائیں پیر کے پنجے کو حرکت دینا چاہی۔ میرے پیر میں بے حد تیز سنسناہٹ پیدا ہوئی۔ اتنی تیز کہ میں بے اختیار اپنے پنجے کی حرکت روکنے پر مجبور ہو گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اگر میرے پیر کچھ دیر اور اسی طرح بندھے رہے تو وہ ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو جائیں گے۔

''خدا کا خوف کرو کیوں مجھ پردیسی پر ظلم کرتے ہو۔'' میں نے درد بھرے لہجے میں فریاد کی۔

''ابھی پتا چل جائے گا بچو کہ تم دیسی ہو یا پردیسی۔'' ملک کریم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میرے ہاتھوں اور پیروں کے گرد لپٹے ہوئے چمڑے کے بند اچھی طرح سے چیک کیے پھر وہ ایک کونے کی طرف بڑھا۔ جب وہ واپس لوٹا تو مجھے اس کے ہاتھ میں بید کی ایک باریک' لچک دار چھڑی نظر آئی۔ اس چھڑی کو ہاتھ میں تولتے ہوئے وہ میرے پیروں کی طرف آن کھڑا ہوا۔

''اب بھی سوچ لو جوان۔ کیا تم سچ بولنے پر راضی ہو۔'' اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ میں نے جواب میں کچھ نہ کہا۔

وہ چند لمحوں تک میری آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ میری جانب سے کوئی ردعمل نہ پا کر وہ ایک قدم پیچھے ہٹا۔ چھڑی فضا میں لہرائی۔ میرے کانوں نے شائیں کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی چھڑی پوری قوت

سے میرے دائیں پیر کے تلوے سے ٹکرائی۔ اف میرے خدا! مجھے لگا کہ ہزاروں وولٹ کرنٹ والا ننگا تار میرے تلوے سے ٹکرا گیا ہے۔ میرے پیر میں زبردست زناٹا پیدا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی سرد نوکیلے درد کی بے رحم لہر میرے تلوے سے بلند ہو کر میرے اعصاب کو تہس نہس کرتی ہوئی میرے دماغ سے جا ٹکرائی۔ کرب کی شدت سے میں بے اختیار تڑپ اٹھا۔ کوشش کے باوجود میں اپنے آپ پر قابو نہ پا سکا۔ میرے حلق سے اذیت ناک چیخ نکلی اور پورا گودام گونج اٹھا۔ میری آنکھیں کرب کی شدت سے آنسوؤں سے بھر گئیں۔ میرے پیروں کی جھن جھناہٹ اور اذیت کم ہوئی تو میں نے ملک کریم کو اپنے قریب کھڑے ہوئے دیکھا۔ مجھے اس کے چہرے سے عجیب سی ذہنی اذیت کے تاثرات جھلکتے محسوس ہوئے۔ جیسے اسے مجھ پر ہاتھ اٹھا کر خوشی نہ ہوئی ہو۔

''اب بھی مان جا جوان' کیوں اپنی جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دے میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں جان سے نہیں ماروں گا۔'' مجھے اس کے لہجے میں سچائی کی جھلک محسوس ہوئی۔ اسی وقت میں نے رفاقت علی کی آواز سنی۔

''یہ اس طرح ماننے والا نہیں ملک کریم۔ اس کی کھال بہت موٹی ہے۔ دو چار کرارے ہاتھ لگا دو اسے۔ اس کے بعد بات کرنا اس سے۔'' مجھے وہ اذیت پسندی کا مریض محسوس ہوا۔

''مجھے بات کرنے دو رفاقت علی۔ تم بیچ میں دخل مت دو۔'' ملک کریم نے ناگوار لہجے میں رفاقت علی کو جھڑک دیا۔ مجھے رفاقت علی سے شدید ترین نفرت محسوس ہوئی۔ میرا دل چاہا کہ اس کی گردن پکڑ کر شہ رگ میں دانت گاڑ دوں۔

ملک کریم چند لمحوں تک میرے جواب کا منتظر رہا۔ میری خاموشی نے اس کے چہرے پر مایوسی کی لہر دوڑا دی۔ اس نے گویا اپنے طیش کو دوبارہ خود پر طاری کرنے کی کوشش کی۔ اس کی یہ کوشش پوری طرح کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔

''تم کچھ دیر اور سوچ لو اس کے بعد میں تم سے بات کرتا ہوں۔'' ملک کریم نے دھیمے لہجے میں کہا۔ چند منٹ تک وہاں تناؤ آمیز سکوت طاری رہا۔ ملک کریم نے رفاقت علی کے کان میں کوئی سرگوشی کی' جواب میں رفاقت علی نے تیز لہجے میں کہا۔

''ارے یار ملک کریم تم وقت بہت ضائع کرتے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے شام تک یہ سدھر جائے گا؟ تم سونٹی مجھے دو۔ میں اس کی زبان کھلواتا ہوں۔'' ملک کریم نے جو کچھ کہنا چاہا لیکن اس لمحے رفاقت علی مجھے مکمل طور پر اس پر حاوی نظر آیا۔ اس نے چھیننے کے انداز میں ملک کریم کے ہاتھ سے چھڑی لی اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا میرے پیروں کے پاس آن کھڑا ہوا۔

''کیوں بے نہیں بتائے گا تو کون ہے؟'' اس نے اشتعال انگیز لہجے میں پوچھا۔

''نہیں بتاؤں گا۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ فضا میں شائیں کی کریہہ آواز لہرائی اور بید کی لچک دار چھڑی پوری قوت سے میرے دائیں پاؤں کے تلوے سے ٹکرائی۔ میرے وجود پر ایک اور قیامت گزر

گئی لیکن اس بار میں ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس دردناک عذاب کے لیے تیار کر چکا تھا۔ لہٰذا میرے سینے سے ابھرنے والی چیخ میرے حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ سختی سے بھینچے جبڑے اس چیخ کے لیے سدِ راہ بن کر رہ گئے۔ میں نے قہر آلود نظروں سے رفاقت علی کو گھورا۔

''بتا تو کون ہے؟ تو نے میرے گھر میں گھسنے کی جرات کیسے کی؟''

''نہیں بتاؤں گا۔'' میں نے اپنے وجود میں ابھرنے والی درد کی قیامت خیز لہروں کو برداشت کے سمندر میں غرق کرتے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا۔ میرے اس انداز نے اسے بری طرح چڑا دیا۔

''نہیں بتائے گا؟'' اس نے بید کی چھڑی ہوا میں لہرائی اور میرے پیر کے شل شدہ تلوے پر ماری۔ مجھے نئے سرے سے قیامت خیز اذیت کا تجربہ ہوا۔

''نہیں بتائے گا؟'' اس نے پھر پوچھا۔ میں نے محض انکار میں گردن ہی ہلا سکا۔ میری نفی میں ہلتی ہوئی گردن کو دیکھ کر اس پر گویا دیوانگی کا دورہ پڑ گیا شائیں۔۔۔ شڑاپ۔۔۔ شائیں۔۔۔ شڑاپ۔۔۔ لچک دار چھڑی بار بار فضا میں لہراتی اور میرے تلوؤں میں پگ بھر دیتی۔ اذیت سے بے حال ہو کر میں ایک بار پھر چیخ اٹھا۔

''ہاں اب بتا تو کون ہے؟ کس نے بھیجا ہے تجھے؟''

''میں تیری موت ہوں کتے کی نسل اور تجھے جہنم میں پہنچانے کے لیے آیا ہوں۔'' میں حلق کی گہرائیوں سے چیخا۔ رفاقت علی ایک لمحے کے لیے جھجکا اور پھر کسی بدروح کے مانند مجھ پر پل پڑا۔

''تو مجھے مارے گا۔ مجھے مارے گا تو؟'' اس نے میری تلوؤں پر بید کی چھڑی کی بارش کر دی۔

''ہاں میں تجھے ختم کر دوں گا۔ میں تجھے ایسی موت ماروں گا کہ لوگ تجھ سے عبرت پکڑیں گے۔ میں تیرا خون پی جاؤں گا۔ جلاد کی اولاد۔'' میں جنون کی سی حالت میں چیختا چلا گیا۔ اس لمحے میرے دماغ نے درد اور اذیت کے احساس کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔

بس کرو رفاقت علی بس کرو بہت ہو گیا۔ یہ مر جائے گا۔''

''مرتا ہے تو مر جانے دو۔ ہمیں کون سا اس کا اچار ڈالنا ہے۔ تم کہو تو ابھی اسے زہر کا انجکشن لگا دیتا ہوں۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے کی بانسری۔'' رفاقت علی نے کہا۔

''تم پر تو ہر وقت خون سوار رہتا ہے رفاقت علی۔ تمہیں زہر کا انجکشن لگانے کا بہت شوق ہے۔ کبھی یہ تو دیکھ لیا کرو کہ کسی بندے کا زندہ رہنا زیادہ فائدے مند ہے یا اس کا مر جانا۔'' ملک کریم نے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔

''تو پھر اس کا کیا کریں؟ ویسے یہ بات تو پکی ہے یہ زیادہ زبان کھولنے والا تو نہیں۔''

''ابھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ شام کو آ کر اس سے مزید بات کریں گے۔ ابھی تم اسے بے ہوشی کا انجکشن لگا دو۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' رفاقت علی نے بادل نخواستہ کہا۔ اس نے اپنا میڈیکل بکس کھولا اور ایک

انجکشن تیار کرنے لگا۔ اس اثنا میں ملک کریم نے میری پنڈلیوں سے چمڑے کی بیلٹیں کھول لیں۔

''مجھے بے ہوش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اس حالت میں تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہوں۔'' میں نے ملک کریم سے کہا۔

''نہیں میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ میں کسی کو تمہاری چوکی داری کے لیے چھوڑ کر نہیں جا رہا۔ بھولے بھٹکے سے کسی نے تمہاری آواز سن لی تو میں مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔'' ملک کریم نے جانے کس دھن میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ اسی اثنا میں رفاقت علی نے بے ہوشی کا انجکشن بڑی بے رحمی سے میرے بازو میں بھونک دیا۔ کچھ ہی دیر بعد میری آنکھوں کے سامنے دھند چھانے لگی۔ میرا سر زور سے چکرایا۔ میں نے بے اختیار آنکھیں بند کر لیں۔ میں دوبارہ آنکھیں نہ کھول سکا۔ چند لمحوں کے بعد مجھے اپنے گردوپیش کی کوئی خبر نہ رہی۔

مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں بدستور اسی کاٹھ کباڑ سے اٹے گودام میں' لکڑی کی بہت بڑی میز پر جکڑا ہوا پڑا ہوں۔ کونے کھدرے سے جھلکنے والی مدھم روشنی سے میں نے اندلذہ لگایا کہ مغرب کا وقت ہو رہا ہے۔ میرے پیروں کے سوجے ہوئے تلوؤں نے اپنی تباہ حالی کی داستان الم درد کی لہروں کے ذریعے بیان کرنا شروع کی۔ ادھر میرے خالی پیٹ نے اپنے اندر بھڑکتی بھوک کی آگ کا نوحہ سنایا۔ میرے سوکھے ہوئے حلق نے مجھے یاد دلایا کہ اسے پانی کا ایک قطرہ بھی چکھے ہوئے چوبیس گھنٹے سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ چت لیٹے لیٹے میری کمر تختہ ہو رہی تھی۔ میں نے کوشش کر کے اپنا ذہن ان عذابوں کی طرف سے ہٹا لیا۔ میں نے سوچا کہ ابھی رفاقت علی اور ملک کریم آنے والے ہوں گے۔ مجھے اپنے بچاؤ کی تیاری کر لینا چاہیے۔ پھر مجھے اپنی سوچ پر خود ہی ہنسی آنے لگی۔ میں چمڑے کے ان موٹے موٹے بندھنوں میں جکڑا ہوا کیا تیر مار سکتا ہوں؟ میری تو صرف اور صرف زبان آزاد ہے۔ اس زبان سے میں ان کا کیا بگاڑ سکتا ہوں؟ زیادہ سے زیادہ میں انہیں موٹی موٹی گالیاں دے لیتا لیکن اس صورت میں تو میری موت اور جلدی مجھے گلے لگا لیتی۔

یک لخت میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نہ میں ملک کریم کو اپنے اعتماد میں لے کر اسے سچی بات بتا دوں۔ رفاقت علی کو نہیں صرف ملک کریم کو اور وہ بھی پورا نہیں آدھا سچ۔ یعنی یہ کہ میں اکی کے حکم کے تحت' اپنے باپ کو بچانے کی خاطر مجبوراً رفاقت علی کو قتل کرنے ملتان آیا ہوں۔ دیگر یہ کہ میں نے اول تو ایسی کوئی خاص بات سنی ہی نہیں اور اگر سنی بھی ہے تو اسے مجھ سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ پولیس کے پاس جا کر ملک کریم اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں بتانے کی صورت میں اپنی گردن بھی پولیس کے پھندے میں پھنس سکتی ہے کیونکہ میرا اپنا دامن بھی جرائم کے داغوں سے آلودہ ہے۔

جوں جوں میں یہ سب سوچتا گیا میرے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑتا گیا کہ میرے لیے صحیح لائحہ عمل یہی ہے۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ میں ملک کریم سے اسی انداز میں بات کروں گا۔ اگر وہ میری بات کا

یقین کر لیتا تو یقیناً وہ وہ میرے معاملے میں اپنا رویہ تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ مجھے یقین تھا کہ میں ملک کریم پر اپنے بیان کی سچائی ثابت کر دوں گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ میں اسے رفاقت علی سے علیحدگی میں یہ سب باتیں بتا سکوں۔ اگر ان باتوں کی رفاقت علی کے کانوں میں بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ مجھے زندگی سے محروم کرنے پر تل جاتا۔ وہ جعلی دوائیاں فروخت کرنے والا ادھورا ڈاکٹر۔ مجھے اس سے شدید ترین نفرت محسوس ہوئی۔

گودام میں اندھیرے کی چادر گہری سے گہری ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ رات کا پہلا پہر بھی گزر گیا لیکن رفاقت علی اور ملک کریم میں سے کوئی بھی وہاں نہ آیا۔ میری بھوک برداشت سے باہر ہونے لگی۔ میرا دل چاہا کہ اپنے بدن سے لپٹے ہوئے چمڑے کے ان موٹے موٹے پٹوں کو چبا کر کھا جاؤں لیکن چمڑے کے تمام بند میرے دانتوں کی پہنچ سے باہر ثابت ہوئے۔ میں نے چمڑے کے بندھنوں کے خلاف ایک بار پھر زور آزمائی کی لیکن ناکام رہا۔ مجھے میز کے نیچے نصف شدہ فولادی حلقوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی لیکن بندھن ٹس سے مس نہ ہوئے۔ تھک ہار کر میں نے یہ کوشش بھی ترک کر دی۔ عین اسی وقت مجھے اپنے سفید رومال کا خیال آیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ میری شرٹ کے نیچے میری دائیں کلائی پر بندھا ہوا ہے۔ اس مصیبت کے وقت میں بھی وہ میرے کسی کام نہیں آ رہا ہے۔ میری نتھنوں نے مشک عنبر کی وہ مخصوص مہک سونگھنے کی کوشش کی لیکن مجھے وہ مہک بالکل محسوس نہ ہوئی۔ اس صورت حال سے میں نے اندازہ لگایا کہ مجھے فی الحال کسی قسم کی خارجی امداد کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جلد ہی محض اپنی کوششوں سے اس تکلیف دہ صورت حال سے چھٹکارا پانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

تقریباً آدھی رات کے وقت میں گیٹ پر ہونے والی کھٹ پٹ کی آوازیں سن کر چونک پڑا۔ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ میں نے کسی کے چلنے کی آہٹ سنی۔ فضا میں ہلکی سی آواز ابھری۔ اس کے ساتھ ہی میرے سر کے عین اوپر ایک بلب روشن ہو گیا۔ میں نے آنے والی شخصیت پر نظر ڈالی وہ ملک کریم تھا۔ یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ وہ تنہا ہی ہے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ بری طرح چونک پڑا۔

”ارے تمہیں ہوش آ گیا؟ رفاقت علی تو کہہ رہا تھا کہ تمہیں صبح سے پہلے ہوش نہیں آئے گا اور تمہیں ہوش میں لانے کے لیے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے پڑیں گے۔“

”میرے بارے میں اکثر لوگوں کے اندازے غلط ہو جاتے ہیں ملک کریم۔ بالکل اسی طرح جیسے تم نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگا لیا ہے۔“ میں نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔ ملک کریم نے حیرانی کے عالم میں میرے چہرے پر نظر ڈالی۔

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکا ہوں۔ تم کون سے اندازے کی بات کر رہے ہو؟“

”مجھے مغرب کے وقت سے بھی پہلے ہوش آ گیا تھا۔ میں اس وقت سے لے کر اب تک اس صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ جس میں میری قسمت نے مجھے لا پھنسایا ہے۔ کافی سوچ بچار کے

بعد بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہیے۔“

”ہاں ہاں بتاؤ تم کیا بتانا چاہتے ہو؟“ ملک کریم نے بے صبری سے کہا۔ ”لیکن ٹھہرو پہلے میں تمہیں کچھ کھانے پینے کو دیتا ہوں۔ تاکہ تمہاری حالت بہتر ہو سکے۔“ ملک کریم کے ان الفاظ نے میرے وجود میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔

میں نے ملک کریم کا لایا ہوا ہلکا پھلکا کھانا کھایا اور جی بھر کے پانی پیا۔ مجھے اپنے وجود کی گم گشتہ توانائیاں لوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

”ہاں اب بتاؤ کہ سچ کیا ہے؟“ ملک کریم نے سوال کیا۔ میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

”پہلے تمہیں مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا کہ تم حقائق کو جانچے پرکھے بنا میرے بیان کی تردید نہیں کرو گے۔ تم یقین کرو یا نہ کرو میں تمہیں جو کچھ بتا رہا ہوں اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔“

”تم بتاؤ تو سہی جھوٹ سچ کا فیصلہ کرنا مجھے آتا ہے۔“

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ رفاقت علی سے تمہارے تعلقات کی کیا نوعیت ہے؟“ میں نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

”میں تمہارے اس سوال کا مقصد نہیں سمجھ سکا بہر حال رفاقت علی میرے ایک دو کاروباروں میں شراکت دار ہے۔ اس کے علاوہ ہماری سیاسی وابستگی بھی ایک ہی جماعت سے ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے درمیان دوستانہ تعلقات بھی ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ رفاقت علی کا ذاتی دشمن تمہارا بھی دشمن ہے۔“

”نہیں یہ ضروری تو نہیں البتہ اگر وہ مجھ سے مدد کی درخواست کرے تو میں اس کے بارے میں غور کر سکتا ہوں لیکن تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”اس لیے کہ میں تمہیں جو کچھ بتانے والا ہوں اس کا تعلق رفاقت علی کی ذات سے ہے۔“

”رفاقت علی کی ذات سے؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں رفاقت علی کی ذات سے۔ دراصل بات یہ ہے کہ میں اسی کو قتل کرنے کی نیت سے اس کے بنگلے میں داخل ہوا تھا۔ قسمت کی بات ہے کہ ابھی میں بنگلے کے اندرونی حصے میں گھسنے کا راستہ ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ خدا جانے کس طرح تم لوگوں نے اچانک مجھے دبوچ لیا۔“ میری بات سن کر ملک کریم کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

”تم رفاقت علی کو کیوں قتل کرنا چاہتے تھے؟ تمہاری اس سے کیا دشمنی ہے؟ مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ“ اس نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

”سچی بات تو یہ ہے کہ میری اس سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ مجھے اسے قتل کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور میں اس حکم کی تعمیل کے لیے مجبور تھا۔“

”تمہیں یہ حکم کس نے دیا تھا؟“

''یہ ایک لمبی داستان ہے ملک کریم۔ پہلے میں تمہیں اپنے بارے میں مختصراً بتا دوں۔ میرا نام ذوالفقار علی خان ہے۔ میرا پیشہ چوری چکاری اور نقب زنی ہے۔ میں اپنے باپ کے ساتھ مل کر وارداتیں کرتا ہوں۔''

''تمہارا باپ؟'' ملک کریم نے حیرانی سے دہرایا۔

''ہاں میرا باپ' وہ دن کے وقت فقیر کے بھیس میں مختلف مال دار گھروں کو تاڑتا رہتا ہے۔ رات کو ہم مل جل کر کسی ایسے ہی گھر کا انتخاب کرتے ہیں اور پھر کسی مناسب وقت پر اس گھر کا صفایا کر دیتے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے تم رفاقت علی کے بنگلے میں بھی ڈکیتی کی نیت سے داخل ہوئے تھے لیکن تمہارا باپ۔۔۔''

''نہیں تم غلط سمجھے ہو۔ دراصل میں تمہیں بتانا بھول گیا کہ میں ڈیرہ غازی خان سے یہاں آیا ہوں۔ یہ تمام وارداتیں ہم نے اس علاقے میں کی ہیں۔ تو ہوا یوں کہ میرے باپ نے ایک گاؤں میں واردات کی نیت سے ایک حویلی تاڑی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس حویلی سے لمبا مال ملنے کی امید ہے۔ ہم دونوں نے مل کر منصوبہ بندی کی اور ایک رات اس حویلی میں گھس گئے۔''

''پھر کیا ہوا؟'' ملک کریم نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ہم کسی نہ کسی طرح حویلی کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔ حویلی میں گھسنے کے بعد ہم مال ڈھونڈنے لگے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ عین اسی وقت حویلی میں جگار ہو گئی۔ میں نے اور میرے باپ نے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ اس کشمکش میں میرے ہاتھوں حویلی کا ایک کارندہ مارا گیا۔ میں اور میرا باپ حویلی کے کارندوں کے ہاتھوں پکڑے گئے۔ ان لوگوں نے ہمیں پکڑ کر ایک تہ خانے میں ڈال دیا۔ ہم دونوں کی جان نکلی جا رہی تھی کیونکہ اس سے پہلے بھی مختلف وارداتوں کے دوران ہمارے ہاتھوں کئی افراد قتل ہو چکے تھے۔ اگر وہ لوگ ہمیں پولیس کے حوالے کر دیتے تو عدالت ہمیں سیدھا پھانسی پر لٹکا دیتی۔ ہم تین دن تک تہ خانے میں بند رہے تھے۔ چوتھے دن ایک شخص اکی نے ہم سے بات کی۔''

''اکی۔ تم کون سے اکی کی بات کر رہے ہو؟''

''تم شاید اکی کو جانتے ہو گے۔ وہ رفاقت علی اور اس کے مرحوم بھائی برکت علی کا پھوپھی زاد بھائی ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تہ خانے میں اکی ہم سے ملنے آیا۔ اس کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ ہم مرحوم سردار برکت علی کی حویلی میں قید ہیں۔ میں نے پوچھا کہ تم لوگوں نے ہمیں پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا؟ ہمیں اس تہ خانے میں کیوں قید رکھا ہے؟ اس نے کہا کہ وہ ہم دونوں کو پہچان چکا ہے۔ اگر اس نے ہم دونوں کو پولیس کے حوالے کر دیا تو ہم دونوں پھانسی چڑھ جائیں گے۔ میں نے پوچھا کہ تم ہم لوگوں سے کیا چاہتے ہو۔ اس نے کہا کہ وہ مجھ سے ایک سودے بازی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اس سے اس

سودے بازی کی شرائط پوچھیں۔ اس نے مجھے رفاقت علی کے متعلق بتایا کہ وہ اپنے بھائی یعنی سردار برکت علی کی بیوہ کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ اکی نے کہا کہ اگر میں رفاقت علی کو قتل کر دوں تو وہ میرے باپ کو آزاد کر دے گا اور ہم دونوں کو پچاس ہزار روپے بھی ملیں گے۔ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ مجھے اور میرے باپ کو پولیس کے حوالے کر دے گا۔ میں نے حویلی کے جس کارندے کو قتل کیا ہے صرف اسی کے قتل کے سلسلے میں مجھے اور میرے باپ کو سزائے موت مل جائے گی۔ مجھے اپنی اور اپنے باپ کی زندگی سے بے حد محبت ہے۔ چنانچہ میں نے بادل نخواستہ اس کام کی ہامی بھر لی۔ اس طرح رفاقت علی کو قتل کرنے ملتان پہنچ گیا۔''

''لیکن یہ اتنا قیمتی پستول تمہارے پاس کہاں سے آیا؟ کیا یہ اکی نے تمہیں دیا تھا؟''

''یہ میرا پستول ہے۔ مجھے ہتھیار جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔ یہ پستول میں نے بلوچ قبائلی علاقے سے بہت بھاری رقم کے عوض خریدا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے تمہارا کسی ملکی یا غیر ملکی ایجنسی سے کوئی تعلق نہیں ہے؟''

''توبہ کرو بھائی' میں تو ایک نیم خواندہ سا آدمی ہوں۔ یہ حلیہ تو میں نے اپنی شناخت چھپانے کے لیے بدلا ہے۔ میں تو خود پولیس والوں سے چھپتا پھرتا ہوں۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے رفاقت علی کے بنگلے میں گھسنے کے بعد میرے بھائی اور میرے مہمان کے درمیان کیا باتیں سنی ہیں؟''

''میں وہ سب پوری طرح تو نہیں سن سکا البتہ وہ کچھ لوگوں کے اغوا کی باتیں کر رہے تھے جو مجھے پوری طرح سمجھ نہ آ سکیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم ہم لوگوں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے ہو۔'' ملک کریم نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

''وہ کیسے بھائی؟'' میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے کہا نا کہ میں خود پولیس سے چھپتا پھرتا ہوں پھر میں تم لوگوں کی مخبری کیسے کر سکتا ہوں۔''

''میں تمہارب باتوں پر اتنی آسانی سے تو اعتبار نہیں کر سکتا۔''

''ٹھیک ہے تم جس طرح چاہو' اپنا اطمینان کر سکتے ہو بلکہ رفاقت علی بھی باتوں باتوں میں میری کہی ہوئی کئی باتوں کی تصدیق کر سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس نے دو بار اپنی بھابھی کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ ایک بار اسے کھانے میں زہر دے کر ہلاک کرنا چاہا' دوسری بار اس کے بستر میں زہریلا سانپ چھوڑ دیا گیا۔ بلکہ میں تو اس کے مرحوم بھائی کے چیدہ چیدہ کارندوں کے نام اور حلیے بھی بتا سکتا ہوں۔''

''تمہاری باتوں میں وزن ہے ذوالفقار علی خان۔ میں تمہاری بیان کردہ باتوں کی تصدیق کروں گا۔ اگر تم سچے نکلے تو میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔ مجھے رفاقت علی کے ذاتی معاملات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ محض اس کی وجہ سے میں تمہارے خون سے ہاتھ نہیں رنگ سکتا۔ اگر تم سچے نکلے تو میں تم سے اس

زیادتی کی معافی بھی طلب کرلوں گا جو میری وجہ سے تمہیں برداشت کرنا پڑی۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں اس زیادتی کا ہرجانہ بھی ادا کردوں گا۔"

"اس جہنمی عذاب کی تمہاری نظر میں کیا قیمت ہوسکتی ہے ملک کریم؟" میں نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کیا کاغذ کے چند رنگ برنگے ٹکڑے قیامت خیز اذیت کا بدل ہوسکتے ہیں؟" میری بات سن کر ملک کریم کا سر بے اختیار جھکتا چلا گیا۔

"تم صحیح کہہ رہے ہو۔ واقعی اس جان لیوا اذیت کی نفی لاکھوں روپے بھی نہیں کرسکتے۔ میں خود بھی اس عذاب ناک مرحلے سے گزر چکا ہوں۔ ان واقعات کو سالہا سال گزر چکے ہیں۔ ان جہنمی دنوں کی تلافی کے طور پر مجھے عزت، دولت، شہرت سب کچھ مل چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں ان دنوں کو کبھی نہیں بھلا سکتا۔ اب بھی کبھی کبھار مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرے تلووں میں آگ بھر گئی ہو۔ جیسے اب بھی میں برف کی سل پر بندھا ہوا چت لیٹا ہوں۔"

"لیکن تم نے کیا جرم کیا تھا ملک کریم؟ کس نے تم پر یہ تشدد کیا؟"

"میرا جرم حکومت وقت کی کھلم کھلا مخالفت تھا۔ مجھے سزا دینے والے خود قانون کے محافظ تھے۔" مجھے احساس ہوا کہ ملک کریم کے ذہن میں ایک بار پھر وہی اذیت آفریں لمحے ابھر آئے ہیں۔

"تو تمہیں سیاسی مخالفت کی بنا پر تشدد کا نشانہ بنایا گیا؟" میں نے تجسس لہجے میں پوچھا۔ ملک کریم نے خواب ناک لہجے میں کہا۔

"ہاں ان دنوں میں ایک نوجوان سیاسی کارکن تھا۔ پرجوش، سچا، کھرا، اپنی پارٹی کا وفادار اور مفلس کارکن۔ میری پارٹی کے لیڈر کی انقلاب آفریں جذباتی تقریروں نے مجھے دیوانہ بنا دیا۔ حکومت وقت کے خلاف میرے وجود میں نفرت کا طوفان پرورش پانے لگا۔ اپنے لیڈر کے نظریات اور خیالات کی ترویج و تبلیغ کو میں نے اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ نتیجتاً میں نے بہت کم وقت میں کارکنوں کے درمیان میں ایک اہم مقام حاصل کرلیا۔ دو ایک بار پارٹی کے لیڈر سے میری ملاقات ہوئی تو اس نے میری بھرپور حوصلہ افزائی کی۔" ملک کریم چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگیا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"پھر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ میری اہمیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور میں ایک چھوٹا موٹا لیڈر بن گیا۔ میری طرح کے مفلس افراد کو سیاسی پارٹیوں میں زیادہ سے زیادہ یہی مرتبہ ملا کرتا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میرا شمار بھی پارٹی کے چھوٹے موٹے لیڈروں میں ہونے لگا۔ میری پارٹی کا لیڈر اپنی ہر تقریر میں ظالم جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور وڈیروں کے خلاف اعلان جہاد کرتا۔ اس کی تقریر سن کر میرا دل کرتا کہ میں اس پر فدا ہوجاؤں کیونکہ مجھے لگتا کہ وہ میرے جیسے معاشی طور پر کچلے ہوئے لوگوں کے دل کی بات کررہا ہے۔ میں اپنی پارٹی کے جلسوں میں اکثر تقریریں کرتا۔ ان تقریروں میں، میں حکومت وقت پر بڑی بے رحمی سے تنقید کرتا۔ مجھے اطلاعات ملتیں کہ میری ان تقریروں سے ایوان اقتدار کے باسی سخت تلملا رہے

ہیں لیکن یہ سب باتیں سن کر میری زبان کی دھار مزید تیز ہوجاتی۔ بالآخر مجھے اپنی شعلہ بیانی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ حکومت کے اشارے پر مجھے ایک جھوٹے مقدمے میں پھانس کر گرفتار کرلیا گیا۔ میری پارٹی والوں نے اخبارات میں میری گرفتاری پر سخت واویلا مچایا لیکن مجھے آزاد کرانے میں ناکام رہے پولیس والے ایک ہفتے تک مجھ سے فرضی جرائم کا اقرار کرانے کی کوشش کرتے رہے۔ جب میں کسی طرح نہ مانا تو انہوں نے مجھے لاہور کے شاہی قلعے کے عقوبت خانے میں بھجوادیا۔ شاہی قلعے کی فلک بوس فصیلوں کے اندر پہنچتے ہی میری زندگی کے اس ہولناک دور کا آغاز ہوا جس کی یادیں مجھے آج بھی بھیانک سپنوں کی صورت میں بے خواب کرتی رہتی ہیں۔ کونسی غیر انسانی اذیت ہے جو مجھے وہاں نہیں دی گئی؟ وہ مجھے مسلسل کئی کئی دن اور رات سونے نہ دیتے۔ ہزاروں واٹ کے بجلی کے بلبوں کے سامنے مجھے آنکھیں کھلی رکھنے پر مجبور کیا جاتا۔ جون جولائی کی آگ برساتی دوپہر مجھے ننگے بدن ننگے پیر قلعے کے پختہ فرش پر صبح سے دوپہر تک کھڑا رکھا جاتا۔ اسی جگہ پر مجھے تشدد کے اس طریقے کا تجربہ ہوا جو میں نے گزشتہ رات تم پر آزمایا۔ جب میں نے تم پر وار کیا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میرے اپنے تلووں میں ایک بار پھر سے انگارے دہک اٹھے ہوں۔ میں کوشش کے باوجود تم پر مزید ہاتھ نہ اٹھا سکا۔"

"لیکن باقی کسر رفاقت علی نے نکال لی۔" میں نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں رفاقت علی فطرتاً ایک بزدل اور کمینہ شخص ہے اسے مجبوروں پر ہاتھ اٹھانے میں بہت لطف آتا ہے۔ میں کبھی کبھی اس سے شدید نفرت محسوس کرتا ہوں۔ اگر تم اسے قتل کرنے میں کامیاب ہوگئے تو مجھے ذرا سا بھی افسوس نہ ہوگا اور اب تم سے کیا چھپانا اگر تم نے اس کا پتا صاف کردیا تو مجھے بھی لاکھوں کا فائدہ پہنچے گا۔"

"یہ سب تو اس صورت میں ہوگا نا جب تم مجھے آزاد کروگے۔ خیر تم مجھے اپنی داستان سنا رہے تھے۔"

"ہاں تو ہوا یہ کہ میں دو سال تک شاہی قلعے کے عقوبت خانے میں قید قیامت خیز مظالم برداشت کرتا رہا۔ میری سیاسی پارٹی نے میری بے گناہ اسیری کو اپنے جلسے جلوسوں کا موضوع بنایا۔ میری آزادی کے لیے بھوک ہڑتالیں کی گئیں لیکن مجھے آزاد نہ کیا گیا۔ میری پارٹی نے میری مظلومیت کی داستانوں سے خوب سیاسی فائدہ اٹھایا۔ عوام میں اس پارٹی کی مقبولیت بڑھتی گئی۔ اسے متفقہ طور پر غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کی پارٹی تسلیم کرلیا گیا۔

الیکشن ہوئے تو ہماری پارٹی جیت گئی۔ میری پارٹی کے حکومت میں آتے ہی مجھے آزاد کردیا گیا۔ مجھے بڑی عزت و احترام کے ساتھ پارٹی کے سربراہ کے پاس لے جایا گیا۔ میری آمد پر میرے پرانے ساتھیوں نے پرجوش نعرے لگائے۔ میں پارٹی سربراہ کے سامنے پہنچا تو مجھے زبردست ذہنی جھٹکا پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے گرد بیٹھے ہوئے تمام افراد بڑے بڑے وڈیرے اور جاگیردار ہیں۔ ہماری پارٹی انہی افراد کے خلاف جنگ کرنے کے نعرے لگا کر ایوان اقتدار میں پہنچی اور انہی کو میں نے پارٹی پر قابض پایا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ پارٹی کی طرف سے تقریباً تمام تر ٹکٹ انہی لوگوں کو ملے ہیں۔ میں نے

اپنی پارٹی کے سربراہ سے اس سلسلے میں احتجاج کیا تو اس نے کہا کہ ان لوگوں کو شامل کیے بغیر پارٹی مضبوط نہ ہوتی۔ اس نے اشاروں کی زبان میں مجھے سمجھایا کہ چونکہ ہم اب اقتدار میں آ چکے ہیں۔ لہٰذا اب ان قصوں کو دوبارہ چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی یہ منطق سن کر مجھے شدید مایوسی ہوئی لیکن جلد ہی یہ مایوسی حقیقت پسندی میں بدلنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ مجھ سے کہیں کم تر درجے کے پارٹی کارکن دونوں ہاتھوں سے مال جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جبکہ میرے گھر میں دو وقت کی روٹی کا آسرا نہیں ہے۔ میں نے اشاروں کنایوں میں اپنے پارٹی لیڈر کو اپنی معاشی بدحالی کے متعلق بتایا۔ اس کے ساتھ ہی مجھ پر دولت کے دروازے کھل گئے۔ مجھے کئی قسم کی فیکٹریوں کے پرمٹ مل گئے۔ درآمد اور برآمد کے لائسنس بھی میری جیب میں آ گئے۔ بنکوں نے مجھے منہ مانگے قرضے دیے۔

دیکھتے ہی دیکھتے میں زمین سے آسمان پر پہنچ گیا۔ دو ہی سال بعد میں نے ایک بہت ہی بڑی زرعی اراضی خرید لی۔ اس طرح میں نے بھی جاگیرداری کی سند حاصل کر لی۔ شہرت کی تو میرے پاس پہلے ہی کمی نہ تھی۔ دولت آنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو پیشہ ور سیاست دان کے طور پر بھی منوا لیا۔ میں نے جائز ناجائز کے چکروں میں پڑنا تو پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اپنی جاگیر کے آس پاس والے علاقے میں اپنا سیاسی اثر و رسوخ بڑھانا شروع کیا۔ میں نے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے۔

چنانچہ اب میں اس علاقے کی بہت بڑی سیاسی قوت بن چکا ہوں۔ ان دنوں ملک پر مخالف پارٹی کی حکومت ہے۔ اس کے باوجود میری سیاسی قوت اپنی جگہ برقرار ہے۔'' ملک کریم نے اپنی داستان مکمل کرتے ہوئے کہا۔ اس کہانی میں سے اس نے بڑی صفائی سے بعض نازک مرحلے غائب کر دیے تھے لیکن بھلا مجھے ان تفصیلات سے کیا سروکار ہوتا۔ مجھے سوائے اس کے کسی بات سے دلچسپی نہ تھی کہ وہ جلد از جلد مجھے اس اذیت ناک قید سے آزاد کر دے تاکہ میں اپنے لیے نیا لائحہ عمل مرتب کر سکوں۔

ملک کریم کچھ دیر تک مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا اس کے انداز گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میری باتوں کی تصدیق کرنا چاہتا ہے۔

''اب میں چلتا ہوں۔'' ملک کریم نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں کل دوپہر تک کسی وقت یہاں آؤں گا اگر اس دوران میں تمہارے بیان کی تصدیق ہو گئی تو میں تمہیں فوراً آزاد کر دوں گا۔''

''مجھے آزاد کرنے کے بعد تم رفاقت علی کو میرے بارے میں کیا بتاؤ گے؟''

''اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں اسے کچھ بھی کہہ سکتا ہوں۔ میں اسے کہہ دوں گا کہ میں نے تمہیں اپنی جاگیر پر بھجوا دیا ہے لیکن اس پر وار کرتے ہوئے یہ خیال ضرور رکھنا کہ وہ بچنے نہ پائے ورنہ تمہیں خود اپنی جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ رفاقت علی نے اپنی دولت کے بل بوتے پر پولیس والوں سے بڑے گہرے تعلقات استوار کر رکھے ہیں۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ یہ تمہیں ملتان سے زندہ واپس نہیں جانے دے گا۔''

''اگر تمہیں میرے بیان کی سچائی کا یقین ہو جائے تو کل میرا پستول ضرور لیتے آنا۔ اس کے بغیر میں

رفاقت علی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ پاؤں گا۔''

''اچھا خدا حافظ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔'' ملک کریم نے پرانے دوستوں کی طرح مجھے خدا حافظ کہا اور گودام کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ جانے سے پہلے اس نے وہاں پر روشن واحد بلب بھی بجھا دیا۔

ملک کریم کے جانے کے بعد میں دیر تک اس تمام صورت حال پر غور کرتا رہا۔ یہ سوچ کر مجھے خوشی محسوس ہوئی کہ میں نے ملک کریم کو اپنے متعلق بتانے کا جو نازک فیصلہ کیا وہ درست ثابت ہوا۔ وہ خاصی حد تک میری طرف سے مطمئن ہو کر گیا ہے۔ شاید اسی لیے اس نے میرے منہ پر کپڑا باندھنے کی یا مجھے بے ہوش کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ اگر وہ خبیث فطرت رفاقت علی اس کے ساتھ ہوتا تو وہ یقیناً میرے بازو میں انجکشن بھونک دیتا۔ سوچتے سوچتے جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

اس رات میں نے یکے بعد دیگرے کئی خواب دیکھے۔ اس میں سے کچھ تو اتنے خوب صورت تھے کہ میری روح تک سرشار ہو گئی اور کچھ نے مجھے سرتاپا لرزا کر رکھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ میں اپنے گاؤں میں چچا مہرداد کے گھر میں موجود ہوں۔ میں باورچی خانے میں چولہے کے قریب بچھی ہوئی چٹائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوں۔ مہراں میرے لیے گرما گرم روٹی پکا رہی ہے۔ میں نے اسے آواز دی لیکن اس نے سنی ان سنی کر دی۔ میں نے پیار بھرے لہجے میں اسے پکارا۔

''مہراں۔۔۔ مہراں کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟''

''ہاں...... میں تم سے ناراض ہوں۔''

''ارے تم اپنے سیفل سے بھی ناراض ہو سکتی ہو؟'' میں نے مصنوعی حیرت کے ساتھ کہا۔

''ہاں میں تم سے ناراض ہوں۔ اگر تم میرے سیفل ہوتے تو مجھے اس طرح چھوڑ کر نہ جاتے۔ تمہیں کیا معلوم تمہارے بغیر میرا کیا حال ہوا ہے۔''

''اب تو میں تمہارے پاس آ گیا ہوں۔ اب تو ناراضی ختم کر دو۔''

''تمہارا کیا بھروسا تم پھر چلے جاؤ گے۔ تمہارا دل تو اصل میں کہیں اور اٹکا ہوا ہے۔''

''نہیں میں اب کہیں نہیں جاؤں گا۔'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ مہراں نے میرے لیے روٹی پر مکھن کا پیڑا رکھتے ہوئے کہا۔

''تم کہاں دھکے کھاتے پھرتے ہو۔ تم پہلے سے کتنے کمزور ہو گئے ہو۔ تمہارا رنگ بھی سنولا گیا ہے۔ میں اب تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی۔''

''ہاں بابا کہہ دیا نا کہ اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔''

''اگر تم اب مجھے چھوڑ کر گئے تو میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گی۔''

میں نے ابھی روٹی کا پہلا لقمہ ہی منہ میں ڈالا تھا کہ میرے کانوں میں ہیر کی آواز آئی۔ وہ مجھے پکار رہی تھی۔ ''کہاں ہو تم جلدی آؤ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' میں نے بے چارگی کے عالم میں مہراں کی طرف دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں حیرتوں کے سمندر موجزن نظر آیا۔ میرے کانوں میں ایک بار پھر ہیر کی

آواز آئی۔

''اب آبھی جاؤ کب تک انتظار کراؤ گے۔'' میں نے بے قرار ہو کر مہراں کی طرف دیکھا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''جاؤ وہ تمہیں بلا رہی ہے۔''

''نہیں میں نہیں جاؤں گا۔'' میں نے نیم دلی سے کہا۔

''تمہیں جانا ہوگا۔ یہ میری خواہش ہے۔ تم چلے جاؤ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ میں تمہارا انتظار کرلوں گی۔''

میرے انکار کے باوجود مہراں نے اصرار جاری رکھا۔ میں آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ عین اسی وقت میرے خواب کا منظر بدل گیا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک کھیت میں ہل کے دستے پر ہاتھ رکھے کھڑا ہوں۔ میرے کانوں میں ہیر کی آواز آئی۔

''خدا کے لیے اب آبھی جاؤ بھوک کے مارے میرا دم نکلا جارہا ہے۔''

''آرہا ہوں ذرا ساصبر کرو۔'' میں نے نزدیک ہی بہتے ہوئے کھالے میں ہاتھ دھوئے اور ٹالی کے نیچے بچھی ہوئی چارپائی پر جا بیٹھا۔

''ہاں میری ہرنی! بتا کیا پکایا ہے آج تو نے؟'' میں نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ساگ ہے پانچوں رنگ کا۔ ساتھ میں باجرے کی روٹی ہے گھی میں لگی ہوئی۔''

''واہ پھر تو مزہ آجائے گا جلدی سے کھانا نکالو۔''

میں نے اور ہیر نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد میں چارپائی پر دراز ہوگیا۔ ہیر میرے چہرے پر پنکھا جھلنے لگی۔ مجھے اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آئے۔

''تو کچھ پریشان ہے میری ہرنی؟''

''ہاں میں پریشان ہوں۔ مجھے ہر وقت یہ ڈر ستاتا رہتا ہے کہ کہیں مجھے تجھ سے کوئی چھین نہ لے۔''

''تو تو پگلی ہے۔ کس میں ہمت ہے جو تجھے مجھ سے جدا کرے۔ تیری طرف بری نظر ڈالنے والے کی میں آنکھیں نکال لوں گا۔'' میں نے فولادی عزم کے ساتھ کہا۔ ہیر نے میرے سینے پر اپنا سر ٹکا دیا۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہوگئی۔ مجھے اس کے چہرے پر شدید ترین اذیت کے آثار نظر آئے۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں اپنا سر پکڑ لیا۔ اس کی حالت دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ میں نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔

''کیا ہوا تمہیں؟ کیا ہوا میری جان کچھ بتاؤ تو سہی۔''

''میرا سر درد سے پھٹا جارہا ہے۔ مجھے بچالو۔ میں مر رہی ہوں۔ مجھے بچالو۔''

''تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔'' میں نے

دیکھا کہ شدت کرب سے ہیر کے چہرے کے نقوش مسخ ہوگئے۔

''میں جا۔۔۔ رہی۔۔۔ ہوں۔'' اس نے رک رک کر کہا۔ اچانک ہیر کی ناک سے گاڑھے گاڑھے سرخ خون کا فوارہ چھوٹا اور میرے سینے کو رنگین کر گیا۔ میرے حلق سے دردناک چیخ برآمد ہوئی۔

''نہیں نہیں تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتیں۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔'' میری تمام تر چیخ وپکار بے سود رہی۔ ہیر لہولہو ہو کر میرے بازوؤں میں تحلیل ہوتی رہی۔ وہ موم کے پتلے کے مانند پگھلتی چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد میں تہی دامن ہو کر رہ گیا۔ ''ہیر۔۔۔ ہیر'' میں چیخ چیخ کر اسے پکارتا رہا لیکن وہاں کون تھا کو میری فریاد سنتا۔ میرا سر بری طرح سے چکرایا۔

اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر میرے خواب کا منظر بدل گیا۔ مجھے اپنے سامنے ایک آدم قد آئینہ نظر آیا۔ مجھے احساس ہوا کہ میرا جسم مفلوج ہو چکا ہے۔ میں کوشش کے باوجود آئینے سے اپنی آنکھیں نہیں ہٹا سکتا۔ میرے وجود میں دہشت کی سرد لہریں دوڑنے لگیں۔ میرا دل بے اختیار چاہا کہ میں زور زور سے چیخیں ماروں لیکن کوشش کے باوجود میرے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ اسی وقت مجھے اس آئینے میں ایک بدنما سادھندلا ساعکس نظر آیا۔ وہ خنجر فضا میں لہرایا۔ اس کی چمک سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ عین اسی وقت فضا میں ایک تیز نسوانی چیخ گونجی۔ میں نے دیکھا کہ وہ آدم قد آئینہ گاڑھے گاڑھے خون سے سرخ ہو رہا ہے۔ میرے کانوں میں ایک وحشیانہ قہقہہ گونجا۔ میرا وجود خوف کی شدت سے لرز اٹھا۔ عین اسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ میرا وجود پسینے میں شرابور ہے۔

چند لمحے تک تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ مجھ پر کیا بیتی ہے۔ میں کہاں ہوں؟ میں نے ادھر ادھر نظریں گھمائیں۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں کس صورت حال سے دوچار ہوں۔ میرے ذہن میں بہت دیر تک خواب کے منظر گھومتے رہے۔ میرے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ میں اڑ کر ہیر کے پاس پہنچ جاؤں۔ خدا جانے اس پر کیا بیت رہی ہے۔ کہیں یہ بھیانک سپنا حقیقت کا عکس تو نہیں ہے؟ میرے انتظار سے تنگ آکر کہیں ہیر سچ مچ تو مجھ سے روٹھ کر نہیں چلی گئی؟ نہیں نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ تو محض ایک سپنا تھا۔ سپنے بھی کبھی سچ ہوئے ہیں؟ ہیر بیمار ضرور ہے مگر وہ صحیح ہوجائے گی۔ اس کا آپریشن ہوتے ہی اس کا تمام روگ دور ہوجائے گا۔

گودام میں پھیلی ہوئی روشنی سے میں نے اندازہ لگایا کہ صبح کا اجالا پھیلے کافی دیر ہو چکی ہے۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ درد کررہا تھا۔ میں بڑی بے چینی سے ملک کریم کا انتظار کرتا رہا۔ میں خدا سے دعا کرتا رہا کہ ملک کریم کو میری بات کا یقین آگیا ہو اور وہ جلد از جلد یہاں آکر مجھے آزاد کردے۔

وقت چیونٹی کی رفتار سے رینگتا رہا۔ آخر کار دوپہر کا وقت بھی آن پہنچا لیکن مجھے ملک کریم کی صورت نظر نہ آئی۔ اسی انتظار میں دوپہر گزری اور شام آگئی۔ میرا دل طرح طرح کے اندیشوں میں ڈوبنے لگا۔ ملک کریم کیوں نہیں آیا؟ اس پر کیا مصیبت آگئی؟ کیا اسے میری باتوں کا یقین نہیں آیا؟ اس صورت میں بھی اسے یہاں آنا تو چاہیے۔ اگر وہ کل بھی نہ آیا تو میرا کیا بنے گا؟ میں تو بھوکا پیاسا مر جاؤں گا۔

رات کا اندھیرا پھیلنے کے ساتھ ہی میری وحشت عروج پر پہنچ گئی۔ میں نے حلق پھاڑ پھاڑ کر کسی ان جان ہستی کو مدد کے لیے پکارا لیکن میری ساری چیخ پکار رائیگاں گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی تنگ وتاریک قبر میں زندہ دفن کر دیا گیا ہوں۔ بار بار چیخنے کی وجہ سے میرا حلق خشک ہو گیا اور مجھے شدید پیاس لگنے لگی۔ تھک ہار میں خاموش ہو رہا۔ بیرونی امداد کی طرف سے بالکل مایوس ہونے کے بعد میں نے ایک بار پھر چمڑے کے بندھنوں کے ساتھ زور آزمائی کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میں ان ناقابل تسخیر بندھنوں کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا۔ البتہ میرا جسم ایک بار پھر پسینے میں شرابور ہو گیا۔ بدن سے پانی کے مزید اخراج نے میری پیاس میں اور بھی اضافہ کر دیا لیکن میرے پاس اس بھوک اور پیاس کا کوئی علاج نہ تھا۔ مجبوراً تن بہ تقدیر ہو کر پڑا رہا۔

میں مایوسی کی دلدل میں پوری طرح دھنس چکا تھا۔ اچانک مجھے گودام کے گیٹ پر کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ میرا دل خوشی سے دھڑک اٹھا۔ ملک کریم آ رہا ہے۔ وہ مجھے آزاد کرنے کے لیے آ رہا ہے۔ میں نے گیٹ کے کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنی۔ کوئی شخص چلتا ہوا بجلی کے سوئچ کی طرف بڑھا۔ سناٹے میں سوئچ آن ہونے کی ہلکی سی آواز گونجی۔ میرے سر کے اوپر لٹکا ہوا بلب روشن ہو گیا۔ میں نے پرامید نظروں سے آنے والے چہرے کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرا دل اچھل کر میرے حلق میں آن ٹھنسا۔ وہ ملک کریم نہیں بلکہ رفاقت علی تھا۔

رفاقت علی کے مکروہ چہرے پر نفرت اور انتقام کی سیاہی دیکھ کر میرے دل میں پہلا خیال یہی آیا کہ ملک کریم نے شاید اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میرے جیسے تہی دست شخص سے ملک کریم کو کیا دلچسپی ہوئی۔ اس نے مجھ سے سچ اگلوانے کے بعد تمام حقیقت اپنے شریک کار اور دوست رفاقت علی کے گوش گزار کر دی۔ اس نے رفاقت علی کو بتا دیا میں اس کا نہیں بلکہ رفاقت علی کا دشمن ہوں۔ لہٰذا وہ مجھ سے خود ہی نپٹے یہ سب باتیں سن کر رفاقت علی غصے سے لال پیلا ہو گیا ہو گا۔ اس نے ملک کریم کو کہا ہو گا کہ تم مجھے اس گودام کی چابی دو۔ میں اپنے دشمن سے جا کر خود حساب کتاب کرتا ہوں اور اب وہ مجھ سے حساب کتاب کرنے آ گیا ہے۔

''تو۔۔۔تو۔۔۔کتے کے بچے۔۔۔ میں تیرا خون پی جاؤں گا۔'' رفاقت علی نے غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔ میں نے قدرے بے نیازانہ انداز میں کہا۔

''تو مجھ سے کیا چاہتا ہے رفاقت علی؟''

''میں تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھلانا چاہتا ہوں۔ میں تجھ سے ایسا انتقام لوں گا کہ تجھے قبر میں بھی چین نہیں ملے گا۔''

''زندگی اور موت اوپر والے کے ہاتھ میں ہے رفاقت علی۔ تو اتنے بڑے بڑے دعوے نہ کر۔ اگر میری موت تیرے ہی ہاتھوں لکھی ہے تو پھر کوئی تیرا ہاتھ کیسے روک سکتا ہے لیکن اگر میرا آخری وقت ابھی نہیں آیا ہے تو تیرا باپ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' رفاقت علی مغلظات بکتا ہوا میری طرف بڑھا۔ اس

نے میرے گالوں پر طمانچوں کی بارش کر دی۔ کچھ ہی دیر میں وہ بری طرح ہانپنے لگا۔

''تو نے کل ملک کریم کے ہاتھ کا مزہ چکھا۔ اب میں تجھے اپنا مزہ چکھاؤں گا۔ تو اس کے ہاتھ سے تو بچ گیا لیکن میرے ہاتھ سے نہیں بچ سکے گا لیکن میں تجھے اتنی آسانی سے نہیں مرنے دوں گا۔ میں تجھے سسکا سسکا کر ماروں گا۔''

''تمہارا جو جی چاہے کرو لیکن یہ بتاؤ کہ وہ تمہارا باپ ملک کریم کہاں ہے؟'' میرا سوال سن کر رفاقت علی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''تو یہ مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ ملک کریم کہاں ہے؟''

''اور کس سے پوچھوں؟'' میں نے سادگی سے کہا۔

''فکر نہ کر میں ابھی تیری ساری معصومیت تیری ناک کے راستے نکالتا ہوں۔'' رفاقت علی نے اپنا میڈیکل بکس کھولتے ہوئے کہا۔ اس نے بکس میں سے ایک سرنج اور انجکشن کی ایک چھوٹی سی بوتل نکالی۔

''یہ انجکشن دیکھ رہا ہے؟ یہ میں تیرے جسم میں لگاؤں گا تو تجھے یوں لگے گا جیسے تیرے خون میں آگ لگ گئی ہے۔ تو بن پانی کی مچھلی کے مانند تڑپے گا' روئے گا' چلائے گا لیکن یہاں کوئی تیری مدد کرنے نہیں آئے گا۔ مجھے بہت دنوں بعد تیرے جیسا شکار ملا ہے۔ میں تجھ پر جی بھر کے تجربے کروں گا۔ میں یہ دوسرا انجکشن تجھے اس وقت لگاؤں گا جب تم بے ہوش ہونے والے ہو گے۔'' مجھے رفاقت علی کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک نظر آئی۔ ''اس انجکشن کے لگانے سے تجھے اپنے جسم کے ہر حصے میں کانٹے چبھتے ہوئے محسوس ہوں گے۔ تیرا دل چاہے گا کہ تو اپنی کھال خود اپنے ہاتھوں سے ادھیڑ ڈالے لیکن تو کچھ بھی نہیں کر سکے گا فکر نہ کر میں تجھے زیادہ تکلیف نہیں دوں گا۔ اب سے ٹھیک تین گھنٹے بعد میں تجھے یہ انجکشن لگاؤں گا۔'' اس نے مجھے ایک بڑی سی بوتل دکھائی۔ ''اس انجکشن کے لگاتے ہی تو موت کے سفر پر روانہ ہو جائے گا لیکن افسوس تیری یہ موت بھی اتنی آسان نہیں ہو گی کیونکہ۔۔۔ اس بوتل میں زہر نہیں تیزاب ہے۔''

اس جنونی کی زبان سے نکلنے والے ان الفاظ نے میرے سارے وجود میں خوف کی تیز لہر دوڑا دی۔ میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ ''ملک کریم کو معلوم ہے کہ تو کس نیت سے میرے پاس آیا ہے؟''

''پھر وہی بکواس۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ ملک کریم کہاں ہے؟''

''مجھے کیا پتا وہ کہاں ہے؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''تو سن اسے وہ تیرے باپ حرام زادے چٹ کپڑیے گرفتار کر کے لے گئے ہیں۔ تیری سازش کامیاب ہو گئی ہے۔ سور کی نسل۔''

اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ سن کر میرے دماغ میں زور کا چھناکا ہوا۔ اس حیرت انگیز انکشاف نے میرے ہاتھوں کے توتے اڑا دیے۔ فوری طور پر میری سمجھ میں ہی نہ آیا کہ میں کیا ردعمل

ظاہر کروں۔ کتنا عجیب اتفاق تھا رفاقت علی اور ملک کریم نے مجھے خفیہ اداروں کا ایجنٹ سمجھا اور اگلے ہی دن ملک کریم کو ان ہی اداروں نے گرفتار کرلیا۔ میں نے سوچا کہ ملک کریم کا تو جو حشر ہو سو ہو۔ اس کی گرفتاری نے میری موت یقینی بنادی ہے۔ حالات کی ستم ظریفی تو دیکھیے۔ میں رفاقت علی کے قتل کے ارادے سے ملتان پہنچا لیکن اب خود اسی کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ رہا تھا۔

رفاقت علی نے سرنج میں دوا بھری اور میرے پاس آن کھڑا ہوا۔ "تو کیا سمجھتا تھا کہ ہمیں تباہ کرنے کے بعد تو اپنے محکمے سے انعام پائے گا۔ نہیں تو ان کے ہاتھوں نہیں، میرے ہاتھوں اپنا انعام وصول کرے گا۔" وہ میرے بازو میں سرنج کی سوئی گھونپنے ہی والا تھا کہ ایک گونج دار آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا۔

"تم لوگ پولیس کے گھیرے میں ہو خان رفاقت علی۔ اپنے ساتھیوں سے کہو کہ ہتھیار پھینک دیں۔ مزاحمت کی کوشش کی تو ہم تمہیں بھون کر رکھ دیں گے۔" ان الفاظ کا مفہوم سمجھتے ہی رفاقت علی کی آنکھیں دہشت سے پھٹنے لگیں۔ اس کا چہرہ زرد پڑتا چلا گیا۔

"وہ وہ۔۔۔ یہاں بھی پہنچ گئے؟" اس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ مجھے اس صورت حال کو سمجھنے میں محض چند لمحے لگے۔ ملک کریم کی گرفتاری کے بعد پولیس نے اس کے قریبی ساتھیوں کو بھی نگرانی میں لے لیا ہوگا۔ رفاقت علی انتقام کے جوش میں تمام خطروں کو بھول کر یہاں دوڑا چلا آیا۔ اس کے اس پر اسرار انداز میں یہاں آنے سے پولیس والے بری طرح چونک پڑے۔ انہوں نے اندازہ لگایا کہ یہ گودام ملک کریم اور رفاقت علی کا خفیہ ٹھکانا ہے۔ چنانچہ انہوں نے تیاری کی اور اس گودام پر چڑھ دوڑے۔ پولیس کی آمد کے ساتھ ہی میں نے خود کو عجیب گومگو کی کیفیت میں مبتلا پایا۔ کیا میں پولیس کی آمد پر خوشی کا اظہار کروں کہ اس نے مجھے اس جنونی کے ہاتھوں موت کا شکار ہونے سے بچا لیا لیکن پولیس والے خود بھی تو میرے خون کے پیاسے ہیں۔ میرے لیے تو ادھر بھی موت ہے اور ادھر بھی۔

اچانک میرے کانوں میں رفاقت علی کا وحشیانہ قہقہہ گونجا۔ "آہاہاہا۔ تو کیا سمجھتا ہے کہ پولیس تجھے میرے انتقام سے بچا لے گی؟ نہیں تجھے تیری حرکتوں کی سزا ضرور ملے گی۔" اسی دوران میں وہاں ایک بار پھر پولیس افسر کی آواز گونجی۔

"میں دس تک گنتی گن رہا ہوں اگر تم لوگ گنتی ختم ہونے سے پہلے اپنے ٹھکانوں سے باہر نہیں آئے تو ہم اپنی کاروائی شروع کردیں گے۔" مجھے رفاقت علی کی آنکھوں میں جنونی قاتلوں کی سی چمک نظر آئی۔

"وقت بہت کم ہے مجھے جلد از جلد تجھے تیرے انجام تک پہنچا دینا چاہیے۔" اس نے دوا کی بوتل سے سرنج بھرتے ہوئے کہا۔

"لیکن خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں اتنی آسان موت نہیں دوں گا۔ میں تمہیں ایسا انجکشن لگا رہا ہوں کہ تو نہ زندوں میں رہے گا نہ مردوں میں۔" اس کے الفاظ سن کر مجھے اپنی رگوں میں خون منجمد ہوتا محسوس ہوا۔ میں نے چمڑے کے بندھنوں سے زور آزمائی کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔۔۔ تم ایسا نہیں کرسکتے۔"

"کیوں نہیں کرسکتا؟ مجھے کون روک سکتا ہے؟ فکر نہ کر یہ انجکشن لگنے کے بعد تو دنیا کی تمام فکروں اور غموں سے آزاد ہو جائے گا۔ کیونکہ۔۔۔ یہ انجکشن لگتے ہی تو ہمیشہ کے لیے پاگل ہو جائے گا۔ آہاہاہا"

"نہیں۔۔۔ نہیں" میں حلق پھاڑ کر چلایا۔ رفاقت علی نے وحشیانہ قہقہے لگاتے ہوئے میرا دایاں بازو پکڑا اور سرنج کی سوئی میرے بازو کے گوشت میں گھونپ دی۔ چیخ چیخ کر میری آواز بیٹھ گئی۔ رفاقت علی نے بڑے مہارت سے سرنج میں موجود سیال میری رگوں میں پہنچا دیا۔ مجھے رفاقت علی کا مکروہ چہرہ دھندلاتا ہوا نظر آیا۔ یک لخت میرا سر بری طرح چکرایا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا جسم غبارے کے مانند ہلکا ہو کر فضا میں تیر رہا ہے۔ اپنی اس حالت پر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے ایک زوردار قہقہہ ہو گیا۔ میرا یہ قہقہہ ضرورت سے زیادہ ہی طویل ہو گیا میں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن ناکام ہو گیا۔ میں یکے بعد دیگرے قہقہے پر قہقہہ لگاتا چلا گیا۔

اسی لمحے میرے کانوں میں ایک اور زبردست قہقہہ گونجا۔ یہ قہقہہ رفاقت علی نے اپنی کامیابی پر لگایا تھا۔ "اب تو ساری زندگی پاگل خانے میں قہقہے لگائے گا کتے کے بچے۔" میرا دل چاہا کہ میں جواباً اسے زیادہ بھاری بھرکم گالی دوں۔ میں نے بولنا چاہا لیکن میرے منہ سے ایک زبردست قہقہے کے علاوہ کچھ بھی نہ برآمد ہوسکا۔

☆O☆

میری حالت دیکھ کر رفاقت علی کے چہرے پر خاردار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اگلے ہی لمحے اسے صورت حال کی نزاکت کا احساس ہو گیا۔ اس نے پلک جھپکتے مین اپنی جیب سے ایک رومال نکالا اور اسے سختی سے میرے منہ پر جما دیا۔ میرے قہقہے حلق میں گھٹ کر رہ گئے۔ اس نے میرے منہ کو اتنی بے رحمی سے دبایا کہ مجھے اپنے جبڑے آپس میں پیوست ہوتے محسوس ہوئے۔ عین اسی وقت میرے کانوں میں پولیس آفیسر کی کڑک دار آواز گونجی۔ وہ میگافون پر گنتی گن رہا تھا۔ 'ایک' رفاقت کے چہرے پر ایک بار پھر زردی کھنڈنی لگی۔ اس نے میرے چہرے پر سے اپنا ہاتھ ہٹایا اور خوف زدہ نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے میرے ہونٹ آپس میں چپک گئے ہیں۔ میں کوشش کے باوجود کچھ نہ بول پایا۔ میری بے بسی دیکھ کر رفاقت علی مطمئن ہو گیا۔ اس اثنا میں میگافون پر گنتی تین تک جا پہنچی۔

اگلے ہی لمحے رفاقت علی برق رفتاری سے حرکت میں آگیا۔ اس نے اپنی سرنجیں اور دوائیاں اپنے میڈیکل بکس میں رکھیں، میری قمیص کی آستین کے کف کا بٹن لگایا اور پھر اس نے ایک جھٹکے سے میری قمیص کا گریبان کھول ڈالا۔ میری قمیص کے دو تین بٹن ٹوٹے لیکن اس نے بس نہ کیا۔ اس نے میرے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر میرا سر بری طرح سے جھنجوڑ ڈالا۔ میں نے بے اختیار چیخنا چاہا لیکن میرے حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنی زبان ہلانے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ شدت تکلیف سے میری آنکھوں میں آنسوں آگئے۔ میرے بالوں کو بری طرح سے بے ترتیب کرنے کے بعد وہ مطمئن سا

ہوگیا۔ جب تک پولیس افسر کی گنتی دس تک پہنچتی' وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گودام کے گیٹ کے پاس جا پہنچا۔

'ٹھہر جاؤ۔ میں باہر آرہا ہوں۔' رفاقت علی حلق پھاڑ کر چیخا۔

'اپنے ہاتھ اپنے سر سے اوپر اٹھا کر باہر آجاؤ۔' میگا فون پر گونج دار آواز ابھری۔ 'اپنے ساتھیوں سے کہو کہ وہ بھی ہتھیار پھینک دیں۔ کسی نے مزاحمت کی کوشش کی تو اس کا انجام عبرت ناک ہوگا۔'

'میں یہاں بالکل اکیلا ہوں میرا کوئی ساتھی نہیں ہے اور میں بالکل نہتا ہوں۔' رفاقت علی نے چیخ کر کہا

میں نے گردن موڑ کر رفاقت علی کو دیکھنا چاہا لیکن پوری کوشش کے باوجود اپنی گردن کو ذرا بھی جنبش نہ دے سکا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا پورا جسم مفلوج ہوچکا ہے۔ جیسے میں اپنے وجود پر سے مکمل طور پر اختیار کھو چکا ہوں۔ اسی لمحے میرے ذہن میں عجیب سی سوچ ابھری۔ اگر میں واقعی اپنی ذہنی صلاحیتیں کھو چکا ہوں تو پھر میرا دماغ ابھی تک تمام صورت حال کیونکر سمجھ رہا ہے؟ اسی وقت میں نے گودام کا گیٹ کھلنے کی آواز سنی۔ رفاقت علی گودام سے باہر نکل گیا۔

میں نے اپنے سر کے عین اوپر روشن بلب پر نگاہیں جمانا چاہیں۔ مجھے وہ بلب ہلکورے لیتا ہوا محسوس ہوا۔ ایک بار پھر مجھے اپنا وجود بے وزن محسوس ہوا۔ جیسے میں کٹی ہوئی پتنگ ہوں جو ہوا کے آوارہ جھونکے کے ساتھ فضا میں ادھر ادھر ڈولتی پھر رہی ہے۔ میرا ذہن ایک بار پھر اپنی حالت کے بارے میں غور کرنے لگا۔ رفاقت علی نے کہا تھا کہ وہ مجھے پاگل پن کا انجیکشن لگا رہا ہے۔ اگر میں پاگل ہوچکا ہوں تو پھر میرا دماغ ابھی تک کیسے کام کر رہا ہے؟ اگر اس کے انجیکشن نے مجھ پر کوئی اثر نہیں کیا تو پھر میرا وجود کیوں میرا حکم ماننے سے انکاری ہے؟ اگر میں فالج کا شکار ہوں تو پھر میری لمس محسوس کرنے کی قوت ابھی تک کیوں باقی ہے؟ میں نے ایک بار پھر اپنے جسم کو حرکت دینے کی کوشش کی لیکن میں جھری جھری تک نہ لے سکا۔ مجھے لگا کہ میں اپنی مرضی سے پلکیں تک نہیں جھپکا سکتا۔ بے بسی کی اس انتہا پر میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے۔

اچانک پورا گودام بھاری بھرکم بوٹوں کی آواز سے گونجنے لگا۔ یکے بعد دیگرے آٹھ دس جوان اپنی رائفلیں چھتیائے گودام میں گھس آئے۔ چند ہی لمحوں میں وہ گودام کے کونے کونے میں پھیل گئے۔ کچھ دیر بعد ایک بار پھر رفاقت علی گودام میں داخل ہوا۔ اس بار اس کے ساتھ ایک پولیس آفیسر بھی تھا۔ رفاقت علی کو دو سپاہیوں نے اپنی رائفلوں کی زد میں لیا ہوا تھا۔ وہ لوگ سیدھے میرے پاس آن کھڑے ہوئے۔

'یہ ہے وہ جوان نیازی صاحب' یہ مجھے اسی طرح بندھا ہوا ملا ہے۔' میں نے رفاقت علی کی خوشامد میں ڈوبی ہوئی آواز سنی۔ پولیس آفیسر نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا میرے بالکل سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی عقابی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں۔

'ہوں' اس نے معنی خیز انداز میں زوردار ہنکارا ابھرا۔ 'تو یہ آپ کو یونہی بندھا ہوا ملا تھا' مجھے اس کے

لہجے میں طنز کی تیز دھار کاٹ محسوس ہوئی۔

اس لہجے کو سن کر رفاقت علی تلملا اٹھا۔ 'یقین کیجیے میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں اس جوان کو قطعاً نہیں جانتا۔ مجھے کسی عورت کا فون ملا تھا' وہ رو رو کر کہہ رہی تھی کہ اس کا شوہر سخت بیمار ہے۔ اگر میں فوراً نہیں پہنچا تو وہ مر جائے گا۔ اس نے یہاں کا پتہ بتایا اور۔۔۔۔۔۔'

'اور آپ بلا سوچے سمجھے یہاں دوڑے چلے آئے؟' نیازی نامی اس پولیس آفیسر نے ایک بار پھر گہرے طنز بھرے لہجے میں سوال کیا۔

'ہاں میں اس عورت کی آہ و بکا سن کر بے چین ہوگیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس کا شوہر شدید بخار میں مبتلا ہے۔'

'کیوں جوان تم کیا کہتے ہو؟ کون ہو تم اور کس نے تمہیں یہاں جکڑ رکھا ہے؟' اس پولیس آفیسر نے براہ راست مجھ سے سوال کیا۔ میں نے اپنی زبان ہلانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا چنانچہ میں بے بسی کے عالم میں اس کی شکل دیکھنے کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکا۔

'بولو۔ جواب دو۔' اس بار اس نے ذرا سخت لہجے میں سوال کیا۔

میں بدستور اس کی شکل دیکھتا رہا۔ میں نے اس کے سینے پر اس کے نام کا بیج لگا دیکھا۔ 'اکبر خان نیازی۔۔۔' اس کے شانوں پر چمکتے ہوئے ستارے دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ عہدے کے لحاظ سے انسپکٹر ہے۔ اس کی عمر پینتیس برس کے قریب رہی ہوگی۔ بھاری مونچھوں اور گھنی بھنوؤں کے زیر سایہ چمک دار آنکھوں کے ساتھ وہ مجھے تیندوے کے مانند خوں خوار اور ناقابل تسخیر محسوس ہوا۔

میری طرف سے کوئی جواب نا پا کر وہ رفاقت علی کی طرف مڑا۔ 'یہ بات کیوں نہیں کر رہا ہے؟' اس نے گھمبیر لہجے میں پوچھا۔

'مجھے بھلا کیا معلوم؟' رفاقت علی نے معصوم لہجے میں جواب دیا۔ 'مجھے تو یہ اسی حالت میں ملا تھا۔ میں نے اس سے بات چیت کی کوشش کی لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں اس کا معائنہ کرنے ہی والا تھا کہ آپ لوگ آگئے۔'

'ہوں۔۔۔' انسپکٹر نے ایک بار پھر زوردار ہنکارا ابھرا۔ میں نے صاف محسوس کیا کہ اسے رفاقت علی کی کسی بات کا بھی یقین نہیں آیا ہے۔

'اور وہ عورت کہاں ہے جس نے تمھیں یہاں بلایا ہے؟ میرا مطلب ہے اس شخص کی بیوی۔۔'

'مجھے یہ یہاں تنہا ملا تھا۔ میں جب یہاں پہنچا تو گودام کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔' میں نے رفاقت علی کے لہجے میں اعتماد لوٹتا ہوا محسوس کیا۔

''سر یہاں اور کوئی نہیں ہے۔ پورا گودام خالی ہے۔'' ایک نوجوان ہیڈ کانسٹیبل نے نیازی کو اطلاع دی۔

'ٹھیک ہے۔' نیازی نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ محمود تم اس جوان کو غور سے دیکھ کر بتاؤ کہیں یہ

ان پانچ ہندو بھارتیوں میں سے تو نہیں ہے جنہیں بازیافت کرنے کا ہمیں حکم ملا ہے۔'

'نہیں سر جی وہ تو سب پکی عمر بھدے' بے ڈول ہندو لالے ہیں۔ یہ تو کسی کالج کا سٹوڈنٹ لگتا ہے۔'

'میں بھی تمھارے خیال سے متفق ہوں خیر تم ذرا اس کے ہاتھ پاؤں تو کھولو۔ خدا جانے یہ کب سے یہاں جکڑا پڑا ہے۔'

'یہ تو مجھے کوئی عقوبت خانہ لگتا ہے سر جی۔' ہیڈ کانسٹیبل نے میرے پاؤں کے بندھن کھولتے ہوئے کہا۔'یہ میز اور یہ چمڑے کے بند تو دیکھیں۔'

تمھارا اندازہ صحیح ہے محمود۔ یہ واقعی کوئی عقوبت خانہ ہے۔ یہ نوجوان شاید شدید ٹارچر کا نشانہ بنا ہے۔' انسپکٹر نیازی نے گمبھیر لہجے میں کہا پھر وہ رفاقت علی کی طرف متوجہ ہوا۔'اب بھی موقع ہے خان صاحب آپ اپنی خوشی سے سب کچھ بتا دیں کہ یہ کیا چکر ہے۔ تھانے جا کر شاید آپ کو بے حد ناخوشگوار ماحول میں سب کچھ بتانا پڑے۔'

'جو کچھ مجھے معلوم تھا' وہ میں نے پہلے ہی بتا دیا ہے۔ اب آپ کی مرضی ہے کہ مجھے گرفتار کر کے جو چاہیں سلوک کریں لیکن یہ یاد رکھیں کہ میرا نام رفاقت علی خان ہے۔ میں کوئی سڑک چھاپ لفنگا نہیں ہوں' جس کے ساتھ آپ کا جو جی چاہے سلوک کریں۔ مجھ پر ہاتھ اٹھانا آپ کو بہت مہنگا پڑے گا۔'

ہوں۔۔۔۔۔۔' انسپکٹر نیازی نے گونج دار آواز میں ہنکارا ابھرا۔ اسی اثنا میں ہیڈ کانسٹیبل محمود نے میرے ہاتھوں اور پیروں کے بندھن کھول دیے۔ انسپکٹر نیازی نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔'اٹھ کر کھڑا ہو جا جوان۔۔۔ شاباش ہمت کر۔'

میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن میں اپنے جسم کو معمولی سی جنبش بھی نہ دے سکا۔ میں نے ایک بار پھر کوشش کی اس مرتبہ بھی میرے جسم میں کوئی جنبش نہ ہو سکی۔ البتہ میرا سر بڑے زور سے چکرایا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ مجھے اپنی پیشانی پر ٹھنڈے پسینے کے قطرے رینگتے محسوس ہوئے۔ انسپکور نیازی نے میری حالت کا کسی حد تک اندازہ لگا لیا۔

'محمود تم اسے سہارا دے کر بٹھاؤ۔ مجھے اس کا حساب کتاب گڑبڑ نظر آ رہا ہے۔'

ہیڈ کانسٹیبل محمود نے میری گردن کے نیچے ہاتھ ڈال کر مجھے اٹھانے کے لیے زور لگایا۔ مجھے اس کی انگلیوں کا لمس واضح طور پر اپنی گردن کی پشت پر محسوس ہوا۔ زور لگانے کے باعث محمود کے چہرے کے عضلات میں کھنچاؤ پیدا ہوا لیکن وہ ایک تنومند جوان تھا' اس نے با آسانی مجھے بٹھا دیا مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ میں دوبارہ ڈھیر ہو جاؤں گا لیکن میرا یہ اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ ہیڈ کانسٹیبل کے ہاتھ ہٹانے کے باوجود میں بیٹھا رہا۔ البتہ اس عمل میں میرے ارادے یا مرضی کا کوئی دخل نہ تھا۔ میں اپنی اس کیفیت کو کوئی نام دینے سے قاصر ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں ایک بار پھر لیٹ جاؤں تو میرے لیے بیٹھنا ممکن نہ ہو گا۔ البتہ مجھے بیٹھے رہنے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئی۔ میں شاید عادتاً یا جبلتاً بیٹھا ہوا تھا۔

انسپکٹر نیازی کی عقابی آنکھوں سے میری کیفیت مخفی نہ رہی۔ اس کی آنکھوں میں تفکر کے آثار ابھرے۔ اسی وقت رفاقت علی آگے بڑھا۔'آپ مجھے اس کا معائنہ کرنے دیں انسپکٹر صاحب۔ ہو سکتا ہے اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہو۔' انسپکٹر نیازی نے سر کے اشارے سے اسے اجازت دے دی۔

رفاپت علی بڑی آہستگی سے مجھے ایک بار پھر میز پر لٹا دیا۔ اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کر کے مجھے ہلکا سا خوف محسوس ہوا۔ اگر یہ بد بخت شخص مجھ پر کوئی اور خطرناک انجکشن آزما بیٹھا تو میرا کیا بنے گا؟ رفاقت علی نے اپنے کوٹ کی جیب سے اسٹیتھو اسکوپ نکال کر کانوں میں لگا لیا۔ وہ کچھ دیر تک میرا معائنہ کرتا رہا۔ اس دوران انسپکٹر نیازی کی نظریں اسی پر جمی رہیں۔ بالآخر رفاقت علی نے اسٹیتھو اسکوپ اپنے کانوں سے ہٹا لیا۔

'بظاہر تو یہ نارمل ہے۔' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔'اس کے دل کی دھڑکن بھی کی رفتار بھی نارمل ہے۔'

'ہوں۔۔۔۔۔۔ تو پھر آپ کے خیال میں اسے ہوا کیا ہے؟' انسپکٹر نیازی نے دریافت کیا۔

'میں حتمی طور پر تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اس کی یہ حالت کسی شدید اعصابی شاک کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔'

'اعصابی شاک کی وجہ سے یا۔۔۔۔۔۔ بجلی کے شاک کی وجہ سے؟' انسپکٹر نیازی نے گہرے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔ اس دوران میں اس کی آنکھیں رفاقت علی کی آنکھوں میں گڑی رہیں۔ اس کے لہجے نے رفاقت علی کو تھوڑا سا گڑبڑا دیا۔

'ہاں ہاں۔۔۔۔۔۔ یہ بھی ممکن ہے۔ ویسے اس کی یہ حالت نشے کی بڑی ڈوز کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔'

'خیر وہ تو پتہ چل ہی جائے گا۔ محمود تم ایک بار پھر اچھی طرح سے ہر طرف نگاہ ڈال لو شاید کوئی کام کی چیز نظر آ جائے۔'

کچھ دیر بعد محمود واپس لوٹ آیا۔ اسے وہاں کچھ بھی نہ مل سکا تھا۔ انسپکٹر نیازی نے اسے حکم دیا کہ وہ مجھے سہارا دے کر اتارے۔ محمود نے مجھے میز سے اتارا۔ زمین پر پاؤں رکھتے ہی میرا سر زور سے چکرایا لیکن محمود نے مجھے گرنے نہ دیا۔ انسپکٹر نیازی نے ایک جوان کو حکم دیا کہ وہ مجھے سہارا دے۔ ان دونوں جوانوں نے میرا بیشتر بوجھ اپنے شانوں پر سنبھال لیا۔ مجھے لگا کہ اگر وہ مجھے چھوڑ بھی دیں تو میں گروں گا نہیں البتہ چلنا شاید میرے لیے ممکن نہ ہوتا۔

خان صاحب آپ کو ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہو گا۔' انسپکٹر نیازی نے مضبوط لہجے میں رفاقت علی کو مخاطب کیا۔

'لیکن کیوں؟ مجھ پر کیا الزام ہے؟' رفاقت علی نے احتجاج کیا۔ اس کے معصومیت سے لبریز لہجے کو سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ میرا دل چاہا کہ اس کی گدی سے اس کی زبان کھینچ لوں۔

’آپ ہمارے ساتھ چلیے تو سہی خان صاحب۔ ان تمام معاملات کا بھی فیصلہ ہو جائے گا۔ رات کے اس پہر میں ایک تباہ حال جوان کے پاس آپ کی موجودگی آپ کی پوزیشن کو کتنی مشکوک بنا رہی ہے۔ شاید آپ کو اس کا احساس نہیں ہے۔‘

’میں پہلے ہی آپ کو بتا چکا ہوں۔۔۔‘ رفاقت علی نے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی لیکن پھر اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ ’خیر چلیے آپ مجھے تھانے ہی لے جائیں۔ جب میرے ہاتھ صاف ہیں تو پھر مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔‘

انسپکٹر نیازی نے جواب دینے کی بجائے اسے گودام کے گیٹ کی جانب بڑھنے کا اشارہ کیا۔ محمود ہیڈ کانسٹیبل اور اس کے ساتھی نے میری رانوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر عارضی اسٹریچر بنایا اور مجھے اٹھا کر گودام سے باہر نکل آئے۔ مجھے جیپ کی درمیانی سیٹ پر بٹھا کر وہ دونوں میرے دونوں اطراف میں بیٹھ گئے۔ رفاقت علی کو بھی انہوں نے اسی جیپ میں ٹھونس لیا۔ انسپکٹر نیازی نے اسے ہتھکڑی تو نہ لگائی البتہ اس کا رویہ بے حد پتھریلا تھا۔

کچھ دیر بعد جیپ شہر کی طرف روانہ ہو گئی۔ آس پاس کے مناظر سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ گودام شہر سے باہر تقریباً غیر آباد علاقے میں ہے۔ جیپ تیز رفتاری سے شہر کی جانب سفر کرتی رہی۔ انسپکٹر کے دیگر ماتحت کسی دوسری گاڑی میں پیچھے آ رہے ہوں گے۔ اگر میں اپنی گردن موڑنے پر قادر ہوتا تو شاید بہتر طور پر تمام صورت حال کا جائزہ لے سکتا۔ تمام راستے انسپکٹر نیازی وقفے وقفے سے میرا جائزہ لیتا رہا۔ جیپ کے شہر میں داخل ہونے کے بعد انسپکٹر نیازی نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ جیپ نشتر اسپتال لے چلے۔ رفاقت علی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا لیکن منہ سے کوئی لفظ نہ نکالا۔ انسپکٹر نیازی نے رفاقت علی کے ردعمل کو فوری طور پر محسوس کر لیا۔ اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ’ہوں۔۔۔۔۔‘ مجھے اس کی ہنکار میں بے شمار معنی پنہاں محسوس ہوئے۔

جیپ نشتر اسپتال کے شعبہ حادثات کے شیشے کے بڑے سے دروازے کے سامنے پہنچ کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔

’محمود تم اس جوان کی اچھی طرح تلاشی لو۔ شاید اس کے پاس کوئی ایسی شے موجود ہو جس سے اس کی شناخت ہو سکے۔‘ محمود نہایت ماہرانہ انداز میں میری تلاشی لینے لگا۔ اسی اثناء میں شعبۂ حادثات کے دروازے سے دو باوردی اردلی برآمد ہوئے اور جیپ کے پاس پہنچ گئے۔

’ایک وہیل چیئر لے آؤ۔‘ انسپکٹر نیازی نے انہیں حکم دیا۔ وہ دونوں بغیر کوئی سوال کیے واپس لوٹ گئے۔ اتنی دیر میں محمود میری تلاشی سے فارغ ہو گیا۔ ’اس کے پاس کوئی چیز نہیں ہے سر۔‘

’ٹھیک ہے۔ میں اسے اندر لے جا رہا ہوں۔ تم لوگ خان صاحب کا خیال رکھنا۔‘ اس کی بات سن کر رفاقت علی بری طرح کسمسا کر رہ گیا۔

دونوں اردلی مجھے بغور دیکھتے ہوئے وہیل چیئر پر بٹھا کر اسپتال کے اندر لے گئے۔ اندر لے جا کر

انہوں نے مجھے کشن والی ایک بڑی سی ٹیبل پر لٹا دیا۔ ڈیوٹی پر موجود دونوں ڈاکٹر بھی فوری طور پر وہاں پہنچ گئے۔

’ڈاکٹر صاحب اس جوان کا معائنہ کیجیے اور مجھے بتایئے کہ کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے۔‘ انسپکٹر نیازی نے کہا۔ وہ انہیں مختصراً صورت حال کے متعلق بتاتا رہا۔

دونوں ڈاکٹر فوری طور پر میرا معائنہ کرنے کے بعد انسپکٹر نیازی سے مخاطب ہوئے۔

’فوری طور پر اس کی جان کو کوئی خطرہ درپیش نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ نروس بریک ڈاؤن سے ملتا جلتا کیس ہے اس کے علاوہ یہ پانی اور غذا کی کمی کا بھی شکار ہیں۔ فی الحال ہم انہیں داخل کر لیتے ہیں‘ تفصیلی معائنہ کل صبح ہو جائے گا۔‘

’ٹھیک ہے آپ اسے داخل کر لیں۔ فی الحال یہ پولیس کیس نہیں ہے پھر بھی ایک بندے کی یہاں ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔ ویسے واسطی صاحب کس وقت ڈیوٹی پر آتے ہیں؟‘ انسپکٹر نیازی نے دریافت کیا۔

’رحمان علی واسطی صاحب؟ وہ بھی صبح کے وقت ڈیوٹی پر آتے ہیں۔‘

’ٹھیک ہے میں کل ان سے مل لوں گا۔‘

مجھے ایک بڑے سے کمرے میں بیڈ پر منتقل کر دیا گیا۔ ایک نرس نے میرے ہاتھ کی پشت پر رگ میں ڈرپ لگا دی۔ اس ڈرپ میں چند اور انجکشن شامل کیے گئے جن میں شاید نیند کا انجکشن بھی شامل تھا کیونکہ میں کچھ ہی دیر میں نیند کی گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔

اگلے دن دوپہر کے وقت خود بخود میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ سفید لبادے میں ملبوس ایک ڈاکٹر میرا معائنہ کر رہا ہے۔ ”مجھے اندیشہ ہے واسطی صاحب کہ اس پر تشدد کیا گیا ہے۔ آپ اس نقطہ نظر سے بھی اس کا معائنہ کریں۔“

’وہ تو میں کر ہی رہا ہوں نیازی صاحب۔ آپ یہ بتایئے کہ کیا اس مریض کا کوئی سابقہ ریکارڈ مل سکتا ہے؟‘

’میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا واسطی صاحب؟‘

میرا مطلب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ کسی قسم کے اعصابی دورے کا شکار رہا ہو۔ اگرچہ ابھی میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا‘ تاہم میرا خیال ہے کہ یہ کسی قسم کے نروس بریک ڈاؤن کا معاملہ ہے۔ خیر میں چند اور ٹیسٹ کرتا ہوں۔ ویسے میرا خیال ہے اسے اعصابی امراض کے شعبے میں منتقل کرنا پڑے گا۔‘

اسی وقت ایک نرس نے اسے ایک بڑی سی ٹارچ لا کر دے دی۔ ڈاکٹر واسطی نے نرس کو اشارہ کر کے کمرے کی کھڑکیوں پر پردے کھنچوا دیے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا۔ اس نے ٹارچ روشن کر کے اس کی روشنی براہ راست میری آنکھوں میں ڈالی۔ میری آنکھیں بری طرح چندھیا گئیں۔ ڈاکٹر واسطی نے اگلے ہی لمحے ٹارچ بند کر دی۔ اس ایک لمحے میں ہی میری آنکھوں پر قیامت سی گزر گئی۔ میری بینائی بحال ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر پرخیال انداز میں سر ہلا رہا ہے۔ جانے وہ کیا سو

لمحوں تک بغور میرے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔

اگلے ہی لمحے اس نے ایک اور عجیب و غریب حرکت کی۔ اس نے اپنے لبادے کی جیب میں سے ایک سگریٹ لائٹر نکالا اور اسے روشن کر دیا۔ وہ چند سیکنڈ سگریٹ لائٹر کے شعلے پر نظر جمائے رہا پھر اس نے لائٹر بجھا دیا۔ میں نے حیرانی سے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اسی لمحے ڈاکٹر کا لائٹر والا ہاتھ برق رفتاری سے حرکت میں آیا۔ اس نے بجھے ہوئے لائٹر کا گرم دھاتی سرا میرے ہاتھ پشت سے ٹچ کیا۔ میرے ہاتھ کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ خود بخود حرکت کر کے اوپر کی طرف ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے ہاتھ کی پشت پر جلن کا احساس ہوا۔ میرا دل چاہا کہ اس بے ہودہ شخص کے منہ پر طمانچہ دے ماروں۔ مجھے اذیت دے کر وہ خدا جانے کیا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

انسپکٹر نیازی نے اس سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ ڈاکٹر واسطی نے اسی پر بس نہیں کیا۔ اس نے میری دائیں ٹانگ موڑ کر میرا گھٹنا اوپر اٹھا دیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کہیں سے ربر کی چھوٹی سی ہتھوڑی برآمد کی اور نشانہ لے کر اسے میرے گھٹنے کے ایک مخصوص حصے پر دے مارا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا گھٹنا بجلی کے کسی ننگے تار سے چھو گیا ہے میرے پیر کو زبردست جھٹکا لگا اور وہ خود بخود سیدھا ہوتا چلا گیا۔ اس نے اپنی یہی حرکت میرے دوسرے گھٹنے کے ساتھ بھی دہرائی۔ اس بار بھی وہی ردعمل ہوا یعنی میری ٹانگ بلا ارادہ سیدھی ہوتی چلی گئی۔ ڈاکٹر واسطی نے بغور اس عمل کا جائزہ لیا پھر وہ گہری سانس بھر کر انسپکٹر نیازی کی طرف متوجہ ہوا۔

'میں اس جوان کے کیس کی نوعیت کسی نہ کسی حد تک سمجھ گیا ہوں نیازی صاحب۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے اس کے حرکی اعصاب کو نقصان پہنچا ہے۔'

'میں کچھ سمجھ نہیں پایا ہوں واسطی صاحب۔' انسپکٹر نیازی نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

'دیکھیں نیازی صاحب ویسے تو انسان کا اعصابی نظام بے حد پیچیدہ ہے لیکن میں بے حد سادہ انداز میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ دیکھیں ہمارا جسم تین طرح کے افعال انجام دیتا ہے۔ ایک قسم کے افعال کو ہم غیر ارادی افعال کہتے ہیں۔ یہ وہ افعال ہیں جو بغیر کسی ارادے کے ہمارے جسم میں ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً دل کا دھڑکنا' ہمارا سانس لینا وغیرہ۔ دوسری قسم کے افعال وہ ہیں جو ہم سوچ سمجھ کر باقاعدہ اپنے ارادے کے تحت انجام دیتے ہیں۔ مثلاً چلنا' دوڑنا اور کھانا پینا وغیرہ۔' ڈاکٹر واسطی نے انسپکٹر نیازی کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ انسپکٹر نیازی نے استفہامیہ انداز میں گردن ہلا کر اسے اشارہ کیا کہ وہ اپنی گفتگو جاری رکھے۔ 'تیسری قسم کے افعال کو معکوس افعال یا ری فلیکس ایکشن کہتے ہیں۔ یہ وہ افعال ہیں جن کے کرنے میں ہماری سوچ سمجھ کو کوئی دخل نہ ہو بلکہ یہ فعل کسی تحریک کے جواب میں فوری طور پر انتہائی تیزی کے ساتھ انجام پائے جبکہ سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہ مل سکے۔ ابھی میں نے اس جوان کی آنکھوں پر ٹارچ کی روشنی ڈالی تو اس کی آنکھوں کی پتلیاں خود بخود سکڑ گئیں۔ اسی طرح میں نے گرم لائٹر اس کے ہاتھ سے ٹچ کیا تو اس کا ہاتھ اچانک حرکت میں آ گیا۔ یہ سب ری فلیکس ایکشن یا فعل معکوس کی

وجہ سے ہوا۔ گھٹنے پر ضرب لگانے سے پاؤں میں حرکت بھی اسی عمل کا نتیجہ ہے۔'

'یہ سب تو میں سمجھ گیا لیکن اس کو آخر ہوا کیا ہے؟'

'وہی تو میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ دیکھیں جو افعال ہم ارادی طور انجام دیتے ہیں' ان کا مرکز ہمارا دماغ ہوتا ہے۔ ہمارا جسم دو طرح کے اعصاب کے ذریعے ہمارے دماغ سے منسلک ہوتا ہے۔ ایک قسم کے اعصاب کو حسی اعصاب کہتے ہیں۔ یہ اعصاب مختلف اطلاعات دماغ تک پہنچاتے ہیں مثلاً اگر ہم کوئی کڑوی چیز چبائیں تو حس ذائقہ کے اعصاب' یہ اطلاع دماغ تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس مرحلے پر دوسری قسم کے اعصاب کا کام شروع ہوتا ہے۔ ان اعصاب کو حرکی اعصاب کہتے ہیں۔ یہ اعصاب دماغ کا حکم متاثرہ عضو تک پہنچا دیتے ہیں اور وہ دماغ کے حسب حکم فوری طور پر حرکت میں آ جاتا ہے۔ منہ میں کڑوی چیز آنے کی صورت میں ہم فوراً وہ چیز تھوک دیتے ہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟' ڈاکٹر واسطی نے انسپکٹر نیازی سے دریافت کیا۔

'ہاں ہاں میں یہ سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔ آپ اپنی بات جاری رکھیے۔' انسپکٹر نیازی نے بے تابانہ لہجے میں کہا۔

'اپنے اب تک کے معائنے سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس جوان کے حرکی اعصاب کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ یعنی اس کے حسی اعصاب کے ذریعے اس کے دماغ تک تو تمام پیغامات پہنچ رہے ہیں لیکن اس کا دماغ مختلف اعضا کے لیے جو پیغامات بھیجتا ہے' وہ ان اعضا تک نہیں پہنچ پا رہے چنانچہ اس کے اعضا اس کے دماغ کا حکم نہیں مان رہے ہیں۔ ویسے اس کے حواس پوری طرح کام کر رہے ہیں۔'

'اوہ تو یہ مسئلہ ہے۔' انسپکٹر نیازی نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ 'آپ کا کیا خیال ہے اس کی یہ حالت کیوں کر ہوئی؟'

'اس معاملے میں فی الحال میں کوئی حتمی رائے نہیں دے سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ واقعی اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہو۔ بجلی کے شدید جھٹکے کے نتیجے میں بھی اس کی یہ حالت ہو سکتی ہے۔ کوئی زبردست جذباتی صدمہ بھی اس کے اعصاب کی شکست و ریخت کا باعث بن سکتا ہے۔ لیکن فی الوقت یہ سب محض اندازے ہیں۔ ہو سکتا ہے مزید تحقیقات کے بعد ہم اصل حقیقت تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی جائیں' لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اس وقت کا صبر و تحمل سے انتظار کریں؟'

'مجھے اس نوجوان سے شدید ہمدردی ہے ڈاکٹر صاحب' خدا جانے یہ بدقسمت کون ہے اور اس پر کیا کچھ بیت چکا ہے۔'

'آپ اس کے لواحقین کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ اس وقت تک اسے یہیں اسپتال میں ہی رہنے دیں۔ یہاں اس کی بہتر دیکھ بھال اور علاج ہو سکتا ہے۔'

'ٹھیک ہے میں اسے یہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ کل میں اس کی تصویریں بنوا کر اخبار والوں کو دوں گا۔ شاید اس طرح ہم اس کی شناخت معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں لیکن کیا اس کا علاج ممکن ہے؟

کیا یہ ٹھیک ہوسکتا ہے؟'

'اس سلسلے میں میرا کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی یہ کیفیت عارضی ہو اور کچھ عرصے بعد ٹھیک ہو جائے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کبھی ٹھیک نہ ہو سکے۔'

'ہوں۔۔۔۔' انسپکٹر نیازی نے افسوس بھرے انداز میں ہنکارا بھرا' خیر جو اللہ کو منظور۔ فی الحال تو میں اسے آپ کے سپرد کر کے جا رہا ہوں۔ اگر اس کی حالت میں کسی قسم کی تبدیلی واقع ہو تو آپ فوراً مجھے اطلاع دے دیں۔' انسپکٹر نیازی نے ڈاکٹر واسطی سے ہاتھ ملایا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر واسطی بھی کسی طرف نکل گیا۔ ان دونوں کے جاتے ہی مجھ پر شدید مایوسی کا غلبہ طاری ہو گیا۔ یہ تو نے مجھ پر کیسی کڑی آزمائش ڈال دی' میرے مالک؟ میں تو نہ زندوں میں ہوں نہ مردوں میں۔ مجھ جیسے ناتواں شخص پر آزمائش کا اتنا بھاری بوجھ نہ لاد میرے رب ذوالجلال۔ مجھ پر رحم کر۔ مجھے اس مصیبت سے نجات دلا' میرے پروردگار میری آنکھیں اشکوں سے جل تھل ہونے لگیں پھر یہ سیلاب میری آنکھوں سے پھوٹ نکلا۔ میں دیر تک عاجزی اور بے بسی کے اعتراف کے طور پر آنسو بہاتا رہا۔ اتفاق سے اس دوران میں کوئی نرس یا ڈاکٹر اس کمرے میں نہیں آیا' ورنہ مجھے اس کے سامنے شرمسار ہونا پڑتا۔ میں خاصی دیر تک خاموشی سے گریہ وزاری میں مصروف رہا پھر میرا دل پرسکون ہوتا چلا گیا۔ مجھے لگا کہ میرے سینے پر سے کوئی بوجھ سا ہٹ گیا ہے۔

کچھ دیر بعد ایک میل نرس نے مجھے رقیق غذا کھلائی۔ پیٹ میں خوراک پہنچتے ہی مجھے خود بخود نیند آ گئی۔ میں شام کے وقت دوبارہ جاگا۔ اس وقت میں نے ایک مسلح کانسٹیبل کو دیکھا جو کمرے کے دروازے سے اندر جھانک رہا تھا۔ تاہم وہ اندر نہیں آیا۔ رات کے تقریباً نو بجے ایک ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا۔ رقیق غذا میرے جسم میں پہنچانے کے بعد مجھے ایک انجکشن لگایا گیا۔ یہ انجکشن اعصاب کو سکون دینے والا ہوگا کیونکہ اس انجکشن کے بعد مجھ پر میٹھی میٹھی غنودگی طاری ہوتی چلی گئی پھر یہ غنودگی گہری ہوتی چلی گئی۔

وہ رات کا جانے کون سا پہر تھا جب میری آنکھ خود بخود کھل گئی لیکن اپنی اس وقت کی حالت کو میں مکمل بیداری کی حالت نہیں کہہ سکتا۔ بس یہ سمجھ لیں کہ میری آنکھیں کھل گئیں جبکہ میرا دماغ حالت غنودگی میں رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ کچھ دیر تک میں اسی کیفیت میں رہا پھر میرا دماغ بھی بیدار ہوتا چلا گیا۔ میں نے اپنے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیا تاکہ میں اپنے بیدار ہونے کی وجہ جان سکوں لیکن مجھے وہاں کوئی غیر معمولی چیز نظر نہ آئی۔ اچانک میں نے اپنے بیدار ہونے کی وجہ تلاش کر لی۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔ ہاں وہی تو تھی۔۔۔ بالکل وہی خوشبو۔۔۔ مشک وعنبر سے ملتی جلتی۔۔۔ نتھنوں کے راستے دماغ پر قابض ہوتی ہوئی۔۔۔ خاصی تیز۔۔۔ جیسے مجھے مغلوب کرنے پر تلی ہوئی ہو۔۔۔ اس کے ماخذ کو تو تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ معمولی سا سفید رومال جس نے کسی وقت بھی میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ اسپتال والوں نے میرا لباس بدل کر

مجھے اسپتال کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنا دیے لیکن یہ رومال بدستور میری کلائی پر موجود رہا مگر کیسے؟ کیا اسپتال والوں نے اسے کیسے نظر انداز کر دیا؟ نہیں بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ وہ اسے کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں اگر یہ انہیں نظر آتا تو وہ یقیناً اسے کھول کر کچرے میں ڈال دیتے۔ ہاں۔۔۔۔ ضرور۔۔ بشرطیکہ۔۔۔۔ یہ انہیں نظر آیا ہوتا۔۔۔ خوش بو تیز ہوتی چلی گئی اور تیز اور تیز مجھے اپنا دماغ ایک بار پھر غنودگی میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

اچانک کمرے کے دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ میرے بالکل سامنے ہی تو تھا دروازہ۔ میں نے امید اور ناامیدی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ اپنے جسم کو حرکت دینے کی کوشش کی لیکن پھر فوراً مجھے مایوسیوں کے بھاری بوجھ نے دبا لیا۔ میں باوجود کوشش کے اپنی گردن کو معمولی سی جنبش نہ دے سکا۔ عین اسی وقت دروازے پر ایک بار پھر آہٹ ہوئی۔ میں نے دروازے کو دھیرے دھیرے کھلتے دیکھا۔ دروازہ کھلا اور اس میں سے سفید لبادے میں ملبوس ایک ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔ اس ڈاکٹر نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد کمرے کے دروازے کو اپنی پشت پر بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دی۔ اس کی یہ حرکت دیکھ کر میرا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ میں نے دیکھا کہ اس ڈاکٹر نے اپنے چہرے پر نقاب چڑھا رکھی ہے جیسے وہ کوئی آپریشن کرنے والا ہو۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا عین میرے بیڈ کے قریب آن کھڑا ہوا۔ میں نے اس کی آنکھوں پر نظر ڈالی اور میں نے ایک ہی نظر میں اسے پہچان لیا' اس کے ساتھ ہی میرا دل خوف اور دہشت سے پھٹنے لگا۔ وہ چمک دار' کینہ توز شیطانی آنکھیں میں بھلا کیسے نہ پہچانتا؟ رفاقت علی۔۔۔! خان۔۔۔ رفاقت علی خان۔۔۔ ایک سفاک جنونی' خون خوار مجرم جسے انسانی زندگی پر شیطانی تجربات کا شوق تھا۔ کس نیت سے آیا ہے یہاں؟ اب کیا چاہتا ہے یہ مجھ سے؟ میرے قریب پہنچتے ہی اس نے اپنے چہرے پر سے نقاب ہٹا دی۔ اس کے چہرے پر رقصاں شیطانی مسکراہٹ مجھے اپنے دماغ میں چھید کرتی ہوئی محسوس ہوئی اور ایک سرسراتی ہوئی سرگوشی اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔

'تو کیا سمجھتا ہے میں تجھے اتنی سے بخش دوں گا؟ تو اسپتال میں مزے کرتا رہے گا اور پھر ٹھیک ہونے کے بعد سب کچھ اس کتے کے بچے نیازی کے سامنے بک دے گا' تاکہ میری گردن کے گرد پھانسی کا پھندا کس جائے۔۔۔ کیوں یہی سوچا تھا نا تو نے؟ نہیں یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ تو نے رفاقت علی سے دشمنی مول لی ہے۔ رفاقت علی کے دشمن سسک سسک کر' خارش زدہ کتے کے مانند مرتے ہیں۔ میں تجھے بھی عبرت کا نشان بنا دوں گا حرام کی اولاد!'

میں نے رفاقت علی کے چہرے پر شدید نفرت کے تاثرات ابھرتے دیکھے۔ اس نے اپنے لبادے کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جب اس کا ہاتھ واپس نکلا تو مجھے اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی سرنج نظر آئی۔ اس نے ایک حقارت بھری نگاہ مجھ ڈالی۔ میں نے نہایت اضطراب کے عالم میں اپنے جسم کو حرکت دینا چاہی لیکن ناکام رہا۔ مجھے شدید دہشت کا احساس ہوا لیکن پھر یہ دہشت جانے کہاں جا سوئی۔ مجھے احساس ہوا کہ میرا پورا وجود خوشبو میں تحلیل ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے اپنی نظر دھندلاتی ہوئی محسوس ہوئی' جانے

رفاقت علی کو اس خوشبو کا احساس ہوا یا نہیں؟

میں نے دیکھا کہ رفاقت علی کا سرنج والا ہاتھ میرے دائیں بازو کی جانب بڑھ رہا ہے لیکن حیرت انگیز طور پر مجھے ذرا بھی خوف محسوس نہ ہوا۔ اس سے پہلے کہ سرنج کی سوئی میرے بازو میں چبھتی' میں نے خوشبو میں یک لخت شدت محسوس کی۔ اچانک مجھے بجلی سی کوندتی نظر آئی۔ میں نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا کہ میرے دائیں ہاتھ کی کلائی برق رفتاری سے حرکت میں آئی اور زوردار طریقے سے رفاقت علی کے چہرے سے ٹکرائی۔ میں نے اپنی کلائی اور رفاقت کی ناک کے تباہ کن تصادم کو واضح طور پر محسوس کیا۔ رفاقت علی کی گردن کو زبردست جھٹکا لگا۔ میں نے شیشے کی سرنج کے پختہ فرش پر گر کر چور چور ہونے کی آواز سنی

اگلے ہی لمحے رفاقت علی اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر جما کر آگے کی جانب جھک گیا۔ میں نے اس کی انگلیوں کے درمیان سے گاڑھے گاڑھے سرخ خون کے قطرے ٹپکتے دیکھے۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل رہی تھیں۔ مجھے ایک لمحے میں اندازہ ہو گیا کہ اس کی ناک کی ہڈی چکنا چور ہو چکی ہے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ مجھے اس صورت حال کو سمجھنے میں اچھی خاصی دیر لگ گئی۔ میں نے۔۔۔ ہاں میں نے اس شیطان خصلت شخص کی ناک کو سپاٹ کر دیا ہے میں نے اس کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملا دیا ہے! مگر کیسے؟ کیا میرا جسم دوبارہ صحیح ہو چکا ہے؟ میں نے اپنے دائیں ہاتھ کو ایک بار پھر حرکت دینے کی کوشش کی لیکن اس میں ذرا بھی جنبش نہ ہو سکی۔ نہیں یہ میرا کارنامہ نہیں ہے۔۔۔ رومال۔۔۔ خوشبو۔۔۔

رفاقت علی کی ناک سے چھوٹنے والی خون کی ترلی نے اس کے سفید لبادے کو رنگ دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں شدید ترین حیرانی اور دہشت کے آثار دیکھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا۔ اچانک وہ تیزی سے مڑا اور تقریباً بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

رفاقت علی کے فرار ہوتے ہی کمرے میں پھیلی ہوئی خوشبو میں مزید اضافہ ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ خوشبو نشے کے مانند میرے حواس پر طاری ہو رہی ہے۔ میں نے اس احساس کے خلاف مزاحمت کرنا چاہی لیکن ناکام رہا۔ وہ خوشبو میرے نتھنوں کے راستے میرے دماغ پر قابض ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ میں بالکل مدہوش سا ہو گیا۔ دفعتاً مجھے اپنے دائیں ہاتھ پر۔۔۔ عین اس جگہ جہاں پر وہ سفید رومال بندھا ہوا تھا' کسی کے ہاتھ کی گرفت محسوس ہوئی۔ بالکل ایسے جیسے کوئی اپنی محبت کے اظہار کے طور پر نرمی سے کسی کی کلائی تھام لے۔ اسے احساس دلانے کے لیے کہ کہ تنہا نہیں ہے۔ یہ بتانے کے لیے کہ میں ہر مشکل وقت میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میری موجودگی میں کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ اس اپنائیت سے بھرپور لمس نے میرے حوصلوں کی شکستہ دیوار کہ ایک بار پھر سنگلاخ' ناقابل تسخیر فصیل بنا ڈالا۔ اس سے پہلے کہ میرا دماغ کچھ اور سمجھ پاتا۔ میری کلائی پر وہ غیر مرئی گرفت مزید مضبوط ہو گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ کوئی طاقت ور۔۔۔ بہت طاقتور شخص مجھے کلائی سے پکڑ کر بیڈ پر سے اٹھا رہا ہے۔ میری ذرا سا بھی کاوش کے

بغیر میں بیڈ پر بیٹھ گیا لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو گئی۔ اس غیر مرئی قوت تے مجھے بڑی آسانی سے بیڈ سے نیچے اتارا اور مجھے میرے پیروں پر کھڑا کر دیا۔

اس پراسرار صورت حال کے باعث مجھے اپنے وجود میں ہیجان کی لہریں تو ضرور دوڑتی محسوس ہوئیں' البتہ مجھے خوف کا احساس قطعاً نہ ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ کمرے میں پھیلی ہوئی مہک کچھ اور تیز ہو گئی ہے۔ یک لخت۔۔۔ بالکل غیر ارادی طور پر میرے قدموں میں حرکت پیدا ہوئی' میں نے خود کو کمرے کے دروازے کی جانب بڑھتے دیکھا۔ میں نے اپنے قدم روکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے نکلتا چلا گیا۔ میں نے کمرے کے دروازے کے قریب ایک کانسٹیبل کو ایک کرسی پر خواب خرگوش میں مگن دیکھا لیکن مجھے اس پر مزید توجہ دینے کی مہلت نہ مل سکی کیونکہ کمرے سے نکلتے ہی میری رفتار میں مزید اضافہ ہو گیا۔ میرے ننگے پیروں کے تلوے اسپتال کے چکنے فرش پر تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ میرا رخ اسپتال کے شعبہ حادثات کے گیٹ کی جانب تھا۔ دو ایک راہداریاں اور دالان عبور کرنے کے بعد میں گیٹ کے سامنے جا پہنچا اس دوران میں مجھے کوئی ڈاکٹر یا نرس نہ ملی۔ میں نے اپنے شانے کو گیٹ سے چھوتا ہوا محسوس کیا۔ ہلکا سا دباؤ پڑتے ہی شیشے کا دروازہ کھلتا چلا گیا۔ میں نے نہایت اطمینان سے سیڑھیاں طے کیں لیکن ہموار زمین پر پہنچتے ہی مجھے زور کا چکر آ گیا۔ مجھے لگا کو میرے پیروں تلے سے زمین سرک رہی ہے۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے آس پاس کا جائزہ لینا چاہا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ میرا وہم نہیں ہے بلکہ حقیقتاً میرے پیروں تلے سے زمین بڑی تیزی سے سرکتی جا رہی ہے۔

میرے اردگرد کے مناظر برق رفتاری سے پیچھے کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ چند ہی لمحوں میں میری رفتار میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ مجھے اپنے کانوں میں سیٹیاں سی بجتی محسوس ہوئیں۔ سامنے آنے والی تیز ہوا نے مجھے آنکھیں بند کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے پیر بمشکل ہی زمین کو چھو رہے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے اپنی رفتار کم ہوتی ہوئی محسوس ہوئی پھر بڑی ہی آہستگی سے' نہایت نرمی سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے اپنے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لینا چاہا۔ ابتدا میں مجھے وہ علاقہ بالکل اجنبی محسوس ہوا لیکن کچھ دیر بعد اجنبیت کا یہ احساس رفتہ رفتہ دور ہوتا چلا گیا۔ گرچہ میں اس جگہ پہلی بار آیا تھا تاہم میں نے کتنی ہی بار اس جگہ کہ تصاویر اور طغروں وغیرہ میں دیکھ رکھا تھا۔

حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی رحمتہ اللہ علیہ کا روضہء مبارک مجھے اپنے روئیں روئیں میں عقیدت و طمانیت کی لہریں کوندتی محسوس ہوئیں۔ میں بے حد پرسکون انداز میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا مزار کی پرشکوہ عمارت کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ مجھے لگا کہ میرا وجود لوہے کا حقیر ذرہ ہے جسے کوئی بے حد طاقتور مقناطیس اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ رات کے اس پہر مجھے مزار کے اس احاطے میں مکمل سکوت کی کیفیت نظر آئی۔ میں ہر طرف سے بے نیاز ہو کر اپنے دل میں موجیں مارتی عقیدت و محبت کی لہروں کی پرورش کرتا ہوا' دھڑکتے دل کے ساتھ تربت کی پائنتی جا کھڑا ہوا۔ یک لخت مجھے اپنا دل بھاری ہوتا محسوس ہوا۔ میری

آنکھوں میں بے اختیار اشکوں کے بادل امڈ آئے ایک بار آنکھوں کے چھلکتے ہی گویا منہ زور لہروں کو راستہ مل گیا۔اشکوں کے دھارے میرے چہرے کو بھگوتے چلے گئے۔روتے روتے میری ہچکیاں بندھ گئیں پھر رفتہ رفتہ میرے دل کو سکون آتا چلا گیا۔میرے آنسو بھی خود بخود دھمتے چلے گئے۔میں نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھانا چاہے لیکن میں اپنے ہاتھوں کو جنبش نہ دے سکا۔عین اسی لمحے مجھے اپنے آس پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔مشک وعنبر کی خواب گیں مہک ایک بار پھر میری مشام جاں کو معطر کرنے لگی۔میں نے قدرے اضطراب کے عالم میں اپنے آس پاس کا جائزہ لینا چاہا لیکن میں اپنی گردن کو ذرا سی بھی جنبش بھی نہ دے سکا۔مجھے واضح طور پر محسوس ہوا کہ میری کلائی پر سے وہ غیر مرئی گرفت ختم ہو چکی ہے۔عین اسی وقت کسی نے میرے شانے پر نرمی اور اپنائیت سے ہاتھ رکھ دیا۔

'تو آ گیا ہے میرے بچے؟' میرے کانوں میں کسی کی شہد یلی آواز گونجی۔وہ آواز سن کر میرا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔مجھے لگا کہ یہ آواز میں نے پہلے بھی کہیں سنی ہے۔۔۔لیکن کہاں؟ اسی لمحے اس شخص نے میرا بازو پکڑ کر میرا رخ اپنی طرف کر لیا۔اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مجھے اپنی آنکھیں چندھیاتی محسوس ہوئیں۔سفید براق' برف کے گالوں جیسی گھنی داڑھی' چمک دار آنکھوں پر جھکی لمبی لمبی سفید پلکیں اور آدھے پپوٹوں کو چھپائے ہوئے بھاری' گھنی بھنویں۔۔۔ایک سیکنڈ کے اندر اندر میں نے اسے پہچان لیا۔قلندر بابا۔۔۔کیا میں اس کی مشفق نورانی صورت بھلا سکتا تھا؟

مجھے قلندر بابا کی مہربان آنکھوں میں محبت اور شفقت کا دریا موجیں مارتا نظر آیا۔'یہ تو نے کیا حال بنا لیا ہے میرے بچے؟ یہ تو کن چکروں میں پڑ گیا؟' اس نے درد سے لبریز لہجے میں پوچھا۔اس کے لہجے کی اپنائیت نے ایک بار پھر میرے ضبط کے بندھن توڑ دیے۔میری آنکھیں ایک بار پھر جل تھل ہو گئیں۔میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر قلندر بابا بے چین ہو اٹھا۔'ارے۔۔۔ارے روتا کیوں ہے میرے بچے؟ سیف داد خان ہو کر روتا ہے۔ارے تو تو میرا شیر ہے شیر ببر۔کہیں شیر بھی رویا کرتے ہیں۔' اس کے پیار بھرے تسلی کے الفاظ نے میرے دل کو اور رقیق کر دیا۔میرے آنسوؤں کی دھار مزید تیز ہو گئی۔قلندر بابا نے یک لخت مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔

'بس میرے بچے بس۔اب چپ ہو جا۔بس اتنی سی مصیبت سے حوصلہ ہار بیٹھا وے اگر اور آزمائش تجھ پر پڑی تو تو کیا کرے گا؟ تیری وہ فولادی قوت ارادی کہاں گئی' سیف داد خان جو تجھے منہ زور طوفانوں کے سامنے سینہ سپر کر دیا کرتی تھی۔' قلندر بابا میرے کان میں جانے کیا کیا سرگوشیاں کرتا رہا۔اس دوران میں وہ مسلسل میرے الجھے ہوئے بالوں میں اپنی استخوانی انگلیوں سے کنگھی کرتا رہا۔رفتہ رفتہ میرا دل و دماغ پرسکون ہوتا چلا گیا۔حتیٰ کہ میرے آنسو بالکل تھم گئے۔'بس اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔دیکھ تو سہی تو کتنی عظیم المرتبت ہستی کے حضور حاضر ہوا ہے۔بس اب تیرا بیڑا پار ہے۔' قلندر بابا نے مجھے اپنے سینے سے علیحدہ کر کے میرے دونوں ہاتھ فاتحہ کے انداز میں ملا دیے۔میں نے نہایت خشوع و خضوع سے اس عظیم ہستی کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کیا۔فاتحہ کے بعد قلندر بابا نے میرا بازو پکڑا اور

الٹے قدموں حجرے سے باہر نکل آیا۔میں نے اپنے قدموں کو ایک بار پھر بلا ارادہ حرکت میں آتے دیکھا۔قلندر بابا میرا بازو پکڑے دھیرے دھیرے ایک طرف چل پڑا۔مزار کے ایک دور افتادہ حصے میں پہنچ کر وہ ایک تنگ و تاریک حجرے میں داخل ہو گیا۔حجرے میں پہنچ کر اس نے ایک دیا روشن کر دیا۔'لے بیٹا سیف داد خان فی الحال یہ تیرا ٹھکانا ہے تجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ارے ہاں تجھے بھوک تو نہیں لگ رہی ہے؟'

میں نے انکار میں سر ہلانا چاہا۔وہ ضعیف شخص اتنی رات گئے میرے لیے کھانے کا بندوبست کیسے کرتا؟ قلندر بابا نے میرے چہرے سے میرے دل کی بات سمجھ لی۔اس کے جھریوں بھرے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ نمودار ہوئی۔'تکلف نہ کرو میرے بچے کیا تجھے نہیں معلوم کہ تو کس کا مہمان بنا ہے۔اچھا ٹھہر جا میں تیرے لیے کچھ کھانے پینے کو لاتا ہوں۔'

قلندر بابا مجھے چارپائی پر بیٹھا چھوڑ کر ایک تاریک گوشے کی جانب بڑھ گیا۔چند ہی لمحے بعد وہ واپس پلٹا۔میں نے دیکھا کہ اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں ایک طشتری اٹھائی ہوئی ہے جس پر خوان پوش ڈھکا ہوا ہے جبکہ اس کے بائیں ہاتھ میں ایک ڈول تھا۔قلندر بابا نے وہ طشتری میرے سامنے چارپائی پر رکھ دی جبکہ ڈول ساتھ والی چارپائی پر رکھ دیا۔

'چل بیٹا سیف داد خان بسم اللہ کر۔' میں نے مایوس نگاہوں سے طشتری کی طرف دیکھا۔'اوہو۔۔۔میں تو بھول ہی گیا۔تمھارے تو ہاتھ پابند ہیں۔ارے پگلے پریشان کیوں ہوتا ہے آگ میں تپ کر ہی سونا کندن بنتا ہے۔سانپ کو ڈھیلے ہاتھ سے پکڑنے کی کوشش کرو گے تو وہ تو پلٹ کر ڈسے گا ہی کیونکہ یہ تو اس کی فطرت میں شامل ہے۔اس بار اس کا داؤ چل گیا تو مایوس ہونے کی کیا بات ہے؟ آئندہ معرکے میں تم بھی حساب برابر کر لینا۔اچھا ٹھہرو' میں اپنے ہاتھوں سے تیری خاطر تواضع کرتا ہوں۔'

قلندر بابا' نے اپنی بات ختم کر کے طشتری پر سے خوان پوش ہٹا دیا۔طشتری میں موجود نعمت پر نظر پڑتے ہی مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔وہ طشتری سرخ سرخ' رس بھری جلیبیوں سے پر تھی۔میری حیرت کا سبب دراصل یہ تھا کہ ان جلیبیوں سے گرما گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔قلندر بابا نے حسب معمول میری حالت کو فوراً ہی سمجھ لیا'حیران کیوں ہوتا ہے میرے بچے؟ ابھی تو ناپختہ ہے۔حالات کی بھٹی میں جب پکے گا تو تجھ پر سب کچھ عیاں ہو جائے گا' قلندر بابا نے ایک گرما گرم جلیبی اٹھا کر میرے منہ کی طرف بڑھائی۔جونہی جلیبی میرے لبوں کے قریب آئی میرا منہ خود بخود کھل گیا۔رس بھری جلیبی منہ میں پہنچتے ہی میرے جبڑے خود بخود ہی حرکت میں آ گئے۔قلندر بابا نے میرا ساتھ دیتے ہوئے خود بھی ایک جلیبی اٹھا لی۔ایک کے بعد قلندر بابا نے دوسری جلیبی میرے منہ میں ڈال دی اور اس کے بعد تیسری۔رات کے اس آخری پہر میں ان جلیبیوں نے ایسا مزہ دیا کہ بیان سے باہر ہے۔کئی جلیبیاں کھانے کے بعد قلندر بابا ٹھہر گیا''میرے خیال میں اب تمھارا شیرینی سے جی بھر گیا ہو گا؟ اس نے استفہامیہ انداز میں میرے چہرے کی طرف دیکھا'' قدرے توقف کے بعد اس نے دوسری چارپائی پر رکھا ہوا ڈول اٹھایا اور اسے

میرے منہ سے لگا دیا۔ نیم گرم دودھ کی لذیذ مہک میرے نتھنوں میں گئی۔ اگلے ہی لمحے میں نے غٹاغٹ دودھ پینا شروع کر دیا۔ عین اس وقت جب میرا پیٹ بھر گیا' قلندر بابا نے ڈول میرے منہ سے ہٹا لیا' بس اب تو آرام کر۔ بہت در بہ در بھٹک لیا چند دن اپنے بدن کو بھی آرام کرنے دے' قلندر بابا نے مجھے چارپائی پر لٹا کر' دیا بجھا دیا۔ کچھ ہی دیر میں مجھ پر نیند کا غلبہ طاری ہو گیا۔

اگلی صبح میری آنکھ کھلی تو میں نے قلندر بابا کو بدستور اپنے سرہانے پایا۔ اس نے اسی پراسرار طریقے سے مجھے ناشتا کرایا۔ ناشتہ کے بعد وہ مجھے مزار کے احاطے میں لے آیا اور مجھے ایک چھدرے سے درخت کے نیچے ایک چادر پر بٹھا دیا "تو یہاں بیٹھ کر خلق خدا کا حال دیکھ سیف داد خان۔ اس اثناء میں' میں اپنے دیگر فرائض ادا کر کے آتا ہوں' تو فکر نہ کر' تجھے یہاں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ دوپہر تک میں واپس آ جاؤں گا۔" قلندر بابا مجھے وہاں چھوڑ کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا مزار کی حدود سے باہر نکل گیا۔

کچھ ہی دیر میں زائرین کی آمد شروع ہو گئی۔ سورج چڑھنے تک وہاں اچھی خاصی چہل پہل ہو گئی۔ میرے پاس سے گزرنے والے بہت سے لوگوں نے عجیب سی نظروں سے میرا جائزہ لیا لیکن میری طرف سے توجہ نہ پا کر وہ آگے بڑھ گئے' انھوں نے مجھے نشے کی لت کا شکار نوجوان سمجھا ہوگا۔ میں طوعاً و کرہاً ان کی نگاہوں کے زہریلے تیر برداشت کرتا رہا۔ اچانک ایک موٹی سی' گول مٹول ادھیڑ عمر عورت میری طرف بڑھی۔ اس نے بغور میرے چہرے کا جائزہ لیا پھر افسوس بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے اٹھنی اور چونی کے دو تین سکے میرے سامنے چادر پر ڈال دیے۔ اس کی اس حرکت سے مجھے شدید جذباتی صدمہ پہنچا۔ میرا دل چاہا کہ یہ سکے اٹھا کر اس عورت کے منہ پو دے ماروں اور اسے کہوں کہ میں کوئی بھکاری نہیں ہوں جس پر رحم کھا کر وہ بھیک دے رہی ہے۔ لیکن میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے کے علاوہ کچھ نہ کر سکا۔ اس عورت کے ڈالے ہوئے سکے میرے سامنے چادر پر چمکتے رہے۔ ان سکوں کی چمک نے مزید نرم دل زائرین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ رفتہ رفتہ سکوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ کچھ ہی دیر میں میرے سامنے چادر پر اچھی خاصی رقم سکوں اور نوٹوں کی شکل میں جمع ہو گئی۔ یہ تمام سکے مجھے اپنی روح میں سوراخ کرتے محسوس ہوئے۔ تو نے مجھے یہ دن بھی دکھانا تھا میرے رب کہ میں معزور و مفلوج بھکاری بن کر بھیک مانگوں۔ شدید بے بسی کے احساس سے میری آنکھیں بہہ نکلیں۔ میرے آنسوؤں نے مجھے اور زیادہ رحم کا مستحق بنا دیا۔ میرے سامنے پڑے ہوئے سکوں کی تعداد میں اور تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔

دوپہر ہونے تک میں اچھی خاصی رقم کا "مالک" بن گیا۔ دھوپ کی تیزی میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں براہ راست دھوپ کی زد میں آ گیا۔ مجھے اپنے وجود میں سوئیاں چبھتی محسوس ہوئیں۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ مجھے اس اذیت میں زیادہ دیر مبتلا نہ رہنا پڑا کیونکہ کچھ ہی دیر بعد ایک بلند دیوار کے بڑھتے ہوئے ٹھنڈے سائے نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

اس وقت مجھے قلندر بابا اپنی جانب بڑھتا ہوا نظر آیا۔ میرے قریب پہنچ کر اس کی نظر میرے سامنے پڑے ہوئے سکوں پر پڑی۔ میں نے اس کے چہرے پر شریر مسکراہٹ نمودار ہوتے دیکھی پھر یہ مسکراہٹ

ہلکے سے قہقہے میں تبدیل ہو گئی۔ میں نے شکایت بھری نظروں سے قلندر بابا کو دیکھا۔ اس نے اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا' ارے دل شکستہ کیوں ہوتا ہے؟ کیا ان لوگوں کے بھکاری سمجھنے سے تو بھکاری بن گیا ہے؟ قلندر بابا میرے پاس ہی چادر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔" میں نے تجھے کہا تھا نا کہ یہ مصیبت دراصل تیری آزمائش ہے اگر تو اس آزمائش میں کامیاب ہو گیا تو جسم کی مانند تیری روح بھی فولادی ہو جائے گی" میں قلندر بابا کی زبان سے نکلنے والے ایک ایک لفظ کو بغور سنتا رہا۔

"خدا اپنے بندوں پر اپنی نعمتوں کی برسات کیے رکھتا ہے۔ اس کی عطا کی ہوئی نعمتوں کے مزے لوٹتے ہوئے اکثر لوگ بھول جاتے ہیں کہ ہمیں نعمت عطا کرنے والا رب کریم کا شکر بھی ادا کرنا چاہیے۔ نتیجتاً جب ہمارا مالک ہمیں کسی نعمت سے محروم کر دیتا ہے تو ہمیں اپنی بے مائیگی اور عاجزی کا احساس ہوتا ہے اپنے نفس' اپنی انا کو مارنا سیکھو میرے بچے اسی میں تمھاری نجات ہے۔"

قلندر بابا کچھ دیر میرے پاس بیٹھا رہا۔ اس کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم کچھ دیر اور یہاں براجمان رہو۔ میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں"۔ قلندر بابا کچھ ہی دیر بعد واپس لوٹ آیا۔ مجھے کھانا کھلانے کے بعد وہ مجھے اٹھا کر حجرے میں لے گیا۔ چادر پر پڑے ہوئے پیسوں کو اس نے جھٹک کر زمین پر پھینک دیا' حجرے میں پہنچ کر اس نے مجھے سلا دیا۔

اگلی صبح قلندر بابا نے ایک بار پھر مجھے اسی درخت کے نیچے بٹھا دیا اور خود کسی طرف غائب ہو گیا۔ مجھے بن مانگے بھیک سے نوازا جاتا رہا۔ دوپہر سے کچھ دیر پہلے مجھے ایک عجیب سی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ میں درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ ایک مفلوک الحال سا ادھیڑ عمر شخص بلاوجہ میرے ارد گرد منڈلا رہا ہے۔ بالآخر وہ میرے پاس آن بیٹھا۔ چند لمحوں تک خاموش رہنے کے بعد وہ جھجکتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا" م۔۔۔ میں بہت غریب آدمی ہوں ملنگ سائیں۔ ایک اکیلا کمانے والا ہوں اور سات جی کھانے والے۔۔۔ مجھ پر رحم کرو' ملنگ سائیں' میں حیرانی کے عالم میں اس کی گفتگو کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتا رہا' صبح سے شام تک مزدوری کرتا ہوں ملنگ سائیں' تب کہیں جا کر بچوں کے لیے سوکھی روٹی کا انتظام کر پاتا ہوں۔ میرے ان کمزور کاندھوں پر چار جوان بیٹیوں کا بوجھ ہے ملنگ سائیں۔ میری حالت پر اپنی عنایت کرو ملنگ سائیں۔ میری قسمت بدل دو'

میں افسوس اور ہمدردی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس کی مسمسی صورت دیکھتا رہ گیا۔ وہ کچھ دیر میرے بولنے کا منتظر رہا پھر وہ میرے ہاتھ میرے پیر دبانے لگا" آپ کے لیے کیا مشکل ہے ملنگ سائیں' اس نے رازدارانہ لہجے میں میرے کان میں سرگوشی کی۔' آپ تو اللہ والے آدمی ہو۔ ایک بار نظر کرم میرے اوپر ڈال دو۔ میرا بیڑا پار ہو جائے گا' اس کی آواز مزید دھیمی ہوتی چلی گئی' بس ایک بار نمبر بتا دو' ملنگ سائیں۔ میں تمام عمر تمھارے قدموں میں پڑا رہوں گا'

کچھ دیر تک تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کہہ کیا رہا ہے پھر رفتہ رفتہ ساری بات میری سمجھ میں آتی چلی گئی۔ وہ شخص سٹے بازی کا شوقین تھا اور مجھ سے کوئی ایسا نمبر جاننا چاہتا تھا جس پر رقم لگا کر وہ اپنی رقم کو کئی

گنا کر سکے۔ مجھے اس کی حالت پر افسوس بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ اپنی مفلسی کا ذمہ دار وہ خود تھا۔ اپنی اس بد عادت کی وجہ سے اس نے اپنے کنبے کو غربت اور افلاس کی دلدل میں پھنسایا ہوا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اسے دھتکار کر یہاں سے بھگا دوں لیکن میں بے حس و حرکت بیٹھے رہنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔

وہ شخص کافی دیر تک میری منت سماجت کرتا رہا لیکن جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو اس پر مایوسی طاری ہونے لگی۔ میں چپ چاپ بیٹھا اس کی بکواس سنتا رہا۔ اچانک میں نے اس کے لہجے میں جوش و مسرت کی جھلک محسوس کی 'اوہ۔۔۔۔۔ میں سمجھ گیا ملنگ سائیں۔۔ میں بالکل سمجھ گیا۔۔۔ ایک دو۔۔۔ تین' وہ خدا جانے کیا چیز گننے لگا۔ 'گیارہ۔۔۔ بارہ' اس نے گنتی ختم کرتے ہوئے کہا۔ 'شکریہ بہت بہت شکریہ ملنگ سائیں' وہ اٹھ کر تیزی سے وہاں سے چل پڑا تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ کیا گنتا رہا ہے۔ اس وقت میرے سامنے چادر پر پڑے ہوئے سکوں کی تعداد بارہ تھی۔ اس نے وہ سکے گنے اور بارہ کے عدد کو اپنے لیے خوش قسمتی کا ہندسہ سمجھ کر خوشی خوشی وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اب وہ اس عدد پر رقم لگائے گا اور اپنی بچی کھچی پونجی بھی لٹا بیٹھے گا 'اس بدنصیب کے حال پر رحم کر میرے مالک' میں نے اپنے دل میں اس شخص کے لیے دعا کی۔

اس روز شام تک میں وہیں ڈیرہ جمائے بیٹھا رہا۔ مغرب سے کوئی گھنٹہ بھر پہلے میں نے اسی شخص کو ایک بار پھر اپنی جانب بڑھتے دیکھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں اخبار کی ایک پڑیا سی اٹھا رکھی تھی۔ وہ پڑیا اس نے میرے قریب رکھی اور یک لخت میرے پاؤں پکڑ لیے 'بہت بہت شکریہ ملنگ سائیں' آپ نے میری بگڑی بنا دی ہے' میری جھولی بھر گئی ہے ملنگ سائیں' مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے؟ 'میں نے اپنا سارا جمع جتھا داؤ پر لگا دیا ملنگ سائیں اور۔۔۔۔ اور میں جیت گیا' میں نے اس کی آواز میں لرزش محسوس کی۔ اگلے ہی لمحے اس نے اخبار کی پڑیا کھولی اور سرخ گلاب کے پھولوں کا بڑا سا ہار میرے گلے میں ڈال دیا۔ 'آپ بہت پہنچی ہوئی ہستی ہیں ملنگ سائیں' وہ جانے کیا کہتا رہا۔ اسی دوران وہ مسلسل میرے ہاتھ پیر دباتا رہا۔ اچانک میری نگاہ اپنے سامنے پڑے ہوئے اخبار پر پڑی۔ سامنے چھپی ہوئی ایک خبر کو پڑھ کر میں بری طرح چونک گیا۔

'نشتر اسپتال سے پراسرار انداز میں غائب ہونے والے مریض کا ابھی تک بتا نہیں چلایا جا سکا۔'

میں نے سرخی کے نیچے درج خبر پر نظر دوڑائی۔ اس خبر کے مطابق پولیس ابھی تک اس مفلوج مریض کا پتا نہیں لگا سکی جو نشتر اسپتال کے شعبہ حادثات سے پراسرار انداز میں غائب ہو گیا تھا۔ نیز اس خبر کے شائع ہونے کے بعد کسی گمنام شخص نے اخبار کے دفتر فون کر کے دعویٰ کیا تھا کہ وہ مریض دراصل بھارتی جاسوس تھا جو گرفتاری کے خوف سے فرار ہو گیا۔ فون کرنے والا شخص اس سوال کا تسلی بخش جواب نہ دے سکا کہ اسے یہ سب کیسے معلوم ہوا۔ ہمارے نمائندے نے جب پولیس کے حکام سے اس گمنام شخص کے دعوے کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے اسے سراسر بکواس قرار دیا۔

یہ خبر پڑھ کر مجھے اپنے وجود میں چنگاریاں سی بھڑکتی ہوئی محسوس ہوئیں۔۔ بھارتی جاسوس۔۔۔ میں

بھارتی جاسوس؟ یہ یقیناً اسی حرام زادے رفاقت علی کی کارستانی ہے۔ کاش میں تیری ہڈیوں کا چورا بنا سکوں کتے کے بچے۔ تو نے مجھے میری زندگی کا بدترین اذیتوں سے دوچار کیا ہے۔

کچھ دیر بعد وہ شخص چلا گیا۔ میں مغرب کے وقت تک بیٹھا اس صورت حال پر غور کرتا رہا۔ مغرب کے بعد قلندر بابا مجھے حجرے میں لے گیا۔ جب وہ مجھے کھانا کھلانے لگا تو بے اختیار میرے آنسو نکل آئے۔ خلاف توقع میرے آنسو دیکھ کر قلندر بابا خود بھی رنجیدہ ہو گیا۔ اس نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ سینے سے لگتے ہی میرے بندھن ٹوٹ گئے۔ میری آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب بہہ نکلا 'مجھے تیری حالت کا احساس ہے میرے بچے' قلندر بابا نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہا 'فکر نہ کر انشاءاللہ جلد ہی تیری یہ آزمائش ختم ہو جائیگی' بس اب یہ آنسو روک لے' تجھے روتا دیکھ کر میرے کلیجے کے ٹکڑے ہونے لگتے ہیں' بڑی مشکل سے میرے آنسو تھمے۔ مجھے کھانا کھلانے کے بعد قلندر بابا نے مجھے بستر پر لٹاتے ہوئے کہا' تو آرام کر' آج رات میں باہر گزاروں گا اور خدا سے تیرے لیے دعا کروں گا'

قلندر بابا مجھے لٹا کر میرے سونے کا انتظار کیے بغیر حجرے سے باہر نکل گیا۔ میں بہت دیر تک دیے کی ٹمٹماتی روشنی میں حجرے کی چھت پر نظریں جمائے خیالوں کے بیابان میں بھٹکتا رہا پھر جانے کس وقت مجھے نیند آ گئی۔

اس رات میں بہت گہری نیند سویا۔ وہ رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ حجرے میں ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ یک لخت مجھے محسوس ہوا کہ میرا پورا جسم پسینے میں بھیگا ہوا ہے۔ پھر مجھے مشک کی تیز مہک کا احساس ہوا۔ مجھے لگا کہ یہ مہک میرے مساموں سے پھوٹ رہی ہے۔ اسی لمحے مجھے اپنے منہ میں شیرینی کا ذائقہ محسوس ہوا۔ یک لخت میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے احساس ہوا کہ کوئی عجیب و غریب واقعہ رونما ہو چکا ہے کوئی بہت ہی غیر معمولی واقعہ۔ میں نے ڈرتے ڈرتے بہت ہی آہستگی سے اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دینے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کر فرط حیرت اور خوشی سے میری چیخ نکل گئی کہ میرا ہاتھ میری مرضی کے مطابق حرکت کر رہا ہے۔ میں نے فوراً اپنے ہاتھ پیروں کو ہلا جلا کر دیکھا۔ یہ جان کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ میں اپنے جسم کو اپنی مرضی کے مطابق حرکت دے سکتا ہوں۔

'تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے پاک پروردگار' میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی اور مجھے اٹھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔

'مبارک ہو سیف داد خان' میرے کانوں میں قلندر بابا کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا لیکن گہرے اندھیرے کے باعث مجھے اس کی شکل نظر نہ آئی۔

'مبارک ہو میرے بچے۔ میرے پیارے رب نے تجھے ایک نئی زندگی عطا کی ہے۔'

'بابا۔۔ بابا تم کہاں ہو؟ روشنی کرو بابا' میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔'

'ارے تم ابھی تک مجھ سے ملے ہی نہیں ہو' قلندر بابا نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا' مجھ سے تم بعد میں

مل لینا' پہلے تم خدا کے حضور شکرانے کے دو نفل پڑھ کے آؤ۔ جاؤ شاباش۔ فجر کی اذان ابھی ہوئی ہے۔'

'اچھا بابا اچھا۔۔۔ تمھارا حکم سر آنکھوں پر لیکن تم دیا تو جلاؤ۔'

قلندر بابا نے دیا روشن کر دیا۔ میں نے چارپائی کے پاس پڑے ہوئے خستہ حال سلیپر پہنے اور حجرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ قلندر بابا بھی میرے ساتھ ساتھ آیا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے کہا 'تم مسجد کی طرف چلو۔ میں کچھ دیر میں آتا ہوں' میں اثبات میں سر ہلا کر مسجد کی جانب چل پڑا۔ مسجد کی طرف جاتے ہوئے مجھے ہر قدم پر اپنی توانائی میں اضافہ ہوتا محسوس ہوا۔ مسجد میں جا کر میں نے وضو کر کے دو نفل نماز شکرانہ ادا کی۔ اس اثناء میں فجر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ جماعت کے لیے صفیں تیار ہونے لگیں۔ میں انتظار کرتا رہا لیکن قلندر بابا نہ آیا۔ میں نے جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔ دعا کے دوران میں نے تمام نمازیوں کا جائزہ لیا لیکن قلندر بابا وہاں نظر نہ آیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ کہاں رہ گیا ہے۔ نماز کے بعد میں ایک بار پھر حجرے کی طرف روانہ ہوا۔ مطلوبہ مقام پر پہنچ کر میں نے حجرے کے دروازے کی طرف قدم بڑھائے لیکن پھر میں ایک جھٹکے سے رک گیا۔ مجھے لگا کہ جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ جس جگہ حجرے کا دروازہ ہونا چاہیے تھا وہاں پر ایک سپاٹ دیوار موجود تھی۔ میں نے جلدی جلدی تین چار بار آنکھیں جھپکیں لیکن وہ سنگلاخ دیوار وہیں موجود رہی۔ شدید حیرانی کے عالم میں' میں نے مزید قریب سے دیوار کا جائزہ لیا لیکن مجھے وہاں کوئی معمولی سا رخنہ بھی نظر نہ آیا۔ یا خدایا' یہ کیا اسرار ہے؟ میرا دل چاہا کہ قلندر بابا کو آواز دے کر دیکھوں لیکن پھر میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ قلندر بابا کو اگر مزید میرا ساتھ دینا ہوتا تو وہ مجھے اس طرح چھوڑ کر نہ چلا جاتا۔

میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر مایوس ہو کر وہاں سے پلٹ پڑا۔ حضرت بہاؤالدین زکریا کی خدمت میں حاضر ہو کر میں نے نذرانہ سلام و فاتحہ پیش کیا۔ اس کے بعد میں مزار کے احاطے سے باہر نکل آیا۔ اس دلکش اور حسین صبح میں نے گویا اپنی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ خدا کی اس زمین پر اپنے پیروں پر چلنا بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اپنی سابقہ حالت پر غور کرتا تو مجھے جھری جھری سی آنے لگتی۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں نے سوچا کہ اب کس طرف کا رخ کروں؟ اس شہر میں تو میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے' سوائے۔۔ نور جہاں بیگم کے اڈے کے۔ مجھے اس عجیب و غریب حلیے میں دیکھ کر وہ لوگ کیا سوچیں گے لیکن میں وہاں کے علاوہ اور کہاں جاؤں؟ میں نے یوں ہی بے خیالی میں اسپتال والی وردی کی ڈھیلی ڈھالی قمیض کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میری انگلیاں کاغذ کے مانوس ٹکڑوں سے ٹکرائیں اور میرا دل خوشی سے بلیوں اچھل پڑا۔ میں نے تمام چھوٹے بڑے نوٹ نکال کر گنے تو وہ اچھی خاصی رقم بن گئے۔ میرے دل سے بے اختیار قلندر بابا کے لیے دعا نکلی۔ اس نے مجھ سے جدا ہونے سے پہلے میری ممکنہ دشواریوں کا حل بھی میرے حوالے کر دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں پہلے کسی اچھے سے ہوٹل سے ناشتا کروں اور اس کے بعد کسی اعلیٰ قسم کے اسٹور سے اپنے لیے لباس خریدوں لیکن پھر میں نے اپنے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ مجھے یاد آ گیا کہ میرے متعلق اخبار میں کس قسم کی سنسنی خیز خبریں چھپ چکی ہیں۔ اس

صورت حال میں میرا کم سے کم لوگوں کے سامنے آنا ہی بہتر ہوتا۔ اس حلیے میں کسی اسٹور یا ہوٹل میں داخل ہو کر میں خواہ مخواہ تماشا بن جاتا۔ اگر خدانخواستہ میں پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تو مجھے لینے کے دینے پڑ جاتے۔ میں اپنی اسپتال سے پراسرار گمشدگی کا کیا جواز پیش کرتا؟ وہ تو پہلے ہی مجھے بھارتی جاسوس ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ میری آہ و بکا پر کون کان دھرے گا؟

اسی وقت مجھے سامنے سے ایک خالی رکشا آتا نظر آیا۔ میں نے فوراً اسے ہاتھ دے کر روک لیا۔ خوش قسمتی سے رکشا ڈرائیور ایک سیدھا سادا نوجوان ثابت ہوا۔ اس نے بلا حیل و حجت مجھے حسین آگاہی پہنچا دیا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ گھر کے دروازے پر دستک دی۔ دروازے کھولنے والی چھیمو بی تھی۔ مجھے پہچاننے میں اسے چند لمحے لگ گئے' ارے بیٹا ذوالفقار تم؟' اس نے حیران سے لہجے میں پوچھا 'یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟' اس نے مجھے گھر میں داخل ہونے کے لیے راستہ دے دیا۔ اندر پہنچ کر میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اسی اثناء میں چھیمو بی نے نور جہاں بیگم اور دونوں لڑکیوں کو بھی جگا دیا۔ وہ تینوں کمرے سے اپنے حلیے درست کرتی نکلیں۔

'ارے میاں ذوالفقار علی شاہ' آپ اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے؟ اور یہ آپ نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟' نور جہاں بیگم نے مجھ پر تابڑ توڑ سوال کرتے ہوئے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ میں جواب دے پاتا عنبرین اور پروین نے بھی مجھ پر سوالات کی بارش کر دی۔ میں بڑی مشکل سے ان لوگوں کو کسی حد تک مطمئن کر سکا۔

ناشتے کے بعد میں اوپری منزل پر اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ نور جہاں بیگم نے سلامت علی کا شیونگ کا سامان اوپر بھجوا دیا۔ اپنا بے ہنگم حلیہ درست کرنے کے بعد میں بستر پر دراز ہو گیا۔ دوپہر کے وقت دونوں لڑکیاں میرے کمرے میں آن دھمکیں۔ ان دونوں نے میرے سامنے ان چیزوں کا ڈھیر لگا دیا جو وہ بازار سے میرے لیے خرید کر لائی تھیں۔ مجھے ان کی اپنائیت دیکھ کر شرمندگی کا احساس ہوا۔ ان دونوں کے شدید اصرار پر اسی وقت وہ لباس پہن کر دکھانے پڑے۔ خدا خدا کر کے وہ دونوں رخصت ہوئیں تو میں نے سکون کا سانس لیا۔

اس روز میں دیر تک ان حالات سے نمٹنے کے راستے تلاش کرتا رہا۔ مجھے بار بار خیال آتا کہ ملتان شہر میرے لیے آہنی پنجرا بنتا جا رہا ہے جس سے نکلنا میرے لیے ناممکن ہو گیا ہے۔ رفاقت علی کو قتل کرنا تو دور کی بات ہے۔ یہاں تو مجھے خود اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک بار تو میرے دل میں آئی کہ میں انسپکٹر نیازی کے پاس پیش ہو کر اسے تمام حالات سے آگاہ کر دوں لیکن پھر میں نے خود ہی اپنا یہ خیال مسترد کر دیا۔ خدا جانے وہ میری بات کا یقین کرتا بھی یا نہیں۔ اگر وہ مجھے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیتا تو شاید مجھے اپنی اصل شخصیت چھپانا بھی مشکل ہو جاتا۔ میں پولیس سے جتنا بھی دور رہتا اتنا ہی میرے لیے بہتر ہوتا۔ البتہ اگر مجھے کسی طرح سے ملک کریم کے متعلق کچھ معلوم ہو جاتا تو شاید میرے لیے کوئی بہتری کی صورت نکل آتی۔ مجھے یقین تھا کہ ملک کریم میری بہت مدد کر سکتا ہے لیکن اس کے متعلق

آخری اطلاعات یہی ملی تھیں کہ اسے تحقیقاتی ادارے نے گرفتار کرلیا ہے۔

میں شام تک سوتا رہا۔ شام کو میں لباس تبدیل کر کے بیٹھا ہی تھا کہ چھیمو بی میرے لیے چائے لے کر آ گئی۔ میں نے چائے کے دو ہی گھونٹ بھرے ہوں گے کہ ایک تخنی سا شخص حواس باختگی کے عالم میں میرے کمرے میں آیا۔

'وہ۔۔۔وہ رنگو استاد۔۔۔رنگو استاد عنبرین بی بی کو اٹھا کر لے گیا ہے' اس نے پھولے سانسوں کے ساتھ بتایا۔

'ہائے اللہ میں مرگئی' چھیمو بی نے ایک زوردار چیخ ماری اور روتی ہوئی مکان کے نچلے حصے کی طرف دوڑی۔

'یہ رنگو استاد کون ہے؟' اور وہ عنبرین کو کیوں لے گیا ہے؟' میں نے نور جہاں بیگم کے اڈے کے اس سازندے کو بری طرح جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

'وہ۔۔۔رنگو استاد۔۔۔وہ اس علاقے کا سب سے بڑا استاد۔۔۔سب سے بڑا بدمعاش ہے۔ تمام علاقہ اس سے ڈرتا ہے۔'

'لیکن وہ عنبرین کو کیوں اٹھا کر لے گیا ہے؟' میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

'عنبرین نے استاد راگو کے خلیفہ نیمے پہلوان کے منہ پر تھپڑ مار کے اسے ذلیل کر کے اڈے سے بھگا دیا تھا۔ رنگو استاد نے اپنے شاگرد کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے عنبرین کا اغوا کرلیا۔'

'مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ یہ سب ہوا کیسے؟ عنبرین تو اب محفل میں نہیں ناچتی ہے؟' میں نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

اسی بات پر تو سارا جھگڑا ہوا ہے شاہ جی۔ نیمے پہلوان نے آج ہمارے اڈے پر آتے ہی عنبرین کے مجرے کی فرمائش کی۔ نور جہاں بیگم نے نرمی سے اسے سمجھایا کہ عنبرین نے دھندا کرنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ پروین کا مجرا دیکھ لے۔ نیمے پہلوان حلق تک چڑھائے ہوئے تھا' چنانچہ وہ بدتمیزی پر اتر آیا۔ اتفاق سے عنبرین بھی وہیں موجود تھی۔ نیمے پہلوان نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ عنبرین نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا اور گھنگھروؤں کی جوڑی اس کے منہ پر مار کر اسے لہولہان کر دیا۔ وہ گالیاں بکتا اور دھمکیاں دیتا چلا گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے رنگو استاد خود ہمارے ڈیرے پر آیا تھا۔ اس نے چاقو دکھا کر سب کو ایک طرف کر دیا اور عنبرین کو اٹھا کر لے گیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ آج چوک میں عنبرین کا مجرا کرائے گا۔'

'یہ حرام کی نسل رنگو استاد رہتا کہاں ہے؟' میں نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے پوچھا اور تم لوگوں کو شرم نہیں آئی' اتنے لوگوں کے سامنے ایک اکیلا آدمی لڑکی کو اغوا کر کے لے گیا۔'

'وہ بہت خطرناک آدمی ہے شاہ جی۔ کئی آدمیوں کے پیٹ پھاڑ چکا ہے۔ ہر وقت اپنے پاس بھرا پستول رکھتا ہے۔ پولیس تک اس سے ڈرتی ہے' سازندے نے سہمے ہوئے لہجے میں اپنی صفائی پیش کی۔

'اس کی تو ایسی کی تیسی' آخر وہ ہے تو انسان ہی۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس کے اندر کتنا دم خم ہے' تم مجھے

اس کا پتہ بتاؤ' اس نے مختصر الفاظ میں مجھے رنگو استاد کا پتا بتا دیا۔ میں پتا اچھی طرح سمجھنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔

بہن دنوں کے بعد مجھے اپنے وجود میں شعلہ فشاں' آتش ریز سیف داد خان بیدار ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نچلی منزل پر پہنچا تو میں نے چھیمو بی کو وہاں بین کرتے پایا۔ میں اس سے بات کیے بغیر مکان کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ علاقے کی گلیوں سے گزرتے ہوئے میں نے ماحول پر خوف و ہراس کی دھند چھائی ہوئی محسوس کی۔ اس کا مطلب ہے کہ رنگو استاد واقعی خطرناک شخص ہے۔ خیر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جب دو افراد لڑائی کے لیے ایک دوسرے کے سامنے ہوں تو ان میں سے ایک تو قوت و مہارت میں برتر ہوتا ہی ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ جیت زیادہ طاقت ور اور ماہر شخص کی ہی ہو۔ بعض اوقات طاقت اور مہارت کو عزم اور جذبۂ صادق کے سامنے سرنگوں ہونا پڑتا ہے۔ جب دو افراد باہم نبرد آزما ہوں تو صرف ان کے جسم ہی آپس میں نہیں ٹکراتے بلکہ ان کے سینوں میں بھڑکتی ہوئی مخاصمت کی آگ بھی ایک دوسرے کو جلانے کی کوشش کرتی ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک فریق برتر ہونے کے باوجود اپنے مخالف کی نفرت کی آگ کی زد میں آ کر بھسم ہو جاتا ہے۔ تجھے آج سیف داد خان کے سینے میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کا سامنا کرنا ہے رنگو استاد۔ آج تیری ساری استادی ان شعلوں کی نذر ہو جائے گی۔ مجھے اس وقت خضر خان کا مہربان چہرہ یاد آ رہا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ اس کی زندگی کا حاصل عنبرین اس کی منتظر ہے۔ وہ جب چاہے اسے بیاہ کر لے جا سکتا ہے اور اب اس نیک خصلت شخص کی امانت کو ایک بد نیت شخص اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لیے لے اڑا تھا۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ عنبرین میری ذمہ داری ہے۔ میں نے ہی اسے باعزت زندگی کے خواب دکھائے ہیں۔ میں ان خوابوں کو چکنا چور نہیں ہونے دوں گا۔ میں اسے واپس لاؤں گا چاہے مجھے اس کے لیے جان سے ہی کیوں نہ ہاتھ دھونا پڑیں۔

رنگو استاد کے علاقے میں پہنچ کر میں نے واضح طور پر تناؤ کی فضا محسوس کی۔ لوگوں کی اکا دکا ٹولیاں ادھر ادھر کھڑی چہ می گوئیاں کر رہی تھیں۔ ایک اجنبی چہرے کو اتنی بے باکی سے رنگو استاد کے ڈیرے کی طرف بڑھتے دیکھ کر ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ میں ان پر توجہ دیئے بغیر سیدھا اس حویلی نما مکان کے کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہو گیا۔

مجھے دروازے پر کسی نے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے سامنے ہی ایک بڑا سا دروازہ سا نظر آیا۔ میں بے دھڑک اس دروازے سے اندر گھستا چلا گیا۔ مجھے کسی سے رنگو استاد کے متعلق پوچھنا نہیں پڑا کیونکہ وہ فوراً ہی نظر آ گیا۔ اس ہال نما کمرے کا منظر کسی گھٹیا قسم کی فلم کے سیٹ کے مانند تھا۔ رنگو استاد مجھے ایک بڑے سے تخت پر آلتی پالتی مارے بیٹھا نظر آیا۔ اس کے قریب بیٹھے ہوئے اس کے چمچے 'نیمے پہلوان' کو بھی میں نے فوراً پہچان لیا۔ اس کے سوجے ہوئے منہ نے مجھے فوراً اس کی شناخت کرا دی۔ رنگو استاد میری توقع کے خلاف ایک عام سی جسامت کا شخص ثابت ہوا۔ اپنے حلیے سے اس نے خود کو ایک مستند قسم کا بدمعاش تسلیم کرانے کی پوری کوشش کی تھی لیکن جانے کیوں وہ مجھے بدمعاش کے بجائے ایک بہروپیا

محسوس ہوا۔

میں نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا رنگو استاد کے تخت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ 'عنبرین کہاں ہے؟' میں نے بلاتمہید رنگو استاد پر سوال داغ دیا۔ میرے انداز نے ان دونوں کو بری طرح چونکا دیا۔

دونوں استاد شاگرد نے حیرانی کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا 'تو کون ہے بے؟' نیمے پہلوان نے مجھ سے ڈپٹ کر سوال کیا۔ میں نے عقارت بھری نظر اس پر ڈالی۔

'تو تو اپنی چونچ بند ہی رکھ۔ چھوکری سے پٹنے والے پہلوانوں سے بات کرنا میں اپنی توہین سمجھتا ہوں' میں نے اپنے عقب میں لوگوں کے ہنسنے کی آواز سنی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ کمرے کے دروازے پر لوگوں کا اچھا خاصا ہجوم جمع ہو چکا ہے۔ وہ سب نیمے پہلوان کی بہادری کا ذکر سن کر ہنس رہے تھے۔ میری بات سن کر نیمے پہلوان کے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھی۔

'اوئے تیری تو۔۔۔' اس نے تخت سے اٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن رنگو استاد نے اس کے کندھے پر دباؤ ڈال کر اسے دوبارہ بٹھا دیا۔

'تو کون ہے جوان اور تیرا اس چھوکری سے کیا تعلق ہے؟' میں نے رنگو استاد کے لہجے میں صلح جوئی کی جھلک محسوس کی۔ نتیجتاً میرا لہجہ مزید جارحانہ ہو گیا۔

'تمھیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے' میں اس لڑکی کو لینے آیا ہوں' بہتر یہی ہے کہ اسے شرافت سے میرے ساتھ بھیج دو ورنہ۔۔۔'

'ورنہ تم کیا کر لو گے؟' نیمے پہلوان نے تخت پر سے اترتے ہوئے غضب ناک لہجے میں سوال کیا۔ اس بار رنگو استاد نے اسے روکنے کی کوشش نہ کی۔

'ورنہ میں اسے زبردستی واپس لے جاؤں گا۔'

'اوئے جا۔۔۔ بڑا آیا چھوکری کو لے جانے والا' اس نے اپنا بھاری بھرکم ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر مجھے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی۔ اس مرحلے پر میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک زبردست جھٹکے سے آگے کی جانب کھینچ لیا۔ نیمے پہلوان بے اختیار آگے جھکا۔ میرا گھٹنا طوفانی رفتار سے اٹھا اور اس کے سینے سے ٹکرایا۔ نیمے پہلوان بری طرح کھانسنے لگا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ میں نے اس کے منہ پر تابڑ توڑ گھونسوں کی بارش کر دی۔ چند ہی گھونسوں میں اس کا منہ لہولہان کر دیا۔ اس سے نمٹنے کے بعد میں رنگو استاد کی جانب متوجہ ہوا۔ میں نے دیکھا کہ وہ حیرانی کے عالم میں منہ پھاڑے۔ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی ردعمل ظاہر کرتا' اچانک وہاں پر موجود لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ 'پولیس' کسی نے دبی آواز میں کہا۔

اگلے ہی لمحے ایک اے ایس آئی' تین کانسٹیبلوں کے ساتھ ہال میں داخل ہوا 'اوئے یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم لوگوں نے؟' اے ایس آئی نے گرج دار لہجے میں سوال کیا۔

'ارے تھانے دار صاحب' آیئے آیئے تشریف لایئے' رنگو استاد نے خوشامدی لہجے میں کہا۔

'رنگو استاد' کیا حال ہے تمھارا؟ سنا ہے کوئی چھوکری شوکری بھگا لائے ہو تم؟'

'ارے نہیں تھانے دار صاحب' وہ کنجری کی بچی وہ ہتھ چھٹ ہو گئی تھی۔ اسے اس کی اوقات یاد دلانے کے لیے چٹیا پکڑ کر لے آیا تھا۔'

'ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر کام کیا کرو رنگو استاد۔ وہ حرافہ بڑھیا نور جہاں بیگم بڑے وسیع تعلقات رکھتی ہے۔ شام سے اب تک تھانے میں چار پانچ فون آ چکے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ اس چھوکری کو واپس بھیج دو۔'

'ارے ہمیں اس چچوڑی ہڈی سے کیا لینا ہے تھانے دار جی۔ آپ کا حکم ہے تو ابھی دفع کر دیتے ہیں اسے۔۔۔'

'تھانے دار جی' اس حرامی تے میری ناک کی ہڈی توڑ دی ہے' نیمے پہلوان نے تقریباً روتے ہوئے میری طرف اشارہ کیا۔

'اوئے یہ کون تیس مار خاں ہے بھئی؟' اے ایس آئی نے چونک کر میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

'تھانے دار جی' یہ نور جہاں بیگم کا پالتو غنڈا ہے۔ یہ چھوکری کو چھڑانے کے لیے آیا ہے۔ نیمے نے اس سے بات ہی کی تھی کہ اس نے اس کی ناک پر مکا مار دیا۔ وہ تو میں نے نیمے کو روک دیا ورنہ اس کی تو یہاں لاش پڑی ہوتی۔'

'تم نے اچھا کیا رنگو استاد۔ اس کی بدمعاشی تو میں نکالوں گا تھانے لے جا کر۔ جبار لگا تو اس ڈشکرے کو ہتھ کڑی۔' اے ایس آئی نے اپنے ماتحت کو حکم دیا۔

'یہ کہاں کا انصاف ہے اے ایس آئی صاحب؟' میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا' ان لوگوں نے لڑکی اغوا کی ہے اور آپ انہیں گرفتار کرنے کے بجائے مجھے گرفتار کر رہے ہیں۔'

'زیادہ بکواس کرنے کی کوشش کی تو زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔ ذرا تھانے تو چل پھر میں تجھے بتاتا ہوں کہ انصاف کیسے کیا جاتا ہے؟' اس نے رعونت بھرے لہجے میں دھمکی دی۔ میرے شدید احتجاج کے باوجود کانسٹیبل نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ 'میں اسے تھانے لے جا رہا ہوں رنگو استاد۔ میرے جانے کے بعد تم اس چھوکری کو چھوڑ دینا۔'

'جو حکم تھانے دار جی' رنگو استاد نے خوشامدی لہجے میں جواب دیا۔ اس مرحلے پر میں نے مزاحمت کو بے سود سمجھا اور طوعاً و کرہاً ان کے ہمراہ تھانے کی جانب چل پڑا۔ تمام راستے لوگ مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے۔ کوئی مجھے خوف زدہ نظروں سے دیکھتا تو کسی کے چہرے پر نفرت کے آثار ابھر آتے۔

راستے میں کھڑے ہوئے چند آوارہ گرد لڑکوں نے مجھے گندی گالیاں دی۔ پولیس والوں نے منع کرنے کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ میرا دل چاہا کہ ان پولیسیوں سے ہتھکڑی چھڑا کر ان کی کھوپڑیوں کے ٹکڑے کر ڈالوں لیکن میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ سوائے مجرموں کے مانند سر جھکائے ان کے ساتھ ساتھ گھسٹنے کے۔

تھانے میں پہنچنے کے بعد انہوں نے کوئی سوال جواب کیے بغیر مجھے حوالات میں ڈال دیا پھر اے ایس آئی نے میرے سامنے ہی ایک کانسٹیبل کو نور جہاں کے ڈیرے کی طرف روانہ کیا' بڑھیا کو کہنا کہ اس لفنگے کے خلاف دفعہ تین سو سات کا کیس بنتا ہے۔اس کی خیریت چاہتی ہے تو فوراً تھانے پہنچے'۔اس نے کچھ دیر تک کانسٹیبل کے کان میں کھسر پھسر کی اور پھر اسے روانہ کر دیا۔

میں تن بہ تقدیر ہو کر حوالات کے ایک کونے میں بیٹھ رہا۔اتفاق سے اس وقت حوالات میں' میں تنہا ہی تھا۔مجھے یہی خوف ستائے جا رہا تھا کہ کہیں کوئی پولیس والا مجھے پہچان نہ لے۔نشتر اسپتال کے مفرور مریض کی حیثیت سے یا پھر۔۔۔سیف داد خان کی حیثیت سے۔

تقریباً دو گھنٹے کے تیز دھار انتظار کے بعد' میں نے نور جہاں بیگم اور سلامت علی کی تھانے دار سے بات کرنے کی آوازیں سنیں۔اے ایس آئی انہیں حوالات کے پاس لے آیا۔

'تم دونوں اس سے بات کرو' اتنی دیر میں اس کی رہائی کی تیاریاں مکمل ہو جائیں گی۔' انھیں وہیں چھوڑ کر تھانے دار واپس چلا گیا۔

'حرام خور' سور کا بچہ' تھانے دار کے جانے کے بعد نور جہاں بیگم اسے موٹی موٹی گالیاں دینے لگی۔

'تم ٹھیک تو ہو میاں؟ ان شیطانوں نے تم سے کوئی زیادتی تو نہیں کی؟' سلامت علی نے فکر مندی سے پوچھا۔

'نہیں' میں بالکل ٹھیک ہوں' کیا عنبرین گھر پہنچ گئی ہے؟ اسے تو کوئی تکلیف نہیں پہنچی؟'

'عنبرین بیٹا ٹھیک ٹھاک ہے۔اس سور رنگو استاد نے اسے خود ہی چھوڑ دیا۔۔۔تم فکر نہ کرو۔میں نے تھانے دار کے منہ میں سور کا ماس ٹھونس دیا ہے' اب تم آزاد ہو جاؤ گے۔'

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد تھانے دار نے مجھے حوالات سے آزاد کر دیا۔

'اس بار تو میں تمھیں چھوڑ رہا ہوں لیکن اگر تم نے دوبارہ بدمعاشی کی کوشش کی تو ساری زندگی کے لیے جیل میں سڑا دوں گا' اس نے شیطانی رعونت کے ساتھ مجھے دھمکی دی۔

اس کے لہجے کو سن کر میرا خون کھول اٹھا۔میں کوشش کے باوجود اپنی زبان پر قابو نہ پا سکا

'کیوں؟ کیا اس علاقے میں بدمعاشی کا ٹھیکا تم نے تمہارا رنگو استاد کو دے رکھا ہے؟'

'کیا کہا؟' اے ایس آئی نے غضب ناک انداز میں دھاڑتے ہوئے کہا' لگتا ہے تیری کھوپڑی کا بخار کم نہیں ہوا ہے۔فکر نہ کر میں ابھی تیرا پکا انتظام کرتا ہوں۔'

'اسے معاف کر دیں تھانے دار جی۔اسے سمجھ نہیں ہے کہ کس جگہ کیا کہنا ہوتا ہے۔اس کی طرف سے میں معافی مانگتی ہوں۔'

'ٹھیک ہے نور جہاں بیگم لیکن اگر اس کی خیریت چاہتی ہو تو اسے فوراً میری نظروں سے دور لے جاؤ' بلکہ اسے میرے علاقے سے ہی دور بھیج دو۔ایسا نہ ہو کہ میں اس کی لمبی زبان اس کے حلق سے کھینچ لوں۔'

نور جہاں بیگم نے مجھے مزید وہاں نہیں رکنے دیا۔وہ مجھے دھکیلتی ہوئی تھانے سے باہر لے آئی۔گھر

پہنچے تو عنبرین' پروین اور چھیمو بی نے بڑی بے تابی کے عالم میں میرا استقبال کیا۔جب انہیں یقین ہو گیا کہ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں' تب انہیں اطمینان ہوا۔اس رات ہم لوگ بہت دیر تک بات کرتے رہے۔مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ نور جہاں بیگم بھی سردار خضر حیات کے عنبرین کے رشتے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکی ہے۔ اب وہ لوگ بڑی بے چینی سے سردار خضر خان کے منتظر تھے۔میں نے ایک بار پھر انہیں یقین دلایا کہ سردار خضر خان کسی بھی دن عنبرین کا رشتہ لے کر آنے والا ہے۔

'خدا کرے وہ جلدی آ جائے۔مجھے اس شیطان رنگو استاد کی نیت کا بھروسہ نہیں ہے۔'

'تم فکر نہ کرو نور جہاں بیگم' میری موجودگی میں کوئی عنبرین کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا' میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔

'اب تم کسی سے لڑائی بھڑائی کی کوشش نہ کرنا۔وہ نابکار تھانے دار تمھارا دشمن بن چکا ہے۔اسے موقع مل گیا تو وہ تمھیں کوئی بھاری نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔آج بھی وہ بڑی مشکل سے دس ہزار روپے رشوت لے کر تمھاری رہائی کے لیے تیار ہوا تھا۔'

'آپ نے دس ہزار روپے کی رقم اسے دے دی نور جہاں بیگم؟' میں نے شدید حیرانی کے عالم میں سوال کیا۔

'تو پھر کیا کرتی؟ تمھیں جیل میں سڑنے دیتی؟'

'نور جہاں بیگم نے بالکل صحیح کیا' دونوں لڑکیوں نے یک زبان ہو کر کہا' دس ہزار تم سے بڑھ کر تو نہیں ہیں۔'

میں نے مزید احتجاج کرنا چاہا لیکن ان لوگوں کے خلوص کے سامنے میری ایک نہ چل سکی۔مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ نور جہاں بیگم نے جو کچھ کیا وہ درست ہے۔

اگلے دن صبح ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں گھر سے نکل آیا اور منزل کا تعین کیے بغیر ایک طرف چل پڑا۔میرا مقصد صرف یہ تھا کہ آس پاس کے علاقے کا جائزہ لے لوں اور اس کے ساتھ اپنے مستقبل کے لائحہ عمل پر بھی غور کر لوں۔میرے ملتان آنے کا واحد مقصد رفاقت علی کا قتل تھا۔مجھے اس انداز میں اس کا خاتمہ کرنا تھا کہ اس کی موت کسی حادثے کا نتیجہ معلوم ہو۔قسمت کے الٹ پھیر نے مجھے خود اس کے تیر کا نشانہ بنا دیا۔اب خدا خدا کر کے ایک بار پھر میری زندگی قدرے معمول پر آئی ہے تو مجھے ایک بار پھر اس زہریلے شخص کی موت کا سامان کرنا چاہیے۔ برکت علی کی حویلی میں فقیر بابا کی خدا جانے کیا حالت ہو رہی ہوگی؟ جب تک میں رفاقت علی کے شانوں کو اس کے سر کے بوجھ سے آزاد نہیں کراؤں گا' وہ فقیر بابا کو آزاد نہیں کریں گے لیکن رفاقت علی کا شکار اب بچوں کا کھیل تو نہیں ہے۔اگر میں نے جلد بازی میں اس پر ہاتھ ڈالا تو ممکن ہے وہ ایک بار پھر مجھ سے پہلے مجھ پر وار کر دے اور اسے شکار کرنے کی آس دل میں لیے میں خود اس کا شکار بن جاؤں۔

اپنے خیالوں میں گم میں جانے کتنی دور نکل آیا۔یک لخت مجھے اپنے اردگرد مکمل سناٹے کا احساس

ہوا۔ میں نے چونک کر اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میں بھٹکتا ہوا ریلوے کے ایک ویران غیر آباد روڈ میں آنکلا ہوں کچھ آگے جا کر راستہ مسدود ہو گیا تھا۔ میں واپس ہونے کے لیے مڑا لیکن مجھے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ چھ ہٹے کٹے بدمعاش میرا راستہ روکے کھڑے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں آہنی سلاخیں' سائیکل کی چین اور ہاکیاں وغیرہ تھیں۔ میں نے ان بدمعاشوں میں کسی جانے پہچانے چہرے کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ وہ سب میرے لیے اجنبی ثابت ہوئے۔ ان کے چہروں پر چھائی ہوئی نحوست اور خشونت نے ان کے ارادوں کو ایک لمحے میں مجھ پر عیاں کر دیا۔ وہ بڑی تیزی سے نہایت ماہرانہ انداز میں مجھے اپنے حصار میں لینے لگے۔ اتنے سارے ہتھیار بند لوگوں کے چنگل سے فرار ہونا' مجھے احمقانہ خیال معلوم ہوا۔ میں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔ محض حجت پوری کرنے کے لیے میں نے ان میں سے ایک کو مخاطب کر کے کہا۔

'تم لوگ کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'

'نیمے پہلوان کو جانتے ہو نا تم؟' اس نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

مجھے مزید سوال کرنے کی ضرورت نہ رہی۔ میں وقت ضائع کیے بغیر بجلی کے کوندے کی مانند اپنے دائیں طرف والے غنڈے پر جھپٹا۔ میری برق رفتاری نے ایک لمحے کے لیے اسے گڑ ابڑا دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سائیکل کی چین لہرا کر میرے سر پر مارنا چاہی لیکن اپنی گڑبڑاہٹ کے باعث اس نے فیصلہ کن لمحہ گنوا دیا۔ میں نے اس کے چین والے ہاتھ کو اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی پر روک لیا۔ صورت حال اتنی نازک تھی کہ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ میں فیصلہ کن انداز میں ضربیں لگاؤں۔ میں نے پوری قوت سے اس کی رانوں کے سنگم پر گھٹنے کا وار کیا۔ اس کے حلق سے کربناک چیخ نکلی' وہ اگلے ہی لمحے خود بخود سامنے کی طرف جھک گیا۔ میرا گھٹنا ایک بار پھر طوفانی انداز میں حرکت میں آیا اور اس کے جھکے ہوئے چہرے سے ٹکرایا۔ وہ شخص ایک جھٹکے سے سیدھا ہوتا چلا گیا مجھے اپنے پیچھے تیزی سے بڑھتے ہوئے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ میں تیزی سے اپنے شکار پر جھپٹا۔ قدرے جھک کر میں نے اس کی ٹانگوں کے بیچ میں ہاتھ ڈالا اور اسے کاندھے پر لاد کر پوری قوت سے پچھلی سمت اچھال دیا۔ میں نے بہ یک وقت کئی چیخوں کی آوازیں سنیں۔ میں تیزی سے چند قدم آگے بڑھا' عین اسی وقت ان میں سے کسی نے میری کمر پر ہاکی کھینچ ماری۔ میری کمر میں سخت چوٹ لگی لیکن میں نے چوٹ کو نظر انداز کر کے ہاکی پر قبضہ کر لیا۔ اسی وقت بہ یک وقت چار غنڈوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے تیز رفتاری سے پینترے بدل کر خود کو ان کی زد سے باہر نکالا۔ اس کے بعد میں ہاکی کو ہاتھ میں تول کر ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مجھے ہاکی سے مسلح دیکھ کر وہ قدرے محتاط ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ چھ میں سے دو بندے بیکار ہو چکے ہیں۔ باقی چاروں ایک بار پھر مجھے اپنے حصار میں لینے لگے۔

اچانک ایک غنڈہ تیزی سے مجھ پر جھپٹا۔ اس نے انچ بھر موٹی سلاخ فضا میں لہرائی اور میرے سر پر دے ماری۔ میں محض لمحے بھر پہلے پیچھے ہٹ گیا۔ آہنی سلاخ زناٹے کی آواز کے ساتھ میرے چہرے کے

سامنے سے گزری اور زوردار طریقے سے نیم پختہ زمین سے ٹکرائی۔ اس شخص کے ہاتھ کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور سلاخ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں نے ایک لحہ بھی ضائع کیے بغیر ہاکی کی ایک زوردار ضرب اس کی گدی پر رسید کر دی۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ زمین پر گرا اور اپنی گردن پکڑ کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔

اپنے تیسرے ساتھی کو بھی ناکارہ ہوتے دیکھ کر باقی تینوں پیچھے ہٹنے لگے۔ میں ہاکی کو فضا میں دائرے کی شکل میں گھماتا ہوا تیزی سے ان تینوں کی طرف لپکا۔ وہ تینوں اپنے ہتھیار سنبھالتے ہوئے تیزی سے پیچھے ہٹنے لگے۔ میں نے ایک بار زبردست طریقے سے انہیں جھکی دی۔ اس بار وہ جونہی پیچھے ہٹے' میں تیزی سے مڑا اور برق رفتاری سے دوڑ پڑا۔ وہ تینوں ہکا بکا سے کھڑے دیکھتے رہ گئے۔ میں پیچھے دیکھے بغیر بگٹٹ دوڑتا چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرا پیچھا نہیں کیا گیا ہے۔ میں نے اپنی رفتار کم کر لی پھر میں نے دوڑنا بند کر دیا۔ صرف تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔

اس وقت ایں ریلوے لائن کے ساتھ والی ایک سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ مجھے کسی سواری کی تلاش تھی جو مجھے واپس حسین آگاہی پہنچا سکے۔ کافی تلاش کے باوجود اس سڑک پر سے کسی رکشا' ٹیکسی کا گزر نہ ہوا۔ میرے پاس سے کئی گاڑیاں گزریں لیکن نہ میں نے کسی کو روکنے کی کوشش کی اور نہ ہی کسی گاڑی والے نے خود گاڑی روک کر میرا حال جاننے کی کوشش کی۔ کافی دیر تک چلنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ میں لحہ بہ لحہ شہر سے دور ہوتا چلا جا رہا ہوں۔ تنگ آ کر میں سڑک کے کنارے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا۔ مجھے وہاں بیٹھے ہوئے دو ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ مجھے اپنے دائیں طرف سے ایک تیز رفتار جیپ اپنی طرف آتی نظر آئی۔ جیپ قریب آئی تو میں نے ہاتھ کے ہلکے سے اشارے سے اسے روکنے کی کوشش کی۔ میری توقع کے عین مطابق جیپ کی رفتار میں کوئی فرق نہیں پڑا اور وہ زائیں سے میرے سامنے سے گزرتی چلی گئی۔ میں نے منہ ہی منہ میں گاڑی والے پر لعنت بھیجی۔ اچانک میں چونک کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ مجھ سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر پہنچ کر جیپ ایک جھٹکے سے رک گئی پھر میں نے جیپ کو ریورس ہو کر پیچھے آتے دیکھا۔ آخر کار میرے بالکل قریب آ کر جیپ ایک بار پھر رک گئی۔ میں حیرانی کے عالم میں ڈرائیور کو دیکھنے لگا۔ اسی وقت جیپ کی درمیانی سیٹ کا دروازہ کھلا اور سیاہ شیروانی اور بوسکی کے جوڑے میں ملبوس ایک بھاری بھرکم شخص جیپ سے اتر کر میری طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچتا' سمجھتا وہ شخص والہانہ انداز میں مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔

'لیکن آپ کون ہیں جناب؟' میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

ارے بھائی تم مجھے نہیں پہچانے؟ بھئی میں ملک عبدالکریم ہوں۔' ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ مجھ سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا۔

تب میں نے اسے پہچان بیا وہ واقعی ہی ملک کریم ہی تھا۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس نے اپنی بھاری بھرکم مونچھیں بہت باریک کروالی تھیں۔' ملک عبدالکریم آپ یہاں؟' میں نے خوشی اور حیرت کے ملے

جلے تاثرات کے ساتھ پوچھا۔

'ہاں بھئی حیران کیوں ہوتے ہو۔ یہ واقعی میں ہی ہوں۔'

'لیکن آپ کو تو ایف بی آئی والوں نے گرفتار کر لیا تھا۔'

'ہاں گرفتار تو کر لیا تھا لیکن وہ مجھے دو دن سے زیادہ اندر نہ رکھ سکے۔ میرا نام بھی ملک کریم ہے۔ میری پارٹی والوں نے حکومت کو اوپر سے نیچے تک ہلا کر رکھ دیا۔ ایف بی آئی والے میرے خلاف کچھ بھی ثبوت مہیا نہ کر سکے۔ مجبوراً انہیں مجھے آزاد کرنا پڑا۔'

'لیکن۔۔۔ میں نے اگلا سوال کرنا چاہا۔

'ارے بھئی سارے سوال یہیں کھڑے رہ کر کرو گے؟ بھائی ذوالفقار علی۔۔۔ یہی نام بتایا تھا نا تم نے؟'

'ہاں میرا یہی نام ہے۔'

'آؤ گاڑی میں بیٹھو۔ باقی باتیں راستے میں ہوں گی۔' ملک کریم نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے ساتھ واگی سیٹ پر بٹھا لیا۔ ڈرائیور نے جیپ گیئر میں ڈال کر آگے بڑھا دی۔

'اب تم بتاؤ' تم یہاں کیا کر رہے ہو اور اس دن گودام سے تمھیں کس نے چھڑایا تھا؟' ملک کریم نے مجھ سے سوال کیا۔

اس کا مطلب ہے آپ کی ابھی تک رفاقت علی سے ملاقات نہیں ہوئی۔' میں نے جواب دینے کی بجائے الٹا اس پر سوال داغ دیا۔

'نہیں بھئی میں پچھلے چند دنوں سے کچھ اور ہی چکروں میں پڑا ہوا ہوں۔ ویسے بھی میں نے جان بوجھ کر اس سے ملاقات نہیں کی۔ کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ خفیہ پولیس والے اب بھی میری نگرانی کر رہے ہیں۔'

'اسی لیے آپ کو کچھ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ اس کتے کے بچے نے مجھے کس عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔'

'کچھ بتاؤ تو سہی آخر ہوا کیا تھا؟' ملک کریم نے بے قرار ہو کر سوال کیا۔ میں نے مناسب ردو بدل کے بعد اسے پوری کہانی کہہ سنائی۔' وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ انجکشن کا اثر مجھ پر پوری طرح نہیں ہو سکا۔ اور دو دن بعد میں خود بخود ٹھیک ہو گیا ورنہ اس نے تو مجھے پاگل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔'

'میں اس جنونی کی اولاد کا خون پی جاؤں گا۔' ملک کریم نے دانت پیستے ہوئے کہا' اس شیطان کے بچے کو انسانی جان کی اپنے مکروہ تجربات کی نذر کرنے کی بھیانک سزا ملنی چاہیے۔'

'وہ ایک نفسیاتی مریض ہے ملک صاحب۔ فکر نہ کریں اس کا خون اب مجھ پر واجب ہو چکا ہے۔ میں اسے سسکا سسکا کر ماروں گا لیکن میرے لیے اصل مسئلہ یہ ہے کہ پولیس والے مجھے تلاش کر رہے ہیں۔'

'ارے اس کی تم فکر نہ کرو۔ تم پر کوئی الزام تو نہیں ہے۔ تھک ہار کر وہ خود ہی خاموش ہو کر بیٹھ جائیں گے۔'

'لیکن وہ بدبخت رفاقت علی تو مجھے بھارتی جاسوس بنائے بیٹھا ہے۔ اس نے اخبار والوں کو بھی اسی لائن پر لگا رکھا ہے۔ مجھے خطرہ ہے میں کسی لمبے چکر میں نہ پھنس جاؤں۔'

یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ میں اسے کہہ دوں گا کہ وہ اپنی زبان بند رکھے۔ اس طرح یہ فتنہ بھی خود ہی دب جائے گا۔'

'لیکن انسپکٹر نیازی مجھے اچھی طرح پہچانتا ہے۔'

'ارے بھائی اس مسئلے کا بھی کوئی حل ڈھونڈ لیں گے' تم اتنا پریشان کیوں ہوتے ہو۔ زیادہ ہی مسئلہ بڑھا تو تم ملتان چھوڑ دینا کچھ عرصے کے لیے۔ میری زمین داری پر ڈیرہ جما لینا' وہاں کوئی پرندہ بھی پر نہیں مارتا' میری اجازت کے بغیر۔' ملک کریم نے فخریہ لہجے میں کہا۔ میں اس کی بات تسلیم نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے ملک کریم سے ملاقات کے بعد بے حد تقویت کا احساس ہوا۔ مجھے لگا کہ جلتے ہوئے صحرا میں مجھے شجر سایہ دار نصیب ہو گیا ہے۔

'ملک صاحب ابھی آپ کہاں جا رہے ہیں؟' میں نے گاڑی سے باہر نظریں دوڑاتے ہوئے سوال کیا۔

'میں اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔ میرا کچھ زمین بیچنے کا ارادہ ہے۔ وہاں جا کر کوئی مناسب ٹکڑا دیکھوں گا۔ اچھا ہے ساتھ ہی ساتھ تم بھی میری زمین داری دیکھ لو گے۔ رفاقت علی کا قصہ تمام کر کے تم سیدھے یہاں آ جانا اور چند مہینے یہاں گزار کر مزے سے واپس چلے جانا۔ کوئی تم پر معمولی سا بھی شک نہیں کرے گا۔'

میں نے چونک کر ڈرائیور کی طرف دیکھا۔

'ارے تم اس کی طرف سے فکر مت کرو۔ ہم کچے بندوں کو اپنے ساتھ نہیں رکھتے۔ یہ خود بھی میرے اشارے پر دو بندے ٹھکانے لگا چکا ہے۔' میں نے جواب میں استفہامیہ انداز میں گردن ہلا دی۔

جیپ تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑتی رہی۔ ایک دوراہے سے وہ ایک کچی سڑک پر مڑ گئی۔ دھول اڑاتی ہوئی سڑک پر کئی کلو میٹر کا فاصلہ طے کر کے جیپ ایک چھوٹے سے گاؤں کے پاس سے گزرتی ہوئی ایک پختہ حویلی کے احاطے میں جا رکی۔ جیپ کو دیکھتے ہی درجنوں کے حساب سے ملازمین جیپ کے گرد اکھٹے ہو گئے۔ ملک کریم کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ ملک کریم مجھے ساتھ لے کر حویلی میں داخل ہو گیا۔ حویلی کے اندر پہنچ کر میں نے محسوس کیا کہ حویلی دور جدید کی تمام سہولیات سے مالا مال ہے۔ ملک کریم نے ایک بڑے سے دیوان پر قبضہ جماتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

'کیا میں پوچھ سکتا ہوں ملک صاحب کہ یہ زمین بیچنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟' میں نے سنجیدہ لہجے میں سوال کیا۔

ملک کریم نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر اس کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ نمودار ہوگئی' ارے بھئی پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ زمین کا یہ ٹکڑا بیچ کر میں یہ رقم ایک نئے کاروبار میں انویسٹ کر رہا ہوں۔'

'کون سے کاروبار ملک صاحب؟ اگر مناسب سمجھیں تو بتا دیں۔'

'دراصل۔۔۔۔ دراصل میں ایک فلم بنا رہا ہوں۔ پنجابی فلم۔' ملک کریم نے پرجوش لہجے میں بتایا۔

'آپ اور فلم؟' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

'یہ سب میں تمھیں بعد میں بتاؤں گا۔ تم فی الحال آرام کرو۔ میں چند کام نبٹا کر واپس آتا ہوں۔'

ملک کریم کے ملازم نے مجھے ایک آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا۔ گرم تپتے موسم میں وہ کمرہ مجھے نخلستان کے مانند محسوس ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے گہری نیند نے آلیا۔ ملازم نے مجھے اٹھایا تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ملک کریم مجھے کھانے پر اپنا منتظر ملا۔

'بڑی گہری نیند سویا جوان۔ اب جلدی سے آجا کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔' ہم دونوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد ملک کریم میرے ساتھ میرے کمرے میں ہی آگیا۔ اطمینان سے کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں ذوالفقار علی خان۔'

'پوچھیں ملک صاحب؟' میں نے حیرت سے جواب دیا۔

'کیا تم میرے ساتھ کام کرنا پسند کرو گے؟ میرا مطلب ہے تم میرے ساتھی بن کر میرے ساتھ رہو۔ میں تمھیں معقول تنخواہ دوں گا۔ تمھیں پولیس سے محفوظ رکھنا بھی میری ذمہ داری ہوگی۔' ملک کریم کی بات سن کر میں کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگیا۔ کافی غور و غوض کے بعد میں نے سوال کیا۔

'میرے فرائض میں کیا کیا شامل ہوگا ملک صاحب؟'

'کوئی خاص کام نہیں۔ میں باڈی گارڈ وغیرہ رکھنے پر یقین نہیں رکھتا۔ میرے خیال میں اپنی زندگی کی سب سے بہتر طریقے سے حفاظت انسان خود ہی کر سکتا ہے۔ تم میرے دست راست کی حیثیت سے میرے ساتھ رہو گے۔ کبھی کبھار گاڑی چلانے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ تم گاڑی تو چلا لیتے ہو گے۔'

'کسی حد تک۔ میرا مطلب ہے مجھے مصروف سڑکوں پر گاڑی چلانے کا تجربہ نہیں ہے۔'

'خیر یہ تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ کچھ ہی دنوں میں تم سب کچھ سیکھ جاؤ گے۔'

'لیکن میں ملازمت نہیں کر سکتا ملک صاحب۔' میں نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

'لیکن کیوں آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟'

'دراصل کسی جگہ پابند ہو کر رہ جانا میری فطرت کے خلاف ہے۔ وہاں گاؤں میں میرا بابا برکت علی کی حویلی میں قید ہے۔ مجھے رفاقت علی کو قتل کر کے اسے آزاد کرانا ہے۔ جب تک میرا بابا زندہ ہے' میں اس کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے آپ جب تک حکم دیں گے میں آپ کے ساتھ رہنے کے لیے تیار ہوں۔ اس کے لیے مجھے کوئی معاوضہ درکار نہیں ہے۔ آپ مجھے اپنا ہمدرد سمجھیں میرے لیے اتنی ہی عزت

کافی ہے۔'

'تمھاری یہی خوشی ہے تو ایسے ہی سہی ذوالفقار علی خان۔ ویسے میری پیشکش ہمیشہ برقرار رہے گی۔ جب بھی دل چاہے مجھے اپنا بھائی' اپنا دوست سمجھ کر میرے پاس چلے آنا۔ میرے گھر کے دروازے تمھیں ہمیشہ کھلے ملیں گے۔'

'آپ کا بہت بہت شکریہ ملک صاحب' میں آپ کی محبت ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ ناراض نہ ہوں تو ایک ذاتی سا سوال پوچھوں۔ ملک صاحب آپ کے گھر والوں کہاں ہیں؟ میرا مطلب ہے آپ کے بیوی بچے۔' میں نے جھجکتے جھجکتے سوال کیا۔

میری بات سن کر ملک کریم نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ وہ ہنستا تو ہنستا ہی چلا گیا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنی ہنسی پر قابو پایا اور ہانپتے ہوئے جواب دیا۔

'کہاں کی بیوی اور کس کے بچے۔۔۔۔ ذوالفقار علی خان؟ زندگی نے اتنی مہلت ہی کہاں دی کہ ان بکھیڑوں میں پڑوں۔' مجھے اس کی بات سن کر خاصی حیرت ہوئی۔ میرے اندازے کے مطابق ملک کریم کی عمر کم از کم پچاس برس تو ضرور ہی رہی ہوگی اور وہ ابھی غیر شادی شدہ تھا۔

اچانک ملک کریم نے رازدارانہ لہجے میں میرے کان میں کہا' میں آج شام کو اپنے مہمانوں کے پاس گیا تھا۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات کو؟'

میں چند ہی لمحوں میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ مہمانوں سے اس کی مراد وہ بھارتی باشندے تھے جنہیں اس نے اپنی زمینوں پر کہیں رکھا ہوا تھا۔

'ہاں ہاں میں سمجھ رہا ہوں۔'

'آج شام کو میں مہمان خانے کے معائنے کے لیے گیا تھا۔ نگراں نے بتایا کہ ایک بڈھے کی طبیعت خراب ہے۔ خطرہ ہے کہ کہیں وہ لڑھک ہی نہ جائے۔'

'یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔' میں نے پر تشویش لہجے میں کہا۔

'تشویش کی بات تو ہے اگر بڈھا مر گیا تو کروڑوں کا نقصان ہو جائے گا۔ اب جلد از جلد کافروں سے جان چھڑانی پڑے گی۔' ملک کریم نے مطمئن لہجے میں کہا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ ملک کریم اس حد تک مجھ پر اعتبار کر رہا ہے' ملک کریم کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا پھر وہ مجھے آرام کرنے کی ہدائیت کر کے رخصت ہوگیا۔

کچھ ہی دیر پہلے تو میں سو کر اٹھا تھا' ایسے میں نیند کہاں سے آتی۔ نتیجتاً مجھ پر مختلف خیالات اور یادوں کے ہجوم نے حملہ کر دیا۔ مجھے بڑی شدت سے مہراں یاد آئی۔ خدا جانے وہ کس حال میں ہوگی۔ میرے فرار ہونے کے بعد جانے زمین دار شاہ مراد نے ان دونوں باپ بیٹی سے کیا سلوک کیا۔ ایک ٹانگ سے معزور چچا مہرداد اپنا اور اپنی بیٹی کا پیٹ کیسے بھرتا ہوگا؟ پھر مجھے اپنا بدنصیب دوست غلام سرور یاد آیا۔ اس وفا پرست انسان نے میری زندگی بچانے کے لیے اپنی آنکھیں قربان کر دیں لیکن میں کتنا بے وفا ہوں کہ

میں نے بھی پلٹ کر اس کی خبر تک لینے کی کوشش نہیں کی کہ ان کا کیا حال ہے۔ وہ اپنی چار چار جوان بہنوں کا بوجھ کیسے سنبھالتا ہوگا؟ کیا اس کی بہنیں میری بہنیں نہیں ہیں؟ میں کیسا بھائی ہوں جو اپنی بہنوں کو زمانے کی ناپاک نگاہوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر فرار ہوگیا پھر میرے خیالات کی رو ہیر کی جانب مڑ گئی۔ خدا جانے اس کے خطرناک ترین مرض کا کیا بنا ہوگا؟ وہ ڈاکٹر کے ہمراہ اپنا معائنہ کرانے کراچی گئی یا نہیں اور اگر وہ کراچی جا چکی ہے تو پھر اس کے ٹیسٹوں کا کیا نتیجہ نکلا۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ اس کا آپریشن نشتر اسپتال میں بھی ہوسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ ملتان آ چکی ہو اور نشتر اسپتال میں داخل ہو۔ میں نے اپنے دل میں مصمم ارادہ کرلیا کہ ملتان جانے کے بعد ہیر کو نشتر اسپتال میں تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔ خدا کرے اس کا آپریشن ہو چکا ہو اور وہ اپنے مرض سے نجات حاصل کر چکی ہو۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

میری نیند ابھی گہری نہیں ہو پائی تھی کہ اچانک فائرنگ کی زوردار آوازوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ میں صورت حال کو ابھی پوری طرح سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ میں نے کسی کی دردناک چیخ کی آواز سنی۔ یہ آواز سن کر میں مزید کمرے میں نہیں ٹھہر سکا۔ حویلی کے دالان میں مجھے ملک کریم مل گیا۔ وہ مجھے حواس باختہ سا نظر آیا۔

'یہ کیا ہو رہا ہے ملک صاحب؟' میں نے مضطرب لہجے میں دریافت کیا۔

'کچھ نامعلوم افراد نے حویلی پر حملہ کر دیا ہے۔' ملک کریم نے جلدی جلدی بتایا 'وہ لوگ حویلی میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چوکی داروں نے فائرنگ کی تو انہوں نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ وہ پوری تیاری سے آئے ہیں۔'

'حویلی میں اسلحہ ہو تو مجھے ایک رائفل اور کچھ راؤنڈ دے دیں۔

'ہاں ہاں اسلحہ تو بہت ہے۔ تم ٹھہرو میں ابھی گن لے کر آتا ہوں۔' ملک کریم ایک کمرے میں گھس گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس نے دو سیون ایم ایم رائفلیں اپنے کندھوں پر لٹکا رکھی تھیں جبکہ اس کے ہاتھ میں راؤنڈ کے ڈبے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے ایک رائفل اور راؤنڈ کا ایک ڈبہ لے لیا۔ اس دوران میں دوطرفہ فائرنگ میں مذید تیزی آ گئی۔

'ملک صاحب مجھے اپنے ساتھ لے کر چھت پر چلیں، ہم وہاں سے زیادہ بہتر طریقے سے دشمنوں کا مقابلہ کرسکیں گے۔'

'ہاں چلو اوپر چلتے ہیں۔' ملک کریم نے جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیں۔ چھت پر چڑھ کر میں نے اندھیرے میں نگاہیں گاڑ کر حملہ آوروں کی کمین گاہوں کا پتہ لگانے کی کوشش کی جبکہ ملک کریم نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ میں نے جھنجلا کر کہا۔

'ملک صاحب اس طرح ایمونیشن ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ذرا صبر کرلیں۔ میں دشمنوں کے ٹھکانے تلاش کرتا ہوں۔ اس کے بعد آپ فائرنگ کریں۔' ملک کریم نے شرمندہ ہو کر فائرنگ بند کر دی۔

اسی دوران میں میری آنکھوں نے حملہ آوروں کی پوزیشنوں کا پتا لگا لیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ حملہ آور بے حد چالاک اور منظم ہیں وہ ایک خاص ترتیب سے جگہیں بدل بدل کر فائرنگ کر رہے تھے۔ اگر ایک فائر ایک جگہ سے ہوتا تو دوسرے فائر کا مقام پہلے سے کئی گز ہٹ کر ہوتا۔ پہلے پہل تو مجھے لگا کہ وہ درجنوں میں ہیں لیکن پھر فوراً ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ ان کی جنگی چال ہے۔ جس کی مدد سے وہ اپنی تعداد کئی گنا زیادہ دکھا رہے ہیں۔ جبکہ حقیقت میں ان کی تعداد چھ سات سے زیادہ نہیں ہے۔ ملک کریم شاید اس قسم کی صورت حال سے کبھی نبرد آزما نہیں ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

'یہ تو چالیس پچاس بندوں کی فوج ہے ذوالفقار علی خان۔' ملک کریم نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔' میرے گنتی کے چند کارندے کب تک ان کا مقابلہ کریں گے۔ ہمارے پاس تو اسلحہ اور بارود بھی بہت کم ہے۔'

'آپ فکر نہ کریں ملک صاحب۔ میں اس پوری فوج سے مقابلہ کرلوں گا۔ آپ بس دیکھتے جائیں۔' میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے اپنی رائفل کاک کی اور اپنے نشانے کی تلاش میں نگاہیں گھمانے لگا۔ بالآخر میں نے حملہ آوروں کی 'فوج' کے انتہائی دائیں طرف والے حصے کہ اپنے ٹارگٹ کے طور پر منتخب کرلیا۔ میں نے اس مخصوص حصے میں فائر کی چمک دیکھی۔ وہ چمک تو لمحہ بھر میں معدوم ہوگئی لیکن میں نے اس مقام پر شست باندھ لی۔ اگلا فائر اس جگہ سے تقریباً چھ گز بائیں طرف ہوا لیکن میں نے اپنی نظر بدستور پہلے والے فائر کے مقام پر جمائے رکھی۔ کچھ دیر بعد اس بار پھر اس جگہ سے فائر کی چمک ابھری۔ میری انگلی حرکت میں آئی اور میں نے ٹھیک اسی مقام پر فائر جھونک مارا۔ خاصے فاصلے سے کسی کی دردناک چیخ ابھری۔ میں نے فوراً ہی اسی مقام پر دوسرا فائر کیا۔

'شاباش۔۔۔ تم نے ایک کو مار گرایا ہے جوان۔' ملک کریم نے پرجوش انداز میں میری پیٹھ تھپ تھپائی۔ مین نے اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر اپنے دوسرے ٹارگٹ کی تلاش میں نگاہیں جما دیں۔ میرے ان فائروں کی وجہ سے حملہ آور حویلی کی چھت کی جانب بھی متوجہ ہوگئے۔ لگاتار کئی گولیاں ہمارے قریب دیواروں سے ٹکرائیں۔ ملک کریم جھٹ سے منڈیر کے پیچھے دبک گیا جبکہ میں نے محض جگہ کی تبدیلی پر اکتفا کیا۔ اپنے دوسرے شکار کے لیے مجھے کافی جدوجہد کرنا پڑی۔ حملہ آور پہلے سے زیادہ محتاط ہوگئے تھے۔ میں نے گولیوں کے دو میگزین خالی کر دیئے لیکن کسی حملہ آور کو نشانہ نہ بنا سکا۔ تب میں نے اپنی حکمت عملی میں تبدیلی کی اور بلی کی مانند گھات میں بیٹھ گیا۔ بالآخر مجھے اپنا شکار نظر آ ہی گیا۔ میں نے ایک ہی مقام پر تاریکی میں دو فائروں کی چمک دیکھی۔ تیسرے فائر کے ساتھ میں نے اس مقام پر فائر کر دیا۔ میرا یہ نشانہ بھی خطا نہیں گیا۔ تاریکی میں کسی کی چیخ گونجی اور اس محاذ پر بھی خاموشی طاری ہوگئی۔ یک لخت حملہ آوروں کی فائرنگ میں بے حد شدت آ گئی۔ مجھے لگا کہ حویلی پر گولیوں کی برسات ہو رہی ہے۔ کچھ دیر کے لیے میں بھی سر اٹھانے کی جرأت نہ کرسکا۔ اچانک حملہ آوروں کی فائرنگ بالکل بند ہوگئی۔ حویلی کے نچلے حصے سے کئی فائر کیے گئے لیکن اندھیرے کی گاڑھی چادر سے کوئی جوابی فائر نہ ہوا۔

ملک کریم نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ فی الحال اپنی جگہ پر دبکا رہے۔ اسی وقت دو گاڑیوں کے اسٹارٹ ہونے کی آواز نے سناٹے کی چادر تار تار کر دی۔ تقریباً تین چار سو گز کے فاصلے پر مجھے دو گاڑیوں کے دھندلے ہیولے حرکت میں محسوس ہوئے۔ پہلے تو مجھے لگا کہ وہ گاڑیاں حویلی کی جانب بڑھ رہی ہیں۔ فوراً ہی میری یہ غلط فہمی رفع ہو گئی۔ دونوں گاڑیوں کے طاقت ور انجن غرائے اور وہ حویلی کی مخالف سمت میں دوڑنے لگیں۔ میں نے اس سمت میں یکے بعد تین فائر کیے لیکن یہ سب کارروائی بے سود رہی۔ فائرنگ رینج سے باہر نکلتے ہی دونوں گاڑیوں کی ہیڈ لائیٹس روشن ہوئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ حد نظر سے باہر نکل گئیں۔

میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے ملک کریم کی طرف دیکھا۔ ملک کریم نے ڈرتے ڈرتے حویلی کے سامنے دور تک پھیلے ہوئے اندھیرے پر نظر ڈالی۔

'وہ۔۔۔وہ چلے گئے؟'

'چلے نہیں گئے بلکہ فرار ہو گئے ہیں اور اپنے ساتھ کم از کم دو لاشیں بھی لے گئے ہیں۔' میں نے مطمئن انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ میری بات سن کر ملک کریم کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ پاگلوں کی مانند مجھ سے لپٹ گیا۔

'تم۔۔۔تم بہت بہادر شخص ہو ذوالفقار علی خان۔ تم نے تنہا اتنے سارے دشمنوں کو مار بھگایا۔' ملک کریم نے میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

میں نے انکسار کے ساتھ جواب دیا 'اس بات کو رہنے دیں ملک صاحب۔ میں نے کوئی تیر نہیں مارا ہے۔ اگر وہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے تو باقی سب لوگوں کے ساتھ میری زندگی بھی خطرے میں پڑ جاتی۔'

'لیکن یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟' ملک کریم نے تشویش بھرے لہجے میں سوال کیا۔

'یہ تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے ملک صاحب۔ یہ حملہ آور یقینی طور پر آپ کے پیچھے آئے ہوں گے۔'

'لیکن میری تو کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے اس قسم کی دشمنی نہیں ہے کہ باقاعدہ لشکر کی شکل میں میرے گھر پر حملہ کر دیں پھر میں تو یہاں زیادہ رہتا بھی نہیں ہوں۔'

'لیکن یہ بات بھی یقینی ہے کہ حملہ آور آپ کی یہاں موجودگی سے پوری طرح واقف ہونے کے بعد ہی یہاں حملہ کرنے آئے ہیں۔ آپ یہ بتائیے کہ کہیں اس معاملے کا تعلق آپ کے مہمانوں سے تو نہیں ہے۔' میں نے اپنی آواز کو دھیما کرتے ہوئے سوال کیا۔ میری بات سن کر ملک کریم کا چہرہ زرد پڑتا چلا گیا۔

'لیکن ان لوگوں کو میں نے حویلی میں تو نہیں رکھا ہوا۔' ملک کریم نے نیم مردہ آواز میں کہا 'ان کے ٹھکانے سے تو حویلی میں میرے علاوہ کوئی بھی واقف نہیں ہے۔ وہ تو یہاں سے بہت دور ایک خفیہ جگہ پر رکھے گئے ہیں۔'

'آپ پریشان نہ ہوں ملک صاحب۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بالکل ہی مختلف معاملہ ہو۔ یہ سیاسی رقابت کا بھی شاخسانہ ہو سکتا ہے۔'

'نہیں میں نے سیاسی معاملات کو کبھی دشمنی کی حد تک نہیں پہنچنے دیا۔ میرے اپنے سیاسی مخالفین سے بھی دوستانہ تعلقات ہیں۔' ملک کریم نے اپنے کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کرتے ہوئے میرے خیال کی تردید کی۔

'چلیے نیچے چل کر چوکی داروں سے معلومات کرتے ہیں کہ یہ سب کس طرح ہوا۔' میں نے بحث سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ ملک کریم اور میں حویلی کے ہال کمرے میں آ گئے۔ ملک کریم نے حویلی کے گیٹ پر تعینات چوکی داروں کو طلب کر لیا۔

'ہاں بھئی جاوید اور رشید خان تم بتاؤ کہ یہ سب کیا قصہ تھا؟ تمھیں کیسے پتا چلا کہ حویلی پر حملہ ہوا ہے؟' ملک کریم نے گمبھیر لہجے میں سوال کیا۔

'ملک صاحب جب ہم لوگ چائے شائے بنا کر پی رہا تھا کہ حویلی کے پھاٹک پر ایک جیپ آ کر رکا۔ انجن کی آواز سن کر ہم دونوں اٹینشن ہو گیا۔ ہم نے چھوٹی کھڑکی کھول کر جیپ والوں سے پوچھا کہ وہ لوگ کیا چاہتا ہے۔' رشید خان نے اپنے ساتھی کی ترجمانی سنبھالتے ہوئے ملک کریم کو بتانا شروع کیا 'جیپ کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک بندے نے بتایا کہ وہ لوگ ملک کریم سے ملنے آیا ہے۔ جاوید نے اور ہم نے آپس میں بات کی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اتنی رات کو حویلی کے گیٹ پر آنے والا مشکوک بھی ہو سکتا ہے۔ ہم نے جیپ والوں کو کہا۔ کہ ملک صاحب ابھی سویا ہوا ہے۔ وہ لوگ ملک صیب کو ملنے صبح آ جائے۔ ہماری بات سن کر وہ لوگ چپ چاپ جیپ آگے بڑھا لے گیا۔ ہم دونوں ان لوگوں کی طرف سے مشکوک ہو گیا تھا۔ اس لیے ہم نے دیوار کے اوپر سے جیپ کو دیکھتا رہا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ جیپ سامنے والے میدان کے پار درختوں کے جھنڈ میں گھس گئی ہے۔ کچھ دیر بعد ہم نے دیکھا کہ اس جھنڈ سے ایک نہیں دو جیپیں باہر نکلیں۔ ان دونوں ہی کا رخ حویلی کی طرف تھا۔ یہ معاملہ دیکھ کر ہم دونوں نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے جواب میں وہ جیپیں واپس لوٹ گئیں۔ کچھ دیر بعد ہم پر برسٹ فائرنگ ہونے لگی۔'

ہمارا خیال ہے کہ ان لوگوں کے دو تین بندے زخمی ہوئے ہیں۔' جاوید نامی نوجوان نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے بتایا۔

'ہمارا تو کوئی بندہ زخمی نہیں ہے؟' ملک کریم نے پوچھا۔

'نہیں جی۔۔۔ ہمارے سب بندے محفوظ ہیں۔' جاوید نے بتایا۔

'ٹھیک ہے فی الحال کسی کو حویلی سے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صبح کو میں خود سارے معاملے کا جائزہ لوں گا۔ ویسے تم لوگ ہوشیار رہنا۔ ان لوگوں کے واپس آنے کا خطرہ ہے۔'

'آپ فکر نہ کرو ملک صیب اب کے وہ لوگ آیا تو بچ کر نہیں جائے گا۔' رشید خان نے سینہ پھلاتے

ہوئے کہا۔

’شاباش ابھی تم لوگ جاؤ‘ ملک کریم نے ان کے شانے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد ملک کریم کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ خاصی دیر کے بعد اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

’میرا خیال ہے کہ اب مجھے اپنے تمام معاملات پر نئے سرے سے غور کرنا پڑے گا۔ اگر ان لوگوں نے مجھے قتل کرنے کے لیے حویلی پر حملہ کیا تھا تو پھر یہ لوگ حویلی کے باہر مجھے زیادہ آسانی سے قتل کر سکتے ہیں۔‘

’ہاں اب آپ کو زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ بہت منظم اور ہو خطرناک لوگ ہیں بلکہ بہتر ہوگا کہ آپ اپنے ’مہمانوں‘ کو بھی کہیں اور منتقل کر دیں۔‘ میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

’نہیں ان کے لیے موجودہ ٹھکانے سے زیادہ کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے۔ بہر حال اب میں جلد از جلد ان لوگوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔‘

ملک کریم دیر تک میری نشانہ بازی کی مہارت کی تعریف کرتا رہا پھر ہم اپنے کمروں میں سونے کے لیے چلے گئے۔ اگلی صبح بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ ملک کریم اور میں نے حملہ آوروں کے مورچوں کا معائنہ کیا۔ ہمیں وہاں پر گولیوں کے سینکڑوں خالی کھوکھوں کے علاوہ اچھا خاصا خون بھی پڑا نظر آیا۔

’ملک صاحب کیا آپ اس حملے کی پولیس میں رپٹ لکھوائیں گے؟‘ میں نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

’ارے نہیں بھائی۔ میں ان چکروں میں نہیں پھنسنا چاہتا۔ وہ تو ٹیڑھے میڑھے سوالات کر کے میرا دماغ خراب کر دیں گے پھر اس طرح یہ بات اخبارات میں بھی آ جائے گی۔ وہ لوگ اس پر اپنی حاشیہ آرائیاں کریں گے۔ نہیں بھئی نہیں میں یہ مصیبت مول لینے کو تیار نہیں ہوں۔‘

’میرے خیال میں یہی بہتر ہے۔ اپنے بندوں کو کہہ کر یہ خون وغیرہ صاف کروا دیں۔ لیکن مجھے خطرہ ہے کہ گاؤں والوں میں کوئی پولیس کو فائرنگ کی اطلاع نہ دے دے۔‘ میری بات سن کر ملک کریم نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

’ارے بھائی ذوالفقار علی تم اتنے سمجھدار آدمی ہو کر ایسے بھول پن کی باتیں کرتے ہو‘ ملک کریم نے اپنی مسکراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ’ہمارے دیہاتوں میں لوگ ملک الموت سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا پولیس والوں سے ڈرتے ہیں۔ کس کی شامت نے آواز دی ہے کہ وہ پولیس کو اطلاع دے کر اپنی گردن خود آہنی شکنجے مین پھنسائے گا۔ ویسے بھی پولیس چوکی ہمارے گاؤں سے پورے تیس میل دور ہے۔‘ میں استفہامیہ انداز میں سر ہلانے کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

ملک کریم مجھے میرے کمرے میں چھوڑ کر ایک بار پھر غائب ہو گیا۔ سہ پہر کے قریب وہ واپس لوٹا۔ ’تیار ہو جاؤ ذوالفقار علی خان ہم شہر واپس چل رہے ہیں۔‘ اسنے پر جوش لہجے میں بتایا۔ مجھے کیا تیاری کرنی

تھی؟ بس پاؤں میں بوٹ چڑھائے اور چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ملک کریم نے روانہ ہونے سے پہلے تیس بور کا ایک پستول اور بہت سے راؤنڈ میرے حوالے کیے۔ کافی دنوں بعد ایک بار پھر ایک ہتھیار میرے قبضے میں آ گیا۔ جیپ روانہ ہونے سے پہلے ملک کریم نے کلاشنکوف سے مسلح ایک جوان کو بھی ساتھ لے لیا۔ ملک کریم کا اشارہ ملتے ہی ڈرائیور نے ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ سڑک کچی ہونے کے باوجود اس نے جیپ کی رفتار بہت زیادہ رکھی۔ تمام راستے میری نظریں ارد گرد کا جائزہ لیتی رہیں۔ ملک کریم کے اعصاب بھی مسلسل تناؤ کا شکار رہے لیکن راستے میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ ملتان شہر پہنچ کر ڈرائیور نے گاڑی ہوٹل رائل کے سامنے لے جا کر روک دی۔ میں نے سوالیہ انداز میں ملک کریم کی جانب دیکھا۔

’آج کل میں یہیں ٹھہرا ہوا ہوں۔‘ ملک کریم نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے جیپ سے اتارتے ہوئے کہا۔ ہوٹل کی شاندار عمارت میں داخل ہونے کے بعد ملک کریم سیدھا استقبالیہ پر جا ٹھہرا۔ ’ملک صاحب آپ کے لیے چند پیغام آئے ہوئے ہیں‘ استقبالیہ کلرک نے اسے سلام کر کے چند کاغذات اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔ وہ چند لمحوں تک پیغامات کا مطالعہ کرتا رہا۔ ’سنیں۔۔۔ یہ ندا صاحبہ کا فون کب آیا تھا؟‘ اس نے کلرک سے پوچھا۔

’انہوں نے کل شام کے وقت فون کیا تھا۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ آپ جاگیر پر گئے ہوئے ہیں۔‘

’ٹھیک ہے۔ آپ ایسا کریں کہ میرے ساتھ والا کمرا ابھی مجھے الاٹ کر دیں۔ اب میرا یہ دوست بھی میرے ساتھ ہی ٹھہرے گا۔‘

’کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ ندا صاحبہ کون ہیں؟‘ میں نے ملک کریم کے کمرے میں پہنچ کر سوال کیا۔

’ارے مت پوچھو بھائی کہ وہ دشمن جان کون ہے۔‘ ملک کریم نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ’مجھے شاعری آتی تو میں اس کے حسن کی تعریف میں جانے کتنی غزلیں اور نظمیں کہہ ڈالتا۔‘

’وہ تو صحیح ہے ملک صاحب لیکن یہ ہے کون؟‘

’وہ فلم کی ہیروئن ہے‘ بھائی بلکہ سچ پوچھو تو یہ فلم میں دراصل اسی لیے بنا رہا ہوں۔ ساری زندگی اسی طرح کے کھیل کھیلتے گزری ہے۔ لیکن اس لڑکی نے مجھے دیوانہ بنا ڈالا ہے۔‘

’لیکن وہ ہے کہاں ملک صاحب؟‘

’کل شام اس نے فون کیا تھا۔ اس نے پیغام بھیجا ہے کہ وہ کل صبح ملتان پہنچ رہی ہے۔ اس کی رہائش دراصل لاہور میں ہے۔ میری اس سے ملاقات وہیں ہوئی تھی۔ میں جو فلم بنا رہا ہوں اس کی کہانی بھی ندا نے ہی لکھی ہے۔ کل وہ آ جائے تو کہانی پر غور شروع ہوگا۔ ابھی تو فلم کے لیے ہدائیت کار کا انتخاب بھی نہیں ہو سکا ہے۔‘

ملک کریم کو اس قدر والہانہ انداز میں بات کرتے دیکھ کر مجھے شدید حیرت ہوئی۔ مجھے یقین ہو گیا

کہ یہ لڑکی ندا اس کے دل و دماغ پر پوری طرح حاوی ہو چکی ہے۔ خدا جانے اس بنت حوا نے کیا سحر کیا کہ ملک کریم جیسا سرد و گرم چشیدہ شخص اس کے ابرو کے ایک اشارے پر مال و جاں نذر کرنے پر تل گیا ہے۔ میرے دل میں اس لڑکی کو دیکھنے کا شدید تجسس پیدا ہو گیا۔

ملک کریم مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا لیکن وہ گھما پھرا کر بار بار ندا کو اپنی گفتگو کا موضوع بنا لیتا۔ مجھے اس کی دیوانگی دیکھ کر تھوڑی سی تشویش محسوس ہونے لگی۔ خدا جانے وہ لڑکی کس فطرت کی ہے اور اس کے ملک کریم کے بارے میں کس قسم کے خیالات ہیں؟ کہیں ملک کریم کی خوش امیدی کا نازک آبگینہ حقیقت کے نوک دار پتھر سے ٹکرا کر چور چور نہ ہو جائے۔

اسی وقت بیڈ کی ملحقہ میز پر رکھا ہوا ٹیلی فون گنگنا اٹھا۔ ملک کریم نے فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کر ملک کریم کے چہرے پر بے شمار گلاب کھل اٹھے۔

؟ارے ندا تم۔۔۔ بہت اچھا کیا تم نے مجھے فون کر لیا۔ میں تمھیں ہی یاد کر رہا تھا' ملک کریم نے حلاوت اور اپنائیت سے لبریز لہجے میں کہا۔ مجھے احساس ہوا کہ ملک کریم ندا کی چاہت کی راہ پر بہت آگے نکل چکا ہے۔

'ارے بھئی ناراض کیوں ہوتی ہو۔ کل شام میں ذرا گاؤں کی طرف چلا گیا تھا۔۔۔ ہاں ہاں۔۔۔ بہت ضروری کام تھا۔' میں بغور یہ سب سنتا رہا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ ندا نامی وہ لڑکی ملک کریم سے گلے شکوے کر رہی ہے۔ مجھے یقین سا ہو چلا کہ یہ لڑکی بناوٹ سے کام لے رہی ہے۔ ملک کریم جیسے ادھیڑ عمر کے شخص میں اسے ایسی کیا بات نظر آ گئی کہ یہ اس پر لٹو ہوتی جا رہی ہے؟ مجھے اپنے اس سوال کا جواب بھی فوراً ہی مل گیا۔ ملک کریم کی اس خوبی کا نام ہے دولت! یہ چمک دار چادر انسان کے تمام عیب چھپا لیتی ہے۔ ملک کریم بڑی عمر کا سہی' موٹا اور بھدا سہی! آخر کار ہے تو کروڑ پتی! اس کی نظر کرم ندا جیسی لڑکی کو فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا سکتی ہے۔ اپنے مستقبل کو روشن کرنے کے لیے اگر کچھ دن ایک بڈھے کھوسٹ شخص کو اپنا محبوب تسلیم کر لیا جائے تو آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اگر ملک کریم کی وجہ سے وہ ایک کامیاب ہیروئن بننے میں کامیاب ہو گئی تو پھر اسے اس ناگوار بوجھ سے جان چھڑانا کون سا مشکل ہو گا؟

ملک کریم جانے کتنی دیر تک ندا سے باتیں کرتا رہا۔ میں اکتا کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے ملک کریم اور ندا کے مسئلے کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ ملک کریم کوئی بچہ تو ہے نہیں جسے کوئی ورغلا کر لے جائے۔ اگر وہ کھلی آنکھوں سے گڑھے میں گرنا چاہتا ہے تو میں اسے کیسے روک سکتا ہوں؟ سوچتے سوچتے میری ذہنی رو رفاقت علی کی طرف مڑ گئی۔ میرے دل میں شدت سے خواہش پیدا ہوئی کہ میں ابھی اور اسی وقت اس کی طرف چل پڑوں۔ میرے پاس ہتھیار تو موجود ہے کیوں نہ لگے ہاتھوں اس کا فساد بھی ختم کر دوں؟ پھر میرے دماغ نے مجھے حقیقت کی دنیا میں واپس آنے پر مجبور کر دیا۔ خان رفاقت علی کوئی مرغی کا چوزا نہیں ہے جس کی پلک جھپکتے میں گردن مروڑ دی جائے۔ ایک بار تو جلد بازی کا مزہ چکھ ہی چکا ہوں۔ دوسری بار تو وہ مداری شاید واقعی مجھے بندر بنا ڈالے۔ بہتر یہی ہے کہ اس بار

ملک کریم سے مشورہ کر کے کوئی جامع منصوبہ بنا کر کارروائی کی جائے۔ بصورت دیگر نتیجہ عبرت ناک بھی ہو سکتا ہے۔

اگلے دن ملک کریم مسلسل اپنے کمرے میں گھسا رہا۔ وہ فون پر جانے کتنے لوگوں سے باتیں کرتا رہا۔ میں کئی بار اس کے کمرے میں گیا لیکن ہر بار وہ فون میں مصروف ملا۔ دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد میں آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ ائرکنڈیشنر کی یخ بستہ ہوا میں فوراً ہی میری آنکھ لگ گئی۔

اس روز میں نے خاصے دنوں کے بعد ہیر کو اپنی خوابوں کی بستی میں مہمان بنایا۔ وہ مجھے بے حد شگفتہ اور کھلی کھلی سی نظر آئی۔ میں والہانہ انداز میں دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ میں نے اسے حال دل سنانا چاہا لیکن اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ 'کیا تم ناراض ہو ہیر؟ تم مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہی ہو؟' میں نے مضطرب لہجے میں پوچھا لیکن ہیر نے تو گویا بات سنی ہی نہیں۔ میں نے بے قرار ہو کر اسے بازوؤں میں بھرنا چاہا لیکن ہیر کا وجود دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ مجھے اپنا دل ٹکڑے ہوتا محسوس ہوا۔ میں نے پوری قوت سے آوازیں دے کر اسے بلانا چاہا لیکن وہ واپس نہ آئی۔ میرا دل اداسی اور مایوسی کے اتھاہ اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی کی کریہہ آواز نے میری نیند کے آئینے کو چکنا چور کر دیا۔ میں نے بیزار نظروں سے ٹیلی فون کو گھورا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی ایک بار پھر بجی مجبوراً مجھے اٹھانا ہی پڑا۔

'ہیلو' میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔

'ارے بھائی ذوالفقار کہاں ہو تم؟' میرے کانوں میں ملک کریم کی چہکتی ہوئی آواز آئی۔

'جی ملک صاحب فرمائیے؟'

'ارے فرمانا کیا ہے' بھائی بس فوراً میرے کمرے میں پہنچو۔'

'اچھا میں ابھی آتا ہوں۔' میں نے بدستور بوجھل آواز میں کہا۔ ٹیلی فون کا ریسیور کریڈل پر رکھ کر میں غسل خانے میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی کے چند چھپکے منہ پر مارنے سے میری طبیعت کا بوجھل پن کچھ دور ہوا۔

میں ملک کریم کے کمرے کے دروازے پر پہنچا اور بے دھڑک اندر گھستا چلا گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اچانک مجھے اپنی آنکھیں خیرہ ہوتی محسوس ہوئیں۔ مجھے خیال آیا کہ شاید میں ایک بار پھر خوابوں کی دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ اس لڑکی نے اگر ملک کریم کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا تو اس میں ملک کریم کا کوئی قصور نہ تھا۔ وہ واقعی ایسی تھی کہ انسان اپنا سب کچھ اس کے قدموں میں نثار کر دے۔ میں چند لمحوں کے لیے مبہوت ہو کر رہ گیا۔

'یہ ندا ہے' ملک کریم نے فخریہ لہجے میں اس کا تعارف کرایا۔ جیسے حسن کا وہ انمول خزانہ واقعی اس کی ملکیت میں آ چکا ہو۔ 'اور ندا' یہ ذوالفقار علی خان ہے۔ میرا دوست اور دست راست' اس قاتل ہوش و خرد نے گردن کے ہلکے سے خم کے ساتھ مجھے سلام کیا۔ اس کی نگاہوں کی تپش نے مجھے سلام کا جواب دینے

کی بھی مہلت نہ دی۔ ملک کریم نے مسکراتے ہوئے مجھے اپنے پاس صوفے پر بٹھالیا۔ ’ندا تم ذوالفقار علی کو بھی اپنی کہانی کا خلاصہ سناؤ۔ یہ بھی فلم کی تیاری کے دوران میں ہمارے ساتھ ہوگا۔‘

جیسی آپ کی مرضی ملک جی۔‘ ندا نے اپنی کھنک دار آواز میں کہا۔ مجھے اس لہجے میں تصنع اور جعل سازی کی معمولی سی جھلک بھی محسوس نہیں ہوئی۔ مجھے وہ کوئی بہت ہی پہنچی ہوئی چیز معلوم ہوئی۔

ندا نے ملک کریم کی ہدایت کے مطابق مجھے فلم کی کہانی سنانی شروع کی۔ اس کہانی میں تو مجھے کوئی خاص بات محسوس نہ ہوئی! البتہ ندا کے یاقوتی لبوں سے نکلنے والے ہر لفظ نے کہانی کی قدر و قیمت کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ میرا دل بے اختیار چاہا کہ وہ کہانی سنائے جائے اور میں ہمہ تن گوش ہو کر سنتا رہوں۔ زمانے بیت جائیں لیکن کہانی ختم نہ ہو۔ میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ کچھ ہی دیر میں ندا نے فلم کی کہانی مکمل کر لی پھر وہ داد طلب نظروں سے میرا منہ دیکھنے لگی۔ اپنی گم صم حالت کا خیال آتے ہی میں بری طرح جھینپ گیا۔

’کیسی کہانی ہے ذوالفقار صاحب؟‘ ندا نے ایک ملکوتی تبسم اپنے لبوں پر سجاتے ہوئے سوال کیا۔ میں نے قدرے بوکھلاہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

’اچھی ہے بہت اچھی ہے۔‘ میں اسے کیسے بتاتا کہ یہ کہانی میں نے کانوں سے نہیں بلکہ آنکھوں سے سنی ہے۔

بڑی اچھی لو اسٹوری ہے جی۔‘ ملک کریم نے فخریہ لہجے میں تبصرہ کیا۔ ’اس میں بس تھوڑا سا ایکشن اور ایڈونچر شامل کرنا پڑے گا پھر دیکھنا کیسی سپر ہٹ فلم تیار ہوگی۔‘

’ملک جی پھر لاہور کب چلنا ہے؟‘ ندا نے ناز بھرے لہجے میں پوچھا۔ میں نے ایک بار پھر اس کے لہجے میں بناوٹ اور تصنع کی جھلک محسوس کرنا چاہی لیکن میری یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ اس کے لہجے میں مجھے معصومیت کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے اسے دوسرے انداز میں پرکھنے کی کوشش کی۔ میں نے ملک کریم کی نظر بچا کر کئی بار نہایت والہانہ نظروں سے ندا کو گھورا۔ معلوم نہیں ندا نے میری نظروں کی تپش کو محسوس کیا یا نہیں لیکن اس نے اپنے رویئے میں کسی قسم کی تبدیلی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ بدستور ملک کریم کے واری صدقے ہوتی رہی۔ اس دوران میں مجھے اندازہ ہوا کہ ملک کریم فلم پروڈیوس کرنے کے معاملے میں پوری طرح سنجیدہ ہے۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ ملک کریم کو کہوں وہ اپنی فلم کا ہیرو بھی خود ہی بن جائے لیکن پھر یہ سوچ کر اپنی زبان بند رکھی کہ ملک کریم سمجھے گا میں اس کا مذاق اڑا رہا ہوں۔

ہم تینوں کافی دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔ موضوع گفتگو فلم ہی رہی۔ میں نے زیادہ تر ان دونوں کی ہاں میں ہاں ملانے پر اکتفا کیا۔ رات گہری ہونے لگی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

’مجھے تو اب اجازت دیں ملک صاحب۔‘

’مجھے بھی اجازت دیں ملک جی۔ بڑے زور کی نیند آ رہی ہے۔‘ ندا نے ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر کہا۔

’اچھا تم بھی جا رہی ہو؟‘ ملک کریم نے عجیب سی نظروں سے ندا کو دیکھا۔

’جی ہاں میں بھی جا رہی ہوں۔‘ ندا نے شریر لہجے میں جواب دیا۔ ’بہتر ہے‘ آپ بھی سو ہی جائیں۔‘

’اچھا چلو‘ میں تمھیں تمھارے کمرے تک چھوڑ دیتا ہوں۔‘ ملک کریم نے کہا۔ ندا نے جلدی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے سے روکتے ہوئے کہا۔ ’ارے ملک جی آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ میرا کمرہ کون سا دور ہے۔ ذوالفقار صاحب مجھے دروازے تک چھوڑ دیں گے۔‘

’خیر جیسی تمھاری مرضی۔ اچھا شب بخیر۔‘ ملک کریم نے اپنے بستر پر قبضہ جماتے ہوئے کہا ندا کا کمرا میرے کمرے سے دو کمرے بعد والا ثابت ہوا۔ میں نے اسے اس کے کمرے کے دروازے پر پہنچا کر واپس لوٹنا چاہا۔

’آپ دو منٹ کے لیے میرے کمرے کو بھی عزت بخش دیں ذوالفقار جی‘ ندا نے التجا کے سے انداز میں مجھ سے درخواست کی۔ اس کی بات ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں اس کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں پہنچ کر میں بے اختیار چونک اٹھا۔ میں نے دیکھا کہ کمرے میں بچھے ہوئے دو بیڈز میں سے ایک پر ایک معمر شخص دراز ہے۔ ندا نے فوراً ہی میری حیرت کو محسوس کر لیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ’یہ میرے ماما جی ہیں۔ ان کے علاوہ میرا دنیا میں کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ یہ میرے ساتھ ہی رہتے ہیں۔

اپنا ذکر سن کر ماما جی بستر سے اٹھ بیٹھے۔ ان کی عمر ساٹھ برس کے قریب رہی ہوگی۔ ان کا سر اور داڑھی مونچھیں صفاچٹ تھیں۔ اس کی گدلی گدلی سوجی ہوئی آنکھوں میں موجود سرخ سرخ ڈوروں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی نشے کا عادی ہے۔ ندا نے ماما جی سے میرا تعارف کرایا۔ جواب میں اس نے گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

”ذوالفقار جی آپ کے لیے چائے منگاتی ہوں۔‘ ندا نے پرخلوص لہجے میں کہا۔ میں نے اسے منع کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے روم سروس کو فون کر کے چائے منگوالی۔ ندا نے ایک پیالی چائے ماما جی کو بھی دے دی۔ چائے کے دوران میں ندا مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاتی رہی کہ اسے بچپن سے فلم میں کام کرنے کا شوق ہے۔ اب ملک کریم کی مہربانی سے اس کی یہ خواہش پوری ہونے والی ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس وقت مجھے یوں لگا کہ جیسے ماما جی نے بہت غور سے میرا جائزہ لیا ہے۔ میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ پسلیوں کے ڈھانچے پر منڈھی اس مدقوق بوڑھے کو میری شخصیت میں دلچسپی لینے کی بھلا کیا ضرورت ہوتی۔ ندا نے بڑے پرخلوص انداز میں مجھے رخصت کیا۔ اپنے کمرے میں آنے کے بعد میں دیر تک ندا کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ اس کے وجود میں بے پناہ کشش پنہاں ہے۔ اگر کوئی ماہر ہدائیت کار اس کو پردۂ سکرین پر پیش کرتا تو وہ فلم بینوں کو اپنا دیوانہ بنانے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی پھر میرا ذہن رفاقت علی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ اگلے دن مناسب موقع دیکھ کر ملک کریم سے رفاقت علی کے بارے میں بات کروں گا۔ خاصی دیر بعد میری آنکھ لگی۔

اگلے دن تقریباً آٹھ بجے صبح میری آنکھ کھلی۔ میں نے ملک کریم کے کمرے کی طرف جا کر دیکھا تو وہ مجھے ابھی تک سوتا ہوا ملا۔ ندا کے کمرے کا دروازہ بھی بند تھا۔ تھک ہار کر میں دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں نے روم سروس والوں کو فون کر کے اپنے لیے ناشتا منگا لیا۔ بیرا ناشتے کے ساتھ تازہ اخبار بھی دے گیا۔ ناشتے کے ساتھ ساتھ میں اخبار کا مطالعہ بھی کرتا رہا۔ دس بجے کے قریب میں اخبار کو پوری طرح چاٹ کر فارغ ہو گیا۔ سوا دس بجے کے قریب ملک کریم نے فون کر کے مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ میں نے دیکھا کہ ندا پہلے ہی سے وہاں ڈیرے جمائے بیٹھی ہے۔ ملک کریم نے ایک بار پھر فلم کے متعلق منصوبے بنانے شروع کر دیے۔ میں کچھ دیر وہ بے معنی، فضول اور سنی سنائی باتیں برداشت کرتا رہا پھر میں نے سر درد کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ مجھے ملک کریم پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ اس کوڑھ مغز شخص نے کئی دن سے مجھے اس خوب صورت جیل میں بند کر کے بٹھا رکھا ہے۔ خود تو اس نے اپنے لیے ندا کی شکل میں ایک کھلونا ڈھونڈ لیا ہے۔ خدا جانے مجھے کب تک یہ سب فضولیات برداشت کرنی پڑیں گی۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ ہوٹل سے باہر نکل کر چہل قدمی کی جائے پھر مجھے اپنے ارادے کو ملتوی کرنا پڑا۔ مجھے یاد آ گیا کہ پولیس والے مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ دوسری طرف میں نے رنگو استاد اور اس کے خطرناک شاگرد نیمے پہلوان کو بھی اپنا جانی دشمن بنا رکھا ہے۔ اب تو میرا نور جہاں بیگم کے اڈے کی طرف جانا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ یہ سب سوچ کر میں کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ کوئی راہ نہ پا کر میں نے نیند کو اپنے اوپر زبردستی مسلّط کر لیا۔

شام پانچ بجے میری آنکھ کھلی۔ میں بہت دیر تک بیڈ پر بے حس و حرکت پڑا رہا پھر اٹھ کر ملک کریم کے کمرے میں پہنچ گیا۔ حسب توقع مجھے ندا وہیں موجود ملی۔ اس سمے مجھے وہاں کی ہر چیز کے مانند اس سے بھی بے زاری محسوس ہوئی۔ میرا دل چاہا کہ ملک کریم کو کہوں تم دنیا کے سب سے بڑے الو کے پٹھے ہو۔ بھاڑ میں گئے تم اور تمھاری فلم۔ تمھیں دولت برباد کرنے کا شوق ہے تو اسے اس خوب صورت ٹھگنی کے حوالے کر دو۔ کسی طرح سے اس کی یہ ڈرامہ بازی تو ختم ہو۔ ملک کریم نے میری حالت کو محسوس کر لیا۔ اس نے کھسیانے لہجے میں کہا۔ 'تیار ہو جاؤ ذوالفقار علی خان کل ہم لوگ لاہور روانہ ہو رہے ہیں۔' میں نے جواباً محض اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ ملک کریم کی دل جوئی کے لیے میں نے اس کے پسندیدہ موضوع یعنی اس کی فلم کا تزکرہ چھیڑ دیا۔

'ملک صاحب آپ نے اپنی فلم کے لیے ہیرو کا انتخاب کر لیا ہے؟'

'ارے نہیں بھئی۔ ابھی تو ہیرو کے علاوہ ہدایت کار کا بھی انتخاب کرنا ہے۔ کل لاہور پہنچتے ہی ہم اپنا کام شروع کر دیں گے۔ سب سے پہلے کسی مشہور ہدائیت کار سے بات کریں گے۔ اس کے بعد آگے کی منصوبہ بندی کریں گے۔'

'ملک جی، ہیرو کے لیے ذوالفقار علی خان کیسا رہے گا؟' ندا نے کہا۔ میں نے چونک کر اس کے منہ کی طرف دیکھا۔ مجھے اس کے چہرے پر غیر سنجیدگی کی کوئی علامت نظر نہ آئی۔ ملک کریم نے ندا کی بات سن

کر ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر ندا کی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے وہ خود بھی سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ 'ہاں چل تو سکتا ہے شاید۔ لڑائی بھڑائی بھی اس کے لیے مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن ناچ گانے کے معاملے میں یہ بالکل کورا ہے۔'

'ارے ان چیزوں کی فکر نہ کریں ملک جی۔ فلم کے ڈانس ڈائریکٹر اچھے اچھوں کو ناچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

'ارے ارے یہ آپ لوگ مجھے کس چکر میں ڈال رہے ہیں۔ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔' میں نے سچ مچ بوکھلاتے ہوئے فریاد کی۔ 'ملک صاحب آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرے سر پر کیسے کیسے مسائل کا بوجھ ہے۔ اس کے باوجود آپ ایسی باتیں کر رہے ہیں۔'

'اچھا اچھا اس مسئلے پر لاہور چل کر گفتگو کریں گے۔' ملک کریم نے کہا۔ کچھ دیر بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ اپنے بستر میں لیٹ کر میں دیر تک الٹی سیدھی باتیں سوچتا رہا۔ جب بھی میں اپنے ہیرو بنائے جانے کی تجویز کے بارے میں سوچتا' بے اختیار مجھے ہنسی آنے لگتی۔ میں سیف داد خان۔۔۔ اور فلم کا ہیرو۔۔۔ خوبصورت ہیروئنوں کے پیچھے مٹک مٹک کر عاشقانہ گانے گاتا ہوا۔ چونکہ میں دن کے وقت اپنی نیند پوری کر چکا تھا چنانچہ میں کوشش کے باوجود سو نہ سکا۔ رات کے بارہ بجے اور پھر ایک بج گیا۔ دو بجے کے قریب میں بستر پر اٹھ بیٹھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اب کیا کروں۔

اس سے پہلے کہ میں بستر پر دراز ہوتا۔ میرے کانوں میں کسی گاڑی کے انجن کی آواز آئی۔ میں نے حیرانی کے عالم میں سوچا کہ اتنی رات گئے کسی کو کہاں جانے کی ضرورت پیش آ گئی۔ میں نے اپنے کان باہر کی طرف جما دیے۔ مجھے محسوس ہوا کہ گاڑی کسی ایک ہی جگہ پر کھڑی ہے۔ البتہ کسی نے اس کا انجن بند کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں کمرے کی بالکونی کی طرف بڑھا۔ کھڑکی کھول کر میں' نے بڑی آہستگی سے باہر جھانکا۔ میں نے دیکھا کہ میری بالکنی ایک بڑی سی گلی میں کھلتی ہے۔ بالکنی کی زمین سے بلندی پندرہ فٹ کے قریب رہی ہو گی۔ اسی وقت میں نے اس گاڑی کو دیکھ لیا۔ نیم تاریکی میں جیپ کا ہیولا ہوٹل کی دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا تھا۔ جیپ کا انجن بہت دھیمی آواز میں کھر کھر کیے جا رہا تھا۔ اچانک مجھے نیم تاریکی میں ایک بہت بڑا سا بنڈل آہستہ اوپر سے جیپ کی طرف اترتا ہوا نظر آیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھا۔ آخر کار مجھے وہ رسی بھی نظر آ گئی جس سے وہ بنڈل لٹکا ہوا تھا۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ اسی اثناء میں وہ بنڈل جیپ کی چھت کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے جیپ کی چھت پر موجود خلا میں سے ایک ہیولے کو کھڑا ہوتے دیکھا۔ اس ہیولے نے بڑی تیزی سے اس بنڈل کو پکڑ کر جیپ کے اندر اتار لیا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک زبردست چھناکا ہوا۔ مجھے یاد آ گیا کہ وہ جیپ ملک کریم کے کمرے کی بالکنی کے عین نیچے کھڑی ہوئی ہے۔ اسی وقت میں نے کسی شخص کو بندر کی پھرتی سے رسی کے سہارے نیچے اترتے دیکھا۔ میں تیزی سے اپنے بستر کی طرف بڑھا۔ میں نے تکیے کے نیچے سے اپنا پستول نکالا اور بجلی کی سی تیزی سے بالکنی کی طرف

بڑھا۔ میں نے دیکھا کہ جیپ تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ میں نے پستول کاک کیا اور جیپ کی طرف فائر کر دیا۔ فضا میں ایک زبردست دھماکہ گونجا۔ میں نے چھناکے کی آواز سنی۔ شاید جیپ کا پچھلا شیشہ ٹوٹا تھا۔ میں نے بلا توقف دوسرا اور پھر تیسرا فائر کر دیا۔ میری فائرنگ کے باوجود جیپ تیز رفتاری سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ جب تک میں چوتھا فائر کرتا' وہ دائیں طرف مڑ کر میری زد سے باہر ہو گئی۔

فائرنگ کے دھماکوں نے پورے ہوٹل کو ہلا کر رکھ دیا لیکن میں ہر طرف سے بے نیاز ہو کر ملک کریم کے کمرے کی طرف دوڑا۔ میرے اندیشوں کے عین مطابق اس کا کمرہ خالی پڑا ہوا تھا۔ میں کسی خیال کے تحت تیز رفتاری سے ندا اور اس کے ماما کے کمرے کی طرف بڑھا۔ ان کے کمرے کا دروازہ بھی مجھے غیر مقفل ملا۔ میں بلا توقف کمرے کے اندر گھستا چلا گیا۔ میری نظروں کے سامنے ندا اور اس کے ماما کے خالی بستر میرا منہ چڑا رہے تھے۔

☆O☆

میرے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ ملک کریم کو اغوا کرنے والے نامعلوم افراد نے شاید ندا اور اس کے ماما کو بھی اغوا کر لیا ہے۔ لیکن اگلے ہی لمحے میرے اس خیال کی تردید ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کمرے میں کسی قسم کی افراتفری یا بے ترتیبی کے آثار موجود نہیں ہیں۔ کمرے کا مزید جائزہ لینے سے مجھے احساس ہوا کہ وہ دونوں نہایت اطمینان سے' پوری تیاری کے ساتھ یہاں سے رخصت ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے سامان میں سے کوئی معمولی سے معمولی شے بھی وہاں نہیں چھوڑی۔

اس نتیجے تک پہنچنے کے ساتھ ہی پوری صورت حال میرے ذہن میں واضح ہونے لگی۔ ملک کریم کی گاؤں والی حویلی پر مسلح افراد کا حملہ۔۔۔۔ غیر معمولی طور پر خوب صورت ایک نوجوان لڑکی کا ملک کریم جیسے ادھیڑ عمر اور عام سی شکل و صورت کے حامل شخص پر شیدا ہونا اور پھر نہایت ماہرانہ انداز میں ملک کریم کا اغوا' یہ سب شاید ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ ملک کریم نے اس قدر گھاگ اور سرد و گرم چشیدہ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو مکمل طور پر اس خوب صورت ناگن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا' جس نے مناسب موقع دیکھتے ہی اسے ڈس لیا۔ اس سازش کی منصوبہ بندی بہت پہلے سے کی جا رہی تھی۔ ملک کریم کے دشمنوں نے ندا کی گھنیری زلفوں کو ملک کریم کے لیے دام خوش رنگ کے طور پر استعمال کیا اور ملک کریم دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر خوشی خوشی اس دل کش جال میں پھنستا چلا گیا۔

لیکن ملک کریم کے یہ دشمن ہیں کون؟ دفعتاً میرے دماغ میں خطرے کا الارم بج اٹھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں خود بھی بے حد خطرناک صورت حال سے دوچار ہوں۔ ہوٹل والے مجھے ملک کریم کے ساتھی کی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں سب کو معلوم ہو جائے گا کہ ہوٹل میں کیا واردات ہو چکی ہے۔ اس کے بعد سب کی ہدف کا مرکز صرف اور صرف میں ہوں گا۔ ہوٹل والے یقیناً فوری طور پر پولیس کو اطلاع دیں گے نتیجتاً مجھے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ ایک بار پولیس کے ہاتھوں میں پڑنے کی دیر ہے۔ اس کے بعد تو پھر میرا یوم حساب آیا ہی سمجھو۔ یہ سب سوچتے ہی میں فوری طور پر حرکت میں

آ گیا۔

میں نے اپنا پستول اپنے لباس میں چھپا کر بڑی احتیاط سے کمرے سے باہر جھانکا۔ میں نے دیکھا کہ راہداری کے سرے پر چار پانچ افراد جمع ہیں۔ وہ سب فائرنگ کی آواز کے متعلق آپس میں تبادلہ خیال کر رہے ہوں گے۔ اتفاق سے ان میں سے کوئی بھی میری طرف متوجہ نہ تھا۔ موقع مناسب دیکھ کر میں ندا کے کمرے سے نکلا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا راہداری کے سرے پر موجود افراد کے پاس پہنچ گیا۔ ان میں سے کسی نے بھی خصوصی طور پر مجھ پر توجہ نہ دی۔ میں خاموشی سے ان کی باتیں سننے لگا۔

'ارے جناب! میں فائرنگ کی آواز کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ یقیناً پستول کی فائرنگ کی آواز تھی' ایک ادھیڑ عمر شخص نے پرزور لہجے میں اپنی رائے ظاہر کی۔

'لیکن یہ فائرنگ ہوئی کس طرف ہے؟' ایک اور شخص نے سوال کیا۔

'چلو نیچے استقبالیے پر چل کر پتا کرتے ہیں کہ کیا معاملہ ہے؟'

'ہاں ہاں چلو۔ استقبالیے پر چلتے ہیں' کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ تمام لوگ اس رائے پر متفق ہو کر سیڑھیاں اترنے لگے۔ میں بھی خاموشی سے ان کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اترنے لگا۔

ہم لوگ استقبالیہ پر پہنچے تو وہاں عجیب افراتفری کا عالم نظر آیا۔ لابی میں رکھے ہوئے ایک صوفے پر ہوٹل کا چوکیدار بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ دو بیرے اس کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ ہم سب استقبالیہ کلرک کے پاس جمع ہو گئے۔ میرے ساتھ آنے والوں نے کلرک پر سوالات کی برسات کر دی۔

'پوری بات تو مجھے بھی نہیں معلوم ہے جناب کیونکہ ہوٹل کا چوکیدار ابھی تک ہوش میں نہیں آیا ہے۔'

'کیا وہ فائرنگ اس پر کی گئی تھی؟ کہیں یہ ڈکیتی وغیرہ کا معاملہ تو نہیں ہے؟' اسی ادھیڑ عمر شخص نے سب مہمانوں کی ترجمانی کی ذمہ داری سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔

'نہیں' چوکیدار کو کوئی گولی نہیں لگی۔ اس کے سر پر کوئی بھاری کند شے مار کر اسے بے ہوش کیا گیا ہے۔ ہوٹل کے اندر کوئی نہیں گھسا۔ فائرنگ کی آواز سن کر ہم لوگ ہوٹل سے باہر نکلے تو دیکھا کہ چوکیدار ایک کونے میں بے ہوش پڑا ہے' ہم اسے اٹھا کر اندر لے آئے۔'

'تم نے پولیس کو فون کیا یا نہیں؟' سرکردہ شخص نے سوال کیا۔ پولیس کا ذکر سنتے ہی میرے جسم میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ پولیس کے آنے سے پہلے مجھے ہر قیمت پر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ بصورت دیگر میرا گلا پھندے میں آیا سمجھو۔ میری سننے کی تمام حسیات استقبالیہ کلرک کے جواب پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔

'میں نے پولیس کو اور اسپتال دونوں کو فون کر دیا ہے۔ وہ لوگ بس آنے ہی والے ہوں گے' کلرک کا جواب سن کر مجھے لگا کہ میرے گرد آہنی شکنجہ کستا جا رہا ہے۔ اگر میں بلا جواز ہوٹل سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا تو یقینی طور پر ان تمام لوگوں کی توجہ کا واحد مرکز بن کر رہ جاتا۔ اگر وہ لوگ مجھ سے سوال کرنے لگتے تو

مجھے جواب دینا مشکل ہو جاتا۔

عین اسی وقت ادھیڑ عمر شخص نے میری مشکل آسان کر دی 'ارے بھائیو' باہر چل کر دیکھو تو سہی۔ ہماری گاڑیوں کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا؟' اس کے ان الفاظ نے تمام لوگوں میں اضطراب کی تیز لہر دوڑا دی۔ ان سب کو یک دم اپنی گاڑیوں کی فکر لاحق ہو گئی۔ اسی اثنا میں ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے بہت سے دیگر مہمان بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔

'چلو۔۔۔ چلو باہر چلو' بے شمار آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ کم از کم پندرہ افراد کا ریلہ ایک ساتھ ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نہایت چابک دستی سے ان افراد میں شامل ہو گیا۔ ہوٹل سے باہر آنے کے بعد وہ تمام مہمان بے قراری کے عالم میں اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھے۔ وہ سب اپنی گاڑیوں کی فکر میں مبتلا تھے۔ ایسے میں مجھ پر کون توجہ دیتا۔ موقع مناسب دیکھ کر میں تیزی سے ایک تاریک گوشے کی جانب کھسک گیا۔

پوری طرح سے مطمئن ہونے کے بعد کہ کوئی میری غیر موجودگی سے آگاہ نہیں ہوا ہے' میں تیز رفتاری سے ایک طرف روانہ ہو گیا۔ ہوٹل سے خاصی دور آنے کے بعد میں نے اپنی رفتار نارمل کر لی۔ رات کے اس پہر میرا سڑکوں پر آوارہ پھرنا مجھے مصیبت میں بھی پھنسا سکتا تھا۔ میں جتنی جلدی کسی محفوظ مقام پر پہنچ جاتا اتنا ہی میرے حق میں بہتر ہوتا۔ میں سوچنے لگا کہ اس اجنبی شہر میں کون سے تاریک گوشے میں اپنا منہ چھپاؤں۔ لے دے کر نور جہاں بیگم کا ڈیرا تھا جہاں میں پناہ ڈھونڈ سکتا تھا لیکن اس وقت وہاں پہنچنا بھی میرے لیے آسان کام نہ تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اس وقت شہر کے کس حصے میں موجود ہوں۔ ویسے بھی اس ہقت کوئی سواری ملنا آسان نہ تھا۔

میں تن بہ تقدیر ہو کر مسلسل چلتا رہا۔ اس دوران میں میرا دماغ مسلسل سوچ بچار میں مصروف رہا۔ یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ ملک کریم کو اسی کی جیپ میں اغوا کیا گیا ہے۔ ملک کریم کا ڈرائیور اور باڈی گارڈ کسی سستے سے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے جبکہ ملک کریم کی جیپ رائل ہوٹل کی پارکنگ میں تھی۔ ملک کریم کو اغوا کرنے والوں نے اس کی جیپ ہتھیانے کے لیے ہوٹل کے چوکیدار کو بے ہوش کر دیا تا کہ وہ کسی قسم کی مزاحمت نہ کر سکے۔ اگر میں فائرنگ نہ کرتا تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی کہ کیا کچھ رونما ہو چکا ہے۔ پولیس کی آمد کے بعد ملک کریم کی گمشدگی راز نہ رہ سکے گی۔ عین ممکن ہے کہ مجھے بھی ملک کریم کے اغوا کی سازش میں شریک سمجھ لیا جائے۔ اس صورت میں مجھے اپنی صفائی پیش کرنا مشکل ہو جائے گا۔ چلتے چلتے اچانک میرے قدم خود بخود رک گئے۔ اپنے اردگرد کے ماحول پر نظر پڑتے ہی میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ میں نے دیکھا کہ میں چلتے چلتے انجانے میں ملتان چھاؤنی ریلوے اسٹیشن کے قریب آ نکلا تھا۔ اس صورت حال میں شاید میرے لیے اس سے بہتر جگہ کوئی نہ ہو سکتی تھی۔

رات کے دو بجے کے قریب بھی ریلوے اسٹیشن اور اس کے آس پاس کے علاقے میں دن کا سماں تھا۔ مجھے اپنے دائیں ہاتھ پر چائے اور کھانے کے کتنے ہی ڈھابے نما ہوٹل کھلے ہوئے نظر آئے۔ میں ان

سے کنی کاٹ کر سیدھا اسٹیشن کی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ شاید کچھ ہی دیر پہلے وہاں سے کوئی ٹرین روانہ ہوئی تھی۔ چنانچہ مجھے وہاں اچھی خاصی چہل پہل نظر آئی۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر ٹکٹ گھر کے سامنے پہنچا اور ٹرین کے ٹائم ٹیبل پر ایک نظر ڈال کر واپس سیڑھیاں اترنے لگا۔ سامنے ہی رکشوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ دائیں ہاتھ ذرا فاصلے پر تانگوں کا اسٹینڈ تھا۔ میں چپ چاپ رکشاؤں کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے راستے میں ہی کئی رکشے والوں نے گھیر لیا۔ میں خاموشی سے ایک عمر رسیدہ رکشے والے کے ساتھ چل پڑا۔ ڈرائیور کے برعکس اس کا رکشا خاصا نیا نکور ثابت ہوا۔ رکشے کے کیبن پر لگے ہوئے دروازوں کو دیکھ کر مجھے خاص طور پر طمانیت محسوس ہوئی۔ اس طرح سے مجھے راستے میں دیکھ لیے جانے کا خطرہ بھی نہ رہا۔

میں نے رکشے والے کو حسین آگاہی کا پتا بتایا تو وہ بغیر کوئی سوال کیے روانہ ہو گیا۔ راستے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئی۔ رکشے والے نے راستے میں ایک آدھ بار مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ بنا کر بات طویل نہ ہونے دی۔ رکشے والے کو میں نے اس کا منہ مانگا کرایہ دے کر رخصت کر دیا۔ رکشے کے نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد میں نے نور جہاں بیگم کے ڈیرے کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

نور جہاں بیگم کے ڈیرے کے عقبی رہائشی حصے کے دروازے پر پہنچ کر میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دستک دی۔ دوسری دستک کے بعد مجھے اندر سے چھیمو بی کی آواز سنائی دی 'کون ہے' مجھے اس کے لہجے میں تشویش اور حیرانی کا رنگ جھلکتا محسوس ہوا۔

'میں ہوں چھیمو بی۔۔۔ ذوالفقار علی شاہ'

'ارے بیٹا تم اس وقت؟' چھیمو بی نے فوراً ہی مجھے پہچان لیا۔ اس کے بعد دروازہ کھلنے میں دیر نہ لگی۔ میں اندر پہنچا تو میں نے عنبرین کو اندرونی کمرے کے دروازے پر کھڑا ہوا پایا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر بے شمار گلاب کھل اٹھے۔

'ارے آپ۔۔۔؟ آئیے۔۔۔ آئیے' اس نے والہانہ لہجے میں مجھے کمرے کے اندر آنے کی دعوت دی۔

'نور جہاں بیگم۔۔۔ پروین۔۔۔ اٹھو دیکھو کون آیا ہے' نور جہاں بیگم اور پروین ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں بھی مسرت کا اظہار کرنے لگیں۔

'بہت اچھے وقت پر آئے ہو میاں ذوالفقار علی شاہ' نور جہاں بیگم نے پر جوش لہجے میں کہا۔

'ہم آج سارے دن سے تمہیں یاد کر رہے ہیں'

'کیوں خیریت نور جہاں بیگم؟'

'ہاں بھئی کچھ ایسی ہی بات تھی۔ وہ دراصل آج صبح سردار خضر خان یہاں آئے تھے' نور جہاں بیگم نے پر جوش لہجے میں بتایا۔

'یہ تو آپ نے بہت خوشی کی خبر سنائی نور جہاں بیگم' میں نے حقیقی خوشی کے احساس کے ساتھ کہا۔

'اب کہاں ہے وہ؟' میں نے عنبرین کے گلنار ہوتے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس لمحے وہ مجھے شبنم سے دھلی پاکیزہ کلی کے مانند نظر آئی۔

'وہ کسی بڑے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کل دن میں کسی وقت پھر یہاں آئیں گے' نور جہاں بیگم نے بتایا۔ اس کے لہجے میں مسرت کی جھلک محسوس کر کے مجھے دلی طمانیت حاصل ہوئی۔ عنبرین شرم و حیا کے مارے چھوئی موئی بنی جا رہی تھی۔

'خضر خان نے آپ سے بات کر لی ہے نور جہاں بیگم؟' میں نے جھجکتے جھجکتے پوچھا۔

'ہاں بیٹا بس بات پکی ہی سمجھو۔ انشاء اللہ جلد ہی تاریخ طے ہو جائے ہو جائے گی' نور جہاں بیگم نے مسرور لہجے میں کہا۔

میں نے سوچا کہ اس سے پوچھوں کہ اس نے سردار خضر خان سے کتنی دولت کا مطالبہ کیا ہے۔ لیکن پھر میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اسے شرمندہ کرنے سے مجھے بھلا کیا حاصل ہوتا؟ یہ ایک گاہک اور دکان دار کا باہمی معاہدہ تھا۔ سردار خضر خان اسے جو بھی ادائیگی کرتا وہ یقیناً اپنی خوشی سے کرتا۔ اپنے دل کی سب سے بڑی خواہش کی تکمیل کے لیے کچھ نہ کچھ تو قربانی دینا ہی پڑتی ہے! کیا ہوا اگر یہ قربانی اس معاملے میں زر نقد کی شکل میں تھی؟ ویسے بھی میرا اب اس معاملے سے کوئی واسطہ نہیں رہا ہے۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکا میں نے کیا۔ آگے جوان لوگوں کی قسمت۔

میں کچھ دیر ان سے گفتگو کرتا رہا۔ اسی اثناء میں چھمو بی چائے بنا لائی۔ چائے پینے کے بعد میں اوپر والی منزل پر اپنے مخصوص کمرے میں آ گیا۔

اس رات میں کافی دیر تک جاگتا رہا۔ میں نے اس دوران میں اپنی آیندہ کی حکمت عملی کے متعلق چند اہم فیصلے کیے۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اب رفاقت علی کے سلسلے میں مزید تاخیر نہیں کروں گا۔ ملک کریم کا اغوا بے شک بے حد اہم معاملہ ہے۔ لیکن فی الحال میرے لیے اس کی کوئی مدد کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ کوئی بہت لمبا چوڑا چکر ہے۔ میں اس میں پڑ گیا تو شاید رفاقت علی خان والا معاملہ کبھی بھی اپنے انجام تک نہیں پہنچ سکے۔ جس قسم کی صورت حال سے میں دوچار ہوں۔ اس میں کسی بھی وقت میں پولیس کے شکنجے میں پھنس سکتا ہوں۔ اگر ایک بار میری قسمت مجھے دھکیل کر آہنی سلاخوں کے پیچھے لے گئی تو میری ساری تپسیا اکارت ہو کر رہ جائے گی۔ رفاقت علی کی ناپاک زندگی ختم نہ ہوئی تو فقیر بابا بھی ہمیشہ کے لیے برکت علی کی حویلی کے زنداں میں اسیر رہے گا۔ لہٰذا میری کوشش ہونی چاہیے کہ جلد از جلد رفاقت علی کی منحوس ذات سے اس زمین کو پاک کر دیا جائے۔ اس کے بعد اگر ممکن ہو تو ملک کریم کے متعلق کچھ سوچا جائے۔

اگلی صبح دیر سے میری آنکھ کھلی۔ ناشتے کے بعد عنبرین پروین اور نور جہاں بیگم نے مجھے گھیر لیا۔ وہ مجھ سے شکایت کرتی رہیں کہ میں اچانک بغیر اطلاع دیئے غائب ہو جاتا ہوں۔ ان لوگوں کے پاس مجھ سے

رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ادھر ادھر کی باتیں کر کے انہیں ٹال دیا۔ کچھ دیر بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔

'ارے ارے تم کہاں چلے میاں؟ نور جہاں بیگم نے حیرانی سے پوچھا۔

'مجھے ذرا ایک ضروری کام سے جانا ہے۔'

'لیکن میاں ابھی سردار خضر خان آنے والے ہیں۔ ان سے نہیں ملو گے؟'

'نور جہاں بی' میں انشاء اللہ سہ پہر تک واپس آ جاؤں گا۔ فرض کریں میں واپس نہ آ سکا تو شام کو سردار خضر خان سے اس کے ہوٹل میں مل لوں گا' میں نے انہیں تسلی دی۔ عنبرین اور پروین نے بصد اصرار مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اپنی بات منوا ہی لی۔

حسین آگاہی کے بارونق بازار سے گزرتے ہوئے مجھے مسلسل دھڑکا لگا رہا کہ کہیں میں رنگو استاد اور بیے پہلوان کے گرگوں کی نظر میں نہ آ جاؤں۔ اس وقت میں کسی الجھن میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ مزید کچھ دور آنے کے بعد مجھے ایک رکشا مل گیا۔ قدرے حیل و حجت کے بعد رکشے والا گلشن جمال چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ تمام راستے میں سوچتا رہا کہ رفاقت علی کو کس انداز میں ٹھکانے لگایا جائے۔ اگر اسے محض قتل ہی کرنا ہوتا تو کوئی مشکل نہ تھی۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ اس کا اس انداز میں خاتمہ ہو کہ اس کی موت کسی حادثے کے باعث یا طبعی نظر آئے۔ اس قسم کا انتظام یقیناً آسان نہ ہوتا۔

رفاقت علی کے بنگلے سے خاصا پہلے ہی میں رکشے سے اتر گیا۔ رکشے کو رخصت کرنے کے بعد میں رفاقت علی کے بنگلے کی طرف بڑھا لیکن میں نے بنگلے کے قریب جانے کا خطرہ مول نہیں لیا بلکہ کافی دور سے بنگلے کی نگرانی کرتا رہا۔ دوپہر کے وقت میں نے بنگلے کے گیٹ سے رفاقت علی کی سفید مرسڈیز کار نکلتے دیکھی۔ میری توقع کے عین مطابق وہ سیدھی میری جانب ہی آئی۔ میں نے خود کو ایک درخت کی آڑ میں کرتے ہوئے بغور کار کا جائزہ لیا۔ مجھے یہ دیکھ کر قدرے مایوسی ہوئی کہ اس کار کو ایک باوردی ڈرائیور چلا رہا ہے۔ کار کی پچھلی نشست پر موجود سواری کو بھی میں نے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ خوبصورت عورت رفاقت علی کی بیوی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ شاید رفاقت علی شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ اسی لیے رفاقت علی کی بیوی اپنی چھوٹی گاڑی کی بجائے رفاقت علی کی بڑی گاڑی استعمال کر رہی ہے۔

ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ نگرانی کے بیزار کن کام پر لعنت بھیج کر واپس لوٹ جاؤں لیکن پھر میں نے اپنی خواہش کو سختی سے دبا دیا۔ ہو سکتا ہے رفاقت علی گھر میں ہی موجود ہو۔ اور کسی وجہ سے گھر سے باہر نہ نکل رہا ہو۔ وہ وجہ اس کی شکستہ ناک بھی ہو سکتی تھی جو کہ اس رات میری ضرب کا نشانہ بنی تھی۔ اگر اس کی ناک کی ہڈی نہیں بھی ٹوٹی ہو تو اسے شدید چوٹ ضرور لگی ہو گی۔ ہو سکتا ہے اس کے مسخ شدہ چہرے نے اسے گھر میں اسے محصور ہونے پر مجبور کر دیا ہو۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں فی الحال رفاقت علی کے بنگلے کی نگرانی جاری رکھوں گا۔ اور اگر کوئی موقع ملا تو بنگلے میں گھسنے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔ فی الحال میرے ذہن میں کوئی بھی ایسا منصوبہ نہیں تھا جس کے ذریعے میں رفاقت علی کو کیفر کردار تک پہنچا سکتا۔ چنانچہ

میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کہ کسی مناسب موقعے کا انتظار کروں اور جونہی کوئی مناسب موقع ملے اپنے دشمن کا پتا صاف کر دوں۔

میں جگہ بدل بدل کر مسلسل رفاقت علی کے گھر کی نگرانی کرتا رہا۔ سہ پہر کے وقت رفاقت علی کی بیوی واپس آئی۔ وہ اپنے بنگلے میں گھسی تو اس کے بعد ایک لمبے وقفے تک نہ کوئی بنگلے سے نکلا نہ بنگلے میں داخل ہوا۔ مغرب کے وقت تک مجھے شدید بھوک ستانے لگی۔ جب بھوک ناقابل برداشت ہونے لگی تو میں علاقے کے بازار کی طرف چل پڑا۔ وہاں ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ سے میں نے ہلکا پھلکا ناشتہ نما کھانا کھایا۔ بل کی ادائیگی کے لیے کیشیئر کے کاؤنٹر پر پہنچا تو کاؤنٹر پر رکھے ہوئے ٹیلی فون نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ میں نے سوچا کہ اگر میں رفاقت علی کے گھر میں موجودگی یا عدم موجودگی کا پتا چل سکتا ہے۔ لیکن رفاقت علی کا فون نمبر کیسے معلوم ہو؟ مجھے اس مسئلے کا حل بھی سامنے ہی نظر آ گیا۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری۔۔۔ میں نے بل کی ادائی کے بعد کیشیئر کی اجازت سے ٹیلی فون ڈائریکٹری اپنی طرف کھسکا لی۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد میں نے خان رفاقت علی کا نمبر ڈھونڈ نکالا۔ فون نمبر نوٹ کرنے کے بعد میں نے ٹیلی فون ڈائریکٹری واپس کر دی اور شکریہ ادا کر کے ریسٹورنٹ سے باہر نکل آیا۔ اگر میں چاہتا تو وہیں سے رفاقت علی کے گھر فون کر سکتا تھا۔ لیکن میں نے احتیاطاً ایسا نہیں کیا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد میں نے فون کرنے کی مناسب جگہ ڈھونڈ نکالی۔ وہ ایک بڑا میڈیکل اسٹور تھا جس کا عملہ اپنے گاہکوں میں کافی مصروف تھا۔ میں نے اجازت لے کر فون کے نمبر ملانا شروع کیے۔ دوسری گھنٹی بجنے پر ہی کسی نے فون اٹھا لیا۔

'ہیلو جی آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟' میں نے کسی کی سریلی نسوانی آواز سنی۔

'ہیلو خاتون میرا نام چوہدری بشارت علی ہے' میں ڈاکٹر خان رفاقت علی سے بات کرنا چاہتا ہوں' میں نے اپنی آواز کو بھاری اور بارعب بناتے ہوئے فرضی نام سے اپنا تعارف کرایا۔

'چوہدری صاحب' میں بیگم رفاقت علی بات کر رہی ہوں۔ آپ کو شاید معلوم نہیں ہے' خان رفاقت علی آج کل شدید بیمار ہیں' مجھے اس کے لہجے میں افسوس یا تشویش کی معمولی سی جھلک بھی محسوس نہ ہوئی۔

'او ہو خیر تو ہے بیگم صاحبہ؟ کیا ہوا خان صاحب کو؟ ابھی چند دن پہلے تو بالکل بھلے چنگے تھے۔ میں دراصل آج ہی لاہور سے واپس لوٹا ہوں' میں نے پر تشویش لہجے میں سوال کیا۔

'کیا بتاؤں چوہدری صاحب۔ چند دن پہلے خان صاحب کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ جس میں ان کی ناک کی ہڈی اور دو دانت ٹوٹ گئے۔ انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ وہیں پر انہیں دل کا زبردست دورہ پڑا۔ ان کی قسمت ہی تھی کہ وہ اتنے زبردست دورے کو جھیل گئے' بیگم رفاقت علی کی کھنک دار آواز میرے کانوں میں رس گھولتی رہی۔ یہ خوش خبری سن کر مجھے اپنے دل میں مسرت کی لہریں گردش کرتی محسوس ہوئیں۔ اس بدبخت کے ساتھ جو کچھ بھی ہوتا وہ کم تھا۔ میں نے اپنی مسرت کو چھپاتے ہوئے بے حد متفکر لہجے میں کہا۔

'یہ تو آپ نے بے حد تشویش ناک خبر سنائی مسز رفاقت علی! اب وہ کیسے ہیں؟'

'فی الحال تو وہ بہتر حالت میں ہیں۔ آج دوپہر کو انہوں نے کھانا بھی کھایا ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے اگر مزید کوئی دورہ نہ پڑا تو وہ ایک ڈیڑھ ہفتے تک کافی حد تک صحت یاب ہو جائیں گے۔'

'ویسے وہ کون سے اسپتال میں ہیں؟ ہو سکے تو ان کا بیڈ نمبر وغیرہ بھی بتا دیں۔ میرے ان سے اچھے خاصے مراسم تھے یہ اور بات ہے کہ میں بھی آپ کے در دولت پر حاضری کا شرف حاصل نہ کر سکا' میں نے اپنے لہجے کو حتی الوسع پر اعتماد اور مہذب بنانے کی کوشش کی۔

'ارے چوہدری صاحب' آپ جب جی چاہے غریب خانے پر تشریف لائیں۔ ویسے خان صاحب عرفان کلینک میں زیر علاج ہیں۔ بہت بڑا پرائیویٹ کلینک ہے بوسن روڈ پر۔ آپ نے یقیناً دیکھا ہوگا' گراؤنڈ فلور پر تین نمبر کمرا ہے خان صاحب کا۔

'اچھا اچھا وہ عرفان کلینک جو بوسن روڈ پر ہے۔ واقعی بہت اچھا کلینک ہے۔ میں کسی وقت جاؤں گا وہاں' میں نے اپنی ترکیب کی سو فیصد کامیابی پر مسرور ہوتے ہوئے کہا۔ جواباً میں نے بیگم رفاقت علی کے لہجے کی حلاوت میں حد درجہ اضافہ ہوتا محسوس کیا۔

'چوہدری صاحب' آپ ایسا کیجیے کہ ابھی میرے گھر آ جائیے۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں کھانا لے کر کلینک جاؤں گی۔ آپ بھی میرے ساتھ ہی چلیے گا۔'

'بہت بہت شکریہ بیگم صاحبہ دراصل ۔۔۔' میں نے وضاحت کرنا چاہی لیکن اس نے میری بات درمیان میں کاٹ دی۔

'میرا نام رعنا ہے چوہدری صاحب' اگر آپ مجھے اسی نام سے پکاریں تو مجھے خوشی ہوگی' اس نے نہایت بے تکلفانہ انداز میں گنگناتے لہجے میں کہا۔ مجھے اس کی بے باکی پر بے حد حیرت ہوئی۔ وہ عورت محض فون پر گفتگو کے دوران اس قدر وسیع القلبی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ جانے روبرو ملاقات میں وہ کس قدر پیش قدمی پر آمادہ ہو جاتی۔ اس کے لہجے نے مجھے اس کے متعلق بہت کچھ بتا دیا۔ مجھے رفاقت علی پر تھوڑا سا رحم آنے لگا۔ وہ بدنصیب شخص ایسی عورت کے لیے اپنے آپ کو جہنم کا کندہ بنانے پر تلا ہوا ہے جو اس کی علالت کے وقفے میں بھی خود کو ایک تقریباً اجنبی شخص سے ملوث کرنے کے لیے بے قرار ہے۔

'بہت بہت شکریہ بیگم صاحبہ' میں نے اس کی پوشیدہ پیش کش کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا' فی الحال میں بے حد مصروف ہوں۔ ویسے مجھے جونہی وقت ملا میں کلینک کا چکر لگاؤں گا۔ آپ میری طرف سے خان صاحب کی مزاج پرسی کر لیجیے گا۔'

'اچھا ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی چوہدری صاحب۔' اس نے قدرے مایوس لہجے میں کچھ اور کہنا چاہا لیکن میں نے خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

میڈیکل اسٹور سے باہر آنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ رفاقت علی کو اپنی غلیظ حرکتوں کا کچھ نہ کچھ صلہ مل چکا تھا۔ میں نے مصمم ارادہ کیا کہ اسے اس اسپتال سے زندہ باہر نہیں

آنے دوں گا۔اسے ختم کرنے کا اس سے بہتر موقع شاید مجھے پھر کبھی نہ مل پاتا'ایک بار تو نے اسپتال میں میری زندگی سے کھیلنے کی کوشش کی تھی رفاقت علی۔آج میری باری ہے'میں نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ میں ابھی اس کلینک کی جانب چل پڑوں جہاں رفاقت علی میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچنے کا منتظر ہے لیکن پھر میں نے اپنی اس خواہش کو رد کر دیا۔اگر میں اسی وقت وہاں پہنچ جاتا تو مجھے رات گہری ہونے تک کا وقت گزارنا مشکل ہو جاتا۔کون جانے کب کوئی ٹٹولتی ہوئی نظر مجھے پہچان لے۔میرے لیے یہی بہتر ہے کہ خود کو کم سے کم نمایاں کروں۔یہ سب سوچ کر میں نے فی الحال رفاقت علی کی طرف جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔اس کے ساتھ ہی ایک اور سوال میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔میں رات گئے تک کا یہ وقت کیسے گزاروں؟ فوراً ہی ایک نام میرے ذہن میں گونجا۔سردار خضر خان۔مجھے معلوم تھا کہ وہ ہوٹل بلیو سینڈ میں ٹھہرا ہوا ہے۔اس ہوٹل کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ ریلوے اسٹیشن سے محض ایک کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔میں اگر اس ہوٹل سے رات کو خاصی دیر سے نکلتا تو بھی مجھے سواری حاصل کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہ آتی۔

میں کچھ ہی دیر بعد ایک رکشے میں بلیو سینڈ کی جانب رواں دواں تھا۔چند بار رکشے کو بطور سواری استعمال کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ ملتان شہر میں رکشے والے میٹر کو زحمت دینے کے قائل نہیں ہیں۔ان کی اس من مانی کو روکتا بھی کون؟ ٹریفک پولیس والے اول تو تھے ہی بہت کم اور جو تھے وہ ہر وقت اپنی اور اپنے افسران کی جیبیں بھاری کرنے کے راستے ڈھونڈتے رہتے۔رکشے والوں سے بھاؤ تاؤ اور بحث مباحثے سے گریز کرتے ہوئے میں ان کا منہ مانگا کرایہ ان کے حوالے کر دیا کرتا۔اس وقت بھی میں نے اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد رکشا ڈرائیور کو اس کے حسب مرضی کرایہ دے کر رخصت کر دیا۔

مجھے سردار خضر خان کے کمرے کا نمبر یاد تھا لہٰذا میں نے استقبالیے پر ٹھہرنے کی کوشش نہ کی۔دوسری منزل پر پہنچ کر میں نے اپنا مطلوبہ کمرا فوراً ہی تلاش کر لیا۔دستک کے جواب میں جس شخص نے دروازہ کھولا اُسے بھی میں نے فوراً ہی پہچان لیا۔وہ لاکھو تھا۔سردار خضر خان کا خاص آدمی۔اس نے بھی مجھے پہچاننے میں دیر نہ کی۔اس کے چہرے پر حیرانی کے آثار ابھرے'کون آیا ہے لاکھو'میں نے سردار خضر خان کی بھاری آواز سنی۔اس کی آواز سن کر میں نے قدم آگے بڑھا دیے۔لاکھو نے میرا راستہ روکنے کی کوشش نہ کی۔مجھے دیکھتے ہی سردار خضر خان کے چہرے پر مسرت کے پھول کھل اٹھے۔

'ارے میرا بھائی۔۔۔میرا دوست آیا ہے۔۔۔خوش آمدید ذوالفقار علی شاہ خوش آمدید۔۔میں بڑی بے چینی سے تمہارا منتظر تھا'سردار خضر خان نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بڑی محبت اور خلوص سے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔

'آپ ٹھیک تو ہیں سردار خضر خان؟'میں نے اس کے خلوص کی گرمی سے پگھلتے ہوئے سوال کیا۔

'ارے کم از کم تم تو مجھے سردار نہ کہو بھائی ذوالفقار۔میں تمہیں اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں۔تم بھی مجھے

بھائی کہہ کر مخاطب کرو تو مجھے خوشی ہوگی'

'جیسے آپ کی مرضی۔۔۔بھائی صاحب'میں نے اپنی آواز آنسوؤں سے **بھیگتی** محسوس کی۔سردار خضر خان نے میری جذباتی کیفیت کو محسوس کر کے مجھے ایک بار پھر اپنے سینے سے لگا لیا۔

'ارے ایسا شیر جیسا جوان ہو کر آنکھیں گیلی کرتا ہے ذوالفقار علی'

دراصل میرا کوئی بھائی نہیں ہے نا اس لیے'میں نے اپنے لہجے کو بہ مشکل گلوگیر ہونے سے بچایا۔ میرا دل چاہا کہ اپنے دل کے تمام زخم کھول کر اس کے سامنے رکھ دوں۔اسے بتاؤں کہ میں بھائی بہن ہی نہیں'باپ کی نعمت سے بھی محروم ہوں۔اگرچہ میری ماں زندہ ہے لیکن کاش وہ بھی اس زمین کا بوجھ ہلکا کر دیتی۔اس کے خاتمے کی خواہش نے تو میری زندگی کو ببول کا جھاڑ بنا کر رکھ دیا ہے۔لیکن میں اُسے کچھ بھی' نہ بتا سکا۔

سردار خضر خان نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔جذبات کے غلبے کے باعث کچھ دیر تک میری زبان سے کوئی بات نہ نکل سکی۔سردار خضر نے میری کیفیت کو سمجھتے ہوئے اپنے دونوں کارندوں کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔وہ دونوں قدرے حیرانی کے عالم میں چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئے۔

'ہاں اب بتاؤ بھائی'تم ٹھیک ٹھاک تو ہو؟'اس نے پیار بھرے انداز میں میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے سوال کیا۔

'میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں بھائی صاحب۔'میں نے اپنی حالت پر خاصی حد تک قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔'آپ کیسے ہیں؟ نور جہاں بیگم سے آپ کی بات چیت کیسی رہی؟'

'خداوند کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے'سارا معاملہ بالکل ٹھیک ٹھاک رہا ہے۔میں نے نور جہاں بیگم سے عنبرین کے رشتے کی بات کی تو وہ خلاف توقع جلد ہی رضامند ہو گئی۔البتہ اس نے ابھی تک مجھے اپنی شرائط نہیں بتائی ہیں۔خیر وہ تو کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ویسے نور جہاں بیگم کے اس طرح آسانی سے راضی ہونے پر مجھے کافی حیرت ہوئی شاید اس معاملے میں تمہاری کاوشوں کا بھی بہت دخل ہے۔نور جہاں بیگم اور دونوں لڑکیاں تمہارا ہی دم بھرتی رہتی ہیں۔'سردار خضر خان نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ اپنا خیال ظاہر کیا۔

'ہاں'یہ بات خاصی حد تک صحیح ہے۔پہلے پہل تو نور جہاں بیگم آپ کا نام تک سننے کو تیار نہ تھی۔میں نے اور عنبرین نے زبردست کوشش کی تب جا کر وہ سیدھے راستے پر آئی'

'اس کا مطلب ہے عنبرین مجھ سے شادی کرنے کے لیے'بخوشی رضامند ہے؟'سردار خضر خان نے مسرور لہجے میں دریافت کیا۔

'جی ہاں بھئی بھائی صاحب'عنبرین آپ سے شادی کے لیے دل و جان سے تیار ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ یہ نیک کام آپ جلد از جلد کر ڈالیں'

میں نے سردار خضر خان کو مختصراً رنگو استاد اور نیمے پہلوان کی ناپاک حرکتوں کے متعلق بتایا۔میں نے

سردار خضر خان کے چہرے کے تاثرات کو تیزی سے تبدیل ہوتے دیکھا۔ اس کا پروقار چہرہ آتش غضب سے سرخ ہوتا چلا گیا۔

'ہوں! تو یہ بات ہے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ نور جہاں بیگم اور اس کے گھر والے کچھ پریشان سے ہیں۔ لیکن انہوں نے مجھے اپنی پریشانی کی وجہ نہیں بتائی۔'

'رنگو استاد اور اس کا چمچا نیمے پہلوان بذات خود اتنے طاقتور نہیں ہیں لیکن پولیس والوں کی پشت پناہی نے انہیں خطرناک بنا دیا ہے۔'

'انہیں آج تک کسی بلوچ سے واسطہ نہیں پڑا ہوگا میرے بھائی۔' سردار خضر خان کے پنجے میں پنجہ ڈالیں گے تو انہیں اپنی اوقات کا اندازہ ہوگا۔ میرں عزت پر بری نظر ڈالنے والے کی آنکھیں سلامت نہیں رہ سکتیں' مجھے اس کے لہجے میں آگ دہکتی محسوس ہوئی۔ مجھے خیال آیا کہ میں نے اس کے سامنے رنگو استاد اور نیمے پہلوان کا ذکر کر کے کہیں کوئی غلطی تو نہیں کر ڈالی۔ وہ ان غنڈوں سے انتقام لینے پر تل جاتا تو جانے کس کس کے لہو سے ملتان کی سرزمین سرخ ہو جاتی۔

'میری آپ سے درخواست ہے بھائی صاحب کہ آپ فی الحال ان بدمعاشوں سے الجھنے کی کوشش نہ کریں۔ آپ جتنی جلدی ممکن ہو سکے' عنبرین کو اپنے نکاح میں لے لیں اور اسے اپنے ساتھ لے جائیں پھر کوئی تنازع باقی نہیں رہے گا۔ آپ کسی معرکے میں الجھے تو عنبرین کے لیے بھی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں' میں نے اس کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان محسوس ہوا کہ میرے الفاظ نے سردار خضر پر خاطر خواہ اثر کیا ہے۔

اس کے چہرے کے عضلات کا تناؤ کم ہو گیا 'اچھا' جیسے تمھاری مرضی۔ ان کم ذاتوں پر لعنت بھیجو۔ اگر آیندہ انہوں نے کوئی شرارت کرنے کی کوشش کی تو پھر ان سے اچھی طرح نمٹ لیں گے۔ ویسے تمھاری رائے مجھے پسند آئی۔ میں ایک آدھ دن میں نہایت سادگی سے عنبرین سے نکاح کر لوں گا اور اسے لے کر سخی سرور روانہ ہو جاؤں گا' سردار خضر نے پرسکون لہجے میں کہا۔

میں رات کے بارہ بجے تک سردار خضر کے ساتھ رہا۔ اس کے پیار بھرے سلوک نے مجھے یقین دلا دیا کہ وہ واقعی مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہے۔ رات کا کھانا ہم دونوں نے اکٹھے ہی کھایا۔ کھانے کے بعد ہم آپس میں باتیں کرتے رہے۔ سردار خضر خان نے مجھ سے میرے بارے میں بہت سے سوالات کیے۔ میں نے کچھ سچ اور کچھ جھوٹ بول کر اسے اپنی طرف سے مطمئن کر دیا۔ رات بارہ بجے میں نے اس سے رخصت کی اجازت طلب کی تو وہ بھونچکا سا رہ گیا۔

'ارے اتنی رات گئے تم کہاں جاؤ گے میرے بھائی؟ رات کو میرے ساتھ ٹھہرو' صبح سویرے جہاں جی چاہے روانہ ہو جانا۔ اس وقت تو تمھیں کوئی سواری بھی نہیں ملے گی۔

آپ میری فکر نہ کریں بھائی صاحب۔ عزیز ہوٹل کے پاس سے مجھے رکشا مل جائے گا۔ ویسے بھی ابھی اتنی رات نہیں ہوئی ہے۔'

'اچھا تو پھر میں لاکھو کو کہتا ہوں وہ تمھیں جیپ پر چھوڑ آئے گا۔'

'ارے نہیں بھائی صاحب' اس بے چارے کو شہر کی اجنبی سڑکوں پر کیوں پریشان کرتے ہیں۔ یقین کیجئے مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔'

'اچھا بھئی جیسے تمھاری مرضی' سردار خضر خان نے میرے ارادے کے سامنے پسپائی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ میں اسے خدا حافظ کہہ کر ہوٹل سے نکل آیا۔ کچھ دیر کی تیز رفتار چہل قدمی کے بعد میں اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ میں نے وہاں سے ایک رکشا پکڑا اور بوسن روڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے رکشے والے کو بوسن روڈ پر کسی مخصوص مقام کا پتا نہیں بتایا تھا۔ رکشا طویل سڑک پر دوڑتا رہا۔ بالآخر مجھے عرفان کلینک کی بڑی سی دو منزلہ عمارت نظر آ ہی گئی۔ کلینک سے تقریباً دو فرلانگ آگے آنے کے بعد میں نے رکشا ٹھہرا لیا۔ کرائے کی ادائیگی کے بعد جب تک رکشا میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا' میں وہیں کھڑا رہا۔ پھر میں خراماں خراماں اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھنے لگا۔ مجھے کوئی جلدی نہ تھی۔ میں کلینک کے پاس پہنچا تو وہاں مجھے خاصی چہل پہل نظر آئی۔ کلینک کے شیشے کے بڑے سے دروازوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے گہری نظروں سے اندر کا جائزہ لیا۔ یہ دیکھ کر مجھے کافی اطمینان ہوا کہ کلینک کا اندرونی نقشہ بہت سادہ ہے۔

سامنے ہی دائیں ہاتھ پر استقبالیہ کاؤنٹر تھا جس پر مجھے ایک کاہل سا نوجوان بیٹھا نظر آیا۔ بائیں ہاتھ پر ڈاکٹروں کے کمرے تھے جو اس وقت بند تھے۔ سامنے ایک راہداری تھی جو وارڈوں کی طرف جا رہی ہوگی۔ مجھے ایک دو افراد کلینک میں آتے جاتے نظر آئے۔ کلینک کے ساتھ ہی ایک بڑا اور ایک چھوٹا میڈیکل اسٹور تھا۔ چھوٹا میڈیکل اسٹور تو اسی وقت میرے سامنے بند ہو رہا تھا البتہ بڑے میڈیکل اسٹور کے متعلق میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ساری رات کھلا رہتا ہوگا۔ قدرے سوچ بچار کے بعد میں پرسکون انداز میں کلینک میں داخل ہو گیا۔ میں نے استقبالیہ کاؤنٹر پر موجود نوجوان سے نگاہیں ملانے کی کوشش نہیں کی' نہ ہی اس نے مجھے ٹوکا۔ وہ کسی کتاب یا رسالے کے مطالعہ میں غرق تھا۔ میں پرسکون قدموں سے چلتا ہوا سامنے والی راہداری میں گھس گیا۔ وہاں پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کلینک تو دراصل اچھا خاصا اسپتال ہے۔ اس راہداری میں مجھے کم از کم دس دروازے نظر آئے۔

مجھے رفاقت علی کے پرائیویٹ کمرے کو ڈھونڈنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ کھلے ہوئے دروازے کے سامنے سے تیزی سے گزرتے ہوئے میں نے ایک نظر کمرے کے اندر ڈالی۔ مجھے سامنے بیڈ پر رفاقت علی سویا ہوا نظر آیا۔ میں بغیر ٹھہرے آگے نکلتا چلا گیا۔ مجھے خطرہ یہ تھا کہ کہیں کوئی نرس وغیرہ مجھے روک کر باز پرس نہ شروع کر دے لیکن مجھے یہ مشکل صورت حال پیش نہ آئی۔ دیگر دروازوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے اندر سے باتیں کرنے کی آواز سنی لیکن میں رکے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا۔ ایک کمرے کی پیشانی پر مجھے 'اسٹاف روم' کی تختی نظر آئی۔ اندر دو نرسیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ وہ اپنی گفتگو میں اتنی مگن تھیں کہ انہیں معلوم ہی نہ ہو سکا کہ ان کے کمرے کے دروازے کے

سامنے سے کوئی گزرا ہے۔ میں راہداری کے آخری حصے میں پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ راہداری دائیں ہاتھ پر مڑ گئی ہے۔ راہداری کے اس حصے میں مجھے بہت کم روشنی نظر آئی لیکن اس کے باوجود میں نے سامنے موجود بڑے سے دروازے پر لکھے ہوئے الفاظ کو بآسانی پڑھ لیا' آپریشن تھیٹر'۔ راہداری کے اس حصے میں مجھے کوئی دروازہ نظر نہیں آیا۔ میں نے آپریشن تھیٹر کے دروازے کو دھکیل کر دیکھا تو وہ حسب توقع مقفل تھا۔ میں نے سوچا کہ اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں بچا ہے کہ میں واپس لوٹ جاؤں لیکن اگر میں اس وقت کلینک سے باہر نکل جاتا تو میرے لیے واپس اندر داخل ہونا دشوار ہو جاتا۔ میں نے مناسب یہی سمجھا کہ وہیں کسی کونے کھدرے میں چھپ کر بیٹھ جاؤں۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد ہی میں نے اپنے لیے چھپنے کی بے حد مناسب جگہ ڈھونڈ نکالی۔

آپریشن تھیٹر کے دروازے کے قریب ہی ایک لمبی سی سیٹھی پڑی ہوئی تھی۔ اس سیٹھی کے قریب ہی مجھے ایک بڑی سی پہیوں والی ٹیبل نظر آئی۔ اگر میں سیٹھی کے پیچھے دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتا تو بالکل نزدیک آئے بغیر میرا دکھائی دینا ناممکن ہو جاتا۔ ویسے بھی رات کے اس حصے میں کسی کو کیا آفت پڑی ہے کہ وہ کلینک کے تاریک کونوں کھدروں کو کھنگالتا پھرے گا۔ سیٹھی کے پیچھے بیٹھنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو بالکل محفوظ محسوس کیا۔ میں نہایت صبر و تحمل کے ساتھ رات کے مزید بھیگنے کا انتظار کرنے لگا۔

زرا سی فراغت ملتے ہی میرا دماغ ایک بار پھر اپنے پیاروں کی یاد میں گم ہو گیا۔ مہراں وہ میری عم زاد ۔وہ صابر وشاکر معصوم لڑکی جو میری موجودگی میں بھی میری توجہ سے محروم رہی۔ اس کے پاس سے روانہ ہونے کے بعد تو میں نے اس کی خبر تک نہ لی۔ جانے اب وہ کس حال میں ہوگی؟ دوسری طرف وہ بدنصیب ہیر ہے جسے قسمت نے بھری جوانی میں ایسا روگ لگا دیا ہے۔ جس کے پنجے سے بہت کم لوگ زندہ بچ پاتے ہیں۔ اسے میری توجہ میری محبت کی ضرورت ہے اور میں یہاں پردیس میں در در کی ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہوں۔ مجھے اس کے متعلق کیسے بھیانک سپنے آتے ہیں۔ کہیں وہ میرے انتظار سے مایوس ہو کر واقعی زندگی کا جوا اپنی گردن سے نہ اتار پھینکے۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا! میں نے اپنے خیالات کی پرواز کو سختی سے روک دیا۔ نہیں اسے کچھ نہیں ہوگا' میری ہیر کو کچھ نہیں ہوگا۔ میں اسے خود ملتان لے کر آؤں گا۔ اس کا ایک آپریشن ہوگا اس کے بعد وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

میں اپنی سوچوں میں ایسا کھویا کہ مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہا۔ میں اس وقت چونکا جب مجھے اپنے وجود پر نیند چھائی محسوس ہوئی۔ میں نے اپنے سر کو زوردار جھٹکا دے کر نیند کو بھگایا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دبے پاؤں چلتا ہوا میں راہداری کے موڑ تک پہنچا اور بڑی احتیاط سے جھانک کر صورت حال کا جائزہ لیا۔ میں نے دیکھا کہ راہداری میں روشن بڑی لائٹیں بجھا دی گئی ہیں' اب وہاں بہت کم روشنی تھی۔ میں اپنے پستول کے دستے پر اپنے دائیں ہاتھ کی گرفت قائم کرتے ہوئے بلی کی چال چلتا ہوا آگے بڑھا۔ مزید آگے آنے کے بعد میں نے دیکھا کہ تمام کمروں میں بہت کم طاقت کے بلب روشن ہیں۔ میں نے اسٹاف روم میں جھانک کر دیکھا تو مجھے دونوں نرسیں گہری نیند میں ڈوبی ہوئی نظر آئیں۔

اسی وقت میری نظر رفاقت علی کے کمرے پر پڑی۔ اس کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھ کر میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ کیا رفاقت علی نے اپنا کمرا اندر سے بند کر لیا ہے؟ اگر واقعی ایسا ہوا تو میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔

میں نے بغور اپنے آس پاس کا جائزہ لیا۔ مجھے وہاں کوئی ذی روح اپنی طرف متوجہ نظر نہ آیا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ بڑی آہستگی سے رفاقت علی کے کمرے کے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ یہ دیکھ کر میرے دل میں مسرت کی لہریں دوڑ گئیں کہ دروازہ بڑی آسانی سے اندر کی جانب کھلتا چلا گیا۔ مجھے سامنے ہی رفاقت علی اپنے بیڈ پر بے سدھ سویا ہوا نظر آیا۔ اس وقت اس کے کمرے میں بھی نائٹ بلب روشن تھا۔

اپنے اردگرد کا ایک بار پھر اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد میں بغیر کوئی آہٹ پیدا کیے کمرے میں داحل ہو گیا۔ دروازے کو اپنے عقب میں بے آواز طریقے سے بند کرنے کے بعد میں نے احتیاطاً اس کی اندرونی چٹخنی بھی چڑھا دی۔ اس دوران میں میری نظریں مسلسل رفاقت علی کے چہرے پر جمی رہیں۔ بالآخر تیری باری بھی آ ہی گئی رفاقت علی تو جعلی ڈاکٹر بنا پھرتا تھا۔ تیرے نزدیک انسانی زندگی کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ تو زندہ انسانوں کو کھلونے سمجھ کر ان پر اپنے مکروہ تجربات کرتا تھا۔ جانے کتنے بے گناہ انسان' کتنے بے بس مریض تیرے زہریلے انجکشنوں کا شکار ہوئے ہونگے۔ تو نے کس کس طرح ان کے تڑپنے کا مزا لیا ہوگا۔ تیری جعلی دواؤں کی فیکٹری کتنے بے شمار مریضوں کی بے وقت موت کا سبب بنی ہوگی۔ بالآخر تیرے جنون کے علاج کا وقت آن ہی پہنچا۔ اب تو کسی کو اپنی شقاوت کا' اپنے جنون کا نشانہ نہیں بنا سکے گا۔

رفاقت علی کے بیڈ کے قریب پہنچ کر میں نے اپنے پستول کے دستے سے اپنی گرفت ختم کر دی۔ اس جیسے غلیظ انسان کو بہادروں جیسی موت دینا انصاف کی توہین ہوتی۔ وہ ایک زہریلا ناگ تھا۔ لہٰذا میں نے سوچ لیا کہ اسے حسب روایت کچل کر ہی ختم کروں گا۔ اس کے سانسوں کے زیر و بم سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس وقت اس کی حالت بالکل ٹھیک ہے اور یہ پرسکون نیند کے مزے لے رہا ہے۔ میں نے اسے جگانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ بہتر ہے موت اچانک کسی بھیانک سپنے کی مانند اس پر مسلط ہو جائے۔ اس طرح کہ یہ چیخ و پکار کر کے اپنے خوف' اپنی دہشت کا بھی اظہار نہ کر پائے۔ اسے ختم کرنے کے لیے مجھے آلہءِ قتل کی تلاش میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ اس کے بیڈ پر پڑے ایک فاضل تکیے نے میری ضرورت بخوبی پوری کر دی۔ میں نے تکیے کو مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر ایک نظر نیند میں کھوئے ہوئے رفاقت علی پر ڈالی۔ اگلے ہی لمحے میں نے بجلی کی سی تیزی سے وہ تکیہ اس کے منہ پر پوری قوت سے جما دیا۔ منہ پر دباؤ پڑتے ہی وہ بری طرح تڑپا۔ اس نے اضطراری طور پر تکیے کو اپنے منہ پر سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن میری آہنی گرفت کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ چلی۔ تکیے کو منہ پر سے ہٹانے میں ناکام ہونے کے بعد اس نے بیڈ پر اپنی ٹانگوں کو مارا لیکن نرم بستر پر کوئی بلند آواز پیدا نہ ہو سکی۔ رفتہ

رفتہ اس کی مزاحمت ماند پڑتی چلی گئی۔اس کے جسم نے چند بار جھرجھری سی لی۔اس کے بعد اس کا جسم ایک جھٹکے سے ساکت ہو گیا۔میں نے محض احتیاطاً مزید کچھ دیر اس کا منہ دبائے رہا لیکن پھر میرے حواس نے مجھے آگاہ کیا کہ اب اس احتیاط کی ضرورت نہیں ہے۔اس کی روح کا پنچھی پہلے ہی اس کے جسم کا قفس چھوڑ کر پرواز کر چکا ہے۔میں نے تکیہ ہٹا کر اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔اس کے چہرے پر تشنج کے آثار تھے' البتہ اس کی آنکھیں بند تھیں۔اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مجھے اپنے دل میں ہلکی سی دکھ کی چبھن محسوس ہوئی لیکن میں نے اس احساس کو مزید پروان نہ چڑھنے دیا۔میں نے جو کچھ کیا بالکل صحیح کیا ہے۔یہ شخص اسی قابل تھا کہ اسے جلد از جلد زندگی کی قید سے آزاد کر دیا جاتا۔اسی میں اس کی اور تمام انسانیت کی بھلائی تھی۔

میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ کر بڑی تیزی سے اپنے آس پاس کا جائزہ لیا۔کہیں ادھر ادھر میری موجودگی کا نشان تو باقی نہیں رہ گیا ہے؟ مجھے وہاں کوئی ایسی علامت نظر نہ آئی۔میں نے آلہء قتل یعنی تکیے کو اچھی طرح تھپتھپا کر اس پر سے اپنی گرفت کے نشانات مٹا دیے اور اسے اس کی سابقہ جگہ پر رکھ دیا۔تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد میں نے رفاقت علی کے سرہانے ٹیبل پر رکھی ہوئی نائٹروگلیسرین ٹیبلٹ کی شیشی کو اٹھایا اور اس کا ڈھکن کھول کر اسے رفاقت علی کے دائیں ہاتھ کے پاس ڈال دیا۔شیشی سے گولیاں نکل کر اس کے بیڈ پر بکھر گئیں۔اب اگر کوئی رفاقت علی کو دیکھتا تو اسے یہی محسوس ہوتا کہ اس پر اچانک دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔اس نے نائیٹروگلیسرین کی گولی اپنی زبان کے نیچے رکھنا چاہی لیکن اس سے پہلے ہی اس کے دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا۔

پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد میں بے آواز چلتا ہوا کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔میں نے بڑی احتیاط سے چٹخنی اتاری اور کمرے سے باہر جھانکا۔مجھے باہر کسی قسم کی نقل و حرکت محسوس نہ ہوئی۔میں خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔میں نے اپنے عقب میں دروازہ بھی بند کر دیا۔راہداری میں کلینک کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے پوری طرح احتیاط رکھی کہ میں کسی کی نظر میں نہ آ جاؤں۔استقبالیہ کاؤنٹر پر موجود شخص مجھے حسب توقع خواب خرگوش میں ڈوبا ہوا نظر آیا۔اس پر نظریں جمائے ہوئے میں بے آواز قدموں سے چلتا ہوا بڑے دروازے کے پاس پہنچا۔

اس شعلہ صفت نوجوان
کی سرگزشت کے بقیہ واقعات
حصہ سوم میں پڑھیے

☆O☆

اس دربدر نوجوان کی سرگزشت جس کی دشمن زمین بھی تھی اور آسمان بھی
آگ بگولا
3
محمد عباس ثاقب

دروازہ کھولتے ہوئے میں نے اپنے خدا سے دعا کی کہ باہر کوئی چوکی دار وغیرہ موجود نہ ہو۔ بصورت دیگر میرے لیے دشواری پیدا ہو جاتی۔ دروازے سے باہر آ کر میں نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ اگر وہاں کوئی چوکی دار تھا بھی تو اس وقت دروازے کے آس پاس کہیں موجود نہیں تھا۔

کلینک سے نکلنے کے بعد میں نے میڈیکل اسٹور کے سامنے سے گزرنا مناسب نہ سمجھا۔ بجائے اس کے میں مخالف سمت میں چل پڑا۔ کچھ دور آنے کے بعد میں نے اپنی رفتار میں اضافہ کر دیا۔ میری کوشش تھی کہ جلد از جلد جائے وقوعہ سے دور نکل جاؤں۔ اصل مشکل یہ تھی کہ رات کے تقریباً تین بجے مجھے کوئی سواری ملنا بہت مشکل تھا۔ میں اگر پیدل بھی سفر جاری رکھتا تو مجھے سمتوں اور راستوں کا علم نہ ہونے کے برابر تھا۔ دوسرا خطرہ پولیس کے گشتی دستوں کا تھا اگر رات کے اس حصے میں میرا ان سے سامنا ہو جاتا تو وہ فوراً مجھے مشکوک گردان کر اپنے زہریلے پنجوں میں جکڑ لیتے۔ اگر میں پستول کے ساتھ ان کے ہتھے چڑھ جاتا تو ان کی عید ہو جاتی۔

میری نظریں مسلسل اپنے لیے کوئی مناسب پناہ گاہ ڈھونڈتی رہیں۔ اس دوران میں میرے قدم تیز رفتاری سے حرکت کرتے رہے۔ خوش قسمتی سے مجھے راستے میں کوئی بھی ذی نفس نہیں ٹکرایا۔ حتیٰ کہ کسی کتے نے بھی میرا راستہ روکنے کی کوشش نہ کی۔ بالآخر مجھے ایک مناسب جگہ نظر آ گئی۔ وہ ایک بڑا سا پارک تھا جس میں بہت گھنے درخت اگے ہوئے تھے۔ ویسے تو وہاں اکا دکا بلب روشن تھے لیکن درختوں کے نیچے مجھے گہری تاریکی نظر آئی اگر میں کسی گھنے درخت کے نیچے دبک کر بیٹھ جاتا تو مجھ پر کسی کی نظر پڑنا ناممکن ہو جاتا۔ میں بے حد محتاط انداز میں اس پارک میں داخل ہوا۔ غائر نظروں سے آس پاس کا جائزہ لینے کے باوجود مجھے پارک میں کوئی ذی روح نظر نہ آیا۔ میں دبے پاؤں ایک بڑے سے درخت کی جانب بڑھا۔ اس درخت کے نیچے پہنچ کر مجھے احساس ہوا کہ یہاں تک نزدیکی بلب کی ہلکی ہلکی روشنی پہنچ رہی ہے۔ میں وہاں سے قدرے فاصلے پر اگے ہوئے بے حد گھنے درخت کی جانب بڑھا۔ اس درخت کے نیچے اس قدر اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ میں اندھوں کی طرح

نہایت احتیاط سے قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ مزید احتیاط کے طور پر میں نے درخت کے تنے کے دوسری جانب والے حصے کو اپنی پناہ گاہ کے طور پر چنا۔

میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ اچانک کوئی ٹھوس چیز میرے پاؤں کے تلے آئی۔ میرا پاؤں لڑکھڑایا۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا اور میں سامنے کی جانب گر پڑا۔ میرا گھٹنا کسی انسانی جسم سے ٹکرایا دفعتاً اندھیرے میں کسی کی چیخ ابھری۔ میں نے خود کو اس شخص کے جسم سے ہٹانے کی کوشش کی۔ اسی اثناء میں وہ شخص اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے منہ سے میرے لیے غلیظ گالیوں کا طوفان جاری ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے حواس پر قابو پاتا۔ میرے کانوں میں ایک اور بھاری بھرکم مردانہ آواز گونجی۔

'اوئے طفیل کیا ہوا تجھے؟ کسے گالیاں دے رہا ہے تو؟' اوئے تو ٹارچ تو لا یار۔ پتا نہیں کون حرام کی نسل ہے۔ اس اندھے کے بچے نے تو مجھے کچل کر رکھ دیا ہے' ان دونوں کے لہجے میں پھنکارتی رعونت نے میرے دماغ کے کسی دور دراز گوشے میں خطرے کی گھنٹی بجادی لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کر پاتا' بھاری آواز والے نے ٹارچ روشن کر دی۔ ٹارچ کی تیز روشنی میرے چہرے پر پڑی تو میری آنکھیں بری طرح چندھیا کر رہ گئیں۔

'کون ہے بے تو؟ کیا کر رہا ہے اس وقت یہاں؟' میں نے کوئی جواب دینا چاہا لیکن اسی وقت میں نے ان کے جسموں پر موجود وردیوں کو دیکھ لیا۔ پولیس! مجھے سخت اعصابی شاک لگا اور میں چند لمحوں کے لیے ساکت وصامت ہو کر رہ گیا۔

اس اثنا میں طفیل نے چادر پر پڑی ہوئی چائینز رائفل اٹھا کر مجھ پر تان لی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ میرا پاؤں اسی رائفل پر پڑا ہے۔ 'بولتا کیوں نہیں کون ہے تو؟ جواب دے؟'

'وہ جی آپ میری آنکھوں پر سے ٹارچ تو ہٹائیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دیتا ہوں۔' میں نے مری مری آواز میں کہا۔ ٹارچ کا رخ تھوڑا سا تبدیل ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس جگہ پر دو چادریں بچھی ہوئی ہیں جن کے سرہانے دو چھوٹے تکیے بھی موجود ہیں۔ وہ دونوں کانسٹیبل رات کے گشت پر نکلے ہوں گے۔ کچھ دیر ادھر ادھر پھرنے کے بعد انہوں نے یہاں بستر لگایا اور لمبی تان کر سو گئے۔ یہ میری خار خار قسمت ہے جو مجھے گھیر کر ان فرض شناس محافظین قانون کے پاس لے آئی ہے۔ مجھ جیسے منہ میں آئے شکار کو تو یہ کسی قیمت پر نہیں بخشیں گے۔

'وہ جی دراصل میں ـــ دراصل میں ایک پردیسی ہوں جی۔' میں نے اپنے لہجے کو حتی الوسع خوشامدانہ بناتے ہوئے کہا۔' رات گزارنے کے لیے یہاں آ گیا تھا۔'

'اوئے بکواس کرتا ہے! ہمیں چکر دیتا ہے۔ رات کے تین بجے تو سونے کی جگہ تلاش کرتا پھر رہا ہے۔' رائفل والے کانسٹیبل طفیل نے پولیس والوں کے مخصوص لہجے میں مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

'اوئے بشیر تو اس کی تلاشی لے۔ مجھے تو یہ کوئی چور ڈاکو لگتا ہے۔'

'تو ٹھیک کہتا ہے یار۔ یہ مجھے بھی مشکوک لگتا ہے۔ تو یہ ٹارچ پکڑ میں اس کا جھاڑ لیتا ہوں۔' بشیر

نے ٹارچ طفیل کو تھما دی۔

طفیل نے رائفل کو اپنے دائیں ہاتھ میں تھام کر بائیں ہاتھ سے ٹارچ پکڑ لی۔ اس کی اس حماقت نے مجھے وہ موقع فراہم کر دیا جسے میں خاصی دیر سے تلاش کر رہا تھا۔ میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ طفیل نے رائفل کو کاک نہیں کیا ہے۔ جب تک وہ رائفل کو کاک کر کے گولی کو گھوڑے کے سامنے نہ لاتا' وہ فائر نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے الٹے قدموں' طفیل کی طرف ہٹتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں بشیر فریاد کی۔

'میں تو بہت شریف آدمی ہوں جی۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا ہے۔' مجھے پسپا ہوتے دیکھ کر بشیر کچھ اور شیر ہو گیا۔ وہ مجھے موٹی موٹی گالیاں بکتا میری طرف جھپٹا۔ میں دو تین قدم مزید پیچھے ہٹا۔ میرے عقب میں موجود طفیل نے غضب ناک ہو کر رائفل کی نال میری پشت میں گاڑ دی۔

'اپنی جگہ پر کھڑا رہ کتے کے بچے ورنہ میں تجھے چھلنی کر دوں گا۔'

میں نے سہمے ہوئے انداز میں اپنے ہاتھ سر سے اوپر اٹھا لیے۔ اپنے پیچھے سے آتی ہوئی ٹارچ کی روشنی میں مجھے بشیر کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ نظر آئی۔

'ابے ڈرتا کیوں ہے؟ ہم تجھے کھا تو نہیں جائیں گے۔' اس نے غلیظ لہجے میں کہا۔

مجھے اس کی صورت سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ اس نے میری جیبوں کو تھپتھپانا چاہا۔ عین اسی لمحے میرا ہاتھ بجلی کے کوندے کے مانند حرکت میں آیا۔ میرے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کے سرے کی ضرب اس کی گردن پر پڑی۔ اس کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑا اور پھرکی کے مانند تیزی سے پیچھے کی جانب گھوم گیا۔ اس سے پہلے کہ طفیل صورت حال کو پوری طرح سمجھ کر کوئی قدم اٹھاتا' میں نے اس کی رائفل کی نال کو پکڑ کر تیزی سے اپنی طرف کھینچا۔ وہ اپنے اکیلے ہاتھ سے رائفل کو اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے ٹارچ زمین پر گرا کر دوسرے ہاتھ سے بھی رائفل کو تھامنا چاہا لیکن اس اثنا میں رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میرے قبضے میں آ گئی۔ میں نے رائفل کی نال کو مضبوطی سے تھام کر بلا توقف اس کے سر پر دے مارا۔ رائفل کا بٹ کھٹاک سے اس کی کھوپڑی سے ٹکرایا۔ اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ اپنا سر پکڑ کر جھومتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر اس کی کھوپڑی نہیں بھی چٹخی تو اس کے اندر کا نظام ضرور تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر میں دوسرے کانسٹیبل کی طرف متوجہ ہوا۔ زمین پر گری ہوئی ٹارچ کی روشنی میں وہ مجھے زمین سے اٹھتا ہوا نظر آیا۔ میں نے رائفل کو فضا میں تول کر اس کی کھوپڑی پر ایک نپی تلی ضرب لگائی۔ میرا نشانہ بالکل ٹھیک رہا۔ اس کی کنپٹی پر پٹاخا سا پھوٹا۔ اگلے ہی لمحے وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک بار پھر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کئی گھنٹے کے لیے ہوش وحواس سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ میں نے پھرتی سے دوسرے کانسٹیبل کا جائزہ لیا۔ وہ بالکل بے حس وحرکت تھا اور اس کی کھوپڑی سے خون بہہ رہا تھا۔ پتا نہیں وہ زندہ تھا یا مر چکا تھا ـــ؟

میں نے وقت ضائع کیے بغیر ٹارچ کا بٹن بند کیا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر تیزی سے اس پارک سے باہر نکل آیا۔ میں اس وقت مصیبت کے پنجوں میں گرفتار ہونے سے بال بال بچا تھا۔ اگر وہ

دونوں پولیسیے میرے قبضے سے پستول برآمد کر کے مجھے گرفتار کر لیتے تو شاید مجھے تمام زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنی پڑتی بلکہ عین ممکن ہے کہ پھانسی کا پھندا ہی میرا مقدر بن جاتا۔ اس خطرے سے بچ نکلنے کے بعد میں مذید محتاط ہوگیا۔ میں نے کھلی سڑک چھوڑ کر تنگ و تاریک گلیوں میں چلنا شروع کر دیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد مجھے نئے اندیشوں نے گھیرنا شروع کر دیا اگر ان تپلی تپلی گلیوں میں میرا کسی شب بیدار قسم کے شخص سے آمنا سامنا ہو جاتا تو وہ بلا توقف مجھے چور قرار دے دیتا۔ اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے وہ چیخ پکار بھی شروع کر دیتا تو مجھے لینے کے دینے پڑ جاتے۔ اس کے علاوہ اگر ان تاریک اجنبی گلیوں میں میرا پاؤں کسی سوئے ہوئے کتے پر جا پڑتا تو وہ بھونک بھونک کر سارے شہر کو سر پر اٹھا لیتا۔ اس صورت میں بھی نتیجہ وہی نکلتا یعنی تمام محلے والے متفقہ طور پر مجھے چور قرار دے دیتے۔ یہ سب سوچتے ہی میرے قدموں کی رفتار خود بخود سست پڑنے لگی۔ خوش قسمتی سے مجھے مزید کسی مصیبت میں گرفتار ہونے سے پہلے ہیں ایک محفوظ ٹھکانا مل گیا۔ وہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی جس کے دروازے میں باہر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ میں کنڈی کھول کر مسجد کے اندر داخل ہوگیا۔ مسجد کے اندر گہری تاریکی تھی۔ میں سنبھل کر قدم رکھتا ہوا برآمدے میں پہنچا اہو چٹائی کی صف پر بیٹھ گیا۔ خدا کے گھر میں پہنچ کر میں نے اپنے دل کو بے حد پرسکون محسوس کیا۔ جیسے مجھے ہر مصیبت سے امان مل گئی ہو۔ مسجد کے اندر والے کمرے پر تالا لگا ہوگا لیکن اندھیرے کے باعث مجھے معلوم نہ ہوسکا۔ آس پاس ہی کہیں بجلی کے سوئچ بورڈ کی موجودگی بھی یقینی تھی لیکن میں نے روشنی کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ میں نے اپنی پشت دیوار سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میری بند آنکھوں کے سامنے رفاقت علی کا مسخ شدہ چہرہ ابھرا لیکن میں نے سر جھٹک کر اسے اپنے تصور سے نکال باہر کیا۔ میں فقیر بابا کے بارے میں سوچنے لگا رفاقت علی کی موت کی اطلاع ملنے کے بعد وہ لوگ فقیر بابا کو رہا کر دیں گے؟ ہاں کیوں نہیں! وہ بوڑھا انسان ان کے مزید کس کام آسکتا ہے؟ وہ اسے اپنی قید میں رکھ کر کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ یہی کچھ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

میں شاید گھنٹا بھر سویا ہونگا کہ ایک بار میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے مسجد کے دروازے پر کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ میں چوکنا ہوگیا۔ مسجد کا دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر داخل ہوا۔ میں نے اس کے قدموں کی آہٹ کے ساتھ لاٹھی کی کھٹ کھٹ کی آواز سنی تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ شخص آنکھوں کی نعمت سے محروم ہے۔ مسجد کے صحن کو نصف عبور کرنے کے بعد اس شخص کا رخ دائیں جانب ہوگیا۔ چند لمحوں کے بعد میں نے پانی گرنے کی آواز سنی۔ وہ نابینا شخص وضو کر رہا تھا۔ وضو کے بعد وہ سیدھا مسجد کے برآمدے میں آیا۔ اپنی جیب سے چابی نکال کر اس نے دروازے کا قفل کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے روشنی کا بٹن دبا کر روشنی کر دی۔ تب میں اٹھا اور وضو کی جگہ کی طرف بڑھا۔ جونہی میں نے وضو شروع کیا۔ فضا میں اذان سحر کے مقدس الفاظ گونجنے لگے۔ وضو کے بعد میں مسجد کے اندرونی حصے میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ نابینا ضعیف شخص تسبیح خوانی میں مصروف ہے۔ جانے اس نے میری موجودگی محسوس کی یا نہیں بحر حال اس نے مجھ سے مخاطب ہونے کی کوشش نہ کی۔ کچھ ہی دیر

بعد مسجد میں نمازیوں کی آمد شروع ہوگئی۔ ان میں نے کسی نے خصوصی طور پر مجھ پر توجہ نہ دی۔ اسی نابینا شخص کی امامت میں نماز ہوئی۔ دعا ختم ہوتے ہی میں سب سے پہلے مسجد سے نکل آیا۔

اس وقت تک گلی کوچوں میں زندگی کی ہلچل بیدار ہونا شروع ہوگئی تھی۔ میں پرسکون انداز میں ٹہلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں نے خود کو ایک بڑی سی سڑک پر پایا۔ اس وقت تک ہر طرف صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ جلد ہی مجھے ایک رکشا مل گیا جس نے مجھے حسین آگاہی پہنچا دیا۔

گھر کا دروازہ چھیمو بی نے کھولا۔ مجھے دیکھ کر اس نے حسب معمول بے حد خوشی کا اظہار کیا۔ نور جہاں بیگم اور دونوں لڑکیاں ابھی تک سو رہی تھیں۔ چھیمو بی نے مجھے ناشتے کے لیے روکنا چاہا لیکن میں نے کہا کہ میں ناشتا کر کے آیا ہوں۔ اس کے بعد میں اپنے کمرے میں آگیا۔ پلنگ پر لیٹتے ہی نیند نے مجھ پر غلبہ پالیا۔

دوپہر کے وقت مجھے چھیمو بی نے جگایا۔ وہ میرے لیے کھانا لے کر آئی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد میں نیچے آگیا۔ نور جہاں بیگم اور دونوں لڑکیاں بے چینی سے سردار خضر خان کی منتظر تھیں۔ میں نے اُنہیں بتایا کہ سردار خضر خان شام کے وقت آئے گا اور میں نے کل رات اس سے ہوٹل میں ملاقات کی ہے۔ یہ سن کر نور جہاں بیگم نے گہرے اطمینان کا اظہار کیا۔ میں نے چھیمو بی سے کہا کہ وہ کسی سے کہہ کر آج کا اخبار منگا دے۔ کچھ دیر بعد اخبار آگیا۔

میں اخبار لے کر اوپری منزل پر اپنے مخصوص کمرے میں آگیا۔ اخبار میں رفاقت علی کی موت کی خبر تو خیر ہو ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ میں رات کے پچھلے پہر اس کا قصہ تمام کیا تھا۔ البتہ مجھے حسب توقع ملک کریم کے اغوا کی خبر نظر آگئی۔ اخبار نے اس کے اغوا کو خاصی اہمیت دی تھی۔ اور اس کے پراسرار اغوا پر کافی حاشیہ آرائی کی تھی۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے یہ پڑھ کر ہوئی کہ اخبار نے ملک کریم کے علاوہ مجھے اور ندا اور اس کے ماما کو بھی اغوا شدگان ظاہر کیا تھا۔

اخبار کے مطابق ہوٹل والوں نے مجھے بھی ندا اور اس کے ماما کے مانند لاہور کا باسی بتایا تھا۔ سب سے زیادہ ہنسی یہ پڑھ کر آئی کہ اخبار نے مجھے ملک کریم کی مجوزہ فلم کا ہیرو بنا دیا تھا۔ اس خبر کے ساتھ ملک کریم کے چھوٹے بھائی ملک رحیم کا بیان بھی شائع ہوا تھا۔ اس نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ اس کے بھائی کو مخالف سیاسی پارٹی نے اغوا کرایا ہے خبر کے ساتھ کئی اور احتجاجی اور وضاحتی بیان بھی موجود تھے۔ پولیس نے دعوی کیا تھا کہ ملک کریم اور اس کے ساتھیوں کو جلد ہی بازیاب کرالیا جائے گا۔ اچانک میری نظر ایک اور بیان پر جم کر رہ گئی۔ یہ بیان صوبائی اسمبلی کے رکن سردار شاہ مراد کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔ اپنے بیان میں اس نے ملک کریم کے اغوا پر پرزور احتجاج کیا تھا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ ملک کریم ہماری پارٹی کا قیمتی سرمایہ ہے۔ اس کے اغوا میں یقیناً حکمران پارٹی کا ہاتھ ہے جو انتقامی ہتھکنڈوں پر اتر آئی ہے۔ اس واقعے سے چند دن پہلے بھی ملک کریم کو گرفتار کر لیا گیا تھا لیکن اس کے خلاف کوئی ثبوت نہ ملنے کے باعث حکومت کو اسے رہا کرنا پڑا لیکن چند دن بعد اسے پھر غائب کر دیا گیا۔ سردار شاہ مراد نے خدشہ ظاہر کیا کہ ملک کریم کی زندگی کو خطرہ بھی لاحق ہوسکتا ہے۔

اتنے عرصے بعد اچانک شاہ مراد کے نام کو سامنے پا کر مجھے ہلکا سا ذہنی جھٹکا لگا۔ میں تو تقریباً اسے فراموش کر چکا تھا۔ مجھے یاد ہی نہ رہا کہ میں نے کتنے خون خوار درندے کو زخمی کر کے چھوڑ دیا ہے اگر میں شاہ مراد کی گرفت میں آ جاتا تو وہ میری دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتا۔ یہ بیان اگرچہ لاہور سے جاری کیا تھا۔ تاہم اگر اسے شک ہو جاتا کہ میں ملتان میں موجود ہوں تو وہ اس پورے شہر کو کھنگال ڈالتا۔ اس خبر سے میں نے اندازہ لگایا کہ سردار شاہ مراد کو اپنی پارٹی میں بے حد اہم پوزیشن حاصل ہے اور اس کے ملک کریم سے بھی بہت قریبی تعلقات ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے ملک کریم کی بازیابی کے بعد بھی اس سے دور رہنا چاہیے۔ ورنہ میرا کسی بھی وقت سردار شاہ مراد سے سامنا ہو سکتا ہے۔

ان خبروں کو پڑھنے کے بعد میرا ذہن ملک کریم کے متعلق سوچ بچار میں گم ہو گیا۔ ملک کریم نے مجھ سے بہت مربیانہ سلوک کیا تھا۔ اس نے مجھے اپنا دست راست بنا لیا تھا۔ کیا مجھے اس کی مہربانیوں کو بالکل فراموش کر دینا چاہیئے؟ لیکن میں اس سلسلے میں کر بھی کیا سکتا ہوں؟ اس کو اغوا کرنے والوں کی بات تو الگ رہی' مجھے تو اس کے بھائی ملک رحیم کے گھر کا پتا بھی معلوم نہیں ہے پھر مجھے خیال آیا کہ میں اگر کوشش کروں تو اخبار والوں کے ذریعے کم از کم ملک رحیم کا پتا تو معلوم کر ہی سکتا ہوں۔

رفتہ رفتہ یہ خیال میرے ذہن میں جڑ پکڑتا چلا گیا کہ مجھے ملک رحیم سے ملنا چاہیے۔ جانے وہ مجھ سے مل کر کس قسم کا ردعمل ظاہر کرے؟ شاید وہ تو مجھے ابھی تک ملک کریم کا دشمن سمجھ رہا ہوگا۔ اگر وہ سکون سے میری بات سننے پر راضی ہو جائے تو میں با آسانی یقین دلا دوں گا کہ میں ملک کریم کا دشمن نہیں دوست ہوں۔ اس کے ساتھ مل کر شاید میں ملک کریم کے لیے کچھ کر سکوں یہ سب سوچ کر میں نے اخبار اٹھایا اور گھر سے باہر نکل آیا۔

بازار میں واقع ایک پبلک کال آفس سے میں نے اخبار کے دفتر فون کیا۔ کافی حیل وحجت کے بعد اخبار والوں سے مجھے ملک رحیم کے گھر کا صرف فون نمبر مل سکا۔ میں نے ملک رحیم کے گھر فون کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ فی الحال گھر پر موجود نہیں ہے اور شام تک اس کے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ مایوس ہو کر میں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ تب مجھے خیال آیا کہ میں ملک رحیم کے گھر فون کر کے کم از کم اس کے گھر کا پتہ تو معلوم کر سکتا ہوں۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ کام تو شام کو بھی ہو سکتا ہے تب مجھے رفاقت علی کے متعلق یاد آیا۔ میں نے رفاقت علی کے گھر کا فون نمبر نکالا اور پھر اس کے گھر فون کیا۔

' تیسری گھنٹی پر کسی نے ریسیور اٹھا لیا۔

'ہیلو۔۔۔' دوسری طرف سے کسی کی مردانہ آواز سنائی دی۔

'ہیلو۔۔۔' کون صاحب بات کر رہے ہیں؟ میں نے سوال کیا۔

'جی میرا نام رشید ہے۔ میں گھر کا ملازم ہوں۔'

دیکھو بھئی رشید میں بیگم صاحبہ سے بات کرنا چاہتا ہوں دراصل مجھے خان صاحب کی صحت کے متعلق پتا کرنا ہے۔'

'ارے صاحب جی کیا آپ کو پتا نہیں ہے؟ خان صاحب کا تو آج انتقال ہو گیا۔'

'اوہ نہیں۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہیں بھئی رشید؟' میں نے اپنے لہجے میں گہرے افسوس اور تشویش کا عنصر شامل کرتے ہوئے پوچھا۔

'کیا ہوا تھا انہیں؟ اچانک کیسے فوت ہو گئے؟ وہ اتنے زیادہ بیمار تو نہیں لگتے تھے۔'

'بس صاحب جی! یہ سب قدرت کے کھیل ہیں۔ خان صاحب کل شام کو بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔ کھانا بھی انہوں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ رات کو کسی وقت انہیں دل کا شدید دورہ پڑا کسی کو پتہ بھی نہ چلا اور وہ چپ چاپ اللہ کہ پیارے ہو گئے۔' خان رفاقت علی کے وفادار ملازم نے نہایت مہذب لیکن پر تاسف لہجے میں اپنے مالک کی ''اچانک'' وفات کے متعلق مجھے بتایا۔

'اوہو۔۔۔ یہ تو بہت افسوس کی بات ہے۔ تمھاری بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟ میں ان سے تعزیت کرنا چاہتا ہوں۔'

بیگم صاحبہ تو جی اسپتال گئی ہیں خان صاحب کی میت کو گھر لانا ہے۔ اس کے بعد آخری رسومات کی تیاری کرنی ہے۔'

ٹھیک ہے بھائی رشید۔ میں خود شام کو گھر آ کر ان سے تعزیت کر لوں گا اچھا خدا حافظ۔' میں نے فون کا ریسیور رکھتے ہوئے اطمینان کی گہری سانس لی۔ سب کچھ میری توقع کے عین مطابق ہوا۔ خان رفاقت علی اچانک دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا علیہ راجعون۔ مجھے اپنے ذہن سے بہت بڑا بوجھ اترتا محسوس ہوا۔ کل صبح یہ خبر اخبار میں شائع ہوگی اس کے بعد فقیر بابا آزاد ہو جائے گا۔

میں گھر واپس آیا تو میں نے عنبرین کو پھپھو بی کے ہمراہ باورچی خانے میں مصروف پایا۔ وہ دونوں رات کے لیے نہایت پرتکلف کھانا تیار کر رہی تھیں۔ اس لمحے مجھے عنبرین کے چہرے پر ایسی معصومیت اور پاکیزگی نظر آئی جیسے وہ کبھی بھی کسی آلودہ نظر کے سامنے نہ آئی ہو۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ مجھے نور جہاں بیگم اور پروین بھی پہلے سے بالکل مختلف رنگ ڈھنگ کے ساتھ نظر آ رہی تھیں جیسے وہ بھی اپنی سابقہ زندگی سے تائب ہو چکی ہوں۔ کچھ ہی دیر بعد میرے اس خیال کی تائید ہو گئی۔ نور جہاں بیگم نے مجھے اپنے پاس بٹھا کر پروین کو عنبرین کے پاس بھیج دیا پھر وہ گہری سانس لے کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

'میں نے فیصلہ کر لیا ہے بیٹا ذوالفقار علی شاہ۔۔۔'

'کیسا فیصلہ نور جہاں بیگم؟' میں نے حیرانی سے پوچھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ عنبرین کی شادی کے بعد اپنے ڈیرے کو فروخت کر دوں گی۔'

'اس کی کیا ضرورت ہے نور جہاں بیگم' سردار خضر خان سے جو رقم ملے گی وہ تم لوگوں کے گزارے کے لیے بہت کافی ہوگی۔'

'نہیں بیٹا مجھے عنبرین کے عوض کچھ نہیں چاہیئے۔ عنبرین میری سگی بیٹی کی طرح ہے۔ بیٹی سے کچھ لیا نہیں جاتا بلکہ دیا جاتا ہے۔ عنبرین کی شادی کے بعد میں کہیں نہ کہیں پروین کی شادی بھی کر دوں گی۔ اس کے بعد میں اس غلیظ دھندے پر لعنت بھیج دوں گی۔'

'یہ تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے نور جہاں بیگم۔ انسان کو جب بھی توفیق ہو اسے اپنے گناہوں سے

توبہ کرلینی چاہئیے۔ اللہ بڑا رحیم وکریم ہے وہ اپنے عاجز بندے کے ندامت کے آنسو ضرور قبول کرلیتا ہے۔'

'کک کیا یہ ممکن ہے بیٹا؟' کیا میری توبہ قبول ہوسکتی ہے؟' نور جہاں بیگم نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

'ہاں ہاں نور جہاں بیگم میں نے کہا ہے نا کہ وہ غفور الرحیم ہے۔ اس کے رحمت کی ایک بوند بڑے سے بڑے گناہ کو دھوسکتی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ انسان صدق دل سے اپنے گناہوں کی توبہ کرے اور اس کی مغفرت کا طالب ہو۔' میری بات سن کر نور جہاں بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

'تم نے مجھے ایک بار پھر جینے کا حوصلہ دیا ہے ذوالفقار بیٹا۔ تو نے مجھے مایوسی کے اندھیروں سے نکالا ہے۔ خدا تجھے اس کی جزا دے گا۔'

شام کے وقت سردار خضر خان آ گیا۔ تمام گھر والوں نے نہایت والہانہ انداز میں اس کا استقبال کیا۔ خضر خان کا رویہ مجھ سے اتنا محبت بھرا تھا کہ مجھے شرمندگی سی محسوس ہونے لگی۔ نور جہاں بیگم نے سلامت علی کو بھی بلالیا۔ چھیمو بی نے لذیذ پکوانوں سے سب کی تواضع کی۔ کھانے کے بعد بزرگوں کی محفل جمی جس میں خضر خان' سلامت علی' نور جہاں بیگم اور چھیمو بی کے علاوہ میں بھی شریک ہوا۔ تھوڑی بہت بحث تمحیص کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ اگلے دن دوپہر کے وقت نہایت سادگی سے سردار خضر خان اور عنبرین کا نکاح پڑھا دیا جائے اور شام کو عنبرین کی رخصتی کردی جائے۔ سردار خضر خان نے رقم کی بات کرنا چاہی لیکن نور جہاں بیگم نے صاف کہہ دیا کہ مجھے کوئی روپیا پیسا نہیں چاہئیے۔ سردار خضر خان نے حیرانی سے میری طرف دیکھا تو میں نے مختصر الفاظ میں تبدیل شدہ حالات کے متعلق بتایا۔ یہ سب کچھ سن کر وہ بہت خوش ہوا۔ مجھے وہ محفل طول کھینچتی محسوس ہوئی تو میں معذرت کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

'دراصل مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ ہوسکتا ہے مجھے واپسی میں دیر ہو جائے' لہٰذا آپ لوگ میرا انتظار مت کریں۔'

'وہ تو صحیح ہے میرے بھائی لیکن کل دوپہر تمھیں ہر صورت میں یہاں ہونا چاہئیے ورنہ تمھارا بھائی نکاح نہیں پڑھوائے گا۔' سردار خضر خان نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

'آپ کو میری قسم ہے بھائی صاحب نکاح سنت رسول ہے۔ اسے ملتوی نہیں ہونا چاہئیے۔ میں آؤں یا نہ آؤں آپ اس نیک کام کو موخر نہ کیجئے گا۔'

'اس کا مطلب ہے تم واقعی نہیں آؤ گے؟' سردار خضر خان نے مصنوعی غصے کے ساتھ پوچھا۔

'نہیں بھائی صاحب میں ضرور آؤں گا۔ میں تو صرف یہ کہہ۔۔۔۔'

'اچھا اچھا اب زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں۔ کل دوپہر کو تمھیں یہاں موجود ہونا چاہئیے۔' سردار خضر خان نے پیار بھرے لہجے میں مجھے تنبیہ کی۔ میں نے ایک بار پھر وعدہ کیا اور گھر سے نکل آیا۔

پبلک کال آفس پر پہنچ کر میں نے ملک رحیم کے گھر کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب سے کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے پہچان لیا۔ وہ ملک کریم کا چھوٹا بھائی ملک رحیم ہی تھا۔

'ہیلو آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟' میں نے محسوس کیا کہ ملک رحیم کے لہجے میں قدرے ہیجان کا عنصر شامل ہے۔ میں نے اپنے لہجے کو پرسکون رکھتے ہوئے کہا۔ 'مجھے تم سے بے حد اہم بات کرنا ہے ملک رحیم۔۔۔'

'کون سی اہم بات؟ اور آپ ہیں کون؟'

'میرا نام ذوالفقار علی خان ہے۔۔' میں نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

'کون ذوالفقار علی خان؟'

'تمھارا بھائی ملک کریم مجھے اچھی طرح جانتا تھا تم بھی مجھ سے مل چکے ہو۔'

'میں آپ سے مل چکا ہوں؟ لیکن کب؟ کہاں؟

'یہ ایک طویل داستان ہے جو تم سے ملاقات پر ہی بتائی جا سکتی ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم سے ملاقات ہو سکتی ہے؟'

'کب؟ اور آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟' میں نے اس کے لہجے میں الجھن کی جھلک محسوس کی۔

'میں ابھی اور اسی وقت تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ یہ ملاقات بہت اہم ہے۔ فی الحال میں اتنا بتا دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اس ملاقات کا تعلق تمھارے بھائی ملک کریم کے اغوا سے ہے۔۔'

'کیا کیا۔۔۔تم۔۔۔۔ٹھیک ہے میں آپ سے ابھی ملنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ میرے گھر آ جائیں۔۔۔'

'ٹھیک ہے تم مجھے اپنے گھر کا پتا بتا دو' میں نے کہا۔ اس نے مجھے اپنے گھر کا مکمل پتا لکھوا دیا۔ فون بند کر کے میں ایک ٹیکسی میں بیٹھا اور ملک رحیم کے گھر روانہ ہوگیا۔ گل فشاں ٹاؤن کا علاقہ بھی دیگر امرا کے علاقوں کے مانند شہر کے بالکل دوسرے سرے پر ثابت ہوا۔ ملک رحیم کا بنگلہ تلاش کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ میں نے چوکیدار کو اپنا نام بتایا تو اس نے مجھے سیدھا ڈرائینگ روم میں پہنچا دیا۔ ملک رحیم شاید بے چینی سے میرا منتظر تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ڈرائینگ روم میں داخل ہوا۔ میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی چھوٹی چھوٹی چمک دار آنکھیں حیرانی کی زیادتی سے پھٹنے کے قریب ہوگئیں۔

'تت۔۔۔۔تم؟' اس نے ہکلاتے ہوئے میری طرف اپنی شہادت کی انگلی اٹھائی۔ اس کی بدحواسی دیکھ کر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

'ارے بھائی تم اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ میں بھی تمھاری ہی طرح کا انسان ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ تم مجھے فوراً پہچان لوگے۔'

'لیکن تمھیں تو بھائی صاحب نے وہاں گودام میں۔۔۔۔' ملک رحیم نے مضطرب لہجے میں کہنا شروع کیا۔ میں نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

'ہاں میں وہاں موجود تھا لیکن پھر میں نے تمھارے بھئی ملک کریم کو یقین دلایا کہ میں اس کا دشمن

نہیں ہوں۔ لہٰذا اس نے مجھے آزاد کر دیا۔ پھر ہم دونوں میں دوستانہ تعلقات استوار ہو گئے۔'

'لیکن میں یہ سب کچھ کیسے تسلیم کر لوں؟' ملک رحیم نے کشمکش میں مبتلا ہوتے ہوئے کہا۔

'دیکھو اگر میں ملک کریم کا دشمن ہوتا تو مجھے تمھارے پاس آنے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ ملک کریم مجھ پر بہت مہربان تھا۔ اس کی مہربانیوں کے سلسلے میں تمھاری ہر ممکن مدد کروں گا۔'

'چلو مان لیا کہ واقعی بھائی صاحب کے اور تمھارے تعلقات خوش گوار ہو گئے تھے لیکن تم ان کی بازیابی کے سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہو؟' ملک رحیم نے مصالحانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے سوال کیا۔

'اس سلسلے میں مجھ سے زیادہ کوئی تمھاری مدد نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اسے کس نے اور کیسے اغوا کیا ہے؟'

'تم۔۔۔تم یہ سب جانتے ہو؟' ملک رحیم کی آنکھیں فرط حیرت سے اپنے حلقوں سے باہر آنے لگیں۔ تم جانتے ہو کہ بھائی صاحب کو کس نے اغوا کیا ہے؟' مجھے اس کے لہجے میں شک اور حیرانی کی ملی جلی کیفیت محسوس ہوئی۔ میں نے اس کی ذہنی کیفیت کو نظر انداز کر کے اپنی بات آگے بڑھائی۔

'ہاں میں پورے واقعے کا عینی شاہد ہوں۔ اس رات میں ملک کریم کے ساتھ ہی ٹھہرا ہوا تھا۔ ملک کریم کو میری نظروں کے سامنے اغوا کیا گیا۔ میں نے ان خانہ خرابوں کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا۔'

'مجھے۔۔۔مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ یہ سب کیسے ہوا؟' ملک رحیم کا اضطراب اپنی آخری حدوں کو چھونے لگا۔ 'مجھے بتاؤ کہ بھائی صاحب کو کس نے اغوا کیا؟'

'جیسا کہ میں نے تمھیں بتایا' میرا نام ذوالفقار علی خان ہے۔ مجھے تمھارے بھائی نے بے حد اصرار کر کے اپنے ساتھ ہوٹل میں ٹھہرایا ہوا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ مجھے اپنی فلم میں ہیرو کا کردار دے گا۔'

'اوہ تو وہ تم ہو! لیکن تمھیں تو بھائی صاحب کے ساتھ اغوا کر لیا گیا تھا؟' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

'نہیں اغوا کرنے والے صرف ملک کریم کو اغوا کرنے آئے تھے اور انھوں نے اسے اغوا کر لیا۔ جانتے ہو تمھارے بھائی کو کس نے اغوا کیا ہے؟'

'نہیں۔۔۔میں نہیں جانتا۔'

'ملک کریم کو اس کی مجوزہ فلم کی ہیروئن ندا اور اس کے خبیث ماما نے اغوا کیا ہے۔' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

'اوہ۔۔۔لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'

'ہو نہیں سکتا بلکہ ایسا ہی ہوا ہے۔ یہ کوئی بہت گہری سازش ہے میرا اندازہ ہے کہ تمھارے بھائی کو اس کے غیر ملکی مہمانوں کے چکر میں اغوا کیا گیا ہے۔'

'اوہ! تو تمھیں سب کچھ معلوم ہے؟' ملک رحیم نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

'ہاں! میں نے تمھیں بتایا ہے نا کہ ملک کریم مجھ پر پورا اعتماد کرتا ہے۔ مجھ سے اس نے اس معاملے کے متعلق کوئی بات نہیں چھپائی۔'

'کیا تمھیں معلوم ہے کہ بھائی صاحب نے ان مہمانوں کو کہاں چھپا رکھا ہے؟'

'ہاں کسی حد تک! میں ملک کریم کے ساتھ ایک بار اس کی گاؤں والی حویلی میں بھی جا چکا ہوں اگر تم کہو تو میں تمھیں تمھاری گاؤں والی حویلی اور اس کے کارندوں کے متعلق سب کچھ بتا سکتا ہوں۔'

'اس کا مطلب ہے تم واقعی سچ بول رہے ہو۔' ملک رحیم نے دھیمے لہجے میں کہا۔

'ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تمھارے بھائی کی جیپ کا ڈرائیور اور باڈی گارڈ بھی میری تصدیق کرے گا۔'

'چلو میں نے تسلیم کر لیا کہ تم نے سب کچھ سچ کہا ہے لیکن اب یہ تو بتاؤ کہ بھائی صاحب کو کیسے اغوا کیا گیا؟'

میں نے ملک رحیم کو پوری تفصیل سے اس رات پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کر دیا۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا' ملک رحیم کے چہرے کا رنگ بدلتا رہا۔ میں نے اپنی بات ختم کر لی لیکن وہ حیرانی کے عالم میں بت بنا بیٹھا رہا پھر گویا اس کے حواس ایک بار پھر کام کرنے لگے۔ اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ 'یہ تو واقعی کوئی بہت گہری سازش لگتی ہے۔ بھائی صاحب کو باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے اغوا کیا گیا ہے۔ لیکن کیا تم یہ سب باتیں پولیس کو بتا سکتے ہو؟'

'میں نے تمھیں بتایا ہے نا کہ میری کچھ ایسی مجبوریاں ہیں جن کے باعث میں پولیس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ ویسے بھی تم اب صحیح صورت حال سے واقف ہو ہی چکے ہو۔ اگر چاہو تو پولیس کو یہ سب کچھ بتا دو لیکن میرا خیال ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ بازی تم لوگوں کے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔'

'کیسی بازی؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔' ملک رحیم نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔

'جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے ملک کریم کو ان بھارتی باشندوں کی وجہ سے اغوا کیا گیا ہے جو تم لوگوں کی تحویل میں ہیں۔ ملک کریم کو اغوا کرنے والے لوگ بے حد خطرناک اور اعلیٰ تربیت یافتہ ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ جلد ہی فون پر تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ تم سے سودے بازی کی کوشش کریں گے یعنی وہ ملک کریم کے بدلے میں ان پانچوں بھارتی لالوں کو طلب کریں گے۔'

'اس کا مطلب ہے بھائی صاحب کو اغوا کرنے والے بھارتی جاسوس ہیں۔'

'میں فی الحال اس معاملے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن تمھارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ تم ان کی بات مان لو۔ بصورت دیگر وہ ملک کریم کو ختم کر دیں گے۔ یہ تو تم دیکھ ہی چکے ہو کہ اپنے بندوں کی بازیابی کے لیے وہ آخری حد تک جا سکتے ہیں۔ ان کا اگلا نشانہ تم بھی بن سکتے ہو۔ جلد یا بدیر وہ اس جگہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے جہاں تم لوگوں نے ان بھارتی سیٹھوں کو رکھا ہوا ہے۔'

'تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو۔' ملک رحیم نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ 'واقعی ہم بھائی صاحب کو اغوا

کرنے والوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ خاص طور پر اس صورت حال میں کہ ہمارے لیے پولیس کو اپنے قیدیوں کے متعلق بتانا بھی ممکن نہیں ہے۔'

'تم صحیح نتیجے پر پہنچے ہو۔ ان قیدیوں پر لعنت بھیجو۔ ملک کریم کی زندگی بڑی سے بڑی دولت سے بھی زیادہ بیش قیمت ہے۔ خاموشی سے ملک کریم کے عوض ان قیدیوں کا تبادلہ کرلو۔'

'جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو جاتا' تم میرے پاس ہی کیوں نہیں ٹھہر جاتے؟ تمھاری موجودگی میں میری ہمت بندھی رہے گی۔' ملک رحیم نے ملتجی لہجے میں کہا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے کہا۔

'ابھی تو میرا واپس جانا ضروری ہے۔ البتہ کل اسی وقت میں یہاں پہنچ جاؤں گا اگر اس دوران میں تمھیں ان لوگوں کا کوئی فون وصول ہو تو ان سے مہلت طلب کر لینا'۔

'ٹھیک ہے۔ میں تمھاری ہدایت کے مطابق عمل کروں گا' ملک رحیم نے رضا کارانہ طور پر میری ذہنی برتری قبول کرلی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے اس سے اجازت طلب کی اور اس کے بنگلے سے نکل آیا۔

'ملک رحیم کے بنگلے سے فرلانگ بھر کا فاصلہ پیدل طے کرنے کے بعد سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے بہ مشکل دو منٹ ہوئے ہونگے اچانک سفید رنگ کی ایک ہنڈا سوک کار میرے پاس آ کر رک گئی۔ میں نے حیرانی کے عالم میں کار پر نظر ڈالی۔ مجھے کار میں دو افراد نظر آئے۔ وہ دونوں ہی بے حد مہذب قسم کے سوٹڈ بوٹڈ افراد تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر کلین شیو شخص نے نہایت شائستہ لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

'آپ شاید کسی سواری کا انتظار کر رہے ہیں۔ آیئے میں آپ کو لفٹ دے دیتا ہوں۔'

میں نے قدرے بوکھلاہٹ کے عالم میں کہا۔ 'شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔ مجھے ابھی کوئی رکشا ٹیکسی مل جائے گی۔ آپ زحمت نہ کریں۔'

'اجی صاحب تکلف کیوں کرتے ہیں۔' کار کی پچھلی سیٹ پر موجود بھاری بھرکم لیکن پروقار شخص نے نہایت پرخلوص لہجے میں اصرار کیا۔ 'اس وقت یہاں آپ کو کوئی سواری ملنا بہت مشکل ہے آجایئے ہم آپ کو بڑی سڑک تک چھوڑ دیں گے۔' ان دونوں کے پرزور اصرار نے مجھے تذبذب میں مبتلا کر دیا۔ 'واقعی اس وقت اس علاقے میں دور دور تک کسی رکشے ٹیکسی کا نام و نشان تک نظر نہ آیا تھا۔ ایک بار تو میرا دل چاہا کہ میں ان کی پرخلوص پیشکش قبول کرلوں لیکن پھر میں نے اپنے اس خیال کو رد کر دیا۔ راستے میں وہ یقیناً مجھ سے میرے متعلق سوال جواب کرتے نتیجتاً مجھے ایک کے بعد ایک جھوٹ بولنا پڑتا۔

'آپ کا بہت بہت شکریہ جناب۔ میں آپ کو زحمت نہیں دینا چاہتا۔'

'اپنی خریت چاہتے ہو تو اب آ ہی جاؤ میاں صاحب زادے۔ بہت نخرے کر لیے تم نے۔' کار کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے شخص نے کار کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کے لہجے میں گہرے طنز اور تحکم کا زہر گھلا محسوس ہوا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ بجلی کے قریبی کھمبے پر موجود بلب کی روشنی میں مجھے اس کے ہاتھ میں ایک تباہ کن ہتھیار نظر آیا۔ ایم پی فائیو سب مشین گن ۔۔۔کوبرا سانپ کے مانند سفاک اور اجل آفرین ۔۔۔ اس مختصر مگر خوبصورت ہتھیار کی تاریک آنکھ کا رخ

اپنی طرف دیکھ کر میں مٹی کے تودے کی مانند ساکت اور بے حس کھڑے رہنے پر مجبور ہو گیا۔ 'اب ذرا اپنے ہاتھ بھی اپنے سر سے اوپر کر لو۔' اسٹیرنگ وہیل کے عقب میں موجود شخص نے مجھے حکم دیا۔ میں بے بسی کے عالم میں ہاتھ سر سے اوپر اٹھانے کے علاوہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ مشین گن والے شخص نے مجھے اپنی زد میں لیے رکھا جبکہ ڈرائیونگ سیٹ پر جو مود شخص کار سے باہر نکل آیا۔ تب مجھے اس کے ہاتھ میں موجود نقرئی رنگ کا چمک دار پستول نظر آیا۔ اس نے میری پشت پر پہنچ کر نہایت مہارت سے میرا جسم تھپتھپایا۔ اس کے مشاق ہاتھوں نے فوراً ہی میرے پستول کو تلاش کر لیا۔ میں بے چارگی کے عالم میں اپنے واحد ہتھیار کو ان نامعلوم شکاریوں کے قبضے میں جاتا دیکھتا رہا۔ اس دوران میں ان دونوں نے مجھے کسی قسم کا کرتب آزمانے کا موقع ہی نہ دیا۔ ویسے بھی اس جدید ترین خودکار گن کے سامنے ایسی ویسی حرکت کرنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا۔ میری طرف سے مکمل طور پر مطمئن ہونے کے بعد انہوں نے مجھے ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر بٹھا دیا۔ میری طرف سے کسی ممکنہ مزاحمت کے پیش نظر انہوں نے کار کی سیٹ بیلٹ کو اس انداز سے میرے جسم کے گرد کسا کہ میرے لیے حرکت کرنا ناممکن ہو کر رہ گیا۔ مجھے بے بس کرنے کے ساتھ انہوں نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھادی۔

یہ سب کچھ اتنا آناً فاناً ہوا کہ خاصی دیر تک میری سمجھ میں ہی نہ آیا کہ یہ ایک حقیقت ہے یا میں کوئی بھیانک سپنا دیکھ رہا ہوں۔ گاڑی تیز رفتاری سے بھاگتی رہی۔ میں نے بہ مشکل اپنے حواس پر قابو پایا۔ مجھے یقین تھا کہ میں انہیں لوگوں کے چنگل میں پھنس گیا ہوں جنہوں نے ملک کریم کو اغوا کیا ہے۔ کسی نامعلوم وجہ سے انہیں میری ضرورت پیش آگئی تھی۔ شاید اس لیے کہ میں ملک کریم کو اغوا کرنے والے افراد کی شکل و صورت بہت قریب سے دیکھ چکا ہوں اور میری یہ واقفیت ان لوگوں کے حق میں خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

'تم کون ہو بھائیو اور مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟' میں نے اپنے لہجے کو پرسکون رکھتے ہوئے ان سے سوال کیا۔

'تم فی الحال چپ چاپ بیٹھے رہو میاں۔ ابھی کچھ دیر میں تمھیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ مشین گن بردار شخص نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ کار چلانے والے شخص نے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی اور مسکراتے ہوئے کہا۔

'تمھاری عمر تو اتنی زیادہ نہیں ہے لیکن تم مجھے بڑے پہنچے ہوئے بزرگ نظر آتے ہو۔ کتنے عرصے سے یہ دھندا کر رہے ہو؟' اس کے اس غیر متوقع سوال نے چند لمحے کے لیے مجھے گڑبڑا کر رکھ دیا پھر میں نے سنبھلتے ہوئے نہایت سادگی سے پوچھا۔

'کون سا دھندا جی؟ میں تو کوئی دھندا نہیں کرتا۔'

'اوہو واقعی تم تو بہت ہی معصوم ہو۔ تمھیں تو کچھ بھی نہیں معلوم۔ اچھا بتاؤ تمھارا نام کیا ہے؟' اس نے سڑک پر نظریں جماتے ہوئے سوال کیا۔ اس دوران میں مشین گن بردار شخص نے ہمارے درمیان میں کوئی دخل نہیں دیا البتہ اس کی انگلی ایک لمحے کے لیے بھی گن کے ٹرائیگر پر سے نہیں ہٹی۔ وہ کوئی بہت

محتاط قسم کا بندہ تھا۔

'میرا نام جی شمشیر خان ہے۔' میں نے نہایت سادگی سے کہا۔ میری بات سن کر گاڑی چلانے والے شخص کے چہرے پر رقصاں مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔

'جبکہ میرا خیال ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمھارا نام شمشیر خان نہیں بلکہ ۔۔۔ ذوالفقار علی خان ہے۔'

اس کے منہ سے یہ نام سن کر مجھے اچھا خاصا ذہنی جھٹکا لگا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ ان دونوں کا تعلق ندا والے گروہ سے ہے۔ وہ دونوں مجھ سے چوہے بلی کا کھیل کھیل رہے تھے۔ میں نے اس شخص کے دعوے پر نہ حیرانی کا اظہار کیا اور نہ ہی تردید کی' بس خاموشی سے سڑک پر نظر جمائے بیٹھا رہا۔ وہ کچھ دیر تک میرے ردعمل کا انتظار کرتا رہا پھر اس نے کہا۔ تم خوف زدہ دکھائی نہیں دے رہے ہو۔'

'مجھے ڈر اور خوف سے نفرت ہے۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔' میں نے قدرے بے نیازانہ لہجے میں جواب دیا۔

'کیا موت سے بھی نہیں؟'

'موت ایک اٹل حقیقت' ایک انمٹ سچائی ہے اور حقیقت اور سچائی سے ڈرنا حماقت ہے۔'

'بہت خوب! اس کا مطلب ہے میرا اندازہ صحیح نکلا۔ تم واقعی ایک غیر معمولی نوجوان ہو۔' میں نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کار بدستور تیز رفتاری سے بھاگتی رہی۔ میں نے راستوں کو اپنے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کی اور اپنی کوشش مین خاصی حد تک کامیاب رہا۔ اس بات سے وہ دونوں بھی یقیناً واقف رہے ہوں گے لیکن حیرت انگیز طور پر انہوں نے اس معاملے کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ انہیں اس بات کی کوئی پروا نہ تھی کہ میں تمام راستوں سے آگاہ ہوگیا ہوں۔ شاید انہیں یقین تھا کہ اب میں ان کے شکنجے سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔

بالآخر گاڑی ایک بڑے سے بنگلے کے گیٹ پر پہنچ کر رک گئی۔ گاڑی کا ہارن مخصوص انداز میں دوبار بجا۔ اس کے ساتھ ہی بنگلے کا گیٹ خود بہ خود کھلتا چلا گیا۔ گاڑی آگے بڑھی اور ایک پورچ میں پہنچ کر رک گئی۔ اس وقت کوئی شخص میری طرف والے دروازے کے ساتھ آن کھڑا ہوا۔ گاڑی چلانے والے نے سیٹ بیلٹ کھول کر مجھے آزاد کیا۔ اسی اثنا میں مشین گن بردار شخص بھی کار سے باہر نکل آیا۔ میری طرف والے دروازے کے ساتھ موجود اس شخص نے دروازے کا لاک ہٹا کر دروازہ کھول دیا میں گاڑی سے باہر نکلا۔ تب میں نے اس تیسرے شخص کو پوری طرح دیکھا۔ اس چوڑے شانوں والے باریش جوان کا قد شاید ساڑھے چھ فٹ سے بھی زیادہ رہا ہوگا۔ اس کی چمک دار بھوری آنکھیں مجھے اپنے وجود کے آر پار چھید کرتی محسوس ہوئیں۔ مجھے اس کے شانے پر کلاشنکوف رائفل نظر آئی لیکن اس نے اسے سیدھا کرنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی۔ شاید اسے کسی ہتھیار کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اس کے چوڑے پنجوں والے لمبے لمبے ہاتھ ہی اس کا سب سے موثر ہتھیار تھے۔

اسی وقت ایک اور مسلح شخص وہاں پہنچ گیا۔ وہ اوسط قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک ایک ادھیڑ عمر شخص

تھا۔ اس کے کھردرے چہرے پر چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں۔ بنگلے کا گیٹ کھولنے والا یہی شخص رہا ہوگا۔ وہ چاروں افراد مجھے اپنے نرغے میں لیے بنگلے کے اندرونی حصے میں پہنچ گئے۔ ایک وسیع اور پر آسائش بیڈ روم میں پہنچ کر انہوں نے مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ ایم پی فائیو گن والے شخص نے باریش جوان اور اس کے ادھیڑ عمر ساتھی کو اشارہ کیا کہ وہ بیڈ روم سے باہر چلے جائیں۔ ان کے باہر جاتے ہی وہ دونوں پوری طرح میری طرف متوجہ ہوگئے۔ 'سب سے پہلی بات تو میں تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ تمھیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچانا چاہتے' گاڑی ڈرائیو کرنے والے شخص نے نہایت سنجیدہ لہجے میں بات شروع کی۔۔ 'جواباً ہم تم سے بھی امید رکھتے ہیں کہ تم ہماری پوری بات سننے سے پہلے کوئی الٹی سیدھی حرکت نہیں کروگے۔ ماحول کو تناؤ سے آزاد کرنے کے لیے ہم اپنے ہتھیاروں کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔' مجھے ان کے طرز عمل دیکھ کر خاصی حیرانی ہوئی۔

'تم لوگ کون ہو بھائی اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟' میں نے استفسار کیا۔

'ہم لوگ کون ہیں' اس کا بھی تمھیں ابھی پتا چل جائے گا۔ فی الحال تم یہ جان لو کہ ہم ملک کریم کے اغوا کے سلسلے میں تمھیں یہاں لے کر آئے ہیں۔' اس شخص نے نہایت سنجیدہ لہجے میں بتایا۔ اس کی زبان سے ملک کریم کا ذکر سن کر میں مزید چوکنا ہوگیا۔ 'لیکن میں اس سلسلے میں تمھاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟'

'درحقیقت اس معاملے میں صرف تم ہی ہماری مدد کرسکتے ہو۔ تم ہی وہ شخص ہو جو ملک کریم کے اغوا میں ملوث افراد کو بخوبی پہچان سکتے ہو۔'

'تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'

'میری بات غور سے سنو جوان۔ ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ سچ کیا اور جھوٹ کیا ہے۔ تم نے ملک کریم کے بھائی ملک رحیم سے فون پر اور اس کے گھر جا کر جتنی باتیں کی ہیں وہ سب ہم اپنے کانوں سے سن چکے ہیں بلکہ ہم اس تمام گفتگو کو ریکارڈ بھی کر چکے ہیں۔ لہٰذا خواہ مخواہ جھوٹ بولنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔' اس کی بات سن کر مجھے اپنا ذہن چکراتا محسوس ہوا۔ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے؟ اگر یہ سب سچ ہے تو پھر تو میرا بس خدا ہی حافظ ہے۔

'تم ۔۔۔ تم کون لوگ ہو؟ اور تم نے یہ سب کیسے کرلیا؟'

'یہ سب ہمارے لیے معمولی باتیں ہیں۔ میرے خیال میں تمھیں یہ بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ہمارا تعلق ایک بے حد حساس تحقیقاتی ادارے سے ہے۔ ہمیں دارالحکومت سے اس کیس کے سلسلے میں بھیجا گیا ہے۔' اس کی بات سن کر میرے ذہن میں زبردست چھناکا ہوا۔ تحقیقاتی ادارہ ۔۔۔! تو بالآخر میں قانون کے لمبے ہاتھوں کی زد میں آ ہی گیا۔ اب اپنے کرتوتوں کا حساب دینے کے لیے تیار ہو جاؤ مسٹر سیف داد خان؟ بہت دن آزادی کے مزے لوٹ لیے۔

اس شخص نے ہی شاید میرے تاثرات سے کسی نہ کسی حد تک میرے دلی جذبات واحساسات کا اندازہ لگایا۔ 'ویسے تمھیں ہم سے وحشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تم اگر ہماری مدد کرنے پر آمادہ ہو جاؤ تو ہم تمھیں بہت سے مسائل سے بچا سکتے ہیں۔ ہمیں بہت وسیع اختیارات دے کر اسلام

آباد سے بھیجا گیا ہے۔'

'لیکن میں آپ لوگوں کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟'

'اگر تم ہمارا ساتھ دینے کے لیے خوشی سے راضی ہو تو پھر ہم بات آگے بڑھاتے ہیں۔ ہمارے اصل نام کیا ہیں؟ تمھارے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے تم مجھے احسن صدیقی اور میرے ساتھی کو جمیل مرزا کہہ سکتے ہو۔'

'ٹھیک ہے صدیقی صاحب آپ لوگ جو چاہیں گے' میں وہی کروں گا لیکن پہلے آپ لوگ مجھے تفصیل سے ساری باتیں بتائیں۔'

'ٹھیک ہے میں تمھیں تفصیل سے ساری بات بتاتا ہوں۔ جیسا کہ تمھیں معلوم ہوگا کہ ملک کریم حزب اختلاف کی ایک اہم اور طاقت ور پارٹی کا ایک سرکردہ رہنما ہے۔ سیاسی لیڈر ہونے کی وجہ سے اسے خود بخود کچھ مراعات حاصل ہوگئیں ہیں۔ وہ بہت امیر کبیر شخص ہے لیکن ہماری اطلاعات کے مطابق اس کے ہمسایہ ملک بھارت کے کچھ جرائم پیشہ افراد سے بھی گہرے تعلقات ہیں۔ کچھ عرصے پہلے بھارت کے ایک جرائم پیشہ شخص منوج سنگھ نے اپنے ملک کے پانچ بے حد دولت مند افراد کو تاوان کے لیے اغوا کیا۔ بھارتی حکومت کی طرف یہ الزام لگایا گیا کہ وہ پانچوں افراد پاکستان اسمگل کر دیئے گئے ہیں۔ بھارتی حکومت نے پاکستان سے مطالبہ کیا ہے کہ ان پانچوں افراد کو بازیاب کر کے بھارت واپس بھجوایا جائے۔ ہمارے تحقیقاتی اداروں کے مطابق اس شخص منوج سنگھ کے ملک کریم سے تعلقات رہ چکے ہیں۔ ہمارے تحقیقاتی ادارے اور پولیس ان باشندوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ اسی دوران میں محض شک کی بنیاد پر ملک کریم کو ہم نے اپنی تحویل میں لے لیا لیکن ہم اس سے کچھ بھی نہ اگلوا سکے۔ دوسری طرف ہم نے اس کے تمام ٹھکانوں پر چھاپے مارے لیکن نہ تو ہمیں مغویان مل سکے اور نہ ہی منوج سنگھ ہمارے ہتھے آیا۔ کوئی ثبوت نہ ملنے اور اپوزیشن کے زبردست دباؤ کے باعث ہمیں مجبوراً ملک کریم کو چھوڑنا پڑا۔' صدیقی ذرا دم لینے کے لیے خاموش ہوا۔ میں نے اس کی گفتگو کی روانی میں مداخلت مناسب نہ سمجھی۔

ہماری حکومت نے بھارت کو کہا کہ بھارتی مغویان پاکستان میں موجود نہیں ہیں لیکن بھارتی حکومت نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ پچھلے دنوں بھارت میں یہ معاملہ ایک نئے انداز سے زندہ ہوا۔ بھارتی اخبارات میں نہایت زور و شور سے پروپیگنڈا کیا جانے لگا کہ ان بھارتی باشندوں کے اغوا میں پاکستانی حکومت کا ہاتھ ہے۔ بھارتی شہروں میں پاکستان کے خلاف مظاہرے ہوئے اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ پاکستان سے سختی سے نبٹا جائے۔ انہیں دنوں بھارت میں موجود ہمارے نمائندوں نے اطلاع دی کہ بھارتی جاسوسی ادارے 'را' نے اپنے بہت سے اعلیٰ تربیت یافتہ ایجنٹ پاکستان بھیجے ہیں۔ ہمارے قومی سلامتی کے تمام ادارے پوری طرح مستعد ہوگئے۔ عام طور پر 'را' کے ایجنٹ پاکستان میں دہشت گردی اور تخریب کاری کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان خطرات سے نمٹنے کے لیے خصوصی انتظامات کیے گئے۔ ادھر بھارتی اخبارات میں یہ پروپیگنڈا زور پکڑتا گیا کہ بھارتی

باشندوں کے اغوا میں پاکستان ملوث ہے۔ ہمیں معلوم تھا کہ یہ سب کچھ بھارتی حکومت کے اشارے پر ہو رہا ہے پھر یہ پروپیگنڈا کچھ اور تیز کیا گیا۔ اب بھارتی اخبارات میں کھلم کھلا ہمارے ملک کے سب سے حساس تحقیقاتی ایجنسی کا نام لیا جانے لگا اور کہا جانے لگا کہ اس معاملے میں یہ ایجنسی براہ راست ملوث ہے۔ اسی کے ایما پر یہ واردات ہوئی ہے۔ ہر روز نئے شوشے چھوڑے جانے لگے کہ یہ ایجنسی بھارت میں فلاں دہشت گردی کی کاروائی کی ذمے دار ہے' فلاں نسلی فساد اس کی کارستانی ہے۔ حتیٰ کہ اسے کھلم کھلا جنوبی ایشیاء کی سب سے خطرناک اور دہشت گرد تنظیم لکھا جانے لگا۔ پاکستانی حکومت نے بھارتی حکومت سے اس سلسلے میں احتجاج کیا تو وہاں سے روکھا جواب دیا گیا کہ بھارتی حکومت پریس کی آزادی میں خلل نہیں ڈال سکتی۔ اس صورت حال سے ہمارے حکومتی حلقوں میں تشویش پیدا ہونے لگی۔ ایک بار پھر تمام تحقیقاتی ایجنسیوں کو حکم دیا گیا کہ ان بھارتی مغویان کا پتہ لگانے کی کوشش کی جائے۔ ملک کریم ان دنوں میں لاہور میں تھا۔ اس کی نگرانی کی گئی لیکن ہمیں اس کے متعلق کوئی مشکوک بات معلوم نہ ہو سکی۔ اس پر ان دنوں فلم بنانے کی دھن سوار تھی اور وہ ہر وقت اسی چکر میں رہتا تھا۔ تنگ آ کر اس کی نگرانی ختم کر دی گئی۔' صدیقی اپنے خیالات مجتمع کرنے کے لیے خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

'پھر کیا ہوا صدیقی صاحب؟'

'اوہ ہاں۔۔۔۔۔ دراصل میں یہ سب کچھ تمھیں اس قدر تفصیل سے اس لیے بتا رہا ہوں کہ تمھیں معاملے کی نزاکت اور سنگینی کا پوری طرح احساس ہو سکے۔ تم نے ملک رحیم سے جو باتیں کی ہیں' ان سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تم ایک ذہن اور حقیقت پسند نوجوان ہو اور مجھے امید ہے کہ تم محب وطن ہو گے۔'

'یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے صدیقی صاحب۔ پاکستان سے محبت تو ہر پاکستانی کی روح میں بسی ہوئی ہے۔' میں نے قدرے جذباتی لہجے میں کہا۔

'مجھے یقین تھا کہ تم اسی قسم کے جذبات کا اظہار کرو گے۔ خیر تو میں کہہ رہا تھا کہ ملک کریم کی نگرانی ختم کر دی گئی۔ تمھیں تو معلوم ہوگا کہ بھارت پچھلے کچھ عرصہ سے کس اندرونی خلفشار کا شکار ہے۔ خالصتان کے حصول کے لیے سکھ حریت پسندوں کی جدوجہد مسلسل طاقت ور ہوتی جا رہی ہے۔ ادھر کشمیر میں الگ آزادی کی تحریک مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ ناگالینڈ اور آسام کی آزادی کے متوالے الگ بھارت کے جغرافیائی ڈھانچے کے لیے دیمک ثابت ہو رہے ہیں۔ ہمارے نمائندوں نے اطلاع دی ہے کہ بھارت کی ایجنسی را نے اسرائیل کی خفیہ ایجنسی موساد کو باضابطہ طور پر اپنی امداد کے لیے طلب کیا ہے۔ موساد کے مشورے سے را نے پاکستان میں تخریبی کاروائیاں مزید تیز کر دی ہیں لیکن اس کے باوجود بھارت کا داخلی بحران مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔ نتیجتاً بھارتی حکومت نے اپنے ملک کی عوام کی توجہ اپنے داخلی خلفشار اور سنگین مسائل سے ہٹانے کے لیے یہ راگ الاپنا شروع کر دیا کہ بھارت کے تمام مسائل کی وجہ صرف اور صرف پاکستان ہے۔ پاکستان کے خلاف پروپیگنڈے کے لیے بھارتی

حکومت نے اربوں روپے مختص کر دیے۔ اس سلسلے میں پاکستان کی سب سے حساس تنظیم کو خصوصی نشانہ بنانے کے احکامات جاری کیے گئے لیکن بھارتی حکومت اور بدنام زمانہ تنظیم 'را' کی بدقسمتی یہ ہے کہ بھارتی اخبارات میں پروپیگنڈے کے لیے لکھے جانے والے تمام تر مضامین اور کالم کوئی ایسی شہادت فراہم کرنے میں ناکام رہے جس سے پڑھنے والے متاثر ہو سکتے۔ چنانچہ صحافتی سطح پر یہ مہم بری طرح ناکام ہو گئی لیکن یہ مغویان والا واقعہ رونما ہونے سے اس مہم میں ایک بار پھر جان پڑ گئی۔ بھارتی پروپیگنڈا مشینری نے اپنا دائرہ مغربی ممالک تک وسیع کر لیا۔ ساری دنیا میں بھارت کی مظلومیت اور پاکستان کی دہشت گردی کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ چند دن پہلے ہمارے نمائندوں نے اطلاع دی کہ بھارتی تنظیم 'را' اسرائیلی تنظیم ' موساد ' کے ساتھ مل کر کسی ایسی سازش پر عمل کر رہی ہے جو اگر کامیاب ہو گئی تو پاکستان کو زبردست نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی تمام پاکستانی ادارے اپنے طور پر چوکنا ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی بھارتی حکومت کے لہجے میں پاکستان کے لیے تلخی بڑھنے لگی۔ چند دن پہلے بھارتی حکومت نے مغویان کے حوالے سے دھمکی آمیز لہجہ اختیار کرتے ہوئے پاکستان سے مطالبہ کیا کہ بھارتی شہری فوری طور بازیاب کیے جائیں۔ بصورت دیگر بھارت اور پاکستان کے باہمی تعلقات ناخوش گوار ہو سکتے ہیں۔ انہیں دنوں ملک کریم کو اچانک پراسرار انداز میں اغوا کر لیا گیا۔ ملک کریم کے اغوا کے ساتھ ہی تمام تحقیقاتی ادارے بری طرح چونک پڑے۔ بھارتی مغویان کے حوالے سے سب سے زیادہ مشکوک نام ملک کریم ہی تھا۔ کافی بحث مباحثے کے بعد تمام ادارے اس نتیجے پر پہنچے کہ ملک کریم کے اغوا میں بھارتی ایجنٹوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر تم نے اپنے اور ملک رحیم کے درمیان بات چیت کے دوران میں بالکل یہی نظریہ پیش کیا۔ کہ ملک کریم کو اغوا کرنے والے بھارتی ایجنٹ ہیں جو ملک کریم کے بدلے میں اپنے مغویان کو آزاد کرانے کی کوشش کریں گے۔ ملک رحیم نے تمھارا یہ نظریہ من وعن تسلیم کر لیا اور تمھارے اس مشورے کو قبول کرنے پر بھی آمادگی ظاہر کر دی کہ ملک کریم کے بدلے میں پانچوں مغویان کو بھارتی ایجنٹوں کے حوالے کر دیا جائے۔' صدیقی نے میری اور ملک رحیم کی گفتگو کا حوالہ دیا تو میں مداخلت کے بغیر نہ رہ سکا۔

'لیکن آپ لوگوں کو یہ سب باتیں اتنی تفصیل سے کیسے معلوم ہیں صدیقی صاحب؟' میں نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

'آ۔۔۔ ہاہاہاہا۔۔۔ آج کے جدید ترین دور میں یہ سب کیا مشکل ہے بھائی۔ ملک کریم کے اغوا کے ساتھ ہی ہم لوگوں کے کان کھڑے ہو گئے تھے اور ہم فوری طور پر حرکت میں آ گئے تھے۔ سب سے پہلے ملک رحیم کے فون پر ہونے والی گفتگو کو سننے اور ریکارڈ کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ اس کے بعد اس کے گھر کے مختلف حصوں میں ایسے حساس آلات پہنچا دئے گئے کہ اس گھر میں ہونے والی گفتگو کا ہر لفظ ہمارے کانوں تک پہنچنے لگا۔ تم نے ملک رحیم سے فون پر بات کی تو ہم فوری طور پر چوکنا ہو گئے۔ ہم نے محسوس کیا کہ تم ہمارے مطلب کے بندے ثابت ہو سکتے ہو پھر ملک رحیم کے گھر پر تم نے جو گفتگو کی اسے سن کر ہمیں یقین ہو گیا کہ اس مسئلے کے حل کے لیے تمھارا تعاون حاصل کرنا ہمارے لیے ناگزیر

ہے۔ لہٰذا ہم نے فوری طور پر تمھیں گھیرنے کا پروگرام بنایا۔ جس کے نتیجے میں اب تم ہمارے سامنے ہو۔'

'تو اب آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ملک رحیم اپنے بھائی کے بدلے میں مغویان کو ان ایجنٹوں کے حوالے کر دے۔ بعد میں اگر آپ چاہیں تو ان ایجنٹوں پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔' میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

'یہ معاملہ اس قدر سیدھا سادہ نہیں ہے میرے بھائی۔ تم نے ساری صورت حال کے پیش نظر جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ اگرچہ خاصی حد تک صحیح ہے۔ ملک کریم کو اغوا کرنے والے واقعی 'را' کے ایجنٹ ہیں اور وہ ملک کریم کے بدلے مغویان کو ہی رہا کرانا چاہتے ہیں لیکن بات صرف یہیں تک محدود نہیں ہے۔ ہماری تحقیقات سے ثابت ہو گیا ہے کہ اس معاملے کی آڑ میں بہت گہری سازش کے تانے بانے بنے گئے ہیں۔ اتفاق سے ہم بروقت اس سازش کی بھنک پانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔'

'کیا آپ لوگ مجھے اس سازش کے متعلق کچھ بتانا پسند کریں گے؟' میں نے قدرے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔

ویسے یہ بے حد نازک اور خفیہ معاملہ ہے تاہم کیونکہ تم خود بھی اس معاملے کا ایک اہم حصہ ہو۔ لہٰذا کچھ چیدہ چیدہ باتیں تمھیں بتانا ناگزیر ہیں۔ تو بات یوں ہے کہ ہمارے ایک دوست ملک کی خفیہ ایجنسی نے ہمیں خبردار کیا ہے کہ بھارت اپنی عوام کی توجہ ملک کے پیچیدہ اندرونی مسائل کی طرف سے ہٹانے کے لیے پاکستان پر حملے کا پروگرام بنا رہا ہے۔ اس سلسلے میں وہ کسی ایسے مناسب بہانے کا منتظر ہے جس کی آڑ میں وہ پاکستان کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کر سکے۔ بھارتی مغویان کے معاملے میں ہمیں احساس ہوا کہ بھارتی حکومت اس معاملے میں جان بوجھ کر اپنے عوام کے جذبات بھڑکا رہی ہے پھر بھارت کے پاس پاکستان کے خلاف شدید ترین پروپیگنڈے اور بھارتی حکومت کی دھمکی سے ہمیں احساس ہوا کہ بھارتی حکومت اس واقعے کو بھی اپنی جارحیت کے لیے جواز بنا سکتی ہے۔ اس مرحلے پر ہماری حکومت کو اس معاملے کی سنگینی کا صحیح معنوں میں احساس ہوا۔ موجودہ حالات میں ہمارا ملک کسی بھی صورت جنگ کا متحمل نہیں ہو سکتا لیکن اگر ہم پر زبردستی جنگ مسلط کی گئی تو مجبوراً اپنا دفاع کرنا ہی پڑے گا۔ بالآخر کافی سوچ بچار کے بعد اور یہ بات مصدقہ طور پر معلوم ہونے کے بعد کہ ملک کریم کے اغوا میں بھارتی تنظیم 'را' کا ہی ہاتھ ہے' ہم یہ سمجھنے میں کامیاب ہو گئے کہ بھارت اس معاملے سے کیا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ ملک کریم کے اغوا سے بھارت کا صرف یہی مقصد نہیں ہے کہ وہ بھارتی مغویان کو آزاد کرانا چاہتا ہے بلکہ دراصل وہ اس معاملے میں پاکستانی حکومت اور حساس تحقیقاتی اداروں کو پوری طرح ملوث ثابت کرنا چاہتا ہے۔ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ ان بھارتی باشندوں کے اغوا میں حکومت پاکستان کا ہاتھ ہے تو بھارت ساری دنیا میں واویلا مچا دے گا کہ پاکستان ایک فتنہ پرور اور دہشت گرد ملک ہے جو بھارت میں تخریب کاری اور فساد پھیلانے پر تلا ہوا ہے۔ ایسے میں ساری دنیا کے ممالک کی ہمدریاں بھارت کے ساتھ ہو جائیں گی۔ ہمارا اندازہ ہے کہ عین اسی وقت بھارتی حکومت کے اشارے پر بھارت میں پاکستان کے خلاف زبردست احتجاجی تحریک شروع کی جائے گی

اور پھر بھارت کسی بھی معمولی واقعے کو جواز بنا کر پاکستان پر چڑھ دوڑے گا۔'

'یہ تو واقعی بہت خطرناک صورت حال ہے لیکن یہ سب کچھ ہوگا کیسے؟' میں نے پرتشویش لہجے میں سوال کیا۔

'موجودہ صورت حال میں بھارت کے لیے اپنے ناپاک منصوبے پر عمل پیرا ہونا بہت آسان ہے۔ ملک کریم ان کے قبضے میں ہے۔ ملک کریم کتنا ہی محب وطن ہو۔ بحر حال وہ ایک عام سا انسان ہے۔ بھارتی ایجنٹ اپنے جدید ترین آلات تشدد استعمال کر کے اس سے سب کچھ اگلوا سکتے ہیں بلکہ عین ممکن ہے انہوں نے اگلوا بھی لیا ہو۔ چنانچہ انہیں معلوم ہو جائے گا کہ بھارتی مغویان کو کہاں رکھا گیا ہے لیکن وہ انہیں فی الحال آزاد نہیں کروائیں گے۔ البتہ وہ ملک کریم کو مجبور کریں گے کہ وہ اقرار کرے کہ بھارتی مغویان کے اغوا کے ذمے دار دراصل پاکستان کی سب سے حساس تحقیقاتی تنظیم ہے اور ملک کریم نے ان مغویان کو اسی تنظیم کے ایما پر اپنے قید خانے پر رکھا ہوا ہے۔ دوسری طرف اس معاملے میں ایک سکھ منوج سنگھ بھی ملوث ہے لہٰذا ملک کریم سے یہ اعتراف بھی کروایا جا سکتا ہے کہ اس حساس تحقیقاتی ادارے نے ان بھارتی باشندوں کو اس لیے اغوا کرایا ہے کہ ان کے بدلے میں کروڑوں روپے کی رقم حاصل کی جائے اور اس کے بعد یہ بھاری رقم خالصتان تحریک کے سرکردہ افراد تک پہنچا دی جائے تا کہ خالصتان کے قیام کی جدوجہد عروج پر پہنچ سکے۔ تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ یہ معاملہ اگر اس انداز میں بھارت کے اخبارات میں پیش کیا جائے تو بھارتی عوام میں کس قدر اشتعال پھیل سکتا ہے۔ اس اشتعال کی آڑ میں بھارتی حکومت پاکستان کے خلاف کوئی بھی کاروائی کر سکتی ہے۔ اس معاملے کو ایک قدم اور آگے بڑھ کر دیکھو۔ فرض کرو کہ بھارتی ایجنٹ ملک کریم کی مدد سے مغویان کو آزاد کرا کے اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ملک کریم سے تمام اعترافات کرانے کے بعد مغویان کو اپنے ہاتھوں سے ختم کر دیتے ہیں اور اس کا الزام بھی پاکستان پر دھر دیتے ہیں تو پاکستان کی پوزیشن کتنی نازک ہو جائے گی؟ اور کیا یہ صورت حال بھارتی جارحیت کے لیے ایک مضبوط جواز نہیں بن جائے گی؟' صدیقی نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

'اف میرے خدا! یہ تو میرے تصور سے بھی بڑھ کر خطرناک معاملہ ہے۔ اگر وہ لوگ اپنی سازش میں کامیاب ہو گئے تو پاکستان سخت مشکلات میں پھنس سکتا ہے۔ ملک کریم کا لالچ پوری پاکستانی قوم کے لیے تباہی کا سامان بن سکتا ہے۔'

'تم صحیح سمجھے ہو بھائی۔ اس معاملے میں ہماری ذرا سی غفلت ہم سب کے لیے تباہی کا پیغام ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے ساتھ تعاون کرو۔'

'لیکن میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟' میں نے سوال کیا۔

میں نے بتایا ہے نا کہ اس معاملے میں تم سے بڑھ کر کوئی ہماری مدد نہیں کر سکتا کیونکہ تم ملک کریم کے اغوا کنندگان کو اچھی طرح پہچانتے ہو۔ دراصل بات یہ ہے کہ ملک کریم کے اغوا کے اگلے ہی دن شام کو ہمیں ملک کریم کی پجیرو جیپ مل گئی تھی۔ اسے دریائے چناب میں ڈبونے کی کوشش کی گئی تھی لیکن

وہ لوگ اس کوشش میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے لہٰذا وہ جیپ کو دریا کے کنارے ایک پشتے پر چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ اس خبر کو جان بوجھ کر راز میں رکھا گیا۔ جیپ کو قبضے میں کرنے کے بعد ہم نے جیپ کا بغور معائنہ کیا تو ہمیں اندازہ ہوا کہ جیپ پر پیچھے سے فائرنگ کی گئی ہے نیز یہ کہ وہ فائرنگ خاصی کارگر بھی ہو رہی ہے کیونکہ ہمیں جیپ کی اگلی پسنجر سیٹ پر اچھا خاصا خون پڑا ہوا نظر آیا۔' صدیقی نے توقف کرتے ہوئے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا۔

'وہ فائرنگ میں نے ہی کی تھی۔ آپ یہ بتائیں کہ پھر کیا ہوا؟' میں نے اس مرحلے پر اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا ویسے بھی وہ لوگ ملک رحیم اور میری گفتگو سننے کے بعد پہلے ہی اس حقیقت سے واقف ہو چکے ہوں گے۔

'ہاں تو اس خون سے ہم نے اندازہ لگایا کہ جیپ میں سوار کوئی فرد یقیناً شدید زخمی ہو گیا ہے۔ یہ شخص ملک کریم نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ایک بے ہوش شخص کا فرنٹ سیٹ پر ہونا بعید از امکان بات تھی۔ خیر اس بات کی تصدیق بھی جلد ہی ہو گئی کہ اس خون کا گروپ ملک کریم کے خون سے مختلف ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ گولی کا نشانہ بننے والا مرد یا عورت اس قدر شدید زخمی ہے کہ اگر اسے جلد ہی کسی ہسپتال وغیرہ میں پہنچا کر طبی امداد مہیا نہ کی گئی تو اس کا زندہ بچنا بہت مشکل ہو گا۔ خون کے اتنے کثیر ضیاع کے بعد اسے خون دیا جانا بھی لازم ہے۔ دوسری طرف اگر ہم اس زخمی شخص کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو جائیں تو اس کے ذریعے ہم اپنے مطلوبہ افراد تک پہنچ سکتے ہیں بصورت دیگر ہمارے پاس ان کو تلاش کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔'

'میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں صدیقی صاحب۔ آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ مل کر اس زخمی بھارتی جاسوس یا جاسوسہ کو تلاش کروں جو ممکنہ طور پر ہسپتال وغیرہ میں زیر علاج ہے کیونکہ میں انہیں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔'

'تم بالکل صحیح سمجھے ہو بھائی۔ ہمارا اندازہ ہے کہ ملک کریم کے اغوا میں ملوث وہ مرد اور اس کی ساتھی عورت اپنے گروپ میں بے حد اہم حیثیت کے حامل ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کے شدید زخمی ہونے سے ان لوگوں کی سرگرمیوں میں عارضی طور پر تعطل پیدا ہو گیا ہو گا۔ ہمیں اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر ان لوگوں کو ڈھونڈ نکالنا چاہیے۔'

'میرا خیال ہے کہ میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ ان دونوں میں سے زخمی ہونے والا کون ہے۔' میں نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

'اچھا۔۔۔۔۔! وہ کیسے؟' وہ دونوں بیک وقت بول پڑے۔

'دراصل میں نے جب ان دونوں کو ملک کریم کا بے ہوش جسم جیپ میں اتارتے دیکھا تو میں نے اندازہ لگایا کہ آخر میں رسے کے ذریعے جیپ کی چھت کے خلا سے اندر داخل ہونے والا مرد تھا۔ اس کے چھت کے راستے جیپ میں اترتے ہی ایک جھٹکے سے جیپ چل پڑی۔ اس کے بعد میں نے فائرنگ کی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فائرنگ سے زخمی ہونے والا مرد ہے کیونکہ اتنی جلدی وہ ڈرائیونگ سیٹ

پر پہنچ کر گاڑی نہیں چلا سکتا۔ جیپ یقیناً وہ لڑکی ندا ہی چلا رہی تھی۔ پسنجر سیٹ پر وہ مرد ہی ہوگا۔‘

’بہت خوب تمھارا تجزیہ سو فی صد صحیح ہے۔‘ صدیقی نے تحسین آمیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ ’یقیناً یہی کچھ پیش آیا ہوگا۔ اس کا مطلب ہے ہمارا کام قدرے آسان ہو گیا ہے۔ اب ہمیں ایک مرد اور ایک عورت نہیں بلکہ صرف ایک بوڑھے مرد کو تلاش کرنا ہو لا۔‘

’اسے بوڑھا مت کہیے صدیقی صاحب۔ وہ خبیث کسی بندر کے مانند نہایت پھرتی اور مہارت سے رسے کے ذریعے عین جیپ میں اترا تھا۔‘

’اسے ایسا ہونا ہی چاہیے بھائی۔ آخر وہ دنیا کی خطرناک ترین خفیہ ایجنسی کا اہم رکن ہے۔‘

’لیکن صدیقی صاحب اگر وہ شخص گولی لگنے کے باعث ختم ہو گیا ہو تو پھر ہم اسے کیسے ڈھونڈ سکیں گے؟‘ میری بات سن کر صدیقی ایک لمحے کے لیے خاموش سا ہو گیا پھر اس نے قدرے مضطرب لہجے میں کہا۔

’فی الحال ہمیں اس معاملے کے تاریک گوشوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ ہمیں اپنی سی کوشش کرنی چاہیے۔ کامیابی اور ناکامی تو صرف اور صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔‘

’ٹھیک ہے صدیقی صاحب لیکن ہمیں یہ مہم کب شروع کرنا ہے؟‘

’ابھی اور اسی وقت! ہمارے وقت ضائع کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔‘

’لیکن صدیقی صاحب میرے پولیس سے تعلقات خوش گوار نہیں ہیں۔ میں ان کی نظروں میں آنا پسند نہیں کروں گا۔‘ میں نے اپنی پوزیشن واضح کرتے ہوئے کہا۔

’ارے تم فکر نہ کرو بھائی۔ اس وقت تم ہماری تنظیم کی نمائندگی کر رہے ہو۔ کوئی پولیس والا تمھاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔‘

’پھر بھی کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں اپنے حلیے میں کچھ تبدیلیاں کر لوں۔‘ میں نے اصرار کیا۔ ’اوہ تو یہ بات ہے خیر جیسی تمھاری مرضی۔ میرا ساتھی مرزا فوری طور پر تمھارے چہرے میں کچھ تبدیلیاں پیدا کر دے گا۔ جس کی وجہ سے تمھاری شکل میں خاصی چینج آ جائے گی۔ مرزا تم اس کے چہرے پر ہلکا پھلکا عارضی میک اپ کر دو۔‘

’بہت بہتر! مرزا نے دھیمے لہجے میں کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ڈاکٹر کے میڈیکل بکس کی طرح کا ایک ڈبہ تھا۔ اس نے وہ بکس کھولا اور فوری طور پر میرے چہرے کی مرمت میں مصروف ہو گیا۔ اس نے میرے نتھنوں میں نرم اسپرنگوں کی ایک جوڑی چڑھا دی جس کی وجہ سے میری ناک چوڑی اور پھولی ہوئی نظر آنے لگی۔ چوڑے نتھنوں کے باعث میرا چہرہ خاصا بدنما ہو گیا پھر اس نے میرے بالائی لب پر گھنی سیاہ موچھیں چپکا دیں جنھوں نے میرے بالائی لب کے خاصے حصے کو بھی چھپا لیا۔ وہ میرے سر پر ایک گھنے‘ بھورے بالوں والی وگ رکھنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ اس نے میرے چہرے کے ساتھ جو سلوک کیا وہی بہت کافی تھا۔ صدیقی نے تنقیدی نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لیا۔ ’بس اب ٹھیک ہے۔ اب

پولیس والوں کا باپ بھی تمھیں نہیں پہچان سکتا۔‘ میں نے آئینہ دیکھا تو مجھے اس کی تائید کرنا پڑی۔

کچھ ہی دیر بعد ہم لوگ ایک بار پھر سفید ہنڈا اسوک میں آن بیٹھے۔ البتہ اس بار صورت حال ذرا مختلف تھی۔ اس بار میری حیثیت ان کے ساتھی کی سی تھی۔ بنگلے سے روانہ ہونے سے پہلے صدیقی نے ملتان کے تمام اہم میڈیکل سنٹرز اور ہسپتالوں کی فہرست اپنے ساتھ لے لی۔ میں ان دونوں کے ہمراہ نکل تو آیا لیکن مجھے امید نہ تھی کہ ہم اتنے بڑے شہر میں ایک شخص کو ڈھونڈ سکیں گے۔ صرف نشتر اسپتال ہی اس قدر وسیع و عریض ہے کہ اگر ہم اس میں داخل مریضوں کو فرداً فرداً دیکھنے لگتے تو ہمیں کم از کم ہفتہ بھر وہیں لگ جاتا۔ اس کے علاوہ بھی ملتان میں بے شمار چھوٹے بڑے کلینک اور میڈیکل سینٹرز ہوں گے۔ ہم کس کس جگہ جا کر چھان بین کرتے۔ بالآخر میں نے اپنے خدشات کو ان دونوں کے سامنے ظاہر کر ہی دیا۔

’آپ لوگوں کو یقین ہے کہ ہم اتنے بڑے شہر میں اپنے مطلوبہ شخص کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟‘

’پورے یقین کے ساتھ تو کوئی بھی بات کہنا ممکن نہیں ہے بھائی تاہم اگر ہم لوگ صورت حال کی مناسبت سے اور صحیح طریقہ کار کے مطابق اپنا کام کریں تو کامیابی کے روشن امکانات ہیں۔ اگر ہم اپنے مطلوبہ شخص کو نہیں بھی ڈھونڈ پائے تو کم از کم اتنی یقین دہانی حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے کہ اس شخص کو ملتان کے کسی اسپتال میں نہیں رکھا گیا ہے۔ ویسے اس کا امکان ذرا کم ہی ہے کہ وہ لوگ اس شخص کو اتنی تشویش ناک حالت میں ادھر ادھر لیے پھر رہے ہوں گے۔ البتہ یہ امکان قوی تر ہے کہ اس کے زخم کی نوعیت کو چھپانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سلسلے میں وہ یقیناً ڈاکٹروں کی مدد لیں گے۔‘

اس وقت تو میں نہیں سمجھ سکا کہ ’تلاش کے صحیح طریقہ کار‘ سے صدیقی کی مراد کیا ہے لیکن جب نشتر اسپتال سے ہم نے اپنی مہم کا آغاز کیا تو یہ بات مجھ پر پوری طرح واضح ہو گئی۔ ہم لوگ نشتر اسپتال پہنچے تو ان دونوں کے سروس کارڈ کی ایک جھلک نے تمام دروازے کھول دیے۔ صدیقی نے براہ راست اسپتال کے دفتر استقبالیہ کا رخ کیا۔ وہاں پر موجود منشی نما شخص نے جب صدیقی اور مرزا کے سرکاری محکمے کا نام سنا تو وہ چرمر ہو کر رہ گیا۔ صدیقی نے اسے سختی سے تنبیہہ کی کہ اس معاملے کی کسی کو خبر نہ ہو۔ صدیقی کی ہدائیت پر عمل کرتے ہوئے اس شخص نے اس رات اور اگلے دن اسپتال میں داخل کیے جانے والے مریضوں کا ریکارڈ سامنے لا کر رکھ دیا۔ صدیقی نے سب سے زیادہ توجہ شعبہ حادثات کے مریضوں پر دی۔ شعبہ حادثات میں لائے جانے والے مریض کی عمر‘ حادثے کا شکار ہونے کی صورت میں زخموں کی نوعیت‘ اس کا اقامتی پتہ۔۔۔۔ صدیقی کسی تیز مشین کے مانند مریضوں کے کوائف کا جائزہ لیتا رہا۔ ایک کے بعد ایک مریض غیر مشکوک قرار دے کر نظر انداز کیا جاتا رہا۔ آخر میں جا کر صرف دو ایسے مریض باقی بچے جن کی کسی نہ کسی حد تک ہمارے مطلوبہ شخص سے مماثلت تھی۔ صدیقی نے ان کے وارڈ اور بیڈ نمبر نوٹ کر کے نئے پرانے مریضوں‘ خصوصاً زخمی مریضوں کی فہرست پر گہری نظر ڈالی۔ اس کے

بعد صدیقی نے ان مریضوں کی فہرست طلب کر لی جنہیں اسی رات اور اس کے بعد والے دنوں میں اسپتال کے بلڈ بنک سے خون مہیا کیا گیا۔ اس فہرست سے بھی صدیقی نے چند مریضوں کے نام اور بیڈ نمبر مع وارڈ نمبر نوٹ کر لیے۔ جب ہم دفتر استقبالیہ سے نکلے تو ہمارے پاس صرف چھ نام تھے۔

'دیکھا بھئی ذوالفقار علی یہ ہفتوں کا کام کیسے چند منٹوں میں ہو گیا اور مرزا تم بھی ذرا ہوشیار ہو جاؤ' ہمیں کسی بھی وقت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ ان لوگوں نے اسے بے یار و مددگار نہیں چھوڑا ہوگا۔' صدیقی نے اپنے ساتھی کو خبردار کیا۔

'تم فکر نہ کرو۔ میں ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار ہوں۔' مرزا نے اپنے کوٹ کے نیچے پوشیدہ ہولسٹر کو تھپتھپاتے ہوئے کہا پھر ایک وارڈ کے دروازے کے قریب پہنچ کر وہ دونوں ٹھہر گئے۔ میں نے استفہامیہ نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

'فی الحال ہم تینوں کا ایک ساتھ دیکھا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو وہ لوگ کھٹک جائیں۔ ابھی تم اکیلے اس وارڈ میں جاؤ۔ دونوں مریضوں کے بیڈ نمبر تو تمھیں معلوم ہیں ہی۔ خاموشی سے ان دونوں کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے سیدھے نکلتے چلے جاؤ۔ وارڈ کے دوسرے دروازے پر ہم تمھارے منتظر ہوں گے۔ یاد رہے کہ تمھیں خود کسی قسم کا ردعمل ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'

میں اثبات میں سر ہلا کر وارڈ میں داخل ہو گیا۔ میرا پہلا مطلوبہ شخص مجھے سامنے ہی نظر آ گیا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے اور بھاری بھرکم جسم کا گورا چٹا شخص تھا۔ اس کے کولہے سے ذرا اوپر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے کروٹ کے بل گہری نیند میں غرق نظر آیا۔ میں نے پہلی ہی نظر میں اسے فہرست سے خارج کر دیا۔ اس میں اور ہمارے مطلوبہ شخص میں کوئی مماثلت نہ تھی۔ وارڈ میں مزید آگے بڑھنے کے بعد میں نے دوسرے مریض کو بھی ڈھونڈ نکالا۔ وہ تقریباً ستر برس کا ایک بلوچ بوڑھا تھا۔ اس کی سفید داڑھی اور سفید پٹوں کو دیکھ کر مجھے بے اختیار فقیر بابا یاد آ گیا۔ فقیر بابا کی مانند وہ بھی دبلا پتلا اور کشیدہ قامت شخص تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ مجھے اس کے دائیں شانے پر پٹیوں کی موٹی تہہ نظر آئی۔ اس بوڑھے مریض کے بیڈ کے ساتھ پڑی ہوئی بنچ پر بلوچی لباس میں ملبوس ایک باریش نوجوان اپنے ہاتھ سے اپنا چہرہ ڈھانپے سو رہا تھا۔ وہ بوڑھا شخص بھی یقیناً شک اور شبہ سے بالاتر تھا۔ میں نے پیار بھری نظر اس کے پرنور چہرے پر ڈالی اور خراماں خراماں چلتا ہوا وارڈ کے دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔ صدیقی اور مرزا مجھے وارڈ کے دوروازے کے قریب ہی مل گئے۔ ان کے چہرے پر اعصابی تناؤ کے آثار نمایاں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دونوں تیزی سے میری طرف بڑھے 'ہاں بھئی بتاؤ کیا رپورٹ ہے؟' صدیقی نے پرہیجان لہجے میں پوچھا۔ مجھے اس کی نوکیلی انگلیاں اپنے بازو کے گوشت میں پیوست ہوتی محسوس ہوئیں۔ میں نے قدرے شگفتہ لہجے میں انہیں بتایا۔

'ان دونوں میں سے کوئی ہمارا مطلوبہ شخص نہیں ہے۔ پہلے والا تو شاید کوئی پہلوان ہے جو اکھاڑے میں چوٹ کھا کر یہاں آن پڑا ہے جبکہ دوسرا بندہ ستر پچھتر سال کا ضعیف بلوچ ہے۔ اس پر تو کسی قسم کا شک کرنا حماقت ہوگی۔'

'اوہ۔۔۔۔۔ تو یہ بات ہے۔' صدیقی نے اپنے سینے میں رکی ہوئی سانس باہر نکالتے ہوئے کہا۔ 'تو گویا ان دونوں میں سے کوئی بھی ہمارا شخص نہیں ہے۔ ویسے ہمیں زیادہ شک دوسرے مریض پر تھا۔ کیونکہ اسے رائفل کی گولی سے زخمی کیا گیا ہے۔ گولی اس کے دائیں شانے میں عقب سے داخل ہوئی اور سوراخ کرتی ہوئی سامنے سے نکل گئی۔ اس طرح اس کے شانے میں دوہرا زخم ہے۔'

'ان بڑے میاں کا تعلق کسی آزاد قبائلی علاقے سے ہوگا۔ آتشیں ہتھیار تو ان لوگوں کے لیے کسی کھلونے کی مانند ہیں۔ خوشی کی کوئی معمولی سی خبر ملتے ہی ان کے ہتھیاروں کے منہ کھل جاتے ہیں۔ ہوائی فائرنگ کی برسات سے آسمان چھلنی ہونے لگتا ہے ایسے ہی کسی موقع پر کوئی آوارہ گولی بہک کر اس کے شانے میں گھس گئی ہوگی۔' میں نے اپنی رائے ظاہر کی۔

'میرے خیال میں ایسا ہی ہوا ہوگا۔ خیر چلو ایک نظر باقی لوگوں پر بھی ڈال لیتے ہیں۔' صدیقی نے میری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

میں نے صدیقی کے بتائے ہوئے دیگر بیڈ نمبرز پر موجود مریضوں کا فرداً فرداً بغور جائزہ لیا لیکن مجھے ان میں اپنے مطلوبہ شخص کی معمولی سی جھلک بھی نظر نہ آئی۔ میں نے صدیقی اور مرزا کو یہ اطلاع دی تو ان کے چہروں سے مایوسی جھلکنے لگی۔ 'چلو چل کر باقی جگہوں کا بھی جائزہ لے لیں۔ شاید کوئی نتیجہ نکل آئے۔' صدیقی نے پژمردہ لہجے میں کہا۔

اس رات ہم لوگوں نے ملتان کے بے شمار اسپتال میڈیکل سنٹرز اور کلینک کھنگال ڈالے لیکن ہمیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ صبح کے چھ بجے ہم تھکے ہارے اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔ وہ دونوں مجھے ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ میں منہ ہاتھ دھونے کے لیے کمرے سے ملحق باتھ روم میں داخل ہوا۔ تب مجھے خیال آیا کہ میرے چہرے پر میک اپ موجود ہے۔ میں نے سوچا کہ مرزا کو بلاؤں لیکن پھر میں نے اپنا یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ غریب تو شاید اس وقت گہری نیند سو چکا ہوگا۔ اسے اس وقت تکلیف دینا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔'

میں نے اپنے لبوں پر موجود مونچھوں کے ساتھ تھوڑی سی کھینچا تانی کی تو وہ اکھڑ کر میرے ہاتھوں میں آ گئیں۔ نتھنوں سے اسپرنگ نکالنے میں بھی مجھے کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ میں نے مونچھوں اور اسپرنگوں کو ایک کاغذ میں لپیٹ کر نہایت احتیاط سے ایک طرف رکھ دیا۔ صابن سے منہ دھونے کے بعد میرے اوپری لب پر سے چپکنے والے لوشن کی تہہ بھی ختم ہو گئی۔

میں منہ ہاتھ دھو کر کمرے میں آیا تو میں نے دیکھا کہ صدیقی کاغذات کا ایک چھوٹا سا پلندا کمرے کی میز پر بھول گیا ہے۔ میں نے ان کاغذات پر نگاہ ڈالنا چاہی لیکن میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ میں بستر پر پہنچا تو چند لمحوں کے اندر اندر مجھ پر گہری نیند کا غلبہ ہو گیا۔

دن کے گیارہ بجے میری آنکھ کھل گئی۔ اس اثناء میں احسن صدیقی اور جمیل مرزا بھی بیدار ہو چکے تھے۔ ہم نے اکٹھے ناشتا کیا۔ ناشتے کے بعد وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ 'ہم دونوں کو ایک ضروری کام کے سلسلے میں اسلام آباد جانا ہے۔ ہماری فلائٹ ایک بجے روانہ ہوگی۔ ہم رات کی فلائٹ سے واپس آ

جائیں گے۔ تب تک تم آرام کرو،' صدیقی نے کہا۔

'مجھے بھی اپنے چند ذاتی کام نمٹانے ہیں۔ اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں چلا جاؤں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ رات تک واپس آ جاؤں گا۔' میں نے اپنے لہجے کو جان بوجھ کر مودبانہ بناتے ہوئے کہا۔

ان دونوں نے متذبذب انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ 'ہمیں تمھارے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن ہمیں امید ہے تم ہمارے اعتماد کو دھوکا نہیں دو گے۔ ہمیں اب بھی تمھارا بھرپور تعاون درکار ہے۔ ملتان کے آس پاس کے شہروں کے اسپتالوں وغیرہ میں تمھارے بیان کردہ حلیے کے مالک شخص کی تلاش زور شور سے جاری ہے۔ جیسے ہی کسی مشکوک شخص کے متعلق اطلاع ملی، ہم تمھیں فوری طور پر وہاں لے کر جائیں گے تاکہ تم اسے شناخت کر سکو۔ نیز پولیس بھی پوری سرگرمی سے ان لوگوں کو تلاش کر رہی ہے۔ کسی بھی وقت ہمیں تمھاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ہم تمھارے متعلق اپنے اوپر والے حکام کو اطلاع بھیج چکے ہیں۔ اگر تم غائب ہو گئے تو ہمیں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔'

'آپ فکر نہ کریں صدیقی صاحب۔ میری ذات سے آپ لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں انشاءاللہ رات کو آپ لوگوں کے واپس لوٹنے سے پہلے یہاں پہنچ جاؤں گا۔'

ان دونوں نے مجھے اپنی گاڑی میں نزدیکی بڑی سڑک پر چھوڑ دیا۔ میں نے ایک رکشا پکڑا اور حسین آگاہی کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نور جہاں بیگم کے گھر پہنچا۔ مجھے دیکھ کر وہ لوگ خوشی سے باغ باغ ہو گئے۔ نور جہاں بیگم نے مجھے بتایا کہ سردار خضر خان اور عنبرین کے نکاح کی تمام تیاریاں مکمل ہیں۔ کچھ ہی دیر میں سردار خضر خان آنے والا ہے۔ اس کے بعد یہ مبارک فرض بھی ادا ہو جائے گا۔ یہ سب سن کر عنبرین شرم کے مارے، گھر کے جانے کس کونے کھدرے میں جا چھپی۔

'میں نے عنبرین کی شادی کی خبر تمام لوگوں سے پوشیدہ رکھی ہے۔ سلامت علی اپنے ایک واقف نکاح خواں کو عین وقت پر لے آئے گا۔ شام کو ہم عنبرین کو رخصت کر دیں گے۔ دراصل میں نہیں چاہتی کہ یہ خبر اس منحوس رنگو استاد کے کانوں تک پہنچے اور وہ کوئی فساد کھڑا کرے۔' نور جہاں بیگم نے رازدارانہ لہجے میں مجھے بتایا۔

'تم نے بالکل ٹھیک کیا نور جہاں بیگم، اس مبارک موقع پر کوئی بدمزگی نہیں ہونی چاہیے۔ آج ہم سردار خضر خان کی امانت اس کے حوالے کر دیں گے۔ اس کے بعد یہ جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا۔' میں نے کہا۔

پروین اور چھیمو بی نے عنبرین کو شادی کا سرخ جوڑا پہنا کر اس کا ہلکا پھلکا میک اپ کر دیا۔ دلہن کے روپ میں عنبرین آسمان سے اتری ہوئی حور نظر آ رہی تھی۔ نور جہاں بیگم نے اس کا صدقہ اتار کر چٹ چٹ کر کے اس کی بلائیں لے لیں۔ عنبرین نے ایک بار میری طرف دیکھا پھر شرما کر سر جھکا لیا۔

کچھ دیر بعد سردار خضر خان بھی پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ صرف اس کا دست راست لاکھو تھا۔ کچھ دیر بعد شیخ سلامت علی ایک نکاح خواں کے ساتھ پہنچ گیا۔ نور جہاں بیگم کی ہدائیت کے عین مطابق بلا تاخیر سردار خضر خان اور عنبرین کا نکاح پڑھا دیا گیا۔ سردار خضر خان نے ایک بھاری رقم بطور مہر درج کروائی۔

نکاح کے بعد سب لوگوں نے سردار خضر خان کو مبارک باد دی۔ سردار خضر خان دیر تک مجھے اپنے سینے سے جکڑے کھڑا رہا۔ 'تم نے میرا بھائی ہونے کا حق ادا کر دیا ہے ذوالفقار علی شاہ! میں تمھارا یہ احسان ساری عمر نہیں بھولوں گا۔' سردار خضر خان نے بھیگی ہوئی آواز میں میرے کان میں سرگوشی کی۔

'آپ مجھے اپنا بھائی بھی کہتے ہیں اور دوسری طرف احسان کی بات بھی کرتے ہیں۔ یہ آپ کی کون سی ادا ہے؟'

'اچھا اچھا اب ایسا نہیں ہوگا۔ خیر تم یہ بتاؤ تمھیں کوئی مسئلہ تو درپیش نہیں ہے؟'

خداوند ذوالجلال کا بڑا شکر ہے بھائی صاحب؟ وہ ہر مشکل سے نجات دلانے والا ہے۔' میں نے کہا۔ چھیمو بی نے نہایت پرتکلف کھانے سے سب لوگوں کی تواضع کی۔ کھانے کے بعد شیخ سلامت علی نکاح خواں کے ساتھ گھر سے باہر نکل گیا۔ میں سردار خضر خان اور لاکھو کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ ہم لوگ دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔ میں نے چھیمو بی کو کہہ کر بازار سے اس دن کا اخبار منگوا لیا۔ اخبار ہاتھ میں آتے ہی میری آنکھیں تیزی سے اپنی مطلوبہ خبر ڈھونڈنے لگیں۔ مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ جلد ہی مجھے وہ خبر نظر آ گئی۔ خبر کی سرخی پڑھتے ہی میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ ممتاز سیاسی و سماجی رہنما ڈاکٹر خان رفاقت علی خان دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔'

میں نے اپنی بے پناہ مسرت پر قابو پاتے ہوئے خبر کی تفصیل پر نگاہ ڈالی۔ سب کچھ میری مرضی اور توقع کے عین مطابق ہوا تھا۔ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق رفاقت علی کے بڑے بھائی برکت علی کا بھی تذکرہ کیا تھا جو کچھ عرصہ پہلے 'ڈاکوؤں' کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ خبر کا یہ حصہ پڑھ کر بے اختیار میرے لبوں پر مسکراہٹ رینگنے لگی۔ سردار خضر خان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

'ایسی کون سی خبر پڑھ لی بھائی کہ لبوں پر پھول کھل رہے ہیں؟'

میں نے ادھر ادھر کی کہہ کر اسے ٹال دیا۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ میں دو یکساں طور پر بدفطرت بھائیوں کی موت کا ذکر پڑھ کر مسکرا رہا ہوں۔ قسمت کی یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ یہ دونوں بھائی یکے بعد دیگرے میرے ہی ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے۔

دونوں ہی دولت کے زعم میں انسانیت کی ہر قدر کو نیست و نابود کرنے پر تلے رہتے تھے لیکن دونوں ہی کی دولت ان کے کسی کام نہ آ سکی پھر میرا دماغ فقیر بابا کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس خبر کے چھپنے کے بعد اسے آزاد کر دیا جائے گا۔ وہ ایک بار پھر کھلی فضا میں سانس لے سکے گا۔ زندگی نے موقع دیا تو کبھی نہ کبھی تو ہم دونوں مل ہی جائیں گے۔ اگر میں کسی طرح ڈیرہ غازی خان واپس پہنچ گیا تو پھر تو میں اسے کسی نہ کسی طرح ڈھونڈ ہی نکالوں گا۔ اس کے کئی ٹھکانے میرے علم میں ہیں۔ انہیں میں سے کسی ٹھکانے پر وہ دھونی رمائے بیٹھا ہوگا۔ ہم دونوں مل کر ایک بار پھر اپنی زندگی کے پیچ و خم دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہی کچھ سوچتے ہوئے میں نے سردار خضر خان اور لاکھو پر نگاہ ڈالی۔ میں نے دیکھا کہ وہ دونوں سو چکے ہیں۔

مجھے سردار خضر خان کے باریش چہرے پر ایسا سکون نظر آیا جیسے وہ جلتے صحرا کو عبور کر کے ٹھنڈے

حیات بخش نخلستان میں پہنچ گیا۔ وہ اپنی منزل پانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میرے دل سے بے اختیار دعا نکلی کہ اے میرے مالک سچے مجھے بھی میری منزل تک پہنچا دے۔ میں بھی تپتی ریت پر ننگے پاؤں چلتے چلتے جان بہ لب ہو رہا ہوں یک لخت میرے دماغ میں سوچ کی ایک خاردار لہر ابھری۔ میں اپنے لیے منزل کی دعا تو مانگ رہا ہوں لیکن میری منزل ہے کہاں؟ کیا میری ہیر کا حصول میری منزل ہے؟ لیکن پھر مہراں کا کیا بنے گا؟ اور میری وہ قسم کہ میں اپنے باپ کے قاتلوں کو تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔۔۔ اس قسم کا کیا بنے گا؟ وہ بدبخت ڈاچی سوار تو اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے لیکن کیا میں اس سیاہ کار عورت کو معاف کر دوں جو میری رگوں میں تیزاب بھر کر خود اس اونچی حویلی کی سنگین دیواروں کے پیچھے جا چھپی ہے؟ جانے کیوں اس لمحے مجھے اس عورت کے متعلق سوچ کر اپنے خون میں آگ بھرتی محسوس نہ ہوئی۔ شاید میرے سینے میں بھڑکتا آتش فشاں سرد پڑنے لگا تھا۔

شام ہوتے ہی عنبرین کی رخصتی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ جہیز کا تو خیر کوئی سوال ہی نہ تھا البتہ نور جہاں بیگم اپنے پاس جمع شدہ عنبرین کی رقم اس کے حوالے کرنا چاہتی تھی۔ لیکن عنبرین نے ایک پیسا بھی لینے سے انکار کر دیا۔ سردار خضر خان نے رخصت ہونے کی اجازت طلب کی تو عنبرین نور جہاں بیگم سے لپٹ کر ایسی روئی کہ وہاں موجود تمام لوگوں کے دل بھر آئے۔ چھیمو بی اور پروین بھی بلک بلک کر رونے لگیں۔ میں نے بھاری دل کے ساتھ عنبرین کو خاموش کرانا چاہا۔

'بس کر میری بہنا' ان آنسوؤں کو اب روک لے۔' میں نے شاید پہلی بار عنبرین کو بہن کہا۔ میری زبان سے بہن کا لفظ سن کر عنبرین مزید بے قابو ہو گئی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دینا چاہی تو وہ میرے سینے سے آ لگی۔

'بھیا میرے بھیا۔۔۔ خدا کے لیے ایک بار اور مجھے بہن کہو۔' اس نے زارو قطار روتے ہوئے کہا۔

'جتنا رونا ہے ابھی رو لے میری بہنا۔ خدا کرے پھر کبھی تیری آنکھوں میں آنسو نہ آئیں۔' میرے مسلسل تسلی دینے پر اس کا جی کسی قدر قابو میں آیا۔ میں عنبرین کو سردار خضر خان کی گاڑی تک چھوڑنے گیا۔ عنبرین کو گاڑی میں بٹھانے کے بعد سردار خضر خان نے مجھے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔

'میں تو تمھیں اپنا بھائی بنانے چلا تھا لیکن تم تو میرے سالے بن بیٹھے۔' سردار خضر خان نے شریر لہجے میں کہا۔

'جی ہاں اب آپ مجھے ساری دنیا سے بڑھ کر قیمتی سمجھیں بھائی صاحب کیونکہ وہ مثل تو آپ نے سنی ہی ہو گی کہ ساری خدائی ایک طرف اور جورو کا بھائی۔۔۔۔'

'ٹھیک ہے سالے صاحب ہم تمھاری یہ بات یاد رکھیں گے۔ ویسے تم اپنی بہن کے گھر کب آ رہے ہو؟'

'انشاء اللہ بہت جلد۔ بس آپ میری بہن کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیں کیونکہ۔۔۔۔'

'بس بھائی اب سالے ہی رہو سسر نہ بنو۔' سردار خضر خان نے شریر لہجے میں کہا۔

'بڑا بھائی باپ کی جگہ ہوتا ہے سردار صاحب لہٰذا آپ مجھے اپنے سسر کی جگہ سمجھیں۔' میں نے ترت جواب دیا۔

'بہت خوب' سردار خضر خان نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا' اس کا مطلب ہے مجھے واقعی محتاط رہنا پڑے گا۔' سردار مجھ سے مصافحہ اور معانقہ کر کے گاڑی میں جا بیٹھا۔ اس کے ساتھ ہی لاکھو نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ لوگ آج رات ہوٹل میں ٹھہریں گے لیکن میں نے ان کے ساتھ ہوٹل تک جانا مناسب نہ سمجھا۔ گاڑی میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں خاصی دیر وہاں کھڑا رہا پھر میں تھکے تھکے قدموں سے گھر کی طرف بڑھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے واقعی اپنی سگی بہن کو الوداع کہا ہو۔ بھرے دل لیکن ہلکے شانوں کے ساتھ میں گھر پہنچا۔ ہم لوگ خاصی دیر تک عنبرین کے متعلق باتیں کرتے رہے پھر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ نور جہاں بیگم اور پروین نے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن اب میں وہاں رک کر کیا کرتا؟ میں ان سے اجازت لے کر گھر سے نکل آیا۔

لو ایک اور کہانی اپنے انجام کو پہنچی۔ خدا کرے کہ یہ جوڑی ہمیشہ خوش و خرم رہے۔ یہ سب سوچتے ہوئے میں نے ٹیکسی پکڑی اور صدیقی اور مرزا کے بنگلے پر جا پہنچا۔ ظہیر الدین نامی اس دراز قد جوان نے مجھے بتایا کہ صدیقی اور مرزا ابھی تک اسلام آباد سے واپس نہیں پہنچے ہیں۔ وہ شاید اب کل صبح کسی وقت ملتان پہنچیں۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ کر ادھر ادھر کی باتیں سوچتا رہا۔ بنگلے میں ٹیلی فون موجود تھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ ملک رحیم سے فون پر بات کر کے تازہ ترین صورت حال پر بات کی جائے۔ میرے پاس ملک رحیم کا فون نمبر تو موجود تھا ہی۔ میں نے اس کے گھر کا نمبر ملایا۔ اتفاق سے فون ملک رحیم نے ہی اٹھایا۔ 'ہیلو۔۔ ملک رحیم؟ میں ذوالفقار علی خان بات کر رہا ہوں۔'

'آپ کہاں گم ہیں بھائی۔ میں آج سارے دن سے آپ کے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔'

'کیوں خیریت تو ہے ملک رحیم؟ ان لوگوں نے تم سے فون پر رابطہ تو قائم نہیں کیا؟' میں نے پر تجسس لہجے میں سوال کیا۔

'ارے نہیں بھائی۔۔۔ ان لوگوں نے کسی قسم کا رابطہ نہیں کیا البتہ ایک ایک اور منحوس خبر مجھ تک پہنچی ہے۔' مجھے ملک رحیم کے لہجے میں مایوسی کا عنصر محسوس ہوا۔

'کیا ہوا بھائی؟ وہ کون سی منحوس خبر ہے؟'

'آج دوپہر کو ہمارے گاؤں سے ایک بندہ میرے پاس پہنچا ہے۔ اس نے اطلاع دی ہے کہ بھائی صاحب جب پچھلی بار گاؤں گئے تھے تو انہوں نے پانچوں قیدیوں کو کسی ایسی جگہ منتقل کر دیا تھا جس سے حویلی کا کوئی ملازم واقف نہیں۔ حتیٰ کہ بھائی صاحب نے اس جگہ کی اطلاع اپنے منیجر کو بھی نہیں دی۔'

'کیا اس جگہ کا تمھیں بھی پتا نہیں ہے؟' میں نے پوچھا۔

'یہی تو مصیبت ہے بھائی' میں بھی اس جگہ سے واقف نہیں ہوں۔ اگر اب ان لوگوں کا فون آ گیا تو میں ان سے کیسے سودے بازی کر سکوں گا۔۔۔'

ملک رحیم کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا پھر میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ’فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے ملک رحیم؟ اگر وہ لوگ فون پر تم سے رابطہ قائم کریں تو تم ان سے کہنا کہ وہ پہلے تمھارے بھائی سے تمھاری بات کرائیں۔ اس طرح تمھیں اپنے بھائی کی خیریت بھی معلوم ہو جائے گی۔‘

’ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گا لیکن وہ کتے کے بچے مجھ سے رابطہ تو قائم کریں۔ میں تو تنگ آ گیا ہوں‘ فون کے پاس بیٹھے بیٹھے۔‘ اس نے بیزار لہجے میں کہا۔

’صبر کرو ملک رحیم یہ بہت پیچیدہ معاملہ ہے۔ اس میں بے حد تحمل اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ مزید کچھ باتیں کرنے کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔ تب مجھے یاد آیا کہ ملک رحیم کا فون ریکارڈ کیا جا رہا ہے۔ میرے فون سے کہیں ان کے معاملے میں خلل نہ پڑے۔ ایسا نہ ہو کہ صدیقی اور مرزا میری اس حرکت سے ناراض ہو جائیں؟ پھر میں نے یہ اندیشہ اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ میں مرزا اور صدیقی کا زر خرید غلام تو نہیں ہوں کہ ان کی انگلیوں کے اشارے پر ناچتا رہوں۔ ویسے بھی میں نے ملک رحیم سے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے انہیں کوئی نقصان پہنچے بلکہ انہیں اس کال سے کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوگا۔ اس کے علاوہ میں صدیقی اور مرزا سے اپنے اس فعل کی وضاحت بھی کر دوں گا۔ صدیقی اور مرزا تو اب صبح کو ہی آتے لہٰذا میں وقت گزاری کے لیے کچھ دیر ٹی وی دیکھتا رہا۔ اس کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ بستر پر لیٹنے کے کچھ ہی دیر بعد مجھے نیند نے آن دبوچا۔

اگلی صبح بہت سویرے میری آنکھ کھل گئی۔ اخبار کے آنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب یہ وقت کیسے گزارا جائے۔ اسی وقت میری نظر کاغذات کے اس پلندے پر پڑی جو صدیقی اسپتالوں کی چھان بین کے بعد میرے کمرے کی میز پر ہی چھوڑ گیا تھا۔ ان کاغذات پر ان مریضوں کے کوائف درج تھے جنہیں مشکوک سمجھا گیا لیکن چھان بین کے بعد وہ معصوم ثابت ہوئے۔ میں نے محض وقت گزاری کے لیے ان کاغذات کو اٹھا لیا۔ ان مریضوں میں سے کچھ ملتان شہر کے رہنے والے تھے جبکہ کچھ کا تعلق آس پاس کے علاقوں میں سے تھا۔ ان کاغذات پر سرسری نگاہ دوڑاتے ہوئے میری آنکھیں ایک مریض کے کوائف پر جم گئیں۔ یہ وہی بوڑھا بلوچ تھا۔ جسے میں نے نشتر اسپتال میں دیکھا تھا۔ اس مریض کا بیڈ نمبر مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ میں نے اس مریض کے نام پر نگاہ ڈالی۔۔ در محمد ملغانی۔۔ عمر پینسٹھ سال۔۔۔ میری نظر کاغذ پر پھسلتی ہوئی اس کے اقامتی پتے پر پڑی۔ اس کے گاؤں کا نام پڑھتے ہی میں بری طرح چونک پڑا۔۔۔ یہ پتا تو میرے اپنے۔۔۔ گاؤں کا ہے۔۔۔ گویا یہ اسی گاؤں نما قصبے کا ساکن ہے جہاں کا میں رہنے والا ہوں لیکن آخر یہ ہے کون؟ گاؤں کا کون سا شخص ہے جس سے میں ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں؟ میرے گاؤں میں تو اس نام اور اس شکل و صورت کا کوئی بوڑھا آدمی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے یہ شخص حال ہی میں وہاں آ کر رہنے لگا ہو۔۔۔ میرے گاؤں چھوڑنے کے بعد۔۔۔ ہاں ممکن تو ہے لیکن۔۔۔۔

میں نے ایک بار پھر اس شخص کے پتے پر نگاہ ڈالی۔ شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔۔۔ گاؤں کے

ساتھ ساتھ تحصیل اور ضلع کا نام بھی وہی ہے۔ خیر ہوگا کوئی مجھے اس میں سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے اس کا خیال اپنے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن مجھے یوں لگا جیسے وہ نام میرے ذہن میں پھانس بن کر چبھ گیا ہو۔ میں نے ایک بار اس شخص کی صورت اپنے ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کی۔ نہیں میں نے اس سے پہلے اس شخص کی شکل کبھی نہیں دیکھی! میں نے اس شخص کے ہمراہ نوجوان شخص کا چہرہ یاد کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا کیونکہ جس وقت میں نے اس کو دیکھا وہ اپنے بازو سے اپنا چہرہ ڈھانپے ہوئے تھا۔ میں خاصی دیر تک صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ تھک ہار کر میں نے اپنی کوشش ترک کر دی۔

ظہیر کے ساتھی بشارت نے مجھے ناشتے کے ساتھ اخبار بھی مہیا کر دیا۔ وہ دونوں ہی مجھ سے کوئی فالتو بات کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ میں نے بھی عمداً ان دونوں سے تعلقات بڑھانے کی کوشش نہ کی۔ اس روز کے اخبار میں بھی ملک کریم کے اغوا کے متعلق ایک دو مختصر خبریں موجود تھیں۔ سردار شاہ مراد نے ایک مرتبہ پھر ملک کریم کے اغوا کے سلسلے میں ایک زبردست بیان جاری کیا تھا۔ جس میں حکومت پر شدید تنقید کی گئی تھی کہ وہ ابھی تک ملک کریم کو بازیاب نہیں کرا سکی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ سردار شاہ مراد کو اپنی پارٹی کے ترجمان کی سی حیثیت حاصل ہے نیز یہ کہ وہ اس واقعے سے فائدہ اٹھا کر حکومت کو زیادہ سے زیادہ لعن طعن کا نشانہ بنانا چاہتا ہے۔

دوپہر کے بارہ بجے کے قریب صدیقی اور مرزا واپس آ گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ دونوں قدرے پژمردہ اور مایوس سے نظر آ رہے ہیں۔ ’خیریت تو ہے صدیقی صاحب! آپ لوگ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں؟‘ میں نے استفسار کیا۔

’کچھ ایسی ہی بات ہے بھائی۔۔ اوپر سے احکام آئے ہیں کہ ہر قیمت پر اور جلد از جلد ملک کریم کو اغوا کرنے والے افراد کو گرفتار کیا جائے اور ملک کریم کو بازیاب کرایا جائے۔ جب ہم نے میٹنگ میں رپورٹ دی کہ ہم ابھی تک کسی قسم کی کامیابی حاصل نہیں کر سکے ہیں تو ہمیں سخت سست کہا گیا۔ اگر ہم جلد ہی ملک کریم کا سراغ لگانے میں کامیاب نہیں ہوئے تو ہمارا کیریر داؤ پر لگ سکتا ہے۔ خیر تم بتاؤ۔ اب تک کیا کرتے رہے ہو؟ ان لوگوں تک پہنچنے کا کوئی راستہ سمجھ میں آیا یا نہیں؟‘

’میں نے ملک کریم کے بھائی ملک رحیم سے بات کی تھی۔ اس نے بتایا ہے کہ اس کے بھائی نے مغویان کو کسی ایسی جگہ منتقل کر دیا تھا جہاں کا پتہ ملک کریم کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں ہے‘ ایسی صورت حال میں اگر انہوں نے ملک کریم سے مغویان کا اتا پتا معلوم کر لیا تو ہمیں پتا بھی نہیں چلے گا اور وہ لوگ مغویان کو آزاد کرا لیں گے۔‘

’اس خطرے کا سدباب کرنے کے لیے ہم نے کچھ انتظام کیے ہیں۔ ملک کریم کے گاؤں اور اس کے آس پاس کے بہت دور تک کے علاقے کی اس طرح ناکہ بندی کی گئی ہے کہ ان مغویان کو منتقل کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ تلاشی کے بغیر کسی قسم کی گاڑی چند کلومیٹر کا فاصلہ بھی طے نہیں کر سکتی۔‘ صدیقی نے مضطرب لہجے میں مجھے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن مجھے احساس ہوا کہ وہ اپنے ان

انتظامات سے دلی طور پر مطمئن نہیں ہے۔اس ناکہ بندی کے لیے انہیں پولیس کی خدمات حاصل کرنا پڑی ہونگی اور پولیس کی کارکردگی سے وہ خود بھی بخوبی واقف رہا ہوگا۔اس وقت مجھے اس بوڑھے بلوچ مریض کا خیال آیا۔میں نے مناسب یہی سمجھا کہ ان دونوں کو بھی اپنی الجھن سے آگاہ کر دوں۔میری بات سن کر ان کے چہرے پر شدید الجھن اور ادھیڑ بن کے آثار نمایاں ہونے لگے۔'کیا تمھیں پوری طرح یقین ہے کہ تم نے اس شخص کو کبھی بھی اپنے گاؤں میں یا آس پاس کے علاقے میں نہیں دیکھا ہے؟'صدیقی نے پرزور لہجے میں سوال کیا۔

'ہاں مجھے سو فیصد یقین ہے۔'میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔۔۔'گاؤں کی زندگی بہت محدود ہوا کرتی ہے۔مشاغل کی کمی کے باعث تمام لوگوں کے لیے فالتو وقت گزارنا ایک مسئلہ ہوتا ہے چنانچہ اپنے ارد گرد موجود ہر جان دار اور بے جان شے کو گاؤں کے لوگ اپنی گفتگو کا موضوع بنانے پر مجبور ہوتے ہیں۔اس قدر غیر متحرک زندگی میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ گاؤں کا کوئی فرد دوسرے فرد کے لیے انجان ہو۔گاؤں کا ہر باشندہ دوسرے باشندے کے تمام تر ذاتی اور خاندانی کوائف سے آگاہ ہوتا ہے لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص میرے اپنے گاؤں سے تعلق رکھنے کے باوجود میری نظروں میں نہ آیا ہو۔اگر وہ شخص کسی دوسرے نزدیکی گاؤں سے تعلق رکھتا ہے تو اسے ہمارے گاؤں کا حوالہ دینے کی کیا ضرورت ہے؟'

'اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کا پتا عمداً غلط لکھوایا گیا ہے۔مجھے یہ معاملہ کچھ گڑ بڑ دکھائی دیتا ہے۔کیوں نہ ایک بار پھر اسپتال کا چکر لگایا جائے؟'صدیقی نے سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

'میرا بھی یہی خیال ہے صدیقی صاحب۔اس شخص کا معاملہ جلد از جلد صاف ہونا چاہیے۔'میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

'تو پھر دیر کس بات کی؟ چلو ابھی چلتے ہیں۔'مرزا نے کہا۔ہم دونوں نے یک زبان ہو کر اس کی تائید کی۔کچھ ہی دیر بعد ہم لوگ نشتر اسپتال کی طرف رواں دواں تھے۔روانگی سے پہلے صدیقی نے ظہیر کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔تباہ کن آتشیں اسلحے سے تو وہ ہر وقت لیس رہا ہی کرتے تھے۔اس وقت مجھے ان تینوں کا موڈ بہت جارحانہ محسوس ہوا۔گاڑی تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی کچھ ہی دیر میں نشتر اسپتال پہنچ گئی۔ایک بار پھر صدیقی کے سروس کارڈ نے 'کھل جا سم سم کا' کام کیا۔اس بار صدیقی نے کسی بھی ڈاکٹر وغیرہ سے گفتگو کی زحمت گوارا نہ کی۔ہم لوگ تیزی سے چلتے ہوئے اپنے مطلوبہ وارڈ تک پہنچ گئے۔ہم چاروں بلا توقف وارڈ میں گھستے چلے گئے۔وارڈ میں موجود مریضوں نے چونک کر ہماری طرف دیکھا لیکن ہم ان کی حیرت زدہ نظروں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے مطلوبہ مریض کے پاس پہنچ گئے۔میری نظر بیڈ پر موجود مریض پر پڑی تو میں بری طرح چونک پڑا۔میں نے دیکھا کہ بیڈ پر اس بوڑھے کی جگہ ایک آٹھ دس سال کا بچہ دراز ہے۔اس بچے کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔بچے کے پاس موجود ادھیڑ عمر عورت اس کی ماں رہی ہوگی۔ہم چاروں کو اس بیڈ کے قریب رکتے دیکھ کر وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔'کیا بات ہے بھائی؟'اس نے سوال کیا۔

صدیقی اور مرزا نے حیرانی کے عالم میں ایک نظر میرے چہرے اور دوسری بیڈ کے نمبر پر ڈالی۔

ہم تینوں ہی کچھ دیر تک صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ہماری خاموشی نے اس عورت کو مزید پریشان کر دیا۔

'آپ لوگ کون ہو بھائی اور ہم سے کیا چاہتے ہو؟'میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے نرم اور مہذب لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

'آپ پریشان نہ ہوں خاتون دراصل ہم اپنے ایک عزیز کی عیادت کے لیے آئے تھے۔ہمیں اس کا یہی بیڈ نمبر بتایا گیا تھا جس پر آپ کا بچہ موجود ہے۔'

'اچھا۔۔۔۔!یہ تو بڑی حیرت کی بات ہے جی۔'اس عورت نے سادہ دلی سے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

'خاتون آپ کا بچہ کب اس بیڈ پر آیا ہے؟ میرا مطلب اسے آپ کب اسپتال لائی تھیں؟'میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

'وہ جی میں کل شام اپنے پپو کو اسپتال لے کر آئی تھی۔یہ پتنگ اڑاتے ہوئے چھت سے گر گیا تھا۔ڈاکٹر کہتا ہے۔'

'ہمارے پاس وقت بالکل نہیں ہے ذوالفقار۔'صدیقی نے میرا بازو تھام کر میرے کان میں سرگوشی کی۔'اچھا خاتون خدا آپ کے بچے کو صحت دے۔ہم اپنے عزیز کو کہیں اور تلاش کرتے ہیں۔'میں نے اس عورت کی رام کہانی کو منقطع کرتے ہوئے کہا۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی،ہم وہاں سے آگے بڑھ گئے۔صدیقی اب ہم سب سے آگے تھا اور اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔وہ سیدھا اسٹاف روم میں گھستا چلا گیا۔'اس مریض کو کب ڈسچارج کیا گیا ہے؟'صدیقی نے اپنا مختصر تعارف کرانے کے بعد سخت لہجے میں وہاں موجود دونوں نرسوں سے سوال کیا۔وہ دونوں ہی کچھ حواس باختہ سی ہو گئیں۔ان میں سے ایک نے جلدی جلدی ایک رجسٹر کے ورق الٹے اور تقریباً ہانپتے ہوئے کہا۔

'وہ مریض تو جی کل صبح کو ہی ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔'

'کیوں کیا اس کا علاج مکمل ہو گیا تھا؟'صدیقی نے اپنی عقاب جیسی آنکھیں ان دونوں کے چہروں پر گاڑتے ہوئے سوال کیا۔اس کے اس طرح گھورنے سے وہ دونوں مزید گڑ بڑا گئیں۔

'وہ جی۔۔۔۔آپ یہ سب ڈاکٹر صاحب سے پوچھیں،ہمیں تو۔۔۔۔'

'ٹھیک ہے کون سے ڈاکٹر ہیں اس وقت ڈیوٹی پر؟'

'آپ واسطی صاحب سے بات کر لیں۔وہ یہاں کے سینئر ڈاکٹر ہیں۔'

اس نرس کی زبان سے ڈاکٹر واسطی کا نام سن کر مجھے ہلکا سا ذہنی جھٹکا لگا۔یہ وہی تو ڈاکٹر تھا جس نے فالج جیسے عجیب و غریب مرض کی کیفیت میں معائنہ کیا تھا۔مجھے فوراً ہی خیال آیا کہ جلد بازی میں میں بغیر میک اپ یہاں آن دھمکا ہوں۔ڈاکٹر واسطی نے مجھے دیکھا تو ایک لمحے میں مجھے پہچان جائے گا۔میری وجہ سے تو اخبارات میں ان کے اسپتال کے نظام پر سخت لعن طعن کی گئی تھی۔وہ خود بھی میرے اس طرح پراسرار انداز میں غائب ہونے سے پریشان ہو گیا ہوگا۔خدا جانے اس نے اور انسپکٹر نیازی

نے میرے متعلق کیا کیا اندازے قائم کیے ہوں گے۔

'صدیقی آپ تنہا جا کر ڈاکٹر سے بات کریں۔ ہم یہیں ٹھہرتے ہیں۔' ڈاکٹر واسطی کے آفس کے سامنے پہنچ کر میں نے کہا۔

'ٹھیک ہے تم لوگ ادھر ویٹنگ روم میں جا کر بیٹھو۔ میں ڈاکٹر واسطی سے بات کر کے ابھی واپس آتا ہوں۔' صدیقی نے کہا اور ڈاکٹر واسطی کے آفس کی جانب بڑھ گیا۔ میں ظہیر اور مرزا کے ہمراہ ویٹنگ روم کی طرف آ گیا۔ ہم تقریباً بیس منٹ تک وہاں بیٹھے رہے۔ اس دوران میں ہم نے بہت کم بات چیت کی۔ میں نے اس طرح کا انداز نشست کیے رکھا کہ زیادہ تر وقت میری پشت ویٹنگ روم کے دروازے کی طرف رہی۔

صدیقی واپس لوٹا تو مجھے اس کے چہرے پر شدید کشمکش اور الجھن کے آثار نظر آئے۔ اسے ویٹنگ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر ہم نے روانگی کے ارادے سے کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن صدیقی نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں اٹھنے سے منع کر دیا۔

'بیٹھو۔ ابھی بیٹھو۔ میرے خیال میں اس جگہ ہم سکون سے تبادلہ خیال کر سکتے ہیں۔' صدیقی نے ہمارے قریب ہی ایک کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔

'صدیقی صاحب آپ کی ڈاکٹر سے کیا بات ہوئی ہے؟' میں نے قدرے بے چینی سے پوچھا۔

'ڈاکٹر واسطی نے مجھے خاصی عجیب و غریب باتیں بتائی ہیں۔' صدیقی نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ 'اس کا کہنا ہے کہ کل صبح اچانک اس بوڑھے شخص کے چند قریبی عزیز رشتے دار اسپتال پہنچے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اس بوڑھے شخص درمحمد کو ابھی اور اسی وقت ڈسچارج کروا کر لے جانا چاہتے ہیں۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ مریض کی حالت ابھی اس قابل نہیں ہے کہ اسے کہیں لے جایا جا سکے لیکن وہ لوگ ہر قیمت پر اسے لے جانا چاہتے تھے۔ ان کے رویے سے تنگ آ کر ڈاکٹر نے انہیں صاف صاف بتا دیا کہ وہ مریض کو ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ اگر انہوں نے زیادہ شور مچانے کی کوشش کی تو پولیس کو طلب کر لیا جائے گا۔ پولیس کی دھمکی سن کر وہ لوگ خاموشی سے اسپتال سے باہر نکل گئے۔ اس اثناء میں ڈاکٹر واسطی خود بھی ڈیوٹی پر پہنچ گئے۔ انہوں نے بھی اپنے ماتحت ڈاکٹر کے اقدام کو صحیح قرار دیا۔ ڈاکٹر واسطی کا کہنا ہے کہ اسے اسپتال پہنچے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اسے لاہور سے ایک بے حد بااثر اور بارسوخ سیاسی شخصیت کا فون آیا۔ اس سیاسی شخصیت نے ذاتی طور پر ڈاکٹر واسطی سے درخواست کی کہ اس بوڑھے شخص کو ڈسچارج کر دیا جائے کیونکہ اس کے عزیز و اقارب اس کا لاہور کے میو اسپتال میں علاج کرانا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر واسطی کا کہنا ہے کہ وہ اس شخصیت کی بات نہیں ٹال سکا۔ لہٰذا اس نے بوڑھے شخص کو ڈسچارج کر کے اس کے عزیزوں کے حوالے کر دیا جو اسے لے کر فوری طور پر رخصت ہو گئے۔ ڈاکٹر واسطی کا کہنا ہے کہ اس بوڑھے شخص کو اسی سیاسی شخصیت کی سفارش پر اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ وہ بوڑھا شخص کیونکہ گولی سے زخمی ہوا تھا لہٰذا یہ معاملہ پولیس کیس بنتا تھا لیکن اسی شخصیت کے پرزور اصرار پر گنجائش نکالی گئی کہ یہ پولیس کیس نہ بن سکے۔ چنانچہ اس شخص کہ محض اتفاقی

حادثے کا شکار قرار دے کر معاملہ رفع دفع کر دیا گیا۔ ڈاکٹر واسطی نے بتایا ہے کہ اس سیاسی شخصیت نے اپنی اس بوڑھے شخص میں غیر معمولی دلچسپی کی وجہ یہ بیان کی کہ یہ بوڑھا اس کے خاندان کا پشتینی وفادار ہے۔' صدیقی نے ہم تینوں کے چہروں پر گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

'کیا تم لوگ جانتے ہو وہ بارسوخ سیاسی شخصیت کون ہے؟'

'ہاں میں جانتا ہوں۔' میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ان تینوں نے چونک کر میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ 'ہاں میں اس سیاسی شخصیت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ سردار شاہ مراد خان ہے۔ ہمارے علاقے کا سب سے بڑا جاگیردار۔۔۔۔۔۔۔'

'تم نے بالکل صحیح پہچانا۔ وہ سردار شاہ مراد ہی ہے۔' صدیقی نے پرجوش لہجے میں میری تائید کی۔ میں نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ اب مجھے یقین سا ہو چلا ہے صدیقی صاحب کہ اس معاملے میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ اگر میں نے اس بوڑھے کی شکل اپنی آنکھوں سے نہ دیکھی ہوتی تو میں یہاں تک کہنے کو تیار تھا کہ یقیناً وہی بوڑھا شخص ہمارا مطلوبہ شخص ہے۔'

'تمھیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہے ہو ذوالفقار علی۔' صدیقی نے سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔

'ہاں صدیقی صاحب مجھے معلوم ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اس بوڑھے شخص کا پراسرار انداز میں اسپتال میں داخل کیا جانا' جب کہ اس کا پتا بھی غلط درج کرایا گیا۔ نیز سردار شاہ مراد کی اس معاملے میں غیر معمولی دلچسپی اس پر طرہ یہ کہ اس نے اسپتال والوں سے جھوٹ بولا کہ وہ بوڑھا اس کا خاندانی ملازم ہے جبکہ میں اس کے تمام نئے اور پرانے کارندوں کو اچھی طرح جانتا ہوں اس بوڑھے کو میں نے کبھی بھی سردار شاہ مراد کے پاس نہیں دیکھا۔'

'کہو کہو آگے کہو۔ اپنی بات پوری کرو۔' مرزا نے بے تاب لہجے میں کہا۔ میں نے اپنے خیالات مجتمع کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔ 'یہ تو ہمیں معلوم ہو ہی گیا ہے کہ سردار شاہ مراد کا اس اسپتال میں بھی خاصا اثر و رسوخ ہے۔ اس کے پیش نظر اس بوڑھے کی نہایت افراتفری میں یہاں سے منتقلی بھی مجھے بے حد معنی خیز دکھائی دیتی ہے۔'

'تم صاف صاف کہو بھائی تم کیا کہنا چاہتے ہو؟' مرزا نے بے چین لہجے میں کہا۔ 'میں یقین سے کہتا ہوں کہ اس بوڑھے کی یہاں سے منتقلی کا تعلق ہمارے اس رات اس اسپتال کی چھان بین کرنے سے ہے۔ ہم جونہی یہاں سے روانہ ہوئے' اسپتال کے کسی ملازم نے سردار شاہ مراد کو ہمارے متعلق اطلاع دے دی نتیجتاً اگلی ہی صبح اس بوڑھے کو یہاں سے ہٹا لیا گیا۔'

'تمھارا مطلب ہے سردار شاہ مراد۔۔۔۔۔۔۔؟' صدیقی نے حیرانی بھرے لہجے میں کہا۔

'ہاں صدیقی صاحب جہاں تک میری عقل کام کرتی ہے' سردار شاہ مراد اس معاملے میں پوری طرح ملوث ہے۔ میرے ذہن میں صرف یہ الجھن ہے کہ اس بوڑھے کی شکل و صورت۔۔۔۔۔۔؟' میں نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا۔

صدیقی نے ہیجان سے پر لہجے میں کہا۔ 'اوہ اس بات کو چھوڑو ذوالفقار علی۔ آج کے ترقی یافتہ دور

میں کسی کی شکل تبدیل کر دینا کوئی مشکل نہیں ہے۔ تمھیں یاد نہیں ہے کہ مرزا نے کس طرح محض منٹوں میں تمھاری شکل کو بدل کر رکھ دیا تھا۔'

'اف میرے خدا۔۔۔۔' میں نے ہیجان کے عالم میں تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ 'میرا تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ یقیناً یہی ہوا ہوگا۔ اسے بھارتی ایجنٹ کا میک اپ کر کے اسپتال میں داخل کرا گیا ہو اور پھر۔۔۔۔'

'لیکن سردار شاہ مراد۔۔۔۔۔۔؟' صدیقی نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

'آپ نے خود ہی تو کہا تھا صدیقی صاحب کہ یہ کوئی بہت بڑا معاملہ' کوئی بہت گہری سازش ہے کسی بہت ہی طاقتور اور با اثر شخص کی پشت پناہی کے بغیر را کے ایجنٹ ہمارے اپنے علاقے میں اس طرح اندھا دھند کاروائیاں نہیں کر سکتے۔ سردار شاہ مراد سے زیادہ طاقت ور شخص انہیں اس علاقے میں کون مل سکتا ہے۔ میں سردار شاہ مراد کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ وہ دولت' اقتدار اور طاقت کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے۔'

'شاید۔۔۔۔ شاید تم صحیح کہہ رہے ہو۔' صدیقی نے ڈانواڈول یقین کے ساتھ کہا۔ 'لیکن تمھارے اس بیان کی تصدیق کیسے کی جائے؟'

'میرے خیال میں اس مشکوک شخص کو سردار شاہ مراد کی جیپ میں اسپتال سے لے جایا گیا ہوگا۔ ایسے کسی کام کے لیے کسی ایم پی اے کی گاڑی سے بڑھ کر کوئی ذریعہ آمد و رفت کا نہیں ہو سکتا۔ آیئے ہم اسپتال کے چوکیداروں سے معلومات حاصل کرتے ہیں۔ وہ یقیناً ہمیں اس بارے میں کارآمد معلومات مہیا کر سکتے ہیں۔' صدیقی اور اس کے ساتھی مزید کوئی بحث کیے بغیر تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے یقین تھا کہ میں انہیں قائل کر چکا ہوں۔ اب محض رسمی تصدیق باقی ہے۔

کچھ ہی دیر بعد میرے اندازوں کی سو فیصد تصدیق ہوگئی۔ اسپتال کے گیٹ کیپرز نے بتایا کہ مذکورہ دن دوپہر سے ذرا پہلے ایم پی اے کی شناختی پلیٹ والی ایک بالکل نئی پجیرو جیپ اسپتال سے روانہ ہوئی ہے۔

'آپ کا کیا خیال ہے صدیقی صاحب؟' میں نے پوچھا۔

'تمھارا کہا ہوا ایک ایک لفظ حیرت انگیز طور پر سچ ہے ذوالفقار علی خان۔ تمھاری ذہانت نے ہمارے طویل تجربے کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوے کہ اس گیم کے پیچھے سردار شاہ مراد کا مکروہ چہرہ چھپا ہوا ہے۔ وہ غدار قوم' دشمن ملک کا آلہ کار بن چکا ہے۔ اب یہ معاملہ ایک بالکل ہی دوسری شکل اختیار کر گیا ہے۔ مجھے جلد از جلد اپنے اعلی حکام سے بات کرنا پڑے گی۔

'میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا صدیقی صاحب لیکن میرا اندازہ ہے کہ ہمارے مطلوبہ شخص کو لاہور نہیں بلکہ ڈیرہ غازی خان کی طرف لے جایا گیا ہوگا جہاں سردار شاہ مراد زیادہ کھل کر اپنی کاروائی کر سکتا ہے۔' میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

'میرے خیال میں اس نظریے کی تصدیق زیادہ مشکل نہیں ہے ظہیر' تم گاڑی کا رخ اس ناکے کی

طرف موڑ دو جو لاہور جانے والی شاہراہ پر قائم کیا گیا ہے۔' کچھ ہی دیر بعد ہم اس عارضی چیک پوسٹ پر پہنچ گئے۔ وہاں موجود پولیس والے صدیقی کو دیکھتے ہی اٹینشن ہو گئے۔ صدیقی کے استفسار پر ڈیوٹی پر موجود پولیس افسر نے بتایا کہ مذکورہ دن اور وقت پر اس طرح کی کوئی جیپ لاہور کی طرف نہیں گئی۔

'تم یہ بات وثوق سے کہہ رہے ہو نا؟ دیکھو یہ بہت اہم معاملہ ہے۔'

'مجھے معلوم ہے جناب۔ میرے تمام ماتحت سردار شاہ مراد کی تمام گاڑیوں کو پہچانتے ہیں۔ اگر کوئی گاڑی ناکے سے گزرتی ہے تو وہ ضرور مجھے اطلاع کرتے۔ اس روز بھی میں ہی ڈیوٹی پر تھا۔ ویسے میں ان سے مزید تصدیق کر لیتا ہوں۔' صدیقی نے گردن کے اشارے سے اجازت دے دی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس لوٹ آیا۔

'نہیں جناب اس روز یہاں سے سردار شاہ مراد کی کوئی گاڑی نہیں گزری۔'

'ٹھیک ہے تم اپنے بندوں سے کہہ دو کہ کسی بڑے سے بڑے تیس مار خاں کی گاڑی بھی یہاں سے بغیر تلاشی کے نہیں گزرنا چاہیے' ورنہ تم سب کا مقدر جیل کی اندھیری کوٹھری ہوگی سمجھ گئے نا؟' صدیقی نے سرد لہجے میں تنبیہ کی۔ دو پھولوں والا پولیس افسر اس کی دھمکی سن کر محض تھوک نگل کر رہ گیا۔

'چلو ظہیر تم گاڑی شجاع آباد چیک پوسٹ کی طرف لے چلو۔' صدیقی کی ہدایت پر ہماری گاڑی تیز رفتاری سے شجاع آباد کی طرف دوڑنے لگی۔ مظفر گڑھ ڈیرہ غازیخان اور اس کے آگے کی طرف جانے والی شاہراہ پر ناکہ شجاع آباد کے قریب قائم کیا گیا تھا۔ جب ہم اس چیک پوسٹ پر پہنچے تو ہم نے وہاں گاڑیوں کی ایک لمبی قطار لگی دیکھی۔ ہماری گاڑی ان تمام گاڑیوں کو کراس کرتی ہوئی سیدھی چیک پوسٹ کے سامنے جا ٹھہری۔ گاڑیوں کی تلاشی کا کام پورے زور شور سے ہو رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ لوگ مزید مستعد ہو گئے۔ صدیقی ہمیں ساتھ لیے سیدھا چھولداری میں گھستا چلا گیا۔ اسے دیکھتے ہی ڈیوٹی آفیسر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ 'سر آپ؟ آیئے تشریف لایئے۔'

'تم بیٹھو مراتب علی' میں یہاں بے حد اہم کام سے آیا ہوں۔' صدیقی نے مختصر اور نپے تلے الفاظ میں اپنا مدعا بیان کر دیا۔ پولیس افسر کچھ دیر اپنے ذہن پر زور ڈالتا رہا پھر اس نے محتاط لہجے میں کہا۔

'جہاں تک مجھے معلوم ہے جناب اس روز سردار شاہ مراد کی جیپ یہاں سے نہیں گزری۔ ویسے میں اپنے ماتحت کو بلا کر مزید تصدیق کر لیتا ہوں۔' اس نے چھولداری سے باہر نکل کر کسی کو آواز دی۔ چند لمحوں بعد پچاس پچپن برس کا ایک حوالدار چھولداری میں داخل ہوا۔

'اس کا نام سبز علی ہے جی۔' پولیس افسر نے اپنے ماتحت کا تعارف کرایا۔ صدیقی نے اپنی چمک دار آنکھیں حوالدار پر جما دیں۔

'تم یہ بتاؤ سبز علی کہ اتوار والے دن سردار شاہ مراد کی جیپ تو یہاں سے نہیں گزری؟ اس پر ایم پی اے کی سنہری تختی لگی ہوگی۔' حوالدار نے قدرے تذبذب کے بعد کہا۔

'نہیں صاحب جی کئی روز سے سردار شاہ مراد کی گاڑی یہاں سے نہیں گزری۔'

'تم یہ بات پورے یقین سے کہہ رہے ہو سبز علی؟' صدیقی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

اپنے ایک ایک لفظ پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔'تمھاری یادداشت کی کمزوری تمھیں ساری عمر جیل کی چکی پسوا سکتی ہے۔'

'میں سچ کہہ رہا ہوں صاحب جی۔' سبز علی نے کسمساتے ہوئے کہا۔'واقعی تین چار دن سے سردار شاہ مراد کی جیپ یہاں سے نہیں گزری البتہ۔۔۔۔۔۔'

'کہو کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟' صدیقی نے بے تاب لہجے میں کہا۔

'البتہ صاحب جی اس روز سردار شاہ مراد کی ٹرانسپورٹ کمپنی کا ایک ٹرک ضرور یہاں سے آگے گیا ہے۔' حوالدار نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

'کیا اس ٹرک کی تلاشی لی گئی تھی سبز علی؟' صدیقی نے گمبھیر لہجے میں سوال کیا۔ میں نے حوالدار کے چہرے پر زردی کھنڈتی دیکھی۔

'نہیں صاحب جی۔' اس نے بے جان لہجے میں جواب دیا۔

'لیکن کیوں؟' صدیقی نے شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے کہا۔'تم نے اس ٹرک کی تلاشی کیوں نہیں لی جبکہ میں نے تم لوگوں کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ کوئی گاڑی تلاشی کے بغیر ناکہ پار نہیں کرے گی۔' حوالدار چپ چاپ گم صم کھڑا رہا۔

'بولو جواب دو۔' صدیقی ایک بار پھر گرجا۔ حوالدار نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

'وہ جی سردار شاہ مراد بادشاہ آدمی ہے۔ ان کے بندوں کی ناراضگی۔۔۔۔۔۔'

'ہوں۔۔۔۔۔سردار شاہ مراد بادشاہ آدمی ہے۔۔۔۔۔! ٹھیک ہے تم ابھی اور اسی وقت اپنے آپ کو معطل سمجھو۔ میں دیکھتا ہوں وہ بادشاہ آدمی تمھارے لیے کیا کر سکتا ہے۔' صدیقی نے قہر آلود لہجے میں کہا۔ اس کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی حوالدار ٹوٹے تنے کی مانند اس کے قدموں میں گرتا چلا گیا۔

'مجھے معاف کر دو صاحب جی' صرف ایک بار معاف کر دو۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں صاحب جی۔' اس نے بھیگی لرزتی آواز میں فریاد کی۔

'اپنی یونیفارم کی عزت کا خیال کرو احمق آدمی۔ چلو سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔' صدیقی نے کڑک کر حکم دیا۔ حوالدار کسی روبوٹ کی مانند سیدھا ہوتا چلا گیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔

'تم یہ بتاؤ تمھارے پاس اس ٹرک کا نمبر درج ہے؟' صدیقی نے قدرے نرم لہجے میں سوال کیا۔ حوالدار نے جواب دینے کے بجائے محض نفی میں گردن ہلا دی۔

'اس ٹرک کو کون چلا رہا تھا؟' میں نے پہلی بار مداخلت کرتے ہوئے سوال کیا۔ اس لمحے میرے ذہن میں ایک ہی نام گردش کر رہا تھا۔ میں نے حوالدار کے چہرے پر قدرے بحالی کے آثار نمودار ہوتے دیکھے پھر میرے ذہن میں گردش کرتا ہوا نام اس کے منہ سے نکلا۔

'اس ٹرک کو استاد مینو چلا رہا تھا۔ اس کا اصل نام امین ہے جی۔'

'امین۔۔۔۔۔!' صدیقی نے دھیمے لہجے میں دہرایا۔'اور کون کون تھا اس کے ساتھ!'

'کوئی نہیں جی بس اس کا کلینر تھا۔ شرفو!' حوالدار سبز علی نے نیم مردہ لہجے میں بتایا۔

'تم نے کم از کم یہ تو دیکھا ہو گا کہ ٹرک خالی ہے یا لوڈ؟' صدیقی نے بدستور ناراض لہجے میں سوال کیا۔

'ٹرک تو لوڈ تھا جی۔ پیچھے سارے تختے لگے ہوئے تھے اوپر ترپال بھی پڑی ہوئی تھی البتہ میں نے یہ نہیں دیکھا کہ ٹرک میں کیا سامان لوڈ تھا۔'

صدیقی نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ مجھے اس حوالدار پر ترس آ رہا تھا۔ اس نے وہی کیا تھا جو وہ ہمیشہ سے کرتا آیا تھا یعنی عام شہریوں کو بسوں سے اتار کر تلاشی لینا اور ہر ممکن طریقے سے انہیں تنگ کرنا جبکہ کسی بھی صاحب حیثیت اور باوثوق شخص کی گاڑی دیکھ کر سلام کر کے اسے بصد احترام راستہ دے دینا۔ یہ اس حوالدار کی بدقسمتی تھی کہ اتنی 'معمولی' سی غلطی کے نتیجے میں اس کی نوکری خطرے میں پڑ گئی۔

'اس پر لعنت بھیجیں صدیقی صاحب۔ یہاں سے چلیں ہمیں اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔' میں نے اس حوالدار کی جان چھڑانی چاہی۔

'ٹھیک ہے سبز علی اس بار میں تمھاری یہ غلطی نظر انداز کرتا ہوں لیکن آئندہ کبھی ایسی حرکت نہیں کرنا۔ تمھیں قانون کی حفاظت کے لیے یہ یونیفارم پہنائی گئی ہے نا کہ بڑے لوگوں کی چمچہ گیری کے لیے۔' صدیقی نے سخت نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ صدیقی نے ایس آئی مراتب علی کو چیکنگ میں مزید سختی کی ہدایت کی اور ہمیں ساتھ لے کر چھولداری سے نکل آیا۔

'سانپ نکل گیا ہے صدیقی صاحب اب لکیر پیٹنے سے کچھ حاصل نہیں۔' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ میری بات سن کر وہ چلتے چلتے رک گیا۔

'کیا تمھیں پورا یقین ہے کہ ہمارا مطلوبہ شخص کو اسی ٹرک میں۔۔۔۔۔؟' صدیقی نے الجھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

'ہاں صدیقی صاحب مجھے پورا یقین ہے۔ آپ گاڑی تک چلیے میں آپ کو اپنے اس یقین کی وجہ بھی بتاتا ہوں۔' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ گاڑی میں صدیقی نے ظہیر کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی جبکہ میں اور مرزا کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔

'ہاں اب بتاؤ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟' صدیقی نے بے چین لہجے میں سوال کیا۔

'دیکھیں صدیقی صاحب! سردار شاہ مراد اور اس کے کارندے کوئی احمق نہیں ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ یہ بات چھپی نہیں رہے گی کہ اس زخمی شخص کو سردار شاہ مراد کی جیپ میں اسپتال سے لے جایا گیا ہے۔ اگر وہ اسی جیپ میں اس شخص کو ڈیرہ غازیخان منتقل کرتے تو یہ جیپ یقیناً کسی نہ کسی کی نظروں میں آ جاتی اور عین ممکن ہے کسی پولیس والے کی نظر اس زخمی شخص پر بھی پڑ جاتی۔ اس طرح یہ بات یقینی طور پر ہم لوگوں تک پہنچ جاتی کہ اس زخمی شخص کو لاہور کی طرف نہیں بلکہ ڈیرہ غازی خان کی طرف لے جایا گیا ہے۔ لہٰذا ان شاطر لوگوں نے ایسی چال چلی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اس زخمی شخص کو ایک مال بردار ٹرک میں اصل ٹھکانے کی طرف بھیج دیا۔ انہیں یقین ہو گا کہ ہم کسی ٹرک پر

شک نہیں کریں گے کیونکہ ہماری تمام تر توجہ کسی جیپ کی تلاش پر مرکوز ہوگی۔ ٹرک کے ذریعے اس شخص کی منتقلی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ وہ کسی کی بھی نظروں میں نہ آسکا۔'

'تم نے سو فیصد صحیح تجزیہ کیا ہے ذوالفقار علی۔ یقیناً ایسا ہی ہوا ہے۔ اس شخص کو اسی ٹرک کے ذریعے منتقل کیا گیا ہے جبکہ وہ جیپ ابھی تک اسی شہر میں موجود ہے۔'

'میرا اندازہ ہے کہ وہ شخص اب تک سردار شاہ مراد کے کسی بے حد مضبوط ٹھکانے پر پہنچ چکا ہے۔ عین ممکن ہے ملک کریم کو بھی وہیں رکھا گیا ہو۔'

'چلو پھر سردار شاہ مراد کے گاؤں کی طرف چلتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کا ٹھکانہ معلوم کرنا مشکل نہ ہوگا۔' ظہیر نے پرجوش لہجے میں کہا۔

'تمھیں پوری طرح اندازہ نہیں ہے بھائی ظہیر کہ سردار شاہ مراد کتنی بڑی بلا کا نام ہے۔ وہ اپنے علاقے کا بے تاج بادشاہ ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر وہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ اس علاقے کی تمام سرکاری مشینری اس کے اشاروں پر ناچتی ہے۔ ہم اس طرح بے سروسامانی کے عالم میں وہاں جا کر لاوارثوں کی طرح اس کے رحم وکرم پر ہوں گے۔ اس کے ایک اشارے پر ہماری لاشوں کا بھی نام و نشان نہیں ملے گا۔'

'اوہ۔۔۔۔تو یہ سردار شاہ مراد اتنا طاقت ور ہے؟' ظہیر نے حیرانی کے عالم میں سوال کیا۔

'ہماری اور تمھاری سوچ سے بھی بڑھ کر طاقتور۔ سردار شاہ مراد اپنی ذات میں خود ایک حکومت ہے۔ یہ سمجھو کہ اس علاقے میں تو بس اسی کا سکہ چلتا ہے۔ اس کے مسلح کارندوں کی فوج اتنی وسیع ہے کہ وہ اچھی خاصی فوج کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ بغیر منصوبہ بندی اور تیاری کے کھلم کھلا وہاں جانا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔'

'اس کا مطلب ہے اس نے وہاں اپنی اچھی خاصی آزاد ریاست قائم کر رکھی ہے۔' صدیقی نے پر خیال لہجے میں کہا۔

'کچھ ایسی ہی بات ہے صدیقی صاحب۔ سردار شاہ مراد جانے کتنے افراد کے خون کی ہولی کھیل چکا ہے۔ لیکن اس کے براق دامن پر خون کا ایک چھینٹا تک نہیں ہے۔ کس کی موت آئی ہے جو اس کی طرف انگلی اٹھا سکے۔ اس کے خلاف خوب سوچ سمجھ کر ٹھوس منصوبہ بندی کر کے قدم اٹھانا پڑے گا۔ بصورت دیگر ناکامی کے ساتھ ساتھ موت بھی ہمارا مقدر بن جائے گی۔' میں نے مستحکم لہجے میں انہیں حقیقت سے آگاہ کر دیا۔

'پھر بھی ہمیں ڈیرہ غازی خان تو جانا ہی پڑے گا۔ کھلم کھلا نہ سہی شکلیں بدل کر رازداری کے ساتھ ہی سہی۔ ویسے یہ صورت حال بے حد گمبھیر ہے۔ مجھے جلد از جلد اپنے اعلیٰ حکام کو اس پورے معاملے کی خبر دینی چاہیئے۔ سردار شاہ مراد ایک سیاسی لیڈر ہے۔ لہٰذا اس پر بہت سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالنا پڑے گا۔ اگر ہم اس پر جرم ثابت کرنے میں ناکام رہے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یہی بہتر ہے کہ اسلام آباد سے رجوع کیا جائے پھر وہاں سے جو ہدایت ملے اسی کے مطابق عمل کیا جائے۔ چلو ظہیر' گاڑی کو

گھر کی طرف لے چلو۔' صدیقی نے کہا۔ ظہیر نے چپ چاپ گاڑی کا رخ شہر کی جانب موڑ دیا۔

صدیقی ظہیر سے کچھ باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے مرزا کے چہرے پر نظر ڈالی۔ مجھے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آیا۔

'آپ کچھ متفکر دکھائی دے رہے ہیں مرزا صاحب۔ کن سوچوں میں گم ہیں آپ؟' میں نے شگفتہ لہجے میں پوچھا۔

'میں متفکر نہیں بلکہ اداس ہوں بھائی ذوالفقار علی۔ انسان اپنے ذہن میں اپنی پسندیدہ شخصیت کا کانچ کا کتنا بڑا بت تیار کر لیتا ہے۔ جب اس شخصیت کی اصلیت سامنے آتی ہے تو وہ بت ایک چھناکے سے چور چور ہو جاتا ہے اور اس کی تیز دھار کرچیاں انسان کی روح میں کھب کر اسے لہولہان کر دیتی ہیں۔' مرزا نے پرسوز لہجے میں کہا۔ میں نے حیرانی کے عالم میں اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔

'میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا مرزا صاحب؟'

'میں نے بھی ایک شخصیت کو اپنے دل و دماغ کے دریچوں میں دیوتا بنا کر بٹھایا تھا لیکن وہ دیوتا دراصل شیطان ثابت ہوا۔'

'آپ کا مطلب ہے۔۔۔۔۔۔' میں نے شدید حیرانی کے عالم میں کچھ کہنا چاہا۔ مرزا نے دکھ بھرے لہجے میں میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ 'ہاں بھائی تم صحیح سمجھے ہو۔ سردار شاہ مراد میری پسندیدہ شخصیت تھی۔ میرے دل میں اس کے لیے بے پناہ محبت اور عزت تھی۔ وہ بظاہر ہے بھی ایسا ہی۔۔ ذہین' روشن خیال' اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پروقار۔ اس کی تقریریں پڑھ کر اور سن کر میرا دل چاہتا تھا کہ کاش سارے سیاست دان اسی کے مانند محب وطن اور پرخلوص خادم قوم بن جائیں لیکن اب آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹا ہے تو معلوم ہوا ہے کہ جسے میں فرشتہ سمجھتا رہا وہ دراصل خناس ہے۔ چھپ چھپ کر حملے کرنے والا۔ معصوم بھیڑ کے روپ میں خون خوار بھیڑیا۔ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ملک وقوم کی سالمیت تک سے کھیل جانے والا۔۔۔ اس کی شیطانی مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارا تعلق ایک اعلیٰ تحقیقاتی ایجنسی سے ہے اس کے باوجود ہمارے کانوں میں اس کے کرتوتوں کی بھنک تک نہ پڑ سکی۔ کاش۔۔۔ کاش۔۔۔ میں اسے ملک وقوم سے غداری کے جرم میں پھانسی کے پھندے سے لٹکتا دیکھ سکوں۔۔۔' مرزا کی جذباتی باتوں نے مجھے بھی اداس کر دیا۔

'آپ صحیح کہہ رہے ہیں مرزا صاحب کسی قوم کے لیے اس سے بڑھ کر بدقسمتی کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ عوامی رہنما اس کے وجود کی بنیادوں کے لیئے دیمک کا کام کرنے لگیں۔ ہمارے یہ سیاسی لیڈر چور بازاری' اسمگلنگ' منشیات فروشی اور اپنے مزارعوں کی حق تلفی سے دولت اکٹھا کر کے اسمبلیوں میں پہنچ جاتے ہیں اور پھر نت نئے طریقوں سے قوم کی دولت کی لوٹ مار شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کو شاید علم نہ ہو سردار شاہ مراد ایک بہت بڑا اسمگلر بھی ہے۔ شاید اسی ناپاک کاروبار کے دوران میں وہ بھارتی ایجنسیوں کا ہرکارہ بن گیا ہو۔ اس کی منافقت کی انتہا تو دیکھیے ایک طرف تو وہ ملک کریم کے اغوا کے سلسلے میں حکومت پر لعن طعن کر رہا ہے تو دوسری طرف خود ہی اپنے 'دوست' ملک کریم کی گردن پر پاؤں

رکھے کھڑا ہے۔'

'اسی لیے مجھے اپنے ملک کی سیاست سے نفرت ہے۔' صدیقی نے ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ 'دولت کے لالچ میں پوری قوم کو تباہی کے منہ پر پہنچا دینے والا دوسرا شخص ملک کریم بھی تو ایک معزز سیاسی رہنما ہے۔ یہ لوگ اپنے چہروں پر دھوکے اور فریب کے جانے کتنے نقاب چڑھائے رکھتے ہیں۔ مجھے تو یہی اندیشہ کھائے جا رہا ہے کہ کہیں وہ لوگ اس سے مغویان کا پتا اگلوانے میں کامیاب نہ ہوگئے ہوں۔ اگر وہ لوگ ان مغویان کو کسی نہ کسی طرح نکال لے جانے میں کامیاب ہوگئے تو ہمارے وطن کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔' ظہیر نے اس گفتگو میں حصہ نہیں لیا تاہم وہ تمام باتیں بڑے غور سے سنتا رہا۔

گاڑی بنگلے کے سامنے پہنچی۔ ظہیر نے مخصوص انداز میں تین بار ہارن بجایا۔ کچھ دیر بعد بنگلے کا گیٹ کھلتا چلا گیا۔ گیٹ کھولنے والا ظہیر کا ادھیڑ عمر ساتھی بشارت تھا۔ گاڑی سے اتر کر ہم لوگ تیزی سے بنگلے کے اندرونی حصے میں گھستے چلے گئے۔ صدیقی نے ہمیں ڈرائینگ روم میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

'تم لوگ یہاں ٹھہرو۔ میں ابھی اسلام آباد رابطہ قائم کرتا ہوں۔' صدیقی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں سوچنے لگا کہ انہیں کس انداز میں اپنے اور مینو استاد کے باہمی تعلق کے بارے میں بتاؤں۔ مجھے معلوم ہے کہ مینو استاد مجھے سب کچھ بتا دے گا لیکن یہ لوگ خدا جانے مینو استاد کے ساتھ کیسا سلوک کریں؟ پھر میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ چاہے کچھ بھی ہو میں انہیں مینو استاد کے بارے میں ضرور بتاؤں گا۔ میری یا مینو استاد کی سلامتی ملک وقوم کے مفاد سے بڑھ کر تو نہیں ہوسکتی۔ عین ممکن ہے یہ لوگ میری طرح مینو استاد کی شخصیت کے تاریک گوشوں سے بھی چشم پوشی کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

کچھ دیر بعد صدیقی واپس لوٹ آیا۔ اس کے چہرے پر تفکر اور تشویش کے آثار نمایاں تھے۔ 'میں نے اپنے اعلیٰ حکام کو تمام حقائق سے آگاہ کردیا ہے۔' صدیقی نے اعلان کے سے انداز میں کہنا شروع کردیا۔ 'پہلے تو وہ میرے بیان پر یقین کرنے کو تیار نہ تھے۔ میں نے اپنی کارگزاری اور اس کے نتائج سے انہیں آگاہ کیا تو بالآخر وہ میری بات ماننے پر مجبور ہو گئے' تاہم انہوں نے سردار شاہ مراد کے خلاف کسی بھی قسم کی اندھا دھند کاروائی سے سختی سے منع کیا ہے۔ ہمیں ہدایت ملی ہے کہ ہم بھیس بدل کر ڈیرہ غازی خان جائیں اور صرف اس بات کی تصدیق کریں کہ ملک کریم' سردار شاہ مراد کی تحویل میں ہی ہے' نیز اس زخمی شخص کا پتا چلانے کی کوشش کریں۔ میں نے انہیں یاد دلایا کہ ہماری تحقیقات کے مطابق را کے ایجنٹوں کا ایک پورا گروہ اس معاملے میں ملوث ہے اور ہمیں یقین ہے کہ وہ سب سردار شاہ مراد کی مہیا کردہ پناہ گاہ میں پوشیدہ ہیں۔ اس پر ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم ان ایجنٹوں کو بھی تلاش کریں۔ البتہ ہمیں کسی بھی قسم کے تصادم سے ہر ممکن گریز کرنا ہے۔ ہمیں ہدایت کی گئی ہے کہ جونہی ہمیں کسی قسم کا ثبوت ملے ہم اسلام آباد سے رابطہ قائم کریں۔ کسی بھی قسم کی کاروائی کے لیے وہ لوگ دیگر ذرائع استعمال کریں گے۔

'اس طرح تو ہم کچھ بھی نہیں کرسکیں گے۔ سردار شاہ مراد کے خلاف ثبوت حاصل کرنا بچوں کا کھیل

تو نہیں ہے۔ اس میں ہمیں جانے کتنا وقت لگ جائے۔ اس اثنا میں ہمارے ملک کے دشمن اپنا کام کر گزریں گے۔' مرزا نے سخت ناراضگی کے عالم میں کہا۔ صدیقی نے بے بسی کے عالم میں شانے اچکا کر کہا۔

'میں اس معاملے میں کیا کرسکتا ہوں بھائی۔ مجھے جو احکام موصول ہوئے میں نے تم لوگوں کو بتا دیے۔ ہم ہیڈکوارٹر کے احکام کے خلاف کام تو نہیں کر سکتے نا؟'

'اس کا مطلب یہ ہے کہ اب ہم اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے کوئی عملی کاروائی نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے حکام بالا سردار شاہ مراد کی سیاسی قوت سے خوف زدہ ہیں۔' مرزا نے مزید مشتعل ہوتے ہوئے کہا۔

'دیکھو بھائی ہم لوگ حکم کے غلام ہیں۔ ہمیں حکام بالا نے یہاں بھیجا ہے اور اگر انہوں نے ہمیں واپس بلایا تو ہمیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس جانا پڑے گا۔' میں نے مرزا صاحب کے چہرے پر شدید غصے کی سرخی دیکھی۔ وہ کوئی بہت ہی تند وتلخ قسم کی بات کہنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔

'آپ لوگ آپس میں تلخی نہ ہی پیدا کریں تو بہتر ہے۔ ہمارے لیے حالات ناسازگار سہی لیکن بہرحال ہمیں کوئی نہ کوئی راستہ تو نکالنا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ آپ کے ہیڈکوارٹر نے جو احکام بھیجے ہیں وہ بہت معقول ہیں۔ ہم لوگ محدود رہ کر بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ لوگ بھول رہے ہیں کہ ہمارے سامنے ایک ایسا کردار موجود ہے جس کی مدد سے ہم سردار شاہ مراد کی جڑوں تک پہنچ سکتے ہیں۔

'کیا۔۔۔؟ تم کون سے کردار کی بات کر رہے ہو؟' ان دونوں نے بیک زبان ہوکر سوال کیا۔

'امین عرف مینو استاد! سردار شاہ مراد کی ٹرانسپورٹ کمپنی کا ٹرک ڈرائیور۔۔۔ وہ ہمیں بتا سکتا ہے کہ وہ اس روز ملتان سے وہ 'مال' کہاں لے کر گیا تھا۔'

'اوہ اسے تو ہم بھول ہی گئے تھے لیکن کیا اسے ڈھونڈا جا سکتا ہے؟ اور کیا وہ یہ سب کچھ ہمیں آسانی سے بتا دے گا؟' صدیقی نے سوال کیا۔ مرزا بھی استفہامیہ انداز میں میرا چہرہ دیکھنے لگا۔

'یہ بڑا عجیب وغریب اتفاق ہے صدیقی صاحب کہ میں اس شخص مینو استاد سے اچھی طرح واقف ہوں بلکہ یوں کہیں تو زیادہ بہتر ہوگا کہ ہمارے آپس میں قریبی تعلقات ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں اس سے اس سلسلے میں معلومات فراہم کرنے کو کہوں تو وہ ہرگز انکار نہیں کرے گا۔'

صدیقی اور مرزا بڑی حیرانی سے میرا منہ دیکھنے لگے۔ 'تم آخر ہو کیا چیز بھائی ذوالفقار علی؟' صدیقی نے استفہامیہ لہجے میں سوال کیا۔ 'تمھارا بظاہر اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے باوجود تم ہر معاملے میں ہم سے دو قدم آگے ہی ہوتے ہو۔'

'یہ سب قسمت کے کھیل ہیں صدیقی صاحب! آپ لوگوں نے زبردستی مجھے اپنی مدد کے لیے آمادہ کرنا چاہا لیکن میں خلوص دل سے آپ کا ساتھ دے رہا ہوں۔ ہمارے ارادے نیک ہیں۔ شاید اسی لیے خدا ہمارے لیے راستے نکال رہا ہے۔'

'شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو بھائی' بہر حال یہ بتاؤ کہ اس شخص مینو استاد کو کیسے تلاش کیا جائے؟'

'اس کے لیے ہمیں ڈیرہ غازی خان جانا پڑے گا۔ مینو استاد کی رہائش گاہ وہیں ہے۔ میں اس کے گھر سے واقف ہوں۔'

'ٹھیک ہے ہم ابھی کچھ دیر میں ڈیرہ غازی خان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ مرزا تم اپنا اور ذوالفقار علی کا میک اپ کر دو۔ میں اپنا میک اپ کرتا ہوں۔ میرے خیال میں ظہیر کو ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بیسیوں افراد میں نمایاں نظر آتا ہے۔ ہم لوگ جیپ میں چلیں گے۔ میں بشارت کو کہتا ہوں کہ وہ اس کا تیل پانی چیک کرے۔' صدیقی اپنے مخصوص انداز میں لگاتار بولتا چلا گیا جبکہ مرزا نے اپنی عادت کے مطابق اس طویل تقریر کے جواب میں محض اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

مرزا نے میرے سابقہ میک اپ میں معمولی تبدیلیاں کر کے اسے میرے چہرے کی زینت بنا دیا۔ گھنی مونچھوں اور ناک کے اسپرنگوں کے علاوہ اس نے میرے سر پر ایک پی کیپ جما دی جس کے باعث میرے بال چھپ گئے۔ میری فرمائش پر اس نے شفاف شیشوں والا زیرو نمبر چشمہ بھی میری آنکھوں پر لگا دیا۔ میں نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو مجھے سیف داد خان کی جگہ ادھیڑ عمر کا پروفیسر نما ایک شخص نظر آیا۔ میک اپ سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے اس نے مجھے ایک کوٹ بھی پہنا دیا۔ مرزا نے اپنا میک اپ کرتے وقت اپنے چہرے میں زیادہ تبدیلیاں کیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک ستر سالہ بوڑھے کا روپ دھار لیا جس کے چہرے پر کتنی ہی جھریاں موجود تھیں۔ اس نے اپنے بکس سے ایک بہت پرانے طرز کا گول چشمہ نکالا اور اسے ڈوری کی مدد سے اپنے چہرے پر جما لیا۔

'بیٹا ذوالفقار ذرا میری بتیسی تو ڈھونڈ دو' جانے کہاں رکھ کر بھول گیا ہوں۔' مرزا نے کھرکھراتے لہجے میں کہا۔ اس کا لہجہ اس قدر حقیقی تھا کہ میں ہکا بکا رہ گیا۔

کچھ دیر بعد صدیقی بھی واپس آ گیا۔ اس نے گھنی داڑھی مونچھ والے ایک ادھیڑ عمر شخص کا میک کیا تھا۔ اس کا چہرہ تو بدل گیا تھا لیکن میں نے اسے اس کی چال سے پہچان لیا۔ صدیقی کی نظر مرزا کے چہرے پر پڑی تو اس کے چہرے پر بے اختیار تحسین کے جذبات ابھر آئے۔ مرزا نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ صدیقی سے اچھا میک اپ آرٹسٹ ہے۔ مرزا جب تک میک اپ میں مصروف رہا' میں بغور اس کے طریقہ کار کو دیکھتا رہا۔ میری دلچسپی معلوم کر کے مرزا خود بھی مجھے میک اپ کے بنیادی اصولوں کے متعلق بتاتا رہا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میک اپ کی کتنی اقسام ہیں اور ان میں بنیادی طور پر کون سے لوشن' کریم اور دیگر اجزا استعمال ہوتے ہیں۔ مرزا کا سمجھانے کا انداز اس قدر دلکش اور جامع تھا کہ مجھے اس کی بیان کردہ باتوں کو ذہن نشین کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ مرزا نے مجھے میک اپ کے خصوصی اجزا کے متبادل اجزا کے متعلق بھی بتایا جو بآسانی کسی بھی کاسمیٹک اسٹور سے مل سکتے ہیں۔ مرزا کی مختصر مگر ماہرانہ تربیت سے فیض یاب ہونے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اب میں کم از کم سادہ نوعیت کا میک اپ تو خاصی مہارت اور اعتماد کے ساتھ کر سکتا ہوں۔ صدیقی کی آمد کے بعد بھی مرزا مجھے میک اپ کے آداب اور لوازمات کے بارے میں بتاتا رہا۔

'میری یہ بات ذہن نشین کر لو بھائی ذوالفقار علی کہ میک اپ صرف چہرے کا ہی نہیں بلکہ پوری شخصیت کا کیا جاتا ہے۔ چہرے کی رنگت اور خدوخال بدلنے کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی پوری شخصیت کو بدلنا پڑتا ہے۔ ہمیں خود کو پوری طرح میک اپ سے تیار شدہ شخصیت کے ڈھانچے میں ڈالنا پڑتا ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو ہم بہترین میک اپ کے باوجود ہر ایک کی نظروں میں عجوبہ بن کر رہ جائیں گے۔ مثلاً اگر میں اپنے چہرے پر بوڑھے کا میک اپ کر لوں لیکن اپنی چال ڈھال' طور طریقوں اور بول چال کو بوڑھے کی طرح نہ بنا سکوں تو پھر میرا یہ میک اپ میری کوئی مدد نہیں کر سکے گا بلکہ الٹا مصیبت میں پھنسا دے گا۔ لہٰذا میک اپ آرٹسٹ کو وہی میک اپ کرنا چاہیے جس کے تمام تقاضوں پر وہ پورا اتر سکے۔' مرزا نے یہ سب باتیں اپنے میک اپ کے عین مطابق ایک ستر سالہ بوڑھے کی کھرکھراتی بلغمی آواز میں بتائیں۔ صدیقی نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ مجھے مخاطب کیا۔

'تم بہت خوش قسمت ہو ذوالفقار علی کہ اس فن میں تمھارا استاد وہ شخص ہے جو شاید ہمارے ملک کا ماہر ترین میک اپ آرٹسٹ ہے۔ اس کی صحبت میں اگر تم نے کچھ دن گزار لیے تو یہ تمھیں کندن بنا کر رکھ دے گا۔ اگر یہ تمھیں سکھانے پر آمادہ ہو ہی گیا ہے تو اس کی نظر عنائیت کا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔'

'میں خلوص دل سے اپنا استاد تسلیم کرتا ہوں صدیقی' میں نے اعتراف کیا۔ مرزا حسب معمول' ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ محض سر ہلا کر رہ گیا۔

'جیپ بالکل تیار ہے اس اب تم لوگ تیار ہو جاؤ۔'

'ہمیں تیار ہونے میں کیا دیر ہے لیکن کیا تم ذوالفقار علی کو خالی ہاتھ اپنے ساتھ لے کر جاؤ گے؟' مرزا نے سوال کیا۔

'اوہ یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ میں نے ذوالفقار علی کے متعلق بھی اسلام آباد والوں سے بات کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہم اسے مہمان کے طور پر اپنی ٹیم میں شامل کر سکتے ہیں۔ ذوالفقار علی تم میرے ساتھ چل کر اپنی مرضی کے ہتھیار منتخب کر لو۔' وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ اس نے ایک بڑی سی الماری کھولی تو ایک اچھا خاصا وسیع اسلحہ خانہ میری نظروں کے سامنے آ گیا۔ میں نے تحسین آمیز نظروں سے اسلحے کے اس نادر اور بیش قیمت ذخیرے کو دیکھا۔ وہاں ہر قسم کا جدید ترین اسلحہ موجود تھا۔ اے کے ۴۷ یعنی کلاشنکوف' سیون ایم ایم پی فائیو سب مشین گن' اٹالین ریپیٹر شاٹ گن۔۔۔ صدیقی نے ایک دراز کو کھینچا تو مختلف برانڈ کے ریوالور اور پستول کی ایک وسیع رینج میرے سامنے آ گئی۔ میں نے بڑی گنوں کو نظر انداز کر کے ان چھوٹے ہتھیاروں کو الٹنا پلٹنا شروع کر دیا۔ میری نظر اپنے جانے پہچانے ہتھیار پر پڑی۔ میں نے ایک لمحے کی دیر کیے بغیر اسے اٹھا لیا۔ وہ بتیس بور کا سیاہ رنگ کا خوبصورت پستول تھا۔۔۔ کولٹس۔۔۔۔۔۔

'واہ۔۔۔۔۔ اس کا مطلب ہے تمھیں ہتھیاروں کی بھی خاصی سوجھ بوجھ ہے! کولٹس میرا بھی پسندیدہ ہتھیار ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا' میرے پاس یہی پستول ہے۔' صدیقی نے اپنے بغلی ہولسٹر میں

لگے ہوئے چمک دار پستول پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔صدیقی نے کولٹس پستول کے ساتھ اس کے دو میگزین اور بہت سی گولیاں بھی میرے حوالے کیں۔ہم دونوں مرزا کے پاس پہنچے تو وہ ہمیں روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار ملا۔ہم تینوں بنگلے کے پورچ میں کھڑی ایک طاقتور جیپ میں جا بیٹھے۔صدیقی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔مجھے اس نے اپنے ساتھ بٹھالیا تاکہ میں ڈیرہ غازیخان تک اس کی راہنمائی کرسکوں۔

'یہ معاملہ تو لحہ بہ لحہ الجھتا ہی جارہا ہے ذوالفقار علی۔اسلام آباد والوں کے ردعمل نے مجھے شدید مایوسی کا شکار بنا دیا ہے۔مجھے تو لگتا ہے کہ وہ اس معاملے کی نزاکت اور سنگینی کو پوری طرح سمجھ ہی نہیں رہے ہیں۔حالات چکنی مچھلی کے مانند ہمارے ہاتھوں سے پھسلے جارہے ہیں لیکن وہ روایتی محکمانہ کاروائی سے آگے بڑھنے کے لیے تیار نہیں ہیں' صدیقی نے مایوسی سے بوجھل لہجے میں کہا۔

'ایسی بات نہیں ہے صدیقی صاحب۔وہ لوگ یقیناً اس معاملے کی نزاکت سے واقف ہوں گے لیکن وہ حکومتی پالیسی کی وجہ سے کوئی بھی بڑا اقدام اٹھانے سے پہلے تمام حجتیں پوری کرلینا چاہتے ہیں۔جونہی وہ حکومت کو یقین دلانے میں کامیاب ہوگئے کہ یہ معاملہ سیاسی مصلحتوں سے بالاتر ہوکر عمل کرنے کا متقاضی ہے' حکومت کی طرف سے آپ لوگوں کو بھرپور ایکشن لینے کی اجازت مل جائے گی۔' میں نے اسے تسلی دینا چاہی۔

'خدا کرے اس وقت تک بہت دیر نہ ہوچکی ہو' صدیقی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

جب ہم لوگ شجاع آباد چیک پوسٹ پر پہنچے تو سورج مغرب کی طرف جھک چکا تھا۔چیک پوسٹ پر موجود سپاہیوں نے بڑی مستعدی سے ہماری گاڑی کی تلاشی لی لیکن وہ گاڑی میں سے کوئی بھی قابل اعتراض چیز برآمد کرنے میں ناکام رہے۔ہم لوگ اپنے ہتھیار چیک پوسٹ پر پہنچنے سے پہلے ہی گاڑی کی خفیہ جگہوں پر پوشیدہ کرچکے تھے۔پولیس والوں کے فرشتوں تک کو خبر نہ ہوسکی کہ ہم وہی لوگ ہیں جو ابھی چند گھنٹے پہلے اسی چیک پوسٹ پر براجمان رہ چکے ہیں' ظاہر ہے ہمیں کیا پڑی تھی کہ ہم انہیں یہ سب بتاتے۔

پولیس والوں کے مطمئن ہونے کے بعد جیپ تیز رفتاری سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہوگئی۔اس دوران میں رات کا اندھیرا پوری طرح پھیل گیا۔درختوں کی دورویہ قطاروں کے بیچ میں سیاہ ناگ کے مانند بل کھاتی ہوئی سڑک جیپ کی ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں آئینے کی طرح چمک رہی تھی۔تنگ شاہراہ پر ٹریفک کا بے حد رش تھا۔صدیقی کو بہت محتاط رہ کر ڈرائیونگ کرنا پڑ رہی تھی۔

دریائے چناب کے طویل اور بل کھاتے ہوئے پل کو پار کرکے ہم مظفر گڑھ شہر کی حدود میں داخل ہوگئے۔پل سے اتر کر بائیں ہاتھ پر نو تعمیر شدہ تفریحی پارک تھا۔اس جگہ پر اس وقت بھی اچھا خاصا رش تھا۔سڑک سے ذرا ہٹ کر بے شمار کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔صدیقی نے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔میں نے اسے اس چھوٹے سے لیکن خوبصورت پارک کے متعلق بتایا۔اس کشیدہ صورت حال میں یہ ہلکی پھلکی گفتگو مرزا اور صدیقی کے تنے ہوئے اعصاب کے لیے بے حد فرحت افزا ثابت

ہوئی۔بہت دیر بعد ان کے لبوں پر دھیما تبسم نمودار ہوا۔

مظفر گڑھ شہر کے مصروف اور پر رونق بازار سے گزرتے ہوئے مرزا نے تجویز پیش کی کہ ہم یہاں رک کر رات کا کھانا کھالیں تو زیادہ بہتر ہے لیکن صدیقی نے نرم لہجے میں اس کی تجویز مسترد کردی۔'ہم جس قدر جلد ڈیرا غازیخان پہنچ جائیں اتنا ہی ہمارے لیے بہتر ہے۔اگر ہم رات گئے کسی ہوٹل میں پہنچے تو خواہ مخواہ ہوٹل کے عملے کی توجہ کا مرکز بن جائیں گے۔اب ہم اپنی منزل مقصود پر پہنچ کر ہی رات کا کھانا کھائیں گے۔'

'جیسی تمھاری مرضی!' مرزا نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔ہماری جیپ بغیر رکے شہر کے قلب میں سے گزرتی چلی گئی۔کچہری سے آگے بڑھتے ہی اس چھوٹے سے شہر کے ہنگامے پیچھے رہ گئے۔چھوٹے سے اسٹیڈیم اور گورنمنٹ اسکول اور کالج کے پاس سے گزر کر ہم تھانے کے پاس پہنچ گئے۔میں نے صدیقی کو تھانے کے متعلق بتایا۔رات کے اس ابتدائی حصے میں بھی تھانے پر ہو کا عالم طاری تھا۔اگر تھانے کے گیٹ پر کوئی سنتری تھا بھی تو اس وقت ہمیں وہ کہیں نظر نہیں آیا۔تھانے سے آگے نکلتے ہی شہر کی آبادی یک لخت ختم ہوگئی۔کچھ مزید آگے آنے کے بعد ہمیں اپنے بائیں ہاتھ پر ایک کارخانے کی وسیع عمارت نظر آئی۔اس وقت وہ کارخانہ بھی کسی بھوت بنگلے کا منظر پیش کررہا تھا۔اس وقت تک سڑک کے دونوں اطراف میں ریگستانی علاقہ شروع ہوچکا تھا۔چاند کے آخری عشرے کی مدھم چاندنی میں ریت کے اونچے نیچے ٹیلے عجیب پراسرار منظر پیش کررہے تھے۔میں اس خواب ناک ماحول کے طلسم میں کھو سا گیا۔اچانک صدیقی کی حیرانی سے لبریز آواز نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرالی۔'یہ۔۔۔۔۔۔یہ کیا ہے ذوالفقار علی؟'

میں نے نظر پر زور ڈال کر سڑک کے دائیں طرف دیکھا جس طرف صدیقی نے ہاتھ کا اشارہ کیا تھا۔سڑک سے ذرا ہٹ کر ریت کے اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان اچھی خاصی تعداد میں چھوٹے چھوٹے بلکہ بہت چھوٹے چھوٹے ایک اور دو کمروں پر مشتمل پختہ مکان بنے ہوئے تھے۔ان میں سے کسی بھی مکان میں کوئی چراغ تک روشن نہیں تھا۔پہلی نظر میں یہ مکانوں کی قطاریں دیکھ کر یہ احساس ہوتا کہ گویا کسی نامعلوم پراسرار ہستی نے راتوں رات صحرا کے اس دور افتادہ گوشے میں یہ عجیب وغریب بستی بسادی ہے۔تاہم وہ ابھی تک ان مکانوں کے مکین تلاش نہیں کرپائی ہے۔میں نے صدیقی کو اس بستی کے متعلق بتایا تو وہ حیران رہ گیا۔

'لیکن شہر سے اتنی دور صحرا میں یہ مکانات تعمیر کرنے کی بھلا کیا تک ہے؟'

'یہ سب سیاست کا کھیل ہے صدیقی صاحب۔آج سے کئی سال پہلے ایک حکمران نے اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے مکان تعمیر کرکے عوام میں تقسیم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔اس اسکیم پر بڑے زور شور سے کام شروع ہوا۔سستے سے سستے مکان بنانے کے چکر میں حکومت کے منظور نظر ٹھیکے داروں نے نہایت گھٹیا میٹریل سے یہ مکان تعمیر کیے چونکہ یہ مکانات بے حد کم قیمت زمین پر تعمیر ہونے تھے۔لہٰذا یہ بستی شہر سے دور سے دور ہٹتی ہوئی اس صحرا تک آن پہنچی۔اس جگہ تک پانی اور بجلی جیسی

سہولتیں پہنچنے کا فی الحال دور دور تک امکان نہیں ہے۔ خیر تو اس بستی کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد ان مکانوں کو مستحق افراد میں تقسیم کرنے کا مرحلہ آیا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ایسی صورت حال میں مستحقین کی اکثریت کن افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ خیر تو مستحقین کا انتخاب کرلیا گیا اور یہ مکان انہیں الاٹ کرنے کی کاغذی تیاریاں مکمل ہونے لگیں۔ شومئی قسمت سے انہیں دنوں حکومت تبدیل ہوگئی۔ نئی حکومت نے حسب روایت پہلا کام یہ کیا کہ سابقہ حکومت سے منسوب تمام فلاحی اور ترقیاتی منصوبے ترک کردیے اور اپنے نام سے اور نئے نعرے کے تحت فلاحی اور ترقیاتی منصوبے شروع کردیئے' چونکہ یہ منصوبہ مکمل ہوچکا تھا لہٰذا سب سے پہلے تو اس منصوبے میں بے شمار خامیاں نکالی گئیں اس کے بعد تمام سابقہ مستحقین کے الاٹ منٹس منسوخ کرکے اپنے 'اصلی اور سچے' مستحقین کو یہ مکانات بانٹنے کی تیاریاں شروع کردیں۔ ابھی یہ تیاریاں مکمل بھی نہیں ہو پائی تھیں کہ ایک بار پھر حکومت تبدیل ہوگئی۔ نئی حکومت نے بھی اپنی پیش رو حکومت کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تمام سابقہ منصوبے منسوخ کرکے نئے منصوبوں کی تیاریاں شروع کردیں۔ ان مکانات کے لیے ایک بار پھر مستحقین ڈھونڈے جانے لگے لیکن اس اثنا میں ان مکانات کی حالت اتنی خستہ ہوگئی کہ شاید ان میں بسیرا کرنے والے جن بھوت بھی کہیں اور منتقل ہوچکے ہوں۔ حکومت نے ان مکانات کی مرمت کے لیے اخراجات کا تخمینہ لگوانا چاہا تو معلوم ہوا کہ اس تمام عرصے کے دوران تعمیری لاگت میں اس قدر اضافہ ہوچکا ہے کہ ان مکانات کی مرمت کے اخراجات ان کی تعمیر کے اخراجات سے بھی بڑھ جائیں گے۔ اس مرحلے پر حکومت نے ان مکانات کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور عوام کی خدمت کے لیے نئے منصوبوں کی تیاریاں کی جانے لگیں۔ نتیجتاً اب یہ لاوارث مکانات اس صحرا میں عبرت کا نشان بنے کھڑے ہیں۔' میں نے طنز اور دکھ کے ملے جلے تاثرات سے لبریز ایک اچھی خاصی تقریر جھاڑ دی۔

'تمھارا مشاہدہ اور مطالعہ قابل رشک ہے نوجوان۔ وطن سے محبت کا جذبہ بھی تمھارے ہر جملے سے جھلک بلکہ چھلک رہا ہے۔' صدیقی نے تعریفی لہجے میں کہا۔ 'تم دلی جذبات کو الفاظ میں بیان کرنے کی خداداد صلاحیت سے مالا مال ہو۔' مرزا نے اپنے مخصوص انداز میں گردن ہلا کر صدیقی کی رائے سے اتفاق کیا۔

جیپ ایک صحرائی بستی کے پاس سے گزری تب تک اس سڑک پر ٹریفک بہت کم رہ گیا۔ صدیقی کھلی سڑک پر جیپ کو بھگائے جا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا مرزا کسی قسم کی بے چینی میں مبتلا ہے۔ اس نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے کئی بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کی تقلید میں' میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مجھے خاصے فاصلے پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ کچھ ہی دیر بعد صدیقی نے بھی مرزا کی بے قراری کو بھانپ لیا۔ 'خیر تو ہے مرزا؟ تم کچھ پریشان دکھائی دیتے ہو؟'

'مجھے شک ہے کہ کوئی گاڑی خاصی دیر سے مسلسل ہمارا پیچھا کررہی ہے۔ میں اس ہیڈ لائٹ کو مظفر گڑھ کے بعد سے مسلسل اپنے عقب میں دیکھ رہا ہوں۔' مرزا نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

'ممکن ہے تمھارا یہ شک بے معنی ہو۔ اس سڑک پر بہت سی گاڑیاں آ جا رہی ہیں۔ ممکن ہے اس

گاڑی کی اور ہماری منزل ایک ہی ہو۔ ویسے بھی ہم خاصی تیز رفتاری سے سفر کررہے ہیں۔ اسی لیے یہ گاڑی ہمیں اوور ٹیک نہیں کرسکی۔'

'یہی تو میرے شک کی وجہ ہے بھائی۔ تم کئی بار سو کی حد کو پار کرچکے ہو اس کے باوجود ہماری گاڑی کا اس گاڑی سے فاصلہ جوں کا توں ہے۔'

'اگر ایسی بات ہے تو ہم ابھی تمھارے شک کی تصدیق کرلیتے ہیں۔' صدیقی نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جیپ کی رفتار میں یک لخت اضافہ کردیا۔ جیپ کے اسپیڈو میٹر کا کانٹا ایک سو دس ایک سو بیس کے ہندسوں کے درمیان لڑکھڑانے لگا۔ رفتار میں اضافہ ہوتے ہی اونچی نیچی سڑک کے نتیجے میں لگنے والے دھچکوں میں اضافہ ہوگیا۔ یہ تو جیپ تھی جو اس ظلم و ناانصافی کو خندہ پیشانی سے برداشت کر رہی تھی۔ اگر اس کی جگہ کوئی کار ہوتی تو جانے کب کی جواب دے چکی ہوتی۔

مرزا کی نظریں اس دوران مسلسل عقب میں جمی رہیں۔ میں نے بھی اپنی نظریں پچھلی گاڑی کی ہیڈ لائٹس پر جما دیں۔ ہماری گاڑی کی رفتار میں اضافہ ہونے کے باعث کچھ دیر کے لیے وہ ہیڈ لائٹس پیچھے رہیں' اس کے بعد ایک بار وہ روشنیاں ہماری جیپ کے عقب میں ایک مخصوص فاصلے پر آ گئیں۔ صدیقی نے اپنے عقب نما آئینے پر گہری نظریں ڈالیں اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

'تم صحیح کہہ رہے ہو مرزا! یہ گاڑی واقعی ہمارا تعاقب کررہی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم لوگ شدید خطرے کی زد میں ہیں۔'

'گاڑی کی رفتار کم نہ کرنا صدیقی۔ اس گاڑی سے اپنا فاصلہ ہرگز کم نہ ہونے دینا۔ اس ویرانے میں' اس قطعاً اجنبی علاقے میں ہم تصادم کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔' مرزا نے پرتشویش لہجے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

'مرزا صاحب کا کہنا بالکل صحیح ہے۔۔۔۔ صدیقی صاحب ہمیں براہ راست تصادم سے ہر ممکن گریز کرنا ہے۔ اگر یہ سردار شاہ مراد کے زرخرید غلام ہیں تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ ہماری نقل و حرکت اور ہمارے ارادوں سے پوری طرح واقف ہیں۔' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

'لیکن ان لوگوں کو ہمارے متعلق یہ سب معلومات کیسے حاصل ہوگئیں۔۔۔'

'یہ بھی کسی نہ کسی طرح معلوم ہو ہی جائے گا صدیقی صاحب فی الحال تو ہماری کوشش ہونا چاہیے کہ ہم صحیح سلامت ڈیرا غازی خان پہنچ جائیں۔ اس کے بعد ہی ہم اس مصیبت سے نجات کی کوئی صورت نکال سکیں گے۔۔۔'

صدیقی جیپ کو کسی جیٹ طیارے کی طرح اڑائے جا رہا تھا۔ میں اس کی ڈرائیونگ کی مہارت کا بری طرح قائل ہوگیا۔ وہ گاڑی کی رفتار سو سے کم نہیں ہونے دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم صحرائی علاقے سے آگے نکل آئے۔ اس کے ساتھ ہی سڑک زیادہ چوڑی اور ہموار ہوگئی۔ صدیقی نے جیپ کی رفتار مزید تیز کردی۔ میں نے دیکھا کہ پچھلی گاڑی کا ہم سے فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ میری تقلید میں صدیقی نے بھی عقب نما آئینے میں جھانک کر پچھلی گاڑی سے اپنی گاڑی کے فاصلہ کا اندازہ لگانا چاہا' عین اسی

وقت میری نظر سامنے پڑی جو مجھے سامنے نظر آیا اسے دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ خوف اور استعجاب کے عالم میں میری آنکھیں پھٹنے لگیں۔

’صدیقی صاحب!‘ میرے حلق سے دہشت انگیز چیخ نکلی۔ صدیقی نے چونک کر میرے چہرے کی طرف دیکھا پھر اس کی نظریں بھی سامنے کی جانب اٹھ گئیں۔ اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں بھی دہشت کی شدت سے اپنے حلقوں سے باہر آنے لگیں پھر وہ چونک کر اپنے حواس میں واپس آ گیا۔ اس کا بایاں پاؤں برق رفتاری سے حرکت میں آیا اور پوری قوت سے بریک کو دباتا چلا گیا۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میرا سر ایک دھماکے سے جیپ کے ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دماغ گہری‘ بے رحم تاریکی کے بھنور میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆O☆

یا اللہ خیر!‘ میرے چکراتے ہوئے دماغ میں بے اختیار یہ دعائیہ کلمات کسی الیکٹرک نیون سائن کے مانند چمک اٹھے جو منظر میری آنکھوں نے دیکھا وہ اتنا دہشت ناک تھا کہ ایک لمحے کے لیے تو میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ تیزی سے قریب آتی موت کو دیکھ کر میرے جسم کے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کول تار کی کھردری سڑک کے ساتھ بری طرح رگڑ کھانے کے باعث جیپ کے ٹائر بڑی درد ناک آواز میں چیخ رہے تھے۔ حد درجہ تیز رفتاری کے باعث‘ بریک لگانے کے باوجود جیپ فوری طور پر رکنے کے بجائے دور تک سڑک پر گھسٹتی چلی گئی۔ آنے والے لمحات کے تصور سے مجھے اپنا سانس سینے میں اٹکتا محسوس ہوا۔ کیا صدیقی اتنی مہلت میں جیپ روکنے میں کامیاب ہو سکے گا؟ جیپ مزید کچھ دور تک سڑک پر گھسٹتی چلی گئی۔ مجھے لگا کہ موت عین سر پر آن پہنچی ہے۔ یک لخت جیپ بری طرح لہرائی اور ایک جھٹکے سے ساکت ہو گئی۔

ٹائروں کی کان پھاڑ دینے والی چرچراہٹوں کے بعد وہ سکوت کانوں کو بے حد نامانوس سا لگا۔ عین اسی وقت میرے کانوں میں صدیقی کے کراہنے کی آواز گونجی۔ اچانک بریک لگانے کے باعث اس کے سینے پر اسٹیرنگ وہیل کا تباہ کن دباؤ پڑا ہو گا۔ عین ممکن ہے اس کی کوئی پسلی بھی شکستہ ہو گئی ہو۔ جیپ کے ٹھہرتے ہی میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے جیپ کے سامنے نگاہ ڈالی۔ جیپ کی تیز ہیڈ لائٹوں میں مجھے موت کا پیامبر وہ ٹرک محض چند گز کی دوری پر نظر آیا۔ اگر صدیقی کو بریک لگانے میں ایک لمحے بھی تاخیر ہو جاتی تو ہماری جیپ کے پرخچے اڑ جاتے اور ہم تینوں کی لاشوں کا نام و نشان بھی نہ ملتا۔

وہ ٹرک سڑک کے آر پار ترچھا کھڑا ہوا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف میں خاصی عمودی ڈھلوان تھی۔ سڑک سے نیچے اترنے کی صورت میں کوئی بھی گاڑی الٹنے سے نہ بچ پاتی۔

جس وقت میں نے اس ٹرک کو دیکھا اس وقت اُس کا ہماری جیپ سے فاصلہ تقریباً ڈیڑھ سو گز رہا ہو گا۔ اس وقت وہ بے حد سست رفتاری سے ’خراماں خراماں سڑک کے انتہائی دائیں کنارے پر چلا جا رہا تھا۔ تعاقب میں آنے والی گاڑی کے چکر میں صدیقی نے اس پر کوئی دھیان نہ دیا اس وقت بھی صدیقی عقب میں آنے والی گاڑی کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اتفاق سے اس وقت میری نظر

سامنے سڑک پر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ سڑک کے انتہائی دائیں کنارے سے اچانک اس ٹرک نے رخ بدلا اور سڑک کے دوسرے کنارے کی جانب مڑ کر یک لخت ساکن ہو گیا۔ اس طرح اس نے پوری سڑک بلاک کر دی۔ اس کے دائیں بائیں سے کسی موٹر سائیکل کے گزرنے کی بھی گنجائش نہ رہی۔ جب تک میں صورت حال کو پوری طرح سمجھتا اور صدیقی کو خبردار کرتا‘ جیپ اور ٹرک کا درمیانی فاصلہ مزید کم ہو گیا۔ جس وقت صدیقی نے بریک لگائے تب تک جیپ اور ٹرک کا درمیانی فاصلہ بمشکل پچاس گز رہ گیا۔ جیپ رکتے رکتے بھی ٹرک کے اس قدر قریب پہنچ گئی کہ میں ٹرک کی ڈیزل کی ٹنکی پر لکھی ہوئی تحریر بھی بخوبی پڑھ سکتا تھا جس میں ٹنکی کی گنجائش سے آگاہ کیا گیا تھا۔

میرے کانوں میں صدیقی کے بری طرح کھانسنے کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا سینہ دبائے بری طرح کھانس رہا تھا۔ عین اسی وقت مجھے اپنے شانے پر مرزا کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ اس نے سرسراتی آواز میں میرے کانوں میں سرگوشی کی۔ ’قابو رہنا جوان۔ ہم لوگ دشمنوں کے گھیرے میں آ چکے ہیں۔‘ میں نے گویا سحر زدہ کیفیت میں اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔

اس نے میرے سپاٹ چہرے سے میری ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔ اس نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ ’اپنے حواس پر قابو پاؤ لڑکے ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔‘ اس کے لہجے میں پوشیدہ سرزنش نے میرے شل اعصاب کے لیے مہمیز کا کردار ادا کیا۔ میں ہلکی سی جھرجھری لے کر گویا بیدار ہو گیا۔ صورت حال کی سنگینی کا پوری طرح احساس ہوتے ہی میرے جسم میں ایک کرب کی لہر دوڑ گئی‘ اب کیا ہو گا؟ ہمارا راستہ تو اس بدنما دیو نے روک لیا جبکہ ہمارے خون کے پیاسے‘ ہمارے شکاری‘ ہمارے عقب میں سر پر چڑھے آ رہے ہیں۔ کیا کریں۔۔۔۔۔؟ اب کیا کریں؟

ہمارے ہتھیار بھی تو فی الحال ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ کیا یہ ٹرک بھی ہماری پیش قدمی کو روکنے کے لیے ہمارے شکاریوں نے استعمال کیا ہے؟ مجھے صدیقی اور مرزا پر شدید غصہ آیا جنہوں نے معمولی سے معمولی ہتھیار بھی میرے پاس رہنے نہیں دیا۔ اگر وہ ہتھیار ہمارے پاس ہوتے تو ہم کسی نہ کسی حد تک اپنا دفاع کرنے میں کامیاب ہو ہی جاتے۔ شدید بے بسی کے عالم میں‘ میں محض ہونٹ چبا کر رہ گیا۔

صدیقی اور مرزا میری ذہنی کیفیت سے بے خبر‘ ٹرک پر نظر جمائے بیٹھے تھے۔ میں نے بھی بغور ٹرک کے ڈرائیونگ کیبن کی طرف دیکھا۔ مجھے وہاں کسی قسم کی نقل و حرکت نظر نہ آئی۔ وہ لوگ شاید ہماری طرف سے پیش قدمی کے منتظر تھے۔

’اب کیا کریں صدیقی صاحب؟‘ میں نے بے تاب لہجے میں پوچھا۔

’صرف انتظار۔۔۔۔۔۔ ہم لوگ جال میں پھنس چکے ہیں۔ ہمارا کوئی بھی غلط قدم ہمیں موت کے منہ میں لے جا سکتا ہے۔ یہ سب اتفاق نہیں ہے۔ ہمیں باقاعدہ منصوبے کے تحت گھیرا گیا ہے۔‘

’کچھ ہی دیر بعد صدیقی کے اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ہم نے کسی گاڑی کے طاقتور انجن کی آواز سنی۔ میں نے تیزی سے پلٹ کر عقب میں دیکھا۔ وہ سرخ رنگ کی فور وہیل ڈرائیو‘ ڈبل کیبن

ہائی لکس گاڑی تھی جو سر پر چڑھی آ رہی تھی۔ ہماری جیپ کے پہلو میں پہنچ کر وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ گاڑی کے رکتے ہی گاڑی کے پچھلے کھلے حصے سے تین مسلح افراد کودے اور انہوں نے ہماری جیپ کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔

وہ تینوں ہی مقامی لباس میں تھے اور انہوں نے اپنے چہرے منڈاسوں میں چھپا رکھے تھے۔ ان کے حلیے دیکھتے ہی میرے ذہن میں فوری طور پر ایک خیال آیا' میں نے مدھم لہجے میں صدیقی اور مرزا کو مخاطب کیا۔

'آپ لوگ مجھے ان سے بات کرنے دیجیے گا اور ہاں ہم تینوں سرائیکی' پشتو اور بلوچی زبان سے ناواقف ہیں۔ سمجھ گئے نا؟' میں نے جلدی جلدی اپنی بات مکمل کی۔ مرزا اور صدیقی نے کوئی جواب دینے کے بجائے اس اثبات میں سر ہلا دیا۔

اسی اثنا میں اس گاڑی نے مزید چار افراد اگل دیے۔ وہ چاروں بھی پوری طرح مسلح تھے۔ ان میں سے دو نے میری اور صدیقی کے اطراف والے دروازے کھول دیے۔

'تم لوگ خاموشی سے گاڑی سے نیچے اتر آؤ۔ کوئی چالاکی دکھائی تو اچھا نہ ہوگا۔' ان میں سے ایک بھاری بھرکم نقاب پوش نے سرائیکی زبان میں حکم دیا۔

صدیقی نے بے بسی کے عالم میں میری طرف دیکھا۔ میں نے گویا ان دونوں کی ترجمانی کا فریضہ سنبھالتے ہوئے اردو اور سرائیکی زبان ملاتے ہوئے جواب دیا۔

'ہم لوگوں کو سرائیکی زبان صحیح طرح نہیں آتی بھائی۔ ہم سے اردو میں بات کرو۔' میں نے محسوس کیا کہ میری بات سن کر وہ شخص تھوڑا سا چونکا ہے۔

'اچھا تم لوگ نیچے تو آؤ۔' اس نے نہایت شگفتہ لہجے میں اردو بولتے ہوئے کہا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اسے ان تمام افراد میں خاص حیثیت حاصل ہے۔ اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

سب سے پہلے صدیقی نیچے اترا۔ اس کے بعد میں بھی نیچے اتر آیا۔ اس کے بعد مرزا نے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا۔ اس کی نقل و حرکت اور چہرے کے تاثرات سے یہ اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ وہ ستر سال کا ضعیف آدمی نہیں ہے۔ وہ لرزتے لڑکھڑاتے قدموں سے جیپ سے اترا اور نحیف آواز میں نقاب پوش سے مخاطب ہوا۔

'تم کون ہو بیٹا؟ کیوں ہمارا راستہ روک کو کھڑے ہو گئے ہو؟' مرزا کو دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر وہ شخص واضح طور پر چونک پڑا۔

وہ ہیڈ لائٹوں سے منعکس ہونے والی روشنی میں بغور مرزا کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ کسی الجھن کا شکار ہو گیا ہے۔ میں نے قدرے بلند آواز میں مرزا کو مخاطب کیا۔

'یہ لوگ ڈاکو ہیں ابا جی۔' میری توقع کے عین مطابق مرزا نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ میری بات صحیح طرح سن نہیں سکا ہے۔

'اس نے دائیں کان پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ 'تم نے کیا کہا زلفی بیٹے؟' اس کی آواز میں اس قدر حقیقی

لرزش تھی کہ میرا بے اختیار واہ واہ کہنے کو دل چاہا۔ میں نے اس کے کان کے قریب منہ کر کے مزید بلند آواز میں اپنی بات دہرا کر مرزا سے کہا۔

'اچھا اچھا۔ پر یہ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟'

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میری نظریں اس نقاب پوش سرغنہ پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے ایک بار پھر واضح طور پر احساس ہوا کہ وہ شدید تذبذب کا شکار ہے۔ اچانک وہ مڑا اور اپنے قریب موجود ایک نقاب پوش کے کان میں کچھ کہنے لگا۔ اس نے دھیمی آواز میں اسے جواب دیا۔ اس کی آواز ہلکی ہونے کے باوجود میں اس کی بات سمجھنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس نے بلوچی زبان میں کہا تھا۔ 'اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے' شمروز خان۔ یہ یقیناً وہی جیپ ہے۔ وقت ضائع نہ کرو۔ انہیں فوراً گولی مار دو اور یہاں سے نکل چلو۔ کسی وقت بھی یہاں کوئی گاڑی پہنچ سکتی ہے۔' اس کی بات سن کر وہ نقاب پوش شمروز خان خاصے طیش میں آ گیا۔

اس نے تیز لہجے میں اسے تقریباً ڈپٹتے ہوئے کہا۔ 'تم پر تو ہر وقت خون سوار رہتا ہے دلدار خان! تمھارا کہنا ہے کہ یہ جیپ ہماری مطلوبہ جیپ جیسی ہے لہٰذا ہم اس میں سوار لوگوں کو فوراً گولی مار دیں۔ تم جیپ کا حلیہ تو دیکھ رہے ہو لیکن ان لوگوں کا حلیہ نہیں دیکھ رہے۔ تمھارا کیا خیال ہے یہ بڈھا کھوسٹ سرکاری ایجنٹ ہے؟ اگر یہ بے گناہ نکلے تو انہیں مار کر ہمیں کتنے نفلوں کا ثواب ملے گا؟'

ان دونوں کی باہمی گفتگو سن کر مجھے اپنی رگوں میں خون جمتا محسوس ہوا۔ وہ لوگ اس حقیقت سے پوری طرح واقف تھے کہ ہم کس قسم کی گاڑی میں' کس ارادے سے ڈیرہ غازیخان کی طرف روانہ ہو رہے ہیں۔ چنانچہ وہ پہلے سے ہی ہماری گھات میں تھے۔

ان لوگوں کے ساتھی شاید ملتان سے ہمارے نکلنے کے بعد ہم پر نظر نہیں رکھ سکے۔ البتہ انہوں نے ہماری جیپ کی ساخت وغیرہ سے اپنے ان ساتھیوں کو مطلع کر دیا جو مظفر گڑھ میں یا مظفر گڑھ سے باہر ہمارے منتظر تھے۔ ان کی ایک غلطی یہ تھی کہ انہوں نے ہماری جیپ کا نمبر نوٹ نہیں کیا۔

اس وقت ان کی یہی غلطی ہماری زندگی کے بچاؤ کے لیے کسی قدر امید کا سامان بن گئی۔ دوسری طرف مرزا کی میک اپ میں اور اداکاری میں مہارت نے اس شخص شمروز خان کے یقین کو متزلزل کر دیا کہ ہم لوگ ہی ان کے مطلوبہ افراد ہیں۔ بصورت دیگر انہیں حکم ملا تھا کہ ہمیں فوری طور پر گولی کا نشانہ بنا کر ہمارا قصہ پاک کر دیا جائے۔

'ناراض کیوں ہوتے ہو استاد شمروز۔' میں نے دلدار کو مدافعانہ لہجے میں کہتے سنا۔ 'تمھاری جو مرضی میں آئے کرو لیکن روڈ تو جام نہ کرو۔'

'ٹھیک ہے فیروز سے کہو کہ وہ ٹرک کو سیدھا کر کے اڈے پر لے جائے۔ ہم ان لوگوں کو ایک طرف لے جا کر ان سے اچھی طرح پوچھ گچھ کرتے ہیں۔ اگر یہ ذرا بھی مشکوک ثابت ہوئے تو ہم انہیں سردار کے حکم کے مطابق گولی مار دیں گے۔ فرمان علی سے کہو کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ یہیں موجود رہے۔ اگر کوئی اور اسی طرح کی جیپ آتی نظر آئے تو اس کو روک کر سواریوں کی تلاشی وغیرہ

تک ہم واپس نہ آ جائیں اس گاڑی کو روکے رکھیں۔'

دلدار نے شمروز خان کے حکم کے عین مطابق ٹرک کو فوری طور پر آگے روانہ کر دیا۔ اس اثنا میں شمروز کے حکم پر اس کے ساتھیوں نے خاصی باریک بینی سے ہماری تلاشی لی۔ ہمارے ہتھیار گاڑی کے خفیہ خانوں میں پوشیدہ ہونے کے باعث وہ ہمارے قبضے سے کوئی قابل اعتراض شے برآمد نہ کر سکے۔ ہمارے پاس جو رقم تھی اسے انہوں نے ہاتھ بھی نہ لگایا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہمارے نہتا ہونے کا یقین ہو جانے کے بعد شمروز اور اس کے ساتھیوں کے کشیدہ اعصاب خاصی پرسکون حالت میں آ گئے ہیں۔

میں نے کن انکھیوں سے مرزا اور صدیقی کی طرف دیکھا۔ مجھے ان کے چہرے پر اطمینان کی ہلکی سی جھلک نظر آئی۔ وہ لوگ شاید شمروز اور اس کے ساتھی کی گفتگو کو تو نہیں سمجھ سکے ہوں گے تاہم انہوں نے یہ اندازہ تو یقیناً لگا لیا ہوگا کہ ان کی زندگیوں کو فوری طور پر کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔

یہ خطرہ اگرچہ اب بھی سر پر منڈلا رہا ہے تاہم ہمیں کچھ نا کچھ مہلت ضرور مل گئی کہ ہم اپنی مدافعت میں جو ممکن ہو وہ کر گزریں۔

تم لوگ اپنی گاڑی میں بیٹھو۔ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ ہمیں تم سے کچھ سوال جواب کرنا ہے۔' شمروز نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں ہمیں اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

'لیکن ہمیں بہت دور جانا ہے بھائی صاحب۔ پہلے ہی بہت رات ہو چکی ہے۔ آپ کو ہم سے جو کچھ پوچھنا ہے یہیں پوچھ لیں۔ ہمارے پاس زیادہ رقم نہیں ہے۔ اگر آپ چاہیں تو ہم وہ رقم آپ کے حوالے کر دیتے ہیں۔'

میں نے اپنے لہجے میں لجاجت اور احتجاج کے ملے جلے تاثرات سموتے ہوئے کہا۔ اس بار میں نے سرائیکی زبان کا سہارا لینے کے بجائے صاف ستھری اردو زبان میں بات کی۔ میں نے محسوس کیا کہ شمروز کا یقین مزید متزلزل ہو گیا ہے کہ ہم اس کے مطلوبہ افراد ہیں۔ میرے اس احساس کی تائید بھی فوراً ہو گئی جبکہ شمروز نے ہمیں کسی اور جگہ لے جا کر تفصیل سے پوچھ گچھ کا ارادہ ترک کر کے ہم سے وہیں سوال جواب شروع کر دیے۔

اس سے قبل دونوں گاڑیاں سڑک سے ہٹا کر کنارے پر کھڑی کر دی گئیں۔ شمروز اور دلدار ہمیں جیپ کے دوسری طرف لے آئے۔ اس طرح ہم سڑک پر سے گزرنے والی دیگر گاڑیوں کے مسافروں کی نظر سے دور ہو گئے۔

'تم لوگ کون ہو اور اس وقت کہاں جا رہے ہو؟' شمروز نے سرد لہجے میں سوال کیا۔ اس کا مخاطب میں تھا۔

'میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا بھائی صاحب لیکن پہلے آپ میرے والد کو گاڑی میں بیٹھنے کی اجارت دے دیں۔ اس عمر میں اتنی دیر تک کھڑا رہنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔' میں نے نرم لہجے میں درخواست کی۔ شمروز کا ردعمل میری توقع کے عین مطابق رہا۔ 'اوہ—ٹھیک ہے' ٹھیک ہے—بابا جی تم جیپ میں بیٹھو۔' اس نے جلدی سے کہا۔ اس مرحلے پر مرزا نے ایک بار پھر شاندار اداکاری کا مظاہرہ

کیا۔

اس نے اپنے دائیں کان پر ہاتھ رکھ کا بھونپو سا بنا کر پوچھا۔ تم نے کیا کہا بیٹا ڈاکو' شمروز نے عجیب پشیمان سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے مرزا کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اسے سہارا دے کر جیپ کی طرف لے جاتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔' آپ جیپ میں بیٹھیں ابا جی۔ یہ لوگ ڈاکو نہیں ہیں۔ انہیں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ یہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔'

'اچھا••••••• اچھا' مرزا نے کچھ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں گردن ہلا کر کہا۔ میں نے جیپ کا دروازہ کھولا اور سہارا دے کر مرزا کو سیٹ پر بٹھا دیا۔ میں واپس لوٹا تو میں نے دیکھا کہ دلدار نے اپنا ڈھاٹا کھول دیا ہے۔ میں نے غور سے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔

'ہاں اب پوچھیے آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟' میں نے مطمئن لہجے میں شمروز کو مخاطب کیا۔

'تم لوگ یہ بتاؤ تم کہاں کے رہنے والے ہو اور اس وقت کہاں جا رہے ہو؟' شمروز نے سوال کیا۔

اس دوران میں وہاں سے ایک دو گاڑیاں گزریں لیکن ان میں سے کوئی بھی جیپ نہ تھی۔

'ہم لوگ ملتان کے رہنے والے ہیں بھائی اور ہمارا کپڑے کا کاروبار ہے۔ ہمیں ڈیرہ غازی خان سے آگے سخی سرور جانا ہے۔'

'شمروز نے بغور میری بات سنی۔ اس دوران میں اس کی عقابی نظریں میرے چہرے پر جمی رہیں۔ اگلا سوال اس کے دست راست دلدار نے کیا۔ اس کا لہجہ شمروز سے بھی زیادہ شکستہ اور اکھڑ تھا۔

'تم لوگ سخی سرور کیا کرنے جاتا ہے۔ کیا تم لوگ کو وہاں زیارت کرنا ہے؟'

'سخی سرور سلطانؒ کے دربار پر تو خیر ہمیں حاضری دینی ہی ہے بھائی لیکن دراصل ہم وہاں اپنی بہن سے ملنے جا رہے ہیں۔ اس کی وہاں شادی ہوئی ہے۔'

'تمھارا بہن کی شادی! سخی سرور میں؟ دلدار نے حیران لہجے میں سوال کیا۔

میں نے محسوس کیا کہ میری بات سن کر شمروز کو بھی تعجب ہوا ہے۔ اگلا سوال اسی نے کیا۔

'سخی سرورؒ میں تمھاری بہن کی شادی کس سے ہوئی ہے؟ میں وہاں کے زیادہ تر لوگوں کو جانتا ہوں۔ کس کے گھر گئی ہے تمہاری بہن؟'

'میری بہن عنبرین کی شادی وہاں کے رئیس سردار خضر خان سے ہوئی ہے۔ ہم اسی کے گھر جا رہے ہیں۔'

'کیا•••؟ کیا کہا تم نے؟ تمہاری بہن کی شادی سردار خضر خان سے ہوئی ہے؟' شمروز خان نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے سوال کیا۔

'ہاں بھئی۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ سردار خضر خان سے ہمارے بہت اچھے خاندانی تعلقات ہیں۔ وہ میرے ساتھ بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی میں پڑھتا رہا ہے۔ اس نے میری بہن کا رشتہ مانگا تو ہم نے اس کا رشتہ قبول کر لیا۔' میں نے پرسکون لہجے میں وضاحت کی۔

'لیکن سردار خضر خان تو شادی کا نام بھی نہیں سنتا تھا۔ کب کیا اس نے شادی؟' شمروز نے بے یقینی

کی کیفیت میں سوال کیا۔

'ابھی چار دن پہلے وہ ملتان آیا تھا۔ ہم نے اس کی خواہش پر سادگی سے اپنی بہن اس کے نکاح میں دے دی۔ ہم پہلی بار اپنی بہن کے گھر جا رہے ہیں۔ میری بہن میرے باپ کی لاڈلی ہے۔ لہٰذا یہ ہمارے منع کرنے کے باوجود ہمارے ساتھ آ گئے تاکہ اپنی بیٹی کا گھر دیکھ سکیں۔' یہ سب میں نے اتنے پر اعتماد لہجے میں کہا کہ دلدار کی تیز نگاہوں کی چبھن بھی کم ہو گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے شمروز کو تقریباً پوری طرح قائل کر لیا ہے۔

'اچھا تو یہ بات ہے۔' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ 'لیکن تم لوگ اتنی دیر سے وہاں کیوں جا رہے ہو؟ تمہیں معلوم ہے کہ سخی سرورؒ کا راستہ کتنا دشوار گزار ہے؟'

شمروز کے لہجے سے میں نے اندازہ لگایا کہ میں میدان مارنے میں کامیاب ہو چکا ہوں۔ میں نے شمروز کو قائل کر لیا ہے کہ ہم بے ضرر لوگ ہیں۔ یہ تو میں پہلے ہی سن چکا تھا کہ وہ بے گناہ افراد کے خون سے ہاتھ رنگنے کا قائل نہیں ہے۔ میرے جوابات نے اس کی پوری تشفی کر دی تھی۔ میں نے اس کے اعتبار کی دیوار پر ایک اور تہہ چڑھاتے ہوئے کہا۔

'سردار خضر نے مجھے اور میرے بھائی کو تمام راستہ بہت اچھی طرح سمجھا دیا تھا اور تمام صورت حال کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم وقت سے کچھ پہلے ہی گھر سے نکلتے لیکن عین وقت پر اباجی نے ضد شروع کر دی کہ وہ بھی اپنی بیٹی کو دیکھنے جائیں گے۔ مجبوراً ہمیں انہیں بھی ساتھ لینا پڑا۔ کچھ دیر تو ان کی تیاری کی وجہ سے لگ گئی پھر ہمیں راستے میں پانچ چھ مرتبہ ٹھہرنا پڑا۔ اباجی کو پیشاب کی بیماری ہے۔ لہٰذا بار بار ان کی رفع حاجت کے لیے ہم گاڑی روکتے رہے۔ اس کے علاوہ ہم مظفر گڑھ میں بھی ڈیڑھ گھنٹے ٹھہرے رہے کیونکہ اباجی تھکن محسوس ہو رہی تھی اور انہیں کھانا بھی کھلانا تھا۔ چنانچہ ہم سب سہ پہر کے قریب گھر سے نکلنے کے باوجود ابھی تک آدھا راستہ بھی طے نہیں کر پائے۔'

'زلفی بیٹا........ بیٹا مجھے پیشاب کرا دو۔' مرزا نے جیپ میں سے نحیف آواز میں مجھے پکارا۔

میں نے اجازت طلب نظروں سے شمروز کی طرف دیکھا۔

'ہاں........ ہاں ضرور........ ضرور' اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلا کر مجھے اجازت دے دی۔

میں نے صدیقی کے ساتھ مل کر مرزا کو سہارا دے کر جیپ سے اتارا۔ اس دوران میں میری صدیقی سے آنکھیں چار ہوئیں۔ میں نے اس کے چہرے پر حیرانی اور تحسین کے گہرے تاثرات دیکھے۔ میں اس کے دلی جذبات کو سمجھ گیا۔ اس کی حیرانی کی وجہ بھی معلوم تھی۔ میں نے اس کی کیفیت کو نظر انداز کرتے ہوئے مرزا کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے سنبھالتا ہوا ایک قریبی جھاڑی کی طرف بڑھا۔

شمروز کے کسی مسلح ساتھی نے ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش نہ کی البتہ صدیقی، شمروز کے پاس موجود رہا۔ ان کی سماعت کی حد سے پوری طرح اور بصارت کی حد جزوی طور پر باہر آتے ہی مرزا نے مجھے گرم جوشی سے گلے لگا لیا۔

'واہ میرے شیر کیا کام دکھایا ہے تو نے' جی چاہتا ہے تیرا منہ چوم لو

'یہ سب آپ جیسے مہربانوں کی کرم نوازی اور خدا کی رحمت ہے استاد جی ورنہ میں کس قابل ہوں لیکن ابھی خطرہ پوری طرح ٹلا نہیں ہے۔ ان لوگوں کو کسی بھی وقت ہم پر دوبارہ شک ہو سکتا ہے۔'

'لیکن یہ سردار خضر خان کون ہے؟' مرزا نے ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اس کے پاس کھڑے ہو کر سڑک کی طرف نظر جماتے ہوئے کہا۔ 'خدا کرے ہم یہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائیں۔ میں راستے میں آپ لوگوں کو سب کچھ بتا دوں گا۔'

'لیکن تمھاری ذہانت اور حاضر دماغی نے تو مجھے حیران کر دیا ہے بھئی۔ اگر تم یہ شوشا نہ چھوڑتے تو سمجھو کہ ہمارا آخری وقت آ ہی گیا تھا۔'

مرزا نے رفع حاجت میں جان بوجھ کر خاصی دیر لگائی۔ میرے سہارے سے سڑک کے کنارے کی چڑھائی چڑھتے ہوئے اس نے باقاعدہ کراہنا شروع کر دیا۔ میں نے اسے جیپ کی سیٹ پر بٹھایا تو وہ اس طرح ہانپنے لگا جیسے وہ میلوں دور سے بھاگتا ہوا آیا ہو۔ اس کے یہ تمام ہتھکنڈے تیر بہ ہدف ثابت ہوئے۔ شمروز نے معذرت خواہانہ انداز میں مجھے مخاطب کیا۔

'ٹھیک ہے ہمیں اب تم سے کچھ نہیں پوچھنا۔ تم لوگ اب جا سکتے ہو۔ اگر تم لوگ پولیس کے چکر میں نہ پڑو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ ہو سکے تو سردار خضر سے بھی ہمارا ذکر نہ کرنا۔ ویسے اگر تم صبح کے وقت سخی سرورؒ جاؤ تو زیادہ بہتر ہے۔'

'آپ کا بہت بہت شکریہ بھائی صاحب۔ آپ نے ہمیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائی لہٰذا ہمیں پولیس کے چکر میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے آپ برا نہ مانیں تو میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ لوگوں کو کس کی تلاش ہے؟'

'تم کو اس سے کیا لینا دینا ہے بھائی۔' شمروز نے پژمردہ لہجے میں کہا۔ 'تم لوگ اپنے راستے پر جاؤ۔ ہمیں جن کی تلاش ہے انہیں تو ہم ڈھونڈ ہی لیں گے۔' اپنی بات ختم کر کے شمروز نے مجھ سے اور صدیقی سے ہاتھ ملایا اور اپنی گاڑی پر جا بیٹھا۔

اس کے ساتھی بھی اپنے ہتھیاروں کو لہراتے ہوئے اس گاڑی میں سوار ہوئے۔ گاڑی نے یوٹرن لیا اور دھول اڑاتی ہوئی واپس مظفر گڑھ کی جانب روانہ ہو گئی۔

گاڑی کے روانہ ہوتے ہی ہم نے اپنے سینوں میں رکی ہوئی سانسوں کو آزاد کیا۔ اچانک میں نے مرزا کی مسرور آواز سنی۔ 'گاڑی میں آ جاؤ میرے بچو! ایسا نہ ہو تمہارے وہ سسرالی واپس آ جائیں۔'

'جو حکم اباجی!' صدیقی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ گاڑی کی اسٹیرنگ سیٹ پر جا بیٹھا جبکہ میں نے حسب سابق اس کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی۔ اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ جیپ کا طاقتور انجن زور سے غرایا۔ صدیقی نے گیر لگا کر ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچھ ہی دیر میں گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

چند لمحے کے لیے میرا ذہن بے اختیار اس شخص شمروز خان کی جانب منتقل ہو گیا۔ وہ ہمارے لیے

موت کا فرشتہ بن کر نازل ہوا لیکن آخر میں دیرینہ دوستوں کے مانند مصافحہ کر کے ہم سے رخصت ہوا۔ اگر وہ اپنے ساتھی دلدار کے مشورے کے مطابق محض شک کی بنیاد پر ہمیں گولی کا نشانہ بنا دیتا تو اس کے لیے کیا مسئلہ تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس کے سنگ صفت دل میں ابھی انسانیت کی مدھم سی چنگاری زندہ تھی۔ شاید یہی موہوم سی چنگاری کسی انسان اور خونی درندے کے درمیان حد فاصل ہوتی ہے۔ یہ چنگاری دم توڑ دے تو انسان شرف انسانیت سے محروم ہو کر بے رحم حیوان بن کر رہ جاتا ہے۔ اگرچہ شمروز نامی اس شخص نے اپنے اوپر خونی درندے کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے لیکن اس کے وجود کے کسی گم گشتہ گوشے میں ایک دردمند انسان چھپا بیٹھا ہے۔

'مان گئے بھئی تمہیں ذوالفقار علی خان! تم تو واقعی چھپے رستم نکلے۔ تم نے تو ہم جیسے گرگ باراں دیدہ بڈھوں کو بھی جاسوسی کے داؤ پیچ میں پیچھے چھوڑ دیا۔' صدیقی نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

اس لمحے گاڑی سنسان سڑک پر سو سے اوپر رفتار پر اڑی جا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا۔ مرزا نے محبت بھرے انداز میں میرا کاندھا تھام لیا۔

'قسم پاک رب کی ذوالفقار علی خان میں نے اپنی بیس سالہ سروس میں تم جیسا حاضر دماغ اور شاطر نوجوان نہیں دیکھا۔ تمہارا دماغ تو کسی کمپیوٹر سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے کام کرتا ہے۔ ہم ذرا اس مہم سے فارغ ہو لیں اس کے بعد ہم تمہیں اپنے ساتھ ہی اسلام آباد لے جائیں گے۔ تم جیسے باصلاحیت اور ذہین نوجوان ہی کی تو ہمارے ملک اور ہماری قوم کو ضرورت ہے۔' کم گو اور متین فطرت کے مالک جمیل مرزا نے اس وقت میری تعریف میں ایک اچھی خاصی تقریر جھاڑ ڈالی۔

'ہاں ہاں مرزا صحیح کہہ رہا ہے۔ ہم اپنے اعلیٰ افسران سے بات کریں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ تمہیں ہمارے ادارے کے لیے منتخب کر لیا جائے گا۔ تم جیسے ہیرے کی تو ہر جگہ قدر ہوتی ہے۔' صدیقی نے پرجوش لہجے میں اپنے ساتھی کی تائید کی۔

ان کے منہ سے اپنی بے تحاشا تعریف سن کر مجھے شرم آنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی میرے دل کے کسی گوشے میں کرب کی ایک تیز لہر ابھری۔ کاش ایسا ممکن ہو سکے۔! کاش مجھے کوئی ایسا زود اثر محلول مل جائے جو میرے نامۂ اعمال کی سیاہی دھو سکے۔ میرے دامن پر لگے بے شمار افراد کے خون کے چھینٹوں کو صاف کر سکے۔ میں۔ سیف داد خان۔ ایک بے گھر' بے در' خانماں برباد' گم کردہ راہ بدنصیب! کیا میں ان تعریفوں کا مستحق ہوں؟ اگر ان دونوں کو معلوم ہو جائے کہ میری اصلیت کیا ہے تو شاید یہ سب کچھ بھول بھال کر پہلی فرصت میں مجھے اپنے شکنجے میں جکڑ لیں۔ یہ مجھے ہیرا کہہ رہے ہیں جبکہ حقیقتاً میری قدر و قیمت کسی پتھر سے بھی کم ہے۔

'کیا سوچ رہے ہو؟' صدیقی نے میری خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے سوال کیا۔ 'کیا تمہیں اس مصیبت سے بچ نکلنے پر خوشی محسوس نہیں ہو رہی ہے؟'

'خوشی تو محسوس ہو رہی ہے صدیقی صاحب لیکن ابھی تک ہم خطرے کی حدود سے باہر نہیں نکلے ہیں بلکہ دراصل ابھی تو ہم خطرناک علاقے میں داخل بھی نہیں ہوئے۔ اس سے پہلے ہی مصیبتیں ہمارا

مزاج پوچھنے لگی ہیں۔ اصل خطرے کے علاقے میں پہنچنے کے بعد ہمارا کیا حشر ہوگا؟'

'اوہ۔ واقعی یہ تو تم صحیح کہہ رہے ہو۔ ہمیں اب مزید احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔' صدیقی نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

'ہاں ہم غازی گھاٹ کے پل پر پہنچنے والے ہیں۔ اس کے بعد یہ سمجھیں کہ ہم مکمل طور پر سردار شاہ مراد کے بھٹ میں داخل ہو جائیں گے' جہاں قدم قدم پر ہمارے خون کے پیاسے بھیڑیے ہمارے منتظر ہیں۔ اس شخص شمروز نے تو ہماری باتوں پر یقین کر لیا لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں روکنے والا اگلا گروہ ہم سے بات کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کرے بلکہ اس سے پہلے ہی ہمیں گولیوں سے چھلنی کر دے۔ یہ جیپ کسی بھی وقت ہمارے لیے موت کا پیام بر ثابت ہو سکتی ہے۔'

'تم صحیح کہہ رہے ہو۔ جب تک ہم اس جیپ میں ہیں' ہماری زندگی مسلسل خطرے میں ہے۔ یہ جیپ ہماری پہچان بن چکی ہے۔ ہم کیسا ہی بھیس بدل لیں' اس جیپ کی وجہ سے ہم فوری طور پر شک کا نشانہ بن جائیں گے۔' صدیقی نے گھمبیر لہجے میں میری تائید کی۔ 'اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہم ملتان میں ہی پوری طرح ان لوگوں کی نظروں میں آ گئے تھے۔ ہمارے گھر تک نہایت ہوشیاری سے ہمارا تعاقب کیا گیا۔ جب ہم جیپ پر سفر پر روانہ ہوئے تو ہمارے شکاریوں کو ہماری آمد سے آگاہ کر دیا گیا۔ اس طرح ہمارے لیے پہلے سے ہی جال تیار کر لیا گیا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ عارضی طور پر ہی سہی ہم بہرحال اس جال سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔'

'لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ ہم لوگوں کے ارادوں سے اس قدر جلد یہ لوگ کس طرح آگاہ ہو گئے؟ کیا یہ تمام تیاریاں محض چند گھنٹوں کی کوششوں کا نتیجہ ہیں؟' مرزا نے تشویش اور حیرانی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوالات کا اظہار کیا۔

'آپ کے ان سوالوں کا میں جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں مرزا صاحب۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے یہ سب چکر اس وقت شروع ہوا جب ہمیں سردار شاہ مراد کے اس معاملے میں ملوث ہونے کا علم ہوا۔ ہم نے نشتر اسپتال کے علاوہ دونوں پولیس چیک پوسٹوں پر بھی سردار شاہ مراد کا نام ایک مشکوک شخص کے طور پر لیا اور اس کے حوالے سے خصوصی ہدایات جاری کیں۔ انہیں لوگوں میں سے کسی کے ذریعے یہ اطلاع سردار شاہ مراد یا اس کے کارندوں تک پہنچی کہ ہم سردار شاہ مراد کے خلاف اس کیس کے حوالے سے تفتیش شروع کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سردار شاہ مراد کے لمبے ہاتھ حرکت میں آ گئے۔ انہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہماری اگلی منزل کون سی ہوگی لہٰذا فوری طور پر ہماری بیخ کنی کی تیاریاں مکمل کر لی گئیں۔' میں نے مفصل انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

'میرا بھی یہی اندازہ ہے۔ پولیس والوں میں سے ہی کسی نے ہماری مخبری کی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی بڑی مہارت سے ہماری نقل و حرکت کی نگرانی شروع ہو گئی۔' صدیقی نے متفکر لہجے میں میری تائید کی۔ مرزا نے بھی گردن ہلا کر اس کی رائے سے اتفاق کیا۔

کچھ دیر بعد ہم غازی گھاٹ کے پل پر سے گزرے۔ خلاف توقع کسی نے ہم سے باز پرس نہ کی۔

پل سے گزرنے کے ساتھ ہی میں مزید محتاط ہو گیا۔ صدیقی اور مرزا بھی پہلے سے زیادہ چوکنا ہو گئے۔

'کیا خیال ہے ذوالفقار علی؟ ہم اپنے ہتھیار نہ نکال لیں؟' صدیقی نے میری رائے دریافت کی۔

'نہیں ہم اس علاقے میں اسلحے کے بل پر ان لوگوں پر حاوی نہیں ہو سکتے۔ ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم اسی کہانی پر مضبوطی سے جمیں رہیں۔ یہی فی الحال ہماری بچت کی واحد صورت ہے۔ ڈیرہ غازی خان پہنچنے کے بعد ہم اس جیپ سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں گے۔' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

'لیکن یہ سردار خضر خان کون ہے بھئی جس کا حوالہ دے کر تم نے اپنی اور ہماری جان چھڑائی ہے؟ کیا واقعی ایسی کوئی شخصیت موجود ہے؟' مرزا نے پوچھا۔

'سردار خضر خان کا وجود نہ صرف حقیقت ہے بلکہ میں نے جو کچھ کہا تھا وہ بھی خاصی حد تک سچ ہے۔ سوائے اس کے کہ سردار خضر خان کی نوبیاہتا بیگم میری سگی نہیں بلکہ منہ بولی بہن ہے۔ ان دونوں کی شادی کو ابھی چند ہی روز گزرے ہیں۔ سردار خضر خان میری بہن کو ملتان سے ہی بیاہ کر لے گیا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ سردار خضر خان نے بے حد اصرار کے ساتھ مجھے اپنے گھر بلوایا تھا۔'

'یہ تو بڑا دلچسپ و عجیب اتفاق ہے بھئی۔ بہر حال تمہارا یہ بہنوئی آج ہماری زندگی بچانے کا سبب بن گیا ہے لیکن کیا ہم لوگ واقعی اس کے پاس جا رہے ہیں؟' صدیقی نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔

'پہلے خیر خیریت سے ڈیرہ غازی خان تو پہنچ جائیں بھائی! اس کے بعد ہی ہم آئندہ کے متعلق کچھ سوچ سکیں گے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ ہم ابھی شاہ مراد کے آبائی گاؤں کے قریب سے گزرنے والے ہیں۔ مجھے خطرہ ہے کہ ہمیں ایک بار پھر تلاشی اور پوچھ گچھ کے مرحلے سے گزرنا پڑے گا اور شاید اس بار ہمارا واسطہ زیادہ درشت اور جارحانہ مزاج کے حامل افراد سے پڑے۔'

'اللہ مالک ہے بھائی۔ جب اوکھلی میں سر دے ہی دیا تو اب موسلوں سے کیا ڈرنا؟ جو بھی ہم پر گزرے گی بھگتیں گے۔ ہماری زندگی ہمارے پاک وطن کی سلامتی سے بڑھ کر تو نہیں ہے۔ اگر اسی مہم میں ہمیں شہادت کا رتبہ حاصل ہو جائے تو پھر اور ہمیں کیا چاہیے؟' مرزا نے پر جوش لہجے میں ہماری ہمت بڑھائی۔

جوں جوں ہماری جیپ میرے گاؤں کے قریب ہوتی گئی میرے دل کی دھڑکنوں کی رفتار میں اضافہ ہوتا چلا گیا ایک بار پھر میں اس خطۂ زمین کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں میں نے جنم لیا۔ جہاں میں نے اپنا بچپن گزارا۔ جہاں میرا بدنصیب دوست سرور علی ہے جہاں میرا شفیق چچا مہر داد ہے۔ جہاں میری۔ میری اپنی مہراں ہے جس کی ویران آنکھیں کتنے طویل عرصے سے میری منتظر ہیں۔ کتنا مجبور ہوں میں۔ اس کے اتنے نزدیک ہونے باوجود میں اس سے ملنے نہیں جا سکتا۔

میرے خیالات کا تسلسل ایک جھٹکے سے ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا کہ جیپ سڑک کے کنارے رکی ہوئی ہے۔ اسے چار مسلح افراد نے گھیر رکھا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ہم ابھی گاؤں سے خاصی دور ہیں۔ اسی وقت ایک بدشکل سا شخص میری طرف والی کھڑکی کی جانب بڑھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی طاقتور ٹارچ روشن کر کے اس کی تیز روشنی باری باری ہم تینوں کے چہرے پر ڈالی۔ جب

ٹارچ کی روشنی مرزا کے چہرے پر پڑی تو اس نے اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں چھپا کر اپنی لرزتی چنچناتی آواز میں احتجاج کیا۔

'یہ کیا ہو رہا ہے بیٹا ذوالفقار علی! یہ کون میری آنکھیں اندھی کر رہا ہے؟' میں نے اس کی بات جواب دینے کے بجائے استفہامیہ انداز میں اس ٹارچ والے کے مکروہ چہرے پر نظر ڈالی۔

عین اسی وقت میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ بختیار عرف بختیارا تھا۔ سردار شاہ مراد کی ذاتی فوج کا ایک اہم عہدے دار۔ ہمارے گاؤں والے اس سے نفرت کرتے تھے۔ اس کی غیر موجودگی میں اسے لومڑ اور چمگادڑ جیسے القاب سے نوازا جاتا تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ سردار شاہ مراد کے لیے نت نئی لڑکیوں کا انتظام اسی کے ذمے ہے۔ رات کے اس پہر اسے اپنے قریب پا کر مجھے شدید کراہت کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ اندیشہ بھی محسوس ہوا کہ کہیں یہ غلیظ شخص مجھے پہچاننے میں کامیاب نہ ہو جائے۔

'تم لوگ سردار خضر خان کے مہمان ہو نا؟' بختیار نے قطعاً غیر متوقع طور پر قدرے نرم لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

'ہاں۔ لیکن آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟'

'اس بات کو چھوڑو۔ تم لوگ جا سکتے ہو لیکن اتنی رات گئے تمہارا "سخی سرور" جانا مناسب نہیں ہے۔ میرا مشورہ ہے رات کو تم لوگ شہر کے کسی ہوٹل میں ٹھہر جانا۔ صبح سویرے آرام سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جانا۔'

'آپ کے مشورے کا شکریہ بھائی! ہم یقیناً ایسا ہی کریں گے۔' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

'سردار خضر خان کو میرا سلام کہنا۔ میرا نام بختیار لغاری ہے۔ اچھا خدا حافظ۔' بختیار نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو گاڑی سے دور ہو جانے کا اشارہ کیا۔

صدیقی نے نہایت اطمینان سے گاڑی اسٹارٹ کی اور آہستگی سے آگے بڑھا دی۔

'خدا کا شکر ہے یہ کڑا مرحلہ بھی بآسانی گزر گیا۔' میں نے اطمینان کی گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ 'ویسے اس شخص کی زبان سے سردار خضر خان کا نام سن کر حیرانی ہوئی ہے۔'

'ہاں تم صحیح کہہ رہے ہو۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ان لوگوں کا آپس میں جدید ترین مواصلاتی نظام کے ذریعے رابطہ ہے۔ شمروز اور اس کے ساتھی مسلسل اپنی مطلوبہ گاڑی کا پتا لگانے کی کوشش کر رہے ہیں اور اپنی ان کوششوں سے وہ اپنے ساتھیوں کو بھی پوری طرح آگاہ رکھ رہے ہیں۔'

اسی اثنا میں ہماری گاڑی گاؤں کے قریب پہنچ گئی۔ میں نے انہیں گاؤں کی جانب جانے والے راستے سے آگاہ کیا۔ 'تمہارا کیا خیال ہے ذوالفقار بھائی؟ کیا سردار شاہ مراد نے ملک کریم اور ان بھارتی ایجنٹوں کو اسی گاؤں میں کہیں چھپا کر رکھا ہوا ہے۔'

'میں اس سلسلے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ سردار شاہ مراد کا شیطانی جال اس علاقے کے چپے چپے میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی کئی ذاتی جیلوں سے میں واقف ہوں لیکن اور کتنی ایسی جیلیں اور

ٹھکانے ہیں؟ یہ شاید کوئی بھی نہیں جانتا۔ خود سردار شاہ مراد کی قلعہ نما حویلی سینکڑوں افراد کو پوشیدہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔'

'میرا خیال ہے وہ اتنے خطرناک افراد کو اپنی حویلی میں رکھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ یہ افراد یقیناً کسی اور جگہ پوشیدہ رکھے گئے ہوں گے۔' مرزا نے اپنی رائے ظاہر کی۔

'سردار شاہ مراد کے لیے اس علاقے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس کی حویلی پر چھاپا مارنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ ایسا کرنا ایک اچھی خاصی جنگ چھیڑنے کے مترادف ہوگا۔ ویسے میرا بھی یہی خیال ہے کہ شاہ مراد جیسے شاطر شخص نے ان لوگوں کو اپنی حویلی میں نہیں رکھا ہوگا۔ اس علاقے میں اس کے پاس ٹھکانوں کی کیا کمی ہے؟ وہ انہیں کسی بھی جگہ رکھ سکتا ہے۔' میں نے متفکر لہجے میں کہا۔

دراصل مجھے ابھی تک پوری طرح یقین نہیں آسکا تھا کہ ہم لوگ اتنی آسانی سے شاہ مراد کے گھاگ کارندوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ جس خوش اخلاقی سے بختیار نے ہمیں رخصت کیا تھا وہ انداز میرے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ ایک پھانس سی تھی جو میرے ذہن میں رہ رہ کر چبھ رہی تھی۔ جیسے یہ سکوت کسی طوفان کا پیام بر ہو۔ میری چھٹی حس مجھے چیخ چیخ کر بتا رہی تھی کہ کوئی خطرہ۔۔۔ کوئی بہت بڑا خطرہ ہمارے سر پر منڈلا رہا ہے۔ جوں جوں ہم شہر کے قریب ہوتے گئے' میرے اضطراب میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ شہر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ٹک کر بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ میں نے بے چینی سے لبریز لہجے میں صدیقی سے کہا۔

صدیقی صاحب آپ براہ کرم گاڑی کو سڑک کے کنارے کر کے روک لیں۔'

'کیا ہوا بھائی خیر تو ہے؟ گاڑی کیوں رکوا رہے ہو؟' صدیقی نے حیرانی کے عالم میں میری طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کی رفتار بھی خاصی کم کر دی۔

'میری درخواست مان لیں صدیقی صاحب۔ وضاحت میں بعد میں کر دوں گا۔'

میرے لہجے میں یقیناً کوئی ایسی بات ہوگی جس نے صدیقی کو بری طرح چونکا دیا۔ اس نے مزید سوال جواب کیے بغیر گاڑی سڑک کے کنارے کر کے روک دی۔

'ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے؟' اس نے میری طرف مڑ کر سوال کیا۔ مرزا بھی حیرانی سے میری شکل دیکھنے لگا۔

'مرزا صاحب آپ خفیہ خانوں سے اسلحہ نکال لیں۔ براہ کرم سوال جواب کرنے کے بجائے میرے کہے پر عمل کریں۔' مرزا نے حسب عادت عمل کو گفتگو پر ترجیح دی۔

اس نے مزید پوچھ گچھ کیے بغیر تیزی سے جیپ کے خفیہ خانوں سے ہتھیار نکالنے شروع کر دیے۔ اس نے صدیقی کا نقرئی کولٹ پستول اور ایک ایم پی فائیو سب مشین گن اس کے حوالے کر دی۔ خود اس نے صرف سب مشین گن لینے پر اکتفا کیا۔ مجھے میرا سیاہ کولٹ پستول پکڑاتے ہوئے اس نے کہا۔

'کیا تمہیں بھی مشین گن دوں؟'

'کوئی رائفل نہیں ہے۔ آپ کے اسلحہ خانے میں؟ لانگ رینج۔۔۔ آٹو میٹک یا سیمی آٹو میٹک۔'

'جی تھری کیسی رہے گی؟ اسپیشل میگزین کے ساتھ۔'

'واہ۔۔۔ پھر اور کیا چاہیے۔ مرزا صاحب جلدی سے دیدار کرائیے اس خوبصورت اور مستعد رائفل کا۔' میں نے وقتی طور پر اپنی بے قراری کو فراموش کرتے ہوئے مسرور لہجے میں کہا۔

مرزا نے ایک نئی نکور جی تھری رائفل نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دی۔ اس نے مجھے گولیوں سے لبا لب بھرے ہوئے دو میگزین بھی دیے۔

یہ خصوصی طور پر تیار کردہ میگزین تھے جن میں بیس کے بجائے تیس گولیوں کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ میں نے رائفل میں میگزین لگا کر اسے کاک کر لیا اور ہر خطرے سے نمٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مرزا اور صدیقی نے مجھے رائفل کو کاک کرتے دیکھا تو ان کے چہرے پر حیرت اور تشویش کے ملے جلے تاثرات ابھر آئے۔

'اب تو بتا دو بھائی کہ اصل بات کیا ہے؟ تم کیوں اس قدر بے قرار ہو رہے ہو؟ کیا تم نے کوئی خطرے والی بات دیکھی ہے؟ صدیقی نے بے تاب لہجے میں سوال کیا۔ میری دیکھا دیکھی انہوں نے بھی اپنی گنوں میں میگزین لگا لیے تھے۔

'جانے کیوں مجھے شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ ہم کسی بھیانک خطرے کی زد میں ہیں۔ میرے لاشعور میں خطرے کا الارم گونج رہا ہے۔ میں خطرے کے اس سگنل کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتا۔' میں نے مستحکم لہجے میں انہیں بتایا۔

'لیکن وہ خطرہ ہے کہاں؟ فی الحال تو دور دور تک ایسے آثار نہیں ہیں۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے ہم شہر کے قریب پہنچ چکے ہیں۔' صدیقی نے قدرے بے یقینی کے انداز میں کہا۔

'خدا کرے میرا اندیشہ غلط ثابت ہو صدیقی صاحب۔ خدا کرے ہمیں کوئی مصیبت پیش نہ آئے اور ہم خیر خیریت سے اپنی منزل پر پہنچ جائیں۔ آپ گاڑی آگے بڑھائیں البتہ ذہنی طور پر کسی بھی قسم کی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار رہیں۔'

'ٹھیک ہے۔' صدیقی نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ 'اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟ میرے خیال میں کسی ہوٹل میں ٹھہرنا تو زیادہ مناسب نہیں رہے گا۔'

'ہم لوگ شہر میں تو پہنچیں۔ اس کے بعد کوئی قدم اٹھائیں گے۔' میں نے اپنی رائفل کا دستہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ جوں جوں ہم شہر کے قریب ہوتے گئے۔ سڑک کے اردگرد بنے مکانات کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیام۔ میں اپنی آنکھیں پھاڑے کسی متوقع خطرے کا انتظار کرتا رہا۔ گاڑی ڈانٹ کے پل کے قریب پہنچی۔ اس کے ساتھ ہی میری رگوں میں لہو کی گردش تیز ہونے لگی۔ پل والی چورنگی کے قریب پہنچ کر صدیقی نے جیپ کی رفتار بالکل دھیمی کر لی۔ اس جگہ پہنچ کر مجھے اس کی رہنمائی کا فریضہ انجام دینا تھا کہ ہم اب کس طرف کا رخ کریں۔ اگر ہم اس سڑک کے سامنے والی بڑی سڑک کا رخ کرتے تو وہ سیدھی ہمیں کوٹ چھٹا' جام پور' راجن پور اور کوٹ مٹھن لے جاتی۔ اسی سڑک پر ہم مزید آگے بڑھتے رہتے تو کشمور کے راستے صوبہ سندھ میں داخل ہو جاتے جبکہ ہمارے دائیں طرف والی

سڑک ہمیں سیدھا مغرب کی طرف واقع قصبہ سخی سرور' اور فورٹ منرو کی طرف لے جاتی۔ مزید آگے بڑھنے پر ہم لورالائی کے راستے صوبہ بلوچستان میں داخل ہو جاتے۔ اسی طرح اگر گاڑی پل پر سے گھو کر مزید دائیں ہاتھ پر شمال کی طرف جانے والی دو سڑکوں پر چڑھ جاتی تو یہ دونوں سڑکیں ہمیں ڈیر غازی خان شہر کے مرکز کی طرف لے جاتیں۔ میں نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد صدیقی کو اپنی آیند منزل کی سمت سے آگاہ کرنا چاہا۔

عین اسی وقت میری ادھر ادھر بھٹکتی نظروں نے خطرے کو بھانپ لیا۔ وہ ایک لینڈ کروزر جیپ تھی جو سامنے راجن پور روڈ پر تقریباً سو گز کے فاصلے پر اندھیرے میں دبکی کھڑی تھی۔ اس کی چھوٹی سرخ بیک لائٹوں کے علاوہ تمام روشنیاں بند تھیں۔ اسے دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے کوئی خونخوار درندہ اپنے شکا کی گھات میں دم سادھے دبکا بیٹھا ہو۔ میں نے بے قرار لہجے میں صدیقی سے کہا۔

'صدیقی صاحب گاڑی کو پل پر دائیں جانب موڑ لیں۔' میرے لہجے کے اضطراب کو محسوس کر کے صدیقی نے فوری میری ہدایت پر عمل کیا۔ ہماری جیپ رینگتی ہوئی پل کے وسط میں پہنچی۔ عین اسی وقت میں نے دوسرے خون خوار درندے کو بھی دیکھ لیا۔ یہ بھی ایک بڑی سی جیپ تھی جو لورالائی روڈ پر تقریباً سو گز تقریباً مردہ حالت میں کھڑی تھی۔ البتہ بیک لائٹس اس کی بھی روشن تھیں۔ میں نے شدید اضطراب کے عالم میں تقریباً چیختے ہوئے صدیقی سے کہا۔

صدیقی صاحب گاڑی کو فوراً ریورس کر کے نہر کے ساتھ والی سڑک پر گھما لیں' جلدی کریں۔'

صدیقی کا پاؤں برق رفتاری سے گاڑی کے بریک پر گیا۔ اس نے گاڑی کو ریورس کر کے نہر کے ساتھ والی سڑک پر ڈال دیا۔ یہ سڑک سیدھی ڈیرہ غازی خان کے بس اسٹینڈ کی طرف جاتی تھی۔

'صدیقی صاحب گاڑی کی رفتار بڑھائیں۔ میں نے شدید کشیدہ لہجے میں کہا۔

میری بے چین آنکھیں گاڑی کے عقب میں سنسان سڑک کو کھنگال رہی تھیں۔ مرزا نے بھی میری طرف دیکھا دیکھی مڑ کر گاڑی کے عقب میں دیکھنا شروع کر دیا۔ صدیقی نے میری ہدایت پر عمل کرنے کے بعد خود بھی عقب نما آئینے پر نگاہیں ڈالنا شروع کر دیں۔ ہمارے دلوں کی دھڑکن میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ ہمیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ کچھ ہی دیر بعد ہمارے عقب میں چمک دار سڑک پر دو طاقتور ہیڈ لائٹس نظر آنے لگیں۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے اس گاڑی کے عقب میں موجود جیپ کی جھلک بھی دیکھ لی۔ وہ دونوں گاڑیاں آندھی اور طوفان کے مانند ہماری جیپ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ یہ منظر میرے لیے متوقع سہی لیکن ان دونوں کے لیے ہوش اڑا دینے والا ثابت ہوا۔ پیچھے آنے والی جیپوں کے جارحانہ انداز سے انہوں نے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ لگا لیا۔ صدیقی نے میرے کہے بغیر گاڑی کی رفتار میں اضافہ کر دیا لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ عقب میں آنے والی جیپوں کا ہم سے فاصلہ مسلسل کم ہوتا چلا گیا۔ وہ جیپیں ہماری جیپ سے کہیں زیادہ طاقتور انجنوں کی حامل تھیں۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ کچھ ہی دیر میں ہمارے سروں پر آن پہنچیں گی۔

'یہ کون ہیں بھائی؟ اور ہم سے کیا چاہتے ہیں؟' صدیقی نے پریشان لہجے میں سوال کیا۔ میں نے

جواب دینے سے پہلے اس کی گن کو کاک کیا۔

'یہ لوگ سردار شاہ مراد کے بھیجے ہوئے شکاری ہیں اور یہ ہمیں شکار کرنا چاہتے ہیں۔' میں نے سرد لہجے میں اسے انتباہ کیا۔

'لیکن کیوں۔۔۔۔؟ ہم نے تو۔۔۔۔۔' اسے مزید کچھ کہنے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ عین اسی لمحے عقب میں آنے والی جیپ سے کلاشنکوف کا برسٹ فائر کیا گیا۔ نشانہ ہماری جیپ کو ہی بنایا گیا لیکن گولیوں کی بوچھاڑ شاید جیپ کے اوپر سے گزر گئی۔

'اف میرے خدا۔' صدیقی نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ میں نے اپنے تعاقب میں آنے والی جیپ پر نظر ڈالی۔ وہ مجھے اپنی جیپ سے صرف سو گز پیچھے نظر آئی۔ اس کی چھت کے خلا میں کھڑا ہوا مسلح شخص میں نے بالکل صاف دیکھ لیا۔ وہ کلاشنکوف سے ہماری جیپ کا نشانہ باندھ رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک اور برسٹ فائر کیا۔ اس بار اس کا نشانہ خطا نہیں ہوا۔ گولیوں کی بوچھاڑ سیدھی ہماری جیپ پر پڑی۔ دو گولیوں نے ہماری جیپ کے پچھلے شیشے میں سوراخ کر کے مکڑی کے خوبصورت جالوں کی سی شکلیں بنا دیں۔

ایک گولی شیشہ توڑتی ہوئی زناٹے سے میرے سر کے اوپر سے گزری اور ہماری جیپ کی ونڈ اسکرین کے اوپری حصے میں بھی ایک سوراخ بن گیا۔ دوسری گولی نہ جانے کس کونے کھدرے میں گھس کر ٹھنڈی ہو گئی۔ بقیہ گولیاں شاید جیپ کے عقبی حصے کی فولادی چادر سے ٹکرا کر ادھر ادھر اچٹ لئیں۔

صدیقی کی آنکھیں خوف کے مارے اپنے حلقوں سے ابلنے لگیں۔ مرزا اپنی مشین گن سمیت اپنی سیٹ میں دبکا بیٹھا یہ تماشہ دیکھتا رہا اچانک ایک اور گولی آئی اور اس اجل بار جیپ پر نظریں جما دیں۔ اس جیپ کے عقب میں آنے والی جیپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں میری آنکھوں نے بہت واضح طور پر اس شخص کو دیکھا جو ہماری گاڑی پر موت برسا رہا تھا۔

میں نے دیکھا کہ اس کی رائفل کا رخ اس لمحے آسمان کی جانب ہے۔ میرے ذہن نے پلک جھپکنے میں مجھے پیغام بھیجا کہ اگر میں کچھ کر گزرنا چاہتا ہوں تو اس کے لیے یہی مناسب ترین وقت ہے کیونکہ وہ کلاشنکوف بردار شخص اپنی رائفل کا میگزین تبدیل کر رہا ہے۔ یہ پیغام ملتے ہی میرا جسم بجلی کے کوندے کی طرح حرکت میں آ گیا۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر جیپ کے پچھلے حصے میں آ گیا۔

اس سے پہلے کہ صدیقی اور مرزا کچھ سمجھ پاتے میں نے اپنی رائفل کا بٹ مار کر پچھلی طرف کا شکستہ شیشہ توڑ دیا۔ میں جیپ کے پچھلے حصے کے فولادی فرش سے چند لمحوں تک چپکا رہا۔ میری توقع کے عین مطابق پچھلی جیپ سے کلاشنکوف کا ایک اور برسٹ فائر کیا گیا۔ اس بار گولیاں سڑک پر پڑیں۔ برسٹ کی تڑتڑاہٹ ختم ہوتے ہی میں برق رفتاری سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اپنے ہدف کو تلاش کرنے اور اس کا نشانہ لینے میں مجھے بمشکل چند لمحے لگے ہوں گے۔ پچھلی جیپ کے خلا میں کھڑا ہوا شخص جونہی میری شست پر آیا' میں نے اپنی رائفل کا ٹرائیگر دبا دیا۔ جی تھری رائفل اس وقت لگاتار فائرنگ پر سیٹ تھی۔ ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ رائفل کی نال سے انگاروں کی قطار نکلی اور

پیچھے آنے والی جیپ کی طرف بڑھی۔

فضا میں گونجنے والی کرب ناک چیخ نے مجھے بتایا کہ میرا نشانہ کارگر رہا ہے۔ وہ شخص گولیاں کھانے کے بعد واپس جیپ میں لڑھک گیا۔ میں نے اگلا برسٹ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر فائر کرنا چاہا لیکن عین اسی لمحے اس جیپ کے خلا سے ایک اور جسم ابھرا۔ میرے فائر کرنے سے پہلے ہی اس شخص نے برسٹ فائر کر دیا۔

گولیوں کی بوچھاڑ ہماری جیپ کی باڈی سے ٹکرائی۔ میں اضطراری طور پر ایک بار پھر جیپ کے فرش سے چپک گیا۔ میں ایک بار پھر اٹھنے ہی والا تھا کہ مجھے اپنے شانے میں کوئی چیز بری طرح چبھتی محسوس ہوئی۔ میں نے پہلو بدل کر وہ چیز دیکھی۔ وہ سیاہ رنگ کی چھوٹی سی چپٹی سی پلاسٹک کی ڈبیا نما شے تھی جو مقناطیس کی طرح جیپ کے فولادی فرش سے چپکی ہوئی تھی۔ فوری طور پر میری سمجھ میں نہ آسکا کہ یہ کیا چیز ہے۔ میں نے اسے اکھاڑنا چاہا تو وہ معمولی سی کوشش سے فرش سے علیحدہ ہو کر میرے ہاتھ میں آ گئی۔ میں نے بغور اس کا جائزہ لینا چاہا۔ عین اسی لمحے پچھلی جیپ سے ایک اور برسٹ فائر ہوا۔

اس بار میں پہچاننے میں ناکام رہا کہ یہ فائرنگ کس ہتھیار سے کی گئی ہے۔ نہ تو یہ کلاشنکوف یا جی تھری رائفل کی فائرنگ تھی اور نہ ہی یہ فائرنگ اسٹین گن یا ایم پی فائیو سب مشین گن سے کی گئی ہے۔ بہر حال اس بار بھی یہ فائرنگ بھی خاصی حد تک کامیاب رہی۔ اس بار گولیوں کی بوچھاڑ پچھلے ٹوٹے ہوئے شیشے کے خلا سے گزری اور اس نے ہماری جیپ کی ونڈ اسکرین کو چکنا چور کر دیا۔ ہماری جیپ ایک مرتبہ بری طرح لہرائی لیکن صدیقی نے اسے سنبھال لیا۔ البتہ اس جھٹکے کی وجہ سے وہ سیاہ ڈبیا میرے ہاتھ سے چھوٹ کر سیٹوں کے نیچے خلا میں چلی گئی۔ میں نے اس کا خیال ذہن سے جھٹک کر اپنی توجہ ایک بار پھر اس قیامت خیز صورت حال پر مرکوز کر لی۔

فائرنگ میں وقفہ محسوس کرتے ہی میں ایک بار پھر طوفانی رفتار سے اٹھا۔ میں نے ایک بار پھر فائرنگ کرنے والے شخص کا نشانہ لے کر فائر کھول دیا۔ اس بار میرا نشانہ خطا گیا البتہ اتنا ضرور ہوا کہ وہ شخص غڑاپ سے جیپ کے اندر دبک گیا۔ میرے اس برسٹ کے ساتھ ہی پہلی بار مرزا بھی معرکے میں شریک ہو گیا۔ وہ جھک کر گھٹنوں کے بل چلتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔ اس جیسے گھاگ شخص کو بھلا مجھ جیسے نوآموز لڑکے کی رہنمائی کی کیا ضرورت ہوئی۔ اس نے اپنی گن ٹوٹے ہوئے شیشے کے خلا میں جمائی اور بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی۔ معلوم نہیں اس کی فائرنگ سے کوئی فائدہ ہوا یا نہیں۔ لیکن عین اسی وقت میں نے ایک شخص کو پچھلی جیپ کی چھت کے خلا میں نمودار ہوتے دیکھا۔ خطرے کو بھانپتے ہی میں ایک بار پھر جیپ کے فرش سے چپک گیا۔ میں نے مرزا کو بھی کھینچ کر نیچے کرنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ وہ اندھا دھند فائرنگ کیے جا رہا تھا۔ سب مشین گن سے نکلنے والی گولیوں کے گرم گرم خول تڑا تڑ میری پشت پر گرتے رہے۔ اسی لمحے پچھلی جیپ سے برسٹ فائر ہوا۔ میرے کانوں میں مرزا کی بھیانک چیخ گونجی۔ اس کے ہاتھ سے سب مشین گن چھوٹی اور ٹوٹے ہوئے شیشے کے خلا سے گزر کر سڑک پر جا گری۔ مرزا ایک جھٹکے سے فرش پر میرے برابر گر پڑا۔ اس نے اپنا بایاں شانہ اپنے دائیں ہاتھ سے دبا

رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں کرب سے پھٹی جا رہی تھیں۔

مرزا کی چیخ سن کر صدیقی کے ہاتھ گاڑی کے اسٹیئرنگ پر بری طرح بہکے۔ جیپ بری طرح سے لہرائی۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ جیپ کو بائیں طرف بہنے والی نہر میں نہ گرا دے لیکن وہ ایک بار پھر جیپ کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں تمام خطرات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک بار پھر اٹھ بیٹھا۔

مجھے پچھلی جیپ کی چھت کے خلا میں وہ مسلح شخص نظر آیا لیکن میں نے اسے نظرانداز کر کے پچھلی جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کا نشانہ لیا اور اپنی رائفل کا ٹرائیگر دباتا چلا گیا۔ عین اسی وقت پچھلی جیپ کی طرف سے برسٹ فائر ہوا۔ ہم دونوں کے ہی نشانے کامیاب رہے۔ میرے برسٹ نے پچھلی جیپ کے ڈرائیور کو چھلنی کر دیا جبکہ اس شخص کی فائرنگ نے ہماری جیپ کے بائیں طرف والے پچھلے ٹائر کے پرخچے اڑا دیے۔ یہ ہم دونوں کی ہی خوش قسمتی ہی کہی جاسکتی ہے کہ اس لمحے ہم نے ایک دوسرے کا نشانہ نہیں لیا ورنہ دونوں ہی ایک ساتھ ایک دوسرے کی گولیوں کا شکار ہو جاتے۔ بہر حال میری گولیوں کا شکار ہونے والا ڈرائیور شاید اگلے ہی لمحے موت کے منہ میں جا پہنچا۔ نتیجتاً وہ جیپ بری طرح لہراتی ہوئی آگے بڑھی اور پھر سڑک پر ٹیڑھی ہو کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ جبکہ دوسری طرف پچھلے ٹائر کی تباہی کے بعد ہماری جیپ صدیقی کے کنٹرول سے باہر ہو کر بائیں طرف بہتی ہوئی نہر کی جانب بڑھی۔ خوش قسمتی سے اس طرف نہر کا کنارہ زیادہ ڈھلواں ثابت نہیں ہوا پانی تک پہنچنے سے پہلے ہی صدیقی نے جیپ کو بریک لگا کر روک لیا۔ جیپ کے رکتے ہی صدیقی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اترا اور تیزی سے جیپ کے پچھلے دروازے کی طرف آیا۔ اس نے جلدی سے پچھلا دروازہ کھولا اور مرزا سے لپٹ گیا۔

'تم ۔۔۔۔۔۔ٹھیک تو ہو نا مرزا؟ تم ٹھیک تو ہو؟' وہ بیقراری کے عالم میں اس سے پوچھتا رہا۔

میری بیتاب نظریں اوپر سڑک کی طرف جمی رہیں۔ کسی بھی لمحے دوسری جیپ والے شکاری سر پر پہنچ جاتے پھر ہماری ہڈیوں کا بھی پتہ نہ چلتا۔

'صدیقی صاب جلدی سے مرزا کو جیپ سے نکالیں' میں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ اس دوران میں میری رائفل کا رخ مسلسل سڑک کی جانب رہا۔

میری دیکھا دیکھی صدیقی نے بھی اپنی گن کا رخ سڑک کی جانب کر دیا۔ خلاف توقع مرزا کو جیپ سے اتارنے کے لیے ہمیں کوئی کوشش نہ کرنی پڑی۔ وہ خود ہی اپنے لہولہان شانے کو اپنے ہاتھ سے دبائے جیپ سے باہر نکل آیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ہمارے پیچھے آنے والی دوسری جیپ اب تک ہم تک کیوں نہیں پہنچی پھر مجھے خیال آیا کہ شاید وہ لوگ پہلے جیپ کے اندر موجود اپنے ساتھیوں کا احوال معلوم کرنے کے لیے وہاں ٹھہر گئے ہیں۔ لیکن وہ زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہریں گے۔ وہ بس آتے ہی ہوں گے۔ ابھی یا چند لمحوں بعد۔۔۔۔۔۔ ہماری موت کا سامان سنبھالے۔ اس جگہ سے بچ کر ہم کہاں جائیں؟ ایک طرف نہر ہے۔ دلدل اور جھاڑیوں سے بھرپور۔۔۔۔۔ دوسری طرف بند دکانیں اور گیراج

وغیرہ۔ پیچھے دشمن اور آگے طویل سڑک۔ اپنی موت سے بچ کر کب تک بھاگیں گے؟ اور موت سے بھی بھلا کوئی دامن بچا سکا ہے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک دھندلی سی بے معنی سی یاد ابھری۔ کوئی ایسا منظر جو کبھی بالکل ہی ناقابل توجہ محسوس ہوا تھا۔ میں نے اپنے اردگرد پھیلے ہوئے نیم تاریک منظر پر گہری نگاہ ڈالی۔ خاصی کوشش کے بعد میں نے اچھی طرح اندازہ لگا لیا کہ میں کس جگہ موجود ہوں۔ میں نے ایک نظر سڑک کی جانب ڈالی ابھی تک وہاں کوئی نہیں پہنچا تھا۔ اسی اثنا میں صدیقی نے مرزا کا کوٹ اتار کر اس کے شانے پر ایک بڑے سے رومال کی پٹی بنا کر باندھ دی تھی اور اپنا کوٹ اسے پہنا دیا۔

'آپ دونوں میرے پیچھے پیچھے آئیں ------- فوراً' میں نے نہر کے کنارے کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ قدرے ہچکچاہٹ کے بعد وہ دونوں میرے پیچھے آنے لگے۔

مرزا میں ابھی خاصا دم خم تھا۔ اس کے باوجود صدیقی اسے مسلسل سہارا دے رہا۔ میری رفتار خاصی تیز تھی۔ موت سے دور بھاگنے والے کی رفتار تیز ہی ہونی چاہیے کہ زندگی کا خوشبودار پھولوں سے گندھا ہار زیادہ سے زیادہ عرصے تک گلے کی زینت بنا رہے۔ اس سمے قسمت بھی ہم پر پوری طرح مہربان تھی۔ ہمارے دشمن عارضی طور پر ہی سہی ہم سے غافل ہو گئے۔ جب تک وہ ہماری جیپ تک پہنچتے ہم وہاں سے ڈیڑھ دو سو گز آگے نکل آئے۔ وہ پاگل کتوں کے مانند ہماری بو سونگھنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کی ٹارچوں کی لائٹیں تاریک رات کا سینہ چیرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ اپنے گردوپیش سے مایوس ہو کر وہ ہماری سمت میں آگے بڑھنے لگے۔ اگر وہ اسی طرح تیز رفتاری سے ہماری طرف بڑھتے رہے تو یقیناً ہم تک پہنچ جاتے لیکن اسی وقت ہم اس جگہ پہنچ گئے جس کی مجھے تلاش تھی۔ یہ کھجور کے درخت کے تنے کا بنا ہوا تنگ پل تھا۔ بڑا ہی سادہ طریقہ ہے۔ کھجور کے درخت کے دو طویل تنوں کو ہموار کر کے نہر کے آر پار ڈال دیا۔ اس طرح ایک مضبوط اور پائیدار لیکن قدرے کم گنجائش والا پل تیار ہو گیا۔ اس پل پر ایک ساتھ ایک یا زیادہ سے زیادہ دو افراد چل سکتے تھے۔

'جلدی سے اس پل کے راستے دوسرے کنارے پر پہنچ جائیں۔ احتیاط سے' میں نے ان کے کانوں میں سرگوشی کی۔

'اور تم ------------؟' مرزا نے اپنے درد پر قابو پانے کی کوششیں کرتے ہوئے کہا۔

'آپ میری فکر نہ کریں۔ آپ کے دوسرے کنارے پر پہنچتے ہی میں بھی آ جاؤں گا۔' میں نے تقریباً سو گز دور حرکت کرتی ہوئی ٹارچوں کی روشنی پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ وہ لوگ جلد ہی اس جگہ پہنچ جاتے۔

مرزا اور صدیقی نے دوسرے کنارے پر پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لیا۔ جب تک میں دوسرے کنارے پر پہنچا' ٹارچ کی روشنیاں مزید قریب آ گئیں۔

'صدیقی صاحب آپ اپنی گن وہاں رکھ کر جلدی سے میری طرف آیئے۔' صدیقی نے فوری طور پر میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ کھجور کے ایک تنے پر جماتے ہوئے کہا۔

'اسے کنارے پر سے ہٹانے کے لیے زور لگایئے۔' صدیقی فوری طور پر میرا منصوبہ سمجھ گیا۔ کھجور کا وہ تنا جانے کب سے زمین کا حصہ بنا ہوا تھا۔ اسے ہلانے میں ہمیں دانتوں پسینہ آ گیا۔ آخری حد تک زور لگانے کے بعد بالآخر ہم نے اسے زمین سے جدا کر دیا۔ ایک کنارے کی زمین سے علیحدہ ہوتے ہی دوسری طرف سے وہ تنا خود بہ خود زمین چھوڑ گیا۔ ہم دونوں نے مل کر اسے کھینچا۔ اس کا دوسرا سرا غڑاپ سے نہر میں گرا۔ تھوڑا سا مزید کھینچنے کے بعد ہم نے اپنی طرف والے سرے کو بھی پانی میں ڈال دیا۔ بھاری بھرکم تنا کیچڑ میں دھنس کر رہ گیا۔ دوسرا تنا یعنی پل کا دوسرا نصف حصہ اکھاڑ کر نہر کی نذر کرنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا لیکن اس وقت تک ہمارے دشمن ہمارے خاصے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ تنے کے نہر میں گرنے سے جو چھپاکا ہوا اس نے ان کی توجہ اس طرف مبذول کرا دی۔ ان میں سے کسی طالع آزما نے اندھا دھند نہر میں گولیوں کی بارش کر دی۔

میں نے صدیقی اور مرزا کو اپنے ساتھ لیا اور تیزی سے نہر کے کنارے سے دور ہٹتا چلا گیا۔ ہم کچی دیواروں کے بنے ہوئے دو احاطوں کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے ان کی نظروں سے دور ہو گئے۔ انہیں جلد ہی ہماری راہ فرار کا علم ہو جاتا۔ لہٰذا ہم نے اپنی رفتار ممکنہ حد تک تیز کر دی۔ کچھ دور آگے بڑھنے کے بعد ہم کچے پکے مکانوں پر مشتمل ایک چھوٹے سے محلے میں داخل ہو گئے۔ اس محلے کی گلیاں کچی تھیں اور گلی کے عین درمیان میں ایک بڑی سی گندی سی نالی بہہ رہی تھی۔ ہم نیم تاریکی میں راستہ تلاش کرتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ ہم نے جان بوجھ کر کئی موڑ مڑے تاکہ اگر ہمارے دشمن ہمارے تعاقب میں آئیں تو انہیں ہماری راہ گزر کا تعین کرنے میں مشکل پیش آئے۔ خلاف توقع ہمیں کوئی بھی اپنے تعاقب میں آتا نظر نہیں آیا۔ مزید آگے بڑھنے کے بعد ہم قدرے جدید قسم کی کالونی میں داخل ہو گئے۔ ترتیب سے بنی ہوئی اس کالونی میں اکثر مکانات ابھی تعمیر کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ اس جگہ گلیوں میں اکا دکا بلب روشن تھے۔

صدیقی نے اپنی گن مرزا کے حوالے کر دی تھی۔ جو اس نے کوٹ کے اندر پوشیدہ کر لی تھی۔ میرے پاس موجود جی تھری رائفل اتنا چھوٹا ہتھیار نہ تھی کہ اسے آسانی سے چھپایا جا سکتا اگر کوئی شخص یہ رائفل میرے ہاتھ میں دیکھ لیتا تو اسے خوف زدہ اور پریشان ہونے میں ذرا دیر نہ لگتی۔ مجبوراً میں اپنے اس نفیس ہتھیار سے جان چھڑانے کی ترکیب سوچنے لگا۔ میری آنکھیں کسی ایسی مناسب جگہ کو تلاش کرنے لگیں جہاں میں اپنی رائفل کو چھپا سکوں۔ فوری طور پر مجھے ایسی کوئی جگہ نظر نہ آ سکی۔ صدیقی نے میری پریشانی کو محسوس کر لیا اس نے رائفل میرے ہاتھ سے لے کر اپنی پشت پر چھپا لی۔ اسی وقت میری نظر تقریباً سو گز آگے واقع ایک زیر تعمیر مکان پر پڑی۔ اس کے سامنے چار افراد کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اگر ہم ان کے قریب پہنچتے تو یقیناً وہ رائفل ان کی نظروں میں آ جاتی۔ میں نے پریشانی کے عالم میں صدیقی کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے تسلی دی کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ بڑے غیر محسوس انداز میں ہمارے دائیں ہاتھ پر واقع ایک اور زیر تعمیر مکان کے احاطے کی طرف بڑھنے لگا۔ احاطے کی دیوار کے ساتھ ہی شٹرنگ کی لکڑیوں کا اونچا سا

ڈھیر تھا۔ صدیقی نے قدرے جھکتے ہوئے' بڑی صفائی سے وہ رائفل لکڑیوں کے درمیان موجود ایک خلا میں کھسکا دی۔ اس عمل کے دوران میں کسی قسم کی آواز پیدا نہ ہوئی۔ رائفل کو اس جگہ پہچانے کے ساتھ ہی صدیقی مطمئن انداز میں چلتا ہوا ایک بار پھر میرے اور مرزا کے پاس آ گیا۔

صدیقی کا یہ عمل بے حد بروقت ثابت ہوا کیونکہ اگلے ہی لمحے مکان کے احاطے میں ایک چوکیدار نما شخص موجود تھا۔ اس نے خاصی حیرانی کے عالم میں ہم تینوں پر نظر ڈالی۔ تمام تر جسمانی درماندگی کے باوجود ہمارے حلیے ہمیں معزز افراد ثابت کر رہے تھے۔ صدیقی نے مرزا کے شانے پر رومال باندھنے کے بعد اسے اپنا کوٹ پہنا دیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا گھائل شانہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مرزا خاصا شدید زخمی تھا لیکن وہ اپنی ہمت کو یکجا کیے مسلسل ہمارا ساتھ دیتا رہا۔ اپنے میک اپ سے وہ ایک ضعیف العمر شخص نظر آتا تھا۔ لہٰذا اس کی دھیمی چال میں کسی قسم کی لرزش حیرت انگیز نہ ہوتی۔

ہم تینوں اس چوکیدار کی نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے سر اٹھائے آگے بڑھتے چلے گئے۔ ایک معمولی چوکیدار کی مشکوک نظروں کی ہم جیسے 'معززین' کو کیا پروا ہوتی؟ کرسیوں پر براجمان چاروں افراد کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے دھیمے لہجے میں انہیں مشترکہ سلام کیا۔ ان چاروں نے پرجوش انداز میں سلام کا جواب دیا۔ اس طرح سے ہم ان کی مشکوک نظروں کا نشانہ بننے کے بجائے یک لخت ان کی یگانگت کے مستحق قرار پائے۔ تاہم اس دوران میں ہم نے اپنے قدم نہیں روکے۔ ان چاروں نے یقیناً ایک آدھ بار مزید ہماری جانب دیکھا ہوگا لیکن مجھے یقین تھا کہ ان کی نظروں میں ہمارے لیے ہمدردی کا تاثر ہوگا۔ دو شریف آدمی اپنے بزرگ ساتھی کے ہمراہ جو شاید ان کا باپ ہی ہو' کہیں جا رہے ہیں۔ شاید کسی ڈاکٹر کے پاس تاکہ اس ضعیف شخص کا طبی معائنہ کروا سکیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔

'تمہیں لوگوں کو نفسیات کا بھی خاصا علم ہے جوان۔' صدیقی نے دلی آواز میں مسکراتے ہوئے مجھے داد دی۔ میں نے جوابی مسکراہٹ کے ساتھ محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ تھوڑا مزید آگے بڑھنے کے بعد ہم ایک باقاعدہ آبادی میں داخل ہو گئے۔ تب میں اس علاقے کو پہچان گیا۔ ہم اس وقت فرید آباد میں سے گزر رہے تھے۔ راستوں کو پہچانتے ہی میں زیادہ پراعتماد انداز میں قدم اٹھانے لگا۔

مرزا اور صدیقی اس وقت کلی طور پر مجھ پر انحصار کیے ہوئے تھے۔ میرا ذہن مسلسل اس سوچ میں گم تھا کہ اب اگلا قدم کس سمت میں اٹھایا جائے۔ سردار شاہ مراد کے خونخوار کارندے بھوکے کتوں کے مانند ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے۔ اگر ہم جلد از جلد اپنے لیے کوئی پناہ گاہ تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہوئے تو ہمارا ان کے زہریلے پنجوں کی گرفت میں آ جانا یقینی ہو جائے گا۔ اس صورت حال میں اس شہر سے نکلنے کے متعلق تو سوچنا بھی حماقت ہے لیکن یہ چھوٹا سا' پرسکون شہر کب تک ہمیں پناہ دے سکے گا؟

عین اسی وقت میرے کانوں میں مرزا کے دھیمے لہجے میں کراہنے کی آواز آئی۔ میں سمجھ گیا کہ اس کی قوت برداشت اب جواب دینے لگی ہے۔ اگر وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا تو ہمارے لیے زبردست مشکلات کھڑی ہو جاتیں۔

صدیقی جلدی سے مرزا کے قریب پہنچا اور اس سے اس کا حال احوال دریافت کرنے لگا۔

میری نظریں سامنے کی طرف اٹھ گئیں۔ بجلی کے کھمبوں کی دودھیا روشنی میں وہاں ایک چوڑی سیاہ سڑک نظر آ رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کالج روڈ ہے۔ اس سڑک پر پہنچ کر ہم اپنے دشمنوں کے لیے کھلا نشانہ بن جاتے لیکن اگر ہمیں کسی جگہ پہنچنا تھا تو پھر اس سڑک پر پہنچنا ناگزیر تھا۔ سڑک کے نزدیک پہنچنے سے پہلے ہی میرے قدم مدھم پڑ گئے۔ رات کے اس پہر میں کون سا ٹھکانا ہمارا منتظر ہے؟ کون سا در ہے جو ہماری آمد کے لیے اپنے دامن کو وا کیے ہوئے ہے؟ ہمیں چھپ کر کچھ وقت گزارنا ہے تو پھر یہی جگہ کیا بری ہے؟ کوئی پناہ گاہ ہی تلاش کرنی ہے تو پھر یہیں کیوں نہ تلاش کر لی جائے۔

مجھے ٹھہرتے دیکھ کر مرزا اور صدیقی بھی ٹھہر گئے۔ 'کیا بات ہے بھائی؟ رک کیوں گئے ہو؟' صدیقی نے مجھ سے سوال کیا۔

'مرزا کی حالت زیادہ بہتر نہیں ہے۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

'ہاں یہ تو صحیح ہے لیکن اس وقت ہمیں کہاں سے طبی امداد مل سکتی ہے۔ ہم اسے اسپتال تو لے جا نہیں سکتے اور اتنی رات گئے کوئی ڈاکٹر۔۔۔۔۔' میں نے ہلکی سی مسرت کے ساتھ اس کی بات کاٹ دی۔

'ڈاکٹر مل سکتا ہے اور پناہ بھی۔۔۔۔' میری نگاہیں ایک بڑی سی کوٹھی کی نیم پلیٹ پر جمی ہوئی تھیں۔

صدیقی نے میری نظروں کا تعاقب کیا اور اسے بھی وہ نیم پلیٹ نظر آ گئی۔ ڈاکٹر رضا محمد خان قیصرانی۔۔۔۔۔ آگے کئی ڈگریاں لکھی ہوئی تھیں۔ صدیقی کو میرا مطلب سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اس کی آنکھیں حیرانی کے عالم میں پھیلتی چلی گئیں۔

'تم۔۔۔۔ تمہارا مطلب ہے۔۔۔۔۔؟' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

'ہاں صدیقی صاحب! اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہمیں اپنی اور مرزا کی زندگی بچانے کے لیے یہ سب کرنا ہی پڑے گا۔ بصورت دیگر۔۔۔۔۔' میں نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ صدیقی کے چہرے پر شدید تذبذب کے آثار ابھر آئے۔

'لیکن یہ تو بہت سنگین جرم ہے۔ ہم ان بے گناہ شہریوں کو کیسے۔۔۔۔؟'

'دیکھیے صدیقی صاحب یہ سب ہم اپنی خوشی سے نہیں کر رہے نہ ہی ہم کسی جرم کی نیت رکھتے ہیں۔ ہم کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ ہمارے ساتھی کو فوری طبی امداد کی ضرورت ہے جو ایک ڈاکٹر ہی مہیا کر سکتا ہے اور یہ اس کا فرض ہے۔ ہمیں صرف رات بھر کی پناہ درکار ہے صرف اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے ملک' اپنی قوم کے مفاد کی خاطر اور یہ صرف ہمارا ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کا بھی ملک ہے۔ اگر انہیں اس معاملے میں کسی قدر ذہنی اور جسمانی کوفت برداشت کرنا پڑ گئی تو کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔'

'ٹھیک ہے۔' صدیقی نے پژمردہ لہجے میں کہا۔ 'تمہارا جو جی چاہے کرو۔' اس کا ردعمل عین فطری تھا۔ وہ بنیادی طور پر قانون کا محافظ تھا۔ ایک فرض شناس محافظ قانون کے لیے مجبوری کی حالت میں بھی

قانون کے خلاف قدم اٹھانا آسان نہیں ہوتا۔وہ ہرگز مجھے کوئی خلاف قانون حرکت کرنے کی اجازت نہ دیتا لیکن اس کے دیرینہ ساتھی کی اکھڑتی ہوئی سانسوں اور زرد پڑتے ہوئے چہرے نے اسے اپنے دل میں جبر کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

’لیکن یہ سب تم کرو گے کیسے!‘ صدیقی نے تھکے تھکے لہجے میں پوچھا۔

’بس آپ دیکھتے جائیں!‘ میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

میں ان دونوں کو ساتھ لے کر حویلی کے گیٹ کے قریب پہنچ گیا۔مرزا کو صدیقی کے پاس چھوڑ کر میں نے کوٹھی کی اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔قدرے توقف کے بعد میں نے ایک بار پھر یہی عمل دہرایا۔ اس بار گھنٹی کے بٹن سے ذرا اوپر سرخ رنگ کی چھوٹی سی لائٹ روشن ہوئی۔اس کے ساتھ ہی کسی پوشیدہ اسپیکر سے ایک مردانہ آواز ابھری۔’کون ہے؟‘

’ہمیں ڈاکٹر رضا صاحب سے ملنا ہے جی۔ بے حد ایمرجنسی ہے۔‘ میں نے اپنے لہجے میں لجاجت کا بھرپور تاثر پیدا کرتے ہوئے کہا۔

’میں رضا ہی بات کر رہا ہوں۔آپ کون صاحب ہیں اور اتنی رات گئے آپ کو مجھ سے کیا کام آن پڑا؟‘

’ہم آپ کے گھر سے تین گلیاں چھوڑ کر چوتھی گلی میں رہتے ہیں ڈاکٹر صاحب ہمارے والد صاحب کی سے طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے۔ ہماری گاڑی آج گھر پر نہیں ہے کہ ہم انہیں اسپتال لے جاسکتے اس لیے۔۔۔۔‘ میں نے ملتجی لہجے میں طویل گزارش کی۔

’اچھا اچھا۔۔۔کیا مجھے آپ کے ساتھ چلنا ہوگا؟‘ ڈاکٹر نے اس بار نرم لہجے میں سوال کیا۔

’نہیں ڈاکٹر صاحب میں اور میرا بھائی والد صاحب کو یہیں لے آئے ہیں۔آپ مہربانی کر کے ان کا معائنہ کر لیں۔‘

’ٹھیک ہے۔آپ لوگ ٹھہریں میں ابھی آتا ہوں۔‘ ڈاکٹر نے کہا۔اس کے ساتھ ہی اسپیکر سے آواز آنا بند ہوگئی۔اس کے ساتھ ہی سرخ لائٹ بھی بجھ گئی۔

میں نے اور صدیقی نے مرزا کو سہارا دے کر گیٹ کے ستون پر روشن طاقت ور لائٹ کے عین سامنے کھڑا کر دیا۔صدیقی نے دھیمے لہجے میں میری کارگردگی کو سراہا۔اسی اثنا میں گیٹ کے عقب میں آہٹ پیدا ہوئی۔کسی نے گیٹ کی جھریوں سے جھانک کر باہر کا اچھی طرح جائزہ لیا۔وہ ڈاکٹر رضا ہی تھا۔اس کی نظر مرزا کی زرد پڑتے ضعیف چہرے پر پڑی۔اس کی تجربہ کار نظروں نے ایک لمحے میں اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مریض کی حالت تشویش ناک ہے۔اگلے ہی لمحے گیٹ میں موجود چھوٹی کھڑکی کھل گئی۔

’آئیں آئیں! انہیں فوراً اندر لے آئیں؟‘ ایک ہمدردانہ آواز نے ہمیں گیٹ سے اندر آنے کی دعوت دی۔ہم دونوں مرزا کو سہارا دے کر گیٹ سے اندر لے گئے۔

گیٹ کے ساتھ ہی ڈاکٹر رضا بذات خود موجود تھا۔میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی عمر پینتالیس

کے قریب ہوگی۔وہ فربہی مائل جسم کا مالک تھا‘ کلین شیو اور گورا چٹا شخص تھا۔اس وقت اس کے جسم پر ڈھیلا ڈھالا لباس تھا۔اس کی رہنمائی میں ہم اس کی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔

اس نے مرزا کو فوری طور پر ایک قیمتی صوفے پر لٹا دیا۔’میں ابھی اپنا میڈیکل بکس لے کر آتا ہوں‘ یہ شاید ہارٹ ٹربل کا کیس ہے۔‘ ڈاکٹر رضا نے کہا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔

صدیقی نے معنی خیز نظروں سے مجھے گھورا۔تاہم اس نے کچھ کہا نہیں۔ڈاکٹر رضا کے جاتے ہی صدیقی نے مرزا سے اپنی گن واپس لے کر ایک صوفے کے دبیز کشن کے نیچے چھپا دی۔میں گہری نظروں سے ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا۔میں نے فوراً ہی دیکھ لیا کہ وہاں پر ٹیلی فون موجود ہے۔میں نے آنکھ کے اشارے سے صدیقی کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔صدیقی نے ٹیلی فون دیکھ کر استفہامیہ انداز میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر رضا واپس لوٹ آیا۔اس کے ہاتھ میں اس کا میڈیکل بکس تھا۔ڈاکٹر رضا نے میڈیکل بکس کھول کر اپنا اسٹیتھو اسکوپ نکالا اور اسے کانوں میں لگا لیا۔اس کے ساتھ ہی اس نے بکس سے بلڈ پریشر کٹ بھی نکال لی۔

’آپ بڑے صاحب کا کوٹ اتار دیں تاکہ میں ان کا بلڈ پریشر معلوم کرسکوں۔‘ ڈاکٹر رضا نے صدیقی سے کہا۔

صدیقی اور میرے درمیان آنکھوں ہی آنکھوں میں پیغامات کا تبادلہ ہوا۔صدیقی جھک کر مرزا کا کوٹ اتارنے لگا جبکہ میں نے اپنے لباس میں پوشیدہ پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔تاہم اتنی احتیاط ضرور رکھی کہ ڈاکٹر رضا کی نظر فوری طور پر اس پر نہ پڑے۔

مرزا کا کوٹ اترتے ہی ڈاکٹر رضا کی نظر فوری طور پر مرزا کے شانے پر پڑی۔خون میں بھیگے ہوئے رومال کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات امڈ آئے۔

’یہ۔۔۔۔یہ۔۔۔۔یہ تو۔۔۔۔‘ اس نے ہکلاتے ہوئے کہنا چاہا۔’زخمی ہے۔‘ میں نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

’اور آپ کو اس کا علاج کرنا ہے۔‘ میں نے پتھریلے لہجے میں کہا۔میرے لہجے میں چھپے تحکم کو محسوس کر کے اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

میں نے ہاتھ اٹھا کر اپنے کولٹ پستول کی جھلک اسے دکھائی۔پستول پر نظر پڑتے ہی اس کا چہرہ سپید پڑتا چلا گیا۔اسی اثنا میں صدیقی نے اپنی ایم پی فائیو بھی صوفے کے کشن کے نیچے سے نکال لی۔

مشین گن پر نظر پڑتے ہی اس کا چہرے کی سپیدی زردی میں ڈھل گئی جیسے چنبیلی کے پھولوں کی چادر پر کسی نے گیندے کے پھولوں کی چادر چڑھا دی ہو۔مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ خود ہی دل کے دورے کا شکار نہ ہو جائے۔صدیقی سے اس کی یہ حالت برداشت نہ ہوئی۔

’آپ پریشان نہ ہوں ہم آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔آپ جلدی سے مریض کی مرہم

پٹی کردیں۔'

'لیکن آپ لوگ کون ہیں؟ یہ صاحب کیسے زخمی ہوگئے؟' ڈاکٹر رضا نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

'ہم کوئی بھی ہوں اس سے آپ کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بس یہ سمجھ لیں کہ ہم کوئی چور ڈاکو وغیرہ نہیں ہیں اپنے ساتھی کی جان بچانے کے لیے مجبوراً ہمیں یہ سب کرنا پڑا ہے۔' میں نے نرم لہجے میں اسے سمجھایا۔

میرے طرزِ عمل سے ڈاکٹر رضا کے چہرے سے تناؤ کی کیفیت ختم ہونے لگی۔ اس نے نہایت احتیاط سے مرزا کے شانے پر بندھا ہوا رومال کھولا۔ زخم پر نگاہ پڑتے ہی وہ ایک بار پھر چونک پڑا۔ 'اوہ ---۔ یہ تو گولی کا زخم لگتا ہے۔'

'ہاں یہ گولی کا ہی زخم ہے۔ آپ جلدی سے پٹی کردیں۔' مرزا نے کمزور لہجے میں جھلاہٹ کا اظہار کیا۔ رومال کھلتے ہی زخم سے ایک بار پھر خون رسنے لگا۔

'لیکن میرے اندازے کے مطابق گولی ابھی جسم کے اندر ہی ہے۔ مجھے ایک چھوٹا سا آپریشن کرنا پڑے گا۔'

'تو پھر کرونا۔ دیر کس بات کی ہے؟' مرزا نے درد کی شدت سے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔

'لیکن آپریشن کے دوران میں خون کی بھی ضرورت پڑسکتی ہے۔' ڈاکٹر رضا نے بے بسی کے عالم میں کہا۔

'اتنے معمولی آپریشن کے لیے کوئی خون وون کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تم آپریشن کرو۔' مرزا نے ایک بار پھر تلخ لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر رضا نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔ 'اچھا میں سرجیکل انسٹرومنٹس لے کر آتا ہوں۔' ڈاکٹر رضا اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے کی جانب جانے لگا۔

'ذرا ٹھہریے ڈاکٹر صاحب' میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔' میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر رضا نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ پستول پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے حلق سے مرے مرے لہجے میں محض اتنا نکل سکا۔ 'چلیئے'

ڈاکٹر رضا دروازہ کھول کر آگے بڑھا۔ میں نے نہایت محتاط انداز میں اس کی پیروی کی۔ ڈرائنگ روم سے نکل کر ہم ایک بڑے سے لاؤنج میں پہنچ گئے۔ کوٹھی کی اندرونی سجاوٹ سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس گھر کے مکین متمول ہونے کے ساتھ ساتھ باذوق بھی ہیں۔

'ڈاکٹر رضا سیدھا ایک دیوار گیر الماری کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس نے نہایت آہستگی سے الماری کے پٹ کھولے۔ اس کے ساتھ ہی میں پوری طرح الرٹ ہوگیا۔ اس کی کسی بھی غلط حرکت سے نمٹنے کے لیے میں پوری طرح تیار تھا۔ ڈاکٹر رضا واپس پلٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک دھاتی بکس تھا۔

'آپ اس بکس کو ٹیبل پر رکھ کر پیچھے ہٹ کر کھڑے ہوجائیں۔' میں نے اسے حکم دیا۔

اس نے بے چوں وچرا میرے کہے پر عمل کیا۔ میں نے نہایت احتیاط سے اسٹین لیس اسٹین کے بکس کو کھولا۔ مجھے اس میں آلات جراحی کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔ مختلف قسم کے نشتر' قینچیاں' چمٹیاں اور دیگر نازک اور نفیس آلات۔ میں نے بکس بند کرتے ہوئے ڈاکٹر رضا سے سوال کیا۔

'گھر میں اس وقت اور کون کون موجود ہے؟'

'کک ---۔ کوئی بھی نہیں۔' اس نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

'جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کریں۔ میں گھر کی تلاشی بھی لے سکتا ہوں لیکن یہ کوئی اچھی صورت حال نہ ہوگی۔' میں نے سنجیدہ لہجے میں اسے تنبیہ کی۔

اس نے میرے پستول پر نظر ڈالتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ 'اس وقت گھر میں صرف میرا بیٹا ہے۔ اس کی طبیعت کچھ صحیح نہیں ہے۔'

'باقی گھر والے کہاں ہیں؟' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

'ہم دونوں کے علاوہ یہاں کوئی نہیں رہتا۔ میری بیوی کا چند سال پہلے انتقال ہو چکا ہے۔' اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ اس کے لہجے سے گہری اداسی عیاں تھی۔

'آپ کا بیٹا کہاں ہے؟' میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

'اس کا کمرہ دوسری منزل پر ہے۔' اس نے روانی میں بتایا پھر اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات ابھر آئے۔ 'لیکن تمھیں اس سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے۔ تم لوگ جو کہو گے میں کروں گا۔ اس کے علاوہ بھی تمھیں جو کچھ چاہیے میں دینے کو تیار ہوں۔'

'آپ گھبرائیے نہیں۔ ہم آپ کو اور آپ کے بیٹے کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ یہ سب میں محض احتیاطاً پوچھ رہا ہوں۔'

میری بات سن کر اس کے چہرے پر قدرے اطمینان کے آثار ابھر آئے۔

'چلیے آپ کے ساتھیوں کے پاس چلتے ہیں۔' ڈاکٹر رضا نے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ میں اس سے چند قدم پیچھے رہا۔ جونہی وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا میں پھرتی سے لوٹا اور ایک جھٹکے سے وہاں رکھے ہوئے ٹیلی فون کا تار توڑ دیا۔ اب یہاں سے باہر کال کرنا ناممکن تھا۔ البتہ ڈرائنگ روم کا فون صحیح کام کرتا رہتا۔

میں ڈرائنگ روم میں واپس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر روئی سے مرزا کے زخم کو صاف کر رہا ہے۔ اس نے ایک انجکشن لگا کر مرزا کو بے ہوش کر دیا۔ اس اثنا میں بجلی کے ہیٹر پر رکھا ہوا پانی ابلنے لگا۔ اس نے آلات جراحی اچھی طرح سے ابلتے ہوئے پانی میں کھنگالے اور پھر بڑے انہماک سے مرزا کے شانے کا آپریشن کرنے لگا۔

وہ بے حد ماہر سرجن ثابت ہوا۔ اس نے نہایت مہارت سے مرزا کے شانے میں پیوست گولی نکال دی۔ میں نے طشتری میں پڑی ہوئی گولی کو اٹھایا اور اسے پانی میں دھو کر بغور اس کا جائزہ لیا۔ میری

سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کس ہتھیار میں استعمال ہونے والی گولی ہے۔ وہ رائفل کی گولی سے چھوٹی تھی جبکہ اسٹین گن اور ایم پی فائیو کی گولی سے بڑی تھی۔

ڈاکٹر رضا' مرزا کے شانے کی ڈریسنگ میں مصروف ہو گیا۔ جبکہ میں وہ گولی لے کر صدیقی کے پاس پہنچ گیا۔

'صدیقی صاحب یہ کون سے ہتھیار کی گولی ہے؟' صدیقی نے گولی ہاتھ میں لے کر بغور اس کا جائزہ لیا پھر اس کے لبوں سے بے ساختہ 'اوہ' نکلا۔

'کیا آپ نے پہچان لیا ہے کہ۔۔۔۔۔۔'

'ہاں یہ اس ہتھیار کی گولی ہے جو ہمارے ملک میں بلکہ ہمارے علاقے میں نہ فروخت ہوتا ہے اور نہ تیار ہوتا ہے اگر چہ یہ گن دنیا کے خطرناک ترین ہتھیاروں میں شمار ہوتی ہے۔'

'میں کچھ سمجھا نہیں۔' میں نے کہا۔

'یہ اسرائیلی ساختہ یوزی سب مشین گن کی گولی ہے۔' صدیقی نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

'لیکن سردار شاہ مراد کے کارندوں کے پاس یہ گنیں کیسے پہنچ گئیں؟' میں نے حیرانی کے عالم میں سوال کیا۔

'اسمگلنگ کے ذریعے یا بھارتی ایجنسی را کے ذریعے اسرائیلیوں نے حال ہی میں جذبۂ خیر سگالی کے طور پر ایسی ہزاروں گنیں بھارت کو بطور تحفہ پیش کی ہیں۔'

'اور بھارت یہ اسرائیلی ہتھیار کشمیر میں ہمارے مسلمان بھائیوں پر استعمال کر رہا ہے۔' میں نے شدید نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

'ہاں! اس کے علاوہ مفت میں ملنے والے ہتھیاروں کو وہ پاکستان میں سرگرم غداروں اور دہشت گردوں میں بانٹ رہا ہے یعنی ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے۔' صدیقی نے بھی زہر بھرے لہجے میں اپنے جزبات کا اظہار کیا۔

'رنگ تو ہم ان بھارتی ایجنٹوں پر ایسا چڑھائیں گے کہ یہ تمام عمر یاد رکھیں گے۔ بس ایک مرتبہ کھل کر آمنا سامنا ہو جائے۔' میں نے کھولتے ہوئے لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر رضا نے مرزا کے زخم کی ڈریسنگ کرنے کے بعد اسے ایک دو انجکشن اور لگا دیے۔

'اب یہ انشاء اللہ جلد ہی تندرست ہو جائیں گے۔ پندرہ بیس منٹ میں یہ دوبارہ ہوش میں آ جائیں گے۔ میں آپ کو چند ٹیبلٹس اور کیپسولز دوں گا۔ آپ وہ انہیں کھلاتے رہیں۔ ان کے استعمال سے انفیکشن کا خطرہ دور ہو جائے گا۔' ڈاکٹر رضا نے پیشہ ورانہ انداز میں اپنی رائے ظاہر کی۔

یہ پندرہ بیس منٹ خاصے تناؤ کی کیفیت میں بیتے۔ ڈاکٹر رضا خاصا مضطرب تھا۔ اس اثنا میں اس نے کئی بار اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ بالآخر مرزا کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے ہلکی سی کراہ کے ساتھ اپنی آنکھیں کھول دیں۔ صدیقی کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

'تم ٹھیک تو ہو مرزا؟'

'ہاں۔۔۔لیکن میرا شانہ۔۔۔' مرزا نے کمزور لہجے میں کہا۔

'میں نے آپ کے شانے سے گولی نکال دی ہے۔ اب آپ بے فکر ہو کر چل پھر سکتے ہیں۔' ڈاکٹر رضا نے مطمئن لہجے میں بتایا۔

اس نے اپنے میڈیکل بکس میں سے کچھ گولیاں اور کیپسول نکال کر صدیقی کے حوالے کر دیے پھر وہ متوقع نظروں سے ہماری شکلیں دیکھنے لگا۔

ہمیں یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ اب وہ چاہتا ہے کہ ہم جلد از جلد اس کے گھر سے دفع ہو جائیں۔ اب ہم اسے کیسے بتاتے کہ آج کی رات پورا شہر ہمارے لیے دہکتی بھٹی کی مانند ہے۔ ہماری معمولی سی لغزش ہمیں بے وقعت راکھ میں تبدیل کر سکتی ہے۔ خونخوار شارک مچھلیوں سے لبریز اس بحیرہ خون رنگ میں یہ گھر ہمارے لیے جزیرہ عافیت ہے۔ یہاں سے پاؤں باہر نکالتے ہی ہم موت کے تیز دھار دانتوں کا شکار ہو جائیں گے۔

ہم لوگوں کی جانب سے کوئی ردعمل نہ پا کر ڈاکٹر رضا کے چہرے پر ایک بار پھر شدید اضطراب کے آثار نظر آنے لگے۔ اس نے اپنے خشک گلے کو لعاب دہن سے تر کرتے ہوئے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ کسی بھی ایسی بات سے گریز کرنا چاہتا تھا جسے سن کر ہمیں طیش آ جائے۔

کچھ دیر توقف کے بعد اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ 'میرا خیال ہے آپ لوگوں کو بھوک بھی لگ رہی ہو گی۔ میں آپ کے لیے کچھ کھانے پینے کا انتظام کرتا ہوں۔' اس کی زبان سے کھانے پینے کا ذکر سن کر مجھے احساس ہوا کہ واقعی ہمیں کھانے کی ضرورت ہے۔ تقریباً بارہ تیرہ گھنٹے پہلے دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد ہم نے کچھ نہیں کھایا۔

ہماری طرف سے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ گھر کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ میں خاموش سائے کی مانند اس کے پیچھے چل پڑا۔ ہم دونوں لاؤنج میں سے گزرے تب اس کی نظر تپائی پر رکھے ٹیلی فون پر پڑی۔ اس کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے رک گیا۔

'یہ۔۔۔۔۔۔یہ۔۔۔۔۔۔' اس نے شکایتی لہجے میں کچھ کہنا چاہا لیکن پھر اس نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ پہلی بار مجھے اس کے چہرے پر شدید غصے کی سرخی نظر آئی۔ میں نے جان لیا کہ اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چلا ہے۔ اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے کے بعد میں مزید محتاط ہو گیا۔

ڈاکٹر رضا تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کوٹھی کے بڑے سے باورچی خانے میں داخل ہو گیا۔ مجھ سے کوئی بات کیے بغیر اس نے کسی روبوٹ کی مانند فریج کھولا اور اس میں سے انڈوں کی ٹرے نکال کر چولہوں کے پاس رکھ دی وہ شاید اس قسم کے کاموں کا ماہر تھا۔ اس نے ایک بڑے فرائنگ پین میں گھی ڈال کر اسے چولہے پر چڑھا دیا۔ گھی کے گرم ہوتے ہی اس کے ہاتھ حرکت میں آ گئے۔ وہ نہایت مہارت سے ایک کے بعد ایک انڈے کو توڑ کر فرائنگ پین میں ڈالنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے نصف درجن ہاف فرائی انڈے تیار کر دیے۔ انڈوں کو تین پلیٹوں میں سجانے کے بعد اس نے نرم لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

'آپ ذرا فریج میں سے ڈبل روٹی کا پیکٹ نکال لیں۔' میں اس کی ہدایت کے مطابق مڑا اور فریج کا دروازہ کھول کر اندر جھانکنے لگا۔ ڈبل روٹی کا پیکٹ مجھے سامنے ہی رکھا نظر آ گیا۔ میں ڈبل روٹی کا پیکٹ اٹھا کر مڑنے ہی والا تھا کہ یکا یک میری چھٹی حس بیدار ہو گی۔

میرے حساس کانوں میں دو دھاتوں کے آپس میں دھیمی آواز میں گڑ کرانے کی آواز سننے کی آہٹ پاتے ہی میرے ذہن میں سوال ابھرا۔ اگلے ہی لمحے بجلی کے کوندے کی طرح میرا ذہن ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔

میں تیزی سے مڑا لیکن اسی دوران میں میرا جسم گھٹنوں کے بل بیٹھتا چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر رضا نے کڑکڑاتے ہوئے گھی سے لبریز فرائنگ پین اپنے ہاتھ میں اٹھا رکھا ہے۔

جوں ہی میرا رخ اس کی طرف ہوا' اس نے وہ کھولتا ہوا گھی میرے چہرے کی جانب اچھال دیا۔ اگر میں اس سے پہلے ہی بیٹھ نہ چکا ہوتا تو میرا چہرہ اس سیال آتش کی زد میں آ کر ان انڈوں کی مانند تلا جاتا۔ اس کے بعد میری ان عقابی آنکھوں کی جگہ محض دو بھیانک گڑھے باقی رہ جاتے۔ گرم گرم گھی میرے سر کے اوپر سے گزر کر فریج پر جا گرا البتہ اس کے کچھ چھینٹے میری پیشانی' سر اور گردن کی پشت پر گرے۔ ان ہی چھینٹوں کی جلن نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔

اپنے کاری وار کو خالی جاتے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر مایوسی کے آثار ابھرے لیکن اگلے ہی لمحے یہ آثار معدوم ہو گئے۔ اس کی جگہ اس کی آنکھوں میں خوفناک چمک نمودار ہوئی۔ میں نے اس چمک کو فوری طور پر پہچان لیا۔

یہ وہ چمک تھی جو کسی بلی کی آنکھوں میں اس وقت نمودار ہوتی ہے جب وہ کسی بند کمرے میں گھیر لی جائے اور اس کے لیے کوئی راہ فرار باقی نہ بچے۔ اس لمحے اس معمولی سے جانور سے بڑھ کر کوئی درندہ خطرناک نہیں ہوتا۔ ایسے میں اگر اسے گھیرنے والا ذرا سی بھی چوک کر جائے تو یہ ہلکا پھلکا لیکن غضب ناک جانور اس کی آنکھیں نوچ لیتا ہے۔

ڈاکٹر رضا نے اسٹیل کے بھاری فرائنگ پین کو فضا میں لہرایا اور برق رفتاری سے میری طرف جھپٹا۔ میرے پاس اتنی مہلت کہاں تھی کہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ اس اثنا میں وہ فرائنگ پین میری کھوپڑی سے ٹکرا کر میرے چودہ طبق روشن کر ڈالتا۔ پلک جھپکنے میں وہ میرے قریب پہنچا اور فرائنگ پین کو فضا میں تول کر میرے سر پر مارنا چاہا۔

اس ایک لمحے کی مہلت سے فائدہ اٹھا کر میں برق رفتاری سے پشت کے بل کچن کے چکنے فرش پر دراز ہو گیا۔ فرائنگ پین تیزی سے نیچے آیا لیکن اس کا تصادم میرے سر کے بجائے میرے جوتوں کے سول سے ہوا۔

کچن میں دھات کے سخت چمڑے سے ٹکرانے کی آواز گونجی۔ ڈاکٹر رضا نے فوری طور پر خود کو سنبھالتے ہوئے میری پنڈلیوں پر فرائنگ پین کا ترچھا وار کیا۔

میں نے تیزی سے حرکت دے کر اپنی ٹانگیں اس کے نشانے سے ہٹا لیں۔ نشانہ خطا ہونے کے

بعد اس کے جسم کا توازن کچھ بگڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر مجھ پر دوبارہ وار کرتا میں نے اپنی ٹانگوں کو کسی کلہاڑے کی مانند اس کی پنڈلیوں پر دے مارا۔

میری یہ ضرب توقع سے بڑھ کر کارگر ثابت ہوئی۔ میری ٹانگوں کے ٹکراتے ہی اس کے قدم زمین سے اکھڑ گئے۔ وہ فضا میں اچھل کر خاصی زور سے پختہ فرش پر گرا۔ اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی لیکن یہ چیخ فرائنگ پین کے فرش سے ٹکرانے کے شور میں دب گئی۔

اس کی کمر کے نچلے حصے میں خاصی چوٹ لگی ہو گی لیکن اس نے اپنے درد کو نظر انداز کر کے میرے چہرے کو اپنے پاؤں کی ضرب کا نشانہ بنانا چاہا۔ میں نے بڑی پھرتی سے فرش پر اپنا جسم پھسلا کر خود کو اس کے وار سے بچایا۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور وار کرتا میں نے اپنا پاؤں اس کے پیٹ میں دے مارا۔ میری یہ ضرب کچھ زیادہ ہی کارگر ثابت ہوئی۔ اس کے حلق کے تیز چیخ نکلی اور وہ اپنا پیٹ پکڑ کر بری طرح تڑپنے لگا۔

'اسے اسی کے حال پر چھوڑ کر میں فرش سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس اثنا میں صدیقی بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کی مشین گن اس کے ہاتھ میں آگ برسانے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔

'کیا۔۔۔۔۔ کیا ہوا ذوالفقار علی؟' اس نے حواس باختگی کے عالم میں سوال کیا۔

'کچھ نہیں۔' میں نے اپنا سانس بحال کرتے ہوئے کہا۔ 'ڈاکٹر صاحب کو ذرا جسمانی ورزش کا شوق چڑھ گیا تھا۔'

اس وقت صدیقی نے ڈاکٹر رضا کو پیٹ پکڑ کر فرش پر بل کھاتے دیکھ لیا۔

'اوہ یہ کیا ہوا؟ کیا اسے تم نے مارا ہے؟ تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس پر ہاتھ اٹھا کر تم نے اچھا نہیں کیا!' صدیقی نے اضطراب کے عالم میں بنا سوچے سمجھے مجھے مورد الزام ٹھہرانا شروع کر دیا۔

'آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ مجھے واقعی اس پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا بلکہ مجھے چاہیے تھا کہ چپ چاپ اسے اپنا چہرہ گرم گھی سے تل دینے کی اجازت دے دیتا۔' میں نے کٹیلے لہجے میں صدیقی پر طنز کیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے فریج پر سے بہہ کر گرتے ہوئے گھی اور فرائنگ پین کی طرف اشارہ کیا۔

صدیقی نے چند ہی لمحوں میں تمام صورت حال کو سمجھ لیا اس کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات ابھر آئے۔

'اوہ۔۔۔۔۔ تو یہ بات ہے؟' اس نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

'جی ہاں صدیقی صاحب۔۔۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے کڑکڑاتا ہوا گھی میرے چہرے پر پھینک کر ہمیشہ کے لیے میری دنیا اندھیری نہیں کرنا چاہی بلکہ میری کھوپڑی کے دو ٹکڑے کر کے میرا قصہ پاک کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔'

'ہاں ہاں میں نے یہ سب کیا ہے اور موقع ملا تو پھر کروں گا۔' ڈاکٹر رضا نے کرب کی شدت سے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ 'تم جیسے درندوں کے ساتھ اس سے بھی برا سلوک ہونا چاہیے۔'

'یہ سب آپ نے اچھا نہیں کیا ڈاکٹر صاحب۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ہم آپ کو کوئی نقصان

نہیں پہنچانا چاہتے۔ ہم نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ہم کوئی چور ڈاکو نہیں ہیں لیکن آپ نے ہماری بات پر یقین نہیں کیا۔ بہر حال جو کچھ ہوا اسے بھول جائیں اور براہ کرم مزید کسی مہم جوئی سے گریز کریں۔ ہم آپ کو کسی قسم کی جسمانی تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔'

ڈاکٹر رضا کراہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اس کے چہرے سے شدید تکلیف کے آثار ہویدہ تھے۔ اس دوران میں اس کا دایاں ہاتھ مسلسل پیٹ پر جما رہا۔ صدیقی نے پلیٹوں میں سجے انڈوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

'ذوالفقار تم کھانے کے برتن لے کر آ جاؤ۔ میں ڈاکٹر صاحب کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔ چلیے ڈاکٹر صاحب۔'

ڈاکٹر رضا لڑکھڑاتے قدموں سے اس کے آگے چل پڑا۔ ان کا رخ ڈرائینگ روم کی طرف تھا۔ ان کے روانہ ہونے کے بعد میں نے فرش پر سے ڈبل روٹی کا پیکٹ اٹھا کو کھولا اور ایک بڑی سی طشتری میں ڈبل روٹی کے توس سجا دیے۔ چولہوں کے اوپر بنی ہوئی الماری میں سے میں نے نمک اور کالی مرچ بھی ڈھونڈ نکالی۔

میں کھانے پینے کا سامان سجا کر ڈرائینگ روم میں پہنچا۔ میں نے دیکھا کہ مرزا کے چہرے پر تکلیف کے آثار نہیں ہیں۔ البتہ ڈاکٹر رضا بدستور اپنے پیٹ کو دبائے' صوفے پر دبکا نظر آیا۔ صدیقی اس دوران میں شاید اسے اپنے متعلق مطمئن کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اس کے الفاظ نے ڈاکٹر رضا پر خاطر خواہ اثر کیا کیونکہ مجھے اس کے چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آئے۔ پہلے مرزا اور صدیقی نے ڈبل روٹی اور انڈوں سے اپنے پیٹ کی آگ بجھائی پھر میں نے ٹھنڈی ڈبل روٹی اور گرم انڈوں پر مشتمل اس ڈنر بلکہ بریک فاسٹ کو اپنے پیٹ میں اتارنا شروع کیا۔ اس دوران میں صدیقی دھیمے لہجے میں ڈاکٹر رضا سے جانے کیا کیا باتیں کرتا رہا۔

'دراصل میں معدے کے السر کا مریض ہوں۔' میں نے ڈاکٹر رضا کی آواز سنی۔ 'شاید میرے معدے کا زخم پھر ہرا ہو گیا ہے۔ مجھے دوا لینی پڑے گی۔' میرے دل میں آئی اس سے پوچھوں کہ کیا تمھیں یہ سب اس وقت یاد نہیں تھا جب تم اپنی کاروائی میں مصروف تھے؟ جو کچھ کیا ہے اب اس کا نتیجہ بھی بھگتو۔ وہ تو شکر کرو کہ میرا پستول میرے ہاتھ میں نہیں تھا ورنہ تمھاری کھوپڑی کے اتنے ٹکڑے ہو جاتے کہ کوئی گن بھی نہ پاتا۔

صدیقی نے اسے دوا لینے کی اجازت دے دی۔ دوا کھانے کے بعد اس کی حالت کچھ بہتر ہو گئی۔

'ہم وعدہ کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب کہ ہم لوگ صبح یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔ اس وقت تک آپ کو خوشی سے یا مجبوراً ہماری میزبانی کرنی پڑے گی۔ یہ ہماری مجبوری ہے کہ ہم اپنا پوری طرح سے تعارف نہیں کروا سکتے ورنہ آپ بخوشی ہماری مدد کرنے پر تیار ہو جاتے۔ بہر حال کل صبح تک آپ کو ہمارے ساتھ اسی کمرے میں رہنا پڑے گا۔ آپ بے فکر ہو کر سو سکتے ہیں۔ ہم آپ کی جان اور آپ کے مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔' صدیقی نے ایک بار پھر اسے اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

'لیکن میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ میرے بیٹے کی طبیعت صحیح نہیں ہے اگر اس کی آنکھ کھل گئی تو مجھے تلاش کرے گا۔'

'کیا عمر ہو گی آپ کے بیٹے کی؟' صدیقی نے سوال کیا۔ ڈاکٹر رضا کے چہرے پر تذبذب کے آثار ابھر آئے۔ اس نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ 'وہ۔۔۔۔۔۔۔ وہ تقریباً سترہ سال کا ہے۔'

'ارے۔۔۔۔۔ اس عمر کے تو اکثر لڑکے بھرپور جوان ہو جاتے ہیں۔ کیا بیماری ہے آپ کے بیٹے کو؟' صدیقی کے سوال نے ڈاکٹر رضا کے چہرے پر گہری اداسی طاری کر دی۔ اس نے پژمردہ لہجے میں جواب دیا۔

'وہ دراصل ذہنی طور پر ناپختہ ہے۔ عمر کے لحاظ سے تو وہ بالغ ہو چکا ہے لیکن اس کا دماغ ابھی تک نوعمر بچے کے مانند ہے۔ مجھے کسی نوعمر بچے کے مانند ہی اس کی دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے۔ اگر وہ کچھ دیر تک مجھے نہ دیکھے تو رو رو کر برا حال کر لیتا ہے۔'

'بڑا افسوس ہوا یہ سن کر۔' صدیقی نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ 'کیا اس کا علاج نہیں ہو سکتا؟'

'جس قدر علاج کرانا ممکن ہے وہ میں کرا چکا ہوں لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکا۔ اس کے تندرست ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ کبھی کبھی اس پر شدید دماغی دورے پڑتے ہیں۔ اس کے سر میں اس قدر شدید درد ہوتا ہے گویا اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ میں ہر ممکن کوشش کرتا ہوں کہ اسے کسی قسم کی جسمانی یا ذہنی اذیت نہ پہنچے۔ اسی کی خاطر میں نے پریکٹس چھوڑ دی ہے۔ اسی کے غم نے میری بیوی کو گھلا گھلا کر ختم کر دیا۔ میری نیندیں یہ سوچ سوچ کر اڑ جاتی ہیں کہ کسی وقت میرا ابلاوا ابھی آ گیا تو میرے بچے کا کیا بنے گا؟'

ڈاکٹر رضا کی آواز باتیں کرتے کرتے گلوگیر ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ ان آنسوؤں نے میرے دل میں اس کے لیے موجود کدورت دھو ڈالی۔ وہ شخص قابل رحم تھا۔ اس کی زندگی کا واحد سہارا اس کا بیٹا تھا لیکن یہ سہارا بذات خود اس پر بوجھ بن چکا تھا۔ اپنے جوان بیٹے کو اذیت سے تڑپتے دیکھ کر اس کے دل پر کیا بیتتی ہو گی؟ کتنا بدنصیب ہے یہ شخص! اسے دنیا کی ہر نعمت حاصل ہے لیکن یہ نعمتیں اس کی آنکھوں کے نور' اس کے دل کے چین کو صحت عطا نہیں کر سکتیں۔ اسے یہی اندیشہ چین سے نہیں سونے دیتا کہ اس کی موت کے بعد کہیں اس کا بیٹا گلی کوچوں میں لوگوں کے ہاتھوں سنگ باری کا نشانہ نہ بن جائے۔ اس بدنصیب کی حالت پر رحم کھا میرے پاک پروردگار۔ تیرے لیے اس کی مشکل آسان کرنا کیا دشوار ہے؟

'کبھی کبھی مجھے یہ احساس ستانے لگتا ہے کہ اپنے بیٹے کی اس حالت کا ذمے دار میں خود ہوں۔ یہ میرے کریہہ اعمال ہیں جن کی سزا میرے معصوم بیٹے کو بھگتنی پڑ رہی ہے۔' ڈاکٹر رضا نے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا۔

'کیا آپ کا بیٹا پیدائشی طور پر ایسا ہے؟' میں نے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔ 'یا اسے کوئی دماغی چوٹ وغیرہ لگی تھی؟'

'نہیں بھائی۔ تین سال کی عمر تک میرا بیٹا قاسم بالکل نارمل بچہ تھا۔ سخت سردیوں کی ایک رات میں اسے بخار چڑھ گیا۔ بدقسمتی سے اس رات میں گھر پر موجود نہیں تھا۔ میرا لالچ مجھے گھیر کر میرے ایک امیر کبیر مریض کے پاس لے گیا۔ وہ شخص بوڑھا ہونے کے ساتھ ساتھ وہمی اور خبطی بھی تھا لیکن وہ بے حد فیاض بھی تھا۔ اس کی بیماری زیادہ خطرناک نہ تھی لیکن اس نے مجھے اپنے پاس بٹھائے رکھا۔ بھاری انعام اور فیس کے لالچ میں میرے قدم بھی وہاں سے نہ اٹھے۔ صبح کو جب میں اس کے گھر سے نکلا تو میری جیبیں نوٹوں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ میں گھر پہنچا تو میری بیوی نے مجھے بتایا کہ میرا اکلوتا بیٹا تمام رات شدید بخار میں تپتا رہا ہے۔ اس نے ایک دو ڈاکٹروں سے رابطہ کر کے انہیں بلانے کی کوشش کی لیکن اس سردترین رات کو کوئی بھی اپنا گرم بستر چھوڑ کر آنے پر تیار نہ ہوا اور انہوں نے مختلف بہانوں سے معذرت کر لی۔ میری بیوی کے پاس میرے مالدار مریض کا فون نمبر نہ تھا۔ اس نے گھر میں موجود معمولی گولیوں سے اپنے بیٹے کا علاج کرنا چاہا لیکن اس کا بخار کم نہ ہو سکا۔ میں نے ان بے حس ڈاکٹروں کو جی بھر کر کوسا اور برا بھلا کہا۔ اس وقت مجھے قطعاً یاد نہ آیا کہ خود میں بھی کتنی ہی بار اپنے مریضوں کو دیکھنے سے صاف انکار کر چکا ہوں۔ خاص طور پر نادار اور مفلس مریضوں کی تو میں نبض تک دیکھنا گوارہ نہ کرتا تھا۔ گھر جا کر ان کی بیماری کا علاج کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ میری نظر میں انسانیت' ہمدردی اور بے لوث خدمت بے معنی الفاظ تھے۔ کوئی مرتا ہے تو مر جائے لیکن میں اپنی فیس وصول کیے بغیر کسی مریض کو ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ خیر تو میں بتا رہا تھا کہ میں نے گھر آنے کے بعد اپنے بیٹے کا بغور معائنہ کیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اسے نمونیے کی شدید شکایت ہے۔ میں نے اسے کچھ دوائیاں وغیرہ دیں اور اس کے لیے مزید دوائیں وغیرہ خریدنے کے لیے بازار کے بڑے میڈیکل اسٹور پر چلا گیا۔ واپسی پر خلاف توقع مجھے خاصی دیر لگ گئی۔' ڈاکٹر رضا چند لمحوں کے لیے خاموش ہو کر اپنے خیالات کو مجتمع کرنے لگا۔ ہم لوگوں نے اس کے خیالات کے تسلسل کو منقطع کرنے کی کوشش نہ کی۔ آخر کار اس نے ایک بار اپنا سلسلہ گفتگو جاری کی۔ 'میں گھر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ میری بیوی بری طرح سے حواس باختہ ہو رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ میرے جانے کے بعد قاسم کا بخار بہت شدید ہو گیا تھا اور پھر اسے جھٹکوں کا شدید دورہ پڑ گیا تھا۔ پانی وغیرہ پلانے سے بڑی مشکل سے اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی ہے۔ جھٹکوں کے دورے کے متعلق سن کر میں خود بھی بے حد پریشان ہو گیا۔ میں اس دورے کے مضمرات سے پوری طرح واقف تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ دورے مریض کی دماغی حالت کو تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی موت کا سبب بھی بن سکتے ہیں۔ میں نے اپنے بیٹے کو فوری طور پر کئی انجکشن لگائے اور دوائیاں دیں لیکن میرے دیکھتے ہی دیکھتے اسے ایک بار پھر جھٹکوں کا دورہ پڑ گیا۔ اس کے ہاتھ پیر اکڑ گئے۔ منہ سے جھاگ بہنے لگا اور اس کا جسم زور زور سے جھٹکے لینے لگا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں نے جلدی جلدی اس کے سر پر پانی کی پٹیاں رکھیں۔ جس کے باعث اس کی یہ کیفیت دور ہو گئی۔ اس کے بعد میں مسلسل اپنے بیٹے کے پاس موجود رہا۔

'خدا خدا کر کے ایک ہفتے بعد میرے بیٹے کی حالت بہتر ہوئی۔ میں خود بھی ڈاکٹر تھا اس کے

باوجود میں نے بے شمار ماہر ڈاکٹروں سے اپنے بیٹے کے متعلق بات کی۔ انہوں نے جو کچھ بتایا وہ مجھے پہلے سے معلوم تھا۔ تمام ڈاکٹروں کی متفقہ رائے تھی کہ اس قسم کے مزید دورے میرے بیٹے کی زندگی کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد میں بے حد محتاط ہو گیا۔

ہم دونوں میاں بیوی اسے اپنی پلکوں پر رکھنے لگے۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر ہم دونوں میاں بیوی تڑپ اٹھتے لیکن میری یہ نرم دلی محض گھر تک محدود رہی۔ اپنے کلینک پہنچتے ہی میں ایک بار پھر بے حس اور خودغرض دکان دار بن جاتا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی ایسا مریض میرے کلینک سے دھتکار کر نکالا جاتا جس کے پاس میری فیس کے پیسے نہ ہوتے۔ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت کمانا' بس یہی میری زندگی کا مقصد تھا۔ میرے پاس پہلے بھی دولت کی کمی نہ تھی لیکن میں مسلسل اسی کوشش میں لگا رہتا کہ اپنے مریضوں کو نچوڑ کر زیادہ سے زیادہ مال اکٹھا کر لوں۔ اسی طرح ایک سال بیت گیا۔ اس دوران میں میرا بیٹا قاسم بالکل ٹھیک ٹھاک رہا۔

وہ فروری کی ایک سرد رات تھی۔ پچھلے تین دنوں سے وقفے وقفے سے بارش ہو رہی تھی۔ سردی اور بارش نے مل کر میرے مریضوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ میں ہر روز رات دیر تک کلینک میں بیٹھتا اور نوٹوں سے لبالب جیبیں لے کر گھر پہنچتا۔ اس رات میں مسلسل مصروفیت کے باعث پیدا ہونے والی تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا لیکن میری جیب میں کڑکڑاتے نوٹوں کی گڈیاں میری تھکن کا مداوا کر رہی تھیں۔ اس وقت بھی کلینک کے باہر اچھی خاصی تیز بارش ہو رہی تھی۔

میں نے کئی بار سوچا کہ اب کلینک سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلا جاؤں کیونکہ خاصی دیر سے کوئی مریض نہیں آیا تھا لیکن میری ہوس مجھے اٹھنے نہ دیتی تھی۔ شاید کوئی موٹی آسامی آ جائے اور میری جیب کے وزن میں کچھ اور اضافہ ہو جائے۔ میری گرسنہ آنکھیں کلینک کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں کہ اچانک دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے اپنی گود میں ڈیڑھ سال کا بچہ اٹھا رکھا تھا۔

بچے کو اس نے ایک خستہ حال کمبل میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس شخص کے حلیے پر نظر ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مفلوک الحال مزدور پیشہ شخص ہے۔ میں نے ناگواری سے ناک چڑھا لی۔ وہ شخص حواس باختہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

'ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر صاحب میرا بچہ سخت بیمار ہے۔ اسے بہت تیز تپ چڑھی ہوئی ہے۔ اسے بالکل ہوش نہیں ہے۔' میں نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

'اچھا اسے ادھر میز پر لٹا دو۔' اس نے بچے کو میز پر لٹا دیا۔ میں نے ایک نظر میں اندازہ لگا لیا کہ بچے کی حالت تسلی بخش نہیں ہے۔ اس کے حلق سے کھرکھراہٹ کی آوازیں ابھر رہی تھیں اور وہ بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ مجھے فوراً ہی معلوم ہو گیا کہ وہ ڈبل نمونیے کا شکار ہوا ہے۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی لیکن میرا ذہن تو ایک اور فکر میں غلطاں تھا کہ یہ مفلس اور قلاش شخص میری بھاری فیس ادا کر پائے گا؟ ایسا نہ ہو کہ یہ اپنے بچے کا علاج کرانے کے بعد اپنی جیبیں جھاڑ کر دکھا دے۔ ایسے 'مشکوک' قسم کے افراد سے پیشگی وصولی کر لینا ہی عقل مندی ہے۔ اگر یہ بچہ چل بسا تو وصولی کی رہی سہی امید بھی

ختم ہو جائے گی۔ میں نے بے دلی سے بچے کے جلتے بھنتے بدن کو ایک دو جگہ سے دبا کر دیکھا۔ بچے کے باپ نے سخت پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

'میرا بچہ ٹھیک تو ہو جائے گا ڈاکٹر صاحب؟'

اسے ڈبل نمونیا ہے۔ اس کے علاج پر بھاری رقم خرچ ہوگی۔ تمھاری جیب میں کچھ ہے یا اسے اٹھا کر ایسے ہی دوڑے چلے آئے؟' میرے لہجے میں خود بہ خود طنز اور حقارت کا زہر گھل گیا۔

میری بات سنتے ہی اس شخص کا چہرہ یک دم فق ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔ ان آنسوؤں کی روانی کو مجھ سے چھپانے کے لیے اس نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔ اس کی شکل زبان نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

'اسے اٹھا کر کسی خیراتی اسپتال لے جاؤ۔ اپنے پلے سے رقم خرچ کر کے مریض کا علاج کرنا میرے اصول کے خلاف ہے۔'

'ایسا نہ کریں ڈاکٹر صاحب۔ اس برستی بارش میں اپنے بیٹے کو لے کر کہاں مارا مارا پھروں گا؟ مجھ پر رحم کھائیں ڈاکٹر صاحب خدا آپ کے بال بچوں کو۔۔۔۔۔'

'بس بس بہت ہو چکا' میں نے اپنے مخصوص لہجے میں اسے دھتکارا۔ 'یہ سب میری ذمے داری نہیں ہے تمھارا بچہ زندہ رہے یا مر جائے میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ارے بھائی گھوڑا گھاس سے دوستی کرلے تو کھائے گا کیا تم اسے اٹھاؤ اور کسی سرکاری اسپتال میں لے جاؤ' اس نے خاصی آہ و بکا کی لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی۔

میں کلینک سے نکل کر اپنی کار کی طرف بڑھا تو سردی کی شدت سے مجھے اپنا خون رگوں میں جمتا محسوس ہوا۔ بارش کے جھکڑوں نے فضا میں سرد آگ بھڑکا رکھی تھی۔ میں گرم چسٹر اور اسکارف میں خود کو چھپاتا ہوا گاڑی کے اسٹیرنگ وہیل کے پیچھے جا بیٹھا۔ مجھے یہ سوچ کر اپنے جسم میں حیات بخش گرمی کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی کہ کل میرے کلینک پر آنے والے مریضوں کی تعداد آج سے بھی زیادہ ہوگی لیکن اپنے کلینک میں آنے والے آخری مریض کے متعلق سوچ کر مجھے اپنے حلق میں کڑواہٹ گھلتی محسوس ہوئی۔ 'اونہہ۔۔۔۔۔۔آجاتے ہیں قلاش کہیں کے۔۔۔۔' میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ میں نے اپنی جیب تھپتھپائی اس کے ساتھ ہی میرے حلق میں شیرنی گھلنے لگی۔

میری گاڑی اپنے گھر کے گیٹ پر پہنچی تو مجھے احساس ہوا کہ آج مجھے ضرورت سے زیادہ ہی دیر ہو گئی ہے۔ میں نے گاڑی کا ہارن بجایا۔ تقریباً چار بار ہارن بجانے کے بعد میرے واحد نوکر نے گیٹ کھولا۔ سخت سردی کے باعث وہ بری طرح کپکپا رہا تھا۔ میں نے اس کی سستی پر اسے سرزنش کرنا چاہا لیکن پھر اس پر لعنت بھیج کر میں سیدھا اندر گھستا چلا گیا۔

گھر کی اندرونی فضا ہیٹروں کی وجہ سے بے حد فرحت بخش حرارت سے لبریز ہو رہی تھی۔ مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی میں نے نوکر کو کہا کہ وہ کھانا گرم کر کے میز پر رکھ دے۔ بجائے میرے حکم کی تعمیل کرنے کے وہ سر جھکا کر میرے روبرو آ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر تناؤ کے آثار دیکھ کر میرا دل

بری طرح دھڑک اٹھا۔ میں نے بے قرار لہجے میں کہا۔

'کیا بات ہے فیضو؟ تم کچھ پریشان ہو؟'

'وہ۔۔۔۔ وہ صاحب جی۔۔۔۔ قاسم بابو کی طبیعت سخت خراب ہے۔ بیگم صاحبہ اسے بڑے اسپتال لے گئی ہیں'

'کیا کہہ رہے ہو فیضو؟' میں نے چیختے ہوئے کہا۔ 'کیا ہوا میرے بیٹے کو؟ جلدی سے بتاؤ' مجھے محسوس ہوا کہ میرا سانس سینے میں گھٹ رہا ہے۔

'آج دوپہر سے ہی بیگم صاحبہ کی طبیعت خراب تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھیں۔ میں گھر کے کام کاج میں لگا ہوا تھا۔ جانے کس وقت قاسم بابو آنکھ بچا کر چھت پر چلا گیا۔ خدا جانے وہ کتنی دیر تک بارش میں بھیگتا رہا۔ مجھے تو اس وقت معلوم ہوا جب وہ نیچے آیا۔ وہ سردی کے مارے بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ سردی کی شدت سے نیلے ہو رہے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ میں نے جلدی سے جا کر بیگم صاحبہ کو جگا دیا۔ قاسم بابو کی حالت دیکھ کر وہ بھی بری طرح حواس باختہ ہو گئیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے قاسم بابو تیز بخار میں پھنکنے لگا۔ بیگم صاحبہ نے فون پر آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن پتہ چلا کہ گھر کا فون خراب ہے۔ میں قاسم بابو کو اسپتال لے جانے کے لیے کوئی سواری تلاش کرتا رہا لیکن بارش کی وجہ سے سڑکیں خالی پڑی تھیں۔ بڑی مشکل سے ایک راہ چلتے کار والے کی منت سماجت کر کے میں نے قاسم بابو اور بیگم صاحبہ کو بڑے اسپتال بھجوایا ہے۔ اس بات کو کئی گھنٹے گزر چکے ہیں۔ خدا جانے اب قاسم بابو کی کیسی طبیعت ہوگی۔'

'اف میرے خدا یہ کیا ہو گیا؟' میں نے اپنے سر کو پکڑتے ہوئے کہا۔ بارش کے برفیلے پانی میں بھیگنے کے تصور سے ہی مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ اس ننھی سی جان پر کیا قیامت گزر گئی ہوگی؟ میں جلدی سے اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ میں نے گاڑی کے اگنیشن میں چابی گھمائی تو اس نے اسٹارٹ ہونے سے انکار کر دیا۔ جونہی میں چابی گھماتا' وہ محض کھڑ کھڑا کر خاموش ہو جاتی۔ میں آدھ گھنٹے تک اس کے ساتھ سر کھپاتا رہا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اپنی بے بسی پر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں اس پر لعنت بھیج کر سڑک پر آ گیا۔

سرد ترین بارش زدہ رات کے سناٹے میں مجھے سڑک پر دور دور تک کسی ذی روح کی شکل نظر نہ آئی۔ میں بارش میں بھیگتا ادھر سے ادھر چکر لگاتا رہا لیکن مجھے کوئی دوسری سواری نہ ملی۔ مجبوراً میں واپس اپنے گھر کی طرف لوٹا۔ اس زمانے میں میرے گھر کے آس پاس چند ہی گھر آباد تھے۔ اور ان میں سے بھی صرف ایک ہی گھر میں ایک گاڑی تھی۔ اپنی رعونت اور غرور کے باعث میں نے اپنے پڑوسیوں کو کبھی منہ لگانے کی کوشش نہ کی تھی لیکن اس روز مجھے مجبوراً اس گھر کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ ان لوگوں نے بڑی خندہ پیشانی سے میری بات سنی لیکن مجھے معلوم ہوا کہ یہاں بھی قسمت مجھے سزا چکھانے پر تلی ہوئی ہے۔ ان لوگوں کی گاڑی بھی دو دن سے خراب تھی اور مکینک کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں مکافات عمل کے گرداب میں بری طرح گھرتا جا رہا ہوں۔ میری پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے

میرے پڑوسی کے نوجوان بیٹے نے پیشکش کی کہ وہ میری گاڑی کی خرابی دور کرنے کی کوشش کر سکتا ہے؟ کیونکہ اسے گاڑی کے انجن کے بارے میں کچھ سدھ بدھ حاصل تھی۔ میں بھلا اس پیشکش کو کیسے ٹھکراتا؟

وہ نوجوان بارش میں بھیگتا ہوا میرے ہمراہ میرے گھر آیا۔ وہ خاصی دیر تک میری گاڑی کے ساتھ لگا رہا۔ آخر کار کسی نہ کسی طرح وہ گاڑی کر اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے شکریے کے ساتھ اسے رخصت کرنا چاہا لیکن اس نے اصرار کیا کہ وہ میرے ساتھ اسپتال چلے گا۔ ان لوگوں کے پر خلوص رویے اور اپنے متکبرانہ سلوک کا موازنہ کر کے مجھے شدید ندامت کا احساس ہوا۔ اسپتال جاتے ہوئے راستے میں گاڑی اسی نے ڈرائیو کی اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ ہوسکتا ہے بدحواسی کے عالم میں' مجھ سے گاڑی بے قابو ہو کر ادھر ادھر ٹکرا جاتی۔

اسپتال پہنچنے کے بعد میں بدحواسی کے عالم میں اندر داخل ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ میرا بیٹا انتہائی نگہداشت وارڈ میں ہے۔ مجھے اپنی بیوی سامنے ہی نظر آ گئی۔ رو رو کر اس نے اپنی آنکھیں سجالی تھیں۔

مجھے دیکھتے ہی وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے اس قابل کیا کہ وہ مجھے کچھ بتا سکے۔ اس نے سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان مجھے بتایا کہ قاسم کو اسپتال لاتے ہوئے راستے میں جھٹکوں کا زبردست دورہ پڑا تھا۔ اسپتال والوں نے فوراً اسے آئی سی یو میں ایڈمٹ کر لیا۔ ڈاکٹروں نے بتایا ہے کہ اسے ڈبل نمونیا ہوگیا ہے۔ اس کا علاج جاری ہے لیکن اس کی حالت ابھی تک خطرے سے باہر نہیں ہے۔ 'یہ لوگ مجھے میرے بچے کو دیکھنے نہیں دیتے رضا محمد خان۔ انہیں سمجھاؤ کہ میں اپنے بچے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔' میری بیوی نے بلکتے ہوئے کہا۔

میں اسے تسلی دے کر ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ وہ ڈاکٹر بھی حسب توقع میرا آشنا نکلا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرے بیٹے کی حالت ابھی تک تسلی بخش نہیں ہے۔

'اگر بات صرف نمونیئے کی ہوتی تو اتنا خطرہ نہیں تھا لیکن جھٹکوں کے دورے کی وجہ سے اس کی زندگی کو شدید خطرہ لاحق ہے۔ کسی بھی وقت اسے یہ دورہ دوبارہ پڑ سکتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس کے دماغی خلیے نہ نقصان زدہ ہو گئے ہوں۔' اس نے مجھے جو کچھ بتایا وہ مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اگر میرے بیٹے کو مزید کوئی دورہ پڑا تو وہ جان لیوا بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ اچانک میرے کانوں میں کسی کی لرزتی ہوئی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز گونجی۔

'مجھ پر رحم کھائیں ڈاکٹر صاحب۔۔۔۔ خدا آپ کے بال بچوں کو۔۔۔۔' اسی لمحے میرے کانوں میں ایک اور رعونت اور تکبر میں ڈوبی ہوئی آواز گونجی۔

'تمھارا بچہ زندہ رہے یا مر جائے۔ میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ارے بھائی اگر گھوڑا گھاس سے۔۔۔۔' اچانک ڈاکٹر نے مجھے میرے خیالات کی دنیا سے باہر آنے پر مجبور کر دیا۔ وہ متفکر لہجے میں کہہ رہا تھا۔

'اس سخت سردی اور بارش نے قیامت ڈھا رکھی ہے' رضا صاحب۔ ان چند دنوں میں نمونیے کے بے شمار کیس آچکے ہیں' خاص طور پر بچوں پر تو نمونیے نے دھاوا بول رکھا ہے۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے ایک

غریب مزدور قسم کا شخص اپنے بچے کو لے کر آیا تھا۔ اس بچے کو بھی بارش میں بھیگنے کے باعث ڈبل نمونیا ہو گیا تھا۔' مجھے یک لخت احساس ہوا کہ میرے وجود میں برف کے تیز دھار خنجر پیوست ہو رہے ہیں۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

'پھر اس بچے کا کیا بنا؟'

'وہ بچہ اس وقت ہمارے پاس پہنچا جب معاملہ قابو سے باہر ہو چکا تھا۔ اس بچے کے دونوں پھیپھڑے کام کرنا چھوڑ چکے تھے۔ وہ راستے میں بھی بارش میں بھیگتا رہا تھا۔ ہم نے اسے طبی امداد دی لیکن وہ سنبھل نہ سکا۔'

'اف میرے خدا!' میرے دل میں درد کی شدید ٹیس اٹھی۔ یہ میں نے کیا کر دیا؟! ایک ننھی سی جان کو جان بوجھ کر موت کے حوالے کر دیا۔ میں قاتل ہوں' ہاں میں قاتل ہوں۔ اب میں کس منہ سے اپنے خدا سے اپنے بچے کی زندگی کی بھیک مانگوں؟ کیا فرق ہے میرے بچے اور اس مفلس شخص کے بچے میں! کیا وہ ایک باپ کے جگر کا ٹکڑا نہ تھا؟ کیا وہ اپنی ماں کی آنکھوں کا نور نہ تھا؟ کیا گزری ہوگی ان غریب ماں باپ پر اپنے بیٹے کی اکڑی ہوئی لاش دیکھ کر؟ ان دونوں نے مجھے کیسی کیسی بددعائیں نہ دی ہوں گی؟ شاید وہی بددعائیں سیدھی فلک سے جا ٹکرائی ہیں۔

اس رات ایک طویل عرصے کے بعد پہلی مرتبہ میں نے خدا کے حضور سر جھکایا۔ اپنی تمام تر بد اعمالیوں کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے رب سے رحم کی التجا کی۔ اس سے اپنے بچے کی زندگی کے لیے فریاد کی۔ معلوم نہیں خدا نے میری توبہ قبول کی یا یہ میری بیوی کے نالہ و فریاد کا نتیجہ تھا کہ تین دن بعد بالآخر میرے بیٹے کی حالت بہتر ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ وہ نمونیے کے اثرات سے وہ پوری طرح آزاد ہو گیا۔ ہم اسے اسپتال سے ڈسچارج کرا کے گھر لے آئے۔ ایک بار پھر ہم نے بڑی احتیاط سے اس کی پرورش شروع کر دی۔ بظاہر وہ بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آتا تھا لیکن کچھ ہی عرصے بعد ہمیں احساس ہونے لگا کہ سب کچھ نارمل نہیں ہے۔ ہم نے اس کے کچھ ٹیسٹ کرائے جن کے نتائج سے شبہ پیدا ہوا کہ قاسم کی ذہنی نشوونما کی رفتار بہت سست ہے۔ میں نے اس کے لیے قیمتی سے قیمتی ادویات منگوائیں اور نہایت جاں سوزی سے اس کا ہر ممکن علاج کیا لیکن آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ میری تمام کاوشیں رائیگاں ہیں۔ قاسم کی ذہنی نشوونما تقریباً نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ پوری کوشش کے بعد ہمارے پاس صورت حال سے سمجھوتے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔ لیکن اس کے بعد ہم لوگوں کی زندگی کا رخ یکسر تبدیل ہو کر رہ گیا۔ اب ہمارے گھر میں شاذ و نادر ہی قہقہے گونجا کرتے تھے۔ میری بیوی اپنے بیٹے کے لیے چھپ چھپ کر روتی تھی۔ مجھے اس دولت سے نفرت ہونے لگی تھی جو میرے بیٹے کی صحت واپس نہ لا سکی۔ میں اب بھی کلینک جاتا ہوں لیکن اب میری دلچسپی کا مرکز میرے مریض ہوتے نا کہ ان کی دولت۔ اب میرے کلینک پر آیا ہوا کوئی مریض بغیر علاج کے واپس نہ جاتا خواہ اس کے علاج پر مجھے اپنے پاس سے رقم خرچ کرنا پڑتی۔ یہ سب شاید میں سابقہ طرز عمل کی تلافی کے لیے کرتا تھا لیکن اس ساری تپسیا کا اب کوئی فائدہ نہ تھا وہ جو کہتے ہیں کہ اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیا چگ گئی

کھیت ۔۔۔۔ تو میرا راہ راست پر آنا بہت بعد از وقت تھا۔

وقت گزرتا گیا برس ہا برس بیت گئے۔ قاسم بچپن سے لڑکپن میں داخل ہو گیا لیکن اس کا ذہن وہی تین چار سالہ بچے کا رہا۔ میری بیوی اپنے بچے کی یہ حالت مزید برداشت نہ کر سکی اور وہ ہم دونوں کو چھوڑ کر ابدی سکون کی تلاش میں روانہ ہو گئی۔

میں نے قاسم کو بڑی مشکل سے سنبھالا لیکن اب میرے لیے ممکن نہ رہا کہ میں اسے تنہا چھوڑ سکوں۔ مجبوراً میں نے اپنا کلینک کرائے پر دے دیا۔ میں ڈاکٹر تو اب بھی ہوں لیکن میری تمام تر توجہ کا مرکز میرا بیٹا ہے۔ آج ایک طویل عرصے کے بعد میں نے کسی مریض کا معائنہ کیا ہے۔ ڈاکٹر رضا محمد خان اپنی طویل اور عبرت ناک داستان سنا کر خاموش ہو گیا۔

ہم تینوں گویا سحر کا شکار ہو کر بیٹھے تھے۔ بالآخر صدیقی نے ایک گہری ٹھنڈی سانس بھر کر مہر سکوت توڑ دی۔ 'ہمیں یہ تکلیف دہ داستان سن کر بہت افسوس ہوا ڈاکٹر صاحب۔۔۔۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ آپ کے ہشاش بشاش چہرے کے پیچھے اتنا دکھی انسان چھپا ہوا ہے۔ ہمیں آپ سے پوری ہمدردی ہے۔ خدا آپ کی مشکل آسان کرے۔ واقعی دنیا میں انسان کے لیے اولاد کے دکھ سے بڑھ کر کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی۔ انسان خود پر پڑنے والی تو بڑی سے بڑی تکلیف جھیل سکتا ہے لیکن اولاد کو پہنچنے والی معمولی سی تکلیف بھی برداشت کرنا ماں باپ کے بس سے باہر ہوتا ہے جبکہ آپ تو برس ہا برس سے اتنا بڑا زخم اپنے سینے میں لیے زندہ ہیں۔'

صدیقی نے جذبات سے بوجھل آواز میں اپنی دلی کیفیت کا اظہار کیا۔ میں نے اور مرزا نے اثبات سے سر ہلا کر اس کی تائید کی۔ میں نے محسوس کیا کہ اب ہمارے درمیان تناؤ کی کیفیت باقی نہیں رہی بلکہ ایک طرح کا یگانگی کا جذبہ ہمارے درمیان فروغ پا رہا ہے۔

'آپ لوگ اگر سونا چاہیں تو میں آپ کے لیے یہیں بستر لگا دیتا ہوں۔' ڈاکٹر رضا نے پیش کش کی۔

'ارے نہیں ڈاکٹر صاحب اب تو صبح ہونے ہی والی ہے۔ اب سونے کا ٹائم کہاں رہا۔ البتہ اگر آپ سونا چاہیں تو ہماری طرف سے پوری اجازت ہے۔' صدیقی نے نرم لہجے میں کہا۔

'ارے نہیں بھائی۔ میں خود ایک طویل عرصے سے کسی سے کھل کر بات کرنے کو ترس رہا ہوں۔ قسمت نے آپ لوگوں کو میرا مہمان بنا ہی دیا ہے تو پھر میں اس قیمتی وقت کو سو کر نہیں گنواؤں گا۔ آپ لوگوں کے روانہ ہونے کے بعد خدا جانے کب مجھے کوئی بات کرنے والا نصیب ہوگا۔ میں تو ایک طرح سے گوشہ نشینی کی حالت میں ہوں اپنے نوکر کو رخصت کرنے کے بعد تو میرے پاس قاسم کے علاوہ کوئی بھی نہیں رہ گیا۔ جس سے میں اپنے دل کی بات کر سکوں۔' ڈاکٹر رضا نے پرخلوص لہجے میں کہا۔

عین اسی وقت کسی قریبی مسجد سے اذان سحر کی مقدس صدا فضا میں گونجنے لگی۔ اذان مکمل ہوتے ہی ڈاکٹر رضا کسمسا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ 'میرا خیال ہے کہ میرا بیٹا قاسم بیدار ہو چکا ہوگا۔ وہ ہر روز اسی وقت بیدار ہوتا ہے۔ مجھے اپنے کمرے میں نہ پا کر وہ پریشان ہو جائے گا۔'

صدیقی نے مشورہ طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کہ میں ردعمل کا اظہار کرتا' دفعتاً فضا میں ایک بھاری آواز گونجی۔ 'پاپا۔۔۔۔ پاپا۔۔۔۔ آپ کہاں ہیں پاپا؟' وہ بظاہر ایک نوجوان کی آواز تھی لیکن اس کے لہجے میں بچوں کی سی معصومیت واضح طور پر عیاں تھی۔

'اللہ پڑھنے کا وقت ہو گیا ہے آپ کہاں ہیں؟' ڈاکٹر رضا نے بے تاب نظروں سے لاؤنج کی طرف دیکھا۔ 'پاپا۔۔۔ پاپا' اس بار وہ آواز روہانسی ہو گئی۔

میں ڈاکٹر رضا کو کہنے ہی والا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے پاس چلا جائے لیکن اس سے قبل ہی وہ پکار اٹھا 'میں یہاں ہوں قاسم بیٹے! ڈرائنگ روم میں! تم پریشان نہ ہونا۔'

'آہا جی آپ ڈرائنگ روم میں ہیں۔' قاسم نے مسرور لہجے میں کہا۔ 'آپ وہیں ٹھہریں پاپا میں ابھی آتا ہوں۔'

'ڈاکٹر رضا نے شاید اسے منع کرنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

صدیقی اور میں خاصی دیر پہلے ہی اپنے ہتھیار چھپا چکے تھے۔ مرزا کے شانے کے ڈریسنگ کے بعد اسے ایک بار پھر صدیقی کا کوٹ پہنا دیا گیا تھا۔

میں نے لاؤنج میں کسی کے قدموں کی آواز سنی۔ پھر ایک دبلا پتلا دراز قامت نوجوان ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس کے گورے چٹے دلکش چہرے کا سنہری رواں ہلکی ہلکی بھوری داڑھی مونچھوں میں بدل رہا تھا البتہ اس کے چہرے پر چھائی بے پناہ معصومیت اسے چند سالہ بچہ ثابت کر رہی تھی۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا کرتا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ سب سے پہلے اس کی نظر اپنے باپ پر پڑی۔ وہ بے تکلفی سے اس کی جانب بڑھا۔

'ارے پاپا آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟' عین اسی وقت اس کی نگاہ ہم تینوں پر پڑی۔ اس کے چہرے پر بچگانہ حیرت اور مسرت کے ملے جلے تاثرات نمودار ہوئے۔

'پاپا۔۔۔۔ پاپا یہ کون لوگ ہیں؟' اس نے معصومانہ لہجے میں سوال کیا۔

'بیٹا یہ ہمارے مہمان ہیں۔ انہیں سلام کرو۔'

'السلام علیکم۔' قاسم نے بچوں کی طرح پیشانی پر ہاتھ رکھ کر ہمیں سلام کیا اور پھر باری باری ہم تینوں سے ہاتھ ملایا۔ 'آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔' اس نے جملہ اتنے بھول پن سے کہا کہ مجھے بے اختیار اس پر پیار آ گیا۔

'مجھے بھی تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی قاسم بھائی۔'

اس کے چہرے پر پہلے حیرت اور پھر شدید مسرت کے تاثرات ابھرے۔

'پاپا۔۔۔۔ پاپا یہ مجھے بھائی کہتے ہیں!'

'ہاں بیٹا یہ تمہارے بڑے بھائی ہیں۔' ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

'آہا جی یہ میرے بھائی جان ہیں۔' قاسم نے مسرور لہجے میں کہا۔ پھر وہ اسی صوفے پر بیٹھ گیا جس پر میں بیٹھا ہوا تھا۔

'آپ کا نام کیا ہے بھائی جان؟' اس نے معصومانہ لہجے میں کہا۔
'میرا نام۔۔۔ذوالفقار علی ہے قاسم بھائی۔'
'آپ کا نام بہت اچھا ہے۔۔۔آپ کو معلوم ہے میرا نام کیا ہے؟'
'نہیں بھائی' بھلا مجھے کیسے معلوم ہوگا؟' میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر کہا۔
'میرا نام قاسم رضا خان ہے۔۔۔اچھا ہے نا میرا نام؟'
'بہت اچھا ہے' جس طرح تم خود بہت اچھے ہو' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
'ہاں میں بہت اچھا بچہ ہوں۔آپ مجھ سے دوستی کریں گے نا؟ ارے میں تو بھول ہی گیا۔آپ تو بھائی جان ہیں۔آپ سے میں کیسے دوستی کر سکتا ہوں' قاسم نے اپنی سمجھ کے مطابق بے حد عقل مندی کی بات کی۔
'کیوں بھئی تم بھائی صاحب سے دوستی کیوں نہیں کر سکتے؟ بس آج سے ہم پکے دوست ہیں۔'
'اچھا یہ بات ہے تو پھر ملائیں ہاتھ۔' قاسم نے پرجوش لہجے میں کہا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا۔اس کے جسم میں نوجوانی کی ابلتی' جوش مارتی طاقت تھی لیکن اس کا ذہن چند سالہ بچے کی سوچ رکھتا تھا۔مجھے اس پر بے پناہ پیار اور ترس آنے لگا۔چند ہی دن پہلے سردار خضر خان نے مجھے اپنا چھوٹا بھائی بنایا اب یہ نوجوان مجھے اپنا بڑا بھائی بنا رہا ہے۔کیا اس طرح میرا مالک سچا میری محرومیوں کی تلافی کر رہا ہے؟'
اسی وقت قاسم کی توجہ صدیقی اور مرزا کے مسکراتے چہروں کی طرف مبذول ہوگئی۔
'بھائی جان یہ دونوں صاحب کون ہیں؟'
'بیٹا یہ آپ کے انکل ہیں۔' ڈاکٹر رضا نے صدیقی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا پھر اس نے مرزا کا تعارف کرانا چاہا۔'اور یہ۔۔۔۔۔'
'بس بس میں سمجھ گیا یہ کون ہیں۔۔۔۔یہ میرے دادا ابو ہیں! ہیں نا پاپا؟'
'ہاں بیٹا یہ آپ کے دادا ابو ہیں۔' ڈاکٹر رضا نے درد میں ڈوبی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
'آہا جی اب تو میرے بھائی جان بھی آ گئے' انکل بھی آ گئے' دادا ابو بھی آ گئے۔اب میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔' قاسم نے مسرور لہجے میں میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔
'ہاں بیٹا اب ہم کہیں نہیں جائیں گے۔اب ہم تمہارے پاس ہی رہیں گے۔' صدیقی نے اپنے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔اس کی بات سن کر قاسم خوشی سے جھوم اٹھا۔
اچانک لاؤنج میں سے اطلاعی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔یہ آواز سن کر صدیقی' مرزا اور میرے درمیان استفہامیہ نظروں کا تبادلہ ہوا لیکن ڈاکٹر مرزا کے چہرے پر ذرا بھی حیرت کے تاثرات نظر نہ آئے۔اس نے قاسم کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔
'جاؤ بیٹا۔دودھ والے سے دودھ لے لو اور ہاں اس سے کہنا کہ آج ایک سیر دودھ فالتو دے جائے ہمارے گھر مہمان آئے ہیں۔' ڈاکٹر رضا کے منہ سے نکلنے والے الفاظ سن کر ہم تینوں کے تنے

ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔
قاسم اپنے باپ کی ہدایت سن کر سعادت مند بچے کی طرح اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔'اچھا بھائی جان میں ابھی دودھ لے کر آتا ہوں۔آپ کہیں جائیے گا نہیں۔'
اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر رضا نے متفکر لہجے میں کہا۔'مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ آپ لوگوں سے بہت زیادہ مانوس نہ ہو جائے۔آپ لوگ چلے جائیں گے تو یہ آپ کی غیر موجودگی کو بہت بری طرح محسوس کرے گا۔'
'آپ فکر نہ کریں۔میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے بھائی جان کی بات ضرور سمجھ جائے گا۔' میں نے اسے تسلی دی۔ میں نے اس کے چہرے پر عجیب وغریب تاثرات دیکھے۔اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔
'ممکن ہے یہ بات آپ کو عجیب وغریب لگے مگر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں۔'
'آپ کھل کر کہیں ڈاکٹر صاحب آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟' صدیقی نے کہا۔
'میں آپ لوگوں سے درخواست کرنا چاہتا تھا کہ۔۔۔کیا آپ لوگ ایک آدھ دن مزید یہاں ٹھہر سکتے ہیں؟' صدیقی نے حیرانی کے عالم میں میری طرف دیکھا۔حتیٰ کہ مرزا بھی ہلکی ہلکی غنودگی کی کیفیت سے چونک پڑا۔
'کیا کہا آپ نے؟' اس نے حیرانی سے پوچھا۔
'دراصل میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ مزید ایک دو دن ہمارے ساتھ ٹھہریں۔یقین کریں میں نے آج تک اپنے بیٹے کو اتنا خوش وخرم نہیں دیکھا۔آپ لوگوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر گلاب کھل اٹھے ہیں۔'
صدیقی نے ایک نظر مرزا اور میری طرف دیکھا پھر قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا۔'اس معاملے میں فی الحال کوئی حتمی وعدہ نہیں کر سکتے۔صبح کا سورج طلوع ہونے دیں۔ہم تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد آپ کو اپنے پروگرام کے متعلق بتا سکیں گے۔'
'جیسے آپ کی مرضی۔ویسے بھی آپ لوگوں کے اپنے مسائل ہیں۔پھر بھی جتنا وقت ہمارے ساتھ گزاریں' ہمارے لیے خوشی کا باعث ہوگا۔'
اسی وقت قاسم ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔'پاپا میں نے دودھ کچن میں رکھ دیا ہے۔آپ ناشتا تیار کر لیں۔' کمرے میں قاسم کی پرجوش آواز گونجی۔'آج میں آپ کے ساتھ ناشتا تیار نہیں کراؤں گا۔مجھے بھائی جان سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔' اس نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے بچوں کے مانند لاڈ میں میری گردن میں اپنی بانہیں حمائل کر دیں۔
ڈاکٹر رضا مسکراتا ہوا کچن کی طرف روانہ ہوگیا۔اسے جاتے دیکھ کر میرے وجود میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔میرے دل میں خیال آیا کہ میں ایک بار پھر اس کے ساتھ جاؤں' اس کی نگرانی کروں۔مجھے پہلے بھی ایک ڈاکٹر کا بے حد دہشت ناک تجربہ ہے۔خان رفاقت علی بھی تو ایک ڈاکٹر کہلاتا

تھا۔ اس نے میرا ایسا علاج کیا تھا کہ میری زندگی آگ کی نذر ہوتے ہوتے بچی تھی۔ ایسا نہ ہو کہ یہ بھی کوئی داؤ کھیل جائے۔ اس بار تو میرے ہمراہ یہ دونوں شریف آدمی بھی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میری بدبختی کا سایہ ان پر بھی پڑ جائے۔ میں نے شدید تذبذب کے عالم میں صدیقی اور مرزا کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں سے تھکن عیاں تھی تاہم وہ مجھے پوری طرح مطمئن نظر آئے۔

کیا یہ دونوں گھاگ افراد ڈاکٹر رضا کی جانب سے پوری طرح مطمئن ہو چکے ہیں؟ کیا انہیں اب اس کی طرف سے کسی خطرے کا اندیشہ نہیں ہے؟ کہیں ہم لوگ خون آشام دلدل پر جمی کائی کو سرسبز سیرگاہ سمجھنے کی حماقت تو نہیں کر رہے ہیں؟ میں خواہش کے باوجود اپنی جگہ سے نہ اٹھ سکا۔ جو ہونی ہے وہ تو ہو کر رہتی ہے۔

'بھائی جان آپ میرے ساتھ کھیلیں گے نا؟ میں پاپا کے ساتھ روزانہ کرکٹ کھیلتا ہوں۔ اب میں آپ کے ساتھ کھیلوں گا۔'

'ہاں قاسم بھائی ہم دونوں مل کر خوب کھیلیں گے۔ تم اور کون کون سے کھیل کھیلتے ہو؟'

'پاپا نے مجھے کئی کھیل سکھائے ہیں لیکن مجھے بس کرکٹ پسند ہے۔ آپ کو پتا ہے میں بڑا ہو کر عمران خان بنوں گا۔' قاسم نے مسرور لہجے میں مجھے بتایا۔ میں نے اس پونے چھ فٹ لمبے بچے پر حسرت بھری نظر ڈالی۔

'ہاں قاسم بھائی انشاء اللہ تم ضرور عمران خان بنو گے' تم ضرور ایک دن فخر پاکستان بنو گے۔' مجھے اپنے دل میں درد کی تیز ٹیس اٹھتی محسوس ہوئی۔ میرے پاک پروردگار اس کی حالت پر رحم کر۔ تیری رحمت اور قدرت کے لیے یہ کون سا مشکل امر ہے۔

دفعتاً میری توجہ صدیقی کی طرف مبذول ہو گئی۔ وہ آنکھ کے اشارے سے مجھے اپنے پاس آنے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے قاسم کو کہا۔' قاسم بھائی اب تم جاؤ اور پاپا کے ساتھ مل کر ناشتا تیار کراؤ۔ وہ اتنا سارا کام تنہا کیسے کریں گے؟'

'ارے یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ اچھا میں ابھی جاتا ہوں لیکن آپ جایئے گا نہیں ورنہ میں بہت روؤں گا۔'

'ارے قاسم بھائی میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ تم بے فکر ہو کر کچن میں جاؤ۔' اس نے نہایت معصومیت سے میری بات کا اعتبار کر لیا۔ قاسم کے جانے کے بعد میں صدیقی کے پاس جا بیٹھا۔

'جی صدیقی صاحب آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟'

'ہاں بھائی کل رات ایسی آفت پڑی کہ ساری تیاریاں درہم برہم ہو کر رہ گئیں۔ اسلام آباد میں موجود ہمارے سربرآوردہ افراد کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہو گی کہ ہم اپنی جان بچانے کے لیے کونے کھدروں میں چھپتے پھر رہے ہیں۔ خدانخواستہ اگر ہم سردار شاہ مراد کے کارندوں کے ہاتھوں مارے گئے تو کسی کو علم بھی نہ ہو سکے گا کہ ہمارا انجام کیا ہوا۔'

'پھر آپ کیا چاہتے ہیں صدیقی صاحب؟'

'میں چاہتا ہوں کہ اسلام آباد فون کر کے اپنے اعلیٰ افسران کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کر دیا جائے۔ میں اس سلسلے میں تمھاری رائے جاننا چاہتا ہوں۔'

'میرے خیال میں اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ فون تو آپ کے پاس رکھا ہی ہے۔ تو پھر دیر کس بات کی؟ کیجیے بسم اللہ؟'

'تم خیال رکھو کہ ڈاکٹر رضا نہ اس طرف نکل آئے۔'

'ٹھیک ہے۔' میں نے کہا اور اس انداز میں بیٹھ گیا کہ اگر ڈاکٹر رضا اس طرف آتا تو وہ مجھے دور سے ہی نظر آ جاتا۔

صدیقی خاصی دیر تک ٹیلی فون کے ساتھ مصروف رہا لیکن وہ اسلام آباد کا نمبر ملانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے چہرے پر گہری مایوسی کے تاثرات ابھر آئے۔' اس ٹیلی فون سے براہ راست اسلام آباد کال کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ فون شاید نان ایس ٹی ڈی ہے۔'

'پھر اب آپ کیسے اسلام آباد رابطہ قائم کریں گے؟'

'اب تو یہی ممکن ہے کہ میں ٹیلی فون ایکسچینج کے آپریٹر کو اسلام آباد کا نمبر دے کر ٹرنک کال بک کراؤں۔'

'میں آپ کو ایسا مشورہ نہیں دوں گا۔ اب تو آپ کو اندازہ ہونا چاہیے کہ ہم کس قدر خطرناک حالات میں گھرے ہوئے ہیں۔' سردار شاہ مراد کا اثر و رسوخ اس پورے علاقے میں دیمک کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ اس جیسے مکار شخص سے آپ کیسے توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ اس پہلو کو نظر انداز کر دے گا؟ اس نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہو گا کہ وہ ہمیں قتل کر کے ہماری لاشوں کا نام و نشان تک مٹا دیں۔ جب اس تک خبر پہنچی ہو گی کہ ہم لوگ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں' تو اس نے ایک آفت برپا کر دی ہو گی۔ ہماری زندگی اس کے لیے موت کے مترادف ہے۔ اسے اس اندیشے نے پریشان کر رکھا ہو گا کہ کہیں ہم اپنے ہیڈ کوارٹر اطلاع نہ بھیج دیں کہ سردار شاہ مراد کھلم کھلا حکومتی اداروں سے تصادم پر اتر آیا ہے۔ وہ ہمیں ختم تو کرانا چاہتا ہے لیکن نہایت خاموشی سے۔ اس طرح کہ اس سلسلے میں براہ راست اس کا نام ملوث نہ ہو۔ اس پر شک تو بے شک کیا جائے لیکن کوئی الزام اس پر ثابت نہ کیا جا سکے۔ اسے یہ بھی اندازہ ہو گا کہ ہم پہلی فرصت میں اسلام آباد اطلاع بھجوانا چاہیں گے۔ اور اس معاملے میں یقینی طور پر ٹیلی فون کا سہارا لیں گے۔ کال بک کرانے کا مطلب سیدھا سادھا یہ ہے کہ ہم اپنی گردن سردار شاہ مراد کے لگائے ہوئے پھندے میں دے رہے ہیں۔ کال بک کرانے کی صورت میں ہمیں اپنا فون نمبر دینا پڑے گا۔ وہ کسی ایسی ہی کال کے منتظر ہوں گے۔ اس چھوٹے سے شہر میں فون نمبر کے ذریعے گھر کا پتا لگانے میں چند منٹ بھی نہیں لگیں گے۔ اگلے چند منٹ میں ہمارے دشمن پھنکاریں مارتے ہوئے ہمارے سروں پر پہنچ جائیں گے۔' میں نے اپنے ذہن میں کلبلاتے اندیشوں کو ایک ساتھ اپنے منہ سے اگل دیا۔

میری باتیں سن کر صدیقی اور مرزا کی آنکھیں فرط حیرت اور دہشت سے پھیلتی چلی گئیں۔ وہ چند

لمحوں تک سناٹے کی کیفیت میں مبتلا رہے پھر صدیقی نے ایک گہری سانس بھر کر کہا۔

'تم حیرت انگیز طور پر ایک بار پھر ہمیں ایک بہت بڑی حماقت سے باز رکھنے میں کامیاب رہے ہو۔ میں واقعی یہ حقیقت فراموش کر چکا تھا کہ ہم کراچی' لاہور یا اسلام آباد جیسے جدید اور بین الاقوامی شہر میں موجود نہیں ہیں جہاں لاکھوں فون نمبروں میں سے کسی مخصوص فون نمبر کو ٹریس کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ اس چھوٹے سے شہر میں تو کسی فون کی جائے وقوع تلاش کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس پورے شہر میں ایک ہی ٹیلی فون ایکسچینج ہوگا جو کہ بمشکل چند ہزار لائنوں پر مشتمل ہوگا۔ ایسی صورت میں تو یہاں سے اسلام آباد براہ راست کال کرنا بھی خطرناک ہوگا۔ وہ لوگ ٹیلی فون ایکسچینج والوں کی ملی بھگت سے شاید اس صورت میں بھی ہمارا پتا لگانے میں کامیاب ہو جائیں۔'

'براہ راست اسلام آباد کال کرنے کا خطرناک ہونا نہ ہونا تو بعد کی بات ہے' مجھے تو یہاں تک یقین ہے کہ فی الحال کسی بھی فون کے ذریعے براہ راست اسلام آباد کال کرنا ممکن نہیں ہے۔'

'میں تمھاری بات کو پوری طرح سمجھ نہیں سکا۔ تمھارا مطلب ہے کہ اگر ہمارے پاس ایس ٹی ڈی یعنی ڈائریکٹ ڈائیلنگ والا فون ہو تب بھی ہم اسلام آباد فون نہیں کر سکتے؟' صدیقی نے بے یقینی کے عالم میں میرا منہ تکتے ہوئے کہا۔ 'لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'

'ہو نہیں سکتا بلکہ یہ ہو چکا ہے۔ پہلے میرے دماغ میں صرف شک تھا لیکن آپ کے اسلام آباد کا نمبر ملانے میں ناکام ہونے کے بعد مجھے یقین ہو چکا ہے کہ اب ہمارے لیے فون پر اسلام آباد رابطہ قائم کرنا ممکن نہیں رہا ہے۔'

'کیوں ممکن نہیں رہا ہے بھائی؟ صاف صاف بتاؤ۔' مرزا نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

'بات گھوم پھر کر پھر وہیں آ جاتی ہے۔ کم از کم اس شہر میں قانون اور حکومت سردار شاہ مراد کے ہاتھوں بے بس ہیں۔ ہمارے بچ نکلنے کی اطلاع ملتے ہی سردار شاہ مراد نے ایک اشارہ کیا ہوگا اس کے ساتھ ہی ڈیرہ غازیخان اور اسلام آباد کے درمیان ٹیلی فون کا براہ راست رابطہ منقطع ہو گیا۔ فنی خرابیاں تو ہوا ہی کرتی ہیں نا؟ جسے اسلام آباد بہت ضروری کال کرنی ہو وہ ایکسچینج سے رابطہ کر کے کال بک کرا لے۔ جب صدیقی صاحب نے اسلام آباد رابطہ قائم کرنا چاہا تو میرے ذہن میں یہ شک موجود تھا لیکن میں نے قبل از وقت اپنے اندیشے کا اظہار نہیں کیا۔ پھر جلد ہی میرے شبے کی تصدیق ہو گئی۔ اب آپ کسی بھی فون پر کوشش کر لیں نتیجہ یہی نکلے گا۔'

'اف میرے خدا!۔۔۔ تمھارے ذہن میں کون سا کمپیوٹر نصب ہے بھائی؟ تم اتنی دور دور کی باتیں کیسے سوچ لیتے ہو؟ اتنی کم عمری میں تم نے یہ سو سالہ تجربہ کیسے حاصل کر لیا؟' صدیقی نے پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میں ان کے سوالات کے جواب میں مسکرانے کے علاوہ بھلا کیا کہتا؟

صدیقی کے برعکس مرزا خاموشی سے بغور میرے چہرے کا جائزہ لیتا رہا پھر اس نے دھیمے لہجے میں

کہا' ہم لوگوں نے جان بوجھ کر تم سے تمھاری ذات کے متعلق زیادہ کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی لیکن اب میرا دل چاہت ہے کہ تمھاری شخصیت کے ہر گوشے کو کھنگال ڈالوں۔ تمھارے پراسرار ہیولے پر پڑی ہوئی تمام پرتیں اتار ڈالوں۔ اب تو یہ ثابت ہو ہی چکا ہے کہ تم جتنے زمین کے اوپر نظر آتے ہو اس سے کئی گنا زمین کے نیچے ہو۔'

یہ سب آپ کی ذرہ نوازی ہے مرزا صاحب' ورنہ میں کیا اور میری اوقات کیا۔ البتہ مجھے آپ جیسے ماہرین فن کی صحبت حاصل رہی تو میں یقیناً کچھ نہ کچھ سیکھنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔' میں نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

'اچھا میاں تمھاری یہی مرضی ہے کہ تم اپنے آپ کو چھپائے رکھو تو ایسے ہی سہی۔ کبھی نہ کبھی تو بتاؤ گے ہی یار زندہ صحبت باقی۔ فی الحال تو تم یہ بتاؤ کہ اب ہمیں کرنا کیا چاہیے اب تو مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ ہم دونوں پچاس ساٹھ سال کے بڈھے تمھارے مقابلے میں طفل مکتب ہیں۔' صدیقی نے مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ مجھے اس کے لہجے پر ہنسی آنے لگی۔

'اب مجھے مزید شرمندہ نہ کریں صدیقی صاحب۔۔۔ اصل بات یہ ہے کہ مجھے شاہ مراد کی طاقت' اس کی مکاری' اس کے زہر اور اس کے پینتروں کا کچھ ذاتی تجربہ ہے۔ وہ اپنے شکار کو اس طرح گھیرتا ہے کہ اس کے لیے فرار کی کوئی راہ نہیں بچتی۔ اسے صرف ایک راستہ کھلا نظر آتا ہے اور یہ راستہ اسے سیدھا صیاد کے روبرو لے جاتا ہے۔'

'اچھا اب یہ بھی تم ہی بتاؤ کہ اب ہمارے اسلام آباد سے رابطے کی کون سی صورت بچی ہے؟'

'یہ معاملہ ابھی میرے ذہن میں بھی واضح نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی لیں گے۔'

'ایک سوال ہے جو ساری رات سے میرے ذہن میں پھانس کی طرح چبھ رہا ہے۔ اب میں مزید اس کی چبھن برداشت نہیں کر سکتا۔' مرزا نے کسمساتے ہوئے کہا۔

'وہ کون سا سوال ہے بھائی؟ کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔' صدیقی نے حیرانی کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

'اپنے سوال کی وضاحت کرنے سے پہلے میں کل سے اب تک رونما ہونے والے حالات کا جائزہ پیش کرنا چاہوں گا۔ دیکھیں' کل دوپہر کو ہم لوگ دونوں پولیس چوکیوں پر گئے اور وہاں موجود لوگوں کو سردار شاہ مراد کے متعلق خبردار کیا' وہیں سے ہمیں سردار شاہ مراد کے ٹرک کے متعلق معلوم ہوا۔ اس کے بعد ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ اس دوران ہمارا پیچھا کیا گیا۔ ہم اپنے افسران کی ہدایت کے مطابق ڈیرہ غازیخان کے لیے روانہ ہوئے۔ یقینی بات ہے کہ ان لوگوں نے اس بار بھی ہمارا پیچھا کیا۔ البتہ وہ ہم سے دور رہے۔ لہٰذا ہماری تبدیل شدہ صورتوں سے واقف نہ ہو سکے۔ انہوں نے ہماری گاڑی کی روانگی کی سمت سے اور شاید ان حرام خور پولیس والوں کی مدد سے پتا لگا لیا کہ ہم سردار شاہ مراد کی جانب سے مشکوک ہیں اور اب ہماری منزل ڈیرہ غازیخان ہے۔ ہماری نگرانی اور تعاقب کرنے

والوں نے شاید ملتان کی آخری حد تک ہمارا پیچھا کیا اور اس کے بعد اگلی ٹیم کا مرحلہ شروع ہوا۔ اس ٹیم نے مظفر گڑھ سے ہمارا پیچھا شروع کیا۔ وہ ہماری گاڑی کے ماڈل اور ہمارے اصل حلیوں اور شکل و صورت سے آگاہ تھے۔ البتہ انہیں ہماری گاڑی کا نمبر معلوم نہیں تھا۔ اس دوسری ٹیم کو ڈیوٹی سونپی گئی تھی کہ وہ ہمیں کسی مناسب جگہ پر گاڑی سے اتار کر ہمیں زندگی کی سرحد پار کرا کر ہماری لاشیں غائب کرا دیں۔ انہوں نے نہایت مہارت سے ہمیں روک لیا اور ہمیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اس مرحلے پر ہمارے موثر میک اپ اور ذوالفقار بھائی کی برجستہ اور طاقت ور کہانی نے ہماری مدد کی اور ہم ان پیشہ ور قاتلوں کو یقین دلانے میں کامیاب ہوگئے کہ ہم ان کے مطلوبہ افراد نہیں ہیں۔ ہم تینوں ہی اس بات کے گواہ ہیں کہ ہمیں رخصت کرتے ہوئے وہ لوگ پوری طرح مطمئن نظر آرہے تھے۔ انہوں نے ذوالفقار علی کے کہنے کے عین مطابق ہمیں ایک معزز سردار خضر خان کا قابل احترام مہمان تسلیم کرلیا تھا۔ اس کے بعد سردار شاہ مراد کے کارندوں کی تیسری ٹیم نے ہمیں روکا لیکن انہیں پہلے ہی آگاہ کردیا گیا تھا کہ ہم سردار خضر خان کے سسرالی رشتہ دار ہیں لہٰذا ہم سے غیر ضروری روک ٹوک نہ کی جائے۔ اس ٹیم نے ہمیں بہترین خیر سگالی کے جذبات کے ساتھ رخصت کیا۔ آپ دونوں سے میرا سوال یہ ہے کہ اگر وہ لوگ ہماری طرف سے پوری طرح مطمئن تھے تو پھر بمشکل آدھے گھنٹے کے بعد ایسی کون سی قیامت آگئی کہ وہ براہ راست ہمیں قتل کرنے پر تل گئے؟ کیا وہ اتنی جلدی بھول گئے کہ ہم ان کے مطلوبہ افراد نہیں ہیں؟'

مرزا کا سوال سن کر صدیقی کے ساتھ ساتھ میں بھی بری طرح چونک پڑا۔ واقعی اس پہلو پر تو میں نے بھی غور نہیں کیا بلکہ ہم اپنی جان بچانے کی اس قدر سر توڑ کوشش کرتے رہے کہ ہمیں معاملے کے اس پہلو پر توجہ دینے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

'ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ ہماری جیپ سے ملتی جلتی کوئی اور جیپ نہ ڈھونڈ سکے ہوں لہٰذا وہ ہماری جانب سے مشکوک ۔۔۔۔۔' صدیقی نے ایک توجیہہ پیش کرنا چاہی لیکن میں نے مضبوط لہجے میں اس کی بات منقطع کردی۔

'نہیں صدیقی صاحب ان لوگوں کا طرز عمل بتاتا تھا کہ انہیں یقین ہو چکا ہے کہ ہم ہی ان کے مطلوبہ افراد ہیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ انہیں اس حقیقت کا علم کیسے ہوا؟ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم ان کی موجودگی سے فوری طور پر آگاہ نہ ہوجاتے تو وہ ہماری بے خبری کے عالم میں ہمیں مار گراتے۔'

صدیقی نے اپنا سر اثبات میں حرکت دے کر میری دلیل کے وزن کو تسلیم کیا۔ کچھ دیر تک ہم خاموشی سے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ میں بیزار ہو کر بات بدلنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ مجھے وہ بات یاد آگئی جو مسلسل میرے لاشعور میں ہلچل مچا رہی تھی۔ ایک ایسا منظر، ایک ایسی چیز جسے میرا ذہن فراموش کرچکا تھا۔ اسی لمحے صدیقی نے کچھ کہنا چاہا۔

'ٹھہریے صدیقی صاحب۔' میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ 'میرا خیال ہے میں اس اثرات کے حل تک پہنچ گیا ہوں۔ شاید میں پتہ لگانے میں کامیاب ہوگیا ہوں کہ ان لوگوں

کو ہماری اصلیت کے متعلق کیسے علم ہوا۔'

'کہو کہو بھائی ہمارے دماغ تو ٹھس ہو کر رہ گئے ہیں۔ کم از کم تم تو اپنے دماغ سے کام لیتے رہو۔' مرزا نے اپنا دائیاں ہاتھ بڑھا کر میری پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

'کل رات ہماری جیپ پر فائرنگ ہوئی تھی اور میں اس فائرنگ کا جواب دینے کے لیے جیپ کے پچھلے حصے میں گیا تھا تو میں نے وہاں ایک عجیب وغریب چیز دیکھی تھی۔ بعد میں مجھے اس کے متعلق آپ کو بتانا یاد ہی نہ رہا۔'

'وہ ۔۔۔۔۔ وہ کیا چیز تھی بھائی؟' مرزا اور صدیقی نے یک زبان ہو سوال کیا۔

'وہ سیاہ رنگ کی پلاسٹک کی چھوٹی سی ڈبیا نما چیز تھی۔ وہ شاید مقناطیس کے ذریعے جیپ کے پچھلے حصے کے آہنی فرش سے چپکی ہوئی تھی۔ وہ چیز میرے لیے بالکل انجانی تھی۔'

'اف میرے خدا!' صدیقی اور مرزا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ 'پھر تم نے اس ڈبیا کا کیا کیا؟' مرزا نے کھوئے کھوئے لہجے میں سوال کیا۔

'میں کیا کرتا بھائی؟ گولیوں کی بارش نے مجھے مہلت ہی نہ دی کہ میں اس پر توجہ دے سکوں۔ وہ میرے ہاتھ سے پھسلی اور پچھلی سیٹ کے نیچے جا گری۔ پھر مجھے اسے اٹھانے کا موقع ہی نہ مل سکا۔' میں نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

'کیا تمہیں اندازہ ہے کہ وہ ڈبیا کیا چیز تھی؟' مرزا نے سوال کیا۔

'ہاں آپ کے سوال پر غور کرنے کے بعد مجھے اب کچھ کچھ اندازہ ہو چکا ہے کہ وہ کیا چیز تھی اور اس کا کیا کام تھا اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو وہ کوئی ایسا آلہ تھا کہ جس کی مدد سے ہم لوگوں کی آپس کی گفتگو ان لوگوں نے سن لی۔'

'ہاں تم صحیح سمجھے ہو۔ وہ امریکی ساخت کا جدید ترین اور حساس ترین جاسوسی آلہ تھا' جس کی مدد سے ان لوگوں نے ہماری ایک ایک بات بالکل صاف صاف سن لی۔ یہ آلہ بھارتی ایجنسی را نے امریکہ سے براہ راست یا اسرائیلی ایجنسی موساد کے ذریعے حاصل کیا ہوگا۔ را کے ایجنٹوں کے ذریعے سے یہ آلہ سردار شاہ مراد کے کارندوں تک پہنچ گیا۔' صدیقی نے میرے اندازے کی مکمل تائید کی۔ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

'اب میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ یہ آلہ کب اور کیسے ہماری جیپ میں پہنچا ہوگا جب ہمیں پہلی بار روکا گیا تو وہ شخص ہماری اداکاری اور ہماری کہانی سے متاثر ہوگیا اور اس نے ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔ اس نے اپنے سے اوپر والوں کو ہمارے متعلق اطلاع دی ہوگی۔ اس شخص شمروز کے برعکس اس کے حکام بالا ہماری طرف سے پوری طرح مطمئن نہ ہوسکے انہوں نے ایک اور ٹیم کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ ہمیں راستے میں روکے اور کچھ دیر ہمیں باتوں میں لگائے رکھے۔ اس دوران میں نہایت مہارت سے وہ آلہ ہماری جیپ میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں سے بآسانی بچ نکلنے کے بعد ہم بے فکر ہوگئے اور آپس میں سردار شاہ مراد اور اس کے مکروہ کرتوتوں کے بارے میں کھل کر گفتگو کرتے رہے۔ اس دوران میں ملک

کریم اور بھارتی ایجنٹوں کا بھی ذکر آیا۔ یہ گفتگو جوں کی توں ہمارے دشمنوں کے کانوں تک پہنچتی رہی۔ انہیں یہ سمجھنے میں معمولی سی دیر بھی نہ لگی کہ ہم ہی ان کے مطلوبہ' واجب القتل مجرم ہیں۔ دونوں جیپوں میں موجود قاتلوں کے گروہوں کو یا تو پیش بندی کے طور پر ہماری باتیں سننے کے بعد فوری طور پر انہیں ہمارے جسم چھلنی کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوگا۔'

'ایک بار پھر تمہارا تجزیہ سو فیصد درست ہے۔ یقیناً سب کچھ اسی طرح رونما ہوا ہے۔'

عین اس وقت لاؤنج میں قاسم اور ڈاکٹر کے آپس میں باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ قاسم بچگانہ انداز میں ضد کر رہا تھا کہ ناشتے والی ٹرالی وہ دھکیل کر لے جائے گا جبکہ ڈاکٹر رضا اسے منع کر رہا تھا۔ قاسم روہانسا ہونے لگا۔ میں اٹھ کر باہر گیا اور قاسم کو اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ وہ اپنی ضد بھول کر چپ چاپ میرے ساتھ چلا آیا۔

'معاف کیجیے گا ناشتے کی تیاری میں ذرا دیر لگ گئی۔ میں دراصل آپ لوگوں کے لیے گرما گرم پراٹھے تیار کر رہا تھا۔'

'واہ ڈاکٹر صاحب آپ نے تو کمال کر دیا۔' میں نے اسے داد دی۔ 'میں نے آپ جیسا سگھڑ اور سلیقہ شعار ڈاکٹر آج تک نہیں دیکھا۔' میری بات سن کر وہ تینوں ہنس پڑے۔ ان کی دیکھا دیکھی قاسم نے بھی قہقہہ لگایا۔

اس کے قہقہوں میں بچوں کی معصومیت کے ساتھ ساتھ جوانوں کی سی گھن گرج بھی تھی۔ میرے دل میں ایک بار پھر بے اختیار اس کے لیے شدید ہمدردی کا جذبہ ابھرا۔ کاش میں اس کے لیے کچھ کر سکتا۔

ناشتا ہم سب نے اکٹھے کیا۔ اس دوران میں ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی رہیں۔ صدیقی' قاسم کو شادی کے لیے اکساتا رہا جبکہ وہ کچھ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے کے عالم میں شرما کر مسلسل انکار کرتا رہا۔ ڈاکٹر رضا پہلے تو ہمارے ساتھ ہنستا رہا پھر اس کے چہرے اور آنکھوں سے حسرت عیاں ہونے لگی۔ میں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ وہ اپنے نوجوان بیٹے کی حقیقی شادی کے متعلق سوچ رہا ہے۔ میں نے اپنے پیر سے صدیقی کا پیر ہلکے سے دبا دیا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ فوراً ہی وہ میرا مطلب سمجھ گیا اور اس نے نہایت صفائی سے موضوع بدل دیا۔ وہ قاسم سے اس کے پسندیدہ ٹی وی پروگراموں کے متعلق پوچھتا رہا۔ حسب توقع اس کے پسندیدہ پروگراموں میں کارٹون ہی رہے۔ قاسم اگرچہ اپنے ہاتھ سے ناشتہ کرتا رہا تاہم کیتلی سے کپ میں چائے ڈالنے کے لیے اسے ڈاکٹر رضا کی ضرورت پڑتی رہی۔

ناشتے کے بعد ڈاکٹر رضا کسی فرض شناس گھریلو خاتون کی مانند سیدھا باورچی خانے جا گھسا تا کہ برتن وغیرہ دھو سکے۔ جبکہ قاسم لاؤنج میں ٹی وی کھول کر اس کے سامنے جا بیٹھا۔ اس نے اصرار کیا کہ میں بھی اس کے ساتھ ٹی وی دیکھوں لیکن میں نے نہایت نرمی سے اسے سمجھا دیا کہ میرا فی الحال ٹی وی دیکھنے کا موڈ نہیں ہے۔ ان دونوں کے جانے کے بعد ہم نے ایک بار پھر گفتگو شروع کی۔

'میری رائے ہے کہ فی الحال اسلام آباد فون کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ ہمیں اس شہر میں ایک

ٹھکانے کی ضرورت تھی۔ کم از کم عارضی طور پر ہمیں یہ ٹھکانہ میسر آ گیا ہے تو پھر کیوں نہ اپنی مہم کے سلسلے میں کارروائی شروع کی جائے۔'

'لیکن اس کے لیے ہمیں باہر نکلنا پڑے گا اور اس میک اپ کے ساتھ ہم فی الحال باہر نہیں نکل سکتے ہیں۔' صدیقی نے اعتراض کیا۔

'میرا خیال ہے اگر ہم اپنے میک اپ میں کچھ معمولی تبدیلیاں کر لیں اور الگ الگ باہر نکلیں تو ہمیں پہچاننا آسان نہیں رہے گا کیوں مرزا صاحب آپ کی کیا رائے ہے؟'

'تم ویسے تو صحیح کہہ رہے ہو۔ واقعی اسی میک اپ میں کچھ تبدیلیاں تو کی جا سکتی ہیں جن کی وجہ سے ہماری شکل خاصی حد تک مختلف ہو جائے گی لیکن یہ تبدیلی ڈاکٹر رضا کی نظر میں نہیں آنی چاہیے۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ ہم تینوں میک اپ میں ہیں تو وہ خواہ مخواہ ایک بار پھر مشکوک ہو جائے گا۔'

'مجھے آپ کی رائے سے مکمل اتفاق ہے۔ ویسے میرے خیال میں میرا میک اپ سب سے سادہ ہے۔ میں باہر جاتے ہی اپنی مونچھیں اتار کر جیب میں رکھ سکتا ہوں اور کوٹھی میں داخل ہونے سے قبل انہیں بآسانی اپنے چہرے پر چپکا سکتا ہوں۔ ویسے بھی اس شہر سے پوری طرح واقفیت رکھنے کے باعث میں سب سے آسانی سے کام کر سکوں گا۔'

'وہ تو صحیح ہے لیکن میرا باہر جانا ضروری ہے۔ میں ڈی آئی جی پولیس ڈیرہ غازی خان سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ خطرناک قدم ہوگا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہمیں اگر اس شہر میں کام کرنا ہے تو کسی نہ کسی اعلیٰ افسر کی مدد حاصل کرنا ہی پڑے گی۔ ویسے بھی ڈی آئی جی کا تقرر وفاقی حکومت کی مرضی سے ہوتا ہے لہٰذا وہ صوبائی یا شہری انتظامیہ کے پوری طرح زیر اثر نہیں ہوتا۔ ممکن ہے وہ کھلم کھلا نہ سہی چوری چھپے ہی سردار شاہ مراد کے خلاف ہماری مدد کرنے پر تیار ہو جائے۔ اس سے اصل بات کرنے سے پہلے میں اس کے رویے سے اندازہ لگا لوں گا کہ وہ کس قسم کے مزاج کا حامل ہے۔'

سوچ لیجیے صدیقی صاحب یہ قدم بے حد خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر آپ کا ہاتھ اوچھا پڑ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔' میں نے اسے خبردار کیا۔

میری بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا پھر وہ متفکر لہجے میں بولا' تو پھر تم لوگوں کی رائے میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اگر فون کرنا ممکن ہوتا تو میں فون پر ہی اس سے بات کر لیتا۔'

'اس کا علاج یہی ہو سکتا ہے کہ ہم کوئی ایسی صورت نکالیں کہ ہم ڈی آئی جی سے ملاقات بھی کر لیں اور وہ فوری طور پر ہمارے خلاف کوئی قدم بھی نہ اٹھا سکے۔' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

'ایسی کون سی صورت ہو سکتی ہے؟ کیا ہم اس کی قیام گاہ پر جا کر اس سے ملاقات کریں؟'

'نہیں اس کی قیام گاہ پر جانا بھی خطرے سے خالی نہ ہوگا البتہ ہمیں ایک دو دن کی مہلت مل جائے تو ہم کوئی نہ کوئی ایسا موقع ڈھونڈ ہی نکالیں گے جب وہ تنہا ہوگا۔ اس سے بات کرنے کے بعد ہم اسے اپنا ٹھکانا نہیں بتائیں گے۔ اگر اس نے ہمارا پیغام اسلام آباد بھجوا دیا تو ہم سمجھیں گے کہ کم از کم وہ بذات

خود تو سردار شاہ مراد کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی نہیں بنا ہوا ہے۔ بصورت دیگر ہماری یہ خوش فہمی دور ہو جائے گی کہ اس علاقے میں قانون نام کی بھی کوئی شے موجود ہے۔'

'وہ تو ٹھیک ہے لیکن ایسا مناسب موقع تلاش کرنے کے لیے بھی ہمیں باہر تو نکلنا پڑے گا ہی۔' صدیقی نے کہا۔

'نکلنا تو پڑے گا لیکن ہم سب نہیں صرف میں باہر جاؤں گا البتہ جب میں ڈی آئی جی سے ملاقات کی مناسب جگہ ڈھونڈ نکالوں تو پھر آپ بھی میرے ساتھ چلیے گا۔ ویسے بھی مجھے سردار شاہ مراد کے اس ٹرک ڈرائیور مینو استاد کے پاس تو جانا ہوگا ہی۔ مجھے اس کے گھر کا پتا معلوم ہے۔'

'ارے واقعی اس ٹرک ڈرائیور کو تو میں بھول ہی گیا۔ تم نے بتایا تھا کہ تمھارے اس سے بہت قریبی تعلقات ہیں۔ اگر وہ تمھیں بتادے کہ وہ اس روز اپنے ٹرک کو کہاں لے کر گیا تھا تو ہمارا مشن خاصا آگے بڑھ سکتا ہے۔ اس صورت میں ہم اپنے حکام بالا پر زور دے سکتے ہیں کہ وہ سردار شاہ مراد کے خلاف کسی ٹھوس کارروائی کی تیاری کریں۔'

'بظاہر تو یہ کام بہت آسان نظر آتا ہے۔ مینو استاد اگر مجھے مل گیا تو وہ یقیناً مجھے شاہ مراد کے اس ٹھکانے کا پتا بتادے گا جہاں وہ اس زخمی ہندو ایجنٹ کو لے کر گیا تھا لیکن اس معاملے میں اب تک یہی ہوتا رہا ہے کہ بظاہر سیدھی سادھی بات بھی بعد میں بے حد پیچیدہ ثابت ہوئی ہے لہٰذا فی الحال کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔' میں نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے اندیشہ رنگ بہ رنگ کو خود تک ہی محدود رکھتے ہوئے کہا۔

'ٹھیک ہے تو پھر تم کب باہر جارہے ہو؟'

'ابھی کچھ دیر بعد۔ ذرا ڈاکٹر رضا واپس لوٹ آئے۔ اسے آگاہ کرنے کے بعد میں باہر نکل جاؤں گا۔'

کچھ دیر بعد قاسم اور ڈاکٹر رضا ایک ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ ان دونوں نے اپنے ہاتھوں میں ہینگروں میں ٹنگے ہوئے بہت سے لباس اٹھا رکھے تھے۔ ہم نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

'ارے ڈاکٹر صاحب خیر تو ہے؟ یہ سب کیا اٹھا لائے؟' میں نے پوچھا۔

'میں آپ کے لیے اچھے اچھے کپڑے لایا ہوں بھائی جان۔' قاسم نے خوشی سے لہکتے ہوئے کہا۔

'ہاں بھئی ہم دونوں باپ بیٹے نے مل کر بڑی محنت سے آپ لوگوں کے لیے مناسب لباس ڈھونڈ کر نکالے ہیں۔'

'ارے آپ لوگوں نے اتنی زحمت کیوں کی؟ ہمارے لباس تو فی الحال اچھے خاصے ہیں۔' صدیقی نے سپاس گزار لہجے میں کہا۔

'اجی زحمت کیسی جناب؟ یہ ہمارے پیارے بیٹے قاسم کی فرمائش تھی۔ اسے اپنے بھائی جان کا لباس میلا نظر آرہا تھا۔' ڈاکٹر رضا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

'دیکھیے بھائی جان میں نے آپ کے لیے یہ پینٹ نکالی ہے۔ اچھی ہے نا؟' قاسم نے ڈارک

براؤن رنگ کی ایک تقریباً نئی پینٹ مجھے دکھائی۔

'بہت اچھی ہے۔ میرے قاسم بھائی کی پسند تو خراب ہو ہی نہیں سکتی۔' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

'تو پھر اسے پہن کر دکھائیں ابھی ابھی!' قاسم نے نادر شاہی حکم صادر فرمایا۔

'صدیقی' مرزا اور ڈاکٹر رضا نے بھی اس کی تائید کی۔ میں نے قاسم کی ہی پسند کردہ ایک ہلکے سرمئی رنگ کی قمیص لی اور ڈرائنگ روم کے ملحق باتھ روم میں داخل ہوگیا۔ وہ پینٹ ڈاکٹر رضا کی رہی ہوگی۔ لہٰذا وہ میری کمر پر ایک ڈیڑھ انچ ڈھیلی رہی تاہم میں نے چمڑے کی بیلٹ مزید کس کر اسے گزارے لائق بنا لیا۔ شرٹ البتہ میرے سائز کے عین مطابق ثابت ہوئی۔ میں نے اس کے دامن کو پینٹ میں نہیں ڈالا۔ شرٹ کے نیچے بلٹ میں' اپنا کولٹ پستول اڑسنے کے بعد میں باتھ روم سے نکل آیا۔

'آہا جی اب مزا آیا نا!' قاسم نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔

ان تینوں نے بھی توصیفی نگاہوں سے میرا جائزہ لیا۔ صدیقی اور میں مرزا کا لباس تبدیل کروانے لگے تو ڈاکٹر رضا' قاسم کو کسی بہانے اپنے ساتھ لے کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا تاکہ اس کی نظر مرزا کے شانے کے زخم پر نہ پڑے اور وہ اس کے متعلق طرح طرح کے سوال نہ شروع کردے۔

مرزا کی شرٹ کا بایاں بازو تو پہلے ہی تار تار تھا۔ ہم نے اسے پھاڑ کر مرزا کے جسم سے الگ کر دیا۔ اس کے بنیان کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ مرزا خاموشی سے ہماری حرکتوں کو برداشت کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نہیں تھے۔ شاید اس کے شانے کا زخم خاصی بہتر حالت میں تھا۔

کچھ ہی دیر میں صدیقی بھی اپنا لباس تبدیل کر کے فارغ ہوگیا۔ میں لاؤنج میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر رضا اور قاسم وی سی آر پر کارٹون فلم دیکھنے میں محو ہیں۔ میں نے ڈاکٹر رضا کو ڈرائنگ روم میں آنے کا اشارہ کیا۔ وہ قاسم کو ٹی وی کے سامنے چھوڑ کر خاموشی سے ڈرائنگ روم میں آگیا۔

'ڈاکٹر صاحب میں کچھ دیر کے لیے شہر جارہا ہوں۔'

'اچھا! لیکن آپ لوگوں نے تو کہا تھا کہ باہر آپ لوگوں کی جان کو خطرہ ہے؟' اس نے حیرانی سے کہا۔

'وہ تو صحیح ہے لیکن میرا باہر جانا بھی از حد ناگزیر ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم تمام عمر تو یہاں چھپ کر نہیں بیٹھ سکتے۔'

'آپ لوگ اپنے معاملات زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ میں تو یہی کہہ سکتا ہوں کہ باہر جانے کے بعد اپنا خیال رکھیے گا۔ ویسے آپ کب تک واپس لوٹیں گے؟'

'دعا کریں ڈاکٹر صاحب کہ میں جس مقصد کے لیے جارہا ہوں اس میں مجھے کامیابی ملے۔ کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا تو انشاء اللہ میں مغرب کے وقت تک واپس لوٹ آؤں گا۔'

ڈاکٹر رضا مجھے کوٹھی کے گیٹ تک چھوڑنے آیا۔ اس کے مشورے کے مطابق میں نے قاسم کو اپنی

روانگی کے متعلق نہیں بتایا کہ مبادا وہ میرے ساتھ چلنے کی ضد کرے۔ کوٹھی سے باہر آنے کے بعد میں محتاط نظروں سے آس پاس کا جائزہ لیتا ہوا سڑک کی جانب بڑھا۔ سڑک تک میں نے اپنی مونچھوں کو بل دے کر ان کی شکل اور ساخت میں خاصی حد تک تبدیلی پیدا کرلی۔ سڑک پر پہنچنے کے بعد میں کچھ دیر تک سواری کا انتظار کرتا رہا۔ بالآخر مجھے ڈگری کالج کی طرف سے ایک تانگا آتا نظر آیا۔ اس پر پہلے ہی تین افراد سوار تھے۔ میرے قریب پہنچ کر تانگا ہلکا ہوگیا۔ کوچوان نے سرائیکی میں ہانک لگائی۔

'باؤ جی! کڈے جل سو؟' (باؤ جی آپ کہاں جائیں گے؟) تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ 'ایکسپریس' نہیں بلکہ 'پسنجر تانگہ' ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

'توں جتھے مرضی میکوں گھن ونج پر توں اپنا اے راکٹ تے کھڑا کر'۔ (تم جہاں جی چاہے مجھے لے چلو مگر پہلے اپنے اس راکٹ کو تو ٹھہراؤ) میرے الفاظ سن کر کوچوان کی لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ کھلنے لگی۔ اس نے تانگا روک لیا۔ میں تانگے کی جانب بڑھا تو مجھے اس کے پہلو میں بھدے سیاہ الفاظ میں گھوڑا کا یا اس کے مالک کا لقب مع ایڈریس تحریر نظر آیا۔ 'گدائی کا شہزادہ'

'ذرا چھیتی کر کے منزل تے پہنچا دیویں مینڈے شہزادے۔' میں نے گردن موڑ کر کوچوان کو چھیڑا۔

میری بات سن کر وہ بری طرح شرما گیا لیکن اسے میرے جملے کی تہہ تک پہنچنے میں ذرا دیر نہ لگی۔

'شہزادہ تو میرا یہ گھوڑا ہے جی۔ پورے موضع گدائی میں اس کے مقابلے کا جانور نہیں ہے۔' اپنے دعوی کی سچائی ثابت کرنے کے لیے اس نے چابک لہرا کر گھوڑے کو تیز دوڑنے کا اشارہ کیا۔

چند ہی لمحے میں گھوڑا گویا ہوا میں اڑنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر اسپتال والی چورنگی آگئی۔ وہ تانگہ شاید آگے بس اڈے تک جاتا لیکن میں وہیں اتر گیا۔ تانگے والے کو دو روپے کا نوٹ پکڑا کر میں ریلوے روڈ پر بمبے ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

کچھ دور تک سیدھا چلنے کے بعد میں دائیں ہاتھ والی گلی کی طرف مڑ گیا۔ دستکاری سکول کے پاس سے گزر کر میں نو بلاک میں داخل ہوگیا۔ پہلے چوک میں پہنچ کر میں بائیں طرف والی گلی میں گھوم گیا۔ اسی کے ساتھ ہی میری رفتار میں اضافہ ہوگیا۔ سڑک پار کر کے میں پانچ نمبر بلاک میں داخل ہوگیا پانچ کے بعد ایک نمبر بلاک اور پھر اے بلاک۔ اگلا بلاک ای تھا اور مینو استاد اسی بلاک میں رہتا تھا۔ سیدھی سیدھی گلیوں والے اس چھوٹے سے شہر میں شاید ہی کوئی راستہ بھولا ہو پھر میں کیسے نا اپنی منزل پر پہنچ پاتا۔

مینو استاد کے گھر والی گلی کے کنارے پہنچ کر میں لمحہ بھر کے لیے رک گیا۔ کیا مینو استاد اس وقت مجھے اپنے گھر پر مل سکے گا؟ اگلے ہی لمحے ایک بار پھر میرے قدم مینو استاد کے گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ گھر کے دروازے پر نگاہ ڈالی۔ اس کے ساتھ ہی مجھ پر شدید مایوسی کا غلبہ ہونے لگا۔

دروازہ پر لٹکا ہوا بھاری بھرکم قفل مجھے اپنا منہ چڑاتا محسوس ہوا۔ شاید مینو استاد اپنا ٹرک لے کر کہیں

گیا ہوا تھا۔ میں مایوس ہوکر پلٹنے ہی والا تھا کہ میری نگاہ ساتھ والے مکان کے دروازے میں کھڑے نوجوان پر پڑی۔ دبلا پتلا سادہ نوجوان میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے تھوڑا سا سوچ کر اس سے پوچھا۔ 'یہ مینو استاد کہاں گیا ہوا ہے؟'

'مم۔۔۔۔ مینو۔۔۔۔ اس۔۔۔۔ تاد کا تو پپ۔۔۔۔ پتہ نہیں البتہ اس کا۔۔۔۔ شش۔۔۔۔ شاگرد شرفو صبح تک یہیں تھا۔ وہ۔۔۔۔ شش شاید کھانا۔۔۔۔ کھانے بمبے ہوٹل پر گگ گیا ہو۔۔۔۔ گا۔' اس نوجوان نے اپنی ہکلاہٹ کے باوجود بالآخر اپنا جملہ مکمل کر ہی لیا۔

اس نے کسی نہ کسی حد تک میرا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ اگر مجھے شرفو مل جاتا تو اس کے توسط سے مجھے مینو استاد کے بارے میں بھی معلوم ہو جاتا۔ اس نوجوان نے اخلاقاً مجھے دعوت دی کہ میں اس کی بیٹھک میں بیٹھ کر شرفو کی واپسی کا انتظار کر سکتا ہوں لیکن میں نے نہایت نرمی سے اس کی پیشکش رد کر دی۔

'میں اس سے جا کر بمبے ہوٹل میں ہی مل لیتا ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔' میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور بمبے ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

بمبے ہوٹل کے قریب پہنچتے ہی میرے پاؤں خود بخود سست پڑتے گئے۔ ہوٹل کے بالکل سامنے' سڑک کے پار' بمشکل پچاس گز کے فاصلے پر صدر تھانہ واقع ہے جہاں پر ہر وقت بوہلی کتوں جیسی حساس قوت شامعہ اور گدھ جیسی گرسنہ آنکھوں والے پولیسیوں کا میلہ سا لگا رہتا ہے۔ اگر میں ان میں سے کسی کی شکاری آنکھوں میں آگیا تو۔۔۔۔ پھر مجھے اپنے چہرے پر موجود میک اپ کا خیال آیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنا کھویا اعتماد واپس لوٹتا محسوس ہوا۔ میں نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا ہوٹل کے ائیر کنڈیشنڈ ہال میں داخل ہوگیا۔ چھوٹے سے ڈائننگ ہال میں مجھے شرفو کو تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ وہ حسب معمول اپنے سامنے موجود ڈھیر سارے کھانے پر لمبے لمبے ہاتھ مار رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں اس کے سامنے جا بیٹھوں لیکن پھر میں رک گیا۔ مجھے یاد آیا کہ میرے چہرے پر میک اپ موجود ہے جس کے باعث وہ فوری طور پر مجھے پہچان نہیں سکے گا۔ اس جیسے اکھڑ اور تند خو شخص سے کیا بعید کہیں یہ میری بات پر توجہ دیے بغیر ہی مجھ سے لڑنے مرنے پر آمادہ نہ ہو جائے۔ خواہ مخواہ میں میری ذات سب لوگوں کی نظروں کا مرکز بن جائے گی۔ دو باوردی کانسٹیبل تو یہاں موجود ہیں ہی جانے اور کون کون بغیر وردی کے' اپنے نوکیلے دانت اپنی باچھوں میں چھپائے بیٹھا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ فی الحال اس سے بات کرنے سے گریز کیا جائے۔

میں ایک قریبی میز پر بیٹھ گیا۔ ویٹر نے مجھے چائے لا دی۔ میں خاموشی سے چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ جب تک میں نے چائے ختم کی' شرفو بھی کھانے سے فارغ ہوگیا۔ میں نے ویٹر کو چائے کے پیسے دیے اور ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔ بالآخر شرفو نے میز چھوڑی اور جھومتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا تھوڑا سا وقفہ دے کر میں بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ باہر آ کر میں نے شرفو کو تلاش کرنا چاہا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی کہ وہ مینو استاد کے گھر کی طرف جانے کے بجائے مخالف سمت میں کچہری کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مجبوراً میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

دائیں ہاتھ پر ڈی آئی جی پولیس کے دفتر کی سرخ رنگ کی خوبصورت اور بلند و بالا عمارت تھی۔ اس جگہ کسی زمانے میں پولیس چوکی تمبر ۳ کی ٹوٹی پھوٹی بیرکیں ہوا کرتی تھیں۔ قانون کے محافظوں کی بیٹھکیں تو عالی شان ہوگئیں لیکن جرائم کی گرم بازاری پہلے سے بھی کچھ زیادہ ہوگئی۔ بائیں ہاتھ پر کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کی عدالتیں تھیں۔ شرفو ان سب کو پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھا چلا گیا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اسے یہیں راستے میں ٹھہرا کر اس سے بات کروں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی رفتار تیز کرلی۔ کچہری کی مسجد والے نالے کی پلی پر میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے نرمی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

'میری بات سننا بھائی۔' وہ چونک کر پیچھے مڑا۔ میرے حلیے پر نظر پڑتے ہی اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

'کیا بات ہے؟' اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔

'تم نے مجھے پہچانا نہیں شرفو؟' میں نے نرم لہجے میں استفسار کیا۔

'کون ہو تم؟' اس نے بدستور بے لوچ لہجے میں پوچھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی چمک دار آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر مجھے اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار ابھرتے نظر آئے۔ شاید وہ میرے چہرے میں مانوسیت محسوس کر رہا تھا۔

'مجھے غور سے دیکھو شرفو میں سعید خان ہوں۔ یاد ہے ہم کوٹ چھٹے سے اکٹھے آئے تھے۔'

'اوہ تو تم وہ ہو۔' شرفو نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں نرمی کی جھلک محسوس کر کے مجھے دلی اطمینان محسوس ہوا۔ اس کا مطلب تھا وہ میرے اور اپنے درمیان موجود سابقہ تلخ تعلقات کو فراموش کر چکا ہے۔

'لیکن تم نے تو اپنا یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟' اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ اب اس کا لہجہ پرسکون اور نرم تھا۔

'یہ سب تو میں بعد میں بتاؤں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ استاد مینو کہاں ہے؟' میں نے اپنے لہجے کی بے تابی کو چھپاتے ہوئے سوال کیا۔

'مینو استاد کمپنی کے اہم کام سے کہیں گیا ہوا ہے۔ میں دو دن سے اس کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''کیا تمھیں نہیں معلوم کہ اسے کہاں بھیجا گیا ہے؟'

'نہیں ایسا شاید پہلی بار ہوا ہے کہ مجھے مینو استاد کے متعلق کچھ معلوم نہیں ورنہ ہم ہر جگہ ہمیشہ اکٹھے ہی جایا کرتے ہیں۔ تمھیں کیا اس سے کوئی ضروری کام ہے؟' شرفو نے سادہ لہجے میں سوال کیا۔

'کام تو کیا بس اس سے ملنا تھا۔'

'میں ابھی کمپنی کے اڈے کی طرف ہی جا رہا تھا تا کہ مینو استاد کے متعلق معلوم کر سکوں۔ اگر تمھارا دل چاہے تو تم بھی میرے ساتھ چلو۔'

اس کی بات سن کر میں قدرے تذبذب کا شکار ہو گیا۔ کیا سردار شاہ مراد کی گڈز کمپنی کے اڈے پر

میرا جانا مناسب ہے؟ کہیں وہاں پر موجود کوئی شخص مجھے پہچان نہ لے! پھر میں نے تمام اندیشوں کو اپنے دماغ سے جھٹک دیا۔ میرے ساتھ شرفو بھی تو ہے۔ تمام سوال جواب یہ خود کرے گا لہٰذا سب کی توجہ کا مرکز یہ ہوگا۔ عین ممکن ہے اس اڈے سے مجھے کوئی ایسا سراغ مل جائے جو سردار شاہ مراد کے خلاف کارروائی میں کارآمد ثابت ہو۔ اپنے اس موجودہ حلیے میں تو میں ان سب کے لیے قطعاً اجنبی ہوں گا لہٰذا میں براہ راست خطرے کی زد میں نہیں ہوں۔

'کیا خیال ہے چلیں؟' شرفو نے پوچھا۔

'ہاں چلو۔'' میں تو خیر تانگے کے ذریعے ہی جاتا۔' شرفو نے کچہری کے تانگہ اور رکشا اسٹینڈ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا 'لیکن اب تم ساتھ ہو تو چلو رکشے میں چلتے ہیں۔' میں نے اس کی تائید کی۔

شرفو نے ایک نئے نکور رکشے کا انتخاب کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ رکشے کے مسافر کیبن میں باقاعدہ دروازے لگے ہوئے ہیں۔ شرفو نے رکشے والے کو اپنی منزل کے متعلق بتایا اگلے ہی لمحے رکشا گویا ہوا میں پرواز کرنے لگا۔ ہم لوگ ایک بار پھر بمبے ہوٹل کے پاس سے گزرے۔ اسٹیشن روڈ پر پہنچتے ہی رکشے کی رفتار میں مزید اضافہ ہو گیا۔ سامنے سے آنے والی ٹھنڈی اور خوش گوار ہوا نے مجھے احساس دلایا کہ موسم تیزی سے بدل رہا ہے۔ اب دھوپ میں وہ پہلے سی تیزی نہ تھی۔ شاید مہینہ بھر میں باقاعدہ سردی شروع ہو جاتی۔ راستے میں کئی بار میرا دل چاہا کہ میں شرفو سے پوچھوں کہ اس روز وہ اور مینو استاد ملتان سے جو ٹرک لائے تھے اسے انہوں نے کہاں پہنچایا اور کیا انہیں معلوم تھا کہ ٹرک کے پچھلے حصے میں ایک زخمی شخص موجود ہے لیکن پھر میں نے اپنے اس خیال کو رد کر دیا۔ جانے یہ میری پوچھ گچھ سے کیا تاثر لے ممکن ہے اسے سختی سے منع کیا گیا ہو کہ وہ یہ راز کسی کو نہ بتائے۔ میری زبان سے یہ سب کچھ سن کر یہ بری طرح چونک پڑے گا۔ ممکن ہے سردار شاہ مراد کے سلسلے میں اس کے جذبات اپنے استاد مینو سے مختلف ہوں۔ ممکن ہے یہ ان لوگوں میں سے ایک ہو جو نمک حلالی کو اپنی عزت و غیرت' ملک و قوم اور دین و دنیا' سب سے بڑھ کر سمجھتے ہیں۔ نہیں میں مینو استاد کے علاوہ کسی کو اپنا راز دار نہیں بنا سکتا۔

رکشا سردار گڈز فارورڈنگ کمپنی کے اڈے کے سامنے جا ٹھہرا۔ میں نے رکشے کا کرایہ ادا کرنا چاہا لیکن شرفو نے مجھے ایسا نہ کرنے دیا۔ وہ مست ہاتھی کی طرح جھومتا جھامتا کمپنی کے دفتر کی طرف بڑھا۔ جبکہ میں نہایت محتاط انداز میں' غائر نظروں سے اپنے آس پاس کا جائزہ لیتا ہوا' آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلتا رہا۔ مجھے وہاں اکا دکا بندہ ہی نظر آیا۔ مینو استاد نے مجھے بتایا تھا کہ اس کمپنی کے پاس تیس ٹرکوں کا بیڑا ہے لیکن اس وقت وہاں ایک بھی ٹرک موجود نہ تھا۔ شرفو سیدھا دو کمروں پر مشتمل دفتر میں گھستا چلا گیا لیکن میں جان بوجھ کر اس کے پیچھے دفتر میں داخل نہیں ہوا۔ بجائے اس کے میں ایک الگ تھلگ گوشے میں بچھی چارپائی پر جا بیٹھا۔

شرفو کو دفتر میں کچھ دیر لگی۔ میں چارپائی پر نیم دراز ہو گیا۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ میں اپنے بدترین دشمن سردار شاہ مراد کی کمپنی کی عمارت میں ایسے لیٹا ہوا ہوں جیسے داماد اپنے سسرال میں لیٹتا ہے۔ اگر سردار شاہ مراد کو معلوم ہو جائے کہ اس وقت میں یہاں موجود ہوں تو کیا ہوگا؟ اس کے

کارندوں کی فوج بھوکے کتوں کے مانند' جانے کن کن کونے کھدروں میں مجھے تلاش کرتی پھر رہی ہوگی جبکہ میں خود سردار شاہ مراد کی پناہ میں ہوں۔ یہ سب سوچ کر مجھے بجائے خوف کے ہنسی آنے لگی۔ بالآخر شرفو دفتر کے دروازے میں نمودار ہوا۔ اسے آتا دیکھ کر میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شرفو آٹھ دس قدم ہی آگے بڑھا ہوگا کہ دفتر کے دروازے میں ایک موٹا سا شخص نمودار ہوا۔ اس نے شرفو کو آواز دے کر واپس بلایا۔ شرفو واپس مڑا اور ایک بار پھر دفتر میں داخل ہوگیا۔ البتہ وہ موٹا شخص چند لمحوں تک وہیں دروازے میں کھڑا رہا۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ مجھے پہچاننے کی کوشش تو نہیں کر رہا ہے لیکن اسی وقت وہ شخص واپس لوٹ گیا۔ میں نے اطمینان کی گہری سانس لی اور ایک بار پھر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس بار شرفو ایک دو منٹ بعد ہی واپس لوٹ آیا۔ میں نے اس کے عقب میں دروازے پر نظر ڈالی۔ مجھے وہ موٹا شخص وہاں نظر نہیں آیا۔ میرے دل کو اطمینان ہوگیا کہ اس شخص نے مجھے مشکوک نہیں سمجھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ یقیناً ایک بار پھر دروازے میں آکر میرا جائزہ ضرور لیتا۔

'کیا ہوا بھائی شرفو؟ یہ لوگ مینو استاد کے بارے میں کیا بتا رہے ہیں؟' میں نے شرفو کے ساتھ چلتے ہوئے سوال کیا۔

'کہتے ہیں مینو استاد مالکوں کے خاص کام سے کہیں گیا ہے اور ایک دو دن بعد واپس لوٹے گا۔'

'تم نے میرے متعلق انہیں کیا بتایا؟' میں نے اپنی بے تابی چھپاتے ہوئے سوال کیا۔

'انہوں نے تو کچھ نہیں پوچھا البتہ میں نے خود ہی بتایا تھا کہ میرا ایک دوست میرے ساتھ آیا ہے۔ وہ تمھیں اندر بلانا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں منع کر دیا کہ تم وہاں زیادہ بہتر حالت میں ہو۔ ویسے اکبر صاحب نے تو شاید تمھیں دیکھا بھی ہے۔' شرفو نے بیدھے سادے انداز میں بتایا۔

ناز سینما کے سامنے پہنچ کر وہ ٹھہر گیا۔ وہ شاید رکشے وغیرہ کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اسے کہا' بس اب میں تم سے رخصت ہوتا ہوں۔ تمھیں جہاں جانا ہے چلو جاؤ۔'

'کیوں کیا تم میرے ساتھ گھر نہیں چل رہے ہو؟' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

'نہیں مجھے کہیں اور جانا ہے۔ میں پرسوں گھر آؤں گا۔ اگر اس دوران میں استاد مینو آجائے تو اسے میرے بارے میں بتانا اور کہنا کہ میں بے حد ضروری کام کے سلسلے میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ہو سکے تو وہ گھر میں رہ کر میری آمد کا انتظار کرے۔'

'ٹھیک ہے میں اسے یہ بتا دوں گا۔' شرفو نے کہا۔

مجھ سے رخصت ہونے کے بعد وہ پیدل ہی فریدی بازار کی طرف چل پڑا۔ میں کچھ دیر تک انتظار کرتا رہا۔ جب وہ خاصی دور نکل گیا تو میں بھی اسی سمت میں چلنے لگا۔ کہکشاں سینما اور دو تین بڑے بڑے ہوٹلوں کے سامنے سے گزر کر میں ویگن کے اڈے کی طرف بڑھا۔ میں نے ویگن اڈے کے ساتھ واقع پیراماؤنٹ نیوز کارنر سے اس دن کا اخبار خریدا۔ نیوز کارنر کے ساتھ والی سرائے کے سامنے سے گزر کر میں گیٹ کے ذریعے میونسپل پارک میں داخل ہوگیا۔ سرسبز گھاس کے قطعات پر چادریں بچھائے مالیشوں کی ''دعوت چمپی'' کو نظر انداز کر کے میں خاصی تیز رفتاری سے آگے بڑھتا رہا۔

میونسپل لائبریری کے پاس سے گزر کر میں باسکٹ بال کورٹ میں پہنچ گیا۔ اس کورٹ کو دیکھ کر میرے ذہن میں اپنے اسکول کی یادیں تازہ ہونے لگیں۔ اس کورٹ پر کتنی ہی بار گورنمنٹ ہائی اسکول نمبر ۱ اور نمبر ۲ ہمارے حریف اسلامیہ اسکول کی باسکٹ بال ٹیمیں آمنے سامنے صف آراء ہوئیں۔ کیسے معرکے کے میچ ہوا کرتے تھے۔ کتنی ہی بار جوش و جذبے کی فراوانی کے باعث دونوں اسکولوں کے طلباء میں خون خرابہ ہوتے ہوتے بچا بلکہ ایک آدھ بار تو چھوٹے پیمانے پر تصادم ہوا بھی لیکن اساتذہ نے درمیان میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کر دیا۔ میرا دل چاہا کہ کچھ دیر یہاں بیٹھ کر اس زمانے کی سہانی یادیں تازہ کروں لیکن میرے دماغ نے اجازت نہیں دی۔ میں ایک بے حد ضروری کام کے لیے جا رہا تھا۔ اس معاملے میں تاخیر خود مجھے بھی گوارا نہ ہوئی۔ میں نے اپنی منزل کے متعلق سوچا۔ اس کے ساتھ ہی میرے قدموں کی رفتار مزید تیز ہوگئی۔

گرلز ڈگری کالج کو پیچھے چھوڑتا ہوا میں بڑی مسجد کے پاس سے گزر کر جامعہ اسکول کی حدود میں اخل ہوگیا۔ مزید آگے بڑھنے کے بعد سامنے پھیلا وسیع قبرستان نظر آنے لگا۔ چھوٹے بڑے درختوں کے بیچ میں گھرا حضرت مولوی مکلیت شاہ کا سادہ اور باوقار مزار مبارک جونہی میری نظروں کے سامنے آیا۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں بلا ارادہ اس طرف کھنچا چلا جا رہا ہوں۔

مزار کے احاطے میں پہنچ کر میں نے مشہور و معروف شفا بخش پانی سے وضو کیا اور تربت والے حجرے میں داخل ہوا۔ تربت کی پائنتی کھڑے ہو کر میں نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ اتفاق سے اس وقت وہاں کوئی بھی موجود تھا۔

درود فاتحہ کے بعد میں اپنے رب ذوالجلال سے دعا مانگنے لگا اپنے گناہوں کی' اپنی کوتاہیوں کی مغفرت طلب کرنے لگا۔ عین اسی وقت میرے ذہن کے پردے پر ایک دلکش اور معصوم چہرہ ابھر آیا۔ یہ چہرہ قاسم کا تھا۔ اس بدنصیب نوجوان کا جس کے ذہن میں بچپن ہی سے گرہ پڑ گئی تھی۔ میں پورے خشوع و خضوع سے اس کے لیے دعا کرنے لگا۔

رفتہ رفتہ مجھ پر ایک عجیب وجد کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے بہنے لگے۔ میں نے گڑگڑا کر اپنے رب سے دعا کی کہ اس بدنصیب باپ کو اس کا نوجوان بیٹا مکمل ذہنی صحت کے ساتھ مل جائے۔ میں روتا رہا' روتا رہا۔ بالآخر میرے دل کو سکون آنے لگا۔ میرے آنسو تھمتے گئے۔ میں ہلکے دل کے ساتھ الٹے قدموں حجرے سے باہر نکلنے لگا۔ اچانک دروازے کے اوپر کہیں ٹنگا ہوا گلاب کے خشک پھولوں کا ایک ہار میرے گلے میں آ گرا۔ ایک لمحے کے لیے میرے قدم رکے پھر میرے وجود میں مسرت کا طوفان برپا ہوگیا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے اس پاک درگاہ سے یہ بیش قیمت تحفہ عطا ہوا ہے۔ میری یہ عاجزانہ حاضری رائگاں نہیں گئی اور شاید میری دعائیں بھی۔

میں نے خشک پھولوں کے ہار کو بڑی احتیاط سے' بڑے احترام سے اپنے سفید رومال میں باندھ لیا۔ اسی رومال میں جو کہ کسی نامعلوم پاکیزہ ہستی نے میرے لیے بطور تحفہ بھیجا تھا۔ میں نے اس چھوٹی

سی پوٹلی کو اپنی شرٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ بائیں جیب میں اپنے دل کے عین اوپر۔

میں مسرور دل و دماغ کے ساتھ مزار کے احاطے سے باہر نکلا۔ اس وقت میری نگاہ ایک شخص پر پڑی جو ایک ریشمی مفلر اپنے سر پر اور منہ پر لپیٹے مزار کی چار دیواری کے باہر ہی سے فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ میں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ اب میرا رخ مزار کے پہلو میں بنے ہوئے چھوٹے بڑے حجروں کی طرف تھا۔ ایک موہوم سی امید تھی جو کشاں کشاں مجھے اس طرف لے جا رہی تھی۔

ایک بار پہلے بھی فقیر بابا اور میں نے اس جگہ پناہ حاصل کی تھی۔ ہوسکتا ہے فقیر بابا نے سردار برکت علی کی حویلی سے رہائی پانے کے بعد ایک بار پھر اسی جگہ ڈیرا جما لیا ہو کون جانے' دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ کیا پتہ مجھے اس مقدس جگہ کے صدقے ایک اور تحفہ مل جائے۔ میرا ہمدم، میرا مشفق' میرا دوست' میرا بزرگ' میرا استاذ یہیں میرا منتظر ہو۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ایک حجرے کے برآمدے میں نگاہ ڈالی' وہاں پر دو تین غلیظ بستر پڑے ہوئے تھے لیکن وہاں کوئی بھی نظر نہ آیا۔ دوسرے حجرے کے برآمدے میں ٹاٹ کے ایک ٹکڑے پر کوئی سویا ہوا تھا۔ میں نے قریب جا کر دیکھا وہ پچیس چھبیس سال کا ایک جوان شخص تھا۔ کسی زمانے میں وہ خوش شکل اور تندرست و توانا رہا ہوگا لیکن نشے کے بے تحاشا اور مسلسل استعمال نے اسے زندہ لاش بنا کر رکھ دیا تھا۔

اندر دھنسے گال' چہرے پر بڑی داڑھی مونچھیں الجھے ہوئے گرد آلود سر کے بال۔ وہ مجھے کسی ماہر مصور کا سیلن زدہ شاہکار نظر آیا۔ میں اس پر عبرت آمیز نظریں ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ میں نے وہاں موجود تمام حجروں اور ان کے برآمدوں پر اچھی طرح نظر ڈال لی لیکن مجھے فقیر بابا اور اس کا مخصوص سامان کہیں نظر نہیں آیا۔ مجھ پر مایوسی طاری ہونے لگی۔ کاش میرا ہمدم دیرینہ' میرا فقیر بابا یہیں مل جاتا پھر میں نے ان مایوسانہ خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ کیا ہوا اگر فقیر بابا یہاں نہیں مل سکا۔ ابھی تو کم از کم دو ایسے ٹھکانے موجود ہیں جہاں اس کی موجودی کا امکان ہے۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی تو مجھے تلاش کرسکتا ہے۔ اسے عالم بستی کے متعلق تو معلوم ہی ہے۔ اسے علم ہے کہ میں جلد یا بدیر عالم بستی ضرور لوٹوں گا۔ اپنی زندگی' اپنی روح' اپنی ہیر کے پاس۔

میں واپسی کے لیے جونہی مڑا اچانک میری نظر ایک شخص پر پڑی وہ ایک درخت کے پیچھے چھپا ہوا شاید میری نگرانی کر رہا تھا۔ میرے وجود میں ہنگامی حالت کا الارم بج اٹھا۔

میں نے پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے جو ابھی کچھ دیر پہلے مجھے مزار کی چار دیواری کے باہر فاتحہ پڑھتا نظر آیا تھا پھر میرے ذہن کے خفتہ حصے نے مجھے احساس دلایا کہ پارک سے گزرتے ہوئے بھی میری نظر اس شخص پر پڑ چکی ہے لیکن میں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ شخص میرا تعاقب کرتا رہا ہے۔ میرے تعاقب میں یہ یہاں تک پہنچ گیا ہے اور شاید یہ آئندہ بھی میرا تعاقب کرے گا تاکہ میرے ٹھکانے کا پتا لگا سکے۔

میرے ذہن میں پہلا خیال یہی ابھرا کہ یہ شخص سردار شاہ مراد کا کارندہ ہے اور پھر یہ خیال میرے

ذہن میں راسخ ہوگیا۔ اس کے علاوہ وہ کون ہوسکتا ہے؟ لیکن اس نے مجھے پہچانا کیسے اور یہ کب میرے پیچھے لگا؟ کیا ٹرک کی کمپنی سے ہی یہ میرے تعاقب میں ہے؟ نہیں وہاں پر میں نے پوری طرح سے ہر طرف کا جائزہ لے لیا تھا۔ بعد میں بھی میں نے پوری احتیاط رکھی یا تو یہ شخص ویگن اسٹینڈ کے آس پاس سے میرے پیچھے لگا یا پھر پارک سے۔

میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں اس شخص کی موجودگی سے بے خبر ہوں۔ میں بڑی بے فکری کے انداز میں قبروں کے درمیان بنی پگڈنڈی پر آگے بڑھا۔ وہ خاصے وقفے سے میرے تعاقب میں آیا لیکن قبرستان کے وسط میں آنے کے بعد اسے کوئی اوٹ میسر نہ آئی۔ اس وقت اگر میں مڑ کر اسے دیکھتا تو وہ خود کو چھپا نہ پاتا لیکن میں نے براہ راست اُس کی جانب نہیں دیکھا البتہ کن انکھیوں سے اسے دیکھنے کے بعد میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مضبوط قسم کا طویل قامت اور جوان العمر شخص ہے۔ اس کا چہرہ اس وقت بھی سفید رنگ کے ریشمی مفلر میں پوشیدہ تھا۔

قبرستان کی حد سے باہر آنے کے بعد میں نے اپنا رخ تھوڑا سا بائیں طرف جامعہ اسکول کی طرف موڑ دیا۔ میری توقع کے عین مطابق وہ شخص اپنا رخ بدلے بغیر سیدھا چلتا رہا۔ البتہ اس کی رفتار بے حد کم ہوگئی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے تعاقب میں آئے گا لیکن اس انداز میں کہ مجھے اپنے تعاقب کا شک نہ ہوسکے۔

جامع اسکول کے صدر دروازے کے سامنے سے گزر کر میں مزید آگے بڑھا۔ مجھے اس وقت اسکول میں ہو کا عالم نظر آیا۔ عمارت کے سرے پر پہنچ کر میں اس کے پہلو کی طرف گھوم گیا اور پھر اسکول کی عمارت کے عقب میں پہنچ گیا۔ یہ جگہ بالکل سنسان تھی۔ میں نے اپنی چال میں تھوڑی سی عجلت پیدا کی تاکہ میرے عقب میں آنے والے شخص کو لگے کہ میں رفع حاجت کے لیے اس طرف جا رہا ہوں۔ اسکول کی عمارت کی عقبی دیوار تقریباً سپاٹ تھی۔ مزید آگے جانے کے بجائے دیوار کے کونے سے چپک کر کھڑا ہوگیا۔ میرا ہاتھ میرے پستول کے دستے پر جما ہوا تھا۔ میں اچھی خاصی دیر تک وہاں اپنا سانس روکے کھڑا رہا۔

بالآخر میں نے اس شخص کے قدموں کی آواز سنی۔ وہ محتاط انداز میں پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا تھا۔ دیوار کے کونے کے پاس پہنچ کر وہ ٹھہر گیا۔ وہ مجھ سے اس قدر کم فاصلے پر تھا کہ میں نے اس کے سانسوں کی آوازیں بھی بالکل واضح طور پر سنیں۔

اس نے اپنی گردن کو دیوار کی اوٹ سے تھوڑا سا نکالا۔ میں دیوار کے ساتھ مزید چپک گیا۔ اس کی نظریں مجھے خاصی دور ڈھونڈ رہی تھیں لہٰذا میں فوری طور پر اسے نظر نہ آسکا۔

اگلے ہی لمحے اس نے اپنی گردن دیوار کی اوٹ سے نکالی۔ تب اس نے مجھے دیکھ لیا۔ مجھے اپنے اتنے قریب' اپنے روبرو پا کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ قبل اس کے کہ وہ اپنی حیرانی پر قابو پاتا' میں نے اس کا گریبان پکڑ کر ایک وحشیانہ جھٹکے سے آگے کھینچ لیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑاتا ہوا گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ میری زوردار پھوک اس

کے سینے پر پڑی۔ اس کے حلق سے زوردار چیخ نکلی اور وہ پہلو کے بل لڑھک گیا۔

اس نے اپنا مفلر اس قدر مضبوطی کے ساتھ اپنے چہرے پر لپیٹ رکھا تھا کہ اس دھینگا مشتی کے باوجود اس کے منہ پر سے نہ ہٹ سکا۔ میں نے ٹھہرے بغیر اس کی پسلیوں پر دوسری ٹھوکر ماری۔ اس کے حلق سے ایک اور زوردار چیخ ابھری۔ وہ تیزی سے لڑھکنیاں کھاتا مجھ سے دور ہوتا چلا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر اسے اپنی ٹھوکروں کی زد میں لینا چاہا لیکن وہ پھرتی سے اٹھ کھڑا ہو گیا۔

میں نے اس پر جھپٹنا چاہا لیکن اس نے اپنے نیفے سے سیاہ رنگ کا بڑا سا ریوالور نکال لیا۔ ریوالور کے بھیانک دہانے کا رخ اپنی جانب دیکھ کر میں اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ 'اب بول کتے کے بچے کتنی گولیاں اتاروں تیرے سینے میں۔' اس نے غراتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں سے خون جھلک رہا تھا۔

مجھے اس کی آواز کچھ مانوس سی لگی۔ اچانک مجھے اپنے عقب سے کسی کی گرج دار آواز سنائی دی۔ 'یہ کیا ہو رہا ہے اوئے؟' میں نے چونک کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ چار افراد تھے جو شاید اس شخص کی چیخوں کی آواز سن کر ادھر آ گئے تھے۔ ان میں سب سے آگے والے بھاری بھرکم شخص نے ہمیں للکارا تھا۔

انہوں نے ایک لمحے میں صورت حال کا اندازہ لگا لیا لیکن وہ مسلح شخص کے ریوالور سے خوف زدہ ہونے کے بجائے سیدھے اس کی طرف بڑھنے لگے۔

'پکڑ لو اوئے اس لفنگے کو۔۔۔۔ سالا دن دھاڑے ڈکیتی کرتا ہے۔' بھاری بھرکم شخص نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

وہ تینوں محتاط انداز میں ریوالور بردار شخص کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کی بے خوفی اور اعتماد کو دیکھ کر مسلح شخص کی آنکھوں میں شدید پریشانی کے آثار ابھر آئے۔ اس نے تذبذب کے عالم میں اپنے ریوالور کا رخ ان چاروں کی طرف کر دیا۔

مجھے اسی موقع کی تلاش تھی۔ جونہی ریوالور کا رخ میری طرف سے پھرا' میں نے پوری قوت سے اس کے ریوالور والے ہاتھ پر ٹھوکر ماری۔

اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹا اور اچھل کر اس کے پیچھے والی دیوار کے قریب جا گرا۔ وہ خود کو سنبھال کر اندھادھند اس ریوالور کو اٹھانے کے لیے دوڑا۔ اس نے جھک کر ریوالور اٹھانا چاہا لیکن میں نے اسے اس کی مہلت نہ دی۔ میری لات اس کی کمر پر پڑی۔

وہ زبردست طریقے سے پختہ دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کا سر خاصی قوت سے دیوار سے ٹکرایا۔ وہ دیوار سے ٹکرانے کے بعد آٹے کی بوری کی طرح دیوار کی جڑ میں ڈھیر ہو گیا۔ میں نے ایک نظر میں اندازہ لگا لیا کہ وہ اتنا غفیل ہو چکا ہے۔ میرے وجود میں اطمینان کی لہر دوڑنے لگی۔

میرا اصل مقصد پورا ہو چکا تھا۔ میں اسے اپنے تعاقب سے جھٹکنا چاہتا تھا۔ اسی لیے میں نے اسے اس ویران جگہ لا کر گھیرنے کی کوشش کی۔ یہ الگ بات ہے کہ معاملہ بگڑتے بگڑتے رہ گیا۔ اگر وہ لوگ بروقت نہ آ جاتے تو میری اپنی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی۔ میں نے ان چاروں پر نظر ڈالی۔ وہ حیرانی کے عالم میں میری شکل دیکھ رہے تھے۔ بالآخر انہوں نے اپنی حیرت پر قابو پا لیا۔

'واہ میرے شیر! خوب کاریگری دکھائی ہے تو نے!' ادھیڑ عمر کے بھاری بھرکم شخص نے میری کمر تھپکتے ہوئے کہا۔ 'کسی بہت اچھے استاد کا شاگرد لگتا ہے تو! اچھا مزا چکھایا ہے۔ اس لفنگے کو۔'

'آپ لوگ کون ہیں اور اس وقت یہاں کیسے آ گئے؟'

'میں غلام رسول ہوں۔ یہ تینوں میرے پٹھے ہیں۔ ہم تینوں اکھاڑے کی طرف جا رہے تھے۔ یہاں سے شور شرابے کی آواز سنی تو اس طرف نکل آئے۔ تمہیں اس حرامی نے کیسے گھیر لیا؟' اس نے جونہی اپنا تعارف کرایا میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ ڈیرہ غازیخان کا مشہور پہلوان غلام رسول شاہ تھا۔ میں نے ایک آدھ بار اسے کشتی لڑتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اس کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

'میں تو رفع حاجت کے لیے اس طرف آیا تھا شاہ جی۔ یہ حرامی پتہ نہیں کہاں سے میرے پیچھے لگ گیا۔'

'کوئی اناڑی لگتا ہے یہ کتے کا بچہ۔ اتنی تمیز بھی نہیں ہے اسے کہ کس پر ہاتھ ڈالنا ہے اور کس سے بچ کر نکلنا ہے۔ آج اسے اچھا سبق مل گیا۔'

'شاہ جی اس لفنگے کا دیدار تو کراؤ۔' رسول شاہ کے ایک پتلے دبلے شاگرد نے فرمائش کی۔

'اچھا اچھا صبر کرو۔ دیکھ لینا اس منحوس کی شکل بھی۔ مجھے اس تیندوے سے تو بات کر لینے دو۔ اس بدبخت کا بھی کوئی قصور نہیں۔ تو پتلون قمیض میں لگتا ہی بالکل شہری بابو قسم کی چیز ہے جو ایک جھکی میں سب جیبیں خالی کر دے گا۔ کہاں کے رہنے والے ہو تم اور اس طرف کیسے نکل آئے؟'

'میں کوٹ چھٹے کا رہنے والا ہوں شاہ جی۔ شہر میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ آج سوچا کہ مولوی مکلیت شاہ کے مزار پر حاضری بھی دے دوں۔ میں وہیں سے واپس آ رہا تھا کہ اس لفنگے سے مڈبھیڑ ہو گئی۔'

'تم نے کراٹے سیکھ رکھے ہیں بھائی؟' اسی دبلے پتلے نوجوان نے اشتیاق لہجے میں سوال کیا۔

'اوئی پاگل کے پتر یہ تجھے کراٹے کے داؤ پیچ لگ رہے تھے؟' رسول شاہ نے طنزیہ لہجے اسے جھڑک دیا پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

'یہ میرا خاص شاگرد یعقوب ہے۔ اس کی جسامت پر نہ جانا۔ سب لوگ اسے بجلی کہتے ہیں اور یہ اکھاڑے میں بجلی کی طرح کوندتا ہے۔ بہت کم اکھاڑے اس نے ہارے ہیں اور یہ دونوں نذر محمد اور ابراہیم کالیا ہیں۔ یہ دونوں بھی اکھاڑے کے شیر ہیں۔' مجھے اس کے لہجے میں فخر و ناز کی واضح جھلک نظر آئی۔

میں بظاہر خوش دلی سے ان کی باتیں سنتا رہا جبکہ میرے وجود میں بے چینی کی لہریں دوڑتی رہیں۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد وہاں سے کھسک لوں لیکن وہ مجھے مسلسل اپنی باتوں میں الجھا رہے تھے۔ میں نے کسمساتے ہوئے کہا۔

'شاہ جی مجھے دراصل ایک ضروری کام سے شہر جانا ہے۔'

'اچھا! لیکن اس کم نسل کا کیا کریں؟' رسول شاہ نے بے سدھ پڑے نقاب پوش کی طرف اشارہ

کیا۔

’اس کا کیا کرنا ہے شاہ جی۔ جو اس نے کیا‘ اس کی اسے مناسب سزا مل گئی۔ تھانے کچہری کے چکر میں پڑ کر اپنی مٹی خراب کرانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس پر لعنت بھیجیں اور اپنی منزل کی راہ لیں۔‘

’اچھا بھئی جیسی تمھاری مرضی لیکن کم از کم اس لومڑی صفت شخص کی شکل تو دیکھ ہی لیں۔‘ رسول شاہ نے کہا۔ اس کا اشارہ ملتے ہی اس کے شاگرد یعقوب بجلی نے بے ہوش شخص کے چہرے کے گرد لپٹا مف کھول دیا۔

اس شخص کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مجھے ذہنی جھٹکا لگا۔ اسے پہچاننے میں مجھے ذرا بھی دیر نہ لگی وہ دلدار تھا۔ سردار شاہ مراد کے پالتو کتوں میں سے ایک۔ گزشتہ رات ہمیں مظفر گڑھ کے قریب روکنے والوں میں یہ بھی شامل تھا۔ اسی نے شمروز کو کہا تھا کہ ہمیں فوری طور پر قتل کر دیا جائے۔ اس نے مجھے کافی قریب سے دیکھا تھا لہٰذا مجھے آج دن کے وقت میرے قدرے مختلف حلیے کے باوجود اس نے پہلی نظر میں پہچان لیا۔ یہ تو اسے معلوم ہو ہی چکا ہوگا کہ ہم تینوں ہی ان کے مطلوبہ شکار ہیں۔ اس نے میرے خلاف کوئی فوری قدم اٹھانے کے بجائے چھپ کر میرا پیچھا کرنا مناسب سمجھا تا کہ وہ ہمارے ٹھکانے تک پہنچ جائے اور پھر میرے ساتھ میرے دونوں ساتھیوں کو بھی اگلے جہان پہنچانے کا انتظام کر سکے۔

مجھے بغور دلدار کی طرف دیکھتے پا کر رسول شاہ نے پوچھا۔ ’کیوں بھائی کیا تم اسے پہچانتے ہو؟‘

’نہیں شاہ جی۔ میں بھلا اسے کیسے پہچانوں گا۔‘ میں نے جلدی سے کہا۔

’تو پھر ٹھیک ہے۔ اسے اس طرح پڑا رہنے دو۔ کچھ ہی دیر میں اسے خود بہ خود ہوش آ جائے گا۔ یعقوب تم اس کے پھٹکار زدہ منہ پر اس کا مفلر ڈال دو۔ اس کا یہ پستول بھی اٹھا لو راستے میں بڑے نالے میں ڈال دیں گے۔ سالے کو ہوش آئے گا تو اپنا سر پیٹ لے گا۔‘

یعقوب نے اس کی ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کیا۔ ’میرے ساتھ میرے اکھاڑے چل جوان میں تجھ سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔‘ رسول شاہ نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

’میں نے آپ کو بتایا ہے نا شاہ جی کہ مجھے بہت ضروری کام سے شہر جانا ہے۔ میرے پاس وقت ہوتا تو میں ضرور آپ کے ہمراہ چلتا۔‘ میں نے نرم لہجے میں کہا۔

’خیر پھر سہی۔ تجھے میرے اکھاڑے کا تو پتا ہے نا؟ نہیں پتا تو پاکستانی چوک کے پاس پہنچ کر کسی سے بھی پوچھ لینا وہ تمھیں سیدھا میرے پاس پہنچا دے گا۔ تمھیں جب بھی فرصت ملے میرے پاس ضرور آنا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔‘

میں نے نیم دلی سے اس سے وعدہ کیا۔ میرے جیسے شخص کے لیے وعدوں کی پاس داری کیسے ممکن ہے جبکہ مجھے یہی خبر نہیں ہوتی کہ میری صبح اگر یہاں ہو رہی ہے تو شام کہاں ہوگی۔

میں رسول شاہ اور اس کے پٹھوں کے ہمراہ سڑک تک آیا۔ میری آنکھوں کے سامنے ہی یعقوب بجلی نے نہایت صفائی سے دلدار کا ریوالور بڑے سے گندے نالے میں پھینک دیا۔ سیاہ رنگ کا قیمتی ریوالور سیاہ رنگ کی بے مایہ کیچڑ میں گرا۔ ایک ہلکا سا چھپاکا ہوا اور وہ اجل آفریں ہتھیار غلیظ دلدل کی تہ

میں اترتا چلا گیا۔ رسول شاہ اور اس کے شاگردوں نے نہایت گرم جوشی سے مجھ سے مصافحہ اور معانقہ کیا۔ رسول شاہ نے مجھے ایک بار پھر اپنے اکھاڑے آنے کی تاکید کی پھر وہ مجھ سے رخصت ہو کر پاکستانی چوک کی طرف روانہ ہو گئے۔

میں نہایت تیز رفتاری سے ٹریفک چوک کی جانب چل پڑا۔ ٹریفک چوک پر پہنچ کر مجھے ایک رکشا مل گیا۔ میں نے رکشے میں بیٹھ کر اسے اپنی منزل کا پتا بتا دیا۔ اگلے ہی لمحے رکشا پر ہجوم سڑک پر فراٹے بھرنے لگا۔ دلدار والے واقعے کے بعد میں خود کو بے حد غیر محفوظ محسوس کر رہا تھا۔ تمام راستے میری یہی کوشش رہی کہ میرا چہرہ لوگوں کی نظروں سے محفوظ رہے۔ ہسپتال کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے اپنے چہرے کو مزید چھپا لیا کیونکہ اس جگہ کبھی کبھار پولیس والے کھڑے رہا کرتے ہیں۔ خوش قسمتی سے راستے میں مجھے کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ فرید آباد کالونی پہنچ کر میں رکشے سے اتر گیا۔ رکشے کے وہاں سے روانہ ہو جانے کے بعد میں آگے روانہ ہوا اور تیسری گلی میں واقع ڈاکٹر رضا کی کوٹھی کی جانب مڑ گیا۔

میں نے کوٹھی کے گیٹ پر نصب کال بیل کا بٹن دبایا۔ کچھ ہی دیر بعد گیٹ کے اسپیکر میں سے ایک مردانہ آواز ابھری۔

’کون ہے؟‘ میں نے اس آواز کو فوراً پہچان لیا۔ وہ قاسم کی آواز تھی۔ میں نے نرم لہجے میں کہا۔

’دروازہ کھولو قاسم میں تمھارا بھائی جان ہوں۔‘

’آہا جی بھائی جان آ گئے۔ آہا جی بھائی جان آ گئے۔‘ میں نے قاسم کی مسرت بھری آواز سنی۔ قدرے توقف کے بعد چھوٹا گیٹ کھلا اور قاسم مجھ سے لپٹ گیا۔

’بھائی جان آپ مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے۔ میں بہت رویا تھا۔‘

’ارے اچھے بچے بھی کہیں روتے ہیں قاسم بھائی؟ دیکھو میں تمھارے پاس واپس لوٹ آیا ہوں۔ اگر تم میرے پیارے بھائی ہو تو پھر کبھی نہیں رونا۔‘

’ٹھیک ہے بھائی جان میں اب کبھی نہیں روؤں گا۔‘ قاسم نے مجھے یقین دلایا۔ ڈاکٹر رضا حسب توقع باورچی خانے میں ہی مصروف نظر آیا۔ میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو صدیقی اور مرزا نے یک زبان ہو کر سوال کیا۔

’کہاں رہ گئے تھے بھائی۔ بہت دیر لگا دی تم نے مغرب کا وقت ہوا چاہتا ہے۔‘

’میں دراصل ایک چکر میں پھنس گیا تھا اسی لیے مجھے دیر ہو گئی۔‘

’کیسا چکر بھائی؟ اور وہ تمھاری مہم کا کیا بنا؟‘

’تقریباً ناکام ہی سمجھیں۔ مینو استاد سے ملاقات نہیں ہو سکی البتہ اس کا شاگرد شرفو مجھے ملا تھا۔‘

’اس نے کیا بتایا‘ اس روز ٹرک لے کر وہ کہاں گئے تھے؟‘

’نہیں میں نے اس سے اس معاملے میں بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ایک آدھ دن میں مینو استاد واپس آ جائے گا۔ میں کل شام کو ایک بار پھر اس کا پتا کر لوں گا۔‘ میں نے صدیقی کو بتایا۔

'لیکن وہ چکر کیا تھا جس میں تم پھنس گئے تھے؟' مرزا نے سوال کیا۔ میں نے تفصیل سے انہیں بتایا کہ میرے ساتھ کیا کیا واقعات پیش آئے البتہ میں نے درمیان سے فقیر بابا کا ذکر گول کر دیا۔ میری سرگزشت سن کر ان دونوں کے چہرے پر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔

'اس کا مطلب ہے کہ تم ۔۔۔۔ بلکہ ہم تینوں بال بال بچے ہیں' وہ شخص دلدار تمھارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ جاتا تو ۔۔۔۔'

'لیکن تمھیں ٹرکوں کے اڈے پر نہیں جانا چاہیے تھا۔ تم نے یہ بے حد خطرناک حرکت کی ہے۔ یہ آنکھیں بند کر کے بھیڑیے کے بھٹ میں جا گھسنے والی بات ہے۔' مرزا نے پر تشویش لہجے میں مجھے سرزنش کی' تم ہمیں تو سمجھاتے رہتے ہو کہ اس علاقے کے چپے چپے پر سردار شاہ مراد کے بچھائے ہوئے زہریلے کانٹے بکھرے ہوئے ہیں جبکہ خود ایسی، خطرناک حرکتیں کرتے پھر رہے ہو۔'

'اچھا جناب! اس مرتبہ میری خطا درگزر کر دیں۔ آیندہ احتیاط رکھوں گا۔' میں نے اپنے کان پکڑتے ہوئے کہا۔

'اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم لوگ اپنی شکلیں مکمل طور پر تبدیل کیے بغیر قدم باہر نکالنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ ہمیں فوری طور پر میک اپ کٹ کی ضرورت ہے۔' مرزا نے کہا۔

کچھ دیر بعد قاسم آ گیا۔ ہم دونوں آپس میں چھوٹی چھوٹی بچگانہ باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں ڈاکٹر رضا نے بتایا کہ کھانا تیار ہو چکا ہے۔ ہم نے مل کر لاؤنج میں بچھی ڈائنگ ٹیبل پر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد مرزا اور صدیقی ایک بار پھر ڈرائنگ روم میں جا گھسے۔ ڈاکٹر رضا میز پر سے برتن سمیٹ کر کچن میں پہنچانے لگا۔ اس نے گلے میں سلیقہ شعار خاتون کے مانند ایپرن باندھا ہوا تھا۔ قاسم میرا ہاتھ پکڑ کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس وقت نو بجے کا خبرنامہ آ رہا تھا۔ میں خبروں کی طرف متوجہ ہوا۔ نیوز ریڈر گھمبیر آواز میں کہہ رہا تھا۔

'مقبوضہ کشمیر میں بھارتی افواج کی وحشیانہ کاروائیوں میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ بھارتی فوج نے مزید پندرہ بے گناہ کشمیریوں کو شہید کر دیا ہے۔ کشمیری مجاہدین نے جوابی کاروائی کر کے تین بھارتی فوجیوں کو ہلاک کر دیا۔ حکومت پاکستان نے بھارتی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ کشمیری باشندوں کا وحشیانہ قتل عام بند کیا جائے اور کشمیریوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حق خودارادیت دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان نے مطالبہ کیا ہے کہ بھارت پاکستان کی سرحد پر بلا جواز موجود اپنی فوج کی بھاری تعداد کو سرحدوں سے پیچھے لے جائے۔ ادھر بھارت کے وزیر خارجہ نے ایک یورپی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے دھمکی دی ہے کہ اگر پاکستان نے بھارت کے اندر اپنی دہشت گردی اور بے جا مداخلت کی کاروائیاں بند نہ کیں تو بھارت اسے مزا چکھا دے گا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ نے بھارتی وزیر خارجہ کے الزام کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان اپنے کسی بھی پڑوسی ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت پر یقین نہیں رکھتا البتہ اگر بھارتی وزیر خارجہ کا اشارہ مقبوضہ کشمیر کی طرف ہے تو اس بارے میں پاکستان کی پالیسی بالکل واضح ہے۔

ہم اہل کشمیر کی اخلاقی اور سیاسی امداد سے ہرگز گریز نہیں کریں گے۔ کشمیر کے مظلوم مسلمان ہمارے بھائی ہیں۔ انہیں بھارتی فوج کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ان کی حمایت میں ذرائع ابلاغ کے ہر پلیٹ فارم پر آواز بلند کی جائے گی۔ بھارتی حکومت کو چاہیے کہ وہ دھمکی آمیز لہجہ اختیار نہ کرے بصورت دیگر دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات کو نقصان پہنچ سکتا ہے ۔۔۔۔' ٹی وی اناؤنسر اور بھی جانے کیا کیا کہتا رہا لیکن میرا ذہن اپنی ہی سوچ میں گم ہو گیا۔ باہمی تعلقات ۔۔۔۔ اونہہ ۔۔۔۔ ایک خونی بھیڑیے سے باہمی تعلقات بلکہ خوش گوار باہمی تعلقات ۔۔۔۔ ایک ایسے بھیڑیے سے تعلقات جس کے جبڑوں سے ہمارے بھائیوں کا خون مسلسل ٹپک رہا ہے۔ جس نے بار بار ہماری ملکی سالمیت پر حملہ کیا۔ جس نے اپنے تیز دھار دانتوں سے ہماری پاک سرزمین کے دو ٹکڑے کر دیے جس کی دلی خواہش ہے کہ ہمارے پیارے ملک پاکستان کا نام دنیا کے نقشے سے کھرچ دیا جائے۔ اس کے بھیجے ہوئے مردار خور بجو اس سوہنے دیس کی بنیادیں کھودنے میں لگے ہیں جبکہ سردار شاہ مراد جیسے کفن چور غدار ان کی پرورش اور ان کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ اگر ان کا پھیلایا ہوا تار عنکبوت جلد از جلد تہس نہس نہ کیا گیا تو ہمارے پاک وطن کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ خدا نہ کرے کہ وہ وقت آئے۔

یکایک میرے کانوں میں عجیب و غریب آواز گونجی اس کے ساتھ ہی میں اپنے خیالات سے چونک پڑا۔ میں نے دیکھا کہ قاسم نے وی سی آر لگا دیا ہے اور اب ٹی وی اسکرین پر خبروں کی جگہ کارٹون فلم چل رہی ہے۔ لمبے لمبے کانوں والا ایک خرگوش چیختا چلاتا آگے بھاگ رہا تھا۔ جبکہ اپنے قد سے بھی بڑا ہیٹ پہنے ایک بندوق بردار اس پر دھڑا دھڑ گولیاں برسا رہا تھا۔ میں نے ہلکی سی ناگواری محسوس کی۔

'قاسم بھائی تم نے وی سی آر کیوں لگا دیا۔ ٹی وی پر خبریں آ رہی تھیں۔'

'مجھے خبریں اچھی نہیں لگتیں۔' اس نے بھرپور معصومیت کے ساتھ کہا۔ اس کے ساتھ ہی میری ناراضگی بھاپ بن کر اڑ گئی۔ مجھے یاد آ گیا کہ وہ سمجھدار نوجوان نہیں بلکہ ایک معصوم بچہ ہے۔

'قاسم بھائی تمھیں خبریں کیوں اچھی نہیں لگتیں؟' میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

'بس یہ میری سمجھ میں ہی نہیں آتیں۔'

'اچھا تو تمہیں کارٹون پسند ہے لیکن قاسم بھائی تم بچے تو نہیں ہو جو کارٹون فلمیں دیکھتے ہو۔' قاسم نے حیرانی اور الجھن آمیز انداز میں میری طرف دیکھا۔

'مم ۔۔۔۔ میں بچہ ہی تو ہوں!' اس نے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا۔

'نہیں قاسم بھائی تم بچے نہیں ہو۔ بچے تو چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ تم تو بڑے ہو چکے ہو۔ تم تو اب ماشاء اللہ اب جوان ہو چکے ہو۔'

'میں جوان ہو چکا ہوں؟' اس نے حیرانی سے پوچھا پھر اس نے نہایت سعادت مندی سے میری بات مان لی۔ 'ہاں میں جوان ہو چکا ہوں۔'

'تم جوان ہو چکے ہو تو پھر جوانوں کی طرح رہا کرو۔ یہ کارٹون وغیرہ تو بچے دیکھا کرتے ہیں۔'

'اچھا میں آیندہ کارٹون بھی نہیں دیکھوں گا۔ ٹھیک ہے بھائی جان؟'

'ہاں تم میرے بہت اچھے بھائی ہو'میری تمام باتیں مانتے ہو۔'

قاسم کچھ دیر تک ٹی وی دیکھتا رہا پھر وہ میری گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ مجھے اس پر بے حد پیار آیا۔ میرے دل سے اس کے لیے بے شمار دعائیں نکلنے لگیں۔ اے میرے پاک پروردگار اس معصوم روح کی گم گشتہ نوجوانی اسے عطا کر دے۔ اس دنیا کے مسیحاؤں کی نظر میں تو یہ ناممکن امر ہے لیکن تو'تو سب سے بڑا شفا دینے والا' کارساز ہے۔ تیرے لیے یہ کیا مشکل ہے ۔۔۔۔ شدت جزبات سے مجھے اپنا دل پگلتا محسوس ہوا۔ میری آنکھ سے آنسو ٹپکا اور میری قمیض میں جذب ہو گیا۔

دفعتاً میری قیمص کی جیب سے تیز مہک پھوٹنے لگی۔ یہ گلاب اور مشک کی ملی جلی خوشبو تھی۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہوئی۔ کیا یہ ذات باری کی طرف سے کوئی اشارہ ہے؟ عین اسی وقت قاسم نے کسمساتے ہوئے پوچھا۔

'بھائی جان یہ خوبشو کہاں سے آ رہی ہے؟' میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ہاں شاید میرا خیال درست ہے۔ میری حقیر دعا کو شرف قبولیت مل چکا ہے۔ میرے آنسوؤں نے اس نوجوان کی قسمت پر چھائی سیاہی کو دھندلا دیا ہے۔

'قاسم بھائی تمھیں پھول پسند ہیں نا؟' میں نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔

'ارے آپ کو کیسے پتا چلا؟' اس نے معصومیت سے سوال کیا۔

'میں تمہارے لیے پھولوں کا ہار لایا ہوں۔ تم اسے گلے میں پہنو گے نا؟'

'ہاں ہاں میں ہار گلے میں پہنوں گا۔' قاسم نے مسرور لہجے میں کہا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ 'کہاں ہے وہ ہار؟ مجھے پہنایئے نا!'

میں نے اپنی جیب سے پھولوں کے ہار کی چھوٹی سی پوٹلی نکالی۔ جوں ہی پوٹلی جیب سے باہر نکلی۔ خوشبو مزید بڑھ گئی۔ میں نے دیکھا کہ قاسم حیرانی اور مسرت کے ملے جلے تاثرات سے اس پوٹلی کو تک رہا ہے۔ میں نے گلاب کے سوکھے ہوئے پھولوں کا ہار رومال سے نکالا۔ قاسم کے چہرے پر ہلکی سی مایوسی ابھر آئی۔

'ارے یہ پھول تو سوکھے ہوئے ہیں۔ یہ تو پیارے پیارے بھی نہیں ہیں۔ میں اس ہار کو گلے میں نہیں ڈالوں گا۔ یہ تو اچھے نہیں ہیں۔'

'ایسا نہیں کہتے ہیں قاسم بھائی۔ کیا تر و تازہ اور خوبصورت پھول ہی محبت کے قابل ہوتے ہیں؟ ہر پھول کو بالآخر مرجھانا اور پھر سوکھنا ہی ہوتا ہے۔ یہ تو دیکھو یہ بدشکل اور بدرنگ ہونے کے باوجود خوبشودار تو ہیں۔ یہ اب بھی اپنی خوشبو سے تمھارے وجود کو مہکانا چاہتے ہیں۔ ترو تازہ پھولوں کا پرستار تو ہر شخص ہوتا ہے۔ کوئی تو ہو جوان جان بلب گلابوں کا مسیحا بنے۔' میں جانے کیوں خود بخود جذباتی ہوتا چلا گیا۔

قاسم نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ 'پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی جان۔

میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'

'تم میرے کہنے پر اس ہار کو گلے میں ڈال لو قاسم بھائی۔ خدا نے چاہا تو تم سب کچھ سمجھنے کے قابل ہو جاؤ گے۔'

'آپ کہتے ہیں تو میں اسے گلے میں پہن لیتا ہوں۔' اس نے سعادت مندی سے گردن جھکا دی۔ میں نے نہایت احتیاط سے وہ ہار اس کے گلے میں پہنا دیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ڈاکٹر رضا نے یہ ہار اس کی گردن میں دیکھ لیا تو شاید وہ پوچھ گچھ کرے اور اسے توڑ کر پھینک دے۔ اس جیسے مکمل طور پر دنیا دار شخص کو بھلا کیا معلوم کہ انسان کے جسم کے علاوہ اس کی روح کو بھی علاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ جسمانی بیماریوں کا علاج دنیاوی دواؤں سے ہو سکتا ہے لیکن روحانی بیماریوں کے لیے صرف اور صرف روحانی علاج ہی کارگر ہو سکتا ہے۔

'قاسم بھائی اس ہار کو اپنی قمیض کے نیچے کر لو تا کہ اس کی خوشبو تمھارے دِل میں اچھی طرح جذب ہو جائے۔'

'اچھا بھائی جان۔' قاسم نے حسب عادت خوشی خوشی میری یہ بات بھی مان لی۔ اب وہ ہار بالکل نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر میری گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

'بھائی جان میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ آپ میرے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ اس نے پیار بھرے لہجے میں درخواست کی۔ میں بڑی نرمی سے اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ بالآخر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی آنکھ لگے ابھی چند ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ ڈاکٹر رضا تمام کام سے فارغ ہو کر آ گیا۔ اس نے آتے ہی قاسم کو جھنجوڑنا شروع کر دیا۔

'قاسم ۔۔۔۔ قاسم اٹھو۔ اپنے کمرے میں جا کر سوؤ۔' مجھے اس کی یہ حرکت قدرے ناگوار گزری۔

'ڈاکٹر صاحب اسے مت اٹھایئے۔ آج رات یہ میرے پاس سو جائے گا۔ کیوں اس کی نیند خراب کرتے ہیں؟' ڈاکٹر رضا نے مجھے سرد نظروں سے گھورا۔

'آپ اس معاملے میں دخل نہ دیں بھائی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے اس کے کمرے میں سونے کی عادت ڈالی ہے۔' اس کے لہجے میں عجیب سی تلخی تھی۔ قاسم کچھ دیر تک کسمساتا رہا بالآخر اسے جاگنا پڑا۔ 'قاسم اٹھو۔ اپنے کمرے میں چلو۔'

'نہیں نہیں میں بھائی جان کے پاس سوؤں گا۔ آپ جائیں۔ میں آج بھائی جان کے پاس سوؤں گا۔' اس نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر رضا کے چہرے پر خشونت کے آثار ابھر آئے۔ 'قاسم میں جو کہہ رہا ہوں اس پر شرافت سے عمل کرو۔ اپنے کمرے میں جاؤ اور چپ چاپ سو جاؤ۔ تمھارے ہاتھ پیر گرم ہو رہے ہیں۔ میں تمہیں بخار کی دوا دوں گا۔' قاسم نے ملتجی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

ان باپ بیٹے کے بیچ میں بھلا کیا کہتا؟ میری جانب سے کوئی ردعمل نہ پا کر اس کے چہرے پر مایوسی کے آثار ابھر آئے۔ 'اچھا پاپا میں اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔ آپ بھائی جان کو جانے نہ دینا۔'

'اچھا تم جاؤ اپنے کمرے میں۔ ابھی کچھ دیر میں' میں بھی آتا ہوں۔' ڈاکٹر رضا نے تلخ لہجے میں کہا پھر اس نے بے مہری سے میری طرف دیکھا۔

'اگر اجازت ہو تو میں بھی اوپر جا کر سو جاؤں؟' اس کے لہجے میں طنز اور تلخی گھلی ہوئی تھی۔ میں اثبات میں گردن ہلانے کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کا لہجہ مجھے ناموس سا محسوس ہوا۔ جیسے وہ میری شکل سے بیزار ہو چکا ہو۔ اس کا رویہ دیر تک میرے ذہن میں چھبتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ وہ پاؤں زور زور سے پٹختا ہوا زینہ چڑھ رہا ہے۔

میں اسی کے متعلق سوچتا ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ صدیقی اور مرزا نے مجھے دیکھا اور یک زبان ہو کر کہا۔

'آؤ بھائی آؤ۔' میں خاموشی سے ان کے پاس جا بیٹھا۔

'بھر گیا تمھارا جی کارٹونوں سے؟ اور وہ ڈاکٹر رضا اور قاسم کہاں ہیں؟' میں جواب میں خاموش رہا۔ صدیقی نے میرے چہرے سے میری کیفیت کا اندازہ لگا لیا۔

'خیریت تو ہے بھائی؟ کیا بات ہو گئی؟'

'بس صدیقی صاحب اب ہم لوگ یہاں نہیں ٹھہریں گے۔ کل صبح ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔' میں نے پژمردہ لہجے میں کہا۔

'لیکن مرزا کا زخم۔۔۔۔ ارے بھئی کچھ بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے؟'

'ابھی ڈاکٹر رضا نے نہایت تلخ لہجے میں مجھ سے بات کی ہے۔ شاید وہ اس زبردستی کی مہمان داری سے تنگ آ چکا ہے۔ شاید وہ قاسم سے میرا بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔'

'ایسا ہے تو ایسے ہی سہی۔ ہمیں تو یہاں سے جانا ہی ہے۔ تو چلو صبح ہی سہی۔ اسے اس طرح کا رویہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس نے خود ہی ہمیں رکنے کے لیے کہا تھا کہ اس کا بیٹا ہمارے آنے سے بہت خوش ہے۔ اب شاید اسے اپنے بیٹے کی خوشی کی پروا نہیں رہی۔' صدیقی نے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔

'چھوڑیے صدیقی صاحب کیوں اپنا جی جلاتے ہیں بعض لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں جو ہر وقت اپنے چہرے پر خوش اخلاقی کا نقاب چڑھائے رکھتے ہیں لیکن ان کا اصل چہرہ زیادہ عرصے تک نقاب کے پیچھے نہیں چھپا رہ سکتا۔ آپ لوگ سونے کی کوشش کریں۔ کل علی الصباح ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔'

'ہاں میرے خیال میں یہی ہمارے لیے بہتر ہے۔' مرزا نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ اس کے بعد ہم تینوں کے درمیان خاموشی حائل ہو گئی۔ میں دیر تک ڈاکٹر رضا کے اس غیر متوقع رویے کے بارے میں سوچتا رہا۔ جونہی مجھے اس کا لہجہ یاد آتا' میں بے چین سا ہو اٹھتا۔ میرا دل چاہتا کہ ابھی اس گھر پر لعنت

بھیج کر یہاں سے چل دوں۔ سوچتے سوچتے جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

'مجھے سوئے ہوئے تین گھنٹے ہوئے ہوں گے کہ اچانک کسی نے مجھے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ وہ مرزا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی وحشت کو دیکھ کر میں بری طرح چونک پڑا۔ 'کیا ہوا مرزا صاحب خیریت تو ہے؟'

'مجھے نہیں معلوم۔ مجھے صدیقی نے جھنجوڑ کر جگایا ہے۔ اس نے مجھے کہا کہ میں تمھیں فوری طور پر جگا دوں۔ ہمیں فوراً یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ وہ بے حد حواس باختہ ہو رہا ہے۔' مرزا نے مجھے بتایا۔

'ایسی کیا مصیبت آ گئی کہ۔۔۔۔' عین اسی وقت صدیقی ہانپتا ہوا ڈرائینگ روم میں داخل ہوا۔

'چوٹ ہو گئی ذوالفقار علی خان! ڈاکٹر رضا اپنے بیٹے سمیت گاڑی میں نکل بھاگا ہے۔ کوٹھی کا گیٹ چوپٹ کھلا پڑا ہے۔'

'کیا کہا؟' میرا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

☆O☆

"حیرانی اور پریشانی ظاہر کرنے کی مہلت ہمارے پاس نہیں ہے بھائی۔ فٹافٹ یہاں سے نکل چلو۔ اس سے پہلے کہ ہمارے پرستار ہماری پزیرائی کے لیے آ پہنچیں۔" صدیقی نے اپنی تمام تر پریشانی ایک پھیکی مسکراہٹ کے عقب میں چھپاتے ہوئے کہا۔ اس مشکل صورت حال میں اس کے لہجے کی شگفتگی نے ہمارے جھلستے ہوئے کشیدہ اعصاب پر ٹھنڈی پھوار کا کام کیا۔ مرزا اور میں فوری طور پر حرکت میں آ گئے۔ میں نے مرزا کو کوٹ پہنایا تو اس کے حلق سے بے اختیار ایک کرب ناک کراہ خارج ہوئی۔ صدیقی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ "مرزا کیا تمھارے شانے میں زیادہ تکلیف ہے؟"

"ویسے تو زیادہ درد نہیں ہوتا لیکن جب میں ہاتھ ہلاتا ہوں تو زخم میں زبردست ٹیس اٹھتی ہے۔" مرزا نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

'اس کا مطلب ہے زخم کی حالت ابھی تک تسلی بخش نہیں ہے۔ خیر ابھی یہاں سے تو نکلیں۔ اس کے بعد کا اللہ مالک ہے۔' صدیقی نے کہا۔ اس کی ایم پی فائیو سب مشین گن مرزا نے اپنے کوٹ میں چھپا لی۔

ڈاکٹر رضا کی کوٹھی سے باہر آنے کے بعد ہم نے کوٹھی کے گیٹ کے پٹ بھیڑ دیے۔ ہم تینوں تیز رفتاری سے سڑک کی طرف بڑھنے لگے۔ ہم تینوں کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ ہم اتنی افراتفری میں نکلے تھے کہ مجھے اپنے اسپورٹس شوز کے فیتے بھی صحیح طرح کسنے کا موقع نہیں ملا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ ڈاکٹر رضا سیدھا پولیس تھانے پہنچا ہوگا۔ اس کی کوشش یہی رہی ہوگی کہ وہ خاموشی سے اپنے بیٹے کے ساتھ وہاں سے نکل بھاگے لیکن پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ گاڑی کے انجن کی آواز کی وجہ سے یہ معاملہ خفیہ نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے اس نے نہایت پھرتی کا مظاہرہ کیا۔

'گاڑی کے انجن کی آواز سن کر میں فوری طور پر چوکنا ہو گیا لیکن جب تک میں صورت حال کو پوری طرح سمجھ کر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر جھانکتا۔ وہ گاڑی لے کر ہوا ہو گیا۔' صدیقی نے

قدرے شرمندہ لہجے میں کہا۔ ’ہم تینوں کے درمیان جو خفیہ معاہدہ ہوا تھا‘ اس کی رو سے صدیقی کو رات کے آخری حصے میں جاگتے رہنا تھا لیکن شاید ہر طرح سے مطمئن ہونے کے باعث وہ کسی قدر تساہل کا شکار ہوگیا۔ اس کی آنکھ لگ گئی ہوگی ورنہ اسے ڈاکٹر رضا کی خفیہ کاروائی کی کچھ نہ کچھ بھنک ضرور مل جاتی تاہم میں نے اس سے باز پرس نہ کی۔ ویسے بھی سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنا حماقت ہی ہوتی۔

پھر میرا ذہن ایک اور مسئلہ میں الجھ گیا۔ اب ہم لوگ کہاں پناہ لیں؟ کون سی جگہ ہے جو ہمیں پولیس اور سردار شاہ مراد کے مشترکہ ہانکے سے بچا سکے؟ صدیقی اور مرزا اس شہر میں بالکل اجنبی تھے۔ لہٰذا مجھے ہی کسی مناسب ٹھکانے کو تلاش کرنا تھا۔ مرزا اور صدیقی میرے آگے آگے چل رہے تھے۔ گلی کے کنارے پہنچ کر وہ دونوں ٹھہر گئے۔ سامنے ہی کالج روڈ کی چمک دار سیاہ سڑک تھی۔ فیصلے کی ذمہ داری ایک بار پھر مجھ پر آن پڑی۔ دائیں ہاتھ پر شہر واقع تھا جبکہ بائیں ہاتھ پر کالج اور اس کے بعد ڈانٹ کا پل آجاتا۔ اس خطرناک صورت حال میں شہر کی جانب بڑھنا موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہوتا۔ جب تک ہم اسپتال کی چورنگی تک پہنچتے‘ ایک طرف صبح کا اجالا پوری طرح پھیل جاتا تو دوسری طرف پولیس والے شاید آدھے ہی راستے میں ہمیں دبوچ لیتے۔ اس کے بعد ایک زبردست پولیس مقابلہ ہوتا اور پھر......

’کس طرف چلنا ہے ذوالفقار بھائی؟‘ صدیقی نے بے چین لہجے میں میرے کان میں سرگوشی کی۔ میں نے بلاتوقف کہا۔

’بائیں طرف......لیکن نہایت احتیاط کے ساتھ۔‘ ان دونوں نے کوئی سوال کیے بغیر میری ہدایت پر عمل کیا۔

ہم تینوں کالج کی سمت میں حتی الامکان تیزی سے چلنے لگے۔ البتہ میں نے اس دوران میں رہنمائی کی ذمے داری سنبھال لی۔ میں ان دونوں سے تقریباً پچاس گز آگے چل رہا تھا۔ بظاہر میں ان سے قطعاً لاتعلق تھا۔ اس وقت تک کالج روڈ پر زندگی کے کچھ آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ میں نے دو تین سائیکل سواروں کو دیکھا جو پیتل کے بڑے بڑے مٹکوں میں دودھ لیے شہر کی طرف رواں دواں تھے۔ ان کا تعلق موضع گدائی‘ پائیگاہ اور دیگر نزدیکی بستیوں سے رہا ہوگا۔ اس کے علاوہ مجھے اونٹوں کی ایک لمبی سی قطار بھی نظر آئی۔ ان پر بھوسا لدا ہوا تھا۔ میری نظریں بے قراری کے عالم میں اپنے آس پاس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وقتاً فوقتاً میں عقب کا بھی جائزہ لے لیتا۔ اگر مجھے ذرا بھی خطرہ محسوس ہوتا تو میرا کولٹ پستول بلاتوقف گولیاں اگلنے لگتا۔

کچھ ہی دیر بعد اذان سحر کا وقت ہوگیا۔ دور و نزدیک کی مسجدوں سے اذان کی آوازیں ہمارے کانوں میں آنے لگیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ہمارے پاس اپنے لیے مناسب ٹھکانا ڈھونڈنے کا بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ دن کی روشنی میں تو ہمارا شکار بچوں کا کھیل ثابت ہوتا۔ اب تو وہ لوگ ہماری شکلوں اور ہمارے حلیوں سے حتمی طور پر آگاہ ہو چکے ہوں گے۔ اب تو ہم الگ الگ بھی پہچان لیے جائیں گے۔ بہتر ہے کہ اپنے حلیے اور شکل و صورت میں ممکنہ حد تک تبدیلی کرلی جائے۔ یہ سب سوچ کر میں نے اپنے

لبوں پر چپکی ہوئی موٹی سی مونچھوں کو پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔ ہلکے سے کھنچاؤ اور تکلیف کے بعد مونچھیں اکھڑ کر میرے ہاتھ میں آگئیں۔ انہیں پتلون کی جیب میں رکھنے کے بعد میں نے اپنی انگلیوں سے اوپری لب کے اور ناک کے درمیانی حصے کو اچھی طرح رگڑا جس کے باعث وہاں سے رواں اور خصوصی قسم کا چپکنے والا سلوشن بھی پوری طرح صاف ہوگیا۔ میرا شیو خاصا بڑھ چکا تھا لیکن ابھی تک داڑھی مونچھ کی شکل نہیں اختیار کر سکا تھا۔ ویسے بھی میری مونچھوں اور داڑھی کے بال سنہری مائل بھورے ہونے کے باعث میری بڑھی ہوئی شیو بھی بدنما محسوس نہ ہوتی تھی۔

مونچھوں سے نجات حاصل کرنے کے بعد میں نے اپنے نتھنوں میں پھنسے اسپرنگ بھی نکال لیے۔ اب میں اپنی اصل شکل و صورت میں تھا۔ میں نے مڑ کر صدیقی اور مرزا کی طرف دیکھا۔ صبح کے دھندلے اجالے اور بجلی کے کھمبوں میں نصب لائٹوں کی ملی جلی روشنی میں ان دونوں نے میرے چہرے پر رونما ہونے والی تبدیلی کو دیکھ لیا۔ صدیقی نے سر ہلا کر میرے اس عمل کی تائید کی۔ کچھ دور مزید آنے کے بعد میں نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے صدیقی کے چہرے پر سے داڑھی غائب نظر آئی۔ اس کے چہرے پر اب صرف اس کی اپنی اصلی مونچھیں تھیں۔ مرزا کا میک اپ ذرا پیچیدہ تھا۔ اسے اتارنے کے لیے شاید ہمیں خاص کیمیکل کی ضرورت پیش آتی۔

جب تک ہم کالج والے سہ راہے پر پہنچے صبح کی گدلی چادر میں مزید نکھار آگیا۔ اس مرحلے پر ایک بار پھر میرے ذہن میں سوالیہ نشان ابھرا۔ اب ہم کس طرف جائیں؟ میرے قدم خود بخود ٹھہر گئے۔ کچھ ہی دیر میں صدیقی اور مرزا بھی میرے پاس پہنچ گئے۔ ’مرزا کو طبی امداد کی ضرورت ہے ذوالفقار بھائی۔ اس کی ہمت کسی وقت بھی جواب دے سکتی ہے۔‘ صدیقی نے گھمبیر لہجے میں میرے کان میں کہا۔ مجھے اپنے وجود میں اضطراب کی لہریں دوڑتی محسوس ہوئیں۔ اسی لمحے میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ ماڈل ٹاؤن! ڈیرہ غازیخان کی جدید ترین نوتعمیر شدہ بستی۔ شاید وہاں ہمیں کسی ڈاکٹر کی کوٹھی یا بنگلہ بھی نظر آجائے۔ ڈاکٹر رضا کے مانند۔

میں نے صدیقی اور مرزا کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور خود بائیں طرف جانے والی سڑک پر مڑ گیا۔ سامنے ہی چوراہا تھا۔ یہ سڑک سیدھی جا کر بائیں ہاتھ پر مڑتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس پر ضلعی اور ڈویژنل سرکاری حکام کے بنگلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ کمشنر‘ ڈپٹی کمشنر‘ ایس ڈی ایم‘ ڈی آئی جی وغیرہ وغیرہ ان سب کے دروازوں کے سامنے مسلح پولیس والوں کا جمگھٹا تعینات ہوتا۔ اس خطرناک علاقے سے پہلو بچاتے ہوئے ہم بائیں طرف والی سڑک پر مڑ گئے۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ماڈل ٹاؤن کے قریب پہنچے۔

دائیں طرف ماڈل ٹاؤن کی خوبصورت بستی تھی۔ یہاں چھوٹے بڑے پختہ مکان بھی تھے اور جدید قسم کے بنگلے اور کوٹھیاں بھی۔ سڑک نما گلیوں کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم آگے بڑھتے گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم کون سی گلی میں مڑیں۔ کئی گلیاں پیچھے چھوڑنے کے بعد بالآخر میری نظروں نے اپنے مطلب کی جگہ ڈھونڈ ہی نکالی۔ یہ سڑک کے رخ پر ذرا الگ تھلگ واقع ایک چھوٹا سا

خوبصورت بنگلہ تھا۔ جالی دار گیٹ سے ہمیں سامنے ہی ایک چھوٹا سا سرسبز لان نظر آیا۔ مجھے ٹھہرتے دیکھ کر مرزا اور صدیقی بھی رک گئے۔ انہیں میری نگاہوں کا مرکز تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ گیٹ کے پاس لگی ہوئی چمک دار تختی نے انہیں بتا دیا کہ یہ ایک ڈاکٹر کا گھر ہے۔ ایک لیڈی ڈاکٹر کا'

صدیقی نے قدرے پژمردہ لہجے میں پوچھا۔ 'کیا یہاں بھی ہمیں وہی کچھ کرنا ہوگا جو..........'

'ہاں فی الحال ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔'

'اچھا بھئی جیسے تمھاری مرضی.....' صدیقی کے لہجے میں مایوسی کا بھرپور تاثر تھا۔

اس کے اس انداز نے مجھے ہلکے سے احساس جرم میں مبتلا کر دیا۔ اپنے مطلب کے لیے کسی معصوم اور بے ضرر شہری کو ذہنی اور جسمانی آزار میں مبتلا کرنا کوئی قابل تعریف فعل تو نہیں ہوتا۔ میرے جی میں آئی کہ وہیں سے پلٹ پڑوں اور اپنے لیے کوئی ایسا ٹھکانہ ڈھونڈوں جہاں ہماری ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ اچانک مرزا کی سنجیدہ اور گھمبیر آواز نے مجھے اپنا خیال تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔

'جذباتی مت بنو صدیقی حالت جنگ اور دیگر ہنگامی حالات میں روزمرہ کے قوانین اور ضوابط معطل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح ایسے مواقع پر اخلاقی اور سماجی پابندیوں پر بھی بعض اوقات سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ ہم لوگ بھی حالت جنگ میں ہیں لہٰذا ہمیں تکلفات کو نظر انداز کرنا پڑے گا۔ اپنے ملک اور قوم کی سلامتی کے لیے کسی ایک یا چند افراد کا چین و آرام متاثر ہونا کوئی غیر معمولی صورت حال نہیں ہے۔' مرزا کی بات سن کر صدیقی کے چہرے پر موجود تناؤ اور مایوسی کے تاثرات رفتہ رفتہ دور ہوتے چلے گئے۔

صدیقی نے پرسکون لہجے میں سوال کیا۔ 'یہاں بھی تم بات کرو گے یا میں؟'

'میرے خیال میں میرا بات کرنا زیادہ بہتر رہے گا۔ آپ کے لہجے سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کا تعلق اس علاقے سے نہیں ہے۔' ان دونوں نے سر ہلا کر میری رائے سے اتفاق کیا۔

میں نے گیٹ کے ساتھ نصب اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ پہلی گھنٹی پر کسی قسم کا ردعمل نظر نہ آیا۔ میں نے صدیقی پر نظر ڈالی۔ اس نے مرزا کو سہارا دے رکھا تھا۔ قدرے توقف کے بعد میں نے دوبارہ بٹن پر دباؤ ڈالا۔ اس مرتبہ میں نے نسبتاً زیادہ دیر تک بٹن پر دباؤ برقرار رکھا۔ ایک بار پھر ہم کسی کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ بالآخر بنگلے کے پہلو میں کوئی دروازہ کھلا۔ میری نظریں اس طرف مبذول ہو گئیں۔

چند لمحوں بعد اس طرف سے ایک لڑکی نمودار ہوئی۔ اس کے جسم پر ایک ڈھیلا ڈھالا سا لبادہ تھا جس نے اس کے شباب کی بلندیوں کو کند کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کی چال میں مجھے ایک عجیب سی لچک اور سرمستی نظر آئی جیسے وہ کسی زود اثر نشے میں چور ہو۔ شاید قیامت خیز شباب کے نشے میں! جوں جوں وہ میرے نزدیک آتی گئی میری نظروں کی تشنگی بڑھتی گئی جیسے میری آنکھیں اس کے جلوؤں کا پوری طرح احاطہ نہ کر پا رہی ہوں۔ جیسے وہ حسن کے اس نادر شاہکار کا تاثر بھرپور طریقے سے میرے دماغ تک نہ پہنچا پا رہی ہوں۔ پہلی نظر میں وہ مجھے انیس بیس سال کی نوجوان لڑکی نظر آئی لیکن جب وہ میرے روبرو پہنچی تو مجھے معلوم ہوا کہ میرا ابتدائی تاثر غلط ہے۔ وہ تقریباً تیس برس کی بھرپور جوان عورت تھی۔ وہ نو شگفتہ کلی نہیں

بلکہ پختہ رس سے لبریز پھل تھا۔

'جی فرمایئے آپ کو کس سے ملنا ہے؟' اس کی کھنک دار آواز مجھے دوبارہ حقیقت کی دنیا میں لے آئی۔ اس کے لہجے میں درشتی اور طنز کی ہلکی سی جھلک نمایاں تھی۔

'وہ جی......وہ جی ہمیں ڈاکٹر صاحبہ سے ملنا ہے۔' میں نے گڑبڑا کر کہا۔

'جی فرمایئے میں ہی ڈاکٹر صنم خان ہوں۔' اس نے اس بار قدرے نرم لہجے میں کہا۔ مجھے اس کی بات سن کر ہلکی سی حیرانی ہوئی۔ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ پچاس پچپن سال کی خرانٹ بڑھیا ہوگی۔

'وہ جی ڈاکٹر صاحبہ میرے والد صاحب کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ آپ براہ کرم ان کا معائنہ کر لیں۔' میں نے لجاجت بھرے لہجے میں درخواست کی۔

'میرے خیال میں آپ اتنا تو ضرور پڑھنا جانتے ہوں گے کہ میرے گھر کے گیٹ پر لگی نیم پلیٹ پڑھ سکیں۔ اس پر صاف لکھا ہوا ہے کہ میں خواتین کے امراض کی ماہر ہوں اور صرف خواتین کا علاج کرتی ہوں۔ آپ کوئی سواری پکڑیں اور اپنے والد صاحب کو فوراً سرکاری اسپتال لے جائیں۔' اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ مجھے اس کی بات سن کر غصہ آنے لگا۔ اس نے ابھی تک گیٹ کھولنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے اپنے لہجے کو مزید عاجزانہ بناتے ہوئے کہا۔

'آپ کا کہنا صحیح ہے ڈاکٹر صاحبہ لیکن میرے والد کو فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ ان کی حالت جیسے ہی بہتر ہوئی ہم انہیں فوراً اسپتال لے جائیں گے۔ ہم پر مہربانی کریں ہم آپ کو منہ مانگی فیس دیں گے۔' اس نے ایک اچٹتی سی نظر مرزا پر ڈالی وہ بہترین اداکاری کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن ڈاکٹر صنم خان اس کی حالت سے زیادہ متاثر نظر نہ آئی۔ اس نے بے نیازی سے کہا۔

'کیا فیس دے سکتے ہیں آپ مجھے؟' اس دوران میں اس کی چمک دار آنکھیں سر سے پیر تک میرا جائزہ لیتی رہیں۔ اس کی نگاہوں کی چبھن سے مجھے شدید بے چینی محسوس ہوئی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے میں کوئی فاختہ ہوں جسے وہ شکرے کی مانند اپنے خونخوار پنجوں میں دبوچ لے گی۔ میں نے اس سے آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔

'فیس کی آپ فکر نہ کریں ہزار، دو ہزار، پانچ ہزار جتنی رقم آپ مانگیں گی ہم آپ کو دیں گے لیکن خدا کے لیے مزید دیر نہ کریں۔' اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ اس کی تیز دھار نظریں بدستور میرے چہرے پر جمی رہیں پھر اس کے گلابی لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

'ٹھیک ہے میں ان کا معائنہ کر لیتی ہوں لیکن یاد رہے آپ نے منہ مانگی فیس کا وعدہ کیا ہے۔' میں نے اپنے دل میں کہا کہ تم ایک بار اپنے گھر میں گھسنے کا موقع تو دو محترمہ..... ہم تمھیں ایسی 'فیس' دیں گے کہ تمام عمر یاد رکھو گی۔ اسی اثنا میں مرزا کی کراہوں میں شدت آ گئی۔ صدیقی اسے سہارا دے کر اس کا سینہ سہلانے لگا۔

ڈاکٹر صنم نے اپنے گاؤن کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کنجی نکالی اور گیٹ کے چھوٹے دروازے کا قفل کھول دیا۔ صدیقی اور میں مرزا کو سہارا دے کر اندر داخل ہوئے۔ چھوٹے دروازے کو دوبارہ مقفل

کر کے وہ مورنی کی چال چلتی بنگلے کی اصل عمارت کی طرف بڑھی۔ میں کوشش کے باوجود اپنی نظریں اس کے دلکش وجود پر سے نہ ہٹا سکا۔ داخلی دوراز ے کے پاس پہنچ کر وہ ٹھہر گئی۔

'آپ لوگ یہاں ٹھہریں میں اندر سے لاک کھولتی ہوں۔ دراصل میں اپنے گھر میں تنہا رہتی ہوں۔ کوئی نوکر وغیرہ بھی نہیں ہے میرے پاس۔' صدیقی نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ڈاکٹر صنم کے وہاں سے ہٹتے ہی مرزا کی کراہیں بند ہوگئیں۔ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

'بڑی پہنچی ہوئی چیز لگتی ہے یہ حرافہ۔ اس کے ڈنک سے بچ کر رہنا۔' صدیقی اور میں نے اثبات میں سر ہلا کر اس کی تائید کی۔

'آیئے جناب اندر آجایئے۔' ڈاکٹر صنم نے دروازہ کھول کر ہمیں اندر آنے کی دعوت دی۔ سب سے پہلے صدیقی مرزا کو سہارا دے کر اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے میں تھا۔ میں نے اپنے عقب میں دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ ڈاکٹر صنم میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ یک لخت اس نے اپنی رفتار تیز کی اور میرے عقب میں مجھ سے بہت کم فاصلے پر چلنے لگی۔ مجھے اس کی گرم گرم نم آلود سانسیں اپنی گردن کی پشت پر محسوس ہوئیں۔ اگر میں اپنی رفتار سست کرتا یا ٹھہرتا تو وہ یقیناً مجھ سے ٹکرا جاتی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو شاید اس کی دلی مراد بر آتی۔ میں گردن موڑ کر اس پر ایک نظر ڈالنے کی جرات بھی نہ کر سکا۔ بجائے اس کے میں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ وہ بے حد دھیمی آواز میں ہنس دی۔ اس کی ہنسی میں جانے کیا بات تھی کہ مجھے بے اختیار جھرجھری سی آگئی۔

صدیقی نے مرزا کو لاؤنج میں بچھے دیوان نما صوفوں میں سے ایک پر بٹھا دیا۔ وہ فوراً کراہتے ہوئے صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ 'میں لباس بدل کر اور میڈیکل بکس لے کر ابھی آتی ہوں۔' ڈاکٹر صنم نے ایک ادا سے کہا اور شاخ گل کے مانند لچکتی ایک کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ میں نے مرزا اور صدیقی کی طرف دیکھا۔ ان دونوں نے بہ یک وقت مجھے پرسکون رہنے کا اشارہ کیا۔ میں محض اپنے پستول کے دستے پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ ڈاکٹر صنم کے کمرے میں داخل ہوتے ہی صدیقی نے مرزا سے سب مشین گن لے کر اپنے صوفے کے گداز کشن کے نیچے چھپا دی۔ میں بارک بین نظروں سے آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ ڈاکٹر صنم کا وہ ایک منزلہ مختصر سا بنگلہ نفاست اور خوبصورتی کا شاہکار تھا۔ میں نے ایک نظر میں اندازہ لگا لیا کہ ڈاکٹر صنم بے حد خوش ذوق اور نفاست پسند عورت ہے۔ اس نے پورے گھر کو بے حد قیمتی اور نایاب سامان آرائش سے سجا رکھا تھا۔ سب سے پہلے میں نے شیشے کی خوبصورت تپائی پر رکھے نازک سے ٹیلی فون کا جائزہ لیا۔ تھوڑی سی کوشش سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس ٹیلی فون کا کوئی اور کنکشن نہیں ہے۔

ڈاکٹر صنم نے واپسی میں اچھی خاصی دیر لگا دی۔ میں بے قراری سے بار بار پہلو بدلتا رہا۔ عین اس وقت جب میرے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا تھا' ڈاکٹر صنم کی خواب گاہ کے بند دروازے میں جنبش ہوئی۔ وہ لاؤنج میں داخل ہوئی۔ یک لخت مجھے اپنی آنکھیں چندھیاتی محسوس ہوئیں۔ اس کے سرد قامت وجود پر سرخ رنگ کا چست لباس تھا۔ گلے میں تین لڑی کا سونے کا نیکلس تھا۔ اس کے کندن جیسے بدن پر مجھے

وہ قیمتی زیور قطعی اضافی محسوس ہوا۔ اس نے اپنے چہرے کی زیبائش پر بھی خصوصی توجہ دی تھی۔ نہایت مہارت سے کیے گئے نفیس میک اپ نے اس کی عمر میں کم از کم دس برس کی کمی کر دی تھی۔

میری نگاہیں اس کے قیامت خیز وجود سے چپک سی گئیں۔ ڈاکٹر صنم نے نہایت گہری نظروں سے میری محویت کا جائزہ لیا پھر وہ کسی فاتح کے مانند گردن اونچی کیے اپنی مخصوص لہراتی چال کے ساتھ ہماری طرف بڑھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا پورا وجود آنکھ بن کر اس کے حسن شعلہ فگن کے نظارے میں محو ہے۔ وہ بلاشبہ صنف نازک کے تمام تر تباہ کن ہتھیاروں سے پوری طرح لیس تھی۔ اس وقت شاید وہ خاص طور پر اپنے شکار کو فیصلہ کن وار سے گھائل کرنے کی نیت سے اپنے ہتھیاروں کو سان لگا کر آئی تھی لیکن اس کا شکار ہے کون؟

مجھے اپنے ذہن میں ابھرنے والے اس سوال کا جواب بھی جلد ہی مل گیا۔ عین میرے روبرو پہنچ کر' میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے بڑی عجیب سی دھیمی اور سرسراتی آواز میں کہا۔ 'اب بس بھی کر میرے سوہنے کبوتر۔ کیا اب آنکھوں سے ہی نگلنے کا ارادہ ہے؟' اس کے منہ سے نکلنے والے ان الفاظ نے مجھے بری طرح جھینپنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے تیز دھار جملوں کا جواب دینا میرے بس میں ہوتا تو میں کچھ کہتا۔ میں اس سے آنکھیں چرا کر مرزا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ صدیقی سے کوئی بات کر رہا تھا۔ میں نے صدیقی کی مدد سے سہارا دے کر اسے بٹھا دیا۔ ڈاکٹر صنم نے اسٹیتھو اسکوپ اپنے کانوں میں لگا کر کہا۔ 'آپ ان کا کوٹ اتار دیں۔' اس کے ان الفاظ نے گویا مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ مجھے خاصی دیر کے بعد ایک بار پھر یاد آ گیا کہ ہم اس خوبصورت عورت کے خوبصورت گھر میں مہمان بن کر نہیں آئے۔ اب وقت آن پہنچا ہے کہ اس کی تمام تر ادائیں اور ناز نخرے بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو جائیں۔

صدیقی نے آنکھ کے ہلکے سے اشارے سے مجھے کہا کہ میں ہر ممکنہ صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار ہو جاؤں۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ میں پہلے سے تیار ہوں۔ 'ارے بھئی آپ ایک دوسرے کو کیا دیکھ رہے ہیں؟ ان کا کوٹ اتاریں تاکہ میں پوری طرح سے ان کا معائنہ کر سکوں۔' ڈاکٹر صنم نے حیرانی ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ صدیقی نے نہایت نرمی اور احتیاط سے مرزا کا کوٹ اتار دیا۔ ڈاکٹر صنم مرزا کے سینے پر اسٹیتھو اسکوپ رکھنے کے لیے جھکی لیکن یک لخت اس کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا اور وہ ٹھٹک کر ایک بار پھر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر حیرانی اور سراسیمگی کے واضح آثار تھے۔ میں نے اس کی حالت میں اس تغیر کی وجہ بھی فوراً جان لی۔ مرزا کی قمیض کے بائیں شانے پر خون کا بڑا سا دھبا سا لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر رضا نے اس کے شانے پر جو ڈریسنگ کی تھی وہ خون میں بھیگ چکی تھی۔

'یہ......یہ تو......یہ تو زخمی ہیں!' ڈاکٹر صنم نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

'ہاں یہ زخمی ہیں۔ آپ کو ان کی ڈریسنگ کرنا ہے۔' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آئے۔

'لیکن......لیکن یہ زخمی کیسے؟'

'سوال جواب کو چھوڑیں ڈاکٹر صاحبہ۔ آپ کا مریض آپ کے سامنے ہے آپ اس کا علاج

کریں۔‘صدیقی نے کہا۔اس کے لہجے میں تحکم کی جھلک صاف محسوس کر کے وہ بری طرح چونک پڑی۔

عین اسی وقت صدیقی نے اپنے نقرئی کولٹ پستول کی جھلک اسے دکھائی۔ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ فق پڑ گیا۔ مجھے اس کی سانس اس کے سینے میں اٹکتی محسوس ہوئی۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنی حالت پر قابو پالیا۔

’اوہ تو تم وہ لوگ ہو؟‘اس نے گہری سانس بھر کر پرسکون لہجے میں کہا۔اس کے لہجے میں اطمینان کی جھلک محسوس کر کے مجھے شدید حیرت ہوئی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ بلاشبہ آہنی اعصاب کی مالک ہے۔ میں اس کے جملے پر پوری طرح توجہ نہیں دے سکا۔البتہ صدیقی کو میں نے واضح طور پر چونکتے دیکھا۔

’کیا مطلب ہے آپ کا....؟ ہم کون لوگ ہیں؟‘اس نے حیرانی سے پوچھا۔ڈاکٹر صنم کے جملے کا مفہوم سمجھ میں آیا تو میں بری طرح چونک پڑا۔ یہ عورت کیسے ہمارے متعلق جانتی ہے؟

’لیکن آپ لوگ حلیے اور شکل وصورت سے تو ڈاکو نظر نہیں آتے۔‘ڈاکٹر صنم نے صدیقی کا سوال نظر انداز کر کے ایک بار پھر میرے چہرے پر نظریں جمادیں۔اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر عجیب سا خمار جھلکنے لگا۔

’آپ سے کس نے کہا کہ ہم ڈاکو ہیں؟‘میں نے حیرانی سے سوال کیا۔میرے ذہن میں چند لمحے کے لیے خیال آیا کہ شاید اسے کسی طرح سے ڈاکٹر رضا کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے۔لیکن پھر فوراً ہی میں نے یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔اس قدر مختصر عرصے میں یہ اطلاع یہاں تک کیسے پہنچ سکتی ہے؟ یہ شاید کوئی اور ہی معاملہ ہے۔

’دراصل دو تین دن پہلے ڈانٹ کے پل سے کچھ دور ڈاکوؤں کے دو گروہوں کے درمیان زبردست مقابلہ ہوا ہے۔لوگوں کا کہنا ہے کہ وہاں خاصی دیر تک دھواں دھار فائرنگ ہوتی رہی ہے۔ آپ لوگوں کا شاید انہی دونوں گروہوں میں سے کسی سے تعلق ہے۔‘

’کیا ہم لوگ آپ کو چور ڈاکو نظر آتے ہیں؟‘مرزا نے گمبھیر لہجے میں کہا۔اس کے لہجے میں سنجیدگی اور وقار کا رچاؤ تھا لیکن اس گھاگ عورت پر مرزا کے لہجے کا کوئی اثر نہ ہوا۔اس نے بے نیاز لہجے میں کہا۔

’یہ بات تو میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ آپ لوگ اپنے حلیوں اور شکل وصورت سے ڈاکو نظر نہیں آتے لیکن نظر آنے یا نہ آنے سے کیا ہوتا ہے؟ آج کے دور میں ہر شخص اپنے چہرے پر کئی قسم کے نمائشی چہرے چڑھائے پھرتا ہے۔کوئی کتنا بھی بڑا بدمعاش‘ قاتل یا اسمگلر ہو اپنے حلیے سے وہ خود کو بے ضرر‘ شریف شہری ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔جس کا پورا جسم مظلوموں کے لہو کے چھینٹوں سے داغ دار ہو‘ وہ بھی سفید براق لباس اور سیاہ اچکن پہن کر خود کو خادم قوم کہتے نہیں تھکتا۔‘اس کے سرخی سے مزین لبوں پر بے حد تلخ‘ زہریلی مسکراہٹ ابھری۔اس کی باتوں کی سچائی سے مجھے اپنے حلق میں بھی کڑواہٹ گھلتی محسوس ہوئی۔میں نے اپنے لہجے کو مستحکم رکھتے ہوئے کہا۔

’آپ کا اندازہ غلط ہے۔ہم لوگ چور ڈاکو نہیں ہیں اور نہ ہی ہمارا اس فائرنگ سے کوئی تعلق ہے۔

البتہ فی الحال ہم منظر عام پر آنا نہیں چاہتے کیونکہ ہم لوگوں کی جان خطرے میں ہے۔‘

’اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ لوگ مجھے یرغمال بنا کر میرے گھر پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں؟‘ڈاکٹر صنم کے لہجے میں ایک عجیب سی بے نیازی تھی۔ جیسے اسے ہم سے کسی قسم کا خطرہ نہ ہو۔جیسے ہم کوشش کے باوجود اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے‘ جیسے اسے ہمارے ہتھیاروں میں پوشیدہ موت کی پیام بر گولیوں کا بھی کوئی خوف نہ ہو۔میں نے بے قراری سے پہلو بدل کر کہا۔

’نہیں ڈاکٹر صاحبہ ایسا نہیں۔ہم لوگ بے حد مجبوری کی حالت میں آپ کے گھر میں آئے ہیں۔ ہمارے ساتھی کو فوری طبی امداد کی ضرورت ہے اور ہمیں ایک عارضی پناہ گاہ کی۔یقین کیجیے ہم آپ کو یا آپ کے گھر کو کسی قسم کا نقصان پہنچانا نہیں چاہتے۔‘

’تم.....مجھے کیا نقصان پہنچا سکتے ہو؟‘اس نے لفظ ’تم‘ پر زور ڈالتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا۔میں بے اختیار اس سے نظریں چرانے پر مجبور ہو گیا۔مجھے ایک بار پھر اپنے رگ و پے میں سردی کی ہلکی سی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔

’خیر مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے کہ آپ لوگ کون ہیں۔اگر مجھے پہلے سے آپ کے متعلق اندازہ ہو جاتا تو شاید میں آپ کو اپنے گھر میں گھسنے نہ دیتی لیکن اب آپ لوگ آ ہی گئے ہیں تو.... اچھا میں ان کا زخم صاف کرنے کے لیے پانی گرم کرتی ہوں۔‘اس نے پرسکون لہجے میں کہا اور اپنے گھر کے کچن کی طرف چل پڑی۔میں نے بھی اس کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔کچن کے دروازے پر پہنچ کر اس نے میری موجودگی کو محسوس کر لیا۔اس نے مڑ کر میرے چہرے کی طرف دیکھا۔مجھے ہلکی سی خجالت محسوس ہوئی۔میں اسے کیسے بتاتا کہ میں اس کی نگرانی کرنا چاہتا ہوں۔میری مشکل اس نے خود ہی آسان کر دی۔

’اوہ.....تم شاید میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ آؤ آؤ۔‘میں کھسیانے سے انداز میں گردن ہلا کر کچن میں داخل ہو گیا۔میں نے دیکھا کہ کچن میں ایک بہت بڑا سا ریفریجریٹر رکھا ہوا ہے۔چولہوں کے قریب ہی گیس کی خاصی بڑی ٹنکی بھی موجود تھی۔ایک تنہا عورت کے لحاظ سے یہ انتظام خاصا اضافی محسوس ہوا۔ ڈاکٹر صنم نے شاید میری حیرت کو بھانپ لیا۔

’میں بہت کم گھر سے باہر نکلتی ہوں۔میں مہینے بھر کا راشن اپنے فریج میں خرید کر رکھ لیتی ہوں۔اسی لیے میں نے اتنا بڑا فریج گھر میں رکھا ہوا ہے۔‘

’لیکن ڈاکٹر صاحبہ آپ کا کلینک۔۔آپ کے مریض۔۔‘میں نے سوال کیا۔

’ارے یار یہ کیا تم نے ڈاکٹر صاحبہ۔۔ڈاکٹر صاحبہ کی رٹ لگا رکھی ہے۔اب میں اتنی بڑی بھی نہیں ہوں۔مجھے ڈاکٹر نہیں صرف ایک عورت سمجھو۔ایک جیتی جاگتی عورت۔‘اس نے نہایت صفائی سے میری بات ٹال دی۔جانے کیوں؟ اسی اثنا میں چولہے پر رکھا ہوا پانی ابلنے لگا۔

’ڈاکٹر صاحبہ پانی گرم ہو گیا ہے۔‘میں نے کہا۔اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

'نہیں مجھے تو ویسے کا ویسا ہی ٹھنڈا ٹھار نظر آ رہا ہے۔' میں نے آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔

''دیکھیے تو سہی اب تو ابلنے لگا ہے۔''

''ہاں پانی تو ابل ہی رہا ہے۔'' اس نے قدرے مایوسی کے ساتھ کہا۔

'ڈاکٹر صنم نے مرزا کے شانے کی پٹی کھولی۔ زخم پر نظر پڑتے ہی وہ ایک بار چونک پڑی۔

'یہ تو گولی کا زخم ہے۔' اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ میں نے صدیقی کی جانب دیکھا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ 'ہاں یہ گولی کا ہی زخم ہے۔'

'اس کے باوجود آپ لوگ دعوی کر رہے ہیں کہ آپ کا اس روز کے واقعے سے کوئی تعلق نہیں ہے؟' اس کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔

'نہیں۔۔۔ آپ کا انداز صحیح ہے وہ گولیاں ہم پر ہی چلائی گئی تھیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہم لوگ ڈاکو نہیں ہیں۔ ہم محض جان بچانے کے لیے یہاں پناہ لینے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ہمارے خون کے پیاسے ہمارے دشمن ہر طرف ہماری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔' میں نے بھاری آواز میں اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ وہ چند لمحوں تک بغور میرے چہرے کا جائزہ لیتی رہی۔ شاید وہ جھوٹ اور سچ کا پتا لگانا چاہتی تھی۔

'آپ پر کن لوگوں نے فائرنگ کی تھی؟ اگر آپ لوگ مجرم نہیں ہیں اور آپ کی جان کو خطرہ لاحق ہے تو پھر آپ پولیس سے رجوع کیوں نہیں کرتے؟'

'آپ کی تجویز بہت مناسب ہے ڈاکٹر صاحبہ لیکن ہمارے دشمن اتنے با اثر اور طاقت ور ہیں کہ پولیس ان کے اشاروں پر ناچتی ہے۔ پولیس سے رجوع کرنے کا مطلب اپنی موت کو خود دعوت دینا ہے۔' صدیقی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ڈاکٹر صنم کے چہرے پر گہری تشویش کے آثار نمودار ہوئے اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

'اوہ تو یہ بات ہے شاید آپ نے اس علاقے کے زمینی خداؤں سے کسی کی دشمنی مول لے لی ہے۔ کسی سردار کو اپنے لہو کا پیاسا بنا لیا ہے۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ وہ کون ہے؟'

اس کا سوال سن کر مرزا اور صدیقی نے بہ یک وقت میری طرف دیکھا۔ میں شدید تذبذب کا شکار ہو گیا۔ اسے اپنے راز میں شریک کیا جائے یا نہیں؟ کون جانے ہماری زبان سے نکلنے والے الفاظ ہی ہمارے لیے مصیبت بن جائیں۔ میری کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے صدیقی نے جواب دینے کی ذمہ داری اپنے شانوں پر سنبھال لی۔ 'معاف کیجیے گا ڈاکٹر صاحبہ فی الحال ہم یہ سب آپ کو نہیں بتا سکتے۔ ویسے بھی آپ کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'

'اوہ تو یہ بات ہے۔ خیر جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔ میں بھلا آپ لوگوں کے معاملات میں دخل دینے والی کون ہوتی ہوں۔' اس نے قدرے سرد مہری سے کہا۔ میں نے مضطرب ہو کر اسے کسی رسمی جملے سے تسلی دینا چاہی لیکن صدیقی نے آنکھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔

ڈاکٹر صنم نے نہایت مہارت سے مرزا کے شانے کے زخم پر ڈریسنگ کر دی۔ اسے کچھ اینٹی

بائیوٹک کیپسول اور گولیاں دے کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ 'میں آپ لوگوں کے ناشتے کا بندوبست کرتی ہوں۔' اس کے لہجے میں ابھی تک سرد مہری کی جھلک موجود تھی۔ اپنے میڈیکل بکس کو الماری میں رکھنے کے بعد وہ کچن میں گھس گئی۔ صدیقی نے میرا ہاتھ دبا کر اشارہ کیا کہ میں بھی اس کے پاس پہنچ جاؤں۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنے وجود میں سنسنی کی تیز لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ بے اختیار میرے دل میں آئی کہ میں اس کی بات ماننے سے انکار کر دوں۔ کہہ دوں کہ تنہائی میں ڈاکٹر صنم کی تیز دھار نظروں کا مقابلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ اسے بتا دوں کہ ہماری یرغمال بنی یہ عورت موقع ملتے ہی مجھے یرغمال بنانے لگتی ہے۔ اس کی نگاہوں کی تپش میرے وجود کو قطرہ قطرہ پگھلانے لگتی ہے۔ اس کے نسوانی حسن کا زہر میرے ذہن کو شل کرنے لگتا ہے۔ اپنی ساحر آنکھوں کے جال میں پھنسا کر کہیں یہ مجھے اپنا مطیع نہ بنا ڈالے۔

'جاؤ ذوالفقار علی۔۔۔ اس پر نظر رکھو۔ مجھے یہ بہت گہری عورت لگتی ہے۔ کہیں یہ کوئی داؤ نہ کھیل جائے۔' مرزا نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھنا پڑا۔ باورچی خانے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے مجھے زندگی میں پہلی بار ان جانوروں کے جذبات و احساسات کا علم ہوا جنہیں مذبح خانے کی طرف لے جایا جا رہا ہو۔ کچن میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صنم سلیقہ شعار اور سگھڑ عورت کے مانند ناشتے کی تیاری میں مصروف ہے۔ وہ ڈبل روٹی کے سلائسوں پر مکھن لگا رہی تھی۔ میری آہٹ محسوس کر کے اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ وہ چند لمحوں تک خالی خالی نظروں سے میری شکل دیکھتی رہی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ سر جھکا کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ جانے کیوں مجھے اس کا یہ رویہ اچھا نہیں لگا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پہلے کی طرح ہنسے بولے' مجھ پر جملے کسے۔ شاید اس کے لبوں کی مسکراہٹ میں ہی اس کا تمام تر حسن پوشیدہ تھا۔ سنجیدگی کے عالم میں وہ مجھے ایک عام سی' ادھیڑ عمری کی طرف تیزی سے گامزن عورت نظر آئی۔ میں کچھ دیر خاموشی سے اسے کام کرتا دیکھتا رہا۔

'آپ کو تو مکھن لگانے میں خاصی مہارت ہے۔' میرے منہ سے جانے کیسے خود بہ خود یہ جملہ پھسل گیا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر اس کے چہرے کے تاثرات میں تیزی سے تغیر نمایاں ہوا۔ اس کی آنکھوں میں گم گشتہ چمک لوٹ آئی۔

'اوہو! تو تمہیں بھی بولنا آتا ہے؟' اس نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اس کے لہجے کی شوخی نے مجھے بے اختیار اپنے حفاظتی خول میں سمٹنے پر مجبور کر دیا۔

'ہاں تھوڑا بہت تو آتا ہی ہے۔' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

'بہت خوب۔ ہنستے بولتے رہا کرو۔ اچھے لگتے ہو۔' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس بار اس کے لہجے میں سادگی کا عنصر نمایاں تھا۔ 'اچھا بھئی باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ تم کام میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ باقی سلائسوں پر تم مکھن لگاؤ اتنے میں' میں انڈے تل لیتی ہوں۔ اتنی دیر میں چائے بھی تیار ہو جائے گی۔'

اس نے الیکٹرک ٹوسٹر کے ذریعے ٹوسٹ بنا لیے اور ناشتے کو ٹرالی میں سجا کر مرزا اور صدیقی کے پاس لے آئی۔

ناشتے کے بعد ڈاکٹر صنم نے کہا۔'اب آپ لوگ آرام کریں۔ یہ دونوں کمرے آپ اپنے قبضے میں لے لیں۔ آپ لوگوں کی آمد کے باعث میں اپنی نیند پوری نہیں کر سکی۔ میں ابھی کچھ دیر سوؤں گی۔' وہ برتن کچن میں رکھنے کے بعد اپنے کمرے میں گھس گئی۔ مجھے اس کی چال میں عجیب سی تھکن اور پژمردگی محسوس ہوئی جیسے وہ بے آب و گیاہ صحرا میں طویل مسافت طے کر کے آئی ہو۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔

'اب کیا کرنا ہے بھائی ذوالفقار علی؟' صدیقی نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

'کچھ نہیں۔۔۔ فی الحال وہی کریں جو ڈاکٹر صنم کہہ کر گئیں ہیں' یعنی آرام۔۔۔ اس وقت باہر نکلنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔' میں نے اپنی رائے ظاہر کی۔ صدیقی اور مرزا نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ میں نے ڈاکٹر صنم کے بتائے ہوئے کمروں کا جائزہ لیا۔ وہ خاصے پر آسائش قسم کے کمرے تھے جن میں آرام دہ بستر لگے ہوئے تھے۔'آپ لوگ اس کمرے میں آرام کریں۔ میں یہیں لاؤنج میں لیٹ جاتا ہوں۔' میں نے کہا۔ وہ دونوں میرا مطلب سمجھ گئے۔ میں ٹیلی فون کے قریب رہنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے ڈاکٹر صنم پر بھی نظر رکھنی تھی۔

صدیقی اور مرزا کمرے میں چلے گئے جبکہ میں ایک صوفے پر دراز ہو گیا۔ مجھے نہ نیند آ رہی تھی اور نہ ہی میں سونا چاہتا تھا۔ تنہائی ہوتے ہی مجھے خیالات کے ہجوم نے گھیر لیا۔ میں ملک کریم کے متعلق فکر مند تھا لیکن اس سے بھی بڑھ کر مجھے یہ فکر تھی کہ جانے بھارتی ایجنٹ سردار شاہ مراد کے توسط سے کن کن کاروائیوں میں مصروف ہیں۔ ہماری یہاں آمد نے شاید انہیں محتاط ہونے پر مجبور کر دیا ہو لیکن وہ ملک کریم پر اپنی مشق ستم جاری رکھے ہوئے ہوں گے۔ کون جانے اب تک وہ اپنے مطلوبہ افراد کو برآمد بھی کر چکے ہوں اور اب وہ میرے پیارے وطن کو بھاری نقصان پہنچانے کی تیاری کر رہے ہوں۔ میرے وطن کی حفاظت فرما' میرے پروردگار! اسے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ فرما! مجھے اتنی ہمت اور طاقت دے کہ اپنے وطن کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والی ان شیطانی طاقتوں کا قلع قمع کر سکوں۔ مجھے اپنی حقیر اور بے مایہ زندگی کو اپنے ملک اور قوم کی سلامتی پر نچھاور کرنے کی توفیق عطا فرما۔

یہ سوچتے سوچتے میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ نیند کا قرب محسوس کرتے ہیں میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اس وقت سونا کسی بھی طرح مناسب نہ ہوتا۔ میں نے صدیقی اور مرزا کے کمرے میں جھانکا۔ وہ دونوں ہی جاگ رہے تھے اور دھیمی آواز میں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے مجھے اندر آنے کی دعوت دی۔'میرا خیال ہے آپ لوگ کچھ دیر سو لیں تاکہ رات کو باری باری جاگ سکیں۔ ڈاکٹر رضا والے تجربے کے پیش نظر ہم کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔' ان دونوں نے میری رائے سے مکمل اتفاق کیا۔ میں ایک بار پھر صوفے پر دراز ہو گیا۔ اس مرتبہ میری سوچ کا رخ میری ہیر کی جانب مڑ گیا۔ میری زندگی کا حاصل' میری زندگی کی منزل' میں اسے موت کے بے رحم دہانے پر چھوڑ آیا۔ وہ میرے متعلق کیا سوچتی ہوگی؟ میں نے تو دوبارہ اس کی خبر بھی نہ لی۔ اسے مجھ پر کتنا مان تھا لیکن

میں اس کا یہ مان خاک میں ملا کر اسے تسلی کے دو بول کہے بغیر وہاں سے چلا آیا۔ اس کا کیا حال ہوا ہو گا۔ میری چپ چاپ روانگی کی خبر پا کر؟ اس کی وہ نرگسی آنکھیں ہر آہٹ پر دروازے کی طرف اٹھ جاتی ہونگی۔ خدا جانے اس نامراد بیماری کا کیا بنا جس نے اسے اپنے بھیانک پنجوں میں جکڑ رکھا تھا؟ جانے بابا کریم بخش اسے کراچی لے کر گیا یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ میرا انتظار ہی کرتے رہ گئے ہوں؟ اب تک تو وہ میری طرف سے پوری طرح مایوس ہو چکے ہوں گے۔ ہیر کو پورا یقین ہو گیا ہو گا کہ میں اسے بھلا چکا ہوں۔ کیا واقعی میں اسے فراموش کر سکتا ہوں؟ کیا میرے لیے یہ ممکن ہے کہ میں اس کی یاد کو اپنے دل سے بھلا سکوں۔؟

اچانک میرے ذہن میں ایک بھولی بسری نظم کے چند اشعار تازہ ہو گئے۔ یہ نظم میں نے سکول کے زمانے میں پڑھی تھی جو میرے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئی۔ ذرا سی کوشش سے مجھے اس نظم کے خالق کا نام بھی یاد آ گیا۔ مجاز نام کا وہ شاعر بلاشبہ خون جگر سے اشعار تخلیق کرتا ہوگا۔

اپنے دل کو دونوں عالم سے اٹھا سکتا ہوں میں
کیا سمجھتی ہو کہ تم کو بھلا سکتا ہوں میں؟
کون تم سے چھین سکتا ہے مجھے' کیا وہم ہے
خود زلیخا سے بھی دامن بچا سکتا ہوں میں
میں بہت سرکش ہوں لیکن اک تمہارے واسطے
دل بچھا سکتا ہوں میں' آنکھیں بچھا سکتا ہوں میں
تم اگر روٹھو تو اک تم کو منانے کے لیے
گیت گا سکتا ہوں میں' آنسو بہا سکتا ہوں میں
تم سمجھتی ہو کہ ہیں پردے بہت سے درمیاں
میں یہ کہتا ہوں. کہ ہر پردہ اٹھا سکتا ہوں میں

ان اشعار کو دل میں دہراتے ہوئے جانے کیوں میری آنکھیں بھر آئیں کاش میں یہ ہیر کے روبرو کہہ سکتا۔ اس کو اپنے سامنے بٹھا کر اعتراف کر سکتا کہ وہ میرے لیے دنیا کی سب سے عزیز ہستی ہے۔ جانے زندگی مجھے پھر اس کے پاس پہنچنے کا موقع دے یا نہ دے۔ ہیر کے تصور میں گم ہوتے ہوئے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں خاصی دیر تک آنکھیں میچے خاموش پڑا رہا۔

اچانک مجھے اپنے آس پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں پوری طرح چوکنا ہو گیا۔ البتہ میں نے اپنی آنکھیں بدستور بند رکھیں۔ وہ جو کوئی بھی تھا میرے بالکل قریب پہنچ کر ٹھر گیا۔ نتھنوں کے راستے دماغ میں پہنچنے والی پرفیوم کی دھیمی دھیمی سحر انگیز مہک نے مجھے آنے والے کی شخصیت سے آگاہ کر دیا۔ میں دم بہ خود سا بے حس و حرکت چپ چاپ پڑا رہا۔ وہ مہکتا وجود میرے مزید قریب ہوا۔ اس کی نم آلود گرم سانسیں مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہوئیں۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکنوں کی دھمک اپنے دماغ میں محسوس ہوئی۔ میرے جسم کے تمام رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ گرم سانسیں میرے چہرے کے اور

قریب ہوئیں اور قریب۔۔ میں نے بے اختیار اپنی سانس روک لی۔ مجھے اپنے ہونٹوں پر مرطوب' جھلتا ہوا لمس محسوس ہوا۔ میں کوشش کے باوجود اپنے جسم کو جھرجھری لینے سے نہ روک سکا۔ عین اسی وقت میرے کانوں میں ایک مدھم سا کھنکتا قہقہہ گونجا۔ عجیب سا معنی خیز قہقہہ! میں نے کسمساتے ہوئے کروٹ بدلی۔ وہ خوشبودار وجود ایک بار پھر میرے بے حد قریب ہوا لیکن اس بار وہ کوئی شرارت کیے بغیر مجھ سے دور ہٹ گیا۔ میں نے کسی کے قدموں کی دور ہوتی آہٹ سنی۔ اس کے بعد کسی کمرے کا دروازہ بند ہوا۔ میں نے سینے میں سانس آزاد کی۔ میرا دل ابھی تک معمول پر نہیں آسکا تھا۔ کسی کے لمس کی دھیمی دھیمی آنچ ابھی تک میرے ہونٹوں کو سلگا رہی تھی۔ مجھے اپنا وجود ابھی تک خلاؤں میں ہلکورے لیتا محسوس ہو رہا تھا۔

کچھ دیر تک میری یہی حالت رہی پھر آہستہ آہستہ میری کیفیت بحال ہوتی چلی گئی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور صوفے پر اٹھ بیٹھا۔ اسی لمحے میں نے صدیقی کو اپنے کمرے سے باہر آتے دیکھا۔ وہ میرے پاس آگیا۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ کہیں اس نے وہ منظر۔۔۔ تو نہیں دیکھ لیا لیکن مجھے اس کے چہرے پر کوئی غیر معمولی تاثرات نظر نہیں آئے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ مرزا کے زخم میں اب تکلیف نہیں ہے اور وہ پرسکون نیند سو رہا ہے۔ اس نے مجھ سے آیندہ کے پروگرام کے متعلق تبادلہ خیال کرنا چاہا لیکن اسی وقت ڈاکٹر صنم کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ ہم اپنی گفتگو ادھوری چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ شاید ابھی ابھی غسل کر کے آئی تھی۔ ہلکے سبز رنگ کے پھول دار لباس میں وہ مجھے بے حد ترو تازہ اور سرسبز و شاداب نظر آئی۔ ہمیں دیکھ کر اس کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس کی مسکراہٹ میں جانے کیا چیز پوشیدہ تھی جس نے مجھے بے اختیار جھینپنے پر مجبور کر دیا۔ 'اوہ آپ لوگ تو پہلے ہی بیدار ہو چکے ہیں۔' اس نے مصنوعی حیرانی سے کہا۔ 'یا شاید آپ لوگوں کو بھوک لگ رہی ہوگی۔ فکر مت کیجیے۔ میں ابھی فٹافٹ کھانا تیار کر دیتی ہوں۔ البتہ مجھے آپ کی مدد درکار ہوگی۔' اس نے مجھ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ میں نے آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔ 'آپ کا حکم سر آنکھوں پر ڈاکٹر صاحبہ۔'

ڈاکٹر صنم نے فریج میں موجود پہلے سے تیار شدہ کھانا نکالا۔ البتہ روٹیاں اس نے تازہ پکائیں۔ صدیقی نے مرزا کو بھی اٹھا دیا۔ ہم چاروں نے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر اکھٹے کھانا کھایا۔ ڈاکٹر صنم ایک اچھے میزبان کے مانند اصرار کر کے ہمیں کھانا کھلاتی رہی۔ ہم کھانا کھا کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ گھنٹی کی کرخت آواز سن کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس وقت وہ فون کال ہم لوگوں کے لیے مصیبت کی پیام بر بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ ہم تینوں نے آنکھیں ہی آنکھوں میں صلاح مشورہ کرنے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے کہ ہم کوئی فیصلہ کر پاتے ڈاکٹر صنم خراماں خراماں چلتی ٹیلی فون کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ اس کے ساتھ ہی ہم تینوں کے اعصاب ربڑ کی ڈور کے مانند تن گئے۔ ہم تینوں کی تمام حسیات ہمارے کانوں میں سمٹ آئیں۔

'ہیلو۔۔۔ یس ڈاکٹر صنم خان ہیر۔۔۔ آپ کون ہیں؟' میں نے صدیقی کا ہاتھ اس کے پستول پر پہنچتے دیکھا۔ ڈاکٹر صنم کی زبان سے نکلنے والا ایک غلط لفظ ہماری موت بن سکتا تھا۔ 'لیکن آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟ میرا خیال ہے ہماری پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ آپ کو میرا پتا کس نے دیا؟' میں نے اس کے چہرے پر الجھن کے آثار دیکھے۔ وہ کچھ دیر تک دوسری طرف سے ہونے والی باتیں سنتی رہی پھر اس کے چہرے پر کسی قدر اطمینان کے آثار نظر آئے۔ 'اوہ! تو یہ بات ہے۔ ٹھیک ہے آپ مجھ سے ہفتے والے دن مل لیں۔ میں آپ کا معائنہ کرلوں گی۔ دراصل میرے گھر کچھ بے حد اہم مہمان آئے ہوئے ہیں۔ اس کی زبان سے 'مہمانوں' کا ذکر سن کر ہمارے ڈھیلے پڑتے اعصاب ایک بار پھر تن گئے۔ میں نے صدیقی کے چہرے کے عضلات میں کھنچاؤ محسوس کیا۔ 'کیا کہا۔۔۔؟ ایمرجنسی ہے۔۔۔؟ لیکن۔۔۔۔ ہاں میں سن چکی ہوں۔ آپ راجن پور سے آئی ہیں۔۔ اچھا ٹھیک ہے۔۔ آپ آجائیں۔۔ میں آپ کا معائنہ کرلوں گی۔۔ کیا نام بتایا تھا آپ نے۔۔۔؟ ثروت۔۔۔ اچھا ٹھیک ہے میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔' ڈاکٹر صنم نے بات ختم کر کے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ ہماری استفہامیہ نظروں کو محسوس کر کے اس نے کہا۔ 'میں آپ لوگوں سے معذرت خواہ ہوں کہ میں نے آپ سے پوچھے بغیر اپنی مریضہ کو وقت دے دیا۔ دراصل میرے مریض بہت محدود تعداد میں ہیں۔ یہ خاتون راجن پور سے آئی ہیں اور انہیں شام کو واپس جانا ہے لہٰذا مجھے انہیں وقت دینا پڑا۔'

'ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحبہ۔۔۔ آپ اپنی مریضہ کا معائنہ کریں۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔' صدیقی نے دھیمے لہجے میں کہا۔ 'ہماری آپ سے صرف اتنی درخواست ہے کہ ہماری مجبوریوں کا خیال رکھیے گا۔'

'آپ فکر نہ کریں۔ آپ لوگوں کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔' ڈاکٹر صنم نے ہمیں یقین دلایا۔

بیس پچیس منٹ بعد اطلاعی گھنٹی بجی۔ ڈاکٹر صنم نے اجازت طلب نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ صدیقی نے گردن کے اشارے سے اسے اجازت دے دی۔ وہ اٹھ کر گھر کے دروازے کی طرف چل پڑی۔ میں شدت بے قراری کے عالم میں پہلو بدل کر رہ گیا۔ اسے بنگلے کے گیٹ تک تنہا جانے کی اجازت دے کر ہم نے زبردست خطرہ مول لیا تھا اگر وہ گیٹ سے نکل کر کسی طرف دوڑنا شروع کر دیتی تو ہم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ پاتے۔ اگر وہ بروقت کسی 'مطلب' کے شخص تک پہنچ جاتی تو ہمیں لینے کے دینے پڑ جاتے۔

ڈاکٹر صنم جونہی گھر کا داخلی دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ میں بے آواز قدموں سے دوڑتا ہوا دروازے کی طرف لپکا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے درز سے گیٹ کی جانب نظر دوڑائی۔ میرا ہاتھ پستول کے دستے پر جما ہوا تھا۔ میں نے دیکھا گیٹ کے باہر سیاہ برقع نما چادر میں لپٹی ایک دراز قامت عورت کھڑی ہے۔ ڈاکٹر صنم گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کر کچھ دیر تک اس سے بات کرتی رہی پھر اس نے اس کو اندر آنے کی دعوت دی۔ اس کے اندر آنے کے بعد ڈاکٹر صنم نے گیٹ کو ایک بار پھر مقفل کر دیا۔ اس کے اس عمل نے میرے دل میں اطمینان کی لہر دوڑا دی۔ وہ پوری طرح سے ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا مرزا اور صدیقی کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ دونوں پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔

میں نے کمرے کا دروازہ اس انداز میں بھیڑ دیا کہ اگر کوئی دروازے کے قریب آتا تو ہمیں پہلے سے پتہ چل جاتا۔ میں کسی قسم کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ اگر ہماری غفلت سے فائدہ اٹھا کر وہ چالاک عورت ہمارے کمرے کا دروازہ باہر سے لاک کر دیتی تو ہم چوہے دان میں پھنسے چوہوں کے مانند بے بس اور لاچار ہو کر رہ جاتے۔ مرزا اور صدیقی نے اثبات میں سر ہلا کر میری اس احتیاط کو سراہا۔ میرے کان باہر سے آنے والی آوازوں پر مرکوز ہو گئے۔ میں نے کسی کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اس کمرے سے تیسرا کمرہ ہے۔ اس کمرے کو اس نے مریضوں کے معائنے کا کمرہ بنا رکھا ہوگا کیونکہ مرزا کے معائنے کے لیے وہ اسی کمرے میں سے میڈیکل بکس اور دیگر سامان لے کر آئی تھی پھر میری حساس سماعت نے اس کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔

'یہ بہت خطرناک بات ہے۔' مرزا نے دھیمے' تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ 'اگر ڈاکٹر صنم نے اس مریضہ کے ذریعے باہر کوئی پیغام بھجوا دیا تو ہم لوگ مصیبت میں پھنس سکتے ہیں۔' اندیشوں کے یہی ناگ میرے اور صدیقی کے دماغ میں بھی بل کھا رہے تھے۔ مختصر سے صلاح مشورے کے بعد میں اس کمرے سے نکلا اور دبے پاؤں ساتھ والے کمرے کی طرف بڑھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ کمرا خالی اور غیر مقفل ہے کیونکہ اسے بھی ڈاکٹر صنم نے ہم لوگوں کو الاٹ کر دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے اسے ابھی تک استعمال نہیں کیا تھا۔ میں نے نہایت آہستگی سے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ حسب توقع وہ کھلتا چلا گیا۔ کمرے کے اندر پہنچ کر میں نے اسے بے آواز بند کر دیا۔

میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا کمرے کی دیوار تک پہنچا اور اپنا کان دیوار سے لگا دیا۔ مجھے ڈاکٹر صنم اور ثروت نامی اس عورت کے آپس میں بات کرنے کی آواز سنائی دی لیکن یہ آواز اتنی ہلکی تھی کہ ان کی گفتگو کا ایک لفظ بھی میرے پلے نہ پڑا۔ میں نے اضطراب کے عالم میں دیوار میں کوئی روشن دان وغیرہ تلاش کرنا چاہا لیکن وہاں اس قسم کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ آخری چارہ کار کے طور پر میں کمرے میں موجود باتھ روم کی طرف بڑھا۔ باتھ روم کا دروازہ کھلنے سے ہلکی سی چر چراہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ کمرے کے سناٹے میں وہ آواز مجھے بے عد بلند محسوس ہوئی۔ میں نے بہت آہستہ آہستہ دروازے کو کھولا اور باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ میں نے باتھ روم کی بغلی دیوار سے کان لگایا تو میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ میں یہاں سے نہایت واضح طور پر دوسرے کمرے میں ہونے والی گفتگو سن سکتا تھا۔ غسل خانے کی پتلی دیوار نے میری مشکل کو آسان بنا دیا۔ 'میں تمہیں پہلے خبردار کر دیتی ہوں کہ اس عمل کے نتیجے میں تمہاری صحت بھی متاثر ہو سکتی ہے۔' میں نے ڈاکٹر کی سنجیدہ آواز سنی۔ 'تمہیں اس مصیبت میں پھنسے ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا۔ اگر تمہیں کچھ اور دیر ہو جاتی تو تمہاری زندگی کو خطرہ بھی لاحق ہو سکتا تھا۔' میں نے اس کی باتوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی لیکن پوری طرح نہ سمجھ سکا پھر میں نے کسی نوجوان عورت کو سرائیکی لہجے میں اردو بولتے سنا۔

'وہ تو صحیح ہے ڈاکٹرنی جی پر میری جان تو چھوٹ جائے گی نا؟ دراصل میں ابھی ماں نہیں بننا چاہتی جبکہ میرا شوہر بچوں کا بہت شوقین ہے۔'

'بس بس میرے کو زیادہ چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کر چھوکری۔' میں نے ڈاکٹر صنم کی کرخت آواز سنی۔ 'میں تیری جیسی سینکڑوں کو جانتی ہوں۔ تیرے کو اس گناہ کی نشانی سے جان چھڑانی ہے تو تیرا یہ کام ہو جائے گا۔ مجھے یہ شوہر اور خاوند کی کہانی نہ سنا۔ تم جیسی احمق چھوکریوں کو کیا پتا کہ شوہر اور آشنا میں کیا فرق ہوتا ہے۔ پہلے تو جھوٹے پیار اور لارے لپے میں اپنا سب کچھ اسے سونپ دیتی ہو اور پھر امید لگاتی ہو کہ وہ تم سے شادی کر لے گا۔ ارے بے وقوفو سوچو تو سہی کسی کو کیا پڑی کہ تم جیسی چچوڑی ہڈی اور جھوٹے برتن کی طرح عورت سے شادی کرے گا۔' ڈاکٹر صنم کے منہ سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ نے میرے کانوں میں انگارے سے انڈیل دیے۔ مجھے پوری صورت حال کا اندازہ ہو گیا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر صنم اس گوشہ نشینی کے عالم میں اتنے ٹھاٹ باٹ سے کیسے زندگی بسر کر رہی ہے۔ وہ اسی طرح 'مصیبت زدہ' عورتوں کی مشکل آسان کر کے ان سے منہ مانگی فیس وصول کرتی ہوگی۔ صحیح ہی تو کہا ہے اس نے کہ اس کے مریضوں بلکہ مریضاؤں کی تعداد بہت محدود ہے۔

ڈاکٹر صنم کی لعنت ملامت نے اس 'مظلوم' عورت پر خاطر خواہ اثر کیا۔ وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

'بس بس بہت ٹسوے بہا لیے۔ رونے سے تیری کھوئی عصمت تجھے واپس نہیں مل جائے گی۔ یہ دوائی مسلسل دس دن تک کھانی ہے۔ امید ہے تیرا کام اسی سے ہو جائے گا۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو پھر میرے پاس آ جانا۔ خبردار اور کسی کو میرے بارے میں نہ بتانا۔ آ جاتی ہیں چل کر۔۔۔ کی طرح۔' ڈاکٹر صنم نے نفرت بھرے لہجے میں اسے ایک غلیظ لقب سے پکارا۔ مجھے اس کا طرز عمل بے حد عجیب و غریب لگا۔ ایک طرف وہ اس لڑکی کو پاک بازی اور عفت مابی کا درس دے رہی تھی۔ دوسری طرف میرے ساتھ اس کی کارروائیاں۔۔۔ شاید اسے ہی قول و فعل کا تضاد کہتے ہیں۔ لوگوں کو دوسروں کے دامن پر لگی گندگی ایک چھینٹ بھی بری لگتی ہے۔ جبکہ انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ سراپا نجاست ہیں۔ خیر مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ یہ تیز طرار عورت اگر اپنی شرارتوں میں حد سے بڑھی تو میں اسے اس کی اوقات یاد دلا دوں گا۔

میں نے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی میں محتاط ہو گیا۔ جونہی وہ کمرے سے باہر نکلیں میں بھی باتھ روم سے باہر نکل آیا۔ ان دونوں کے قدموں کی آواز گھر کے داخلی دروازے کی طرف بڑھی۔ جونہی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ گھر سے باہر جا چکی ہیں' میں کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ میں تیز قدموں سے داخلی دروازے کی طرف لپکا۔ میری نظروں کے سامنے ڈاکٹر صنم نے اپنی مریضہ کو گیٹ سے باہر کیا اور اس سے مزید کوئی بات کیے بغیر گیٹ میں اندر سے قفل لگا دیا۔ میں ایک بار پھر تیزی سے صدیقی اور مرزا کے کمرے میں آ گھسا۔ ڈاکٹر صنم نے کمرے میں جھانک کر کہا۔

'میری مریضہ رخصت ہو چکی ہے۔ آپ لوگ چاہیں تو باہر لاؤنج میں آ سکتے ہیں۔' اس کے لہجے میں پژمردگی کی جھلک نمایاں تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا سا ہے۔ میں اور صدیقی' مرزا کو ساتھ لے کر لاؤنج میں آ گئے جبکہ ڈاکٹر صنم تھکے تھکے قدموں سے چلتی اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے حسب معمول کمرے کا دروازہ بند کیا۔ 'اسے کیا ہوگیا ہے ذرا... بتاؤ' مرزا نے حیرانی سے پوچھا۔ میں نے انہیں ڈاکٹر صنم اور اس کی مریضہ کے مابین ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔ 'اوہ تو یہ بات ہے!' مرزا نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ 'لیکن اگر یہ اس کا مستقل دھندا ہے تو پھر یہ بجھ کیوں گئی ہے۔ اسے تو ایک نیا گاہک پھنسنے پر خوش ہونا چاہیے۔'

'عورت کی شخصیت شاید دنیا کا سب سے پیچیدہ معمہ ہے۔ مرزا اسے دنیا کے بڑے بڑے دانشور اور نفسیات داں نہیں سمجھ سکے تو ہم کس کھاتے میں ہیں۔ ویسے یہ عورت مجھے خاصی متلون مزاج معلوم ہوتی ہے۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ قسم کی۔ ذرا سی بات پر خوش اور ذرا سی بات پر اداس ہو جانے والی۔' صدیقی نے اپنے رائے ظاہر کی۔

'مجھے آپ کی رائے سے خاصی حد تک اتفاق ہے صدیقی صاحب' البتہ اس عورت کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ منہ پھٹ اور صاف گو ہے۔ ایسے لوگ کھلی دوستی اور کھلی دشمنی کے قائل ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ کسی نہ کسی حد تک منتقم مزاج اور جنونی بھی ہوتے ہیں۔'

'اس کا مطلب ہے ہمیں اس عورت کی طرف سے محتاط رہنا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ یہ ہم سے ناراض نہ ہو بصورت دیگر یہ ہمارے لیے مصیبت بھی بن سکتی ہے۔' مرزا نے کہا۔

'تمہارا کہنا صحیح ہے مرزا بلکہ ہمارے لیے زیادہ بہتر یہی ہوگا کہ ہم جلد از جلد کوئی دوسرا ٹھکانہ ڈھونڈ لیں۔ ہم یہاں بھی زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔' صدیقی نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ مجھے اس کے لہجے میں مایوسی کی جھلک محسوس ہوئی۔ اس کے لہجے نے مرزا کو بھی متاثر کیا۔

'لیکن آخر ہم کب تک یوں چوروں کی طرح چھپتے رہیں گے۔ شاہ مراد کے خلاف کوئی کاروائی کرنا تو درکنار ہمیں اپنی زندگی بچانا دشوار ہو رہا ہے۔ ایسے میں ہم بھلا کیا کر سکتے ہیں۔'

'مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے مرزا صاحب۔ حالات تو بے شک بے حد ناسازگار ہیں لیکن ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ سردار شاہ مراد واقعی بے حد خطرناک اور چابک دست شکاری ہے۔ اس نے ہمارے ہر طرف شکنجے اور پھندے لگا رکھے ہیں لیکن اگر ہم اپنی کوشش جاری رکھیں تو یقیناً کوئی نہ کوئی راہ تلاش کرنے میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ ہاتھی جیسے ناقابل تسخیر جانور کا بھی ایک نازک پہلو ہوتا ہے جس پر وار کرنے سے وہ زمین بوس ہو جاتا ہے۔ سردار شاہ مراد کی بھی کوئی کمزوری ہاتھ آنے کی دیر ہے اس کے بعد ہم اسے مار گرائیں گے۔' میری رجز نما تقریر نے ان دونوں پر خاطر خواہ اثر کیا۔ ان کے چہروں کی گم شدہ بشاشت لوٹ آئی۔

'ٹھیک ہے بھائی۔ ہم دونوں بوڑھوں کو اب تم ہی راستہ دکھاؤ۔ ہماری ٹیم کی کیپٹن شپ اب تم ہی سنبھالو۔' مرزا نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ صدیقی نے بھی اس کی تائید کی۔ میں نے شرمندہ سا ہو کر کہا۔

'یہ آپ لوگ کن چکروں میں پڑ گئے۔ آئندہ کے متعلق سوچیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔'

'میرا خیال ہے سب سے پہلے تو ہمیں میک اپ کے سامان کی ضرورت ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ میرے چہرے کا میک اپ دو دن میں اکھڑنے لگے گا۔ اس کی مرمت کے لیے مجھے سامان درکار ہوگا

ویسے بھی اپنے حلیے اور چہرے مکمل طور پر تبدیل کیے بغیر ہم یہاں سے کسی اور جگہ جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یعنی ہمیں نئے ملبوسات کی بھی ضرورت ہے۔' مرزا نے ایک بے حد اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائی۔ ہم دونوں نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔

'اس کے علاوہ مجھے اس ٹرک ڈرائیور' مینو استاد کو بھی تلاش کرنا ہے۔ یہ بے حد اہم ہے۔ اگر وہ مجھے مل جائے تو ہمارا مسئلہ کسی حد تک حل ہو سکتا ہے۔' میں نے کہا۔

'اس کے علاوہ میں ڈی آئی جی پولیس سے بھی ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔' صدیقی نے کہا۔

'لیکن اس معاملے میں ذوالفقار کی رائے کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا۔ ہمیں اس سے اس انداز میں ملاقات کرنی ہے کہ وہ اگر چاہے بھی تو فوری طور پر ہمارے خلاف کوئی قدم نہ اٹھا سکے۔

'میرا خیال ہے ان تمام کاموں کے لیے مجھے ایک بار پھر شہر میں جانا ہوگا۔' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

'لیکن یہ بہت خطرناک۔۔۔' مرزا نے احتجاج کرنا چاہا۔ 'اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے مرزا صاحب۔' میں نے اس کی بات درمیان میں منقطع کرتے ہوئے کہا۔

'خطرات سے ڈر کر تو ہم کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔ آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ وطن کی سلامتی کی خاطر جان سے گزر جانا ہی سب سے بڑی خوش بختی ہے تو پھر اس سعادت سے قدم پیچھے ہٹانا کیا معنی رکھتا ہے؟'

'ٹھیک ہے بھائی ٹھیک ہے تم جیتے میں ہارا۔ جیسا تم مناسب سمجھتے ہو کرو۔ خداوند کریم تمہاری حفاظت فرمائے۔' مرزا نے دھیمے لہجے میں کہا۔

تو پھر تم کب شہر جاؤ گے؟' صدیقی نے پوچھا۔

'ابھی کچھ دیر بعد۔ میرا خیال ہے اگر میں اپنے بالوں کا انداز بدل دوں تو میرا حلیہ کچھ نہ کچھ ضرور بدل جائے گا۔ مونچھیں اور اسپرنگ تو میں پہلے ہی اکھاڑ چکا ہوں۔'

'ہاں تم باتھ روم میں جا کر ہاتھ منہ دھو کر شیو بنالو۔ میں نے وہاں شیونگ کا سامان رکھا دیکھا ہے۔' مرزا نے بتایا۔

'ارے شیونگ کا سامان کیا کر رہا ہے؟' صدیقی نے حیرانی سے پوچھا۔ 'یہاں تو ڈاکٹر صنم کے علاوہ کوئی نہیں رہتا۔'

'اللہ جانے کیا چکر ہے بھائی۔ اس عورت کے پتہ نہیں کتنے روپ ہیں۔' مرزا نے سادگی سے کہا۔

'مرزا کے کہنے کے عین مطابق مجھے باتھ روم کی چھوٹی سی الماری سے شیونگ کا مکمل سامان مل گیا۔ میں نے شیو بناتے ہوئے اپنی دونوں قلمیں صاف کر دیں۔ میں نے حال ہی میں کئی نوجوان لڑکوں کو بغیر قلموں کے دیکھا تھا۔ شاید ان دنوں یہی فیشن چل رہا تھا۔ شیو کے بعد میں دیر تک نہاتا رہا۔ وہیں پر مجھے خوشبودار شیمپو کی ایک بوتل بھی مل گئی۔ اس شیمپو کی بھی اچھی خاصی مقدار میں نے استعمال کر لی۔ اس طرح سے میرے بالوں کی نرمی اور چمک کسی حد تک بحال ہوگئی۔ نہانے کے بعد میں نے اپنے آپ

کو پہلے کی نسبت خاصا نکھرا نکھرا سا محسوس کیا۔

کپڑے پہن کر مرزا اور صدیقی کے پاس پہنچا تو میرے اس خیال کی تصدیق بھی ہوگئی۔ جب مرزا نے ستائش بھرے لہجے میں ماشاء اللہ کہا۔ میں ڈاکٹر صنم کی نگاہوں سے بچنا چاہتا تھا لیکن گھر کے دروازوں اور بڑے گیٹ کی چابیاں اسی کے پاس تھیں۔ لہٰذا مجھے مجبوراً اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ اس نے دروازہ کھولا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔ شاید وہ خاصی دیر تک روتی رہی تھی۔ اس نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا پھر فوراً ہی اس نے میرے چہرے پر موجود شگفتگی کو محسوس کر لیا اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر زندگی کی رمق لوٹ آئی۔

'چشم بدور!' اس نے زیر لب کہا۔ میں نے خجل سا ہو کر کہا۔

'مجھے ذرا باہر جانا ہے۔ آپ دروازوں کے لاک کھول دیں۔'

'تم کہاں جا رہے ہو؟ تم تو کہہ رہے تھے کہ باہر تم لوگوں کی جان کو خطرہ ہے۔'

'وہ تو صحیح ہے لیکن میرا باہر جانا ناگزیر ہے۔ مجھے ہر صورت میں باہر جانا ہے۔' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ میرے بے لچک لہجے نے اسے احساس دلایا کہ میرا ارادہ اٹل ہے۔ اس نے دھیمے لہجے میں صرف اتنا کہا۔

'اچھا۔۔۔ لیکن اپنا خیال رکھنا۔' میں میں نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ خلاف توقع مجھے وہاں گہری سنجیدگی نظر آئی۔

مغرب کے وقت میں ڈاکٹر صنم کے بنگلے سے نکلا اور شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ مجھے کوئی خاص جلدی نہ تھی۔ چہل قدمی کے انداز میں چلتا جب میں اپنے سابقہ اسکول یعنی گورنمنٹ ہائی اسکول نمبرا کے پاس پہنچا تو' خاصا اندھیرا پھیلنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اسکول کے کھیلوں کے میدانوں کی رونق رخصت ہو رہی ہے۔ کرکٹ اور فٹ بال وغیرہ کے کھلاڑی اپنے گھروں کو جا رہے ہیں۔ میں شارٹ کٹ کی نیت سے اسکول میں داخل ہوگیا۔ انگریزی حرف E کی شکل کی عمارت کے سامنے موجود گولڑ کے عمر رسیدہ درخت کے نیچے حسب معمول کچے پکے گولڑوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ دھندلی پڑتی روشنی میں مجھے اپنے کلاس روم کا سبز دروازہ سیاہ نظر آیا۔ ایک بار پھر اپنی مادر علمی کی آغوش میں پہنچ کر مجھے اپنی طالب علمی کا دور بے دریغ یاد آیا۔ فخر صاحب کا اپنے مخصوص لہجے میں 'منحوسو جھک ماری کھڑے او تماشا بنائی کھڑے او۔' میں اور میرے ہم جماعت شاید ساری عمر نہ بھلا سکیں۔ اس ادارے کے مشفق اساتذہ نے بے حد مختصر عرصے میں میری شخصیت کو جو استحکام بخشا اسے میں اپنی زندگی کا اہم ترین اثاثہ سمجھتا ہوں۔ فٹ بال گراؤنڈ اور ہاکی گراؤنڈ سے گزر کر میں گرلز ہائی اسکول والی سڑک پر چلتا اکبر دواخانے کے ساتھ سے گزر کر اے بلاک میں داخل ہوگیا۔ اے بلاک سے ای بلاک کی طرف بڑھتے ہوئے میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ خدا کرے مجھے مینو استاد اپنے گھر پر مل جائے۔

مینو استاد کے گھر کے دروازے پر قفل نہ پا کر مجھے اپنی دعاؤں کی قبولیت کا یقین ہونے لگا۔ میں نے اپنے دل کی بے قراری پر قابو پاتے ہوئے بند دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ کسی چارپائی کے چر

رانے کی آواز میرے کان میں پہنچی اس کے ساتھ ہی کسی نے کھنکار کر حلق صاف کیا۔ 'کون ہے بھائی؟' یں نے ایک لمحے میں اس آواز کو پہچان لیا۔ وہ مینو استاد ہی تھا۔ مجھے اپنا دل خوشی کے مارے بلیوں اچھلتا محسوس ہوا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔' میں ذوالفقار۔' اچانک مجھے یاد آیا کہ مینو استاد مجھے اصل نام سے جانتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے میرا دوسرا نام سعید خان معلوم ہے۔ میں نے اپنے جملے کو درمیان میں روک لیا۔ اسی اثنا میں مینو استاد دروازے میں پہنچ گیا۔ 'کون آ گیا ہے اس وقت؟' اس نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ اس کے عقب سے آنے والی بلب کی روشنی نے میرا چہرہ اس کے لیے بالکل واضح کر دیا۔ مجھے پہچاننے میں اسے معمولی سی دقت بھی نہ ہوئی۔ اس کی آنکھیں مسرت اور حیرانی کے ملے جلے تاثرات سے پھٹنے لگیں۔

'ارے تم۔۔۔ تم سیف۔۔۔ سعید خان!' اس نے اپنی عادت کے عین مطابق ہیجانی کیفیت میں بھی اپنے ذہن اور زبان کو بے قابو نہ ہونے دیا۔ 'آؤ آؤ اندر آ جاؤ۔' اس نے مجھے گھر میں آنے کی دعوت دی۔ جوں ہی میں نے اندر قدم رکھا' اس نے دروازے میں اندر سے کنڈی لگا دی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر کمرے میں آ گیا۔ اس نے کمرے کے دروازے کو بھی بھیڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بڑی محبت اور گرم جوشی سے مجھے اپنے گلے لگا لیا۔

'میں بتا نہیں سکتا کہ تمہیں اس طرح تندرست و توانا صحیح سلامت اپنے سامنے پا کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے سعید خان۔ میں تو سمجھا تھا کہ شاید اب کبھی ہماری ملاقات نہیں ہو سکے گی۔' اس نے بڑی محبت سے مجھے چارپائی پر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہا۔ 'تم ٹھیک تو ہو؟ کسی قسم کی پریشانی تو نہیں ہے؟'

'یہ سب چکر تو چلتے ہی رہتے ہیں مینو استاد۔ تم مجھے کچھ کمزور کمزور دکھائی دے رہے ہو۔ تمہاری طبیعت تو خراب نہیں ہے؟' میں نے پوچھا۔

'ارے نہیں بھائی' میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ تمہیں ایسے ہی وہم ہو رہا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ اتنے دن کہاں رہے۔ کیا کیا کرتے رہے؟ آج مجھ حقیر فقیر کی یاد کیسے آ گئی؟' اس کے سوال کے جواب میں میرا لہجہ خود بخود گمبھیر ہوتا چلا گیا۔

'مجھے ایک بے حد اہم معاملے میں تمہارا تعاون درکار ہے مینوہ استاد۔'

'کس قسم کا تعاون میرے بھائی؟ اور کس معاملے میں؟'

'میں دو دن پہلے بھی تمہاری تلاش میں یہاں آیا تھا مینو استاد۔ اس وقت تم یہاں نہیں تھے۔ البتہ شرفو سے میری ملاقات ہوئی تھی۔'

'ہاں میں کمپنی کے کام سے بلوچستان گیا تھا۔ آج ہی واپس لوٹا ہوں۔ شرفو مجھے نہیں ملا' وہ شاید اپنے گھر کوٹ چھٹے چلا گیا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ تم مجھے کس سلسلے میں تلاش کر رہے تھے؟'

'یہ بہت سنگین معاملہ ہے مینو استاد۔ یہ سمجھو کہ ہمارے ملک و قوم کی سلامتی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ اس وقت تم نے ہماری مدد نہ کی تو ہمارے پیارے وطن کو سنگین خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔' میرے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے اسے بے حد مضطرب کر دیا۔

تم تمہید باندھنے کے بجائے اصل بات کرو بھائی میں وعدہ کرتا ہوں کہ میرے لیے جس حد تک بھی ممکن ہو سکا میں تمہاری مدد کروں گا۔ تم جلدی سے بتاؤ کہ اصل بات کیا ہے۔ میں سخت ہیجان میں مبتلا ہو رہا ہوں۔'

'مینو استاد تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم سردار شاہ مراد کی ٹرانسپورٹ کمپنی سے وابستہ ہو۔ سردار شاہ مراد کتنا بد فطرت' مکار اور خطرناک شخص ہے' اس سے ہم دونوں ہی اچھی طرح واقف ہیں مجھے یقین ہے کہ اس کالے دھندوں سے تم کسی نہ کسی حد تک واقف ہو گے۔'

'ہاں مجھے معلوم ہے۔ وہ منشیات اور اسلحے کا بہت بڑا اسمگلر ہے۔ آزاد قبائلی علاقے میں اس کی ہیروئن تیار کرنے کی دو فیکٹریاں بھی ہیں۔ اس کا یہ تمام دھندا چاروں صوبوں کے مختلف شہروں میں پھیلا ہوا ہے۔ منشیات اور اسلحے کی یہ اسمگلنگ پھلوں کے لدے ہوئے ٹرکوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس اسمگل شدہ اسلحے کے سب سے بڑے خریدار سندھ کے ڈاکو ہیں۔ البتہ منشیات کی اصل منزل کراچی ہے جہاں سے اسے مختلف ذرائع سے بیرون ملک اسمگل کر دیا جاتا ہے۔' مینو استاد نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں مجھے سب کچھ بتا دیا۔

'یہ جو کچھ تم نے مجھے بتایا مینو استاد اس کی روشنی میں سردار شاہ مراد بلاشبہ ایک بہت بڑا مجرم نظر آتا ہے لیکن تمہارے علم میں یہ بات نہیں ہو گی کہ سردار شاہ مراد وطن کا غدار بھی ہے۔ اس کے ہمارے وطن کے بدترین دشمن ملک بھارت سے گہرے تعلقات ہیں۔'

'تم ــــ تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ شاہ مراد بھارتی ایجنٹ ہے؟ لیکن تمہیں یہ سب ــــ' مینو استاد نے بے چینی سے پوچھا۔

'ہاں مینو استاد! میں نے جو کچھ تمہیں بتایا' اس کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔ سردار شاہ مراد شاید بھارتی حکومت کے معتبر ترین کارندوں میں سے ایک ہے۔

'تم مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا!' مینو استاد نے بے حد مضطرب لہجے میں سوال کیا۔ میں نے مینو استاد کو مختصر لیکن جامع الفاظ میں بتانا شروع کیا کہ کس طرح میری ملک کریم سے دوستی ہوئی۔ اس کے بعد میں نے اسے ندا اور اس کے ماما کے متعلق بتایا۔ اس مرحلے پر میں نے مینو استاد کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ نہایت انہماک کے عالم میں میری بات سن رہا تھا۔ میں نے اسے ملک کریم کے اغوا کے متعلق بتاتے ہوئے اپنے فائرنگ کرنے کے بارے میں آگاہ کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح میری ایک اہم سرکاری خفیہ ادارے کے ارکان سے ملاقات ہوئی جنہوں نے مجھے اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ ملک کریم کے اغوا میں بھارتی ایجنٹوں کا ہاتھ ہے' نیز کس طرح ہمیں یقین ہوا کہ سردار شاہ مراد اس علاقے میں بھارتی ایجنٹوں کی سرپرستی کر رہا ہے۔

'ہم کسی نہ کسی طرح یہاں تک تو پہنچ گئے ہیں مینو استاد لیکن ہم ابھی تک سردار شاہ مراد کے خلاف کسی قسم کی کاروائی نہیں کر سکے۔ میں تم سے جو سوالات کرنا چاہتا ہوں اگر ان کے جوابات مجھے مل جائیں تو ہم سردار شاہ مراد کے خلاف کسی حد تک موثر کاروائی کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔' میں نے

کسی قدر ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

میں نے مینو استاد کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور تفکر کے آثار نمایاں ہوتے دیکھے۔ اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ 'تمہیں شاید علم نہیں ہے سعید خان کہ اس مختصر سے عرصے میں تم مجھے کتنے عزیز ہو گئے ہو۔ میں تمہاری زبان سے نکلے ہوئے کسی لفظ کو نہیں ٹال سکتا۔ ویسے بھی میں تمہیں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ مجھے سردار شاہ مراد سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں ہے۔ اس کے خلاف کسی بھی قسم کی کاروائی میں میرا تعاون تمہیں پوری طرح حاصل رہے گا۔ ویسے بھی اب تو معاملہ وطن کی سلامتی کا آن پڑا ہے۔ میں کوئی پارسا شخص نہیں ہوں۔ میرا دامن گناہوں کی سیاہی سے آلودہ ہے لیکن میں وطن کا غدار نہیں ہوں اور نہ ہی اپنے وطن کے غدار کا ساتھی بن سکتا ہوں۔ میری زندگی حسرتوں اور ناکامیوں سے عبارت ہے۔ اگر یہ بے ثمر زندگی میرے وطن کے کسی کام آ جائے تو میرے لیے اس سے بڑھ کر خوش قسمتی کی بات کیا ہو سکتی ہے؟ تم میرے لائق جو بھی خدمت ہو وہ مجھے بتاؤ۔ اپنے ملک کے خلاف ہونے والی سازش کو ناکام بنانے کے لیے میں اپنے آخری سانس تک تمہارا ساتھ دوں گا۔' مجھے اس کے جذباتی لہجے میں وہی سچائی نظر آئی جو کسی محب وطن سپاہی کے لہجے میں ہو سکتی ہے۔

'مینو استاد آج سے کچھ دن پہلے تم اپنے شاگرد شرفو کے ہمراہ ملتان سے اپنے ٹرک میں کوئی سامان لے کر آئے تھے؟' میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔

'ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ یہ شاید آٹھ دس دن پہلے کی بات ہے۔'

'تم نے وہ سامان وہ کہاں سے اٹھایا تھا؟' اور کیا تمہیں معلوم ہے وہ سامان کیا تھا؟' میں نے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے سوال کیا۔ مینو استاد کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نمودار ہوئے۔ اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ کہا۔

'یہ کچھ عجیب سی بات ہے لیکن ہوا یوں تھا کہ میں اور شرفو خالی ٹرک لے کر کوہاٹ جا رہے تھے جہاں سے ہمیں کچھ مال لے کر کراچی جانا تھا۔ ہم علی الصبح ڈیرہ غازیخان سے ملتان گئے۔ ملتان میں اپنی کمپنی کے دفتر میں کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد ہم ملتان سے کوہاٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ ہم ملتان سے تیس پینتیس کلومیٹر آگے نکلے ہونگے کہ کمپنی کی ایک جیپ میں دو آدمی ہمارے پیچھے آئے۔ انہوں نے ٹرک رکوا کر مالکوں کا حکم دیا کہ ہم واپس ملتان چلیں۔ کوہاٹ والا پھیرا فی الحال کینسل ہو گیا ہے۔ ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ہم واپس ملتان آ گئے۔ کمپنی کے اڈے پر پہنچ کر ہمیں کہا گیا کہ ہم اڈے پر ٹھہر کر اگلے حکم کا انتظار کریں۔ البتہ مجھ سے ٹرک کی چابی لے لی گئی۔ مجھے یہ بات عجیب سی محسوس ہوئی لیکن وہ ٹرک تو بہر حال کمپنی کا ہی تھا نا؟ میں نے خاموشی سے چابی ان لوگوں کے حوالے کر دی۔ کمپنی کا ایک کارندہ میرا ٹرک لے کر کسی طرف چلا گیا۔ تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے بعد میرا ٹرک دوبارہ میرے حوالے کر دیا گیا۔ ٹرک کے پچھلے حصے پر ترپال ڈھکی ہوئی تھی۔ اڈے کے منیجر نے رازدارانہ لہجے میں مجھے بتایا کہ ٹرک پر بے حد قیمتی 'مال' لدا ہوا ہے۔ ہم یہ مال لے کر سیدھے واپس ڈیرہ غازیخان چلے جائیں۔ اس نے یہ تو بتا دیا کہ پولیس چوکی والے ہم سے کوئی باز پرس نہیں کریں گے۔ البتہ اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ

مال دراصل ہے کیا؟ خیر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مال یقیناً ہیروئن کی کھیپ ہوگی جسے کسی وجہ سے ہنگامی طور پر ہیڈکوارٹر منتقل کیا جارہا ہے۔ میں اور شرفو ٹرک لے کر چل پڑے۔ پولیس چوکی والوں نے حسب معمول ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اپنے طویل تجربے کے باعث مجھے فوراً ہی معلوم ہوگیا کہ ٹرک کا پچھلا حصہ تقریباً خالی ہے۔ ہم مظفر گڑھ سے کچھ آگے آئے تو شرفو نے کہا کہ اس نے ٹرک کے پچھلے حصے سے کچھ لوگوں کے آپس میں بات کرنے کی آوازیں سنیں ہیں۔ میں نے ذرا توجہ سے سننے کی کوشش کی تو شرفو کی بات کی تصدیق ہوگئی۔ شرفو پیچھے جا کر صورت حال کا جائزہ لینا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے منع کردیا۔ وہ مال انسانوں کی شکل میں تھا یا سامان کی شکل میں اس سے بھلا ہمیں فرق کیا پڑتا تھا۔'

'اوہ تو ہمارا اندازہ درست ہے اس زخمی بھارتی جاسوس کی منتقلی کے لیے تمہارا ہی ٹرک استعمال کیا گیا تھا۔' میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔ مینو استاد کے استفسار کرنے پر اسے اصل صورت حال سے آگاہ کیا پھر میں نے دھڑکتے دل سے مینو استاد سے اصل سوال کیا۔ 'کیا تم بتا سکتے ہو مینو استاد کہ اس روز تم نے وہ مال کہاں پہنچایا؟' مجھے مینو استاد کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑتی محسوس ہوئی۔

'کاش میں تمہیں بتا سکتا کہ وہ کتے کا بچہ بھارتی جاسوس کہاں پہنچایا گیا ہے۔ ہم ٹرک لے کر کمپنی کے اڈے پر پہنچے تو ایک بار پھر مجھ سے چابی لے لی گئی اور ہمیں اڈے پر چھوڑ کر ایک کارندہ ٹرک چلا کر جانے کہاں لے گیا۔ کئی گھنٹے بعد ٹرک واپس پہنچا تو بالکل ہی خالی تھا۔ پہلی بار مجھ سے اس حد تک راز داری برتی گئی۔ حالانکہ جب میں منشیات اور اسلحہ وغیرہ لے کر کراچی کی طرف جاتا ہوں تو مجھے مال کے متعلق تمام تفصیلات سے آگاہ کیا جاتا ہے اور میں مال اپنے سامنے رکھواتا اور اترواتا ہوں۔ اب مجھے یقین ہوگیا ہے۔ تم نے بالکل صحیح کہا۔ واقعی اس حرام کے تخم شاہ مراد کا بھارتی ایجنٹوں سے گٹھ جوڑ ہے اس روز ٹرک میں بھارتی کتوں کو ہی یہاں لایا گیا تھا۔ اسی لیے مجھے ان کی موجودگی سے ناواقف رکھنے کی کوشش کی گئی۔ البتہ مجھے مطمئن رکھنے کے لیے مجھے ایک خاصی موٹی رقم ادا کی گئی تا کہ میں یہ سمجھوں کہ میں منشیات کی کھیپ لے کر آیا ہوں۔'

مینو استاد کی باتیں سن کر مجھ پر شدید مایوسی کا غلبہ طاری ہونے لگا۔ وہ امیدیں دم توڑنے لگیں کہ ہم مینو استاد کے ذریعے اپنے مطلوبہ ٹارگٹ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ سردار شاہ مراد ایک بار پھر ہماری توقع سے بڑھ کر مکار ثابت ہوا۔ اس نے اپنے خصوصی کارندے مینو استاد کو بھی اصل بات کی ہوا تک نہ لگنے دی۔ اس کا مطلب ہے ہم ایک بار پھر مکمل اندھیرے میں رہ گئے۔ میرے ذہن کے پردے پر ایک سوال ابھرا جسے میں نے فوراً ہی پوچھ ڈالا۔ 'مینو استاد کیا تم مجھے اس بندے کا نام اور پتہ بتا سکتے ہو جو تمہارے ٹرک کو لیکر کہیں گیا تھا؟' مینو استاد کے چہرے پر ایک ہلکی سی چمک ابھری اور پھر فوراً ہی معدوم ہوگئی۔

'اس کا نام شاید رب نواز تھا لیکن اب وہ تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔ وہ تین دن پہلے مر چکا ہے۔'

'وہ مر چکا ہے؟ لیکن کیسے؟' میں نے شدید حیرانی کے عالم میں سوال کیا۔

'اسے گولیاں لگی تھیں۔ اس کے علاوہ دو بندے شدید زخمی بھی ہوئے ہیں۔ شاید ان کا سردار شاہ مراد کے مخالف گروہ سے مقابلہ ہوا تھا۔'

'اوہ۔۔۔۔ یہ تو بہت غلط ہوا۔' میں نے دھیرے سے کہا۔ میں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ اصل بات کیا ہے۔ یہ شخص رب نواز اور ان کے دونوں ساتھی میری ہی گولیوں کا نشانہ بنے ہیں۔ اس خون آشام رات ہماری زندگی کے چراغ گل کرنے کے لیے آنے والی قاتلوں کی پارٹی میں یہ شخص رب نواز بھی شامل رہا ہوگا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے تعاقب میں آنے والی پہلی جیپ کے تین بندے میری گولیوں کا نشانہ بنے تھے۔ یہ انہیں میں سے ایک ہوگا۔ تاہم میں نے مینو استاد کو یہ سب بتانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

'تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تم لوگ کہاں ٹھہرے ہو؟ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔' مینو استاد نے پرخلوص لہجے میں کہا۔

'ہاں ایک مناسب جگہ روپوش ہیں۔ مینو استاد' البتہ سردار شاہ مراد کے کارندے ہمیں ہر طرف تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ تم اتنے دن کہاں رہے؟ شرفو نے بتایا تھا کہ تم نے اسے بھی نہیں بتایا کہ تم کہاں جارہے ہو؟'

'مجھے ایسا کمپنی کی ہدایت پر کرنا پڑا۔ مجھے ہدایت ملی تھی کہ میں شرفو کو یہیں چھوڑ کر تنہا اپنا ٹرک لے کر بلوچستان چلا جاؤں۔'

'لیکن کمپنی والوں نے ایسی ہدایت کیوں کی؟ بلوچستان میں تمہارا کیا کام تھا؟' میں نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

'پتہ نہیں بھائی' ان لوگوں کے دل میں کیا سمائی ہوئی ہے۔ صرف میرا ٹرک ہی نہیں کمپنی کے تمیں ٹرک اور دونوں ٹرالر بلوچستان پہنچ چکے ہیں۔ اسمگلنگ وغیرہ کی تمام کاروائیاں فی الحال بند ہیں۔ تمام ٹرک بلوچستان کے مختلف اڈوں پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں اپنے ٹرک کے ساتھ لورالائی میں پڑا ہوا تھا۔ سب ڈرائیوروں کو ہدایت ہے کہ وہ کسی بھی وقت روانگی کے لیے تیار رہیں۔ خدا جانے یہ سب کیا چکر ہے۔ سنا ہے شاہ مراد بھی آج کل کوئٹہ میں ٹھہرا ہوا ہے۔'

'پر تم کیسے واپس آگئے مینو استاد؟' میں نے سوال کیا۔ میں اپنے وجود میں عجیب سی بے چینی محسوس کررہا تھا۔ ایک موہوم سا اضطراب تھا جو لمحہ بہ لمحہ بڑھ کر مجھے اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔

'میری طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ مجھے شدید بخار ہوگیا تھا۔ کمپنی نے نمائندے نے مجھے اجازت دے دی کہ میں گھر آجاؤں۔ دراصل وہاں میری غیر موجودگی سے کوئی خاص فرق بھی نہیں پڑتا۔ کمپنی نے جو نئے کارندے بھرتی کیے ہیں ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اگر تمیں کی بجائے ساٹھ ٹرک بھی ہوں تو انہیں بندوں کی کمی محسوس نہ ہوگی۔' میرے اضطراب کی شدت میں مزید اضافہ ہوگیا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں خطرے کی سرسراہٹ سی ہورہی تھی لیکن میں اس خطرے کا پوری طرح ادراک نہیں کر پارہا تھا۔

'لیکن کمپنی کو اضافی عملہ بھرتی کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے مینو استاد؟ کیا کمپنی اپنے ٹرکوں کی تعداد میں اضافہ کرنا چاہتی ہے؟' میں نے ٹامک ٹوئیاں مارنے کے انداز میں سوال کیا۔

'فی الحال تو کوئی ایسی بات سننے میں نہیں آئی ویسے یہ تمام اضافی عملہ ماہر ڈرائیوروں پر مشتمل ہے لیکن شاید انہیں دشوار گزار پہاڑی سڑکوں پر بھاری گاڑیاں چلانے کا تجربہ نہیں ہے۔ ایک عجیب و غریب بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے ڈرائیونگ لائسنس کمپنی نے حال ہی میں بنوائے ہیں۔'

مینو استاد کی بات سن کر میرے ذہن میں ایک جھما کا سا ہوا۔ بھارتی ایجنٹ۔۔۔! شاہ مراد یقیناً اپنی کمپنی کی آڑ میں ان ایجنٹوں کو ٹھکانے مہیا کر رہا ہے۔ ٹرک کے ڈرائیور اور کلینز کے روپ میں تربیت یافتہ ایجنٹ یقیناً بڑی آسانی سے ملک کے ہر حصے میں جا سکتے ہیں اور اپنی من مانی کاروائیاں کر سکتے ہیں لیکن ٹرانسپورٹ کمپنی کے تمام ٹرک بلوچستان میں اکٹھا کرنے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ ڈرائیوروں کو کسی بھی وقت روانگی کے لیے تیار رہنے کا حکم ہے لیکن روانگی ہوگی کس طرف؟ سردار شاہ مراد نے اپنی کاروائیوں کا مرکز بلوچستان کو کیوں بنا لیا ہے؟ یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟ بلوچستان کی پہاڑیوں میں کون سی سازش پروان چڑھ رہی ہے؟

'اب تم کب لورالائی جاؤ گے مینو استاد؟' میں نے سوال کیا۔

'اب میری طبیعت کچھ بہتر ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ کل میں واپس لورالائی چلا جاؤں۔'

'اب تم تمام صورت حال سے واقف ہو چکے ہو مینو استاد۔ اپنے آس پاس کے حالات و واقعات پر گہری نظر رکھو۔ مجھے خطرہ ہے کہ سردار شاہ مراد وہاں کوئی خطرناک کھیل کھیل رہا ہے۔ کمپنی کے نئے بھرتی شدہ کارندوں سے ہوشیار رہنا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ سب بھارتی ایجنٹ ہیں۔'

'لیکن وہ سب تو بڑی روانی سے سرائیکی پشتو اور بلوچی زبان میں بات کرتے ہیں۔ اپنے حلیوں سے بھی وہ سرحد اور بلوچستان کے باسی نظر آتے ہیں۔' مینو استاد نے حیرانی سے کہا۔

'ہاں مینو استاد تمہارا کہنا بھی صحیح ہے۔ وہ تمام لوگ یقیناً مقامی باشندے ہی نظر آتے ہوں گے۔ را کے تربیت یافتہ ایجنٹوں سے کسی طرح بھی امید نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ اپنے طور طریقوں سے اپنی اصلیت کا پتہ لگنے دیں گے۔ ظاہری طور پر ان کے رویے اور بول چال کو شک و شبے سے بالاتر بنا دیا گیا ہوگا لیکن مجھے یقین ہے کہ تم جب قریب سے ان پر کڑی نظر رکھو گے تو تمہیں کوئی نہ کوئی کام کی بات ضرور معلوم ہو جائے گی۔' مین نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

'ٹھیک ہے بھائی سعید خان ٹھیک ہے۔' مینو استاد نے پرعزم لہجے میں کہا۔ 'آج سے میری زندگی کا مقصد اپنے وطن کے ان دشمنوں کی بیخ کنی کرنا ہے۔ خدا کرے میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں۔'

'تم سے مجھے یہی امید تھی مینو استاد۔ وہاں پہنچ کر اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا۔ اپنی پوری کوشش کرنا کہ کسی طرح سے یہ سن گن مل جائے کہ ان بدبختوں کے ناپاک ارادے کیا ہیں۔ یہ بہت خطرناک اور نازک کام ہے لیکن مجھے امید ہے کہ تم اسے سرانجام دینے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔' میں نے اپنے

وجود میں موجیں مارتے اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اڑ کر صدیقی اور مرزا کے پاس جا پہنچوں اور انہیں اس تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کردوں۔

'میں کل صبح سویرے لورالائی چلا جاؤں گا اور پہنچتے ہی اپنی کاروائی میں مصروف ہو جاؤں گا لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ اگر مجھے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے تو میں تم سے کیسے رابطہ قائم کروں گا؟ ظاہر ہے مجھے تو تمہاری کسی بھی پناہ گاہ کا علم نہیں ہے اور میرے لیے ہر وقت اپنے گھر میں موجود رہنا ممکن نہیں ہے۔' مینو استاد نے ایک اہم ترین مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی۔

'اوہ یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ واقعی یہ تو بے حد اہم بات ہے۔' میں نے متفکر لہجے میں کہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسے اپنا کون سا پتا بتاؤں۔ ڈاکٹر صنم خان کا گھر تو شاید ہمیں ایک دو دن میں چھوڑنا پڑے۔ کیا میں اسے عالم بستی میں کمال الدین خان کی حویلی کا پتا دے دوں؟ لیکن کسے خبر میں کب تک وہاں پہنچ پاؤں اور اس کا بھیجا ہوا پیغام وہاں پہنچ بھی سکے گا یا نہیں؟ خاصی سوچ بچار کے بعد ایک ہی ترکیب میری سمجھ میں آئی۔

'میں تمہیں ایک فون نمبر دیتا ہوں مینو استاد۔ میں کوشش کروں گا کہ زیادہ دن تک اس فون والی جگہ پر موجود رہوں اگر تمہارا اس نمبر پر مجھ سے رابطہ نہ ہو سکے تو تم اپنے پاس موجود تمام اطلاعات ایک لفافے میں بند کر کے سخی سرور قصبے کے سردار خضر خان کے پاس پہنچانے کی کوشش کرنا۔'

'تم۔۔۔تم سردار خضر خان کو کیسے جانتے ہو؟' مینو استاد نے حیرانی سے پوچھا۔

'سردار خضر خان نے مجھے اپنا چھوٹا بھائی بنا رکھا ہے۔'

'تو پھر تمہیں ادھر ادھر چھپتے پھرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم سیدھے اس کے پاس چلے جاؤ۔ تم اس کی پناہ میں پہنچ گئے تو کوئی تمہارا بال تک بیکا نہ کر سکے گا۔'

'کچھ ایسی مجبوریاں ہیں مینو استاد جن کے باعث میں ایسا نہیں کر سکتا۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ سردار خضر خان سے مسلسل رابطہ رکھ سکوں لیکن یہ یاد رکھنا کہ سردار خضر خان مجھے ذوالفقار علی شاہ کے نام سے پہچانتا ہے۔'

'اوہ اچھا! اچھا! میں یہ بات یاد رکھوں گا۔ ویسے میرا خیال ہے اس کی ایک حویلی یہاں شہر میں بھی ہے۔' اس کی بات سن کر میں نے مسرت اور حیرانی کے ملے جلے جذبات سے کہا۔

'اچھا! مجھے تو معلوم ہی نہیں ہے۔ کہاں ہے اس کی حویلی اور کون رہتا ہے اس میں؟' اس نے بہت کام کی بات بتائی تھی۔ سردار خضر خان کی یہ حویلی ہمارے لیے بہت عمدہ پناہ گاہ ثابت ہو سکتی تھی۔

'یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں کہ یہ حویلی کس جگہ ہے۔ ویسے میرا خیال ہے یہ معلوم کرنا زیادہ دشوار نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سردار خضر خان کی سخی سرور قصبے والی حویلی میں ٹیلی فون موجود ہوگا۔ اس علاقے میں چند سال پہلے ٹیلی فون پہنچ چکا ہے۔'

'مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں۔ خیر یہ بھی اچھی بات ہے۔ تم اگر سردار خضر تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤ تو اس کا فون نمبر بھی حاصل کر لینا۔ سردار خضر ایک پڑھا لکھا، سلجھا ہوا انسان ہے۔ تم اسے اعتماد میں لے

کر اسے اصل بات بتا سکتے ہو اور میرے لیے پیغام بھی دے سکتے ہو۔' میں نے بدستور متفکر لہجے میں کہا۔ میں نے مینو استاد کو جو فون نمبر لکھوایا وہ ڈاکٹر صنم کے گھر کا تھا۔ اس کے علاوہ میرے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود ہمیں ڈاکٹر صنم کا مہمان بن کر رہنا تھا۔

مینو استاد نے بڑی وضاحت سے مجھے لورالائی میں واقع اپنی کمپنی کے اڈے کے بارے میں بتایا۔ میرے دیے ہوئے فون نمبر کو اس نے بڑی احتیاط سے اپنی بنڈی کی جیب میں رکھ لیا۔ کچھ دیر بعد میں نے اس سے اجازت طلب کی۔ اس نے مجھے رات کے کھانے کے لیے روکنا چاہا لیکن میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ 'میرے لیے دعا کرنا مینو استاد۔ خدا مجھے میرے مقصد میں کامیابی عطا کرے۔ میں نے اپنے جوتوں کے فیتے کس کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ مینو استاد بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یک لخت اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا اور وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ کھانستے کھانستے وہ ایک بار پھر اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میں جلدی سے آگے بڑھا اور اس کی پشت سہلانے لگا۔ بڑی مشکل سے اس کی کھانسی تھمی۔ وہ آنکھیں بند کر کے لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ مجھے اس کے چہرے پر شدید نقاہت کے آثار نظر آئے۔

'تمہاری طبیعت تو کافی خراب ہے مینو استاد۔' میں نے تشویش آمیز لہجے میں کہا 'تم اس حالت میں کیسے لورالائی جا سکو گے؟'

'ارے۔۔ بھائی۔۔ پریشان۔۔ کیوں ہوتے ہو؟' مینو استاد نے ہانپتے ہوئے کہا 'مجھے۔۔ کچھ۔۔ کچھ نہیں ہوا ہے۔ معمولی کھانسی ہے میں۔۔ کل تک۔۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔ ویسے بھی۔۔ جہاں ہمارے پاک وطن کی سلامتی کا مسئلہ ہو وہاں ان چھوٹی موٹی بیماریوں کے متعلق کیسے۔۔ سوچا جا سکتا ہے۔'

'خدا تمہیں تمہارے اس جذبے کا اجر عطا کرے مینو استاد۔ تمہیں دیکھ کر میرا حوصلہ ایک بار پھر آسمان سے باتیں کرنے لگا ہے۔'

مینو استاد نے والہانہ محبت کے ساتھ مجھے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ جب میں اس سے الگ ہوا تو میں نے دیکھا کہ مینو استاد کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے ہیں۔ 'خدا حافظ میرے بھائی۔ میرے بچے۔' اس نے جذبات سے بوجھل لہجے میں کہا۔ اس کے خلوص کی گرمی سے مجھے اپنا دل پگھلتا محسوس ہوا۔ 'خدا تمہارا حامی و ناصر ہو' مینو استاد مجھے اپنے گھر کے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے ایک بار پھر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس بار اس نے خاصی دیر میں مجھے خود سے علیحدہ کیا۔ 'خدا حافظ سعید خان۔' اس نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ 'خدا حافظ' میں نے بھی دھیمے لہجے میں کہا اور تیزی سے مڑ کر دروازے سے باہر نکل آیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری آنکھوں کو چھلکتا دیکھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دیر تک گھر کے دروازے میں کھڑا رہا ہو گا لیکن میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ تیز قدم اٹھاتا' میں سڑک پار کر کے اے بلاک میں داخل ہو گیا۔ خاصی دور آ کر میں نے اپنی قمیص کی آستین سے اپنی آنسوؤں سے دھندلاتی آنکھوں کو پونچھا۔ ایک گہری سانس لے کر میں نے اپنے دل پر موجود جذباتی بوجھ کو ہلکا کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت تک رات اتنی گہری نہیں ہوئی تھی۔ لوگوں کے گھروں میں

چلنے والے ٹیلی ویژن کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس وقت آٹھ ساڑھے آٹھ کا وقت ہوا ہے۔ اس روز شاید کوئی بے حد دلچسپ ٹی وی پروگرام آ رہا تھا کیونکہ مجھے گلیوں میں اور سڑکوں میں خاصے کم لوگ نظر آئے۔

ایک بلاک میں داخل ہوتے ہی میں نے اپنے آئندہ کے قدم کے بارے میں سوچا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں یہاں سے سیدھا ماڈل ٹاؤن کی طرف لوٹ جاؤں لیکن پھر میں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ مجھے یاد آ گیا کہ ہم لوگوں کو میک اپ کے سامان کی بے حد شدید ضرورت ہے۔ مرزا نے میک اپ کے لیے اہم ترین اشیا کی جو فہرست مجھے بتائی' وہ میرے ذہن پر نقش تھی۔ میری جیب میں اچھی خاصی رقم موجود تھی۔ میں نے سوچا کہ لگے ہاتھوں یہ سامان بھی خرید لیا جائے۔ خدا جانے پھر حالات ہمیں یہ مہلت دیں یا نہ دیں۔

ایک بلاک کے چوک سے بائیں ہاتھ پر مڑ کر میں دو بلاک میں داخل ہوا اور پھر بلاک کراس کر کے صدر بازار پہنچ گیا۔ اس وقت تک اکا دکا دکانیں بند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ تاہم تمام میڈیکل اور جنرل اسٹور ابھی تک کھلے ہوئے تھے۔ بدلتے ہوئے موسم کی وجہ سے شام ڈھلے موسم بے حد خوش گوار ہونے لگا تھا۔ لہٰذا اس وقت بھی مجھے دوکانوں پر گاہکوں کی اچھی خاصی بھیڑ نظر آئی۔ میں سیدھا ایک بڑے سے جنرل اسٹور میں داخل ہو گیا۔ اسٹور کا نوجوان سیلز مین اس وقت اپنی ایک خاتون گاہک کو نمٹا رہا تھا۔ سیاہ برقعے میں ملبوس وہ دراز قامت خاتون کاسمیٹکس کا سامان دیکھ رہی تھی۔ میں خاموشی سے دکان دار کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ خلاف توقع اسے خاصی دیر لگ گئی۔ نقاب سے نصف چہرہ ڈھکے وہ خاتون کسی خاص شیڈ کی لپ اسٹکس کی تلاش میں تھی۔ دکان دار نے تھوڑا سا بے زار ہو کر لپ اسٹک کا اچھا خاصا ڈھیر اس کے سامنے سرکا دیا اور پھر میری طرف متوجہ ہوا 'جی فرمایئے آپ کو کیا چاہیے؟'

میں نے اسے اپنی مطلوبہ اشیا میں سے دو کا نام بتایا۔ دکان دار شیشے کے بنے شوکیس میں سے میری مطلوبہ چیزیں نکالنے لگا۔ میں دکان میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ وہ عورت کن انکھیوں سے میرا جائزہ لے رہی ہے۔ میں نے جان بوجھ کر براہ راست اس کی طرف نہیں دیکھا۔ دیکھتی ہے تو دیکھتی رہے۔ میرا اس میں کیا جاتا ہے۔ اگر میں نے بھی اسے بغور دیکھا تو یہ خواہ مخواہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے گی۔ اس کی آواز تو بہت دلکش ہے۔ جانے شکل کیسی ہو گی؟ میرا دماغ بھٹکنے لگا لیکن میں نے سر جھٹک کر اپنی آوارہ خیالی پر قابو پا لیا۔ دکان دار نے مختلف برانڈ کی بہت سی کاسمیٹکس کی اشیاء میرے سامنے رکھ دیں۔ سستی مہنگی' بہت مہنگی' ملکی' غیر ملکی' امپورٹڈ' باڑے کا مال۔۔ بظاہر یہ سب خواتین کے میک اپ کی اشیاء تھیں۔ میں نے ان میں سے سب سے اعلیٰ کوالٹی کی اشیا کا انتخاب کیا۔ نتیجتاً مجھے ادائیگی بھی ٹھیک ٹھاک کرنا پڑی۔ وہ دکان دار سمجھ رہا ہو گا کہ میں اپنی چہیتی بیوی یا نخریلی محبوبہ کے لیے یہ سامان خرید رہا ہوں۔ اسے کیا خبر کہ۔۔ میرے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔

اپنی خرید کردہ اشیا کو پیک کروا کر میں اسٹور سے باہر نکل آیا۔ اس دوران میں' میں نے اس برقع پوش عورت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ البتہ اسٹور کے دروازے سے نکلتے ہوئے میرے کانوں میں ایسی آوازیں پڑیں جن سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ عورت دکاندار سے معذرت کر کے خود بھی رخصت ہو رہی ہے۔ فٹ پاتھ پر آنے کے بعد میں پرسکون انداز میں چلتا' کچھ فاصلے پر واقع دوسرے بڑے اسٹور کی جانب بڑھا۔ چلتے چلتے میں نے گردن کو تھوڑا سا موڑ کر اپنے عقب پر ترچھی نظر ڈالی۔ میں نے دیکھا کہ وہ عورت میری طرف دیکھتی دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی ہے۔ میرے لبوں پر ایک بے ساختہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ عورت یا لڑکی مجھ سے متاثر ہو چکی ہے۔ دوسرے اسٹور میں داخل ہوتے ہوئے میں نے ایک بار پھر اس کی طرف نظر ڈالی۔ میں نے دیکھا کہ وہ فٹ پاتھ پر کھڑی میری ہی طرف دیکھ رہی ہے۔ میں مسکراتا ہوا اسٹور میں داخل ہو گیا۔

اس اسٹور میں پہلے سے ہی چار پانچ گاہک موجود تھے جبکہ کاؤنٹر کے پیچھے مجھے ایک اچھی خاصی عمر کے صاحب نظر آئے۔ یہ صورت حال میرے نقطہ نظر سے بے حد مناسب تھی۔ گاہکوں کی کثرت کی وجہ سے دکان دار کو اتنا موقع ہی نہ ملتا کہ وہ خصوصی طور پر میری طرف متوجہ ہوتا۔ اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے میں نے اسٹور کے دروازے کی طرف کئی بار نظر دوڑائی۔ مجھے موہوم سی توقع تھی کہ شاید وہ عورت جراتِ مندانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے تعاقب میں اس اسٹور میں بھی پہنچ جائے لیکن میری توقع پوری نہ ہو سکی۔ مجھے اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی۔ یہ میں کن چکروں میں پڑ گیا۔ اب میرا ذہن خواہ مخواہ اجنبی عورتوں کی جانب بھٹکنے لگا ہے۔ یہ سب شاید ڈاکٹر صنم کی محبت کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر صنم کے متعلق سوچتے ہی جانے کیوں مجھے ہلکی سی جھرجھری آ گئی۔ جیسے برفیلی ہوا کا کوئی کٹیلا جھونکا میری ریڑھ کی ہڈی سے ٹکرایا ہو۔ اپنے گاہکوں سے فارغ ہونے کے بعد ادھیڑ عمر دکان دار میری طرف متوجہ ہوا۔ میں نے اسے چند اشیا کے نام بتا دیے۔

اس مرتبہ بھی میں نے اعلیٰ معیار کی اشیا خریدیں۔ اس کے ساتھ ہی میرے نوے فی صد خریداری مکمل ہو گئی۔ اب مجھے صرف چند چھوٹی موٹی اشیا خریدنی تھیں جو کسی بھی ہارڈ ویر اسٹور سے مل جاتیں۔ جب تک میں کسی ہارڈ ویر اسٹور کو ڈھونڈتا' مجھے خاصی بھوک لگنے لگی۔ خریداری مکمل کرنے کے بعد اپنی بھوک کا علاج تلاش کرنے لگا۔ سامنے ہی مجھے اپنی منزل مقصود نظر آئی۔ غلہ منڈی کی طرف جانے والی بڑی سی گلی کی نکڑ پر' پینے کے پانی کی ٹینکی کے نزدیک موجود وہ پکوڑے اور سموسے وغیرہ کی دکان خاصی معروف ہے۔ اس وقت بھی پکوڑے والا گرم گرم سموسے اور پکوڑے تل رہا تھا۔ میں بھی کئی دوسرے لوگوں کے ہمراہ آہنی بینچوں پر بیٹھ گیا۔ اس خوش گوار شام ان سموسوں اور پکوڑوں نے بے حد لطف دیا۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔

مسرور انداز میں ٹہلتا میں غلہ منڈی کی طرف بڑھا۔ غلہ منڈی کے گیٹ کے سامنے سے میں دائیں ہاتھ مڑ کر ایک بار پھر بائیں طرف مڑ گیا۔ اس گلی میں خاصی کم روشنی تھی۔ میں پرسکون انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ میں نے تیس چالیس گز کا فاصلہ ہی طے کیا ہوگا کہ اچانک میرے حساس کانوں نے

عقب سے کسی کے بڑھتے قدموں کی آہٹ سنی۔ میں چونک کر پیچھے کی طرف مڑا۔ آنے والے پر نظر پڑتے ہی مجھے اپنا دماغ چکراتا محسوس ہوا۔ خاکی اور سیاہ وردی میں ملبوس وہ سنتری مجھے سیدھا اپنی جانب بڑھتا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف رائفل تھی جو اس نے بڑے عجیب سے انداز میں پکڑی ہوئی تھی۔ مجھے مڑتے دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے رائفل سیدھی کر کے اسے مجھ پر تان لیا۔

'کیوں بھئی کیا بات ہے؟ کیا چاہتے ہو مجھ سے؟' میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے رعب دار لہجے میں سوال کیا۔

'خبردار' اپنے ہاتھ سر سے اوپر اٹھا لو ورنہ گولی مار دوں گا۔' اس نے جواباً دھیمے لیکن مستحکم لہجے میں کہا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میرے لہجے نے اس پر کوئی اثر نہیں کیا ہے۔

'کوئی ایسی ویسی حرکت کی کوشش کی تو میں تجھے چھلنی کر دوں گا۔' اس نے سیدھا میرے دل کا نشانہ باندھ لیا۔ اپنی دھمکی کو بامعنی ثابت کرنے کے لیے اس نے پلک جھپکتے ہی اپنی کلاشنکوف کو کاک کر لیا۔ رائفل کے بے رحم سیاہ دہانے کو آگ برسانے کے لیے تیار پا کر میں محض تلملا کر رہ گیا۔ مجھے چند لمحے ملے تھے جن سے میں بھرپور فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہو جاتا تو میں اس ناگہانی آفت سے جان چھڑا سکتا تھا لیکن میں نے تذبذب کی کیفیت میں وہ کندن جیسے لمحے گنوا دیے۔ اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ کسی کٹھ پتلی کے مانند اس موت کے ہرکارے کے حکم کی تعمیل کروں۔

میں نے مایوسی کی دلدل میں دھنستے ہوئے دھیرے دھیرے اپنے ہاتھ سر سے اوپر اٹھا دیے۔ اب بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔ وہ سنتری مجھے اتنا چوکنا نظر آیا کہ میری ہلکی سی جنبش سے اس کی انگلی رائفل کا ٹرائیگر دبا دیتی۔ اس کی آنکھوں میں لہراتی چمک اسے کوئی بے حد بے جگر قسم کا شخص ثابت کر رہی تھی۔ وہ یقیناً مجھے اچھی طرح پہچان چکا ہوگا۔ میری تصویر تو تمام پولیس والوں کے ذہن میں نقش ہو چکی ہوگی۔ مینو استاد نے مجھے بتایا تھا کہ سردار شاہ مراد نے میری زندہ یا مردہ گرفتاری پر غیر سرکاری طور پر دو لاکھ روپے نقد کا انعام رکھا ہوا ہے۔ یہ دو لاکھ کی رقم تو اس مفلس شخص کی قسمت بدل سکتی ہے۔ اس رقم کے حصول کے لیے تو یہ میری بوٹیاں کر ڈالے گا۔ لے بھائی سیف داد خان بالآخر تیرا آخری وقت آن ہی پہنچا۔ شاید مایوسی کے عالم میں مجھے اپنے قدم زمین میں دھنستے محسوس ہوئے۔ میں بے بسی کے عالم میں رائفل کی نال سے چھوٹنے والی پھلجھڑی کا انتظار کرنے لگا۔

کئی لمحے کے انتظار کے باوجود کچھ نہ ہوا۔ وہ سنتری پوری طرح چاق و چوبند انداز میں میرا سینہ اپنی شست میں لیے کھڑا رہا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ یہ کس انتظار میں ہے؟ دفعتاً مجھے اپنے عقب میں محتاط چاپوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے دھیرے سے گردن موڑ کر دیکھا۔ مجھے ایک بار پھر اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا محسوس ہوا۔ میرے عقب میں آنے والا بھی ایک لمبا تڑنگا کلاشنکوف بردار سنتری تھا۔ اس کی رائفل کی نال کا رخ مجھے سیدھا اپنی کھوپڑی کی طرف نظر آیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب میرے بچنے اور فرار ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ میں ہر طرف سے گھیرا جا چکا ہوں۔ میرے پاس میرا

پستول موجود ہے لیکن کیا یہ دونوں مجھے اسے نکالنے کی مہلت دیں گے؟ نہیں! ناممکن۔

'کیا بات ہے بھائیو؟ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟' میں نے لجاجت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

'بک بک بند کرو۔' میرے عقب میں آنے والے نے کرخت لہجے میں حکم دیا۔

'چپ چاپ دیوار کی طرف مڑو اور دیوار پر دونوں ہاتھ رکھ کر اپنی ٹانگیں چوڑی کر کے کھڑے ہو جاؤ۔' اس کا لہجہ اس قدر تحکم آمیز اور بے لچک تھا کہ میں کسی روبوٹ کی مانند قریبی دیوار کی جانب مڑ گیا۔ جس دیوار پر میں نے اپنے دونوں ہاتھ رکھے وہ غلہ منڈی کی نیم پختہ دیوار تھی۔ اس دیوار پر کہیں کہیں کچی مٹی کا لیپ موجود تھا۔ اس حالت میں کھڑے ہونے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اس پوزیشن سے میرے لیے فوری طور پر کوئی عملی کاروائی کرنا ممکن نہیں ہے۔ پیچھے مڑ کر اپنا توازن درست کیے بغیر میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے ہلکی سی حیرانی ہوئی۔ اس پسماندہ ترین علاقے کے نیم خواندہ کانسٹیبلوں کو یہ جدید ترین طور طریقے کس نے سکھا دیے؟ مجھے حیران ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ ان دونوں میں سے کسی ایک نے بڑی پھرتی سے میری قمیض کا پچھلا دامن اٹھایا اور میری پینٹ کی پشت پر اڑسا ہوا میرا کولٹ پستول نکال لیا۔ یک لخت مجھے لگا کہ میرے ہاتھ پیروں کی جان نکلی جا رہی ہے۔ میں مایوسی کے اندھیروں میں غوطے کھاتے ہوئے ان کے اگلے حکم کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک میری حساس سماعت نے کسی دھات کے دھیمی آواز میں چر چرانے کی آواز سنی۔ لمحے بھر میں ہی میری تمام تر حسیات بیدار ہوگئی۔ میں نے ذہن پر زور ڈال کر سمجھنے کی کوشش کی کہ یہ آواز کیسی ہے؟

اسی لمحے میں نے کلک کی ہلکی سی آواز سنی۔ اس آواز کو پہچاننے میں ذرا دیر نہ لگی۔ وہ رائفل کا سیفٹی کیچ چڑھانے کی آواز تھی۔ اب یہ سیفٹی کیچ ہٹائے بغیر رائفل فائرنگ نہیں کر سکتی تھی۔ میری رگوں میں لہو کی گردش بے حد تیز ہوگئی۔ میرے کانوں نے ایک بار پھر دھات کی وہی دھیمی چر چراہٹ سنی۔ اس بار میرا دماغ بجلی کی سی تیزی سے حقیقت کی تہ تک پہنچ گیا۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ کیسی آوازیں ہیں اور ان کا کیا مطلب ہے۔ میں نے تیزی سے اپنا سر جھکایا اور اپنی بغلوں کے نیچے سے اپنے عقب میں دیکھا۔ عقب کے منظر پر نظر پڑتے ہی میرے اندازوں کی تصدیق ہوگئی۔ وہ دونوں کانسٹیبل اپنی رائفلوں کی سنگینیں سونتے نپے تلے قدموں سے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ نوک دار سنگینیں ان کی رائفلوں کے نیچے فولڈ حالت میں موجود تھیں۔ میرے کانوں نے چر چراہٹ کی جو آوازیں سنی وہ ان ہی سنگینوں کے سیدھا کرنے کی تھیں۔

میرا ذہن برق رفتاری سے دو نتائج تک پہنچ گیا۔ اوّل یہ کہ یہ دونوں کانسٹیبل مجھے قتل کرنے کا مصمم ارادہ کر چکے ہیں۔ دوم یہ کہ یہ مجھے بالکل خاموشی سے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ کسی وجہ سے یہ میری موت کو فی الحال پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ان نتائج تک پہنچتے ہی میں فوری طور پر حرکت میں آ گیا۔ قبل اس کے کہ وہ اپنی رائفلوں کی سنگینیں میری پشت میں گھونپتے' میں برق رفتاری سے زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ میری اس حرکت سے وہ ٹھٹک سے گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں اپنی رائفلوں کو تول کر مجھ پر جھپٹتے' میں ایک بار پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اسی دوران میں میرا رخ ان دونوں کی جانب ہوگیا۔ مجھے اپنے روبرو پا کر وہ

قدرے محتاط ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی رائفلوں کی سنگینیں ایک ساتھ میرے پیٹ میں گھونپنے کی کوشش کی۔ میں نے اپنے جسم کی تمام تر قوت یکجا کر کے برق رفتاری سے اپنے جسم کو حرکت دی۔ جب تک وہ نوک دار سنگینیں میرے جسم تک پہنچتیں' میں پینترا بدل کر ان کے نشانے سے ہٹ چکا تھا۔ دونوں سنگینیں نیم پختہ دیوار سے ٹکرائیں۔ ان میں سے ایک سنگین تو اینٹ پر پڑ کر اچٹ گئی جب کہ دوسری دو اینٹوں کے بیچ میں اٹک گئی۔ قبل اس کے کہ وہ رائفل کو جھٹکا دے کر سنگین باہر نکالتا' میرا دایاں ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا۔ میرے ہاتھ کی مٹھی میں بھری ہوئی ریت اور بجری کی بوچھار اس کے چہرے پر پڑی۔ اس نے ہلکی سی چیخ ماری اور رائفل کو چھوڑ کر اپنے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے۔ اس کے دوسرے ساتھی نے یہ ماجرا دیکھا تو وہ اپنی رائفل تول کر غراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ جونہی وہ میرے قریب پہنچا میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی مٹھی کی ریت اور بجری اس کے منہ پر دے ماری۔ وہ اس حربے کے لیے کسی حد تک تیار تھا۔ اس نے پھرتی سے اپنے چہرے کو موڑ کر اس بوچھاڑ سے اپنی آنکھوں کو بچا لیا لیکن اس دوران میں مجھے وہ مہلت مل گئی جس کی مجھے تلاش تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا چہرہ میری جانب کر کے سنگین سے مجھ پر حملہ کرتا' میں نے زمین سے کئی فٹ اوپر اچھل کر پوری قوت سے اس کے سینے پر لات ماری۔ میرا یہ وار توقع سے بڑھ کر کارگر ثابت ہوا۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف ہٹا اور لڑکھڑاتا ہوا پہلو کے بل زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ اس کی رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر قریبی نالی کے اندر جا گری۔ اس ضرب نے شاید اس کی ایک آدھ پسلی توڑ ڈالی تھی کیونکہ وہ اپنا سینہ اپنے ہاتھوں سے دبائے بری طرح تڑپ رہا تھا۔

اس کی طرف سے کسی حد تک مطمئن ہونے کے بعد میں دوسرے حملہ آور کی طرف متوجہ ہوا۔ اس اثنا میں اس کی آنکھیں دوبارہ دیکھنے کے قابل ہوگئیں۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر پہلے تو اس نے دیوار میں گڑی اپنی رائفل کی طرف بڑھنا چاہا لیکن پھر شاید اسے خیال آیا کہ میں اس دوران میں اس پر پشت سے حملہ کر کے اسے بیکار کر دوں گا چنانچہ اس نے رائفل کا خیال چھوڑ دیا اور خم ٹھونک کر میرے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اس کے انداز سے بے خوفی اور بے جگری عیاں تھی۔ اپنے ساتھی کی حالت کا اس نے ذرا بھی اثر نہ لیا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ البتہ اس کی آنکھوں سے مجھے خون برستا نظر آیا۔ اس نے مجھ پر نگاہ جماتے ہوئے نپے تلے قدموں سے چند پینترے بدلے۔ دفعتاً میں نے اسے بھپکی دی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جسم نے ایک خاص انداز میں حرکت کی۔ اس نے اپنے تمام جسم کو اپنی بائیں ٹانگ پر متوازن کیا اور اپنی دائیں ٹانگ بجلی کی سی تیزی سے فضا میں گھمائی۔ شائیں کی آواز کے ساتھ فضا میں قوس بنانے کے بعد اس کی ٹانگ ایک بار پھر زمین پر جم گئی۔ اگر بھپکی دینے کے بجائے اس نے واقعی مجھ پر حملہ کیا ہوتا تو شاید میرا جبڑا کئی حصوں میں تقسیم ہو چکا ہوتا۔ مجھے اپنی رگوں میں لہو کی گردش تیز ہوتی محسوس ہوئی۔ مجھے ہلکے سے خوف کا احساس ہوا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ شخص کراٹے کا ماہر ہے۔ یہ فن میرے لیے پوری طرح اجنبی نہیں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نویں جماعت میں تھا تو کراٹے کا شوق نوجوان لڑکوں میں وبا کی طرح پھیل گیا تھا۔ ہر دوسرا لڑکا اس فن کو سیکھنے کا مشتاق

تھا۔ شہر میں کراٹے کے کئی چھوٹے بڑے کلب بھی کھل گئے تھے۔ اس زمانے میں مجھے بھی اس فن سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی لیکن میرے حالات نے مجھے اجازت نہ دی کہ میں اپنے شوق کی تکمیل کے لیے کوئی عملی قدم اٹھا پاتا اور اب اس نیم تاریک گلی میں ایک ماہر کراٹیکا میرے مدمقابل تھا۔ ایک معمولی پولیس کانسٹیبل کو اس روپ میں دیکھ کر مجھے شدید حیرت ہوئی۔

وہ شخص چند لمحے تک میری طرف سے پیش قدمی کا منتظر رہا۔ پھر یک لخت وہ حرکت میں آ گیا۔ اس نے اپنی پشت میری طرف کی۔ اس سے قبل کہ میں کچھ سمجھ پاتا' اس کی بائیں ٹانگ فضا میں بلند ہوئی اور دائرہ بناتی سیدھی میرے چہرے کی طرف آئی۔ میں نے اضطراری طور پر اپنا چہرہ بچایا نتیجتاً وہ کک میرے چہرے کے بجائے بائیں شانے پر پڑی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے شانے پر بھاری بھرکم ہتھوڑا دے مارا ہو۔ میں بری طرح لڑکھڑا گیا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل پاتا' اس نے ایک بار پھر وہی تباہ کن داؤ دہرایا۔ یہ محض میری خوش قسمتی ہی کہی جا سکتی ہے کہ عین اسی وقت میں لڑکھڑاتا ہوا ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی کک شائیں سے میرے چہرے کے سامنے سے گزر گئی۔ اس نے اپنا اگلا وار بھی فوراً ہی کر ڈالا۔ اس کی بائیں ٹانگ فضا میں لہرائی اور میرے دائیں بازو سے ٹکرائی۔ میرا توازن تو ضرور تھوڑا بگڑا البتہ مجھے کسی قسم کی تکلیف کا احساس نہ ہوا۔ بچپن سے ہی بھاری بھرکم آہنی ہتھوڑا چلاتے چلاتے میرے بازو خود بھی فولاد بن چکے تھے۔ میرے بازوؤں پر تو شاید کوئی لاٹھی بھی اثر نہ کرتی۔ اتنی بھرپور کک کے باوجود میرے چہرے پر کسی قسم کی تکلیف کا تاثر نہ پا کر اسے ہلکی سی حیرانی ہوئی۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا اگلے ہی لمحے اس نے ایک اور درو مارا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے زمین پر بیٹھا۔ اپنے ایک پیر پر خود کو متوازن کر کے اس نے اپنی دوسری لات کو کسی لاٹھی کی طرح گھمایا۔ وہ بھاری بھرکم لاٹھی میری ٹانگوں سے ٹکرائی۔ مجھے پتا بھی نہ چلا کب میرا جسم فضا میں اچھلا اور دھم سے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میں کھوئی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس وقت میں مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر تھا لیکن اس وقت وہ میری حالت سے پوری طرح سے لطف لینا چاہتا تھا۔ اس کے لبوں پر بے حد طنزیہ اور تضحیک آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے بڑے حقارت بھرے انداز میں ہاتھ کے اشارے سے مجھے کھڑا ہونے کو کہا۔

دفعتاً میرے دماغ میں زبردست شرارے چھوٹے۔ جیسے کسی نے بارود کو آگ لگا دی ہو۔ میری رگوں میں گردش کرنے والا لہو یک لخت آتشی لاوے میں تبدیل ہو گیا۔ مجھے لگا میں محض اپنی آنکھوں سے برسنے والے انگاروں سے اسے جلا کر راکھ کر دوں گا۔ وہ بدقسمت شخص اس صورت حال سے بے خبر تھا۔ جوں ہی میں اٹھا اس نے اپنی لات گھما کر میرے بازو پر ماری۔ اس مرتبہ وہ لات سیدھی میرے بائیں بازو کے شکنجے میں جکڑ گئی۔ اس نے گھبرا کر اپنی دوسری ٹانگ مجھے کک مارنے کی کوشش کی لیکن اسے اس کا موقع نہ مل سکا۔ میری دائیں ٹانگ پوری قوت سے اس کی بائیں ٹانگ کی ران پر اندر کی جانب لگی۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔ میں نے فوراً ہی دوسرا وار بھی اس جگہ کیا۔ اس کی دوسری چیخ پہلی سے زیادہ کربناک تھی۔ میں نے اس کی ٹانگ چھوڑ دی۔ وہ کھڑا تو ہو گیا لیکن بری طرح لڑکھڑاتا

رہا۔ میں قدم بڑھاتا' سیدھا اس کے سامنے پہنچ گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں خوف اور دہشت کی دھند پھیلتی دیکھی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ اپنی مجروح ران پر رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے مجھے خود سے دور رکھنے کی کوشش کی۔

میرا دایاں ہاتھ مشینی انداز میں حرکت میں آیا اور میرا تباہ کن گھونسا اس کے منہ پر پڑا۔ اس کے جسم کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ تیورا کر پیچھے ہٹا۔ اس کے ہونٹوں نے فوراً ہی خون اگلنا شروع کر دیا۔ میں نے اسے دوبارہ سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ میرے دونوں بازو باری باری حرکت میں آئے' وحشیانہ قوت کے حامل دو گھونسے یکے بعد دیگرے اس کے منہ پر پڑے۔ دوسرے گھونسے کے ساتھ ہی میں اس کا جبڑا ٹوٹنے کی آواز سنی۔ اس مرتبہ وہ اپنی اذیت پر قابو نہ پا سکا۔ اس کے حلق سے ایک کربناک چیخ نکلی اور سناٹے کی چادر کو چیرتی چلی گئی۔ البتہ وہ ابھی تک اپنے پیروں پر کھڑا جھوم رہا تھا۔ میں نپے تلے قدموں سے ایک بار پھر اس کی طرف بڑھا۔ عین اسی وقت مجھے اپنے عقب میں ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ قبل اس کے کہ میں پلٹ کر دیکھتا' میرے دائیں شانے پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ مجھے لگا میرے کاندھے کی ہڈی سینکڑوں کرچیوں میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اضطراری طور پر میں چند قدم آگے تک بڑھتا چلا گیا پھر میں نے بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ دوسرا کانسٹیبل تھا۔ جس کے سینے پر میں نے ضرب لگائی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اس نے کلاشنکوف رائفل کو لاٹھی کے مانند پکڑا ہوا ہے۔ اس نے رائفل کا فولادی بٹ میرے سر پر مارنے کی کوشش کی تھی لیکن اپنی بدقسمتی یا میری خوش قسمتی سے وہ اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا اور محض میرے شانے کو نشانہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ میں نے اپنے شانے میں لہریں مارتے کرب کے سمندر کو نظر انداز کر کے اس کی نقل و حرکت کا جائزہ لیا۔ دفعتاً مجھے اپنی رگوں میں لہو منجمد ہوتا محسوس ہوا۔ وہ شخص رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹا کر میرے سینے کا نشانہ لے رہا تھا۔ میرے پاس مہلت بہت کم تھی۔ شاید ایک لحہ یا اس سے بھی کم ۔۔ میں صحرائی بگولے کے مانند گھوما اور اپنے پہلو میں جھومتے مجروح کانسٹیبل کی طرف لپکا۔ عین اسی وقت کلاشنکوف بردار کانسٹیبل نے فائر کر دیا۔ دھماکے کی خوفناک آواز نے ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی سانس روکنے پر مجبور کر دیا۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی فضا میں مجروح کانسٹیبل کی فلک شگاف چیخ گونجی۔ کلاشنکوف کی گولی اس کی پسلیاں توڑ کر اس کے سینے میں بہت اندر تک گھس گئی تھی۔

دفعتاً میں نے کچھ فاصلے پر کسی عورت کی چیخ کی آواز سنی۔ یہ آواز سنتے ہی میں بری طرح چونک پڑا۔ میں نے دیکھا کہ گلی کے نکڑ سے ایک سیاہ برقع پوش عورت ہذیانی انداز میں چیختی ہماری طرف بڑھ رہی ہے۔ میں نے خود کو حیرانی کے جھٹکے سے سنبھالا اور ایک بار پھر کلاشنکوف بردار کانسٹیبل پر نگاہ ڈالی۔ گولی سے گھائل کانسٹیبل ابھی تک میری ڈھال بنا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کلاشنکوف بردار شخص پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے ساتھی کے ہولے ہولے جھٹکے لیتے جسم کو دیکھ رہا ہے۔ اس کی رائفل کا رخ زمین کی طرف ہو چکا تھا۔ سیاہ برقع میں ملبوس وہ عورت ذرا قریب پہنچی تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی عورت تھی جو مجھے جنرل اسٹور میں ملی تھی۔ وہ بری طرح سے روتی ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ رائفل

بردار کانسٹیبل نے کھوئی کھوئی نظروں سے اس عورت کو دیکھا۔اس عورت نے زاروقطار روتے ہوئے اس کی رائفل چھینی اور زمین پر پٹخ دی۔اگلے ہی لمحے اس کا وحشیانہ قوت کا حامل طمانچہ کانسٹیبل کے گال پر پڑا۔ 'کتی کے بچے تو نے گولی کیوں چلائی؟' اس نے بری طرح سے چیختے ہوئے کہا۔اگلے ہی لمحے وہ دیوانہ وار ہماری طرف بڑھی۔ 'ترمتی ۔۔۔ ترمتی ۔۔۔' اس نے میرے بازوؤں میں جکڑے قریب المرگ کانسٹیبل کو شانے سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ میں نے بڑی آہستگی سے اپنے پر بوجھ بنے کانسٹیبل کو آزاد کر دیا۔ وہ کٹے درخت کے مانند زمین پر گرنے لگا لیکن اس عورت نے سنبھال لیا۔ 'بھگوان کے لیے ہوش میں آؤ ترمتی' اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ سن کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔وہ عورت اس کو بھگوان کا واسطہ دے رہی تھی۔ میں نے چونک کر اس عورت کے چہرے پر نظر ڈالی لیکن اس کا نقاب میں چھپا چہرہ مجھے واضح طور پر نظر نہ آسکا۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کروں کہ میں نے بہت سے لوگوں کی اونچی آواز میں بات کرنے کی آواز سنی۔ وہ دس پندرہ افراد تھے۔ جو فائرنگ اور چیخ کی آواز سن کر اس طرف آ گئے تھے لیکن وہ گلی کے نکڑ سے آگے بڑھنے کی خود میں ہمت نہیں پا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ گلی میں واقع مختلف مکانوں کی کھڑکیاں اور دروازے بھی کھلنے لگے۔ صورت حال کی نزاکت محسوس کر کے میں بری طرح مضطرب ہو گیا۔ میں جس قدر جلدی وہاں سے نکل بھاگتا اتنا ہی میرے حق میں بہتر ہوتا۔ چہ می گوئیاں کرنے والے تماشائیوں کو اگر معاملے میں مداخلت کی سوجھ گئی تو مجھے اپنی جان بچانی مشکل ہو جائے گی۔

اس عورت نے گھائل شخص کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا تھا جبکہ گولی چلانے والا کانسٹیبل مجرموں کے انداز میں سر جھکائے اُس کے پاس کھڑا تھا۔ وہ دونوں شاید میری طرف سے پوری طرح غافل ہو چکے تھے۔ صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں تیزی سے گلی کے دوسرے کونے کی طرف بڑھا۔ عین اسی وقت مجھے دیوار کے ساتھ اپنا کولٹ پستول پڑا نظر آیا۔ میں نے فوری طور پر اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ گلی کے سرے کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے دیکھا کہ گلی کے اس موڑ پر بھی کئی افراد کھڑے ہیں۔ مجھے پستول ہاتھ میں لیے اپنی طرف بڑھتے پا کر وہ دیوانہ وار دوڑ پڑے۔ میں گلی میں دائیں ہاتھ پر مڑنے کے بجائے سیدھا نکلتا چلا گیا۔ میری رفتار بہت تیز تھی۔ میں تقریباً دوڑ رہا تھا۔

گلی کے سرے پر پہنچ کر میں نے اپنا پستول پتلون میں اڑس لیا۔ مجھ پر یہی دھن سوار تھی کہ جلد از جلد وقوعہ سے دور نکل جاؤں۔ میں بائیں ہاتھ پر مڑ کر ایک اور تاریک گلی میں گھس گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں کالج روڈ پر پہنچ گیا۔ پٹرول پمپ کے قریب مجھے ایک رکشا نظر آیا۔ میں نے اسے ماڈل ٹاؤن چلنے کو کہا۔ قدرے پس و پیش کے بعد رکشے والا راضی ہو گیا۔ رکشے کی سیٹ پر بیٹھتے ہی مجھے اپنے شانے کے درد کا ایک بار احساس ہونے لگا۔ یہ جان کر مجھے خاصا اطمینان ہوا کہ میرے شانے کی ہڈی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے اور میں اپنے ہاتھ کو حسب مرضی حرکت دے سکتا ہوں۔

رکشا ماڈل ٹاؤن کی طرف رواں دواں تھا۔ میں نے اپنے شانے کے درد سے دھیان ہٹانے کے لیے خود کو خیالات کے حوالے کر دیا۔ یہ تو مجھے یقین ہو ہی چکا تھا کہ وہ عورت اور دونوں پولیس والے

دراصل بھارتی ایجنٹ تھے۔ اس عورت نے یقیناً جنرل اسٹور میں مجھے پہچان لیا ہوگا لیکن کیسے؟ وہ مجھے کیوں کر پہچان گئی؟ اس نے مجھے پہلے کہاں دیکھا ہے؟ میرے ذہن میں ایک خیال کوندے کے مانند لپکا۔ شاید وہ عورت ندا ہے۔ وہی حرافہ جس نے ملک کریم کو اپنے حسن کے جال میں پھنسا کر اغوا کر لیا ہے۔ میں نے اپنے ذہن پر زور ڈال کر اس برقع پوش کی کوئی ایسی بات یاد کرنے کی کوشش کی جو اسے ندا ثابت کر سکے۔ خاصی سوچ بچار کے بعد میں قائل ہو گیا کہ وہ برقع پوش عورت ندا ہی ہو سکتی ہے۔ وہی مجھے میرے موجودہ حلیے میں بہت قریب سے دیکھ چکی تھی۔

میں نے رکشے کو ڈاکٹر صنم کے گھر سے خاصے فاصلے پر رکوا لیا۔ گیٹ پر نصب کال بیل بجانے کے بعد میں اس انداز میں کھڑا ہو گیا کہ گھر کے اندر سے مجھے واضح طور پر دیکھا جا سکے۔ گیٹ کھولنے کے لیے حسب معمول ڈاکٹر صنم خود آئی۔ 'ہوں! تو آ گئے تم؟ بہت دیر لگائی تم نے شہر میں!' میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے محض سر ہلا کر اس کا جواب دیا۔ میری کوشش تھی کہ وہ میرے چہرے سے اذیت کا اندازہ نہ لگا سکے لیکن میری یہ کوشش ناکام رہی۔ ڈاکٹر صنم کے چہرے سے مسکراہٹ معدوم ہو گئی۔ اس کی جگہ تشویش نے لے لی۔ 'کیا ہوا تمہیں؟ تم ٹھیک تو ہو؟'

جواب دینے کے بجائے میں تیز تیز قدموں سے اندر کی طرف بڑھ گیا۔

مرزا اور صدیقی مجھے اپنے کمرے میں ملے۔ 'کیا ہوا بھائی ذوالفقار علی؟ خیر تو ہے؟ اتنی دیر کہاں لگا دی؟' مرزا نے مضطرب لہجے میں سوالات کی بارش کر دی۔ میں نے ڈاکٹر صنم کو اپنے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ ڈاکٹر صنم کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے مرزا اور صدیقی نے بھی مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ ڈاکٹر صنم چند لمحوں تک چپ چاپ میرے بولنے کی منتظر رہی پھر اصل بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ ہم اس کی موجودگی میں گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔ ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر خجالت کے آثار ابھرے لیکن پھر فوراً ان تاثرات میں ڈرامائی تبدیلی رونما ہوئی۔ اب اس کے چہرے پر طیش، جھنجھلاہٹ اور سرکشی کے ملے جلے تاثرات ابھر آئے۔

'آپ لوگوں نے آخر مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟ کیا میں کوئی کٹھ پتلی ہوں جو چپ چاپ آپ کی انگلی کے اشاروں پر ناچتی رہوں گی۔ اگر آپ لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ آپ نے مجھے اپنے ہتھیاروں کے بل پر اپنے تابع کر رکھا ہے تو یہ آپ کی شدید غلط فہمی ہے۔' ہم تینوں متعجب انداز میں اس کے خوبصورت چہرے کو غصے سے سرخ انگارہ ہوتے دیکھتے رہے۔ 'میں ایک عورت ضرور ہوں لیکن مجھے میری مرضی کے بغیر کسی بھی کام کے لیے مجبور کرنا ناممکن ہے لیکن آپ لوگ مجھ پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ اب میں مزید آپ لوگوں کا وجود اپنے گھر میں برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ براہ مہربانی آپ لوگ فوراً میرے گھر سے نکل جائیں۔' ہم تینوں نے بہ یک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہمیں وہاں سے روانگی میں کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن مینو استاد سے میری گفتگو کے بعد یہ ضروری ہو گیا تھا کہ ہم مزید کچھ دن اسی گھر میں گزارتے۔ ہماری طرف سے کسی قسم کا ردعمل نہ پا کر اس کا غصہ مزید بھڑک اٹھا۔ 'میں کہتی ہوں آپ لوگ چلے جائیں یہاں سے ورنہ ۔۔۔' اس نے اپنے

گریبان میں ہاتھ ڈالا۔ اس کا ہاتھ واپس آیا تو اس میں موجود چیز کو دیکھ کر ہم بری طرح چونک اٹھے۔ اس کے ہاتھ میں اعشاریہ دو دو کا نہایت نفیس لیکن خطرناک پستول تھا۔ مجھے علم تھا کہ بظاہر کھلونا نما یہ ننھا سا ہتھیار کم فاصلے سے بے حد کارگردار کر سکتا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم کوئی ردعمل ظاہر کرتے' اس نے نہایت مہارت اور چابکدستی سے پلک جھپکنے میں اپنا پستول کاک کر لیا۔

'یہ نہ سمجھنا کہ میں ہتھیار کے استعمال میں اناڑی ہوں۔ میرا نشانہ بہت کم خطا ہوتا ہے۔ میں پلک جھپکتے میں آپ تینوں کو اگلے جہان پہنچا سکتی ہوں۔' اس لمحے وہ کسی بپھری ہوئی جنگلی بلی کے مانند دکھائی دے رہی تھی۔ پستول پر اس کی گرفت بے حد مضبوط تھی۔ 'میں جس وقت چاہتی آپ تینوں کو قتل کر سکتی تھی لیکن مجھے آپ لوگوں کی حالت پر ترس آ گیا تھا مگر اب میں مزید یہ ڈرامہ برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ لوگ شرافت سے یہاں سے چلے جائیں۔ ورنہ میں آپ تینوں کو گولی ماردوں گی۔' اس کے چہرے پر عزم صمیم کی جھلک نمایاں نظر آئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی یقیناً اس پر عمل بھی کر گزرے گی۔

میرے اور صدیقی کے پاس اپنے پستول موجود تھے۔ ایم پی فائیو بھی ہماری پہنچ سے زیادہ دور نہ تھی۔ ہم چاہتے تو کوئی نہ کوئی حربہ استعمال کر کے ڈاکٹر صنم کو زیر کر سکتے تھے۔ لیکن اس دوران میں وہ شدید زخمی بھی ہو سکتی تھی۔ عین ممکن تھا وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی۔ ہمیں پناہ تو درکار تھی لیکن کسی بے گناہ انسان کی زندگی کے بدلے میں نہیں۔ شاید مجھے کوئی موقع ملتا تو بھی میں اس عورت پر ہاتھ نہ اٹھا پاتا۔ یقیناً مرزا اور صدیقی کے بھی اسی قسم کے احساسات رہے ہوں گے۔

کچھ دیر تک ہم لوگوں کے درمیان بے حد اذیت ناک سکوت حائل رہا۔ ڈاکٹر صنم کی دھمکیوں پر ہم نے کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس دوران میں ڈاکٹر صنم کے ننھے سے پستول کا رخ مسلسل ہماری طرف رہا۔ سناٹے کی بے داغ چادر کو بالآخر مرزا کی گمبھیر آواز نے چاک کیا۔ 'ٹھیک ہے بے بی! آپ کی یہی مرضی ہے تو ایسے ہی سہی۔' مجھے اس کے لہجے میں گہری پژمردگی رچی نظر آئی۔ 'ہم آپ پر خواہ مخواہ بوجھ نہیں بنیں گے۔ آپ اپنا پستول رکھ لیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے سخت مجبوری کی حالت میں آپ کی مدد حاصل کی تھی۔ آپ نے اب تک ہم پر جو احسان کیے اس کے لیے ہم تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔'

مرزا کے لہجے میں کوئی بات ایسی ضرور ہو گی جسے محسوس کر کے ڈاکٹر صنم بری طرح مضطرب ہو گئی۔ اس کے چہرے پر بے بسی' بے قراری اور مایوسی کے ملے جلے تاثرات ابھر آئے۔ 'آخر آپ لوگ یہ بات سمجھتے کیوں نہیں ہیں؟' اس کا لہجہ روہانسا ہو گیا۔ 'خدا کی قسم میں آپ کی دشمن نہیں' دوست ہوں۔ میری ذات سے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ البتہ گر آپ لوگ مجھے اپنے اعتماد میں لیں تو میں آپ کے بہت کام آ سکتی ہوں۔ خدارا آپ مجھے اپنے اعتماد میں تو لیں۔' اپنی بات کے زور میں وہ لحہ بہ لحہ جذباتی ہوتی چلی گئی۔ اس کے پستول کا رخ بھی خود بخود زمین کی جانب ہوتا چلا گیا۔ اس لمحے اگر میں چاہتا تو بآسانی اسے بے دست و پا کر سکتا تھا لیکن میں نے اپنی جگہ سے معمولی سی بھی جنبش نہ کی۔ صدیقی نے استفہامیہ انداز میں میری طرف دیکھا لیکن میں نے نظریں چرا لیں۔ میں چاہتا تھا کہ اس فیصلے کی

ذمہ داری وہ دونوں خود لیں۔ 'آپ لوگوں نے کہا کہ آپ کو کسی سردار سے اپنی جان کا خطرہ ہے۔ یعنی آپ کا دشمن کوئی مطلق العنان قسم کا وڈیرا ہے۔ اگر آپ لوگوں کی بات سچ ہے تو میرے اور آپ لوگوں کے درمیان خود بخود دوستی کا رشتہ قائم ہو گیا۔ دانشوروں کا کہنا ہے کہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے آپ لوگ میرے دوست ہیں کیونکہ میں ان تمام ظالم وڈیروں اور سرداروں کو اپنا بدترین دشمن سمجھتی ہوں جنہوں نے اس علاقے بلکہ اس ملک کے غریب مظلوم اور بے بس عوام کو اپنے جبر کی چٹان کے نیچے کچل رکھا ہے۔ ان لوگوں کے خلاف میں آخری حد تک آپ لوگوں کا ساتھ دے سکتی ہوں۔' ڈاکٹر صنم نے اپنے موقف کی تائید میں اچھی خاصی جذباتی تقریر جھاڑ دی۔ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ خاموشی سے لیکن اضطراب کے عالم میں ہمارے منہ دیکھنے لگی۔

'ٹھیک ہے بی بی!' صدیقی نے گہری سانس بھر کر کہا۔ 'آپ اصرار کر رہی ہیں تو ہم آپ کو اپنے راز میں شریک کر لیتے ہیں۔ شاید اسی میں کوئی بہتری ہو۔ بات یہ ہے بی بی کہ ہمارا تعلق دراصل قومی سلامتی کے ایک بے حد اہم ادارے سے ہے۔ ہم اس علاقے میں ایک بیحد اہم کام سے آئے ہیں۔'

چند اہم باتوں کے سوا صدیقی سب کچھ اسے مختصراً بتاتا چلا گیا۔ جوں جوں بات آگے بڑھتی گئی ڈاکٹر صنم کی حیرانی اور اضطراب میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ملک کریم کے ذکر سے بات را کے ایجنٹوں اور پھر سردار شاہ مراد تک اور آخر میں ہماری ڈیرہ غازیخان میں آمد تک پہنچی۔ صدیقی نے ڈاکٹر رضا اور اس کے بیٹے قاسم کے ذکر کو جان بوجھ کر داستان سے حذف کر دیا۔ تمام ماجرا سن کر ڈاکٹر صنم پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔

'اف میرے خدا۔ یہ میں کیا کرنے لگی تھی۔ آپ لوگ اس غدار ملت اور ننگ قوم سردار شاہ مراد کے ہتھے چڑھ جاتے تو ہمارے وطن کو جانے کتنے سنگین خطرے سے دوچار ہونا پڑتا۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب مجھے آپ دل و جان سے اپنے اس مشن میں مددگار پائیں گے۔' ڈاکٹر صنم کی زبان سے نکلنے والے ان الفاظ نے صدیقی اور مرزا کے چہرے پر اطمینان کی دھول بکھیر دی۔ میں نے بھی سکون کی سانس لی کہ ہم ایک دشوار صورت حال سے بخیر و خوبی عہدہ برآ ہونے میں کامیاب رہے۔

ڈاکٹر صنم نے اپنے پستول کو دوبارہ اس کی 'پناہ گاہ' میں پہنچا دیا۔ اب اس کے چہرے پر مکمل اطمینان کی کیفیت تھی۔

'ہاں اب تم بتاؤ ذوالفقار بھائی۔ کیا کارنامہ انجام دے کر آئے ہو تم؟' مرزا نے پوچھا۔

'کارنامے کی کیا پوچھتے ہیں مرزا صاحب۔ جان بچا کر آ گیا یہی بہت غنیمت۔' میں نے اپنے شانے میں موجیں مارتے درد کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

'کیوں کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟' صدیقی نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

'شکاریوں کے پنجے سے بال بال بچا ہوں صدیقی صاحب۔ بڑا برا گھیرا تھا مجھے انہوں نے۔'

'کچھ بتائیں تو سہی کہ ہوا کیا؟' ڈاکٹر صنم نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔ 'تم زخمی تو نہیں ہو؟ مجھے تو پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ تم نارمل نہیں ہو۔'

'لیکن تم تو اس ٹرک ڈرائیور مینو استاد کے پاس گئے تھے نا؟ وہاں تمہیں کون سا شکاری مل گیا؟' صدیقی نے حیرانی سے پوچھا۔

'میرے پاس بہت اہم اور پرتشویش خبریں ہیں صدیقی صاحب۔ انہیں پوری طرح آپ لوگوں کے گوش گزار کرنے میں مجھے وقت تو لگے گا نا؟'

'ہاں ہاں تم اطمینان سے بتاؤ' جلد بازی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔' مرزا نے کہا۔

میں نے حتی الامکان تفصیل سے انہیں اپنی اور مینو استاد کی گفتگو سے آگاہ کیا۔ جب میں نے انہیں بلوچستان میں سردار شاہ مراد کی پراسرار سرگرمیوں سے آگاہ کیا تو صدیقی اور مرزا بری طرح چونک پڑے۔ 'یہ سب تو بے حد خطرناک ہے ذوالفقار بھائی۔ صوبہ بلوچستان تو ہمارے ملک کا بے حد اہم اور حساس صوبہ ہے۔ بھارتی ایجنٹوں کی وہاں آزادانہ موجودگی ہمارے ملک کی سلامتی کے لیے بے حد خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ خدا جانے اس نسل حرام سردار شاہ مراد نے کس نیت سے اپنی سرگرمیوں کو بلوچستان پر مرکوز کر دیا ہے۔ کہیں ملک کریم اور اس زخمی بھارتی ایجنٹ کو بلوچستان میں ہی کہیں چھپا کر تو نہیں رکھا گیا ہے؟'

'عین ممکن ہے آپ کا اندازہ صحیح ہو لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ حرافہ ندا اسی شہر ڈیرہ غازیخان میں موجود ہے۔' میں نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

'تم یہ بات اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟' مرزا نے پوچھا۔

'اس کے اشارے پر اس کے دو گرگوں نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ میں زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

'اوہ۔۔۔اوہ۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تفصیل سے بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟ وہ عورت تمہیں کہاں مل گئی؟' صدیقی نے شدید اضطراب کے عالم میں مجھ پر سوالات کی بارش کر دی۔ مرزا اور ڈاکٹر صنم نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ کس طرح بازار میں میرا اس برقع پوش عورت سے سامنا ہوا اور پھر کس طرح مجھے اس سنسان گلی میں گھیر کر خاموشی سے ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔

'تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ برقع پوش عورت ندا ہی تھی؟' مرزا نے پرتشویش لہجے میں سوال کیا۔ 'یہ بھی تو ہو سکتا ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔'

'بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ عورت ندا نہیں تھی تو بھی اس امر میں تو کسی شبے کی گنجائش نہیں کہ مجھ پر حملہ کروانے والی وہ عورت اور اس کے دونوں ساتھی بھارتی ایجنٹ تھے۔ اس عورت نے اپنے زخمی ہونے والے ساتھی کو ترمتی کے نام سے پکارا اور اسے بھگوان کا واسطہ دیا۔' میں نے اپنے بیان کے حق میں دلیل دیتے ہوئے کہا۔ میری بات سن کر مرزا اور صدیقی کی پیشانی پر سوچ کی گہری سلوٹیں پڑ گئیں۔

'تمہیں۔۔۔ تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟' ڈاکٹر صنم نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

'میرے کاندھے پر چوٹ لگی ہے لیکن میرا خیال ہے کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔'

'کوئی تشویش کی بات ہے یا نہیں یہ فیصلہ کرنا میرا کام ہے۔ تم اپنی شرٹ اتارو میں اپنا میڈیکل

بکس لے کر آتی ہوں۔' اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ میں نے مزاحمت کرنا چاہی لیکن وہ سنی ان سنی کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے اپنی قمیص تو نہ اتاری البتہ اپنا شانہ اپنی قمیص سے باہر نکال لیا۔ میں نے دیکھا کہ جس جگہ ضرب لگی وہ حصہ نیلا ہونے لگا ہے۔

'یہ بات فی الحال ہمارے لیے اہم نہیں ہے کہ وہ عورت ندا تھی یا کوئی اور اصل بات یہ ہے کہ تمہیں پہچان لیا گیا ہے۔ دوسری طرف اس عورت کی عین اس وقت اس اسٹور میں موجودگی بھی مجھے کھٹک رہی ہے۔ کیا یہ محض ایک اتفاق ہے؟'

'فی الحال اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔' میرے بجائے صدیقی نے مرزا کے سوال کا جواب دیا۔

'لیکن تم نے اپنی اصل شکل وصورت کے ساتھ ایک بھری پری اور مصروف جگہ جا کر بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے بھائی ذوالفقار علی۔ اس واقعے سے پوری طرح واضح ہو گیا کہ بھارتی ایجنٹ اس علاقے میں کس حد تک سرگرم ہیں۔ پولیس کی وردی نے انہیں مکمل تحفظ دے رکھا تھا۔ خدا جانے وہ لوگ کس کس روپ میں کہاں کہاں پہنچ چکے ہیں۔ ہم تو یہاں سے ایک قدم بھی باہر نہیں نکال سکتے۔ ان حالات میں تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔'

'بات تو کچھ ایسی ہی ہے صدیقی صاحب۔ میں نے میک اپ کے لیے مطلوبہ سامان خرید لیا تھا لیکن پولیس کی وردی میں ملبوس ان بھارتی ایجنٹوں سے جھڑپ کے دوران سامان کی تھیلی خدا جانے کدھر گر گئی۔ اگر وہ سامان میں اپنے ساتھ لانے میں کامیاب ہو جاتا تو ہمارے لیے بڑی آسانی پیدا ہو جاتی۔'

'یہ تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔' ڈاکٹر صنم نے پرسکون لہجے میں کہا' وہ تو سامان دوبارہ خریدا جا سکتا ہے۔ آپ لوگ فکر نہ کریں۔ میں کل دن میں بازار جا کر وہ سامان خرید لاؤں گی۔ آپ مجھے لسٹ بنا کر دے دیجیے گا۔'

'میرا ذہن تو اس ٹرک ڈرائیور مینو استاد میں اٹکا ہوا ہے۔' مرزا نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔ 'کیا وہ شخص اتنا نازک اور اہم کام کر پائے گا؟'

'وہ ایک ذہین محتاط اور بردبار شخص ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی کارآمد بات ضرور معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس کام کے لیے اس سے زیادہ موزوں اور کوئی شخص نہیں ہو سکتا۔ وہ سردار شاہ مراد کی ٹرانسپورٹ کمپنی کا بہت پرانا ملازم ہے۔ وہ پہلے ہی اس کمپنی کے بہت سے رازوں میں شریک ہے۔'

'خدا کرے وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو جائے۔ تم نے اچھا کیا کہ اسے ڈاکٹر صنم کا فون نمبر دے دیا۔ اس طرح اسے ہم سے رابطہ قائم کرنے میں آسانی رہے گی۔'

اس اثناء میں ڈاکٹر صنم نے میرے شانے کا معائنہ مکمل کر لیا۔ اس نے میرے اندازے کی تصدیق کی کہ میرے شانے کی ہڈی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ وہ مجھے درد رفع کرنے والا انجکشن لگانا چاہتی تھی

لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ البتہ میں نے شانے پر دوا لگانے پر اعتراض نہیں کیا۔ مرزا اور صدیقی اپنی ہی باتوں میں مگن تھے۔ ڈاکٹر صنم نے میرے شانے پر دوا لگا کر نہایت نرمی سے اسے ملنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی تو مجھے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کیفیت نظر آئی۔ میں نے فوراً نظریں چرا لیں۔ وہ مجھ سے اتنے قریب تھی کہ مجھے دوا کے بجائے اس کے گل رنگ سراپے کی مہک اپنے حواس پر چھاتی محسوس ہوئی۔ میرے نظریں چرانے پر وہ دھیمی آواز میں ہنس پڑی۔ 'کیا تمہیں مجھ سے ڈر لگتا ہے؟' اس نے شریر لہجے میں میرے کان میں سرگوشی کی۔ میں نے چونک کر صدیقی اور مرزا کی طرف دیکھا۔ کہیں انہوں نے یہ جملہ نہیں سن لیا۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہ دونوں ڈاکٹر صنم کی 'شر انگیزیوں' سے بے خبر ہیں۔ میں نے کسمساتے ہوئے کہا۔ 'بس کیجیے اتنی دوا بہت کافی ہے۔'

'ارے ڈرتے کیوں ہو۔ میں تمہیں کھا تو نہیں جاؤں گی۔ ویسے بھی تم پھولوں کا نازک گجرا تو ہو نہیں جو ذرا سا ہاتھ لگانے سے بکھر جائے گا۔' اس کی نرم گرم انگلیوں سے مجھے اپنا شانا پگھلتا محسوس ہوا۔ اس کی جھلستی ہوئی نم آلود سانسیں میری گردن کی جلد پر آگ بھڑکانے میں مصروف تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں جل اٹھتا' میں نے بہانہ بنا کر خود کو اس کی زد سے باہر نکال لیا۔ وہ اپنا بکس اٹھا کر مسکراتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

اس رات بھی میں نے لاؤنج کے صوفے پر شب بسری کی۔

ڈاکٹر صنم کے کمرے میں بہت رات گئے تک روشنی رہی۔ اس نے اپنی خواب گاہ میں ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہاں پر وی سی آر بھی موجود ہے۔ اس خیال نے کہ وہ اپنے کمرے میں مکمل طور پر بیدار ہے' میری نیند بھی اڑائے رکھی۔ اس نے آج دوپہر جو حرکت کی تھی۔ اس کے متعلق سوچ کر مجھے جھرجھری سی آنے لگی تھی۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ اپنے کمرے میں گھس کر اندر سے لاک لگا کر بے فکر ہو کر سو جاؤں لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ یہ تو سراسر میری مردانگی کی توہین ہوگی۔ وہ سمجھے گی کہ میں اس سے خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ مجھے خواہ مخواہ اس کی طنزیہ باتوں کا نشانہ بننا پڑے گا۔ نہیں میں یہیں رہوں گا۔ دیکھتا ہوں یہ عورت میرا کیا بگاڑ لے گی۔ یہ مجھے اپنی انگلی کے اشارے پر نچانا چاہتی ہے۔ اپنے جارحانہ اطوار سے یہ ہمارے حواس پر چھانا چاہتی ہے۔ اس طرح کہ میری اپنی شخصیت مجہول ہو کر رہ جائے۔ بڑے بڑے پھنے خانوں سے شکست تسلیم نہ کرنے والے سیف داد خان کو یہ عورت ذہنی اور نفسیاتی طور پر تسخیر کر لینا چاہتی ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ہرگز مغلوب نہیں ہونگا۔ نہ ذہنی طور پر نہ جسمانی طور پر۔

بالآخر ڈاکٹر صنم کی خواب گاہ کی روشنی گل ہو گئی۔ میں آنکھیں بند کر کے دم سادھے صوفے پر پڑا رہا۔ جانے کیوں مجھے یقین سا تھا کہ ڈاکٹر صنم پھر اپنی دوپہر والی حرکت دہرائے گی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اسے ایسا مزا چھکاؤں گا کہ یہ تمام عمر یاد رکھے گی۔ اچانک میرے حساس کانوں نے کھٹکے بہت دھیمی آواز سنی۔ یک لخت میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ مجھ پر ہیجان سا طاری ہونے لگا لیکن فوراً ہی میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ میں کسی بھی قسم کی کمزوری کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا پھر میں نے

بڑھتے قدم کی آہٹ سنی۔ بہت ہی دھیمی' دھیمی جیسے کوئی اپنی کتاب حیات کے ورق الٹ رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی میری قوت شامعہ پوری طرح بیدار ہو گئی۔ کسی کے وجود کی دل آویز مہک میرے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ بے حد مانوس مہک۔ اس مہک کا مجھ سے فاصلہ کم ہونے لگا......اور کم اور کم۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی سابقہ حرکت دہراتی' میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وہ مجھ سے اتنی قریب تھی کہ مجھے اپنے چہرے کا عکس اس کی سیاہ چمک دار آنکھوں میں نظر آیا۔ اس نے جھجک کر سیدھا کھڑا ہونا چاہا لیکن میں نے اسے مہلت نہ دی۔

میرے ہاتھ آتشیں اژدہے کے مانند حرکت میں آئے اور اس کے شاخ گل کے مانند نازک وجود کے گرد لپٹ گئے۔ میرے ہلکے سے جھٹکے سے وہ میری آغوش میں آ گری۔ قریب تھا کہ وہ اضطراری طور پر چیخ پڑتی لیکن میں نے اپنے ہاتھ سے اس کا منہ دبا دیا' تم نے صحیح کہا تھا بی بی میں واقعی پھولوں کی نازک گجرا نہیں ہوں۔ میں ایک فولادی زنجیر ہوں اور یہ زنجیر آج تمہیں اس طرح جکڑے گی کہ تمہارے شیشے جیسے وجود کی کرچیاں تک نہیں ملیں گی۔' میں نے وحشی لہجے میں اس کے کان میں سرگوشی کی۔ میری بات سن کر اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹنے لگیں۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ اس نے اپنی پوری قوت لگا کر خود کو میری گرفت سے آزاد کرانا چاہا لیکن اس کی ایک نہ چلی۔

میں اسے اٹھا کر اسی کے کمرے کی جانب بڑھا۔ وہ بری طرح مچلتی رہی ٹانگیں چلاتی رہی۔ میں اس کے خوشبو میں بسے' پھول کے مانند ہلکے پھلکے وجود کو اٹھائے اس کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ وہاں بے حد دھیمی خواب آور نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے پاؤں کی ایڑی سے اپنے عقب میں خواب گاہ کا دروازہ بند کیا۔ اس نے ایک بار پھر میری گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ 'ارے ڈرتی کیوں ہو میری جان میں تمہیں کھا تو نہیں جاؤں گا۔ ویسے بھی تم کوئی پھولوں کا نازک گجرا۔۔۔۔ لیکن نہیں۔ تم واقعی پھولوں کا مہکتا گجرا ہی ہو۔ آج کی رات میں اس گجرے کے ایک ایک پھول کی ایک ایک پتی کو کچل کر رکھ دوں گا۔ آج کے بعد تم کسی مرد کی مردانگی کو للکارنے کی جرأت نہیں کر سکو گی۔' میں نے سرسراتی آواز میں اس کے کانوں میں زہریلی سرگوشی کی۔ وہ بری طرح کلبلائی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے اس کے نرم و گداز بیڈ پر پٹخ دیا۔ اس نے چیخنا چاہا لیکن میرا بایاں ہاتھ ایک بار اس کے منہ پر جم گیا۔ اس نے اپنے ناخنوں سے میرا چہرہ نوچنا چاہا لیکن میں نے اپنے سیدھے ہاتھ سے اس کے دونوں ہاتھ جکڑ لیے۔ میں بستر پر چڑھ کر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے پیروں کے ذریعے میری پیٹھ پر ضرب لگائی لیکن مجھ پر معمولی سا اثر بھی نہ ہوا۔ 'مزاحمت کا کوئی فائدہ نہیں ہے محترمہ۔ تمہاری یہ ہلکی پھلکی ضربیں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ تم نے جس آگ کو ہوا دی اب اس میں جل کر راکھ ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔' اسے اپنی بے بسی اور میری بالادستی کا ادراک جلد ہی ہو گیا۔ اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوئی پھر اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہنے لگے۔ اس کا وجود ہولے ہولے جھٹکے کھانے لگا۔

مجھے یوں لگا جیسے وہ ذبح شدہ مرغی ہے جو اپنی آخری سانسیں لے رہی ہے۔ یک لخت میرے

وجود میں بھڑکتی طیش اور توہین کی آگ چھن سے بجھتی چلی گئی۔ مجھے اس پر بے طرح رحم آنے لگا مجھے لگا کہ وہ ایک بے بس فاختہ ہے جو کہ باز کے خون ریز پنجوں میں پھنسی اپنے انجام کی منتظر ہے۔ میرے ہاتھ کا دباؤ اس کے منہ پر سے خود بہ خود کم ہوتا چلا گیا۔ وہ چند لمحوں تک گہری گہری سانسیں لیتی رہی پھر وہ بری طرح سسک پڑی۔ 'مجھے۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔' اس نے سسکیوں کے درمیان بہ مشکل کہا۔ میں اس کے ہاتھ چھوڑ کر بستر پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔' میں تمہاری ان حرکتوں کا مطلب تو نہیں سمجھتا لیکن تمہیں یہ ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہر شخص کی فطرت دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ اگر تم یہ سب مذاقاً کیا تو بھی مناسب نہیں ہے۔ اس کے نتائج حقیقتاً خطرناک بھی نکل سکتے ہیں۔' میں نے گہرے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ وہ اپنے بازو سے اپنی آنکھیں ڈھانپے سسکیاں بھرتی رہی۔ میں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اس کی خواب گاہ سے نکل آیا۔

میں اپنے مخصوص صوفے پر آ کر لیٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے طرح طرح کے اندیشوں نے گھیر لیا۔ جو کچھ میں کر چکا ہوں' خدا جانے اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ کہیں یہ عورت انتقام پر نہ اتر آئے۔ بپھری ہوئی عورت تو زخمی درندے سے بھی بڑھ کر خطرناک ہوتی ہے۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ اس کے پاس ایک عدد آتشیں ہتھیار بھی ہے۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ کشن کے نیچے خوابیدہ میرا کولٹ پستول پلک جھپکتے ہی میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں نے بغور ڈاکٹر صنم کی خواب گاہ کے دروازے کی طرف دیکھا۔ مجھے وہاں کسی قسم کی نقل و حرکت نظر نہ آئی۔ تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ میں خاصی دیر تک اس طرف گھورتا رہا۔ بالآخر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور بے آواز قدموں سے چلتا اس کی خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ بڑی احتیاط سے میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ اندر نظر پڑتے ہی میرے اعصاب ڈھیلے پڑتے چلے گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ منہ لپیٹے بالکل ساکت و صامت اپنے بستر پر پڑی ہے۔ میں نے اطمینان کی گہری سانس لی اور دبے پاؤں چلتا واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔ کم از کم فوری طور پر تو کوئی خطرے کی بات نہیں تھی۔

میں اگلی صبح بہت دیر سے سو کر اٹھا۔ مرزا اور صدیقی خاصی دیر پہلے ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے۔ اب وہ اخبار کے مطالعے میں مگن تھے۔ میرے شکایت کرنے پر مرزا نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر صنم نے انہیں مجھے اٹھانے سے منع کر دیا کیونکہ اس کے کہنے کے مطابق میں رات خاصی دیر سے سویا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں چور کی داڑھی میں تنکا کے مصداق اپنی صفائی میں کچھ کہتا' ڈاکٹر صنم میرے سر آن کھڑی ہوئی۔ 'آپ منہ ہاتھ دھو لیں میں آپ کے لیے ناشتا لگا دیتی ہوں۔' میں نے اس کے چہرے سے اس کے اندرونی موسم کے حالات معلوم کرنا چاہے۔ غصہ ناراضگی۔ انتقام۔ لیکن میں اپنی اس کوشش میں ناکام رہا۔ اس کے لہجے کے مانند اس کے چہرے پر بھی اتھاہ جھیل کی سی پرسکون کیفیت طاری تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں بری طرح جھینپ گیا۔ اس نے مزید کچھ نہیں کہا بلکہ خاموشی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ میں سیدھا باتھ روم میں گھس گیا۔ جب میں کچن میں پہنچا تو وہ گرما گرم ناشتہ تیار کر چکی تھی۔

ناشتے کے دوران میں ہمارے درمیان کوئی بات نہ ہو سکی۔ البتہ میں مسلسل اس سے نظریں چراتا

رہا۔ مجھے اس کے رویے میں کوئی غیر معمولی تبدیلی محسوس نہ ہوئی سوائے اس کے کہ اب وہ خاصی سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ جانے کیوں مجھے اب اس کی خاموشی سے الجھن ہونے لگی تھی۔ میں نے کہیں پڑھا تھا خاموشی اجنبیت کو جنم دیتی ہے۔ اس لمحے وہ مجھے خاصی اجنبی سی لگی۔ میں نے چاہا کہ کوئی بات کروں لیکن میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا کہوں۔ گزشتہ رات کے متعلق تو کوئی بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر میں اس سے کیا بات کروں؟ کیا میں اس سے اپنی اس حرکت کی معافی مانگ لوں؟ نہیں یہ مناسب نہیں ہے!

ناشتے کے بعد میں سیدھا مرزا اور صدیقی کے پاس آ بیٹھا۔

وہ عالمی سیاست پر بحث کر رہے تھے۔ امریکا' روس' برطانیہ' جاپان اور جانے کون کون سے ملک ان کے زیر گفتگو تھے۔ انہوں نے مجھے بھی اس بحث میں گھسیٹنا چاہا لیکن میں نے معذرت کر لی۔ مجھے ان کا انداز بہت عجیب سا لگا جیسے وہ اپنے سسرال میں بیٹھے بے فکری سے خوش گپیوں میں مشغول ہوں۔ میں نے سوچا کہ انہیں گزشتہ رات پیش آنے والے واقعے سے آگاہ کر دوں۔ تاکہ یہ بھی محترمہ کی طرف سے محتاط ہو جائیں۔ میں نے کئی بار بات شروع کرنا چاہی لیکن مجھے الفاظ نہ مل سکے۔ شرم اور جھجک کے مارے الفاظ میرے حلق میں چپکنے لگتے تھے۔ قبل اس کے کہ میں ان الفاظ کو کسی نہ کسی طرح حلق سے اگلتا ڈاکٹر صنم وہاں آ پہنچی۔ 'آپ لوگوں کی میک اپ کا جو سامان چاہیے اس کی فہرست بنا کر مجھے دے دیں۔ میں شہر جا کر وہ سب سامان خرید لاتی ہوں۔ اس کے علاوہ میں کھانے پینے کی چیزوں کا بھی تازہ ذخیرہ لاؤں گی۔' اس کے لہجے میں حد گہری سنجیدگی کی جھلک تھی۔ اس کی بات سن کر میں بری طرح بے چین ہو گیا۔ کیا ہم اس پر بھروسا کر سکتے ہیں؟ اگر اس نے مجھے مزا چکھانے کے لیے کوئی ایسی ویسی حرکت کر ڈالی تو؟ 'مرزا صاحب یہ آپ کا شعبہ ہے یہ کام آپ ہی کیجیے' صدیقی نے فہرست بنانے کی ذمے داری مرزا پر ڈال دی۔ اپنی عادت کے مطابق مرزا فضول بحث میں پڑنے کے بجائے فہرست تیار کرنے لگا۔ میری بے قراری میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ کیا میں ڈاکٹر صنم کو گھر سے باہر جانے سے منع کر دوں؟ لیکن اس طرح تو خواہ مخواہ کی تلخی پیدا ہو گی۔ میں مرزا اور صدیقی کو اپنے اس اقدام کی کیا وجہ بتاؤں گا۔ کہیں یہ خطرناک عورت بھر نہ جائے پھر میں کیا کروں؟

ڈاکٹر صنم نے مرزا کی تیار کردہ فہرست اپنے پرس میں رکھ لی' اچھا میں چلتی ہوں۔ میں انشاء اللہ سہ پہر تک واپس آ جاؤں گی' ڈاکٹر صنم نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی' میں بھی آپ کے ساتھ چل رہا ہوں ڈاکٹر صاحبہ' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ مرزا اور صدیقی بھی استفہامیہ انداز میں میرا منہ دیکھ رہے تھے' لیکن اس حلیے میں آپ کا بازار جانا خطرناک۔۔۔' ڈاکٹر صنم نے دھیمے لہجے میں اپنے خدشات کا اظہار کرنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات درمیان میں کاٹ دی۔ 'میں جانتا ہوں لیکن پھر بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ میں اپنا چہرہ پوشیدہ رکھوں گا۔ دراصل میں شہر کی صورت حال کا بغور جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ تاکہ کل شام کے واقعے کے اثرات کا اندازہ لگا سکوں۔' مجھے اپنی دلیل کا پھسپھسا پن خود بھی محسوس ہوا لیکن میں نے اپنے لہجے کو پرسکون اور

بے لچک رکھا۔ مرزا اور صدیقی میرے اصرار کی وجہ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے ڈاکٹر صنم تو سب کچھ سمجھ رہی تھی لہٰذا اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا' تمہاری یہی مرضی ہے تو چلو' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ وہ اپنے کمرے میں گئی جب وہ واپس لوٹی تو اس کے ہاتھ میں ایک اسکارف تھا' اسے آپ اپنی گردن میں لپیٹ لیں کچھ نہ کچھ سیفٹی ہو جائے گی' اس نے اسکارف میرے حوالے کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ میں نے چپ چاپ وہ اسکارف لے کر اپنی گردن میں اس طرح لپیٹ لیا کہ میری ٹھوڑی اور ہونٹ اس کی اوٹ میں چھپ گئے۔

ڈاکٹر صنم کے پاس نیلے رنگ کی چھوٹی سی سوزوکی کار تھی اسٹیرنگ وہیل کے پیچھے وہ خود بیٹھی میں اس کے ساتھ بیٹھنے کی بجائے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اس نے میری اس حرکت پر کوئی اعتراض نہیں کیا گاڑی گیٹ سے باہر نکالنے کے بعد اس نے اس کا رخ شہر کی جانب موڑ دیا. میں نے اندازہ لگایا کہ اسے ڈرائیونگ میں خاصی مہارت حاصل ہے جوں جوں گاڑی آگے بڑھتی گئی' اس پر چھائی اداسی اور سنجیدگی میں کمی ہونے لگی. اس کے پرسکون ہوتے چہرے نے میرے اعصاب کی کشیدگی کو بھی کم کر دیا. کچھ دور آنے کے بعد اس نے اپنی گاڑی میں نصب نہایت نفیس اسٹیریو ڈیک آن کر دیا گاڑی کی محدود فضا میں غلام علی کی مدھر اور پرسوز آواز گونجنے لگی

اکھیاں وچ تصویر تری اے
ایہہ جندڑی جاگیر تری اے
چار چوفیرے چانن تیرا
اکھیاں وچ تصویر تری اے
ہور کسے ول دل نہیں ٹردا
پیراں وچ زنجیر تری اے
کھیڑے ایویں ای کھہڑے پے گئے
اج وی رانجھا ہیر تری اے

اف خدایا! وہ گیت مجھے اپنے حواس چھینتا محسوس ہوا اس گیت کا ایک ایک بول تیز دھار کانچ کے مانند میرے دل کو چیرتا چلا گیا مجھے لگا کہ اس گیت کے ذریعے کسی کی آنسوؤں میں بھیگی آنکھوں کا پیغام مجھ تک پہنچ رہا ہے. ان ترستی آنکھوں کا پیغام جو میری راہ تکتے تکتے شاید پتھر کی ہونے والی ہوں گی۔ وہ وفا پیشہ ہیر جس نے ایک لفظ زبان سے نکالے بغیر مجھے اپنا سمجھ لیا۔ مجھے دیکھ کر جس کی زندگی کے دن بڑھنے لگتے تھے جسے میں موت کی دہلیز پر سسکتا چھوڑ آیا کہیں واقعی وہ کبھی واپس نہ آنے کے لیے مجھ سے روٹھ کر نہ چلی گئی ہو لیکن نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ مجھ سے نہیں روٹھ سکتی۔ میرے لیے تو وہ موت کے فرشتے کو بھی انکار کر دے گی۔ میری ہیر کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا' نہیں ہرگز نہیں۔

یک لخت گاڑی کو جھٹکا لگا اور میں خیالات کی دنیا سے باہر آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ ہم کمیٹی کی گول مارکیٹ کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ ڈاکٹر صنم نے گاڑی فٹ پاتھ کے ساتھ کر کے روک رکھی تھی' آپ

گاڑی میں ہی ٹھہریں۔ میں کچھ دوائیں لے کر آتی ہوں' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ میں نے اپنے اضطراب کو چھپاتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا کر اس کی بات سے اتفاق کیا وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ سڑک کے اس طرف بھی دو تین میڈیکل اسٹور تھے لیکن وہ انہیں نظر انداز کر کے دوطرفہ سڑک کے پار واقع ایک بڑے سے میڈیکل اسٹور کی طرف بڑھی۔

میرے دماغ میں شک کا ناگ گلبلایا۔ کہیں یہ کوئی چال تو نہیں ہے۔ میں پوری طرح چوکنا ہو گیا اور اپنی نظریں ڈاکٹر صنم پر جما دیں۔ کمیٹی کی طرف سے گدائی جانے والے تانگوں کے ایک بے ہنگم ریلے کی وجہ سے اسے سڑک پار کرنے کے لیے کچھ انتظار کرنا پڑا۔ ایک جوان اور خوب صورت عورت کو اس طرح سرعام سراپا نظارہ دیکھ کر دیہات کے باسیوں کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابلنے لگیں۔ ڈاکٹر صنم اس طرح کی صورت حال کی عادی رہی ہو گی۔ وہ ان بھوگی پیاسی نظروں کو نظر انداز کر کے پلک جھپکتے میں سڑک پار کر گئی۔ اسے میڈیکل اسٹور میں داخل ہوتے دیکھ کر کاؤنٹر کے پیچھے موجود باریش نوجوان پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی وہ شاید ڈاکٹر صنم سے پہلے واقف رہا ہو گا۔ میں نے اپنی دیکھنے کی پوری صلاحیت کو کام میں لاتے ہوئے ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کے متعلق اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ مجھے سب سے زیادہ خطرہ یہ تھا کہ ڈاکٹر صنم کسی پرچے پر درج پیغام کے ذریعے اس نوجوان کو تمام صورت حال آگاہ نہ کر دے۔ یہ دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ ڈاکٹر صنم نے اسے کسی قسم کا پرچا وغیرہ نہیں دیا۔ ان دونوں کے درمیان محض چند لمحے گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد وہ نوجوان دواؤں کے شیلف کی طرف مڑ گیا۔ جب وہ واپس پلٹا تو اس کے ہاتھ میں کچھ دوائیں تھیں۔ اس وقت بھی وہ مجھے مسکراتا ہوا نظر آیا۔ اس نے شاید دوا کی قیمت بتائی۔ ڈاکٹر صنم نے اپنے پرس سے سو کے دو نوٹ نکال کر اس کے حوالے کر دیے۔ اس دوران میں وہ دونوں مسلسل آپس میں باتیں کرتے رہے......ان دونوں کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی رہی۔ بقایا پیسے لینے کے بعد ڈاکٹر صنم میڈیکل اسٹور سے باہر نکل آئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے لبوں پر اب بھی تبسم رقصاں ہے۔ وہ باریش نوجوان یقیناً بے حد خوش گفتار رہا ہو گا۔ شاید اسی لیے ڈاکٹر صنم نے اس سے دوا خریدنے کو ترجیح دی۔

'اس لڑکے کے بڑے بھائی نے میرے ساتھ ہی ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کی ہے۔ ان کے گھر والوں سے میرے اچھے تعلقات ہیں۔ بڑا ہی تیز طرار لڑکا ہے' ڈاکٹر صنم نے خوش گوار لہجے میں کہا۔ 'اور خوش شکل بھی' میرے منہ سے خواہ مخواہ ایک چبھتا ہوا فقرہ پھسل پڑا: حالانکہ بعد میں مجھے خود پر غصہ آیا تھا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے کھچاؤ پیدا ہوا لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا' ہاں لیکن تمہارے برابر نہیں۔ تم تو بہت ہی نایاب شے ہو' اس کے بے باک فقروں نے مجھے جھینپنے پر مجبور کر دیا۔ البتہ مجھے خفیف سی مسرت کا احساس بھی ہوا۔ بالآخر اس پر چھائی سنگین سنجیدگی کا پردہ تو چاک ہوا۔ مجھے شرماتے دیکھ کر ڈاکٹر صنم کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی' یقین نہیں آتا کہ کل رات میں نے تم کو ہی دیکھا تھا۔ یا تو تم دوہری شخصیت

کے مالک ہو یا پھر بہت اعلیٰ قسم کے اداکار' میں نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔

صدر بازار میں پہنچ کر اس نے گاڑی کو ایک مناسب جگہ کھڑا کر دیا اور خود پلاسٹک کی ایک بڑی سی ٹوکری لے کر سبزی منڈی میں گھس گئی۔ اس مرتبہ مجھے اس کی طرف سے کوئی تشویش محسوس نہ ہوئی۔ میرے ذہن سے اندیشوں کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔ میں اپنے چہرے کو اسکارف سے نصف چھپائے گہری نظروں سے آس پاس کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے وہاں کسی قسم کی مشکوک بات نظر نہ آئی۔ وہاں حسب معمول خاصی چہل پہل تھی۔ سڑک پر اچھا خاصا ٹریفک اپنی مخصوص بے ہنگم چال کے ساتھ رواں دواں تھا۔ سواریوں سے لدے اور خالی تانگے ٹہلنے کے انداز میں آڑے ترچھے چل رہے تھے جبکہ ان کے پیچھے چلنے والی گاڑیاں ہارن بجا بجا کر آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھیں۔ ان کی بے بسی دیکھ کر بے اختیار میرے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اسی وقت ڈاکٹر صنم سبزی اور گوشت وغیرہ کی شاپنگ مکمل کر کے واپس آ گئی 'یہ کس بات پر مسکرایا جا رہا ہے؟' اس نے بھی مسکراتے ہوئے پوچھا۔

'یہ دیکھ کر ہنسی آ رہی ہے کہ یہ معمولی مزدور قسم کے تانگے والے کتنی قیمتی کار والوں کو بڑی آسانی سے بے کار کر کے رکھ دیتے ہیں۔'

'ہاں بھئی یہاں تو ہر طرف انہی کی بادشاہت ہے۔ سچ کہتی ہوں کبھی کبھی تو سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔'

'اوہ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔ آپ بھی تو کار والی ہیں' میری بات سن کر ڈاکٹر صنم نے بلند قہقہہ لگایا۔ اس کے ہنسنے کی آواز سن کر بہ یک وقت آٹھ دس افراد نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا۔

'آہستہ محترمہ آہستہ' میں نے دبی آواز میں کہا۔

'اب تو عادت پڑ گئی ہے جناب۔ ان گھورتی آنکھوں سے ڈرنا شروع کر دوں تو گھر میں گھٹ کر مر جاؤں۔'

میں نے اس بات پر کسی قسم کا تبصرہ نہیں کیا۔ اپنے معاملات وہ یقیناً مجھ سے بہتر سمجھتی ہو گی۔ یہ تو اس نے دکھا ہی دیا تھا کہ اس میں کس حد تک اعتماد ہے۔ اس نے چند لمحوں تک میری طرف سے ردعمل کا انتظار کیا پھر اس نے چمکتی آنکھوں لیکن دھیمے لہجے کے ساتھ کہا 'ویسے سچ سچ بتاؤ تمہارے بازو کون سی دھات کے بنے ہوئے ہیں۔ سچی میری ہڈیاں ابھی تک کڑکڑا رہی ہیں۔'

'میں آپ سے بے حد شرمندہ ہوں' میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

'ارے اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے۔ کاش تم مجھے دس سال پہلے مل گئے ہوتے! میں تو تمہیں اغوا کر کے لے جاتی' اس کے شرارتی لہجے نے ایک بار پھر مجھے جھینپنے پر مجبور کر دیا۔ اس لمحے وہ پوری طرح شرارت پر تلی ہوئی تھی۔ میری شرم نے اسے اور شوخی پر اکسایا 'ویسے یار مجھے اب افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے کل رات اتنا اچھا چانس کیوں گنوا دیا۔ اس بڑھاپے میں ایسی انمول شے کہاں قابو میں آتی ہے۔ پتا نہیں کیوں میں خوف زدہ ہو گئی۔'

'میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں محترمہ بس کریں' میں نے واقعی اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے

کیا آج ہی آپ ساری کسر نکال لیں گی۔'

'چلو معاف کیا تمہیں۔ بچہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ ویسے تم اتنے بچے ہو نہیں' اس نے شرارت سے چمکتی آنکھوں کے ساتھ کہا۔

'پھر وہی۔ میں ہاتھ جوڑ چکا ہوں' میں نے بے بسی سے کہا۔

'اچھا جناب' بس اب مذاق ختم۔ بہت تماشا دیکھ لیا فٹ پاتھیوں نے۔ تم یہیں بیٹھو' میں میک اپ کا سامان لے کر ابھی پانچ دس منٹ میں واپس آتی ہوں۔'

جب تک ڈاکٹر صنم واپس نہیں آئی فٹ پاتھیوں کی نظریں مجھ پر جمی رہیں تنگ آ کر میں نے سر نشست سے لگایا اور اسکارف منہ پر ڈال کر آنکھیں بند کر لیں۔

'کیا ہوا محترم' کیا نیند ستا رہی ہے' ڈاکٹر صنم نے میک اپ کے سامان کی تھیلی میری گود میں پٹختے ہوئے کہا۔

'نیند تو نہیں ستا رہی البتہ ان پرستاروں نے ناک میں دم کر رکھا ہے جن کے لیے تماشا بنا کر آپ مجھے یہاں چھوڑ گئی تھیں' میں نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

'ارے بس اتنی دیر میں پریشان ہو گئے۔ تم تو مرد ہو کبھی خود بھی کسی عورت کو گھورتے ہو گے۔ ذرا سوچو اگر تم لڑکی ہوتے تو تمہیں کن کن نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ویسے اچھا ہوا خدا نے تمہیں لڑکی نہیں بنایا ورنہ عاشقوں کی افواج میں باقاعدہ جنگ چھڑ جاتی۔'

'بس بس محترمہ۔ آپ نے گھس گھس کر میری کھال تک اتار دی ہے۔ اب یہاں سے چلیں میرے ننگے گوشت پر مکھیاں چپکنے لگی ہیں' میں نے باقاعدہ جھنجلاتے ہوئے کہا۔

'مکھیاں یا مکھے! اچھا چلو چلتے ہیں۔ ویسے جھنجلاتے ہوئے تمہارے چہرے کی رنگت بالکل کشمیری سیب جیسی ہو جاتی ہے۔'

'اف میرے خدایا!' میں نے اپنے کان بند کر کے سر کو اگلی نشست کی پشت پر لگایا۔ ڈاکٹر صنم نے قہقہہ لگاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گاڑی چلاتے ہوئے وہ تھوڑی سی سنجیدہ ہوئی تھی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کمیٹی کی گولائی کا چکر کاٹ کر گاڑی ایک بار پھر جنوب کی طرف جانے والی سڑک پر آ گئی۔ باریش نوجوان کے میڈیکل اسٹور کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ وہ کسی گاہک کے ساتھ مصروف ہے۔ ڈاکٹر صنم نے بھی اس بار اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ چورنگی پر پہنچ کر گاڑی ہلکی ہوئی اور پھر دائیں ہاتھ مڑ کر پیٹرول پمپ میں داخل ہو گئی۔ اس وقت ایک رکشے والا پیٹرول ڈلوا رہا تھا۔ اس کے بعد ایک جیپ تھی پھر ہماری باری تھی۔ ڈاکٹر صنم نے گاڑی کا انجن بند کر دیا اور پرسکون انداز میں اپنی باری کا انتظار کرنے لگی۔ رکشے والے نے پیٹرول بھروانے کے بعد پیٹرول پمپ کے احاطے میں ہی یوٹرن لیا اور ہماری گاڑی کے بائیں طرف سے گزرا۔

میری نظر رکشے کے کیبن کی سیٹ پر پڑی اس کے ساتھ ہی میں بری طرح چونک پڑا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یقین نہیں آیا لیکن پھر میرے دماغ نے تصدیق کی کہ میری آنکھوں نے جو دیکھا ہے صحیح

ہے۔ ہاں وہ وہی تھا۔ اس معاملے میں بھی کہیں میری آنکھیں دھوکا کھا سکتی ہیں؟ فقیر بابا! ہاں وہی تو تھا۔ اس رکشے کی پچھلی سیٹ پر۔ وہ مشفق چہرہ جسے دیکھنے کے لیے میری آنکھیں ایک عرصے سے ترس رہی ہیں۔ وہ جا رہا ہے' مجھ سے دور جا رہا ہے۔ ایک بار پھر۔ مجھ پر تو گویا دیوانگی کا دورہ پڑ گیا۔ 'ڈاکٹر صاحبہ؟' میں نے اس کا شانہ بری طرح جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

'کک ۔۔ کیا۔ کیا ہوا؟' اس نے بری طرح بوکھلاتے ہوئے پوچھا۔

'ڈاکٹر صاحبہ آپ گاڑی موڑیں ۔۔ فوراً۔

'لیکن ۔۔ آخر کیوں'۔

'میں کہہ رہا ہوں آپ گاڑی موڑیں۔ ابھی اور اسی وقت'۔

مجھے اس لمحے ذرا بھی ہوش نہ رہا کہ میں کس لہجے میں اور کس سے مخاطب ہوں۔ مجھ پر تو ایک ہی دھن سوار تھی۔ فقیر بابا۔ میرا فقیر بابا مجھ سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ لمحہ بہ لمحہ ۔۔ کہیں میں ایک بار پھر اسے نہ کھو بیٹھوں۔ ڈاکٹر صنم نے گاڑی اسٹارٹ کر کے اسے ریورس کرنا چاہا لیکن پیچھے ایک اور کار ہونے کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ اگلی گاڑی سے فاصلہ اتنا کم تھا کہ دائیں بائیں گاڑی موڑنے کی گنجائش نہ تھی۔ میرے لہجے کی وحشت اور بے قراری نے ڈاکٹر صنم کی رگوں میں بھی بجلی دوڑا دی۔ اس نے مضطرب انداز میں زور زور سے ہارن بجایا۔ اگلی گاڑی کے ڈرائیور نے شدید ناراضگی کے عالم میں مڑ کر ڈاکٹر صنم کی طرف دیکھا۔ پٹرول ڈلوانے کے دوران میں وہ بھلا گاڑی کیسے آگے بڑھاتا۔ میں نے بے قراری کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا لیکن گاڑی کے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ خدا خدا کر کے اگلی گاڑی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی اور سیدھی کمیٹی کی طرف نکل گئی۔ پیٹرول ڈالنے والا ہاتھ میں پمپ لیے ہماری گاڑی کا منتظر تھا لیکن ڈاکٹر صنم نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھائی اور دائیں ہاتھ پر بے حد تنگ موڑ کاٹتے ہوئے واپسی کا رخ کیا۔ اس دوران میں گاڑی ایک ٹرک سے ٹکرانے سے بال بال بچی 'دائیں ہاتھ پر' میں نے چیخ کر کہا۔ اس نے گاڑی کا اسٹیرنگ مشینی انداز میں دائیں طرف موڑ دیا۔ مجھے اسے گاڑی کی رفتار تیز کرنے کے لیے نہیں کہنا پڑا۔ تنگ ناہموار سڑک پر جس حد تک گاڑی دوڑانا ممکن ہوا وہ دوڑانے لگی۔

میری نظریں سامنے سڑک پر اس رکشے کو تلاش کر رہی تھیں۔ پرانی بکر منڈی کے چوک پر پہنچ کر ڈاکٹر صنم نے گاڑی کی رفتار کم کر کے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے بے قرار نظروں سے بائیں طرف جانے والی سڑک کا جائزہ لیا۔ 'سیدھے چلیں' میں نے اس طرف کسی رکشے کو نہ پا کر کہا۔ دائیں ہاتھ دیکھنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اگر رکشے کو صدر بازار جانا ہوتا تو وہ واپس مڑنے کے بجائے سیدھا کمیٹی کی طرف چلا جاتا۔

گاڑی تیزی سے آگے بڑھتی رہی۔ گجروں والے محلے کے چوراہے پر پہنچ کر گاڑی ایک بار پھر ہلکی ہوئی۔ میں نے ایک بار پھر بائیں ہاتھ والی سڑک پر نظر ڈالی۔ سڑک کے دونوں اطراف بھینسوں کی قطاریں تو مجھے نظر آئیں۔ لیکن سیاہ ناہموار سڑک پر دور دور تک رکشے کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ گاڑی

ایک بار پھر آگے بڑھ گئی۔ تین نمبر اسکول والا چوراہا۔ این بلاک کا چوراہا' اس کے بعد میاں صاحب کے مزار کا چوراہا۔ اس کے آگے ناپختہ راستہ شروع ہو جاتا تھا جو آگے جا کر نہر پر جا کر ختم ہو جاتا۔ اس چوراہے پر پہنچ کر میں تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ اگر وہ رکشا بائیں طرف والی سڑک پر گیا تھا تو اس کی منزل یقیناً ریلوے اسٹیشن رہی ہو گی یک لخت مجھے خیال آیا کہ اس رکشے کو اگر ریلوے اسٹیشن جانا ہوتا تو وہ بہت پہلے کسی بھی چوراہے پر بائیں ہاتھ مڑ کر اسٹیشن روڈ پر جا چڑھتا۔ اس وسیع و عریض ہموار سڑک کے ہوتے اسے اس تنگ اور غیر ہموار سڑک پر دھکے کھانے کی کیا ضرورت تھی 'دائیں طرف چلیں' میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔ گولائی کا چکر کاٹ کر گاڑی دائیں ہاتھ پر مڑ گئی۔ چند لمحوں پر ہم دربار قادریہ کے پاس سے گزرے۔ ڈاکٹر صنم نے گاڑی کی رفتار مزید بڑھاتے ہوئے ڈرتے ڈرتے پوچھا' کچھ بتاؤ تو سہی ہم کس کا پیچھا کر رہے ہیں؟'

'رکشا۔ سیاہ چھت اور نیلی باڈی والا رکشا' میں نے بے چینی سے کہا۔

'وہی جو پیٹرول پمپ پر ۔۔۔'

'ہاں وہی' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا' ہمیں ہر قیمت پر اسے تلاش کرنا ہے'۔

'ٹھیک ہے' اس نے مختصراً کہا اور سامنے سڑک پر اپنی نگاہیں مرکوز کر دیں۔ اگلے چوراہے پر میں نے بڑی بے تابی سے بائیں طرف دیکھا سامنے نارمل اسکول تھا لیکن اس سڑک پر بھی رکشے کے کوئی آثار نہ تھے۔ گاڑی آگے بڑھتی چلی گئی اگلا چوراہا آیا۔ میں نے ایک بار پھر بائیں طرف دیکھا۔ اچانک مجھے لگا کہ میں نے اس رکشے کا ہیولا دیکھا ہے۔ اگلے ہی لمحے وہ ہیولا غائب ہو گیا۔ 'الٹے ہاتھ پر موڑیں' میں نے چیخ کر کہا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی' ریورس ہوئی اور پھر بائیں ہاتھ کی طرف جانے والی نیم پختہ سڑک پر دوڑنے لگی۔ سامنے ریتی والی نہر کا پل آیا۔ میرے کہنے پر ڈاکٹر صنم نے گاڑی بلا تامل پل پر چڑھا دی۔ جونہی ہم پل پر پہنچے ہمیں رکشا نظر آ گیا وہ نیم پختہ سڑک پر دھول اڑاتا مغرب کی طرف رواں دواں تھا۔ رکشے کو دیکھتے ہی میرے وجود میں اطمینان و سکون کی لہر دوڑ گئی۔

ڈاکٹر صنم گاڑی کو ناہموار سڑک نما راستے پر دوڑائے جا رہی تھی 'اب گاڑی کی رفتا کم کر دیں۔ ہمیں اس رکشے کے پیچھے پیچھے چلنا ہے' میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ گاڑی کی رفتار کم ہو گئی۔ رکشا آگے آگے چلتا رہا اور ہم پیچھے پیچھے۔ ریلوے لائن قبرستان اور بڑی نہر کو پیچھے چھوڑتا رکشا مزید آگے بڑھا۔ اب مجھے اس کی منزل کا پتا چل چکا تھا۔ وہ رکشا وڈور بستی جا رہا تھا۔

موضع وڈور پہنچ کر رکشا ایک بے حد قدیم طرز کی چھوٹی سی درگاہ نما عمارت کے احاطے کے سامنے رک گیا۔ میں نے گاڑی کو خاصے فاصلے پر رکوا لیا۔ رکشے سے دو انسانی ہیولے برآمد ہوئے اور دھیرے دھیرے چلتے مزار کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ ڈاکٹر صنم نے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن میں نے اس کی نظروں کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ مزار کسی بزرگ ہستی کا ہے لیکن میں نے تصدیق کرنا مناسب سمجھا۔

'بھائی وہ بابا ڈوڈا شاہ کا دربار ہے نا؟' میں نے ایک نوجوان سے پوچھا۔

'ہاں۔ہاں جی وہ ڈوڈا سائیں کا ہی مزار ہے' اس نے تھوڑی سی بوکھلاہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

'چلیے ڈاکٹر صاحبہ۔واپس چلیے' میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔
'لیکن۔وہ۔رکشا۔۔رکشے والے۔؟'
'بس ڈاکٹر صاحبہ۔میرا مقصد پورا ہو چکا ہے۔یقین کیجیے میرے دماغ پر سے بہت بڑا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔'
'کیا وہ دونوں کوئی مجرم تھے؟' اس نے حیرانی سے پوچھا۔
'نہیں ہرگز نہیں۔ میں نے زور دے کر کہا۔' اس معاملے کا سرکاری فرائض سے کوئی تعلق نہیں ہے۔یہ خالصتاً میرا ذاتی معاملہ ہے۔آپ براہ کرم مرزا اور صدیقی صاحب سے اس کا کوئی ذکر نہ کیجیے گا' میں نے احتیاطاً اسے پہلے ہی سمجھا دینا بہتر سمجھا۔

ہماری واپسی نسبتاً مختلف راستے سے ہوئی۔ پہلے ہم اسٹیشن کے سامنے والے روڈ پر آئے پھر انڈس کالونی اور سرکٹ ہاؤس کے سامنے سے گزرتے ہوئے آفیسرز کلب کے پاس پہنچ گئے۔اس جگہ پر ڈیرہ ڈویژن کی انتظامیہ کے اعلیٰ ترین افسران کے بنگلے تھے جن پر ہر وقت پولیس کے دستے تعینات رہتے تھے۔یہاح پہنچ کر میں نے ایک بار پھر اسکارف کا سہارا لیا اور سیٹ پر دبک کر بیٹھ گیا۔

ڈاکٹر صنم کے بنگلے کا گیٹ صدیقی نے کھولا 'اف میرے خدایا! کہاں رہ گئے تھے آپ لوگ؟ ہماری تو آدھی جان نکل کر رہ گئی' صدیقی نے تشویش بھرے لہجے میں واویلا کیا۔اس کی بات سن کر ڈاکٹر صنم نے بلند قہقہہ لگایا۔گاڑی کو اس کی جگہ کھڑا کرنے کے بعد ہم نے گاڑی میں رکھا ہوا سامان اٹھالیا۔

'کچھ بتائیں تو سہی' اتنی دیر کہاں پر لگا دی آپ لوگوں نے؟ خیریت تو ہے؟' صدیقی نے پھر پوچھا۔

'ہاں ہاں جناب' سب خیریت ہے۔آپ پریشان مت ہوں' ڈاکٹر صنم نے مسکراتے ہوئے کہا۔
اسی اثنا میں ہم گھر کے لاؤنج میں پہنچ گئے۔مرزا نے بھی تقریباً ان ہی سوالات سے ہمارا استقبال کیا۔
'اتنی دیر کہاں لگا دی بھئی؟'
'دراصل میری گاڑی کچھ گڑ بڑ کر رہی تھی۔ میں نے اسے مکینک کو دکھایا تو اس میں فوری نوعیت کا خاصا کام نکلا۔بس وہیں دیر لگ گئی' ڈاکٹر صنم نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے فی البدیہ ایک کہانی گھڑ دی۔یہ وضاحت سن کر میں نے اطمینان کی گہری سانس لی ساتھ ہی ساتھ دل میں ڈاکٹر صنم کی حاضر جوابی کی داد بھی دی۔صدیقی نے میک اپ کے سامان والا بیگ مرزا کے حوالے کر دیا۔
'یہ آپ کا شعبہ ہے مرزا صاحب' اچھی طرح چیک کر لیجیے' کوئی چیز کم تو نہیں ہے؟' مرزا نے بغور تمام سامان کا جائزہ لیا۔
سب ٹھیک ٹھاک ہے۔بے حد اچھی کوالیٹی کا سامان لائی ہے ڈاکٹر صاحبہ'
'میرا خیال ہے اب آپ بھی اس ستر سالہ بڈھے کے میک اپ سے نجات حاصل کر لیں۔میں بھی

ان مصنوعی مونچھوں سے تنگ آ گیا ہوں' صدیقی نے کہا۔
'ارے! آپ لوگ اس وقت بھی میک اپ میں ہیں' ڈاکٹر صنم کا منہ حیرانی سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔
اس کی حیرت زدہ نظریں مرزا اور صدیقی کے چہرے پر سے بھٹکتی ہوئی میرے چہرے پر آٹھہریں۔
'کیا۔۔کیا تم بھی میک اپ میں ہو' اس کے لہجے میں پوشیدہ بے قراری کو محسوس کر کے مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ مجھے موقع مل گیا کہ اس کی تمام بے باکیوں کا حساب کسی نہ کسی حد تک بے باق کر دوں۔
'جی ہاں' محترمہ میرے چہرے پر بھی میک اپ ہے۔میری اصل عمر چالیس برس ہے۔یہ تو مرزا صاحب نے میرے بے حد اصرار پر مجھے بیس سالہ لڑکے کا روپ دیا ہے۔اب میں بھی اپنے اصل روپ میں آ جاؤں گا۔' میری شرارت سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے مرزا اور صدیقی نے بھی میری تائید کی۔
'ہاں ہاں' اب میرے نوجوان بننے کی باری ہے۔اب ذوالفقار علی خان پر بڈھے کا میک اپ کیا جائے گا' صدیقی نے یہ سب اتنی سنجیدگی سے کہا کہ ڈاکٹر صنم کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس پر یقین کرنا پڑا۔
اس کے چہرے پر حیرت تاسف اور بے چارگی کے ملے جلے تاثرات ابھر آئے۔
'حیرت ہے۔میں نے پلاسٹک میک اپ اور کاسمیٹک میک اپ کے متعلق پڑھا تو ضرور ہے لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس فن میں اس حد تک مہارت حاصل کی جا سکتی ہے کہ انسان کی مکمل شخصیت ہی تبدیل کی جا سکے۔' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔
واقعی اس حد تک مہارت حاصل کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ہم تینوں میں سے بھی صرف مرزا صاحب ہی اس غیر معمولی مہارت حامل ہیں۔ان کی مہارت کا ثبوت ابھی آپ کو ابھی مل جائے گا۔
چلیے مرزا صاحب اب آپ اپنا میک اپ اتارنا شروع کر دیں' صدیقی نے کہا۔
مرزا فوری طور پر مصروف عمل ہو گیا۔اس کے چہرے پر پڑی جھریاں رفتہ رفتہ غائب ہونے لگیں۔آنکھوں کے پپوٹوں کا بوجھل پن دور ہوتا چلا گیا۔بھنوؤں اور سر کے بالوں کی سفیدی ہلکی پڑنے لگی۔ڈاکٹر صنم حیرت سے منہ پھاڑے مرزا کے چہرے میں آنے والی انقلابی تبدیلیاں دیکھتی رہی۔کچھ ہی دیر بعد ہمارے سامنے ستر سالہ بڈھے کھوسٹ کی جگہ ادھیڑ عمر کا ایک صحت مند شخص نمودار ہوا۔ڈاکٹر صنم چند لمحوں کے لیے گویا سانس لینا بھول گئی۔
'اف میرے خدایا!' اس نے حیرت سے تقریباً چیختے ہوئے کہا 'یہ تو گویا جادوگری کا شاہکار ہے۔ اگر میں نے یہ سب اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو میں ہرگز یقین کرنے پر تیار نہ ہوتی کہ یہ وہی ہانپتے کانپتے ضعیف بڑے میاں ہیں۔آپ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔مرزا صاحب آپ واقعی بہت بڑے فن کار ہیں۔'
'یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے ڈاکٹر صاحبہ' ورنہ میں کس قابل ہوں۔۔' مرزا نے انکسار سے کہا۔
'اب مجھے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والی ایک الجھن کا حل بھی مل چکا ہے' ڈاکٹر صنم نے مسرور

لہجے میں کہا۔

'کون سی الجھن ڈاکٹر صاحبہ؟' مرزا نے پوچھا۔

'دراصل جب میں آپ کے شانے کی ڈریسنگ کر رہی تھی تو مجھے احساس ہوا تھا کہ آپ کی عمر کے لحاظ سے آپ کا جسم خاصا مضبوط اور صحت مند ہے لیکن پھر میں نے اس الجھن کو اپنا وہم سمجھ کر فراموش کر دیا' اس کی بات سن کر ہم تینوں نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ اپنا میک اپ اتارنے کے بعد مرزا نے صدیقی کا میک اپ بھی اتار دیا تھا۔ البتہ میک اپ اترنے کے بعد بھی صدیقی کے چہرے میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی تھی۔

'اب تم بھی مرزا کے روبرو آ جاؤ ذوالفقار علی خان۔ مرزا اسے بھی اس کی اوقات میں لے آؤ۔ بہت مزے لوٹ لیے اس نے نوجوانی کے' صدیقی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں نہایت سعادت مندی سے مرزا کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں ترچھی نگاہوں سے ڈاکٹر صنم کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ صورت حال سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے مرزا نے جان بوجھ کر میک اپ اتارنے کی تیاری میں بہت دیر لگا دی۔ میں نے ڈاکٹر صنم کے چہرے پر تناؤ اور کشمکش کے آثار دیکھے پھر اس کی آنکھوں میں عزم صمیم کی جھلک نمایاں ہوئی جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچ گئی۔ مرزا ایک محلول میرے چہرے پر ملنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر صنم نے مضبوط لہجے میں اسے منع کر دیا۔

'نہیں مرزا صاحب! ذوالفقار کا میک اپ نہ اتاریں میری آپ سے درخواست ہے کہ کم از کم میری نظروں کے سامنے انہیں اسی حلیے میں رہنے دیں۔ آپ لوگ جو چاہیں اپنا حلیہ بنا لیں'۔

اس کی یہ بات سن کر مرزا اور صدیقی کے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میرا دل چاہا کہ میں زور زور سے قہقہے لگاؤں۔ اس چالاک عورت کی تمام تر چالاکی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ ہم نے اسے جو کچھ باور کرانا چاہا اس پر اس نے آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا۔

'ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحبہ' میں آپ کا حکم مان لیتا ہوں' مرزا نے اپنی مسکراہٹ پر قابو پاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

'لیکن ہمارے دشمن اسے اس شکل وصورت کے ساتھ پہچانتے ہیں۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ اس کے اس میک اپ میں کچھ ایسے اضافے کر دوں جس سے اس کے چہرے کی دلکشی بھی زیادہ متاثر نہیں ہوگی اور اسے پہچاننا بھی مشکل ہو جائے گا'۔

'آپ کی یہ تجویز بہت مناسب ہے۔ ویسے آپ اپنے ہاتھ کو حرکت دینے میں کسی قسم کی تکلیف تو محسوس نہیں کر رہے؟' یکا یک اس میں چھپا طبیب بیدار ہو گیا۔

'نہیں اب میں بالکل ٹھیک ہوں میرا خیال ہے' میرا زخم بہت بہتر حالت میں ہے۔ مجھے ہاتھ ہلانے سے زیادہ تکلیف نہیں ہوتی' مرزا نے کہا وہ نہایت انہماک سے میرے چہرے کو نئی شکل دینے لگا اس نے میرے ہونٹوں پر ایک بار پھر بھاری مونچھیں چپکا دیں البتہ اس مرتبہ ان کا انداز تبدیل شدہ تھا میری مونچھوں کے نوکیلے سروں کو 'وٹ' دے کر اس نے انہیں اوپر اٹھا دیا پھر وہ میرے گالوں اور ٹھوڑی پر

نہایت مہارت سے ڈاڑھی چسپاں کرنے لگا اس نے میرے بھنوؤں میں کوئی پیسٹ لگایا جس سے وہ بہت گھنی نظر آنے لگیں اس نے پوری طرح سے مطمئن ہونے کے بعد آئینہ میرے سامنے رکھا تو مجھے سیف داد خان ایک بالکل مختلف حلیے میں نظر آیا مرزا نے میرے بالوں کے انداز میں کچھ تبدیلی کرنے کے بعد مجھے فارغ کر دیا ڈاکٹر صنم کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ میں اس حلیے میں بھی برا نہیں لگ رہا ہوں۔

مرزا نے صدیقی اور اپنی شکل صورت میں کچھ.....اور اہم تبدیلی اور اضافے کیے ان کی شناخت بھی خاصی حد تک تبدیل ہو گئی تھی ڈاکٹر صنم کچھ دیر تک بغور ہم تینوں کے چہروں کا جائزہ لیتی رہی پھر اس نے اعتراف کیا کہ اب ہم تینوں کو ہماری سابقہ شکل وصورت کے حوالے سے پہچاننا ممکن نہیں ہے

'اب کیا پروگرام ہے صدیقی؟' مرزا نے پوچھا اس نے ڈاکٹر صنم کی موجودگی کو نظر انداز کر دیا تھا میں نے بھی اس بار کسی قسم کی پریشانی محسوس نہیں کی

'میرا خیال ہے میں چیک کر کے دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحبہ کے فون سے اسلام آباد بات کرنا ممکن ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے اب انہوں نے اسلام آباد سے براہ راست رابطہ بحال کر دیا ہو۔

'میرا نہیں خیال کہ ایسا ہوا ہوگا وہ لوگ فی الحال ایسا رسک نہیں لے سکتے ویسے آپ یہ کام ڈاکٹر صاحبہ سے کروائیں تو زیادہ بہتر ہے' میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

'کیوں کیا اسلام آباد سے براہ راست رابطے والی ٹیلی فون لائنیں کام نہیں کر رہی ہیں؟' ڈاکٹر صنم نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں ایسا ہی ہے اور یہ سردار شاہ مراد کی کارستانی ہے' وہ چاہتا ہے کہ ہم اپنے ہیڈ آفس کسی قسم کی اطلاع نہ بھیج سکیں۔ اس سے پہلے ہی وہ ہمیں ختم کر دینا چاہتا ہے۔''

''اس شیطان صفت شخص سے کچھ بھی بعید نہیں ہے' کم از کم اس علاقے میں وہ سب کچھ کرنے پر قادر ہے۔''

ڈاکٹر صنم نے صدیقی کے دیے ہوئے نمبر پر اسلام آباد بات کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی ہمارے مشورے پر اس نے ٹیلی فون انکوائری سے معلومات حاصل کیں اسے بتایا گیا کہ لائنوں میں خرابی کے سبب فی الحال اسلام آباد' لاہور اور ملتان براہ راست کال کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ اگر وہ چاہے تو کال بک کرا کر بات کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر صنم نے شکریے کے ساتھ بات ختم کر دی۔ کچھ دیر کے لیے وہاں مکمل خاموشی چھا گئی۔ ہم چاروں ہی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ گفتگو کا سلسلہ ڈاکٹر صنم نے جوڑا۔

'آپ لوگوں کو اگر اپنے ہیڈ آفس سے بے حد ضروری بات کرنی ہے تو اس کے لیے کوئی اور صورت بھی نکالی جا سکتی ہے۔'

'کون سی صورت ڈاکٹر صاحبہ!' صدیقی نے چونک کر پوچھا' آپ لوگوں کی شکل صورت بدل چکی ہے۔ اب سردار شاہ مراد کے کارندے آپ کو نہیں پہچان سکتے کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ میں سے ایک فرد

مظفر گڑھ یا ملتان جا کر وہاں سے اسلام آباد اپنے ہیڈ آفس فون کرلے۔'

'ہاں ہاں' یہ یقیناً ممکن ہے' صدیقی نے پر جوش لہجے میں کہا' ہم یقیناً ایسا ہی کریں گے بلکہ ملتان پہنچنے کے بعد تو ہمارے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ ہم ہوائی جہاز کے ذریعے اسلام آباد چلے جائیں اور اپنے اعلیٰ حکام سے ملاقات کر کے انہیں براہ راست پوری صورت حال سے آگاہ کر سکیں۔ ملتان میں بھی ہمارا ایک ٹھکانہ موجود ہے جہاں سے ہمیں تازہ ترین معلومات مل سکتی ہیں۔'

'ہاں میرے خیال میں اب یہی صورت باقی رہ گئی ہے' مرزا نے سنجیدگی سے کہا۔

'ہماری پراسرار گم شدگی سے ہمارے محکمے میں پریشانی کی لہر دوڑ گئی ہوگی۔ وہ لوگ جانے کیا کیا قیاس آرائیاں کر رہے ہوں گے۔'

'تمہارا کیا خیال ہے ذوالفقار بھائی اس بارے میں؟' صدیقی نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے اس کی رائے کی تائید کی۔ موجودہ صورت حال میں اس کے علاوہ کیا ہو سکتا تھا۔

'تو پھر نیک کام میں دیر کیسی؟ تم ابھی اور اسی وقت ملتان روانہ ہو جاؤ' مرزا نے صدیقی کو کہا۔ صدیقی کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے جوش کا تاثر ابھرا لیکن پھر اس کا چہرہ بجھ سا گیا۔

'لیکن میں اپنے اعلیٰ افسران کو کیا بتاؤں گا کیا؟' ہم نے پچھلے چند دنوں میں کیا کارنامے انجام دیے ہیں؟ یہی نا کہ چوہوں کے مانند کونے کھدروں میں چھپتے پھر رہے ہیں۔ یہ سب سن کر وہ نا اہل تصور کریں گے۔ یہاں کی صورت حال کی سنگینی کو وہ اپنے ائر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر کیسے محسوس کر سکتے ہیں؟'

'تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں صدیقی صاحب؟' میں نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

'میں چاہتا ہوں کہ ہمارے پاس کوئی ایسی خبر ہو جسے سن کر وہ ہماری جدوجہد کی وقعت کو محسوس کر سکیں۔ اب جبکہ ہمارے لیے شہر میں آزادانہ گھومنا ممکن ہو چکا ہے تو کیوں نہ اپنے مشن کے لیے کچھ نہ کچھ جدوجہد کرنے کی کوشش کریں۔ شاید ہمیں کوئی ایسا سراغ مل جائے جس کے ذریعے ہم سرخرو ہو سکیں۔'

'تمہارا کہنا صحیح ہے صدیقی۔ ہارنے والا چاہے کتنے ہی شاندار کھیل کا مظاہرہ کرے تعریف ہمیشہ جیتنے والے کی ہوتی ہے۔ ہماری اس بات پر کوئی توجہ نہیں دے گا کہ ہمیں کس قدر دشوار صورت حال کا سامنا تھا۔ ہر کوئی یہی پوچھے گا کہ ہم نے اتنے دنوں میں کیا کیا ہے۔ جہاں اتنے دنوں سے ہمارا ہیڈ آفس سے رابطہ نہیں ہے وہاں چند دن اور سہی۔ کسے خبر خدا ہمارے لیے کوئی نہ کوئی بہتری کی صورت نکال دے۔' مرزا نے گمبھیر لہجے میں اس کی تائید کی۔

'اگرچہ ہم لوگ سردار شاہ مراد کے خلاف کھل کر کام نہیں کر سکتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی ہم نے کچھ نہ کچھ کام ضرور کیا ہے۔ یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے۔ کہ ملک کریم کے اغوا میں بھارتی ایجنٹ پوری طرح ملوث ہیں اور سردار شاہ مراد ان کا سرپرست ہے نیز یہ کہ بھارتی ایجنٹوں نے اس علاقے کو اپنی بھرپور سرگرمیوں کا مرکز بنا رکھا ہے۔ ہم نے مینو استاد کے ذریعے پتا چلا لیا ہے کہ سردار شاہ مراد اور

بھارتی ایجنٹ بلوچستان کو اپنی پراسرار سرگرمیوں کا مرکز بنائے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دو دن میں مینو استاد ان لوگوں کے اصل ارادے معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ ان کے بارے میں یہ قیمتی معلومات جب اسلام آباد پہنچیں گی تو وہ ہم لوگوں کی کارکردگی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔'

''ہاں تمہاری بات میں وزن ہے بھائی ذوالفقار علی۔ ہم لوگوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم مینو استاد کے پیغام کا انتظار کریں۔ لیکن اس اثنا میں میری خواہش ہے کہ ہم لوگ ایک آدھ کام اور کرلیں۔''

'کون سے کام صدیقی صاحب!' میں نے پوچھا۔

'میں۔۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے ڈیرہ غازیخان کے ڈی آئی جی پولیس سے بات کرنے کا موقع مل جائے۔ اگرچہ ہم پہلے ہی اس موضوع پر بحث کر چکے ہیں کہ ایسا کرنا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے لیکن پھر بھی میرے ذہن سے یہ خیال نکل نہیں سکا ہے۔ ہم کوشش کریں تو ایسا موقع تلاش کر سکتے ہیں۔ جب اس سے ملاقات کرنا ہمارے لیے خطرناک ثابت نہ ہو۔'

'میرا خیال ہے آپ کی یہ تجویز بری نہیں ہے۔ اگر یہ ڈی آئی جی بھی سردار شاہ مراد کا کارندہ ثابت ہوا تو کم از کم یہ بات تو یقینی ہو جائے گی کہ سردار شاہ مراد کے خلاف کسی بھی قسم کی کاروائی کے لیے یہاں کی مقامی مشینری پر ہرگز ہرگز بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر خوش قسمتی سے یہ پولیس افسر دیانت دار ثابت ہوا تو ہم لوگوں کی بیشتر مشکلات دور ہو سکتی ہیں۔'

'آپ لوگ ڈی آئی جی سے کس انداز میں ملاقات کرنا چاہتے ہیں؟' ڈاکٹر صنم نے خاصی دیر بعد ہماری گفتگو میں دخل دیا۔

'ہم چاہتے ہیں کہ جب ہم اس سے ملاقات کریں تو وہ بالکل تنہا ہو تاکہ وہ فوری طور پر ہمارے خلاف کوئی کاروائی نہ کر سکے اور نہ ہی کوئی ہماری گفتگو کے درمیان مداخلت کر سکے۔ ہم اسے تمام صورت حال سے آگاہ کر دینا چاہتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے یہ تمام معلومات اسلام آباد میں ہمارے محکمے کے ہیڈ آفس تک پہنچ جائیں' میں نے تفصیل سے وضاحت کی۔

'میرا خیال ہے میں اس سلسلے میں آپ کی کچھ مدد کر سکتی ہوں۔'

'وہ کیسے؟' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

'میں اگرچہ سماجی سرگرمیوں میں زیادہ حصہ نہیں لیتی۔ تاہم میرے علم میں یہ بات آئی تھی کہ شہر کا نیا ڈی آئی جی پولیس ٹینس کا بہت اچھا کھلاڑی ہے۔ وہ باقاعدگی سے آفیسرز کلب میں ٹینس کھیلنے آتا ہے۔ ڈی آئی جی ہاؤس کا کلب سے فاصلہ بہت کم ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ پیدل ہی کلب آ جاتا ہوگا۔ اس بات کا امکان بھی کم ہے کہ وہ اتنے مختصر فاصلے کے لیے اپنے باڈی گارڈز کو ساتھ لاتا ہوگا۔ اس علاقے میں سب اعلیٰ افسران کے بنگلے ہیں۔ میرا خیال ہے وہیں کہیں مناسب جگہ اسے روک کر اس سے بات کی جا سکتی ہے۔'

'یہ تو آپ نے بہت کام کی باتیں بتائیں ڈاکٹر صاحبہ۔ ہم یقیناً ایسا ہی کریں گے۔ اس طرح تو وہ چاہے بھی تو ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا' صدیقی نے پر جوش لہجے میں کہا۔ میں نے اس بات میں سر ہلا کر اس

کی تائید کی حالانکہ میں جانتا تھا کہ یہ سب اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ یہ سمجھ رہے ہیں۔ اس 'مناسب موقع' کی تلاش میں ہم کسی بھی مشکل میں پھنس سکتے تھے۔ تاہم میں نے اپنے خدشات کا اظہار مناسب نہیں سمجھا۔ 'ٹھیک ہے۔ آج شام کو میں اس کلب کی طرف جاؤں گا اور تمام صورت حال کا جائزہ لوں گا۔ ڈاکٹر صاحبہ آپ مجھے ڈی آئی جی ہاؤس اور کلب کا محل وقوع سمجھا دیں' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ وہ مجھے کیا سمجھاتی یہ سب تو میں پہلے سے جانتا تھا۔ میرا ذہن تو پہلے ہی تمام منصوبہ بندیوں میں مصروف تھا۔

شام پانچ بجے کے قریب میں ڈاکٹر صنم کے گھر سے نکلا اور اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔ فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا لہٰذا میں کچھ ہی دیر میں اس علاقے میں پہنچ گیا۔ اس وقت تک گھنے درختوں سے گھری اس سڑک پر اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ چہل قدمی کی غرض سے نکلنے والے لوگ خراماں خراماں چلے جا رہے تھے۔ اسی سڑک پر آگے جا کر نو تعمیر چڑیا گھر تھا۔ شام ڈھلے وہاں اچھی خاصی رونق ہو جاتی تھی۔ کلب کے عقب میں خاصا بڑا باغ تھا۔ وہاں بھی شام ڈھلے لوگ تک گھومتے رہتے۔ میں چہل قدمی کے انداز میں چلتا کلب کے پاس پہنچا۔ اس کے بعد ڈی آئی جی ہاؤس کی جانب بڑھنے لگا۔ اس دوران میں میری نظریں بڑے غور سے آس پاس کا جائزہ لیتی رہیں۔ میں اپنے منصوبے کی جزئیات طے کرتا رہا۔ ڈی آئی جی ہاؤس کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے ایک سرسری نظر ادھر اُدھر ڈالی۔ بنگلے کے گیٹ پر دو گارڈ تعینات تھے۔ ان کی مستعدی سے میں نے اندازہ لگایا کہ ان کا مالک گھر میں موجود ہے۔ میں ٹہلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ کچھ دور آگے جانے کے بعد میں واپس لوٹ آیا۔ میں ایک بار پھر ڈی آئی جی ہاؤس کے گیٹ کے سامنے سے گزرا مکب اور ڈی آئی جی ہاؤس کے تقریباً درمیان میں پہنچ کر میں نے بغور آس پاس کا جائزہ لیا۔ اس وقت مجھے وہاں کوئی ذی روح نظر نہ آیا۔ میں سڑک سے ذرا ہٹ کر بہنے والا نالا پھلانگ کر مہندی کی باڑ کی طرف بڑھا۔ باڑ پھلانگ کر میں دوسری طرف پہنچا اور گھاس پر بیٹھ کر اپنے بوٹ اتارنے لگا۔ بوٹ کے فیتے اپنی پتلون کی بیلٹ میں باندھ کر میں تیزی سے ایک بڑے سے پیڑ پر چڑھتا چلا گیا۔ خاصی اونچائی پر پہنچ کر میں نے صورت حال کا جائزہ لیا۔

میں نے دیکھا کہ ڈی آئی جی ہاؤس سے کلب تک کا راستہ پوری طرح میری نظروں کے سامنے ہے۔ خود کو ایک نسبتاً آرام دہ دوشاخے پر جما کر میں نہایت صبر و تحمل سے ڈی آئی جی کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ میری نظریں ڈی آئی جی ہاؤس کے گیٹ پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد میں نے ایک میانہ قامت شخص کو ڈی آئی جی ہاؤس کے گیٹ سے باہر نکلتے دیکھا۔ اس نے سبز رنگ کا جوگنگ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹینس کا ریکٹ تھا۔ ورزش کے انداز میں اپنے شانے اچکاتا' لمحہ بہ لمحہ وہ قریب آتا گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ تقریباً چالیس برس کا' سانولی رنگت کا حامل ایک چاق و چوبند شخص تھا۔ وہ میرے سامنے سے گزرا۔ اس کے بلند آواز میں گنگنانے کی آواز خاصی دیر تک مجھے سنائی دیتی رہی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کلب کے گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے گہری سانس لی اور خود کو ایک طویل انتظار کے لیے تیار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر

یلغار کرنے لگے۔ روزی کی
کے بعد مغرب کا وقت ہو گیا اندھیرے کے بھوت چاروں طرف سے
جدوجہد سے واپس لوٹنے والے پرندے اپنے گھونسلوں میں شب بسری کی تیاری کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ
پرندوں کا بے ہنگم شور کم ہونے لگا۔ حتیٰ کہ خاموشی طاری ہو گئی۔ بیٹھے بیٹھے میرا جسم درد کرنے لگا۔ میں
نے پہلو بدلا۔ یوں ہی پہلو بدلتے بدلتے کئی گھنٹے بیت گئے۔ بہت سے لوگ پیدل اور اپنی گاڑیوں میں
کلب میں داخل ہوئے اور باہر نکلے لیکن ڈی آئی جی کا کوئی پتا نہیں تھا۔ میں دل ہی دل میں اسے کوستا

رہا۔
وہ میری طرف
بالآخر وہ مجھے گیٹ سے باہر نکلتا نظر آیا۔ سڑک پر لگی دھندلی لائٹوں کی روشنی میں
سانولا رنگ' کھڑے نقوش۔ کلین شیو
بڑھنے لگا۔ میں نے اس کی صورت ذہن نشین کرنے کی کوشش کی۔
چہرے پر چمک دار چوکنا آنکھیں۔ مجھے اس کے چہرے میں کوئی عجیب سی بات محسوس ہوئی جسے میں کوئی
معنی نہیں پہنا سکا۔ وہ میرے سامنے سے گزر کر آگے بڑھ گیا۔ میں سوچتا ہی رہ گیا کہ وہ کون سی چیز ہے
جو میرے ذہن میں چبھ رہی ہے۔ ڈی آئی جی اپنے بنگلے میں گھس گیا۔ کھمبوں پر لگی لائٹوں کی روشنی میں
چمکتی ہوئی سڑک پر ایک بار پھر ویرانی چھا گئی۔ قدرے توقف کے بعد میں نہایت خاموشی اور احتیاط کے
ساتھ درخت سے نیچے اترنے لگا۔ درخت سے اترنے کے بعد میں نے ایک بار پھر اپنے اسپورٹس شوز

پیروں میں چڑھا لیے۔
مجھے اصل خطرہ پولیس کے گشتی
ماڈل کالونی کی طرف واپس آتے ہوئے میں بے حد محتاط رہا۔
دستوں کی طرف سے تھا۔ وہ اگر مجھے راستے میں روک لیتے تو میرے لیے شدید مشکلات پیدا ہو
جاتیں۔ میں اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بظاہر پر اعتماد انداز میں قدم اٹھاتا رہا۔ راستے میں
مجھے ہلکی سی خنکی کا احساس ہوا۔ بدلتے موسم کے ساتھ ساتھ راتیں ٹھنڈی ہوتی جا رہی تھیں۔ خوش قسمتی
سے مجھے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ درپیش نہیں ہوئی۔ میں واپس پہنچا تو مجھے مرزا' صدیقی اور ڈاکٹر صنم
بے چینی سے اپنا انتظار کرتے ہوئے ملے 'کیا ہوا؟ کیسی صورت حال ہے؟ کیا تم نے ڈی آئی جی کو دیکھا
؟' ان تینوں نے تقریباً بیک وقت مجھ پر سوالات کی بارش کر دی۔ میں نے خاصی وضاحت سے انہیں
تمام صورت حال سے آگاہ کر دیا۔
صدیقی نے پر جوش لہجے میں
اس کا مطلب ہے میں اس سے تنہائی میں ملاقات کر سکتا ہوں؟'

پوچھا۔
'ہاں میرے خیال میں ڈی آئی جی سے تنہائی میں ملاقات کرنے کی یہی واحد صورت ہے۔ ڈاکٹر
صنم نے ڈی آئی جی کے متعلق جو کچھ بتایا وہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔
'بس تو پھر صحیح ہے۔ میں کل ہی اس سے ملاقات کرتا ہوں' صدیقی نے پر جوش لہجے میں کہا۔
'میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گا۔ ہم دونوں اس سے بات کریں گے۔' مرزا نے پر زور لہجے میں
کہا۔ میں نے اس کی رائے مسترد کر دی۔
'نہیں مرزا صاحب' ابھی آپ کا زخم پوری طرح نہیں بھر سکا ہے۔'

'لیکن کیوں؟ میرا زخم پہلے سے بہتر ہے۔ میں با آسانی چل پھر سکتا ہوں' اس نے اصرار کیا۔

'میری بات مان جائیں مرزا صاحب' بظاہر سادہ سا نظر آنے والا یہ کام خطرناک بھی بن سکتا ہے۔ اس علاقے میں تقریباً تمام بنگلے اعلیٰ ترین سرکاری کارندوں کے ہیں۔ تمام بنگلوں کے گیٹوں پر پولیس گارڈ تعینات ہیں۔ خدانہ خواستہ معاملہ بگڑ گیا تو ہمیں چاروں طرف سے گھیرا جا سکتا ہے۔' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

'اچھا بھئی' جیسے تمہاری مرضی۔ ویسے تم تو صدیقی کے ہمراہ جاؤ گے نا؟'

'ہاں میں بھی جاؤں گا اور ڈاکٹر صنم بھی ہمارے ہمراہ ہوں گی۔'

'وہ کیوں؟ ڈاکٹر صنم کی اس معاملے میں کیا ضرورت ہے؟' صدیقی نے پوچھا۔

'ضرورت ہے صدیقی صاحب' ہم کل شام پوری تیاری کے ساتھ وہاں جائیں گے۔ ڈاکٹر صنم اپنی گاڑی لے کر ہمارے ساتھ جائیں گی۔ خدانخواستہ ہمیں کوئی خطرہ درپیش ہوا تو ہم ان کی گاڑی میں پلک جھپکتے میں وہاں سے ہوا ہو جائیں گے۔ ہمیں ہر صورت میں تصادم سے گریز کرنا ہے۔ بصورت دیگر ہم لوگ شدید مشکلات میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ ہم یہ سب کچھ بھرپور منصوبہ بندی سے کریں گے۔'

'بالکل ٹھیک ہے' ڈاکٹر صنم نے مسرت اور جوش سے بھرپور لہجے میں کہا' میں آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ لوگوں کو میری کارکردگی سے مایوسی نہیں ہوگی۔'

'ٹھیک ہے۔ اب میں آپ لوگوں کو تمام محل وقوع اور اپنے ذہن میں موجود تجاویز سے آگاہ کرتا ہوں۔' وہ تینوں ہمہ تن گوش ہو گئے۔ میں نے انہیں اپنے ذہن میں موجود منصوبے سے آگاہ کیا۔ تھوڑی سی بحث کے بعد وہ مجھ سے متفق ہو گئے۔ میں نے ایک بار پھر منصوبے کی اہم باتوں کو دہرایا۔ 'ہمیں ڈی آئی جی کو اس کلب سے واپسی پر روکنا ہے تاکہ کسی بھی قسم کی مداخلت کا امکان کم سے کم ہو سکے۔ ڈاکٹر صنم پلیا کے پاس گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر کے ہماری منتظر رہیں گی۔ میں درخت پر چڑھ کر کلب سے واپسی کے راستے کا جائزہ لیتا رہوں گا۔ صدیقی مجھ سے چالیس گز آگے درخت کی آڑ میں چھپ کر میرے اشارے کے منتظر رہیں گے۔ اگر صورت حال موافق ہوئی تو میں سیٹی کی ہلکی سی آواز سے انہیں اشارہ دوں گا۔ یہ اسے روک کر اس سے بات کریں گے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی قسم کی مزاحمت یا شک و شبے کا اظہار کرے۔ ایسے میں صدیقی صاحب اسے اپنا پستول دکھا کر درخت کی آڑ میں لے آئیں گے۔ اسی اثنا میں' میں درخت سے اتر کر مہندی کی باڑھ کے پیچھے چلتا ہوا' ان دونوں کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ البتہ میں مہندی کی باڑھ کے پیچھے ہی رہوں گا اگر معاملات ٹھیک ٹھاک رہے تو میں مداخلت نہیں کروں گا۔ ہم تینوں میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر چوکنا رہے گا۔ اس منصوبے کے کسی بھی مرحلے پر ہم میں سے کسی کو کسی قسم کی خطرے کا احساس ہو جائے تو وہ الو کی آواز میں سگنل دے گا جس کا مطلب یہ ہے کہ منصوبے پر عمل درآمد فوری طور پر روک دیا جائے اور گاڑی تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ ہماری پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہمارا کام خاموشی سے مکمل ہو۔ بالفرض اگر ہم میں سے کسی کی جان کو خطرہ درپیش ہو تو اپنے تحفظ کے لیے گولی چلا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ہم تینوں ایک دوسرے کی مدد کریں

گے۔ البتہ اس صورت میں بھی ہماری کوشش یہی ہوگی کہ پہلی فرصت میں اس علاقے سے نکل جائیں۔'

صدیقی اور ڈاکٹر صنم نے مجھے یقین دلایا کہ وہ تمام باتیں پوری طرح ذہن نشین کر چکے ہیں۔

تمام تفصیلات طے ہونے کے بعد ڈاکٹر صنم اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد مرزا اور صدیقی بھی اپنے کمرے میں گھس گئے۔ تنہا ہوتے ہی مجھ پر خیالات اور اندیشوں کا جال تن گیا۔ یہ سوچ کر مجھے اپنا خون بڑھتا محسوس ہوا کہ میرا فقیر بابا مجھ سے محض چند کلومیٹر کے فاصلے پر موجود ہے۔ وہ سردار برکت علی کی حویلی سے آزاد ہو چکا ہے۔ اب وہ میرا منتظر ہوگا۔ اس نے مجھے خاص طور پر تو نہیں بتایا تھا کہ حویلی سے آزاد ہونے کے بعد مجھے کہاں ملے گا۔ تاہم اس نے مجھ سے یہ ضرور کہا تھا کہ وہ ڈیرہ غازیخان اور اس کے قریبی علاقوں میں واقع درگاہوں میں کسی پر بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ ویسے بھی میں نے اسے بتا دیا تھا کہ عالم بستی کا جاگیردار کمال الدین خان میرا قریبی عزیز بن چکا ہے اور میں اپنی مہم سے واپس آنے کے بعد وہیں قیام کروں گا۔ ہو سکتا ہے فقیر بابا آزاد ہونے کے بعد عالم بستی جا چکا ہو۔ اس نے کمال الدین خان کو پیغام دے دیا ہوگا کہ وہ مجھے بتا دے کہ فقیر بابا ان دنوں سائیں ڈوڈہ شاہ کی درگاہ پر ڈیرا جمائے ہوئے ہے۔ وہ میری آمد کا شدت سے منتظر ہوگا۔ اسے کیا خبر کہ میں کن الجھنوں میں گرفتار ہوں۔ میں اس کے اتنے قریب جا کر اس سے ملاقات کیے بغیر لوٹ آیا مگر میں بھی کیا کرتا؟ ڈاکٹر صنم کے ساتھ میں فقیر بابا کے ساتھ کیسے ملاقات کرتا؟ ہمارے باہمی تعلق کو وہ جانے کیا کیا معنی پہناتی۔ اگر وہ فقیر بابا کے متعلق سوالات پر اتر آتی تو میرے لیے جان چھڑانا مشکل ہو جاتی۔ اچھا ہی ہوا کہ میں اس کے ساتھ فقیر بابا سے نہیں ملا۔ اب بھلا پریشانی کی کیا بات ہے؟ میں کسی بھی وقت موقع دیکھ کر وہاں چلا جاؤں گا۔ بھلا وڈور بستی جانا کیا مشکل ہے؟ پھر میں اپنے فقیر بابا سے بے فکر ہو کر ملاقات کروں گا۔ مجھے اپنے سامنے وہ دیکھ کر کتنا خوش ہوگا۔ فقیر بابا !میرا فقیر بابا ایک طویل جدائی کے بعد بالآخر مجھ سے مل جائے گا۔

اس رات میں نے بار بار فقیر بابا کو اپنے خوابوں میں دیکھا۔ وہ مجھے اپنے سینے سے لگا رہا ہے۔ میرے بال سنوار رہا ہے۔ مجھے اپنی دانش مندانہ باتوں سے مستفید کر رہا ہے۔ میں بچوں کے مانند اس سے روٹھ رہا ہوں۔ وہ بہت پیار سے مجھے منا رہا ہے۔ میں اسے اپنے دکھڑے سنا رہا ہوں۔ وہ میری پیٹھ تھپک کر مجھے تسلی دے رہا ہے' پریشان کیوں ہوتا ہے بیٹا سیفل؟ تو تو میرا شیر ہے' شیر ببر۔'

اگلے دن صبح ہمیں ناشتہ وغیرہ کرانے کے بعد ڈاکٹر صنم ایک مرتبہ پھر شہر کی طرف روانہ ہوئی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ کسی بے حد ضروری کام سے شہر جانا چاہتی ہے۔ اس مرتبہ ہم نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ پچھلے تجربے کے پیش نظر میں نے اس کے ہمراہ جانے کی ہمت نہ کی۔ دوپہر کے وقت وہ واپس لوٹ آئی۔ اس نے بے شمار پیکٹ اور شاپنگ بیگ وغیرہ اٹھا رکھے تھے۔ وہ تمام سامان اس نے لاؤنج کی میز پر ڈھیر کر دیا' یہ سب کیا ہے ڈاکٹو صاحبہ؟' میں نے حیرانی سے پوچھا۔ اسی اثنا میں مرزا اور صدیقی بھی اپنے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آ گئے۔ انہوں نے بھی میرا سوال دھرا دیا' جو بھی کچھ ہے آپ لوگوں کے سامنے ہے خود ہی دیکھ لیجیے' اس نے کہا اور ایک بڑا سا شاپنگ بیگ اٹھا کر کچن میں گھس

گئی۔ مرزا اور صدیقی کی ہدایت پر میں نے یکے بعد دیگرے وہ پیکٹ اور شاپنگ بیگ کھولنا شروع کر دیے۔ ان سے برآمد ہونے والی اشیا پر نظر پڑتے ہی ہمارے منہ حیرانی سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ نہایت عمدہ قسم کے مردانہ لباس' بنیان' موزے' رومال مرزا اور صدیقی کے لیے اعلیٰ قسم کے برانڈ کے سگریٹ کے پیکٹ' میرے لیے چمڑے کی سیاہ جیکٹ اور ایک کلائی کی گھڑی۔۔۔

ہم لوگ حیران حیران نظروں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر صنم کچن سے نکل کر ہمارے پاس آن کھڑی ہوئی' کھانا تیار ہے صاحبان۔ اس وقت کا مینو مٹن کڑاہی اور چکن فرائیڈ رائس ہمراہ روغنی روٹی' اس نے مئودبانہ لہجے میں کہا۔

'یہ آپ نے ہم پر بہت بڑی زیادتی کی ہے ڈاکٹر صاحبہ' صدیقی نے شاکی لہجے میں کہا۔

'ارے ارے کیا کھانے کی دعوت دینا زیادتی ہے؟' اس نے مصنوعی حیرانی کے ساتھ کہا۔

'ہم کھانے کی نہیں اس ڈھیر سارے سامان کی بات کر رہے ہیں۔ آپ نے خواہ مخواہ ہماری خاطر اتنا بہت سا پیسہ ضائع کیا۔'

'ارے نہیں جناب۔ میں خواہ مخواہ پیسا ضائع کرنے والی عورت نہیں ہوں۔ میری نظر میں پیسے کا صحیح مصرف یہی ہے جو میں نے کیا۔ ویسے آپ لوگ میری فکر نہ کریں۔ میرے پاس بہت پیسا ہے۔ ان چھوٹے موٹے اخراجات سے میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔'

ہم لوگوں نے خاصا احتجاج کیا لیکن ہم لوگوں کی ایک نہ چلی۔ کھانا وہ کسی بہت ہی اچھے ہوٹل سے لائی تھی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے فرمائش کی کہ ہم لوگ اس کے لائے ہوئے لباس پہن لیں۔ میک اپ کے باعث ہمارے لیے غسل کرنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ ہم نے بغیر غسل کے لباس تبدیل کر لیے۔ ڈاکٹر صنم نے مرزا اور صدیقی کے لیے شلوار قمیص کا انتخاب کیا تھا جب کہ میرے لیے وہ پتلون قمیص لے آئی تھی۔ اس کی خوردبین صفت آنکھوں نے میرے جسم کی جو پیمائش کی وہ صد فی صد درست ثابت ہوئی۔ براؤن پتلون اور دھاری دار سبز قمیص میرے جسم پر اتنی عمدگی سے فٹ بیٹھی کہ گویا انہیں میرے ہی لیے تیار کروایا گیا ہے۔ چمڑے کی سیاہ جیکٹ بھی میرے جسم پر سج گئی۔ مجھے جس بات کا اندیشہ تھا بالآخر وہی رونما ہوئی ان تینوں نے بیک زبان میری جامہ زیبی کو اپنا موضوع گفتگو بنا لیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو ان کے زبان کے سنگریزوں کی زد سے نکالا۔

سہ پہر کے قریب ہم نے اپنی مہم کی تیاریاں شروع کر دیں۔ 'میرے کل کے جائزے کے مطابق وہ چھ بجے شام کلب کی طرف روانہ ہوتا ہے جبکہ اس کی واپسی دس بجے رات کے قریب ہوتی ہے۔ ہم احتیاطاً ساڑھے آٹھ بجے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔' انہوں نے میری رائے سے مکمل اتفاق کیا۔ اس مہم کے پیش نظر ہم نے رات کا کھانا جلدی کھا لیا۔ اس کے بعد ہم وقت مقررہ کا انتظار کرنے لگے۔ یہ مختصر سا وقفہ خاصا اعصاب شکن ثابت ہوا۔ سب سے زیادہ اضطراب کا شکار ڈاکٹر صنم رہی ہو گی لیکن اس باہمت عورت نے اپنی حالت کا ہم پر اظہار نہیں ہونے دیا۔ سوا آٹھ بجے ہم تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم تینوں نے اپنے ہتھیار چیک کیے۔ میں نے صدیقی کے اور صدیقی نے میرے چہرے کے

میک اپ کا جائزہ لیا۔ پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد ہم ڈاکٹر صنم کی چھوٹی سی گاڑی میں آ بیٹھے۔ مرزا ہمیں گیٹ پر رخصت کرنے آیا۔ وہ بے حد مضطرب تھا۔ صدیقی نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ جواباً اس نے بڑی محبت سے صدیقی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔' خدا تم لوگوں کو اپنے نیک مقصد میں کامیاب کرے' اس نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ ڈاکٹر صنم نے سنبھال لی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ گئے۔ میں نے ان دونوں کو بتایا کہ میں کس درخت پر چڑھ کر بیٹھوں گا۔ میں نے صدیقی کو وہ جڑواں درخت دکھائے جن کے پیچھے اسے چھپ کر کھڑا ہونا تھا۔ وہ دونوں درخت خاصی تاریکی میں سڑک سے ذرا ہٹ کر اگے ہوئے تھے۔ ان درختوں کے عقب میں مہندی کی آدم قد باڑ تھی۔ میں نے ان دونوں درختوں کا انتخاب اس لیے کیا تھا کہ ان درختوں کے عین پیچھے مہندی کی باڑ میں سے گزرنے کا راستہ موجود تھا۔ کسی بھی مشکل صورت حال میں وہ خاموشی سے اس راستے سے باڑ کے عقب میں آ جاتا۔ اس صورت میں سڑک پر سے اسے دیکھنا ممکن نہ رہتا۔ جس درخت پر مجھے چڑھنا تھا اس کی خاص بات یہ تھی کہ اس کی جڑ اور تنا مہندی کی باڑ کے پیچھے تھا جب کہ اس کی بڑھی ہوئی شاخیں باڑ کے اوپر سے گزر کر سڑک کی طرف جھک آئی تھیں۔ درخت سے اترتے ہی میں باڑ کے پیچھے جاتا اور با آسانی صدیقی کے پاس پہنچ جاتا۔

ڈاکٹر صنم کی گاڑی کو میں نے سڑک کے موڑ پر پل کے قریب اس طرح کھڑا کر دیا کہ اسے دیکھنے کے لیے خاصی تگ و دو کرنی پڑتی۔ گہرے نیلے رنگ کی چھوٹی سی کار تاریک سائیوں میں مدغم ہو کر رہ گئی۔ احتیاطاً میں نے اپنے جوتے پہلے ہی اتار کر گاڑی میں رکھ دیے۔ صدیقی نے درختوں کی جوڑی کے پیچھے جگہ سنبھال لی جبکہ میں کانٹے دار جھاڑیوں سے اپنے پاؤں بچاتا' پھونک پھونک کر قدم رکھتا مذکورہ درخت کی جانب بڑھنے لگا۔ درخت پر چڑھنے کے بعد میں نے ایک مناسب سی جگہ سنبھال لی۔ اس کے ساتھ ہی بے حد تکلیف دہ انتظار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مجھے علم تھا کہ ڈی آئی جی کی کلب سے واپسی میں ابھی خاصی دیر ہے۔ اس کے باوجود میری نظریں بار بار کلب کے گیٹ کی طرف جم جاتیں۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ میرے دل کی دھڑکنوں کی رفتار بڑھتی چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی وسوسے مجھے گھیرنے لگے۔ کیا خبر وہ آج کلب آیا ہی نہ ہو؟ ہو سکتا ہے وہ آج جلدی گھر واپس لوٹ گیا ہو۔ ہم خواہ مخواہ اس کے انتظار میں سوکھتے رہیں جبکہ وہ اپنی آرام دہ خواب گاہ میں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا ہو۔ میں نے ڈاکٹر صنم کی تحفے میں دی ہوئی خوبصورت گھڑی میں ٹائم دیکھا۔ ابھی تو ساڑھے نو بجے ہیں۔ اس کا مطلب ہے اس کی واپسی میں کم و بیش آدھا گھنٹہ باقی ہے۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدلا اور اپنے ذہن کو ادھر ادھر خیالات میں الجھانا چاہا۔ اب کیا ٹائم ہوا ہے؟ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ گھڑی کے ڈائل پر روشن نقطے اور لکیریں پونے دس کا وقت بتا رہی تھیں۔ میں پوری طرح چوکنا ہو گیا۔ اپنی جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر میں نے پستول کا لمس محسوس کیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے حوصلے آسمان کو چھوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں نے اپنی نظریں کلب کے گیٹ پر جما

لیں۔

اچانک میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ وہ ڈی آئی جی ہی تھا۔ اس کا حلیہ کل والا ہی تھا۔ صرف ایک ہی تبدیلی مجھے نظر آئی۔ جسے دیکھتے ہی میرے وجود میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ آج وہ اکیلا نہیں تھا۔ مجھے اس کے ہمراہ ایک پستہ قامت عورت نظر آئی۔ اس عورت نے قمیص کے ساتھ اسپورٹس پاجامہ پہن رکھا تھا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں بھی ٹینس کا ریکٹ نظر آیا۔ وہ دونوں خراماں خراماں چلتے ہماری طرف بڑھنے لگے۔ وہ دونوں مسلسل آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ ان کے بے تکلفانہ انداز گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ عورت ڈی آئی جی کی بیوی ہے۔

یہ صورت حال دیکھ کر میں تذبذب کا شکار ہوگیا۔ کیا میں سیٹی بجا کر صدیقی کو اشارہ دوں کہ معاملہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے؟ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ بے فکر ہو کر ڈی آئی جی کو مل سکتا ہے۔ پھر میرے ذہن میں خیال آیا کہ میں الو کی آواز نکال کر صدیقی کو کاروائی پر عمل درآمد سے منع کر دوں۔ ایک کے بجائے دو افراد سے نمٹنے میں اسے دشواری بھی پیش آسکتی ہے۔ کہیں صدیقی کو دیکھ کر یہ عورت بغیر سوچے سمجھے چیخنا چلانا نہ شروع کر دے پھر میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر اس شخص کے ہمراہ اس کی بیوی ہے تو کیا ہوا؟ ہمیں اس سے صرف چند باتیں ہی تو کرنا ہیں۔ صدیقی پستول دکھا کر انہیں شور مچانے سے روک سکتا ہے پھر میں تو اس کی مدد کے لیے پہنچ ہی چکا ہوں گا۔ معاملہ پیچیدہ ہوا تو میں بھی سامنے آجاؤں گا۔ دو ہتھیاروں کے سامنے تو یہ دونوں دم مارنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ آج کی یہ رات ضائع ہوگئی تو کل رات پھر ہمیں نئے سرے سے یہ تمام مصیبت بھگتنا پڑے گی۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ یہ اکثر و بیشتر اکٹھے کلب آتے جاتے ہوں۔ یہ بات میرے دل کو لگی۔ میں نے دھیمی اور باریک آواز میں سیٹی بجا کر صدیقی کو ہوشیار کر دیا کہ وہ کاروائی کے لیے تیار رہے اس کے ساتھ ہی میں بے حد احتیاط سے درخت سے نیچے اترنے لگا۔ جب تک میں درخت سے زمین پر پہنچتا' وہ دونوں مجھ سے خاصے قریب پہنچ گئے۔ ان کے آپس میں باتیں کرنے کی آواز واضح طور پر میرے کانوں میں آنے لگیں۔ لاشعوری طور پر میرا ذہن ان کی زبان سے نکلنے والے الفاظ پر مرکوز ہوگیا۔ میں نے ان کی باتیں سننے اور سمجھنے کی کوشش کی لیکن ان کی زبان سے نکلنے والا ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑا۔ خدا جانے وہ کس زبان میں بات کر رہے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے بہت سے کنکر پتھر ایک کنستر میں ڈال کر اس کنستر کو زور زور سے ہلایا جا رہا ہے۔

میرے زمین تک پہنچنے تک وہ درخت کے سامنے سے گزر کر آگے بڑھ گئے۔ میں تیز لیکن خاموش قدموں سے آگے بڑھا۔ جس طرف صدیقی درختوں کے عقب میں چھپا ان دونوں کا منتظر تھا اس نے بھی یقیناً ان دونوں کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ لیا ہوگا۔ میں ان دونوں کے متوازی چلتا باڑ کے عقب میں آگے بڑھنے لگا۔ اس دوران میں میرے کان ان کی باتوں پر لگے رہے اور میرا ذہن ان کی زبان سے نکلنے والے الفاظ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ یک لخت اس عورت نے خاصی تیز اور پرجوش آواز میں ایک لفظ دہرایا۔ جونہی وہ لفظ میرے کان میں پہنچا' میں اضطراری طور پر ایک جھٹکے سے رک گیا۔ میرے دماغ

میں خطرے کا تیز الارم گونجنے لگا۔ ترمتی!۔۔۔۔۔ یہ تھا وہ لفظ جو اس عورت کے منہ سے نکلا جس نے میری یادداشت کی سطح پر ہلچل مچا دی۔ یہ عورت ان دو سپاہیوں میں سے ایک کا نام لے رہی تھی جنہوں نے غلہ منڈی عقبی گلی میں مجھے گھیر کر خاموشی سے ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ پولیس والا اپنے ساتھی کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس برقعہ پوش عورت نے اسے ترمتی کے نام سے پکارا اور اسے بھگوان کا واسطہ دیا۔ اس نام کے کان میں پڑتے ہی میرے دماغ نے فیصلہ سنا دیا۔ خطرہ! اب شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ ڈی آئی جی اور اس کی بیوی سو فیصد بھارتی ایجنٹ ہیں جنہیں سردار شاہ مراد کی سرپرستی حاصل ہے۔ اس سے پہلے کہ صدیقی انہیں روک کر ان سے بات چیت کرے مجھے اسے خطرے سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم خاموشی سے واپس لوٹ جائیں۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر اپنے ہاتھ کا بھونپو بنایا اور حلق سے الو کی کریہہ آواز نکالی۔ مجھے یقین تھا کہ ڈی آئی جی اور اس کی بیوی یہ آواز سن کر چونک پڑیں گے لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ اچانک میں نے اس عورت کی ہلکی سی چیخ سنی۔ شاید اس نے صدیقی کو دیکھ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈی آئی جی کی بھاری اور کرخت آواز سناٹے میں گونجی۔ 'کون ہے اوئے؟ باہر نکل۔' میں برق رفتاری سے آگے بڑھنے لگا۔ میں نے مہندی کی باڑ میں ہلکی سی آواز سنی۔ شاید صدیقی باڑ کے درمیان موجود راستے سے اندر آرہا تھا۔ قبل اس کے میں اس کے قریب پہنچتا' میں نے اس کی ہلکی سی چیخ سنی اس کے ساتھ ہی اس کا بھاری بھرکم جسم دھم سے منہ کے بل گھاس پر گرا۔ اسی لمحے فضا میں ایک فائر' کڑاکا گونجا۔ میرا دل اچھل کر میرے حلق میں آپہنچا۔ فائر کے ساتھ ہی مہندی کے پودوں کی چند ٹہنیاں ٹوٹیں۔ اس فائر کا ہدف صدیقی تھا جو زمین سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گولی اسے نہیں لگی لیکن وہ گھبرا کر ایک بار پھر زمین سے چپک گیا۔ ایک اور فائر ہوا۔ اس بار گولی باڑ کو چیرتی اس کے قریب ہی زمین میں کہیں دھنس گئی۔

میرے وجود میں اضطراب کی بجلیاں کوندنے لگیں۔ ابھی تک صدیقی پر اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی لیکن اگر فائرنگ کرنے والا باڑ کے قریب آکر درمیانی راستے سے صدیقی کو نشانہ بناتا تو وہ با آسانی اسے شکار کر لیتا۔ میں نے اندازے سے فائرنگ کی سمت اپنے پستول کا رخ کیا اور فائر کر دیا۔ ایک زبردست دھماکہ ہوا اور میرے پستول سے نکلنے والی گولی مہندی کی باڑ میں گھس کر جانے کس طرف نکل گئی۔ میں نے بلا توقف دو فائر اور کر ڈالے۔ میرے یہ فائر کارگر تو کیا رہتے لیکن اس ترت جواب نے صدیقی پر فائر کرنے والے کو بری طرح بوکھلا دیا۔ اس نے دو اور فائر کیے لیکن اس بار اس کا نشانہ میں تھا اس کے اندھے فائروں نے میرا تو کچھ نہیں بگاڑا البتہ صدیقی تیزی سے لڑھکنیاں کھاتا اس کی زد سے باہر ہوگیا۔ اسے کور دینے کے لیے میں نے مزید دو فائر کیے اس کے ساتھ ہی صدیقی پر فائر کرنے والے کو اپنی کمزور پوزیشن کا احساس ہوگیا۔ وہ دونوں کھلی جگہ پر تھے جبکہ میں گھنی باڑ کے پیچھے تھا۔ مزید مقابلہ کرنے کے بجائے انہوں نے سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا۔

میں تیزی سے دوڑتا ہوا صدیقی کے پاس پہنچا جو لنگڑاتا ہوا ڈاکٹر صنم کی کار کی طرف دوڑ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ شاید زخمی نہیں ہے۔ اس کی طرف سے بے فکر ہو کر میں مہندی کی باڑ کے

درمیان بنے تنگ راستے کی طرف بڑھا۔ خشک ٹہنیوں نے میرے چہرے پر کئی کھرنچیں ڈال دیں لیکن میں ان کھرونچوں سے بے پرواباڑ کے پار نکل آیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ نام نہاد ڈی آئی جی اور اس کی بیوی بھاگتے ہوئے اپنے سرکاری بنگلے کے گیٹ کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ میں نے ڈی آئی جی کا نشانہ لے کر مزید دو فائر کیے لیکن میرا نشانہ خطا ہوگیا۔

وہ دونوں بھاگتے ہوئے بنگلے کے اندر گھستے چلے گئے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس خطرے کا شدت سے احساس ہوا جس میں ہم لوگ گھر چکے تھے۔ فائرنگ کے دھماکوں نے سناٹے کی دیوار کو لیر لیر کر دیا تھا۔ حیران و پریشان پرندے اپنے ٹھکانوں سے نکل کر چیختے ہوئے ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔ فائرنگ کی آواز نے مختلف سرکاری بنگلوں پر تعینات پولیس گارڈ کو بھی چونکا کر رکھ دیا ہوگا اگر وہ لوگ اس طرف نکل آتے تو ہمارے لیے شدید دشواری پیدا ہو جاتی اور اگر پولیس کا کوئی مستعد قسم کا دستہ آس پاس کہیں گشت کر رہا ہوتا تو ہمیں لینے کے دینے پڑ جاتے۔ مجھے امید تھی کہ صدیقی گاڑی تک پہنچ گیا ہوگا اور اب وہ دونوں بڑی بے چینی سے میرے منتظر ہوں گے۔ میں اپنے پستول کو سنبھالتے ہوئے تیزی سے گاڑی کی طرف دوڑنے لگا۔ اس احساس سے میرے پیروں میں پر لگ گئے کہ مجھے سڑک پر نصب کھمبوں کی روشنی میں باآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ موڑ تک پہنچتے پہنچتے میرے اندیشے کی بھی تصدیق ہوگئی۔ میں نے دو تین پولیس والوں کو ڈی آئی جی کی قیام گاہ کے گیٹ پر نمودار ہوتے دیکھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ان کے ہتھیار سیدھے ہوئے زبردست دھماکے سے دو گولیاں سنسناتی ہوئی میرے سر پر سے گزر گئیں۔ جوابی فائر کرنے کے بجائے میں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ مجھ پر گولیوں کی دوسری باڑھ ماری گئی لیکن اس اثنا میں' میں سڑک کا موڑ مڑ چکا تھا۔ میں تقریباً فضا میں پرواز کرتا اس طرف لپکا جہاں ڈاکٹر صنم کی گاڑی پوشیدہ تھی۔ مجھے دیکھتے ہی صدیقی نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ میں غڑاپ سے گاڑی میں گھس گیا۔ 'گاڑی چلاؤ' میں ہذیانی لہجے میں چیخا۔ ڈاکٹر صنم نے گیئر لگا کر ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گاڑی نے بہت جلد رفتار پکڑ لی اور سنسان سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اتنے کم وقفے میں کوئی بھی ہماری گاڑی کو نہیں دیکھ پایا ہوگا۔ صدیقی نے ڈاکٹر صنم کو مختصراً یہ تو بتا دیا ہوگا کہ ہم بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگے ہیں لیکن یہ اسے بھی معلوم نہ تھا کہ میں نے ابتدا میں گرین سگنل دینے کے بعد اچانک خطرے کا سگنل کیوں دیا۔ خطرے کے احساس کے باعث ڈاکٹر صنم کی توجہ مکمل طور پر ڈرائیونگ پر مرکوز رہی چنانچہ اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

مرزا شاید گیٹ کے آس پاس ہی کہیں موجود تھا۔ اس نے تیزی سے گیٹ کھول دیا۔ ڈاکٹر صنم نے گاڑی کو اس کی جگہ پر کھڑا کر دیا۔ ہم تینوں گاڑی سے نکل آئے۔ میں نے صدیقی کو سہارا دینا چاہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اسی اثنا میں مرزا بھی تیزی سے چلتا ہمارے پاس پہنچ گیا۔ اس نے صدیقی کو لنگڑاتے دیکھا تو اس کا چہرہ فق ہوگیا۔ 'خ۔۔۔ خیریت تو ہے؟ کیا ہوا تمہیں؟' اس نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔ 'مجھے کچھ نہیں ہوا۔ تم فکر نہ کرو۔ چلو اندر چلو۔'

لاؤنج میں پہنچ کر ہم آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ مرزا نے بے تابی سے میری طرف دیکھا۔ 'تم بتاؤ بھائی ذوالفقار علی۔ تم لوگوں کے ساتھ کیا حالات پیش آئے؟' اچانک اسے میرے چہرے پر کوئی ایسی چیز نظر آئی جس نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ 'اوہ تو تم بھی زخمی ہو!'

'نہیں میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔' میں نے کہا۔ 'تمہارے چہرے پر کئی خراشیں ہیں اور' اچانک اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ 'اور تم اپنی نورانی داڑھی بھی کہیں چھوڑ آئے ہو۔' میں نے جلدی سے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرا۔ واقعی وہاں پر چند ہی بال چپکے رہ گئے تھے۔ باقی داڑھی شاید مہندی کی باڑ میں اٹکی رہ گئی تھی۔ مرزا کے توجہ دلانے پر ڈاکٹر صنم اور صدیقی نے بھی میری ہیبت کذائی کا جائزہ لیا۔ ان کے چہروں پر بھی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ 'آپ داڑھی کی بات کر رہے ہیں مرزا صاحب ہم اپنی جان بچا کر لے آئے یہی بڑی بات ہے۔ ورنہ ہم دونوں کا قصہ تمام ہونے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔' میں نے شگفتہ لہجے میں کہا لیکن میری بات سن کر وہ تینوں سنجیدہ ہوگئے۔ میں نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ مجھے اور صدیقی کو کس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ 'صدیقی صاحب کو روکنے کا سگنل دینے کے بعد میں درخت سے اترا تو ڈی آئی جی اور اس کی بیوی کے آپس میں بات کرنے کی آواز سنی۔ خدا جانے وہ کون سی زبان میں بات کر رہے تھے۔ میری سمجھ میں تو ان کی ایک بات بھی نہ آسکی۔ البتہ ڈی آئی جی کی بیوی کی زبان سے نکلنے والے ایک لفظ نے مجھے بری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے فوراً صدیقی کو خطرے کا سگنل دیا۔۔۔'

'وہ کون سا لفظ تھا؟' ان تینوں نے بہ یک وقت پوچھا۔ 'ترمتی۔۔ وہ لفظ تھا ترمتی۔ اس رات اناج منڈی کے پچھواڑے اس برقع پوش بھارتی ایجنٹ نے اپنے زخمی ساتھی کو اسی نام سے پکارا تھا۔ یہ لفظ سنتے ہی مجھے یقین ہوگیا کہ یہ ڈی آئی جی اور اس کی بیوی بھی بھارتی ایجنٹوں کے گروہ کا ایک حصہ ہیں۔'

'اوہ تو یہ بات ہے' صدیقی نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ 'گویا یہ آخری امید بھی ٹوٹ گئی۔ یہ ڈی آئی جی بھی دشمنوں کا آلہ کار ثابت ہوا۔'

'مجھے تو پہلے ہی تقریباً صد فی صد اندازہ تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ سردار شاہ مراد جیسے مکار شخص سے ایسی توقع رکھنی ہی فضول ہے کہ وہ اپنے کسی نازک پہلو کو اپنے دشمن کی طبع آزمائی کے لیے کھلا چھوڑ دے گا۔ اسی خدشے کے باعث میں نے لمبی چوڑی منصوبہ بندی کی اور احتیاط کے تقاضوں کو پوری طرح مدنظر رکھا۔ البتہ میری بھی خواہش یہی تھی کہ میرے شک کی تائید یا تردید ہو جائے۔ صدیقی صاحب آپ کو پاؤں میں چوٹ کیسے لگی؟'

'جس وقت تم نے مجھے خطرے کا سگنل دیا تو میں درخت کی آڑ سے نکل کر ان دونوں کی طرف چل پڑا تھا۔ عین اسی وقت جب تم نے الو کی آواز میں سگنل دیا' انہوں نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ دونوں بری طرح چونک پڑے۔ بدحواسی کے عالم میں' جب میں واپسی کے لیے مڑا تو ان دونوں نے للکار کر مجھے روکنے کی کوشش کی۔ جب میں نہیں رکا تو وہ میری طرف سے مشکوک ہوگئے۔ عورت نے اپنے لباس سے ریوالور

نکال کر مرزا کو دے دیا۔ مہندی کی باڑ کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے مجھے ایک پتھر سے زبردست ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل گر پڑا۔ وہ تو میری قسمت اچھی ہے کہ ذوالفقار میرے ہمراہ تھا ورنہ میرا تو کام تمام ہو چلا تھا کیونکہ اس لمحے میں بالکل نہتا تھا۔ ٹھوکر لگنے سے میرا پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر جانے کس تاریک کونے کھدرے میں جا پڑا تھا۔ ہم تو گرتے پڑتے وہاں سے نکل آئے لیکن میرا پستول وہیں رہ گیا۔' صدیقی نے مایوس لہجے میں کہا۔ اس کے لہجے میں مایوسی پورے ماحول میں سرایت کر گئی۔ کچھ دیر وہاں مکمل خاموشی رہی۔

بالآخر ڈاکٹر صنم نے اس سنگین خاموشی کا خاتمہ کیا۔ 'جو ہوا سو ہوا۔ اس پر مٹی ڈالیں۔ خدا کا شکر ادا کریں کہ ہمیں کسی بڑے نقصان سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ ہم صحیح سلامت واپس لوٹ آئے۔ یہ سمجھیں کہ یہ واقعہ رونما ہی نہیں ہوا۔ اسے اعصاب پر سوار کیا گیا تو ہماری ہمتیں ٹوٹ جائیں گی۔ صدیقی صاحب آپ کل صبح میرے ہمراہ ملتان چلیں اور وہاں سے اسلام آباد فون کر کے اپنے اعلیٰ حکام سے اس تمام صورت حال پر تبادلہ خیال کر لیں۔' صدیقی نے اس کی بات کا فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا پھر مرزا نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

'میرے خیال میں اب اس تجویز پر عمل کرنا بھی آسان نہیں رہا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ شاید اب صدیقی کا اس شہر سے نکلنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔'

'لیکن کیوں؟ میں آپ کی اس بات کا مطلب پوری طرح نہیں سمجھ سکی ہوں۔' ڈاکٹر صنم نے حیران لہجے میں کہا۔

مرزا نے پژمردہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ 'آپ آج رات کے اس واقعے کے مضمرات پر غور نہیں کیا ہے ڈاکٹر صاحبہ۔ اس سلسلے میں ان لوگوں کا شک فوری طور پر ہماری طرف آئے گا۔ ہماری تلاش کے کام میں طوفانی تیزی آ چکی ہوگی۔ صدیقی وہاں اپنا پستول اور ذوالفقار وہاں اپنے میک اپ کا کچھ حصہ چھوڑ آیا ہے۔ بھارتی ایجنٹوں کی ماہر نظروں سے یہ چیزیں چھپ نہیں سکیں گی۔ وہ فوری طور پر سمجھ جائیں گے کہ ہم مسلح ہونے کے ساتھ ساتھ میک اپ بھی کیے ہوئے ہیں۔ یہ بات تو یقینی ہے ہی کہ وہ شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی کڑی نگرانی کر رہے ہوں گے۔ اس واقعے کے بعد اس نگرانی میں شدت آ جائے گی۔ اب وہ اپنی نظروں کے سامنے سے گزرنے والے چہروں پر میک اپ بھی تلاش کریں گے۔ یہ بات پہلے ہی ہمارے نوٹس میں آ چکی ہے کہ وہ لوگ جدید ترین سائنسی آلات استعمال کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ ہماری تلاش کے لیے بھی کسی ایسی مشین کا استعمال کریں جو میک اپ کی نشان دہی کر سکے۔ بیرونی ممالک میں ایسی مشینیں ایک طویل عرصے سے استعمال کی جا رہی ہیں۔' مرزا کے منہ سے نکلنے والے الفاظ کی سنگینی کو محسوس کر کے ڈاکٹر صنم پریشان سی ہو کر رہ گئی۔

'تو پھر اب ہم کیا کریں؟'

'کچھ نہیں۔۔۔ فی الحال ہمارے لیے کسی بہتر صورت حال کے انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔' مرزا نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ 'آج کے اس واقعے سے ہمارے دشمنوں کے علم میں یہ بات

بھی آ چکی ہوگی کہ ہم لوگوں کی دسترس میں ایک گاڑی بھی ہے۔ شاید وہ یہاں تک بھی اندازہ لگائیں کہ ہمیں کسی مقامی باشندے کا بھرپور تعاون حاصل ہے جس نے ہمیں پناہ دے رکھی ہے۔ ایسی صورت حال میں آپ کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔' میں نے ڈاکٹر صنم کے چہرے پر مرزا کے الفاظ کا ردعمل تلاش کرنا چاہا۔ مجھے اس کے چہرے پر خوف کے بجائے عزم کے تاثرات نظر آئے۔

'مجھے اپنی زندگی کی پرواہ نہیں ہے۔ موت کو تو ایک نہ ایک دن آنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ اپنے ملک و قوم کے لیے جان دے دی جائے۔ اس سے اچھی موت بھلا اور کون سی ہو سکتی ہے۔' میں نے حیرانی سے اس کی شکل دیکھی۔ اس لمحے وہ مجھے بالکل ہی اجنبی سی عورت نظر آئی۔

'آپ کے جذبات قابل تحسین ہیں ڈاکٹر صاحبہ۔ آپ واقعی ایک سچی اور محب وطن خاتون ہیں۔' صدیقی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ اس رات ہم خاصی دیر تک آپس میں صلاح مشورے کرتے رہے۔ بالآخر یہی طے پایا کہ فی الحال ایک دو دن اپنی سرگرمیاں موقوف رکھی جائیں ممکن ہے اس دوران میں مینو استاد فون پر رابطہ کرے۔ اگر اس نے کوئی اہم اطلاع دی تو اس اطلاع کی روشنی میں اپنا آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دیا جائے۔

رات کو دیر سے سونے کے باعث ہم لوگ صبح خاصی دیر سے بیدار ہوئے۔ ڈاکٹر صنم ناشتا تیار کرنے کے لیے کچن میں گھس گئی جبکہ میں تازہ اخبار اٹھانے کے لیے گیٹ کی طرف چلا گیا۔ میں گیٹ کے اندر پڑا اخبار اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ گیٹ کے عین سامنے کسی بھاری گاڑی کے بریک چرچرائے۔ میں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا ہاتھ بجلی کے ننگے تار کو چھو گیا ہے۔ سنسناتی آنکھوں سے میں نے دیکھا کہ گیٹ کے بالکل سامنے ایک لینڈ کروزر جیپ کھڑی ہے۔ قبل اس کے کہ میں کوئی ردعمل ظاہر کرتا' جیپ کے دروازے کھلے اور اس میں سے تین کلاشنکوف بردار اشخاص چھلانگ لگا کر اترے اور خونی نظروں سے مجھے گھورتے میری طرف بڑھنے لگے۔

☆O☆

خطرے کی تیز جھنجھناہٹ نے میرے رونگٹوں کو ایستادہ کر دیا۔ اگلے چند لمحوں میں کتنے ہی بھیانک اندیشوں نے بجلی کی چمک کے مانند میرے دماغ کی دنیا کو چکا چوند کر ڈالی۔ مجھے اپنے ہاتھ پیروں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ شاید میرا آخری وقت آن پہنچا۔ میرے شکاری بالآخر مجھے ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ وحشت زدہ صورتوں کے حامی یہ خون خوار قبائلی میرے خیر خواہ تو نہیں ہو سکتے۔ مجھے محض چند لمحوں کی مہلت ملی لیکن میں اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔

وہ تینوں سیدھے گیٹ پر آن پہنچے' دروازہ کھول اوئے' ان میں سے ایک نے بے حد اکھڑ اور تند لہجے میں مجھے حکم دیا۔ میرے وجود میں غصے کی ہلکی سی چنگاری اڑی۔ میں نے اس اشتعال کی چنگاری کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے مخاطب کا جائزہ لیا۔ وہ تقریباً چالیس برس کا گھنی داڑھی مونچھوں کا حامل دراز قامت شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں چائنہ ساختہ کلاشنکوف تھی لیکن وہ رائفل اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں تھام رکھی تھی۔ اس کے دونوں ساتھیوں کا حلیہ بھی مجھے اس سے ملتا جلتا نظر آیا۔

ان تینوں کے ہاتھ میں کلاشنکوف رائفلیں تو تھیں لیکن ان کی نالوں کا رخ میرے سینے کی جانب نہ تھا۔ گویا میری زندگی کو فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ یہ اگر میرے دشمن ہیں بھی تو فوری طور پر مجھے نہیں پہچان سکے ہیں' سنا نہیں تو نے؟ دروازہ کھول جلدی سے' دراز قامت شخص نے ایک بار پھر اشتعال انگیز لہجے میں مجھے للکارا۔

'آپ تمیز سے بات کریں جناب' میں فوری طور پر اپنی حکمت عملی طے کرتے ہوئے صاف ستھرے مہذب لہجے میں احتجاج کیا' آپ کو مجھ سے اس انداز میں بات کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ کون لوگ ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟' میرے لہجے اور میری گفتگو کے انداز نے اس پر فوری اثر کیا۔ اس نے عجیب سے انداز میں مجھ پر نظر ڈالی پھر اس نے اپنے لہجے میں کسی قدر نرمی پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

'تم۔۔۔ تم کون ہو اور ادھر کیا کر رہے ہو؟'

'اخلاقی طور پر یہ پہلے آپ کا فرض بنتا ہے کہ آپ اپنا تعارف کرائیں اور اپنی آمد کا مقصد واضح کریں' میں نے بدستور نرم لہجے میں کہا۔

'تم۔۔۔ تم ادھر ڈاکٹرنی کے بنگلے پر کیسے موجود ہو؟ تمہارا یہاں کیا کام ہے؟' اس کے لہجے میں ایک بار پھر تیزی پیدا ہونے لگی تھی۔

'میں ڈاکٹر صاحبہ کا مہمان ہوں۔ آپ فرمایے۔ آپ حضرات کس ارادے سے یہاں تشریف لائے ہیں؟' میں نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

اس نے قدرے تذبذب کے بعد کچھ کہنا چاہا۔ عین اسی وقت میری نظر گیٹ کے سامنے موجود لینڈ کروزر کے درمیانی دروازے پر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ جیپ سے ادھیڑ عمر کا میانہ قامت شخص اتر رہا ہے۔ قدرے بھاری جثے کا حامل ہونے کے باوجود وہ خاصا چاق و چوبند تھا۔ پلک جھپکتے میں وہ بنگلے کے بند گیٹ پر پہنچ گیا۔

'کیا بات ہے منظور؟ یہ چھوکرا کون ہے؟' اس کی رعب دار آواز سن کر تینوں کلاشنکوف بردار احترام کے ساتھ ادھر ادھر ہٹ گئے۔ وہ شخص سیدھا میرے روبرو آ کھڑا ہوا۔ مجھے اس کی باریک مونچھوں کے نیچے موجود لبوں پر ایک عجیب سا طنزیہ تبسم نظر آیا۔ اس کی کلائی پر بندھی سنہری راڈو گھڑی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ بالکل ایسی ہی چمک مجھے اس کی آنکھوں میں نظر آئی۔ ایک لمحے کے لیے مجھ پر رعب سا طاری ہوا لیکن میں نے اس احساس کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا۔

'پتا نہیں سردار صاحب۔ میں اس سے یہی پوچھ رہا تھا۔ یہ بتاتا ہی نہیں ہے' منظور نے مودبانہ لہجے میں بتایا۔

'ہوں تو یہ بات ہے!' سردار صاحب نے اپنی گونج دار آواز میں کہا۔

اچانک مجھے لگا کہ میں اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔ میں نے بغور اسے دیکھا۔ اس بار مجھے اس کا چہرہ پہلے سے بھی بڑھ کر مانوس لگا۔ منظور نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ اس کی بات سن کر سردار نے ایک بار پھر بغور میرے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس لمحے مجھے اس کی آنکھیں کالے ناگ کی

آنکھوں جیسی نظر آئیں۔ چمک دار' ساکت' اپنے سحر میں جکڑ لینے والی۔

'تو آپ ڈاکٹر صنم کے مہمان ہیں؟' اس بار اس نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے صاف ستھری اردو کا سہارا لیا۔ البتہ مجھے اس کے لہجے میں طنز کی واضح جھلک محسوس ہوئی۔

'کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کا ڈاکٹر صنم سے کیا رشتہ ہے؟' اس کا سوال سن کر میں ایک لمحے کے لیے کچھ گڑبڑا سا گیا۔

'آپ۔۔۔ آپ مجھ سے پوچھ گچھ کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ کیا کسی مہمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ میزبان کا رشتے دار ہو؟' میں نے جھنجلا کر کہا۔

'مجھ سے اڑنے کی کوشش نہ کرو چھوکرے' اس نے قدرے کرخت لہجے میں کہا' ایک جوان تنہا عورت کے پاس کوئی نوجوان لڑکا بغیر کسی تعلق اور رشتے کے کیسے مہمان بن سکتا ہے؟ تم اتنے بچے بھی نہیں ہو کہ میری بات کا مطلب نہ سمجھ سکو۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ مجھے اپنے متعلق صحیح صحیح بتادو۔'

'میں۔۔۔ لیکن جناب۔۔۔ پہلے آپ یہ تو بتائیے کہ آپ آخر ہیں کون؟'

'اچھا چھوڑو اس بات کو۔ تم ڈاکٹر صنم سے کہو کہ سردار رب نواز اس سے ملنے کے لیے آیا ہے۔'

اس کا نام سنتے ہی میرے ذہن کے پردے پر سے دھند سی چھٹ گئی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ سردار رب نواز! علاقے کا بہت بڑا جاگیردار اور سیاست دان۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ایک عجیب سی الجھن نے گھیر لیا۔ اس شخص کا ڈاکٹر صنم سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے؟ میں نے پر خیال انداز میں گھر کے اندرونی حصے کی جانب قدم بڑھادیے۔ ڈاکٹر صنم مجھے ناشتے کی تیاری میں مصروف نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری۔

'ڈاکٹر صاحبہ۔۔۔ سردار رب نواز آپ سے ملنے آیا ہے' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ میری زبان سے نکلنے والے الفاظ اس کی سماعت پر بجلی بن کر گرے۔ اس کے ہاتھ بری طرح کپکپائے۔ چینی کی پلیٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹی اور پختہ فرش پر گر کر چور چور ہوگئی۔ وہ سفید پڑتے چہرے کے ساتھ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میرا منہ دیکھنے لگی۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ ہلکے سے احساس جرم کی بھی چبھن محسوس ہوئی۔

'س س۔۔۔ سردار رب نواز؟' اس نے سرگوشی نما آواز میں کہا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ رفتہ رفتہ اس نے خود کو سنبھال لیا۔

'اچھا۔۔۔ اچھا سردار رب نواز آیا ہے۔ ٹھیک ہے میں اس سے بات کر لیتی ہوں۔ تم نے اسے اپنے متعلق کیا بتایا؟' اس نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

'کچھ بھی نہیں۔ بس یہ کہ میں آپ کے ہاں مہمان ہوں' میں نے سادگی سے کہا۔ میری بات سن کر اس کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات ابھرے۔

'ٹھیک ہے میں اس سے خود بات کر لیتی ہوں۔ میں جو کچھ کہوں آپ اس کی تائید کیجیے گا۔'

'لیکن یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ یہ سردار رب نواز ہے کون اور یہ اس عجیب انداز میں آپ کے

متعلق باز پرس کیوں کر رہا ہے؟' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

ڈاکٹر صنم کا چہرہ ایک بار پھر پھیکا پڑ گیا' وہ۔۔۔وہ۔۔۔میں تمہیں کیسے بتاؤں' اس نے عجیب سی بے بسی کے عالم میں کہا۔' وہ۔۔۔وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے صاف انکار کر دیا ہے۔ اس کے باوجود وہ مجھ پر اپنا استحقاق سمجھتا ہے۔ تمہیں دیکھ کر وہ شک و شبے میں پڑ گیا ہوگا۔ تم مرزا اور صدیقی صاحب کو تمام صورت حال سمجھا دو۔ میں اس بد بخت کو گیٹ پر سے ہی دفع کرنے کی کوشش کروں گی لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ اندر آنے پر اصرار کرے۔ یاد رکھو تم میرے سابقہ ساتھی ڈاکٹر وجاہت کے چھوٹے بھائی ہو جو نشتر اسپتال میں میرے ہمراہ ہاؤس جاب کر چکا ہے۔ تم لوگ فورٹ منرو سے واپسی پر چند دن کے لیے میرے مہمان بن گئے ہو۔ مرزا اور صدیقی تمہارے دوستوں کا کردار ادا کریں گے۔' ڈاکٹر صنم نے جلدی جلدی اپنی بات ختم کی۔

میرے ذہن میں بہ یک وقت کئی سوالات ابھرے لیکن میں نے محض اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ مضطرب انداز میں چلتی گھر کے صدر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے صدیقی اور مرزا کے کمرے میں پہنچ کر انہیں سردار رب نواز کے متعلق بتا دیا۔ میری بات سن کر وہ دونوں بری طرح پریشان ہو گئے۔

'یہ۔۔۔یہ کیا مصیبت آ گئی بھائی ذوالفقار علی!' مرزا نے دھیمی آواز میں کہا' یہ سردار رب نواز کون ہے؟'

'یہ بھی سردار شاہ نواز کی طرح ایک بہت بڑا جاگیردار اور سیاست دان ہے۔ یہ دوبارہ سردار شاہ مراد کے مقابلے میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑ چکا ہے لیکن دونوں بار ناکام رہا ہے۔' میں نے متفکر لہجے میں اسے بتایا۔

'لیکن وہ یہاں کیوں آیا ہے؟' صدیقی نے سوال کیا۔ میں نے انہیں مختصراً تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ میرے اندازے کے عین مطابق ڈاکٹر صنم سردار رب نواز کو ٹالنے میں ناکام رہی۔ میں نے ان کی آپس میں باتیں کرنے کی آواز سنی پھر وہ دونوں لاؤنج میں پہنچ گئے۔

'تم بہت شکی ہو رب نواز۔ ہر ایک پر شک کرنے لگتے ہو۔ یہ لوگ تو بڑی مشکل سے میرے بے حد اصرار پر چند دن کے لیے میرے مہمان بنے ہیں' ڈاکٹر صنم نے بے تکلفانہ لہجے میں اسے سمجھایا۔

'لیکن مجھے یہ سب بالکل پسند نہیں ہے۔ تم جلد از جلد۔۔۔'

'اب چھوڑو بھی تم تو اس بات کے پیچھے ہی پڑ گئے۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ یہ لوگ ایک دو دن میں جانے والے ہیں۔'

'لیکن میں ان کی تمہارے گھر میں موجودگی ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتا' میں نے سردار رب نواز کی غضب ناک آواز سنی' تم ان لوگوں کو ابھی اور اسی وقت۔۔۔'

'بس بس سردار رب نواز بہت ہو چکا۔ تم یہ چیخنا چلانا بند کرو۔ میں تمہاری زر خرید لونڈی ہوں نہ معمولی کھیت مزدور جس پر تم اس طرح حکم چلا رہے ہو' میں نے ڈاکٹر صنم کو بپھرے لہجے میں کہتے سنا'

وہ میرے مہمان ہیں جب تک میری مرضی ہوگی میرے گھر میں رہیں گے۔ تمہیں میرا چوکیدار بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' ڈاکٹر صنم کے جارحانہ لہجے کو سن کر ہم تینوں پریشان ہو گئے۔ خدا جانے اس نیم وحشی شخص پر ان الفاظ کا کیا اثر ہو؟ کہیں غصے میں آ کر یہ اسے کوئی جسمانی نقصان پہنچانے پر نہ تل جائے۔

میں تیزی سے کمرے کے دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اپنا پستول میں پہلے ہی قابو کر چکا تھا۔ میرے ایک اشارے پر وہ میرے ہاتھ میں موجود ہوتا۔ چند لمحوں تک لاؤنج میں گمبھیر خاموشی چھائی رہی پھر میں نے سردار رب نواز کی بے حد دھیمی آواز سنی۔

'اچھا جیسے تمہاری مرضی۔ تم غصہ نہ کرو' اس کے رویے میں ایسی انقلابی تبدیلی دیکھ کر میں بھونچکا کر رہ گیا۔ مجھے لگا کہ ڈاکٹر صنم کی ناراضگی نے اس کے غصے کو جھاگ کی طرح بٹھا دیا ہے۔' میں تمہیں ایک بہت بڑی خوش خبری سنانے آیا ہوں۔ تم سنو گی تو جھوم اٹھو گی' سردار رب نواز نے مسرور لہجے میں کہا۔

'ایسی کون سی خوش خبری لے آئے ہو تم؟' ڈاکٹر صنم نے سادگی سے کہا۔

'یہ بہت راز کی بات ہے۔ فی الحال کسی کو اس بات کا پتا نہیں ملنا چاہیے۔' سردار رب نواز کا لہجہ مزید دھیما ہو گیا۔ پھر اس نے ڈاکٹر صنم کے کان میں ایک طویل سرگوشی کی۔

'ہوں! تو یہ بات ہے؟' ڈاکٹر صنم نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا' تو تم اس لیے خوش ہو رہے تھے؟'

'کیا یہ خوشی کی بات نہیں صنم جان؟' سردار رب نواز نے ناز بھرے لہجے میں کہا۔

'یہ جان وان چھوڑو۔ انسانوں کی طرح بات کرو۔ یہ خوشی کی بات ہوگی تمہارے لیے۔ میرا اس سے کیا واسطہ؟' ڈاکٹر صنم نے سرد لہجے میں کہا۔ اس کی سرد مہری محسوس کر کے سردار رب نواز چند لمحوں کے لیے سٹ پٹا سا گیا پھر اُس نے خود کو سنبھالتے ہوئے ڈھیٹ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

'کیوں؟ تمہارا اس خوش خبری سے واسطہ کیوں نہیں۔ صنم ڈارلنگ! ہم دونوں کوئی غیر تو نہیں ہیں۔'

'میں تمہیں ایک بار پھر کہہ رہی ہوں کہ مجھ سے تمیز سے بات کرو۔ ایسا نہ ہو میں تمہاری تمام تر خوش فہمی ایک پل میں خاک میں ملا دوں۔ میرا خیال ہے تم مجھ سے جو بات کرنا چاہتے تھے وہ کر چکے ہو۔ لہٰذا اب یہاں سے روانہ ہونے کی کوشش کرو۔ مجھے اپنے مہمانوں کو ناشتا دینا ہے' ڈاکٹر صنم نے بیزاری سے کہا۔

'بہت خیال ہے تمہیں اپنے مہمانوں کا؟' سردار رب نواز کے لہجے سے ایک بار پھر حسد ٹپکنے لگا' ڈاہڈا سوہنا چھوکرا ہے تمہارا مہمان۔ کتنے دن مہمان رکھنے کا ارادہ ہے ان لوگوں کو؟'

'تم مجھ سے یہ سوال جواب کرنے والے کون ہوتے ہو؟ میرا جب تک جی چاہے میں انہیں رکھوں گی۔'

'مجھے غصہ نہ دلاؤ صنم جی۔ یاد رکھو میرا نام سردار رب نواز ہے۔ میں۔۔۔' اس نے غصیلے لہجے

میں کوئی خوف ناک دھمکی دینا چاہی لیکن ڈاکٹر صنم نے اس بات کے درمیان میں کاٹ دی۔

'بس بس مجھے دھمکی وکی دینے کی کوشش مت کرو۔ تم اگر سردار رب نواز ہو تو یاد رکھو' میرا نام بھی ڈاکٹر صنم خان ہے۔ میں اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتی ہوں۔ ایسا نہ ہو تمہیں بعد میں پچھتانا پڑے' ڈاکٹر صنم کے لہجے کی تپش میں ایک بار پھر اضافہ ہونے لگا۔

ایک بار پھر میرے رگ وپے میں اضطراب پیدا ہونے لگا۔ میری سمجھ میں نہ آیا' میں ان دونوں کے باہمی تعلق کو کیا نام دوں۔ وہ دونوں پل میں شعلے کی طرح بھڑکنے لگتے تو اگلے ہی لمحے شبنم بن جاتے۔ ڈاکٹر صنم کے لہجے میں جارحیت نے سردار رب نواز کو ایک مرتبہ پھر پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کا لہجہ ایک مرتبہ پھر معذرت خواہانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر صنم نے ایک بار پھر اسے چلے جانے کو کہا۔

'اچھا اچھا' بھئی میں جا رہا ہوں۔ میں ابھی چند دنوں تک شہر والی کوٹھی میں ہی ہوں۔ فرصت ملی تو آج شام یا کل صبح پھر چکر لگاؤں گا۔"

"فرصت کو تو چھوڑو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم آج ہی شام پھر یہاں آ دھمکو گے' مجھے تمہاری تمام مصروفیات کا اچھی طرح علم ہے۔" ڈاکٹر صنم نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ سردار رب نواز' اس کی یہ بات سن کر کھسیانا سا ہو گیا۔

"ارے نہیں بھئی۔ میں آج کل واقعی بہت مصروف ہوں۔ جب سے یہ نئی صورت حال پیدا ہوئی ہے۔ مجھے سر کھجانے کی فرصت نہیں ہے۔ یہ بڑی ذمے داری کا کام ہے۔"

"اسی لے تو تم یہاں کھڑے فضول بک بک کیے جا رہے ہو۔ واقعی تمہیں سر کھجانے کی فرصت نہیں ہے" ڈاکٹر صنم نے طنز سے بھرپور لہجے میں کہا۔

اس بار وہ اس بُری طرح جھینپا کہ ایک لفظ بھی منہ سے نکالے بغیر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مرزا اور صدیقی نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں اطمینان کی گہری سانس بھر کر ان دونوں کے پاس آ بیٹھا۔ سردار رب نواز کو گیٹ تک پہنچانے کے بعد ڈاکٹر صنم بھی اسی کمرے میں آ گئی۔ وہ چند لمحوں تک شاید ہم لوگوں کے بولنے کی منتظر رہی۔ جب ہم نے کسی قسم کا سوال نہ کیا تو وہ خود ہی وضاحت کرنے لگی۔

"یہ شخص کچھ سر پھرا سا ہے' کبھی کبھی بالکل پاگلوں کی سی حرکتیں کرتا ہے۔ میں اس کی چند دکھتی رگوں سے واقف ہوں۔ لہٰذا یہ میرے سامنے آپے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ روپے پیسے' مال جائداد کی کمی نہیں۔ لہٰذا سیاست کو فارغ اوقات کے مشغلے کے طور پر اپنایا ہوا ہے۔ دو بار سردار شاہ مراد سے شکست کھا چکا ہے لیکن ہمت ہارنے پر تیار نہیں ہے۔ پہلے سے شادی شدہ ہے لیکن مجھ سے شادی کے لیے بضد ہے۔ اسے امید ہے کہ یہ کبھی نہ کبھی میرا دل جیتنے میں کامیاب ہو جائے گا۔"

"آپ نے بتایا کہ یہ شخص اس علاقے کا خاصا طاقت ور جاگیردار ہے؟' مرزا نے خاصے پرجوش لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں سردار رب نواز واقعی بہت بڑا جاگیردار ہے" ڈاکٹر صنم نے سادگی سے کہا "آپ یہ کیوں

پوچھ رہے ہیں؟" میں نے مرزا کے انداز گفتگو میں واضح طور پر ہیجانی کیفیت محسوس کی۔

"اس کے۔۔اس کے سردار شاہ مراد سے کیسے تعلقات ہیں؟"

"میں نے آپ کو بتایا نا کہ سردار رب نواز دو مرتبہ سردار شاہ مراد کے مقابلے میں انتخاب لڑ چکا ہے۔ ظاہری بات ہے ایسی صورت میں ان کے باہمی تعلقات تو خوشگوار نہیں ہو سکتے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے حریفانہ جذبات رکھتے ہیں۔ البتہ ان دونوں میں کبھی براہ راست تصادم نہیں ہوا ہے کیونکہ سردار شاہ مراد' سردار رب نواز کی نسبت زیادہ طاقتور اور بارسوخ ہے۔ اس سے براہ راست ٹکراؤ کی صورت میں سردار رب نواز شدید نقصان اٹھا سکتا ہے۔"

"یہ شخص سردار رب نواز ہمارے بہت کام آ سکتا ہے۔" مرزا نے پرتفکر لہجے میں کہا۔ اس کی بات سن کر ہم تینوں بری طرح چونک اٹھے۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مرزا صاحب؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں میں صحیح کہہ رہا ہوں بھائی ذوالفقار علی۔ چند دن پہلے تم نے ہی مجھے ایک ضرب المثل سنائی تھی۔ جس کے مطابق دوست کا دشمن دشمن ہوتا ہے جبکہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے۔" صدیقی نے حیرانی کے ساتھ کچھ کہنا چاہا لیکن مرزا نے اس کی بات درمیان میں کاٹ دی۔

"ہاں تم صحیح سمجھے ہو۔ اگر ہم سردار رب نواز کو سردار شاہ مراد کے خلاف صف آرا کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہمیں بہت سے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ اگر سردار رب نواز ہماری پشت پناہی پر راضی ہو جائے تو ہم سردار شاہ مراد کو شدید زک پہنچانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔"

'لیکن سردار رب نواز کیوں ہماری مدد کرے گا؟ جبکہ ڈاکٹر صنم کا کہنا ہے کہ وہ سردار شاہ مراد سے دبتا ہے پھر وہ ہماری مدد کر کے اپنے طاقت ور ترین حریف سے براہ راست خونی تصادم کا خطرہ کیوں مول لے گا جبکہ ڈاکٹر صنم کے کہنے کے مطابق وہ خود بھی اچھا آدمی نہیں ہے۔"

"وہ اچھا آدمی ہو یا برا؟" ہمیں اس سے کیا لینا دینا ہے بھائی۔ ہمیں سردار شاہ مراد کے خلاف سردار رب نواز کے مخالفانہ جذبات کو اپنے حق میں استعمال کرنا ہے" مرزا نے بدستور پرجوش لہجے میں کہا۔

"بات گھوم پھر کر ایک بار پھر وہیں آ جاتی ہے۔ بھائی مرزا کہ کیا سردار رب نواز' سردار شاہ مراد کی براہ راست دشمنی مول لینے کی جرات کر سکتا ہے" صدیقی نے مضبوط لہجے میں سوال کیا۔ مرزا نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ چند لمحوں تک ماحول پر بے حد تکلیف دہ سناٹا طاری رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صنم کچھ مضطرب ہے۔ چند ہی لمحوں میں اس نے کئی بار پہلو بدلا۔ بالآخر وہ بول ہی پڑی۔

"میرے خیال میں صدیقی صاحب کا سوال بہت معقول ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب سے کچھ عرصے پہلے اگر سردار رب نواز کو سردار شاہ مراد کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑا ہونے کو کہا جاتا تو اس کے

پسینے چھوٹ جاتے لیکن بدلی ہوئی صورت حال میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ سردار شاہ مراد سے براہ راست ٹکر لینے پر تیار ہو جائے۔"

"کون سی بدلی ہوئی صورت حال ڈاکٹر صاحبہ؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"آپ لوگوں نے شاید سنا ہو' سردار رب نواز ایک بے حد اہم خوش خبری مجھے سنانے آیا تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ فی الحال یہ خبر راز میں رہنی چاہیے لیکن میرے خیال میں یہ اہم بات آپ لوگوں کے علم میں لانا بہت ضروری ہے۔ آج سردار رب نواز بے حد خوش تھا کیونکہ اسے آج ایک بے حد اہم سیاسی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ وہ آج تک ایک آزاد امیدار کی حیثیت سے انتخابات لڑتا اور ہارتا رہا لیکن اب وہ حکمران پارٹی میں شامل ہو گیا ہے اور آیندہ انتخابات میں اسے سردار شاہ مراد کے خلاف حکمران پارٹی کا ٹکٹ مل جائے گا۔ سردار رب نواز بے حد پر امید ہے کہ وہ حکمران پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے شاہ مراد کو شکست فاش دینے میں کامیاب ہو جائے گا۔"

"یہ تو آپ نے واقعی بہت اہم خبر سنائی ڈاکٹر صاحبہ۔" صدیقی نے پر جوش لہجے میں کہا "اس خبر کی روشنی میں تو خاصی امید ہے کہ سردار رب نواز اپنے مضبوط سیاسی حریف کے خلاف ہمارا ساتھ دینے میں تیار ہو جائے گا۔"

"میرے ذہن میں بھی کچھ اسی قسم کے خیالات ہیں" میں نے کہا۔

"سردار رب نواز نیا نیا حکمران پارٹی میں شامل ہوا ہے۔ اسے اپنی پارٹی کے مقتدر رہنماؤں کی نظر میں اپنی مستعدی' چابک دستی اور سیاسی داؤ پیچ کی مہارت ثابت کرنی ہے۔ اگر وہ سردار شاہ مراد کے خلاف کوئی ٹھوس کاروائی کرنے میں ہماری معاونت کرے' جس کے نتیجے میں سردار شاہ مراد مجرم ثابت ہو جائے تو اس کو سیاسی طور پر دھماکہ خیز کامیابی ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں وہ اپنے پارٹی لیڈران کی نظر میں ہیرو بن جائے گا۔"

"میں آپ لوگوں کو یہی سمجھانا چاہ رہا تھا؟" مرزا نے مسرور لہجے میں کہا "ہمیں سردار شاہ مراد کے خلاف کاروائی کرنے کے لیے کسی مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ سردار رب نواز وہ سہارا بن سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم اسے اپنا ساتھ دینے پر رضامند کر سکیں۔"

"میرے خیال میں ہم سب مل کر یہ کام کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہم اسے مکمل صورت حال سے آگاہ کر دیں گے۔ اس کے بعد وہ یقیناً ہمارا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائے گا" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو پھر دیر کس بات کی؟ ڈاکٹر صاحبہ' آپ سردار رب نواز سے فون پر رابطہ کریں اور اسے کہیں کہ وہ فوراً یہاں آ جائے" صدیقی نے کہا۔

"ہاں میں اس کی کوٹھی پر فون کرتی ہوں۔ ویسے بھی وہ شام کو تو یہاں ہر صورت میں آئے گا" ڈاکٹر صنم نے کہا۔

"اگر اس کی آج شام یہاں آمد یقینی ہے تو پھر اسے فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اس سے

شام کے وقت ہی بات کر لیں گے" مرزا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ہم نے اس کی تائید کی۔ ہم مزید کچھ دیر تک آپس میں اس صورت حال کے بارے میں گفتگو کرتے رہے پھر ڈاکٹر صنم دوپہر کا کھانا تیار کرنے کے لیے کچن میں چلی گئی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد مرزا اور صدیقی اپنے کمرے میں آرام کرنے لگے۔ میں نے ڈاکٹر صنم سے فرمائش کی کہ وہ بازار سے میرے لیے ایک شلوار قمیض کا جوڑا خرید لائے۔

"یاد رکھیے یہ جوڑا سستے قسم کے کپڑے کا ہونا چاہیئے جسے پہن کر میں عام لوگوں میں نمایاں نظر نہ آؤں۔ یہ لباس اگر دیہاتی انداز میں سلا ہوا ہو تو بہت ہی اچھا ہو گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم چاہتے کیا ہو؟" اس نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میں نے مسکراتے ہوئے کہا" میں جو چاہتا ہوں اس کا آپ کو جلد ہی پتا چل جائے گا۔ آپ براہ مہربانی میری یہ فرمائش پوری کر دیں۔"

"ارے یہ تو بہت معمولی فرمائش ہے جناب" ڈاکٹر صنم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت موجیں مار رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ ایک بار پھر میری شامت آنے والی ہے "تم کوئی بڑی فرمائش۔۔۔ تو کر کے دیکھو۔ دیکھو میں کیسے اسے پورا کر کے دکھاتی ہوں" اس نے لفظ فرمائش پر زور دیتے ہوئے کہا۔

ایک لمحے کے لیے میں جھینپ سا گیا لیکن پھر میں نے خود پر قابو پا لیا۔ "میرے خیال میں آپ اس بے چارے سردار رب نواز کی بھی ایک آدھ چھوٹی موٹی فرمائش پوری کر دیں تو زیادہ بہتر ہے۔ میرے خیال میں وہ مجھ سے زیادہ مستحق ہے" میرا جوابی حملہ خاصا کارگر رہا۔ اس مرتبہ جھینپنے کی باری اس کی تھی لیکن اس نے بھی اپنے آپ کو جلد ہی سنبھال لیا۔

"اوہو تو جناب احساس رقابت کا شکار ہیں۔ ویسے تم ہوشیار رہنا۔ سردار رب نواز واقعی تمہیں اپنا رقیب سمجھ رہا ہے۔"

"آج شام کو وہ آئے گا تو اس کی یہ غلط فہمی بھی دور کر دوں گا۔ اگر ایک انسان کی آنکھوں پر پردہ پڑ جائے تو وہ سمجھتا ہے کہ باقی لوگ بھی اسی کی مانند اندھے ہو چکے ہیں" میں نے کہا۔

"آہ ظالم! تمہیں کیا پتا یہ نشہ کیا ہے؟ ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں۔ تم کبھی جام سے ایک جرعہ تو حلق سے نیچے اتار کر دیکھو پھر میں تم سے پوچھوں گی کہ رندی بہتر ہے یا پارسائی" اس کی آواز ایک انجانے نشے سے بوجھل ہونے لگی۔

"بخشو بی بی چوہا لنڈورا ہی بھلا۔ ایسی سیرابی سے مجھے اپنی تشنہ لبی زیادہ عزیز ہے۔ آپ اپنے مے خانے کو سنبھال کر رکھیے۔ ہو سکتا ہے آپ کو کسی زیادہ باذوق مہمان کی خاطر مدارت کرنی پڑے" میں نے خود کو اس کی سلگتی آنکھوں کے حصار سے نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میری بات سن کر اس نے ایک مصنوعی سرد آہ بھری "تم نہیں سمجھو گے مولانا صاحب۔ جنت کے نخلستان تمہارے دماغ پر اس قدر حاوی ہیں کہ تمہیں سامنے موجود نعمتیں نظر نہیں آتیں" میں نے بڑی

مشکل سے اسے شہر کی طرف روانہ کیا۔ وہ شہر سے جو لباس خرید کر لائی وہ میری خواہش کے عین مطا ثابت ہوا۔ سفید سوتی جوڑے کے ہمراہ وہ پشاوری چپلوں کی ایک جوڑی اور ململ کا ایک لمبا چوڑا صافہ خرید لائی تھی۔ میں نے وہ لباس پہن کر دیکھا۔ وہ میری جسامت کے عین مطابق ثابت ہوا۔ میں نے جوڑا اتار کر ایک مرتبہ پھر اپنا سابقہ لباس زیب تن کر لیا۔

سہ پہر ہونے کے ساتھ ہی ہم لوگ سردار رب نواز کا انتظار کرنے لگے۔ ہم لوگ آپس میں باتیں دہراتے رہے جو ہمیں اس سے کرنا تھیں۔ مغرب کا وقت ہوا اور پھر رات کا اندھیرا ہو۔ لگا۔ ڈاکٹر صنم رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ ہم تینوں بے قراری سے پہلو بدلتے رہے۔ کھا۔ کے دوران بھی ہماری گفتگو کا مرکز سردار رب نواز رہا۔ کھانے کے بعد ایک بار پھر وہ تکلیف دہ انتظا شروع ہو گیا۔

''میرا خیال ہے اس کو آنا ہوتا تو وہ اب تک آ چکا ہوتا'' ڈاکٹر صنم نے بےزاری سے کہا ''میں اس کی کوٹھی پر فون کر کے اس کا ارادہ معلوم کرتی ہوں۔ اگر وہ اب نہیں آ رہا تو اس سے کہتی ہوں کہ وہ صبح کے وقت یہاں پہنچ جائے۔''

ہم نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ ڈاکٹر صنم نے فون پر نمبر ملایا ''جی۔ میں ڈاکٹر صنم بات کر رہی ہوں۔ رب نواز صاحب سے بات کروا دیں۔ کیا کہا؟۔ کب؟۔ لیکن اس طرح اچانک۔ کچھ پتا ہے کب تک واپسی ہو گی؟'' ہمارے کان اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ پر لگے رہے۔ ڈاکٹر صنم کے لہجے سے مایوسی اور پژمردگی جھلک رہی تھی ''اچھا ٹھیک ہے۔۔ ان کا فون آئے تو ان سے کہنا کہ وہ فوراً مجھ سے بات کریں۔ خدا حافظ'' ڈاکٹر صنم نے فون بند کر دیا۔ ہماری استفہامیہ نظروں کے جواب میں اس نے کہا ''اچھی خبر نہیں ہے۔ وہ کسی بے حد ضروری کام سے اچانک اسلام آباد چلا گیا ہے۔ شاید دو تین دن بعد واپس آئے۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ جیسے ہی اس کا فون آئے' اسے کہہ دیں کہ وہ فوراً مجھ سے رابطہ قائم کرے۔''

''لیکن وہ اسلام آباد سے کیسے فون کر سکتا ہے؟ آپ کو شاید یاد نہیں کہ یہاں کا رابطہ دیگر شہروں سے منقطع ہے'' مرزا نے افسردہ لہجے میں کہا۔

'اوہ۔ واقعی یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہا'' ڈاکٹر صنم یک لخت بجھ سی گئی ''کاش میں دن میں سردار رب نواز سے فون پر رابطہ کر لیتی۔''

''تقدیر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے' ڈاکٹر صاحبہ! کون جانے اللہ نے اسی میں کوئی بہتری پوشیدہ رکھی ہو؟'' مرزا نے اسے تسلی دی۔

''اب کیا کیا جائے؟'' صدیقی نے خود کلامی کے سے انداز میں سوال کیا۔

''فوری طور پر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں ایک ہی صورت ہے کہ اس کی اسلام آباد سے واپسی کا انتظار کر لیا جائے'' مرزا نے متفکر لہجے میں کہا۔ ہم تینوں نے اس کی تائید میں سر ہلا دیا۔

اس رات میں بے حد بے آرامی کی نیند سویا۔ بار بار مجھے اوٹ پٹانگ خواب ستاتے رہے۔ آخری

خواب سب سے بھیانک ثابت ہوا۔ یہ خواب میرے لیے اجنبی نہ تھا۔ چمک دار تیز دھار خنجر' کسی عورت کی خوفناک چیخیں پھر ایک مکروہ قہقہہ اور آئینے پر گاڑھے سرخ خون کی بارش۔ میں چونک کر بیدار ہو گیا۔ میں نے اپنا لباس پسینے میں تر بتر پایا۔ میرے تنفس کی رفتار بڑھی ہوئی تھی۔ اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے میں نے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس وقت رات کا آخری پہر ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اب میں دوبارہ نہیں سو سکوں گا۔

یکا یک مجھ پر شدید ترین اکتاہٹ اور بےزاری کا غلبہ ہونے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں شیشے کے ناقابل تسخیر چیمبر میں قید ہوں۔ اس چیمبر میں آکسیجن ختم ہو چلی ہے اور میرا سانس بری طرح گھٹ رہا ہے۔ میں بے چینی کے عالم میں صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ میری اکتاہٹ کی وجہ میرے گردوپیش کے ماحول کا جمود اور یکسانی ہے۔ اگر میں نے جلد از جلد اس خوب صورت پنجرے سے نجات نہ پائی تو میرا دم واقعی گھٹ جائے گا۔ میرے اعصاب تہس نہس ہو جائیں گے۔ میں بے قراری کے عالم میں کچھ دیر لاؤنج میں ٹہلتا رہا۔

بالآخر میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ میں ابھی اور اسی وقت یہاں سے نکل جاؤں گا۔ سردار رب نواز کی اسلام آباد سے واپسی میں ابھی کئی دن باقی ہیں۔ اس وقت تک میں واپس لوٹ آؤں گا۔ میرا فقیر بابا میرا منتظر ہے۔ یہ دو تین دن میں اپنے فقیر بابا کی معیت میں' اس کی پرشفقت چھاؤں میں گزاروں گا۔ اس فیصلے پر پہنچتے ہی میں فوری طور پر حرکت میں آ گیا۔ ڈاکٹر صنم کا لایا ہوا شلوار قمیض کا جوڑا میرے پاس ہی تھا۔ میں نے اپنی قمیض پتلون اتار کر وہ لباس پہن لیا۔ میں نے پتلون کی چمڑے کی بیلٹ اپنی شلوار کے نیفے پر باندھ لی اور اپنا کولٹ پستول اسی بیلٹ میں اچھی طرح اڑس لیا۔ پیروں میں پشاوری چپل پہنے اور سفید صافہ سر پر لپیٹنے کے بعد میں روانہ ہونے کے لیے تیار ہو گیا۔

ایک مرتبہ تو میرے دل میں آئی کہ میں بغیر کوئی اطلاع دیے چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں پھر مجھے خیال آیا کہ یہ لوگ میری اس حرکت کا برا منائیں گے لیکن اگر میں انہیں اپنے ارادوں سے آگاہ کرتا تو مجھ پر طرح طرح کے سوالوں کی بوچھار کر دیتے۔ عین ممکن تھا' وہ مجھے گھر سے نکلنے کی اجازت ہی نہ دیتے۔ تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد میں نے اس مسئلے کا بھی ایک حل تلاش کر لیا۔ میں نے سوچا کہ میں ایک خط کے ذریعے ان لوگوں کو آگاہ کر دوں گا۔ میں نے پیغام لکھنے کے لیے کاغذ قلم بھی ڈھونڈ نکالا۔ میں قلم کو کاغذ پر چلانے ہی والا تھا کہ لاؤنج میں نصب اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔ اس اچانک مداخلت پر میں بری طرح چونک اٹھا۔ قدرے توقف کے بعد ایک مرتبہ پھر اطلاعی گھنٹی بجی اس مرتبہ وہ خاصی دیر تک بجتی چلی گئی۔ جیسے کوئی گھنٹی کے پش بٹن پر انگلی رکھ کر بھول گیا ہو۔ میں پریشان ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ عین اسی وقت ڈاکٹر صنم کی خواب گاہ کے دروازے میں جنبش ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ شب خوابی کے لبادے میں لپٹی' خواب پریشاں کی صورت' ڈاکٹر صنم نیند سے بوجھل آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔

''یہ اس وقت کون آ گیا؟'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ اطلاعی گھنٹی ایک مرتبہ پھر بجنے لگی۔ ڈاکٹر صنم تیز قدموں سے داخلی دروازے کی جانب بڑھی۔ میں بھی اس کے پیچھے چل دیا۔ رات کے

آخری پہر کی پھیکی پڑتی ہوئی تاریکی اور گیٹ پر نصب قمقموں کی آویزش سے خود کو ہم آہنگ کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ سیاہ رنگ کا ایک ہیولا گیٹ کے ستون سے چپکا کھڑا ہے۔

''آپ کون ہیں؟'' میں نے ڈاکٹر صنم کی دھیمی آواز سنی۔ ہیولے میں جنبش ہوئی ''ارے۔۔تم؟'' میں نے ڈاکٹر صنم کی حیرانی سے بھرپور آواز سنی۔ میں سمجھ گیا کہ گیٹ پر موجود شخصیت اس کے لیے اجنبی نہیں ہے۔ ڈاکٹر صنم نے اپنے لبادے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چابی نکالی اور گیٹ میں لگا قفل کھول دیا۔ وہ گیٹ کی کھڑکی سے باہر نکلی۔ یک لخت وہ سیاہ ہیولا کچی دیوار کے مانند ڈاکٹر صنم پر گرنے لگا'' ارے ارے'' ڈاکٹر صنم نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا اور اسے سنبھالنے کی کوشش کی لیکن وہ ہیولا اس کے بازوؤں میں جھول گیا۔ یہ ماجرا دیکھ کر میں بدحواسی کے عالم میں تیز تیز چلتا گیٹ کے پاس پہنچا۔

میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صنم نے سیاہ برقعے میں لپٹی ہوئی ایک عورت کو اپنے بازوؤں میں سنبھال رکھا ہے۔ وہ سرخ و سفید رنگت کی حامل ایک صحت مند نوجوان عورت تھی۔ اس لمحے اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ زرد پڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صنم نے بے بسی کے عالم میں میری طرف دیکھا۔

''اسے میرے ہمراہ سہارا دے کر اندر لے چلیں'' میں نے اس عورت کو سہارا دے کر اس کے پیروں پر کھڑا کرنا چاہا لیکن وہ بالکل بے سدھ ہوئی جا رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر صنم کو کہا کہ وہ اسے چھوڑ دے پھر میں نے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ اچھی خاصی دراز قامت اور تنومند ہونے کے باوجود وہ زیادہ وزنی ثابت نہ ہوئی۔ میں اسے اُٹھا کر گھر کے دروازے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں مجھے احساس ہوا کہ اس عورت کی سانسیں غیر ہموار اور اکھڑی اکھڑی سی ہیں۔ ڈاکٹر صنم نے اپنے معائنے کے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ میں نے اس عورت کو معائنہ ٹیبل پر لٹا دیا۔

''یہ کون ہے ڈاکٹر صاحبہ!'' میں نے اس عورت کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''یہ۔۔۔یہ میری مریض ہے'' اس نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد جواب دیا'' اس روز یہی میرے پاس آئی تھی۔ یہ راجن پور کی رہنے والی ہے۔ خدا جانے اس وقت یہ کہاں سے آن ٹپکی ہے'' اس کا جواب سن کر سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا۔ یہ وہی عورت تھی جو اپنے گناہ کا بوجھ ہلکا کروانے کے لیے ڈاکٹر صنم کے پاس آئی تھی۔ ڈاکٹر صنم نے اسے خاصی لعنت ملامت کرنے کے بعد اسے دوا دے کر رخصت کر دیا تھا۔ مجھے فوری طور پر خیال آیا کہ شاید ڈاکٹر صنم کی دی ہوئی دوا نے اس کی یہ حالت بنا دی ہے۔

''یہ۔۔یہ کسی ناجائز بچے کی ماں بننے والی تھی۔ میں نے اسے اس عذاب سے نجات دلانے کے لیے دوا دی تھی۔ وہ دوا کسی طرح بھی خطرناک نہیں تھی۔ خدا جانے اس کا یہ حال کیسے ہو گیا؟'' ڈاکٹر صنم نے احساس جرم کے بوجھ سے دبی ہوئی آواز میں اپنی صفائی پیش کی۔ عین اسی لمحے اس عورت کا بدن دھیرے دھیرے لرزنے لگا۔ ڈاکٹر صنم نے میز پر رکھا ہوا اسٹیتھو اسکوپ اٹھایا اور اسے جلدی سے اپنے کانوں میں لگا لیا۔ اسے معائنے کے لیے تیار ہوتے دیکھ کر میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

مرزا اور صدیقی کے کمرے کا دروازہ مجھے بدستور بند نظر آیا۔ میں اپنے مخصوص صوفے پر آ بیٹھا۔ اس عورت کے متعلق سوچتے ہوئے مجھے شدید تشویش ہونے لگی۔ وہ مجھے پوری طرح ہوش و حواس سے بے گانا محسوس ہوئی تھی۔ یہ جاننے کے باوجود کہ وہ اچھی سیرت کی حامل عورت نہیں ہے۔ مجھے خواہ مخواہ اس سے شدید ہمدردی کا احساس ہوا۔ خدا جانے ڈاکٹر صنم کی دی ہوئی دوا نے اس پر کیا قیامت ڈھائی ہوگی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میری بے تابی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ جانے کس حال میں ہے؟ کچھ دیر بعد مجھے ڈاکٹر صنم اس کمرے کے دروازے پر نظر آئی۔ وہ بدحواسی کے عالم میں چلتی میرے پاس آئی۔

''اسے۔۔اسے زز۔۔زہر دیا گیا ہے'' اس نے حواس باختہ لہجے میں کہا۔ اس لمحے وہ مجھے پوری طرح فاتر العقل نظر آئی۔ خدا جانے کیا اول فول بک رہی تھی۔

''آپ۔۔آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟'' میں نے اس کے بیان کی تصدیق چاہی۔

''ہاں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اس کی یہ حالت میری دوا کے باعث نہیں ہوئی۔ اسے زہر دیا گیا ہے۔ اس کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ اس کی زندگی شدید خطرے میں ہے۔ میں نے اسے انجکشن لگا دیا ہے لیکن اس کی حالت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ابتر ہو رہی ہے۔ زہر نے اس کے جسم کے اندرونی نظام میں تباہی مچا رکھی ہے'' اتنا کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے معائنے کے کمرے کے جانب چل پڑی۔ قدرے توقف کے بعد میں بھی اس کے پیچھے چل دیا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صنم اپنی مریضہ کو بری طرح جھنجوڑ رہی ہے۔ ''ہوش میں آؤ لڑکی۔ ہوش میں آؤ'' میں نے دیکھا کہ اس لڑکی کے چہرے کی زردی میں اب نیلاہٹ بھی گھلنے لگی ہے۔ اس کی سانسیں مزید ناہموار ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر صنم کی چیخ و پکار کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور بے سدھ پڑی رہی۔ اس کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر صنم مزید پریشان ہو گئی۔ اس نے اسے ایک اور انجکشن لگا دیا پھر وہ بڑی بے تاب نظروں سے اپنے انجکشن کا ردعمل اپنی مریضہ کے چہرے پر تلاش کرنے لگی۔ میری نظریں بھی اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ مریضہ کی سانسیں پہلے کی نسبت زیادہ ہموار ہو گئی ہیں۔ یہ تبدیلی ڈاکٹر صنم نے بھی نوٹ کی۔ اس نے اس کی نبض کی رفتار دیکھی۔ یک لخت اس کے چہرے پر اطمینان کے آثار نمایاں ہوئے ''شاید۔۔شاید یہ زندگی کی جانب لوٹ رہی ہے۔ اس کے جسمانی نظام نے زہر کے خلاف جدوجہد شروع کر دی ہے۔'' اس نے دبے جوش کے ساتھ کہا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا کر اس کے اندازے کی تائید کی۔

سخت اضطراب اور بے قراری سے بھرپور ایک گھنٹا گزارنے کے بعد ڈاکٹر صنم نے اسے ایک اور انجکشن لگا دیا۔ کچھ دیر بعد اس کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ وہ کرب ناک آواز میں کراہی۔ ڈاکٹر صنم کی آنکھوں کی چمک میں یک دم اضافہ ہو گیا۔ اس کے دلکش لبوں پر ایک جان دار مسکراہٹ نمودار ہوئی'' میرا خیال ہے' یہ اب خاصی حد تک خطرے سے باہر ہے۔''

اس کی بات سن کر مجھے اپنے دل پر سے ایک بوجھ سا ہٹتا محسوس ہوا۔ ڈاکٹر صنم نے اپنی مریضہ کا منہ کھولا اور ڈراپر کی مدد سے ایک زردی دوا کے کئی قطرے حلق میں ٹپکا دیے۔ اسی وقت کسی دور افتادہ مسجد سے اذان سحر کی روح پرور صدا بلند ہوئی۔ کچھ دیر بعد میں نے ساتھ والے کمرے سے مرزا اور صدیقی کے آپس میں باتیں کرنے کی آواز سنی۔ میں وہاں پہنچا تو انہیں کسی معاملے پر بحث کرتے پایا ان دونوں نے خوش دلی سے میرا خیر مقدم کیا۔ میں نے انہیں اس عورت کے بارے میں بتایا وہ پہلے تو کچھ پریشان ہوئے لیکن جب میں نے انہیں یقین دلایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے تو وہ پرسکون ہو گئے۔

ہم تینوں ساتھ والے کمرے میں پہنچے تو ہم نے ڈاکٹر صنم کے چہرے کو بے حد ہشاش بشاش پایا۔ وہ سمجھ گئی کہ میں نے ان دونوں کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس نے مسرت بھرے لہجے میں کہا ''اب یہ خطرے سے باہر ہے۔ اس نے ابھی ابھی لگاتار دو الٹیاں کی ہیں۔ جن سے اس کے معدے میں موجود زہر کی زیادہ تر مقدار خارج ہو چکی ہے۔ اگر اسے ایک اور الٹی ہو جائے تو بہت ہی اچھا ہو لیکن ایسا نہ ہو تو بھی اس کی زندگی کو اب کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ اس کا جسم زہر کے خلاف بھرپور مزاحمت کر رہا ہے۔ انشاء اللہ دو ایک دن کے اندر یہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گی۔''

ہم تینوں نے اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا اور ڈاکٹر صنم کو مبارک باد دی۔ ڈاکٹر صنم نے شاید اپنی مریضہ کو مسکن ادویات دی ہوئی تھیں۔ وہ مسلسل نیند کی حالت میں تھی۔ دن چڑھ آنے کے بعد ڈاکٹر صنم نے ایک پرچی پر چند ادویات کے نام لکھ کر وہ پرچی میرے حوالے کر دی ''فی الحال میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ اس کی حالت میں کسی بھی وقت بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے لہٰذا یہ میڈیسن تمہیں لانی ہوں گی۔ تم جا کر اسی میڈیکل اسٹور سے یہ ادویات خرید لاؤ جہاں سے میں نے ادویات خریدی تھیں۔''

مجھے فوری طور پر وہ نوک جھونک یاد آ گئی جو میڈیکل اسٹور کے مالک خوش کن نوجوان کے حوالے سے ہم دونوں میں ہوئی تھی۔ میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ ڈاکٹر صنم جانے کیوں تھوڑی سی جھینپ گئی۔

''چلو اچھا ہے اس طرح مجھے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس نوجوان کے طرز گفتگو میں ایسا کیا جادو ہے جس نے آپ کو گرویدہ بنا رکھا ہے'' میں نے شگفتہ انداز میں کہا۔

''بس بس یہ جملے بازیاں بعد میں کر لینا۔ میں ذرا اس مریضہ کی جانب سے مطمئن ہو جاؤں پھر دیکھوں گی کہ تم کتنے پانی میں ہو۔''

''پانی بہت گہرا ہے محترمہ۔ ایک بار پاؤں پھسلا تو پھر دوبارہ کنارہ نہیں ملے گا۔ پہلے تیراکی میں ماہر ہو جائیں پھر گہرے پانی کا رخ کیجیے گا'' میں نے بدستور شوخ لہجے میں کہا۔ اس نے مصنوعی غصے سے مجھے گھورا۔ میں نے جب دوبدو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے دیکھا تو وہ کھسیانی سی ہو گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ شہر سے خریداری سے واپسی پر اس نے مجھے کس قدر زچ کیا تھا۔ اس موقع پر میں اپنا حساب بے باق کر لینا چاہتا تھا بلکہ وہ دفاعی پوزیشن میں تھی۔

''میں ساری رات جاگتا رہا آپ آئی ہی نہیں'' میں نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

''کک۔۔کیا مطلب؟'' ڈاکٹر صنم نے حواس باختہ ہو کر کہا۔

''مطلب یہ ہے کہ مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔ آپ نے شربت گلاب کا ڈوز نہیں دیا تھا نہ آج؟'' ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر واقعی گلابی رنگت جھلک اٹھی لیکن اس نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ اس نے طیش بھرے انداز میں سنگ مرمر کا ایک پیپر ویٹ اٹھا لیا۔

''اب جاتے ہو یا تمہارا سر پھوڑوں۔''

''پھاڑ دیجیے۔ پھر پٹی بھی تو آپ ہو کو کرنی پڑے گی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرے قلب کو تقویت پہنچانے کے لیے ایک جام شربت گلاب ضرور پلائیں گی۔ سر حاضر ہے سنگ باری کیجیے۔ سچی بڑا دل چاہ رہا ہے اس وقت سنگ سار ہونے کا لیکن شرط یہ ہے کہ پہلے وہ حد عبور کر جاؤں جس کے بعد میں اس سزا کا حق دار ہو جاؤں گا۔''

''لگتا ہے تم ایسے نہیں مانو گے'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا اس کے ساتھ ہی اس نے وہ پیپر ویٹ میری طرف اچھال دیا۔ وہ پیپر ویٹ میں نے راستے میں ہی اچک لیا۔

''عجیب ڈاکٹرنی ہیں آپ بھی۔ پہلے تو مریض کو ایک دوا کی لت لگا دی۔ اب وہ اس دوا کی طلب کرتا ہے تو آپ پتھروں سے اس کی تواضع کرتی ہیں۔ جایئے ہمیں آپ سے علاج نہیں کرانا۔''

''تمہیں۔ تمہیں دماغی علاج کی ضرورت ہے۔ تم کسی برین اسپیشلسٹ کے پاس جاؤ۔ بلکہ تمہارا مرض لاعلاج ہو چکا ہے۔ اب تمہاری آخری منزل صرف اور صرف پاگل خانہ ہے'' مجھے لگا کہ وہ سچ مچ طیش میں آ جائے گی۔ میں نے اس وقت اتنی ہی ڈوز کافی سمجھی اور مسکراتے ہوئے گھر سے باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر چلنے کے بعد مجھے ایک خالی رکشا مل گیا۔ میں نے اسے اپنی منزل کا پتا بتایا۔ اگلے ہی لمحے وہ خالی سڑک پر فراٹے بھرنے لگا۔ کمیٹی کی گول مارکیٹ کے قریب اپنے مطلوبہ میڈیکل اسٹور کے سامنے رکشا ٹھہرا کر میں رکشے سے اتر گیا۔ مجھے اس وقت بھی وہی باریش نوجوان کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا نظر آیا۔ اس نے نہایت خوش اخلاقی سے میرا خیر مقدم کیا۔ میں نے ڈاکٹر صنم کی دی ہوئی پرچی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ ایک سرسری سی نظر پرچی پر ڈالتے ہی وہ بری طرح چونک اٹھا۔

''آپ کو۔۔آپ کو ڈاکٹر صنم نے بھیجا ہے؟''

''جی ہاں۔۔آپ صحیح سمجھے۔''

''وہ۔۔وہ۔۔میرا مطلب ہے وہ ٹھیک تو ہیں نا؟۔۔میرا مطلب ہے آپ۔''

''میں ان کے ہاں مہمان آیا ہوا ہوں' وہ ایک مریضہ کے معائنے میں مصروف تھیں۔ انہوں نے مجھے دوا لانے بھیج دیا'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''اوہو! آپ ڈاکٹر صنم صاحبہ کے مہمان ہیں؟ پھر تو آپ میرے بھی مہمان ہیں'' اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔ اس نے میرا ہاتھ ایک مرتبہ پھر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا ''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ آپ یہاں میرے ساتھ آ کر بیٹھیں'' اس نے اپنے پاس پڑی ہوئی ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے بہت کہا کہ میں یہاں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں لیکن اس کے پرزور اصرار کے سامنے میری ایک نہ چل سکی۔ مجھے کاؤنٹر کے عقب میں جا کر اس کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔

''دراصل میں ڈاکٹر صاحبہ کی طرف سے اکثر پریشان رہتا ہوں۔ وہ شہر کے دور افتادہ اور الگ تھلگ گوشے میں بالکل تنہا رہتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ۔''

''آپ ان کی طرف سے بالکل بے فکر رہیں جواد صاحب۔ وہ ایک بے حد باہمت اور بلند حوصلہ خاتون ہیں۔ کوئی ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا کیونکہ وہ اپنا دفاع کرنا بخوبی جانتی ہیں'' میں نے بے حد پراعتماد لہجے میں کہا۔

''یہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن پھر بھی۔ اچھا یہ بتائیں آپ کا اسم گرامی کیا ہے اور آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟''

میں نے اسے اپنے فرضی نام اور دیگر کوائف سے آگاہ کیا۔ کچھ دیر تک ہم آپس میں باتیں کرتے رہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ڈاکٹر صنم کا کہنا بالکل صحیح ہے۔ یہ خوش شکل اور خوش گفتار نوجوان واقعی دشمنوں کو بھی اپنی شیریں کلامی کی وجہ سے دوست بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ میرے انکار کے باوجود اس نے مجھے بے حد عمدہ چائے پلائی۔ اس دوران میں اس کے لبوں سے مسلسل پھول جھڑتے رہے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس نوجوان کا مشاہدہ اور مطالعہ بے حد وسیع ہے۔

یک لخت میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا ''یہ تو بتائیں جواد بھائی ڈاکٹر صنم صاحبہ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟'' میرا سوال سن کر جواد کے چہرے پر حزن و ملال کی ہلکی سی جھلک نمایاں ہوئی پھر اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''یہ ان کی زندگی کی بہت بڑی ٹریجڈی ہے ذوالفقار بھائی۔ اس ٹریجڈی کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہے اس کا اہم کردار میرا بڑا بھائی فراز بھی ہے۔''

''آپ برا محسوس نہ کریں تو مجھے اس سانحے کی تفصیل سے آگاہ کر دیں۔ دراصل مجھے ڈاکٹر صنم کی شخصیت نے بہت متاثر کیا ہے۔''

''ہاں ہاں۔ مجھے اس سانحے کی تفصیل بتانے میں کوئی اعتراض نہیں کیونکہ اس سانحے کی ذمے دار صرف اور صرف قسمت ہے۔ آپ کو شاید علم نہ ہو کہ ڈاکٹر صنم صاحبہ اور میرے بھائی فراز نشتر میڈیکل کالج میں ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان دونوں میں محبت کے آفاقی جذبے کی بنیاد پڑ گئی۔ ان دونوں نے عہد کیا کہ زندگی کا سفر ایک ساتھ طے کریں گے۔ ڈاکٹر صنم صاحبہ کا تعلق ایک متوسط اور مختصر گھرانے سے تھا۔ ان کے گھر میں ان کے والدین کے علاوہ کوئی اور فرد نہیں تھا۔ ہمارے گھر کے لوگوں کو فراز بھائی اور صنم صاحبہ کے معاملے کا بخوبی علم تھا اور ہمیں اُن کی باہمی شادی پر کوئی اعتراض بھی نہ تھا۔ ڈاکٹر صنم صاحبہ کے والدین ذات برادری وغیرہ قسم کے کچھ تحفظات رکھتے تھے لیکن ڈاکٹر صنم صاحبہ کی محبت سے مجبور ہو کر انہیں بھی اس رشتے کے لیے راضی ہونا پڑا۔ فراز بھائی اور صنم صاحبہ جب میڈیکل کالج کے فائنل ائیر میں پہنچے تو بڑی دھوم دھام سے ان کی منگنی کر دی گئی۔ شادی کے لیے

دو سال بعد کا وقت رکھا گیا۔ ان دونوں نے بحسن و خوبی ڈاکٹری کا امتحان پاس کر لیا۔

جب انہیں ہاؤس جاب کرتے ہوئے ایک سال ہو گیا تو دونوں گھرانوں کے بزرگوں نے فیصلہ کیا کہ اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ ان دونوں کی شادی کر دی جائے لیکن ان دونوں نے اصرار کیا کہ وہ ہاؤس جاب مکمل ہونے سے پہلے شادی نہیں کریں گے۔ خیر خاصی بحث تمحیص کے بعد ہمیں ان کی بات ماننا پڑی۔ ہاؤس جاب کے آخری چند مہینوں میں دونوں گھرانوں نے شادی کی تیاری شروع کر دی۔ اس مرتبہ ان دونوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری رہیں۔ ان دونوں کی ہاؤس جاب مکمل ہوتے ہی ان کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ وہ دونوں بے حد خوش تھے۔ ہم لوگوں میں روایتی پردے وغیرہ کا تو کوئی چکر تھا ہی نہیں۔ وہ دونوں حسب معمول باقاعدگی سے ملاقاتیں کرتے رہے۔ ان دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی شادی کا لباس اپنی پسند سے خرید کر لائیں گے۔

شادی سے ایک ہفتہ پہلے وہ دونوں لاہور روانہ ہو گئے تاکہ اپنی شادی کے لباس خرید سکیں۔ لاہور پہنچنے کے بعد وہ لوگ سیدھے انارکلی پہنچ گئے۔ فراز بھائی نے اپنے لیے سوٹ خرید لیا تھا۔ صنم صاحبہ اپنے لیے لباس تلاش کر رہی تھیں کہ اچانک ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ان کے پیٹ میں شدید درد تھا۔ فراز بھائی انہیں فوراً میو اسپتال لے گئے۔ صنم صاحبہ دو دن اسپتال رہیں۔ ان کے پیٹ کا درد صحیح ہو گیا لیکن وہیں پر ایک ایسا بھیانک انکشاف ہوا جس نے اس خوش و خرم جوڑے کی امیدوں کے چمن کو آگ لگا دی۔ مختلف ڈاکٹری معائنوں کے نتیجے میں ثابت ہو گیا کہ صنم صاحبہ ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ یہ منحوس خبر ان دونوں پر بجلی بن کر گری۔ چند ایک مزید ٹیسٹوں نے تصدیق کر دی کہ صنم صاحبہ زندگی بھر ماں نہیں بن سکیں گی۔ ڈاکٹر صنم کو اسپتال سے رخصت کر دیا گیا لیکن ان چند دنوں میں سب کچھ بدل گیا۔ فراز بھائی نے صنم صاحبہ سے التجا کی کہ اس منحوس خبر سے تمام لوگوں کو بے خبر رکھا جائے اور پروگرام کے مطابق شادی ہونے دی جائے لیکن صنم صاحبہ نے ان کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ اس منحوس انکشاف کے بعد وہ کسی قیمت پر فراز سے شادی نہیں کر سکتیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ فراز کو مسرتوں اور خوشیوں سے بھرپور زندگی کی فراہمی کے لیے ان سے شادی کر رہی تھیں نہ کہ ان کی زندگی کو بے آب و گیاہ صحرا بنانے کے لیے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ میں اپنے شوہر کو کبھی اولاد نہیں دے سکتی' شادی کرنا بدترین خود غرضی ہے۔ محبت راحتیں نچھاور کرتی ہے' محرومیاں نہیں۔ فراز ایک صحت مند اور زندگی سے بھرپور نوجوان ہے۔ صرف محبت کی زنجیروں میں قید کر کے اس کی زندگی تباہ کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

فراز بھائی نے انہیں ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ صنم صاحبہ نے انہیں اپنی زندگی کی قسم دے دی ہے۔ ہر طرح کی کوشش ناکام ہو جانے کے بعد فراز بھائی بالکل مایوس ہو گئے انہوں نے کوشش کی کہ صنم صاحبہ واپس گھر چلیں لیکن صنم صاحبہ نے فی الحال اپنے گھر جانے سے بھی انکار کر دیا۔ انہیں خدشہ تھا کہ ان کے والدین اور دیگر لوگ شادی کے لیے دباؤ ڈالیں گے۔ وہ لاہور میں اپنی ایک سہیلی کے گھر پر ٹھہر گئیں جبکہ فراز بھائی بے نیل مرام گھر واپس لوٹ آئے۔

ان کی زبان سے تمام واقعات سن کر تمام لوگ سناٹے میں رہ گئے۔ شادی کی تیاریوں میں مگن دونوں گھروں میں کہرام مچ گیا۔ خاص طور پر ڈاکٹر صنم کے والدین کی حالت تو بہت ہی خراب تھی۔ اس دوہرے صدمے نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ انہوں نے لاہور جا کر صنم صاحبہ کا فیصلہ تبدیل کرانے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ صنم صاحبہ چھے ماہ تک لاہور میں مقیم رہیں۔ اس دوران میں فراز بھائی کی حالت پاگلوں کی سی رہی۔ ہم لوگوں نے بڑی جدوجہد کے بعد انہیں زندگی میں دلچسپی لینے پر مجبور کیا لیکن اب ان کے لیے اس شہر' اس ملک میں رہنا ممکن نہ رہا تھا جہاں وہ اپنی زندگی کے سب سے قیمتی سرمائے کو کھو بیٹھے تھے۔

کچھ عرصے کی جدوجہد کے بعد وہ امریکا چلے گئے۔ اس کے بعد وہ کبھی واپس نہیں آئے۔ انہیں گرین کارڈ مل گیا ہے۔ وہیں پر ایک پاکستانی خاندان میں انہوں نے شادی کر لی۔ میرے والدین کو وہ کئی بار ملاقات کے لیے امریکا بلوا چکے ہیں۔ میں بھی دو مرتبہ ان کے پاس امریکا جا چکا ہوں لیکن وہ خود کبھی واپس نہیں آئے اور نہ ہی کبھی آئیں گے۔ مجھے یقین ہے وہ آج بھی صنم صاحبہ کا سامنا نہیں کر سکیں گے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے جس چنگاری کو راکھ میں دبایا ہے' وہ اسے دوبارہ ہوا دینے کی جرات نہیں کر سکتے۔ شاید اسی میں بہتری بھی ہے۔ مجھے یقین ہے یہی کیفیت ڈاکٹر صنم کی بھی ہے۔ وہ بھی فراز بھائی کو بھول نہیں پائی ہیں لیکن وہ فراغ حوصلہ عورت غموں' تمام یادوں اور تمام حوالوں کو اپنے سینے کے قبرستان میں دفن کر چکی ہے۔ وہ آج بھی ہنستی ہے اور خوب ہنستی ہے۔ اسے دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس کا دل کس قدر چھلنی ہے۔''

''تم صحیح کہہ رہے ہو جواد بھائی۔ ڈاکٹر صنم صاحبہ واقعی چٹان جیسا حوصلہ رکھتی ہیں۔ اس داستان کو سن کر میرے دل میں ان کی عزت مزید بڑھ گئی ہے۔ ایثار' قربانی اور سچی محبت کی ایسی مثالیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں'' میں نے اپنے دلی جذبات کی ترجمانی کی۔ جواد نے نہایت پرتپاک انداز میں مجھے رخصت کیا۔ اس نے مجھے اپنا رہائشی پتا بتایا اور نہایت اصرار سے فرمائش کی کہ چند دن اس کے گھر بطور مہمان رہوں۔ میں نے اس کی فرمائش کی تکمیل کے لیے ہر ممکن کوشش کا وعدہ کیا اور اپنی مطلوبہ ادویات لے کر چل پڑا۔

تمام راستے میرا ذہن ڈاکٹر صنم کے متعلق سوچتا رہا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جواد نے مجھے جو کچھ بتایا ہے وہ سچ ہے۔ گھر کا گیٹ کھولنے کے لیے ڈاکٹر صنم خود آئی ''آ گئے تم؟'' اس نے خوشی سے چہکتے لہجے میں پوچھا۔ میں سنسناتے دماغ کے ساتھ اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ کیا وہی عورت ہے جس کی داستان الم جواد نے مجھے سنائی ہے۔ اس بے ساختہ ہنسی کے عقب میں رنج و غم کے کون کون سے طوفان پوشیدہ نہیں ہیں؟ میری محویت دیکھ کر وہ چونک پڑی۔

''ارے سرکار' کیا آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہو ہو مجھے؟ کیا اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تم نے؟''

''ہاں ڈاکٹر صاحبہ! میں پہلی بار آپ کو آنکھیں کھول کر دیکھ رہا ہوں'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا اور گھر کے اندرونی حصے کی جانب چل پڑا۔ ڈاکٹر حیرانی سے میرے رویے کی تبدیلی پر غور کرتی رہ گئی۔ میں

صدیقی اور مرزا کے کمرے میں پہنچا تو انہیں خوش گپیوں میں مصروف پایا۔ ان دونوں نے نہایت خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ ہم تینوں کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے ڈاکٹر صنم کے ماضی کے متعلق انہیں کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ انہیں وہیں چھوڑ کر میں ایک بار پھر باہر نکل آیا۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صنم کچن میں مصروف ہے۔ میرے چہرے پر سنجیدگی دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ رہی۔

''آپ کی مریضہ کا کیا حال ہے ڈاکٹر صاحبہ!'' میں نے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

''اسے کچھ دیر کے لیے ہوش آیا تھا لیکن ابھی وہ شدید شاک میں ہے۔ میں نے نیند کی دوا دے کر اسے دوبارہ سلا دیا ہے۔ اب وہ شام کو بیدار ہوگی۔''

''ڈاکٹر صاحبہ' آپ کو یقین ہے کہ اسے جان بوجھ کر زہر دیا گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں مجھے پورا یقین ہے۔ یہ مخصوص قسم کا زہر ہے جو مخصوص مقاصد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسے حادثاتی طور پر استعمال کرنے کا بہت کم امکان ہوتا ہے۔''

''آپ کا کیا خیال ہے؟ اسے یہ زہر کس نے دیا ہوگا؟''

''فی الحال تو کسی قسم کی قیاس آرائی کرنا آسان نہیں ہے۔ یہ شام تک ہوش میں آ جائے گی پھر میں اس سے دریافت کرنے کی کوشش کروں گی کہ اس پر کیا گزری ہے؟''

''آپ کا کیا خیال ہے؟ وہ یہ سب آسانی سے بتا دے گی؟''

''مجھے پوری امید ہے کہ میں اس سے سب کچھ اگلوانے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔'' ڈاکٹر صنم نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

دوپہر کا کھانا ہم لوگوں نے اکٹھے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں ہماری گفتگو کا موضوع وہی لڑکی رہی۔ میں ہوں ہاں کر کے ان لوگوں کا ساتھ دیتا رہا لیکن اس دوران میں میرے ذہن میں بالکل ہی مختلف خیالات کا ہجوم رہا۔ میں مینو استاد کے سلسلے میں شدید اضطراب کا شکار تھا۔ خدا جانے وہ بلوچستان پہنچ بھی سکا یا نہیں؟ اس نے ابھی تک ہم سے رابطہ قائم نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ فی الحال اس کے پاس ہمارے لیے کوئی اہم اطلاع نہیں ہے۔

دوسری طرف وہ شخص سردار رب نواز اسلام آباد میں عیش کر رہا ہے۔ اس سے کچھ امید بندھی تھی کہ وہ سردار شاہ مراد کے خلاف ہماری کچھ مدد کر سکے گا لیکن وہ بھی کسی نامعلوم کام سے اسلام آباد جا بیٹھا۔ اب دیکھو کب اس کی واپسی ہوتی ہے۔ ادھر قصبہ وڈور میں سائیں ڈوڈا شاہ کی درگاہ میں فقیر بابا بڑی بے چینی سے میرا منتظر ہوگا۔ کہیں وہ میری طرف سے مایوس ہو کر ادھر ادھر نہ نکل جائے۔

مجھے ایک بار پھر شدید ترین اضطراب کا احساس ہونے لگا۔ اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے تو شاید ہم ساری زندگی کوئی ڈھنگ کا کام نہیں کر سکیں گے۔ سردار شاہ مراد نے ہمیں ختم کروانے کی کوشش کی جس میں وہ ناکام رہا لیکن اس نے اپنا اصل مقصد حاصل کر لیا۔ یعنی ہم لوگ اس طرح سے پھنسے ہوئے ہیں کہ کوشش کے باوجود اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ دوسری طرف اس کے کارندے شکاری کتوں کے مانند مسلسل ہماری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت ہمیں تلاش کرنے

میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔اس کے بعد سردار شاہ مراد نہایت صفائی سے ہماری زندگی کی کہانی کا آخری باب رقم کردے گا۔ ہماری داستان بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔

شام ڈھلے ڈاکٹر صنم نے مجھے اپنے معائنے کے کمرے میں بلالیا۔اس نے بتایا کہ اس کی مریضہ ہوش میں آنے والی ہے۔میں نیم دلی کے عالم میں اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرتا رہا۔ بالآخر اس کے جسم میں حرکت ہوئی اور اس نے کراہتے ہوئے کروٹ بدلی۔میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کی زرد رنگت میں ہلکی سی سرخی گھلنے لگی ہے۔اس کی سانسیں بھی بالکل ہموار محسوس ہوئیں۔ڈاکٹر صنم نے اسے بیدار کرنے کی کوشش نہیں کی لیکن کچھ ہی دیر بعد اس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔وہ تھوڑی دیر تک خالی خالی نظروں سے کمرے کی سپاٹ چھت کو گھورتی رہی پر اس کی آنکھوں میں ہوش و حواس کی چمک نمایاں ہونے لگی۔کمرے میں ہماری موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ چونک پڑی۔

اس نے وحشت زدہ سی نظروں سے ہمیں دیکھا۔اسے ڈاکٹر صنم کو پہچاننے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔''میں۔۔میں''اس نے عجیب بے یقینی کے عالم میں کچھ پوچھنا چاہا''میں۔۔۔میں زندہ ہوں؟''

''ہاں تم زندہ ہو۔بس یہ سمجھو کہ موت تمہیں چھو کر گزر گئی ہے۔''

''آپ۔۔۔نے مجھے کیوں بچالیا؟ مرجانے دیا ہوتا نہ مجھے''اس نے کہا اور بری طرح سسک پڑی۔دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں سے دھاروں دھار آنسو بہنے لگے۔اس کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر صنم بدحواس سی ہوگئی۔

''ارے ارے۔تم یہ رونا دھونا بند کرو۔تمہاری طبیعت پھر خراب ہو جائے گی''ڈاکٹر صنم نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ تمہیں زہر دیا گیا ہے؟''میں نے اسے براہ راست مخاطب کر کے سنجیدہ لہجے میں سوال کیا۔میرا سوال سن کر وہ سٹ پٹا سی گئی۔میں نے گمبھیر لہجے میں اپنا سوال دہرایا''کیا تم جانتی ہو کہ تم زہر کی وجہ سے مرتے مرتے بچی ہو؟''اس کی آنکھوں سے یک لخت خوف جھلکنے لگا اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''مم۔۔۔میں''

''ہاں ہاں بتاؤ' تمہیں کس نے زہر دیا تھا؟''میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔یک لخت وہ پھر زار و قطار رونے لگی۔

ڈاکٹر صنم نے اسے چپ کرانے کی کوششوں میں مصروف ہوگئی۔اس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں فی الحال کوئی سوال نہ کروں۔ڈاکٹر صنم کی کوششیں رنگ لائیں۔رفتہ رفتہ اس کے آنسو تھمنے لگے۔اس دوران میں وہ وقتاً فوقتاً خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ڈاکٹر صنم نے اس کی کیفیت بھانپتے ہوئے کہا۔

''ذوالفقار صاحب' آپ کمرے سے باہر چلے جائیں۔میں اپنی مریضہ سے خود بات کرلوں گی''

قدرے توقف کے بعد میں کمرے سے باہر نکل گیا۔مرزا اور صدیقی نے مجھ سے اس لڑکی کے بارے میں پوچھا۔میں نے بتادیا کہ''ڈاکٹر اس سے سوال جواب کررہی ہے۔''

تقریباً پندرہ بیس منٹ بعد ڈاکٹر صنم بھی وہیں آگئی''کیا بتایا ہے اس نے؟''میں نے بے تابی سے پوچھا۔میرا سوال سن کر اس کے چہرے پر عجیب سی پژمردگی چھا گئی۔

''بہت ہی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی ہے۔خدا جانے کس بدفطرت شخص نے اس کی معصومیت سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی ناپاک خواہشات کی بھینٹ چڑھانے کی کوشش کی ہے۔''

''اس نے یہ نہیں بتایا ہے کہ اسے کس نے زہر دیا ہے؟''میں نے پوچھا۔

''بتا دے گی سب کچھ بتادے گی بہت ڈرپوک اور حساس لڑکی ہے۔مجھے یقین ہے کہ میں اس سے سب کچھ معلوم کرلوں گی بس اسے ذرا اعتماد میں لینے کی ضرورت ہے۔میں نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کون ہے اور اس کے والدین کون ہیں لیکن وہ کوئی جواب دینے پر تیار نہیں ہے۔اس کی بس ایک ہی رٹ ہے کہ میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔میں نے پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتی ہے تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔میں نے اسے یقین دلایا ہے کہ جوں ہی اس کی حالت بہتر ہوئی میں اسے جانے کی اجازت دے دوں گی۔''

''اس نے بتایا تو تھا کہ وہ راجن پور کی رہنے والی ہے''میں نے کہا۔

''مجھے شک ہے کہ اس نے جھوٹ بولا تھا۔اس کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اس میں جھوٹ' مکر و فریب سے کام لینے کی صلاحیت نہیں ہے۔اسے کسی نے یہاں بھیجنے سے پہلے اچھی طرح سکھایا پڑھایا تھا۔اس دن میرے روبرو اس نے وہی کچھ دہرایا جو اسے رٹایا گیا تھا۔میں اسے سوالات کی زد میں لاؤں گی تو یہ زیادہ مزاحمت نہیں کرسکے گی لیکن ہمیں بے حد صبر و تحمل سے کام لینا پڑے گا۔''

''یہ آپ کا شعبہ ہے ڈاکٹر صاحبہ آپ جس طرح چاہیں اسے ڈیل کریں۔ویسے مجھے بھی اس لڑکی پر بے حد ترس آرہا ہے۔''مرزا نے پرتاسف لہجے میں کہا۔اچانک ساتھ والے کمرے سے کسی بھاری شے کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ڈاکٹر صنم اور میں تیزی سے اس کمرے کی طرف دوڑے۔ہم نے دیکھا کہ وہ لڑکی اپنی مسہری سے کچھ فاصلے پر اوندھے منہ پڑی ہوئی ہے۔ڈاکٹر صنم تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

''نسیم! نسیم! ہوش میں آؤ نسیم۔۔۔تم بستر سے کیوں اٹھیں؟ تم نے آواز دے کر مجھے کیوں نہیں بلوا لیا؟''تب مجھے معلوم ہوا کہ اس لڑکی کا نام نسیم ہے۔اس نے ڈاکٹر صنم کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔بس دھیرے دھیرے کراہتی رہی۔ڈاکٹر صنم نے اسے اٹھا کر اس کے بستر پر لٹانا چاہا لیکن یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔اس نے التجا آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔میں نے اس لڑکی کو ڈاکٹر صنم کی مدد سے اس کے بستر پر لٹادیا۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''بتاؤ میرے سختی سے منع کرنے کے باوجود تم بستر سے

نیچے کیوں اتریں؟" ڈاکٹر صنم نے سرزنش آمیز لہجے میں سوال کیا۔ نسیم کوئی جواب دینے کے بجائے آنکھیں بند کیے گہرے گہرے سانس لیتی رہی۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

"مجھے۔ جانا ہے" بالآخر اس کے لبوں سے بے حد دھیمی آواز خارج ہوئی۔ ڈاکٹر صنم نے چونک کر اس لڑکی کی طرف دیکھا۔

"تمہیں کہاں جانا ہے؟ تمہیں معلوم ہے تم موت کے منہ سے واپس آئی ہو؟"

"ہاں مجھے معلوم ہے" اس کے لبوں سے ایک مرتبہ پھر سرگوشی نما آواز برآمد ہوئی۔

"تو پھر یہ بھی بتادو کہ تمہیں کس نے زہر دیا تھا؟" ڈاکٹر صنم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش رہی پھر اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں۔۔ میں نے خود ہی زہر پی لیا تھا۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔ تم نے خود ہی زہر نہیں پیا۔ اگر ایسا ہوتا تو تم اپنی جان بچانے کے لیے میرے پاس ہرگز نہ آتیں۔ تمہیں بتانا پڑے گا کہ تمہیں کس نے زہر پلایا تھا؟" ڈاکٹر صنم کا لہجہ رفتہ رفتہ تحکمانہ ہوتا چلا گیا۔

"مم۔۔ میں نے کہا نہ کہ میں نے خود۔۔" نسیم نے خاصے جارحانہ انداز میں اپنا فقرہ شروع کیا لیکن جملے کے آخر تک پہنچتے پہنچتے اس کی آواز جھنجھنانے لگی یک لخت وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہم دونوں بڑے تحمل سے اس کے چپ ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ بالآخر اس کی سسکیاں کم ہوتی گئیں۔

"اچھا یہ بتاؤ تمہارا گھر کہاں ہے؟ تم یہاں سے کہاں جانا چاہتی ہو؟"

"میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ مجھے کہیں نہیں جانا۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ میں مرجانا چاہتی ہوں۔ میں اپنا یہ گندگی میں لتھڑا چہرہ لے کر کہاں جاؤں گی۔ کون قبول کرے گا مجھے؟ یا خدایا مجھے موت دے دے۔ مجھے موت دے دے میرے رب العالمین" نسیم نے سسکتے کہا پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

ڈاکٹر صنم نے اس کا چہرہ اپنے سینے میں چھپالیا اور اس کا سر تھپکنے لگی۔ "بس بس اب چپ ہو جاؤ۔ مجھے بتاؤ کہ تمہیں کس نے برباد کیا ہے؟ تم کون ہو اور تمہارا گھر کہاں ہے؟ مجھ سے کچھ مت چھپاؤ۔ یہ مرنے ورنے کی باتیں چھوڑو۔ تم سے جو گناہ ہو چکا ہے، اس کے لیے خدا سے معافی مانگو۔ مجھے سب کچھ سچ سچ بتاؤ۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری ہر ممکن مدد کروں گی" ڈاکٹر صنم نے شفیق لہجے میں کہا۔

نسیم نے آنسوؤں سے بھیگی آنکھیں اٹھا کر ڈاکٹر صنم کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوگی۔ اس لمحے اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ بولتے بولتے رک گئی۔ ڈاکٹر صنم نے اس کا مطلب سمجھ گئی۔

"ذوالفقار! تم دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔ میں نسیم سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی ہوں" نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اس کی بات ماننا پڑی۔ میں مرزا اور صدیقی والے کمرے میں آگیا۔

"ہاں بھئی خریت تو ہے؟ کیا اطلاع لائے ہو مریضہ کے بارے میں؟" مرزا نے پوچھا۔

"اطلاع یہ ہے مرزا صاحب کہ مجھے بھی وہاں سے نکال دیا گیا ہے" میں نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ مرزا اور صدیقی نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔

"گویا تمہارا بھی پتا کٹ گیا۔ تمہیں بھی چھٹی دے دی گئی یعنی بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے۔۔" صدیقی نے مجھ پر پھبتی کسی۔

"جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم کوئی بے آبرو ہو کر نہیں نکلے۔ ہمارا یہ اخراج عارضی ہے۔ کچھ دیر بعد ہم پھر جائیں گے اور آپ لوگ دیکھتے رہ جائیں گے" میں نے اپنی خفت کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"ہاں میاں، تم نہیں جاؤ گے تو کون جائے گا۔ لوہا ہی مقناطیس کے پاس کھنچا چلا جاتا ہے۔ میں نے دیکھی ہے وہ چھوکری۔ اچھا صاف ستھرا پیس ہے" صدیقی نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"آہیں کیوں بھرتے ہیں صدیقی صاحب۔ وہ مقناطیس ہے تو لوہا تو آپ بھی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ لوہا ذرا بوسیدہ اور زنگ آلود ہے۔"

"ہاں بھائی، لگاؤ جتنا چونا لگا سکتے ہو۔ جانتے ہو نا کہ تمہاری موجودگی میں ہماری دال نہیں گل سکے گی۔ مزے کرو۔ تم جیسی قسمت ہماری کہاں؟ یعنی چپڑی اور دو دو۔"

"ارے ارے آپ مایوس کیوں ہوتے ہیں صدیقی صاحب! ان چپڑیوں میں سے ایک آپ تناول فرمالیں بشرطیکہ آپ کی بتیسی اس کی اجازت دے۔ میرے خیال میں ڈاکٹر صنم کی جوڑی آپ کے ساتھ ٹھیک رہے گی۔"

"ارے بھائی، کیوں دل جلاتے ہو۔ اس بڑھیا کو بھی تمہارے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا ہے۔ ہم سے تو باتیں کرنا بھی گوارا نہیں کرتی۔ ذرا رنگ و روغن نہیں بگڑا ہے تو وہ سمجھتی ہے کہ وہ نئے ماڈل کی مرسیڈیز ہے۔ حالانکہ اگر وہ صحیح وقت پر شادی کرلیتی تو آج تمہاری عمر کے اس کے بچے ہوتے" صدیقی کے لہجے کی تپش محسوس کر کے ہم دونوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"واہ صدیقی واہ۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم بھی اس عورت کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کیے ہوئے ہو۔ تمہارے لہجے میں تو باقاعدہ رقابت کی جھلک ہے۔ گویا ابھی تک بھوبھل میں چنگاری زندہ ہے۔" مرزا نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

"تو کیا تم مجھے اپنی طرح برف کا ڈھیر سمجھ رہے ہو۔ تم تو جوانی کے عروج میں بھی اسی سالہ بوڑھے کے مانند تھے۔"

"اوہو، تو گویا تم کھلم کھلا اعتراف عشق کر رہے ہو۔ تو پھر میں ڈاکٹر صنم سے بات کروں تمہارے سلسلے میں؟ اس چمکتی دمکتی مرسیڈیز کے مقابلے میں تم اگرچہ ایک سال خوردہ بیڈفورڈ ٹرک نظر آتے ہو لیکن عین ممکن ہے وہ خوب صورتی کے بجائے بار برداری کی صلاحیت کو ترجیح دے۔ ویسے اس لمحے مجھے اسلام آباد میں موجود تمہاری فوکس ویگن اور اسپٹنیاں نظر آرہی ہیں" مرزا کی بروقت اور برمحل چوٹوں نے صدیقی کو کھسیانا کر دیا۔ اس نے بات بدلنے کی کوشش کی لیکن مرزا نے اسے موقع نہ دیا۔ وہ بار بار اسے

گھیر کر اسی موضع پر لے آتا۔ بالآخر صدیقی نے زچ ہو کر ہاتھ جوڑ دیے۔

''بس بہت ہو گیا۔ بھائی خدا کے لیے اب مجھے بخش دو۔'' مرزا اور میں نے مل کر ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ اسی لمحے ڈاکٹر صنم کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر موجود تاثرات دیکھ کر میں بری طرح چونک پڑا۔ وہ مجھے کچھ حواس باختہ اور مضطرب سی نظر آئی۔

''خیر تو ہے ڈاکٹر صاحبہ؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے پاس آپ لوگوں کے لیے بے حد اہم خبریں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ یہ سب سن کر بری طرح چونک پڑیں گے۔'' اس نے ہیجان آمیز لہجے میں کہا۔

''اوہ۔ آپ کہیے کیا کہنا چاہتی ہیں۔ ہم لوگ ہمہ تن گوش ہیں'' مرزا نے بے چینی سے لبریز لہجے میں کہا۔

''آپ لوگ جانتے ہیں یہ لڑکی کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں بھلا ہمیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟'' صدیقی نے کہا۔

''یہ۔۔ یہ لڑکی سردار شاہ مراد کی بیٹی ہے۔''

''کیا!۔۔ کیا؟'' ہم تینوں ایک ساتھ چیخ پڑے ''آپ کیا کہہ رہی ہیں'' مجھے ہیجان اور اضطراب کی شدت سے اپنی رگیں کھنچتی محسوس ہوئیں۔ نسیم شاہ مراد کی بیٹی۔۔ یہاں۔۔ اس حال میں۔۔ نہیں یہ بھلا کیونکر ممکن ہے؟''

''میں نے آپ سے جو کچھ کہا وہ سو فی صد سچ ہے۔ نسیم نے مجھے بتایا ہے کہ اس کا باپ اس علاقے کا بہت جاگیردار اور سیاست دان سردار شاہ مراد ہے'' ڈاکٹر صنم نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''لیکن وہ یہاں' اس حال میں۔؟'' صدیقی نے جلدی سے پوچھا۔

''ذرا صبر کیجیے۔ میں نے سب کچھ دریافت کر لیا ہے۔ میں پوری صورت حال آپ کو تفصیل سے بتاتی ہوں۔ جو بات آپ کی سمجھ میں نہ آئے وہ مجھ سے پوچھ لیجیے گا۔ نسیم نے مجھے بتایا ہے کہ سردار شاہ مراد کی انیس بیٹیوں میں سے اس کا چھٹا نمبر ہے جبکہ اس کی ماں سردار شاہ مراد کی تیسری بیوی تھی جو کہ چند سال پہلے فوت ہو چکی ہے۔''

''قطع کلامی معاف ڈاکٹر صاحبہ' کیا آپ بتائیں گی کہ سردار شاہ مراد نے کل کتنی شادیاں کی ہیں؟'' مرزا نے حیرانی سے پوچھا۔

''سردار شاہ مراد ابھی تک سات شادیاں کر چکا ہے۔ ان سات بیویوں سے اس کی انیس بیٹیاں ہیں جبکہ اس کا صرف ایک ہی بیٹا ہے جس کا نام جاہ مراد ہے۔ چند ماہ پہلے سردار جاہ مراد عرف رتا سائیں ایک حادثے کا شکار ہو کر معذور ہو چکا ہے۔''

''ہاں وہ خبر ہم نے بھی پڑھی تھی کہ سردار شاہ مراد کے کسی دیرینہ دشمن نے اس کے جوان بیٹے کو آنکھ ناک اور زبان سے محروم کر دیا۔ خاصے دنوں تک اس واقعے کا چرچا ہوتا رہا پھر رفتہ رفتہ یہ معاملہ دبتا چلا گیا۔'' مرزا نے تیز تیز لہجے میں کہا۔ مجھے اپنے رگ و پے میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ یہ لوگ

میرے ہی روبرو کارنامہ دہرا رہے ہیں۔

''ہاں وہ کوئی بہت ہی جی دار نوجوان تھا۔ اس نے سردار شاہ مراد کو زبردست زک پہنچائی اور پھر بڑے پراسرار انداز میں منظر عام سے غائب ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا آج تک پتا نہیں چل سکا۔''

''مجھے یقین ہے کہ سردار شاہ مراد اور اس کے بیٹے نے اس نامعلوم جوان پر کوئی بڑی زیادتی کی ہوگی۔ جبھی تو وہ اتنی خطرناک کارروائی کرنے پر مجبور ہوا'' میں نے دھیمے لہجے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''پورے معاملے کا تو مجھے علم نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ یہی کچھ ہوا ہوگا'' ڈاکٹر صنم نے کہا۔

''آپ اس لڑکی نسیم کے متعلق کچھ بتا رہی تھیں'' صدیقی نے یاد دلایا۔

''ہاں میں اسی طرف آ رہی ہوں۔ نسیم کے کہنے کے مطابق لڑکیوں کی یہ فوج ظفر موج سردار شاہ مراد کی گاؤں والی حویلی میں قیدیوں کی سی زندگی گزار رہی ہے۔ انہیں آزادانہ گھومنے پھرنے اور پڑھنے لکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ لڑکیاں طرح طرح کی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہیں۔ جذباتی گھٹن سے بچنے کے لیے یہ قفس کی دیوار میں کوئی خفیہ جھروکا ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ جہاں سے وہ آزاد فضا میں کوئی سانس لے سکیں۔ نسیم نے بھی خاصی جدوجہد کے بعد ایک ایسا جھروکا تلاش کر لیا۔ افضل ایک وجیہ و شکیل نوجوان تھا جو سردار شاہ مراد کی وسیع و عریض حویلی میں مقیم تھا۔ نسیم کے کہنے کے مطابق افضل کئی مہینے سے حویلی کے پچھلے حصے میں واقع ایک کمرے میں بطور مہمان ٹھہرا ہوا تھا۔ نسیم نے اسے دیکھا تو وہ اسے بہت اچھا لگا۔ وہ روزانہ چوری چھپے اسے دیکھنے لگی۔ وہ زیادہ عرصے خود کو افضل کی نظروں سے نہ بچا سکی۔ ایک دن افضل نے بھی اسے دیکھ لیا۔ یہ روز روز کی تانکا جھانکی بالآخر رنگ لائی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ ان دونوں میں چوری چھپے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ محرومیوں کی ماری' پیار کی ایک نظر کو ترستی' معصوم لڑکی اتنا بہت سا پیار پا کر دیوانی سی ہو گئی۔ وہ افضل کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئی۔ یہ خفیہ ملاقاتیں بالآخر گناہ کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ نسیم نے مزاحمت کی اپنی سی کوشش کی لیکن اس کی ایک نہ چلی۔ گناہ کا دروازہ ایک مرتبہ کھل جائے تو پھر کسی قسم کی روک ٹوک نہیں ہوا کرتی۔

افضل نسیم کی معصومیت سے کھیلتا رہا پھر ان کے باہمی تعلق میں ایک نیا موڑ آیا۔ افضل کو گاؤں والی حویلی سے شہر والی حویلی میں منتقل ہونا پڑا۔ اس صورت حال سے نسیم بے حد پریشان ہوئی۔ ان ہی دنوں اس پر ایک بھیانک انکشاف ہوا۔ اپنی حالت سے باخبر ہونے کے بعد وہ بری طرح حواس باختہ ہو گئی۔ وہ بڑی بے قراری سے افضل کا انتظار کرنے لگی۔ کئی دن بعد افضل گاؤں آیا اور اپنے مخصوص کمرے میں ٹھہرا۔

رات کو نسیم اس کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے اسے بتایا کہ وہ کس مصیبت میں پھنس گئی چکی ہے۔ یہ خبر سن کر افضل کے رویے میں عجیب سی تبدیلی پیدا ہوئی۔ اس نے روکھے سے لہجے میں کہا کہ نسیم کو چاہیے کہ وہ جلد از جلد اس مصیبت سے جان چھڑا لے۔ نسیم نے اس سے کہا کہ انہیں آپس میں شادی کر لینی چاہیے لیکن افضل نے سرد لہجے میں کہا کہ فی الحال ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اگلے ہی دن افضل شہر آ گیا۔ اس

صورت حال نے نسیم کی آنکھوں میں اندھیرے اتار دیے۔ وہ اتنی کم عقل بھی نہ تھی کہ اس صورت حال کی سنگینی کو نہ سمجھ پاتی۔ اسے معلوم تھا کہ مزید کچھ دن گزر گئے تو معاملہ قابو سے باہر ہو جائے گا۔

خاصی سوچ بچار کے بعد اس نے اپنی ایک سوتیلی ماں کو اپنا ہم راز بنانے کا فیصلہ کیا۔ نسیم کی اس سوتیلی ماں کا تعلق ڈیرہ غازیخان شہر سے ہے۔ سردار شاہ مراد کی چہیتی ہونے کے ناتے اسے حویلی میں خاصا اثر ورسوخ حاصل ہے۔ نسیم کی زبانی اس کی حماقتوں کی داستان سن کر پہلے تو وہ سخت برافروختہ ہوئی پھر اسے اس پر رحم آ گیا۔ اس نے نسیم کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ نسیم کو اپنے ساتھ لے کر اپنے میکے یعنی شہر آ گئی۔ اس نے نسیم کو میرا پتا اچھی طرح سمجھا کر ایک رکشے میں بٹھا دیا۔ میں نے اسے سرزنش کرنے کے بعد دوا دے کر رخصت کر دیا۔ وہ دوا لے کر اپنی سوتیلی ماں کے میکے کی طرف روانہ ہوئی تو راستے میں اس کا دل افضل کی طرف کھنچنے لگا۔ وہ جانتی تھی کہ افضل یہیں اسی شہر میں اس کے باپ کی حویلی میں مقیم ہے۔ وہ اگر چاہتی تو اس سے بآسانی مل سکتی تھی کیونکہ برقعے میں ہونے کے باعث اسے کوئی بھی نہ پہچان پاتا ویسے بھی سردار شاہ مراد کی بیٹیاں سات پردوں میں رہتی تھیں۔ بہت کم لوگوں نے انہیں دیکھا ہوگا۔

نسیم اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوگئی۔ اس نے اپنی سوتیلی ماں کو بتایا کہ ڈاکٹر صنم نے اسے اگلی صبح پھر بلایا ہے اور ہوسکتا ہے کہ اسے ایک آدھ دن ڈاکٹر صنم کے گھر پر ٹھہرنا پڑے۔ اس کی ماں نے بادل نخواستہ اسے اجازت دے دی۔ اگلے دن صبح نسیم رکشے میں بیٹھ کر ڈاکٹر صنم کے بجائے اپنے باپ کی شہر والی کوٹھی پر پہنچ گئی۔ کوٹھی کا چوکیدار حسب توقع نسیم کے لیے بالکل اجنبی ثابت ہوا۔ نسیم نے اپنی تمام تر ہمتیں جمع کرکے اسے بتایا کہ وہ افضل سے ملنا چاہتی ہے۔ چوکیدار نے اس سے مزید کوئی سوال پوچھے بغیر اسے سیدھا افضل کے کمرے میں پہنچا دیا۔

افضل اسے اس طرح اچانک اپنے پاس پاکر بری طرح حواس باختہ ہوگیا۔ اس نے جلدی جلدی اپنے کمرے کے دروازے کھڑکیاں بند کرکے نسیم سے پوچھا کہ وہ وہاں کیوں آئی ہے؟ اس کی وہاں موجودگی ان دونوں کی موت کا باعث بھی بن سکتی تھی۔ نسیم نے اسے بتایا کہ وہ یہ خوش خبری سنانے کے لیے وہاں آئی ہے۔ کہ اس نے ناگہانی مصیبت سے نجات کے انتظامات کرلیے ہیں۔ یہ بات سن کر افضل بہت خوش ہوا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھ کر نسیم کی جان میں جان آئی۔ افضل نے چوکیدار کو چند خصوصی ہدایات دیں اور نسیم کو رات بھر کے لیے اپنے پاس روک لیا۔

نسیم نے کوئی اعتراض نہ کیا کیونکہ وہ افضل سے بے حد اہم گفتگو کرنا چاہتی تھی۔ رات کے اندھیرا ہوتے ہی افضل نے حسب عادت شراب کی بوتل کھول لی اور شب عشرت منانے کی تیاری کرنے لگا۔ مسرت ونشاط کی گھڑیاں قریب آ گئیں تو نسیم حرف مدعا زبان پر لے آئی۔ اس نے افضل کو کہا کہ وہ اس سے شادی کے لئے پیش رفت کرے۔ افضل نے اسے ٹالنا چاہا لیکن پہلی مرتبہ نسیم اپنے کہے پر جم گئی۔ اس نے افضل کو کہا کہ وہ اسی صورت میں اس کے قریب آسکتا ہے کہ وہ اس سے شادی کا وعدہ کرلے۔ اس موقعے پر نسیم کی تلخ گفتگو سن کر افضل بری طرح جھنجلا گیا۔ اس نے نسیم کو صاف صاف کہ

دیا کہ وہ فی الحال شادی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اگر نسیم انتظار نہیں کرسکتی تو اس معاملے کو ابھی اور اسی وقت ختم سمجھے۔ اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ سن کر نسیم کی آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ اسے ساری دنیا گھومتی محسوس ہوئی۔

یک لخت اس پر شدید غیظ وغضب کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے افضل کو صاف صاف بتا دیا۔ کہ وہ اس کی زندگی برباد کرکے اتنی آسانی سے اپنا دامن نہیں جھٹک سکتا۔ اگر وہ اس سے شادی پر راضی نہیں ہوا تو وہ تمام صورت حال اپنے باپ سردار شاہ مراد کے گوش گزار کر دے گی۔ وہ خود تو اپنی جان سے جائے گی ہی سردار شاہ مراد افضل کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کرکے اپنے کتوں کے آگے ڈال دے گا۔ نسیم کی دھمکی سن کر افضل یک دم شیر سے بلی بن گیا۔ اس نے گھگھیاتے ہوئے نسیم سے کہا کہ وہ ہرگز ایسا نہ کرے۔ اسے تھوڑی سی مہلت درکار ہے۔ اس کے بعد وہ نسیم کے رشتے کے لیے اس کے باپ سے بات کرے گا۔ اسے سیدھا ہوتا دیکھ کر نسیم مطمئن ہوگئی۔

اس رات افضل دیر تک پیتا رہا۔ اس نے نسیم کے لیے کولڈ ڈرنک کی بوتل کھول دی۔ نسیم وہ بوتل پینا نہیں چاہتی تھی لیکن افضل کے بے حد اصرار پر اسے وہ بوتل پینا پڑی۔ بوتل ختم ہونے کے کچھ ہی دیر بعد نسیم کو اپنی طبیعت خراب ہوتی محسوس ہوئی۔ اس نے افضل کو بتایا تو اس نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ یہ عارضی کیفیت ہے' کچھ ہی دیر میں وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔

کچھ دیر بعد نسیم کی طبیعت مزید خراب ہوگئی۔ نسیم نے افضل سے التجا کی کہ وہ اسے فوراً ڈاکٹر کے پاس لے چلے۔ افضل تیار تو ہوگیا لیکن نسیم کو احساس ہوا کہ وہ جان بوجھ کر دیر کر رہا ہے۔ اس نے اصرار کرکے نسیم کو سیاہ برقعہ پہنایا۔ حالانکہ اس ہنگامی حالت میں اس کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اسے ایک کار میں ڈال کر کوٹھی سے نکل آیا۔ شدید اذیت کے عالم میں ہونے کے باوجود نسیم کو یہ جاننے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کہ افضل خواہ مخواہ ادھر ادھر کے چکر لگا رہا ہے۔ جیسے اسے کسی بات کا انتظار ہو۔ نسیم کی حالت لحہ بہ لحہ خراب ہوتی گئی لیکن افضل اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے کر نہیں گیا۔

ایک لمحے پر جب اسے نسیم کی سانسیں اکھڑتی محسوس ہوئیں تو اس نے گاڑی روکی نسیم کو گھسیٹ کر گاڑی سے اتارا اور اسے سڑک کے کنارے ڈال دیا۔ نسیم نے لرزتی آواز میں اسے روکنا چاہا لیکن وہ ایک جھٹکے سے گاڑی بھگا لے گیا۔ تب نسیم کو اصل صورت حال کا احساس ہوا۔ اپنی طبیعت کی اچانک خرابی کا اصل سبب بھی اس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ جان گئی کہ افضل نے کولڈ ڈرنک میں زہر ملا کر اسے پلا دیا ہے تاکہ وہ اپنے باپ کے سامنے زبان کھول کر اس کی زندگی کے لیے خطرہ نہ بن جائے۔

نسیم نہایت بے بسی کے عالم میں اپنی موت کا انتظار کرنے لگی۔ اچانک اسے ایک ابکائی آئی اور اس نے قے کردی۔ اس قے کے بعد اسے اپنی حالت میں کچھ بہتری محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے آس پاس کا جائزہ لیا تو اسے وہ علاقہ کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ تھوڑی سی ذہنی جدوجہد کے بعد اسے معلوم ہوگیا کہ وہ ماڈل ٹاؤن کے قریب موجود ہے۔ اس لمحے اسے یاد آیا کہ میرا یعنی ڈاکٹر صنم کا گھر یہیں قریب ہی ہے۔ اگر وہ کسی طرح میرے گھر تک پہنچ جائے تو اس کی زندگی کے بچاؤ کی کوئی صورت پیدا ہوسکتی

ہے۔ وہ اپنی تمام ترپچی کھچی طاقت اکٹھی کر کے کسی نہ کسی طرح گرتی پڑتی مجھ تک پہنچ گئی۔ آگے جو کچھ ہوا اس سے آپ لوگ اچھی طرح واقف ہیں۔"

ڈاکٹر صنم کے خاموش ہوتے ہی ہم تینوں گویا کسی خواب سے چونک پڑے۔ یہ سب سن کر مجھے دل میں عجیب وغریب سے احساسات ابھرتے محسوس ہوئے۔ بڑی ہی متضاد کیفیت کا شکار تھا' ایک طرف مجھے نسیم کی داستان سن کر گہرے افسوس کا احساس ہوا تو دوسری طرف میرے دل کے کسی کونے کھدرے میں عجیب کمینی قسم کی خوشی جنم لے رہی تھی۔ تو غریبوں کی بہن بیٹیوں کی عزت کو کھلونا سمجھتا تھا سردار شاہ مراد! دیکھ آج تیری اپنی عزت مٹی کا بے مایہ کھلونا بن کر رہ گئی ہے۔ میں نے اپنی اس کمینی سوچ پر فوراً ہی قابو پالیا۔ سردار شاہ مراد کی بداعمالیوں کی سزا اس بے بس لڑکی کو ملنا کس طرح درست نہیں۔ یہ بے چاری تو خود مظلوم ہے۔

"یہ اس لڑکی کی خوش قسمتی ہے ڈاکٹر صاحبہ کہ یہ آپ کے پاس پہنچ گئی۔ اب اس کی زندگی خطرے سے باہر ہے۔ اگر یہ چپ چاپ اپنی سوتیلی ماں کے پاس پہنچ جائے تو کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی کہ اس پر کیا بیت چکی ہے" صدیقی نے کہا۔

"یہ تو آپ صحیح کہہ رہے ہیں صدیقی صاحب۔ یہ اپنی سوتیلی ماں سے جا کر کہہ سکتی ہے کہ ڈاکٹرنی نے اسے ایک کے بجائے دو دن اپنے پاس رکھا ہے" ڈاکٹر صنم نے صدیقی سے اتفاق کیا۔

"لیکن اس حرام زادے افضل کا کیا بنے گا؟" میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا "کیا اس ذلیل شخص کو ایسے ہی چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ اپنی کمینی حرکتوں کے ذریعے مزید معصوم لڑکیوں کی زندگی برباد کرتا رہے؟"

"ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں بھائی۔ ہمارے اپنے مسائل کیا کم ہیں۔ ہم ان چکروں میں کیوں کر پڑ سکتے ہیں؟" صدیقی نے کہا۔

"چکروں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس پر صرف ایک گولی ہی تو خرچ کرنا پڑے گی۔" میں نے پیچ وتاب کھا کر کہا۔

"آپ دونوں کو احساس نہیں ہے کہ آپ لوگ ایک بالکل احمقانہ بحث میں الجھے ہوئے ہو" مرزا نے تلخ لہجے میں کہا "لگتا ہے' ہم لوگوں کے ساتھ رہنے کے باعث ذوالفقار کے دماغ کو بھی زنگ لگ گیا ہے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا مرزا صاحب!" میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے تمہاری حاضر دماغی اور بروقت فیصلے کی قوت نے بہت متاثر کیا تھا پھر میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ تم معاملات کے ظاہری پہلوؤں پر توجہ دینے کے بجائے ان کے پس پردہ حقائق اور اس کے منطقی نتائج پر نظر رکھتے ہو مگر اس معاملے میں تم نے بے حد سطحی سوچ اپنا رکھی ہے۔ تم صرف اس بات پر توجہ دے رہے ہو کہ ایک معصوم لڑکی کے ساتھ ظلم ہوا ہے لہٰذا اس پر ظلم کرنے والے کو سزا ملنی چاہیے۔"

مرزا کے طنزیہ طرز گفتگو پر مجھے ہلکی سی ناراضگی کا احساس ہوا لیکن میں نے اپنی ناراضگی کا اظہار

مناسب نہ سمجھا ہوسکتا ہے یہ شخص واقعی صحیح کہہ رہا ہو۔ مجھ سے بھی تو کوتاہی ہوسکتی ہے۔

"اچھا تو جناب مرزا صاحب' اب آپ ہی بتائیں کہ ہم دونوں کن حقائق کو نظر انداز کر رہے ہیں؟" میرے بجائے صدیقی نے سوال کیا۔ اس کے لہجے میں طنز کی جھلک نمایاں تھی۔ مرزا نے اس کے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"میں پہلے اس لڑکی نسیم سے چند سوالات کرنا چاہوں گا۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیے۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگوں کو اپنے سوالات کے مکمل جوابات مل جائیں گے۔"

"چلیے' پھر دیر کس بات کی ہے؟" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ اس دوران میں میرا ذہن مسلسل اسی ادھیڑ بن میں لگا رہا کہ میں کس چیز کو نظر انداز کر رہا ہوں جبکہ مرزا کے خیال کے مطابق وہ بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ مرزا کا کہنا بالکل صحیح ہے۔ واقعی میں اس معاملے کو سرسری انداز میں لے رہا تھا۔

ہم ساتھ والے کمرے میں پہنچے تو ہمیں نسیم بیدار نظر آئی۔ اس نے ہم چاروں کو ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں الجھن کے آثار پیدا ہوئے۔ اس نے استفہامیہ نظروں سے ڈاکٹر صنم کی جانب دیکھا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مرزا صاحب تم سے چند سوالات کرنا چاہتے ہیں۔ براہ مہربانی ان سے تعاون کرنا۔ تم اگر کوئی جواب براہ راست انہیں نہ دینا چاہو تو مجھے بتا دینا" نسیم نے تذبذب کے عالم میں اثبات میں گردن ہلا دی۔

"میں تم سے جو سوالات کرنا چاہتا ہوں وہ بہت اہم ہیں بیٹی" مرزا نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہنا شروع کیا "ان کے جوابات بہت سوچ سمجھ کر دینا" نسیم نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ڈاکٹر صنم صاحبہ نے ہمیں تمہارے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے" مرزا نے دھیمی آواز میں کہا۔ اس کی بات سن کر نسیم کی نظریں بے اختیار جھکتی چلی گئیں "جو کچھ تم پر گزری اس کا ہمیں افسوس ہے تم نے اپنی معصومیت اور نادانی کی وجہ سے دھوکا کھایا۔ مجھے امید ہے کہ تم اب سمجھ چکی ہو گی کہ وہ شخص حد درجے کا کمینہ' مطلب پرست اور غلیظ ہے۔ اس نے اپنا مطلب پورا ہونے کے بعد تمہیں قتل کرنے کی کوشش کی۔ میرے خیال میں اس سے بڑھ کر شیطانیت کوئی نہیں ہوسکتی" مرزا نے توقف کر کے نسیم کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ "میں تم سے پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ اس شخص کی اصلیت سے واقف ہونے کے بعد تم اس کے لیے اپنے دل میں کس قسم کے جذبات رکھتی ہو؟ میرا مطلب ہے کیا تم اب بھی اس سے محبت کرتی ہو؟" نسیم ایک لمحے کے لیے گم سم سی ہو کر رہ گئی پھر اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

"میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔ شدید ترین نفرت" اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

"مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم ایک حقیقت پسند لڑکی ہو۔ اب تم یہ بتاؤ کہ اس شخص کو کیا سزا ملنی چاہیے۔"

''میں اسے اپنے ہاتھوں سے گولی مارنا چاہتی ہوں'' نسیم نے پہلی مرتبہ قدرے تیز لہجے میں کہا۔

''بہت خوب!'' مرزا نے تحسین بھرے لہجے میں کہا۔ میں مرزا کے ان سوالات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ صدیقی کے چہرے پر بیزاری کے واضح آثار تھے۔

''اس کا مطلب ہے تم ایک بہادر لڑکی ہو۔ اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ کوئی شخص تمہارے گھر کو آگ لگانا چاہ رہا ہے تو تم کیا کرو گی؟'' نسیم نے عجیب سی نظروں سے مرزا کی طرف دیکھا۔

''میں۔۔۔ میں۔۔''

''اسے گولی مار دو گی۔ یہی کہنا چاہتی ہو نا تم؟'' مرزا نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔ نسیم کے چہرے پر عزم کے آثار ابھرے۔

''ہاں میں ایسے شخص کو گولی مار دوں گی۔''

''ہمارا یہ پیارا وطن پاکستان بھی تو ہمارا اپنا گھر ہے نا؟'' مرزا نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا۔ میرے ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا۔ میری سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگا کہ مرزا کے ان سوالوں کا مقصد کیا ہے؟

''ہاں یہ پاک وطن بھی ہمارا اپنا پیارا گھر ہے'' نسیم نے مستحکم لہجے میں کہا۔

''اور اگر کوئی ہمارے پیارے وطن کو آگ لگانا چاہے تو۔۔'' مرزا نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''تو میں اسے بھی گولی مار دوں گی۔'' مجھے نسیم کے لہجے میں فولادی عزم کی جھلک نظر آئی۔

''تو تم اپنے وطن کے دشمنوں کو گولی مار دو گی۔ خواہ وہ کوئی بھی ہو؟''

''ہاں بے شک وہ کوئی بھی ہو۔''

''ایک مرتبہ پھر اچھی طرح سوچ لو کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''حب الوطنی کے معاملے میں سوچنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔''

''اور اگر وطن کا دشمن' وطن کو آگ لگانے والا تمہارا اپنا باپ ہو تو؟ پھر تمہارا کیا ردعمل ہوگا؟'' مرزا نے یک لخت وہ سوال کر ڈالا جس کے لیے وہ اتنی دیر سے زمین ہموار کر رہا تھا۔

مرزا کا سوال سن کر نسیم کا چہرہ یک دم سفید پڑ گیا۔ یہ سوال اس کے اعصاب پر بجلی بن کر گرا۔ میں اس کے ذہن میں ہونے والی زبردست کشمکش کو اپنے تصور کی آنکھ سے بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ وہ میری توقع سے کہیں پہلے ایک فیصلے پر پہنچ گئی ''وطن کے مقابلے میں کسی رشتے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ مادر وطن کی سلامتی ہر شے' ہر تعلق' ہر مفاد پر فوقیت رکھتی ہے۔''

''مجھے تم سے یہی امید تھی بیٹی۔ مجھے تم پر فخر ہے۔'' مرزا نے مسرور لہجے میں کہا۔

''مجھے نہیں معلوم مجھے یہ سب کس نے سکھایا۔'' نسیم نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا ''شاید میری مرحومہ ماں نے۔ وہ پڑھی لکھی عورت تھی۔ وہ مجھے پڑھانا لکھانا چاہتی تھی لیکن میرے باپ نے اس کی اجازت نہ دی۔ میری ماں مجھے میرے باپ سے چوری چھپے پڑھایا کرتی تھی۔ بغیر کسی کتاب اور تختی

کے۔ وہ سبق کتاب کے نہیں زندگی کے ہوتے تھے۔ ان ہی اسباق میں سے ایک سبق وطن سے محبت کا بھی ہوا کرتا تھا۔ یہ سبق مجھے اتنی بار پڑھایا گیا کہ میری روح تک میں اتر گیا پھر میری ماں' میری استانی اس دنیا سے چلی گئی۔ میری تعلیم ادھوری رہ گئی۔ میں ادھوری رہ گئی۔ آج مجھے پھر وہ بھولا ہوا سبق یاد آ گیا۔''

''تمہاری ماں واقعی ایک عظیم عورت تھی جس نے تمہاری ابتدائی تربیت کی۔'' مرزا نے تعظیم بھرے لہجے میں کہا۔

''کک۔۔ کیا میرا باپ واقعی۔۔ واقعی وطن دشمن ہے؟'' نسیم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ سچ ہے۔ تمہارا باپ وطن سے غداری کا مرتکب ہو رہا ہے۔ یہ محض الزام نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ بلکہ وہ اس راستے پر اتنا آگے جا چکا ہے کہ اس کی ذات ملک وقوم کے لیے زبردست خطرہ بن چکی ہے۔ وہ اس علاقے میں بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کا سب سے بڑا سرپرست اور پشت پناہ بنا ہوا ہے۔ میرے خیال میں تمہیں یہ بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ہم تینوں کا تعلق ملک کی ایک اہم خفیہ ایجنسی سے ہے۔ ہمیں تمہارے باپ سردار شاہ مراد کے خلاف تحقیقات کرنے کے لیے دارالحکومت سے یہاں بھیجا گیا ہے۔ بدقسمتی سردار شاہ مراد کو ہمارے ارادوں کی سن گن مل گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہمیں ختم کرنے کے لیے طرح طرح کے جان لیوا جال بچھانے شروع کر دیے۔ ہم سخت جدوجہد کے بعد اپنی جانیں بچانے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ ڈاکٹر صنم کا گھر ہم لوگوں کی واحد پناہ گاہ ہے جس کے باہر ہر طرف تمہارے باپ کے کارندے بھوکے درندوں کی مانند ہمیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں'' مرزا نے نہایت پراعتماد لہجے میں بہت پراثر انداز میں اپنی بات مکمل کی۔

نسیم بھونچکا سی ہو کر خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ چند لمحوں تک کمرے میں مکمل سناٹا چھایا رہا۔ ڈاکٹر صنم نے اس دوران میں کئی بار پہلو بدلے۔ وہ سخت اضطراب و بے قراری کا شکار تھی۔

''اگرچہ ابھی تک آپ لوگوں نے کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیا ہے لیکن مجھے میری چھٹی حس بتا رہی ہے کہ آپ نے مجھے جو کچھ بتایا وہ سچ ہے۔ میں چاہوں بھی تو اپنے باپ کا دفاع نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس کے جو کرتوت پہلے سے میرے علم میں موجود ہیں' وہی اسے ایک بدنیت اور بدفطرت شخص ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ آپ لوگ مجھے یہ بتائیں کہ میں اس معاملے میں آپ لوگوں کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''

''وہ تو بعد کی بات ہے پہلے تم مجھے اس شخص افضل کے متعلق چند سوالات کے جوابات دے دو۔''

''میں تیار ہوں۔ پوچھیے آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

''تمہارے کہنے کے مطابق وہ شخص کئی مہینے تک تمہاری حویلی کے پچھواڑے ایک کمرے میں مہمان کی حیثیت سے ٹھہرا رہا۔ اسے عام لوگوں کی نگاہوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی۔ ذرا ذہن پر زور دے کر بتاؤ کہ کبھی اس سے کوئی اور شخص ملنے آیا ہو؟''

قدرے توقف کے بعد نسیم نے جواب دیا ''نہیں' میرے خیال میں کوئی اجنبی شخص خاص طور پر اس سے ملنے کے لیے نہیں آیا۔ البتہ وہ خود کئی کئی دن کے لیے غائب ہو جایا کرتا تھا۔ میرا باپ اکثر گاؤں سے باہر رہا کرتا تھا لیکن جب وہ آتا تو افضل مسلسل اس کے ساتھ ملاقاتیں کرتا رہتا۔''

''تم نے بتایا کہ تم کئی بار افضل کے کمرے میں جا چکی ہو۔ ذرا سوچ کر بتاؤ کہ تمہیں وہاں کوئی عجیب و غریب اور ناقابل فہم چیز نظر آئی جس نے تمہیں الجھن میں ڈال دیا ہو۔ افضل کے رویے اور عادات و اطوار کی کوئی ایسی خاص بات جسے وہ تم سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہو؟''

نسیم کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر اس نے دھیمے لہجے میں کہا ''ویسے تو اس کا طرز عمل تھا ہی پراسرار یعنی اسے کبھی بھی دن کے وقت حویلی سے باہر نہیں دیکھا گیا پھر وہ اتنے عرصے حویلی میں مہمان بن کر رہا لیکن اس کے متعلق کسی کو علم نہ ہو سکا کہ اس کا ہم لوگوں سے کیا تعلق ہے' یعنی نہ وہ ہمارا رشتہ دار ہے نہ ہی وہ ملازم معلوم ہوتا ہے۔ وہ بھائی جان یعنی رتہ سائیں کا دوست بھی نہیں ہے کیونکہ ان دونوں کو کبھی ایک ساتھ نہیں دیکھا گیا۔ ویسے بھی بھائی جاہ مراد نے اپنے معذور ہو جانے کے بعد اپنے تمام دوستوں سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اب وہ ملتان میں گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ میری دونوں بھابھیوں کو اس نے طلاق دے دی تھی۔ وہ اب گھر بھی نہیں آتے لہٰذا افضل ان کا دوست نہیں ہو سکتا۔۔۔ اوہ مجھے یاد آیا' شاید یہ بات آپ لوگوں کی دلچسپی کا باعث بنے۔ میں چوری چھپے افضل سے ملنے اس کے کمرے میں جایا کرتی تھی۔ ایک دو بار ایسا ہوا کہ جب میں کمرے کے دروازے پر پہنچی تو میں نے اندر سے بند پایا۔ میں دروازے سے کان لگا کر سنتی تو مجھے یوں لگتا جیسے وہ کسی سے گفتگو کر رہا ہو۔ اس نے میرے دستک دینے پر دروازہ کھول دیا لیکن مجھے وہاں کبھی کوئی دوسرا شخص نظر نہیں آیا۔ میرے پوچھنے پر وہ آئیں بائیں شائیں کر کے مجھے ٹال دیتا۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکی کہ وہ بند کمرے میں کس سے بات کرتا تھا؟''

نسیم کی بات سن کر مرزا اور صدیقی کے چہرے پر بہ یک وقت خوشی اور جوش کے جذبات ابھرے۔ انہوں نے فاتحانہ انداز میں ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا ''کچھ سمجھے بھائی ذوالفقار علی؟ نسیم بی بی کے اس بیان کا کیا مطلب ہے؟''

''ہاں' میں سمجھ رہا ہوں مرزا صاحب'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مرزا نے نسیم سے مخاطب ہو کر کہا۔

''تم بے حد ذہین لڑکی ہو' تم نے اپنی حاضر دماغی سے ہماری بے حد مدد کی ہے۔ تم نے ہمیں وہ سب کچھ بتا دیا جو ہم جاننا چاہتے تھے۔ اب ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ شخص افضل دراصل بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' کا کارندہ ہے۔''

''آ۔۔۔ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟'' نسیم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''مرزا کا کہنا بالکل صحیح ہے نسیم بہن!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ میں اس کے جذبات بخوبی سمجھ رہا تھا'' جو کچھ تم نے بتایا اس کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں۔ خاص طور پر تم نے اس

بدفطرت شخص افضل کے متعلق جو آخری بات بتائی اس سے پوری طرح واضح ہو چکا ہے کہ وہ حقیقت میں کون ہے اور کس ارادے سے تمہاری حویلی میں مقیم تھا۔'' میں نے اپنے ذہن میں مرتب شدہ نتیجے سے اسے آگاہ کیا۔

''کچھ مجھے بھی تو بتائیں کہ آپ لوگ یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' ڈاکٹر صنم نے حیرانی سے پوچھا۔

''نسیم بہن کے بیان پر غور کریں ڈاکٹر صاحبہ۔ اس شخص کا پراسرار رویہ اور بند کمرے میں کسی غیر موجود ہستی سے گفتگو۔۔۔! وہ شخص افضل دراصل را کا ایجنٹ ہے۔ وہ بھارتی ایجنسی ''را'' اور سردار شاہ مراد کے مابین رابطہ افسر کا کام سرانجام دیتا ہے۔ اس کے کمرے میں کوئی بہت ہی جدید اور طاقتور ٹرانسمیٹر سیٹ نصب ہوگا۔ اس ٹرانسمیٹر کے ذریعے وہ سردار شاہ مراد کی فراہم کردہ معلومات بھارت بھیجتا ہوگا۔ جبکہ بھارت سے بھیجے گئے احکامات اور پیغامات سردار شاہ مراد تک پہنچاتا ہوگا۔ نسیم بہن نے جس وقت اسے بند کمرے میں گفتگو کرتے سنا اس وقت وہ دراصل ٹرانسمیٹر پر بھارت میں اپنے افسران سے ہدایات لے رہا ہوگا۔'' میری باتیں سن کر نسیم پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ یک لخت وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ڈاکٹر صنم اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر اسے ہولے ہولے تھپکنے لگی۔

''بس کرو۔ میری بہن' جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اس بدبخت شخص نے تمہاری معصومیت سے فائدہ اٹھا کر تمہیں اپنے جال میں پھانس لیا۔ اس میں تمہارا کوئی قصور۔۔۔'' ڈاکٹر صنم نے اسے تسلی دینا چاہی۔

دفعتاً نسیم نے اس کی بانہوں سے اپنے آپ کو آزاد کرا لیا۔ اس کے چہرے پر غیظ و غضب کی سرخی تھی۔ اس لمحے وہ مجھے بپھری ہوئی شیرنی نظر آئی۔ اس نے دھیمی مگر ٹھوس آواز میں کہا۔

''میں۔۔۔ میں اس کمینے کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ میں اس ناپاک کافر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گی۔ اس نے۔۔۔ اس نے۔۔۔'' وہ ایک مرتبہ پھر بکھر گئی۔ اس کی آنکھوں سے ایک مرتبہ پھر آنسوؤں کی دھاریں بہنے لگیں۔

''تمہاری اس بے حرمتی کا ذمہ دار کسی حد تک تمہارا باپ بھی ہے نسیم بہن'' میں نے دھیمی آواز میں کہا ''اگر وہ اپنے مالی مفاد کی خاطر بھارت کا ایجنٹ نہ بنتا اور دشمن ملک کے کارندے کو اپنی حویلی میں جگہ نہ دیتا تو تمہیں اس سانحے سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔''

''میرے باپ کے پاس دولت کی کمی تو نہیں ہے پھر بھی وہ اس طرح کی غلیظ حرکات میں ملوث ہے۔ خدا جانے وہ اتنی دولت کا کیا کرے گا؟ اس کا اکلوتا بیٹا تو پہلے ہی زندہ درگور زندگی گزار رہا ہے اسے بھی شاید میرے باپ کے اعمال کی سزا ملی ہے۔''

''یہ معاملہ دولت کی کمی یا زیادتی کا نہیں بلکہ اس کی ہوس کا ہے۔ ایک عام انسان کو پیٹ بھرنے کے لیے محض دو روکھی سوکھی روٹی اور تن ڈھانپنے کے لیے چند گز موٹا جھوٹا کپڑا درکار ہوتا ہے جبکہ دولت کی ہوس کا شکار اگر لکھ پتی ہو تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ راتوں رات کروڑ پتی بلکہ عرب پتی بن جائے۔ تمہارا باپ اور اس قبیل کے تمام افراد اسی مرض کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھوں پر سونے

چاندی کی پٹی بندھی ہوتی ہے جس کے پار انہیں کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا۔"

"میں آپ لوگوں کے رو برو عہد کرتی ہوں کہ میں اپنے باپ کی بداعمالیوں کی ہر ممکن تلافی کی کوشش کروں گی لیکن پہلے میں اس غلیظ انسان افضل کے مکروہ وجود سے اس پاک دھرتی کا سینہ ہلکا کروں گی۔ آپ لوگ مجھے صرف چھد گھنٹوں کی مہلت دے دیں۔ میں۔۔۔"

"نہیں۔ نسیم بیٹی نہیں۔ اب یہ معاملہ اتنا سیدھا سادہ نہیں رہا ہے۔" مرزا نے سنجیدہ لہجے میں کہا" وہ شخص اپنی دانست میں تمہیں قتل کر چکا ہے لیکن اسے یہ اندیشہ بری طرح ستا رہا ہوگا کہ کہیں کوئی اس کی اس واردات سے آگاہ تو نہیں ہو گیا ہے۔ اس وقت وہ پوری طرح چوکنا اور محتاط ہوگا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کا اعلیٰ تربیت یافتہ رکن ہے۔ اسے اتنی آسانی سے قابو نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ اسے اس کے گھناؤنے کرتوتوں کی سزا نہیں ملے گی۔ اسے اپنی ایک ایک غلیظ حرکت کا حساب دینا ہوگا لیکن یہ کام تم تنہا نہیں کرو گی بلکہ ہم لوگ اس نیک کام میں تمہارے دوش بدوش ہوں گے۔ اسے سزا ضرور دی جائے گی لیکن یہ کام مکمل تنظیم کے ساتھ اور بھرپور منصوبہ بندی کے تحت کیا جائے گا۔"

نسیم چند لمحوں تک خاموشی سے کچھ سوچتی رہی پھر وہ دھیمے لہجے میں بولی" مجھے آپ کی رائے سے مکمل اتفاق ہے۔ میری زندگی کا مقصد اس موذی ناگ کی سرکوبی ہے۔ یہ کاروائی کسی طرح بھی مکمل ہو مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے تم کل صبح اپنی سوتیلی ماں کے میکے چلی جاؤ۔ اپنی ماں کو سمجھانا کہ تم ڈاکٹر صنم سے اپنا علاج کرا رہی ہو اور مزید ایک دو دن ڈاکٹر صنم کے زیر تشخیص رہنے پڑے گا اور ہاں اپنی ماں کو ہرگز نہ بتانا کہ تم ایک بار پھر اس غلیظ شخص کے پاس گئی تھیں اور اس نے تمہیں زہر دے کر ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"ٹھیک ہے، میں آپ کی ہدایات پر مکمل عمل کروں گی" نسیم نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ڈاکٹر صنم اسے دوا وغیرہ کھلانے لگی۔ ہم تینوں دوسرے کمرے میں آ گئے۔

"ہم لوگوں کو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہیے بھائی ذوالفقار علی" کمرے میں پہنچتے ہی مرزا نے پر جوش انداز میں میرے شانے تھام لیے۔ "یہ لڑکی ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر نازل ہوئی ہے۔ اس کی فراہم کردہ قیمتی معلومات سے ہمارے لیے اپنی آئندہ کی حکمت عملی طے کرنا خاصا آسان ہو گیا ہے۔"

"یہ سب آپ کی معاملہ فہمی کا نتیجہ ہے مرزا صاحب۔ واقعی تجربے کا بدل کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ نے فوراً بھانپ لیا کہ یہ لڑکی ہمارے کام آ سکتی ہے۔ جبکہ ہمارا اس طرف دھیان ہی نہ جا سکا" میں نے پوری دیانت داری سے اس کی تعریف کی۔ "اب ہمیں اپنی آئندہ کی کاروائی کی منصوبہ بندی کرنا چاہیے۔ یہ بندہ افضل ہمارے ہتھے چڑھ جائے تو ہماری بے شمار مشکلات دور ہو سکتی ہیں۔"

"وہ تو صحیح ہے لیکن اس کو پکڑ کر لانا بھی تو بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اگر اس پر ذرا بھی اوچھا ہاتھ پڑا

تو یہ چکنی مچھلی کی طرح ہاتھ سے پھسل جائے گا" صدیقی نے اپنی رائے ظاہر کی" کام چاہے مشکل ہو یا آسان بہرحال ہمیں کرنا تو ہے اگر یہ بندہ ہماری گرفت میں آ جائے تو ہم اس سے بے شمار معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بھارتی ایجنسی اور سردار شاہ مراد کے مابین رابطے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ ان معاملات میں اس سے زیادہ واقف حال کوئی شخص نہیں ہو سکتا۔ میں اس شہر میں واقع سردار شاہ مراد کی حویلی کے پورے حدود اربعہ سے واقف ہوں اگر وہ شخص اس حویلی میں پوشیدہ ہے تو ہم بغیر کسی کی رہنمائی کے اس حویلی پر دھاوا بول سکتے ہیں۔ البتہ اس دوران میں ہمیں شدید مزاحمت کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا ہوگا" میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"اس کا مطلب ہے ہم ابھی اور اسی وقت منصوبے کی تیاری شروع کر سکتے ہیں۔ تو پھر نیک کام میں دیر کیسی؟ ذوالفقار؟ تم ایک کاغذ اور قلم لے آؤ۔ ہم اہم پوائنٹس پر فرداً فرداً بحث کریں گے۔ رہنمائی کا فریضہ چونکہ ذوالفقار انجام دے گا۔ لہٰذا اس مہم کی لیڈر شپ بھی اسی کا حق ہے" مرزا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ میں نے احتجاج کرنا چاہا لیکن میری ایک نہ چلی۔ جمہوریت کے اکثریتی اصول کے تحت مجھے ان کی بات ماننا پڑی۔

ہم نے اپنی مہم کی منصوبہ بندی کی ابتدا میں ان راستوں کا انتخاب کیا جن پر سے گزر کر ہم سردار شاہ مراد کی حویلی تک پہنچتے اور اپنی کاروائی میں کامیابی کے بعد واپسی کا سفر طے کرتے۔ میں نے اپنی یاداشت اور عملی تجربے کی بنیاد پر ایسے راستوں کا تعین کیا جن پر پولیس سے مڈبھیڑ کا کم سے کم امکان تھا۔ نقل و حمل کے ذریعے کے لیے فیصلہ ہوا کہ ڈاکٹر صنم کی چھوٹی سی گاڑی اس مہم کے لیے مناسب نہیں ہے۔ لہٰذا ایک طاقتور انجن والی گاڑی کے انتظام کا فیصلہ کیا گیا۔

ہم لوگوں کے پاس ہتھیاروں میں ایک ایم پی فائیو سب مشین گن اور ایک کولٹ پستول موجود تھا۔ ڈاکٹر صنم کا اعشاریہ دو دو کا ننھا سا پستول ملا کر ہمارے پاس ہتھیاروں کی تعداد تین ہو جاتی ہم نے فیصلہ کیا کہ مہم کی نوعیت کے لحاظ سے یہ ہتھیار کافی ہیں کیونکہ ہمیں مسلح تصادم سے ہر ممکن گریز کرنا ہے۔ ڈاکٹر صنم اور نسیم کی اس مہم میں شمولیت کو غیر ضروری کرار دیا گیا۔ غیر متوقع اور ہنگامی حالات میں کی جانے والی کاروائی کے اصول طے کیے گئے۔ میں نے کاغذ پر نقشوں اور خاکوں کی مدد سے حویلی کے محل وقوع اور اندرونی ساخت سے آگاہ کیا حویلی کے انتظامات اور ان کی خامیوں کے متعلق بتایا۔ مہم کا سرسری سا خاکہ تیار کرنے کے بعد ہم نے اس کے کمزور پہلوؤں پر تبادلہ خیال کیا۔ ناکامی کے امکانات کا جائزہ لیا گیا۔

آخر کار ہم اس رائے پر متفق ہو گئے کہ اس مہم پر ہماری کامیابی کے امکانات خاصے روشن ہیں بشرطیکہ کوئی بہت ہی غیر متوقع صورت حال پیش نہ آ جائے۔ اس مہم کا بنیادی مقصد افضل کا اغوا طے کیا گیا اگر اس دوران میں کوئی دشواری پیش آئی تو ہمیں اسے قتل کر دینا تھا مگر یہ اسی صورت میں ہوتا جب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ بچتا۔ منصوبے کی تقریباً تمام تفصیلات طے کرنے کے بعد ہم لوگ اپنے اپنے بستروں پر پہنچ گئے۔

اگلے روز صبح میں دیر سے بیدار ہوا۔ مجھے ناشتا دیتے ہوئے ڈاکٹر صنم نے بتایا کہ اس نے نسیم کو رخصت کر دیا ہے۔ وہ آج شام یا کل صبح تک واپس آجائے گی۔ ناشتے کے بعد میں نے مرزا اور صدیقی سے مشورہ کر کے ڈاکٹر صنم کو اپنے مجوزہ منصوبے کے متعلق بتایا۔ ڈاکٹر صنم نے اصرار کیا کہ اسے بھی مہم میں شامل کیا جائے لیکن اس کی بات کو نہایت نرمی سے مسترد کر دیا گیا۔ منصوبے کی جزیات سے آگاہ ہونے کے بعد ڈاکٹر صنم نے چند مشورے دیے۔

ان میں سے چند کو مفید پا کر ہم نے اپنے منصوبے میں چند معمولی تبدیلیاں کر لیں۔ مرزا نے چند اشیا کی فہرست بنا کر ڈاکٹر صنم کے حوالے کر دی۔ جو اسے بازار سے خرید کر لانی تھیں۔

ڈاکٹر صنم شہر کی طرف گئیں اور مطلوبہ سامان خرید کر واپس آ گئی۔ سہ پہر کے بعد میں گھر سے باہر نکل آیا۔ مجھے رات کی مہم کے لیے کسی مناسب گاڑی کو تاڑنا تھا۔ خاصی دیر کی آوارہ گردی کے بعد بالآخر میں نے اپنے مطلب کی گاڑی ڈھونڈ نکالی۔ ڈبل کیبن کی وہ فور وہیل ڈرائیو ہائی لکس مجھے ایک خستہ حال سے آئل ملز کے احاطے میں کھڑی نظر آئی۔ آثار و شواہد سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ گاڑی رات کے وقت بھی یہیں موجود ہوتی ہے۔ اس ملز کے ارد گرد کے ماحول اور دیگر تفصیلات کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے بعد میں واپس ڈاکٹر صنم کے گھر لوٹ آیا۔

مرزا، صدیقی کے چہرے پر ایک گنجلک قسم کی داڑھی چپکا رہا تھا۔ میں نے ان دونوں کو اپنی کارکردگی سے آگاہ کیا۔ مرزا، صدیقی کے میک اپ سے فارغ ہوا۔ مجھے صدیقی کی نئی شکل کچھ ایسی مضحکہ خیز نظر آئی کہ میں باوجود کوشش کے اپنے قہقہے کو نہ روک سکا۔ میرے اس طرح بے تحاشا ہنسنے سے صدیقی بے حد کھسیانا ہو گیا۔ مرزا اور ڈاکٹر صنم کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ صدیقی کے بعد مرزا نے مجھے اپنے سامنے بٹھا لیا۔

کچھ ہی دیر بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ مرزا میرے چہرے کا حال صدیقی کے چہرے سے بھی زیادہ برا کرنے والا ہے۔ اس کے ساتھ ہی صدیقی کے بلند آہنگ قہقہوں نے میرا احاطہ کر لیا۔ مرزا کے ہاتھ کی ہر جنبش پر اس کا فلک شگاف قہقہہ بلند ہوتا۔ اس ترنت جواب سے میں بے حد کھسیانا ہوا۔ کچھ ہی دیر بعد میرے چہرے پر بھی سیاہ رنگ کی، جھاڑ جھنکار قسم کی داڑھی اگ آئی۔ اس نے میری بھنوؤں کو بھی گہرا کر کے آپس میں جوڑ دیا۔ میک اپ مکمل کرنے کے بعد مرزا تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لینے لگا۔

''دیکھتے کیا ہیں، مرزا صاحب بس دو سینگوں کی کمی ہے۔ وہ بھی نصب کر دیں'' میں نے مظلومیت بھرے لہجے میں کہا۔ ان تینوں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ ہمارے میک اپ سے فارغ ہونے کے بعد مرزا نے اپنا میک اپ شروع کیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم پر واضح ہو گیا کہ مرزا آج پوری طرح شرارت کے موڈ میں ہے۔ اپنے میک اپ پر شاید اس نے اپنی تمام تر مہارت صرف کر دی۔ جب اس نے اپنا میک اپ مکمل کیا تو ہمارے سامنے کسی رومانی فلم کا وجیہہ و شکیل ہیرو بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس کی آن بان دیکھ کر صدیقی اور میں تلملا کر رہ گئے۔ ''ہم لوگوں کو کیا اپنا محافظ دیو سمجھ رکھا ہے، شہزادہ گل فام صاحب؟''

''تمیز سے بات کرو کالا دیو صاحب۔ اتنی جلدی بھول گئے کہ آج سے چند دن پہلے ہم تم جیسے نا

خلف بیٹوں کے ضعیف باپ رہ چکے ہیں۔ ہم نے تو کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔''

''ٹھیک ہے بھائی۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ بندر کو ملی ہلدی کی گرہ تو وہ پنساری بن بیٹھا۔ بس وہی حال تمہارا ہے لیکن یاد رکھو بھائی چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات، کبھی تو ہماری باری آئے گی بچو'' اس کی جلتی جھلستی باتوں کا مرزا نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس اپنی دلکش مسکراہٹ بکھیرتا رہا۔

''ڈاکٹر صنم ایک لمحے کے لیے اندیشے کا شکار ہوئی کہ شاید ہم لوگوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہونے والی ہے لیکن مرزا اور میرے چہرے پر موجود مسکراہٹ نے اس کے اس اندیشے کی تردید کر دی۔ وہ بھی کھل کر مسکرانے لگی۔ ہم تینوں کو مسکراتے دیکھ کر صدیقی شرمندہ سا ہو گیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور گفتگو کا موضع بدل دیا'' میرا خیال ہے اب اپنی مہم کی تیاری شروع کی جائے۔ ساری چیزیں چیک کر لیں۔ نصف شب کے بعد ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔''

''صدیقی کی بات سن کر ہم سب لوگ سنجیدہ ہو گئے۔ میں نے ڈاکٹر صنم کا پوائنٹ ٹو ٹو کا پستول اس سے مانگ لیا۔ میں نے اس کے ننھے سے میگزین کو گولیوں سے خالی کر کے اس میں نئی گولیاں بھر لیں۔ وہ پستول میں نے مرزا کے حوالے کر دیا اور پھر اپنے کولٹ پستول کا جائزہ لینے لگا۔ صدیقی اپنی ایم پی فائیو کو چیک کر رہا تھا۔ اپنا پستول میں نے نہایت احتیاط سے اپنی شلوار کے نیفے پر بندھی ہوئی چمڑے کی بیلٹ میں اڑس لیا۔ صدیقی نے کوٹ پہننے کے بعد اپنی ایم پی فائیو کو اپنے کوٹ میں چھپا لیا۔

جوں جوں ہماری روانگی کا وقت قریب آتا گیا۔ ڈاکٹر صنم کے اضطراب میں اضافہ ہوتا گیا۔ جب ہم روانگی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تو اس کا اضطراب اپنی آخری حدوں کو چھونے لگا'' اگر مجھے اس معاملے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا تو میں آپ لوگوں کو ہرگز نہ جانے دیتی مگر مجبوری ہے، اس صورت میں آپ کو روکنا ملک و قوم کے مفاد کے خلاف ہے۔ خدا کا نام لے کر اپنی مہم پر روانہ ہوں۔ رب کریم سے دعا ہے کہ آپ لوگ کامیاب و کامران واپس لوٹیں اور۔۔'' اس کی آواز بھرانے لگی ہمیں گیٹ سے رخصت کرنے کے بعد بھی وہ دیر تک وہاں کھڑی رہی۔

کھلی فضا میں آتے ہی مجھے اپنی تمام تر حسیات بیدار ہوتی محسوس ہوئیں۔ ایک بار پھر ایک خطرناک مہم میری منتظر تھی۔ اس شہر کے چپے چپے پر دشمنوں کی خوں خوار آنکھیں ہماری راہ تک رہی ہیں۔ ہماری کوئی بھی لغزش آخری ثابت ہو سکتی ہے۔ ہم اگر اپنی طرف سے کوئی غلطی نہ بھی کریں تو قسمت کی معمولی سی بے مہر ہوا ہماری ساری محنت کو خشک پتوں کے مانند بکھیر سکتی ہے۔ مرزا اور صدیقی کی بھی یقیناً یہی کیفیت رہی ہو گی۔

اپنی مطلوبہ آئل ملز کی جانب بڑھتے ہوئے میں نے حتی الوسع کوشش کی ہم اندھیرے اور ویران راستے سے آگے بڑھیں۔ ہماری خوش قسمتی کہ راستے میں کسی سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ ملز کے گیٹ پر ایک مریل سا زرد رو بلب روشن تھا۔ میں نے گیٹ پر کان لگا کر اندر کی سن گن لینے کی کوشش کی لیکن مجھے کسی قسم کی آواز سنائی نہ دی۔ سوائے جھینگروں کی آوارہ سیٹیوں کے۔ مرزا نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے ایک طرف متوجہ کیا۔ اس طرف چار دیواری خاصی نیچی تھی۔ میں نے استفہامیہ انداز میں گردن ہلائی اور اس

طرف بڑھ گیا۔ میں نے دیوار کے پاس پہنچ کر پنجوں کے بل اٹھ کر اندر جھانکا۔ مجھے ہر طرف سناٹے اور اندھیرے کی حکمرانی نظر آئی۔ بغور دیکھنے پر مجھے اپنی مطلوبہ ڈبل کیبن والی ہائی لکس گاڑی نظر آ گئی۔ اسے گیٹ سے ذرا ہٹ کر دیوار کے ساتھ کھڑا کیا گیا تھا۔

میں نے گردن کا اشارہ کر کے مرزا اور صدیقی کو اطمینان دلایا اور دیوار پر ہاتھ جما کر دیوار پر چڑھنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مرزا نے اشارے سے مجھے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ میں نے استفہامیہ نظروں سے اس جانب دیکھا۔ اس نے اپنی ایک جیب سے رومال نکالا اور دوسری جیب سے کلوروفام کی بوتل نکال کر اسے رومال پر چھڑکنا شروع کر دیا۔ رومال اچھی طرح تر کرنے کے بعد اس نے میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اسے بھی قمیص کے نیچے بیلٹ میں اڑس لیا۔

میں نے دیوار پر ہاتھ رکھ کر جست لگائی اور ایک جھٹکے سے دیوار پر پہنچ گیا۔ دیوار پر پہنچ کر میں نے ایک بار پھر بغور احاطے کے اندر کا جائزہ لیا۔ گیٹ سے ذرا ہٹ کر ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی۔ سامنے ہی ملز کی اصل عمارت تھی جو اس وقت مکمل اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ احاطے کے دوسرے سرے پر تقریباً سو گز کے فاصلے پر تین چار چھوٹے چھوٹے نیم پختہ کوارٹر نما گھر بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کے دروازے کے سامنے چھوٹا اور کم طاقت کا بلب روشن تھا۔

ہر طرف مکمل سکوت کی کیفیت پا کر میں بے آواز، دیوار سے اندر اتر گیا۔ میں بغور چاروں طرف کا جائزہ لیتا دبے پاؤں گیٹ کی جانب بڑھا کوٹھری کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں مزید محتاط ہو گیا۔ کوٹھری کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کوٹھری کے اندر مکمل تاریکی تھی۔ وہ کوٹھری یقیناً چوکیدار کی رہی ہو گی۔ اس لمحے وہ شاید اپنے فرض کے تقاضے نبھاتے ہوئے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا ہو گا۔ میں گیٹ کی طرف بڑھا تا کہ اسے کھول کر مرزا اور صدیقی کو اندر بلا سکوں۔

گیٹ کے اندرونی کنڈے پر نظر پڑتے ہی میں ایک جھٹکے سے رک گیا۔ کنڈے میں ایک بھاری بھر کم قسم کا قفل لگا ہوا تھا۔ اس قفل کو توڑنا تو شاید جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ اسے اچھی طرح جانچنے کے بعد میں ہائی لکس گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔ گاڑی کا دروازہ بڑی آسانی سے کھل گیا لیکن اس کے ساتھ ہی کیبن کی اندرونی لائٹ بھی روشن ہو گئی۔ میں نے نہایت پھرتی لیکن احتیاط سے دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ اس معمولی سے وقفے میں، میں نے دیکھ لیا کہ گاڑی کی اگنیشن میں چابی نہیں ہے۔ میرے ذہن پر چھائی ہوئی مایوسی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ مجھے اپنے سارے کیے کرائے پر پانی پھرتا نظر آیا۔

مجھے اپنے مشاہدے کی کمزوریوں کا بری طرح احساس ہوا۔ یہ سب تو میں نے سوچا ہی نہ تھا۔ فرض کیا گیٹ کی چابی چوکیدار کے پاس ہو بھی تو اس گاڑی کی چابی میں کہاں ڈھونڈوں گا۔ ایک بار تو میرے جی میں آیا کہ میں دیوار پھاند کر واپس چلا جاؤں اور ان دونوں کو بتا دوں کہ یہاں ہماری دال گلنے والی نہیں ہے لیکن پھر میں نے اس خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ بغیر کوشش کیے شکست تسلیم کرنا تو سراسر بزدلی ہے۔

میں ایک نئے حوصلے سے کوٹھری کے بند دروازے کی طرف بڑھا۔ اپنا پستول ہاتھ میں لینے کے بعد میں نے نہایت آہستگی سے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں تک کمرے کے اندر سے کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہ ہوا۔ مجھے اپنی رگوں میں لہو کی گردش تیز ہوتی محسوس ہوئی۔ کہیں چوکیدار مشکوک تو نہیں ہو گیا؟ اگر یہ اسلحے سے لیس ہوا تو؟

میں نے ایک بار پھر دروازے پر دستک دی۔ اس مرتبہ میں نے جان بوجھ کر ذرا زیادہ طاقت صرف کی۔ یک لخت مجھے کوٹھری سے کسی کے کھسر پھسر کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے لمحے بھر میں دو نتائج اخذ کیے۔ اول یہ کہ کوٹھری میں ایک سے زیادہ لوگ ہیں۔ دوم وہ مشکوک ہو چکے ہیں کہ اتنی رات گئے کون دروازہ کھٹکانے آ گیا۔ اب وہ دبی آواز میں ایک دوسرے سے صلاح مشورے کر رہے ہیں کہ انہیں کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے۔

میرے دماغ نے پلک جھپکتے میں ایک فیصلہ کر لیا۔ میں چند قدم پیچھے ہٹا اور تیزی سے دوڑتے ہوئے پوری قوت سے اپنا شانہ دروازے سے ٹکرایا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور درواز ایک جھٹکے سے چوپٹ کھل گیا۔ میری ٹکر نے اس کی اندرونی چٹخنی وغیرہ اکھاڑ پھینکی تھی۔ میں پستول سنبھالتا درانہ وار اندر گھستا چلا گیا۔ پہلی نظر میں مجھے معلوم ہو گیا کہ کمرے میں مکمل تاریکی نہیں ہے۔ مجھے کمرے کے کونے میں ایک شمع روشن نظر آئی۔

مجھے اگلے لمحے شمع کے نزدیک فرش پر موجود دو انسانی وجود بھی نظر آ گئے۔ اس لمحے وہ دونوں اپنے فطری لباس میں تھے۔ شمع کی روشنی میں ان کے جسم پسینے سے چمک رہے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی عورت کے حلق سے اضطراری چیخ نکلی۔ اس نے وحشیانہ پھرتی سے کسی کپڑے سے خود کو ڈھانپنا چاہا۔ اس کا اپنا لباس اس کی پہنچ سے دور تھا۔ اس نے نزدیک پڑی چادر سے خود کو چھپانا چاہا۔ وہ چادر دراصل اس کے قریب پوٹلی بنے مرد کی دھوتی تھی۔ وہ شخص پھٹی پھٹی آنکھوں اور کھلے منہ سے مجھے تکتا رہا۔ یک لخت اسے بھی اپنی عریانی کا خیال آ گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اس عورت سے اپنی دھوتی چھین لی۔ وہ عورت ایک مرتبہ پھر الف ہو کر رہ گئی۔ اس کے حلق سے ایک مرتبہ پھر گھٹی گھٹی چیخیں نکلیں۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے پسینہ پسینہ وجود کو چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ اس کوشش میں وہ کچھ اور عیاں ہو گئی۔

اس لمحے مجھے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں وحشی ہرنی کی سی دہشت نظر آئی۔ وہ قدرے پکی عمر کی سانولی سی عورت تھی لیکن اس کا جسم کسی نوجوان لڑکی سے بڑھ کر شاداب تھا۔ اس کا ساتھی اسے اسی حالت میں چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور دھوتی کو اپنی کمر کے گرد لپیٹنے لگا۔ وہ تقریباً چالیس برس کا موٹا تازہ بھاری بھر کم کلین شیو شخص تھا۔ مجھے اس کے ہاتھوں میں بڑی واضح لرزش نظر آئی۔ وہ دہشت زدہ آنکھوں اور سفید چہرے سے میرے ہاتھ میں موجود پستول پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے دل میں شرمندگی کا احساس پیدا ہوا کہ شاید میں نے غیر ارادی طور پر ایک شادی شدہ جوڑے کی خلوت میں مداخلت کی ہے۔ لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرا ابتدائی تاثر غلطی تھا۔

وہ دونوں میاں بیوی نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ شہری بابو ٹائپ کا ڈھیلا ڈھالا گورا چٹا شخص تھا جبکہ وہ عورت مجھے واضح طور پر غریب قسم کی دیہاتن نظر آئی۔ ان دونوں نے چارپائی کے ہوتے ہوئے زمین کو اپنا تختہ مشق بنا رکھا تھا تاکہ چارپائی کی چرچراہٹ ان کی خرمستیوں کی چغلی نہ کھا سکے۔ مزید احتیاط کے طور پر انہوں نے کمرے میں موجود بلب کے بجائے ایک چھوٹی سی موم بتی سے کام چلانا چاہا تاکہ کمرے کے باہر سے کمرے میں اندھیرا نظر آئے۔ اس عورت کے کپڑے مجھے چارپائی کی پائنتی پر پڑے نظر آئے۔ میں نے تھر تھر کانپتے دھوتی پوش شخص پر نظر ڈالتے ہوئے ان کپڑوں کو اٹھا کر اس عورت کی طرف پھینک دیا۔ وہ جلدی جلدی الٹے سیدھے کپڑے اپنے بدن پر چڑھانے لگی۔

ان کی حالت نے مجھے یقین دلا دیا کہ وہ دونوں آپس میں صرف اور صرف گناہ کا رشتہ رکھتے ہیں۔ اس طرح رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے باعث ان کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ اس غیر متوقع صورت حال کے باعث چند لمحے کے لیے میرا دماغ بھی شل ہو کر رہ گیا تھا۔ رفتہ رفتہ میں نے اپنی حالت پر قابو پا لیا۔ وہ دونوں بھی خاصی حد تک اپنے حواس میں واپس آ گئے۔ عالم نشاط کے بعد یہ دہشت ناک منظر ان کے اعصاب پر بجلی بن کر گرا ہوگا۔ بالآخر دھوتی پوش کے پلپلے جسم کی لرزش میں کمی آئی اس نے اپنی ہمت مجتمع کر کے سوال کیا۔

''تت۔۔۔تم کون ہو؟ اور یہاں۔۔۔''

'بکواس بند کرو'' میں نے گرج دار لہجے میں کہا ''سوال صرف میں کروں گا جواب تم دونوں دو گے'' اس شخص کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ تھوک نگل کر خاموش ہو گیا۔ میں نے عورت پر نظر ڈالی۔ وہ گدے پر اکڑوں بیٹھی دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ میں نے اسے مخاطب کر کے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

''تم کون ہو بی بی اور یہاں کیسے پھنس گئی ہو؟''

''یہ۔۔ یہ میری بیوی ہے۔۔تم۔۔تم۔۔'' اس عورت کے بجائے دھوتی پوش نے جواب دیا۔

''تم بکواس بند کرو'' میں نے غضب ناک لہجے میں کہا اور اپنے پستول کی نال کا رخ سیدھا اس کی دونوں آنکھوں کے بیچوں بیچ کر دیا ''اب ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو۔۔۔تم جواب دو عورت۔۔ یہ شخص کون ہے۔۔تم نے ایک منٹ کے اندر اندر جواب نہیں دیا تو میں تم دونوں کو ختم کر دوں گا' سمجھے تم ؟'' میرے لہجے میں موجود درندگی کی جھلک نے انہیں لرزا کر رکھ دیا۔ دھوتی پوش شخص تھوک نگل کر اس عورت کی طرف متوجہ ہوا۔ اس عورت نے اس سے آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔

''یہ۔۔سعادت علی ہے۔۔مل کا منیجر۔۔اور میں۔۔میں۔۔'' اس کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔

''ہاں' ہاں بتاؤ کون ہو تم ؟'' میں نے اس کی ہمت بندھائی۔

''میں۔۔چچ۔۔چوکی دار کی بیوی ہوں'' اس نے دھیمی آواز میں کہا اور اس کی آنکھیں خود بہ خود جھکتی چلی گئیں۔ میں نے خونی نظروں سے سعادت علی کی جانب دیکھا۔ اس کا چہرہ یک دم پھیکا پڑ گیا اور اس کی پیشانی پر ایک بار پھر پسینہ چمکنے لگا۔ وہ مجھ سے آنکھیں نہ ملا سکا۔ میں ایک بار پھر چوکی دار کی

بیوی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تمہارا شوہر کہاں ہے؟''

''اسے اس نے ملتان بھیج دیا ہے شراب لانے کے لیے۔''

''اچھا تو یہ بات ہے؟'' میں نے گردن ہلا کر کہا '' کتنے پیسوں میں خریدی ہے اس نے تمہاری عزت؟'' میرا سوال سن کر اس نے ایک بار پھر کمرے کے فرش پر نظریں گاڑ دیں ''سنا نہیں تم نے' میں کیا پوچھ رہا ہوں؟''

''یہ سس۔۔سو روپے دیتا ہے'' اس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

''ہوں! تو گویا یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ اس عورت کے جھکے ہوئے سر اور بند زبان نے میرے سوال کی تائید کر دی۔ غصے اور نفرت سے مجھے اپنا لہو کھولتا محسوس ہوا۔ ''شرم نہیں آتی تم لوگوں کو؟ تم۔۔تم بہت ہی قابل نفرت عورت ہو۔ ذرا سوچو کبھی تمہارے شوہر کو تمہاری اس حرکت کا پتا چلے گا تو وہ تمہارا کیا حشر کرے گا؟'' اس عورت نے ایک عجیب سی نظر مجھ پر ڈالی پھر وہ استفہامیہ نظروں سے سعادت علی کو دیکھنے لگی۔ سعادت علی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''غلام فرید کو سب معلوم ہے'' اس کی بات سن کر مجھے یک لخت چکر سا آ گیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔

''یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟'' میں نے طیش اور حیرانی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' سعادت علی نے جواب دینے کے بجائے امداد طلب نظروں سے اس عورت کی طرف دیکھا۔ قدرے توقف کے بعد اس عورت نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''سعادت بابو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میرے مرد کو پتا ہے کہ سعادت بابو اسے ملتان کیوں بھیج رہا ہے۔'' اس کے الفاظ مجھے اپنے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ بن کر اترتے محسوس ہوئے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کوئی شخص اس قدر بے غیرت بھی ہو سکتا ہے۔

''تم۔۔تم دونوں میاں بیوی یہ۔۔ یہ بے غیرتی۔۔''

''یہ بے غیرتی نہیں مجبوری ہے۔'' اس عورت نے تیکھے لہجے میں میری بات کاٹ دی۔

''کیسی مجبوری؟'' میں نے تیز لہجے میں کہا ''ایسی کون سی مجبوری ہے جس نے تمہیں اپنی عزت اور تمہارے شوہر کو اپنی غیرت نیلام کرنے پر مجبور کر دیا؟''

''اس مجبوری کا نام ہے اولاد۔۔ میرے سات بچے ہیں۔۔ سات سو روپے میں ہم ان کا پیٹ کہاں سے بھریں۔'' یک لخت اس عورت کی آواز پھٹنے لگی۔ ''میری عزت میرے بچوں کی زندگی سے بڑھ کر تو نہیں ہے؟ ہفتہ دس دن میں سعادت بابو غلام فرید کو ملتان بھیج دیتا ہے۔ سو روپے اسے ملتے ہیں۔'' اس جاہل گنوار عورت کی زہریلی باتوں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔

مجھے پستول پر اپنی گرفت کمزور پڑتی محسوس ہوئی۔ میرے دل میں آئی کہ میں ان دونوں کو وہیں گولی مار دوں لیکن پھر میری آنکھوں میں سات ننھی جانوں کے عکس ابھرے۔ میرے سات بچے ہیں۔

سات سو روپے میں ہم ان کا پیٹ کیسے بھریں؟ یک لخت مجھے یوں لگا جیسے وہ عورت ایک محنت کش مزدور ہے اور وہ موٹا سعادت علی اس کا آجر۔ اپنے بچوں کی زندگی کے لیے ایک ماں اپنا خون پسینہ بہا سکتی ہے تو اپنی عزت کیوں نہیں؟ فاقے کی حالت میں تو مردار بھی حلال ہو جاتا ہے۔ یہ تو سیدھا سیدھا طلب اور رسد کا معاملہ ہے۔ سعادت علی اگر کوئی خدمت حاصل کرتا ہے تو اس کا پورا معاوضہ بھی دیتا ہے۔ یہ زبردستی تو نہیں کرتا پھر اسے کیسے مورد الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ مجھے ان سے کیا لینا دینا ہے؟ میں کوئی مصلح قوم تو نہیں ہوں جسے تمام لوگوں کے چال چلن کی فکر لاحق ہو۔

ان دونوں کو ختم کر دینے سے دنیا سے بدکاریوں کا ارتکاب رک تو نہیں جائے گا۔ یہ سلسلہ تو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ میں سر جھٹک کر حقیقت کی دنیا میں واپس آ گیا۔ وہ دونوں مجھے رحم طلب اور امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں شاید اسی شش و پنج میں تھے کہ میں کون ہوں اور اس طرح اچانک خدائی فوج دار بن کر کہاں سے آن ٹپکا ہوں اور میرے ارادے کیا ہیں۔ میری شکل و صورت تو ویسے بھی اس وقت کسی خوں خوار وحشی جیسی بنی ہوئی تھی۔

میں چند قدم آگے بڑھا۔ سعادت علی کے عین روبرو پہنچ کر میں نے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ وہ جانے کیا سمجھ کر یک لخت خوف زدہ ہو گیا۔ اس کے جسم پر تیز لرزہ طاری ہو گیا۔ ''ابے مرتا کیوں ہے؟ میں تجھے کھا تو نہیں جاؤں گا؟'' میں نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔ اس کی حالت ایک بار پھر سنبھلنے لگی۔ ''یہ بتا کارخانے کے گیٹ کی چابی کہاں ہے؟'' میں نے سوال کیام۔ وہ خاصی دیر میں میری بات سمجھا۔ اس نے بغیر دیکھے قریبی دیوار کی طرف انگلی اٹھا دی۔ میں نے دیکھا کہ وہاں پر ایک کیل میں چابیوں کا ایک چھوٹا سا گچھا لٹک رہا ہے۔

''اب یہ بھی بتاؤ کہ گاڑی کی چابی کہاں ہے؟''

''گاڑی کی چابی۔۔؟ وہ تو گل محمد کے پاس ہوتی ہے۔ ڈرائیور کے پاس؟''

''اور یہ گل محمد کہاں ہوتا ہے؟'' میں نے قدرے مایوسی سے پوچھا۔

''وہ ادھر کوارٹر ہے اس کا۔۔۔'' سعادت علی نے نہایت سعادت مندی سے جواب دیا۔ اس کے جواب نے میری مایوسی میں اور اضافہ کر دیا۔ مجھے گاڑی کی چابی کا حصول لحہ بہ لمحہ دشوار ہوتا نظر آ رہا تھا۔

''تم دونوں ادھر دیوار کے پاس کھڑے ہو جاؤ'' میری جانب پشت کر کے!'' میں نے انہیں حکم دیا۔ ''خبردار مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہ کرنا۔'' سعادت علی کو یقین ہو گیا کہ میں اسے گولی مارنے والا ہوں۔ وہ یک لخت میرے قدموں میں گر پڑا۔

''خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ مجھے اپنے بچوں کی قسم میں آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔ بس ایک بار مجھے معاف کر دو۔ مجھے گولی مت مارو۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔'' وہ بری طرح گڑبڑا رہا تھا۔ اس کے پھولے پھولے گال آنسوؤں سے بھیگ رہے تھے۔

''چھوٹے چھوٹے بچے تو اس عورت کے بھی ہیں جنہیں پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں ملتی۔'' میں نے زہر خند کے ساتھ کہا۔

''میں۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔۔ قسم کھاتا ہوں کہ غلام فرید کی تنخواہ دگنی کر دوں گا۔ اس عورت کو بھی مل میں نوکری دے دوں گا۔ خدا کے لیے بس ایک بار معاف کر دو۔''

''معافی ہی مانگنا ہے تو اپنے خدا سے مانگو۔ میں تمہیں آج گولی نہ بھی ماروں تو کوئی اور مظلوم اور بے بس شخص تمہاری جان لے لے گا۔ ہر ایک شخص غلام فرید کی طرح بے شرم بے غیرت نہیں ہوتا۔ عزت کی خاطر جان پر کھیل جانے والوں کی بھی کمی نہیں ہے سعادت علی۔ ایسا نہ ہو تم ایسے ہی کسی غیرت مند شخص کے ہتھے چڑھ جاؤ۔''

''میں۔۔ میں قسم کھا چکا ہوں کہ۔۔۔''

''اچھا اچھا اب تم دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ بے فکر رہو تمہیں قتل نہیں کروں گا۔'' اس نے جھجکتے ہوئے میری ہدایت پر عمل کیا۔ جوں ہی اس کی پیٹھ میری طرف ہوئی میں نے اپنے پستول کے دستے سے اس کی کھوپڑی بجا دی۔ وہ تیورا کر گرا اور فوراً بے ہوش ہو گیا۔ اسے گرتے دیکھ کر اس عورت نے دبی دبی سی چیخ ماری۔ قبل اس کے کہ وہ مزید شور مچاتی' میں نے اسے اپنی بانہوں میں دبوچ لیا۔ کلوروفارم میں بھیگے رومال نے چند ہی لمحوں میں اسے ہوش و خرد کے جھنجھٹوں سے نجات دلا دی۔ میں نے اسے احتیاط سے فرش پر ڈال دیا۔ عین اسی وقت مجھے چارپائی کے سرہانے سعادت علی کا بقیہ لباس نظر آیا۔ تلاشی لینے پر اس کی قمیض کی جیب سے ساڑھے چار ہزار کی رقم ملی۔ وہ رقم میں نے اس عورت کی قمیص کی جیب میں ٹھونس دی۔ میں نے سعادت علی کو گھسیٹ کر چارپائی پر ڈال دیا۔

اب اس عورت کی باری تھی۔ اسے میں نے اٹھا کر کاندھے پر لاد لیا۔ کوٹھری کو باہر سے آ کر میں رہائشی کوارٹروں کی طرف بڑھنے لگا۔ کوارٹروں سے کچھ فاصلے پر میں نے اسے ذرا آڑ میں کر کے زمین پر لٹا دیا۔ کوٹھری کی جانب واپس لوٹتے ہوئے میں نے اپنے آپ کو خاصا ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد یہ عورت ہوش میں آ جائے گی اور پھر اپنے گھر پہنچ جائے گی جہاں اس کے بچے اس کے منتظر ہوں گے۔ کل صبح سے ان کی زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہو گا۔ ایک پرسکون اور پاکیزہ باب کا۔ شاید۔

میں نے کوٹھری سے چابیوں کا چھوٹا سا گچھا اٹھایا۔ پہلی ہی چابی آزمانے سے تالا کھل گیا۔ میں نے گیٹ سے باہر نکل کر دھیمی آواز میں مخصوص سیٹی بجائی۔ ایک اندھیرے گوشے سے مرزا اور صدیقی برآمد ہوئے اور تیزی سے میری سرف بڑھے۔

''کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟ اتنی دیر کہاں لگا دی؟''

''اندر چلیں' سب کچھ بتا دیتا ہوں۔ سب خیریت ہے۔'' میں نے دھیمے لہجے میں انہیں تسلی دی اور یہ کم بخت شخص دروازے بند کیے پڑا تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو یہ مشکوک ہو گیا۔ بالآخر مجھے کوٹھری کا دروازہ توڑنا پڑا۔ گیٹ کے تالے کی چابی حاصل کرنے کے لیے مجھے خاصی محنت کرنا پڑی۔ افسوس کہ گاڑی کی چابی پھر بھی حاصل نہ کر ہو سکی کیونکہ وہ اس کے پاس نہیں ہے۔'' میں نے اس عورت کا تذکرہ بیچ سے گول کر کے اپنی صفائی پیش کی۔

"ارے تم گاڑی کی چابی کی فکر نہ کرو ذوالفقار بھائی۔ بغیر چابی کے گاڑی اسٹارٹ کرنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" صدیقی نے کہا۔

"تو پھر چلیں دیر کس بات کی ہے۔ وہ سامنے گاڑی کھڑی ہے۔"

صدیقی نے گاڑی کا دروازہ کھولا کیبن کی اندرونی لائٹ جلی۔ اس نے وہ لائٹ آف کر کے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی مگر طاقت ور ٹارچ نکالی اور اسے میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ ڈیش بورڈ کے نیچے نظر آنے والے رنگ برنگے تاروں کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق ٹارچ سے روشنی ڈالتا رہا۔ صدیقی نے خاصی کوشش کے بعد دو تاروں کو آپس میں ملایا۔ گاڑی کے انجن نے ہلکی سی جھرجھری لی۔ صدیقی نے فاتحانہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے مرزا کے ساتھ مل کر گاڑی کو دھکا دے کر گیٹ سے باہر نکالا۔ گیٹ کے بند کرنے کے بعد ہم بھی گاڑی میں جا بیٹھے۔ صدیقی نے اگنیشن کے تاروں کو آپس میں جوڑا۔ ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ گاڑی کا انجن جاگ اٹھا۔ مرزا نے خوشی کا نعرہ بلند کیا۔

گاڑی پختہ سڑک پر اپنی منزل کی جانب دوڑنے لگی۔ میں صدیقی کی راہنمائی کر رہا تھا۔ پلان کے مطابق میں نے ایسے راستوں کا انتخاب کیا جن پر آمدورفت بہت کم رہا کرتی تھی۔ رات کے اس پہر ہر طرف مکمل سناٹے کی حکمرانی تھی۔ گاڑی کی حالت خاصی اچھی تھی۔ صدیقی بڑی مہارت سے گاڑی دوڑاتا رہا۔ خاصا لمبا چکر کاٹنے کے بعد ہم پاکستانی چوک کے پاس پہنچے۔ میونسپل پارک کے ساتھ والی سڑک پر پہنچ کر گاڑی کا رخ شمال کی طرف ہو گیا۔ گاڑی تھوڑا سا ہی آگے بڑھی ہو گی کہ اس کا انجن جھٹکے لینے لگا۔ صدیقی نے گاڑی کے ڈیش بورڈ پر نظر ڈالی۔

"اوہ۔۔ بیڑا غرق!" اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"کیا ہوا خیر تو ہے؟" مرزا نے جلدی سے پوچھا۔

"خیریت ہی تو نہیں ہے۔ گاڑی کا فیول ٹینک خالی ہو چکا ہے۔"

"اوہ مارے گئے بھائی۔" مرزا نے اپنی پریشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انجن خاموش ہو گیا اور گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ہم تینوں نے پریشانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"اب کیا کریں؟ یہ تو سارا معاملہ ہی چوپٹ ہو گیا۔" مرزا نے اس انداز میں میری طرف دیکھا جیسے اس مسئلے کا حل میرے پاس ہے۔

"میں کیا بتا سکتا ہوں مرزا صاحب!" میں نے گہری سانس بھر کر کہا۔ "سردار شاہ مرادی کی حویلی یہاں سے میل ڈیڑھ میل آگے ہے۔ ہم پیدل وہاں پہنچ بھی جائیں تو ہمارا مسئلہ تو حل نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اس بندے کو اٹھا کر ڈاکٹر صنم کے گھر لے جانا ہے۔ ظاہر ہے ہم بغیر گاڑی کے تو اسے اتنی دور نہیں لے جا سکتے۔" ان دونوں کے چہرے پر مایوسی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

"گاڑی کے پچھلے حصے میں دیکھو شاید وہاں کوئی فالتو کین فیول کا بھرا رکھا ہو۔" صدیقی نے امید بھرے لہجے میں کہا۔ میں نے انکار میں گردن ہلا دی۔

"نہیں گاڑی کے پچھلے حصے میں کسی قسم کا سامان نہیں ہے۔ یہاں آس پاس کوئی پٹرول پمپ بھی تو نہیں ہے۔"

"اتنی رات میں تمہیں کون پٹرول دے گا بھائی۔ وہ تو تمہیں دیکھتے ہی مشکوک ہو جائیں گے۔" صدیقی نے پژمردہ لہجے میں کہا۔

"تو پھر کیا کریں؟ میرا خیال ہے ہم گاڑی سے اتر کر اپنی منزل کی طرف چلتے ہیں۔ وہیں پہنچ کر صورت حال کو دیکھتے ہوئے اس مسئلے کا حل تلاش کریں گے۔" میں نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"ہاں ہاں چلو اترو۔ کیا پتہ اس حویلی سے ہی کوئی گاڑی ہمارے ہتھے لگ جائے۔" مرزا نے پر امید لہجے میں کہا۔

ہم تینوں گاڑی سے اترنے ہی والے تھے کہ اچانک عقب سے کسی گاڑی کی طاقت ور ہیڈ لائٹ ہماری گاڑی پر پڑی۔ ہم لوگ اپنی جگہ پر ساکت ہو کر رہ گئے۔ گاڑی قریب آتی گئی۔ میرے رگ و پے میں اضطراب کی لہریں دوڑنے لگیں۔ میں نے ہیڈ لائٹوں کی پوزیشن سے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی جیپ ہے۔ جیپ ہماری گاڑی کے پاس پہنچ کر خاصی دھیمی ہو گئی۔ مجھے اپنی آنکھوں میں رنگ برنگے تارے تلملاتے محسوس ہوئے۔ وہ پولیس کی جیپ تھی۔

جیپ میں موجود پولیسیے بغور ہماری گاڑی کو گھورتے گزرے۔ جیپ کے آگے بڑھتے ہی ہم نے اپنے سینے کی سانس آزاد کی۔ ہمارا یہ اطمینان محض وقتی ثابت ہوا۔ دس پندرہ گز آگے جا کر پولیس کی جیپ ایک جھٹکے سے رکی اور پھر ریورس میں ہماری گاڑی کی طرف آنے لگی۔ مجھے شدت سے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اگر ہم لوگ اس جیپ کے قریب آنے سے پہلے ہی اپنی گاڑی میں دبک کر بیٹھ جاتے تو شاید یہ پولیس والے ہم پر توجہ دیے بغیر آگے بڑھ جاتے لیکن اتنی رات گئے ہمیں اس طرح بلا جواز گاڑی میں بیٹھے دیکھ کر وہ ہماری طرف سے مشکوک ہو گئے ہوں گے۔ رہی سہی کسر میرے اور صدیقی کے بے ہنگم چہروں نے پوری کر دی ہو گی۔

جیپ ہمارے پاس آ کر رکی۔ جیپ میں سے ایک نوجوان حوالدار اتر کر ہماری گاڑی کی طرف بڑھا۔ اپنی تربیت کے عین مطابق اس نے بغور ہماری شکلوں کا جائزہ لیا۔ اسے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ ہم تینوں میں سے قابل توجہ اور مقتدر ہستی مرزا ہی ہے۔ مجھے اور صدیقی کو اس نے مرزا کے کارندے وغیرہ سمجھا ہو گا۔ اس نے بڑے ہی نپے تلے لہجے میں مرزا کو مخاطب کیا۔

"خیر تو ہے جناب؟ یہاں کیسے ٹھہر گئے ہو؟ ہمارے لائق کوئی خدمت؟"

"وہ دراصل ہماری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ اس لیے ہمیں یہاں ٹھہرنا پڑا۔" مرزا نے ہر ممکن کوشش کی کہ اس کے لہجے سے اس کا غیر مقامی ہونا ظاہر نہ ہو۔ اپنی اس کوشش میں وہ خاصی حد تک کامیاب بھی رہا۔

"اچھا تو خیر سے آپ کو جانا کہاں ہے؟" حوالدار نے فوراً ہی اگلا سوال کر ڈالا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ پستول پر میری گرفت سخت ہونے لگی۔ مرزا تو ارد گرد کے علاقوں سے بالکل ناواقف تھا۔ وہ

بھلا اس سوال کا کیا جواب دیتا۔

"آپ نے بتایا نہیں آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟" حوالدار نے اپنا کانٹے دار سوال پھر دہرایا۔

"وہ۔۔ ہم۔۔ ذرا مظفر گڑھ تک جا رہے تھے۔ ایک ضروری کام سے۔" مرزا نے کسمساتے ہوئے جواب دیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس حوالدار نے مرزا کو اپنے جال میں پھانس لیا ہے۔ حوالدار کے لبوں پر ایک خبیثانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے گاڑی کے بالکل قریب ہوتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یہ سڑک تو مظفر گڑھ کی طرف نہیں جاتی میرے سرکار۔"

"ہمیں چوک چوہٹے سے ایک بندے کو ساتھ لینا ہے' تھانے دار جی۔" میں نے اپنی آواز کو ذرا بھاری بناتے ہوئے کہا۔ اس نے بغور میرے چہرے پر نظر ڈالی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں شک کے بادل مزید گہرے ہوتے محسوس ہوئے۔ اس مرتبہ اس نے اسٹیرنگ پر بیٹھے صدیقی کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔

"کہاں سے آ رہے ہو تم لوگ؟ لائسنس اور گاڑی کے کاغذات ہیں تمہارے پاس؟" لمحہ بہ لمحہ اس کے لہجے کھردرے پن میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

عین اس وقت اس نے کوئی ایسی چیز دیکھ لی جس نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خوفناک چمک پیدا ہوئی۔ اس کا دایاں ہاتھ تیزی سے اس کے ہولسٹر کی طرف بڑھا۔ اگلے ہی لمحے سیاہ رنگ کا بڑا سا ریوالور اس کے ہاتھ میں چمکنے لگا۔ میں نے اپنے کولٹ کو اس کی آرام گاہ سے نکالنا چاہا لیکن پھر میرا ہاتھ وہیں ساکت ہو کر رہ گیا۔ اس صورت حال میں میری کوئی بھی کارروائی خود ہم لوگوں کے لیے موت کی پیغام بر ثابت ہوتی۔ وہ گاڑی ہمارے لیے موت کا پھندا ثابت ہو رہی تھی۔

"تم میں سے کسی نے حرکت کرنے کی کوشش کی تو کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔" حوالدار نے درندگی بھرے لہجے میں کہا۔ "شاہ جی ذرا جلدی سے ادھر آ جائیں۔۔ یہ تو معاملہ ہی دوسرا نکل آیا ہے۔" اس نے بلند آواز میں پولیس جیپ میں موجود کسی شخص کو پکارا۔ اس کے لہجے میں ہیجانی کیفیت تھی۔ اسی لمحے جیپ کے دروازے کھلے اور اس میں سے دو باوردی پولیس والے کود کر نیچے اترے۔ ان میں سے ایک کے کاندھے پر تھری ناٹ تھری رائفل تھی جبکہ دوسرے باریش پولیس والے نے ہولسٹر میں ریوالور اڑسا ہوا تھا۔ وہ تیز قدموں سے ہماری گاڑی کی طرف بڑھے۔ حوالدار کو ریوالور تھامے دیکھ کر انہوں نے بھی اپنے ہتھیار سونت لیے۔

"کیا بات ہے نذر حسین؟ خیریت تو ہے؟" باریش شخص نے اپنے ریوالور کا رخ ہماری گاڑی کی جانب کرتے ہوئے سوال کیا۔ اس کے شانوں پر چمکتے اسٹارز کو دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ پولیس انسپکٹر کے عہدے کا حامل ہے۔ اسٹریٹ لائٹس کی مدھم روشنی میں مجھے اس کا چہرہ کچھ مانوس سا لگا۔ حوالدار نے اس کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی۔ یک لخت انسپکٹر کی آنکھیں بھی چمکنے لگیں۔

"اوہ تو یہ بات ہے! اس نے اپنی بھاری بھرکم بارعب آواز میں کہا۔" تم لوگ چپ چاپ گاڑی سے نکل آؤ۔ کوئی گڑبڑ نہ کرنا۔ ورنہ یاد رکھو۔ میرا نام دوست محمد شاہ ہے۔ میں تم لوگوں کی چمڑی ادھیڑ دوں گا۔"

"تھانے دار صاحب یہ آپ ہم سے کس انداز میں بات کر رہے ہیں۔ ہم شریف لوگ ہیں اور۔۔" صدیقی نے اس کے رویے پر احتجاج کرنا چاہا لیکن اس نے کرخت لہجے میں اس کی بات درمیان میں کاٹ دی۔

"بکواس بند کرو۔ تم جیسے شریف بہت دیکھے ہیں میں نے' شریف لوگوں کا پیشہ کار چوری ہی ہوتا ہے نا؟"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے احتجاجاً کہا۔

"تم بک بک بند کرو اور گاڑی سے نیچے اترو۔ میں بہت دنوں سے تم لوگوں کی تاک میں تھا۔ یہ گاڑی تم لوگوں نے شاید کراچی سے چرائی یا چھینی ہو گی۔" دوست محمد شاہ نے سخت لہجے میں کہا۔

"آپ یقین کریں تھانے دار صاحب ہم لوگوں کا کار چوروں کے گروہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم۔۔" مرزا نے کہا۔

"اب تم لوگوں نے ہمیں اندھا سمجھ رکھا ہے کیا؟ گاڑی کے کاغذات تمہارے پاس نہیں ہیں۔ بغیر چابی کے تار جوڑ کر گاڑی چلاتے ہو پھر بھی کہتے ہو کہ تم کار چور نہیں ہو۔ تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہو تو اسے اس کی جگہ پر رہنے دو اور باری باری گاڑی سے باہر آ جاؤ۔" تب مجھے اندازہ ہوا کہ حوالدار نذر حسین کیوں ہماری طرف سے مشکوک ہوا تھا۔ اس نے شاید اگنیشن کی تاروں کو آپس میں جڑا ہوا دیکھ لیا تھا۔ ہم تینوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ مرزا نے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دے کر ہمیں سمجھایا کہ ہم مزاحمت کی کوشش نہ کریں۔ میں نے دیکھا کہ صدیقی نے اپنی ایم پی فائیو گاڑی ہی میں چھوڑ دی ہے میں نے اپنا کولٹ اپنی بیلٹ میں ہی رہنے دیا۔ جانے کس امید میں؟

جونہی ہم تینوں گاڑی سے اترے۔ انسپکٹر نے ایک نیا حکم صادر کیا۔ "تم تینوں گاڑی کی باڈی پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ اپنی ٹانگوں کو کھلا رکھو۔ خبردار کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو۔۔" عین اسی لمحے میں نے اس تھانے دار کو پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دل و دماغ میں کھلبلی سی مچ گئی۔ یہ وہی تھانے دار تھا جس سے کچھ عرصہ پہلے میرا شورہ نہر کی چیک پوسٹ پر آمنا سامنا ہوا تھا۔ میں مینو استاد کے ہمراہ اس کے ٹرک میں کوٹ چھٹے سے ڈیرہ غازی خان آ رہا تھا۔ اس رات اس نے مجھے سیف داد خان کی حیثیت سے تقریباً پہچان ہی لیا تھا اگر مینو استاد میری پشت پناہی نہ کرتا تو یہ مجھے اپنے شکنجے میں کس چکا ہوتا لیکن آج پھر میں اس کی گرفت میں آ گیا ہوں۔ اگر یہ ایک بار پھر مجھے پہچان گیا تو؟ پھر کیا ہو گا؟ مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سرد لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔

ہم تینوں گاڑی کی باڈی پر ہاتھ رکھ کر' ٹانگیں چوڑی کر کے کھڑے ہو گئے۔ نذر حسین نہایت مہارت سے ہماری جامہ تلاشی لینے لگا۔ سب سے پہلے اس نے مرزا کی جیب سے اعشاریہ دو دو کا

ننھا سا پستول برآمد کیا۔ صدیقی کے پاس سے کچھ نہ نکلا۔ میرے بیلٹ میں اڑسا کولٹ بھی فوراً اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس دوران میں میرا دماغ برق رفتاری سے اس صورت حال سے جان چھڑانے کے راستے تلاش کرتا رہا۔ اگر وہ لوگ گرفتار کر کے ہمیں تھانے لے جاتے تو ہم لوگوں کے لیے بے شمار مشکلات کھڑی ہو جاتیں۔ اگر ان لوگوں کو ہماری اصلیت کے متعلق سن گن مل جاتی تو ہمیں لینے کے دینے پڑ جاتے۔ حوالات میں پہنچنے کے بعد تو ہمارے لیے کوئی بھی کارروائی کرنا ناممکن ہو کر رہ جاتا۔ شاہ مراد اور اس کے کارندوں کے ہتھے چڑھنے کے بعد تو ہماری موت یقینی تھی۔

''ٹھیک ہے شاہ جی۔ ہم مان لیتے ہیں کہ تمہارا کہنا صحیح ہے۔ ہم لوگ واقعی کار لفٹر ہیں۔'' میں نے دھیمے' شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ''ہم یہ گاڑی کراچی سے ہی چرا کر لائے ہیں اور آزاد علاقے کے ایک بندے سے ہم اس کا پیشگی سودا کر چکے ہیں۔ یہ گاڑی ہمیں ایک دو دن کے اندر مالاکنڈ پہنچانی ہے۔'' مرزا اور صدیقی نے بڑی حیرت سے میری طرف دیکھا۔ میری بات سن کر انسپکٹر دوست محمد شاہ کی آنکھوں میں مسرت کی چمک ابھری۔

''تم مجھے سمجھدار آدمی لگتے ہو۔ کتنے پیسے لگے ہیں اس گاڑی کے؟''

''ساٹھ ہزار۔۔ دس ہزار ہم ایڈوانس لے چکے ہیں۔ دو ہزار خرچ ہو گئے ہیں۔ بقیہ آٹھ ہزار ہمارے پاس موجود ہیں۔''

''ہوں! تو پھر کیا ارادے ہیں تمہارے؟'' اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''ہمارے کیا ارادے ہوں گے شاہ جی؟ آپ خود مختار ہیں۔ واردات آپ کے علاقے میں نہیں ہوئی۔ ویسے آپ جو حکم دیں ہم خدمت کرنے کے لیے تیار ہیں۔'' میں نے شاہ جی کے سابقہ کردار کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے دانا ڈالا۔ شاہ جی اور اس کے دونوں ماتحتوں کی آنکھوں میں لالچ کی چمک لہرائی۔ شاہ جی نے کچھ توقف کے بعد ایک مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''تم واقعی ہوشیار آدمی ہو۔ دھندے کے گر جانتے ہو۔ ٹھیک ہے تم مال کی راہ داری ادا کر دو۔ ہم تم سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔ تم میں سے رقم کس کے پاس ہے؟'' معاملے کو طے پاتے دیکھ کر ان تینوں کے چہروں پر اطمینان بھری مسکراہٹ ابھر آئی۔ شاہ جی نے اپنا ریوالور ہولسٹر میں رکھ لیا۔ اس کے ماتحتوں کے ہتھیار بھی خود بہ خود جھکتے چلے گئے۔

''رقم تو گاڑی میں ہے شاہ جی۔ راستے کے خرچے کے لیے دو چار سو ہمیں دے دیں۔ باقی آپ لے لیں۔'' میں نے سادگی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ تم رقم نکالو گاڑی سے۔'' شاہ جی نے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ میں نے کن انکھیوں سے مرزا اور صدیقی کا جائزہ لیا۔ انہیں معلوم تھا کہ گاڑی میں کسی قسم کی رقم وغیرہ نہیں ہے۔ وہ یقیناً اصل صورت حال سمجھ گئے ہوں گے۔

میں نہایت پرسکون انداز میں گاڑی کی جانب بڑھا۔ تینوں پولیس والوں میں سے کسی نے بھی میرے ہمراہ آنے کی کوشش نہیں کی۔ معاملہ طے پانے کے بعد وہ پوری طرح مطمئن ہو چکے تھے۔ گاڑی

میں داخل ہونے کے بعد میں نے ڈیش بورڈ کا خانہ کھولا اور اپنا بایاں ہاتھ اس میں ڈال دیا۔ عین اس وقت میں نے ڈرائیونگ سیٹ کے پاس رکھی ایم پی فائیو سب مشین گن کو اپنے دائیں ہاتھ میں تھام لیا۔ ڈیش بورڈ کے خانے سے ایک میلی کچیلی صافی میرے ہاتھ لگی۔ اسے اپنی مٹھی میں دبا کر میں گاڑی سے اتر آیا۔

میری توقع کے عین مطابق اس دوران میں مرزا اور صدیقی نہایت مہارت سے ان تینوں پولیس والوں سے خاصا ہٹ کر کھڑے ہو چکے تھے۔ تینوں پولیس والے ان کی طرف سے بالکل بے نیاز ہو کر مشتاق نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہتھیار ہمیں فوری طور پر کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ وہ تینوں پہلی نظر میں میرے دائیں ہاتھ میں موجود ایم پی فائیو کو نہیں دیکھ سکے۔ دیکھتے بھی کیسے؟ ان کی حریص نظریں میرے بائیں ہاتھ کی مٹھی میں دبے میلے کچیلے کپڑے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے وہ صافی ان تینوں کی طرف پھینک دی۔ وہ تینوں بلا سوچے سمجھے' بھوکے کتوں کے مانند اس کی طرف جھپٹے۔ انہیں فوراً معلوم ہو گیا کہ اس کپڑے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ انہوں نے سخت ناراضگی سے میری طرف دیکھا۔ تب انہیں میرے ہاتھوں میں موجود اجل آفرین ہتھیار نظر آیا۔ چند لمحوں تک تو وہ صورت حال کو سمجھ ہی نہیں سکے پھر ان کے چہروں پر یکے بعد دیگرے پہلے حیرت اور پھر دہشت کے تاثرات ابھرے۔

''کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو تمہارے یہ سور جیسے پلے پلائے جسم چھلنی کر دوں گا۔'' میں نے دھیمی مگر مضبوط آواز میں انہیں دھمکی دی۔ ''چپ چاپ گاڑی کی باڈی پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ تمہاری ٹانگیں ایک دوسرے سے الگ ہونی چاہییں' ہری اپ!''

''تم۔۔ تم'' شاہ جی نے کمزور لہجے میں احتجاج کرنا چاہا۔ میری یہ کارروائی یقیناً اسے بے حد ہتک آمیز لگی ہو گی۔ میں نے ایم پی فائیو کی نال کا رخ اس کے منہ کی طرف کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بولتی بند ہو گئی۔ وہ تینوں نہایت سعادت مندی سے سر تسلیم خم کر کے گاڑی کی باڈی پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ تو اس فن کی تمام تر باریکیوں سے واقف رہے ہوں گے۔ جانے کتنے لوگوں کو ان کے حکم پر یہ سب کرنا پڑا ہو گا۔ آج خود ان کی باری بھی آ ہی گئی۔

مرزا اور صدیقی نے پلک جھپکتے میں انہیں ہتھیاروں سے محروم کر دیا۔ مرزا نے اپنا ننھا منا پستول واپس لینے کے علاوہ نذر حسین کے ریوالور کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ ان دونوں نے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اشارے سے انہیں ہدایت دی۔ کہ وہ ان میں سے دو کو ناک آؤٹ کریں۔ تیسرے کو میں دیکھتا ہوں۔ وہ دونوں تذبذب کا شکار ہو گئے۔ باوردی پولیس والوں پر ہاتھ اٹھانا انہیں بے حد گراں گزر رہا ہو گا۔ میں نے جھنجلائے ہوئے انداز میں انہیں اشارہ کیا کہ وہ میرے کہنے پر عمل کریں۔ بالآخر ان دونوں نے خود پر قابو پا لیا۔ انہوں نے اپنے پستول اور ریوالور کو نالوں سے تھاما اور حوالدار اور تھانے دار کی کھوپڑی بجا دی۔ عین اسی وقت میں نے ایم پی فائیو کے پچھلے حصے سے تیسرے کے سر پر ضرب لگا دی۔ ان تینوں کے منہ سے ہلکی چیخیں نکلیں اور وہ تیورا کر سڑک پر ڈھیر ہو گئے۔

"اب کیا کرنا ہے؟" مرزا نے مجھ سے پوچھا۔ مجھے اس کے لہجے میں تلخی کی ہلکی سی جھلک نظر آئی۔ میں نے اس کے لہجے کو نظر انداز کر کے نرم لہجے میں کہا۔

"ان تینوں کو اٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈال لیں۔" ان دونوں نے اس مرتبہ چپ چاپ میری ہدایت پر عمل کیا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ ایک بار پھر استفہامیہ نظروں سے مجھے گھورنے لگے۔ میں نے زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر حوالدار نذر حسین کی وردی اتارنا شروع کر دی۔ ان تینوں میں سے مجھے وہی اپنی قد و قامت سے نزدیک تر نظر آیا تھا۔ کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے مرزا اور صدیقی نے بھی میری تقلید کی۔ کچھ ہی دیر بعد تینوں پولیس والے اپنی وردی سے محروم ہو گئے۔ ہم نے صرف ان کے بنیان اور زیر جامے ان کے بدن پر رہنے دیے۔

"آپ لوگ بھی یہ وردیاں پہن لیں۔" میں نے حوالدار نذر حسین کی وردی کو جیسے تیسے اپنے بدن پر چڑھاتے ہوئے کہا۔ ان دونوں نے بادل نخواستہ میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں ان کے جذبات سمجھ رہا تھا۔ لیکن میں ان چھوٹی چھوٹی جذباتی باتوں کی خاطر اپنے مشن کو کیونکر داؤ پر لگاتا۔

نذر حسین حوالدار کی قمیص میرے سینے پر تنگ رہی اور کمر پر ڈھیلی۔ مرزا اور صدیقی بھی تقریباً اسی صورتحال سے دوچار تھے۔ میں نے پولیس والوں کے بوٹ چڑھانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ "نائلون کی اضافی ڈوری سے ان کے ہاتھ پاؤں اچھی طرح باندھ دیں اور ان کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیں۔" میں نے نذر حسین کے ہاتھ اس کی پشت پر باندھتے ہوئے کہا۔

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟" مرزا نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ مجھے اس کا یہ انداز گفتگو برا لگا۔ میرے ہاتھ کام کرتے کرتے رک گئے۔

"پہلے آپ مجھے یہ بتایئے آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ کیا انہیں اسی طرح آزاد یہاں چھوڑ کر چلے جائیں تا کہ یہ ہوش میں آنے کے بعد واویلا کر کے سارا شہر اپنے سر پر اٹھا لیں؟ آپ کیا سمجھتے ہیں مجھے یہ سب کرتے ہوئے دلی خوشی ہو رہی ہے؟" میرے لہجے کی تلخی کو محسوس کر کے مرزا خاموش ہو گیا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا اگر اس وقت وہ مزید کوئی ایسی ویسی بات کرتا تو شاید میں اسی وقت انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر وہاں سے روانہ ہو جاتا۔ اتنے اہم اور نازک موقع پر ان کی خواہ مخواہ کی جذباتیت مجھے بری طرح کھل گئی تھی۔ وہ خواہ مخواہ اس طرح کا طرز عمل اختیار کرتے تھے کہ گویا میں وہ سب کچھ اپنی ذاتی دلچسپی کے لیے کر رہا ہوں۔ ان کے اس رویے سے میں ایک عجیب سے احساس جرم کا شکار ہونے لگا تھا۔

تینوں پولیس والوں کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد میں گاڑی سے اتر آیا۔ ان دونوں نے بھی میری پیروی کی۔ میں نے نذر حسین کی ٹوپی بھی پہن لی تھی۔ تھری ناٹ تھری رائفل ہم نے گاڑی میں ہی چھوڑ دی۔ "اب کیا ارادہ ہے؟" صدیقی نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ کوئی جواب دینے کے بجائے میں پولیس جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ سنبھالنے کے بعد میں نے ایم پی فائیو کو اپنی گود میں رکھ لیا۔ صدیقی نے چپ چاپ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ مرزا عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ ہم تینوں ہی باہمی کشیدگی اور تناؤ سے ناخوش تھے لیکن میں بھلا اس سلسلے میں کیا کر سکتا تھا۔ اس

ناخوشگوار صورت حال کا ذمہ دار میں تو نہیں تھا۔

میرے اشارے پر صدیقی نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ ہم کچھ ہی دور آئے تھے کہ مجھے اپنے شانے پر مرزا کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔

"مجھ سے ناراض ہو ذوالفقار بھائی؟" اس نے پژمردہ سے لہجے میں پوچھا۔

"میں کسی سے ناراض نہیں ہوں۔" میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

"مجھے معاف کر دو۔ ذوالفقار بھائی۔ میں مانتا ہوں کہ غلطی میری ہے۔ خدا جانے مجھے کبھی کبھی کیا ہو جاتا ہے۔ شاید میں فطرتاً اس پیشے کے لیے موزوں نہیں ہوں۔" اس کے لہجے میں گہری پشیمانی تھی۔ پلک جھپکتے میں میرے دل سے سارا تکدر دھل گیا۔

"مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے مرزا صاحب' میں آپ کے احساسات کو سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے الجھن صرف اس بات پر ہوتی ہے کہ ہنگامی حالت میں جبکہ صرف اور صرف دماغی فیصلے کیے جانے چاہئیں آپ بھی کبھی دل سے سوچنے لگتے ہیں۔ میں خود کچھ عرصہ پہلے اس کیفیت کا شکار رہ چکا ہوں۔ جب بھی مجھ پر غصہ طاری ہوتا میرا دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا تھا۔ نتیجتاً میں اندھا دھند جو سمجھ میں آتا کر گزرتا لیکن بعد میں مجھے اپنی جذباتی حماقتوں کے نتائج بھگتنے پڑتے تھے۔ خوش قسمتی سے مجھے ایک ایسی ہستی کی سرپرستی حاصل ہو گئی جس نے مجھے دل کے بجائے دماغ سے فیصلے کرنے کی تربیت دی۔ ہنگامی حالت میں بھی حواس برقرار رکھنے کا فن سکھایا۔"

"تم بہت خوش قسمت ہو تمہیں صحیح وقت پر ایسا سرپرست مل گیا۔" صدیقی نے کہا۔ "اسی لیے تم اتنی برق رفتاری سے فیصلے کرتے ہو۔"

"تمہارا وہ استاد کون ہے بھائی ذوالفقار علی؟ کبھی اس سے ملواؤ نہ ہمیں؟" مرزا نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔ "میں خود اس سے ملنے کے لیے بے قرار ہوں مرزا صاحب۔ انشاء اللہ میں جلد ہی اسے آپ سے ملاؤں گا۔" میں نے فقیر بابا کا مشفق چہرہ اپنے تصور میں لاتے ہوئے کہا۔

سردار شاہ مراد کی حویلی کے پاس پہنچ کر ہماری جیپ کی رفتار دھیمی ہو گئی گیٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے بغور تمام صورت حال کا جائزہ لیا۔ مجھے حویلی کے حفاظتی انتظامات میں بظاہر کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔ سوائے اس کے کہ حویلی کی چار دیواری پر خاردار آہنی تاروں کی ڈیڑھ فٹ اونچی باڑھ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ مرزا اور صدیقی کی نظریں بھی حویلی پر جمی ہوئی تھیں۔ حویلی کے پہلو سے گزر کر جیپ حویلی کے عقب میں آ گئی۔ ایک گھنے درخت کے نیچے پہنچ کر جیپ رک گئی۔

"میں اس حویلی کی اندرونی بناوٹ سے کسی حد تک واقف ہوں مرزا صاحب۔" میں نے پرسکون لہجے میں بتایا۔ "اگرچہ اب اس حویلی کی چار دیواری پر خاردار باڑھ لگ چکی ہے۔ تاہم میں ایک ایسی جگہ سے واقف ہوں جہاں سے بآسانی حویلی کے اندر داخل ہوا جا سکتا ہے البتہ ہمیں اس جیپ کو دیوار کے ساتھ کھڑا کرنا پڑے گا تا کہ اس خاردار تار کو پھلانگا جا سکے۔"

"یہ سب اتنا آسان نہیں ہے ذوالفقار علی صاحب۔" مرزا متفکر لہجے میں بولا۔ "اس باڑھ کو عبور

کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ شاید تم اس باڑھ کو عام سی خاردار تاروں کی باڑھ سمجھ رہے ہو۔ اپنی یہ غلط فہمی دور کرلو بھائی۔ اس باڑھ میں نہایت طاقتور برقی رو دوڑ رہی ہے۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ اس باڑھ کے ساتھ نہایت حساس الارم بھی منسلک ہوگا۔ کسی بھی ٹھوس شے کے خاردار تار سے چھو جانے سے اس میں دوڑنے والی برقی رو کی مزاحمت میں تبدیلی پیدا ہوگی جس کے نتیجے میں فوری طور پر الارم چیخنے لگے گا۔"

مرزا کی زبان سے نکلنے والے ایک ایک لفظ نے مجھ پر ادراک کے بے شمار دروازے کھول دیے۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں کس قدر ناپختہ اور خام ہوں۔ اگر اس وقت مرزا اور صدیقی میرے ہمراہ نہ ہوتے تو میں حسب معمول اندھا دھند حویلی میں گھسنے کی کوشش کرتا نتیجتاً اذیت ناک موت یا عبرت انگیز زندگی میرا مقدر بن کر رہ جاتی۔

"پھر اب کیا کیا جائے مرزا صاحب؟ رات تیزی سے گزرتی چلی جارہی ہے۔ صبح کا اجالا پھیل گیا تو ہمارے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔" میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس صورت حال میں ہم لوگ کیا حکمت عملی اختیار کریں۔

اس شعلہ صفت نوجوان
کی سرگزشت کے بقیہ واقعات
حصہ چہارم میں پڑھیے

☆O☆

اس دربدر نوجوان کی سرگذشت جس کی دشمن زمین بھی تھی اور آسمان بھی
آگ بگولا
4
محمد عباس ثاقب

''سوچو۔۔سوچو بھائی۔۔ہم بھی سوچتے ہیں۔آج کی رات ہمارے لیے بے حد اہم ہے۔ہمیں ہر صورت میں اس غلیظ شخص افضل کو قابو کر کے لے جانا ہے۔'' مرزا نے متفکر لہجے میں کہا۔ہم تینوں اپنی سوچوں میں گم ہو گئے۔

''میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔'' صدیقی نے یک لخت پر جوش لہجے میں کہا۔''اس ترکیب پر عمل کر کے ہم اس برقی باڑھ والے حربے کو ناکام بنا سکتے ہیں۔''

''ہاں ہاں کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' مرزا نے پر جوش لہجے میں کہا۔میں بھی پر اشتیاق نظروں سے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''دیکھیں حویلی کے حفاظتی نظام کا دارومدار بجلی پر ہے۔یہ بجلی یقیناً کسی قریبی پول یا ایم ٹی کے ذریعے حویلی میں پہنچ رہی ہوگی۔ہم حویلی کو بجلی مہیا کرنے والے ٹرانسفارمر کو ناکارہ بنا دیتے ہیں۔ایسا کرنا کوئی زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔بجلی کی فراہمی منقطع ہوتے ہی خاردار باڑھ کی ہلاکت خیزی ختم ہو جائے گی اور ہم حویلی میں داخل ہونے میں کامیابی حاصل کر لیں گے۔''

''بہت اچھی ترکیب ہے صدیقی صاحب۔اس پر یقیناً عمل کیا جا سکتا ہے۔'' میں نے پر جوش لہجے میں کہا۔مجھے یہ پیچیدہ مسئلہ حل ہوتا نظر آ رہا تھا۔''آپ کا کیا خیال ہے مرزا صاحب؟'' میں نے مسرور لہجے میں پوچھا۔میں نے محسوس کیا کہ مرزا کے چہرے پر بدستور تفکر کے آثار ہیں۔

''ہاں یہ ترکیب قابل عمل تو ہے لیکن اس میں بے حد شدید خطرات پوشیدہ ہیں۔''

''کون سے خطرات مرزا صاحب؟'' صدیقی نے حیرت سے سوال کیا۔

''ان جدید ترین حفاظتی انتظامات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ لوگ بہت زیادہ محتاط ہیں۔اس طرح اچانک لائٹ چلے جانے سے وہ چونک اٹھیں گے اور کسی بھی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار

ہو جائیں گے۔ ایسے میں حویلی میں داخل ہونا اپنی شامت کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔ دوسری طرف یہ بھی امکان ہے کہ انہوں نے بجلی کے فیل ہونے کی صورت میں کوئی متبادل انتظام کر رکھا ہو۔ جونہی بجلی فیل ہو خود کار طریقے سے کوئی الیکٹرک جنریٹر اسٹارٹ ہو جائے۔ اس صورت میں ہم کیا کر پائیں گے سوائے کف افسوس ملنے کے؟''

مرزا کے دلائل کے وزن کو ہم دونوں نے ہی پوری حقیقت پسندی سے تسلیم کیا۔ ہم لوگ ایک بار پھر اپنے خیالات میں گم ہو گئے۔ عین اسی وقت میری نظر مرزا کے شانوں پر چمکتے ستاروں پر پڑی۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میرے دماغ میں ایک منصوبے کے خدوخال ترتیب پانے لگے۔ رفتہ رفتہ تمام تر جزئیات میرے ذہن میں واضح ہوتی چلی گئیں۔

''میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے مرزا صاحب۔ اگرچہ اس میں بھی ناکامی کے امکانات موجود ہیں۔ تاہم اس پر ہم مزید غور کر سکتے ہیں۔''

''تم بتاؤ تو سہی بھائی کیوں ہماری بے قراری میں اضافہ کر رہے ہو؟'' مرزا نے ہلکی سی جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔

''دیکھیں مرزا صاحب یہ تو واضح ہو ہی چکا ہے کہ ہم لوگوں کا چوری چھپے حویلی میں داخل ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ گویا ہم حویلی کے مکینوں کی مرضی کے بغیر نہیں داخل ہو سکتے۔ لہٰذا اب ہمارے لیے یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ ہم حویلی میں موجود افراد کی مرضی اور اجازت سے حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کریں۔''

''لیکن ہم حویلی میں موجود افراد کی مرضی اور اجازت کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ مرزا نے حیرانی سے پوچھا۔

میں نے نہایت تحمل سے انہیں اپنے ذہن میں پرورش پانے والے منصوبے کی تفصیلات سے آگاہ کرنا شروع کیا۔ جوں جوں میری زبان سے الفاظ نکلتے گئے' ان دونوں کے جوش وخروش میں اضافہ ہوتا گیا۔ میری بات ختم ہوئی تو مرزا نے بڑی بے قراری سے میری پیشانی چوم لی۔

''یہ۔۔یہ۔۔ منصوبہ تم ہی تیار کر سکتے ہو بھائی ذوالفقار علی۔۔۔ یہ کسی اور کے بس کی بات نہیں ہے۔ انشاء اللہ یہ منصوبہ ضرور کامیاب ہوگا۔'' صدیقی نے بھی میری تجویز کو سراہا۔ ہم تینوں خاصی دیر تک منصوبے کی راہ میں حائل رکاوٹوں اور ممکنہ ہنگامی صورت حال کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔

ہر طرح سے مطمئن ہونے کے بعد ہم لوگوں نے کاروائی شروع کر دی۔ میں نے حوالدار کی وردی اتار کر سفید شلوار قمیض سوٹ پہن لیا۔ حلیے سے میں دیہاتی قسم کا شخص نظر آنے لگا۔ مرزا نے اپنے شانوں پر سے دو دو پھول اتار کر اپنے ہاتھوں اپنی تنزلی کر لی اور انسپکٹر سے اے ایس آئی بن گیا۔ صدیقی پہلے ہی کانسٹیبل بنا ہوا تھا۔ اپنے حلیوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ہم منصوبے کی اگلی منزل کی طرف

متوجہ ہوئے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد ہم نے حویلی میں جانے والے ٹیلی فون کے تار ڈھونڈ نکالے۔ میں ٹیلی فون کے کھمبے پر چڑھا اور چاقو سے ٹیلی فون کا تار کاٹ دیا۔ میں ٹیلی فون کے کھمبے سے نیچے اترا تو مرزا اور صدیقی نے ایک رسی سے میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔

''یہ تمام کاروائی کرنے کے بعد صدیقی نے جیپ کا انجن اسٹارٹ کیا اور جیپ حویلی کے گیٹ کی طرف بڑھا دی۔ جوں جوں جیپ حویلی کے قریب ہوتی گئی میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ جیپ سیدھی حویلی کے آہنی گیٹ کے سامنے جا رکی۔ ہم تینوں جیپ سے اتر آئے صدیقی نے میرے ہاتھوں میں بندھی رسی تھام رکھی تھی جبکہ مرزا پولیس والوں کے مخصوص انداز میں جھومتا حویلی کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ اس نے بلاتوقف گیٹ پر نصب اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ پہلی مرتبہ کوئی ردعمل نہ ہونے پر اس نے ایک مرتبہ پھر بٹن دبایا اور اس مرتبہ زیادہ دیر اسے دبائے رکھا۔ ہم نے گیٹ کی اندرونی سمت کسی کے قدموں کی آہٹ سنی۔ ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ کے بعد گیٹ میں ایک چھوٹا سا روشن دان نمودار ہوا اور دو سرخ سرخ آنکھوں نے باہر جھانکا۔ گہری نیند سے جاگنے کے باعث ان آنکھوں میں برہمی کے آثار تھے۔ اس شخص نے ایک نظر پولیس کی جیپ پر ڈالی اور پھر تلخ لہجے میں مرزا سے سوال کیا۔

''خیر تو ہے حوالدار جی! رات کے اس پہر کون سی مصیبت آ گئی جو تم یوں لوگوں کو تنگ کرتے پھر رہے ہو؟'' وہ شخص یقینی طور پر حویلی کا چوکیدار رہا ہوگا لیکن اس کے لہجے میں ایسا تحکم تھا کہ گویا وہ حاکم وقت ہو۔ مرزا نے کھسیانے لہجے میں کہا۔

''خیریت ہے ہے جناب۔ ایک نہایت اہم مسئلہ آن پڑا ہے اس لیے آپ کو زحمت دی۔ دراصل ہم نے ابھی گشت کے دوران اس بندے کو مشکوک حالت میں گھومتے ہوئے گرفتار کیا ہے۔ اس کے قبضے سے ایک پستول بھی برآمد ہوا ہے۔ ہمارے تھانے دار جناب دوست محمد شاہ کے روبرو اس نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ سردار شاہ مراد کا کارندہ ہے اور یہ ان کا کوئی بہت اہم پیغام لے کر اس حویلی کی طرف آ رہا تھا۔ شاہ جی نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم آپ لوگوں سے تصدیق کرائیں کہ واقعی یہ بندہ آپ لوگوں کا ہے یا نہیں۔''

گیٹ کے روشن دان سے جھانکتی آنکھوں نے بغور میرا جائزہ لیا۔ میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''میں صحیح کہہ رہا ہوں بھائی۔ مجھے سردار صاحب نے بھیجا ہے۔ وہ شہر کے بڑے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ بہت دیر سے فون کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن یہاں کا فون نہیں ملا۔ دونوں گاڑیاں سردار صاحب نے گاؤں بھیج رکھی ہیں۔ جب حویلی سے فون پر رابطہ نہیں ہو سکا تو سردار صاحب نے مجھے یہاں بھیج دیا۔ میں افضل صاحب کے لیے سردار صاحب کا بہت ضروری پیغام لایا ہوں۔'' میری زبان سے افضل کا نام سن کر مجھ پر گڑی سرخ آنکھوں میں کچھ نرمی کے آثار ابھرے۔

''سردار صاحب کب ڈیرے آئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہم لوگ دو گھنٹے پہلے ملتان سے ڈیرے پہنچے ہیں۔ یہاں کا فون شاید خراب ہے۔ کافی کوشش

کے بعد تنگ آ کر سردار صاحب نے مجھے یہاں بھیج دیا۔ راستے پر چوک چورہٹے کے پاس ان پولیس والوں نے مجھے پکڑ لیا۔ میں افضل صاحب کے لیے سردار صاحب کا بے حد اہم اور فوری نوعیت کا پیغام لایا ہوں۔ تم انہیں جگا دو۔'' روشن دان سے جھانکتی آنکھوں میں شدید تذبذب کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ میرے بیان کے وزن کو پرکھنے کی کوشش کر رہا ہوگا۔ میں نے ایک بار پھر پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''تم افضل صاحب کو جگا دو بھائی۔ تم انہیں سردار صاحب کے متعلق بتاؤ گے تو وہ ناراض نہیں ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ میں انٹرکام پر افضل صاحب سے بات کرتا ہوں۔ جو فیصلہ وہ کریں گے اسی پر عمل ہوگا۔'' چوکیدار نے کہا اور گیٹ میں نمودار ہونے والا روشن دان ایک بار پھر غائب ہو گیا۔

مرزا اور صدیقی نے امید و بیم کے ملے جلے تاثرات سے میری طرف دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔ ہم دعا کر رہے تھے کہ وہ شخص زیادہ مین میخ نکالے بغیر مجھے حویلی میں داخل ہونے کی اجازت دے دے۔ اگر وہ زیادہ باریکی سے باز پرس شروع کر دیتا تو ہمارے لیے مشکل کھڑی ہو جاتی۔ وہ یقیناً فوری طور پر اپنے ٹیلی فون کا جائزہ لیتا۔ اسے ڈیڈ پا کر اسے میری گھڑی ہوئی کہانی کے ابتدائی حصے پر یقین کرنا ہی پڑتا کہ سردار شاہ مراد کوشش کے باوجود فون پر حویلی سے رابطہ قائم نہیں کر سکا۔ لہٰذا اسے اپنے ایک کارندے کو یہاں بھیجنا پڑا۔

اچانک گیٹ میں ایک مرتبہ پھر چھوٹا سا روشن دان نمودار ہوا۔ ''میں نے افضل صاحب کو اطلاع دے دی ہے۔ تم لوگ ذرا انتظار کرو۔ وہ خود تم سے بات کریں گے۔''

''تو کیا ہم اس کے ہاتھ کھول دیں؟'' مرزا نے پوچھا۔

''نہیں! افضل صاحب کو اس سے بات کرنے دو۔ اس کے بعد وہ جیسا حکم دیں ویسا کرنا۔''

کچھ دیر بعد اس روشن دان میں موجود آنکھوں کی ساخت تبدیل ہوگئی۔ نو وارد یقیناً افضل رہا ہوگا۔ نسیم کا خیال آتے ہی مجھے اپنے خون میں اس کے لیے نفرت کا زہر گھلتا محسوس ہوا۔ وہ اپنی چمکدار آنکھوں سے ہم تینوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ مرزا اور صدیقی کے چہرے سے بے زاری عیاں تھی۔ پولیس جیپ اور ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لینے کے بعد اس کی نظریں میرے چہرے پر آ کر جم گئیں۔ میں بڑی بے نیازی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ چوکیدار نے اسے میرے متعلق سب کچھ بتا دیا ہوگا۔

''تم میرے قریب آؤ۔'' اس نے دھیمے لہجے میں حکم دیا۔ مرزا میری رسی کو پکڑ کر مجھے گیٹ میں موجود روشن دان کے بالکل سامنے لے آیا۔ افضل کے حکم پر اس نے میری رسی چھوڑ دی اور واپس صدیقی کے پاس جا کھڑا ہوا۔

''کیا پیغام بھیجا ہے سردار شاہ مراد نے؟'' اس نے دبی آواز میں پوچھا۔ میں نے متذبذب انداز میں اپنے آس پاس کا جائزہ لیا جیسے اس صورت حال میں مجھے اپنی زبان کھولتے ہوئے الجھن ہو رہی ہو۔

''انہوں نے آپ کو ابھی اور اسی وقت بلایا ہے۔'' میں نے بھی رازدارانہ لہجے میں جواب دیا۔

''لیکن کیوں اور کہاں؟ ایسی کون سی ضرورت آن پڑی انہیں میری؟''

''یہ تو پتا نہیں جی کہ انہوں نے آپ کو کیوں بلایا ہے مجھے تو انہوں نے صرف اتنا کہا ہے کہ میں آپ کو بتا دوں کہ آپ فوری طور پر ان سے مل لیں۔ کسی بے حد اہم معاملے میں وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ متفکرانہ انداز میں میری بات پر غور کرنے لگا۔ ''میرے ہاتھوں کی رسی تو کھلوا دیں جناب۔ میرے ہاتھوں میں خون جمنے لگا ہے۔'' میں نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر اس نے کسی فیصلے پر پہنچ کر کہا۔ ''اس کے ہاتھ کھول دیں حوالدار صاحب۔ شاہ جی سے کہنا یہ اپنا ہی بندہ ہے۔'' مرزا نے میرے ہاتھوں کی رسی کھول دی۔ میں نے اپنی کلائیاں سہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرا پستول بھی ان کے پاس ہے افضل صاحب۔''

''اس کا پستول بھی اسے دے دو حوالدار جی۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔ مرزا نے جیپ کی ڈیش بورڈ سے میرا کولٹ اٹھا کر میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اس کا الٹ پلٹ کر جائزہ لیا اور اسے اپنی شلوار پر بندھی بیلٹ میں اڑس لیا۔

''ہمارے لیے کیا حکم ہے جناب؟'' مرزا نے پوچھا۔

''تم لوگ جا سکتے ہو۔ شاہ جی کو میرا اسلام کہنا اور شکریہ بھی ادا کر دینا۔'' مرزا اور صدیقی نے اسے سلام کیا اور اپنی جیپ میں جا بیٹھے۔

جیپ اسٹارٹ ہوئی اور وہاں سے روانہ ہوگئی۔ جیپ کے رخصت ہوتے ہی گیٹ میں موجود چھوٹا دروازہ کھلا اور مجھے حویلی کے اندر بلا لیا گیا۔ میں نے افضل کو فوراً پہچان لیا۔ نسیم کی زبانی مجھے پہلے ہی اس کا حلیہ معلوم ہو چکا تھا۔ وہ تیس بتیس برس کا چاق و چوبند شخص تھا۔

''تم فتح محمد کے پاس بیٹھو۔ میں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ خوشی کے مارے مجھے اپنا دل بلیوں اچھلتا محسوس ہوا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں اتنی کامیابی سے اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکوں گا۔ بغیر کسی ہنگامے کے ایک بھی گولی چلائے بغیر۔

کچھ ہی دیر بعد وہ واپس آ گیا۔ میں نے واضح طور پر دیکھا کہ اس کے کوٹ کے نیچے پستول کا ہولسٹر موجود ہے۔ ''آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے مجھے کہا اور حویلی کی پارکنگ میں موجود نیلے رنگ کی نئی نکور پجیرو کی طرف بڑھ گیا۔ اسی اثنا میں فتح محمد چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ افضل اسٹیئرنگ ویل کے عقب میں بیٹھا۔ میں نے اس کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی۔ اس نے ریورس کر کے جیپ کو سیدھا کیا' عین اسی وقت حویلی کے اندرونی دروازے سے کوئی عورت تقریباً دوڑتی ہوئی باہر نکلی۔

''ٹھہرو افضل میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔ مجھے بھی سردار شاہ مراد سے بات کرنی ہے۔'' اس نے جیپ کے سامنے آتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ افضل نے جیپ ٹھہرا لی۔ وہ خوبصورت عورت مجھے جانی پہچانی سی لگی۔ میں نے اسے پہچاننے کی کوشش کی لیکن اس سے پہلے ہی اس نے مجھے پہچان لیا۔

اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی۔ اس نے کسی نامعلوم زبان میں چیخ کر افضل کو بتایا۔ مجھے اس کی زبان سے نکلنے والا صرف ایک لفظ سمجھ آیا۔۔ ترمتی!

مجھے اپنے قدموں تلے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی۔ میں اسے پہچان چکا تھا۔ وہ ندا تھی۔ میرے چہرے پر موجود میک اپ کے باوجود اس نے پہلی نظر میں مجھے پہچان لیا تھا۔ اس نے چیخ کر چوکیدار فتح محمد کو حکم دیا کہ وہ گیٹ بند کر دے۔ صورت حال کو بگڑتے دیکھ کر میں نے برق رفتاری سے اپنا پستول نکالنا چاہا لیکن افضل مجھ سے بڑھ کر پھرتیلا ثابت ہوا۔ اس نے پلک جھپکتے میں اپنا پستول نکالا اور اس کی بھیانک نال کا رخ میرے سینے کی طرف کر دیا۔

☆O☆

''اچھا تو وہ تو ہے'' افضل نے شدید طیش کے عالم میں بھنچی بھنچی آواز کے ساتھ دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ میں فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کی آنکھوں کی چمک زیادہ دہشت ناک ہے یا اس کے پستول کی نال۔ ان آنکھوں سے بہتے نفرت کے لاوے نے ایک لمحے میں مجھے اس کی نیت سے آگاہ کر دیا۔ وہ مجھے موت کے اندھیرے اتھاہ غار میں دھکیلنے والا تھا۔ بلاتوقف ایک لمحے کی بھی دیر کیے بغیر تیزی سے پھسلتی ساعتوں میں مجھے موت کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میرا دماغ فوری طور پر فیصلہ نہ کر سکا کہ میرے اعضاء کو کیا حکم دے۔ میری ذرا سی بھی حرکت کرنے سے پہلے وہ یقیناً فائر کر دیتا۔ عین اسی لمحے میں نے اس کے پستول والے ہاتھ کے انگوٹھے کو حرکت میں آتے دیکھا۔ اس کا انگوٹھا پستول کے ہیمر پر پہنچا۔ یہی وقت تھا جب میرے دماغ میں میرے ہاتھوں کو عمل کا حکم دیا۔ پستول کا ہیمر انگوٹھے کے دباؤ سے پیچھے ہوا۔ اس کے ساتھ ہی پستول فائر کے لیے تیار ہو گیا۔ افضل نے ٹرائیگر پر دباؤ ڈالا۔ عین اسی وقت میری کلائی کی اوپر کی سمت اٹھتی ضرب نے اس کے پستول والے بازو کو ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا دیا۔

ایک زبردست دھماکا ہوا۔ پستول کی نال سے چنگاریاں اڑیں۔ گولی پجیرو کی چھت کا شیشہ توڑتی فضا میں گم ہو گئی۔ فائر کے دھماکے سے مجھے اپنے کانوں میں باریک سیٹیاں گونجتی محسوس ہوئیں۔ افضل نے ایک مرتبہ پھر پستول کی نال کا رخ میرے سینے کی جانب کرنا چاہا لیکن میں نے اسے اس کا موقع نہ دیا۔ میرے بائیں ہاتھ کے فولادی پنجے نے اس کا پستول والا ہاتھ فضا میں ہی دبوچ لیا۔ باوجود کوشش کے وہ اپنے ہاتھ کو چھڑا نہ سکا۔ چار و نا چار اسے اپنے بائیں ہاتھ سے کام لینا پڑا۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ کا زوردار گھونسا میرے سینے پر رسید کیا۔ یہ ضرب اچھی خاصی طاقتور ہونے کے باوجود میرا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ البتہ میرے دائیں ہاتھ کے گھونسے نے اس کا منہ پھیر دیا۔ اس کے حلق سے ایک کرب ناک چیخ برآمد ہوئی۔ غلیظ قسم کی بھاری بھرکم گالیاں بکتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اپنی پوری قوت لگا دی کہ پستول کا رخ میری طرف کر کے فائر کر سکے۔ اس کی یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ پستول سے ایک اور فائر ہوا۔ اس مرتبہ گولی جیپ کی ونڈ سکرین کے اوپری سرے میں چھید کر کے تاریک فضا میں تیرتی چلی گئی۔

جیپ کی ونڈ شیلڈ پر مکڑی کے جالے کا خوبصورت سا ڈیزائن بن گیا۔ افضل نے میرے جبڑے پر گھونسے کی کاری ضرب لگانا چاہی۔ میں نے اس کا وار اپنے دائیں ہاتھ پر روکا۔ اس کے ساتھ ہی میرا ہاتھ برق رفتاری سے حرکت میں آیا۔ میرے دائیں ہاتھ کا گھونسا تباہ کن قوت سے اس کی ناک پر پڑا۔ وہ ذبح شدہ بکرے کے مانند ڈکرایا۔ مجھے اس کا پستول والا ہاتھ ڈھیلا پڑتا محسوس ہوا۔ میں نے اس کا ہاتھ وحشیانہ جھٹکے سے ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ وہ پستول پر اپنی گرفت برقرار نہ رکھ سکا۔ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پستول بریک پیڈل کے پاس جا گرا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو رہی تھیں۔ اس کی ناک سے بہنے والے خون کی دھار اس کی سفید براق قمیص کو سرخ کر رہی تھی۔ خون کے چھینٹے میرے چہرے اور قمیص پر بھی پڑ رہے تھے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اندھا دھند میرے چہرے پہ گھونسے مارنے کی کوشش کی۔ میں نے اپنا چہرہ بچاتے ہوئے اس کا بایاں ہاتھ بھی اپنے دائیں ہاتھ کی گرفت میں لے لیا۔ اب اس کے دونوں ہاتھ کی کلائیاں میرے ہاتھوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ اسٹیرنگ ویل کے عقب میں پھنسا ہونے کے باعث وہ آزادی سے حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ اپنا پورا زور لگا لے تو بھی میری گرفت سے اپنی کلائیاں نہیں چھڑا سکتا۔ ویسے بھی ناک سے بہنے والے خون کے باعث وہ لمحہ بہ لمحہ ہمت ہارتا جا رہا تھا۔ اس کی طرف سے تھوڑا اطمینان ہونے کے بعد میں نے جیپ سے باہر کی صورت حال کا جائزہ لیا۔ ندا حواس باختہ سی ہو کر جیپ کے اندر ہونے والی کشمکش کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ افضل کے پستول سے نکلنے والی گولیاں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکی ہیں۔ افضل کی بے بسی کا اندازہ لگانے میں بھی اسے دیر نہ لگی۔ شاید وہ اس کی ناک سے بہنے والے خون کو بھی دیکھ چکی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کی گھٹائیں چھانے لگیں۔ اس نے چیخ کر حویلی کے چوکیدار سے کچھ کہا۔ وہ حویلی کے گیٹ کے دونوں پٹ بند کر کے کنڈا لگانے والا تھا۔ اس کی کلاشنکوف اس کے شانے پر لٹکی ہوئی تھی۔ ندا کی چیخ نما آواز سن کر وہ ایک دم ساکت ہو گیا۔

گیٹ کی اسی حالت میں چھوڑ کر وہ تیزی سے پلٹا۔ اس دوران میں کلاشنکوف اس کے شانے سے اتر کر اس کے ہاتھوں میں آ گئی۔ ندا ایک مرتبہ پھر حلق پھاڑ کر چلائی۔ اس بار میں اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ کو واضح طور پر سمجھ گیا۔ اس نے سرائیکی زبان میں چوکیدار کو حکم دیا کہ وہ گولی مار کر میری کھوپڑی اڑا دے۔ چوکیدار نے پلک جھپکتے میں کلاشنکوف کاک کی اور ندا کے حکم کی تعمیل کے لیے پوری طرح تیار ہو گیا۔

صورت حال کے اس بدلتے رخ نے میرے اعصاب میں سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ میری سمجھ میں کہ میں فوری طور پر کیا کروں کہ کلاشنکوف کی اجل رساں گولی سے میری کھوپڑی ٹکڑوں میں بٹنے سے محفوظ رہ سکے۔ اگر میں افضل کو چھوڑ دیتا تو وہ بلاتوقف مجھ پر ٹوٹ پڑتا۔ مجھے اتنی مہلت ہی نہ ملتی کہ میں اپنا پستول نکال سکوں یا جیپ کے فرش پر پڑا افضل کا پستول اٹھا سکوں۔ ترمتی کے مانند اگر یہ بھی کراٹے کا

ماہر ثابت ہوتا تو اس کی لگائی ہوئی ایک ہی ضرب مجھے خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتی۔

بے حد مختصر لیکن ذہنی کشمکش کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس کے ہاتھ چھوڑ کر کوئی فیصلہ کن ضرب لگا کر اسے بیکار کر دوں اس کے بعد جیپ کے فرش سے اس کا پستول اٹھا کر اپنا دفاع کرنے کی کوشش کروں۔ یہ سب کرنے کے لیے میرے پاس محض چند لمحوں کی مہلت تھی۔ اگر اس سے پہلے وہ چوکیدار میرے سر پر پہنچ گیا تو میری داستان حیات کا آخری باب یہیں رقم ہو جائے گا۔ صرف یہ بات میرے حق میں جاتی ہے کہ چوکیدار فاصلے سے مجھے نشانہ نہیں بنا سکتا کیونکہ اس صورت میں افضل کے بھی گولی کی زد میں آنے کا خطرہ ہے۔ میں اپنے ارادے پر عمل کرنے ہی والا تھا کہ ایک زبردست دھماکے نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔

میں نے حویلی کے بھاری بھرکم گیٹ کو ایک زبردست جھٹکے سے کھلتے دیکھا۔ بھرپور قوت سے کھلنے والے گیٹ کا ایک پٹ طوفانی ریلے کے مانند چوکیدار کی پشت سے ٹکرایا۔ میں نے اس کی کھوپڑی کے فولادی چادر سے ٹکرانے کی آواز سنی۔ وہ بری طرح لڑکھڑاتا' کلابازی کھاتا آگے گرا اور منہ کے بل' پختہ راہ گزر پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کی کلاشنکوف مجھے اس سے چند قدم کے فاصلے پر پڑی نظر آئی۔ مجھے اس پر مزید توجہ دینے کی مہلت نہ مل سکی۔ کیونکہ اسی لمحے حویلی کے چوپٹ کھلے گیٹ سے میں نے پولیس کی جیپ کو اندر گھستے دیکھا۔ مست ہاتھی کی طرح جھومتی' لہراتی' چنگھاڑتی جیپ کی فرنٹ سیٹ پر مجھے صدیقی اور مرزا بیٹھے نظر آئے۔ میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔

جیپ ایک جھٹکے سے رکی۔ مرزا اور صدیقی نے صورت حال کو پوری طرح سمجھنے میں محض چند لمحے لگائے۔ افضل نے مجھے غافل سمجھ کر ایک زوردار جھٹکے سے اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس کے ہونٹ اور ٹھوڑی خون میں بری طرح لتھڑ چکے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔ میں نے مرزا کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایم پی فائیو سب مشین گن تھی۔ جیپ کا انجن بند کر کے صدیقی بھی اس کے پیچھے آنے لگا۔ میرے ذہن میں تشویش کی برق رفتار لہر پیدا ہوئی۔ وہ دونوں ہی ندا کو نظر انداز کر رہے تھے۔ صدیقی نے تو اپنا اعشاریہ دو دو کا پستول نکالنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔ میں نے چیخ کر انہیں خبردار کرنا چاہا لیکن عین اسی وقت افضل نے اپنے جسم کو یکجا کر کے پوری قوت سے میرے چہرے پر ٹکر ماری۔ اضطراری طور پر آنکھیں بند کر کے میں نے اپنا سر جھکا لیا۔ جس کے باعث وہ ٹکر میری ناک پر لگنے کی بجائے میری پیشانی پر لگی۔ ایک لمحے کے لیے میرا دماغ ہل کر رہ گیا۔

چکراتے سر کے ساتھ میں نے افضل کو ایک اور ضرب لگانے کے لیے تیار ہوتے دیکھا۔ عین اسی وقت مرزا نے اس کے عقب میں جیپ کا دروازہ کھولا اور اس کا کالر پکڑ کر اسے پیچھے کھینچ لیا۔ گلا گھٹنے کے باعث اس کی زبان باہر نکل آئی۔ صدیقی نے میری سمت والا دروازہ کھولا۔ عین اسی وقت میری نگاہ ندا پر پڑی۔ مجھے اپنے بدترین اندیشے سچ ہوتے محسوس ہوئے وہ نہایت تیزی سے لیکن خاموشی سے بے حس و

حرکت پڑے چوکیدار کی طرف بڑھ رہی تھی' اس کی کلاشنکوف اٹھانے کے لیے۔ میں نے چیخ کر صدیقی کو خطرے سے آگاہ کیا۔ وہ بجلی کی تیزی سے پلٹا۔ جب تک وہ ندا کے پاس پہنچتا' وہ جھک کر کلاشنکوف اٹھا چکی تھی اگر وہ کلاشنکوف اٹھا کر پلٹنے میں کامیاب ہو جاتی تو ہم تینوں کے جسم چھلنی کرنے میں اسے محض چند سیکنڈ لگتے۔ خطرے کو بھانپتے ہوئے صدیقی نے نہایت بے رحمی سے ندا کی پشت پر زوردار ٹھوکر ماری۔ اس کے منہ سے زبردست چیخ برآمد ہوئی۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک طرف گر گئی اور وہ اوندھے منہ چوکیدار کے پاس ڈھیر ہو گئی۔

صدیقی نے اسے نظر انداز کر کے کلاشنکوف کی طرف بڑھنا چاہا لیکن اسی لمحے ندا خونخوار جنگلی بلی کی مانند غراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ صدیقی نے چونک کر اس کی سمت دیکھا۔ ندا کے جسم میں تناؤ پیدا ہوا۔ اپنے آپ کو متوازن کرتے ہوئے اس نے اپنے جسم کو ایک خاص انداز میں حرکت دی۔ صدیقی بے حد پھرتی سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اگر وہ لمحہ بھر کی بھی دیر کر دیتا تو ندا کی فضا میں سنسناہٹ پیدا کر دینے والی کک اس کے جبڑے کو شکستہ کر دیتی۔ وار ناکام ہونے کے باوجود ندا نے اپنا توازن دوبارہ حاصل کرنے میں دیر نہ لگائی۔ اس کی مہارت اور چابک دستی نے مجھے بے اختیار واہ کہنے پر مجبور کر دیا۔ میری گرفت میں جکڑے افضل کی نظریں بھی اسی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اس نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ عین اسی وقت میں نے مرزا کو اس کے عقب میں نمودار ہوتے دیکھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں اپنی ایم پی فائیو سب مشین گن تولی خطرے کو محسوس کر کے افضل نے پلٹ کر دیکھنا چاہا لیکن مرزا نے اسے مہلت نہ دی۔

ایم پی فائیو کا پچھلا حصہ اس کی کھوپڑی کے عقبی حصہ سے ٹکرایا۔ اس کی آنکھوں میں جھما کا سا ہوا پھر وہ چمکدار آنکھیں بجھتی چلی گئیں۔ اس کے بے حس و حرکت جسم کو میں نے اپنی طرف کھینچ کر ڈرائیونگ سیٹ خالی کر دی۔ مرزا نے جیپ کا دروازہ کھولا اور اسٹیئرنگ ویل پر قابض ہو گیا۔ میں نے مرزا کی مدد سے افضل کو پچھلی نشستوں پر ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے جھک کر افضل کا پستول اٹھا لیا۔ مرزا نے اگنیشن میں چابی گھمائی اس کے ساتھ ہی جیپ کا طاقتور انجن جاگ اٹھا۔ ہم دونوں بے تاب نظروں سے صدیقی اور ندا کی جانب متوجہ ہوئے۔ ہم نے دیکھا وہ دونوں خونی نظروں سے ایک دوسرے کو تولتے ہوئے آہستہ آہستہ پینترے بدل رہے ہیں۔ صدیقی نے بھی ندا کی طرح دونوں ہاتھ گھونسوں کی شکل میں اٹھا رکھے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ صدیقی بھی کراٹے کے فن کا ماہر ہے۔ مرزا نے جیپ کے ایکسلیٹر پر اپنے پاؤں کا دباؤ بڑھایا تاکہ صدیقی ہماری طرف متوجہ ہو اور ہم وہاں سے نکل بھاگیں لیکن صدیقی کے انہماک میں کوئی کمی نہ آئی۔

یک لخت ندا نے اپنے حلق سے چیخ کی سی آواز نکالی اور صدیقی کو بھپکی دی کہ وہ دائیں پاؤں سے کک لگانے والی ہے۔ صدیقی کے جسم نے تیزی سے حرکت کی۔ اس کا بایاں گھٹنا کسی آہنی کھمبے کی مانند

اُوپر اٹھ کر اس کے سینے کے ساتھ چپک گیا۔عین اسی وقت ندا بجلی کی سی تیزی سے زمین پر بیٹھ گئی۔وہ پھرکی کی طرح گھومی۔ ایک شراٹے سے اس کی دائیں ٹانگ صدیقی کے پیروں کی طرف بڑھی قبل اس کے کہ وہ صدیقی کے پیروں سے ٹکراتی وہ فضا میں اچھل گیا۔وار خالی ہونے کے باعث ندا کا توازن بگڑا۔صدیقی نے وہ موقع ضائع نہیں ہونے دیا۔اس نے اچھل کر اپنی پوری قوت سے ندا کے پہلو میں ٹھوکر ماری۔ندا نے ایک کرب ناک چیخ ماری۔صدیقی نے بلاتوقف دوسری ٹھوکر بھی اس کے پہلو میں دے ماری۔ندا اپنے پہلو کو پکڑ کر چیختی گھسٹتی پیچھے ہٹی۔صدیقی ایک مرتبہ پھر اس کی جانب لپکا۔عین اسی وقت مرزا نے جیپ کو گیئر میں ڈال کر آگے بڑھا دیا۔

''بس کرو صدیقی گاڑی میں آجاؤ۔'' مرزا نے چیخ کر کہا۔صدیقی نے چونک کر ہماری طرف دیکھا۔ندا نے اس کی اس معمولی سی غفلت کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔وہ کوڑیالے سانپ کی طرح رینگتی کلاشنکوف کی طرف بڑھی۔

''صدیقی صاحب!'' میں نے چیخ کر صدیقی کو اس کی طرف متوجہ کیا۔وہ مڑا اور تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ مجھے لگا کہ اسے دیر ہوگئی ہے۔ندا نے کلاشنکوف پر قبضہ کیا اور تیزی سے ہماری طرف گھومی اسی اثنا میں صدیقی اس کے سر پا جا پہنچا۔قبل اس کے کہ ندا کلاشنکوف کا ٹرائیگر دباتی' صدیقی بجلی کی سی تیزی سے جھکا۔اس کے ندا کے ہلکے پھلکے وجود کو اپنے شانے پر لادا اور ایک وحشیانہ جھٹکے سے اپنے عقب میں اچھال دیا۔وہ لکڑی کے بے جان لٹھے کے مانند دھپ سے پختہ زمین پر گری۔اس سے حلق سے نکلنے والی چیخ بڑی بھیانک تھی۔وہ کلاشنکوف پر اپنی گرفت کھو بیٹھی۔

صدیقی نے لپک کر کلاشنکوف اٹھالی۔وہ ندا پر گولی چلانے ہی والا تھا کہ مرزا نے چیخ کر اسے ایسا کرنے سے منع کیا اور اسے کہا کہ وہ فوراً گاڑی میں آجائے تا کہ ہم فوری طور پر یہاں سے فرار ہوسکیں۔ ندا بے دم سی زمین پر پڑی اپنی قسمت کے فیصلے کی منتظر تھی۔قدرے تذبذب کے بعد صدیقی نے مرزا کی بات مان لی۔اس کی آنکھوں میں بھڑکتے شعلے دھیمے پڑ گئے۔اس نے نفرت بھری ایک نگاہ ندا پر ڈالی اور تیز قدموں سے چلتا جیپ کی طرف آگیا۔

صدیقی نے میرے ساتھ والی سیٹ سنبھالی۔اس کے ساتھ ہی مرزا نے بریک پر سے پاؤں ہٹا لیا۔جیپ اوندھے منہ پڑے چوکیدار کو بچاتی کھلے گیٹ کی طرف بڑھی' میں نے ایک نظر ندا پر ڈالی۔وہ کروٹ کے بل گٹھڑی سی بنی پڑی تھی۔جیپ کے انجن کی دھیمی گڑگڑاہٹ سن کر اس نے ایک مایوسی بھری نظر جیپ پر ڈالی۔درد سے بے حال ہو کر اس نے ایک بار پھر اپنا سر زمین پر ڈال دیا۔

جیپ گیٹ سے نکل کر چند قدم ہی آگے بڑھی ہوگی کہ مرزا نے ایک جھٹکے سے اسے روک دیا۔'' کیوں کیا ہوا مرزا؟ گاڑی کیوں روک دی؟'' صدیقی نے حیرانی اور بے چینی کے ملے جلے تاثرات کے

''تم لوگ یہیں ٹھہرو۔میں ابھی واپس آتا ہوں۔'' مرزا نے کہا اور ایم پی فائیو سنبھالتا جیپ سے اتر کر تیزی سے حویلی کی طرف بڑھا۔ مجھے لگا کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔صدیقی نے استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔میں نے حیرانی کے انداز میں اپنے شانے اچکا دیے۔

''تم اس کے پیچھے جاؤ بھائی ذوالفقار علی۔خدا جانے کیا چکر ہے۔کہیں یہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔'' صدیقی نے مضطرب لہجے میں کہا۔

میں نے ڈرائیونگ سیٹ والی سمت والا دروازہ کھولا اور اپنا پستول سنبھال کر حویلی کے کھلے ہوئے گیٹ سے اندر داخل ہوگیا۔ مجھے وہاں کے منظر میں کوئی تبدیلی نظر نہ آئی البتہ مرزا مجھے وہاں نہیں ملا۔ مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ شاید وہ حویلی کی اصل عمارت میں گھس گیا ہے۔میں نے نہایت احتیاط سے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیا۔مجھے وہاں کوئی خطرے والی بات نظر نہ آئی۔ندا اوندھے منہ زمین پر پڑی کرب ناک انداز میں کراہ رہی تھی۔چوکیدار کے متعلق میں نے اندازہ لگایا کہ وہ یا تو اپنی زندگی کی سرحد عبور کر چکا ہے یا پھر طویل عرصے کے لیے اپنے ہوش وحواس سے بے گانہ ہو چکا ہے۔ان کی طرف سے بےفکر ہو کر میں حویلی کے اندر گھستا چلا گیا۔میں نے دیکھا مرزا حویلی کے ہال میں واقع تین کمروں میں سے ایک میں سے نکل کر دوسرے میں گھس گیا۔مرزا میری آہٹ پا کر تیزی بے پلٹا یہی خیر رہی کہ اس نے سب مشین گن کا ٹریگر نہیں دبا دیا۔

''یہ آپ کیا تلاش کرتے پھر رہے ہیں مرزا صاحب؟''

''ٹرانسمیٹر ---لانگ رینج کا طاقتور ٹرانسمیٹر جس کے ذریعے افضل بھارت میں اپنے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کرتا ہے۔تم بھی میرے ساتھ مل کر اسے تلاش کرو۔'' مرزا نے تیزی سے کمرے کا سامان الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ تو یہ بات ہے! لیکن آپ اس ٹرانسمیٹر کا کیا کریں گے؟'' میں نے حیرانی سے سوال کیا۔

''افوہ یار تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ارے بھئی۔ہم فوری طور پر اسلام آباد میں اپنے ہیڈ آفس سے رابطہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ٹیلی فون لائنوں پر سردار شاہ مراد کے حکم سے پہرا بٹھا دیا گیا ہے۔ایسے میں ہمارے پاس اگر یہ ٹرانسمیٹر موجود ہوگا تو ہمارا یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ہم اس ٹرانسمیٹر کے ذریعے اپنے ہیڈ آفس سے مسلسل رابطہ رکھ سکتے ہیں۔''

''واقعی! اگر ایسا ہو جائے تو ہماری بہت بڑی مشکل دور ہوسکتی ہے۔لیکن یہ سب تو اس وقت ہوسکتا ہے جب ہم اس ٹرانسمیٹر کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔'' میں نے ایک الماری میں پڑے کاٹھ کباڑ کو باہر نکالتے ہوئے کہا۔

''ڈھونڈو بھائی ڈھونڈو۔یہ بے حد ضروری ہے۔'' یک لخت میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں ایک جھٹکے سے رک گیا۔میرا دل چاہا کہ اپنی حماقت پر اپنا سر پیٹ لوں۔

''یہ ٹامک ٹوئیاں مارنا بند کرو مرزا صاحب۔ وہ ٹرانسمیٹر ہمیں یہاں نہیں ملے گا۔''

''کیا مطلب؟'' مرزا نے حیرانی سے پوچھا۔

''میرا مطلب ہے وہ ٹرانسمیٹر ان کمروں میں نہیں بلکہ اوپری منزل پر واقع افضل کی خواب گاہ میں ہوگا۔ اس وسیع و عریض حویلی کے تمام بیڈ رومز اوپر کی منزل پر ہیں۔''

''تم صحیح کہہ رہے ہو۔'' مرزا نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''واقعی وہ ٹرانسمیٹر اس خبیث کی خواب گاہ میں ہی ہوسکتا ہے۔ چلو وہیں چلتے ہیں۔''

میں مرزا کو ساتھ لے کر اوپری منزل پر پہنچ گیا۔ ہمیں یہ جاننے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ وہاں پر واقع متعدد بیڈ رومز میں سے صرف سب سے بڑا بیڈ روم استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا سیدھا سیدھا مطلب یہ تھا کہ ندا اور افضل ایک ہی بیڈ روم استعمال کرتے تھے۔ میرے اس خیال کی تصدیق بھی فوراً ہی ہوگئی۔ اس پرآسائش خواب گاہ کا وسیع و عریض بستر واضع طور پر اعلان کر رہا تھا کہ اسے کسی جوان' امنگوں بھرے جوڑے نے اپنی عیش و عشرت کا مرکز بنایا ہے۔ اشتعال انگیز پرفیوم سے مہکتی فضا میں دھیمی دھیمی جذبات کی تپش ابھی تک باقی تھی۔

مرزا نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا پھر ہم دونوں ٹرانسمیٹر کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ مرزا نے مجھے ٹرانسمیٹر کی امکانی ساخت بتادی تھی۔ مرزا خواب گاہ کے وارڈ روب کو کھنگالنے لگا۔ میں وسیع و عریض بیڈ روم کا باریک بینی سے جائزہ لینے لگا۔ میں نے بیڈ پر بچھا فوم کا دبیز گدا اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔ مسہری کے نیچے مجھے ایک بڑا سا سوٹ کیس نظر آیا میں نے اسے باہر نکال کر کھولا اس میں سے کچھ مردانہ ملبوسات اور متفرق اشیاء کے علاوہ مجھے کوئی قابل توجہ چیز نہ مل سکی اسی اثنا میں مرزا بھی میرے پاس آ گیا اسے بھی کوئی قابل ذکر چیز نہ مل سکی تھی اسی وقت میری نظر بیڈ کے سرہانے پر پڑی مجھے بیڈ کا وہ حصہ غیر معمولی محسوس ہوا میں نے اس کے ساتھ زور آزمائی کی تو وہ کسی چوبی بکس کے ڈھکن کی طرح کھل گیا سامنے ہی مجھے اپنا گوہر مطلوب نظر آ گیا میں نے مسرور نظروں سے مرزا کی جانب دیکھا اس کی آنکھیں بھی خوشی سے چمک رہی تھیں اس نے نہایت احتیاط سے خلا میں ہاتھ ڈالا اور اس چنپے سے دھاتی بریف کیس کو باہر نکال لیا ''چلو اب جلدی سے یہاں سے نکل چلو ایسا نہ ہو کوئی اور مسئلہ کھڑا ہو جائے'' مرزا نے اپنی ایم پی فائیو مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔

ہم لوگ حویلی کے احاطے میں پہنچے۔ میں نے دیکھا کہ چوکیدار کے ساتھ ساتھ اب ندا بھی بے حس و حرکت پڑی ہے۔ اسے نظر انداز کر کے ہم دونوں گیٹ کے بھڑے ہوئے پاٹ کھول کر باہر نکل آئے۔ ہم دونوں جیپ کے دروازے کھول کر جونہی اندر گھسے' صدیقی بری طرح ہم پر برس پڑا۔

''تم لوگوں کا دماغ خراب ہوگیا ہے کیا؟ کیا تم پک نک پر آئے ہوئے ہو جو ادھر ادھر گھومتے پھر رہے ہو؟ تم لوگوں کو احساس نہیں ہے کہ۔۔۔۔''

''بس بس بھائی یہ دیکھو ہم تمہارے لیے کیا لائے ہیں۔'' مرزا نے دھاتی بریف کیس اس کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔ صدیقی نے حیران حیران سی نظروں سے بریف کیس کو دیکھا۔

''یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟''

''اس کیس میں سردار شاہ مراد کے ملوث ہونے کا پہلا ٹھوس ثبوت۔۔۔ وہ ٹرانسمیٹر جس کے ذریعے یہ شخص را کے افسران بالا کے احکام سردار شاہ مراد تک پہنچاتا ہے۔'' مرزا نے پچھلی سیٹ پر پڑے افضل کی طرف اشارہ کیا۔ مرزا کی زبان سے نکلنے والے ان الفاظ نے صدیقی کے چہرے پر قوس قزح کے رنگ بکھیر دیے۔

''بہت خوب۔۔۔ یہ کام کیا ہے نا تم لوگوں نے شان دار قسم کا۔۔۔۔! بس اب تم یہاں سے نکل چلو۔۔۔ ذوالفقار تم اسے راستہ بتاؤ۔''

مرزا نے *بجیر و جیپ آگے بڑھادی۔ بجائے الٹے ہاتھ یعنی اڈے کی طرف مڑوانے کے' میں نے جیپ کا رخ مغرب کی طرف کروادیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم لوگ آبادی کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ میں نے مرزا کو مشورہ دیا کہ وہ گاڑی کی رفتار تیز نہ رکھے تاکہ ہم خواہ مخواہ لوگوں کی نیندیں اچاٹ کر کے ان کی مشکوک نگاہوں کا مرکز نہ بن جائیں۔ صدیقی پچھلی سیٹ پر پڑے' افضل کا جائزہ لے چکا تھا۔ اسے ہوش میں آنے کے لیے کئی گھنٹے درکار تھے۔

چند موڑ مڑنے کے بعد جیپ چھتیس بلاک والی پانی کی پرانی ٹنکی کے پاس پہنچ گئی۔ تبھی میں نے محسوس کیا کہ مرزا کچھ اضطراب کا شکار ہے۔ اس نے کئی بار عقبی آئینے پر نگاہ ڈالی۔ مجھے کسی خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہاں پر مجھے کوئی قابل ذکر شے نظر نہ آئی۔ مرزا نے ایک بار پھر عقبی آئینے پر نگاہ ڈالی۔

''خیریت تو ہے مرزا صاحب۔ آپ کچھ پریشان ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہے!'' مرزا نے پریشان سے لہجے میں کہا۔ اس کی ہم دونوں چونک اٹھے۔

''اوہ! یہ آپ کا کہہ رہے ہیں؟ یہ ہمارا پیچھا کرنے والا کہاں سے آن ٹپکا؟''

''پتا نہیں۔ کوئی گاڑی ہے جو لائٹیں بند کیے خاصا فاصلہ رکھ کر ہماری گاڑی کا تعاقب کر رہی ہے۔''

مرزا کی بات سن کر میں سیٹ پر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ جیپ کی شکستہ سن روف ہٹا کر میں بغور جیپ کے عقب میں دیکھنے لگا۔ خاصی جدوجہد کے بعد بالآخر وہ گاڑی مجھے نظر آ ہی گئی۔

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں مرزا صاحب کوئی گاڑی ہے جو مسلسل ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔''

''پھر اب کیا کیا جائے؟ اس گاڑی میں موجود افراد شاید صرف ہمارے ٹھکانے کا پتا لگانا چاہتے ہیں۔'' مرزا نے اضطراب کے عالم میں کہا۔

"یہ جو کوئی بھی ہوں ہمیں ان سے فوری طور پر چھٹکارا پا لینا چاہیے۔ بصورت دیگر یہ ہماری زندگیوں کے لیے موت کا پیغام ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"مگر یہ گاڑی تو ہماری جیپ سے اتنا فاصلہ رکھے ہوئے ہے کہ ہم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ ایسے میں۔۔۔" مرزا نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"اس کا علاج کوئی مشکل نہیں آپ گاڑی کو بظاہر بائیں ہاتھ پر موڑیں اس کے بعد تمام لائٹس بند کر کے گاڑی کو دائیں ہاتھ پر ٹنکی والی گول چورنگی کے گرد گھمالیں۔ وہ لوگ سمجھیں گے ہم بائیں ہاتھ پر مڑ گئے ہیں۔ جوں ہی ان کی گاڑی یہاں سے بائیں مڑے گی ہم گولائی کا چکر کاٹ کر ان کے عقب میں پہنچ جائیں گے۔"

میری تجویز کو قابل عمل محسوس کر کے مرزا نے فوری طور پر اسے عملی جامہ پہنا دیا۔ جیپ کی لائٹس بند ہوئیں اور وہ ٹنکی والی گول چورنگی کا چکر کاٹنے لگی۔ اس اثنا میں' میں ایم پی فائیو کے ساتھ جیپ کی چھت میں موجود سن روف کے خلا میں پوزیشن سنبھال کر کھڑا ہو گیا۔ جیپ نے گھات لگائے ہوئے چیتے کے مانند نہایت آہستگی اور خاموشی سے چورنگی کا چکر کاٹا۔ عین اسی وقت ہمیں اپنے تعاقب میں آنے والی گاڑی نظر آ گئی۔ میں نے اس گاڑی کو فوراً پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے پورے وجود میں سنسناہٹ کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ وہ گاڑی دراصل پولیس جیپ تھی اور اسے چلانے والا کوئی اور نہیں ندا تھی۔ ہم نے اس کی حالت کا غلط اندازہ لگایا۔ اس نے شدید زخمی اور پھر بے ہوش ہونے کا ناٹک کیا۔ ہم اس کے فریب میں آ گئے اور اسے اپنی سمجھ کے مطابق' نیم مردہ سمجھ کر وہیں چھوڑ دیا۔ اس پر دوسری حماقت یہ کہ پولیس کی جیپ بھی مع چابی صحیح سالم وہاں چھوڑ دی تاکہ اگر کوئی ہمارے تعاقب میں آنا چاہے تو اسے کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئے۔

پولیس کی جیپ قدرے تیز رفتاری سے چورنگی سے بائیں ہاتھ والی سڑک پر مڑ گئی۔ مرزا نے اپنی جیپ بھی اس کے پیچھے لگا دی۔ ندا نے فوری طور پر صورت حال کا اندازہ لگا لیا۔ اس کی جیپ کی رفتار میں بے حد تیزی سے اضافہ ہوا۔ لیکن مرزا نے اسے نکل بھاگنے کا موقع نہیں دیا۔ دونوں گاڑیوں کا باہمی فاصلہ برقرار رہا۔ میں نے اپنی ایم پی فائیو اپنے شانے سے لگائی۔ پولیس کی جیپ کے عقبی حصے کا نشانہ لیا اور فائر کھول دیا۔ جلترنگ کی مخصوص آواز کے ساتھ گولیوں کی بوچھاڑ ایم پی فائیو سے نکلی اور پولیس کی جیپ کے عقبی کھڑکی کے شیشے چکنا چور ہو گئے۔ جیپ ایک مرتبہ بری طرح لہرائی لیکن ندا نے اسے فوری طور پر سنبھال لیا۔ اس نے جیپ کی رفتار میں مزید اضافہ کر دیا لیکن ہم سے جان نہ چھڑا سکی۔

گول باغ کی گول چورنگی پر پہنچ کر اس نے گولائی کا چکر کاٹنے کے بجائے جیپ کو براہ راست دائیں ہاتھ پر موڑ دیا۔ مرزا نے بھی نہایت چابک دستی سے اس کی پیروی کی۔ ندا اپنی پوری کوشش کے باوجود دونوں گاڑیوں کا باہمی فاصلہ نہ بڑھا سکی۔ سیدھی سڑک پر آتے ہی میں نے ایک مرتبہ پھر جیپ کا

نشانہ باندھا اور ٹریگر دبا دیا۔ ایک مرتبہ پھر گولیوں کی بوچھاڑ جیپ کی باڈی پر پڑی۔ ایک زبردست دھماکے سے جیپ کے پچھلے حصے میں نصب اضافی ٹائر پھٹا لیکن جیپ کی رفتار پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر ذرا زیادہ احتیاط سے پولیس جیپ کا نشانہ باندھا۔ جیپ کے ٹائروں کو اپنا ہدف مان کر میں نے اپنی ایم پی فائیو کا ٹریگر دبا دیا۔ میری یہ کاوش تیر بہ ہدف ثابت ہوئی۔ جیپ کے دائیں عقبی ٹائر کے پرخچے اڑ گئے۔ تیز رفتاری سے دوڑتی جیپ مست ہاتھی کی طرح لہرائی۔ قبل اس کے کہ ندا اس پر قابو پاتی' جیپ بے قابو ہو کر ایک الیکٹرک پول سے ٹکرائی اور ایک جھٹکے سے رک گئی۔ میں نے ایک ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ اس شدید تصادم کے بعد گاڑی اسٹارٹ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ندا بھی یقیناً شدید زخمی ہوئی ہو گی لیکن میں نے مرزا کو جیپ ٹھہرانے نہیں دی۔ کچھ ہی دیر بعد اس علاقے کے تمام باسی اپنی میٹھی نیند سے بیدار ہو کر اس جگہ پہنچ جاتے۔ ان میں سے کسی بھی سرپھرے کی مہم جوئی کی خواہش ہمارے لیے مسائل کا باعث بن جاتی۔

جیپ بائیں ہاتھ پر مڑ کر' دربار قادریہ کے سامنے سے گزر کر سیدھی اسٹیشن روڈ پر جا چڑھی۔ جیپ کی ونڈ شیلڈ کی خستہ حالت کسی بھی لمحے ہمیں مشکوک بنا سکتی تھی۔ لہٰذا مرزا نے جیپ کے ایکسیلیٹر پر پیر کا بھرپور دباؤ مسلسل برقرار رکھا۔ سرکٹ ہاؤس کے سامنے سے ہم بائیں ہاتھ مڑے اور گول سڑک کے بائیں پہلو سے چکر کاٹ کر سیدھے کالج والی چورنگی پر جا پہنچے۔ رات کے آخر پہر کی خنک' خواب آلود فضا نے ہمیں کسی بھی مداخلت کنندہ سے محفوظ رکھا تھا۔ اس سمے شاید قانون کے رکھوالے اور قانون شکن دونوں ہی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہوں گے البتہ ہمیں ڈاکٹر صنم پوری طرح جاگتی ہوئی ملی۔ اس نے مجھے گیٹ کے پاس دیکھتے ہی گیٹ کی کھڑکی کھول دی۔

"کیا۔۔۔ کیا تم لوگ۔۔۔۔؟"

"ہم لوگ کامیاب لوٹے ہیں۔" میں نے دھیمے سے لہجے میں اسے تسلی دی۔

"تم لوگ خیریت سے تو ہو؟ کوئی زخمی۔۔۔" اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

اسے جواب دینے کے بجائے میں نے جیپ کا درمیانی دروازہ کھول دیا۔ مرزا اور صدیقی نے بے ہوش افضل کو گاڑی سے اتارنے میں میری مدد کی۔ میں اور صدیقی اسے ڈنڈا ڈولی کر کے گھر کے اندر کی طرف بڑھے جبکہ مرزا محتاط نظروں سے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ افضل کو دیکھ کر ڈاکٹر صنم کے چہرے پر جوش اور تجسس کے آثار نمایاں ہوئے۔

"تو۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ ہے وہ!" اسی وقت اس کی نظر افضل کے خون میں لتھڑے چہرے اور لباس پر پڑی۔ "یہ۔۔۔ یہ تو شش۔۔۔ شدید زخمی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ ہم اسے شادی کا دعوت نامہ دینے تو نہیں گئے تھے نا؟" مرزا نے ہلکی سی جھنجلاہٹ کے ساتھ کہا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہے یا کم از کم فی الحال تو نہیں ہے۔" صدیقی نے ڈاکٹر صنم کو تسلی دی۔ تمام راستے افضل کی نگرانی کی ذمے داری وہی نبھاتا رہا تھا۔ افضل کو معائنے کی ٹیبل پر لٹا دیا گیا۔

"تم لوگ اسے اچھی طرح سے قابو کر کے باندھو اسی اثنا میں، میں جیپ سے نجات حاصل کر کے آتا ہوں۔"

"ٹھہریے مرزا صاحب میں بھی آپ کے ہمراہ چلتا ہوں۔ اس کی مشکیں کسنے کے لیے ڈاکٹر صنم اور صدیقی صاحب کافی ہیں۔" میں نے کہا۔ مرزا نے میری تجویز پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں نے مرزا کی ڈانٹ کے پل تک رہنمائی کی۔

"میرا خیال ہے گاڑی کو نہر میں گرا دیا جائے۔" مرزا نے تجویز پیش کی۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح خواہ مخواہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ جیپ کو ایک طرف کر کے ٹھہرا دیں۔ یہ بے حد مصروف چوراہا ہے۔ وہ لوگ کسی طرح بھی اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ہمارا ٹھکانہ کس طرف ہے۔" مرزا نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ بجیرو جیپ کو ایک تاریک گوشے میں کھڑا کر کے ہم لوگ اس سے اتر آئے۔ آبادی کے درمیان سے گزر کر ہم بہت کم وقت میں اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔

"ارے آپ لوگ اتنی جلدی واپس آ گئے؟" ڈاکٹر صنم نے حیرانی سے کہا۔ "جی محترمہ آپ نے ابھی ہمارے کمالات دیکھے ہی کہاں ہیں؟" میں نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟"

"اچھا جناب آپ جو کچھ دکھائیں گے میں دیکھ لوں گی۔ فی الوقت تو آپ لوگ صدیقی صاحب کے پاس پہنچیں۔ میں فٹافٹ چائے اور ہلکا پھلکا ناشتا تیار کر کے لاتی ہوں۔"

معائنے کے کمرے میں پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ صدیقی اس دھاتی بریف کیس کو اپنے سامنے میز پر رکھے بیٹھا ہے۔ افضل کو ان دونوں نے اس بری طرح جکڑا ہوا تھا کہ شاید اسے سانس لینے میں بھی دشواری پیش آ رہی ہو گی۔

"ہاں بھئی صدیقی کچھ سلسلہ سمجھ آیا اس ٹرانسمیٹر کا؟" مرزا نے پوچھا۔

"وہ تو بہت بعد کی بات ہے بھائی۔ پہلے یہ کھلے تو سہی۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟ کیا تم اب تک اسے کھول بھی نہیں سکے ہو؟" مرزا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تم نے اسے اپنی پھوپھو کا بکسا سمجھا ہے کہ یہ ہاتھ لگاتے ہی کھل جائے گا۔ اس بریف کیس میں کوڈ نمبر والا ڈیجیٹل لاک لگا ہوا ہے۔ صحیح کوڈ معلوم ہونے پر ہی اسے کھولا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف اس بریف کیس کے ساتھ طاقت آزمائی کرنا بھی مشکل ہے۔ ایک تو یہ بنا ہوا ہی بہت مضبوط دھات کا ہے۔ بالفرض ہم اسے توڑنے میں کامیاب ہو بھی جائیں تو اس امر کا قوی اندیشہ ہے کہ اس عمل کے دوران میں

ٹرانسمیٹر کو شدید نقصان پہنچ جائے گا اور یہ مکمل طور پر ناکارہ ہو جائے گا۔"

صدیقی کی بتائی ہوئی باتوں نے مرزا کے چہرے پر تفکر کے گہرے تاثرات پیدا کر دیے۔ "ہوں! تو یہ بات ہے۔ اس طرح تو ہم اس ٹرانسمیٹر سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔"

"اب ایسا بھی اندھیر نہیں ہے بھائی۔" صدیقی نے قدرے مطمئن لہجے میں کہا۔ "ذرا اس حرامی لونڈے کو ہوش میں آنے دو۔ ہم اسے زبان کھولنے پر مجبور کر دیں گے۔ اس کے بعد یہ خود ہمیں اس بریف کیس کا کوڈ نمبر بتائے گا۔ جب تک اس کی زبان نہ کھلے اس وقت تک ویسے بھی یہ ٹرانسمیٹر ہمارے کسی کام کا نہیں ہے۔"

"کہہ تو تم صحیح رہے ہو۔ اصل مسئلہ تو اس کی زبان کھلوانا ہی ہے۔ اس کے بعد تو ہمارے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ خیر یہ ہمارے سامنے کتنی دیر اپنی زبان بند رکھ سکے گا۔ میں تو اس کا خون پی جاؤں گا۔" مرزا نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

میں نے اس کی خوش فہمی پر مبنی دعوے کو جھٹلانے کی کوشش نہیں کی۔ اس لمحے شاید وہ مکمل طور پر اس حقیقت کو فراموش کر چکے تھے کہ ان کا واسطہ ایک تربیت یافتہ غیر ملکی ایجنٹ سے ہے۔

"تم نے اس کے منہ پر جما خون صاف نہیں کروایا؟" میں نے افضل کی دگرگوں حالت پر نظر ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

"ڈاکٹر صنم اس کا چہرہ صاف کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ اگرچہ اس کا خاصا خون بہہ چکا ہے۔ تاہم اس کی زندگی کو کسی قسم کا خطرہ لاحق نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ اسی حالت میں ہوش میں آئے۔ خود کو اس بے بسی اور کسمپرسی کی حالت میں جکڑا دیکھ کر یہ نفسیاتی اضمحلال کا شکار ہو جائے۔ اپنا خون دیکھ کر شاید اس کی قوت مزاحمت جلد جواب دے جائے۔" مرزا نے اثبات میں سر ہلا کر اس کے موقف کی تائید کی۔

ڈاکٹر صنم جب چائے اور لوازم لے کر آئی تو پو پھٹنے لگی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ تھوڑے سے اعصابی تناؤ کا شکار ہے۔ شاید وہ آنے والے لمحات کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ہم افضل کی زبان کھلوانے کے لیے اس پر تشدد کریں گے۔ عورت ہونے کے ناطے یہ سب کچھ اس کے لیے شدید اعصابی کشیدگی کا باعث ہوتا۔

ناشتے کے بعد ہم نے ضروری کارروائیاں شروع کر دیں۔ مرزا اور صدیقی نے ڈاکٹر صنم کے آلات جراحی کی مدد سے افضل کا منہ کھول لیا۔ وہ بڑی باریک بینی سے اس کے دانتوں کا جائزہ لیتے رہے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ لوگ کیا تلاش کر رہے ہیں۔ قبل اس کے کہ میں کوئی سوال کرتا، مرزا پر جوش لہجے میں چلایا۔

"یہ رہا۔۔۔ اوپری داڑھوں کے آخر میں۔۔" صدیقی نے چونک کر مرزا کی بتائی ہوئی جگہ پر نظر

ڈالی۔

"کون سی داڑھ کے ساتھ۔۔۔؟ وہ پیلا پیلا سا نوکیلا سراتا؟"

"ہاں ہاں بالکل وہی۔۔۔ یہ یقیناً مصنوعی داڑھ ہے۔" مرزا نے پرجوش انداز میں اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لیکن بالکل ایسی ہی داڑھ اس کے جبڑے کے دوسری سمت بھی ہے۔"

"اچھا۔۔۔ کون سی؟" صدیقی نے چھوٹی ٹارچ کی روشنی افضل کے کھلے ہوئے منہ کی دوسری سمت ڈالی۔

"ارے ہاں۔۔۔ یہ داڑھ تو بالکل ویسی ہے۔ اس کا مطلب ہے۔ ان لوگوں نے دہرا بندوبست کر رکھا ہے۔ یہ ہندو لالے ہماری توقع سے بڑھ کر چالاک ثابت ہو رہے ہیں۔"

میں نے صورت حال کو کچھ کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگوں کی یہی تو خوش فہمی ہماری تباہی کا باعث ہے مرزا صاحب۔ ہم ان لوگوں کو مضحکہ خیز اور تمسخر آمیز ناموں سے پکار کر اپنا دل خوش کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ واقعی اتنے ہی بے وقوف ہیں جتنا کہ یہ اپنے حلیوں اور اپنے ناموں سے معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے اسی جھوٹے احساس تفاخر اور برتری کے باعث ہمیں باز بار منہ کی کھانا پڑی ہے لیکن ہم آج تک ان احساسات سے نجات نہیں پا سکے۔ حالانکہ ہم مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں ایک زبردست قومی سانحے سے دوچار ہو چکے ہیں۔ وہ سب ان ہی احمق صورت ہندو لالوں کا کیا دھرا تھا۔"

"ارے ارے تم تو جذباتی ہو گئے ذوالفقار بھائی۔ یقین کرو ہم لوگ کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار نہیں ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ کتنے زہریلے ناگ ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو ہم اس سنپولیے کو اس زہریلے دانتوں سے محروم کر رہے ہیں۔" مرزا نے مجھے تسلی دی۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے مرزا اور صدیقی نے نہایت مہارت اور احتیاط سے افضل کے منہ سے زرد رنگ کی دو مصنوعی داڑھیں نکال لیں۔ اس کام کے درست انداز میں تکمیل تک پہنچ جانے کے بعد مرزا اور صدیقی نے اطمینان کا سانس لیا۔ انہوں نے افضل کا منہ دوبارہ بند کر دیا۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر صنم بھی واپس اسی کمرے میں آ گئی۔ مرزا نے اسٹیل کی طشتری میں رکھی دونوں داڑھیں اسے دکھائیں۔ وہ خاصی دیر تک بغور ان کا معائنہ کرتی رہی پھر اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگوں کا کہنا صحیح ہے۔ یہ مصنوعی داڑھیں مخصوص انداز میں تیار کی گئی ہیں۔ یہ اندر سے کھوکھلی ہیں۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ان کے اندر کوئی خطرناک اور سریع التاثیر زہر بھرا ہوا ہے۔"

"اب یہ خودکشی کے ذریعے خود کو ہماری پوچھ گچھ سے نہیں بچا سکتا۔ آپ اسے ہوش میں لائیں۔" مرزا نے ڈاکٹر صنم سے کہا۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

ڈاکٹر صنم نے افضل کو یکے بعد دیگرے دو انجکشن لگا دیے پھر وہ ان انجکشنوں کے ردعمل کا انتظار کرنے لگی۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد افضل کے جسم میں کچھ کسمساہٹ پیدا ہوئی۔

"ڈاکٹر صاحبہ' فی الحال آپ یہاں سے چلی جائیں۔ آپ کا اس کی نظروں میں آنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں آپ کی مدد درکار ہوئی تو ہم آپ کو بلا لیں گے۔" مرزا نے کہا۔ ڈاکٹر صنم چند لمحوں تک تذبذب کا شکار رہی پھر وہ خاموشی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔

صدیقی نے ایک مرتبہ پھر افضل کے جکڑ بند کا جائزہ لیا۔ افضل کے جسم میں ایک مرتبہ پھر حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے کراہتے ہوئے اپنے سر کو دائیں بائیں حرکت دی۔ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ مرزا نے تھوڑا سا پانی اس کے ہونٹوں پر ٹپکا دیا۔ پانی کی چند بوندیں اس کے حلق میں گئیں باقی پانی اس کے چہرے کو بھگوتا اس کی گردن تک پہنچ گیا۔ اس کے چہرے اور ٹھوڑی پر جما ہوا خشک خون ایک بار پھر گیلا ہو گیا۔ پانی کی ٹھنڈک نے اس کے ہوش و حواس کی طرف لوٹنے کے عمل کو مزید تیز کر دیا۔ مرزا نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اس کے جسم میں جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ اگلے ہی لمحے اس نے کراہتے ہوئے آنکھ کھول دی۔

اسے پوری طرح اپنے حواس میں آنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اس نے اپنے رسن بستہ جسم پر ایک نظر ڈالی۔ فوراً ہی اسے ہماری موجودگی کا احساس ہو گیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی' خوف اور حیرت کے ملے جلے تاثرات ابھرے۔ اس نے اضطراری کیفیت میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر فوراً ہی اس نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ لیے۔

"تمہارے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے برخوردار کہ تم شرافت سے اپنی زبان کھول دو۔" مرزا نے گھمبیر آواز میں کہا۔ افضل کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے ہیجانی کیفیت کے آثار ابھرے لیکن اس نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا۔ "تم یہ تو سمجھ ہی گئے ہو گے کہ ہم کون ہیں اور تمہیں یہاں لانے کے لیے ہم نے اتنے پاپڑ کیوں بیلے ہیں۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم کون ہو اور کیا کرتے ہو۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ جو کچھ ہم تم سے پوچھیں' تم شرافت سے ہمیں بتاتے جاؤ۔"

ہم تینوں متوقع نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔ ایک منٹ' دو منٹ' تین منٹ۔۔۔ اس کے ہونٹوں میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ میں نے مرزا کو آنکھ کا ہلکا سا اشارہ کیا اور ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اس کتے کے بچے کے ساتھ مغز ماری کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے مرزا صاحب۔" میں نے غیظ و غضب سے بھرپور لہجے میں کہا۔ "اسے میرے حوالے کر دو۔ میں اس کی ہڈیاں چورا چورا کر دوں گا۔" میں اس انداز میں افضل کی طرف بڑھا کہ گویا واقعی اس کی ہڈیاں چبا جاؤں گا۔

صدیقی نے بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ "ارے۔۔۔ ارے ٹھہرو تو

سہی۔"

"مجھے چھوڑ دیں صدیقی صاحب میں اس کا خون پی جاؤں گا۔ میں اس کی ناپاک زبان اس کے حلق سے کھینچ لوں گا۔ اس کی منحوس شکل دیکھ کر میرا خون کھول رہا ہے۔" میں نے نیم دلانہ سی مزاحمت کرتے ہوئے کہا۔

مجھے افضل کی آنکھوں میں سراسیمگی کی جھلک نظر آئی۔ اگلے ہی لمحے وہ جھلک غائب ہوگئی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ناک اور سر کی چوٹ میں یقیناً شدید تکلیف ہو رہی ہوگی لیکن مجھے اس کے چہرے پر کسی قسم کی تکلیف کے آثار نظر نہ آئے۔ صدیقی نے مجھے ایک بار پھر صوفے پر بٹھا دیا۔ اس دوران میں میری خون آلود نظریں مسلسل افضل کو گھورتی رہیں۔

"دیکھو میاں! ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تم اعلیٰ تربیت یافتہ ایجنٹ ہو۔ تمہیں ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کی تربیت دی گئی ہوگی۔ تم یقیناً ہر قسم کا تشدد بھی برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو گے۔ ہمیں تمہاری قوت برداشت پر کسی قسم کا شک نہیں ہے لیکن ذرا سوچو تو سہی اس تشدد کو برداشت کرنے کا تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟ تم کسی طرح بھی ہم پر اپنی معصومیت ثابت نہیں کر سکتے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم سردار شاہ مراد اور اپنے ہیڈ کوارٹر کے درمیان رابطے کے ذمے دار ہو۔ تمہارا ٹرانسمیٹر بھی ہم ساتھ لے آئے ہیں جو تمہاری خواب گاہ میں مسہری کے خفیہ خانے میں موجود تھا۔" مرزا نے قریبی میز کی طرف اشارہ کیا۔ میز پر رکھے ہوئے دھاتی بریف کیس کو دیکھ کر افضل کی آنکھوں میں شدید تفکر و تشویش کے آثار نمایاں ہوئے۔ قدرے توقف کے بعد مرزا نے اپنی بات جاری رکھی۔ "یقین کرو ہمیں کسی قسم کی جلدی نہیں ہے۔ ہم غیر معینہ مدت تک تمہاری زبان کھلنے کا انتظار کر سکتے ہیں۔ جلد یا بدیر تمہیں اپنی زبان کھولنا ہی پڑے گی۔ تم شاید سوچ رہے ہو گے کہ اگر تم زیادہ مجبور ہوئے تو اپنی زندگی کا خاتمہ کر لو گے لیکن افسوس ہم تم سے یہ سہولت بھی چھین چکے ہیں۔" مرزا نے اسٹیل ٹرے میں پڑی دونوں مصنوعی داڑھیں اس کی نظروں کے سامنے کر دیں۔ اس مرتبہ میں نے اس کی آنکھوں میں واضح طور پر مایوسی کی جھلک نمایاں ہوتی دیکھی۔

مرزا اور صدیقی ایک مرتبہ پھر اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگے۔ میں بجلی کی سی تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ قبل اس کے کہ مرزا یا صدیقی مجھے روکتے' میں نے کس کس کے دو تین تمانچے اس کے منہ پر جما دیے۔ ضربات کی شدت سے مجھے اپنی انگلیاں جھنجھناتی محسوس ہوئیں۔ بھاری بھرکم گالیوں اور دھمکیوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے' میں نے ایک جھٹکے سے اپنا کولٹ نکال لیا۔ عین اسی وقت مرزا اور صدیقی نے مجھے جکڑ لیا۔

"مجھے چھوڑ دو۔ میں اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ اسے جرأت کیسے ہوئی۔۔"

"بس تھوڑا سا صبر کر لو بھائی ذوالفقار۔" مرزا نے مجھے تھپکتے ہوئے کہا۔ "مجھے تھوڑی سی اور کوشش

کرنے دو۔ اگر یہ نہ مانا تو ہم اسے تمہارے حوالے کر دیں گے۔ اس کے بعد تم جو چاہے اس سے سلوک کرنا۔" میرے طمانچوں نے اس کے گال لال کر دیے تھے۔ اس کے ہونٹوں کے کنارے سے خون کی باریک لکیر بہہ نکلی۔ میرے دل کے کسی دور افتادہ گوشے میں ندامت کا ہلکا سا احساس ابھرا لیکن فوراً ہی معدوم ہوگیا۔ وہ میرے وطن کا ہی نہیں اس معصوم لڑکی نسیم کا بھی مجرم تھا۔ اس کے جرائم اتنے سنگین تھے کہ اسے جو سزا ملتی کم ہوتی۔ ظالم پر رحم کرنا بذات خود ایک بہت بڑا ظلم ہوتا ہے۔ بھیڑیے کو آزاد چھوڑ کر گلے کی حفاظت کی توقع رکھنے سے بڑی حماقت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

"ٹھیک ہے بھائی۔ تم یہی چاہتے ہو تو ایسا ہی سہی۔ صدیقی تم الیکٹرک ہیٹر آن کر کے نشتر اس پر رکھ دو۔ ہم افضل صاحب کے گورے چٹے خوبصورت چہرے پر نقش و نگار بنائیں گے۔" مرزا نے سرد لہجے میں کہا۔ میں نے افضل کو واضح طور پر چونکتے دیکھا۔ پہلی بار اس کے لبوں میں حرکت پیدا ہوئی۔

"تم۔۔۔ تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟" مرزا کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "میں نے تمہیں بتایا ہے ناکہ ہم تمہارے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم ہے کہ تم کئی مہینوں تک سردار شاہ مراد کی گاؤں والی حویلی کے پچھواڑے ایک کمرے میں روپوش رہ چکے ہو۔ تمہارے متعلق سب کچھ جاننے کے بعد ہی تو ہم نے تمہیں اٹھانے کا پروگرام بنایا تھا۔"

"تم۔۔۔ تم لوگ زیادہ دنوں تک اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے۔ بہت جلد تم لوگ ہمارے پنجوں میں آجاؤ گے۔ اپنی خیریت چاہتے ہو تو۔۔۔"

"ہماری فکر چھوڑو برخوردار' اپنی فکر مناؤ۔ اگر تم نے ہمارے سوالات کے صحیح جوابات نہیں دیے تو تمہارا یہ خوبصورت چہرہ ہمیشہ کے لیے عبرت کا نشان بن کر رہ جائے گا۔"

"تم لوگ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" اس نے مردہ سے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں اب آئے تو تم صحیح راستے پر۔ سب سے پہلے تو تم یہ بتاؤ کہ ملک کریم کہاں ہے؟ اس کے ساتھ تم لوگوں نے کیا کیا؟"

"کون ملک کریم؟ میں کسی ملک کریم کو نہیں جانتا۔" افضل نے سادگی سے بھرپور لہجے میں کہا۔ مرزا اس کا یہ انداز دیکھ کر بری طرح تلملا اٹھا۔

"بکواس بند کرو۔ تمہارا معصومیت کا یہ ڈھونگ زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔ ملک کریم کو ندا نے اغوا کیا تھا۔ جسے ہم ابھی ختم کر کے آ رہے ہیں۔" مرزا کی بات سن کر وہ بری طرح تڑپ اٹھا۔

"تت۔۔۔ تم نے اسے قتل کر دیا۔۔۔؟ تم نے اسے جان سے مار دیا؟"

"ہاں ہم نے اس کے خوبصورت جسم کو گولیوں سے چھلنی کر دیا ہے۔" مرزا نے سفاک لہجے میں کہا۔ افضل پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ بہت دیر تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے چپ چاپ کمرے کی چھت کو گھورتا رہا پھر اس کے لبوں میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی۔ "ندا" اس نے سرگوشی کے انداز میں'

نہایت شیریں لہجے میں پکارا۔ مرزا نے حیرانی اور الجھن کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ میں نے بھی شانے اچکا کر اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ ''ندا۔۔ندا کہاں ہو تم ؟'' کمرے میں افضل کی پیار بھری پکار گونجی۔ مرزا پریشانی اور اضطراب کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور اس کے بازو پکڑ کر زور سے اسے جھنجوڑ دیا ''افضل' افضل'' مرزا کے اس بری طرح جھنجوڑنے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ایک بار پھر خواب کی سی کیفیت میں پکارا۔ ''ندا۔۔میری جانم۔۔کہاں ہو تم؟''

صدیقی اور مرزا کے چہروں پر حیرانی کی جگہ تشویش نے لے لی۔ خود میں بھی شدید کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گیا۔ کیا یہ شخص ڈھونگ رچا کر ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے؟ کیا اسے یقین ہے کہ یہ اس طرح ہمیں بیوقوف بنانے میں کامیاب ہو جائے گا؟

''افضل۔۔افضل۔۔ہوش میں آؤ افضل۔'' مرزا نے ایک بار پھر اسے بری طرح جھنجوڑ دیا۔ افضل ہوش میں تو نہ آیا البتہ اس کی خود فراموشی کی کیفیت جنون میں بدلنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے پھیلاؤ میں اضافہ ہو گیا اور ان میں خون کی سرخی گھلنے لگی۔ ''ندا آ۔۔'' وہ حلق پھاڑ کر چیخا۔ اس کی آواز پھٹ گئی اور اس کے لبوں کے کناروں سے بہنے والا کف اس کی گردن تک آ گیا۔ اس نے ایک زبردست جھٹکے سے اپنے جسم کو بندھنوں سے آزاد کرانا چاہا لیکن۔۔ناکام رہا۔ وہ ایک بار پھر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے ایک بار پھر ندا کا نعرہ لگا کر اپنے جسم کے اوپری حصے کو اوپر اٹھایا۔ اس مرتبہ اس کا جسم جھٹکے سے بستر پر گرا تو اس کا سر خاصے زور سے مسہری کے آہنی سرہانے سے ٹکرایا۔ قبل اس کے ہم کچھ کر پاتے' اس کا جسم ایک بار پھر اچھلا اس مرتبہ اس کا سر پہلے سے بھی زیادہ قوت سے سرہانے سے ٹکرایا۔ اس کی کھوپڑی کی ہڈی اور دھات کے تصادم کی بہت واضح آواز ہم نے سنی۔ اس کی آنکھوں ی میں دھندلاہٹیں ابھریں اور وہ ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا۔ اس کی ناک سے دوبارہ خون ٹپکنے لگا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر ہم دم بخود رہ گئے۔ بالآخر مرزا نے اپنی حالت پر قابو پایا۔ اس نے صدیقی کو بھیج کر ڈاکٹر صنم کو بلوا لیا۔

''کیا ہوا۔۔؟ خیریت تو ہے؟'' ڈاکٹر صنم نے حواس باختہ سے لہجے میں کہا۔ مرزا نے اشارے سے اس کی توجہ افضل کی طرف مبذول کروائی۔ ''کیا ہوا اسے؟'' اس نے جلدی جلدی افضل کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔

ہم نے مختصراً اسے تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ ''اوہ تو یہ بات ہے! یہ شخص اس عورت سے یقیناً بے حد شدید محبت کرتا ہو گا۔ اس کی موت کی خبر نے اسے شدید جذباتی صدمہ پہنچایا ہے۔ کیا وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی؟''

''میرے خیال میں لفظ خوبصورت اس کی شخصیت کی دلکشی کا پوری طرح اظہار نہیں کرتا۔ وہ خوبصورت ہی نہیں خطرناک حد تک خوبصورت ہے اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ ابھی تک

زندہ ہے۔''

''کیا واقعی؟ تو پھر آپ لوگوں نے اسے کیوں کہا کہ وہ مر چکی ہے؟''

''بس حماقت ہو گئی۔ میں اسے خوف زدہ کرنا چاہتا تھا لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا۔ ویسے آپ کا کیا خیال ہے۔ یہ کب تک اپنے ہوش و حواس میں واپس آ جائے گا؟ میرا مطلب ہے یہ ہمیشہ کے لیے تو پاگل نہیں ہو گیا؟''

''فی الحال اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے جب یہ ہوش میں آئے تو یہ ٹھیک ہو چکا ہو۔ ہو سکتا ہے اس کی یہ حالت مزید کچھ دن تک رہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ یہ رفتہ رفتہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ البتہ اسے مزید چوٹ نہیں لگنی چاہیے۔''

''خدا کرے آپ کا اندازہ درست نکلے ورنہ ہمارے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ یہ شخص ہمارے لیے ترپ کے آخری پتے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم اسے ضائع کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔''

ڈاکٹر صنم نے گیلے کپڑے سے افضل کے چہرے کی اچھی طرح صفائی کرنے کے بعد اسے کی شکستہ ناک پر برف کے ٹکڑوں سے ٹکور کی جس سے اس کی ناک سے خون بہنا بند ہو گیا۔ اس کے سر کی چوٹوں کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے اعلان کیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ کچھ دیر بعد یہ خود ہی ہوش میں آ جائے گا۔

''جب یہ ہوش میں آنے لگے تو آپ مجھے بلوا لیجیے گا۔ میں اس کی کیفیت کا مزید تفصیل سے جائزہ لوں گی۔ ڈاکٹر صنم نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

ہم تینوں بے چینی سے افضل کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگے۔ میرا ذہن خاصی الجھنوں میں گرفتار تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں انہیں اپنی الجھنوں میں شریک کروں یا نہ کروں۔ بالآخر میں نے ان سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''معاف کیجیے گا مرزا صاحب۔ میں نے مرزا کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ دونوں پوری طرح میری طرف متوجہ ہو گئے۔

''کیا آپ لوگوں کو پورا یقین ہے کہ اصل صورت حال یہی ہے جو بظاہر ہمارے سامنے ہے؟ میرا مطلب ہے کہیں یہ الو کا پٹھا' مجنوں کی اولاد کوئی ڈراما تو نہیں کھیل رہا ہے؟'' میری بات سن کر ان کے چہروں پر بھی الجھن کے واضح تاثرات ابھر آئے۔

''بظاہر تو اس کی یہ حالت حقیقی ہی نظر آتی ہے۔'' مرزا نے بھی سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ ''بالفرض یہ سب ڈراما بھی ہے تو یہ ڈراما زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔ ہم اسے اتنی آسانی سے تو جان چھڑانے نہیں دیں گے۔ یہ کتنے بھی پند فریب کر لے ہم اسے ان کی جکڑ بندھنوں سے آزاد نہیں کریں گے۔ تھک ہار کر اسے

اپنی زبان کھولنا ہی پڑے گی۔ بصورت دیگر ہم اسے گولی مار کر کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیں گے۔'' مرزا کی باتیں سن کر مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ میں نے اس کی مکمل تائید کی۔

تقریباً نصف گھنٹے کے بیزار کن انتظار کے بعد اس کے جسم میں کچھ جنبش پیدا ہوئی۔ صدیقی جا کر ڈاکٹر صنم کو بلا لایا۔ وہ شاید کھانے کی تیاری میں مصروف رہی ہوگی۔ اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے افضل کا چہرہ تھپتھپایا اور پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے بند آنکھوں کے ساتھ غٹا غٹ پورا گلاس خالی کر دیا۔ ''ندا۔۔۔'' اس کے حلق سے کمزور سی آواز نکلی۔ ڈاکٹر صنم نے اس کے گال تھپکتے ہوئے کہا۔

''ہوش میں آؤ۔ تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہو۔ آنکھیں کھولو۔''

''ندا! تم کہاں ہو ندا؟ آخر تم آ ہی گئیں ندا؟ میرے پاس آؤ ندا۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔'' افضل نے بند آنکھوں کے ساتھ اپنا چہرہ ڈاکٹر صنم کے ہاتھوں سے ملتے ہوئے کہا۔

مجھے اس کے انداز میں تصنع کا شائبہ تک نظر نہ آیا۔ مرزا نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ڈاکٹر صنم کا چہرہ شرم سے گلنار ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔ میں اپنی جگہ سے تیزی سے اٹھا اور ایک کرارا سا طمانچہ افضل کے گال پر دے مارا۔ ڈاکٹر صنم نے ملامت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں اس کی نظروں سے بے نیاز افضل کے ردعمل کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کا چکنا چکنا سفید رخسار سرخ پڑ گیا لیکن اس کے حلق سے کوئی چیخ وغیرہ نہ نکلی۔ وہ آنکھیں بند کیے خواب کی سی حالت میں ندا ندا پکارتا رہا۔ میں نے مرزا کی طرف دیکھا اس نے دھیرے سے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دے کر میرے اس عمل کو سراہا۔ اس نے بھی اس کے ردعمل کا مشاہدہ کیا ہوگا اور شاید اس نے بھی وہی نتیجہ اخذ کیا جو میں نے کیا۔

ڈاکٹر احتجاج کے سے انداز میں منہ پھلائے' گیلے کپڑے سے افضل کا منہ صاف کرتی رہی۔ بالآخر اس نے ڈھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی ویران ویران نظروں نے سب سے پہلے ڈاکٹر صنم کو دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک ابھری۔ ''تم۔۔۔ تم آ گئیں ندا۔ میں تمہارے بغیر کتنا اداس ہو گیا تھا۔ مجھے چھوڑ کر مت جانا ندا۔۔۔ میں مر جاؤں گا ندا۔''

ڈاکٹر صنم نے جھینپی جھینپی نظروں سے ہم لوگوں کی طرف دیکھا۔ ہم تینوں کی نظریں افضل پر پڑی ہوئی تھیں۔ کوئی جھول' کوئی بناوٹ' کوئی تصنع جس سے ہم اس کا پول کھول سکیں۔ ہمیں ایک مرتبہ پھر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمیں اس کے چہرے پر نوعمر بچے کی سی معصومیت نظر آئی۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے اس کے گال پر ایک اور طمانچہ دے مارا۔ اس مرتبہ ڈاکٹر صنم نے باقاعدہ قہر آلود نظروں سے مجھے گھورا اس کے نازک لبوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی لیکن وہ کچھ کہے بغیر پیر پٹختی کمرے سے باہر نکل گئی۔ صدیقی اور مرزا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ میری نظریں بدستور افضل کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ تھپڑ لگتے ہی اس کی

آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ بچوں کی طرح منہ بسورنے لگا۔ ڈاکٹر صنم کو جاتے دیکھ کر وہ باقاعدہ رونے لگا۔

''مجھے چھوڑ کر مت جاؤ ندا۔ یہ لوگ مجھے مار دیں گے ندا۔ مجھے بچا لو' مجھے بچا لو۔'' اس کی آواز بلند سے بلند تر ہونے لگی۔

''ابے چپ'' مرزا نے سخت لہجے اسے ڈانٹ دیا۔ ''بڑا آیا ندا کا مامابن کے۔۔۔ زبان بند کر لے ورنہ گلا گھونٹ دوں گا۔'' افضل نے بلند آواز سے رونے کے لیے منہ کھولا لیکن مرزا کی غضب ناک آنکھوں کو دیکھ کر اپنی آواز حلق میں ہی روک لی۔ اس کے انداز میں اتنی معصومیت اور بے ساختگی تھی کہ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ شاید ہم خوامخواہ شکوک وشبہات کا شکار ہیں۔ شاید یہ واقعی اسی شدید جذباتی صدمے کے باعث اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے۔ اس مرحلے پر مجھے بے ساختہ اپنا منہ بولا بھائی قاسم رضا یاد آ گیا۔ اس کی ذہنی کیفیت بھی تو تقریباً افضل جیسی ہی تھی فرق صرف یہ ہے کہ وہ بچپن سے ہی ذہنی بحران کا شکار رہا تھا۔ خدا جانے اب وہ بے ضرر اور مخلص نوجوان کس حال میں ہوگا۔

میں نے افضل کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ دبی دبی سسکیاں بھر رہا تھا۔ اس دم ڈاکٹر صنم کمرے کے دروازے میں نمودار ہوئی۔ ''کھانا تیار ہے۔'' اس نے عجیب سے' سرد مہری سے لبریز لہجے میں کہا۔ ہم تینوں اٹھ کر کھانے کی میز پر آ گئے۔ ڈاکٹر صنم میز پر کھانا لگانے لگی تو میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''میں اپنی حرکت سے معذرت خواہ ہوں ڈاکٹر صاحبہ۔ دراصل میں دیکھنا چاہ رہا تھا کہ کہیں وہ ہمیں بیوقوف بنانے کی کوشش تو نہیں کر رہا ہے۔ آپ تو جانتی ہیں یہ کتنا نازک معاملہ ہے۔ وہ بحر حال ایک بھارتی ایجنٹ ہے ہم کسی قسم کا بھی خطرہ مول لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔'' میں نے ڈاکٹر صنم کے چہرے پر بحالی کے آثار دیکھے۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اس کی آزمائش کے لیے اور بھی کئی طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ بہر حال آپ لوگوں نے اس کے متعلق کیا اندازہ لگایا؟''

''بظاہر تو واقعی ذہنی ابتری کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ خدا کرے وہ جلد از جلد اپنے ہوش وحواس میں واپس آ جائے۔ ہمیں اس سے بہت کچھ معلوم کرنا ہے۔'' میں نے متفکر لہجے میں کہا۔ ''میرا ذہن ابھی تک پوری طرح اس تمام تر صورت حال کو قبول نہیں کر پایا تھا۔ تاہم میں نے ڈاکٹر صنم کی دل شکنی کے خیال سے مزید شک وشبے کا اظہار نہیں کیا۔ ہمیں کھانا کھلانے کے بعد اس نے اجازت طلب کی کہ وہ افضل کو بھی کھانا کھلا دے۔ اپنی مدد کے لیے اس نے صدیقی کو اپنے ساتھ لے لیا۔

میں اور مرزا جان بوجھ کر ان کے ساتھ نہیں گئے کیونکہ ہمیں دیکھ کر افضل خوف زدہ ہو جاتا تھا۔ نصف گھنٹے کے بعد وہ واپس لوٹے تو میں نے ڈاکٹر صنم کے چہرے پر ایک مرتبہ پھر شرم وحیا کی شفق

پہیلی دیکھی۔ صدیقی بھی زیرلب مسکرا رہا تھا۔ ڈاکٹر صنم سیدھی کچن کی طرف چلی گئی جبکہ صدیقی مرزا کے کان میں کچھ کھسر پھسر کرنے لگا۔ میں انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر ڈاکٹر صنم کے پاس پہنچ گیا۔

''خیر تو ہے آپ نے افضل کی تازہ ترین حالت کے متعلق کچھ نہیں بتایا؟''

''وہ۔۔۔وہ۔'' ڈاکٹر صنم کا چہرہ ایک بار پھر شرم سے گلنار ہو گیا۔ میں تعجب سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔ کیا یہ وہی چرب زبان اور بے باک عورت ہے جو اپنے زبانی حملوں سے مجھے پسپا کر دیا کرتی ہے۔'' وہ۔۔۔وہ مجھے واقعی ندا سمجھ رہا ہے پتہ نہیں کیا کیا الٹی سیدھی ہانک رہا ہے۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں ندا نہیں ہوں لیکن وہ ماننے پر تیار نہیں ہے۔ میں اس کے رومانی مکالموں سے تنگ آ گئی ہوں۔ میں نے اسے خاموش ہونے کا حکم دیا تو وہ فوراً خاموش ہو گیا لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ اس مرتبہ اس پر یہ دھن سوار ہو گئی کہ میں اس سے ناراض ہو گئی ہوں وہ دیر تک میری منت سماجت کر کے مجھے منانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے قسم کھائی ہے کہ وہ حرف بہ حرف میری ہدایات پر عمل کرے گا۔ اس نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں اس کے ہاتھ پاؤں کھول دوں لیکن میرے سختی سے انکار کرنے پر وہ اپنے اس مطالبے سے بھی دستبردار ہو گیا۔ وہ کٹھ پتلی کی طرح میرے ہر حکم کی تعمیل کرنے پر تیار ہے۔ اس کا انداز اتنا معصومانہ اور والہانہ ہے کہ مجھے خواہ مخواہ شرمندگی ہونے لگتی ہے۔'' ڈاکٹر صنم اپنی بات ختم کر کے خاموش ہو گئی۔ یک لخت میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے بے قرار لہجے میں ڈاکٹر صنم سے پوچھا۔

''کیا آپ کو پورا یقین ہے وہ آپ کی ہر بات بند آنکھیں کر کے مان لے گا؟''

''ہاں جناب مجھے پورا یقین ہے۔'' اس نے ناز بھرے لہجے میں کہا۔

''اگر آپ اس سے کچھ پوچھیں تو کیا وہ بتا دے گا؟'' میں نے شدید اضطراب کے عالم میں پوچھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچائی پھر اس نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

''ہاں مجھے پورا یقین ہے۔''

''اوہ! پھر تو ہمارا کام بن سکتا ہے۔'' میں نے پر جوش لہجے میں کہا۔ چلو مرزا اور صدیقی کے پاس چلتے ہیں۔'' وہ قدرے استعجاب کے عالم میں میرے ساتھ مرزا اور صدیقی کے پاس پہنچ گئی۔

میں نے مرزا اور صدیقی کو ڈاکٹر صنم کے دعوے سے آگاہ کیا۔ حسب توقع انہیں میری بات سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ ان کی آنکھیں خوشی سے چھلکنے لگیں۔

''ایسا ہو جائے تو ہمارا مسئلہ ہی حل ہو جائے گا۔'' مرزا نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ''اس طرح تو ہمیں اس پر تشدد کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔'' ڈاکٹر صنم ابھی تک استفہامیہ نظروں سے ہمارے منہ دیکھ رہی تھی۔

''حیران نہ ہوں ڈاکٹر صاحبہ۔ ہم ابھی آپ کو سب کچھ بتا دیتے ہیں۔ دیکھیں جیسا کہ آپ کو معلوم

ہے کہ اس شخص افضل کو جان پر کھیل کر اغوا کر کے لائے ہیں کہ اس کی زبان سے ہم راز اگلا سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے شاید ہمیں اس پر سخت تشدد کرنا پڑتا۔ اس کی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ جزوی طور پر اپنی دماغی صلاحیتیں کھو بیٹھا ہے لیکن ہم امید کر سکتے ہیں کہ اگر اس سے کرید کر پوچھا جائے تو وہ اپنے لا شعور میں پوشیدہ قیمتی معلومات اگل دے گا۔ آپ کا کہنا ہے کہ وہ آپ کی ہر بات ماننے پر تیار ہے۔ ایسے میں اگر آپ پیار محبت سے' اس سے ہمارے مطلب کی معلومات حاصل کر لیں تو ہمیں ہماری محنت کا پھل مل سکتا ہے۔'' میں نے تفصیل سے اسے تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس کے چہرے پر تفکر کے آثار ابھرے۔ قدرے توقف کے بعد اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''میرا خیال ہے میں یہ کام کر سکتی ہوں۔ اگر ہم اس سے پوری معلومات نہ بھی حاصل کر سکے تو کم از کم اتنا کچھ ہمیں ضرور معلوم ہو جائے گا کہ ہم سردار شاہ مراد کی اصل سازش کو سمجھ سکیں۔ ضرورت صرف چرب زبانی سے کام لینے کی ہے۔''

''آپ نے بالکل صحیح کہا ڈاکٹر صاحبہ۔ ہم سب مل کر اس طرح کے سوالات ترتیب دیتے ہیں کہ وہ بآسانی ہمیں ہماری مطلوبہ معلومات فراہم کر دے اور اس کے دماغ پر کسی قسم کا زور بھی نہ پڑے۔'' مرزا نے کہا۔ ہم سب نے اس کی تائید کی۔

خاصی دیر کی دماغ سوزی کے بعد ہم کچھ ایسے سوالات تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جن کا اصل موضوع سے بظاہر کوئی براہ راست تعلق بھی نہیں تھا لیکن اگر ان کے جوابات ہمیں حاصل ہو جاتے تو ہم سردار شاہ مراد کے منصوبے کی اہم ترین باتوں سے آگاہ ہو جاتے۔ ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اب ڈاکٹر صنم بحیثیت ندا افضل سے زیادہ سے زیادہ گھلنے ملنے کی کوشش کرے گی اور پھر مناسب موقع دیکھ کر اس سے مذکورہ سوالات کے جوابات حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔ البتہ اسے احتیاطاً افضل کے ہاتھ پاؤں نہیں کھولنے۔ ہم لوگ اگرچہ آس پاس رہیں گے تاہم انہیں زیادہ سے زیادہ تخلیہ فراہم کریں گے۔

اس منصوبے پر فوری طور پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر صنم افضل کے کمرے میں چلی گئی۔ ہم بڑی بے چینی سے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ آخر کار خدا خدا کر کے تقریباً نصف گھنٹے بعد ڈاکٹر صنم اس کمرے سے برآمد ہوئی۔ اس کے چہرے پر چمکتی مسکراہٹ نے ہمیں مضطرب کر دیا۔ متوقع خوش خبری سننے کے لیے ہم تینوں ہمہ تن گوش ہو گئے۔

''آپ لوگوں کا اندازہ صحیح نکلا۔ خلاف توقع مجھے ابتدائی کامیابی جلد ہی حاصل ہو گئی۔ میں نے اس سے جو کچھ معلوم کیا اگرچہ وہ بہت زیادہ اہم نہیں ہے۔ تاہم ابتدا کے لحاظ سے کامیابی بری نہیں ہے۔''

''آپ تمہید کو ذرا مختصر کریں اور ہمیں بتائیں کہ آپ نے اس سے کیا کچھ معلوم کیا ہے۔'' میں نے بے قراری سے پوچھا۔

''پہلے مرحلے میں اپنے سوالات کے نتیجے میں مجھے افضل اور ندا کے ذاتی کوائف جاننے میں

کامیابی حاصل ہوگئی ہے۔ افضل اور ندا دونوں بچپن سے ایک ساتھ پلے بڑھے ہیں۔ اسی لیے یہ ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں۔ ان دونوں کا تعلق بھارت کے شہر آگرہ سے ہے۔ مذہب کے لحاظ سے دونوں قادیانی ہیں۔ ندا نے پہلے بھارتی ایجنسی ''را'' میں شمولیت اختیار کی۔ افضل نے صرف ندا کے قریب رہنے کے لیے را میں شامل ہونے کی خواہش کی اور کامیاب ہوگیا۔ دونوں کٹر بھارتی قوم پرست ہیں۔''

''ابتدائی کامیابی کے طور پر یہ معلومات واقعی قابل قدر ہیں۔ ان معلومات کی روشنی میں ہم اس شخص افضل کی ذہنی حالت کی شکستگی کے سبب کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس کی زندگی کا محدود مقصد ندا رہی ہے۔ صرف ندا کی قربت کی خاطر اس نے خود بھی کسی نہ کسی طرح اسی ادارے میں شمولیت اختیار کر لی جس میں ندا خدمات انجام دے رہی تھی۔ ان دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کی تصویر بسی ہوئی تھی۔ یہ دونوں ایک ساتھ بقیہ زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھ رہے ہوں گے۔ ایسے میں افضل کو اچانک ندا کی موت کی اطلاع ملی تو صدمے سے اس کا دماغ الٹ گیا۔ یہ ناگہانی آفت اس کے ذہن میں بجلی بن کر گری ہوگی۔'' مرزا نے تفصیل سے اپنے اخذ کردہ نتائج سے ہمیں آگاہ کیا۔

''میں بھی مرزا صاحب کے تجزیے سے خاصی حد تک متفق ہوں۔ البتہ میں اتنا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ ان تمام معلومات کی موجودگی میں یہ بات یقینی ہے کہ یہ شخص بے حد جذباتی ہونے کے ساتھ ساتھ خاصے کمزور اعصاب کا مالک رہا ہوگا۔ اسی لیے اس سانحے کی اطلاع نے اس کے دماغ کو شدید انتشار کا شکار بنا دیا۔ اتنی کمزور شخصیت کے حامل شخص کی اتنی نازک اور اہم معاملے میں موجودگی وہ بھی اتنے خطرناک ادارے کی طرف سے' یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے۔ اس شخص کو یقیناً پوری طرح ٹھوک بجا کر را تنظیم میں شامل کیا گیا ہوگا۔'' میں نے ان لوگوں کو اپنی ذہنی الجھن سے آگاہ کیا۔ کچھ دیر کے لیے وہ تینوں ہی سوچ کی گہرائیوں میں ڈوب گئے۔

''تمہارا یہ موقف بے شک قابل غور ہے بھائی ذوالفقار علی۔ میرے ذہن میں اس کی یہ توجیہ آئی ہے کہ شاید اس کی شخصیت کا یہ کمزور پہلو صرف اور صرف ندا کے حوالے سے ہو۔ زندگی کے بقیہ تمام معاملات میں شاید یہ بالکل نارمل انسان رہا ہو۔ اس کی شخصیت کا یہ کمزور پہلو اسے ایجنسی کے لیے چننے والوں کی نظر سے پوشیدہ رہا ہوگا۔ ویسے بھی اس کا تعلق شعبہ مواصلات سے ہے۔ لہٰذا اسے دیگر ایجنٹوں کی بہ نسبت کم تر جسمانی اور نفسیاتی مشقوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ یہ بات یقینی ہے کہ ندا بھی اس سے شدید محبت کرتی ہے۔ اسی لیے وہ اپنی تمام تر تباہ حالی کے باوجود اس کو چھڑانے کے لیے اتنی دور تک ہمارے پیچھے آئی۔ اس کے بچاؤ کے لیے وہ نہتی ہونے کے باوجود جان پر کھیل گئی۔ اگر اس کے پاس کوئی ہتھیار ہوتا تو مجھے یقین ہے وہ ہمیں شدید مشکلات میں مبتلا کر دیتی۔'' مرزا نے تحسین بھرے لہجے میں کہا۔

''ہو سکتا ہے آپ کا یہ تجزیہ درست ہو۔ ڈاکٹر صاحبہ آپ آج رات اس سے مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ مجھے بھی اب خاصی امید ہو چلی ہے کہ آپ کی مدد سے ہم کوئی نہ کوئی اہم کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔'' میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔

رات کے کھانے کے بعد ڈاکٹر صنم ایک بار پھر افضل کے کمرے میں پہنچ گئی۔ خفیہ انتظام کے تحت ہم پہلے ہی اس کمرے میں ہونے والی گفتگو ریکارڈ کرنے کا بندوبست کر چکے تھے۔ دوپہر کے وقت ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو لفظ بہ لفظ ہمارے پاس محفوظ ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر صنم کی عدم موجودی میں ہم اس گفتگو کو سن بھی چکے تھے۔ ہم تینوں ہی نے اس گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ واقعی افضل ندا کا دیوانہ ہے۔ وہ اس کے حکم پر جان بھی دے سکتا ہے۔ اگر اسے ڈاکٹر صنم کی صورت میں عارضی اور مصنوعی جذباتی سہارا نہ ملتا تو شاید وہ مکمل طور پر پاگل ہو جاتا۔

ڈاکٹر صنم کی اس کمرے سے واپسی تقریباً نصف رات کے بعد ہوئی۔ مضمحل سے انداز میں مسکراتی وہ ہمارے پاس آ بیٹھی۔ ہم شدید اضطراب کے عالم میں اس کے لب کھولنے کا انتظار کرتے رہے۔'' مجھے خوشی ہے میں اس کی زبان سے ایک بار پھر کئی اہم باتیں اگلوانے میں کامیاب رہی ہوں۔ اس کے کہنے کے مطابق بھارت کی حکومت کشمیر میں مجاہدین کی روز بہ روز زور پکڑتی سرگرمیوں سے بے حد تنگ آ چکی ہے۔ بھارتی فوج کی سرتوڑ کوشش کے باوجود وہاں آزادی کے تحریک طاقت ور سے طاقت ور ہوتی جا رہی ہے۔ بھارت کشمیر میں اپنی فوج کی تعداد میں مسلسل اضافہ کر رہا ہے۔ جسے مکمل اختیارات حاصل ہیں۔ بھارتی فوج کشمیر کے مسلمانوں کا مسلسل قتل عام کر رہی ہے۔ جبر و تشدد کے حربے بھی استعمال کر رہی ہے۔ اس کے باوجود اسے ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ دوسری طرف کشمیر میں تعینات کئی لاکھ فوجیوں کے روزانہ اخراجات بھارتی معیشت کی کمر توڑے دے رہی ہے۔ اگر کشمیری مجاہدین اور کشمیری باشندے مزید کچھ عرصے مزاحمت جاری رکھنے میں کامیاب ہو گئے تو بھارتی حکومت کے لیے اتنے بھاری اخراجات برداشت کرنا ممکن نہیں رہے گا۔

اس صورت حال سے بھارتی حکومت سخت پریشان ہے۔ دوسری طرف رفتہ رفتہ بھارت کے اندر بھی لوگوں کے ذہن میں سوالات ابھرنے لگے ہیں کہ کیا بھارت واقعی محض طاقت کے بل پر کشمیر پر اپنا قبضہ برقرار رکھ سکتا ہے؟ بھارتی دانشوروں اور صحافیوں میں رفتہ رفتہ ایک ایسا طبقہ پیدا ہو رہا ہے جس کا کہنا ہے کہ بھارت کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ کشمیر کو مکمل خودمختاری دے دے۔ دوسری طرف بھارتی حکومت کو یہ مسئلہ درپیش ہے کہ اگر بھارت کشمیر کو خودمختاری سے نوازتا ہے تو دوسری کئی ریاستیں مثلاً پنجاب' آسام' میزورام اور ناگالینڈ وغیرہ بھی اس حق کا مطالبہ کریں گی یعنی کشمیر کی نصف آزادی یعنی خودمختاری کا نتیجہ بھی بھارت کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کشمیر کے موقف پر معمولی سی نرمی کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا لیکن بات پھر وہیں آ جاتی ہے کہ بھارت اب ایک طویل

عرصے تک کشمیر میں اپنی فوج پھنسائے رکھنے کا متحمل بھی نہیں ہوسکتا۔ ان حالات میں بھارتی حکومت نے منصوبہ بنایا ہے کہ وہ کسی نہ کسی بہانے پاکستان پر حملہ کردے گا کہ اسے کم از کم اپنے اندرونی دباؤ سے تو نجات مل جائے۔ دوسری طرف ان کی بنیا ذہنیت اس حقیقت سے بھی آگاہ ہے کہ پاکستان پر حملے میں پہل کرنے کے باعث بھارت تمام دنیا کے ممالک کی حمایت سے محروم ہوسکتا ہے۔ اس مسئلے کا حل انہوں نے یہ سوچا ہے کہ کوئی ایسا بہانہ سوچا جائے جس کے باعث بھارت عالمی سطح پر اپنی مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹ سکے اور پاکستان کو جارح ثابت کرسکے۔ ملک کریم اور اس کے ساتھیوں کی حمایت سے بھارت کو بہت اچھا موقع مل گیا ہے۔ وہ پہلے ہی ساری دنیا میں واویلا مچا رہا ہے کہ پاکستان اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت کررہا ہے اور بھارت کے باغیوں کو اسلحہ اور تربیت فراہم کررہا ہے۔ ملک کریم اور منوج سنگھ کے گٹھ جوڑ کو وہ پاکستانی حکومت کی سازش قرار دینا چاہتا ہے۔۔۔

بھارتی ایجنٹوں نے ملک کریم کو تو ندا کی مدد سے قابو کرلیا لیکن وہ منوج سنگھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکے کیونکہ اسے ملک کریم نے کہیں غائب کرادیا ہے۔ دوسری طرف اپنی تمام تر کوشش کے باوجود وہ بھارتی مغویان کو بھی برآمد نہیں کرسکے۔'' ڈاکٹر صنم سانس درست کرنے کے لیے خاموش ہوئی۔ میں نے بے چین لہجے میں کہا۔

''ملک کریم کے متعلق کچھ پتا چلا کہ وہ کہاں ہے اور کیا یہ لوگ اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہوگئے ہیں؟''

''اسی مسئلے نے تو ان لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ یہ لوگ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود ملک کریم کو زبان کھولنے پر مجبور نہیں کرسکے۔ ان لوگوں نے بھارت سے خصوصی طور پر ایک ماہر فن کو بلوایا لیکن وہ بھی ابھی تک کامیاب نہیں ہوسکا۔ البتہ کچھ ایسے آثار ظاہر ہورہے ہیں کہ چند دنوں میں انہیں کامیابی ہو جائے گی۔ افضل نے بتایا ہے کہ بھارت سے کوئی ایسی خاص مشین بھیجی جارہی ہے جس کے استعمال سے کوئی بھی انسان چاہے بھی تو اپنی زبان بند نہیں رکھ سکتا۔''

''اوہ۔۔۔!'' یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔'' مرزا نے پرتشویش لہجے میں کہا۔ ''ملک کریم کتنا بھی سخت جان ہو۔ آخر ہے تو انسان ہی۔ آخر کار اسے زبان کھولنا ہی پڑے گی۔ خاص طور پر اس مشین کے آنے کے بعد۔۔۔''

''اس نے بتایا کہ ان لوگوں نے ملک کریم کو کہاں رکھا ہوا ہے؟'' میں نے شدید اضطراب کے عالم میں مرزا کی بات کاٹ دی۔

''ہاں۔۔۔ افضل نے بتایا ہے کہ سردار شاہ مراد نے اپنے گاؤں کے قریب ایک نئی حویلی بنوائی ہے۔ وہ حویلی ایک طرح سے اس علاقے میں را کے ایجنٹوں کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ ملک کریم کو اسی حویلی میں رکھا گیا ہے۔ اس حویلی کا انچارج سدھاکر ہروانی نامی ایک بڈھا ہے۔ ملک کریم کو اغوا کرنے کے لیے

ندا کا ماموں بن کر وہی گیا تھا۔ اس مہم کے دوران وہ شدید زخمی بھی ہوگیا تھا۔''

ڈاکٹر صنم نے اپنی بات مکمل کرلی۔ چند لمحوں تک وہاں خاموشی چھائی رہی۔ بالآخر صدیقی نے سکوت کا پردہ چاک کیا۔ ''ان تمام معلومات سے کم از کم ایک بات تو ثابت ہوگئی ہے۔'' اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''کون سی بات؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ افضل ڈرامے بازی نہیں کررہا ہے۔ اس نے ڈاکٹر صاحبہ کو ندا سمجھ کر سب کچھ سچ بتا دیا ہے۔ امید ہے وہ ہمیں باقی سب معلومات بھی مہیا کردے گا۔'' صدیقی نے پرجوش لہجے میں کہا۔ مرزا نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

''تمہارا کہنا صحیح ہے۔'' پھر وہ ڈاکٹر صنم کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ڈاکٹر صاحبہ آپ اس سے کل باقی معلومات بھی حاصل کرلیں۔ مثلاً سردار شاہ مراد نے اپنے تمام ٹرک اور ٹرالر بلوچستان کیوں بھیج دیے ہیں۔ ان ٹرکوں پر اضافی عملہ بھرتی کرنے کا کیا مقصد ہے اور سب سے ضروری یہ کہ یہ بریف کیس کس کوڈ نمبر سے کھلتا ہے اس کا طریقہ استعمال کیا ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ میں انشاء اللہ اس سے باقی معلومات بھی حاصل کرلوں گی۔'' ڈاکٹر صنم نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

اس رات مجھے بہت دیر تک نیند نہ آئی۔ گاؤں کے ذکر نے میرے سوئے ہوئے زخم جگا دیے تھے۔ چاچا مہرداد کا مغموم چہرہ۔۔۔ مہراں کی حسرت بھری مسکراہٹ اور میرے یار وفادار سرور علی کی بے نور آنکھیں! مجھے صوفے کے نرم وگداز کشن میں انگارے دہکتے محسوس ہوئے۔ میرا دل چاہا کہ میں اڑ کر ان کے پاس پہنچ جاؤں۔ مجھے شدید احساس جرم ہوا۔ میں تو انہیں مکمل طور پر فراموش کر چکا ہوں۔ مجھے تو ان کی بے لوث محبت اور بے مثال ایثار قربانی اور احسان کچھ بھی یاد نہ رہا۔ سرور علی کی آنکھیں جیسی بے بہا نعمت خداوندی مجھ پر نثار کر کے میری زندگی بچائی لیکن میں نے پلٹ کر خبر بھی نہ لی کہ اس پر کیا گزری۔ اس کنبے کی کفالت کیسے ہورہی ہے؟ اس کی جوان بہنوں کی ڈولیوں کا بوجھ کس طرح اٹھے گا؟ میں نے تو یہ بھی جاننے کی کوشش نہ کی کہ میرے فرار کے بعد میرے چاچا مہرداد اور اس کی۔۔۔ صبر کی دیوی مہراں پر کیا گزری؟ کہیں سردار شاہ مراد نے اپنی ناکامیوں اور نفرتوں کا زہر ان کی رگوں میں تو نہیں اتار دیا پھر میں نے اس تکلیف دہ اذیت ناک تصور کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ سردار شاہ مراد کی دشمنی مجھ سے ہے۔ ان معصوم باپ بیٹی نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟ میں اپنے دل کو جھوٹی تسلی دیتا رہا۔ اسی کشمکش میں جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

اگلی صبح ہمیں ناشتا کرانے کے بعد ڈاکٹر صنم افضل کا ناشتا لے کر اس کے کمرے میں چلی گئی۔ ہم تینوں موجودہ صورت حال کے پیش نظر اپنا مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کرنے لگے۔

"بالآخر وہ وقت آن ہی پہنچا جس کے لیے ہم نے اتنی طویل جدوجہد کی ہے۔" مرزا نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "ملک کریم کے اغوا کے موقعے پر ہم نے جن اندیشوں کا اظہار کیا تھا' وہ سو فیصد صحیح ثابت ہوئے۔ بھارتی حکومت ملک کریم کو پاکستانی حکومت کی طرف سے متعین کردہ تخریب کار ثابت کر کے پاکستان پر حملے کا جواز ڈھونڈنا چاہتی ہے۔ ملک کریم کا ان لوگوں کے قبضے میں ہونا پاکستان کے لیے شدید خطرے کی علامت ہے۔ ہمیں جلد از جلد اور ہر قیمت پر ملک کریم کو ان بدبختوں کے چنگل سے آزاد کرانا ہے۔"

"آپ کا کہنا صحیح ہے مرزا صاحب۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ اگر وہ لوگ ملک کریم کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو گئے تو ہماری ساری محنت خاک میں مل جائے گی اور بھارتی حکومت کو اپنے مذموم ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کا موقع مل جائے گا۔ ہمیں بغیر وقت ضائع کیے اس حویلی پر حملہ کرنا پڑے گا۔" میں نے بھرپور سنجیدگی سے کہا۔

"وہ تو صحیح ہے لیکن کیا ہم صرف تین افراد اتنی کٹھن مہم سر کر لیں گے؟ ہمارے پاس تو اسلحہ بھی بہت کم ہے پھر اس خطرناک علاقے تک پہنچنا۔۔۔" صدیقی نے جھجکتے جھجکتے کہا۔

"کچھ بھی ہو بھائی۔ یہ کام تو ہمیں کرنا ہی پڑے گا۔ خواہ ہم کتنی ہی دشواریوں کا شکار ہوں۔ ہمارے پاس ہتھیار رہیں یا نہ رہیں۔ جان لے کر یا جان دے کر۔ جہاں مسئلہ وطن کی سلامتی کا آ جائے وہاں مصلحتوں کو بالائے طاق رکھنا ہی پڑتا ہے۔" مرزا نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "ویسے بھی ہم تو ہمہ وقت جہاد میں مصروف ہیں۔ اس جہاد میں کامیاب و کامران رہے تو غازی کہلائیں گے اور اگر جان سے گزر گئے تو شہادت کا عظیم رتبہ ہمارا مقدر بن جائے گا۔ پھر بھلا ہمیں گھبرانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"نہیں میں بھی کسی قسم کے خوف یا گھبراہٹ کا شکار نہیں ہوں۔ جب بھی کوئی معرکہ درپیش ہوا تم انشاءاللہ مجھے اپنے شانہ بہ شانہ پاؤ گے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کیا ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دیے بغیر اتنا بڑا اقدام اٹھانا مناسب ہو گا؟" صدیقی نے کہا۔

"خدا کرے ڈاکٹر صنم افضل سے اس بریف کیس کا کوڈ نمبر معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائے پھر ہم اس ٹرانسمیٹر پر اپنے ہیڈ آفس بات کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ویسے میں ایک بات تمہیں صاف صاف بتا دوں۔ ہیڈ آفس ہمیں اجازت دے یا نہ دے۔ ہمیں ملک کریم کی بازیابی کا مشن ہر قیمت پر مکمل کرنا ہے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو پھر بہتر ہے ہیڈ آفس سے رابطہ قائم نہ کیا جائے۔ مجھے یقین ہے وہ ہمیں اس بے سروسامانی کے عالم میں اتنا خطرناک آپریشن کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔"

"وہ تو بعد کی بات ہے بھائی۔" میں نے درمیان میں مداخلت کی۔ "پہلے ہمیں اس بریف کیس کا کوڈ نمبر تو معلوم ہو۔"

گھنٹے بھر بعد ڈاکٹر صنم کی پژمردہ سی صورت نظر آئی۔ مرزا اور صدیقی اس کی جذباتی کیفیت سے ناواقف تھے۔ لہٰذا انہیں خبر بھی نہ ہو پائی کہ جتنے عرصے ڈاکٹر صنم افضل کے پاس رہتی ہے' وہ عرصہ اس پر کس قدر کڑا گزرتا ہے۔ افضل کا والہانہ اظہار محبت صنم کے خوابیدہ زخموں پر جیسے وقت کے کھرنڈ کھرچنے لگتا ہے۔ جن تشنہ جذبوں کو اس نے بڑی دقت سے تھپک تھپک کر سلایا ہو گا ان خفیہ جذبوں میں پیدا ہونے والی خفیف سی ہلچل بھی اس کے لیے سوہان روح بن جاتی ہو گی۔ وہ کتنی ہی اولوالعزم' بلند حوصلہ اور آہنی ارادوں کی مالک ہوتی آخر تھی تو ایک عورت' کانچ کے سے نازک جذبات و احساسات کی حامل! مجھے اس کی حالت پر بے اختیار ترس آ گیا۔

"کیوں ڈاکٹر صاحب کچھ کامیابی حاصل ہوئی؟" صدیقی نے پوچھا۔

"ہاں خاصی حد تک۔" اس نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔

"خاصی حد تک؟ ہم آپ کا مطلب نہیں سمجھے۔ کیا آپ پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی ہیں؟" مرزا نے پوچھا۔

"ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔ افضل کوشش کے باوجود بریف کیس اور اس میں موجود ٹرانسمیٹر کا کوڈ نمبر نہیں بتا سکا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس ٹرانسمیٹر کا کوڈ نمبر ہر روز خودکار طریقے سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ سال بھر کے کوڈ نمبر یاد رکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ افضل کا کہنا ہے کہ اس کے پاس کوڈ نمبروں کی ایک چھوٹی سی ڈائریکٹری ہوا کرتی ہے جس کی مدد سے وہ تازہ ترین کوڈ نمبر معلوم کر لیتا ہے۔ وہ مختصر سی ڈائریکٹری اس کی خواب گاہ کے ایک خفیہ گوشے میں پوشیدہ ہے۔ اس نے مجھے وہ خفیہ مقام بھی بتا دیا ہے۔"

"اوہ! یہ تو معاملہ گڑبڑ ہو گیا۔ اس کا مطلب ہے ہم اس ٹرانسمیٹر سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ اس ڈائریکٹری کے لیے تو ہم اس حویلی میں دوبارہ گھسنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ یہ تو سیدھا سیدھا آہنی شکنجے میں گردن پھنسانے والی بات ہو گی۔"

"میں آپ سے پوری طرح متفق ہوں مرزا صاحب۔ اس وقت تک وہ حویلی ہمارے لیے آتش فشاں کا دہانہ بن چکی ہو گی۔ ندا کے انتقام اور غیظ و غضب کی آگ ہمیں بھسم کر ڈالے گی۔ فی الحال ہم اس طرف کا رخ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہمیں اس ٹرانسمیٹر کے بغیر ہی گزارہ کرنا ہو گا۔ ڈاکٹر صاحبہ آپ یہ بتائیں کہ اس نے اور کیا کیا بتایا؟" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"افضل نے بتایا ہے کہ سردار شاہ مراد بھارتی حکومت کی طرف سے اشارہ ملنے کا منتظر ہے۔ اسے بھارتی حکومت کی طرف سے دو قسم کی ہدایات ملی ہیں۔ اگر بھارتی فوج پاکستان پر حملہ کرتی ہے تو سردار شاہ مراد کا فرض ہو گا کہ وہ آزاد قبائلی علاقے سے ہلکے اور بھاری ہتھیاروں مثلاً کلاشنکوف اور روسی مشین گن کی بھاری کھیپ خریدے اور اسے اپنے ٹرکوں کے ذریعے اندرون سندھ خفیہ مقامات پر پہنچا دے۔ بھارت اندرون سندھ کلبلانے والی علیحدگی پسند تنظیموں پر بے تحاشا پیسا خرچ کر رہا ہے۔

پاکستان پر بھارت کے حملے کی صورت میں سردار شاہ مراد کا پہنچایا ہوا اسلحہ ان تنظیموں میں مفت بانٹ دیا جائے گا۔ بھارتی ایجنٹوں کے اشارے پر ان تنظیموں کے ارکان' جن کی اکثریت ڈاکوؤں پر مشتمل ہے' عقب سے پاکستانی فوج پر شب خون ماریں گے۔ بھارتی فوج سے نبرد آزما پاکستانی فوج کو اس انداز میں پیٹھ میں گھونپے جانے والے خنجروں سے فیصلہ کن نقصان پہنچ سکتا ہے۔ نتیجتاً بھارتی فوج کو سندھ کے محاذوں پر کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ سردار شاہ مراد کو دوسری ہدایت یہ ملی ہے کہ وہ اپنے ان ٹرکوں کو ہلکے اسلحے سے بھر کر بھارتی پنجاب کی سرحد میں گھس جائے۔ جہاں بھارتی بارڈر فورس مصنوعی مقابلے کے بعد اسلحے سے لدے ان ٹرکوں پر قبضہ کر لے۔ اسلحے کی اتنی بھاری مقدار عالمی خبر ایجنسیوں کو اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دے گی۔ بھارتی حکومت پروپیگنڈے اور واویلے کا طوفان کھڑا کر دے گی۔ ساری دنیا کو بتایا جائے گا کہ یہ اسلحہ پاکستان نے بھارت میں سرگرم علیحدگی پسندوں کے لیے بھیجا ہے۔ اس طرح یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ پاکستان بھارتی پنجاب اور کشمیر میں براہ راست مداخلت کر رہا ہے اور ان علاقوں میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں کی سرپرستی پاکستان کر رہا ہے۔ بھارت عالمی سطح پر پاکستان کو تخریب کار ملک ثابت کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہے۔ اس ڈرامے کے بعد بھارت کا یہ کام بہت آسان ہو جائے گا۔ سردار شاہ مراد نے ان دنوں مستقل طور پر کوئٹہ میں ڈیرہ جمایا ہوا ہے تاکہ اشارہ ملتے ہی حرکت میں آ جائے۔"

"خدا غارت کرے اس بدبخت انسان کو۔ خدا جانے کس قیمت پر اپنے ضمیر کا سودا کیا ہے اس نے۔ اس نے تو وطن فروشی میں میر صادق اور میر جعفر کو بھی مات کر دیا ہے۔" مرزا نے دانت کچکچا کر کہا۔ "میرا بس چلے تو میں اسے زمین میں آدھا گاڑ کر اس پر بھوکے کتے چھوڑ دوں۔"

"ہم لوگوں کے بھی بالکل یہی جذبات ہیں مرزا صاحب۔ فی الحال اس پر لعنت بھیجیں اور اپنے آئندہ کے پروگرام کے متعلق سوچیں۔ ڈاکٹر صاحبہ نے جو کچھ بتایا ہے اس کی روشنی میں یہ بات تو بالکل واضح ہے ہمارے پاک وطن کو شدید خطرہ درپیش ہے اور ہمارے پاس سردار شاہ مراد کی سازش کو ناکام بنانے کے لیے بہت کم مہلت ہے۔" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔ "ہمیں ابھی اور اسی وقت حرکت میں آ جانا چاہیے۔ اتنی لمبی چوڑی سازش کو ختم کرنے کے لیے شاید ہمیں کئی زندگیاں درکار ہوں گی۔ خدا جانے یہ جال کہاں تک پھیلا ہوا ہے۔"

"یہ کام خواہ کتنا ہی دشوار گزار ہو بہرحال ہم اپنے قدم تو پیچھے نہیں ہٹا سکتے۔ میرے خیال میں ہمیں سب سے پہلے ملک کریم کو ان لوگوں کے چنگل سے آزاد کرانا پڑے گا۔ ویسے بھی ہمیں ہیڈ آفس سے اسی مشن پر روانہ کیا گیا تھا۔ ملک کریم خواہ کتنا ہی برا آدمی ہو لیکن اس کی وطن سے محبت شک و شبے سے بالاتر ہے۔ اس نے اس قدر اذیتیں سہنے کے باوجود اپنی زبان بند رکھی ہے۔ قبل اس کے کہ وہ اپنی زبان پر قابو کھو دے ہمیں اس آزاد کرا لینا چاہیے۔" صدیقی نے مرزا کی تائید میں سر ہلا دی۔ ڈاکٹر صنم بغور ہماری

باتیں سن رہی تھی۔

"میں بھی آپ لوگوں سے متفق ہوں۔ پہلے مرحلے پر ہمیں ملک کریم کی رہائی کے لیے ہی کوشش کرنی چاہیے۔ میں سردار شاہ مراد کے گاؤں کے محل وقوع سے اچھی طرح واقف ہوں۔ کسی نہ کسی طرح اس حویلی کا بھی پتا لگایا جا سکتا ہے جسے سردار شاہ مراد نے را کے ایجنٹوں کے حوالے کر رکھا ہے۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"اس امر میں تو کسی شک کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی کہ اس حویلی کی حفاظت کے بے حد اعلیٰ انتظامات کیے گئے ہوں گے۔ سب سے پہلے ہمیں اپنے پاس موجود اسلحے کا اندازہ لگانا چاہیے۔" مرزا نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"ہمارے پاس ایک عدد ایم پی فائیو سب مشین گن پہلے سے موجود ہے۔ اس کا میگزین تقریباً نصف خالی ہے۔ ایک اضافی میگزین بھی ہے جو پوری طرح بھرا ہوا ہے۔" صدیقی نے ماہرانہ انداز میں اسلحے کا تخمینہ لگانا شروع کیا۔ "اس کے علاوہ ذوالفقار بھائی کے پاس اس کا کولٹ پستول مع اضافی میگزین موجود ہے۔ میرے پاس ڈاکٹر صاحبہ کا اعشاریہ دو دو کا پستول ہے ہماری تازہ ترین مہم میں ہمیں ایک عدد کلاشنکوف رائفل اور ایک ٹی ٹی پستول بطور مال غنیمت حاصل ہوئے ہیں۔ کلاشنکوف کا میگزین پورا بھرا ہوا ہے۔ ٹی ٹی پستول سے دو گولیاں چل چکی ہیں لیکن ہمارے پاس اس کے دو بھرے ہوئے اضافی میگزین موجود ہیں جو افضل کے لباس سے برآمد ہوئے ہیں۔"

"گویا ہمارے پاس تین عدد چھوٹے اور دو بڑے ہتھیار موجود ہیں۔ ایمونیشن کی مقدار اگرچہ کم ہے تاہم کسی مختصر معرکے کے لیے کافی ہے۔ ویسے بھی ہمیں کسی براہ راست ٹکراؤ سے ہر ممکن گریز کرنا ہے اور کوشش کرنی ہے کہ چھاپا مار کر کارروائی سے اپنا مقصد حاصل کر لیا جائے۔" مرزا نے کسی ماہر سپہ سالار کے مانند جنگی حکمت عملی ترتیب دینا شروع کر دی۔

"یہ سچ ہے کہ موجودہ حالات میں ہم لوگ کسی بھی وقت اپنے دشمنوں کی نظر میں آ سکتے ہیں لیکن ہمیں یہ خطرہ بہرحال مول لینا ہی پڑے گا۔ ہم لوگ سادہ سے میک اپ میں ہوں گے۔ ہمیں علیحدہ علیحدہ یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ ہم لوگوں کے لیے موزوں راستے کا تعین ذوالفقار علی کرے گا۔ ہمیں کسی مناسب مقام پر اکٹھے ہونا ہے۔ اس کے بعد طے شدہ حکمت عملی کے تحت اپنے ہدف کی جانب بڑھنا ہے۔ اس مرحلے سے پہلے ہمیں انفرادی طور پر جو جو مسائل درپیش ہوں ان سے ہمیں خود نمٹنا ہو گا۔ آپ لوگوں کے ذہن میں کوئی شک کوئی سوال کوئی تجویز ہو تو اسے زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔"

"لیکن ہم لوگ اپنے ہتھیاروں کو کیسے لوگوں کی نظروں سے چھپائیں گے؟" صدیقی نے پوچھا۔ مرزا نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"میرے خیال میں اصل مسئلہ کلاشنکوف کو چھپا کر لے جانا ہے۔ آہنی دستہ فولڈ ہو جانے کے باوجود

اس کی جسامت اچھی خاصی ہوگی۔ اس کے لیے یہ ہوسکتا ہے کہ اسے اپنے پاس رکھنے والا کوئی بڑی سی چادر اوڑھ لے۔ ہم تینوں میں سب سے دراز قد ذوالفقار علی ہے۔ یہ ذمے داری یہی بہتر طور پر سنبھال سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں آپ کی اس رائے سے تھوڑا اختلاف کرنا چاہوں گا کہ ہمیں یہاں سے علیحدہ علیحدہ روانہ ہونا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں رات کے پہلے پہر میں الگ الگ بس وغیرہ ملنا بہت دشوار ہے۔ بالفرض ہم کوئی ایسا ذریعہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو بھی جائیں تو مقامی باشندوں کی نظر میں ہم مشکوک بن جائیں گے کیونکہ ہم حلیوں اور بول چال کے اعتبار سے ان سیدھے سادھے دیہاتیوں سے بالکل علیحدہ نظر آئیں گے۔ ان میں سے ہر ایک اسی تجسس میں مبتلا ہو جائے گا کہ ہم لوگوں کی منزل کون سا گاؤں یا دیہات ہے۔ ویسے بھی ہم لوگوں کا بس کے اڈے کی طرف جانا خطرے سے خالی نہیں۔ ممکن ہے وہ لوگ شہر سے باہر جانے والے ذرائع آمدورفت کی نگرانی کر رہے ہوں۔"

"پھر ہم لوگ کس طرح اتنا طویل فاصلہ طے کریں گے۔" صدیقی نے پوچھا۔

"پیدل۔۔۔! ہم لوگ پیدل وہاں تک جائیں گے۔ سڑک کے راستے سے اس گاؤں کا فاصلہ جتنا بنتا ہے' پیدل کا راستہ اس سے کہیں کم ہے۔ اگر ہم رات کے ابتدائی حصے میں روانہ ہوں تو نصف شب کے آس پاس اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس طرح ہم راستے میں آنے والی کسی بھی مشکل صورت حال سے مل جل کر نمٹ سکتے ہیں۔"

"تمہاری یہ رائے ہے تو ہم یقیناً ایسا ہی کریں گے۔" مرزا نے میرے موقف کی تائید کی۔

"اجازت ہو تو میں بھی کچھ کہوں۔" ڈاکٹر صنم نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں کہیے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟" ہم نے بہ یک وقت کہا۔

"میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ لوگ میری گاڑی لے جائیں یا میں آپ لوگوں کو وہاں تک چھوڑ آؤں؟"

"ان دونوں ہی صورتوں میں آپ براہ راست خطرے کی زد میں ہوں گی۔ ہم یہ کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتے۔ میرے خیال میں ہمیں ذوالفقار علی کی رائے پر عمل کرنا چاہیے۔" مرزا نے ڈاکٹر صنم کی تجویز کو رد کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ یہ بھی تو سوچیے کہ اگر آپ لوگ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے جو کہ انشاءاللہ ہوں گے تو ملک کریم کو کس طرح یہاں تک لائیں گے؟ عین ممکن ہے اس کی جسمانی حالت ایسی نہ ہو کہ وہ اپنے پیروں پر چل سکے۔"

"آپ کی دلیل خاصی وزنی ہے ڈاکٹر صاحبہ۔ اس کے باوجود ہم آپ کو کسی خطرے میں نہیں ڈال

سکتے۔ اگر آپ بھی ہمارے دشمنوں کی نظروں میں آ گئیں تو ہم اس محفوظ پناہ گاہ سے محروم ہو جائیں گے۔"

"اگر میں آپ لوگوں کے لیے کسی اور گاڑی کا بندوبست کر دوں تو کیسا رہے گا؟" ڈاکٹر صنم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا ایسا ممکن ہے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ اگر میں جواد سے کہوں تو وہ کسی نہ کسی گاڑی کا انتظام کر سکتا ہے۔ اس کا ایک دوست موٹر گیراج کا مالک ہے۔"

"اگر ایسا ہو جائے تو پھر کیا ہی بات ہے۔" مرزا نے مسرور لہجے میں کہا۔ "آپ ابھی اور اسی وقت اس کے پاس جائیں اور اسے کہیں کہ وہ ایک اچھی سی گاڑی کا انتظام کر دے۔ البتہ اسے احتیاطاً یہ بھی سمجھا دیجیے گا کہ اگر خدانخواستہ صبح تک وہ گاڑی واپس نہ پہنچے تو فوری طور پر اس کی چوری کی رپورٹ درج کرا دے۔"

"ٹھیک ہے آپ کا یہ کام ہو جائے گا لیکن اب افضل کا کیا کرنا ہے؟ آپ لوگ اجازت دیں تو میں اس کے ہاتھ پاؤں کھول دوں۔" ڈاکٹر صنم نے دھیمے لہجے میں کہا۔ مرزا نے استفہامیہ نظروں سے پہلے میری طرف اور پھر صدیقی کی طرف دیکھا۔ میں نے فوری طور پر اپنی رائے کا اظہار مناسب نہ سمجھا۔ صدیقی نے بھی اس کڑے فیصلے کا بار مرزا پر ہی رہنے دیا۔ قدرے توقف کے بعد مرزا نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"فی الحال صورت حال کو جوں کا توں رہنے دیں تو بہتر ہوگا۔ صرف ایک رات کی تو بات ہے۔ انشاءاللہ کل صبح تک ہم اپنی اس مہم سے واپس آ جائیں گے۔ اس کے بعد اس بارے میں فیصلہ کر لیں گے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔ ویسے اگر اس کے بندھن۔۔۔" ڈاکٹر صنم کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہم آپ کے جذبات اچھی طرح سمجھ رہے ہیں ڈاکٹر صاحبہ؟" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "یقیناً اس وقت اس کی حالت ایک معصوم بچے جیسی ہے۔ اسے رسن بستہ رکھنا واقعی ظلم محسوس ہوتا ہے۔ لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس کی ذہنی کیفیت کب معمول پر آ جائے۔ ایسے میں وہ آپ کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں کہ وہ دراصل ایک تربیت یافتہ بھارتی جاسوس ہے۔ اپنی اصلی ذہنی کیفیت کے ساتھ وہ ایک مکار اور بدکردار شخص ہے جس نے نسیم جیسی معصوم لڑکی کو اس کی عصمت سے محروم کرنے کے بعد اسے قتل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے متعلق کوئی بھی فیصلہ ہمارا استحقاق نہیں ہے۔"

"مجھے معاف کر دیجیے۔ شاید میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئی تھی۔ آپ لوگ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گی۔" ڈاکٹر نے پشیمان سی ہو کر کہا۔

"آپ معافی وغیرہ کو چھوڑیں اور جواد کے پاس جائیں۔ اسے گاڑی کا انتظام کرنے میں کچھ دیر

لگ سکتی ہے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ہمیں آج رات اپنی مہم پر روانہ ہونا ہے۔“

ڈاکٹر صنم شہر کی طرف روانہ ہوگئی۔ میں یکے بعد دیگرے تمام ہتھیار چیک کرنے لگا۔

”ابھی ہتھیاروں کو رہنے دو بھائی ذوالفقار علی۔ ہمیں اپنی آج کی مہم کی بقیہ تفصیلات طے کرنا ہیں۔“

”اور کون سی تفصیلات باقی رہ گئی ہیں؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”تفصیلات باقی ہیں اور بہت اہم تفصیلات باقی ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر ڈاکٹر صنم کی موجودگی میں بات آگے نہیں بڑھائی۔ وہ خواہ مخواہ پریشانی ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے تم لوگوں کی نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہوگی کہ ہم آج رات جس مہم پر جا رہے ہیں وہ بے حد جان لیوا ہے۔ ہمیں ہر حال میں نیک توقعات رکھنی چاہئیں لیکن ہم حقیقت پسندی کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتے۔ ڈاکٹر صنم کے سامنے ہم نے اس مہم کے لیے صرف اور صرف خوش امیدی کا اظہار کیا لیکن بہتر ہوگا ہم تاریک امکانات کے متعلق بھی غور کر لیں اور ان سے نمٹنے کے لیے ہر ممکن تیاری بھی کر لیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس مہم میں کامیابی اور ناکامی کے برابر امکانات ہیں بلکہ میں دوسرے امکان کو زیادہ قرین قیاس سمجھتا ہوں۔ ہو سکتا ہے ہم میں سے ایک بھی وہاں سے بچ کر نہ آ سکے۔ ہمارے لیے بہتر یہ ہے کہ ہم ہر صورت حال کے لیے خود کو تیار رکھیں۔ مجھے فکر صرف یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ ہم تینوں ایک ساتھ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تو سردار شاہ مراد اور اس کے بھارتی آقاؤں کے ناپاک ارادوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔ ہمارے ہیڈ آفس والوں کو پتہ بھی نہیں چل سکے گا کہ ہم پر کیا گزری۔“ مرزا نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

”آپ کا کہنا صحیح ہے مرزا صاحب۔ واقعی یہ موت اور زندگی کا کھیل ہے۔ اس کھیل میں کسی بھی وقت ہماری جان جا سکتی ہے لیکن ہماری زندگی کی قربانی اسی وقت ثمر آور ہو سکتی ہے جب ہم اپنے پاک وطن کے دشمنوں کے ارادوں کو مٹی میں ملا دیں۔ ہمیں کوئی ایسا انتظام کرنا چاہیے کہ ہماری موت کے بعد بھی سردار شاہ مراد کی سازش ناکام بنانے کا مشن جاری رہے۔“

”ہمارے پاس ڈاکٹر صنم اور افضل کی ریکارڈ شدہ گفتگو کی صورت میں سردار شاہ مراد کی سازشوں کا اہم اور تفصیلی ریکارڈ موجود ہے۔ اگر یہ دونوں کیسٹیں کسی طرح ہمارے ہیڈ آفس پہنچ جائیں تو ہمیں ہماری جدوجہد کا مناسب صلہ مل جائے گا۔ مجھے یقین ہے ان دونوں کیسٹوں میں ریکارڈ شدہ گفتگو ہمارے ہیڈ آفس کے کرتا دھرتا افراد کو فوری طور پر حرکت میں آنے پر مجبور کر دے گی بلکہ مجھے یقین ہے کہ ان کیسٹوں میں ریکارڈ گفتگو حکومت کے ایوانوں میں تہلکہ مچا دے گی۔“

”مگر یہ کیسٹیں وہاں تک پہنچیں گی کیسے؟“ صدیقی نے کہا۔ ”ظاہری بات ہے یہ بے حد نازک معاملہ ہے جس میں کسی بھی قسم کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔“

”اسی سلسلے میں یہی ممکن ہے کہ ہم ڈاکٹر صنم کو سمجھا دیں کہ وہ دو ایک دن تک ہم لوگوں کے واپس نہ آنے کی صورت میں یہ کیسٹیں اسلام آباد میں ہمارے ہیڈ آفس کے کسی ذمے دار فرد تک پہنچا دے۔“

”لیکن اس مجنوں بھائی افضل کا کیا بنے گا۔“ صدیقی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ کیسٹیں اسلام آباد پہنچ گئیں تو یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ وہ لوگ خود ہی اس سے نمٹ لیں گے۔ مجھے یقین ہے ڈاکٹر صنم یہ کام ذمے داری سے کر سکتی ہے۔“ مرزا نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ میں نے اور صدیقی نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔

اپنے منصوبے کی ہر ممکنہ پہلو پر گفتگو کرنے کے بعد مرزا ہمارے میک اپ میں مصروف ہو گیا۔ اس نے کوشش کی کہ ہم شکل و صورت سے اسی علاقے کے باسی دکھائی دیں۔ میرے سامنے رکھے آئینے میں جو چہرہ ابھرا وہ اصل سیف داد خان سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ اسی سیف داد سے ملتا جلتا جو کبھی یہاں سے جان بچا کر بھاگا تھا۔ عین اسی وقت میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا جو میرے لاشعور میں گزشتہ دو دن سے چبھ رہا تھا۔

”مرزا صاحب جب ہم افضل کو اٹھانے کے لیے سردار شاہ مراد کی حویلی پہنچے تو میرے چہرے پر نہایت عمدگی سے کیا گیا میک اپ موجود تھا۔ اس کے باوجود ندا نے پہلی نظر میں مجھے پہچان لیا۔ اس سے پہلے ترمتی کی موت والی رات بھی اس نے مجھے میک اپ کے باوجود پہچان لیا اور مجھے قتل کرانے کی کوشش کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مجھے اتنی آسانی سے کیسے پہچان لیتی ہے۔“

”تم نے بہت اچھا سوال کیا ہے ذوالفقار علی۔ تم نے شاید نوٹ کیا ہوگا کہ میں دو طرح سے میک اپ کرتا ہوں۔ ایک طریقے میں پلاسٹک میک اپ کے ذریعے چہرے پر مصنوعی جھریاں، ابھار اور پیچ و خم پیدا کر کے چہرے کے نقوش کو خاصی حد تک بدل دیا جاتا ہے جیسے کہ میں نے ملتان سے روانگی کے وقت اپنے چہرے پر بوڑھے آدمی کا میک اپ کیا تھا۔ یہ میک اپ خاصی محنت اور مہارت کا متقاضی ہے۔ جبکہ میک اپ کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ چہرے کے بنیادی نقوش میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی بلکہ چہرے پر کچھ ایسے مصنوعی اضافے کر دیے جاتے ہیں کہ میک اپ کے حامل شخص کو شناخت کرنا آسان نہیں رہتا مثلاً چہرے پر گھنی داڑھی مونچھوں کا اضافہ کر دینا، ناک میں اسپرنگ ٹھونس لینا، بھنوؤں کو باریک یا گھنا کر لینا اور مصنوعی تلوں اور مسوں کے اضافے کر لینا۔ اس طرح کے میک اپ میں یہ قباحت ہے کہ آپ کو بہت قریب سے اور بغور دیکھنے والے، اچھی یادداشت کے حامل شخص کو اگر ایک بار پھر آپ کو بغور دیکھنے کا موقع ملے تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ آپ کو اس میک اپ کے باوجود شناخت کر لے گا۔ ویسے بھی انسان اس شخصیت کے چہرے کے نقوش کبھی نہیں بھولتا جس نے اسے کسی بھی طرح متاثر کیا ہو۔ اس کے علاوہ بعض انسانوں میں چہروں کو پہچاننے اور یاد رکھنے کی خصوصی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ کسی بھی شخص کو خواہ کتنے بھی عرصے بعد کتنے بھی تبدیل شدہ حلیے کے ساتھ دیکھ لیں، اسے فوراً پہچان لیتے ہیں۔ یہ

تو قدرتی صلاحیت ہے لیکن آج کل دنیا بھر کے ترقی یافتہ ممالک کے اعلیٰ تحقیقاتی اداروں میں ایجنٹوں کو جدید ترین آلات کے ذریعے چہرے پہچاننے کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ اس تربیت کے ذریعے بعض باصلاحیت افراد اس درجہ کمال پر پہنچ جاتے ہیں کہ انہیں میک اپ کے ذریعے دھوکا دینا بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق ندا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ اس پر چہرے پہچاننے کی فطری صلاحیت ہے اور اس صلاحیت کو خصوصی تربیت کے ذریعے مزید جلا بخشی گئی ہے۔ اسی لیے اس نے دونوں مرتبہ تمہیں پہلی نظر میں پہچان لیا۔"

"یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا مرزا صاحب۔ آپ نے میری بہت بڑی ذہنی الجھن دور کر دی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میری معلومات میں بھی بے حد قیمتی اضافہ ہوا ہے۔" میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

ہم لوگ بڑی بے چینی سے ڈاکٹر صنم کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔ عصر کے وقت اطلاعی گھنٹی بجی۔ میں تیزی سے قدم اٹھاتا گیٹ پر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صنم کی کار مجھے گیٹ کے سامنے ہی نظر آ گئی۔ میں نے گیٹ کے پٹ کھولے۔ عین اسی وقت مجھے ڈاکٹر صنم کی گاڑی کے عقب میں ایک اور گاڑی نظر آئی۔ یہ فور ویل ڈرائیو رینج رووَر جیپ تھی۔ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہستی کو بھی میں نے فوراً پہچان لیا۔ وہ جواد تھا۔ گیٹ کھلتے ہی ڈاکٹر صنم کی گاڑی اندر آ گئی۔ جواد بھی اس کے پیچھے پیچھے جیپ کو اندر لے آیا۔ ڈاکٹر صنم کے بنگلے کا چھوٹا سا احاطہ لبالب بھر گیا۔ تب میں نے دیکھا کہ جیپ کی اگلی اور پچھلی نمبروں کی تختی پر محکمہ انہار، پنجاب لکھا ہوا تھا۔ جواد اپنے دوست کے گیراج سے ایک سرکاری گاڑی اڑا لایا تھا۔ میرے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

میرے چہرے پر ہونے والی چھوٹی موٹی تبدیلیوں کے باوجود جواد نے مجھے فوراً پہچان لیا۔ وہ نہایت گرم جوشی اور اپنائیت سے مجھ سے لپٹ گیا۔ سلام دعا کے بعد ہم ہال کمرے میں آ گئے۔ مرزا اور صدیقی نے وضاحت طلب نظروں سے جواد کی طرف دیکھا۔

"یہ جواد ہے۔ آپ لوگوں کے لیے گاڑی کا انتظام انہوں نے ہی کیا ہے۔"

"اوہو۔۔۔ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" مرزا نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ڈاکٹر صنم نے جواد سے مرزا اور صدیقی کا تعارف کرایا۔ ہم لوگ آپس میں رسمی باتیں کرنے لگے۔

مجھے معلوم تھا کہ مرزا اور صدیقی شدید اضطراب کا شکار ہیں۔ وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ ہمیں اپنی تیاری کو آخری شکل دینی تھی۔ جواد کی موجودگی میں اپنی مہم کے بارے میں بات کرنا کسی بھی طرح مناسب نہ ہوتا۔ وہ بہرحال غیر متعلقہ شخص تھا۔ خاصی دیر کے بعد بھی جب جواد نے روانگی کا ارادہ ظاہر نہ کیا تو مرزا نے شاکی نظروں سے ڈاکٹر صنم کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر صنم کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے پشیمانی سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"مم۔۔۔ میں معافی چاہتی ہوں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے جواد کو آپ لوگوں کے متعلق سب کچھ بتانا پڑا۔ یہ پوری صورت حال سے واقف ہو چکے ہیں۔" مجھے اپنے وجود میں ناراضگی کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔

"ڈاکٹر صاحبہ یہ آپ نے۔۔۔" مرزا نے مرتعش لہجے میں احتجاج کرنا چاہا لیکن جواد نے معذرت خواہانہ لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

"آپ لوگ صنم صاحبہ کو اس معاملے میں قصوروار نہ ٹھہرائیں۔ انہوں نے بے حد مزاحمت کی تھی لیکن میرے شدید اصرار کے باعث انہیں اپنی زبان کھولنا پڑی۔ ذوالفقار بھائی اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں ڈاکٹر صاحبہ کے لیے کس قسم کے احساسات رکھتا ہوں۔ مجھے دن رات ان کی فکر لگی رہتی ہے۔ انہوں نے جب پراسرار انداز میں مجھ سے گاڑی کی فرمائش کی اس انداز نے مجھے بری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میری باز پرس کے باوجود جب انہوں نے اپنی زبان نہ کھولی تو میں از حد پریشان ہو گیا۔ میں نے جب باقاعدہ باہمی تعلقات منقطع کرنے کی دھمکی دی تو انہیں مجھے سب کچھ بتانا پڑا۔" جواد نے ٹھہر کر مرزا اور صدیقی کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ ان کے چہروں کے تکدر میں کچھ کمی دیکھ کر اسے مزید حوصلہ ہوا۔

"مجھے آپ لوگوں کے سرکاری کام میں مداخلت کرنے پر انتہائی شرمندگی ہے۔ مجھے اگر صورت حال کا اندازہ ہوتا تو میں ہرگز ڈاکٹر صاحبہ پر زور نہ ڈالتا۔"

"اب آپ کیا چاہتے ہیں؟" مرزا نے سنجیدگی سے کہا۔ جواد نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے لیکن ہماری سوالیہ نظروں کی چبھن سے مجبور ہو کر اسے اپنی زبان کھولنا پڑی۔

"یہ چھوٹا منہ بڑی بات والی صورت حال ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں۔"

"تمہید میں مت پڑو جوان، سیدھی سیدھی بات کرو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔" مرزا نے نرم لہجے میں کہا۔

"مم۔۔۔ میں آپ لوگوں کے ہمراہ اس مہم پر جانا چاہتا ہوں۔" جواد نے مرزا کو امید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جلدی جلدی کہا۔ اس کی بات سن کر مرزا اور صدیقی کے چہرے پر قدرے حیرانی کے تاثرات پیدا ہوئے۔

"ہم پکنک منانے نہیں جا رہے جوان۔ یہ بے حد خطرناک مہم ہے۔ اس کے دوران ہم لوگ موت کا شکار بھی بن سکتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں جناب۔ ڈاکٹر صاحبہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس کے باوجود میری دلی خواہش ہے کہ میں بھی اس مہم میں شریک ہوں۔ آپ اگر مجھ پر مہربانی کر کے مجھے اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دے دیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ لوگوں پر بوجھ نہیں بنوں گا بلکہ میری شرکت سے آپ لوگوں کو فائدہ ہی پہنچے گا۔"

”لیکن تم اپنی زندگی خطرے میں کیوں ڈالنا چاہتے ہو؟ یہ ہمارا فرض ہے اور ہم اپنا فرض ادا کرنا جانتے ہیں۔“

”ایسا نہ کہیں جناب! یہ صرف آپ لوگوں کا فرض نہیں ہے یہ میرا بلکہ ہر محب وطن پاکستانی کا فرض اولین ہے۔ رہی زندگی کو خطرے میں ڈالنے والی بات تو انسانی زندگی تو ہر وقت خطرے میں رہتی ہے۔ ہم میں سے کون یقین سے کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنا اگلا سانس مکمل کر سکے گا۔ ایک ہلکا سا دل کا دورہ یا معمولی سا حادثہ ہماری زندگی کے لیے فیصلہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ انسان اپنی مختصر سی زندگی کو کسی ایسے کام میں صرف کر دے جو اس کے لیے اگلی دنیا میں عافیت کا سامان بن سکے۔“ جواد کی آواز رفتہ رفتہ جذبات سے بھاری ہوتی چلی گئی۔ ”ملک و قوم کے دشمنوں کے خلاف جہاد ایک ایسی نعمت اور سعادت ہے جو کسی خوش نصیب کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ آپ اس سعادت کے حصول میں مشغول ہیں۔ میری خواہش ہے کہ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ شامل ہو جاؤں۔ میں آپ لوگوں کے مانند اعلیٰ تربیت یافتہ اور پختہ کار تو نہیں ہوں لیکن یقین کیجیے مجھ میں حوصلہ اور جرات کی کمی نہیں ہے۔ آپ لوگ کسی بھی مرحلے پر مجھے پیچھے نہیں پائیں گے۔ مجھے اعتماد ہے کہ میں آپ لوگوں کے لیے بے حد کارآمد ثابت ہو سکتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم آپ لوگ اس علاقے سے کس حد تک واقف ہیں جبکہ وہ تمام علاقہ جس طرف آپ لوگوں کو جانا ہے میرا دیکھا بھالا ہے۔ میں اس علاقے میں آپ لوگوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکتا ہوں۔ ویسے مجھے آتشیں ہتھیاروں کے استعمال میں بھی کسی حد تک سدھ بدھ حاصل ہے۔“ اپنی بات ختم کر کے جواد نے امید بھری نظروں سے ہم لوگوں کی جانب دیکھا۔ اس لمحے وہ بلند حوصلہ اور صاف گو نوجوان مجھے بہت پیارا لگا۔ اس کا جذبہ ایمانی اور حب الوطنی قابل رشک تھا۔ مرزا اور صدیقی تذبذب کے باعث فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔“ مرزا نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”میرے خیال میں جواد بھائی کا دل توڑنا مناسب نہیں ہے مرزا صاحب۔ ہم ان کے جذبہ حب الوطنی کی راہ میں رکاوٹ کیوں بنیں؟ میں ذاتی طور پر جواد بھائی کی ذہانت اور قوت ارادی کا قائل ہو چکا ہوں۔ ان کی ذہانت کی تازہ ترین مثال وہ گاڑی ہے جس کا انتخاب انہوں نے ہماری اس مہم کے سلسلے میں کیا ہے۔ اس گاڑی کے سبب ہم بڑی آزادی سے پنجاب کے کسی بھی علاقے میں گھوم پھر سکتے ہیں کوئی ہم سے پوچھ گچھ نہیں کر سکے گا۔“

میں نے ان دونوں کو جواد کی لائی ہوئی محکمہ انہار کی جیپ کے متعلق بتایا۔ حسب توقع ان کے چہروں پر بھی جواد کے لیے ستائش کے جذبات ابھرے۔

”ٹھیک ہے بھائی۔ جہاں تین ہیں وہاں چوتھا بھی سہی۔ شاید یہی ہمارے حق میں بہتر ہو۔ ہم لوگوں کے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں جواد بھائی کو اپنی اس مہم کے خاص پہلوؤں سے اچھی طرح آگاہ

کر دیتا ہوں۔“ مرزا نے کہا۔ جواد نے اس معاملے سے خاصی حد تک واقف تھا۔ اس نے مرزا کی بتائی ہوئی تمام باتیں غور سے سنیں۔ مرزا نے اسے اپنے لیے کسی ہتھیار کا انتخاب کرنے کو کہا۔

”معاف کیجیے گا جناب میرے پاس میرا اپنا ہتھیار موجود ہے۔“ جواد نے اپنی قمیض کے اندر ہاتھ ڈال کر سیاہ رنگ اور نفیس ساخت کا ایک پستول نکالا۔ مرزا نے اس سے پستول لے کر اس کا بغور جائزہ لیا۔ ”بریٹا۔۔۔ خوبصورت۔۔۔ شان دار۔“ جواد نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”آپ کو پسند آیا؟ میرے پاس اس کا سائلنسر بھی ہے۔“

”بہت خوب۔ پھر تو یہ ہمارے بہت کام آ سکتا ہے۔“ مرزا نے جواد سے پستول کا سائلنسر لیتے ہوئے کہا۔ وہ نہایت مہارت سے پستول میں سائلنسر فٹ کرنے لگا۔

”تو گویا ثابت ہو گیا کہ تم بہت کام کے بندے ہو۔ اب اپنے جوہر دکھانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

”ڈاکٹر صاحبہ نے بتایا تھا کہ آپ لوگوں کے پاس ایک کلاشنکوف بھی ہے جس کا فالتو ایمونیشن شاید آپ کے پاس نہیں ہے۔ میں نے کوشش کر کے کلاشنکوف کے دو لوڈ میگزینوں کا انتظام کیا ہے جو گاڑی میں رکھے ہیں۔“

”بھئی واہ! تم نے تو کمال کر دیا۔ ایک بار پھر ثابت ہو گیا کہ تم بہت کام کے بندے ہو۔“ مرزا نے مسرور لہجے میں کہا۔

رات کے نو بجے کے قریب ہم لوگ تیار ہو کر گاڑی میں آ بیٹھے۔ ڈرائیونگ سیٹ جواد نے سنبھال لی۔ ڈاکٹر صنم نے کپکپاتے ہونٹوں اور نم آلود آنکھوں سے ہمیں رخصت کیا۔ افضل کے بیان والی کیسٹیں ہم پہلے ہی اس کے حوالے کر چکے تھے اور اسے اچھی طرح سمجھا چکے تھے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ چلتے چلتے مرزا نے اسے ایک بار پھر افضل کے متعلق ہدایات دیں۔ جواد نے جیپ گیٹ سے نکال کر آگے بڑھا دی۔ ڈاکٹر صنم کا ہیولا مجھے دیر تک گیٹ پر نظر آتا رہا۔ وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا رہی تھی۔

”کسی ایسے راستے سے چلو جواد بھائی جہاں سردار شاہ مراد کے کارندوں سے مڈبھیڑ کا کم سے کم امکان ہو۔“ مرزا نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”افضل کے اغوا نے ان لوگوں میں کھلبلی مچا دی ہو گی۔ وہ پاگل کتوں کی طرح ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے۔ انہوں نے یقیناً ناکوں پر بھی بندے بٹھا رکھے ہوں گے۔“

”آپ فکر نہ کریں جناب۔ میں آپ کو ایسے راستوں سے لے کر جاؤں گا کہ وہ ہماری گرد کو بھی نہ پا سکیں گے۔“ جواد نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ میرے ذہن میں سوال ابھرا کہ ایسے راستے کون سے ہو سکتے ہیں۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے اپنے اس سوال کا جواب مل گیا۔ جواد نے جس راستے سے جیپ کو شہر سے نکالا وہ میرے علم میں بھی نہیں تھا۔ وہ راستہ شاید صرف بیل گاڑی والے ہی استعمال کرتے ہوں گے۔ یہ راستہ ایسا تھا جس پر جیپ ہی چل سکتی تھی۔ شہر سے نکلتے ہی سڑک کے دونوں اطراف میں بلند و بالا

درختوں کی قطاریں شروع ہوگئیں۔

اندھیری رات میں بھاری بھرکم جیپ کسی عفریت کی طرح چیختی چنگاڑتی ' آنکھیں نکالتی' آگے بڑھتی رہی۔ اس راستے کے آس پاس کھیت کھلیان رہے ہوں گے لیکن اس سمے وہاں ہر طرف اندھیرے اور سناٹے کی حکمرانی تھی۔ مجھے اطمینان تھا کہ ہم لوگ اپنی منزل کی سمت ہی بڑھ رہے ہیں کیونکہ اس دوران میں جیپ کی رخ میں مسلسل شمال کی جانب رہا۔ کئی کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جیپ نے ایک بڑی سی نہر کا نیم پختہ پل پار کیا۔ اس کے ساتھ ہی جواد نے جیپ کو بائیں طرف موڑ دیا اور جیپ نہر کے پشتے پر آگے بڑھنے لگی۔ میں نے دھیمے لہجے میں جواد سے پوچھا۔

''اس طرف کہاں جارہے ہیں؟''

''یہ نہر آگے جاکر تقریباً دو ڈھائی کلومیٹر کے فاصلے سے سردار شاہ مراد کے گاؤں کے قریب سے گزرتی ہے۔ اس راستے سے ہمیں کسی قسم کی روک ٹوک کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔'' جواد نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پہچان لیا کہ یہ نہر کونسی ہوسکتی ہے۔

یہ نہر ہمارے گاؤں کے عقب میں واقع جنگل سے بل کھاتی گزرتی تھی۔ ہمارے گاؤں میں مشہور تھا کہ گرمیوں کی دوپہر میں اس نہر پر بھیڑیوں کے غول پانی پینے آتے ہیں۔ اسی لیے ہمارے گاؤں کے لوگ بلاضرورت اس طرف جانے سے گریز کیا کرتے تھے۔ کسی زمانے میں اس نہر کے کنارے محکمہ جنگلات کا ڈاک بنگلہ بھی تھا جو متروک ہونے کے بعد رفتہ رفتہ کھنڈر بن گیا اور پھر دیہات کی روایت کے عین مطابق اسے بھوتوں کا مسکن قرار دے دیا گیا۔ میں ایک بار پھر جواد کی ذہانت کا قائل ہوگیا۔ اس نے واقعی ایسے راستے کا انتخاب کیا تھا جو ہماری مہم کے لحاظ سے بے حد موزوں تھا۔

''تمہیں ان راستوں کا علم کیسے ہوا جواد بھائی؟'' میں نے پوچھا۔ جواد نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''کیا بتاؤں بھائی بس یوں سمجھو کہ میں نے نوعمری کا زمانہ انہی جنگلوں کی خاک چھان کر گزارہ ہے۔ میرا ایک دوست ہے ظہیر خان۔ آج کل وہ سعودی عرب میں مقیم ہے۔ اسے بچپن سے ہی مہم جوئی کا شوق تھا۔ مجھ سے اس کی دوستی ہوئی تو یہ لت اس نے مجھے بھی لگادی۔ کڑک گرمیوں کی جلتی دوپہر میں ہم پتہ نہیں کن کن جنگل بیابانوں کی دھول مٹی پھانکتے رہتے۔ ایک بار مچھلی کے شکار کا شوق چڑھا تو بنسی ڈوری لے کر شہر کے مضافات کے تمام جوہڑ' تالاب' ندیاں کھنگال ڈالیں۔ کئی بار دو دو دن تک گھر سے باہر رہے۔ اس کے بعد ہم پر پرندوں کے شکار کا شوق سوار ہوا۔ ہم ائیر گن اور غلے لیے بہت دور نکل جاتے۔ اس دوران میں ہم نے شہر کے گردونواع کے تمام علاقے دیکھ ڈالے۔ آج لڑکپن کے زمانے کی وہی آوارہ گردی کام آرہی ہے۔''

''تم لوگوں کے گھر والے تمہیں آوارہ گردی سے منع نہیں کرتے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''منع تو بہت کرتے تھے لیکن ہم پر ان کی باتوں کا اثر ذرا کم ہی ہوتا تھا۔ اسی آوارہ گردی کے

باعث انٹرمیڈیٹ میں میرے نمبر کم رہے اور بھائی جان کے مانند مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ نہ ملنے کا تمام گھر والوں کو افسوس ہوا۔ تب ڈاکٹر صنم نے مجھے سمجھایا کہ میں آوارہ گردی ختم کرکے اپنی تعلیم پر توجہ دوں۔ ان ہی دنوں ظہیر کو سعودی عرب میں نوکری مل گئی۔ اس کے پاکستان سے جاتے ہی میری آزاد منش طبیعت خود بخود اعتدال پر آگئی۔''

''تم اپنے میڈیکل اسٹور پر کسے چھوڑ کر آئے ہو؟''

''ایک لڑکا ہے باقر علی۔ وہ کام میں میرا ہاتھ بٹاتا ہے۔ میری عدم موجودگی میں وہی اسٹور کو سنبھالتا ہے۔'' جواد نے بغور آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے ہم اپنے مطلوبہ مقام کے قریب پہنچ چکے ہیں۔''

میں نے جیپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں باہر کا جائزہ لیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ اس کا اندازہ درست ہے۔ متذبذب سے انداز میں وہ گاڑی سیدھی بڑھاتا چلا گیا پھر اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے مطلوبہ مقام سے آگے نکل آیا ہے۔ گاڑی واپس موڑنے کی تو جگہ تھی نہیں۔ اسے گاڑی ریورس کر کے پیچھے لانی پڑی۔ ایک مناسب جگہ دیکھ کر اس نے جیپ کو نہر کے پشتے سے اتار لیا۔ گاڑی اونچے نیچے راستے پر آگے بڑھی۔ تقریباً فرلانگ بھر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جواد نے گاڑی کو ایک، گھنے درخت کے نیچے ٹھہرالیا۔

''اب آپ لوگ یہیں ٹھہر کر میرا انتظار کریں۔'' میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جیپ کے آس پاس کا علاقہ ذہن نشین کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ خاصا مشکل کام تھا لیکن مجھے اعتماد تھا کہ میں واپسی پر یہ جگہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔'' میں گاؤں میں جاکر کسی سے سردار شاہ مراد کی اس حویلی کا پتہ معلوم کرتا ہوں جسے اس نے بھارتی ایجنٹوں کے حوالے کر رکھا ہے۔'' میں نے اپنے دل کی دھڑکن پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ''انشاء اللہ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے تک واپس آجاؤں گا۔'' مرزا اور صدیقی نے اثبات می سر ہلا دیا لیکن جواد سے مداخلت کیے بنا نہ رہا گیا۔

''آپ اکیلے ہی گاؤں کی طرف جارہے ہیں؟ میرا مطلب ہے آپ۔۔۔''

''میں بھی اس گاؤں کے محل وقوع سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں آنکھیں بند کر کے بھی وہاں پہنچ سکتا ہوں۔'' میں نے قدرے سرد لہجے میں کہا۔

''وہ تو صحیح ہے۔'' جواد نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''لیکن کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں۔ ایک سے دو بہر حال بہتر ہوتے ہیں۔'' اس نے تائید طلب نظروں سے مرزا اور صدیقی کی طرف دیکھا۔

''نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں تنہا ہی وہاں جاؤں گا۔'' میں نے قدرے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

''لیکن اس میں حرج ہی کیا ہے؟ جواد بھائی کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ویسے بھی تم سردار شاہ مراد کے گاؤں کی طرف جا رہے ہو۔ وہاں کسی وقت بھی کوئی خطرناک صورت حال پیش آسکتی ہے۔ ایسی صورت میں جواد بھائی تمہیں کور دیں گے۔'' مرزا نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''آپ لوگ سمجھتے کیوں نہیں۔۔۔'' میں نے بے چارگی بھرے لہجے میں کہا۔ میں انہیں کیسے بتاتا کہ جانے کتنی دعاؤں کے بعد آج مجھے یہ دن نصیب ہوا ہے۔ کتنے زہریلے کٹیلے دنوں کے بعد میں ایک بار پھر اپنے گاؤں اپنے گھر جا رہا ہوں۔ اپنے مشفق و محترم چچا کے پاس' اس وفا آشنا' وفا شعار مہراں کے پاس' جس کے لیے میری ایک جھلک دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے۔ کتنے طویل عرصے سے وہ تہی دست و تہی داماں اپنی آنکھوں کے ویراں در وا کیے میری منتظر ہے۔ مجھے دیکھ کر اس پر کیا کیفیت طاری ہو گی؟ کہیں اس پر شادی مرگ نہ طاری ہو جائے۔ ان نایاب لمحات میں اس اجنبی شخص کی موجودگی میں کیونکر برداشت کر سکتا ہوں۔ اس کے سامنے بھلا ہم آپس میں کیسے دل کا حال سنا سکیں گے۔ وہ شرم و حیا کی پتلی تو اس کی موجودگی میں آزادی سے سانس بھی نہ لے سکے گی لیکن میں اسے اپنے ساتھ لے جانے سے کیسے انکار کروں؟ اگر میں درشتی سے انکار کر دوں تو یہ میرے رویے کو جانے کیا معنی پہنائیں گے۔ نہیں یہ قطعی مناسب نہیں ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے چلتا ہوں۔ راستے میں کوئی ترکیب سوچوں گا۔ اس مسئلے سے نپٹنے کی۔ 'ٹھیک ہے چلو تم۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' میں نے اپنے لہجے کو حتی الامکان پرسکون رکھتے ہوئے کہا۔

اپنا اپنا پستول لے کر ہم گاؤں کی طرف چل پڑے۔ میں نے رہنمائی کی ذمہ داری جواد پر ڈال دی۔ کچھ ہی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس طرح کے ماحول اور صورت حال سے میری بہ نسبت زیادہ مانوس ہے۔ اس کی آنکھیں طاقت ور سرچ لائٹ کے مانند اندھیرے کو چیرتی محسوس ہوئیں۔ ہمارے پاس ٹارچ موجود تھی لیکن ہم نے جان بوجھ کر اس کا استعمال نہیں کیا۔ اندھیری رات میں ہلکی سی روشنی بھی میلوں تک دکھائی دیتی ہے۔ اس جنگل بیابان میں روشنی کی موجودگی ہر دیکھنے والے کو بری طرح چونکا دیتی۔

جوں جوں ہم اپنی منزل کے قریب پہنچتے گئے۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ کبھی میرا دل چاہتا کہ فاصلہ یک لخت سمٹ جائے پھر میرا ذہن ان گنت اندیشوں سے بھر جاتا' اس کے ساتھ ہی میرے قدموں کی رفتار خود بہ خود دھیمی ہو جاتی۔ جواد میری اندرونی کیفیت سے بے خبر' اپنی بے چین نظریں گھماتا' میرے آگے آگے چل رہا تھا۔ گاؤں کے قریب پہنچتے ہی اس نے اپنا پستول ہاتھ میں تھام لیا۔ اس کے سائلنسر لگے پستول نے مجھے حالات کی سنگینی کا احساس دلایا۔ اس کے ساتھ ہی میرا ہاتھ بھی جیکٹ کی جیب میں خوابیدہ کولٹ کے دستے پر جم گیا۔

ہم نے ہل چلاتے ہوئے کھیتوں کی ناہموار زمینوں پر اچھا خاصا فاصلہ طے کیا۔ کچھ ہی دیر بعد

گاؤں کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ یہاں سے رہنمائی کا فریضہ میں نے سنبھال لیا۔ جواد نے کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا۔ مجھے سب سے زیادہ خطرہ گاؤں کے آوارہ کتوں سے تھا۔ اگر ان سے ہماری مڈبھیڑ ہو جاتی تو وہ بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ میں نے جواد کو بھی متوقع خطرے سے آگاہ کر دیا۔

جوہڑ کے پاس پہنچ کر میں ایک لمحے کے لیے ٹھہر گیا۔ جواد نے سامنے واقع پیر بخش کے گھر کی طرف اشارہ کر کے مجھے مشورہ دیا کہ ہم دروازہ کھٹکھٹائیں۔ میں نے نفی میں سر ہلا کر اس کی تجویز رد کر دی۔ ہم دونوں بغور آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیتے رہے۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ آسمان پر نصف چاند اور آوارہ بادلوں میں آنکھ مچولی جاری تھی۔ فضا میں اچھی خاصی خنکی موجود تھی۔ گاؤں کے لوگ تو شام ڈھلے ہی بستر سنبھال لینے کے عادی ہوتے ہیں۔ جبکہ وہ تو نصف شب کے قریب کا وقت تھا۔ ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے اپنے گھر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ جوہڑ سے ذرا ہٹ کر دوسری گلی کے آخری سرے پر ہمارا گھر تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ جواد کو کس جگہ ٹھہرانا ہے۔ وینو کی ہٹی کے سائبان تلے اسے کوئی بھی نہ دیکھ پاتا۔ میں جواد کو ساتھ لے کر وینو کی ہٹی کی طرف بڑھا۔ میں نے اسے چھپر کے سائبان تلے چھپنے کا اشارہ کیا۔ کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے سائبان کے اندھیرے میں قدم رکھا۔ میں دو قدم ہی آگے بڑھا ہوں گا کہ مجھے سائبان تلے سے ایک بھیانک غراہٹ سنائی دی۔ میں نے تیزی سے مڑ کر دیکھا۔ جواد الٹے قدموں اندھیرے سے باہر نکلا۔ یک لخت میں سمجھا کہ وہ غراہٹ کس جانور کی ہے۔ وہ لبّا تھا۔ ہمارے پڑوسی برکت کا دبلا پتلا مریل کتا۔ جواد کے باہر آتے ہی لبّا بھی باہر آگیا۔ وہ جواد پر دانت نکال کر دھیرے دھیرے مسلسل غرا رہا تھا۔ جواد نے اسے بھبکی دی جواباً لبّا ایک دم سے غرایا۔ جواد نے گھبرا کر اس پر گولی چلانا چاہی۔ میں برق رفتاری سے آگے بڑھا اور اس کے پستول والے ہاتھ کی کلائی پر ہاتھ مار کر اس کا رخ بدل دیا۔ پستول کی نال سے چنگاری سی چھوٹی۔ ہلکی سی ٹھس کی آواز پیدا ہوئی۔ گولی چھپر چیرتی آسمان کی وسعتوں میں گم ہو گئی۔

''کیا کرتے ہو جواد بھائی؟'' میں نے ناخوش گوار لہجے میں اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''یہ ۔۔۔ یہ کتا۔۔۔'' میں نے اسے اپنی پشت پر کیا اور خود لبّا کے سامنے آگیا۔ ''اوئے لبّا تیڈی مت نہیں ماری گئی؟'' میں نے دھیمے لہجے میں کتے کو ڈانٹا۔ اپنا نام سن کر کتا چونکا۔ اس نے ہوا میں تھوتھنی اٹھا کر میری بو سونگھنے کی کوشش کی۔ اس نے فوراً ہی مجھے پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے انداز سے جھلکنے والی جارحیت رفع ہو گئی۔ وہ دم ہلاتے ہوئے ہلکی آواز میں کوں کوں کرنے لگا۔ ''مریں! پرے دفع تھی ونج۔'' میں نے اسے دھتکار کر گلی کے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا گلی کے کونے کی طرف بڑھ گیا۔ جواد نے یقیناً حیرت بھری نظروں سے یہ سب کچھ دیکھا۔ تاہم میں نے اس کے استعجاب کو نظر انداز کر کے اسے سائبان کے اندھیرے میں جانے کا اشارہ کیا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں ایک بار پھر اپنے گھر کی طرف بڑھا۔ دروازے کے سامنے پہنچنے تک میرے تمام اعصاب

ستار کے تاروں کے مانند تن گئے۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن پھر فوراً ہی میں نے ہاتھ روک لیا۔ دستک کی آواز سن کر کہیں پڑوس والے بھی نہ جاگ اٹھیں؟ میں نے گھر کی کچی دیوار کا جائزہ لیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد میں دیوار پھاند کر گھر میں گھس سکتا ہوں۔ حالات کی یہ کیسی ستم ظریفی تھی کہ مجھے اپنے ہی گھر میں چوروں کے مانند دیوار پھاند کر داخل ہونا پڑ رہا تھا۔

میں نے دیوار پر اپنے ہاتھ جمائے اور ان پر سارے جسم کا وزن ڈال کر خود کو اوپر اٹھایا۔ دیوار کے اوپر پہنچ کر میں چند لمحوں تک گھر کے اندر کا جائزہ لیتا رہا۔ گھر پر مکمل اندھیرے اور سناٹے کی حکمرانی تھی۔ میں نہایت آہستگی سے دیوار سے صحن میں اتر گیا۔ مجھ پر یک لخت جذبات کا غلبہ ہونے لگا۔ مجھے لگا کہ میں آندھیوں اور طوفانوں کے بے رحم تھپیڑوں سے بچ بچا کر اپنے ننھے سے آشیانے میں لوٹ آنے والا پرندہ ہوں۔ مجھے شدت سے احساس ہوا کہ اپنے گھر کے تصور سے کتنی اپنائیت اور خلوص وابستہ ہوتا ہے۔ دائیں ہاتھ پر میری بھٹی اور لوہا کوٹنے والا اڈہ تھا۔ یہیں پر میں اپنے خون کو پسینے کی شکل میں بہا کر اپنے گھر والوں یعنی چچا مہرداد اور مہراں کے لیے دو وقت کی روٹی کا انتظام کیا کرتا تھا۔ کتنے پرمشقت روز و شب تھے لیکن مجھے کبھی تھکن کا احساس نہ ہوتا تھا۔ یہی وہ بھٹی ہے جہاں میں نے اپنی نفرت اور انتقام کو ایک خون آشام خنجر کے روپ میں ڈھالا وہ خنجر جو میرا شب و روز کا ساتھی تھا۔ میرا انتقام جو ہر گزرتے دن کے ساتھ پروان چڑھ رہا تھا۔ اس انتقام کی میں نے اپنے خون جگر سے پرورش کی پھر اس بدقسمت رتہ سائیں نے اس انتقام کا رخ زبردستی اپنی طرف موڑ لیا۔ کتنی ہی بار لہو میں ڈوبنے اور ابھرنے کے بعد میرا وہ وفادار ساتھی مجھ سے بچھڑ گیا۔ یہ خیال کیے بغیر کہ جس ناپاک وجود کو چھید چھید کرنے کے لیے میں نے اسے اس شکل میں ڈھالا وہ ابھی تک میرے سامنے ہی نہیں آیا۔ خون میں غسل کرنے کے بعد شاید اس کی پیاس کم از کم عارضی طور پر بجھ گئی۔ اسی طرح شاید میرے وجود پر پڑنے والے لہو کے چھینٹوں نے میری انتقام کی آگ کو وقتی طور پر دھیما ہونے پر مجبور کر دیا۔

ٹارچ کو ہاتھ میں لے کر میں چچا مہرداد اور مہراں کے کمرے کی طرف بڑھا۔ میں نے ابھی تک ٹارچ کو روشن نہیں کیا تھا۔ اس کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ اس مانوس جگہ کا چپہ چپہ میرے دل و دماغ میں نقش ہے۔ میں آنکھیں بند کر کے اس گھر کے ہر گوشے میں پہنچ سکتا ہوں۔

اپنے وجود پر پھیلتی سنسناہٹ پر قابو پاتے ہوئے میں نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا۔ توقع کے عین مطابق دروازہ بند تھا۔ میں نے بہت دھیرے سے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ کسی قسم کا ردعمل نہ پا کر میں نے ذرا زور سے دستک دی۔ میرے سنسناتے کانوں نے کسی چارپائی کے چرچرانے کی آواز سنی۔ کسی نے نیم سرگوشانہ لہجے میں کچھ کہا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور چارپائی چرچرائی۔ میں نے دھڑدھڑاتے دل کے ساتھ ایک بار پھر دروازہ تھپتھپایا۔ ''چاچا'' میں نے دروازہ سے منہ لگا کر حتی الامکان دھیمی آواز

میں اپنے چاچا کو آواز دی۔ کمرے میں یک لخت مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔

''کک۔۔۔کون۔۔۔ہے؟'' چند لمحوں بعد کمرے کے اندر سے ایک لرزتی آواز آئی۔ مجھے اپنے چاچا کی آواز پہچاننے میں ایک لحہ بھی نہ لگا۔

''میں ہوں۔۔۔چاچا۔۔۔'' میں نے جذبات کے بوجھ تلے جھلملاتی آواز میں کہا۔ کمرے میں ایک بار پھر سنگین سناٹا طاری ہو گیا۔ بہت سے کشیدہ لمحوں کے بعد کمرے سے ایک بار پھر لڑکھڑاتی سی آواز برآمد ہوئی۔ ''سس۔۔۔سیفل۔۔۔؟''

''ہاں۔۔۔چاچا!'' میری زبان سے بمشکل نکلا۔ یک لخت کمرے میں کوئی چھوٹا موٹا سا بھونچال آ گیا۔ اگلے ہی لمحے کسی کے قدموں کی آہٹ میرے کانوں میں آئی۔ میں نے طوفانی انداز میں دھڑکتے دل کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ مجھے اپنی آنکھوں میں کہکشاں سی اترتی محسوس ہوئی۔ اگلے ہی لمحے میں نے ایک مانوس ہیولے کو اپنے مقابل پایا۔ اس کی تیز تیز چلتی سانسوں سے مجھے اپنے مشام جان معطر ہوتے محسوس ہوئے۔ مہراں۔۔۔ میرے وجود کے روئیں روئیں نے یک زبان ہو کر پکارا۔

اس نے تاریکی کے پس منظر میں مجھے پہچاننے کی کوشش کی۔ اگلے ہی لمحے اس کے حواس نے اسے یقین دلا دیا کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہی ہے۔ اس کے سامنے میں بذات خود موجود ہوں۔ اسی اثناء میں کمرے میں لالٹین کی روشنی بڑھ گئی۔ لاٹھی کی کھٹ کھٹ دروازے کی طرف بڑھی۔ ایک مردانہ ہاتھ نے مہراں کو ایک طرف کیا۔ میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے چچا مہرداد کے شفیق چہرے کو دیکھا۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتا' میں کٹے ہوئے تنے کے مانند اس کے نحیف وجود کی طرف جھکتا چلا گیا۔ میں بے قراری سے اس کے سینے سے لپٹ گیا۔ چچا مہرداد کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ کر کچے فرش پر گر گئی اور اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

''میرا بچہ۔۔۔میرا سیفل۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ مجھے لگا کہ میں محفوظ پناہ گاہ میں آ گیا ہوں۔ میری آنکھیں خود بخود چھلکنے لگیں۔ ''میرے بچے۔۔۔میرے لعل۔'' چچا مہرداد نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ اس کے ہاتھ بڑی بے قراری سے میرے جسم کو ٹٹول رہے تھے۔ وہ ہر طرح سے میری سلامتی کا یقین کر لینا چاہتا تھا۔ یک لخت میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ میں بری طرح ہڑک ہڑک کر رونے لگا۔ میری آنکھوں سے بہنے والے دھاروں دھار آنسو اس کا شانہ بھگونے لگے۔ اس کی بوڑھی آنکھیں پہلے ہی انمول موتیوں کے خزانے لٹا رہی تھیں۔ روتے روتے میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ دل تھا کہ کسی طرح قابو میں نہ آتا تھا۔ میں نے اپنی پشت پر کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ ہم دونوں کے سامنے سے گزر کر مہراں کمرے کے وسط میں پہنچ گئی۔ ڈبڈباتی' ٹمٹماتی نظروں کے باعث مجھے اس کی صورت واضح طور پر نظر نہ آئی۔ وہ بھی خاموش ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

"تو۔۔۔تو ٹھیک تو ہے میرے بچے؟" چچا مہر داد نے بمشکل مجھے خود سے الگ کیا اور میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ "یہ تیرا کیا حال ہو گیا ہے؟"

"میں۔۔۔میں مجھے کچھ نہیں ہوا چچا۔ میری فکر نہ کرو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے بصد مشکل اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"لیکن تو واپس کیوں آ گیا میرے بچے؟ خدانخواستہ تو حویلی والوں کی نظر میں آ گیا تو؟ تو یہاں سے فوراً چلا جا میرے بچے۔ بہت دور چلا جا اسی میں تیری بہتری ہے۔"

"تو فکر نہ کر چاچا۔ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ مجھے ان درندوں سے نمٹنا آ گیا ہے۔" میں نے جیکٹ کی جیب میں دبکے ہوئے پستول پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"بابا ٹھیک کہتا ہے۔ تم فوراً یہاں سے دور چلے جاؤ۔" مہراں نے شدید بے چینی سے لبریز آواز میں کہا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ لالٹین کی ٹمٹماتی روشنی میں اس کا چہرہ مجھے سرسوں کے پھول کی طرح زرد نظر آیا۔ جیسے وہ ایک طویل عرصے سے کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو۔

"تم۔۔۔تم ٹھیک تو ہو مہراں؟" میں نے اپنے خدشات کو دباتے ہوئے پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا لیکن خدا کے لیے تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ کیوں آئے ہو تم یہاں؟" اس نے عجیب بیگانے سے لہجے میں کہا۔

"یہ۔۔۔یہ تم۔۔۔کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے اس کے لہجے میں گم گشتہ اپنائیت تلاش کرنے کی کوشش کی۔

"میں صحیح کہہ رہی ہوں۔ اسی میں تمہاری بہتری ہے اور ہماری بھی۔ کیوں اپنی اور ہماری زندگی کے دشمن بنے ہوئے ہو؟" بے زبان اور فاختہ صفت مہراں کی زبان سے نکلنے والے ان زہریلے فقروں سے مجھے اپنا سینہ چھلنی ہوتا محسوس ہوا۔ اس کے لہجے کی خنکی اور بیگانگی نے میرے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ مجھے لگا کہ میں غلطی سے کسی اجنبی گھر میں گھس گیا ہوں۔ ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ میں نے معذرتی لہجے میں کہا۔

"تم۔۔۔تم لوگ ٹھیک تو ہو؟ سردار شاہ مراد نے تم لوگوں کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟"

"ہم لوگ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ بابا چار دن حویلی میں بند رہا پھر معافی تلافی کے بعد اور گاؤں والوں کی منت سماجت کے بعد سردار شاہ مراد نے بڑی مشکل سے بابا کو چھوڑا ہے۔ سردار شاہ مراد کئی بار ہمارے گھر آ چکا ہے۔ وہ بہت خوفناک دھمکیاں دیتا ہے۔ بابا اس بڑھاپے میں مزید اذیت نہیں سہہ سکتا۔ تم یہاں سے آخر چلے کیوں نہیں جاتے؟"

"خدا کے لیے مہراں مجھ سے اس لہجے میں بات نہ کرو۔ تمہیں کیا ہو گا؟ تم نے تو مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں کن کن حالات سے گزر کر یہاں پہنچا ہوں۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔ "تم تو مجھے دھکے

دے کر گھر سے نکالنے پر تلی ہوئی ہو۔"

"مہراں کی بات مان لو سیفل۔ یہاں سے بہت دور نکل جاؤ۔ ہمیں بھول جاؤ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔۔۔" چچا مہر داد نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

میں نے الجھن بھرے لہجے میں پوچھا۔ "تم لوگ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ تم لوگ اتنے خوف زدہ کیوں ہو؟ مجھے بتاؤ ایسی کون سی بات ہے جس نے تم لوگوں کو اپنے رویے تک تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا ہے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔" چچا مہر داد نے آنکھیں چراتے ہوئے کہا اور مجھ سے منہ پھیر کر اپنی لاٹھی اٹھا کر وہ گھسٹتا ہوا اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا "لو تم ہماری بات کیوں نہیں مان لیتے بیٹا۔" اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ "کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہو۔"

"ٹھیک ہے چاچا۔ آپ لوگ یہی چاہتے ہیں تو میں ابھی چلا جاتا ہوں۔" میں نے مایوس لہجے میں کہا۔ "اگر ہو سکے تو مجھ پر مہربانی کر کے یہ بتا دو کہ سردار شاہ مراد نے گاؤں سے باہر جو نئی حویلی تعمیر کی ہے وہ کس طرف واقع ہے؟"

"سردار شاہ مراد کی نئی حویلی؟" ان دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ "یقین کرو ہم سردار شاہ مراد کی ایسی کسی بھی حویلی کی موجودگی سے ناواقف ہیں۔ سردار شاہ مراد نے اگر ایسی کوئی حویلی بنوائی ہے تو اس سے ہم ہی نہیں تمام گاؤں والے بھی ناواقف ہیں۔ ایسی باتیں زیادہ عرصے چھپی نہیں رہ سکتیں۔"

"تمہیں پورا یقین ہے کہ۔۔۔؟" میں نے پوری طرح تصدیق چاہی۔

"ہاں بیٹا میں سچ کہہ رہا ہوں۔ گاؤں والوں کی نظر سے کوئی بھی ایسی چیز بھلا کیسے چھپ سکتی ہے؟ بس اب تم دیر نہ لگاؤ، صبح قریب آ رہی ہے کسی کی نظر تم پر پڑ گئی تو۔۔۔"

"اچھا چاچا بس ایک بات اور بتا دو۔ میرا یار سرور کس حال میں ہے؟" میں نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"تمہیں معلوم ہے رتا سائیں نے اس کی آنکھیں۔۔۔"

"مجھے معلوم ہے چاچا۔ اسی لیے تو میں نے رتا سائیں کی آنکھوں میں خنجر اتارا تھا۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ اب اس کا کیا حال ہے؟ اس کے گھر کے حالات کیسے ہیں؟" میں نے بے چینی سے کہا۔

"بہت برا حال ہے بیٹا۔ سرور کے علاج میں ان کے گھر کا سامان تک بک گیا۔ سردار کے ڈر سے کوئی بھی ان کی مدد کرنے کو تیار نہ تھا۔ جب فاقوں تک نوبت آ گئی تو سرور کو مجبوراً بھیک کے لیے ہاتھ پھیلانا پڑا۔"

"کیا کہہ رہے ہو چاچا؟ میں شدید کرب کے عالم میں چیخا۔ "سرور بھکاری بن گیا؟"

"ہاں بیٹا۔۔چھوٹی بہنوں کے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ایک نابینا بھائی اور کر بھی کیا سکتا تھا؟ سنا ہے وہ شہر کے بازاروں میں بھیک مانگتا ہے۔ مہینے میں ایک آدھ بار گاؤں آتا ہے اور فوراً ہی واپس چلا جاتا ہے۔ گاؤں والوں نے ابھی تک اس کے گھرانے سے تعلقات بحال نہیں کیے۔"

"اف میرے خدا! یہ کیا ہو گیا؟" میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ان دونوں نے مجھے مزید وہاں رکنے نہیں دیا۔ مہراں مجھے گھر کے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ دروازے سے قدم باہر رکھتے ہوئے میں نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

"مجھے۔۔۔ مجھے معاف کر دینا سیفل۔۔۔ میں بے حد مجبور ہوں۔" اس نے آنسوؤں میں بھیگی آواز میں کہا۔ میں جواب میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا حتیٰ کہ اس کے خدا حافظ کے جواب میں بھی میں محض سر ہلا کر رہ گیا۔

مجھ پر میرے ہی گھر کا دروازہ بند ہو گیا! شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ یہی سب سننے کے لیے میں نے اتنا کٹھن سفر طے کیا۔ ان ہی سرد مہر اور کٹھور لوگوں کے لیے میں اتنے عرصے تڑپتا رہا۔ انہیں یقیناً میری جان سے زیادہ اپنی جان کا خطرہ ہے۔ ایک بار پھر ثابت ہو گیا کہ اس دنیا میں کوئی بھی رشتہ خود غرضی سے مبرا نہیں ہے۔ ویسے بھی جس شخص کی سگی ماں اپنے رشتے کے تقدس کو اپنی منہ زور خواہشات کے گھاٹ پر قربان کر چکی ہو وہ کسی اور رشتے سے کیسے وفا کی امید رکھ سکتا ہے۔

مجھے اپنے حلق میں کڑواہٹ گھلتی محسوس ہوئی۔ میں نے اپنے وجود کا زہر تھوکنے کی ناکام کوشش کی میں گلی میں چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ جانے کس کونے کھدرے سے لسا برآمد ہوا اور میرے قدموں سے لپٹنے لگا۔ میرا دل شدت سے چاہا کہ اسے اپنے سینے سے لپٹا لوں۔ آج کے دور میں شاید وفا اور مروت صرف جانوروں تک محدود ہو گئی ہے۔ کون جانے کب یہ بے زبان جانور بھی انسانوں کی صحبت میں رہ کر ان ہی کے رنگ میں رنگ جائیں۔

مجھے قریب آتے دیکھ کر جواد اپنے ٹھکانے سے نکل آیا۔ "کچھ پتا چلا؟" اس نے سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔ میں نے محض نفی میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس نے پریشان سا ہو کر پوچھا۔ "اب کیا ہو گا؟ ہم اس حویلی کو کیسے تلاش کریں گے؟"

"ان لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ سب اس طرح کی کسی بھی حویلی کی موجودگی سے لاعلم ہیں۔" میں نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔

"تو پھر کسی اور سے پوچھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ لوگ اس بارے میں صحیح معلومات نہ رکھتے ہوں۔"

"نہیں اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس گھر کے رہنے والوں کا دعویٰ ہے کہ گاؤں کی عام لوگ ایسی کسی بھی حویلی کے وجود سے قطعاً ناواقف ہیں۔ گاؤں کے قرب و جوار میں ایسی کوئی بھی نو تعمیر شدہ عمارت

گاؤں والوں کی نظر سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو گے کہ گاؤں دیہات میں کوئی بھی خفیہ بات زیادہ دیر خفیہ نہیں رہ سکتی۔"

"جس گھر میں تم گئے تھے اس کے باسیوں سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟ میرا مطلب ہے کیا تمہیں ان لوگوں کی باتوں کا پورا اعتبار ہے؟"

"ہاں مجھے ان لوگوں کی باتوں کا مکمل اعتبار ہے!" میں نے سوال کے پہلے حصے کو گول کرتے ہوئے کہا۔ میرے قدم تیزی سے لیکن بے آواز اٹھ رہے تھے۔ میرے عقب میں جواد بھی تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ ہمارے پستول ہمارے ہاتھوں میں آ چکے تھے۔

"اب تم کہاں جا رہے ہو؟" جواد نے اپنی عقابی نظریں آس پاس کے ماحول پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"وہاں جہاں سے ہمیں اپنے مطلب کی اطلاع مل سکتی ہے!" میں نے گول مول سا جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

"بس تم چلتے رہو!" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

گاؤں کے مشرقی حصے میں واقع ایک نیم پختہ مکان کے پاس پہنچ کر میں رک گیا۔ جواد نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اشارے سے اسے آس پاس کی نگرانی کی تاکید کی اور خود مکان کی دیوار کی طرف بڑھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ بغیر سہارے کے دیوار پر چڑھنا خاصا مشکل ہے کیونکہ دیوار کی بلندی اچھی خاصی تھی۔ جواد نے فوری طور پر صورت حال کو سمجھ لیا۔ اس نے پستول کو جیب میں رکھا اور اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں جکڑ کر ایک پائے دان کی سی شکل دے دی۔ اس نے اشارہ کیا کہ میں اس پائے دان پر پاؤں جما کر دیوار کے اوپری حصے پر ہاتھ جما لوں۔ پس و پیش کی گنجائش تھی ہی نہیں۔ میں نے پستول جیکٹ کی جیب میں رکھا' جواد کے ہاتھوں کے پائے دان پر پاؤں رکھا اور اچک کر دیوار کے اوپری سرے پر ہاتھ جما دیے۔ جواد نے سہارا دے کر مجھے اوپر اٹھانا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی میں دیوار پر پہنچ گیا۔

دیوار پر خود کو اچھی طرح جماتے ہوئے میں نے مکان کی اندرونی صورت حال کا جائزہ لیا۔ وسیع صحن میں مکمل اندھیرا تھا۔ سامنے موجود دونوں کمروں کے دروازے بند تھے۔ بغور دیکھنے پر مجھے ایک کمرے کے دروازے کی نچلی درز سے ہلکی ہلکی روشنی جھلکتی نظر آئی۔ میں نے اپنے ہاتھ دیوار کے اوپری سرے پر جمائے اور اندرونی سمت لٹک گیا۔ خود کو متوازن کر کے میں نے ہاتھ چھوڑ دیے۔ ہلکی سی دھمک کے ساتھ میں مکان کے صحن میں اتر گیا۔ میں نے کمرے کی طرف قدم بڑھائے لیکن پھر کچھ سوچ کر ٹھہر گیا۔ میں مکان کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا اور نہایت احتیاط سے دروازے کی کنڈی کھول دی۔ دروازہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ میں نے باہر جھانکا۔ مجھے پہچان کر جواد ایک تاریک گوشے سے باہر آ گیا۔ میں نے اشارے سے اسے گھر بلا لیا۔ جوں ہی وہ اندر آیا' میں نے دروازہ کی کنڈی دوبارہ لگا

دی۔ اپنا پستول سنبھال کر میں دبے پاؤں اس کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے پاس پہنچ کر میں نے کان دروازے سے لگا دیا۔ چند لمحوں تک مجھے کچھ سنائی نہ دیا پھر میرے حساس کان اندر سے برآمد ہونے والی مدھم سرسراہٹیں اور انسانی سرگوشیاں سننے میں کامیاب ہو گئے۔ اچانک کمرے میں ایک مترنم نسوانی قہقہہ بلند ہوا لیکن وہ قہقہہ اپنے اختتام تک پہنچتے پہنچتے چیخ میں تبدیل ہو گیا۔

''سوردا پتر۔۔'' اسی کھنکھناتی نسوانی آواز نے کسی کو گالی دی' ہزار واری آکھیا اے چونڈی نہ وڈیا کر۔''

''اوئے حرام دی تخم۔۔۔ گالی کڈ دی اے۔'' ایک چبھتی سی مردانہ آواز میرے کان میں آئی۔ مجھے اس آواز کو پہچاننے میں ایک لمحہ بھی نہ لگا۔ میں نے معنی خیز نظروں سے جواد کی طرف دیکھا۔ عین اسی وقت دروازے کے پیچھے سے جلترنگ سی بج اٹھی۔۔۔ وہ عورت بے تحاشا ہنس رہی تھی۔

''بس۔۔۔ بس۔۔۔ توں ہن گدگدی کیتی تے چنگا نہ ہوسی۔'' اس نے بہ مشکل اپنی ہنسی پر قابو پایا۔

میں نے جواد کو اشارہ کیا کہ وہ ہوشیار ہو جائے۔ میں چند قدم پیچھے ہٹا اور پھر تیزی سے دوڑ کر اپنا دایاں شانہ پوری قوت سے دروازے پر دے مارا۔ ایک دھماکے سے دروازہ کھل گیا اور میں لڑکھڑا کر اندر گر پڑا۔ کمرے میں ایک ہلکی سی نسوانی سی چیخ گونجی۔ خود کو سنبھالتے ہوئے میں نے اپنے پستول کا رخ سامنے پڑے ہوئے پلنگ کی طرف کر دیا۔ تپائی پر موجود لالٹین کی روشنی نے مجھے جو منظر دکھایا اگرچہ وہ میرے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں ایک لمحے کے لیے نظر چرانے پر مجبور ہو گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پستول پر نظر جمائے وہ عورت پچیس تیس برس کی رہی ہوگی البتہ اس کے وجود کی تمام تر شرفشانی اور آتش گیری ابھی تک اپنے پورے عروج پر تھیں۔ بھرپور جسمانی مشقت کے باعث پھوٹنے والا پسینہ اس کے سانولے وجود پر شفاف آب دار موتیوں کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش دہشت کے باعث بگڑے ہوئے نہ ہوتے تو وہ یقیناً خوش شکل کہلاتی جب کہ اس کے خوش بدن ہونے میں تو کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ حیرت اور دہشت کے اچانک حملے سے سنبھل کر اس نے ہاتھوں سے اپنے تہمت پوشاک سے آزاد وجود کو ڈھانپنے کی کوشش کی پھر اسے احساس ہوا کہ اس بھرپور سراپے کے لیے یہ اوٹ ناکافی ہے۔ اس نے جھپٹ کر فرش پر ڈھیری بنے کپڑے اٹھا لیے اور انہیں اپنے جسم سے لپٹا لیا اسے نظر انداز کر کے میں نے اس کے عقب میں اکڑوں بیٹھے مرد پر نظر ڈالی۔ وہ اپنی چندھی چندھی آنکھیں پھاڑے حیرت سے منہ کھولے' میری شکل دیکھ رہا تھا۔ اسے احساس ہی نہ تھا کہ وہ کس ناگفتہ بہ حالت میں ہے۔ میں نے پستول کا ہیمر پیچھے کیا اور نپے تلے قدموں سے چلتا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اسی اثنا میں اس عورت نے جیسے تیسے قمیض پہن لی۔ البتہ اسے شلوار پہننے میں دشواری پیش آئی کیونکہ شلوار کا ازار بند نکلا ہوا تھا۔

میری توقع کے عین مطابق اس شخص کو مجھے پہچاننے میں دیر نہ لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے مکروہ

چہرے پر چھائی حیرت شدید دہشت میں تبدیل ہو گئی۔

''تت۔۔۔ تت تم۔۔۔؟'' اس کے حلق سے لڑکھڑاتی سی آواز نکلی۔

''ہاں۔۔۔ میں۔۔۔! اب تمہاری زبان سے کوئی آواز نہیں نکلنی چاہیے۔'' میں نے خوں خوار لہجے میں اسے تنبیہ کی۔ مجھ سے بھی زیادہ بہتر طور پر میرے پستول کی چمکتی نال نے میرا اجل آفریں پیغام اس تک پہنچا دیا۔ وہ تھوک نگل کر محض سر ہلا کر رہ گیا۔ اس پر نظر رکھتے ہوئے میں نے اس کی گدڑی کا پلو پلٹا۔ سامنے ہی بتیس بور کا ریوالور پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر جیکٹ کی جیب میں ٹھونس لیا۔ میرے نشانہ کی زد میں موجود شخص کے چہرے کی زردی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ جواد نے اس عورت کے سر پر پستول تان رکھا تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں نے جواد کو اشارہ کیا۔ اس کا پستول والا ہاتھ بجلی کی تیزی سے حرکت میں آیا۔ پستول کا دستہ کھٹ سے اس عورت کی کھوپڑی پر پڑا۔ اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بے ہوش ہو کر زمین پر ڈھیر ہو گئی۔ اس شخص نے احتجاج کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن میرے تیور دیکھ کر سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

''یہ بات اچھی طرح اپنی کھوپڑی میں اتار لے بختیار رے کہ تو اس وقت پوری طرح میرے رحم و کرم پر ہے۔ تجھے کوئی بھی میری گولی سے نہیں بچا سکتا۔ تیرا وہ باپ شاہ مراد بھی لیکن تو اگر چاہے تو تیری زندگی بچ سکتی ہے۔''

''تت۔۔۔ تم کیا چاہتے ہو؟'' اس نے تھوک نگل کر اپنا حلق گیلا کرتے ہوئے پوچھا۔ میں نے اپنے پستول کو جنبش دے کر کہا۔ ''یقین کر بختیار رے مجھے تیرے کو ختم کر کے ذرا بھی افسوس نہیں ہوگا۔ میرے اسی پستول کی گولیوں کا تجھ سے بڑھ کر مستحق اس گاؤں میں شاید ہی کوئی اور ہو۔ میرے اس پستول کی ہر گولی تیرے خون کی پیاسی ہے۔ تو وہ بے غیرت ہے جس نے کتنے ہی غریب گھرانوں کی عزتیں سردار شاہ مراد اور رتا سائیں کی عیاشی کی بھینٹ چڑھا دی ہیں۔ میں اپنے پستول کی گولیوں کی پیاس بجھانا چاہتا ہوں لیکن اگر تم مجھ سے تعاون کرو تو میں ان گولیوں کو اسی طرح پیاسا یہاں سے واپس لے جا سکتا ہوں۔'' میں نے اپنے لہجے کی حتی الامکان دہشت ناک بناتے ہوئے کہا۔ میرے ان الفاظ کا اس پر حسب توقع بھرپور اثر ہوا۔ اس کی مزاحمت مکمل طور پر دم توڑ گئی۔

''مم۔۔۔ میں تم سے ہر طرح کا تعاون کرنے کو تیار ہوں۔ خدا کے لیے مجھے مت مارو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تم سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم نے اس کا صحیح صحیح جواب نہیں دیا تو میں اپنے پستول کی گولی تمہاری کھوپڑی میں اتار دوں گا اور اگر تم نے میرے سوال کا صحیح جواب دیا تو میں وعدہ کرتا ہوں میں اپنے اس پستول کی گولیوں کو جوں کا توں واپس لے جاؤں گا۔''

''پوچھو۔۔۔ پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' اس نے شدید اضطراب کے عالم میں سوال کیا۔

''مجھے اچھی طرح معلوم ہے آج کل سردار شاہ مراد بھارت کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا ہے۔ تم اس

کے خاص کارندوں میں سے ہو۔ تم یقیناً تمام باتوں سے واقف ہو گے۔''

''مم۔۔۔ مجھے جو کچھ معلوم ہے وہ میں ضرور بتا دوں گا۔'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ یقیناً وہ سوچ رہا ہو گا کہ مجھے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہو گیا۔ ''ذرا دماغ حاضر رکھ کر بتاؤ کہ سردار شاہ مراد نے ان بھارتی ایجنٹوں کے لیے جو نئی حویلی تعمیر کروائی ہے وہ کس طرف ہے؟''

''نئی حویلی؟'' اس نے قدرے توقف کے بعد حیرانی سے پوچھا۔ ''کون سی نئی حویلی؟ سردار صاحب نے تو کوئی نئی حویلی نہیں بنوائی۔''

''لگتا ہے تمہیں اپنی زندگی سے پیار نہیں ہے۔ یار جی میری تو صرف تین روپے کی گولی خرچ ہو گی جبکہ تیری کھوپڑی کا سوراخ ساری دنیا کی دولت بھی نہ بھر سکے گی۔ وفاداری شفاداری کو گولی مار۔ سچ سچ بتا دے۔ تیرے پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

''تم جس چیز کی قسم کہو میں کھانے کے لیے تیار ہوں۔ میں ایسی کسی حویلی سے واقف نہیں ہوں۔ میں لعنت بھیجتا ہوں سردار شاہ مراد اور اس کی ملازمت پر۔ تم صرف ایک بار مجھے معاف کر دو۔ میں یہاں سے بہت دور چلا جاؤں گا۔''

''اتنی جلدی بھی کیا ہے میری جان۔ میرے سوال کا صحیح جواب دے دو۔ اس کے بعد تم جہاں کہو گے میں خود تمہیں وہاں بھیج دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔'' میں نے اس کے لہجے سے جھوٹ سچ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ مجھے لگا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ سردار شاہ مراد ہمیں سب کچھ نہیں بتاتا۔ اگر ایسی کوئی حویلی ہے بھی تو میں اس سے واقف نہیں ہوں۔'' اس نے بلبلاتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہاری بدقسمتی ہے بھائی۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر تم میرے سوال کا جواب نہیں دے سکے تو میں اپنے پستول کی گولی تیری کھوپڑی میں اتار دوں گا۔''

''لیکن میں نے تمہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے۔'' اس نے دہشت سے سفید پڑتے ہوئے کہا۔

''ممکن ہے تم نے یہ سب سچ کہا ہو لہٰذا میں وعدے کے مطابق اپنے پستول کی گولی تم پر خرچ نہیں کروں گا البتہ۔۔۔'' میں نے جواد کے پستول کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ بختیارے کی آنکھوں میں موت کی تاریکی اتر آئی۔ وہ اندھا دھند کمرے کے بند دروازے کی طرف دوڑا۔ اسے دروازے کی کنڈی کھولنے کی بھی مہلت نہ مل سکی۔ کمرے کی محدود فضا میں ٹھک ٹھک کی دو مختلف آوازیں ابھریں۔ پہلی آواز سائلنسر لگے پستول کے فائر کی تھی جبکہ دوسری آواز بختیارے کی کھوپڑی کی ہڈی ٹوٹنے کی تھی۔ اس کا منہ بند دروازے سے ٹکرایا۔ اس کا جسم ہولے ہولے کپکپاتا ہوا وہیں ڈھیر ہو گیا۔ کھوپڑی کے عقب میں موجود بھیانک سوراخ سے بہنے والا خون نیم پختہ فرش پر ڈھلان کی سمت چل پڑا۔

جواد سنگی مجسمے کی طرح بے حس و حرکت یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ تو وہ

بری طرح چونک پڑا۔ اس کے چہرے پر جذباتی تناؤ کی سی کیفیت تھی۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھولا اور بختیارے کی لاش پھلانگ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ بیرونی دروازے سے باہر نکلنے سے پہلے میں نے بغور آس پاس کا جائزہ لے لیا۔ میدان صاف دیکھ کر ہم باہر نکل آئے۔ جواد کا پستول میں نے واپس کر دیا۔

''کیا یہ ضروری تھا ذوالفقار بھائی؟'' کچھ دور آنے کے بعد جواد نے اپنی چپ توڑی۔

''ہاں بے حد ضروری! میں نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ یہ غلیظ شخص خدا جانے کتنے کسانوں اور کھیت مزدوروں کی بیٹیاں اغوا کر کے سردار شاہ مراد اور اس کے بیٹے رتا سائیں کی خواب گاہ میں پہنچا چکا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بہت سے بے گناہ افراد کا قاتل بھی ہے۔ ویسے بھی اس کا زندہ رہنا ہمارے مشن کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔'' میری وضاحت کا خدا جانے جواد پر اثر ہوا یا نہیں۔ بہرحال اس نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ میرے متعلق اس گاؤں کے حوالے سے جانے کیا کیا اندازے لگا رہا ہو گا۔ اسے رتا سائیں والے معاملے کا علم ہوتا تو شاید وہ مجھے پہچاننے میں کامیاب ہو جاتا۔ بالفرض اگر اس نے مجھے بتایا نہیں۔

خاصی دیر بعد' جب کہ ہم کھیتوں کے سلسلوں کو عبور کر کے جنگل میں داخل ہو رہے تھے' جواد نے سوال کیا۔ ''اب کیا کیا جائے ذوالفقار بھائی؟''

''فی الحال تو مرزا اور صدیقی کے پاس چلتے ہیں۔ ان سے مشورہ کر کے ہم اپنے اگلے اقدام کے بارے میں سوچیں گے۔ یہ تو ثابت ہو ہی چکا ہے کہ ہماری مطلوبہ حویلی اگر آس پاس کہیں موجود ہے تو بیشتر لوگ اس کے وجود سے بے خبر ہیں۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ اس شخص افضل نے جھوٹ بولا ہو؟'' جواد نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ قدرے توقف کے بعد میں نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''بظاہر اس کا امکان تو نہیں ہے کیونکہ۔۔۔ بہرحال اگر ایسا ہے بھی تو فوری طور پر ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔'' اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اگر جواد نے گاؤں میں رہنے والے میرے رشتے داروں کے متعلق مرزا اور صدیقی کو بتا دیا تو وہ خواہ مخواہ میرے متعلق متجسس ہو جائیں گے۔ اس سے بہتر ہے کہ اسی کو اعتماد میں لے لیا جائے۔ ''جواد بھائی میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی فرمائیے۔۔۔ میں سن رہا ہوں۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اگر آپ مرزا اور صدیقی کے سامنے میرے رشتے داروں کا ذکر نہ کریں تو بڑی مہربانی ہو گی۔ دراصل میری کچھ مجبوریاں ہیں جن کے باعث میرے لیے۔۔۔''

''آپ فکر نہ کریں ذوالفقار بھائی۔ آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔ ویسے آپ اگر غلط نہ سمجھیں تو میں کہنا چاہوں گا کہ میں آپ کی مجبوریوں سے پوری طرح واقف ہوں۔'' اس کی بات سن کر

مجھے شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ میں چلتے چلتے رک گیا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا جواد بھائی؟"

"مجھے معلوم ہے آپ میرا مطلب اچھی طرح سمجھ چکے ہیں البتہ میں اپنے دل کی گہرائیوں سے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا یہ راز قیامت تک میرے سینے میں محفوظ رہے گا۔ آپ کا اصل نام کبھی میری زبان پر نہیں آئے گا۔" جواد نے دھیمے لیکن مضبوط لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم واقعی مجھے پہچان چکے ہو!" میں نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں آپ کو پہچان گیا ہوں۔ اس گاؤں کے حوالے سے آپ کا نام اس علاقے میں خاصا مشہور رہا ہے۔ ویسے میں آپ کو اس روپ میں دیکھ کر حیران ضرور ہوا ہوں۔ آپ ان سرکاری ایجنٹوں کے ساتھ کیسے آن ملے؟"

"یہ سب قسمت کا پھیر ہے بھائی۔ میرا ان سے ٹکراؤ ہوا اور انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کام کرنے پر مجبور کر دیا۔ ویسے یہ لوگ میری اصلیت سے واقف نہیں ہیں۔" میں نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"وہ تو میں سمجھ ہی چکا ہوں۔ ویسے شاید آپ کو معلوم نہ ہو آپ کے کارنامے کا شہر میں خاصے دنوں تک چرچا رہا ہے۔ اگرچہ آپ کو قاتل اور ڈکیت بنا کر پیش کیا گیا اس کے باوجود آپ لوگوں کی نظروں میں ہیرو ہیں کیونکہ آپ نے اس علاقے کے سب سے طاقتور وڈیرے کو خاک چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس لفنگے رنا سائیں کی تو دوبارہ شکل ہی نظر نہیں آئی۔" اس نے تعریفی لہجے میں کہا۔ میں نے جواب دینے کے بجائے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"مجھے یہ بات ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ لوگ ڈاکٹر صنم سے کیسے واقفیت رکھتے ہیں نیز آپ لوگوں نے اپنے راز سے انہیں کیسے آگاہ کر دیا؟" جواد نے حیرانی سے پوچھا۔

"شاید تمہیں علم نہ ہو دراصل سردار شاہ مراد کے کارندوں کے ساتھ ایک جھڑپ میں مرزا صاحب شدید زخمی ہو گئے تھے۔ ان کی مرہم پٹی کے لیے ہم ڈاکٹر صنم کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے مرہم پٹی کے لیے جب مرزا صاحب کا زخم دیکھا تو انہیں معلوم ہو گیا کہ یہ زخم گولی کا ہے۔ انہوں نے اصل صورت حال سے آگاہ ہوئے بغیر مرزا صاحب کا علاج کرنے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً ہمیں انہیں اپنے راز میں شریک کرنا پڑا۔ اس کے بعد وہ ہمارے منع کرنے کے باوجود زبردستی اس مہم میں شریک ہو گئیں۔"

اسی اثنا میں ہم اپنی مطلوبہ جگہ کے قریب پہنچ گئے۔ ہم نے متلاشی نظروں سے اس طرف دیکھا جہاں ہم رینج روور جیپ کو چھوڑ کر گئے تھے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود ہمیں وہاں جیپ کا ہیولا تک نظر نہ آسکا۔

"کہیں ہم راستہ تو نہیں بھول گئے؟" میں نے شدید الجھن اور اضطراب کے عالم میں کہا۔

"اس کا امکان تو نہیں ہے۔ بہرحال ہم ایک بار پھر اچھی طرح آس پاس کا جائزہ لیتے ہیں۔" جواد

نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ہاں ایسا ہی کرنا ہوگا۔ تم اس طرف جاؤ۔ میں اس طرف جاتا ہوں۔ میں نہایت غور سے آس پاس کا جائزہ لیتا ہوا نہر کے پشتے پر پہنچ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد جواد بھی گھوم پھر کر وہیں پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے میری طرف بڑھا۔

"مجھے صد فی صد یقین ہے کہ ہم صحیح جگہ پر پہنچے ہیں۔" جواد نے مضبوط لہجے میں کہا۔ پھر وہ کچی زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ وہ ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھ رہا تھا۔ "یہ دیکھیے۔ یہاں جیپ کے ٹائروں کے تازہ نشان بھی موجود ہیں۔" وہ جھک کر چلتا ہوا آگے بڑھا۔ "یہ دیکھیے۔ یہاں سے جیپ پشتے سے نیچے اتری تھی۔ اس جگہ ٹائروں کے نشانات بے حد واضح ہو گئے ہیں۔"

وہ بالکل صحیح کہہ رہا تھا۔ ہم دونوں ٹائروں کے نشانات کے ساتھ ساتھ نہر کے پشتے سے نیچے اتر آئے۔ ٹائروں کے نشانات کا رخ اچھی طرح بھانپنے کے بعد ہم ان نشانات کی بالکل سیدھ میں آگے بڑھنے لگے۔ چند ہی لمحوں بعد ہم سیدھے اس درخت کے نیچے پہنچ گئے جہاں ہم جیپ کو کھڑا کر کے گئے تھے۔ وہاں پر جیپ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جیسے اسے زمین کھا گئی ہو یا آسمان نگل گیا ہو۔ جواد نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔

"یہ لوگ کہاں غائب ہو گئے؟"

"خدا جانے کیا معاملہ ہے؟" میں نے اپنے دل کی بڑھتی ہوئی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"شاید کسی وجہ سے انہیں اپنی جگہ بدلنی پڑ گئی ہو۔" میں نے دلیل کے ذریعے خود کو تسلی دینا چاہی۔ اپنے لہجے کی بے اطمینانی میں نے خود بھی محسوس کی۔

'خدا کرے ایسا ہی ہوا ہو۔ مجھے تو معاملہ گڑبڑ معلوم ہو رہا ہے۔" جواد نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک بار پھر اکڑوں بیٹھ گیا۔ "گاڑی کو اس طرف لے جایا گیا ہے۔" اس نے شمال مشرق کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں بڑے محتاط قدموں سے اس سمت بڑھنے لگے۔ ہمارے دل ہماری کنپٹیوں میں دھڑک رہے تھے۔ مجھے چاروں طرف خطرات کی دھند پھیلتی محسوس ہوئی۔ مرزا اور صدیقی کی اس طرح اچانک جیپ سمیت گمشدگی خارج از علت نہیں ہو سکتی تھی۔

جواد مجھ سے آگے آگے ٹائروں کے نشانات کے تعاقب میں چل رہا تھا جبکہ اس دوران میں میری آنکھیں اندھیرے کے پرزے چاک کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ آسمان پر موجود نصف چاند کے باعث چاندنی کی کرنیں کہیں کہیں درختوں کی چادر چاک کر کے زمین پر بھی اتر آتی تھیں۔ جیپ کے ٹائروں نے بڑی بے دردی سے گھاس پھوس اور جھاڑ جھنکاڑ کو کچلا تھا۔ جواد سست رفتاری لیکن مستقل مزاجی سے آگے بڑھتا رہا۔ تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جواد گھاس کے ایک قطعے کے پاس ٹھہر گیا۔ اس کی نظریں گھاس پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ وہاں گھاس پر سیاہ رنگ کا کوئی سیال

اچھی خاصی مقدار میں پھیلا ہوا ہے۔ جواد نے جھک کر اس سیال میں اپنی شہادت کی انگلی ڈبوئی۔ اسے انگوٹھے کی مدد سے مسلنے کے بعد اس نے ناک کے قریب لا کر سونگھا۔

”خون!“ اس کے حلق سے ایک سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔ مجھے اپنے رگ و پے میں خوف کی سرد لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ خون اس قدر بڑی مقدار میں نکلنے کی صورت میں زخمی کی زندگی شدید خطرے میں ہو سکتی تھی۔ کیا یہ خون مرزا یا صدیقی کے جسم سے نکلا ہے؟ میرے ذہن میں سوال ابھرا۔ اس کے ساتھ ہی میری رگیں کھنچنے لگیں۔ میرے دل نے نہیں نہیں کی گردان شروع کر دیا۔ مجھے اپنے بدترین اندیشے پورے ہوتے نظر آنے لگے۔

”اب اس امر کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ معاملہ خطرناک حد تک گڑبڑ ہے۔ مرزا اور صدیقی کو گاڑی سمیت اغوا کر لیا گیا ہے اور ان میں سے کوئی ایک ممکنہ طور پر شدید زخمی ہے۔ اس شخص افضل کی مہیا کی ہوئی اطلاع خاصی حد تک درست ثابت ہو چکی تھی۔ سردار شاہ مراد کی حویلی اور دیگر چھوٹے موٹے ٹھکانوں کے علاوہ کم از کم ایک اور ٹھکانہ ضرور موجود ہے۔ اسی ٹھکانے سے ان دونوں افراد کے اغوا کی کاروائی کی گئی ہے۔ ہمیں جلد از جلد وہ ٹھکانا تلاش کرنا ہے اور مرزا اور صدیقی کے علاوہ ملک کریم کو بھی آزاد کرانا ہے۔“ میں نے سنجیدہ لہجے میں صورت حال کا تجزیہ کیا۔

”یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن ہم لوگوں کے پاس اس مہم کی تکمیل کے لیے وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ طلوع آفتاب کے بعد تو ہمارے لیے کچھ بھی کرنا ممکن نہیں رہے گا پھر تو مجبوراً کل رات تک کا انتظار کرنا پڑے گا۔“ جواد نے تیزی سے پھسلتے وقت کی جانب توجہ دلائی۔ میں نے اضطراب کے عالم میں کہا۔

”ایسا نہ کہو بھائی۔ کل رات تو جانے کیا سے کیا ہو جائے گا۔ ان میں ایک کو ممکنہ طور پر فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ اپنے دشمنوں کے مسکن میں انہیں یہ سہولت کون مہیا کرنے کی زحمت گوارا کرے گا۔ ہمیں جو بھی کچھ کرنا ہے اسی محدود وقت میں کرنا ہے۔ خدا کرے ٹائروں کے ان نشانات کے ذریعے ہم ان لوگوں کی کمین گاہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں۔ ہمارے پاس بس اب یہی صورت باقی رہ گئی ہے۔“

جواد ٹائروں کے محدود نشانات کے سہارے آگے بڑھتا رہا۔ درختوں کی چھدری چھت سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی اس کی مدد کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ ٹھہر گیا۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ میرا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ آسمان پر نور بکھیرتا چاند آہستہ آہستہ گہرے بادلوں کی اوٹ میں چھپ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی رفتہ رفتہ اندھیرے کی گھٹا ٹوپ چادر ہر طرف حملہ آور ہو رہی تھی۔ ہم بے بسی کے عالم میں دیکھتے رہ گئے۔ اور چاند سیاہ بادلوں کی اوٹ میں چھپ کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ فضا میں گھٹن اور حبس کی سی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔

”اب کیا کریں ذوالفقار بھائی؟“ جواد نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔ ”مجھے تو لگتا ہے کہ بارش بس

اب شروع ہونے ہی والی ہے۔ بارش شروع ہو گئی تو ہم کچھ بھی نہیں کر پائیں گے۔ بارش کے ساتھ ہی تمام نشانات ختم ہو جائیں گے۔“

”اب ہمیں وہ کرنا ہو گا جس سے ہم ابھی تک گریز کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ ایسا کرنا خطرناک ہے لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔“

میں نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سی لیکن طاقتور ٹارچ نکالی اور اس کا رخ زمین کی طرف کر کے اسے روشن کر دیا۔ جواد نے بھی اپنی ٹارچ نکال لی۔ ایک بار پھر ہمارے اطراف کی دنیا روشن ہو گئی۔ ہم ٹائروں کے نشانات کے تعاقب میں آگے بڑھنے لگے یکلخت آسمان پر بجلی چمکی چند لمحوں بعد اس کی گھڑ گھڑاہٹ بھی سنائی دی۔

”جلدی کرو جواد بھائی۔ میں شدید اضطراب کے عالم میں کہا۔ جواد نے اپنی رفتار میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ایک بار بجلی کڑکی۔ اس کے ساتھ ہی ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ جواد نے ٹائروں کے نشانات کی سمت میں تقریباً دوڑنا شروع کر دیا۔ ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے میں پستول لیے میں بھی اس کے پیچھے پیچھے تیز رفتاری سے چلتا رہا۔ کچھ دیر بعد بارش کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ہم دونوں پر شدید مایوسی طاری ہونے لگی۔ شدید اضطراب کے عالم میں جواد نے اپنی ٹارچ کی روشنی اس سمت میں دور تک ڈالی جس سمت میں ٹائروں کے نشانات بڑھ رہے تھے۔ اچانک مجھے لگا کہ میں نے جیپ کا ہیولا دیکھا ہے۔

”ادھر ٹارچ کی روشنی ڈالو“ میں نے اپنی ٹارچ کی روشنی کو بھی اسی سمت مرتکز کر دیا۔ مجھے فوراً ہی یقین ہو گیا کہ یہ میری آنکھوں کا دھوکا نہیں ہے۔ وہ یقینی طور پر ہماری جیپ ہی تھی۔ میں نے اپنی ٹارچ بند کر کے جیب میں رکھ لی اور اپنے پستول کو سنبھال لیا۔ ہم دونوں بڑے بڑے محتاط قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر ہمارے دشمن ہمارے آس پاس کہیں چھپے ہوتے تو اب تک وہ ہمیں اپنی گولیوں کا نشانہ بنا چکے ہوتے۔ یہ محض رسمی سی کاروائی تھی۔ تیز بارش میں بھیگتے ہم کچھ ہی دیر میں جیپ کے پاس پہنچ گئے۔ میری توقع کے عین مطابق ہمیں کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جیپ کے قریب پہنچتے ہی ہمیں معلوم ہو گیا کہ یہ ہماری ہی جیپ ہے۔ اسے درختوں کے ایک چھوٹے سے جھنڈ میں چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔

چاروں طرف کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد ہم جیپ کی طرف بڑھے۔ حسب توقع جیپ بالکل خالی تھی۔ جواد نے ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ بآسانی کھلتا چلا گیا۔ جواد جیپ کے اندر داخل ہو گیا۔ میں نے اپنی سمت کا دروازہ کھولا تو وہ بھی بآسانی کھل گیا۔ میں بھی جیپ کے اندر گھس گیا۔ طرح طرح کے اندیشوں سے لبریز دل کے ساتھ میں نے جیپ کے اندرونی حصے کا ٹارچ کی

روشنی میں جائزہ لیا۔ پچھلی سیٹ پر روشنی پڑتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ پوری سیٹ خون میں لت پت ہو رہی تھی۔ سیٹ کے ایک کونے میں مجھے مرزا کی چرمی بوٹ بھی خون میں ڈوبے نظر آئے۔ صاف پتا لگتا تھا کہ کچھ دیر پہلے اس جگہ شدید زخمی حالت میں کوئی شخص یہاں موجود تھا۔

میں ایک بار پھر جیپ کے باہر پھیلے گھور اندھیرے میں کسی نادیدہ دشمن کو تلاش کرنے لگا۔ وہ لوگ ہم سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ یہیں کہیں۔۔۔ ہمارے آس پاس۔۔۔ شاید وہ اس وقت بھی ہماری نقل و حرکت پر اپنی نظریں گاڑھے ہوئے ہوں۔۔۔ کسی مناسب وقت کے انتظار میں۔۔۔ کب ہم گردوپیش سے غافل ہوں اور وہ ہمارے سینوں پر اپنے تیز دھار پنجے گاڑ کر اپنی مکروہ چونچ سے ہماری آنکھیں نوچ لیں۔ انہوں نے مرزا اور صدیقی کو بھی اسی طرح شکار کیا ہوگا۔ اچانک۔۔۔ گھات لگا کر۔۔۔ خدا جانے اب اس کا کیا حال ہوگا۔ اتنا شدید زخمی ہونے کے بعد اتنا بہت سا لہو بہ جانے کے بعد اس کا زندہ رہ جانا بھلا کیوں کر ممکن ہے۔۔۔ شاید وہ ان درندوں کے ہاتھوں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ قربان ہو گیا اپنے مقدس فرض کی راہ میں۔ اپنے وطن کی سلامتی کی خاطر۔۔۔ جواد نے بھی پچھلی سیٹوں پر بکھرے خون کو دیکھا۔ اس کا چہرہ یک لخت زرد پڑ گیا۔

''اف میرے خدا۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے۔۔۔''

''ہاں بھائی۔۔۔ شاید مرزا صاحب زندگی کی بازی ہار گئے ہیں لیکن میں ان کا خون رائیگاں نہیں جانے دوں گا۔ میں ان کے قاتلوں کا نام و نشان تک صفحۂ ہستی سے مٹا دوں گا۔''

میں نے چنگاریاں اڑاتے لہجے میں کہا۔ ''وہ لوگ اگر پاتال کی گہرائیوں میں جا چھپیں تو بھی میرے انتقام سے نہیں بچ سکتے۔ اپنے پستول کو تیار کر لو جواد بھائی۔ چھپ چھپ کر کارروائی کرنے کا دور اب ختم ہو گیا۔ اب کھلی جنگ ہوگی۔ روانگی کے لیے تیار ہو جاؤ۔

''لیکن اس موسلا دھار بارش میں ہم کہاں جائیں گے؟''

''سردار شاہ مراد کی حویلی اب ہماری منزل ہے۔ ہم اس فلک بوس محل کو موت کا نشان بنا دیں گے۔'' شدید غصے کے باعث مجھے اپنی آواز لرزتی محسوس ہوئی۔ میری بات سن کر جواد چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا پھر اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات کہوں ذوالفقار بھائی؟''

''ہاں کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے اپنے پستول کو ہاتھ میں تولتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے آپ شدید جذباتی ہیجان کا شکار ہیں۔ اس کیفیت میں انسان کی صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت کند ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ دل کے فیصلوں کو دماغ پر ترجیح دینے لگتا ہے۔ دل کے فیصلے اکثر و بیشتر انسان کے لیے پچھتاؤں کا سبب بن جاتے ہیں۔ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اپنے غیظ و غضب پر قابو پائیں اور پرسکون دماغ کے ساتھ کوئی فیصلہ کریں۔'' جواد کا دھیمہ اور پرسکون لہجہ میرے جلتے بھنتے اعصاب پر سرد پانی کے چھینٹے کے مانند اثر انداز ہوا۔ یکلخت مجھے فقیر بابا یاد آ گیا۔ وہ بھی مجھے اسی طرح نصیحتیں کرتا

تھا۔ اسے بھی مجھ سے یہی شکایت تھی کہ بعض اوقات میں جوش کو میں اپنے ہوش پر حاوی کر لیتا ہوں۔ طیش کے عالم میں میری عقل میرا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ اس کی نصیحت کے باعث میں نے بصد مشکل اپنی اس کمزوری پر قابو پایا تھا لیکن اس وقت ایک بار پھر وہی کمزوری مجھ پر غالب آ گئی تھی۔

جواد نے میری خاموشی کا کچھ اور ہی مطلب سمجھا۔ ''میری بات آپ کو ناگوار گزری ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ میرا مقصد آپ پر نقطہ چینی کرنا یا آپ کی توہین کرنا نہیں ہے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ خوب سوچ بچار کر کے ٹھنڈے دل و دماغ سے کسی فیصلے پر پہنچیں۔ آپ کے کہنے کے مطابق اگر ہم اندھا دھند سردار شاہ مراد کی حویلی پر چڑھ دوڑیں تو اس کا منطقی نتیجہ صرف اور صرف ہماری موت ہو گا۔ آپ سے بڑھ کر اس حقیقت سے کون واقف ہوگا کہ اس کی حویلی دراصل ایک چھوٹا سا قلعہ ہے جسے تسخیر کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ بالفرض ہم اپنی جان پر کھیل کے' راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو تہس نہس کر کے حویلی کے اندر پہنچ بھی جائیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ہم مرزا اور صدیقی صاحب کو ان لوگوں کے چنگل سے چھڑانے میں کامیاب بھی ہو جائیں گے۔ میرا مطلب ہے ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کو کسی اور جگہ رکھا گیا ہو۔ شاید اسی حویلی میں جس کی تلاش میں ہم در بدر بھٹک رہے ہیں۔''

'تم غلط سمجھے جواد بھائی۔ میں تم سے قطعی ناراض نہیں ہوں بلکہ میں تو تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے میری احمقانہ حرکت کے سلسلے میں خبردار کیا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں جزباتی انداز میں سوچ رہا تھا۔ میں تمہارے موقف سے پوری طرح متفق ہوں۔ ہم مرزا اور صدیقی کی اسی صورت میں کوئی مدد کر سکتے ہیں جبکہ ہم خود محفوظ رہیں۔ یہ وقت واقعی جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کا متقاضی ہے۔''

''پھر اب ہم کیا کریں؟ اس موسلا دھار بارش میں ہم کیا کارروائی کر سکتے ہیں؟''

''یہ بارش جہاں ہماری کارروائی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ وہاں یہ ہماری محافظ بھی ہے۔ اس بارش کے باعث ہماری گھات میں بیٹھے شکاری بھی محفوظ پناہ گاہوں میں دبکنے پر مجبور ہو گئے ہوں گے۔ ہم ایک بار پھر گاؤں کی طرف چلتے ہیں۔ میں سردار شاہ کی حویلی میں موجود ایک ایسی ہستی سے واقف ہوں جو اس معاملے میں ہماری کچھ نہ کچھ مدد کر سکتی ہے۔ اگر ہم کسی طرح سے اس سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہمیں کچھ نہ کچھ اہم معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔'' میں نے اپنے ذہن میں آنے والی نئی حکمت عملی کو الفاظ کی شکل دیتے ہوئے کہا۔

''میں پوچھ سکتا ہوں وہ ہستی کون ہے؟ کیا وہ ہستی اتنی اہلیت کی حامل ہے کہ ہماری کچھ عملی مدد کر سکے؟''

''تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ وہ ہستی کوئی اور نہیں سردار شاہ مراد کی سگی بیٹی ہے۔ اس کا نام نسیم ہے۔ وہ بے حد ذہین حساس اور محب وطن لڑکی ہے۔ وہ اپنے باپ کے تمام کالے کرتوتوں سے واقف ہے اور اس کی وطن دشمن سرگرمیوں سے سخت نفرت کرتی ہے۔ وہ ہمارے ساتھ مل کر اپنے باپ کے خلاف

جہاد کرنا چاہتی ہے۔"

"یہ تو آپ نے بے حد عجیب بات بتائی۔ میں نے پڑھا تو ہے کہ خداوند کریم فرعون کے گھر میں موسیٰ اتارتا ہے لیکن عملی زندگی میں یہ پہلی مثال دیکھی ہے میں نے۔" اس نے شدید حیرانی کے عالم میں کہا۔

"بس اب چل پڑو یہاں سے ہمیں جلد از جلد گاؤں پہنچنا ہے۔" میں نے اپنی طرف والا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "کیا خیال ہے اسی گاڑی میں نا چلیں گاؤں کی طرف؟"

"مگر کیسے؟ کیا تم یہ گاڑی۔۔۔؟" میں نے حیران حیران سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں ذوالفقار بھائی۔۔۔ آپ کا یہ خادم اس فن میں تھوڑی بہت سدھ بدھ رکھتا ہے۔ میرے مکینک دوست نے مجھے بھی چند داؤ پیچ سکھا دیے ہیں۔" جواد نے منکسر لہجے میں کہا۔

"بہت خوب تو پھر دیر کس بات کی؟ شروع ہو جاؤ۔"

جواد فوری طور پر جیپ کے اگنیشن کے تاروں کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ میں ٹارچ سے روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ اس کی تمام کاروائی کا بھی بغور جائزہ لیتا رہا۔ میں نے ایک آدھ سوال کیا تو جواد نے بھی میری دلچسپی کو محسوس کر لیا چنانچہ اس نے رضا کارانہ طور پر مجھے سب کچھ سکھانا شروع کر دیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں پورے طریقہ کار کو سمجھ گیا۔

"لو جی کام ہو گیا!" اس نے مطمئن لہجے میں کہا۔ میں نے تاروں کو آپس میں جوڑا۔ ہلکی سی چنگاریاں اڑیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک جھرجھری لے کر جیپ کا انجن بیدار ہو گیا۔ جواد نے ہیڈ لائٹس پہلے ہی بند کر رکھی تھیں۔ اس نے نہایت مہارت سے جیپ کو درختوں کے جھنڈ میں سے نکالا۔ جنگل کے درمیان میں سے جیپ کے گزرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ لہٰذا جواد نے جیپ کو دوبارہ نہر کے پشتے پر چڑھا دیا۔

مجھے جواد کو گاؤں کی طرف جانے والے کچے راستے کے متعلق بتانا نہیں پڑا۔ نہر کے پشتے پر شمال کی سمت تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر سفر کرنے کے بعد وہ چھوٹی سی کچی سڑک آ گئی جس پر بیل گاڑیاں وغیرہ سفر کیا کرتی تھیں۔ یہ سڑک ہمارے گاؤں کے پاس سے گزر کر بڑی سڑک سے جا ملتی تھی۔ جواد نے جیپ کو اس سڑک پر موڑ لیا۔ شدید بارش نے کچے راستے پر کیچڑ ہی کیچڑ پھیلا دیا تھا۔ ہماری گاڑی اگر سخت جان جیپ کے علاوہ کوئی اور ہوتی تو شاید چند گز بھی اس بے ڈھب راستے پر نہ چل پاتی۔ اندھیرے کے باعث جیپ کے پہیے کئی بار گڑھوں میں پھنسے لیکن فور ویل ڈرائیور ہونے کے باعث جیپ باآسانی ان سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔

گاؤں سے خاصا پہلے ہی میں نے جیپ ٹھہرائی۔ قدرے سوچ بچار کے بعد میں نے جیپ کو چھپانے کے لیے ایک مناسب جگہ بھی ڈھونڈ لی۔ وہ ایک متروک رہٹ تھا۔ کنوئیں میں ریت بھر جانے

کے باعث اس کنوئیں کا استعمال بند کر دیا گیا۔ اب یہاں محض ٹوٹی پھوٹی چار دیواری باقی رہ گئی تھی۔ جواد نے جیپ اس چار دیواری میں لے جا کر روک دی۔

ہم دونوں جیپ سے اترے۔ اس کے ساتھ ہی تیز بارش کے تمانچے ہمارے گالوں پر پڑے۔ ہماری آنکھیں بے اختیار بند ہوتی چلی گئیں۔ اپنے چہروں کو بچاتے ہوئے ہم گاؤں کی طرف بڑھنے لگے۔ گاؤں کے نزدیک پہنچتے ہی ہم لوگ مزید محتاط ہو گئے۔ تیز بارش اور اندھیرا ہم لوگوں کی ڈھال بن گیا تھا۔ اس مرتبہ ہم دوسری سمت سے گاؤں میں داخل ہوئے۔ میں نے جواد کو بتایا نہیں تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ وہ یقیناً شدید تجسس میں مبتلا ہو گا۔ ہم ذرا دیر کے لیے دم لینے کو ایک دیوار کی آڑ میں ٹھہرے تو اس کے ذہن میں کھلبلی مچانے والے سوالات زبان پر آ گئے۔

"اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟ رات کے اس تیسرے پہر میں ہم کیسے سردار شاہ مراد کی حویلی میں پیغام بھیجیں گے؟ یہ بات مت بھولیں کہ آج ہی رات ہم یہاں ایک لاش چھوڑ کر جا چکے ہیں۔"

"مجھے یاد ہے بھائی۔ یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔ اس وقت سردار شاہ مراد کی حویلی تک رسائی حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن ہم اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش تو کر سکتے ہیں۔ ہم اس وقت جس گھر کی طرف جا رہے ہیں۔ وہ میرے جگری یار سرور علی کا گھر ہے۔ میرا دوست سرور علی بھی ان بدبخت سرداروں کے ظلم کا نشانہ بن چکا ہے۔ سردار شاہ مراد کے بیٹے رتا سائیں نے میری مدد کرنے کے جرم میں اس کی آنکھیں نکال کر اپنے کتے کو کھلا دی تھیں۔ آنکھوں سے محرومی کے بعد میرے دوست کو اپنے گھر والوں کا پیٹ پالنے کے لیے بھکاری بننا پڑا۔ اس کے گھر والے سردار شاہ مراد سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ سرور علی کی ماں مجھے بھی اپنے بیٹے کی طرح سمجھتی ہیں۔ ان کی ایک منہ بولی بہن اور پڑوسن فاطمہ سردار شاہ مراد کی حویلی میں کام کرتی ہے۔ اس کی ڈیوٹی زنان خانے میں ہوتی ہے۔ وہ بیوہ عورت ہے اس کی ایک ہی بیٹی ہے۔ سولہ سترہ برس کی۔ فاطمہ کو رات کے وقت حویلی میں ہی ٹھہرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا وہ رات کے وقت اپنی بیٹی بشیراں کو اپنی منہ بولی بہن کے گھر چھوڑ جاتی ہے۔ میں سرور کی ماں خالہ شیداں کو ساری بات سمجھا کر حویلی کی طرف بھیج دوں گا۔ وہ حویلی کے چوکیداروں سے کہے گی کہ فاطمہ کی بیٹی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے اور وہ فاطمہ کو بلانے آئی ہے۔ چوکیدار فاطمہ کو بلا دیں گے۔ خالہ شیداں فاطمہ کو اپنے گھر لے آئے گی۔ ہم دونوں فاطمہ کو سب باتیں اچھی طرح سمجھا دیں گے۔ فاطمہ اسی وقت حویلی واپس جائے گی اور سردار شاہ مراد کی بیٹی نسیم کو ہمارا پیغام پہنچا دے گی۔ نسیم بہت ذہین اور سمجھدار لڑکی ہے۔ وہ مسلسل اپنے باپ کے کرتوتوں کی ٹوہ میں لگی رہی ہو گی۔ مجھے امید ہے وہ اس پراسرار حویلی کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور جانتی ہو گی جسے تلاش کرنے کے چکر میں ہم اپنے دو ساتھیوں کو کھو بیٹھے ہیں۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ مرزا اور صدیقی کو بھی اسی حویلی میں لے جایا گیا ہو گا۔" جواد چند لمحوں تک میری باتوں پر غور کرتا پھر اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"خدا کرے ہم یہ سب کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اگر یہ لڑکی نسیم ہمیں کوئی کام کی اطلاع پہنچانے میں کامیاب ہوگئی تو ہماری بہت سی مشکلات ختم ہوسکتی ہیں۔"

سرور علی کے گھر کے سامنے بارش کے پانی کا اچھا خاصا جوہڑ بن چکا تھا۔ ہم کیچڑ سے بچتے گھر کے دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے میں نے بہتر سمجھا کہ دیوار پھاند کر اندر گھس جاؤں۔ عین ممکن ہے اس تیز بارش کے شور میں وہ دستک کی آواز سن ہی نہ پائیں۔ اس کے علاوہ دستک کی بلند آواز آس پاس کے رہنے والوں کی نیند بھی اچاٹ کرسکتی ہے۔ جواد کی مدد سے میں نیم پختہ دیوار پر چڑھ گیا۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ شدید بارش کے باعث یہ دیوار زمین بوس نہ ہو جائے۔ لہٰذا اس گھر کے اندر اتر گیا۔ کیچڑ میں پاؤں پڑنے کے باعث ہلکا سا چھپاکا ہوا۔ میں نے آس پاس کا بغور جائزہ لیا۔ عین اسی وقت بجلی چمکی۔ روشنی کے معمولی سے وقفے میں مجھے گھر کا وسیع صحن خالی نظر آیا۔ سامنے ہی چار کمروں کی قطار تھی۔ اس وقت ان چاروں ہی کمروں کے دروازے بند تھے۔ میں کیچڑ میں جما جما کر پیر رکھتا' بڑے کمرے کی طرف بڑھا۔ کمرے کے دروازے کے بالکل قریب پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ کمرے میں روشنی ہو رہی ہے۔ اتنی رات گئے روشنی کر کے یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ میں نے دروازے پر دستک دینا چاہی۔ اچانک مجھے اندر سے کسی کے بات کرنے کی آواز سنائی دی۔ شدید حیرت کے عالم میں' میں نے اپنے کان دروازے سے لگا دیے۔ فوری طور پر تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ البتہ یہ بات میں نے واضح طور پر محسوس کی کہ جو کوئی بات کر رہا ہے' وہ شدید غصے میں ہے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے اس آواز کہ پہچان لیا۔ وہ خالہ شیداں کی آواز تھی۔ وہ کسی کو شدید نفرت کے عالم میں کوس رہی تھی۔ مزید چند الفاظ میرے کان میں پڑے۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ خالہ شیداں کی گالیوں کا نشانہ سردار شاہ مراد ہے۔

میں نے اپنے حواس کی تمام قوتیں سماعت پر مرکوز کر دیں۔ تب پہلی بار میرے کانوں میں ایک مربوط جملہ پڑا۔ "ہائے وے شاہ مرادتوں کتے دی موو مرے۔" میرے ذہن میں خیال آیا کہ شاید وہ اپنے بیٹے پر ہونے والے ظلم کے سلسلے میں سردار شاہ مراد کو بددعا دے رہی ہے لیکن اس کے اگلے ہی جملے نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ "ہائی وے میڈے پتر سیفل۔۔۔ میں تیں کو کی جواب ڈیساں؟" مجھے اپنے پیروں تلے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اندر سے آواز اب سسکیوں اور ہچکیوں میں بدل چکی تھی۔ اس کی آواز کے ساتھ ہی میں نے کئی اور نسوانی آوازوں میں بھی سسکیاں سنیں۔ جیسے وہ سب مل کر کسی کی موت کا ماتم کر رہی ہوں۔ میرا دل دہل کر رہ گیا۔ مجھ سے مزید برداشت نہ ہوسکا۔ میں نے آہستگی سے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹا دی۔ اندر سے آنے والی سسکیوں کی آوازیں یک لخت بند ہوگئیں۔ کچھ دیر اندر مکمل خاموشی رہی لیکن کوئی دروازہ کھولنے نہیں آیا۔ شاید انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا ہوگا۔ اس طوفانی موسم میں' اتنی رات گئے' کون دروازہ کھٹکھٹانے آگیا لیکن گھر کے بیرونی دروازے میں تو اندر سے کنڈی لگی ہوئی ہے۔ قدرے توقف کے بعد میں نے ایک بار پھر دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد دروازے کے پیچھے سے ایک سہمی سہمی آواز ابھری۔

"کک۔۔۔کون ہے؟" اس آواز کو پہچاننے میں مجھے ایک لمحہ بھی نہ لگا۔

"میں ہوں خالہ۔۔۔ تمہارا بیٹا سیفل۔"

"کک۔۔۔کون؟" اندر سے ایک بار پھر حیران پریشان سی آواز ابھری۔ اس کے ساتھ ہی خالہ شیداں نے میری آواز واضح طور پر پہچان لی۔ ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا۔ خالہ شیداں نے لمحہ بھر میرے چہرے پر نظر جمائی پھر اس نے والہانہ انداز میں میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ "میرا سوہنا۔۔۔ میرا لعل۔۔۔ میرا سیفل۔"

میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہاں کھلبلی سی مچ گئی۔ سرور علی کی بہنیں اپنے اپنے دوپٹے سنبھالتی' فرشی بستروں پر سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ سب میرے گرد جمع ہوگئیں۔ خالہ کچھ دیر تک والہانہ انداز میں مجھ سے شفقت و محبت کا اظہار کرتی رہی پھر یک لخت اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ اس کی آنکھوں سے شدید خوف جھلکنے لگا۔

"تو۔۔۔ تو یہاں کیوں آگیا سیفل بیٹے۔۔۔؟ یہ۔۔۔ یہ پاگل کتے تجھے قتل کر دیں گے۔" بالکل اسی طرح کے ردعمل کا اظہار چچا مہرداد اور مہراں نے بھی کیا تھا۔ میں نے اس کی کیفیت کو نظر انداز کر کے شدید اضطراب کے عالم میں کہا۔

"تم میری فکر چھوڑو خالہ۔ یہ بتاؤ کہ تم لوگ کیوں پریشان ہو؟ تم پر کون سی تازہ آفت ٹوٹی ہے؟" میری بات سن کر خالہ شیداں کا چہرہ کورے لٹھے کے مانند سفید پڑ گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میرا منہ دیکھنے لگی۔ میں نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے بتاؤ خالہ تم مجھ سے کیا چھپا رہی ہو؟" خالہ شیداں پتھر کے بت کی طرح ساکت و صامت کھڑی رہی۔ میں نے اسے ایک بار پھر بری طرح جھنجھوڑ دیا۔

"تمہیں خدا کا واسطہ خالہ مجھے سچ سچ بتا دو۔ تم رو رو کر مجھے کیوں پکارتی رہتی ہو؟" میرے سوالات کا خالہ شیداں پر صرف اتنا اثر ہوا کہ اس کے چہرے کی سفیدی میں ہلکی سی زردی گھل گئی۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر میں سرور کی سب سے بڑی بہن کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم بتاؤ شریفاں۔۔۔ یہ کیا معاملہ ہے؟" میرا سوال سن کر شریفاں کے چہرے کی رنگت بھی اڑ گئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ محض ہونٹ ہلا کر رہ گئی۔ جیسے الفاظ اس کے حلق میں پھنس رہے ہوں۔

"بتاؤ شریفاں!" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ وہ مزید مزاحمت نہ کرسکی۔ الفاظ اس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلنے لگے۔ "وہ۔۔۔ سیفل۔۔۔ سیفل بھائی۔۔۔ سر۔۔۔ سردار شاہ مراد کے۔۔۔ شاہ مراد کے کارندے۔۔۔ مم۔۔۔ مہراں کو۔۔۔ اٹھا کر لے۔۔۔ لے گئے۔۔۔"

"نہیں ں ں ں۔۔۔"

☆O☆

☆O☆

فولاد کو ایک بے حد مضبوط اور ناقابل تسخیر دھات سمجھا جاتا ہے لیکن آگ کی طاقت کے سامنے اس کی ساری سختی اور مضبوطی دھری کی دھری رہ جاتی ہے اور یہ موم کے مانند پگھلنے لگتا ہے۔ میری بھٹی کی آگ نے کتنی ہی بار فولاد کی سرکشی کو مائع کی شکل دی تھی۔ لیکن بھٹی کی بھڑکتی آگ ہمیشہ میرے سینے میں بھڑکنے والی نفرت اور انتقام کی آگ سے شکست کھا جایا کرتی تھی۔ اس آنسو بہاتی رات کو ایک بار پھر میرے سینے میں نفرت اور انتقام کی بھٹی دہک اٹھی۔ میرے وجود سے بلند ہونے والے لپلپاتے شعلے آسمان کو چھونے لگے۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا کب میرا پستول میرے ہاتھ میں آیا اور کب میں کمرے کے بند دروازے تک پہنچ گیا۔ میرے دماغ کی دیواروں سے بار بار ایک ہی صدا ٹکرا رہی تھی۔ مہراں............
مہراں............مہراں۔

میں نے مشینی انداز میں دروازے کی اندرونی کنڈی پر ہاتھ ڈالا۔ عین اسی وقت کسی استخوانی ہاتھ کی نوک دار انگلیوں نے میرا شانہ پکڑ کر بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ ''ہوش کرو پتر سیفل'' ایک لرزتی ہوئی آنسو بھری آواز نے مجھے سرزنش کی۔ میں نے شراٹے اڑاتے شعلوں سے منہ پھیر کر خالہ شیداں کی طرف دیکھا۔ میری کیفیت دیکھ کر وہ بری طرح بوکھلا گئی۔ اس نے میرے دونوں شانے پکڑ کر مجھے بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔ ''حوصلہ پکڑ پتر سیفل'' اس کی آواز میں رنجھ کے ساتھ تشویش کا عنصر بھی شامل ہو گیا۔ اس نے اپنی بیٹیوں میں سے کسی کو پانی لانے کو کہا۔ پانی آیا اور میں نے خودکار انداز میں جست کے بڑے سے کٹورے کو ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔ پانی کی برودت نے میرے سینے کی تپش پر تو نہیں البتہ دماغی درجہ حرارت پر کسی حد تک اثر کیا۔ میرے دماغ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ایک بار پھر لوٹنے لگی۔ میری آنکھیں ایک بار پھر اپنے آس پاس کا منظر دیکھنے لگیں۔ میں نے دیکھا کہ ان تمام گھر والوں کی نظریں میرے ہاتھ میں موجود پستول پر جمی ہوئی ہیں۔ ان کی آنکھوں سے جھلکتی دہشت کو دیکھ کر میں نے جلدی سے پستول اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

''یہ یہ کیسے ہوا خالہ؟'' میں نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ ''انہوں نے مہراں کو کیوں اغوا کیا اور کس کے حکم سے؟''

''کسی نے اس کنجر بختیار کو قتل کر دیا ہے۔ اس وقت چھمی کمہارن اس کے ساتھ منہ کالا کر رہی تھی۔ اس نے جا کر حویلی میں شور شرابا ڈال دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ قاتل کو پہچانتی ہے۔ اس نے۔'' خالہ شیداں بات مکمل کرتے کرتے رک گئی۔ قدرے توقف کے بعد اس نے اپنی بات پوری کی۔ ''وہ لچی تیرا نام لیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ تم اور ایک داڑھی والا بندہ پستول لے کر زبردستی بختیار کے گھر میں گھسے تھے۔ تمھارا ساتھی نے پستول کا دستہ مار کر اسے بے ہوش کر دیا۔ جب وہ ہوش میں آئی تو اس نے دیکھا کہ بختیار مرا پڑا ہے۔'' اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ کام میں نے ہی کیا ہے اس کے باوجود اس نے براہ راست میرا نام نہیں لیا۔

''ہاں ہاں خالہ بتاؤ پھر کیا ہوا؟'' میں نے بے قراری سے پوچھا۔

''چھمی کمہارن کی اطلاع نے حویلی میں کھلبلی مچا دی۔ سردار شاہ مراد کی غیر موجودگی میں حویلی کے معاملات نصراللہ منیجر سنبھالتا ہے۔ اس نے فوراً تمھاری تلاش میں آدمی دوڑا دیے۔ جب تم نہ ملے تو اس نے بندے بھیج کر تمہارا چچا مہرداد اور مہراں کو اٹھوا لیا۔''

''لیکن تمہیں یہ سب کیسے پتا چلا خالہ؟'' میں نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے پوچھا۔

''وہ بدمعاش بڑکیں مارتے تمہارے گھر گئے تھے۔ تمہارے گھر کے دروازے پر انہوں نے کئی ہوائی فائر کیے۔ بارش کے باوجود کئی لوگ اکھٹے ہو گئے۔۔ انہوں نے تمہیں گندی گندی گالیاں بکتے ہوئے کہا کہ وہ تمہاری نسلوں کو مکا دیں گے۔ سارے گاؤں میں کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ ان کی راہ روکتا۔ ایک تمہاری گلی کا کتا لسا تھا جو ان پر بھونکا تھا۔ اس بے چارے کو ان ظالموں نے گولی مار دی۔'' خالہ شیداں بات ختم کرتے کرتے ایک بار پھر جھجک کر خاموش ہو گئی۔

''آگے بتاؤ خالہ۔''

''پھر وہ بدمعاش تمہارے گھر کے دروازے توڑ کر اندر گھس گئے۔ تمہارے چچا مہرداد نے لٹھ مار کر ان میں سے ایک کا سر کھول دیا۔ مہراں نے بھی ان میں سے ایک کا کندھا کلہاڑی کے وار سے چیر دیا لیکن وہ تو درجن بھر سے بھی زیادہ تھے۔ انہوں نے رائفلوں کے بٹ مار کر ان دونوں باپ بیٹی کو بے ہوش کر دیا اور انہیں اٹھا کر لے گئے۔ ان کے جاتے ہی سب لوگ دوبارہ اپنے گھروں میں گھس کر سو گئے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔'' خالہ شیداں کی آواز ایک بار پھر بھرانے لگی۔ قبل اس کے کہ وہ دوبارہ رونے لگتی میں نے مضطرب لہجے میں سوال کیا۔

''وہ۔۔ وہ انہیں کہاں لے گئے ہیں؟ کیا حویلی۔۔۔؟''

''نہیں۔۔۔ وہ انہیں حویلی کی طرف نہیں لے گئے۔ برکت بتا رہا تھا کہ ان لوگوں کا رخ کالے ٹبے والے ڈیرے کی طرف تھا۔''

کالا ٹبا! میں زیر لب بڑبڑایا ''یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے خالہ؟''

''میرا خیال ہے ڈیڑھ۔۔ دو گھنٹے تو گزر گئے ہونگے''

''اچھا خالہ میں چلتا ہوں'' میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مگر اس وقت تم کہاں جاؤ گے؟''

''وہیں جہاں مجھے جانا چاہیے۔ کالے ٹبے کی طرف!''

''پر پتر وہ تمہیں گولی مار دیں گے'' خالہ شیداں نے پریشانی سے چیختی آواز میں مجھے تنبیہہ کی۔

''کوئی پرواہ نہیں ہے خالہ۔ میری زندگی مہراں کی عزت سے بڑھ کر نہیں ہے۔''

تیز بارش کے باوجود وہ مجھے گھر کے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ ''میرے یار سرور کو میرا اسلام دینا خالہ اور میری کامیابی کے لیے دعا کرنا۔ مہراں کی عزت پر کوئی آنچ آئی تو میں سردار شاہ مراد کی نسلوں کو آگ میں جھونک دوں گا۔'' میں نے دروازے سے باہر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ گھر سے نکلتے ہی ایک بار پھر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں پانی سے لبریز گڑھے سے بچ کر ایک طرف بڑھا۔ کچھ ہی دیر بعد جانے کس تاریک گوشے سے جواد برآمد ہوا اور تیز تیز قدموں سے چلتا میرے پاس آگیا۔ میں حتی الامکان تیز رفتاری سے گاؤں کے شمال کی طرف بڑھنے لگا' کالے ٹبے کی طرف۔ جواد معاملے کے نئے رخ سے پوری طرح بے خبری کے عالم میں چپ چاپ میرے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اس اثنا میں بارش کی شدت میں کچھ کمی آگئی۔ گاؤں سے باہر نکلنے کے بعد میں کچھ دیر کے لیے ایک گھنے درخت کے نیچے رکا۔ اس کے ساتھ ہی جواد کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اس نے بے تابی کے عالم میں پوچھا۔

''کیا ہوا بھائی؟'' خالہ شیداں نے کیا کہا؟ آپ تو اسے سردار شاہ مراد کی حویلی کی طرف بھیج رہے تھے؟''

''سب کچھ تباہ ہو گیا جواد بھائی سب کچھ!'' میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔'' میری بات سن کر وہ سخت پریشان ہو گیا۔

''کچھ بتائیں تو سہی بھائی آخر ہوا کیا؟''

''سردار شاہ مراد کے کارندے میری چچا زاد بہن اور میرے چچا کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔''

''اف میرے خدا!۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ سب کیوں کر ہوا؟'' اس نے شدید اضطراب کے عالم میں پوچھا۔ میں نے اسے مختصراً پوری صورت حال سے آگاہ کیا۔ ''یہ تو بہت برا ہوا۔ اس کا مطلب ہے ہم نے اس حرافہ کمہارن کو زندہ چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟ حویلی کو تو ہم شاید پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔''

''مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ لوگ میرے چچا اور مہراں کو کہاں لے گئے ہیں۔ جہاں ہم جا رہے ہیں وہ سردار شاہ مراد کا ذاتی جیل خانہ ہے۔ میں خود بھی وہاں قید رہ چکا ہوں۔''

''کیا ہم وہاں براہ راست حملہ کریں گے؟'' جواد نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔ مہراں کی عزت شدید خطرے میں ہے۔ ہم لمبی چوڑی منصوبہ بندی میں وقت ضائع نہیں کر سکتے۔''

ہم نہایت تیز رفتاری سے فاصلہ طے کر کے جلد ہی کالے ٹبے والے ڈیرے کے قریب پہنچ گئے۔ ہمیں دور ہی سے ڈیرے کی روشنی نظر آگئی۔ میں نے جواد کو محتاط ہونے کا اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ ڈیرے کے سامنے ہارڈ ٹاپ جیپ کھڑی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ جیپ سردار شاہ مراد کے منیجر نصر اللہ

کے استعمال میں رہتی ہے۔ بہت احتیاط سے ڈیرے کے آس پاس کا جائزہ لینے کے باوجود ہم کسی چوکی دار وغیرہ کو نہ ڈھونڈ سکے۔ بارش کے باعث شاید انہوں نے اس کی ضرورت محسوس نہ کی ہوگی۔ ڈیرے کا بڑا سا دروازہ بند تھا۔

ڈیرے کی چھوٹی سی عمارت کے پہلو سے گزر کر ہم عقب میں آگئے۔ موٹی سلاخوں والی بند کھڑکی کے پاس پہنچ کر میں نے اپنے کان کھڑکی کے بند پٹوں کے ساتھ لگا دیے۔ چند لمحوں تک تو مجھے اپنے دھڑ دھڑ کرتے دل کے علاوہ کوئی بھی آواز سنائی نہ دی پھر میں نے ایک آواز سنی دبی دبی سی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اس آواز کو پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے دل میں تیز دھار برچھی اترتی محسوس ہوئی۔ وہ آواز ایک بار پھر میرے کان میں پڑی وہ کرب ناک آواز بلاشبہ چچا مہر داد کے کراہنے کی تھی۔

''بڈھا تو تقریباً ہوش میں آگیا ہے لیکن یہ چھوکری ابھی تک ہوش میں نہیں آئی۔ اوئے گامن تو نے کھوپڑی تو نہیں توڑ دی اس کی؟'' میں نے ایک گونج دار آواز سنی۔

''نہیں منیجر صاحب میرا ہاتھ اتنا بھی اوچھا نہیں ہے۔ یہ تو دیکھو کہ یہ چھوکری بھی تو گلاب کی ڈالی جیسی ہے۔ اس پر تو ہاتھ اٹھاتے ہوئے بھی دل ہلتا ہے۔ مت پوچھو کس طرح اس پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ یہ تو آنکھوں میں بسانے والی شے ہے منیجر صاحب۔ تم اسے مجھے بخش دو۔ میں ساری عمر تمہاری غلامی کروں گا۔''

''اوئے جا آئینے میں اپنا منہ دیکھ۔ شکل چماروں کی مزاج نوابوں کے۔ تو اسے کوئی گری پڑی شے سمجھ رہا ہے پٹھے۔ اب اسے تو میں بھی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ اس چھوکری کے متعلق سردار شاہ مراد کی خاص ہدایت ہے۔ وہ اسے خاص نسخے میں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کوئٹہ میں سردار شاہ مراد کے پاس پیغام پہنچا دیا ہے۔ وہ کل دن میں یہاں پہنچ رہا ہے۔ ان سے وہ خود نبٹے گا۔''

''تمہاری یہ بات تو سچ ہے منیجر صاحب۔ کسی خاص وجہ سے سردار شاہ مراد ان دونوں باپ بیٹی کو چھوٹ دیتا رہا ہے ورنہ رتا سائیں والے معاملے کے بعد تو میں سمجھا تھا کہ سردار ان دونوں کے ٹکڑے کر کے اپنے کتوں کے آگے ڈال دے گا لیکن منیجر صاحب کہیں ان دونوں پر ہاتھ اٹھانے کے باعث سردار مجھے اور منشے کو تو سزا نہیں دے گا؟''

''ابے مرتا کیوں ہے؟ تم لوگوں نے یہ سب میرے کہنے پر کیا ہے۔ میں سردار کو خوب جواب دے لوں گا۔ تجھے کیا پتہ سردار شاہ مراد کتنا شاطر انسان ہے۔ اس نے بلا وجہ ان کو زندہ نہیں چھوڑا' اس بڈھے اور اس کی بیٹی کو ختم کر کے اس کے انتقام کی آگ سرد نہیں پڑ سکتی اس کا اصل مقصد تو اس کتے سیفل کو عبرت ناک موت مارنا ہے۔ میں نے خاصی شوچ بچار کے بعد اندازہ لگایا ہے کہ سردار شاہ مراد اس بڈھے اور اس کی بیٹی کو سیفل کے لیے چارے کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اسے پختہ یقین تھا کہ سیفل جلد یا بدیر ان دونوں سے ملنے ضرور آئے گا اور تم نے دیکھ ہی لیا کہ سردار شاہ مراد کا اندازہ سو فی

صد صحیح نکلا۔ آخر کار آج رات وہ حرامی ان سے ملنے آ ہی گیا۔ البتہ یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ گاؤں میں داخل ہونے والے تمام راستوں کی کڑی نگرانی کرنے والے بندوں کی نظر سے بچ کر وہ گاؤں میں گھسا کیسے؟ اور پھر بختیارے کو قتل کرنے کے بعد وہ گاؤں سے فرار ہونے میں کیسے کامیاب ہو گیا؟'' نصر اللہ نے حیران سے لہجے میں کہا۔ جواد نے دھیرے سے میرا شانہ دبایا۔ میں نے استفہامیہ انداز میں گردن ہلا دی۔

''کچھ بھی ہو منیجر صاحب وہ چھوکرا ہے بڑا جی دار! اکیلے نے سردار شاہ مراد جیسی بلا کے نتھ ڈال رکھی ہے۔ سارا زور لگانے کے باوجود شاہ مراد اس کا بال بیکا نہیں کر سکا۔ آج رات بھی اس نے بختیارے جیسے تیس مار خاں کو مٹی کر دیا۔ بختیارے کی بھی آج شامت ہی آئی تھی جو اس نے حویلی سے آج رات کی چھٹی لے رکھی تھی۔''

''اسے چھٹی کیسے نہ لیتا۔ چھمی کمہارن کو ٹائم جو دے رکھا تھا۔ سالے نے موج کرا رکھی تھی اس کتیا کی۔ اپنی ساری تنخواہ وہ تقریباً اسی پر خرچ کرتا تھا۔''

''پھر کیا ہوا منیجر صاحب۔ اس کنجر نے رتا سائیں کے دور میں کمائی بھی تو لمبی کی تھی۔ جب بھی رتا سائیں کے یار دوستوں کی محفل جمتی ان کے لیے چھوکریاں یہی فراہم کرتا تھا۔ خود رتا سائیں اور سردار شاہ مراد تو اسی کے مستقل سرپرست تھے ہی۔''

''چھوڑو یار گامن وہ جیسا بھی تھا۔ ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔ تم یہ بتاؤ فدے اور رسولن وغیرہ کو گئے ہوئے کچھ زیادہ ہی دیر نہیں ہو گئی؟ ابھی تک تو انہیں واپس آ جانا چاہیے تھا۔''

''وہ واپس آنے ہی والے ہوں گے جناب۔ اکبر اور رحمت کی مرہم پٹی کرانے اور تینوں چوکیوں اور تھانے تک آنے جانے میں اچھا خاصا وقت لگتا ہے۔ ہو سکتا ہے انہیں سیفل اور اس کے ساتھی کے متعلق کچھ سن گن مل گئی ہو اور وہ سیدھے ان کے پیچھے چلے گئے ہوں۔'' گامن نے کہا۔ جواد نے ایک بار پھر میرے شانے کو ہلکا سا دبایا۔

''نہیں اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو وہ فون پر حویلی اطلاع کر دیتے اور وہ اطلاع ہمارے پاس پہنچ چکی ہوتی۔ میرا دماغ ابھی تک اسی مسئلے میں الجھا ہوا ہے کہ وہ دونوں اتنی آسانی سے اس علاقے سے نکل جانے میں کیسے کامیاب ہو گئے۔ یہ دونوں پوری طرح ہوش میں آ جائیں تو ان سے کچھ پوچھ گچھ کریں۔''

''ہاں خان جی بات تو تمہاری قابل غور ہے۔ تم کہو تو میں ان دونوں کو ہوش میں لانے کی کوشش کروں؟''

''اسے رہنے دے سالے۔ چھوکری کو ہاتھ لگانے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہے۔ بھول گیا اس نے اکبر کا کندھا کس طرح کلہاڑی سے چیر دیا تھا۔ وہ تو اس کا ہاتھ اوچھا پڑ گیا ورنہ یہ اس کی گردن اتار دیتی۔''

''جیسی تمہاری مرضی خان جی' ویسے بھی میرا خیال ہے یہ دونوں اس کے متعلق کچھ نہیں بتا سکیں

گے۔ سیفل واردات سے پہلے ان کے پاس آیا تھا۔ بختیارے کو قتل کرنے کے بعد تو وہ ایک منٹ بھی گاؤں میں نہیں رکا ہو گا۔''

''بات پھر وہیں آ جاتی ہے کہ وہ دونوں اتنی خاموشی سے فرار کیسے ہو گئے؟ ان لوگوں کے پاس یقیناً کوئی گاڑی بھی ہو گی۔ وہ کسی بھی سڑک سے جاتے ہمارے بندوں کی نظر سے بچ کر نہیں جا سکتے تھے۔'' منیجر نصر اللہ نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

''میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔ منیجر صاحب۔'' گامن نے یک لخت پر جوش لہجے میں کہا۔

''اسے سیدھی طرح بک دے نا کیا بکنا چاہتا ہے۔'' منیجر نصر اللہ نے بے توجہی سے کہا۔

''خان جی ہو سکتا ہے وہ دونوں ابھی تک گاؤں سے فرار ہی نہ ہوئے ہوں؟'' گامن نے بے حد پر جوش لہجے میں کہا۔ یک دم مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی تیز لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ جواد کے ہاتھ کی گرفت یک لخت میرے شانے پر بے حد سخت ہو گئی۔ میرے وجود کی تمام قوت میرے کانوں میں سمٹ آئی۔

''اسے یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟ کیا مطلب ہے تیرا؟''

''میرا مطلب ہے خان جی ہو سکتا ہے وہ ابھی تک یہیں گاؤں میں ہی چھپے ہوئے ہوں؟''

''اسے اتنی بڑی بڑی باتیں اپنے چھوٹے سے دماغ سے نہ سوچا کر کسی دن پاگل ہو جائے گا۔ وہ دونوں تیرے جتنے عقل مند نہیں ہیں کہ ایک قتل کے بعد بھی یہیں پھنسیں رہیں۔ ویسے یہ تو بتا تیرے خیال میں وہ دونوں اس گاؤں میں کس جگہ چھپ کر بیٹھ سکتے ہیں؟'' منیجر نصر اللہ نے گامن کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ مجھے اپنی رگوں میں لہو کی گردش لحہ بہ لحہ تیز ہوتی محسوس ہوئی۔

''خان جی ہو سکتا ہے وہ دونوں سرور علی کے گھر میں چھپے ہوئے ہوں۔ سرور علی تو سیفل کا جگری یار ہے۔''

''دھت تیرے کی۔ سالے تیرے دماغ پر تو بس عورت سوار ہے۔ یوں کیوں نہیں کہتا کہ اندھے سرور علی کی بہنوں پر تیری رال ٹپک رہی ہے تو اسی بہانے ان پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے۔ خیر تجویز تیری بھی بری نہیں۔ اس بہانے آج رات کی جگار کی تھکن بھی اتر جائے گی۔ ٹھیک ٹھاک چھوکریاں ہیں تینوں۔ بہت دنوں سے کسی سیل بند بوتل کا مزا نہیں چکھا۔ فدے اور رسولن کو آ لینے دے اس کے بعد سرور علی کے گھر کی طرف چلیں گے۔ اس بھیگے بھیگے موسم میں ایسی سوغات پھر کہاں ملے گی۔'' منیجر نصر اللہ نے خباثت بھرے انداز میں ایک بلند قہقہہ لگایا۔ گامن نے خوشی سے کلکاری مار کر اس کی تائید کی۔

میرا کھولتا ہوا خون میرے دماغ کی دیوار پر ٹھوکر مارنے لگا۔ مجھے لگا کہ میں نے ایک اور رتا سائیں کو اس کے اصل مکروہ روپ میں دیکھ لیا ہے۔ منیجر نصر اللہ اور اس کا چچا گامن اپنے غلیظ منصوبے کی جزئیات طے کر رہے تھے لیکن میرے کانوں نے گویا کام کرنا بند کر دیا۔ میں خواب کی سی کیفیت میں خود

کارانداز میں کھڑکی سے دور ہٹتا چلا گیا۔ میرے جسم کے تناؤ نے جواد کو میری جزباتی کیفیت سے آگاہ کر دیا۔

"چلو ذوالفقار بھائی۔" اس نے دھیرے سے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے سرگوشی کی۔ "ان شیطانوں کے ارادے نیک نہیں ہیں۔" مجھے خاصی دیر تک اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میں اسے اجنبی سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ "دیر نہ کرو ذوالفقار بھائی۔ ان کے ساتھی واپس لوٹ آئے تو ہمارا کام مزید دشوار ہو جائے گا۔" اس نے بے چین سے لہجے میں کہا۔

یک لخت میں اپنے ہوش وحواس سے واپس آ گیا۔ مجھے احساس ہوا کہ ہم دونوں اتنی دیر سے مسلسل بارش میں بھیگ رہے ہیں۔ چمڑے کی جیکٹ کے باعث میرے جسم کا اوپری حصہ محفوظ تھا لیکن جواد یقیناً اچھی خاصی سردی محسوس کر رہا ہوگا۔ اس سے مزید کچھ کہے بغیر میں تیزی سے ڈیرے کے سامنے والے حصے کی طرف بڑھا۔ جواد میرے پیچھے پیچھے تھا۔ ہم دونوں کے پستول آگ اگلنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ بھاری پٹوں والے بڑے سے دروازے کے سامنے پہنچ کر میں ایک لمحے کے لیے رکا پھر میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کو دھیرے سے دھکا دیا۔ دروازے میں کسی قسم کی جنبش نہ ہوئی۔ میں نے اپنے ہاتھ کے دباؤ میں اضافہ کیا لیکن دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ میرا دل مایوسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ صورت حال کو سمجھتے ہوئے جواد نے ڈیرے کی چھت کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے مایوسی سے سر ہلا کر کہا۔

"نہیں۔ چھت پر جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہاں کوئی روشن دان وغیرہ نہیں ہے۔"

"آواز بدل کر دروازہ کھلوانے کی کوشش کریں؟" اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ میں نے پھر مایوسی سے سر ہلا دیا۔

"نہیں۔ ان کا دھوکا کھانا آسان نہیں ہے۔ البتہ یہ پوری طرح ہوشیار ضرور ہو جائیں گے۔"

"تو پھر کیا کریں؟" اس نے مایوسی سے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ جواب دینے کے بجائے میں نے دروازے میں موجود باریک سی درز سے آنکھ لگا دی۔ میں نے دیکھا کہ سامنے ہی چارپائی پر منیجر نصر اللہ ترچھا لیٹا اپنی موچھوں کو تاؤ دے رہا ہے۔ اس کا پیر مسلسل ہل رہا تھا۔ گامن کی پیٹھ میری طرف تھی۔ اس کی کلاشنکوف مجھے چارپائی کے سہارے کھڑی نظر آئی۔ کوشش کے باوجود میں چچا مہرداد اور مہراں کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکا۔ اچانک جواد نے ہیجانی کیفیت میں میرا کندھا زور سے ہلا دیا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کام بن گیا!" اس نے پرجوش لہجے میں میرے کان میں سرگوشی کی۔

میں نے حیرانی کے عالم میں اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ "کام بن گیا؟ مگر کیسے؟" جواب دینے کے بجائے اس نے سامنے کھڑی ہوئی منیجر نصر اللہ کی ہارڈ ٹاپ جیپ کی طرف اشارہ کیا۔ میری

حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ "میں اب بھی تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکا۔" میں نے الجھن بھرے لہجے میں اعتراف کیا۔

"آپ آیئے میرے ساتھ۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور جیپ کی طرف چل دیا۔ میں نے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی۔ جیپ کے قریب پہنچ کر اس نے کہا۔ "اپنی جیکٹ اتار کر مجھے دے دیجیے۔" میں نے نہ سمجھتے ہوئے بھی خاموشی سے اس کی فرمائش پوری کر دی۔

بارش کی ہلکی سی بوچھار میری قمیص کے خشک حصے سے ٹکرائی۔ ہلکی سی جھرجھری کے ساتھ میں پوری طرح جواد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے جیکٹ کو اپنے پستول والے ہاتھ پر لپیٹا۔ قبل اس کے کہ میں صورت حال کو پوری طرح سمجھ پاتا' اس نے اپنے اس ہاتھ کو اچھی خاصی قوت سے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے کے شیشے پر دے مارا۔ شیشے پر ضرب پڑتے ہی ہلکا سا چھناکا ہوا اور کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ کر اندر گر گیا۔ جیکٹ کے باعث چھناکے کی آواز خاصی دب گئی تھی۔ میں نے چونک کر ڈیرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ مجھے وہاں کسی قسم کے ردعمل کے آثار نظر نہ آئے۔ شیشے کا چھناکا بارش کی سرسراہٹ میں دب گیا تھا۔ اسی اثناء میں جواد نے کھڑکی سے اندر ہاتھ ڈال کر جیپ کا دروازہ کھول دیا۔

"بہت خوب!" میں نے صورت حال کو کسی حد تک سمجھتے ہوئے جواد کو شاباش دی۔ دروازے سے پہلے میں اندر داخل ہوا اور ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جواد اسٹیرنگ ویل کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے جیب سے ٹارچ نکال کر روشن کر لی۔ جواد فوری طور پر اگنیشن کے تاروں کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ اسے اپنا کام مکمل کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اس نے انگوٹھا اٹھا کر اپنی کامیابی کا اعلان کیا۔

"اب کیا کرنا ہے؟" میں نے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔ جواد نے مجھے اپنے ذہن میں تشکیل پانے والے منصوبے سے مختصراً آگاہ کیا۔ مجھے اس کا منصوبہ اچھا لگا "تو پھر تم اپنا سائلنسر لگا پستول میرے حوالے کر دو۔" میں نے مسرور لہجے میں کہا۔ جواد نے خاموشی سے اپنا بریٹا میرے حوالے کر دیا اور میرا کولٹ لے کر اپنی آغوش میں رکھ لیا۔ بریٹا کو سنبھال کر میں نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور خاموشی سے جیپ سے نیچے اتر آیا۔

جیپ سے اشٹیرنگ پر بیٹھے جواد کے ہیولے نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے محتاط رہنے کی تاکید کی۔ میں اثبات میں سر ہلاتا دبے پاؤں ڈیرے کے بند دروازے کی طرف بڑھا۔ میں دروازے کے پہلو میں دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا عین اسی وقت دھیمی سی غراہٹ کے ساتھ جیپ کا انجن بیدار ہو گیا۔ میں نے کان دروازے سے لگا کر اندر سے آنے والی غیر معمولی آواز کو سننے کی کوشش کی لیکن اندر سے مجھے کسی قسم کی ہلچل کی آواز سنائی نہ دی۔ بارش کے دھیمے لیکن مسلسل شور نے جیپ کے انجن کی آواز

بھی اپنے اندر دبالی تھی۔ میں نے ہاتھ سے جواد کو سب ٹھیک ہے کا اشارہ کیا۔ جواد نے جیپ کو گیئر میں ڈالا اور وہ دھیرے سے حرکت میں آ گئی۔ کچھ فاصلہ جیپ نے اسی رفتار سے طے کیا پھر جیپ کی رفتار میں اضافہ ہو گیا۔ تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جیپ نے موڑ کاٹا اور واپس ڈیرے کی سمت آنے لگی۔ اب اس کی ہیڈ لائٹس پوری طرح روشن ہو چکی تھیں۔ جوں جوں فاصلہ کم ہوتا گیا میرے دل کی دھڑکن کی رفتار بڑھتی گئی اور پستول پر میری گرفت سخت ہوتی گئی۔ ڈیرے کے قریب پہنچ کر جواد نے جیپ کی ہیڈ لائٹس پوری طرح ڈیرے کے دروازے پر مرکوز کر دیں۔ جیپ دروازے کے عین سامنے رکی۔ اس کا انجن کئی بار غضب ناک انداز میں غیرایا۔ میں نے ڈیرے کے اندر سے کسی چارپائی کے چرچرانے کی آواز سنی۔

''اوئے گامن!'' جواد جیپ کی کھڑکی سے گردن نکال کر بھاری آواز میں چیخا اس کے ساتھ ہی جیپ کا انجن مسلسل کئی بار غرایا۔

''اوئے صبر تو کرو نامراد دہنی آوندا ہاں۔ کی مصیبت پے گئی اے۔'' میں نے گامن کے زور سے بڑبڑانے کی آواز سنی۔ میں نے اپنے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا اٹھا کر جواد کو کامیابی کا اشارہ کیا اور پھر گامن کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ گامن نے بڑبڑاتے ہوئے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹ کے باعث اس کی آنکھیں چندھیا کر رہ گئیں۔

''اوئے تساڈی ماں کوں۔'' اس نے کسی غلیظ گالی کی ابتدا کی۔ اسی اثنا میں مجھے نظر آ گیا کہ وہ خالی ہاتھ ہے۔ میں نے پوری قوت سے اس کے منہ پر اپنے بائیں ہاتھ کا گھونسا مارا۔ اس کے منہ سے برآمد ہونے والی گالی اس کی زبان سمیت اس کے دانتوں کے درمیان کچلی گئی۔ وہ تیورا کر پیچھے ہٹا میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر پوری قوت سے اسے پیچھے دھکا دیا۔ اس کے پاؤں آپس میں الجھے اور وہ دھڑام سے پشت کے بل گر پڑا۔

میں نے اسے زوردار ٹھوکر مارنا چاہی لیکن اسی لمحے میری نظر منیجر نصراللہ پر پڑی۔ میں نے دیکھا کہ وہ بہت پھرتی سے پائنتی کے سہارے کھڑی کلاشنکوف کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے حیرت انگیز طور پر برق رفتاری سے بگڑی ہوئی صورت حال کو سمجھ لیا تھا۔ گامن کو نظرانداز کر کے میں نے نصراللہ کی طرف گولی چلا دی۔ ہلکے سے پٹاخے کی آواز کے ساتھ گولی چارپائی کے پائے پڑی۔ نصراللہ ذرا سا جھجکا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے کلاشنکوف کی نال پر ہاتھ ڈال دیا۔ میں نے اس پر دوسرا فائر کیا لیکن اس اثنا میں وہ فرش پر لیٹ چکا تھا۔ میں نے اس پر تیسرا فائر کرنا چاہا عین اسی وقت زمین پر پڑے گامن نے پوری قوت سے میرے پیروں پر دولتی ماری۔ میرے پیر زمین سے اکھڑ گئے۔ میرے پستول سے نکلنے والی گولی چھت میں گھس گئی جبکہ میں پہلو کے بل گامن کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ اس نے ایک بار پھر لات چلائی۔ اس کی لات میرے بائیں شانے پر پڑی۔

میں نے تیزی سے کروٹ بدل کر اس کی زد سے باہر نکلنا چاہا۔ عین اسی وقت ڈیرے کی محدود فضا میں ایک زبردست دھماکا گونجا۔ میرے دماغ میں پیغام پہنچا کہ یہ کلاشنکوف کے فائر کی آواز ہے۔ یک لخت میری سیدھ میں پڑے گامن کے جسم کو زبردست جھٹکا لگا۔ کلاشنکوف کی گولی نے اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ اس کے بھیجے کے چھینٹے مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہوئے۔ اگلے ہی لمحے منیجر نصراللہ نے ایک اور گولی چلا دی۔ یہ گولی میرے پاس سے سنسناتی گزری اور دیوار میں پیوست ہو گئی۔ میں نے اپنا پستول سیدھا کر کے اس کا نشانہ لینا چاہا لیکن میں اس قدر بے ڈھنگی پوزیشن میں زمین پر پڑا تھا کہ بغیر زمین پر بیٹھے میرے لیے فائر کرنا بہت مشکل تھا۔

اسی اثنا میں نصراللہ فرش سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی خونی آنکھوں سے مجھے گھورا۔ اس کا ہاتھ حرکت میں آیا' اس کے ساتھ ہی کلاشنکوف کا لیور لگاتار فائرنگ پر سیٹ ہو گیا۔ اس نے نہایت اطمینان سے میرے سینے کا نشانہ لیا۔ میں نے ناامیدی کے عالم میں برق رفتاری سے زمین پر اپنی جگہ سے کروٹیں بدلنے کے متعلق سوچا۔ میں اپنے اس فیصلے پر عمل کر بھی نہیں پایا تھا کہ ڈیرے کی فضا لگاتار دھماکوں سے گونج اٹھی۔ مجھے لگا کہ میرا دل دھڑکنا بھول گیا ہے۔ اگلے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ میرا جسم بالکل محفوظ ہے۔ شاید نشانہ خطا ہو گیا۔ میں نے جلدی سے نصراللہ کی طرف دیکھا۔ مجھے وہاں ایک عجیب منظر نظر آیا۔ اس کی آنکھیں حیرت اور دہشت کی ملی جلی کیفیت سے بری طرح پھیل گئی تھیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ہاتھ سے کلاشنکوف چھوٹ کر اس کے پیروں پر گر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی گھٹنوں کے بل گر پڑا تب مجھے اس کے جسم پر ابھرنے والے بڑے بڑے سرخ دھبے نظر آئے پھر وہ دھڑام سے منہ کے بل گر پڑا۔ میں حیرت سے منہ پھاڑے یہ سب دیکھتا رہا۔ اسی لمحے کوئی بے آواز قدموں سے چلتا میرے قریب آن کھڑا ہوا۔

''اٹھیے جناب!'' میں نے جواد کی پرسکون آواز سنی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ اس کے ہاتھ کا سہارا لے کر میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اپنے جھنجھناتے اعصاب پر قابو پانے میں مجھے اچھی خاصی دیر لگی۔

''بال بال بچایا ہے تم نے جواد بھائی ورنہ آج تو بس سمجھو کہ کہانی ختم ہو ہی گئی تھی۔''

''میں کیا شے ہوں بھائی۔ زندگی اور موت دینے والی تو خدا کی ذات ہے۔ آپ کی زندگی باقی تھی سو بچ گئے۔ ان کی موت آئی تھی سو یہ اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ جو کچھ ہو گیا اس پر مٹی ڈالیں۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ فوری طور پر کارروائی شروع کریں۔'' جواد نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور برق رفتاری سے حرکت میں آ گیا۔ میں نے نصراللہ کے پیروں تلے دبی کلاشنکوف اٹھائی اور اس کا لاک لگا کر اسے اپنے شانے سے لٹکا لیا۔ نصراللہ کو چت کر کے میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک جیب سے مجھے قید خانے کے سلاخوں والے دروازے پر لگے موٹے سے قفل کی چابی مل گئی۔ میں نے نہایت بے تابی سے قفل کھولا اور سلاخوں والا دروازہ کھول کر نیم تاریک کمرے میں

داخل ہو گیا۔ اس نے گیس کا لیمپ اٹھا رکھا تھا۔ لیمپ کی روشنی میں مجھے مہراں منہ کے بل ٹاٹ پر پڑی نظر آئی۔ اس کی گھنی سیاہ زلفوں سے خون جھلک رہا تھا۔ اس کے پاس ہی چچا مہر داد پہلو کے بل پڑا ہوا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا جبکہ مہراں بالکل بے حس وحرکت پڑی تھی۔ میں تیزی سے مہراں کی طرف بڑھا۔ اس کی سانس بے ترتیبی سے آ جا رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گی۔ میں نے نہایت احتیاط سے اسے اپنے شانے پر لا دلیا۔ جواد نے چچا مہر داد کو اٹھالیا۔ نصراللہ اور گامن کی لاشوں کے پاس سے گزر کر ہم ڈیرے سے باہر آ گئے۔

جیپ کے دروازے کھول کر ہم نے ان دونوں کو ممکنہ حد تک آرام دہ حالت میں لٹا دیا۔ ''بس اب جلدی سے یہاں سے نکل چلو۔'' میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔

ابھی میرا جملہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ میری نظر گاؤں کی طرف سے آنے والی کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹوں پر پڑی۔ اس گاڑی کا رخ سیدھا ہماری طرف تھا۔

''جلدی کرو جواد!'' میں نے شدید اضطراب کے عالم میں کہا۔ جواد نے گاڑی ریورس کر کے سیدھی کی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ اسی اثنا میں گاؤں کی طرف سے آنے والی گاڑی مزید نزدیک آ گئی۔ حتیٰ کہ مجھے صاف نظر آ گیا کہ وہ ڈبل کیبن والی ہائی لکس گاڑی ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس گاڑی میں موجود افراد نے بھی ہماری گاڑی کو روانہ ہوتے دیکھ لیا ہے۔ جواد نے بھی صورت حال کی سنگینی کو پوری طرح محسوس کر لیا۔

''یہ تو بہت برا ہوا ذوالفقار بھائی۔'' اس نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ''یہ لوگ تو قیامت تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔''

''جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ تم گاڑی کو ممکنہ حد تک تیز رفتاری سے بھگاتے رہو۔ جب تک وہ لوگ صورت حال کو پوری طرح سمجھ سکیں ہمیں زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کر لینا چاہیے۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ جواد نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کی رفتار میں مزید اضافہ ہو گیا۔ میں نے کلاشنکوف سنبھالی اور مہراں اور چچا مہر داد والی سیٹیں پھلانگ کر جیپ کے عقبی حصے میں آ گیا۔ چچا مہر داد بدستور آنکھیں بند کیے دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔ میں نے اپنی پوری توجہ عقبی منظر پر مرکوز کر دی۔ مجھے ہائی لکس گاڑی ڈیرے کے سامنے رکتی نظر آئی۔ اس کی ہیڈ لائٹس بند ہو گئیں۔ میں نے جواد کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس اثنا میں بارش پوری طرح تھم چکی تھی لیکن کیچڑ کے باعث راستہ بے حد خراب ہو رہا تھا۔ ویسے بھی یہ کوئی باقاعدہ سڑک نہ تھی۔ بغیر ہیڈ لائٹوں کے اس راستے پر گاڑی چلانا تقریباً ناممکن تھا لہٰذا اسے مجبوراً ہیڈ لائٹ روشن رکھنی پڑ رہی تھیں۔ اونچے نیچے راستے پر جیپ کو زبردست جھٹکے لگ رہے تھے لیکن جواد اسے اندھا دھند بھگائے جا رہا تھا۔ خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد

ایک جگہ اس نے جیپ کی رفتار دھیمی کی اور بائیں طرف موڑ لیا۔ عین اسی وقت میں نے بہت دور اندھیرے میں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹوں کو روشن ہوتے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے وہ روشنی میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

''خبردار ہو جاؤ جوان۔ وہ لوگ تمام صورت حال سے آگاہ ہو چکے ہیں۔'' میں نے بھاری لہجے میں اسے خطرے سے آگاہ کیا۔ ''اب وہ لوگ سیدھے ہمارے پیچھے آئیں گے۔''

''ہمیں تھوڑی سی اور مہلت مل جاتی تو یہ لوگ ہماری گرد کو بھی نہ پہنچ پاتے۔ ایک تو یہ راستہ بہت خراب ہے۔ اگر گاڑی کی رفتار مزید بڑھائی گئی تو اس کے الٹنے کا شدید خطرہ ہے۔'' جواد نے بے چارگی سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی جیپ کی رفتار میں مزید کچھ اضافہ ہو گیا۔ خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد جواد نے جیپ کی رفتار ایک بار پھر کم کی اور اسے دائیں ہاتھ کو جانے والے ایک راستے پر موڑ لیا۔ مجھے بہت دور عقب میں روشنی کی ہلکی سی جھلک نظر آئی۔ وہ یقیناً کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹوں کی روشنی تھی۔

''وہ لوگ بہت تیز رفتاری سے ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔'' میں نے جواد کو تیزی سے قریب آتے ہوئے خطرے سے آگاہ کیا۔

''آنے دو۔ پرواہ نہیں۔ اب وہ لوگ ہمیں نہیں پکڑ سکتے۔'' جواد نے خلاف توقع خاصے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ اب ہم خاصے ہموار راستے پر آ چکے ہیں۔ اور بآسانی ان لوگوں سے اپنا فاصلہ بڑھا سکتے ہیں۔'' میں نے ذرا غور سے دیکھا تو اس راستے کو پہچان لیا۔ یہ وہی راستہ تھا جس کے ذریعے ہم گاؤں تک پہنچے تھے۔ اس راستے پر جواد بغیر ہیڈ لائٹس جلائے گاڑی چلا کر لایا تھا۔ روشن ہیڈ لائٹوں کے ساتھ جیپ نہایت سبک رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس راستے کے دونوں اطراف گھنا جنگل تھا۔ دشواری صرف یہ تھی کہ اس راستے پر خاصی دور تک کوئی موڑ نہیں تھا۔ چنانچہ ہمارے تعاقب میں آنے والے بآسانی بہت دور سے ہماری گاڑی کو دیکھ سکتے تھے۔

میں نے اپنے عقب میں ایک بار پھر ہیڈ لائٹ کی روشنی دیکھی۔ اس بار ان کا فاصلہ ہماری جیپ سے پہلے کی نسبت زیادہ تھا۔ جواد پوری طرح مطمئن تھا کہ وہ یہ فاصلہ کم نہیں ہونے دے گا لیکن مجھے ایک اور فکر کھائے جا رہی تھی۔ چچا مہر داد اور مہراں کے چکر میں ہم مرزا اور صدیقی کو تقریباً پوری طرح فراموش کر چکے ہیں۔ ہمارے پاس انہیں تلاش کرنے کا وقت بھی نہیں ہے۔ ہم یہاں سے جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو بھی جائیں تو مرزا اور صدیقی تو یہیں رہ جائیں گے۔ ملک کریم کے بعد میں اپنے مزید دو ساتھیوں کو کھو بیٹھا ہوں۔ یہ دونوں بھی سردار شاہ مراد کے شیطانی جال میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ میں ایک بار پھر تنہا رہ گیا ہوں۔ لیکن نہیں!۔۔۔ میں تنہا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ جواد جیسا جاں

نثار ساتھی موجود ہے۔ میں چچا مہر داد اور مہراں کو سردار شاہ مراد کے ناپاک سائے سے دور نکال لایا ہوں۔۔۔لیکن نہیں!۔۔۔ابھی میں اپنے اس مقصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا ہوں۔ سردار شاہ مراد کے پالتو کتے ابھی تک ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت ہمارے سروں پر پہنچ سکتے ہیں۔

میں نے اپنے عقب میں آنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹوں پر نظریں جما دیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ دونوں گاڑیوں کے باہمی فاصلے میں کچھ کمی ہوئی ہے۔ اسی وقت جواد نے جیپ بائیں طرف موڑ دی۔

''جواد بھائی جیپ کو آگے لے جا کر سڑک سے اتار لو اور کسی محفوظ جگہ کھڑی کر دو۔''

''لیکن کیوں؟'' جواد نے شدید حیرانی کے عالم میں سوال کیا۔ البتہ اس نے گاڑی کی رفتار میں کمی کر دی تھی۔

''اس لیے بھائی کہ ہم کتنی ہی گاڑی بھگا لیں' ان کی گاڑی سے فاصلہ تو بڑھ سکتا ہے لیکن ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ ہمیں ان کا حتمی علاج کرنا پڑے گا ورنہ یہ ہمارے تعاقب میں ہمارے ٹھکانے تک پہنچ جائیں گے۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' جواد نے بلا حیل و حجت میری بات مان لی۔ ایک مناسب جگہ دیکھ کر اس نے گاڑی راستے سے اتار لی اور خود جھاڑیوں کو روندتا گھنے جنگل میں گھس گیا۔ درختوں کے ایک چھوٹے سے جھنڈ میں پہنچ کر اس نے گاڑی کا انجن بند کر دیا۔

ہم دونوں اپنے ہتھیار سنبھال کر جیپ سے اتر آئے۔ کلاشن کوف میں نے اپنے پاس رکھی جبکہ جواد کا سائلنسر والا پستول میں نے اس کے حوالے کر دیا۔ اب اس کے پاس دو پستول تھے۔ ہم دونوں تیزی سے کچی سڑک کی طرف بڑھے۔ سڑک کے پاس پہنچ کر ہم نے برق رفتاری سے اپنی حکمت عملی طے کی۔ میں کلاشنکوف سنبھال کر سڑک کے کنارے اگی درختوں کی ایک جوڑی کی طرف بڑھا۔ تقریباً دو دو فٹ قطر کے تنوں والے یہ درخت ایک نہایت محفوظ مورچے کا کام دے سکتے تھے۔ ان دونوں کے درمیان بمشکل ایک فٹ کا فاصلہ تھا۔

میں نے اس کے پیچھے پہنچ کر کلاشنکوف کا رخ اس طرف کر دیا جدھر سے ہمارے دشمن تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ اسی اثنا میں جواد کسی پھرتیلے بندر کی مانند سڑک کے دائیں کنارے اگے ایک گھنے درخت پر چڑھتا چلا گیا۔ اس نے نہایت مہارت سے گھنے پتوں کے درمیان خود کو چھپا لیا۔ عین اسی وقت میں نے سڑک کے موڑ پر روشنی کی تیز دھاریاں نمودار ہوتے دیکھیں۔ گاڑی کے انجن کی غر غراہٹ میرے کانوں میں آئی۔ کچھ ہی دیر کے بعد گاڑی نے موڑ کاٹا۔ اس کا رخ سیدھا ہماری طرف تھا۔ میں نے روشنی سے خود کو بچاتے ہوئے اپنی کلاشنکوف کا لاک ہٹا دیا۔ وہ اس وقت سنگل فائر پر سیٹ تھی۔ گاڑی غراتی ہوئی موڑ سے آگے بڑھی۔ اس پر حملے کی ابتدا جواد نے کرنی تھی۔ گاڑی مزید آگے

بڑھی۔ اچانک میں نے گاڑی کا شیشہ تڑخنے کی آواز سنی۔ درختوں کی اوٹ سے میں نے دیکھا کہ گاڑی کی ونڈ شیلڈ میں یکے بعد دیگرے تین سوراخ ہو گئے۔ گاڑی یک لخت بری طرح لہرائی۔ خاموش فضا میں کسی کرب ناک چیخ گونجی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی سڑک سے اتری اور زبردست دھماکے سے ایک درخت سے ٹکرائی۔ فضا میں مزید انسانی چیخیں گونجیں۔ گاڑی کا اگلا حصہ تصادم کے نتیجے میں بری طرح پچک گیا۔ جواد نے اپنے پستول سے خاموش انگاروں کی برسات جاری رکھی۔ شکستہ ونڈ شیلڈ کے پیچھے موجود تینوں افراد اس کی گولیوں کا نشانہ بن چکے تھے۔ میں نے گاڑی کے پچھلے کیبن سے کسی انسانی ہیولے کو باہر آتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میری کلاشنکوف گرج اٹھی۔ بمشکل چالیس گز کے فاصلے سے میری رائفل کی پہلی ہی گولی نے اس کا جسم چھید دیا تھا۔ میں نے مزید دو فائر کیے۔ وہ بغیر کوئی آواز نکالے منہ کے بل زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

میں نے فضا میں پٹرول کی تیز بو محسوس کی۔ شاید اس گاڑی سے پٹرول گر رہا تھا۔ انجن بند ہونے کے باوجود گاڑی کی اکا دکا لائٹیں روشن تھیں۔ اچانک گاڑی میں ایک چنگاری سی چھوٹی۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کے انجن کے آس پاس آگ بھڑک اٹھی۔ میں نے چیخ کر جواد کو متوقع خطرے سے آگاہ کیا اور اپنے آپ کو پوری طرح درختوں کے پیچھے چھپا لیا کچھ ہی دیر بعد آگ گاڑی کے پٹرول ٹینک تک پہنچ گئی۔ ایک زبردست دھماکہ ہوا اور پوری گاڑی آگ کا گولہ بن گئی۔ دھماکے کے باعث اڑنے والے دھاتی ٹکڑے دور دور تک بکھر گئے۔ مجھے اندیشہ معلوم ہوا کہ کہیں جواد کسی دھاتی ٹکڑے کی زد میں آ کر زخمی نہ ہو گیا ہو۔ آگ کے باعث ہونے والی تیز روشنی میں میری نظریں اس درخت پر جم کر رہ گئیں جو جواد کی پناہ گاہ کا کام دے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے جواد کو درخت سے نیچے اترتے دیکھا۔ میں نے پہلی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ وہ زخمی نہیں ہے۔ میرے وجود میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ جواد ڈھیلے قدموں سے میری طرف بڑھا۔

''مر گئے۔ سب ختم ہو گئے!'' اس نے عجیب تھکے تھکے سے انداز میں کہا۔

''ہاں! شکاری خود شکار ہو گئے۔'' میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

''ان میں سے تین۔ تین میری گولیوں کا نشانہ بنے ہیں۔ جب کہ دو۔ دو تو زندہ جل گئے۔'' اس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔ ''میں نے۔ میں نے آج محض چند گھنٹوں کے اندر چار انسانوں کی جان لے لی۔'' میں نے پریشانی کے عالم میں اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھا۔

''ہوش میں آؤ جواد۔ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں نے دھیرے سے اس کا شانہ جھنجھوڑ دیا۔'' اپنے آپ کو ذہنی اذیت نہ دو۔ تمہاری تمہاری گولیوں کا نشانہ بننے والے کوئی شریف اور معصوم لوگ نہیں ہیں۔ یہ سب خون خوار وحشی درندے تھے جو بے شمار انسانوں کی زندگی سے کھیل چکے تھے۔ جانے کتنی معصوم لڑکیاں اپنی عزتیں ان کے ہاتھوں گنوا چکی ہیں اگر ہم انہیں ختم نہ کرتے تو یہ ہمیں ختم کر چکے

ہوتے۔ حقیقت پسندی سے کام لینا سیکھو۔ ظالم کا ہاتھ توڑنا ہرگز ظلم نہیں ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ میرے الفاظ کا ان پر خاطر خواہ اثر ہوا۔

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ واقعی اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ یہ لوگ تو طاقت کے نشے میں اندھے ہو جاتے ہیں۔'' اس نے پژمردہ سے لہجے میں کہا۔ میں نے اس کا شانہ تھپتھپا کر اس کا حوصلہ بڑھایا۔

جیپ کے پاس پہنچنے تک اس کی حالت خاصی حد تک سنبھل گئی۔ ہم دونوں جیپ میں جا بیٹھے' عین اسی وقت میں نے چچا مہرداد کی آواز سنی۔ ''ہائے۔ میرا سر۔ ہائے۔'' میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ چچا مہرداد نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دبا رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں۔

''چاچا۔ ہوش میں آؤ چاچا۔'' میں نے خوشی اور تشویش کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ کہا۔ میری مانوس آواز نے اس کے حواس کی بحالی میں مدد دی۔ اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ جیپ کے کیبن کی اندرونی دھیمی روشنی کے باوجود اس نے مجھے پہچاننے میں دیر نہیں لگائی۔ ''سس۔۔ سیفل۔''

''ہاں چاچا۔ میں سیفل ہوں۔ تیرا سیفل'' میں نے خوشی سے بوجھل آواز میں کہا۔

''بیٹا۔ تو۔ تو یہاں۔''

''ہوش میں آؤ چاچا۔ میں تم لوگوں کو ان کتوں کی قید سے چھڑا لایا ہوں۔ میں نے ان کے سینے چھلنی کر دیے ہیں۔ میں نے وہ ناپاک ہاتھ توڑ دیے ہیں جو تم پر اور مہراں پر اٹھے تھے۔ اب کسی میں ہمت نہیں ہے کہ تم لوگوں پر ٹیڑھی نظر ڈال سکے۔'' شدت جذبات سے میری آواز بھرانے لگی۔ چچا مہرداد چند لمحوں تک میری شکل دیکھتا رہا بالاآخر تمام صورت حال اس پر واضح ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے سے درد کے آثار مٹنے لگے۔ اس کی جگہ گہرے تفکر نے لے لی۔ اس نے گرد و پیش کا جائزہ لے کر گہری پریشانی کے عالم میں کہا۔

''یہ۔ یہ تو نے اچھا نہیں کیا سیفل۔ وہ لوگ پہلے ہی تیرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ تو مسلسل ان کے غیظ و غضب کو بھڑکا رہا ہے۔''

''تو پھر تم ہی بتاؤ چاچا کہ میں کیا کرتا؟ کیا میں ان کو تمہیں قتل کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا؟ کیا میں مہراں کی عزت کی طرف اٹھنے والے غلیظ ہاتھوں کی پیش رفت چپ چاپ دیکھتا رہتا؟ نہیں چاچا میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ تم لوگ مجھے کچھ بھی سمجھتے ہو' میرے لیے تم دونوں ہی دنیا کی عزیز ترین ہستی ہو۔ تمہاری حفاظت کے لیے میں اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔''

''تم تو خواہ مخواہ آپے سے باہر ہو رہے ہو۔ ہمیں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ سردار شاہ مراد کو ہمارے خلاف کوئی قدم اٹھانا ہوتا تو اس وقت اٹھا لیتا جب تم رتا سائیں کو خون میں نہلا کر فرار ہو گئے تھے۔ اپنے جنون پر قابو پاؤ سیفل۔ اس قتل و غارت سے تمہیں کیا تسکین ملتی ہے؟''

''چاچا۔ تم۔ چاچا تم بھی مجھے ہی قصوروار ٹھہرا رہے ہو۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ سردار شاہ مراد نے تمہیں کسی قسم کا نقصان کیوں نہیں پہنچایا۔ تم نے اسی طرح کی باتیں کر کے' مجھے برا بھلا کہہ کر اس کی ہمدردیاں حاصل کر لیں ہوں گی۔ اسی لیے تم لوگ اپنے گھر میں میری ایک منٹ کی بھی موجودگی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔'' میں نے دکھی لہجے میں کہا۔

''ہاں' ہاں تم بالکل صحیح سمجھے ہو۔ میں نے سردار شاہ مراد کے سامنے تم سے لاتعلقی کا اظہار کیا تھا۔ یہی نہیں میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہیں پکڑوانے میں اس کی ہر ممکن مدد کروں گا۔'' چچا مہرداد کی باتیں آتشیں لاوے کے مانند میری سماعت کو جھلساتی چلی گئیں۔ مجھے لگا کہ میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کر تیز ہواؤں میں بکھرتا جا رہا ہے۔

''تت۔ تم نے ایسا کیوں کیا چاچا؟'' میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''تو پھر اور کیا کرتا؟ میرے جیسا معذور بوڑھا سردار شاہ مراد کی بے پناہ طاقت کا کیسے مقابلہ کر سکتا تھا۔ تمہارے جانے کے بعد ہم کسے اپنا سہارا بناتے؟ اگر میری اطاعت کے اظہار سے میری زندگی اور میری بیٹی کی عزت محفوظ رہ جائے تو پھر اس سے بہتر کون سی صورت حال ہو سکتی ہے؟ نصراللہ نے ہم دونوں کو اٹھوا لیا تو کیا ہوا؟ وہ ہم پر ہاتھ ڈالنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ سردار شاہ مراد کو ہمارے متعلق علم ہوتا تو وہ فوراً ہماری رہائی کا حکم جاری کر دیتا۔ تم نے یہ خون خرابہ کر کے ہم دونوں کے لیے شدید مشکلات پیدا کر دی ہیں۔''

''بات صرف اتنی ہے چاچا' تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ سردار شاہ مراد کی ان مہربانیوں کی کوئی خاص وجہ ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔ ٹھیک ہے میں تم سے یہ سب معلوم بھی نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم لوگوں کو آزاد کرا کے شدید غلطی کی ہے۔ میری طرف سے تم دونوں کو پوری اجازت ہے۔ مہراں کو ہوش آ جائے تو تم لوگ یہاں سے واپس گاؤں چلے جاؤ۔ ان لوگوں سے کہہ دینا کہ میں تمہیں زبردستی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ موقع ملتے ہی تم لوگ واپس لوٹ آئے۔ میری نشان دہی کرنے کی بھی تمہیں مکمل آزادی ہے۔'' میں نے شکستہ دلی کے عالم میں کہا۔ میری بات سن کر چچا مہرداد خاموش ہو گیا۔ جواد نے بے چینی سے پہلو بدل کر کہا۔

''آپ دونوں کس فضول جھگڑے میں پڑ گئے۔ اجازت ہو تو یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔ یہ دونوں اگر گاؤں واپس جانا چاہیں بھی تو گھنے جنگل اور اندھیری رات میں پیدل وہاں تک نہیں جا سکتے۔ ویسے بھی اس وقت حویلی کے تمام کارندے بھوکے درندے بنے ہوئے ہوں گے۔ وہ بغیر سوال جواب کیے ان کی تکہ بوٹی کر دیں گے۔ فی الحال یہاں سے نکلیں اس کے بعد اس مسئلے کا مناسب حل سوچیں گے۔'' چچا مہرداد نے بے بسی کے سے عالم میں سر ہلا کر اس کی تائید کی۔

جواد نے جیپ اسٹارٹ کر کے ریورس کی۔ ہم لوگ ایک بار پھر کچی سڑک پر آ گئے۔ جلتی ہوئی جیپ

کے شعلے اب مدھم پڑ چکے تھے۔ البتہ فضا میں بسی ہوئی گوشت جلنے کی بو ابھی تک ناقابل برداشت تھی۔ جواد نے جلدی سے جیپ آگے بڑھا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے جلتی ہوئی گاڑی بہت پیچھے رہ گئی۔ ہم گول نہر کے قریب پہنچ چکے تھے نہر کے پشتے پر پہنچ کر جواد نے گاڑی کا رخ بائیں طرف موڑ دیا۔ ہم لوگ اسی طرف سے آئے تھے۔

''میری سمجھ میں اب تک نہیں آیا کہ مرزا اور صدیقی اتنے پراسرار انداز میں کہاں اور کیسے غائب ہو گئے؟'' جواد نے درمیانی رفتار سے گاڑی چلاتے ہوئے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''یوں لگتا ہے کہ انہیں بھوت پریت اٹھا کر لے گئے ہیں۔''

''ہو نہ ہو اسی جنگل میں کوئی خطرناک گڑبڑ ہے۔ ہمیں تو یہ تک علم نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں گئے ہیں یا انہیں ان کی مرضی کے خلاف اغوا کیا گیا ہے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ ہم فوری طور پر ان کے لیے کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ ویسے یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ اس جنگل میں پیش آنے والے واقعات کا بظاہر سردار شاہ مراد کی حویلی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' میں نے جواد کے کان میں جوابی سرگوشی کی۔

ہم نہر کے پشتے پہ شمالاً جنوباً ایک ڈیڑھ کلومیٹر ہی چلے ہوں گے کہ جواد کو اچانک ایک جھٹکے سے گاڑی روکنا پڑی۔ میری حیرت زدہ نظروں نے دیکھا کہ ہماری گاڑی کے سامنے نہر کا پشتہ بری طرح ادھڑا پڑا ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی دیو قامت درندے نے بارش سے بھیگی زمین میں پنجے گاڑ کر اسے تہس نہس کر دیا ہو۔ ایک فٹ سے دو فٹ تک گہرے کھالے نما گڑھوں کا وہ سلسلہ تاحد نظر پھیلا ہوا تھا۔ اس قطعہ زمین کو پار کرنا کسی گاڑی کے بس کی بات نہیں تھی۔ شدید حیرانی کے عالم میں میری نظریں ان گڑھوں پر جم گئیں۔ بالآخر مجھے گیلی زمین پر موجود بڑے بڑے ٹائروں کے نشانات نظر آ گئے۔ یہ نشانات زیادہ پرانے نہیں تھے۔ نہر کے پشتے کے اس حصے کو ادھیڑنے کے لیے بڑے ٹریکٹروں یا اس قسم کی مشینوں کی مدد لی گئی ہو گی لیکن وجہ؟

''نہر کے پشتے کو اس لیے تباہ کیا گیا ہے ذوالفقار بھائی کہ اسے راستے کے طور پر استعمال نہ کیا جا سکے۔'' جواد نے پریشانی کے عالم میں میرے کان میں سرگوشی کی۔

''ہاں تم صحیح کہہ رہے ہو۔ یہ کام اب سے چند ہی گھنٹے پہلے کیا گیا ہے یعنی ہمارے یہاں سے گزرنے کے کچھ ہی دیر بعد۔'' میں نے محتاط نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں شدید خطرے کی بو محسوس کر رہا ہوں۔ شاید ہمیں گھیرنے کی کوشش کی جائے۔ ہمارے پاس مہلت بالکل نہیں ہے۔ تم فوراً جیپ کو موڑنے کی کوشش کرو۔'' میرے لہجے کی سنسنی جواد کے رگ و پے میں دوڑتی چلی گئی۔ اس نے برق رفتاری سے گاڑی کو ریورس کیا اور پھر اس پشتے کے کنارے کی طرف کر کے اسے واپس موڑنے کی کوشش کی۔ میں نے کلاشنکوف سنبھال لی۔ نہر کا پشتہ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ اس کے باوجود جواد

نے کسی نہ کسی طرح جیپ کو واپس موڑ لیا۔

میری چھٹی حس تیزی سے قریب آتے کسی خطرے کی نشان دہی کر رہی تھی۔ میری نظریں دائیں ہاتھ پر موجود گھنے جنگل پر جمی ہوئی تھیں۔ گولیوں کی بوچھار اب آئی کہ آئی۔ چچا مہرداد نے بھی صورت حال کی سنگینی محسوس کر لی تھی۔ وہ بھی کسی چوکنے خرگوش کے مانند ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا۔ جیپ نہایت تیزی سے واپسی کے راستے پر دوڑ رہی تھی۔ ہم تینوں کے اعصاب سخت تناؤ کا شکار تھے۔ اچانک جواد کے ہونٹوں سے ایک تحیر انگیز آواز برآمد ہوئی۔ ''اوہ۔''

میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اس کے ساتھ ہی میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ پھیل گئی۔ وہ ایک بڑا سا ٹریکٹر تھا جس کے اگلے حصے میں بڑے بڑے ہل نما بلیڈ لگے ہوئے تھے۔ وہ ٹریکٹر ہماری گاڑی سے تقریباً فرلانگ بھر آگے خاصی تیز رفتاری سے جنگل کی طرف سے نہر کے پشتے پر چڑھ رہا تھا۔ جب تک ہماری گاڑی وہاں تک پہنچتی' وہ ٹریکٹر یقیناً پشتے کے درمیان پہنچ جاتا۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے بچ نکلنے کا واحد راستہ بھی مسدود ہو جاتا اور ہم لوگ چوہوں کی طرح گھیر کر مار لیے جاتے۔ جواد لمحے بھر کے لیے تذبذب میں مبتلا ہوا کہ وہ گاڑی کی رفتار میں کمی کرے یا اضافہ؟ میں نے تیز لہجے میں اسے ہدایت کی کہ وہ گاڑی کی رفتار برقرار رکھے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کلاشنکوف کا آہنی دستہ مار کر جیپ کی ونڈ شیلڈ کا اپنی طرف والا حصہ توڑ دیا۔

ہم نے نصف فاصلہ ہی طے کیا ہو گا کہ ٹریکٹر پشتے پر چڑھ آیا۔ مجھے اس کے کیبن میں دو افراد نظر آئے۔ ڈرائیور کے ساتھ موجود شخص کے ہاتھوں میں مجھے کلاشنکوف چمکتی نظر آئی۔ اسی کے ساتھ مجھے ٹریکٹر کے عقب میں کچھ فاصلے پر' درختوں کے درمیان کسی گاڑی کی جھلک نظر آئی۔ میں نے اپنی کلاشنکوف شانے سے نکالی اور ٹریکٹر کے ڈرائیونگ کیبن کا نشانہ لے کر بلاتوقف فائر کھول دیا۔ یکے بعد دیگرے چار گولیاں میری رائفل کی نال سے برآمد ہوئیں۔ ٹریکٹر کے کیبن میں موجود کلاشنکوف بردار پہلے ہی ہلے میں مارا گیا۔ چار میں سے کم از کم دو گولیاں اس کے سینے میں گھس گئیں۔ ایک ہولناک چیخ کے ساتھ وہ ٹریکٹر سے نیچے گرا اس کے ساتھ ہی ٹریکٹر کے پچھلے بڑے پہیے نے اس کا کچومر بنا دیا۔

عین اسی وقت ٹریکٹر کے عقب میں موجود گاڑی سے کلاشن کوف کا برسٹ فائر ہوا۔ گولیوں کی بوچھار ہماری جیپ کے اوپری حصے پر پڑی۔ قیامت خیز جھنجھلاہٹ سے ہماری گاڑی لرز اٹھی۔ کچھ گولیاں دھاتی چادر پر پڑ کر اچٹ گئیں اور کچھ اس میں پیوست ہو گئیں۔ اسی اثنا میں ٹریکٹر پشتے پر مزید آگے بڑھ آیا۔

گاڑی سے ہونے والی فائرنگ کو نظر انداز کر کے میں نے ایک بار پھر ٹریکٹر کے ڈرائیونگ کیبن کی نشست باندھی اور فائر کھول دیا۔ میری فائر کی ہوئی پانچ گولیوں میں سے جانے کتنی گولیاں ٹریکٹر کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کے پہلو میں گھس گئیں۔ وہ ذبح شدہ بکرے کے مانند ڈکرایا۔ اپنے آخری

لمحوں میں اس نے ٹریکٹر کا بریک لگا کر اسے ٹھہرانے کی کوشش کی لیکن دست اجل نے اسے مہلت نہ دی۔ ڈرائیور کے خاتمے کے باوجود اس سرکش مشین نے سامنے یعنی نہر کی سمت اپنا سفر جاری رکھا۔ جنگل کی طرف ڈھلوان میں پوشیدہ گاڑی سے ایک اور برسٹ فائر ہوا۔ اس بار ہماری جیپ کی ونڈ شیلڈ کے پرخچے اڑ گئے۔ ہم لوگوں پر شیشے کے ٹکڑوں کی بارش ہونے لگی۔ جواد کے ہاتھوں میں اسٹیرنگ بری طرح ڈگمگایا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ گولیاں اس کا وجود چھلنی کر گئیں ہیں لیکن میرے اس اندیشے کی فوراً ہی تردید ہوگئی جب اگلے ہی لمحے اس نے گاڑی کو سنبھال لیا۔

ہماری بچت کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہم پر فائرنگ کرنے والا شخص خاصی ڈھلوان میں تھا۔ اس کی چلائی ہوئی گولیاں دونوں مرتبہ تقریباً پینتالیس درجے کے زاویے سے ہماری سمت آئیں لہٰذا ہمیں کسی شدید نقصان کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اگلی مرتبہ شاید وہ زیادہ بہتر نشانے کا مظاہرہ کرتا یا اس کی جگہ دوسرے نشانہ باز لے لیتے چنانچہ میں نے بہتر سمجھا کہ اس سے پہلے ہی انہیں مدافعت پر مجبور کر دیا جائے۔ ہمارا ان سے فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہو رہا تھا۔ رائفل کو آٹو میٹک پر سیٹ کر کے میں نے اس گاڑی کی سمت میں مختصر سا برسٹ مارا۔ خدا جانے وہ برسٹ کس حد تک کارگر رہا۔ البتہ میں نے گولیوں کے گاڑی کی باڈی سے ٹکرانے کی آواز واضح طور پر سنی۔ ایک آدھ شیشہ بھی ٹوٹا۔ میری فائرنگ کا اتنا فائدہ یقیناً ہوا کہ وہ لوگ وقتی طور پر دبک کر بیٹھ گئے۔ اس اثنا میں ہماری جیپ ٹریکٹر کے بالکل قریب پہنچ گئی۔

ڈرائیور کے زندگی سے محروم ہونے کے بعد اس کی رفتار میں کمی آگئی تھی لیکن وہ مسلسل آگے کی طرف رینگ رہا تھا۔ جواد کو جیپ کی رفتار بے حد کم کرنا پڑی کیونکہ ٹریکٹر کے عقب میں اب بھی بہت کم جگہ تھی۔ میں نے دائیں ہاتھ پر ڈھلان میں موجود گاڑی پر ایک چھوٹا سا برسٹ فائر کیا۔ ایسا کرتے ہوئے مجھے رائفل جواد کے چہرے کے سامنے سے گزار کر کھڑکی سے باہر نکالنا پڑی۔ گولیوں کے ایک دو گرم خول شاید اس کے چہرے سے بھی ٹکرائے ہوں لیکن اس نے اپنی توجہ پوری طرح ڈرائیونگ پر مرکوز رکھی۔ اس اثنا میں ٹریکٹر بائیں طرف پشتے کے کنارے تک پہنچ گیا۔ اس کے عقب میں جیپ کا انجن بری طرح غرایا۔ جواد نے اس کی رفتار بڑھاتے ہوئے اسے ٹریکٹر کے پیچھے سے گزار دیا۔ پشتے کے کنارے پر پہنچ کر ٹریکٹر کا توازن بگڑا اور وہ نہر میں لڑھک گیا۔

ہماری جیپ پر عقب سے دو برسٹ فائر ہوئے۔ کچھ گولیاں جیپ کی باڈی پر لگیں بھی لیکن ہمیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا۔ جواد دیوانوں کی طرح جیپ کو اڑاتا چلا گیا۔ میری نظریں مسلسل عقب میں جمی ہوئی تھیں۔ خاصا فاصلہ طے کرنے کے باوجود مجھے اپنے تعاقب میں کوئی گاڑی آتی دکھائی نہ دی۔

آپ بے فکر رہیں ذوالفقار بھائی۔ وہ گاڑی اتنی جلدی ہمارے تعاقب میں نہیں آسکتی۔'' جواد نے میری پریشانی محسوس کر کے مسرور لہجے میں کہا۔

''کیوں؟ وہ گاڑی فوری طور پر ہمارے تعاقب میں کیوں نہیں آسکتی؟'' میں نے حیرانی سے

پوچھا۔

''اس لیے کہ وہ گاڑی پشتے سے خاصی ہٹ کر ڈھلان میں کھڑی تھی۔ بارش کے باعث پشتے کی ڈھلان بے حد پھسلواں ہو رہی ہے۔ اس پر ٹریکٹر تو کسی نہ کسی طرح چڑھ سکتا ہے لیکن کسی عام گاڑی کے لیے اس پر چڑھنا اتنا آسان نہیں ہے۔ خواہ وہ فور ویل ڈرائیو گاڑی ہی کیوں نہ ہو۔ اس کوشش میں گاڑی الٹ بھی سکتی ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے لیکن ہم اس وقت کس طرف جا رہے ہیں؟'' میں نے مسرور لہجے میں سوال کیا۔

''بس آپ دیکھتے جائیں۔ ہم چار پانچ کلومیٹر اسی پشتے پر سفر کریں گے۔ اس کے بعد ہم اس نہر پر بنے ہوئے ایک پل تک پہنچ جائیں گے۔ پل پار کرنے کے بعد ہم ایک اور راستے سے واپس شہر کی طرف چلیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے دشمن ہماری واپسی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکیں گے۔''

''وہ تو صحیح ہے لیکن میرے خیال میں تم کسی مناسب جگہ چچا مہرداد اور اس کی بیٹی کو اتار دو۔ ہم خواہ مخواہ ان کی مرضی کے بغیر انہیں ساتھ لیے پھر رہے ہیں۔ انہیں واپس گاؤں جانے دو۔ انہیں ابھی جا کر سردار شاہ مراد کو بھی منانا ہوگا۔'' میں نے چچا مہرداد کی طرف نظر ڈال کر طنزیہ لہجے میں کہا۔ اس نے مہراں کا سر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا اور وہ فکر مندی کے عالم میں کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ میری بات سن کر وہ چونک اٹھا۔ چند لمحوں تک غصے بھری نظروں سے میری طرف دیکھنے کے بعد اس نے کہا۔

''میں تیرے باپ کی جگہ ہوں۔ سیفل تو مجھے اپنی انگلی کے اشارے پر نہیں نچا سکتا۔ مجھے معلوم ہے تو بڑا شہ زور ہے لیکن تیری یہ شہ زوری میرے تجربے کا بدل نہیں ہوسکتی۔ تیری سرکشی نے ہماری زندگی اور عزت خطرے ڈال دی تھی۔ ایسی صورت میں میرا جیسا بوڑھا اور معزور شخص مکمل طور پر ان دیو قامت وحشیوں کے رحم و کرم پر تھا۔ تمہاری اور سردار شاہ مراد کی مخاصمت میں ہم لوگ بلاوجہ روندے جاتے۔ میں نے صرف اتنا کیا ہے کہ تم سے لاتعلقی ظاہر کر دی۔ تم مجھ سے جتنا بھی طنز کر دو میں اپنے موقف کو درست سمجھتا ہوں اور اس پر پوری طرح قائم ہوں۔ میری حتی الوسع کوشش ہوگی کہ تم لوگوں کے درمیان میری حیثیت غیر جانب دار فریق کی ہو۔'' اس کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اس کی بات بہت بری لگی لیکن رفتہ رفتہ مجھے احساس ہوا کہ اس نے جو کہا اور کیا وہ غلط نہیں ہے۔ اتنے عرصے کے دوران میں ایک بار بھی میں ان دونوں کی خیریت معلوم نہ کر سکا۔ اگر یہ دونوں سردار شاہ مراد کے غیظ و غضب کی بھینٹ چڑھ جاتے تو میری ان سے ہمدردی اور محبت ان کے کس کام آتی۔ بہتر یہی ہے کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ ویسے بھی یہ لوگ سردار شاہ مراد کے بہروپ سے واقف ہی نہیں ہیں۔ جس میں وہ ایک ملک دشمن اور غدار ہے۔ کسی مناسب وقت پر انہیں تمام تفصیلات سے آگاہ کیا جا سکتا ہے۔

"تو پھر تم ہمارے ساتھ چل رہے ہو؟" میں نے سنجیدہ لہجے میں چچا مہر داد سے سوال کیا۔

"ہاں۔لیکن ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں؟"

"اپنے ٹھکانے پر۔۔۔ڈیرہ غازیخان۔مہراں کی بے ہوشی ضرورت سے زیادہ طویل ہو گئی ہے۔ اسے طبی امداد کی ضرورت ہے۔جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں اس کا بہترین طریقے سے علاج ہو سکے گا۔"

"میرے خیال میں اس کی حالت زیادہ خراب نہیں ہے۔" اس نے پرشفقت انداز میں مہراں کے بالوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "اسے زیادہ شدید ضرب نہیں لگی۔یہ دراصل دہشت کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی تھی۔میرا خیال ہے اب اس کی بے ہوشی ختم ہو چکی ہے اور اب یہ پرسکون نیند سو رہی ہے۔"

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔" جواد نے مسرور لہجے میں کہا۔اس کے لہجے میں کسی عجیب سی کیفیت محسوس کر کے میں چونک اٹھا۔میں نے پہلی بار نوٹ کیا کہ وہ عقب نما آئینے کے ذریعے سے وقفے وقفے سے مہراں پر نظر ڈال لیتا ہے۔میں نے اسے غور سے دیکھا۔میری نظروں کی تپش محسوس کر کے وہ محتاط ہو گیا۔اس کے بعد اس نے مہراں کی طرف نہیں دیکھا۔

جواد کے کہنے کے عین مطابق کسی گاڑی نے ہمارا تعاقب نہ کیا۔نہر کے پشتے پر کئی کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جواد نے جیپ کی رفتار کم کر دی۔وہ بہ غور ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔اس کی پریشانی کو سمجھتے ہوئے میں نے بھی نہر پر موجود متوقع پل کی تلاش میں نظریں دوڑانا شروع کر دیں۔

"آرام سے چلتے رہو۔چھانگے والی پل ابھی دو تین فرلانگ آگے ہے۔" چچا مہر داد کی پرسکون آواز ہمارے کانوں میں پڑی۔جواد نے قدرے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔اس کے بعد تائید کے انداز میں سر ہلا کر اپنی توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کر دی۔کچھ دیر بعد ہم ایک پل کے پاس پہنچ گئے۔جواد کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات ابھر آئے اس نے گاڑی کو پل پر سے گزار دیا۔پل کے ختم ہوتے ہی ہمیں ایک بے حد بے ڈھب اور ناہموار کچا راستہ سامنے نظر آیا۔اس طرف جنگل کچھ اور بھی زیادہ گھنا تھا۔اس جنگل میں شاید کوئی بھی رات کے وقت سفر کرنے کی جرات نہ کرتا ہوگا۔

جیپ کے چیختے چنگاڑتے انجن نے خوابیدہ جنگلی حیات کا سکون درہم برہم کر دیا ہوگا۔جواد بھرپور توجہ سے گاڑی چلا رہا تھا۔مجھے شدت سے احساس ہوا کہ چچا مہر داد بہت چپ چپ ہے۔مجھے لگا کہ میں نے اب تک اس سے مناسب سلوک روا نہیں رکھا۔شاید میں کچھ زیادتی کر گزرا ہوں۔ کچھ بھی ہو بہر حال وہ میرے باپ کی مانند ہے۔وقتی مصلحتوں نے میرے سلسلے میں اس کا رویہ تبدیل کر دیا۔ورنہ یہ مجھے ہمیشہ اپنے سگے بیٹے کی طرح سمجھتا تھا۔میرے بچپن سے لے کر اب تک اس نے کبھی مجھ پر کوئی زیادتی نہیں کی۔یہ یقیناً مجھ سے خفا ہے۔میرے لیے بہتر یہی ہے کہ میں اسے منانے کی کوشش کروں۔

"چاچا یہ راستہ کس طرف جا رہا ہے؟" میں نے جان بوجھ کر جواد کے بجائے چچا مہر داد کو مخاطب کیا۔

"یہ راستہ آگے جا کر دوراہے میں تبدیل ہو جائے گا۔دائیں ہاتھ والا راستہ بستی روشن کی طرف نکل جائے گا جبکہ بائیں ہاتھ والا راستہ ہمیں شہر کی طرف لے جائے گا۔یہ راستہ بالکل ویران ہے کیونکہ پختہ سڑک کی موجودگی میں کوئی اسے استعمال نہیں کرتا۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔اس طرح ہمیں راستے میں کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔" میں نے مطمئن لہجے میں کہا۔چچا مہر داد نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

ہم لوگ مزید آگے بڑھے تو جنگل چھدرا ہونے لگا۔راستہ بھی کسی حد تک ہموار ہونے لگا۔چچا مہر داد کے کہنے کے عین مطابق خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہماری گاڑی ایک دوراہے پر پہنچ گئی۔جواد نے گاڑی کو بائیں ہاتھ والے راستے پر موڑ دیا۔صبح صادق کا دودھیا اجالا رفتہ رفتہ سارے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔اس راستے کے آس پاس ہمیں انسانی زندگی کے واضح آثار نظر آئے۔راستے کی حالت بھی خاصی بہتر ہو گئی تھی۔رات کی بارش سے ہر شے دھل دھلا کر نکھر آئی تھی۔فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ماحول کی تمام تر دل کشی اور ترو تازگی کے باوجود میرے دل و دماغ پر شدید یاسیت چھا رہی تھی۔گزشتہ شب کی تمام تر شب بیداری اور جاں فشانی کے باوجود ہمیں کیا ملا؟ رات کی تیرگی ہمارے دو ساتھی ہم سے چھین لے گئی۔

مرزا اور صدیقی! کتنے بلند حوصلوں اور فلک بوس توقعات کے ساتھ ہم گھر سے نکلے تھے۔جیسے آسمان کو زمین پر لے آئیں گے۔سردار شاہ مراد کے ناقابل تسخیر قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ملک کریم کو بھارتی ایجنٹوں کے قبضے سے ایسے نکال لائیں گے جیسے مکھن سے بال۔۔۔لیکن ہوا کیا۔۔۔اسے آزاد کرانے کے بجائے مرزا اور صدیقی خود بھی کسی اندھے غار میں جا گرے۔میں ڈاکٹر صنم کو ان کے متعلق کیا جواب دوں گا؟

ڈاکٹر صنم کا خیال آتے ہی مجھے افضل بھی یاد آ گیا۔اس کا کہنا تھا کہ ملک کریم کو گاؤں کے قریب کسی نو تعمیر شدہ حویلی میں رکھا گیا ہے۔لیکن تمام گاؤں والے اپنے موقف پر سختی سے قائم ہیں کہ گاؤں کے آس پاس ایسی کسی عمارت کا وجود نہیں ہے۔تو پھر وہ حویلی ہے کہاں؟ کیا افضل نے جھوٹ بولا ہے؟ پھر تو اس نے باقی سب کچھ بھی جھوٹ بتایا ہوگا۔کیا اس نے ہم سب کے ساتھ ڈرامہ کیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر ہم نے ڈاکٹر صنم کو تنہا اس کے پاس چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔کہیں اس نے ڈاکٹر صنم کو اپنی لچھے دار باتوں سے شیشے میں نہ اتار لیا ہو؟ ڈاکٹر صنم نے اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیے تو وہ اس کی زندگی اور عزت کے لیے بھیانک خطرہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

"گاڑی کی رفتار بڑھاؤ جواد!" میں نے شدید اضطراب کے عالم میں کہا۔وقت کی ریشمی ڈوری مجھے تیزی سے اپنے ہاتھوں سے پھسلتی محسوس ہوئی۔کہیں ہمیں دیر نہ ہو جائے۔جواد۔نے میرے لہجے کی تبدیلی کو محسوس کر لیا۔

"خیر تو ہے ذوالفقار بھائی؟"

"خدا کرے خیر ہی ہو۔" میں نے اپنے حوصلوں کو مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ مجھے اپنی آواز کا کھوکھلا پن خود بھی واضح طور پر محسوس ہوا۔

"کچھ بتائیں تو سہی آخر معاملہ کیا ہے؟" جواد نے سخت پریشانی کے عالم میں میری جانب دیکھا۔ گاڑی کی رفتار میں وہ پہلے ہی اضافہ کر چکا تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں کلبلاتے اندیشوں کو الفاظ کی شکل دے دی۔

"اف میرے خدا! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔" جواد نے چیختے ہوئے کہا۔ مجھے اس کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت نظر آئی۔

"کیا ہوا بیٹا؟" چچا مہرداد نے حیرانی سے پوچھا۔ جواد کی بے ساختہ چیخ نے اسے پریشان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے مہراں کے کراہنے کی دھیمی آواز سنی۔ شاید وہ اپنی نیند یا بے ہوشی سے بیدار ہو رہی تھی۔ چچا مہرداد اپنے سوال کو بھول کر اپنی بیٹی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"مہراں ۔۔۔ ہوش میں آؤ بیٹی۔" اس نے دھیرے سے اسے جھنجھوڑا۔ وہ دھیرے سے کراہی بالآخر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"بابا!" اس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ "بابا۔۔۔ بابا میرا سر بہت دکھ رہا ہے۔"

"فکر نہ کرو بیٹی ۔۔۔ تم ابھی ٹھیک ہو جاؤ گی۔ آنکھ کھولو۔ دیکھو ہم کہاں ہیں۔" مہراں نے بھی صورت حال کی تبدیلی کو محسوس کر لیا۔ چند لمحوں تک وہ شدید حیرانی کے عالم میں اپنے گردو پیش کا جائزہ لیتی رہی پھر اس نے مجھے دیکھ لیا۔ فرط استعجاب سے وہ اپنے سر کے درد کو بھول گئی۔

"تت ۔۔۔ تم ۔۔۔ سیفل!"

"ہاں یہ میں ہی ہوں۔ تم ٹھیک تو ہو مہراں؟ تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" میں نے پرخلوص لہجے میں اس کا حال پوچھا۔ اس لمحے میں گزشتہ تمام تلخیوں کو فراموش کر چکا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ پچھلی رات ہی کو وہ بڑی سرد مہری سے مجھے دھتکارنے کے انداز میں اپنے گھر سے رخصت ہو جانے پر مجبور کر چکی ہے۔ اس لمحے وہ صرف ایک مظلوم لڑکی تھی جسے میری ہمدردی درکار تھی۔ مہراں نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا پھر بے نیازانہ انداز میں مجھ سے آنکھیں پھیر لیں۔ میرے دل کو چوٹ سی لگی۔ خدا جانے اسے مجھ سے کیا پرخاش ہو گئی تھی۔

"یہ سب کیا ہے بابا؟ ہم یہاں کیسے پہنچ گئے؟ ہم تو وہاں۔۔۔"

"ہاں بیٹی تمہارے بے ہوش ہونے کے بعد میں بھی بے ہوش ہو گیا۔ وہ لوگ ہمیں اغوا کر کے لے گئے تھے۔ انہوں نے ہمیں قید میں ڈال دیا تھا پھر سیفل وہاں پہنچ گیا۔ یہ ہمیں وہاں سے چھڑا کر لے آیا ہے۔"

"لیکن یہ سب ہوا کیسے؟ اسے کیسے پتا چلا کہ ہم کہاں ہیں؟ ان لوگوں نے اتنی آسانی سے ہمیں کیسے چھوڑ دیا؟ انہوں نے اسے کچھ نہیں کہا؟" اس نے شدید حیرانی کے عالم میں میری طرف دیکھا۔ میرا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ چچا مہرداد کہیں پھر سے میری قتل و غارت گری کو کوسنا شروع نہ کر دیں!

"اس بات کو چھوڑو۔ سیفل نے جو کچھ کیا تمہاری عزت کی حفاظت کی خاطر کیا۔ اس خبیث فطرت نصر اللہ کی نیت کا کوئی بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے فاطمہ کی معصوم بچی کو نہیں بخشا تو تم پر بھی وہ اپنی خباثت کے سائے ڈال سکتا تھا۔ سردار شاہ مراد کو پتا بھی نہیں لگتا کہ ہم دونوں باپ بیٹی پر کیا گزری۔ یہ بد بخت ہماری لاشیں تک غائب کرا دیتا۔" چچا مہرداد نے متفکر لہجے میں کہا۔ فاطمہ کے ذکر پر میں چونک پڑا۔

"تم کون سی فاطمہ کی بات کر رہے ہو چاچا؟"

"وہی علم دین کی بیوہ! سرور کی ماں شیداں کے ساتھ اس کا بہناپا تھا۔ بے چاری حویلی کا کام کاج کر کے اپنی یتیم بچی کی پرورش کرتی تھی۔ ظالموں نے اس یتیم بچی کو بھی نہیں بخشا۔"

"لیکن یہ سب کیسے ہوا؟" میں نے شدید رنج کے عالم میں سوال کیا۔ "فاطمہ کی بیٹی تو رات کو سرور علی کے گھر رہا کرتی تھی کیا انہوں نے اسے وہاں اغوا کیا تھا؟"

"نہیں اسے انہوں نے فاطمہ کے گھر سے ہی اٹھایا تھا۔ اس روز دن کے وقت اس کا سرور علی کی بہنوں سے جھگڑا ہو گیا تھا اس نے اس رات ان کے گھر سونے سے انکار کر دیا۔ فاطمہ نے اسے سمجھایا لیکن وہ نہ مانی۔ مجبوراً فاطمہ نے فیصلہ کیا کہ وہ اس رات حویلی نہیں جائے گی بلکہ اپنے گھر پر اپنی بیٹی کے ساتھ ہی رات گزارے گی۔ وہ حویلی پہنچی تاکہ مالکان کو اپنی غیر حاضری سے آگاہ کر سکے۔ اسے واپسی کی اجازت تو مل گئی لیکن اس شرط پر کہ وہ اپنے ذمے لگے تمام کام مکمل کر کے جائے۔ کسی طرح سے اس بد بخت نصر اللہ کے کان میں بھی بھنک پڑ گئی کہ فاطمہ کے گھر میں اس وقت اس کی نوجوان لڑکی اکیلی ہے۔ وہ اسی وقت اپنے چمچے گامن کو ساتھ لے کر حویلی سے غائب ہو گیا۔ آدھی رات کے وقت اپنا کام ختم کر کے فاطمہ اپنے گھر پہنچی تو اپنے گھر کا دروازہ کھلا پا کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اپنی بیٹی کو غائب پا کر وہ روتی ہوئی سرور کے گھر پہنچی۔ اسے موہوم سی امید تھی کہ شاید اس کی واپسی میں دیر ہونے کے باعث وہ اپنی خالہ شیداں کے گھر چلی گئی ہو لیکن جب وہ اپنی منہ بولی بہن کے گھر پہنچی تو اس کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ دونوں عورتوں نے رو رو کر سارا گاؤں سر پر اٹھا لیا۔ گاؤں والوں نے نیم دلی سے لڑکی کو تلاش کرنے کی کوشش کی' ناکامی پر وہ چپ چاپ اپنے گھروں کو چلے گئے اور سکون سے سو گئے۔ اسی صبح منہ اندھیرے لڑکی واپس پہنچ گئی۔ اس دھمکی کے ساتھ کہ اگر ان دونوں ماں بیٹی نے زبان کھولنے کی کوشش کی تو انہیں ختم کر دیا جائے گا۔ فاطمہ کی بیٹی کی حالت تباہ ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود اسے ساتھ لے کر' گاؤں والوں سے منہ چھپا کر جانے کس طرف نکل گئی۔ اس کے بعد وہ دونوں واپس گاؤں نہیں

آئیں۔ ان کے جانے کے خاصے دنوں بعد شیداں نے بتایا کہ فاطمہ کی بیٹی کو سردار شاہ مراد کے منیجر نصراللہ اور گامن نے اغوا کیا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟" اس مرتبہ جواد نے سوال کیا۔ جواب دینے کی ذمہ داری چچا مہرداد کے بجائے میں نے سنبھال لی۔

"میں بتاتا ہوں کہ پھر کیا ہوا ہوگا۔ اس دردناک واقعے کے بعد گاؤں والے چند دنوں تک آپس میں میں کھسر پھسر کرتے رہے ہوں گے۔ راز دارانہ انداز میں سردار شاہ مراد کے کارندوں کو اکا دکا گالیاں بھی دی گئی ہوں گی۔ ہوسکتا ہے کسی گرم خون والے جوان نے سردار شاہ مراد کے اقتدار کے خلاف آواز بھی بلند کرنے کی کوشش کی ہو لیکن اس کے بزرگ' اس کا باپ' اس کا چاچا اس کے پیچھے پڑ گئے ہوں گے۔ اسے لعن طعن کیا گیا ہوگا کہ وہ سردار شاہ مراد جیسے ان داتا کے متعلق اول فول نہ بکے۔ تاویل پیش کی گئی ہوگی کہ یہ حرکت سردار شاہ مراد کی نہیں بلکہ اس کے کارندوں کی ہے۔ لہٰذا اسے قصوروار ٹھہرانا انصاف کے خلاف ہے۔

ایسے مواقع پر تمام لوگ اس حقیقت سے آنکھ بچا لیتے ہیں کہ سردار شاہ مراد وہ چھتر چھاؤں ہے جس کے تلے یہ تمام خوں خوار درندے پناہ حاصل کرتے ہیں۔ یہ تمام لوگ اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ سردار شاہ مراد خود بھی بدکردار' بدفطرت' شرابی اور زانی شخص ہے لیکن ان کے خیال میں چونکہ سردار شاہ مراد ایک سردار ہے' وڈیرا ہے' جاگیردار ہے' حاکم ہے' ان کی تقدیروں کا مالک ہے لہٰذا یہ اس کا استحقاق ہے کہ وہ جو چاہے کر گزرے۔ وہ مائی باپ ہے اس پر انگلی اٹھانا ان جیسے معمولی کیڑے مکوڑوں کو زیب نہیں دیتا۔

یہ وہ سوچ ہے جو ہمارے گاؤں اور ایسی ہی دیگر بستیوں میں صدیوں سے موجود ہے۔ اس سوچ کے خلاف اگر کوئی آواز اٹھائے' احتجاج کرے کہ خدا کی زمین پر تمام انسان برابر ہیں' تو اسے بھی میری طرح گردن زدنی قرار دیا جاتا ہے۔ گاؤں کے باسیوں کی نظروں کے سامنے گاؤں کی بہن بیٹیوں کی عزت لوٹ لی جاتی ہے لیکن تمام لوگ گونگے بہرے بنے بیٹھے رہتے ہیں' اس خیال کے تحت کہ کون سا ان کی اپنی بہن بیٹی کی عزت کی طرف ہاتھ اٹھ رہا ہے اور پھر وہ وقت بھی جلد ہی آجاتا ہے جب ان کی اپنی عزت بھی سرِ راہ کھلونا بن جاتی ہے۔"

مجھے لگا کہ میرے خون میں آگ کے الاؤ بھڑک رہے ہیں۔ جلتی ہوئی نگاہوں سے میں نے چچا مہرداد اور مہراں کی طرف دیکھا۔ وہ حیرت سے منہ پھاڑے میرا چہرا دیکھ رہے تھے۔ قدرے توقف کے بعد میں نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ "میرا قصور صرف یہ ہے کہ میں نے ان زمینی خداؤں کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا پھر رتا سائیں اور اس کے شیطان فطرت ساتھیوں نے مہراں کے متعلق اپنے ناپاک ارادوں کا اظہار کیا یہی وہ مرحلہ ہے جہاں میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں نے اپنے سینے

میں بھڑکتی نفرت کی آگ کو ان کے جسموں میں اتار دیا۔ مجھے یقین ہے کہ اس سیاہ رات کو اگر میں ان بد خصلت شیطانوں پر اپنے خنجر نہ آزماتا تو وہ مہراں کی عزت کی دھجیاں اڑا دیتے۔ میں نے جو کچھ کیا مجھے اس پر کسی قسم کی شرمندگی نہیں ہے۔ اب مجھے آپ کی زبانی نصراللہ اور گامن کے جو کرتوت معلوم ہوئے ہیں ان کے لحاظ سے ان کی کم از کم سزا موت ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ دونوں بدبخت بھی ہمارے ہی ہاتھوں کیفرِ کردار تک پہنچے ہیں۔"

میری اس جذباتی تقریر کے جواب میں وہ دونوں باپ بیٹی خاصی دیر تک کچھ نہیں کہہ سکے۔ جواد بار بار عجیب سی نظروں سے مجھے گھورنے لگتا تھا۔ بالآخر چچا مہرداد نے اپنی زبان کھولی۔

"چلو میں نے مان لیا کہ تم نے رتا سائیں کے ساتھ جو کچھ کیا صحیح کیا لیکن تم ابھی تک سردار شاہ مراد کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو؟ لعنت بھیجو اس پر اور یہاں سے بہت دور کسی پرسکون مقام پر اپنی زندگی گزار دو۔"

"کاش کہ ایسا ممکن ہوتا چاچا۔ میں یہاں سے بہت دور چلا گیا تھا لیکن مجھے واپس لوٹنا پڑا۔ پوری تفصیل میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال یہ سمجھ لو کہ اب میں ذاتی طور پر نہیں بلکہ سرکاری طور پر سردار شاہ مراد کے خلاف کام کر رہا ہوں۔"

"سرکاری طور پر؟" مہراں اور چچا مہرداد نے بہ یک وقت بلند آواز میں سوال کیا۔

"ہاں۔۔۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ مزید تفصیل میں تمہیں کسی مناسب وقت پر بتاؤں گا۔ فی الحال ہم شہر کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ ہمیں تیاری شروع کر دینی چاہیے۔"

"کیسی تیاری ذوالفقار بھائی؟" جواد نے حیرانی سے پوچھا۔ مہراں اور چچا مہرداد نے شاید پہلی بار مجھے اس نئے نام سے پکارنے پر توجہ دی۔

"ذوالفقار۔۔۔؟" چچا نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"یہ میرا سرکاری نام ہے چاچا۔ بہتر ہے تم دونوں بھی مجھے اسی نام سے پکارو۔ یعنی ذوالفقار علی خان۔" مہراں نے زیرِ لب میرا یہ نام دہرایا۔ پہلی بار مجھے اس کے چہرے پر نرمی کے آثار نظر آئے۔

"آپ نے بتایا نہیں کہ ہمیں شہر میں داخل ہونے کے لیے کون سی تیاریاں کرنی ہیں؟" جواد نے اپنا سوال دہرایا۔ "ارے بھائی تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ہم لوگ اس وقت سردار شاہ مراد کے منیجر نصراللہ کی گاڑی میں سوار ہیں۔ ہوسکتا ہے اب تک اس کی تلاش شروع ہو چکی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس گاڑی کو سردار شاہ مراد کی گاڑی کی حیثیت سے پہچان لیا جائے۔ لہٰذا ہمیں شہر میں داخل ہونے سے پہلے اس گاڑی سے جان چھڑا لینی چاہیے۔ یہ کلاشنکوف بھی ہم اپنے ساتھ ساتھ لٹکائے نہیں پھر سکتے۔ اسے بھی کسی مناسب جگہ چھپانا پڑے گا۔ جو خدشات میرے ذہن میں موجود ہیں اگر وہ صحیح ہیں تو ہم لوگ شدید خطرات کی زد میں ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''کیسے خطرات ذوالفقار بھائی؟'' جواد نے کہا۔ وہ گاڑی کی رفتار آہستہ کرکے ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا تاکہ گاڑی ٹھہرانے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر سکے۔ چچا مہرداد اور مہراں بھی حیرانی سے میری باتیں سن رہے تھے۔ میں نے مختصر الفاظ میں انہیں ڈاکٹر صنم اور افضل کے متعلق اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔ میری گفتگو سن کر ان کے چہرے پر سراسیمگی کے تاثرات ابھر آئے۔

''اس کا مطلب ہے ہمیں فوری طور پر وہاں پہنچنا چاہیے۔ وہ شخص ڈاکٹر صاحبہ کو جسمانی تشدد کا نشانہ بھی بنا سکتا ہے۔ اگر ہم نے یہ جیپ یہاں چھوڑ دی تو ہمیں وہاں پہنچنے میں بہت دیر لگ جائے گی۔ ہم لوگ ایک لمحے کا وقت بھی ضائع کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔''

''لیکن ایسی صورت میں براہ راست وہاں پہنچنا بھی تو خطرے سے خالی ہے۔ فرض کیا یہ جیپ کسی کی نظر میں نہ آئے تو بھی یہ خطرہ تو اپنی جگہ موجود ہے کہ افضل اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہم لوگوں کے لیے خونی جال بچھائے بیٹھا ہوگا۔'' میں نے پرتشویش لہجے میں کہا۔

''لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ افضل ابھی تک آزاد ہونے میں کامیاب نہ ہو سکا ہو۔'' جواد نے اجازت طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''کاش ایسا ہی ہو لیکن جانے کیوں مجھے یقین سا ہو گیا ہے کہ افضل اپنی چال میں کامیاب ہو چکا ہے۔'' میں نے دھیمی آواز میں انہیں اپنی ذہنی کیفیت سے آگاہ کیا۔ جواد کے چہرے پر چند لمحوں تک کشمکش کے تاثرات نمایاں رہے پھر ان کی جگہ عزم و استقامت کے جذبات نے لے لی۔

''بہرحال معاملہ کچھ بھی ہو وہاں خواہ کتنے ہی خطرات میرے منتظر ہوں میں وہاں ضرور جاؤں گا۔ میں آپ لوگوں پر زور نہیں دوں گا۔ آپ لوگ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ آپ جہاں کہیں گے میں آپ کو وہاں اتار دوں گا۔ یہ جیپ میں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔''

''جذباتی نہ بنو جواد۔ ڈاکٹر صنم کی عزت اور زندگی جس طرح تمہیں عزیز ہے' اسی طرح ہمیں بھی ہے۔ میں وہاں جانے سے انکار نہیں کر رہا۔ میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہم اس انداز میں وہاں پہنچیں کہ افضل اگر اپنی سازش میں کامیاب ہو گیا ہو تب بھی وہ فوری طور پر ہمارے خلاف کوئی کاروائی نہ کر سکے۔ ہمیں اتنی مہلت مل جائے کہ ہم لوگ بخوبی اپنا دفاع کر سکیں۔ ہم لوگ وہاں ضرور جائیں گے لیکن بھرپور تیاری اور مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ۔ اگر ہم آنکھیں بند کرکے ان لوگوں کے پھندے میں پھنس جائیں تو اس طرح ہم ڈاکٹر صنم کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔''

''تو پھر آپ ہی بتائیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' میری بات کا وزن محسوس کرکے جواد نے اپنے جوش پر قابو پانے کی کوشش کی۔

''ذرا صبر کرو۔ میں تمہیں پوری تفصیل سے آگاہ کرتا ہوں۔ تم بے شک یہ جیپ بھی نہ چھوڑو۔ اس صورت میں تمہیں صرف یہ کوشش کرنا پڑے گی کہ ہم ایسے راستوں سے گزریں کہ کم سے کم لوگوں کی نگاہ

ہماری جیپ پر پڑ سکے۔''

''انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے کیا ترکیب سوچی ہے؟''

میں نے خاصی تفصیل سے انہیں اپنے ذہن میں موجود منصوبے سے آگاہ کیا۔ میری توقع کے عین مطابق انہیں میری منصوبہ بندی بہت پسند آئی۔ تھوڑے سے رد و بدل کے بعد ہم چاروں اس منصوبے پر متفق ہو گئے۔ جب ہم شہر میں داخل ہوئے تو سورج کی نرم کرنیں درختوں کی سرسبز چوٹیوں کا بوسہ لے رہی تھیں۔ سڑکوں پر پوری طرح چہل پہل شروع نہیں ہوئی تھی۔ جواد شہر کی بڑی سڑکوں سے بچتا بچاتا کم آباد سڑکوں سے گزرتا شہر کے مرکز کی طرف بڑھا۔ اس وقت وہ مکمل طور پر اپنی صوابدید پر کام کر رہا تھا۔ سترہ بلاک کے ایک گندے سے کونے میں واقع ایک چھوٹے سے گھر کے سامنے پہنچ کر اس نے گاڑی روک لی۔ انجن بند کرکے وہ گاڑی سے اترا اور خاصے زور سے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے پہلے سے بھی زیادہ قوت سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

''کون ہے بے؟'' اندر سے کسی نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ جواب دینے کے بجائے جواد نے پہلے سے بھی زیادہ زور سے' تقریباً پوری قوت سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

''ابے کیا پاگل ہو گیا ہے سالے؟ دروازہ توڑے گا کیا؟ ذرا صبر کر چھری کے نیچے دم تو لے۔'' اندر سے کسی نے شدید ناراضگی کے عالم میں کہا۔ جواد کے لبوں پر ایک شریر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے ایک بار پھر زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

''اوئے تیری تو۔۔ ابھی تجھے مزا چکھاتا ہوں۔۔۔ کی اولاد۔۔۔ پاگل کی نسل۔'' کسی کے بھاری قدموں کی آہٹ دروازے کی طرف بڑھی۔ ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا۔ میں نے دروازے کو ایک موٹے تازے نوجوان کے وجود سے بھرتے دیکھا۔ اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں لیکن اس کی ہیبت کذائی نے مجھے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ اس نے دھاری دار پاجامہ پہنا ہوا تھا جس کا ازار بند تقریباً زمین کو چھوتا ہوا جھول رہا تھا۔ اس کے گلے میں میلی سی تولیا لپٹی ہوئی تھی۔ چہرے پر شیو کا صابن لگا ہوا تھا۔ جواد کی اشتعال انگیز مداخلت کے باعث اسے اپنی شیو ادھوری چھوڑ کر آنا پڑا تھا۔ غصے کے باعث اس کی توند بنیان سے نہایت مضحکہ خیز انداز میں پھولتی پچکتی نظر آ رہی تھی۔ جواد کو دیکھتے ہی اس کا سارا غصہ ہوا میں اڑ گیا۔ اس نے تیزی سے اس کی طرف بڑھنا چاہا لیکن ازار بند پیر کے نیچے کے باعث وہ منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔

''اوئے جواد تو؟ معاف کرنا یار پتا نہیں غصے میں کیا کیا کہہ گیا۔ تو اتنے صبح سویرے کیسے؟ وہ والہانہ انداز میں جواد سے لپٹ گیا۔

''بس بس مکھن بازی بعد میں۔ میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ مجھے تیرے سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ چل گھر میں چل۔'' اس نے نہایت بے تکلفی سے اس فربہ نوجوان کو گھر کے اندر دھکا

دیا۔ پھر وہ ہماری طرف مڑا۔

”آپ لوگ یہیں ٹھہریں۔ میں ابھی دو منٹ میں واپس آتا ہوں۔ یہ میرا دوست خالد ہے۔ میں نے اسی کے متعلق آپ کو بتایا تھا۔“ ہم نے اثبات میں سر ہلا دیے۔ وہ دونوں گھر میں داخل ہو گئے۔ ان کے جاتے ہی مجھ پر اضطراب طاری ہونے لگا۔ وہ گاڑی بے حد تباہ کن ٹائم بم کے مانند تھی جو کسی بھی وقت ہم لوگوں کے لیے موت کا سامان بن سکتی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ہم لوگوں کے اضطراب میں اضافہ ہوتا گیا۔ آخر کار خدا خدا کر کے ہمیں ان دونوں کی شکل نظر آئی۔ اس دوران میں خالد نے اپنا حلیہ درست کر لیا تھا۔ وہ سیدھا جیپ کی طرف بڑھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ جیپ میں بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر کے ایک طرف روانہ ہو گیا۔

”آپ لوگ گھر میں چلیے۔ ہمیں کچھ دیر یہاں ٹھہرنا ہو گا۔“ جواد نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں گھر میں داخل ہونے کی دعوت دی۔ ہم لوگ بلا توقف گھر میں داخل ہو گئے۔ پہلی ہی نظر میں ہمیں اندازہ ہو گیا کہ دو کمروں کا یہ گھر کسی چھڑے چھانٹ شخص کی ملکیت ہے۔ ہر طرف زبردست بے ترتیبی اور لاپروائی کے آثار بکھرے نظر آئے۔ مہراں کے چہرے پر یہ حالات دیکھ کر ناگواری کے تاثرات ابھرے۔

”معاف کیجیے گا۔ دراصل میرا یار بہت ہی لاپرواہ اور من موجی قسم کا بندہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ شاید اس شہر کا سب سے اچھا موٹر مکینک ہے۔ چند ہی سالوں میں اس نے اپنا اچھا خاصا بڑا گیراج بنا لیا ہے۔ میں نے وہ جیپ اس کے حوالے کر دی۔ یہ اس کی اتنی مہارت سے شکل بدلے گا کہ کسی کا باپ بھی اسے پہچان نہیں سکے گا۔ فی الحال یہ ہمارے لیے ایک اور گاڑی لے کر آئے گا جس پر بیٹھ کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔“ جواد نے مطمئن لہجے میں کہا۔ میں نے ایک بار پھر محسوس کیا کہ اس کی نظریں بار بار بھٹک کر مہراں کے چہرے پر جمنے لگتی ہیں تاہم اس نے براہ راست مہراں پر نظر ڈالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ اس سے نگاہ چرانے کی حتی الوسع کوشش کر رہا تھا۔ اسی وقت میری نظر دودھ کے برتن پر پڑی جو شاید کچھ دیر پہلے خریدا گیا تھا۔

”مہراں تم یہ دودھ باورچی خانے میں لے جاؤ۔ مجھے یقین ہے وہاں چائے بنانے کا سامان موجود ہو گا۔ جب تک خالد صاحب واپس آئیں، تم چائے تیار کر لو۔“ میں نے دھیمے لہجے میں مہراں کو ہدایت کی۔ توقع کے عین مطابق باورچی خانے میں ناشتے کی تیاری کا مکمل سامان موجود تھا۔ مٹی کے تیل کے چولہے پر چائے تیار کرنے میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ چائے تیار کر کے فارغ ہی ہوئی تھی کہ خالد واپس آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک بڑا سا شاپنگ بیگ بھی لایا تھا جس میں کیک بسکٹ اور پیسٹری وغیرہ تھی۔

”کون سی گاڑی لائے ہو؟“ جواد نے اس سے پوچھا۔

”ہائی لکس ہے ڈبل کیبن فور ویل ڈرائیو۔“

”کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے؟“

”ارے نہیں میری جان۔ استعمال کرو اور دریا میں پھینک دو۔ تیری آنکھ کے اشارے پر ایسی لاکھوں گاڑیاں قربان!“

”جو رینج رودر لے گئے تھے اس کی رپورٹ درج کرا دی تھی تم نے؟“ جواد نے سوال کیا۔

”ارے نہیں بھائی۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس گاڑی کے کاغذات، رجسٹریشن نمبر، چیسی نمبر اور انجن نمبر سب فرضی تھے۔ کسی کے باپ کو بھی اس کی اصلیت کا پتا نہیں چل سکتا۔ اس گاڑی کے ساتھ بھی یہی صورت حال ہے۔ تمہارا بھائی کچے کام نہیں کرتا۔“ خالد نے چائے پیتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا۔

”اچھا اب ذرا سنجیدہ باتیں ہو جائیں۔“ میں نے ان تمام لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا ”ہم نے جو منصوبہ بنایا وہ مختصراً اس طرح ہے۔ ہم لوگ اس گاڑی میں ڈاکٹر صنم کے گھر کی طرف چلیں گے۔ گھر سے خاصی دور ہم گاڑی کو روک دیں گے“ چچا مہر داد اور مہراں کو وہاں اتار دیں گے۔ جواد وہیں گاڑی میں رہے گا جبکہ میں ان دونوں کی نگرانی اور حفاظت کے لیے ان کے پیچھے پیچھے کافی فاصلہ رکھ کر چلوں گا۔ اگر ہمیں ڈاکٹر صنم کے گھر کے آس پاس خطرے کے آثار نظر آئے تو ہم چپ چاپ سیدھے نکلتے چلیں گے۔ بصورت دیگر یہ دونوں ڈاکٹر صنم کے گھر پہنچ کر اطلاعی گھنٹی بجائیں گے۔ اگر دروازہ کھولنے کے لیے ڈاکٹر صنم خود آئی تو اس کا مطلب ہے کہ حالات فی الحال خراب نہیں ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں خود میں بھی سامنے آ جاؤں گا۔ بالفرض محال اگر گیٹ پر ڈاکٹر صنم کے بجائے افضل خود آئے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ ابھی تک فرار نہیں ہوا ہے۔ ایسی صورت میں آپ دونوں ڈاکٹر صنم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کریں گے۔ ظاہری بات ہے کہ وہ آپ دونوں کو ٹالنے کی کوشش کرے گا۔ اس دوران میں، موقع ملتے ہی میں آنکھ بچا کر چار دیواری سے اندر کود جاؤں گا۔ اس کے بعد میں موقع محل کی مناسبت سے اپنی حکمت عملی وضع کروں گا۔ اس دوران میں جواد اپنی گاڑی کے ساتھ قرب و جوار میں موجود رہے گا۔“

”ٹھیک ہے ہم نے تمام باتیں پوری طرح سمجھ لی ہیں۔ خالد کا اصرار ہے کہ یہ بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔ مجھے آپ لوگوں کی اجازت چاہیے۔“ جواد نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ خالد صاحب کو بھی اپنے ساتھ لے چلو لیکن انہیں عملی کارروائی سے علیحدہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرنا۔“ جواد اور خالد نے اقرار کے اظہار کے لیے اپنی گردن کو جنبش دی۔

ممکنہ حد تک بھرپور تیاری کے بعد ہم گاڑی میں آ بیٹھے گاڑی کا اسٹیئرنگ ویل خالد نے سنبھال لیا۔ میں اور جواد فرنٹ سیٹ پر بیٹھے جبکہ چچا مہر داد اور مہراں کو عقبی نشستوں پر جگہ ملی۔ خالد نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کچھ ہی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ جواد سے بھی ماہر ڈرائیور ہے۔ گاڑی اس کی انگلی کے

اشارے پر رقصاں تھی۔ جواد نے مختصراً اسے راستے کے متعلق ہدایت دی۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی فرائے بھرنے لگی۔ بہت کم وقت میں ہم اپنی منزل کے قریب پہنچ گئے۔ ایک مناسب جگہ دیکھ کر خالد نے گاڑی ٹھہرالی۔ مہراں نے سہارا دے کر چچا مہرداد کو گاڑی سے اتارا۔ مہراں کے سر پر خالد کی مہیا کردہ سفید چادر تھی۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی گاڑی سے اتر آیا۔ وہ دونوں آگے بڑھے۔ چچا مہرداد بری طرح لنگڑا رہا تھا۔ تاہم وہ مہراں کے سہارے سے آگے بڑھتا رہا۔ مناسب فاصلہ رکھ کر میں بھی ان کے تعاقب میں چل پڑا۔ میرے نیفے کی بیلٹ میں جواد کا سلائنسر لگا پستول موجود تھا۔ اپنی جیکٹ میں گاڑی میں چھوڑ آیا تھا۔

بغور آس پاس کا جائزہ لینے کے باوجود مجھے آس پاس کسی قسم کے خطرے کے آثار نظر نہیں آئے۔ اس وقت اس سڑک پر کوئی گاڑی نہیں تھی۔ نہایت سست رفتاری سے میں ان دونوں باپ بیٹی کا تعاقب کرتا رہا۔ میری طرف سے کوئی اشارہ نہ پا کر وہ دونوں ڈاکٹر صنم کے گھر کے گیٹ کی طرف بڑھے۔ میں نے ایک محفوظ اور قریب ترین پناہ گاہ تلاش کی پھر ڈاکٹر صنم کے گھر کا جائزہ لینے لگا۔ چچا مہر داد نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ میں ردعمل کا انتظار کرنے لگا۔ قدرے توقف کے بعد چچا مہرداد نے ایک بار پھر اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ میں نے ان کی نظروں کے زاویے سے اندازہ لگایا کہ کوئی گیٹ کی طرف آرہا ہے۔ میرے ہاتھ کی گرفت پستول کے دستے پر سخت ہونے لگی۔ ہیجان کی شدت سے مجھے اپنی رگیں کھنچتی محسوس ہوئیں۔ اندر سے آنے والا گیٹ پر پہنچا۔ اس کی ایک جھلک دیکھتے ہی میرے سینے سے ایک گہری سانس آزاد ہوئی۔ میرے کشیدہ اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ بالا شبہ ڈاکٹر صنم ہی تھی۔ نیلے رنگ کے شب خوابی کے لبادے میں ملبوس اپنی گھنی زلفوں میں ڈھیلے ڈھالے جوڑے کی شکل میں لپیٹے۔ صبح کی نرم دھوپ میں نقرئی مجسمے کی مانند لشکارے مارتی۔ اسے دیکھ کر چچا مہرداد اور مہراں بھی پرسکون ہو گئے ہوں گے۔

میں نے اوٹ سے نکل کر گیٹ کی طرف بڑھنا چاہا لیکن جانے کیوں میں نے اپنا یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ خطرے سے نجات کے پرکیف احساس نے مجھے شاید شرارت پر اکسانا شروع کر دیا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق ڈاکٹر صنم نے انہیں گھر کے اندر بلانے کی بجائے باہر ہی سے ٹالنے کی کوشش کی۔ مایوسی کے عالم میں ان چہرے لٹک گئے۔ مہراں نے اس سے کچھ کہا۔ ڈاکٹر صنم نے اس بات میں سر ہلایا اور گیٹ سے پیچھے ہٹ گئی۔ مہراں نے گردن کے اشارے سے مجھے حرکت میں آنے کی ہدایت کی۔ مجھے معلوم تھا اس نے ڈاکٹر صنم سے پانی پلانے کی فرمائش کی ہوگی۔

جوں ہی مجھے یقین ہوا کہ ڈاکٹر صنم اب گھر میں داخل ہو چکی ہے' میں تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ چار دیواری کے کونے کے پاس پہنچ کر میں نے اچک کر دیوار کا اوپری سرا تھاما اور اپنے بازوؤں پر زور ڈال کر اوپر اٹھتا چلا گیا۔ اگلے ہی لمحے میں چار دیواری کے اندر اتر چکا تھا۔ سامنے ہی مجھے ڈاکٹر صنم

کی گاڑی نظر آئی۔ میں تیزی سے اس کے عقب میں چھپ گیا۔ عین اسی وقت گھر کے اندر سے ڈاکٹر صنم نمودار ہوئی۔ اپنے معمول کے مطابق اس نے داخلی دروازے کی بجائے گھر کے پہلو میں واقع چھوٹا دروازہ استعمال کیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پلاسٹک کی بوتا اور شیشے کا گلاس اٹھا رکھا تھا۔ گیٹ کے پاس پہنچ کر اس نے پانی کا گلاس بھرا اور اسے سلاخوں کے درمیان سے باہر کی طرف بڑھا دیا۔ عین اسی وقت میں حرکت میں آ گیا۔ ہوا کے بے آواز جھونکے کے مانند میں گھر کے پہلو میں پہنچا۔ دروازہ کھول کر میں نے احتیاط سے اندر جھانکا۔ مجھے سامنے ہال میں کوئی نظر نہ آیا۔ میں تیزی سے اندر گھستا چلا گیا۔ اپنے چھپنے کی جگہ بھی میں نے فوراً تلاش کر لی۔

بھاری بھرکم پردوں نے با آسانی مجھے پناہ دے دی۔ میرے وجود میں ایک پرلطف سنسنی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ مجھے اچانک اپنے سامنے پا کر ڈاکٹر صنم بری طرح چونک پڑے گی۔ اس کی حواس باختگی کا میں خوب مذاق اڑاؤں گا۔ وہ سالا افضل ابھی تک مسہری سے جکڑا اپنی قسمت کو رو رہا ہوگا۔

میری متوقع نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ بالآخر دروازے میں جنبش ہوئی۔ ڈاکٹر صنم اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی بوتل اور گلاس تھا۔ مجھے اس کے چہرے پر گہری سوچ اور تفکر کے آثار نظر آئے۔ وہ یقیناً میرے' مرزا اور صدیقی کے متعلق سوچ رہی ہوگی۔ وہ نہایت بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہی ہوگی۔ ہو گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا ہوگا۔

پانی کی بوتل ریفریجریٹر میں رکھنے کے بعد وہ افضل کے کمرے کی طرف بڑھی۔ جونہی وہ کمرے میں داخل ہوئی' میں بھی پنجوں کے بل چلتا کمرے کے دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ میرے کان اندر سے آنے والی آوازوں پر جم گئے۔

"دیکھو افضل تم پلیز ناشتہ کر لو۔ دیکھو میں نے تمہارے لیے کتنے اچھے انڈے تیار کیے ہیں۔" میں نے ڈاکٹر صنم کی ملتجی آواز سنی۔

"نہیں میں ہرگز ناشتہ نہیں کروں گا۔ نہ کھانا کھاؤں گا۔ میں بھوکا مروں گا۔" افضل نے معصومانہ غصے کے ساتھ کہا۔ اگر میں اس کی طرف سے مشکوک نہ ہوتا تو اس کے لہجے میں موجود معصومانہ ضد کی جھلک یقیناً مجھے بھی متاثر کرتی۔ البتہ میں کوشش کے باوجود اس کے لہجے میں تصنع اور بناوٹ کا عنصر تلاش نہ کر سکا۔

"ایسا نہ کہو۔ افضل ورنہ تمہاری ندا تم سے ناراض ہو جائے گی۔"

"ہو جاؤ۔۔۔ مجھ سے ناراض ہو جاؤ۔ میں پہلے ہی تم سے ناراض ہوں۔ تم کچھ بھی کہو۔ میں ہرگز ناشتہ نہیں کروں گا۔"

"لیکن کیوں؟ کچھ پتہ تو چلے۔ تم کیوں ناراض ہو؟" ڈاکٹر صنم نے بے چارگی سے کہا۔ "تم اپنی ندا کو بھی نہیں بتاؤ گے؟"

’’جاؤ جاؤ میں تم سے بات نہیں کرتا تم میری ندا نہیں ہو۔تم میری بات نہیں مانتی ہو۔ میں تم سے ناراض ہوں۔‘‘

’’ارے ارے بھائی ناراضگی کی کوئی وجہ بھی تو ہوگی۔ وہ وجہ تو معلوم ہو۔‘‘ ڈاکٹر صنم نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ یک لخت میرے دل کی دھڑکن میں اضافہ ہونے لگا۔ میرے جسم کی تمام طاقت میرے کانوں میں سمٹ آئی۔

’’پھر تم میرے ہاتھ کیوں نہیں کھولتی؟ جب تک تم میرے ہاتھ نہیں کھولو گی میں کچھ نہیں کھاؤں پیوؤں گا۔ بھوکا مروں گا۔‘‘ افضل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ مجھے اپنے شکوک یقین میں بدلتے محسوس ہوئے۔

’’ایسی بات نہ کرو افضل، مریں تمہارے دشمن تم نے آیندہ ایسی بات کی تو تمہاری ندا جان دے دے گی۔‘‘ مجھے ڈاکٹر صنم کے لہجے میں ایسی بے ساختگی نظر آئی کہ میں دل ہی دل میں اسے بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہوگیا۔ وہ واقعی غضب کی اداکاری کر رہی تھی۔

’’مر جاؤ۔ مر جاؤ تم بھی مر جاؤ، ہم دونوں مر جائیں۔ تم میری ندا نہیں ہو۔ تم میری ندا ہوتی تو میری بات ضرور مان لیتی۔ جاؤ میں تم سے بات نہیں کرتا۔‘‘

’’میں مجبور ہوں افضل۔ فی الحال میں تمہارے ہاتھ نہیں کھول نہیں سکتی۔ تم دوپہر تک صبر کرلو پھر میں تمہارے ہاتھ کھول دوں گی۔ ابھی تم میرے ہاتھ سے کھانا کھالو۔‘‘

’’نہیں۔ میں اپنے ہاتھ سے کھانا کھاؤں گا۔ تم میرا صرف ایک ہاتھ کھول دو۔‘‘ اس نے ضدی بچے کے انداز میں کہا۔

’’اوہو تمہاری اس بحث میں ناشتہ بالکل ٹھنڈا ہوگیا۔ میں ابھی اسے گرم کر کے لاتی ہوں۔‘‘ میں نے ڈاکٹر صنم کی پرسکون آواز سنی۔ میں نے لمبے ڈگ بھرے اور پلک جھپکنے میں باورچی خانے میں پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صنم کے قدموں کی چاپ باورچی خانے کی سمت بڑھی۔ وہ ناشتے کی ٹرے اٹھائے باورچی خانے میں داخل ہوئی۔ میں نے بڑی خاموشی سے باورچی خانے کا دروازہ بند کرلیا۔ وہ ناشتے کی ٹرے چولہے کے پاس رکھ کر پلٹی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی۔ وہ حیرت اور بے یقینی کے عالم میں منہ پھاڑے میری شکل دیکھ رہی تھی۔ بالآخر اسے اپنی آنکھوں پر یقین آ ہی گیا۔

’’تت۔۔۔تم۔۔۔تم۔۔۔‘‘ اس نے لڑکھڑاتی زبان سے اپنی حیرت کا اظہار کرنا چاہا۔

’’ہاں یہ میں ہی ہوں۔ آپ اپنی حالت پر قابو پایئے ہمیں بہت اہم باتیں کرنی ہیں۔‘‘

’’تم۔۔۔تم ٹھیک تو ہو نہ؟ اور مرزا اور صدیقی صاحب؟‘‘

’’میں آپ کو سب کچھ بتا دیتا ہوں۔ براہ کرم آپ اپنے آپ پر قابو رکھیے گا۔ مجھے آپ کی بھرپور مدد درکار ہے۔‘‘ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے اسے گزشتہ شب کے ہنگامہ خیز واقعات کے متعلق مختصراً بتایا۔ مرزا اور صدیقی کی پراسرار گم شدگی کی تفصیل سن کر اس کا چہرہ یک لخت زرد پڑ گیا۔ تاہم اس نے اپنی بے مثال قوت ارادی سے خود پر قابو پالیا۔ البتہ جب اس نے زبان کھولی تو مجھے اس کی آواز میں واضح لرزش نظر آئی۔

’’اب۔۔اب کیا ہوگا؟‘‘

’’میرے خیال میں یہ سب کیا دھرا اس شخص افضل کا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کی یہ حالت دراصل ایک ڈراما ہے۔ یہ درحقیقت بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ اس نے جھوٹ بول کر ہم لوگوں کو موت کے منہ میں دھکیلنے کی کوشش کی اور اپنی اس کوشش میں خاصی حد تک کامیاب بھی ہو گیا۔ یہ محض ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم زندہ سلامت یہاں پہنچنے میں کامیاب ہوگئے لیکن ہم اپنے دو ساتھیوں کو وہیں چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔‘‘

’’تو پھر اب ہم کیا کریں؟ کیا تم اس پر تشدد کرو گے؟‘‘

’’وہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلے تو میں یہ چاہتا ہوں کہ کسی طرح سے اس کا جھوٹ کھل کر سامنے آ جائے۔ اس کا ڈھونگ ختم ہوگیا تو میں اسے زبان کھولنے پر مجبور کر دوں گا۔‘‘

’’لیکن ہم اس کا پول کیسے کھول سکتے ہیں؟‘‘ ڈاکٹر صنم نے حیرانی سے کہا۔ ’’بہت آسان ترکیب ہے لیکن خطرناک بھی۔ اس کے نتیجے میں آپ زخمی بھی ہوسکتی ہیں۔‘‘

’’تم میری فکر نہ کرو بلکہ مجھے وہ ترکیب بتاؤ۔ یہ شخص میرے لیے شدید جذباتی الجھن کا سبب بنا ہوا ہے۔ میں ہر قیمت پر اس کی اصلیت سے آگاہ ہونا چاہتی ہوں۔‘‘ ڈاکٹر صنم نے مضبوط لہجے میں کہا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے اپنے ذہن میں موجود منصوبے سے آگاہ کر دیا۔

’’بہت خوب۔ مجھے بھی یقین ہے کہ اس طرح ہم اس کی اصلیت سے واقف ہو جائیں گے تم میری طرف سے بے فکر رہو۔ میں یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہوں۔‘‘

’’تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ ناشتا گرم کر کے لے جایئے۔ میں آپ سے زیادہ دور نہیں ہوں گا۔‘‘

ڈاکٹر صنم ناشتہ لے کر افضل کے کمرے میں پہنچی۔ پنجوں کے بل چل کر میں بھی کمرے کے دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہوا۔ ’’لو جناب تمہارا ناشتا آ گیا۔‘‘ ڈاکٹر صنم نے پیار بھرے انداز میں کہا۔

’’میں نے کہا نا، میں ناشتا ہرگز نہیں کروں گا۔‘‘ افضل نے درشت لہجے میں کہا۔ ’’تم مجھے اپنے ہاتھ سے ناشتا کرانے کی کوشش نہ کرنا۔‘‘

’’لیکن کیوں؟‘‘ ڈاکٹر صنم نے سادگی سے پوچھا۔

’’تم میرے ہاتھ کھول دو۔ ورنہ میں اپنا سر پھوڑ لوں گا۔‘‘ افضل نے جنونی لہجے میں کہا۔

’’ارے۔۔۔ارے تم تو ناراض ہوگئے۔ ٹھیک ہے میں تمہارا ایک ہاتھ کھول دیتی ہوں لیکن تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم ناشتا کرنے کے بعد شرافت سے اپنا ہاتھ دوبارہ بندھوا لو گے۔‘‘ ڈاکٹر صنم نے نہایت

رسانیت سے اسے سمجھایا۔

"ٹھیک ہے میں وعدہ کرتا ہوں۔ آپ میرا ہاتھ کھول دیں۔" میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ کہیں میں کسی غلطی کا مرتکب تو نہیں ہو رہا ہوں؟ "آہا کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ میرے تو ہاتھ سن ہو گئے۔ اب میں ہمیشہ اپنے ہاتھ سے ہی کھانا کھاؤں گا۔"

"اچھا جناب ٹھیک ہے۔ اب تم ناشتا کرو۔" ڈاکٹر صنم نے متحمل لہجے میں کہا۔

"اونہوں تم نے آلو بھرا پراٹھا تو پکایا ہی نہیں۔" افضل نے بچے کی طرح مچلتے ہوئے کہا۔

"ابھی تم ناشتا کر لو۔ میں دوپہر کے کھانے میں تمہارے لیے پراٹھا پکا دوں گی۔" ڈاکٹر صنم نے نرم لہجے میں اسے بہلانے کی کوشش کی۔

"نہیں نہیں! میں تو ابھی آلو والا پراٹھا کھاؤں گا۔ تم ابھی میرے لیے آلو بھرا پراٹھا پکا کر لاؤ۔ ورنہ میں ناشتا نہیں کروں گا۔"

"افوہ! تم بہت تنگ کرنے لگے ہو۔ تم ذرا صبر کرو۔ میں ابھی تمہارے لیے آلو بھرا پراٹھا لاتی ہوں۔ دیر ہو جائے تو شور مت مچانا۔" ڈاکٹر صنم نے مشفقانہ لہجے میں اسے تنبیہ کی۔ وہ بلاشبہ بہت اچھی اداکاری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ افضل کی بے وقت کی ضد نے میرے شک کو مزید مستحکم کر دیا۔ سب کچھ میری توقع کے عین مطابق ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر صنم افضل کے کمرے سے باہر نکلی۔ ایک معنی خیز نظر مجھ پر ڈال کر وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے چھپنے کے لیے کوئی ایسا مقام تلاش کرنا چاہا جہاں سے میں بغیر کوئی وقت ضائع کیے ڈاکٹر صنم کی مدد کو پہنچ سکوں۔ میری پوری کوشش کے باوجود مجھے کوئی بھی ایسا مقام نظر نہ آیا۔ وقت بے حد تیزی سے گزر رہا تھا۔ اس دوران میں افضل حتی الامکان تیزی سے خود کو رسیوں سے آزاد کرا رہا ہوگا۔ کوئی متبادل صورت نہ پا کر میں ڈاکٹر صنم کے پیچھے پیچھے باورچی خانے میں داخل ہو گیا۔ ڈاکٹر صنم نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ وہ آلو ابالنے کے لیے چولہے پر پانی چڑھا چکی تھی۔

"آپ دروازے کی طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہو جائیں۔ وہ یہاں پہنچنے ہی والا ہے۔ آپ کو اس کی آہٹ ملے تب بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ میں آپ کی حفاظت کے لیے یہیں دروازے کے پیچھے چھپا ہوا ہوں۔ گھبرائیے گا نہیں۔" میں نے دروازے کی آڑ میں چھپتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر صنم نے اثبات میں سر ہلایا اور نہایت انہماک سے چولہے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

اگلے چند منٹ سخت اعصابی تناؤ کے عالم میں گزرے۔ ڈاکٹر صنم بظاہر پرسکون انداز میں آلوؤں کے ابلنے کا انتظار کر رہی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ بھی شدید اضطراب میں مبتلا ہے۔ بالآخر میرے حساس کانوں نے کسی کے قدموں کی بے حد دھیمی چاپ سنی۔ کوئی باورچی خانے کے دروازے کے قریب پہنچ کر چند لمحے کے لیے ٹھہرا پھر وہ باورچی خانے میں داخل ہو گیا۔ ڈاکٹر صنم شاید اس کی آہٹ محسوس نہ

کر سکی۔ افضل کے وجود کو پہچاننے میں مجھے ایک پل بھی نہ لگا۔ وہ بلی کی سی بے آواز چلتا ڈاکٹر صنم کی طرف بڑھا۔ اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ میرے جسم کے تمام اعصاب ستار کے تاروں کی طرح تن گئے۔ میں برق رفتاری سے حرکت میں آنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ڈاکٹر صنم کے پاس پہنچ کر وہ چیل کی طرح جھپٹا اور ڈاکٹر صنم کو عقب سے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ ڈاکٹر صنم کے حلق سے ایک اضطراری چیخ نکل گئی۔

"چیخ جتنا چیخ سکتی ہے کتیا۔ یہاں تیری چیخ کوئی سننے والا نہیں ہے۔" افضل نے کسی خون خوار درندے کے مانند غراتے ہوئے کہا۔ "میں تجھ سے تیری ایک ایک حرکت کا بدلہ لوں گا۔"

"یہ۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو افضل؟ میں تمہاری ندا ہوں۔"

"بکواس بند کرو حرافہ! تو میری ندا کے پیر کی جوتی کی برابر بھی نہیں ہے۔ وہ بے چاری تو تیری ان حرامی یاروں کی درندگی کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔" ڈاکٹر صنم نے کسمسا کر خود کو اس کی آہنی گرفت سے آزاد کرانا چاہا لیکن ناکام رہی۔ افضل نے اسے فرش پر گرانا چاہا لیکن اس کی شدید مزاحمت کے باعث وہ فوری طور پر کامیاب نہ ہو سکا۔

"تو۔ تو کیا وہ سب۔۔۔" ڈاکٹر صنم نے بھنچی بھنچی آواز میں کچھ پوچھنا چاہا۔ افضل کے بلند قہقہے نے اس کی بات درمیان میں کاٹ دی۔

"ہاں وہ سب ڈراما تھا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ڈاکٹر صنم کو فرش پر گرا لیا۔ شدید غصے سے میرے دماغ کی رگیں کھنچنے لگیں لیکن میں نے اپنے ضبط کے اس تازی کی باگیں کھینچے رکھیں۔ ڈاکٹر صنم بھرپور مزاحمت کر رہی تھی۔ کوشش کے باوجود افضل اس پر قابو نہیں پا سکا تھا۔

"زور آزمائی کا کوئی فائدہ نہیں ہے میری جان۔ تجھے میرے پنجے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ تیرا یہ پھول جیسا جسم پتی پتی ہو کر بکھر تو سکتا ہے۔ میرے بازوؤں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ میں ندا کی موت کا انتقام تیری اس پر بہار جوانی سے لوں گا۔" افضل کا شیطانی لہجہ میرے تن بدن میں آگ لگا گیا۔ میں نے اپنے ضبط کے بندھنوں کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر صنم پر چھانے کی کوشش میں وہ میرے بڑھتے قدموں کی دھمک بھی نہ سن سکا۔ میں نے اپنے دائیں پاؤں کی ٹھوکر بھرپور قوت سے اس کے پہلو میں ماری۔ اس کے حلق سے ایک کرب ناک چیخ برآمد ہوئی۔ ڈاکٹر صنم پر سے اس کی گرفت ختم ہو گئی اور وہ پہلو کے بل فرش پر لڑھک گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنا پہلو دبا لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر میری طرف دیکھتا ڈاکٹر صنم نے اپنے دائیں ہاتھ کی کہنی پوری قوت سے اس کے چہرے پر ماری۔ اس کا سر خاصے زور سے فرش سے ٹکرایا۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک اور ٹھوکر اس کے پہلو میں رسید کر دی۔ ہائے کر کے وہ فرش پر لوٹنے لگا۔ ڈاکٹر صنم نفرت بھری نظروں سے اسے گھورتی فرش سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا لباس درست کرنے کے بعد اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "مارو۔۔۔ اس کتے کے بچے کو اتنا مارو کہ اس کی ایک بھی ہڈی

سلامت نہ رہے۔"

افضل نے اپنے پہلوؤں میں طوفان اٹھاتے درد پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بمشکل میری طرف دیکھا۔ مجھے پہچاننے میں اسے محض چند لمحے لگے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا چہرہ خوف سے سفید پڑتا چلا گیا۔ اس اعصابی جھٹکے نے اسے اپنا درد فراموش کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"تت۔۔۔ تم" اس نے پھٹی پھٹی سی آواز میں کہا۔

"ہاں۔ یہ میں ہی ہوں۔ غور سے دیکھ لو۔ میں زندہ سلامت آ گیا ہوں اور اب میں تمہاری دھجیاں اڑا دوں گا۔ تمہاری ساری ڈرامے بازی تمہاری ناک کے راستے نکل جائے گی۔ مجھے تجھ سے بہت سا حساب بے باک کرنا ہے۔" میرا پستول میرے نیفے سے نکل کر میرے ہاتھ میں آ گیا۔ اس کے چہرے کی سفیدی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

"چپ چاپ اٹھ جا۔ کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے کی کوشش کو تو سالے بھیجا پھاڑ دوں گا۔ یہ تو' تو دیکھ ہی چکا ہے کہ میرے پستول پر سائلنسر چڑھا ہوا ہے۔"

ڈاکٹر صنم اس کے پاس سے ہٹ کر میرے پاس آ چکی تھی۔ وہ ڈرتے ڈرتے فرش سے اٹھا۔ اس دوران میں اس کی نظریں مسلسل پستول کی نال پر جمی رہیں۔

"چل آگے لگ۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی تو کچھ بھی دیکھنے کے قابل نہیں رہے گا۔ سیدھا اپنے پنجرے کی طرف چل بہت مزے لوٹ لیے آزادی کے۔" میں نے شدید نفرت اور حقارت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔ میں پوری طرح محتاط تھا۔ اس کی طرف سے کسی بھی کاروائی کی صورت میں میرے پستول کی گولی بلاتوقف اس کے ناپاک وجود کی مہمان بن جاتی۔

اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ میں نے مشینی انداز میں پستول سے اشارہ کیا تو وہ چپ چاپ کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے کسی قسم کی مزاحمت کی قطعی کوئی کوشش نہ کی۔ نہایت سعادت مندی سے وہ اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ میں پستول لیے اس کے سر پر کھڑا رہا۔ ڈاکٹر صنم نے پہلے سے بھی زیادہ مضبوطی سے اسے بستر کے ساتھ جکڑ دیا۔ افضل کے چہرے پر مایوسی اور شکست خوردگی کی سیاہ گھٹا چھا گئی تھی۔ اس نے رحم طلب نظروں سے ڈاکٹر صنم کی طرف دیکھا لیکن اس کی آنکھوں سے جھڑتی نفرت کی چنگاریوں نے اسے نظر چرانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ڈاکٹر صنم کو کمرے سے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

"اب تم مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ یہ سب کیسے ہوا؟" اس نے بے صبری سے سوال کیا۔ میں نے حتی الامکان جامع انداز میں اسے تمام واقعات سے آگاہ کر دیا۔ اس دوران میں وہ مرحلہ بھی آیا جب مجھے اپنی اصلیت سے پردہ اٹھانا پڑا۔ ایک بار پھر مجھے احساس ہوا کہ میں اس شہر کی خاصی معروف شخصیت بن چکا ہوں۔ منفی اور مثبت دونوں طرح کے تاثرات کے ساتھ لوگ مجھے میرے نام سے پہچانتے ہیں۔ شاید

اسی کیفیت کے لیے کسی شاعر نے کہا تھا کہ "بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا؟"

"لیکن تمہارا نام تو ذوالفقار ہے اور۔۔۔" ڈاکٹر صنم نے حیرانی سے کہنا شروع کیا۔ میں نے اس کی بات درمیان سے منقطع کر دی۔

"یہ میرا فرضی نام ہے۔ دراصل میرا اصلی نام وہی ہے جس سے آپ واقف ہیں۔ البتہ یہ سچ ہے کہ مرزا اور صدیقی کے ساتھ مجھے بھی سرکاری طور پر سردار شاہ مراد کے خلاف کاروائی کے لیے بھیجا گیا۔ اس کتے کے بچے کی سازش کا شکار ہو کر وہ دونوں مجھ سے بچھڑ گئے۔ اب ان کا پتا اسی سے مل سکتا ہے۔ آپ اپنا دل مضبوط کر لیجیے۔ اب میں اس سے کوئی رعایت نہیں کروں گا۔ اگر مجھے اس کے جسم کی ساری کھال بھی اتارنا پڑی تو میں دریغ نہیں کروں گا۔ اسے اگلنا پڑے گا۔ سب کچھ ایک ایک لفظ۔۔۔ ایک ایک نام۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں بلکہ اس سلسلے میں تمہیں میری مکمل امداد حاصل ہوگی۔ اس شیطان صفت شخص نے میرے اعتماد اور انسانی ہمدردی کے جذبات کو شدید ٹھیس پہنچائی ہے۔"

"آپ اس کی احتیاط سے نگرانی کیجیے۔ میں جواد اور دیگر لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہوں۔ وہ اضطراب کے عالم میں گھر کے آس پاس ہی منڈلا رہے ہوں گے۔"

"ہاں ہاں جلدی سے جاؤ۔ یہ لو گیٹ کی کنجیاں جواد سے کہنا وہ گاڑی بھی اندر لے آئے" ڈاکٹر صنم نے پرجوش لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر صنم کے بنگلے کے باہر آنے کے بعد میں متلاشی نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے خالد کی گاڑی سست رفتاری سے اپنی سمت آتی دکھائی دی۔ اس دوران میں شاید وہ لوگ مسلسل اسی سڑک پر چکر لگاتے رہے ہوں گے۔ مجھے دیکھ کر خالد نے گاڑی کی رفتار میں اضافہ کر دیا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں مطمئن رہنے کی تاکید کی۔

"خیریت تو ہے ذوالفقار بھائی؟ سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟" جواد نے گاڑی سے باہر جھانک کر مضطرب لہجے میں پوچھا۔

"ہاں' سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ خدا کا شکر ہے۔ ہم معاملہ قابو سے باہر ہونے سے پہلے یہاں پہنچ گئے۔ میں گیٹ کھول رہا ہوں تم گاڑی اندر لے آؤ" میں نے پرسکون لہجے میں اسے تسلی دی۔

خالد نے گاڑی ڈاکٹر صنم کی کار کے پاس کھڑی کر دی۔ یہ جگہ شاید اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ البتہ چچا مہر داد اور مہراں کچھ اکھڑے اکھڑے سے نظر آئے۔ ان کے لیے یہ سب کچھ قدرے غیر رومانوی ہوگا۔ میں چچا مہر داد کو سہارا دے کر گھر میں لے آیا۔ ڈاکٹر صنم نے نہایت پرجوش انداز میں سب کا استقبال کیا۔

"ڈاکٹر صاحبہ! یہ میرے چچا مہر داد ہیں اور یہ ان کی بیٹی مہراں!" میں نے ان دونوں کو ڈاکٹر صنم

سے متعارف کروایا۔ڈاکٹر صنم چند لمحوں تک بہ غور مہراں کا جائزہ لیتی رہی پھر اس نے تعریفی انداز میں سر ہلا کر کہا۔

"ماشاءاللہ بہت پیاری ہے۔آؤ مہراں میرے پاس آؤ" اس نے ہاتھ کے اشارے سے مہراں کو اپنے قریب آنے کی دعوت دی۔اس دوران میں مہراں بھی بہ غور اس کا جائزہ لیتی رہی تھی۔جانے اس نے کیا نتیجہ اخذ کیا۔بہرحال اس نے ڈاکٹر صنم کی دعوت کا خاصے روکھے انداز میں جواب دیا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں۔دراصل بابا کو میرے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"اوہ! آپ لوگ ابھی تک کھڑے کیوں ہیں؟ آیئے بیٹھیے نا۔"

تمام افراد ہال میں موجود صوفوں پر بیٹھ گئے۔میں جواد کو ایک طرف لے گیا اور اسے تازہ ترین پیش رفت سے آگاہ کیا۔

"جس ترکیب سے ہم نے اسے اپنے خول سے باہر آنے پر مجبور کیا کاش یہ ترکیب پہلے سے میرے ذہن میں آجاتی۔ایسی صورت میں ہمیں مرزا اور صدیقی سے اس کا پراسرار انداز میں نہ بچھڑنا پڑتا۔"

"ہر واقعہ اپنے متعین وقت پر رونما ہوتا ہے۔ہم نے اپنی طرف سے بھرپور کوشش کی' یہ اور بات ہے کہ نتائج ہماری توقع کے مطابق نہیں نکلے لیکن اس سلسلے میں ہم کر بھی کیا سکتے ہیں' سوائے اپنی ممکنہ کوششوں کے۔باقی صلہ دینے والی ذات تو صرف پاک پروردگار کی ہے۔۔ پنجابی زبان کے معروف صوفی شاعر میاں محمد بخش نے کیا خوب کہا ہے۔

مالی دا کم پانی دینا بھر بھر مشکاں پاوے
مالک دا کم پھل پھل لانا' لاوے یا نہ لاوے۔

"ہاں بھائی تم صحیح کہہ رہے ہو۔ہم جیسے بے مایہ انسان اور کر بھی کیا سکتے ہیں' سوائے اپنی حقیر کوششوں کے لیکن مجھے مرزا اور صدیقی کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔میں جب بھی ان کے متعلق سوچتا ہوں میرا دل بوجھل ہونے لگتا ہے۔خدا جانے وہ کس حال میں ہوں گے؟ سب سے زیادہ فکر مجھے مرزا کے متعلق ہے۔خدا جانے اس کا زخم کس حد تک خطرناک ہوگا۔اگر اسے خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو میں قسم کھاتا ہوں کہ اس حرامی افضل کے جسم میں بارود بھر کے اسے تیلی دکھا دوں گا" جواد نے میرا شانہ تھپتھپا کر مجھے پرسکون رہنے کی تلقین کی۔

"میں آپ لوگوں کے لیے ناشتا تیار کرتی ہوں۔مہراں تم میرے ساتھ باورچی خانے میں چلو" ڈاکٹر صنم نے مہراں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔اس کے جسم میں کسی قسم کی جنبش نہ ہوئی۔بس وہ خالی نظروں سے ڈاکٹر صنم کو گھورتی رہی۔ڈاکٹر صنم یک لخت کھسیانی سی ہو گئی۔

"ہم لوگ ناشتہ کر کے آئے ہیں ڈاکٹر صاحبہ آپ مہراں اور چچا مہرداد کو طبی امداد مہیا کیجیے۔ان دونوں کے سر زخمی ہیں" میں نے صورت حال کی کشیدگی کو کم کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں نہیں' میں بالکل ٹھیک ہوں۔میرے سر میں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہے۔"

"تم خواہ مخواہ کا تکلف کر رہی ہو مہراں۔میں نے اپنی آنکھوں سے تمہارے بالوں میں خون کی جھلک دیکھی تھی۔" میں نے اصرار کیا۔

"ارے نہیں بھئی مہراں کے سر میں تو کہیں خون وغیرہ نہیں ہے۔تمہیں کوئی غلط فہمی ہے۔مہراں کے سر پر کوئی گہری چوٹ نہیں لگی جس کے نتیجے میں اس کے سر سے خون نکلتا۔" چچا مہرداد نے پرزور لہجے میں اپنی بیٹی کی تائید کی "البتہ میرے سر میں زخم موجود ہے۔ڈاکٹر صاحبہ چاہیں تو میری مرہم پٹی کر سکتی ہیں۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ ان دونوں کے طرز عمل کا مقصد کیا ہے۔یہ دونوں مہراں کے سر کی چوٹ کیوں چھپانا چاہتے ہیں۔تاہم میں نے ان سے مزید بحث نہیں کی۔ڈاکٹر صنم نے چچا مہرداد کے سر کا زخم صاف کر کے اس پر دوا لگا دی۔اس دوران میں مہراں کسی سنگی مجسمے کے مانند ساکت و صامت بیٹھی رہی۔اس نے اپنے باپ کی مرہم پٹی میں ڈاکٹر صنم کا ہاتھ بٹانے کی قطعاً کوشش نہیں کی۔یک لخت مجھے اس پر شدید غصہ آنے لگا۔شاید اس کا دماغ چل گیا ہے۔یہ پہلے تو اتنی تند مزاج اور نک چڑھی نہیں تھی۔اب اس کو کیا ہو گیا ہے؟ کہیں یہ ڈاکٹر صنم کو اپنی حریف تو نہیں سمجھ رہی؟ یہ رقابت کا جذبہ تو نہیں ہے جو اسے اندر ہی اندر جھلسائے دے رہا ہے۔ہاں ہو سکتا ہے بالکل ہو سکتا ہے۔ڈاکٹر صنم خوش شکل ہے' خوش لباس ہے' گفتگو کے فن سے واقف ہے۔اس کا عمر کا اندازہ اس کے چہرے سے لگانا آسان نہیں ہے۔مہراں جیسی سیدھی سادھی دیہاتی لڑکی اس کی ظاہرہ حالت سے باآسانی دھوکا کھا سکتی ہے۔یہ اپنے تخیل کی آنکھ سے مجھے اور ڈاکٹر صنم کو جذباتی رشتوں میں بندھا دیکھ رہی ہوگی۔عورت خواہ کتنی بھی نرم خو ہو اور سادہ لوح ہو اپنے پیار' اپنی محبت میں کسی دوسری عورت کی شرکت کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی۔مہراں حسد و رقابت کے ساتھ ساتھ شاید احساس کمتری میں بھی مبتلا ہوگی۔اس کی مدمقابل ایک دلکش طرح دار اور بے حد امیر عورت ہے۔کوئی بھی ذی شعور انتخاب کی آزادی کی صورت میں غالباً ڈاکٹر صنم کا ہی انتخاب کرتا۔

مجھے مہراں کی احمقانہ سوچ پر ہنسی آنے لگی۔یہ بے وقوف لڑکی خواہ مخواہ اپنے ذہن میں طرح طرح کے نتائج اخذ کر کے ڈاکٹر صنم سے مخاصمت پر آمادہ ہے۔حالانکہ میرے اور ڈاکٹر صنم کے درمیان ایسی کوئی مطابقت موجود نہیں ہے لیکن۔۔ ہیر؟۔۔ یک لخت میرے دماغ میں تیز جھنجھناہٹ سی پیدا ہوئی۔ڈاکٹر صنم نہ سہی ہیر تو مہراں کی حریف ہے۔وہ تو حقیقتاً مہراں کو میرے دل کی دہلیز سے باہر دھکیلنے پر آمادہ ہے۔اگر مجھے کبھی ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑا تو میں کیا کروں گا؟

یک لخت مجھے اپنا دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہوا اتنا مشکل فیصلہ شاید اس کے بس کی بات نہ تھی۔بڑی

مشکل سے میں نے ان خیالات کو اپنے ذہن کی چادر سے جھٹکا۔ جب ایسا کوئی مرحلہ آیا تو دیکھا جائے گا۔ رہی ڈاکٹر صنم کے متعلق مہراں کی غلط فہمی کی بات تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی خود بخود دور ہو جائے گی۔

''میرا خیال ہے اس افضل سے ملاقات کی جائے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس کی چیخ و پکار کی آواز سڑک تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس کے باوجود ہم احتیاطاً کمرے کا دروازہ بند کر لیں گے۔ چچا مہرداد خواتین کے پاس رہیں گے۔'' میں نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

افضل کے کمرے میں پہنچ کر میں نے کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے بند کر دیا۔ افضل نے خوف زدہ نظروں سے ہم تینوں کو دیکھا۔ ہم تینوں کے چہروں کے بھیانک تاثرات نے اسے مزید دہشت زدہ کر دیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ جواد نے اپنے دوست خالد کو کس حد تک صورت حال سے آگاہ کیا لیکن وہ افضل کو اس انداز میں گھور رہا تھا جیسے اسے کچا ہی کھا جائے گا۔ بھاری بھر کم جثے پر سرخ سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ خوں خوار درندے کے مانند غرا رہا تھا۔ افضل کے پاس پہنچ کر میں خاصی دیر تک اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورتا رہا۔ بالآخر اسے ہی نظریں چرانا پڑیں۔

''میری بات غور سے سنو اور اپنے دماغ میں بٹھا لو مسٹر افضل'' میں نے گھمبیر لہجے میں گفتگو کی ابتدا کی۔ جواب دینے کے بجائے وہ سہمی سہمی سی نظروں سے میری شکل دیکھتا رہا'' تم نے ایک چال چلی جس میں تم بلاشبہ کامیاب رہے۔ تم نے بے حد مہارت سے ہمیں دھوکا دیا۔ تم نے جو کہانی ہمیں سنائی وہ بلاشبہ بے حد مربوط تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ تم نے بے حد فطری اداکاری کا بھی مظاہرہ کیا۔ تم نے لچھے دار باتوں کا جال پھیلایا جس میں ہم پھنس گئے۔ میرے خیال میں اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ مرزا اور صدیقی تمہارے حواریوں کے چنگل میں پھنس چکے ہیں لیکن تمہاری چال صدفی صد کامیاب نہیں ہو سکی۔ میں اور میرا ساتھی تمہارے حواریوں کا جال توڑ کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ف تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہم دونوں نے تمہارے کم از کم نصف درجن ساتھیوں کو جہنم رسید کر دیا ہے۔ سردار شاہ مراد کے زرخرید غلاموں کی بھی خاصی بڑی تعداد ہماری گولیوں کا نشانہ بن چکی ہے۔ ہم واپس آ چکے ہیں۔ تم سے حساب کتاب بے باک کرنے کو۔ تم یہ تو سمجھ ہی چکے ہو گے کہ میں اتنی طویل تمہید کس مقصد کے تحت باندھ رہا ہوں۔ تم شرافت سے اپنی زبان کھول دو۔ اس میں تمہاری بہتری ہے۔ پہلے تم نے جھوٹ اور سچ کا ملغوبہ اگلا تھا لیکن اب میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔ سوالات کی ابتدا میں اس سوال سے کرتا ہوں کہ تم مجھے سچ سچ بتا دو کہ اس حویلی کا درست حدود اربعہ کیا ہے جو تمہارے کہنے کے مطابق بھارتی ایجنٹوں کا مرکز ہے۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہیں کہیں تم لوگوں کا کوئی خفیہ ٹھکانہ موجود ہے لیکن گاؤں والے اس کے وجود سے بے خبر ہیں حتیٰ کہ حویلی کے کارندے بھی اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ اسی خفیہ ٹھکانے سے کاروائی کر کے مرزا اور صدیقی کو اغوا کیا گیا اور اسی ٹھکانے

سے حملہ کر کے ہمیں ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔''

میں نے متوقع نظروں سے اسے دیکھا۔ خاصی دیر تک اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ البتہ اس کے چہرے پر شدید کش مکش کے آثار واضح طور پر دیکھے جا سکتے تھے۔ میں نے مزید کچھ نہ کہا تا کہ وہ اپنے خیالوں کو ایک سمت میں مرکوز کر کے کسی فیصلے پر پہنچ سکے۔ جواد اور خالد نے ہماری گفتگو میں دخل اندازی نہیں کی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا' ماحول کی کشیدگی میں اضافہ ہوتا گیا۔ بالآخر افضل کسی فیصلے پر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے سے تناؤ کے آثار ختم ہوتے چلے گئے۔

''تم نے جو کچھ کہا اس پر میں نے اچھی طرح غور کیا ہے'' کمرے کے سناٹے میں افضل کی پرسکون آواز گونجی'' اس حقیقت میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں ہے کہ میں اس وقت مکمل طور پر تم لوگوں کے رحم وکرم پر ہوں۔ اب تم آسانی سے دھوکا بھی نہیں کھاؤ گے۔ تم لوگ ہر قیمت پر میری زبان کھلوانا چاہتے ہو' اپنے مقصد کے لیے تم مجھ پر بدترین تشدد سے بھی گریز نہیں کرو گے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں کوئی بہت مضبوط انسان نہیں ہوں۔ شاید جلد یا بدیر مجھے تم لوگوں کے سامنے سب کچھ اگلنے پر مجبور ہونا پڑے لیکن یہ حقیقت بھی میں تم لوگوں پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں ہرگز ہرگز اپنے ملک کے خلاف غداری نہیں کروں گا۔ میں بھرپور کوشش کروں گا کہ میری زبان سے کوئی ایسا لفظ نہ نکلے جو میرے اور میرے دیش کے لیے نقصان دہ ثابت ہو۔ میں رضا کارانہ طور پر تم لوگوں کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم لوگ میری زبان کھلوانے کی جدوجہد کرو' میں اپنی زبان بند رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم اپنے دیش سے وفاداری کا ثبوت دو' میں اپنے دیش سے وفاداری نبھانے کی کوشش کرتا ہوں اگر بالفرض تم لوگ میری زبان کھلوانے میں کامیاب ہو بھی گئے تو میرے دل میں یہ احساس جرم تو نہیں ہو گا کہ میں نے اپنی خوشی سے اپنے دیش کے قیمتی راز اپنے دیش کے دشمنوں کے حوالے کر دیے۔''

مجھے اس کے لہجے میں آہنی عزم کی جھلک نظر آئی۔ مجھے لگا میرے اعتماد کی بلند وبالا دیوار میں رخنے پڑ رہے ہیں۔ اگلے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا'' اگر تمہاری یہی مرضی ہے۔ تو ہم ایسا ہی کریں گے۔ میں تمہارا دشمن ہونے کے باوجود تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ تمہاری جگہ اگر میں ہوتا تو شاید میرے بھی یہی احساسات ہوتے۔ میرا وعدہ ہے کہ میں تمہیں بے بسی کی موت نہیں ماروں گا۔ تم زبان کھولو نہ کھولو تمہیں بہادری کی موت ملے گی'' میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ جواب میں کچھ کہنے کے بجائے افضل نے پرسکون انداز میں اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

جواد اور خالد نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر کے اشارے سے انہیں پرسکون رہنے کی تلقین کی۔ اس کے بعد ہی میں کمرے کی ایک بڑی سی دیوار گیر الماری کی طرف بڑھا۔ مجھے سامنے ہی نائلوں کی مضبوط ڈوری کا گچھا نظر آ گیا۔ الماری بند کر کے میں نپے تلے قدموں سے افضل کی طرف بڑھا۔ ڈوری کا گچھا کھولنے کے بعد میں نے جواد سے اس کا چاقو طلب کیا۔ اس نے بغیر

کوئی سوال کیے اپنا شکاری چاقو میرے حوالے کر دیا۔

افضل نے اس دوران میں مسلسل اپنی آنکھیں بند رکھیں۔ میں نے چاقو کی مدد سے نائلون کی رسی کے کئی ٹکڑے کر لیے۔ خالد اور جواد حیرانی سے میری تمام کارروائی دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان دونوں کو مدد کے لیے طلب کر لیا۔ میرے اشارے پر انہوں نے افضل کے پیروں کو باری باری گھٹنوں کے پاس سے تھوڑا سا خم دے کر اوپر اٹھایا۔ میں نے نائلون کی رسی کے ایک ٹکڑے کو اس کے دائیں گھٹنے پر خوب کس کر باندھ دیا۔ اس کے بائیں پاؤں کے ساتھ بھی میں نے ایسا ہی کیا۔ افضل نے ایک لمحے کے لیے آنکھ کھول کر اپنے گھٹنے کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد اس نے پھر آنکھ بند کر لی۔ اس عمل سے فارغ ہو کر میں اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے ہاتھ میں نائلون کی رسی کے دو نسبتاً چھوٹے ٹکڑے تھے جنہیں میں آپس میں بل دے کر نہایت مضبوط اور لچک دار کوڑے کی شکل دے رہا تھا۔ جواد اور خالد کوشش کے باوجود میری کارگزاری کا مقصد نہیں سمجھ پائے۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟" جواد نے حیرانی سے پوچھا۔

"جو کچھ ہو رہا ہے تم چپ چاپ دیکھتے جاؤ۔ میں ناکام ہو گیا تو پھر تمہاری باری ہو گی" میں نے نائلون کی رسی کو کوڑے کی فنشنگ ٹچ دیتے ہوئے کہا۔ میری توقع کے عین مطابق چند ہی منٹوں میں افضل کے وجود میں بے چینی کے آثار نظر آنے لگے۔ دوران خون میں رکاوٹ کے باعث اس کے پیر سن ہونا شروع ہو گئے ہوں گے۔ اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ میرے ہونٹوں پر فاتحانہ تبسم دیکھ کر اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر فولادی عزم کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ کچھ دیر مزید انتظار کرنے کے بعد میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس اثنا میں اس کے پاؤں پوری طرح سن ہو گئے ہوں گے۔ اس کے پیروں کے پاس پہنچ کر میں نے اپنے خود ساختہ کوڑے کو فضا میں لہرایا۔ کمرے کی محدود فضا میں زن زناہٹ کی آواز گونجی۔ افضل نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ عین اسی وقت میں نے کوڑے کو فضا میں لہرا کر پوری قوت سے اس کے دائیں پیر کے تلوے پر دے مارا۔ اس کے حلق سے ایک بے ساختہ قسم کی فلک شگاف چیخ برآمد ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا جسم اذیت سے بری طرح بل کھانے لگا۔ اس اثنا میں جواد اور خالد صورت حال کو پوری طرح سمجھ چکے تھے۔ ان کے چہرے پر مجھے تحسین کے واضح تاثرات نظر آئے۔ میں نے پہلا وار کرنے کے بعد اپنا ہاتھ روک لیا تا کہ اسے اپنے آپ کو سنبھالنے کا موقع مل سکے۔ چند لمحوں تک اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلتی رہیں پھر یہ چیخیں ہلکی ہلکی سسکیوں میں ڈھل گئیں۔

"مجھے اس اذیت کا احساس ہے افضل جو تمہیں برداشت کرنا پڑ رہی ہیں کیوں کہ میں ذاتی طور پر اس مرحلے سے دو چار ہو چکا ہوں۔ تمہارے لیے اب بھی موقع ہے کہ اپنی زبان کھول دو۔"

"نہیں!" افضل نے بھنچی بھنچی آواز میں کہا' اس کے ساتھ ہی میرے ہاتھ میں بل کھاتا ہوا کوڑا

ایک بار پھر حرکت میں آیا۔ شڑاپ شڑاپ کی کریہ آوازوں کے ساتھ وہ باری باری دونوں پیروں کے تلووں پر اذیت کی لکیریں ثابت کر گیا۔ اس بار اس کے حلق سے برآمد ہونے والی چیخوں سے کمرے کی دیواریں جھنجھنا اٹھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو خود میری روح تک کانپ اٹھی لیکن میں نے نرم و نازک جذبات کو خود پر حاوی نہ ہونے دیا۔ اس کی چیخیں رفتہ رفتہ مدھم پڑ گئیں میں کچھ دیر تک اس کی زبان کھولنے کا انتظار کرتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں کے کناروں سے آنسوؤں کی آبشاریں بہ رہی ہیں۔

"اب کیا خیال ہے؟" میں نے سوال کیا۔ جواب دینے کے بجائے اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی استقامت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے اشارے سے خالد کو اپنے پاس بلایا اور نائلون کا کوڑا اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"شڑاپ۔۔شڑاپ۔۔شڑاپ۔۔" خالد نے بلا توقف وحشیانہ قوت کے حامل چار لگا تار کوڑے اس کے تلووں پر برسا ڈالے۔ افضل کی کربناک چیخوں سے کمرے کے در و دیوار لرز اٹھے۔ اسی وقت میری نظر جواد پر پڑی اس کے ساتھ ہی مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھیں سختی سے بند ہیں۔ اس کے چہرے پر تشنجی کیفیت کے آثار تھے اور وہ دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ مجھے افضل اور اس کی حالت میں زیادہ فرق نظر نہ آیا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے خالد کو ہاتھ روکنے کو کہا۔

"جواد بھائی شاید آپ کی طبیعت صحیح نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو کمرے سے باہر جا سکتے ہیں۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ جواد نے چونک کر اپنی آنکھیں کھولیں۔ اس کے ہونٹوں پر نہایت پژمردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اوہ۔ معاف کیجیے گا۔ میری وجہ سے آپ لوگ ڈسٹرب ہوئے میرے خیال میں بہتر یہی ہے کہ میں کمرے سے باہر چلا جاؤں۔" اس نے شکستہ خوردہ لہجے میں کہا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ڈگمگاتے قدموں سے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ یک لخت مجھے اس تمام کارروائی سے شدید بے زاری کا احساس ہوا۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی جواد کے پیچھے کمرے سے باہر نکل جاؤں۔ اگلے ہی لمحے میں نے خود کو سنبھال لیا۔

کمرے کا دروازہ بند کر کے میں نے خالد کو دوبارہ شروع ہو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بلا توقف مشینی آدمی کی مانند حرکت میں آ گیا۔ شڑاپ شڑاپ کی آوازوں سے کوڑا افضل کے تلووں پر برسنے لگا۔ اس کی لرزہ خیز چیخیں کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھیں۔ یک لخت اس کے جسم میں لرزش پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ اس کی چیخیں تھمتے ہی خالد نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ شکست خوردہ سے انداز میں ہاتھ کے اشارے سے میں نے اسے اپنے پاس آ کر بیٹھنے کو کہا۔

’’ذوالفقار بھائی۔اب کیا کریں؟ یہ کتے کا بچہ تو زبان کھولنے کو تیار نہیں ہے۔‘‘

’’تم صحیح کہہ رہے ہو۔ یہ واقعی غیر معمولی قوت برداشت اور مزاحمت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید پہلے چند ہاتھوں میں ہی سب کچھ بک دیتا۔‘‘

’’یہ بے ہوش ہو گیا ہے۔اس پر مزید زور آزمائی کی تو یہ مر بھی سکتا ہے۔‘‘

’’تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس کے پیروں کے بندھن کھول دو۔ ہم اس پر کوئی دوسری ترکیب آزمائیں گے۔‘‘ میں نے پرتفکر لہجے میں کہا۔ مجھے یقین سا ہونے لگا کہ اس کی زبان کھلوانا میرے بس سے باہر ہے۔اس پہلی فتح نے اس کے حوصلے مزید بلند کر دیے ہونگے۔اب یہ یقیناً پہلے سے زیادہ عزم کے ساتھ مزاحمت کرے گا۔ویسے بھی مجھے اس فن کا زیادہ تجربہ نہیں ہے۔میری کسی حماقت کے سبب یہ مر بھی سکتا ہے۔اس کی موت اس کی بھرپور فتح ہوگی جبکہ میری مکمل شکست۔اس کے مرنے کے بعد میں پوری طرح تہی دست و تہی دامن ہو کر رہ جاؤں گا۔نہیں میں اسے ضائع کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔مجھے اس کی زبان تو کھلوانی ہے لیکن ہاتھ پاؤں بچا کر۔

’’اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ کچھ دیر بعد یہ خود ہی ہوش میں آ جائے گا‘‘ میں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا’’ آؤ ہم یہاں سے چلتے ہیں‘‘ خالد نے میری تائید میں سر ہلایا۔ہم دونوں کمرے سے باہر نکل آئے۔ چچا مہرداد مہراں اور جواد ہال میں بیٹھے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ہمیں آتا دیکھ کر وہ ہماری جانب متوجہ ہو گئے۔ڈاکٹر صنم شاید باورچی خانے میں مصروف تھی۔ہم دونوں چپ چاپ ان کے پاس جا بیٹھے۔

’’کچھ کامیابی حاصل ہوئی آپ لوگوں کو؟‘‘ جواد نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔ مجھے لگا کہ وہ میری ناکامی کا مزاق اڑا رہا ہے۔اسے شاید یقین ہو چکا تھا کہ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔

’’نہیں!‘‘ میں نے مختصر سا جواب دیا اور ہونٹ بھینچ کر بیٹھ گیا۔

’’یہ جاسوس وغیرہ بہت پکے ہوتے ہیں۔ انہیں اپنی زبان بند رکھنے کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ظاہری بات ہے یہ اتنی آسانی سے تو زبان نہیں کھول دے گا۔‘‘ جواد نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ مجھے ایک بار پھر شدت سے احساس ہوا کہ وہ میرا مزاق اڑا رہا ہے۔ جانے کیوں مجھے اس کی زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ زہر لگ رہا تھا۔ مجھے اس کی شکل سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ میں اپنی اس وقت کی ذہنی کیفیت کا تجزیہ نہ کر سکا۔شاید یہ حسد و رقابت کا جذبہ تھا جو جواد کو مہراں کے روبرو دیکھ کر میرے وجود کی گہرائیوں سے امڈ آیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بے حد چرب زبان اور حاضر جواب شخص ہے۔باتوں ہی باتوں میں مدمقابل کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔پہلی ہی ملاقات میں اس نے مجھے اپنا دوست بننے پر مجبور کر دیا۔اب اپنی اس خوش گفتاری کے جوہر وہ چچا مہرداد اور مہراں پر آزما رہا ہے۔ یہ دونوں سیدھے سادھے انسان اس کی میٹھی میٹھی باتوں کے جال سے بھلا کیسے بچ سکتے ہیں۔ میرے اور ان دونوں کے درمیان جو

غیر مرئی خلیج حائل ہے یہ اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔

میرے لہو کی تپش میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔عین ممکن تھا کہ میں اس سے کسی قسم کا ناگوار سلوک کر گزرتا لیکن عین وقت پر ڈاکٹر صنم نے باورچی خانے سے جھانک کر مجھے پکارا۔

’’ذوالفقار۔۔۔زرا ادھر آؤ‘‘ مہراں نے چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور بیزاری سے منہ پھیر لیا۔ مجھے لگا کہ بازی واقعی میرے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔مہراں جزباتی طور پر مجھ سے لحہ بہ لحہ دور ہوتی چلی جا رہی ہے۔

’’کیا ہوا؟ تم اس سے کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہوئے؟‘‘

’’نہیں کوشش کے باوجود میں اس کی زبان نہیں کھلوا سکا‘‘ میں نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا’’ خدا جانے وہ کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔ بدترین مار کا بھی اس پر کوئی اثر ہوا؟‘‘

’’دوبارہ کب کوشش کرنے کا ارادہ ہے؟‘‘

’’کوشش تو کی جا سکتی ہے لیکن کامیابی کا امکان ذرا کم ہی ہے۔ہم نے اس کی سخت کھنچائی کی لیکن اس نے کچھ نہیں اگلا۔وہ برداشت کی آخری حد تک پہنچ کر بے ہوش ہو چکا ہے۔اس پر مزید تشدد کرتے تو وہ مر جاتا۔‘‘

’’تو پھر اب تم کیا کرو گے؟ اب تو مرزا اور صدیقی تمہاری مدد کے لیے موجود نہیں ہیں‘‘ ڈاکٹر صنم نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

’’مجھے سب سے زیادہ فکر ان دونوں ہی کی ہے۔ان دونوں کی زندگی شدید خطرے میں ہے۔وہ دونوں میرے ہمراہ ہوتے تو پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہ ہوتا۔ وہ دونوں اس طرح کے معاملات کی اعلیٰ ترین تربیت کے حامل ہیں۔ وہ یقیناً کسی نہ کسی ترکیب سے اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو جاتے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟ اب تو یہی صورت نظر آتی ہے کہ میں ایک بار پھر سردار شاہ مراد کی شہر والی حویلی پر چڑھائی کر دوں اور اس حرافہ ندا کو بھی چوٹی سے پکڑ کر یہاں لے آؤں۔اپنے عاشق کو مصیبت میں دیکھ کر شاید وہ زبان کھولنے پر تیار ہو جائے۔‘‘

’’ایسی حماقت کے متعلق سوچنا بھی مت۔ یہ تو سیدھا سادھا موت کے منہ میں جانے والی بات ہے۔تمہارا کیا خیال ہے؟ اب تم وہاں جاؤ گے تو زندہ بچ کر واپس آ جاؤ گے؟ ویسے بھی جب افضل جیسے نسبتاً خام کار ایجنٹ کی زبان کھلوانا اتنا مشکل بن گیا ہے تو کیا وہ سرد گرم چشیدہ عورت آسانی سے ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہو جائے گی۔‘‘

’’لیکن اس بات کو دوسرے انداز میں بھی تو دیکھیں۔ ہو سکتا ہے کہ ندا کی زندگی کو عزاب میں دیکھ کر افضل زبان کھولنے پر آمادہ ہو جائے۔ یہ تو ثابت ہو ہی چکا ہے کہ افضل اپنی زندگی سے بھی بڑھ کر ندا سے محبت کرتا ہے۔ابھی تک تو وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ ندا مر چکی ہے۔ندا کو دوسری مرتبہ موت کے منہ میں جانے

سے روکنے کے لیے وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔'' میں نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''ہوسکتا ہے تمہارا موقف درست ہو۔ بہرحال میں تمہیں ایسا کرنے کا مشورہ نہیں دوں گی۔ اس میں بے حد خطرہ ہے۔ تم کوئی اور ترکیب سوچنے کی کوشش کرو۔ مرزا اور صدیقی کی عدم موجودگی میں تم کسی خطرے میں پڑنے کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ افضل کے اغوا اور تم لوگوں کی گاؤں میں کاروائیوں کے بعد سردار شاہ مراد کی حویلی میں کھلبلی مچ گئی ہوگی۔ اس وقت وہ اپنے سائے سے بھی بدک رہے ہوں گے۔ اس بار شاید تمہیں کوئی داؤ پیچ دکھانے کا بھی موقع نہ مل سکے۔'' ڈاکٹر صنم نے پرتشویش لہجے میں اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

میں چند منٹ تک اس کی بتائی ہوئی باتوں پر غور کرتا رہا۔ مجھے احساس ہوا کہ اس کی کہی ہوئی زیادہ تر باتوں میں وزن ہے لیکن پھر وہی سوال میرے سر پر آن کھڑا ہوا۔ آخر میں کروں تو کروں کیا؟ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ جاؤں؟ انتظار کروں کہ سردار شاہ مراد کب اپنی سازشوں میں کامیاب ہوتا ہے؟ بھول جاؤں کہ ملک کریم کے ساتھ ساتھ اب مرزا اور صدیقی بھی بھارتی ایجنٹوں کے چنگل میں پھنس گئے ہیں۔ خدا جانے انہیں کیسی کیسی اذیتوں سے گزارا جارہا ہوگا۔ کتنی بھی مضبوط قوت ارادے کے مالک ہوں آخر وہ ہیں تو گوشت پوست کے انسان ہی۔ کسے خبر وہ جدید ترین مشین اب تک پاکستان پہنچ بھی گئی ہو جسے وہ ملک کریم کی زبان کھلوانے کے لیے استعمال کرنے والے ہوں۔ اس معاملے میں مجھے ندا اور افضل سے ہی اہم ترین معلومات مل سکتی ہیں۔ سردار شاہ مراد کے کارندے تو شاید ان تمام چکروں سے بے خبر ہی ہیں۔ ندا کو پکڑ لانے کے علاوہ میرے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''ڈاکٹر صاحبہ آپ کا کہنا بالکل بجا ہے۔ اس کام میں واقعی بے شمار خطرات پنہاں ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارے پاس کوئی متبادل راستہ نہیں ہے۔ یہ کام خواہ کتنا ہی جان جوکھوں میں ڈالنا والا ہو ہمیں اسے سرانجام دینے کی کوشش کرنا ہی پڑے گی۔ افضل کی زبان کھلوانے کے لیے یہ ہمارے پاس اہم ہتھیار ہوگا'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ڈاکٹر صنم کے چہرے پر تفکر اور مایوسی کے ملے جلے تاثرات پھیل گئے۔

''مجھے معلوم تھا کہ تم اپنے ارادے سے باز نہیں آؤ گے۔ تم اس معاملے میں کم از کم اپنے ساتھیوں کی رائے تو لے لو۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس خطرناک فیصلے کی ذمے داری میں صرف اور صرف اپنے آپ پر رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ مہم بھی میں تن تنہا سرانجام دینا چاہتا ہوں۔ ویسے بھی وہ لوگ اسلحے سے اور خونخوار قسم کے لڑاکوں سے لدی گاڑیوں کے استقبال کی تیاری مکمل کرکے بیٹھے ہوں گے۔ ہم کسی گاڑی میں بیٹھ کر اس حویلی سے میل بھر کے فاصلے سے بھی گزرے تو ان کے کان کھڑے ہوجائیں گے۔ لہٰذا اس مرتبہ ہمیں طریقہ کار میں تبدیلی لانا پڑے گی۔ میک اپ کے ذریعے میں اپنا حلیہ اور شکل وصورت تبدیل

کرلوں گا اور پھر پیدل وہاں پہنچ جاؤں گا۔ بات صرف اس حویلی میں داخل ہونے کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں کسی نہ کسی ترکیب سے اس حویلی میں گھسنے میں کامیاب ہو ہی جاؤں گا۔''

''نہیں، ایسے نہیں۔ تم مجھے اپنے پورے منصوبے سے آگاہ کرو۔ میں پوری طرح سے مطمئن ہونے کے بعد ہی تمہیں یہ خطرہ مول لینے کی اجازت دوں گی اور کسی کو تم یہ سب بتاؤ یا نا بتاؤ۔ مجھے تو تمہیں بہرحال اعتماد میں لینا ہی پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ویسے بھی اس کاروائی کے سلسلے میں مجھے آپ کی مدد درکار ہوگی۔'' میں نے اس کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ میں نے اپنے ذہن میں تشکیل پانے والے سیدھے سادے منصوبے سے اسے آگاہ کردیا۔ وہ میری سلامتی کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہ تھی، تاہم میرے بھرپور اصرار پر اسے میری بات ماننا ہی پڑی۔ میں نے اسے اپنی ضرورت کی چند اشیا کے نام بتائے جو اسے خرید کرلانی تھیں۔

''تم اس منصوبے پر کب عمل کرنا چاہتے ہو؟'' ڈاکٹر صنم نے سوال کیا۔

''آج ہی رات! ہمارے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔''

''تو گویا یہ تمہارا فیصلہ ہے کہ تم جواد اور خالد کو اس تمام معاملے سے علیحدہ رکھو گے؟''

''ہاں اس میں ان کی اور ہماری بھلائی ہے۔ میں بلا جواز ان کی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ مجھے جہاں ان کی مدد درکار ہوگی میں ان کی مدد حاصل کرلوں گا۔''

''خیر جیسے تمہاری مرضی۔ اگر تم اپنے بتائے ہوئے منصوبے پر پوری طرح عمل کرنے میں کامیاب ہوگئے تو تمہاری کامیابی کی خاصی امید ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم مشکل حالات میں بھی ہمت ہارنے والے نہیں ہو۔''

''ہدیہ تہنیت کا شکریہ۔ آپ میری کامیابی کے لیے دعا کرتی رہیں۔ سنا ہے بزرگوں کی دعا میں اثر ہوتا ہے۔''

''تمہاری فرمائش پوری کی جائے گی ننھے بچے۔ ہاں اچھا یاد آیا۔ میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔''

''پوچھیے پوچھیے۔ آپ کو اجازت طلب کرنے کی ضرورت کب سے پیش آنے لگی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں پوچھنا یہ چاہتی تھی کہ تمہاری یہ چچازاد مجھ سے اتنی اکھڑی اکھڑی کیوں رہتی ہے؟ میں نے اس سے کئی بار بات کرنے کی کوشش کی لیکن یہ مجھ سے سیدھے منہ بات کرنے کو تیار نہیں ہے۔ کیا یہ کسی قسم کا غرور یا احساس برتری ہے؟'' ڈاکٹر صنم نے الجھن بھرے لہجے میں کہا۔

''احساس برتری تو نہیں البتہ اسے احساس کمتری کی ایک شکل ضرور کہا جاسکتا ہے۔ یہ محترمہ آپ سے جذبہ رقابت کا شکار ہیں۔ دراصل یہ ہمیشہ سے مجھے اپنی غیر منقولہ جائداد سمجھتی رہی ہے۔ اس کے

خیال میں مجھ پر صرف اور صرف اس کا حق ہے۔ اس کی محدود سی عقل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ آپ اس کے حق پر ڈاکہ ڈال رہی بلکہ ڈال چکی ہیں۔ آپ کے سامنے اسے اپنی دال گلتی نظر نہیں آ رہی' لہٰذا یہ آپ سے سوکنوں کا سا رویہ برقرار رکھے ہوئے ہے۔"

"اف میرے خدا! تو دراصل یہ چکر ہے" ڈاکٹر صنم نے کہا اس کے ساتھ ہی وہ بے تحاشہ ہنسنے لگی "اب میری سمجھ میں آیا کہ یہ اس طرح نتھنے پھلا کر اور آنکھیں نکال کر مجھے کیوں گھورتی ہے۔ یہ بے چاری تو تمہارے پرستاروں میں سے نکلی۔ مجھے پتا بھی نہ چلا کہ میں کب سے اس کی حریف بن بیٹھی ہوں۔ اس بے چاری نے تب سے اب تک جانے کتنا خون جلا لیا ہوگا۔ تم بتاؤ تمہارے اس کے بارے میں کیا جذبات ہیں؟ اس سادہ لوح کبوتری کی محبت یک طرفہ ہے یا دو طرفہ؟"

"یہ تو آپ پر منحصر ہے۔ آپ اس حقیر پر تقصیر پر نظر کرم ڈالیں تو بندہ اپنے ہر نئے پرانے رشتے دار اور تعلق کو فراموش کرنے پر تیار ہے۔ آپ جیسا نفیس پیس تو بہت کم نظر آتا ہے۔" میں نے نہایت صفائی سے پہلو بچاتے ہوئے ڈاکٹر صنم کو گھسنا چاہا۔

"تم اپنی فضول بکواس کو فی الحال کسی اور وقت پر رکھو اور فی الحال میرے سوال کا جواب دو تاکہ اس لڑکی کی پوزیشن میرے ذہن میں واضح ہو سکے۔"

"یہ پوزیشن تو فی الحال میرے ذہن میں بھی واضح نہیں ہے۔ پچھلے چند دنوں میں ان دونوں نے مجھ سے جو طرز عمل اختیار کیا ہے' اس نے میری نظر میں ان کی عزت خاصی متزلزل کر دی ہے۔ ویسے بھی جب تک آپ کوئی ہاں ناں میں جواب نہیں دیں گی' میں کسی اور کے متعلق سوچوں گا بھی نہیں۔"

"او فضول چھوکرے۔ تو اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا" ڈاکٹر صنم نے مصنوعی غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا۔ میں نے سہم کر کہا۔

"آپ۔ آپ کون سی حرکت کی بات کر رہی ہیں؟ قسم سے میں نے کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کی۔ وہ تو آپ ہی۔۔۔"

"بکواس بند کرو خبیث کہیں کے۔ جاؤ کھانے کی میز پر جا کر بیٹھو۔ میں ابھی کھانا لے کر آتی ہوں" اس نے جھینپتے ہوئے کہا۔

کھانا تقریباً مکمل خاموشی میں کھایا گیا البتہ فضا میں موجود ہیجان اور کشیدگی کو میں نے واضح طور پر محسوس کیا۔ مہراں بدستور ڈاکٹر صنم سے سرد مہری کا رویہ اپنائے ہوئے تھی۔ چچا مہر داد کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ جواد نے کئی بار چوری چھپے مہراں کی طرف دیکھا۔ سب کچھ دیکھنے کے باوجود میں انجان بنا رہا۔ البتہ ایسے ہر موقعے پر میری کھوپڑی کی طیش میں ہلکی سی لہر ضرور پیدا ہوئی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر صنم نے جواد اور خالد سے کہا۔

"فی الحال تم دونوں کی یہاں موجودگی ضروری نہیں ہے۔ جاؤ جا کر اپنے کام کاج کی خبر لو۔"

"ہمارے کام کاج کی آپ فکر نہ کریں۔ ہمارے وہاں ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہماری عدم موجودگی میں ہمارا کام سنبھالنے والے موجود ہیں۔" جواد نے اس کی ہدایت سے پہلو بچانے کی کوشش کی۔

"پھر بھی مالک کی موجودگی کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ قائم مقام تو بہرحال قائم مقام ہی ہوتا ہے۔ ویسے بھی تم لوگ یہاں ٹھہر کر کرو گے بھی کیا؟ افضل سے بھی کل صبح ہی حساب کتاب شروع کیا جائے گا۔ تم لوگ شہر جا کر تازہ ترین صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش کرو۔"

میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صنم کی یہ ہدایت جواد کو پسند نہیں آئی۔ وہ تذبذب کی کیفیت میں تھا کہ خالد اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

آؤ جواد، ہم لوگ چلتے ہیں۔ آج کے دن ہم اپنا تمام کام نپٹا لیتے ہیں۔ کل صبح سویرے ہم یہاں پہنچ جائیں گے۔ ویسے بھی سب لوگ رات بھر کے جاگے ہوئے ہیں۔ انہیں آرام کی بھی ضرورت ہوگی۔"

جواب میں جواد نے کوئی عذر تراشنا چاہا لیکن وہ محض ہونٹ ہلا کر رہ گیا۔ بالآخر اس نے حلق سے مری مری سی آواز میں کہا۔

"اچھا چلو" میں نے معنی خیز نظروں سے چچا مہر داد اور مہراں کی طرف دیکھا۔ چچا مہر داد صوفے سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا جبکہ مہراں بے زاری کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

جواد اور خالد کے جانے کے کچھ دیر بعد ڈاکٹر صنم نے چچا مہر داد اور مہراں کو ایک خالی کمرے میں منتقل کر دیا۔ اسی اثنا میں افضل کو ہوش آ گیا۔ ہم دونوں نے اسے کھانا کھلایا۔ اس کے بعد میں نے ہال کمرے کے ایک صوفے پر قبضہ کر لیا کچھ ہی دیر بعد میں دنیا و مافیہا سے غافل ہو گیا۔ بہت دنوں میں ایسی مدہوش نیند سویا کہ کسی معمولی سے خواب نے بھی مداخلت نہیں کی۔ سہ پہر سے کچھ بعد میں بیدار ہوا تو میری ساری تھکن دور ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر صنم نے مجھے ایک بالکل نیا شلوار قمیص سوٹ تھما دیا۔ غسل کے بعد میں نے وہ سوٹ پہن لیا۔

"میں تمہارا مطلوبہ سامان لینے شہر جا رہی ہوں۔ اس اثنا میں تم اپنی باقی تیاریاں مکمل کر لو" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ڈاکٹر صنم کے روانہ ہونے کے بعد میں نے گیٹ میں اندر سے قفل لگا دیا۔ گھر میں پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ چچا مہر داد اور مہراں بھی بیدار ہو چکے ہیں۔ میں کچھ دیر تک ان کے کمرے سے باہر آنے کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ اپنے کمرے میں ہی آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کہ میں خود ان کے کمرے میں چلا جاؤں لیکن پھر میری انا میرے راستے میں حائل ہو گئی۔ میں نے ہمیشہ ان لوگوں کو دنیا میں سب سے عزیز' سب سے محترم سمجھا ہے۔ ان کے لیے اپنی جان پر کھیلنے سے بھی گریز نہیں کیا اس کے باوجود ان کا مجھ سے رویہ بے گانگی اور سرد مہری پر مبنی ہے۔ کوئی ایسی زہریلی' خاردار

باڑھ ہم لوگوں کے درمیان حائل ہو چکی ہے جسے عبور کرنا اب ہمارے بس کی بات نہیں رہی۔ ہم خواہ کتنی ہی کوشش کر لیں ہم لوگوں کے باہمی تعلق میں وہ پہلی سی اپنائیت واپس نہیں آسکتی۔

لہجے کی تھکن نے تری یہ پیام دیا ہے
وہ ناتا پرانا بھی اب بوجھ بنا ہے

میں نے وقتی طور پر ان کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور اپنی رات کی مہم کے بارے میں سوچنے لگا۔ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔ مضطرب ذہن کے ساتھ میں فون کی طرف بڑھا۔ اس وقت کس کا فون آن دھمکا؟

''ہیلو!'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

''ہیلو جی مجھے ڈاکٹر صنم سے بات کرنی ہے۔ آپ کون بات کر رہے ہیں؟'' دوسری طرف سے کسی مردانہ آواز نے بات کی۔ جانے کیوں مجھے وہ آواز جانی پہچانی سے محسوس ہوئی۔

''جی میں ذوالفقار بات کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر صنم صاحبہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ آپ اپنا نام بتا دیں میں انہیں آپ کا پیغام دے دوں گا۔''

''آپ۔۔۔آپ کون ہیں؟''

''میں۔۔۔ڈاکٹر صنم صاحبہ کا مہمان ہوں۔ آپ فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔'' میں نے قدرے سرد مہری سے کہا۔

''اوہ۔۔۔کچھ نہیں۔۔۔دراصل مجھے آپ کی آواز کچھ مانوس سی لگی تھی۔ خیر آپ ڈاکٹر صنم کو میرا نام بتا کر کہیے گا کہ وہ فوراً مجھ سے فون پر رابطہ کریں۔ میرا نام ڈاکٹر رضا محمد خان ہے۔'' یک لخت میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی تیز لہر دوڑ گئی۔ میں بھلا اس نام کو کیونکر فراموش کر سکتا تھا۔ وہ بھی اتنے مختصر عرصے میں۔

''جی۔۔۔جی بہت بہتر!'' میں نے دبی دبی سی آواز میں کہا۔

''اچھا خدا حافظ۔'' ڈاکٹر رضا نے مزید بات بڑھائے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے بھیانک اندیشوں نے گھیر لیا۔ کہیں اس نے میری آواز پہچان تو نہیں لی؟ فون بند کرتے ہی کہیں وہ تھانے میں نہ پہنچ جائے؟ شدید اضطراب کے عالم میں ہال میں ٹہلنے لگا۔ عین اسی وقت اطلاعی گھنٹی اپنی کریہہ آواز میں چیخنے لگی۔ میں ایک بار پھر چونک پڑا۔ تیز تیز قدموں سے میں کھڑکی کی طرف بڑھا۔ مجھے سامنے ہی گیٹ کے باہر ڈاکٹر صنم کی گاڑی نظر آئی۔ گیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے میں مسلسل اسی سوچ میں گم رہا کہ ڈاکٹر صنم کو اس فون کے متعلق بتاؤں یا نہیں لیکن اگر دوبارہ ڈاکٹر رضا کا فون آ گیا تو؟ پھر کیا ہوگا؟

''لو بھائی اٹھاؤ اپنا سامان۔۔۔خاصی پریڈ کرا دی ان چیزوں کی تلاش نے۔'' اس نے گاڑی کو اس

کی مخصوص جگہ پر ٹھہراتے ہوئے کہا۔ گاڑی کی عقبی نشست سے شاپنگ بیگ اٹھا کر میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

ڈاکٹر صنم کی آمد سے آگاہ ہونے کے باوجود چچا مہر داد اور مہراں اپنے کمرے سے باہر نہیں آئے۔ میں نے دل ہی دل میں ان پر لعنت بھیجی اور سامان لے کر اپنے کمرے میں گھس گیا وہ دراصل مختلف قسم کے کیمیکل اور محلول تھے۔ ان کے استعمال کی ترکیب مجھے فقیر بابا سے معلوم ہوئی تھی۔ اس سے پہلے اگرچہ میں نے عملی طور پر اس ترکیب کو استعمال نہیں کیا تھا۔ تاہم مجھے خاصی امید تھی کہ میں اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ خاصی دیر کی جدوجہد کے بعد میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اچھی مقدار میں ایک گاڑھا محلول تیار کر لیا۔ اس محلول کو میں نے بڑی احتیاط سے چار درمیانے سائز کی بوتلوں میں بھر لیا۔ ان بوتلوں کے ڈھکن اچھی طرح بند کرنے کے بعد میں نے وہ کینوس کے ایک بیگ میں رکھ لیں۔ اس بیگ کو میں نے سنبھال کر ایک طرف رکھ دیا۔ اسی وقت ڈاکٹر صنم کمرے میں داخل ہوئی۔

''ہاں جناب کیا تیاری مکمل ہو گئی؟''

''جی ہاں میری تیاری مکمل ہو چکی ہے۔ اب صرف روانگی باقی ہے۔''

''کھانا بھی تیار ہے تم ڈائننگ ٹیبل پر آ جاؤ۔''

''ان لوگوں کو کھانے کے متعلق کہہ دیا کیا؟''

''نہیں بھئی۔ یہ کام تو تم ہی کرو تو بہتر ہے۔ وہ لوگ مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے۔'' اس نے پریشان سے لہجے میں کہا۔

''آپ فکر نہ کریں۔ جلد ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ فی الحال میں ان لوگوں سے اس موضوع پر بات کرنا نہیں چاہتا۔ کسی طرح سے افضل کا معاملہ نپٹ جائے۔ اس کے بعد میں ان لوگوں کا کوئی مناسب انتظام کروں گا۔''

''یہ لوگ بے شک مجھ سے بات نہ کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن مجھ سے نفرت کا اظہار نہ کریں۔ میں زندگی میں کبھی نفرت کا نشانہ نہیں بنی ہوں اور نہ ہی بننا چاہتی ہوں۔ میں تو اپنے دشمنوں کو بھی دوست بنانے کی کوشش کرتی ہوں لیکن یہ لڑکی تو مجھے بات کرنے کا موقع بھی نہیں دیتی۔'' اس نے بے حد دکھی لہجے میں کہا۔ اپنی ڈبڈباتی آنکھوں کو چھپانے کے لیے وہ جلدی سے وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ مجھے اس سے شدید ہمدردی کا احساس ہوا۔ وہ بے چاری خلوص کی بندی خواہ مخواہ ہمارے لیے ہماری خوشی کے لیے اتنے جتن کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے چچا مہر داد اور مہراں پر شدید غصہ بھی آیا۔ یہ دونوں باپ بیٹی آخر خود کو سمجھتے کیا ہیں؟

اس لمحے حیرت انگیز طور پر مجھے مہراں کے لیے اپنے دل میں ذرا بھی انسیت یا یگانگت محسوس نہیں

ہوئی۔ہم خواہ کتنی بھی لفاظی کرتے رہیں یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے۔ہمیشہ دوطرفہ محبت ہی پائیدار ثابت ہوتی ہے۔ایک متوازن اور معتدل انسان ایک حد تک ہی کسی دوسرے انسان سے یک طرفہ محبت کرتا ہے۔اگر ایک مناسب وقت تک اس کے ان پرخلوص جذبات کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے تو رفتہ رفتہ یہ جذبات خود بخود سرد پڑ جاتے ہیں اور آخر کار فنا ہو جاتے ہیں۔اس معاملے میں محبت کرنے والا اگر منفی ذہنیت کا مالک ہو تو صورت حال اور بھی خراب ہو جاتی ہے۔ایسی صورت میں یک طرفہ محبت شدید نفرت بلکہ جنون میں تبدیل ہو جاتی ہے۔اس جنون میں وہ اپنے سابقہ محبوب کو نا قابل تلافی نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ہم لوگوں کے باہمی تعلقات بھی اسی طرح انحطاط کا شکار تھے۔مجھے ڈر محسوس ہوا کہ کہیں میں اپنے سگے چچا اور اس کی بیٹی سے نفرت کرنے پر مجبور نہ ہو جاؤں۔

''آیئے کھانا کھا لیجیے۔'' میں نے چچا مہرداد کے کمرے میں جانک کر کہا۔انہوں نے خاصی سرد مہری سے میری طرف دیکھا۔مجھے خطرہ محسوس ہوا کہیں یہ لوگ انکار نہ کر دیں۔صد شکر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

''تم چلو ہم لوگ ابھی آتے ہیں۔'' چچا مہرداد نے دھیمے لہجے میں کہا۔میں چپ چاپ ڈائننگ ٹیبل پر جا بیٹھا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں بھی میرے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے نظریں ملانے سے گریزاں ہیں۔ڈاکٹر صنم نے کھانا میز پر لگا دیا۔اس کے بعد وہ خود بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئی۔

''بسم اللہ کریں بابا۔'' اس نے پرخلوص لہجے میں چچا مہرداد کو مخاطب کیا۔اس نے بڑی عجیب سی نظروں سے ڈاکٹر صنم کی طرف دیکھا پھر چپ چاپ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

''وہ۔۔۔سیفل بیٹا۔۔۔وہ مجھے تم سے کچھ بات کرنی تھی۔'' کھانے کے بعد اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے چچا مہرداد نے ٹھہر کر کہا۔

''ہاں ہاں چاچا کہو۔۔۔میں سن رہا ہوں۔'' میں نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

''وہ بیٹا دراصل بات یہ ہے کہ۔۔۔'' وہ بولتے بولتے رک گیا۔''وہ۔۔۔بیٹا دراصل ہم کل صبح یہاں سے روانہ ہونا چاہتے ہیں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو چاچا؟'' میں نے چونک کر کہا۔تم لوگ کہاں جانا چاہتے ہو؟'' باورچی خانے کی طرف جاتے جاتے ڈاکٹر صنم بھی ٹھہر گئی۔

''کہیں بھی بیٹا۔جہاں زندگی لے جائے۔'' چچا مہرداد نے کہا۔

''لیکن چاچا تم اس بے سروسامانی کے عالم میں' جوان بیٹی کے ساتھ کہاں در بدر پھرو گے؟ ویسے بھی تم لوگوں کا ابھی باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔سردار شاہ مراد کے کارندے اب تمہیں بھی تلاش

کرتے پھر رہے ہوں گے۔''

''کچھ بھی ہو بیٹا۔کل نہیں تو پرسوں یا تین دن بعد ہمیں بہر حال اپنا ٹھکانا ڈھونڈنا تو ہے ہی۔ہم کب تک کسی کے بن بلائے مہمان بن کر مفت کی روٹیاں توڑتے رہیں گے۔'' اس کی بات سن کر ڈاکٹر صنم یک لخت تڑپ اٹھی۔

''یہ۔۔۔یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا؟ آپ میرے زبردستی کے مہمان تو نہیں ہیں۔آپ سیفل کے بزرگ ہیں تو میرے لیے بھی بے حد محترم ہیں۔سیفل مجھے بھائیوں کی طرح عزیز ہے۔اسی طرح مہراں میرے لیے سگی بہن کی طرح ہے۔آپ لوگ میرے لیے میرے گھر کے افراد کی طرح ہیں پھر بھلا آپ مجھ پر کیسے بوجھ ہو سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر صنم نے جذباتی لہجے میں کہا۔اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو رہی تھیں۔''میں قسمت سے گلہ کرنے کی قائل نہیں ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں بے حد محروم انسان ہوں۔اس دنیا میں میرا کوئی قریبی عزیز رشتے دار نہیں ہے۔میرے والدین بھی مجھے چھوڑ کر اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ایسے میں مجھے ہر وقت پرخلوص لوگوں کی تلاش رہتی ہے۔آپ مجھے کچھ بھی سمجھیں میں آپ کو اپنے باپ کی جگہ سمجھتی ہوں۔اتنے طویل عرصے بعد مجھے ایک بھرے پرے کنبے کا فرد ہونے کا احساس ہوا تھا لیکن آپ اس قدر جلدی مجھ سے میری یہ خوشی چھین لینا چاہتے ہیں۔مجھے معلوم ہے کہ آپ لوگ مجھ سے خوش نہیں ہیں لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ ایسا کیوں ہے؟ مجھے اپنی خطا کا علم تو نہیں ہے۔بہر حال میں آپ سے غیر مشروط طور پر معافی مانگتی ہوں۔خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں۔آپ مجھے بے شک مہراں کی جگہ نہ دیں لیکن خدارا مجھ سے نفرت نہ کریں۔آپ لوگوں کی موجودگی اس گھر میں میرے لیے خدا کی بے بہا نعمت کی طرح ہے۔مجھے اس نعمت سے اتنی جلدی محروم نہ کریں۔'' بالآخر ضبط کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ بلک بلک رونے لگی۔میں نے ملامت آمیز نظروں سے ان دونوں باپ بیٹی کی طرف دیکھا۔ان دونوں کی نظریں آپس میں ٹکرائیں اور پھر بے اختیار جھکتی چلی گئیں۔

بالآخر ڈاکٹر صنم کے آنسوؤں کا زور ٹوٹ گیا۔اس نے آہستہ آہستہ خود پر قابو پا لیا۔

''ہمیں معاف کر دو بیٹی۔'' خاصی ہچکچاہٹ کے بعد چچا مہرداد نے گھمبیر لہجے میں کہا۔''ہم نے تمہیں غلط سمجھا۔ہمیں نہیں معلوم تھا تم اتنی دکھی ہو۔ہمارے رویے سے تمہیں جو تکلیف پہنچی' اس کے لیے تم ہمیں معاف کر دو۔شاید ہم دونوں کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔تمہاری ملنساری اور خلوص کو ہم بناوٹ سمجھ رہے تھے۔پتا نہیں کیسی الٹی سیدھی باتیں ہماری دماغوں میں گھس گئی تھیں۔میں مہراں کی طرف سے بھی تم سے معافی مانگتا ہوں بیٹی۔'' چچا مہرداد کی آواز بھی جذبات کے بوجھ سے دبنے لگی۔

''ایسا نہ کہیں بابا آپ نے مجھے بیٹی کہا ہے۔باپ کو بیٹی سے معافی طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔آپ نے مجھے بیٹی کہہ کر میرے سارے رنج و غم بھلا دیے ہیں۔خدا کے لیے اب مجھے چھوڑ کر جانے کی بات مت کیجیے گا۔''

"جیسا تم کہو گی ویسا ہی ہوگا میری بچی۔"

"بابا۔" اس نے مسرت بھرے لہجے میں کہا اور چچا مہرداد کے سینے سے لپٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک بار اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے پھوٹ پڑے۔ ان جذباتی مناظر نے مجھے بے حد متاثر کیا لیکن اس سے بڑھ کر میرے دل میں اطمینان و مسرت کا بے قابایاں دریا موجیں مارنے لگا۔ خدا کا شکر ہے مجھے ایک تکلیف دہ ذہنی خلجان سے تو نجات ملی۔ اب میں زیادہ یکسوئی سے اپنے اصل مقاصد کی طرف توجہ دے سکوں گا۔

ڈاکٹر صنم ان دونوں کے ہمراہ ان کے کمرے میں چلی گئی کچھ ہی دیر بعد اس کے کمرے سے خوش گوار لہجے میں گفتگو کی آوازیں آنے لگیں۔ ان کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں افضل کے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازے کا ہینڈل گھما کر کمرے میں داخل ہوا اور فوراً ہی اپنی پشت پر دروازہ بند کر دیا۔ افضل پوری طرح بیدار تھا۔ اس نے تھکی تھکی سی مایوسی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"کیا حال ہے بھئی؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ جواب دینے کے بجائے وہ خاموشی سے میری شکل دیکھنے لگا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے پژمردہ لہجے میں سوال کیا۔

"میں آخر کب تک اسی طرح رسیوں میں جکڑا پڑا رہوں گا۔ میرے جسم کے پٹھے مردہ ہونے لگے ہیں۔"

"اس امر کا انحصار خود تم پر ہے۔ تم اپنی زبان کھول دو تو تمہاری جان اس عذاب سے چھوٹ سکتی ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر تم نے زبان کھول دی تو تمہارے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی قسم کی سودے بازی کے نتیجے میں ہماری حکومت تمہیں زندہ سلامت تمہاری حکومت کے حوالے کر دے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ ہم تمہاری زبان کھلوائے بغیر تمہیں کسی قسم کی سہولت مہیا کر دیں۔"

"مجھے ابھی تک رات کا کھانا نہیں ملا ہے" اس نے شاکی لہجے میں کہا۔

"تم فکر نہ کرو تمہیں کھانا مل جائے گا۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں آلو بھرا پراٹھا شامل نہ ہو" میں نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

"سچ سچ بتاؤ کیا ڈاکٹر صنم کو تم نے میرے ہاتھ کھولنے کی ہدایت کی تھی؟"

"ہاں۔۔۔ مجھے معلوم تھا کہ تم ڈاکٹر صنم کے جذبہ ہمدردی اور ہماری غیر موجودگی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو گے۔ اپنے شک کو یقین میں بدلنے کے لیے مجھے اس ترکیب پر عمل کرنا پڑا۔"

"تمہاری ٹھوکروں نے میری پسلیوں کو شکستہ کر دیا ہے۔ میرے پہلو ابھی تک درد کر رہے ہیں" اس نے ہلکی سی کراہ کے ساتھ کہا۔

"تم نے اپنی اس حرکت سے ڈاکٹر صنم کو بھی اپنا دشمن بنا لیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں وہ تمہارے

کھانے میں زہر نہ ملا دے۔ وہ بہت خطرناک عورت ہے" اسے خوف زدہ کرنے کے لیے میں نے ایک اور شوشا چھوڑا۔

"نہیں وہ ہرگز نہیں کر سکتی" اس نے شدید پریشانی کے عالم میں کہا۔

"کیوں وہ ایسا کیوں نہیں کر سکتی؟ زخم خوردہ عورت زہریلی ناگن سے بھی بڑھ کر خطرناک ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ہونے کے ناطے اس کے لیے زود اثر زہر کا حصول ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ ویسے بھی ایک ڈاکٹر کے لیے انسانی لاش کوئی اجنبی شے نہیں ہوتی۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو آزاد ہونے کے بعد پہلی فرصت میں فرار ہونے کی کوشش کرتا۔ نہ کہ اپنے نفسانی جذبات کی تسکین کے لیے اندھا ہوتا۔ مجھے تمہاری فطرت کی اس کمزوری کا اندازہ تھا۔ اسی لیے میں نے وہ ڈراما اس انداز میں ترتیب دیا تھا۔"

"تم بے حد چالاک شخص ہو۔ میری زبان کھلوانے کے لیے تم نے تشدد کا جو حربہ استعمال کیا' وہ بلا شبہ بے حد بھیانک تھا۔ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں اسے کس طرح برداشت کر سکا ہوں۔ میرا اعصابی نظام ابھی تک معمول پر نہیں آسکا ہے۔ تلوؤں کی سوجن کے باعث میرے دونوں پیر بے حس ہو رہے ہیں۔ یہ حربہ میرے لیے بالکل نیا ہے۔ تمہیں یہ حربہ کس نے سکھایا؟"

"یہ ایک راز کی بات ہے۔ میں ایسے اور بہت سے حربے جانتا ہوں جو میں تم پر باری باری آزماؤں گا۔ مرزا اور صدیقی کی گمشدگی کے بعد مجھے تمہاری زندگی سے کوئی دلچسپی اور ہمدردی نہیں رہ گئی ہے۔" میں نے سفاک لہجے میں کہا۔

"تم اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لو بھائی۔ ندا کی موت کے بعد مجھے بھی خود اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے" اس کے لہجے میں ایک بار پھر مایوسی در آئی۔

"تمہاری یہی مرضی ہے تو یہی سہی۔ لگتا ہے تمہاری موت اس بستر پر آئے گی۔ میرے ہاتھوں آئے یا ڈاکٹر صنم کے ہاتھوں" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور اس کمرے سے باہر نکل آیا۔

رات کا پہلا پہر ختم ہونے تک میں اپنے مشن کے لیے پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اپنے ہاتھ سے اپنا میک اپ کیا اور خاصی حد تک کامیاب رہا۔ میک اپ کی تکمیل کے بعد میرے چہرے کی رنگت سیاہی مائل ہو چکی تھی۔ ہونٹوں پر گھنی بے ترتیب مونچھیں تھیں۔ بالوں میں سرسوں کا تیل چپڑنے کے بعد میں نے وحید مراد کے انداز میں ٹیڑھی مانگ نکالی۔ اس میک اپ کے ساتھ میں نے ایک بے حد میلے کچیلے لباس کا انتخاب کیا۔ اس حلیے میں اگر کوئی مجھے سرسری نظروں سے دیکھتا تو میں کوئی موٹر مکینک یا ترکھان نظر آتا۔

ڈاکٹر صنم نے مجھے اس حلیے میں دیکھا تو اس کی بے اختیار ہنسی چھوٹ گئی۔

"کیوں دانت نکال رہی ہے او چھوکری؟" میں نے بھاری اور کرخت آواز میں اسے ڈانٹا لیکن بجائے چپ ہونے کے وہ اور زور زور سے ہنسنے لگی۔ میں اسے خونی نظروں سے گھورتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ یک لخت سنجیدہ ہوگئی۔

”کیا تم ابھی سے جا رہے ہو؟“

”ہاں۔۔۔ پیدل وہاں تک پہنچنے میں خاصا وقت لگ جائے گا۔ زیادہ رات ہوگئی تو لوگ خواہ مخواہ شک کی نظروں سے دیکھیں گے۔ جلدی پہنچنے کا یہ فائدہ ہے کہ صورت حال کو اچھی طرح سے سمجھنے کا موقع مل جائے گا“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے خدا کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ لیکن ذرا دیکھ بھال کر کام کرنا۔ اندھا دھند خطرہ مول لینے کی کوشش نہ کرنا۔“

”ٹھیک ہے میں خیال رکھوں گا“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”خدا حافظ“ ڈاکٹر صنم مجھے گیٹ پر رخصت کرتے ہوئے کہا۔

”خدا حافظ“ میرے حلق سے موہوم سی آواز نکلی اس کے ساتھ میں نے کینوس بیگ کو ہاتھ میں لٹکا کر قدم آگے بڑھا دیے۔ ڈاکٹر صنم حسب عادت دیر تک وہاں کھڑی رہی ہوگی لیکن میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

سڑک پر ابھی تک گاڑیوں کی خاصی آمد و رفت جاری تھی۔ میں کالج روڈ پر پہنچا ہی تھا کہ مجھے ایک رکشے کی آواز سنائی دی۔ میرے قریب پہنچ کر وہ سست ہوا۔ میرے ہاتھ دینے پر وہ ٹھہر گیا۔

”کہاں جاؤ گے بھائی؟“ رکشے والے نے پوچھا۔

”یار ذرا مجھے فردوس سینما تک پہنچا دے۔ اچھا ہوا تو آ گیا ورنہ خواہ مخواہ اتنی دور تک پیدل خوار ہونا پڑتا“ میں نے رکشے میں بیٹھتے ہوئے بے تکلفانہ لہجے میں کہا۔

”میرا رب جو کچھ کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے بھائی جی۔ تم نہ ملتے تو مجھے بھی خالی گھر تک جانا پڑتا۔ گیارہ بلاک میں ہے میرا گھر۔ تم کہاں رہتے ہو“ میرے حلیے سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ سماجی لحاظ سے میں بھی کوئی اونچی شخصیت نہیں ہوں لہٰذا وہ نہایت بے تکلفی سے برابر کی سطح پر مجھ سے بات کر رہا تھا۔

”میں وہیں فردوس سینما کے پیچھے والی آبادی میں رہتا ہوں۔ میں پلمبر ہوں ادھر ماڈل ٹاؤن میں ایک کوٹھی کی پلمبرنگ کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ کل تک مجھے کام مکمل کر کے دینا ہے۔ اسی لیے دیر ہوگئی“ میرے جوابات نے اسے خاصی حد تک مطمئن کر دیا۔ ہم آپس میں بدلتے ہوئے موسم اور بڑھتی ہوئی مہنگائی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اسی اثنا میں ہم اپنی مطلوبہ جگہ پہنچ گئے۔

”اور بھائی جی کتنا کرایہ بنا تمہارا؟“

”جو جی چاہے دے دو بھائی۔ تم سے کوئی سودے بازی تو نہیں کرنی“ رکشے والے نے خوش گوار لہجے میں کہا۔ میں نے اسے دس کا نوٹ دیا تو وہ خوش ہوگیا۔

جب رکشا میری نظروں سے اوجھل ہوگیا تو میں نہر کے ساتھ ساتھ سڑک پر شمال کی طرف بڑھنے لگا۔ نصف چاند کی مدھم روشنی راستے کی پہچان آسان بنا دیتی تھی۔ پچھلی رات کے برعکس اس رات آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہ تھا۔ سڑک پر اکا دکا گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ میں جان بوجھ کر درختوں کی قطار کے نیچے چل رہا تھا تاکہ کم سے کم لوگوں کی نظر مجھ پر پڑ سکے۔ میری توقع کے عین مطابق میں بلا کسی روک ٹوک کے اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ چور پٹے کے پل سے میں نے نہر پار کی اور ایک بار پھر شمال کی جانب بڑھنے لگا۔ نہر کے اس طرف والے کنارے پر اس وقت تقریباً مکمل سناٹا تھا۔ سردار شاہ مراد کی حویلی کا فاصلہ جیسے جیسے کم ہوتا گیا میں محتاط تر ہوگیا۔ مجھے معلوم تھا کہ حویلی کے حفاظتی انتظامات میں پہلے سے کئی گنا اضافہ ہوگیا ہوگا۔ عین ممکن ہے حویلی کی طرف آنے والے راستوں کی نگرانی کی جا رہی ہو۔

نہر کے پشتے سے اتر کر کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے دور سے حویلی کا ہیولا نظر آنے لگا۔ میں نے پیش قدمی جاری رکھی البتہ میری رفتار خاصی کم ہو چکی تھی۔ میری آنکھیں ٹمٹماتی چاندنی میں بہ غور آس پاس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ حویلی کے عقب میں تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر درختوں کے ایک چھوٹے سے جھنڈ میں پہنچ کر رک گیا۔ کینوس بیگ کو ایک درخت کی جڑ کے پاس رکھ کر میں ایک دوسرے نسبتاً بڑے درخت پر چڑھتا چلا گیا۔ مناسب بلندی پر پہنچ کر میں نے اپنی نظریں حویلی پر جما دیں۔ حویلی کی چار دیواری پر مناسب فاصلوں پر لائٹ لگی ہوئی تھی۔ خار دار تاروں کی باڑھ میں شاید اس وقت بھی مہلک کرنٹ دوڑ رہا ہوگا۔ کوشش کے باوجود میں حویلی کی دوسری منزل پر کسی قسم کی روشنی نہ دیکھ سکا۔ شاید تمام لوگ سو چکے تھے۔ حویلی کے اگلے حصے میں البتہ تیز روشنی ہو رہی تھی۔ حویلی کے گرد و پیش کا بغور جائزہ لینے کے باوجود مجھے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جسے میں مشکوک سمجھ سکتا۔ پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد میں درخت سے نیچے اتر آیا۔

کینوس بیگ کو کھول کر میں نے چار بوتلیں نکالیں اور انہیں احتیاط سے ایک قطار میں سجا دیا۔ اس کے بعد میں نے اپنی قمیص کی جیب سے مٹھی بھر اعشاریہ دو دو کے پستول کی گولیاں نکالیں۔ بوتلوں کے ڈھکن کھول کر میں نے وہ تمام گولیاں برابر برابر چاروں بوتلوں میں ڈال دیں۔ اس کے بعد میں نے کینوس بیگ کے ایک کونے سے مٹی کا تیل کا چھوٹا سا دھاتی ڈبا برآمد کیا۔ ڈبے کا ڈھکن کھول کر میں نے کپڑے کی ایک لمبی دھجی اس میں ڈال کر مٹی کے تیل میں بھگو دی۔ اس دھجی کے بھی میں نے چار ٹکڑے کیے اور چاروں بوتلوں کے منہ میں اس طرح ٹھونس دیا کہ دھجی کا ایک سرا بوتل سے باہر رہا۔ اس کے ساتھ ہی میری تیاری مکمل ہوگئی۔

میں نے ایک بار پھر بہ غور آس پاس کا جائزہ لیا۔ مطلع صاف پا کر میں نے وہ چاروں بوتلیں اپنے ہاتھوں میں تھامیں اور نپے تلے قدموں سے حویلی کے عقبی حصے کی جانب بڑھا۔ حویلی کے دائیں طرف

والے عقبی کونے کے پاس پہنچ کر میں ٹھہر گیا۔ میرے مشن کا اہم اور خطرناک ترین مرحلہ آچکا تھا۔ میں نے اپنی سماعت اور بصارت کی تمام قوتوں کو یکجا کر کے آس پاس کسی ذی روح کی موجودگی کو محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ہر طرف قبرستان کا سا سناٹا طاری تھا۔ پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد میں نے دو بوتلیں زمین پر رکھیں اور دو کو اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسا کر پکڑ لیا۔ اپنا دایاں ہاتھ میں نے قمیص کی جیب میں ڈالا۔ جب وہ باہر نکلا تو اس میں ایک گیس کا سگریٹ لائٹر پھنسا ہوا تھا۔ میں نے لائٹر کا بٹن دبایا۔ اس کے ساتھ ہی لائٹر کا نیلا شعلہ لو دینے لگا۔

میں نے نہایت احتیاط سے بوتل کے منہ سے باہر نکلی ہوئی کپڑے کی دھجیوں کو باری باری آگ لگا دی۔ بھک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ' مٹی کے تیل میں بھیگی ہوئی دھجیاں جلنے لگیں۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور دونوں بوتلوں کو یکے بعد دیگرے حویلی کی چار دیواری کے اندر اچھال دیا۔ میرا اندازہ تھا کہ ان میں ایک عقبی دروازے کے پاس اور دوسری لان کے آس پاس کہیں گرے گی۔ بوتلیں اندر اچھالنے کے ساتھ ہی میں نے باقی دونوں بوتلیں زمین سے اٹھائیں اور تیزی سے حویلی کے دوسرے کونے کی طرف بھاگا۔ دوسرے کونے پر پہنچ کر میں نے بقیہ دونوں بوتلوں کو بھی آگ دکھائی اور انہیں حویلی میں اچھال دیا۔ ان میں ایک بوتل کو میں نے تاک کر حویلی کے پارکنگ لاؤنج کی طرف پھینکا۔ اپنی کاروائی کے ردعمل کا انتظار کیے بغیر میں تیزی سے واپس پلٹا اور حویلی کے عقب کا چکر کاٹ کر حویلی کے اگلے حصے کی طرف گیٹ کے قریب اگی ہوئی ایک گھنی جھاڑی میں گھستا چلا گیا۔ میں ابھی خود کو سنبھال بھی نہیں پایا تھا کہ حویلی کے عقبی حصے سے ایک فائر کی آواز آئی۔ یہ اعشاریہ دو دو کے فائر کی آواز تھی۔ اس کے فوراً بعد دوسرا فائر ہوا۔ اس کے بعد تو فائروں کا تانتا بندھ گیا۔ یکے بعد دیگرے تقریباً ڈیڑھ دو درجن فائروں کی آواز آئی۔ فائرنگ کی آواز سے حویلی میں کھلبلی سی مچ گئی۔

میں نے دو تین افراد کی آپس میں چیخ چیخ کر بات کرنے کی آواز سنی۔ اچانک میں نے حویلی کی چار دیواری کے اندر سے شعلے بلند ہوتے دیکھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ شعلے دوسری منزل کی کھڑکیوں تک پہنچ گئے۔ عین اسی وقت حویلی کے دوسرے پہلو سے بھی اعشاریہ دو دو کے فائروں کی آواز آنے لگی۔ فضا میں لہرانے والے گاڑھے سیاہ دھویں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس طرف بھی آگ بری طرح بھڑک اٹھی ہے۔ میرے ہونٹوں پر ایک مطمئن سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ حویلی میں ایک قیامت سی بپا تھی۔ کئی افراد ایک ساتھ بلند آواز میں شور مچا رہے تھے۔ میں نے حویلی کی چھت پر دو افراد کو نمودار ہوتے دیکھا۔ انہوں نے جھانک کر نیچے دیکھا اور کسی نامعلوم دشمن پر فائرنگ کر دی۔ کسی نے نیچے سے انہیں ایک دو غلیظ القاب سے نوازا اور انہیں نیچے آنے کا حکم دیا۔ آگ لمحہ بہ لمحہ بھڑکتی ہی چلی گئی حتیٰ کہ اس نے دوسری منزل کی کھڑکیوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

عین اسی وقت حویلی کے کسی حصے میں زبردست دھماکا ہوا۔ مجھے سمجھنے میں ایک لمحہ بھی نہ لگا کہ یہ

گاڑی کا فیول ٹینک پھٹنے کی آواز ہے۔ اس کے ساتھ ہی حویلی میں ہونے والے شور وغل نے چیخ و پکار کی شکل اختیار کر لی۔ قدرے فاصلے پر ہونے کے باوجود پھنکارتے شعلوں کی تپش مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ میری نظریں حویلی کے گیٹ کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ یکا یک گیٹ ایک جھٹکے سے باہر کی طرف کھلا اور اس میں سے دو افراد لڑکھڑاتے ہوئے باہر نکلے۔ وہ دونوں بری طرح کھانس رہے تھے۔ زہریلا دھواں شاید ان کے پھیپھڑوں کو مسموم کر گیا ہوگا۔ دیوار کا سہارا لے کر انہوں نے خود کو سنبھالا اور چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو باہر بلانا شروع کر دیا۔ دو اور افراد تیزی سے گیٹ سے باہر نکلے۔ ان کی حالت خاصی بہتر تھی اور وہ پوری طرح مسلح تھے۔

''اوئے طیفے' تو دوسری طرف دیکھ۔ میں ادھر سے جاتا ہوں'' ان میں سے ایک نے کلاشنکوف چھپاتے ہوئے کہا۔ طیفا گردن ہلاتا ہوا دوسری طرف بڑھ گیا جبکہ کلاشنکوف بردار آگ کی روشنی میں کسی نادیدہ دشمن کو ڈھونڈتا تیزی سے حویلی کے پچھلے حصے کی طرف بڑھا۔ وہ دونوں چکر کاٹ کر واپس حویلی کے اگلے حصے کی طرف آگئے۔ وہاں کوئی اور ہوتا تو انہیں نظر آتا۔ کچھ دیر مزید تگ و دو کرنے کے بعد وہ مایوس ہو گئے۔

''یوں لگتا ہے ادھر تو کوئی چڑی کا بچہ بھی نہیں آیا ہے شیرو بھائی'' طیفے نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''اوئے بکواس نہ کر۔ یوں کہہ کہ اب وہاں کوئی نہیں ہے۔ اگر کوئی نہیں آیا تو یہ آگ کیا تیرے باپ نے لگائی ہے؟ وہ لوگ آئے اور آگ لگا کر بھاگ گئے جبکہ ہم سب سوتے رہ گئے۔ لعنت ہو ہم سب پر۔ ہم سردار شاہ مراد کو کیا منہ دکھائیں گے؟''

''پر یہ کیسی آگ ہے شیرو بھائی جو بجھنے کے بجائے مسلسل بھڑکتی ہی جا رہی ہے۔ ساری حویلی اس کی زد میں آگئی ہے'' میرے کان بڑی بے چینی سے ندا کا نام سننے کے منتظر تھے۔ کیا وہ ابھی تک حویلی کے اندر ہی پھنسی ہوئی ہے لیکن یہ لوگ تو اس کے متعلق کسی قسم کی تشویش کا اظہار بھی نہیں کر رہے ہیں۔

''ہم دونوں تو بال بال بچے ہیں۔ ہال کا دروازہ بھی آگ کی زد میں آگیا تھا۔ ہم نے صوفا اٹھا کر اس پر مارا جب جا کر وہ ٹوٹا'' کھانسنے والوں میں سے ایک نے ہانپتے ہوئے کہا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ عظیم الشان عمارت پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آگئی۔ آسمان کو چھوتے ہوئے شعلوں نے فرلانگ بھر کے فاصلے پر موجود آبادی کے باسیوں کو بھی اپنے بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آہستہ آہستہ کوئی تین درجن افراد وہاں جمع ہو گئے۔ وہ آپس میں چہ مے گوئیاں کر رہے تھے۔ آگ کی دم بہ دم بڑھتی تپش سے بچنے کے لیے' حویلی سے برآمد ہونے والے چاروں افراد حویلی کے سامنے سے ہٹ کر تقریباً میرے پاس آ کھڑے ہوئے۔

''اب سردار صاحب کو کیا بتلائیں گے شیرو بھائی! وہ تو ابھی شہر ہی میں بیٹھا ہے'' طیفے نے دبی دبی آواز میں پوچھا۔ اس کی بات سن کر شیرو خواہ مخواہ ہی طیش میں آگیا۔

''اوئے تیری ماں کا سر بتائیں گے اسے۔شام کو فون آیا تھا اس کا۔وہ اب تک ملتان جا چکا ہوگا۔ وہ چھوکری ندا بھی اس کے ساتھ گئی ہوگی۔وہ زخمی ہے۔سردار شاہ مراد اس کے علاج کے لیے اسے ملتان لے گیا ہے۔''

شیرو کی بات سن کر میرے دماغ میں زناٹا سا ہوا۔اس کا مطلب ہے میری تمام محنت اکارت گئی۔ندا اس وقت اس حویلی میں موجود ہی نہیں تھی جسے ہانکا کر کے حویلی سے نکالنے کے لیے میں نے یہ سب جتن کیے ہیں۔وہ تو کبھی کی ملتان جا چکی ہے۔میری پہنچ سے بہت دور۔مجھ پر شدید مایوسی طاری ہونے لگی۔میرے دل میں آئی کہ اپنے بے آواز پستول سے ان چاروں کی کھوپڑی میں سوراخ کر دوں۔ میرے اس رت جلے کا کچھ تو بدلہ ملے۔

آگ جتنی تیزی سے بھڑکی تھی اتنی ہی تیز رفتاری سے دھیمی بھی پڑنے لگی لیکن اسی اثنا میں پوری حویلی راکھ کا ڈھانچا بن کر رہ گئی تھی۔میرے تیار کردہ آتش گیر مادے نے میری توقع سے بڑھ کر کام دکھایا تھا۔سردار شاہ مراد کی لاکھوں کی جائداد کھنڈر میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔وہ چاروں آپس میں آئندہ کی صورت حال کے بارے میں مشورے کر رہے تھے۔میں بے چینی سے ان کے وہاں سے ہٹنے کا انتظار کرتا رہا۔خدا خدا کر کے وہ چاروں وہاں سے دفع ہوئے۔میں بے آواز قدموں سے چلتا ہوا اس جھاڑی سے نکلا اور تاریکی کی آڑ لے کر وہاں سے دور ہٹتا چلا گیا۔

میں مرے مرے قدموں سے شہر کی طرف بڑھتا رہا۔مجھے ڈاکٹر صنم کے گھر تک پہنچنا قیامت لگ رہا تھا۔چلتے چلتے مجھ پر نیند سی طاری ہونے لگی۔میرا بے ساختہ جی چاہا' میں راستے میں پاؤں پسار کر گہری نیند سو جاؤں۔خود پر جبر کر کے میں چلتا تو رہا لیکن مجھے راستوں کی کچھ زیادہ پروا نہ رہی۔بھٹکتے قدم مجھے کن کن راستوں پر لیے جا رہے تھے۔ہوش مجھے اس وقت آیا جب مجھے زور کی ایک ٹھوکر لگی۔غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک ٹوٹی پھوٹی چار دیواری ہے۔میرے سامنے دور دور تک ٹوٹی پھوٹی' پختہ اور کچی' نئی اور پرانی قبریں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔میں نے شہر خموشاں کی سرحد پر کھڑا تھا۔میں نے فوراً اس جگہ کو پہچان لیا۔میں مولوں مکلیت شاہ کے قبرستان کے پاس پہنچ چکا تھا۔

اس کے بعد مجھے سوچنے' سمجھنے' غور کرنے کی ضرورت نہ پڑی سامنے ہی قبرستان کے درمیان میں غازی خان کے مقبرے کا ہیولہ نظر آ رہا تھا۔اس کے عقب میں ہی مولوی مکلیت کا روضہء پرنور تھا۔ مدھم چاندنی کا فائدہ اٹھا کر میں قبروں کے درمیان موجود ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر چلتا ہوا مزار اقدس کی جانب بڑھا۔تربت والے حجرے کا دروازہ مجھے خلاف توقع کھلا ملا۔میں وضو کر کے حجرے میں داخل ہوا۔تربت کی پائنتی درود و فاتحہ کے بعد میں دعا میں مصروف ہو گیا۔میں نے نہایت خشوع و خضوع سے اپنے رب ذوالجلال سے اپنی کامیابی کے لیے دعا مانگی حسب معمول شدت جذبات سے میرے آنسو بہنے لگے۔اس کے ساتھ ہی میرا دل پرسکون ہو گیا۔تب میری نظر تربت کے سرہانے کی طرف دوزانو

بیٹھے ایک ادھیڑ عمر باریش شخص پر پڑی۔وہ آنکھیں بند کیے شاید کسی قسم کا ورد کر رہا تھا۔میں نے اس کی عبادت میں دخل دینا مناسب نہ سمجھا۔بے آواز قدموں سے مزار سے باہر آنے کے بعد میں عقبی سمت میں بنی ہوئی کوٹھریوں کی طرف بڑھا۔میں نے فیصلہ کیا کہ وہ رات ان ہی کوٹھریوں میں سے کسی کے برآمدے میں گزار دوں گا۔زیادہ تر کوٹھریوں کے برآمدوں میں پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس فقیر اور نشئی نیند میں مست پڑے ہوئے تھے۔بالآخر میں نے الگ تھلگ واقع ایک چھوٹی سی کوٹھری ڈھونڈ نکالی جس کا برآمدہ بالکل خالی تھا۔کپڑے کے ایک بوسیدہ کپڑے سے کھڑنجے کے فرش کو حتی الوسع اچھی طرح صاف کرنے کے بعد میں اپنے بازو کو تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔میں سونے کو کوشش کر ہی رہا تھا کہ یک لخت مجھے شدید بھوک کا احساس ہوا۔چچا مہرداد اور مہراں کے رویے سے پیدا شدہ ذہنی کھنچاؤ کے باعث میں شام کا کھانا صحیح طرح نہیں کھا سکا تھا نتیجتاً اس وقت میرا پیٹ خوراک کا مطالبہ کر رہا تھا۔

اس مردوں کی بستی میں مجھے اس وقت کون کھانا دیتا؟ میں نے بھوک کے احساس کو جھٹک کر سونے کی کوشش کی۔تھوڑی سی جدوجہد کے بعد میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گیا۔شاید نیند کا غلبہ طاری ہوتے ہی میں نے ایک خواب دیکھا۔میں نے دیکھا کہ میں اور فقیر بابا ایک ہرے بھرے جنگل میں چلے جا رہے ہیں۔فقیر بابا مجھے مختلف پودوں اور جڑی بوٹیوں کی پہچان اور خواص بتا رہا ہے میں اس کی باتوں کو حسب معمول ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔یک لخت خواب کا منظر تبدیل ہوا۔میں نے دیکھا کہ ہم دونوں فلک بوس پہاڑوں کے درمیان موجود ہیں۔ہر طرف گھٹنوں گھٹنوں برف پڑی ہوئی ہے۔ بابا مجھے برفانی لومڑی پکڑنے کی ترکیب بتا رہا ہے۔ہم شفاف ٹھوس برف پر چل رہے ہیں۔اچانک فقیر بابا کے پیروں تلے برف تڑخی۔قبل اس کے کہ وہ خود سنبھلتا یا میں اسے سنبھالتا' وہ غڑاپ سے برفیلے پانی کے دریا میں گر گیا۔اس کے حلق سے ایک دردناک چیخ نکلی۔وہ ڈوبنے سے بچنے کے لیے کسی ننھے منے بچے کے مانند الٹے سیدھے ہاتھ مار رہا تھا لیکن کوئی نامعلوم قوت اسے مسلسل گہرائی کی طرف کھینچ رہی تھی۔جب فقیر بابا کا کوئی بس نہ چلا تو اس نے مجھے مدد کے لیے پکارا ''سیفل مجھے بچاؤ'' میں نے تیزی سے اس کی طرف بڑھنے چاہا لیکن مجھے لگا کہ میرے پاؤں زمین نے جکڑ لیے ہیں۔میں نے زور لگا کر فقیر بابا کی طرف قدم بڑھانا چاہے۔یک لخت میرے پیروں کے نیچے موجود شفاف برف کا فرش تڑخنے لگا۔میری ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔مجھ میں قدم اٹھانے کی جرات نہ رہی۔

عین اسی وقت فقیر بابا نے پانی میں غوطہ کھایا اور دردناک آواز میں مجھے پکارا ''سیفل ۔۔۔ مجھے بچاؤ'' میں نے قدم بڑھانا چاہا لیکن ایک بار پھر میرے پاؤں تلے برف تڑخی۔میں ایک بار پھر منجمد ہو کر رہ گیا ''سیفل ۔۔۔ مجھے ۔۔۔ بچاؤ'' فقیر بابا نے دردناک لہجے میں پکارا۔اس کے ساتھ ہی وہ آہستہ آہستہ برفیلے پانی میں ڈوبتا چلا گیا۔چند ہی لمحوں بعد پانی کی سطح پر صرف چند بلبلے باقی رہ گئے ''بابا۔'' میں حلق پھاڑ کر چیخا۔میری آواز برف کے ویرانے میں گونج کر رہ گئی۔میں ایک بار پھر چیخا اور پھر چیختا ہی چلا

گیا۔ چیختے چیختے میری آواز بیٹھ گئی۔ یکایک میرے پیروں تلے کی برف بھی اپنی جگہ چھوڑ گئی۔ میں برفیلے پانی میں ڈوبتا چلا گیا۔ میں نے اندھا دھند ہاتھ مار کر پانی سے ابھرنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ رفتہ رفتہ یخ بستہ پانی میری ناک اور منہ کے راستے میرے جسم میں اترتا چلا گیا۔ میں نے آخری کوشش کے طور پر ہاتھ پاؤں مارے عین اسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ کوئی شخص مجھ پر جھکا ہوا ہے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے اس شخص کو پہچان لیا۔ یہ وہی تھا جسے میں نے تربت کے سرہانے دوزانو بیٹھے دیکھا تھا۔

''کون ہو بھائی۔ کیا چاہتے ہو؟'' میں نے پریشان سا ہو کر کہا۔ میرا ذہن ابھی تک اس بھیانک خواب کے اثر سے آزاد نہیں ہو سکا تھا۔

''اٹھیے! اندر چلیے'' اس شخص نے نرم لہجے میں کہا اور ہاتھ سے کوٹھری کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ کوٹھری کا دروازہ کھلا ہے اور اندر طاق میں دیا بھی روشن ہے۔ میں نے حیرانی سے اپنے مخاطب کی طرف دیکھا۔

''اندر چلیے جناب'' اس نے احترام آمیز لہجے میں مجھے کوٹھری کے اندر چلنے کی دعوت دی۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی میں نے اس کی بات مان لی۔ کوٹھری میں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ سامنے ہی ایک بڑی سی چارپائی پر صاف ستھرا بستر بچھا ہوا ہے۔

''تشریف رکھیے۔''

''لیکن یہ سب کیا ہے بھائی؟ آپ یہ سب کیوں کر رہے ہیں؟'' میں نے حیرانی سے کہا۔

''مجھے جو حکم دیا گیا ہے، میں وہی کر رہا ہوں' آپ براہ کرم تشریف رکھیے۔''

میں خاموشی سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ''آپ یہیں بیٹھیے میں ابھی واپس آتا ہوں'' اس نے کہا اور تیزی سے کوٹھری سے باہر نکل آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب چکر کیا ہے۔ چند منٹ بعد ہی وہ واپس لوٹ آیا۔ اس نے ہاتھ میں ایک طشتری اٹھا رکھی تھی جس میں خوان ڈھکا ہوا تھا۔ طشتری میرے سامنے رکھ کر اس نے اس پر ڈھکا ہوا خوان ہٹا دیا۔ یک لخت پوری فضا گرم گرم کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو سے مہک اٹھی۔ میں نے دیکھا میرے سامنے مرغ پلاؤ سے لبریز طشتری رکھی ہے۔ جس سے گرما گرم بھاپ اٹھ رہی ہے۔ کھانے پر نظر پڑتے ہی میری بھوک بھی بری طرح چمک اٹھی۔ میں نے تمام حیرانی اور استعجاب کو نظر انداز کر کے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ پہلے ہی لقمے نے میرے دہن میں لذت کا خزانہ کھول دیا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنا لذیذ کھانا کبھی نہیں کھایا تھا۔ میرے ہاتھ تیز تیز چلنے لگے۔ میرا پیٹ بھر گیا لیکن نیت نہ بھری۔ آخری لقمہ لیتے ہوئے میں نے ممنون لہجے میں کہا۔

''بہت بہت شکریہ بھائی صاحب!'' اس نے پانی کا گلاس مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

''اس شکریے کا حق دار میں نہیں ہوں بھائی۔''

''تو پھر کون ہے؟'' میں نے حیرانی کے عالم میں کہا ''اس شکریے کا اصل حقدار آپ کا میزبان ہے۔''

''میرا میزبان؟'' میں نے شدید حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں آپ کا میزبان جس کے گھر آپ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ مجھے حکم ملا تھا کہ ان کے مہمان کے لیے شب بسری کا انتظام کروں البتہ آپ کے لیے کھانے کا انتظام انہوں نے خود کیا ہے'' اس نے بے نیازی سے کہا۔ یک دم مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مجھے اس سے مزید سوال کرنے کی ہمت نہ ہو سکی ''آپ اب آرام کیجیے۔ میرا تہجد کا وقت ہو رہا ہے۔'' اس نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ مجھے خدا حافظ کہہ کر وہ کوٹھری سے باہر نکل گیا۔

استعجاب کے عالم میں کچھ دیر تک میں اس عجیب و غریب صورت حال پر غور کرتا رہا۔ میرے دل سے ممنونیت اور تحسین آمیز کلمات نکل رہے تھے۔ ایسا میزبان کسے نصیب ہوگا جو اپنے مہمان کی بھوک کا انتظام اس کے کہے بغیر کر دے۔ وہ بھی بن بلائے مہمان کا۔

میں نے طشتری کے متعلق سوچا کہ اسے ابھی واپس کر دوں تاکہ اس شخص کو صبح زحمت نہ کرنا پڑے۔ طشتری لے کر میں درگاہ کی طرف بڑھا۔ وضو خانے والے دروازے سے میں احاطے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ شخص حجرے کے دروازے کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ حجرے میں داخل ہو گیا۔ میں نے جوتیوں کے لیے مخصوص جگہ پر اپنی جوتیاں اتاریں اور حجرے کی طرف بڑھا۔ حجرے کے دروازے پر پہنچ کر میں نے اندر داخل ہونا چاہا۔

دفعتاً مجھے حیرت کے شدید جھٹکے سے دوچار ہونا پڑا۔ میرے سامنے موجود دروازہ بند تھا اور اس میں باہر کی طرف دو بھاری بھرکم تالے پڑے ہوئے تھے۔ خدایا یہ کیا ماجرا ہے؟ میں نے اپنی آنکھوں سے اس شخص کو حجرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ کیا وہ میری نظروں کا دھوکا تھا؟ میں نے بلا سوچے سمجھے حجرے کے دروازے سے کان لگا دیے۔ مجھے کسی کے بات کرنے کی آواز سنائی دی۔ مزید توجہ سے سننے سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ دراصل تلاوت کی آواز ہے۔ حجرے میں کوئی شخص نہایت خوش الحانی سے قرآن حکیم کی تلاوت کر رہا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ یہ اسی شخص کی آواز ہے جو میری خاطر مدارت کرتا رہا ہے۔ قدرے غور کرنے کے بعد معاملہ کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگا۔ وہ شخص کوئی عام انسان نہیں تھا۔ وہ خاکی نہیں آتشی مخلوق تھا۔ اپنے ذمے لگائے گئے کاموں کو بھگتا کر وہ ایک بار پھر جائے عافیت میں جا پہنچا۔

طشتری کو وہیں دیوار کے سہارے کھڑا کر کے میں ڈگمگاتے قدموں سے اپنی کوٹھری میں آ گیا۔ مدہوشی کی سی کیفیت میں بستر تک پہنچا اور پھر بے جان ہو کر اس پر دراز ہو گیا۔ میرے ذہن پر بے شمار سوالوں کا بوجھ تھا لیکن اس سے بھی بڑا بوجھ مجھے اپنی پلکوں پر محسوس ہوا۔ میں نے نیند کے خلاف مزاحمت کرنا چاہی لیکن میری ایک نہ چلی۔ کوشش کے باوجود میری آنکھیں کھلی نہ رہ سکیں۔ اس رات میں بے حد

پرسکون نیند سویا۔ صبح اذان سحر کی پرنور آواز کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ درگاہ کے احاطے میں موجود چھوٹی سی مسجد کے صحن میں موذن دعوت حق دے رہا تھا۔ میں اپنی کوٹھری سے نکلا اور وضو کر کے خانہ خدا میں حاضر ہو گیا۔ نماز کا وقت ہونے تک وہاں کوئی درجن بھر نمازی جمع ہو گئے۔ میں نے ان میں گزشتہ شب والے شخص کو ڈھونڈنا چاہا لیکن مجھے ان میں کوئی اس سے ملتے جلتے حلیے اور شکل کا حامل بھی نظر نہ آیا۔ نماز کے بعد ان ہی میں سے کسی نے حجرے کا دروازہ بھی کھول دیا میں دھڑکتے دل کے ساتھ حجرے میں داخل ہوا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود گزشتہ شب والا شخص مجھے کہیں نظر نہ آیا۔

جذبہ تشکر سے بوجھل دل کے ساتھ میں نے صاحب تربت کے حضور نزرانہ درود و فاتحہ پیش کیا اور الٹے قدموں حجرے سے باہر نکل آیا۔ سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ہی میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ صبح سویرے کی سرد اور خوش گوار ہوا سے اپنے پھیپھڑے پر کرتے ہوئے میں نے شہر کا رخ اختیار کیا۔ مجھے کوئی خاص جلدی نہیں تھی لہٰذا میں مطمئن انداز میں خراماں خراماں چلتا رہا۔ میونسپل پارک کے پاس سے گزر کر میں ٹریفک چوک پر پہنچ گیا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ رکشا پکڑ کر اپنی منزل یعنی ڈاکٹر صنم کے گھر پہنچ جاؤں کہ اچانک میرے کانوں میں کسی کی بلند للکار گونجی۔ وہ کسی مسافر بردار گاڑی کا مالک یا ڈرائیور تھا جو چیخ چیخ کر مسافروں کو اپنی ہائی لکس گاڑی میں بیٹھنے کی دعوت دے رہا تھا "آؤ بھئی چلو چلو وڈور چلو۔ سائیں دودا شاہ کی درگاہ چلو۔ صبح سویرے چلو۔" سائیں دودا شاہ کی درگاہ کا حوالہ سن کر میں نے بری طرح چونک اٹھا۔ سائیں دودا شاہ!۔۔۔ وڈورا!۔۔۔ فقیر بابا!" میرا ذہن لمحے بھر میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے قدم اس گاڑی کی طرف اٹھنے لگے۔ میرے ذہن میں گزشتہ شب کا بھیانک سپنا گردش کر رہا تھا۔ فقیر بابا کے علاوہ ہر سوچ میرے ذہن سے محو ہونے لگی۔ گاڑی والے نے نہایت گرم جوشی سے مجھے خوش آمدید کہا۔ گاڑی میں تین سواریاں پہلے ہی سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک معمر عورت اور ایک نوعمر لڑکا تھا جبکہ تیسری سواری ایک خوش شکل نوجوان لڑکی تھی۔ گاڑی والے نے مجھے ان کے سامنے والی سیٹ پر بالکل آخری کونے پر بٹھایا۔ میرے عین مقابل وہ لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے ناگواری کے اظہار کے طور پر ناک چڑھائی اور اپنی اوڑھنی سے اپنا نصف چہرہ ڈھانپ لیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں میک اپ کے ذریعے ایک کالا کلوٹا بدشکل شخص بنا ہوا ہوں۔ ایک کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ میں نے گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف نظر جما دی۔

گاڑی کو پوری طرح بھرنے میں کوئی نصف گھنٹا لگا ہوگا۔ خدا خدا کر کے گاڑی وہاں سے چلی۔ وہ لڑکی وقفے وقفے سے حقارت آمیز نظروں سے مجھے گھورنے لگتی تھی۔ شاید وہ میرا تقابل اپنے کسی پیارے سے کر رہی ہوگی جس کے گورے رنگ اور مستانی آنکھوں پر اسے بڑا مان ہوگا۔ گھنٹا گھر چوک کے پاس گاڑی کا ٹائر کسی گھڑے پر پڑا زوردار جھٹکے کے باعث وہ مجھ پر گرتے گرتے بچی۔ میں ذرا سا بھی آگے جھکتا تو وہ سیدھے میرے سینے سے آٹکراتی لیکن میں نے بروقت خود کو سنبھالتے ہوئے اپنا رخ تھوڑا سا

بدل لیا۔ میرا شانہ اس کے گداز شانے سے ٹکرایا۔ وہ فوراً ہی سنبھل گئی۔ اس نے قدرے شرمندہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے بے نیازانہ انداز میں گاڑی کی کینوس کی چھت پر نظریں جما دیں۔ اس نے یقیناً محسوس کر لیا ہوگا کہ میں جان بوجھ کر اس کے جوان لمس سے لطف اندوز ہونے کا موقع گنوا دیا ہے۔ میری اس پہلوتہی نے شاید اس پر اچھا اثر کیا۔ اب اس کی نظروں میں پہلے والی نفرت وحقارت نہیں تھی۔ گول باغ پہنچنے تک اس نے کئی بار کن انکھیوں سے مجھے دیکھا لیکن میں ان جان بنا رہا۔ میرا کئی بار دل چاہا کہ اس کے دلکش چہرے پر نظر ڈالوں لیکن میں نے اپنی اس خواہش پر قابو رکھا۔ مجھے اس کے چہرے میں ہیر کے چہرے کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ میں اگر اسے غور سے دیکھتا تو شاید پھر میرے لیے اپنی نظر ہٹانا مشکل ہو جاتا۔ چنانچہ میں نے آنکھیں بند کر کے اپنی حقیقی ہیر کے تصور میں کھو گیا۔

وہ چھوٹا سا گھر۔۔۔ کچا صحن۔۔۔ کونے میں چھوٹے سے چبوترے پر بنا چھوٹا سا باورچی خانہ۔۔۔ میں چٹائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوں ہیر میرے لیے گرما گرم روٹی پکا رہی ہے۔

"اونہوں۔۔ تم اتنی دیر لگا رہی ہو۔ میں بھوک سے مرا جا رہا ہوں۔"

"بس دو منٹ اور صبر کر لو۔ میں دال کو بگھار لگا لوں۔ اتنی دیر میں روٹی بھی پک جائے گی پھر ہم دونوں اکھٹے روٹی کھائیں گے۔"

"اچھا جناب جیسے تمہاری مرضی۔ جب تک تم کھانا تیار کرو میں بھورو سے بات کرتا ہوں۔ کیوں بھئی بھورو تمہاری مالکن روز بہ روز کالی ہوتی جا رہی ہے نا؟"

"ہاں ہاں میں تو کالی ہوتی جا رہی ہوں کبھی اپنا منہ بھی آئینے میں دیکھ لیا کرو۔ بالکل میرے توے جیسا ہو رہا ہے اور یہ مونچھیں جیسی بھورو کی پونچھ" اس نے کہا اور زور زور سے ہنسنے لگی۔ فضا میں ہر طرف سریلی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ رفتہ رفتہ ان گھنٹیوں کی آواز تیز ہونے لگی حتیٰ کہ وہ میرے کانوں کے بالکل قریب بجنے لگیں۔ میں نے ہڑبڑا کر اپنے اردگرد دیکھا۔ میرا سہانا سپنا ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے اس ہچکولے کھاتی کھٹارا گاڑی میں سوار تھا۔ میری سامنے والی سیٹ پر موجود لڑکی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ اس کی ماں اور چھوٹا بھائی بھی مسکرا رہے تھے۔ میں سمجھا کہ وہ میرے اونگھنے پر ہنس رہے ہیں۔ میں نے جھینپتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ آپس میں ہی کسی بات پر ہنس رہے ہیں۔ میں نے گاڑی کے باہر کے ماحول کا جائزہ لیا۔ میں نے دیکھا کہ ہم اپنی منزل مقصود کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔

گاڑی وڈور پہنچ کر اپنے مقررہ مقام پر ٹھہر گئی۔ پوری گاڑی خالی ہو گئی۔ وہ لڑکی اپنی ماں اور بھائی کے ہمراہ مجھے سامنے ہی نظر آ گئی۔ انہیں نظرانداز کر کے میں تیز تیز قدموں سے سائیں دودا شاہ کی درگاہ کی جانب چل پڑا۔ جوں جوں درگاہ قریب آتی گئی' میرے دل کی دھڑکنوں کی رفتار تیز سے تیز ہوتی چلی گئی۔

درگاہ کے احاطے میں پہنچ کر میں نے غائر نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اس وقت وہاں زائرین کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ میں نے ایک ایک چہرے کا جائزہ لے لیا لیکن مجھے فقیر بابا کہیں نظر نہیں آیا۔ میں ٹہلنے کے سے انداز میں سائیں دودا شاہ کے مقام استراحت کی سمت بڑھا۔ میں فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھانے ہی والا تھا کہ میری نظر اپنے مقابل کھڑے ہوئے زائرین پر پڑی۔ ان میں وہ لڑکی بھی شامل تھی جو گاڑی میں میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ میرے دائیں ہاتھ والے کونے کی طرف کن انکھیوں سے دیکھ رہی ہے۔ میں نے بے حد غیر محسوس انداز میں اس طرف گردن گھمائی۔ مجھے اس کونے میں بائیس تئیس سال کا ایک دراز قامت اور خوش شکل نوجوان کھڑا نظر آیا۔ اس کی نظریں مسلسل اس لڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھوں سے کوئی خفیف سا اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس لڑکی کے لبوں پر ایک دلکش مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میں محض لمحے بھر میں پوری صورت حال سمجھ گیا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے اس نوجوان کو گاڑی میں بھی دیکھا تھا۔ وہ گاڑی کے ڈرائیونگ کیبن والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وڈور پہنچتے ہی وہ ہمارے ساتھ ہی گاڑی سے اترا تھا۔ ان کے باہمی تعلق کا اندازہ لگانے کے لیے ان کی آنکھوں میں روشن چراغ ہی کافی تھے۔ اس لڑکی کا دل شاید اس نوجوان کے گھنے گھنگھریالے بالوں پر الجھا ہوا تھا جبکہ اس نوجوان کا دل ان شربتی آنکھوں نے پرچالیا ہوگا۔ یہ نوجوان اسی عشوہ طراز کے دیدار کی آس میں یہاں تک کھنچا چلا آیا ہوگا۔

درود فاتحہ سے فارغ ہو کر میں نے ایک بار پھر فقیر بابا کی تلاش شروع کر دی۔ کچھ ہی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مزار کے احاطے میں موجود نہیں ہے۔ مجھے پریشانی سی ہونے لگی۔ گزشتہ شب کا بھیانک سپنا ایک بار پھر میری نظروں کے سامنے پھرنے لگا۔ کہیں خدانخواستہ۔۔۔

"آپ کو کس کی تلاش ہے بھائی؟" کسی نے نرمی سے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ لمحے بھر کے لیے میں گڑبڑا سا گیا۔

"ہاں۔ نہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ دراصل مجھے اپنے ایک عزیز کی تلاش ہے۔ وہ کافی عرصے سے اپنے گھر سے غائب ہیں۔ مجھے پتا چلا کہ وہ یہاں دیکھے گئے ہیں۔"

"تم۔۔۔ تم سیفل ہو نا؟" اس نے متذبذب انداز میں پوچھا۔ مجھے اس کی زبان سے اپنا نام سن کر زبردست اعصابی جھٹکا لگا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن آپ کو۔۔۔؟"

"مجھے تمہارے متعلق سعدی بابا نے بتایا تھا۔ دو دن پہلے تک وہ یہیں تھا۔ وہ بہت دنوں سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

"اب وہ کہاں ہے؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"دو دن پہلے وہ سخی سرور سائیں کے دربار پر چلا گیا ہے۔ پتا نہیں کیوں اسے یقین تھا کہ تم جلد اس

کے پاس پہنچنے والے ہو۔ اب وہ وہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوگا" وہ پچاس پچپن برس کا صحت مند شخص تھا۔ اپنے حلیے سے وہ بھی کوئی فقیر قسم کا بندہ نظر آ رہا تھا۔ تب مجھے یاد آیا کہ رکشے میں فقیر بابا کے ہمراہ میں نے اسے ہی دیکھا تھا۔ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

"ہاں اب تو اس کی حالت خاصی بہتر ہے۔ البتہ اس کی نظر ابھی پوری طرح بحال نہیں ہو سکی" اس نے مطمئن لہجے میں کہا۔

"کیا۔۔؟" میں حیرت اور اضطراب کے ملے جلے جذبات کے ساتھ چیخ اٹھا "کیوں کیا ہوا ہے؟ اس کی آنکھوں کو کیا ہوا؟"

"ارے تمہیں کچھ نہیں پتا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں، مجھے کچھ نہیں پتا۔ جب وہ مجھ سے جدا ہوا تھا تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ بالکل صحت مند! خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ اسے کیا ہوا تھا؟" میرے اضطراب کی کوئی حد نہ تھی۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ اس کے ساتھ وہ سب کیسے ہوا بہر حال مجھے وہ بہت بری حالت میں ملا تھا۔"

"مجھے تفصیل سے سب کچھ بتاؤ۔ تمہیں وہ کہاں اور کیسے ملا تھا، اسے کیا ہوا تھا؟ میں سخت پریشان ہوں۔"

"لگتا ہے کہ اسے بہت پیار کرتے ہو۔ وہ بھی تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ دن میں کئی بار اس کی زبان پر تمہارا نام آتا ہے۔ شاید کوئی باپ اپنے سگے بیٹے کو بھی اتنی شدت سے نہ چاہتا ہوگا۔ چلو میرے ساتھ میری کوٹھری تک چلو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔"

میں کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ وہ مجھے ایک دور افتادہ گوشے میں واقع ایک چھوٹی سی کوٹھری میں لے گیا۔ وہاں پر صرف دو ہی چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں۔

"تم یہاں بیٹھو، میں تمہارے لیے پانی وانی کا انتظام کرتا ہوں۔"

"ارے بھائی چھوڑو پانی وانی کو۔ مجھے کسی شے کی طلب نہیں ہے۔ تم مجھے میرے بابا کے متعلق بتاؤ۔"

"اچھا بھئی جیسے تمہاری مرضی۔ دراصل بات یہ ہے کہ میرے بھتیجے نے سخی سرور سائیں کی درگاہ پر جوتیوں کی رکھوالی کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔ میں اکثر وہاں جاتا رہتا ہوں۔ ایک روز میں وہاں سے واپس لوٹ رہا تھا۔ میں لورالائی روڈ پر نہر کے پل کے پاس بس سے اتر گیا۔ میں وہاں سے پیدل ہی یہاں تک آجایا کرتا ہوں۔ اس روز بھی نہر کے کنارے والے راستے پر ادھر آ رہا تھا کہ اچانک میری نظر نہر کے کنارے پر پڑی۔ مجھے وہاں ایک گٹھڑی سی نظر آئی۔ اس وقت سورج بس ڈوبنے ہی والا تھا۔ جس سے

مجبور ہو کر میں ڈھلان سے نیچے اترا۔ گٹھری کو ہاتھ لگا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ تو انسانی جسم ہے۔ میں سمجھا کہ شاید لاش ہے۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ اسے وہیں چھوڑ کر چلتا بنوں لیکن میرا دل نہیں مانا۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی دل میں آیا کہ شاید اس ضعیف انسان میں کچھ سانسیں باقی ہوں۔ میں اس کا ہلکا پھلکا جسم اٹھا کر نہر کے پشتے پر لے آیا۔ اس کی نبض اور دل کی دھڑکن بہت دھیمی تھی' تاہم وہ زندہ تھا۔ البتہ اسے خاصی ضربات پہنچی تھیں۔ اس کے ہونٹ پھٹے ہوئے تھے۔ ناک اور پیشانی بری طرح سوجی ہوئی تھی۔ چہرے پر اور آنکھوں کے حلقوں پر گہرے نیل پڑے ہوئے تھے۔ اسے کسی نے نہایت بے دردی اور سفاکی سے اپنے تشدد کا نشانہ بنایا اور پھر نیم مردہ حالت میں نہر میں پھینک دیا تھا کہ اس کی رہی سہی سانسیں بھی ختم ہو جائیں۔ خدا کو شاید ابھی اس کے سانس کی ڈوری برقرار رکھنی تھی۔ چنانچہ وہ پانی میں ڈوبنے کے بجائے کسی نہ کسی طرح نہر کے کنارے لگ گیا۔ میں نے اس کے پیٹ کا پانی نکالنے کی کوشش کی۔ اس کے پیٹ میں بہت کم پانی پہنچا تھا شاید اسی لیے وہ ابھی تک زندہ بھی تھا۔

میں نے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس کا کیا کروں؟ خدانخواستہ یہ مر مرا گیا تو مدعا میرے گلے پڑ جائے گا پھر میں نے سوچا کہ یار غلام یاسین ایک انسانی زندگی کے مقابلے میں یہ چھوٹے چھوٹے خطرات کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ اللہ کا نام لے کر اسے اٹھا کر لے چل' کیا پتا اس کی جان بچ جائے۔ یہ سوچ کر میں نے اسے اپنے شانے پر اٹھا لیا۔ یہ راستہ اچھا خاصا طویل تھا اس کے باوجود میں اسے کسی نہ کسی طرح یہاں تک لے ہی آیا" غلام یاسین اپنی سانس درست کرنے کے لیے چند لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ اس کے بعد اس نے پھر اپنی گفتگو کا سلسلہ شروع کیا" اسے اپنی کوٹھری میں لٹا کر میں بڑی مشکل سے ایک ڈاکٹر کو ڈھونڈ کر لایا۔ معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ اس کی حالت بہت خراب ہے۔ اس کی دو پسلیاں بھی ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ اسے اندرونی چوٹیں بھی آئیں۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ وہ زندہ بچ بھی گیا تو اس کی بینائی ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ ڈاکٹر نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔ اسے واقعی زبردست تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس صورت حال میں اگر میں اسے اسپتال لے جاتا تو یقیناً معاملہ پولیس تک پہنچ جاتا۔ میں نے جیسے تیسے اس کا یہیں علاج کروانا شروع کر دیا۔ چند ہی دن بعد اس کی حالت سنبھلنے لگی۔ گویا وہ موت کے منہ سے واپس لوٹ آیا۔ وہ رفتہ رفتہ اٹھنے بیٹھنے اور باتیں کرنے لگا۔ البتہ اس کی نظر پوری طرح بحال نہ ہو سکی۔ اسے تمام لوگ دھندلے سایوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ جب اس کے چہرے کے زخموں کے نشانات مدھم پڑ گئے تو میں اسے گاڑی میں بٹھا کر شہر لے گیا اور اسے آنکھوں کے ڈاکٹر کو دکھایا۔ ڈاکٹر نے ہمیں بتایا کہ سر پر لگنے والی کسی چوٹ کے باعث اس کی بینائی کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ اب اس کی بینائی کا پوری طرح بحال ہونا خاصا مشکل ہے البتہ اس نے محض آزمائشی طور پر اس کا علاج کرنے کی حامی بھر لی۔

سعدی بابا اس صورت حال سے قطعی پریشان نہیں ہوا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس کی بینائی واپس آ جائے گی۔ اس کا یقین سچ ثابت ہوا۔ کچھ ہی دنوں بعد اس کی نظر بہتر ہونے لگی۔ اب وہ قریب سے انسانی چہرے پہچاننے لگا۔ اس مرحلے پر آ کر اس کی نظر ٹھہر گئی۔ ڈاکٹر نے اپنی بہت کوشش کی لیکن اس کی نظر جوں کی توں رہی۔ آخر کار ڈاکٹر نے ہار مان لی۔ سعدی بابا اس صورت حال سے بھی مایوس نہ ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ بالکل کچھ نہ ہونے سے بہتر ہے۔ اسے آزادی سے نقل و حرکت کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ لیکن اسے شاید اس کی پرواہ بھی نہیں ہے۔ وہ لاٹھی کے سہارے نہایت تیزی سے ادھر ادھر چلنے پھرنے لگا۔ اس دوران میں وہ وقتاً فوقتاً مجھ سے تمہارا ذکر کرتا رہا ہے۔ ہر بار ایسے موقعے پر اس کے لہجے میں فخر و ناز کی جھلک نمایاں ہو جاتی ہے۔ جیسے تم جیسا کوئی اور اس دنیا میں ہے ہی نہیں۔ میرے شدید اصرار کے باوجود اس نے مجھے نہیں بتایا کہ اس پر تشدد کرنے والے کون تھے اور انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ دو دن پہلے اس کی فرمائش پر میں اسے سخی سرور سائیں کے دربار پر چھوڑ کر آ گیا۔ وہاں پر میرا بھتیجا غلام رسول موجود ہے جو اس کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہے۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ غلام یاسین بھائی۔ تم نے میرے بابا کی جان بچائی اور اس کا اتنا خیال رکھا۔ زندگی نے مہلت دی تو میں تمہارا یہ عظیم احسان اتارنے کی کوشش ضرور کروں گا۔"

"ارے نہیں بھئی' ایسی باتیں نہ کرو۔ سعدی بابا جیسے تمہارے بزرگ ہیں' ویسے ہی میرے بھی۔ خدا کرے وہ مکمل طور پر صحت مند ہو جائیں میرے لیے بھی بہت خوشی کی بات ہو گی۔"

"اچھا بھائی' اب مجھے اجازت دو۔ مجھے ابھی اور اسی وقت سخی سرور پہنچنا ہے۔ میں کچھ دن بعد انشاء اللہ بابا کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آؤں گا۔ تمہارا قیام یہیں ہے نا؟"

"ہاں میں یہیں ہوتا ہوں۔ میں تم لوگوں کا انتظار کروں گا۔"

اس سے رخصت ہو کر میں درگاہ کے احاطے میں نکل آیا۔ سامنے درخت کے سائے میں مجھے وہ لڑکی اپنی ماں اور چھوٹے بھائی کے ساتھ نظر آئی۔ وہ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ ان سے تھوڑے فاصلے پر مجھے وہ دراز قد نوجوان بھی نظر آ گیا۔ وہ ایک دیوار سے ٹیک لگائے ترچھی نظروں سے ان ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ بہ غور میری طرف دیکھنے لگا۔ ہماری نظریں ملیں۔ میرے لبوں پر بے اختیار ایک معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے جھینپ کر فوراً نظریں جھکا لیں۔ میں مسکراتے ہوئے مزار کے احاطے سے نکل آیا۔

سخی سرور پہنچنے کے لیے میں نے بھی وہی راستہ اختیار کیا جو غلام یاسین اختیار کرتا تھا۔ مجھے اچھا خاصا فاصلہ طے کر کے واپس بڑی نہر کے پل پر آنا پڑا۔ اس وقت تک سورج تقریباً سر پر آ چکا تھا۔ میں جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا درختوں کے گھنے سائے میں چلتا رہا۔ اس کے باوجود میں پسینے میں بری طرح شرابور ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے شدید بھوک اور پیاس لگنے لگی۔ کھانے کو تو مجھے بھلا وہاں کیا ملتا البتہ

پیاس سے نجات کے لیے اتنی بڑی نہر میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ میں ڈھلان میں اترا اور چلو بھر بھر کر پانی سے اپنی پیاس بجھائی۔

پیٹ بھر کر پانی پینے سے میری بھوک وقتی طور پر کند ہو گئی۔ جانے پہچانے راستے پر میں خراماں خراماں آگے بڑھتا رہا۔ میں نے نصف کے لگ بھگ راستہ طے کیا ہوگا کہ آسمان پر آوارہ پھرنے والی بدلیاں متحد ہو کر گھنگھور گھٹا کا روپ دھانے لگیں۔ فضا میں ایک عجیب سی گھٹن اور حبس کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ یہ واضح طور پر تیز بارش کے آثار تھے۔ میں نے اپنی رفتار میں حتی الامکان اضافہ کر دیا۔ میں نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ بوندا باندی شروع ہو گئی۔ جب میں لورالائی روڈ پر پہنچا تو بارش میں شدت آ گئی تھی۔ سڑک پار کر کے میں تیزی سے قریب ترین درخت کی طرف لپکا۔ اسی اثنا میں میرا لباس پوری طرح شرابور ہو چکا تھا۔ چاروں طرف اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ بارش کی شدت میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

میں خاصی دیر تک کسی بس وغیرہ کا انتظار کرتا رہا لیکن بس تو درکنار اس دوران میں وہاں سے کوئی بھی گاڑی نہ گزری۔ موسلا دھار کے باعث شاید تمام گاڑیاں شہر میں ہی ٹھہر گئی تھیں۔ وہ درخت اچھا خاصا گھنا ہونے کے باوجود بارش کی بوچھار پوری طرح نہیں روک پا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھ پر قدرے مایوسی طاری ہونے لگی۔ کھڑے کھڑے میرے پاؤں سن ہونے لگے تو میں درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ خاصی دیر بعد مجھے نہر کے پل پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ میں تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ گاڑی ایک ٹرک ثابت ہوئی۔ میں نے زور زور سے ہاتھ ہلا کر ٹرک کو رکنے کا اشارہ کیا لیکن وہ مست ہاتھی کے مانند جھومتا' میرے پاس سے گزر کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں نے اپنے لبوں پر آنے والی گالی بمشکل روکا اور ڈھیلے قدموں سے واپس اس درخت کی طرف بڑھا۔ میں اس درخت کے تلے پہنچا ہی تھا کہ مجھے ایک بار پھر پل پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ میں تیزی سے پلٹا اور ایک بار پھر سڑک کے کنارے جا کھڑا ہوا۔ وہ گاڑی قریب آئی تو میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ وہ ایک مسافر بس تھی۔ اس رفتار کچھ زیادہ نہ تھی۔ اس کے باوجود میں سڑک کے عین درمیان میں کھڑا ہوا زور زور سے ہاتھ ہلانے لگا۔

بس میرے پاس آ کر رک گئی۔ میں تیزی سے اس میں گھس گیا۔ ''اوے تیڈا امتھا تے نہیں پھر گیا'' میرے کانوں میں ڈرائیور کی غصیلی آواز پڑی۔ میں اس کے لہجے کو نظر انداز کر کے اپنے لیے مناسب جگہ تلاش کرنے لگا۔ بس میں بہت کم مسافر تھے اور وہ سب بارش کی بوچھاروں کی مخالف سمت والی نشستوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ اس کے باوجود ہوا کے آوارہ جھونکوں کے ساتھ پھوار انہیں بار بار بھگو دیتی تھی۔ میں پہلے ہی اتنا بھیگ چکا تھا کہ میرے لیے اپنا بچاؤ کرنا نہ کرنا برابر تھا۔ تاہم میں بھی ان لوگوں کے ہمراہ ایک نسبتاً محفوظ نشست پر جا بیٹھا۔ میرے ساتھ والی نشست پر موجود شخص نے خود کو نیلے رنگ کی چادر میں

لپیٹ رکھا تھا۔

میں سنبھل کر بیٹھا ہی تھا کہ بس کا کنڈیکٹر میرے پاس پہنچ گیا۔ میرے پاس موجود نوٹ بری طرح بھیگ چکے تھے۔ میں نے نسبتاً بہتر حالت میں ایک نوٹ اس کے حوالے کیا۔ برا سا منہ بنا کر اس نے بقیہ پیسے مجھے واپس کیے اور بے زاری سے چلتا ہوا ڈرائیور کے پاس جا بیٹھا۔ آسمان پر بجلی بار بار چمک رہی تھی۔ میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا' ''بہت تیز بارش ہے' اللہ رحم کرے'' میرے ساتھ والی نشست پر موجود' مسافر اونگھتے ہوئے چونک اٹھا۔ اس نے اپنے منہ سے چادر ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ مجھے اس کا چہرہ مانوس سا لگا' اسے پہچاننے میں مجھے بہت کم وقت لگا۔ یہ وہی نوجوان تھا جسے میں نے دودہ شاہ کی درگاہ پر دیکھا تھا۔ اس نے بھی مجھے فوری طور پر پہچان لیا۔ اس کے چہرے پر حیرانی کے تاثرات ابھرے۔ عین اسی وقت میں نے اس لڑکی' اس کی ماں اور چھوٹے بھائی کو بھی دیکھ لیا۔ وہ ہم سے تین سیٹ آگے بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر وہ نوجوان بری طرح جھینپ گیا۔

میں نے محض وقت گزاری کے لیے' دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

''تم کہاں کے رہنے والے ہو؟'' قدرے ہچکچاہٹ کے بعد اس نے جواب دیا۔

''میرا گھر شاہ صدر دین کے قریب ایک بستی میں ہے۔'' ''اور اس کا؟'' میں نے آنکھ کے ہلکے سے اشارے کے ساتھ پوچھا۔ وہ ایک بار پھر شش و پنج میں مبتلا ہو گیا۔

''یہ ساتھ والی بستی میں رہتی ہے'' بالآخر اس نے اپنی زبان کھول ہی دی۔ ''اس پر جن آتا ہے۔ اس کی ماں ہر ماہ کی پہلی جمعرات کو اسے دونوں درگاہوں پر لاتی ہے۔''

''اس پر قابض وہ جن تم ہی تو نہیں ہو؟'' میں نے اچانک سوال کیا۔ اس غیر متوقع حملے سے وہ بوکھلا سا گیا۔

''نن۔۔نہیں تو۔۔''

''ہم سے چھپانے کی کوشش نہ کرو برخوردار۔۔۔ ہمیں راز دار بنا کر تم فائدے میں ہی رہو گے؟'' میں نے پر زور لہجے میں کہا۔

''ہم ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''تو پھر مسئلہ کیا ہے؟'' اس کے ماں باپ سے بات کر کے اس کا ہاتھ مانگ لو۔''

''فی الحال ایسا ممکن نہیں ہے۔ میں ابھی کالج میں پڑھ رہا ہوں۔ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد ہی میں کوئی روزگار حاصل کر سکتا ہوں۔ میں نے بی۔اے کر لیا تو میرا ماموں مجھے سیمنٹ فیکٹری میں کلرک لگوا دے گا۔ اس سے پہلے میں شادی نہیں کر سکتا۔ مجھے صرف تین سال کی مہلت چاہیے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے' تم لوگوں کا یہ جن بھوت کا ناٹک تین سال تک کامیابی سے چل جائے گا؟'' میں نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ اس نے شدید اضطراب کے عالم میں

کسمساتے ہوئے کہا۔

''نہیں اب یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتا۔ رقیہ کے عزیز' رشتے دار دبی دبی زبانوں میں رقیہ کی حالت کو ڈھونگ قرار دینے لگے ہیں۔ رقیہ کے ماں باپ کو مسلسل یہ مشورہ دیا جا رہا ہے کہ اس کی جلد از جلد شادی کر دی جائے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ شادی کے بعد کے بعد سب جن بھوت خود ہی بھاگ جائیں گے۔ فی الحال رقیہ کی ماں اس تجویز کے خلاف مزاحمت کر رہی ہے لیکن خطرہ ہے کہ اس کی مزاحمت بھی جلد ہی دم توڑ دے گی۔ رقیہ بہت جذباتی لڑکی ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ ایسی کسی صورت حال میں وہ اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچا بیٹھے۔''

''یہ تو واقعی تشویشناک صورت حال ہے۔ میری ہمدردیاں پوری طرح تم لوگوں کے ساتھ ساتھ ہیں۔'' میں نے خلوص دل سے کہا۔

''جو میرے بس میں ہے وہ میں کر رہا ہوں بھائی۔ میرا پیار پاک اور سچا ہے۔ مجھے اپنے رب پر یقین ہے۔ وہ میری دعا ضرور پوری کرے گا۔''

''تمہاری سوچ درست ہے۔ میں بھی تمہارے لیے دعا کروں گا'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

یک لخت مجھے اپنے چہرے پر کسی کی نظروں کی چبھن محسوس ہوئی۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس شخص کا نصف چہرہ اس کی سفید چادر میں چھپا ہوا تھا۔ ہم سے اگلی سیٹ سے گردن موڑ کر وہ کئی بار مجھے دیکھ چکا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے سامنے کی طرف دیکھنے لگا۔ میرے رگ و پے میں اضطراب کی شدید لہر دوڑ گئی۔ کیا یہ شخص مجھے پہچانتا ہے؟ لیکن کیسے؟ کیا میرے چہرے کا میک اپ بارش میں بہ چکا ہے؟ میں نے جلدی سے اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ میرے ہونٹوں پر مونچھیں ابھی تک برقرار تھیں۔ البتہ رنگت شاید پھیکی پڑ گئی ہو۔ اگر میرا چہرہ اپنی اصلی حالت میں آ گیا ہوتا تو یہ نوجوان ارشد مجھے اتنی آسانی سے نہ پہچان لیتا۔ اگر یہ شخص میری طرف سے کسی شک و شبے میں مبتلا ہے تو اس کی کوئی وجہ تو ہوگی۔

اس شخص نے دوبارہ میری طرف نہیں دیکھا تاہم میرا ذہن مسلسل اس کی طرف لگا رہا۔ بارش کے باعث بس نے سخی سرور تک پہنچنے میں معمول سے زیادہ وقت لیا۔ اسی اثنا میں بارش کی شدت میں کوئی کمی نہ آئی۔ اڈے پر پہنچ کر بس رک گئی۔ میں بس سے اترنے ہی والا تھا کہ ارشد نے مجھے روک لیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم دونوں اکٹھے رہیں۔ یہ تو واضح تھا ہی کہ وہ رقیہ' اس کے بھائی اور ماں کے بس سے اترنے کے بعد ہی نیچے اترتا۔ میں نے مضطربانہ نظروں سے اپنے سامنے والی سیٹ پر موجود اس مشکوک شخص کا جائزہ لیا۔ اس نے اپنا چہرہ بدستور چادر میں چھپایا ہوا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بس کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے پاس رک کر اس نے ایک بار پھر شدید اضطراب کا شکار بنا دیا۔ مجھے خود غصہ آنے لگا کہ میں نے کیوں خواہ مخواہ اس نوجوان ارشد کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس سے یاری

نبھانے کے چکر میں میری گردن کسی پھندے میں نہ پھنس جائے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ بس سے اترتے ہی میں اس سے اپنا پیچھا چھڑا لوں گا۔

خدا خدا کر کے وہ لڑکی رقیہ اور اس کے گھر والے بس سے اترے ارشد بھی مجھے ساتھ لیے بس سے اتر آیا۔ رقیہ نے ہم دونوں کو دیکھا اور شاید مجھے پہچان بھی لیا۔ میں اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ نہ لے سکا کیونکہ میری نظریں اسی سفید چادر والے شخص کو تلاش کر رہی تھیں۔ باوجود کوشش کے میں اسے آس پاس کہیں بھی نہ ڈھونڈ سکا۔ خدا جانے اتنی جلدی وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔ میں مزید پریشان ہو گیا۔ بس کے تمام مسافر ایک جھونپڑا نما ریسٹورنٹ کے سائبان تلے ٹھہر کر بارش کی شدت میں کمی کا انتظار کر رہے تھے' سوائے اسی سفید چادر والے کے۔ قدرے توقف کے بعد میرا ذہن اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ میرا مزید اس جگہ رکنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ارشد کی تمام تر توجہ رقیہ کی جانب تھی۔ موقع مناسب جان کر میں نے کھسکنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اگر ارشد مجھے دیکھ لیتا تو میں اس سے رفع حاجت کا بہانہ بنا دیتا۔ خوش قسمتی سے وہاں موجود کسی فرد نے میری نقل و حرکت پر توجہ نہ دی۔ میں تنو کے پاس سے گزر کر ریسٹورنٹ کے پچھواڑے نکل آیا۔ اس طرف کیچڑ کچھ زیادہ تھی۔ میں اپنی شلوار کے پائنچے چڑھا کر اصل راستے سے ذرا ہٹ کر دربار کی جانب بڑھنے لگا۔ مجھے اصل خطرہ پولیس چوکی کی طرف سے تھا۔ چوکی کے قریب پہنچ کر میں راستے سے مزید ہٹ گیا۔ میں چوکی کے عقب سے خاصے فاصلے سے گزرا۔

بارش کے باعث قانون کے فرض شناس محافظ اپنی اپنی پناہ گاہوں میں دبکے ہوئے تھے۔ قصبے کی تنگ اور پرپیچ گلیوں میں کئی بار میں راستے سے بھٹکا۔ بالآخر میں کسی نہ کسی طرح دربار تک پہنچ ہی گیا۔ دربار کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی میرے دل میں اطمینان کا بے پایاں احساس موجیں مارنے لگا۔ مجھے لگا کہ میں ہر قسم کے خطرے سے محفوظ ہو گیا ہوں۔ بارش کے باعث تمام لوگ ادھر ادھر دبکے ہوئے تھے۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ فقیر بابا کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانا شروع کیں۔ زیادہ تر بھکاری اور ملنگ تربت والے حجرے کے برآمدے میں ادھر ادھر ڈیرے جمائے بیٹھے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک ایک کو بہ غور دیکھ لیا۔ فقیر بابا ان میں موجود نہیں تھا۔ مایوس ہو کر میں تربت والے بڑے کمرے میں داخل ہو گیا۔ ایک ہی نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ فقیر بابا یہاں بھی نہیں ہے۔

پژمردگی اور مایوسی کے عالم میں میرا دل بوجھل ہو گیا۔ میں نے فاتحہ خوانی کے لیے ہاتھ اٹھائے تو میری آنکھیں بہہ نکلیں۔ عاجزی کے عالم میں دیر تک میں اپنے خدا سے اپنی کامیابی کی دعا مانگتا رہا۔ میں نے دعا ختم کر کے منہ پر ہاتھ پھیرے ہی تھے کہ اچانک مجھے ایک بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔ میں برآمدے میں پہنچا اور اپنے مطلب کے کسی بندے کو تلاش کرنے لگا۔ بالآخر میں نے ایک ہٹے کٹے فقیر کو اپنے مقصد کے لیے چن لیا۔

"بابا' کیا تمہیں معلوم ہے کہ درگاہ کے زائرین کی جوتیوں کا ٹھیکے دار کہاں رہتا ہے؟" میں نے نرم لہجے میں پوچھا۔ اس فقیر نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورا۔

"کیوں تجھے اس سے کیا کام ہے؟" اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ میں نے قدرے جھنجلاہٹ کے ساتھ کہا۔

"مجھے اس سے جو بھی کام ہو تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ اگر تم اس کے گھر کا پتہ نہیں جانتے تو میں کسی اور سے پوچھ لیتا ہوں۔"

"ٹھہرو۔ کیا تم بھی اس خبیث بڈھے سے ملنا چاہتے ہو؟ میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ وہ کوئی پیر فقیری نہیں بلکہ بہروپیا ہے۔ تم اس کے چکر میں نہ پڑھنا۔"

"تم کس بڈھے کی بات کر رہے ہو؟" میں نے شدید حیرت کے عالم میں پوچھا۔ اس فقیر نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"اچھا تو تم کچھ نہیں جانتے؟"

"نہیں بھئی' میں تو ٹھیکے دار سے ملنے آیا ہوں۔ مجھے وڈور سے اس کے چچا نے بھیجا ہے۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ ٹھیک ہے میں تمہیں اس کے گھر کا پتہ بتا دیتا ہوں لیکن اس بڈھے سے بچ کر رہنا۔ وہ بہت بڑا فراڈی ہے کہیں تمہاری جیب بھی خالی نہ کرا لے۔" میں نے جواب میں اقراری انداز میں گردن ہلا دی۔ اس نے مجھے ٹھیکے دار کے گھر کا پتہ بتا دیا۔ زیادہ پیچیدہ راستہ نہیں تھا۔ فقیر کا شکریہ ادا کر کے میں دربار کے دروازے سے باہر نکل آیا۔

بارش کے تھپیڑے سہتا' کیچڑ سے بچتا بچاتا میں کچھ ہی دیر بعد اپنے مطلوبہ مکان تک پہنچ گیا۔ اپنے ہیجان پر قابو پاتے ہوئے میں نے دروازے کی کنڈی زور سے کھٹکھٹا دی۔ کچے صحن میں کسی کے قدموں کے چھپاکوں کی آواز ابھری۔ دروازہ کھولنے والا تیس بتیس برس کا باریش شخص تھا۔

"جی فرمائیے؟" اس نے خلاف توقع صاف ستھری اردو زبان میں کہا۔

"مم۔۔۔ مجھے بابا۔۔۔ سعدی بابا سے ملنا ہے۔"

"اتنی تیز بارش میں؟"

"ہاں بھائی جان ان سے ضروری کام ہے۔ وہ مجھے پہچانتے ہیں۔ ان سے کہو سعید خان ان سے ملنے آیا ہوں" میں نے مضطرب لہجے میں کہا۔

"اگر ایسی بات ہے تو پھر تم میرے بھی مہمان ہو۔ آؤ اندر آ جاؤ۔ میں تمہیں بابا کے پاس لے چلتا ہوں۔" اس نے نرم لہجے میں کہا اور میرے لیے راستہ چھوڑ دیا اور مجھے ساتھ لے کر ایک کمرے کے کھلے دروازے پر پہنچا۔

"بابا۔۔۔ بابا دیکھو تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔"

"مجھ سے کون ملنے آ گیا بھائی!" چارپائی پر دراز دبلے پتلے شخص نے کہنیوں کے بل اٹھ کر چندھیائی ہوئی سی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ مجھے اپنا گلا آنسوؤں سے رندھتا محسوس ہوا۔

"مم۔۔۔ می سس۔۔۔ سعید ہوں بابا!" شدت جذبات سے میری آواز ٹوٹ ٹوٹ جاتی تھی۔ میری آواز سن کر اسے کرنٹ سا لگا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

"سس۔۔۔ سعید خان!" اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں بابا۔۔۔ یہ میں ہی ہوں۔ تمہارا سعید خان۔ آخر میں نے تمہیں ڈھونڈ ہی لیا" میں نے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میرے الفاظ نے فقیر بابا پر جادو کا سا اثر کیا۔

وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ میں کسی جڑ سے اکھڑے درخت کے مانند اس کے نحیف جسم پر ڈھے گیا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ "نہ رو میرے بچے نہ رو" فقیر بابا نے میری پیٹھ تھپک کر کہا۔ اس کی تسلی نے جلتی پر تیل کا سا کام کیا۔ میں اور زور سے' باقاعدہ کسی ننھے بچے کے مانند بلک بلک کر رونے لگا۔ میرا دل میرے قابو میں ہی کب تھا۔ فقیر بابا کی اپنی آنکھیں بھی جل تھل ہو رہی تھیں۔ اس نے مزید دلاسا دینے کی کوشش نہ کی۔ شاید اس لیے کہ میرے اندر کا زہر میری آنکھوں کے راستے بہہ جائے۔ روتے روتے میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ وہ باریش شخص ہمیں حیرانی سے دیکھ رہا ہو گا لیکن ہمیں اس کی پرواہ کب تھی۔ بالآخر میرے آنسوؤں کا زور ٹوٹنے لگا۔ میرے دل کی حالت سنبھلنے لگی۔ فقیر بابا نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے مجھے اپنے سینے سے الگ کیا۔

"تو ٹھیک تو ہے میرے بچے؟" اس نے اپنی چندھیائی ہوئی آنکھیں میرے چہرے پر جماتے ہوئے کہا۔

"میں ٹھیک ہوں بابا لیکن یہ۔۔۔ یہ تو نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے؟"

"میں بھی ٹھیک ہی ہوں بیٹا۔۔۔ اب اور بھی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ اب تو آ گیا ہے نا! اب میری ساری بیماریاں دور ہو جائیں گی۔"

"لیکن تیرے ساتھ یہ سب کس نے کیا بابا؟ کس نے تیرا یہ حال بنا دیا؟ مجھے اس کا نام بتا دے بابا۔ میرا خون میری رگوں کو جلا رہا ہے" میرے لہجے میں انتقام کے انگارے دھک رہے تھے۔

"پاگل نہ بن۔ میں نے تجھے کتنی بار سمجھایا کہ غصے کو اپنے دماغ پر نہ چڑھنے دیا کر۔ ادھر بیٹھ میرے پاس۔ میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا" فقیر بابا نے پچکار کر مجھے اپنے پاس چارپائی پر بٹھا لیا۔ ہمارے میزبان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں یہاں بیٹھ کر آپس میں بات کرو۔ میں تمہارے لیے روٹی پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔"

"اتنی تیز بارش میں تم کہاں جاؤ گے بھائی۔ تکلیف نہ کرو۔ مجھے فی الحال اتنی بھوک نہیں ہے" میں

نے اپنے پیٹ میں بڑھکتی ہوئی بھوک کی آگ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''اس میں تکلیف کی کوئی بات نہیں ہے بھائی۔ تم بابا کے مہمان ہو تو میرے لیے اپنے مہمانوں سے بھی بڑھ کر ہو۔ تم لوگ آپس میں بات کرو' میں ابھی تھوڑی دیر میں گرما گرم کھانا لے کر آتا ہوں۔''

''اچھا بھئی! جیسے تمہاری مرضی!'' فقیر بابا نے مسکراتے ہوئے اسے اجازت دے دی۔ وہ فوراً ہی اپنی چادر سر پر ڈھانپ کر کمرے سے نکل گیا۔ ہم نے گھر کا دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنی۔

''بڑا ہی سعادت منداور مہمان نواز بچہ ہے۔ اللہ اس کی عمر دراز کرے'' فقیر بابا نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ میں فقیر بابا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کچھ کہنے ہی والا ہی تھا کہ میں نے ایک جھٹکے سے مکان کا بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔

''ارے۔۔۔ یہ اتنی جلدی واپس آ گیا؟'' فقیر بابا نے حیرانی سے کہا۔

میں اس کا ہاتھ چھوڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے دیکھا کہ مکان کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا ہے اچانک کھلے ہوئے دروازے سے ایک انسانی جسم اندر داخل ہوا۔ سفید لباس میں ملبوس وہ شخص اپنی جھونک میں آگے بڑھا اور کیچڑ میں دو قلابازیاں کھا کر صحن کے وسط میں ڈھیر ہو گیا۔ اس کا چہرہ کیچڑ میں لتھڑا ہونے کے باوجود میں نے اسے ایک لمحے میں پہچان لیا۔ وہ ہمارا میزبان تھا! قبل اس کے کہ ہم کچھ کر پاتے' کھلے دروازے سے تین پولیس والے دندناتے ہوئے صحن میں گھس آئے۔ انہیں اپنے ہدف کا پوری طرح علم تھا۔ کیچڑ میں چھپاکے اڑاتے اپنی رائفلیں سونتے وہ سیدھے ہمارے کمرے کی طرف بڑھے۔

''کون آیا ہے سیفل؟'' فقیر بابا نے پوچھا۔

''پولیس!'' میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے نیفے پر ہاتھ مارا۔ یک لخت مجھے اپنے پیروں تلے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی۔ میرے نیفے سے پستول غائب تھا۔ میں خالی ہاتھ ہو چکا تھا' بالکل نہتا۔۔۔!

☆O☆

خطرہ عین سر پر آن پہنچا تھا۔ میرا پستول جانے کب میرا ساتھ چھوڑ گیا تھا' اب میں حملے میں پہل کے حق سے محروم ہو چکا تھا۔ میرا ذہن برق رفتاری سے صورت حال کا میزان کر رہا تھا۔ میں خالی ہاتھوں سے خودکار ہتھیاروں سے لیس حملہ آوروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ممکن ہے ان میں سے ایک آدھ کو مار گراتا لیکن تب تک باقی دو مجھے مار گراتے۔ میں اپنے آپ کو ان کے حوالے کرنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا۔ عین ممکن تھا وہ مجھے دیکھتے ہی گولی سے اڑا دیتے۔ میرے جیسے خطرناک مجرم کو پولیس مقابلے میں ہلاک کر کے وہ اپنے لیے ترقی کے راستے کھول سکتے تھے' دوسری طرف سردار شاہ مراد کی خوشنودی اور اس کی طرف سے میرے سر کی قیمت دو لاکھ روپے نقد بھی ان کے حصے میں آتے۔

نہیں' نہیں میں ایسی بے بسی اور لاچاری کی موت قبول نہیں کر سکتا' میں سردار شاہ مراد کو اتنی آسانی سے جیتنے نہیں دوں گا۔ اگر مجھے مرنا ہی ہے تو مردوں کی طرح جان لڑاتے ہوئے اپنی زندگی کو خیرباد کہوں گا۔ میں محض لمحہ بھر میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ قبل اس کے کہ مسلح شکاری مجھ تک پہنچ پاتے' میں نے کمرے کا دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگا لی۔ مہلت بہت کم تھی۔ بھاری بھرکم دروازہ خاصا مضبوط تھا لیکن کچی دیوار میں نصب چوکھٹیں زیادہ دیر جمی نہیں رہ سکتی تھیں۔ مجھے فوری طور پر راہ فرار تلاش کرنا تھی اور اس کے لیے میں عقبی دیوار میں موجود ایک روشن دان سے امید وابستہ کیے ہوئے تھا لیکن اس سے پہلے مجھے فقیر بابا سے کچھ کہنا تھا ''بابا یہ پولیس والے میرے پیچھے آئے ہیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔۔۔'' میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی دروازے پر رائفل کے دستے کی لگاتار ضربیں پڑنے لگیں۔ پھر کسی نے غضب ناک لہجے میں ''اوئے دروازہ بند کر کے تو ہم سے بچ نہیں سکتا۔ دروازہ کھول دے ورنہ ہم تیرے ٹوٹے کر دیں گے۔''

میں نے ان بڑکوں پر توجہ دیے بغیر فقیر بابا کے کان میں سرگوشی جاری رکھی ''میرے جانے کے بعد تم مجھ سے مکمل لاتعلقی ظاہر کرنا اور موقع ملتے ہی یہاں کے رئیس سردار خضر خان کے پاس چلے جانا۔ وہ مجھے ذوالفقار شاہ کے نام سے جانتا ہے اور اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہے۔ تم اسے پوری صورت حال سے آگاہ کر دینا۔ میں ان کتوں سے پیچھا چھڑا کر وہیں پہنچوں گا۔''

اس گفتگو میں چند بے حد قیمتی لمحے ضائع ہو گئے تھے لیکن ابھی وقت ہاتھ سے پھسلا نہیں تھا۔ میں برق رفتاری سے دیوار کے ساتھ رکھے صندوق پر چڑھا اور روشن دان کے دونوں پٹ کھول دیے۔ روشن دان میں نصب سلاخیں دیکھ کر مجھے مایوسی تو ہوئی لیکن افسوس کرنے کا وقت کہاں تھا۔ میں نے اپنی پوری قوت یک جا کر کے شانے سے سلاخوں پر ضرب لگائی اور پھر یکے بعد دیگرے یہ عمل دہراتا چلا گیا۔ نہ جانے وہ کون سی ضرب تھی کہ روشن دان اکھڑ کر دوسری طرف جا گرا۔ میں نے اپنے جسم کو سکیڑا اور روشن دان کے خلا سے گزرنے لگا۔ وہ روشن دان ایک بڑے سے احاطے میں کھلتا تھا۔ وہاں سے زمین تقریباً آٹھ فٹ نیچے تھی' چھلانگ لگانے کا نتیجہ پاؤں ٹوٹنے کی صورت میں بھی نکل سکتا تھا لیکن دروازے پر پڑنے والی ضربوں سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ بس اکھڑنے ہی والا ہے چنانچہ میں نے اللہ کا نام لیا اور چھلانگ لگا دی۔ پتھریلی زمین پر قدم پڑتے ہی میرے پیروں میں زوردار زناٹا دوڑ گیا' عین اسی وقت فضا ایک زوردار دھماکے سے لرز اٹھی' گولی میرے بہت قریب پتھریلی زمین سے ٹکرائی تھی' میں نے ایک زوردار جست لگائی اور قلابازی کھاتا ہوا لکڑی کے پھاٹک سے جا ٹکرایا۔ پھاٹک کے قریب زمین قدرے کم پتھریلی تھی اور وہاں پر بارش کے پانی نے جمع ہو کر ایک چھوٹا سا تالاب بنا دیا تھا۔ ایک چھپاکے سے میرا لباس گدلے پانی میں تر ہو گیا۔ میں پھاٹک کی کنڈی کھولنے کے لیے اٹھنے لگا تھا کہ ایک بار پھر فضا میں فائرنگ کی تڑتڑاہٹ گونجی۔ گولیوں کا برسٹ مجھ سے محض دو ڈھائی فٹ کے فاصلے

پر پھاٹک کر چیرتا چلا گیا۔ پھاٹک کے اس حصے کے لکڑی کے تختوں کے پرخچے اڑ گئے۔ اس سے پہلے کہ شکاری مجھے صحیح طرح اپنی زد میں لے کر انگاروں کی نئی بوچھار روانہ کرتے میں نے زمین پر لوٹ لگائی اور گولیوں سے چھلنی ہونے والے تختوں پر دونوں پیر جوڑ کر زوردار ضرب لگائی۔ اگلے ہی لمحے پھاٹک میں خاصا بڑا خلا بن چکا تھا۔ میں نے کسی وحشی چیتے کی مانند زقند لگائی اور خلا سے باہر نکلتا چلا گیا۔ اگر مجھے ایک ثانیے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو اگلا برسٹ بارش کے نتیجے میں بننے والے تالاب میں چھینٹے اڑانے کے بجائے مجھے چھلنی کر چکا ہوتا۔

میں فی الوقت خطرے کی زد سے باہر ہو چکا تھا لیکن مسلح درندے اتنی آسانی سے میرا پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔ چنانچہ میں نے سنبھلتے ہی گلی میں ایک طرف دوڑ لگا دی۔ میری خوش قسمتی کہ اس وقت وہ گلی بالکل ویران نظر آ رہی تھی۔ میں قطعاً نہیں جانتا تھا کہ وہ گلی مجھے کس طرف لیے جا رہی ہے۔ میں تو بس دیوانہ وار بگٹٹ دوڑے جا رہا تھا۔ میرے کسی موڑ مڑنے سے پہلے شکاری گلی میں پہنچ جاتے تو مجھے کسی لنگڑے ہرن کی طرح مار گراتے۔ عین اس وقت جب میری امیدیں دم توڑنے لگی تھیں۔ اچانک میں ایک چھوٹی سی گلی کے موڑ پر پہنچ گیا۔ میں تنگ گلی میں مڑا اور اپنی پوری قوت سے دوڑتا چلا گیا۔ مجھے قطعاً علم نہیں تھا کہ میرے تعاقب میں آنے والے مجھے اس گلی میں مڑتے دیکھ چکے ہیں یا نہیں۔ میں تو بس کم سے کم وقت میں ان کی پہنچ سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔

اچانک ہی گلی کا اختتام ہو گیا۔ میں نے بمشکل خود کو روکا۔ سخی سرور سائیں کے دربار کے عقب سے گزرنے والا خشک برساتی نالا میری نظروں کے سامنے تھا۔ ایک خطرناک حد تک ڈھلوان گزرگاہ مجھے وہاں تک لے جا سکتی تھی لیکن نالے کی طویل و عریض ریتلی تہ تک پہنچنے کے بعد اپنے لیے کوئی آڑ تلاش کرنا میرے لیے بے حد دشوار ہو جاتا۔ مجھے ریتلا میدان عبور کر کے دوسری طرف واقع اکا دکا مکانات تک جانا پڑتا' اس بعد بلند و بالا پہاڑی سلسلے میں خود کو پوشیدہ کر سکتا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اب یہ خطرہ مول لینے کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ واپس پلٹنا' سیدھا موت کے منہ میں جانے کے مترادف تھا۔

میں نے قدرے توقف کے بعد ڈھلوان رستے پر قدم بڑھائے' میری رفتار خاصی تیز تھی۔ لیکن ایک چوتھائی راستہ طے ہوتی ہی میری رفتار میں خود بخود اضافہ ہو گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں خود پر قابو کھو چکا ہوں۔ اب میں مکمل طور پر کشش ثقل کے رحم و کرم پر تھا جو پوری قوت سے مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور میں بے جان پتھر کی مانند لڑھکتا چلا جا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اپنے دوڑتے قدم روکنے کی کوشش کی تو پھر مجھے اپنے پیروں کے بجائے قلابازی کھاتے ہوئے جانا پڑے گا۔ اس صورت میں میرا حشر زیادہ برا ہوتا لیکن حشر تو اب بھی کچھ زیادہ ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ جوں جوں میں تہ کے قریب ہوتا جا رہا تھا' بڑے بڑے پتھروں کے ڈھیر بھی تیزی سے میری ہڈیوں کا چورا کرنے کے لیے

آگے بڑھتے نظر آ رہے تھا۔ میری رفتار اتنی تیز ہو چکی تھی کہ میں اپنے بچاؤ کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا سوائے رب کریم سے دعا مانگنے کی۔ اس نازک لمحے مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ قادر مطلق کی قدرت کے مقابلے میں انسان کتنا حقیر اور بے بس ہے۔ ہم حقیر سا کام کر کے سمجھتے ہیں یہ ہماری ذہانت اور قوت بازو کا نتیجہ ہے لیکن اگر خدا کی منشا نہ ہو تو کیا ہماری اتنی وقت ہے کہ زمین پر پڑا ہوا ایک معمولی کنکر بھی راستے سے ہٹا سکیں۔

میں نہیں جانتا کہ تیز رفتاری سے بلندی سے پستی کی طرف آنے کی وجہ سے مجھ پر غشی طاری ہو گئی تھی یا کسی نامعلوم دھند نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں تیز رفتاری سے پیٹ کے بل ایک بڑے سے گول پتھر سے ٹکرایا تھا اور پھر پلٹ کر دوسری طرف جا گرا تھا۔ جانے یہ تصادم واقعی بے ضرر تھا یا کوئی اور معاملہ تھا۔ ب بہر حال میں نے چند لمحوں بعد اٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کی تو پسلیوں میں ہلکے سے درد کے علاوہ مجھے کوئی تکلیف نہ ہوئی البتہ میرا سر بری طرح چکرا تھا اور کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں بھی گونج رہی تھیں۔ میری یہ کیفیت زیادہ دیر برقرار نہ رہی۔ ہوش و حواس بحال ہوتے ہی میں نے پلٹ کر بلندی پر گلی کے سرے کی جانب دیکھا۔ مسلح بردار ابھی تک وہاں نہیں پہنچے تھے۔ میں شاید کچھ زیادہ ہی تیزی سے بلندی سے پستی تک کا فاصلہ طے کر آیا تھا۔

اگلے ہی لمحے میں پوری رفتار سے خشک برساتی نالے کے دوسرے کنارے کی طرف دوڑنے لگا۔ میں نے نصف راستہ ہی طے کیا تھا کہ فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ گولیاں شاید مجھ سے چند قدم پیچھے گیلی ریت میں دھنس گئی تھیں۔ موت کی چاپ سن کر میری رفتار میں خود بخود اضافہ ہو گیا تھا۔ نالے کے کنارے تک پہنچتے پہنچتے مجھ پر دو برسٹ فائر کیے گئے لیکن دونوں مرتبہ قسمت میری پشت پناہ ثابت ہوئی۔ بالآخر میں مختصر سی چڑھائی عبور کر کے کچے مکانوں کی چھدری قطار کے درمیان پہنچ گیا۔ اس وقت دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید گولیوں کی بارش نے سب کو اپنی پناہ گاہوں میں دبکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ صورت حال میرے لیے فائدہ مند تھی۔ میں اس وقت کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ میرے عقب میں ایک بار پھر کلاشنکوف کا قہقہہ گونجا لیکن اب میں نشانے کی زد سے باہر نکل چکا تھا البتہ میں نے اپنی رفتار مزید تیز کر دی۔ میں جنگلی گھوڑے کی طرح ویران گلی میں دوڑا چلا جا رہا تھا۔

مجھے اطمینان یہ تھا کو میرے تعاقب میں آنے والے مجھے آسانی سے گھیر نہیں پائیں گے۔ وہ اس وحشیانہ تیز رفتاری سے ڈھلوان راستے سے نیچے اترنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ انہیں بخوبی علم ہو گا کہ ایسی حماقت کا نتیجہ کھوپڑی کے ٹکڑے ہونے کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔ انہیں ہر قدم سنبھل کر رکھنا تھا۔ مجھے یہ بھی اعتماد تھا کہ ہموار راستے پر وہ میری رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکتے اگلے چند سو گز کے بعد میں پہاڑی گھاٹیوں کی بھول بھلیوں میں گم ہونے والا تھا۔

میں مسلسل دوڑتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ مجھے یقین ہو گیا کہ میرا تعاقب کرنے والے بہت پیچھے رہ گئے

ہیں۔شاید وہ راستے میں ہمت ہار کر واپس لوٹ گئے تھے۔ بالآخر میں نے اپنا رخ بدلا اور ایک بار پھر کچھ برساتی نالے کی ریتلی گزرگاہ پہ پہنچ گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ میں دربار سے کم از کم دو اڑھائی کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکا ہوں۔ اب وہ خفیہ غار کچھ ہی دور رہ گیا تھا جہاں مجھے فقیر بابا کی مہربانی سے نئی زندگی ملی تھی۔ میں ایک بار پھر اسی غار کو اپنی پناہ گاہ بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس فیصلے کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس غار کے کچھ ہی فاصلے پر پانی کا چشمہ موجود تھا کہ جو میرے خشک گلے کو تر بہ تر کر سکتا اور مجھے امید تھی کہ غار میں کھانے کے قابل کوئی چیز بھی ضرور مل جائے گی جسے حلق سے اتار کر میں پیٹ میں بھڑکتی بھوک کی آگ کو سر کر سکوں گا۔

چشمے کے میٹھے پانی کے چند گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد میں غار تک پہنچنے کے لیے پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ فقیر بابا کا غار کافی بلندی پر واقع تھا اور بالکل قریب پہنچے بغیر نظر نہیں آتا تھا۔ غار کے دھانے تک پہنچتے پہنچتے میں بارش میں پوری طرح بھیگ گیا جو کچھ ہی دیر پہلے دوبارہ شروع ہوئی تھی۔ سیاہ بادلوں کی وجہ سے شام قبل از وقت سر پر منڈلانے لگی تھی' غار کے اندر اچھا خاصا اندھیرا تھا۔ میں زمین ٹٹولتے ہوئے اس طرف بڑھا جہاں ایک طاق نما جگہ فقیر بابا کھانے کا خشک راشن رکھا کرتا تھا۔ میرا ہاتھ کپڑے کی دو چھوٹی پوٹلیوں سے ٹکرایا۔ میں نے بمشکل ان کے منہ کھولے اس کے ساتھ ہی میرے وجود میں طمانیت کی لہر دوڑ گئی۔ ان میں سے ایک پوٹلی میں بھنے ہوئے چنے تھے جب کہ دوسری پوٹلی میں گڑ تھا۔ اس وقت وہ بظاہر حقیر کھانا دنیا کی سب سے لذیز نعمت لگا۔ بھوک کے عذاب سے نجات حاصل کر کے میں ہموار فرش پر دراز ہو گیا۔

تھکن کی شدت سے برا حال ہونے کے باوجود نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اتنے ہنگاموں اور مصیبتوں سے پر سفر طے کرنے کے باوجود میں وہیں موجود تھا جہاں سے اس سفر کی ابتدا ہوئی تھی۔ میرے بھاگ جانے نکلنے کے بعد خدا جانے ان درندوں نے فقیر بابا سے کیا سلوک کیا ہوگا۔ اپنی جسمانی حالت کے لحاظ سے وہ قطعاً بے ضرر نظر آتا تھا۔ لیکن انتقام کے زیر میں ڈوبے ان وردی پوشوں سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ وہ بے چارہ غلام رسول' فقیر بابا کا میزبان خواہ مخواہ ہی ہمارے چکر میں ذلیل ہو گیا تھا۔ پولیس والے اس کا جو حشر کرنے والے تھے اس کا اندازہ لگانا ذرا بھی مشکل نہ تھا۔ اگر میں اپنا پستول نہ کھو بیٹھا ہوتا تو مجھے ان دونوں کی ایسی کسمپرسی کے عالم میں چھوڑ کر فرار ہونے پر مجبور نہ ہونا پڑتا۔ خدا جانے میرا وہ دیرینہ اور قابل اعتماد ساتھی کب اور کیسے مجھ سے جدا ہو گیا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میری سمجھ میں یہی آیا کہ میرا پستول اس وقت نیفے سے نکل کر گر گیا ہوگا جب تیز بارش کے دوران میں لورالائی روڈ پر ایک درخت کے نیچے بیٹھا سخی سرور آنے والی بس کا انتظار کر رہا تھا۔ بھیگے ہوئے کپڑوں کے باعث مجھے احساس ہی نہ ہو سکا کہ میں اپنا انمول اثاثہ درخت کے نیچے چھوڑے جا رہا ہوں۔

رات کا ابتدائی پہر ختم ہونے تک بارش کی شدت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ گرج اور چمک نے

قیامت بپا کر رکھی تھی۔ بار بار لگتا کہ کہیں آس پاس بجلی گری۔ اس آنکھ مچولی میں جانے کب نیند کی وادیوں میں جا پہنچا۔ اس رات ایک بار پھر وہی بھیانک خواب میرے اعصاب پر حملہ آور ہوا۔ نقشیں چوکھٹ میں آئینہ' وہ مبہم سی شبیہہ اس کے ہاتھ میں چم چم کرتا خونی خنجر' دہشت بھری نسوانی چیخ اور گاڑھے گاڑھے خون سے نہایا ہوا آئینہ۔۔۔۔حسب معمول میری ایک جھٹکے سے آنکھ کھل گئی۔ میں سرد پسینے میں شرابور تھا اور میرا دل بُری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ مجھے خود کو سنبھالنے میں خاصی دیر لگ گئی۔ دوبارہ نیند آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اندھیرے میں آنکھیں گاڑے بارش کا شور سنتا رہا جس کی شدت میں ذرا بھی کمی نہ آئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آسمان اپنا دامن آج ہی خالی کر کے دم لے گا۔ مجھے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ پانی کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت ہی کہاں تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں کی اوک بنا کر غار کے دہانے سے باہر قدم رکھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ قدرتی برتن پانی سے بھر گیا۔ میں نے پانی پیا اور واپس اپنی خواب گاہ میں لوٹ آیا۔

رات کا بقیہ حصہ کروٹیں بدلتے اور سوچتے گزرا۔ ڈاکٹر صنم" چاچا مہر داد' مہراں اور جواد میرے واپس نہ لوٹنے سے پریشان ہو گئے ہوں گے۔ اس بدبخت افضل کا خدا جانے کیا حال ہوگا۔ مجھے یقین تھا کہ ڈاکٹر صنم اور دیگر لوگ اس کی سختی سے نگرانی کر رہے ہوں گے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ اس کی طرف سے غفلت برتنے کا نتیجہ کتنا خطرناک نکل سکتا۔ میں اس خبیث کی سازش کا شکار ہو کر ملک کریم' مرزا اور صدیقی جیسے قابل اعتماد ساتھیوں سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ کون جانے وہ زندہ بھی تھے کہ ان قاتلوں کی بربریت کا نشانہ بن گئے۔ میں پوری طرح بے دست و پا ہو کر رہ گیا تھا۔ سردار شاہ مراد کی سازشوں کا جال میری توقع سے زیادہ وسیع اور مضبوط ثابت ہوا تھا۔ بلوچستان کی سرزمین کو وہ نہ جانے کس مصرف میں لانے والا تھا۔ میں گویا فولادی دیوار سے ٹکر مار رہا تھا۔ میں اس کے خلاف کوئی بھی کارگر قدم نہیں اٹھا پا رہا تھا۔ مجھے اپنی جان بچا کر بھاگنے سے فرصت ملتی تبھی کچھ کرتا ناں؟

میں صبح سویرے غار سے باہر نکلا تو بارش کی شدت میں کچھ کمی آ گئی تھی۔ میں ایک سویل انگڑائی لے کر خشک برساتی نالے کی طرف نظر دوڑائی۔ اس کے ساتھ ہی میری حیرت کی انتہا رہی۔ جس جگہ رات تک خشک ریتلا میدان تھا وہاں اب ایک شوریدہ سر ندی رواں دواں تھی جس کے طوفانی تھپیڑے چٹانوں سے ٹکرا کر جھاگ اڑا رہے تھے۔ سخت بارش کے باعث وہ برساتی نالا ایک منہ زور دریا بن چکا تھا جو اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کو اپنے ساتھ بہا لے جانے کی طاقت رکھتا تھا۔ مقامی زبان میں اس صورت حال کو "نے" آ جانا کہتے ہیں۔ نے کی تباہ کاریاں اس علاقے میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس ناگہانی سیلابی ریلے کے باعث میں کم از کم عارضی طور پر تو اس غار میں محصور ہو کر رہ گیا تھا۔ اگر بارش کا سلسلہ اسی زور وشور سے جاری رہتا تو نے کا زور ٹوٹنے میں کئی روز لگ سکتے تھے۔ تب تک

مجھے خشک خوراک کے اسی مختصر سے ذخیرے پر گزارا کرنا تھا۔ میں نے خود کو ذہنی طور پر اس صورت حال کے لیے تیار کر لیا۔

میں پورے تین روز اس غار کا قیدی بنا رہا۔ تیسرے روز بارش تھم گئی۔ اس کے ساتھ نے کی بلاخیزی میں کمی آنے لگی' پھر رفتہ رفتہ پانی کے ریلے دم توڑ گئے۔ پانی کی سطح میں نہایت تیزی سے کمی آئی اور شام تک پانی پہلے پایاب اور پھر سطح زمین کو گیلا کرنے تک محدود ہو گیا۔ برساتی نالا ایک بار پھر ریتلی راہ گزر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ چوتھے دن میں اپنی پناہ گاہ چھوڑنے پر غور کر رہا تھا کہ میں نے کسی انسان کے چیخنے کی آواز سنی۔ میں چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میری تمام حسیات کانوں میں سمٹ آئی تھیں۔ کوئی ایک بار پھر چیخا۔ مجھے لگا کہ جیسے اس نے میرا فرضی نام ذوالفقار علی شاہ پکارا ہو۔ میرے وجود میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ وہ کون ہے جو میرے تعاقب میں اس دور افتادہ غار تک آ پہنچا ہے۔ فقیر بابا کے علاوہ تو اس ٹھکانے سے کوئی بھی واقف نہیں ہے۔ کیا فقیر بابا۔۔۔۔

''ذوالفقار۔۔۔ذوالفقار علی شاہ۔۔۔کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟'' اس بار آواز خاصی واضح تھی اور میرے لیے نامانوس بھی نہیں تھی'' میں خضر خان ہوں ذوالفقار۔۔۔اگر تم غار میں موجود ہو تو باہر نکل آؤ۔ ہم تمہیں ساتھ لے جانے آئے ہیں۔''

خضر خان کی آواز پہچانتے ہی میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اگلے ہی لمحے میں غار سے نکل کر کھلی جگہ پہنچ چکا تھا۔ خضر خان نے مجھے دیکھ لیا تھا'' ذوالفقار جلدی سے نیچے اتر آؤ۔ ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکلنا ہے۔ نئے کا نیا ریلا کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔ سنا ہے اوپر کے پہاڑوں میں دوبارہ بارش شروع ہو چکی ہے'' تبھی میں نے فقیر بابا کو بھی دیکھ لیا۔ اس کا مختصر سا وجود خضر خان کے لمبے چوڑے جثے کی آڑ میں چھپ کر رہ گیا تھا۔ میں برق رفتاری سے نیچے اترنے لگا' اس کوشش میں کئی بار لڑکھڑایا' نوکیلے پتھروں سے کھرونچیں کھائیں' حتیٰ کہ ایک بار تو ایک گہرے گڑھے میں گرتے گرتے بچا۔

خضر خان والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گیا'' تم ٹھیک تو ہو ذوالفقار بھائی'' بابا بتا رہے تھے کہ پولیس والوں نے تم پر کلاشن کوف سے فائرنگ کی تھی۔''

''بس اللہ کی ذات ہی بچانے والی ہے خضر بھائی' ورنہ انہوں نے مجھے شکار کرنے میں کوئی کسر تو نہیں چھوڑی تھی'' میں نے کہا۔ سردار خضر خان نے مجھے اپنی لینڈ کروزر کی درمیانی سیٹوں پر دبک کر لیٹ جانے کی ہدائیت کی اور گاڑی چلا دی تھی۔'' پولیس والوں نے قصبے میں خوب ادھم مچایا تھا۔ بابا تو خیر اپنی ضعیفی کے سبب کچھ رعایت کے قابل ٹھہرے لیکن بے چارے غلام رسول کو تو انہوں نے کھال ادھیڑ کر رکھ دی تھی۔ اگر بارش تیز نہ ہو جاتی اور نئے کے ریلے راستے مخدوش نہ کر دیے ہوتے تو وہ تمہاری تلاش میں یہاں کا ہر کونا کھدرا کھنگال ڈالتے۔'' سردار خضر خان چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا پھر پلٹ کر اشک نظر مجھ پر ڈالتے ہوئے کہا'' پولیس والوں کا دعویٰ ہے کہ تم وہی ہو جس نے سردار شاہ مراد کے بیٹے رتا

سائیں کو زندہ لاش بنا ڈالا تھا۔ کیا یہ سچ ہے؟ کیا واقعی تم وہی سیف داد خان ہو جس نے پورے بخی سرور کو ہلا کر رکھ دیا تھا؟''

یہ میرے لیے بے حد کٹھن مرحلہ تھا۔ میں اپنی اصلیت ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن وہ تو پہلے ہی تقریباً پوری طرح کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ ویسے بھی خضر خان جیسے مخلص اور مہربان شخص کو دھوکا دینے کی کوشش مجھے اپنی نظروں میں گرا دیتی'' ہاں میں وہی بدنصیب ہوں خضر بھائی'' میری قسمت مجھے گھیر کر ایک بار پھر اسی شکار گاہ میں لے آئی ہے۔''

''لیکن اب صورت حال مختلف ہے میرے بھائی۔ اب یہاں کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ جب تک میرے سینے میں سانسیں چل رہی ہیں' دل دھڑک رہا ہے' سردار شاہ مراد اور اس کے پالتو کتے تمہارے سائے کو بھی نہیں چھو سکتے۔ میں شاہ مراد اور اس کے خبیث بیٹے سے اچھی طرح واقف ہوں۔ ان میں انسانیت کی کوئی چیز سرے سے ہے ہی نہیں۔ تم نے جو کچھ کیا بالکل ٹھیک کیا۔ رتا سائیں نے یقیناً تمہیں کسی زیادتی کا نشانہ بنایا ہوگا؟''

''وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر مجھے کسی بے بس ہرن کی طرح شکار کرنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ میں ان سنگلاخ پہاڑوں میں اپنی جان بچانے کے لیے بھاگتا پھروں اور وہ اور اس کے ساتھی مجھ پر چاند ماری کی مشق کریں لیکن میں نے یہ ذلت بھری موت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔''

''شاباش! مجھے تم اسی لیے اچھے لگے تھے کہ تم موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی جرات رکھتے ہو۔ اب تم خود کو اچھی طرح چھپا لو۔ ہم قصبے کی حدود میں داخل ہونے والے ہیں۔'' تم سے تفصیلی بات اپنے ٹھکانے پر چل کر ہوگی۔ خضر خان نے کہا۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ گاڑی اونچے نیچے راستوں پر آگے بڑھتی رہی اور پھر کچھ دیر بعد ٹھہر گئی۔

''آؤ بھئی ذوالفقار۔۔۔ہم منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔'' خضر خان نے کہا۔

گاڑی ایک بڑی سی حویلی کے احاطے میں موجود تھی۔ خضر خان کے کئی کارندے گاڑی کو گھیرے کھڑے تھے'' امجد خان۔ ٹھیک ٹھاک ہے ناں؟'' خضر خان نے ایک طویل قامت اور بھاری بھرکم ملیشیا پوش سے پوچھا'' قصبے کی کیا خبریں ہیں؟'' ''سب ٹھیک ٹھاک ہے سائیں۔ پولیس والے بھی صبر کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے مفرور بندہ بارش میں گھر کر مر کھپ گیا ہوگا۔ سردار شاہ مراد کا کارندہ بھی حوصلہ ہار بیٹھا ہے۔ اس نے شاہ مراد کے مطلوبہ بندے کا جو حلیہ بتایا ہے پولیس کے مخبر کے مطابق مفرور اس سے خاصا مختلف تھا۔ اب پولیس کو یہ پریشانی ہے کہ اگر مفرور ان کا مطلوبہ بندہ نہیں تھا تو وہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر فرار کیوں ہوا'' امجد خان نے بتایا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تم اپنے بندوں کو ہوشیار رکھو۔ ہم پر کسی وقت بھی دھاوا بولا جا سکتا

ہے۔ہوسکتا ہے یہ جگہ بھی ان کی نظروں میں ہو' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا" میں تمھیں جان بجھ کر گھر لے کر نہیں گیا۔ وہاں کی نسبت یہ جگہ تمہارے لیے زیادہ محفوظ پناہ گاہ ہے۔"

وہ مجھے اور فقیر بابا کو اپنے ساتھ ایک آرام دہ کمرے میں لے آیا" ہاں اب تم تفسیل سے بتاؤ کہ یہ چکر شروع کیسے ہوا؟"

"چکر تو لمبا ہے خضر بھائی اور خطرناک بھی۔ مجھے آپ کو بہت کچھ بتانا ہے جو اس سے پہلے نہیں بتایا کیوں کہ وہ مناسب وقت نہیں تھا۔"

"ہاں تو بتاؤ ناں" تمہید باندھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم بے فکر رہو' تمہارا ہر راز میرے سینے میں محفوظ رہے گا۔"

"آپ کو یہ سب کہنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے آپ پر اتنا ہی اعتبار ہے جتنا خود پر۔ تبھی تو میں نے بابا کو آپ کے پاس جانے کی ہدایت کی تھی۔" میں نے خضر خان کا ہاتھ گرم جوشی سے تھام کر کہا۔

"ان کی زبانی ساری صورت حال سن کر میں تو پریشان ہو گیا تھا۔ تمہارے فرار ہونے میں کامیابی کی اطلاع ملی تو کچھ اطمینان ہوا۔ پھر انہوں نے یہ بتا کر میری پریشانی مزید کم کر دی کہ یہ جانتے ہیں تم کہاں پناہ حاصل کرو گے اور وہ بہت محفوظ جگہ ہے۔ ویسے تم نے یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟ چلو ایسا کرتے ہیں کہ تم نہا دھو کر فریش ہو جاؤ۔ باقی باتیں کھانے کے دوران ہوں گی۔ عنبرین اپنے گھر گئی ہوئی ہے۔ چنانچہ آج رات میں یہیں رک جاتا ہوں۔"

خضر خان نے میرے لیے ایک عمدہ شلوار سوٹ کا انتظام کر دیا تھا' میں غسل خانے میں گھس گیا اور دیر تک نہاتا رہا' اس دوران میں نے بچے کھچے میک اپ سے بھی نجات حاصل کر لی۔ غسل خانے سے باہر آیا تو کھانا لگ چکا تھا" میں جو باتیں آپ کو بتانے جا رہا ہوں وہ بہت اہم اور خطرناک ہیں۔ سردار شاہ مراد سے میری محض ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ بات اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔" خضر خان نے مجھے چند لمحوں کے لیے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

میں نے واقعات کو ذہن میں یک جا کر کے اپنی دستان حیات کی ابتدا کی۔ میرا تلخ و تند بچپن جب میرے کانوں میں میری ماں کے حوالے سے طعنوں کی صورت میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا جاتا تھا' نفرت کی آندھیوں کے تھپیڑے سہتے ہوئے نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھنا' آتش آہن سے زور آزمائی کرتے کرتے سردار شاہ مراد کے بیٹے سردار جاہ مراد عرف رتا سائیں کی فرعونیت کی زد میں آنا اور پھر جوابی کاروائی کے نتیجے میں سردار شاہ مراد کو اپنا جانی دشمن بنا لینا۔ سخی سرور کے سنگلاخ پہاڑی سلسلے میں سردار شاہ مراد کے کارندوں سے خونی آنکھ مچولی اور اس کے بعد کے حالات کی زنجیر میں گرفتار ہو کر ملتان پہنچنا' سردار شاہ مراد کے غدار وطن ہونے کا انکشاف' قومی سلامتی کے خفیہ ادارے کے اہل کاروں سے سابقہ پڑنا' ان کے ہمراہ ڈیرہ غازیخان واپسی اور جان بچانے کی سخت جدوجہد' بھارتی ایجنٹوں سے ٹکراؤ۔۔۔

غرض کہ میں نے سردار خضر خان کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ ان میں سے زیادہ تر واقعات فقیر بابا کے علم میں بھی نہیں تھے لہٰذا وہ بھی خضر خان کے ہمراہ حیرت آمیز انہماک سے سب کچھ سنتا رہا۔ حتی الامکان اختصار سے کام لینے کے باوجود میری کہانی خاصے طویل وقت پر محید ثابت ہوئی۔

میں نے اپنی بپتا سنا دی لیکن خضر خان کی محویت خاصی دیر میں ٹوٹی" اگر میں تمہارے بتائے ہوئے چند واقعات سے آگاہ نہ ہوتا اور کچھ وقت تمہارے ساتھ نہ گزار چکا ہوتا تو میں تمہاری ایک بھی بات پر یقین نہ کرتا" بالآخر اس نے ایک گہری سانس بھر کے کہا۔" مجھے تو یہ داستان طلسم ہوشربا محسوس ہوتی ہے۔ میرا ذہن یہ تسلیم کرنے کو آمادہ نہیں کہ یہ سب تم تن تنہا بھگت چکے ہو اور ابھی تک زندہ سلامت ہو۔ سردار شاہ مراد کے بیٹے پر جو گزری وہ میرے علم میں ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ سب سیف داد خان عرف سیفل نامی نوجوان کا کیا دھرا ہے۔ سردار شاہ مراد کے کالے دھندے بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ غدار وطن اور دشمن ملک کا آلہ کار بھی ہے۔ اب میں صحیح معنوں میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ تم کتنے سنگین خطرات کی زد میں ہو۔"

"جی ہاں! اور آپ یہ بھی سمجھ لیں کہ ان خطرات کا رخ آپ کی طرف پھرتے دیر نہیں لگے گی۔ میں سردار شاہ مراد کے کارندوں کے سامنے خود کو آپ کا رشتے دار ظاہر کر چکا ہوں۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔" خضر خان نے پر اعتماد لہجے میں کہا" وہ شاہ مراد خواہ کتنا بھی طاقت ور اور خطرناک ہو' اسے میری طرف آنکھ اٹھانے سے پہلے درجنوں مرتبہ سوچنا پڑے گا۔ میں اس کے ہر حربے کا منہ توڑ جواب دے سکتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے نوبت یہاں تک نہ ہی پہنچے تو زیادہ بہتر ہے۔ آپ پس پردہ رہ کر میرے لیے زیادہ مددگار ثابت ہو سکیں گے" میں نے کہا۔

"سیفل صحیح کہہ رہا ہے سردار سائیں" فقیر بابا نے میری تائید کی۔

"سردار شاہ مراد سے براہ راست ٹکراؤ ہمارے لیے بے فائدہ ثابت ہو گا۔ ہمیں اس کی سازشوں کا جال جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے اور یہ طاقت سے نہیں بلکہ درست حکمت عملی سے ممکن ہے۔ شاہ مراد پر یہ ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ سیفل کو آپ کی پشت پناہی حاصل ہے۔ لہٰذا آپ اس معاملے میں اس وقت تک براہ راست ملوث ہونے سے گریز کریں جب تک ایسا ناگزیر نہ ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے لیکن اب ہمیں کیا کرنا ہے؟ ویسے اس بات سے آپ بے فکر رہیں کہ آپ کے معاملے میں میری شرکت کسی بھی طرح ثابت ہو سکتی ہے" خضر خان نے کہا۔

"اچھا یہ بتائیں کہ آپ مجھے شاہ مراد کے کارندوں کی نظر سے بچا کر لورالائی بھجوا سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ خضر خان نے اثبات می سر ہلا دیا۔" لیکن تم وہاں اکیلے جا کر کیا کر سکتے ہو؟ وہ تو شاید تمہارے لیے بالکل اجنبی شہر ہے؟"

''میں مسلسل سوچ بچار کے باوجود یہ سمجھنے میں ناکام رہا ہوں کہ شاہ مراد نے بلوچستان کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز کیوں بنا لیا ہے۔ میں لورالائی جا کر اس سازش کی سن گن لینا چاہتا ہوں جو شاہ مراد پروان چڑھا رہا ہے۔ لورالائی میں شاہ مراد کی ٹرک کمپنی کے اڈے پر میرا ایک قابل اعتماد ساتھی مینو استاد موجود ہے۔ مجھے یقین ہے وہ مجھے اس سازش کے بارے میں معلومات مہیا کر سکتا ہے۔ وہ لورالائی میں میرا منتظر ہوگا بالفرض میں لورالائی میں اس سازش کا سراغ لگانے میں ناکام رہا تو میں وہاں سے کوئٹہ چلا جاؤں گا جہاں شاہ مراد نے مستقل ڈیرا جما رکھا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ تن تنہا یہ سب کچھ کرنا بہت مشکل ہے لیکن موجودہ صورت حال میں اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس کام میں کچھ نہ کچھ مدد تو میں بھی کر سکتا ہوں تمہیں بلوچستان روانہ کرنے کے ساتھ ہی میں ملتان چلا جاتا ہوں اور قومی سلامتی کے ادارے کی ملتان میں قائم مرکز پر موجود سرکردہ افراد سے مل کر انہیں تمام صورت حال سے آگاہ کر دیتا ہوں۔ میں صدیقی اور مرزا صاحب کے حوالے سے گفتگو کروں گا تو وہ میری بات پر ضرور توجہ دیں گے۔ اس طرح شاہ مراد پر گرفت کرنے کی ذمے داری صرف تم تک محدود نہیں رہے گی۔ صورت حال اتنی نازک ہے کہ اگر خدانخواستہ تم اپنے مقصد میں ناکام رہے تو ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو میں اسلام آباد بھی جا سکتا ہوں۔''

''آپ کی تجویز بہت اچھی ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے میرے بچ نکلنے کے بعد آپ شاہ مراد کی نظر میں مشکوک ٹھہریں گے اور وہ آپ کی نقل و حرکت کی نگرانی شروع کرا دے گا۔''

''ابھی تک تو ایسی کوئی صورت حال نہیں' بالفرض ایسا ہے بھی تو وہ شوق سے میری نگرانی کرائے۔ میں اپنے سسرال جاؤں گا پھر اس انداز میں وہاں سے نکلوں گا کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی۔ ایک بار پوری صورت حال ذمے دار افراد کے علم میں آجائے' اس کے بعد شاہ مراد میرے خلاف کوئی کارروائی کرے بھی تو لا حاصل ہوگی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ڈی جی خان میں ڈاکٹر صنم کے گھر میں مقید بھارتی ایجنٹ افضل کا کیا بنے گا؟ اگر وہ زبان کھول دے تو ہمیں بے حد کارآمد معلومات مل سکتی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اس کی زبان کھلوانے کی ذمے داری میں قبول کرتا ہوں'' فقیر بابا نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''سیفل تم لورالائی جا کر اپنا فرض نبھاؤ میں ڈی جی خان جاتا ہوں۔ سردار سائیں آپ صرف تین دن میرا انتظار کریں۔ میں آپ کو اپنی کامیابی یا ناکامی کی خبر سناؤں گا۔ اس کے بعد آپ خواہ ملتان جائیں یا اسلام آباد۔''

''اگر آپ کو اتنا اعتماد ہے تو میں آپ کی واپسی کے بعد ہی یہاں سے روانہ ہوں گا۔ آپ کل صبح ڈی جی خان روانہ ہو جائیں۔ سیفل کو میں پرسوں علی الصباح لورالائی روانہ کر دوں گا۔''

''میرا خیال ہے یہی سب سے بہتر صورت ہے خضر بھائی۔ اگر آپ خفیہ ادارے کے ذمے داروں

کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں تو انہیں میرے گاؤں کے عقب میں واقع گھنے جنگل کے بارے میں ضرور بتایئے گا' مرزا اور صدیقی وہیں پراسرار انداز میں غائب ہوئے تھے۔ اس جنگل میں شاہ مراد کا کوئی ایسا خطرناک ٹھکانہ موجود ہے جو بظاہر نظر نہیں آتا۔ انہیں زخمی بھارتی جاسوسہ ندا کے بارے میں بھی بتایئے گا۔ ہو سکتا ہے وہ ہسپتالوں کا جائزہ لے کر اس کا پتا لگانے میں کامیاب ہو جائیں۔ افضل کو تو وہ پہلی فرصت میں اپنے قبضے میں لینے کی کوشش کریں گے ہی۔ خدا کرے ہم اپنے مقاصد پانے میں کامیاب ہو جائیں۔''

''اللہ ہماری مدد کرے۔ اب آپ دونوں گپ شپ کریں۔ میں قصبے کی صورت حال کا پتا لگا کر واپس آتا ہوں۔ مجھے دیر ہو جائے تو آپ دونوں سو جایئے گا۔ انشاء اللہ صبح ناشتے پر ملاقات ہوگی۔ بابا آپ صبح کی پہلی بس سے ڈی جی خان کی تیاری کر لیں۔''

''مجھے کیا تیاری کرنا ہے سائیں۔ اپنے وجود کے علاوہ میں کوئی بوجھ اپنے ساتھ نہیں رکھتا۔''

سردا خضر خان کے جانے کے بعد فقیر بابا اور میں رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے فقیر بابا سے پوچھا کہ اسے تشدد کا نشانہ بنا کر مرنے کے لیے نہر کنارے پھینک جانے والے کون لوگ تھے۔ فقیر بابا نے بتایا ''اکرام عرف اکی کی قید سے فرار ہونے کی ناکام کوشش کے دوران میرے ہاتھوں جو دو آدمی زخمی ہوئے تھے وہ میرے خلاف دل میں زبردست کینہ رکھتے تھے۔ ان کا بس چلتا تو وہ مجھے کچا چبا جاتے البتہ اکی نے تمہارے ملتان روانہ ہونے کے بعد مجھ پر کوئی تشدد نہیں کیا تھا۔ جب تم نے ملتان پہنچ کر شیطان صفت ڈاکٹر رفاقت کو قتل کر دیا تو اکی نے حسب وعدہ مجھے آزاد کر دیا لیکن جیسے ہی میں برکت علی کی حویلی سے چند فرلانگ دور پہنچا' اکی کے ان دونوں کارندوں نے اپنے چار پانچ ساتھیوں کے ہمراہ مجھے گھیر لیا۔ میں نے اپنی سی بہت کوشش کی لیکن سر پر پڑنے والی رائفل کے بٹ کی ضرب نے مجھے بے بس کر دیا۔ وہ مجھے اغوا کر کے لے گئے اور سخت تشدد کرنے کے بعد مردہ سمجھ کر نہر میں پھینک دیا۔''

''اور! تو یہ ان درندوں کی کارستانی تھی۔ خیر وقت آنے دو انہیں اپنی خباثت کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔'' میں نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ فقیر بابا نے میرے شانے پر تھپکی دے کر میرا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی' ''اس بارے میں پھر سوچنا' پہلے موجودہ صورت حال پر توجہ دو۔ مجھے یہ فکر ہے کہ اپنی اصل صورت کے ساتھ کہیں تم پہچان نہ لیے جاؤ۔ اگر تم کہو تو میں تمہارا حلیہ کسی حد تک تبدیل کر دوں؟''

''یہ کام تو اب میں بھی خاصے بہتر انداز میں کر سکتا ہوں البتہ مجھے چند اشیاء کی ضرورت پڑے گی جو ڈیرہ غازیخان شہر ہی سے مل سکیں گی۔ میں اس سلسلے میں سردار خضر خان سے بات کروں گا۔''

خضر خان سے صبح ناشتے پر ملاقات ہوئی۔ اس نے فقیر بابا کو شہر جانے کے لیے تیار رہنے کی ہدایت کی۔ میں نے اس سے میک اپ کے سامان کے بارے میں بات کی ''تمہیں جن چیزوں کی ضرورت ہے ان کی فہرست بنا کر مجھے دے دو۔ میں اپنے ایک بندے کو بابا کے ساتھ شہر بھیج دیتا ہوں۔ وہ بابا کو ڈاکٹر

ضنم کے گھر پہنچائے گا اور بعد میں بازار سے یہ سامان خرید کر شام کو واپس لوٹ آئے گا۔ وہ تمہاری روانگی کے سلسلے میں بھی میرا پیغام ایک اہم بندے تک پہنچائے گا۔"

میں نے مطلوبہ سامان کی فہرست بنا کر خضر خان کے حوالے کر دی۔ کچھ دیر بعد فقیر بابا ڈی۔جی خان کے لیے روانہ ہو گیا۔ شام تک کا وقت میں نے وہیں خضر خان کے ساتھ گزارا۔ وہ مجھے اپنی زندگی کے تجربات سے مستفید کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ اس کا ایک بے حد عزیز دوست نعمت شیخ کوئٹہ میں رہتا ہے۔ کوئٹہ پہنچنے پر اگر مجھے ضرورت محسوس ہو تو میں اس سے ملاقات کر سکتا ہوں۔ وہ میری ہر ممکن مدد کرے گا۔ میں اس پر اسی طرح اعتماد کر سکتا ہوں جس طرح میں خضر خان پر کر سکتا ہوں۔ خضر خان نے اپنے دوست کے نام ایک خط لکھ کر میرے حوالے کر دیا اور اس کے گھر کا پتہ بھی مجھے اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا۔

شام ڈھلے خضر خان کا کارندہ شہر سے لوٹ آیا۔ وہ میرا مطلوبہ سامان لے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ فقیر بابا بخریت ڈاکٹر ضنم کے گھر پہنچ چکا ہے۔ اس نے خضر خان کا پیغام بھی پہنچا دیا تھا۔ خضر خان نے مطمئن لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ "تمہیں جو تیاریاں کرنا ہیں ابھی کر لو۔ تمہیں کل علی الصبح لورالائی روانہ ہونا ہے۔"

خضر خان کے جاتے ہی میں اپنی شکل وصورت اور حلیے کو ایک نیا روٹ دینے میں مشغول ہو گیا۔ میرا شیو بڑھ کر ڈاڑھی مونچھوں کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ میں نے ڈاڑھی تو صاف کر دی البتہ مونچھیں رہنے دیں۔ سر کے بال خاصے لمبے ہو چلے تھے۔ میں نے ایک خاص کیمیکل سے رنگ کر انہیں سیاہ سے سنہری مائل بھورا بنا دیا۔ اپنی مونچھوں اور بھوؤں کو بھی میں نے اسی رنگ میں رنگ دیا۔ صرف اسی کارروائی سے میری شکل وصورت میں غیر معمولی تبدیلی آ گئی تھی لیکن میں نے اپنی ناک میں اسپرنگ چڑھا کر ناک کی ساخت میں تبدیلی پیدا کر کے اپنی شناخت مزید بدل ڈالی۔ میں نے اپنی رنگت میں بھی سرخی کی جھلک پیدا کر دی۔ میں اپنی اس کوشش سے خاصی حد تک مطمئن تھا۔ اس تبدیلی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ میں اس روپ میں بدشکل نظر نہیں آ رہا تھا۔

مجھے نیند کی آغوش میں پہنچے بمشکل تین چار گھنٹے ہی گزرے ہوں گے کہ خضر خان نے مجھے جگا دیا "لورالائی روانہ ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ میرے بھائی۔" اس نے میری کارگردگی کا ستائش آمیز نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے کہا "تم نے نہایت ہنرمندی سے اپنی شکل وصورت میں تبدیلی کی۔ اب تمہیں آسانی سے پہچانا نہیں جا سکتا۔ آؤ جلدی سے ناشتہ کر لیتے ہیں اس کے بعد تمہیں ایک تھکا دینے والے سفر پر روانہ ہونا ہے۔"

ناشتے کے بعد خضر خان نے ایک چھوٹا بیگ اور ایک عدد نفیس روسی ٹی ٹی پستول مع اضافی میگزین میرے حوالے کر دیا۔ بیگ میں غالباً میرے پہننے کے لیے کپڑے رہے ہوں گے۔ ابھی صبح کا اجالا نمودار نہیں ہوا تھا۔ خضر خان مجھے ساتھ لے کر اپنی لینڈ کروزر میں جا بیٹھا۔ میں خود کو بے حد مطمئن اور پُراعتماد

محسوس کر رہا تھا۔ پستول کا لمس مجھے تحفظ کی ٹھنڈک مہیا کر رہا تھا۔ لینڈ کروزر پتھریلے راستے پر تیز رفتاری سے آگے بڑھتی رہی' پھر ایک گھاٹی میں پہنچ کر ٹھہر گئی۔ سردار خضر خان بے چینی سے کسی کا منتظر تھا۔ کچھ ہی دیر بعد گھاٹی کس بھاری بھرکم گاڑی کے انجن کی گھن گرج سے گونج اٹھی۔ وہ ایک ٹرک تھا جو سیدھا خضر خان کی لینڈ کروزر کے پاس آ کر ٹھہر گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹرک کے ڈرائیونگ کیبن کے دروازے کھلے اور دو افراد برآمد ہوئے۔ ہم نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا "غلام مصطفیٰ یہ ہے وہ جوان جسے تمہیں منزل تک پہنچانا ہے۔ باقی باتیں تو تم جانتے ہی ہو۔"

"آپ فکر نہ کریں سردار صاحب۔ ہم آپ کے اعتماد پر پورا اتریں گے۔ چلو بھائی ہم جتنا جلدی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں اتنا ہی ہمارے لیے بہتر ہوگا۔" میں خضر خان کی طرف مڑا اس نے مجھے بانہوں میں سمیٹ کر سینے سے لگا لیا۔ "خدا تمہارا حامی وناصر ہو میرے ننھے بھائی اپنا خیال رکھنا۔"

مجھے جس ٹرک میں سفر کرنا تھا اس میں دودھ کی ٹینکیاں لدی ہوئی تھیں۔ یہ دودھ مائع نہیں بلکہ ٹھوس شکل میں تھا یعنی اسے سردخانے میں منجمد کر کے برف کی شکل دے دی گئی تھی تاکہ وہ کئی گھنٹوں کے اس سفر میں خراب نہ ہو سکے۔ میرے لیے ان ٹینکیوں کے عقب میں تختوں کی آڑ لگا کر پناہ گاہ بنائی گئی جس کی چھت بھی تختوں پر مشتمل تھی جن پر دودھ کی ٹینکیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں تختوں کی چھت اور ٹینکیوں کے درمیانی خلا سے اپنی پناہ گاہ میں گھس گیا۔ تین چار کمبلوں کی مدد سے ممکنہ حد تک آرام دہ بنائے گئے اس کیبن میں نقل وحرکت کی گنجائش بہت محدود تھی البتہ اس لحاظ سے وہ بہت محفوظ ٹھکانہ تھا کہ دودھ کی ٹینکیوں کی قطاریں ٹرک سے اتارے بغیر مجھے نہیں دیکھا جا سکتا جب کہ میں باآسانی اس پناہ گاہ سے باہر آ سکتا تھا۔ میں نے کمبلوں کو جسم کے گرد لپیٹا ہی تھا کہ ٹرک حرکت میں آ گیا۔

کچھ ہی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ صورت حال اتنی موافق ہرگز نہیں ہے جتنی بظاہر نظر آ رہی تھی۔ برفیلی ٹینکیوں کی ٹھنڈک کمبلوں کی گرمائش کو چیرتی ہوئی میری ہڈیوں میں اتر رہی تھی۔ مجھے اپنے جسم میں سردی سے تھرتھری کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر میرے دانت بری طرح بجنے لگے۔ ٹرک مسلسل پہاڑی سڑک کی چڑھائیاں طے کر رہا تھا لہٰذا اس کی رفتار بہت سست تھی۔ ویسے بھی ان خطرناک ترین راستوں پر تیز رفتاری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں نے اپنی تمام تر قوت ارادی سے کام لیتے ہوئے سردی کا احساس ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور عارضی طور پر کامیاب بھی ہو گیا۔ خوش قسمتی سے اس دوران میں سورج نکل آیا تھا اور اس کی کرنوں کی تپش میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ ٹرک جوں جوں بلندی کا سفر طے کرتا جائے گا فضا میں درجہ حرارت میں کمی ہوتی جائے گی اور فورٹ منرو ہل اسٹیشن کے آس پاس تو باقاعدہ گرمیوں میں سردی کے موسم کا سا سماں ہوگا۔

لگ بھگ دو گھنٹے کا سفر طے کرنے کے بعد ٹرک کسی مقام پر ٹھہر گیا۔ غالباً کوئی چیک پوسٹ تھی۔

میں نے کئی لوگوں کے آپس میں بات کرنے کی آواز سنی۔ وہ دوستانہ انداز میں ایک دوسرے کی خیریت معلوم کررہے تھے۔ میں نے احتیاطاً پستول پر اپنی گرفت مضبوط کرلی لیکن چند ہی منٹ بعد ٹرک ایک بار پھر روانہ ہوگیا اس کے ساتھ ہی سردی کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میری رگوں میں دوڑنے والا خون جمنے لگا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میرے سر میں درد ہونے لگا۔

آئندہ ڈیڑھ دو گھنٹے، میں نے شدید ترین اذیت کے عالم میں گزارے۔ میں باقاعدہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ یہ عذاب ناک سفر جلد از جلد ختم ہو جائے۔ شاید میری دعائیں کچھ زیادہ ہی پُر درد تھیں کہ ان کا نتیجہ آنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اچانک ٹرک ایک زوردار جھٹکے سے ٹھہر گیا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں میری تلاشی میں پھرنے والے تو راستہ روک کر کھڑے ہوگئے ہوں میں نے ٹرک کے ڈرائیونگ کیبن کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ ڈرائیور غلام مصطفیٰ اور کلینر زور زور سے آپس میں باتیں کررہے تھے۔ ان کی گفتگو سے پتا چلا کہ ٹرک کا ٹائی راڈ کھل گیا ہے۔ وہ خدا کا شکر ادا کررہے تھے کہ وہ ایک خطرناک حادثے کا شکار ہونے سے بال بال بچ گئے تھے۔ پھر انہیں یاد آگیا کہ ان کے ٹرک میں ایک اور شخص بھی محو سفر ہے۔ وہ غالباً آپس میں مشورہ کررہے تھے کہ اب مجھے لورالائی بھیجنے کا کیا بندوبست کیا جائے۔ سردار خضر خان نے انہیں سختی سے تاکید کی تھی کہ مجھ پر کسی کی نظر نہیں پڑنی چاہیے لیکن اس صورت حال میں میری موجودگی پوشیدہ رکھنا ان کے لیے تقریباً ناممکن تھا۔ ان کی گفتگو سے مجھے پتا چلا کہ ہم فورٹ منرو کے نزدیکی قصبے کے قریب موجود ہیں۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر کے صلاح مشورے کا سلسلہ طول پکڑنے لگا تو میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں نے کمبل ہٹائے اور اپنی پناہ گاہ سے باہر آگیا۔ وہ دونوں ٹرک کے عقب میں کھڑے تھے مجھے دیکھ کر وہ بری طرح سٹپٹا گئے۔

''بھائی صاحب آپ باہر نہ نکلو کسی کی نظر آپ پر پڑ گئی تو اچھا نہ ہوگا'' غلام مصطفیٰ نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا وہ بے قراری سے ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا۔ کلینر نے پرزور الفاظ میں اس کی تائید کی۔

''اب میں مزید اس برف خانے میں نہیں ٹھہر سکتا۔ آپ لوگ مجھے یہاں تک لائے آپ کا بہت شکریہ۔ باقی سفر میں خود طے کرلوں گا۔'' میں نے اپنے لہجے میں ناگواری کی جھلک ظاہر نہیں ہونے دی۔

''سردار سائیں نے بتایا تھا کہ آپ کی جان خطرے میں ہے۔ آپ ہمیں اس طرح چھوڑ کر چلے گئے تو ہم انہیں کیا جواب دیں گے۔'' غلام مصطفےٰ نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ میں نے اس کا شانہ تھپتھپا کر کہا ''دیکھو بھائی' تمہارا ٹرک خراب ہوگیا ہے اور اس کے فوری طور پر ٹھیک ہونے کا امکان بھی نہیں ہے۔ ایسے میں تم بھلا میری کیا مدد کرسکتے ہو؟ تم فکر نہ کرو' سردار خضر خان کو اس صورت حال کا علم ہوگا تو وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا' میں یہاں سے لورالائی جانے کا خود ہی بندوبست کرلوں گا۔''

ڈرائیور غلام مصطفےٰ اور کلینر نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن میں ٹس سے مس نہیں ہوا۔ بالآخر انہیں میری ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے۔ میں ان سے رخصت ہو کر فورٹ منرو کی جانب چل پڑا۔

میں اب بھی خطرے کی زد میں تھا لیکن مجھے وہ خطرہ برف خانے کے سرد جہنم کے مقابلے میں بہت معمولی لگ رہا تھا۔

کھر کی حد سے نکلنے کے بعد میں عام راستے سے ہٹ کر چلنے لگا' دوپہر ہونے کے باوجود فضا میں تپش نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہوا میں بس تازگی میری روح میں نئی امنگیں جگا رہی تھی۔ کھر سے فورٹ منرو کا پرمشقت راستہ نہایت خوش گوار انداز میں طے ہوگیا۔ شام کی آمد میں ابھی خاصی دیر تھی۔ البتہ فضا میں اچھی خاصی خنکی تھی' میں جانتا تھا کہ رات پڑنے پر یہ خنکی جاڑے میں تبدیل ہو جائے گی چنانچہ میں جلد از جلد کوئی ایسی پناہ گاہ تلاش کرلینا چاہتا تھا جہاں میں شب بسری کرسکوں۔ میں قصبے کے مرکزی بازار میں واقع مسافر خانوں کی طرف جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ فورٹ منرو پولیس چوکی وہاں سے محض سو ڈیڑھ گز دور واقع تھی' میں تنہا ہونے کے باعث بھی لوگوں کی نظروں میں آسکتا تھا۔ میرے لیے کوئی غار ہی محفوظ پناہ گاہ ثابت ہوسکتا تھا۔

قدرے سوچ بچار کے بعد میں سڑک کے دائیں طرف ڈھلان سے نیچے اترنے لگا۔ خاردار جھاڑیوں سے بچتا بچاتا' سنگلاخ چٹانیں اور گڑھے پھلانگتا میں کچھ ہی دیر میں تریموں آبشار کے پاس جا پہنچا۔ حسب معمول وہاں درجن بھر سیاح موجود تھے جن میں یورپی سیاحوں کا پانچ رکنی گروہ نمایاں تھا۔ اس گروہ میں دو مرد اور تین عورتیں تھیں۔ مردوں کی عمر چالیس اور تیس برس کے لگ بھگ تھی جب کہ خواتین نسبتاً کم عمر تھیں۔ وہ لوگ اسی لیے میری توجہ کا مرکز بنے تھے کہ وہ سب مقامی لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ آبشار کے پانی کی دھار اس وقت خاصی چوڑی تھی اور دو من چلے اس کے برفیلے پانی میں غسل فرما رہے تھے۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی چنانچہ میں نے قریب ہی واقع غار میں واقع پانی رس رس کر بننے والی چھوٹی سی ٹب نما جگہ پر پانی پیا۔ واپس آیا تو دو رائفل بردار افغانوں کو گورے سیاحوں سے اشاروں میں مصروف گفتگو پایا۔ وہ دونوں افغانی نوجوان گورے کو رائفل کے ذریعے نشانہ لگانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ اپنی روسی سیون ایم ایم رائفلوں کو انہوں نے رنگا رنگ چمک دار پٹیوں کے ذریعے نہایت خوبصورتی سے آراستہ کررکھا تھا البتہ ان کا اپنا لباس اور چپلیں ان کی مفلسی کا حال سنا رہے تھے۔ بالآخر گورا نوجوان نشانہ بازی کا شغل کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ شاید اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کوئی آتشیں ہتھیار تھام رہا ہے۔ میں سیون ایم ایم رائفل کی طاقت اور ہلاکت خیزی سے بخوبی واقف تھا' اور مجھے یہ بھی علم تھا کہ اس ہتھیار سے نشانہ لگانا بچوں کا کھیل نہیں' لہٰذا اس معاملے میں میری دلچسپی مزید بڑھ گئی۔

افغان نے گورے نوجوان کو رائفل شانے سے ٹکا کر شست کے ذریعے نشانہ لینا سکھایا۔ اس نے نوجوان کو رائفل مضبوطی سے شانے سے لگائے رکھنے کا اشارہ کیا۔ اور پھر رائفل کاک کرکے چیمبر میں گولی ڈال دی۔ سامنے پہاڑی پر مختلف پتھروں اور چٹانوں پر چونے کے ذریعے ہدف کے نشانات پہلے

ہی بنے ہوئے تھے۔ رائفل کے ٹریگر پر دباؤ پڑا اور فضا میں ایک زبردست دھماکے سے گونج اٹھی۔ میں نے پہلے ہدف اور پھر نشانے باز کو دیکھا۔ گولی تو خدا جانے کس طرف گئی تھی البتہ رائفل نوجوان کے ہاتھ سے چھوٹ کر فوراً ہی گر پڑی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ رائفل کے دھکے سے اس کے شانے پر بٹ کی ضرب لگی ہے لیکن گولی کی بازگشت کی گونج ابھی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ میں نے اسے بری طرح لڑکھڑاتے دیکھا' اس کا حال دیکھ کر میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور برق رفتاری سے اس کی طرف لپکا۔ اسے سنبھالنے میں مجھے ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ کائی زدہ چٹان پر سے پھسل کر کھڈ میں جا گرتا۔ میں نے اسے زمین پر لٹا کر اس کا سر گود میں رکھ لیا۔ وہ ہوش و حواس سے بے گانہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ رائفل کا بٹ اچھل کر اس کی کنپٹی سے ٹکرایا ہے۔ یہ چوٹ جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اس کے ساتھی بدحواسی کے عالم میں بری طرح چیخ و پکار کرنے لگے۔ میں نے ان میں سب سے کم عمر لڑکی کے پاس تھرماس دیکھا تو اسے پانی کا کپ بھر کر دینے کی ہدایت کی' اس نے بتایا کہ تھرماس میں پانی نہیں بلکہ چائے ہے' تب میں دونوں افغانیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اس حادثے سے وہ بھی سخت پریشان نظر آ رہے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کو غار میں سے پانی لانے کو کہا۔

ٹھنڈے پانی کا کٹورا آنے پر میں نے نوجوان کے منہ میں انگلیاں ڈال کر اس کے ایک دوسرے پر مضبوطی سے جمے دانتوں کو کھولا اور دو گھونٹ پانی حلق میں انڈیل دیا لیکن وہ سارا کا سارا واپس آ گیا۔ اس کی حالت خطرناک تھی "اسے میرے ساتھ اٹھاؤ اور یہاں سے لے چلو۔ اسے فوری طور پر ڈاکٹر اور دوا کی ضرورت ہے" میں نے چیخ کر کہا۔ مضروب نوجوان کا ساتھی فوراً آگے بڑھا۔ ہم نے اسے اٹھایا اور جھیل کی طرف چل پڑے۔ تینوں خواتین پریشانی کے عالم میں ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

مجھے امید تھی کہ جھیل کے پاس واقع ریسٹ ہاؤسز میں ہم کوئی نہ کوئی ڈاکٹر تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ جھیل کے پاس سے گزرتے ہوئے گورے سیاح نے بتایا کہ وہ ان ہی میں سے ایک ریسٹ ہاؤس میں مقیم ہیں۔ ہم مضروب نوجوان کو اٹھائے اس ریسٹ ہاؤس میں پہنچ گئے اور اسے ایک آرام دہ بستر پر لٹا دیا۔ میں نے مضروب نوجوان کے ساتھی کو ہدایت کی کہ وہ ریسٹ ہاؤس کے چوکی دار کی مدد سے آس پاس کے ریسٹ ہاؤسز میں کوئی ڈاکٹر تلاش کرے۔ وہ فوراً ہی اس مہم پر نکل کھڑا ہوا۔

میں نے تھرماس والی لڑکی کو پانی لانے کی ہدایت کی۔ مضروب نوجوان کی سانس خاصی بے ترتیب تھی۔ میں پانی اس کے حلق میں ڈالتے ہوئے خلوص دل سے دعا کر رہا تھا پانی اس کے حلق سے اتر جائے تاکہ اس کے بچنے کی کچھ امید پیدا ہو سکے۔ رب کریم نے میری دعا سن لی۔ نوجوان کے حلق سے ہلکی سی کراہ برآمد ہوئی' اس کے ساتھ ہی اس نے پانی کا گھونٹ نگل لیا۔ وہ ہوش و حواس کی طرف لوٹ رہا تھا۔ میں نے ایک گھونٹ پانی اور اس کے حلق میں ڈالا' اس نے وہ بھی نگل لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جھرجھری سی لی۔ میرے وجود میں خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ وہ زندگی کی ڈور پھر سے تھام رہا تھا۔

اگر اسے جلد طبی امداد مل جاتی تو وہ خطرے کی زد سے باہر آ سکتا تھا۔ تینوں خواتین نوجوان کی حالت کا بغور جائزہ لے رہی تھیں "خدا کا شکر ہے' مارک کو ہوش آ رہا ہے۔" ان تینوں میں سے سب سے دراز قامت اور پختہ عمر خاتون نے کہا "سوزی تم برانڈی لے کر آؤ۔ ایک دو گھونٹ پی کر اس کی حالت بہتر ہو جائے گی" اس کی مخاطب تھرماس بردار لڑکی تھی "جی نہیں' فی الحال اسے پانی کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت نہیں" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "الکوحل اس کے لیے فائدہ مند کے بجائے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے" میری بات سن کر سوزی اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی۔ دراز قامت خاتون نے بھی اپنی رائے پر اصرار نہیں کیا۔ وہ تینوں اب خاصی مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ "تم نے ہماری بہت مدد کی' اس کے لیے ہم تمہارے احسان مند ہیں۔" دراز قد خاتون نے کہا "تم خاصی اچھی انگلش بول لیتے ہو۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

میں نے اپنا نام حسام خان بتایا۔ پھر اس خاتون نے اپنا اور باقی ساتھیوں کا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر کی تلاش میں جانے والے صاحب جوناتھن راڈرک تھے جنہیں جون کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا۔ مجھ سے ہم کلام خاتون ایلس جون کی اہلیہ تھی۔ مارک جون کا چھوٹا بھائی اور سوزانا یعنی سوزی ان دونوں کی بہن تھی۔ تیسری خاتون میریا عرف میری مارک کی گرل فرینڈ تھی۔ ان سب کا تعلق امریکا سے تھا۔ جون ایک اسکول میں پی ٹی تھا' مارک نے حال ہی میں وکالت کی سند حاصل کی تھی لیکن ابھی اپنے کیرئیر کا آغاز نہیں کیا تھا۔ سوزی اور میری ایک مشہور سپر اسٹور میں سیلز گرل تھیں۔ جب کہ ایلس خاتون خانہ تھی۔

ایلس نے مجھے کہا کہ میں اپنے بارے میں بتاؤں۔ میں اپنے بارے میں ایک فرضی کہانی ترتیب دے رہا تھا کہ جون اور چوکی دار واپس لوٹ آئے۔ وہ کوئی ڈاکٹر تلاش کرنے میں ناکام رہے تھے "اب کیا ہو گا؟" جون نے پریشانی کے لہجے میں پوچھا "کیا ہم اسے قریبی شہر لے چلیں؟" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "نہیں' کئی گھنٹے کا تکلیف دہ سفر اسے زندگی سے مزید دور کر سکتا ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میں نے کھر قصبے سے گزرتے ہوئے ایک ڈسپنسری کا بورڈ دیکھا تھا "کیا آپ لوگوں کے پاس کوئی گاڑی ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔ مارک نے اثبات میں سر ہلا دیا "ہم ہارڈ ٹاپ جیپ میں یہاں آئے ہیں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا ٹھیک ہے۔ ہم ابھی یہاں سے چل رہے ہیں۔ میرے ساتھ مل کر اسے اٹھائیں۔"

"لیکن ہم کہاں جا رہے ہیں؟" جون نے پوچھا۔

"قریبی قصبے کھر۔ وہاں ایک ڈسپنسری موجود ہے۔ جلدی کریں ہمیں سورج ڈوبنے سے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہیے ورنہ وہ جگہ تلاش کرنا مسئلہ بن جائے گا۔ ڈسپنسری بند بھی ہو سکتی ہے۔"

خوش قسمتی سے ہم ڈسپنسری پر بروقت پہنچ گئے۔ وہاں موجود ڈاکٹر ڈسپنسری بند کر کے رخصت ہونے ہی والا تھا۔ اس نے مارک کا بغور معائنہ کیا "فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ بہت جلد ہوش میں آ جائیں گے لیکن اسے نہایت باقاعدگی سے دوا کھلانا پڑے گی۔" ڈاکٹر نے مارک کو انجکشن لگانے کے بعد کہا۔

"اگر آپ کہیں تو ہم اسے ڈیرہ غازیخان لے جاتے ہیں" میں نے کہا۔ ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلا دیا "میرا خیال ہے فی الحال اس کی ضرورت نہیں البتہ اگر یہ ایک گھنٹے تک ہوش میں نہ آئے تو پھر اس بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔ میرا خیال ہے اسے بہت جلد ہوش آجائے گا۔"

ڈاکٹر کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد مارک ہوش میں آگیا۔ اس کے سر میں درد تو تھا لیکن اس کی حالت خاصی سنبھلی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے ایک بار پھر اس کا معائنہ کیا اور پھر دوا ہمارے حوالے کر کے اسے ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی۔ مارک نارمل انداز میں بات چیت کر رہا تھا۔ جون نے اس حادثے کے بارے میں بتایا اور پھر میرا تعارف کرا کے اس معاملے میرے کردار کا ستائش آمیز انداز میں تذکرہ کیا۔ مارک نے نہایت گرم جوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا "میں تمہارا احسان تا زندگی یاد رکھوں گا دوست۔"

"میرا نام حسام ہے' حسام خان۔ تمہارے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس چاند ماری کا نتیجہ تمہارے لیے اچھا نہیں لگے گا" میری بات سن کر مارک شرمندہ سا ہو گیا "ظاہر ہے اس حماقت کا میں کیا جواز پیش کر سکتا ہوں۔ دراصل میں بھول گیا تھا کہ میرے لیے عدالت کے کمرے میں دلائل کی گولہ باری ہی موزوں رہے گی۔" اس کی بات سن کر جون اور میں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ وہ دونوں بھائی بے حد خوش مزاج اور کھلے دل کے مالک تھے۔

ایلس' سوزی اور میری نہایت بے قراری سے ہماری واپسی کے منتظر تھے۔ مارک کو اپنے قدموں پر چلتا دیکھ کر ان کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ کچھ وقت ان کے ساتھ گزارنے کے بعد میں نے رخصت کی اجازت طلب کی جسے یک زبان ہو کر مسترد کر دیا گیا "یہ کیسے ہو سکتا ہے' ابھی تو تم نے اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔" ایلس نے کہا "ابھی تو تم ہم سے بہت سی باتیں کریں گے۔ پاکستان آنے کے بعد تم واحد شخص ہو جس سے اس ملک اور یہاں کی رسم و رواج اور لوگوں کے بارے میں دل کھول کر باتیں کرنے کا موقع ملے گا۔" جون نے اس سے بھی زیادہ پرزور لہجے میں اصرار کیا "دیکھو کوئی بہانہ پیش کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہارے اس سفری بیگ سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہماری طرح تم بھی سیلانی ہو۔ اگر تمہیں کہیں جانا ہے تو کل صبح بھی جا سکتے ہو۔"

اس صورت حال کے پیش نظر میرے پاس ان کی بات ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ ویسے بھی مجھے رات گزارنے کے لیے کسی ٹھکانے کی ضرورت تو تھی ہی' اس ریسٹ ہاؤس سے زیادہ محفوظ اور آرام دہ پناہ گاہ مجھے بھلا کہاں مل سکتی تھی۔ مجھے رضامند دیکھ کر ایلس نے وہی سوال دہرایا جو ڈاکٹر کے پاس روانگی کے باعث جواب سے محروم رہا تھا۔

میں نے اپنی رام کہانی کچھ اس طرح سنائی کہ میں ایک مصنف ہوں اور ان دنوں پاکستان کے اہم لیکن غیر معروف تاریخی مقامات کے بارے میں ایک کتاب لکھنے کی تیاری کر رہا ہوں۔ فورٹ منرو بھی

ایک ایسا ہی مقام ہے جسے انگریزوں کے دور میں ڈیرہ غازیخان کے حاکم گرمائی صدر مقام کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ انگریز حکمران اپنے حواری تمن دار سرداروں کے ساتھ بیش تر اہم اجلاس فورٹ منرو ہی میں منعقد کیا کرتے تھے جن میں عام طور پر آزادی کی تحریک کے کچلنے کے لیے صلاح مشورہ ہوتا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ڈیرہ غازیخان اور اس کے آس پاس کے قبائلی علاقوں کو تمن دار سرداروں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس بندر بانٹ کی قد آدم یادگار جس پر سنگ مرمر کی لوح پر تمام سرداروں کے نام درج ہیں' آج بھی فورٹ منرو میں موجود ہے۔

جون اور دیگر چاروں افراد میری معلومات سے خاصے متاثر نظر آرہے تھے۔ میں نے ان کی توجہ اپنے پر سے ہٹانے کے لیے پوچھا کہ ان کا یہ تفریحی دورہ کیسا رہا ہے اور ان کی اگلی منزل کون سی ہے۔ پتا چلا کہ وہ لوگ شمالی علاقوں کا تفصیلی دورہ کرنے کے بعد پہلے ملتان اور پھر ڈیرہ غازیخان ہوتے ہوئے فورٹ منرو پہنچے ہیں۔ فورٹ منرو میں یہ ان کا تیسرا دن تھا اور وہ اگلے روز یہاں سے رخصت ہو کر لورالائی کے راستے زیارت جانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن مارک کو لگنے والی چوٹ کے باعث وہ اپنا قیام مزید ایک دن بڑھانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ "اگر تمہارے لیے ممکن ہو تو تم بھی ہمارے ساتھ زیارت چلو۔ وہ بھی تمہارے ملک کا اہم تاریخی مقام ہے۔ ہو سکتا ہے تمہیں وہاں سے اپنی کتاب کے لیے اچھا مواد مل جائے اور ہمیں ایک رہنما اور ساتھی۔" وہ سب مجھے پر امید نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

میرا ذہن برق رفتاری سے ان کی پیشکش قبول کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ مجھے مینو استاد کی تلاش میں لورالائی جانا تھا۔ اپنی آئندہ منزل اور لائحہ عمل کا فیصلہ مجھے اس سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں کرنا تھا۔ ممکن ہے مجھے کوئٹہ جانا پڑتا' دوسری طرف اگر لورالائی میں مینو استاد مجھے نہ ملتا تب بھی مجھے کوئٹہ جانا پڑتا۔ ایسی صورت میں بس یا کسی اور ذریعے سے سفر کرنا میرے لیے خطرے سے خالی نہ ہوتا۔ میں شاہ مراد کے پالتو کتوں یا پولیس کے اہل کاروں کی نظروں میں آسکتا تھا جو یقیناً تمام عوامی ذرائع آمد و رفت پر توجہ مرکوز کیے ہوں گے۔ البتہ میں ان لوگوں کے ہمراہ روانہ ہوا تو اپنے موجودہ روپ کی بدولت ان ہی کا ساتھی نظر آؤں گا۔ میری تلاش میں ادھر ادھر جھانکتے پھرنے والوں کو قطعاً توقع نہیں ہو گی کہ میں گوروں کی ٹولی کا حصہ بھی بن سکتا ہوں گویا یہ لوگ میرے لیے حفاظتی ڈھال ثابت ہو سکتے تھے۔ اگر میں ان کے ساتھ زیارت پہنچ جاتا تو کوئٹہ پہنچنے کا کوئی محفوظ راستہ بھی ڈھونڈا جا سکتا تھا۔

بالآخر میں نے ان کے ساتھ چلنے کی مشروط حامی بھر لی "مجھے راستے کے ایک قصبے میں اپنے ایک واقف سے ملاقات کرنا ہے۔ اگر اس نے مجھے ٹھہرنے کو کہا تو ہمارا ساتھ وہیں ختم ہو جائے گا لیکن اگر وہ شخص نہ ملا یا اس نے مجھے جلدی رخصت ہونے کی اجازت دے دی تو میں آپ سب کے ساتھ زیارت چلوں گا۔"

ہم لوگ رات گئے تک جاگتے رہے۔ مارک بالکل فٹ نظر آ رہا تھا۔ میں انہیں پاکستان کی ثقافت، تاریخ، یہاں کے لوگوں کے رہن سہن، رسم و رواج اور نمایاں خصوصیات کے متعلق بتاتا رہا۔ یوں تو وہ سبھی میری باتیں دلچسپی سے سن رہے تھے لیکن سوزی کا انہماک ذرا مختلف رنگ لیے ہوئے تھا۔ ابتدا میں مجھے یہ اپنا وہم لگا تھا لیکن اس کی والہانہ نظریں مسلسل میرا تعاقب کر کے اس کے دل کا حال مجھ پر عیاں کرتی گئیں۔ امریکا جیسے بے حجاب ملک سے تعلق رکھنے والا اس لڑکی کے لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی لیکن اس کی یہ بے باکی مجھے سخت بے آرامی کی کیفیت میں مبتلا کیے دے رہی تھی۔ خدا خدا کر کے ان لوگوں کو خیال آیا کہ رات خدا نے سونے کے لیے بنائی ہے۔ میرے سونے کا انتظام ان لوگوں نے مارک کے کمرے میں ہی کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد باقی لوگ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ مارک خواب آور دوا کے زیر اثر جلد ہی سو گیا۔ میں نے بھی خود کو نیند کے حوالے کر دیا۔

مجھے سوئے ہوئے جانے کتنی دیر ہوئی تھی کہ کسی عجیب سے احساس نے مجھے جگا دیا۔ کمرے کی لائٹ بند تھی اور کسی کی نم آلود سانسیں میرے چہرے کو جھلسائے دے رہی تھیں، پھر مجھے اپنے رخساروں پر دو نرم و نازک ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا۔ مجھے صورت حال سمجھنے میں محض چند لمحے لگے ہوں گے لیکن تب تک شبنم میں بھیگی گلاب کی کلیاں میری پیشانی پر مہکتی مہر ثبت کر چکی تھی، مجھے لگا کہ جیسے میرا وجود بے وزن ہو کر فضا میں بلند ہو رہا ہے۔ قبل اس کے کہ سوزی مزید پیش قدمی کر پاتی میں نے بستر پر کروٹ لے کر خود کو اس سے دور کیا اور پھر بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا "سوزی پلیز ایسا نہ کرو" میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ اسی وقت میرا پاؤں کسی دھاتی برتن سے ٹکرایا، جھنجھناہٹ اس قدر زوردار تھی کہ میں نے غنودگی میں ڈوبے مارک کی ہموار سانسیوں میں بھی بے ترتیبی محسوس کی۔ اگر وہ بیدار ہو جاتا تو میری پوزیشن کافی نازک ہو سکتی تھی۔ اس دوران میں میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔ میں نے ایک ہیولے کو کمرے سے باہر جاتے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے میں دوبارہ اپنے بستر پر دراز ہو چکا تھا۔ مارک کی نیند دوبارہ گہری ہو گئی لیکن میری نیند ہوا ہو چکی تھی۔ یہ واقعہ مجھے نئے اندیشوں میں مبتلا کر گیا تھا۔ کہیں یہ لڑکی میری پہلو تہی کو اپنی توہین نہ سمجھ بیٹھے۔ میں موجودہ صورت حال میں کسی کی دشمنی مول لینے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسری طرف اگر سوزی کی ایسی کوئی بے باکانہ حرکت اس کے بھائیوں کی نظر میں آ جاتی تو ان کا مہربانی آمیز رویہ تبدیل بھی ہو سکتا تھا۔

بالآخر صبح بھی ہو گئی۔ میں سوزی کا سامنا کرنے کے خیال سے گھبرا رہا تھا۔ سب سے پہلے ایلس بیدار ہوئی۔ اس نے مارک کی طبیعت کا پوچھا اور پھر چوکیدار کو ناشتہ لانے کی ہدایت دینے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد جون اور میری بھی بیدار ہو گئے۔ صرف وہ نہیں آئی جس نے میری نیند تہس نہس کر ڈالی تھی "میری جاؤ سوزی کو جگا دو۔ ناشتہ آنے والا ہے۔" جون نے کہا "اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے" میری نے کہا "وہ دیر سے اٹھے گی۔ اس نے کہا ہے کہ ہم لوگ ناشتے پر اس کا انتظار نہ کریں۔" اس کی آنکھوں میں عجیب سی

معنی خیز چمک تھی۔ میرا دل بری طرح دھڑک اٹھا کہیں یہ رات کی واردات سے آگاہ تو نہیں ہے؟ سوزی نے اسے ہمراز تو نہیں بنا رکھا ہے؟ اس طرح تو یہ معاملہ بہت جلد ان سب لوگوں کے علم میں آ جائے گا۔

چوکی دار پورے دو گھنٹے بعد ناشتا لے کر واپس لوٹا۔ جون اور مارک نے ناراضگی کا اظہار کیا تو چوکی دار نے ایک سنسنی خیز خبر سنا کر مجھے بری طرح چونکا دیا۔ اس نے بتایا کہ رات گئے پولیس کو دو افراد کی مسخ شدہ لاشیں ملی ہیں جنہیں وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد قتل کیا گیا تھا۔ پولیس کے مطابق دونوں مقتول ڈیرہ غازی خان سے لورالائی دودھ لے جانے والے ایک ٹرک کے ڈرائیور اور کلینر تھے۔ ٹرک خراب ہونے کے باعث انہیں کھر قصبے کے پاس رکنا پڑا تھا جہاں سے نامعلوم افراد نے انہیں اغوا کر لیا اور پھر سخت اذیتیں دینے کے بعد انہیں قتل کر کے ان کی نعشیں سڑک کے عین درمیان میں پھینک دیں۔ اب پولیس والے ان دونوں کے قاتلوں کو تلاش کر رہے تھے۔ انہوں نے بڑے بازار کے مسافر خانوں میں ٹھہرے تمام مسافروں سے کڑی تفتیش کی تھی اور ان کے سامان کی بھی تلاشی لی تھی۔ اس کے علاوہ جو کوئی ان کے ہتھے چڑھتا تھا وہ اسے پکڑ کر بٹھا لیتے تھے اور اس سے ان دو افراد کے قتل کا اعتراف کرانے کی کوشش کرتے تھے۔ چوکیدار بے چارہ بھی ان کے چنگل میں پھنس گیا تھا اور بمشکل جان چھڑا کر واپس آ سکا تھا۔

میرے لیے صورت حال کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ غلام مصطفٰے اور اس کا کلینر میری تلاش میں بھٹکنے والے خونی درندوں کی نظروں میں آ گئے تھے۔ میرا اتا پتا جاننے کے لیے ان بے چاروں پر اتنا بہیمانہ تشدد کیا گیا کہ وہ جان کی بازی ہار گئے۔ ہو سکتا ہے وہ بتانے پر مجبور ہو گئے ہوں کہ میں ان سے رخصت ہو کر فورٹ منرو کی طرف روانہ ہوا تھا۔ گویا میں سنگین خطرات میں گھرا ہوا تھا۔ اسے محض حسن اتفاق ہی کہنا چاہیے کہ میں شام کو کھر واپس جانے کے باوجود ان شکاریوں کی عقابی نظروں سے محفوظ رہا تھا۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ پولیس ان دو مظلوموں کے قاتلوں کو نہیں بلکہ ان کے تیسرے ساتھی کو تلاش کر رہی تھی۔ اگر میں کسی مسافر خانے میں رات گزارتا تو کب کا ان کے ہتھے چڑھ چکا ہوتا میری احتیاط پسندی نے مجھے بچا لیا تھا۔

اب سوال یہ تھا کہ میرے خون کی بو پر بھٹکنے والے درندے اس ٹرک، اس کے ڈرائیور اور کلینر تک کیسے پہنچے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا۔ انہیں اس ٹرک میں میری موجودگی کا صدفی صد یقین رہا ہوگا اور اس یقین کا ایک ہی جواز ہو سکتا تھا انہیں قابل اعتماد ذریعے سے اطلاع ملی ہو گی کہ میں اس ٹرک میں چھپ کر لورالائی فرار ہو رہا ہوں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا نہیں تھا کہ یہ مخبری خضر خان کے کسی غدار کارندے کے لالچ یا خوف کا شاخسانہ تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ٹرک خراب ہو گیا اور میں نے بروقت اس سے دور ہونے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اب میرے لیے لورالائی میں قدم رکھنا موت کو دعوت دینے

کے مترادف تھا۔ غلام مصطفے اور اس کا کلینز ساتھی اب لورالائی میں میرے منتظر ہوں گے۔ اب خیریت اسی میں تھی کہ اب لورالائی جا کر استاد مینو سے ملاقات کا خیال ذہن سے نکال دوں۔

اس صورت حال کے پیش نظر اب میں ریسٹ ہاؤس سے باہر نکلنے اور آزادانہ گھومنے پھرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اب میں صرف ان گوروں کے ساتھی کی حیثیت سے ہی اس خوب صورت پنجرے سے نکلنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

جون اور اس کا ساتھی دیر تک دورہے قتل کی اس واردات پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ قبائلی دشمنیوں کی نسل در نسل روایت کے باعث اس طرح کی وارداتیں ان علاقوں میں وقتاً فو قتاً رونما ہوتی رہتی ہیں تاہم اس سے ہم لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ یہ قتل و غارت گری غیر متعلقہ لوگوں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیتی تاہم میں اس موضوع کو طول دینے کی کوشش نہیں کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بات اتنی آگے بڑھے کہ میری اصلیت آشکار ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ خدا جانے اس واقعے کا اثر تھا یا مارک مضروب ہونے کا خیال لیکن وہ لوگ شام تک ریسٹ ہاؤس سے باہر نہیں گئے۔ سوزی شدید اصرار پر دوپہر کے کھانے پر آ گئی تھی لیکن اس کی حالت سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔ چند لقمے لینے کے بعد وہ اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔

موسم صبح سے بہت اچھا ہو رہا تھا۔ ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ خنک ہوا چل رہی تھی۔ شام ہونے پر جون' ایلس اور میری نے گھومنے پھرنے کے لیے باہر جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مارک کو وہ مزید آرام دینے کے لیے اپنے ساتھ لے کر نہیں جا رہے تھے' میں نے سر درد کا بہانہ کر کے ان کے ساتھ جانے سے معذرت کر لی جب کہ سوزی تو گزشتہ رات سے ہی اپنے کمرے میں بند میری بدمزاقی کا سوگ منا رہی تھی۔ میری کے نظروں میں میرے لیے اب بھی معنی خیز چمک موجود تھی۔ چنانچہ میں اس سے نظریں چرانے کی حتی الامکان کوشش کر رہا تھا۔

ان تینوں کے جانے کے بعد میں اور مارک گپ شپ کرتے رہے۔ ہم میں خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ وہ پاکستان کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ اس نے ملتان سے ایک شلوار سوٹ خریدا تھا جو اسے پہننے میں بہت آرام دہ لگا لیکن اس کے خیال میں یہ لباس تیز رفتاری سے کام کرنے کے لیے موزوں نہیں تھا۔ میں نے اس کی تردید کرنے کی کوشش نہیں کی' پھر اس نے شدید اصرار کر کے اپنی جینز اور ٹی شرٹ مجھے پہنا دی' یہی نہیں اس نے اپنی پی کیپ اور سن گلاسز بھی مجھے پہنا دیے "اب تم ایک ہینڈسم امریکن نوجوان دکھائی دیتے ہو" اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔ "جب تم ہمارے ساتھ ہو تم یہی لباس پہنو گے' او کے!"

اس کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ میری مرضی کے عین مطابق تھا۔ میں خود بھی تو انہیں میں سے ایک نظر آنا چاہتا تھا۔ سورج ڈھلے جون وغیرہ بھی لوٹ آئے۔ انہوں نے بھی مجھے اس حلیے میں بے حد سراہا۔

رات کے کھانے پر سوزی بھی موجود تھی' اب اس کی حالت کافی بہتر نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پا لیا تھا۔ صبح ہمیں زیارت روانہ ہونا تھا لہٰذا جلدی سونے کا پروگرام بنا لیا گیا۔ مارک خود کو بالکل فٹ محسوس کر رہا تھا چنانچہ وہ مجھے کمرے میں تنہا چھوڑ گیا۔

میرا خیال تھا کہ گزشتہ رات کی حوصلہ شکنی کے بعد سوزی میرے کمرے کا رخ نہیں کرے گی لیکن دل کے کسی چور گوشے میں اس کا انتظار بھی تھا۔ میری نظریں بار بار کمرے کے دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ گیارہ بجے کے قریب دروازے پر آہٹ ہوئی' میرے دل کی رفتار یک لخت بڑھ گئی۔ وہ سوزی ہی تھی' شب خوابی کے لباس میں وہ بہت دلکش اور نکھری نکھری دکھائی دے رہی تھی۔ وہ محض لمحہ بھر دروازے میں ٹھہری اور پھر اندر داخل ہو گئی۔ "مجھے یقین تھا آپ جاگ رہے ہوں گے اور آپ کو چائے کی ضرورت بھی محسوس ہو رہی ہو گی۔" اس نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ تب میری نظریں اس کے ہاتھوں میں موجود چھوٹی سی ٹرے پر پڑی جس میں چائے سے لبریز دو کپ موجود تھے۔

اس اپنائیت آمیز بے تکلفی نے میرا اضطراب دور کر دیا "آیئے۔۔۔آیئے۔۔۔میں واقعی شدت سے چائے کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ لوگوں کے خیالات پڑھنا چاہتی ہوں۔

"سب لوگوں کے نہیں' میں صرف چند خاص لوگوں کے خیالات پڑھنے کی اہلیت رکھتی ہوں' ویسے اگر ان خاص لوگوں میں آپ کا نام شامل کر لوں تو آپ کو برا تو نہیں لگے گا؟"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ لگاؤ کے اس واضح اظہار کا میں کیا جواب دوں میری مشکل اس نے خود آسان کر دی "پریشان مت ہوں۔ میں زبردستی آپ کے گلے سے لٹکنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ ویسے بھی ضروری تو نہیں کہ جو شے آپ کے دل کو اچھی لگے وہ آپ کی دسترس میں بھی ہو۔"

"آپ میری توقع سے زیادہ سمجھ دار ہیں سوزی۔ زندگی ایک سفر کا نام ہے جس میں نت نئے ہم سفر ملتے رہتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو منزل نہیں بنایا جا سکتا کیوں کہ ہو سکتا ہے خود اس مسافر کی منزل کوئی اور ہو۔"

"اوہ! مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔ آپ مشرقی لوگ بہت رومانٹک ہوتے ہیں۔ تو جناب پہلے ہی کسی کو اپنے دل کا مالک بنا چکے ہیں۔"

"ہاں سوزی' مجھے کل رات کے واقعے کا افسوس ہے' مجھے امید ہے آپ نے میرے رویے کو اپنی توہین نہیں سمجھا ہو گا۔" میں نے بڑی احتیاط سے الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے کہا۔ میری بات سن کر سوزی کے چہرے میں شدید حیرانگی کے آثار نمودار ہوئے" آپ کس واقعے کی بات کر رہے ہیں؟ کل رات تو میں نے بستر سے قدم زمین پر نہیں رکھا' مجھے سینے میں ٹھنڈ لگ رہی تھی اور دمے کا پرانا مرض مجھ پر حملہ آور ہو گیا تھا۔"

اس کی بات سن کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا "اوہ! تو پھر۔۔۔تو پھر وہ کون تھی جس نے۔۔۔"

میں کوشش کے باوجود اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ سوزی چند لمحوں تک حیرت سے میرا منہ تکتی رہی۔ پھر اس کے حسین چہرے پر یکا یک جوش و خروش کے تاثرات ابھر آئے "میں سمجھ گئی۔۔۔ تو وہ کتیا آپ کے پاس آئی تھی؟" "آپ کس کی بات کر رہی ہیں؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"وہی میری۔۔۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس حد تک گر جائے گی۔ کل رات میری آنکھ کھلی تو مجھے اس کا بستر خالی نظر آیا تھا۔ میں یہ سوچ کر دوبارہ سو گئی کہ وہ مارک کی طبیعت کا جائزہ لینے گئی ہے۔"

"لیکن وہ تو مارک۔۔۔"

"وہ مارک کے روشن مستقبل کے امکانات کی وجہ سے اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے ورنہ وہ محبت اور وفا کے نام سے بھی ناواقف ہے۔ میں مارک کو اس کی اس حرکت کے بارے میں ضرور بتاؤں گی۔"

"پلیز سوزی! جب تک میں آپ لوگوں کے ساتھ ہوں تب تک اس بارے میں زبان کھولنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں فی الحال کوئی بدمزگی نہیں چاہتا۔" "ٹھیک ہے لیکن میں اپنے بھائی کو اس حرافہ سے کسی قیمت پر شادی نہیں کرنے دوں گی۔" وہ سخت غصے میں نظر آ رہی تھی۔ میں نے اسے بمشکل پر سکون کر کے رخصت کیا۔

اگلے روز صبح سویرے ہم اپنے سفر پر نکل کھڑے ہوئے میں نے انہیں بتایا کہ میں نے لورالائی میں رکنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے اور اب میں ان کے ساتھ زیارت جاؤں گا۔ یہ سن کر وہ سب بہت خوش ہوئے۔ میرا حلیہ بالکل جون اور مارک جیسا تھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ غیر معمولی توجہ دیے بغیر مجھے اس ٹولی سے الگ نہیں سمجھا جا سکتا۔ جون نہایت مہارت سے گاڑی چلا رہا تھا۔ وہ بلاشبہ بہت اچھا ڈرائیور تھا۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ ان دشوار گزار اور خطرناک راستوں پر جلد بازی یا لاپروائی کا نتیجہ صرف اور صرف موت کی صورت میں نکل سکتا تھا۔ ہم اضافی خوراک ساتھ لے کر روانہ ہوئے تھے۔ کیونکہ ہم شام سے پہلے پہلے زیارت پہنچنا چاہتے تھے۔ جون کے پاس نقشہ موجود تھا اس کے علاوہ میں بھی اس کی رہنمائی کرتا رہا۔

گاڑی کی فرنٹ سیٹ پا ایلس جون کے ہمراہ براجمان تھی۔ مارک مجھ سے گپ شپ لگانے کے لیے اتنا بے تاب تھا کہ اس نے دونوں لڑکیوں کو عقبی نشستوں پر بھیج کر درمیانی نشستوں پر میرے ہمراہ قبضہ کر لیا تھا۔ لورالائی قریب آنے پر میں نے سر میں درد کی شکایت کی۔ مارک نے مجھے چیونگم پیش کی لیکن میں نے اپنا اگلی نشستوں کی پشت سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

"کیا بہت زیادہ تکلیف ہے خان؟" مارک نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔ پہاڑی راستوں پر سفر کے دوران مجھے کبھی کبھی یہ تکلیف ہو جاتی ہے' ابھی کچھ دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"ایسا کرو تم سیٹ پر لیٹ جاؤ۔ ایلس تمہارے فرسٹ ایڈ بکس میں سر درد کی کوئی گولی ہو تو دے

دو۔"

ایلس کی دی ہوئی گولی نگل کر میں مارک کی ران پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ پی کیپ میں نے پیشانی پر جھکا لی تھی۔ میں پورے دو گھنٹے اسی حالت میں لیٹا رہا۔ اس دوران میں گاڑی سبک رفتاری سے آگے بڑھتی رہی۔ بالآخر میں اٹھ بیٹھا "اب کیسی طبیعت ہے؟" مارک نے پوچھا "بہت معمولی سی تکلیف باقی ہے۔" میں نے کنپٹیاں سہلا کر کہا۔ "یہ پی لو۔ تم بالکل فٹ ہو جاؤ گے۔" مارک نے سوزی کے ہاتھ سے تھرماس کے کپ نما ڈھکن میں چائے لے کر میرے حوالے کر دی۔ چائے پی کر میں نے ظاہر کیا کہ جیسے میں بالکل ٹھیک ہو گیا۔ ورنہ سہی میں خطرے کی زد میں تو تھا ناں! اب مجھے اس عذاب سے بھی چھٹکارا مل چکا تھا۔

ہم شام ڈھلنے سے خاصا پہلے زیارت پہنچ گئے۔ ان لوگوں کے علاوہ میں خود بھی وہاں پہلی بار آیا تھا۔ اس خوب صورت وادی کا پُر رعب حسن دیکھ کر ہم مبہوت ہو کر رہ گئے۔ بلند و بالا صنوبروں سے چھن کر آنے والی ہوئی خنک ہوا بدن میں میٹھی سی تھرتھراہٹ پیدا کر رہی تھی۔ جس ریسٹ ہاؤس میں ہمیں ٹھہرنا تھا وہ ایک چھوٹی سی پہاڑی کی چوٹی پر تعمیر کیا گیا تھا۔ جدید دور کی بیشتر سہولتوں سے آراستہ یہ ریسٹ ہاؤس ایک سرکاری محکمے کی ملکیت تھا۔ ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار اور اس کے لیے بھی نزدیک ہی ایک جھونپڑی نما مکان موجود تھا۔ چوکیدار نے بتایا کہ وہ مہمانوں کے گزشتہ روز نہ آنے کی وجہ سے پریشان ہو گیا تھا کیوں کہ ان خطرناک پہاڑی راستوں پر حادثات روزمرہ کا معمول ہیں۔

سفر کی تھکن نے میرے ہمسفروں خصوصاً خواتین کو نڈھال کر دیا تھا۔ چنانچہ کھانے کے فوراً بعد سب نے بستر سنبھال لیے۔ صرف میں تھا جس کی آنکھیں نیند سے محروم تھیں۔ مجھ جیسے بے منزل مسافر کا ایسی تھکن بلا کیا بگاڑ سکتی تھی؟ سرد چاندنی رات میں میرا ذہن اپنے روز و شب کا تجزیہ کرتا رہا۔ مجھے حیرت اس بات سے ہوتی تھی کہ نفرت کا وہ طوفان جو بچپن سے اپنی ماں کے خلاف میرے رگ و پے میں گردش کرتا تھا' اب نہ جانے دھیما کیوں پڑ گیا تھا۔ شاید یہ اس ماحول سے دور نکل آنے کا نتیجہ تھا جو مجھے اس سانحے کے حوالے سے میری روح کو کچوکے دیتا تھا۔ میرا وہ خنجر بھی مجھ سے چھن گیا تھا جسے میں نے اپنی نفرت کے زہر میں بجھا کر اپنے باپ کے قاتلوں کے خون سے غسل دینے کی قسم کھائی تھی۔ کمال الدین خان کی زبانی مجھے علم ہوا تھا کہ برکت علی کی بیوی میری ماں کے ہم نام ہونے کے علاوہ کچھ اسی قسم کا پس منظر بھی رکھتی ہے' کمال الدین خود بھی اس کے خون کا پیاسا تھا لیکن نہ جانے کیوں میرے وجود میں اس عورت کے خلاف انتقامی چنگاریاں بھڑک نہیں پائی تھیں۔ اگر وہ واقعی وہ ہی تھی جس کے خاتمے کو میں نے اپنی زندگی کا مقصد بنایا تھا تو پھر میں اسے کیوں کر فراموش کر بیٹھا ہوں۔ یکایک مجھے ایک عجیب سا خیال آیا۔ جوں جوں میں اس پر غور کرتا گیا مجھے یقین ہوتا چلا گیا کہ اصل صورت حال یہی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے وجود میں انتقام کی آگ اس دن تک پوری ہلاکت آفرینی سے دہک رہی تھی

جب سخی سرور سلطان کی درگاہ کے احاطے میں اس پراسرار شخصیت قلندر بابا سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مجھے تلقین کی تھی کہ میں نفرت کی آگ میں خود کو جلانا چھوڑ دوں۔ اس کے بعد سے میرے سینے میں انتقام کی آگ مانند پڑتی چلی گئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے خود اس کا احساس نہیں تھا۔

صبح ناشتے کے فوراً بعد ہم سب وادی زیارت کی سیر کو نکل کھڑے ہوئے مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی ان سب کا ساتھ دینا پڑ رہا تھا۔ میں نے خود کو تاریخ کا طالبعلم کہہ کر اپنی گردن پھنسالی تھی۔ وہ لوگ ہر مقام کا تاریخی پس منظر دریافت کرتے تھے۔ میں جیسے تیسے انہیں مطمئن کرتا رہا۔ اب مجھے اس ڈرامے سے الجھن ہونے لگی تھی۔ میں جلد از جلد کوئٹہ نکل بھاگنا چاہتا تھا تاکہ اپنا مشن آگے بڑھا سکوں۔ وہ لوگ تین چار روز زیارت میں گزارنے کا ارادہ رکھتے تھے میں تب تک وہاں پھنسا نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں اگلے روز ان سے اجازت لے کر کوئٹہ روانہ ہو جاؤں گا لیکن اس رات سوزی کی طبیعت ایک بار پھر خراب ہوگئی۔ اسے دمے کا دورہ پڑا تھا۔ اگلے دن تک اس کی حالت مزید بگڑ گئی۔ زیارت کی خنک فضا اسے راس نہیں آئی تھی۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے جون نے زیارت میں مزید ٹھہرنے کا پروگرام منسوخ کر دیا۔ شام کو ہم سب اپنا سامان سمیٹ کر کوئٹہ آگئے۔ وہ لوگ شاہراہ زرغون پر واقع شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ میں نے ان کے ساتھ ٹھہرنے کی دعوت پر معذرت کر لی اور ملتے رہنے کا وعدہ کر کے ہوٹل کی خوبصورت عمارت سے باہر نکل آیا۔

سردار خضر خان کے دوست نعمت خان کا پتا اور اس کے نام خضر خان کا خط میرے پاس محفوظ تھے لیکن میں خواہ مخواہ اسے زحمت نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے ایک رکشا روکا اور ڈرائیور کو کسی سستے ہوٹل والے علاقے تک چلنے کی ہدایت کی۔ رکشا ڈرائیور چند لمحوں تک عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے سر جھٹک کر رکشا آگے بڑھا دیا۔ اس نے مجھے جس جگہ چھوڑا وہ ایک پررونق بازار تھا۔ رات کا پہلا پہر قریب قریب گزر چکا تھا لیکن وہاں ابھی تک خاصی چہل پہل تھی۔ میں ایک قدیم عمارت میں واقع ہوٹل میں داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر استقبالیے کے طور پر استعمال ہونے والی میز کے عقب میں موجود شخص مجھے دیکھ کر جیسے سوتے سے بھاگ اٹھا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے ایک کمرا چاہیے۔ میری بات سن کر وہ حیرت انگیز طور پر کسی نامعلوم سوچ میں گم ہوگیا۔ اس کی نظریں مسلسل میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر اس نے مجھے ٹھہرنے کی ہدایت کی اور اندر ایک دروازے میں غائب ہوگیا۔ اس کا طرز عمل مجھے اضطراب میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ کئی منٹ بعد واپس لوٹا "معاف کرنا جی۔ ہمارے پاس اس وقت کوئی کمرا خالی نہیں ہے۔" اس نے عجیب روکھے لہجے میں کہا اور پھر ایک رجسٹر میں نہ جانے کون سے اندراجات کا بغور جائزہ لینے میں مصروف ہوگیا۔ میں شدید جھنجلاہٹ کے عالم میں ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ اس شخص نے سراسر غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ سامنے موجود لکڑی کے خانوں میں رکھی متعدد چابیوں سے صاف ظاہر تھا کہ اس ہوٹل میں ایک نہیں بلکہ کئی کمرے خالی تھے لیکن اس نے مجھے صاف انکار کر دیا تھا۔ مجھے اس

حرکت کی وجہ سمجھ نہ آئی۔ میں اسی قسم کے ایک اور ہوٹل میں گیا۔ لیکن وہاں بھی مجھ سے اسی قسم کا سلوک کیا گیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ مجھے اب بھوک لگ رہی تھی۔ میں ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا۔ اس کے ساتھ ہی ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ ریسٹورنٹ میں موجود تمام لوگ مجھے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔ میرا وہ حلیہ جو ڈیرا غازی خان سے کوئٹہ تک میری بہترین آڑ ثابت ہوا تھا اب میرے لیے مصیبت ثابت ہو رہا تھا۔ اس حلیے میں میں سب سے الگ اور اجنبی نظر آتا تھا۔ دونوں ہوٹل والوں نے مجھے مشکوک سمجھ کر کمرا دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان دنوں ملک بھر میں بم دھماکوں کی وارداتیں اتنے تسلسل سے ہو رہی تھیں کہ لوگ ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ اس حلیے کے ساتھ میں مزید ہوٹلوں میں قسمت آزمائی کرتا تو شاید دہشت گردی کے شبہے میں حوالات کی ہوا کھانا پڑتی۔ میرے پاس ٹی ٹی پستول برآمد ہونے کے بعد میری گردن میں پھندا پوری طرح کس جاتا۔

میں نے چائے کی پیالی ختم کی اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل آیا۔ اب میں بازاروں میں پھرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے فوری طور پر پناہ کی ضرورت تھی۔ خوش قسمتی سے مجھے فوراً ہی ایک رکشا مل گیا "چمن ہاؤسنگ سکیم چلو" میں نے رکشا ڈرائیور کو ہدایت کی۔ میں نعمت شیخ کا پتہ ذہن میں دہرا رہا تھا۔ موجودہ صورت حال میں اس کا سہارا لینے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

نعمت شیخ میری توقع سے زیادہ امیر شخص ثابت ہوا۔ اس کے عظیم الشان بنگلے کے گیٹ پر تعینات مسلح چوکیدار نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا اور پھر گیٹ کی کھڑکی بند کر کے اندر اطلاع دینے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ عمر کا گورا چٹا شخص میرے سامنے تھا "میرا نام ذوالفقار علی شاہ ہے۔۔۔ میں ۔۔۔" میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس نے میرا ہاتھ گرم جوشی سے تھام لیا "تمہیں خضر خان نے بھیجا ہے نا؟ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ آؤ۔۔۔ اندر آجاؤ" میں کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوا۔ وہ مجھے ایک نہایت نفاست سے آراستہ ڈرائنگ روم میں لے آیا "تم بیٹھو۔ میں تمہارا کمرہ ٹھیک کرواتا ہوں اور کھانے پینے کا انتظام کرتا ہوں۔ وہ مجھے ایک گداز صوفے پر بٹھا کر غائب ہوگیا۔ اس قدر گرم جوشی سے استقبال میرے لیے غیر متوقع تھا۔ خضر خان نے خدا جانے کب اسے میری متوقع آمد سے آگاہ کر دیا تھا۔ خضر خان نے کہا تھا کہ میں اس پر مکمل اعتماد کر سکتا ہوں۔ اس "مکمل" کی کیا حد تھی، اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔

"چلو بھائی اپنا کمرہ دیکھ لو اور لباس تبدیل کر لو۔ تب تک کھانا بھی لگ جائے گا۔ اتفاق کی بات ہے، میں نے بھی آج ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے۔ دونوں بھائی ایک ساتھ کھانا کھائیں گے۔" نعمت شیخ کے لہجے میں اتنی اپنائیت اور بے تکلفی تھی کہ میرے اعصاب خود بخود پرسکون ہوتے چلے گئے۔ کھانے کے دوران بھی اس کی کوشش رہی کہ میں خوب اچھی طرح پیٹ بھروں۔ ساتھ ساتھ وہ خضر خان اور اپنی

دوستی کے قصے بھی سناتا رہا۔اسے باتیں کرنے کا کچھ زیادہ ہی شوق تھا۔مجھے زبان کھولنے کا ذرا کم ہی موقع مل پا رہا تھا اور میرے لیے یہی بہتر بھی تھا۔

”اچھا اب تم اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔باقی باتیں صبح ناشتے پر ہوں گی۔“ کھانے کے بعد اس نے کہا۔میری خود بھی یہی خواہش تھی چنانچہ میں اپنی خواب گاہ میں آ گیا۔اب میں جلد از جلد اپنے اجنبی حلیے سے نجات حاصل کر لینا چاہتا تھا۔چنانچہ نعمت شیخ کے رخصت ہونے کا یقین ہوتے ہی میں میک اپ کا سامان اٹھائے ملحقہ غسل خانے میں گھس گیا۔نصف گھنٹے کی صبر آزما کوشش کے بعد میں اپنی اصل صورت واپس حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔سر کے بال تو کوئی نائی ہی تراش سکتا تھا البتہ میں نے مونچھوں کو ہلکا اور ترتیب میں کر دیا تھا۔پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد میں بستر پر دراز ہو گیا۔خضر خان نے نعمت شیخ کو میرے بدلے ہوئے حلیے کے بارے میں بھی یقیناً بتا دیا ہو گا اور مجھے امید تھی کہ وہ میری تبدیل شدہ شکل وصورت دیکھ کر حیرت زدہ نہیں ہو گا۔

بے حد گداز ودبیز بستر مجھے اجنبی لگ رہا تھا اور کوشش کے باوجود میں سو نہیں پا رہا تھا۔آدھی رات تک سونے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا۔مجھے کسی کتاب کی تلاش تھی۔کچھ دیر مطالعہ کرنے کے بعد میری روٹھی ہوئی نیند مجھ پر مہربان ہو سکتی تھی۔میں نے ڈرائنگ روم میں چند میگزین پڑے دیکھے تھے چنانچہ میں اپنے کمرے سے نکلا اور ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑا۔ڈرائنگ روم میں مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔میں دو ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ کسی کے بولنے کی دھیمی آواز میں مجھے متوجہ کر لیا۔سناٹے کے باعث میرے کان کچھ زیادہ ہی بہتر کام کر رہے تھے۔میں نے بغور آس پاس کا جائزہ لے کر آواز کی سمت معلوم کرنے کی کوشش کی۔وہ کمرہ میرے اندازے کے مطابق نعمت شیخ کی خواب گاہ تھا۔کمرے کے بند دروازے کی نچلی جھری سے روشنی کی لکیر نظر آ رہی تھی۔وہ گفتگو بھی اسی کمرے میں ہو رہی تھی۔مجھے یہ جان کر خاصی حیرت ہوئی کیونکہ نعمت شیخ بتا چکا تھا کہ اس کے گھر والے لاہور گئے ہوئے ہیں۔اور وہ یہاں بالکل اکیلا ہے۔ایسے میں اتنی رات گئے وہ کس سے بات کر رہا تھا۔گھر کا فون بھی میری نظروں کے سامنے ڈرائنگ روم میں موجود تھا ورنہ یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ ٹیلیفون پر کسی سے محو گفتگو ہے۔

میرا تجسس آخری حدوں کو چھونے لگا۔میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور دروازے سے کان لگا دیے”ہاں ہاں ۔۔۔آپ اطمینان رکھیں۔وہ اپنے کمرے میں آرام سے سو رہا ہے۔۔۔نہیں میں نے جان بوجھ کر آپ کا ذکر نہیں کیا۔کل تو آپ آ ہی جائیں گے۔آپ خود اس سے بات کر لیجیے گا۔۔۔نہیں وہ کہیں نہیں جائے گا آپ فکر نہ کریں۔میں نے خضر خان کا حوالہ دے کر اسے مطمئن کر دیا ہے۔۔۔ٹھیک ہے۔۔۔میں انتظار کروں گا۔“نعمت شیخ غالباً ٹرانسمیٹر پر کسی سے بات کر رہا تھا۔موضوعِ گفتگو میں ہی تھا۔اس کا ہر لفظ بم بن کر میری سماعت پر گر رہا تھا۔اس نے مجھے لچھے دار گفتگو کے ذریعے اپنے جال میں

پھنسا لیا تھا۔اب وہ اس شکاری کا منتظر تھا جس سے اس نے میرا سودا چکایا تھا۔یہ غالباً ٹرک ڈرائیور غلام مصطفےٰ اور اس کے کلینر کے قتل کی سازش ہی کی اگلی کڑی تھی۔میری ڈلیوری لینے کے لیے آنے والا خود سردار شاہ مراد بھی ہو سکتا تھا اور اس کا کوئی اہم کارندہ بھی۔اگر میں رات بھر غفلت کی نیند سوتا رہتا تو کل کسی بھیگے پرندے کی طرح شاہ مراد کے ہتھے چڑھ چکا ہوتا۔قسمت ایک بار پھر میرا ساتھ دے رہی تھی۔اب میں کم از کم یہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش تو کر ہی سکتا تھا۔خضر خان کے دیے ہوئے پستول کی موجودگی میرے لیے زبردست تقویت کا باعث تھی'اور کچھ نہیں تو میں جان کی بازی تو لگا ہی سکتا تھا۔

میں تیز رفتاری سے لیکن بے آواز قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔میں وقت ضائع کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا نہ ہی اضافی سامان اپنے ساتھ رکھنے کی گنجائش تھی۔میں نے بیگ سے صرف پستول اور اضافی میگزین ساتھ لیے اور جوتے چڑھا کر کمرے سے باہر نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔نعمت شیخ نے گرم جوش استقبال کے باعث میں بنگلے کے حفاظتی انتظامات کا بغور جائزہ نہیں لے سکا تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ بنگلے کے گیٹ پر صرف ایک ہی چوکی دار تعینات تھا جو کلاشنکوف سے لیس تھا۔وہ بھاری بھرکم لیکن پھرتیلا شخص نظر آتا تھا۔اگر سابق فوجی ہوتا تو مارشل آرٹ میں سوجھ بوجھ بھی ہو سکتی تھی۔مجھے بہرحال اسی پر احتیاط سے ہاتھ ڈالنا تھا۔

میں نے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔پورے بنگلے میں نیم تاریکی اور سناٹے کا دور دورہ تھا۔مرکزی دروازہ شاید رات کو مقفل رہتا تھا۔مجھے بغلی دروازہ تلاش کرنا تھا۔اس دوران صرف نعمت شیخ کی طرف سے مداخلت کا خدشہ تھا۔میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر مار گراؤں گا۔باورچی خانے کے ساتھ والی راہداری میں مجھے مطلوبہ راستہ مل گیا۔اس مضبوط دراوازے میں اندر سے چٹخنی لگی ہوئی تھی۔میں نے بغیر آواز پیدا کیے چٹخنی کھولی۔وہ دروازہ پورچ میں کھلتا تھا۔سامنے شیخ نعمت کی بیش قیمت کار موجود تھی۔پورچ کے اس حصے سے چوکی دار کے کیبن کا کچھ حصہ بھی نظر آ رہا تھا۔اگر چوکی دار اپنے کیبن سے جھانکتا تو پورچ میں کھڑا کوئی بھی شخص اس سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔

میں اندزاہ لگانے میں ناکام رہا کہ چوکیدار جاگ رہا ہے یا سو چکا ہے۔ہو سکتا ہے نعمت شیخ نے اسے میرے حوالے سے آج خصوصاً ہوشیار رہنے کی ہدایت کر رکھی ہو۔پستول پر میری گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی۔کچھ دیر صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد میں نے پنجوں کے بل چوکیدار کے کیبن کی طرف دوڑ لگا دی۔میرا پستول انگارے اگلنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔میرے دوڑنے سے بہت ہلکی آواز پیدا ہو رہی تھی۔اس کے باوجود مجھے خدشہ تھا کہ چوکیدار کسی بھی لمحے نمودار ہو سکتا ہے۔میں کیبن کے بالکل پاس پہنچ گیا لیکن چوکیدار کا کوئی پتہ نہ تھا۔میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے نہایت احتیاط سے کیبن میں جھانک کر دیکھا۔چوکیدار کی کلاشنکوف دیوار کے سہارے کھڑی تھی اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ کر گیٹ

پھلانگ کر فرار ہونے کے بارے میں سوچا لیکن مجھے خدشہ ہوا کہ بلند و بالا گیٹ پھلانگتے ہوئے میں کسی کی نظروں میں نہ آ جاؤں۔ اس کے علاوہ گیٹ کے ہلنے جلنے کے شور سے چوکیدار کی آنکھ کھل سکتی ہے۔

نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے چوکیدار کی کھوپڑی پر اپنے پستول کا دستہ آزمانا پڑا۔ اس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔ میں نے اس کی واسکٹ کی جیب سے گیٹ کی چھوٹی کھڑکی کی چابی نکالی اور قفل کھول کر باہر نکل آیا۔

بے دری کے عالم میں ایک اجنبی شہر اور اس کی طویل ویران رات میرے مقابل تھی۔ مجھے جلد از جلد وہاں سے دور جانا تھا اور اپنے جیسے آوارہ گردوں کے ازلی دشمن کتوں، چوکیداروں اور پولیس والوں کے پنجے سے بھی خود بچانا تھا۔ نعمت شیخ کا عالی شان بنگلا اور پر آسائش خواب گاہ مجھے راس نہیں آئے تھے۔

اس بے سروسامانی اور کسمپرسی کے عالم میں رب جلیل کا گھر میری پناہ گاہ ثابت ہوا۔ چھوٹی سی مسجد کے احاطے میں رات کاٹنے اور فجر کی نماز پڑھنے کے بعد میں ایک بار پھر عذاب بھرے راستوں پر نکل آیا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اب کس طرف کا رخ کروں۔ میں سردار شاہ مراد کے تعاقب میں یہاں آیا تھا لیکن اب خود اس سے چھپتا پھر رہا تھا۔ میرے نعمت شیخ کے گھر سے غائب ہونے کی خبر پا کر شاہ مراد کے کارندے شہر بھر میں میری تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہوں گے۔ جانے کس موڑ پر وہ گھات لگائے بیٹھے ہوں۔ مجھے شدید عدم تحفظ محسوس ہو رہا تھا۔ اپنی اصل شکل و صورت میں، میں بآسانی ان کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ مجھے جلد از جلد اپنا حلیہ بدلنا چاہیے تھا۔

خاصی دوڑ دھوپ کے بعد میں اپنا مطلوبہ حلیہ اپنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس جعلی ملنگ کو میں نے پہلی نظر میں تاڑ لیا تھا۔ پورے ایک ہزار روپے کے عوض وہ اپنا میلا کچیلا لباس، موٹے موٹے موتیوں کی تین مالائیں، رنگ برنگے کپڑوں کی دھجیوں سے بنی ٹوپی، گھنگھرو جڑا سونٹا، شکستہ چپلیں اور کشکول میرے حوالے کرنے پر راضی ہو گیا۔ یہ سب لوازم گداگری زیب تن کرنے کے بعد مجھے صرف اپنا رنگ سیاہ اور لمبے بالوں کو بے ترتیب اور گرد آلود کرنا پڑا۔ اپنی کارکردگی سے مطمئن ہونے کے بعد میں شہر کے بازاروں میں نکل کھڑا ہوا۔ میں نے اپنا حلیہ تو تبدیل کر لیا تھا لیکن اپنے جثے اور قد و قامت کو کیسے تبدیل کرتا جن کی وجہ سے مجھے بھیک کم، دھتکار اور پھٹکار زیادہ مل رہی تھی۔ جس کے بھی آگے کشکول پھیلاتا وہ میری عمدہ صحت اور جسامت کا طعنہ دے کر محنت مزدوری کے ذریعے حق حلال کی روٹی کمانے کا مشورہ دیتا۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرا یہ بہروپ بے عیب ہے تو میں نے دست سوال پھیلانا کم کر دیا۔ اب میں کسی نام نہاد مجذوب اور قلندر کے انداز میں اپنی منزل ڈھونڈ رہا تھا۔

سردار شاہ مراد کا ٹرکوں کا اڈہ تلاش کرنے میں مجھے کئی گھنٹے لگ گئے کیونکہ اپنے اس حلیے میں میرے لیے کسی سے اس اڈے تک رہنمائی حاصل کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ خلاف توقع اس طویل و عریض اڈے پر

کچھ زیادہ رونق نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے وہاں صرف دو ٹرک کھڑے نظر آئے۔ حالانکہ مینو استاد کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق تو وہاں تیس کے لگ بھگ ٹرک موجود ہونا چاہئیں تھے۔ اڈے کا دفتر باہر سے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میں وہاں چھائی بے رونقی سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ دفتر میں بھی ایک آدھ ہی کارندہ موجود رہا ہوگا۔ میں اڈے کے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہونا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس صورت میں تبدیل شدہ حلیے کے باوجود میں اڈے میں موجود افراد کی توجہ کا مرکز بن جاتا۔ میرے لیے بہتر یہی تھا کہ باہر رہ کر ہی اندر کے حالات کی سن گن لینے کی کوشش کرتا رہوں۔

میں کئی گھنٹوں تک وہاں جھک مارتا رہا۔ سورج ڈھلنے سے ذرا پہلے ایک نشئی ٹائپ کا ادھیڑ عمر شخص گیٹ سے برآمد ہوا اور گیٹ پر بھاری بھرکم تالا لگا کر ایک طرف چل پڑا۔ اس کی چال ڈھال اور حلیے سے صاف ظاہر تھا کہ اس کی مالی حالت بہت پتلی ہے۔ وہ شاہ مراد کا کوئی اہم کارندہ نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ میں نے اس کے تعاقب یا نگرانی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مجھ پر سخت مایوسی اور بے زاری کا غلبہ طاری ہو چلا تھا۔ میرا اتنی صعوبتیں جھیل کر کوئٹہ آنا بیکار ثابت ہو رہا تھا، الٹا اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

رات جوں جوں گہری ہوتی جا رہی تھی چھوٹے بڑے ریستورانوں پر بھی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں جس علاقے میں موجود تھا وہاں ٹرک ڈرائیوروں کے پسندیدہ چارپائی ہوٹلوں کی بہتات تھی۔ مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی لیکن بھکاری کے حلیے میں کسی ہوٹل کی چارپائی پر قبضہ جمانے میں مجھے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ بالآخر میں ایک ایسے ہی ہوٹل کے قریب ایک دکان کے پختہ تھڑے پر جا بیٹھا اور ہوٹل کے بیرے کو بلا کر اسے کھانا لانے کی ہدایت کی، وہ شک بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا لیکن میں نے اسے سو کے نوٹ کی جھلک دکھائی تو مطمئن ہو گیا اور کچھ ہی دیر بعد کھانا لا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں کھانے سے فارغ ہو کر وہاں سے روانہ ہونے ہی والا تھا کہ اچانک میری نظر ایک تنومند نوجوان پر پڑی، اس کا چہرہ میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ مینو استاد کا شاگرد شرافت عرف شرفو تھا جو اپنی طاقت کے نشے میں مجھ سے خواہ مخواہ زور آزمائی پر اتر آیا تھا اور میرے ہاتھوں منہ کی کھائی تھی۔ مینو استاد کی وجہ سے ہم دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف اپنے دلوں سے کدورت دور کر لی تھی۔ شرفو کی یہاں موجودگی سے مجھے امید ہو چلی تھی کہ میں اس کے ذریعے مینو استاد تک بھی پہنچ جاؤں گا۔

اس وقت شرفو کھانا کھانے کے لیے ہوٹل میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نہایت بے چینی سے اس کے ہوٹل سے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ خوش قسمتی سے وہ بالکل تنہا نظر آ رہا تھا لہٰذا میں مناسب موقع ملتے ہی اس سے گفتگو کر سکتا تھا۔ خدا خدا کر کے سرفو ہوٹل سے برآمد ہوا اور مست ہاتھی کی طرح جھومتا ایک طرف چل پڑا۔ میں خاصا فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنے لگا۔ خیریت یہ گزری کہ اس نے کسی رکشے کو زحمت نہیں دی ورنہ وہ میری پہنچ سے باہر نکل جاتا۔

دس پندرہ منٹ چلتے رہنے کے بعد ایک پسماندہ سے علاقے میں ایک دروازے کے سامنے پہنچ کر

رک گیا۔اس نے دروازے پر لگا قفل کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔اس کے ساتھ ہی میری یہ امید دم توڑ گئی کہ شرفو کے توسط سے میں مینو استاد سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔دروازے کے مقفل ہونے کا صاف مطلب یہ تھا کہ اس مکان میں شرفو تنہا مقیم ہے۔اس مایوسی کے زیر اثر میں واپس پلٹ جانا چاہتا تھا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ شرفو کم از کم مینو استاد کا موجودہ پتا تو بتا ہی سکتا ہے لہٰذا میں نے اس سے ملنا ہی بہتر سمجھا۔

دستک دینے کے چند ہی لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔توقع کے عین مطابق شرفو مجھے اس حلیے میں قطعاً نہ پہچان سکا۔ایک خستہ حال ملنگ کو رات کے اس پہر اپنے دروازے پر پا کر اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے ”ہاں۔۔۔کیا بات ہے؟“ اس جیسے گرم دماغ شخص سے میں نرم رویے کی توقع تو پہلے ہی نہیں رکھ رہا تھا چنانچہ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ اس کا غصہ بھڑکنے سے پہلے ہی اپنی شناخت کرا دوں ”ارے یار شرفو‘ تم نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں غلام سعید ہوں۔“

”غلام سعید؟“ اس کی آنکھوں میں الجھن کے تاثرات ابھرے۔اس نے اس بار غور سے مجھے دیکھا ”ہاں میں غلام سعید خان ہوں۔یاد ہے ڈی جی خان میں مینو استاد کے ہاں تم سے کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں؟ حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔اس وقت میں نے ایک خاص وجہ سے اپنا حلیہ بدل رکھا ہے۔“

”اوہ‘ تو یہ تم ہو! میں تو تمہیں بالکل نہیں پہچان سکا۔“ اس نے نہایت گرم جوشی سے مجھے گلے لگا لیا ”یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے؟ میں تو پریشان ہی ہو گیا تھا۔آؤ‘ اندر آجاؤ۔“

وہ مکان صرف ایک بڑے سے کمرے پر مشتمل تھا۔شرفو مجھے ساتھ لے کر ایک چارپائی پر جا بیٹھا ”ہاں بھائی‘ اب بتاؤ یہ سب چکر کیا ہے؟“ شرفو کے لبوں پر جاندار مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”چکر تو بہت پیچیدہ ہے شرفو بھائی‘ تم پہلے یہ بتاؤ کہ مینو استاد آج کل کہاں ہے‘ تم سے تو ان کا رابطہ ہوگا۔“

میری بات سن کر یکا یک شرفو کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات ابھر آئے ”مینو استاد کو تو نوکری سے جواب مل گیا تھا۔ان کی صحت بہت زیادہ گر گئی تھی۔مہینے میں بیس دن تو وہ بستر پر گزارتے تھے‘ ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ ٹرک ڈرائیوری جیسا مشقت کا کام جاری رکھ پاتے۔“

”اب وہ کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ہو سکتا ہے ڈی جی خان میں ہوں‘ یہ بھی ممکن ہے کروڑ پکا چلے گئے ہوں۔لورالائی سے وہ کوئٹہ آئے تھے پھر مجھے ٹرک لے کر کراچی جانے کی ڈیوٹی ملی تو وہ ڈی جی خان کے ارادے سے روانہ ہو گئے تھے۔اس کے بعد سے میرا ان سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔میں خود بھی ان کے لیے سخت فکر مند ہوں۔“

”کیا تم بھی سردار شاہ مراد کی کمپنی کا ٹرک چلاتے ہو؟“

”نہیں‘ وہ تو شاید کاروبار ہی ختم کرنے والے ہیں‘ ڈی جی خان اور لورالائی میں ان کے اڈے خالی پڑے ہیں۔کوئٹہ میں بھی تقریباً یہی حال ہے۔میں تو اپنے ماموں دوست محمد شاہ کا ٹرک چلا رہا ہوں۔“

”آج کل کہاں تعینات ہیں تمہارے تھانے دار ماموں؟ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔شرفو نے بھی تقریباً اسی انداز میں جواب دیا ”سٹی تھانے کا چارج سنبھالے انہیں کچھ ہی دن ہوئے ہیں۔اس کے بعد ہی انہوں نے یہ ٹرک خریدا تھا اور میرا لائسنس پکا کروایا تھا۔“

”گویا یہ ٹرک ایک طرح سے تمہاری ذاتی ملکیت ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔میری بات سن کر شرفو نے ایک زوردار قہقہہ لگایا ”ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔میں جو کچھ ماموں کو دے دوں چپ چاپ رکھ لیتے ہیں‘ نہ دوں کبھی پوچھتے نہیں۔“

”سچ سچ بتاؤ یہ تمہارے ماموں تمہیں اپنا داماد بنانے کا ارادہ تو نہیں رکھتے؟“ میں نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔وہ یکدم خفیف سا ہو گیا ”ہاں بھائی‘ تم نے صحیح اندازہ لگایا۔بالکل یہی معاملہ ہے۔“

”کیا واقعی؟“ میں نے ہنستے ہوئے کہا ”میں نے تو یونہی ہوا میں تیر چلایا تھا جو نشانے پر جا لگا۔“ شرفو نے بھی میرے ساتھ مل کر زوردار قہقہہ لگایا۔پھر وہ سنجیدہ ہو گیا۔”میں ایک آدھ دن میں استاد مینو کی خیر خبر لینے ڈی جی خان جانے والا ہوں۔اگر چاہو تو تم بھی میرے ساتھ چل سکتے ہو۔دونوں بھائی اپنے ٹرک میں چلیں گے۔ویسے تم نے ابھی تک نہیں بتایا کہ تم نے یہ روپ کیوں اختیار کر رکھا ہے؟“

”جہاں تک ڈی جی خان جانے کا تعلق ہے‘ فی الحال میں ہاں یا ناں میں جواب نہیں دے سکتا۔میں ایک اہم کام سے کوئٹہ آیا ہوں۔میری پوری کوشش ہے کہ یہ کام جلد از جلد مکمل کر لوں۔اس کے بعد ہی میں یہ شہر چھوڑ سکتا ہوں۔“ ”اگر تم مجھ پر اعتماد کر کے مجھے اس بارے میں بتا دو تو شاید میں بھی تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔کوئٹہ شہر اور آس پاس کے علاقے میرے دیکھے بھالے ہیں۔ویسے تم نے جوگی کا جو بھیس بنا رکھا ہے اسے دیکھ کر مجھے تخت ہزارہ کا رانجھا یاد آ رہا ہے جو اپنی ہیر کے دیدار کے لیے جوگی بن کر مارا مارا پھرتا تھا۔“

شرفو کی زبان سے نکلنے والے الفاظ اگرچہ مزاح کا رنگ لیے ہوئے تھے لیکن انہوں نے میرے دل کے تار جھنجھنا کر رکھ دیے۔میری منزل حیات ہیر ہی تو تھی لیکن میں اسے موت اور زندگی کے دوراہے پر چھوڑ آیا تھا اور پلٹ کر اس کی خبر تک نہیں لی تھی۔میں نے اپنی ہیر کے لیے نہیں بلکہ اپنے محبوب وطن کی خاطر جوگ اپنایا تھا لیکن اس معاملے میں شرفو کو اعتماد میں لینا مناسب بھی ہوگا یا نہیں؟

”یار شرفو میں دراصل استاد مینو کی تلاش میں ہی یہاں آیا تھا اگر تم رازداری برقرار رکھنے کا وعدہ کرو تو میں تمہیں استاد مینو کی تلاش کا مقصد بھی بتا سکتا ہوں۔“

”تم مجھ پر اسی طرح اعتماد کر سکتے ہو جس طرح استاد مینو پر کرتے ہو۔میں مانتا ہوں کچھ عرصے

پہلے تک میں بے حد لاابالی اور غیر ذمے دار تھا لیکن زندگی نے مجھے عقل سکھا دی ہے۔ تمہارا ہر راز میرے سینے میں محفوظ رہے گا۔ ویسے میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ معاملہ حقیقتاً بہت سنگین اور پیچیدہ ہوگا۔"

"بس یہ سمجھ لو کہ تمہاری زبان کی ہلکی سی جنبش مجھے موت کے اندھیروں میں دھکیل سکتی ہے لیکن میں تمہیں اس راز میں ضرور شریک کروں گا کیونکہ تم اس معاملے میں میری خاطر خواہ مدد کر سکتے ہو۔"

میں نے شرفو کو مختصر لیکن جامع الفاظ میں پوری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ خوش قسمتی سے اس نے میری خواہش کے عین مطابق ردعمل ظاہر کیا"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شاہ مراد ملک دشمن اور غدار ہو سکتا ہے"اس نے حیرت اور تشویش کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا"لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ خطرناک حد تک طاقت ور اور بارسوخ ہے۔ اگر وہ واقعی اس قسم کی تباہ کن سرگرمیوں میں ملوث ہے تو وہ واقعی ملک کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے اور اس سے بھی کہیں زیادہ خطرہ تمہاری زندگی کو ہے کیونکہ تم اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہو۔ ویسے بھی تم سے تو اس کی ذاتی دشمنی بھی ہے۔ شاہ مراد نے کوئٹہ میں بھی بہت مضبوطی سے پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ اگر تمہاری یہاں موجودگی واقعی اس کے علم میں ہے تو وہ چند ہی دنوں میں تمہیں ڈھونڈ نکالے گا۔ تم نے بہت عمدگی سے حلیہ بدلا ہے لیکن اپنے قد وقامت سے تم ہزاروں سے الگ نظر آتے ہو۔"

"مجھے اس خطرے کا احساس ہے۔"میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔"اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جو کام میں کرنا چاہتا ہوں وہ تم کر دو۔"

"ہاں ہاں' میں پوری طرح تمہارے ساتھ ہوں۔ بتاؤ مجھے کیا کرنا ہوگا"شرفو نے نہایت پرجوش لہجے میں پوچھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ نہایت رازداری سے پتا لگانے کی کوشش کرے کہ شاہ مراد کی ٹرک کمپنی کے ٹرکوں کا بیڑا اس وقت کہاں ہے اور یہ جاننے کی کوشش کرے کہ شاہ مراد کوئٹہ آنے کے بعد کہاں ٹھہرتا ہے۔ شرفو نے وعدہ کیا کہ وہ کل صبح ہی سے اپنی مہم کی ابتدا کر دے گا۔

اگلے روز صبح سویرے شرفو اور میں ایک ساتھ گھر سے نکلے۔ شرفو نے ٹرانسپورٹ کمپنیوں کے گڑھ کا رخ کیا جبکہ میں نے حتی الامکان تیز رفتاری سے چلتا ہوا چمن ہاؤسنگ اسکیم میں نعمت شیخ کے بنگلے کے پاس جا پہنچا۔ حسب توقع سورج خاصا اونچا ہو جانے کے باوجود اس عالی شان بنگلے پر نیند کا غلبہ نظر آ رہا تھا۔ میں خاصا فاصلہ رکھ کر بنگلے کی نگرانی کرنے لگا۔ صبح سے دوپہر ہو گئی لیکن ایک عدد نوکر نما شخص کے علاوہ کوئی گیٹ سے باہر نہیں نکلا۔ وہ نوکر بھی سودا سلف لے کر واپس بنگلے میں غائب ہو گیا۔ اکتاہٹ اور بھوک جب برداشت سے باہر ہونے لگی تو میں فرلانگ بھر دور ایک چارپائی ہوٹل میں جا گھسا۔ کھانا کھانے کے بعد میں پوزیشن بدل کر ایک بار پھر بنگلے کی نگرانی کرنے لگا۔ سہ پہر کے بعد وہی خستہ حال نوکر مجھے ایک بار پھر بنگلے کے گیٹ سے باہر نکلتا نظر آیا۔ اس کا رخ میری ہی طرف تھا۔ میرے پاس سے گزر کر وہ کچھ فاصلے پر واقع ایک میڈیکل اسٹور میں گھس گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک بار میرے پاس سے

گزرا۔ میں چند قدموں کا فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنے لگا۔ وہ بنگلے کے گیٹ پر پہنچا اور چوکیدار کو آواز دے کر گیٹ کھولنے کو کہا۔ گیٹ کی کھڑکی کھلنے پر میں گیٹ کے عین سامنے تھا۔ میں نے صرف ایک نظر گیٹ کے اندر ڈالی اور آگے نکلتا چلا گیا۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ نعمت شیخ کی گاڑی بنگلے کی پارکنگ میں موجود تھی جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ نعمت شیخ اس وقت بھی گھر کے اندر موجود ہے۔ اب میں زیادہ یکسو ہو کر اپنا کام جاری رکھ سکتا تھا۔

رات آٹھ بجے کے قریب میں نے بنگلے کا بڑا گیٹ کھلتے دیکھا' اس کے ساتھ ہی میں پوری طرح چوکنا ہو گیا۔ چند لمحوں بعد گیٹ سے نعمت شیخ کی گاڑی برآمد ہوئی۔ اندازے کے عین مطابق اس کا رخ اس طرف تھا جہاں میں درخت کی اوٹ میں موجود تھا۔ گاڑی کی رفتار تیز نہیں تھی اور میرے سامنے سڑک پر موجود اسپیڈ بریکر کے قریب پہنچ کر تو اس کی رفتار بہت ہی کم ہو گئی۔ میں نے اپنا پستول تھاما اور پلک جھپکتے میں گاڑی کے پاس جا پہنچا اور پستول کی نال نعمت شیخ کی کھوپڑی سے لگا دی"بریک لگاؤ"میں نے غرا کر کہا۔ اگلے ہی لمحے گاڑی ساکت ہو گئی۔ نعمت شیخ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔"کیا کیا چاہتے ہو تم؟"اس کے لہجے میں ہلکی سی لرزش موجود تھی۔ میں نے لمحہ بھر میں اپنے آس پاس کا جائزہ لے ڈالا تھا"پچھلا دروازہ کھولو۔۔۔ جلدی کرو۔۔۔"اس نے میرے حکم پر بھی نہایت سعادت مندی سے عمل کیا۔ میں دروازہ کھول کر عقبی نشستوں پر قابض ہو گیا۔"گاڑی آگے بڑھاؤ۔ رفتار نارمل رکھنا' کوئی بھی چالاکی دکھائی تو کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔"چند ہی لمحوں میں گاڑی چمن ہاؤسنگ سوسائٹی کی کشادہ اور صاف ستھری سڑک پر ہموار رفتار سے رواں دواں تھی۔ اس دوران میں نعمت شیخ نے کئی مرتبہ عقب نما آئینہ میں بغور میرا جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن میں نے اپنا چہرہ فرنٹ سیٹ کی پشت کی آڑ میں کر کے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔

"دیکھو بھائی تم جو بھی ہو اور مجھ سے جو کچھ بھی چاہتے ہو' صرف اتنا جان لو کہ میں اس وقت ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ مجھے دمے کی تکلیف ہے اور اگر فوری طبی امداد نہ ملی تو میری حالت خراب ہو سکتی ہے۔"نعمت شیخ کے لہجے میں تکلیف کی جھلک موجود تھی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی بات پر یقین کروں یا نہ کروں"تم مر بھی جاؤ تو مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا۔"میں نے سرد لہجے میں کہا"ویسے بھی اگر تم نے میرے سوالات کے سچ سچ جوابات نہ دیے تو تمہارا انجام عبرت ناک موت ہی ہوگا۔"

"سوالات۔۔۔ کیسے سوالات۔۔۔؟"نعمت شیخ نے چونک کر کہا۔

اس بار کوشش کے باوجود میں اپنا چہرہ اس سے نہ چھپا سکا۔ وہ پہلی نظر میں مجھے نہ پہچان سکا البتہ میرا حلیہ دیکھ کر اس کے چہرے پر خاصے ناخوش گوار آثار ابھر آئے تھے"اس وقت میرے پرس میں پانچ ساڑھے پانچ ہزار روپے ہیں' جی چاہے تو یہ گاڑی بھی لے جاؤ اور مجھے یہیں اتار دو۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔"

''مرنا ہے تو شوق سے مرو۔ مجھے ایسے شخص کی موت کا کوئی دکھ نہیں ہوگا جو محض پیسے کی خاطر اپنے وطن اور اپنے جگری دوست سے غداری کر سکتا ہو'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ میری بات سن کر اسے اس قدر شدید جھٹکا لگا کہ اس کا پاؤں گاڑی کے بریک پر دبتا چلا گیا۔ گاڑی ساکت ہوتے ہی اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا ''تم ۔۔۔تم کون ہو؟ ۔۔۔اور مجھ پر غداری کا الزام ۔۔۔'' یک لخت اس کی آنکھوں میں دنیا بھر کی حیرت اتر آئی۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا ''ہاں ۔۔۔ میں ذوالفقار علی شاہ ہوں جسے تمہارے دوست سردار خضر خان نے تمہارے پاس بھیجا تھا تاکہ میں تم سے مدد حاصل کرسکوں۔''

''ہاں! لیکن تم اچانک کہاں غائب ہوگئے تھے ۔۔۔اور یہ پستول ۔۔۔''

''اگر میں عین وقت پر تمہاری سازش سے آگاہ نہ ہو جاتا تو شاید وادی بولان کے چیل کوے میری ہڈیوں سے گوشت نوچ کر دعوت اڑا رہے ہوتے۔''

''تم کون سی سازش کی بات کر رہے ہو میرے بھائی؟ میں نے تمہارے خلاف کوئی سازش نہیں کی تم یقیناً کسی بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو۔''

''ہاں واقعی میں غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔ اس رات ٹرانسمیٹر پر تم میرا سودا کر رہے تھے۔ میں تمہاری زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ اپنے کانوں سے سن چکا ہوں۔ کہہ دو کہ اس وقت میرے کان بج رہے تھے یا میں خواب دیکھ رہا تھا۔ تم نے اپنی طرف سے پکا کام کر دیا تھا۔ اگر میں رسالہ لینے ڈرائنگ روم کی طرف نہ آتا اور تمہاری باتیں میرے کانوں میں نہ پڑتیں تو تم وعدے کے مطابق مجھے میرے دشمنوں کو سونپ چکے ہوتے۔''

''اوہ تو تم نے وہ باتیں سن لی تھیں! دیکھو میں اب بھی کہوں گا کہ تم غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ تم پوری بات سنو گے تو یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ تمہارا خیال درست نہیں ہے کہ میں تمہارا بدخواہ ہوں یا میں خضر خان سے وعدہ خلافی کر کے تمہیں تمہارے دشمنوں کے حوالے کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔''

''تم مجھے لچھے دار باتوں میں نہیں الجھا سکو گے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا ''اپنی خیریت چاہتے ہو تو سچ سچ بتا دو کہ میرے دشمنوں کا اڈا کہاں ہے اور کیا شاہ مراد کوئٹہ میں آچکا ہے؟''

''دیکھو جوان۔ میں نے جو کچھ کہا وہ سو فی صد درست ہے۔ میرا قصور یہ ہے کہ میں نے تمہیں شروع میں ہی پوری صورت حال سے آگاہ نہیں کیا ورنہ بات اتنی نہ الجھتی اور میں ایسا کرنے پر اس لیے مجبور ہوا کہ مجھے اس کی ہدایت کی گئی تھی۔ خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔''

''تم فالتو مکالمے بازی کر کے اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔'' میں نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ ''میرے سوالوں کا درست جواب دے کر تم بآسانی اپنی جان چھڑا سکتے ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے اطمینان بخش جواب دے دیا تو میں تمہیں چھوڑ کر چپ چاپ گاڑی سے اتر جاؤں گا۔''

''دیکھو تم جن حالات کا شکار ہو ان کے پیش نظر تمہارا اپنے سائے سے بھی محتاط ہونا بالکل درست

ہے۔ موجودہ صورت حال میں اگر تمہاری جگہ میں بھی ہوتا تو اتنی آسانی سے تمہاری بات کا اعتبار نہ کرتا۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو۔ مجھے یقین ہے اس کے بعد بات کھل کر سامنے آجائے گی۔ اگر پھر بھی تم مطمئن نہ ہوئے تم تمہیں اپنی مرضی کا سلوک کرنے کی اجازت ہوگی۔''

''اچھا کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے آس پاس کے ماحول کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔'' لیکن تمہیں چند منٹ کے اندر اندر بات مکمل کرنا ہوگی۔''

''ٹھیک ہے۔ اب سنو اصل قصہ کیا ہے۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے خضر خان کو تمہاری روانگی کے بعد ملتان جانا تھا تو اس نے یہی کیا۔ وہ ملتان میں اپنے سسرال پہنچ گیا اور پھر مناسب موقع دیکھ کر قومی سلامتی کے خفیہ ادارے کے دفتر جا پہنچا اور تمام روداد وہاں کے بااختیار افسروں کے گوش گزار کر دی۔ یہ سن کر وہاں ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ فوری طور پر اسلام آباد رابطہ کیا گیا۔ اسلام آباد سے کہا گیا کہ یہ معاملہ نہایت احتیاط سے ہینڈل کیا جائے۔ اور سب سے پہلے تمہیں تلاش کر کے اعلیٰ افسران کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ تمہاری مدد سے کوئی ٹھوس قدم اٹھانے کی منصوبہ بندی کی جاسکے۔ خضر خان نے تب ان لوگوں کو میرے بارے میں بتایا اور کہا کہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ تم جلد یا بدیر مجھ سے رابطہ کرو گے۔ چنانچہ قومی سلامتی کے ادارے کے ایک اہم افسر نے مجھ سے ملاقات کی اور مجھے پوری صورت حال سے آگاہ کر کے تعاون کی درخواست کی۔ مجھے ایک ٹرانسمیٹر دیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ تم جوں ہی میرے پاس پہنچو میں اس ٹرانسمیٹر کے ذریعے تمہاری آمد کی اطلاع دے دوں۔ مجھے اس بارے میں تمہیں قبل از وقت آگاہ کرنے سے منع کیا گیا تھا اس لیے میں نے یہ بات تم سے چھپائی تھی۔''

''اوہ! تو اصل بات یہ ہے۔'' میں نے اس کے بیان کے ایک ایک لفظ کو جانچنے کے بعد کہا۔ ''اس کا مطلب ہے مجھے واقعی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' میں نے اپنا پستول جھکا لیا تھا۔ ''خیر جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ اگر یہ بات تمہیں پہلے معلوم ہو جاتی تو شاید تمہیں یقین نہ آتا۔ چلو اسی بہانے مجھے تمہاری کارگردگی دیکھنے کا بھی موقع مل گیا۔ اپنے چوکیدار کی تو میں نے ٹھیک ٹھاک کھنچائی کی تھی۔ امید ہے اب وہ کبھی اپنے فرض سے غافل نہیں ہوگا اب تم میرے ساتھ گھر چلو تاکہ سلسلہ ایک بار پھر وہیں سے جوڑا جاسکے جہاں سے ٹوٹا تھا۔ تمہارے فرار کا سن کر ٹرانسمیٹر والے صاحب نے خاصے تلخ لہجے میں مجھ سے بات کی تھی۔ امید ہے تمہاری واپسی کا سن کر وہ خوش ہو جائے گا۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ''مجھے آپ کے ساتھ چلنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن میں فوری طور پر آپ کے ساتھ آپ کے گھر نہیں جاسکوں گا۔ مجھے ایک جگہ پہنچ کر اس صورت حال کے بارے میں اپنے ایک ساتھی کو اعتماد میں لینا ہوگا۔ اگر میں رات بھر گھر نہ پہنچا تو وہ پریشان ہو جائے گا۔ آپ بے فکر ہو کر گھر جائیں۔ میں کل صبح آپ کے گھر پہنچ جاؤں گا۔ اس ٹرانسمیٹر والے صاحب سے بھی کہہ دیجیے گا کہ صبح آپ کے گھر پہنچ جائے۔''

''اگر تمہارا جانا ضروری ہے تو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ تم اپنے ساتھی کو پوری بات سمجھا

دینا‘ اس کے بعد ہم اکٹھے گھر چلیں گے۔‘‘

’’نہیں آپ کو میرے ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں۔ آپ ڈاکٹر کے پاس جائیں۔ میں صبح نو بجے تک آپ کے گھر پہنچ جاؤں گا۔‘‘

نعمت شیخ نے مزید اصرار نہیں کیا اور مجھے ایک جگہ چھوڑ کر آگے نکل گیا۔ میں خراماں خراماں شرفو کے ٹھکانے کی طرف چل پڑا۔ یہ محض اتفاق ہی ہے کہ میں جوں ہی اس کے گھر کی طرف جانے والی سڑک پر مڑا عین اسی وقت شرفو کا ٹرک بھی اسی طرف مڑتا نظر آیا۔ میں نے شرفو کو دیکھ لیا تھا لیکن اس کی نظر مجھ پر نہ پڑ سکی۔ وہ بھی یقیناً اپنے گھر ہی جا رہا تھا لیکن میں اپنے خستہ حلیے کے ساتھ اسے آواز نہیں دے سکتا تھا‘ ویسے بھی وہاں سے شرفو کا گھر زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ میں محض چند منٹ میں وہاں پہنچ سکتا تھا۔

میں چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ اچانک میری نظر ایک پجیرو جیپ پر پڑی جو شرفو کے ٹرک کے عقب میں خاصی سست رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ سڑک اچھی خاصی چوڑی تھی۔ پجیرو کا ڈرائیور چاہتا تو باآسانی ٹرک کو اوورٹیک کر سکتا تھا۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ شرفو کا تعاقب کیا جا رہا تھا‘ تعاقب کرنے والے کون ہو سکتے ہیں‘ میرے لیے یہ اندازہ لگانا بھی دشوار نہیں تھا۔ شاہ مراد کے پالتو کتے شرفو کے ذریعے مجھے شکار کرنا چاہتے تھے لیکن میرے خدا نے بروقت مجھے اس سازش سے خبردار کر دیا تھا۔

میرے قدم خود کار انداز میں رک چکے تھے۔ میں وہیں سے پلٹ سکتا تھا لیکن مجھے اپنے سے زیادہ شرفو کی فکر تھی۔ مجھے قابو کرنے میں ناکامی پر وہ غصہ اس غریب پر اتار سکتے تھے۔ میں یہ کس طرح گوارا کر سکتا تھا کہ وہ بے چارہ محض میری معاونت کے جرم میں ان درندوں کی بربریت کی بھینٹ چڑھ جائے۔ مجھے ہر قیمت پر اسے بچانا تھا خواہ مجھے اس کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگانا پڑ جاتی۔

شرفو کا ٹرک گھر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں اب پہلے سے کہیں زیادہ تیز قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ٹرک رکنے تک میں خاصا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ شرفو ٹرک سے اترا اور ٹہلنے کے انداز میں اپنے گھر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ٹرک کے رکنے پر پجیرو اس کے پہلو سے گزر کر آگے بڑھتی چلی گئی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ بہت جلد واپس لوٹ کر آئے گی۔ اب میں شرفو کے گھر کے اتنا قریب پہنچ چکا تھا کہ وہاں ہونے والی تمام کارروائی کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ اب مجھے کسی آڑ کی تلاش تھی جس کے پیچھے خود کو چھپا سکتا لیکن وہاں آس پاس ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ وقت بہت محدود تھا مجھے پجیرو کے واپس لوٹنے سے پہلے خود کو کسی محفوظ جگہ پوشیدہ کرنا تھا۔ پھر میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا اور نہایت تیز رفتاری سے شرفو کے ٹرک کی طرف بڑھنے لگا۔ میں ٹرک کے پہلو میں پہنچا اور پھر فولادی سیڑھی کے ذریعے محض چند لمحوں میں ڈرائیونگ کیبن کی چھت پر پہنچ گیا۔ اس دوران مجھے اندھیرے کی چادر میسر رہی تھی لہٰذا دیکھے جانے کا خطرہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ چھت پر پہنچنے کے بعد میں نے ٹرک کی پیشانی پر سجے چوبی تاج کی جالیوں

سے سامنے کی طرف نظر جما دی۔ توقع کے عین مطابق بمشکل دو منٹ بعد مجھے وہی پجیرو واپس آتی دکھائی دی اس کی رفتار بہت کم تھی۔ وہ ٹرک کے پاس سے گزر کر آگے بڑھتی چلی گئی۔ ڈرائیور کے علاوہ صرف دو خرانٹ شکل افراد موجود تھے۔ وہ تینوں میرے لیے اجنبی تھے۔ ان تینوں کی نظریں شرفو کے گھر کے بند دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔

چند منٹ کے بعد وہ لوگ ایک بار پھر پلٹے اور اس مرتبہ پجیرو تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سڑک کے کنارے ٹھہر گئی۔ میں بڑھتے ہوئے اضطراب کے ساتھ ان کی طرف سے اگلی کارروائی کا منتظر تھا۔ وہ لوگ زیادہ دیر وہاں کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ پھر میں نے ڈرائیور کو گاڑی سے باہر نکلتے دیکھا۔ اس نے پجیرو کا بونٹ کھولا اور انجن سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ اس کے دونوں ساتھی گاڑی کے اندر ہی بیٹھے رہے۔ ان کی نظریں یقیناً شرفو کے گھر کے دروازے پر جمی ہوئی ہوں گی۔ انتظار کے لمحات ان کے اعصاب پر سخت گراں گزر رہے ہوں گے۔ اعصاب تو خیر میرے بھی کشیدہ ہو رہے تھے لیکن میری ہر کارروائی ان کی آئندہ کارروائی پر منحصر تھی۔

نصف گھنٹے کے لگ بھگ صورت حال جوں کی توں رہی پھر دنوں پجیرو میں بیٹھے ہوئے دونوں افراد بھی گاڑی سے اتر آئے اور ڈرائیور کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ وہ تینوں آپس میں صلاح مشورہ کر رہے تھے پھر وہ کسی فیصلے پر متفق ہو گئے۔ ڈرائیور نے بونٹ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا جب کہ اس کے دونوں ساتھی آس پاس کے ماحول پر نظریں ڈالتے شرفو کے گھر کی طرف بڑھے۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی اپنا پستول کاک کر کے ان کے عزائم کو خاک میں ملانے کے لیے تیار ہو گیا۔

کھردرے چہروں والے دونوں افراد شرفو کے گھر کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ ان کے ہاتھ ان کی جیکٹوں میں پوشیدہ ہتھیاروں پر جمے ہوئے تھے۔ ان میں نسبتاً پستہ قد والے نے دروازے پر دستک دی۔ شاید اس کے اعصاب بھی خاصے کشیدہ تھے۔ کیونکہ دروازے پر پڑنے والی اس کی انگوٹھی کی ضرب کچھ زیادہ ہی زوردار تھی۔ جس کا اسے فوراً ہی احساس بھی ہو گیا تھا۔ چنانچہ قدرے توقف کے بعد دوبارہ قدرے ڈھیلے ہاتھ سے دروازہ کھٹکھٹایا ’’کون ہے؟‘‘ میں نے شرفو کی آواز سنی۔ میرے اندازے کے عین مطابق اس بے ہنگم دستک نے اسے محتاط کر دیا تھا‘ ہو سکتا ہے اسے خطرے کا بھی احساس ہو گیا ہو۔ دستک دینے والی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ انہیں توقع رہی ہو گی کہ دستک کے جواب میں فوراً دروازہ کھل جائے گا۔

جواب نہ ملنے پر شرفو کا شک یقین میں سبدیل ہو گیا ’’جواب کیوں نہیں دیتے؟ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟‘‘ شرفو کے لہجے میں فولاد کی سی سختی تھی۔ دستک دینے والوں نے اس بار بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اچانک گولی چلنے کے دھماکے نے سناٹے کی چادر تار تار کر دی۔ اس کے ساتھ ہی دروازے پر دستک دینے والے کے حلق سے ایک کربناک چیخ برآمد ہوئی۔ وہ اپنا بایاں شانہ دبا کر بری طرح اچھل رہا

تھا۔ گولی گھر کے اندر سے چلائی گئی تھی۔ شرفو نے دروازے کی درز کے عین سامنے موجود دستک دینے والے کا شانہ چھید ڈالا تھا۔ شرفو کی اس جارحانہ کارروائی نے بن بلائے مہمانوں کو بری طرح بدحواس کر ڈالا تھا۔ اس وقت تو ان کے رہے سہے حواس بھی جواب دے گئے جب میں نے اپنے پستول کی نال ایک درز میں جما کر لگاتار چار پانچ گولیاں ان پر برسا دیں۔ ان میں سے کوئی بھی ان کے جسموں میں پیوست نہیں ہوئی تھیں لیکن اس ناگہانی نے ان کے پاؤں اکھاڑ ڈالے اور وہ بے تحاشا پجیرو کی طرف دوڑ پڑے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول لہرا رہے تھے لیکن ان پر گولیاں برسانے والے ان کی نظروں سے اوجھل تھے۔ شرفو شاید دروازے کی درز سے ان کی نقل وحرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے بھی مزید پانچ چھ گولیاں ان کی طرف روانہ کر دیں جن میں سے کوئی بھی کارگر نہ ہو سکی البتہ ان دونوں کی رفتار مزید بڑھ گئی۔ پجیرو کا ڈرائیور یہ صورت حال دیکھ کر پہلے ہی گاڑی کے دروازے کھول چکا تھا۔ زخمی اور اس کا ساتھی دیوانہ وار گاڑی میں گھستے چلے گئے اس کے ساتھ ہی پجیرو ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ میں نے اسے تقریباً پچاس گز آگے جانے دیا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے پستول کا پورا میگزین پجیرو کے عقبی حصے پر خالی کر دیا۔ پجیرو کے پچھلے دروازے کے شیشے چکنا چور ہو گئے اور ایک دو گولیوں نے عقبی حصے میں نصب ڈیزل سے لبریز بھری کیبن کو بھی چھید دیا تھا۔ پجیرو کی رفتار بہت تیز تھی۔ یکا یک وہ بری طرح سے لہرائی اور ایک زوردار دھماکے کے ساتھ ایک الیکٹرک پول سے جا ٹکرائی۔ تصادم اتنا شدید تھا کہ پول ٹوٹ کر قریبی عمارت کی دیوار سے ٹکرایا' فضا میں زبردست چنگاریاں اڑیں' اگلے ہی لمحے پورا علاقہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ پھر میں نے پجیرو کو شعلوں میں گھرتے دیکھا۔ جیری کیبن سے بہنے والے ڈیزل نے آگ پکڑ لی تھی اور چند ہی لمحوں میں پجیرو پوری طرح آگ کا الاؤ بن چکی تھی۔ پجیرو میں سوار افراد شاید تصادم کی شدت سے ہوش وحواس کھو چکے تھے۔ کیونکہ آگ کی لپیٹ میں آنے کے باوجود وہ چیخ پکار نہیں کر رہے تھے۔

میری نظریں مسلسل دھڑا دھڑ جلتی پجیرو پر جمی ہوئی تھیں۔ ان تینوں بدبختوں کا یہ حشر دیکھ کر مجھے ذرا بھی خوشی محسوس نہیں ہوئی رہی تھی۔ یہ محض حکم کے غلام تھے جو معمولی مالی مفاد کے لیے اپنی دنیا و آخرت کو تباہ کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ میں انہیں صرف خوف زدہ کرنا چاہتا تھا مجھے کیا پتا تھا کہ ان کی موت انہیں گھیر کر آج رات یہاں لے آئی ہے۔ میں جانتا تھا کہ کچھ ہی دیر میں آگ پجیرو کے فیول ٹینک تک پہنچنے والی ہے۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کے پرخچے اڑ جاتے اور ان تینوں بدنصیبوں کی لاشیں اس قابل بھی نہ رہ جاتیں کہ انہیں یک جا کر کے سپرد کیا جا سکے۔

میں مزید یہ عبرت ناک نظارہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اپنے پستول میں نیا میگزین چڑھا کر میں تیز رفتاری سے ٹرک پر سے اتر آیا۔ میں نے شرفو کے گھر کے دروازے پر دستک کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ فضا ایک زبردست دھماکے سے لرز اٹھی۔ پجیرو کا فیول ٹینک پھٹ چکا تھا۔ دھماکے کی آواز آدھے شہر کو جگانے کے لیے کافی تھی۔ اس علاقے کے لوگوں کی نیند تو بے تحاشا فائرنگ سے پہلے ہی اڑا ڈالی تھی۔

ایسے میں میرا سڑک پر نظر آنا مجھے مشکلات میں پھنسا سکتا تھا۔ میں نے جلدی سے شرفو کا دروازہ کھٹکھٹا دیا "شرفو دروازہ کھولو۔ جلدی کرو" میری نظریں تیزی سے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اگر کچھ لوگ اپنے گھروں سے باہر نکلے تھے بھی تو اندھیرے کے باعث میں انہیں دیکھ نہیں پا رہا تھا "کون ہے؟" شرفو نے حسب سابق محتاط لہجے میں پوچھا "میں غلام سعید ہوں یار۔ فکر نہ کرو۔ خطرہ دور ہو چکا ہے' جلدی سے دروازہ کھول دو۔"

میری آواز پہچانتے ہی شرفو نے دروازہ کھول دیا۔ گھپ اندھیرے کے باوجود میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کے ہاتھ میں پستول موجود ہے۔ اس نے میرے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ "تم۔۔۔تم غلام سعید بھائی۔۔۔؟" وہ ہیجان زدہ لہجے میں بولا۔ "ہاں میں سارا ڈراما اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔" میں نے اپنے لہجے کو حتی الامکان پرسکون بناتے ہوئے کہا "تمہارے دروازے پر آنے والے تینوں افراد موت کی اندھی وادی میں جا سوئے ہیں۔"

"لیکن۔۔۔وہ تو۔۔۔یہ سب ہوا کیسے؟ وہ تو فرار ہو گئے تھے"

"ہاں۔۔۔لیکن ان کی موت ان سے زیادہ تیز رفتار ثابت ہوئی۔"

میں نے شرفو کو تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ وہ اس قدر حیرت زدہ تھا کہ اسے بہت دیر میں خیال آیا کہ ہم دونوں ابھی تک اندھیرے میں کھڑے ہیں۔ بالآخر وہ صحیح طرح سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا "اس کا مطلب ہے کچھ ہی دیر میں یہ علاقہ پوری طرح پولیس کے گھیرے میں آ جائے گا۔ اگر اس واقعے کا کوئی عینی شاہد نکل آیا تو وردی پوش سیدھے ہمارے دروازے پر آ جائیں گے۔"

"ہاں میں تمہیں کہنے ہی والا تھا۔ ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ فوری طور پر یہاں سے نکل بھاگیں۔ تم اپنا ضروری سامان سمیٹ لو اور یہ جگہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر نکل چلو"

"یہاں کوئی ایسی قابل ذکر چیز نہیں ہے جس کی مجھے فکر ہو' یہ جگہ کیا میں یہ شہر بھی چھوڑ سکتا ہوں۔ میں لالٹین جلاتا ہوں' تم اپنا بیگ سنبھال لو' میں بھی اپنا بوریا بستر سمیٹ لیتا ہوں۔ اس کے بعد ہم دونوں بھائی سیدھے ڈی جی خان چلتے ہیں۔"

میں نے اس کی رائے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ چند ہی منٹ بعد ہم دونوں گھر کا دروازہ مقفل کر کے ٹرک میں بیٹھ چکے تھے۔ پجیرو ابھی شعلوں کی لپیٹ میں تھی اور مجھے چند افراد کے ہیولے بھی اس کے قریب نظر آئے۔ شرفو نے میری ہدایت کے مطابق ٹرک کی ہیڈ لائٹس روشن نہیں کی تھیں۔ ٹرک نہایت سبک رفتاری سے جائے وقوع سے دور ہوتا چلا گیا۔ خطرے کی حد سے باہر نکلنے کے بعد میں نے شرفو کو بتایا کہ میں فی الحال اس کے ہمراہ نہیں جا سکتا۔ میں نے اسے مختصراً وجہ بھی بتا دی۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے دن بھر کیا کیا "شاہ مراد جو کچھ بھی کر رہا ہے۔ اس میں رازداری کا سختی سے اہتمام کیے ہوئے ہے۔" شرفو نے تشویش بھرے لہجے میں بتایا "بھرپور کوشش کے باوجود میں صرف اتنا ہی جان پایا

ہوں کہ اس کے کچھ ٹرک گزشتہ دنوں سرحدی قصبے تافتان میں دیکھے گئے تھے جب کہ شاہ مراد جب بھی کوئٹہ میں آتا ہے شاہراہ زرغون پر واقع کوئٹہ کے سب سے بڑے ہوٹل میں قیام کرتا ہے' جہاں روزانہ سینکڑوں افراد سے اس کی ملاقات ہوتی ہے اور یہ کہ پچھلے کچھ دنوں سے وہ کوئٹہ نہیں آیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے شاہ مراد کے خلاف پیش قدمی کا ہمارے پاس کوئی قابل ذکر راستہ نہیں ہے البتہ ہم خود اس کے کارندوں کے ہاتھوں موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچے ہیں۔ اپنی سرگرمیوں کے دوران تم ان کی نظروں میں آ گئے اور وہ تمہارا تعاقب کرتے کرتے تمہارے گھر تک پہنچ گئے۔ اگر تم بروقت ہوشیار نہ ہو جاتے اور میں عین موقع پر نہ پہنچ جاتا تو وہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔ اب تم مجھے نعمت شیں کے بنگلے پر چھوڑ کر سیدھے ڈی جی خان روانہ ہو جاؤ اور مینو استاد کی خیر خبر لو۔ انشاء اللہ میں بھی بہت جلد وہاں پہنچ جاؤں گا۔''

نعمت شیخ نے اپنے چوکی دار کو میرے بارے میں واضح ہدایت کر رکھی تھی' یہی وجہ ہے کہ میری نا وقت آمد پر بھی اس نے بظاہر کسی ناگواری کا مظاہرہ نہیں کیا اور انٹر کام کے ذریعے فوراً ہی نعمت شیخ کو میری آمد سے آگاہ کر دیا۔ ''چلیے صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔'' اس نے سنجیدہ لہجے میں بتایا۔ اس دوران وہ عجیب سی نظروں سے میرے حلیے کا جائزہ لیتا رہا تھا۔

نعمت شیخ نے مجھے اسی کمرے میں پہنچا دیا جہاں سے میں فرار ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ٹرانسمیٹر پر رابطہ کر کے کل صبح میری آمد کے بارے میں بتا چکا ہے۔ میں نے اسے تازہ ترین واقعے کے بارے بتایا تو وہ پریشان ہو گیا۔ ''اس کا مطلب ہے اس شہر میں تمہاری زندگی سخت خطرے میں ہے۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ میرے پاس آ گئے۔ انشاء اللہ کل سارا معاملہ درست ہو جائے گا۔''

نعمت شیخ ٹرانسمیٹر کے ذریعے حالیہ واقعے کی اطلاع دینا چاہتا تھا لیکن میں نے منع کر دیا۔ صبح ہونے میں محض چند گھنٹے ہی تو باقی رہ گئے۔ یہ واقعہ ان صاحب کے روبرو بھی تو سنایا جا سکتا تھا۔ اگلی صبح ناشتے کے بعد ہم سرکاری اہل کار کا انتظار کرنے لگے۔ دس گیارہ اور پھر بارہ بج گئے لیکن اس کی آمد کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ اس صورت حال سے نعمت شیخ سخت الجھن میں نظر آ رہا تھا' پتا نہیں کیا مسئلہ ہے یار' ابرار صاحب کو اب تک تو یقیناً پہنچ جانا چاہیے تھا۔''

''ہو سکتا ہے وہ کسی کام میں پھنس گئے ہوں' ممکن ہے اب وہ شام کو پہنچیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر ایسی کوئی بات تھی تو وہ کم از کم فون کر کے ہمیں اطلاع تو دے سکتے تھے۔'' نعمت شیخ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ''اگر انہوں نے فون نہیں کیا تو آپ ہی فون پر ان سے رابہ کر لیں۔''

''یہی تو مسئلہ ہے ان کا فون نمبر میرے پاس نہیں ہے۔ ان سے رابطے کی واحد صورت ٹرانسمیٹر ہے لیکن ابرار نے سختی سے تاکید کر رکھی ہے کہ صرف رات کے وقت ہی ٹرانسمیٹر کے ذریعے اس سے رابطہ

قائم کروں۔''

''پھر تو ہم انتظار کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے لیکن پریشان ہو کر اپنی طبیعت خراب کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ آرام کریں' جو ہونا ہے اپنے وقت پر ہو کر رہے گا۔ اگر وہ شام تک بھی نہ آئے تو رات کو ان سے رابطہ کر کے صورت حال معلوم کی جا سکتی ہے۔'' نعمت شیخ نے میری بات سن کر اثبات میں سر ہلا دیا البتہ اس کی پریشانی پر سوچ کی لکیریں بدستور موجود تھیں۔ ''ٹھیک ہے تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ میں بھی سونے کی کوشش کرتا ہوں۔ انشاء اللہ شام کی چائے پر ملاقات ہوگی۔''

میں نعمت شیخ کو پرسکون رہنے کی نصیحت کر کے اپنے کمرے میں تو آ گیا لیکن پرسکون میں خود بھی نہیں تھا۔ ایک ذمے دار عہدے کے حامل شخص کا اتنے سنجیدہ معاملے میں غفلت برتنا میرے حلق سے نہیں اتر رہا تھا۔ جب کہ اسے اچھی طرح علم تھا کہ اس شہر میں میری زندگی کو بے شمار خطرات لاحق تھے۔ شاہ مراد کے کارندوں کو میری یہاں موجودگی کی سن گن مل جاتی تو وہ نعمت شیخ کے خوب صورت بنگلے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے۔

بالآخر شام ہوئی اور پھر رات بھی آ گئی۔ گیارہ بجے کے قریب ہم بالکل مایوس ہو گئے۔ ''چلو اب ٹرانسمیٹر کے ذریعے رابطہ کرتے ہیں۔'' نعمت شیخ نے کہا اور مجھے اپنی خواب گاہ میں لے آیا۔ اس نے الماری کھولی اور ایک چپٹا سا دھاتی بریف کیس لا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اس بریف کیس پر نظر پڑتے ہی میں بری طرح چونک پڑا۔ اس بریف کیس کی ساخت اور شکل میرے لیے اجنبی نہ تھی۔ افضل اور ندا کے قبضے سے بھی ہم نے بالکل ایسا ہی بریف کیس نما ٹرانسمیٹر برآمد کیا تھا لیکن اس کے ڈیجیٹل لاک کا کوڈ معلوم نہ ہونے کے باعث ہم اسے کھولنے میں ناکام رہے تھے۔ جب کہ سخت کوشش کے باوجود افضل نے ہمیں اس کا کوڈ نمبر نہیں بتایا تھا۔ قبل اس کے کہ میں کوئی ردعمل ظاہر کر پاتا۔ نعمت شیخ نے اس بریف کیس ڈیجیٹل لاک پر موجود بٹن دبا کر کوڈ نمبر ملانا شروع کر دیا اور پھر فوراً ہی ہلکی سی کلک کی آواز کے ساتھ بریف کیس کھل گیا۔ اندر سے وہ ایک عام سا اسٹیریو ٹیپ ریکارڈر نظر آ رہا تھا جس میں ڈبل کیسٹ لگانے کا انتظام موجود تھا۔ نعمت شیخ نے اس کے ایک خانے سے جدید ساخت کا چھوٹا سا مائک برآمد کیا اور ٹرانسمیٹر کے ایک بٹن سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ پھر اس نے ایک گول سی ناب کو گھمایا' اس کے ساتھ ہی ٹرانسمیٹر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے اسپیکر سے سائیں شوں سائیں شوں کی بے ہنگم آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ادھر میرے دماغ میں ایک بھونچال آیا ہوا تھا۔ اب شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ یہ ٹرانسمیٹر واضح طور پر بتا رہا تھا کہ بھارتی ایجنٹوں نے میرے لیے نہایت مہارت سے جال بچھایا تھا۔ میں ایک بار یہ جال توڑ کر نکل بھاگا تھا لیکن اپنی بے وقوفی کے باعث ایک بار پھر اس پھندے میں اپنی گردن پھنسا بیٹھا تھا۔ جانے کس کی دعائیں میرے ساتھ تھیں کہ میں ابھی تک زندہ سلامت بیٹھا تھا۔ اگر ٹرانسمیٹر کے ذریعے بلایا جانے والا شکاری پروگرام کے مطابق صبح ہی آن دھمکتا تو شاید میں اب تک

قبر کے اندھیروں میں جا سویا ہوتا۔ اب بھی ہر گزرتا پل مجھے اسی انجام کی طرف دھکیل رہا تھا۔ الجھن صرف یہ تھی کہ یہ شخص نعمت شیخ میرے خلاف بنی جانے والی اس سازش کا اہم کردار ہے یا اسے محض ایک مہرے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ جب تک اس کی پوزیشن واضح نہ ہو جاتی مجھے اس کی طرف سے بھی محتاط رہنا ہوگا۔

"عجب بات ہے ٹرانسمیٹر کے ذریعے بھی اس سے رابطہ نہیں ہو پا رہا ہے۔" نعمت شیخ نے کئی منٹ تک سر کھپانے کے بعد مایوس لہجے میں کہا۔ میں نے اسے جانچنے کے لیے کہا "ہو سکتا ہے وہ کسی ایمرجنسی کام سے شہر سے باہر چلے گئے ہوں۔ آپ کسی اور فریکوئینسی وغیرہ کے بارے میں تو ابرار صاحب نے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ مجھے تو صرف ان دو بٹنوں کا پتا ہے۔"

"یہ خاصا طاقتور ٹرانسمیٹر ہے۔ میرا خیال ہے اس کے ذریعے پاکستان کے کسی بھی شہر میں بلکہ میرا خیال ہے سرحد پار کے ممالک میں بھی رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ ابرار صاحب اگر شہر یا ملک سے باہر چلے گئے ہیں تب بھی وہ رات کے کسی بھی وقت کال کر سکتے ہیں۔ آپ خود بھی کوشش کرتے رہیں اور ان کی کال کا بھی انتظار کریں۔۔۔ لیکن آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' آرام کی ضرورت ہے آپ کو۔۔۔ ایسا کریں یہ ٹرانسمیٹر میرے حوالے کر دیں اور مجھے استعمال کا طریقہ بھی سکھا دیں۔ میں رات بھر جاگ کر ٹرائی کرتا رہوں گا۔"

"ٹھیک ہے میرا خیال ہے یہی بہتر ہوگا۔ جب تک یہ میرے پاس ہے مجھے نیند نہیں آئے گی۔" نعمت شیخ کے اس سادگی آمیز خواب نے میرا رہا سہا شک بھی دور کر دیا۔ اس کا شاہ مراد کے غول سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسے خصر خان کا نام لے کر بے وقوف بنایا گیا تھا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ اسے بھی اعتماد میں لے لوں' ورنہ وہ بے خبری کے عالم میں شدید نقصان اٹھا سکتا تھا۔

"نعمت صاحب اگر میں کہوں کہ آپ کے ابرار صاحب درحقیقت سردار شاہ مراد کے کارندے ہیں تو کیا آپ یقین کر لیں گے؟" میری بات سن کر نعمت شیخ تقریباً اچھل پڑا۔ "یہ۔۔۔ تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں بہت سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔ وہ شخص جو سرکاری کارندے ابرار کی حیثیت سے آپ کو ملا تھا درحقیقت میرے بدترین دشمن شاہ مراد کا ہرکارہ تھا جسے مجھے پھانسنے کے لیے آپ کے پاس بھیجا گیا تھا اور اپنی اس سازش میں تقریباً کامیاب بھی ہو گئے ہیں۔ اگر وہ آج صبح آ جاتا تو میں نہایت سعادت مندی سے اس کے ساتھ چل پڑتا۔" "لیکن تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ شاہ مراد کا کارندہ ہے؟" نعمت شیخ نے سخت اضطراب کے عالم میں پوچھا۔

"یہ ٹرانسمیٹر میں بھارتی ایجنٹ افضل کے پاس بھی دیکھ چکا ہوں اور قومی سلامتی کے ادارے کے پختہ کار کارندے بھی اس کی ساخت سمجھنے میں ناکام رہے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اجنبی ساخت کا یہ

ٹرانسمیٹر اچانک اسی ادارے میں اتنی بے تکلفی سے استعمال ہونے لگے۔"

"اوہ تو یہ بات ہے۔" نعمت شیخ نے بمشکل اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس نے خضر خان کے حوالے سے جو کہانی سنائی تھی اس میں تو ذرا سا بھی جھول نہیں تھا۔"

"اس لیے کہ اس کا تانا بانا اصل صورت حال کی مدت سے بنا گیا تھا۔ سارے فساد کی بنیاد یہ ہے کہ کسی نامعلوم طریقے سے خضر خان اور میرے معاملے کی تفصیلات شاہ مراد کے کارندوں تک پہنچ چکی ہیں۔ ان ہی معلومات کی روشنی میں مجھے دودھ کے ٹرک کے ذریعے سفر کے دوران قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ میں تو محض اتفاقاً بچ نکلا تاہم بے چارہ ٹرک ڈرائیور اور اس کا کلینر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ جب میں راستے میں ان کے ہتھے نہ چڑھ سکا تو خضر خان سے میری گفتگو سے حاصل شدہ معلومات نے انہیں آپ تک پہنچا دیا اور انہوں نے ایک قابل اعتبار کہانی کے ذریعے آپ کو پھنسا لیا اور میرے لیے ایک خطرناک جال بچھا دیا۔"

"اف میرے خدا! یہ میں کیا کرنے لگا تھا۔ میں اپنے عزیز دوست خضر خان کو کیا جواب دیتا؟' میرے بھائی خدا نے میری عزت رکھنا تھی ورنہ میں نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ بہرحال تم اب بھی خطرے کی زد میں ہو۔ خدا کرے صبح تک کوئی گڑبڑ نہ ہو' کل منہ اندھیرے میں تمہیں ایک محفوظ مقام پر پہنچا دوں گا۔"

"میرا خیال ہے فوری طور پر خطرے کی کوئی بات نہیں ہے اس کے باوجود محتاط رہنے میں کوئی حرج نہیں۔ آپ انٹرکام کے ذریعے چوکیدار کو ہوشیار کر دیں۔ مجھے بھی اب رات بھر نیند نہیں آئے گی البتہ اگر آپ سو جائیں تو اچھا ہوگا کیونکہ آپ کی طبیعت خراب ہونے کا خطرہ ہے۔"

"نہیں بھائی میں اتنا بھی نازک نہیں ہوں۔ اگر معاملہ خطرناک صورت اختیار کر گیا تو تم مجھے پیچھے نہیں پاؤ گے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں ہے ایک دور میں میں بھی فوج میں خدمات انجام دے چکا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ایک الماری کے قفل میں کنجی گھما دی۔ وہ واپس پلٹا تو ایک عدد نئی نکور کلاشنکوف اس کے ہاتھوں میں جگ مگا رہی تھی۔ "تم فکر نہ کرو ہم نہتے نہیں ہیں۔ وقت آنے پر اچھی خاصی نفری کو منہ توڑ جواب دے سکتے ہیں۔" اس نے وہ مہلک ہتھیار مجھے تھما دیا۔ "سنبھالو اسے' میرے پاس اسمتھ اینڈ ویسن کا پوائنٹ تھری ٹو ریوالور موجود ہے۔ ایمونیشن کی بھی کمی نہیں ہے۔"

"پھر مجھے کہیں اور بھیجنے کی کیا ضرورت ہے؟ جو بھی آتا ہے آئے' ہم اس کا گرم جوشی سے استقبال کریں گے۔" میں نے اے کے فورٹی سیون میں میگزین لگاتے ہوئے کہا۔ نعمت شیخ نے نفی میں گردن ہلا دی۔ "ہمیں خواہ مخواہ کا تصادم مول لینے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کل میں چپ چاپ تمہیں یہاں سے غائب کر دوں گا۔ اس کے بعد ابرار نے مجھ سے رابطہ کیا بھی تو میں کہہ دوں گا کہ تم سرے سے آئے ہی نہیں ہو۔ اسے میری بات پر اعتبار کرنا ہی پڑے گا۔"

”آپ کی یہ خواہش ہے تو چلیں ایسا ہی سہی۔ اب آپ اپنے چوکیدار کی خیر خبر لے لیں۔“

وہ رات بغیر کسی قابل ذکر واقعے کے گزر گئی۔ اگلے روز منہ اندھیرے نعمت شیخ نے مجھے ناشتا کرایا اور مجھے گاڑی میں ساتھ لے کر گھر سے نکل پڑا۔ ہماری منزل مضافاتی علاقے میں واقعے ایک بہت بڑا سردخانہ ثابت ہوا۔ اس سردخانے کی چھت پر دو کمروں پر مشتمل ایک وسیع و عریض اور پرآسائش قیام گاہ موجود تھی۔ ”یہ جگہ صرف اور صرف میرے استعمال میں رہتی ہے۔ میں یہاں اس وقت آتا ہوں جب زندگی کے معمولات مجھے حد سے زیادہ تھکا دیں اور ایسے مواقع سال میں چند ہی بار آتے ہیں۔ تم یہاں بے فکر ہو کر رہ سکتے ہو۔ تمہارے آنے جانے پر کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔“ میں نے پسندیدگی کے اظہار کے طور پر اثبات میں گردن ہلا دی۔ یہ جگہ واقعی میرے مقصد کے لحاظ سے بہت موزوں تھی۔ کچھ دیر بعد نعمت شیخ رخصت ہو گیا۔

سورج بلند ہونے تک میں ایک بار پھر ملنگ کا حلیہ اپنا چکا تھا۔ پہلے دو تین دنوں کے تجربے نے ثابت کیا تھا کہ یہ روپ میری اصلیت پوشیدہ رکھنے کے لیے بہترین تھا۔ اپنی کارگردگی سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد میں اپنے ٹھکانے کو مقفل کر کے شہر کی طرف چل پڑا۔ کوئی خاص منزل میرے ذہن میں نہ تھی۔ کوئی ایسا سراغ، کوئی ایسی روشنی جو مجھے شاہ مراد تک لے جائے۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر ایک دو دن میں مجھے کامیابی نہ ملی تو تافتان روانہ ہو جاؤں گا۔ شرفو کے بیان کے مطابق شاہ مراد کے ٹرک وہاں دیکھے گئے تھے۔

وہ سارا دن میں نے کوئٹہ شہر کے گلی کوچوں کی خاک چھانتے ہوئے گزارا لیکن خواری کے علاوہ کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ شام ہونے پر میں اپنے ٹھکانے پر لوٹ آیا۔ اگلے روز میں ایک بار پھر صبح سویرے نکل پڑا۔ میں دوپہر تک بغیر رکے چلتا رہا۔ دوپہر کا کھانا میں نے ایک چھپر ہوٹل پر کھایا۔ اس کے بعد میں ایک بار پھر اپنے بے منزل سفر پر چل پڑا۔ کچھ ہی دیر بعد میں ایک تعلیمی ادارے کے پاس سے گزر رہا تھا۔ چھٹی ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کیونکہ طلبا ابھی تک بڑے سے گیٹ سے برآمد ہو رہے تھے۔ اتفاق کی بات یہ کہ گزشتہ روز بھی میں تقریباً اسی وقت یہاں سے گزرا تھا اور مجھے من چلے نوجوانوں کے تضحیک آمیز جملے برداشت کرنا پڑے تھے۔ ان میں سے چند اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ مجھے صبر و تحمل کا دامن تھامے رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ گزشتہ روز کے تلخ تجربے کے پیش نظر میں جلد از جلد اس جگہ سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔

چند ہی منٹوں میں ڈیڑھ دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر چکا تھا۔ اب میں درختوں کی قطاروں کے درمیان ایک نیم پختہ سڑک پر چہل قدمی کے انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس سڑک پر گاڑیوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی لہٰذا جب میں نے کسی گاڑی کے طاقتور انجن کی وحشیانہ غراہٹ سنی تو چونک اٹھا۔ وہ سرخ رنگ کی نئی نکور لینڈ کروزر تھی۔ میں نے سڑک سے اتر کر اسے جانے کا راستہ دے دیا

حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ لینڈ کروزر قریب آئی لیکن آگے نکلنے کے بجائے میرے پہلو میں آ کر رک گئی۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن دیر ہو چکی تھی۔ گاڑی کے دروازے کھلے اور چار نوجوان چھلانگ لگا کر نیچے اترے۔ ان کے ہاتھوں میں موجود گنوں کا رخ میری طرف تھا۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ ان ہتھیاروں کے استعمال بھی پوری مہارت سے کرنا جانتے ہیں۔

”خبردار، ہلنے کی کوشش مت کرنا“ ان میں سب سے پختہ کار نظر آنے والے نوجوان نے کڑک دار لہجے میں کہا۔ ”ہاتھ سر سے اوپر اٹھاؤ۔“ اس کے ہاتھ میں دبے ماؤزر کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔ اس کے تینوں ساتھی اس دوران مجھے گھیرے میں لے چکے تھے۔ مزاحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”کیا بات ہے بھائی؟ کیوں فقیر کو تنگ کرتے ہو۔“ میں نے پشتو میں کہا۔ ”بکواس مت کرو تمہیں جیسا کہا ہے ویسا کرو ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔“ ماؤزر بردار نے سخت لہجے میں مجھے جھڑک دیا۔ عین اسی وقت اس کے ایک ساتھی نے میری کمر میں پستول کی نال سے کچوکا دے کر اس حکم کو مزید حتمی بنا دیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ میں نے ہاتھ سر سے اوپر اٹھا دیے۔ میرا ذہن اس دوران مسلسل صورت حال کا تجزیہ کرتا رہا تھا۔ تقریباً یقینی بات ہے کہ یہ شاہ مراد کے کارندے ہیں لیکن انہوں نے مجھے ڈھونڈا کیسے؟ کیا اس بدلے ہوئے حلیے میں بھی مجھے پہچان لیا گیا ہے؟ اب یہ میرا کیا حشر کرنے والے ہیں؟

ماؤزر بردار نے ماؤزر کے اشارے سے مجھے لینڈ کروزر کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ”دونوں ہاتھ گاڑی پر رکھو۔ دونوں پیروں کے درمیان کم از کم دو فٹ فاصلہ ہونا چاہیے۔ سمجھے“ میں نے چپ چاپ اس کے حکم کی تعمیل میں ہی عافیت سمجھی۔ میرے حسب حکم پوزیشن سنبھالتے ہی ان میں سے ایک آگے بڑھا اور نہایت ماہرانہ انداز میں میرے لباس کی تلاشی لے ڈالی اور میرے پاس موجود نقدی وغیرہ اپنے قبضے میں لے لی۔ ”یہ تھیلا اس کے کندھے سے اتار لو اور زمین پر الٹ دو، جلدی کرو۔“ اگلے ہی لمحے اس کے ساتھی نے میرے جھولے پر ہاتھ ڈال دیا۔ ”یہ تم کیا کر رہے ہو بھائیو۔ میں نے تم لوگوں کا کیا بگاڑا ہے؟۔۔۔“ میں نے دردناک لہجے میں فریاد کی جواباً مجھے اپنی گدی پر ایک زوردار تمانچہ سہنا پڑا۔ وہ لوگ جو کچھ کر رہے تھے اس میں کامیابی کا انہیں پختہ یقین تھا۔ میری فقیری زنبیل مجھ سے چھن گئی اور اسے سڑک پر الٹ دیا گیا۔ اگلے ہی لمحے میرا ”غیر فقیرانہ“ لباس اور لوڈڈ پستول نظروں کے سامنے بکھرتے ہوئے نظر آئے۔ ماؤزر بردار نے گہری نظر سے میرے مال و متاع کا جائزہ لیا۔ ”دیکھا! میرا اندازہ کبھی غلط نہیں نکل سکتا۔ یہ گلائیڈر ہے۔ پتا نہیں کب سے ہماری ٹوہ میں لگا ہوا ہے، باندھ لو اسے۔“

میرے ہاتھ پشت کی جانب کر کے نائلون کی مضبوط ڈوری سے جکڑ دیے میرے پیروں کا بھی یہی حال ہوا۔ یہی نہیں انہوں نے میری آنکھوں پر کپڑا باندھنے کے بعد میرے منہ میں بھی رومال ٹھونس دیا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے نہایت بے دردی سے لینڈ کروزر کی عقبی سیٹوں کے درمیان والے آہنی فرش پر پٹخ دیا۔ اگلے ہی لمحے گاڑی ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ حرکت میں آ گئی۔

میں اس ناگہانی افتاد سے ابھی تک نہیں سنبھل پایا تھا۔ یہ تو مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ مجھے سیف داد خان کی حیثیت سے شناخت نہیں کر پائے تھے۔ وہ غالباً جرائم پیشہ افراد تھے۔ وہ مجھے پولیس کا مخبر سمجھ کر میرے پیچھے لگ گئے تھے اور میرے پاس سے برآمد ہونے والے لباس اور پستول نے ان کا شک یقین میں بدل دیا تھا۔ خدا جانے اب وہ مجھ سے کیا سلوک کرنے والے تھے۔ میں شاید گزشتہ روز ہی ان کی نظروں میں آ گیا تھا۔ آج ایک بار پھر اپنے ٹھکانے کے آس پاس منڈلاتے دیکھ کر وہ میرے خلاف عملی کارروائی کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

گاڑی نصف گھنٹے تک اونچے نیچے سیدھے ناہموار راستوں پر سفر کرتی رہی' اس دوران ان میں سے کسی نے بلند آواز میں گفتگو کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بالآخر گاڑی ٹھہر گئی مجھے ہاتھ پاؤں سے پکڑ کر اٹھا لیا گیا اور کچھ دور لے جا کر پختہ فرش پر پٹخ دیا۔ اچھی خاصی چوٹ آئی لیکن میں نے اس قدر زور سے چیخ ماری جیسے میر ریڑھ کی ہڈی کے ٹکڑے ہو گئے ہوں۔ اس کے بعد میں بری طرح کراہنے لگا "ہائے میں مر گیا۔۔۔ ہائے۔۔۔ ظالموں میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ کیوں میری جان کے دشمن بن گئے ہو؟"

"اوئے دیکھنے میں تو جنگلی سانڈ لگتے ہو' برداشت تم میں نام کو بھی نہیں ہے۔ سچ سچ بتاؤ تم ہو کیا چیز؟" ماؤزر بردار نے طنز سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔ "ہائے۔۔۔ اف۔۔۔ تم کم از کم میری آنکھیں تو کھول دو بھائی۔ کیا اندھا بنا کر دم لو گے؟" میں نے دردناک لہجے میں فریاد کی۔

"سی پی۔۔۔ تم اس کی آنکھوں پر سے کپڑا ہٹا دو تا کہ یہ اپنی موت کو واضح طور پر دیکھ سکے۔ ایم کے تم میری اسپورٹس کٹ لے آؤ۔ میرا خیال ہے یہ اتنی آسانی سے زبان نہیں کھولے گا۔"

ماؤزر بردار کے حکم پر عمل ہوا۔ میری آنکھیں کھول دی گئیں۔ میں ایک طویل و عریض کمرے کے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ ماؤزر بردار میرے عین سامنے ایک کرسی پر براجمان تھا۔ وہ اپنا ہتھیار جیکٹ میں واپس رکھ چکا تھا البتہ اس کے دونوں ساتھیوں کے ہاتھوں میں موجود پستول بدستور مجھے زد میں لیے ہوئے تھے۔ جس عمارت میں مجھے لایا گیا تھا وہ ابھی زیر تعمیر تھی۔ اس کمرے کی کھڑکیاں لکڑی کے تختوں سے بند کی گئی تھیں۔ البتہ دروازہ مضبوط فولاد کا نظر آ رہا تھا۔ اس کمرے میں ایک آہنی مسہری اور ایک کرسی کے علاوہ کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ جبکہ برقی وائرنگ بھی نامکمل تھی۔

میرے کراہنے کا سلسلہ بدستور جاری تھا لیکن ماؤزر بردار اور اس کے ساتھی میری کیفیت سے قطعاً بے نیاز نظر آ رہے تھے۔ "میری کولہے کی ہڈی کریک ہو گئی ہے' خدا کے لیے کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔ میں مر جاؤں گا ہائے۔۔۔ اللہ۔۔۔ اف۔"

"شوق سے مر جاؤ۔۔۔ اچھا ہے ہمیں زحمت نہیں کرنا پڑے گی۔" ماؤزر بردار نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اتنی دیر میں اس کا چوتھا ساتھی بھی واپس آ گیا۔ اس نے کرکٹ کٹ بیگ شانے سے لٹکا رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر ماؤزر بردار کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "بہت خوب' اب مزہ آئے گا۔ این ڈی

سب سے پہلے چٹکیاں نکال کر دو۔ ہم اس کی نازک جلد کی کھنچائی سے ابتدا کریں گے۔"

"ہائے۔۔۔ اللہ تمہیں غارت کرے۔۔۔ بدبختو مجھے کم از کم یہ تو بتا دو کہ میرا قصور کیا ہے؟ کیوں مجھ پر ظلم ڈھانے پر تلے ہوئے ہو۔" میں نے اپنے لہجے میں تھوڑی سی سختی پیدا کر کے کہا۔ ماؤزر بردار میری بات سن کر یک لخت آپے سے باہر ہو گیا۔ "اوئے تو یہ ڈراما ختم کرتا ہے یا اپنی کھوپڑی تڑوا کر ہی باز آئے گا۔ اب بھی پوچھتا ہے کہ تیرا قصور کیا ہے؟ تیرا تو میں خون پی جاؤں گا۔ تجھے پتا نہیں کہ مجھے گلائیڈروں سے کتنی نفرت ہے!"

"کون گلائیڈر' کیسا گلائیڈر؟ بھائی مجھے تو اس لفظ کا مطلب بھی نہیں پتا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے تمہارے خلاف کچھ نہیں کیا۔ تم لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" "اگر تم گلائیڈ نہیں ہو تو تم ملنگ کے بھیس میں کیوں پھر رہے ہو؟ اگر تم واقعی ملنگ ہو تو پھر یہ پستول اور یہ عمدہ قسم کا لباس تمہارے قبضے میں کیوں ہے؟ دیکھو میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ ہمیں دھوکا دینے کی کوشش مت کرو اور سچ اگل دو ورنہ میں تمہارا اتنا برا حشر کروں گا کہ کوئی تمہاری شکل بھی نہیں پہچان پائے گا۔" ماؤزر بردار نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

"سب سے پہلی بات تو یہ بتاؤ میرے بھائی کہ یہ گلائیڈر کس بلا کا نام ہے؟ میں تو ایک ہی گلائیڈر کو جانتا ہوں جو انسان کو ساتھ لے کر بڑی پتنگ کی طرح فضا میں پرواز کرتا ہے۔" میں نے لاچار لہجے میں کہا۔ میری بات سن کر ماؤزر بردار کی آنکھوں میں خوفناک چمک لہرائی۔ "تم نے خود ہی بتا دیا ہے کہ تم ان پڑھ جاہل ملنگ یا فقیر نہیں ہو۔ اب سچ بولنے پر آ ہی گئے ہو تو باقی سب بھی اگل ہی ڈالو۔ کیوں خواہ مخواہ ہمیں زحمت دینے پر تلے ہوئے ہو۔"

"بھائی صاحب کیا ضروری ہے کہ ہر ملنگ اور فقیر کورا ان پڑھ ہو۔ آج کل گداگری بے حد منافع بخش کاروبار بن چکا ہے۔ اب اس شعبے میں ہر طرح کے لوگ داخل ہو چکے ہیں۔ ویسے میں تسلیم کرتا ہوں کہ دراصل فقیر یا ملنگ نہیں ہوں لیکن میں کوئی گلائیڈر وغیرہ بھی ہرگز نہیں ہوں۔"

"تو پھر تم کون ہو اور یہ بھیس کیوں اختیار کر رکھا ہے؟"

"ظاہر ہے اپنی شناخت چھپانے کے لئے میں نے یہ بھیس بدل رکھا ہے۔"

"اب یہ بھی بتا دو کہ تمہاری اصل شناخت کیا ہے؟" ماؤزر بردار نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ "میری شناخت سے تمہیں کیا لینا دینا؟ بس یوں سمجھ لو کہ دو نمبر کا دھندا کرتا ہوں۔ پنجاب سے تعلق ہے' وہاں گھیرا تنگ ہونے لگا تو یہ روپ اپنا کر کوئٹہ آ گیا۔ یہاں اپنے لیے روزی کا ذریعہ تلاش کر رہا تھا کہ تمہارے ہتھے چڑھ گیا۔"

"یہ جھوٹ بک رہا ہے ایم جی۔" ایم کے نے اچانک ہماری گفتگو میں مداخلت کر ڈالی۔ "اگر یہ واقعی مفرور مجرم ہوتا تو اسے روزانہ عین چھٹی کے وقت گیٹ پر موجود ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ یقیناً

ہماری نگرانی کر رہا تھا۔ یہ شرافت سے زبان نہیں کھولے گا۔ اس پر اپنی مہارت آزماؤ۔ یہ ابھی حقیقت اگل دے گا۔"

ایم جی کچھ دیر تک بغور اپنے ساتھی کو دیکھتا رہا پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ "تو تم سچ نہیں بولو گے۔ کیا تم نے ہمیں گدھا سمجھا ہے کہ تمہاری اس پھسپھسی کہانی پر یقین کر لیں گے؟ ٹھیک ہے ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ ایم کے تم اس کی پنڈلی پر سے کپڑا ہٹاؤ۔ این ڈی تم چٹکیاں میرے حوالے کر دو۔"

وہ چٹکیاں دراصل آہنی شکنجے کی مختصر شکل تھی۔ اسے پیچھے سے پکڑ کر دبایا جاتا تو اس کا جبڑا کھل جاتا۔ اس جبڑے میں متعدد تیز رفتار دانت موجود تھی جو گوشت کو بے رحمی سے جکڑ لیتے تھے۔ طاقت اور اسپرنگ کا دباؤ انہیں گوشت کے اندر پیوست کر دیتا تھا۔ جب دو عدد چٹکیوں نے میری پنڈلیوں کو تیز رفتار دانتوں سے جکڑا تو میرے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ میں نے اپنی تکلیف کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ کمرے کی دیواریں میری چیخوں کی آوازوں سے لرز رہی تھیں۔ ڈیڑھ دو منٹ کے بعد ہی وہ چٹکیاں ہٹا لی گئیں لیکن اتنی سی دیر میں ہی میں پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ میری پنڈلیوں کا گوشت بری طرح کچلا گیا تھا اور اس سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

"اف' ہائے۔۔۔ تمہارا بیڑا غرق ہو تمہارا ستیاناس ہو بد بختو۔ تم انسان نہیں شیطان ہو۔" میں نے غضب ناک نظروں سے ایم جی کو گھورتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ مجھ سے جو سلوک کر رہے ہو اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔"

"لگتا ہے تمہارے کس بل ڈھیلے کرنے کے لیے ہمیں ذرا سخت ہاتھ ڈالنا پڑے گا۔" ایم جی نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "اب میں تمہیں۔۔۔" وہ اپنی بات پوری نہیں کر پا رہا تھا کہ اچانک ایک شخص کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی ایم جی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ نووارد شخص کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ "سالار یہ ہے وہ گلائیڈر جسے ہم نے آج دوپہر پکڑا ہے۔ اس کے قبضے سے پستول برآمد ہوا ہے۔" سالار نے ایم جی کی کرسی پر قبضہ جماتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "اس نے زبان کھولی یا نہیں؟"

"ہم نے ابھی کاروائی شروع کی ہے سالار۔ ابھی کچھ ہی دیر میں سب کچھ بک دے گا۔"

"نہیں اس کی زبان کھلوانے کے لیے مناسب جگہ نہیں ہے۔ اسے پوائنٹ زیرو پر لے چلو۔ ہم سب کو چار گھنٹے کے اندر وہاں جمع ہونا ہے۔"

"ٹھیک ہے این ڈی' ایم کے تم اسے ناک آؤٹ کر کے گاڑی میں ڈال دو۔ ہم یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔"

میں بے بسی کے عالم میں دونوں خبیث شکل چھوکروں کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر ان میں سے ایک نے نہایت بے رحمی سے اپنے پستول کا دستہ میری کھوپڑی کے عقبی حصے پہ دے مارا۔

میرے دماغ میں زوردار دھماکا ہوا! اگلے ہی لمحے میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

سر کے عقبی حصے میں درد کی ٹیسوں نے مجھے زیادہ دیر ہوش و حواس سے بیگانہیں رہنے دیا۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور ہاتھ پاؤں بھی بدستور نائیلون کی ڈوری میں جکڑے ہوئے تھے۔ میں کسی ہموار فرش پر پڑا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس وقت میرے آس پاس کوئی نہیں ہے۔ ہر طرف مکمل سناٹا تھا۔ میں اپنے اندازے کی تصدیق کے لیے زور سے چیخا۔ "اے۔۔۔ سنو۔۔ کوئی ہے؟" جواب میں میری آواز کی بازگشت کے علاوہ کچھ سنائی نہ دیا۔

موقع مناسب جان کر میں نے اپنے ہاتھوں کے بندھنوں پر زور آزمائی شروع کی۔ نائلون کی ڈوری کی مضبوطی میں تو شک وشبے کی گنجائش ہی نہیں لیکن ان خبیثوں نے گرہیں لگانے میں بھی غیر معمولی مہارت کا مظاہرہ کیا۔ میری تمام کوششیں اکارت گئیں اور میں ڈوریوں کو معمولی سا بھی ڈھیلا کرنے میں ناکام رہا۔ تھک ہار کر مجھے تن بہ تقدیر ہونا پڑا۔

تقریباً پونے گھنٹے بعد مجھے کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے فوراً جھوٹ موٹ کی بے ہوشی خود پر طاری کر لی۔ کئی افراد کے بھاری قدموں کی آوازیں میری طرف بڑھیں۔ "ابھی تک ہوش میں نہیں آیا سالا۔۔۔" کسی نے مجھے ایک غلیظ گالی سے نوازتے ہوئے کہا۔ اگلے ہی لمحے میری پسلیوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ شاید گالی بکنے والے نے ہی بھاری بھرکم بوٹ کی ٹھوکر سے میری تواضع کی تھی۔ میں شدید جدوجہد کے بعد اذیت ناک کراہ کو اپنے سینے میں قید رکھ پایا تھا۔ البتہ شدید درد کی لہریں میرے روئیں روئیں میں پھیل گئیں تھیں۔ "ہاں' ابھی یہ کئی گھنٹے بے ہوش رہے گا۔" ایک بھاری بھرکم آواز میرے کانوں میں پہنچی' میں نے اسے فوراً پہچان لیا وہ سالار تھا۔ لفنگوں کی اس ٹولی کا سرغنہ اس کے لہجے میں اضطراب آمیز خوشی کی جھلک نمایاں تھی۔ "اسے جلدی سے ہتھ کڑی اور بیڑی میں جکڑ دو اور اس کی آنکھوں سے پٹی اتار دو۔ میں ایک بار پھر غور سے اس کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

سالار کے منہ سے برآمد ہونے والے الفاظ میرے لیے حیران کن تھے۔ قبل اس کے کہ میں اس کے حکم کی توجیہ تلاش کر پاتا مجھے پابند سلاسل کر دیا گیا۔ ہتھ کڑی اور بیڑی پہنانے کے باوجود میرے ہاتھ پاؤں کو نائلون کی ڈوریوں سے آزاد کرنے کی زحمت نہیں کی گئی۔ آنکھوں سے پٹی ہٹتے ہی مجھے تیز روشنی کا احساس ہوا۔ میرے چہرے کا بغور جائزہ لیا جا رہا تھا لہٰذا میں چہرے کے عضلات کو مکمل طور پر ساکت رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "اس کا قد کاٹھ اور شکل وصورت تو تقریباً ویسی ہی ہے۔" سالار نے ہیجان سے بھرپور لہجے میں کہا۔ "دعا کرو کہ یہ وہی ہو۔ اگر یہ واقعی سردار کا مطلوبہ بندہ نکلا تو سمجھو کہ ہم سب کے نصیب جاگ جائیں گے۔ سردار ہمیں مالا مال کر دے گا۔" یہ الفاظ سنتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ حالات کے چکر نے مجھے گھیر کر سردار شاہ مراد کے چنگل میں پھنسا دیا تھا اور اس بار مجھے پہچان بھی لیا گیا تھا۔ اب میرا جو حشر ہونے والا تھا اس کے بارے میں مجھے کوئی خوش فہمی نہیں

تھی۔ شاہ مراد تو میری تلاش میں ایک طویل عرصے سے ایک ہڑکائے کتے کی طرح پھر رہا تھا۔ اسے مجھ سے کئی حساب چکانے تھے۔ اس کے کارندے جس قدر احتیاط کا مظاہرہ کر رہے تھے اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ انہیں میرے بارے میں سخت ترین ہدایت مل چکی ہے۔ اب وہ میری طرف سے کسی قیمت پر غفلت نہیں برتیں گے۔ میں پوری طرح بے دست و پا ہو چکا تھا۔

کچھ دیر بعد سالار نے ایک بار پھر میری آنکھوں پر پٹی چڑھانے کا حکم دیا۔ ان کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اب مستقل میرے سر پر سوار رہنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ''اس کے متعلق جو کچھ سننے میں آیا وہ غلط نہیں ہے۔ یہ واقعی خطرناک بندہ ہے۔ مجھے یقین ہے رستم، سرفراز اور ڈیوڈ کی موت کا ذمے دار بھی یہی ہے۔ یہ اس رات اس ٹرک ڈرائیور کے گھر پر موجود ہوگا۔''

''ہاں بابر سائیں، انہوں نے شاید ان کی گاڑی پر فائر بم مارا ہوگا۔ اسی لیے انہیں باہر چھلانگ لگانے کی مہلت نہ مل سکی۔'' میں نے ایم جی کی آواز سنی۔ ''ہاں کچھ ایسا ہی ہوا ہوگا۔ ہمارے پاس وقت ہوتا تو ہم اس کی زبان سے سب کچھ اگلوا لیتے۔ ایک طرح سے ڈیوڈ اپنی موت کا ذمے دار خود ہے۔ میرے کہنے کے باوجود وہ زیادہ بندے اپنے ساتھ لے کر نہیں گیا تھا خیر اب بڑا سردار خود ہی سارا حساب چکتا کر لے گا۔ ویسے یہ جی دار ہونے کے ساتھ ساتھ چالاک بھی ہے۔ ہمیں شروع سے معلوم تھا کہ یہ بلوچستان کی طرف آ رہا ہے اس کے باوجود ہم اسے راستے میں کہیں نہیں روک سکے اور اب یہ اتنی آزادی سے کوئٹہ میں دندناتا پھر رہا تھا۔ صرف اس ایک بندے کی وجہ سے ہمیں اتنی تمام سرگرمیاں روکنا پڑ گئی تھیں۔ اگر ہم اسے مخبر سمجھ کر قابو کر لیتے تو یہ ہمیں کوئی اور بڑا نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔''

''آپ نے بالکل ٹھیک کہا بابر سائیں۔ ہمیں جلد از جلد اسے بڑے سردار کے پاس پہنچا کر اپنی جان چھڑا لینا چاہیے۔ شاہنواز بس آنے ہی والا ہوگا۔'' میں تقریباً نصف گھنٹے تک ان لوگوں کی ہرزہ سرائیاں برداشت کرتا رہا پھر شاہنواز نامی وہ شخص بھی آ گیا جس کا انہیں بے چینی سے انتظار تھا۔ ''ہاں بھئی شاہنواز کہو کیا خبر لائے ہو؟''

''اس کا تابوت ایک گھنٹے میں تیار ہو جائے گا۔ اسے میں نے آپ کی ہدایت کے عین مطابق سیٹ کرایا ہے یہ دم گھٹنے سے نہیں مرے گا اور اس تابوت کو یہ تو کیا اس کا باپ بھی نہیں توڑ سکتا۔'' شاہنواز نے پر جوش لہجے میں بتایا۔ ''ٹھیک ہے اب اسے دوا سنگھا کر کم از کم دس بارہ گھنٹے کے لیے اس کی بتی گل کر دو تاکہ ہماری فکر تو ختم ہو سکے۔ ہماری کسی غلطی یا غفلت سے یہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تو سمجھو ہم نے اپنے ہاتھوں سے قبر کھود لی ہے۔ سردار ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''ایسا نہ کہو بابر سائیں۔ میں ابھی اسے دوا سنگھاتا ہوں۔'' ایم جی نے مضطرب لہجے میں کہا۔ اس نے شاید بے ہوشی کی دوا کی پوری شیشی رومال پر انڈیل دی تھی، دوا کی ناخوشگوار بو کا بھپکا جوں ہی میرے نتھنوں سے ٹکرایا میں نے سانس روک لی لیکن جب اس کا ہاتھ میرے منہ اور ناک پر سے ہٹ نہ سکا تو

بالآخر مجھے اپنی ناکام جدوجہد ترک کرنا پڑی۔ تیز ترین بو نتھنوں میں گھستے ہی میرا سر بری طرح چکرایا اور پھر میں ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گیا۔

تاریکی کی چادر جانے کتنی دیر مجھ پر مسلط رہی۔ دماغ دوبارہ بیدار ہوا تو سب سے پہلے سر کے درد نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ میری آنکھوں پر سے پٹی ہٹ چکی تھی اور ہاتھ پیروں سے نائلون کی ڈوری کے جکڑ بند بھی کھل چکے تھے۔ میں پختہ فرش پر اس انداز میں چت لیٹا ہوا تھا کہ میرے ہاتھ پیروں میں الگ الگ ہتھکڑی اور بیڑی پڑی ہوئی تھی جو بھاری بھرکم قفلوں کے ذریعے چار ایسے کنڈوں سے منسلک تھیں جو فرش میں گڑے ہوئے تھے۔ میرے ہاتھ پیروں میں پڑی زنجیریں اتنی مضبوط نظر آ رہی تھیں کہ شاید انہیں کوئی ہاتھی بھی نہ توڑ پاتا۔

وہ ایک ہال نما کمرہ تھا جس کی سپاٹ دیواروں میں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا صرف ایک فولادی دروازہ تھا جو اس وقت بند نظر آ رہا تھا۔ اس دروازے کے درمیان میں ایک چھوٹی سی کھڑکی بھی تھی لیکن وہ بھی بند تھی۔ میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ یہ کون سی جگہ ہو سکتی ہے۔ مجھے کسی صندوق میں بند کر کے سردار شاہ مراد کے پاس نامعلوم مقام پر بھیجا گیا تھا۔ یہ جگہ ملتان یا کسی اور شہر میں شاہ مراد کا ٹھکانا بھی ہو سکتی تھی اور وہ خفیہ اڈا بھی جس کی تلاش کے دوران میں مرزا اور صدیقی پر اسرار انداز میں غائب ہو گئے تھے۔

اس کمرے میں روشن طاقت ور بلب روشنی کا واحد ذریعہ تھا۔ یہ اندازہ لگانا تقریباً ناممکن تھا کہ اس وقت دن ہے یا رات ہے لیکن شدید ترین بھوک اور پیاس مجھے احساس دلا رہی تھی کہ مجھے یہاں آئے کافی وقت گزر گیا چکا ہے۔ سردار شاہ مراد سے کسی اچھے سلوک کی توقع کا بھلا کیا سوال تھا اس کے باوجود میں نے محض اپنے ہوش میں آنے کا اعلان کرنے کے لیے زور زور سے آوازیں لگانا شروع کر دیں۔ جب کوئی ردعمل سامنے نہ آیا تو مجھے یہ لاحاصل مشق ترک کرنا پڑی۔

خاصے طویل انتظار کے بعد دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی اور پھر وہ ایک جھٹکے سے کھلتا چلا گیا۔ دروازے سے اندر قدم رکھنے والا واحد شخص شاہ مراد تھا اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی اور وہ اپنی عقابی نظریں مجھ پر جمائے نپے تلے قدم اٹھائے ہوئے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس بدترین صورت حال میں بھی مجھے کسی قسم کے ڈر یا پریشانی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ میں تو نہ جانے کب سے اس طرح کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ مجھے قتل کر سکتا تھا۔ وہ بھی صرف اس صورت میں جب خداوند کریم نے میری موت اس کے ہاتھوں لکھی ہوتی۔ اگر خدا کی یہ مرضی نہ ہوتی تو وہ میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا تھا۔

میری بے خوفی و بے باکی نے اس کے غصے اور نفرت کی آگ کو کئی گنا تیز کر ڈالا تھا۔ وہ میرے پاس پہنچا تو مجھے اس کے ہاتھوں میں واضح طور پر لرزش نظر آئی جیسے وہ آتش فشاں کے مانند پھٹنے والا ہو۔

میں نے اسے مزید مشتعل کرنے کے لیے کہا۔ ”سردار نامراد اپنے چمچوں سے کہہ کہ مجھے کھلانا تو کھلا دو۔ اگر میں بھوکا رہا تو کمزور ہو جاؤں گا اور تمہارے کتوں کا پیٹ پورا نہیں بھرے گا۔ ویسے تمہارے شکاری سپوت رتا سائیں کا کیا حال ہے؟ مزید کتنی چھوکریاں شکار کی ہیں اس نے؟“

میری بات سن کر اس کی آنکھوں میں شعلہ سا لپکا لیکن پھر اس نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا اور پرسکون ہوتا چلا گیا۔ ”بہت خوب‘ تم تو اچھا خاصا بولنا سیکھ گئے ہو۔ لگتا ہے اچھے استادوں کے پاس رہے ہو۔ دیکھو میں تمہارا دشمن ضرور ہوں لیکن اس معاملے میں بھی میں اپنے معیار سے نہیں گر سکتا۔ میں تم سے جو بھی سلوک کروں گا وہ تمہارے شایان شان ہوگا یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔“

”فکر نہ کرو میں رتا سائیں کی طرح تمہیں بھی مایوس نہیں کروں گا۔ انشاء اللہ تم مجھے اپنی توقعات سے بڑھ کر پاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے شاید تمہارے خاندان کی خدمت کے لیے ہی پیدا کیا ہے۔“

”جاہ مراد کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اس کے اناڑی پن کا نتیجہ تھا۔ شکار کے وقت غفلت کرنے والے شکاری کو سنگین خمیازہ بھگتنا پڑتا اس بے چارے کو تو یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس قسم کے جانور کا شکار کرنے کے لیے روانہ ہو رہا ہے۔ شکار ایک مکمل فن ہے جس کے اپنے آداب ہیں جن کا احترام ہر شکاری کو کرنا پڑتا ہے۔ خیر موقع ملا تو میں باپ اور بیٹے کے فرق سے تمہیں بخوبی آگاہ کر دوں گا۔ تم جانتے ہو کہ تم اب مکمل طور پر میرے رحم و کرم پر ہو۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ موت اب تمہارا مقدر بن چکی ہے لیکن اگر تم چاہو تو میں تمہیں اپنی زندگی بچانے کا موقع دے سکتا ہوں۔“

سردار جی تم اس وقت ایک بہت عام فہم بات نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہے ہو جو چھوٹے سے بچے کو بھی معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ زندگی لینا اور زندگی دینا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ تم اس وقت خود کو مکمل طور پر مجھ پر حاوی سمجھ رہے ہو جبکہ قادر مطلق صرف رب ذوالجلال ہے۔ بہر حال تم بتاؤ کہ تم مجھے زندگی بچانے کا موقع کس شرط پر دینا چاہتے ہو؟“

”تم مجھے صرف یہ بتا دو کہ تم نے افضل کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے‘ اگر زندہ ہے تو اس وقت کہاں ہے؟“

”اوہ بس اتنی سی بات ہے؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ”میں سمجھا تھا کہ تم پوچھو گے کہ میں تمہاری ملک دشمن سرگرمیوں سے کس حد تک آگاہ ہوں۔“

”وہ سب میں پہلے ہی جانتا ہوں اور میں نے اس کا پہلے ہی بندوبست کر رکھا ہے۔ سارے ملک کے ادارے مل کر بھی میرے خلاف کچھ ثابت نہیں کر سکتے۔“ ”لیکن اگر افضل زبان کھول دے تو شاید تمہیں باآسانی غدار وطن ثابت کیا جا سکتا ہے اس لیے تم اس کا پتا چلانے کے لیے بے تاب ہو‘ میں نے درست کہا ناں؟“

”تمہارا خیال خاصی حد تک درست ہے لیکن مجھے دراصل افضل کی اس لیے ضرورت ہے کہ اس کی

غیر موجودگی میں ہمارا کام چوپٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ اب تک کسی ادارے کے قبضے میں نہیں آیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اب بھی تمارے قبضے میں ہے۔“

”اگر میں کہوں کہ وہ مر چکا ہے تو۔۔۔“ میں نے شاہ مراد کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اس نے شانے اچکا کر کہا۔ ”اگر یہ ثابت ہو جائے تب بھی میرا آدھا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔“

”اگر میں بتا دوں کہ افضل اس وقت کہاں ہے تو تم مجھ سے کیا سلوک کرو گے؟“

”اس صورت میں ایک بار پھر وہی کھیل کھیلا جائے گا جو جاہ مراد اور اس کے ساتھیوں نے تم سے کھیلنے کی کوشش کی تھی لیکن اس مرتبہ مقابلہ صرف میرے اور تمہارے درمیان ہوگا اور میں تمہیں ہتھیار بھی دوں گا۔ اگر تم بچ نکلے تو میں تمہارا پیچھا نہیں کروں گا۔“

”اور اگر میں نے شکار ہونے کے بجائے تمہیں شکار کر لیا تو۔۔۔“ میں نے چبھتے لہجے میں پوچھا۔ شاہ مراد نے چونک کر کہا۔ ”ایسی صورت میں تو سارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا۔“

”اور اگر میں افضل کے بارے میں زبان کھولنے سے انکار کر دوں تو؟“

”پھر مجبوراً مجھے تم پر سختی کرنا پڑے گی۔ میں جانتا ہوں تم بہت سخت جان ہو لیکن ہر انسان کی قوت برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ اگر اس دوران تم مر گئے تو مجھے مایوسی تو ہوگی لیکن کوئی افسوس نہیں ہوگا کیونکہ بالآخر تمہیں میرے ہاتھوں ہی مرنا ہے۔“

”تم افضل کے بارے میں میری زبان کھلوانے کے لیے جس قدر بے تابی کا مظاہرہ کر رہے ہو اس سے ایک بات تو بالکل صاف ہو جاتی ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ اس نے قدرے چونکتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا۔۔۔ تم کون سی بات کا ذکر کر رہے ہو؟“

”یہی کہ افضل ہی دراصل وہ طلسمی طوطا ہے جس میں تمہاری جان ہے۔ جب تک میں اس کے بارے میں زبان نہ کھولوں تم مجھے قتل نہیں کر سکتے۔“ میں نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔ اسکے ساتھ ہی میں نے پہلی مرتبہ شاہ مراد کے چہرے پر جھنجھلاہٹ کے آثار دیکھے۔

”اس خوش فہمی میں نہ رہنا۔ جب بھی مجھے اس کھیل سے بوریت ہوئی میں تمہیں بلا تاخیر اپنے کتوں کے سامنے پھنکوا دوں گا۔ میں دور دراز کے اندیشوں میں زیادہ دیر تک گرفتار رہنے کا عادی نہیں ہوں۔ بہر حال‘ میں تمہیں کل تک سوچنے کی مہلت دیتا ہوں۔ اس کے بعد ہماری بازی کا آغاز ہوگا۔ ویسے جاتے جاتے یہ بتاتا چلوں کہ تمہارے اندھے دوست غلام سرور کی بہنیں اب بھی اسی گاؤں میں ہیں۔ تم چاہو تو انہیں تم سے ملانے کے لیے یہاں لایا جا سکتا ہے۔“

شاہ مراد کے آخری الفاظ آتش فشاں کے لاوے کی مانند میری رگوں میں جہنم برپا کر دیا تھا۔ غیظ و غضب کی لہر اتنی شدید تھی کہ میں لمحہ بھر کے لیے گنگ ہو کر رہ گیا۔ میری آنکھوں کے بدلتے رنگ نے

اسے میری اندرونی کیفیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس نے ایک تضحیک سے بھرپور قہقہہ لگایا۔ عین اسی وقت میرے حلق سے نفرت میں بجھی مغلظات کا طوفان پھوٹ نکلا لیکن وہ تو جیسے میری ہر گالی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے قہقہوں میں مزید شدت آ گئی۔ پھر وہ ہنستے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں دیر تک اپنے اندر کا زہر اگلتا رہا۔

شاہ مراد نے مجھے بے حد بھرپور جذباتی شاک لگایا تھا۔ اس کی برتری تو ویسے بھی واضح تھی لیکن اس نے اس غلیظ دھمکی کے ذریعے مجھے شدید ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ میری کوئی سگی بہن نہیں لیکن میں نے غلام سرور کی بہنوں کو کبھی اپنی سگی بہنوں سے کم نہیں سمجھا۔ غلام سرور نے مجھے زندگی دینے کے لیے جو عظیم قربانی دی تھی اس کے بعد تو اس کی بہنوں کا تحفظ میری اہم ترین ذمے داری تھی۔ شاہ مراد میری دکھتی رگ پہچان گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میری زبان کھلوانے کا یہ سب سے بہترین طریقہ ہے۔

شاہ مراد کے رخصت ہونے کے کافی دیر بعد تک میں بری طرح پیچ و تاب کھاتا رہا۔ پھر مجھ پر مایوسی اور بے بسی کا غلبہ ہونے لگا۔ میری آنکھیں بے اختیار بہ نکلیں۔ میں جس مضبوط پنجرے میں آ پھنسا تھا اس سے نجات بظاہر ناممکن ہی نظر آ رہی تھی لیکن نہیں میں بے یار و مددگار تو نہیں۔ میرا پاک پروردگار میرے ساتھ ہے۔ اس نے مجھے ہر آزمائش کی گھڑی میں سرخرو کیا ہے۔ وہ اب بھی میری دستگیری کرے گا۔

میرا دل رفتہ رفتہ بالکل پرسکون ہوتا چلا گیا۔ مجھے شدید بھوک اور پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ شاہ مراد نے کہا تھا کہ وہ مجھے بھوکا پیاسا نہیں مارے گا۔ یہ اس کی نیک دلی نہیں بلکہ مجبوری تھی کیونکہ میری زبان کھلنے تک اسے مجھے بہرصورت زندہ رکھنا تھا۔ لیکن یہ ضروری تھا کہ وہ فوری طور پر میری بھوک اور پیاس کا انتظام کر دیتا۔ وہ جانتا تھا میں اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں۔ ممکن ہے وہ میری حالت تباہ ہونے اور میری قوت مزاحمت کمزور ہونے تک انتظار کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اس سے نرمی کا سلوک رکھنے کی حماقت سرزد نہیں ہو سکتی تھی۔

میں اپنی پوری قوت ارادی صرف کر کے نیند کو اپنے اوپر حاوی کرنے کی جدوجہد کرنے لگا۔ بھوک و پیاس کی شدت فراموش کرنے کا میرے پاس یہی طریقہ تھا۔ میری غنودگی ابھی پوری طرح گہری نہیں ہو پائی تھی کہ اچانک کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ''سیفل'' ''سیفل بھائی ہوش میں آؤ۔'' ایک مانوس سی نسوانی آواز نے مجھے چونک کر آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا میں اسے پہچاننے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ نسیم تھی شاہ مراد کی بدنصیب بیٹی جسے افضل نے اپنے پیار کا بہلاوا دے کر برباد کر دیا تھا۔ ڈاکٹر صنم اسے گناہ کے بوجھ سے نجات نہ دلاتی تو وہ خود کو موت کے اندھیروں میں دھکیل چکی ہوتی۔ اسے اس جگہ اپنے روبرو پا کر مجھے شدید حیرت ہوئی۔ ''تم۔۔۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''یہ سوال جواب کا موقع نہیں ہے بھیا۔ میں بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچی ہوں۔'' تب میری نظر اس کے نازک ہاتھوں

میں موجود کلاشنکوف پر پڑی۔ ''میں تمہیں آزاد کرنے آئی ہوں۔ ان تالوں کی چابیاں شاہ مراد کے قبضے میں ہیں لیکن میرا خیال ہے یہ زنجیریں۔۔۔''

''ہاں ہاں بالکل'' میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''تم کلاشنکوف چلانا تو جانتی ہو ناں؟ تم میرا صرف ایک ہاتھ آزاد کرا دو باقی کام میں خود کر لوں گا۔ ٹھہرو میں بتاتا ہوں تمہیں کیا کرنا ہے۔''

میں نے کلاشنکوف کا لیور سنگل فائر پر سیٹ کرایا اور پھر دائیں ہاتھ میں بندھی زنجیر کی ایک کڑی کے جوڑ پر کلاشنکوف کی نال رکھوائی۔ ''ٹرائیگر دباؤ'' میں نے کہا۔ نسیم نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ وہ ہال نما کمرہ دھماکے سے گونج اٹھا لیکن کلاشنکوف کی گولی زنجیر کی کڑی سے براہ راست ٹکرانے کے بجائے اچٹ گئی تھی۔ نسیم نے مایوسی سے مجھے دیکھا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایک بار پھر کوشش کرو۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ اس دوران میری نظریں آنے والے راستے کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ گولی کی آواز سن کر کسی بھی وقت کوئی آ سکتا تھا۔ نسیم نے میری پریشانی بھانپ لی تھی۔ ''فکر نہ کرو سیفل بھیا۔ فی الحال کوئی اس طرف نہیں آ سکتا۔ میں سب انتظام کر کے آئی ہوں۔'' اس نے کہا اس کی دوسری کوشش کامیاب رہی۔ میرے ہاتھ کو زوردار جھٹکا لگا۔ اس کے ساتھ ہی زنجیر کی کڑی ٹوٹ گئی۔ میرا دایاں ہاتھ آزاد ہو چکا تھا۔

''تمہارا بے حد شکریہ میری بہن۔ تم نے۔۔۔'' نسیم نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میرا شکریہ بعد میں ادا کرتے رہنا بھیا پہلے یہ بندوق سنبھالو اور جلدی سے مکمل آزادی حاصل کر لو اور یہاں سے فرار ہو جاؤ۔''

اپنے بائیں ہاتھ اور دونوں پیروں کی زنجیروں سے نجات حاصل کرنے کے لیے مجھے صرف تین گولیاں ضائع کرنا پڑیں۔ آزادی کا احساس حد درجہ فرحت بخش تھا لیکن مجھے نسیم کی فکر لگی ہوئی تھی۔ خدا جانے اس میں اتنی جرات کہاں سے آ گئی ہے۔ شاہ مراد کو اس کی حرکت کا علم ہو گیا تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یہ کون سی جگہ ہے اور اس وقت سردار شاہ مراد کہاں ہے؟'' میں نے نسیم سے پوچھا۔ اس کے چہرے سے ہلکی سی پریشانی بھی ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ ''یہ ہماری حویلی کا تہہ خانہ ہے جس کے بارے میں شاہ مراد کے علاوہ کوئی نہیں جانتا' وہ تو یہی سمجھتا ہے۔'' نسیم نے مستحکم لہجے میں بتایا۔ ''اس وقت وہ اپنے ہیڈکوارٹر گیا ہوا ہے جہاں سے صبح ہونے پر اس کی واپسی ہوگی۔''

''اس تہہ خانے تک پہنچنے کا راستہ کہاں ہے اور تم یہاں تک کیسے پہنچی ہو؟''

''یہ ایک طویل داستان ہے پہلے تم کچھ کھا پی لو۔'' اس نے تین میٹھی روٹیاں اور پانی کی لٹیا میرے حوالے کر کے کہا۔'' تب تک میں تمہیں پوری صورت حال بتاتی ہوں۔ جیسا کہ تم جانتے ہو میری بربادی کا ذمے دار افضل، شاہ مراد کا دوست ہے اس لیے میں اسے بھی اپنی تباہی کا سبب سمجھنے لگی تھی۔ پھر ڈاکٹر صنم کے ہاں مجھے معلوم ہوا کہ میرا نام نہاد باپ دشمن ملک کا ایجنٹ اور وطن کا غدار ہے تو میرے دل سے

اس کی رہی سہی عزت بھی ختم ہوگئی بلکہ میں نے تہیہ کرلیا کہ اسے بے نقاب کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گی۔ شہر سے واپس آنے کے بعد میں دن رات شاہ مراد کی ٹوہ میں رہنے لگی۔ رفتہ رفتہ اس کی خفیہ سرگرمیاں میرے علم میں آتی گئیں۔ اس مقصد کے لیے مجھے متعدد مرتبہ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنا پڑا لیکن مجھے اپنی زندگی کی پروا ہوتی تو مجھے ڈر لگتا ناں!'' وہ دم لینے کے لیے رکی پھر گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا شاہ مراد کی غیر موجودگی میں اس کا کمرہ مقفل رہتا ہے۔ صفائی وغیرہ کا کام بھی اس کی موجودگی میں ہوتا ہے۔ ایک روز شام ڈھلے جب وہ کسی کام سے چند منٹ کے لیے کمرے سے نکلا تو میں موقع غنیمت جان کر اس کے کمرے میں گھس کر اس کی مسہری کے نیچے جا چھپی۔ شاہ مراد کمرے میں آنے کے بعد مسہری پر آرام کرنے کے بجائے دیواری الماری کی طرف بڑھا اور پھر اس کے اندر گھس کر میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ پہلے تو میں پریشان ہوئی لیکن پھر ہمت کر کے مسہری کے نیچے سے نکلی اور الماری کا جائزہ لیا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ وہ الماری دراصل تہ خانے میں اترنے کا راستہ ہے۔ خاصی دیر انتظار کے بعد میں تہ خانے میں اترنے والے زینے کے ذریعے اس جگہ پہنچ گئی۔ یہ تہ خانہ اس قسم کے چار وسیع و عریض کمروں پر مشتمل ہے۔ یہاں پہنچنے کے بعد میں نے شاہ مراد کو تلاش کیا لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ اس کو تلاش کرنے کی دھن میں مجھے ایک عجیب و غریب بات معلوم ہوئی۔''

انتا کہہ کر نسیم نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور ایک طرف چل پڑی۔ میں کلاشنکوف سنبھالے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ ساتھ والے ہال کمرے میں ایک دیوار گیر الماری کے پاس پہنچ کر وہ رک گئی پھر الماری کے دونوں پٹ کھول دیے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ الماری دراصل ایک زمین دوز سرنگ میں داخل ہونے کا دروازہ تھی۔ اس سرنگ کی اونچائی اور چوڑائی چھ فٹ سے زائد رہی ہوگی۔ سب سے زیادہ قابل توجہ اور دلچسپ چیز ریل کی چھوٹی چھوٹی پٹریاں تھیں جو سرنگ میں بچھی ہوئی تھیں۔ ایسی پٹریاں کوئلے اور دیگر معدنیات کی کانوں میں بچھی ہوتی ہیں جن پر معدنیات سے لدی ٹرالیاں دوڑتی ہیں۔ شاہ مراد کی حویلی اس ریلوے ٹریک کا پہلا اسٹیشن تھی۔ آخری اسٹیشن کے متعلق میں صرف اندازہ ہی لگا سکتا تھا۔

''میں یقین سے کہہ سکتی ہوں یہ سرنگ سیدھی سردار شاہ مراد کی سازشوں کے مرکز کی طرف جاتی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے۔ البتہ یہ مجھے معلوم ہے کہ شاہ مراد صبح ہونے سے پہلے نہیں لوٹے گا۔ تم اب مزید وقت ضائع نہ کرو اور جلد از جلد یہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش کرو۔'' نسیم نے بے قراری سے کہا۔

''لیکن اس کے لیے تو مجھے اوپر حویلی میں جانا ہوگا۔'' میری بات سن کر نسیم نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''شاہ مراد گاؤں آیا ہوا ہے لہٰذا حویلی پر کڑا پہرا ہے اور کارندے بھی پوری طرح مستعد ہیں۔ میں تمہیں یہاں سے فرار ہونے کا ایک اور راستہ بتاتی ہوں جو محنت طلب تو ضرور ہے لیکن کم خطرناک ہے۔''

''وہ کون سا راستہ ہے بھئی؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''تم یہیں ٹھہرو میں ابھی آتی ہوں۔'' نسیم نے کہا اور پھر ساتھ والے کمرے میں جا گھسی۔ وہ واپس لوٹی تو اس کے ہاتھوں میں ایک ٹارچ بیلچہ' کسی اور کدال موجود تھے۔ ''یہ سرنگ سطح زمین سے پانچ چھ فٹ گہرائی میں ہوگی۔ مٹی بھی زیادہ سخت یا ور پتھریلی نہیں ہے۔ تم اگر اوپر کی طرف کھدائی کرو تو دو ڈھائی گھنٹے کی محنت کے بعد زمین کے اوپر پہنچ سکتے ہو۔ البتہ اتنی احتیاط ضرور رکھنی ہوگی کہ یہ عمودی سرنگ گاؤں کی حد سے باہر نکل کر کھودی جائے۔''

''واقعی فرار کا یہ راستہ بہت عمدہ ہے۔ میں ابھی اپنی اس مہم پر نکلتا ہوں۔ اب تم بھی اوپر حویلی میں چلی جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری یہ کارروائی شاہ مراد کے علم میں آجائے اور وہ تمہیں اپنے عتاب کا نشانہ بنائے۔''

''اس کی تم فکر نہ کرو میں نے پورا انتظام کر رکھا ہے۔ اسے ساری عمر پتا نہیں چلے گا کہ یہ سب کیا دھرا میرا ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ مجھے یا حویلی کے کسی فرد کو تمہاری یہاں موجودگی کا علم ہو سکتا ہے۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا تھا کہ میں یہاں قید ہوں۔'' میں نے پوچھا۔

''میں نے شاہ مراد کی نقل و حرکت سے اندازہ لگایا تھا کہ تہ خانے میں کوئی غیر معمولی کارروائی جاری ہے۔ وہ دوپہر کے بعد کمرے میں گھسا تو شام کو باہر نکلا۔ پھر شہر کی طرف چلا گیا۔ موقع غنیمت جان کر میں چپکے سے کمرے میں گھس گئی۔ شاید میں نے تمہیں نہیں بتایا ہے کہ میں نے سخت جدوجہد کے بعد شاہ مراد کے کمرے کے ہضمی قفل کی ڈپلیکیٹ چابی حاصل کر لی ہے۔ خیر میں تہ خانے میں پہنچی تو میں نے تمہیں بے ہوشی کے عالم میں پابند سلاسل پایا۔ میں یہاں سے واپس چلی گئی اور مناسب موقع کا انتظار کرنے لگی۔ رات کو شاہ مراد شہر سے آیا اور سیدھا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ مجھے معلوم ہے کہ رات کو ایک مخصوص وقت پر وہ لازماً سرنگ کے راستے اپنے خفیہ ٹھکانے کی طرف چلا جاتا ہے جہاں سے اس کی واپسی صبح سے پہلے نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس مخصوص وقت کے بعد میں یہاں آگئی۔''

''تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے وہ میں زندگی بھر نہیں اتار سکتا میری بہن۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔'' میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''اس میں احسان کی کوئی بات نہیں ہے سیفل بھائی۔ تم نے اور ڈاکٹر صنم وغیرہ نے مجھے موت کے منہ سے نکالا اور جینے کا مقصد دیا ورنہ احساس گناہ مجھے خودکشی پر مجبور کر دیتا۔ شاہ مراد جیسے خونی درندے کے خلاف جہاد میں شریک ادنیٰ سپاہی کی حیثیت سے یہ میری ذمہ داری تھی جو میں آئندہ بھی نبھانے کی سر توڑ کوشش کروں گی۔''

''ٹھیک ہے' اب تم جاؤ۔ باقی کام میں خود سنبھال لوں گا۔'' میں نے ٹارچ' کدال' بیلچا اور کسی سنبھالتے ہوئے کہا۔ کلاشنکوف میں نے شانے سے ٹانگ لی تھی۔ جب کہ اس کا اضافی میگزین میں پہلے

ہی نیفے میں اڑس چکا تھا۔ نسیم دیر تک سرنگ کے سرے پر کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ حتیٰ کہ میں اندھیری سرنگ میں سوسوا سو گز دور نکل آیا۔ جب مجھے یقین آ گیا میں نسیم کی بصارت اور سماعت کی حد سے باہر آ چکا ہوں تو میں نے بیلچہ اور کدال وغیرہ ایک طرف پھینک دیے۔

اپنے ہدف کے اتنے قریب پہنچ کر اسے تباہ کرنے کے بجائے اپنی جان بچا کر نکل بھاگنا مجھے ہرگز گوارہ نہ تھا۔ یہ سرنگ مجھے سیدھی شاہ مراد کے اس خفیہ ٹھکانے تک لے جا رہی تھی جس کی تلاش کے دوران صدیقی اور مرزا پراسرار انداز میں غائب ہو گئے تھے اور جواد اور میں متعدد بار مرتے مرتے بچے تھے۔ سطح زمین پر اس ٹھکانے کو تلاش کرنا بہت مشکل تھا لیکن اب میری یہ مشکل خود بخود آسان ہو گئی تھی۔

میرا اندازہ تھا اگر میں تیز قدموں سے چلتا رہوں تو ڈیڑھ گھنٹے میں اس مقام تک پہنچ سکتا ہوں جہاں میرے اندازے کے مطابق شاہ مراد کا وہ خفیہ ٹھکانا ہو سکتا تھا کلاشنکوف کے میگزین میں سے پانچ گولیاں استعمال ہو چکی تھیں جبکہ لبالب میگزین میرے پاس موجود تھا۔ ان پچپن گولیوں کو احتیاط سے استعمال کرتا تو ایک اچھی خاصی فوج کو منہ توڑ جواب دے سکتا تھا۔ کلاشنکوف پر نصب ہلاکت خیز فولڈنگ سنگین بھی بے حد کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھے اچانک حملے کا اضافی فائدہ حاصل تھا۔ قبل اس کے کہ دشمن سنبھل پاتے میں انہیں ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتا تھا۔

سرنگ میں سفر میری توقع سے زیادہ طویل ثابت ہوا۔ بلا آخر مجھے بہت دور روشنی کی جھلک نظر آئی۔ میں نے فوراً اپنی ٹارچ بجھا دی۔ مزید آگے بڑھنے پر مجھے وہ جیپ نما گاڑی بھی نظر آنے لگی جو ان پٹڑیوں پر دوڑتی تھی۔ اس جگہ چھت پر ایک دودھیا لائٹ روشن تھی اور اس جگہ پر سرنگ خاصی چوڑی ہو گئی۔ میری کلاشنکوف انگارے برسانے کے لیے بالکل تیار تھی۔ پھر مجھے وہ راستہ بھی نظر آ گیا جو ان پڑیوں تک آتا تھا۔ ہر طرف مکمل سناٹے کی حکمرانی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہاں اس وقت کوئی ذی روح موجود نہ ہو۔ میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ میری کمر سرنگ کی دیوار سے ٹکی ہوئی تھی اور نظریں روشن راستے پر مرکوز تھیں۔ کسی بھی وقت کوئی وہاں سے برآمد ہو سکتا تھا۔

قدم بہ قدم سرکتا ہوا میں عین موڑ پر پہنچ گیا۔ پھر میں نے نہایت احتیاط سے بائیں طرف جانے والے راستے پر جھانکا۔ یہ ایک پختہ راہداری تھی جو تقریباً پندرہ گز آگے جا کر ایک بار پھر بائیں طرف مڑ گئی تھی جبکہ سامنے صرف ایک سپاٹ دیوار تھی۔ راہداری میں ہلکی روشنی کی دودھیا لائٹس نصب تھیں۔ شاہ مراد یقیناً اس راستے سے گیا ہوگا۔ تاہم اس وقت وہاں مکمل سناٹا طاری تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس جگہ کوئی کارندہ تعینات نہیں تھا۔ شاید وہ لوگ اس مقام کے تحفظ کی طرف سے کچھ زیادہ ہی مطمئن تھے۔ ان کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں ہوگی کہ کوئی اس انتہائی محفوظ اور خفیہ راستے سے بھی ان کی زیر زمین کمین گاہ میں گھس سکتا ہے۔ ویسے بھی یہ راستہ صرف اور صرف شاہ مراد کے لیے مخصوص تھا۔ اگر اس کے استقبال کے لیے کوئی موجود بھی تھا تو اب وہاں سے رخصت ہو چکا تھا۔

کچھ دیر سن گن لینے کے بعد میں راہداری میں آگے بڑھا۔ میرے پیروں تلے پختہ فرش تھا لیکن میں پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا تھا۔ موڑ پر پہنچ کر میں نے نہایت احتیاط سے بائیں طرف جھانکا۔ اگلے ہی لمحے مجھے نہایت تیزی سے پیچھے ہٹنا پڑا۔ یہ محض میری خوش قسمتی ہی تھی کہ شاہ مراد اس وقت سامنے نہیں دیکھ رہا تھا۔ ورنہ اس کی نظر تقریباً مجھ پر پڑ جاتی۔ وہ سیدھا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا موڑ سے فاصلہ تیس گز کے لگ بھگ رہا ہوگا۔

میں پلٹا اور برق رفتاری سے دوڑتا ہوا سرنگ میں پہنچ گیا لیکن اگر شاہ مراد اس جیپ نما گاڑی میں بیٹھ کر اس کی ہیڈ لائٹس روشن کرتا تو میں اس کی نظروں سے چھپ نہیں سکتا تھا۔ اسی خدشے کے باوجود میں سرنگ میں حویلی کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں ٹھہر گیا۔ اب میں گہری تاریکی کی پناہ گاہ میں تھا۔ میری کلاشنکوف کی نال کا رخ پٹڑی پر موجود گاڑی کی جانب تھا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ ہیڈ لائٹس روشن ہونے پر شاہ مراد کی طرف سے کوئی کارروائی ہونے سے پہلے ہی میں اسے مار گراؤں گا۔

چند لمحوں بعد مجھے شاہ مراد نظر آیا۔ گاڑی کے پاس پہنچ کر اس نے پائے دان پر پاؤں رکھا اور گاڑی میں گھس گیا۔ میں کلاشنکوف گولیوں کا مینہ برسانے کے لیے بالکل تیار تھا لیکن کئی سیکنڈ گزرنے کے بعد بھی شاہ مراد نے گاڑی کی ہیڈ لائٹس نہ جلائیں نہ ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔ تقریباً دو منٹ بعد میں نے اسے ایک بار پھر گاڑی سے اترتے دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں کاغذ کے دو تین بڑے بڑے رول موجود تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ رول جغرافیائی نقشے ہو سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں اگر یہ نقشے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو میں باآسانی شاہ مراد کی سازش کے تار و پود بکھیر سکتا تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ میں یہ نادر موقع ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔ چنانچہ شاہ مراد کے راہداری میں گھستے ہی میں تیزی سے آگے بڑھا۔ میں راہداری کے سرے پر پہنچا تو وہ بائیں طرف مڑ رہا تھا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد میں ایک بار پھر آگے بڑھا اور راہداری کے موڑ پر پہنچ گیا۔ شاہ مراد نقشوں کے بنڈل اٹھائے متوازن قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ یہ ایک طویل راہداری تھی جس میں سے دو راستے دائیں اور بائیں طرف نکل رہے تھے لیکن شاہ مراد سیدھا جا رہا تھا۔ راہداری کے آخری سرے پر مزید دو راستے دائیں اور بائیں طرف نکل رہے تھے۔ وہ راہداری کے سرے پر پہنچ کر بائیں طرف مڑ گیا۔

مجھے فوری طور پر اس کے تعاقب میں جانا تھا لیکن یہ خطرہ بدستور میرے سر پر منڈلا رہا تھا کہ میں اس تک پہنچنے سے پہلے کسی کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ ایسی صورت میں مجھے زندگی کے لالے پڑ سکتے تھے۔ قدرے توقف کے بعد میں خدا کا نام لے کر شاہ مراد کے نقش قدم پر چل پڑا۔ میری نظریں سرچ لائٹ کی مانند گردش کر رہی تھیں اور کلاشنکوف گولیوں کی بارش کرنے کے لیے بے تاب تھی۔

راہداری کے عین درمیان میں دونوں طرف نکلنے والے راستوں کے موڑ پر پہنچ کر میں رک گیا اور نہایت احتیاط سے دائیں طرف کے ماحول پر نظر ڈالی۔ اس کے ساتھ ہی میں چونکنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ طویل راہداری ایک طویل و عریض میدان نما جگہ پر نکلتی تھی۔ اس چھوٹے سے میدان میں مجھے فوجی ساخت کے متعدد ٹرک اور لینڈ کروزر ٹائپ گاڑیاں نظر آئیں۔ ان گاڑیوں کے آس پاس کوئی موجود نہیں تھا اور ہر طرف مکمل سناٹا طاری تھا۔ اس صورت حال کا بغور جائزہ لینے کے بعد میں نے بائیں طرف دیکھا۔ یہ چھوٹی سی راہداری پندرہ گز طویل تھی جس میں دو کمروں کے دروازے کھلتے تھے لیکن اس وقت وہ دونوں ہی بند تھے۔

میں پہلے شاہ مراد کے ٹھکانے کا پتا لگانا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں میدان کا منظر فراموش کر کے آگے چل پڑا۔ راہداری کے سرے پر پہنچ کر میں نے پہلے دائیں طرف کا جائزہ لینا مناسب سمجھا۔ یہ ایک طویل راہدای آگے جا کر بند ہو گئی تھی جبکہ اس میں تین کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے جو اس وقت بند تھے۔ میرں توقع کے عین مطابق بائیں طرف صرف ایک کمرا تھا۔ شاہ مراد یقیناً اسی کمرے میں گھسا تھا۔ میں دبے پاؤں کمرے کے دروازے پر پہنچا اور اسے دھیرے سے اندر دھکیلنے کی کوشش کی۔ اگر چہ مجھے پہلے سے اندازہ تھا۔ اس کے باوجود دروازے کو ٹس سے مس نہ ہوتے دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ یہ دروازہ میرے ارادوں کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہو گیا تھا۔ شاہ مراد غیر معینہ وقت کے لیے کمرے میں بند ہو چکا تھا۔ اس کے کمرے سے برآمد ہونے کا انتظار کرنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں کسی بھی وقت نظروں میں آ سکتا تھا۔ اس کے بعد میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔ نہ صرف مجھے اپنی جان کے لالے پڑ جاتے بلکہ شاہ مراد بھی صاف بچ نکلتا اور اپنے مزموم ارادوں پر عمل کر ڈالتا۔ مجھے جلد از جلد یہ دروازہ کھلوا کر اس تک پہنچنا تھا۔

میرا ذہن برق رفتاری سے سوچ رہا تھا کوئی ایسی ترکیب جس سے شاہ مراد کو خطرے کا احساس بھی نہ ہو اور وہ اپنی مرضی سے دروازہ کھول دے۔ تب میری نظر دروازے کے نیچے سے جھلکنے والی تیز روشنی پر پڑی۔ میرے ذہن میں ہلکا سا جھماکا سا ہوا۔ میں نے تیزی سے اس راہداری کے در و دیوار پر نظر دوڑائی۔ میری یہ کاوش رائیگاں نہیں گئی۔ بائیں طرف راہداری کے آخری سرے کی دیوار پر ایک آہنی بکس نظر آ رہا تھا۔ میں تیزی سے اس طرف بڑھا۔ میری توقع کے عین مطابق اس بکس میں بجلی کا مین سوئچ اور سرکٹ بریکرز وغیرہ نصب تھے۔ میں نے تینوں سرکٹ بریکرز کا بغور جائزہ لے کر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ ان میں سے کس کا تعلق شاہ مراد کے کمرے سے ہو سکتا ہے۔ قدرے غور کے بعد میں نے ایک سرکٹ بریکر کا انتخال کیا اور اللہ کا نام لے کر لیور گرا دیا۔ یک لخت راہداری میں نصب تمام لائٹس آف ہو گئیں۔ میں تیز تیز قدموں شے شاہ مراد کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اسی کمرے کے دروازے کے نیچے سے جھلکنے والی روشنی بھی دم توڑ چکی تھی۔ میں نے کلاشنکوف پر گرفت مضبوط کر لی اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

اچانک میں نے کمرے میں سے شاہ مراد کی دبی دبی آواز سنی۔ وہ ڈانٹنے کے انداز میں کسی سے مخاطب تھا۔

"ہاں لائٹ چلی گئی ہے۔ جلدی آ کر دیکھو کیا مسئلہ ہے۔۔۔ باقی سب جگہ لائٹ موجود ہے۔"

مجھ پر مایوسی کا شدید حملہ ہوا۔ وہ خبیث شاید انٹرکام پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ خود باہر نکلنے کے بجائے وہ اپنے کسی کارندے سے کام لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ قطعاً سازگار صورت حال نہیں تھی۔ اگر برقی رو بحال ہو جاتی تو نہ صرف میرا شاہ مراد کو کمرے سے باہر نکالنے کا مقصد پورا نہ ہوتا بلکہ میرے لیے خود کو پوشیدہ رکھنا بھی ناممکن ہو جاتا۔

چند لمحوں بعد میں نے شاہ مراد کے کمرے میں ایک بار پھر روشنی کی جھلک دیکھی لیکن وہ نسبتاً دھیمی تھی۔ غالباً اس نے ایمرجنسی لائٹ آن کر لی تھی۔ اس کی طرف سے مایوسی کے بعد میں تیزی سے راہداری کے موڑ پر جا پہنچا۔ شاہ مراد کے کارندے کسی بھی وقت پہنچنے والے تھے۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ سناٹے میں چاپ کی آواز ابھری اور تیز روشنی کا دائرہ سامنے والی دیوار پر نمودار ہوا۔ میں نے سانس روک لی اور حرکت میں آنے کے لیے تیار ہو گیا۔

بھاری جسامت اور دراز قد کا مالک وہ شخص نہایت بےفکری سے راہداری کے موڑ پر نمودار ہوا اور فوراً ہی دائیں طرف مڑ گیا۔ اس کے ہاتھ میں روشن طاقتور ٹارچ کا رخ سرکٹ بریکرز والے بکس کی طرف تھا۔ میں نے اسے چند قدم بڑھنے دیا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے اس پر جھپٹا۔ اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار تو کیا لیکن اس کے مڑ کر دیکھنے سے پہلے ہی میں اس تک جا پہنچا۔ میری کلاشنکوف کا بٹ اس کی گدی اور کھوپڑی کے سنگم پر پڑا۔ ایک بےساختہ کراہ اس کے حلق سے خارج ہوئی اور وہ کٹے درخت کی مانند پختہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کی ٹارچ خاصی آواز کے ساتھ فرش سے ٹکرائی لیکن اس نے اجالا بکھیرنے کا فریضہ ترک نہیں کیا۔ میں نے ٹارچ سنبھال لی اور شاہ مراد کی طرف سے کسی ردعمل کا انتظار کرنے لگا۔ میرے اندیشے غلط ثابت ہوئے۔ شاہ مراد نے کمرے سے باہر جھانکنے کی زحمت نہ کی۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر میں ایک بار پھر الیکٹرک سپلائی کے کنٹرول بکس کے پاس جا پہنچا۔ قدرے توقف کے بعد میں نے سرکٹ بریکر کا لیور آن پوزیشن پر کر دیا۔ راہداری کی لائٹس ایک بار پھر روشن ہو گئیں۔ دس تک گنتی گننے کے بعد میں نے ایک بار پھر سرکٹ بریکر کا لیور گرا کر برقی رو منقطع کر دی۔ اس بار میں نے بیس تک گنتی گن کر برقی رو بحال کر دی۔ لیکن محض تین سیکنڈ بعد ایک بار پھر سرکٹ بریک کر دیا۔ راہداری میں اندھیرا پھیلتے ہی میں نے برق رفتاری سے شاہ مراد کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ صورت حال سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے اپنی کمین گاہ سے ضرور باہر نکلے گا۔

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں حساس کانوں نے دروازے کی ناب گھومنے کی آواز سنی۔ دروازہ تھوڑا کھلتے ہی مجھے شاہ مراد کے بڑبڑانے کی آواز سنی اور اپنے نااہل ماتحتوں کو

مغلظات سے نواز رہا تھا۔ پھر وہ دروازے میں نمودار ہوا۔ عین اسی وقت میں نے کلاشنکوف کی نال اس کے سینے پر رکھ دی۔ اس اچانک صدمے نے لمحاتی طور پر اسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بے گانہ کر دیا اور وہ اپنی جگہ پر سنجیدہ ہو کر رہ گیا۔ اس کے چہرے کی رنگت سفید پڑ گئی تھی اور آنکھیں میرے چہرے سے چپک کر رہ گئیں تھیں۔ میں نے فولادی نال سے اس کے سینے پر ٹھوکا دیا تو وہ ہڑبڑا کر اپنے ہوش وحواس میں واپس آ گیا۔ میں نے اس کے دائیں ہاتھ میں موجود ایمرجنسی لائٹ میں واضح لرزش محسوس کی۔ میں نے اسے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ تب میری نظر سامنے موجود جہازی سائز بیڈ پر پڑی اور میں چونک اٹھا۔ وہ کوئی جواں سال عورت تھی جو ایک باریک گاؤن میں لپٹی محو خواب تھی۔ اس کا لباس بھی مجھے قریبی صوفے پر پڑا نظر آ گیا۔ اس کا چہرہ دوسری طرف تھا لہٰذا میں اسے فوری طور پر پہچاننے میں ناکام رہا۔ اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہ پا کر میں شاہ مراد کی طرف متوجہ ہوا۔ ''یہ لائٹ میز پر رکھ کر دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا لو۔ ہلکی سی آواز بھی نکالی تو نتیجہ موت کی شکل میں نکلے گا۔'' دھیمے لہجے کے باوجود میں اسے اپنے ارادے کی پختگی کا یقین دلانے میں کامیاب رہا۔ شاہ مراد نے میری ہدایت پر چپ چاپ عمل کیا۔ میں نے اشارے سے اسے کمرے کی دیوار کے پاس کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ اس نے جانے کیا نتیجہ اخذ کیا کہ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔ ''مم۔۔۔مم۔۔۔ مجھے مت مارو۔۔۔ خدا کے لیے۔۔۔''

میں اس کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک میں نے بستر پر دراز عورت کو بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آتے دیکھا۔ مجھے اس کے دائیں ہاتھ میں کسی چمک دار چیز کی جھلک نظر آئی۔ میں اضطراری طور پر اس کی طرف گھوما۔ عین اسی وقت کمرہ زوردار دھماکے سے گونج اٹھا۔ خدا جانے یہ اس کی جلد بازی کا نتیجہ تھا یا میری خوش قسمتی کہ گولی میرے دائیں شانے پر سے سنسناتی ہوئی گزری اور دیوار میں پیوست ہو گئی۔ اگلے ہی لمحے میری کلاشنکوف کا بٹ اس کی کنپٹی سے ٹکرایا اور وہ تیورا کر بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرنے والا نقرئی پستول فرش پر بچھے قیمتی قالین پر جا گرا۔ تب میں نے پہلی بار اس عورت کو غور سے دیکھا۔ اس کا حسین چہرہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا وہ ندا تھی۔

ندا کو زخمی ہو کر گرتے دیکھ کر شاہ مراد پر وحشت طاری ہو گئی۔ وہ دیوانہ وار آگے بڑھا اور ضرب کا نشانہ بننے والی ندا پر جھک گیا۔ ''نرملا۔۔۔ آہ۔۔۔ نرملا۔۔۔ ہوش میں آؤ۔ اف میرے خدا یہ کیا ہو گیا اس نے ندا کو گرا دیکھا تھا صاف ظاہر تھا کہ وہ اس سے جذباتی طور پر ہو چکا ہے۔ شاہ مراد کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ میں اس کی حالت کا بغور جائزہ لے رہا ہوں۔ چنانچہ ندا کو چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور خون خوار لہجے میں بولا۔ ''تمہیں اپنی حرکت کا حساب چکانا ہو گا۔ میں قسم کھاتا ہوں تمہیں ایسی اذیتیں دے کر ماروں گا کہ مرنے کے بعد تمہاری روح بھی قیامت تک تڑپتی رہے گی۔'' ''زیادہ بڑکیں مارنے کی ضرورت نہیں بڑے میاں ورنہ میں تمہارا ابھی وہی حشر کروں گا جو تمہارے تیس مار خان بیٹے کا کیا تھا۔

شاید تیری نسل کا خاتمہ میرے ہی ہاتھوں لکھا ہے۔''

میری بات سن کر شاہ مراد کا پارہ آسمان سے چھونے لگا اور اس نے مجھ پر مغلظات کی بارش کر دی۔ تنگ آ کر میں نے ایک زوردار چانٹا اس کے منہ پر دے مارا۔ یک دم اس کی زبان کو بریک لگ گئی۔ ضرب کی شدت نے اسے سن کر دیا تھا۔ میں نے نرملا کا پستول اپنے قابو میں کرتے ہوئے کہا۔ ''شاہ مراد تم اپنے آپ کو زمینی خدا سمجھ بیٹھے ہو۔ مجھے خدا نے شاید تمہیں تمہاری اوقات یاد دلانے کے لیے پیدا کیا ہے۔ یقین کرو تم جیسے شیطان صفت انسان کو جہنم رسید کر کے مجھے بے حد خوشی ہو گی لیکن میں تمہارے خون سے اپنے ہاتھ گندے نہیں کروں گا۔ تم میرے ہی نہیں ملک و قوم کے بھی مجرم ہو۔ تمہیں اس وقت تک زندہ رہنا پڑے گا۔ جب تک تم اپنی زبان سے اپنے تمام کرتوتوں کا اعتراف نہ کر لو۔''

''اگر تم سمجھ رہے ہو کہ تم یہاں سے بچ کر نکل جاؤ گے تو یہ تمہاری بھیانک غلط فہمی ہے سیفل۔'' شاہ مراد نے پژمردہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے برسوں کی محنت اور کروڑوں کی لاگت سے یہ ٹھکانا تعمیر کرایا ہے۔ میری مرضی کے بغیر یہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ اب یہاں سے تمہاری لاش ہی باہر جائے گی۔ میرے کارندے بس پہنچنے ہی والے ہیں۔ تم نے نرملا پر ہاتھ اٹھا کر اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیے ہیں۔''

''تم میری فکر نہ کرو۔ انشاءاللہ نہ صرف میں بخیریت یہاں سے باہر جاؤں گا بلکہ تمہیں بھی گردن سے پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تم سے حساب کتاب کرنے کے لیے تو بہت سے لوگ بے تاب ہیں۔ اب تم اپنے ہاتھ کمر کی طرف کر لو۔ میرا خیال ہے یہ یاد دلانے کی تو ضرورت نہیں کہ کسی بھی قسم کی زور آزمائی یا چالاکی دکھانے کا نتیجہ گرما گرم گولی کی صورت میں ملے گا۔ شاباش جلدی کرو۔'' نرملا کے ریشمی ازار بند سے شاہ مراد کے ہاتھ جکڑتے ہوئے مجھے بے حد احتیاط اور مہارت سے کام لینا پڑا۔ تاہم شاہ مراد نے مزاحمت کی کوشش نہیں کی۔ وہ سوالیہ نظروں سے مجھے گھور رہا تھا جبکہ میں خود بھی حتمی طور پر فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ میرا آئندہ قدم کیا ہو گا۔

میرا ذہن تیزی سے صورت حال کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھا۔ شاہ مراد میرے قبضے میں ہے اور اس کے لائے ہوئے نقشے بھی سامنے میز پر موجود ہیں۔ اگر میں شاہ مراد کو نقشوں سمیت قومی سلامتی کے خفیہ ادارے کے حوالے کر دوں تو تمام سازشیں بے نقاب ہو سکتی ہیں لیکن شاہ مراد کو ساتھ لے کر اس خطرناک جگہ سے فرار ہونا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ شاہ مراد کے کارندے مجھے روکنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔ کسی کہنہ مشق نشانہ باز کی انگلی کی ہلکی سی جنبش مجھے اور میرے ارادوں کو مٹی میں ملا سکتی ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں۔

اچانک میری نظر دیوار گیر الماری پر پڑی جس کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ الماری کے سامنے والے خانے میں ایک ایسی شے موجود تھی جسے کئی بار بہت قریب سے دیکھ چکا تھا۔ یہ اسی ساخت کا ٹرانسمیٹر تھا

جو میں پہلے شاہ مراد کی شہر والی حویلی اور پھر کوئٹہ میں نعمت شیخ کے بنگلے میں دیکھ چکا تھا۔ شاہ مراد کی حویلی سے برآمد شدہ ٹرانسمیٹر کو میں ڈاکٹر صنم کے گھر لے گیا تھا اور میرے وہاں سے رخصت ہونے تک وہ وہیں موجود تھا۔ اگر میں شاہ مراد کو اس ٹرانسمیٹر کا کوڈ نمبر اور افضل والے ٹرانسمیٹر کی فریکوئنسی بتانے پر مجبور کر دیتا تو میں ڈاکٹر صنم کے گھر رابطہ کر کے اپنے ساتھیوں کو تمام صورت حال سے آگاہ کر سکتا تھا۔ اس کے بعد شاید کوئی زیادہ بہتر صورت حال سامنے آ جاتی لیکن اصل مسئلہ شاہ مراد کو اپنی بات ماننے پر مجبور کرنا تھا۔

''مائی ڈیئر سردار سائیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں شاہ مراد کو مخاطب کیا۔ ''اتنا تو تم سمجھ ہی چکے ہو کہ آج رات تمہارے لیے صرف اور صرف مصیبتیں لے کر آئی ہے۔ بالفرض تمہارے کارندے مجھ تک پہنچ بھی جائیں تو تمہیں میری گولی سے نہیں بچا سکتے اور یقین کرو تمہیں اور تمہاری چہیتی نرملا عرف ندا کو گولی کا نشانہ بنا کر مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ اور ہاں یہ سوچ کر خوش ہونے کی ضرورت نہیں کہ میں تم دونوں کو کھوپڑیوں میں گولیاں اتار کر تمہیں دنیا کے جھنجٹوں سے نجات دلا دوں۔ میں تم دونوں کے چاروں ہاتھ پاؤں کے جوڑوں پر کلاشنکوف کی گولیاں برساؤں گا تاکہ تم سسک سسک کر موت کے منہ میں جاؤ اور بالفرض زندہ بچ جاؤ تو ساری دنیا کے لیے عبرت کا نمونہ بن کر زندگی گزار رو۔''

میری بات سن کر شاہ مراد کے چہرے پر زردی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے کمزور لہجے میں کہا۔ ''آخر تم چاہتے کیا ہو؟ اگر تم مجھے یرغمال بنا کر یہاں سے فرار ہونا چاہو تو یہ تمہاری بہت بڑی غلطی ہوگی۔ ہماری تنظیم کا دستور ہے کہ اگر کوئی اہم شخص کسی وجہ سے فرائض انجام دینے کے قابل نہ رہے تو اس کا نائب خود بخود اختیار سنبھال لیتا ہے اور پھر صرف اس کا حکم چلتا ہے۔ یہاں پر میرا نائب اس ڈمپ کا چیف سیکیورٹی آفیسر ہے۔ وہ تمہیں کسی قیمت پر یہاں سے نکلنے کا موقع نہیں دے گا۔ ایسے میں اسے تمہارے ساتھ مجھے بھی اڑانا پڑا تو وہ ذرہ بھر ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ صرف میری خاطر وہ اتنے اہم کیمپ کو خطرے میں نہیں ڈالے گا۔''

''اچھا ہوا تم نے مجھے یہ بتا دیا ورنہ شاید میں یہی کچھ کرتا۔'' میں نے مطمئن لہجے میں کہا۔ ''بہرحال فی الوقت تم میرا ایک چھوٹا سا کام کر دو۔ اس کے بعد میں سوچوں گا کہ ہم کس طرح یہاں سے بچ کر نکل سکتے ہیں۔''

''ہاں بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ میں آگے بڑھا اور الماری سے ٹرانسمیٹر نکال کر اسے بیڈ پر رکھ دیا۔ ''تم مجھے اس ٹرانسمیٹر کے استعمال کا طریقہ بتاؤ۔ اگر تم نے انکار یا ٹال مٹول کی کوشش کی تو اپنی موت کا وقت قریب لانے کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکو گے۔ چلو شروع ہو جاؤ پہلے تم مجھے اس کا لاک کھولنے کا کوڈ نمبر بتاؤ۔''

''اس ٹرانسمیٹر کے ذریعے آخر تم کس سے بات کرنا چاہتے ہو؟'' شاہ مراد نے مضطرب لہجے میں

پوچھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''تمہیں شاید اپنی اور اپنی محبوبہ کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے میں نرملا سے ابتدا کرتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر میں نے کلاشنکوف کا رخ بے ہوشی میں غرق نرملا عرف ندا کے پیروں کی جانب کر دیا۔ ''ٹھہرو' ٹھہرو میں بتاتا ہوں لیکن تمہیں نہایت احتیاط سے کوڈ نمبر انٹر کرنے ہوں گے ورنہ یہ لاک جام ہو جائے گا۔''

میں نے شاہ مراد کے بتائے ہوئے نمبر انٹر کیے' ہلکی سی کلک کی آواز پیدا ہوئی اور ٹرانسمیٹر کے لاک کھل گئے۔ وہ ٹرانسمیٹر اندر سے بالکل ویسا ہی تھا جیسا میں کوئٹہ میں نعمت شیخ کے گھر دیکھ چکا تھا۔ ''اب تم افضل کے ٹرانسمیٹر کی فریکوئنسی بتاؤ۔'' اس مرتبہ اس نے بغیر کسی مزاحمت کے مجھے مزکورہ فریکوئنسی سے آگاہ کر دیا۔ اب وہ منتظر تھا کہ میں اس سے ٹرانسمیٹر کے استعمال کا طریقہ پوچھوں گا۔ میں نے اسے مایوس نہیں کیا۔ ''اب یہ بھی بتا دو کہ اسے کیسے استعمال کیا جاتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''دیکھو یہ کوئی عام سا ٹرانسمیٹر نہیں ہے۔ اسے استعمال کرنے کے لیے خاصے تجربے مہارت کی ضرورت ہے۔ اگر تم سے ذرا سی بھی گڑبڑ ہو گئی تو نہ صرف یہ خراب ہو جائے گا بلکہ اس خرابی کی اطلاع ایسے ٹرانسمیٹر رکھنے والے تمام افراد کو ہو جائے گی۔ تم کچھ دیر کے لیے میرے ہاتھ کھول دو۔ تم جہاں کہو گے میں تمہارا رابطہ کرا دوں گا۔ اس کے بعد بے شک تم دوبارہ میرے ہاتھ باندھ دینا۔''

''میں تم سے یہی بات کہلوانا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تم بہانہ بنا کر اپنے ہاتھ کھلوانا چاہو گے تاکہ اس ٹرانسمیٹر کے ذریعے مجھ سے نظر بچا کر اپنے ساتھیوں کو خطرے کا سگنل دے سکو۔ اب تم چپ چاپ کونے میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں یہ ٹرانسمیٹر آپریٹ کرنا جانتا ہوں۔ تم شاید بھول گئے ہو کہ ایسا ہی ٹرانسمیٹر تم لوگوں نے کوئٹہ میں نعمت شیخ کو بھی دیا تھا۔ میں اس ٹرانسمیٹر پر اچھی خاصی پریکٹس کر چکا ہوں۔''

اپنی چال ناکام ہوتے دیکھ کر اس پر مایوسی طاری ہونے لگی۔ پھر وہ مایوسی غصے میں تبدیل ہو گئی لیکن اس مرتبہ اس نے اپنی مغلظات کو زبان پر آنے نہیں دیا۔ میں افضل کے ٹرانسمیٹر سے رابطہ قائم کرنے ہی والا تھا لیکن پھر میں نے لمحاتی طور پر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ شاہ مراد کی نظریں اور کان میری ہی طرف لگے ہوئے تھے۔ میں ٹرانسمیٹر کے پاس سے ہٹ کر شاہ مراد کی سرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا' نقرئی پستول کا دستہ اس کی کھوپڑی سے ٹکرایا۔ اس کے حلق سے کرب ناک کراہ خارج ہوئی۔ اگلے لمحے وہ قالین پر ڈھے گیا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں کمرے سے نکل کر راہداری میں پہنچا۔ وہاں بدستور تاریکی کا راج تھا۔ میں ٹارچ کے سہارے آگے بڑھا۔ برقی رو بحال کرنے کے لیے آنے والا شخص اسی پوزیشن میں پڑا تھا۔ جس میں، میں چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے اس کی بغل میں ہاتھ ڈال کر گھسیٹنے کی کوشش کی۔ تب مجھے علم ہوا کہ وہ جان ہار بیٹھا ہے۔ اس کی موت پر افسوس کرنے کا موقع تھا نہ گنجائش۔ میں اسے گھسیٹتا ہوا شاہ مراد کے کمرے میں لے آیا۔ اس کے قبضے سے ایک پستول برآمد ہوا

تھا۔اس کے بعد میں ایک بار پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔سرکٹ بریکر کے ذریعے برقی رو بحال کرنے کے بعد میں اس جگہ پہنچا جہاں میں نے اس شخص کو مار گرایا تھا۔ مجھے وہاں ایسی کوئی علامت نظر نہ آئی جو اس واقعے کی چغلی کھاتی ہو۔پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد میں ایک بار پھر شاہ مراد کے کمرے میں آ گیا اور دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔

ٹرانسمیٹر پر رابطہ کرتے ہوئے میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔خدا جانے ڈاکٹر صنم کے گھر پر کس قسم کے حالات ہوں۔میں اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو پاؤں یا نہیں۔نصف گھنٹے کی لگا تار کوشش کے بعد مجھ پر مایوسی طاری ہونے لگی تھی کہ اچانک ایک کھرکھراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ کوئی انگریزی میں مجھ سے مخاطب تھا۔" تم کون ہو؟ اپنی شناخت کراؤ۔" وہ آواز میرے لیے قطعاً اجنبی تھی لہٰذا مجھے بھی محتاط ہونا پڑا۔ " تم کون ہو اور اس فریکوئنسی پر کیوں موجود ہو؟ پہلے تم اپنی شناخت کراؤ۔" دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔پھر اسی آواز نے پوچھا۔" اچھا یہ بتاؤ تم کس سے بات کرنا چاہتے ہو؟ رابطہ تم نے کیا ہے لہٰذا تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس طرف کون ہوگا۔" بولنے والے کے لہجے میں پختگی اور ذہانت کی جھلک نمایاں تھی۔میں نے نہایت سوچ سمجھ کر اپنے الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے کہا۔" میں ڈاکٹر یا کیمسٹ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔مجھے اس مرض کا پتا کرنا ہے جسے میں نے ایڈمٹ کرایا تھا۔اس کی تیمارداری کے لیے میں نے اپنا بابا بھی بھیجا تھا۔"

" اوہ! تم ۔۔۔تم سیف داد خان بات کر رہے ہو؟" بات کرنے والے نے اچانک پر جوش لہجے میں پوچھا۔اس کا سوال اتنا بے ساختہ تھا کہ میں چونک اٹھا۔جلدی بتاؤ۔تم سیف داد ہی بات کر رہے ہو ناں؟ فکر نہ کرو میں تمہارا دشمن نہیں بلکہ دوست ہوں۔مرزا اور صدیقی میرے کولیگ ہیں۔اس معاملے کا چارج اب میرے پاس ہے۔" اس کے لہجے میں اتنا اعتماد اور بے ساختگی تھی کہ مجھے اس کی سچائی تسلیم کرنا پڑی۔" آپ نے صحیح پہچانا۔میں سیف ہوں۔یہ ٹرانسمیٹر آپ کے پاس کیسے پہنچا؟ کیا آپ اب بھی ڈاکٹر کے گھر سے بات کر رہے ہیں؟"

" ہم یہ ٹرانسمیٹر اور مہمان ڈاکٹر کے گھر سے ہٹا چکے ہیں لیکن ہم اب اسی شہر میں ہیں۔ساری صورت حال ہمارے علم میں آ چکی ہیں اور ہم بھرپور ایکشن کی تیاریاں مکمل کر چکے ہیں۔پہاڑی بستی والے سردار نے ہمیں سب کچھ بتا دیا تھا۔اب تم بتاؤ کہ اس وقت تم کہاں ہو اور یہ ٹرانسمیٹر تمہارے ہاتھ کیسے لگا جس پر تم بات کر رہے ہو؟"

" یہ ایک طویل داستان ہے جناب۔میں مختصراً بتا دیتا ہوں۔" میں نے اپنے کوئٹہ اور پھر شاہ مراد کی کوٹھی تک پہنچنے اور بالآخر سرنگ کے راستے شاہ مراد کی اس کمین گاہ تک پہنچنے اور شاہ مراد پر قابو پانے کی روداد مختصراً سنا دی۔یہ سب سن کر اختر فاروقی نامی شخص حیرت اور خوشی سے گنگ ہو کر رہ گیا۔" اف میرے خدا! میں نے تمہارے بارے میں جو کچھ سنا تھا تم اس سے بڑھ کر ہو۔تم نے اس شخص کو بے بس کر دیا جس

پر ہاتھ ڈالنے کی تیاریاں ہم کئی برسوں سے کر رہے ہیں۔تم نے اس جگہ کی کیفیت بتائی ہے اب کے لحاظ سے وہاں تک پہنچنا اور پھر شاہ مراد کے کارندوں سے ٹکرانا اور انہیں شکست دینا آسان نہیں ہوگا۔ہمیں تو اس جگہ کا صحیح محل وقوع بھی معلوم نہیں ہے۔مجھے یقین ہے کہ شاہ مراد کا یہ ٹھکانہ زیر زمین ہوگا۔"

" جی ہاں! اور شاہ مراد کے مطابق یہ ٹھکانہ ایک ناقابل تسخیر قلعہ ہے۔اس کا محل وقوع سمجھنے میں میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں لیکن آپ اس جگہ پہنچنے سے پہلے شاہ مراد کے کارندوں کی نظر میں آ جائیں گے اور آپ کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

" اس کی تم فکر نہ کرو' اختر فاروقی صاحب نے مجھے اطمینان دلایا۔" میں بہت بڑی فورس کے ساتھ آپریشن کروں گا۔اگر ہم اس اڈے پر قبضہ نہ کر سکے تو اس جگہ کو بارود سے اڑا دیں گے تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری لیکن اس سے پہلے تم یہ پتا لگانے کی کوشش کرو کہ مرزا اور صدیقی کو کہاں رکھا گیا ہے۔ اگر وہ وہیں ہیں تو ہمیں انہیں پہلے وہاں سے نکالنا ہوگا اور یہ کام تمہیں کرنا ہوگا۔"

" آپ فکر نہ کریں میں ابھی ان کا پتا لگاتا ہوں اگر وہ مل گئے تو انشاءاللہ میں انہیں بہ حفاظت یہاں سے نکال لے جاؤں گا۔آپ ٹرانسمیٹر کے قریب رہیں میں آپ سے دوبارہ رابطہ قائم کروں گا۔" میں نے کہا اور ٹرانسمیٹر آف کر دیا۔میرے حوصلے دوچند ہو گئے تھے۔میں اس اندیشے سے آزاد ہو گیا تھا کہ خدانخواستہ مجھے کوئی حادثہ پیش آ گیا تو شاہ مراد کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

میں نے شاہ مراد اور ندا کی کیفیت کا جائزہ لیا۔وہ دونوں گہری بے ہوشی میں نظر آ رہے تھے لیکن میں نے احتیاطاً شاہ مراد کے بندھنوں کا ایک بار پھر جائزہ لیا اور بیڈ شیٹ پھاڑ کر اس کی پٹیوں سے اس کے پیروں کو بھی جکڑ لیا۔اس کے بعد میں نے ندا کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔شاہ مراد کے لباس کی تفصیلی تلاشی لینے پر اس کے کمرے کی چابی بھی میرے ہاتھ لگ گئی۔میں نے ان دونوں کو کمرے کے الگ الگ کونوں میں پٹخا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔دروازے کو لاک کرنے کے بعد میں خاصی حد تک مطمئن ہو گیا۔اب مجھے مرزا اور صدیقی کو تلاش کرنا تھا۔جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ یہیں کہیں آس پاس موجود ہیں۔

میں نے سب سے پہلے اس راہداری میں موجود دوسرے کمرے میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ کمرے کے دروازے کے پاس پہنچ کر میں نے اسے اندر کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی لیکن اس میں ہلکی سی جنبش بھی نہیں ہوئی۔میں نے مایوسی کی لہر کو نظر انداز کر کے ایک موہوم سی توقع کے سہارے شاہ مراد کے کمرے کی چابی قفل کے سوراخ میں ڈال کر گھما دی۔ہلکی سی کلک سنائی دی۔اس کے ساتھ ہی میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔کمرے کا لاک کھل چکا تھا۔میں نے پستول سنبھالتے ہوئے دروازہ کو دھکا دیا۔ کمرے کے اندر مکمل تاریکی کا راج تھا۔مجبوراً مجھے ٹارچ روشن کرنا پڑی۔اس کمرے میں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔البتہ ایک دلچسپ اور عجیب و غریب منظر نے میری توجہ حاصل کر لی۔کمرے کی چاروں

دیواروں کے ساتھ جست کے جدید طرز کے ریک بنے ہوئے تھے جن میں نہایت دلکش کھلونے سجھے ہوئے تھے۔ مجھے لگا کہ میں غلطی سے کھلونوں کی دکان میں آ گیا ہوں۔ میں نے ریک پر سے ایک بھالو اٹھا کر بغور اس کا جائزہ لیا۔ اس کی بناوٹ بہت نفیس تھی لیکن اس کا وزن میری توقع سے قدرے زیادہ تھا۔ میں نے اسے واپس اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ ان کھلونوں کی اس جگہ موجودگی کا کیا مقصد ہوسکتا ہے۔ باقی ریکوں میں سجے کھلونوں کا جائزہ لیتے ہوئے میری نظر ٹرانسسٹر ریڈیو کی ایک طویل قطار پر پڑی۔ ان میں سے کچھ جیبی سائز کے تھے اور کچھ نسبتاً بڑے۔ میں نے جیبی سائز کے ایک ریڈیو کو اٹھایا تو اس کا وزن بھی غیر معمولی محسوس ہوا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ کھلونے منشیات کی اسمگلنگ میں استعمال ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے اندر اس وقت بھی منشیات کی خاصی مقدار موجود ہے تاہم میں اپنے اس خیال سے پوری طرح مطمئن نہ ہوسکا۔

میں نے اس کمرے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ اسے باہر سے مقفل کر کے آگے بڑھا تو مجھے احساس ہوا کہ کمرے کے ریک سے اٹھایا ہوا جیبی سائز ریڈیو میں نے بے خیالی میں اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ اسے واپس رکھنے کا جواز تھا نہ کوئی موقع۔ لہٰذا میں دوبارہ کمرے میں جانے کی زحمت نہیں کی۔ اب مجھے سب سے خطرناک مرحلہ درپیش تھا کیونکہ درمیانی راہداری سیدھی میدان نما جگہ پر کھلتی تھی اور میدان میں موجود کوئی بھی شخص راہداری میں ہونے والی نقل و حرکت دیکھ سکتا تھا۔ راہداری کے موڑ پر پہنچ کر میں نے کھلی جگہ کا جائزہ لیا۔ وہاں مکمل سکوت طاری تھا۔ ٹرکوں اور جیپوں کے آس پاس بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن کسی بھی لمحے کوئی اس طرف کا رخ کر سکتا تھا۔ لہٰذا بہتر یہی تھا کہ میں جلد از جلد اپنی کاروائی مکمل کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن ضروری تو نہیں تھا کہ قسمت اس بار بھی میرا ساتھ دیتی اور شاہ مراد کا چابی سے قفل کھل جاتا۔ لیکن قسمت آزمائی کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میں تیز قدموں سے دائیں ہاتھ والے دروازے کی طرف بڑھا اس دوران میں مسلسل کھلے احاطے کی طرف بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے اللہ کا نام لیا اور چابی قفل میں ڈال کر گھما دی۔ اگلے ہی لمحے دروازے کا لاک کھل گیا۔ اس بے بہا کرم پر میں نے رب کریم کا شکر ادا کیا اور دروازے کو دھیرے سے اندر دھکیلا۔ کمرے میں تاریکی کا دور دورہ تھا۔ میں نے پستول کے ٹریگر پر انگلی جماتے ہوئے ٹارچ کی روشنی اندر پھینکی۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ وہاں پر موجود فرنیچر سے اندازہ ہوا کہ وہ کمرہ میٹنگ کے لیے استعمال ہوتا ہوگا۔ کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر راہداری کے اختتام پر کھلے میدان کا جائزہ لیا۔ صورت حال جوں کی توں تھی۔ میں پلک جھپکتے میں سامنے والے کمرے کے دروازے پر پہنچا اور قفل میں چابی گھما دی۔ نتیجہ اس مرتبہ بھی حسب دل خواہ نکلا۔ دروازہ کھل گیا میں نے اندھیرے کمرے میں ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ اگلے ہی لمحے میرے پستول نے کمرے میں موجود آہنی چارپائی پر محو خواب شخص کو اپنی زد میں لے لیا۔ میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور نپے تلے قدموں سے چارپائی کی جانب

بڑھا۔ وہ شخص شاید بہت گہری نیند سونے کا عادی تھا ورنہ ٹارچ کی خیرہ کن روشنی اسے بیدار کر دیتی۔ اس کے قریب پہنچ کر میں نے پستول کی نال سے اس کے شانے پر ٹہوکا دیا۔ وہ شخص تھوڑا کسمسایا اور سیدھا ہو گیا۔ تب میں پہلی مرتبہ اس کا چہرہ واضح طور پر دیکھا اور خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میری نظروں کے سامنے موجود شخص بلاشبہ صدیقی تھا لیکن اس کی جسمانی حالت اتنی ابتر تھی کہ انہیں پہلی نظر میں پہچاننا بھی آسان نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی طویل اور جان لیوا بیماری نے ان کی صحت کو چاٹ لیا ہو۔ تو شاید اپنے بل پر اٹھ کر بیٹھنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔

"صدیقی صاحب" میں نے انہیں ہلکے سے جھنجھوڑا۔ "آنکھیں کھولیں صدیقی صاحب۔۔۔ دیکھیں میں آ گیا ہوں۔" میری آواز سن کر صدیقی کی مچی ہوئی آنکھوں میں جنبش پیدا ہوئی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی ان کے چہرے سے پرے کرتے ہوئے کہا۔ "صدیقی صاحب میں سیفل ہوں دیکھیں میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ آنکھیں کھولیں۔" میرا نام کان میں پڑتے ہی صدیقی کے جسم میں لہر دوڑ گئی' انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے پہچاننے میں انہیں محض چند لمحے لگے۔ ان کی دھندلی آنکھوں میں زندگی کی چمک ابھری۔ "تم۔۔۔تم۔۔۔سیفل۔۔۔" میں نے اٹھ کر بیٹھنے میں ان کی مدد کی۔ "یہ آپ کا کیا حال ہو گیا ہے مرزا صاحب؟" میں نے دکھی دل کے ساتھ کہا۔ "میں ٹھیک ہوں۔" صدیقی نے کہا۔ "یہ بتاؤ تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟ کیا ان کم بختوں نے تمہیں بھی۔۔۔" عین اس وقت ان کی نظر میرے شانے سے آویزاں کلاشنکوف پر پڑی اور انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ میں نے انہیں تسلی دی۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں اپنی مرضی سے یہاں آیا ہوں لیکن میں شرمندہ ہوں کہ میں نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ آپ کی یہ حالت کرنے والے بد بخت کا عبرت ناک حشر کروں گا۔ آپ تیار ہو جائیں میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ آپ یہ بتایئے ہمارے مرزا صاحب کو ان خبیثوں نے کہاں بند کر رکھا ہے؟"

میری بات سن کر صدیقی کا چہرہ یک لخت زرد پڑ گیا۔ مجھے لگا کہ کسی نے میرا دل مٹھی میں جکڑ کر بری طرح بھینچ دیا ہے۔ صدیقی کی آنکھوں میں بھر آنے والے آنسوؤں نے میرے بدترین اندیشوں کی تصدیق کر دی۔ میں نے امید کی موہوم سی کرن کا سہارا لیتے ہوئے پوچھا۔ "کیا وہ خدانخواستہ۔۔۔" صدیقی نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ "ہاں۔۔۔ میرا یار مجھے چھوڑ گیا۔۔۔ وطن کی سلامتی کے لیے جان کی قربانی دے دی اس نے۔"

"اف میرے خدا!" میں نے رنج کے اچانک حملے کو سہنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کیسے ہوا صدیقی صاحب؟" وہ جواب دینے ہی والے تھے کہ میں جیسے گہری نیند سے جاگ اٹھا۔ میں خطرناک صورت حال میں طویل گفتگو کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے صدیقی صاحب کو سہارا دے کر فرش پر کھڑا کر دیا۔ "ابھی یہاں سے نکل چلیں' باقی باتیں خطرہ کم ہونے پر کریں۔" صدیقی صاحب نے میری بات

سے اتفاق کیا۔ "ہاں یہی بہتر ہے۔ تمہیں دیکھ کر میری جان میں جان آ گئی ہے۔ تم آگے آگے چلو میں بغیر سہارے کے چل سکتا ہوں۔"

میں نے کمرے کے دروازے سے جانک کر آس پاس کے حالات کا جائزہ لیا۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ میں نے کلاشنکوف سنبھالتے ہوئے صدیقی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میدان نما حصے میں اس وقت بھی کسی قسم کی نقل وحرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم بخیریت راہداری کا موڑ مڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ چند ہی سیکنڈ بعد ہم شاہ مراد کے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ شاہ مراد اور ندا بدستور گہری بے ہوشی کی آغوش میں تھے۔ شاہ مراد کو دیکھتے ہی صدیقی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ "اس نے گولی ماری تھی میرے بھائی مرزا کو۔ مرزا کی زبان کھلوانے میں ناکامی کے بعد اس نے مجھے ڈرانے کے لیے اسے شہید کیا تھا لیکن مرزا نے مرتے مرتے بھی مجھے اپنے خون کی قسم دی تھی کہ میں اپنی زبان نہ کھولوں۔" صدیقی کی آواز کبھی بلند ہو رہی تھی تو کبھی پست۔ "اگر وہ مجھے اتنی بڑی قسم نہ دیتا تو شاید میں اس درندے کے تشدد سے ہار مان لیتا لیکن میں اپنے بھائی کے خون کی بے حرمتی کیسے کرتا؟ یہ بدبخت اپنے تمام حربے استعمال کر کے بھی مجھ سے تمہارا اور اس کتے افضل کا پتا معلوم نہیں کر سکا۔"

"اب اسے اپنے تمام کرتوتوں کی سزا ملے گی صدیقی صاحب۔ اس کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ مرزا صاحب کا مقدس لہو رائیگاں نہیں جائے گا۔ یہ اب ہمارے رحم وکرم پر ہے۔ آپ کے محکمے کی فورس ڈیرہ غازیخان پہنچ چکی ہے اور وہ لوگ بہت جلد یہاں دھاوا بولنے والے ہیں۔ میں نے اس ٹرانسمیٹر کے ذریعے آپ کے کولیگ اختر فاروقی سے بات کی تھی۔ اب میں آپ کی بھی ان سے بات کرواتا ہوں۔"

"اوہ! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم یہاں تک کیسے پہنچے اور اس خبیث کو کیسے قابو میں کیا؟" صدیقی نے پوچھا۔ میں نے انہیں مختصراً پوری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ "یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ شاہ مراد کی چابی سے تمام قفل کھل گئے ورنہ میں اتنی آسانی سے آپ تک نہ پہنچ پاتا۔ البتہ میری سمجھ میں یہ بات ابھی تک نہیں آئی کہ اس راہداری میں واقع دوسرے کمرے میں بچوں کے کھلونوں کا ذخیرہ کیوں موجود ہے؟ یہ دیکھیے' یہ پاکٹ ریڈیو بھی مجھے وہیں سے ملا ہے۔" میں نے ٹرانسسٹر ریڈیو صدیقی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ صدیقی صاحب میری زبان سے نکلنے والا ایک ایک لفظ نہایت غور سے سن رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ ریڈیو پر نظر پڑتے ہی اس چمک میں مزید اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے ریڈیو کو الٹ پلٹ کر غور سے دیکھا۔ اس کے وزن کو جانچا' پھر گہرا سانس بھر کر میری طرف متوجہ ہوئے۔ "اس کمرے میں تمہارے اندازے کے مطابق ایسے کتنے ریڈیو اور کھلونے موجود ہیں؟"

"کھلونے تو شاید کئی سو ہوں گے البتہ ریڈیو چار پانچ درجن کی تعداد میں نظر آئے تھے۔ میرا خیال

ہے ان میں منشیات چھپا کر اسمگل کی جاتی ہوگی۔" صدیقی نے میری بات سن کر نفی میں گردن ہلا دی۔ "تمہیں یہ جان کر شاید حیرت ہو کہ یہ چھوٹا سا ٹرانسسٹر ریڈیو درحقیقت ایک بہت ہی طاقتور ٹائم بم ہے۔ اتنا طاقتور کہ اگر اس کمرے میں پھٹ جائے تو نہ صرف سب کے پرخچے اڑ جائیں بلکہ اس کمرے کی چھت بھی اڑ سکتی ہے۔ یہ ٹائم بم پچاس گز کے دائرے میں موجود ہر شے کو نیست ونابود کر سکتا ہے۔"

"اف میرے خدایا!" میں نے شدید حیرت کے عالم میں کہا۔ "اس کمرے میں تو اس سے کئی گناہ بڑے ریڈیو موجود ہیں۔"

"تو پھر ان کی ہلاکت خیزی بھی اسی تناسب سے کئی گناہ زیادہ ہوگی۔ رہی بات کھلونوں کی تو وہ یقینی طور پر بوبی ٹریپ بم ہوں گے۔ اس طرح کھلونے تخریب کاری کے لئے بے حد موثر ثابت ہوتے ہیں۔ انہیں کسی بھی بارونق جگہ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جیسے ہی کوئی بچہ یا بڑا انہیں اٹھاتا ہے' یہ زبردست دھماکے سے پھٹ پڑتے ہیں اور کھلونا اٹھانے والے اور آس پاس موجود افراد کو موت کے منہ میں دھکیل دیتے ہیں۔ ان سب چیزوں میں نہایت طاقتور دھماکہ خیز مادہ استعمال ہوتا ہے۔"

"شاہ مراد کو یہ سب دشمن ملک سے ملا ہوگا۔ یہ بدبخت نہ جانے کتنے معصوموں کے خون سے ہاتھ رنگ چکا ہے۔ ملک کے مختلف گوشوں میں نیز بسوں اور ٹرینوں میں لگاتار بم دھماکوں میں یقیناً اسی کا ہاتھ ہے۔"

"ہاں! اب تم ٹرانسمیٹر پر اختر فاروقی سے میری بات کراؤ۔ یہ سب باتیں اس کے علم میں لانا بہت ضروری ہیں۔"

میں نے صدیقی کی ہدایت کے مطابق ٹرانسمیٹر پر فاروقی صاحب سے رابطہ کیا۔ وہ شاید بے چینی سے میری کال کے منتظر تھے۔ "فاروقی میں احسن صدیقی بات کر رہا ہوں۔" صدیقی صاحب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ یہ سن کر فاروقی صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا لیکن مرزا کی شہادت کی خبر نے انہیں بری طرح رنجیدہ کر دیا۔ صدیقی نے انہیں مختصراً اپنی آپ بیتی اور نو دریافت کھلونوں اور ریڈیو کے بارے میں بتایا۔ "اس جگہ ان خطرناک ڈیوائسز کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے کہ یہ جگہ ملبے کا ڈھیر بن سکتی ہے۔"

"ہاں لیکن اگر ایسا ہوا تو تم لوگ بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ اس کے علاوہ ہمیں شاہ مراد زندہ سلامت چاہیے اور ہاں' تم ان نقشوں کا بھی جائزہ لو جن کا ذکر ہمارے نوجوان ساتھی نے کیا ہے۔ اگر ان نقشوں کے ذریعے شاہ مراد کے ٹھکانوں کی اور اس کے منصوبوں کی نشان دہی ہو سکے اور ش، ہمارے قبضے میں آ جائے تو ہم اس سازش کے تار وپود بکھیر سکتے ہیں۔"

صدیقی نے چند لمحوں تک میز پر پھیلے نقشوں کا جائزہ لیا اور پھر ٹرانسمیٹر کے پاس لوٹ آئے۔ "یہ نقشے ہماری توقع سے زیادہ کارآمد ہیں فاروقی۔" صدیقی صاحب کی آواز جوش وجذبات سے لرز رہی

تھی۔ ”لیکن یہ بھی سمجھ لو کہ اگر یہ سازش خدانخواستہ کامیاب ہوگئی تو ہمارے پیارے وطن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔“

میں ان دونوں کی گفتگو کا ایک ایک لفظ غور سے سن رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میرا ذہن بھی برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ ایک قابل عمل منصوبہ میرے دماغ میں ترتیب پا رہا تھا۔ بالآخر میں نے صدیقی اور فاروقی کو اس منصوبے میں شریک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ”معاف کیجیے گا‘ میں آپ دونوں کی گفتگو میں مداخلت کر رہا ہوں۔ دراصل میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے جو میں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے اگر یہ منصوبہ کامیابی سے مکمل ہو جائے تو ہم اپنے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔“

”یار خواہ مخواہ تمہید کیوں باندھ رہے ہو۔ جو کچھ کہنا ہے جلدی سے کہہ ڈالو“ صدیقی نے بے تابی سے کہا۔ میں نے اپنے خیالات کو مربوط کرتے ہوئے کہا۔ ”صدیقی کا کہنا ہے کہ اس کمرے میں کھلونوں اور ریڈیوز کی شکل میں اس قدر بھاری مقدار میں خطرناک دھماکہ خیز مواد موجود ہے کہ یہ قلعہ نما اڈا مٹی کا ڈھیر بن سکتا ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ اس صورت میں شاہ مراد کے کرتوتوں کے ثبوت اور ہم سب بھی فنا ہو جائیں گے۔ حالانکہ اس مسئلے کا بے حد آسان حل موجود ہے۔“ اتنا کہہ کر میں چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا لیکن صدیقی سے میری یہ خاموشی برداشت نہ ہو پائی۔ ”ارے بھائی سسپنس نہ پھیلاؤ۔ جلدی سے بتاؤ وہ حل کیا ہے؟“

”آپ کو شاید یاد نہیں کہ میں نے بتایا تھا میں ایک سرنگ کے ذریعے شاہ مراد کی حویلی سے یہاں پہنچا ہوں۔ اس سرنگ میں آہنی پٹری بچھی ہوئی ہے جس پر ایک جیپ نما گاڑی دوڑتی ہے۔ شاہ مراد اس گاڑی کے ذریعے حویلی سے اس اڈے تک آتا جاتا تھا۔ میرا خیال ہے اس گاڑی کو چلانا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ یہ سب بتانے سے میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم اس اڈے میں ٹائم بم فٹ کر کے اس جیپ کے ذریعے سے نکل جائیں تو محض چند منٹ میں خطرے کی زد سے باہر نکل سکتے ہیں۔ تمام نقشے اور شاہ مراد بھی ہمارے قبضے میں ہوگا۔ البتہ اس کے اڈے کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔“

”منصوبہ تو واقعی زبردست اور قابل عمل ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے فاروقی؟“ صدیقی نے ٹرانسمیٹر پر فاروقی سے سوال کیا۔ ”میں تم سے پوری طرح متفق ہوں اور میرا خیال ہے تم دونوں اس منصوبے پر جلد از جلد عمل کر ڈالو۔“

”ہاں میرے خیال میں یہی بہتر ہے۔“ صدیقی نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”سیفل چلو۔ مجھے وہ کمرہ دکھاؤ جس میں ٹائم بم اور بوبی ٹریپ ذخیرہ کیے گئے ہیں۔“

”ایک منٹ صبر کرو بھائی۔ مجھے یہ تو بتاؤ کہ تم لوگ اس سرنگ سے سطح زمین پر کیسے پہنچو گے؟ سرنگ کے دوسرے سرے پر شاہ مراد کی حویلی ہے۔ تم لوگ اس کے کارندوں کے ہتھے چڑھ گئے تو سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔“ فاروقی نے کہا۔

”آپ فکر نہ کریں فاروقی صاحب میں نے سرنگ میں زمین کھودنے کے اوزار چھپا رکھے ہیں۔ ہم سرنگ کی چھت میں سوراخ کر کے سطح زمین پر نکل آئیں گے۔“ میں نے اسے تسلی دینا چاہی لیکن وہ پوری طرح مطمئن نہ ہوا۔ ”تم یہ بات کیوں بھول رہے ہو کہ تم لوگ شاہ مراد کے علاقے میں ہو جہاں تمہارے لیے قدم قدم پر خطرات موجود ہیں۔ تم دونوں شاہ مراد کو ساتھ لے کر وہاں سے نکل نہیں پاؤ گے۔ تم لوگ ایسا کرو کہ ٹائم بم پر اب سے ایک گھنٹے بعد کا ٹائم سیٹ کر کے سرنگ میں موجود گاڑی کے ذریعے وہاں سے چل پڑنا اور حویلی اور اس کے اڈے کے عین درمیان میں گاڑی ٹھہرا لینا۔ میں اپنے اسکواڈ کے ساتھ چند منٹ میں یہاں سے روانہ ہوتا ہوں۔ مجھے یقین ہے ہم ٹائم بم بلاسٹ ہونے سے پہلے اس علاقے میں پہنچ جائیں گے۔ اڈہ تباہ ہونے کے فوراً بعد شاہ مراد کی حویلی پر دھاوا بول کر قبضہ کر لیں گے اور علاقے میں موجود اس کے تمام کارندوں پر بھی قابو پا لیں گے۔ اس کے بعد تم لوگ حویلی کے تہ خانے میں بھی پہنچ سکتے ہو اور سرنگ کی چھت میں سوراخ کر کے سطح زمین پر بھی آ سکتے ہو۔ تم لوگ یہ ٹرانسمیٹر اپنے ساتھ رکھنا تاکہ ہمارا رابطہ برقرار رہے۔“ فاروقی نے مستحکم لہجے میں کہا۔

”میرا خیال ہے یہی بہتر رہے گا۔ اب آپ حرکت میں آ جائیں۔ ہم بھی اپنی مہم پر روانہ ہوتے ہیں۔ اللہ ہمیں اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔“ میں نے کہا اور ٹرانسمیٹر آف کر دیا۔ ”چلیے صدیقی صاحب“ میں نے صدیقی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا لیکن وہ میری بات پر توجہ دیے بغیر اپنی کاروائی میں مصروف رہے۔ انہوں نے پاکٹ ریڈیو کو کھول لیا تھا اور اس کی مشینری کے مختلف حصوں کو نہایت مہارت سے اپنی مرضی کے مطابق ترتیب دے رہے تھے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے کمرے کی دیوار پر موجود کلاک پر نظر ڈالی اور ایک بٹن دبا دیا۔ ”میں نے اس میں ایک گھنٹے بعد کا ٹائم سیٹ کر دیا ہے یہ بلسٹ ہوتے ہی باقی تمام بموں کو بھی بلاسٹ کر دے گا۔ چلو اسے بھی اس بارود خانے میں رکھ آتے ہیں۔“

میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور صدیقی کو سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن وہ بغیر سہارے کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ حیرت انگیز طور پر خاصے ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔ ہم دونوں شاہ مراد اور ندا پر ایک نظر ڈالنے کے بعد کمرے سے باہر نکلے اور کھلونوں والے کمرے میں پہنچ گئے۔ صدیقی نے پاکٹ ریڈیو کو باقی ریڈیوز کے ساتھ رکھ دیا۔ وہ چند لمحوں تک ان ریڈیوز اور کھلونوں کا دلچسپی سے جائزہ لیتے رہے۔ ان کے چہرے پر اطمینان کی واضح جھلک تھی۔ پھر ہم دونوں شاہ مراد کے کمرے میں پہنچ گئے۔ ”اب جلد از جلد یہاں سے نکل چلو۔ یہ جگہ آتش فشاں کا دہانہ بن چکی ہے۔“ صدیقی نے تمام نقشے اور چارٹ سمیٹ کر بغل میں دابتے ہوئے کہا۔ میں نے ان کی تقلید کی اور ساہ مراد کو شانے پر لاد لیا۔ وہ شیطان میرے اندازے سے کہیں زیادہ بھاری ثابت ہوا لیکن میں اسے دل ہی دل میں کوسنے کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

راہداری کا موڑ مڑنے کے بعد ہم بے حد محتاط ہو گئے۔ احاطے کی طرف سے کسی قسم کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک دوسرے کو کراس کرنے والی راہداری کے سرے پر پہنچ کر میں نے احتیاط سے احاطے کی صورت حال کا جائزہ لیا۔ مجھے وہاں کس نقل وحرکت کے آثار نظر نہ آئے۔ میں نے صدیقی کو اشارہ کیا۔ اگلے ہی لمحے ہم وہ خطرناک حصہ پار کر چکے تھے۔ اب ہماری رفتار خاصی تیز ہو چکی تھی۔ راہداری کا دایاں موڑ مڑ کر ہم کچھ ہی دیر میں پٹری پر دوڑنے والی گاڑی کے پاس جا پہنچے۔ میں نے شاہ مراد کو عقبی نشست پر پٹخ دیا اور اسٹیرنگ کے پیچھے جا بیٹھا۔ صدیقی میرے ساتھ والی نشست پر براجمان ہو چکے تھے۔ میں اگنیشن میں لگی چابی گھمانا ہی چاہتا تھا کہ اچانک مجھے یاد آیا کہ میں ٹرانسمیٹر شاہ مراد کے کمرے میں بھول آیا ہوں۔ ''آپ یہیں ٹھہریں' میں ٹرانسمیٹر لے کر آتا ہو۔''

''ارے یار چھوڑو ٹرانسمیٹر کو اور یہاں سے نکلنے کا سوچو۔'' صدیقی نے کہا۔ میں نے اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے کہا۔ ''اس ٹرانسمیٹر کا ہمارے پاس موجودگی ضروری ہے صدیقی صاحب۔ اس کے ذریعے ہم فاروقی صاحب سے رابطہ کر کے انہیں تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کر سکتے ہیں اور انہیں راہنمائی فراہم کر سکتے ہیں۔ دو منٹ کی تو بات ہے۔ میں بس ابھی گیا اور ابھی آیا۔'' اس سے پہلے کہ صدیقی مجھے مزید روکتے' میں ٹرانسمیٹر کی طرف چل پڑا۔ کچھ ہی دیر بعد میں کسی مزاحمت کے بغیر اس راہداری میں پہنچ گیا جس میں شاہ مراد کا کمرہ واقع تھا۔

میں نے دروازے کے لاک میں چابی گھما کر اسے اندر دھکیلنے کی کوشش کی۔ لاک میں چابی گھوم گئی لیکن خلاف توقع دروازے میں ہلکی سی بھی جنبش نہ ہوئی۔ میں نے دروازے کے لٹو کو پوری قوت سے گھما کر ایک بار پھر اندر دھکیل کر کھولنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ مجھے یہ سمجھنے میں محض چند لمحے لگے کہ دروازے کو اندر سے چٹخنی لگا کر بند کر لیا گیا تھا۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ شاید ندا ہوش میں آ چکی تھی اور اس نے کود بندھوں سے آزاد کر کے دروازے کو اندر سے بند کر لیا تھا ظاہری بات ہے اس نے فوری طور پر انٹر کام کے ذریعے مدد بھی طلب کر لی ہوگی۔

میں اپنے اگلے اقدام کے بارے میں سوچنے بھی نہیں پایا تھا کہ میرے بدترین اندیشوں کی تصدیق ہوگئی اور سائرن کی کریہہ چیخوں سے پوری عمارت گونج اٹھی۔ یہ سائرن کی آواز اتنی بلند تھی کہ شاید قبروں میں سوئے مردے بھی بیدار ہو جاتے۔ اسی اثنا میں بہت سے لوگوں کے بیک وقت زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں بھی میرے حساس کانوں تک پہنچنے لگیں۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ان آوازوں کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ لوگ یقیناً اس طرف آ رہے تھے۔ سائرن تقریباً ایک منٹ چیخنے کے بعد خاموش ہوا تو یہ آوازیں مزید واضح ہو گئیں۔ صورت حال کی سنگینی نے مجھے وقتی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ میں ایک ایسے آہنی پنجرے میں پھنس چکا تھا جس سے رہائی آسان نہ تھی۔ اس راہداری کے دونوں سرے بند تھے۔ فرار کی واحد راہ مرکزی راہداری تھی لیکن اب وہ بھی بند ہو چکی تھی۔

میری آنکھیں راہداری کے موڑ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس اثنا میں سینے کے بل فرش پر دراز ہو چکا تھا۔

کلاشنکوف کا رخ راہداری کے موڑ کی سمت تھا اور میری انگلی ٹریگر پر دباؤ ڈالنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ خدا جانے ندا نے انٹر کام پر شاہ مراد کے کارندوں کو کیا بتایا تھا۔ انہیں اسی طرف تو آنا ہی تھا لیکن مجھے سب سے زیادہ اندیشہ اس بات کا تھا کہ کہیں وہ سرنگ کی طرف نہ نکلیں۔ اگر صدیقی اور شاہ مراد ان کے ہاتھ لگ جاتے تو میری ساری محنت خاک میں مل جاتی۔ میں نہایت خشوع وخضوع سے دعا کر رہا تھا کہ صدیقی سائرن کی آواز سن کر خطرہ بھانپ گئے ہوں اور گاڑی کو اسٹارٹ کر کے روانہ ہو گئے ہوں۔

راہداری کی طرف سے آنے والی آوازیں حیرت انگیز طور پر بند ہو چکی تھیں۔ شاید وہ لوگ میری یہاں موجودگی سے حتمی طور پر آگاہ تھے یا پھر وہ محض احتیاطاً پوری طرح مطمئن ہو کر اس طرف کا رخ کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہیں جلد یا بدیر موڑ سے جھانک کر دیکھنا ہی تھا۔ میں اسی وقت کا منتظر تھا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ نظر میں آنے والے پہلے شخص کی کھوپڑی اڑا دوں گا۔ اس طرح ان لوگوں پر دہشت طاری ہو جاتی اور ان کی پیش قدمی رک جاتی اور مجھے کچھ مہلت مل جاتی جس کی مجھے اس وقت شدید ضرورت تھی۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ تقریباً پانچ منٹ سکوت کے بعد ایک شخص نے راہداری میں جھانکا۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ میری کلاشنکوف کی نال بالکل اس کی کھوپڑی کو زد میں لئے ہوئے تھی۔ ٹریگر پر دباؤ پڑتے ہی راہداری لگاتار دھماکوں سے گونج اٹھی۔ میرا اندازہ تھا کہ پہلی ہی گولی نے اس کی کھوپڑی پاش پاش کر دی تھی۔ موت نے اتنی اچانک اس پر جھپٹا مارا کہ اسے چیخنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے گرا اور میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

مجھے یقین تھا کہ اب کوئی بھی اندھا دھند پیش قدمی کی حماقت نہیں کرے گا۔ اس طرف سے وقتی طور پر مطمئن ہونے کے بعد میں شاہ مراد کے کمرے کی طرف متوجہ ہوا۔ میں کافی سرچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ میرے یہاں سے بچ نکلنے کی واحد صورت یہ ہے کہ شاہ مراد کے کمرے کا دروازہ توڑ کر ندا کو اپنے قابو میں کر لوں۔ مجھے یقین تھا کہ ندا کو جان سے مارنے کی دھمکی دے کر شاہ مراد کے کارندوں کو پیچھے ہٹنے کا حکم دوں تو وہ پسپائی پر مجبور ہو جائیں گے اور میں ندا کو ڈھال بنا کر سرنگ میں پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ سرنگ میں پہنچنے کے بعد میں تعاقب میں آنے والے کارندوں کو خاصی دیر تک الجھائے رکھ سکتا تھا۔ حتیٰ کہ یہ پورا اڈا دھماکے سے اڑ جاتا۔

میں نے دروازے کے پاس پہنچ کر ندا کے پستول سے لاک کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ راہداری ایک بار پھر دھماکے سے گونج اٹھی۔ میرا نشانہ ٹھیک بیٹھا تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر شدید حیرت ہوئی کہ گولی کی ضرب لاک پر ہلکی سی خراش بھی نہیں ڈال سکتی تھی بلکہ اس پر پڑنے کے بعد گولی اچٹ گئی تھی۔ وہ لاک کسی غیر معمولی حد تک مضبوط دھات کا بنا ہوا تھا۔ دوسری گولی میں نے لاک کے بالکل قریب دروازے کے چوبی حصے پر چلائی۔ گولی کے ٹکرانے سے لکڑی کی کھپچیاں اڑیں لیکن دروازے میں سوراخ نہ بن سکا۔ میں نے قریب سے جائزہ لیا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہ دروازہ دراصل بھاری فولادی چادر کا بنا ہوا

ہے جس پر لکڑی کی باریک تہ چڑھائی گئی تھی۔ میں پستول اور کلاشنکوف کی تمام گولیاں برسانے کے بعد بھی اس دروازے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ بچاؤ کا یہ واحد راستہ بھی مسدود پا کر مجھ پر مایوسی کا غلبہ ہونے لگا تھا۔

وقت پر لگا کر اڑا جا رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں گھڑی نہیں تھی لیکن مجھے اتنا اندازہ ضرور تھا کہ ٹائم بم پر ٹائم سیٹ کیے بیس پچیس منٹ تو یقیناً گزر چکے تھے اور موجودہ صورت حال میں ایسی کوئی امید نظر نہیں آ رہی تھی کہ میں آیندہ تیس پینتیس منٹ میں اپنے خون کے پیاسے شکاریوں کے نرغے سے نکل پاؤں گا۔ میں پیش قدمی کے حق سے محروم تھا اور دشمن کی چالوں کا توڑ کرنے کے علاوہ میرے بس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ ندا نے انٹر کام کے ذریعے شاہ مراد کے کارندوں کو میری ناکام کاروائی سے آگاہ کر دیا ہوگا اور ان کے حوصلے ایک بار پھر بلند ہو چکے ہوں گے اور وہ جلد ہی میرے خلاف نئی کاروائی کرنے والے ہوں گے۔ اس بار ان کا حملہ کہیں زیادہ مربوط اور بھرپور ہوتا۔

لگ بھگ پانچ منٹ مزید گزر گئے۔ وہ لوگ نہ جانے سوچے بیٹھے تھے۔ مجھے کوئی ایسی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ وہ لوگ صدیقی کو بے بس کر کے شاہ مراد کو بازیاب کرا چکے ہیں۔ میرے دل میں یہ امید تقویت پکڑ گئی کہ صدیقی شاہ مراد سمیت فرار ہونے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ اس کے ساتھ میرے حوصلے ایک بار پھر بلند ہونے لگے۔ اگر شاہ مراد ان چارٹ اور نقشوں سمیت قومی سلامتی کے اداروں کی گرفت میں آ جاتا تو میری طویل جدوجہد کامیابی سے اپنی تکمیل تک پہنچ جاتی۔ مسئلہ صرف میری زندگی کا باقی رہ جاتا تو خود کو بچانے کی سر توڑ کوشش کرنا میرا فرض تھا جو میں ادا کر ہی رہا تھا۔ اگر ناکام رہتا تو بھی شہادت کی موت میرا مقدر بنتی جو اپنی جگہ ایک بہت بڑی سعادت ہے جو صرف خوش نصیبوں کے حصے میں آتی ہے۔ یعنی میں ہر طرح سے فائدہ میں رہتا۔

انتظار طول پکڑنے لگا تو بے قراری مجھے اپنی گرفت میں لینے لگی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب انتشار ترک کر کے حملے میں پہل کروں۔ میں سبک قدموں سے راہداری کے موڑ پر پہنچا اور کلاشنکوف کی نال راہداری کی طرف کر کے ایک چھوٹا سا برسٹ فائر کیا۔ خلاف توقع گولیوں کی اس بوچھاڑ کا کوئی ردعمل سامنے نظر نہیں آیا۔ میں نے نہایت محتاط انداز میں جھانک کر دیکھا تو راہداری کو بالکل خالی پایا۔ وہ لوگ میری گولی کا شکار ہونے والے شخص کی نعش بھی اٹھا لے گئے۔ میرے تجسس میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بدبخت نہ جانے کس منصوبے پر عمل پیرا تھے۔ تذبذب اور جھنجھلاہٹ اس حد تک مجھ پر غالب ہو چکی تھی کہ میں نے سب کچھ بھول بھال کر قدم آگے بڑھا دیے۔ البتہ میری کلاشنکوف انگارے برسانے کے لیے بالکل تیار تھی۔ بظاہر راستہ بالکل صاف نظر آ رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ احاطے کی طرف نہ جانے کتنی گنیں میرا جسم چھلنی کرنے کے لیے بے تاب ہوں گی۔

موڑ پر پہنچ کر میں ٹھہر گیا اور پھر بجلی کے کوندے کی مانند جھانک کر احاطے کی طرف دیکھا اور گردن پیچھے ہٹا لی۔ اس لمحہ بھر کے عرصے میں مجھے وہاں ایک جیپ کے سوا کچھ بھی نظر نہ آ سکا۔ چند لمحوں کے بعد

اس لحاتی منظر کی جزیات میرے ذہن تک پوری طرح منتقل ہو سکیں۔ وہ جیپ نہ صرف متحرک تھی بلکہ اس کا رخ راہداری کی طرف تھا۔ وہ راہداری کے دہانے کے خاصا قریب پہنچ چکی تھی اور چند ہی لمحوں میں راہداری کے اندر گھسنے والی تھی۔ اگلے ہی لمحے میرا ذہن اس صورت حال کا جواز بھی تلاش کر چکا تھا۔ یہ جیپ یقیناً بلٹ پروف رہی ہوگی۔ وہ لوگ اس گاڑی کے ذریعے نہایت اطمینان کے ساتھ میرے سر پر پہنچ جاتے اور مجھے شکار کر لیتے جبکہ میری گولیاں اس گاڑی سے ٹکرا کر بے اثر ہو جاتیں۔

یہ صورت حال اس قدر سنگین اور غیر متوقع تھی کہ مجھے پسپائی اختیار کرنا پڑی اور میں نے شاہ مراد کے کمرے والی راہداری کے موڑ پر مورچہ سنبھال لیا۔ چند لمحوں بعد میں نے احاطے کی طرف سے آنے والی راہداری کے موڑ پر جیپ کی جھلک دیکھی۔ اس نے جونہی موڑ کاٹا میں نے اس کے ٹائروں کا نشانہ لے کر برسٹ فائر کر دیا۔ اگلے ہی لمحے جیپ کے اگلے دونوں ٹائروں کے پرخچے اڑ گئے۔ جیپ کی رفتار بہت ہلکی تھی اس کے باوجود وہ دھیرے سے لہرائی اور راہداری کے کونے سے رگڑ کھا کر ساکت ہو گی۔ میں نے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ اور فرنٹ سیٹ پر براجمان افراد کے چہرے پر بدحواسی کی جھلک دیکھی۔ وہ اس ناگہانی صورت حال کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ وہ مجھ پر گولی چلانے کی پوزیشن میں نہیں تھے جبکہ میری کلاشنکوف کا بھیانک دہانہ ان کی جانب تھا۔ تاہم میں نے گولی چلانے کی کوشش نہیں کی۔ میرے پاس ایمونیشن بے حد محدود تھا۔ میں ایک بھی گولی ضائع کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ جب تک وہ جیپ کے اندر تھے میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اگلی سیٹوں پر موجود دونوں افراد جیپ کے عقبی حصے کی طرف گئے اور میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ وہ یقیناً اپنے ساتھیوں سمیت جیپ کے عقبی دروازے سے فرار ہو گئے تھے۔ میں نے راہداری کے سنگم پر پھنسی جیپ کا بغور جائزہ لیا۔ اس جیپ نے راہداری کا نصف سے زیادہ حصہ گھیر رکھا تھا۔ اگر میں پھرتی کا مظاہرہ کرتا تو محض ایک جست میں وہ خطرناک حصہ پار کر کے راہداری کے دوسری طرف والے حصے میں پہنچ سکتا تھا۔ اس صورت حال کا احساس میرں دشمنوں کو بھی ہو چکا تھا کیونکہ انہوں نے اچانک فائرنگ شروع کر دی تھی اور ان کی تمام گولیاں اسی ڈیڑھ دو گز چوڑے حصے سے گزر رہی تھیں۔ ایک طرح سے یہ راہ میرے لیے پوری طرح مسدود ہو چکی تھی۔

گولیوں کی بارش میں اتنا تسلسل تھا کہ زندہ سلامت اس خطہ کو پار کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف نظر آ رہا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ٹائم بم پھٹنے کا لمحہ بھی سر پر آن پہنچا تھا۔ اگر میں مزید توقف کرتا تو شاید میری ہڈیاں بھی دھول بن کر فضا میں تحلیل ہو جاتیں۔ نہ ہونے کے برابر ہی سہی۔ راہداری پار کرنے میں بچ نکلنے کا کچھ تو امکان موجود تھا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میں نے خود کو گولیوں کی بارش پار کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کیا اور راہداری کے سنگم کی طرف بڑھا۔ خاصی کوشش کے بعد میں نے ایک ایسا زاویہ تلاش کر لیا جس سے فائر کر کے میں راہداری کی چھت پر نصب لائٹس کو ایک ہی برسٹ میں تباہ کر سکتا تھا۔ میں نے ٹریگر پر دباؤ بڑھا دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ نے اپنی کاروائی بھرپور انداز میں مکمل

کرلی تھی۔ راہداری میں گہری تاریکی کا غلبہ ہوا۔ اس اچانک تبدیلی نے فائرنگ کرنے والوں کو بوکھلا دیا اوران کی فائرنگ کا تسلسل لمحاتی طور پر منقطع ہوا لیکن قبل اس کے کہ میں اس موقع سے فائدہ اٹھا پاتا' فائرنگ کی شدت میں ایک بار پھر اضافہ ہوگیا اور پھر ہر گزرتے لمحے کے ساتھ فائرنگ شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔

سوچنے سمجھنے اور انتظار کرنے کی مہلت پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے جسم کو تولا اور پر پوری قوت سے گولیوں کی بوچھار میں جست لگائی۔ اگلے ہی لمحے میں راہداری کے پار پختہ فرش پر جا گرا۔ میں خاصی دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی تب مجھے احساس ہوا کہ میری بائیں ٹانگ گولیوں کی زد میں آچکی ہے۔ نہ جانے ایک' دو یا کتنی گولیاں میری پنڈلی چھید گئی تھیں۔ خون اتنی تیزی سے بہہ رہا تھا کہ محض چند لمحوں میں میرے ذہن پر اندھیروں کا غلبہ ہونے لگا تھا۔ میں نے کلاشنکوف کا سہارا لے کر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن اپنے ہی لہو سے پھسل کر چاروں شانے چت گر پڑا۔ میں نہ جانے کتنی دیر بے حس وحرکت سرد فرش پر پڑا رہا۔ عجیب خواب ناک کیفیت تھی۔ جسم روئی کے گالوں سے بھی زیادہ ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک ہی خواہش دل پر غلبہ پا رہی تھی کہ یہ کیفیت گہری سے گہری ہوتی جائے اور میں نیند کی وادیوں میں کھو جاؤں۔

مدہوشی کی دھند اندھیرے میں تبدیل ہونے ہی والی تھی کہ ایک آواز نے میرے ذہن کے کسی دور افتادہ گوشے میں ہلچل سی پیدا کردی۔ کوئی مجھے پکار رہا تھا۔ "سیفل۔۔۔ کہاں ہو تم؟۔۔۔ میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔۔۔۔ آجاؤ ناں۔۔۔ کب تک انتظار کراؤ گے؟۔۔۔" اس آواز کو پہچاننے کے لیے مجھے اپنی یادداشت پر زور ڈالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیا میں اپنی ہیر کو پہچاننے میں بھی غلطی کرسکتا ہوں؟

میرا ذہن نیند کی آغوش میں جاتے جاتے بیدار ہوگیا۔ تب مجھے پہلی مرتبہ صحیح معنوں میں اپنی پنڈلی میں تکلیف کا احساس ہوا۔ ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو صورت حال کی سنگینی کا احساس بھی پوری طرح بیدار ہوگیا۔ گولیوں کی بارش بدستور جاری تھی جبکہ ٹائم بم بھی کسی بھی وقت پھٹنے والا تھا۔ اس کے بعد میری زندگی کی کہانی اپنے انجام تک پہنچ جاتی۔ موت کا ذائقہ تو ہر ایک کو چکھنا ہوتا ہے لیکن ایسی بے کسی کے عالم میں موت مجھے گوارہ نہ تھی۔ میں نے اپنی تمام بچی کچھی توانائی یکجا کی اور دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ البتہ جھک کر کلاشنکوف اٹھانے کی ہمت نہ کرسکا۔ شاید میں اسے استعمال بھی نہ کر پاتا لہٰذا میں نے اسے نظر انداز کردیا اور دیوار کے سہارے سرنگ کی طرف بڑھا۔ بائیں پاؤں کی حالت اس قدر تباہ ہو چکی تھی کہ میں اسے زمین پر ٹکانے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ خون کے اخراج میں حیرت انگیز طور پر خاصی کمی آگئی تھی لیکن پہلے ہی اتنا خون ضائع ہو چکا تھا کہ میں نچڑ کر رہ گیا تھا۔

سرنگ تک محض چند قدموں کا فاصلہ میرے لیے کوسوں کی مسافت بن گیا۔ خدا خدا کر کے یہ کٹھن

مرحلہ طے ہوا تو طویل سرنگ ایک چیلنج بن کر میری نظروں کے سامنے آگئی۔ میرا اندازہ تھا کہ سرنگ میں کم از کم ڈیڑھ دو سو گز کا فاصلہ کر کے ہی میں خود کو دھماکے کی زد سے باہر تصور کرسکوں گا۔ البتہ مجھے قطعاً یقین نہیں تھا کہ میں بم پھٹنے سے پہلے اتنا طویل فاصلہ طے کر پاؤں گا اور میری توانائیوں کا تیزی سے ختم ہوتا ذخیرہ وہاں تک میرا ساتھ بھی دے پائے گا یا نہیں تاہم میں نے تمام اندیشوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور قدم بہ قدم آگے گھسٹنے لگا۔ ہر قدم کے بعد مجھے دم لینے کے لیے سرنگ کی دیوار کا سہارا لے کر رکنا پڑتا تھا اور دوبارہ پیش قدمی کا آغاز کرنا ایک کڑی آزمائش بن جاتا تھا لیکن میں نے تمام تر قوت مدافعت سے کام لیتے ہوئے آگے بڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میری رفتار بہت سست تھی جبکہ مہلت ختم ہو چکی تھی۔ میں نیم بے ہوشی کے عالم میں اندھیری سرنگ میں نہ جانے کتنا فاصلہ طے کر پایا کہ زلزلے کے زبردست جھٹکے نے مجھے زمین سے کئی فٹ اوپر اچھال پھینکا۔ ہولناک گڑگڑاہٹ نے سماعت مفلوج کرڈالی تھی۔ میں منہ کے بل زمین پر گرا۔ اس کے ساتھ ہی سرنگ کی چھت سے مٹی اور پتھر میرے جسم پر برسنے لگے۔ اگلے چند لمحوں میں سرنگ کی چھت بیٹھنے والی تھی اور میرے وجود میں توانائی کی اتنی رمق بھی باقی نہیں تھی کہ اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ میرا جسم مٹی اور پتھروں کے ڈھیر میں دبتا چلا گیا۔ پھر ایک بڑا سا پتھر میری کھوپڑی کے عقبی حصے سے ٹکرایا اور میں رہے سہے ہوش وحواس سے بھی محروم ہوگیا۔ میرا ذہن عمیق اندھیری کھائی میں ڈوب چکا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ خدا جسے زندہ رکھنا چاہے اس سے کوئی زندگی نہیں چھین سکتا۔ میرے رب کریم کو میری زندگی مقصود تھی۔ چنانچہ شدید زخمی ہونے اور سرنگ کے ملبے میں دبنے کے باوجود میں زندہ رہا۔ مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ڈاکٹر صنم کے گھر میں ایک آرام دہ بستر پر دراز پایا۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ اس وقت کمرے میں میرے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ لہٰذا مجھے اپنی ذہنی حالت درست کرنے اور صورت حال سمجھنے کا موقع مل گیا۔ میں ایک بار پھر موت کو شکست دینے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس عظیم احسان پر میں نے اپنے خالق و مالک کا تہ دل سے شکر ادا کیا۔ یہ سوچ کر میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا کہ میں شاہ مراد کا ناقابل تسخیر اڈا نیست و نابود کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ سرنگ میں جس قدر زبردست بھونچال آیا تھا اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ ان بموں نے مل کر اس اڈے کی اینٹ سے اینٹ بجا ڈالی ہوگی۔ مجھے یہ فکر تھی کہ صدیقی شاہ مراد کو ساتھ لے کر صحیح سلامت سرنگ سے نکلنے میں کامیاب ہو پائے تھے یا نہیں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ تجسس بھی تھا کہ میں سرنگ میں زندہ بچ نکلنے میں کیوں کر کامیاب ہوسکا تھا۔

میں نے بستر پر لیٹے لیٹے اپنے جسم کا جائزہ لیا۔ حیرت انگیز طور پر مجھے اپنے جسم پر کوئی زخم نظر نہیں آیا۔ حتیٰ کہ گولیوں کی زد میں آنے والی ٹانگ ہلانے میں بھی مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی جس میں میں کامیاب تو ہوگیا لیکن میرا سر بری طرح چکرا گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرے جسم کی قوت مجھ سے روٹھ کر رہ گئی ہے۔ مجھے اپنے ہاتھ پیروں پر قابو پانے میں خاصی دیر لگ گئی۔ میں

بستر سے اتر کر کھڑا ہونے ہی والا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر صنم اندر داخل ہوئی۔ مجھے بیٹھا دیکھ کر وہ حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اپنی جگہ ساکت وصامت کھڑی رہ گئی۔ اسے شاید اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ”سس۔۔۔ سیفل۔۔۔ تم۔۔۔“ اس نے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا۔ پھر وہ اچانک مڑی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ چیخ چیخ کر مختلف لوگوں کو پکار رہی تھی۔ ”سعدی بابا۔۔۔ مہر بابا۔۔۔ مہراں۔۔۔ جلدی آؤ۔۔۔ اف میرے خدا۔۔۔ اے میرے رب العالمین تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔“

”کیا بات ہے ڈاکٹر بٹیا؟ کیوں چیخ رہی ہو؟“ میں نے فقیر بابا کی حیرت بھری آواز سنی۔ پھر میں نے چاچا مہر داد اور مہراں کی آوازیں سنیں۔ وہ بھی اس طرح کے سوال پوچھ رہے تھے۔ ”سیفل کو ہوش آ گیا ہے۔“ ڈاکٹر صنم نے لرزش آمیز لہجے میں کہا۔ ”وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ رب ذوالجلال نے اسے نئی زندگی دے دی ہے۔“ یہ سن کر ان تینوں کے حلق سے بھی خوشیوں بھری چیخیں برآمد ہوئیں۔ چند ہی لمحوں بعد وہ سب مجھے گھیرے بیٹھے تھے اور مجھ پر اپنی محبتیں نچھاور کر رہے تھے۔

”ہم تو تمہاری زندگی کی طرف سے مایوس ہو چلے تھے سیفل بیٹے۔“ فقیر بابا نے میری پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ ”تم نے ہمیں بہت انتظار کرایا۔“ ڈاکٹر صنم نے اس کی تائید کی۔ ”حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں مسٹر سیفل۔ شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ تم کتنے عرصے ہوش وحواس سے بیگانہ رہے ہو۔ تمہارے زخم تو کبھی کے بھر چکے ہیں لیکن تمہاری بے ہوشی ٹوٹنے میں پورے دو مہینے لگے ہیں۔

”اف میرے خدا! میں نے شدید حیرت کے عالم میں کہا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔“ کیا میں واقعی اتنے دن بے ہوش رہا ہوں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟“

”جس حالت میں تم رہے ہو اسے بے ہوشی نہیں بلکہ کوما کہتے ہیں یعنی زندگی اور موت کی درمیانی منزل۔ اس دوران میرے علاوہ بھی کئی ڈاکٹر تمہارا معائنہ کر چکے ہیں اور ان میں سے زیادہ تر اس رائے پر متفق تھے کہ تمہارے دماغ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے اور اب تمہارے ہوش میں آنے کے امکانات بہت کم ہیں لیکن تم نے ان سب کو غلط ثابت کر دیا ہے؟“

”اچھا اب آپ یہ بتائیں کہ مجھے سرنگ کے ملبے سے کس نے نکالا؟“ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔ ”صدیقی صاحب کہاں ہیں؟ سردار شاہ مراد کا کیا بنا؟“ میں نے ڈاکٹر صنم کے چہرے پر نظریں جما رکھی تھیں۔ اپنے سوال کے جواب میں اس کے چہرے کی بشاشت میں اضافہ ہوتے دیکھ کر میرا دل خوشی سے لہرا اٹھا۔ ”ارے بھائی صدیقی صاحب ہی تو تمہیں موت کے منہ سے واپس گھسیٹ کر لانے کے ذمے دار ہیں۔ وہ اگر بروقت نہ پہنچتے تو وہ سرنگ جناب کا مزار بن چکی ہوتی لیکن اس کے محل وقوع سے کوئی آگاہ نہ ہوتا۔“

ڈاکٹر صنم نے بتایا کہ صدیقی صاحب، شاہ مراد کو ساتھ لے کر فرار تو ہو گئے لیکن وہ میری طرف سے متفکر تھے۔ مجبوری یہ تھی کہ وہ شاہ مراد اور نقشوں کی طرف سے لمحے بھر کے لیے بھی توجہ نہیں ہٹا سکتے تھے۔

جب بم پھٹے تو وہ صبر کا دامن چھوڑ بیٹھے اور گاڑی کو لے کر واپس چل پڑے۔ آگے سرنگ کو بیٹھا پا کر ان کا دل دھک سے رہ گیا لیکن کسی موہوم امید کے سہارے وہ ملبے کو کریدتے رہے۔ خاصی دیر کی جدوجہد کے بعد وہ ہمت چھوڑنے والے تھے کہ انہیں میرے دائیں ہاتھ کی جھلک نظر آئی جو ملبے میں دبنے سے رہ گیا تھا۔ انہوں نے نہایت مشکل سے مجھے ملبے کے نیچے سے نکالا لیکن میری حالت اتنی خراب تھی کہ وہ بدحواس ہو گئے۔ وہ کچھ دیر فاروقی صاحب کی طرف سے امداد کے منتظر رہے لیکن مجھے زندگی سے دور جاتے دیکھ کر وہ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے اور مجھے گاڑی میں ڈال کر شاہ مراد کی حویلی کی طرف چل پڑے۔ میرے لباس سے انہیں لوڈ پستول مل گیا تھا لہٰذا انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ حویلی کے باشندوں کے ذریعے مجھے فوری طبی امداد فراہم کریں گے۔ ان کی گاڑی حویلی کے تہ خانے میں جا کر ٹھہری اور صدیقی صاحب گاڑی سے اترے۔ وہ چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ ایک کلاشنکوف کی نال ان کی کھوپڑی پر ٹک گئی اور کسی نے انہیں پستول پھینکنے کا حکم دیا۔ بے بسی کے عالم میں صدیقی نے اس حکم پر عمل کیا۔ صدیقی کو بے بس کرنے والی شخصیت ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اس نے صدیقی سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور وہاں کیوں آیا ہے۔ صدیقی کوئی جواب دینے ہی والے تھے کہ اس لڑکی نے گاڑی میں مجھے اور شاہ مراد کو دیکھ لیا۔ میری یہ حالت دیکھ کر اس پر جنون طاری ہو گیا اور اس نے صدیقی سے پوچھا کہ میری اس حالت کا ذمے دار کون ہے۔ اس لڑکی کو مجھ پر مہربان پا کر پہلے تو صدیقی کو شدید حیرت ہوئی پھر اسے یاد آ گیا کہ میں نے اسے بتایا تھا۔ میں شاہ مراد کی بیٹی نسیم کی مدد سے شاہ مراد کے اڈے تک پہنچا تھا۔ صدیقی نے اسے نسیم کہہ کر مخاطب کیا اور پھر ساری صورت حال سے اسے آگاہ کر دیا۔ نسیم فوراً ہی مجھے طبی امداد فراہم کرنے کے لیے سرگرم عمل ہو گئی۔ وہ میرے پاؤں کی پٹی کر کے فارغ ہوئی ہی تھی کہ تہ خانے میں خطرے کا سائرن بج اٹھا۔ نسیم نے بتایا کہ یہ سائرن اس وقت بجتا ہے جب باہر سے حویلی پر حملہ کیا گیا ہو۔ صدیقی نے اسے بتایا کہ یہ کارروائی فاروقی اور اس کے ساتھیوں کی ہو سکتی ہے۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ سرنگ میں سے بہت سے لوگوں کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ صدیقی اور نسیم ہتھیار سنبھال کر مورچہ بند ہو گئے لیکن وہ لوگ فاروقی کے ماتحت ثابت ہوئے۔ صدیقی نے اپنا تعارف کرایا تو وہ لوگ انہیں پہچان گئے۔ انہوں نے وائرلس پر فاروقی اور صدیقی کی بات کرائی۔ صدیقی نے اسے میری ابتر حالت سے آگاہ کیا تو فاروقی نے انہیں اسی گاڑی میں مجھے اور شاہ مراد کو ڈال کر سرنگ میں آگے بڑھنے کی ہدایت کی۔ صدیقی نے نسیم کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم سرنگ کے اس کھلے حصے تک پہنچ گئے جہاں سے فاروقی کے ساتھی سرنگ میں داخل ہوئے تھے۔ ہم سب کو ایک تیز رفتار گاڑی میں شہر روانہ کر دیا گیا۔ شاہ مراد اور اس کے نقشوں کو تحویل میں لے لیا گیا۔ میرے باقاعدہ علاج کا سلسلہ شروع ہوا۔ نسیم کو صدیقی اپنے ساتھ اسلام آباد لے گئے تھے کیونکہ اسے شاہ مراد کے خلاف ایک اہم گواہ کی حیثیت حاصل تھی۔ ویسے بھی صدیقی نے اسے اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔

”صدیقی صاحب نے شاہ مراد کے بارے میں مزید کوئی اطلاع دی ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ڈاکٹر

صنم نے اس اثبات میں گردن ہلا دی۔ ”وہ تمہاری خیریت دریافت کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً فون کرتے رہتے ہیں اور دو بار چکر بھی لگا چکے ہیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ شاہ مراد کے کرتوتوں کا دائرہ غیر معمولی حد تک وسیع ثابت ہوا ہے۔ ملک بھر میں اس کے اڈوں کا جال پھیلا ہوا ہے جن کا خاتمہ کیا جا رہا ہے۔ جب انہیں تمہارے ہوش میں آنے کی اطلاع ملے گی تو وہ بے حد خوش ہوں گے اور دوڑے چلے آئیں گے۔ سردار خضر خان بھی چکر لگاتے رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ایک آدھ دن میں وہ آ ہی جائیں۔“

چچا مہر داد اور مہراں بھی بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔ ہم لوگ کچھ دیر گپ شپ کرتے رہے۔ پھر ڈاکٹر صنم اور مہراں کھانا تیار کرنے کے لیے چلی گئیں۔ تب چچا مہر داد نے سنجیدہ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”بیٹا سیفل اللہ نے کرم کیا اور تمہیں ایک بار پھر ہم سے ملا دیا اور سارے دکھڑے بھی دور کر دیے۔ اب میں تم سے اپنی مہراں کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“

چچا مہر داد کا لہجہ اس قسم کا تھا کہ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کیا یہ مہراں سے میری شادی کی تجویز پیش کرنے والے ہیں؟ میں انہیں کیسے بتاؤں گا کہ میں ہیر کو اپنی زندگی کی مالک بنا چکا ہوں۔ ”ہاں ہاں بتائیں چچا جان' آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”بیٹا ڈاکٹر صنم نے جواد کے لیے مہراں کا ہاتھ مانگا ہے۔ مجھے یہ لڑکا پسند ہے لیکن میں تم سے مشورہ کیے بغیر جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ تم مہراں کے بڑے بھائی ہو۔ اس کا برا بھلا بہتر سمجھتے ہو۔“

میں نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ ”چچا جان جواد مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ بہت سلجھا ہوا نوجوان ہے۔ میرا خیال ہے ہماری مہراں کے لیے بہت مناسب رہے گا۔“ فقیر بابا نے بھی ہماری رائے سے اتفاق کیا اور طے پایا کہ اس رشتے کی حامی بھر لی جائے۔ کچھ دیر بعد جواد بھی آ گیا۔ ڈاکٹر صنم نے فون کے ذریعے اسے میری صحت یابی کی خوشخبری سنا دی تھی۔ وہ حسب معمول نہایت گرم جوشی اور خلوص سے ملا۔ اس نے فقیر بابا کی ہدایت کے مطابق مجھے ورزش کرائی اور پھر نہایت ماہرانہ انداز میں سرسوں کے تیل سے میرے جسم کے پٹھوں کی مالش کی۔ اس کے بعد نیم گرم پانی کے غسل نے میرے وجود کو ایک نئی تازگی و توانائی بخشی۔ مجھے بھوک بھی لگ گئی تھی۔ کھانا تیار تھا سب نے مل کر کھانا کھایا۔ اب میں خاصی حد تک خود کو نارمل محسوس کر رہا تھا۔

رات کو اسلام آباد سے صدیقی صاحب کا فون آیا۔ میری آواز سن کر وہ خوشی سے باغ باغ ہو گئے۔ میں شاہ مراد کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن احتیاط کے تقاضوں کے پیش نظر میں اس کا نام زبان پر نہ لایا۔ صدیقی صاحب میری کیفیت سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے چند دن بعد آنے کا وعدہ کیا۔ ”میرے پاس تمہارے لیے بہت سی دھماکا خیز خبریں ہیں۔ بس چند دن انتظار کر لو۔“

دو دن تک ورزش اور مالش کا سلسلہ جاری رہا۔ حتیٰ کہ میں خود کو بالکل فٹ فاٹ محسوس کرنے لگا۔ تب ایک روز خضر خان بھی آ گیا۔ اس نے دیر تک مجھے سینے کے لپٹائے رکھا۔ ”تمہیں اپنے پیروں پر کھڑا دیکھ کر مجھے ایک نئی زندگی ملی ہے میرے ننھے بھائی۔“ اس نے میرے گال کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔ ہم

خاصی دیر تک گپ شپ کرتے رہے۔ اچانک مجھے کچھ یاد آ گیا۔ ”خضر بھائی آپ جانتے ہیں میں جس ٹرک پر چھپ کر فرار ہوا تھا اس کے ڈرائیور غلام مصطفٰے اور اس کے کلینر کو نہایت بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا اور میں محض اتفاقاً ہی بچ پایا تھا۔ مجھے یقین ہے آپ کے کارندوں میں سے کسی نے میرے فرار کی خبر شاہ مراد کے کارندوں تک پہنچائی تھی۔“

”تمہارا یقین بالکل درست ہے سیفل بھائی۔ غلام مصطفٰے کے قتل کی اطلاع ملتے ہی میں نے اس بد بخت کو ڈھونڈ نکالا تھا اور اسے عبرت ناک سزا دی تھی۔“

”وہ کون تھا خضر بھائی؟“ میرا سوال بن کر اس نے شدید دکھ کے اظہار کے طور پر گردن جھکا لی۔ ”میرا دست راست امجد خان۔ وہ بد نصیب تمہارے سر پر رکھے گئے بھاری انعام کے لالچ میں آ گیا تھا۔ اس نے تمہیں پہلی نظر میں پہچان لیا تھا۔“ خضر خان کے لہجے میں غصے اور ندامت کے ملے جلے تاثرات نمایاں تھے۔ میں نے اس تکلیف دہ موضوع کو تبدیل کرنا مناسب سمجھا۔ ”اچھا یہ بتائیں کہ عنبرین کیوں نہیں آئی؟“ حسب توقع یہ سن کر خضر خان رنج کی دھند سے باہر نکل آیا۔ ”یہ تم اپنی ڈاکٹر صنم سے پوچھو جس نے اس کے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ تمہیں اس سے ملاقات کے لیے بذات خود نخی سرور جانا ہوگا۔“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”وہ تو ٹھیک ہے لیکن عنبرین کو ہوا کیا ہے؟ اس کی طبیعت تو ــــــ“ عین اسی وقت ڈاکٹر صنم چائے لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تم بالکل بدھو ہو مسٹر سیفل ـــــ سمپلی اسٹوپڈ ـــــ ارے تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ میں نے یہ مشورہ کیوں دیا ہوگا۔ ارے بھائی تم ماموں بننے والے ہو۔“

”اوہ ـــــ یہ تو آپ نے بہت بڑی خوشی کی خبر سنائی۔“ میں نے کہا۔ خضر خان سے میرے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ”بس تم ابھی میرے ساتھ چلو۔ عنبرین تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوگی۔“

”اس کے پاس بھی چلیں گے لیکن مجھے ایک اور جگہ جانا ہے۔“ میں نے کہا۔

خضر خان نے معنی خیز نظروں سے مجھے گھورا۔

”کہاں جانا ہے بھائی؟ کچھ ہمیں بھی بتاؤ کون خوش قسمت تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

”آپ کی کوئی مصروفیت نہ ہو تو میرے ساتھ چلیں۔ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ فوراً ہی راضی ہو گیا۔ ہم دونوں شام تک واپسی کا کہہ کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ خضر خان میری منزل مقصود کا راستہ جانتا تھا لہٰذا مجھے رہنمائی کی زحمت نہیں کرنا پڑی۔ میرے کانوں میں ہیر کی حیات بخش آواز گونج رہی تھی۔ ”میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں' کب تک انتظار کراؤ گے۔“

جوں جوں فاصلہ کم ہو رہا تھا میرے دل کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی۔ میں اپنے ذہن کو اس بارے میں سوچنے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اندیشوں کے سیاہ ناگ بار بار پھن اٹھانے لگتے تھے۔ خدا جانے وہ کس حال میں ہوگی؟ اسے اپنی خطرناک بیماری کا آپریشن کے ذریعے علاج کرانا تھا کہیں

خدانخواستہ۔۔۔نہیں نہیں۔۔۔خدا کو اگر اسے اپنے پاس بلانا ہوتا تو وہ مجھے موت کے دروازے سے واپس کیوں لوٹاتا؟ وہ بالکل صحت مند ہوگی اور بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہوگی۔

خضر خان میری حالت کو سمجھ رہا تھا لہٰذا اس نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا تھا البتہ مقبول ہستی کے پاس پہنچ کر اسے مجھے مخاطب ہونا پڑا۔ ''ہاں بھئی اب کس طرف چلنا ہے؟'' میں اسے سردار کمال الدین کی حویلی لے گیا۔ خوش قسمتی سے وہ اس وقت گھر پر ہی تھا۔ مجھے دیکھ کر تو جیسے سیروں خون بڑھ گیا۔ میں نے سردار خضر خان سے اس کا تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ وہ غائبانہ طور پر ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ ان دونوں میں کچھ ہی دیر میں گاڑھی چھننے لگی تھی۔ کمال الدین ہیر کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تو میری کچھ ڈھارس بندھی۔ اس کا مطلب تھا اس کے پاس میرے لیے منحوس خبر نہیں تھی۔

میرے صبر کی حد پوری ہونے لگی تو میں نے ان دونوں سے کچھ دیر کے لیے رخصت ہونے کی اجازت طلب کی۔ اس وقت مجھے انتہائی خوش گوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب خضر خان کے ساتھ ساتھ کمال الدین کی آنکھوں میں بھی معنی خیز چمک نظر آئی۔ ''ہاں بھائی' جاؤ' ضرور جاؤ' ہم دوپہر اور شام کے کھانے پر تمہارا انتظار۔۔۔نہیں کریں گے۔'' پھر ان دونوں نے مل کر ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ میں شرمندہ سا ہو کر حویلی سے نکل آیا۔

گھر کے باہر کریم بابا کی بیل گاڑی نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ کام پر گیا ہوا ہے۔ میں نے دھڑکنوں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں بعد ایک مانوس آہٹ سنائی دی۔ ''کون ہے؟'' میرے کانوں میں امرت کی بوندیں ٹپکیں۔ مجھے لگا کہ میری زبان تالو سے چپک کر رہ گئی ہے۔ ''کون ہے؟۔۔۔بابا گھر پر نہیں ہیں' مغرب کے بعد آئیں گے۔''

''ہیر۔۔۔دروازہ کھولو'' میری زبان بمشکل حرکت میں آسکی۔ الفاظ کی گونج ابھی مدھم بھی نہ ہو پائی تھی کہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ میرے سامنے تھی۔ اس کے گلاب چہرے پر پہلے سے کہیں زیادہ تازگی اور نکھار تھا۔ وہ خاصی دیر تک دیوانہ وار مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئیں اور وہ دوڑتی ہوئی کمرے میں گھس گئی۔ اس کا یہ ردعمل میرے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ مجھ سے سخت ناراض تھی اور اپنی اس ناراضی میں حق بہ جانب بھی تھی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ بانہوں میں چہرہ چھپائے زاروقطار رو رہی تھی۔ اس کا ہر آنسو میرے دل پر پگھلا ہوا موم بن کر گر رہا تھا لیکن میں نے اسے فوری طور پر مخاطب نہیں کیا۔ میں چاہتا تھا وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لے۔ جب اس کی سسکیاں کچھ کم ہوئیں تو میں نے کہا۔ ''کیا اتنے عرصے بعد گھر لوٹنے والوں کا اس طرح استقبال کیا جاتا ہے؟'' اس نے مجھے دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر غصے کی جھلک نظر آئی۔ اس روپ میں وہ مجھے اور بھی زیادہ پیاری لگی۔ ''آپ بھی اس طرف کا رخ کرنے کی زحمت کیوں کی؟ کیسے فرصت مل گئی؟'' اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔ پھر وہ اچانک ایک بار پھر رونے لگی۔ مجھ سے مزید برداشت نہ ہو سکا اور میں نے آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ میرے سینے پر سر رکھ کے

آنسو بہانے لگی۔ اس کے گلے شکوؤں کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ ''کوئی جیے یا مرے' تمہیں اس سے کیا۔''

''ایسا نہ کہو ہیر۔'' میں نے تڑپ کر کہا۔ ''تم ہی تو میرے جینے کا جواز ہو۔''

''سب کہنے کی باتیں ہیں۔ میری موت آنے میں کیا کسر رہ گئی تھی! اس کچے صحن میں میری قبر بن جاتی اور تمہیں پتا بھی نہ چلتا۔ تم کیا جانو میرا ایک ایک پل کیسے گزرا ہے لیکن تمہیں تو صرف اپنے سیر سپاٹوں سے کام ہے ناں! کسی اور کے بارے میں سوچنے کا وقت کہاں ہوگا تمہارے پاس۔''

''پگلی کہیں کی'' میں نے دھیرے سے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تمہیں بھول گیا ہوں۔ اپنا دل و دماغ تو میں یہیں چھوڑ گیا تھا۔ میں تم سے دور تھا لیکن مجھے اپنے پیارے رب پر پورا بھروسا تھا کہ وہ اپنے ناچیز بندے کو زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے محروم نہیں کرے گا۔''

ہیر نے میرے سینے سے سر ہٹا کر میرے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں جل تھل کی کیفیت کم ہو گی البتہ شکوے کی نمی اب بھی تیر رہی تھی۔ ''تم نے اپنی آپ بیتی تو سنا دی' مجھ سے تو پوچھا ہوتا کہ میں آزمائش کی کن گھڑیوں سے گزرتا رہا ہوں۔''

''کک۔۔۔کیا ہوا تمہیں؟'' پریشانی کی شدت سے اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔ اس نے پہلی مرتبہ بغور میرا جائزہ لیا۔ ''اف میرے خدا! تم تو بے حد کمزور نظر آرہے ہو۔'' اگلے ہی لمحے وہ بری طرح شرمسار نظر آنے لگی۔ '' میں بے حد خود غرض ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔'' وہ ایک بار پھر آنسوؤں کے جھرنے بہانے کی تیاری کر رہی تھی لیکن میں نے اسے ایک بار پھر اپنی بانہوں کے حلقے میں بھر لیا۔ ''فکر نہ کرو اب سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہے۔ خدا نے تمہیں میری خاطر زندگی بخشی اور مجھے تمہارے لیے زندہ سلامت رکھا۔ اب میں تمہیں انتظار کی آگ میں کبھی نہیں جلنے دوں گا۔ میں آج ہی کریم بابا سے بات کروں گا اور تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا ہی بنا لوں گا۔''

میری بات سن کر وہ بری طرح شرما گئی۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ''اچھا یہ تو بتاؤ کہ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے اور تمہارے آپریشن کا کیا بنا؟ کیا تم لوگ کراچی گئے تھے؟'' ہیر نے اثبات میں سر ہلا کر کہا' بابا اور میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کراچی گئے تھے۔ وہاں بہت بڑی بڑی مشینوں سے میرے ٹیسٹ ہوئے پھر ڈاکٹروں نے کہا کہ میرا جلد از جلد آپریشن ہونا چاہیے۔ جب ہم کراچی جا رہے تھے تو سردار کمال الدین نے کہا تھا کہ مزید رقم کی ضرورت پڑے تو خط کے ذریعے اسے اطلاع کر دیں۔ وہ مزید رقم بھجوا دے گا۔ اس نے کہا تھا تم نے میرے علاج کے لیے اس کے پاس ایک لاکھ روپے رکھوا رکھے ہیں۔ بابا نے خط بھجوایا تو سردار کمال الدین رقم سمیت خود کراچی پہنچ گیا اور آپریشن اور اس کے بعد میرے ٹھیک ہونے تک وہیں رہا اور ہمیں ساتھ لے کر واپس آیا ہے۔ اس دوران اس نے بابا کا ایک پیسا بھی خرچ نہیں ہونے دیا۔ بابا تو اس کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔ ان کا کہنا ہے کہ کمال الدین انسان کے روپ میں فرشتہ ہے۔''

"اچھا تمہارے آپریشن سے ڈاکٹرز کس نتیجے پر پہنچے؟ کیا تمہیں بیماری سے مکمل نجات مل چکی ہے؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ڈاکٹروں نے اسے کس حد تک مرض سے آگاہ کیا ہوگا۔ میری بات سن کر اس نے ایک بار اثبات میں سر کو جنبش دی۔ "ان کا کہنا ہے کہ میرا آپریشن سو فی صد کامیاب رہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ لوگ جسے میرا دماغ میں کینسر کا پھوڑا سمجھ رہے تھے وہ دراصل خشک خون کی بے ضرر گٹھلی ثابت ہوئی جو انہوں نے نکال دی۔ اس کے بعد سے میں بالکل ٹھیک ہوں۔ پھر سر میں اب بالکل درد نہیں ہوتا۔"

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے اس نے تمہیں ایک نئی زندگی سے ہم کنار کیا۔ چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ میری غیر موجودگی میں یہ سب کچھ ہو گیا ورنہ ڈاکٹروں کو تمہارے آس پاس چکر لگاتے دیکھ کر میں تو حسد سے جل کر کباب بن جاتا۔ ویسے سچ سچ بتاؤ یہ غصہ کرنا تم نے کس سے سیکھ لیا؟ کہیں کراچی کی ہوا تو نہیں لگ گئی؟" میری بات سن کر اس کے گلاب گوں لبوں پر سجی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ "جب میں بالکل ٹھیک ہو گئی اور ڈاکٹروں نے مجھے ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا تو چاچا کمال الدین نے دو دن تک مجھے اور بابا کو کراچی کی سیر کرائی تھی۔ اتنا بڑا شہر ہے کہ میرا تو دماغ گھومنے لگا تھا اور سمندر دیکھ کر تو میرا دل دھک کر رہ گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی اونچی لہریں ابھی سب کچھ اپنے ساتھ بہا لے جائیں گی۔"

"تمہیں اچھا تو لگا ناں کراچی؟" ہیر نے اپنے مخصوص انداز میں گردن ہلا کر حامی بھری۔ "تو بس طے رہا۔ شادی کے بعد ہم بھی گھومنے پھرنے کے لیے کراچی جائیں گے۔"

وہ ایک بار پھر شرما گئی۔ "اچھا تم بیٹھو میں گوشت بھون کر آتی ہوں۔ میں نے بابا سے کہا تھا کہ جلدی آ جانا۔ ہو سکتا ہے دوپہر کے کھانے پر وہ بھی آ جائیں۔"

"چلو میں بھی وہیں بیٹھتا ہوں۔ یہاں میں کیا کروں گا۔" میں نے کہا۔ "تمہاری بھورو سے بھی تو سلام دعا کرنا ہے۔ پتا نہیں میں اسے یاد بھی ہوں یا نہیں۔"

"ہم لوگ اتنی آسانی سے اپنوں کو نہیں بھلاتے' خواہ وہ ہمیں بھلا دیں۔ اب تم شرافت سے بتاتے جاؤ کہ اتنے دن کیا کرتے رہے اور تمہاری صحت اتنی خراب کیسے ہوئی۔ میں نے چاچا کمال الدین اور ریشماں سے بھی پوچھا تھا لیکن انہیں بھی تمہارے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔"

"اچھا تو ریشماں سے بھی تمہاری دوستی ہو گئی ہے؟" میں نے باورچی خانے کے قریب موجود موڑھے پر براجمان ہوتے ہوئے کہا۔ ہیر نے چولہے پر چڑھی ہانڈی میں ڈوئی گھماتے ہوئے کہا۔ "ہاں! اب وہ گاؤں میں میری سب سے پکی سہیلی ہے اور تمہاری تو جیسے وہ دیوانی ہے۔ تعریفیں کرتے نہیں تھکتی۔ تمہیں بھائی کہتی ہے ورنہ میں اس کا گلا گھونٹ دیتی۔" اس کے لبوں پر شریر مسکراہٹ تھی۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ وہ تمہیں بھائی صرف کہتی ہی نہیں بلکہ سمجھتی بھی ہے۔ چاچا کمال الدین اپنے بیٹے شوکت سے اس کی شادی کرنا چاہتا ہے لیکن اس نے صاف کہہ دیا کہ اس بارے میں میرے بھائی سے بات کرنا۔ وہ جو فیصلہ کرے گا مجھے قبول ہوگا۔

"اچھا تو یہ بات ہے" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "لیکن شوکت تو ہیروئن اور چرس وغیرہ کا نشہ کرتا ہے۔ سردار کمال الدین کیا ریشماں کی زندگی تباہ کرنا چاہتا ہے؟"

"شوکت نشے سمیت اپنی تمام بری عادات ترک کر چکا ہے اور تم سے کیا پردہ اس نے ریشماں کی خاطر ہی اپنے آپ کو تبدیل کیا ہے۔ اب وہ حقے کا کش بھی نہیں لگاتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اب اس کا گھر سے باہر دل ہی نہیں لگتا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے یہ رشتہ قبول کر لینا چاہیے؟ سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ ریشماں صرف تمہاری سہیلی ہی نہیں بلکہ نند بھی ہے۔"

"تم بے فکر ہو کر ہاں کہہ دو۔ ریشماں نے اسے تیر کی طرح سیدھا کر دیا ہے۔ ویسے وہ خود بھی شوکت کو پسند کرنے لگی ہے۔ ان دونوں کی جوڑی اچھی رہے گی۔"

اسی اثنا میں گھر کا دروازہ کھلا اور بابا کریم بخش اندر داخل ہوئے۔ میں ان کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ انہوں نے نہایت محبت اور شفقت سے مجھے گلے لگا لیا۔ انہوں نے میرا حال چال تو پوچھا لیکن مجھ سے اتنے دنوں تک غائب رہنے کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ اس شریف آدمی نے زندگی بھر اپنے کام سے کام رکھا تھا اور اب بھی اسی حکمت عملی پر عمل پیرا تھا۔ ہیر نے ہم دونوں کے لیے کھانا لگا دیا اور خود ایک بار پھر چولہے کے پاس جا بیٹھی۔ میں نے ہیر کے کامیاب آپریشن پر بابا کریم بخش کو مبارک باد دی۔ ہم کچھ دیر اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ پھر میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "بابا مجھے آپ سے ایک اہم بات کرنا ہے"

"ہاں ہاں کہو بیٹا' میں سن رہا ہوں۔"

"بابا میں آپ کے سامنے اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میرا اصل نام سعید نہیں بلکہ سیف داد خان ہے۔" کریم بابا کے چہرے پر حیرانی کے آثار ابھرے لیکن میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "البتہ یہ سچ ہے کہ میں نے اپنی جان کو لاحق خطرے کی وجہ سے اپنا نام تبدیل کیا تھا۔ اب اللہ کے فضل سے میری زندگی بہت جھنجٹوں سے آزاد ہو چکی ہے اور میں ایک پرسکون زندگی گزارنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ میرا یہ سب کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب میں اپنے بزرگوں کو آپ کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں تاکہ آپ کی بیٹی کا ہاتھ میرے لیے مانگ سکیں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟" یہ پوچھتے ہوئے میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اگر کریم بابا نے انکار کر دیا تو میرا کیا بنے گا؟

بابا کریم بخش کچھ دیر گہری سوچ میں ڈوبا رہا پھر اس نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "بیٹا تم جانتے ہو ہرنی کے علاوہ دنیا میں میرا اور کوئی نہیں ہے۔ میں نے اسے باپ اور ماں دونوں کا پیار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اس کی خوشیاں اپنی زندگی سے بھی بڑھ کر عزیز ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم میری ہرنی کو یہ خوشیاں دے سکتے ہو لیکن میں اس سلسلے میں خوب سوچ سمجھ کر فیصلو کرنا چاہتا ہوں۔

"مجھے آپ کے احساسات کا اندازہ ہے بابا اور مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ آپ کو جو بھی فیصلہ کرنا

ہے پورے اطمینان اور غور و فکر کے بعد کریں۔ مجھے شام کو واپس جانا ہے لیکن میں چند روز بعد واپس آؤں گا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ بابا کریم بخش نے میری حوصلہ شکنی نہیں کی تھی لیکن موہوم سے اندیشے میرا دامن چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ کچھ دیر وہاں ٹھہرنے کے بعد میں شام کو واپس آنے کا کہہ کر کمال الدین کی حویلی میں آ گیا۔ اس وقت وہاں زبردست میلا لگا ہوا تھا۔ اتنی سی مدت میں ہی خضر خان اور کمال الدین میں گاڑھی چھننے لگی تھی۔ انہوں نے حسبِ معمول معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ کمال الدین نے خضر خان کو ہیر کے بارے میں یقیناً بتا دیا ہوگا لہٰذا مجھے ان نظروں کا سامنا کرنا کڑی آزمائش لگ رہا تھا۔ بالآخر میری یہ مشکل خود کمال الدین نے آسان کی۔ "ارے بھائی ریشماں درجنوں بار تمہارے بارے میں پوچھ چکی ہے۔ جاؤ اس کو بھی چہرہ دکھا دو۔ وہ باورچی خانے میں ہے۔"

ریشماں پہلے سے کہیں زیادہ صحت مند، خوش باش اور مطمئن نظر آ رہی تھی۔ ہم خاصی دیر تک گپ شپ کرتے رہے۔ اس نے ہیر کے حوالے سے مجھے جی بھر کے زچ کیا۔ مردان خانے میں آیا تو کمال الدین نے اعلان کیا کہ ہمیں آج کی رات اس کے ہاں ٹھہرنا پڑے گا۔ خضر خان کو آمادہ پا کر میں نے بھی تعرض نہیں کیا۔ شام ڈھلے میں بابا کریم بخش کے گھر چلا گیا اور وہاں سے رات گہری ہونے پر واپس لوٹا۔ حسبِ توقع کمال الدین نے موقع ملتے ہی ریشماں کو اپنی بہو بنانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے کہا کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ یہ سن کر وہ خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔

اگلے روز خضر خان اور میں شہر آ گئے اور کچھ دیر ڈاکٹر صنم کے ہاں ٹھہرنے کے بعد سخی سرور روانہ ہو گئے۔ فقیر بابا بھی ہمارے ہمراہ تھا۔ وہ بہت پرجوش نظر آ رہا تھا۔ "کل سے سخی سرور داتا کا عرس شروع ہو رہا ہے جس کا میں نہایت بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ ایک بار سخی سرور سائیں کا فقیر بننے کا اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اب میں وہاں سے واپس نہیں آؤں گا۔" فقیر بابا کی یہ بات سن کر میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ قلندر بابا کی نورانی صورت میرے ذہن کے دریچوں میں اتر آئی اور ان کے دل میں اتر جانے والی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ سخی سائیں کے مزار کے احاطے میں مجھے دشمنوں سے بچانے کے بعد انہوں نے کہا تھا۔ "سخی سائیں کے میلے میں شریک ہونا نہ بھولنا' چاہے جس طرح بھی ہو یہاں پہنچنے کی کوشش کرنا ورنہ ساری زندگی پچھتاتا رہے گا' جلتا رہے گا۔" میرے دل کی دھڑکن بڑھنے لگی۔ کیا میری زندگی ایک بار پھر کوئی غیر متوقع موڑ مڑنے والی ہے؟ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ مجھے پتا بھی نہ چلا اور میرے سخی سرور سائیں کے میلے میں شرکت کا انتظام ہو گیا تھا۔

سخی سرور پہنچنے کے بعد خضر خان کے قلعہ نما حویلی ہمارا مسکن بنی۔ عنبرین نے نہایت والہانہ انداز میں میرا خیر مقدم کیا لیکن میں جلد از جلد سخی سرور سائیں کے دربار میں حاضری دینے کے لیے بے تاب تھا۔ فقیر بابا کی کیفیت بھی زیادہ مختلف نہ تھی۔ لہٰذا کچھ دیر بعد ہم دونوں اجازت لے کر دربار کی طرف چل پڑے۔ ہم نے سخی سرور کے سرہانے کھڑے ہو کر نہایت خشوع و خضوع کے سے فاتحہ پڑھی۔ پھر میں فقیر بابا کو وہیں چھوڑ کر دربار کے احاطے میں نکل آیا۔ عرس کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں احاطے میں

زائرین کا اتنا بڑا ہجوم موجود تھا کہ چلنا پھرنا مشکل ہو رہا تھا۔ میری نظریں نہایت بے قراری سے قلندر بابا کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ میں نے دربار کا کونا کونا چھان مارا لیکن قلندر بابا کہیں نظر نہ آئے۔ میں نے احاطے کی کنگروں والی دیوار کے پاس پہنچ کر خشک برساتی نالے پر نظر ڈالی۔ وہاں پر خیموں پر اور قناتوں کا شہر آباد ہو چکا تھا۔ سورج ڈھلنے کے ساتھ ہی ان خیموں میں گیس کے ہنڈے روشن کر دیے گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ کیا قلندر بابا کو ڈھونڈنے کے لیے ادھر جاؤں لیکن پھر میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر قلندر بابا کو مجھ سے ملنا ہوا تو وہ خود بخود مجھ تک پہنچ جائے گا۔ ویسے بھی اس نے نہیں کہا تھا کہ وہ عرس کے موقع پر مجھ سے ضرور ملے گا۔

رات گہری ہونے پر ہم دونوں خضر خان کی حویلی لوٹ آئے۔ اگلی صبح ہم نے فجر کی نماز دربار کے احاطے میں واقع مسجد میں ادا کی اور عرس کی تقریبات میں شریک ہو گئے۔ دوپہر اور رات کا کھانا ہم نے دربار کے لنگر سے کھایا۔ ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ عرس کے دوران میں ہم مزار کے احاطے میں ہی شب بسری کریں گے۔ قلندر بابا کے انتظار میں مجھے رات گئے تک نیند نہ آئی لیکن میرا یہ انتظار بے سود ثابت ہوا۔ اگلے روز میں لنگر سے دوپہر کا کھانا کھا کر فارغ ہوا ہی تھا کہ مجھے خضر خان کی جھلک نظر آئی۔ پھر میں نے ان کے ساتھ موجود شخص کو بھی دیکھ لیا۔ وہ صدیقی صاحب تھے۔ انہوں نے گرم جوشی سے مجھے گلے لگا لیا۔ ان کی صحت اب کافی بہتر نظر آ رہی تھی۔ مجھے ان سے بہت سی باتیں کرنا تھیں لہٰذا میں انہیں ایک نسبتاً الگ تھلگ گوشے میں لے آیا۔ خضر خان صدیقی کو مجھ سے ملوانے کے فوراً بعد واپس چلا گیا تھا۔

صدیقی صاحب میری بے تابی سے لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن انہوں نے میرے صبر کا زیادہ امتحان نہیں لیا۔ "مبارک ہو سیفل' ہمارا مشن کامیابی سے مکمل ہو چکا ہے۔ شاہ مراد کی سازش کا قلع قمع ہو چکا ہے اور اس کے تمام ٹھکانے نیست و نابود کر دیے گئے ہیں۔ اس کے زیادہ تر ساتھی گرفتار ہو چکے ہیں باقیوں کی تلاش جاری ہے۔ میرے محکمے کے تمام سرکردہ افراد تم سے ملنے کے لیے بے چین ہیں۔ اب جلد از جلد میرے ساتھ چلنے کی تیاری کرو۔ میں تمہارا غائبانہ تعارف کراتے کراتے تنگ آ گیا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ شاہ مراد کی زبان کھولی یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ارے بھائی ہم نے دو ہی دن کی مہمان نوازی کے بعد اسے فر فر بولنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ باقی کسر اجے نادیو عرف افضل کے بیان نے پوری کر دی۔" صدیقی نے خوشی سے چہکتے ہوئے بتایا۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اب ذرا تفصیل سے بتائیں کہ شاہ مراد تخریب کاری کی کس سازش کی تیاری کر رہا تھا؟"

"میں اس کے منصوبے کو تخریب کاری نہیں بلکہ تعمیر کاری کہوں گا۔ وہ موصوف دراصل ایک طویل عرصے سے اپنے اس سازشی منصوبے پر عمل پیرا تھے اور وہ سازش ہے ہمسایہ ملک ایران کے بلوچ علاقے اور صوبہ بلوچستان کے بڑے حصے کو ملا کر آزاد بلوچستان قائم کرنا۔ وہ یہ سب اپنے بھارتی آقاؤں کے

اشارے پر کر رہا تھا۔ جنہوں نے اسے جھانسا دے رکھا تھا کہ یہ آزاد ریاست بننے کے بعد وہ اس کا بلا شرکت غیر حکمران بن جائے گا۔ اس سازش کو عملی شکل دینے کے لیے ایک طویل عرصے سے بلوچستان کے تعلیمی اداروں میں نوجوانوں اور عوام کو وفاق کے خلاف بھڑکایا جا رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے طلبہ تنظیمیں خصوصاً ان کا اہم ٹارگٹ ہیں۔ بلوچستان میں ضروریات زندگی کی ناقص صورت حال نے ان کا کام آسان بنا دیا ہے۔ وفاق سے آزادی کے نظریاتی پرچار کے بعد اب بات مسلح جدوجہد تک جا پہنچی تھی اور شاہ مراد نے اس مقصد کے لیے اپنے اڈوں میں اسلحے اور گولا بارود کا بھاری ذخیرہ محفوظ کر رکھا تھا جو مناسب وقت پر ہم خیال لوگوں میں تقسیم کیا جانا تھا۔ اس کے علاوہ شاہ مراد اپنے بھارتی آقاؤں کے اشارے پر ملک بھر میں بم دھماکوں اور دہشت گردی کی وارداتیں بھی کراتا تھا۔ جو اڈا تم نے تباہ کیا تھا وہ اس کا سب سے بڑا اور مضبوط ٹھکانہ تھا جہاں بوب ٹریپ اور ٹائم بموں کے علاوہ آتشی ہتھیاروں اور گولا بارود کا اتنا بھاری ذخیرہ موجود تھا کہ ٹائم بم پھٹنے کے بعد وہ جگہ ایک جھیل کی شکل اختیار کر چکی ہے۔''

''اب شاہ مراد کا کیا بنے گا؟'' میں نے پوچھا۔ صدیقی صاحب شانے اچکا کر کہا۔ ''خدا جانے اب یہ معاملہ بہت اعلیٰ سطح پر جا چکا ہے۔ شاید ہمیں کبھی پتہ نہ چل سکے کہ اس کا کیا حشر ہوا۔'' اچانک مجھے ایک اور بات یاد آ گئی۔ ''صدیقی صاحب کیا شاہ مراد نے ملک عبدالکریم کے بارے میں بھی کچھ بتایا ہے؟''

''ملک عبدالکریم کے بارے میں اس نے جو کچھ بتایا ہے وہ نہایت رنج ناک ہے۔ ملک عبدالکریم کو سرحد پار بھیج دیا گیا تھا جہاں تشدد کے مراحل سے گزرتے ہوئے اس پر دل کا دورہ پڑا اور وہ انتقال کر گیا۔ ہم اس کے بھائی ملک عبدالرحیم کی مدد سے اہم بھارتی باشندوں کو بھی برآمد کر چکے ہیں اور انہیں خفیہ طور پر سرحد پار کرا کے ان کے گھروں میں بھیجا جا چکا ہے۔ اب بھارتی منصوبہ ساز ہمارے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی افضل اور شاہ مراد کے زبان کھولنے سے ان کی پوزیشن نازک ہو چکی ہوگی اور وہ سب کچھ بھول کر اپنے دفاع کی تیاریوں میں مگن ہو گئے ہونگے۔'' اتنا کہنے کے بعد وہ کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔ پھر ایک گہری سانس لے کر انہوں نے میری نظروں میں نظریں ڈال دیں۔

''اب میں شاہ مراد کے کچھ ایسے کرتوتوں کے بارے میں بھی تمہیں بتانا چاہتا ہوں جن کا تعلق تم سے ہے!'' میں نے حیرانی سے صدیقی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ''آپ کن کرتوتوں کی بات کر رہے ہیں صدیقی صاحب؟'' میرے لہجے میں بے قراری کی کیفیت دیکھ کر انہوں نے مجھے تحمل سے کام لینے کا اشارہ کیا۔ ''یہ سب اس نے بالکل رضا کارانہ طور پر بتایا ہے۔ میں نے تمہارے حوالے سے اس سے بات کی تو وہ بکتا چلا گیا۔''

''آپ میرے صبر کی آزمائش نہ کریں صدیقی صاحب۔ صاف بتائیں اس نے کیا بتایا ہے؟''

''میں نے اس سے کہا تھا کہ تمہاری تباہی کی ابتدا سیفل پر تمہارے مظالم سے ہوئی تھی۔ یہ سن کر اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔ بات صرف اتنی نہیں ہے۔ میرے بیٹے نے سیفل کو اپنے ظلم کا نشانہ بنا کر اپنے باپ کی خونی روایت کا اعادہ کیا تھا۔ یہ لڑکا سیفل اس وقت محض چند ماہ کا تھا جب

میں نے اس کی ماں جنت کو اغوا کرایا تھا۔ اس وقت سیفل بھی اپنی ماں کے ساتھ تھا۔ جنت میری خواب گاہ میں پہنچنے کے باوجود خود کو میرے رحم و کرم پر چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔ تب میں نے ننھے بچے کو اپنے خنجر کی زد میں لے کر جنت کو دھمکی دی کہ اگر اس نے میری بات نہ مانی تو میں اس کے بیٹے کو مار ڈالوں گا۔ یہ سن کر وہ بری طرح دہشت زدہ ہو گئی لیکن اس کے باوجود مزاحمت ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ تب میں نے خنجر کو اس انداز میں لہرایا جیسے میں بچے کے سینے میں پیوست کرنے والا ہوں۔ یہ دیکھ کر اس کے حلق سے خوف ناک چیخ برآمد ہوئی۔ میں نے اپنی یہ حرکت کئی بار دہرائی تو اس کی ہمت ٹوٹنے لگی۔ میں نے اسے مسہری کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے بظاہر میری بات مان لی تھی۔ میں مطمئن ہو کر اس کے قریب پہنچا لیکن مجھے یہ حرکت بہت مہنگی پڑی۔ مجھے بالکل خیال نہیں رہا تھا کہ مسہری سے منسلک تپائی پر پھلوں سے بھرا تھال موجود ہے جس میں پھل کاٹنے کی چھری بھی رکھی ہوئی تھی۔ جنت نے وہ چھری اٹھائی اور بجلی کی سی تیزی سے مجھ پر حملہ کر دیا۔ وار اتنا اچانک اور بھرپور تھا کہ میں خود کو اس کی زد سے نہ بچا سکا۔ چھری میرے شانے میں اتر گئی تھی۔ اگلا وار اس نے میری گردن پر کیا۔ میں نے اس بار اپنے آپ کو بچا لیا لیکن وہ اس قدر تابڑ توڑ حملے کر رہی تھی کہ مجھے سچ مچ اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ اسی کشمکش میں نہ جانے کب میرا خنجر حرکت میں آیا اور جنت کے جسم میں اتر گیا۔ میرا ہاتھ اس وقت رکا جب وہ دم توڑ گئی۔'' اتنا کہنے کے بعد صدیقی صاحب خاموش ہو گئے۔ اس دوران میں ان کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ میری سماعت اور حواس پر کوڑا بن کر برستا رہا تھا۔

اس تمام بیان کو قبول کرنے اور اس پر اعتبار کرنے میں میرے شعور کو زیادہ دیر نہ لگی۔ اگلے ہی لمحے شدید ندامت اور پچھتاوے کے احساسات نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اف میرے خدا! میں زندگی بھر اپنی ماں سے نفرت کرتا رہا۔ اس کو دردناک موت کے حوالے کرنا میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا جب کہ وہ۔۔۔ دراصل کس قدر عظیم شخصیت تھیں۔ میری اس گھٹیا سوچ سے اس پاک روح کو کتنی اذیت پہنچی ہوگی؟ میں عالم بالا میں کیسے انہیں منہ دکھاؤں گا؟ میرے مرحوم باپ کی روح مجھ پر کتنی لعنتیں بھیجتی ہوگی جن کی پاک باز اور وفا شعار بیوی پر کیسی غلیظ تہمت لگاتا رہا ہوں۔۔۔'

''شاہ مراد کا کہنا ہے کہ وہ اس افتاد سے اتنا پریشان ہو گیا تھا کہ اس نے بلا سوچے سمجھے تمہیں جھاڑیوں میں پھنکوا دیا اور تمہاری ماں کو گاؤں سے باہر ایک غیر آباد علاقے میں دفن کرا دیا۔ دوسری طرف اس نے اپنے زرخرید غلاموں کے ذریعے افواہ پھیلا دی کہ تمہاری ماں کسی ڈاچی سوار کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ یہ پروپیگنڈا اتنے وثوق اور زور شور سے پھیلایا گیا کہ گاؤں کے بیشتر لوگوں کو اس پر اعتبار آ گیا لیکن تمہارے باپ گوہر داد کو اپنی بیوی کے کردار کی مضبوطی کا اتنا یقین تھا کہ اس نے ان افواہوں پر کان دھرنے سے انکار کر دیا اور نزدیکی پولیس چوکی میں اپنی بیوی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دی جس میں شک ظاہر کیا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے خود بھی اپنی بیوی کی تلاش شروع کر دی۔ شاہ مراد کا کہنا ہے کہ اسے خطرہ محسوس ہوا تھا کہ گوہر داد حقیقت کا پتا چلا لے گا لہٰذا

اس نے اسے بھی راستے سے ہٹا دیا اور اس کی موت کی ذمے داری بھی تمہاری ماں کے فرضی آشنا پر ڈال دی۔ اتنا کچھ کرنے کے باوجود شاہ مراد کو تمہارے چچا مہرداد سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا اس کا سدباب اس نے اس طرح کیا کہ ایک رات اپنے کارندے ڈاکوؤں کے بھیس میں بھیج کر تمہارے چچا کی ٹانگ توڑ ڈالی اور انہیں ہمیشہ کے لیے معذور کر دیا۔ شاہ مراد کی خباثت کا سلسلہ یہیں تک محدود نہیں رہا۔ اس نے جعلی کاغذات کے ذریعے دعویٰ کیا کہ گوہرداد مرنے سے کچھ عرصے پہلی اپنی تمام جائیداد شاہ مراد کے ہاتھ فروخت کر چکا تھا۔ تمہارا چچا مہرداد پے در پے مصائب سے اس قدر نڈھال ہو چکا تھا کہ اس نے شاہ مراد کا دعویٰ تسلیم کر کے تمام زمین و جائیداد سے دست بردار ہونے میں ہی عافیت سمجھی۔ اسے شاید صورت حال کا اندازہ بھی ہو چکا تھا لہٰذا اس نے مزاحمت کر کے اپنی اپنی بیوی اور تمہاری زندگی خطرے میں ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح ایک خاندانی زمیندار کو معذوری کی حالت میں لوہار کا پیشہ اپنانا پڑا۔''

''کاش! کاش یہ سب مجھے پہلے معلوم ہو جاتا۔'' میں نے اپنے دل میں بپا غم و غصے کی قیامت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس شیطان کے بوجھ سے اس زمین کو بہت پہلے نجات دلا دیتا۔'' صدیقی صاحب نے میرا شانہ تھپک کر مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''زندگی ان ہی آزمائشوں کا نام ہے۔ تم خوش نصیب ہو کہ تم شہید والدین کی اولاد اور بذات خود غازی ہو۔ یہ ذاتی انتقام سے کہیں بڑا اعزاز اور بلند مقام ہے۔ شاہ مراد ایک لعنت بھری زندگی گزارنے کے بعد کیفر کردار کو پہنچنے والا ہے۔ جبکہ ایک باوقار اور خوشحال زندگی تمہاری منتظر ہے۔ شاہ مراد نے جس جائیداد پر قبضہ کیا تھا۔ وہ اب بھی تمہاری اور تمہارے چچا کی ملکیت ہے۔ بیس مربع کے لگ بھگ زرخیز زرعی اراضی کے مالک کی حیثیت سے تم ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکتے ہو۔ اس کے علاوہ ایک آفر میں بھی لے کر آیا ہوں۔ تم ہمارے محکمے میں شمولیت اختیار کرنا چاہو تو ایک ذمے دار عہدہ تمہارا منتظر ہے۔ تم فوری طور پر ہمیں جوائن کر سکتے ہو۔''

''آپ مجھے سوچنے کا موقع دیں۔'' میں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ چلو اس سخی سرور سائیں کے روضے پر حاضری دینے چلتے ہیں۔'' میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور صدیقی صاحب کے پیچھے چل دیا۔

☆O☆